

رسول نمبر

نقوش

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد اوّل

شمارہ نمبر ۱۳۰
دسمبر ۱۹۸۲ء

مُدیر:
محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

طلوع ۷

عہد

(۱) پندرھویں صدی ہجری ۹

تکنیک

(۱) سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول ۳۸
(۲) سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو ۵۲
(۳) سیرت نگاری کے چند پہلو ۷۰
(۴) سیرت نگاری کی ذمہ داریاں ۸۱

سیرتِ نبویؐ کا بنیادی مواد

(۱) ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ ۸۹
[قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے]

سورۃ الفاتحہ	۹۲	سورۃ البقرہ	۹۳	سورۃ آل عمران	۹۸
سورۃ النساءُ	۱۰۱	سورۃ المائدہ	۱۰۵	سورۃ الانعام	۱۰۸
سورۃ الاعراف	۱۱۲	سورۃ الانفال	۱۱۵	سورۃ التوبہ	۱۱۷
سورۃ یونس	۱۲۱	سورۃ ھود	۱۲۳	سورۃ یوسف	۱۲۴
سورۃ الرعد	۱۲۵	سورۃ ابراہیم	۱۲۷	سورۃ الحجر	۱۲۸
سورۃ النحل	۱۲۹	سورۃ بنی اسرائیل	۱۳۱	سورۃ کہف	۱۳۳
سورۃ مریم	۱۳۵	سورۃ طٰہٰ	۱۳۷	سورۃ الانبیا	۱۳۸
سورۃ الحج	۱۳۹	سورۃ المومنون	۱۴۰	سورۃ النور	۱۴۱

سورۃ الفرقان	۱۴۲	سورۃ الشعراء	۱۴۴	سورۃ النمل	۱۴۵
سورۃ القصص	۱۴۶	سورۃ العنکبوت	۱۴۸	سورۃ الروم	۱۵۰
سورۃ لقمان	۱۵۲	سورۃ السجدہ	۱۵۳	سورۃ الاحزاب	۱۵۴
سورۃ السبا	۱۵۷	سورۃ فاطر	۱۵۸	سورۃ یٰسین	۱۶۰
سورۃ الصّٰفّٰت	۱۶۱	سورۃ صٓ	۱۶۲	سورۃ الزُّمر	۱۶۳
سورۃ المومن	۱۶۵	سورۃ حٰم السجدہ	۱۶۶	سورۃ الشوریٰ	۱۶۸
سورۃ الزخرف	۱۶۹	سورۃ الدّخان	۱۷۰	سورۃ الجاثیہ	۱۷۰
سورۃ الاحقاف	۱۷۱	سورۃ محمد	۱۷۲	سورۃ الفتح	۱۷۳
سورۃ الحجرات	۱۷۴	سورۃ ق	۱۷۵	سورۃ الذّٰریٰت	۱۷۶
سورۃ الطور	۱۷۷	سورۃ النجم	۱۷۷	سورۃ القمر	۱۷۸
سورۃ الرحمٰن	۱۷۹	سورۃ الواقعۃ	۱۷۹	سورۃ الحدید	۱۸۰
سورۃ المجادلہ	۱۸۱	سورۃ الحشر	۱۸۲	سورۃ الممتحنہ	۱۸۳
سورۃ الصف	۱۸۳	سورۃ الجمعہ	۱۸۴	سورۃ المنٰفقون	۱۸۵
سورۃ التغابن	۱۸۵	سورۃ الطلاق	۱۸۵	سورۃ التحریم	۱۸۶
سورۃ الملک	۱۸۶	سورۃ القلم	۱۸۷	سورۃ الحاقہ	۱۸۷
سورۃ المعارج	۱۸۸	سورۃ نوح	۱۸۸	سورۃ الجنّ	۱۸۹
سورۃ المزّمل	۱۸۹	سورۃ المدثر	۱۹۰	سورۃ القیٰمۃ	۱۹۰
سورۃ الدھر	۱۹۱	سورۃ المرسلٰت	۱۹۱	سورۃ النبأ	۱۹۲
سورۃ النّٰزعٰت	۱۹۲	سورۃ عبس	۱۹۲	سورۃ التکویر	۱۹۳
سورۃ الانفطار	۱۹۳	سورۃ المطفّفین	۱۹۳	سورۃ الانشقاق	۱۹۳
سورۃ البروج	۱۹۴	سورۃ الطارق	۱۹۴	سورۃ الاعلیٰ	۱۹۴
سورۃ الفجر	۱۹۵	سورۃ البلد	۱۹۵	سورۃ الغاشیہ	۱۹۵
سورۃ الشمس	۱۹۶	سورۃ الیل	۱۹۶	سورۃ الضحٰی	۱۹۶
سورۃ الانشراح	۱۹۷	سورۃ التّین	۱۹۷	سورۃ العلق	۱۹۷
سورۃ القدر	۱۹۸	سورۃ البیّنۃ	۱۹۸	سورۃ الزلزال	۱۹۸
سورۃ العٰدیٰت	۱۹۸	سورۃ القارعۃ	۱۹۹	سورۃ التکاثر	۱۹۹

سورۃ العصر	۱۹۹	سورۃ الھمزہ	۱۹۹	سورۃ الفیل	۲۰۰
سورۃ قریش	۲۰۰	سورۃ الماعون	۲۰۰	سورۃ الکوثر	۲۰۰
سورۃ الکفرون	۲۰۱	سورۃ النصر	۲۰۱	سورۃ اللھب	۲۰۱
سورۃ الاخلاص	۲۰۱	سورۃ الفلق	۲۰۱	سورۃ الناس	۲۰۱

(۲) نبوت محمدیؐ پر قرآن میں استدلال ۲۰۳
(۳) پیغمبرِ انسانیت خدا کی نظر میں ۲۱۲
(۴) قرآن سے مظہر نبوت کی تشریح ۲۲۱
(۵) سیرتِ رسولؐ قرآن کی روشنی میں ۲۳۲
رسالت و بشریت ۲۵۴
معاصرین ۲۶۱
مشرکین ۲۶۴
منافقین ۲۸۰
مومنین ۲۹۲
(۶) قرآن حکیم اور اطاعتِ رسولؐ ۳۰۳
(۷) نبی کریمؐ کا مقصد بعثت (قرآن کی روشنی میں) ۳۱۲
(۸) کتاب اللہ، محمد رسول اللہ والذین معہٗ ۳۵۱
(۹) عہد نبویؐ میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین ۳۶۹

سیرت کا دورِ اوّل

[سیرت نگارانِ رسولؐ]

(۱) حضرت عروہ بن الزبیر، پہلے سیرت نگار ۳۹۷
(۲) ابن اسحٰق اور سیرۃ الرسول اللہ ۴۱۰
(۳) ابن ہشام، اور سیرت ابن ہشام ۴۵۲
(۴) طبقات ابن سعد، سیرت نبویؐ کا قدیم ماخذ ۴۹۸
(۵) تاریخ یعقوبی ——— سیرت نبویؐ کا ایک اہم ماخذ ۵۶۲
(۶) ابن حزم الاندلسی، اور جوامع السیرۃ ۵۹۵

(۷) ابنِ عبدالبر، اور الدرر فی اختصار المغازی و السیر — ۶۱۵
(۸) قاضی عیاض — ۶۳۷
(۹) ابنِ کثیر، سیرت نگارِ رسول اللہؐ — ۶۴۶
(۱۰) علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی — ۶۹۱
(۱۱) ابن الجوزی اور سوانحِ رسولؐ — ۷۰۱
(۱۲) رسولِ اکرمؐ کے سیرت نگار — ۷۰۹

سیرتِ نبویؐ کی اوّلین کتابیں

[اور اُن کے مؤلفین]

(۱) ابان بن عثمان — ۷۲۲
(۲) عروۃ بن الزبیر — ۷۲۶
(۳) شرحبیل بن سعد — ۷۳۴
(۴) وہب بن منبہ — ۷۳۵
(۵) عبداللہ بن ابی بکر بن حزم — ۷۳۹
(۶) عاصم بن عمر — ۷۴۴
(۷) ابن شہاب الزہری — ۷۴۵
(۸) موسیٰ بن عقبہ — ۷۵۳
(۹) معمر بن راشد — ۷۵۶
(۱۰) محمد بن اسحٰق — ۷۵۷
(۱۱) ابومعشر السندی — ۷۶۸
(۱۲) الواقدی — ۷۷۰
(۱۳) محمد بن سعد — ۷۸۳

(محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا)

التماس

ایک دن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تفسیر کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری نظر تفسیر کے ایک ابتدائی صفحہ پر پڑی، لکھا تھا:

"حضرت شاہ صاحب (شاہ عبدالقادر) کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو انشاء اللہ ایسا نہیں کہ اہلِ علم و دیانت میں کوئی اس کا منکر ہو۔ ہاں احقر نے جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے، اس کی نسبت ضرور ہم کو خلجان ہے۔ اس لیے اہلِ علم و انصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو کر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابلِ اصلاح ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرمائیں اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرمائیں۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہلِ علم اور عوام دونوں کو مفید ہے ایک تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آ جائے۔ جس طرح ہو اور جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے۔"

جو خواہش مولانا محمود حسن صاحب کی تفسیر کے بارے میں تھی ویسی ہی خواہش میری اس نمبر کے بارے میں ہے۔ وہ عالم سہی، میں طالب علم سہی، وہ برگزیدہ سہی، میں گنہگار سہی، اس کے باوجود خواہش میری بھی وہی ہے کہ اس کام کو بھی بہتر سے بہتر بنایا جاتے۔ لہٰذا اس نیکی میں آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا، نئے مضامین لکھ کر بھی، موجودہ شمارون سے متعلق اپنی رائے سے نواز کر بھی۔ تاکہ آیندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کی جاسکے۔

مجھے اس نمبر کے سلسلے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، محمد اجمل اصلاحی، مولانا نعیم صدیقی، ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا عبدالمتین ہاشمی، جناب رفیع اللہ شہاب اور جناب محمد عالم مختار حق کا بھی تعاون حاصل رہا۔ کسی نے مشوروں سے نوازا، کسی نے مواد کی فراہمی میں مدد دی۔ جس نے جس حد تک مدد کی خدا اُن کے اُتنے ہی درجات بلند کرے گا۔

——— اور میں تو شکر گزار ہوں ہی! ——— تہ دل سے شکر گزار!

[محمد طفیل]

طلوع

[یہ اداریہ میں نے زیارتِ روضۂ رسولؐ سے پہلے لکھا تھا]

میں ادبی گنہگار ہُوں ۔ دربارِ رسولؐ تک کون ساجذبہ لے آیا ۔ یہ میں نہیں جانتا ۔ مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں !

مَیں نے آج تک جو کچھ بھی کیا اُس کی بھی توفیق نہ تھی ۔ اس لیے کہ اہلِ نظر نے جو کچھ دیکھا وُہ بھی میری سعی کا نہیں، "تائید کا نتیجہ ہے ۔

میرے حصہ میں کیا آیا ؟ حیرانی اور صرف حیرانی !

آج بھی میں جو کچھ لے کر حاضر ہو رہا ہُوں ، یہ توفیق نہیں انعام ہے ۔ کیونکہ مجھے اپنے گناہوں کا حال اوروں سے زیادہ معلوم ہے ۔

مُجھ سے جو کام مولا نے لینا ہے' وہ لے رہا ہے ۔ کیونکہ میں تو اپنی ذات میں نارسائیوں کی پوٹ ہوں، اور کچھ بھی نہیں ہُوں !

میری گنہگاری اپنی جگہ، توفیقِ ایزدی اپنی جگہ ۔ مگر سوال یہ ہے کہ میرے اِس سفرِ شوق کا حال کچھ میرے رسولؐ کو بھی معلوم ہے ؟

میں حاضر ہُوں یا رسولؐ اللہ !

میں حاضر ہُوں !

میں حاضر !

○

محمد طفیل

اس شمارے میں

مجھ سے ایک دن، رسول نمبر کے خوشنویس نے کہا : میں نے اس نمبر کی کتابت ۱۹۷۲ء میں شروع کی تھی اور آج ۱۹۸۲ء ہے کہ سیرت نمبر ہی لکھ رہا ہوں۔

اس نمبر کی اشاعت، میرے لیے وُہ سعادت ہے کہ جس کی تڑپ ایک عرصہ سے میرے دل میں تھی۔ میں نے اس نمبر کے لیے بڑی محنت کی اور محنت سے زیادہ اللہ کی بارگاہ میں دُعائیں مانگیں۔ جذبۂ اوّل کا ثمر محدود ہوسکتا ہے اور جذبۂ دوم کا ثمر لامحدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں کسی قابل ہُوا ہوں۔

"آج سے تقریباً ستر (۷۰) برس پہلے مولانا شبلی نعمانی کے دل میں سیرۃ النبیؐ لکھنے کا خیال آیا تو بقول سید سلیمان ندوی اُنھوں (مولانا شبلی) نے ۱۹۱۲ء میں اس بار امانت کو اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ پچاس ہزار کے سرمایے قوم میں مرافعہ پیش کیا۔ سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لیے آگے بڑھے۔ اُن میں فقرائے اُمت بھی تھے اور امرائے ملت بھی۔ لیکن یہ سعادت اُخروی ازل ہی سے نواب سلطان جہاں بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال کے لیے مقدر تھی۔ اس لیے وہ سب سے آگے بڑھیں اور سوانح نگار نبوت کو دُوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا۔ فرمانروا خواتین اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دئے ہیں، آیندہ مورخ غالباً اس کارنامے کو سب سے بڑا قرار دے گا کہ اس کا تعلق اس ذاتِ اقدس سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔"

یہ اور ایسے کام جو بڑے اہتمام اور سرمایہ سے شروع کیے جاتے ہیں، اُسے اس ہیچمدان نے اپنے جذبہ ہی کو ساری پُونجی سمجھ کر شروع کر دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کام کس پایہ کا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔ میں نے سیرت کے موضوع پر جتنے اچھے مقالے موجود تھے انھیں اکٹھا کیا ہے (کچھ دُوسری جلدوں میں آئیں گے) جن موضوعات پر کام کا مواد نہ ملا اُن پر نئے مقالے لکھوائے۔

سیرت کی دُوسری کتابوں سے، اس پہلی جلد میں قدرے مختلف اور اہم پہلو یہ نظر آئے گا کہ جہاں اور کتابوں میں سیرت نگارانِ رسولؐ کا ذکر ایک ایک دو دو صفحات میں ملے گا وہاں اس جلد میں خاصی تفصیل سے یعنی بیس بیس چالیس چالیس صفحات میں۔ اس طرح ہم نے تکنیک اور مصادر پر ۱۰۶ صفحات پیش کیے، جو ضروری تھا مگر ایسا ضروری کام پہلے ہوا نہ تھا۔

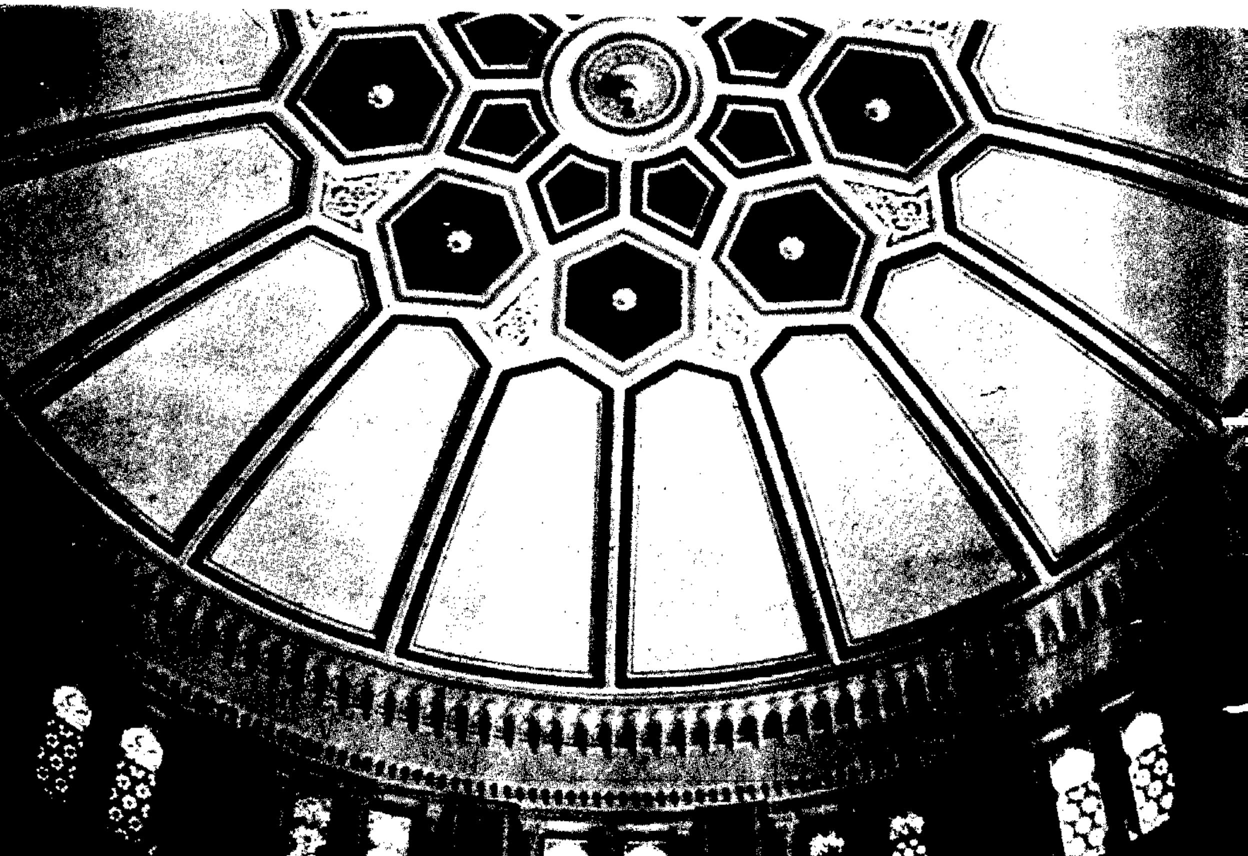
میں نے آج تک جتنے نمبر پیش کیے، وہ سب فخریہ انداز میں پیش کیے۔ مگر یہ نمبر انتہائی عاجزی کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ یہ معاملات دل کے ہیں! کبھی اُس طرح خوشی، کبھی اِس طرح خوشی!

[محمد نقوش]

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ

دیکھو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں

تکنیک



پندرھویں صدی ہجری ــــــ ماضی و حال کے آئینہ میں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس وقت دنیا میں پندرھویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے۔ عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے[1]، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے، لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا بلکہ پیغام پر رکھا ہے۔ اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرز عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا۔ یہی خصوصیت اس صدی کی ہے۔ اس صدی کا آغاز بھی کسی بڑی شخصیت، یہاں تک کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب و محترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے عقیدہ اور نظر میں سب سے محبوب و محترم شخصیت ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے اور نہ آپؐ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں، بلکہ آپؐ کے واقعۂ ہجرت سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہوگی تو ایک پیغام لے کر آئے گی، وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپؐ نے ایک عظیم مقصد کے لیے اپنے عزیز وطن کو خیر باد کہا، اور ایک نئے شہر میں بود و باش اختیار کی۔ یہ بات ایک پیغام اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے، آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اس کو ساری دنیا تک پہنچانے کا موقعہ مہیا کرنے کے لیے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے کہ کسی عظیم مقصد کے لیے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جا سکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جا سکتا ہے، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز

---

[1] مثلاً عیسوی تقویم (جنتری) جو ساری دنیا میں رائج ہے حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے۔ بکرمی جنتری کی جو ہندوستان میں رائج تھی نسبت بکرماجیت بادشاہ کی طرف ہے، ایران میں اور زردشتیوں کے یہاں یزدگرد ثالث کے دو سنہ مستقل تھے، ایک اس کی تخت نشینی سے شروع ہوتا تھا دوسرا اس کی موت سے۔ گریگورین کیلنڈر پوپ گریگوری سیزدہم کی طرف منسوب ہے جو ۱۵۸۲ء سے (باستثنائے روس و یونان) تمام یورپ میں جاری ہے۔

خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اس کی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے، اور ارادہ میں عزم و پختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا، اور اس کی قسمت میں کامیابی و کامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اس لیے یہ پندرھویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لیے وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کے لیے حیاتِ نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرھویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہوگی، یا (خدانخواستہ) منحوس و نامبارک؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں، اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:

وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (سورہ النجم۔ ۳۹) اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

انسان کو اپنی زندگی، اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے، جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اس کی سعی آئے گی اور سعی کے نتائج آئیں گے۔ اس کے بعد فرماتا ہے:

وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی۔ (سورہ النجم۔ ۴۰) اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں اور تاریخ کے تمام دوروں کے لیے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، اور اس کے اثرات و نتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی۔ (سورہ النجم۔ ۴۱) پھر اس کو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی اور بارآوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے، وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے۔ اقبال نے انسان کے لیے کہا تھا ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا "خاکی" کی جگہ آپ "صدی" کہہ لیجئے، یہ پندرھویں صدی، اور وہ صدیاں جو گزر چکی ہیں، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں نہ منحوس، اس کے مبارک و منحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رُخ پر ہونے، اور صحیح طریقہ پر انجام پانے پر منحصر ہے، ہم کسی صدی کے متعلق، بلکہ کسی سال، کسی مہینہ، کسی دن، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہوگی یا منحوس؟ اسلام میں برکت و نحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں، جو بعض جاہل قوموں میں (جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے محروم رہی ہیں)

اب بھی پایا جاتا ہے، ہم یہ کہیں کہ آنے والی صدی بہت مبارک ہے، اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہوگا، یا یہ صدی کسی ملت یا تقدیر انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہوگی۔ یہ بالکل اسلامی طرزِ فکر نہیں ہے اور کتاب و سنت سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ تخیل فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس، انسانی قوتِ عمل کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے، اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعتِ نحس آنے والی ہے، یا فلاں گھڑی منحوس ہے، تو اس کے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے اور اس کی قوتِ عمل کیا بلکہ قوتِ فیصلہ بھی جواب دے جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے وہم پرستی، بلکہ غائبانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا، ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا، خدا کو اس اُمت کی تربیت مقصود تھی، اس سے کچھ پہلے ہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال[1] ہوا تھا، عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے، اور اس کے اثرات تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے تھے، واقعہ بھی ایسا غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ کیوں نہ ہو اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہوا اور سورج اس سے متاثر نہ ہو یا دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علمبردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اس کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کھلائی بھی نہیں خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آئے ہوں) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بے شک اس کی مثال مل سکتی ہے لیکن بانیانِ جماعت، اور سیاسی رہنماؤں کے یہاں نہیں مل سکتی۔ آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا اور فرمایا:

إن الشمس والقمر آيتان من آيات الله لا يخسفان لموت أحدٍ ولا لحياته[2]	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی موت یا زندگی پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپؐ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، اور ان کا قانون دوسرا ہے، وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے، یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقع پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد پیدا ہونے والا نہیں تھا، بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی، اور محبت و عظمت

---

[1] یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ کا ہے، حضرت ابراہیم کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی، جب ان کا انتقال ہوا۔

[2] کتاب الکسوف، صحیح مسلم ج ۱، ص ۲۹۶

پر مبنی تھا ، پیدا ہوا تھا ، اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا ، اللہ کا رسول اس کو بھی برداشت نہ کر سکا ، اور کہا کہ نہیں نہیں ! میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں ، کائنات اس سے زیادہ وسیع ، اور اللہ کی ذات اس سے زیادہ غنی ہے ۔ اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے ۔ یہ ایک اصولی رہنمائی تھی جو پوری نسلِ انسانی ، بلکہ ذہنِ انسانی کو دی گئی ، ذہنِ انسانی نسلِ انسانی سے بھی زیادہ قیمتی ، اور قابلِ لحاظ ہے ، وہ ساری نسلِ انسانی پر حکومت کرتا ہے ۔ نسلِ انسانی ذہنِ انسانی پر حکومت نہیں کرتی ، یہ ذہنِ انسانی کا انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے ، اور اس کا علاج اور سدِباب ضروری تھا ۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جاسکتی ہے نہ منحوس ، میں گلاس کی مثال دُوں گا ، گلاس اگر خالی ہے تو آپ اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا بُرا ہے ۔ اس کا انحصار اس "مظروف" پر ہے ، جس کا یہ گلاس ظرف ہے ، یہ پانی کا گلاس ہے ، خدانخواستہ اگر شراب ہوتی تو یہ شراب کا جام ہوتا ، اگر اس کے اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالہ ہوتا ۔ یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم ، ایک بالکل غیر جانب دار چیز ہے ۔ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کو کس چیز سے بھرتے ہیں ! آپ اس کو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے ، اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے ، اس لیے نسلِ انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی ، مبارک ہوگی ، یا منحوس ہوگی ؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے ، جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے ۔

اس سلسلہ میں مَیں تین مثالیں دُوں گا ، دو مثالیں ان صدیوں کی جن کا آغاز نہایت ہولناک ، مایوس کُن ، ہمت شکن اور حوصلہ فرسا واقعات سے ہوا ، اس وقت کے مؤرخوں اور اہلِ نظر نے اس صدی کا استقبال ناگواری سے نہیں ، بلکہ جگر کے زخموں ، دل کے داغوں اور آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے کیا ، ابن اثیر و ابن کثیر کی شہادت موجود ہے کہ اسلامی حلقوں نے ساتویں صدی کا استقبال کس طرح کیا ! تمام آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ صدی مسلمانوں کے حق میں نہیں ، ملّتِ اسلامیہ کے حق میں نہیں ، بلکہ پوری انسانیت کے حق میں منحوس ترین صدی ثابت ہوگی ، اس کا آغاز ایسے غیر معمولی واقعہ سے ہوا تھا ، جس طرح کا واقعہ (مورخ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) کے بقول) " اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دُنیا میں پیش نہیں آیا ، تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا ، اس لیے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا ۔[1]"

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے ، جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی (EMPIRE) علاء الدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا ، یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا ، اور تیرھویں صدی مسیحی چل رہی تھی ، "تاتاری مور و ملخ کی طرح اُٹھے اور عالمِ اسلام پر چھا گئے ، ترکستان اور ایران کو زیر و زبر اور پورے پورے شہروں کو انھوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا ۔ انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے ، جن پر چڑھ چڑھ کر انھوں نے صدا لگائی ، پورے

[1] الکامل لابن اثیر ، ج ۱۲ ، ص ۱۴۷ - ۱۴۸

پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب " سقوط و زوال روما " (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھا ہے کہ:

" سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی وحشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔"[1]

خیال کیجیے کہ سویڈن کہاں واقع ہے؛ انگلستان کا ساحل اس علاقے سے جس پر تاتاریوں کی تاخت ہوئی تھی، جغرافی طور پر کتنی دور تھا، سویڈن کے ماہی گیر جن کا پیشہ ماہی گیری تھا، کچھ عرصہ انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے خوف و وہشت کے مارے نہیں آئے، کیمبرج کی " تاریخ عہد وسطیٰ " کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچنے کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ " آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دیا۔"[2]

یہ دونوں ان مغربی مصنفین کے بیانات ہیں، جو جذبات اور گرد و پیش کے حالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور جن پر براہِ راست تاتاری حملہ کی زد نہیں پڑتی تھی، مسلمانوں نے اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھا، اس کا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جا سکتا ہے، جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زبان زد تھی:

" اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق۔"

(ہر بات مان لینا، لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا)

وہ مسلمان قوم جو یاس کے مفہوم سے ناآشنا تھی، جس سے کہا گیا تھا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ (الزمر ۔ ۵۳) — اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ مسلمان جنھوں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (سورہ یوسف ۔ ۸۷) — اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی لوگ ہوتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر ایسی مایوسی طاری تھی کہ ان کے لیے یہ کہاوت بن گئی تھی کہ ہر بات قابلِ تسلیم ہے، قرینِ قیاس ہے، کوئی بات دنیا میں ناممکن نہیں، ناممکن بات صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے " حصار " سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ

---

[1] گبن ص ۱۶

[2] ماخوذ از " چنگیز خاں " از ہیرلڈ لیمب ص ۲۶۶

میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے اور انھوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان اور ایران و عراق کا تختہ اُلٹ دیا تھا، اور ان ملکوں کی حکومت اور تہذیب و تمدن کا چراغ گل کر دیا تھا، یہی وقت ہے جب ذہین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے، اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، آرنلڈ نے اپنی کتاب "PREECHING OF ISLAM" میں مسلمانوں کی مایوسی اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس وقت ہر حساس آدمی جس کو خدا نے دیکھنے کے لیے دو آنکھیں دی تھیں، اور مقدمات و اسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہو چکے ہیں، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو رہا ہے، اس عالم آشوب واقعے سے مسلمانوں کو اصل نقصان پہنچا تھا کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اسی لیے سب سے زیادہ مسلمانوں کے لیے کام کرنے کا میدان تنگ تھا اور سب سے کم اُمید ان کے لیے تھی۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

"(اسلام کے علاوہ) دو مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی، جس وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب، اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔

اسلام کے لیے ایسے وقت میں بودھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔"[1]

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اس لیے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں، اور ان کے پادری ان کے درباروں میں تھے، اس لیے اگر قبولِ مذہب کا سوال ہوتا، تو حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ وہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنا پڑے کہ:

"بالآخر اپنی گزشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے اسلام اُٹھا اور واعظینِ اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا مسلمان کر لیا۔"[2]

آرنلڈ مزید لکھتا ہے:

"باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو بعد میں آئیں، انھیں مسلمانوں کا

---

[1] دعوتِ اسلام ص ۲۴۰، ۲۴۱

[2] ایضاً ص ۲۴۵ - ۲۴۶

مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔"[1]

وہ صدی جس کا آغاز نحوست سے ہوا تھا (اگر نحوست کا کوئی لفظ اسلام کی ڈکشنری میں ہے) وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا، وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی، اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بلکہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔

ہوورتھ لکھتا ہے کہ:

"مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کیے کہ چینی تماشے والے جو پردے پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹتے گھسیٹتے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے۔"[2]

لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس اسلام نے فاتح تاتاریوں کو فتح کر لیا۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، خدا پر اعتماد نہیں کھویا تھا، ایمان و عقیدہ نہیں کھویا تھا، روحانی طاقت نہیں کھوئی تھی، شکست کس نے کھائی تھی؟ شکست کھائی تھی (مجھے بہت تکلیف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) نالائق مسلمان بادشاہوں نے، ایک کمزور و مریض معاشرہ نے، اسلام اپنی جگہ پر تھا، اسلام کے شیشہ پر کوئی بال بھی نہیں پڑا تھا، مسلمانوں نے اس وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ تاتاریوں کو تلوار سے زیر کرنا ممکن نہیں، اسلام کی تلوار کند ہو چکی ہے، تقریباً ٹوٹ چکی ہے یا نیام میں جا چکی ہے۔ تاتاری یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان کے پاس مسلمانوں سے بہتر فوجی طاقت ہے، وہ دولت و حکومت، اور تمدن و تہذیب کی خرابیوں اور بیماریوں سے دور ہیں، ان کے اندر مشقتوں اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی وہ طاقت ہے جو کبھی تازہ دم عربوں اور فاتحین اسلام میں تھی، وہ صدیوں کے بعد صحرا سے نکلے ہیں، ان کی ساری توانائی (ENERGY) ان کے اندر محفوظ ہے، ان کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جا سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پھر کس نے تاتاریوں کو فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟

اس نازک گھڑی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اہلِ دل سامنے آئے، جن کے اندر روحانی طاقت تھی، اور تقریباً نصف صدی کے اندر اندر انھوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنا لیا، قبول اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، افراد کے قبولِ اسلام کے، خاندانوں کے قبولِ اسلام کے، شہروں کے قبولِ اسلام کے، لیکن

---

[1] دعوتِ اسلام، ص ۲۴۵ - ۲۴۶

[2] HOWORTH: HISTORY OF THE MONGOLS V.I. (LONDON 1876-80) P. 159.

قوموں کے من حیث القوم قبولِ اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں، عربوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا، افغانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا (افسوس ہے کہ وہ بھی آج ابتلا و آزمائش میں ہیں) تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں من حیث القوم سو فیصدی اسلام قبول کیا۔ تاریخ کا یہ معمّہ ہے۔ اور میں بھی اس آزمائش سے گزر چکا ہوں۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا واقعہ) پیش آئے، اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ ملیں جن کے سر تاتاریوں کے قبول اسلام کا سہرا ہے، یہ کیا بات ہے؟

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آیا کہ جب مدائن کی فتح میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا، اور وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواجِ اسلامی سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا، جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے "ایھا الامیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے" پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصّع تاج زرّیں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی، اس کو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اس کو اپنے خیمہ میں لے جا کر رکھ دے۔ کہا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کی طرف مُنھ کر کے اور پیٹھ پھیر کر کہا کہ "جس چیز کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام جانتا ہے" اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک فرد کا واقعہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تاتاریوں کو کلمہ پڑھانے والوں کا یہی طرزِ عمل تھا، انھوں نے اپنے نام کو چھپایا۔ مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا دو آدمیوں کے نام ملے ہیں، ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام[1] جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیر اعظم تھے، وہ صوفی منش اور عابد و زاہد وزیر تھے، اور ان کا عمل اس پر تھا کہ: ع

درویش صفت باش، و کلاہ تتری دار

تاتاری بادشاہ کے کان میں وہ اچھی بات ڈالتے رہے، حتّٰی کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے اور تاتاری حکمران سلطان غازان اور اس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لیے ہوئے مسجد کو جا رہے ہیں۔[2]

دوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے، جن کے خلوص بے پایاں، سچی روحانیت اور دلی درد مندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ میں جو بلادِ متوسط میں (جس کا مرکز کاشغر تھا) اسلام پھیلا اور پوری شاخ مسلمان ہو گئی۔ واقعہ

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[2] البدایہ والنہایہ، ج ۱۳، ص ۳۴۰

یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جا رہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے وقعت تھے، وہ ان کو طعنہ دیتے تھے اور چڑاتے تھے کہ ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں! اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے، یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا، جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، اور اس کی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا کچھ سال باقی تھے، شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں، اور یہ لوگ تو سخت وہم پرست تھے۔ شیخ جمال الدین کو دیکھا کہ وہ شکار گاہ میں داخل ہو گئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا، اس نے کہا کہ آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی میں نے صورت دیکھ لی، یہ ایرانی کمبخت یہاں آ گیا، اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ تم اچھے ہو کہ میرا یہ کتا اچھا ہے؟ خیال کیجئے اور اس منظر کو سامنے لائیے، اور دیکھیے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا ہے، ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا، کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا! شہزادہ نے کہا کیا مطلب؟ یہ کون سی مشکل بات ہے؟ انھوں نے کہا کہ اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں، ورنہ یہ کتا اچھا ہے۔

تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی، محض کچھ کہہ دینے سے ایسی ضرب نہیں لگتی، لیکن ؏

ہر چہ از دل می خیزد، بر دل می ریزد

جو چیز دل سے اٹھتی ہے دل پر گرتی ہے، انھوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہوگا اس کے ساتھ کتنی دعائیں، کتنے آنسو، کتنی آہیں رہی ہوں گی۔ خدایا! کہنے کو تو میں یہ جملہ کہتا ہوں اثر تو پیدا کر، یہ وقت ہے اسلام کی قسمت کے فیصلہ کا! اگر اس شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ تو ابھی نہیں ہو سکتا، اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا جب میں کلمہ پڑھتا ہوا، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اس وقت یقیناً میں اشرف المخلوقات ہوں، میں افضل ہوں، ورنہ یہ کتا ہزار درجہ مجھ سے بہتر رہے گا۔ یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے آرنلڈ کی کتاب "PREACHING OF ISLAM" میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے[۱]

تغلق تیمور نے کہا کہ اچھا اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہد سلطنت ہوں آپ کہیں بھی ہوں جب یہ سنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو مجھ سے ملنے گا، اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعت سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو اور میں خدا کا پیغام اس تک پہنچاؤں، ان کی قسمت میں نہیں تھا، وقت اخیر آ گیا، مرض موت میں انھوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا، اور کہا کہ بیٹا! ایک بہت بڑی سعادت تھی جو میری قسمت میں معلوم ہوتا ہے نہیں ہے،

۱؎ آرنلڈ کی کتاب میں اس واقعہ پر شیخ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے کہ "اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہو، تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے"

شاید تمھاری قسمت میں ہو، جس وقت تم یہ سُنناکہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی، اس تک میرا اسلام پہنچانا اور کہنا کہ آپ نے میرے والد سے کچھ کہا تھا؛ چنانچہ وُہ گئے، کون ان بے چاروں کو محل میں گھسنے دیتا؛ وہ تاتاری شہنشاہ کا محل تھا، دربانوں نے ان کو روک دیا، اس وقت تو انھوں نے انتظار کیا کہ کوئی موقعہ ملے، نہیں موقعہ ملا، ایک درخت کے نیچے مصلّٰی ڈال کر وہاں بیٹھ گئے جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے اور نماز پڑھ لیتے، خدا کو منظور تھا، ایک دن صبح کے وقت جو میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے، انھوں نے اذان دی، وہ آواز محل اور خواب گاہ سلطانی میں پہنچی یا پہنچائی گئی، بادشاہ نے کہا یہ کون باؤلا شخص ہے؛ کیا صدا بے ہنگام لگاتا ہے یہ؛ میں نے تو آج تک یہ آواز نہیں سُنی، محل کے قریب حفاظت (SECURITY) کے بڑے انتظامات ہوتے ہیں، داروغہ نے کہا کہ حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہوا ہے ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا کہ کوئی مسکین آدمی ہوگا صدا لگاتا ہے، بادشاہ نے حکم دیا اسے پکڑ کر لاؤ۔ بلایا گیا۔ بادشاہ نے کہا تم کون ہو؟ یہ کیا صدا لگاتے ہو؛ اس کا کیا مطلب ہے؛

شیخ رشید الدین نے کہا کہ سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ شکار کھیلنے کے لیے نکلے تھے، ایک مسلمان فقیر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، آپ نے ان سے پُوچھا تھا کہ تم اچھے ہو یا میرا کتّا اچھا؛ اُنھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکتا، میں آپ کو یہ بتانے آیا ہُوں کہ اس کا فیصلہ ہوگیا، الحمدللہ وہ ایمان کے ساتھ دُنیا سے رخصت ہُوئے۔

بادشاہ نے سُنا اور وزیر اعظم کو بلایا، کہا کہ ایک راز ہے جو میرے سینے میں تھا، یہ واقعہ میرے ساتھ گذرا ہے، اس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہوجاؤں گا، تمھاری کیا رائے ہے؛ وزیر نے کہا کہ حضور والا! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، میں تو اپنے اسلام کو چھپا رہا تھا، میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وزراء بلائے گئے، اور جب بادشاہ کا منشأ معلوم ہوا تو سب مسلمان ہوگئے۔

ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ تہذیب تھی نہ علم و ادب، نہ کوئی آسمانی مذہب جس کو عقل قبول کرے، قانون بھی انھوں نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (سورہ فتح۔ ۷) اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کے لشکر ہیں۔

یہ خدائی تدبیر تھی، اتنے متمدن اور ترقی یافتہ مملکت کا نظم و نسق کرنا تاتاریوں کے بس کا روگ نہ تھا، وہاں مسلمان قانون ساز موجود تھے، آب پاشی کا نظام، تحصیل وصول کا نظام، مقدمات کے فیصلے، ان کے پاس ایک مختصر و محدود قانون تعزیرات تھا، جو صحرا کی محدود زندگی اور اس کے تجربات پر مبنی تھا، پہلے سے وہ مسلمانوں کے دست نگر تھے، مسلمان دانشور، ماہرینِ قانون اور علمأ پہلے ہی اپنا کام کر چکے تھے، اور انھوں نے اتنی بڑی مملکت کے نظم و نسق میں ان کی مدد کی تھی، اور اسلام کی زندگی کی رہنمائی، اور معاشرہ و مملکت کی تنظیم کی صلاحیت کا نقش ان کے دماغوں پر قایم کردیا تھا، اُنھوں نے دیکھا کہ اب صرف عقیدہ اور ایمان کی بات باقی تھی، وہ مرحلہ یہاں طے ہوگیا۔

اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا، اور پُورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہو گئے، ادھر امیر توزون کی کوشش سے عراق میں جو خاندان حکومت کر رہا تھا، اسلام قبول کر چکا تھا۔ جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے، یہ مسلمان دانشور، مخلص علماء، واعظین، مبلغین، اور سب سے بڑھ کر اہلِ دل کا کارنامہ تھا، اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، پُوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہلِ دل نے اندر اندر کام کیا ہے، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں، یہ لاکھوں انسان (جنھوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انھیں کے حساب میں شمار ہوں گے، ان اہلِ دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ رہا ہے ؎

اچھے وہی ہیں آج، جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے، انھیں کے ہزاروں گلے ہُوئے

میں نے ایک ایسی صدی کی مثال دی جس کا آغاز نہایت ہولناک حالات، اور اسلام کے حق میں پیامِ موت سے ہوا تھا، لیکن مسلمانوں نے ہمّت نہیں ہاری، انھوں نے سلطنت ہاری تھی، ہمت نہیں ہاری تھی۔ اور مسئلہ یہی ہے کہ سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے گیارھویں مرتبہ آسکتی ہے، ہمت ایک مرتبہ ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی، داعیانِ اسلام بغیر کسی پروپیگنڈے کے خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے اس وقت کوئی انجمن بنائی ہو کہ تاتاریوں کو مسلمان کرنا ہے، پہلے اُنھوں نے یہ اشتہار دیا ہو کہ تاتاری مسلمان ہوں گے، تو یہ فائدہ ہوگا اس سے کھوئی ہوئی سلطنت ملے گی، اقتدار قایم ہوگا، کچھ نہیں، خود مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اچانک یہ معلوم ہوا کہ پُوری کی پوری قوم اسلام کی جھولی میں ڈال دی گئی۔

میں نے ایک مثال ساتویں صدی ہجری، اور تیرھویں صدی عیسوی کی دی، جس کا آغاز ایسے مہیب اور ایسے ہولناک حالات سے ہُوا تھا، جس سے مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے، اور خدانخواستہ اگر ان میں عقیدہ کی طاقت نہ ہوتی، تو اگر ایمانی ارتداد نہیں تو تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو ضرور آجاتا، اس وقت نہ تہذیبی ارتداد آیا نہ ذہنی ارتداد، اور ایمانی ارتداد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دُوسری مثال میں دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کی دُوں گا، میں اس موقع پر عالمِ اسلام کی وسعتوں میں نہیں جاؤں گا، ہندوستان کا تذکرہ کرتا ہُوں، دسویں صدی ہجری کا وسط اس حالت میں آیا کہ ہندوستان اسلام کی قیادت و رہنمائی بلکہ اسلام کے برکات ہی سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہو گیا تھا، بظاہر نظر آ رہا تھا کہ چند دنوں کا معاملہ ہے، تفصیلات آپ بڑی کتابوں میں پڑھیے[1]۔ اس وقت عالمِ اسلام میں دو سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، ایک عثمانیوں کی سلطنت ایشیائے کوچک اور مشرقِ وسطیٰ میں۔ دوسری مغلوں کی سلطنت اس برّ اعظم میں، اس کے بعد اگر نمبر تھا تو ایران کی صفوی سلطنت کا، یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک قوی الارادہ، صاحبِ عزم، ذہین

---

[1] مثلاً تاریخِ دعوت و عزیمت حصہ چہارم

فاتح اور کشور کشا سلطانِ وقت کے ساتھ اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابوالفضل اور فیضی کا نام سب سے نمایاں ہے) ایک تحریک میں شامل ہو گئے، جس کا مقصد ہندوستان کا رُخ اسلام سے ہٹا کر اکبر کے دینِ الٰہی اور اس وحدت ادیان کی طرف موڑنا تھا، جس میں پلڑا ہمیشہ دُوسری طرف جُھکا ہوا ہوتا تھا[1]۔

یہ مادّی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلق العنان سلطنت، اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی، جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا کہ دسویں صدی ختم ہو رہی ہے، گیارھویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کے لیے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے، ایران و ہندوستان کے بہت سے فاضلوں نے جن کو خوفِ خدا اور دین کا گہرا علم نہیں تھا، اور جاہ و اقتدار اور منصب و عہدہ کی ہوس تھی، اس کے لیے مواد فراہم کر دیا کہ فلاں مذہب کا ستارۂ اقبال اتنے دنوں تک بلند رہا، ایک ہزار سال کے بعد دُوسرا مذہب آیا، اور دُوسری فکری رہنمائی اور قیادت میدان میں آئی، اب دینِ عربی کی عمر پوری ہو گئی ہے، اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت پر ایک ہزار سال گزر گئے ہیں، اس نسل کو نئے دین و آئین کی ضرورت ہے، اکثر ایسے فتنے ان فلسفوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو مذہب اور اخلاقیات کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس خطرہ کا ذرا اندازہ کیجئے، اس تحریک کا علم بردار اور رمز (SYMBOL) وہ شخص تھا جس کی تلوار کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی، جس نے ہر ناقابلِ تسخیر مہم کو سر کیا تھا، اور جو شکست و ناکامی کو جانتا نہیں تھا، جس میں جوانی کا خُون تھا، اور اپنے جدِ اعلیٰ تیمور کی حوصلہ مندی، اور بابر کی مشکل پسندی، ایک طرف وہ شہنشاہ ہے، اور دوسری طرف وہ ذہین ترین انسان ہیں، جن کی آج بھی آپ تحریریں پڑھیں تو ان کی ذہانت کا لوہا مان جائیں گے۔

پھر کیا ہوا؟ دسویں صدی کا آخر یہ خبر لے کر آیا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اُکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری طاقتوں اور فلسفوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے، یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پر پانی پھیر رہا تھا، جنھوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا، اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنھوں نے اپنے اپنے گوشوں میں بیٹھ کر سعید رُوحوں کو انسانیت اور محبّت، مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا درس دیا تھا، باہر

---

[1] اس رواداری اور صلح کل تحریک میں اسلام کے ساتھ مساویانہ و منصفانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرۃً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جُھک گیا، جس کا دربار میں رسوخ، اور بادشاہ کی طبیعت میں رجحان غالب تھا" مختصر تاریخ ہند" کے مصنفین ڈبلیو، ایچ مورلینڈ اور اے، سی، چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ:

"اکبری قوانین دینِ اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے۔"

(ص ۲۵۱)

رہ کر حکومتِ وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی اور امانت دار، خدا ترس، انسانیت دوست افراد مہیا کیے تھے اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی رُوح پھونک دی تھی[1]

پھر کیا ہوا؟ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی افق سے نہیں، کسی مادی افق سے، صرف اسی ایمان و روحانیت کے گوشہ سے، اسی اخلاص وللّٰہیت کے گوشہ سے، اسی علم و حکمت کے گوشہ سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے، اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، جس کا نام شیخ احمد سرہندی حضرت مجدّد الف ثانیؒ (۱۰۳۴ھ - ۱۶۲۴ء) ہے، جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے: ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان ۔۔۔ اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے ۔۔۔ جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے جس میں اس وقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزّت و آزاد طریقہ پر رہنے، اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کیے جاتے ہیں، اور صرف انھیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جا رہا ہے؟

پھر کیا نتیجہ ہوا؟ گیارھویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے، اس کے بعد سے دو تین صدیوں تک کے لیے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کر دیا گیا، اس وقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت و رسالتِ محمدی کی ضرورت و بقا اور شریعت و سنّت کے مقام و دوام کے خلاف جو علمی و اشراقی مغالطے تھے ان کا پردہ چاک کیا اور اس پر اعتماد بحال کیا[2]۔ دُوسری طرف اس خطرہ کا سدِّباب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس کی حکمتِ عملی (STRATEGY) کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو منظم کرنے کی کوشش نہیں، اس کے تاریخی مطالعہ نے بھی، اور اس کی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دیے جاؤ گے، تمھیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا۔ اللہ سے دُعائیں کرو، اپنے گرد مخلص اور لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو۔ وہ دولت اور حکومت کے دریا سے گزر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وُہ جاہ و حشمت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربارِ جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز ہیں۔ ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اس وقت موت و زندگی کے آخری

---

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی، اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخِ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم، باب پنجم

مرحلہ سے گزر رہا ہے، آپ کو کچھ کرنا چاہیے، جارحانہ طریقہ سے نہیں، بالکل تعمیری، علمی اور فکری طور پر، اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ۔"

مجدد صاحب نے خط و کتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے، جن سے انھوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں، اور نواب مرتضیٰ خاں (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ ۱۵۰-۲۰۰ برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا، ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کے لیے نہیں، پورے عالم اسلام کے لیے مرجع و مرکز بن گئے، اور روحانیت روحانیت میں، علمِ حدیث اور عربی لغت میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی، اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر و محقق پیدا ہوئے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (۱۱۱۴ - ۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سامنے آئی، جنھوں نے ایک نیا "علمِ کلام" پیدا کیا، نظامِ خلافت کی ایسی تشریح و تفصیل، اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو (جس کا بدل اس وقت موجود نہیں تھا) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے کی کوشش کی کہ اس کی شکست و ریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی و اخلاقی انتشار کا خطرہ تھا۔[1]

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پیش پیش تھے) اس ملک میں کتاب و سنّت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقاید، اعمال و رسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔

اسی سلسلۂ طلائی کی ایک زریں، اور مستحکم کڑی اصلاح و جہاد، احیائے سنّت و احیائے خلافت کی وہ عظیم الشان تحریک تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) کی قیادت میں اس برعظیم میں شروع ہوئی، اور جس نے انقلابِ حال، اسلامی سیرت، دینی حمیت، اور آدم گری اور مردم سازی کے وہ نمونے پیش کیے جنھوں نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کر دی، اس جماعت نے دعوت و اصلاح کے اتنے وسیع اور طویل محاذ پر اپنی جدّ و جہد جاری رکھی، جس کی نظیر عالمِ اسلام کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[2]

پھر عظیم دینی مدارس کا دَور آیا، اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور وہ دوسرے مدارس جا بجا قائم ہوئے، جن کی بنیاد خالص کتاب و سنّت کی تعلیم و اشاعت پر تھی۔[3] ان مدارس کے عالی مرتبہ بانیوں، اور مخلص و

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، اور "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" از ابوالحسن علی ندوی [3] ان کے تفصیلی تعارف کے لیے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ" ملاحظہ ہو۔

راسخ العلم فضلاً کی مساعی جمیلہ سے بڑے پیمانہ پر عقاید و اعمال کی اصلاح ہوئی، دینی ذوق اور اسلامی حمیت پیدا ہوئی، ان میں سے ایک بڑی تعداد نے آزادی کی تحریک اور ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، اور ان کی وجہ سے (بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح) مذہب و سیاست کی تفریق کا اصول کامیاب نہیں ہونے پایا، اور ملک کے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ، علماء و اہل دین کی قیادت سے (باغی ہونے کا کیا ذکر) ان کی رہنمائی و اثرات سے بھی آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکے۔

ان علماء کی علمی کاوشوں کی بدولت ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی کہ اگر یمن میں، مراکش میں، کسی شخص کو علم حدیث میں کمال پیدا کرنا مقصود ہوتا تو سیدھا ہندوستان آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو روحانی پیاس بجھانے کا شوق ہوتا، اور وہ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتا تو ہندوستان کا رُخ کرتا، مولانا خالد رومی پیدا ہوتے ہیں، عراق اور شام کے شمالی حصہ میں جو ترکی میں داخل ہے، ساری تعلیم و تربیت ان کی شہرزور اور دمشق کی ہے، لیکن جب ان کو اپنی رُوح کی پیاس بجھانے اور اللہ کی باتوں پر، غیبی حقائق پر، وہ یقین پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا جو بدیہیات اور ریاضی کے نتائج پر ہوتا ہے تو وہ کہاں گئے؟ وہ اپنے وطن شہرزور سے سیدھے دہلی شاہ غلام علی صاحب (م ۱۲۴۰ھ) کی خانقاہ میں آئے، اور وہاں آ کر پڑ گئے، اور یہاں سے کامیاب ہو کر گئے، اور عراق اور شام اور ترکی کے ملکوں میں انھوں نے اخلاق و روحانیت، اور معارف و حقایق کے دریا بہا دیے، اور ایک نئی رُوح پھونک دی، جس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

اگرچہ یہ گفتگو ہندوستان کی اصلاحی و تجدیدی تحریکوں تک محدود تھی، لیکن اس میں بیرون ہند، بلکہ مرکز اسلام (جزیرۃ العرب) کی عظیم تحریک تطہیر عقائد اور دعوت دین خالص کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوت تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر ہیں[1]۔ اس تحریک نے بعض خاص تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر وہ کامیابی حاصل کی، جو کم مصلحین اور داعیوں کے حصے میں آئی تھی، اس کے نتیجہ میں ایک پوری نسل، ایک وسیع سلطنت، اور ایک مکتب فکر پیدا ہوا جس کے اثرات دُور دُور پھیلے، اسی زمانہ میں یمن میں علامہ محمد بن الشوکانی (۱۱۷۲ - ۱۲۵۰ھ)، عسیر میں احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی بانیٔ سلسلۂ ادریسیہ، اور لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۲۰۶ - ۱۲۷۶ھ) پیدا ہوئے[2]، جنھوں نے اپنے اپنے مقامات پر اصلاح عقائد و رسوم، اشاعت کتاب و سنّت، اور مجاہدانہ تربیت و سیرت سازی کا عظیم کام

---

[1] شیخ محمد بن عبدالوہاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً ہم عمر ہیں، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے، اور شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ کی۔ شیخ کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

[2] مشہور مجاہد و مصلح سیدی احمد الشریف السنوسی (امام سنوسی) انھیں محمد بن علی السنوسی کے پوتے تھے، جنھوں نے طرابلس اور برقہ کی جنگ میں اطالیوں کے چھکے چھڑا دیے، اور تیرہ برس تک محض اپنے تربیت یافتہ رفقاء اور تلامذہ کی مدد سے یورپ کی اس بڑی طاقت کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے، وہ سیف و تسبیح، اور قرآن و شمشیر کے بیک وقت حامل تھے، اور ان کا شمار اپنے وقت کے شیوخ کبار، اور اہل اللہ میں سے تھا، ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۳ء) میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی" از امیر شکیب ارسلان۔ ج ۲۔

انجام دیا، مغربی مستشرقین ان سب مصلحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک کا خوشہ چیں اور ان کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا ثبوت مشکل ہے، مغربی ذہن اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ قرآن و حدیث کا مخلصانہ مطالعہ ہر دور میں ایسی اصلاحی شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے، جو بگڑے ہوئے حالات اور فاسد خیالات سے نبرد آزما رہیں، اور اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اسی کے کچھ بعد علامہ سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۷ء) نے اسلامی حمیت، اور اتحاد عالم اسلامی کا صور پھونکا، جس سے مصر و شام اور ترکی کے دشت و جبل اور بام و در گونج اُٹھے۔ انھوں نے اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مصری (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) نے اپنے عہد کی ذہین اور بے چین نوجوان مسلمان نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا[1]

جہاں تک چودھویں صدی ہجری کا تعلق ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ کامیابیوں اور ناکامیوں، غلطیوں اور تلافی کی کوششوں، مسلمان قوموں کی فریب خوردگی اور سادہ لوحی، اور اسی کے ساتھ سیاسی شعور اور بیداری، کثیر التعداد آزاد مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے قیام، اور اسی کے ساتھ متعدد طاقتور اسلامی تحریکوں کی صدی ہے، اس صدی میں واقعات و حوادث کا جو تنوع اور تضاد نظر آتا ہے، اس کی مثال پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کر و فر کے ساتھ موجود تھی، اور مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید خان ثانی (۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء - ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۶ء) متمکن تھے، جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنی رہی ہے، اور مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مؤقر عربی و ترکی رسائل میں شائع ہوئے ہیں، نیز ان کے روز نامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں، اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردِ عمل بھی) ایک نہایت باحمیت اور صاحب غیرت مسلمان حکمران تھے، جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے، اور یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور جنھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیشکشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا، اور زمین سے مٹی کی مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ "بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لیے تیار نہیں"[2] اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں

---

[1] پچھلے چند برسوں سے دونوں (استاد و شاگرد) کی شخصیتیں تنقید و تحقیق کا موضوع بن گئی ہیں، اور ان کے خلاف عربی رسائل اور علمی مجالس میں مضامین اور خطبات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن کی وجہ سے ان دونوں کی شخصیتوں کی عظمت اتنی مسلّم نہیں رہی جتنی ربع صدی پہلے تھی، لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے نوجوانوں کا اسلام کی صلاحیت اور عقلیت پر اعتماد بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کش مکش"۔

[2] یہ روایت میں نے مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کی زبان سے کئی بار سنی، جو اس سلسلہ کے ایک معتبر راوی اور ثقہ گواہ تھے۔

ایک نئی روح، اور عالمِ اسلام میں وحدتِ اسلامی اور "جامعہ اسلامیہ" کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

دولتِ عثمانیہ جو تولیتِ حرمین شریفین کے شرف، اور خلافتِ اسلامیہ کے اعزاز سے مفتخر تھی، اپنی ساری کمزوریوں اور داخلی و خارجی فتنوں اور مہیب سازشوں کے باوجود ملتِ اسلامیہ کے لیے خواہ وہ کہیں بستی ہو، قوت وعزت کا سرچشمہ، اور مقاماتِ مقدسہ اور ممالکِ عربیہ کے لیے ایک آہنی حصار تھی، جس کی موجودگی میں یہ مقامات وممالک (جن سے مسلمانوں کی عزت وقسمت وابستہ تھی اور ہے) لاوارث آدمی کے مال کی طرح تقسیم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس صدی کی ابتدا میں دولتِ عثمانیہ مشرق میں یمن وعسیر سے لے کر، مغرب میں ایک طرف یورپ میں ادرنہ والبانیہ، افریقہ میں طرابلس، تونس، قیروان تک، دوسری طرف جنوب میں اسوان، مصر، برقہ سے لے کر شمال میں بلگیریا، ریاست ہائے بلقان، طرابزون اور ایڈریانوپل تک وسیع تھی۔ دولتِ عثمانیہ کے حدود میں ایشیائے کوچک کا اکثر حصہ، شام (جس میں موجودہ فلسطین، لبنان اور شرقِ اردن بھی شامل تھے) مصر، جزیرۃ العرب، عراق، جزیرۂ قبرص شامل تھا، اور یورپ پر بھی اس "مردِ بیمار"[1] کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن مسلمانوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی (جو خلافت اور ایک وسیع مسلم امپائر کی شکل میں ان کو خدا نے دی تھی) سلطان عبدالحمید خاں کی ۱۹۰۹ء میں معزولی تو ایسا المناک واقعہ نہ تھا، جس سے تاریخ بدل جائے، وہ اس وقت کے سیاسی حالات یا سلطان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ان کے بعد علی الترتیب سلطان رشاد، سلطان وحیدالدین خاں اور سلطان عبدالمجید تختِ سلطنت اور خلافت پر متمکن ہوئے، لیکن اصل المناک واقعہ جس سے پورے عالمِ اسلام کو ذلت ونکبت کا سامنا کرنا پڑا، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور بقول مولانا شبلی کے "حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی نگاہیں اٹھیں"، ممالکِ عربیہ مصر وشام (عظیم) عراق اور افریقہ کی پوری شمالی پٹی براہِ راست یا بالواسطہ مغربی اقوام وممالک کے زیرِ حکومت یا زیرِ انتداب آئے اور جس کی سزا کی میعاد (جہاں تک مغربی ایشیا کے عرب ممالک کا تعلق ہے) ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترکوں کے خلاف، وہ اقدام تھا جو عربوں نے اپنے ممالک کی چالاک عیسائی اقلیت کی سازش کا شکار، اور اتحادیوں کے پُرفریب وعدوں پر اعتبار اور قومیتِ عربیہ کے سحر سامری سے مسحور ہو کر پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر کیا، اور جس کے قائد شریفِ مکہ شریف حسین تھے جنھوں نے ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے نتیجہ میں ۱۹۱۷ء میں شام وفلسطین ترکوں سے آزاد ہوئے۔ مصر برطانوی اقتدار میں چلا گیا۔ ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شریف حسین کے فرزند امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے، فرنچ جنرل گورو نے فاتح بیت المقدس اور آبروئے اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ "صلاح الدین ہم یہاں تک آ گئے اور ہم نے شام فتح کر لیا، تم کب تک سوتے رہو گے"۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق وعرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آ چکے تھے۔

---

[1] یورپ کے مصنفین اور اہلِ سیاست ترکی سلطنت اور قوم کو مردِ بیمار (SICK MAN) کے نام سے یاد کرتے تھے۔

سارا عالمِ اسلام اس صورتِ حال سے بے چین تھا اور مسلمان ذلیل، لیکن سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس پر بے چینی محسوس کی، اور اپنے قلبی و ذہنی اضطراب کا مظاہرہ کیا، یہی زمانہ ہے جب تحریکِ خلافت نے (جو اس صدی کی سب سے بڑی نیم دینی نیم سیاسی تحریک تھی) مسلمان علماء و قائدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی قیادت میں (جو اپنی طاقتور شخصیت، اسلامی حمیت اور جوشِ خطابت میں عالمِ اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے) سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کا دل ناسور کی طرح بہا، اور ملی احساس کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ اس زلزلہ انگیز تحریک سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ پورے ملک میں سیاسی شعور اور مغربی اقتدار اور تہذیب سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ خود گاندھی جی جیسے عظیم ملکی قائد نے اس تحریک کا ساتھ دیا، اور اس کے قائدین کے ساتھ ملک گیر دورے کیے۔

لیکن جب ۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی اور ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی۔ اقبال نے اسی موقع پر کہا تھا: ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالمِ اسلام کے لیے رُوح فرسا اور ہوش ربا تھا، اور ایک طرح سے اس کو ساتویں صدی ہجری کے اس نصفِ اوّل سے مماثلت تھی جس میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالمِ اسلام کے زرخیز و مردم خیز متمدن اور مرکزی ممالک پر حملہ اور پھر قبضہ کرکے اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا، لیکن وہ محض ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کی متمدن و تن آسان اسلامی دُنیا تاب نہ لا سکی، اس کے ساتھ کوئی فکری فلسفہ، کوئی تازہ دم تہذیب اور نئے افکار و اقدار نہ تھے، لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس تاخت کی جو چودھویں صدی کے پہلے ثلث اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جُدا تھی۔ اس کے ساتھ نئے فلسفے، نیا نظامِ تعلیم، نئے افکار و اقدار، الحاد و تشکیک کا نیا لشکر اور مادیت و مادہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہُوا کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب پیش آیا، جو صرف تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی نقشہ کو ہی تبدیل کرنے والا نہ تھا اور وہ اقتصادیات و سیاسیات کے حدود میں محدود نہ تھا۔ عقیدہ و عمل، اصول و مبادی، اخلاق و معاشرت بلکہ حیاتِ انسانی اور شعورِ انسانی کی بنیادوں کو منہدم کرنے والا اور ان کے ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والا تھا، اس کی زد سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں پر پڑنے والی تھی، جو ایک مثبت، متعین اور مختتم دین کے پیرو اور داعی تھے، اور جن کے دین کی حقیقت اور فرائض میں "احتسابِ کائنات" کا فریضہ بھی شامل تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں بروقت اس خطرہ کو محسوس کرنے والے اور اس کا مقابلہ کرنے والے بہت کم تھے اور انھوں نے اس معاملہ میں اس "فراستِ مومن" کا ثبوت نہیں دیا، جو اس سے پہلے اس سے کم درجہ کے خطرات کو بھانپ لینی تھی، مغربی عالمِ اسلام میں ترکی کے

سابق وزیر حربیہ اور مومن مجاہد غازی انور پاشا مرحوم نے بالشویکی خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کیا، انھوں نے ترکستان کے باشندوں کو منظم کرکے کمیونسٹوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء میں ان کے اور بالشویکوں کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں۔ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے قریب انھوں نے ایک روسی فوج پر حملہ کیا۔ غنیم کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس جنگ میں انور پاشا شہید ہوئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کی غالباً ساتویں تاریخ[1]

اسی انقلاب سے نہ صرف یہ کہ وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی کے مردم خیز و تاریخ ساز ممالک روسی و چینی ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہاں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو نہ صرف ذہنی و تہذیبی ارتداد بلکہ اعتقادی و ایمانی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دیا، اور وہاں اسپین کی وہ تاریخ دُہرائی جانے لگی جو نویں صدی ہجری میں پیش آئی تھی، بلکہ صرف اس تحتی براعظم کو نہیں، ممالک عربیہ و مرکزِ اسلام کو بھی اس تحریک سے متاثر ہونے کے خطرے سے دوچار اور اس کا حلیف یا حریف بننے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا، اور نوبت یہاں تک آئی کہ بعض عرب ممالک[2] نے اس سے صرف اسلحہ، جدید مصنوعات ہی درآمد نہیں کیں اس کی آئیڈیا لوجی اور اس کا فلسفہ بھی درآمد کیا، اور اس کے پُرجوش حامی اور داعی بن گئے، اور اب ماضی قریب میں اس افغانستان پر بھی اس کا فوجی تسلط ہو گیا جو اسلامی شجاعت اور حمیت کا معدن و مخزن تھا اور جس نے ہندوستان کو ہر دور میں لائق منتظم حاکم و قائد اور عالم و درویش مہیا کیے تھے، اور جو اس کی آزادی کا پاسبان اور اس کا بیرونی قلعہ تھا، اور اس طرح یہ فتنۂ عالم آشوب برصغیر کے دروازہ پر پہنچ گیا۔

لیکن چودھویں صدی کے وسط کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جب عالم اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی، بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ اور بقول اقبالؔ: ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عالم اسلام میں ایک طرف نمایاں طریقہ پر سیاسی شعور بیدار ہوا، غیر ملکی اقتدار کے خلاف جا بجا آزادی کا علم بلند کیا گیا، جس کے نتیجہ میں مصر، شام (اپنے تمام حصّوں کے ساتھ) عراق، لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش آزاد ہوئے افریقہ میں نئی نئی مسلم حکومتیں قایم ہوئیں، انڈونیشیا اور ملیشیا نے آزادی حاصل کی، پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا، ہندوستانی مسلمانوں نے جنگِ آزادی میں شریک ہو کر، اور قربانیاں دے کر، سیاسی شعور اور حب الوطنی کا ثبوت دیا اور بالآخر دنیا کے سیاسی نقشہ پر ۴۵ سے اوپر آزاد مسلم ممالک اور سلطنتیں نمودار ہوئیں، جن میں سے ۲۴

---

[1] انور پاشا کے اسلامی جذبات اور ان عظیم خدمات کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو امیر شکیب ارسلان کا (جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھے) وہ ولولہ انگیز مضمون جو ان کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں شامل ہے۔

[2] مثلاً شام، عراق، جنوبی یمن۔

اقوام متحدہ کی ممبر ہیں، اور ان کے جھنڈے یونائیٹڈ نیشن کی پُرشکوہ عمارت پر لہرا رہے ہیں۔ مسلمان اقوام متحدہ میں بھی اور بین الاقوامی مسائل و مذاکرات میں بھی، اور دنیا کے سیاسی ترازو کے پلڑے میں بھی اپنا ایک خاص وزن رکھتے ہیں، اور اگر ان کا سیاسی شعور بالغ اور ان کو اپنی سیاسی طاقت و وزن کا احساس ہو اور وہ متحد ہو جائیں تو دنیا میں بہت سی ناانصافیوں کو روک سکتے ہیں، بہت سی کمزور اور مظلوم قوموں اور ملکوں کی مدد کر سکتے ہیں، اگر خدا ان کو خدا ترس، مخلص قائد و سربراہ عطا فرمائے یا اس کے قائدین اور سربراہان مملکت کو توفیق اور ہدایت نصیب فرمائے تو وہ ان اسلامی ممالک اور اپنے دائرۂ حکومت میں صحیح اسلامی حکومت قائم اور نظامِ شرعی کو نافذ اور جاری کر سکتے ہیں اور اپنی قلمرو اور حدودِ حکومت میں وہ معیاری مسلم معاشرہ اور وہ پاکیزہ، بلند کردار، اطاعت شعار، ذمہ دار اخلاقی و روحانی ماحول پیدا کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں صرف تاریخ کے صفحات میں صدیوں کے فاصلہ سے نظر آتی ہیں اور جن سے دُنیا یکسر مایوس اور خود مسلمان غافل اور مستغنی ہو چکے ہیں اور جو آج بھی ذہنِ انسانی کو چونکانے اور مغرب و مشرق کے بلاکوں کو مسئلہ پر غور کرنے پر مجبور اور اشاعتِ اسلام کے لیے ایک نیا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنے سیاسی وزن و اہمیت کا صحیح استعمال کرنے کا عزم کر لیں اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کا مکمل طریقہ پر احساس کریں تو وہ اس انسانیت کو بھی تباہی سے بچا سکتے ہیں، جس کی قسمت کے مالک بزعمِ خود مغربی و مشرقی بلاک بنے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی وہ اپنی دانشمندی، اتحاد اور اخلاقی طاقت سے نہ صرف اپنے ملّی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں بلکہ ہندوستان کو بھی ایک نئی اخلاقی، روحانی قیادت عطا کر کے اس عام تباہی سے بچا سکتے ہیں جو روز افزوں سیاسی انتشار اور خطرناک اخلاقی بحران کی بنا پر اس کی طرف منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف عالمِ اسلام میں وہ چند وسیع و طاقتور، اصلاحی، فکری اور انقلابی تحریکیں پیدا ہوئیں، جن کی نظیر اپنی وسعت و قوت میں ماضی قریب میں بھی ملنی مشکل ہے۔ ان تحریکوں کا ایک درخشاں اور امید افزا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک طرف خواص، ذہین (INTELLECTUAL) طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور اس طبقہ کو مطمئن کرنے اور اس کا اسلام پر اعتماد بحال کرنے کے لیے واضح اور پُرکشش علمی مواد فراہم کرتی ہیں۔ دُوسری طرف ان کا دائرہ جغرافیائی حدود سے آزاد ہے، اور وہ عالمِ اسلام کے ایک بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان تحریکوں سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پہلی مرتبہ نہ صرف متاثر، بلکہ اپنے دیرینہ سال ہم مذہبوں کے مقابلہ میں ان کا زیادہ پرجوش داعی اور مبلغ ہے۔ اس سلسلہ میں مصر کی عظیم و جلیل تحریک "الاخوان المسلمون" ترکی کی نوری تحریک وجماعت، اردن و فلسطین کی تحریک "حزب التحریر"، انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، برصغیر کی عالمگیر تبلیغی دعوت، اور تحریک جماعت اسلامی کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے، جن سے خواہ کسی کو کلی اتفاق نہ ہو، ان کی اثر انگیزی اور وسعت و مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں میں اس ایمان افروزی، ہمت آفرینی اور خود شناسی میں اقبال کے ولولہ انگیز اور خیال افروز کلام کا بھی بڑا دخل ہے، جس کی اپنی قوت و تاثیر اور عالمگیری میں پچھلی صدیوں کے اسلامی ادب و شاعری میں مثال نہیں ملتی۔

پندرھویں صدی اب پُورے عالم پر سایہ فگن ہوگئی ہے۔ اگر ملّتِ اسلامیہ اور عالمِ اسلام اس عظیم سرمایہ، اور

اس اعتقادی، فکری، علمی، سیاسی، طبعی اور انسانی ثروت و صلاحیت، طاقتور تحریکوں اور کثیر التعداد آزاد ملکوں اور وسیع سلطنتوں سے بھی محروم ہوتا، جس کی طرف کچھ مختصر اشارے اوپر کیے گئے ہیں، تب بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے پاس قرآن مجید کا یہ صحیفہ، اور اللہ کا آخری اور ابدی دین (اسلام) موجود ہے جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں ملت کے تنِ مُردہ اور قلبِ افسردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوتی رہی ہے، اور معجزات و عجائبات کا ظہور رہا ہے۔

پھر مسلمان ہی اس دور میں تنہا انسانیت کی امیدوں کی پناہ گاہ، خدا کا آخری پیغام اور انسانیت کے امین و پاسبان ہیں۔ شاید یہ صدی ایک ایسا فیصلہ کن موڑ لائے جو پورے عالمِ انسانی پر اثر انداز ہو۔ اللہ کی رحمت سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انسانیت کی زبوں حالی، انسانوں کی ذلت و نگوں ساری اپنے آخری نقطہ پر پہنچ چکی ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب رحمتِ الٰہی، بلکہ غیرتِ الٰہی کو حرکت ہوتی ہے، اور دُنیا میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔

"مغربی تہذیب کو پُورے طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض اپنی صلاحیت اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے بلکہ اس لیے کہ بدقسمتی سے کوئی دُوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کو تیار نہیں۔ اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں۔ اب اگر اسلامی ممالک اور عالمِ اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالمِ اسلامی میں پیدا ہوگا تو اس کو دُنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے، جو سنت اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔ اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری اور کشکول گدائی مناسب ہے یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں، کیا اس کے لیے ظاہری نام نمود، عہدہ و منصب، لذت، راحت اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے، اگر اس کے لیے سَو جانیں بھی قربان کی جائیں تو درحقیقت گھاٹے کا سودا، اور زیاں و نقصان کا معاملہ نہیں ہے

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں[1]"

میں اپنے اس مختصر جائزہ اور مخلصانہ پیغام کو اقبالؔ کے ان روح پرور اور حیات آفریں اشعار پر ختم کروں گا، جن میں انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے:

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی ۔۔۔ دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی ۔۔۔ صہبائے یقین درکش و از دیر گماں خیز

---

[1] واوین کے درمیان کا حصہ مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ص ۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

پندرھویں صدی میں عالمِ اسلام کے لیے دس نکاتی پروگرام

ساتویں صدی اور دسویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے جو واقعات اور اسباب بیان کیے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کو ہر دور میں ایسے ربانی، حقانی، بیدار مغز، عالی ہمت مصلحین اور داعیوں کی ضرورت ہے جو دعوتِ الی اللہ اور نفوس قدسیہ کی اصلاح و تربیت کا کام ناساز گار سے ناساز گار ماحول میں انجام دیں، جب اسلامی حکومتیں زیر و زبر ہو رہی ہوں، مادیت اور خواہشات نفسانی کے سیلاب بلا میں لوگ تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے ہوں، مال و دولت کے حصول کی ایک اندھی "ریس" جاری ہو، وہ گرتے ہوئے دلوں کو تھامنے، اللہ تعالیٰ سے ان کو جوڑنے، اور ان میں تازہ ایمان و یقین، محبت اور خوفِ الٰہی اور اعتماد و توکّل پیدا کرنے کے کام میں لگ جائیں، وہ لوگوں کو پست اغراض سے بلند رہنے کا سبق دے رہے ہوں، دنیا کے مال و متاع کی حقارت ان کے دل میں جاگزیں کر رہے ہوں، دولت و حشمت اور سلطنت و قوت کے سامنے سرنگوں اور سجدہ ریز ہوتے، ضمیر و ملّت فروشی اور ملکوں اور قوموں کا سودا کرنے سے بیزار اور بالاتر بنائیں اور عقیدہ و اصول کے لیے قربانی اور راہِ خدا میں شہادت کی آرزو سینوں میں بیدار کر دیں، ناامیدیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکال کر رحمت و نصرتِ الٰہی کی روشنی میں لے آئیں، زوال آمادہ اور کرم خوردہ معاشرہ کو ایسے اہل، طاقتور اور امانت دار اشخاص مہیا کریں جو حکومت کی نازک سے نازک ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت کر سکیں۔ یہ وہ ربانی حقانی لوگ ہیں جو اپنے معاشرہ و ماحول میں وہ خدمت انجام دیتے ہیں، جو خواجہ حسن بصریؒ نے بنو امیہ کے دور میں اور حافظ ابن جوزیؒ، حجۃ الاسلام غزالیؒ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے عباسیوں کے دور میں انجام دی تھی۔

ان ربانی اشخاص کا وجود ہر ملک اور ہر زمانہ کی بنیادی ضرورت ہے، وہ اس وقت کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ جب حکومتیں ناکام و نامراد ہو جاتی ہیں[1] ان کا علَم دولت و اقبال اس وقت بلند ہوتا ہے جب حکومتوں اور طاقتوں کے فلک بوس

---

[1] پروفیسر ہٹی (HITTI) نے (جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں نقل کیا ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

"سیاسی اسلام" کے نازک ترین لمحات میں "مذہبی اسلام" نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔

(HISTORY OF THE ARABS, P-475)

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھنڈے سرنگوں ہوجاتے ہیں ، اسلامی معاشرہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ ان نفوس قدسیہ سے سراسر محروم ہوجائے ، بہت سے وہ اسلامی اور عرب ملک جہاں اللہ تعالیٰ نے رزق اور اپنی نعمتوں کے دہانے کھول دیے ہیں ، وہاں آج بشدت یہ " دعوتی و روحانی خلاء" محسوس ہوتا ہے ، یہ خلاء وسیع تنظیمات ، عظیم علمی اداروں ، سیاسی و اشاعتی سرگرمیوں ، فلک شگاف نعروں اور خدمتِ دین کے بلند بانگ دعووں سے پُر نہیں کیا جا سکتا ۔

دعوتِ دینی اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جو کوششیں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف انداز سے اور اپنی اپنی بصیرت ، تجربے اور حالات کے تقاضا سے ہو رہی ہیں ان کو اپنے اپنے مرتبے پر رکھتے ہوئے ، اور ان کی کسی نہ کسی درجہ میں افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پندرھویں صدی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور مسلم معاشرہ کو مزید انحطاط و زوال کے خطرے سے بچانے اور نئی صدی ہجری کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ معین نقاط (POINTS) اور چند واضح خطوط (LINES) (خواہ ان کی حیثیت اشارات اور عنوانات سے زیادہ نہ ہو) پیش کر دیے جائیں ، شاید با توفیق اور بلند حوصلہ کارکنوں اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے فکرمند جماعتوں کو اُن سے کچھ روشنی یا مدد حاصل ہو :

۱ ۔ مسلم عوام میں ایمان و عقیدہ کو طاقت پہنچانے (جس کی چنگاریاں اس کے خاکستر میں بہر حال موجود ہیں) اور ان کے دینی شعور کو بیدار و متحرک بنانے کی ضرورت ہے ، ان مسلم عوام کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لیے گرم جوشی (خواہ وہ بعض اوقات حالات و حوادث ہی کا نتیجہ ہو) ایک ایسی بلند و مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار رہے جس کی بدولت بہت سی مسلم (یا مدعی اسلام) قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر و الحاد کی آغوش میں ڈال دینے کی ہمت نہیں ہوتی ، اور اسلام ان تمام سازشوں اور منظم اور وسیع منصوبوں کے باوجود جو اس کو ان ملکوں سے بے دخل کرنے کے لیے اندرون یا بیرونِ ملک تیار کیے جاتے ہیں ، ان ملکوں میں زندہ اور کسی نہ کسی درجہ میں فعال اور مؤثر ہے ۔ خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یعنی اسلام نے ایک دین اور جاوداں پیغام کی حیثیت سے کامیابی و کامرانی حاصل کی جبکہ اسلام ایک نظامِ حکومت کی حیثیت سے بعض اوقات شکست و ہزیمت سے دوچار رہا ۔ واضح رہے کہ اسلام میں دین و سیاست کی کوئی تفریق نہیں ہے جیسا کہ ہٹی کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے ۔

یہی بات ہالینڈ کے ایک فاضل مورخ لوکے گارڈ (FRCIDE LOKKE GAARD) نے بھی کہی ہے ، وہ لکھتا ہے :

" گو اسلام کا سیاسی زوال تو بارہا ہوا لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا ۔"

ان کی روحانی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہوگئی تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت اور ان قیادتوں (LEADERSHIPS) اور حکومتوں کے کھل کھیلنے اور اپنے ملکوں کو اسپین اور ترکستان بنا دینے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ پھر یہی عوام اور نرم اور بار آور زمین ہے، جس سے ہر طرح کی قدرتی دولت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس پر ہر طرح کے پُرثمر باغات لگائے جاسکتے اور محل تعمیر کیے جاسکتے ہیں، یہ وہ خام مال (RAW MATERIAL) ہے جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں اور مردم سازی اور آدم گری کا کام کیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں اور قابلِ اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے جس پر پیغمبرانہ توجہات اور اہلِ قلوب اور اہلِ خلوص کی محنتیں صرف ہوئی ہیں اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت اور گرمجوشی اور ایثار و قربانی کے جذبہ اور صلاحیت میں دوسری انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق و ممتاز ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ ان مسلم عوام (MASSES) اور مسلم ممالک کی مسلم آبادی میں ان صفات کو بھی پیدا کرنے اور اس اسلامی سیرت کو بروئے کار لانے کے لیے بھی سخت جد و جہد کی جائے، جن کی بنا پر انسانی نفوس، نصرت آسمانی اور فتح و کامرانی کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے پہاڑ گرد و غبار بن جاتے ہیں۔ مثلاً صحیح عقیدہ توحید خالص جو شرک کے شائبہ سے محفوظ ہو، اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ جو جاہلی رسم و رواج اور غیر مسلم اقوام کی تقلید سے پاک ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس مرض نفاق اور اس "تضاد" سے پاک کیا جائے جو عرصہ سے اس میں سرایت کیے ہوئے ہے اور جو اسلام کی اصل تعلیمات اور مثالی مسلم معاشرہ کے منافی ہے۔ اسی طرح اُن کے اخلاق و عادات اور نفسِ امارہ کو دولت و طاقت کے ان اثرات سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کی جائے جن کی بنا پر انبیاء سابقین کی بہت سی اُمتیں مستحقِ عذاب اور موردِ غضبِ الٰہی ہوئیں۔ اسی طرح مغربی اقوام کے اس "اخلاقی جذام" سے بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے جس میں مغربی تہذیب اور اہلِ مغرب مبتلا ہیں، اور اب وہ چاہتے ہیں مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم ملکوں میں بھی وہ پوری طرح پھیل جائے۔

لیکن یہ اصلاحی کام ادھورا رہے گا اور اس کے صحیح نتائج ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ مسلمانوں میں صحیح دینی شعور پیدا نہ کیا جائے اور ان کو صحیح ذہنی تربیت نہ ہو، ضرورت ہے کہ ان میں حقائق اور مسائل کا صحیح فہم اور دوست و دشمن میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ اور ان کا دینی فہم اتنا عمیق ہو کہ وہ گہرے سیاسی مقاصد رکھنے والے رہبروں، سیاسی بازی گروں اور کھوکھلے نعروں سے دھوکا نہ کھائیں اور عالمِ اسلام میں پھر روح فرسا المیوں (TRADGADIES) کا اعادہ نہ ہو، جن میں بعض بڑی پُرجوش مسلم قومیں اور ممالک، جاہلی قوم پرستی (NATIONALISM) یا لسانی (LINGUISTIC) اور ثقافتی (CULTURAL) تعصبات کی آندھیوں میں پتوں کی طرح اُڑ گئے اور آسانی کے ساتھ شاطر قیادتوں اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی ناپختگی کے بھینٹ چڑھ گئے۔[1]

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ (اردو، عربی، انگریزی، بنگالی ایڈیشن)

۲- دینی حقایق اور قرآنی و ایمانی اصطلاحات کو، نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچایا جائے، اور ان کو جدید عصری و مغربی تصورات اور سیاسی و اقتصادی نظاموں کے (بے اعتدالی کے ساتھ) تابع اور مطابق بنانے اور اسلام کی خالص سیاسی تشریح و تعبیر اور اسلام کو ایک نظریۂ حیات ثابت کرنے اور عصری فلسفوں، سیاسی نظاموں کی سطح پر لے آنے میں شدید احتیاط برتی جائے اس لیے کہ حکومت و اقتدار اور نظام و فلسفہ تغیر و ترقی پذیر چیزیں ہیں، لیکن یہ دینی حقایق اور دین کا صحیح عقیدہ اسلام کی دائمی بنیاد اور وہ نقطہ ہے جس سے اس کا آغاز اور انجام مربوط ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ میں انھیں کی دعوت دی اور انھیں کے راستہ میں ان کی ساری جدوجہد اور جہاد تھا۔ اسی طرح ہر ایسی چیز سے احتیاط ضروری ہے جس کی بنیاد "ایمان بالآخرۃ" پر نہ ہو اور جس سے حصولِ رضائے الٰہی کا جذبہ کمزور اور ایمان و احتساب[1] کی روح مضمحل ہوتی ہو، اور تقرب الی اللہ زندگی کی اصل غایت نہ ٹھہرتی ہو، نیز جس تعلیم و تلقین اور تفہیم و تشریح سے دورِ جاہلیت کی بت پرستی (جو ابھی زندہ ہے) اور شرک اور اس کے عام اعمال و مظاہر کی قباحت و نفرت کم ہوتی ہو اور اس کو دورِ جاہلیت کی ایسی یادگار سمجھنے کا ذہن پیدا ہوتا ہو، جس کا زمانہ لد گیا اور جس کی اب اس ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں[2] حالانکہ بقول اقبال؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات،

۳- ذات نبوّت (علیہ الف الف سلام) سے مسلمان کے روحانی اور جذباتی تعلق پیدا ہونے اور برقرار رہنے کی کوشش، دل میں آپ کے لیے گہری محبت اور مسلم معاشرہ میں عشقِ نبوی پیدا کرنے کی کوشش جو ایک مسلمان کی نظر میں آپ کو اہل و عیال یہاں تک کہ اپنی ذات سے زیادہ محبوب بنا دے، جیسا کہ صحیح احادیث کے مطابق وہ ایمان کا تقاضا اور اس کی علامت ہے، اور اس بات پر ذہنی طور پر پورا اطمینان اور اعتماد کہ آپؐ "ختم الرسل، مولائے کل، دانائے سبل" ہیں اور ایسے تمام اثرات سے احتراز جو محبت کے ان سرچشموں کو خشک یا پایاب کر دیں۔ سنت پر عمل کرنے، اسوۂ رسول کی پیروی اور سیرت کے مطالعہ کے شغف اور اس کے تاثر کو کمزور کر دیں۔ یہی وہ وابستگی اور گرویدگی تھی جس نے عجمی قوموں کو اسلام کے رشتہ سے منسلک اور غیر اسلامی تہذیب اور قومیتوں میں تحلیل ہو جانے سے محفوظ رکھا۔

یہ پہلو اس زمانہ میں ممالک عربیہ کے لیے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جہاں پچھلے برسوں میں عرب قوم پرستی کی تحریکوں، عیسائی اور یہودی مصنفین کی کتابوں اور جدید عرب ادیبوں اور ان داعیوں و فضلا نے جو محبت کے عنصر سے محروم یا مقام "محمد عربی" سے ناآشنا تھے، اس کو اس حد تک کمزور کر دیا ہے کہ اب اس کے دوبارہ احیا اور تقویت اور ایک ایسے ایمان افروز اور روح پرور اسلامی ادب کی ضرورت پیدا کر دی ہے[3]، جس کے پیش کرنے والے ایک عجمی عاشقِ رسولؐ

---

[1] کسی کام کو محض اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے موعود اجر و ثواب کے لالچ میں انجام دینے کو "احتساب" کہتے ہیں۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"۔ (اردو، عربی، انگریزی) [3] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "الطریق الی المدینۃ" یا اس کا ترجمہ "کاروانِ مدینہ"۔

(اقبال) کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ :ے

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

۴۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں، اور جن کے ہاتھ میں آج ممالک اسلامیہ کی فکری، تعلیمی قیادت اور ذرائع ابلاغ ہیں۔ اسلام کی ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے، نئے نئے مسائل کا سامنا کرنے، نئی نئی گتھیوں کو سلجھانے اور انسانی قافلہ کو اس منزلِ مقصود پر پہنچانے اور کشتیٔ حیات کو کنارے لگانے کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی جو غلط تعلیم اور مغربی افکار کے اثر سے یا تو ختم ہو گیا ہے یا متزلزل ہو چکا ہے اس طبقہ نے فرض کر لیا ہے کہ اسلام ایک ایسی بیٹری یا ٹارچ ہے جس کا مسالہ ختم ہو گیا ہے، یا ایک ایسی بتی ہے جس کا تیل ختم، اور اس کا فتیلہ جل چکا ہے، اس کے دل میں از سرِ نو یہ اعتقاد اور اعتماد پیدا کرنا کہ اسلام ایک عالمی اور جاوداں پیغام ہے جس میں زمان و مکان کی کوئی تفریق نہیں، اس کی ہر زمانہ میں کشتیٔ نوح کی حیثیت ہے جو تنہا غرق ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اس اعتماد کا اس طبقہ کے دلوں سے بالکل نکل جانا یا اس کا کمزور پڑ جانا اس طبقہ کا وہ اصلی مرض ہے جو اس وقت اس کے اکثر خلافِ اسلام اقدامات اور " اصلاحات " کا محرک اور اس ذہنی و تمدنی ارتداد کا سبب ہے، جس نے اس وقت پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے ان رہنماؤں اور اہلِ حکومت اور مسلم عوام کے درمیان وہ عمیق و عریض خلیج پیدا ہو گئی ہے جو کسی طرح سے پُر نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے ان ملکوں میں ایک شدید ذہنی، تہذیبی اور معاشرتی کشمکش برپا ہے، جو کبھی کبھی بغاوت اور انقلابات پر منتج ہوتی ہے۔

۵۔ اسلامی ممالک میں نظام و نصابِ تعلیم کی بنیادی تبدیلی اور از سرِ نو تشکیل جو ان مسلم اقوام و ممالک کے قدو قامت، پیغام و فرائض اور اغراض و مقاصد سے پوری مطابقت رکھتی ہو، اور جو قطعاً کسی دوسرے ملک یا "کیمپ" سے درآمد نہ کی گئی ہو، بلکہ ان مسلمان ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ فنون کے اجتہاد و مطالعہ، اسلام کے عمیق و جامع فہم، اور بصیرت و تجربہ کا نتیجہ ہو، جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خود ساختہ حدود و خطوط سے بالاتر اور آزاد ہوں، یہ ایک ایسا ضروری کام ہے جس میں مطلق تاخیر کی گنجائش نہیں، اس کے بغیر یہ اسلامی ممالک اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ اپنے دماغ سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں، نہ اپنے عزم و ارادہ سے ان ممالک کا نظام چلا سکتے ہیں اور نہ ان ممالک کی دانش گاہیں، ادب و صحافت اور ذرائع ابلاغ، اسلام کے مزاج و روح اور معاشرہ کی ضرورت کے مطابق فرض انجام دے سکتے ہیں[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مصنف کی اس عنوان پر مستقل تصنیف " نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ " یا اردو کتاب " اسلامیت و مغربیت کی کشمکش " عنوان " مغربی نظامِ تعلیم " اور " زہر کا تریاق " ص ۲۲۰ - ۲۳۴

۶۔ ایک ایسی طاقت ور، عالمگیر، علمی و تحقیقی تحریک، جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کرسکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے، اور اس حقیقت کو ثابت کرسکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، وہ ایسے ابدی اصولوں پر قایم ہے، جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہوسکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصرِ حاضر کا وہ "تجدیدی" کام ہے جو اسلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے اور مغرب زدگی و تجدید کے اس دھارے کو روک سکتا ہے جو عالمِ اسلام میں اس وقت پوری طغیانی پر ہے[1]۔

۷۔ اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اس اسلامی تمدن کی کارفرمائی اور جلوہ نمائی کی کوشش جو اسلام کے اصول و مقاصد، طہارت و عفت، اعتدال، ذوقِ سلیم، قرآنی تعلیمات، اُسوۂ رسول اور قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی اور اسلام کے مثالی معاشرہ کے بہت سے محاسن کا جامع ہے۔ کسی ملک اور قوم کا محض عقاید و عبادات سے وابستہ رہنا اور اس تمدن سے کنارہ کشی اختیار کرلینا جو ان دینی تعلیمات اور ان کے وسیع، جامع اور لچکدار اصول کے ماتحت پروان چڑھا ہو اور کسی اجنبی تمدن کا اختیار کرلینا، دین کو عبادت گاہوں اور مذہبی رسوم (RITUALS) میں محدود اور ان ممالک کو تہذیبی و معاشرتی ارتداد کے خطرے سے دوچار کردینے کے مرادف ہے۔ جہاں تک ان مسلم ممالک کا تعلق ہے جو مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ہیں، ان میں دانایانِ فرنگ کی سازش پورے طور پر کامیاب ہوگئی ہے، جنھوں نے ان ممالک کو چند عبادات اور اسلامی شعائر کو چھوڑ کر بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور حکومت کے دفاتر سے لے کر قومی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں، سکونتی مکانات اور ہوٹلوں میں بعض اوقات یہ پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ ہم کسی مسلم ملک میں ہیں یا کسی خالص مغربی ملک میں۔ ملی تشخص اور دین کے ساتھ زندہ اور طاقت ور ربط کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے لیے پیدا کیا ہوا مخصوص تمدن اور طرزِ زندگی بھی ان ملکوں میں کارفرما ہو کہ تمدن اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے[2]۔

عالمِ اسلام کی اس وقت ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فکری قیادت اُبھرے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت و اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیبِ جدید کے مختلف سانچوں، مکاتبِ فکر اور طریقہ ہائے عمل کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جو تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "قانون اسلامی میں تدوینِ جدید کی ضرورت" ص ۲۵۱ - ۲۵۵

[2] اس موضوع پر مصنف کا مستقل رسالہ ملاحظہ ہو "اهمية الحضارة فی تاريخ الديانات وحياة اصحابها" ص ۲۶ تا ۲۸ (مذہب کی تاریخ اور ان کے پیروؤں کی زندگی میں تمدن کی اہمیت) شائع کردہ دارِ عرفات رائے بریلی۔

محفوظ، ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو۔ حقائق اور وسائلِ قوت اور مغز کی طرف توجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ اُلجھے۔ مغربی تہذیب اور علوم کے ساتھ خام مال (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر اور زندگی کا ایک ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدے اور اس کے اصولِ اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ یہ وہ انقلاب انگیز اور مجتہدانہ کام ہے جس کے بغیر عالمِ اسلام حقیقی طور پر آزاد اور خود کار نہیں ہو سکتا۔[1]

۹۔ ان حکومتوں کو جو مسلم اکثریت کے مالک ہیں دین پسند اور اسلام دوست عناصر سے برسرِ پیکار ہیں اور وہاں ایک معنوی و اقتصادی نسل کشی (GENOCIDE) کی مہم جاری ہے، اور اس پر اس ملک کے قائدین اور حکمرانوں کی (جو کسی فوجی انقلاب کے نتیجہ میں یا کسی سازش کے ماتحت) حکومت و اقتدار میں آگئے ہیں۔ بہترین توانائیاں صرف ہو رہی ہیں، نیز بعض ان عرب ممالک کے سربراہوں کو جو دینی حقائق و مفاہیم اور شرعی احکام و نصوص میں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو ان کے سیاسی اغراض، شخصی کمزوریوں یا غیر ملکی منصوبوں کی کامیابی میں مدد کر سکیں۔ یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ یہ حکمتِ عملی بے نتیجہ، قومی سالمیت اور استحکام کے لیے مضر اور انتشار انگیز کوشش ہے جو ہر مسلم ملک میں ناکام ہو چکی ہے۔ ان کو ان مقاصد اور کوششوں کی طرف متوجہ کرنا جو ملک کے لیے حقیقی طور پر مفید اور اس کی طاقت و حفاظت کا ذریعہ ہیں۔

اسی طرح سے ان مسلمان حکومتوں اور ان کے سربراہوں کو جن کے دل میں اسلام کی عزت و محبّت ہے۔ شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اسلامی قوانین کے اجراء پر اور اس مقصد کے لیے مناسب فضائل اور ماحول تیار کرنے پر آمادہ کرنا اور اس بات کا یقین دلانا کہ یہ تبدیلی خدا کی طرف سے فتح و نصرت اور معاشرہ میں سعادت و برکت پیدا ہونے کا موجب ہو گی۔

اسی کے ساتھ عالمِ اسلام میں ایک ایسی مرکزی قیادت، کے عالمِ وجود میں آنے کی فکر و سعی جو "شورائیت" کے اسلامی اصول اور تعاون علی البرّ والتقویٰ کی بنیاد پر قائم ہو اور اپنی اس کوتاہی اور محرومی پر کم سے کم تاسف و ندامت کہ اس وقت عالمِ اسلام خلافت کے اس ضروری ادارے اور اس مبارک نظام سے محروم ہے جس کے قیام کے مسلمان مکلّف بنائے گئے تھے اور جس سے محرومی کا جرمانہ وہ مختلف شکلوں میں ادا کر رہے ہیں۔

۱۰۔ جہاں تک خالص غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے وہاں اسلام کا ایسا مؤثر اور معقول تعارف اور اس طرح اسلامی دعوت کا پیش کرنا جو اسلام کے مزاج اور اس زمانہ اور ان کی قوموں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس لیے کہ ان ممالک میں (صحیح دین اور روحانی و اخلاقی تعلیم کا خلا موجود ہونے اور تہذیبِ حاضر کی ناکامی کی وجہ سے) اسلام کے لیے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اس کی اشاعت کا وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں مسلم اقلیتیں پائی جاتی ہیں وہاں مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کے آزاد و خود کفیل انتظام، اپنے پرسنل لا کے تحفظ، نئے نئے قوانین کے بارے میں بیدار مغزی اور خودداری کا ثبوت دینے کے ساتھ ان ممالک کی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "عالمِ اسلام کا سب سے بڑا خلا"۔

[2] ملاحظہ ہو دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش اور مسلم پرسنل لا بورڈ (مونگیر) کی طرف سے شائع کیا ہوا لٹریچر۔

اخلاقی قیادت کے خلا کو پُر کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کو صرف وہی پُر کر سکتے ہیں بلکہ جس کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنی افادیت و ضرورت ثابت کر سکتے ہیں بلکہ اس بر سر انحطاط معاشرہ اور ان زوال پذیر ملکوں کے نجات دہندہ اور معمار بن کر ان کے محبوب رہنما اور محترم قائد بھی بن سکتے ہیں[1]۔ اور اس طرح اسلام کے لیے خدمت اور ان مسلمانوں کے لیے عزت و اعتماد کا راستہ کھل سکتا ہے جو مخصوص سیاسی حالات اور گذشتہ تاریخ نے اگر بند نہیں تو سخت دشوار گذار بنا دیا ہے۔

تاریخ انسانی بلکہ درحقیقت نسلِ انسانی کی اس نئی صدی کے آغاز میں ایسے مردانِ کار کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے، جو نہ صرف اسلام بلکہ عصرِ حاضر کی ان ضرورتوں کی تکمیل کریں اور ایسے مجتہدانہ اور جرأت مندانہ اقدامات کریں جو تاریخ کے دھارے کو بدل دے۔ زمانہ کا حقیقت شناس، فراخ نظر اور کشادہ دل مورخ قلم ہاتھ میں لیے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ وہ ان کارناموں کو سنہرے حروف سے لکھے اور ان کے انجام دینے والوں کو خراجِ عقیدت ادا کرے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو" شائع کردہ "حلقہ پیامِ انسانیت"، لکھنؤ۔

سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول

قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

سرکار دو عالم فخر بنی آدم رسول الثقلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ اپنی ظاہری و باطنی وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے کوئی شخصی سیرت نہیں بلکہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی سیرت ہے جو کسی شخص واحد کا دستور زندگی نہیں بلکہ جہانوں کے لیے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ جُوں جُوں زمانہ ترقی کرتا چلا جائے گا اُسی حد تک انسانی زندگی کی استواری و ہمواری کے لیے اس سیرت کی ضرورت شدید سے شدید تر ہوتی چلی جائے گی۔

زمانہ اور اُس کا تمدّن اپنی ارتقائی حرکت سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور کل کو نہ معلوم کہاں تک جا پہنچے لیکن وہ کہیں بھی پہنچے اور اس کی تمدنی زندگی کے گوشے کتنے بھی پھیل جائیں اور پھیل کر زمین و آسمان اور فضاء، خلاء سب ہی کو ڈھانپ لیں پھر بھی یہ ارتقائی سیرت اور اُس کے تدیّن کے گوشے اسی حد تک تمدنی گوشوں کی تقویم و اصلاح کے لیے شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوتے رہیں گے جیسا کہ وہ اب تک زمانہ کی مدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے اور ان میں سکون و اطمینان کی روح پھونکتے رہے ہیں۔

اس کی شرعی وجہ یہ ہے کہ آیت وانّك لعلیٰ خلقٍ عظیم کے بارے میں جب صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی اس خلقِ عظیم کی سیرت و اخلاق کے سلسلے میں پُوچھا گیا تو فرمایا کہ:

وكان خلقه القرآن۔

آپ کا خلق (سیرت) یہ قرآن ہی تو ہے۔ اور قرآن کے بارے میں خود حضرت صاحب سیرت علیہ افضل الصّلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ:

ولا تنقضی عجائبه ولا یخلق عن كثرة الرد۔

اس قرآن کے عجائبات (علوم و معارف) کبھی ختم ہونے والے نہیں اور یہ بار بار کے تکرار سے کبھی بھی پُرانا نہیں ہوگا (کہ اس سے دل اکتا جائیں)

اس سے صاف نتیجہ یہی نکلتا ہے اور نکل بھی سکتا ہے کہ سیرت کے عجائبات بھی کبھی منقضی ہونے والے نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ قرآن میں یہ لامحدود عجائبات علمی صورت میں اور ذات بابرکات نبوی کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، گویا ایک علمی قرآن ہے جو اوراق میں محفوظ ہے اور ایک عملی قرآن یعنی سیرت ہے جو ذاتِ نبوی میں محفوظ ہے اور دونوں آپس میں ایک دوسرے پر من وعن منطبق ہیں، پس قرآن کا کہا ہوا حضور کا کیا ہوا ہے اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہُوا ہے، اس لیے قرآنِ حکیم کی یہ

ہزاروں آیتیں درحقیقت سیرت مقدسہ کے علمی اور تعارفی ابواب ہیں اور ادھر سیرت کے یہ ہزاروں گوشے قرآن کے عملی پہلو ہیں پس قرآن میں جو چیز قال ہے وہی ذاتِ نبوی میں حال ہے اور جو قرآن میں نقوش و دوال ہیں وہی ذاتِ اقدس میں سیرت و اعمال ہیں، اس لیے سیرت سے تو قرآن کی عملی صورتیں متشخص ہوتی ہیں اور قرآن سے سیرت کی علمی حیثیتیں کھلتی ہیں۔

اس قرآن حکیم کے مختلف مضامین اپنی اپنی نوعیت اور مناسبت کے مطابق سیرت کے مختلف الانواع پہلو ثابت ہوتے ہیں، قرآن میں ذات وصفات کی آیتیں آپ کے عقائد ہیں اور احکام کی آیتیں آپ کے اعمال، تکوین کی آیتیں آپ کا استدلال ہیں اور تشریع کی آیتیں آپ کا حال، قصص و امثال کی آیتیں آپ کی عبرت ہیں اور تذکیر کی آیتیں آپ کی موعظت، خدمتِ خلق کی آیتیں آپ کی عبدیت ہیں اور کبریاءِ حق کی آیتیں آپ کی نیابت، اخلاق کی آیتیں آپ کا حسنِ معیشت ہیں اور معاملات کی آیتیں آپ کا حسنِ معاشرت، توجہ الی اللہ کی آیتیں آپ کی خلوت ہیں اور تربیت خلق اللہ کی آیتیں آپ کی جلوت، قہر و غلبہ کی آیتیں آپ کا جلال ہیں اور مہر و رحمت کی آیتیں آپ کا جمال، تجلیاتِ حق کی آیتیں آپ کا مشاہدہ ہیں اور ابتغاء وجہ اللہ کی آیتیں آپ کا مراقبہ، ترکِ دنیا کی آیتیں آپ کا مجاہدہ ہیں اور احوالِ محشر کی آیتیں آپ کا محاسبہ، نفی غیر کی آیتیں آپ کی فنائیت ہیں اور اثباتِ حق کی آیتیں آپ کی بقائیت، انا اور انت کی آیتیں آپ کا شہود ہیں اور ہو کی آیتیں آپ کی غیبت، نعیم جنت کی آیتیں آپ کا شوق ہیں اور جحیم نار کی آیتیں آپ کا وہم و غم۔ رحمت کی آیتیں آپ کی رجاء ہیں اور عذاب کی آیتیں آپ کا خوف، انعام کی آیتیں آپ کا سکون و انس ہیں اور انتقام کی آیتیں آپ کا حزن، حدود و جہاد کی آیتیں آپ کا بغض فی اللہ ہیں اور امن و ترحم کی آیتیں آپ کا حب فی اللہ، نزولِ وحی کی آیتیں آپ کا عروج ہیں اور تعلیم و تبلیغ کی آیتیں آپ کا نزول، تنفیذ اوامر کی آیتیں آپ کی خلافت ہیں اور خطاب کی آیتیں آپ کی عبادت وغیرہ وغیرہ۔ بغرض کسی بھی نوع کی آیت لو وہ آپ کی کسی نہ کسی پیغمبرانہ سیرت اور کسی نہ کسی مقام نبوت کی تعبیر ہے اور آپ کی سیرت اُس کی تفسیر، جس سے صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس زریں مقولہ وکان خلقه القرآن سے قرآن اور ذاتِ اقدس نبوی کی کامل تطبیق اور صدیقہؓ پاک کی علمی گہرائیوں اور ذاتی ذکاوتوں کا نشان ملتا ہے اس لیے یہ دعویٰ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآن کے علمی عجائبات کبھی ختم نہیں ہو سکتے تو سیرت نبوی کے عملی عجائبات بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں، اور اگر قرآن علمی طور پر تاقیامِ قیامت اپنے شاخ در شاخ علوم سے بنی نوع انسان کی تکمیل کا ضامن ہے تو یہ سیرت جامعہ بھی تا یومِ محشر اپنے شاخ در شاخ عملی اسوؤں سے اقوامِ عالم کی تکمیل و تسکین کی کفیل رہے گی۔

اس توجیہ و استدلال کے سلسلہ میں ذرا اور آگے بڑھو تو قرآن کی شرعی تفسیر حدیث پاک ہے، قرآن اگر متن ہے تو حدیث اس کا بیان اور شرح ہے جس سے قرآن کے مخفی گوشے مرادی طور پر کھلتے ہیں اور مطالبِ خداوندی نمایاں ہو جاتے ہیں، اس لیے اگر قرآن حضور کی سیرت ہے تو حدیث اس سیرت کی تفصیل ہے اور اس لیے کتب حدیث کے ہزاروں ابواب و فصول درحقیقت سیرت مقدسہ ہی کے ابواب و فصول ہیں جن سے گزر کر ہی آدمی اقلیم سیرت میں داخل ہو سکتا ہے۔

اندریں صورت کہ قرآن و حدیث سیرت مقدسہ کی تعبیر ہے اس نکتہ پر غور کرنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے مضامین کی ترتیب میں جو درحقیقت سیرت مقدسہ اور حیات نبوی کے مراتب کی ترتیب ہے اوّلیت ایمان و عقائد کو اور پھر عبادات کو

دی گئی ہے ، فاتحۂ قرآن کو بھی اولاً ذاتِ حق پھر اُس کی ربوبیت عامہ پھر رحمت عامہ اور پھر مالکیت عامہ اور پھر عبادت و استعانت سے شروع کیا گیا ہے ، سورۂ بقرکو لو تو اُس کی ابتدا بھی ایمان بالغیب اور نماز و انفاق فی سبیل اللہ سے کی گئی ہے ، بہرحال قرآن میں اولیت عقاید اور عبادات کو دی گئی ہے ۔

اُس کے بعد دوسرے ابواب میں دین کی تفصیل ہے ، اسی طرح عموماً کتب حدیث میں اسی اسوۂ قرآنی کے مطابق ابواب و فصول کی ابتدا کتاب الایمان پھر کتاب الصلوٰۃ ، کتاب الزکوٰۃ ، کتاب الصوم ، کتاب الحج وغیرہ سے کی گئی ہے ۔ اس کے بعد اخلاق معاملات نکاح طلاق ، میراث ، ہبہ ، اوقاف پھر وسائل معاش زراعت تجارت صنعت وحرفت ملازمت اور پھر ان معاملات نفاذ کے لیے قضاء ، تعزیرات وکفارات وغیرہ اور پھر ان تمام ابواب کی حفاظت کے لیے آخر میں خلافت وامارت اور جہاد وسیاست کے ابواب لائے گئے ہیں ۔ یہ سب کے سب مرتب شعبے بلاشبہ سیرت مقدسہ ہی کے ابواب ہیں ، لیکن اس ترتیب نبوی اور اس کی متابعت میں ان ترتیبات نائبانِ نبوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ سیرت کی اساس وبنیاد درحقیقت عقائد وعبادات ہی قرار دی گئی ہیں ، خود حضورؐ نے بھی اسلام کی اساس وبنیاد عقائد وعبادات ہی کو قرار دیا جو دوسرے لفظوں میں سیرت کی بنیاد ہے ، فرمایا :

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ وصوم رمضان وحج البیت ان استطاع الیہ سبیلا ۔ (مشکوٰۃ)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے ۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا ، نماز کا قایم کرنا ، زکوٰۃ ادا کرنا ، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج اگر استطاعت ہو ۔

جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی میں عبادت اور دیانت اصل سیرت ہیں اور انتظامی اور سیاسی ابواب اُس کے محافظ ہیں جو ابعدیت کا درجہ رکھتے ہیں تاکہ یہ بر دِ تقویٰ اور یادِ خداوندی کا کارخانہ خلل اور زلل سے محفوظ رہے اور دنیا میں کسی فتنہ پرور کو اس نظام سیرت نبوی میں رخنہ کی جرأت نہ ہو ۔

قرآن کریم نے اس سے زیادہ کھلے لفظوں میں اقامت عبادت ودیانت کو اصل مقصود ٹھہراتے ہوئے تمکین وسیاست اور فتوح ممالک کو اُس کا وسیلہ قرار دیا ہے ، فرمایا :

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ۔

اگر ہم ان (مسلمانوں) کو زمین کی سلطنت دے دیں تو یہ نماز قایم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور پاکیزہ امور کا امر کریں گے اور منکرات سے باز رکھیں گے ۔ الخ

یہی وجہ ہے کہ دین ودیانت تو تمام انبیاء علیہم السلام کو دیا گیا لیکن قہر وسیاست اور جہاد وجنگ سب کو نہیں دی گئی جہاں ضرورت سمجھی گئی دی گئی ورنہ نہیں دی گئی ، حضورؐ نے بھی اعلانِ نبوت کے ساتھ سب سے پہلے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی اور جس پر اپنے صحابہ کو تربیت دی وہ یہی ایمان باللہ ، مبدا ، معاد ، توحید رسالت اور سزا وجزا کے عقیدے تھے اور پھر خدا سے رشتہ جوڑنے کے لیے عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ کی تعلیم فرمائی گئی جس سے مکی آیتیں بھری ہوئی ہیں ۔

اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرت مقدسہ کا اساسی اور غالب رنگ عبادت اور تقدس ہے اور وہ دنیا کے سارے معاملات کو اسی عباداتی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے یعنی اس کا طبعی رُخ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اپنی ساری دنیا اور دنیا کے ایک ایک کام کو مقدس بن کر برنگِ عبادات انجام دیں جن میں رضائے الٰہی اور یادِ خداوندی کی روح کار فرما ہو، وہ جو کچھ بھی کریں اللہ کے لیے کریں، نفسانی انداز اختیار کرنے کے بجائے ربانی راہ اختیار کریں، اور ان کا ہر عمل مجاہدہ و جہاد ہو یعنی عبادت ہو عادت نہ ہو جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو اعلائے نفس نہ ہو حق تعالیٰ نے یہی حقیقت جس کا نام تفویض ہے اپنے خلیل پاک حضرت ابراھیم علیہ السلام سے طلب فرمائی جسے اسلام کا نام دیا، فرمایا:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین لاشریک لہ وبذٰلک امرت وانا اول المسلمین۔

کہہ دو (ابراہیم) کہ میری نماز اور عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا امر کیا گیا ہے اور میں ہی (اس امت میں) پہلا مسلم ہوں۔

یہی تفویض مطلق اور عبدیت کاملہ کی بلند پایہ کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تھی جسے آپ نے اپنی دعا میں کھولا ہے، فرمایا:

اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت وبک خاصمت والیک حاکمت والیک انبت والیک المصیر۔

اے اللہ میں تیرے ہی لیے اسلام لایا اور تیرے ہی اوپر ایمان لایا اور تجھی پر میں نے توکل کیا اور تجھے ہی میں نے حکم مانا اور تیری ہی طرف میں ہر جھگڑا لے گیا اور تیری ہی طرف میں نے رجوع کیا اور تیری ہی طرف جانا ہے۔

یہی حال جب اہل اللہ پر طاری ہوتا تھا تو تفویض کے عجیب وغریب عنوانات اُن کی زبانوں پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت بابا فرید شکر گنج قدس سرہ پر یہ کیفیت غلبہ کے ساتھ وارد ہوئی تو وہ بار بار ذیل کی رباعی پڑھتے تھے اور سجدہ میں گر جاتے تھے اور پھر اُٹھتے اور پھر وہی رباعی پڑھ کر پھر سجدہ میں جا پڑتے جس کے راوی حضرت سلطان المشایخ خواجہ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ ہیں، فرمایا:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم و از برائے تو زیم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور سیرت کے بے شمار عملی نمونے اور اسوے ہر وقت جس روح سے زندہ و پائندہ تھے وہ یہی ذکر الٰہی تفویض مطلق اور عبادت خداوندی کی روح تھی۔ گویا اسی کے لیے اس پاک زندگی کا لمبا چوڑا ڈھانچہ بنایا گیا کہ اُس میں یہ ذکر و فکر کی رُوح پھونکی جائے، چنانچہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ ذکر اللہ سے معمور اور فکر آخرت سے بھرپور تھا، ذکر عام کے بارے میں حدیث ہے کہ:

کان یذکر اللہ علیٰ کل احیانہ۔

آپ ہر لمحہ ذکر الٰہی میں لگے رہتے تھے۔

اور فکر دائمی کے بارے میں ارشاد حدیث ہے کہ:

کان دائم الفکرۃ حزینا۔

آپ ہمیشہ متفکر اور غمزدہ سے رہتے تھے۔

پس آپ کی زندگی اور زندگی کی سیرت بالاصل نہ ملوکیت تھی نہ ریاست نہ غلبہ و قہر تھی نہ تسلط و استیلاء، نہ تعیش تھی نہ تزین، نہ آرائش زیبائش تھی، نہ راحت طلبی و آسائش بلکہ بندگی سرافگندگی، نیازکیشی عبودیت اور طاعت و عبادت تھی جس میں خوئے ذکر اور بوئے فکر سمائی ہوئی تھی اور جو کچھ بھی زندگی نقل و حرکت تھی وہ اسی فکر دائمی اور ذکر دوامی کے رنگ میں تھی، قرآن نے اسی ذکر و فکر کے مجموعہ کو دانائی کہا اور اولوالالباب یعنی عقلمندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض۔

(دانشمند) وہ ہیں جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور فکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت اور بناوٹ میں۔

پس قرآن کی رو سے محض متفکر بھی دانشمند نہیں جبکہ وہ ذاکر نہ ہو اور محض ذاکر بھی پورا دانشمند نہیں جبکہ وہ مفکر اور متفکر نہ ہو، حقیقی دانشمندی وہی ہے جس میں ذکر بھی ہو اور فکر بھی، عقل بھی ہو اور عشق بھی، محبت بھی اور ہوش بھی۔ پس حضورؐ کی سیرت اسی ذکر و فکر کا مجموعہ اور ان دونوں مقاموں کا کامل امتزاج تھی، جہاں آپ کی عبادت ان دونوں روحوں کا مظہر تھی وہیں آپ کی سیاست بھی ان دونوں روحوں سے عبادت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی سرکارِ دو عالمؐ خلیفۂ خداوندی بھی ہیں، معاملات کے فیصلے بھی دے رہے ہیں، دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی فیصل فرما رہے ہیں جہاد کے لیے لشکر بھی بھیج رہے ہیں، غنائم کی تقسیم بھی کر رہے ہیں حدود و قصاص کا اجراء بھی ہو رہا ہے، فتوحات ممالک کا سلسلہ بھی جاری ہے صوبوں اور نئی حکومتوں میں گورنر بھی مقرر کیے جا رہے ہیں یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر صحن مسجد میں ذکر اللہ اور فکر آخرت کے ساتھ کیا جا رہا ہے یعنی یہ سب کچھ تھا مگر عبادت الٰہی کے ہی رنگ میں تھا ڈھانچہ اگرچہ سیاست کا تھا مگر روح عبادت کی اس میں کارفرما تھی اور روح اور ڈھانچہ میں کامل مناسبت کے ساتھ ڈھانچہ اس روح کے حسبِ حال تھا اور روح ڈھانچہ کی مثال۔

پس آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا امتیازی اور غالب پہلو یہی ایمان و عبادت اور ذکر و فکر تھا جس میں عقل و عشق، محبت و بصیرت، مادیت و ملکیت، امارت و مسکنت، خلافت و عبادت کا کامل اجتماع و امتزاج تھا کہ ایک سے دوسری متقابل صفت کسی حالت میں بھی بے تکر نہیں بنا سکتی تھی، حتیٰ کہ آپ غزوات اور جنگوں میں بہ نفس نفیس خود بھی شرکت فرماتے اور نہ صرف شرکت بلکہ ان کی قیادت فرماتے لیکن یادِ الٰہی اور رنگِ عبودیت سے یہ ہنگامہ خیزی بھی بھرپور رہ کر عبادت ہی کے رنگ میں

ادا ہوتی تھی عین جہاد میں بھی ذکر اللہ اور متعلقہ دعائیں پڑھتے ہوئے آپ لشکروں کی قیادت فرماتے جس سے یہ جہاد اعلیٰ ترین عبادت بن جاتا اور عین لڑائی میں جبکہ نماز کا وقت آتا تو یہ اضافی عبادت اس حقیقی عبادت میں حارج نہیں بن سکتی تھی، بلکہ اس کی مدت متعین ہوتی تھی۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

جس سے نمایاں ہے کہ آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا بنیادی پہلو ایمان و عبادت تھا جس کے لیے دوسرے شعبہ ہائے زندگی بطور خادم اور بطور وسائل کے کام کرتے تھے، پس زندگی کے عام شعبوں کی عبادتیں وقتی تھیں اور یہ اصل عبادت ہمہ وقتی۔

اب اس سیرت جامعہ کا خلاصہ یہ نکل آیا کہ سیرت مقدسہ اصولاً زندگی کے تین شعبوں پر مبنی ہے تعلق مع اللہ، تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس۔ تعلق مع النفس کے سلسلہ میں پاک دامنی و پاک نفسی عفت و عصمت، حیاء و انکسار، غیرت و حمیت، ہمت و شجاعت، صبر و سماحت، حلم و ضبط، اعتماد و توکل، زہد و قناعت، مجاہدہ و ریاضت، تحمل شدائد و مصائب اور خدا ترسی وغیرہ کے اعلیٰ ترین ملکات اور اخلاق حمیدہ آپ کی فطرت صالحہ کا خمیر تھے۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں خدمت خلق اللہ، صلہ رحمی، نصرت و اعانت، جود و سخا، ایثار و عطاء، راحت رسانی اور کف اذی (ایذا رسانی سے بچنا) عفو و درگزر، محبت و شفقت، دلسوزی و ہمدردی، تعلیم و تربیت، ارشاد و تزکیہ وغیرہ آپ کی پاک طبیعت کے فطری جوہر تھے۔

اور تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت و ریاضت، مجاہدہ و مراقبہ، کسر شہوات و لذات، تقرب و انابت، توبہ و استغفار، تہجد و شب بیداری، ذکر اور فکر وغیرہ آپ کی پاک فطرت کی افتاد تھی۔

لیکن ان تینوں تعلقات میں تعلق مع اللہ ہی دونوں تعلقات کی استواری کی رُوح تھی جو نفس و خلق کے تعلقات کو صحیح نہج پر قائم کرتی ہے۔ اگر نفس انسانی کو تعلق مع اللہ سے آشنا اور اُس کے تقاضوں کا خوگر نہ بنایا جائے تو تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس صحیح بنیادوں پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا، آج بھی جو لوگ اللہ سے منقطع ہو کر ان تعلقات کو خوشنما بنانے کی فکر میں ہیں وہ طرح طرح کی مہلک لغزشوں کا شکار اور نفسانی جذبات میں گرفتار ہیں جن کی مہلک لغزشوں سے دنیا فتنہ و فساد کا گھرانہ بنی ہوئی ہے۔

آج یورپ میں عقل و فہم کی کمی نہیں، روابط اور بین الاقوامی علائق کی کمی نہیں، سیاسی تعلقات کی ہمہ گیری اور اُن کی تدابیر کی کمی نہیں حتیٰ کہ صرف انہی بین الاقوامی تعلقات کے لیے متحدہ کونسل یو، این، او بھی قائم ہے جس میں رات دن ممالک کے معاملات آتے رہتے ہیں۔ خانگی زندگی کے لیے تربیتوں کے بے انتہا ڈھنگ اور گھریلو زندگی کی خوشگواریوں کے لیے بے شمار لٹریچر وغیرہ سب ہی کچھ مہیا ہیں لیکن اس کے باوجود انہی کے اقراروں اور اعلانوں سے یہ بھی واضح ہے کہ گھر اور باہر سے چین اور سکھ مفقود ہے یہی نفوس جن کی طمانیت کی خاطر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے امن و اطمینان کی ہوا تک سے بھی کوسوں دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ فقدان اسباب نہیں کہ وہ تو سب مہیا ہیں بلکہ مسبب الاسباب سے ربط کا فقدان ہے، خدا پرستی خوف

آخرت اور مالک الملک کے سامنے جواب دہی کا فکر معدوم ہے۔ اعتقاداً ہو یا عملاً جو ان تعلقات کو صحیح نہج پر نہیں آنے دیتا جس سے ان نفوس میں جذبۂ انقیاد و اتباع حق کے بجائے خود رائی اور خود بینی کے جراثیم پرورش پائے ہوئے ہیں۔ مدار کار غرور نفس ہے یقین حق نہیں جس کے تحت خود غرضیوں، اور قومی و نسلی اور وطنی تعصبات کی آگ سلگ رہی ہے اور اس سے تمدنی سیاسی اور اقتصادی اونچ نیچ کی مہلک وبا سکون و امن کی جان لیوا بنی ہوئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا اُن کے تمدنی وسائل اور ایجادات سے فائدہ بھی اٹھا رہی ہے لیکن دلوں میں ان سے تنفر کے جذبات بھی لیے ہوئے اور اُن کی جبری قیادت کا جوا سروں سے اتار پھینکنا بھی چاہتی ہے۔ بہ محبوبیت کا فقدان اُسی خدا پرستی کے نہ ہونے اور خود پرستی کے ہونے سے رونما ہے، جس سے واضح ہے کہ کوئی بھی انسانی تعلق خواہ اپنے نفس سے ہو یا مخلوق سے بغیر خدائی تعلق کی ہمواری کے ہموار رہنا ممکن نہیں، اسی لیے حضرت صاحب سیرت علیہ السلام نے اپنی سیرت مبارکہ کی روشنی میں بطور ضابطۂ حیات ارشاد فرمایا کہ:

من اصلح فیما بینه وبین الله اصلح الله فیما بینه وبین الخلق۔ (کنز العمال)

جس نے اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کا معاملہ درست کر لیا تو خدا اُس کا اور مخلوق کے درمیان کا معاملہ خود درست فرما دیتا ہے۔

اس لیے اگر آج ہم اس سیرت پاک کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحیح بنیادوں پر اٹھانا چاہتے ہیں تو اُس میں سیرتِ مقدسہ کی روشنی میں ان تینوں تعلقات کو عملی صورت دیتے ہوئے اُن کی رُوح اور بنیاد تعلق مع اللہ ہی بنانا ہوگا۔ جیسا کہ حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ کا اساسی پہلو یہی تعلق ہے۔

اب اگر ہم سیرت عبادت و اخلاق اور تعلق مع اللہ سے کنارہ کش ہو کر مثلاً محض قہر و سیاست اور اقتدار و غلبہ کی سیرت کو مطمح زندگی بنالیں جس میں یہ اخلاقی روح نہ ہو تو یہ کوری سیاست ملک عضوض یعنی کٹکھنا ملک ہو کر رہ جائے گی، جس میں کسی وقت بھی ظلم و ستم، زبردستی اور زبردست آزادی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہ جائے گی اور اگر محض قومی خدمت اور رفاہیت عامہ کو مقصد زندگی ٹھہرالیں جس میں خدا ترسی اور اخلاقی قدریں نہ ہوں تو وہ کوری خود غرضی نمود نمائش اور شہرت پسندی ہو کر رہ جائے گی جس میں کسی وقت بھی قلبی یکسوئی اور مخلوق کی مدح و ذم سے بالاتر ہو کر غناء و استغناء کی دولت نصیب نہ ہو سکے گی۔ پھر اسی کے ساتھ اگر ہم تمام طبعی اور اجتماعی تعلقات سے الگ ہو کر محض عبادت اور خلوت گزینی اختیار کریں گے تو نہ صرف ہم تعاون باہمی کی اُن تمام قوتوں سے محروم ہو جائیں گے جو مدنیت کی روح اور اجتماعیت کی اساس ہیں اور جن کے بغیر وہ عالمگیر خدمت انجام نہیں پا سکتی جو سیرتِ پاک اور طبیعتِ اسلام کے تقاضے ہیں بلکہ اس قید تنہائی میں گلہ سے الگ ہو کر کسی وقت بھی نفس و شیطان کی مکاریوں سے پناہ نہیں پا سکیں گے جنھوں نے خلوت گزیں راہبوں کو کتنی ہی بدکاریوں کا شکار بنایا ہے۔

پس خدمتِ خلق بلا عبادت انانیت ہے، خدمتِ نفس بلا خدا ترسی نفسانیت ہے انقطاعی عبادت بلا خدمتِ خلق رہبانیت ہے اور ریاست بلا عبادت ملوکیت و استبدادیت ہے اور ظاہر ہے کہ نہ رہبانیت حضورؐ کی سیرت ہے نہ

ملوکیت نہ نفسانیت آپ کی سیرت ہے نہ انانیت، کیونکہ یہ اکہری چیزیں الگ رہ کر جیسے مجموعی سیرت نہیں بن سکتی ایسے ہی اپنی روح سے الگ ہو کر اس روح کے خلاف خود رو نقشوں اور رسوم کے ساتھ اجزاء سیرت بھی نہیں کہلائی جا سکتیں کہ انھیں جزوی سیرت ہی کہا جا سکے، البتہ جب اس خدمت خلق اور خدمتِ نفس کے خانوں میں اخلاق و عبادت کا رنگ بھر دیا جائے اور یہ سب اجزاء اپنے مطلوبہ نقشوں کے ساتھ عبادت کے محور پر جمع ہو جائیں تو پھر اُس جامع سیرت کا عکس پیدا ہو جائے گا جس کا نام لے کر ہم اُس کا کام کرنا چاہتے ہیں، اب اُسے نہ نفسانیت کہیں گے نہ رہبانیت، نہ ملوکیت کہیں گے نہ انانیت بلکہ ربانیت کہیں گے جس میں انسان اپنی ہر نقل و حرکت کا مرجع و محور اپنے رب کو بنا لے گا، پس ان تمام اجزاء کی پاک اور مطلوب صورتوں کا صحیح اور معقول امتزاج ہی سرکار دو عالم کی جامع ترین سیرت ہے جس میں فرد کی رعایت الگ ہے اور قوم کی الگ، حکومت کی رعایت الگ ہے اور (رعایا) کی الگ۔ اُس میں دیانت بھی ہے اور سیاست بھی، انفرادیت بھی ہے اور اجتماعیت بھی، خدمت بھی ہے اور عنائیت بھی۔ اور ان سب عناصر کے امتزاج سے سیرت صالحہ کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ انسان میں طبعی جذبات باقی رہیں مگر اُن پر عقل کی حکومت ہو، عقلی نظریات بھی ہوں مگر اُن پر وحی الٰہی کی نگرانی ہو، آزادیِ ضمیر بھی ہو مگر اُس میں حق کے ساتھ تقید ہو غرض، نفس، طبع، عقل، وجدان، ضمیر اور جذبات میں سے کوئی چیز بھی پامال نہو، سب کے تقاضے کار فرما رہیں مگر ہر ایک کی نقل و حرکت کا محور طاعتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی ہو اور کسی وقت بھی یہ تقاضے پابندیٔ حق سے آزاد نہوں، بس اسی جامعیت اور اعتدال کامل کا نام سیرت مقدسہ حضرت خاتم الانبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

آج اگر ہم اپنے نونہالوں کے لیے سچے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ نہایت اُونچے پیمانہ کے دیندار اور خدا پرست ہوں جن میں بے راہ روی، بے قیدی، بد اعتقادی اور اصول سے آزادی نہ ہو اُن کی نگاہ خدا پر ہو اور اُسی پر بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوں اور دُوسری طرف وُہ ملک کے سچے شہری اور متمدن ہوں جن کے حالات و معاملات میں دیانت، صداقت، راست گوئی اور راستبازی ہو شخصی مفاد کے غلبہ کے بجائے قومی اور جماعتی مفاد اُن پر غالب ہو، ایک طرف وہ مساجد و مدارس کی زینت ہوں اور دوسری طرف درباروں اور بازاروں کا نظم بھی ان کے ہاتھوں فروغ پا رہا ہو، ایک طرف اُن کی خلوت گاہیں یادِ الٰہی سے بھرپور ہوں اور دُوسری طرف ان کی جلوتیں اور حکومت کے دفاتر اُن کی عدل گستری سے معمور رہوں، ایک طرف وہ اپنے ملک میں خوشحال اور خوش مآل ہوں اور دوسری طرف دُوسرے ملک ان کی طرف رجوع لا کر نہ صرف ان سے عزت مندانہ تعلقات و معاملات ہی کو اپنی آبرو سمجھیں بلکہ اُن کے مثالی معاملات سے درس بھی لیں تو یہ جامع زندگی بجز اس سیرت جامعہ کی عملی پیروی کے اور کہیں بھی انھیں دستیاب نہیں ہو سکتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پیشتر انسانوں کی یہ دنیا دین کے نام سے تو رہبانیت اور انقطاع کا شکار تھی، ترکِ لذات اور ترکِ مرغوبات ہی اصل دین بن گیا تھا تعذیب جسمانی ہی کا نام تہذیب روحانی رکھ لیا گیا تھا اور اس قسم کے لوگ ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو کر پہاڑوں کی کھوہ اور وتروں میں چھپے ہُوئے پڑے تھے نہ وہ دنیا کے کار آمد تھے نہ دنیا ان کے کام کی تھی، جن کو حدیث نبوی میں فتلك بقايا هم فی الصوامع والديار سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اور

میں توحید و عدل کا رنگ صاف نمایاں ہوگیا، توحید نے لاکھوں انسانوں کی کثرتوں کو ایک کر کے اُن میں جماعتی عبادت کا جذبہ پیدا کیا اور عدل و مساوات نے اونچ نیچ میں پڑے ہُوئے بے اعتماد انسانوں میں اعتماد باہمی اور باہمی خدمت و تعاون کے جذبات پیدا کر دیے جس سے اُن میں یکسانی آگئی اور اس طرح پہاڑوں میں پڑے ہُوئے رہبان تو منظرِ عام کی عبادت گاہوں میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے اور عرشِ حکومت پر بیٹھے ہُوئے ملوک فرشِ خاک پر اُتر کر عوام کے ساتھ آملے، ادھر جو لوگ استبداد پسندوں کی غلامی میں پڑے ہُوئے دم توڑ رہے تھے اُن میں حوصلے پیدا ہوئے اور وہ اس آزادی و حریت کی چمک دمک دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خود اپنے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں توڑ کر میدان مساوات میں آگئے، اور جو لوگ تمدن کی ظاہری چمک دمک پر فریفتہ رہ کر خالق کے سامنے سرِ عبودیت جھکانے کا وقت ہی نہیں پاتے تھے وُہ اپنی دنیا کے جھرمٹ میں رہ کر بھی دین سے محروم نہ رہے، غرض اس سیرت مقدسہ نے مرتی ہوئی دنیا کو سنبھال لیا اور مادیت و روحانیت اور دیانت و سیاست کے صحیح امتزاج سے ایک ایسی مخلوط اور معتدل راہ دکھائی کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہ کر دین اور دنیا دونوں سے متمتع ہونے کے قابل بن گیا۔

آج تیرہ سو برس کے بعد دنیا کا نقشہ پھر وہی بن گیا ہے جو تیرہ صدی پیشتر بنا ہوا تھا، آج بھی مشرق و مغرب کی دنیا دو ہی گروہوں میں بٹی ہُوئی ہے، ایک طرف امریکن گروپ ہے جو مغرب پر اثر انداز ہے اور دوسری طرف "رشین" گروپ ہے جو مشرق پر اپنے اثرات قایم کیے ہُوئے ہے، آج دنیا کی ہر چھوٹی بڑی ریاست انہی دو گروپوں میں سے کسی ایک کے ماتحت یا زیر اثر رہنے پر مجبور ہے اور پوری دنیا "دو جتھوں" میں بٹ کر رہ گئی ہے، وہی ملوکیت، وہی اقتدار پرستی، وہی اونچ نیچ اور وہی آقائی اور غلامی کے جراثیم مثل سابق پل پل کر شباب پر آئے ہُوئے ہیں۔ قیصریت نے امریکیت کا چولا پہن رکھا ہے اور کسرویت نے رشیائیت کا لباس زیبِ تن کیا ہُوا ہے فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ پہلے شخصی اقتدار بلا واسطہ کارفرما ہوتا تھا اب وہ عوام کی آڑ میں کام کرتا ہے، پہلے اُس کا نام شخصیت تھا اب جمہوریت ہے، بہرحال جو نقشہ فارس و روم کا تھا وہی اب یُو۔ایس۔اے اور روس کا ہے فرق صرف شخصیت و عوامیت کے عنوان کا ہے۔ ع

وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے

لیکن جس سیرت مقدسہ نے اُس وقت کی قیصریت و کسرویت کا زور توڑا تھا وہ آج کی قیصریت و کسرویت کا بھی صحیح علاج کر سکتی ہے، اور جس سیرت کی ہمہ گیر معنویت سے اُس وقت کے دو عالمگیر گروپوں کی قوت ٹوٹی تھی وہی آج بھی اس گروپ بندی کا نقشہ بدل سکتی ہے، اور وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ ہے جس میں نہ شخصیت ہے نہ رسمی جمہوریت، نہ رہبانیت ہے نہ عوامیت نہ کوری سیاست خشک دیانت بلکہ اصل خلافت ہے خواہ وہ شخص کے پردہ میں کام کرے یا جماعت کے، اصل دیانت ہے خواہ وہ سیاست کے چولے میں نمودار ہو یا عبادت کے بھیس میں اصل توجہ الی اللہ اور خوفِ آخرت ہے خواہ وُہ تدین کے روپ میں نمایاں ہو یا تمدن کے لباس میں، غرض ان دونوں سے بالاتر ہو کر سیرتِ نبوی نے وہ ہمہ گیر اصول پیش کر دیا جس کے وسیع دائرہ میں دین و دنیا، دیانت و سیاست، انفرادیت و اجتماعیت سب باقی بھی رہیں اور اُن کے اصلی جوہر کارآمد بھی ہوگئے اور پھر ان دونوں متضاد کناروں کو اس ہمہ گیر اصول میں جوڑ کر اُن کی آمیزش سے ایک ایسا جامع رنگ

دنیا کے سامنے لا رکھا جس سے اب تک دنیا نا آشنا تھی آج کی ناہموار دنیا ہمواری کی تلاش میں ہے اور آج کے جدید تمدن کے پجاری خود اپنے تمدن کی مبالغہ آرائیوں سے تنگ آچکے ہیں انھیں خود ایک معتدل مسلک کی تلاش ہے، وُہ آج کی مدنیت کے انتہا پسندانہ جذبات سے عاجز آ کر خود ہی دوسرا راستہ مانگ رہے ہیں اور اس تمدن کی کشمکش اور بے سکونی و بے اطمینانی سے پریشان ہو کر سکون دل کی تلاش میں ہیں جو تمدن کو چھوڑے بغیر اور رہبانیت اختیار کیے بغیر انھیں مل جائے، تو کیا یہ جامع راستہ انھیں بجز اسی سیرت مقدسہ کے کہیں اور دستیاب ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں یہود و نصاریٰ سے تو یوں نہیں کہ وہ خود ہی ایک متلاشی کی حیثیت سے سرگرداں ہیں اور پھر اُن کے سوا کسی اور قوم سے یُوں نہیں کہ اور سب قومیں ان ہی متمدنوں کی نقالی اور پیروی کو آج اپنی بقاء وارتقاء کا راستہ سمجھ رہی ہیں اس لیے یہ ذمہ داری اسی قوم کی ہو سکتی ہے جس کا نام اس سیرت کی پیروی سے مسلم ہوا تھا اور جس طرح اس قوم نے اس ذمہ داری کو تیرہ صدی پیشتر پورا کیا تھا آج بھی وہی پُورا کر سکتی ہے، ہاں اگر یہ قوم اپنی ذمہ داری ہی محسوس نہ کرے تو جس خدا نے ذمہ داری نباہنے پر اس قوم کے لیے اپنا وعدہ استخلاف پورا کیا تھا اور اس قوم کو زمین کی سلطنت عطا کی تھی جیسا کہ آیت استخلاف میں ارشاد ہے:

وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصّٰلحٰت ليستخلفنهم في الارض۔

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان سے جو ایمان لائے اور عمل صالح اختیار کیا کہ انھیں زمین میں خلافت دے گا (اور سلطنت عطا فرمائے گا)

وہی خدا اس ذمہ داری کو محسوس نہ کرنے پر وعید استبدال بھی پُوری کر سکتا ہے کہ اس قوم سے زمین کی سلطنت چھین کر دُوسری قوموں کے حوالے کر دے جیسا کہ آیت استبدال میں ارشاد ہے:

وان تتولوا يستبدل قوما غيركم ثم لا يكونوا امثالكم۔

اور اگر تم (اس دین کی خدمت سے) پھر جاؤ گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم بدل کرلے آئے گا اور وہ تم جیسے (سست اور کاہل) نہ ہوں گے۔

پس جیسے استخلاف کا وعدہ اپنے وقت پر پورا کر دیا گیا ایسے ہی استبدال کی وعید بھی اپنے وقت میں برسرکار آسکتی ہے، پس آج ضرورت ہے کہ مسلم قوم اُٹھے اور سیرتِ مقدسہ کو پریشان دنیا کے سامنے پیش کرے مگر نہ اس طرح کہ سیرتِ مقدسہ ایک نعرہ ہو کر رہ جائے بلکہ اسوہ اور نمونہ عمل کے لباس میں سامنے آئے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایسی شخصیتیں اس کام کو آگے بڑھائیں جو اس سیرت سے ہم آہنگ ہوں یعنی سیرت کی ترویج محض لٹریچر محض پروپیگنڈہ اور محض کانفرنسوں سے نہیں بلکہ صحیح لٹریچر کے ساتھ صحیح شخصیتوں اور ایسے عملی نمونوں سے ہو سکتی ہے جو تقشف اور زہد خشک سے بھی بالا ہوں، اور فکری بے قیدیوں اور آزادروشی سے بھی بری ہوں کیونکہ جہاں قوم کی اجتماعیت کو ایسے افراد سے نقصان پہنچ رہا ہے جو تقشف کی راہ سے جمود محض اور رہبانیت کو سیرت سمجھے ہُوئے ہیں وہیں ایسے طبقات سے بھی مضرت پہنچ رہی ہے جو آزادی ضمیر اور حریت فکر کے نام پر دین میں طبع آزمائیوں اور تخیل آفرینیوں سے راہ بنانے کا نام سیرت رکھے ہوئے ہیں، اگر پہلے طبقہ کے نزدیک آیات و روایات

اورسلف کے اقوال ومقالات میں محدود رہنے کے معنی ہر فکری قوت کو زائل کر دینے اور ہر عبرت وبصیرت سے کنارہ کش ہوجانے کے ہیں تو دوسرے طبقہ کے نزدیک ان روایات سلف کے تمام مقالات اوران کی قایم کردہ حدود کو توڑ دینے کا نام استنباط فکر اور حریت رائے کے ہیں، لیکن یہ دونوں چیزیں سیرت سے تعلق نہیں رکھتیں، جمود کے طریقہ کو تو قرآن حکیم نے دعوتِ فکر دے کر آیتِ ذیل سے رد کر دیا ہے کہ:

ولیتذکر اولوا الالباب -

اور چاہیے کہ تذکر کریں دانشمند۔

اور فرمایا:

لم یخروا علیها صما وعمیانا۔

(آیات الٰہیہ کی یاد دہانی پر) وہ بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ فکر وبصیرت سے حقایق تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں)

اور آزادیٔ نفس کے طریقہ کو قرآن حکیم نے آیت ذیل سے مردود قرار دیا ہے:

ثم جعلنا علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذین لا یعلمون -

پھر ہم نے آپ کو قانونِ شریعت پر قایم کیا ہے تو اسی کا اتباع کیجیے اور جاہلوں کی اہواء (تخیل آفرینی) کی پیروی نہ کیجیے۔

پس یہ دونوں راستے سیرت کی اقلیم تک پہنچانے والے نہیں، جس سے صاف واضح ہے کہ سیرت کا ایک رکن اگر تقلید کامل ہے تو دُوسرا رکن اصول حقہ کی روشنی میں تدبر کامل بھی ہے، چنانچہ تقلید کامل کے بارے میں تو تمام انبیاء علیہم السلام اور خصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح سیرت قرآن نے یہ بیان کی کہ:

ماکنت بدعا من الرسل وما ادری مایفعل بی ولا بکم ان اتبع الا مایوحیٰ الیّ ان انا الا نذیر مبین -

میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، میں تو اپنی طرف آئی ہُوئی وحی کے سوا کسی چیز کا اتباع نہیں کروں گا، میں سوائے اس کے کہ ایک کھلا ڈرانے والا ہوں اور کچھ نہیں۔

اور آیات الٰہیہ کی روشنی میں فکر وبصیرت کی آزادی کے بارے میں سیرتِ پاک یہ بیان کی ہے:

قل هذه سبیلی ادعوا الی الله علیٰ بصیرة انا ومن اتبعنی - (۱۲: ۱۰۸)

فرما دیجیے کہ یہ ہے میرا راستہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں۔

بہرحال اپنی اپنی حدود میں پابندیٔ کامل اور آزادیٔ کامل کے کامل امتزاج کا نام سیرت ہے جس سے واضح ہے کہ ذہن میں آزادی کے

معنی اصول کے اندر آزادی کے ہیں اصول سے آزاد ہو جانے کے نہیں اور دین میں پابندی کے معنی منقول پروگرام کی پابندی کے ہیں۔ خیالی یا رواجی پروگرام کی پابندی کے نہیں، اس لیے بے بصیرت متقشف بھی سیرت کی راہ نہیں چل سکتا اور اصول سے آزاد مفکر بھی اس سیرت کی راہ نہیں پا سکتا، سیرت ان دونوں راستوں کے بیچ میں ہے جس میں پابندی اور آزادی حریت اور عبدیت فکر اور اتباع استنباط اور ادب قانون اور اخلاق عقل اور عشق ذکر اور فکر تعلق مع اللہ اور تعلق مع الخلق دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہوں نہ پابند بے حریت سیرت پر ہوگا نہ آزاد بے عبدیت، نہ مفکر بے اتباع سیرت سے مربوط ہوگا نہ مجتہد بے ادب نہ مقنن بد خلق سیرت سے متعلق رہ سکتا ہے نہ خلیق لاقانون نہ عاقل بے عشق سیرت پا سکتا ہے نہ عاشق بے عقل نہ ذاکر بے بصر اصل سیرت پر ہے نہ مبصر بے ذکر نہ دیانت بے خدمت سیرت ہے نہ خدمت بے دیانت بلکہ دونوں کی معتدل آمیزش سے جو جامع اسوہ بنے گا وہی سیرت مقدسہ ہے۔

پس اس جامع سیرت میں جہاں گلیم پوشی ہے وہیں عالمی حکمرانی بھی ہے جہاں شاہی ہے وہیں درویشی بھی ہے جہاں انا النبی لاکذب کا نعرہ جلال ہے وہیں لاتقولوا انا خیر من یونس ابن متّی کا نعرہ جمال بھی ہے، وہاں جس طرح ایک ہاتھ میں خدا کی روشن کتاب ہے وہیں دوسرے ہاتھ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی چمکتی ہوئی تلوار بھی ہے، وہاں جس طرح البغض فی اللہ کے تحت اللہ اکبر کا رجز ہے وہیں حب فی اللہ کے تحت مکہ کو انت احب البلاد الی اللہ کا خطاب بھی ہے وہاں جس طرح خانگی زندگی میں کلمینی یا حمیرا کلی کے محبت آمیز مخاطبات ہیں وہیں بین الاقوامی زندگی میں سلاطین عالم کو فرامین نبوت کے ذریعہ خطاب بھی کیا جا رہا ہے، غرض انا الضحوک اور انا القتال کے نعرے بیک وقت جمع ہیں اور شدت و رحمت ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اللہ کی طرف سے اپنے رسول کو یہ بھی حکم ہے کہ فبما رحمۃ من اللہ لنت لہم اور یہ بھی امر ہے کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم نہ شدت میں رحمت مانع ہے نہ رحمت میں شدت، نہ جہاد میں مجاہدہ نفس حارج ہے نہ مجاہدہ میں جہاد، قاہرانہ اور مشفقانہ دونوں شانیں جمع ہیں، یہ بھی ارشاد ہے کہ انا سید ولد آدم — اور سچا ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا اور بجا ارشاد ہے، جلو میں عبدالرحمٰن ابن عوف، جابر بن عبداللہ اور عثمان غنی جیسے اغنیاء صحابہ بھی اور ابوذر غفاری، مقداد، عمّار بن یاسر اور ابوہریرہ جیسے فقراء صحابہ بھی ہیں، حضرت عمر اور خالد جیسے تلوار کے دھنی اور شجاعان عرب بھی قدموں سے لگے ہوئے ہیں اور زید بن ثابت اور حسان بن ثابت جیسے قلم کے دھنی بھی وابستہ دامن ہیں اور سب کے ساتھ اور صدیق اکبر جیسے جامع صفات صحابی بھی، جو ایک امت واحدہ میں تابع فرمان ہیں اور ان سب پر رحمت نبوت کی کرنیں یکسانی کے ساتھ پڑ رہی ہیں لیکن نہ اغنیاء کو فقیر ہو جانے کی ہدایت ہے نہ فقراء کو اغنیاء بن جانے کا امر ہے نہ ارباب سیف کو قلم سنبھالنے کی ہدایت ہے نہ ارباب قلم کو تلوار پر مجبور کیا جا رہا ہے، بلکہ سب طبقے اپنے اپنے حال میں مست رہ کر انہی متفاوت احوال سے بارگاہ حق میں واصل ہو رہے ہیں۔ ع

یوں بہم کس نے کیے ساغر و سنداں دونوں

اسی جامع سیرت پر آپؐ نے اپنی امت کو تربیت دی اور یہی جامعیت و اعتدال امت سے ہر وقت مطلوب بھی ہے جو اس سیرت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

اس سیرت سے اُس وقت کی مضطرب دنیا کو امن وچین ملا تھا اور اسی سیرت سے آج کی دنیا کو بھی راہ دکھانے کا

راستہ مطلوب ہے۔

پس آج دولت عزت وجاہت حکومت سب کچھ مل سکتی ہے لیکن اس سیرت میں اسے رنگے بغیر وہ مقبولیت پیدا نہیں کر سکتی۔

اس مختصر تحریر کا موضوع سیرت کے ابواب پر کلام کرنا یا اُس کی تفصیلات بیان نہ تھا۔ جبکہ یہ کسی ایک تحریر میں ممکن بھی نہ تھا، جو سیرت قرآن میں بصورت متن حدیث میں بصورت شرح فقہ میں بصورت مسائل اصول فقہ میں بصورت دلائل اور علماء کی بے شمار تصانیف میں بصورت اجزاء و تفاصیل موجود ہے اُسے کسی تحریر میں کس کا یارا ہے کہ سما کر پیش کرے اور سارے قرآن و حدیث اور فقہ و اصول فقہ کا عطر کھینچ کر ایک کاغذ پر رکھ دے نہ یہ ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے پس اس تحریر کا موضوع سیرت کا پیش کرنا نہیں بلکہ سیرت کی جامعیت کے چند بنیادی اصول بیان کرکے سیرت کی نشان دہی کرنا تھا تاکہ اس عظیم بین الاقوامی کانفرنس[1] میں اس کی نوعیت کا فی الجملہ تعارف کرایا جا سکے، اگر ہمارے عوام اور ہمارے خواص ہماری قومیں اور ہماری اسلامی حکومتیں اپنے نظام اجتماعی کا آخری نقطہ اور نصب العین کا جزء اخیر اس نشان دادہ جامع سیرت اور اس کی تمرین و تدریج کو بنالیں جس کی آج دنیا متلاشی ہے تو وہ بلا شبہ عالمی امن قایم کرنے میں ایک بڑا رول ادا کریں گی، پوری دنیا کی محسن ثابت ہوں گی اور تاریخ کے صفحات میں ان کا نام اور یہ کام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ وباللہ التوفیق۔

---

[1] یہ مقالہ بین الاقوامی سیرۃ النبی کانفرنس منعقدہ ۲۷، ۲۸ فروری و یکم مارچ ۱۹۷۶ء بمقام کراچی میں پڑھا گیا۔ (ادارہ)

سیرت نگاری کے بعض اہم پہلو

ندیم الواجدی

سیرت کیا ہے؟

لغت میں سیرت کے معنی ہیں طریقہ اور راستہ۔ بعد میں یہ لفظ عام لوگوں کے حالات کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات، اذکار اور تعلیمات کے مجموعے پر اس لفظ کا اطلاق ہوا[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) نے سیرت کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

آنچہ متعلق بوجود پیغمبر ما صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام و آل عظام است و از ابتدائے تولد آنجناب تا غایت وفات آں را سیرت گویند[2]

جو کچھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ اور آل عظام کے مبارک وجود کے ساتھ متعلق ہو اور آنجناب کی پیدائش سے وفات تک واقعات پر مشتمل ہو سیرت کہتے ہیں۔

فقہا اور محدثین کے یہاں لفظ سیرت مغازی اور جہاد کے معنوں میں مستعمل ہے، چنانچہ امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی جامع میں "کتاب السیر والجہاد"[3] اور حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) کی فتح الباری میں "کتاب المغازی والسیر" کے عنوانات موجود ہیں[4] فقہی کتابوں میں بھی یہ استعمال ہے[5] ابن اسحاق (م ۱۵۰ھ) اور واقدی (م ۲۰۷ھ) کی کتب مغازی کو کتب سیر بھی کہا جاتا ہے اور غالباً اسی لیے اولین بعض سیرت نگاروں نے سیرت پر جو کتابیں لکھیں ان میں غزوات زیادہ ذکر کیے گئے ہیں، لیکن بعد میں یہ فن غزوات ہی کے ساتھ نہیں رہا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی تفصیل سے لکھا جانے لگا۔ مثال کے طور پر ابن سعد (م ۲۳۰ھ) کی "الطبقات الکبریٰ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے احوال بھی لکھے گئے ہیں۔

حدیث اور سیرت کا فرق!

محدثین اپنے فن میں ان تین امور سے بحث کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ کیا کیا؟ اور آپ کے سامنے کیا کیا گیا؟

اسی کو قول، فعل اور تقریر کے اصطلاحی الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے[6] ارباب سیر بھی اپنی کتابوں میں یہی تین چیزیں پیش کرتے

---

[1] البستانی۔ دائرۃ المعارف ج ۱۰ ص ۳۰۹ [2] شاہ عبدالعزیز دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) عجالہ نافعہ ص ۱۴ [3] ابوالحسین القشیری (م ۲۶۱ھ) جامع صحیح مسلم ج ۲ ص ۸۱ [4] حافظ ابن حجر العسقلانی (م ۸۵۲ھ) فتح الباری ج ۷ ص ۲۱۷ [5] امام ابن الہمام حنفی (م ۸۶۱ھ) فتح القدیر (شرح ہدایہ) ج ۴ ص ۲۸۶ [6] علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) فتح الملہم ج ۱ ص ۱

ہیں [7] موضوع کے اعتبار سے یہ دونوں فن ایک ہیں، لیکن تفصیل میں یہ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ محدثین کا مقصد احکام و مسائل کا علم اور ان کا بیان ہوتا ہے۔ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے یہاں التزامی موضوع نہیں ہے سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے بحث کرتے ہیں، احکام کی بحث ان کے یہاں ضمنی ہوتی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں واقعات کی تفصیل ہوتی ہے اور ایک ایک پہلو واضح کیا جاتا ہے۔ حدیث میں واقعات کی تفصیل نہیں ملتی اور کسی خاص پہلو کی وضاحت کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔

حدیث اور سیرت میں یہ فرق بھی ہے کہ ثانی الذکر میں درجۂ صحت سے کم روایات بھی اعتنا کے لائق ہوتی ہیں۔ حدیث میں اس کی گنجائش نہیں ہے لیکن یہ صرف ان احادیث کے لیے ہے جن کا تعلق احکام و مسائل سے ہوتا ہے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ علماً کا ایک اچھا خاصا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حدیث ضعیف سے فضائل اعمال اور قصص وغیرہ میں استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس گروہ میں امام احمدؒ، ابو داودؒ، ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، نوویؒ جیسے اصحاب رائے شامل ہیں [8] امام ابو حنیفہ حدیث ضعیف سے احکام میں بھی معتبر سمجھتے ہیں، اگر وہ اُسے حدیث صحیح پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ حدیث صحیح کی تائید کے لیے پیش کرتے ہیں، یا ایسے مسائل میں ضعیف روایات سے استدلال کرتے ہیں جن کے لیے اعلیٰ درجے کے دلائل میسر نہیں ہوتے۔ امام احمد کے یہاں کچھ زیادہ ہی توسع ہے [9]

حدیث اور سیرت کے درمیان صرف اتنا ہی فرق نہیں ہے، بلکہ بعض واقعات میں محدثین اور سیرت نگار اس حد تک مختلف ہیں کہ کھلا تضاد محسوس ہوتا ہے۔ اس فرق کی وضاحت کے لیے ذیل میں کچھ واقعات درج کیے جا رہے ہیں۔

غزوۂ ذات الرقاع مشہور غزوہ ہے۔ اکثر اہل سیر کی رائے یہ ہے کہ اس غزوہ کا وقوع خیبر کی جنگ سے پہلے ہوا [10] لیکن محدثین خیبر کے بعد وقوع کے قائل ہیں، چنانچہ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) نے اپنی جامع میں تعلیقاً اس کی تصریح کی ہے۔

وھی بعد خیبر [11] اور غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد ہے۔ اس طرح مسلم نے جو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کی جو روایت غزوۂ ذات الرقاع کے ذیل میں ذکر کی ہے، اس سے بھی امام بخاری کے قول کی تائید ہوتی ہے [12] خود امام بخاری بھی اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس روایت میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں خود راوی شریک رہے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری رضؓ خیبر کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، اس کی تصریح امام بخاریؒ نے بھی فرمائی ہے [13] یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ خیبر سے پہلے ہوا ہے تو اس میں ابو موسیٰ اشعری رضؓ کی شرکت کس طرح ممکن تھی۔ امام بخاریؒ نے یہاں حضرت جابر رضؓ کی یہ روایت بھی پیش کی ہے کہ اس غزوہ میں آپ نے صلوٰۃ

---

[7] مولانا عبدالرؤف داناپوری اصح السیر ج ۱ ص ۸، [8] فتح الملہم ج ۱ ص ۵۸ [9] امالی حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری (م ۱۳۵۲ھ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸، ۵۹ [10] مولانا شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ) سیرۃ النبی ج ۱ ص ۸ [11] ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) الجامع الصحیح ج ۲ ص ۵۹۲ [12] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۸۸ [13] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵۹۲۔

خوف بھی ادا فرائی تھی [14] مسند احمد بن حنبل میں حضرت ابوعیاش زرقی رضؓ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ صلوٰۃ خوف سب سے پہلے غزوہ عسفان میں پڑھی گئی ہے [15] اور یہ ثابت ہے کہ غزوہ عسفان، غزوہ خندق اور غزوہ خیبر کے بعد ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزوہ ذات الرقاع غزوۂ خیبر کے بعد وقوع پذیر ہوا ہے

اصحاب سیر و محدثین کے یہاں دمیاطی (م ۷۰۵ھ) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ سیرت کے موضوع پر ان کی ایک نہایت محققانہ تصنیف ہے جس میں اہل سیر کے اتفاق کو شیخین کی روایات پر ترجیح دی گئی ہے۔ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر قسطلانی مؤلف "ارشاد الباری الی شرح البخاری" (م ۹۲۳ھ) اور حافظ ابن حجر مؤلف "فتح الباری شرح البخاری" (م ۸۵۲ھ) نے دمیاطی کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس نقطہ نظر پر خاص طور سے تنقید کی ہے کہ جو انہوں نے غزوہ ذات الرقاع کے سلسلے میں اختیار کیا ہے [16]

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ زرقانی نے شرح المواهب اللدنیہ میں دمیاطی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اہل سیر کے اتفاق کو صحیحین کی روایات پر ترجیح دینے کی جو کوشش کی تھی اس میں وہ غلطی پر تھے، دمیاطی چاہتے تھے کہ وہ اپنی کتاب میں ترمیم کر دیں، مگر کتاب کے نسخے عام ہو چکے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے [17]۔

اسی قسم کا اختلاف غزوہ ذات قرد کے سلسلے میں بھی ہے۔ اصحاب سیر کہتے ہیں کہ اس کا وقوع صلح حدیبیہ سے پہلے ہوا [18] جب کہ محدثین صلح حدیبیہ کے بعد وقوع کے قائل ہیں [19] ان کا استدلال سلمہ ابن الاکوع کی اس طویل روایت سے ہے جو ان کے بیٹے ایاس بن سلمہ سے منقول ہے اور جس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ غزوہ ذی قرد کے تاریخ وقوع سے خیبر میں تین راتیں باقی تھیں [20] حافظ ابن حجر نے اس موقع پر قرطبی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لا یختلف اھل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیہ	اہل سیر کا اتفاق ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے ہے۔

سلمہ ابن الاکوع کی روایت کا جواب قرطبی نے یہ دیا ہے۔

فیکون ما وقع فی حدیث سلمۃ وھم بعض الرواۃ	حدیث مسلم میں جو کچھ آیا ہے وہ بعض راویوں کا وہم ہو سکتا ہے۔

لیکن اس پر حافظ ابن حجر نے تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ زیر بحث روایت بالکل صحیح روایت ہے، اہل سیر کی رائے اس کے مقابلے میں راجح قرار نہیں دی جا سکتی [21]

---

[14] حوالہ سابق [15] امام احمد بن حنبل الشیبانی (م ۲۴۱ھ) مسند احمد ج ۲ ص ۵۹۔ [16] فتح الباری ج ۷ ص ۳۲۲ [17] علامہ عبدالباقی زرقانی (م ۱۱۲۲ھ) شرح المواهب اللدنیہ للقسطلانی ج ۳ ص ۱۱ [18] علی بن برہان الدین حلبی (م ۱۰۴۴ھ) انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون ج ۳ ص ۶۔ [19] بخاری ج ۲ ص ۶۰۳ [20] مسلم ج ۲ ص ۱۱۱ [21] فتح الباری ج ۸ ص ۳۱۔

غزوۂ اوطاس کے جائے وقوع کا مسئلہ بھی اختلافی مسائل کی فہرست میں ہے۔ بعض اہلِ سیر کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ اوطاس اور غزوۂ حنین دونوں ایک ہی مقام پر ہوئے۔ لیکن حافظ نے اس رائے کو مرجوح قرار دیا ہے اور محدّث ابنِ اسحاق کا وہ بیان نقل کیا ہے جس میں انہوں نے اوطاس و حنین کے الگ الگ مقامات بتلائے ہیں، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین سے فراغت کے بعد فوجی صحابہ کی تین جماعتیں ترتیب دی تھیں۔ ایک جماعت کو طائف روانہ فرمایا تھا۔ دوسری جماعت کی روانگی نخلہ کی طرف ہوئی تھی اور تیسری جماعت اوطاس بھیجی گئی تھی[۲۲] اوطاس جانے والے دستے کی قیادت ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے۔ جیسا کہ بخاری میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے[۲۳]

یہ چند واقعات بطورِ مثال ذکر کیے گئے ہیں۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ سیر اور محدثین کے درمیان اس اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ سوال کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں، بات یہ ہے کہ جب ایک ہی واقعہ متعدد اشخاص نقل کریں تو بیان میں اختلاف یقینی ہے۔ بیان کا اختلاف نفسِ واقعہ میں اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ حدیث میں اس کی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں۔ پندرہ راوی ایک روایت بیان کرتے ہیں، مختلف راویوں کی وجہ سے روایت میں کمی بیشی واقع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات مقامات اور سنین بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ اب یہ علما کی ذمہ داری اور ان کے ذہن و دماغ کا کمال ہے کہ وہ مختلف و متضاد روایات میں مطابقت کی کوشش کریں یا صحیح و سقیم میں امتیاز پیدا کر کے ترجیح کا راستہ اختیار کریں، یا تقدیم و تاخیر کی تعیین کے بعد ترجیح کی شکل اپنائیں۔ مختلف روایات میں تطبیق، ترجیح یا تنسیخ کے عمل کے نمونے فقہ، حدیث اور سیر کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ابنِ قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ) نے تو اس سلسلے میں تاویل مختلف الحدیث کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ اردو میں ائمہ اور فقہا کے درمیان اختلاف کے اسباب پر حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ نے "اختلاف الائمہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو اگرچہ محققانہ یا حرفِ آخر نہیں ہے تاہم اس موضوع پر مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

اہلِ سیر اور محدثین کے درمیان اختلافِ روایات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کسی ایک روایت پر اعتبار کریں اور دوسری روایت کو ضعیف قرار دے کر رد کر دیں۔ یہ صحیح ہے کہ جو روایت بخاری رحمہ اللہ و مسلم رحمہ اللہ کی شرطوں کے مطابق ہو گی وہ اہلِ سیر کے اتفاق کے باوجود راجح قرار دی جائے گی، اس کے مقابلے میں دیگر روایتیں غیر راجح تو ہو سکتی ہیں مگر انہیں صرف اسی بنیاد پر موضوع اور غیر صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جو اختلافی واقعات ہم نے ابھی ذکر کیے ہیں، ان میں محدثین میں سے کسی نے بھی بخاری و مسلم کی بیان کردہ احادیث کے مقابلے میں دوسری حدیث کو موضوع یا غیر صحیح نہیں کہا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو بعد کے آنے والے اہلِ سیر اپنے سابقین کی روایت زندہ نہ رکھتے اور محدثین ہی کی رائے قبول کرتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے سیرت نگار اپنے سے پہلوں کی اتباع کرتے ہیں، اور واقعات کی ترتیب میں اپنے پیش روؤں کی ترتیب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیرت نگار اہلِ سیر کی رائے کے مقابلے میں محدثین کی رائے زیادہ وقیع سمجھتے ہیں مگر سابق سیرت نگاروں کے اسلوب سے انحراف نہیں کرتے۔ اردو میں اس کی مثال مولانا حکیم دانا پوری صاحب "اصح السیر" ہیں۔ اگرچہ اہلِ سیر کی رائے کو ترجیح نہیں دیتے، تاہم واقعات کی ترتیب وہی ہے جو

---

[۲۲] فتح الباری ج ۸ ص ۳۱۔ [۲۳] بخاری ج ۲ ص ۶۱۹

دوسرے مصنفین کے یہاں ہے۔ مولانا داناپوری خود بھی غزوۂ ذی قرد کے سلسلے میں اس کی تصریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں [۲۴]

وہ روایات جو بخاری و مسلم کی شروط کے مطابق ہوں اپنے سے کم درجہ والی روایات کے مقابلے میں راجح ہوں گی، لیکن یہ عام قاعدہ نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایسے نظائر بھی ہیں کہ محدثین اپنی اسانید کے علو کے باوجود اہل سیر کی رائے کو فوقیت دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے کہ ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ میں ام حبیبہؓ کو آپ کے عقد میں دیتا ہوں [۲۵]۔ اصحاب سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حبشہ میں ہوا تھا اور آپ کی جانب سے نجاشی (شاہ حبشہ م ۹ھ) کے مقرر کردہ وکیل حضرت خالد ابن سعید ابن العاص نے ایجاب قبول کیا تھا [۲۶] وہ ابوسفیان جن کا ذکر مسلم کی روایت میں ہے ام حبیبہ رضہ کی شادی تک اسلام بھی نہ لائے تھے بلکہ یہ فتح مکہ کے سال ۸ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے [۲۷] اس کی تائید امام بخاریؒ کی بیان کردہ روایت سے بھی ہوتی ہے [۲۸] حافظ ذہبی نے بھی مسلمؒ کی روایت کے بارے میں "ماصح" (صحیح نہیں ہے) کہا ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ شارحین اس حدیث کو عقد جدید کے التماس پر محمول کرتے ہیں، ذہبیؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوسفیان ام حبیبہؓ سے نہیں بلکہ اپنی دوسری بیٹی سے نکاح کرانا چاہتے تھے (یاد رہے کہ ام حبیبہؓ ابوسفیان کی صاحبزادی اور حضرت معاویہ رضہ کی ہمشیرہ تھیں) ذہبی نے اس دوسری بیٹی کا ذکر بلکہ صرف "اسمہا" کہہ کر رہ گئے۔ ذہبی کی سیر اعلام النبلاء کے محقق اور محشی ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے لکھا ہے کہ اصل نسخے میں اسی طرح ہے [۲۹]

نوویؒ نے ابوسفیان کے فضائل کی حدیثوں کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس حدیث کو قاضی عیاضؒ نے غریب اور ابن حزمؒ نے بعض راویوں کا وہم قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث کو موضوع بھی کہا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ حدیث کا ایک راوی عکرمہ ابن عمار واضع حدیث ہے۔ ابن حزم کی اس رائے پر عمرو بن الصلاح نے شدید نقد کیا ہے، ان کی رائے میں مسلم کی حدیث کو موضوع قرار دینا جسارت کی بات ہے۔ کسی بھی ناقد نے ابن عمار پر وضع حدیث کا الزام نہیں لگایا، بلکہ وکیع اور ابن معین نے تو ان کی توثیق بھی کی ہے۔ ابن صلاح نے یہ بھی لکھا ہے کہ عکرمہ مستجاب الدعوات بھی تھے [۳۰]

عمرو ابن صلاح کے الفاظ "وکان مستجاب الدعوات" کا تعلق اگر دعویٰ کے ساتھ دلیل کا تعلق ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ عکرمہ کا مستجاب الدعوات ہونا ثقاہت کے لیے دلیل کیسے ہے؟

---

[۲۴] اصح السیر ج ۱ ص ۲۰۰ [۲۵] مسلم شریف ج ۲ ص ۳۰۴ [۲۶] علامہ ابن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) تاریخ الطبری ج ۳ ص ۱۵۷۰ [۲۷] طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲ [۲۸] بخاری ج ۲ ص ۶۱۳ [۲۹] حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) سیر اعلام النبلاء ج ۲ ص ۱۵۷۔ امام نووی نے مسلم حدیث کی کچھ تاویلات بھی کی ہیں جنہیں شرح مسلم نووی ج ۲ ص ۳۰۴ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[۳۰] مسلم ج ۲ ص ۳۰۴،

سیرت اور تاریخ میں فرق :

سیرت تاریخ کی ایک نوع ہونے کے باوجود فن تاریخ سے الگ اور ممتاز صنف ہے۔ تاریخ کی چند تعریفیں کی جاتی ہیں مشہور ماہر تاریخ کافیجی (م ۸۷۹ھ) نے اپنی کتاب "المختصر فی علم التاریخ" میں یہ تعریف کی ہے کہ تاریخ زمانے کے حالات اور ان حالات کے متعلقات کی یقینی تلاش کا نام ہے۔ سخاوی (م ۹۰۲ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" میں کہا ہے کہ زمانے کے واقعات کی مؤقت جستجو کا نام تاریخ ہے۔ دور وسطیٰ کے مغربی مفکرین کہتے ہیں کہ تاریخ زندہ مطالعہ کا نام ہے [۳۱] اس فرق کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ سیرت کے مآخذ جس قدر مستند اور قابلِ اعتبار ہیں تاریخ کو ان کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں ہے۔ تاریخ کا مدار صحت سند ماخذ کے بجائے قیاس پر زیادہ ہوتا ہے لیکن سیرت میں قیاس کو دخل نہیں ہے بلکہ روایات جس طرح پہنچیں انہیں من وعن ذکر کر دینا سیرت نگار کا پہلا فرض ہے۔ ان روایات میں جس قدر چھان پھٹک اور کاوش سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ الگ قابلِ غور ہے۔

ایک الزام کا جائزہ :

اگر جس طرح حدیث پر اعتراض کرتے ہیں اسی طرح یہ اعتراض سیرت پر بھی ہے کہ اس کا بہت کچھ دار و مدار زبانی روایتوں اور سُنی سنائی باتوں پر ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ محدثین نے روایتوں کے قبول و رد کے لیے سخت اصول مقرر کیے ہیں اور محض حدیث کی صحت یا عدم صحت کا پتہ لگانے کے لیے متعدد علوم معرضِ وجود میں آئے۔ اس صورت میں حدیث و سیرت کے ذخیرے کو بے بنیاد و بے اصل کہہ دینا کوئی جاندار الزام نہیں ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ رضؓ کو انتہائی تعلق تھا جس کی تفصیل ہمیں کتابوں میں ملتی ہے اس محبت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ لوگ پیارے نبیؐ کے ہر فعل اور ہر قول کو اپنے دلوں پر نقش کرلیں اور آپؐ کی مبارک زندگی کا کوئی پہلو بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں اس پر یہ ارشاد مبارک کہ "جس نے عمداً مجھ سے کوئی کذب بیانی کی اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لیا" [۳۲] خود اس کا مستقاضی ہے کہ صحابہ رضؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی جھوٹ منسوب نہ کریں۔

جو لوگ یہ الزام لگاتے ہیں کہ حدیث و سیرت کا مدار زبانی روایات اور سُنی سنائی باتوں پر ہے ان کے پیش نظر وہ روایات ہیں جن میں کتابت حدیث سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی حدیث میں ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج [۳۳]	آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے کچھ مت لکھو اور اگر کسی نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ لکھ لیا ہو اسے مٹا دینا چاہیے۔ ہاں حدیث بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے

[۳۱] عبدالصاحب جعفر جمال الدین "عربوں میں تاریخ کا مطالعہ" ترجمہ ندیم الواجدی۔ "رگ سنگ"، کانپور جنوری ۱۹۷۳ء [۳۲] شیخ ابو عبداللہ خطیب تبریزی (م ۷۴۰ھ) مشکوٰۃ ص ۳۲ باب العلم [۳۳] مسلم ج ۱ ص ۴۱۴۔

اسی مضمون کی روایات سعد بن مالک رضؓ، ابوہریرہ، اور زید بن ثابت رضؓ سے مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہیں [۳۴]

وہ روایات جن میں کتابت حدیث سے روکا گیا ہے۔ اسلام کے دورِ آغاز سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن پاک کا نزول ہو رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر صحابہ رضؓ کو حدیث لکھنے کی اجازت دے دی گئی تو قرآن کریم کی طرف سے ان کی توجہ کم ہو جائے گی۔ ابنِ قتیبہ نے "تاویل مختلف الحدیث" میں یہی توجیہہ کی ہے [۳۵]۔ امام نووی رحؒ کی رائے میں ممانعت ان لوگوں کے لیے تھی جن کے حافظے قوی تھے، وہ لوگ جنہیں سوءِ حفظ کی شکایت تھی، اس حکم سے مستثنیٰ قرار دئیے گئے تھے [۳۶] علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی رائے یہ ہے کہ کمزور یادداشت رکھنے والے لوگوں کے لیے کتابت ضروری ہے۔ انہیں اپنے حافظوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے [۳۷]

بعض کم نظر لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فنّ کتابت سے نفرت تھی، اسی لیے وہ اپنے تلامذہ کو لکھنے سے منع کیا کرتے تھے۔ تاریخی شواہد اس دعوے کے خلاف ہیں۔ حافظ ابن الاثیر نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص کے ترجمے میں یہ تصریح کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اہل مدینہ کو فنّ کتابت کی تعلیم کے لیے مقرر کیا تھا [۳۸] اسی طرح شفاء بنت عبداللہ رضؓ حضرت حفصہ رضؓ کو کتابت سکھلانے کے مقرر کی گئی تھیں [۳۹] جو لوگ اسلامی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اسلام نے فنِ کتابت کو ترقی دی ہے۔ دورِ جاہلیت میں مکہ مکرمہ میں صرف سترہ آدمی کتابت کے فن سے واقف تھے [۴۰] اور مدینہ منورہ میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف نو تھی [۴۱] عربوں کو کتابت کے فنّ سے نفرت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اُسے حاصل کرنا وقار کے منافی ہے [۴۲] لیکن اسلام نے اس فن کو ترقی دی، مسلمانوں کی دلچسپی سے کاتبوں کی تعداد میں اضافہ ہُوا۔ معاشرے میں کتابت کو اس قدر پذیرائی ملی کہ جو لوگ کتابت، تیراندازی اور تیراکی سے واقف ہوتے تھے انہیں الکامل کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا [۴۳]

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کاتب یا کتابت کے مخالف نہ تھے۔ بیشمار روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ رضؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں احادیث لکھیں، اور انہیں صحیفوں میں جمع کیا۔ چنانچہ بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی ایک روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک خطبہ جو کسی شخص کے قتل کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا ایک شخص کو لکھ کر دینے کا حکم فرمایا۔ بخاری کی اس روایت میں اس شخص کے نام کی صراحت نہیں ہے، صرف "لابی فلان" کے الفاظ ہیں۔ مگر دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ان صحابی رضؓ کا نام ابوشاہ تھا [۴۴] حافظ ابن حجر نے ابورافع رضؓ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابتِ حدیث کی اجازت حاصل کی تھی [۴۵] بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ

---

[۳۴] مسند احمد بن حنبل ج ۲ ص ۴۰۲، ۳۹۰ ص ۱۲، ج ۵ ص ۱۸۲ [۳۵] ابن قتیبہ الدینوری (م ۲۷۶ھ) تاویل مختلف الحدیث ص ۳۶۵ [۳۶] امام محی الدین النووی (م ۶۷۶ھ) شرح صحیح المسلم ج ۱ ص ۴۱۴ [۳۷] مقدمہ فتح الملہم ج ۱ ص ۹۲ (علامہ عثمانی رحؒ غیر منقسم ہندوستان کے جلیل القدر محدث تھے۔ دارالعلوم میں مسلم شریف کے درس کے لیے مشہور رہے۔ آپ نے مسلم شریف کی ضخیم شرح بھی تالیف فرمائی۔ اس کے شروع میں علم حدیث پر مبسوط مقدمہ ہے۔ فتح الملہم عرصے سے نایاب تھی۔ اب دیوبند کے ادارہ شرکت علمیہ سے یہ کتاب دوبارہ چھپ رہی ہے [۳۸] ابن الاثیر جزری (م ۶۳۰ھ) اُسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۵، [۳۹] احمد بن یحییٰ البلاذری فتوح البلدان ص ۴۷۷، [۴۰] دیکھیے حوالہ سابق [۴۱] ابن سعد (م ۲۳۰ھ) الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۹۱ [۴۲] ابوالفرج الاصبہانی (م ۳۵۶ھ) کتاب الاغانی، ج ۶ ص ۱۳۰۔ [۴۳] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۹۱ [۴۴] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۲ کتابۃ العلم [۴۵] حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۴۷

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص احادیث لکھا کرتے تھے [۴۶] غالب خیال یہ ہے کہ جو روایات حضرت عبداللہ ابن عمر ابن عاص لکھا کرتے تھے وہ اس صحیفے میں ہوں گی جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے [۴۷] اور جس کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ اس صحیفے کا نام "الصادقہ" تھا اور اس میں ایک ہزار احادیث موجود تھیں [۴۸] اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں صحابہؓ کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، صدقات اور دین (قرض) کے احکامات املا کروا دیے تھے [۴۹] آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ کو ایک ایسا فرمان بھی ملا تھا جس میں صدقات کے احکام درج تھے [۵۰] حضرت علیؓ کے پاس احادیث کا ایک صحیفہ موجود تھا [۵۱] بخاری میں ابوجحیفہ کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [۵۲] حضرت ابوہریرۃؓ کے پاس بھی صحیفہ ہمامؒ کے نام سے ایک صحیفہ موجود تھا [۵۳] سعید ابن عبادہ ابن الصامت کے پاس بھی احادیث کا ایک مجموعہ تھا۔ ربیعہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کی اطلاع سعیدؓ کے بیٹے نے دی تھی [۵۴] عتبان ابن مالکؓ کے پاس بھی لکھی ہوئی احادیث تھیں [۵۵] عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس بھی حدیث کے مجموعے تھے [۵۶]

اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدیث کا بڑا ذخیرہ دورِ نبویؐ میں جمع کر لیا گیا تھا اور وہ غیر مرتب شکل میں صحابہؓ کے پاس موجود تھا۔ بعد میں اسی سرمائے کی بنیاد پر امام مالکؒ، بخاری اور مسلم وغیرہ نے اپنے مجموعے ترتیب دیے۔

صاحب اصح السیر نے ابن قیم صاحب زاد المعاد اور زرقانی محشی للمواہب اللدنیہ للقسطلانی کے حوالے سے کچھ ایسے صحابہؓ کے نام لکھے ہیں جنہوں نے دورِ نبویؐ میں تحریری خدمات انجام دیں۔ حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، فہیرہؓ، عمرو بن العاصؓ ابی بن کعبؓ، عبداللہ ابن ارقمؓ، ثابت بن قیسؓ، حنظلہ ابن الربیع الاسدیؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عبداللہ ابن رواحہؓ، خالد ابن ولیدؓ خالد ابن سعید ابن العاصؓ، معاویہ ابن ابی سفیانؓ، زید بن ثابتؓ، طلحہ ابن عبیداللہؓ، سعید ابن العاصؓ، خالدؓ، ابان ابن عثمانؓ، سعد ابن ابی وقاصؓ، شرحبیل ابن حسنہ العلاء الحضرمیؓ، دوسی، حذیفہؓ بن یمان، حویطب ابن عبدالعزی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین [۵۷] یہ فہرست ان لوگوں کے لیے قابلِ غور ہے جو یہ الزام لگاتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کاتب اور کتابت سے نفرت تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کاتبوں سے نفرت تھی تو ان صحابہ سے بھی رہی ہوگی جن کے اسماء ابھی درج کیے گئے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بہت سوں کے لیے کلماتِ خیر منقول ہیں۔ سیرت کے متعلق تحریری مواد بھی تھا جس کے مستند ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور زبانی سرمایہ بھی موجود تھا۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ سیرتِ نبویؐ کے سلسلے میں جن بزرگوں سے روایات نقل کی جاتی ہیں ان کی تعداد تیرہ [۱۳] ہزار ہے [۵۸]

---

[۴۶] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۲، [۴۷] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۴۸] ابو عمر یوسف بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) جامع بیان العلم وفضلہ ص ۷۷، واسد الغابۃ ص ۸، وابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۴۹] حافظ علی ابن عمر الدارقطنی (م ۳۸۵ھ) سنن دارقطنی ص ۲۰۴ و ۲۰۹ و ۲۸۵ وحافظ ابوالقاسم طبرانی (م ۳۶۰ھ) طبرانی ص ۲۱۷ وشیخ علاء الدین الہندی (م ۹۷۵ھ) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال ج ۳ ص ۱۸۲ و طبقات ابنِ سعد ج ۲ ص ۹ [۵۰] ابوداود السجستانی (م ۲۷۵ھ) سنن ابی داود باب زکوۃ السائمۃ ص ۲۲۳ [۵۱] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷۷، [۵۲] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۵۳] ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۳۱۲ [۵۴] ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ابن سورۃ الترمذی (م ۲۷۹ھ) جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۸ [۵۵] بخاری ج ۱ ص ۲۲ [۵۶] ابنِ سعد ج ۵ ص ۲۱۶ [۵۷] اصح السیر ج ۱ ص ۱۲ [۵۸] ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

سیرت نگاری کی ابتداء

ہم نے مستند کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ احکام اور سیرت نبوی سے متعلق تحریری سرمایہ موجود تھا۔ مگر تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے عرصہ دراز تک یہ سرمایہ تدوین و ترتیب سے محروم رہا۔ بعد میں امراء اور حکام کی توجہ سے اس کا ذوق پیدا ہوا اور اہلِ علم تصنیف و تالیف میں مصروف ہوئے۔ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے عبید ابن شریح کو یمن سے بلا کر قدماء کے حالات تحریر کرائے اور اس تحریری سرمایہ کا نام "اخبار الماضیین" رکھا [59] اس کے بعد عبدالملک ابن مروان نے حضرت سعید بن جبیر سے تفسیر قرآن پاک لکھوائی۔ ذہبی کی تحقیق کے مطابق یہ تفسیر عطاء ابن دینار کی طرف منسوب ہے [60] علماء کو اس زمانے میں تصنیف و تالیف کے لیے کتنا مجبور کیا گیا۔ اس کا اندازہ مشہور محدث ابنِ شہاب زہریؒ کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم علوم کی کتابت کو وہ خیال کرتے تھے لیکن اُمراء نے ہمیں لکھنے پر مجبور کیا [61]

امراء میں علوم اسلامیہ کی تدوین و ترتیب کا سہرا حضرت عمر ابن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) کے سر ہے۔ مشہور مورخ ابو النعیم نے اپنی تاریخ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے دور کے محدثین کو تدوینِ حدیث کا حکم دیا تھا [62] ابن سعد نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے آپ نے مدینے کے قاضی اور مشہور عالم ابنِ شہاب زہری کے استاد ابوبکر بن محمد ابن عمر ابن الانصاری کو طلب کیا اور انہیں حدیث کی جمع و ترتیب کی طرف متوجہ کیا [63] ابن سعد کی تائید امام بخاریؒ کی "باب کیف یقبض العلم" کے تحت ذکر کردہ سطور سے بھی ہوتی ہے۔

کتب عمر ابن عبد العزیز الی ابی بکر بن حزم انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ [64]	حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر ابن حزم کو لکھا کہ جہاں کہیں بھی آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث دیکھیں انہیں نوٹ کر لیں۔

ابنِ عبدالبر نے سعد ابن ابراہیم سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم حضورؐ کی سنن جمع کریں [65]

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد ابن عبدالعزیز میں احادیث کی تدوین ہوئی اور ابن حجر کی تصریح کے مطابق ابنِ شہاب زہری (م ۱۲۴ھ) پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں۔

اول من دون علم الحدیث بامر عمر بن عبد العزیز محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ شہاب الزہری۔	حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے علم حدیث کی تدوین ابن شہاب زہری نے کی۔

چند سطروں کے بعد علامہ عثمانی نے حافظ ابن حجر کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ابن شہاب زہری کی تدوین بحیثیت مجموعی تھی۔ فقہی ترتیب کے ساتھ حدیث کی تدوین میں شعبی فوقیت لے گئے [66] روایت کے جانچنے اور صحیح و غیر صحیح میں تمیز

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیباچہ۔ دورِ نبویؐ میں کتابت حدیث کے موضوع پر راقم السطور کا ایک طویل مقالہ "برہان" دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔

[59] ابن الندیم (م ۲۳۵ھ) الفہرست ص ۱۳۴ [60] حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۹۷ [61] جامع بیان العلم ص ۱۳۶ [62] ابو نعیم اصبہانی (م ۴۳۰ھ) تاریخ اصبہان بحوالہ اصح السیر ص ۷ [63] ابن سعد ج ۲ ص ۱۳۴ [64] بخاری شریف ۱۹ ص ۲۲ [65] جامع بیان العلم ص ۳۶ [66] فتح الملہم مقدمہ ج ۱ ص ۹۲

کرنے کے لیے جو فن وضع کیا گیا۔ اس کے بانی بھی ابنِ شہاب زہری ہیں اور اس کا حکم بھی حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے دیا تھا[٦٧]

عمر ابن عبدالعزیز رحؒ نے مغازی کی طرف بھی توجہ کی اور عاصم ابن عمر ابن قتادہ انصاری (م ١٢١ھ) کو حکم دیا کہ وہ حلقۂ درس قائم کریں اور مغازی (سیر) کے مضامین پڑھائیں[٦٨] یہ مخلصانہ کوششیں ٹھکانے لگیں اور علماؑ میں مغازی کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوا سلسلہ آگے بڑھا تو صاحب قلم محدثین نے اس فن میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ محققین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ مغازی یا سیر میں سب سے پہلی تصنیف کس شخص کی ہے؟ حاجی خلیفہ صاحب "کشف الظنون" کی رائے یہ ہے۔

اوّل من صنف فیہ الامام المعروف محمد بن اسحاق بن یسار رئیس اھل المغازی[٦٩]	مغازی میں سب سے پہلے امام محمد بن اسحاق ابن یسار رئیس اہل مغازی نے کتاب تصنیف فرمائی۔

عصرِ حاضر کے محقق ڈاکٹر مصطفےٰ صبری کی تحقیق یہ ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے ابان ابن عثمان رضؓ نے قلم اٹھایا، موصوف نے "موقف العقل والعلم" میں لکھا ہے "سیرت نگار بہت سے ہیں، ابنِ ہشام (م ٢١٨ھ) مقدم نہیں ہیں، سیرت نگاری کا آغاز حضرت ابان ابنِ عثمان رضؓ سے ہوا۔ پھر عروہ ابن الزبیر اور شرجیل ابنِ سعد نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ پھر زہری رضؓ نے زہری بخاری کے استاذ ہیں اور ان کا شمار بڑے ائمہ میں ہوتا ہے۔ ممکن ہے انھوں نے عمر ابن عبدالعزیز کے اشارے پر قلم اٹھایا ہو[٧٠]"

سہیلی رحؒ کی رائے یہ ہے کہ سیرت کے موضوع پر سب سے پہلے امام زہری رحؒ نے لکھا ہے، فرماتے ہیں۔

ھی اوّل سیرۃ الفت فی الاسلام[٧١]	یہ پہلی سیرت (کی کتاب) ہے جو اسلام میں تالیف کی گئی۔

ڈاکٹر صبری کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگوں نے سیرۃ ابن ہشام کو سیرت کی اوّلین کتاب قرار دیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے سہیلی کی رائے پر اعتماد کیا ہے اور ابنِ شہاب زہری کو سب سے پہلا سیرت نگار مانا ہے۔

ہم اپنی سہولت کے لیے تدوینِ حدیث کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس طرح شاید اس تضاد کا حل ہو سکے گا۔ تدوینِ حدیث کا پہلا دور وہ ہے جب اس کا آغاز ہوا اور لوگوں نے احادیث کے متعدد مجموعے ترتیب دیئے ان مجموعوں میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہ تھا۔ بلکہ صرف احادیث جمع کی جاتی تھیں۔ ان میں جہاں احکامات اور دوسرے موضوعات سے متعلق روایات جمع ہوئیں وہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے متعلق احادیث بھی آگئیں۔ اس دور میں عروہ ابن الزبیر رضؓ، ابن العوام، ابان بن عثمان رضؓ، شرجیل بن سعد اور وہب بن منبہ کا نام لیا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر صبری نے ابان ابنِ عثمان رضؓ کو سیرت نبوی کا پہلا قلم کار قرار دیا ہے لیکن اسے سیرت نگاری کا نام دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان حضرات نے کسی خاص موضوع کا التزام کیے بغیر روایات جمع کی ہیں۔ دوسرے دور میں محدثین نے مختلف موضوعات کی احادیث الگ الگ جمع کیں اور ان میں ترتیب کا خیال رکھا۔ اس دور میں

---

٦٧ شیخ ابراہیم بیجوری، المواہب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ للترمذی ص ٦ ٦٨ تہذیب التہذیب فی ترجمۃ عاصم بن قتادۃ الانصاری ٦٩ کشف الظنون ج ٢ ص ٣٩ ٧٠ ڈاکٹر مصطفےٰ صبری "موقف العلم والعقل والعالم من رب العالمین"، ج ١ ص ٤٧
٧١ ابوقاسم عبدالرحمٰن سہیلی (م ٥٨١ھ) الروض الانف ج ١ ص ١٢٢

مغازی اور سیر پر بھی توجہ کی گئی اور متعدد علماء نے تحریری کام کیا۔ ان علماء میں ابُوبکر بن حزم انصاری، عاصم ابنِ قتادہ انصاری اور ابنِ شہاب زہری کے نام سرفہرست ہیں۔ آخرالذکر کا نام اس لیے بھی اہم ہے کہ ان کی ذاتی جدوجہد سے اس فن کو ترقی ملی اور علماء میں اس کے مُطالعے کا ذوق پیدا ہُوا۔ آپ نے درسِ مغازی کے حلقے بھی قائم کئے۔ اس طرح باصلاحیت تلامذہ کی ایک بڑی جماعت تیار ہوئی۔ ان میں سے بیشتر کے ساتھ امتیازی لقب "المغازی" وابستہ ہے، موسیٰ ابن عقبہ (م ۱۴۱ھ) اور محمد ابن اسحاق ابن یسار (م ۱۵۱ھ) امام زہریؒ کے نامور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ تدوینِ سیرت کا تیسرا دور ان ہی دونوں بزرگوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان حضرات نے مغازی کے سلسلے میں کتابیں لکھیں اور اسے ایک مستقل فن کی حیثیت دی۔ موسیٰ ابن عقبہ کی "مغازی الرسول" اگرچہ زمانے کی دست بُرد سے محفوظ نہ رہ سکی، تاہم سیرت کی معتبر کتابوں میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ ابن اسحاق نے اس فن میں بے پناہ شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی کتاب المغازی کے اعتبار کے لیے یہ بات کافی ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب الغزوات ان ہی کی روایت سے شروع کی ہے[41] امام احمد ابن حنبلؒ ابن اسحاق کی ثقاہت کی نفی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن اسحاق یہود و نصاریٰ کی روایات قبول کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیتے[42] لیکن بخاری نے غزوات اور قرأت خلف الامام میں ان کی روایات لی ہیں اور اس طرح اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ باقی صحاح ستہ میں بھی اُن کی روایات قبول کی جاتی ہیں۔ یحییٰ ابن معین، شعبہ، علی، ابوزرعہ اور ابن مبارک جیسے ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام مالکؒ انتہائی خلاف ہیں۔ ایک جگہ دجال تک کہہ ڈالا ہے لیکن علی ابن مدینی نے امام مالک کی رائے پر سخت تنقید کی ہے اور ابنِ اسحاق کا وقار بحال رکھا ہے[43] حافظ ذہبی جیسے متشدد انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں[44]

ابن اسحاق کی مغازی الرسول بھی اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہ سکی۔ لیکن اس کی یادگار سیرت ابن ہشام ہے جسے ابن ہشام عبدالملک (م ۲۱۸ھ) نے ابن اسحاق کی مغازی الرّسول کی مدد سے لکھا ہے اور اس میں ابنِ اسحاق کی کتاب کے مشکل الفاظ اور اشعار کی تشریح بھی کی ہے۔

ابن اسحاق کے بعد سیرت نگاروں میں جس شخص کا نام اہم ہے وہ محمد بن عمر ابن واقد الواقدی (م ۲۰۷ھ) ہیں گو احکام و مسائل میں متروک الحدیث ہیں، لیکن سیرت میں ان کی روایات قبول کر لی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق ابن کثیر کی رائے یہ ہے:

"واقدی کے پاس عُمدہ تفصیلات، اور تحریر شدہ واقعات موجود تھے اور وہ اس فن کے بڑے ائمہ میں سے ہیں"[45]

مولانا شبلی واقدی سے ناراض ہیں اور انہیں چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ حیرت اس پر ہے کہ انہوں نے اپنی سیرت میں طبقات ابنِ سعد کی روایات نقل کی ہیں جس کا بڑا حصہ واقدی کی مغازی الرّسول سے ماخوذ ہے۔ اُردو میں واقدی کی مغازی الرّسول کا ترجمہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۵ء) میں جناب سید عنایت حسین سیدن پوری نے کیا تھا جسے نول کشور نے شائع کیا اس کے علاوہ بھی اردو

---

[41] بخاری کتاب الغزوات ج دوم [42] ملّا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) الموضوعات ص ۸۵ [43] مولانا احمد رضا صاحب بجنوری (بقید حیات) مقدمہ انوار الباری ج ۱ ص ۲۱۵ [44] تہذیب التہذیب فی ترجمۃ محمد بن اسحاق ابن یسار [45] حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) البدایہ والنہایۃ فی التاریخ ج ۴ ص ۲۳۴۔

میں مغازی الرسول کے کچھ تراجم ہیں۔

سیرت نگاری میں ابن اسحاق اور واقدی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے پہلے جن لوگوں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی آج ان کی تصانیف موجود نہیں ہیں۔ بعد کے آنے والے ان ہی دو بزرگوں کے خوشہ چیں ہیں جس طرح ابن اسحاق کو ابن ہشام نے زندۂ جاوید بنایا اور ان کی مغازی کو نئے اسلوب میں پیش کیا۔ حسن اتفاق سے ایسا ہی شخص واقدی کو بھی ملا۔

محمد ابن سعد، واقدی کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں۔ سنہ ۱۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد بصرے سے بغداد کا سفر کیا اور واقدی کی شاگردی اختیار کی۔ واقدی کے بارے میں علماء کے خیالات کا ذکر ہو چکا ہے۔ ابن سعد اپنے استاذ کی طرح بدنام نہیں ہیں، مؤرخ خطیب بغدادی نے انہیں اصحاب علم وفضل میں شمار کیا ہے[۱] ابن سعد نے "الطبقات الکبریٰ" تصنیف کی۔ اس کتاب کی دو جلدیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر مشتمل ہیں۔ بقیہ جلدوں میں صحابہ اور تابعین کے احوال درج ہیں۔ یہ کتاب جرمنی میں تھی شہنشاہ جرمن نے اس کی اشاعت کا ارادہ کیا، متعدد حضرات کی تصحیح و ترتیب کے بعد بارہ جلدوں میں ہالینڈ سے شائع ہوئی۔ کتاب میں بعض بے اصل چیزیں بھی موجود ہیں۔ خیال ہے کہ ان مواقع پر عیسائیوں نے اسلام کے خلاف اپنی پرانی عداوت کا اظہار کیا ہے۔

ان حضرات کے بعد عربوں میں سیرت نگاری کا عام ذوق پیدا ہوا۔ اور اس موضوع پر تالیفات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان میں بعض کتابیں انتہائی ضخیم ہیں۔ بیشتر کتابیں مشہور و متداول ہیں۔ ایسے حضرات کی ایک نامکمل فہرست مولانا شبلی نعمانی نے تیار کی ہے جنہوں نے اس فن میں کتابیں لکھیں یا ان کا اس سے تعلق رہا۔[۲]

ذیل میں چند کتابوں کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

'سیر النبی'، محب الدین احمد ابن عبداللہ الطبری (م ۶۹۴ھ) کی تالیف ہے۔ یہ حافظ حدیث، فقیہہ حرم اور محدث حجاز تھے۔ 'سیر النبی' میں تمام روایات سندوں کے ساتھ مذکور ہیں 'کشف الظنون' میں حاجی خلیفہ مرحوم نے اس کا ذکر اہمیت کے ساتھ کیا ہے[۳] اسی کے نام سے ایک دوسری کتاب بھی ہے جس کے مصنف ابو عمر و صالح ابن اسحاق الجرمی نحوی (م ۲۲۵ھ) ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں 'سیرت شامیہ' کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کا اصل نام "سبیل الھدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد" ہے۔ محمد ابن یوسف الدمشقی (م ۹۴۲ھ) اس کے مصنف ہیں۔ سیرت کے موضوع پر یہ سب سے زیادہ مبسوط کتاب ہے۔ تقریباً سات ضخیم جلدوں میں، اس کی تالیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تعداد تین سو ہے[۴] اس کے بعد شہرت میں سیرت حلبیہ کا نام ہے علی ابن برہان الدین حلبی اس کے مؤلف ہیں "انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون" کتاب کا اصل نام ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ دیوبند سے شائع ہو رہا ہے۔ مشہور محدث شیخ شہاب الدین احمد ابن محمد القسطلانی (م ۹۲۳ھ) نے اس موضوع پر "المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ" کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی۔ ایک مورخ کی رائے میں یہ کتاب "جلیل القدر، عظیم المرتبت

---

[۱] تہذیب التہذیب' ترجمہ محمد ابن سعد [۲] سیرۃ النبی، مولانا شبلی ج ۱ ص ۸ تا ۴۸ [۳] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹ [۴] حافظ سید عبدالحی الکتانی "فہرس الفہارس" ج ۲ ص ۳۹۲۔

اور کثیر النفع ہے، سیرت کے باب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی" [۵۹] المواہب پر علامہ محمد ابن عبدالباقی زرقانی (م ۱۱۲۲ھ) نے حواشی تحریر فرمائے جس سے کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے تلمیذ رشید حافظ شمس الدین ابن القیم الجوزی (م ۷۵۱ھ) کی کتاب "زاد المعاد فی ہدی خیر العباد" انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ کتاب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ پاکستان میں چھپ چکا ہے۔

دورِ حاضر کے ممتاز عربی مصنفین اور اہلِ قلم نے بھی سیرت پر طبع آزمائی کی ہے اور گرانقدر کتابیں لکھی ہیں، یہاں ہم صرف تین کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اپنی ادبی چاشنی کے لیے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی "علی ہامش السیرۃ"، "محمود عقاد کی "عبقریۃ محمد" اور سید حسنین ہیکل کی "سیرۃ محمدؐ" اہم کتابیں ہیں۔

گذشتہ سطور میں عام وقائع سیرت پر لکھی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعض حضرات نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مخصوص پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ یہ موضوع اس قدر وسیع ہے کہ محض کتابوں کے اعداد و شمار ہی سے ایک مبسوط مقالہ ترتیب پا سکتا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر ہم اتنا عرض کرتے ہیں کہ بعض اکابرِ علم نے غزوات اور سرایا کو بحث و تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس فن کی اہم کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ متعدد نامور علماء نے معجزات اور روحانی واقعات پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اس فن میں جن لوگوں نے دادِ تحقیق دی ہے۔ ان میں ابو اسحاق عربی (م ۳۴۲ھ) امام بیہقی (م ۴۳۰ھ) ابو نعیم اصفہانی (م ۴۳۰ھ) مستغفری (م ۴۳۳ھ) ابو القاسم اسماعیل اصفہانی (م ۵۲۵ھ) اور علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے زبردست شہرت حاصل کی ہے۔ شمائل، اخلاق و عادات اور حلیہ کے موضوع پر اہم کتاب امام ترمذی (م ۲۷۹ھ) کی "کتاب الشمائل" ہے جو ہندوستان کے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ سیرت نبوی سے متعلق یہ حصہ ادبِ عربی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی اردو میں کتاب الشمائل کی متعدد شروح لکھی گئی ہیں۔ ان میں شیخ ابراہیم بیجوری کی "المواہب اللدنیہ علی الشمائل المحمدیہ" بہت مقبول ہے۔ شمائل میں کچھ اور کتابیں بھی ہیں جن میں قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ) کی "کتاب الشفا فی حقوق المصطفٰے" ابو العباس مستغفری (م ۴۳۳ھ) کی "شمائل النبیؐ" ابن المقدمی غرناطی (م ۵۵۲ھ) کی "شمائل النور الساطع" اور مجد الدین فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ) کی "سفر السعادۃ" قابلِ ذکر ہیں۔ "کتاب الشفا" زیادہ ضخیم ہے شہاب خفاجی (م ــــھ) نے اس کی شرح "نسیم الریاض" کے نام سے کی ہے۔

اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ اس موضوع پر سب سے پہلے جو اہم اور مبسوط کتاب فارسی سے اردو میں منتقل ہوئی۔ وہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کی "مدارج النبوۃ" ہے۔ خواجہ عبدالحمید نے اس کا ترجمہ کیا۔ نول کشور پریس کانپور نے یہ ترجمہ ایک ہزار آٹھ سو بتیس (۱۸۳۲) صفحات پر شائع کیا۔ "سرور المحزون" کے نام سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے فارسی میں ایک مختصر رسالہ سیرت پر لکھا تھا۔ اس کے متعدد ترجمے اور شروح موجود ہیں۔ شوکت علی شاہ جہاں پوری نے "درِ مکنون" کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ قیمتی حواشی سے مزین ہے۔ ۱۲۵۵ھ میں اسے مطبع رونق ہند کانپور نے شائع کیا۔ اسی نام سے ایک ترجمہ مولانا سراج الیقین کرسوی کا ہے جو ۱۳۳۲ھ میں مجتبائی لکھنؤ سے چھپا تھا۔ "ظہور المحزون" کے نام سے اس کا ترجمہ شعبۂ فارسی دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر خلیفہ محمد عاقل مرحوم نے کیا اور دیوبند ہی سے کتبخانہ عثمانیہ نے

---

[۵۹] عبدالقادر ردسی (م ۱۰۳۸ھ) النور السافر ص ۱۱۴

چھاپا۔ سرور المحزون کی اردو شرح "قرۃ العیون" پھ جلدوں میں سابق والیٔ ٹونک کے مصارف پر ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی تھی۔

ترمذی کی کتاب الشمائل کو اردو میں سب سے پہلے مولانا کرامت علی جونپوری نے منتقل کیا اور "انوارِ محمدی" نام رکھا۔ یہ صرف ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ شمائل کی ایک عمدہ شرح بھی ہے۔ "خصائل نبوی" کے نام سے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری نے اس کا ترجمہ کیا۔ مولانا عبدالشکور لکھنوی کا ترجمہ بھی مقبول ہے۔ ۱۳۴۷ھ میں دفتر "النجم" نے اسے شائع کیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اسے بچوں کی زبان میں منتقل فرمایا۔ تراجم کے علاوہ اردو میں مستقل تصانیف کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ کچھ اہم کتابوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ۱۲۷۵ھ میں حضرت مفتی عنایت احمد نے تاریخ حبیب اللہ" تصنیف فرمائی۔ کتاب کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ مصنف نے دورانِ تالیف صرف یادداشتوں کو ماخذ قرار دیا، لیکن اس کے باوجود تمام صحیح روایات اس میں سماگئی ہیں۔ اردو میں سیرت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں ضخامت اور حسنِ بیان کے لحاظ سے مولانا شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی مشترکہ تالیف سیرت النبی سب پر فوقیت لے گئی ہے ۹۲

سیرت کے ماخذ

سیرت نبویؐ کے دو اہم ماخذ ہیں۔ پہلا ماخذ قرآن کریم ہے جس کی صحت اور جس کا درجۂ استناد شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ آپؐ کی زندگی کے اہم پہلوؤں کے لیے صحیح معلومات قرآن کریم سے حاصل ہوتی ہیں۔ آپ کی یتیمی کا دور، قبل نبوت کی زندگی، معراج کا واقعہ، ہجرت کے وقائع، فتح مکہ کا ذکر، غزوات۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ سے عرض کیا گیا کہ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر روشنی ڈالیں۔ آپؓ نے جواب دیا قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔ قرآن آپؐ کے اخلاق کی صحیح تفسیر ہے۔ بہت سے علماء نے صرف قرآن پاک سامنے رکھ کر حیات رسولؐ مرتب کر دی ہے۔ اُردو میں اس سلسلے کی اہم کتاب مولانا محمد میاں دیوبندی مرحوم کی ہے جس کی ایک جلد الجمعیۃ پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ سیرت کا دوسرا ماخذ حدیث نبوی ہے۔ صحابۂ کرام رضؓ کو آپؐ کی ذاتِ پاک سے عشق تھا۔ آپؐ کی ہر ادا، آپؐ کی ہر بات اور آپؐ کی ہر کیفیت اُن کے دلوں پر نقش ہو جاتی تھی۔ دلوں سے نکل کر زبان پر آتی اور زبان یہ امانت کتابوں کے سپرد کر دیتی — سیرتِ نبوی پر یہ الزام کہ اس کا مدار زبانی روایات پر ہے غلط ثابت ہو چکا ہے۔ ہمیں زبانی روایات کے وجود سے انکار ممکن نہیں اور کتابوں کی تدوین میں ان سے استفادہ بھی کیا گیا ہے لیکن اگر روایات کے ردّ و قبول کے اصول ملحوظ رہیں تو ماخذ کی صحت میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

سب سے پہلے ہم شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) کا ایک گرانقدر اقتباس پیش کریں گے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے حدیث کی حفاظت کے لیے شروع ہی سے بڑی جدوجہد کی ہے۔

صدرِ اوّل یعنی از زمانۂ تابعین و تبع تابعین تا زمانِ	صدرِ اول یعنی تابعین و تبع تابعین کے دور سے
بخاری و مسلم رنگے دیگر داشت کہ از حال رجال	امام بخاری و امام مسلم کے دور تک راویوں کے حالات

۹۲ اردو میں اس موضوع پر ایک جامع مقالہ ماہنامہ دارالعلوم" دیوبند (جنوری ۲ ء تا نومبر ۱۹۷۲ء) میں شائع ہوا۔ مقالہ نگار الحاج سید محبوب رضوی مصنف "تاریخ دیوبند" ہیں۔ اس سلسلے میں قاموس الکتب ج اوّل شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہر شہر و ہر زمانہ بحث و تفتیش می کردند، و درہر کہ بوئے از بے دیانتی و کذب و سوءِ حفظ می شمیدند حدیث او را قبول نمی کردند، لہٰذا در احوال رجال مبسوط کتب مضبوط نوشتہ اند ۵۳

کی تحقیق کا رنگ کچھ اور رہا کہ وہ لوگ ہر زمانے اور ہر شہر کے راویوں کے حالات کی جستجو کرتے اور جس شخص میں شمہ برابر بھی بد دیانتی، کذب یا سوءِ حفظ کی شکایت پاتے اس کی حدیث قبول نہ کرتے۔ راویوں کے حالات میں ضخیم ضخیم کتابیں انھوں نے لکھی ہیں۔

اہل اسلام کو اس پر جس قدر بھی فخر ہو کم ہے کہ فن حدیث کے لیے علماء نے بے مثال جدوجہد کی ہے۔ جن رواۃ کے حالات کی مکمل تحقیق کا کام انجام دیا ہے۔ ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے اور حالات بھی صرف اتنے نہیں کہ وہ کون تھا؟ کب پیدا ہوا؟ کہاں تھا؟ اور کب وفات ہوئی؟ بلکہ یہ بھی کہ اس کے اساتذہ و تلامذہ کون ہیں؟ حافظہ کیسا تھا؟ دیانت اور علم میں اس کا مقام کیا تھا؟ محدثین اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آج کے اسٹیم دور میں سینکڑوں وسائل اور ذرائع تحقیق کے باوجود کسی ایک شخص کے بارے میں صحیح معلومات کا حصول مشکل ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں نے حدیث کی حفاظت کے لیے لاکھوں افراد کے حالات جمع کیے ہیں ان کی دشواریوں کا اندازہ لگائیے۔

راوی کے حالات کی چھان بین کے فن کو اسی لیے فنِ رجال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب مشہور محدث یحییٰ ابن سعید القطان (م ۱۹۸ھ) نے لکھی تھی، پھر اُن کے تلامذہ یحییٰ ابن معین (م ۲۳۳ھ) امام احمد (م ۲۴۱ھ) ابوخیثمہ (م ۲۳۴ھ) اور عمرو ابن علی الفلاس (م ۲۴۹ھ) وغیرہ نے اس فن میں دادِ تحقیق لی۔ پھر ان لوگوں کے تلامذہ امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ نے ادھر توجہ کی ۵۴

لیکن یحییٰ ابن سعید القطان اور ان کے تلامذہ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ باقی نہ رہ سکا۔ جو کتابیں موجود ہیں، وہ یا تو مخطوطوں کی شکل میں لائبریریوں کی زینت ہیں یا اس فن پر حاوی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی "التاریخ الکبیر" جو اگرچہ آٹھ اجزا میں ہے مگر اپنے فن کو محیط نہیں ہے۔ یہ کتاب حیدرآباد (دکن) سے چھپی ہے۔ اس فن کی اولین تفصیلی کتاب علامہ یوسف ابن الزکی مزنی (م ۷۴۲ھ) کی "تہذیب الکمال" ہے۔ پوری کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے "الاکمال فی بیان احوال الرجال" کے نام سے اس پر اضافے کیے ہیں۔ حافظ شمس الدین ذہبی نے مزنی کی "تہذیب الکمال" کی تلخیص کر کے "تہذیب التہذیب" اور "الکاشف فی اسماء الرجال" ترتیب دی ہیں۔ "میزان الاعتدال فی اسماء الرجال" اور "تذکرۃ الحفاظ" بھی ذہبی کی کتابیں ہیں۔ پہلی کتاب تین جلدوں میں ہے اور دوسری چار ضخیم جلدوں میں۔ "سیر اعلام النبلاء" بھی ذہبی کی محققانہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد کی تصحیح و ترتیب کے بعد یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے۔

مشہور ماہر رجال حافظ ابن حجر نے ذہبی کی "میزان الاعتدال" پر اضافے بھی کیے۔ اس کا نام انھوں نے "لسان المیزان"

---

۵۳ عجالۂ نافعہ ص ۲ ۵۴ میزان الاعتدال (مقدمہ)

رکھا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر ابن حجرؒ کی مستقل تصانیف بھی ہیں جن میں "تہذیب التہذیب" نہائت ضخیم ہے اور بارہ جلدوں میں حیدر آباد سے چھپی ہے "تقریب التہذیب" اور "طبقات الحفاظ" بھی اہم کتابیں ہیں۔ اس مختصر سی گفتگو سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محدثین نے ان لوگوں کے سلسلے میں کس قدر احتیاط سے کام لیا ہے جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کوئی حدیث روایت کی ہے۔

روایات میں بھی محدثین نے درجات قائم کر دیئے ہیں۔ احادیث مرفوع بھی ہیں، منقطع و موقوف بھی۔ شاذ بھی ہیں، مرسل بھی، غریب بھی منکر بھی، حسن یا صحیح بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کا الگ حکم۔ پھر یہ کہ راوی نے "عن فلان" کہہ کر روایت بیان کی ہے۔ یا "اخبرنا" کے ساتھ یا دوسرے لفظوں میں۔ ان سب صورتوں کے احکام علیٰحدہ ہیں بعض صورتیں اہم ہیں اور بعض اس سے کم درجے کی۔ اس پوری کد و کاوش سے جو فن سامنے آیا اسے علم درایت کہتے ہیں۔[۵۳]

اس موضوع پر بھی ان گنت کتابیں لکھی گئیں۔ حافظ ابن حجر کی "نخبۃ الفکر" اور اس کی شرح اصول حدیث کی مشہور کتابیں ہیں اور دینی مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ کتاب کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ متعدد علماء نے اس کی شرح لکھیں مثلاً ملا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) نے "شرح شرح النخبۃ" مولانا عبدالحی خطیب جامع، رنگون نے "المسلعۃ العربی فی توضیح شرح النخبۃ" اور مولانا اکرم ابن عبدالرحمٰن سندھی نے "امعان النظر" لکھی۔ اس فن پر کچھ اہم کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ابو محمد عبدالرحمٰن رازی (م ۳۲۷ھ) "علل الحدیث" تقی الدین ابن صلاح (م ۶۴۳ھ) مقدمۂ ابن صلاح، امام نووی (م ۶۷۶ھ) "تدریب الراوی" طاہر صالح الجزائری "توجیہ النظر"، حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) "الھدی الساری فی مقدمۃ شرح البخاری" شمس الدین السخاوی (م ۹۰۲ھ) "شرح الفیہ" وغیرہ۔

ہندوستان کے علماء نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان میں مولانا عبدالحی لکھنوی (م ۱۳۰۴ھ) کی "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" اور "ظفر فی مختصر الجرجانی" بہت مشہور ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) کی کتاب "مختصر" کی شرح ہے۔ شیخ نظام الدین حلوی کاکوروی نے "المنہج" سید مرتضیٰ ابن محمد حسین بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ) نے "بلغۃ الغریب فی مصطلح آثار الحبیب" شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے "العجالۃ النافعہ"، نواب صدیق حسن بھوپالیؒ (م ۱۳۰۷ھ) نے "حدیث منہج الاصول الیٰ اصطلاح احادیث الرسول" لکھیں۔ اصول حدیث میں ایک عربی رسالہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کا بھی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی (م ۱۳۶۹ھ) کا ذکر نہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ یہ مقدمہ بڑے سائز کے ۱۰۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا شریف حسنؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اصول حدیث میں اس سے بہتر کتاب نہیں ہے۔ ادارہ شرکت علمیہ دیوبند نے فتح الملہم کی پہلی جلد شائع کی ہے۔ اس میں یہ مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔

روایت کے رد و قبول کے سلسلے میں کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ آیئے صرف کذب راوی کے مسئلے پر مختصر سی گفتگو

---

۵۳ فتح الملہم مقدمہ ج ۱ ص ۲

کریں۔ اس سے بھی سیرت نبویؐ کے مآخذ کی صحت پر روشنی پڑے گی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "عجالۂ نافعہ" میں روایت میں کذب کی حسب ذیل علامات بیان کی ہیں۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ ہم یہاں ان علامات کا واضح اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

حسب ذیل اصول میں سے کوئی اصل اگر کسی روایت میں پایا جائے گا تو اُسے رد کر دیا جائے گا (۱) مشہور و معروف تاریخ کے خلاف روایت ہو مثلاً کسی کا یہ کہنا کہ جنگ صفین میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایسا فرمایا۔ حالانکہ ابن مسعودؓ جنگ صفین سے قبل خلافتِ عثمانؓ میں انتقال فرما چکے تھے (۲) راوی رافضی ہو اور صحابہ پر طعن کے متعلق احادیث بیان کرے یا ناصبی ہو اور اہل بیت پر طعن کے سلسلے میں حدیث بیان کرے (۳) راوی ایسی بات بیان کرے جس کا جاننا اور عمل کرنا ہر مکلف پر فرض ہو اور وہ روایت میں تنہا ہو تو یہ حدیث جعلی قرار دی جائے گی (۴) وقت یا حالت ہی راوی کے جھوٹا ہونے کا قرینہ ہو جیسے غیاث بن میمون کا واقعہ کہ وہ مہدی خلیفہ عباسی کی مجلس میں حاضر ہوا۔ خلیفہ اس وقت کبوتر بازی میں مصروف تھا۔ غیاث نے یہ منظر دیکھ کر کہا:

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر — بازی جائز نہیں مگر اونٹ، تیتر گھوڑے اور پرندے میں

او جناح

اس میں جناح کا لفظ غیاث نے مہدی کو خوش کرنے کے لیے بڑھایا تھا (۵) روایت عقل و شرح کے مقتضیٰ کے خلاف ہو اور شرعی اصول سے اس کی تکذیب ہو جائے۔ مثلاً یہ روایت: لا تاکلوا البطیخ حتی تذبحوھا (خربوزے کو ذبح کر کے کھاؤ) (۶) ایسا کوئی واقعہ بیان کیا جائے جو اگر واقع ہوتا تو ہزاروں لوگ اس کو نقل کرتے۔ مثلاً کوئی یہ روایت کرے کہ آج بروز جمعہ خطیب کو برسرِ منبر قتل کر دیا گیا (۷) حدیث کے الفاظ رکیک ہوں اور عبارت کی ساخت عربی قواعد کے خلاف ہو۔ اس طرح کی روایات وقار نبوت کے منافی ہیں (۸) صغیرہ گناہ سے ڈرانے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہو یا تھوڑے سے عمل پر حج و عمرے کے ثواب کی اُمید دلائی گئی ہو (۹) خیر کے کام کرنے والوں کو یہ اُمید دلانا کہ انہیں انبیاءؑ کے ثواب کے بقدر ثواب ملے گا یا ستر نبیوں کا ثواب حاصل ہوگا (۱۰) راوی حدیث وضع کرنے کے بعد خود اپنے جرم کا اعتراف کرے[1]

ملا علی قاری نے بھی کچھ علامات بیان کی ہیں۔ (۱) وہ حدیث جو صریح احادیث کے خلاف ہو (۲) وہ احادیث جن میں آئندہ واقعات کی بتقیید تاریخ پیشین گوئی کی گئی ہو (۳) وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً یہ کہ عوج ابن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا (۴) وہ حدیث جو قرآن کی صراحتوں کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے[2]

سیرت کی ضرورت کیا ہے؟

اس عنوان کے تحت ہمیں اب سیرت کی ضرورت پر گفتگو کرنی ہے۔ ایک ایسا شخص جس پر چودہ سو برس کا طویل زمانہ گزر گیا۔ نئے دور کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؟ اور ہمیں اس کی پاک زندگی کے مطالعہ سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔

---

[1] العجالۃ النافعۃ ص ۵۸-۶۰ [2] الموضوعات ص ۹۲

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اس حیثیت سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس شخص کے حالاتِ زندگی جاننے کی کوشش کریں جس نے خدا کی طرف سے ہمیں حق کا، ہدایت کا پیغام دیا اور کفر کی تاریکیوں میں اسلام کی روشنی عطا کی۔ جو شخص ہمارا محسنِ اعظم ہے جس کی آواز پر ہم نے لبیک کہا ہے۔ وہ کون ہے؟ کب پیدا ہوا؟ کہاں پیدا ہوا؟ اس کا کیا پیغام ہے؟ اس نے اپنے مشن کی تکمیل میں کتنے مصائب برداشت کیے؟ کس قدر تکلیفیں برداشت کیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات ہمیں سیرت کے مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن پاک کا ہر حکم واجب العمل ہے۔ اس مقدس کتاب کا حکم ہے "مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" اس لیے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اور اس لیے بھی "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" اسی لیے قرآن پاک نے یہ اعلان فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم سیرت کے مطالعے کے پابند ہیں۔

سیرت کی ضرورت انسانی حیثیت سے بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" قرآن پاک نے جو دعویٰ کیا ایک انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیاتِ پاک میں اس دعویٰ کی صداقت تلاش کرے۔

دنیا میں ہمیشہ بڑی شخصیتوں نے جنم لیا ہے۔ لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اکثر نگاہوں سے اوجھل ہیں جو لوگ تاریخ کی روشنی میں آگئے۔ ان کے حالات اتنے مختصر ہیں کہ زیر بحث شخصیت کے خدوخال اچھی طرح واضح نہیں ہو پاتے۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے متبعین تسلسل کے ساتھ موجود رہے ہیں مگر ان کے حالات پر بھی تخیلات کا گہرا پرتو ہے۔ بدھ مت، ویدک دھرم، آرین دھرم اور زرتشت کے پیشواؤں کے حالات بھی تاریخی صداقتوں سے محروم ہیں، اور ان پر گمنامی کا دبیز کہر چھایا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس بیان میں کتنی صداقت ہے کہ "آج مذاہب کی تاریخ میں کتنے لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہمارے اوتار، ہمارے پیغمبر، ہمارے بھگوان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کریں گے بھی تو اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔ کتابیں بتاتی ہیں کہ بعض مذاہب والے تو اپنی کتابیں بھی محفوظ نہ رکھ سکے لیکن ہمیں فخر ہے کہ ہم نے اپنا سرمایہ مذہب محفوظ رکھا فللّٰہ الحمد علیٰ ذالک[۵۸]

علم کلام کے نقطۂ نظر سے بھی سیرت ہمارے لیے اہم اور اس کا مطالعہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسلام میں خدا کی معبودیت اور وحدانیت کے اعتراف کے بعد سب سے اہم مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا ہے جو ذات ہمارے لیے اتنی اہم ہو اور جس کا نام لیے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہ ہوتا ہو اس کے حالات سے لاعلمی بدترین جرم ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر سیرتِ نبوی انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ اسی لیے ابن تیمیہؒ نے اس شخص کو جو مدعیانِ علم و مملکت کے ہاتھوں یقین و ایمان کی دولت ضائع کر چکا تھا۔ یہ وصیت کی تھی کہ سب کچھ چھوڑ کر حیاتِ طیبہ کے مطالعے میں لگ جاؤ اور بقول مولانا آزاد (م ۱۹۵۸ء) "انھوں نے اس طرح یہ بتلا دیا کہ علم و بصیرت کا اصل سرچشمہ صرف حیاتِ نبوت اور منہاجِ مقامِ رسالت ہے جس کو قرآن نے الحکمۃ سے تعبیر فرمایا ہے"[۵۹]

---

۵۸ مناظر احسن گیلانی۔ النبی الخاتم ص ۷ ۵۹ مولانا ابوالکلام آزاد ''تذکرہ'' ص ۱۶۰

سیرت نگاری کے چند پہلو

ڈاکٹر سید معین الحق

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو یقیناً دوسرے انبیاءؑ و بانیان مذاہب کے مقابلہ میں وہ کہیں زیادہ ممتاز اور نمایاں نظر آئے گی، اس گہری عقیدت کے علاوہ، جو راسخ العقیدہ مسلمانوں کو آپؐ کی ذاتِ گرامی سے رہی ہے اور رہے گی۔ بعض غیر مسلم مورخین نے بھی جہاں تک ان کے تعصبات و مخصوص مزاجی کیفیت اور اسالیب بیان و طرزِ استدلال نے اجازت دی ہے آنحضرتؐ کی عظمت اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ تہذیب و تمدن کے مختلف ابواب اور خاص طور پر ان انقلابات کا بغور مطالعہ کریں جن کی بدولت حیات کی بنیادی اقدار بلند سے بلند تر ہوتی رہی ہیں، اور جن کے ذریعہ مادی ترقی کے علاوہ زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں نے جلا حاصل کی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے، کہ کوئی انقلابی تحریک اسلام سے زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی، اور اس میں قطعی شک کی گنجائش نہیں کہ اسلام کی صحیح اور مکمل تصویر، رسول اللہﷺ کی حیاتِ طیبہ ہے، آپؐ ہی کی زبان مبارک کے ذریعہ قرآنی آیات انسان تک پہونچیں اور آپ ہی کے اقوال و افعال نے اس انقلاب کو عملی جامہ پہنایا، جو نزولِ قرآن کا مقصد تھا۔ اسی خصوصیت اور امتیاز نے آپؐ کی زندگی کو تاریخ کا اہم ترین باب بنا دیا ہے، جس کے ہر گوشہ کا مطالعہ ضروری ہے، صرف ان ہی لوگوں کے لیے نہیں جو آپؐ کی اتباع کو اپنے لئے ذریعۂ نجات اور باعث صد افتخار سمجھتے ہیں، بلکہ تاریخ تہذیب کے ہر اس طالب علم کے لئے جو ترقی کی ارتقائی منازل کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ رسول اللہ کی سوانح حیات کی صحیح اور مکمل تصویر تیار کرنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آپؐ کی ذات جس کاملیت اور جامعیت کی حامل ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کام سہل نہیں۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے وہ بنیادی اصول جن کی تعلیم آپؐ نے دی ہے، دوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں معلومات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ان اصولوں کا نئے انداز سے مطالعہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپؐ کی زندگی کے واقعات اور ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا پہلا قدم ہے۔ اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تاریخ اسلام اور متعلقہ علوم کے علاوہ، انسانی تہذیب اور اس کے ارتقائی مدارج کا تجزیہ بھی لازمی ہے، اس وسیع اور مسلسل مرقع میں اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ کی بلند مقامی کا اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جبکہ تصویر کے ہر پہلو کا غور سے جائزہ لیا جائے۔

اس نظریہ سے اب اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ کسی تاریخی شخصیت کے حالات اور اقوال اس اہتمام اور تفصیل کے ساتھ محفوظ نہیں کئے گئے، جیسے آنحضرتؐ کے کئے گئے ہیں۔ محدثین و مورخینِ اسلام کی اس کوشش کا ذکر کرتے ہوئے اسپرنگر نے جو مغربی مستشرقین میں سیرت پر اپنی تصنیف کی وجہ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ "کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری، نہ آج

موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے؎ ان تفصیلات کے محفوظ کئے جانے کے سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر اہم ہے کہ رسول اللہ کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق نجی زندگی سے ہی کیوں نہ ہو، اسی قدر ظاہر اور عیاں تھا، جیسے وہ اقدامات جو اعلیٰ مسائل حل کرنے یا ان سے متعلق اعلانات و ہدایات جاری کرنے کی غرض سے کئے جاتے تھے، عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہر شخص چاہے اس کی شخصیت کسی قدر بلند کیوں نہ ہو، اپنے گھر میں یعنی اپنی بیوی بچوں اور نجی ملازموں کے سامنے معمولی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ان کو اس کی کمزوریوں سے اتنی ہی واقفیت ہوتی ہے جتنی اس کے کمالات سے والٹیر (VOLTAIRE) نے صحیح کہا ہے کہ کوئی شخص اپنے نجی خدمت گار کی نظر میں ہیرو نہیں ہو سکتا، (NO MAN IS A HORO TO HIEVOLET) لیکن رسول اللہؐ کی زندگی اس اصول سے مستثنیٰ اور بالاتر ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ آپؐ کی شریک حیات، آپؐ کا غلام، آپؐ کا چچازاد بھائی جو آپؐ کے ساتھ رہتا تھا اور آپؐ کا عزیز ترین دوست ہی سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ نبوت سے قبل آپؐ کی چالیس سالہ زندگی، ایک کھلی ہوئی کتاب کے اوراق کی طرح، روشن اور آئینہ کی طرح صاف اور پاک تھی؟ عمر کے آخری دور میں آپؐ کے متعدد شادیاں کرنے پر، مخالفین اسلام نے کس کس انداز سے اعتراضات کئے ہیں لیکن کیا کبھی اس پہلو پر بھی غور کیا گیا ہے کہ بڑے سے بڑا انسان بھی اپنی رفیقۂ حیات کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ خلوت و جلوت کی ہر بات برملا کہہ دے، لیکن آنحضرتؐ کی ایک وقت میں نو بیویاں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کو "اذنِ عام تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں برملا سب سے بیان کر دو، جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کر دو، جو بند کوٹھڑیوں میں دیکھو اس کو کھلی ہوئی چھتوں پر پکار کر کہہ دو، اس اخلاقی وثوق و اعتماد کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟" اس سوال کا جواب "تاریخ" صرف نفی میں دے سکتی ہے شمائل کی کتابیں، آپؐ کے اخلاق و عادات اور اعمال و افعال کی جزئیات سے پُر ہیں، یہاں مختصراً بھی ان ابواب کا ذکر ناممکن نہیں جو ان کتابوں میں قائم کئے گئے ہیں، لیکن بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی اخلاق و اوصاف کی پاکیزگی کا یہ حیرت انگیز مجموعہ کسی دوسری ایسی شخصیت میں نظر نہیں آئے گا، جس نے نسلِ انسانی کی روحانی قیادت کے ساتھ ساتھ معاشرتی مساوات اور مادی ترقی و خوشحالی کے لیے موثر اور انقلابی اقدامات کئے ہوں، جس نے راتیں جاگ جاگ کر ذکر و عبادت میں گذاری ہوں اور دن کے وقت میدانِ جنگ میں معمولی سپاہی کی طرح جہاد میں جان کی بازی لگائی ہو اور آخر میں وسیع پیمانہ پر کامیابیاں حاصل کر کے ایک بڑے ملک میں نظامِ حکومت قائم کیا اور چلایا ہو، اور جس نے حکمرانی کی ذمہ داری اور اقتدار کے باوجود تخت و تاج نہیں بلکہ فقر و غنا پر فخر کیا ہو۔

سیرت سے متعلق ہم عصر و نیم ہم عصر ماخذ اور مواد کی کثرت، مورخ کے لیے سہولتیں بھی بہم پہونچاتی ہے اور اس کے راستہ میں دشواریاں بھی پیدا کرتی ہے۔ کلام اللہ کے بعد سب سے اہم اور مستند معلومات وہ ہیں جو حدیث اور سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں، لیکن یہ امر افسوسناک ہے کہ ان ہی کے غیر محققانہ مطالعہ کی بنیاد پر یا نسلی و مذہبی تعصب کی وجہ سے بعض مستشرقین نے ایسے غلط اور گمراہ کن نتائج اخذ کئے ہیں جن کو دیکھ کر خود فنِ تاریخ نویسی کو شرم آنے لگتی ہے، اس سلسلہ میں یہ ذکر ضروری ہے کہ خود ہمارے مصنفوں نے بھی سیرت اور مغازی

؎ سید سلیمان ندوی، خطبات مدراس۔

پرالیسی روایتیں جمع کردی ہیں جو کسی صورت سے بھی تاریخی شہادت کے جدید معیار پر پوری نہیں اتر سکتیں اس کے علاوہ موضوع اور ضعیف حدیثوں
کی موجودگی نے مزید مشکلات پیدا کردی ہیں، اس سے خوف کھا کر بعض لوگ کلیتہً حدیث کی افادیت اور استناد سے منکر ہو گئے ہیں، یہاں اس
مسئلہ پر تفصیلی بحث ممکن نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ دورِ جدید کی تحقیقی موشگافیوں اور کوششوں کے پیشِ نظر اس منفی نظریہ کو تسلیم نہیں
کیا جاسکتا، وضع حدیث کا مسئلہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں موضوعِ بحث رہا ہے، اور اس پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، یہ بھی
صحیح ہے کہ اس پر مزید تحقیق۔ تنقید کی اب بھی کافی گنجائش ہے اور تاریخ نویسی کے نظریات میں تبدیلیوں کے ساتھ یہ گنجائش بڑھتی ہی رہے گی
اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کام سخت محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم فرار ذہنیت کا مظاہرہ
کریں اور حدیث سے منکر ہو جائیں، اس بزدلی اور احساس کمتری کو کسی طرح قابلِ تحسین نہیں کہا جا سکتا۔

دورِ جدید کے مورخین نے تاریخی شواہد و اسناد کو تسلیم کرنے کے سلسلہ میں جو اصول قائم کئے ہیں ان کا معیار بہت
بلند سمجھا جاتا ہے، لیکن جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ مستند روایتوں کو ہم عصر اور قابلِ استناد شہادت ماننے پر مجبور رہیں، انیسویں
صدی کے مشہور ترین مستشرقین میں اسپرنگر اور گولڈ زیہر کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ بھی حدیث کی سند سے کلیتہً انکار نہیں کرتے، انہوں
نے اور بعض دوسرے فضلائے نے تحفظ و تدوینِ حدیث کی ابتدائی تاریخ پر تفصیلی بحثیں کی ہیں اور اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ
آں حضرتؐ کے عہد میں ہی حدیث کی روایت اور تحریر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور آپؐ کے بعد جمع حدیث اور اس کی تعلیم کا رواج
برابر ترقی کرتا رہا، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تدلیس اور وضع حدیث کا فتنہ بھی جلد ہی شروع ہو گیا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں لاتعداد
جھوٹی حدیثیں رواج اور شہرت پا گئیں، اس فتنہ کو روکنے اور صحیح حدیثوں کو ضعیف اور موضوع حدیثوں سے علیحدہ کرنے کی غرض سے
محدثینِ اسلام نے جس خلوص، محنت اور جانفشانی سے ان کی چھان بین کی اور اس مقصد میں جس حد تک وہ کامیاب ہوئے، وہ علمی تحقیق
کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔ اس بے مثال کوشش کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر مار گولیتھ نے
کہا ہے کہ مسلمان اپنے علم حدیث پر جتنا بھی فخر کریں جائز ہے۔ خود ہمارے زمانہ میں سرہملٹن گب نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور
وہ مستشرقین میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ان کی رائے میں " پہلی صدی کی ایک مخصوص کوشش یہ تھی کہ محمدؐ کی زندگی اور اُن کے
افعال سے متعلق ہر چیز کو جمع اور دوسروں تک پہنچایا گیا، یعنی آپؐ نے کسی موقع پر کیا کہا اور کیا کیا اور کیسے کیا، اور آپؐ نے
اپنی موجودگی میں اور اپنے علم میں کیا کہنے کی اجازت دی، چونکہ آپؐ کی شخصیت کا آپؐ کے متبعین پر نہایت گہرا اثر تھا، یہ کوشش
فطرتی تھی جس پر کوئی بیرونی اثر نہ تھا۔"

اسی بحث کے سلسلہ میں پروفیسر مذکور صحیح بخاری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" من حیث المجموع۔ صحیح بخاری انتہائی دلچسپ اور محتاط عالمانہ تالیف ہے .... ہر غور سے پڑھنے والے طالب علم
پر وہ، دیانتداری اور تقویٰ کا بہت نمایاں اثر چھوڑتی ہے۔"

آخر میں وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

" جب تک تنقید کے دوسرے اصول دستیاب نہ ہوں، میدان ابتدائی دور کے ناقدین (یعنی محدثین) کے ہاتھ میں

رہے گا۔"

انھوں نے صحیح حدیث کا جو معیار قائم کیا ہے، اس کی وجہ سے پہلی صدی کی پراپیگنڈا والی (موضوع) حدیثیں اور بعد کی سب حدیثیں ترک ہو گئی ہیں، پروفیسر گب ایک دوسرے فاضل کی رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ:

"بلا شک و شبہ ان (حدیثوں) میں اصل موجود ہے، جو چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کے الفاظ نہ رکھتی ہوں، لیکن ان کے خیالات اور افعال کا عکس ان میں ضرور ہے، یا عرب کے ان رواجوں کا جن کو انھوں نے اس طریقہ پر اختیار کر لیا ہے یا شامل کر لیا، جیسے کہ ان پر ابتدائی عہد اسلام میں عمل ہوتا تھا۔[1]"

موجودہ دور کے ایک اور مستشرق پروفیسر مانٹگمری دیٹ کا خیال ہے کہ "حدیثوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، تشریعی (جن کی بنیاد پر شرعی قوانین وضع کئے جاتے ہیں۔) اور تاریخی، جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے، بعض حدیثیں یقیناً موضوع ہیں، لیکن ان حدیثوں کے متعلق جن کا تعلق تاریخ سے ہے صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مواد کو مقصد پر مبنی ہونے کا TENDENTIOUS (SHOPING) رنگ دے دیا گیا ہے، اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ حدیث اور اخبار میں جو معلومات محفوظ ہیں ان کو صحیح سمجھا جائے اور جو واقعات ان میں بیان کئے گئے ہیں ان کے صحیح ہونے میں شک کی کوئی وجہ نہیں بشرطیکہ تاریخی شہادت کے معیار پر وہ پورے اترتے ہوں[2]۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر دورِ جدید کے مستشرقین نے ان مآخذ کو اپنا ذریعہ معلومات بنایا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے کس طرح غلط تاویلیں کر کے اپنے مخصوص انداز میں نتائج اخذ کئے ہیں۔ سر برآوردہ مستشرقین کا حدیث کو مجموعی طور پر مستند ذریعہ معلومات تسلیم کر لینا، اس لئے اور بھی اہم اور قابلِ ذکر ہے کہ اس کے بعد ہمارے ان فضلاء کا مقام، مورخ کی نظر میں بہت گر جاتا ہے جو حدیث کی سند تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام مورخ اسی شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو جائیں تو تاریخ اسلام کے لاتعداد ابواب اس کے صفحات سے غائب ہو جائیں گے۔ غیر مستند مواد کو قابلِ اعتماد ذرائع معلومات سے علیحدہ کر کے صحیح واقعات کی ترتیب تو تاریخ کے طالب علم کا انتہائی اہم بلکہ اولین فرض ہے، موضوع حدیثوں کی موجودگی کے یہ معنیٰ نہیں کہ ہم صحیح حدیثوں کو بھی سند کی حیثیت سے نظر انداز کر دیں، کسی مسئلہ کا حل یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ترکِ حل کا راستہ اختیار کر لیا جائے۔

اسلام میں فن تاریخ نویسی کی بنیاد بھی اصولِ حدیث کے طرز پر قائم ہوئی، شروع زمانہ میں بڑے مورخوں میں سے اکثر محدث بھی تھے چنانچہ ان کا طرزِ تحریر تاریخ کی کتابوں میں بھی وہی ہے جو حدیث کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ بعد میں جب تحریری مواد آسانی سے ملنے لگا تو اسناد نقل کرنے کا طریقہ ترک کر دیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات (سیرۃ) کو محفوظ کرنے اور اس پر مواد جمع کرنے کی کوشش بہت جلد شروع ہو گئی تھی، عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر سب

---

[1] دیکھو محمڈنزم۔ ہوم یونیورسٹی لائبریری باب پنجم۔

[2] دیکھو، محمد ایٹ مکہ صفحہ XIV

سے پہلی کتاب ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہؐ ہے جو ایک مدت سے نایاب ہے[1]۔ اگرچہ اس کا کافی حصہ ابنِ ہشام کی تصنیف میں محفوظ
ہے۔ حال ہی (۱۹۵۵ء) میں پروفیسر گلامی نے ابنِ ہشام کے علاوہ دوسری کتابوں[2] سے مدد لے کر ابنِ اسحاق کی سیرت کا انگریزی
ترجمہ " دی لائف آف محمدؐ " کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں شک نہیں کہ سیرت پر ابنِ اسحاق کی تصنیف ہمیشہ ایک اہم اور
مستند تصنیف سمجھی گئی ہے اور سمجھی جاتی رہے گی لیکن اس موضوع پر مواد جمع کرنے اور اس کو کتابی شکل میں ترتیب دینے کا کام اُن
سے پہلے شروع ہو گیا تھا، ان کے بعض پیشروؤں کا ذکر مولانا شبلیؒ نے اپنی عالمانہ تصنیف " سیرۃ النبیؐ " میں کیا ہے، اس
لئے ہم یہاں اس کا تفصیلی ذکر ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر یہ امر قابلِ غور ہے کہ سیرت پر روایات جمع ہونے کا زمانہ آنحضرتؐ سے اس قدر
قریب ہے کہ ان کو معاصر شہادت کا درجہ حاصل ہے، ابتدائی دور کے جن لوگوں نے یہ روایات جمع کی ہیں ان میں یہ قابلِ ذکر ہیں:
ابان ابنِ عثمان (۲۰ — ۱۰۰ھ) ان کی روایت کا ذکر واقدی نے ابن المغیرہ کے بیان میں اس طرح کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ
کی احادیث میں سے صرف مغازی کی روایات ابان کی سند پر لکھی تھیں[3]۔ عروہ ابن زبیر (۲۳ — ۹۴ھ) حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نواسے اور
حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، اس موضوع پر ان کی روایتیں بکثرت موجود ہیں، بعض لوگوں نے ان کو تاریخ اسلام کا بانی کہا ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاید ان کی تحریری یادداشتیں باقاعدہ کتاب کی شکل میں تھیں۔ بہرحال اس قدر یقینی ہے کہ ابنِ اسحاق ہی نہیں بلکہ ابن
سعدؒ طبری اور دوسرے مورخوں نے بھی ان کی روایتیں کثرت سے بیان کی ہیں، ان کا قدرے مفصل ذکر آگے کیا گیا ہے۔
شرجبیل ابن سعد (ف ۱۲۳ھ) کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت علی کو دیکھا تھا، موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ
جنگ بدر و احد میں حصہ لینے والوں کی فہرستیں انہوں ہی نے تیار کی تھیں۔
وہب ابن منبہ (۳۴ — ۱۱۰ھ) کے صحیفہ کا ۲۲۸ھ کا لکھا ہوا مخطوطہ اب مل گیا ہے، یہ نامکمل ہے اور اس سے زیادہ نئی معلومات
بھی حاصل نہیں ہوتیں لیکن اس لئے اہم ہے کہ وہ اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ رسول اللہ کے سوانحِ حیات پہلی صدی میں جمع کر لئے
گئے تھے۔
عاصم بن عمر بن قتادہ (ف ۱۲۰ھ) دمشق میں مغازی کا درس دیا کرتے تھے، ابن اسحاق ان کے شاگرد ہیں۔
ابن شہاب زُہری (۵۰ — ۱۲۴ھ) اس فن کے امام ہیں اور اس پر پہلی تصنیف ان ہی کی ہے، وہ اپنے عہد کے اعلم العلماء
تھے، موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق ان کے مشہور شاگرد تھے۔
ابن حزم (ف ۱۳۰ یا ۱۳۵ھ) اور ابن نوفل (ف ۱۳۱ یا ۱۳۷ھ) کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] ابن اسحاق کی کتاب کا ایک نامکمل نسخہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔ یہ مراکش میں ایک مسجد کے کتب خانہ میں موجود ہے قیاس کیا گیا ہے کہ شاید یہ اسی نسخہ کا ایک حصہ ہے جو ابن اثیر کے پاس تھا۔ اس کا روٹو گراف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[2] پروفیسر مذکور نے یہ نام تحریر کئے ہیں: واقدی، ازرقی، ابن سعد، ابن قتیبہ، بلاذری، طبری، سیرانی، ماوردی، ابن اثیر، ابن الزیات، ابن کثیر اور ابن حجر عسقلانی۔

[3] بحوالہ پروفیسر گلامی۔ مقدمہ صفحہ ۱۴۔

موسیٰ بن عقبہ (۵۵ - ۱۴۱ھ)، امام مالک، شافعی اور احمد ابن حنبل نے ان کی کتاب کی تعریف کی ہے لیکن ابن اسحاق نے ان کا ذکر نہیں کیا، ان کی کتاب کا کچھ حصہ مل گیا ہے جس کو مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ نے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا[1]۔ ایک نہایت اہم روایت جو اس نامکمل دستاویز میں ملتی ہے، یہ ہے کہ حضرت علی اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ دونوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت کو مکمل طور پر یہ کہہ کر تسلیم کیا کہ، ہماری ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ ہم کو مشورہ میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اقتدار اعلیٰ کے سب سے زیادہ اہل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ہیں، غار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی تھے۔ اور ہم ان کی بزرگی اور مرتبہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ نے نماز کی امامت اس وقت جب کہ وہ ہم موجود تھے ان ہی کے سپرد کی تھی۔

ابن اسحاق (ف - ۱۵۰ھ) جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی کتاب کا بڑا حصہ ابن ہشام (۱۶۸ - ۲۳۰ھ) اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں میں محفوظ ہے۔

تیسری صدی میں ابن سعد نے الطبقات الکبیر لکھی جس میں دو جلدیں سیرت پر ہیں، اسی طرح طبری نے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مفصل حالات لکھے، بعد کے مورخین میں جن میں ابن اثیر بھی شامل ہیں ان کی کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، ان کے علاوہ بھی سیرت پر اور کتابیں تصنیف ہوئیں اور بعض عام تاریخوں میں مفصل واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

سیرت کے طالب علم کو ایک اور دشوار مسئلہ سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے، مغربی مصنفین اور اہل قلم تاریخ اسلام کو ہمیشہ ایک مخصوص رنگ دیتے رہے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک شخصیت کو غلط انداز سے پیش کرنے کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ ہر زمانہ میں اعتراضات کی نوعیت اور شدت نے نیا اور مختلف رنگ اختیار کیا ہے، دورِ جدید کے مورخ اپنی حقیقت پسندی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ دوسری اقوام کی تاریخ مرتب کرتے وقت وہ خود اپنے قائم کردہ اصولوں سے انحراف کرنے لگتے ہیں، اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں مغربی اقوام کو دنیا کے وسیع علاقوں پر سیاسی اقتدار حاصل تھا، اس بالا دستی نے ان کے اندازِ فکر اور فلسفہ پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ وہ مفتوحہ اقوام کے کردار اور کارناموں کا جائزہ لیتے وقت ان کی موجودہ پسماندگی کے آئینہ میں اپنے نظریات قائم کرتے ہیں، یہاں ہم ان مسائل پر مفصل بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق بعض مستشرقین اور دوسرے مغربی ادبا و شعرا کے چند بیانات بطور مشتے نمونہ از خروارے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کو یورپ میں تاریک عہد کہا جاتا ہے، یہ صحیح ہے، اس لئے کہ وہاں اس زمانہ میں جہالت اور تعصب کا دور دورہ تھا، لیکن اس دورِ جہالت میں بھی یہاں کے شعرا اور مصنفین، اسلام اور پیغمبر اسلام کی تنقیص میں سرگرم نظر آتے ہیں، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ کلیسائی تنظیم کے پیرو، اسلام کو بت پرستی سے متہم کرتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بڑا بت تبلاتے ہیں آپ کے نام کو محامیٹ (MAHMET) اور پھر اس کو بگاڑ کر ماملٹ (MAMET) کیا۔ اس دور کے یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا مثال کے طور پر فرانس کی قومی نظم رولینڈ پیش کی جا سکتی ہے، اس لفظ کا رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اس کا اسم صفت یعنی محامیٹری یا مامیٹری، یعنی بت پرستی استعمال ہونے لگا، بت کے علاوہ میمٹ (MAMMET) گڑیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا شیکسپیر میں وھننگ میمٹز WHNN NG MAMMATS کا محاورہ استعمال ہوا ہے یہ لفظ احمق بلکہ گالی کے لئے بھی بولا جاتا تھا ایک

---

[1] اس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر گلامی نے اپنے مقدمہ میں شائع کیا ہے۔

اور انگریزی لفظ ٹرمیگنٹ TERMAGANT بھی قابلِ غور ہے۔ فرانسیسی نظم رولینڈ میں یہ ایک ایسے بت کے لئے استعمال ہوا ہے جس کی مسلمان پرستش کرتے تھے، شیکسپیئر کے الفاظ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی کیا اہمیت اور استعمال تھا، وہ لکھتا ہے

I COULD HAVE SUCH A TERMAGANT FELLAIVHIPT FOR

O, ERDOING TERMAGANT, IT OUT HERODS HEROD.

جہل اور تنگ نظری نے تعصب اور عناد کی مغربی ذہن میں جو بنیاد مستحکم کر دی تھی وہ سیاسی اور حربی مخالفتوں کے ماحول میں مضبوط ہوتی رہی سولھویں صدی میں لوتھر اور ریفارمیشن REFORMATION کے دوسرے رہنماؤں نے بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے معاملہ میں وہی رویہ اختیار کیا جو کلیسائی نظم کے متبعین کا تھا چنانچہ اعتراضات اور اتہامات کا سلسلہ جاری رہا، یہ صحیح ہے کہ مغربی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ان کی نوعیت اور طریقِ تحریر و استدلال میں نمایاں تبدیلیاں ہوگئیں، لیکن بنیادی مخالفت اپنی جگہ پر قائم رہی۔

ہر دَور کی طرح ہمارے عہد کے فضلا بھی اپنی قائم کی ہوئی اقدار کو مثالی سمجھتے ہیں اور انھیں کے معیار پر اسلامی تصورات اور تعلیمات کو جانچتے ہیں، تاریخی شہادت کے اصولوں کا بھی وہ اسی انداز سے جائزہ لیتے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انتہائی محنت اور جانفشانی (اور بعض کی حقیقت پسندی) کے باوجود وہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں، جن سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے پیشرؤوں کے بعض اعتراضات دہراتے ہوئے ندامت محسوس کرتے ہیں اور ان کو ترک کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ اسناد کا سارا ذخیرہ وضع کیا ہوا ہے اور وہ کسی طرح قابلِ استناد نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ جدید ترین تحقیق کے پیشِ نظر یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاتا کہ وہ سب کچھ فرضی ہے، لیکن ثقہ سے ثقہ راویوں میں نقائص دریافت کرنے اور ان کے ان بیانات کو جو کسی نہ کسی سبب سے پسندِ خاطر نہیں، غلط اور ناقص ثابت کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ ان کے استدلال میں وزن ہو یا نہ ہو، وہ اپنے اعتراضات کو پختہ تصور کرتے ہیں اور قطعی طور پر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ایک روشن مثال عروہ بن زبیر کی ہے، ان کو مسلمہ طور پر ثقہ مانا گیا ہے، سیر اور مغازی میں ان کی روایتیں کثرت سے ملتی ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو عالماً بالسیرۃ کہا ہے اور کشف الظنون[1] کے بیان کے مطابق تو سیرۃ کی پہلی کتاب ان ہی کی تصنیف تھی، عروہ کی دیانت اور تقویٰ کی اس سے بہتر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ بقول ابن حجر عسقلانی وہ اپنے عہد کے جھگڑوں (فتن) میں شریک نہیں ہوئے، وہ پہلی صدی کے راوی ہیں اور جن لوگوں کی سند پر انھوں نے روایت کی ہے ان میں اسلام کی بہترین شخصیتیں شامل ہیں، لیکن ان خصوصیات کے باوجود مستشرقین کو ان کی روایات پر اعتبار نہیں، پروفیسر ویٹ WATT ان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ (عروہ) ایک خاص ماحول MILIE سے تعلق رکھتے تھے، یعنی اس پارٹی سے جو محمدؐ کے زمانۂ حیات میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کی مجلس ثلاثہ[2] TRI UMVIRATE کی سرکردگی میں

[1] جلد دوم م۔ کالم ۱۰۴۷۔

[2] یہ اصطلاح روما کی تاریخ سے لی گئی ہے وہاں ایک زمانہ میں اقتدارِ اعلیٰ تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی یا مجلس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اسی مجلس کو ترام ویری (TRIUM VIRATE) کہتے تھے۔

برسرِ اقتدار تھی، اس کے بعد عائشہؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ کی پارٹی سے جس نے ۳۶ھ میں علیؓ اور معاویہؓ دونوں کی مخالفت کی، اس کے بعد اس پارٹی سے جس نے ۶۲ - ۷۲ھ میں بنو امیہ کے اقتدار کے خلاف جنگ کی یہ تینوں پارٹیاں ایک تو نہیں تھیں بلکہ علیحدہ علیحدہ تھیں لیکن پھر بھی ان میں تسلسل کا ربط CONTINVELY موجود تھا' اس پر ہم کو تعجب نہ ہونا چاہئے کہ جو مواد انہوں نے ہم پہونچایا ہے اس کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے، جو بنو امیہ اور ان دوسرے لوگوں کو جنہوں نے محمدؐ اور ابوبکرؓ کی مخالفت کی تھی بُرے ڈھنگ میں پیش کرتا ہے، مثلاً بنو عبدِ مناف کے برتاؤ کے متعلق محمدؐ کی شکایت، مخالفین کی فہرست، ابو جہل کی گستاخی اور جنگ کی کوششیں، لیکن یہ مسئلہ سہل نہیں، قدیم گروہ شکستہ ہونے لگے تھے اور عبدالملک کی کوشش یہ تھی کہ کسی صورت سے عروہ کو ہموار کرے۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عروہ بنو امیہ کے جانی دشمن تو نہ تھے مگر ان کی ہمدردیاں ایک مدت تک حزبِ اختلاف کے ساتھ رہیں اگرچہ شاید ۷۲ھ کے بعد وہ قدرے بدل گئیں علاوہ ازیں انکی خاندانی روایات بھی جن سے ان کی بیان کی ہوئی روایتیں ضرور متاثر ہوئی ہوں گی بنو اُمیہ کے خلاف ہی تھیں، لہٰذا اس کیلئے کچھ جواز موجود ہے کہ عبدالملک کے نام ان کا خط تعصب سے پاک نہیں (IS NOT IMPARTIAL) اس بنا پر یہ خیال غیر معقول UNREASONABLE نہ ہوگا کہ اس خط میں مظالم سے بچنے کے لئے مسلمانوں کے حبشہ کو ہجرت کر کے چلے جانے پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ ظلم کرنے والوں میں بنو امیہ اور دوسرے لوگ تھے جو قدیم سے ابوبکرؓ، زبیرؓ اور ان کے خاندانوں کے دشمن تھے، اگرچہ ہجرت حبشہ میں ابوبکرؓ اور ان کے احباب کا نمایاں حصہ تھا، قبیلہ اور خاندان کی روایت اس پر زیادہ زور نہ دیتی کیونکہ یہ اقدام بہت زیادہ باعث افتخار نہ تھا، لیکن اس کی تشہیر میں حریفوں کی تحقیر کا پہلو آسانی سے مل جاتا ہے[1]۔"

اس طویل اقتباس کو خود مصنف کے الفاظ میں پیش کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ پروفیسر وَیٹ کے طرزِ استدلال کا جائزہ لینے میں سہولت ہو، اس کو غور سے پڑھنے پر وہ دلائل سامنے آجاتے ہیں جن کی بنیاد پر پروفیسر وَیٹ، عروہ کی ثقاہت کو مجروح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چونکہ بعض لوگوں کی رائے میں فنِ مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی اور سیرت سے متعلق کثرت سے ان ہی کی روایتیں ہیں جو دوسرے مصنفین نے نقل کی ہیں، اس لئے اگر کسی صورت سے ان کے بیانات کی تنقیص کی جاسکے تو بہت سے واقعات کے متعلق شبہات پیدا ہو جائیں گے اور اس صورتِ حال سے مخصوص نتائج اخذ کر کے سیرت کی اپنی من مانی تصویر تیار کرنے میں دِقت نہ ہوگی اگر ہم پروفیسر وَیٹ کے الفاظ کو غور سے پڑھیں تو بغیر کسی دِقت کے معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دلائل کس قدر ناقص اور ناقابلِ قبول ہیں۔ سب سے پہلی دلیل جس پر تاریخ کے طالب علم کو ہنسی آتی ہے ان کی یہ کوشش ہے کہ آنحضرتؐ کے دور میں پارٹی سسٹم کا وجود ثابت کریں، رسول اللہؐ، ابوبکر صدیقؓ اور ابو عبیدہؓ کو "مجلسِ ثلاثہ"

---

[1] محمد ایٹ مکہ (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس - ۱۹۵۳ء، ص ۱۸۱ - ۱۸۲)

(TRIUM VIRATE) کہنا تاریخ اور فنِ تاریخ نویسی کا مذاق اُڑانا ہے، پروفیسر وِیٹ جیسے فاضل کے قلم سے ایسے الفاظ لکھے جانے پر حیرت ہوتی ہے اور صرف یہی تبصرہ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے سے قائم کئے ہوئے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے وہ ہر دلیل پیش کرنے کو تیار ہیں، چاہے وہ مضحکہ خیز ہی کیوں نہ ہو، پروفیسر مذکور جب خود ہی تاریخی واقعات پر غور کرتے ہیں تو ان کو خیال آتا ہے کہ عروہ کے متعلق ان کے بیان میں تضاد پیدا ہوگیا ہے، اس لئے وہ نئی تاویل کرکے کہتے ہیں کہ ۷۲ھ کے بعد اُن کی ہمدردیاں بدل گئیں، مثال کے طور پر انہوں نے ہجرت حبشہ سے متعلق روایات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ قابل غور ہے ان کے نظریہ کے مطابق ہجرت حبشہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے احباب کے لئے کوئی باعثِ افتخار عمل نہ تھا، بلکہ اس سے ان کی حیثیت اور عظمت پر داغ آتا تھا، اس صورت میں عروہ کو اس ہجرت سے متعلق روایات پر زیادہ زور نہ دینا چاہئیے تھا لیکن انہوں نے روایات بیان کی ہیں چنانچہ پروفیسر مذکور اس کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ عروہ چاہتے تھے کہ بنوامیہ کی اسلام دشمنی کی تشہیر ہو۔

مستشرقین کے تبصروں اور تاویلوں کے انداز و مقاصد کی طرف ان مختصر اشارات سے کم از کم یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہماری تاریخ کو مخصوص رنگ دینے کے لئے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں، اس تنقید سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم اس دور کے مغربی اہلِ علم اور فضلاء کی نیت یا تحقیقی معیار کے متعلق شبہ کریں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مبنی برمقصد TANDNET-ING طریقہ استدلال کا یہ غیر شعوری مظاہرہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے مستشرقین اور خود ہمارے طلبہ و مصنفین جو ان کی تحقیقات اور تبصروں سے متاثر ہوجاتے ہیں ان ہی دلائل کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے تصورات و نظریات مرتب کرتے ہیں، یہ امر قابل غور ہے کہ پروفیسر وِیٹ اپنی دلیلوں کو قطعی طور پر صحیح سمجھتے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ انہوں نے ایک ایسے راوی کو جو تقریباً ہم عصر ہی نہیں بلکہ ہر طرح سے ثقہ اور قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے، کمزور اور مشکوک ثابت کردیا وہ بظاہر اپنی اس کامیاب کوشش سے مطمئن ہیں، لیکن ایک تاریخ کا طالبِ علم بجا طور پر یہ دریافت کرسکتا ہے کہ اس مسئلہ کے تجزیہ میں عروہؒ کے کردار اور ان کے اخلاقی و دینی تصورات و اعمالؔ کو نظر انداز کردینا صحیح ہے؟ کیا ہم کو اس پر غور کرنا نہیں چاہیے کہ وہ کون سے مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے اقتدار میں آنے والی پارٹی کی خوشامد ضرور اور پھر بنوامیہ کے دورِ عروج میں ان کے آباواجداد کی تنقیص میں روایتیں بیان کرنے سے ان کو کیا حاصل ہوسکتا تھا، وہ اپنے عہد کے اختلافات میں کیوں ملوث نہیں ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کی مادی زندگی میں تقویٰ اور خدا ترسی کے لئے کوئی مقام نہیں، چنانچہ دورِ جدید کے ناقدین اس کی اہمیت کو نظر انداز کردیتے ہیں، حالانکہ اسلامی

لہ عروہ کے اخلاق اور اوصاف رجال کی کتابوں میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ نہایت پابندی سے نمازِ تہجد ادا کرتے تھے اور ہمیشہ روزے سے رہتے تھے، چنانچہ انتقال کے دن بھی روزے سے تھے۔ ان کے تقویٰ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ زخم کی وجہ سے ان کا پیر کاٹنے کی ضرورت ہوئی، جراح نے تکلیف کا احساس کم کرنے کے لیے شراب پلانا چاہی لیکن انہوں نے انکار کردیا، سیاسی فتنوں سے بچنے کے لئے انہوں نے شہر چھوڑ کر مدینہ کے قریب ایک گاؤں عقیق میں قیام کرلیا تھا۔

تاریخ کے مسائل اور شخصیات کو سمجھنے کے لئے زندگی کے اس عنصر کی حیثیت پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم صرف ان ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں جن سے عروہ نے روایت کی ہے تو معلوم ہو جائے گا کہ اموی دور کی گروہ بندی میں ان کی دلچسپی کا ذکر ان پر کتنا بڑا اتہام ہے۔

تاریخی شواہد کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں ایک اور مسئلہ قابلِ غور ہے، دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ آج کل قرائنی شہادت پر بھی بہت زور دیا جاتا ہے، محدثین و مورخینِ اسلام نے بھی درایت کو اہمیت دی تھی، لیکن دورِ جدید کے بعض مصنفین قرائنی شہادت کے مقابلہ میں ثقہ راویوں کے بیانات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ قرائنی شہادت کی ترتیب اور اس کی اہمیت میں خود مورخ کے قیاسات بلکہ مزاجی کیفیات اور عقائد کو بھی دخل ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ بعض واقعات کی تاویل اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں یہ لوگ غلط راستہ پر پڑ جاتے ہیں مثلاً اوپر نقل کی ہوئی مثال میں یہ نظریہ قائم کر لینے سے کہ عہدِ نبوت میں اس زمانہ کی طرح پارٹیاں اور گروہ بندی موجود تھی کس قدر غلط نتائج نکالے گئے ہیں، ثقہ سے ثقہ راویوں کو شک کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ ہم درایت اور قرائنی شہادت کو ثقہ راویوں کے بیانات کے مقابلہ میں غیر ضروری سمجھیں، یہ اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ان کی اہمیت کو حد سے زیادہ آگے لے جانے میں خطرہ ضرور ہے، ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ بعض حالات میں قرائنی شہادت پر اعتماد ناگزیر ہو جاتا ہے صحیح واقعات کی ترتیب اور ان کی بنا پر صحیح نتائج مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قابلِ اعتماد روایات، تحریری مواد اور قرائنی شہادت میں توازن قائم رکھا جائے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف سیرت ہی نہیں بلکہ تمام تاریخ اسلام سے متعلق مستشرقین کے پیش کردہ نظریات اور ان کے عائد کردہ الزامات و اعتراضات، ہمارے لئے ایک چیلنج ہیں، اگر ہم اپنے شاندار دینی، اخلاقی اور ثقافتی ورثہ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کے سامنے اسلامی تہذیب اور تعلیمات کی صحیح تصویر پیش کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہمارے لیے یہ چیلنج قبول کرنا ناگزیر ہے، اور یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اگر اس مسئلہ میں ہماری طرف سے غفلت برتی گئی تو یہی غلط تصویر جو مغربی مصنفین کی طرف سے پیش ہوتی رہتی ہے صحیح تسلیم کر لی جائے گی، ہمارے طلبہ ہی نہیں بلکہ وہ مصنفین بھی جن کو ذاتی طور پر تحقیق مسائل کے مواقع نہیں ملتے، اسی کو اپنا لیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے، ہر قوم اور ملت کے مستقبل کی عمارت اس کی تاریخی روایات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، قوم کی تعمیر کے لئے ان روایات کا صحیح علم انتہائی ضروری ہے، پاکستان کے لئے اس کی اہمیت خاص طور پر زیادہ ہے، کیوں کہ ہماری ایڈیالوجی کی بنیاد اسلامی تعلیمات و تصورات ہی پر قائم ہے۔

سیرتِ رسولؐ اور تاریخ اسلام کی غلط تصویر رائج ہو جانے کے خطرناک نتائج کو گذشتہ صدی میں سر سید احمد خاں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ سر ولیم میور کی کتاب "دی لائف آف محمدؐ" شائع ہونے پر ان کو خیال آیا کہ مستشرقین کے اعتراضات کا جائزہ لیا جائے اور جو غلط فہمیاں انکی وجہ سے پھیل رہی ہیں ان کا سدباب کیا جائے۔ ان کے لندن میں قیام کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ سیرت کے بعض پہلوؤں پر تحقیق کریں اور ضروری مواد جمع کر بعض ان مسائل کا جائزہ لیں جن کو میور اور دوسرے مستشرقین نے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے، خطباتِ احمدیہ جن کا انگریزی ترجمہ لندن سے سنہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا، اسی کاوش کی عملی شکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں کی بعض تاویلات اور نظریات تسلیم نہیں کیے گئے، لیکن ہم ان کی اس کوشش کو غیر مقبول اور ناقابلِ اعتنا نہیں کہہ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے انہوں

نے چند اصول قائم کیے تھے اور ان پر عمل کرنا ان کی رائے میں اس قوم کی بقا کے لئے ضروری تھا، ان ہی کے پیش نظر وہ اسلامی عقائد اور تصورات کی تاویل کرتے تھے۔ مسلمانوں کے اُس طبقہ نے جو قدیم روایات کا سختی سے حامی تھا، ان کی اکثر تاویلوں کو یکسر رَدّ کر دیا، لیکن روشن خیال طبقہ نے اُن کی بہت سی تشریحات و تاویلات کو پسند کیا، بہرحال اس کار خیر میں اوّلیت کا فخر سید احمد خاں ہی کو حاصل ہے، اس کے بعد جسٹس سید امیر علی کی کتاب قابلِ ذکر ہے، جو آج بھی اپنے نئے ایڈیشن اور نئے عنوان 'دی اسپرٹ آف اسلام' کے ساتھ مقبول ہے۔ سید امیر علی جدید تصنیفات کا براہِ راست مطالعہ کر سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دلائل اور بیانات میں زیادہ وسعت ہے، مگر سید امیر علی نے بھی سید احمد خاں کی طرح اپنے استدلال اور طرزِ تحریر میں مدافعانہ بلکہ بعض مواقع پر معذرت آمیز انداز اختیار کیا ہے۔ جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد برصغیر میں جو ماحول پیدا ہو گیا تھا اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں مغربی اقوام کو جو سیاسی و تمدنی بالادستی حاصل تھی اس کے پیش نظر ہم کو اس مدافعانہ روش پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بہرحال زمانہ کے ساتھ حالات اور ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی، سید احمد خاں کی قائم کردہ روایت نے علی گڑھ میں پرورش پائی، مگر اب اس کا لباس بدل چکا تھا، مولانا شبلی کی کوششوں میں ہم کو اس تبدیلی کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ علی گڑھ میں چند سال ہی رہے لیکن اس مختصر قیام نے ہی ان کے خیالات میں وسعت پیدا کر دی، اور اسلامی علوم کے سلسلہ میں ان مسائل سے ان کو واقفیت ہو گئی، جن پر جدید انداز سے تحقیق اور ان کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری تھا الفاروق، المامون، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر وغیرہ میں ہم کو مولانا کی یہ کوشش صاف طور پر نظر آتی ہے لیکن مولانا کا سب سے اہم کارنامہ ان کی آخری تصنیف سیرۃ النبیؐ ہے جس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید اور اس دور کے بلند پایہ مؤرخ سید سلیمان ندوی نے کی۔

مغربی ممالک میں اب سیرت اور تاریخ اسلام کا مطالعہ وسیع پیمانہ پر کیا جا رہا ہے، دورِ جدید کے مستشرقین بعض قدیم نظریات کو نئے لباس میں اور کچھ نئے تصورات و نظریات پیش کر رہے ہیں، جوں جوں تحقیق کے امکانات اور دائرہ وسیع ہوتا جا رہا ہے، نئے نئے مسائل اور خیالات ہمارے سامنے آ رہے ہیں، بعض دستاویزیں جو اُب تک ناپید خیال کی جاتی تھیں وہ اب دستیاب ہو گئی ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط جو مقوقس، حاکم اسکندریہ کے نام بھیجا گیا تھا حال ہی میں مل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس خط کی جو عبارت حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے وہ اصل خط کے متن سے ملتی ہے، مُہر میں بھی نام کے وہی الفاظ اور ترتیب وغیرہ ہیں جو حدیثوں میں بیان کی گئی ہے[1] اسی طرح صحیفہ ہمام بن منبّہ جو انہوں نے صحیفۂ ابو ہریرہؓ سے اخذ کیا تھا اور جس کا ذکر علمائے حدیث نے کیا ہے، اس کا ایک حصّہ دستیاب ہو گیا ہے، ان کے بھائی وہب بن منبہ کے صحیفہ[2] کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان انکشافات اور قدیم دستاویزوں کے ملنے سے ایک طرف تو حدیث کی صحت و حجیت ظاہر ہوتی ہے اور دوسری طرف سیرت اور متعلقہ موضوعات پر جدید تحقیق کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔

---

[1] بحوالہ خطبات مدراس از سید سلیمان ندوی۔ ص۔ ۵

[2] اس کا ذکر تہذیب التہذیب (جلد اول۔ ۲۔ ۳۰۶) میں موجود ہے۔

سیرت نگاری کی ذمہ داریاں

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

وہ پہلا مکتب اور مدرسہ جہاں سب سے پہلے مصنّفِ کتاب کا داخلہ ہُوا، وہ سیرتِ نبوی کا مدرسہ ہے۔ اس مبارک مدرسہ میں اس کا داخلہ اس ابتدائی عمر میں ہُوا جس میں بچے عام طور پر مکتب اور مدرسہ میں داخل نہیں کیے جاتے۔ یہ اس کے گھرانے اور خاندانی ماحول اور فضا کا نتیجہ تھا جو وہاں قائم تھی۔ سیرت کو اس ثقافت اور کلچر کے ایک اہم اور بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی جس سے بہرہ مند اور آراستہ ہونا گھر کے بچوں اور لڑکوں کے لیے اس عہد میں ضروری خیال کیا جاتا تھا اس میں اس بچے کی چھوٹی موٹی لائبریری کو بھی بڑا دخل ہے جو نظم و نثر دونوں طرح کی کتابوں پر مشتمل تھی اور برابر گردش میں رہتی تھی۔ اس کے بعد اس میں سب سے بڑا حصّہ اس کے برادرِ اکبر ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحبؒ کی حکیمانہ تربیت اور رہنمائی کا ہے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ اس نے بہت کم سنی اور نوعمری میں اردو میں سیرت کی وہ بہترین کتابیں پڑھ لیں جس میں عربی زبان کے بعد سیرت کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور عہدِ آخر میں اس پر سب سے بڑا کام ہُوا ہے [1]

جب عربی زبان و ادب کا کچھ ذوق پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ سیرت کے عربی ماخذ پر مرکوز کر دی ان میں سرِفہرست دو کتابیں تھیں، ایک ابنِ ہشام کی کتاب "السیرۃ النبویۃ" دوسرے امام ابن القیم کی کتاب "زاد المعاد" اس نے کتابوں کو صرف علمی یا روایتی طریقہ سے پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انہیں کتابوں میں اپنی زندگی کے شب و روز بسر کیے۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کا دل ایمان و یقین کی حلاوت سے آشنا ہُوا اور جذبۂ شوق و محبت کو نئی غذا ملی اور اس کی از سرِنو آبیاری ہُوئی اس لیے کہ سیرت کے مؤثر واقعات تربیت و رہنمائی کا سب سے طاقتور ذریعہ اور انسان کے قلب و دماغ کے لیے (قرآن مجید کے بعد) سب سے زیادہ اثر انگیز اور حیات آفریں سرچشمہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے بعد عربی اور انگریزی میں سیرت کی جو قدیم و جدید کتابیں اس کی دسترس میں تھیں وہ بھی برابر مطالعہ میں آتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت اس کی کتابوں اور تحریروں کی ہمیشہ سب سے بڑی بنیاد رہی، اس کے دم قدم سے اس کا سارا سوز و ساز اور آب و رنگ تھا اور اسی کے نقشِ قدم کے طفیل اس کے نقوشِ قلم میں تازگی تھی، اپنے مقاصد و مطالب کی وضاحت کے لیے اس کو قوی سے قوی تر دلائل اور بلیغ سے بلیغ مثالیں سیرت کے جمال و کمال ہی سے ملتی تھیں اور سیرت ہی سے اس کی طبع میں روانی اور جولانی پیدا ہوتی تھی اور اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی تھیں، اس کی کوئی قابلِ ذکر تحریر ایسی نہیں جس پر اس جمالِ محمّدی کا کوئی پرتو اور سیرتِ نبویؐ کے گہرے مطالعہ اور تدبّر کا کوئی عکس نہ ہو۔

---

[1] اس کی دلچسپ کہانی مصنف نے اپنی کتاب "الطریق الی المدینۃ" میں الکتاب الذی لا انسی فضلہ کے عنوان سے بیان کی ہے اور اس میں خاص طور پر قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مقبول کتاب رحمۃ للعالمین کے مطالعہ کے گہرے اثرات کا ذکر کیا ہے۔

سیرت کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں اور بعثتِ محمدی کی عظمت اور اس کے محیر العقول اثرات و نتائج پر اس کے یہ مقالات و خطبات "کاروانِ مدینہ"[1] میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

مصنف نے اس طویل عرصہ میں بہت سی کتابیں لکھیں، لیکن خاص سیرت کے موضوع پر کوئی مستقل کتاب اس کے قلم سے نہ نکل سکی حالانکہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب کی شدید ضرورت ہے جو ایک طرف عصری اور علمی اسلوب میں لکھی گئی ہو اور اس میں قدیم و جدید دونوں قسم کے ماخذ سے پورا استفادہ کیا گیا ہو، دوسری طرف سیرت کے اولین اور اصل ORIGINAL ماخذ پر اس کی بنیاد ہو اور قرآن و حدیث سے اس میں سرِمو انحراف نہ کیا گیا ہو، وہ موسوعی ENCYCLOPEDIE طرز پر نہ لکھی گئی ہو جس میں سارے معلومات بغیر کسی بحث و تمحیص کے بھر دیے جاتے ہیں اور ہر طرح کا ضروری و غیر ضروری مواد پیش کر دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، یہ وہ طرزِ تصنیف اور اسلوبِ تحریر ہے جس کے دورِ آخر کے اکثر مصنفین اور بعض متقدمین بھی عادی رہے ہیں، یہ طرز بہت سے ایسے غیر ضروری اشکالات و سوالات پیدا کرتا ہے جن سے سیرت نبوی بالکل بری و بے داغ ہے اور جس میں بادیہ پیمائی اور آشفتہ سری کی مسلمانوں کو کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ تحقیق و تنقیح کا قلم (تجدد پسندانہ رجحانات اور مستشرقین کی تشکیک کا کوئی اثر قبول کیے بغیر) اپنا کام کر چکا ہے اس کے ساتھ وہ ان دینی مسلمات و حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جن کی روشنی و رہبری کے بغیر آسمانی کتابوں، انبیاء کی سیرت، معجزات و غیبی واقعات و حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے اور جو اس اصول پر کاربند اور اس عقیدہ کا حامل ہو کہ یہ ایک نبیؐ کی سیرت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں مبعوث کیا گیا ہے اور جس کو ہر دم و ہر لحظہ خدا کی نصرت و تائید حاصل تھی نہ کہ کسی بڑے قومی لیڈر اور ملی رہنما کے حالاتِ زندگی ——— یہ وہ سیرت جو ہر منصف مزاج، تعلیم یافتہ شخص (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) کے سامنے کسی تحفظ RESERVATION استثناء اور رکیک تاویل کا سہارا لیے بغیر پیش کی جا سکے، چنانچہ مصنف نے اس کتاب میں خود ان واقعات و حالات اور سیرت کے اصل و بنیادی مواد پر زیادہ اعتماد کیا ہے اور اس کو اس کا موقع دیا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے بولے اور پڑھنے والے کے دماغ و دل اور ذہن و نظر میں اپنا راستہ خود بنائے، ان منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں اور زندہ حقیقتوں کو فلسفہ کا رنگ دینے، واقعات کی تاویل کرنے اور اس کے لیے طویل و عریض مضمون باندھنے کی اس میں زیادہ کوشش نہیں کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ سیرت اپنے حسن و جمال، اپنی موزونیت و لطافت اور اپنی اثر انگیزی و دل آویزی کے لیے، کسی بڑے آدمی کی سفارش، کسی حکیم کے علم و دانش اور کسی ادیب اور صاحبِ قلم کے اندازِ نگارش یا رنگینیٔ بیان کی محتاج نہیں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک مصنف کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے حسنِ بیاں، حسنِ ترتیب اور حسنِ انتخاب۔

پھر اس میں عقل و جذبات دونوں کی بیک وقت اور شانہ بشانہ جلوہ گری اور کارفرمائی ہونی چاہیے ایسا نہ ہو کہ عالمانہ بحث اور معروضی نقد و جائزہ جذبۂ محبت اور ذوق و شوق کی کیفیت کو سرد اور افسردہ کر دے جو سیرت کے جمالِ جہاں آراء

---

[1] کتاب کے تین عربی ایڈیشن مدینہ منورہ، لکھنؤ، اور دمشق سے اور اردو میں دو ایڈیشن لکھنؤ اور کراچی سے شائع ہو چکے ہیں، عربی میں اس کا نام "الطریق الی المدینۃ" ہے۔

سے لطف اندوز ہونے اور اپنے دیدہ و دل کو اس سے روشن اور منور کرنے کی ایک ناگزیر ضرورت اور اس سے صحیح و کامل استفادہ اور اس کے مسائل، احکام اور واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے اور صحیح نتائج تک پہنچنے کی لازمی شرط ہے، اگر سیرت کی کوئی کتاب اس جذباتی اور ایمانی عنصر سے خالی ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ چوب خشک کا مصنوعی ڈھانچہ ہے جس میں زندگی کی کوئی حرارت اور نمی موجود نہیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جذباتی و ایمانی عنصر عقل سلیم کے تقاضوں پر غالب نہ آجائے جن کی اہمیت عصر حاضر نے خاص طور پر بڑھا دی ہے، نہ وہ منطق کے صحیح، معقول اور قابل فہم اصولوں کے منافی ہو نہ عقیدہ اور تقلید پر مبنی ایسا خراج عقیدت اور ایسا خراج تحسین ہو جن کو صرف قوی الایمان پشتینی مسلمان اور وہ علماء راسخین قبول و تسلیم کر سکیں جن کی بیرونی دنیا اور جدید ثقافت سے کوئی راہ و رسم نہیں، یہ عقیدت و محبت بلاشبہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمت خداداد ہے لیکن یہ بات ہمیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ بہرحال اس نبی کی سیرت ہے جس کو رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا کے تمام انسانوں اور نوع انسانی کے تمام طبقوں کی طرف بھیجا گیا ہے اس لیے اس طبقہ کے افراد کے لیے ممنوع یا مہر بند نہیں کیا جا سکتا جن کو حالات نے اس اسلامی و ایمانی ماحول میں نشو و نما حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا اور تقدیر الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ وہ غیر اسلامی ماحول ہی میں پیدا ہوں، وہیں ان کی نشو و نما ہو پھر لطف الٰہی ان کی مساعدت کرے اور سیرت محمدی کا کوئی معطر و جاں نواز جھونکا اپنی دل آرائی و مسیحائی کے ذریعہ ان کو اس جگہ سے اٹھا کر اسلام کے سایۂ رحمت اور ایمان کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان غیر مسلموں کا حق سیرت پر ان مسلمانوں سے ہرگز کم نہیں جو پہلے ہی سے اسلام و ایمان کے سایۂ رحمت میں ہیں، اس لیے کہ دوا و علاج کی تندرست سے زیادہ ایک بیمار کو ضرورت ہے۔ دریا کے اس پار رہنے والے کو پل کی جتنی حاجت ہوگی اتنی حاجت پل کے اسی طرف رہنے والوں کو کیوں کر ہو سکتی ہے ؟

مصنف سیرت نگاری کے وقت اس ماحول اور اس عہد کو بھی کسی طرح نظر انداز اور فراموش نہیں کر سکتا جس میں نبوت محمدی کا آفتاب پہلی بار طلوع ہوا، اس لیے اس عہد کی عالم گیر جاہلیت کی پوری تصویر کشی بھی ضروری ہے جو چھٹی صدی مسیحی میں ہمیں ساری دنیا پر محیط نظر آتی ہے اس میں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ اس زمانہ میں فساد، اخلاقی بگاڑ اور انسان کی بے چینی و اضطراب کس درجہ پر پہنچ چکا تھا اس کی اخلاقی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالت کیا تھی؟ تخریب و فساد کے کیا کیا اسباب و عوامل اس وقت کی دنیا میں کارفرما تھے اور کیسی کیسی ظالمانہ حکومتیں، مسخ شدہ مذاہب، انتہا پسندانہ و خیالی فلسفے، تباہ کن تحریکیں اور دعوتیں اپنا کام کر رہی تھیں، جب مصنف نے اپنی کتاب " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین"[1] کی تمہید اور مقدمہ کے طور پر عہد جاہلیت کی ذرا تفصیل کے ساتھ تصویر کھینچنے کی کوشش کی تو اس قدر دشواری کا سامنا کرنا پڑا جو اسے آج تک یاد ہے، اس کو اس کیلئے ان تمام مغربی ماخذ کا جائزہ لینا پڑا جن میں ظہور اسلام کے وقت کے متمدن ملکوں اور اقوام عالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، اس نے ان تمام ضخیم کتابوں سے ان منتشر حالات کو اس طرح جمع کیا جیسے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کیے جائیں[2]

---

[1] جس کے اردو ترجمہ کا نام "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ہے۔

[2] ملاحظہ فرمائیں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر"، باب " بعثت سے پہلے" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ۔ و مجلس نشریات اسلام ناظم آباد کراچی۔

یہ تمہید جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے روشنی کا کام کرتی ہے اور اس کے سامنے بعثت محمدی کی عظمت و وسعت اور منصب نبوت کی نزاکت و اہمیت اور اس کے عظیم الشان نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے، عہد حاضر کے سیرت نگار کے لیے بہت ضروری ہے اور اس کا کام اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جائے گا جب تک اس بحث و تحقیق کا یہ انداز اختیار نہ کیا گیا ہو اور آغاز اسلام کے وقت عہد جاہلیت کا نقشہ اور اس کے فساد و اضطراب، اخلاقی پستی اور خود فراموشی و خود کشی کی زندہ و متحرک تصویر پوری امانت داری کے ساتھ بے کم و کاست پیش نہ کی گئی ہو۔ یہی اس ماحول اور اس شہر کا نقشہ تھا جہاں اسلام کی پہلی کرن چمکی، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور دعوت حق کے قافلہ نے پہلا قدم آگے بڑھایا، جہاں آپؐ کی عمر مبارک کے ۵۳ سال گزرے، اور جہاں تیرہ سال دعوت اسلام کے سخت و جاں گداز مرحلوں میں بسر ہوئے۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عقل و شعور اور تہذیب و تمدن کی جو سطح تھی اس سے باخبر ہو نیز اس ملک کے اجتماعی اور سیاسی اور دینی و مذہبی حالات، اس کے اقتصادی و سیاسی ڈھانچہ اور حربی و عسکری طاقت کی نوعیت سے بھی واقف ہو تاکہ اس ملک کے باشندوں کے صحیح رجحانات، ان کے مزاج و افتاد طبع، اُن کے ذہن و نفسیات کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کو ان دشواریوں اور رکاوٹوں کا پورا اندازہ ہو سکے جو اسلام کی ترقی و پیش قدمی کی راہ میں حائل ہو رہی تھیں۔

یہی بات بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی یثرب کے بارہ میں کہی جا سکتی ہے جہاں اسلام مکہ سے منتقل ہوا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ہجرت فرمائی اور تقدیر الٰہی نے اس کو اسلام کا اولین مرکز قرار دیا، اس لیے کہ اس کے پس منظر کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات کو جانے بغیر ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اسلام نے ان افراد کی کیا اور کس طرح تربیت کی، ان کو کیسے حیات نو بخشی، مختلف مسائل کو کس طرح حل کیا، متضاد و متحارب عناصر کو کس طرح شیر و شکر کیا، اس سلسلہ میں نبوت محمدی کا کارنامہ کیا تھا؟ اس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور در در بھٹکے ہوئے انسانوں کو ملانے اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کا فریضہ کس طرح انجام دیا۔ یہ بات صرف اسی وقت سمجھی جا سکتی ہے جب آدمی کے سامنے اس عجیب و غریب اور پیچیدہ ماحول کی پوری تصویر ہو جس کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کرنا پڑا، بہت سے واقعات اور فیصلے جو حدیث و سیرت کے مطالعہ میں آدمی کی نظر سے گزرتے ہیں۔ اس وقت تک سمجھے ہی نہیں جا سکتے۔ جب تک مدینہ کی اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی حالت، وہاں کی زمین کی خاصیت، اس کے جغرافیہ، اس کے گرد و نواح، وہاں کی انفرادی اور علاقائی طاقتوں، ان کے باہمی تعلقات و روابط، معاہدوں اور عہد ناموں اور ہجرت سے قبل کے معاملات اور قومی و ملکی دستور اور رسم و رواج کا قاری کو علم نہ ہو، اگر کوئی شخص ان تمام باتوں سے بالکل ناواقف ہو کر سیرت کی کتابوں میں اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کی مثال ایک سرنگ میں چلنے والے کی سی ہو گی جس کو اپنے دائیں بائیں اور آغاز و منزل کسی چیز کی خبر نہ ہو۔

یہی اصول اس وقت کی معاصر و متمدن حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اس لیے کہ ناظرین کے سامنے دعوت اسلامی کے اس اقدام کی اہمیت اور اس کی حوصلہ مندی اور خطر پسندی کی کوئی صاف و واضح تصویر اس وقت تک آ ہی نہیں سکتی جب تک اس کو ان حکومتوں کے حجم اور قوت و شوکت کا اندازہ نہ ہو جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام دی

اوران کے نام فرامین جاری کیے اور ان کی تہذیب و ثقافت، عسکری قوت، فارغ البالی اور مرفہ الحالی نیز انکے سلاطین کی مطلق العنانی، رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کا صحیح علم نہ ہو جدید معلومات نے ان حکومتوں اور قوموں کی تاریخ اور ان کے معاشرہ پر خاصی روشنی ڈال دی ہے اور سیرت سے ان حالات اور حقائق کا پردہ فاش کر دیا ہے، جو عہدِ قدیم میں لوگوں کے سامنے نہیں آئے تھے یا زیادہ صاف اور واضح نہ ہو سکے تھے۔ اس زمانہ کے سیرت نگار کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اپنے کام میں ان تمام معلومات سے پوری مدد لے اور تاریخ و جغرافیہ اور تقابلی مطالعہ (COMPARETIVE STUDIES) کے میدان میں جو جدید ترین (UPTO DATE) مباحث و معلومات اب تک سامنے آئے ہیں ان سے پورا فائدہ اٹھائے۔

مصنف کو ان تمام باتوں کا احساس تھا اور سیرت نگاروں کی ناقابلِ فراموش خدمات اور مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں اُن کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی قیمت و افادیت کا پورا اعتراف بھی اس نے اپنی سعادت سمجھ کر یہ کوشش کی کہ وہ بھی سیرتِ نبویؐ پر ایک نئی کتاب لکھ کر اس محبوب و جلیل القدر موضوع کے مصنفین کی نورانی فہرست میں شامل ہو جائے۔

لیکن تنگیٔ وقت اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے مصنف کو تفصیل و اطمینان کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، اس لیے کہ اس کو اس کا خوب تجربہ تھا کہ کسی بڑے آدمی کی سیرت (نبی اور سید الاولین والآخرین و اشرف المرسلین کا معاملہ تو اس سے کہیں برتر و بالا ہے) مصنفین کے لیے سب سے مشکل اور نازک موضوع ہے۔ مصنف کو مشہور و اہم شخصیات کے سوانح حیات اور متقدمین و متأخرین کے حالات زندگی اور کارنامے لکھنے اور بیان کرنے کا شاید اپنے بہت سے معاصرین اور رفقاء سے زیادہ اتفاق ہوا ہے۔ اس نے آغازِ جوانی بلکہ لڑکپن ہی سے جب سے قلم پکڑنا سیکھا، اہلِ حق، مصلحین اُمت اور اصحابِ دعوت و عزیمت کے حالات و تراجم پر لکھنا شروع کر دیا۔ اور اپنے قلم سے سیر و تراجم کے موضوع پر کئی ہزار صفحے سیاہ اور اپنے نصیب کو روشن کیا اور بچپن ہی سے ان اسلافِ کرام اور ائمہ رشد و ہدایت کے ساتھ زندگی گزاری اور خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا اور بہت کچھ لکھنے کی توفیق ہوئی۔ ان سب وجوہ کی بناء پر اس کو اس موضوع کی نزاکت اور اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ تھا، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مصنف پر کوئی خاص رجحان یا ذوق ایسا غالب آتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کو کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر اپنے اس ذوق و رجحان کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ تصنیف اور تحریر صرف اس رجحان اور ذوق کی نمائندگی کرتی ہے جو اس وقت مصنف پر حاوی تھا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی تصویر کشی کے ارادہ سے قلم اٹھاتا ہے لیکن بجائے اس کے خود اپنی تصویر اُتار دیتا ہے وہ اس کے حالات و سوانح پر معروضی اور بے لاگ طریقہ سے روشنی ڈالنا چاہتا ہے لیکن اس کو اپنے ذاتی میلانات و تجربات اور اپنی نقطۂ نظر کی عینک سے دیکھنے اور ان حالات و واقعات کو اپنے مخصوص پیمانوں سے ناپنے لگتا ہے۔

جس کا علم النفس اور اخلاقیات کے کوچہ سے کبھی گزر ہوا ہے، معاصر شخصیتوں کے مطالعہ و مشاہدہ کا اسے کبھی موقع ملا ہے اور اس نے ایک طویل عرصہ ان کی رفاقت و صحبت میں گزارا ہے وہ بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ نفس انسانی کی تہہ تک پہنچنا اور اس کے وسیع آفاق اور فضائے محیط کا علم، پھر اس کی جامع اور نازک تصویر کشی، علوم ادبیہ اور اسالیب بیانیہ کی سب سے

دشوار، نازک اور بہت جلد متاثر ہونے والی صنف ہے اور اس کا تھوڑا بہت حق وہی ادا کر سکتا ہے جو نفس انسانی کے احساسات و جذبات، اس کے سوز و ساز، سرور و شوق اس کی رُوح کی تپش اور دل گداز سے بہت کچھ واقف ہو اور یہ محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ اس کی راتیں کیسی کٹتی ہیں اور اس کے دن کس طرح گزرتے ہیں، وہ اپنے گھر میں کیا نظر آتا ہے اور اپنے رفقاء و دوستوں سے کس طرح پیش آتا ہے۔ اس نے اس کو صُلح و جنگ میں بھی دیکھا ہو اور اشتغال اور سکون، تنگی و راحت اور ضعف و قوت میں بھی، اس لیے کہ انسان کے اندر بہت سے ایسے جذبات و احساسات اور اس کے جمال و کمال کے بہت سے ایسے نادیدہ و ناشنیدہ پہلو بھی ہیں جن کے لیے انسانی لغت میں ابھی تک الفاظ وضع نہیں کیے جا سکے اور جن کی منظر کشی و ترجمانی کے لیے لغت کا بڑے سے بڑا ذخیرہ کفایت نہیں کرتا ع

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

سیرت نبویؐ دوسرے افرادِ بنی آدم میں (بشمول انبیاء و غیر انبیاء) اپنی نزاکت و لطافت، وسعت و جامعیت، زندگی کی نازک سے نازک تفصیلات اور دقیق سے دقیق معانی و مطالب اور دل کی دھڑکنوں اور پیشانی کی سلوٹوں اور نفس انسانی کی مختلف حالتوں کے احاطہ و استیعاب اور اس کی مکمل تشریح و ترجمانی میں سب سے ممتاز اور بلند مقام رکھتی ہے۔ ایسا دراصل علم حدیث کی وجہ سے ممکن ہو سکا جس کی کوئی نظیر دوسرے انبیاؑ یا تاریخ انسانی کی عظیم شخصیتوں میں کہیں نہیں ملتی، سیرت و شمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں، دن رات کے مختلف حصوں میں آپؐ کے اوراد و اذکار اور خدا کے حضور آپ کی آہ سحرگاہی اور گریۂ نیم شبی اور اس اُمت اور پُوری انسانیت کے لیے آپ کی بے قراری و دل سوزی کے جو عجیب نمونے آپ کے ادعیۂ مسنونہ کے وسیع ذخیرہ[1] میں ہمیں نظر آتے ہیں، اس کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، اسی طرح آپ کے اقوالِ ماثورہ اور جوامع الکلم اور آپ کے باکمال وصف نگاروں اور اہل بیت کرام نے آپ کے جو شمائل و خصائل، عادات و معمولات اور روزمرہ کی زندگی کے واقعات بیان کیے ہیں، ادبیاتِ عالم اور تاریخ و انساب کے وسیع لٹریچر نے اس سے زیادہ نازک تصویر کشی اور منظر نگاری اور انسانی خدوخال اور اس کی اخلاقی بلندیوں اور لطافتوں کی اس سے عمیق اور عظیم ترجمانی اب تک ریکارڈ نہیں کی[2] اس لحاظ سے سیرت کے موضوع پر کتاب کی تصنیف میں کسی طرح کی دشواری اور ابہام، معروضات قائم کرنے اور قیاس سے کام لینے کی بالکل ضرورت نہیں جو مصلحین و قائدین کے تذکرہ میں بہت پیش آتی ہے۔ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ان سب سے زیادہ مکمل بھی ہے اور حسین بھی، اس بنیاد قرآن مجید کے وہ صریح نصوص و تاریخ کی ناقابلِ قدر تردید شہادتیں آپ کا جمال صوری و معنوی، شمائل و خصائل، عادات و عبادات اور اخلاق و معاملات

---

[1] اس کی تفصیل کے لیے مصنف کا مقالہ "سیرتِ محمدی دعاؤں کے آئینہ میں" ملاحظہ فرمائیں جس میں سیرت سے ان دعاؤں کا تعلق، انسانی زندگی کے حقائق اور انسانی نفسیات و اخلاقیات سے آپ کی گہری واقفیت اور اس کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک پہلوؤں کی کامل رعایت کا اندازہ ہوتا ہے یہ مقالہ ایک مستقل رسالہ کی شکل میں کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں مصنف کی کتاب منصبِ نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین "مضمون"، "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و حیات قیامت تک کے انسانوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ اور اُسوہ اور اس کے لیے غیبی انتظامات" ساتواں خطبہ ص ۲۰۹ - ۲۱۳۔

کی وہ واضح، روشن اور متعین تفصیلات و جزئیات ہیں جن سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بایں ہمہ وہ حقیقت اور امرِ واقعہ سے بھی اتنی قریب ہیں جس سے زیادہ تصور ناممکن ہے اور باوجود حیاتِ طیبہ پر اتنا طویل زمانہ گزرنے کے اس سے آگے بڑھنے کی خواہش اور طمع بھی کسی انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوتی۔

لیکن ان تمام باتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور مصلحینِ عالم کے سوانح و حالاتِ زندگی بلکہ خود دوسرے انبیاء کرام کی سیرت میں اس قدر فرق و تفاوت اور سیرتِ محمدیؐ کی اس گیرائی اور ہمہ گیری اور جہاں آرائی کے باوجود جو کمالِ نبوت اور کمالِ آدمیت کی سدرۃ المنتہیٰ اور معراج ہے، ہم اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آپ کی زندگی اور مکارمِ اخلاق کی صحیح تصویر اور آپ کے ان معجزات کا استیعاب و تفصیل جن کی جلوہ ریزی آپ کی پوری سیرت و دعوت اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ آپ کا معاملہ، آپ کا حسنِ صورت و سیرت و کمالِ ظاہر و باطن، آپ کی محبت و شفقت اور دل داری و دلنوازی، آپ کی دعائیں اور خدا سے عرضِ حال، بنی نوعِ انسان اور انسانیت کے مستقبل کے لیے آپ کی بے قراری و دل سوزی، آپ کی فصاحت و بلاغت، علم و حکمت اور کمال و جامعیت کی ان روشن و جہاں نواز نشانیوں اور زندہ و لافانی معجزوں کا مفصل و مکمل بیان قریب قریب ناممکن ہے۔ سیر و شمائل کی کتابوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ (ان کے کمال دیدہ وری و عرق ریزی کے اعتراف کے ساتھ) آپ کے جمالِ سیرت اور کمالِ نبوت کا صرف ایک ہلکا سا عکس ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان مصنفین کی سعی محمود ہے کہ انہوں نے اس قدر ضبط و اتقان اور غایت درجہ اہتمام کے ساتھ ان حالات کو قلمبند کیا اور اس کی بہترین جزا اللہ تعالیٰ ان کو عطا فرمائے گا، یہ ایسی مشترک، عالم گیر اور غیر مختتم دولت ہے جس میں ہر فرد بشر، ہر انسانی نسل اور انسانوں کا ہر گروہ اور ہر طبقہ ہدایت و روشنی اور اتباع و پیروی میں اپنا حصہ رسدی پا سکتا اور اپنے طالعِ خفتہ کو بیدار کر سکتا ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ و الیوم الاخر و ذکر اللہ کثیراً ط (سورۃ الاحزاب الایۃ ۲۱)	تم کو پیغمبر خدا کی پیروی کرنی بہتر ہے یعنی اس شخص کو جس کو خدا سے ملنے اور روزِ قیامت کے آنے کی امید ہو اور وہ خدا کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔

شاید یہی اسباب و وجوہ تھے جن کی وجہ سے سیرتِ نبویؐ کے موضوع پر کسی نئی تالیف کی مجھے اب تک ہمت نہ ہو سکی اور میں اس عظیم الشان کام کو اپنی حیثیت سے بہت بلند سمجھتا رہا۔ میرے بعض فاضل اور محترم دوستوں[1] نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی کہ میں عربی زبان میں سیرتِ نبوی پر ایک ایسی کتاب تیار کر دوں جس میں نئی نسل کے ذہن اور ذوق اور اس کے فہم و نفسیات کی موجودہ سطح کا خیال رکھا گیا ہو، نیز ان نئے تقاضوں اور ضرورتوں اور اس طرزِ تحقیق اور طرزِ کلام کی اس میں پوری رعایت ہو، جو موجودہ دور میں رائج ہے اس لیے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص اسلوبِ بیان اور زبان ہوتی ہے جس کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ دواؤں اور غذاؤں کی بھی خاص خوراکیں اور ایک خاص ترتیب ہوتی ہے جو حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے

[1] بالخصوص مصنف کے فاضل و محترم دوست شیخ محمود الصواف رکن مجلس تاسیسی رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ و مشیر وزارتِ تعلیم حکومت سعودیہ۔

لیکن یہ سب کچھ (جیسا کہ اوپر اشارے کیے جا چکے ہیں) سیرت کو اپنی خواہشات و اغراض اور ان علمی نظریات کا تابع بنائے بغیر ہونا چاہیے جو صبح و شام بدلتے رہتے ہیں اور اس کو ان شبہات و اعتراضات کی آمیزش اور آلودگی سے پاک و صاف ہونا چاہیے جو اکثر مذہبی تعصب، کم علمی و ناواقفیت یا سیاسی مفادات و اغراض سے پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس معاملہ میں شرح صدر نصیب فرمایا اور میں پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو گیا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ میرے سارے لمحات اور سانسیں اسی ماحول میں گزرنے لگیں، میں نے اس سلسلہ میں نہ صرف سیرت و حدیث کی کتابیں پڑھنا شروع کیں بلکہ قدیم اور جدید لٹریچر میں جو بھی کام کی چیز مجھے ملی، میں نے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اس کے بعد میں نے اس موضوع پر جو سب سے زیادہ مستند کتابیں لکھی گئی ہیں، اس پر اعتماد کرتے ہوئے اس مبارک کام کا آغاز کیا۔ اس میں سرِ فہرست یہ کتابیں تھیں کتب صحاح، سیرت ابن ہشام، امام ابن القیم کی زاد المعاد اور سیرت ابن کثیر (جو اصلاً ان کی بڑی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں شامل تھی۔ پھر اس نے چار جلدوں میں ایک مستقل تصنیف کی شکل اختیار کر لی[1] عہد حاضر میں اس موضوع پر جو کچھ کام ہوا ہے اور مغربی زبانوں کے اہم ماخذ سے بھی (جن سے سیرت کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے اور اس عہد پر اور ان حکومتوں اور سلطنتوں نیز اس زمانہ کے معاشرہ اور سوسائٹی پر روشنی پڑتی ہے) سے بھی استفادہ کی کوشش[2] کی گئی اور اس کی کوشش کہ کتاب علمی اور تربیتی و دعوتی دونوں پہلوؤں کی جامع ہو اور ان میں سے کوئی ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آ پائے، نیز اس میں وہ زندہ منہ سے بولتے ہوئے اور زندگی و حرارت سے بھرے ہوئے اقتباسات زیادہ سے زیادہ پیش کیے جائیں جن سے اسوۂ نبوی کے اتباع اور پیروی کا جذبہ پڑھنے والے میں خود بخود پیدا ہوتا ہے اور جن کی نظیر کسی انسان کی سیرت، کسی عظیم سے عظیم شخصیت کے سوانح کسی نسل اور قوم کی تاریخ اور کسی دعوت و تحریک اور دین و مذہب کے نقشہ میں نہیں ملتی، یہ سب کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر قاری کے سامنے رکھ دیا جائے کہ جمالِ فطرت اور حسنِ حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔

روئے دل آرام را حاجت مشاطہ نیست

---

[1] طبع عیسیٰ البابی الحلبی و شرکاہ ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) بتحقیق استاد مصطفیٰ العبد الواحد

[2] عربی و دیگر زبانوں کے مآخذ کا انڈکس کتاب کے آخر میں ملاحظہ کریں۔

ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

قرآن اور عملی قرآن یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جس نے حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا وہ قرآن کو دیکھے لیکن جنھوں نے پورا قرآن نہیں دیکھا تھا اُن کے لئے حضور انور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کافی تھے[1]۔ اُن کی حیاتِ طیّبہ کا ایک ایک واقعہ، قرآن کی ترجمانی کرتا ہے اور اُس کے احکام کی صحیح عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ جس نے اُن کو دیکھ کر قرآن پڑھا اُسی نے ہدایت پائی اور جس نے اُن کو دیکھے بغیر اُس کا مطالعہ کیا وہ ہدایت سے محروم رہا۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد وغیرہ جیسے اہم قرآنی احکام پر عمل کس طرح کیا جائے اور معروف و منکر کو کس طرح پہچانا جائے؟ اس کا جواب صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ سے مل سکتا ہے۔ گویا قرآن کی ہر آیت اور ہر واقعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حقانیت کی تصدیق ہے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ اُنہی سے اس کا تعلق ہے۔ مولانا جامیؒ نے صحیح فرمایا تھا کہ:- ؏

ہمہ قرآن در شانِ محمدؐ

اس حقیر سی کوشش میں اسی قول کی تشریح اور توضیح ہے۔ سعد اللہ مسیحا پانی پتی رحؒ نے کس جذبے سے کہا ہوگا:- ؎

زعشقِ مصطفےٰؐ دل ریش دارم رقابت با خدائے خویش دارم

لیکن یہ غلام صرف اللہ پاک اور اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی رضا کا محتاج ہے۔ اور محمد بن سلیمان الجزولیؒ کے الفاظ میں یہی عرض کرتا ہے:-

یَارَحْمَۃَ اللّٰہِ اِنِّیْ خَآئِفٌ وَّجِلٌ یَانِعْمَۃَ اللّٰہِ اِنِّیْ مُفْلِسٌ عَانٍ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت، رأفت اور شفقت سے محرومی کیسی؟ وہ سب کے لئے ہیں اور اُن کی امتیازی خصوصیات ایسی ہیں کہ جن پر ساری کائنات قربان ہے۔ دیکھیے کچھ خصوصیات یہ ہیں:-

۱- آپ ہی اشرف الانبیاؑ اور آپ ہی افضل البشر ہیں۔ (خیر البریّہ)۔

---

[1] سورۂ توبہ کی آیت ... میں ہے کہ شروع شروع کے مہاجرین اور انصار، نیز وہ جنھوں نے اُن کی پیروی کی وہ سب جنّتی ہیں۔ یہ شروع شروع کے لوگ وہ تھے جبکہ قرآن پاک پورا نازل نہیں ہوا تھا اور اُن کو صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوئی تھی۔

۲- آپ ہی خاتم النبیین ہیں۔
۳- آپ ہی تمام انسانوں کے لئے (کافۃ للناس) رسول ہیں۔
۴- آپ ہی رحمۃ للعالمین ہیں۔
۵- آپ ہی نے دین کو مکمل کیا (الیوم اکملت لکم دینکم)
۶- آپ ہی کے قرآن کو بے مثل قرار دیا گیا اور رہتی دنیا تک اس کی جیسی سورۃ بنا لانے کا چیلنج دیا گیا۔
۷- آپ ہی کے قرآن کو چھونے والے مُطہّر کہے گئے ہیں (لا یمسّہٗ الا المطھرون) جو لوگ مطہّر کیے گئے ہیں وہی اُسے چھو سکتے ہیں (حفظ کر سکتے ہیں) اور جو مُطہّر نہیں کیے گئے وہ حفظ نہیں کر سکتے۔
۸- آپ ہی کے قرآن کو ہر طرح محفوظ رکھا گیا۔ جب کہ کوئی چھوٹی سی کتاب بھی حفظ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو قائم نہیں رہتی
۹- ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام تشریف لائے لیکن صرف آپ کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھا گیا اور سب کے صحیفے منسوخ، سب کے اقوال و تعلیمات مفقود اور سب کے حالات بلکہ نام بھی (سوائے اُنتیس ناموں کے جو قرآن پاک میں آئے ہیں) ہمیشہ کے لیے محو۔ لیکن اس کے برعکس آپ کا قرآن محفوظ، آپ کے اقوال محفوظ، آپ کے حالات کی تمام جزئیات محفوظ اور حالات بھی ایسے بے داغ کہ "جو بات خلوت میں دیکھو وہ جلوت میں بیان کر دو اور جو بات چند لوگوں میں دیکھو وہ سارے عالم میں پہنچا دو"۔ پوری کائنات میں کوئی اور بھی ہے جو اس طرح فرما سکے؟
۱۰- صرف آپ کے قول کو وحی کہا گیا (وما ینطق عن الھوٰی ہ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ)[۱]
۱۱- صرف آپ کو معراج پر بلایا گیا اور اتنا قریب کہ فکان قاب قوسین او ادنیٰ
۱۲- صرف آپ کو اللہ پاک نے اپنے ناموں میں سے کئی نام دیئے۔ رؤف۔ رحیم۔ نور۔ مبین۔ بر۔ عزیز وغیرہ۔
۱۳- صرف آپ کے ذکر کو (سب سے زیادہ) بلند کیا گیا۔ اللہ کے ساتھ آپ کا نام بھی وضو، اذان، خطبہ، نماز، درود اور سلام وغیرہ میں لیا جاتا ہے اور جتنا آپ کو یاد کیا جاتا ہے پوری دنیا میں کسی کو بھی نہیں۔ بعض حضرات تو ہزاروں مرتبہ ہر روز درود پڑھتے ہیں۔
۱۴- صرف آپ کی محبت سب سے زیادہ ہے۔ گناہ گار، سیاہ کار، بدکار اُمتی بھی آپ کے نام پر مرنے مٹنے کو تیار ہے اور آپ کی شان میں کسی گستاخی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔
۱۵- صرف آپ کو کوثر عطا کیا گیا۔ عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ تو گویا آخرت میں بخشش کرانے کا پورا اختیار آپ کو دیا گیا۔

---

[۱] آپ کو خواب میں بھی وحی ہوتی تھی۔ قصیدہ بردہ میں ہے:۔

لَا تُنْکِرِ الْوَحْیَ مِنْ رُؤْیَاہُ اِنَّ لَہٗ　　قَلْبًا اِذَا نَامَتِ الْعَیْنَانِ لَمْ یَنَمِ

۱۶- صرف آپ کو ہمیشہ پیار کے ناموں سے قرآن پاک میں یاد کیا گیا۔ دوسرے انبیا علیہم السلام کو یا آدم، یا نوح، یا ابراہیم، یا موسیٰ، یا عیسیٰ کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن آپ کو یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا بلکہ اسے کملی والے، اسے لحاف والے، اسے طاہر وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا۔

۱۷- اللہ نے اپنا محبوب بنانے کے لیے آپ کی غلامی کو شرطِ اوّل قرار دیا (قل ان کنتم تحبّون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ)۔

۱۸- صرف آپ کا "اسوۂ حسنہ" عالم کے لیے ہے۔ پہلے آپ کو عمل سکھایا گیا، پھر آپ کے عمل پر عمل کرنے کا نام "عملِ صالح" قرار دیا گیا۔

۱۹- صرف آپ کے غلاموں کے لیے یہ فضیلت ہے کہ "ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے"۔

۲۰- جتنی بُرائی ہوگی اُتنی ہی سزا دی جائے تو یہ عدل ہے اور ایک نیکی اگر دس نیکیوں کے برابر بھی جائے تو یہ رحمت ہے۔ (سورۃ الانعام - ۱۶۱)۔ یہ بات رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اُن کی اُمّت کے لیے مخصوص ہے۔

۲۱- صرف آپ کے غلاموں کے لیے یہ نعمت مخصوص ہے کہ شبِ قدر ایک ہزار مہینوں (کی عبادت) سے افضل ہے۔

۲۲- صرف آپ کو "النبی الاُمّی" کہا گیا۔ لفظ "اُمّی" کے معنی میں علما کا اختلاف ہے۔ اُمّ القریٰ (مکہ معظمہ) یا اُمّت کثیرہ یا اُمّ (ماں کے پیٹ سے پاک صاف پیدا شدہ) سے تعلق بتاتے ہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ وہ ہستی جس کو صرف اللہ پاک نے تعلیم دے کر ایسا معلّم بنایا ہو جس سے انسان کو ہر اُس چیز کا علم حاصل ہُوا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (ویعلّمکم مالم تکونوا تعلمون - البقرہ)

۲۳- صرف آپ نے تمام سابقہ کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا لیکن کیا سابقہ اُمّتوں والے بھی (باوجود اُن کے پیغمبروں کی پیش گوئیوں کے) ایسے ہیں جو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے قرآن پر ایمان رکھتے ہوں؟

پھر یہ بھی روایت ہے کہ صرف آپ کی وجہ سے کائنات خلق ہوئی (لولاک لما خلقت الافلاک)

یہ بھی روایت ہے کہ شیطان (خواب میں) صرف آپ کا متمثّل نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی روایت آتی ہے کہ صرف آپ کا سایہ نہ تھا۔

یہ بھی روایت (بخاری) ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن مسعودؓ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پاک سنا رہے تھے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے:- فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (اُس وقت کیسا ہوگا جب ہر ایک اُمّت پر خدا ایک گواہ کھڑا کرے گا اور آپ کو ہم سب اُمّتوں پر شہادت کے لیے کھڑا کریں گے)۔ فرمایا۔ بس ٹھہرو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ "حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مُطیع کو بشارت پہنچاتے، عاصی کو ڈر سناتے، بے خبروں کو پناہ دیتے۔ خدا کے بندے اور رسول۔ جملہ کاروبار کو اللہ پر چھوڑ دینے والے، نہ درشت خُو، نہ سخت گو۔ نہ چیخ کر بولتے۔ بدی کا بدلہ ویسا ہی نہ دیتے۔ معافی مانگنے والے کو معاف کر دیتے، گنہگار کو بخشش دیتے، اُن کا کام مذہبوں کی کجی کو درست کر دینا ہے۔ اُن کی تعلیم اندھوں

02061

کو آنکھیں، بہرے کو کان دیتی، غافل دلوں کے پردے اُٹھا دیتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک خوبی سے آراستہ، جملہ اخلاقِ فاضلہ سے متصف۔ سکینہ اُن کا لباس۔ نیکوئی اُن کا شعار۔ تقویٰ اُن کا ضمیر۔ حکمت اُن کا کلام۔ عدل اُن کی سیرت ہے۔ اُن کی شریعت سراپا راستی۔ اُن کی ملت اسلام۔ ہدایت انکی رہنما ہے۔ وہ ضلالت کو اُٹھا لینے والے گم ناموں کو رفعت بخشنے والے۔ مجہولوں کو نام ور کر دینے والے قلت کو کثرت اور تنگ دستی کو غنا سے بدل دینے والے ہیں"۔ ایسے پیارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق پیاری پیاری باتیں اب قرآن پاک میں دیکھیے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الفاتحہ

سورۃ الفاتحہ، قرآن پاک کا مقدمہ ہے۔ اس میں اسم ذات (اللہ) کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:۔

۱۔ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (خواہ کوئی اُسے جانے اور مانے، خواہ نہیں)۔

۲۔ رحمٰن ہے۔ (قرآن پاک میں ۵۲ جگہ یہ لفظ[۵۱] بطورِ صفت نہیں، بلکہ بطورِ عَلَم استعمال ہُوا ہے)۔ ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ رحمٰن وہ ذات ہے کہ جب اُس سے مانگا جائے تو وہ عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ اُس سے نہ مانگا جائے تو وہ غضب میں آئے (فتح الباری ۱۱۸/۸)

۳۔ رحیم ہے۔

۴۔ یوم دین کا مالک ہے۔

۵۔ وہی عبادت کے لائق ہے۔

۶۔ وہی مدد فرماتا ہے۔

۷۔ وہی صراطِ مستقیم کے لیے ہدایت فرماتا ہے۔

۸۔ اُس میں غضب کی صفت بھی ہے اور

۹۔ وہ راہِ راست سے ہٹا دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

اللہ پاک کی اِن تمام صفات کی پیہم تبلیغ اور ہر رکعت میں ان صفات کی تسبیح، صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اور وہ بھی مکی زندگی ہی سے کرائی جا رہی ہے اور قیامت تک کرائی جائے گی، کیونکہ صرف وہی اس ابلاغ کے اہل ہیں۔ (سورۃ الحجر کی آیت ۸۷ میں بھی اس سورۃ الحمد کا ذکر آئے گا۔)

---

[۵۱] رحمٰن غالباً عبرانی لفظ ہے اور وہ اسلام سے پہلے عموماً عربوں میں مستعمل نہیں تھا۔ دیکھیں ارض القرآن از مولانا سلیمان ندویؒ جلد ۲۔ ص ۲۳۹۔

سورۃ البقرہ

سورۃ الفاتحہ میں بندے کو ہدایت حاصل کرنے کی دعا سکھلائی گئی تھی۔ الٓمّٓ سے والنّاس تک اسی دعا کا جواب ہے جو ہدایت ہی ہدایت ہے اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ شروع میں مومن، کافر اور منافق کی پہچان بتائی گئی ہے، پھر علم کی اہمیت اور اس سے حاصل کی ہوئی صلاحیت کو صحیح طریقے پر بروئے کار لانے کی تعلیم ہے اور مختلف انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے تاکہ عقائد اور اصلاح معاشرہ میں صحیح رہبری حاصل ہو سکے اور حقوق اللہ، نیز حقوق العباد میں کوتاہی نہ ہو۔

یہ سورۃ الٓمّٓ سے شروع ہوتی ہے جنھیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔ پورے قرآن پاک میں جہاں جہاں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے بعد ہی قرآن پاک یا اس کی آیات کا ذکر آیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حروف میں خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی سے ہے۔ (گو کہ ان حروف کے اصل معنی پوشیدہ رکھے گئے ہیں)

پھر متقین کی تعریف آتی ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو روزی دی گئی ہے اس میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کرتے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے قبل کے انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحائف پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ نماز اور زکوٰۃ کے واسطے حکم ہے لیکن نماز جیسی سب سے اہم چیز کس طرح ادا کی جائے؟ اس سوال کا جواب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہی سے مل سکتا ہے۔ گویا قرآنِ پاک کی عملی تفسیر صرف ذات گرامی ہے جس کے بغیر قرآن پاک بھی مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

تیسرے رکوع میں منافقوں اور کافروں کو توحید باری سمجھائی جا رہی ہے اور اسی رکوع میں رہتی دنیا تک کے لیے چیلنج ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ قرآن دیا گیا ہے کہ پوری کائنات میں اور ہر زمانے میں کسی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس قرآن کی کسی سورۃ کے مقابلے میں کوئی سورۃ بنا سکے۔ یہ امتیازی شان صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی گئی ہے۔ چوتھے رکوع میں انسان کو خلافتِ الٰہیہ کے منصب عطا ہونے کا واقعہ یاد دلایا ہے کہ یہ منصب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں بخشا گیا ہے۔ پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کر کے مسلمانوں کو سبق دیا گیا ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں ہر مشکل کا علاج عزم، استقلال اور رجوع الی اللہ ہے جس کی عملی تعلیم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہے۔ چھٹے اور ساتویں رکوع میں بنی اسرائیل کے واقعات اور ان پر اللہ پاک کے احسانات کا ذکر ہے اور آٹھویں رکوع میں بتایا ہے کہ عزت و فضیلت صرف ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے۔ امم سابقہ میں ان کے انبیاء علیہم السلام کی پیروی کا نام ایمان اور اس کے بعد جب کہ وہ قوانینِ سابقہ منسوخ ہو چکے اور قرآن پاک آ گیا تو اب صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا نام ایمان اور عمل صالح ہے۔ آیت نمبر ۶۲ میں یہی بات فرمائی گئی ہے۔

نویں رکوع میں پھر بنی اسرائیل کی قلبی کیفیات اور حالات کا بیان ہے اور دسویں رکوع میں پھر ایمان اور عملِ صالح کی تشریح ہے۔ گیارھویں رکوع میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی ترویج کا ذکر ہے کہ اس کے لئے زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام بھی تشریف

لائے لیکن یہود نے اُن کو قتل کر دیا۔ آیت ۹۴ میں فرمایا ہے کہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ " اگر اللہ کے یہاں آخرت کا گھر اور لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے نہیں، محض تمھارے لیے ہے تو ذرا موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو "۔ یہاں یہی فرمایا گیا کہ یہود اللہ کے لیے مرنے کی تمنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ایسی موت کے بڑے آرزو مند ہوتے ہیں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک صحیح لیڈر کی یہی پہچان بتائی ہے :-

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

آگے چل کر اسی رکوع میں اللہ پاک نے فرشتوں کے دشمنوں (یہود وغیرہ) کو اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ اسی آیت سے ملائکہ پر ایمان لانا بھی ثابت ہوتا ہے۔ پھر اسی رکوع میں (آیت ۱۰۱) فرمایا ہے کہ " اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے جو تصدیق فرماتے ہیں اس (توریت) کی جو اُن (یہود) کے پاس ہے تو اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب (توریت) کو پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ (اس کو) جانتے ہی نہیں۔

تیرھویں رکوع میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو اپنے آقا سے خطاب کرنے کا طریقہ سمجھایا جا رہا ہے کہ " اے ایمان والو (ایسے ذومعنی الفاظ استعمال نہ کیا کرو جن سے دشمن دین کوئی توہین کا پہلو نکال سکتا ہو۔ مثلاً اپنے آقا کو متوجہ کرنے کے لیے) تم 'راعنا' نہ کہا کرو، 'اُنظرنا' (ہماری طرف توجہ کی نظرِ عنایت فرمایے) کہا کرو اور ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے "۔ آیت ۱۰۶ میں سابقہ قوانین کے منسوخ کیے جانے اور نئے قانون کے نفاذ کا ذکر ہے کہ اس میں " خیر " ہے۔

آیت ۱۰۸ میں (آداب تخاطب سکھلانے کے بعد اب) یہود کی طرح کج بحثی سے منع کیا گیا ہے کہ وہ طریقہ یہود کا تھا جو شعارِ اسلام نہیں۔

چودھویں رکوع میں پھر یہود و نصاریٰ کی بنیادی کمزوریوں کا ذکر ہے تاکہ مسلمان اُن کی بُرائیوں سے محفوظ رہیں۔ اور اسی رکوع کی آیت ۱۱۹ میں فرمایا کہ " (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے آپ کو (دین) حق کے ساتھ بھیجا، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (بنایا) اور آپ سے اہلِ دوزخ کے متعلق سوال تک نہ کیا جائے گا "

پھر آیت ۱۲۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ذکر ہے کہ " وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب (قرآن) دی وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جو پڑھنے کا حق ہے (یعنی زبان اور دل کی یکسانیت کے ساتھ پڑھتے ہیں) - وہی اس پر یقین لاتے ہیں ...... "

پندرھویں رکوع میں ابراہیم علیہ السلام کے درجاتِ عالیہ کا ذکر ہے کہ اُن کی آزمائش کس کس طرح کی گئی اور وہ کس طرح پورے اُترے۔ آیت ۱۲۵ میں فرمایا کہ " اور جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے لیے (اللہ کی طرف) رجوع ہونے اور امن کی جگہ بنا دیا اور (حکم دیا کہ) ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسمٰعیل (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لئے، پاک کر رکھو (تاکہ ان کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی اس مقام کو اپنا مرکز بنائیں)۔ اسی رکوع کی آخری آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کی دعاؤں کا ذکر ہے جب

وہ خانۂ کعبہ کی بنیاد قائم کر رہے تھے اور فرماں بردار اولاد کی جماعت کے لیے بھی دعا کر کے ایک ایسے رسول (اسی اولاد میں سے) کی تمنا ظاہر کر رہے تھے جو" تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب سکھائے اور دانائی کے راز بتائے اور ان کو مزکّی کرے۔ بےشک تو بہت بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے۔" ع

دعائے خلیلؑ و نوید مسیحاؑ

اسی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے تھی جس کی خاطر یہ کائنات بنائی گئی اور کعبہ کو جس کا مرکز قرار دیا گیا۔

سولھویں رکوع میں ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کی قبولیت کا ذکر ہے اور یہ کہ ملّتِ ابراہیمؑ (یعنی اسلام) کی پیروی ہی ایمان اور دانش کا اصل معیار ہے۔ آیت ۱۳۶ میں کتبِ سابقہ پر ایمان لانے (اور قرآن پر عمل کرنے) کا عقیدہ ہے اور یہ کہ مسلمان "ان پیغمبروں میں کسی ایک میں فرق نہیں کرتے۔"

آیت ۱۴۰ میں اللہ پاک نے اُن لوگوں کو ظالم کہا ہے جنھوں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے متعلق شہادتوں (پیش گوئیوں) کو چھپا دیا ہے ——— پھر آخری آیت (۱۴۱) میں اس طرح مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ" وہ ایک اُمت تھی جو گذر چکی۔ اُن کے لیے تھا جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا اور جو کچھ وہ لوگ کرتے رہے اُس کی پُرسش تم سے نہیں ہوگی۔"

——— اب دوسرا پارہ شروع ہوتا ہے ———

مدینہ منورہ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ہوتی رہی لیکن جب تحویلِ قبلہ کا حکم ملا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے عین نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف پھیر لیا یعنی صف آگے ہو گئی اور امام پیچھے (مسجدِ قبلتین کا نام اسی وجہ سے ہے)۔

اس پارے کے پہلے رکوع کی تمام آیتوں میں اسی موضوع کا ذکر ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابع داری پر زور دیا گیا ہے اور یہود سے گریز و احتراز کرنے کا حکم ہے کہ وہ تحویلِ قبلہ پر اعتراض کر رہے تھے۔ آیت ۱۵۰ میں ہے کہ" اور (اے رسولؐ) آپ جس جگہ تشریف لے جائیں نماز میں اپنا رُخ خانۂ کعبہ کی سمت کر لیا کیجیے اور (اے مسلمانو) جس جگہ بھی تم ہوا کرو تم بھی اسی سمت اپنا منہ پھیر لیا کرو تاکہ (یہودی) لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع نہ رہے، سوائے اُن کے جو بے انصاف ہیں (جو حق پوشی کرتے ہیں) سو تم (اُن کے اعتراضوں سے) مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور یہی تکمیلِ نعمت ہے تاکہ تم راہِ حق پا جاؤ۔" آیت ۱۵۱ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ ہماری آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں، تمھارا تزکیہ کرتے ہیں، تم کو علمِ کتاب اور علمِ حکمت (قرآنی) سکھاتے ہیں۔ (آلِ عمران ۱۶۴۔ جمعہ ۲ میں بھی یہی مضمون ہے) اور آیت ۱۵۲ میں ہے کہ" پس تم مجھ کو یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا اور تم میرا احسان مانو اور میری ناشکری مت کرنا۔" گویا اُس کے ذکر اور شکر سے اسلام کی تمام نعمتیں مل سکتی ہیں اور کفر سے دوری ہوتی ہے۔ اور یہ ذکر اور شکر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال تابع داری سے حاصل ہوتا ہے۔ البقرہ کے انیسویں رکوع میں (یعنی پارۂ دوم کے تیسرے رکوع میں) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں کے درجات کی بلندی کا ذکر ہے کہ جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ مُردہ نہیں، زندہ ہیں۔ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے اللہ کی اعانت حاصل ہوتی ہے۔ ناگوار کو گوارا کرنا اور رضائے الٰہی کو ہر بات پر مقدم رکھنا

ان شہدا کا منصب ہے جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلام ہیں اور انہی غلاموں کو حیاتِ ابدی حاصل ہے اور انہی کو اُن کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں حاصل ہیں۔ پھر صفا اور مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے جو رضا و تسلیم اور صبر و صلوٰۃ والوں کی یادوں سے وابستہ ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام اور ہاجرہ علیہا السلام کی یادگار ہیں جن کی اولاد میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں اور جن کے قرآن کو پوشیدہ کر دینے والوں پر اللہ پاک لعنت فرماتا ہے۔ آئندہ رکوع میں اللہ پاک کے ماننے، جاننے اور پہچاننے کے لیے سات نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کی تبلیغ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل سے وابستہ ہے اور جن کے نہ پہچاننے والوں کے لیے سخت عذاب ہے — اس کے بعد کے رکوع میں مسلمانوں کو اپنے معاشرے کے سنوارنے کے لیے حکم ہے اور طیب[1] چیزوں کے استعمال کرنے کے لیے ارشاد ہے تاکہ برائی اور بے حیائی سے بچ سکیں کیونکہ حرام چیزوں کے استعمال سے برائی کی طرف میلان ہوتا ہے اور نافرمانی پیدا ہوتی ہے جس کے لیے عذاب ہے۔ بعد کے (بائیسویں) رکوع میں (۱) صحتِ عقیدہ (۲) حسنِ معاشرہ اور (۳) تہذیبِ نفس کے لیے احکام ہیں جن کا مجموعہ اسلام ہے تاکہ تقویٰ پیدا ہو۔ یعنی ایمان لائیں اللہ پر، قیامت، فرشتوں اور کتاب پر (قرآن پر جو پہلے کی کتابوں کی بھی تصدیق کرتا ہے) اور پیغمبروں پر (جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بھی تصدیق کرتے رہے ہیں)۔ اس کے بعد حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے تاکہ حسنِ معاشرہ حاصل ہو اور تہذیبِ نفس کے لیے نماز، زکوٰۃ، ایفائے وعدہ اور مصیبت، تکلیف اور جنگ میں صبر جیسے محاسن حاصل ہو سکیں۔ قصاص کا فرض ہونا، میراث میں اپنے عزیزوں کے لئے وصیت کر جانا بھی حسنِ معاشرہ اور تہذیبِ نفس کے لئے ضروری ہے آئندہ آیتوں میں روزے (صیام) کا حکم ہے جو اسی تہذیبِ نفس کیلئے ضروری ہے اور اس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، پھر حج کا ذکر آتا ہے جس کے لیے چاند کے مہینوں کے تعیّن اور اس کی مصلحت کی طرف اشارہ ہے۔ پھر جہاد کی تعلیم بھی بیان فرمائی ہے کہ "اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اللہ پاک کی خوشنودی (حاصل کرنے) کے لیے اپنی جان کو بھی بیچ ڈالتا ہے ...."۔ گویا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے اللہ پاک نے یہاں نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد جیسے فرائض کو بالترتیب سمجھایا ہے اور فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو، تم کلیتہً اسلام میں داخل ہو جاؤ (یعنی ہر لحاظ سے تم مسلمان بن جاؤ)" — آئندہ رکوع میں پھر بنی اسرائیل کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود اللہ پاک کی نعمتوں کی قدر نہیں کی — اس کے بعد بشارت آتی ہے کہ اگر مسلمان تکلیف اور آزمائش میں ثابت قدم رہیں تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے صدقے میں اُن کے معمولی سے اضطراب پہ اللہ پاک کی رحمتیں نازل ہونے لگتی ہیں۔ پس مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہراساں نہ ہو اور اللہ پہ نظر رکھے۔ اس کے بعد یہ آیت آتی ہے :-

" (اے رسولؐ) آپ سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجیے کہ جو کچھ مال خرچ کرو تو تمہارے ماں باپ کا حق ہے اور (پھر درجہ بدرجہ) قرابت داروں اور مسکینوں کا اور راہ کے مسافر کا اور جو کچھ بھی تم نیکی کرو اللہ خوب جانتا ہے۔" اس کے بعد ہی پھر جہاد کی ترغیب ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کفار کے دھوکے میں نہ آئیں کہ وہ لوگ تم کو اگر شہرِ حرام میں ماریں تو تم خاموش رہو بلکہ اُن سے جنگ کرو تاکہ اُن کے فتنے کا انسداد ہو۔ پھر مسلمانوں کے

---

[1] طیب وہ ہے جس سے انسانی زندگی کو کوئی مضرت نہ ہو۔ اس کا تعین حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی وجہ سے کائنات میں پہلی بار ہوا ہے۔

لیے ہجرت کی اجازت آتی ہے کہ "بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" پھر شراب اور جُوئے کو "اثم کبیر" فرمایا ہے کہ اس سے معیشت اور معاشرت دونوں کا نقصان ہے اور عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں یتیموں کے ساتھ بھلائی، مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کی ممانعت اور سب کچھ دے کر خود کو کنگال بنا لینے کی ممانعت بھی آئی ہے۔ پھر حیض کا بیان ہے کہ یہود ایسی حالت میں اپنی عورتوں کو دیکھتے بھی نہ تھے اور نصاریٰ ایسی حالت میں بھی مباشرت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے صحیح راہ تجویز فرمائی کہ ایسی حالت میں صرف الگ رہو۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی شخص اپنی بیوی کو پسند نہ کرتا اور نہ یہ چاہتا کہ کہیں دوسری جگہ اُس کی شادی ہو تو وہ قسم کھا لیتا کہ میں کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ جاؤں گا۔ اس طرح وہ بیچاری نہ شوہر والی سمجھی جاتی اور نہ بیوہ ــــ اللہ پاک نے اس ظالمانہ طریقے کو ناپسند فرمایا۔ پھر طلاق شدہ عورتوں کا ذکر ہے کہ وہ کتنی مدت کے اندر اپنے شوہروں سے رجوع ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد تین رکوع میں طلاق کے مسائل اور بچوں کی پرورش وغیرہ کے مسائل بیان فرمائے ہیں تاکہ خانگی زندگی اصلاح پذیر ہو سکے۔ پھر حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ سے کم از کم پانچ نمازوں کا حکم پایا جاتا ہے ــــ "صلوات" جمع ہے تثنیہ نہیں۔ اس لیے درمیانی نماز وہی ہو سکتی ہے جو کم از کم دو دو نمازوں کے درمیان ہو۔ خانگی زندگی کی اصلاح کے بعد انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے لیے احکام آ رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کی قومی اور ملی زندگی صحیح بن جائے، جہاد کا پھر حکم ہے اور قوم بنی اسرائیل کے بعض واقعات آ جاتے ہیں کہ اُن کے فتنوں کا سدِ باب کرنے کے لیے داؤد علیہ السلام نے کس طرح جالوت کو قتل کیا۔ ان تمام مسائل اور واقعات کے بعد پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ "یہ آیتیں اللہ کی (ہماری) ہیں، ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں اور بیشک آپ ہمارے رسولوں میں سے ہیں"۔ (بنی اسرائیل کے واقعات سے مسلمانوں کو سبق دیا گیا ہے اور انفرادی، نیز اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے لیے مختلف مسائل سمجھائے گئے ہیں)۔

اس کے بعد تیسرا پارہ شروع ہوتا ہے ــــ

"یہ سب پیغمبر (جو ہم بھیجتے رہے ہیں) ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ پاک نے باتیں کیں اور بعض کے درجات (دوسری طرح) بلند کیے ....." ان انبیا علیہم السلام نے واضح نشانیاں پہنچائیں، پھر بھی کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نہیں لائے۔ اب ایمان والوں کو فرمایا ہے کہ جو کرنا ہے ابھی کر لو اور اُس روزی میں سے جو تم کو دی گئی ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن (قیامت) آ جائے جب کہ کوئی سودا نہ ہوگا اور نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آئے گی۔ پھر آیۃ الکرسی آتی ہے جس میں اللہ پاک کی توحید اور عظمت کو نہایت بلیغ انداز میں سمجھایا گیا ہے ــــ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بتایا ہے کہ اُن کے لائے ہوئے دین کو جو پکڑے گا اُس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ (عروۃ الوثقیٰ) پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ پھر ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا واقعہ اور دوسرے پیغمبر (حضرت عُزیر علیہ السلام یا حضرت یرمیاہؑ) کے واقعات میں اللہ پاک کی قدرت اور عظمت کا ذکر آیا ہے اور اللہ پاک کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو سراہا گیا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم خوئی کا اس طرح بیان ہے کہ "نرمی سے جواب دینا اور درگزر کرنا اُس خیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد دل آزاری ہو اور اللہ پاک بے نیاز اور حلیم ہے"۔ پھر اللہ

پاک کی راہ میں خرچ کرنے والے جو (احسان رکھ کر یا دل آزاری کرکے نہیں بلکہ) اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں اُن کے لئے اجرِ عظیم کی خوش خبری سُنائی ہے — "طیّب" اور "خبیث" مال کی تعریف اور تشریح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے چھوڑ دی ہے اور یہاں صرف یہ لفظ (بغیر تشریح) استعمال کیے گئے ہیں۔ اور سود کی مذمّت بھی فرما دی ہے — (سود کی صحیح اور مکمل تشریح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث ہی سے معلوم ہو سکتی ہے) ۔ پھر باہمی لین دین کا طریقہ بتایا ہے ۔ اور یہ کہ " اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۔ اور اگر تم اس چیز کو جو تمھارے دلوں میں ہے ظاہر کر دو یا اُسے پوشیدہ رکھو ، اللہ پاک تم سے اُس کا حساب لے گا ۔ پھر جسے چاہے گا بخش دے اور جسے چاہے گا عذاب دے گا ۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔" اس آیت کے نزول پر صحابۂ کرام بھی کانپ اُٹھے کہ دل کے خیالات پر حساب بہت سخت چیز ہے — تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کی توجہ شیوۂ تسلیم و رضا کی طرف پھیر دی ۔ اس پیارے طریقے پر اللہ پاک کی رحمت کو جوش آیا اور اس سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں نازل ہوئیں ۔ پہلی آیت یہ ہے :۔" مان لیا رسولؐ نے جو اُن پر اُن کے ربّ کی طرف سے اُترا اور مومنوں نے بھی ۔ سب نے اللہ کو اور اُس کے فرشتوں کو اور اُس کی کتابوں کو اور اُس کے رسولوں کو مانا (اور سب کا کہنا یہ ہے کہ) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور (اللہ کا حکم پاتے ہی) بول اُٹھے کہ ہم نے سُنا اور قبول کیا ۔ اے ربّ ہمارے ، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔"

سورۃ آل عمران

نجران کے ساٹھ عیسائیوں کا ایک وفد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں متنازع فیہ مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے آیا تو اس سورۃ کی تقریباً ۸۰ - ۹۰ آیتیں اسی سلسلے میں نازل ہوئیں ، الوہیت ، وحدانیت ، رسالت اور معاد کے بنیادی مسائل سمجھانے کے بعد اُن امور پر خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی جو معاشرے کو درست کرنے اور اخوتِ اسلامی کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں تاکہ اس برادری میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ دین اور مخلوق کی صحیح خدمت ہو سکے ۔

آیت ۱۳ میں بدر کے مسلمانوں کی طاقت کا ذکر ہے جو اپنے سے بہت بڑی طاقت پر غالب ہوئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت سے مستفیض ہوئے ۔ انھیں دنیا کی چیزیں مرغوب نہیں ۔ آخرت مرغوب ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں (آیت ۱۷) جو" (تکالیف پر) صبر کرنے والے اور سچے اور با ادب (عبادت گذار) اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور راتوں کے پچھلے پہر استغفار کرنے والے ہیں ۔" (آیت ۲۰) "پس (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم) اگر وہ (عیسائی) آپ سے کج بحثی کریں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا رُخ اللہ پاک کی طرف کر لیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" نجران کے وفد کو بتایا جا رہا ہے کہ حق سے انحراف اور انبیاء علیہم السلام کا قتل ، بنی اسرائیل کا شیوہ رہا ہے اور انہوں نے دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال بگاڑ لیے ہیں ۔ آیت ۲۸ میں مؤمنوں سے فرمایا ہے کہ وہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں ۔ پھر آیت ۳۱ میں واضح طور پر حکم ہے کہ " (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ فرما دیجیے ، اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو ۔ اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) اللہ پاک تمہارے

گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔" پھر عمران کی بیوی (عیسیٰ علیہ السلام کی نانی)، زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ اللہ پاک نے اُن کو کس کس طرح نوازا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو یہود نے آپ کے خلاف سازشیں کیں اور اُن کو واجب القتل قرار دیا۔ اللہ پاک نے اُن کو محفوظ رکھا۔ اور کافروں کے لیے سخت عذاب ہے، آیت ۶۱ میں عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت اور اللہ پاک کی ربوبیت سے متعلق عیسائیوں سے جو مباہلہ ہُوا چاہتا تھا اُس کا ذکر ہے۔

یہود و نصاریٰ اس بات پر بھی بحث کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین کیا تھا۔ آیت ۶۷ میں فرمایا کہ" ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے۔ وہ تو سیدھی راہ چلنے والے مسلمان تھے اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھے۔" اور آیت ۶۸ میں ہے کہ بے شک ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنھوں نے اُن کی پیروی کی اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ جو آپ پر ایمان لائے اور اللہ پاک مسلمانوں کا دوست ہے۔"

پھر یہود کی دینی خیانت اور نفاق کے ساتھ اُن کی دنیوی خیانت کا ذکر بھی آتا ہے (آیت ۷۵) اور اہلِ کتاب کی تحریفِ کتاب (آیت ۷۸) اور اللہ پاک پر بہتان تراشی کا بیان ہے۔

آیت ۸۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سیّد المرسلین اور خاتم النبیین ہونے کی اُس تصدیق کا ذکر ہے جو تمام انبیا علیہم السلام نے ارواح کی تخلیق کے وقت کی تھی:۔" اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت سے سرفراز کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے اس کتاب کی تصدیق کرنے والا جو تم کو دی گئی ہے تو تم اس رسول پر ضرور ایمان لاؤ گے اور لازماً اُس کی مدد کرو گے (مزید تاکید کے لیے) فرمایا، کیا تم (سب پیغمبروں) نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ (تم خود اُس نبی کو پاؤ تو اُس کی تصدیق کرو یعنی تمہاری اُمتیں اُن کا زمانہ پائیں تو تصدیق کریں)۔ سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ (اس عہد و پیمان کے) گواہوں میں سے ہوں"۔— آیت ۸۲ میں ہے کہ" پھر جو کوئی (اُن اُمتیوں میں سے) اس کے بعد روگردانی کرے تو وہی فاسق (نافرمان) ہیں"۔ پھر مرتد کے لیے وعید آتی ہے اور پارہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب چوتھا پارہ شروع ہوتا ہے ———

شروع ہی میں یہودیوں کے دو اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے کہ قرآن نے اُن چیزوں کو حرام نہیں کیا جو یہود کے یہاں (توریت میں) حرام نہیں تھیں (توریت اٹھا کر دیکھ لو) اور یہ کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر خانۂ کعبہ کو اس لیے قبلہ قرار دیا گیا ہے کہ" وہ بے شک سب سے پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے تعمیر کیا گیا جو مکہ میں ہے، بڑا برکت والا اور تمام عالموں کے لیے ہدایت ہے۔" (آیت ۹۶)۔ اور دیکھو کہ وہیں مقامِ ابراہیم بھی تو ہے۔ جہاں استطاعت والے لوگ حج کرنے جاتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے کہ" اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑے رہو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم (آپس میں) دشمن تھے (تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں) اُس نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی۔ پس تم رحمتِ الٰہی سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم تو (اپنے کفر و عصیان کی وجہ سے) دوزخ کے

گڑھے کے کنارے تھے، پس اُس نے تم کو اس سے نجات دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کھول کھول کر اپنی نشانیاں تمھارے لیے بیان کرتا ہے "تاکہ تم ہدایت پاؤ۔" (آیت ۱۰۳)

پھر مسلمانوں کی فضیلت کا ذکر ہے کہ " (اے مسلمانو) تم بہترین اُمّت ہو (کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل میں) تم کو سب کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو...... " (آیت ۱۱۰)۔ پھر نافرمانوں کا ذکر ہے جن کو اللہ کے عذاب سے بچانے میں نہ اُن کا مال کام آئے گا اور نہ اُن کی اولاد۔ اس کے بعد منافقوں (یہود اور کفّار) کو اپنا رازدار بنانے سے مسلمانوں کو روکا ہے کہ وہ تمھارے دشمن ہیں اور تمھاری تکلیف سے اُن کو خوشی ہوتی ہے (آیت ۱۲۰)۔ اس کے بعد غزوۂ بدر اور غزوۂ احد کا ذکر ہے جب کہ منافقین کی فریب کاری کے باوجود مسلمانوں کا پلّہ بھاری تھا اور غیبی امداد شاملِ حال تھی۔ غزوۂ احد میں گو کہ ستّر صحابہ شہید ہوئے لیکن کفّار میں سے اکثر بعد میں تائب ہو کر مسلمان ہوئے۔ کیونکہ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) یہ معاملہ آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ (اللہ) یا تو اُن کی توبہ قبول کرے یا اُن کو عذاب دے کہ وہ لوگ بے شک ظالم ہیں۔" (آیت ۱۲۸)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے متّقی غلاموں کا ذکر ہے کہ "وہ فراخی اور تنگ دستی (ہر حال) میں (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اور وہ غصّے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں (ان باتوں سے وہ نیکوکار بن جاتے ہیں) اور اللہ ان نیکوکاروں سے محبّت کرتا ہے۔" (آیت ۱۳۴)۔ آگے چل کر مسلمانوں کو تسلّی دی جاتی ہے کہ " تم ہمّت نہ ہارو اور حزن وملال میں نہ پڑو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔" (آیت ۱۳۹)۔ آگے آتا ہے کہ " اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نہیں مگر رسول (یعنی جب سے محمد ظہور میں آئے رسول ہیں)۔ بے شک اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر وہ (محمدؐ) وفات فرمائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا اور اللہ جلد ہی شکر گزاروں کو جزائے خیر دے گا۔" (آیت ۱۴۴)۔

آیت ۱۵۲ میں اللہ پاک نے غزوۂ احد کا پھر ذکر کیا ہے کہ جب تک مسلمان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے تابع رہے فتح حاصل کرتے رہے اور جونہی اُن کے حکم سے بے اعتنائی کر کے تیر اندازوں نے درّہ چھوڑا اور مالِ غنیمت کی طرف بڑھے تو اللہ پاک نے فتح کو شکست سے بدل دیا، پھر بھی اللہ پاک نے معاف فرما دیا۔ اور امن وامان (سکون واطمینان) نصیب فرمایا۔"

اس کے بعد بھی اللہ پاک کی رحمتیں اور نعمتیں ہر وقت اور ہر حالت میں مسلمانوں کے لیے عام ہیں۔ غزوۂ اُحد کی شکست سے بعض صحابہ کو غیر معمولی غم واندوہ تھا جس کا ذکر مسلسل ہے۔ پھر آیت ۱۵۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی نرم دلی کا ذکر ہے کہ آپ کی وجہ سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ تندخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ منتشر ہو جاتے۔ پھر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں اور مشورہ کر لیا کریں۔ لیکن بھروسا صرف اللہ پاک پر رکھیں — تاہم جو لوگ اللہ پاک اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی کے تابع ہیں اُن کے درجات بہت بلند ہوں گے۔ اس کے بعد ہی آیت ۱۶۴ میں ہے کہ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم جیسی ذاتِ گرامی ہم لوگوں کو عنایت کر کے ہم سب پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔" بلاشبہ اللہ پاک

اللہ پاک نے ایمان والوں پر بہت بڑا احسان فرمایا کہ اُن میں اُنھی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور (اُن کے آنے سے) پہلے تو یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے"۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چار خصوصیات (۱) آیتیں پہنچانا (۲) تزکیہ نفس کرنا (۳) قرآن کا علم اور (۴) حکمت سکھلانا' یہاں مذکور ہیں۔ (یہی خصوصیات البقرہ کی آیت ۱۵۱ میں بھی مذکور رہیں)۔

آیت ۱۷۲ میں ہے کہ "جن لوگوں نے (جنگِ احد میں) زخم کھانے کے باوجود اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانا (لڑنے کے لیے کھڑے ہوگئے) اُن میں جو کہ نیکوکار اور پرہیزگار ہیں اُن کے لیے اجرِ عظیم ہے"۔ ان بزرگوں کی شان آگے والی آیت میں بھی بیان کی ہے کہ بجائے خوف کے اُن کے ایمان میں اور تازگی پیدا ہوگئی اور انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اس ایمانی جذبے کی وجہ سے وہ پھر کامیاب ہوئے اور اُس کے فضل سے خوش خوش واپس آئے۔ (آیت ۱۷۴)۔

آیت ۱۷۶ تا ۱۷۸ میں عذاب کی قسمیں بتائی ہیں۔ شریعت کے مقابلے میں کفر کرنا "عذابِ عظیم" ہے۔ ایمان کے بدلے میں کُفر مول لینا "عذابِ الیم" ہے اور دنیا کی راحتوں سے یہ قیاس کرنا کہ عذابِ آخرت ڈھکوسلا ہے۔ "عذابِ مہین" کہلاتا ہے۔ لیکن ان تینوں عذابوں سے محفوظ رہنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ "اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لاؤ گے تو تم کو بہت بڑا اجر (اجرِ عظیم) ملے گا"۔ (آیت ۱۷۹)

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم جب کفار سے رنجیدہ ہوئے تو ارشاد ہوا "پس اگر وہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا جو واضح دلائل اور صحیفے اور کتابِ منیر لے کر آئے" (آیت ۱۸۴) اس کے بعد پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "اور جب اللہ نے اہلِ کتاب سے (نبیوں کے ذریعے) پختہ وعدہ لیا کہ اس (کے حقائق) کو لوگوں سے صاف صاف بیان کرو گے اور اُس کو (یعنی بشارتِ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم) نہ چھپاؤ گے۔ مگر انھوں نے اسے پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیوی منفعت) حاصل کی۔ کیا ہی بُرا (سودا) ہے جو یہ لوگ خرید رہے ہیں"۔ (آیت ۱۸۷)۔ پھر ایسے لوگوں کے لیے "عذابِ الیم" کی وعید ہے ——— اس کے بعد اللہ پاک نے اپنی قدرت کا ذکر کیا ہے اور اُن غلامانِ رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف کی ہے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلو پر لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ پاک کو یاد کرتے ہیں اور اُسی سے گڑگڑا کر مانگتے ہیں۔ ان کے بڑے درجات ہیں۔ پھر آیت ۲۰۰ میں ان غلاموں کے لیے یہ نصیحت آئی ہے کہ "اے ایمان والو، صبر کرو اور ثابت قدم رہو اور (آپس میں مل جل کر) مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔

سورۃ النسآء

سورۃ البقرہ نے حیوانیت سے نکالا، سورۃ آلِ عمران نے نفسانیت سے بچنے کے آداب سکھائے۔ اب سورۃ النساء سے معاشرت کے آداب معلوم ہوتے ہیں اور زندگی کو سنوارنے کے لیے نکاح اور میراث کے آئین سمجھائے جاتے ہیں۔ معاشرے میں یتیم کے

بعد عورت کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی کمزور ہے۔ شادی کے لیے حکم ہے لیکن وہ نفس پرستی کے لیے نہ ہو۔ معاشرتی نظام کی بھلائی کے لیے ہو۔ پہلے اور دوسرے رکوع میں میراث کا ذکر ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اس تفصیل کے ساتھ ہم کو سمجھایا گیا ہے، تیسرے رکوع میں اُن حدود کا بیان ہے جو معاشرے کی خرابی کی جڑ ہیں اور جن سے خاندان تباہ ہوتے ہیں۔ اسلام سے پہلے یہ رواج تھا کہ جب چاہتے ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کر لیتے اور پہلی پر تہمت لگا کر اُس سے مال واپس لے لیتے۔ اللہ پاک نے اس کام کی ممانعت فرمائی اور اس سے بھی ممانعت فرمائی کہ سوتیلی ماں یا دوسری محرمات سے شادی کی جائے۔ چوتھے رکوع میں تفصیل آتی ہے کہ کن عورتوں سے نکاح حرام ہے۔ عورت کی عزّت اور وقار کو پہلی بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں متعین کیا گیا اور اُس کے حقوق منوائے گئے۔

—— اب پانچواں پارہ شروع ہوتا ہے ——

گذشتہ آیت میں اُن محرمات کا ذکر تھا جن سے نسبی یا رضاعی رشتہ تھا۔ اب دوسری عورتوں کا ذکر ہے جن سے شادیاں حرام کی گئیں۔ حلال و حرام کے احکامات کا مقصد کوئی اور نہیں سوائے اس کے کہ اسلامی معاشرے میں فلاح و خیر کے راستے کھل جائیں اور انسانی زندگی میں سہولتیں پیدا ہو جائیں۔ آیت ۲۹ میں ناجائز طور پر ایک دوسرے کا مال کھانے سے ممانعت فرمائی گئی ہے اور اس طرح کھانے سے (خوں ریزی سے روکا گیا ہے۔ آیت ۳۳ میں ہے کہ" (اے مسلمانو) ہم نے (تمھارے) ماں باپ اور قرابت والوں کے ترکہ میں سے ہر کسی کے لیے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمھارا معاہدہ ہوا ہے اُن کو اُن کا حصہ (ضرور) دے دو۔ بے شک ہر چیز، اللہ کے پیشِ نظر ہے"۔ ترکہ و میراث کی تفصیل کہاں ملے گی؟ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی احادیث و اقوال ہی سے حاصل ہوگی۔

آیت ۳۴ میں دنیوی زندگی میں عورت پر مرد کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ آئندہ آیتوں میں میاں بیوی کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ پھر اللہ کی بندگی کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم ہے۔ پھر قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب کے پڑوسیوں، دور کے پڑوسیوں، ہم مجلسوں، مسافروں اور جن کے تم مالک بن گئے (غلاموں، لونڈیوں اور ملازموں) اُن سب کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے۔ غرور، بخل، ریا کے طور پر خرچ سے بھی منع فرمایا اور نافرمانوں کے لیے یہ وعید ہے کہ "اس دن، کفر کرنے والے اور پیغمبروں کی نافرمانی کرنے والے آرزو کریں گے کہ کاش زمین اُن پر برابر ہو جاتی اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔" (آیت ۴۲)

اس کے بعد نماز اور تیمّم کی سہولتوں کا انعام ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں کتنی آسانیاں ہیں۔ یہود کی عیاری، تحریف اور منافقت کا پھر ذکر ہے کہ وہ کس کس طرح اسلام کے درپئے آزار ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُن پر اللہ کی لعنت ہے اور آیت ۵۴ میں فرمایا ہے کہ" کیا یہ (یہود) حسد کرتے ہیں (مسلمان) لوگوں پر اُن نعمتوں کی وجہ سے جو اللہ پاک نے اپنے فضل سے ان کو دی ہیں؟ (حالانکہ) پس ہم نے (تو) ابراہیم علیہ السلام (ہی) کے خاندان (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کو کتاب (قرآن) اور حکمت دی اور ان کو ہم نے بڑی سلطنت دی"۔ یہود کی خیانت، خباثت اور ناانصافی کے ذکر کے بعد مسلمانوں کو (آیت ۵۸) حکم ہوتا ہے کہ

وہ امانت، دیانت اور عدل کو اپنا طرۂ امتیاز بنائیں اور آیت ۵۹ میں ہے کہ "اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو حاکم ہوں (اُن کی اطاعت کرو)۔ پس اگر مسئلے میں تمہارا اختلاف ہو جائے (حق بات واضح نہ ہو) تو اس کو خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی چیز بہتر ہے اور اس کا انجام اور بھی نیک ہے"۔

اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تم میں سے جو حاکم ہو اُس کی اطاعت کرو — یعنی تم میں سے جو حاکم ہو گا وہ وہی ہو گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہو گا۔ ورنہ وہ حاکم تم میں سے نہیں کہلایا جائے گا۔ یہی آیت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے یزید کی اطاعت نہیں فرمائی اور خود کو، نیز اپنے بہتّر رفقاء کو بھی قربان کر دیا۔

آیت نمبر ۶۰ (اور مابعد) کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی اور ایک منافق (جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا تھا) کے درمیان کسی معاملے میں نزاع تھا۔ منافق چاہتا تھا کہ یہود کے سردار کعب بن اشرف سے فیصلہ کرائے لیکن یہودی اس منافق کو لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ حضور نے معاملے کا فیصلہ اس یہودی کے حق میں فرما دیا تو منافق کو وہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ اور وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، اچھا ذرا ٹھہرو۔ یہ کہہ کر آپ اندر تشریف لے گئے اور ننگی تلوار لا کر اُس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا کہ جو شخص اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو نہ مانے اُس کے لیے یہی فیصلہ بہترین ہے۔ اسی آیت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے "فاروق" کا لقب عطا ہوا۔ آیت ۶۵ میں ہے کہ "پس (اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس کے ہر اختلاف میں یہ لوگ آپ کو (دل و جان سے) حَکَم نہ بنائیں۔ پھر جو فیصلہ آپ فرما دیں اُس سے کسی طرح بھی وہ دل گیر نہ ہوں اور اُسے دل سے خوشی خوشی قبول کریں" — اور آیت ۶۹ میں یہ انعام بھی مذکور ہے کہ "اور جو اللہ کی اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے (اپنا خاص) انعام کیا، (یعنی) انبیاء (علیہم السلام)، صدیقین، شہداء اور دوسرے نیک بندے اور یہ لوگ (کیسے) اچھے ساتھی ہیں"۔

پھر جہاد کا حکم آتا ہے "اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے (یعنی شہید ہو) یا غلبہ پائے (غازی ہو) تو (دونوں صورتوں میں) ہم (قیامت کے دن) اس کو اجرِ عظیم دیں گے"۔ اس کے بعد آیت ۷۵ میں آتا ہے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے اور مظلوم مسلمانوں کو کافروں سے چھڑانے کے لیے کافروں سے لڑنا چاہیے۔ پھر اُن لوگوں کا ذکر ہے جو جہاد سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ جو فائدہ پہنچتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے تو وہ انسان کے نفس کی طرف سے ہوتی ہے (آیت ۷۹) اور آیت ۸۰ میں ہے کہ "جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تو اُس نے اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو (آپ فکر نہ کریں) آپ کو ہم نے اُن پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا"۔ پھر آیت ۸۴ میں یہاں تک ہے کہ اگر کم ہمت مسلمان یا منافق لوگ آپ کا ساتھ نہ دیں "تو آپ (تنہا) راہِ خدا میں جہاد کریں۔ آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی اور آپ مسلمانوں کو (جہاد کی) ترغیب دیتے رہیے ۔۔۔۔"۔ پھر حسنِ گفتگو کی ترغیب ہے اور یہ کہ "(اے مسلمانو) جب تم کو سلام کیا جائے (دعا دی جائے) تو تم اُس سے بہتر طور پر سلام کر دیا (کم از کم یہ

تو ہو کہ) وہی الفاظ دہرا دو۔ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔" (آیت ۸۶)

اس کے بعد مسلمانوں کو خطاب ہے کہ وہ منافقوں کے راہ پر لانے کی فکر نہ کریں بلکہ اُن کی اصلاح حال کریں جن کو ہدایت کی خواہش ہو۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ کن لوگوں سے کب نہ لڑو اور کن سے جہاد کرو۔

پھر فرمایا ہے کہ لڑائی تو دین کی حفاظت کے لیے کی جاتی ہے، مسلمانوں کو مارنے کے لئے نہیں۔ اگر سہواً کسی مسلمان کو نقصان پہنچ جائے تو اس کے احکام بتا دیے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو اپنے کو مسلمان کہے اُسے مسلمان سمجھو۔ پھر ہجرت کی فضیلت کا ذکر ہے کچھ لوگ جو دنیوی تعلقات اور دولت کی وجہ سے ہجرت کے فرض ہونے کے بعد مکہ معظمہ میں رہ گئے، اُن کو عبرت دلائی گئی ہے۔ کچھ ایسے تھے جو ضعیفی اور مجبوری کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے۔ اُن کے لیے بھی بخشش کی بشارت ہے اور کچھ ایسے تھے جنھوں نے محض اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی اُن کے لیے انعامات کا ذکر آتا ہے۔ خواہ وہ راستے میں فوت ہو گئے، تب بھی اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ پھر صلوٰۃ قصر اور صلوٰۃ خوف کی سہولتوں کا ذکر آتا ہے اور اللہ کی یاد پر زور دیا گیا ہے۔ پھر یہ فرمایا ہے کہ قوم کی عزت کسی ایک فرد کی بُرائی سے چلی نہیں جاتی اور یہ کہ صحیح شہادت حاصل ہونے پر مجرم کی قسم کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا ذکر ہے (جیسا کہ البقرہ کی آیت ۱۵۱ - اور آل عمران کی آیت ۱۶۴ میں ہے) کہ اُن کی وہ ذات گرامی ہے کہ منافق لاکھ چاہیں آپ کو بہکا نہیں سکتے اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے ہی سے خیر کثیر ملتی ہے - اور جو اُن کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ جاتا ہے وہ گویا اللہ پاک کے حکم کی توہین کرتا ہے۔ آیت ۱۱۵ میں ہے کہ "اور جو کوئی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے اُس کے بعد کہ اُس پر راہِ ہدایت کھل چکی اور جو مسلمانوں کی راہ سے ہٹ کر ایک الگ راہ پر چلے تو ہم اُس کو اُسی راہ پر ڈال دیں گے جو اُس نے اختیار کی ہے اور ہم اُس کو دوزخ میں ڈالیں گے اور وہ بہت ہی بُرا مقام ہے۔" پھر شرک سے بچنے کا حکم آتا ہے اور ہدایت ہے کہ جو کچھ مانگنا ہے اللہ پاک سے مانگیں کہ سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے - اور جس کے پاس کچھ نہیں اُس سے مانگنا خود اپنی توہین ہے۔ شیطان (جس پر اللہ کی لعنت ہے) مختلف طریقوں سے بہکانا چاہتا ہے لیکن جو لوگ اُس سے بچ کر اللہ سے لَو لگاتے ہیں اُن کے درجات بہت بلند ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے - آیت ۱۲۵ میں ہے کہ" اور اُس شخص سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ نیک کاموں میں لگا رہا اور یکسو ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (اسلام) کی پیروی کرتا رہا اور ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ پاک نے اپنا دوست بنا لیا ہے۔"

آیت ۱۲۷ سے یتیم عورتوں کا ذکر ہے جن سے اُن کے والی نکاح کر سکتے ہیں اور اگر زوجین میں موافقت نہ ہو سکے تو جُدا بھی ہو سکتے ہیں، پھر بھی نیکی اور پرہیزگاری ضروری ہے، اور "جو کوئی دنیا (میں عمل) کا بدلہ چاہتا ہو تو (وہ دنیا کے فائدے کے ساتھ اللہ سے تعلق ہی کیوں نہ پیدا کرے کہ) اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا اجر ہے۔ اور اللہ پاک سب کچھ سُنتا (اور) دیکھتا ہے۔" (آیت ۱۳۴) -

اب انصاف، سچائی اور حقوق کے ادا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے (حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح فرمایا

ہے کہ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اُس کی عبادت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول سمجھنا یہ ہے کہ اُن کی پیروی کرو)۔
آیت ۱۳۶ میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے لائے ہوئے احکام کی پیروی پر زور دیا گیا ہے (صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں)۔ آیت ۱۳۹ میں ہے کہ "وہ (منافق) جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں تو کیا وہ اُن کے پاس عزت کی تلاش کرتے ہیں۔ پس ساری عزت تو اللہ ہی کے واسطے ہے"۔ پھر منافقوں کے انجام کا ذکر ہے جس پر یہ پارہ ختم ہوتا ہے

اب چھٹا پارہ شروع ہوتا ہے ———
اللہ پاک اپنے بندوں کی بُرائیاں دیکھ کر بھی اُن کو مشتہر نہیں کرتا تو پھر ایک بندہ دوسرے بندے کی بُرائیوں کا ڈھنڈورا کیوں پیٹے؟ یہ بات بھی منع کی گئی کہ کچھ رسولوں کو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ بلاشبہ کافر ہیں (آیت ۱۵۱)۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ دوسرے پیغمبروں کو مانتے ہیں لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے وہ بلاشبہ کافر ہیں۔ پھر یہود کی کج بحثی کا ذکر ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایسا ہی مطالبہ کرتے تھے جیسا کہ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہے ہیں کہ آپ اُن پر ایک لکھی لکھائی کتاب نازل کرا دیں (آیت ۱۵۳)۔ اُن یہود کی گستاخیوں کی وجہ سے اُن کو سزائیں بھی ملیں (عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا جھوٹا دعویٰ بھی کیا)۔ "اور (قیامت کے قریب جب عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے تو) اہل کتاب کے جتنے فرقے ہیں وہ عیسیٰؑ پر اُن کی وفات سے پہلے ایمان لائیں گے اور وہ قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوں گے" (آیت ۱۵۹)۔ "لیکن ان میں جو علم میں پختہ ہیں اور مومنین اس (قرآن) پر جو آپؐ پر نازل ہوا ہے اور اُن (کتابوں) پر جو آپؐ سے قبل نازل ہوئیں ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کو ہم عنقریب اجر عظیم عطا کریں گے"۔ (آیت ۱۶۲)۔ پھر مختلف انبیاء علیہم السلام پر نزولِ وحی کا ذکر ہے جنہوں نے ہدایت فرمائی۔ لیکن پھر بھی لوگوں نے انکار کیا اور انہوں نے اپنا ٹھکانا جہنم بنایا۔ "اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے رسول برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) آ چکا۔ پس (اگر اُن پر) تم ایمان لاؤ تو تمہارا ہی بھلا ہوگا اور اگر تم نے انکار کیا تو (اللہ بے نیاز ہے) اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے" (آیت ۱۷۰)
——— بعض لوگوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے بندہ ہونے سے انکار ہے حالانکہ انھیں اس بات سے عار نہیں ہے۔ "رسول برحق" اور "صریح دلیل" (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہی۔ انہی کے ماننے والے رحمت اور فضل کے مستحق ہیں (آیت ۱۷۵) اور انہی سے صراطِ مستقیم حاصل ہو سکتی ہے۔ (قرآن پاک کی پہلی منزل یہاں ختم ہوتی ہے اور کلالہ یعنی جس کے اصول و فروع نہ ہوں اُس کے حقوق کی حفاظت کا بیان اس منزل کی آخری آیت ہے)۔

سورۃ المائدہ

اس سورۃ میں مسلمانوں کے لیے بہت سی نعمتیں مذکور ہیں جن سے اُن کی جسمانی اور روحانی اصلاح منظور ہے۔ پہلے عہد و اقرار کے پورا کرنے کی تعلیم ہے، پھر حلال و طیب چیزوں پر زور دیا گیا ہے تاکہ ذاتی اور معاشرتی زندگی سنور جائے اور اسی سورۃ میں

"الیوم اکملت لکم دینکم" کا مژدہ سنایا گیا ہے جو انسانی زندگی کی فلاح کا آخری پیغام ہے اور جس کے علمبردار صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قول و قرار کو پورا کرنا، پاک جانوروں کو غذا بنانا، شعائر اللہ کی حرمت کرنا۔ شہر الحرام، ھدی اور وہ جانور جن کے گلے میں پٹے بندھے ہوں (خدا کی نذر کے لیے شناخت کے طور پر) اور وہ لوگ جو خانہ کعبہ کی زیارت کو جا رہے ہیں اُن سب کا لحاظ کرنا بھی تربیت اور تادیب کے لیے ہے۔ پھر اُن چیزوں سے روکا گیا ہے جن سے جسمانی یا معاشرتی صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان چیزوں کے ذکر کے بعد مسلمانوں سے خطاب ہے کہ "آج (جمعہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر) کافر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم اُن سے مت ڈرو، مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر میں نے اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمھارے واسطے اسلام کو بطور دین کے پسند کیا۔۔۔۔۔" (آیت ۳)۔ یہ وہ موقع تھا جب کہ دنیا میں پہلی بار دین کی تکمیل کا اعلان کیا جا رہا تھا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی اہمیت کو پیش کیا جا رہا تھا کہ یہ تکمیل اُنہی کی ذات سے وابستہ ہے اور ہر خیر اور ہر نعمت انہی سے تعلق رکھتی ہے ——— اپنوں کے لیے حیاتِ صافی اور مجرموں اور ظالموں کے لیے عام معافی اسی موقع کی یادگار ہے۔ آج پاک چیزیں (جو انسانی جسم، ذہن اور فہم کے لیے مضر نہ ہوں) اور پاک بیبیاں (پاک مقصد کے لیے) بھی حلال کی گئیں۔ پھر ظاہری طہارت کے لیے وضو کے احکام اور تیمم کا طریقہ بتایا گیا کہ "اللہ پاک تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں چاہتا بلکہ وہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے تاکہ تم پر اللہ اپنا احسان پورا فرمائے تاکہ تم اُس کا شکر ادا کرو۔" (آیت ۶)

آیت ۷ سے ۱۱ تک اللہ پاک نے مسلمانوں کو اپنی نعمتیں یاد دلا کر اُن کو ڈھارس اور ہمت دلائی ہے کہ عدل و انصاف اور تقویٰ پر قائم رہیں اور انھیں تو اللہ پاک ہی پر بھروسا کرنا چاہیئے،

مسلمانوں کے میثاق کے ساتھ بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر آتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سے گیارہ سال کی قلیل مدت میں اس میثاق پر عمل کرنے کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی جو ہزاروں سال میں بنی اسرائیل پیدا نہ کر سکے۔ بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے اُن پر اللہ کی لعنت ہوئی اور اُن کے دل سخت کر دیے گئے یہاں تک کہ وہ خود توریت میں تحریف کرنے لگے جو نصیحتیں اُن کو کی گئی تھیں اُن میں سے اکثر کو بھلا دیا۔ یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ آیت ۱۵-۱۶ میں ہے کہ "اے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بلاشبہ ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس آئے۔ وہ تم سے بہت سی باتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جن کو تم اللہ کی کتاب (جو تم کو دی گئی تھی) میں سے چھپاتے ہو۔ اور وہ تمھاری بہت سی باتوں سے درگذر بھی کرتے ہیں۔ بے شک اللہ پاک کی طرف سے تمھارے پاس نور آ چکا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) اور کتاب روشن (یعنی قرآن)۔ اس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو سلامتی کی راہوں پر لے جاتا ہے اور انھیں اندھیرے سے نور کی طرف اپنے حکم سے نکال لاتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔"

پھر آئندہ آیتوں میں نصاریٰ کو کافر کہا گیا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں اور یہود و نصاریٰ کے اس قول کی بھی تردید ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا سمجھتے ہیں۔ آیت ۱۹ میں ہے کہ "اے اہلِ کتاب بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آ گیا ہے جو تمھارے لیے (احکام الٰہی) صاف بیان کرتا ہے بعد اس کے کہ رسولوں کا آنا بند تھا، تاکہ تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور

نذیر نہیں آیا۔ پس (اب تو) تمھارے پاس بشیر اور نذیر آچکا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو ارضِ مقدس (شام) میں داخل ہونے کا حکم دیا کہ وہاں اُن کو حکمرانی نصیب ہوگی لیکن ان کی قوم نے کہا کہ وہاں کے لوگ بڑے زبردست (طاقت ور) ہیں، پہلے اُن کو نکالو تو ہم داخل ہوں گے۔ آخر وہ قوم وہاں نہ گئی اور وہ زمین (شام) اُن پر چالیس برس کے لیے حرام کر دی گئی۔ پھر قابیل کا ذکر ہے کہ اُس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ قتل کے بعد ندامت ہوئی لیکن یہ بھی قابیل کو معلوم نہ تھا کہ ہابیل کو کس طرح دفن کرے، تو دو کوّے لڑتے ہوئے آئے۔ ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور زمین کرید کر دفن کیا۔ قابیل یہ واقعہ دیکھ کر نادم ہُوا کہ میں اس کوّے کی طرح بھی نہ ہو سکا۔

آیت ۳۲ میں ہے کہ "اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر حکم نازل کیا کہ جو کوئی (نفس کی خواہش سے) کسی کو مار ڈالے، سوائے قصاص کے یا ملک میں فساد پھیلانے کے، تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی جان کو قتل سے بچا لیا تو گویا اُس نے تمام لوگوں کو بچا لیا ..... "۔ اللہ پاک نے پھر بھی توبہ کرنے والوں کے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ اور آیت ۳۵ میں ارشاد ہے کہ "اے ایمان والو، تم اللہ سے ڈرتے رہو اور اُس تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرو (یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے متبعین کا وسیلہ) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ پھر چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا کا ذکر ہے اور اس سزا میں بڑی حکمت ہے۔ پھر اُن لوگوں کا ذکر ہے جو منافق ہیں یا صحیفوں کے احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ اُن لوگوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں اور کوئی خیال نہ کریں۔ آیت ۴۸ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ آپ کی کتاب سابقہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور آپ اسی کے مطابق فیصلہ دیا کریں اور جو لوگ اس فیصلے کو نہ مانیں تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کو یہی منظور ہے کہ ان لوگوں کو مصیبت میں گرفتار کر دے۔

اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمھارے دوست نہیں۔ "بے شک تمھارا دوست اللہ اور اُس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا کے سامنے عاجزی سے جھکے رہتے ہیں" (آیت ۵۵) اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دوست رکھیں گے تو وہ اللہ کی جماعت میں داخل ہیں اور انھی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

یہود و نصاریٰ ہمارے دین اور ہماری اذان کا بھی مذاق اُڑاتے تھے تو ایسے نافرمانوں پر اللہ نے لعنت کی ہے اور پہلے ایسے اعمال والوں کو بندر اور سؤر بھی بنا دیا گیا تھا۔ یہود و نصاریٰ کو تو اُن کے علماء نہ سمجھاتے اور نہ اُن کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے روکتے۔ اس لیے "اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہُوا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں (یعنی آپ تو پہنچا دیں اور کوئی خیال نہ کریں) اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ، کافروں کی ہدایت نہیں فرماتا" (آیت ۶۷)۔ پھر یہود اور مشرکین کا حال بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے کس قدر فتنے پھیلائے اور نفس کی خاطر کیا کیا نہ کیا۔ آیت ۸۲ میں ان یہود اور مشرکین کو مسلمانوں کا شدید ترین دشمن کہا گیا ہے۔ البتہ وہ نصاریٰ جو مسلمان ہوتے وہ یقیناً مسلمانوں سے محبت میں قریب ہیں۔

—اب ساتواں پارہ شروع ہوتا ہے —

اس میں پہلے اُن نیکو کاروں کا ذکر ہے جو ایمان لائے، پھر فرمایا ہے کہ جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں اُن کو اپنے اوپر حرام نہ کرلو اور نہ حد سے بڑھو۔ پھر قسم کھانے کا کفارہ بتایا ہے۔ شراب، جُوا، بُت اور پانسے کی ممانعت آئی ہے کہ یہ شیطان کے گندے کام ہیں اور آیت ۹۳ میں توبہ، ایمان عمل صالح، تقویٰ اور حسنات کی منزلیں سمجھائی گئی ہیں۔ احرام کی حالت میں خشکی کا شکار کرنے کو منع فرمایا ہے تاکہ پوری طرح رجوع الی اللہ رہے۔ لیکن دریا کا شکار اور اُس کا کھانا اس حالت میں بھی جائز ہے آیت ۹۷ میں بھی (آیت ۲ کی طرح) احکام ہیں اور آیت ۱۰۳ میں جہالت کی رسموں سے منع فرمایا ہے کہ اب صرف اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلنا ہے۔ مرتے وقت وصیت کرنا بھی اسلامی طریقہ ہے۔ امانت کا ادا کرنا اور اللہ کے قانون کا پاس کرنا بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خصوصیت ہے۔ اب مسلمانوں کو یوم قیامت سے (آیت ۱۰۹) بھی ڈرایا جا رہا ہے جبکہ تمام پیغمبر جمع ہوں گے اور اُن سے اُن کی اُمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ انہوں نے دین میں غلط باتیں کیوں شامل کیں مثلاً نصاریٰ سے پوچھا جائے گا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کو کیوں خدا ٹھہرایا۔ ایسے سوالات اسی لیے ہیں کہ ہم مسلمان صدق پر قائم رہیں اور اللہ ہم سے راضی رہے۔

سورۃ الانعام

اس سورۃ میں حلال و حرام کے متعلق خیالاتِ فاسدہ کی تردید کی گئی ہے جو مشرکین مکہ سے مخصوص تھے۔ گویا اُمت مسلمہ کو بتایا گیا ہے کہ غذا کا مقصد بقائے حیات ہے، نہ کہ بہیمیت کے اثرات پیدا کرنا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے صحیح توحید حاصل ہو سکتی ہے جس کا ذکر اس سورۃ کے شروع میں بھی ہے۔ اللہ پاک کی رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر بھی ہے کہ کتنی اُمتوں کو نوازا گیا تھا لیکن انہوں نے سرکشی کی اور ہلاک کیے گئے۔ اور "آپ فرما دیجیے کیا میں اس اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی کھلاتا ہے اور اُس کو کوئی نہیں کھلاتا (وہ کسی کا محتاج نہیں) اور آپ فرما دیجیے کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں خود فرماں بردار ہو جاؤں اور (مجھے یہ حکم ہے کہ) تم ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔" نفع اور نقصان کا مالک صرف اللہ پاک ہے۔ پھر نہایت بلیغ انداز میں فرمایا ہے کہ "آپ پوچھیے کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے؟ فرما دیجیے کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے اور (اُسی کی طرف سے) یہ قرآن مجھ پر اُتارا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے تم کو اور اُن کو بھی جن کے پاس یہ پہنچے (یعنی تمام عالم کے پاس) ڈراؤں (اور)۔ کیا تم اس بات کی شہادت دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہیں؟ — آپ فرما دیں کہ میں تو ایسی شہادت نہ دوں گا اور فرما دیں کہ وہی ایک معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں" (آیت ۱۹) اور "وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے (میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو) ایسا پہچانتے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (مگر) جو اپنی جانوں کو خود خسارے میں ڈال چکے وہی ایمان نہیں لاتے۔" (آیت ۲۰) ۔ یعنی اُن لوگوں کو سابقہ صحیفوں سے آپ کی تشریف آوری کی اطلاع مل چکی تھی لیکن وہ ہنوز انجان بنے ہوئے ہیں اور باتیں بناتے ہیں — پھر حضور انور صلی اللہ

علیہ وسلم جب تبلیغ فرماتے تو وہ لوگ بظاہر کان لگائے رہتے لیکن وہ بالکل سمجھنے کی کوشش نہ کرتے اور دوسروں کو بھی قرآن سے روکتے۔ "اور (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر دیکھیں کہ جب یہ لوگ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم پھر (دنیا میں) واپس بھیج دیے جائیں تو ہم اپنے پروردگار کی نشانیاں (اب کبھی) نہ جھٹلائیں گے اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں گے" (آیت ۲۷)۔ پھر کافروں کے خسارے کا ذکر ہے جو اللہ کو جھٹلاتے ہیں اور اس دنیوی زندگی کو جو صرف لعب و لہو ہے اپنائے ہوئے ہیں" (اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان (کافروں) کی وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے رہتے ہیں تو (اے پیارے رسولؐ) وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں (نشانیوں) ہی کا انکار کرتے ہیں"۔ (آیت ۳۳) - پھر آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں - وہ لوگ تو کیا کیا مطالبے کریں گے لیکن ایمان نہیں لائیں گے" آپ (ان منکرین سے) فرمایئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ٹوٹ پڑے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم سچے ہو (آیت ۴۰) یعنی مصیبت کے وقت منکرین کو بھی خدا یاد آتا ہے اور جب وہ مصیبت مل جاتی ہے تو خدا کو پھر بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض انھیں ایسی سخت دل بھی ہوئی ہیں کہ اُن پر مصیبتیں آئیں تب بھی وہ اللہ کے آگے نہ جھکے اور "پھر جب وہ اُس نصیحت کو جو انھیں کی گئی تھی فراموش کر بیٹھے تو ہم نے اُن پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے (ڈھیل دے دی) یہاں تک کہ جب وہ اس پر جو انھیں ملا، اِترانے لگے تو ہم نے اُن کو اچانک پکڑ لیا تو وہ ناامید ہو کر رہ گئے" (آیت ۴۴) پھر ان ظالموں کی جڑ ہی کاٹ دی گئی۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشادِ باری ہے کہ اگر اللہ پاک ان ظالموں کے کان آنکھ چھین لے اور دلوں پر مُہر لگا دے (یعنی سمجھ بھی ختم کر دے) تو پھر سوائے اللہ کے کون ہے جو ان صلاحیتوں کو واپس لا سکے؟۔

آیت ۵۰ میں ہے کہ "آپ فرما دیجیے کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی بات جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں - میں تو اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کیا جاتا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھ والا برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟"۔

پھر اُن غریب مسلمانوں کا ذکر ہے جو اللہ کی بات سنتے ہیں - اللہ کے یہاں انسان کی قدر اُس کے ایمان اور عمل سے ہے، دولت و ثروت سے نہیں" اور (اے رسولؐ) جب آپ کے پاس ہماری آیتوں کے ماننے والے آئیں تو فرما دیجیے کہ تم پر سلام ہو، تمھارے رب نے اپنے آپ پر (تمھارے لیے) رحمت لازم کر رکھی ہے کہ جو کوئی تم میں سے لاعلمی کی بنا پر کوئی بُرائی کر بیٹھے پھر توبہ کر لے اور اپنی اصلاح کر لے تو بے شک وہ (اللہ) بڑا بخشنے والا مہربان ہے" (آیت ۵۴)۔

پھر فرمایا ہے کہ "آپ فرما دیجیے کہ اگر میرے پاس وہ (عذاب) ہوتا جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو میرے تمھارے درمیان جھگڑا ہی طے ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے" - (آیت ۵۸) کفار کہتے تھے کہ اگر نافرمانی کی وجہ سے عذاب ہوگا تو ابھی کیوں نہیں ہوتا؟ - اس کا جواب اِس آیت میں تھا۔

اور اللہ پاک ہی کے پاس غیب کی کُنجیاں ہیں اور وہ خشکی اور تری کی ہر چیز کو اور ہر جگہ کی ہر بات کو جانتا ہے اور اسے علم کامل کے ساتھ قدرتِ کاملہ بھی حاصل ہے -" اور وہی ہے جو تمھیں رات کو مار دیتا ہے (نیند طاری کر دیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے

ہو اُس کو جانتا ہے۔ پھر تم جو (اعمال یہاں) کرتے رہے تم معینہ وقت (عمر) کو پورا کرو۔ پھر تم کو اُسی کی طرف واپس جانا ہے۔ پھر تم جو (اعمال یہاں) کرتے رہے تم کو اُس سے باخبر کر دے گا" (آیت ۶۰) — اللہ اپنے بندوں پر قادر ہے اور اُن کے لیے اپنے نگران کار (محافظ) بھی بھیجتا ہے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ جنگل اور سمندر کے اندھیروں سے تم کو کون نجات دیتا ہے۔ تم اُس کو گڑگڑا کر اور خاموشی سے پکارتے ہو کہ اگر وہ ہم کو اس مصیبت سے بچالے تو ہم ضرور اُس کے شکر گذار ہو جائیں گے۔" (آیت ۶۳)

"آپ فرما دیں کہ وہ اس (بات) پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے، تمھارے اوپر سے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے (زمین کے اندر سے) یا تم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے آپس میں لڑا دے اور تم کو ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ (اب بھی) سمجھ جائیں۔" (آیت ۶۵) — دین کو جن لوگوں نے لعب و لہو بنا رکھا ہے اُن سے کنارہ کشی کا حکم بھی آتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع نہ کی جائے کہ وہ خود گمراہ ہو کر بُتوں کے سامنے سر رکھیں گے جو خود ہی اپنے نفع اور نقصان کے مالک نہیں۔ اب ابراہیم علیہ السلام کی شان بتائی گئی ہے کہ اللہ کے لیے اپنے بابا کو چھوڑا، ستارے، چاند اور سورج کی روشنی سے مرعوب نہ ہوئے (اللہ کے لیے نمرود کی آگ میں کود پڑے۔ پھر بیوی اور شیر خوار بچے کو ایسی وادی میں چھوڑا جہاں نہ آبادی تھی اور نہ کھانا پانی تھا۔ اللہ کے لیے صاحبزادے کو بھی ذبح کرنے کے لیے لٹایا اور اللہ کے لیے اپنا سب کچھ لٹایا) — ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام اور اُن کے بعد اور پہلے بکثرت پیغمبر دین کی تبلیغ کی لیکن دین کی توفیق اُنہی کو حاصل ہوئی جن کو اللہ پاک نے چاہا۔" یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی۔ پس تم بھی اُن کے طریقے پر چلو اور اے (میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ میں اس (تبلیغ) پر تم سے کچھ معاوضہ نہیں چاہتا۔ یہ (قرآن) تو محض سارے جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پہلے بھی وحی آتی تھی اور یہ خیال کرنا کہ قرآن، اللہ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے بلکہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہے، اللہ پر بہتان ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔ ایسے خیال رکھنے والوں پر جو سخت عذاب ہوگا اُس کا ذکر آیت ۹۴ میں ہے۔

اللہ پاک اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیوں کی طرف متوجہ فرماتا ہے کہ :- نباتات، جمادات، حیوانات، سورج، چاند، تارے، بارش، مختلف درختوں کے مختلف رنگ اور مختلف ذائقے وغیرہ سب کو دیکھ کر اللہ کو پہچانا جا سکتا ہے کہ سوائے اُس کے ان کو کوئی بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن لوگ پھر بھی شرک کرتے ہیں تو اس میں بھی اللہ کی مشیت ہے۔" اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک ہی نہ کرتے اور ہم نے آپؐ کو اُن پر محافظ نہیں بنایا اور نہ آپ اُن کے ذمہ دار ہیں۔" (آیت ۱۰۸) — پھر مسلمانوں کو منکرین کی باتوں پر صبر کرنے کے لیے حکم ہے اور یہ کہ وہ لوگ اگر غیر خدا کو پکارتے ہیں تو پکارنے دو، تم اُن کو بُرا نہ کہو ورنہ وہ از راہِ عداوت اپنی نادانی سے اللہ کو بُرا کہنے لگیں گے۔

— اب آٹھواں پارہ شروع ہوتا ہے —

اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ہم اُن پر (آسمان سے) فرشتے اُتار دیں اور اُن سے مُردے (قبر سے اُٹھ کر) باتیں کریں

اور ہم اُن کے آمنے سامنے ہر چیز جمع کر دیں، تب بھی یہ لوگ سوائے اس کے کہ اللہ ہی چاہے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں اور ان میں سے اکثر جاہل ہیں" (اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں) ۔ (آیت ۱۱۱) ۔ پھر مختلف انبیاء علیہم السلام کے نافرمان لوگوں کا ذکر ہے کہ اسے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، آپ غمگین نہ ہوں۔ پھر کافروں کا ذکر ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا چاہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان اللہ کا نام لے کر جانوروں کو ذبح کرتے ہیں تو گویا خود کا مارا ہوا کھاتے ہیں اور جو جانور خود بخود مر جائے یعنی جس کو اللہ مارے اُسے یہ نہیں کھاتے ۔ اس قسم کے وسوسے اللہ پاک نے دور فرما دیے ہیں اور صاف فرما دیا کہ "جس جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُس کو تم ہرگز نہ کھاؤ کہ اس کا کھانا فسق ہے اور شیاطین (تو) اپنے ساتھیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے اُن کا کہنا مانا (جیسا کہ وہ چاہتے ہیں) تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے" (آیت ۱۲۲)

شیاطین لاکھ بہکائیں، مومن کا دل جب نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں وہ صراطِ مستقیم سے نہیں ہٹ سکتا۔ لیکن جو لوگ شیاطین کے فریب میں آجاتے ہیں وہ حشر کے دن جمع کیے جائیں گے اور وہ حیلے بہانے کرنے کے باوجود جہنم میں ٹھکانے لگائے جائیں گے ۔

اب جنوں اور انسانوں کی جماعتوں سے اُس سوال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن اُن سے کیا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ہمارے رسول نہیں پہنچے؟ وہ اقرار کریں گے کہ ہاں پہنچے تھے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو تم اپنی جگہ کام کرتے رہو۔ میں (اپنا) کام کیے جاتا ہوں ۔ سو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آخرت کا گھر کس کو ملتا ہے (عاقبت کس کی درست ہوتی ہے) ۔ یقیناً ظالموں کا بھلا نہ ہو گا۔" (آیت ۱۳۶) ۔ پھر مشرکانہ عادات اور اطوار کا ذکر ہے جن کی اصلاح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اور اللہ پاک کے احسانات اور انعامات کا ذکر ہے ۔ حلال و حرام کی تمیز صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہو سکتی ہے اور یہود کے لئے جو چیزیں حرام کی گئی تھیں اُن کا بھی ذکر ہے ۔ اور" عنقریب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ کی مرضی ہوتی تو نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے اور نہ ہم کوئی چیز (خود ہی) اپنے اوپر حرام کر لیتے ۔ اسی طرح ان سے قبل کے لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا ۔ آپ اُن سے کہیے کہ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اُس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو (حقیقت یہ ہے کہ) تم محض وہم و گمان پہ چلتے ہو اور صرف اپنے اندازوں پہ کام کرتے ہو۔" (آیت ۱۴۹) ۔" آپ فرما دیجیے کہ کامل دلیل (اور سند) تو اللہ ہی کے لیے ہے (اللہ کی حجت کامل ہے) پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کی ہدایت کر دیتا۔" (آیت ۱۵۰)

مشرکین نے جن چیزوں کو حلال و حرام ٹھہرایا تھا اُس کی تردید کی گئی ۔ اس کے بعد بتایا جا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھو کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے ۔ اور ایمان حاصل ہو جائے تو اللہ کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت، اولاد کی پرورش، یتیم کا خیال، ناپ تول میں انصاف وغیرہ پر زور دیا گیا ہے ۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی وہ سب کی سب ایک ہی وقت میں دی گئی تھی لیکن قرآن "بتدریجاً" نازل ہو رہا ہے تاکہ ہر زمانے کے ہر شعبۂ حیات پر محیط ہو سکے اور تعلیم محدود نہ رہے ۔

اس کتاب (قرآن) کے آجانے کے بعد اب کس چیز کے لوگ منتظر ہیں؟ کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا آپؐ کا رب خود آئے یا آپؐ کے رب کی کوئی نشانی آئے؟ (لیکن) جس دن آپ کے رب کی کوئی نشانی آجائے گی تو (اس وقت) کسی (ایسے) شخص کا ایمان لانا اُس کے کام نہ آئے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا یا ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہ کرلی تھی۔ آپ فرما دیجیے کہ تم (بھی ان آثار کی) راہ دیکھو اور ہم بھی (اللہ کے حکم کا) انتظار کرتے ہیں۔" (آیت ۱۵۹)۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے (رحمۃ للعالمین ہونے کی وجہ سے) ایک انعام یہ بھی ہے کہ "جو شخص ایک نیکی لاتا ہے تو اُس کے لیے اس کا دس گنا (ثواب) ہے اور جو کوئی ایک بُرائی لاتا ہے تو اُسی کے برابر سزا پاتے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔" (آیت ۱۶۱) یعنی بُرائی کی سزا دس گنا نہیں ہے لیکن نیکی کی جزا دس گنا ہے۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو مِلّتِ ابراہیمی (سراپا تسلیم و رضا) کہا گیا ہے اور "آپؐ فرما دیجیے کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم ہُوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں" (آیت ۱۶۳-۱۶۴) یعنی انبیاء علیہم السلام میں بھی اولیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ (اور امر پر چلنے والا ہی اللہ کا نائب ہوسکتا ہے)۔

سورۃ الاعراف

یہ سورۃ مکی ہے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری بڑھ چکی تھی اور کفار نے حد سے زیادہ مظالم روا رکھے تھے اُس وقت اس سورۃ میں تبلیغی جد و جہد پر زور دیا گیا تھا۔ حروف مقطعات "الٓمّٓصٓ" کے معنی اللہ کو اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو معلوم ہیں لیکن اس کے بعد ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اس لیے اور حروف مقطعات کی طرح یہاں بھی یہ حروف حضورؐ ہی کے پیارے ناموں میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ آپؐ کو تسلی دی ہے کہ آپ کفار کی شدید مخالفت کی وجہ سے غمگین نہ ہوں اور مسلمانوں کے لیے ارشاد ہے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہ کریں۔ قیامت کے دن اُن لوگوں سے جو کافر ہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے رسولوں کی ہدایت پر کہاں تک عمل کیا اور رسولوں سے بھی سوال ہوگا کہ اُن کی اُمتوں کی طرف سے کیا جواب ملا تھا۔ اُس روز اعمال تولے جائیں گے۔ اللہ پاک نے انسان پر اپنے احسانات کا ذکر کیا ہے کہ اُسے دنیا میں معیشت کے لیے قرار و قیام عطا کیا۔ لیکن اس انسان میں شکر قلیل ہے۔ پھر انسان کی پیدائش، فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا، ابلیس کا انکار اور اس کا انجام مذکور ہے۔ ابلیس نے تکبر سے کہا کہ "چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں بھی تیرے صراطِ مستقیم پر اُن کی تاک میں بیٹھوں گا۔" (آیت ۱۶)۔ ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو حکم ہُوا کہ جنت میں ٹھہرے رہیں لیکن اُس درخت کے قریب نہ جانا۔ لیکن وہ دونوں شیطان کے فریب میں آگئے۔ "دونوں التجا کرنے لگے کہ ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم بڑے خسارے میں پڑ جائیں گے۔" (آیت ۲۳)

پھر بنی آدم سے خطاب ہے کہ تمہارا سب سے بہتر لباس تقویٰ ہے اور شیطان کے فریب میں نہ آنا۔ اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) "آپ فرما دیجیے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور (اے مسلمانو) ہر نماز کے وقت اپنی توجہ اُس کی طرف کر لیا کرو اور اُس کے خاص فرمان بردار ہوکر اُس کو پکارو، جیسا تم کو پہلے پیدا کیا دوبارہ پھر پیدا ہوگے۔" (آیت ۲۹)۔ کفار کی رسم تھی کہ وہ طواف کعبہ

کے وقت کپڑے اتار دیتے تھے مسلمانوں کو اس رسم سے منع فرمایا اور کافروں کے اس طریقے کو بھی منع فرمایا کہ وہ لوگ بعض چیزیں کھانا چھوڑ دیتے تھے۔" آپ فرما دیجیے کہ میرے رب نے تو حرام کر دیا ہے بے حیائی کی باتوں کو، ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو۔ اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اُتاری اور اس بات کو بھی کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تم کو علم تک نہیں" (آیت ۳۳)۔ پھر جن لوگوں نے اللہ پاک کی آیتوں کو جھٹلایا ہے اُن کے انجام کا ذکر ہے کہ جب فرشتے اُن کی جان لینے آئیں گے اور پوچھیں گے کہ اللہ کے علاوہ جن کو تم پکارتے تھے وہ کہاں ہیں؟ وہ کہیں گے کہ وہ ہمیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ پھر اسی طرح اُمتیں نافرمانی کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہوں گی۔

اس کے بعد تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو آیاتِ الٰہی کو جھٹلاتے رہے اور دوزخ کے مستحق قرار پائے، دوسرے وہ جو اللہ سے ڈرتے رہے اور نیک عمل کی وجہ سے جنت کے مستحق ٹھہرے اور تیسرے وہ جو اہلِ ایمان تو ہوں گے لیکن ان کے نیک اور بد عمل بالکل مساوی ہیں۔ ایسے لوگ جنتیوں کو اُن کے نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو اُن کی سیاہی سے پہچانیں گے اور اُن کو دیکھ کر اللہ سے پناہ مانگیں گے۔

اب تخلیقِ کائنات خلق و امر کا ذکر ہے تاکہ انسان اپنے رب کو یاد کرے اور دنیا میں شر اور فساد نہ پھیلائے "اور جو بستی پاکیزہ ہے وہاں اس کے رب کے حکم سے (خوب) سبزہ نکلتا ہے اور جو خراب ہے اُس میں (سبزہ) کم تر (ناقص) ہی نکلتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی آیتوں کو مختلف طور پر بیان کرتے ہیں اُن کے لیے جو شکر گذار ہیں۔" (آیت ۵۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح دلوں کی بستی کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں اور جو لوگ اُن سے مستفیض نہیں ہوتے وہ ناقص رہ جاتے ہیں۔

نوح علیہ السلام نے بھی اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا کہ آپ ہی بہکے ہوئے ہیں۔ پھر اللہ پاک نے نافرمانوں کو غرق کر دیا۔ وہ لوگ "اندھے" تھے۔ پھر ہود علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کی دعوت دی تو اُن کو کم عقل اور غلط بیان قرار دیا گیا۔ بالآخر ایسے لوگوں پر بھی عذاب آیا، پھر صالح علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر ہے کہ انھوں نے قوم ثمود کو اللہ کی بندگی سکھائی لیکن انھیں بھی جھٹلایا گیا اور جھٹلانے والوں پر زلزلہ آیا اور نافرمان لوگ تباہ ہوئے، پھر شام کی چند بستیوں میں لوط علیہ السلام نے اصلاح چاہی لیکن اُن کی بھی نافرمانی کی گئی اور وہ لوگ پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئے۔ بحرِ احمر کے کنارے عرب میں مدین ایک بستی تھی جہاں شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ انہوں نے توحید اور اصلاحِ معاشرہ، نیز حقوق العباد پر زور دیا۔

<u>اب نواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم کے سرداروں نے شہر سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ آسمان سے آگ برسی، بادلوں سے ہولناک آوازیں آئیں اور لوگ اس طرح زلزلے سے تباہ ہوئے "گویا کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے۔" پھر فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے کسی قوم کی پکڑ اس وقت تک نہیں کی جب تک کہ کسی نبی کو بھیج کر اُن کی اصلاح نہ کرائی ہو۔ یعنی جب لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی تب اُن پر عذاب آیا، اب مسلسل متعدد آیتوں میں موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور فرعون کا ذکر تفصیل سے کیا جا رہا ہے تاکہ انسان کو عبرت حاصل ہو۔ اور آگے چل کر یہ بھی ہے کہ جب فرعون ہلاک ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک سے توریت مانگی۔

چالیس راتوں کا اعتکاف بھی کیا اور اللہ کے جلوے کے مشتاق ہوئے۔ لیکن جواب ملا کہ "تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے"۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔ (لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پاک کے قریب اس قدر تھے کہ " فکان قاب قوسین او ادنیٰ "۔ پھر بھی اُن کے درجات اتنے بلند تھے کہ " ما زاغ البصر وما طغیٰ "۔) ۔۔۔ موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملی اور تبلیغ فرمائی گئی۔ لیکن نافرمان لوگ کب سنتے ہیں؟ جب موسیٰ علیہ السلام طور پر گئے اور ہارون علیہ السلام اُن کے جانشین ہوئے تو اُن کی قوم نے بچھڑا بنا کر اُس کی پوجا شروع کر دی۔ موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اللہ پاک نے اس واقع سے باخبر کر دیا تھا تو وہ غصے میں اپنی قوم کی طرف آئے اور بھائی کے بال پکڑ کر گھسیٹنے لگے اور ناراض ہوئے، قوم عذاب میں گرفتار ہوئی سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے توبہ کر لی۔ اس کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو توبہ اور اعتکاف کے لئے کوہ طور پر لے گئے لیکن ان لوگوں نے وہاں بھی نافرمانی کی تو زلزلے نے اُن کو گھیر لیا۔ اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ذکر آتا ہے کہ " وہ لوگ جو رسول امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں جس (کے ذکرِ مبارک) کو وہ اپنے یہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ ان (پیروکاروں) کو نیک کام کا حکم فرماتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں اور سب پاک چیزیں اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور اُن پر سے اُن کے بوجھ اور وہ طوق و قیود جو اُن پر (اُن کی نافرمانیوں کے باعث) لگائے گئے تھے اُتار دیتے ہیں۔ پس جو لوگ ان پر ایمان لائے اور اُن کی تعظیم کی اور اُن کی مدد کی اور اس نور (قرآن و حدیث) کی پیروی کی جو اُن پر نازل ہوا تھا، یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح کو پہنچے"۔ (آیت ۱۵۷)۔ پھر ارشاد ہے کہ " آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔ (وہ اللہ) جس کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس اللہ پر اور اُس کے رسول اُمی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اُس کے کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور تم اُن کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ"۔ (آیت ۱۵۸)۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر پھر اللہ پاک نے نوازش فرمائی مگر گرم علاقے میں بارہ چشمے پانی کے دیئے اور منّ و سلویٰ دیا لیکن بجائے مغفرت چاہنے اور سجدہ کرنے کے، ان لوگوں نے اللہ کے حکم میں من مانی تبدیلی کر لی۔ تو اُن پر عذاب نازل ہوا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ان یہود کی نافرمانی، حق پوشی، افترا پردازی، حیلہ سازی، گستاخی وغیرہ عیوب سنائے جا رہے ہیں تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور راہ سے نہ بھٹکیں۔ اُن یہود کا قصہ بھی آتا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا تھا۔ یہود کی گذشتہ قوموں میں کچھ لوگ صالح بھی تھے لیکن اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے توریت کے احکام بھی دنیا کی خاطر بدل ڈالے اور رذیل ہوئے۔

" (اور اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کو وہ واقعہ یاد دلائیے) جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشت در پشت اولاد کو نکالا اور خود اُن سے اُن کے نفسوں پر گواہی دلوائی۔ (فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (سب نے) کہا۔ کیوں نہیں؟۔ ہم اقرار کرتے ہیں (یہ عہد اس لیے تھا) کہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی" (آیت ۱۷۲)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ ایک شخص جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں لیکن وہ نافرمان ہو گیا اور وہ اپنی خواہشات کا پیرو بن گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک کتا۔ جس پر بوجھ لادا جائے تو ہانپتا ہے اور نہ بھی لادا جائے تب بھی ہانپتا ہے یعنی اس پر کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے ہی لوگ وہ ہیں جن کے پاس دل ہے لیکن اُسے سوچنے کے لیے استعمال نہیں کرتے، آنکھیں ہیں لیکن

دیکھتے نہیں اور کان بھی ہیں لیکن سنتے نہیں ۔ یہی لوگ جانوروں جیسے ہیں بلکہ اُن سے بھی بد تر ہیں ۔" اور اللہ کے اسمائے حُسنیٰ (پیارے پیارے نام) ہیں تو اُس کو اُنہی (ناموں) سے پُکارو اور جو لوگ اُس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں اُن کو چھوڑ دو ۔ وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پائیں گے ۔ اور ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے (صحابہ کرامؓ اور ان کے متبعین کی) جو راہِ حق بتاتی ہے اور اسی کے موافق فیصلہ کرتی ہے ۔" (آیت ۱۸۰-۱۸۱) ۔

پھر جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ہے اُن کے لیے ارشاد ہے کہ " ان کو ہم آہستہ آہستہ ایسی جگہ سے پکڑیں گے کہ اُن کو خبر تک نہ ہوگی ۔" " کیا یہ لوگ اتنا غور نہیں کرتے کہ اُن کے صاحب (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کو ذرا بھی جنون نہیں ۔ وہ تو صرف کھُلے طور پر ڈرانے والے ہیں "۔ (آیت ۱۸۴) ۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت پر وہ لوگ غور کریں تب بھی اللہ کو پہچان سکتے ہیں ۔ وہ تو قیامت کے وقوع کے متعلق سوال کرتے ہیں جس کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ پھر انسان کی تخلیق کا ذکر ہے کہ میاں بیوی دونوں دعا کرنے لگتے ہیں کہ ہم کو صحیح سالم بچہ دے اور جب ایسا بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر دینے والے اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں اور ایسوں کو خدا بنا لیتے ہیں جو محض مخلوق ہیں اور جو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے اور ان بُت پرستوں کو دین کی طرف بُلایا بھی جاتا ہے تو وہ بات نہیں سنتے ۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ درگذر سے کام لیجیے اور نیک کام کے لیے حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کش رہیے ۔" (آیت ۱۹۹) ۔ پھر قرآن کے سننے اور خاموش رہنے کا حکم ہے اور اپنے پروردگار سے غافل نہ رہو ۔

سورۃ الانفال

غزوۂ بدر میں پہلی بار مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی تو کثرت سے مال ہاتھ آیا ۔ اس سورۃ میں یہی سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مؤمنین نے اپنی جان و مال اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تھا اسی طرح وہ مالِ غنیمت بھی اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیں ۔ اور مومن وہ ہیں :— " ایمان والے تو صرف وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب اُس کی آیتیں اُن کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں ۔" (آیت ۲) ۔ اور " جو نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں ۔" (آیت ۳) " اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تم سے دو جماعتوں (ابو سفیان اور ابو جہل کی) میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمھارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ غیر مسلح جماعت تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ (مسلمان) حق کو حق کر دکھائے اپنے حکم سے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے ۔" (آیت ۷) ۔ غزوۂ بدر میں اللہ پاک نے ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ " فتح اللہ ہی کی طرف سے ہے ۔ بے شک اللہ بڑا زور آور حکمت والا ہے " (آیت ۱۰) ۔ پھر ریتلے میدان میں (بدر میں) اللہ پاک نے ایسی بارش کی کہ پانی بھی مسلمانوں کو ملا ، چلنے میں بھی آسانی ہو گئی اور کفار دلدل میں پھنس گئے ۔— پھر حکم ہے کہ میدانِ جنگ میں کافروں سے پیٹھ مت پھیرو (کہ یہ ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا) ۔

" پس (اے مسلمانو ، جنگِ بدر میں) تم نے انھیں نہیں مارا بلکہ اللہ نے انھیں مارا اور (اے رسولؐ) جب آپؐ نے (مٹھی بھر

خاک دشمن پر اچھینکی تھی تو آپ نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔ اور تاکہ ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان فرمائے۔ بیشک اللہ بڑا سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔" (آیت ۱۷)۔ اس کے بعد پھر مومنوں سے خطاب ہے کہ وہ اللہ پاک اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور اُن کے احکام سُن کر روگردانی نہ کریں۔ مسلمانوں کو اُس وقت سے بھی آگاہ کرایا ہے۔ جو فتنہ و فساد کی حالت میں اچھے بُرے سب پر آجاتا ہے اور اُن کو وہ وقت بھی یاد دلایا جا رہا ہے جب کہ وہ مکّہ میں کمزور تھے اور مدینہ میں خوشحال ہو گئے۔ پس شکرگزاری یہ ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق ادا کرو (دین کو پھیلاؤ) اور جان لو کہ تمھارا مال اور تمھاری اولاد آزمائش ہیں یعنی ان دونوں کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کر دو۔ اور اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو حق و باطل میں صحیح تمیز نصیب ہوگی اور تم سے تمھارے گناہ دور ہوں گے۔ (آیات ۲۵ تا ۲۹ ملخصاً)

"اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب کفار آپ کے متعلق تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا (وطن سے) نکال دیں اور وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ پاک اپنی تدبیر۔ اور اللہ کی تدبیر سب سے بہتر ہے۔" (آیت ۳۰)۔

جب ان کفار کو اللہ کی آیتیں سُنائی جاتی ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہ دین اللہ کی طرف سے ہے تو نافرمانی کی وجہ سے ہم پر پتھر کیوں نہیں برسائے جاتے اور عذاب کیوں نہیں آتا؟" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ ایسا نہیں کہ جب تک آپ ان میں موجود ہیں اللہ اُن پر عذاب کرے اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ انھیں وہ عذاب دے جبکہ وہ بخشش کے طلب گار ہوں۔" (آیت ۳۳) یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے اور استغفار کرنے سے عذاب نہیں آسکتا۔ اسلام سے پہلے کافروں کی نماز کیا تھی؟ خانہ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانا (آیت ۳۵)۔ وہ کفار اس لیے بھی خرچ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو لالچ میں ڈال کر اللہ کی راہ سے روک لیں (آیت ۳۶) لیکن ایسے لوگوں (کفار) کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ البتہ وہ اگر دین کی مخالفت سے باز آجائیں تو وہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اور اگر وہ لوگ پھر وہی کریں تو اُن سے مسلمان لڑیں یہاں تک کہ فساد باقی نہ رہے اور سب اللہ ہی کا دین ہو جائے اور اللہ ہی مسلمانوں کا کارساز اور مددگار ہے۔

اب دسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور رسولؐ کے قرابت داروں کے لیے اور یتیموں اور محتاجوں کے لیے ہے۔ جنگِ بدر میں کفار کی کثیر تعداد، قلیل تعداد میں مسلمانوں کو دکھائی گئی اور مسلمان آسانی سے غالب ہوئے یہ اللہ پاک کا خاص فضل تھا۔ اور جب کبھی کفار سے مقابلہ ہو تو مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے اور اللہ کو یاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے "اور اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تمھاری ہمت ٹوٹ جائے گی اور تمھارا رعب جاتا رہے گا۔ اور صبر سے کام لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (آیت ۴۶)۔ منافقوں کو حیرت تھی کہ اتنی بے سروسامانی کے باوجود مسلمان کس طرح کامیاب ہوئے اور" جب منافقین اور وہ جن کے دل میں بیماری ہے کہہ رہے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو اپنے دین پر بڑا غرور ہے اور (حقیقت یہ ہے کہ) جو کوئی اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" (آیت ۴۹)۔ جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں تو اُن کے منہ اور اُن کی پشت پر مارتے جاتے ہیں اور

(کہتے ہیں کہ) آگ کا مزہ چکھو" (آیت ۵۰)۔
فرعون (اور اُس سے قبل) کے لوگوں نے بھی اللہ کی آیتوں سے انکار کیا اور اُن کی پکڑ بھی اسی طرح ہوئی اور" اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کو ایک نعمت دے کر اُس نعمت کو نہیں بدلتا (اس سے محروم نہیں کرتا) جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدل نہ ڈالے اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے" (آیت ۵۳) "بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو کفر کرتے ہیں، پھر وہ ایمان نہیں لاتے" (آیت ۵۵)۔ پھر اللہ پاک نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ عہد شکن لوگوں سے جنگ میں مقابلہ ہو تو اُن کو ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پشت پناہ ہیں وہ بھی عبرت حاصل کریں۔ پھر مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا جا رہا ہے تاکہ دشمنوں پر تمھاری دھاک بیٹھ جائے اور صلح ہو یا جنگ ہو، ہمیشہ اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے اور (اے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ (دغا باز) آپ کو دھوکا دیں تو آپ کے لیے اللہ کافی ہے۔ اُسی نے اپنی مدد سے اور ایمان والوں کے ذریعے آپ کی تائید کی ہے" (آیت ۶۲) اور اُسی نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کر دی۔ پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے کہ" اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کو جنگ کے لیے ترغیب دلایئے (کہ) اگر تم میں بیس (مسلمان) ثابت قدم ہیں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سو (ثابت قدم) ہیں تو وہ ہزار کافروں پر غالب ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ (اہلِ کفر) سمجھ نہیں رکھتے" مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش تھی کہ اتنی بڑی تعداد کا مقابلہ کرنا تھا۔ پھر اللہ پاک نے آسانی کر دی اور فرمایا کہ" اب اللہ نے تم پر بوجھ ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ (ابھی) تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سو شخص ثابت قدم ہوں تو وہ دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے (وہ چاہے تو دس ہزار پر بھی فتح دے گا)۔

بدر میں ستر کافر قیدی ہوئے۔ حکم ہوا کہ" نبی کے شایانِ شان نہیں کہ اُس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) وہ زمین پر خون نہ بہا دے (جس سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ جائے) تم لوگ دنیا کا مال و متاع اور اللہ (تمھارے لیے) آخرت (کی نعمتیں) چاہتا ہے اور اللہ زور آور حکمت والا ہے" (آیت ۶۷)۔ کفار کا زور ابھی نہیں ٹوٹا تھا اس لیے فدیہ لینا قبل از وقت تھا" اگر اللہ ایک بات پہلے سے لکھ نہ چکا ہوتا تو اس (فدیہ) لینے پر تم کو بڑی تکلیف پہنچتی" (آیت ۶۸) "اس لیے جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا ہے وہ کھاؤ حلال اور پاک اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے" (آیت ۶۹) پھر مہاجرین اور انصار کی محبت اور اُن کی مدد کا ذکر ہے۔ ان کو باہم بھائی بنایا اور ان کا مال ایک دوسرے کے لیے اللہ نے جائز فرما دیا۔

سورۃ التوبہ

سورۃ الانفال کے بعد سورۃ التوبہ ایک ضمیمہ کی طرح ہے جس میں جنگ کے واقعات، منافقوں کی دغا بازیاں، صحابہؓ کی جاں نثاریاں اور اسلام کی فتوحات کا ذکر ہے۔ مکہ کے قریش نے مسلمانوں سے بدعہدی کی تو اللہ نے مسلمانوں کو بری الذمہ کر دیا کہ" (مسلمانو) جن مشرکین سے تم نے (صلح) معاہدہ کیا تھا۔ اب اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ان کے لیے صاف جواب ہے" (آیت ۱)۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی اعلان کرا دیا کہ کفار پر اچانک حملہ نہیں کیا جائے گا۔ چار ماہ کی مہلت ہے کہ کفار اپنی بدعہدی اور اللہ کی نافرمانیوں سے باز آ جائیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجز نہیں کر سکتے "پھر جب حرمت کے مہینے (جن میں جنگ کی ممانعت کر دی گئی ہے) گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور اُن کو پکڑو اور اُن کو گھیر دو اور ہر جگہ اُن کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں تو اُن کا راستہ نہ روکو (آزادی سے رہنے دو)۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۵) "اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اس کو اُس کی امن کی جگہ بھیج دو۔ یہ اس لیے کہ وہ لوگ بے علم قوم ہیں۔" (آیت ۶) — پھر واضح فرمایا ہے کہ مومن کا مشرک سے معاہدہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ آیت ۸ تا ۱۳ میں مشرکوں کے قول و قرار کا راز فاش کیا جا رہا ہے کہ خوفِ خدا کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

پھر مشرکوں نے کہا کہ ہم تو اچھے کام کرتے ہیں کہ حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور مسجد حرام کو بناتے اور آباد رکھنے والے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ وہ پہلے مسلمان تو ہو جائیں، پھر مسجدوں کو آباد کریں گے۔ حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو بنانا تو دنیا کے فائدے کے لئے ان کا فعل ہے۔ وہ یاد رکھیں کہ "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے گھر چھوڑے اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے رہے، اللہ کے یہاں اُن کے درجے بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔" (آیت ۲۰) پھر باپ بیٹے اور عزیزوں، مال و دولت، مکانوں وغیرہ کی تحقیر فرمائی ہے کہ یہ چیزیں اگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو پھر اللہ کے عذاب کے منتظر رہو۔ بدر کے بعد حنین کی جنگ میں (جب کہ مسلمان اپنی کثرت پر نازاں تھے اور فرار ہونے لگے) اللہ پاک نے غیب سے مدد فرما کر فتح عنایت فرمائی اور بہت زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ فتح مکہ (۹ھ ہجری) کے بعد اعلان ہو گیا کہ مشرک نجس ہیں (یعنی نہا دھو کر صاف کپڑے پہننے سے پاک نہیں ہو سکتے جب تک کہ ایمان سے دل پاک نہ ہوں) اور انھیں مسجد حرام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ اس کے بعد اہلِ کتاب سے بھی جنگ کرنے کا حکم ہو گیا۔ اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں جانتے اور نہ سچا دین قبول کرتے ہیں ان سے بھی (اور مشرکین سے بھی) جزیہ لینے کا حکم آ گیا۔

یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصرانیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا لیا اور وہ اسلام کے چراغ کو بھی بجھانا چاہتے ہیں لیکن ۔ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دین اسلام کے پھیلنے کا مکمل انتظام ہو چکا ہے کہ "وہی (اللہ) تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے، خواہ مشرکین کو کتنا ہی شاق گزرے۔" (آیت ۳۳)۔ (یہ ٹکڑا دوبارہ آیا ہے۔ پہلے تو مشرکین کی ناکامی پر اور اب اسلام کے فروغ کے سلسلے میں)۔ اہل کتاب کے عالموں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں، تو ایسے لوگوں پر سخت عذاب ہو گا اور سونے چاندی کے جمع کرنے والوں کو (جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) مزہ چکھایا جائے گا۔ اور حکم ہے کہ :۔

"بے شک اللہ کے یہاں جس دن سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا (اُسی دن سے) اللہ کے نوشتے میں مہینوں کی گنتی

بارہ ہے۔ ان میں چار مہینے (رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) لائقِ احترام ہیں۔ یہی دین مستقیم ہے تو تم ان (مہینوں) میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو اور تم (بھی) مشرکوں سے لڑو جس طرح وہ لوگ تم سے اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔" (آیت ۳۶)۔

مسلمانوں کو پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے کہ" اگر تم ان کی (یعنی اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہ کرو گے تو (ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، دیکھو) اللہ نے ان کی اس وقت مدد فرمائی جبکہ ان کو کافروں نے (مکہ سے) نکالا تھا۔ جب کہ (رسولؐ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ) دُو میں سے دوسرے تھے۔ جب دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے رفیق کو تسلی دے رہے تھے کہ غم نہ کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اُن پر تسکین نازل فرمائی اور اُن کی مدد ایسی فوجوں سے کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ نے کافروں کی بات کو نیچا کر دیا اور اللہ ہی کی بات اونچی ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔" (آیت ۴۰) پھر منافقوں کا ذکر ہے کہ وہ جہاد سے کس طرح جی چراتے ہیں" (جنگ میں شریک نہ ہونے کی) اجازت تو وہ لوگ طلب کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل میں شکوک ہوتے ہیں۔ پس وہ اپنے شک ہی میں سرگرداں ہیں" (آیت ۴۵) مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی ہے تو منافق خوشیاں مناتے ہیں" آپ فرما دیجیے کہ ہم کو ہرگز کچھ نہ پہنچے گا مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے اور وہی ہمارا کارساز ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں" (آیت ۵۱) پھر منافقوں کی مختلف خصوصیات بتائی گئی ہیں لیکن مسلمانوں کو تو اللہ ہی کی طرف رغبت ہے۔

چونکہ منکرین نے صدقات وخیرات سے متعلق زبان درازی کر رکھی تھی اس لیے اب ارشاد ہے کہ" بے شک صدقات (زکوٰۃ) تو صرف فقراء کا (جن کے پاس کھانے کے لیے نہ ہو) اور مسکینوں کا اور زکوٰۃ کے محصلین کا حق ہے اور ان کا جن کی دل جوئی منظور ہے اور گردنوں کو چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کا قرض ادا کرنے کے لیئے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لئے یہ اللہ کا مقرر کردہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔" (آیت ۶۰) صدقات کی اس تقسیم کے باوجود منکر لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدگوئی کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے دوزخ کی آگ ہے۔ اس کے بعد پھر منافقوں کی حالت بیان کی گئی ہے اور اُن کا انجام بھی بتایا ہے۔ اس کے برعکس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے والوں کے لیئے جنت کا وعدہ ہے جس کے بیچ اللہ کی خوشنودی سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑی کامیابی ہے (آیت ۷۲)۔ پھر کفار اور منافقوں سے جہاد کرنے کا اور سختی کرنے کا حکم ہے کہ ان منافقوں نے اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ میں (عہد کرنے کے باوجود) خرچ نہیں کیا اور جو لوگ خرچ کرتے ہیں اُن کا مذاق اڑایا تو (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم" آپ اُن کے لیے مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (ان کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا ہے) اگر آپ اُن کے لیے ستر بار بھی بخشش طلب فرمائیں تب بھی اُن کو نہ بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں فرماتا۔" (آیت ۸۰)

غزوۂ تبوک میں منافقین پیچھے رہ گئے اور نہیں گئے، بڑے خوش تھے کہ جہاد اور گرمی سے بچ گئے لیکن دوزخ سے نہ بچ سکے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا ہے کہ اب وہ جہاد میں آنے کے لیے اجازت طلب کریں تو آپ منع فرما دیں اور آپ

اُن کی نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھیں" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز (جنازہ) نہ پڑھیے اور نہ اُس کی قبر پہ کھڑے ہوئیے (آپ کا کھڑا ہونا بھی باعثِ رحمت ہے) اور یہ تو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے منکر تھے اور منکر ہی مر گئے۔[1]" (آیت ۸۴) - پھر جہاد کے جو لوگ مکلف نہیں ہیں اُن کا ذکر آتا ہے کہ "نہ تو ضعیفوں پر گناہ ہے اور نہ مریضوں پر اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کو کچھ نہیں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خیر خواہ رہیں نیکو کاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۹۱)

پھر اُن کا ذکر ہے جو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہونے پر روتے تھے - لیکن جو خوش حال تھے اور جہاد سے بھاگنا چاہتے تھے تو اُن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے کہ اُنھیں اچھے بُرے کا ہوش نہیں ۔

اب گیارھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے بعد جب مسلمان واپس ہوں گے تو منافقین پھر عذر پیش کریں گے کہ جہاد میں کیوں شریک نہ ہوئے تو مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ تم اگر اُن سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ اُن سے راضی نہیں (آیت ۹۶) یہ دیہاتی گنوار اپنے کفر اور نفاق میں بہت سخت واقع ہوتے ہیں اور اگر کچھ خرچ کرتے ہیں تو اُسے تاوان سمجھتے ہیں اور مسلمانوں پر گردش آنے کے خواہاں ہیں - لیکن درحقیقت انہی پر گردش آنے والی ہے اور اگر وہ اپنے خرچ کو اللہ کے قُرب اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھیں تو بے شک وہ ان کے لئے قرب ہی کا موجب ہے۔" عنقریب اللہ اُن کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا ؛ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے صدقے میں یہ رحمت حاصل ہوگی) - بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۹۹) — پھر آیت ۱۰۰ میں ہے کہ" اور مہاجرین اور انصار میں سے سب سے پہلے سبقت لے جانے والے اور وہ جو اُن کے نقشِ قدم پر خوبی (احسان) کے ساتھ چلے، اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اُس سے راضی ہوئے اور (اللہ نے) اُن کے واسطے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں - ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے - یہی بڑی کامیابی ہے ۔" اس آیت میں شروع شروع کے مہاجرین اور انصار، نیز اُن کے متبعین کے لیے حکم ہے کہ وہ قطعی جنتی ہیں - یہ شروع شروع کے صحابہ وہ تھے جن کو پورا قرآن نہیں ملا تھا (وہ ۲۳ سال میں مکمل ہوا) تو ظاہر ہے کہ ان صحابہ کو یہ درجہ قرآن کی وجہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی وجہ سے حاصل ہوا ۔

غزوۂ تبوک میں جو لوگ شریک نہ ہو سکے لیکن توبہ کی اور ندامت کا اظہار کیا تو اللہ پاک نے معاف فرما دیا - صدقات اور توبہ سے گناہ معاف ہو سکتے ہیں - تبوک سے واپسی پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں دو رکعت نماز پڑھی تو مسلمانوں نے وہاں مسجد بنادی - منافقین نے اس کے قریب ایک اور مسجد بنادی کہ وہاں سازش ہو اور مسلمانوں میں نفاق ڈالا جائے - اللہ پاک نے

---

[1] منافق عبداللہ ابنِ اُبی مر گیا تو اُس کے بیٹے نے جو صحابی تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اپنی قمیص دے دیں کہ اس میں کفنایا جائے - آپ نے دے دی پھر نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے آپؐ کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا کہ آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے - آپ نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے (منع نہیں فرمایا) میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا - غرض آپ نے نماز پڑھی تو پھر یہ آیت ولا تصلی . . . . نازل ہوئی - پھر آپ نے منافقین کی نماز نہیں پڑھی ۔

نے اس مسجد (ضرار) کی مذمت فرمائی اور مسجد قبا کے لئے فرمایا کہ "اس کی بنیاد اوّل دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی اور وہ اسی لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" (آیت ۱۰۸)

پھر اللہ پاک کی بے پایاں شفقت کا لہجہ دیکھیے۔ فرمایا ہے کہ "بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال خرید لیے ہیں۔ اِس قیمت پر کہ اُن کے لیے جنّت ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے (بھی) ہیں اور شہید (بھی) ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ توریت اور انجیل اور قرآن میں ہے اور اللہ سے زیادہ کون وعدہ کا پکا ہو سکتا ہے؟ پس (اے مسلمانو) اِس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور بڑی کامیابی یہی ہے۔" (آیت ۱۱۱)۔

(یہی بات سورۃ الفتح کے آخر میں بھی ہے)

پھر مسلمانوں کی نو صفات آیت ۱۱۲ میں بتائی گئی ہیں:- "یہ توبہ کرنے والے، بندگی کرنے والے، شکر کرنے والے، بے تعلق رہنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے، نیک کام کا حکم کرنے والے اور بُری بات سے منع کرنے والے اور ان حدود (شریعت) کی جو اللہ نے قائم کی ہیں حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسولؐ آپ ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔"

(ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے لیے بخشش کی دعا کی تھی (کہ وہ ایمان لے آئے لیکن جب وہ کفر پر فوت ہُوا تو آپ نے بیزاری ظاہر فرمائی۔)

غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے والوں میں سے بعض نے خود کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معاف نہ فرمائیں گے وہ اپنے کو نہ کھولیں گے۔ وہ معاف کر دیے گئے لیکن تین حضرات ایسے بھی تھے جو اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہے تھے۔ اللہ پاک نے مؤخر الذکر کو پچاس دن کے بعد معاف فرمایا۔ یہ مدّت بھی اُن پر بہت سخت گزری۔ اس کے بعد پھر جہاد کے لیے ترغیب ہے اور آخر سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا ذکر آتا ہے کہ "(اے مسلمانو) بے شک تمھارے پاس تم ہی میں سے (پاک نفوس میں سے) ایک رسولؐ آئے ہیں۔ جو تکلیف تم کو پہنچتی ہے (وہ تم سے زیادہ) اُن پر گراں گزرتی ہے۔ تمھارے لیے وہ (رحمت کی) فراوانی کے طالب رہتے ہیں مومنوں کے حق میں نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔ پھر (اب بھی) یہ لوگ اگر روگردانی کریں تو آپؐ فرما دیجیے کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا ہے اور وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے۔" (آیت ۱۲۸-۱۲۹)۔

اب تیسری منزل شروع ہوتی ہے جس کی ہر سورۃ (سوائے آخری سورۃ کے) الٓرٰ سے شروع ہوتی ہے۔

سورۃ یونس

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے لوگوں کو تعجب ہے کہ بنی آدم ہی میں سے ان کو پیغمبر کیوں منتخب کیا گیا۔ اللہ پاک اپنی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے۔ آسمان، زمین، عرش، سورج، چاند، رات، دن وغیرہ اللہ کو پہچاننے کے ذریعے ہیں اور جو نہیں پہچانتے اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور ایمان و عمل صالح والے جنّت میں ہوں گے۔" اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے بھی اور بیٹھے بھی اور کھڑے بھی (ہر طرح) ہم کو پکارتا ہے اور جب ہم اُس کی وہ تکلیف دور کر دیتے ہیں تو وہ اس طرح گذر جاتا ہے گویا کسی تکلیف پہنچنے پر اُس نے کبھی ہمیں پکارا ہی نہ تھا ......" (آیت ۱۲)۔

پھر خلافت فی الارض کا ذکر ہے اور یہ کہ جب قرآن کی آیتیں نافرمانوں کو سُنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی قرآن کو بدل دو (کیونکہ اس میں تو کفر کے خلاف آیتیں ہیں)۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے (کہ بدلنا تو الگ رہا) اگر اللہ چاہتا تو میں نہ تو اس کو تم کو پڑھ کر سُنا سکتا، نہ (اللہ) اس کی تم کو خبر کرتا۔ پھر میں تو ایک عمر اس سے قبل تم میں رہ چکا ہوں (کیا کبھی تم نے میری صداقت اور امانت پر شک کیا؟) کیا تم بالکل نہیں سمجھتے؟" (آیت ۱۶)۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے! انسان تو ایک امت تھا۔ لیکن اختلاف پیدا ہوا۔ پھر اللہ پاک نے خشکی اور تری کی سیر کا ذکر کیا ہے کہ کشتی پر جب سخت ہوا آتی ہے اور وہ ڈوبنے لگتی ہے تو اُس وقت لوگ اللہ کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں اور وہ جب اس آفت سے نجات پاتے ہیں تو اسی اللہ سے بغاوت کرتے ہیں۔ دنیا کی زندگی تو اس پانی کی طرح ہے جو زمین کو سیراب کر کے کھیتی پیدا کر دیتا ہے لیکن ناگہاں ہمارا عذاب پہنچتا ہے اور وہ کھیتی ایسی ہو جاتی ہے کہ گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ اسی طرح یہ دنیوی زندگی بظاہر اچھی سمجھی جائے لیکن نافرمانوں پر عذاب آتا ہے تو پھر ان کی زندگی کا وجود ہی یکایک ختم ہو جاتا ہے۔ "آپ (ان مشرکین سے) پوچھیے کہ تم کو آسمان اور زمین میں سے رزق کون دیتا ہے یا (تمہارے) کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور کون جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے نکالتا ہے اور (پھر) امور (کائنات) کی تدبیر کون کرتا ہے۔ پس وہ بول اٹھیں گے کہ اللہ۔ تو آپ اُن سے کہیے کہ (پھر اللہ سے) ڈرتے کیوں نہیں؟" (آیت ۳۱)۔ مشرکین نے اپنے خداؤں اور اوہام باطلہ کی پیروی کی ہے جو بالکل لغو ہیں اور یہ قرآن وہ نہیں جسے اللہ کے سوا کوئی بنا سکے۔ ہے کوئی ابھی یا کبھی جو اس جیسی کوئی سورۃ بنا لائے (آیت ۳۸)۔ منکرین کی کیفیت کا آگے چل کر بھی ذکر ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان اندھے بہروں کو کس طرح راہ دکھائیں گے؟ اور ہر اُمت کے لئے رسول اُتارا ہے لیکن منکرین نہیں مانتے "اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا؟ (آیت ۴۸)۔ لیکن "کیا جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اُس پر یقین کرو گے؟" —— اور (قیامت کا دن ایسا ہولناک ہوگا کہ) اگر ایک گناہ گار کے پاس روئے زمین کی تمام دولتیں ہوں تو یقیناً وہ اپنے (گناہوں کے) بدلے میں دے ڈالے (لیکن وہ عذاب سے نہ بچے گا) ....." (آیت ۵۴) "اللہ پاک کی طرف سے نصیحت (موعظت) آگئی۔ یہ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے" (آیت ۵۷)۔ اللہ پاک کو ہر حالت اور ہر چیز کا علم ہے اور اللہ پاک نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لیے فرمایا ہے کہ "سُن لو، جو اللہ والے ہو گئے اُن کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے یہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا" (آیت ۶۲-۶۳)۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ منکرین کو نوح علیہ السلام کا حال سُنا دیں کہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اگر تم لوگوں کو میرا رہنا اور اللہ کی آیتوں سے نصیحت کرنا گراں گزرتا ہے تو میں نے اللہ پر توکل کیا۔ لیکن اُن کو بھی جھٹلایا گیا۔ ان کے بعد کتنے انبیاء علیہم السلام دنیا میں آئے لیکن لوگ اُنھیں جھٹلاتے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے حق بات پہنچائی تو اُسے بھی جادو کہا گیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا ذکر ہے اور فرعون کی نافرمانی بیان کی گئی ہے۔ "اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار کر دیا۔ پھر فرعون اور اُس کے لشکر نے سرکشی اور ظالمانہ انداز سے اُن کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب وہ (اپنی فوج سمیت) ڈوبنے لگا تو (گھبرا کر) بولا کہ میں ایمان لایا

...... (اللہ پاک کا حکم ہوتا ہے کہ تجھے شرم نہیں آتی) اب (کہتا ہے کہ میں ایمان لایا) اور اس کے قبل نا فرمانی پہ قائم رہا اور مفسدوں میں سے تھا...... پس آج ہم تیرا جسم بچا دیتے ہیں تاکہ تو بعد میں آنے والی اُمّتوں کے لیے ایک نشان (عبرت) بن جائے اور بے شک اکثر لوگ ہماری نشانیوں پر توجہ نہیں دیتے۔" (آیت ۹۰-۹۲) - آج بھی فرعون کی لاش مصر کے عجائب خانے میں عبرت کا مجسمہ ہے۔ یہ واقعات اور پھر یونس علیہ السلام کی مومن اُمّت کا ذکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کی عبرت کے لیے ہے۔ پھر نافرمانیوں کی وجہ سے جب عذاب آجاتا ہے تو "ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کو بچا لیتے ہیں، اسی طرح ایمان والوں کو بچا لینا ہمارا ذمہ ہے۔" (آیت ۱۰۳)۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ "آپ فرما دیجیے۔ اے لوگو! تمھارے رب کی طرف سے تم کو حق پہنچ چکا۔ اب جو کوئی راہ ہدایت اختیار کرتا ہے تو وہ ہدایت سے اپنے ہی حق میں بھلائی کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ گمراہی سے اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور میں تمھارے کاموں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔" (آیت ۱۰۸)

سورۃ ھود

(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیں) کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور میں اُسی کی طرف سے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں اور یہ کہ اپنے پروردگار سے بخشش مانگو۔ پھر اس کی طرف رجوع کیے رہو۔ پھر اس کے حکم پر عمل پیرا رہو۔ اسی سے دونوں جہانوں میں فلاح ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی حیا کے ذکر پر یہ پارہ ختم ہوتا ہے۔ اور اب بارھواں پارہ شروع ہوتا ہے ———

"اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا (جاندار) ایسا نہیں کہ جس کی روزی اللہ پاک نے اپنے اوپر واجب نہ کر لی ہو اور وہ اُس کے ٹھہرنے اور اس کے سونپے جانے کی جگہ کو جانتا ہے (اور یہ) سب کچھ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔" (آیت ۶)۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف اسی دنیا (ارض) میں چلنے پھرنے والے (جاندار) ہیں اور ان کی روزی کا جہاں تک تعلق ہے اللہ پاک (معمولی حیلے سے بھی) وے دیتا ہے اور چلنے پھرنے (حرکت۔ عمل) سے کام بنتا ہے۔ "اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دن (چھے مراتب) میں پیدا کیا اور (اُس وقت) اُس کا عرش پانی پر تھا......" (ابھی تک انسانی دماغ اس حقیقت سے نا آشنا ہے) اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ منکرین کی وجہ سے آپ آزردہ نہ ہوں۔ آپ نے تبلیغ فرما دی تو آپ کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ منکرین عجیب عجیب سوالات کرتے ہیں "کیا یہ کہتے ہیں کہ قرآن کو آپ نے خود بنا لیا ہے۔ آپ فرما دیجیے کہ تم ایسی دس ہی سورتیں (آیتیں) بنا کر لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بُلا سکو (اپنی مدد کے لیے) بُلا لو۔ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔" (آیت ۱۳)۔ یہ منکرین اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں تو یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں رہیں گے۔ پھر نوح علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی عبادت کے لیے پیام دیا اور فرمایا کہ "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور

نہ میں اُن لوگوں کے متعلق جو تمہاری نگاہ میں حقیر ہیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اللہ اُن کو بھلائی نہ دے گا اور اللہ ہی خوب جانتا ہے جو اُن کے دلوں میں ہے (اگر میں بھی تمہاری طرح یہ کہوں) تو اس وقت میں بھی ناانصافوں میں ہو جاؤں"۔ (آیت ۳۱) - اس تقریر کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہمارے منکر ہونے کی وجہ سے جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اُسے لے آئیے۔ اللہ پاک نے اس واقعہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر تسلی دی ہے کہ منکرین کا یہ وطیرہ شروع ہی سے رہا ہے۔ آخر نوح علیہ السلام کے منکرین کو غرق ہونا پڑا۔ کشتی تیار کرنے کا حکم ملا۔ اس میں ہر جنس سے ایک جوڑا سوار کر لیا گیا اور نوح علیہ السلام کی "اہل" (سوائے اُس کے جس کے لیے عذاب کا حکم ہو چکا ہے) اور ایمان والے کشتی میں بٹھا لیے گئے۔ یہ لوگ طوفان سے محفوظ رہے لیکن نوح علیہ السلام کا بیٹا جو کسی پہاڑی کی پناہ لینے کا دعویٰ کر رہا تھا غرق ہو گیا۔ نوح علیہ السلام نے اللہ پاک سے عرض کیا کہ وہ تو میری "اہل" میں سے ہے۔ جواب ملا کہ نہیں، وہ تمہاری "اہل" میں سے نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عمل صالح پیش کرتا (یعنی پیغمبرِ وقت کی پیروی)۔ پھر ہود علیہ السلام کی قوم (عاد) کا ذکر ہے کہ وہ لوگ (یمن میں) مادی طور پر بہت آگے بڑھے ہوئے تھے لیکن اکثر ہدایت پر نہ آئے اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ پھر صالح علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے قوم ثمود میں تبلیغ فرمائی لیکن وہ لوگ اپنے خالق کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے رہے اور عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے۔ لوط علیہ السلام کی قوم جس گندگی میں مبتلا ہوئی اُس سے لوط علیہ السلام عاجز آ گئے۔ ابراہیم علیہ السلام (جو بُردبار، رقیق القلب اور ہر وقت اللہ کی طرف رجوع ہونے والے تھے) لوط علیہ السلام کی قوم پر سے عذاب دور کرنے کے لیے دعا کرنا چاہتے تھے تو اللہ پاک نے منع فرمایا اور اس قوم کو تہ و بالا کر دیا۔ پھر شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور قوم کی ذہنی کیفیت کا بیان ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ جب قومیں نافرمان ہو جاتی ہیں تو کیونکر تباہ کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا ذکر ہے کہ جوش اور ولولہ تھا اور ہم کلامی (اللہ سے) حاصل تھی لیکن قوم نے قدر نہ کی۔ پھر آیت ۱۱۲ سے ۱۱۵ تک مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ منکرین کے باعث پریشان نہ ہوں، ظالموں کی طرف مائل نہ ہوں، پانچوں نمازیں قائم کریں اور صبر سے کام لیں۔ پہلے بھی گذشتہ قوموں کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب پھر وہ حالات سُنائے جا رہے ہیں "تاکہ" آپؐ کا دل قائم (برقرار) رہے اور اس میں آپ کے پاس "حق" پہنچا ہے اور ایمان والوں کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے"۔ (آیت ۱۲۰)۔

سورۃ یوسف

یہ سورۃ بتاتی ہے کہ انسان کو اپنے ہم جنسوں اور اپنی نفسانی خواہشات سے کس طرح بچ کر رہنا چاہیے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو یوسف علیہ السلام اور اُن کے بھائیوں کے قصے میں بڑی نصیحت ملتی ہے۔ کن کن مصیبتوں اور آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے۔ بھائی دھوکا دیتے ہیں (جو اللہ کا خوف نہیں رکھتے)۔ حالی کہتے ہیں :-

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

عزیز مصر کی بیوی کی خواہش بھی ایک فریب ہے جو اللہ سے ہٹا دیتا ہے۔ قید کے رفیقوں سے بھی اللہ کا رشتہ جوڑنے کی تبلیغ ہے کہ

"اے میرے قید خانے کے ساتھیو، کئی کئی جُدا جُدا معبود اچھے یا ایک یگانہ اور غالب اللہ (اچھا ہے)؟" (آیت ۳۹) عزیزِ مصر نے بھی ایک خواب کی تعبیر چاہی۔ یوسف علیہ السلام نے کہلا بھیجا کہ پہلے اُن عورتوں سے میرے متعلق دریافت کرو۔ وہ بول اٹھیں" اللہ کی قسم، ہم نے اس (یوسفؑ) میں کوئی بُرائی نہ پائی۔ عزیز کی بیوی نے کہا کہ اب حق بات سب پر ظاہر ہو چکی ہے۔ میں نے ہی اُس کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا بے شک وہی سچا ہے" (آیت ۵۱)۔ یوسف علیہ السلام انکشافِ حق چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے لیے اس قصے میں یہی بہت بڑا سبق ہے ۔

اب تیرھواں پارہ شروع ہوتا ہے:۔

یوسف علیہ السلام کو ملک کے خزانوں پر مامور کیا گیا۔ قحط کے زمانے میں یوسف علیہ السلام کے تدبر سے ملک مُضر اثرات سے محفوظ رہا اور دوسرے ممالک کے لوگ بھی ان کے یہاں غلہ خریدنے کے لیے آتے تھے، یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی طبیعت کی مناسبت سے کچھ لالچ، کچھ تنبیہ فرمائی تھی اور یعقوب علیہ السلام کے لیے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ بن یامین کو بھیجنے میں متردد نہ ہوں۔ بہر حال آگے تفصیل آتی ہے کہ کس طرح یوسف علیہ السلام نے بن یامین کو روک لیا اور اپنے والد صاحب کے پاس اپنا پیراہن بھیجا۔ یعقوب علیہ السلام کی بصارت واپس آگئی اور یوسف علیہ السلام کو اُن کے والدین کی تشریف آوری سے جو خوشی ہوئی اس کا اظہار یوں کیا تھا۔

"اے میرے رب (میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں) تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور تعبیر (تدبیر بھی) سکھائی۔ اے زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ میرا خاتمہ مسلمان کی حیثیت سے کر اور مجھے صالحین میں شامل کر" (آیت ۱۰۱) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعات سُنائے گئے ہیں کہ حق، حق ہی ہے اور شر کی اصلاح مشکل ہے منکرین کو عذابِ الٰہی سے صرف اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت بچا سکتی ہے اور یہ احسن القصص اہلِ بصیرت کے لیے ہے۔ "بے شک ان کے حالات میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے عبرت ہے۔ کوئی بنائی ہوئی بات تو ہے نہیں۔ بلکہ تمام پہلی صداقتوں کی تصدیق کرنے والا، ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والا اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔" (آیت ۱۱۱)

سورۃ الرّعد

المّٓرٰ حروفِ مقطعات سے پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ کتاب (الٰہی) کی آیتیں ہیں اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا وہی حق ہے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ان منکرین کو متوجہ کرائیے کہ کائنات کو دیکھیں اور سمجھیں کہ کس نے سب کچھ پیدا کیا۔ زمین، پہاڑ، دریا اور ہر طرح کے پھلوں میں جوڑے اُسی نے پیدا کیے، دن کو رات کا لباس اُسی نے پہنایا (لیل و نہار کی گردش سے دنیا میں کیا کیا ہے۔ ع

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات)

غرض کائنات کی ہر چیز اللہ کے وجود پر شہادت دیتی ہے۔ مٹی سے اُگتے ہوئے دانہ سے بھی انسان کو دوبارہ پیدا ہونے کا ثبوت

مل سکتا ہے۔ کفار جو معجزے کے خواہاں ہیں تو قرآن کونسا چھوٹا معجزہ ہے؟ ۔ اللہ پاک ہر چیز اور اُس کی جزئیات کا خالق اور اُس سے واقف ہے۔ ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔ اللہ کے پہرہ دینے والے ہر بندے کے ساتھ مامور ہیں جو اللہ کے حکم سے اُس کی نگہبانی کرتے ہیں۔ پھر بھی اللہ پاک کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ حالی نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے:۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اللہ کی یاد دلا رہی ہے اور ہر چیز اُسی کے آگے سر جھکاتی ہے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُن سے پوچھیے کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ آپ (ہی) فرمادیں کہ اللہ۔ آپ کہیے کہ پھر تم اُس کو چھوڑ کر ایسوں کو کیوں حمایتی (معبود) بناتے ہو جو اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ آپ پوچھیے کیا نابینا اور بینا برابر ہیں یا تاریکی اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا ان لوگوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک ٹھہرا لیے ہیں کہ انہوں نے کچھ پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ نے پیدا کیا ہے تو انہیں ان کا اور اس کا بنانا ایک سا معلوم ہوا۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی اکیلا زبردست ہے" (آیت ۱۶)۔

پھر حق و باطل کی تمیز کے لیے ایک مثال ہے۔ بہرحال، اللہ اور اُس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی سے حق کی راہ مل سکتی ہے اور منکرین کے لیے جہنم جیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

کیا وہ شخص جو آپ کے کلام کو حق جانتا ہے اُس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اندھا ہے؟ ۔ اولی الالباب (صحیح عقل والے) وہ ہیں" جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے عہد کو نہیں توڑتے (ایمان والا عہد) اور وہ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا ہے (ایمان) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور سخت عذاب سے ڈرتے ہیں اور جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور علانیہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور نیکی کر کے بُرائی کو دور کرتے ہیں۔ اُنہی کے لیے آخرت کا گھر (جنت) ہے" (آیت ۲۰-۲۲)۔ اہل ایمان بھی وہی ہیں" (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے تسکین پاتے ہیں" (آیت ۲۹)۔ یہ ایمان والے اور عمل صالح والے وہ ہیں جن کے لیے خوشی اور آفرین ہے اور بہترین ٹھکانا (آخرت کا) ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی کتاب ایسی ہوتی جس سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے اور مُردے بولنے لگتے تو کیا وہ قرآن کے علاوہ کوئی اور کتاب ہو سکتی تھی؟ اور کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی قدرت و حکمت کی مالک ہے؟ یہی قرآن وہ نعمت ہے جس سے ہدایت والوں کو قلبی مسرت حاصل ہوتی ہے (آیت ۳۶) اور یہ عربی زبان میں ہے (آیت ۳۷) اور جس طرح آیاتِ قرآنی اور کائنات کی نشانیوں میں کوئی تناقض نہیں ہے اسی طرح انبیا سابقین (علیہم السلام) اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں بنیادی فرق کوئی نہیں کیا منکرین نہیں دیکھتے کہ ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اللہ پاک جلد حساب لینے والا ہے (آیت ۴۱)۔ اور جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا انکار کر رہے ہیں اُن سے" آپ فرما دیجیے کہ میرے اور

تمھارے درمیان بس اللہ (ہی) گواہ ہے ......" (آیت ۴۳)۔

سورۃ ابراہیم

یہ سورۃ بھی الٓرٰ کے حروف مقطعات سے شروع ہے اور فوراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "یہ ایک (پُرنور) کتاب ہے۔ اس کو ہم نے آپؐ پر اتارا ہے تاکہ آپ (بھولے ہوئے) لوگوں کو اُن کے رب کے حکم سے اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکالیں۔ عزیز (غالب) اور حمید (قابلِ تعریف) خدا کے راستے کی طرف (لے جائیں)۔" ہر رسول کو اُسی کی قوم کی زبان میں تبلیغ کا حکم ہؤا۔ (یہی معاملہ قرآن کے ساتھ ہے)۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم تھا کہ وہ بھی اندھیروں سے نور کی طرف (اپنی قوم کو) لائیں۔ اللہ پاک ہی نے اُن کی قوم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دلائی جو سخت تکلیف پہنچاتے تھے اور بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے لیکن بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ قوم نوح اور قوم عاد و ثمود کی نافرمانی کا ذکر بھی آتا ہے:۔ توحید کی راہ میں اذیتیں اٹھانا تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور منکرین کی مثال یوں آتی ہے:۔" وہ لوگ جو اپنے رب سے منکر ہوئے اُن کے اعمال کی مثال اُس راکھ کی سی ہے جس پر آندھی کے دن ہوا تیزی سے چلے (یعنی اُڑا لے جائے اور کچھ نہ بچے)۔ اُن کو اپنی کمائی سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ یہی تو بہک کر دُور جانا ہے۔" (آیت ۱۸)۔ قیامت کے دن اللہ کے روبرو سب لوگ پیش ہوں گے تو وہ جھوٹے معبود بھی پیش ہوں گے جو بے بس ہیں۔ اُس وقت حق و باطل کا فرق کھل جائے گا۔ اور ایمان و عمل صالح والے لوگ جنتوں میں داخل کئے جائیں گے۔ کلمۂ طیبہ (توحید) کی مثال یوں ہے کہ ایک پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑیں مضبوط اور ڈالیاں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں اور کفر و شرک کی مثال ایسی ہے جیسے ایک فضول (خبیث) درخت جس کو زمین میں سے اکھاڑ پھینکا ہو اور اُسے قرار نہ ہو (آیت ۲۴-۲۶)۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مزرعِ آخرۃ فرمایا ہے۔ توحید کی وجہ سے دنیا میں یہ خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ پوشیدہ طور پر اور علانیہ طور پر اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی مخلوق کو دیا جائے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (سعدیؒ)

یہ شعر آیت ۳۲-۳۴ کی ترجمانی کرتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں دعا مانگی تو وہ امن کا شہر بن گیا، اُن کی اولاد کو اصنام پرستی سے بچا لیا گیا اور بڑھاپے میں اُن کے دو صاحبزادے (اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ) پیدا ہوئے۔ جن کی اولاد میں کتنے جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوئے! ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی اولاد میں سے (اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں) ہیں۔"(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو اُس دن سے ڈرایئے جب اُن پر عذاب آجائے گا، پھر یہ ظالم التجا کریں گے کہ اے ربّ ہم کو کچھ دنوں کی مہلت دے کہ ہم تیری دعوت (دنیا میں جاکر) قبول کریں اور (تیرے) رسولوں کی پیروی کریں۔ کیا تم لوگ اس سے قبل قسمیں نہیں کھایا کرتے تھے کہ تم کو زوال نہیں۔

(اب کیوں ہوا؟)"۔ (آیت ۴۴) - منکرین زنجیروں میں جکڑے جائیں گے اور ان کے کُرتے گندھک (یا تانبے) کے ہوں گے اور آگ اُن کے چہروں کو ڈھانک رہی ہوگی "۔ (آیت ۵۰) - آپؐ ابلاغ فرماتے رہیں -

سورۃ الحجر

اس سورۃ کی پہلی آیت کے بعد ہی :

چودھواں پارہ شروع ہوتا ہے

الٓرٰ ۔ حروف مقطعات کے بعد ہی قرآن مبین کا ذکر ہے اور یہ کہ قیامت میں کفار بار بار آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے - کُفار کی بستی اپنے وقت پر تباہ کی جاتی ہے - آپؐ کے زمانے میں وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپؐ تو (معاذ اللہ) دیوانہ ہیں اور انکار کرنے پر عذاب کے منتظر ہیں جس کو ڈھیل دی گئی ہے -"ہم ہی نے یہ نصیحت (کتاب) نازل کی ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں" (آیت ۹) — قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ پاک نے لیا ہے - قرآن پاک کا حفظ، تراویح میں حفظ کا سالانہ امتحان، الفاظ، معانی، حرکات، حروف، ترتیب، تدوین، تجوید، ترتیل، تفسیر وغیرہ کا پورا انتظام اللہ پاک نے اس طرح کیا ہے کہ دنیا میں کسی اور صحیفے اور کسی کتاب کا ایسا انتظام نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا - پھر اس کی ادبیت علمیت اور افادیت کے مقابلے کے لیے ہمیشہ سے دنیا کے سامنے چیلنج ہے - ان اوصاف کے باوجود منکرین اس پر ایمان نہیں لاتے - آسمان کے بروج، زمین پر سخت وزن کے پہاڑ، زمین میں ہر طرح کی معین مقدار کی چیزیں، معیشت کے اسباب، ابر آلود ہوائیں، بارش اور بالیدگی وغیرہ سے بھی ان کے خالق کو پہچانا جاسکتا ہے - انسان اور جنوں کی تخلیق، پھر شیطان کا انکار، اُس پر لعنت وغیرہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچانا جاسکتا ہے - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انہی چیزوں کو منکرین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اُن سے خطاب ہوتا ہے کہ (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) "میرے بندوں کو مطلع فرما دیجیے کہ میں بخشنے والا بڑا مہربان ہوں اور (کافروں پر) بلاشبہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے۔" (آیت ۴۹-۵۰)

پھر ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ کبر سنی کے باوجود اُن کو صاحبزادے کی ولادت کی خوش خبری سنائی گئی - لوط علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا اُس کا ذکر آیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر عجیب کیفیات رونما ہوئیں - اللہ پاک نے یوں خطاب کیا کہ " اے (میرے پیارے) آپؐ کی جان کی قسم وہ لوگ (لوط علیہ السلام کی قوم) اپنی مستی میں مدہوش ہو رہے تھے (ان کا علاج یہی تھا کہ ان کو ہلاک کیا جائے) پس طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اُن کو ایک چنگھاڑنے آپکڑا - پھر ہم نے اس بستی کو تہ و بالا کر ڈالا اور اُس پر کنکر (سنگ گل - سجیل) کے پتھر برسائے "۔ (آیت ۷۲-۷۴)، درختوں کی گھنی جھاڑیوں میں رہنے والے (اصحاب الایکہ)، حجر کی بستی والے (اصحاب الحجر) جو پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے وہ بھی قہر الٰہی سے نہ بچ سکے - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سات آیتوں والی سورۃ (الفاتحہ) اور قرآن پاک عطا فرمایا ہے (آیت ۸۷) جس کی تلاوت سے ایسا تزکیہ ہو جاتا ہے کہ اگلے وقتوں کی قوموں والے عذاب سے انسان کو چھٹکارا مل سکتا ہے "۔ اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم جانتے ہیں کہ ان (کافروں) کی باتوں سے آپ

کا جی تنگ ہوتا ہے۔ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہیے (جو آپ کا معمول ہے) اور سجدہ کرنے والوں میں رہیے اور اپنے رب کی عبادت وصال بالرفیق الاعلیٰ تک کیے جائیے۔" (آیت ۹۷ تا ۹۹)۔

سورۃ النّحل

انبیاء علیہم السلام پر طعن و تشنیع کرنا منکرین کا شیوہ رہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے منکرین کو بتایا جا رہا ہے کہ "اللہ کا حکم آ پہنچا۔ پس اس کے لیے جلدی نہ کرو (یعنی اُن کی شکست اور تباہی کا وقت آ پہنچا)۔ وہ (اللہ) اُس شرک سے پاک تر ہے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔" (آیت ۱) اللہ پاک کی شان اور قدرت کی بھی تبلیغ ہے کہ آسمانوں، زمین، انسان، حیوانات، بارش، شجر، کھیتی، زیتون، کھجور، انگور، رات دن، سورج چاند، رنگ برنگ کی چیزوں، سمندر کی تسخیر، اُس میں سے گوشت، زیور (موتی وغیرہ) کشتیوں وغیرہ سے اللہ پاک کی شان کو پہچانا جا سکتا ہے اور اُس کی اتنی نعمتیں ہیں کہ اُن کو شمار نہ کر سکو گے۔ لیکن منکرین نہیں پہچانتے اور قرآن کو بھی اساطیر الاولین (آیت ۲۴) سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شامتِ اعمال اور ان اعمال کے نتائج کا ذکر ہے۔ اور "ہم نے ہر امت کے لیے ایک رسول بھیجا ....." (آیت ۳۶) اور "جب ہم کسی شئے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا اس کو اتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے"۔ (آیت ۴۰)۔

کفار کے ذکر کے بعد مومنوں کی کیفیت کا بیان ہے اور مشرکانہ توہمات کی تردید ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی تابع ہے اور اپنی عاجزی کی معترف ہے لیکن نافرمان انسان سرکشی کرتا ہے اور اللہ کو نہیں پہچانتا۔ کافروں کا یہ حال ہے کہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے بتوں کا حصّہ نکالتے ہیں اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔" اور ہم نے تو قرآن آپ پر اس لیے نازل کیا کہ آپ اُن پر وہ باتیں واضح فرما دیں جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں (مثلاً توحید، رسالت، آخرت، حلال و حرام وغیرہ) اور (قرآن تو) ہدایت و رحمت اُنہی کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں" (آیت ۶۴) اور تمھارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے (وہ تمھارے لیے تر ندہ ہیں)۔ اُن کے پیٹ میں سے گوبر اور خون کے درمیان سے ہم خالص دودھ تم کو پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے"۔ (آیت ۶۶)۔" اور کھجور اور انگور کے میووں میں سے بھی (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو) تم اُن سے نشہ کی چیزیں بناتے ہو اور کھانے کی عمدہ غذائیں۔ بے شک اس میں عقل والوں کے لیے بڑی نشانی ہے۔" (آیت ۶۷)۔ شہد کی مکھی ہر قسم کے درختوں سے کھا کر شہد بناتی ہے"۔ جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے"۔ (آیت ۶۹)۔

اللہ پاک نے رزق کے معاملے میں بعض کو بعض پر فضیلت دی (آیت ۷۱)، بیوی بچے بنائے اور طیّب چیزیں کھانے کو دیں۔ لیکن لوگ پھر بھی اُس کو نہیں پہچانتے اور اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ کیا ایک غلام (مجبورِ محض) ایک صاحبِ اختیار آقا کے برابر ہو سکتا ہے اور کیا ایک گونگا (محتاج) اُس کے برابر ہو سکتا ہے جو لوگوں کو انصاف کے ساتھ (کام کرنے کا) حکم دیتا ہے اور خود بھی راہِ حق پر قائم ہے (آیت ۷۶)۔ تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا، کان، ناک، آنکھیں دیں، پرندوں کو ہوا میں پرواز کرنے کی طاقت دی، تم کو گھر دیے، خیمے دیے، اون بال والے جانور، آرام کے لیے چیزیں دیں"۔ پھر بھی اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو ...

میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے ذمّے صرف اللہ کا حکم صاف صاف پہنچا دینا ہے۔" (اور بس) (آیت ۸۲)۔

" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) جس دن ہر امت پر ہم ایک گواہ اُن میں سے اٹھائیں گے (یہ وہی پیغمبر ہوں گے جو اُن کے اعمال پر گواہی دیں گے) اور ان سب پر ہم آپؐ کو گواہ بنائیں گے (کیونکہ آپ سب سے افضل ہیں) اور آپ پر (وہ) کتاب نازل کی جو ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت ہے اور رحمت ہے اور بشارت ہے۔" (آیت ۸۹) - اس آیت میں قرآن پاک کی چار خصوصیات بتائی ہیں) — پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ پیام ہے کہ "بے شک اللہ پاک تم کو انصاف احسان اور رشتہ داروں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور کھلی بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور ظلم سے منع کرتا ہے تم کو نصیحت کرتا ہے کہ تم یاد رکھو۔" (آیت ۹۰) - خدا کی قسم کھا کر توڑنا تو ایسا ہے کہ اللہ کو شاہد بنا کر اس کا انکار کیا۔ یا ایک دیوانی عورت، محنت اور مشقت سے سوت کاتے اور پھر تاگے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ (آیت ۹۲) - دھوکا دینے کے لیے قسموں کو ذریعہ نہ بناؤ، دنیوی عزت اور دولت کے لیے دین کو نہ بیچو۔ اللہ کے پاس تمھارے لیے بڑا فائدہ ہے اگر اُس کی اطاعت کرو۔ کیونکہ نیک عمل سے "حیاتِ طیبہ" (اس دنیا میں بھی) مل سکتی ہے اور قرآن پڑھتے وقت بھی شیطان سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ یہ قرآن جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے اور ایسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہنچایا جس نے سوائے خدا کے کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔ اللہ پر بہتان باندھنے والے عذابِ عظیم کے لیے تیار رہیں۔ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کی زندگی کے مقابلے میں عزیز رکھا۔ "یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی اور یہی لوگ غفلت میں پڑے ہیں۔" (آیت ۱۰۸) - مسلمانوں پر جب سخت مظالم ڈھائے جا رہے تھے تو اُن کے لیے تین صورتیں تھیں۔ پہلی یہ کہ مجبور ہو کر اسلام کو چھپانے کے لیے کلمۂ کفر کہے اور جان بچائے لیکن دل میں پوری صداقت ہو، دوسری یہ کہ مرتد ہو جائے۔ جس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تیسری یہ کہ ہجرت کرے۔ یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔ "پھر جن لوگوں نے تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور (ہر حال میں اسلام پر) قائم رہے (تو) بے شک اللہ (ان آزمائشوں) کے بعد (ان کو) بخشنے والا مہربان ہے۔" (آیت ۱۱۰) - پھر "حلال طیّب" چیزوں کے کھانے کا حکم ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں دنیا کو حاصل ہوئیں ورنہ پہلے ان کے احکام بھی پوری طرح مرتب نہیں ہوئے تھے۔ آیت ۱۱۶ میں حلال اور حرام کے متعلق ارشاد ہے کہ اللہ نے اگر کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں کہا تو اللہ سے ایسا کہنا کیوں منسوب کرتے ہو؟ حقیقت یہ ہے "حلال طیّب" کی پہچان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے بنی نوع انسان کو سمجھ میں آئی ہے۔ اللہ نے خود کوئی تفصیل نہیں بتائی لیکن حضورؐ کے ذریعے ہم کو سمجھائی ہے۔

پھر ابراہیم علیہ السلام کی تعریف ہے جن کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اُن سے بھی "ملّتِ ابراہیمی" کی پیروی کے لیے فرمایا گیا ہے۔ اور یہ کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیتے رہیے حکیمانہ اور مشفقانہ نصیحتوں کے ساتھ (بلاتے رہیے) اور (اگر اُن لوگوں سے بحث کرنے کی نوبت آئے تو) بہتر طریقے پر مباحثہ کیجیے۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ اُس کی راہ سے کون بھٹکا ہوا ہے اور کون ہدایت پر ہیں۔" (آیت ۱۲۵) - پھر اُن مظالم کا ذکر ہے جو مسلمانوں پر توڑے جا رہے تھے کہ اگر بدلہ لو تو اُسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کرنے

والوں کے حق میں یہ بہت اچھی بات ہے" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر کیے جائیں اور آپ کا صبر بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہے اور اُن پر غم نہ کیجیے اور اُن کے فریب سے دل تنگ نہ ہوں" (آیت ۱۲۷) "بے شک اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں"۔ (آیت ۱۲۸)۔

—اب چوتھی منزل اور پندرھویں پارہ کا آغاز ہے——

سورۃ بنی اسرائیل

"پاک ہے وہ ذات (اللہ) جو اپنے بندے کو ایک رات خانہ کعبہ سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) لے گیا جس کے گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں آنکھوں سے دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے"۔ اس آیت میں اپنے بندے کہا ہے، بندے کی روح نہیں کہا۔ یعنی نبوت کے بارہ سال بعد اور ہجرت سے ایک سال پہلے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات اپنی چچا زاد بہن حضرت ام ہانی کے مکان پر تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ کے حکم سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر لے گئے۔ ہر آسمان پر دروازے کھلواتے یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے۔ اس کے آگے جبرئیل علیہ السلام نہ جا سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب رف رف پر (براق کی سواری کے بعد) سوار ہوئے اور عرش سے بالائے عرش تک کا سفر تھا۔ اس آیت کے آخر میں اللہ پاک کی دو صفتیں سمع اور بصر کی ہیں جن کا آئینہ دار حضور کو بنایا گیا (سورۃ والنجم میں اس سفر مقدس کی اور تفصیل ہے) یہ امتیازی شان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی تاہم بنی اسرائیل کیلئے حضرت یعقوبؑ سے لے کر عیسیٰؑ تک جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے انہوں نے بڑے درجات حاصل کیے لیکن اُن کی قوم میں سے اکثر نے نافرمانی کی اور یہ بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں جن میں سے اکثر نے ملک میں دو بار فساد برپا کیا (پہلی بربادی جالوت کے ہاتھوں اور دوسری بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی۔ بعض مفسرین نے اس قول سے کچھ اختلاف کیا ہے)۔ "تاہم اگر بنی اسرائیل اب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے سدھرنا چاہیں تو سدھر سکتے ہیں ورنہ دوزخ کو ہم نے کافروں کے لیے (دائمی) قید خانہ بنا رکھا ہے (آیت ۸)۔ اور بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھی ہے اور ان ایمان والوں کو جو عمل صالح کرتے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں) بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے"۔ (آیت ۹)۔ اور ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے جسے وہ قیامت کے دن خود پڑھ لے گا۔

"اور جب ہم کسی بستی کو (اُس کی بداعمالیوں کی وجہ سے) تباہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اُس کے عیش پسند لوگوں کو حکم دیتے ہیں (ان کو رسولوں کے ذریعے احکام پہنچا دیتے ہیں تاکہ وہ خود کو درست کریں اور اپنے اثر سے عوام بھی درست ہوں) پھر وہ نافرمانی کرتے ہیں، اس طرح اُن پر حجت تمام ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس (بستی) کو تباہ کر ڈالتے ہیں"۔ (آیت ۱۶)۔ دنیا کے طالب اور عقبیٰ کے طالب اگر اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں تو وہ ہر ایک کی مدد کرتا ہے (آیت ۲۰)۔ "اللہ کے ساتھ کسی کو معبود نہ بناؤ" اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پروردگار کا یہ فرمان (عام) ہے کہ (اے لوگو) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کیا کرو۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُن کو اُف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو،

بلکہ ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور اپنے بازو نہایت عاجزی کے ساتھ محبت سے اُن کے سامنے جھکا دو اور اُن کے لیے دعا کرو کہ اے پروردگار تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے) پالا تھا" (آیت ۲۳-۲۴)- اِن آیتوں میں اللہ کی عبادت کے بعد ہی والدین کی خدمت کا ذکر ہے جس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ تیسرا حکم رشتہ دار، مسکین، مسافر کے حقوق کے لیے ہے (لیکن اپنا مال بے موقع نہ اُڑا دو) - چوتھا حکم ہے کہ" نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو (بخل پہ اُتر آؤ) اور نہ اُس کو بالکل ہی کھول دو (کہ خود شکستہ حال رہ جاؤ)" (آیت ۲۹) پانچواں حکم ہے کہ اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے نہ مار ڈالو (آیت ۳۱) - چھٹا حکم ہے کہ زنا کے قریب (بھی) مت جاؤ (آیت ۳۲) - ساتواں حکم ہے کہ جس کو اللہ نے قتل سے منع کیا ہے اُسے مت مارو (آیت ۳۳) - آٹھواں اور نواں حکم ہے کہ یتیم کے مال کے قریب (بھی) نہ جاؤ (بے جا تصرف نہ کرو) - آیت ۳۴) اور دسواں حکم ہے کہ ناپ تول برابر (صحیح) رکھو (آیت ۳۵) - گیارھواں حکم یہ ہے کہ جس بات کی تجھے (صحیح) خبر نہیں اُسکے پیچھے نہ پڑو (باز پرس کے دن پوچھ گچھ ہو گی - آیت ۳۶) اور بارھواں حکم ہے کہ زمین پر اکڑ کر مت چلو (آیت ۳۷)" یہ (ہدایت کی) باتیں اس حکمت سے ہیں کہ آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی فرمائی (تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق سمجھا جائے) ......" (آیت ۳۹) اور ہم نے قرآن میں (تمام اہم امور) پھیر پھیر کر (طرح طرح سے) بیان کیے ہیں تاکہ (لوگ) نصیحت حاصل کریں۔ مگر (افسوس کہ) وہ اور بدک جاتے ہیں" (آیت ۴۱)..." اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور اُن لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک نظر نہ آنے والا حجاب حائل کر دیتے ہیں" (آیت ۴۵) - وہ لوگ آپ کے خلاف کیا کیا سرگوشیاں کرتے ہیں - اگر وہ لوگ پتھر یا لوہا بھی ہو جائیں تب بھی اللہ کے سامنے حاضر کیے جائیں گے" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے بندوں سے فرما دیجیے کہ بات ایسی کریں جو احسن ہو ......" (آیت ۵۳) اور" آپ فرما دیجیے کہ (اے مشرکو) جن کو تم نے اللہ کے سوا (خدا) سمجھ رکھا ہے اُن کو پکارو (اُن کی مدد چاہو) تو (تم دیکھو گے کہ) ان کو تمہاری تکلیف دور کرنے یا بدل دینے کا قطعی اختیار نہیں (وہ خود مجبور ہیں)" (آیت ۵۶) -

"اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب ہم نے آپ سے کہا کہ آپ کے رب نے لوگوں کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے (یعنی نہ تو وہ کفار آپ کو کوئی ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ خود کو بچا سکتے ہیں) اور جو منظر ہم نے آپ کو (شبِ معراج میں) دکھایا تو وہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش ہے اور رہا (تھوہڑ) درخت (بھی ایک آزمائش ہے) جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے (دوزخ کے درخت اور وہاں کے عذاب پر کفار نے اعتراض کیا تھا) اور ہم (طرح طرح سے) اُن کو ڈراتے ہیں لیکن اُن کی سرکشی بڑھتی ہی جاتی ہے" (آیت ۶۰)-

پھر شیطان کا ذکر ہے کہ اُس نے نافرمانی کے بعد بنی آدم کو بہکانے کا عزم کیا تو اللہ پاک نے فرمایا کہ" بے شک جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا قابو نہیں چل سکتا اور آپ کا رب کارساز کافی ہے" (آیت ۶۵) اور بنی آدم کو (اس دنیا میں بھی) بزرگی بخشی ہے کہ خشکی اور تری میں اُن کو سواری (عزت) دی، پاک روزی دی اور کثیر مخلوقات پر فضیلت دی ہے -

پھر کفار کا واقعہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک میں سے وہ احکام نکال دیں جو کفار کے معتقدات کے خلاف ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کو مکہ معظمہ سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں لیکن (اے میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم)" آپ

سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی) نماز قائم رکھیں اور صبح کی نماز بھی۔ بے شک فجر کی نماز حضوری کا وقت ہے۔" (آیت ۷۸)۔ تہجد آپ کے لیے مزید ہے (آیت ۷۹)۔" اور آپ (علی الاعلان) فرما دیجیے کہ حق آگیا اور باطل بھاگا۔ بیشک باطل تو نکل بھاگنے والا ہے۔" (آیت ۸۱) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں (حضورؐ کی طرح) مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ (آیت ۸۲)

لوگ روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ وہ کیا سمجھیں گے جب کہ ایمان ہی کو نہیں سمجھتے اور بے شک آپؐ پر اللہ کا بڑا فضل ہے (آیت ۸۷)۔ کفار کے سامنے پھر قرآن جیسی چیز بنا لانے کا چیلنج ہے اور کفار کے جو ہتھکنڈے ہیں اُن کا ذکر ہے۔" آپ فرما دیں۔ تم سمجھو یا نہ سمجھو میرے اور تمھارے درمیان (حق کی) گواہی کے لیے اللہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں (کی نیت) سے باخبر اور (ان کے اعمال کا) دیکھنے والا ہے۔" (آیت ۹۶)

موسیٰ علیہ السلام کو نو واضح معجزات عطا کیے گئے لیکن پھر بھی اُن کو جادوگر کہا گیا اور فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو زمین میں چین نہ لینے دے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ اور اُس کے ساتھی ڈبو دیے گئے (آیت ۱۰۳)۔ پھر سبق ہے کہ موسوی معجزات ایک وقت معینہ کے لیے تھے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ (قرآن) جو بتدریج نازل ہوا ہے وہ ہمیشہ رہے گا اور" آپؐ فرما دیجیے کہ تم اس کو مانو یا نہ مانو، البتہ جن لوگوں کو اس کے نازل ہونے سے قبل علم دیا جا چکا ہے (کتبِ سابقہ سے) جب یہ انھیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے (سب پاکی اُسی کے لیے ہے) بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں، روتے جاتے ہیں اور اُن کا خشوع بڑھتا جاتا ہے۔" (آیت ۱۰۷-۱۰۸)" اور فرما دیجیے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اُس کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ کسی کمزوری کے باعث اس کا کوئی مددگار ہے اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اُس کو بڑا جان کر اُس کی بڑائی (بیان) کرتے رہیے" (آیت ۱۱۱)۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے توحید کی تبلیغ سب سے زیادہ پُر اثر انداز میں کی گئی ہے کیونکہ وہی اس طرح تبلیغ کرنے کے اہل تھے۔

سورۃ کہف

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ کتاب نازل فرمائی اور جس میں کوئی بھی کجی نہ رکھی (کتاب کیسی) ٹھیک کہ وہ (منکرین کو) ایک سخت عذاب سے متنبہ کرے جو اللہ کی طرف سے (آنے والا) ہے اور ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہیں) خوش خبری سنا دے کہ اُن کے لیے نیک اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" (آیت ۱-۳)" پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان کے پیچھے غم سے اپنی جان گھلا نہ ڈالیں کہ وہ اس بات پر (توحید پر) ایمان کیوں نہ لاتے" (آیت ۶)۔ وہ لوگ تو عجیب عجیب باتوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کہف (CAVE) والے (جو غار میں پناہ گزیں ہوئے تھے) کتنے تھے۔ اس گنتی کی بحث سے کیا فائدہ؟ ان لوگوں نے تو اللہ سے لو لگائی

تھی اور اللہ نے اُن کو سالہا سال تک تھپک کر سُلا دیا تھا تاکہ لوگ اللہ پاک کی قدرت کو سمجھیں کہ وہ کس طرح آخرت میں پھر پیدا کر سکتا ہے۔ اصحاب کہف کے دلوں کو اللہ کی یاد نے مضبوط کر دیا (آیت ۱۴) اور انہوں نے غار میں پناہ لی" اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سورج کو دیکھیں گے کہ جب وہ نکلتا ہے تو اُن کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو اُن سے بائیں جانب کترا کر جاتا ہے اور اس (غار) کے ایک کشادہ میدان میں تھے (جو پہاڑیوں کے درمیان میں تھا۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو حالتِ گمراہی میں چھوڑ دے تو پھر آپ اس کے لیے کوئی رفیق راہ بتانے والا نہ پائیں گے"۔ (آیت ۱۷)۔ یعنی جب آپؐ ہی کی بات یہ نہیں سنیں گے تو پھر ان کی ہدایت کون کر سکتا ہے؟ اس کے بعد آیت ۲۲ تک پھر اور آیت ۲۵ - ۲۶ میں بھی اصحاب کہف کا حال ہے۔ اس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اُمت کو تعلیم دی ہے کہ ایسا نہ کہیں کہ ہم یہ کل کر دیں گے بلکہ انشاء اللہ بھی کہیں"۔ اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم") آپ اپنے کو ان (اصحاب) کے ساتھ روکے رکھیے (صبر و استقامت کے ساتھ) جو اپنے پروردگار کو صبح و شام (ہر وقت) یاد کرتے ہیں۔ جو اُس کی رضا کے طالب ہیں اور آپ بھی اپنی آنکھیں (نظرِ التفات) دنیوی زندگی کی زینت کے خیال سے نہ ہٹائیں اور آپ اُس کا کہنا نہ مانیں جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جو اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اُس کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے"۔ (یہود چاہتے تھے کہ غریب مسلمانوں کو حضورؐ چھوڑ دیں)۔ آیت ۲۸ - کافر اور مومن کے صلے کا ذکر تھا، اب دولت مند کافر اور مومن فقیر کی مثال دی جا رہی ہے کہ اصل دولت ایمان ہے اور اسی ضمن میں دنیا کی بے ثباتی، کفر و تکبر کے انجام اور ایمان و تقویٰ کی مقبولیت سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ (آیت ۳۲ تا ۴۴)" مال اور اولاد تو دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور (حقیقی سرمایۂ حیات وہ) باقی رہنے والی نیکیاں ہیں جو آپ کے رب کے یہاں ثواب کے اعتبار سے بہت اچھی اور امید کے اعتبار سے بہت بہتر ہیں"۔ (آیت ۴۶) پھر انسان کو غیرت دلائی گئی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر اس قدر سرکشی اختیار کرے حالانکہ اسے مسجودِ ملائک بنایا گیا تھا اور اُسے دشمن شیطان سے بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام اور اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اُسی کی بھلائی کے لیے تشریف لائے ہیں، اب موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آتا ہے کہ وہ اللہ کے ایک بندے سے جو مجمع البحرین میں تھے ملنے کے آرزو مند ہوئے۔ پتا یہ دیا گیا کہ تلی ہوئی مچھلی ساتھ رکھو، جہاں وہ گم ہو جائے وہیں وہ بندہ ملے گا۔ بہر حال وہ (خضر علیہ السلام) مل گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سے" انہوں نے کہا۔ اچھا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو تم مجھ سے کسی بات پر سوال نہ کرو گے جب تک کہ میں خود اس کا ذکر تم سے نہ کر دوں"۔ (آیت ۷۰)۔ — خضر علیہ السلام نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا، ایک لڑکے کو قتل کر دیا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دیا۔ یہ تینوں باتیں موسیٰ علیہ السلام کے نظریے (شریعت) کے لحاظ سے قابلِ اعتراض تھیں، علامہ اقبالؒ نے اسی واقعے کے متعلق کہا ہے :-

کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اب سولھواں پارہ شروع ہوتا ہے ———

موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کا قصہ جاری ہے۔ تیسرے موقع پر خضر علیہ السلام نے ایک دیوار کو سیدھا کر دیا جو گرنے والی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام کا کچھ معاوضہ لے لیتے تاکہ کچھ غذا ہی میسر آ جاتی کیونکہ بھوکے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ" اب میرے اور تمہارے درمیان جُدائی ہے۔" پھر بتایا کہ وہ جو کشتی تھی چند غریبوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ اس میں نقص پیدا کر دوں تاکہ اُس طرف کا بادشاہ جو (ثابت) کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا، اس کو نہ چھین سکے اور جو لڑکا میں نے مار ڈالا تھا اُس کا ماتعبیر یہ ہے کہ اُس کے ماں باپ ایمان والے تھے، اور اندیشہ تھا کہ وہ لڑکا ان کو اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز کر دے گا۔ اور وہ جو دیوار تھی وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی جس کے نیچے ان دونوں کے لئے مال دفن تھا اور ان لڑکوں کا باپ بڑا نیک آدمی تھا۔ پس اللہ پاک نے چاہا کہ یہ لڑکے جب جوان ہو جائیں تو اپنے باپ کا مال دیوار کے نیچے سے نکال لیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہوئے ہیں۔

ان واقعات سے مقصود یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو تسلّی دی جائے کہ کفار کی ظاہری خوش حالی اور مومنین کی خستہ حالی (جس کا ذکر شروع میں آ چکا ہے) یا جو بھی اللہ پاک کے کام ہیں اُن سب میں مصلحت ہے جسے ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اس لیے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنا کام (تبلیغ) کرتے رہنا چاہیے۔ واقعات کا ظاہر اُن کے باطن سے مختلف بھی ہوتا ہے ——

آیات ۸۳-۱۰۱ میں ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح وہ سد تعمیر ہوئی اور اس کے استحکام کا ممکن حد تک بندوبست کیا گیا لیکن وہ لازوال نہیں ہو سکتی۔ جب تک اللہ پاک کی مرضی ہے وہ قائم رہے گی اور جب وقت آ جائے گا تو اُس کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

آخری رکوع (آیت ۱۰۲-۱۱۰) میں ارشاد ہے کہ جن لوگوں نے اللہ پاک کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا کارساز بنا لیا ہے اُن کے لیے جہنم تیار ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا اور اس بات کو نہیں مانا کہ انھیں پروردگار کے سامنے جانا ہے باقی رہے مومنین تو اُن کے لیے جنت ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔" آپ فرما دیجیے کہ میں بھی تم جیسا ایک بشر ہوں (لیکن) مجھ پر وحی آتی ہے۔ (اور میری تبلیغ کا خلاصہ یہ ہے) کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ پس جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو تو اُسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔" (آیت ۱۱۰)

"نیک عمل" وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق ہو۔ اور یہ چیز ایمان کے ساتھ ساتھ ہے ——

سورہ مریم

اس سورۃ میں پہلے رکوع (آیت ۱ تا ۱۵) پھر دوسرے رکوع (آیت ۱۶ تا ۴۰) پھر تیسرے رکوع (آیت ۴۱ تا ۵۰) بعد ازاں چوتھے رکوع (آیت ۵۱ تا ۶۵) میں حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیا علیہم السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ سورۃ شروع کرتے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ تمہارے پروردگار کی اُس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریاؑ پر کی تھی ہے۔ انبیا علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہی وہ حضرات ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام

فرمایا اور ان ہی میں ان کی ذریات بھی داخل ہیں جو ایمان لائیں۔ لیکن ان کے بعد جو لوگ آئے وہ ناخلف تھے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور نمازیں چھوڑ دیں۔ غرض جو لوگ ایمان لائے وہ تو جنت میں ہوں گے۔ اسی درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی دیر سے آنے پر تسلی بھی دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کو بھولنے والا نہیں ہے۔ وحی مصلحت کے مطابق خدا تعالےٰ کے حکم سے ہی نازل ہوتی ہے۔ یہ سورۃ بہت دیر کے بعد نازل ہوئی اس لیے آپ مضطرب تھے چنانچہ آپ کو ان الفاظ میں جبرئیل علیہ السلام کی زبانی تسلی دی گئی کہ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) ہم تمھارے رب کے حکم کے بغیر نہیں اُترا کرتے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے اور تمھارا رب بھولنے والا نہیں۔" اللہ اللہ کس قدر پاس خاطر اپنے محبوب کی پیشِ نظر ہے کہ جب بھی کوئی اضطراب انگیز مرحلہ پیش آتا ہے تو اطمینان دلایا جاتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ وہ آپ کو بھول نہیں سکتا۔ وہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اس لیے آپ اس کی عبادت کریں اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہیں۔ انسان کہتا ہے کیا مرنے کے بعد پھر زندہ کیا جاؤں گا؟ کیا اُسے یاد نہیں کہ اس کو پہلے پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ہم تو بلاشبہ ان کو اکٹھا کریں گے پھر جو منکرین ہیں ان کو تو جہنم میں اور جو متقین ہیں اُن کو جنت میں داخل کریں گے۔ جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کفار، مومنین سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلس شاندار ہے؟ حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ظاہری شان و شوکت میں ان سے بڑھی ہوئی تھیں۔" اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ جو شخص گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے خداوند تعالےٰ انھیں ڈھیل دیا کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ لوگ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے تب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کس کا حال خراب ہے اور کس کا جتھا کمزور ہے۔" کیا آپ نے دیکھا کہ ہماری آیتوں کا انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ میں تو مال اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا۔ کیا ان لوگوں کو غیب کا پتا چل گیا ہے۔ ارے یہ تو ہمارے پاس تنہا حاضر ہوں گے۔ ان لوگوں نے جو مجھے چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لیا ہے اور اپنا مددگار سمجھ رکھا ہے۔ یہ سب ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور اُلٹے ان کے مخالف بن جائیں گے۔"

اب پانچویں رکوع (آیت ۸۳ تا ۹۸) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان لوگوں کی زیادتیوں پر بے صبر نہ ہوں۔ ان کی شامت قریب آگئی ہے۔ ان کی مہلت کے دن اور باقی ہیں انھیں پورا ہونے دیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ان منکرین پر شیاطین چھوڑ رکھے ہیں جو ان کو مخالفت پر خوب خوب اُکسا رہے ہیں۔ آپ ان پر نزول عذاب کے لئے جلدی نہ کریں ہم ان کے دن گن رہے ہیں۔ وہ دن آنے والا ہے جب متقی تو ہمارے دربار میں مہمان بن کر حاضر ہوں گے اور مجرمین جہنم کی طرف کشاں کشاں لے جائے جائیں گے یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنایا ہے سخت بیہودہ بات کہتے ہیں اللہ تعالےٰ کی شان یہ نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ یہ تمام لوگ فرداً فرداً میرے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور جو لوگ ایمان لے آئے اور عمل صالح کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے محبت پیدا کر دے گا چنانچہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کی زبان میں اس کتاب کو آسان کر کے اسی لیے نازل کیا ہے کہ آپ متقین کو خوشخبری سنائیے اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیے۔ ہم ان لوگوں سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کا آج آپ کہیں نشان نہیں پاتے اور نہ ان کی بھنک ہی کہیں سنائی دیتی ہے۔ (یہی وہ

سورۃ ہے جو حضرت جعفرؓ نے شاہ نجاشی کے دربار میں پڑھ کر سنائی تھی۔)

سورۃ طٰہٰ

یہ سورہ مکی ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے یہ سورۃ نازل ہو چکی تھی۔ پہلے اس سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ہم نے قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں خدا کا خوف نہیں تو ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ آسمان اور زمین کا اور تمام چیزوں کا مالک ہے پھر آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ کیا آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر بھی پہنچی ہے اس کے بعد (آیت ۹ تا ۱۰۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے پھر (آیت ۱۰۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں کہ آخر قیامت کے دن یہ پہاڑ کہاں چلے جائیں گے تو آپ ان سے کہہ دیجیے یہ پہاڑ کوٹ پیٹ کر اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے جیسے ریت کے ذرے اور ان کو دھول کی طرح اڑا کر ساری زمین ایک ایسا ہموار میدان بنا دی جائے گی کہ اس کی کوئی اونچ نیچ نہ رہے گی۔ احوال قیامت بیان کرنے کے بعد پھر (آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵ میں) آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے اسی طرح قرآن عربی کر کے نازل کیا ہے اور اس میں طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ یہ لوگ ڈریں یا یہ قرآن ان کے لیے کچھ سمجھ پیدا کر دے اور قرآن میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیا کیجیے۔ اور آپ یہ دعا کیا کیجیے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا دے۔ ہم پہلے بھی آدمؑ کو ایک حکم دے چکے تھے مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

آیت ۱۱۶ تا ۱۲۹ میں حضرت آدمؑ کا قصہ بیان کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا گیا کہ یہ منکرین اصل میں اپنے ازلی دشمن شیطان کے بہکائے میں آ گئے ہیں ان سے پہلے بھی ہم بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں اور یہ بھی ہلاک ہوں گے لوگوں کو گذشتہ قوموں سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔

پھر آیت ۱۳۰ تا ۱۳۵ میں براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر آپ صبر کیجیے اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے ضمناً نماز کے اوقات بھی بیان کر دیئے گئے اور کہا گیا کہ آپ دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیے جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں۔ ہم نے صرف ان کی آزمائش کے لیے ایسا کیا ہے اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس کی پابندی کیجیے، ہم آپ سے کوئی رزق کمانا نہیں چاہتے رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں یہ مشرکین آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتا کیا اس سے پہلے ان کے پاس اگلے صحیفوں کا بیان نہیں ہو چکا اگر ہم اس کے آنے سے پہلے ان کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو پھر یہی لوگ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ہی ہم تیری آیات کی پیروی اختیار کر لیتے۔ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے کہہ دیجیے کہ سب انتظار کر رہے ہیں سو تم

بھی انتظار کرو اب عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ راہ راست والے کون ہیں اور کون ہے جس نے راہ پائی اور مقصود تک پہنچا۔

سترھواں پارہ شروع ہوتا ہے ـــــ

سورۃ الانبیاءؑ

یہ سورۃ مکی ہے اور اس کی ابتدا ہی اس آیت سے ہوتی ہے کہ "لوگوں کے حساب کا وقت آ گیا ہے اور وہ ہیں کہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی آتی ہے ان کے رب کی طرف سے آتی ہے اس کو بہ تکلف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں"۔ ان ابتدائی آیات میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قیامت کے درمیان کسی نبی کی دعوت نہیں آئے گی اسی مضمون کو آپ نے بھی ایک حدیث میں اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے ارشاد فرمایا کہ "میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح ہیں"۔ یعنی میرے بعد بس قیامت ہی ہے۔ اب کوئی نبی درمیان میں نہیں آئے گا۔ پھر بتایا گیا کہ ظالم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں یہ تو تم ہی جیسا ایک انسان ہے پھر کیا دیکھتے ہوئے بھی تم جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے یہ لوگ آپ کو شاعر بھی قرار دیتے ہیں حالانکہ آپ سے پہلے بھی انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ ہم نے ان لوگوں کی طرف جو کتاب بھیجی ہے اس میں ان ہی لوگوں کا ذکر ہے۔

پھر آیت ۱۰ تا ۲۴ میں بیان کیا گیا کہ ہم نے بہت ہی ظالم قوموں کو ہلاک کر دیا کیونکہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ شرک کیا تھا اور یہ لوگ بھی تباہ ہوں گے۔ یہ لوگ شرک کرتے ہیں یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن سے وہ پاک ہے کیا دنیا جس نظم و ضبط سے چل رہی ہے اگر ایک سے زائد خدا ہوتے تو یہ نظم و ضبط قائم نہ رہتا اور پورا کارخانہ درہم برہم ہو جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہی ہے۔

بعد ازاں آیت ۲۴ تا ۲۹ میں فرمایا گیا کہ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنا لیا ہے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے فرما دیجیے کہ تمہارے پاس اگر اس کے متعلق کوئی دلیل ہے تو وہ پیش کرو یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے تم لوگ میری ہی عبادت کرو۔ یہ لوگ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں چنانچہ اپنا شفیع سمجھتے ہوئے فرشتوں کو معبود قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ تو صرف بندے ہیں۔

پھر آسمان و زمین کی تخلیق شب و روز اور شمس و قمر کی پیدائش کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ سب فانی ہیں اور اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے ہمیشگی نہیں رکھی ہے اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ یہ منکرین حق جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔ جلد بازی نہ کرو۔ عنقریب میں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کب وہ وعدہ پورا ہو گا کاش یہ لوگ جانتے کہ کس طرح اچانک وہ وقت ان پر آئے گا جبکہ وہ اس کو دفع نہ کر سکیں گے نہ اپنے منہ کو آگ سے بچا سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھیں اور نہ کہیں سے انھیں مدد پہنچے گی۔

اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے لیکن مذاق اڑانے والے تباہ ہو گئے آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ کون ہے جو رات کو یا دن کو تمھیں رحمان (کے عذاب) سے بچا سکتا ہے کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلہ میں ان کی مدد کر سکیں۔ وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں تم کو وحی کی بنا پر ڈرا رہا ہوں لیکن یہ بہرے ہیں آپ کی پکار کو نہیں سنیں گے قیامت میں ان کا پورا پورا احساب ہو جائے گا۔

ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان اور روشنی اور ذکر عطا کیا تھا تاکہ خدا سے ڈرنے والے متقین اس سے مستفید ہوں۔ اب یہ بابرکت ذکر یعنی قرآن نازل کیا ہے تو کیا یہ لوگ اس کا انکار کریں گے۔

آیت ۵۱ تا ۹۲ میں متعدد انبیائے کرام مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، اسحٰق، یعقوبؑ علیہم السلام وغیرہم کا قصہ ذکر کیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ تمھاری یہ اُمت ایک ہی ہے لیکن ان لوگوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا پھر قیامت اور اس کی ہولناکی بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ہم قیامت ضرور قائم کریں گے اور وہاں میرے صالح بندے اُسی زمین کے وارث ہوں گے اب (آیت ۱۰۶ تا ۱۱۲) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے یہ مشرکین آپ کو اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھتے ہیں حالانکہ آپ زحمت نہیں بلکہ رحمت ہی رحمت ہیں آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے تو کیا تم سر اطاعت جھکاؤ گے؟ اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دیجیے کہ میں نے تمھیں خبردار کر دیا ہے اب میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا دور۔ اللہ جانتا ہے وہ باتیں جو بلند آواز سے کہی جاتی ہیں اور وہ بھی جانتا ہے جو تم چھپا کر کرتے ہو۔

سورۃ الحج

اس سورۃ کے شروع میں قیامت کے ہولناک منظر کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ یقیناً قائم ہو کر رہے گی جس طرح اللہ تعالےٰ عالم سے وجود میں لانے پر قادر ہے اسی طرح دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے، جو لوگ اس کا انکار کرتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور جنھوں نے اس کو مان لیا وہ جنتی ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کعبہ اور اعلان حج کا ذکر ہے۔ اس کے بعد (آیت ۳۸ تا ۴۱) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ان لوگوں سے جنگ کی اجازت دی گئی جو جنگ کریں اور ظلم کریں۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اپنے گھروں سے ناحق محض اس بنا پر نکالے گئے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور عبادت گاہیں مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد فرمائیں گے یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر اللہ تعالےٰ ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

آیت ۴۲ تا ۴۶ میں کہا گیا "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ مشرکین آپ کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں آپ سے

پہلے دیگر انبیاءؑ کی قوموں نے بھی انھیں جھٹلایا لیکن ہم نے ان جھٹلانے والوں کو مہلت دی پھر ہم نے ان کی گرفت کی اور کتنی ہی ظالم آبادیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے ہوتے مگر ان کے دل اندھے ہیں۔"

(آیت ۴۹ تا ۵۱) "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اے لوگو میں تو صرف تمہارے لئے کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اس لیے جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے۔"

(آیت ۵۲ تا ۵۴ میں) پھر فرمایا گیا کہ "اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے پہلے جو رسول یا نبی ہیں سبھوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ جب انہوں نے تمنا کی تو شیطان ان کی تمنا میں خلل انداز ہوگیا اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ تعالےٰ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کرتا ہے تاکہ شیطان کی ڈالی ہوئی خرابی کو فتنہ بنا دے۔ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو لوگ علم والے ہیں وہ جان لیں کہ یہ حق ہے جو آپ کے رب کی طرف سے آیا ہے۔"

آیت ۶۵ تا ۷۲ میں فرمایا گیا کہ "ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے اس لیے اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اس معاملہ میں آپ سے جھگڑا نہ کریں۔ آپ تو اپنے رب کی طرف دعوت دیں اگر وہ لوگ آپ سے جھگڑیں تو کہہ دیجیے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو خوب معلوم ہے قیامت میں اللہ ان کی ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو پھر آخری آیت میں تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اللہ تعالےٰ نے تم لوگوں کو اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر قائم ہو جاؤ۔ اللہ تعالےٰ نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے" تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو "شہید" یعنی گواہ کہا گیا ہے ترمذی کی روایت ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی امت پیش ہوگی اللہ تعالےٰ حضرت نوح علیہ السلام سے فرمائے گا کیا تم نے تبلیغ کر دی تھی؟ وہ جواب میں عرض کریں گے ہاں اے پروردگار میں نے تیرے احکام پہنچا دیے تھے پھر ان کی قوم سے اللہ تعالےٰ فرمائے گا کیا نوح (علیہ السلام) نے میرے احکام پہنچا دیے تھے؟ تو وہ لوگ جواب دیں گے کہ نہیں ہمارے پاس تو کوئی نبی ہی نہیں آیا۔ پھر اللہ تعالےٰ حضرت نوحؑ سے فرمائیں گے کوئی ہے جو تمہاری گواہی دے سکے؟ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں عرض کریں گے جی ہاں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی امت اس بات کی گواہ ہے کہ ہم نے آپ کے احکام پہنچا دیے تھے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تصدیق فرمائیں گے اور امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کی تصدیق کرے گی۔"

اٹھارھواں پارہ شروع ہوتا ہے :-

سورۃ المومنون

اس سورۃ میں اطاعتِ رسولؐ اور اتباعِ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بحث کو مرکزی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اس کی ابتداء اس آیت سے ہوتی ہے کہ جو لوگ مومن ہیں یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات جن لوگوں نے مان لی ہے وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔ پھر ان

لوگوں کی چند بنیادی صفات بیان کی ہیں وہ یہ کہ نماز میں خشوع سے کام لیتے ہیں، لغو سے پرہیز کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں امانت و عہد کا پاس رکھتے ہیں۔ نماز کی پابندی کرتے ہیں ایسے لوگ جنت کے وارث ہیں۔

پھر آیت ۱۲ تا ۲۵ میں انسان کی تخلیق، آسمان و زمین اور نباتات و حیوانات وغیرہ کی پیدائش کو بیان کر کے انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کیے ہیں اُن قصوں سے مقصود یہ ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیم ایک رہی ہے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں لیکن بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے اس لیے اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے تو انھیں چھوڑ دیں اپنی غفلت میں ایک خاص وقت تک ڈوبے رہیں۔ مومنوں اور مشرکوں کا حال بیان کرتے ہوئے۔

(آیت ۶۹) میں فرمایا گیا کہ منکرین آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ کو جنون ہے حالانکہ آپ حق لے کر آئے ہیں لیکن ان کی اکثریت کو حق ناگوار ہے۔ اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

(آیات ۸۱-۹۰) یہ کفار کہتے ہیں کہ کیا مر جانے اور مٹی ہو جانے پر ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے ایسی باتیں تو اس سے پہلے بھی ہم سے کہی جا چکی ہیں؟ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ زمین اور اس پر کی ساری چیزیں کس کی ہیں، ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ پھر کیوں یہ لوگ دھوکے میں ہیں۔

(آیت ۹۳-۹۸) میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) دعا کیجیے کہ پروردگار جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ اگر میری موجودگی میں تو لائے تو اے میرے پروردگار مجھے ان ظالم لوگوں میں شامل نہ کیجیو۔"

پھر حکم دیا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) برائی کو اس طریقہ سے دفع کیجیے جو بہترین ہو یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ہم ان سے بخوبی واقف ہیں آپ دعا کیجیے کہ "اے پروردگار میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں بلکہ اے میرے پروردگار میں تو اس سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔"

(آیت ۹۹ تا ۱۱۵ میں) موت اور حشر کی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ کیا ان لوگوں کا خیال ہے ہم نے ان لوگوں کو عبث پیدا کیا ہے اور یہ میری طرف لوٹائے نہیں جائیں گے جنھوں نے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو عبادت میں شریک کیا تو اس کا حساب ان کے پروردگار کے پاس ہے یہ لوگ فلاح نہیں پا سکتے پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دعا کریں کہ میرے رب درگذر فرما اور رحم کر اور تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔

سورۃ النور

یہ سورۃ زنا، قذف اور لعان کے قانون پر مشتمل ہے۔ پردے کے قواعد و احکام بیان کیے گئے ہیں شادی کے قابل لوگوں کے مجرد بیٹھے رہنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے کسی کے گھر جانے پر اذن طلبی کا قاعدہ بیان کیا ہے غرض اس طرح کے معاشرتی و مجلسی آداب اس سورۃ میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں ان احکام کو بیان کرتے ہوئے آیت ۵۲ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا کہ آپ

کہہ دیں کہ اللہ کی اطاعت کرو لیکن اگر تم منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ رسول پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اسی کا ذمہ دار وہ ہے اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو۔ اس کی اطاعت کروگے تو خود ہی ہدایت پاؤ گے ورنہ رسولؐ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔ پھر آیت ۶۲ - ۶۳ میں فرمایا گیا کہ " مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں ۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے ہیں اس لیے جب وہ آپ سے اجازت مانگیں تو آپ جسے چاہیں اُسے اجازت دے دیں اور ایسے لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں اللہ تعالےٰ یقیناً غفور و رحیم ہے پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ذہن نشین کراتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے حکم دیا گیا کہ دیکھو" اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔ جو لوگ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ یا اُن پر دردناک عذاب نہ آجائے۔" گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کسی فتنہ میں پڑ جانے کا عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے کا سبب ہے اللہ تعالےٰ ہم سبھوں کو آپ کے حکموں کے خلاف ورزی سے محفوظ رکھیں۔ آیت میں" دعاء الرسول" کا لفظ ہے اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ رسول کو دوسروں کی طرح نہ پکارو، یا یہ کہ رسول پکاریں تو دوسروں کے پکارنے کی طرح اُن کی پکار کو ناقابلِ اعتنا نہ سمجھو یا یہ کہ رسول کی دعا کو دوسروں کی دعا کی طرح نہ سمجھو۔ بہرحال تینوں مفہوم کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور بزرگی ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ الفرقان

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ" بابرکت ہے وہ جس نے یہ فرقان (قرآن) اپنے بندے پر (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر) نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو۔ نذیر کے معنی ہیں ڈرانے والا، خبردار کرنے والا، گمراہی کے نتائج سے باخبر کرنے والا۔ آپ سے پہلے جو انبیاءؑ آتے تھے وہ ایک مخصوص آبادی کے لیے آتے تھے لیکن آپ سارے جہان کے لئے نذیر ہیں لیکن کفار اس قرآن کو کہتے ہیں کہ من گھڑت چیز ہے جس کو آپ نے خود گھڑ لیا ہے اور لوگوں نے اس کام میں آپ کی مدد کی ہے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے (آیت ۶ میں) فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اس کو تو اس نے نازل کیا ہے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔

پھر (آیت ۷) میں کفار کا قول نقل کیا ہے کہ" یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور دوسروں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ ہوتا یا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ اس قول کے نقل کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے (آیت ۹ میں) کہا گیا ہے کہ آپ دیکھیے کیسی کیسی عجیب حجتیں یہ لوگ آپ کے آگے پیش کر رہے ہیں۔ بہک گئے ہیں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اللہ اگر چاہتا تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی بہتر چیزیں دے دیتا۔ یہ لوگ ایسی باتیں جو کہتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان لوگوں

نے قیامت کو جھٹلا دیا ہے اور ان جھٹلانے والوں کے لیے ہم نے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے۔

(آیت ۱۵) اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے پوچھیے کہ یہ انجام اچھا ہے یا وہ ابدی جنت جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے۔" آپ سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے تھے۔ (اصل بات یہ ہے کہ) ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے کہ آیا تم ثابت (قدم) بھی رہتے ہو (یا نہیں) اور بے شک آپ کا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔" (آیت ۲۰)

انیسواں پارہ شروع ہوتا ہے:-

منکرین اب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل ہوئے یا ہم اللہ ہی کو دیکھ لیتے، یہ رسولوں کے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ پاک فرماتا ہے کہ جس دن یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ دن ان مجرموں کے لیے خوشی کا دن نہ ہوگا۔ (یعنی جس دن آسمان پھٹ جائیں گے اور فرشتوں کا ہجوم نظر آئے گا تو یہ مجرمین چاہیں گے کہ ان کے اور فرشتوں کے درمیان کوئی مضبوط آڑ واقع ہو جائے تاکہ انھیں نہ دیکھ سکیں)" اُس دن حقیقی بادشاہی (خدائے) رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں پر بڑا سخت ہوگا۔ آیت ۲۶) اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا ہے (جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ شور کرتے ہیں اور اسے سننے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتے)۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں، بلکہ ہر زمانے میں انبیا علیہم السلام کو ایسے سرکشوں سے کم یا زیادہ سابقہ ہوا ہے جو دین کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالتے اور لوگوں کو راہِ حق سے روکتے تھے۔

پھر اسی کے ساتھ آیت ۳۲ میں کفار کا یہ قول نقل کیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ پر قرآن یکبارگی ہی کیوں نہیں اتار دیا گیا، اس کے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ ہاں ہم نے ایسا اس لیے کیا کہ اس کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو قوی رکھیں اور ہم نے اس کو بہت ٹھیر ٹھیر کر اتارا ہے اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا آپ کو عنایت کر دیتے ہیں۔

پھر آیت ۴۱ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ" یہ لوگ جب آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق بنا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کیا یہی شخص ہے جس کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ تو ہمیں اپنے معبودوں سے ہی ہٹا دیتا اگر ہم ان کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے" پھر فرمایا گیا کہ" عنقریب جبکہ وہ عذاب کو دیکھ لیں گے تو انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہ تھا گویا آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ ان کے مذاق اڑانے پر صبر کیجیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی خبر لے لے گا"

آیت ۵۱-۵۲ میں ارشاد باری ہے کہ" اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں (ایک نذیر) مبعوث کر دیتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا اس لیے اے نبیؐ آپ کافروں کی بات ہرگز نہ مانیے اور اس قرآن کو لے کر آپ ان کے ساتھ جہادِ کبیر کیجیے"

آیت ۵۶-۵۷ میں آپؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو تو بس ایک خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میں اس کام پر تم لوگوں سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے اور آپ تو اس خدا پر بھروسا رکھیے جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی

حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے "۔
آخری آیت ۷۷ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میرے رب کو تمھاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے تو عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی"۔ یعنی اگر تم لوگ اللہ سے دعائیں نہ مانگو اور اپنی حاجتیں اللہ سے نہ مانگو تو اللہ اس کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسے اس کی پروا ہے بلکہ تم خود اس کے محتاج ہو اور تمھارا اس میں فائدہ ہے ۔

سورۃ الشعراء

پانچویں منزل شروع ہوتی ہے ۔
اس سورۃ کی ابتدا میں قرآن پاک کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کتاب مبین ہے ۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اضطراب کا ذکر ہے جو لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ " شاید اس بات پر کہ وہ ایمان نہیں لاتے آپ اپنی جان کھو دیں گے"۔ (آیت ۳)۔ یہی بات سورۃ کہف کی آیت ٦ میں بھی ہے اور سورۃ فاطر کی آیت ۸ میں بھی یہی مضمون ملتا ہے ۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کے انکار پر آپ دل ہی دل میں گھٹتے رہتے تھے ۔ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ " میری اور تم لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے روشنی کے لیے آگ جلائی مگر پروانے جل جانے کے لیے اُس پر ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ کسی طرح آگ سے بچیں مگر پروانے اس کی چلنے نہیں دیتے ۔ ایسا ہی میرا حال ہے کہ میں تمھیں دامن پکڑ پکڑ کر کھینچ رہا ہوں اور تم ہو کہ آگ میں کودے جاتے ہو"۔ اللہ اللہ کس قدر امت کی بہی خواہی آپ کے دل میں تھی ۔ غرض ، ان آیات میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ اس کا اتنا غم نہ کریں ۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ اُن کی گردنیں اُس کے آگے جھک جائیں ۔ ان لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ رحمٰن کی طرف سے جو نصیحت بھی آتی ہے تو یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں ۔ یہ لوگ جس چیز کا مذاق اُڑاتے رہے ہیں عنقریب اس کی حقیقت ان کو مختلف طریقوں سے معلوم ہو جائے گی ۔ اگر یہ زمین ہی کو دیکھ لیں اور اس پر غور کریں تو اسی میں انھیں بہت سی نشانیاں نظر آئیں گی ۔ لیکن ان میں اکثر جاننے والے نہیں ہیں ۔ یہ تو اللہ پاک کا (خاص) رحم ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا ۔ ورنہ اگر وہ چاہے تو فوراً انھیں تباہ کر دے ۔
پھر آیت ۱۰ تا ۱۹۱ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ، ابراہیم علیہ السلام ، نوح علیہ السلام ، قوم عاد و ثمود اور لوط علیہ السلام کی قوم اور شعیب علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان تمام واقعات میں یہ بات قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے کہ انکار کرنے والوں کو اللہ پاک نے پہلے تو خوب ڈھیل دی لیکن پھر وہ لوگ اُس کے عذاب میں ایسے گرفتار ہوئے کہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے ۔
پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ یہ قرآن ، رب العالمین کی نازل کی ہوئی چیز ہے جسے روح الامین (جبریل علیہ السلام) لے کر آپ کے قلب پر اُترے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں شامل ہو جائیں ۔ یہ کتاب صاف عربی زبان میں نازل ہوئی ہے ۔ یہی الٰہی تعلیم سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی موجود ہے ۔ پھر آیت ۱۹۶ - ۲۰۲ میں ہے کہ کیا ان منکرین کے لیے یہ نشانی (کافی) نہیں کہ اسے علمائے بنی اسرائیل (خوب) جانتے ہیں (اگرچہ اہل مکہ اس علم کتاب سے ناآشنا ہیں) کہ یہ وہی تعلیم ہے جو سابقہ کتب آسمانی میں دی گئی ہے ۔ لیکن یہ اس قدر ہٹ دھرم

ہیں کہ اگر ہم اس کتاب کو کسی عجمی پر نازل کرتے (جیسا کہ انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی) اور وہ عجمی ان کو یہ کتاب پڑھ کر سُناتا تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ یہ لوگ دردناک عذاب دیکھنا چاہتے ہیں، پھر مہلت مانگیں گے۔

آیت ۲۱۰-۲۲۷ میں بھی قرآن کے متعلق ہے کہ اس کو شیاطین لے کر نہیں اُترے بلکہ ان کو تو اس کے کان لگا کر سننے کا موقع بھی نصیب نہیں پھر آپؐ کو اپنے قریب ترین عزیزوں کو ڈرانے کا حکم ہے اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ آپ کی پیروی کریں تو اُن سے نرمی کا برتاؤ کیجیے۔ پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو آپ فرما دیں کہ جو کچھ تم کرتے ہو میں اس سے بری ہوں۔ اور آپ بڑے غلبہ والے رحیم پر بھروسا کیجیے جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ (تنہائی میں عبادت کے لیے) اُٹھتے ہیں اور (جب) آپ نمازیوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ شیاطین ان لوگوں پر اُترتے ہیں جو جعل ساز اور بدکار ہیں، سُنی سُنائی باتیں کانوں میں پھونکتے ہیں اور اُن میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ آپ جو کلام پیش کر رہے ہیں اُس کو شعر سے کیا نسبت؟ شعرا کی پیروی تو بہکے ہوئے لوگ کرتے ہیں اور یہ لوگ ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے۔ بجز اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر عمل کیا اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لیا۔ یہ ظالم جو آپ پر ظلم کرتے ہیں کہ آپ کو شاعر، کاہن، ساحر اور مجنون کہتے ہیں اور اس قسم کی باتیں آپ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عنقریب اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔

سورۃ النّمل

یہ سورۃ مکی ہے اس کی ابتدا بھی اسی بات سے کی گئی ہے کہ یہ قرآن کی اور کتاب مبین کی آیتیں ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری مومنین کے لئے ہے جو نماز کی پابندی کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لئے بُرا عذاب ہے اور یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔

پھر آیت ۶-۷ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنائیے۔ پھر حضرت موسیٰؑ کا اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کا اور ملکہ سبا کا حضرت صالحؑ اور قوم لوطؑ کے واقعات بیان کر کے بتایا گیا کہ جن لوگوں نے نافرمانی کی اور انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے انکار کیا وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور تباہ ہو گئے۔ آیت ۵۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر فرمایا گیا کہ آپ کہہ دیجیے کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے برگزیدہ کیا۔ پھر ان سے پوچھئے کہ اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنھیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں۔

<u>بیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

(آیت ۶۰-۶۴) میں آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی کہ آسمان و زمین کا خالق کون ہے۔ بارش کون برساتا ہے جس کی وجہ سے تمہاری کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں؟ مصیبت زدہ کی پکار کون سنتا ہے اور کون ہے جو مصیبتوں کو دور کرتا ہے؟ خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں کون راستہ دکھاتا ہے؟ اور کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے اور آسمان

زمین سے کون تم کو رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک ہے؟ اسے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ اور ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور کسی کو کچھ نہیں معلوم کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔

کفار کہتے ہیں کہ جبکہ ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے کیا ہمیں قبروں سے نکالا جائے گا؟ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہہ دیجیے کہ زمین میں چل پھر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے؟ اور آپ ان لوگوں کے حال پر رنج نہ کریں اور نہ ان کی چالوں سے دل میں تنگی محسوس کریں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو وہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ آپ ان لوگوں سے کہدیجئے کہ کیا عجب کہ جس عذاب کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمھارے قریب ہی آگیا ہو۔ آپ کا پروردگار لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن ان میں اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ گویا یہ خدا کا فضل ہے کہ وہ فوری طور پر گرفت نہیں کرتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ اگر سنبھل گئے تو فبہا ورنہ تباہ ہو گئے۔

آیت ۷۳-۸۱ میں فرمایا گیا کہ "آپ کا پروردگار جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اس لیے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اللہ پر بھروسا رکھئے آپ ہی صریح حق پر ہیں۔ آپ ان مُردوں کو اور نہ بہروں کو سُنا سکتے ہیں۔ یہ لوگ تو مُردوں کی طرح ہیں کہ ان میں کسی بات کے سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اور نہ ہی آپ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں۔ آپ تو ان ہی لوگوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور فرمانبردار بن جاتے ہیں۔"

پھر قیامت کی ہولناکی بیان کرنے کے بعد آیت ۸۲-۹۳ میں فرمایا گیا کہ "جو شخص نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ قیامت کے ہول سے محفوظ ہونگے اور جو برائی لے کر آئے گا تو ایسے لوگ اوندھے منہ آگ میں ڈال دیئے جائینگے۔ اس کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو ان سے کہہ دیجئے کہ "مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمان بن کر رہوں نیز یہ بھی حکم دیا گیا کہ میں قرآن پڑھ کر سناؤں۔ اس لئے جو شخص ہدایت اختیار کرے گا تو اپنے بھلے ہی کے لئے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو تو اس سے کہدیجیے کہ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ اور کہہ دیجیے کہ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے عنقریب اپنی نشانیاں تمھیں دکھائے گا تو تم انھیں پہچان لو گے اور پروردگار ان کاموں سے بے خبر نہیں ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ قرآن آپ پڑھ کر سنا دیں اب ہدایت حاصل کرنا ان کا کام ہے اگر یہ نصیحت کو قبول کرلیں تو اس میں ان ہی کا فائدہ ہے اور نہ قبول کریں تو ان ہی کا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں آپ ان لوگوں کے قبول ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

سورۃ القصص

یہ سورۃ مکی ہے اس میں بھی یہ کہہ کر کہ "یہ کتاب مبین کی آیات ہیں" فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح فرعون نے تکبر کی راہ اختیار کی قتل وخونریزی کا بازار گرم کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کے گھر میں پرورش کرائی پھر ان ہی کو اس کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا اس طرح کہ ایک طرف شاہی جاہ وجلال تھا تو دوسری طرف بے سروسامانی اور ظاہری ضعف و

کمزوری تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کامیاب و بامُراد ہوئے اور فرعون غرق ہوُا اور تباہی سے دوچار ہوا۔ ان کا پورا واقعہ آیت ۱-۴۲ تک بیان ہوا پھر آیت ۴۳ میں ذکر کیا گیا کہ "ہم نے پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر، ہدایت اور رحمت بنا کر تاکہ شاید یہ لوگ سبق حاصل کریں۔ پھر آیت ۴۴ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہماری آیتیں پڑھ کر جو آپ سُناتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر قوموں کا حال بیان کر رہے ہیں تو آپ اس وقت موجود نہ تھے۔ وہ خبریں تو ہم بھیجتے ہیں۔ آپ تو مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب موسیٰ ؑ (علیہ السلام) کو ہم نے یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے آپ اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے اور آپ طور کے دامن میں بھی موجود نہ تھے۔ جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو پہلی مرتبہ پکارا تھا۔ یہ تو آپ کے پروردگار کی رحمت ہے کہ آپ کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ وہ لوگ ہوش میں آ جائیں

لیکن جب ان کے پاس ہمارے ہاں سے حق آ گیا تو وہ آپ کے متعلق کہنے لگے کہ کیوں نہ آپ کو وہی چیزیں دی گئیں جو موسیٰ ؑ کو دی گئی تھیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ اگر آپ کو وہی چیزیں دی جاتیں جو موسیٰ ؑ کو دی گئی تھیں تو بھی وہ ایمان نہ لاتے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انکار کر چکے ہیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں یہ تو قرآن اور توریت دونوں کو جادو کہتے ہیں، اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ لاؤ کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو کہ میں اس کی پیروی کروں۔ اب اگر وہ آپ کا مطالبہ پورا نہیں کرتے تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ اصل میں اپنی خواہشات کے پیرو ہیں اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں ان سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

آیت ۵۶ میں فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے، وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔

آیت ۶۸-۷۲ میں ارشاد ہے کہ آپ کا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے خود ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا نہیں اللہ پاک ہے۔ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں بہت ہی بالاتر ہے آپ کا پروردگار جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ دنیا اور آخرت میں اُسی کی فرمانروائی ہے آپ ان لوگوں کو توجہ دلائیے کہ بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کیلئے رات مسلط کر دے تو کس کی طاقت ہے کہ دن کی روشنی لے آئے یا اگر دن ہی ہمیشہ کیلئے مسلط کر دے تو کون ہے جو رات لائے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو، یہ اللہ کی ہی رحمت ہے کہ اُس نے رات اور دن پیدا کئے تاکہ تم لوگ سکون حاصل کرو اور رزق تلاش کر سکو۔

پھر آیت ۷۵-۸۴ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قارون کا ذکر کیا گیا کہ کس طرح قارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے کے باوجود راہِ حق میں خرچ کرنے سے انکار کیا جس کے نتیجے میں وہ زمین میں اپنے خزانہ سمیت دھنسا دیا گیا۔ کیونکہ انجام کی بھلائی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو ڈرنیوالے ہیں بعد ازاں (آیت ۸۵-۸۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا جا رہا ہے اور تسلی بھی دی جا رہی ہے کہ یہ منکرین آپ کے خلاف ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ یقین جانیے کہ جس نے یہ قرآن آپ پر فرض کیا ہے (یعنی لوگوں تک اس کے پہنچانے اس کی تعلیم دینے اور اصلاح کی ذمہ داری ڈالی ہے) وہ آپ کو ایک بہترین انجام تک پہنچانے والا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کون کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔ آپ اس کی امید تو نہ رکھتے تھے کہ آپ پر کتاب

نازل کی جائے گی یہ تو صرف آپ کے پروردگار کی مہربانی ہے کہ اُس نے آپ پر کتاب نازل کی اس لئے آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں۔ اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب آپ پر نازل ہوں تو کفار مکہ آپ کو ان کی تبلیغ و اشاعت سے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے باز رکھیں۔ آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیں اور مشرکوں میں ہرگز شامل نہ ہوں۔ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریئے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اللہ کی ذات کے سوا تمام چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں۔ اسی کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ اسی کی فرمانروائی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جاؤ گے۔

سورۃ العنکبوت

یہ سورۃ مکی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں اور جان نثاروں پر ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو ہمت دلائی گئی اور ان میں عزم استقامت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی کفار مکہ کو تہدید بھی کی گئی کہ تمہارا انجام بھی وہی ہوگا جو دیگر انبیائے کرام کو جھٹلانے والوں کا ہوتا رہا ہے۔

(آیت ۱-۷) اس سورۃ کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے کہ کیا جو لوگ ایمان کے مدعی ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ بغیر آزمائش کے چھوڑ دیئے جائیں گے ہم تو ان سے پہلے بھی لوگوں کو آزمائش میں ڈال چکے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اپنے دعویٰ میں کون لوگ سچے ہیں اور کون جھوٹے ہیں۔ اور یہ لوگ بُری حرکتیں کر رہے ہیں کیا ان کا خیال ہے کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے، ایسا نہیں ہو سکتا، جو شخص اللہ کی لقا کا اُمیدوار ہو تو اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ وقت یقیناً آنے والا ہے اور جو شخص بھی جہاد کرے گا تو وہ اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اللہ تو بے نیاز ہے۔ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی برائیاں دور کر کے ہم ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص مسلمان ہوئے تو ان کی ماں نے کہا کہ جب تک تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کرے گا۔ میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ اگر تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ حضرت سعدؓ پریشان ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا اس پر آیت نازل ہوئی کہ "ہم نے انسان کو نصیحت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے معبود کو شریک ٹھیرائے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

پھر (آیت ۹-۱۳) منافقین کا ذکر ہے آیت ۱۴-۴۴ میں حضرت نوح علیہ السلام حضرت لوطؑ۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام اور قوم عاد و ثمود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ ہم نے تمام منکرین اور مخالفین حق کی گرفت کی کسی پر پتھر برسانے والی ہوا بھیجی اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ ان واقعات کے ذکر کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ایک طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے شیدائی پست ہمت اور دل شکستہ نہ ہوں اور سخت ترین مصائب و مشکلات میں بھی صبر استقامت کے ساتھ حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھیں۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ دوسری طرف منکرین اور مخالفین کو دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر تم مخالفت سے باز نہ آئے تو

تم کو بھی اسی انجام سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے دیگر قوموں کو دوچار ہونا پڑا ۔ شرک کرنے والوں کی حقیقت ایک مثال سے سمجھائی گئی کہ "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے کاش یہ لوگ علم رکھتے"

اور یہ مثالیں لوگوں کو سمجھانے کے لیے دی جاتی ہیں اور ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں ۔

اکیسواں پارہ شروع ہوتا ہے

اس سورہ کے ابتدائی گذشتہ چار رکوعوں میں (آیت ۱ - ۴۴) اہل ایمان کو صبر و استقامت اور توکل کی تلقین اور کفار کو دیگر اقوام کا عبرتناک انجام یاد دلانے کے بعد اب (پارہ ، ۲۱ ، آیت ۴۵)

بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا جا رہا ہے لیکن ساتھ ساتھ تمام اہل ایمان مخاطب ہیں ۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اے نبی ؐ آپ تلاوت کیجیے اس کتاب کی جو آپ کی طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کیجیے ، نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے ۔ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تم لوگ کرتے ہو ۔

پھر آیت ۴۶ - ۵۲ میں اہل کتاب سے عمدہ طریقے پر بحث کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ " اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر پہلی کتابوں کی طرح کتاب اتاری چنانچہ وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں اور آپ تو اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے یعنی آپ جو نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ پڑھنا ہی جانتے ہیں آپ امی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا پیش کرنا خدا ہی کی جانب سے ہو سکتا ہے اور یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ علم آپ کو وحی کے ذریعے حاصل ہوا ہے ۔ اگر آپ لکھے پڑھے ہوئے ہوتے تو البتہ ان منکرین کو شک و شبہ کی گنجائش ہوتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے ۔ اور ہماری آیتوں کا انکار ظالم ہی کرتے ہیں ۔ یہ منکرین کہتے ہیں کہ آپ پر کوئی نشانی یعنی معجزہ کیوں نہیں اتارا گیا جنھیں دیکھ کر یہ یقین آ جائے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں تو آپ فرما دیجیے کہ نشانیاں اور معجزات تو اللہ کے پاس ہیں ۔ میں تو صرف کھول کھول کر خبردار کرنے والا ہوں ۔ کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ گواہی کے لئے کافی ہے وہ آسمان اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے جو باطل پرست ہیں وہ خسارے میں رہنے والے ہیں ۔

آیت ۵۳ ، ۵۵ میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ آپ سے عذاب میں جلدی کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا ، عذاب تو یقیناً اپنے وقت پر آ کر رہے گا اور اچانک اس حال میں آئے گا کہ انھیں خبر بھی نہ ہو گی وہ لوگ آپ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے اور انھیں اس روز پتا چلے گا جبکہ عذاب انھیں اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ڈھانگ لے گا ۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اب تم اعمال کا مزہ

پچھو سو تم کرتے تھے۔

آیت ۵۶، ۵۷ میں فرمایا گیا کہ "اے میرے مومن بندو میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرو"۔ اس سے ہجرت کی طرف اشارہ ہے یعنی اگر کہتے ہیں خدا کی عبادت مشکل ہو رہی ہے تو پھر "ملک خدا تنگ نیست"۔ جہاں بھی تم خدا کی بندگی کر سکتے ہو۔ وہاں چلے جاؤ۔ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے پھر تم سب ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

آیت ۵۸-۶۳ میں ارشاد ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُن کے لیے جنت ہے جہاں صبر کرنے والوں اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں کو بہترین اجر ملے گا۔ ہجرت میں تمہیں روزی روزگار کے لیے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق نہیں اُٹھائے پھرتے ہیں اللہ ان کو رزق دیتا ہے تمہیں بھی رزق دے گا۔ وہ سب کچھ سنتا جانتا ہے اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا اور چاند سورج کو کس نے مسخر کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے پھر یہاں کیوں دھوکہ کھا رہے ہیں۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کس نے برسائی جس سے زمین مردہ میں جان پڑ جاتی ہے تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے بارش برسائی۔ آپ کہہ دیں کہ الحمدللہ مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔

آیت ۶۴، ۶۹ میں بتایا گیا کہ یہ دنیوی زندگی صرف کھیل اور دل کا بہلاوا ہے اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش ان لوگوں کو اس کا علم ہوتا۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں اور جب وہ انھیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں "تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفرانِ نعمت کریں۔ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں یا جھٹلانے والوں سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔ آخری آیت میں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ جدوجہد کرتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ بے یارو مددگار نہیں چھوڑتا ہے بلکہ ان کی دست گیری اور رہنمائی فرماتا ہے اور اپنی طرف آنے کی راہیں ان کے لیے کھول دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ "جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

سورۃ الروم

یہ سورۃ مکی ہے۔ رومیوں اور ایرانیوں یا نصرانیت اور مجوسیت میں سخت کشمکش تھی۔ جنگ میں رومی مغلوب ہوئے۔ چونکہ عیسائی توحید و آخرت کو مانتے تھے اور رسالت کو سرچشمۂ ہدایت مانتے تھے اس لیے روم و ایران کی جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ تھیں اور کفارِ مکہ ایران سے ہمدردی رکھتے تھے رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کو ایران کا غلبہ ناگوار ہوا لیکن کفارِ مکہ اس پر خوش تھے، چنانچہ اس سورہ کی ابتدا اس سے کی گئی کہ اگرچہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں لیکن چند سال گزرنے نہ پائیں گے کہ یہی رومی غالب آ جائیں گے اس پیش گوئی سے مسلمانوں کو اطمینان ہوا۔ جن دنوں یہ آیت نازل ہوئی اس زمانے کے حالات سے کسی طرح بھی اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ رومی چند سالوں ہی میں پھر غالب آ جائیں گے۔ چنانچہ کفارِ مکہ نے ان آیات کے نزول پر مسلمانوں کا خوب مذاق اڑایا۔ اُبی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں "بضع سنین" کا لفظ آیا ہے اور "بضع" کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے ۔ اس لئے دس سال کے اندر کی شرط کرو ۔ اور اونٹوں کی تعداد دس سے سو کر لو ۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا ۔ خدا کی قدرت ہے کہ دس سال کے اندر ہی اندر یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے موقع پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فتح نصیب ہوئی ۔ ظاہر بین نگاہیں کچھ اور دیکھتی ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے جس سے انسان بے خبر ہوتا ہے اُدھر رومی ظاہر حالات کے بالکل برعکس دس سال کے اندر ہی اندر پھر غالب آ گئے تو اِدھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار شیدائی بدر کے میدان میں اپنی ظاہری بے سروسامانی کے باوجود غالب آ گئے ۔

غرض اس سورۃ میں ابتداً تو رومیوں کے غلبہ کی پیش گوئی سنا کر مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی گئی پھر خود مسلمانوں کی بھی کامیابی کی پیش گوئی کی گئی ۔

چنانچہ آیت ۲ ۔ ۷ میں فرمایا گیا کہ قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر پھر وہ غالب آ جائیں گے ۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور وہ دن وہ ہو گا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے یہ اللہ کا وعدہ ہے اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں ، لوگ دنیوی زندگی کا صرف ظاہری پہلو جانتے ہیں بعد ازاں آخرت کا مضمون شروع ہو گیا اور تین رکوع تک مختلف طریقوں سے آخرت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ۔ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا کہ (آیت ۱۶ ۔ ۱۷) "تسبیح کرو اللہ کی جبکہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اور اس کی تسبیح کرو تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے ۔" اس آیت میں نماز کے چار اوقات یعنی فجر ، مغرب ، عصر اور ظہر کی طرف اشارہ ہے خدا کی نشانیاں بیان کی گئیں کہ زندہ کو مُردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے ۔ انسان کو مٹی سے پیدا کیا ، انسان کے لئے انسان ہی کی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ آپس میں محبت و رحمت پیدا ہو آسمان و زمین کی تخلیق کی ، زبان اور رنگ کا اختلاف ، رات کو سونا ، دن کو طلب رزق کرنا ، بجلیوں کی چمک ، آسمان سے بارش ۔ آسمان و زمین کا اس کے حکم سے قائم رہنا یہ سب خدا کی نشانیاں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تخلیق کی ابتدا کی ہے وہ اس کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے لیکن ظالم خواہشات نفس کے بندے اس کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کو کون راستہ دکھا سکتا ہے ۔ اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ یکسو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی سمت جما دیجیے اور اس فطرت پر قائم ہو جائیے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کے خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ یہی دین بالکل راست ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں ۔

آیت ۳۹ میں سود کی مذمت بیان کی گئی اور یہ پہلی آیت ہے جو اس کی مذمت میں نازل ہوئی ۔

آیت ۴۱ ۔ ۴۳ میں پھر روم و ایران کی جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے ۔ لوگوں کے اعمال کے سبب سے تاکہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید کہ وہ باز آ جائیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ پہلے گزری ہوئی قوموں کا کیا انجام ہوا ، ان میں سے اکثر مشرک تھے اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ اس سیدھے دین کی سمت میں جما دیجئے اس دن کے آنے سے پہلے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں جس نے کفر

کیا تو اس کفر کا وبال اُسی پر ہوگا اور جس نے نیک کام کئے تو وہ اپنے ہی لئے فلاح کا راستہ ہموار کر رہا ہے۔

آیت ۵۲ - ۵۳ میں فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ان بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیرے جا رہے ہیں اور نہ تو آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہِ راست دکھا سکتے ہیں آپ تو صرف ان ہی کو سُنا سکتے ہیں جو ہماری آیتوں پہ ایمان لاتے ہیں اور سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ گویا یہ منکرین مُردہ ہیں اور بہرے ہیں اور اندھے ہیں کہ نہ سُن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں، اس لئے آپ تو اپنا کام کئے جائیں کسی کو راہِ راست پر لے آنا آپ کا کام نہیں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

پھر قیامت کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالوں سے سمجھایا ہے آپ کوئی بھی نشانی لے آئیں منکرین یہی کہیں گے آپ باطل پر ہیں اللہ تعالیٰ بے علم لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ اس لئے اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ گھبرائیں نہیں بلکہ صبر کریں۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور یہ مخالفین آپ کو ہلکا نہ پائیں کہ آپ ان لوگوں کے شور و غوغا سے دب جائیں یا ان کے استہ ... سے پست ہمت ہو جائیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعمال و کردار کے ذریعے اپنا وزنی ہونا ثابت کر دیا اور دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنے مشن سے نہ ہٹا سکی۔ ہلکی چیزیں تو ہوا کے ہلکے جھونکے سے اِدھر اُدھر ہو جاتی ہیں لیکن وزنی چیزوں کا ہٹانا مشکل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو آپ نے پورا کر دیا۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی اصحابہ وعلی اتباعہ اجمعین۔

سورۃ لقمان

یہ سورۃ مکی ہے۔ ابتدا میں (آیت ۲ - ۵) فرمایا گیا کہ یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں جو نیکو کار لوگوں کے لیے رحمت اور ذریعہ ہدایت ہے۔ پھر نیکو کاروں کے اوصاف بیان کئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ایک طرف یہ لوگ ہیں کہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں تو دوسری طرف ان کے مقابلے میں بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ ایسی کھیل کی باتوں کو خریدتے ہیں

تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اس کی ہنسی اُڑائے تو ایسے لوگوں کے لئے رُسوا کن عذاب ہے۔"

نصر بن حارث نے قریش سے کہا تھا۔ تم جس طریقے سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا تم جوان کو ساحر کاہن شاعر اور مجنون کہتے ہو اس پہ کون یقین کرے گا جبکہ اس سے پہلے چالیس سال کی عمر تک اس کو صادق اور امین کہتے اور سمجھتے رہے ہو۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر عراق چلا گیا اور وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رستم و اسفندیار کی داستانیں لے کر آیا اور داستان گوئی کی محفلیں شروع کر دیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے اور اس مقصد کے لئے کچھ گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ چنانچہ "لہو الحدیث" کھیل کود کی باتوں سے اشارہ اسی کی طرف ہے پھر آیت ۷ - ۸ میں ارشاد ہوا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو تکبر کے ساتھ اس طرح رُخ پھیر لیتے ہیں گویا کہ انہوں نے سنا ہی نہیں لے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ایسے لوگوں کو

دردناک عذاب کی بشارت دے دیں۔ ہاں جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں ان کے لیے جنت ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

پھر آثار کائنات کی طرف توجہ دلا کر حضرت لقمان کے ان نصائح کو بیان کیا گیا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں اس سے اہل مکہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم لقمان کے حکیمانہ اقوال سے واقف ہو وہ بھی یہی باتیں کہتے تھے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، آپ کوئی نئی بات نہیں فرما رہے ہیں۔

آیت ۲۰-۲۴ میں فرمایا گیا کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ جو شخص اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے تو گویا اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا لیکن جس نے کفر کیا تو آپ اس کفر پر غم نہ کریں انھیں آخر کار پلٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے۔ ہم ان کے سارے کرتوت ان کو بتلا دیں گے۔

آیت ۲۵ میں ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ یقیناً کہیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا ہے اور حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ ان چیزوں کا خالق ہے بلکہ اللہ ان کا مالک بھی ہے پھر آیت ۲۷ میں فرمایا گیا کہ اگر ساری دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں تو اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہوں گی بےشک اللہ تعالےٰ زبردست اور حکیم ہے۔

پھر آثار کائنات کی طرف توجہ دلانے کے بعد قیامت سے ڈرایا گیا اور بتایا گیا کہ قیامت کی اسی گھڑی کا علم اللہ ہی کو ہے وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کوئی شخص جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

مختصر یہ کہ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم پیش کر رہے ہیں وہ کوئی نئی تعلیم نہیں توحید و رسالت اور آخرت کی دعوت اس سے پہلے بھی انبیا دیتے رہے ہیں اس لئے ان لوگوں کو چاہئے کہ باپ دادا کی اندھی تقلید چھوڑ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیں۔

سورۃ السجدہ

اس سورۃ میں توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے تو اس قرآن کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ کتاب بلا شبہ رب العالمین کی طرف سے ہے لیکن یہ لوگ آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ نے اس کو گھڑ لیا ہے حالانکہ یہ حق ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ شاید کہ یہ لوگ ہدایت پا جائیں پھر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں بیان کی گئیں انسان کی پیدائش اور موت کا ذکر کیا گیا۔ ماننے اور نہ ماننے والوں کا انجام بتایا گیا پھر آیت ۲۵ میں فرمایا گیا کہ آپ کا پروردگار قیامت کے روز ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں یہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

پھر آخر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا یہ منکرین آپ کی باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ

فیصلہ کُن فتح آپ کو کب نصیب ہوگی؟ آپ ان لوگوں سے فرما دیجئے کہ فیصلے کے دن ایمان لانا ان کافروں کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور انتظار کیجئے یہ بھی منتظر ہیں۔

سورۃ الاحزاب

یہ سورۃ مدنی ہے۔ عرب میں منہ بولے بیٹے کو وہی حیثیت حاصل تھی جو نسبی بیٹے کو حاصل تھی۔ حضرت زیدؓ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے۔ ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کر دیا تھا، اس نکاح سے حضرت زینبؓ مطمئن نہ تھیں اور خاندان کے لوگ بھی خوش نہ تھے کیونکہ حضرت زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام تھے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مجبور تھے۔ منہ بولے بیٹے کی بیوی سے خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ جاہلیت کی اس رسم کو مٹانا ضروری تھا۔ اسی لئے جب حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تو آپ کو حضرت زینبؓ سے نکاح کرنے میں اندیشہ یہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں اس رسم کہن پر تیشہ چلانے سے کفار و منافقین کو یہ موقع مل جائے گا کہ پروپیگنڈے کا طوفان برپا کر دیں۔ چنانچہ اس سورۃ کی ابتدا ہی اس طرح کی گئی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ آیت (۱-۳) اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ سے ڈرتے رہیئے اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کیجیے بیشک اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔ آپ تو اس چیز کی پیروی کیجئے جس کا اشارہ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ کو کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو اور اللہ پر توکل کیجیے اور اللہ ہی وکیل ہونے کے لئے کافی ہے۔

آیت ۵ میں فرمایا گیا کہ حقیقی باپ ہی کی طرف منسوب کر کے منہ بولے بیٹوں کو پکارا کرو۔

آیت ۶ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ آپ مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں یعنی ایک مومن جس قدر خود اپنی ذات سے محبت رکھ سکتا ہے اور اپنی ذات کا جس قدر خیر خواہ ہو سکتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ اس سے خیر خواہی کرتے ہیں پھر دوسری خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں یعنی تمام مومنین کی مائیں ہیں۔ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرما لینے کے بعد بھی ان ازواج مطہرات سے کوئی شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ نیز یہ بتایا گیا کہ جہاں تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ مختلف ہے لیکن عام مسلمانوں کے درمیان تعلقات اس طرح قائم ہوں گے کہ رشتہ داروں کے حقوق ایک دوسرے پر مقدم ہوں گے۔

پھر آیت (۷-۸) میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ اسے نبی اس عہد و پیمان کو یاد رکھئے جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے۔ آپ سے بھی نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابن مریم سے بھی۔ اور ہم سب سے پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اب آیت ۹ سے ۲۷ تک غزوہ بنی قریظہ اور غزوہ احزاب کا ذکر ہے۔ چنانچہ ان مہموں میں مسلمانوں کی جو مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی اس کی یاد دہانی فرمائی گئی کہ اسے ایمان والو اللہ کے احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا ہے کہ جب تم پر لشکر چڑھ کر آ گئے تو ہم نے ان پر ایک آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں بھیج دیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں اور اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس

وقت کر رہے تھے ۔

جنگ کی اس آزمائش میں مسلمان مبتلا کیے گئے ۔ منافقین طرح طرح کی باتیں بنا کر اس جنگ سے فرار کی خواہش کرنے لگے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا گیا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ یہ فرار تمھیں موت یا قتل سے نہیں بچا سکتا ۔

منافقین کے طرز عمل کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا (آیت ۲۲) کہ درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا ۔ ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے ۔ یعنی جب اس جنگ کی شدت اور مصیبت کو برداشت کرنے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سے پیچھے نہیں تھے ، اور آپ تمام لوگوں کی مصیبتوں میں شریک تھے تو جو لوگ ایمان کے مدعی تھے ان کو آپ کے طریقہ کار کو اختیار کرنا چاہیے تھا ، نہ کہ فرار کی راہ اختیار کرتے ۔ اسی طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر معاملہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو نمونہ سمجھیں اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں ۔ پھر آیت ۲۱-۲۴ میں سچے مسلمانوں کی حالت بیان کی گئی کہ جب ان سچے مومنین نے حملہ آور لشکر کو دیکھا تو بول اُٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ نے اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا ۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی تھی اور اس واقعہ نے ان لوگوں کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا ۔ ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا اور بعض نے اپنی نذر پوری کر دی اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے ۔ اور انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی ۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے ۔

آیت ۲۵ ـ ۲۷ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کا منہ پھیر دیا اور وہ کوئی فائدہ اُٹھائے بغیر دل کی جلن لیے ہوئے یونہی پلٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لئے کافی ہو گیا ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اُن کے قلعوں سے نکالا جنھوں نے ان مشرکین کا ساتھ دیا تھا ، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈال دیا کہ آپؐ نے ان میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو قید کر لیا اور آپؐ کو ان کے گھروں ان کی زمینوں اور ان کے مالوں کا مالک بنا دیا ۔

آیت ۲۸ - ۲۹ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ " اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنی ازواج سے کہہ دیجیے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ دے دلا کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے ۔"

یہ آیت ' آیت تخییر' کہلاتی ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں چار بیویاں تھیں حضرت سودہؓ ، حضرت عائشہؓ ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا کہ "میں تم سے ایک بات کہتا ہوں جواب میں جلدی نہ کرنا اپنے والدین کی رائے لے لو پھر فیصلہ کرو ۔" اسکے بعد آپ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی حضرت عائشہؓ نے جواب دیا سبحان اللہ کیا میں اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں میں تو اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو چاہتی ہوں ۔ اس کے بعد دیگر ازواج کے پاس باری باری سے تشریف لے گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا ۔

آیت ۳۰ میں حضور انور صلی اللہ وسلم کی ازواج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویو تم میں سے

جو کھلی ہوئی ناشائستہ بات کرے گی تو اس کو دُہری سزا دی جائے گی۔

-بائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے——

آیت ۳۱ میں فرمایا گیا "کہ تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی ہم اس کو دُہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لئے ایک عمدہ روزی تیار کر رکھی ہے"۔

آیت ۳۲-۳۴ میں ازواج مطہرات سے خطاب کیا گیا اور ان کو ان کی امتیازی خصوصیات بتائی گئیں۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو"۔ پھر انھیں خصوصی احکام دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ "اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔ اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو یاد رکھو جو تمہارے گھروں میں پڑھی جاتی ہیں اور ان کا چرچا ہوتا رہتا ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچاؤ"۔

پھر عام مومن مردوں اور عورتوں کے اوصاف بیان کر کے آیت ۳۶ میں فرمایا گیا کہ "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسولؐ کسی بات کا حکم دیں تو ان کو ان کے کام میں کوئی اختیار رہے (کہ اس کام کو کریں نہ کریں) اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہنا نہ مانے وہ صریح گمراہی میں پڑا"۔ یہ آیت اگرچہ خاص موقع پر نازل ہوئی لیکن حکم عام ہے کہ جس مسئلہ میں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم موجود ہو تو کسی کو یہ حق نہیں کہ اپنی آزادی رائے استعمال کرے۔

آیت ۳۷ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "آپ وہ موقع یاد کریں جبکہ آپ اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور آپ نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔ اس وقت آپ اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنا چاہتا تھا"۔ پھر حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آیت ۴۰ میں فرمایا گیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اس سے ایک طرف تو یہ بات کہہ دی گئی کہ تم لوگ جو منہ بولے بیٹے کو بیٹا کہتے ہو اور حضرت زیدؓ کی بیوی سے آپ کے نکاح پر اس قدر طوفان اٹھائے ہوئے ہو"۔ حالانکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ پھر آپ کی وہ امتیازی شان بھی بیان کر دی کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اور نبوت آپ پر ختم ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

آیت ۴۵ میں پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو اس شان کا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں۔ اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں"۔ گویا آپ آفتاب نبوت و ہدایت ہیں کہ اس کے طلوع ہونے کے بعد کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں رہی۔ سب روشنیاں اس نور اعظم میں خود مدغم ہو گئیں۔

آیت ۴۷ — ۴۸ میں حکم دیا گیا کہ آپ مومنین کو بشارت دیویں کہ اللہ کی طرف سے ان کے لئے بڑا فضل ہے اور آپ کافروں اور منافقین کا کہنا نہ مانئے اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہے

آیت ۵۰ — ۵۲ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے نکاح کے کچھ احکام بیان کئے جو آپ کی خصوصیات میں سے ہیں

آیت ۵۳-۵۵ میں مسلمانوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں داخلہ کے آداب بتائے گئے۔
آیت ۵۶ میں فرمایا گیا اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔
آیت ۵۷، ۵۸ میں ارشاد باری ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو تکلیف دیتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو اذیت دیتے ہیں بغیر کسی قصور کے تو انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔
آیت ۵۹-۶۰ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا کہ آپ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومن عورتوں کو پردہ کا حکم دیجیے۔

آیت ۷۱ میں مومنین کو حکم دیا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال درست کر دے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔" پھر فرمایا گیا کہ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بڑی کامیابی حاصل کی" گویا کامیابی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں ہے اور جس نے انحراف کیا اس کے لیے ناکامی اور تباہی ہے۔

سورۃ السبا

یہ سورۃ مکی ہے اس میں کفار مکہ کے طنز و تمسخر کا جواب دیا گیا ہے جو وہ دعوت توحید و آخرت پر کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ و داؤد علیہما السلام اور قوم سبا کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو طاقت و حشمت عطا فرمائی لیکن یہ غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوئے۔ قوم سبا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں پر اترانے لگی۔ اوّل الذکر کا نام اب تک باقی ہے لیکن قوم سبا کے افسانے ہی رہ گئے ہیں غرض توحید و آخرت کے عقیدہ پر جو زندگی مبنی ہو اور جس کی بنا ان کے انکار پر ہو ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا فرق ہے کہ پہلی زندگی کامیابی کی ہے تو دوسری زندگی تباہی اور ناکامی کی طرف لے جاتی ہے۔
اس سورۃ کی ابتدا اس سے کی گئی کہ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمان و زمین کا مالک ہے اور حکیم و خبیر ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ کفار قیامت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ قیامت آ کر رہے گی اور جن لوگوں نے جیسے کام کئے ہوں گے ان کے ذرے ذرے کا حساب ہوگا۔ آیت ۱-۹ میں قیامت کا ذکر کرنے کے بعد آیت ۱۰ سے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا قصہ آیت ۱۴ تک پھر آیت ۱۵ تک قوم سبا کا ذکر کرتے کے بعد آیت ۲۲ سے پھر قیامت کا ذکر ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ تم اپنے ان معبودوں کو پکار کر دیکھو جن کو تم اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ آسمان و زمین میں ایک ذرہ کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اللہ کے سامنے کسی کی شفاعت مفید نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے سفارش کی اجازت دی ہو۔

آیت ۲۴-۲۷ میں ارشاد باری ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہیے کہ تم کو آسمان و زمین سے کون رزق دیتا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ جو جرم ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی باز پرس ہم سے نہ

ہوگی۔ ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔"

آپؐ ان سے کہیے کہ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ وہ کون سی ہستیاں ہیں جنھیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے ہرگز نہیں زبردست اور حکمت والا تو وہی ہے۔

آیت ۲۸ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سب بڑی خصوصیت بیان کی گئی کہ پہلے انبیا تو ایک مخصوص عہد کے لیے اور محدود آبادی کے لئے آئے تھے بلکن آپ کی رسالت سارے جہان کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے ہے اور کسی مخصوص عہد کے لئے نہیں ہے بلکہ قیامت تک کیلئے ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ "اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

آیت ۲۹ ۔ ۳۰ میں ہے کہ" یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ وہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ آپ فرما دیجیے کہ تمہارے لئے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک گھڑی پہلے اُسے لا سکتے ہو۔

آیت ۳۴ ۔ ۳۶ میں ارشاد فرمایا گیا کہ" ہم نے جس بستی میں بھی ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے کہا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔ اے نبی صلی اللہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ میرا پروردگار جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ماپ کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

منکرین کے انجام بد کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ (آیت ۴۳ ۔ ۵۰) ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے حالانکہ نہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا تھا اور ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں، جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا اس کے عشر عشیر کو یہ نہیں پہنچے ہیں، لیکن جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ آپ تو ان لوگوں سے کہئے کہ میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم خدا کے واسطے دو دو ایک ایک کھڑے ہو جاؤ پھر سوچو کہ تمہارے اس ساتھی کو جنون نہیں ہے وہ تو تم کو ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمے ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار حق بات کو غالب کر رہا ہے۔ وہ علام الغیوب ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا۔ آپ کہہ دیجیے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ پر وبال ہوگی اور اگر میں راہ پر رہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے جس کو میرا پروردگار میرے پاس بھیج رہا ہے بیشک وہ سب کچھ سنتا ہے نزدیک ہے۔ پھر منکرین کے انجام بد کا ذکر آیا ہے۔

سورۃ فاطر

اس سورۃ میں اللہ پاک کی خالقیت، ربوبیت اور پھر آخرت کی اہمیت کا ذکر ہے۔ اللہ پاک نے آسمان، زمین فرشتے (دو دو تین تین چار پَر والے) بنائے۔ وہ جس جنس میں چاہے اضافہ فرما دے۔ وہ لوگوں پر رحمت کے دروازے کھول دے تو کوئی روکنے والا

نہیں —" اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ (منکرین) آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو آپ سے قبل بھی کتنے پیغمبر جھٹلائے گئے اور اللہ ہی کی طرف تمام امور رجوع کرتے ہیں" (آیت ۴)

شیطان کھلا دشمن ہے۔ وہ دوزخی بنانا چاہتا ہے اور اللہ ہواؤں کو بھیجتا ہے اور مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ اللہ ہی کو سب عزت حاصل ہے۔ میٹھے پانی کا دریا۔ کڑوے پانی کے دریا کے برابر نہیں ہوگا۔ کشتیاں، رات، دن، سورج، چاند سب اُس کے حکم کے تابع ہیں" اور جن کو تم اُس کے سوا (معبود) پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے برابر بھی تو اختیار نہیں رکھتے" "اللہ (تمہاری عبادت کا) محتاج نہیں (تم ہی اللہ کے محتاج ہو" اور" اگر وہ چاہے تو تم کو (دنیا سے) لے جائے اور نئی مخلوق لے آئے اور یہ بات اللہ کیلئے مشکل نہیں"۔ (آیت ۱۶-۱۷)

قیامت میں کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ مومن اور کافر کا کیا مقابلہ؟" اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں — اور نہ تاریکیاں اور روشنی ہی — اور نہ سایا اور (گرم) لو — اور نہ زندہ لوگ اور مُردے برابر ہو سکتے"۔ (آیت ۱۹-۲۲)۔

"ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری سُنانے والا اور نصیحت کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی اُمت ایسی نہیں ہوتی جس میں کوئی نصیحت کرنے والا (پیغمبر) نہ گزرا ہو" (آیت ۲۴)۔

اللہ پاک نے آسمان سے پانی اتارا، پھر مختلف رنگ کے پھل پیدا کیے، انسانوں، جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ ہیں۔ لیکن اللہ پاک سے علم والے (جاننے سمجھنے والے) ہی ڈرتے ہیں" بے شک وہ لوگ جو اللہ کی کتاب (قرآن) پڑھتے اور نماز قائم رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت (کے فائدے) کے امیدوار ہیں جس میں کبھی خسارہ نہ ہوگا" (آیت ۲۹)

"اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب ہم نے آپ پر اتاری ہے وہی حق ہے۔ اپنے سے قبل کی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ بے شک اللہ اپنے بندوں سے باخبر، دیکھنے والا ہے — پھر جنت اور دوزخ والوں کی کیفیات کا ذکر ہے۔ اللہ پاک ہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اور اللہ پاک ہی نے تم کو اپنا خلیفہ بنایا (اللہ کے بعد ہی تمہارا درجہ ہے) منکرین کے معبود کیا بنا سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں؟" بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں۔ اور اگر یہ ہٹ جائیں تو اُس کے سوا کوئی اُن کو تھام نہیں سکتا۔ بلاشبہ وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے" (آیت ۴۱)۔

منکرین نے بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ ہر اُمت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں گے — پھر جب اُن کے پاس اللہ سے ڈرانے والا آیا تو اُس سے ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوا — کیا منکرین نے اُن لوگوں کا انجام نہیں دیکھا جو اُنہی کی طرح منکر تھے؟" اور اگر اللہ، انسانوں کو (فوراً) اُن کے اعمال پر پکڑنے لگتا تو زمین پر ایک بھی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑتا۔ لیکن اللہ، لوگوں کو ایک مدتِ معینہ تک مہلت دیتا ہے (کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں) پھر جب اُن کا وقت مقررہ آ جاتا ہے (تو اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا) — پس بے شک اللہ اپنے تمام بندوں کو آپ دیکھ لے گا" (آیت ۴۵)۔

اللہ پاک کی خالقیت اور قدرتِ کاملہ کی یہ تبلیغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھی ——

سورة یٰسٓ

یہ سورۃ، قرآن پاک کا دل ہے۔ اس میں سات "مبین" ہیں:۔

۱۔ امامِ مبین۔ انسان جو کرے گا وہ لوحِ محفوظ میں موجود ہے اور اللہ پاک کے علیم وقدیر ہونے پر شاہد ہے۔

۲۔ بلاغ مبین۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیا علیہم السلام کا کام دین کا ابلاغ ہے۔ صرف اُن کی فرماں برداری کا نام عملِ صالح ہے جو اللہ پاک کی فرماں برداری کے لیے اساس ہے۔

۳، ۴۔ ضلالِ مبین۔ قادرِ مطلق کو چھوڑ کر غیر کی عبادت کرنا کھلی گمراہی ہے (دو جگہ یہ لفظ آیا ہے)۔

۵۔ عدوّ مبین۔ اللہ پاک نے شیطان کے متعلق ہمیشہ آگاہ کرایا ہے کہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔

۶۔ قرآن مبین۔ خالص نصیحت جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم ہی پہنچا سکتے تھے۔

۷۔ خصیم مبین۔ وہ انسان جو حقیر پیدائش کے باوجود اپنے خالق اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پہچاننا نہیں چاہتا۔

"(اے میرے پیارے، اے سرورِ کائنات) اِس قرآنِ حکیم کی قسم ہے کہ بے شک آپ (اللہ کے) پیغمبروں میں سے ہیں، سیدھے راستے پر ہیں۔ (یہ قرآن) عزیز الرحیم (ہر چیز پر غالب اور رحمت کرنے والے) نے نازل کیا ہے۔ تاکہ آپ ان لوگوں کو جن کے آبا کو ڈرایا نہیں گیا تھا (اُن کو بھی) ڈرائیں کہ وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔" (آیت ۱-۶)۔ منکرین، اصرارِ کفر کی وجہ سے مغرور، محروم اور اندھے ہو گئے ہیں۔" اور اُن کو آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، ان کے لیے (سب) برابر ہے۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ آپ تو صرف اُسی کو ڈرا سکتے ہیں جو آپ کے سمجھانے پر چلے اور (خدا) رحمٰن سے بغیر دیکھے ڈرے۔ (ایسے کو) پس آپ اس کو مغفرت اور بڑے درجے کے ثواب کی بشارت دیجیے۔ بے شک ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی (ہمارے فرشتے) وہ سب لکھتے جاتے ہیں جو (اعمال) یہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے اثرات (جو یہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں) اور ہم نے ہر چیز کو ایک روشن کتاب (لوحِ محفوظ) میں لکھ رکھا تھا (آیت ۱۰-۱۲)

.... اللہ پاک نے پچھلی کسی قوم (اصحاب القریہ) کا ذکر کیا ہے کہ اُن کے پاس پے در پے تین رسول بھیجے گئے لیکن انہوں نے ان سب کو جھٹلایا بلکہ اُن میں سے ایک صالح شخص نے ان رسولوں کی تائید بھی کی تھی۔

اب تیئیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

اس شخص کو اُن لوگوں نے شہید کر دیا اور اللہ پاک نے اُسے جنت میں داخل کر دیا لیکن وہ لوگ عذابِ الٰہی سے ایک دم میں بجھ کر رہ گئے۔ منکرین کے لیے اللہ پاک کی پہچان کے لیے ایک نشانی مُردہ زمین بھی ہے جس میں سے کیا کیا اُگتا ہے اور چشمے جاری ہوتے ہیں تاکہ یہ سب لوگ ان سے مستفید ہوں۔ انہوں نے تو نظامِ قدرت نہیں بنایا۔" پاک ہے وہ ذات جس نے زمین سے تمام اُگنے والی چیزوں کے جوڑے بنائے اور اُن جانوں میں سے بھی اور اُن میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔" (آیت ۳۶)۔ رات، دن، سورج اور چاند کا نظام اور "نہ آفتاب کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات، دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب (ستارے) اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔" (آیت ۴۰)

— پھر منکرین کی روگردانی کی مثالیں آتی ہیں اور ان کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اور قیامت میں مومنوں کو بلاواسطہ "ربِ رحیم کی طرف سے سلام"

کہا جانے گا"۔ (آیت ۵۸) اللہ پاک کا امتِ محمدیہ پر کتنا بڑا اور خصوصی انعام ہے سبحان اللہ! ۔ قیامت کے دن منکرین سے کہا جائے گا۔ کہ " اسے اولادِ آدمؑ کیا میں نے تم کو (انبیاء علیہم السلام کے ذریعے) تاکید نہ کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" (آیت ۶۰) - پھر وہ اللہ جو بڑھاپے میں طاقت سلب کر لیتا ہے تو کیا وہ جوانی میں نہیں کر سکتا۔ یا جس نے ایک بار یہ طاقت دی کیا وہ آخرت میں زندہ نہیں کر سکتا؟ یہ باتیں شعر و افسانہ نہیں۔ بلکہ حقیقت ہے۔" اور ہم نے ان (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ شعر کہنا سکھایا اور نہ یہ ان کے شایانِ شان ہے۔ یہ تو خالص نصیحت ہے۔ واضح قرآن۔ تاکہ ایسے شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو (ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو) اور منکروں پر حجت تمام کر دے۔" (آیت ۶۹ — ۷۰) "پس (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان (منکرین) کی باتوں سے غمگین نہ ہوں، ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔" (آیت ۷۶) "کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے ایک نطفے سے پیدا کیا، پھر اسی لیے (یہ سرکش ہو کر اللہ اور اس کے رسولؐ کا) کھلا دشمن بن گیا۔" (آیت ۷۷) - انسان اپنی حقیر پیدائش کو بھول گیا اور اللہ پاک پر اعتراض کرنے لگا۔" اس (اللہ) کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اُس سے کہتا ہے کہ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیارِ کامل ہے اور اُسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔" (آیت ۸۲ - ۸۳) - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تبلیغ اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ اور خالقیتِ تامہ کے لیے بہت قوی ہے۔

سورۃ الصّٰفّٰت

چھٹی منزل شروع ہوتی ہے :-

اس سورۃ میں توحید کے مضامین ہیں۔ درمیان میں انبیاء علیہم السلام بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بار بار آتا ہے کیونکہ اُن کو یہود و نصاریٰ ایک جلیل القدر پیغمبر مانتے تھے۔ اللہ پاک نے عابدین، مجاہدین اور قرآن پاک کے تلاوت کرنے والوں کو گواہ کر کے فرمایا ہے کہ وہی (اللہ) بے شک تم سب کا معبود ہے جو آسمانوں، زمین، اور جو اُن کے درمیان ہیں اُن سب کا پروردگار ہے۔ اُسی نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی آرائش سے مزین کیا اور ہر شیطانِ سرکش سے اُن کی حفاظت کی۔ وہ شیاطین کبھی ملاء اعلیٰ کی بات نہیں سُن سکتے اور اگر اوپر جاتے ہیں تو اُن پر انگارے پھینکے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ یہ انسان کیوں شیطنت پر آمادہ ہے۔ اُس کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں اور وہ اللہ پاک کی نشانی کا مذاق اڑاتا ہے۔ پھر حشر میں جو کیفیت ہوگی اُس کا بیان ہے کہ منکرین اپنی غلطیوں کا الزام اپنے ساتھیوں پر رکھیں گے لیکن عذاب میں وہ سب شریک ہوں گے۔ اور ایمان والوں کے لیے کیا کیا انعامات ہوں گے اور جوشِ مسرت میں جنتی کہیں گے کہ "کیا اب تو ہم کو مرنا نہیں سوائے (اُس) پہلی بار مرنے کے اور (اب تو) ہم کو عذاب بھی نہیں ہونے کا۔" (آیت ۵۸-۵۹) اب ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے کہ انہوں نے کس طرح بتوں کی پوجا سے روکنا چاہا تو قوم نے اُنھیں آگ میں ڈالا لیکن اُن کا بال بیکا نہ ہُوا۔ پھر آپ نے وطن سے ہجرت کی (اور شام کی طرف روانہ ہوئے)۔ اولاد کے لیے دعا مانگی اور اسمٰعیل علیہ السلام جب اتنے بڑے ہو چکے کہ ساتھ ساتھ چل سکیں "پھر جب وہ (اسمٰعیل) اُن کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچے، فرمایا اے میرے بیٹے، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں

تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تم بھی غور کر لو کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ (بیٹے نے بلا تامل عرض کیا کہ پھر دیر کیا ہے) جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے (اللہ کا) حکم مان لیا تو (ابراہیم علیہ السلام نے) اُن کو ماتھے کے بل لٹایا (اور چاہا کہ ذبح کریں) اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم (علیہ السلام) تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکو کاروں کو یوں ہی بدلہ دیتے ہیں" (آیت ۱۰۲-۱۰۵) یہی اسمٰعیل علیہ السلام وہ تھے جن کی اولاد میں سلسلۂ نبوت تمام ہو کر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم پر ختم ہوا جن کی تمام صفات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے سابق انبیا علیہم السلام کے حالات بار بار بیان کیے جاتے ہیں۔ اب موسٰی علیہ السلام ، الیاس علیہ السلام ، لوط علیہ السلام ، یونس علیہ السلام کے حالات ہیں کہ کس کس طرح اُن کی آزمائش ہوئی اور وہ کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو آزمائشیں ہوئیں یا جس طرح اُن کی پیغمبرانہ شان اُجاگر ہوئی اُس میں ان سابق انبیا علیہم السلام کے واقعات سے بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کافروں نے فرشتوں اور جنوں کا ناتا بھی اللہ پاک سے لگا دیا ہے۔ "پس (اے کافرو) تم لوگ اور وہ جن کی تم پرستش کرتے ہو (سب مل کر بھی) کسی کو اس (اللہ) کے خلاف بہکا نہیں سکتے۔" (آیت ۱۶۱-۱۶۲) "پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ ان (کفار) سے کچھ عرصے تک اعراض کریں اور اُن کو دیکھتے رہیے (اُن کی بگڑتی ہوئی حالت کو) پھر عنقریب وہ (خود بھی اپنا انجام) دیکھ لیں گے۔" (آیت ۱۷۴-۱۷۵) "آپ کا رب بڑی عظمت والا رب ان تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ (منکرین) بیان کرتے ہیں۔" (آیت ۱۸۰)

سورۃ صٓ

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب ہے کہ "قسم ہے اِس قرآن کی جو نصیحت والا ہے بلکہ کافر غرور اور مخالفت میں (مبتلا) ہیں"۔ ایسے کتنے کفار تباہ کیے جا چکے۔ انھیں تعجب یہ تھا کہ اُنھی میں سے ایک شخص کو کس طرح پیغمبر بنایا جا سکتا ہے اور سب معبودوں کی جگہ صرف اللہ کو کیوں معبود سمجھا جائے۔" اور جب (حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے وحدانیت کی تلقین فرمائی تو بجائے ایمان لانے کے) ان کے سردار یہ کہتے ہوئے (ابوطالب کے پاس سے) اُٹھ کھڑے ہوئے کہ (لوگو ، اپنی) ڈگر پر چلتے رہو اور اپنے معبودوں پر قائم رہو۔ بے شک اس بات (تلقینِ وحدانیت) میں ان کی اپنی کوئی غرض ہے" (آیت ۶)۔ پھر نوح علیہ السلام کی قوم ، عاد اور حشمت والے فرعون ، ثمود ، لوط علیہ السلام کی قوم اور بن والوں کا تذکرہ ہے کہ انھوں نے کس طرح رسولوں کو جھٹلایا اور اُن پر عذاب ہوا۔ داؤد علیہ السلام کی نبوت اور شاہی کا ذکر بھی ہے بعض اوقات اللہ کے برگزیدہ حضرات دو خیر کی باتوں میں سے ایک خیر کو منتخب کر لیتے ہیں لیکن پھر خیال کرتے ہیں کہ شاید دوسرا خیر بہتر تھا اس لیے وہ اس کو بھی اپنی لغزش سمجھ کر اللہ کی طرف رجوع ہو کر گڑگڑاتے ہیں۔ اس طرح اللہ اُن کے درجات اور بھی بلند فرماتا ہے۔ پھر سلیمان علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی طرح بتایا گیا ہے کہ وہ بھی ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور اللہ پاک نے اُنھیں عالم پر سرفراز فرما کر حکومت دی۔ ان کو گھوڑے (جہاد کے لیے) پسند آئے اور اولاد کثیر بھی (جہاد کے لیے) طلب کی۔ پھر ایسی حکومت دی گئی کہ ہوا بھی تابع ہوئی، جن بھی تابع ہوئے۔ یہ سب اللہ پاک کا انعام تھا" اور بے شک اُن کا ہمارے یہاں اعلیٰ مرتبہ اور بہتر انجام ہے۔" (آیت ۴۰)۔ ایوب علیہ السلام ، ابراہیم علیہ السلام ، اسحٰق علیہ السلام ، یعقوب علیہ السلام ، اسمٰعیل علیہ السلام الیسع ، ذوالکفل (علیہما السلام) کا ذکر بھی ہے جس سے پرہیزگاروں کے درجات کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔ گویا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو سابق انبیا علیہم السلام کے واقعات تسلی اور

تشفی کے لیے بھی ہیں اور اس لیے بھی کہ آپ کی صلاحیتیں تو اور بھی بلند ہیں اس لیے آزمائشیں بھی بہت زیادہ ہیں۔ اور کفار تو ہمیشہ مذاق ہی اُڑاتے رہتے ہیں اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ میں تو عواقب سے ڈرانے والا ہوں اور معبود (تو) صرف وہی اللہ ہے جو اکیلا اور غالب ہے۔ آسمانوں اور زمین کا اور جو اُن کے درمیان ہے (اس سب کا) پروردگار ہے، بڑا زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔" (آیت ۶۵-۶۶)

پھر انسان کی تخلیق اور شیطان کا سجدے سے انکار کا ذکر ہے کہ وہ امرِ رب کو چھوڑ کر اپنی فضیلت کے گھمنڈ کی وجہ سے مردود اور ملعون ہوا۔ اللہ کا امر دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی "تابع داری" ہے۔ جو اس تابع داری میں کامیاب ہوا وہی مسجودِ ملائک کے درجات تک فائز ہو سکتا ہے۔

سورۃ الزُّمَر

اس سورۃ میں توحید اور رسالت کے مضامین کے ساتھ کافر و مومن کے مزاج کا بیان ہے اور آخر میں دوزخیوں اور جنتیوں کو گروہ در گروہ اپنے مستقر پر پہنچنے کا ذکر ہے۔ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے یہ کتاب آپ پر حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ پس آپ (جس طرح مشغولِ عبادت ہیں اسی طرح) اللہ کے ہو کر خالص اسی کی بندگی کرتے رہیں۔ (اور لوگوں کو علی الاعلان سنا دیجیے کہ) یاد رکھو خالص عبادت اللہ ہی کے لیے ہے (جہاں عبادت میں اخلاص نہ ہو اللہ کے یہاں اسکی قدر نہیں) اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی پرستش محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کا مقرب بنائیں (کیا کیا مکاری کرتے ہیں)۔ بے شک جن باتوں میں یہ اختلاف کر رہے ہیں (یعنی وحدانیت اور رسالت وغیرہ) اللہ اُن کے درمیان فیصلہ کر دے گا۔ بلاشبہ اللہ ایسے کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا جو جھوٹا اور ناشکرا ہے۔" (آیت ۲-۳)

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ پاک کی خالقیت، بے نیازی اور قدرتِ کاملہ کی تبلیغ ہے اور انسان کی عجیب فطرت کا ذکر ہے کہ مصیبت میں تو وہ اللہ کو یاد کر لیتا ہے لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو پھر اُسے بھول جاتا ہے۔ پھر اللہ کو یاد کرنے والے اور اللہ کو فراموش کرنے والے کے بارے میں ہے کہ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے اپنے رب سے ڈرتے رہو، جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام کیے اُن کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین (ان کے لیے) کشادہ ہے (وہ صبر سے کام لیں) بلاشبہ صبر کرنے والوں ہی کو اُن کے صبر کا پورا (اور) بے حساب اجر ملے گا" (آیت ۱۰)۔ پھر خلوص کے ساتھ عبادت کرنا، ہر حکم پر عمل پیرا ہونا، قیامت کے دن سے ڈرنا۔ ہر مومن کا شیوہ ہے۔ منکرین کے لیے دوزخ اور مومنین کے لیے جو اسلام کی پیروی کرتے ہیں جنت ہے اور وہی صحیح عقل والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے کہ "بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہو وہ تو اپنے رب کی طرف سے نور (روشنی) پر ہے۔ پس خرابی ہے اُن کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہو گئے ہیں یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں" (آیت ۲۲)۔ اللہ پاک نے بڑا اچھا کلام نازل فرمایا ہے (قرآن) جس کی آیتیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور دہرائی جاتی ہیں تاکہ دل نشین ہو سکیں، جن کو پڑھنے سے اُن لوگوں کے بدن کے

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کے چمڑے اور دل، نرم ہو کر اللہ کی یاد میں محو ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو اس کو ہدایت دینے والا کوئی نہیں" (آیت ۲۳)۔ پھر ابوجہل کے انجام کا ذکر ہے اور عربی قرآن کی کھلی ہوئی باتوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد ایک مثال ہے کہ اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے۔ ایک (غلام) مرد ہے جس میں کئی شریک ہیں (کئی آقا ہیں) مختلف المزاج اور بدسرشت۔ اور ایک (دوسرا) شخص ہے جو خاص ایک ہی کا (غلام) ہے۔ کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ تمام خوبی اللہ کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ (ان باتوں کو) سمجھتے ہی نہیں" (آیت ۲۹) — اللہ کے آگے سب کو پیش ہونا ہے۔

چوبیسواں پارہ شروع ہوتا ہے ———

"پھر اس سے بڑھ کر ظالم [illegible] اللہ پر جھوٹ باندھے اور جب سچی بات اس کے پاس پہنچ جاتے تو اس کو جھٹلائے۔ کیا (ایسے) منکروں کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے؟ [illegible] جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچا جانا وہی لوگ متقی ہیں" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جاننے والے ہی متقی ہو سکتے ہیں۔ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح تسلی دی ہے کہ "کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ اور یہ منکر آپ کو اس (اللہ) کے سوا اوروں سے ڈراتے ہیں (وہ خود گمراہ ہیں) اللہ جس کو گمراہ کرے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں" (آیت ۳۶)۔ "اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو (یہ برجستہ) کہیں گے کہ اللہ نے۔ آپ فرمایئے بھلا بتاؤ کہ جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف دینا چاہے تو کیا وہ اس کی (دی ہوئی) تکلیف کو دور کر سکتے ہیں، یا [illegible] اللہ مجھ پر مہربانی فرمانا چاہے تو کیا اس کی عنایت کو وہ روک سکتے ہیں؟ آپ فرما دیجیے کہ میرے لیے بس اللہ کافی ہے۔ اسی پر بھروسا کرنے والے بھروسا کرتے ہیں" (آیت ۳۸)۔ "اللہ ہی جانوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن پر موت طاری نہیں [illegible] کی نیند کے وقت (کھینچ لیتا ہے) پھر ان جانوں کو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم صادر کر چکا ہے اور دوسری جانوں کو ایک وقت معین تک چھوڑ دیتا ہے بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں (بڑی) نشانیاں ہیں" (آیت ۴۲)

قیامت کے دن منکرین کے معبود ان کی سفارش نہیں کر سکتے حالانکہ وہ لوگ ایسے معبودوں کے ذکر سے خوش ہوا کرتے ہیں۔

جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اللہ ہی کو پکارتا ہے اور جب اُسے کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ اللہ کو بھول جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ میری اہلیت کی وجہ سے ملی ہے۔ اللہ ہی فراخی سے بھی رزق دیتا ہے اور نپا تلا بھی دیتا ہے —" آپ فرما دیجیے کہ اے میرے بندو جنھوں نے (اُلٹے سیدھے کام کر کے) اپنے آپ پر زیادتیاں کی ہیں (حد سے گزرے ہیں) اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ بے شک [illegible] سب گناہ بخش دے گا۔ بے شک وہ بڑا بخشنے (اور) بڑا رحم فرمانے والا ہے" (آیت ۵۳)۔

ہر ایک کو عذاب سے اس لیے باخبر کیا جاتا ہے کہ وہ پھر افسوس کرے یا یوں نہ کہے کہ اگر اللہ مجھے راہِ حق دکھاتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہو جاتا — قیامت کے دن ان لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کو کوئی تکلیف [illegible] نہ گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے —" اسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کنجیاں ہیں (وہ جس کو چاہے یہ کنجیاں دے دے) اور جو لوگ اللہ کی [illegible] کے منکر ہوئے وہی خسارے میں ہیں" (آیت ۶۳)۔

افسوس کہ کافروں نے اللہ پاک کی قدر شناسی جیسی کہ چاہیے تھی نہیں کی۔ قیامت کے دن تمام زمین اللہ کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان (کاغذ کی طرح) لپٹے ہوئے اُس کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے۔ صور پھونکا جائے گا تو سب بیہوش ہو جائیں گے سوائے اُن کے جنھیں اللہ چاہے کہ ان پر بے ہوشی طاری نہ ہو۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو جائیں گے۔ محشر کی زمین اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے گی اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔" اور ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور اُس کو خوب معلوم ہے جو کچھ یہ کرتے ہیں۔" (آیت ۷۰)۔

کافروں کو جہنّم میں جھونکا جائے گا تو اُن سے دوزخ کے محافظ کہیں گے کہ کیا تمھارے پاس تم ہی میں سے کوئی رسول نہیں آئے تھے۔ وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تھے، پھر وہ دوزخ میں بھر دیے جائیں گے لیکن جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ ذوق و شوق سے جنت میں داخل ہوں گے۔" اور وہ کہیں گے، اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اُس زمین کا وارث بنایا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں۔ پس عمل کرنے والوں کا کیا خوب بدلہ ہے۔" (آیت ۷۴)

پھر ہر طرف سے یہی صدا آئے گی کہ "تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔"

سورۃ المؤمن

حٰمٓ سے یہ سورۃ شروع ہے۔ (سات سورتیں مسلسل اسی نام سے شروع ہوتی ہیں)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے تبلیغ ہے کہ اللہ پاک غالب اور علم والا ہے۔ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول والا ہے۔ نافرمانوں کو عذاب دینے والا اور بڑی قدرت والا ہے۔ اُسی سے ڈرو۔ نوح علیہ السلام کو اور اُن کے بعد کی قوموں نے بھی اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا اور خود دوزخی بنے۔ اللہ کے فرشتے بھی ایمان والوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے پروردگار ان (توبہ کرنے والے اور حضورؐ کے متبعین) کو ہمیشہ کی جنتوں میں داخل فرما جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا اور اُن کو بھی جو اُن کے آبا و اجداد میں سے اور اُن کی بیویوں میں سے اور اُن کی اولادوں میں جو نیک ہوں۔ بے شک تو بڑا ہی غالب حکمت والا ہے۔" (آیت ۸)

پھر کافروں کے انجام کا ذکر ہے جو اللہ کو ایک نہیں مانتے تھے۔ اور قیامت کا ذکر ہے جب کہ ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔" اور اللہ تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اللہ کے سوا جن کو یہ (کافر) پکارتے ہیں وہ تو کچھ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔ (وہ تو مجبورِ محض ہیں)۔ بے شک اللہ ہی سننے والا، دیکھنے والا ہے۔" (آیت ۲۰)۔

منکرینِ حق نے دنیا میں کیا کیا تعمیرات نہیں کیں لیکن عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون ہی کا قصہ دیکھو کہ فرعون اُن کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسی کے لوگوں میں سے ایک شخص جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا بولا کہ اُن کو قتل نہ کرو کیونکہ کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو اُن کا جھوٹ اُنہی پر پڑے گا اور اگر وہ سچے ہیں تو جو پیش گوئی وہ کر رہے ہیں اُس میں سے تم پر پڑے گا (تم ذلیل ہو گے)۔ فرعون نے نوح علیہ السلام، یوسف علیہ السلام وغیرہ کے زمانے کے نافرمانوں کا حال بھی سُنا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا اور ازراہِ تمسخر اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ ایک بہت اونچی عمارت بناؤ کہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کو جھانک کر دیکھوں — بہرحال فرعون پر تبلیغ بے کار ثابت

ہوتی اور وہ تباہ ہوا" "بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اُس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے (اور) جس دن بہانہ بازیاں منکروں کے کچھ کام نہ آئیں گی اور اُن پر (اللہ کی) لعنت ہوگی اور اُن کے واسطے (دوزخ) بدترین گھر ہے"۔ (آیت ۵۱-۵۲)

"پس (اے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر فرمایئے۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے (اُس کی نصرت آپ کے اور آپ کی امت کے ساتھ ہے) اور آپ اپنے (مومنوں کے) گناہوں کی (اللہ سے) مغفرت کیجیے اور شام و صبح اپنے رب کی تعریف و تسبیح کرتے رہیے"۔ (آیت ۵۵)۔

پھر اللہ کی قدرت اور حاکمیت کا ذکر ہے کہ اس نے رات آرام کے لیے اور دن کو روشن بنایا (تاکہ اپنا کام کاج معیشت تلاش کرو) اور وہ خالق ہے۔ زمین کو قیام کے لیے اور آسمان کو چھت (کی طرح) بنایا، تمھاری کیسی اچھی صورتیں بنائیں اور طیب (پاک اور غیر مضر) چیزیں کھانے کو دیں" وہ زندہ رہنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس خالص اعتقاد کے ساتھ (اُس کے ہو کر) اُس کو پکارو۔ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے" (آیت ۶۵)۔ وہی نیست سے ہست میں لاتا ہے" وہی جلاتا مارتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے پس اس کی نسبت یہی فرما دیتا ہے کہ ہو جا، وہ ہو جاتا ہے" (آیت ۶۸)۔

ان تمام نشانیوں کے باوجود منکرین کج بحثی کرتے ہیں اور قرآن کو جھٹلاتے ہیں تو وہ جہنم میں سخت عذاب میں ڈالے جائیں گے "پس (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صبر کیجیے۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے ...." (آیت ۷۷)۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اللہ پاک نے اُس پر کیسے کیسے احسانات کیے ہیں۔ لیکن اُس نے انکار کیا اور جب اُس پر عذاب نازل ہوا تو اللہ پر ایمان لانا چاہا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

سورۃ حٰمٓ السّجدہ

حٰمٓ (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اس قرآن کو جو عربی میں ہے اور سمجھدار لوگوں کے لیے ہے منکرین نہیں مانتے اور) "کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں (پردے میں لپٹے ہوئے ہیں) اس بات سے جس کی طرف آپ بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے (یعنی آپ کی بات نہیں سننا چاہتے) ...." (آیت ۵)۔

اللہ پاک نے پھر ان منکرین کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بتایا ہے کہ کس طرح زمین کی تخلیق ہوئی، پہاڑ رکھے گئے، سامان معیشت مہیا کیا گیا (جو سب کے لیے یکساں طور پر حاصل ہو سکتا ہے)، پھر زمین و آسمان کا نظام بنایا گیا" پھر دو دن میں سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان کے احکام اس میں بھیج دیے اور آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے رونق بخشی اور اس کو محفوظ (بھی) کر دیا۔ یہ انتظام ہے زبردست علم والے (پروردگار) کا"۔ (آیت ۱۲)۔

لیکن منکرین پہلے بھی روگردانی کرتے رہتے تھے، عاد قوم بھی مغرور اور سرکش تھی، قوم ثمود بھی اسی طرح تھی اور یہ سب ایک ذلت کے عذاب میں ڈالے گئے۔ ایسے لوگ جب جہنم کے قریب پہنچائے جائیں گے تو اُن کے اعضاء بھی اُن کے اعمال کی گواہی دیں گے اور

ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔" اور کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنا ہی مت کرو اور (جب یہ پڑھا جائے تو) اس کے درمیان شور وغل مچایا کرو شاید اس طرح تم غالب رہو (لوگ نہ سن سکیں)" (آیت ۲۶) ۔ لیکن ایسے کافروں کو عذابِ شدید کا مزہ چکھایا جائے گا۔ اور یہ لوگ قیامت کے دن ایسے جن اور انسان کو اپنے پیروں کے نیچے روندنا چاہیں گے جنھوں نے دنیا میں انھیں گمراہ کیا تھا۔ پھر مسلمانوں کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ پھر (اس پر) قائم رہے (تو) ان پر فرشتے اُترتے ہیں (جو کہتے ہیں کہ) مت ڈرو اور غم نہ کھاؤ اور تم جنّت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا (اور اللہ فرماتا ہے)" اور ہم تمھارے دنیا میں رفیق ہیں اور آخرت میں (بھی) اور تمھارے لیے وہاں وہ سب موجود ہے جو تمھارا جی چاہے اور تمھارے لیے وہ سب جو تم مانگو موجود ہے ۔" (آیت ۳۰-۳۱) ۔

" اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہو سکتی ۔ آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجیے تو (آپ دیکھیں گے کہ) جس شخص میں اور آپ میں دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ایک دلی دوست اور یہ بات انھی کو حاصل ہوتی ہے جو تحمل سے کام لیتے ہیں اور یہ بات انھی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں۔" (آیت ۳۵/۳۶)

اللہ پاک کی قدرت کی نشانیوں میں سے رات، دن، چاند، سورج ہیں اور فرشتے رات دن اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے ۔ وہ اللہ جو مردہ زمین کو شاداب و زرخیز بنا دیتا ہے وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور جو لوگ قرآن پاک کی آیتوں کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں تو ایسا منکرین پہلے بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ کج بحثی کرتے ہیں کہ قرآن، غیر عربی زبان میں کیوں نہ نازل کیا گیا۔" اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی کتاب دی تھی۔ پھر اس میں بھی اختلاف پڑے اور اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی (کہ مکمل سزا آخرت میں ملے گی) تو ان کے درمیان کب کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور وہ (اپنی کج فہمی کے باعث) اس (قرآن) کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہیں جو اُن کو چین لینے نہیں دیتا۔" (آیت ۴۵) ۔

نیکی اور بدی کا انجام آخرت میں نظر آئے گا اور آپ کا اللہ ایسا نہیں جو اپنے بندوں پر ظلم کرے ۔

پچیسواں پارہ شروع ہوتا ہے :۔

لوگ قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی ۔ اللہ پاک ہی کو علم ہے اور وہ ہر چیز کا خالق بھی ہے اور علیم بھی ہے قیامت کے دن مشرکین کے معبود بھی اُن کی نظروں سے غائب ہو جائیں گے اور کوئی اُن کا ساتھ نہ دے گا۔ واقعی اکثر انسان ناعاقبت اندیش ہیں ۔ وہ دنیوی بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتے اور تنگ دستی لاحق ہو تو ناامید ہو جاتے ہیں اور اگر ان کو تکلیف کے بعد اللہ پاک کی طرف سے راحت مل جاتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہمارا حق ہے۔ غرض جب انسان پر عنایت ہوتی ہے تو وہ اللہ پاک کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے ۔"

(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ (اے لوگو) دیکھو اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے آیا ہو پھر تم اس سے انکار کرو (تو یہ کتنی بڑی گمراہی ہے) اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اس کی مخالفت میں (حق سے) دور جا پڑے۔" (آیت ۵۲)۔" ہم عنقریب ان کو دنیا میں اور خود ان کی ذات پر اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر کھل جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔ کیا

آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے؟" (آیت ۵۳)۔

سورۃ الشوریٰ

یہ بھی حٰمٓ سے شروع ہے اور عٓسٓقٓ کا اضافہ ہے۔ یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطاب سے شروع ہوتی ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ "اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ مشرکین کے متعلق فکر مند نہ ہوں) جن لوگوں نے اللہ کے سوا (کسی اور کو) اپنا کارساز بنا رکھا ہے اللہ اُن کو دیکھ رہا ہے (اللہ اُن کو موقع دے رہا ہے) اور آپ اُن کے ذمہ دار نہیں۔" (آیت ۶) "اور (جس طرح ہر زمانے میں حالات کے مطابق پیغمبروں ہی کی زبان میں کتابیں نازل ہوئیں) اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن عربی زبان میں نازل کیا تاکہ آپ مکہ معظمہ (جو مرجع خلائق ہے) کے لوگوں کو اور اس کے گرد کے لوگوں کو ڈرائیں اور یوم قیامت سے (بھی) ڈرائیں جس کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (اس دن) ایک گروہ جنّت میں اور ایک گروہ دوزخ میں ہوگا۔" (آیت ۷)۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پھر توحید اور قدرتِ الٰہی کی تبلیغ ہے کہ جس طرح دوسرے پیغمبروں نے ہدایت فرمائی اسی طرح آپ بھی فرماتے رہیں "پس آپ اُن کو اسی (دینِ حق) کی طرف بلاتے رہیے اور آپ اسی پر قائم رہیے جیسا کہ آپ کو حکم ملا ہے اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور فرما دیجیے کہ میں تو ہر کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے ایمان رکھتا ہوں اور مجھے اس کا حکم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں......" (آیت ۱۵)۔ جو لوگ صرف دنیا چاہتے ہیں اُن کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا (آیت ۲۰)۔

اور "آپ دیکھیں گے کہ (قیامت کے دن) ظالم لوگ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اُن پر واقع ہو کر رہے گا اور جو لوگ ایمان لائے اور (آپ کے عمل کے مطابق) نیک عمل کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے اور وہ جو چاہیں گے اُن کے پروردگار کے پاس انھیں ملے گا۔ یہی بڑا فضل ہے" (آیت ۲۲)۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا ذکر ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اور جو مصیبت تم پر پڑتی ہے وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کا بدلہ ہے اور اللہ بہت سے گناہ معاف بھی کر دیتا ہے۔" (آیت ۳۰)۔

اُس کی قدرت میں ہے کہ سمندروں میں جہازوں کو چلائے یا روکے رکھے یا لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اُن جہازوں کو تباہ بھی کر دے۔ پھر اللہ پر ایمان لانے والوں اور اُس پر توکل کرنے والوں کا ذکر ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں اور بُرائیوں سے بچتے ہیں اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، اللہ کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور "جو شخص صبر کرے (اور قدرت رکھنے کے باوجود چھوڑ دے) اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔" (آیت ۴۳)۔

"پھر (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) اگر وہ روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کا کام تو بس (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے (اترانے لگتا ہے) اور اگر لوگوں کو ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (وہ سب نعمتیں بھول جاتا ہے) درحقیقت انسان بڑا ناشکرا ہے۔" (آیت ۴۸)۔

اللہ پاک جس کو چاہے بیٹے دے یا بیٹیاں دے یا بے اولاد رکھے۔" اور کسی بشر کی طاقت نہیں کہ اللہ اُس سے (براہِ راست) بات کرے مگر ہاں وحی یا پردے کے پیچھے سے یا (اللہ) کسی فرشتے کو بھیج دے کہ اُس کے حکم سے جو اللہ چاہے وحی کرے۔ بے شک وہ بڑے مرتبے (اور) حکمت والا ہے"۔ (آیت ۵۱" اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف ایک جانفزا حقیقت (قرآن) کو اپنے حکم سے بھیجا اور آپ (تو جمالِ الٰہی کے شیدائی تھے آپ) نہ جانتے تھے کہ کتاب (قرآن) کیا ہے اور نہ آپ کو یہ خبر تھی کہ (کمال) ایمان کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس (کتاب) کو نور بنا دیا ہے اور اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ آپ راہِ حق کی ہدایت کر رہے ہیں"۔ (آیت ۵۲) ۔

سورۃ الزُّخرُف

حٰمٓ سے سورۃ شروع ہے اور قرآن کا ذکر ہے جو عربی میں ہے تاکہ "تم سمجھ سکو"۔ منکرین ہمیشہ وحی کے خلاف رہے اور پیغمبروں کے ساتھ جس طرح اُن کا برتاؤ رہا وہ خود انہی کے حق میں باعثِ ہلاکت ہُوا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے پھر توحید کا پیام ہے۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، زمین کو معیشت کی جگہ بنانے والا، بارش کرنے والا کہ مردہ زمین زندہ ہو، جوڑے پیدا کرنے والا، کشتیاں، چوپائے وغیرہ سہولتیں مہیا کرنے والا وہی ہے۔ وہ لوگ کس قدر احمق ہیں جو فرشتوں کو اللہ پاک کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور اپنے باپ دادا کے دین پر چلنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کے دین کی بھی قدر نہ کی اور اب قرآن پاک کو بھی "جادو" قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ اس میں بڑی اثر آفرینی ہے۔ "اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی طریق پر ہو جائیں گے تو جو اللہ سے انکار کرتے ہیں ہم اُن کے گھروں کی چھتوں کو چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی (چاندی کی) جن پر وہ چڑھا کرتے اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں (چاندی کے) اور سونے کے (کر دیتے) اور یہ سب سامان تو صرف دنیا کی زندگی کو برتنے کے لیے ہے اور آخرت آپ کے رب کے یہاں پرہیزگاروں کے لیے (خاص) ہے"۔ (آیت ۳۳-۳۵) ۔ (اسی وجہ سے حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے کہ دنیوی اعزاز کی کوئی قدر و منزلت ہوتی تو کافروں کو نہ دیا جاتا) ۔" اور جو رحمٰن (اللہ) کی یاد سے آنکھیں بند کرے (تو) ہم اُس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے"۔ (آیت ۳۶) ۔ اور بلاشبہ شیاطین ہی راہِ حق سے روکتے ہیں"۔ (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ بہروں کو سنائیں گے یا اندھوں کو اور اُن کو جو صریح گمراہی میں ہیں راہ دکھائیں گے"؟ (آیت ۴۰) ۔

"اور بے شک یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی اُمّت کے لیے باعثِ نصیحت ہے (قیامت تک کے لیے امت کو شرف حاصل ہو گا) اور (لوگو!) عنقریب تم سے پوچھا جائے گا"۔ (آیت ۴۴) ۔

پھر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر ہے کہ فرعونیوں نے بھی یہی کہا کہ اُن کے ساتھ فرشتے کیوں نہ اُترے؟ یہ دولت مند کیوں نہ ہوئے؟ وہ لوگ بھی اللہ کی آیات کو جھٹلاتے رہے۔ چنانچہ وہ بھی تباہ کر دیے گئے۔

پھر عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ منکرین اپنے بتوں سے انھیں کمتر سمجھتے تھے"۔ اور وہ تو قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ پس آپ فرما دیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت، نبوت، ولادت، اُن کا اٹھایا جانا اور قریب قیامت کے اُن کا نازل ہونا) اس میں شک نہ کرو

اور میری ہی پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے" (آیت ۶۱) - قیامت کے دن "سبھی (دنیوی) دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیزگاروں کے" (آیت ۶۷) - یہ پرہیزگار بلاخوف و غم جنت میں داخل ہوں گے (اور حکم ہوگا کہ) "تم اور تمہاری بیویاں خوش خوش جنت میں داخل ہو جاؤ - (خدام) ان کے پاس سونے کی رکابیاں اور گلاس لیے پھریں گے اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھ کو بھائے سب موجود ہوگا اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے" (آیت ۷۱-۷۲) - پھر مجرمین کا ذکر ہے کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور وہاں موت کے خواہش مند ہوں گے" آپ (احمقوں سے) فرما دیجیے کہ اگر رحمٰن (اللہ) کے اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اُس کی عبادت کرنے والا ہوں" - (آیت ۸۱) - "پس (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ انھیں لغو باتوں اور کھیلوں میں پڑا رہنے دیں یہاں تک کہ اُن کو اپنے اُس دن (قیامت) سے سابقہ پڑے جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے" (آیت ۸۳) - کفار ہر چند اللہ کے منکر ہیں لیکن" اور اگر آپ اُن سے پوچھیں کہ اُن کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے - پھر یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں - (اپنے خالق کی عبادت کیوں نہیں کرتے ؟)" - (آیت ۸۷) - "پس آپ اُن سے درگذر کیجیے (اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیجیے) اور فرما دیجیے کہ تم پر سلام ہو (اللہ تم کو ہدایت دے) - پھر عنقریب اُن کو حقیقتِ حال معلوم ہو جائے گی" (آیت ۸۹)

سورۃ الدخان

حٰمٓ - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ یہ روشن کتاب کو ہم نے لیلۂ مبارکہ میں نازل کیا ہے" اس اہم رات میں ہر اہم معاملے کا (جو ایک سال تک ہوتا رہے گا) فیصلہ کر دیا جاتا ہے (اور یہ) احکام ہماری بارگاہ سے جاری ہوتے ہیں، کیونکہ ہم ہی (قرآن صاحبِ قرآن اور فرشتوں کو) بھیجنے والے ہیں (اور یہ سب) آپ کے رب کی رحمت ہے - بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے" (آیت ۲-۶) "پس (آپ اُن منکرینِ حق سے کنارہ کش رہیے اور) اُس دن کا انتظار کیجیے جب کہ آسمان سے ایک نمایاں دھُواں ظاہر ہوگا جو لوگوں کو گھیرے گا - یہی دردناک عذاب (کی ابتدا) ہے" (آیت ۱۰-۱۱)

جب تکلیف اور عذاب آتا ہے تو مومن بن جاتے ہیں اور جب وہ ہٹ جائے تو وہ لوگ بھی اللہ سے ہٹ جاتے ہیں - پھر موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بتایا ہے کہ فرعون سے انہوں نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو اور اپنا بندہ اُن کو نہ بناؤ - لیکن وہ اور اس کے ساتھی ایذا دینے لگے - پھر وہ ایسے تباہ ہوئے کہ اُن کے ساز و سامان کے مالک دوسرے لوگ ہوئے - لیکن جو مسلمان ہوئے تھے اُن کو اللہ پاک نے لوگوں پر فضیلت دی تھی - قوم تُبّع (یمن) قوم عاد و ثمود وغیرہ جو نافرمان تھے سب تباہ کر دیے گئے - مجرموں کے لیے دوزخ میں زقوم کھانا ہوگا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹ کو کھولا دے گا اور مغرور لوگ اس عذاب کا مزہ چکھیں گے - البتہ پرہیزگار لوگ جنت میں ہوں گے، باریک اور دبیز ریشمی لباس، عمدہ میوے اور ہر طرح کی آسائش کی چیزیں مہیا ہوں گی - "پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں آسان کو دیا ہے تاکہ وہ (آپ کے رب کو) یاد رکھیں (نصیحت حاصل کریں)" (آیت ۵۸)

سورۃ الجاثیہ

حٰمٓ - (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجیے کہ) "اس کتاب کا نازل کیا جانا اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست

حکمت والا ہے۔" (آیت ۲)۔ کائنات کی ہر شے اُسی کی قدرت اور حکمت کا مظہر ہے۔ منکرین محض غرور اور ضد کی بنا پر اس کے کلام کو قبول نہیں کرتے اور مذاق اُڑاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ جہنم میں پھینکے جائیں گے۔" اللہ وہ ہے جس نے سمندر کو تمھارے کام میں لگا دیا تاکہ اللہ کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اُس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔ اور اُس نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے حکم سے تمھارے کام پر مامور کر رکھا ہے (ہر چیز پر قبضہ کرنے کی صلاحیت تم میں ودیعت فرمائی ہے)۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔" (آیت ۱۲-۱۳) اسی آیت سے انسانی صلاحیتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ (علامہ اقبال نے یہیں سے انسان کی بے پایاں صلاحیتوں کا پیام لیا ہے)۔

امتِ محمدیہ کو جب کسی اہم کمزوری سے باخبر کرنا ہوتا ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے خطاب ہوتا ہے تاکہ پوری امت ہوشیار رہے۔ آیت ۱۸ میں اسی طرح خطاب ہے کہ "پھر (بنی اسرائیل کے متعدد پیغمبروں کے بعد) ہم نے آپ کو دین کی واضح راہ پر مامور کر دیا۔ پس آپ اسی پر چلتے رہیں اور اُن لوگوں کی خواہش پر نہ چلیں (اُن کی پروا بھی نہ کریں) جو دین کی سمجھ ہی نہیں رکھتے۔"

ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ نصیحت کو سنا جائے لیکن جو سُننا ہی نہ چاہے اور جو وہم کو اپنا راہبر بنا لے وہ کب راہِ راست پر آسکے گا۔" اور جب ہماری واضح آیتیں انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اُن کی حجت یہ ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ (زندہ کر کے)۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ ہی تم کو زندہ کرتا ہے، پھر تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہی تم (سب) کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کچھ شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔" (آیت ۲۵-۲۶)۔

قیامت میں منکرین گھٹنوں کے بل، ذلیل و خوار بیٹھے ہوں گے اور انھیں بتایا جائے گا کہ تمھیں ہماری آیتیں سنائی گئی تھیں اور قیامت کے آنے کا وعدہ بھی سنایا گیا تھا" اور (اُن سے) کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں جیسا کہ تم نے اِس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمھارا کوئی مددگار نہیں۔" (آیت ۳۴)۔

اللہ ہی کو تمام خوبیاں اور بزرگی زیب دیتی ہے — اُس کے مقابلے میں انسان عاجزی اور انکساری اختیار کرے تو فلاح پائے — (دین کی حلاوت فروتنی ہی میں ہے — جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے)۔

<u>چھبیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u> —

سورۃ الاحقاف

حٰمٓ ۔ یہاں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور کائنات کی تخلیق کا ذکر ہے۔ اور یہ کہ منکرین کو توحید سمجھ میں نہیں آتی۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو، مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ انھوں نے کونسی زمین کو پیدا کیا ہے یا وہ آسمانوں (کے بنانے میں) شریک ہیں۔ (اس بات کے ثبوت کے لیے) تم میرے پاس کسی (آسمانی) کتاب کی سند اس (قرآن) سے پہلے کی لے آؤ۔ (یا انبیاء علیہم السلام کا) کچھ (بچا کھچا) علم ہی جو چلا آتا ہے (وہی لے آؤ) اگر تم سچے ہو۔" (آیت ۴) پھر فرمایا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہی نے یہ قرآن بنایا ہے تو" آپ فرما دیجیے کہ اگر میں نے یہ خود بنا لیا

ہے تو تم اللہ کے سامنے میری کچھ بھی مدد نہیں کر سکتے۔" اور "آپ فرما دیجیے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا۔ (مجھ سے پہلے بھی پیغمبر گزر چکے ہیں) میں (خود یہ) نہیں جانتا کہ مجھے کن حالات سے گزرنا ہے اور تم کو کن حالات سے۔ مجھ کو تو اس وحی کی پیروی کرنی ہے جو میری طرف آتی ہے اور مجھے تو بس صریح (اور علی الاعلان) ہدایت کرنی ہے۔" (آیت ۵)۔ عبداللہ بن سلام مشہور یہودی تھے جو قرآن کو دیکھ کر مسلمان ہوئے۔ اُن کے سلسلے میں فرمایا ہے: "آپ فرما دیجیے کہ بھلا دیکھو تو اگر یہ (قرآن) اللہ کی طرف سے ہے اور تم اس کے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس جیسی کتاب پر گواہی دے رہا ہے (یعنی یہ گواہی دے کہ کتبِ آسمانی میں ایسی ہی کتاب کے نازل ہونے کی بشارت ہے) پھر وہ (خود) ایمان لے آئے اور تم اپنی اکڑ میں رہو۔ بے شک اللہ (ایسے) ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔" (آیت ۱۰)۔

دوسرے رکوع میں ظالموں کے لیے ڈر اور محسنین (نیکی کرنے والوں) کے لیے خوش خبری ہے۔ پھر ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کا حکم ہے اور جو نافرمان اولاد ہے اُن کے لیے وعید ہے" اور جس دن کافر لوگ دوزخ کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ (تو اُن سے کہا جائے گا کہ) تم نے دنیا کی زندگی میں خوب مزے اُڑا لیے اور خوب لطف اُٹھایا۔ پس آج تم کو عذاب دیا جائے گا۔ (یہ) بدلہ ہے اُس غرور کا جو تم دنیا میں ناحق کیا کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ تم نافرمانی کرتے رہتے تھے۔" (آیت ۲۰)۔

پھر قوم ہود کا بیان ہے۔ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو وحدانیت کی تلقین کی اور کفر پر عذاب الٰہی سے ڈرایا۔ قوم ہود نے عذاب (آزمائش کے لیے) مانگا۔ وہ عذاب بادل کی شکل میں نمودار ہوا تو وہ سمجھے کہ بارش ہوگی لیکن وہ ایسی دردناک عذاب والی آندھی تھی کہ وہ لوگ تباہ ہو گئے اور اُن کے گھروں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ قوم ثمود و عاد اور قوم لوطؑ کی بستیاں اسی طرح عذاب الٰہی سے تباہ ہو گئیں — یہ سب واقعات مسلمانوں کی ہدایت کے لیے ہیں جس طرح کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن پاک سنا جب کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بطن نخلہ میں نماز فجر پڑھ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنی قوم کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے گئے اور انکار پر عذاب سے ڈرایا اور بتایا کہ اللہ پاک ہر چیز پر قادر ہے۔ آخر میں اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ صبر فرمائیں جیسا کہ پہلے بھی اولوالعزم پیغمبروں نے اپنی قوموں کی ایذا پر کیا تھا۔

سورۃ محمدؐ

جن لوگوں نے راہِ حق سے خود کو اور دوسروں کو دور رکھا وہی گمراہ ہیں لیکن جو اللہ پر ایمان لائے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق عمل کیا اور اُن کے قرآن پر ایمان لائے تو اللہ پاک اُن کی بُرائیاں دور کر کے ان کا حال سنوار دے گا۔ پھر جنگ کے دوران مستقل مزاجی اور دلیری سے لڑنے کا حکم ہے اور شہدائے کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ اگر مسلمان، اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی مدد کریں گے تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد فرمائے گا۔ وہی اُن کا کارساز ہے اور کافروں کا کارساز کوئی نہیں۔

دوسرے رکوع میں نیکوکار مومنین کے لیے جنت کی بشارت فرمائی گئی ہے اور جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ کافروں کے لیے آخرت میں دوزخ اور اس میں عذاب کی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ نیز یہ کہ کافر دنیا میں ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایسے کھاتے ہیں جیسے

چوپائے اور یہ اپنی نفسانی خواہشوں کے تابع ہوتے ہیں۔ کافروں میں بعض منافقین ہیں جن کے دلوں پر مہر کر دی ہے پس یقین کرو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگیں۔

تیسرے رکوع میں بیان فرمایا ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ایسی سورۃ کیوں نہ اُتاری گئی جس میں جہاد کا حکم ہوتا لیکن جب جہاد کی سورۃ عطا ہوئی تو وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے اُن لوگوں کی طرح دیکھتے ہیں جن پر موت سے بیہوشی چھائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں پر لعنت فرمائی ہے اور ان کو (حق کو سننے سے) بہرا کر دیا اندھا کر دیا (حق دیکھنے سے)۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں پس کیوں نہیں یہ لوگ قرآن میں غور کرتے (حق کو پہچاننے کے لیئے) یا (ان کے) دلوں پر قفل لگے ہیں (یہاں نکتہ قابلِ غور ہے کہ حق کو پہچاننے کے لیے قرآن مجید میں غور بہت اہم ہے۔ اگر دل پر قفل ہو تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے صدقے میں توبہ کر لی جائے اور غور کیا جائے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی سچا غلام مل جائے تو کام بہت سہل ہو جاتا ہے سچے غلام کی پہچان یہ ہے کہ جس کی صحبت میں رہ کر انسان بُرے کاموں سے نفرت اور نیک کام کرنے یعنی شریعت محمدیہ پر شوق سے چلنے والا بن جائے) شیطان کے فریب میں آکر مرتد ہو جانے پر عقوبتوں کا بیان ہے۔

چوتھے رکوع میں جہاد کی آزمائش ضروری قرار پائی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم ماننے کے ساتھ ساتھ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ماننے کا حکم فرمایا ہے۔ دشمن کے مقابلے میں سستی نہ کرنے کا حکم دیا ہے جس طرح کھیل کود میں نفع نقصان یا فتح و شکست کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح دنیوی زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایمان لانے اور پرہیزگاری کرنے پر ثواب عنایت فرمانے کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ (اس میں بہت سے دینی اور دنیوی فائدے مضمر ہیں سب سے اہم یہ کہ عاقبت بہتر ہو جائے گی تعمیل حکم پر آخرت میں ثواب ملے گا۔ دنیوی فائدہ یہ کہ مناسب تقسیم دولت میں مدد ملے گی اور معاشرہ خوش حال ہوگا۔ اس کی ایک مثال یوں سمجھ لیجیے کہ اگر ایک جزیرے میں ایک شخص ارب پتی اور ہزار افراد تنگدست ہوں تو کاروبار اچھا نہ ہوگا یعنی خوش حالی نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف ارب پتی کروڑ پتی بن جائیں اور ہزار افراد میں کچھ لکھ پتی اور کچھ کم دولت والے ہوں تو بفضلہٖ تعالیٰ خوشحالی ہوگی) آخر میں تنبیہ ہے کہ اگر حکم عدولی کی تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم بدل دے گا جو تم جیسے نہ ہوں گے یعنی حکم عدولی نہ کریں گے بلکہ تعمیل حکم کرنے والے ہوں گے۔

سورۃ الفتح

پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو فتح مبین فرمایا ہے جو بعد کے واقعات سے بفضلہٖ تعالیٰ صحیح ثابت ہوئی۔ نیز اگلی پچھلی لغزشیں بھی معاف فرمانے کی خوشخبری عنایت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو جنت کی خوش خبری اور کافروں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس طرح بیان فرمائی "تحقیق بھیجا ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔" حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ ان کی مدد کرو اور تعظیم کرو اللہ تعالیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کو اپنے ہی سے بیعت فرماتے ہیں۔ بیعت توڑنے والوں کو خرابی کا ڈر اور عہد پورا کرنے

والوں کو اجرِ عظیم کی خوش خبری سنائی ہے۔ دوسرے رکوع میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو واپسی پر مطلع فرمایا ہے کہ پیچھے رہنے والے دیہاتی مغفرت کے لیے عرض کریں گے نیز خیبر میں ساتھ چلنے کے لیے۔ دیہاتیوں کے لیے تنبیہہ ہے کہ انہوں نے بدگمانی کی تھی اس لیے خیبر میں ساتھ نہیں لیا جائے گا۔ البتہ ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے اور اگر تم اطاعت کرو گے تو اچھا اجر (جنت) ملے گا اور پھر جانے والوں کے لیے دردناک عذاب کی سزا ہوگی۔ جہاد سے رہ جانے والوں میں اندھے لنگڑے اور بیمار پر تنگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ماننے والوں کے لیے نعمتوں والی جنت کا وعدہ ہے اور پھر جانے والوں کے لیے دردناک عذاب کی وعید ہے۔

تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے خوش ہونے کا اظہار فرماتے ہیں جبکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دست مبارک پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اس خوشی میں فتوحات اور غنیمتوں کی خوش خبریاں عطا فرمائیں نیز دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالنے کا انعام فرمایا اور صلح کی مصلحتیں بیان فرمائیں۔

چوتھے رکوع میں اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے سچے خواب کا سچ ہونا بیان فرمایا ہے اور اپنے پیارے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سب دینوں پر غالب فرمائے اور اللہ تعالیٰ کی شہادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر کافی بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں اور رکوع اور سجدہ کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہتے ہیں۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی علامت روشن چہرے فرمائے ہیں۔ یہ نشانیاں توریت اور انجیل میں بھی بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ (اس آیت میں "معہٗ" سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ۔ "اشداء علی الکفار" سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ "رحماء بینھم" سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور "رکعاً سجداً" سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح اسلام کے فروغ کی چار منزلوں کا ذکر ہے۔ اخرج شطئہٗ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ۔ فاٰزرہٗ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور۔ فاستغلظ سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عہد اور فاستویٰ علیٰ سوقہٖ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے)۔

سورۃ الحجرات

اس سورۃ میں ایمان والوں کو حکم ہے کہ وہ کسی معاملے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے سبقت نہ کیا کریں یعنی ان کے ارشاد سے پہلے نہ بول اٹھا کریں بلکہ اُن کے حکم کا انتظار کریں۔ دوسرے یہ کہ اپنی آواز کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی آواز سے اونچا نہ کریں بلکہ پکار کر بھی بات نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا کرنے سے ان کے عمل ہی ضائع ہو جائیں۔ اسی طرح کسی فاسق کی بات پر یقین نہ کریں بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے تحقیق کر لیں۔ ورنہ تمھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے گا۔ اگر مسلمانوں کے دو فریق لڑ پڑیں تو اُن میں میل جول کرا دینے کا حکم ہے۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتے تو ایسے سے لڑنے کا حکم ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کا حکم مان لے

انصاف اور عدل کو اللہ پاک دوست رکھتا ہے ۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں ۔ اگر لڑ پڑیں تو صلح کرا دو تاکہ تم پر رحمت ہو۔ دوسرے رکوع میں چند اہم منہیات ہیں :-

۱ - ایک دوسرے کی تضحیک نہ کرو ۔

۲ - بدگمانی سے بچو ۔

۳ - غیبت نہ کرو ۔

۴ - نسب پر فخر نہ کرو (اللہ کے نزدیک وہی شخص سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

۵ - ایمان لانے کا احسان نہ جتاؤ (یہ تو اللہ نے تم پر احسان کیا ہے) ۔ ان منہیات کا خیال نہ رکھیں ورنہ دنیا میں ذلت اور عقبیٰ میں دردناک سزا ہو گی ۔

سورۃ قٓ

ساتویں منزل شروع ہوتی ہے ۔

قٓ ، حروف مقطعات میں سے ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ وہ جب اُنہی کے خاندان اور قوم میں سے مبعوث ہوئے تو کافر کہنے لگے کہ یہ تو عجیب بات ہے ۔ (کہ اللہ کا رسولؐ ہماری طرح چلتا پھرتا ہے اور مرنے کے بعد پھر زندہ کیسے جانے کی خبر دیتا ہے ۔" ہم جانتے ہیں کہ زمین ان (کے جسموں) میں سے کس قدر گھٹاتی ہے (اور کیا نہیں گھٹاتی) اور ہمارے پاس تو (وہ) کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے " (آیت ۴) ۔ کفار کی یہ سب باتیں اُن کے وہم و قیاس پر مبنی ہیں اور سراسر غلط ہیں ۔" درحقیقت انہوں نے (دینِ) حق کو جب اُن کے پاس آ پہنچا ، جھٹلا دیا (اس لیے) اب وہ اُلجھن میں پڑے ہیں " (آیت ۵) اب اللہ تعالیٰ کافروں کی توجہ آسمان ، زمین ، پہاڑ اور اناج پیدا کرنے کی طرف مبذول فرماتے ہیں تاکہ اُن کی قدرتِ کاملہ کا یقین ہو جائے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لائیں ۔ اس کے بعد رسولوں علیہم السلام کے جھٹلانے والوں کے انجام سے ڈرایا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ پہلی بار پیدائش کر کے تھک نہیں گئے ، بلکہ کافر نئی پیدائش سے شبہ میں ہیں ۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور نفس جو وسوسہ ڈالتا ہے وہ ہمیں معلوم ہے اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی قریب ہیں ۔ فرشتے انسان کے اعمال لکھتے رہتے ہیں ۔ موت کی سختی ضرور پیش آئے گی ۔ قیامت کے دن دوبارہ صور پھونکا جائے گا ۔ تب کافروں سے کہا جائے گا کہ عذاب کے وعدہ کا دن یہی ہے ۔ دنیا میں تو غفلت میں تھا ۔ اب پردہ اُٹھ گیا سو آج تیری نگاہ تیز ہے ۔ اُن کا اعمال نامہ پیش ہو گا اور دوزخ کا حکم ہو گا ۔ ہم نشین شیطان کہے گا کہ میں نے اسے گمراہ نہیں کیا یہ خود ہی گمراہی میں تھا ۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ۔" جھگڑو مت ۔ میں پہلے ہی کتابوں اور رسولوں علیہم السلام کے ذریعے عذاب کا وعدہ بھیج چکا تھا ۔" میرے ہاں بات نہیں بدلتی اور میں بندوں پر ظلم نہیں کرتا ۔"

تیسرے رکوع میں فرماتے ہیں جس دن دوزخ سے کہا جائے گا کیا تو بھر گئی تو وہ عرض کرے گی کیا اور کچھ بھی ہے ۔ جنت پرہیزگاروں

کے نزدیک کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ اُن سے جنّت میں داخل ہونے کے لیے فرمائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کفار سے پہلے بہت سی اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے قوت میں زیادہ تھے اور وہ عذاب سے نہ بچ سکے بے شک اس بیان میں اس شخص کے لئے نصیحت ہے جو دل رکھتا ہوا اور متوجہ ہو کر سُنے ۔ فرماتے ہیں ۔" ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۔ چھ دن میں پیدا کیا اور ہم کو کچھ تکان نہیں ہوئی ۔" کافروں کے کہنے پر صبر کی تلقین اور ذکر اور نمازیں ادا کرنے کا حکم ہے ۔ جس روز صور پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو کر حاضر ہوں گے ۔ قرآن شریف سے اس شخص کو نصیحت کرنے کا حکم ہے جو وعدۂ عذاب سے ڈرتا ہے ۔

سورۃ الذاریٰت

پہلے رکوع میں قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بے شک جس بات کا تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ بالکل حق ہے اور بیشک اعمال کی جزا اور سزا ضرور ہوگی ۔ بیشک تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف کے بارے میں اختلاف رکھتے ہو قرآن شریف سے وہی باز رکھا جاتا ہے جس کی قسمت میں اوندھا ہونا ہو ۔ جو غفلت میں آخرت کو بھولے ہوئے ہیں ۔ ان پر لعنت ہو ۔ وہ بے سند باتیں کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کب ہو گی ۔ فرماتے ہیں فرما دیجیے جس دن ان کو آگ کا عذاب ہوگا ۔ اور اُن سے کہا جائے گا یہ ہے وہ دن جس کی تم جلدی کرتے تھے ۔ پرہیزگاروں کو جنت میں نعمتیں عطا ہوں گی ۔ یہ رات کو عبادت کی وجہ سے کم سوتے تھے اور بوقت سحر گناہوں کی معافی مانگا کرتے تھے ۔ ان کے مالوں میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حصہ مقرر تھا ۔ یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں اور خود ان میں نشانیاں موجود ہیں ۔ اِدھر توجہ دلائی گئی ہے ۔ سب کا رزق آسمان میں موجود ہے ۔ یہ حق ہے ۔

دوسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعے بیان فرمائی ہے ۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی نے تعجب فرمایا تو فرشتوں نے تسلی فرمائی کہ تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے ۔ وہ حکمت والا جاننے والا ہے ۔

اب ستائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے :۔

ابراہیم علیہ السلام فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ کس کام سے آئے ہو ۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک مجرم قوم یعنی قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں جن پر پتھر برسانے کا عذاب ہوگا ۔ سوائے مسلمانوں کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں نشانی ہے ڈرنے والوں کے لیے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بھی نشانی ہے فرعون اور اُس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا ۔ عاد کے قصوں میں بھی نشانی ہے ۔ آندھی کے عذاب کی صورت میں ۔ ثمود کے ہاں سخت آواز کے عذاب کی نشانیاں ہیں ۔ اور اُن سے پہلے سیدنا نوح علیہ السلام کی قوم کے بدکار لوگوں کو ہلاک کیا ۔

تیسرے رکوع میں توحید کا بیان ہے ۔ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کی نشانیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی ہے کہ آپ سے پہلے جو رسول علیہم السلام کافروں کے پاس آئے تو کافر اُن کو جادوگر اور دیوانہ کہتے تھے جیسے کہ یہ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے آئے ہیں ۔ نیز یہ کہ آپ پر الزام نہیں کیونکہ آپ تبلیغ فرما چکے اور نصیحت فرمائیے کیونکہ نصیحت

مسلمانوں کو فائدہ دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن اور انسان کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور غلامی میں زندگی گزرے تو عین عبادت ہے چاہے روزی کمانا ہو یا بچوں کی پرورش وغیرہ کے کام ہوں۔ پوری زندگی کو عبادت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ اتباع کی جائے تاکہ دنیا میں پیدا کیے جانے کا مقصد حاصل ہو۔ (اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے کسی اور کے آگے جھک کر اپنی توہین نہ کرائے) "اور یقیناً اللہ ہی روزی دینے والا بڑا زور آور توانا ہے۔" (آیت ۵۸) اور ظالموں کے لیے عذاب (قیامت پر) مقرر ہے۔

سورۃ الطور

پہلے رکوع میں اللہ پاک نے مختلف چیزوں کو گواہ بنا کر فرمایا ہے کہ کائنات فنا ہوگی، قیامت آئے گی اور کافروں کو دوزخ میں عذاب ضرور ہوگا لیکن مسلمانوں کے لیے (متقیوں کے لئے) جنت ہے اور وہ نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

دوسرے رکوع میں ہے کہ "آپ نصیحت فرماتے رہیے کیونکہ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنوں" (آیت ۲۹) کفار کہتے ہیں کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن خود بنا لیا ہے تو ایسا کلام کوئی بھی بنا لائے بلکہ سب انسان مل کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ دراصل کفار نہ قرآن کو مانتے ہیں اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا چاہتے ہیں۔ بلکہ اللہ کے متعلق بھی ان کے خیالات مہمل ہیں۔ وہ معمولی چیزیں اللہ پاک سے اور بہترین خود سے منسوب کرتے ہیں۔ "پس آپ ان کو (اُن کے حال پر) چھوڑ دیجیے یہاں تک کہ وہ اپنے اُس دن کو دیکھ لیں جس دن اُن کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ جس دن اُن کی چال بازی اُن کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اُن کو (کہیں سے) مدد پہنچے گی۔" (آیت ۴۵-۴۶) پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ "اور (ان کی گستاخانہ باتوں اور دل آزار رویہ سے آپ غمگین نہ ہوں اور) آپ اپنے رب کے حکم کا انتظار فرمائیے۔ بہر حال آپ تو ہماری نظروں میں ہیں (آپ کے دین کی حفاظت ہمارا کام ہے) اور آپ تو اپنے رب کی تسبیح اور اُس کی حمد کرتے رہیے (خصوصاً جس وقت) آپ کھڑے ہوں (خواہ سو کر اُٹھیں یا نماز کے لیے تیار ہوں) اور کچھ رات میں اس کی پاکی بیان کیا کیجیے اور تاروں کے غروب ہونے کے بعد (آیت ۴۸-۴۹) یعنی آپ ان اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح و تحمید میں جس طرح مصروف رہا کرتے ہیں مصروف رہیں۔ یہی آپ کے قلب کی راحت ہے اور یہی اللہ کو پسند ہے۔

سورۃ النجم

گذشتہ سورۃ لفظ "النجوم" پر ختم ہوئی اور یہ "النجم" سے شروع ہوتی ہے۔ آسمانِ نبوت پر مختلف انبیاء علیہم السلام نمودار ہوئے لیکن اب ایک نجمِ وحدت کا طلوع ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ اور ان کے دین کو کامل و مکمل کرنے والا ہے — وہ تشریف لائے اور معراج کے اُس مقام تک پہنچے جہاں جبریل علیہ السلام بھی نہ پہنچ سکتے تھے۔ خود لفظ "النجم" سے بعض مفسرین نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی مراد لی ہے اور ابتدائی آیتوں کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:۔ "قسم ہے ستارے (یعنی نورِ مبینؐ) کی جب وہ (معراج سے) اُترا۔ قسم (اس بات پر کہ اے لوگو) تمہارا رفیق (اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نہ

بہکا اور نہ راہ سے بے راہ ہوا (یعنی جو دیکھا وہ حق دیکھا اور جو پایا، وہ حق پایا اور جو کچھ بیان کیا اس میں سر مو فرق نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے) اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے۔ وہ تو وہی فرماتے ہیں جو (اللہ کی طرف سے) اُن پر وحی ہوتی ہے۔" (آیت ۱-۴) — اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو براہِ راست اور بے واسطہ تعلیم دی اور انہوں نے آسمانوں کے اوپر استویٰ فرمایا اور جبریل علیہ السلام سدرۃ المنتہیٰ پر رک گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے قرب کی نعمت سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ لطف و رحمت کے ساتھ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلّم سے قریب ہوا اور فاصلہ دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا (یہ نہیں بتایا گیا کہ فاصلہ کتنا کم رہ گیا۔) وصال کی نعمتوں سے فیضیاب کیا۔ اس کے بعد معراج شریف کی بقیہ سیر کا ذکر ہے۔ قریش واقعہ معراج کے متعلق خواہ مخواہ جھگڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ پھر ان کے بے قدرت معبودوں کی طرف متوجہ فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان بتوں کے نام کافروں کے باپ دادا نے رکھ لیے جن کی کوئی سند نہیں اور کافر محض اپنے فاسد گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ دنیا اور آخرت سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آسمانوں میں فرشتوں کی سفارش کام نہیں آتی جب تک کہ اللہ تعالیٰ سفارش کی اجازت نہ عطا فرما دیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرماتے ہیں کہ اُس شخص سے مُنہ موڑ لیجیے جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے منہ موڑ لے اور صرف دنیا ہی کی زندگی چاہے۔ وہ گنہگار اور پرہیز گار کو خوب جانتے ہیں۔ اپنی تعریف خود نہیں کرنی چاہیے پرہیز گار کو وہ خوب جانتے ہیں۔

تیسرے رکوع میں فرماتے ہیں کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا قیامت میں کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر شخص کو اُس کی کوشش کا بدلہ ملے گا۔ نافرمان قوموں کی تباہی کا ذکر فرمایا ہے اور یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اگلے ڈرانے والے کی طرح ڈرانے والے ہیں۔ حضورؐ کا کہنا مانو کیونکہ قیامت قریب آ گئی۔ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔

سورۃ القمر

پہلے رکوع میں شق القمر کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت اقدس میں یہودی اور ابوجہل حاضر ہوئے۔ یہودی نے ابوجہل سے کہا کہ جادو آسمان پر نہیں چلتا اس لیے چاند کے ٹکڑے کرنے کی درخواست کریں۔ درخواست پیش کی گئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے چاند کو دو ٹکڑے فرما دیا۔ یہودی ایمان لے آیا لیکن ابوجہل نے کہا کہ میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے۔ اور لوگوں سے دریافت کیا تو جن لوگوں نے یہ معجزہ دیکھا اقرار کیا لیکن ابوجہل پھر بھی ایمان نہ لایا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ کافروں سے منہ پھیرنے کو فرمایا ہے۔ قیامت میں کافروں کو پتا چل جائے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا بیان نیز دیگر انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی کے انجام کو بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کو نصیحت کے لیے آسان فرما دیا ہے کیا پس کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

دوسرے رکوع میں سیدنا صالح علیہ السلام کی قوم ثمود اور سیدنا لوط علیہ السلام کی قوموں پر نافرمانی کی وجہ سے عذاب ہونے

اور شکر گزاری کرنے والوں کو بچانے کا بیان ہے اور قرآن شریف سے نصیحت حاصل کرنے کی تلقین ہے۔
تیسرے رکوع میں فرعون کا جھٹلانے پر معذب ہونے کا بیان ہے اور مکہ معظمہ کے کافروں کو جھٹلانے پر عذاب کی تنبیہہ ہے۔ قرآن شریف سے نصیحت حاصل کرنے کی تلقین ہے۔ لوح محفوظ سب کے کل اعمال کا لکھا ہونا بیان ہے نیز پرہیزگاروں کے لیے جنت کی نعمتوں کا بیان ہے۔

سورۃ الرحمٰن

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ رحمٰن نے قرآن سکھایا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو) انسان یعنی جان انسانیت مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو پیدا فرمایا۔ اس کے علاوہ دیگر مخلوقات کو پیدا فرمانے کا ذکر ہے۔ ترازو کو پیدا فرمایا تاکہ انصاف سے تولا جائے۔ زمین کو بچھانے کی نعمت کا ذکر ہے اور اس میں سے میوے، اناج اور پھولوں جیسی نعمتوں کے پیدا ہونے کا بیان فرما کر انسانوں اور جنوں سے دریافت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت سے انکار کریں گے۔ آدمی کی اصل یعنی سیدنا آدم علیہ السلام کو خشک مٹی اور جنوں کے باپ جان کو بغیر دھوئیں والی آگ سے پیدا فرمانے کے بعد دریافت فرماتے ہیں کہ کس کس نعمت سے انکار کریں گے۔ ہمارا وجود بلکہ ایک ایک عضو نعمت ہے اور اس کا انحصار یا بنیاد سیّدنا آدم علیہ السلام اور جان کی پیدائش ہے۔ اسی طرح دوسری نعمتوں کا ذکر ہے اور ہر نعمت پر دریافت فرماتے ہیں کہ آخر کس کس نعمت کو جھٹلائیں گے۔
دوسرے اور تیسرے رکوع میں بھی مختلف نعمتوں کا ذکر فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ اے انسانو اور جنو تم کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ کچھ تو فی نفسہٖ نعمت ہیں باقی نعمتیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر بن جاتی ہیں۔ جنت کے اوصاف اور دوزخ کے عذاب بیان فرمائے گئے ہیں تاکہ عذاب سے ڈریں اور جنت کی نعمتوں کے حصول کا شوق پیدا ہو۔

سورۃ الواقعہ

یہ سورۃ مکی ہے۔ پہلے رکوع میں قیامت کی نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں اور یہ کہ جب قیامت واقع ہو جائے گی تو کسی کو انکار کی گنجائش نہ رہے گی۔ انسانوں کی تین گروہوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ دائیں طرف والے جنت میں داخل ہوں گے جنت کی نعمتیں بیان فرمائی ہیں۔ بائیں طرف والے دوزخی ہوں گے۔ دوزخ کے عذاب بیان فرماتے ہیں تاکہ ڈر کر ہدایت پانے والے نیک بن جائیں۔ تیسرے جو سبقت لے گئے وہ اللہ تعالیٰ سے خاص قرب رکھنے والے ہیں۔ یہ بھی جنت کی نعمتوں کے مستحق ہوں گے بفضلہٖ تعالیٰ۔
دوسرے رکوع میں بھی توحید کی نشانیاں بیان فرما کر پرہیزگاروں کے لیے جنت کی نعمتیں بیان فرمائی ہیں اور منکروں کے لیے دوزخ کے مختلف عذاب بیان فرمائے ہیں جو نصیحت کے لیے ہیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے عظمت والے پروردگار کا نام پاکی سے بیان فرمانے کے لیے ارشاد ہے۔ تیسرے رکوع میں آسمانِ رسالت کے درخشاں ستاروں (انبیا علیہم السلام)

کی قسم کھائی گئی ہے۔" اور بے شک یہ ایک بڑی قسم ہے اگر تم سمجھو۔" (آیت ۷۶) بلاشبہ یہ قرآن کریم ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ اسے وہی چھوتے ہیں جو مُطَہَّر کیے گئے ہیں۔" (آیت ۷۹)۔ مطہّر کا اسمِ فاعل اللہ ہے جس نے پاک کیا ہے یعنی جن کے قلوب (صحیح عقیدے کی وجہ سے) پاک ہیں وہی اس قرآن کو حفظ کر سکتے ہیں۔ بدعقیدہ شخص حفظ نہیں کر سکتا۔" پھر کیا تم اس کا انکار کرتے ہو۔" (آیت ۸۱) پھر روح کے نکلنے اور موت کے وقت مرنے والے سے اللہ تعالیٰ کا نزدیک ہونا اور عزیزوں کا بےبس ہونا بیان ہے۔ نیک روح کے لیے جنت کے عیش ہیں اور منکروں کے لیے دوزخ کے عذاب کی وعید ہے اور رکوع کے آخر میں دوسرے رکوع کی آخری آیت دہرائی گئی ہے جس سے اس کی اہمیت یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عظمت والے پروردگار کا نام پاکی سے بیان فرمانے کے لیے فرمایا ہے۔

سورۃ الحدید

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ مختلف قدرتوں کا بیان فرما کر آسمانوں اور زمین کا چھ دن میں بنانا اور عرش پر جلوہ افروز ہونا بیان فرمایا ہے۔ پھر مختلف قدرتوں کا بیان فرما کر اللہ تعالیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا حکم اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے اور ساتھ ہی فرمانبرداری پر اجرِ عظیم کی خوشخبری ہے۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ حالانکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو اس کی دعوت دے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ تم سے عالمِ ارواح میں پہلے ہی عہد لے چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ روشن آیات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارتا ہے تاکہ تمھیں کفر کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی کی طرف لے جائے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔ تمھیں کیا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالانکہ اللہ تعالیٰ کی سب میراث ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہاں سب چھوڑ جانا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر گئے تو عاقبت میں اجرِ عظیم ملے گا اور خرچ نہ کریں گے جب بھی مال و دولت دنیا میں چھوڑ جانی ہے اور عاقبت میں اجرِ عظیم سے محرومی۔ فتح مکّہ معظمہ سے پہلے خرچ کرنے اور جہاد کرنے والوں کا درجہ فتح مکّہ معظمہ کے بعد خرچ کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں سے بڑھا ہوا فرمایا ہے اگرچہ دونوں سے جنّت کا وعدہ ہے۔

دوسرے رکوع میں مسلمان مرد اور عورتوں کا پُل صراط پر سے ایمان کی روشنی میں گزرنا اور جنّت میں داخل ہونا۔ لیکن منافقوں کا نور سے محروم رہنا، پُل صراط پر سے نہ گزر سکنا اور دوزخ میں گرنا مذکور ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ ایمان والوں کے لیے وقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جائیں اور قرآن پاک کو پکڑیں۔ اور اُن جیسے نہ ہوں جن کو اُن سے پہلے آسمانی کتابیں ملیں لیکن بہت زمانہ گزرنے اور توبہ نہ کرنے سے اُن کے دل سخت ہو گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ کو خوشی سے قرض دینے والوں کے لیے (اُس کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے) اجرِ عظیم کی بشارت ہے اور منکرین کے لیے دوزخ کی وعید ہے۔

تیسرے رکوع میں دنیا کی بےثباتی اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا بیان ہے۔ "جان لو کہ دنیوی زندگی محض کھیل تماشا اور آرائش ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور کثرت سے مال اور اولاد کا حصول ہے۔ جیسے بارش کہ اُس سے کھیتی اُگنی کسانوں

کو بھلی معلوم ہوتی ہے) پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے یہاں تک کہ وہ چورہ چورہ ہو جاتی ہے (اسی طرح دنیوی دولت ختم ہو جاتی ہے) اور آخرت میں (ایسے غافلوں کے لیے) سخت عذاب ہے اور (مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے۔ ورنہ دنیا کی زندگی تو دھوکا ہی دھوکا ہے" (آیت ۲۰)۔

"اور اے مسلمانو، تم کو ان باتوں سے اس لیے آگاہ کر دیا گیا) تاکہ جو کچھ تم سے لے لیا گیا اس پر غم نہ کھاؤ اور جو کچھ تم کو دیا گیا اُس پر اترا نہ جاؤ اور اللہ کسی اترانے والے اور شیخی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا" (آیت ۲۳)۔ پھر ارشاد ہے کہ ہم نے لوہا اُتارا جس میں سخت جنگ کے سامان اور بہت فائدے ہیں۔ اللہ پاک دیکھنا چاہتا ہے کہ کون بن دیکھے ایمان لاتا ہے اور دین کی مدد کرتا ہے — بے شک اللہ پاک بڑی قوت (اور) غلبہ والا ہے۔

پھر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجنے اور اُن کی اولاد میں پیغمبری کا بیان ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو انجیل دی گئی اور ان کے پیروکاروں کے دلوں میں نرمی اور شفقت رکھی۔ رہبانیت انہوں نے خود ہی اختیار کر لی جس کا حق وہ ادا نہ کر سکے۔ پھر جو اُن میں سے ایمان لائے ہم نے اُن کو اجر دیا اور اُن میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔ (اس لیے کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے)۔" اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ تاکہ دُو حصّے رحمت کے ملیں اور نور پیدا ہو (ایمان اور تقوٰی سے پُر نور ہو جاؤ) تم اُس کی روشنی میں چلو گے (یہاں بھی اور آخرت میں بھی) اور وہ تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے" (آیت ۲۸)۔ اللہ کے فضل پر اہل کتاب کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ جس پر چاہے فضل کرے۔

<u>اب اٹھائیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

سورۃ المجادلہ

شروع میں ظہار کا بیان ہے۔ ایک عورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ خاوند اسے ماں کہہ دے تو عام دستور کے مطابق اس سے علیحدگی ہو جاتی ہے گی اور بچے پریشان ہو جائیں گے اور گھر اُجڑ جائے گا۔ اللہ پاک نے اس بات (ظہار) کو لغو بات فرمایا اور ملاپ کے لیے کفارہ لازم فرمایا۔ اور یہ حکم اس لیے ہے کہ اللہ پاک اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانو۔ ورنہ اُن کی مخالفت کرنے والے ذلیل کیے گئے ہیں۔ پھر اللہ پاک کے ہر جگہ موجود ہونے کا بیان ہے۔ منافقین کے مخفی مشورے اور ان کی تمام باتیں اللہ پاک جانتا ہے۔ لوگوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ رسولِ برحق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف سازشیں نہ کریں اور خلافِ ادب بات نہ کریں ورنہ جہنم اُن کا ٹھکانا ہے۔ پھر مؤمنوں کو ہدایت ہے کہ اگر تم کان میں بات کرو تو وہ اچھی اور پرہیز گاری کی ہو۔ تم میں کشادہ دلی ہونی چاہیے۔ آدابِ مجلس بھی ملحوظ ہوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی بات چپکے سے عرض کرنی ہے تو پہلے مساکین کو نذرانہ دے دو۔ لیکن یہ حکم ایک دن یا آدھے دن کے بعد اُٹھا لیا گیا اور نماز، زکوٰۃ اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر زور دیا گیا تاکہ عاقبت سنور جائے۔

تیسرے رکوع میں کافروں سے دوستی کی ممانعت آئی ہے۔ منافقین کے لیے آخرت میں ذلت اور دوزخ کے عذاب کی وعید ہے شیطان ان پر غالب آگیا ہے اور اُن کے بُرے کام بھلے نظر آتے ہیں۔ تحقیق شیطان اور اُس کے لشکر ہی نقصان میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

اور اس کا رسولؐ غالب آئیں گے - فرماتے ہیں کہ کوئی قوم ایسی نہیں پاؤ گے جو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان لائے ہوں اور دوستی رکھیں اُن لوگوں سے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہوں چاہے وہ اُن کے باپ بیٹے، بھائی یا کنبے والے ہی کیوں نہ ہوں - یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے دوستی ہو تو کیا وہ لوگ ایماندار رہ سکتے ہیں - صرف ظاہر میں مسلمان ہو سکتے ہیں اور ان کا شمار منافقین میں ہوگا اور اُن کا حشر ویسا ہی ہوگا جیسا اس رکوع کے شروع میں بیان فرمایا گیا ہے - دشمنانِ اسلام نے مرتد بنانے کی بجائے آج کل کے دور میں خاص طور پر یہ ہتھکنڈا استعمال کرنا شروع کر دیا ہے کہ منافق بنا کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کیا جائے تاکہ اسلام کی ترقی رُک جائے اور مسلمان دنیا بھر میں ذلیل ہو کر رہیں - اس شیطانی حربے کا جائزہ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کی روشنی میں لینے کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہماری آخرت بہتر ہو اور دنیا میں بھی فلاح نصیب ہو - نہ صرف یہ بلکہ اس لیے بھی کہ ہماری اولادوں کو ذلت و خواری کی زندگی نہ بسر کرنی پڑے اور وہ بھی فلاحِ دارین حاصل کر سکیں - جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے دوستی نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اُن کے دل میں ایمان نقش فرما دیتے ہیں - ان کو جنت کی بشارت ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہے جو فلاح پانے والی ہے -

سورۃ الحشر

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے - اس لیے سب انسانوں خاص طور پر مسلمانوں کو بھی پاکی ضرور بیان کرنی چاہیے - بنی نضیر کے یہود نے صلح کی عہد شکنی کی - ان کا خیال تھا کہ اُن کے قلعے اُن کو بچا لیں گے - اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور آخر ان کو نکلنا پڑا اور اپنے ہاتھوں سے اپنے مکان ویران کئے - یہ عبرت کا مقام ہے - اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے - غنیمت اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے یہ اس لیے بھی ہے تاکہ وہ مال دولت مندوں کا نہ ہو جائے - ایک خاص اصول وضع فرمایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں وہ نہ لو - نیز وہ مال ان فقیروں ہجرت کرنے والوں کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی وجہ سے جبراً اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے اور وہی اپنے ایمان میں سچے ہیں - جو لوگ اُن کی طرف ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور مہاجرین کو مال دیئے جانے پر اپنے دل میں خلش نہیں پاتے اور ان کی خدمت اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں چاہے خود کتنے ضرورت مند ہوں اور اپنے نفس کو حرص سے روکتے ہیں ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں - نیک لوگوں میں وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ رکھ - بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے -

دوسرے رکوع میں منافقین کا ذکر ہے جنھوں نے یہودیوں سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ ہو کر لڑیں گے - اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں اور یہودی بھی نہ لڑیں گے مگر قلعہ بند ہو کر یا دیوار کے پیچھے سے - اُن کو متفق بھی نہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ

اُن کے دل الگ الگ ہیں۔ ان کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ منافقین کی مثال شیطان کی سی ہے۔ جب انسان نے شیطان کے بہکانے سے کفر کیا تو خود الگ ہو گیا۔ دونو جہنم میں جائیں گے ظالموں کی یہی سزا ہے۔

تیسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ سے مسلمانوں کو ڈرنے کا حکم ہے اور نافرمانی سے بچنے کا نیز اعمال کا جائزہ لینے کا کہ قیامت کے لیے کیا ذخیرہ کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کو بھول نہ بیٹھنے کا حکم ہے مُراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔ ورنہ بھولنے والے فاسق ہو جائیں گے۔ جنّت اور دوزخ والے برابر نہیں ہونے۔ جنّتی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔ قرآن شریف کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اگر قرآن شریف پہاڑ پر اتارتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ توحید کا سبق ملتا ہے نیز اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بیان ہے۔

سورۃ الممتحنہ

پہلے رکوع کی پہلی آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستی کرنے کو منع فرمایا ہے فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ (یعنی کافروں کو) اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو چوری سے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ بھیجے جانے والے خط کی اطلاع فرمائی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے وہ خط سارہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذریعے روضہ خاخ پر پکڑ منگوایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کی طرف رہنمائی فرمائی جبکہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم سے فرمایا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجتے ہو بیزار ہیں ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت ہمیشہ کے لئے ظاہر ہو گئی جب تک تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ امید دلاتے ہیں کہ کفّار کو ایمان کی ہدایت عطا فرما دیں اور اس طرح دشمن دوست بن جائیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہوا کہ کفّار کو دعوتِ اسلام دیتے رہیں اور تبلیغی کاموں میں مصروف رہیں تاکہ جن کی قسمت میں ہدایت ہے مسلمان بن جائیں۔ اس کے بعد مسلمان مہاجر عورتوں کے امتحان اور بیعت کے لیے فرمایا گیا ہے۔ اور اُن کے مہر شوہروں کو ادا کرنے اور کافر عورتوں کے لوٹنے پر اُن کے مہر وصول کرنے کا حکم ہے۔ آخری آیت مبارکہ میں پھر فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرو کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے یعنی کفّار تکرار سے اس کی اہمیت ظاہر فرمائی ہے۔

سورۃ الصف

پہلے رکوع میں فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو ذکر کی تلقین کرنا ضروری اور اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے جو وہ کام نہیں کرتے جس کے لیے وہ کہتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دوست رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں اور پیچھے نہیں ہٹتے گویا وہ سیسہ کی دیوار ہیں۔ سیدنا موسےٰ علیہ السلام کی اپنی قوم تبلیغ فرمانے پر ایمان نہ لائی اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو ستانے پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے

دل ٹیڑھے فرما دیے یعنی ہدایت سے محروم فرما دیے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیش گوئی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روشن نشانیاں لائے تو کافروں نے کہا یہ کھلا جادو ہے۔ کافر چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے نور (دین اسلام) کو بجھا دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ سب دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرک کتنے ہی ناخوش ہوں۔ مولانا ظفر علی خان نے کہا ہے :- ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دوسرے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہ تجارت بتائی ہے جس میں نفع ہی نفع ہے دردناک عذاب سے بچاتی ہے تجارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو گناہ معاف ہو جائیں گے اور جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ مزید ایک نعمت فتح کی حاصل ہوگی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا میں فتح اور آخرت میں جنت کی خوشخبری سنا دیجیے۔ مسلمانوں سے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہو جاؤ جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور ایک گروہ مددگار ہو گئے تھے۔ اسی طرح دشمنوں کے مقابلے پر مدد ہوگی اور تم غالب ہو گے۔

سورۃ الجمعہ

گذشتہ سورۃ میں جہاد والی تجارت کے انداز سکھائے گئے تھے۔ اب محراب و منبر والی تجارت سکھائی جا رہی ہے تاکہ جسمانی اور روحانی روزی بھی میسر ہو۔

"جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جو بادشاہ، پاک، زبردست حکمت والا ہے (اور) وہی ہے جس نے اُمّیین میں انہی میں ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا جو (صرف اللہ پاک کے شاگرد ہیں) ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ یہ لوگ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے اور (ان موجودہ لوگوں کے علاوہ) ان میں سے دوسرے لوگوں کے لیے بھی جو ابھی شامل نہیں ہوئے (یعنی موجودہ اور آنے والی تمام اُمتوں کے لیے وہی رسولِ برحق ہیں) اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔" (آیت ۱-۳- البقرۃ ۱۵۱- آل عمران ۱۶۴ میں بھی یہی مضمون آچکا ہے) توریت نازل کی گئی تھی لیکن اس پر عمل نہ کرنے والے ایسے ہیں گویا گدھے کی طرح ہیں جو بہت سی کتابیں لادے پھرتا ہے۔ ؏

چارپائے بر او کتابے چند

اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ پھر یہودیوں کے لیے ارشاد ہے کہ "آپ فرما دیجیے کہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم کو آئے گی۔ پھر تم اس (اللہ) کے پاس لائے جاؤ گے جو تمام چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو بتا دے گا جو تم کرتے رہتے تھے" (آیت ۸)۔ پھر انفرادی اور اجتماعی فلاح کے لیے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے لیے اذان ہوتے ہی روانہ ہو جائیں اور خرید و فروخت (تمام دنیوی مشاغل) ترک کر کے چلے جائیں۔ پھر جب نماز جمعہ ادا کر چکیں تو پھر اپنے کاموں میں لگ جائیں لیکن اللہ کو خوب یاد کریں تاکہ فلاح

حاصل ہو۔" اور (بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ) جب وہ کچھ خرید فروخت یا تماشا دیکھتے ہیں۔ تو اسکی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور (اے میرے حبیبؐ) آپؐ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ ہر تماشے اور ہر تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔" (آیت ۱۱)

سورۃ المنٰفقون

" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔" بڑی بلیغ زبان میں اللہ پاک نے منافقوں کی تردید فرمائی ہے۔ یہ لوگ دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔" اور جب آپ اُن کو دیکھیں تو اُن کے جسم (ظاہراً) بھلے معلوم ہوں گے اور جب وہ بات کریں تو آپ اُن کی بات توجہ سے سنیں۔ گویا وہ لوگ لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئیں (یعنی محض بے جان) ہر تیز آواز کو سمجھتے ہیں کہ انہی پر آفت نازل ہوئی (ایسے بزدل ہیں)۔ یہی دشمن ہیں اس لیے ان سے ہوشیار رہیے۔ اللہ ان کو غارت کرے (وہ حق سے) کہاں بہکے پھرتے ہیں۔" (آیت ۴)۔ یہی منافق لوگ کہتے ہیں کہ جو لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتے ہیں اُن پر خرچ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان ہو کر خود ہی منتشر ہو جائیں۔ لیکن انھیں کیا معلوم کہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں۔ وہ لوگ (عبداللہ بن اُبی) یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم عزت والے ہیں ہم مدینہ کے ذلت والوں کو نکال باہر کریں گے۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت، اللہ کے لیے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مومنین کے لیے ہے۔ پھر ایمان والوں سے خطاب ہے کہ وہ مال اور اولاد کی وجہ سے اللہ سے غافل نہ ہونے پائیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کریں قبل اس کے کہ موت آ جائے جو کبھی ٹل نہیں سکتی۔

سورۃ التغابُن

پھر اللہ پاک کی شان، اُس کی قدرت، خالقیت، علم کا ذکر ہے اور یہ کہ کتنے رسول آئے، کافروں نے انہیں جھٹلایا کہ وہ ہم جیسے بشر ہیں وہ کیا ہماری راہبری کریں گے! اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ مرنے کے بعد وہ ہرگز (دوبارہ) نہ اٹھائے جائیں گے۔ لیکن "آپ فرما دیجیے کیوں نہیں، میرے رب کی قسم، تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے ـــــ" پس (بھلائی اس میں ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اس نور (قرآن) پر جو ہم نے نازل کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ خوب جانتا ہے" (آیت ۸)۔ اللہ پاک قیامت میں تم کو جمع کرے گا اور وہ ہار جیت کا دن ہوگا۔ جیتنے والے جنت کی راحتیں پائیں گے اور ہارنے والے اصحاب النار ہوں گے۔ پھر مومنوں سے فرمایا ہے کہ تمھاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمھارے (دین کے) دشمن ہیں۔ وہ ایک آزمائش بھی ہیں۔ پس اللہ ہی سے ڈرو، اطاعت کرو اور (راہِ خدا میں) خرچ کرتے رہو۔ (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے)۔

سورۃ الطلاق

بیویوں کی کوتاہیوں پر تحمل سے کام لینا چاہیے (جیسا کہ گذشتہ رکوع میں بھی ذکر ہے)۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اگر حالات سے

مجبور ہو کر طلاق کی صورت پیدا ہو جائے تو عدت کا پاس رہے۔" اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم۔آپ مسلمانوں سے فرما دیں کہ) جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو اُن کی عدت کے زمانے سے پہلے ان کو طلاق دو (حالتِ طہر میں) اور عدت کا حساب رکھو اور اللہ سے جو تمھارا رب ہے ڈرتے رہو (اور طلاق کے بعد عدت کے دنوں میں) اُن کو اُن کے گھروں سے نہ نکالو اور وہ خود بھی نہ نکلیں۔ ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو اُن کو نکال دو) اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو وہ خود اپنے حق میں ظلم کرے گا۔ (اسے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم، اللہ اس (طلاق) کے بعد (آپس میں ملاپ کی) کوئی صورت پیدا کر دے۔" (آیت ۱)۔

آیت ۲-۴-۶-۷ میں بھی طلاق کے مسائل ہیں۔

پھر وعید ہے کہ اللہ اور اُس کے پیغمبروں کی اطاعت نہ کرنے والے کس طرح تباہ کیے گئے۔ بے شک تمھارے لیے ایک کتاب نصیحت کی (قرآن) بھیجی گئی ہے اور" ایک ایسا رسولؐ جو تم کو اللہ کی روشن آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، (رسولؐ کی پیروی کریں) وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے آئے اور جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا اور نیک عمل کرتا ہے (رسول کی پیروی کرتا ہے) اللہ اُس کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ نے اس (مومن) کو بہترین رزق عطا فرمایا۔" (آیت ۱۱)۔ پھر اللہ کی خالقیت اور حاکمیت کا ذکر آتا ہے۔

سورۃ التحریم

ازواجِ مطہرات کی دلجوئی کی خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض باتوں سے احتراز کرنے کی قسم کھائی تھی۔ تو اللہ پاک نے کفارہ مقرر فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسانی پیدا فرما دی۔ شروع کی چار آیتوں میں ان باتوں سے متعلق تلمیح ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ" اے ایمان والو، تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ اس (نارِ جہنم) پر بڑے سخت مزاج اور زبردست فرشتے (متعین) ہیں۔ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جائے اُسے (فوراً) بجا لاتے ہیں۔" (آیتؐ)۔

پھر ایمان والوں کو صدقِ دل سے توبہ کرنے کا حکم ہے جس سے تمام گناہ دور ہو جاتے ہیں اور وہ جنت کے حق دار بن جاتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق اور نرم مزاجی کی وجہ سے کفار اور منافقین سے جنگ کرنے میں سختی کریں۔ پھر نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کا ذکر ہے کہ وہ پیغمبروں کی بیویاں ہونے کے باوجود عذابِ الٰہی سے نہ بچ سکیں اور فرعون کی بیوی (جو اسلام والوں کی معاون تھیں) اور حضرت مریم علیہا السلام (جو عصمت و عفت کی محافظ تھیں) اللہ پاک کے نزدیک مقبول ہوئیں۔ اور اُن کے درجات بلند ہوئے۔ گویا دین کی مخالفت سے پیغمبروں کی بیویاں بھی آگ سے نہ بچ سکیں۔ یعنی اللہ کی اطاعت اور پیغمبروں کی تابعداری ہی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

انتیسواں پارہ شروع ہوتا ہے۔

سورۃ الملک

اس سورۃ میں اللہ کی حکومت اور قدرت کا ذکر ہے تاکہ انسان محدود سے لامحدود کی طرف رجوع ہو اور آنے والی زندگی

کو یاد کرے۔ اللہ پاک اپنی قدرت کو دیکھنے کی دعوت دیتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ پھر بھی منکرین نہیں سمجھتے لیکن جب وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایک مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے پر ایمان لاتے ہیں اُن کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر ہے (آیت ۱۲) اللہ پاک کی قدرتِ کاملہ کے نمونے یہ بے شمار پرندے بھی تو ہیں جن کو ہوا میں اللہ ہی تھامے ہوئے ہے (آیت ۱۹)۔

"(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ وہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان، آنکھیں اور دل دیے (لیکن) تم لوگ بہت کم احسان مانتے ہو۔ آپ فرما دیجیے کہ اُسی نے تم کو زمین میں پھیلایا اور تم اُسی کے سامنے جمع کیے جاؤ گے" (آیت ۲۳-۲۴)۔ خدائی کارخانہ تمہارے سامنے ہے، پھر بھی اس کارخانے کے خالق کا انکار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔

سورۃ القلم

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "قسم ہے قلم کی اور قسم ہے ان کے لکھنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں (جیسا کہ کفار کہتے ہیں) اور آپ کے لیے بے شک (ایسا) اجر ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں (آپ کا فیض جاری رہے گا اور آخرت میں آپ کے بے حد بلند درجات ہوں گے) اور یقیناً آپ کا خُلق بہت ہی بڑا ہے۔" (آیت ۱-۴)۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے لیے اسم مبالغہ استعمال ہوا ہے۔ کسی اور پیغمبر کے لیے کسی صحیفے میں ایسا کلمۂ توصیف نظر نہیں آتا۔

پھر کافروں کے طعن و تشنیع اور شرارت کا ذکر ہے۔ اور پانچ بھائیوں کے ایک باغ کا ذکر ہے جو خیرات کرنے والے باپ سے ترکہ میں ملا تھا۔ ان بھائیوں نے سوچا کہ ہم محتاجوں کو کیوں دیں، علی الصباح ہی کیوں پھلوں کو نہ توڑ لیا جائے۔ لیکن منجھلے بھائی نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اللہ کی راہ میں خیرات کرنے پر زور دیا لیکن اُس کی ایک نہ چلی اور وہ باغ تباہ ہو گیا۔ گویا اللہ کو بھلا دینے سے نہ دنیا سدھر سکتی ہے اور نہ آخرت بن سکتی ہے منکرین کے انجام کا ذکر بھی ہے۔ انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا تو اللہ پاک کی طرف سے تسلی دی گئی ہے کہ "پس آپ صبر کے ساتھ اللہ کے حکم کا انتظار کریں اور صاحبِ حوت (یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب انہوں نے (اپنے رب کو) پکارا اور (حکم کا انتظار کیے بغیر روانہ ہو گئے) اس حال میں کہ وہ غم و غصہ میں گھٹ رہے تھے۔" (آیت ۴۸)۔ "اور کفار جب قرآن کو سنتے ہیں (تو آپ کو وہ گھورتے ہیں) یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو اپنی نظر سے پھسلا دیں گے (لیکن جب اُن کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوتی تو) اور کہتے ہیں کہ وہ تو مجنون ہے۔" اور یہ (قرآن) تو سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے (جس طرح آپ سب جہانوں کے لیے رحمت ہیں)۔" (آیت ۵۱-۵۲)

سورۃ الحاقہ

اس سورۃ میں کفار کے انجام کا ذکر ہے کہ دنیا میں بھی وہ لوگ (عاد و ثمود) تباہ ہوئے اور آخرت بھی اپنے لیے خراب کر لی۔ پھر قیامت کا منظر دکھایا گیا ہے اور دوزخ کی تکالیف کا ذکر وغیرہ ہے کہ منکرین وہاں جا کر اپنی حرکتوں پر کتنا افسوس کریں گے کہ "کاش

میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ جاتا اور مجھے خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش موت (ہمیشہ کے لئے) مجھے ختم کر گئی ہوتی۔ (افسوس) میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا۔ مجھ سے میری حکومت بھی جاتی رہی" (آیت ۲۵-۲۹)۔ پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ "پس میں قسم کھاتا ہوں اُن چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے کہ یہ قرآن، اللہ کا کلام ہے (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور ایک بزرگ لانے والے کا (یعنی جبریلؑ کا لایا ہوا)" (آیت ۳۸-۴۱)۔ کوئی یہ خیال نہ کریں کہ یہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی طرف سے کوئی بات اللہ پاک سے منسوب کر دیتے ہیں (آیت ۴۴)۔" اور بے شک یہ (قرآن) تو یقینی طور پر حق ہے۔ پس (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو اپنے رب کے نام کی تسبیح ہی کرتے رہیں جو بڑی عظمت والا ہے" (آیت ۵۱-۵۲) یعنی آپؐ کی بات کوئی سُنے یا نہ سُنے، آپ اللہ کو یاد کرتے رہیں۔

سورۃ المعارج

ایک کافر کے مطالبے کا ذکر ہے کہ اُس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ سچے ہیں تو ہم پر عذاب نازل ہو جائے۔ اللہ پاک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ "آپ (ان کے سوال سے آزردہ نہ ہوں) صبر فرمائیں صبرِ جمیل۔ وہ (دن) ان لوگوں کی نگاہ سے دور ہے اور ہماری نظر میں قریب ہے۔" (آیت ۵-۷) پھر اللہ کے نیک بندوں کا ذکر ہے کہ وہ نماز کے پابند ہیں، حق داروں کو مال دیتے ہیں۔ روزِ جزا پر یقین رکھتے ہیں، اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، خود کو بچا کے رکھتے ہیں، امانت دار اور وعدے کے سچے، اپنی سچی گواہی پر قائم رہتے ہیں اور نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔" یہی وہ لوگ ہیں جو جنّت میں عزّت سے رہیں گے (آیت ۳۵)۔ یہ سب لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہیں اور اسی اطاعت کی وجہ سے جنّتی ہیں پھر کفّار کا ذکر ہے جو مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں، آخرت میں ذلیل ہوں گے۔

سورۃ نوح

حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت دراز تک حق کی تبلیغ کی لیکن قوم تکذیب ہی کرتی رہی۔ وہ علانیہ اور چپکے چپکے بھی سمجھاتے رہے (آیت ۹) اور اللہ سے گناہ بخشوانے کے لیے ترغیب بھی دلائی (آیت ۱۰)۔ یہ بھی فرمایا کہ "وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا" (آیت ۱۱)۔" اور مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے لیے باغ (بھی) بنا دے گا اور تمہارے لیے نہریں (بھی) بہا دے گا" (آیت ۱۲)۔ غرض کہ مختلف طریقوں سے اللہ پاک کی طرف رجوع کرانے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ نہ مانے اور غرق ہوتے۔" اور نوح (علیہ السلام) نے دعا کی (تھی) اے میرے پروردگار (اب) روئے زمین پر کسی کافر کو بستا ہوا نہ چھوڑ۔ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو بہکاتے رہیں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار اور کافر ہی ہوگی" (آیت ۲۶-۲۷)۔ طوفان کے بعد دنیا ایک بار کفّار سے پاک ہو گئی اور صرف ایک مختصر جماعت مومنین کی باقی رہ گئی۔ جب ایک نبی کی بددعا سے دنیا ہلاک ہو سکتی ہے تو دنیا کو عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اور سب نبیوں کے سردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے فلاح دارین حاصل کرنا چاہیے۔

سورۃ الجنّ

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے دل شکستہ ہو کر واپس ہو رہے تھے تو مقام نخلہ میں نمازِ فجر جہر سے پڑھی۔ وہاں سے جنات کا ایک گروہ گزرا تو قرآن سُن کر حیرت میں رہ گیا اور ایمان لے آیا۔ پھر اپنے لوگوں میں جا کر اس واقعے کا ذکر کیا کہ "وہ بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ پس ہم تو اس پر ایمان لے آئے اور ہم (اب) اپنے رب کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔" (آیت ۲) ۔ اور "یہ لوگ بھی تمہاری طرح غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا۔" (آیت ۷)۔ پھر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ "اور اگر یہ لوگ سیدھی راہ پر رہتے تو ہم ان کو بافراط پانی سے سیراب کرتے تاکہ اس (فراخی) سے ہم ان کی آزمائش کریں اور جو کوئی اپنے رب کی یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کو وہ سخت عذاب میں داخل کرے گا۔" (آیت ۱۶-۱۷)۔ "اور جب اللہ کے پیارے رسول اور بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں (اور قرآن کی تلاوت کرتے ہیں) تو لوگ جوق در جوق ان پر ہجوم کرنے لگتے ہیں۔" (آیت ۱۹)۔ تو "آپ فرما دیجیے کہ میں تو اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔ آپ فرما دیجیے کہ میرے اختیار میں نہ تم کو نقصان پہنچانا ہے نہ ہدایت دینا ہے (بس اللہ کے اختیار میں ہے) اور آپ (یہ بھی) فرما دیجیے کہ مجھ کو (بھی) کوئی اللہ کے ہاتھ سے نہیں بچا سکتا (اگر وہ خفا ہو جائے) اور نہ میں اُس کے سوا کہیں پناہ پا سکتا ہوں ۔ البتہ میرا کام اللہ کی طرف سے (اُس کے احکام) اور اس کے پیغام کا پہنچا دینا ہے اور جس نے اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی تو اُس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں یہ ہمیشہ رہا کریں گے۔ (آیت ۲۰-۲۳)

سورۃ المزّمّل

"اے میرے (کملی والے) کپڑوں میں لپٹنے والے (حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ رات کے تھوڑے سے حصے میں (نماز کے لیے) قیام فرمایا کیجیے (نہ کہ رات رات بھر)۔ آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم۔ یا اس سے زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر (تجوید، معرفت و توقف، فکر و ذکر کے ساتھ جیسا کہ آپ کا معمول ہے) پڑھتے رہیے ۔ بے شک ہم آپ پر عنقریب ایک بھاری کلام (پورا قرآن) نازل کریں گے ۔ بے شک رات کا اٹھنا (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور سیدھی بات نکلتی ہے (ہر بات اس وقت سیدھی اور ٹھیک ہوتی ہے) ۔ بے شک آپ کو دن میں بہت سی مشغولیت ہے (عبادت، ریاضت، تبلیغ و تسبیح) اور آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیے اور سب کو چھوڑ کر (سب سے الگ ہو کر) اُسی کے ہو جائیے۔" (آیت ۱ - ۸)۔ راتوں کو جاگنے کا جو یہ حکم ہوا تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام بھی رات رات بھر جاگتے کہ کہیں ایک تہائی رات جاگنے کا جو حکم ہے اُس کی تعمیل سے محروم نہ رہیں۔ یہ معمول قریب ایک سال تک رہا۔ پھر اللہ پاک نے آسانی پیدا فرما دی کہ "بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگ قریب دو تہائی رات اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) ایک تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں اور اللہ ہی کو رات اور دن کا صحیح اندازہ ہے۔ (اے لوگو) وہ جانتا ہے کہ (مختلف اسباب کی بنا پر) تم لوگ اس کو نباہ نہ سکو گے۔ اس لیے تم پر مہربانی فرمائی (اور اس حکم میں تخفیف فرما دی) پس تم جتنا

آسانی سے ہوسکے قرآن پڑھ لیا کرو۔ اُس کو علم ہے کہ تم میں بعض بیمار ہوں گے اور بعض لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں ملک میں سفر بھی کریں گے اور بعض خدا کی راہ میں لڑیں گے۔ پس جتنا آسانی سے ہوسکے (قرآن) پڑھ لیا کرو اور (پنجگانہ) نماز (بہرحال) قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو اخلاص کے ساتھ قرض دیا کرو (اُس کی راہ میں خرچ کرو) اور تم جو بھی نیک عمل اپنے لیے پہلے بھیجو گے اُسے تم اللہ کے یہاں بہتر اور اجر کے لحاظ سے بڑھا ہُوا پاؤ گے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہو۔ بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"۔ اس آخری آیت میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اوصاف کے ساتھ اُن کے رفقاء کے اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔

سورۃ المدّثّر

کملی والی محبوب (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اب لحاف اوڑھنے والے (یا عالم کو درست کرنے والے) پیارے نام سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ اور امت کو آدابِ تبلیغ سکھائے جا رہے ہیں اور یہ کہ جو لوگ ضدّی منکر ہیں ان کے متعلق تردّد نہ کیا جائے۔ اُن کو دوزخ کی آگ ہی ٹھیک کرے گی۔ (اس سورۃ کی ابتدائی سات آیتیں دوسری وحی کی یادگار ہیں) "اے درست کرنے والے (عالم کے) اُٹھو۔ (گندے اعمال والوں کو) ڈراؤ اور اپنے پروردگار کی بزرگی کو پھیلاؤ اور پاک دامنی اختیار کرو (مخلوق پرستی کی) نجاست سے علیحدگی اختیار کرو۔ احسان اِس نیت سے نہ کرو کہ لوگوں سے اس کا فائدہ حاصل کیا جائے۔ اپنے پروردگار کے لیے رسالت کرتے ہوئے ہر ایک امتحان اور تکلیف میں استقلال رکھو"[1] حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو شروع ہی میں عالم کے درست کرنے والے کی حیثیت سے یاد کیا جا رہا ہے اور آن کے ذریعے مخلوق پرستی کی نجاست سے اہلِ عالم کو پرہیز کرایا جا رہا ہے۔ ان آیات میں لطیف اشارہ قرآن پاک کی بے مثل فصاحت و بلاغت سے متعلق ہے یعنی ان آیات میں سے فکبّر ربّک بھی ہے جس میں مقلوبِ مستوی ہے یعنی حروف کا سلسلہ شروع سے وہی ہے جو آخر سے بھی ہے۔ جس طرح کلّ فی فلک وغیرہ آیتوں میں بھی آ تا ہے۔

آیت ۱۱، ولید بن مغیرہ کے سلسلے میں نازل ہوئی تھی جو اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور دنیوی جاہ و ثروت میں "وحید" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اُس نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اور اُن کے قرآن کی مخالفت کی تو دنیا کی بھی ہر چیز کھو دی اور آخرت اس سے بھی زیادہ خراب کرلی۔ دوزخ کی کیفیات بھی بتائی گئی ہیں جن سے ان سب منکرین کو گزرنا ہوگا۔ آخر میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی تسلّی دی گئی ہے کہ "اور (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) وہ لوگ نصیحت تو اسی وقت قبول کریں گے جب خدا چاہے گا (اور جب تک کوئی ہدایت نہیں چاہتا اللہ بھی اسے ہدایت کی توفیق نہیں دیتا) اُسی سے ڈرنا چاہیے اور وہی بخشنے والا ہے"۔ (آیت ۵۵ - ۵۶)

سورۃ القیٰمہ

اس سورۃ میں قیامت کا ذکر ہے جب کہ موجودہ نظام درہم برہم ہوکر ایک نیا نظام قائم ہوگا۔ شروع کی پندرہ آیتیں اسی سلسلے کی ہیں۔

---

[1] یہ ترجمہ مولانا محمد سلیمان منصور پوری نے کیا ہے۔ رحمۃ للعالمین۔ جلد اوّل "بعثت و نبوت"۔

پھر یہ ذکر ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی تو آپ اُسے جلدی جلدی یاد کرنے لگتے۔ اللہ پاک نے فرمایا کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ اسے جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے (نزولِ وحی کے ساتھ) اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو (آپ کے سینۂ مبارک میں) جمع کر دینا اور اس کو (اسی طرح آپ کی زبان سے) پڑھوانا (جیسا کہ لوحِ محفوظ میں ہے) ہمارا ذمہ ہے[1] پس جب ہم پڑھا کریں (یعنی جب وحی نازل ہو) تو آپ (اس کو سنا کریں اور) اس کو اسی طرح پڑھا کریں (یہاں اللہ پاک نے جبرئیل علیہ السلام کی وحی سُنانے کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے) پھر بلاشُبہ اُس کو کھول کر بیان کر دینا (یعنی آپ کے ذریعے بیان کرنا) ہمارے ہی ذمے ہے۔" (آیت ۱۶-۱۹) پھر انسان کی تخلیق، اس کی حقیقت اور اللہ پاک کی قدرت کا ذکر ہے۔

سورۃ الدھر

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا" (اُس کا نام و نشان بھی نہ تھا)۔ پانچویں آیت میں نیکو کاروں کا ذکر ہے کہ "البتہ نیکو کار ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (خاص) بندے پئیں گے (اور دوسروں کو بھی پلائیں گے اور اپنی نظرِ التفات سے) جہاں چاہیں گے اُسے بہا کر لے جائیں گے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کا ذکر ہے کہ اُن کے درجات کس طرح بلند ہوں گے)" (آیت ۵، ۶)۔ یہ ابرار کون لوگ ہیں؟ - جو "اپنی منتوں کو پورا کرتے ہیں (یعنی عبادات کے علاوہ جو چیز اللہ کے لیے اپنے اوپر واجب کر لی ہے وہ بھی پورا کرتے ہیں) اور اس (قیامت کے) دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت پھیل پڑے گی۔ اور جو مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تین روٹیاں پکائیں اور ایک ایک روٹی ایک مسکین، یتیم اور قیدی کو دے دی اور پورا خاندان بھوکا رہا[2])۔ (ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ) ہم تم کو محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم تو اپنے پروردگار سے اُس دن سے ڈرتے ہیں جو نہایت اداس کرنے والا اور سخت ہوگا۔ پھر اللہ ان کو اس دن کے شر سے بچا لے گا اور اُن کو شگفتگی اور سرور عطا فرمائے گا اور ان کے صبر کے بدلے ان کو جنت اور ریشمی لباس عطا ہوگا . . . . ." (آیت ۷-۱۲)۔ پھر جنت کی مزید راحتوں کا ذکر ہے۔ ان راحتوں کے ذکر کے بعد پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلّی دی ہے اور کفّارِ مکّہ سے اعراض کا حکم ہے (آیت ۲۴) جن کے لئے عذابِ الیم کی وعید ہے ——

سورۃ المرسلٰت

اس سورۃ میں زیادہ تر مکذبین اور منکرین سے خطاب ہے جن کیلئے سخت عذاب ہے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کے لیے

---

[1] پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم خاموشی سے بڑی بڑی آیتیں بلکہ سورتیں سن لیتے تھے اور جبرئیل علیہ السلام کے سامنے دُہرا دیتے تھے۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں کو اللہ پاک نے پاک کیا ہے وہی قرآن کو حفظ کر لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ حفظ نہیں کر سکتے۔

[2] یوں بھی مروی ہے کہ یہ واقعہ تین دن مسلسل ہوتا رہا۔ (ادارہ)

راحت ہی راحت ہے۔" بے شک متقین (حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے متبعین) اُس (کی رحمت) کے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے اور (وہ) اُن میووں میں ہوں گے جو وہ پسند کریں (اُن سے کہا جائے گا کہ) اب مزے سے کھاؤ پیو اُن اعمال کے صلے میں جو تم کیا کرتے تھے (اور) ہم نیکو کاروں کو یوں ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔" (آیت ۴۱-۴۴) آخر میں کافروں سے کہا گیا ہے کہ اِس قرآن (اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلّم) کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟ قرآن اور عملی قرآن (حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم) سے اگر کسی کو ہدایت نہ ملی تو پھر کس سے مل سکے گی؟

<u>اب تیسواں پارہ شروع ہوتا ہے</u>

سورۃ النّبا

جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے تبلیغ شروع کی تو کفارِ مکہ نے توحید، رسالت، نزولِ وحی وغیرہ سب پر اعتراض کیا۔ چنانچہ اس سورۃ میں ان موضوعات اور خصوصیت کے ساتھ قیامت کا ذکر ہے جب کہ اعمال کا محاسبہ اور جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا ——— حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے تبلیغ ہے کہ زمین کو فرش، پہاڑوں کو اوتاد، انسان کو جوڑے، نیند کو راحت، دن کو معاش کا ذریعہ، سات آسمان، سورج، موسلادھار بارش، اناج، میوہ، گھنے باغ وغیرہ سب کو بنایا تاکہ انسان ان کے ذریعے اللہ پاک کو پہچانے، دوزخ سے ڈرے اور جنّت کا امیدوار بنے۔ قیامت کے دن سب لوگ اور فرشتے صف بستہ اور نفس گم کردہ کھڑے ہوں گے۔ "یہ دن حق ہے۔ پس جو چاہے اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنا لے (یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہدایت سے یہ قرب حاصل کرے)" (آیت ۳۹) ۔" بلا شبہ ہم نے تم کو عنقریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا۔ اس دن ہر شخص ان (اعمال) کو جو اُس نے آگے بھیجے ہیں دیکھ لے گا اور کافر کہے گا اے کاش میں مٹی ہو جاتا (کہ اس عذاب سے بچ جاتا)۔

سورۃ النّزعٰت

اس سورۃ میں بھی قیامت کے آنے کا ذکر ہے اور سب روحیں اپنے جسموں میں داخل ہو جائیں گی اور" پھر وہ فوراً میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے ـــ پھر موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ یاد دلا کر انسان کو عبرت کا سبق سمجھایا گیا ہے ـــ پھر تخلیقِ کائنات کی طرف متوجہ کرکے رجوع الی اللہ کا سبق بھی دیا ہے ـــ (اور جن لوگوں کو اسے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم آپ کے فرانے پر یقین نہیں وہ کیا نصیحت حاصل کریں گے۔ البتہ) "جس دن اس (قیامت) کو دیکھ لیں گے (اُن کو) ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دنیا میں) صرف ایک شام یا صبح ہی رہے تھے۔" (آیت ۴۶)

سورۃ عَبَس

مکہ معظمہ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم وہاں کے چند قریش سرداروں کو جن میں ابوجہل بھی شامل تھا، دعوتِ اسلام دے رہے تھے

کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم جو نابینا تھے تشریف لائے اور قطع کلام کر کے خود بھی آپ کی تعلیم معلوم کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ناگوار ہوا تو اللہ پاک نے محبّت آمیز خفگی سے جس پہ ہزاروں پیار نثار ہوتے ہیں اس واقعے کو اس سورۃ میں بیان فرمایا کہ" (میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بجبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (جب) کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ کو کیا معلوم، شاید وہ سنور ہی جاتا۔ یا وہ غور کرتا تو (آپ کا) سمجھانا اُس کے کام آتا۔ لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا تو آپ اس کی فکر میں ہیں (آپ چاہتے ہیں کہ وہ بھی ایمان لے آئے اور سب لوگ مسلمان ہو جائیں)، حالانکہ اگر وہ درست نہیں ہوتا تو آپ پر اس کا کچھ الزام نہیں" (آیت ۱-۷)

پھر قرآن کی شان بیان ہوتی ہے، انسان کی پیدائش اور موت کا ذکر ہے، اور سامان بقا بھی مذکور ہیں۔ اور آخر میں پھر قیامت کا منظر سمجھایا گیا ہے۔

سورۃ التکویر

اس سورۃ میں بتایا جا رہا ہے کہ مرنے کے بعد یہ دنیا چھوٹ جاتی ہے اور آخرت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب کہ نتائج عمل کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ "تو ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے" (آیت ۱۴) اور "بے شک یہ (قرآن یا عزّت فرشتہ کی زبانی پیغام) ہے جو بڑی قوت والا، صاحب عرش کے پاس بڑے مرتبہ والا ہے۔ سردار پھر امین بھی" (آیت ۱۹-۲۱)۔ "اور تمھارے صاحب کوئی مجنون نہیں اور بے شک انھوں نے اُس کو افقِ منوّر پہ دیکھا ہے اور وہ غیب کی بات بتانے میں ذرا بخل نہیں کرتے" (آیت ۲۲-۲۴)۔

سورۃ الانفطار

اس سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے اور ڈرایا جا رہا ہے کہ کراماً کاتبین (آیت ۱۱) بھی تمھارے اعمال لکھنے میں مصروف ہیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے جو غلام ہیں" بلاشبہ وہ نیک لوگ بہشت میں ہوں گے" (آیت ۱۳) اس سورۃ میں عقائد کی بنا پر سزا و جزا کا ذکر ہے اور آئندہ سورۃ میں معاشرتی زندگی کی اہمیت اور اس سے پیدا شدہ نتائج اور انجام کا ذکر ہے۔

سورۃ المطفّفین

"خرابی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لیے۔ جب لوگوں سے وہ ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیا کرتے ہیں تو اُن کو نقصان میں ڈال دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ خیال نہیں کرتے کہ ان کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے" (آیت ۱-۴)۔ پھر سزا اور جزا والوں کا ذکر آتا ہے۔

سورۃ الانشقاق

اس سورۃ میں بھی آخرت کا مضمون جاری ہے "پس جس کو اس کا نامۂ اعمال اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اُس سے حساب

آسانی سے لیا جائے گا اور یہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش واپس آئے گا (خود بھی خوش ہوگا اور اُس کے گھر والے بھی خوش ہوں گے) اور جس کو اس کا نامۂ اعمال، پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارے گا (لیکن وہ نہ آئے گی) اور وہ دوزخ میں پڑے گا" (آیت ۷ - ۱۲)۔ آخر میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں اور حضورؐ کی پیروی میں عمل کرنے والوں کے لیے اجرِ لامتناہی کا ذکر ہے۔

سورۃ البروج

عیسٰی علیہ السلام کے سچے اُمتیوں کو جلا دینے کے لیے ایک یہودی بادشاہ نے آگ کی خندق کھودی تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں کو بھی آگ پر لوٹنا پڑا لیکن اَحد اَحد کی آواز آخر دم تک ان کے لبوں پر رہی۔ "بلاشبہ جن لوگوں نے مسلمان مرد اور عورتوں کو اذیت پہنچائی، پھر توبہ نہ کی تو اُن کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور اُن کے لیے جلنے کا عذاب (بھی) (آیت ۱۰)۔ اذیت پہنچانے والوں کے لیے پھر بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ نافرمانوں (فرعون اور ثمود وغیرہ) کے لیے بھاگنے کی جگہ نہیں ہے" اور اللہ اُن کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے" (آیت ۲۰) "دراصل یہ قرآن (جو آپ پر نازل ہوا ہے) بڑی عظمت والا ہے اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے" (آیت ۲۱ - ۲۲)۔

سورۃ الطّارق

طارق کا مطلب ستارہ بھی ہے اور آسمان پر پہنچنے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ انسان کو اُس کی بے مایہ حقیقت سے پھر خبردار کیا گیا ہے اور "بے شک یہ (قرآن) ایک فیصلہ کُن کلام ہے اور یہ کوئی مذاق کی چیز نہیں (جو اسے چھپانا چاہتے ہیں) وہ لوگ اپنی اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور میں بھی تدبیر کر رہا ہوں۔ اب (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کافروں کو آپ (تھوڑی اور) مہلت دیجیے بس کچھ دنوں اور چھوڑ دیجیے" (پھر اللہ خود ہی اُن کو دیکھے گا) ۔ (آیت ۱۳ - ۱۷)

سورۃ الاعلیٰ

گزشتہ سورۃ میں قرآن کے قولِ فیصل ہونے کا ذکر تھا۔ اب اللہ پاک اپنی شانِ کبریائی بیان کرتا ہے۔" (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے پروردگار کے نام کی پاکیزگی بیان کیجیے جو بہت اعلیٰ ہے۔ جس نے (ہر شے کو عین حکمت کے مطابق) پیدا کیا پھر (اس کو موزونیت اور تناسب کے ساتھ) درست کیا ....." (آیت ۱-۲)۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب ہے کہ "عنقریب ہم آپ کو پڑھا دیں گے۔ پھر آپ (اسے) نہ بھولیں گے" (آیت ۶)۔ "پس آپ نصیحت کرتے رہیے جہاں تک نصیحت کارگر ہو۔ (البتہ) جس کو خوفِ خدا ہوگا وہی نصیحت کو قبول کرے گا اور اس سے وہی بدنصیب دور رہے گا جو (بالآخر دوزخ کی) بڑی آگ میں پڑے گا، پھر وہاں نہ وہ مرے گا، نہ جیے گا" (آیت ۹ - ۱۳)۔ پھر قلب کو پاک کرنا، اُس کو اللہ کی یاد سے معمور کرنا، اللہ کے آگے جھکنا، اور اُس کی کبریائی

کو بیان کرنا وغیرہ احکام ہیں جو صحفِ سابقین میں بھی مذکور تھے۔ (آیت ۱۴-۱۹)۔

سورۃ الغاشیہ

گذشتہ سورۃ میں اللہ کی حمد و ثنا اور شریعتِ محمدیؐ کی پیروی کا ذکر تھا جس کی بنیاد وہی ہے جو صحفِ سابقین کی تعلیمات کی بنیاد رہی ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ خود انسانی زندگی کے لیے شریعت ہر طرح مفید ہے۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ اُس کو کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور وہ کیسی گھڑی ہوگی۔ دوزخیوں اور جنتیوں کے انجام کا ذکر ہے۔ پھر اونٹ جیسے جانور کو دیکھو کہ ایک بچّہ نکیل پکڑ لیتا ہے تو وہ اسی کی اتباع کرنے لگتا ہے۔ آسمان، زمین، پہاڑ وغیرہ سب کے سب اللہ پاک کی قدرت کا سبق دیتے ہیں۔" پس (اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ تو ان کو سمجھاتے ہی رہیے۔ آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو زبردستی منوانے والے تو نہیں ہیں (آپ مختار نہیں ہیں)۔ مگر جس نے (آپ کی اطاعت سے) روگردانی کی اور انکار کیا تو اللہ اُس کو سخت عذاب دے گا۔ بلاشبہ ان (کافروں) کو ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہوگا۔ پھر یقیناً ہمارے ہی ذمے اُن کا حساب لینا ہوگا۔" (آیت ۲۱-۲۶)

سورۃ الفجر

اس سورۃ میں مختلف فطرتوں کی قسم کھائی گئی ہے اُن حقائق کو واضح کرنے کے لیے جو مختلف لوگوں کے لیے مقدّر ہیں۔ پہلے مُنکروں کا بیان ہے جن کو اللہ سے دوری ہے، پھر وہ لوگ جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہو گیا ہے اُن کی جزا کا ذکر ہے۔ اُن کو حکم ہوگا کہ" اے وہ نفس جس نے اطمینان حاصل کر لیا، تو اپنے رب کی طرف رجوع کر اس طرح کہ تو اُس سے راضی، وہ تجھ سے راضی، پھر تو ہمارے (برگزیدہ) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشتِ نعیم میں داخل ہو جا۔" (آیت ۲۷-۳۰)

سورۃ البلد

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مکّہ اور آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کی شہادت دے کر بتایا گیا ہے کہ "بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں (زندگی بسر کرنے کے لیے) پیدا کیا ہے۔ ہر عمل کا دیکھنے والا اللہ پاک ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کی دشمنی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت پر اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے تو اُسے اُس کا انجام دیکھنا ہوگا۔" پھر وہ (خیر کی) گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا اور آپ سمجھے کہ (یہ) گھاٹی کیا ہے (یعنی) کسی گردن کا چھڑانا، یا بھوک (قحط) کے دن کھانا کھلانا، یتیم کو جو قرابت دار ہے یا مسکین کو جو خاک نشین ہے۔ (لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نیکی کرنے والا صاحبِ ایمان ہو یعنی)۔ پھر وہ ایمان والوں میں سے ہو اور (ایسے لوگوں کی خوبی یہ ہے کہ) وہ ایک دوسرے کو صبر کی اور رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ اصحابِ یمین ہیں اور جو ہماری آیتوں سے منکر ہوئے وہی بائیں ہاتھ والے ہیں (بدنصیب ہیں) یہ لوگ آگ میں بند کر دیے جائیں گے۔" (آیت ۱۱-۲۰)۔

سورۃ الشمس

اس سورۃ میں اللہ پاک نے سورج، چاند، دن، رات، آسمان، زمین اور خود انسان کی شہادت سے متوجہ فرمایا ہے کہ یہ ادر کائنات کی تمام چیزیں جو اللہ پاک کے انعامات ہیں انسان کی فلاح کے لیے ہیں۔ اور انسان کے اندر فسق و فجور اور تقویٰ کی بھی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اب اُسے سمجھنا ہے کہ اپنی زندگی کو کس رُخ پر لے جائے۔ قوم ثمود اور صالح علیہ السلام کا واقعہ بھی بتایا ہے کہ اس قوم نے اپنے پیغمبر کو جھٹلایا تو وہ تباہ ہوئی۔ اب بھی اگر اپنی زندگی کو تقویٰ (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی) پر چلایا جائے گا تو فلاح حاصل ہوگی ورنہ تباہی ہوگی۔

سورۃ الیل

اس سورۃ میں بھی اللہ پاک نے رات، دن اور نسلوں کو گواہ کر کے فرمایا ہے کہ انسان خوب سمجھ لے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اشقیٰ یعنی اُمیہ بن خلف نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر اُن کو گرم زمین پر ڈال کر اُن کے سینے پر تپتے ہوئے پتھر رکھے اور اتقیٰ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سختیوں کو دیکھ کر حضرت بلالؓ کو بہت گراں قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ اشقیٰ کا انجام جہنم ہے اور اتقیٰ کی جزا جنت الفردوس ہے جو صرف اللہ کی رضا چاہتے تھے۔ اور یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے تھے۔

سورۃ الضحیٰ

چند روز وحی نازل نہ ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بے قرار ہوئے اور کفار کو طعن کا موقع ملا کہ گویا اب وحی منقطع ہوگئی ہے۔ اللہ پاک کی رحمت کو جوش آیا اور فرمایا کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) قسم ہے دن چڑھے کی (یعنی حضورؐ کے عروج کی) اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے (یعنی اُس حجابِ ذات کی جو نورِ ظہور پر چھایا ہوا تھا) نہ آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے ناراض ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی آخرت اس پہلی سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کو آپ کا رب وہ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے (آپ کی رضا اللہ کو منظور ہے)" (آیت ۱-۵)۔ پھر اللہ پاک طرح طرح سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی کرتا ہے اور بڑی پیاری پیاری باتوں کو یاد دلاتا ہے "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہ پایا۔ پھر جگہ دی اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی (سُکر سے صحو کی طرف لایا) اور آپ کو حاجتمند پایا (طلبِ صادق آپ ہی میں پائی تو عطائے خاص سے نوازا) پھر سب سے بے پروا کر دیا۔ (پس آپ کا سہارا آپ کا رب ہے اور سارے جہان کا سہارا آپ ہیں۔ اس لیے ہر یتیم اور ہر سائل کو آپ کی ضرورت ہے)۔ پس جو یتیم ہو اُس پر دباؤ نہ ڈالو (اہلِ جاہلیت کا شیوہ تھا کہ یتیموں پر بہت دباؤ ڈالتے تھے) اور جو مانگنے آئے (اگر نہ دے سکو) تو اس کو مت جھڑکو۔ اور آپ کے پروردگار نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اُس کا بیان کرتے رہیے۔" (آیت ۶-۱۱)۔

سورۃ الانشراح

یہ سورۃ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔

"کیا ہم نے آپ کا سینہ کشادہ نہ کیا (ہدایت و معرفت اور ہر عظمت و نبوت کے لیے کہ عالمِ غیب و شہادت نے اس کی وسعت میں سما گئے۔ ظاہری شرح صدر بھی بار بار ہوا۔ ابتدائی عمر میں، نزولِ وحی کے پہلے موقع پر اور شبِ معراج میں) اور (ہر وہ چیز جو آپ کے قلبِ مبارک پر احساسِ ذمہ داری کے باعث بوجھ بنی ہوئی تھی، انشراحِ صدر سے) ہم نے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جو آپ کی پیٹھ کو توڑے ڈالتا تھا اور (اسی لیے) ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا (کلمہ، اذان، خطبہ، نماز، دعا، درود و سلام وغیرہ ہر جگہ اللہ کے ساتھ رسولؐ کا نام بھی ہے) پس بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ مکی زندگی میں بھی اور مدنی زندگی میں بھی بیشک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے پس (آپ اپنا معمول جاری رکھیں) جب آپ کو (فرائضِ نبوت سے ذرا) فراغت ملے تو آپ ریاضت میں لگ جایئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جایئے۔" (آیت ۱-۸)

سورۃ التّین

"تین (انجیر) کی قسم اور زیتون (کی قسم) اور طورِ سینا (کی قسم) اور (میرے پیارے امین صلی اللہ علیہ وسلم کے) امن والے شہر کی قسم، بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین تناسب پر بنایا ہے پھر ہم نے اُسے پست ترین حالت میں ڈال دیا۔" (آیت ۱-۵) تین (انجیر) اور زیتون کے ساتھ طورِ سینا اور شہرِ امینؐ کا ذکر غالباً اس لیے ہے کہ تین (انجیر) اور زیتون کے استعمال سے جسمانی صحت لیکن مقامِ موسویؑ اور مقامِ محمدیؐ سے روحانی صحت ایک انسان کو حاصل ہو جائے تو وہ صحیح معنی میں احسن التقویم پہ پہنچ سکتا ہے۔ ورنہ اسفل سافلین میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اس اسفل سافلین والے زوال سے پھر بھی وہ بچ سکتا ہے اگر ایمان اور عملِ صالح (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی) کرے جس کا اجر کبھی کم نہ ہوگا۔ پھر بھی کوئی دین (یا آخرت) کی عظمت کو نہ سمجھے تو افسوس ہے۔ کیا اللہ احکم الحاکمین نہیں ؟ — یعنی اُس کے حکم سے کیا نہیں ہو سکتا!

سورۃ العلق

شروع کی پانچ آیتیں (مالم یعلم تک) سب سے پہلی وحی ہے جو غارِ حرا میں نازل ہوئی۔ "(اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پڑھیے اپنے رب کے نام کے ساتھ (اسی لیے قرأت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے) جس نے (سب کو) پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے اور آپ کا رب بڑی عظمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے (عام لوگوں کو) قلم سے علم سکھایا — اُسی نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا۔" (آیت ۱-۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست اللہ پاک کی طرف سے پڑھایا جا رہا ہے اور اُن کے ذریعے انسان کو وہ سب کچھ دیا جا رہا ہے جو وہ نہ جانتا تھا۔ آیت ۹، ۱۰ (اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی) ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی تھی کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے روکتا تھا۔ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ارادہ فاسدہ سے

آیا تو اُلٹے پاؤں بھاگا۔ کہنے لگا کہ میرے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان ایک خندق ہے جس میں آگ بھری ہوئی ہے اور دہشت ناک پرندے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک نے ابوجہل کو پھر ذلیل کر دیا۔

سورۃ القدر

لوحِ محفوظ سے پورا قرآن، شبِ قدر میں آسمانِ دنیا پر نازل ہوا اور پھر ۲۳ سال میں حسبِ ضرورت تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ شبِ قدر آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہوتی ہے (یہ بھی مسلمانوں کے لیے ایک آسانی پیدا فرمادی ہے تاکہ وہ ان طاق راتوں میں سے کسی بھی رات میں شب بیداری کر کے مستفیض ہو سکیں عموماً ۲۶ ؍ رمضان کی شب کو شبِ قدر کہا گیا ہے۔ اسی لیے سورۃ القدر سے پہلے پورا قرآن بیس بیس رکعاتِ تراویح کے ساتھ ستائیسویں شب میں ۲۰ × ۲۷ یعنی ۵۴۰ رکوعات میں پورا ہوتا ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر میں ۹ حروف ہیں اور یہ لفظ اس سورۃ میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے اس لیے ۹ × ۳ = ستائیسویں شب کا اشارہ ملتا ہے) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے امم سابقہ کے ایک شخص کا ذکر فرمایا جو تمام رات عبادت کرتا تھا اور تمام دن جہاد میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اُس نے ہزار مہینے گزارے تھے۔ مسلمانوں کو اس سے تعجب اور رشک ہوا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں یہ شبِ قدر ہزار مہینوں کی متواتر عبادت اور نیکی سے بھی زیادہ بہتر قرار دی گئی (آیت ۳)۔ پھر یہ بھی فضیلت دی کہ اس رات جو طلوعِ فجر تک ہے، جبرئیل علیہ السلام اور فرشتے امرِ خیر کے لیے آتے رہتے ہیں۔

سورۃ البیّنہ

"اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اور مشرکین (کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس ایک روشن دلیل نہ آتی (یعنی) اللہ کا ایک رسولؐ جو انھیں (قرآن کے) پاک اوراق پڑھ کر سنائے جس میں وہ احکام درج ہیں جو دین کو قائم رکھنے والے ہیں۔" (آیت ۱ - ۳) لیکن ان اہلِ کتاب نے پھر بھی اختلاف کیا حالانکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دلیلِ حق لا چکے ہیں۔ یعنی قرآن پاک میں بھی (کتبِ سابقہ کی طرح) اللہ کی بندگی، نماز اور زکوٰۃ کی تعلیم ہے۔ بہرحال ان منکرین کے لیے ابدی جہنم اور ایمان عملِ صالح والوں کے لیے ابدی جنت ہے۔ (قرآن ایمان سکھاتا ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم، عملِ صالح سکھاتے ہیں)

سورۃ الزّلزال

اس سورۃ میں قیامت کے ہولناک زلزلہ کا ذکر ہے جبکہ زمین کی دبی ہوئی چیزیں (آیت ۲) باہر آ جائیں گی اور انسان اپنے چھوٹے بڑے اعمال کے نتائج دیکھ لے گا۔ ("عملِ خیر"، عاملِ خیر ہی سے سیکھا ہوا ہی کام آئے گا)

سورۃ العٰدیٰت

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کا مضمون ایک نرالے انداز میں پیش کیا ہے اور سرفروشانِ راہِ حق کی قسم کھائی ہے کہ

انھوں نے اپنی جاں نثاری اور وفاداری سے فتح و نصرت حاصل کی - ایک گھوڑا اپنے آقا کا اس قدر وفادار لیکن ایک انسان اپنے خالق اور اپنے آقا (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) کا بالکل نافرمان ہے "کیا وہ نہیں جانتا اس وقت کو جب قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے اور سینوں کے سب راز ظاہر کر دیے جائیں گے بے شک اس دن ان کا رب ان کی حالت سے خوب خبردار ہو گا" (آیت ۹-۱۱)

سورۃ القارعہ

اس سورۃ میں بھی قیامت کا ذکر ہے جبکہ دلوں کو ہلا دینے والی آواز سنائی دے گی "جس دن لوگ پریشان پروانوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دُھنکی ہوئی رنگ برنگی اون کی طرح ہو جائیں گے" (آیت ۴-۵) جن لوگوں کے عمل کا پلہ بھاری ہو گا وہی فلاح پائیں گے - ورنہ سخت عذاب ہے ——

سورۃ التکاثر

"اے لوگو تم کو کثرتِ مال کی طلب نے غفلت میں ڈال دیا یہاں تک کہ تم (اپنی) قبروں میں جا پہنچے - (تم سمجھتے ہو کہ مال و دولت کی فراوانی کام آتی ہے) ہرگز نہیں - تم عنقریب جان لو گے" (آیت ۱-۳)

"کاش تم (اس حقیقت کا) یقینی علم رکھتے (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو صحیح سمجھتے اور دنیا کے کُتے نہ بنتے) - تم (اس حرصِ دنیا کو) دوزخ (کی صورت میں) دیکھ کر رہو گے . . .

سورۃ العصر

قسم ہے زمانے کی (زمانے کی تاریخ یعنی مختلف اقوام کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ) بے شک انسان خسارے میں ہے - سوائے اُن کے جو (اللہ پر) ایمان لائے اور عملِ صالح کیے (پیغمبرِ وقت کے عمل کو اپنایا) اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کی (اجتماعی زندگی بھی درست کی) - اس سورۃ میں انفرادی زندگی کے لیے (۱) ایمان اور (۲) عملِ صالح (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی پیروی) دو چیزیں فلاح کی بتائی گئی ہیں اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی دو چیزیں (حق اور صبر) بتائی ہیں - جو انسان اور انسانوں کی فلاح کے لیے بالکل کافی ہیں -

سورۃ الھمزہ

اہلِ ایمان پر طعن و تشنیع کرنا ہر زمانے کے منکرین کا شیوہ رہا ہے - یہ وہ حریص اور خسیس و متکبر ہے "جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے (اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا) وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ ہمیشہ رہے گا - ہرگز نہیں - وہ یقیناً حطمہ (آگ) میں ڈال دیا جائے گا" (آیت ۲-۴) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے تھے اُن کا مذاق اڑاتے

والے کے لیے یہ وعید ہے۔

سورۃ الفیل

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند روز قبل کا واقعہ ہے کہ یمن کے حاکم ابرہہ نے ایک کلیسا بنایا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ لوگ وہاں جمع ہوں لیکن عربوں نے پسند نہیں کیا تو اس نے ہاتھیوں کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کر دیا۔ عبدالمطلب اس وقت کعبہ کے متولی تھے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ اپنا بچاؤ کر لو۔ کعبہ جس کا ہے وہ خود اسے بچالے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور اللہ پاک نے حملہ آور کی تمام تدابیر کو ناکام بنا دیا۔" اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان پر سنگ گل (بجری۔ کنکر کی پتھریاں) پھینکتے تھے۔" (آیت ۳-۴)۔

سورۃ قریش

اللہ پاک نے قریش کو خطاب کر کے اہل مکہ کو خطاب کیا ہے کہ "چونکہ قریش میں ایک میلان پیدا کر دیا۔ ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر کا میلان دیا (جاڑے میں یمن اور گرمی میں شام کو جانے۔ روزی اور فراغت حاصل ہوتی) پس ان کو چاہیے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک (جس نے وہ روزی اور فراغت دی اس) کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے امن عطا فرمایا۔" (آیت ۱-۴)

سورۃ الماعون

یتیم کو دھکے دینا، محتاج کو اللہ کی راہ میں نہ کھلانا، محض دکھاوے کے لیے نماز پڑھنا، معمولی برتنے کی چیز بھی مانگنے پر نہ دینا صحیح ایمان والوں کی نشانی نہیں ہے۔ سراپا اخلاق، معلم آفاق صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا یہ شیوہ نہیں۔

سورۃ الکوثر

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسم کا انتقال ہوا تو کفار بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب وہ منقطع النسل ہیں۔ اللہ پاک نے اس سورۃ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا تو کیا آخرت میں کوثر (خیر کثیر اور حوض کوثر) بھی عطا کر دیا۔ اسلام میں عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کسی صحابی کو عطا کر دی۔ بعد میں خیال آیا کہ وہ میرے ہاتھ میں رواں تھی۔ اگر اس کو واپس لے لوں اور اس کے بدلے میں اس سے زیادہ قیمتی تلوار ان صحابی کو دے دوں تو کیا مناسب ہوگا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔ چنانچہ حوض کوثر، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا گیا۔ اب وہ واپس نہیں لیا جائے گا اور وہ جس کو چاہیں بلائیں گے۔ انہیں پورا اختیار ہے۔" یقیناً ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دیا ہے۔ پس آپ اپنے رب کے لیے نماز (شکرانہ) پڑھیے اور قربانی دیجئے۔ بیشک جو آپ کو کوثر عطا کر دیا ہے پس آپ اپنے رب کے لیے نماز (شکرانہ)

پڑ ہیے اور قربانی دیجیے۔ بے شک جو آپ کا دشمن ہوا وہی لاولد ہو کر رہا۔" حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولادِ معنوی سب سے زیادہ ہوئی اور ہوتی رہے گی۔

سورۃ الکٰفرون

اس سورۃ میں کفار سے دو ٹوک بات ہے کہ تمھارا معبود اور تمھارا دین ہمارے معبود اور ہمارے دین سے بالکل جُدا ہے۔ اس لیے ہماری تمھاری اس معاملے میں کوئی مناسبت نہیں۔

سورۃ النصر

"جب اللہ کی مدد آ پہنچے اور فتح نصیب ہو اور آپ، لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لیں تو (اُس وقت) آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ (اُس کی) پاکی بیان کیجیے اور (امت کے لیے) مغفرت طلب کیجیے۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔" جب یہ سورۃ نازل ہوئی اور مکہ فتح ہُوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ دھاڑیں مار کر رونے لگے کہ شاید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جُدائی کا وقت قریب ہے۔ فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع میں وہ مشہور آیت (الیوم اکملت لکم دینکم ....) نازل ہوئی اور اس کے اسّی دن بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی۔

سورۃ اللھب

ابولہب اور اُس کی بیوی دونوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے تھے۔" ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے (وہ خود تباہ ہُوا) اور وہ خود ٹوٹ کر رہ گیا۔ اس کا مال اور اُس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی۔ عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا اور اُس کی بیوی بھی جو لکڑیوں کا بوجھ سر پہ لیے پھرتی ہے۔ اُس کے گلے میں مونجھ کی رسّی ہے۔" (ابولہب کی بیوی کا بیان نفرت سے کیا گیا ہے)۔

سورۃ الاخلاص

تمام مشرکین، کافرین اور منافقین کے رَد میں یہ سورۃ بہت بڑا (جامع و مانع) اعلان ہے۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو معبود ٹھہراتے، اور اس کے پیغمبروں کو اس کا بیٹا بتاتے اور دینِ حق کو چھپاتے، اُن سب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے کہ "(اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجیے کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اُس کے کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔"

سورۃ الفلق ۔ سورۃ الناس

سورۃ الفلق میں اللہ اپنے بندوں کو (حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے غلاموں کو) ظاہری شر سے بچنے کی اور سورۃ الناس میں

باطنی وسوسوں اور نفس کی برائیوں سے بچنے کی دعائیں سکھاتا ہے کیونکہ محافظت کرنے والا اور پناہ دینے والا وہی ہے ۔

" آپ فرما دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے پروردگار کی ہر اس شے کے شر سے جو اس نے پیدا کیا اور ظلمت کے شر سے جب وہ چھا جائے اور (پناہ مانگتا ہوں) ان کے شر سے جو گرہوں پر (پڑھ پڑھ کر) پھونکتی ہیں اور (میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے "

ـــــ اور ـــــ

" آپ فرما دیجیے کہ میں پناہ لیتا ہوں تمام لوگوں کے رب کی ۔ تمام لوگوں کے بادشاہ کی ۔ تمام لوگوں کے معبود کی ۔ (کس سے؟) اس (شیطان) کے شر سے جو بہکاتا ہے (اور اللہ کا نام سنتے ہی) چھپ جاتا ہے ۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے ۔ خواہ وہ جنات میں سے (ہو) یا (بھول میں پڑے ہوئے) انسانوں میں سے " ـــــ

الحمد للہ رب العلمین ۔ الرحمٰن الرحیم ۔ مالک یوم الدین ۔

یہ قرآن کس نے بھیجا؟ کس کو وسیلہ بنایا گیا؟ کس کے لیے بھیجا گیا؟ کیا پوری کائنات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور ہستی اس تبلیغ اور اس تبلیغ کی اہل ہے؟

هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِيْ تُرْجٰى شَفَاعَتُهٗ ۔۔۔ لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحِمِ

دَعَا اِلَى اللّٰهِ فَالْمُسْتَمْسِكُوْنَ بِهٖ ۔۔۔ مُسْتَمْسِكُوْنَ بِحَبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمِ

دو عالم روز و شب در گفتگویش
ہمہ قرآں در شانِ محمدؐ

(جامیؒ)

نبوتِ محمدیؐ پر قرآن میں استدلال

(چند اہم نکات)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قرآن کہتا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ط (العنکبوت : ۴۸ - ۴۹)

اے نبیؐ! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے آپ کے اہل وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔

اُمّی ہونے سے نبوت پر استدلال

اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاءِ سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا[1] اور لوگوں نے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے

---

[1] قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد اُن لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضورؐ کے ناخواندہ ہوتے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضورؐ پڑھے لکھے تھے، یا بعد میں آپؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفارِ مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضورؐ نے کاتب (حضرت علیؓ) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے ان کے ہاتھ سے کرده الفاظ خود کاٹ دیے اور محمد بن عبد اللہ لکھ دیا۔۔۔

(باقی صفحہ آئندہ)

حاصل کیا گیا ہے لیکن اُس کی اُمیّت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے - اب خالص ہٹ دھرمی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن یہ روایت براء بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور ہر جگہ الفاظ مختلف ہیں۔

۱- بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں قال لعلی امحه فقال علیؓ ما انا بالذی امحاه فمحاه رسول اللہ بیدہٖ۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے انھیں کاٹ دیا۔

۲- اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ثم قال لعلی امح رسول اللہ قال لا واللہ لا امحوك ابدا فاخذ رسول اللہ الکتاب فکتب ھٰذا ما قاضیٰ علیہ محمد بن عبد اللہ۔ پھر علیؓ سے کہا "رسول اللہ" کاٹ دو، انہوں نے کہا خدا کی قسم میں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضورؐ نے تحریر لے کر لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے طے کیا۔

۳- تیسری روایت انہی براء بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے: وکان لا یکتب فقال لعلی امح رسول اللہ فقال علیؓ واللہ لا امحاہ ابدا قال فارنیه قال فاراه ایاه فمحاه النبی صلی اللہ علیہ وسلم بیدہٖ۔ حضورؐ نہ خود لکھ سکتے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپؐ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اپنے ہاتھ سے الفاظ کاٹ دیئے۔

۴- چوتھی روایت بخاری کتاب المغازی میں یہ ہے فاخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکتاب ولیس یحسن یکتب فکتب ھٰذا ما قاضیٰ محمد بن عبد اللہ۔ پس حضورؐ نے وہ تحریر لے لی، درآنحالیکہ آپؐ لکھنا نہ جانتے تھے اور آپؐ نے لکھا "یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے طے کیا"۔

۵- انہی براء بن عازب سے مسلم کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے انکار کرنے پر حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کے الفاظ مٹا دیئے۔

۶- دوسری روایت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے بتاؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں ہے، حضرت علیؓ نے آپ کو جگہ بتائی اور آپؐ نے اسے مٹا کر ابن عبد اللہ لکھ دیا۔

روایات کا یہ اضطراب بتا رہا ہے کہ بیچ کے راویوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کئے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکے کہ حضورؐ نے "محمدؐ ابن عبد اللہ" کے الفاظ اپنے دست مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؓ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹانے سے انکار کیا تو آپؐ نے اس کی جگہ اُن سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا ہو اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے "ابن عبد اللہ" کے الفاظ لکھوا دیئے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؓ، دوسرے محمد بن مسلمہ (فتح الباری، جلد ۵، صہ ۲۱۷) اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے نہ کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواندہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے مجاہد سے ابن ابی شیبہ اور عمر بن شیبہ نے نقل کی ہے اس کے

(باقی صفحہ آئندہ)

کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔ ایک اُمّی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے، یہی دانش و بینش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں[1]۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کار فرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھلی مناسبت پائی جاتی ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی اُن کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گرد و پیش کے جن ممالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں دُور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں۔ یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں[2] بلکہ بہت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے۔ مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ	"یہ لوگ کہتے ہیں کہ" کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں
اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝	اس کے رب کی طرف سے" کہو "نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور
اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى	میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔۔ اور کیا ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الفاظ یہ ہیں کہ مامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ کتب و قرأ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے) لیکن اوّل تو یہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں فضعیف لا اصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری یُوں بھی واضح ہے کہ اگر حضورؐ نے فی الواقع بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی۔ بہت سے صحابہ اس کو روایت کرتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ اگر حضورؐ نے کس شخص یا کن اشخاص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن سوائے ایک عون بن عبداللہ کے، جن سے مجاہد نے یہ بات سُنی، اور کوئی شخص اُسے روایت نہیں کرتا اور یہ عون بھی صحابہ نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انھیں کس صحابی یا کن صحابیوں سے اس واقعہ کا علم ہُوا۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

[1] "نبوتِ محمدیؐ کا عقلی ثبوت" میں بھی یہ استدلال شامل ہے۔ مگر وہاں قرآنی استدلال کو سامنے لائے بغیر ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ (مرتب)

[2] اس موقع پر قرآن اُن معترضین کو بھی جواب دے رہا ہے جو حضورؐ کی نبوت کو تسلیم کرنے کی شرط کے طور پر محیّر العقول نشانی یعنی معجزہ طلب کرتے تھے۔ (نعیم صدیقی)

عَلَيْهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (العنکبوت : ۵۰-۵۱)

لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا ۔ کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے۔ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے ۔ تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے ۔ تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

نبوت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ (یونس - ۱۶)

"آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تم لوگوں کے درمیان گزار چکا ہوں۔

یہ ایک زبردست دلیل ہے مشرکین قریش کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر دور کی چیز تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے آپ کا بچپن گزرا، جوان ہوئے ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، ملنا جلنا۔ لین دین۔ شادی بیاہ ۔ غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم و تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے ۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ

مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیرِ کعبہ کے سلسلہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا جس میں حجرِ اسود کو نصب کرنے کے معاملہ پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اٹھے ھٰذا الامین رضینا، ھٰذا محمد۔ "یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں، یہ تو محمد ہے۔" اس طرح آپؐ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے "امین" ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔ (الشوریٰ ـ ۵۲)	اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور علیہ السلام کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے بلکہ آپ سرے سے کتبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور تھا مگر یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود اہلِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا ذکر سنا ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ۔ (القصص ـ ۸۶)	تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر) نازل ہوئی ہے۔ پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔

یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان

مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، اُن کے حاشیہ خیال میں بھی پاس کسی کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی۔ بس یکایک اوچنتے انھیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی۔ آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا۔ مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپؐ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے کیونکہ ان مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپؐ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپؐ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔ کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپؐ اجتماعی مسائل کے حل یا مذہبی اصلاح یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے۔ مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آ جانا، اتنا بڑا تغیر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رونما نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تاریخی ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز گزارتا ہو، اگر آنحضرت کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے۔ مگر یہ اعتراض کرنے والا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپ خود بھی نبوت کے خواہشمند یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آ گیا، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورۃ علق کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپ غارِ حرا سے کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوتی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" وہ فوراً جواب دیتی ہیں "ہرگز نہیں۔ آپؐ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ ہر کارِ خیر میں مدد کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔" پھر وہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے

پاس جاتی ہیں جو ان کے چچا زاد بھائی اور اہلِ کتاب میں سے ایک ذی علم اور راست باز آدمی تھے۔ وہ آپ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تامل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپ کے پاس آیا ہے وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰ کے پاس آتا تھا، کاش، میں جوان ہوتا اور اُس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔" آپ پوچھتے ہیں "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں۔"

یہ پورا واقعہ اُس حالت کی تصویر کشی کر دیتا ہے جو بالکل فطری طور پر یکایک خلافِ توقع ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آجانے سے کسی سیدھے سادے انسان پر طاری ہو سکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھیرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی اُمیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔ لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضور کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنع سے ممیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے بھی آپ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو موسیٰ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادا انسان بالکل خالی الذہن ہے۔ نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامل اس نتیجہ تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بین ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (آیت: ۱۶)

اے نبیؐ ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا تو میں کبھی یہ قرآن تمہیں نہ سناتا بلکہ اس کی خبر تک وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔

اور شوریٰ میں فرمایا:-

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (آیت: ۵۲)

اے نبیؐ تم تو جانتے تک نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اس وحی کو ایک نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۱، جلد سوم، عنکبوت: ۸۸ تا ۹۲، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپؐ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتب آسمانی کی طرف سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرتؐ کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۭ (البینہ: ۲-۳)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذاتِ خود ایک دلیل روشن کہا گیا ہے اس لیے کہ آپؐ کی نبوت سے پہلے کی اور بعد کی زندگی، آپ کا اُمی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے ایمان لانے والوں کی زندگی میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپؐ کا بالکل معقول عقائد، نہایت ستھری عبادات، کمال درجہ کے پاکیزہ اخلاق اور انسانی زندگی کے لئے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا۔ اور آپ کا ہر قسم کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔

قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوت کی دلیل ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ

اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (السجدہ: ۱-۲) نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لاریب فیہ، بے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکہ معظمہ کے باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی زندگی بھی اور اس کے بعد کی بھی وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہتہً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب و شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں پیش کئے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انہیں اس کتاب میں اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دور دور بھی اس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم یا قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا۔ کہ اس کتاب کا رب العلمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

لہ قرآن کو جس چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے (فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ) وہ اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس چیلنج کے جواب میں عاجز رہ کر مخالفین نے بزبانِ سکوت یہ اعتراف کر لیا کہ یہ کلام انسانی کاوشوں کا ماحصل نہیں ہے۔ قرآن کی اس معجزانہ اور فوق الانسانی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی نبوت کی دلیل قرار دیا ہے (نعیم صدیقی)

پیغمبرِ انسانیت خدا کی نظر میں

قاری محمد عبداللہ سلیم

خدا کے مقبول بندوں میں ایک شانِ محبوبیت ہوتی ہے خواہ وہ پیغمبر ہوں یا اولیاء اللہ۔ البتہ اولیاء اللہ میں یہ شان صدقہ ہوتی ہے پیغمبروں کے ساتھ قرب و نسبت کا۔ اور دُنیا میں یہ محبوبیت پرتو ہوتی ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک ان کے محبوب و برگزیدہ ہونے کا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

"جب خداوند تعالیٰ کسی بندے کو اپنا مقبول بناتے ہیں تو ملاءِ اعلیٰ کے قلوب میں اسی بندے کی محبت اِلقا فرما دیتے ہیں، اور پھر وہ آسمانوں میں بسنے والوں کے دلوں میں الہامِ محبت کرتے ہیں اور وہاں سے پھر زمین والوں کے دماغوں میں اسی کی محبت اُتار دی جاتی ہے۔"

ہر پیغمبر بہ نفسِ نفیس اسی محبوبیت کا حامل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:

والقيت عليك محبة مني ولتصنع	اور میں نے ڈال دی تجھ پر محبت اپنی طرف سے
على عيني۔	اور تاکہ تیری پرورش میری نگرانی میں ہو۔
واَصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ۔ (سورہ طٰہٰ)	اور بنایا میں نے تجھ کو خاص اپنے واسطے۔

اسی محبوبیتِ موسوی کا یہ کرشمہ تھا کہ جس کو نیست و نابود کر دینے کی خاطر ہزاروں اور لاکھوں اسرائیلی بچے فرعونی ظلم و ستم کا شکار ہو کر بے گناہ مارے جا رہے تھے۔ اس کو ہی جب فرعونی گھرانے نے تابوت میں دیکھا تو دل محبت سے تڑپ گئے، اور بے اختیار ہو ہو کر اس کی پرورش و پرداخت کا بندوبست کرنے لگے۔ اور آخر کار ریلیوں سے ہی دودھ کی رکھوالی کرائی گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام پیغمبروں میں منفرد خصوصیت جس سے ان کی محبوبیت عظیمہ کا بھی پتا چلتا ہے قرآن حکیم نے یہ بتلائی:

انما المسيح عيسى ابن مريم رسول	بلاشبہ مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے اللہ کے
الله وكلمته القاها الى مريم وروح	رسول اور اسی کا کلمہ ہیں کہ جس کا اِلقاء
منه۔	مریم کی طرف اللہ نے کیا اور روح ہے
(سورۃ نسا)	اس کی طرف سے۔

بلاشبہ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر کی یہ اتنی بڑی خصوصیت ہے کہ جس نے ان کو سارے پیغمبروں سے منفرد و ممتاز

کر دیا، اور اسی لیے نا تربیت یافتہ دماغوں نے ٹھوکر کھائی اور ان کو خدا کا بیٹا تصور کر لیا، اور یہ سمجھا کہ رُوح کی نسبت خدا نے اپنی طرف کی ہے اس لیے جزئیت ثابت ہو گئی۔ اس لیے حضرت مسیح خدائی میں بھی شریک ہوئے (نعوذ باللہ منہ)، حالانکہ لفظ "منه" سے جزئیت ہرگز ثابت نہیں ہوتی، ورنہ بقول ایک بزرگ کے آیت قرآنی وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعًا منه میں بھی آسمانوں اور زمینوں کے درمیان ہر چیز کے لیے جزئیت خداوندی ماننی ہو گی اور ظاہر ہے کہ نہ اس کو مانتا ہے اور نہ مان سکتا ہے، ——— معلوم نہیں "روح اللہ" یا روحٌ من اللہ میں خدا کے ساتھ نسبت کی حقیقت صرف یہ کیوں نہ سمجھی گئی، جیسے بیت اللہ اور کتاب اللہ میں ہے۔

اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے "کلمته" فرمانا بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کی پیدائش صرف خداوند تعالیٰ کے ارشاد "کُن" سے ہوئی جبکہ تمام انسانوں کی پیدائش میں اس کلمہ کے علاوہ نطفہ کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ پاک میں یہ فرمایا گیا:

وعلّمنٰه صنعة لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم۔	اور ہم نے اس (داؤدؑ) کو لباس (زرہ) کی صنعت کی تمہارے لیے تعلیم دی تاکہ جنگ میں وہ لباس تمہاری حفاظت کر سکے۔

اس آیت میں حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کی صنعت سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا، یعنی براہِ راست ہم نے یہ صنعت سکھلائی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ فنِ زرہ سازی میں اللہ تعالیٰ معلم ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کے۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بڑی زبردست خصوصیت ہے، جس سے آپ کی عظیم الشان محبوبیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السّلام کی ایک دُعا کا قرآن پاک میں تذکرہ ہے:

ربّ ھب لی ملکًا لا ینبغی لاحد من بعدی۔	پروردگار! مجھ کو ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کو بھی میسّر نہ ہو۔

اور پھر اس دعا کی قبولیت کی خبر بایں طور دی گئی کہ ہم نے سلیمانؑ کے لیے ہوائیں اور جنّات مسخر کر دیے۔ بلا شبہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبردست مقبولیت و محبوبیت کی علامت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے لیے قرآنِ حکیم میں یہ صراحتہً موجود ہے کہ ان کی تخلیق ہم نے اپنے ہاتھوں سے کی اور یہ بات ان کی خصوصی عظمت و محبوبیت کی بیّن دلیل ہے۔

لیکن ان برگزیدہ ہستیوں کی محبوبیت کے ان آثار و شواہد کے بعد اب یہ ارشادِ خداوندی ملاحظہ ہو:

قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایسی شانِ محبوبیت کی خبر دی گئی ہے کہ جس سے بڑی شانِ محبوبیت دوسری نہ ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ یہ وہ شان ہے جس کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بجا طور پر "رحمۃ للعالمین" بھی فرمایا گیا اور "محبوب رب العالمین" بھی باور کیا گیا۔

اگر کسی جگہ یوں فرما دیا جاتا کہ اسے پیغمبر! آپ ہمارے محبوب ہیں۔ تو اس میں وہ بات اور وہ خوبی نہیں ہوسکتی تھی جو اس آیت میں ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ تو محبوبِ خدا ہیں ہی، ہم تو آپ کے صدقہ میں آپ کے ہر پیروکار کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ بھلا دیکھیے تو آپ کی شانِ محبوبیت کہ آپ کے طفیل سیکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ اربوں کھربوں اور وُہ بھی قیامت تک آنے والے اطاعت شعار اُمتی محبوبِ خدا بن گئے، ——— کتنی بڑی شان ہے سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا کے نزدیک۔

قرآن کریم میں حضرت ادریس علیہ السلام کے لیے ارشاد ہے:

ورفعناہ مکاناً علیّاً۔	اور ہم نے اس کو بلند جگہ پر اٹھا لیا۔

یہاں خواہ مرتبہ کی رفعت مراد ہو کہ نبوت و پیغمبری کی راہ سے بلند رتبہ عطا ہوا، یا اسرائیلی روایات کے مطابق رفعِ آسمانی مقصود ہو۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ارشاد فرمایا گیا:

یا عیسٰی اِنّی متوفّیك و رافعك الیّ ومطهرك من الّذین کفروا۔ (آل عمران)	اے عیسیٰ! تم کو (وقت مقررہ پر ہی) وفات دینے والا ہوں اور (اسی وجہ سے دشمنوں سے حفاظت کی یہ صورت ہوگی کہ) اپنی طرف تم کو اٹھانے والا ہوں، اور تم کو پاک کرنے والا ہوں کافروں (کی تہمت) سے۔

اس آیت میں دو باتوں کا تذکرہ ہے ایک رفعِ آسمانی، اور دوسرے کافروں کی تہمتوں سے پاک رکھنا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں نہایت ہی بلندیٔ رتبہ کی دلیل ہیں۔ لیکن ایک رفعتِ مکانی اور رفعتِ آسمانی ان دو جلیل القدر پیغمبروں کی ہے، اور ایک رفعتِ ذکری سید الانبیا کی ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ مثال۔ فرمایا گیا:

ورفعنا لك ذکرك۔	اور ہم نے بلند کر دیا تیری خاطر تیرا ذکر۔

اور یہ اس طرح ہوا کہ ہر اہم موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کو شامل فرما دیا۔ چنانچہ جس کلمہ کے بغیر کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا اس میں بھی اللہ کے نام کے ساتھ پیغمبر کا نام ہے لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ۔ اگر آپؐ کا نام نہیں لیا جائے گا تو کلمہ ہی پورا نہ ہوگا اور اس کلمہ کے دوسرے جزو کو چھوڑ کر

محض پہلے کلمہ پر اعتقاداً قناعت کر لینے والا اس کو کتنی بار بھی رٹتا رہے وہ کسی بھی طرح نہ رحمت کا مستحق ہوگا اور نہ مغفرت کا۔ اسی طرح مسجدوں میں پانچ وقت اذان و اقامت کہی جاتی ہے ساری دُنیا ان کو سُنتی ہے اور روزِ قیامت زمین و فضا کی ہر چیز اس اذان پنجگانہ کی مؤذن کے حق میں شہادت دے گی[۱] تو اسی اذان میں بھی جہاں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ہے وہیں اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ بھی ہے۔ ایسے ہی نماز جو اسلام میں سب سے اہم عبادت ہے اور جوازروئے اسلام کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل ہے اور اسی وجہ سے ایک مسلمان کے اسلام کا تعارف بھی ہے اور ثبوت بھی۔ اس میں بھی بوقت التحیات اللہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا جاتا ہے:

السلام علیك ایھا النبی اور اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ اور اس کے بعد درود شریف بھی پڑھا جاتا ہے۔

مسلمان اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے خدا سے دُعائیں کرنے کا پابند ہے۔ لیکن دُعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ تعلیماتِ اسلامی میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اول و آخر درود شریف پڑھا جائے۔

جبکہ درود شریف کی بھی یہ زبردست خصوصیت ہے کہ قرآن پاک میں اسی کی ہدایت کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا:

ان اللّٰہ و ملٰئِکتہٗ یصلّون علی النبی	حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے درود
یاَیھا الذین اٰمنوا صلّوا علیہ وسلّموا	بھیجتے ہیں پیغمبر پر۔ اے ایمان والو! تم بھی درود
تسلیماً۔	سلام بھیجو آپؐ پر۔

معلوم ہوا کہ جس کام کو خود اللہ اور اس کے مقرب فرشتے کر رہے ہیں اسی کام کے کرنے کی ہدایت مومن بندوں کو دے کر گویا اپنے کام میں شریک کرنے کی زبردست سعادت بخش دی۔ اور یہ صدقہ ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے بھی آپ کے رتبۂ بلند کا پتا چلتا ہے۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کے لیے الفاظ یہ ہیں:

و رافعك الیّ ۔	ہم اٹھانے والے ہیں تم کو اپنی طرف۔

اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ خدا نے اپنے پاس اٹھا لینے کی خبر دی ہے، جو بلاشبہ عظمت عیسوی کی کھلی دلیل ہے۔ لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ کتنا قرب و نزدیکی سے نوازا جائے گا۔ لیکن سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بسلسلۂ معراج جو فرمایا گیا اس کے انداز پر بھی غور کیا جائے۔

علّمہ شدید القوٰی	اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے،

---

[۱] اور یہی وجہ ہے کہ ازروئے حدیث اذان کے وقت شیطان بھاگتا ہے کیونکہ وہ ایسے کام میں خود کو انسان کا گواہ بنانے کے لیے تیار نہیں جس میں اس کا زبردست اُخروی فائدہ ہوتا ہو۔

ذومرّۃ فاستوٰی وھو بالافق الاعلٰی ثم دنا فتدلّٰی فکان قاب قوسین اَو ادنٰی فاوحٰی الٰی عبدہٖ مااوحٰی۔

(سورۂ نجم)

زور آور نے، پھر سیدھا بیٹھا، اور وہ تھا اونچے کنارے پر آسمان کے، پھر نزدیک ہوا، اور لٹک آیا، پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندے پر جو بھیجا۔

ان آیاتِ معراج سے وابستہ قرار دینے والی تفسیروں کے مطابق انتہائی رفعت اور بے انتہا قرب کی تصریح کے ساتھ معجزانہ جملہ ارشاد فرمایا گیا: فاوحٰی الٰی عبدہٖ مااوحٰی ۔ پس اللہ دے اور بندہ لے کا مضمون تھا ۔ بھلا کیا موازنہ ہے اس رفعت و قرب کا کسی اور قرب و رفعت سے۔

محبتِ صادق مولائے کائنات نے محبوبِ صادق جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف بایں الفاظ فرمائی ہے:

انّک لعلٰی خلقٍ عظیم۔ بلاشبہ آپ اخلاق کے بلند معیار پر ہیں۔

(سورۃ القلم)

یہ بات سوائے آپؐ کے کسی بندہ بشر کے لیے نہیں فرمائی گئی اس لیے اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ اخلاقی اعتبار سے آپؐ خدا کے نزدیک نہایت بلند رتبہ ہیں، اور نہ صرف یہی بلکہ آپؐ نے اپنے بارے میں خود فرمایا:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ میں اس لیے بھیجا گیا تاکہ اعلٰی اخلاق کی تکمیل کروں۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ محض اتفاقی طور پر ہی بااخلاق نہیں تھے بلکہ اُصولِ اخلاق کی وضع و تکمیل کے لیے آپؐ کی ذات گرامی ہی معیار بنی۔ اور چونکہ ازروئے حدیث آپؐ کی عادات قرآنی ہدایات کے عین بین مطابق تھیں۔ اس لیے آج قرآن پاک ہی آئینہ ہے اخلاقِ محمدیؐ کا ——— لیکن اس ربانی شہادت کے باوجود کچھ لوگ آپؐ کے قرآنی اخلاق کو بلند رتبہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ مسیحی ہونے کے مدعی ہیں اسی لیے مقابلہ میں انجیل کی یہ اخلاقی تعلیم پیش کرتے ہیں کہ اگر کوئی ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دُوسرا رخسار پیش کر دیا جائے۔ اب چونکہ انجیل خدا کے نزدیک منسوخ ہے اس لیے ہم بھی اس مقابلہ کا جواب دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ انجیل کی اسی اخلاقی ہدایت کا کیا اسر، قرآنی ہدایت سے مقابلہ ہو سکتا ہے، فرمایا گیا:

جزاء سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا فمن عفا و اصلح فاجرہٗ علی اللہ۔

بُرائی کا بدلہ اسی کے برابر برائی سے ہے۔ لیکن جو معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

ظالم اور جفا کار کو نادم و شرمندہ کرنے کے لیے یقیناً ایک اخلاقی بات ہے، لیکن ظلم و زیادتی کو معاف کرتے ہوئے پھر اس خطاکار کی اصلاح و تربیت کی طرف متوجہ ہونا، یہ کتنا بڑا اخلاقی کارنامہ ہے۔ اس سے تو کوئی بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا، ہاں انصاف جو برابری حقوق کی پاسداری کا ضامن ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر مساوی درجہ میں بدلہ لینے کی قانونی اجازت بھی دے دی گئی، مگر تعریف و مدح عفو و اصلاح کی ہی فرمائی گئی، جو ظاہر ہے قانون نہیں ہو سکتا بلکہ درجۂ فضیلت ہی قرار پا سکتا ہے، سو ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن انجیل کی ہدایت کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ قانون ہے یا درجۂ فضیلت۔ اگر قانون ہے تو ہرگز اس کے مناسب نہیں ہے۔ اگر فضیلت ہے تو مذکورہ اسلامی فضیلت سے فروتر ہے۔

ہر مخلوق کے اندر خاص نوعی اور صنفی اوصاف و خصائل ہوتے ہیں جو اس کے مقصدِ تخلیق کے عین مناسب ہوتے ہیں۔ وہ خصوصی اوصاف جس فرد میں نمایاں اور کامل درجہ میں ہوں گے وہی فردِ باکمال مانا جاتا ہے۔ مثلاً شیر میں شجاعت اور سفاکی اس کے خاص نوعی اوصاف ہیں۔ یہ خصلتیں جس شیر کے اندر جس درجۂ کمال کے ساتھ ہوں گی اسی درجہ شیر باکمال ہوگا، کیونکہ اس سے خلقی مقاصد بدرجۂ کمال پورے ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بقاعدۂ اصولیین جب کوئی نام بولا جاتا ہے تو اس سے فردِ کامل ہی مراد ہوتا ہے۔ یعنی وہی فرد مراد لیا جاتا ہے جو اپنے نوعی اور صنفی کمالات کے ساتھ بدرجۂ کمال متصف ہو۔ مثلاً کوئی شیر بولے تو اس سے کامل درجہ کی شجاعت و سفاکی سے متصف شیر ہی مراد ہوگا جو اس کا نوعی وصفِ خاص ——— اس لیے کہ اگر شیر میں اور سب کچھ ہو لیکن شجاعت و سفاکی نہ ہو تو وہ اس کے حق میں عیب ہے۔

اسی طرح انسان کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔	میں نے انسانوں اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

عبادت کا خاصۂ لازمہ ہے بندگی اور عبدیت، اس لیے عبدیت ہی انسان کے حق میں کمال ہے، جس درجہ وصفِ عبدیت کسی انسان میں ہوگی اسی درجہ وہ باکمال ہوگا۔ اگر کامل ترین عبدیت ہے تو کامل ترین انسان ہوگا۔ اس کے برعکس کسی فرد میں سب کچھ ہو مگر عبدیت نہ ہو تو وہ اس کے حق میں عیب شمار ہوگا[1]

اور یہ بات بھی واجب التسلیم ہے کہ کوئی فردِ انسانی عبدیت کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ عبد و معبود کی حقیقت سے باخبر نہ ہو جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو انسان عبدِ کامل ہے وہ لازمی طور پر کامل درجہ کا عالم و عارف ہے۔ اور قاعدۂ اصولیین بتلایا جا چکا ہے کہ جب کوئی لفظ یا نام بولا جائے تو اس سے فردِ کامل ہی مراد ہوتا ہے[2]، لہٰذا

---

[1] چونکہ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے دنیا میں خواہ کچھ بھی سمجھا جائے عالمِ آخرت میں جہاں حقائق اصل روپ کے اندر ہوں گی وہاں یہی اصول کارفرما ہوگا اور اسی بات کو پرکھا جائے گا کہ عبدیت کس درجہ کی ہے۔

[2] اصول کی عربی کتابوں میں ہے المطلق اذا اطلق فالمراد به الفرد الکامل۔

جب کسی انسان کے لیے لفظ "عبد" بولا جائے تو حقیقت کے اعتبار سے وہی فردِ کامل مراد ہو گا جس میں عبدیتِ کاملہ مع اپنے لازمہ وخاصہ کے موجود ہو۔ اور یہ عبد ہونا اور اس کے لیے لفظ عبد کا بولا جانا ساری تعریفوں سے بڑھ کر تعریف ہو گی۔ جس سے یہ بات واضح ہے کہ انسان میں دُوسری کوئی بھی بات خواہ کچھ بھی ہو اور کیسی بھی ہو تعریف کے قابل ہو سکتی ہے اور وُہ اس کے حق میں خُوبی اور اچھائی ہی ہو گی لیکن "عبد" ہونے کے مقابلہ میں کسی بات کو فوقیت و برتری حاصل نہ ہو گی۔

اسی تمہید و تفصیل کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قرآن پاک میں لفظ عبد بولا ہے۔ فرمایا گیا:

سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً۔ — پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات لے چلی اپنے بندے کو۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تمام اوصافِ انسانی میں عبدیت سب سے اعلیٰ وصف ہے اس لیے تاریخ انسانی کے اس عظیم ترین واقعہ، اور زبردست معجزے کے تذکرے کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی وصفِ خاص یعنی عبدیت کے ساتھ ذکر فرمایا گیا جو تمام اوصافِ بشری و پیغمبری میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔

اور چونکہ انسان بحیثیتِ مجموعی ساری کائنات سے افضل و برتر ہے اور ہر چیز اسی کے لیے مسخر ہے، تو انسانوں میں بھی جو فرد کامل ہو گا، اس کی بلا استثنا و بلا تاویل کائنات کی ہر جنس و نوع اور ہر صنف کے آحاد و افراد تک سے فضیلت مسلّم ہو گی، اسی لیے آنحضرتؐ کے لیے یہ مضمون برحق ہے:

لولاک لما خلقت الافلاك۔ — اے پیغمبر! اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات پیدا نہ کی جاتی۔

اسی طرح یہ بھی برحق ہے کہ روضۂ مطہرہ کے جس حصۂ زمین سے آپ کا جسدِ اطہر مس کیے ہوئے ہے وہ عرش کرسی تک سے افضل ہے، یہ درست ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی لفظ عبد قرآن پاک میں بولا گیا۔ مگر ایک تو صرف اس وجہ سے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے اُن کی اُمت میں یہ غلط نظریہ عام ہو گیا کہ آپ خدا کے بیٹے تھے، اس لیے ان کے واسطے بھی لفظ "عبد" لایا گیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جب وہ عبد ہیں تو معبود کے بیٹے کیسے ہوئے۔ اگر ایسا ہوتا تو معبودیت کی کچھ تو شان ہوتی۔

مگر پھر بھی اس نکتہ کی طرف سے ذہن غافل نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لفظ "عبد" لایا گیا تو ان کے قول کی حکایت کے طور پر لایا گیا۔ ارشاد ہے:

قال انی عبد اللہ۔ — حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود 'عبد' فرمایا اور وُہ بھی اپنے لیے ضمیر لا کر اس کی طرف عبد کی اضافت فرما دی جس سے مزید قرب و خصوصیت اور اپنائیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی لذت کو وہی شخص

جانتا ہے جو عربیت سے واقف ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ عبد کامل کے لیے علم و معرفت کاملہ لازم ہے، اس لیے جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عبدیت میں بے مثال ہیں۔ اسی طرح علمِ حقیقی اور معرفتِ رب میں آپ کا کوئی نظیر نہیں ہے، اسی لیے آپ کو قرآن پاک دیا گیا جو کلامِ ربانی ہونے کی حیثیت سے علمی معجزہ ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ جس طرح عملی معجزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسا عمل ہو جس کے کرنے سے دُوسرے عاجز ہوں، اسی طرح علمی معجزے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ایسے علوم و معارف کا اظہار ہو جس کے اظہار سے دُوسرے عاجز ہوں۔ اسی لیے خود آپؐ نے اپنے لیے ارشاد فرمایا:

اُوتیت علوم الاولین والاٰخرین ۔ میں اوّلین و آخرین کا علم دیا گیا ہُوں۔

اور جب یہ سب کچھ ہے تو آپ ہی اس کے حقدار تھے کہ خاتم النبیین بنائے جائیں، اور وُہ بھی اس طرح کہ وجودِ نبوت کے اعتبار سے سب پیغمبروں سے مقدم، لیکن ظہور کے اعتبار سے سب سے مؤخر، اس لیے کہ نورِ نبوت کا تمام سلسلہ آپ ہی پر جا کر مختتم ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ روشنی خواہ ستاروں کی ہو یا چاندکی یہ سب بواسطۂ سورج ان کو عطا ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ سورج کی روشنی مقدم ہے انجم و قمر کی روشنی سے، لیکن رات جو دن سے پہلے آتی ہے اس میں ظہور پہلے چاند ستاروں کی روشنی کا ہوتا ہے اور اس کے بعد سورج ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر اسی وقت سب کی روشنیاں غیر مؤثر ہو جاتی ہیں۔

یہی مثال آپؐ کی نبوت کی ہے اور اس لیے آپؐ مرتبہ کے اعتبار سے بھی خاتم النبیین ہیں کہ سارے پیغمبروں کی نبوت آپؐ ہی کا فیض ہے اور آپؐ زماناً بھی خاتم النبیین ہیں کہ سب سے آخر میں آپؐ کا ظہور رہا۔ اور آپؐ کے بعد کسی نبی کی بعثت نہ ہوگی۔ قرآن پاک میں آپؐ کو خاتم النبیین اسی معنیٰ میں فرمایا گیا ہے ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

یاایھا النبی انا ارسلناك شاھدًا ومبشرًا ونذیرا۔ اے پیغمبر! ہم نے آپ کو بھیجا ہے شاہد اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔

اس آیت میں آپؐ کے ایک ایسے منصب کی خبر دی گئی ہے جس میں آپؐ اوّلین و آخرین میں ممتاز ہوں گے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یوم آخرت کی عدالتِ عالیہ میں جب نوعِ انسانی اپنی زندگی کا حساب و کتاب دے گی، تو انبیأ علیہم السلام ان قوموں کے بارے میں دعویدار ہوں گے جن کی طرف وہ مبعوث کیے گئے کہ ہم نے تبلیغ دین کی لیکن اُنھوں نے جھٹلایا اور تمام ہی پیغمبر اپنی گواہی میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی پیش کریں گے۔ اور آپؐ جو شہادت دیں گے اسی کے مطابق ساری اُمتوں کے لیے فیصلہ ہو جائے گا، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر پیغمبر سے ثبوت مطلوب ہوگا، لیکن آپؐ ایسے

مقام پر ہوں گے کہ آپؐ سے ثبوت کا مطالبہ نہ ہوگا۔ اسی کو دُوسری جگہ اس طرح فرمایا گیا:

فکیف اذا جئنا من کلّ اُمّۃٍ بشھید و جئنا بك علیٰ ھٰؤلاء شھیداً۔ (نساء)	پھر کیسے ہوگا جب ہم لائیں گے ہر امت کا شہید اور آپؐ کو ان سب پر شہید بنا کر لائیں گے۔

اور یہی وہ آپؐ کی خصوصیات و مناقب ہیں جن کا لحاظ بارگاہِ خداوندی سے اس طرح کیا گیا کہ قرآن پاک میں ہر پیغمبر کو اس کے نام کے ساتھ خطاب کیا گیا۔ مثلاً یا اٰدم، یا ابراھیم، یا مُوسیٰ، یا عیسیٰ، یا داؤد۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بھی جگہ نام لے کر مخاطب نہیں فرمایا گیا بلکہ یاایھا النبی اور یاایھا الرسول کے الفاظ سے خطاب کیا۔ حسبِ تصریحِ علماءٗ اس سے عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

ہاں قرآن پاک میں چار جگہ آپؐ کا نام نامی ضرور آیا ہے مگر وہ خطاب کے طور پر نہیں۔ دُوسرے یہ کہ وہ نام لانے ہی سے مقصد پورا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر بات پُوری نہیں ہوتی، وُہ چار جگہیں یہ ہیں:

۱۔ وما محمدٌ الّا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ (آلِ عمران)	اور محمدؐ صرف ایک پیغمبر ہیں، آپ سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں (اس لیے آپ بھی ہمیشہ دنیا میں نہ رہیں گے)
۲۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیّٖن۔ (احزاب)	نہیں ہیں محمد باپ تمھارے مردوں میں سے کسی کے اور لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔
۳۔ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات واٰمنوا بما نزّل علیٰ محمد وھو الحق من ربھم۔ (محمد)	جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی حق بھی ہیں اُن کے رب کی طرف سے۔
۴۔ محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشدّآء علی الکفار رحمآء بینھم۔ (فتح)	محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو ان کے ساتھ ہیں نہایت سخت ہیں کفّار پر اور بہت مہربان ہیں آپس میں۔

قرآن سے مظہرِ نبوت کی تشریح

مولانا محمد حنیف ندوی

تاریخی لحاظ سے عالمِ انسانیت کے تہذیبی ارتقا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تمام تر تگ و دو اور کامرانیوں کا حاصل ہمیشہ دو چیزیں رہی ہیں - ایک وہ کوششیں جو تلاشِ حقیقت کے سلسلے میں عقل و خرد کے بل بوتے پر اس نے از خود انجام دیں اور اس کے نتیجے میں فطرت کے رازہائے درون پردہ کا انکشاف ہوا - دوسرے فیضانِ ربوبیت کا وہ کرشمہ جس نے ہر ہر دور میں اس کی روحانی و اخلاقی سطح کو رفعتیں عطا کیں یعنی دریافت (DISCOVERY) کی برکتیں اور وحی و الہام کی دست گیری - یہی وہ دو محور ہیں جن کے گرد ہزاروں برس ارتقا کا عملیہ گھومتا رہا اور یہی وہ دو روشنی کے مینار ہیں، زندگی کے بحرِ بے کراں میں جن کی تابش و ضو سے تہذیب و تمدن کے سفینے رواں دواں رہے ہیں۔ طائفہ فکر و دانش کے گلِ سر سبد، جنھوں نے ماضی میں حقیقت کو پا لینے کی سعی کی کنفیوشس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ گروہِ پاک جس نے انسانیت کو تزکیہ و تحلیہ کی راہ دکھائی - ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ (صلوات اللہ علیہم اجمعین) کی صورت میں جلوہ گر ہوا -

تاریخ کے اس تجزیہ سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی سعیِ فکر و تعمق اور آسمانی فیوض و ہدایت سے بہرہ مندی کی راہیں جدا جدا اور مختلف ہیں - حالانکہ ایسا ہرگز نہیں - یہ تجزیہ سراسر وہم و خیال کی فسوں سازی ہے ورنہ یہ دونو دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پرتو اور انعکاس ہیں -

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ علم و حکمت نے اپنے اظہار کے لیے تکوین و تشریع کی دو سطحیں پسند کیں - تکوینی سطح پر تو اس سے چاہا کہ انسان اپنی فکری و عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے بالاتر حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور تشریعی سطح پر اس کے فیضِ ربوبیت نے یہ چاہا کہ ایسے انبیا و رسل کو دنیا میں مبعوث فرمائے جو اپنی تعلیمات و عمل سے انسان کو رشد و ہدایت کی راہ دکھائیں اور اس کے اندر کے اس خالق تر انسان کو نکھاریں جو خدا سے ڈرتا ہے، خدا سے محبت رکھتا ہے اور اس حقیقت سے آشنا ہے کہ تسخیرِ کائنات کا راز کیا ہے؟ مزید براں جو اس فلسفہ سے آگاہ ہے کہ انسانی رشتوں کو کیونکر عدل و انصاف کی بنیادوں پر استوار کرنا ممکن ہے -

وحی و تنزیل اور دریافت و یافت کی فکری و عملی کوششوں میں کہیں تضاد یا تناقض نہیں پایا جاتا - دونوں میں ہم آہنگی اور اتحاد ہے، دونو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں، اور دونو ہی کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کسی نہ کسی طرح انسان کی تکمیل کی جائے اور اس کو فطرت کا رازداں بنایا جائے - دوسرے لفظوں میں، عقل و خرد کے تقاضے اور مذہب و دین کے واجبات، دو متناقض پہلو ہونے کے بجائے اس کے تکمیلی اجزا ہیں جو انسانی فطرت کو اور جلا بخشتے ہیں اور اس کے مضمرات ارتقا کو ابھارتے

ہیں، چاہے ان کا تعلق اس کی سیرت و کردار کے معجزات سے ہو اور چاہے ذہن و عقل کے خوارق سے۔ غرض و مقصد کے اتحاد سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کے جوہر و مزاج میں ہی اتحاد و یگانگت پائی جاتی ہے۔ وحی و تنزیل کے داعیے اپنی آغوش میں عقل و خرد کے وہ تمام آفتاب چھپائے ہوئے ہیں۔ جن کی روشنی میں تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے قدم بڑھانا ہے اور اسی طرح عقل و خرد کے علیہ میں وحی و الہام کے تقاضوں کا بھی دخل ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب تشریع اور تکوین کے دائروں کو آپس میں بہرحال ملنا اور متحد ہونا ہے اور جب آسمانی اور زمینی کوششوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھلنا اور ظہور پذیر ہونا ہے۔

سمرؔ کے نقطۂ نظر کی غلطی

نبوت کے بارے میں ہم سمرؔ کی اس تقسیم کو صحیح نہیں مانتے کہ اس کا تعلق کہانت اور اظہار حقیقت کے ان خانوں سے ہے جس میں خواب و بیداری میں بربنائے حدس آئندہ واقعات کی غیر واضح جھلک دیکھ لینا اور اس کے بل پر پیش گوئی کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک نبوت اور کہانت وغیرہ میں رشتہ و تعلق کی نوعیت یہ نہیں کہ یہ کہانت کی ارتقائی شکل ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کے فیوض ربوبیت کا ایک مستقل بالذات مظہر ہے۔ اس کا تعلق تدبیر الٰہی کے کرشموں سے ہے اور اصلاح و تعمیر کے اس باقاعدہ نظام سے ہے جس کا منتہائے مقصود بنی نوع انسان کو زندگی کی ضروری اقدار سے روشناس کرنا اور اس کی فکری و عملی صلاحیتوں کو چمکانا اور سنوارنا ہے۔ یہ مظہر نہ تو بخت و اتفاق کی اعجوبہ کاریوں کا مرہون منت ہے اور نہ کسی غیر منطقی اور بے ڈھب مظہر فطرت کی ارتقائی شکل۔ اس کا تعلق عقیدہ و فکر کے ان تین اصولوں سے ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ زندہ، قیوم اور رحمت و شفقت کی ارزانیوں کا سرچشمہ اور مصدر ہے۔ اس کا اپنے بندوں سے تعلق بیگانگی اور اجنبیت کا نہیں پیار اور محبت کا ہے۔ جس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ دنیا میں انسان کی اصلاح و تدبیر کا اہتمام کرے اور تاریخ کے ہر مناسب موڑ پر اس کی رہنمائی کرے، اس کو روشنی عطا کرے اور اس قابل ٹھہرائے کہ یہ اس کی صفات کا صحیح معنوں میں ترجمان ثابت ہو۔

۲۔ یہ ذات حق اصلاح و تدبیر کے لیے ایسے نفوس قدسیہ کو چنے جو فکر و عمل کے لحاظ سے بالاتر اور فائق تر صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں، جو اپنے مخاطبین سے بہرحال اونچے ہوں اور شخصیت و کردار کے اعتبار سے اس لائق ہوں کہ ان سے ایمان و عقیدت کے رشتوں کو استوار کیا جا سکے۔

۳۔ جس ماحول میں یہ حضرات تشریف لائیں اس میں ایسے حل طلب اجتماعی و انفرادی مسائل و مشکلات کا ہونا ضروری ہے جن کو یہ سلجھائیں اور ان کے جواب میں ایسی روش اختیار کریں، جو معقول اور سمجھ میں آنے والی ہو۔

مظہر نبوت کی تشریح

مظہر نبوت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان سہ گونہ مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حي و قیوم ہے، فعال و کریم ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ جس سے اس کو جسم و جان کی شادمانیاں حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی اس خصوصیت کو ہم "صفت ربوبیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا

ہے کہ یہ صدیوں زندگی کے تضادات سے نبرد آزما ہوتا رہے اور بغیر کسی ہدایت اور زندگی کے واضح نقشے کے ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے اور خود اپنی محنت، تجربا ور عقل و خرد کی کاوشوں سے اپنے لیے راہِ عمل دریافت کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ انسان آج بھی غاروں، جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا اور تہذیب و تمدن کی شمیم آرائیوں سے قطعی محروم رہتا۔ یہ اس کا کرم بے پایاں اور عنایت فزوں تر کا فیض ہے کہ اس نے تہذیب و ترقی اور اصلاح و تعمیر کے عملیہ کو انبیاء و رسل کے ذریعہ تیز تر کر دیا اور فکر و عمل کی ان تمام گمراہیوں سے انسان کو بچا لیا جو ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوتیں، اور بجائے اس کے انسان اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھتا، ان سے اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے نوعِ انسانی کی ہلاکت کا باعث بنتا۔

ہم جب نبوت و وحی کے سرچشمہ کی تعیین کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت و عنایت کا ذکر کرتے ہیں، تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے انسان کی طرف سے نہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور حالات و واقعات کی کروٹیں یا انسانی جذبۂ تحقیق و جستجو اور مجاہدہ و ریاضت کی کوششیں اس کو جنم نہیں دیتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخششیں اور محبت اس کو بروئے کار لانے کی ذمہ دار ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم پیغمبر کی اپنی عظیم تر ذہنی و عملی صلاحیتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے قلب و ذہن میں تحقیقِ حق اور سچائی کو ماننے کا جو بے پناہ جذبہ موجزن ہوتا ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور پیغمبر کو محض ایک غیر فعال، غیر متحرک اور ایسا آلہ تسلیم کرتے ہیں جو وحی و الہام کی موجوں کو وصول کرتا اور انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہم پیغمبر کی ذاتی خوبیوں اور اس کی ذہنی و فکری بلندیوں کو مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالات و مسائل کے مطالعہ سے خود اس کے دل میں بھی حق جوئی کے ولولے پیدا ہوتے ہیں اور شدت و اشتیاق میں اس درجہ بڑھ جاتے ہیں کہ آخر الامر یہی جستجو، ولولہ اور طلب و تلاش کی کوششیں اس کے اندر ان ذہنی صلاحیتوں کو چمکانے کا سبب بنتی ہیں، جن کی بدولت یہ اس لائق ٹھہرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ اس منصب کو قبول کر سکے اور وحی و الہام کی روشنی میں بنی نوع انسان کی اصلاح و تعمیر کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اس اہم اور بدرجہ غایت توجہ طلب موضوع سے ناانصافی ہوگی اگر ہم بحث کے اس مرحلے میں یہ نہ بتائیں کہ نبوت کی تشریح فارابی کے نظریۂ تخیل اور صوفیہ کی بولی میں مجاہدہ و ریاضت کی طرفہ طرازیوں سے کیوں نہیں ہو سکتی۔

اس لئے کہ وحی تخیل و کشف کے نتائج اور ان کی فطرت اور اسلوب سے بالکل مختلف شے ہے۔ دونوں میں اصولی اور بنیادی فرق یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں معروضیت سے بڑی حد تک ہٹی ہیں۔ دونوں کا تانا بانا متعین تعلیم اور مخصوص عقائد و نظریات کی کارفرمائیوں سے تیار ہوتا ہے۔ جب کہ وحی و تنزیل یکسر معروضی حقائق کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں معاشرہ کے مادی تقاضوں، اجتماعی مشکلات اور تضادات کا حل تو موجود ہوتا ہے مگر اس کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ اپنے دور کے حالات و کوائف کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے۔ یہ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک مستقل بالذات حقیقت ہے جس کا سرچشمہ عنایت الٰہی کا فیض گسترانہ فعل و عمل ہے۔

ان میں اور وحی الٰہی میں دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ تخیل و کشف کی بلند پروازیوں کا بالعموم تعلق چونکہ موضوعیت سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے حاصل کردہ نتائج کی حیثیت ایک فرد یا شخص کے اپنے تجربات و احوال اور اپنے حدودِ ذہنی کے تطابق سے زیادہ نہیں ہوتی، اس میں وہ جامعیت اور انسانی زندگی کے جملہ اصلاح طلب پہلوؤں کا استیعاب نہیں ہو پاتا جس کو وحی اپنے آغوش میں سمو لیتی

ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وحی اپنے غلبہ کے اعتبار سے ہمیشہ کلیت کی حامل ہوتی ہے اور کشف و تخیل کے نتائج جزئیات کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

وحی و تنزیل اور تخیل و کشف کے نتائج میں تیسرا فرق حجت و استناد کا ہے۔ وحی اس لئے حجت و مستند ہے کہ اس میں خطا و لغزش کا احتمال نہیں ہوتا اور کشف و تخیل اس وجہ سے حجیت و استناد سے عاری ہیں کہ خطا و لغزش کا ہدف و نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو تقابل کی صورت یہ تھی کہ ہم نے تخیل و کشف کے نتائج پر ایک ساتھ غور کیا لیکن اگر مقابلہ صرف کشف اور وحی و تنزیل کے درمیان ہو تو ان میں چوتھا فرق جو ابھر کر نظر و فکر کے سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ کشف کی ترکیب و ساخت میں چونکہ موضوعیت و معروضیت کے دو گونہ عناصر ملے جُلے رہتے ہیں اور اظہار کا طریق رمز پر مبنی ہوتا ہے، اس بنا پر اس کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں اور وحی کے معاملے میں یہ نہیں ہوتا۔ وحی ہمیشہ صاف، واضح اور متعین زبان و تعبیر کی حامل ہوتی ہے جس میں الجھاؤ، تضاد اور تعبیر کی کثرت و تلون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک وحی کے متعلق دوسرے اور تیسرے اصول کا تعلق ہے، اس کے لیے دلیل آرائی کی قطعی ضرورت نہیں۔ ان کی وضاحت و تشریح ہی ان کی حقانیت پر دلالت کناں ہے۔ مزید برآں ایسا ہوتا ہے کہ بسا اوقات سچائیاں اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود حجت و استناد کے ایسے معیار قائم کر لیتی ہیں کہ جن سے انحراف ممکن نہیں رہتا۔ بیکن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ حقیقت کا اثبات ضروری نہیں کہ منطقی صغریٰ کبریٰ کی ترکیب و ساخت ہی کا مرہونِ منت ہو۔ تجربہ اور نتائج کی استواری و صحت بھی بسا اوقات اثباتِ مدعا کا کام دے جاتی ہے۔ اگر انبیاء کی ذہنی سطح اپنے ہمعصروں سے اونچی نہ ہوتی، اگر ان کے کردار میں اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی اور بلندی نہ پائی جاتی اور اگر وہ پیش آمدہ مسائل کا صحیح صحیح حل پیش نہ کر پاتے تو نوعِ انسانی کی کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکتے اور اپنے ہم زمانہ لوگوں میں اپنے لئے محبوبیت و پذیرائی کا وہ مقام ہرگز حاصل نہ کر پاتے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے نقوشِ قدم کی پیروی و اطاعت صدیاں بیت جانے کے بعد بھی انسانی سعادت کی معراج قرار پاتی۔ تاریخ نے اگر کچھ ناموں، شخصیتوں اور فکر و کردار کے سانچوں کو محفوظ رکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں فکر و تصور کی بلندی اور کردار و سیرت کی استواری و پاکیزگی کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں اور انسانی معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ تاریخ باوجود اپنی سرد مہریوں کے ان کو بھلا نہیں سکی اور یہی صورتِ حال مظہرِ نبوت کی تحقیق و اثبات کا قابلِ اعتماد پیمانہ بھی ہے۔ عنایتِ الٰہی کی ان ارزانیوں سے جو نبوت و رسالت کی اصطلاحوں سے تعبیر ہیں، انسان کی ذہنی و فکری شادمانیوں کا اگر اہتمام ہوا ہے اور ہر ہر دور کے مسائل کی گتھیاں اگر انہوں نے سلجھائی ہیں اور تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے بڑھایا ہے تو اپنے دعووں میں بلاشبہ یہ حضرات صادق تھے۔ ان کو حق بجانب ٹھہرانے کے لیے کسی مصنوعی تفلسف، منطق آرائی اور علم الکلام کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیغام کی کامیابی، ان کی ذہنی و فکری بلندی اور کردار و سیرت کا غیر معمولی تفوق ہی وہ حقائق ہیں جو ان کو صداقت شعار قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

تصورِ نبوت کے بارے میں ڈاکٹر صبحی صالح کی حرفیت پسندی

جس طرح ہم نے تصورِ نبوت کے بارے میں سسرو کے اس نظریہ سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ کہانت اور وحی دو خانوں میں تقسیم پذیر ہے، اور یہ بتایا ہے کہ نبوت کا اطلاق صرف ایک ہی متعین و مخصوص مظہر پر ہوتا ہے اور وہ مظہر وہ ہے جس کا تعلق عنایاتِ الٰہی کی فیض رسانیوں سے ہے، اسی طرح ہمیں اجازت دیجیے کہ ڈاکٹر صبحی صالح کے اس عجیب و غریب نظریہ کی تردید کریں کہ پیغمبر کی ذات دو مختلف عناصر سے تعبیر ہے۔ ایک عنصر وہ ہے جو وحی و تنزیل کے اشارات کو قبول کرتا اور لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ایک وہ ہے جس کا تعلق پیغمبر کی بشریت سے ہے۔ جہاں تک پیغمبر کی اس حیثیت کا تعلق ہے جو وحی و تنزیل کا محل و گہوارہ ہے، اس میں بلاشبہ لغزش و خطا کا کوئی احتمال نہیں لیکن بشری تقاضے ان کو نہ صرف لغزش و خطا کا ہدف ہی قرار دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی گناہ اور ذنب کے ارتکاب پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔

انھیں تعجب ہے کہ رازی اور رشید رضا نے قرآن حکیم کے ان مقامات کی تاویل کیوں کی، جہاں پیغمبر کے لیے "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جہاں بعض امور پر اس کو ٹوکا اور متنبہ کیا گیا ہے، اور کھلے اور واضح الفاظ میں اس کے طرزِ عمل پر عتاب و سرزنش کا اظہار کیا گیا ہے اور طلبِ مغفرت کی تلقین کی گئی ہے[1]

رازی اور رشید رضا کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم کے اس اسلوبِ بیان اور ان مقامات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، جہاں پیغمبر کے لیے "ذنب" کا لفظ بولا گیا ہے، جہاں اس کو ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرنے پر زجر و توبیخ کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام مقامات تاویل طلب ہیں اور سیاق و سباق کی رعایت، لغت و ادب کے صحیح مفہوم اور منصبِ نبوت کی عظمت و توقیر کی روشنی میں ان تمام آیات کی ایسی مناسب اور شایانِ شان تشریح ممکن ہے جس سے کہ پیغمبر کی عصمتِ کردار پر حرف نہ آنے پائے اور ذاتِ پیغمبر بدستور انسانی ہدایت و رہنمائی کا مینارہ بنی رہے۔ ہمیں رشید رضا اور رازی کے مؤقف سے پورا پورا اتفاق ہے۔

ہمارے نزدیک صبحی صالح نے نبوت کے بارے میں جس طریقِ استدلال کا سہارا لیا ہے وہ کھری حرفیت پسندی پر مبنی ہے اور اس بصیرت، عمق اور منطق سے قطعی محروم ہے جس سے نبوت کے فہم و ادراک میں مدد لینا چاہیے۔ قرآن حکیم کی رُو سے نبوت کیا ہے؟ کن کن ذہنی و فکری خوبیوں اور بلندیوں سے آراستہ ہے اور نبی وحی و تنزیل کے کون کون خزائن، اللہ کے بندوں تک پہنچانے پر مامور ہے؟ اس سے قطع نظر کہ خود ان باتوں سے بھی اس کی حیثیت کا تعین ہوتا ہے، اس کی ذات پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ میں اس کا کردار کیا ہے۔ کیا اس کو لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نہیں بھیجا جاتا؟ کیا اس کی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل نہیں کہ یہ فرد و معاشرہ کو گناہ و معصیت کی راہ سے ہٹا کر صحت و صواب اور تزکیہ و تخلیہ کی راہ پر ڈالنے کی سعیِ بلیغ فرمائے؟ ان میں شر اور بغاوت کے جذبات کو فرو کرنے کی کوشش کرے اور اطاعت و پیروی کی روح پھونک سکے؟ ان کو فکر و عمل کی پاکیزگی بخشے اور اس لائق ٹھہرائے کہ اس عالمِ شر و فساد میں نیکی کا پرچم اونچا رکھیں۔

---

[1] مباحث فی علوم القرآن طبع سادس۔ بیروت ص ۲۰

اگر ہمارا یہ تجزیہ صحیح ہے اور پیغمبر کا اجتماعی کردار ان تمام تقاضوں کو امکان کی حد تک پورا کرنے کا مترادف ہے تو پھر اس کی حیثیت یہ تو ہرگز نہ ہونی چاہیے کہ یہ گناہ اور معصیت کے اثرات سے اپنا ہی دامن بچا نہ سکے اور احکام الٰہی یا منشائے الٰہی کا جیتا جاگتا نمونہ اور ترجمان بننے کے بجائے ادنیٰ اگر خود بھی ادنیٰ خواہشات کے گڑھے میں کو د جائے پیغمبر کے بارے میں یہ بدگمانی، بد ذوقی اور ذات پیغمبر سے بیگانگی پر مبنی ہے پیغمبر کا وجود کسی نوع کی ثنویت کا متحمل نہیں ہوتا۔

اس حرفیت پسندی کے علاوہ جس نے نبوت کی وحدت کو دو خانوں میں تقسیم کرکے رکھ دیا ہے، ڈاکٹر صبحی صالح کے طرز استدلال میں خامی دو وجہ سے ابھری ہے۔ ایک تو انھیں یہ معلوم نہیں کہ بشریت کے حدود وارتقا کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں؛ اور دوسرے ان کی نظر وحی کی منوفشانیوں سے ناآشنا ہے۔ جہاں تک انبیا کی بشریت کا تعلق ہے اہل علم کے حلقوں میں اس میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ قرآن حکیم نے بار بار ان کی بشریت کا اقرار کیا ہے۔ اقرار ہی نہیں کیا، اس پر زور دیا ہے اور اس کو ایک مسلمہ عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور مشرکین مکہ کے اس استعجاب و انکار پر کہ کیا بشر رسول ہو سکتا ہے، یہ بتایا ہے کہ بشر ہی کو یہ زیبا ہے کہ وہ منصب نبوت پر فائز ہو سکے۔ کیونکہ بصورت دیگر اس کی زندگی عالم بشری کے لئے نمونہ واسوہ کیونکر قرار پا سکتی ہے؟

نقطۂ اختلاف یہ امر ہے کہ بشریت کے مضمرات ارتقا متعین اور محدود ہیں اور کیا بشر کے معنی صرف اکل وشرب کے عادی اور انسانی کمزوریوں کی حامل مخلوق ہی کے ہیں، یا رشد و اصلاح اور تعلیم و تزکیہ اور مجاہدہ و ریاضت کی خوبیوں سے اس مقام تک بھی اس کی رسائی ممکن ہے کہ جہاں یہ بشر ہوتے ہوئے بھی گناہوں سے اپنا دامن عمل بچا لینے پر قدرت حاصل کر سکے۔ یہی نہیں، جہاں اس کی حرکت و عمل کا محور صرف گناہوں سے باز رہنا اور مجتنب رہنا ہی نہ ہو بلکہ اس کی تلاش و جستجو اور دوڑ دھوپ کا مرکز یہ سوال قرار پائے کہ یہ کس حد تک خوب سے خوب تر کی طرف بڑھ سکتا ہے، کس حد تک حسن سے احسن تک ترقی کر سکتا ہے اور کس حد تک یہ اپنی اخلاقی و روحانی سطح کو بلند سے بلند تر فرازنہ تک اچھال دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارے نزدیک بشریت اپنے فکری و عملی ارتقا کے اعتبار سے کلی مشکک ہے، جس کے اوائل کا تعین تو ممکن و معلوم ہے، انتہا کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ہم نہیں بتا سکتے کہ اس کے فکر کی پرواز کن کن معجزات عقلی کا احاطہ کرے گی اور اس کی محبت خیر و حق اس کو کردار و عمل کے کن نئے نئے آفاق سے روشناس کرائے گی۔ انبیاؑ کی نسبت سے عصمت عمل و کردار کا تصور بشریت کے معمولی اور ابتدائی درجے کی غمازی کرتا ہے جس پر بہت سے حکیم اور صوفی فائز رہے ہیں۔ انبیاؑ کا وصف اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ نہ صرف خود کامل و معصوم ہوں بلکہ انسانوں کو کمال و خیر کی راہ دکھائیں۔ چنانچہ یہ حضرات صرف معصوم ہی نہیں ہوتے، خیر کا پیکر فعال بھی ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایسے سرچشمۂ فیض کی ہوتی ہے جس سے ہمیشہ نیکی، سچائی اور خیر کی لہریں اٹھتی اور چھلکتی رہتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر سے بھی سہو و نسیان اور لغزش فکر کا صدور ہو سکتا ہے۔ لیکن اس لغزش فکر کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ گناہ اور نیکی میں سے اپنے لئے بہ تقاضائے بشری کوئی گناہ پسند کر لیتا ہے، اور اس طرح اپنے منصب کو پورے طور سے ادا کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ پیغمبر اور گناہ کا ارتکاب منطق کی اصطلاح میں متناقض بنفسہ کے مترادف ہے، کیونکہ پیغمبر اگر عام انسانوں کی طرح گناہ گار ہو تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے، پیغمبر نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر کی غلطی کس نہج کی ہوتی ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک سائنٹسٹ، ایک طبیب اور ایک فقیہ کی مثال فکر و نظر کے سامنے لائیے۔ فرض کیجیے، ایک سائنٹسٹ اپنے معمل میں طبیعیات کے بعض قوانین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بسا اوقات بعض ایسے مفروضے اور مقدمات فرض کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو نتائج کے اعتبار سے صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے فکر و فہم کی یہ غلطی اس کے جذبہ تحقیق کو روک دینے کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس جذبے کے لیے مہمیز ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح طبیب مریض کے علاج کے سلسلے میں مختلف دواؤں کو آزماتا ہے اور آخر کار ناکامی کی صورت میں مایوس نہیں ہو جاتا بلکہ صحیح نسخہ دریافت کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال فقیہ کا ہے، وہ بھی جزئیات و مسائل کے حل و کشود کے لیے مختلف اصول جانچتا پرکھتا ہے، مختلف آیات و احادیث پر نظر دوڑاتا ہے اور تطبیق و اطلاق کے ضمن میں بعض اوقات اجتہاد و فکر کی بے راہ روی کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔ ان میں کسی کی غلطی بھی ایسی نہیں جو جرم، گناہ اور فن و منصب سے غداری کہلائے۔ کیوں کہ فکر و عمل اور سعی و طلب کے عمل کا یہ خاصہ ہے کہ صحت و صواب کی تلاش میں انسان لغزش کا بھی شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں بلاشبہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سے ایک سائنٹسٹ، ایک طبیب اور فقیہ مختلف زاویہ ہائے نظر سے دوچار ہوتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے کہ حصول مقصد کی خاطر یہ کس اصول کا اطلاق کرے اور معاملہ زیر بحث کو کس زاویۂ نظر سے دیکھے اور جانچے۔ اور پھر جب اس بارے میں ان سے کسی لغزش کا صدور ہو جاتا ہے جو بتقاضائے بشری ہونا چاہیے، تو یہ لغزش ایک اناڑی، جاہل اور راحدی انسان کی لغزش نہیں ہوتی کہ اس پر مورد عتاب ٹھہرے۔ یہ لغزش ایک بیدار عقل، ایک بے قرار جستجو اور عالم و فقیہ کی لغزش ہوتی ہے جو آئندہ کامیابیوں کی تمہید بن جاتی ہے یہی حال پیغمبر کی سعی خیر و جمال کا ہے۔

یعنی ایک پیغمبر معاشرے کی اصلاح یا اپنی روحانی تکمیل و ارتقا کے سلسلے میں جب خوب سے خوب تر کی تلاش میں فکر و اجتہاد کی کوششوں کا آغاز کرتا ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خوب تر کی بجائے خوب پر قناعت کر بیٹھے اور اولیٰ و افضل کو اختیار کرنے کے عوض مباحات ہی کو اپنا لینے میں مصلحت سمجھے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی یہ لغزشِ اجتہاد و فکر جو فی نفسہٖ خیر اور بہت بڑی نیکی ہے، گناہ اور معصیت سمجھی جائے یا پیغمبر کے اس اختیار کو خواہشاتِ نفس کی پیروی پر مبنی مانا جائے۔ پیغمبر نہ تو کبھی نفس کی سطح سے بولتا ہے اور نہ نفس کی سطح سے متاثر ہو کر کوئی قدم ہی اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے عمل و کردار کے لئے جس قندیل سے روشنی حاصل کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور احکامِ الٰہی کی قندیل ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہونے پاتی:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ (النجم: ۳، ۴)

ترجمہ: اور وہ خواہش نفس سے منہ سے نہیں بولتا۔ یہ قرآن تو وحیِ خداوندی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔

وحی کا مفہوم

وحی سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اس کو منصبِ نبوت سے بہرہ مند کرے تو اس کے قلب و ضمیر اور وجدان و فکر کو وحی و تنزیل کے نور سے روشن کر دیتا ہے اور یہ وحی چونکہ زندگی کے بارے میں رشد و ہدایت کی حامل ہوتی ہے اور ان نکات و معارف کی ترجمانی کرتی ہے جن سے خیر و شر میں فرق و امتیاز کے خطوط ابھرتے ہیں، جن سے انسان میں ایک خاص طرزِ عمل

اور متعین اسلوب اور فکر کی تخلیق ہوتی ہے اور کردار و بصیرت اخلاق کے پاکیزہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ اس بنا پر وحی کے اس عمل کو ہم محض میکانکی عمل قرار نہیں دے سکتے کہ جس سے اصلاح، تعمیر اور روحانی ارتقا کا کام نہیں لیا جاتا۔ پیغمبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وحی و الہام کی روشنی سے یہ خود بیگانہ رہتا ہے یا اس منصب سے اس کی اپنی زندگی متاثر نہیں ہو پاتی۔ وحی تعلیم ہی نہیں تربیت بھی ہے، ابلاغ ہی نہیں عمل بھی ہے۔ اسی طرح اس کو صرف پیغام ہی نہیں کہہ سکتے، اس کو خیر و جمال کی اداؤں کی دل نوازی عطا کرنے والی ایک ہمہ جہت قوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے صرف پیغمبر کا نہاں خانۂ عمل ہی متنیر نہیں ہوتا، اس کے ساتھ سیرت اور روزمرہ معمولات کا ہر ہر گوشہ بھی جگمگا اٹھتا ہے۔ اس سے پیغمبر روشنی اور زندگی کے حقیقی راز سے آشنائی حاصل کرتا ہے اور اس نکتہ سے آگاہ ہوتا ہے کہ ایک کمزور اور ضعیف و ناتواں انسان توفیقِ الٰہی کی دستگیری سے کیونکر گناہ، شر اور برائی پر فتح حاصل کر سکتا ہے اور ایک گناہ گار اور مجرم معاشرے کو کس طرح تقویٰ اور پاکبازی کی راہ پر ڈال دینے کی استطاعت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

یہاں تک تصورِ نبوت و وحی کے منطقی لوازم کا تذکرہ تھا اور بحث و نظر کا اسلوب عموم و اجمال لیے ہوئے تھا۔ اب ہمیں ذرا تفصیلات سے تعرض کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اہلِ کتاب نے وحی و نبوت کے ظہور کو کس نظریے سے دیکھا اور اسلام نے اس کو کیونکر نکھارا اور واضح کیا۔ اس کے بارے میں کس کس غلط فہمی کو دُور کیا اور کیوں کر خیوضِ ربوبیت کی اس روشنی میں اس کو تکمیل و اتمام کی منزلوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وحی و نبوت کے مسئلے میں اختلاف کے کئی پہلو ہیں، اور اس کے باوجود یہودی، عیسائی اور مسلمان بظاہر سب انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصورِ نبوت مشترکہ مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ ذوق و ادراک کے فرق، اغراض و مقاصد کی بوقلمونی اور تاریخ کی ستم ظریفیوں نے اس اشتراک میں متعدد رخنے ڈال رکھے ہیں۔

سب سے پہلے انبیا کی فہرست ہی پر نظر ڈالیے، اس میں ایسے نام نظر آئیں گے جو ایک گروہ کے ہاں خاصے جانے بوجھے اور معروف ہیں تو دوسرا گروہ ان سے قطعی ناآشنا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم نے حضرت ہود، صالح، شعیب اور ذوالکفل کا پیغمبر کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اسرائیلی ادبیات میں ان اسماء سے وقوف و شناسائی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اسی طرح عہد نامہ قدیم میں اشعیا کا نام آتا ہے، جس نے ۷۶۹ - ۶۹۳ ق م اپنے کو پیغمبر کے نام سے پیش کیا۔ سارمیا کا ذکر ہوا ہے جس نے شاہ یوشی یاہ کے عہد میں فرائضِ نبوت انجام دیے اور بارُوک نامی شخص کی تعلیمات جزوِ کتاب بنی ہیں، جو پہلے ارمیا کا کاتب تھا اور پھر منصبِ نبوت کا اہل سمجھا گیا۔ یہ اور اس نوع کے کئی نام اور ہیں جن سے اسلامی روایات کوئی جان پہچان نہیں رکھتیں۔ ناموں کے اختلاف کے علاوہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت و جوہر سے متعلق بھی فکر و عقیدہ کا انداز ایک سا نہیں ہے تو اس سے اس مظہر اصلاح و ہدایت کے لئے کوئی مشترکہ اساس رشتہ اور خصوصیت کا تعین از حد دشوار ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کے حدود کو وسیع تر کرنے میں بنی اسرائیل کی اس بدقسمتی کو بڑا دخل ہے کہ ان کے ہاں شروع ہی سے وحی و نبوت کی پہچان اور تصدیق کے لئے کوئی واضح اور اونچا داخلی یا خارجی پیمانہ پایا نہیں جاتا، جس کی وجہ سے اس عظیم منصب کے تقدس کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔

ہوا یہ کہ سقوطِ فلسطین کے بعد یہودیوں کے نقطۂ نظر میں ایک خوفناک تبدیلی نے کروٹ لی۔ جب اس پر اجنبی اقتدار کی گرفت سخت ہو گئی اور ان کو اپنے قدیم ماحول اور گرد و پیش سے نکل کر دوسری قوموں اور گروہوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈالنا پڑا۔ اس سے ان کے

قومی پندار و غرور کو سخت دھچکا لگا اور ان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار پایا کہ اپنی تمام تر کوششوں کو فلسطین کی بازیابی کے مسئلے پر مرکوز کر دیں اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ نبوت و وحی کے کردار و عظمت کی سمتیں بدل گئیں۔

جہاں ابراہیم، داؤد اور حضرت موسیٰ ایسی بلند پایہ شخصیتیں اپنی غیر معمولی بصیرت و ادراک، اپنے سیاسی تدبر و شکوہ اور اپنے پیغام کی رفعتوں کی بدولت پیغمبر کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئیں، وہاں ایسے لوگوں کو بھی اقلیم نبوت میں در آنے کا موقع ملا جن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے اسرائیل کے قومی پندار کو اجاگر کیا، حادثۂ فلسطین پر نوحے ترتیب دیئے اور فلسطین کے اقتدار کو بحال کرنے کی پیش گوئیاں کیں۔ فلسطین کی شکست اور اجنبی اقتدار و تسلط کے مسئلے نے یہودیوں کو اس درجہ دیوانہ کر دیا کہ یہ مذہب کی روح کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور مخالفین کے خلاف معاندانہ جذبات نے ان سے دینی بصیرت کو اس حد تک چھین لیا کہ جس نے بھی ان کی قومیت کو ابھارا اور فتح و نصرت کے وعدوں کا اعادہ کیا، فلسطین پر دوبارہ قبضے کی پیش گوئی کی، بغیر سوچے سمجھے اس کو نبوت کی مسند پر بٹھا دیا گیا، چاہے اس کے نوحوں، نعروں اور وعدوں میں کوئی جان نہ ہو، کوئی روحانی پیغام نہ ہو اور کسی معاشرتی مسئلے کا حل نہ پایا جائے۔ اس سے بڑھ کر چاہے اس کے کردار و عمل کے دامن پر فسق و فجور کے شرمناک چھینٹے نمایاں ہوں۔ یہودیوں میں یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ انبیا کی فہرست میں چار سو حضرات ایسے پائے گئے ہیں جن کی پیش گوئیاں پوری نہ ہوئیں اور اس بنا پر انھیں جھوٹے نبی کے نام سے پکارا گیا۔

نبوت کے اس غلط تصور سے دو واضح نقصان پہنچے، ایک طرف تو اللہ تعالےٰ سے مکالمہ و مخاطبہ کا یہ اسلوب و منہاج بدنام ہوا اور نبوت، وحی و تنزیل کی بلندیوں سے گر کر کہانت کی سطحوں تک آ پہنچی۔ دوسرے یہودیت ایک عالم گیر اور روحانی و اخلاقی دعوت و پیغام ہونے کے بجائے تنگ نظرانہ قومیت کی علم بردار بن گئی، اور لطف یہ ہے کہ یہودی متکلمین اور حکما کی کوششوں کے باوجود آج بھی مذاہبِ عالم کی برادری میں یہودیت کا شمار ایک ایسے مذہب ہی کی حیثیت سے ہوتا ہے جس کی حدود نسل اور جغرافیہ کے تقاضوں سے آگے نہیں بڑھ پاتیں۔

نبوّت کی اس روایت سے کلیسا کا انحراف

غالباً تصور کی اس پستی کا یہ ردِ عمل تھا کہ کلیسا نے مسیح کو خدا یا لاہوت کے ایک اقنوم کی شکل میں پیش کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہودی روایات میں نبوت کا منصب حد درجہ پستی لیے ہوئے ہے تو اسے یہ شایانِ شان نہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب پیر و مرشد کو پیغمبر کے روپ میں دکھائے۔ اس نے اس طرح ہزاروں برس اس رچی جمی روایت سے انحراف اختیار کیا۔ اول اول اس تصور کی تخم ریزی یوحنا کی انجیل نے کی، پال نے فلو (PHILO) کے رنگ میں اسے فلسفہ کا رنگ دیا اور کلیسا نے اس مصرع طرح پر تثلیث کی پوری غزل کہہ دی اور کہا کہ جب خداوندِ خدا نے دیکھا کہ اس مظہرِ خاص سے جسے منصبِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کی اصلاح و تکمیل کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ یعنی گلستانِ انسانیت کی دیکھ بھال کا کام پوری طرح نہیں ہو پاتا تو خداوند مسیح کی صورت میں جلوہ گر ہوا تاکہ اس گلستان کی خود حفاظت و نگرانی کر سکے۔

یہ انجیل کے رنگ میں ایک تمثیل اور پیرایۂ بیان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ پیغمبر بھیجنے کی جو رسم ہزاروں برس سے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کی خاطر چلی آ رہی تھی، نتائج کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی، اس لیے اب اسے نئے تجربے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ذاتِ گرامی جس نے پیغمبر اور نبی بھیجے تھے بہ نفسِ نفیس انسان کے روپ میں خود دنیا میں آئے اور انسانی مصائب آلام

کا مداوا کرے۔

بحث و تحقیق کے اس موڑ پر ہم یہ سوال پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ کیا اس عجیب و غریب تجربے کی ناکامی کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا اور کیا اظہارِ ذات کے اس تجربے سے انسان کے شخصی و اجتماعی آلام کا قطعی خاتمہ ہو گیا ہے اور انسان نے تمام انواع کے دکھ درد سے نجات پا لی ہے؟ کلیسا کے اس تصور کو اظہارِ ذات (SELF DISCLOSURE) یا تجسیم (INCARNATION) کے الفاظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے لاہوت تین اقانیم پر مشتمل ایک حقیقت کا نام ہے، جو باپ، بیٹا اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں اور ان میں رابطہ و تعلق کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ تین ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں اور ایک ہوتے ہوئے بھی تین ہیں۔ ہم تثلیث کی منطق کو چیلنج کیے بغیر یہ کہیں گے کہ عقائد کا یہ اسلوب کلیسا کے حلقوں میں تو بلاشبہ سندِ قبول حاصل کر سکتا ہے کہ یہاں اس کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی انوکھی باتیں ہیں جنھیں باور کیا جاتا ہے، مگر جہاں تک مسیح کے ان مخاطبین کا تعلق ہے جن کی اصلاح و ہدایت کے لیے یہ معبوث ہوئے ان میں اتنی استعداد ہرگز نہ تھی کہ وہ اس مابعد الطبیعی گورکھ دھندے کو سمجھ سکیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ آج کا پختہ اور سائنسی شعور و ادراک بھی اس گورکھ دھندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے عیسائی دانشوروں نے اس کی ایسی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو قابلِ فہم ہوں۔ ایل ہاڈ گاسن (L.H ODGOSON) کا کہنا ہے کہ مسیح کی تجسیم یا الوہیت کے پیکرِ بشر میں ظہور کی تین صورتیں عقل و خرد کی گرفت میں آسکتی ہیں:

۱- یہ کہ انسان نے اللہ کے علمِ کل میں مسلسل مشارکت کی ہو۔ تعبیر کے اس انداز کو اختیار کرنے میں یہ احتمال پنہاں ہے کہ شاید اس کو عیسائیوں کا کوئی بھی مدرسۂ فکر قبول نہ کر سکے، کیونکہ یہ اس عقیدے کے خلاف ہے جو لوقا کی انجیل میں درج ہے کہ ہمارا لارڈ صحیح معنوں میں انسان یا بشر کامل تھا۔

۲- یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا لارڈ (ناقابلِ فہم طریق سے) علم کی اس نوعیت سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن انسان کے روپ میں جلوہ گر ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح علم کی اس نوعیت کا اظہار نہ کر سکا۔ یہ دراصل اناجیل میں ان مختلف فقرات کی تطبیق و توافق کی ایک شکل ہے، جن سے کہیں اس کی الوہیت کی طرف اشارہ ہے اور کہیں اس کی بشریت کی طرف۔

۳- یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حدودِ تجسیم میں داخل ہونے کے معنی بشری تجربے سے دوچار ہونے کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح جب تک بشری روپ میں ہے اس وقت تک وہ جسم و روح اور فکر و نفسیات کے اعتبار سے بشر ہی ہے[1]۔

یہ اندازِ فکر تو اس دَور کے عیسائی متکلمین کا ہے۔ خود قدیم عیسائی متکلمین بھی تجسیم اور تثلیث کو مان کر مسیح کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ عالمِ لاہوت میں ان کا مقام کیا ہے اور تجسیم اپنے جلو میں خدائی کے کن پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے۔ جسٹن (JUSTIN.) کی یہ رائے ہے کہ تجسیم کے یہ معنی ہیں کہ مسیح کی ذات میں عقل و خرد مرکوز ہو گئی ہے، اور اس میں وہ مسیح کو منفرد نہیں مانتا بلکہ عقل و خرد

---

[1] اے نیو کومینٹری آن ہولی سکرپچر مطبوعہ لندن حصہ دوم صفحہ ۳۰۔

کے اس ازتکاز کو سقراط، افلاطون اور ہیراکلیٹس میں بھی تسلیم کرتا ہے کیونکہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ کلمہ (LOGOS) کا مسکن و محل بلفرق مراتب ہر شخص کا ذہن ہے۔

اسکندریہ کے مدرسۂ فکر کے بہت بڑے نقیب کلیمنٹ (CLEMENT) کا کہنا ہے کہ مبدأ اوّل زمان و مکاں سے بالا و منزہ ہے اس کا کوئی حقیقی نام نہیں، یہ تعداد و عدد سے بھی پاک ہے۔ انسان اپنی نیکی کی وجہ سے بیٹے (یعنی مسیح) کی طرح ہو سکتا ہے لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ کلیمنٹ کے نزدیک بیٹے اور باپ میں فرق ہے، بیٹا کلمہ کی تجسیم ہے اور باپ بیٹے سے بہرحال بڑا ہے۔ اسی اسکندری فلسفہ کے دوسرے عظیم شارح آریگن (ORIGEN) ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ سرچشمۂ وجود اور خالص روح ہے اور بیٹا اگرچہ خدائی صفات بھی رکھتا ہے مگر خدا ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ براہِ راست مسیح کے آگے دستِ دعا دراز کیا جائے۔ دعا اس کے نزدیک صرف خدا سے ہی مانگنی چاہیے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یوحنا کے ابہام اور پال کی تصریحات سے کلیسا نے جو مسیح کی الوہیت کا عقیدہ گھڑا وہ محض علم و فضل کا تصنع ہے، ورنہ کلمہ، روح اور بیٹے کا لفظ محض تعبیر و تشریح کا ایک انداز ہے جس میں اس دور کے ذہنی و فکری پس منظر کی جھلک نمایاں ہے اور اس پس منظر کا تانا بانا کئی عوامل سے تیار ہوا ہے، جن میں ایک عیسائیت کا رومی علم الاصنام سے آشنا ہونا ہے اور دوسرا اس میں ان پڑھے لکھے یہودیوں کا داخلہ ہے جو (PHILO) کے حکیمانہ افکار سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عیسائیت کی تعبیر ان افکار کی روشنی میں کی جائے۔ تیسرا عامل بائیبل کی ذو معنی زبان اور محاورات ہیں، ان سب عوامل نے مل جل کر تثلیث و تجسیم کا مرقع تیار کیا اور ماحول کی مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر اگر ان تصورات کا تجزیہ کیا جائے جو کلیسا کی روایتی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہیں تو اس کا مطلب اس سے زیادہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مسیحؑ کے عقیدت مندان کو بائیبل میں مذکورہ انبیاء کے مقابلے میں زیادہ اونچا، زیادہ بلند اور کامل دیکھنے کے آرزومند ہیں اور کیوں نہ ہو جب یہودی روایات میں نبوت و رسالت کا منصبِ عظیم محض قومی تنگ نظری کا مظہر بن جائے اور پیغمبر کا مصرف صرف یہ رہ جائے کہ فلسطین کی بازیابی کی پیش گوئی کرے تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے ایسے اطلاق کی تلاش کی جائے جو نسبتاً وسیع اور عالمگیر ہو اور اس لائق ہو کہ انسانیت اس سے سکون حاصل کر سکے۔

سیرتِ رسولؐ قرآن کی روشنی میں

مولانا عبد الماجد دریابادی

ظہور کی پیش خبریاں

ظہورِ مبارک کا واقعہ دنیا کے لیے بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر نہیں پیش آگیا۔ اہلِ کتاب یعنی یہود اور نصرانی دونوں ایک موعود کے انتظار میں صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ اور قرآن مجید نے ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے تو اس ظہورِ مبارک کے لیے دعا صراحت سے نقل کی ہے۔ یہ دعا تنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نہ تھی، ایک مبارک وقت جگہ دو مقدس بندوں کی زبان سے مل کر نکلی تھی اور اس میں حضرت ابراہیمؑ کے شریک ان کے فرزند حضرت اسماعیل بھی تھے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ اٹھا رہے تھے دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسماعیل بھی۔

مقام اتنا مقدس کہ خانہ کعبہ کا فرش، وقت اتنا مبارک، کہ عین تعمیر خانہ کعبہ کا زمانہ اور دعا کرنے والے اللہ کے دو مقبول ترین اور انتہائی برگزیدہ بندے، دعا سب سے پہلے اس کی کہ ہماری یہ خدمت قبول ہو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم سے ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ بے شک تو تو خوب سننے والا۔ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔

اس تمہید کے بعد عرض حال میں پہلی گذارش تو یہ تھی کہ ہمیں اور زیادہ توفیق طاعت واطاعت ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم سے ہماری خدمت فرمانبردار بنالے۔

اور پھر معاً بعد یہ آرزو کہ ہماری نسل سے ایک امتِ مسلمہ، ایک فرمانبردار قوم،

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اور ہماری نسل سے ایک اُمت بھی پیدا کر جو تیری فرماں بردار ہو۔

خیال کرکے سنیئے کہ قید "ہماری نسل" کی لگائی جا رہی ہے یعنی وہ نسل ابراہیمیؑ جو حضرت اسمٰعیلؑ کے واسطہ سے ہو۔ قید لگ جانے سے بنی اسحٰق سب نکل گئے اور امتِ مسلمہ بنی اسمٰعیل میں محدود ہوگئی یہ تو ہوئی اُمت اور اس کا رسول کون اور کیسا ہو؟ سماعت فرمائیے:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (البقرۃ، ع ۱۵)

اے ہمارے پروردگار! انھیں لوگوں یعنی بنی اسمٰعیل کے درمیان انھیں میں سے ایک رسُول بھیج۔ جو تیری آیتیں انھیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب (الٰہی) اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی اصلاح نفس کرے، بے شک غالب اور حکمت والا تو تُو ہی ہے۔

اور پھر اپنے وقت پر جب یہ رسُول ظاہر ہوچکا تو اس کا وصف اُس کے دوسرے اوصاف کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا کہ اس کا ظہور مکہ والوں کے درمیان ہُوا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (الجمعة، ع ۱)

وُہ اللہ ہی ہے جس نے اُمّ القریٰ کے رہنے والوں کے درمیان ایک رسول اٹھایا جو انھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی اصلاح نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب (الٰہی) اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی دُعاؤں کا ذکر ہو چکا، قرآن مجید سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ اس ظہور اقدس و مطہر کی پیش خبریاں اگلے آسمانی صحیفوں میں آچکی ہیں یہ ذکر قرآن نے کہیں تو ضمناً اور بالواسطہ کیا ہے۔ یعنی صرف کتاب کا ذکر کر کے اشارہ کتاب لانے والے کی طرف بھی کر دیا مثلاً:

وَاِنَّهٗ لَفِي زُبُرِ الْاَوَّلِينَ۔ (الشعراء، ع ۱۱)

اس کا ذکر یا اس کی خبر اگلے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

اور کہیں یہ ذکر براہ راست اور مستقلاً کیا ہے۔ اور ایسے موقع پر رسُولؐ کے اوصاف امتیاز خصوصی کو بھی گنا دیا ہے۔ مثلاً:

اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهٗ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف۔ ع ۲)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں۔ اُس اُمّی رسول و نبی کی جس کو (یعنی جس کے وصف کو) وہ لکھا ہُوا پاتے ہیں، اپنے ہاں توریت اور انجیل میں وہ حکم دیتا ہے اُنھیں نیک کرداری کا اور روکتا ہے اُنھیں بدکرداری سے اور پاکیزہ چیزیں اُن کے لیے جائز بناتا ہے، اور گندی چیزیں اُن پر حرام رکھتا ہے اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جواب تک تھیں اُتارتا ہے۔

يَجِدُونَهٗ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ یعنی ان رسُولؐ کے اوصاف و علامات یہ اہل کتاب اپنے ہاں توریت و

انجیل میں درج پاتے ہیں۔ قرآن مجید نے یہ دعویٰ اعلانیہ کر دیا اور معاصر اہل کتاب میں سے کسی کو اس سے انکار کی جرأت نہ ہوئی ورنہ جہاں اور سارے الزامات سرورِ کائنات اور آپ کی وحی پر رکھ رہے تھے وہاں ایک اس الزام کا بھی اضافہ کر دیتے کہ توریت و انجیل میں کہاں ایسے رسول کے ظہور کا پتہ نشان ملتا ہے؟

توریت میں جتنے تصرفات و تحریفات اب تک ہو چکے ہیں، اُن کے بعد یہ دعویٰ خود اہل توریت کا بھی باقی نہیں رہا ہے کہ یہ کتاب وحی لفظی کا نمونہ ہے لیکن اتنی تصحیف و تحریف کے بعد بھی کچھ تو حوالے اس میں اب بھی باقی رہ گئے ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے :۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی طرف کان دھریو" (استثنا ۱۸ - ۱۵)

"تیرے ہی بھائی" یعنی اسرائیل کے بھائی سوا بنی اسمٰعیل کے اور کون ہو سکتے ہیں! پھر ان اسمٰعیلیوں میں ایسا نبی جو "میرے ہی مانند" یعنی مشابہت حضرت موسیٰ سے رکھنے والا ہو۔ بجز ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کون ہوا ہے؟

اور پھر توریت کے اس صحیفہ استثنا کی اسی فصل میں دو ہی تین آیتوں کے بعد ہے،

"اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا۔ اچھا کیا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" (ایضاً ۱۸)

اسرائیل کے بھائیوں یعنی اسمٰعیلیوں کا ذکر اس آیت میں بھی اور "تجھ سا" یعنی موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت رکھنے والے کی تعیین یہاں بھی اور پھر آخری فقرہ کی تصریح کہ "اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالوں گا" صاف اس کا مرادف کہ اس کا پیام وحی لفظی کا مجموعہ ہوگا اور یہ وحی لفظی کا دعوےٰ بجز قرآن مجید کے روئے زمین پر آج کس کتاب اور کس پیام کے لیے ہے؟

توریت کے بعد اب انجیل پر آیئے۔ اس میں "ترجمہ اور ترجمہ" در ترجمہ کی بناء پر اصلاح ترمیم اور تبدیلی کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور وہ بھی چرا کر چھپا کر نہیں بلکہ علانیہ و فخریہ لیکن اس سارے کاروبار کے باوجود اس میں بھی یہ لفظ آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔ یہ حضرت مسیح اسرائیلیوں سے فرما رہے ہیں:۔

"یسوع نے ان سے کہا۔ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے، اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے، مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا" (متی ۔ ۲۱ : ۴۲ - ۴۴)

"کتاب مقدس کا" جو فقرہ یہاں نقل ہوا ہے اور انجیل مرقس ۱۲ : ۱۰-۱۱ اور انجیل، لوقا ۲۰ : ۱۸ میں بھی وہ دراصل داؤد نبی کی کتاب زبور کا ۱۱۸ : ۲۲ کا ہے معماروں یعنی اسرائیلیوں نے جس پتھر کو ہمیشہ رد کیا تھا وہ اسمٰعیلی ہی کونے کے سرے کا جو پتھر ہوا۔ یعنی نبوت جس کو سب سے آخر زمانہ میں ملی وہ بنی اسماعیل ہی کا ایک فرد تھا اور یہود و نصرانی جو بھی اس سے ٹکرائے، وہ پاش پاش ہو کر رہ گئے یا پس کر رہ گئے۔

توریت اور انجیل میں حوالے اور بھی ملتے ہیں ان سب کی یہاں سماعت فرمانے کے بجائے انھیں تفسیر ماجدی میں ملاحظہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔ قرآن مجید نے حضرت مسیح کی زبان سے ایک اور پیش خبری کا حوالہ صراحت کے ساتھ دیا ہے اس لیے اسے تو ہر حال سُنتے چلیے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الصف، ع ۱)

اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے اسرائیلیو! میں تمہارے پاس اللہ کا پیمبر آیا ہوں۔ تصدیق کرنے والا توریت کی، جو مجھ سے پیشتر سے ہے۔ اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آنے والے ہیں جن کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ ان کے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے تو یہ بولے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔

قرآن مجید نے جس قول کی جانب اشارہ کیا ہے وہ موجودہ محرف انجیل سے بھی تمام تر محو نہ ہو سکا، بلکہ اس کے حوالے ایک نہیں تین تین جگہ آج تک موجود ہیں ملاحظہ ہوں۔

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار (یا وکیل یا شفیع) بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے"

(یوحنا، ۱۴ : ۱۶)

"جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا" میں صاف اشارہ موجود ہے۔ اس کی شریعت دائمی ہوگی دوسری جگہ ہے۔

"جب وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا" (یوحنا، ۱۵ : ۲۶)

اور تیسری مرتبہ:

"اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (یا وکیل یا شفیع) نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا" (یوحنا۔ ۱۶ : ۷، ۸)

یہ عبارتیں جو پڑھ کر سنائی گئیں۔ اردو بائبل کی نقلیں اور بائبل کے اُردو مترجمین نے متن میں لفظ مددگار اور حاشیہ پر "وکیل" اور "شفیع" دیئے ہیں اور انگریزی بائبل میں جو پروٹسٹنٹ فرقہ کی ترجمان ہے اس کے لیے

لفظ COMFATEN آیا ہے یعنی تسلی دہندہ اور جو انگریزی بائبل عقیدہ کیتھولک کے مطابق ہے اس میں ان مرقوں پر لفظ PANECLELE درج ہے۔ ہمارے یہاں کے فاضلوں کا بیان ہے کہ جس یونانی لفظ کے لیے "مددگار" لاتے ہیں کبھی "وکیل" کبھی "شفیع" کبھی "تسلی دہندہ" اور کبھی PRAELETE وہ اصل میں PERICLYTS ہے جو صحیح ترجمہ لفظ احمد، یہ معنی محمود (ستودہ) کا ہے۔

غرض یہ کہ جو توحیدی قومیں آغاز اسلام کے وقت دنیا میں موجود تھیں اور جو سلسلہ نبوت و وحی کی قائل تھیں ان کے مقدس نوشتوں میں پیش خبریاں شروع ہی سے ایک اسماعیلی نبی کی چلی آرہی تھیں، جس کی شریعت دائمی ہو گی یعنی وہ سلسلہ انبیاء کا خاتم بھی ہوگا۔

فضائل، خصائص، مشاغل

قرآن مجید سے جہاں ایک طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد مصطفےٰ صلعم کوئی فوق البشر یا فرشتہ وغیرہ نہ تھے، بلکہ محض بشر تھے، جیسے دنیا میں بشر ہوا کرتے ہیں اور خود آپؐ کی زبان سے دو دو بار کہلایا گیا ہے کہ:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تو محض ایک بشر ہوں تم ہی جیسا

ایک بار سورۃ الکہف کے رکوع ۱۲ میں اور دوسری بار سورۂ حم السجدہ کے رکوع اول میں اور یہ بھی کہ آپؐ کوئی انوکھے پیغمبر ہو کر دنیا میں نہیں آئے تھے، بلکہ آپؐ سے پیشتر بہت سے انبیاء و مرسلین آچکے تھے اور آپ بس انھیں میں کے ایک فرد تھے۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ (البقرۃ، ع ۳۳)
بے شک ان بھیجے ہوؤں میں سے ایک آپؐ ہیں۔

فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۔ (النمل، ع ۷)
آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تو بس ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ (آل عمران، ع ۱۵)
محمدؐ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک رسولؐ ہیں اور ان کے قبل بہت سے رسولؐ گذر ہی چکے ہیں۔

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ (یونس، ع ۱)
کیا لوگوں کو اس بات پر حیرت ہے کہ ہم نے انھیں میں سے ایک آدمی پر وحی بھیج دی کہ لوگوں کو ڈرائے بھی (ہمارے عذاب سے) اور مومنوں کو خوشخبری بھی پہنچائے۔

اور خود آپؐ کی زبان سے یہ کہلایا گیا:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ۔ (الاحقاف، ع ۱)
آپؐ کہہ دیجئے کہ رسولوں میں میں کوئی انوکھا رسولؐ تو نہیں ہوا۔

اور ساتھ ہی آپ کی بے اختیاری بھی ان الفاظ میں کہلا دی گئی۔

وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ۔ (الاحقاف، ع:۱)

میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کیا معاملہ میرے ساتھ پیش آئے گا اور کیا تمہارے ساتھ۔

بلکہ یہاں تک بھی، کہ

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ (یونس، ع ۵)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے تو کسی ضرر اور کسی نفع کا اختیار ہی نہیں رکھتا، مگر جتنا اللہ کو منظور ہو۔

اور آیت کا یہی ٹکڑا ایک برائے نام لفظی اختلاف کے ساتھ سورۂ الاعراف رکوع ۲۳ میں بھی ملتا ہے۔

اور وقت قیامت کے علم کی بھی نفی آپ کی ذات سے کرائی گئی ہے باوجود اس کے کہ وقوع قیامت کا ذکر بڑی شد و مد کے ساتھ آپ کی زبان سے سنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ۔ (الاعراف، ع: ۲۳)

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کب واقع ہوگی۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم صرف میرے پروردگار ہی کے پاس ہے اس کے وقت پر سوا اللہ کے کوئی اس کو ظاہر نہ کرے گا۔

بلکہ آپ کی غیب دانی اور آپ کی مالکیت خزائن الٰہی اور آپ کی ملکیت اس سب کی نفی پر تصریح آپ کی زبان سے کرا دی گئی۔

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ۔ (الانعام، ع:۵)

آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ (کی سرکار) کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو بس اسی حکم پر چلتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ دنیوی علوم و معارف سے بھی یکسر آپ کی ناشناسی ظاہر کر دی گئی۔ حالانکہ جس عہد میں آپ کا ظہور ہوا تھا اس وقت تک بابل، چین، ایران، مصر، ہندوستان، یونان، روما، سب کہیں علوم و فنون خوب اپنا زور دکھا چکے تھے، اور بڑے بڑے شاعر اور ادیب، مؤرخ اور مہندس، حکیم اور فلسفی، کرۂ ارض کے طول و عرض میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے، اور علوم و فنون الگ رہے۔ قرآن مجید نے تو آپ کی اُمیت یا حرف ناشناسی کی بھی صاف و صریح گواہی دی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ۔ (عنکبوت، ع:۵)

اور اس قرآن کے نزول سے پہلے آپ نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھ سکتے تھے۔

اور پھر کہا ہے :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ ۔ (الجمعہ، ع ۱:)

وہ اللہ وہی ہے جس نے اُمّیوں کے درمیان انھیں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔

اور پھر سورۂ الاعراف میں قریب ہی قریب دو دو جگہ آپؐ کے نبی اُمّی ہونے کا اعلان اسی طرح ہے کہ گویا النبی الامی آپؐ کا علَم ہے۔

رکوع ۱۸ میں ہے ۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ ۔

جو لوگ پیروی کرتے ہیں رسُول نبی اُمّی کی ۔

اور ساتھ ہی ساتھ جا بجا تنبیہیں بھی ہیں ۔ جیسی کہ خالق اپنی محبوب ترین و مکرم ترین مخلوق سے ہی کر سکتا ہے ۔ چنانچہ ایک جگہ موقع جہاد پر بعض صحابیوں کے پیچھے رہ جانے کے سیاق میں ہے ۔

عَفَا اللَّهُ عَنكَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۔ (التوبہ ۔ ع : ۷)

اللہ آپ کو معاف کرے ۔ آپؐ نے اُنھیں کیوں اجازت دے دی ۔ آپ کو رُکنا تھا جب تک اُن لوگوں کا سچا ہونا آپ کو معلوم ہو جاتا ۔

اسی طرح ایک واقعہ خیانت کے سلسلہ میں ۔

وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۔ (النساء، ع : ۱۶)

اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں اور اللہ سے استغفار کریں ۔

اور اسی کے بعد ۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۔

آپ ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کیجیے جو اپنی جانوں میں خیانت کرتے ہیں ۔

یا ایک مرتبہ جنگ کے قیدیوں کے باب میں ۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۔ (الانفال، ع : ۱۹)

نبی کی شان کے لائق نہ تھا کہ ان کے پاس قیدی قیدی رہتے جب تک کہ وہ نبی زمین پر اچھی خونریزی نہ کر لیتے ۔

یا بعض مشرکوں کے لیے استغفار کے سلسلہ میں ۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۔ (التوبہ ۔ ع : ۱۴)

نبی اور مومنین کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ مشرکوں کی مغفرت کی دُعا کرتے خواہ وہ اُن کے قرابت دار ہی کیوں نہ رہے ہوں ۔ جب کہ اُن پر ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ لوگ دوزخی ہیں ۔

یا پھر اسی طرح ایک محبوب و مقبول صحابی حضرت زید کی مطلقہ بیوی کے بیان میں۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ۔ (الاحزاب ع ۵)

اور اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں کی طرف سے اندیشہ کرتے تھے درآنحالیکہ اللہ ہی اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۔

یا ایک اور سلسلہ میں جب کہ آپ نے ایک نابینا صحابی پر توجہ کرنے کے بجائے فوری توجہ اشراف قریش کی طرف کر دی تھی جن پر آپ تبلیغ دین کر رہے تھے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى (عبس)

پیمبر چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا اس بات پر کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور ہی جاتا۔

تو یہ چند مقامات تھے جہاں کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو ۲۳ سال کی نہایت درجہ مصروف و مشغول پیمبرانہ زندگی میں تنبیہات بھی ملی ہیں لیکن دوسری طرف فضائل اسی کثرت سے وارد ہوئے ہیں اور آپ کے پیمبرانہ خصائص و فرائض کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان پر حیرت ہی ہو کر رہتی ہے اور قرآن کا ہر بے تعصب اور انصاف پسند طالب علم یہ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ ایسی پاکیزہ، بے نفس اور جامع اخلاق زندگی بے شک اس قابل تھی کہ اسے ساری نوع انسانی کے سامنے بطور نمونہ و نظیر کے پیش کیا جائے۔

اس سلسلہ بیان کو شروع اس جامع آیت سے کیجئے جس میں خطاب یا تو عام نوع بشر سے اور یا قوم عرب سے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ، ع ۱۶)

بے شک آ گئے ہیں تمھارے پاس ایک پیغمبر تمھیں میں سے گراں گزرتی ان پر ہر چیز جس سے تم تکلیف پاؤ، وہ حریص ہیں تمھارے اوپر اور ایمان والوں پر تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔

آیت میں اگر جمہور کی قرأت سے ساتھ اَنْفُسِكُمْ پڑھئے تو مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ وہ کوئی اجنبی نہیں کسی غیر جنس کی مخلوق نہیں تمھارے آپس کے ہیں اور تم ہی جیسے ہیں۔ ان سے مغایرت اور نامانوسیت کا کوئی محل نہیں۔

اور اگر اَنْفَسِكُمْ (بہ فتحہ فا) پڑھا جائے کہ وہ بھی ایک قرأت متواترہ ہے تو معنی یہ نکلیں گے کہ وہ تمھارے بہترین اور نفیس ترین میں سے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر انسانی تکلیف ان پر گراں گزرتی ہے وہ اس سے انسان کو رہائی دلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انسانوں کے حق میں اپنی فرط شفقت سے حریص ہیں۔ اپنی اُمت کے حق میں وہ توان دو صفات کے مالک ہیں جو اللہ اپنے بندوں سے متعلق رکھتا ہے یعنی رافت و رحمت اور اُمت کے حق میں اُن کی شفقت و دلسوزی بے پایاں ہے۔

آپ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا ایک احسانِ عظیم ہے اور آپ کے فرائض و مشاغل خود اس پر دلیل کا کام دیتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (آل عمران، ع : ۱۷)

اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا ہے جو ان کے درمیان ایک رسولؐ بھیجا انھیں میں سے، جو، انھیں اللہ کی آئتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور انھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی اور گو وہ اس سے قبل صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

آیت سے جہاں ایک طرف رسولؐ کا درجہ و مرتبہ عنداللہ معلوم ہوا کہ اللہ نے آپؐ کی بعثت کو اپنے احسان سے تعبیر کیا ہے وہیں آپؐ کے روزانہ مشاغل پر بھی اس سے روشنی پڑ گئی اور یہ معلوم ہو گیا کہ آپؐ اُمّت تک قرآن مجید نہ صرف پہنچاتے تھے بلکہ اس کی تعلیم دیتے اور شرح کرتے رہتے اور تزکیہ نفس کے کام میں لگے رہتے یعنی اصلاح ظاہری اصلاح باطنی دونوں میں۔

اس سے ملتا ہوا مضمون ایک دوسری آیت کا بھی ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (الجمعۃ، ع : ۱)

وہ اللہ وہی ہے جس نے اُمیّوں کے درمیان ایک رسول بھیجا انھیں میں سے جو ان پر اللہ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور اُنھیں سنوارتا ہے اور اُنھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ (لوگ) اس سے قبل صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

مشاغل روزانہ اور فرائض نبوی کا عکس اس آیت میں بھی نظر آجاتا ہے۔

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ، ع : ۱۵)

جیسا کہ ہم نے بھیجا تمھارے درمیان ایک رسول تمھیں میں سے جو تمھیں پڑھ کر سُناتا ہے، ہماری آئتیں، اور تمھیں سنوارتا ہے اور تمھیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی اور وہ سکھاتا ہے۔ وہ جو تم نہیں جانتے تھے۔

قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ کا ذکر تو مستقلاً آ ہی چکا۔ آیاتِ قرآنی نے تصریح کر دی کہ اس کے اور تزکیہ نفوس کے علاوہ آپ حکمت اور ایسی باتوں کی بھی تعلیم دیتے تھے جو اس وقت تک اُمت کے دائرہ علم میں نہ تھیں اور اس سے یہ صاف معلوم ہو گیا کہ آپ الفاظ قرآنی سے قطع نظر خود بھی تعلیم و تربیت فرمایا کرتے تھے اور نظری و عملی حیثیت سے وہ رہنمائی اپنی قوم کی کرتے جو اب تک اس کی دماغ کی رسائی سے باہر تھی۔

اور آپ کی بعثت کی غرض و غایت تو بہت صاف ارشاد ہو گئی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء، ع : ۷) ہم نے آپ کو بھیجا ہی ہے رحمت بنا کر جہانوں کے لیے۔

یعنی آپؐ توسبب رحمت ہی ہیں۔کُل جہان والوں کے لیے۔

آپؐ کی اطاعت مخلوق پرواجب ہی نہیں بلکہ مرادف ہے اطاعت الٰہی کے۔

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (النساء، ع : ۱۱) جس نے اطاعت کی رسولؐ کی اس نے عین اطاعت کی اللہ کی۔

اور یہ جب ہی ممکن ہے جب آپ کا ہر خطا و لغزش سے معصوم و ماوراء ہونا پہلے تسلیم کرلیا جائے۔ ورنہ غیر معصوم سے تو ہمیشہ احتمال رہے گا کہ فلاں معاملہ میں اس سے لغزش مرضیات حق کی ترجمانی میں ہوگئی ہو اور اطاعت رسول کی تاکید کرنے والی آیتیں ایک نہیں متعدد ہیں بعض بالواسطہ اور اکثر براہِ راست ،چنانچہ ارشاد ہے :۔

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (الحشر، ع : ۲) اور رسول جو کچھ تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمھیں روک دیں اس سے رُک جاؤ۔

اور اس اخذ و منع میں رسولؐ کے سارے احکامِ مثبت و منفی آگئے۔ساتھ ہی کلی اور مجموعی طور پر یہ بھی بتادیا گیا کہ :

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (الاحزاب، ع : ۳) بے شک تمھارے لیے رسول اللہؐ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے۔

اس لیے قدرۃً آپ کا ہر قول و عمل اُمت کے لیے واجب التقلید ہے،تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی تصریح نہ ہو۔ اب وہ آیتیں بھی ملاحظہ ہوں جن میں اطاعتِ رسولؐ کا حکم براہِ راست موجود ہے۔اطاعتِ الٰہی پر عطف ہو کر

سورہ آل عمران ع ۴ میں ہے۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ۔ آپ کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی۔

اور اسی سورت کے رکوع ۱۴ میں لفظ قُلْ حذف کرکے ہے۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ اور اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی۔

سورۃ النساء رکوع ۸ میں ہے :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔

اسی کے متصل اطاعت اولوالامر کا بھی حکم ہے ۔لیکن معاً بعد یہ بھی ارشاد ہوگیا ہے کہ :

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اگر تمھارے آپس میں کسی معاملہ میں اختلاف ہوجائے تو حوالہ کر دیا کرو اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف

خوب خیال کرلیا جائے۔اپیل کی عدالت صرف بارگاہِ خداوندی نہیں دربار رسولؐ بھی ہے اور اس سے بڑھ کر

کسی مخلوق کا اعزاز خالق کے یہاں کس طریقہ پر ظاہر کیا جا سکتا ہے ؟ اور اطاعت رسول والے وہی الفاظ جو ایک منٹ قبل سورۃ النسآ سے نقل کئے جا چکے ہیں ۔ ایک بار پھر سورہ محمدؐ رکوع ۴ میں دہرائے ہوئے ملتے ہیں ۔

سورۃ المائدہ کے رکوع ۱۲ میں پہنچئے تو پھر یہی تاکید ملتی ہے ۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ — اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور اطاعت کرتے رہو رسولؐ کی ۔

اور انھیں الفاظ کی تکرار سورۃ التغابن کے رکوع ۲ میں واقع ہوئی ہے ۔

سورۃ الانفال کھولئے تو اس کے شروع یعنی پہلے ہی رکوع میں یہ الفاظ نظر آتے ہیں ۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ — اطاعت کرتے رہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ، اگر تم ایمان والے ہو ۔

اور سورۃ کے تیسرے رکوع کا آغاز ہی اس آیت سے ہوتا ہے :

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۔ — اے ایمان والو ! اطاعت کرتے رہو ، اللہ اور اس کے رسولؐ کی ۔

سورۃ میں تیسری بار پھر یہی حکم ملتا ہے اور رکوع ۶ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں ۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۔ — اطاعت کرتے رہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ۔

اور انھیں الفاظ کا اعادہ سورۃ المجادلہ ، رکوع ۲ میں ہوا ہے ۔ پھر سورۃ النور کے رکوع ۷ میں پہلے تو یہ ہے کہ :۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ — آپ کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ اور اطاعت کرو رسولؐ کی ۔

اور پھر اسی رکوع میں اور آگے بڑھ کر ہے کہ :۔

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ — اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے ۔

اتنی جگہ صریح حکم اطاعت رسولؐ کا ، صیغہ امر میں اور وہ بھی اکثر اطاعت الٰہی پر عطف کر کے قطعاً کسی اور مخلوق کے حق میں وارد نہیں ہوا ہے اور یہ نظائر تو حکم اطاعت بہ صیغہ امر کے ہوئے ، باقی دوسرے طریقوں سے اسی مفہوم کی جو تبلیغ و تلقین اور تاکید ہوئی ہے وہ بھی کچھ کم مؤثر اور پُر زور نہیں ۔

سورۃ النساء ، رکوع ۱۱ کی ایک آیت وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۔ کچھ دیر قبل نقل ہو چکی ہے ۔ اسی سورۃ کے رکوع ۹ میں انعام یافتہ بندوں کی معیت کے سلسلہ میں یہ آچکا ہے کہ :۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ۔ — (یہ وہ ہیں ، جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ۔

اور اس سے بھی قبل اسی سورۃ کے رکوع ۲ میں جہاں اہل جنت کا ذکر ہے وہاں بھی ٹھیک یہی الفاظ موجود ہیں ۔

اور آیت کا یہی ٹکڑا الوٹ لوٹ کر سورۃ النور رکوع ۷ اور سورۃ الاعراف رکوع ۱۹ اور سورۃ الفتح رکوع ۲ میں بھی آیا ہے ۔

حکم کی یہ سب تاکیدیں لفظ اطاعت کی صراحت کے ساتھ تھیں ایک جگہ مصدر اتباع آیا ہے وہ بھی اس شان کے ساتھ اتباع رسولؐ کو عین زینۃ اللہ کے ہاں محبوبیت کا قرار دے دیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران، ع ۴) — آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبّت کرنے لگے گا۔

اور اس مثبت و ایجابی پہلو کے علاوہ یہی مضمون متعدد منفی اور سلبی پہلوؤں سے بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ — اور جو نافرمانی کرے گا اللہ اور اس کے رسولؐ کی، اور مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ — اور جو کوئی عداوت رکھے گا، اللہ اور اس کے رسولؐ سے اور مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ ، اور جو کوئی دُکھ پہنچائے گا رسولؐ کو اور اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۔ — اور جو لوگ دشمنی رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔

اور اسی قبیل کی دوسری آیتیں اور وہ آیتیں جن میں ذکر رسولؐ سے نافرمانی کرنے یا معصیت الرسول کا ذکر آیا ہے۔ اگر یہ سب استدلال و استشہاد کی غرض سے نقل ہونے لگیں تو یہ محدود وقت گنجائش رکھنے والے لیکچر اپنے حدود سے بڑھ اور بہت بڑھ جائیں اس لیے سامعین کو اس خاص سلسلہ میں قناعت اتنے ہی پر کرنا ہو گی۔

لیکن ابھی دو چار نہیں بیسیوں آیتیں اور ہیں جن میں رسولؐ کے فرائض اور فضائل اور خصائص تینوں کا بیان موجود ہے، ان سب سے قطع نظر کیونکر ممکن ہے؟ اور اگر انھیں چھوڑ دیا جائے تو سیرۃ نبویؐ کا قرآنی خاکہ بالکل ہی ناتمام رہ جائے گا۔ اور اتنی اختصار پسندی اصل موضوع کے ساتھ ایک طرح کی خیانت ہی ہو گی۔

رسولؐ کے فرائض کا جہاں تک تعلق ہے (اور ضمناً فضائل بھی اس میں آگئے) یہ آیت اس باب میں بہت صاف و صریح ہے:

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ (الاحزاب، ع ۶) — اے پیمبر، ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا اور اللہ کی طرف اسی کے حکم سے بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

شاھد کی تفسیر یہ ہے کہ آپؐ سب پر گواہی دیں گے اور اس صفت کا ظہور حشر میں ہوگا۔ مبشر و نذیر کے معنی صاف ہیں۔ انھیوں کو صلہ نیک کی خوشخبری سنانے والے اور بدوں کو ان کے انجام سے ڈرانے والے اور اللہ کی طرف سے اسی کے حکم و رضا سے دعوت دینے والے اور ایک روشن چراغ یعنی نمونہ ہدایت۔ کہ آپ ہی کے چراغ سے خدا معلوم کتنے اولیاء و صادقین کے چراغ آج تک روشن ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی روشن ہوتے رہیں گے اور یہ مضمون قرآن میں جابجا آیا ہے اور اسی سراج منیر کی آیت سے استنباط کر کے جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ — لوگو! تمھارے پاس آگیا ہے اللہ کے یہاں سے ایک نور اور ایک کتاب واضح بھی۔

وہاں نُور سے اشارہ ذات رسالت کی جانب ہے تو انھوں نے کچھ بے جا تفسیر و تاویل نہیں کی ہے۔

آپ کے فضائل کی ایک جامع سورۃ الانشراح ہے جہاں یہ ارشاد ہو گیا ہے کہ :-

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا ہے اور آپ سے آپ کا وُہ بار اُتار دیا جو آپ کی پشت توڑے دیتا تھا۔

یعنی آپ کا شرح صدر کر کے آپ کے قلب و رُوح کو علوم و معارف ربانی سے بھر دیا اور ہدایت خلق کی فکر میں جو آپ گھلے جا رہے تھے اس بار کو آپ کے لیے ہلکا کر دیا۔

اس سے آپ کی اس عادت مبارک پر بھی روشنی خود بخود پڑ گئی کہ ہدایت خلق کی فکر آپ کو کتنی مشقت و تعب میں ڈالے ہوئے تھی اور اس کے معاً بعد یہ مژدہ بھی ہے کہ :-

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ہم نے آپ کے لیے آپ کا آوازہ بلند کر دیا۔

آج دنیا میں کون بشر ہے جو پیغمبر اسلام کے آوازہ کی بلندی میں کلام کر سکتا ہے ؟ کوئی شخص کسی بھی عقیدہ اور مذہب کا ہو آخر آج اس سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ دنیا کی بشری آبادی میں صرف ایک ہی ذات ایسی ہے جس کا نام خدائے واحد کے نام کے ساتھ ساتھ ، دنیا کے ایک ایک گوشہ سے ہر روز پانچ پانچ مرتبہ پکارا جاتا ہے۔

اور اس دلسوزی اور پشت توڑ دینے والی ہمدردی نوع انسانی کا بیان اسی آیت تک محدود نہیں۔ دوسری آیتوں میں اس جذبہ رفاہ خلق کی تصریح در تصریح موجود ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ہے کہ منکروں کے فلاں فلاں قول سے۔

وَضَائِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ (ہود۔ ع : ۲) آپ کا سینہ تنگ ہوا جاتا ہے۔

ایک جگہ اس سے بھی زیادہ فاش و برملا ہے۔ مسیحیوں کی شدید گمراہی اور مسیح پرستی کے شرک کے سیاق میں۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکہف ع ۱) تو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون پر ایمان نہ لائے تو اپنی جان دے دیں گے۔

یہ غمگینی اور دلسوزی جب غیروں کے واسطے تھی تو اپنی اُمّت کے حق میں اس کا جو درجہ ہوگا، ظاہر ہی ہے ۔ دوسری جگہ بھی منکروں ہی کے سلسلہ میں بیان کی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ (الشعراء ع : ۱) شاید ان کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنی جان ہی دے دیں گے۔

جو عالم انسانی کے لیے ایسے ہی غم جانگداز میں گھلتا رہتا ہو۔ حقیقتہً اسی کو حق بھی سارے عالم کی رہبری اور انبیاء و مرسلین کی سروری کا ہے۔

اور جب مقتدائی میں آپ کا یہ مرتبہ تھا جبھی تو یہ قرار پایا کہ اللہ کے یہاں مقبول محمود و محبوب ہونے کا نسخہ یہ ہے کہ اس کامل ہستی کے نقش قدم پر چلا جائے۔

خود آپ کی زبان سے اعلان کرایا گیا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران، ع ۴) آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمھیں اللہ سے محبت ہے تو بس میری راہ پر چلو اللہ تم سے محبت رکھنے لگے گا۔

رسولؐ کے فرائض میں نمایاں طور پر یہ بات داخل تھی کہ آسمانی کتابوں کو ماننے والی پرانی قومیں اپنے ہاتھوں تقلید انسانی اور اوہام پرستی کے جن عذابوں میں مبتلا تھیں انھیں ان قیدوں اور سختیوں سے نجات دلائیں اور انھیں دین کا سیدھا ہموار راستہ دکھائیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ پیمبر جن کا مذکور توریت دانجیل میں آچکا ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف، ع ۱۹) انھیں نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع فرماتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو ان سے دور کرتے ہیں۔

اور اتنا ہی نہیں بلکہ اہل کتاب کے مقتداؤں نے تحریفات وتلبیسات وتصرفات کا انبار جو اپنی آسمانی کتابوں میں لگا دیا تھا اُسے بھی یہ صاف کرتے ہیں اور ان مجرموں کی بہت سی باتوں سے درگزر بھی کر جاتے ہیں۔ ارشاد اہل کتاب کو مخاطب کرکے ہوتا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ (المائدہ، ع ۳) اے اہل کتاب! تمھارے پاس ہمارے یہ رسولؐ آئے ہیں کتاب میں سے جن امور کو تم چھپاتے رہے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو تمھارے سامنے کھول دیتے ہیں اور (تمھاری) بہت سی باتوں سے چشم پوشی بھی کر جاتے ہیں۔

آپ کی راہ میں مشکلات انتہا حائل ہوگئی تھیں اور تبلیغ رسالتؐ کے لیے مواقع اتنے سخت پیش آگئے تھے کہ ان حالات میں ثابت قدم رہ جانا معمولی ہمت والے انسان کا کام نہ تھا۔ آپؐ کو استقامت اور ثبات قلب وثبات قدم کی طاقت بھی اسی لیے غیر معمولی عطا کی گئی۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا۔ (بنی اسرائیل، ع ۸) اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ کچھ تو ان لوگوں کی طرف جھک جاتے۔

یہ بیان فطرت بشری کا ہوا۔ بشریت کا عین مقتضیٰ یہ تھا کہ آپؐ ان منکرین سے کسی قدر کوئی صورت مصالحت ومفاہمت کی نکال لیتے۔ لیکن امداد غیبی آڑے آئی اور اس نے دوجہ ادنیٰ میں آپؐ کو اپنی جگہ سے جنبش نہ ہونے دی۔

منکرین معاندین کے شدید مخالفانہ رویہ سے آپ کو اذیت قلب محسوس ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ اس پر آپ کو علانیہ تسکین دی گئی کہ یہ کوئی آپؐ کی ذاتی حیثیت سے تکذیب تھوڑی ہی ہوئی یہ تکذیب تو عین آیات ودلائل الٰہی اور آپؐ کے

پیام کی ہے تو آپؐ اس سے اپنی ذات پر اتنا اثر کیوں لیں۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (الانعام، ع:۴)

ہم خوب جانتے ہیں کہ ان کی یہ باتیں آپ کو رنج دلاتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ تکذیب آپ کی نہیں کرتے، بلکہ آیاتِ الٰہی کے منکر ہٹ دھرمی سے ہو رہے ہیں۔

ورنہ ذاتی حیثیت سے تو آپؐ کی سیرت اتنی ممتاز اور آپؐ کا پایۂ اخلاق اتنا بلند تھا کہ بڑے بڑے منکر و معاندوں کو بھی گرفت کی گنجائش نہ تھی، آپؐ کی زندگی اتنی بے لوث، بے داغ رہی تھی کہ خود اسی کو حجت بنا کر منکروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان سے سوال کرایا گیا کہ میں تو تمھارے ہی اندر رہا سہا ہوں، تمھارے ہی اندر اتنی عمر گزاری ہے۔ تمھیں بتاؤ کہ اس سے قبل تمھیں کوئی بدگمانی کا موقع ملا ہے؟

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (یونس، ع:۲)

میں تمھارے ہی درمیان اس (دعوٰے نبوت) سے قبل ایک عمر گذار چکا ہوں۔ سو تم لوگ کیوں عقل سے کام نہیں لیتے؟

اور یہ بھی کہلایا گیا ہے کہ اگر میں ارادۃً غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہوں تو تمھاری تشخیص کے مطابق لازمی ہے کہ مجھے کوئی دماغی بیماری ہو کہ اس میں پڑ کر میں اس وہم میں مبتلا ہو گیا ہوں تو اس مفروضہ کو بھی تم اپنی علم و دانشمندی کی کسوٹی پر کس کے دیکھ لو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (السباء، ع:۶)

آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو، دو ایک ایک، پھر سوچو کہ تمھارے (ان) ساتھی کو کہیں جنون تو نہیں ہے۔

اور پھر اسی کو مختصراً دہرایا گیا ہے:

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ۔

یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے ان کے ساتھی کو کوئی شائبہ جنون کا ہے نہیں۔

پھر لے دے کے ایک احتمال یہ ہو سکتا تھا کہ شاید کوئی طمع دنیوی آپ کو اس منزل پر لائی ہو۔ قرآن مجید نے اس احتمال کی بھی جڑ کاٹ دی۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ۔ (السبا، ع:۶)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے (اس تبلیغ رسالت) کا کوئی معاوضہ مانگا ہو تو لیں وہ تمھارا ہی رہا۔ میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے۔

اور اسی کے ہم مضمون فقرے حضرت نوحؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت لوطؑ وغیرہم کی زبان سے ادا کر کے رسول اللہ صلعم کے اس جواب کو اور زیادہ قوی و موکد کر دیا ہے۔

قرآن مجید آپ کو اعزاز و احترام کے جس مرتبہ پر رکھنا چاہ رہا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کلام مبین میں قسم آپ کی عمر کی دلائی گئی ہے۔ قوم لوط کی بدکرداریوں اور بدمستیوں کے سلسلہ میں ہے کہ :-

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ قسم ہے آپ کی جان کی، وہ لوگ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

(الحجر، ع : ۵)

اور قسم کا استعمال اگر عربی میں شہادت کے مفہوم میں ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی کو صداقت کی نظیر کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور آپ کی مرتبت عالی پر روشنی اس حقیقت سے کچھ نہ کچھ پڑ جاتی ہے کہ جہاں اور ہم منصب حضرات کا ذکر صیغۂ ندا میں نام کے ساتھ آیا ہے یا آدمؑ یا ابراہیمؑ یا موسیٰؑ یا داؤد وغیرہم۔ وہاں آپ کا ذکر قرآن مجید بھر میں مخاطبت کے وقت نام کے ساتھ نہیں، بلکہ صفات کمال جمال میں سے کسی نہ کسی صفت ہی کے ساتھ آیا ہے، مثلاً یاایھا النّبی یاایھا الرسول یاایھا المزمّل یا یٰایھا المدثر وغیرہ اور صیغۂ غائب میں مطلق لفظ عبد سے اشارہ آپ ہی کی طرف کیا گیا ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوئے کہ عبدیت اپنی کامل ترین یا اکمل صورت میں جلوہ گر آپؐ ہی کی ذات میں ہوتی ہے۔

اسی قسم ہی کے سلسلہ میں یہ بات بھی سن رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں قسم ایک شہر کی بھی مذکور ہے۔

لَا أُقْسِمُ بِهَٰذَا الْبَلَدِ -(البلد) میں قسم کھاتا ہوں اُس شہر کی۔

لیکن معاً بعد تو رسولؐ کو مخاطب کر کے ہے۔

وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَٰذَا الْبَلَدِ اور آپؐ اس شہر میں اُترے ہوئے ہیں۔

یا کہ آپؐ کے لیے اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے۔

ان دونوں تفسیروں میں سے جو بھی اختیار کی جائے۔ بہر حال اتنا جز وصاف ہے کہ اس مکان کو جو شرف و عظمت حاصل ہے وہ اس مکین کی نسبت سے ہے آپ اس شہر میں مقیم فرض کئے جائیں یا آپ کے لیے اس حرم محترم میں جنگ جائز ہو رہی ہو۔ ہر صورت میں آپؐ کی نسبت ہی باعث احترام ہوئی۔

مشہور واقعہ معراج کی تفصیلی کیفیات جو کچھ بھی ہوں بہر حال قرآن مجید اس کی گواہی تو دے ہی رہا ہے کہ وہ ایک واقعہ عظیم و نادر تھا جس سے آپؐ کی یکتائی ظاہر ہو رہی ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا۔ (بنی اسرائیل، ع : ۱)

وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو لے گیا، راتی رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں رکھ دی ہیں تاکہ ہم اُنھیں اپنے کچھ نشانات دکھا دیں۔

اور اسی طرح دوسری جگہ رسولؐ کی جس سیرِ آسمانی کا ذکر کیا گیا ہے اور جس طرح آپ کی روحانیت کے مرتبے دکھائے گئے ہیں، وہ آپ کو نہ صرف عام نوعِ بشری میں بلکہ صفِ انبیاء و مرسلین میں بھی کتنا ممتاز کرنے والا ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ (النجم، ع: ۱)
یہ تمہارے ساتھی (اس عالم میں بھی) نہ راہ سے بھٹکے نہ غلط راستہ پر پڑ لئے۔

بلکہ آپ کا مرتبہ تو یہ ہے کہ آپؐ جو چیزیں پیش کر رہے ہیں وہ کوئی بھی اپنی خواہش نفس سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی ہی کے ماتحت ہیں۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى۔
اور آپ اپنی خواہش نفس سے باتیں نہیں بناتے بلکہ ان کا ارشاد وہی ہوتا ہے جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔

اور اس خاص موقع پر

فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهِ مَا أَوْحٰى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔
اللہ نے اپنے بندہ پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی اور (آپ کے) قلب نے کوئی غلطی دیکھی ہوئی چیز میں نہیں کی،

اور ملائکہ نورانی کی دید اور دوسرے تجلیات ربانی کے مشاہدہ کی جن منزلوں سے اور جس طرح گزرے اس کی روداد بھی اجمالی سہی، لیکن بڑی پختگی کے ساتھ قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً أُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔ (النجم، ع: ۱)
اور ان پیمبر نے اس فرشتہ کو ایک بار اور بھی دیکھا (سدرۃ المنتہیٰ) کے قریب۔۔۔۔ جبکہ (سدرۃ المنتہیٰ) کو لپیٹ رہی تھیں جو چیزیں کہ لپیٹ رہی تھیں (ان پیمبر کی) نگاہ نہ ہٹی نہ بڑھی انھوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھ لیے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وحی کا آنا کسی حکمت و مصلحت سے۔ کچھ روز کے لیے بند ہو گیا اور اس پر معاندین کو خوب شادیانے بجانے کا موقع مل گیا۔ ان کے خیالات خام کے رد و ابطال میں رسولؐ ہی کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى۔ (الضحیٰ)
آپؐ کو آپؐ کے پروردگار نے نہ چھوڑا، نہ وہ بیزار ہوا۔

اور دست برداری و بیزاری کا کیا ذکر ہے آپ کا مستقبل آپ کے ماضی سے آپ کا انجام آپ کے آغاز سے بھی کہیں زیادہ عالیشان و تابدار رکھ دیا گیا ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولٰى۔ (الضحیٰ)
آخرت آپ کے لیے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔

اتنا ہی نہیں آپ کی رضا خود آپ کے خالق کو کس درجہ مدِ نظر ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ (الضحیٰ)
عنقریب اللہ آپ کو اتنا کچھ دے گا کہ آپ اُس سے خوش ہو جائیں گے۔

اور اس عطا اور بخشش ہی کے سلسلہ میں وہ لفظاً چھوٹی اور معناً بڑی آیت بھی پڑھ لینے کے قابل ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ (الکوثر) بے شک ہم نے آپ کو عطا کر دی کوثر۔

اور اب کوثر کو خواہ جنت کی حوض و نہر کے معنی میں لیا جائے خواہ خیر کثیر کا مرادف سمجھا جائے یہ ہے وہ بشارت عظیم جو آپ کے سوا مخلوق میں اور کسی کو بھی نہیں ملی۔

اور اسی معنی کی تائید، تاکید و تقویت میں یہ آیت بھی ہے۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ۔ (القلم، ع۱) اور آپ کے لیے بیشک ہے اجر غیر منقطع۔

قرآن کی زبان جس اجر کو غیر منقطع بتائے اس کی حد و نہایت کا کون حساب لگا سکتا ہے۔

ایک جگہ قرآن نے آپ کے ایک ایسے وصف جامع کا ذکر کر دیا ہے جس کے اندر سارے ہی اوصاف آ سکتے اور آ جاتے ہیں اور اس کی شرح و تفصیل جتنی بھی کی جا سکے۔ وہ وصف اتنا جامع ہے کہ اس پر کسی اضافہ کا امکان نہیں ارشاد ہوا ہے کہ:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (القلم، ع: ۱) اے پیغمبر! آپ اخلاق کے عظیم پیمانہ پر ہیں،

خلق صیغۂ جمع میں ہے اور اس کے اندر اخلاق حسنہ کے سارے ہی اصناف و افراد آ گئے، پھر جب قرآن نے جو مبالغہ کی زبان سے ناآشنائے محض ہے اس کے ساتھ صفت عظیم کی لگا دی تو اب یہ صفت اس وسعت و بلندی کو پہنچ گئی جو بندوں کے ادراک کی رسائی کی منتہا ہے۔

کہیں کہیں قرآن اخلاق حسنہ کی اس جامعیت کی کچھ تفصیل و تصریح کر تا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ناموافق ماحول کے سیاق میں ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔ (آل عمران ع ۱۷) اللہ کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان لوگوں کے حق میں نرم رہے، اور اگر آپ کہیں تند خو سخت طبیعت والے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان کے لیے استغفار کر دیجئے۔

اس سے ہر قسم کی سخت مزاجی کی نفی اور نرم خوئی کا اثبات پوری طرح ہو گیا اور کہیں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کے ہاں سے جو باتیں آپ کی معلوم ہوتی رہتی ہیں ان کو پھیلانے بتلانے میں آپ ذرا بھی بخل کو کام میں نہیں لاتے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (التکویر) اور یہ رسولؐ غیب کے بتانے میں ذرا بھی بخیل نہیں۔

تحریک شفقت کی نہیں۔ افراط شفقت و دلسوزی سے آپ کو منع کرنے کی ضرورت تھی۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ۔ (الفاطر، ع: ۳) ان لوگوں کے حال پر غم کر کے کہیں آپ جان نہ دے بیٹھیں۔

عبادات خصوصاً عبادات شبینہ کے آپؐ بہت عادی تھے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ آپؐ کے پروردگار کو اس کا علم ہے کہ آپؐ رات کی دو تہائی

وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ۔ رات کے قریب اور آدھی آدھی رات اور تہائی رات کھڑے رہتے ہیں۔ (المزمل: ع ۲:)

ان مجاہدات شاقہ سے قرآن مجید کو آپؐ کو روکنے کی ضرورت پڑی اور غایت شفقت و کرم سے ارشاد ہوا۔

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى۔ ہم نے یہ قرآن آپؐ پر اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ (طٰہٰ ع ۱)

معاندین کی مسلسل شرارتوں پر تسکین آپ کو بار بار دی گئی ہے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ آپ قابل ملامت قابل الزام کسی طرح بھی نہیں۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ۔ آپ لوگوں کی طرف التفات نہ کیجئے، اور آپ پر کوئی ملامت نہیں۔ (الذاریات، ع ۳:)

اور ایک جگہ تسلّی کے لیے شفقت خاصہ اور عنایت خصوصی کے الفاظ یوں وارد ہوئے ہیں کہ آپ تو ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا۔ آپ اپنے پروردگار کی تجویز پر صبر کیے رہیے آپ تو خاص ہماری حفاظت میں ہیں۔ (الطور، ع ۲:)

منکرین و معاندین کے پاس بڑا حربہ طنز و استہزاء کا تھا قرآن مجید نے تسکین اس پہلو سے بھی دی۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ۔ (الحجر، ع ۶:) (ان) استہزاء کرنے والوں سے ہم آپ کے لیے کافی ہیں۔

اس سے نفس استہزاء کا وجود تو ثابت ہی ہو گیا۔

مخالفین و معاندین کثرت سے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے متعدد اشاروں سے معلوم ہوتا ہے تصریح کے ساتھ ذکر ابولہب کا اور اس کی بیوی کا آتا ہے۔ ابولہب کا نام تاریخ میں عبد العزیٰ آیا ہے اور سیرت کی کتابوں میں آیا ہے کہ وہ علاوہ آپ کا عزیز قریب یعنی چچا ہونے کے پڑوسی بھی تھا یہ خود اور اس کی بیوی جو اموی خاندان کی تھی دونوں اذیت رسانی میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اور پڑوس کی بنا پر انھیں اس کے موقعے بھی زیادہ تھے۔ قرآن مجید نے اس الد الخصام کے تذکرہ میں کہا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ (لہب) ٹوٹ گئے دونوں ہاتھ ابولہب کے (یعنی اس کی ساری کوششیں اور تدبیریں ضائع گئیں) اور وہ ہلاک ہو گیا۔ کچھ کام اس کے نہ آیا نہ اس کا مال نہ اس کی کمائی۔

بڑا غرہ معلوم ہوتا ہے اسے اپنے مال و دولت پر تھا۔ اور جو انجام اس کا ہوا، ایسا ہی کہنا چاہیے کہ دشمنان رسولؐ کے جتنے سرخیل تھے سب کا ہوا پیش خبری واضح لفظوں میں کر بھی دی گئی تھی۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ (الکوثر) جو آپ کا دشمن ہے بے شک وہی بے نام و نشان

(رہ جانے والا) ہے۔

اور زیادہ عام اور وسیع الفاظ یہ آئے ہیں۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (التوبۃ، ع: ۸)

جو لوگ رسول اللہؐ کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں ان کے لیے عذاب دردناک ہے۔

اور صرف رسولؐ ہی نہ تھے۔ یعنی سلسلہ انبیاء میں سے ایک بلکہ اس سلسلہ کے خاتم اور آخری نبی بھی تھے۔ آپؐ کے نام کی تصریح کے ساتھ آیا ہے کہ:۔

وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ۔ (الاحزاب، ع: ۵)

محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں، اور انبیاءؑ کے خاتم (بھی)

آپ کی اگلی اور پچھلی تقصیریں۔ اگر کچھ تھیں سب معاف ہو چکی تھیں۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ (الفتح، ع: ۱)

تاکہ اللہ آپؐ کے وہ گناہ جو پہلے ہوئے اور جو پیچھے ہوئے وہ سب بخش دے۔

(تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے) ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی

اور بات اپنی جگہ دلائل سے ثابت ہو چکی ہے کہ پیمبروں کے سلسلہ میں جب ذنب و عصیان کا استعمال ہوگا تو وہ انہی کی شان و مرتبہ کے مطابق ہوگا۔ عام لبشری معیار سے الگ۔ آپؐ کا استغفار، مومنین صادقین تو الگ رہے۔ ظالموں فاسقوں تک کے حق میں مقبول و موثر تھا۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا۔ (النساء، ع: ۹)

اور اے پیمبر جب ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر آپؐ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے استغفار کرتے اور رسولؐ بھی اُن کے حق میں استغفار کرتے تو یہ ضرور پاتے اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان۔

دُنیا میں رسولؐ کی موجودگی نزولِ عذابِ الٰہی سے روک بنی ہوئی تھی۔ صاف ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ۔ (الانفال، ع: ۴)

اور اللہ ایسا نہ کرے گا کہ آپؐ ان کے درمیان موجود ہوں اور وہ (اس حال میں) انھیں عذاب دے۔

رسولؐ سے بیعت اللہ سے بیعت کے مرادف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ۔ (الفتح، ع: ۱)

بے شک جو لوگ آپؐ سے بیعت کرتے ہیں، وہ (درحقیقت) اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

ایمان کا معیار ہی یہ رکھ دیا گیا ہے کہ معاملات میں حکم پیمبر کو بنایا جائے اور اُن کے ہر فیصلہ کو بلا کراہت قبول کر لیا جائے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (النساء، ع ۹)

تو قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ انھیں ایمان نصیب نہ ہوگا جب تک یہ نہ ہو کہ، اُن کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ فیصلہ آپ سے کرائیں اور آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں تنگی (بھی) نہ پائیں اور اُسے پوری طرح تسلیم کرلیں۔

اور اس کی تصریح بار بار آئی ہے کہ آپ خصوصی فضل و رحمت الٰہی کے مورد تھے، مثلاً:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۔ (النساء، ع ۱۷)

اللہ نے آپ کو وہ سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل رہا ہے۔

یا اور اسی طرح براہِ راست۔

اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل، ع ۱۰)

بے شک آپ پر اللہ کا فضل بڑا ہے۔

یا پھر اسی طرح بالواسطہ۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۔ (القصص، ع ۹)

اور آپ کو تو یہ اُمید ہی نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب نازل ہوگی۔ لیکن آپ کے پروردگار کی رحمت سے اس کا نزول ہوا۔

ایسے سرور و سردار کی خانگی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کے لیے کچھ خصوصی آداب بھی مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ ہے مثلاً ایک ادب یہ تھا کہ آپ کو اگر پکارا جائے تو اسی طرح نہیں جیسے لوگ ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۔ (النور، ع ۹)

لوگو! اپنے درمیان رسولؐ کو اس طرح نہ پکارا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

آپ کی محفل سے بلا اجازت اُٹھ جانا ممنوع ہوا۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۔ (النور، ع ۹)

(مومنین) رسولؐ کے پاس کسی ایسے کام پر ہوتے ہیں جس کے لیے مجمع کیا گیا ہے۔ تو جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، نہیں جاتے۔

آپ کا حق مومنین پر اُن کی جانوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ۔ (الاحزاب، ع ۱)

نبی مومنین کے ساتھ خود اُن کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کی ازواج مطہرات اُمّت کی مائیں ہیں۔

وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ۔ (الاحزاب، ع ۱)

اور نبی کی بیبیاں مومنین کی مائیں ہیں۔

اور جب یہ ہوا تو اس اصل کی ایک فرع قدرۃً یہ نکلی کہ ان ماؤں کے ساتھ اُمّت کے کسی فرد کا نکاح ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار پاگیا۔

وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا۔ (الاحزاب، ع ۷) — مسلمانوں تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم آپؐ کے بعد آپؐ کی بیبیوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔

یہ بیبیاں عام عورتوں سے ایک ممتاز و بلند حیثیت رکھتی تھیں۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ۔ (الاحزاب، ع ۴) — اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کئے ہو۔

ان بی بی صاحبوں سے کوئی چیز مانگنا ہو تو اُمّت کو ہدایت تھی کہ پردہ کے باہر سے مانگا کریں۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ (الاحزاب، ع ۷) — اور جب تم کو ان بیبیوں سے کوئی چیز مانگنا ہو تو پردہ کی آڑ سے مانگو۔

پیمبر کے گھر میں بے محابا۔ بلا اجازت چلے آنا، جائز نہ تھا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْذَنَ لَكُمْ۔ (الاحزاب، ع ۷) — اے مومنو! پیغمبر کے گھروں میں نہ داخل ہو جایا کرو، سوا اس کے کہ تمھیں اس کی اجازت دے دی جائے۔

یہ بھی اُمّت کو ہدایت ہوئی کہ پیغمبر کے ہاں اگر کھانا کھانے کا اتفاق ہو تو کھانے سے فراغت کے بعد بس اُٹھ کھڑے ہوا کرو یہ نہ ہو کہ پیمبر کے اوقات کا لحاظ کئے بغیر بے فکری سے باتوں میں لگ گئے۔

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ۔ (الاحزاب، ع ۷) — پھر جب کھانا کھا چکو تو اُٹھ کر چلے جایا کرو، اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو۔

رسول اللہؐ پر مروّت وحیا اس درجہ غالب تھی کہ خود اپنے کفش بردار اُمتیوں سے اتنی بات بھی براہِ راست نہیں فرما سکتے تھے۔ اور قرآن مجید کو یہ ہدایت دینا پڑی۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ۔ (الاحزاب: ع ۷) — اس بات سے پیمبر کو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن وہ تمھارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ صاف بات کہنے سے لحاظ نہیں کرتا۔

اور آپؐ کے ذمہ قرآن مجید کی محض تبلیغ و تعلیم ہی نہ تھی، بلکہ اس کی تبیین بھی تھی، یعنی اس کے خفی کو جلی کرنا اس کے مشکلات کو کھولنا اور واضح کرنا ارشاد ہوا ہے۔

وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل، ۶) — اور ہم نے آپ پر یہ قرآن اُتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں۔ آپؐ ان کی شرح ان پر کر دیں تاکہ وہ سوچیں

اور پھر اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (النحل، رع : ۸)

اور ہم نے تو یہ کتاب آپ پر بس اس لیے نازل کی ہے کہ آپ ان لوگوں پر وہ کھول کر ظاہر کر دیں جس بارہ میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور ایمان والوں کی ہدایت رحمت کی غرض سے۔

غرض یہ کہ مبلغ قرآن و معلّم قرآن ہی کی طرح آپ کا شارح قرآن ہونا بھی قرآن مجید ہی سے ظاہر و ثابت ہے اور جس طرح باب کا آغاز آپؐ کے وصف بشریت سے ہوا تھا۔ اسی طرح باب کا خاتمہ بھی آپؐ کی رسالت کے اس خاص الخاص صفت کے اثبات پر ہو رہا ہے اور جب کسی نبی کے لیے قرآن نے کھل کر کہہ دیا کہ یہ لوگوں کی پیروی کے لیے ایک اسوۂ حسنہ یا ایک بہترین نمونہ ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہوئے کہ وہ بہترین صفات و کمالات کا مجموعہ ہے کہ بغیر اس جامعیت کمالات کے وہ نمونہ کا کام دے کیونکر سکتا ہے اور اوصاف و کمالات کی تھوڑی بہت تشریح و تفصیل جو آپؐ کے سامنے آیات قرآنی سے ہو چکی۔ یقین ہے کہ اس کے بعد آپ کا دل خود بول اُٹھے گا کہ بیشک وہی ذات مستحق تھی اس کی کہ خلق کے سامنے خالق کی طرف سے اس کی کاری گری کے شاہکار کی حیثیت سے پیش ہو۔

رسالت و بشریت

فضائل و مناقب کا مرقع آپ ملاحظہ کر چکے اور اور بھی رسولؐ کی جلالت قدر کے جلوے نظر سے گذرتے رہیں گے۔ لیکن قرآن مجید جیسی جامع، مانع اور کل مکتفی کتاب کو دوسرے سرے کی طرف سے بھی پوری احتیاط رکھنی لازمی تھی۔ پیمبروں اور ہادیوں کی شخصیتوں پر دُنیا کی تاریخ میں برابر یہ ظلم عظیم ہوتا رہا ہے کہ جہاں ایک طرف منکروں اور معاندوں نے ان کے کمالات کی طرف سے یکسر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور تکذیب و انکار کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہیں دوسری طرف ماننے والوں نے بھی عقیدت میں وہ غلو کیا کہ ایلچی کو بادشاہی اور بندہ کو خدائی ہی کے تخت بٹھا کر دم لیا۔ بندہ کو بندہ رہنے ہی نہ دیا اور حلول، اتحاد، ابنیت، ابلیت، عینیت وغیرہ طرح طرح کے عقیدے گڑھ کے رسالت کے ڈانڈے الوہیت سے جا ملائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال تو کھلی ہوئی موجود ہی ہے۔ ہندوستان کے جن بزرگوں کو اوتار کہہ کر مانا جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ ان کی بھی اصلی اور ابتدائی حیثیت پیمبری ہی کی ہو۔

قرآن مجید نے اس شدید گمراہی بلکہ کہنا چاہیئے کہ گمراہیوں کی جڑ سے مسلمانوں کو بچانے کے بالواسطہ اور براہ راست دونوں طریقے پُرزور صورت میں اختیار کئے۔

پہلے نظر طریق بالواسطہ پر کیجئے۔ قرآن مجید نے پہلے اس سلسلہ میں یہ اصل قائم کی کہ آپؐ بھی اسی طرح ایک رسولؐ ہیں، جیسے آپؐ کے قبل ہو چکے ہیں۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ

ہم نے (اے نبی) آپ کی طرف بھی بے شک (اسی طرح) وحی بھیجی

مِنۡ بَعۡدِہٖ ۔ (النساء ، ع : ۲۳) ہے جیسی نوح اور اُن کے بعد (دوسرے) نبیوں پر بھیجی تھی۔

اور خود آپ کی زبان سے یہ کہلایا گیا۔

قُلۡ مَا کُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ ۔ (الاحقاف ، ع : ۱) آپ کہہ دیجئے کہ میں پیمبروں میں کوئی انوکھا تو ہوں نہیں۔

اور یہ بھی تصریح کے ساتھ ارشاد ہوگیا۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ ۔ (آل عمران ، ع : ۱۵) محمدؐ تو بس ایک پیمبر ہی ہیں ۔ بے شک ان سے پہلے بھی پیمبر ہو چکے ہیں۔

اور اس اصل کے مقرر اور متعین ہو جانے کے بعد یہ حقیقت بھی ارشاد ہوگئی کہ سارے رسول انسان ہی ہوئے ہیں، بشر ہوئے ہیں فوق البشر نہیں ۔ نہ دیوتا ۔ نہ اوتار ۔ نہ ابن اللہ نہ کچھ اور ، فقط وحی الٰہی سے سرفراز بشر۔!

وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡقُرٰی ۔ (یوسف ، ع : ۱۲) (اے پیمبر) ہم نے آپؐ سے پہلے جو پیمبر بھیجے وہ بستیوں کے رہنے والے بس آدمی ہی تھے ، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

اسی حقیقت کا اعادہ سورہ النحل ع ۶ میں ہے اور یہی مضمون سورۂ انبیاء ۔ ع ۱ میں ایک بار پھر برائے نام لفظی فرق کے ساتھ ارشاد ہوا ہے ۔ گویا خوب وضاحت اور تکرار کے ساتھ یہ ارشاد ہوگیا کہ نبوت بشریت کے ماوراء اور اس سے مافوق کوئی چیز نہیں۔

یہ طریقہ تو بالواسطہ آپ کو بشر قرار دینے کا تھا ، لیکن قرآن نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ براہِ راست آپ کی بشریت کا اثبات اور وہ بھی بہ تکرار کیا ہے ۔ ایک جگہ آپ ہی کی زبان سے کہلایا ہے۔

هَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۔ (بنی اسرائیل ، ع ۱۰) میں بجز اس کے بشر ہوں پیمبر ہوں اور کیا ہوں۔

شرک اور مشرکانہ عقاید میں ڈوبے ہوئے منکرین بار بار پیمبروں سے انکار و استعجاب کے لہجہ میں کہتے تھے۔

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۔ (بنی اسرائیل : ع ۱۱) کیا خدا نے ایک بشر کو رسولؐ بنا کر بھیجا ہے ؟

یا یہ کہ :-

اَبَشَرٌ یَّہۡدُوۡنَنَا ۔ (التغابن ، ع : ۱) کیا ہماری ہدایت ایک بشر کرے گا ۔

یا کبھی اپنے پیمبر ہی کو براہِ راست مخاطب کرکے کہتے :

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا (الشعراء ، ع : ۸) تم اور کیا ہو کہ بجز اس کے ہم ہی جیسے ایک بشر ہو۔

اس طرح کے فقرے قرآن مجید نے ان مکذب قوموں کی زبان سے بار بار نقل کئے ہیں اور اس کے جواب میں اُن کے پیمبروں کی زبان سے اس واقعیت کو بڑی خندہ جبینی سے تسلیم کرالیا ہے۔

اِنۡ نَّحۡنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (ابراہیم ، ع : ۲) بے شک ہم تو بس بشر ہی ہیں تم جیسے ۔

اور اتنے ہی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ اس کی بھی تصریح بار بار کرادی کہ پیمبروں کا جسم بھی عام انسانوں کی طرح مادی جسم ہوتا ہے اور انھیں احتیاج بھی کھانے پینے کی رہتی ہے۔

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ۔ (الانبیاء، ع ۱) — اور ہم نے انھیں جسم بھی ایسا نہیں دیا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں۔

اور خود ہمارے رسولؐ سے متعلق تو مشرکینِ مکہ کا یہ مستقل طنز تھا کہ یہ کیسے رسولؐ ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں۔

قَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع ۲) — بولے کہ ان رسولؐ کو کیا ہوا ہے کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

جواب میں آپؐ کی بشریت کی واقعیت کو تسلیم کرکے ارشاد ہوا کہ اس میں نئی بات کیا ہے۔ جتنے پیمبر پیشتر آچکے ہیں سب ہی جسم اور یہی احتیاجیں لے کر آتے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع ۲) — اور ہم نے آپؐ سے پیشتر جتنے پیمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔

اور یہی نہیں کہ پیمبران برحق کھانے پینے، چلنے پھرنے کی بشری ضرورتوں سے بے نیاز نہ تھے بلکہ بیوی بچے، شادی بیاہ اور خاندان کے معاملے میں بھی ترک و تبتل اور رہبانیت کے قائل اور عامل نہ تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً۔ (الرعد، ع ۶) — (اے پیمبر) بے شک ہم نے آپؐ سے پیشتر پیمبر بھی بھیجے ہیں اور انھیں بیبیاں اور اولادیں بھی دی ہیں۔

اور پیمبروں میں تو اتنی قوت بھی نہیں ہوتی کہ خود اپنی طرف سے کوئی معجزہ دکھا سکیں۔ یا کوئی امر بطور خارق عادت پیش کرسکیں۔

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (الرعد، ع ۶) — اور کسی رسولؐ کے بس میں نہیں کہ وہ کوئی بھی نشان لاسکے بجز اس کے کہ اللہ کے حکم سے۔

اور خود پیمبروں کی زبان سے کہلایا گیا:

وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَّأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (ابراہیم، ع ۲) — اور ہمارے بس میں تو یہ نہیں کہ ہم تمھارے پاس کوئی دلیل لاسکیں بجز اس کے کہ اللہ کے حکم سے۔

معبودیت کی بڑی پہچان اور مخلوقیت کی بالکل ضد دوام زیست یا ابدیت ہے۔ اس وصف کی کامل نفی پیمبروں سے قرآن نے کی ہے۔

وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ ۔ (الانبیاء، ع:۱)

وہ ہمیشہ رہنے والے نہ تھے ۔

اس قسم کی آیتوں میں تو ہمارے رسولؐ کا ذکر صرف ضمناً و استطراداً ہے۔ باقی دوسری آیتوں میں آپؐ کی وفات یا فناپذیری کا ذکر صراحتؔہ ہے۔ مثلاً

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ (آل عمران، ع: ۱۵)

محمدؐ تو بس ایک پیغمبر ہی ہیں۔ پیغمبران سے پہلے بھی (بہت سے) گزر چکے ہیں۔ تو اگر یہ وفات پا جائیں یا ہلاک کر ڈالے جائیں تو کیا تم پچھلے پیروں واپس چلے جاؤ گے ۔

اور کہیں اس قسم کے الفاظ ہیں:

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۔

(الرعد، ع: ۶)

اور جس عذاب کا وعدہ ہم (کافروں) سے کر رہے ہیں۔ اگر اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو دکھلا دیں یا آپ کو وفات دے دیں تو آپ کے ذمہ تو صرف تبلیغ ہے اور حساب لینا ہمارا ہی کام ہے ۔

اور کہیں اس سے ملتے جلتے الفاظ یوں آئے ہیں :-

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ۔

(یونس، ع، ۵)

اور جس عذاب کا وعدہ ہم ان (کافروں) سے کر رہے ہیں، اگر اس کا کچھ حصہ ہم آپ کو دکھلا دیں یا آپ کو وفات دے دیں تو ہمارے پاس تو انھیں واپس آنا ہی ہے ۔

اور یہ مضمون انھیں آیتوں میں نہیں اور بھی متعدد آیتوں میں آیا ہے اور اگر تکرار سے مقصود مخاطبین کو رسول اللہؐ کی بشریت اور وفات پذیری سے خوب مانوس کر دینا ہے اور ایک جگہ تو انتہا یہ ہے کہ اس خاص وصف کے لحاظ سے رسول مقبولؐ اور کفار معاندین کو بالکل ایک ہی صف میں رکھ دیا گیا ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۔

(الزمر، ع ۳)

آپ بھی موت پانے والے ہیں اور یہ لوگ بھی موت پانے والے ہیں ۔

عبدیت، قرآن نے بتایا کہ حضرات انبیاء کے لیے کوئی ننگ و عار کی چیز نہیں، فخر و مباہات کی بات ہے حضرت مسیح کا نام لے کر ہے ۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ ۔

(النساء، ع ۲۴)

مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں ۔

رسول برحق صلعم کی زبان سے یہاں تک کہلا دیا گیا کہ اور تو اور میں اپنی ذات کو بھی نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا ۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۔ (یونس، ع : ۵)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنی ذات تک کے لیے تو نقصان و نفع کا اختیار نہیں رکھتا ہوں مگر ہاں جتنا اللہ کو منظور رہو۔

اور یہی مضمون ایک برائے نام لفظی فرق کے ساتھ سورۃ الاعراف میں ع ۲۲ میں دہرایا گیا ہے ۔

مشرکانہ مذہبوں کا ذکر نہیں مسیحیت تو اصلاً ایک توحیدی دین ہے اس تک میں شفیع مطلق حضرت مسیحؑ کو ٹھہرالیا گیا ہے، بلکہ ، وہ جزاکے گویا حاکم و مالک ہی وہی ہوں گے اور جس کو چاہیں گے اپنے اختیار سے جنت دلوا دیں گے۔ قرآن مجید نے اس کے برعکس رسولِ اسلامؐ کی زبان سے یہاں تک کہلایا ہے ۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ ۔ (الاحقاف ع ۱)

اور میں بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا، اور تمھارے ساتھ کیا۔

اور خیر یہاں تو معاملہ حشر کے علم کی نفی رسولؐ کی زبان سے کرائی گئی ۔

دوسری جگہ علم غیب کی نفی کہنا چاہیئے کہ مطلق صورت میں ہے ۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ (الاعراف ع ۲۳)

اگر میں غیب کا علم رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سے نفع حاصل کر لیتا اور کوئی مضرت میرے اوپر واقع نہ ہوتی ۔ میں تو محض ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

رسولؐ کی بشریت ایک اور لطیف و نادر طریقہ سے بھی قرآن مجید نے ظاہر کر دی ہے یعنی انجام کے ساتھ حضورؐ کے مادی اجزائے جسم ، اعضاء اور شکل و شمائل کے اہم جزئیات کا بھی ذکر اپنے صفحات میں کر دیا ہے اور اس طرح کہنا چاہیئے کہ سراپائے مبارک کا ایک خاکہ قرآن پاک کی مدد سے تیار ہو جاتا ہے ۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (الدخان ع ۳)

ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان سے آسان ہی کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت قبول کر لیں ۔

زبان مبارک کا تذکرہ ایک دوسرے موقع پر بھی موجود ہے ۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ (القیامۃ ع ۱)

اے پیغمبر! آپ قرآن پر زبان نہ ہلایا کیجئے کہ آپ اسے جلدی جلدی لیں ۔

زبان کے وجود کا اثبات اور وہ بھی دو دو جگہ، خواہ مخواہ اور بلا مقصد نہیں اس سے جہاں ایک طرف حضورؐ کے جسد ظاہری کا اکرام ظاہر ہوتا ہے وہاں مخاطبین کو یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ اس عبد محترم کا جسد و قالب گوشت و پوست کے انھیں لوازم کے ساتھ تھا۔ جو نوع بشری کے لیے عام ہیں۔ زبان کے ساتھ دل کا ذکر بھی آیا ہے۔ قلب اور فواد دونوں لفظوں کے ساتھ دو جگہ ۔ چنانچہ پہلی جگہ ۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی

آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبرئیل سے دشمنی رکھتا ہے تو انھیں نے تو

قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ (البقرع ۱۲) یہ قرآن آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اُتارا ہے ۔

دوسری بار ایک اور سورت میں ۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ (الشعراء ع ۱۱) اس قرآن کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں ۔

لفظ فواد کے ساتھ بسلسلہ معراج آیا ہے ۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۔ (النجم ع ۱) قلب (پیغمبر) نے دیکھنے والی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی ۔

چشمان مبارک کے ذکر جمیل سے بھی یہ صحیفہ ربانی خالی نہیں ۔

حضورؐ ہی کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے ۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ ۔ (الحجر ع ۶) اور آپ ہرگز آنکھیں اُٹھا کر بھی ان چیزوں کو نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان (نافرمانوں) کے مختلف گروہوں کو متمتع کر رکھا ہے ۔

چشم مبارک کی بصارت کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے ۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۔ (النجم ع ۱) نگاہ نہ تو ہٹی نہ بڑھی ،

روئے مبارک کا تذکرہ تو شاید اور زیادہ ضروری تھا۔ اس سے یہ کتاب آسمانی کیسے خالی رہتی۔ حکم تحویل قبلہ کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے ۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ہم آپ کے چہرہ کا آسمان کی طرف باربار اُٹھنا دیکھ رہے ہیں ۔

اور پھر اسی آیت کے اندر انھیں الفاظ سے متصل ۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ بس آپ پھیر لیا کیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف ۔

اور پھر چند سطروں بعد انھیں الفاظ کی تکرار دوسری اور تیسری بار روئے مبارک کو دین کی طرف یکسو رکھنے کا حکم سورۃ الروم میں دوبار قریب قریب ہی ہے ۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (الروم ع ۴) سو اپنا رُخ دین کی طرف یکسو ہو کر رکھئے ۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ ۔ (الروم ع ۴) سو آپ اپنا رُخ اس دین راست کی طرف رکھئے ۔

اور ایک جگہ حکم کی صورت میں آپ سے خطاب ہوا ہے کہ :

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِىَ لِلّٰهِ ۔ اگر یہ (مشرکین) پھر بھی آپ سے حجتیں نکالتے رہیں تو کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رُخ (خاص) اللہ کی طرف ہی کر چکا ۔

ایک اور جگہ زبان مبارک سے یہ کہلایا گیا ہے کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ :

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۔ اپنا رُخ دین کی طرف یکساں ہو کر رکھنا ۔

چشم مبارک کے علاوہ گوش مبارک کا بھی ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر صراحتہً نہیں تو دلالۃً تو بہر حال۔ منافقین مدینہ کا قول نقل ہُوا ہے :۔

يَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ۔ (التوبہ ع ۸)

یہ کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سُنتے ہیں۔ کہہ دیجئے، کہ آپ کان دے کر وہی بات سُنتے ہیں، جو تمھارے حق میں بہتر ہے۔

اب سینۂ مبارک کی طرف آیئے اور اس کا عکس اس آئینۂ آسمانی میں ملاحظہ فرمایئے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ۔ (الانشرح)

کیا آپ کا سینہ ہم نے آپ کے لیے کھول نہیں دیا ہے۔

اور پُشت مُبارک کے ذکر کے لیے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں اسی کے متصل موجود ہے۔

وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ۔

اور آپ سے آپ کا وہ بوجھ دُور کر دیا جو آپ کی پشت کو توڑے ڈالتا تھا۔

اور اُن کے اعضائے جسد کے علاوہ قرآن معرضِ بیان میں حضورؐ کے بعض اعمال و حرکات جسمانی کو بھی لایا ہے مثلاً حضورؐ کا اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا اور نماز اور عام عبادتیں مثلاً :

الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ۔ (الشعراء ع ۱۱)

وہ اللہ جو آپ کو دیکھتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی نشست برخاست نمازیوں کے ساتھ۔

یا منکرین مشرکین کی زبان سے۔

مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ۔ (الفرقان، ع ۱)

ان رسولؐ کو یہ ہے کیا یہ کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی ہیں۔

یا پھر اس قسم کی آیتیں :۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (الاعراف ع ۲۴)

آپ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ پروردگارِ عالم کے لیے ہیں۔

حیات اور ممات دونوں کا ذکر اس آیت میں آگیا ایک جگہ مشرکین کو مخاطب کر کے عمر شریف کا بھی حوالہ آپ ہی کی زبان مبارک سے دیا گیا ہے :

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ۔ (یونس ع ۲)

میں اس (دعویٰ نبوت) سے قبل بھی تو ایک عمر تک تمھارے درمیان رہ چکا ہوں۔

اسی طرح ایک جگہ اور قوم لوط کی سرمستی کو آپ کی عمر یا جان کی قسم کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ۔

آپ کی جان کی قسم وہ لوگ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

معاصرین

رسول اللہ صلعم کے سیرۃ نگار کے لیے بعض اہم سوالات یہ ہیں کہ آپؐ کو پیام کیا ملا تھا اور آپ پیامبر بنا کر کس طرف بھیجے گئے تھے اور وہ پیام ان لوگوں نے کس رنگ میں سُنا۔

تبلیغ کا حکم اجمالی طور پر تو ایک معنی میں آپ کو بعثت و نبوت کے ساتھ ہی مل گیا تھا۔ چنانچہ ایک ابتدائی سورۃ میں ہے۔

قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر ع ۱) آپ کھڑے ہو جیئے اور ڈرائیے۔

لیکن یہاں یہ کچھ تصریح نہیں کہ کس کو ڈرائیے۔ انداز کا عمل کس پر کیجیے۔ اسی طرح یہ آیت بھی رقب۔ تبلیغ کے باب میں مجمل ہی ہے۔

وَقُلْ اِنِّیٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ (الحجر ع ۶) آپ کہہ دیجیے کہ میں تو ایک کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اور کچھ ایسا ہی حال اس آیت کا بھی ہے۔

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ (الاعراف ع ۲۳) میں اور کچھ نہیں بجز اس کے کہ نذیر و بشیر ہوں۔

پھر یہ آیت بھی اسی طرح مطلق ہے اور تصریح سے خاموش۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الاعراف ع ۲۳) غرض آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اُسے صاف صاف سُنا دیجیے اور مشرکوں کی پروا نہ کیجیے۔

اور کچھ اسی قسم کا حکم گو اور زیادہ موکد اس آیت سے بھی نکلتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ۔ (المائدہ ع ۱۰) اے پیغمبر آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے آپ سب پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا ایک پیغام بھی نہ پہنچایا۔

اور اسی قبیل کی یہ آیت بھی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ (البقرہ ع ۱۴) بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو دین حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر۔

اور یہی آیت سورۃ الفاطر رکوع ۳ میں آئی ہے۔

اور وہیں یہ آیت بھی آئی ہے۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ۔ (الفاطر ع ۳) آپ تو بس ایک ڈرانے والے ہی ہیں۔

اور اسی مضمون کی اور لفظاً بھی اسی سے ملتی جلتی آیتیں اور بھی ہیں۔
مثلاً :

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ (الفاطر ع ۳) بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو دین حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر۔

اور

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (بنی اسرائیل ع ۱۲) اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مبشر و نذیر بنا کر۔

اور ایسی ہی آیتیں سورہ الفتح و سورۃ الاحزاب و سورۃ الفرقان میں بھی ملتی ہیں۔

ان ساری آیتوں سے اتنا تو واضح بلکہ موکد طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کے ذمہ فریضہ تبلیغ و دعوت تھا اور آپ شروع ہی سے "بشیر" ، "نذیر" ، "مبشر" اور "شاہد" تھے۔ یہ سب تصریحات اگر نہ ہوتیں جب بھی خود لفظ رسول کے اندر اجمالاً یہ فرائض آگئے تھے۔ رسالت کے معنی یہ ہیں کہ کسی کا پیام کسی کو پہنچانا تو آپ کی پیام بری اور پیام رسانی میں تو کوئی اشتباہ اول روز ہی سے نہ تھا" گفتگو صرف اس میں ہے کہ آپ کا مخاطب کون سا گروہ کون سا طبقہ، کون سی انسانی آبادی تھی۔؟

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے سپرد تبلیغ و ہدایت سب سے پہلے آپ کے کنبہ اور برادری والوں کی ہوئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ (الشعراء ع ۱۱) اور اپنے قریب خاندان والوں کو ڈرا دیجئے۔

اور قدرۃً آغاز یہیں سے ہونا بھی تھا۔ اس کے بعد پھر اس قدرتی ترتیب سے دائرہ دعوت وسیع ہو کر قوم عرب یعنی نسل اسمٰعیل تک پہنچا۔ اس کی جانب رہنمائی متعدد آیات سے ہوتی ہے۔

مثلاً :

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (یٰسین ع ۱) تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جس کے آباؤ اجداد ڈرائے نہیں گئے ہیں وہ اس سے بے خبری میں ہیں۔

اس "قوم" سے کھلی ہوئی مراد قوم عرب یا بنی اسمٰعیل سے ہے۔

دوسری آیت اسی تائیدی معنی میں ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِکَ۔ (السجدہ ع ۱) تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے قبل کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے۔

اور یہی مفاد اس قسم کی آیتوں کا بھی ہے جن میں یہ آیا ہے کہ آپ اُمیوں کے درمیان مبعوث کئے گئے ہیں اُن کی اصلاح و ہدایت کے لیے۔ مثلاً :

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اور اللہ وہی ہے جس نے اُمیوں کے درمیان ایک انہیں میں سے رسول

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الجمعہ ع ۱)

مبعوث کیا جو انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سُناتے ہیں، اور اُنھیں پاک صاف بناتے ہیں اور انھیں کتاب ودانائی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ قبل اس کے کھُلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوتے تھے۔

اُمیّین سے کھُلی ہوئی مُراد ام القریٰ یعنی مکہ معظمہ کے باشندے ہیں اور جب اس کے ساتھ وہ آیت ملائی جائے جس میں تقریباً یہی دُعا حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی ذریت کے حق میں کی ہے، یعنی:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ (البقرہ ع ۱۵)

اے ہمارے ربّ ہماری ذریت کے درمیان ایک رسولؐ انہیں میں سے اُٹھا، جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور اُنھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور اُنھیں پاک صاف بنائے بیشک تُوہی زبردست بھی ہے اور حکمت والا بھی۔

تو یہ بات اور بھی صاف ہوجاتی ہے کہ اُمت دعوت ساری نسل اسمٰعیل ہے۔

اب اس کے بعد دائرہ دعوت میں اور وُسعت ہوتی ہے اور خود رسُولِ پاک کی زبان سے یہ کہلایا جاتا ہے۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ (الانعام ع ۲)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تمھیں بھی خبردار کردوں اور جس کسی کو یہ پہنچے اس کو بھی۔

اس ایک ومن بلغ کے اضافہ نے یہ صاف کردیا کہ دعوت محمدیؐ اب اُنھیں کے ساتھ مخصوص ومحدود نہیں جو آپؐ کے مخاطبین اوّل تھے۔ بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہو کر اس ساری آبادی کو بھی محیط ہوگیا ہے۔ جہاں تک قرآن پہنچ جائے اور چونکہ قرآن کے پہنچ جانے کا امکان روئے زمین کے ہر گوشہ تک ہے اس واسطے دائرہ دعوت بھی گویا اب سارے عالم تک وسیع ہورہا ہے۔

یہ استنباط پھر بھی بالواسطہ تھا اور کچھ اسی قسم کا نتیجہ تکمیل دین والی آیت سے بھی نکالا جاسکتا تھا یعنی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔ (المائدہ ع ۱)

آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا اور تم پر پوری کردی اپنی نعمت۔

اور کہا جاسکتا تھا کہ جب دین کی تکمیل ہر پہلو سے ہوگئی اور اللہ کا انعام ہر طرح پورا ہوگیا، تو اب اولاد آدمؑ کا کوئی طبقہ اس کے فیض سے باہر کیوں رہے۔ لیکن اب اس بالواسطہ استدلال اور استنباط کی بھی ضرورت نہ رہی بلکہ صاف اور کھلے لفظوں میں ارشاد ہونے لگا کہ پیغام محمدیؐ ملک گیر نہیں بلکہ عالمگیر ہے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۔ (الفرقان ع ۱:)

بابرکت ہے وہ ذات جس نے فیصلہ والی کتاب اپنے بندہ (خاص) پر اُتاری تاکہ وہ سارے عالم کو خبردار کرنے والا ہے۔

اور دوسری جگہ ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (الانعام ع ۱۰) یہ (قرآن) نہیں ہے مگر نصیحت سارے عالم کے لیے۔

اور تیسری جگہ براہِ راست رسول اللہؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الاعراف ع ۱۰) آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔ اللہ کا جس کی سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے۔

چوتھی آیت بھی ایسی ہی واضح و صریح ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (السباء ع ۳) اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو (اے پیغمبر) مگر سارے ہی انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔

غرض یہ کہ آپ کی بعثت و دعوت کا ساری نسل آدمؑ کی طرف ہونا تو ہر طرح ثابت اور یقینی ہے لیکن ظاہر ہے کہ آپ کا سابقہ بیک وقت ساری دنیا سے اور دُور دراز بسنے والی قوموں سے کیونکر پڑ سکتا تھا۔ قدرتاً براہِ راست سابقہ آپ کو انھیں لوگوں سے پیش آیا جو جغرافیائی اعتبار سے آپ سے متصل تھے یعنی عرب اور خصوصاً اس کے شہروں مکہ و مدینہ یا ان کے حوالی میں آباد تھے۔ تو اب تاریخی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان اہلِ ملک نے حضورؐ کے پیام کی پذیرائی کس حد تک اور کیونکر کی! ــ اور یہیں سے ایک بڑا طویل باب آپ کے معاصرین کے متعلق شروع ہوتا ہے۔

مُشرکین

ان میں سب سے پہلے نمبر مشرکین کا آتا ہے۔ ان کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مشرکین اور الذین اشرکوا کا ذکر اور شرک کے بابت احکام قرآن مجید میں صدہا آیتوں میں وارد ہوئے ہیں اور ان صریح الفاظ کے علاوہ بالواسطہ بھی جو آیات عبادت غیر اللہ کی ممانعت اور اس پر زجر و ملامت میں وارد ہوئی ہیں اُن کی تعداد تو اور بھی زائد ہے۔

محمد صلعم جو پیام لے کر آئے تھے اس کا اہم ترین جزو توحید ہے یعنی اللہ تعالےٰ کی یکتائی کا اثبات، ذات، صفات، افعال ہر پہلو اور ہر اعتبار سے۔ قرآن نے اسی پیام کو صدہا بار دہرایا ہے۔ مختلف پیرایوں میں اور تاکید سب سے زیادہ اسی کی رکھی ہے۔ کہیں یوں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰــهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ (النحل ع ۷) اور اللہ نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔

اور کہیں یوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ آپ کہہ دیجئے کہ میں تو بس بشر ہی ہوں۔ تمھیں جیسا، اور مجھ

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔ (الکہف ع ۱۲) (حٰم السجدہ ع ۱۲) پر وحی یہ آئی ہے کہ تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

کہیں مطلق صورت میں ارشاد ہوا ہے کہ :-

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ (البقرہ ع ۱۹) اور تمہارا خدا بس اکیلا ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

یا یوں

هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ (زمر ع ۱) وہی اللہ ایک اور زبردست ہے۔

اور کہیں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ جیسے یہی معیارِ اسلام یا انقیاد کا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (الانبیاء ع ۷) آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر وحی یہ آئی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدائے واحد ہے تو اب تم اسلام لاتے ہو؟

اس مضمون کی آیتیں ایک دو نہیں، بیسیوں ہیں — ایک جگہ ایک مختصر جامع سورۃ میں ہر قسم کی توحید کا اثبات اور ہر قسم کے شرک کی نفی کر کے لفظ بھی بجائے "واحد" کے "احد" لایا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ (الاخلاص) آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے اور (سب سے) بے نیاز ہے، نہ اس کے کوئی اولاد، نہ وہ کسی کی اولاد، اور نہ کوئی اس کے جوڑ کا ہے۔

اہلِ لغت اور علماء ادب نے لکھا ہے کہ احد، واحد کی ترقی یافتہ شکل ہے واحد جمع و تعدد کو قبول کر لیتا ہے لیکن "احد" تفرید میں کامل اور تجرید میں یکتا ہے اور اگر یہ ال کے اضافہ کے ساتھ الاحد کر کے لایا جائے تو یہ اسم ذات کی طرح مخصوص ہے اللہ تعالےٰ کے لیے اور ھو الذی لا الٰہ الا ھو اور اللّٰہ لا الٰہ الا ھو کی قسم کی تو بہ کثرت آیتیں قرآن میں ہیں جن سے خدا ؤں کے تعدد یا غیر اللہ معبود کے وجود ہی کی سرے سے نفی کی گئی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں اس قسم کے شرکِ جلی کی بڑی گرم بازاری تھی اور سب سے زیادہ یہی لوگ آپ کا پیام سن کر سنی ان سنی کرتے تھے، اور چونکہ آپؐ مامور تھے تبلیغ پر جیسا کہ آیاتِ کریمہ :-

قُمْ فَاَنْذِرْ۔ (المدثر ع ۱) آپ کھڑے ہو جئے اور خبردار کیجئے۔

اور

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (المائدہ ع ۱۰) اے رسولؐ آپ پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر اتارا گیا ہے۔

اور

فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ۔ (آل عمران، ع ۲) آپ کے ذمہ تو بس پہنچا دینا ہے۔

اور

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ۔ (النحل ع ۱) آپ کے ذمہ تو بس کھلم کھلا تبلیغ ہی ہے۔

اور بہت سی دوسری آیتوں سے ظاہر و ثابت ہے۔ اس لیے یہ بات ایک حد تک بالکل قدرتی تھی کہ جو لوگ اپنی وہم پرستیوں پر زیادہ راسخ اور جامد تھے۔ انھوں نے نئی دعوت کو سن کر اس کی مخالفت بھی شدت سے کی اور دعوت و داعیٔ دونوں کے دشمن ہو گئے۔ انھیں حیرت تھی کہ یہ نیا داعی سارے خداؤں کو چھوڑ کر خدائے واحد (یکتا) کی طرف کیسے بلا رہا ہے۔ کبھی حیرت اور غصّہ کے ساتھ کہتے کہ:-

هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۔ (ص ع ۱)

یہ شخص ساحر ہے۔ کذاب ہے۔ کیا اس نے تمام خداؤں کو بس ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ بات تو بہت ہی عجیب ہے۔

اور کبھی یہ کہتے کہ:-

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۔

ہم نے تو یہ (کبھی اپنے) پچھلے مذہب میں سنا نہیں ہو تو یہ گڑھی ہوئی چیز ہے۔

اور اسی طرح قوم نوح نے بھی اپنے نبی کی دعوت توحید پر کہا تھا کہ

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِیْنَ ۔ (المومنون ع ۲)

ہم نے اپنے باپ دادوں سے کبھی تو یہ سنا نہیں۔

قدرتاً رسولؐ اسلام کا یہ مطالبہ مخاطبین کو بہت عجیب معلوم ہوتا اور ناگوار بھی گزرتا اور اُن کی طرف سے فرمائش طرح طرح معجزات کی ہوتی اور بار بار ہوتی کبھی کہتے۔

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۔ (البقرة ع ۱۴)

اللہ ہم سے خود بات کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی معجزہ کیوں نہیں آتا۔

اور کبھی پیمبر کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں:-

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (الانعام ع ۱)

ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں آتا۔

یہ مضمون بیسیوں آیتوں میں دہرایا گیا ہے اور کبھی یہ لوگ معجزات کا نام بھی متعین طور پر لے دیتے کہ اگر اپنے دعویٰ رسالت اور تعلق باللہ میں سچے ہو تو فلاں فلاں خارق عادت واقعات کرکے ہمیں دکھا دو۔ چنانچہ کہتے:

لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ۔ (ہود ع ۲)

اُن کے پاس اُنکے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں آتا۔

اور کبھی یہ کہتے:

أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا۔ (الفرقان ع ۱)

ان پر کوئی خزانہ کیوں نہ اُتار دیا گیا یا اُن کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔

اور کبھی ان فرمائشی خوارقِ معجزات کی فہرست خاصی طول طویل ہوتی مثلاً یہ کہتے کہ:۔

لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ۔ (بنی اسرائیل ع ۱۰)

ہم تجھ پر ایمان ہرگز نہ لائیں گے جب تک تمہارے لیے زمین سے چشمہ نہ جاری کر دے یا پھر تیرے لیے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو اور تو اس کے درمیان نہریں جاری کر دے یا آسمان کا کوئی ٹکڑا توڑ کر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے یا اللہ اور فرشتوں کو تو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لیے گھر سونے کا ہو جائے یا تو آسمان پر (ہماری آنکھوں کے سامنے) چڑھ جائے۔

یہ ساری آیتیں مکی ہیں اور ایسے فرمائشی معجزات کے مطالبے اہلِ مکہ خصوصاً قریش ہی کی جانب سے زیادہ پیش ہوتے رہتے تھے ——— اور ان کے شرک کے یہ معنی نہ تھے کہ یہ لوگ اللہ کے وجود کے منکر ہوں اور اس کے بجائے اور خدا تسلیم کرتے ہوں۔ نہیں یہ لوگ اللہ کے وجود کے پوری طرح قائل تھے۔ لیکن اسے خدائے واحد یکتا نہیں۔ بلکہ صرف خدائے اعظم تسلیم کرتے تھے۔ یعنی گو سب سے بڑا خدا اللہ ہے تاہم اس کے ساتھ یا شاید اس کے ماتحت اور بھی بہت سے خدا ہیں اور معبودیت و حاجت روائی میں اسی طرح ہیں، بلکہ شاید اس سے بھی بڑھ کر اور اس لیے اس مشرکانہ منطق میں تعلق انھیں سے زیادہ رکھنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس عقیدہ پر سخت جرح کی اور بار بار سوالات کر کے اہلِ جاہلیت کو ان کی جہالت پر متنبہ و آگاہ کیا۔ چنانچہ ایک جگہ یہ جرحی سوالات بہت دُور تک چلے گئے ہیں۔

ءَاللَّهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ أَمَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَّا كَانَ لَكُمْ أَن تُنبِتُوا شَجَرَهَا أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَعْدِلُونَ أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ

(بھلا بتاؤ تو کہ) اللہ بہتر ہے یا وہ جنھیں یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں؟ آیا وہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے اس نے تمہارے لیے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے ہم نے رونق دار باغ لگائے اور تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اُگا سکو تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ یا وہ ذات جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے درمیان ندیاں بنائیں اور اس کے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان حدِ فاصل بنائی تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر تو یہ سمجھتے ہی

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۚ اَمَّنْ
يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ
يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا
الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔

(النمل ع ۵)

نہیں۔ آیا وہ جو بیقرار کی (فریاد) سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور مصیبت کو دُور کر دیتا ہے اور تم کو زمین پر صاحب تصرف بناتا ہے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ بہت ہی کم تم لوگ یاد رکھتے ہو۔ آیا وہ جو تمھیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ سجھاتا ہے اور جو ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے جو خوشخبری دیتی ہیں تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ اللہ برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔ آیا وہ جو مخلوق کو اول بار پیدا کرتا ہے اور پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، اور تمھیں رزق دیتا ہے آسمان و زمین سے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔ آپ کہیئے کہ تم اپنی دلیل لاؤ، اگر تم (دعویٰ شرک میں) سچے ہو۔

ان آیتوں میں مشرکین پر حجت قائم کی ہے کہ جب اللہ ہی خالق و فاطر، رازق و نافع اور ناظم امور ہے اور تم اسے تمام تر تسلیم بھی کرتے ہو تو آخر یہ تمھیں کیا سودا ہے کہ تم اس کے ہوتے ہوئے دوسرے خداؤں کی طرف جھکتے ہو، ان سے اپنی حاجتیں عرض کرتے ہو اور انھیں بھی درجہ معبودیت میں رکھتے ہو۔!

اور اسی طرح کی آیتیں بلکہ ان سے بھی زیادہ واضح ایک دوسری جگہ بھی وارد ہوئی ہیں۔ رسول کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ
سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۗ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ
مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيْمِ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۗ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ قُلْ مَنْۢ
بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ
عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۗ
قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۔

(المومنون ع ۵)

آپ کہیے کہ یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں یہ سب کس کے ہیں اگر تم کچھ خبر رکھتے ہو؟ (اس پر) وہ ضرور یہ کہیں گے کہ یہ اللہ کے ہیں، ان سے کہیئے کہ پھر تم کیوں غور نہیں کرتے۔ آپ یہ بھی کہیے، کہ (ان سات) آسمانوں کا مالک اور عالی شان عرش کا مالک کون ہے؟ وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ بھی اللہ کا ہے۔ آپ کہیے کہ پھر تم کیوں نہیں ڈرتے؟ آپ یہ بھی کہیے کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور کوئی اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، اگر تمھیں کچھ بھی خبر ہو؟ اب بھی وہ ضرور ہی یہ کہیں گے کہ یہ سب اوصاف اللہ کے ہیں۔ آپ کہیئے کہ پھر یہ تمھیں کیا خبط ہو رہا ہے۔

اور اسی طرح ایک جگہ اور انھیں مشرکوں کی زبان سے اقرار کرایا ہے کہ خالق آسمان و زمین اللہ ہی ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ (لقمان ع ۳)

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ بول اُٹھیں گے کہ اللہ نے۔

چنانچہ جن آیتوں میں اثبات توحید اور ممانعت شرک پر زور دیا ہے وہاں اکثر یہ بھی بڑھا دیا ہے کہ عبادت کا حقدار بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

فَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا۔ (النساء ع ۶)

عبادت اللہ کی کرو اور کسی کو اُس کے ساتھ شریک نہ کرو۔

یا

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (الکہف ع ۱۲)

(انسان کو چاہیئے کہ) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

جن کی عبادتوں میں یہ مشرکین عرب لگے رہتے تھے اس کا وجود خارج میں سرے سے تھا ہی کہاں؟ ان لوگوں نے محض ایک خیالی اور فرضی وجود عطا کر رکھا تھا۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ (یوسف ع ۵)

اور تم اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہو وہ تو بس نام ہی نام ہیں۔ جو تم نے اور تمھارے باپ دادوں نے دے رکھے ہیں۔

اس شرک کا ایک خاص مظہر بت پرستی ر نام لے کر اس کی ممانعت وارد ہوئی۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ۔ (الحج ع ۴)

بتوں کی پلیدی سے بچو۔

اور یہ اوثان ہی کا لفظ پُرانی مشرک قوموں یعنی قوم نوح (عنکبوت ع ۲) اور قوم ابراہیم (عنکبوت ع ۳) کے حق میں بھی وارد ہو چکا ہے یہ مورتیاں عموماً پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں دو جگہ جو ذکر آتش دوزخ کے سلسلہ میں انسانوں کے ساتھ پتھروں کا آیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳ میں وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اور دوسری جگہ انھیں الفاظ کے ساتھ سورۃ التحریم کے رکوع اوّل میں تو دونوں جگہ پتھر سے مُراد پتھر کی ترشی ہوئی مورتیاں ہی ہیں اور ان بڑی مورتیوں میں سے تین کا ذکر نام کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ ایک لات دوسرے عزیٰ اور تیسرے منات۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۔ (النجم ع ۱)

بھلا تم نے نظر نہیں کی ہے لات پر اور عزیٰ پر اور تیسری اور منات پر۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ یہ تینوں بُت عرب کے مشہور و پرقوت قبیلوں کے تھے اور قرآن مجید نے قوم

نوح کے جن دیوتاؤں کے نام سورۂ نوح ع ۲ میں گنائے ہیں ۔ ود ۔ سواع ۔ یعوق ۔ یغوث ۔ نسر تاریخوں میں آتا ہے کہ یہ بت جاہلی عربوں کے بھی تھے اور عراق سے آکر عربوں میں بھی پجنے لگے تھے ۔

اہل جاہلیت کا اپنی صفائی میں کہنا یہ تھا کہ ہم ان بتوں کو کہیں خدا تھوڑے ہی سمجھ رہے ہیں ہم تو انھیں بارگاہ خداوندی کے لیے محض ایک وسیلہ کر لیتے اور انھیں محض شافع اور سفارش کرنے والے مانتے ہیں ۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔ (الزمر ع ۱)

ہم تو انھیں محض اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ اللہ سے ہمیں قریب تر کر دیں ۔

اللہ یا خدائے اعظم کے لفظی اعتراف و اعتقاد کے ساتھ عمل میں ان مشرکین عرب کا یہ حال تھا کہ اپنی پیداوار اور اپنے جانوروں میں جو حصے لگاتے، ان میں اللہ کے نام والے حصے تو بتوں کی طرف بے تکلف منتقل کر دیتے، لیکن یہ نہ کرتے کہ بتوں والے حصے اللہ کی طرف منتقل کر دیں ۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے ۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۔ (الانعام ع ۱۶)

اور اللہ تعالٰی نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں، اُن لوگوں نے اس میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا ہے اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ ہمارے معبودوں کا ہے ۔ پھر جو چیز اُن کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی ہے اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ اُن کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے کیا بُری تجویز ان لوگوں نے نکال رکھی ہے ۔

ان مشرکانہ عقائد کا اثر ان مشرکوں کے اعمال اور ساری زندگی پر بھی پڑا تھا ۔ اور یہ لوگ طرح طرح کے خرافات و اوہام میں مبتلا ہو گئے تھے ۔ ان میں ایک بڑی چیز ان کی عادت اولاد کشی تھی اور کھانے پینے کی چیزوں میں سے فلاں فلاں کا فلاں فلاں طبقہ کے لیے حرام کر لینا تھا ۔ قرآن مجید نے اسی سورۂ انعام کی اسی آیت کے متصل ان چیزوں کو بھی ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ شروع کی آیت ہے :۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۔ (الانعام ع ۱۶)

اور اسی طرح کثرت سے مشرکین کے خیال میں اپنی اولاد کے ہلاک کر ڈالنے کو ان کے معبودوں نے اچھا بنا رکھا ہے تا کہ ان کو برباد کر دیں اور ان کے دین کو ان کی نظر میں مخبوط کر دیں ۔

اور آخری آیت ہے :۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۔ (الانعام ع ۱۶)

یقیناً گھاٹے میں آ گئے جنھوں نے ہلاک کر ڈالا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر کسی سند کے اور اللہ نے جو کچھ کھانے پینے کو دیا تھا اسے حرام کر لیا اللہ پر جھوٹ باندھ کر بے شک یہ لوگ گمراہ ہو گئے اور راہ یاب نہ ہوئے ۔

بت پرستی کے علاوہ یہ مشرکین ملائکہ پرستی میں بھی مبتلا تھے اور ملائکہ کو انھوں نے خدا کی بیٹیاں یا دیویاں ٹھہرا لیا تھا۔ ارشاد ہوا ہے:۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۔ (الزخرف ع ۲)

اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں سے خدا کا ایک جزو ٹھہرا لیا، بے شک انسان صریح ناشکرا ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں اپنے لیے لے لیں، اور بیٹوں سے تمھیں معزز کیا۔

اور دوسری جگہ رسولؐ سے خطاب ہے:۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ۔ (الصافات ع ۵)

ان مشرکوں سے پوچھئے کہ کیا آپ کے پروردگار کے لیے تو لڑکیاں ہیں اور ان لوگوں کے لیے لڑکے ہیں؟ کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور یہ لوگ اس کے گواہ تھے۔

ملائکہ پرستی کے علاوہ جنات پرستی بھی ان کے اندر موجود تھی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ ۔ (الانعام ع ۱۲)

اور مشرکوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنا لیا، حالانکہ اللہ ہی نے انھیں پیدا کیا ہے۔

جنات کو وہ اللہ کا قرابت دار سمجھتے تھے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۔ (الصافات ع ۵)

ان مشرکوں نے اللہ اور جنات کے درمیان رشتہ داری بنا لی ہے۔

آفتاب پرستی اور ماہتاب پرستی کی جو صریح ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ۔ (حم السجدہ ع ۵)

نہ سورج کے آگے جھکو نہ چاند کے۔

اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ معاصر مشرکین عرب اجرام فلکی کی پرستش میں بھی بند نہ تھے۔

شراب، جوا، اور قمار کی مختلف قسمیں اتنی شائع تھیں کہ انھیں سختی سے روکنا پڑا۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (المائدہ ع ۱۲)

بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بتوں کے تھان اور قرعہ کے تیر سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو۔ تاکہ فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے سو اب بھی تم ان چیزوں سے باز آؤ گے۔

اور سُود خواری کو تو جس اہتمام بلیغ سے قرآن نے منع کیا ہے وہ خود دلیلوں کی ایک دلیل ہے اس واقعہ تاریخی کی کہ مشرکین عرب کے معاشرہ میں سُود خواری خوب رچی بسی ہوئی تھی۔ ایک جگہ ارشاد ہُوا۔

اِتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (البقرہ ع ۳۸)

اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو بقیہ سُود کو اگر تم (واقعی) مسلمان ہو۔

دوسری جگہ بھی اسی تاکید کے ساتھ:

لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران ع ۱۴)

سود نہ کھاؤ دونا چوگنا اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاجاؤ۔

تیسری جگہ اسی شدت کے ساتھ۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ۔ (البقرہ ع ۳۸)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) نہیں اُٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے آسیب پہنچا کر دیوانہ بنا دیا ہو۔

اور پھر سب سے بڑھ کر۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔

اگر تم سود نہیں چھوڑتے ہو تو اشتہار جنگ سُن لو اللہ اور اس کے رسول سے۔

اولاد کُشی کا مرض بھی (کچھ آج ہی کے حالات سے ملتا ہوا) معاشی بنیادوں پر خوب پھیلا ہُوا تھا۔ اس لیے علاوہ ان آیتوں کے جو پہلے مذکور ہو چکیں۔ اس کی ممانعت اور اس پر وعید خاص طور پر نازل ہوئی۔ مثلاً:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَھُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا۔ (بنی اسرائیل ع ۴)

اور اپنی اولاد کو ہلاک نہ کر ڈالا کرو، ناداری کے اندیشہ سے۔ ہی ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کا مار ڈالنا بڑا بھاری گناہ ہے۔

اس اولاد کُشی میں بھی خصوصیت کے ساتھ رواج دختر کُشی کا بعض قبیلوں میں تھا۔ ان کے شرمندہ کرنے کا ذکر حشر میں ان سے سوال کے وقت کا کیا گیا۔

وَاِذَا الْمَوْؤٗدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۔ (التکویر)

اور جب زندہ دفن کی گئی، لڑکی سے (حشر میں) سوال ہوگا کہ وہ کس جرم میں مار ڈالی گئی۔

بے حیائی۔ بے حجابی، بلکہ بے ستری کے عیب بھی عام تھے۔ چنانچہ فَاحِشَۃً وَّفَحْشَاء کی ممانعت بار بار آئی ہے اور اس قسم کی آیتیں جا بجا ملتی ہیں۔

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ۔ (الانعام ع ۱۹)

اور بے حیائیوں کے پاس نہ جاؤ۔ خواہ وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔

یا مثلاً

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (الاعراف ع ۴) آپ کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو بس بے حیائیوں کو حرام کر دیا ہے۔ خواہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔

اور زنا کے حکم کے لیے جو ہر جاہل تمدن کی طرح اس عرب تمدن میں عام تھا۔ یہ تہدیدی حکم نازل ہوا۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ع ۴) اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ بے شک وہ بے حیائی ہے اور ایک بری راہ بھی۔

ایک دستور یہ بھی جاری تھا کہ خوشحال لوگ اپنی باندیوں کے جسم کو کرایہ پر چلاتے تھے۔ وحی محمدیؐ اسے کیسے نظر انداز کر سکتی تھی۔ ارشاد ہوا۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ۔ (النور ع ۴) اور اپنی باندیوں کو حرام کاری پر مجبور نہ کرو۔

کہیں کہیں عورتوں کو وراثت کا مال سمجھ کر خود ان پر قبضہ کر لیا جاتا تھا حکم آیا کہ ایسا ہرگز درست نہیں۔

لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (النساء ع ۳) تمھارے لیے جائز نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے مالک بن جاؤ۔

یہ بھی ایک دستور تھا کہ اپنی حقیقی ماں کے سوا جو عورتیں باپ کے عقد میں ہوتی تھیں۔ انھیں مال وراثت سمجھ کر اپنی بی بی بنایا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی حکماً مٹائی گئی۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَّسَآءَ سَبِيْلًا۔ (النساء ع ۳) اور تم ان عورتوں سے عقد مت کرو جن سے تمھارے باپ عقد کر چکے ہوں۔ مگر ہاں جو ہو چکا ہو چکا۔ بیشک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔

عورتوں۔ مردوں کا آزادانہ میل جول اور اختلاط اور لباس میں بے احتیاطی اور بد نظری۔ آج ہی کل کی تہذیب تمدن کی طرح عام تھیں۔ ان سب پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی گئیں اور حد بندیاں عائد کی گئیں۔ ارشاد ہوا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔ (النور ع ۴) اے پیمبر مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں کہ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے۔

اور عورتوں کے حق میں اس سے کہیں زیادہ پابندیاں بڑھا کر ارشاد ہوا کہ:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں بجز اس کے جو اس میں سے کھلا ہوا ہے اور اپنی

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ۔ (النور ع ۴)
چادریں اپنے گریبانوں پر ڈال رکھیں، اور اپنی زینت نہ ظاہر کرنے دیں بجز اس کے کہ اپنے شوہروں پر۔

ان قریبی رشتوں کے نام بھی اس آیت میں آگے درج ہیں۔ رسالت محمدی کو جو معاشرہ تیار کرنا تھا۔ اس میں یہ خلاف معاشرہ جاہلی کے یہ ساری تبدیلیں ضروری تھیں۔ چنانچہ آگے ارشاد ہوا ہے کہ:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۔ (النور ع ۴)
اور عورتیں زمین پر بھی اپنے پیر نہ ماریں کہ جس سے وہ زینت جسے وہ چھپاتی ہیں نہ ظاہر ہو جائے۔

بلکہ ازواج نبی اور بنات نبی کے علاوہ عام مومنات کے لیے بھی یہ قاعدہ نافذ ہو گیا کہ:

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۔ (الاحزاب ع ۸)
اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکائے رہیں۔

ایک جامع آیت میں آپ کو یہ بتا دیا کہ عورتیں جب آپ کی خدمت میں بیعت اسلام کے لیے حاضر ہوں تو آپ ان سے بیعت فلاں فلاں امور کے لیے لیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ ۔ (الممتحنہ ع ۲)
اے نبی جب مومنات آپ کے پاس ان امور پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کا شریک کسی شے کو نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اولاد کو ہلاک کر ڈالیں گی اور نہ اپنی بہتان کی روداد لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان بنا لائیں اور نہ مشروع باتوں میں آپ کے خلاف کریں گی تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجیے۔

اور عورت کی عام حالت اس جاہلی معاشرہ میں یہ تھی کہ لڑکی کا وجود باپ کے لیے باعث ننگ و کدورت تھا اور اس کے لیے ایسی شرم کی چیز تھی کہ وہ ہر طرف منہ چھپائے پھرتا تھا۔

قرآن مجید عربی معاشرہ کا یہ نقشہ یوں کھینچتا ہے:۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ۔ (النحل ع ۷)
اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے وہ اس خبر کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ اسے ذلت کے ساتھ قبول کرے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔

جاہلی عرب کے عقائد اور اخلاق و معاملات کی دنیا میں تو یہ اندھیر مچا ہوا تھا ہی عبادات کے عالم میں بھی سکہ جہالت و جاہلیت

ہی کا رواں تھا۔ کعبہ کو واجب التعظیم اور اس کے زائرین کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت یہ لوگ بھی اپنے لیے سمجھتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کے رکوع ۳ کی آیت اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے ظاہر ہو رہا ہے لیکن ان کی عبادت کا طریقہ کیا تھا؟ خانہ کعبہ کے گرد سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً۔ ان مشرکوں نے خانہ کعبہ کا پاس نہیں کیا بجز سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے۔ (الانفال ع ۴)

بلکہ اس عبادت کے وقت تو ان جاہلیوں کو رفع برہنگی اور لباس سازی کی بھی پروانہ تھی اور اس لیے قرآن مجید نے تاکید کی کہ:

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ۔ اے بنی آدم تم مسجد میں حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (الاعراف ع ۳)

اور مسلمانوں کی عبادت پر تو یہ لوگ اہل کتاب کے ساتھ مل کر مضحکہ و استہزا ہی کرتے رہتے۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا۔ اور اے مسلمانو! جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو یہ لوگ اس کے ساتھ ہنسی اور کھیل کرتے ہیں۔ (مائدہ ع ۹)

مشرکین عرب کے بنیادی عقائد کے سلسلہ میں ان کی اعتقادی زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کی عملی، معاشرتی، اخلاقی زندگی کا بھی ذکر آ گیا لیکن شرک جلی کی بھی ایک قسم ان میں رائج نہ تھی۔ بعض کے عقائد کے ڈانڈے دہریت کی سرحدوں سے چھو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ۔ کوئی اور زندگی نہیں ہے بجز اس دنیوی زندگی کے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی نہیں مارتا ہے بجز زمانہ کے۔ (الجاثیہ ع ۲)

یعنی کوئی خالق بالارادہ موجود نہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ مادی حیثیت سے زمانہ ہی کے الٹ پھیر سے ہوتا رہتا ہے اور آخرت کی جزا اور سزا سے انکار تو ان کے ہاں عام تھا اور جو خدا کے کسی درجہ میں قائل بھی تھے۔ وہ بھی اس کے قائل بہر حال نہ تھے کہ موت کے بعد کسی اور عالم میں جانا اور وہاں کسی حاکم سے سابقہ پڑنا، اور کسی مالک کے حضور میں جانا ہے۔ یہ علانیہ کہتے۔

إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ۔ کہ زندگی تو بس فی الحال کی ہے اور ہم بعد کو اٹھائے جانے کے نہیں۔ (الانعام ع ۳)

انکار آخرت کے اقوال قرآن مجید نے ان لوگوں کی زبان سے اس کثرت سے نقل کئے ہیں کہ معلوم ایسا ہونے لگتا ہے کہ شاید انکار توحید سے بھی بڑھ کر یہ لوگ انکار آخرت میں سخت تھے اور یہ بات ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آ رہی تھی کہ اس حیات مادی کے بعد ایک اور عالم بھی ہے، جہاں اس زندگی کے اعمال کی پرسش ہو گی۔ ان پچاسوں بلکہ سینکڑوں اقوال سے صرف دو چار بہ طور نمونہ نقل ہو جانے کافی ہوں گے۔

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ۔ (النازعات ع ۱)

کہتے ہیں کہ ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہوں گے کہ جب ہم بوسیدہ ٹڈیاں ہو جائیں گے۔ پھر واپس ہوں گے کہتے ہیں کہ اس صورت میں یہ واپسی بڑے خسارہ کی ہوگی۔

اور جنات کی زبان سے ہے :-

اِنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا۔ (الجن ع ۱)

اور جیسا تم جنات نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی ان انسانوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ کسی کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔

اور پھر ایک جگہ منکرین کا قول نقل کیا ہے۔

هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ۔ (ق ع ۱)

یہ تو عجیب بات ہے کیا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو دوبارہ زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ زندہ ہونا تو بہت ہی بعید ہے۔

پیمبر کی اس تذکیر آخرت پر بڑی حیرت سے یہ لوگ آپس میں کہتے :-

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ۔ (السبا ع ۱)

ہم تم کو ایسا آدمی بتائیں نہ، جو تم کو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو ضرور ایک نئے جسم میں آؤ گے۔ اس شخص نے یا تو خدا پر جھوٹ باندھ لیا ہے یا اسے کسی طرح کا جنون ہے۔

اتنے ہی قول بالکل کافی ہیں۔ ورنہ اگر سارے قول منکرین آخرت کے نقل ہوں مع ان جوابات کے جو قرآن مجید نے رسول اللہ صلعم کی زبان سے ادا کر دیئے ہیں تو مقالہ اپنے حدود سے گزر کر ایک مستقل رسالہ کی ضخامت اختیار کر جائے۔

انھیں مشرکین میں ایک بہت بڑا فرقہ ایسا بھی تھا جو خدا، اور خدائے اعظم کا قائل کسی حد تک تھا لیکن وحی الٰہی اور نبی کے ذریعہ سلسلہ ہدایت کا یکسر منکر تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ تو آ جاتا تھا کہ خدا کے اولاد ہے یا یہ کہ خدا نخواستہ انسانی قالب اختیار کر کے دنیا میں آ گیا لیکن یہ کسی طرح بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا نے ایک بشر کو ذریعہ ہدایت بنا کر بھیجا اور اس سے مرضیات الٰہی کے تمام نکتے اور طریقے بتلا دیئے یہ لوگ بگڑ کر کہتے :-

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا۔ (التغابن ع ۱)

ہماری ہدایت کو بشر آتے ہیں۔

اور کبھی یہ کہ :

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل ع ۱۱)

کیا خدا نے رسول بنا کر بشر کو بھیجا ہے ؟

کبھی آپس میں پیمبر کے حق میں سرگوشیوں میں کہتے :

هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (انبیاء ع ۱)

یہ تو بس تم ہی جیسا ایک بشر ہے۔

اور آپ کے لوازمِ بشریت کو آپ کے خلاف بہ طور دلیل پیش کرتے ۔

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ ۔ (الفرقان ع ۱)

اس پیمبر کو کیا ہوا کہ وہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ۔ اس کی طرف کوئی فرشتہ کیوں نہ اُتارا گیا ۔

اور چونکہ بشر پر وحی آنا ۔ اُن لوگوں کے دماغ کوتاہ میں بشریت کے منافی تھا اس لیے یہ لوگ قدرتہً تکذیب رسول پر مجبور تھے اور کبھی یہ کہتے کہ آپ مجنون ہیں ۔

وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِىْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۔ (الحجر ع ۱)

اور ان لوگوں نے یہ کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے تم تو مجنون ہو ۔

کبھی کہتے :۔

اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔ (السباء ع ۱)

انھیں کیا کچھ جنون ہے ۔

قرآن نے خود ان کے متعلق سوال کیا ہے ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (المومنون ع ۴)

کیا یہ لوگ آپ کی نسبت جنون کے قائل ہیں ؟

کبھی ان کی تشخیص و تجویز میں آپ خیالی مضمون باندھنے والے اور مؤثر عبارت میں ادا کرنے والے شاعر ٹھہرتے اور آپ کی وحی قرآنی ایک خواب پریشان اور آپ کی گڑھی ہوئی قرار پاتی ۔

بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔ (الانبیاء ع ۱)

بلکہ یوں کہا کہ یہ تو خیالات پریشان ہیں ۔ بلکہ اُنھوں نے اُسے تراش لیا ہے ۔ بلکہ ایک شاعر شخص ہے ۔

دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے :

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۔ (الطور ع ۲)

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم حادثہ موت کا انتظار کر رہے ہیں ۔

اور کبھی شاعری کے ساتھ دیوانگی کا بھی اضافہ کر دیتے ۔

وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْۤا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۔ (الصافات ، ع ۲)

اور یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے دیوتاؤں کو ایک شاعر دیوانہ کی خاطر چھوڑ دیں ۔؟

اور کبھی الفاظ بدل کر اسی مضمون کو یُوں ادا کرتے ۔

وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۔ (الدخان ع ۱۱)

بیشک اُن کے پاس ایک کھلا ہوا پیمبر آ چکا ، پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور کہتے رہے کہ یہ سکھایا ہوا ہے ۔ دیوانہ ہے ۔

شاعری اور جنون کے ساتھ ایک تیسری تشخیص سحر زدگی کی بھی تھی۔

قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (الفرقان ع ۱)
یہ ظالم لوگ (آپس میں) کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔

اور یہی مضمون ایک دوسری جگہ:

اِذْ هُمْ نَجْوٰى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ع ۵)
(ہم خوب جانتے ہیں) جس وقت یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور جبکہ یہ ظالم لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو۔

اور کبھی آپؐ کی نسبت سحر و کہانت کی جانب کرتے جو ان کی دانست میں دو زبردست اور مؤثر فن، غیب سے تعلق رکھنے والے تھے۔ قرآن مجید کو اس کی صاف صاف تردید کرنا پڑی اور کہنا پڑا۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ (الحاقہ ع ۱)
یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔

اور

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ (الحاقہ ع ۱)
یہ کسی کاہن کا کلام نہیں۔

یا یہ باہم خود بھی کسی ایک بات پر جمتے نہ تھے اور قرآن نے انھیں مخاطب کر کے صاف کہہ دیا کہ:

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ۔ (الذاریات ع ۱)
تم لوگ مختلف گفتگو میں (پڑے ہوئے ہو) اس سے وہی پھرتا ہے جس کو پھرنا مقدر ہوتا ہے۔

اور ان کے خرافات کے الگ الگ بھی جوابات دیئے اور ان کی ایک ایک غلط بیانی کی تردید کی مثلاً:

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ (التکویر)
اور یہ تمھارے رفیق دیوانے نہیں ہیں۔

یا

وَمَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ۔ (القلم ع ۱)
آپ اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔

یا پھر

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۔ (الطور ع ۲)
تو آپ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ کاہن ہیں نہ دیوانے۔

قرآن کے اثر سے ان منکرین و معاندین کے لیے بھی انکار ممکن نہ تھا۔ مشاہدہ کی چیز تھی۔ قرآنی اثر کی گہرائی اور وسعت دونوں بہ براہِ راست مشاہدہ ہی کرتے رہتے تھے اس لیے رائے آخر یہ ہوئی کہ ہو نہ ہو یہ قرآن انھوں نے دل سے گڑھ لیا ہے اور ان کی امداد و اعانت پر ایک پوری جماعت بھی ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِۨفْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۔ (الفرقان ع ۱)

یہ قرآن تو نری ایک گڑھنت ہے جس کو اس شخص نے گڑھ لیا ہے اور ایک اور جماعت نے اس میں ان کی مدد کی ہے۔

پھر آپ کے وصف اُمیّت سے بھی چونکہ یہ لوگ براہِ راست واقفیت رکھتے تھے اس واسطے یہ کہتے کہ یہ اگلوں کی خرافاتی حکایات اُنھوں نے کسی سے لکھوا رکھی ہیں اور وُہ اُنھیں صبح و شام پڑھ کر سُنا دی جاتی ہیں۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۔ (الفرقان ع ۱)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو اگلوں کے بے سند قصے ہیں۔ جو اس شخص نے (کسی سے) لکھوا لیا اور یہی اس کو صبح و شام پڑھ کر سُنا دی جاتی۔

اور کبھی یہ دُور کی کوڑی لاتے کہ یہ تو فلاں شخص نے اُنھیں سکھا پڑھا رکھا ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۔ (النحل ع ۱۴)

اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک بشر نے اُنھیں سکھا دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید ان لوگوں کے خیال میں اور آج کے بہت سے روشن خیال فرنگیوں کے خیال کے مطابق ایک گڑھا ہوا کلام تھا۔

وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۔ (السباء ع ۵)

اور یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو بجز ایک گڑھے ہوئے بہتان کے کچھ نہیں۔

بلکہ ان مشرکوں کے ایک رئیس و سردار نے ایک بار بڑے سوچ بچار کے بعد اپنا فیصلہ یہ سُنا دیا تھا کہ :۔

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۔ (المدثر ع ۲)

یہ تو نرا ایک جادو ہے۔ جو قدیم سے چلا آ رہا ہے اور یہ تو نرا ایک بشر کا کلام ہے۔

قرآن مجید نے شافی جواب ان میں سے ہر خرافات کا دیا ہے۔ یہاں ان جوابات سے بحث نہیں۔ یہاں تو دکھانا صرف یہ ہے کہ جس قوم کی براہِ راست اور اصالتًا اصلاح کے لیے رسُول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے۔ اس کی اعتقادی، عملی، اخلاقی زندگی کا نفسیاتی پس منظر کیا تھا اور اس نے آپ کے پیام کی پذیرائی کس طرح کی۔

شرک میں ڈوبی ہوئی قوم کی ناخوشی کی اصل بنیاد یہ تھی کہ یہ پیامبر جو کلام سُناتے ہیں اس میں ذکر سارے دیوی دیوتاؤں اور چھوٹے بڑے خداؤں کو چھوڑ کر نام صرف اللہ ہی کا کیوں لیئے جاتے ہیں اور دعوت اس اکیلے معبود کے ماننے کی کیوں دیتے ہیں قرآن مجید نے انھیں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے :۔

وَاِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۔ (المومن ع ۲)

جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو تم انکار کرتے ہو اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا ہے تو تم مان لیتے ہو۔

ضد اللہ کے نام سے بہ شمول و شرکت دوسرے معبودوں کے نہ تھی۔ اصل ضد اس سے تھی کہ اس اللہ کی وحدت پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے اور پھر ارشاد ہوا ہے :-

وَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَاِذَا ذُکِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِذَا ھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۔

(الزمر ع ۵)

اور جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہونے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔

اور ایک جگہ پھر یہی شہادت قرآن پیش کرتا ہے۔

وَاِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَہٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ نُفُوْرًا۔

(بنی اسرائیل ع ۵)

اور آپ جب قرآن میں صرف اپنے پروردگار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔ نفرت کرتے ہوئے۔

ایسی قوم کو داعیِ توحید سے نفرت و عداوت ہو جانا لازمی تھا اور قرآن مجید نے امّتِ محمدیؐ کو مخاطب کر کے سنا بھی دیا تھا کہ اہلِ کتاب کے علاوہ ان مشرکوں سے بھی تمھاری بہت کچھ دلآزاری ہونا ہے۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا۔

(آل عمران ع ۱۹)

اور تم ضرور سنو گے بہت سی دلآزاری کی باتیں، ان سے بھی جنھیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے، اور ان سے بھی، جو مشرک ہیں۔

مُنافقینٌ

قرآن کی مکی سورتوں میں کثرت سے ذکر مشرکین کا آتا ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے پیام اور پیامبری کے کھلے ہوئے منکر تھے اور مکہ میں قرآن کے براہِ راست مخاطب تھے۔ مدنی سورتوں میں اس کے برعکس ذکر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اور ان سے زیادہ کثرت سے ایسے طبقہ کے لوگوں کا آتا ہے جو رسولؐ و رسالت کا کھلا ہوا منکر نہ تھا۔ بلکہ بظاہر معتقد و مطیع تھا، لیکن زبانی اقرار پر قلبی انکار غالب تھا۔ اپنے آپ کو شامل گروہ مؤمنین میں کرانا چاہتا تھا، لیکن عقاید مشرکین یا یہود کے رکھتا تھا اور در پردہ سازشیں اسلام اور شارحِ اسلام کے خلاف کرتا رہتا تھا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ لوگ منافقین کہلاتے تھے۔ اور قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے مخاطبین کے چار طبقوں میں سے ایک مستقل طبقہ ان لوگوں کا تھا۔

قرآن مجید نے اکثر تو انھیں براہِ راست منافقین ہی کہہ کر یاد کیا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس گروہ میں عورتیں بھی خاصی تعداد میں شامل تھیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے منافقات کا لفظ لا کر ان کی تصریح بھی کم سے کم چار مقامات پر تو کی ہی ہے۔ اور کہیں کہیں بجائے اسم کے۔ اس طبقہ کے لیے صیغۂ فعل سے جو ذکر ہے۔ مثلاً الَّذِیْنَ نَافَقُوْا اور کہیں اس طبقہ کے لیے

الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ لایا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کے اندر روگ ہے۔ اسی طرح کل لا کر اس طبقہ کا ذکر قرآن مجید کے مدنی حصہ میں خاصی کثرت سے ملے گا۔

ان کے ذکر کا آغاز کہنا چاہیئے کہ قرآن مجید کے آغاز سے ہو جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کا دوسرا ہی رکوع ہے کہ پہلے رکوع میں مومنوں اور منکروں دونوں کے تذکرے کے بعد معاً یہ بیان سا منے آجاتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ (البقرۃ ع ۲)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے کہتے یہ ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روز جزا پر حالانکہ وہ ذرا بھی صاحب ایمان نہیں۔

ان کے عمق قلب میں ایمان کا ذرا بھی گزر نہ تھا۔ ان کا کاروبار تمام تر دیدہ و دانستہ دھوکے بازی اور فریب دہی کا تھا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ (البقرہ ع ۲)

یہ دھوکا دے رہے ہیں (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو، حالانکہ کوئی بھی ان سے دھوکا نہیں کھا رہا ہے۔ سوا ان کے اپنے نفس کے اور یہ اس کا بھی ادراک نہیں رکھتے۔

ان کے قلب کے اندر حسد و نفاق کا مرض تھا۔ اسلام کی ترقی دیکھ دیکھ کر انہیں اور جلن پیدا ہوتی تھی اور اس مرض کی آگ اور بھڑکتی رہتی تھی۔ انھیں تکذیب رسولؐ کے علاوہ اس نفاق کی خصوصی سزا کی خبر دے دی گئی۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ (ایضاً)

ان کے دلوں کے اندر بیماری ہے تو اللہ نے اُن کے مرض کو اور ترقی دے دی۔ انھیں عذاب دردناک ہونا ہے، اپنے اس جھوٹ پر۔

ان کی اس منافقانہ زندگی کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ اللہ کی زمین پر بگاڑ پھیلے اور جب انھیں ان کے اس رویہ پر فہمائش کی جاتی تھی تو اُلٹے اس کی تردید و تکذیب کرتے اور اپنے آپ کو پاک صاف ظاہر کرتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۔ (البقرۃ ع ۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر بگاڑ مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں واہ ہم اور بناؤ پیدا کرنے والے ہیں۔ خوب سن لو کہ مفسد یہی لوگ ہیں اور یہ اس کی بھی خبر نہیں رکھتے۔

پھر آگے ان کے اس دورُخے پن کا ذکر ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں اور جب شیطان صفت معاندین اسلام کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں تو اُن کی سی کہنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمانوں کو بنا رہے تھے۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ بیچارے کسی کو کیا بنائیں گے۔ اُلٹے خود ہی بن رہے ہیں اور اپنے عصیان و طغیان کے دلدل میں اور پھنستے ہی جا رہے ہیں۔ اور ان کو جب عام مومنین کی طرح قبول اسلام کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑ اکڑ کر اور اترا اترا کر بولتے ہیں کہ کیا ہم بھی ان لوگوں کی طرح کچھ سادہ لوح ہیں! ــــ اس کے بعد قرآن نے ان کی تہ بہ تہ گمراہیوں اور کج رائیوں کی دو دو تمثیلیں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں اور ان کے انجام بخیر ہونے کے بجائے ان کے انجام بہ شر ہونے کی خبر دی ہے۔

ان کی ایک عادت یہ تھی کہ بے تحاشہ کلمے کفر و انکار کے بک جاتے تھے اور جب گرفت ہوتی تو جھٹ مکر جاتے، حالانکہ اس کے بعد تو وہ ظاہر ہی اسلام سے بھی نکل جاتے۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔ (التوبۃ ع ۱۰)

یہ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی تھی حالانکہ انھوں نے یقیناً کفر کی بات کہی تھی اور اپنے اسلام کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے ایسی بات کا ارادہ کیا تھا جو ان کے ہاتھ نہ لگی۔

اس آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص مقصد ان لوگوں کے پیش نظر تھا، جو حاصل نہ ہو سکا، اور چونکہ آیت ایک غزوہ کے سیاق میں ہے اس لیے عجب نہیں کہ ان آستین کے سانپوں کا مقصد لشکر اسلام کے اندر پھوٹ ڈالنا اور رنجشیں پیدا کرا دینا ہو، جیسا کہ روایات سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ مسلمانوں کے سامنے آ آکر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر انھیں اپنے سے راضی کر لینا اور اپنے سے پرچا لینا چاہتے تھے اور چونکہ مسلمانوں سے ملے جلے اور بہ ظاہر انھیں کے گروہ میں شامل رہا کرتے۔ اس لیے اس کوشش میں کامیابی ان کے لیے کچھ دشوار بھی نہ تھی، حالانکہ اگر صداقت و دیانت ذرا بھی ہوتی تو کوشش اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضاجوئی کے لیے کرتے رہتے۔ ارشاد ہوا ہے:۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ۔ (التوبۃ ع ۸)

یہ لوگ تم مسلمانوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم کو پرچا ئیں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی اس کے حق دار ہیں۔

جھوٹی قسموں میں یہ لوگ منجھے ہوئے تھے لیکن زبان وحی بھی برابر ان کی نقاب کشی کرتی رہتی۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ۔ (التوبۃ ع ۷)

یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمھیں میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ بزدلے ہیں۔

صدق دل سے رسول اللہ پر ایمان لانا، کیسا، یہ لوگ رسولؐ کی بدگوئی کرتے رہتے اور طرح طرح آپ کی اذیت قلب کے باعث بنتے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ۔ (التوبۃ ع ۸)

انھیں میں وہ لوگ بھی ہیں۔ جو نبی کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ کان کے کچے ہیں۔

یہ جھوٹ بولنے، تمسخر کرنے اور بات بنا لینے میں مشاق اور بیباک ہونے کے باوجود قرآن جو ان کی پردہ دری کرتا رہتا۔ اس سے ڈرتے رہتے اور اس کا کچھ بھی علاج ان کے بس میں نہ تھا۔ آسمانی ریکارڈ میں شہادت موجود ہے کہ:

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ قُلِ اسْتَهْزِءُوا

یہ لوگ اس سے اندیشہ کرتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نہ نازل ہو جائے جو ان کو ان منافقین کے مافی الضمیر پر مطلع

إِنَّ اللهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ۔ (التوبۃ ع ۸)
کر دے آپ فرما دیجیے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو۔ بے شک اللہ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم اندیشہ کرتے تھے ۔

جب گرفت ہوتی تو بڑا حیلہ اپنے بچاؤ کا ان کے پاس یہ تھا کہ کہیں واقعی یہ عقاید و خیالات ہمارے تھوڑے ہی ہیں۔ یہ باتیں تو محض ہم خوش طبعی کے طور پر کہہ دیتے ہیں۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۔ (ایضاً)
اور اگر آپ ان سے پوچھیے تو کہہ دیں گے کہ یہ تو ہم محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے ہیں۔

قرآن نے اس عجیب و غریب عذرِ گناہ کا جواب دیا۔ وہ بھی سُننے کے قابل ہے ۔

قُلْ أَبِاللهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۔ (التوبۃ ع ۸)
تو آپ اُن سے کہیے کہ اچھا تو تمھارا یہ استہزاء اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ تھا؟ اب کوئی عذر پیش مت کرو۔ تم تو اپنے کو مومن کہلانے کے بعد کفر کرنے لگے۔ تم میں سے ایک گروہ کو ہم چھوڑ بھی دیں تو ایک گروہ کو ہم سزا دیں ہی گے۔ اس لیے وہ لوگ مجرم تھے۔

ان کی منافقانہ کارروائیوں کا ذکر اکثر جنگ و غزوات کے سلسلہ میں آیا ہے (جیسا کہ سورۃ التوبہ میں خصوصاً آیا ہے) اس سے اتنا تو بہر حال ظاہر ہوتا ہے کہ فوج میں بددلی پھیلانا، فوج کے اندر اختلافات و نفاق پیدا کرا دینا، عین وقت پر ہتھیار رکھ دینا، دشمن سے ساز باز کر لینا، اسے اپنے ہاں کے رازوں پر مطلع کر دینا اور اسی قبیل کے وہ جرائم جو فوجی قانون اور میدانِ جنگ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان کے مرتکب تو یہ ضرور ہی ہوتے ہوں گے لیکن قرآن مجید نے ان پر فردِ جرم جو لگائی ہے ۔ وہ اس سے زیادہ وسعت و عموم رکھتی ہے اور منشاء یہ ہوتا ہے کہ ان کا پھیلایا ہوا بگاڑ ساری ہی اجتماعی زندگی تک محیط ہو چکا تھا۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُم مِّن بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ ۔
یہ منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک سے ہیں تعلیم دیتے ہیں بُری باتوں کی اور باز رکھتے ہیں اچھی باتوں سے اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔

يقبضون ايديهم سے صاف اشارہ ان کی ترویج بخل کی طرف نکلتا ہے۔ اور اس کے اُوپر ذکر ان کی عام بداخلاقی و بدکاری کا ہے نتیجہ جو نکلتا ہے وہ بھی قرآن نے ظاہر کر دیا ہے ۔

نَسُوا اللهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۔ (التوبۃ ع ۸)
یہ اللہ کو بھلا بیٹھے تو اللہ نے بھی اُنھیں بھلا دیا۔ فاسق لوگ یہی منافق ہی تو ہیں۔

اس صورتِ حال کا قدرتی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس طبقہ کا ذکر بار بار کافروں اور مشرکوں پر عطف ہو کر آیا ہے اور ان کے انجام کا شریک ان کو بھی بتایا گیا ہے ۔ مثلاً :۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ (التوبۃ ع ۸)

اللہ نے عہد کر رکھا ہے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے وہی ان کے لیے کافی ہے اور اللہ اُن کو اپنی رحمت سے دُور رکھے گا۔ اور ان کا عذاب دائمی ہے۔

اسی طرح پیمبر کو ایک جگہ جہاں ایک ہدایت کی ہے وہاں بھی منافقوں کا عطف کافروں پر ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ (الاحزاب ع ۹)

اے پیمبر کافروں اور منافقوں کا کہا نہ کیجئے اور ان کی طرف سے جو اذیت پہنچے اس پر التفات نہ کیجئے۔

وَدَعْ اَذٰىهُمْ کا تعلق جتنا کافروں سے ہے اتنا ہی منافقوں سے بھی ہے گویا یہ صاف ہو گیا کہ جتنی اذیت آپ کو منافقوں یعنی ان نام کے مسلمانوں کی طرف سے پہنچتی رہتی تھی وہ اس سے کچھ کم نہ تھی جو کھلے ہوئے منکروں کی طرف سے پہنچتی رہتی تھی۔

ایک جگہ ذکر ہے کہ اللہ کے ساتھ بدگمانی رکھنے کی سزا اُن کو اور ان دونوں کو ملے گی۔ وہاں بھی منافقوں کو مشرکوں کے ساتھ عطف کر کے بیان کیا ہے۔

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ۔ (الفتح ع ۱)

تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو اللہ کے ساتھ برے برے گمان کرتے ہیں۔

اور تقریباً یہی الفاظ ایک جگہ اور دُہرائے ہوئے ملتے ہیں۔

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ۔ (الاحزاب ع ۹)

انجام یہ ہوا کہ اللہ عذاب دے گا منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو۔

ان منافقین کا اصلی جرم تو ان کا یہی نفاق تھا۔ یعنی دل میں کچھ زبان پر کچھ۔ دل سے خاص انکار اور زبان پر محض اقرار، قرآن مجید نے ان کی فردِ جرم میں نمبر اوّل پر اسی کو رکھا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ (الفتح ع ۲)

اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں بالکل نہیں ہیں۔

لیکن اس بنیادی اور اعتقادی جرم کے علاوہ ان کے عملی اور اجتماعی جرائم بھی کچھ کم قابلِ مواخذہ و تعزیر نہ تھے۔ مدینہ میں رہ کر عفیف و پاک دامن مسلمان باشندگانِ شہر کی بدخواہی اور دشمنی میں لگے رہنا ان پر آج کل کی اصطلاح میں سرد جنگ جاری رکھنا۔ یعنی شہر میں وحشت انگیز افواہیں پھیلاتے رہنا ان لوگوں کا مستقل شعار بن گیا تھا۔ قرآن مجید نے اس سیاق میں ان کا ذکر کر کے اُن کے لیے سزائیں بھی انتہائی اور عبرت انگیز تجویز کر دی ہیں:۔

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا مَّلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ (الاحزاب ع ۸)

اگر نہ باز آئیں یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، اور مدینہ میں افواہیں اُڑاتے رہتے ہیں تو ہم آپ کو ان پر ضرور مسلط کر دیں گے۔ پھر یہ لوگ شہر میں آپ کے پاس شہر بھی نہ پائیں گے مگر یاں بہت ہی کم اور وہ بھی لعنت زدہ بس جہاں کہیں مل گئے انھیں پکڑا اور مار کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔

ان کی اخلاقی پلیدی اور رُوحانی زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ آخرت میں ان کا انجام سب سے بدتر قرار پایا کہ ایک تو قبول اسلام سے انکار اور مسلک کفر و شرک پر جمود اور اس پر اضافہ اس ریا و مکر کا کہ ہم تو مسلم و مطیع ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا۔ (النساء ع ۲۱)

بیشک منافقین دوزخ کے سب سے بڑے طبقہ میں ہوں گے، اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔

اور ان کے جرائم کی پاداش میں ان کا انجام اخروی یاد دلا کر دُنیا میں بھی ان کے ساتھ معاملہ سختی کا رکھا گیا ہے اور انھیں کافروں ہی کی صف میں رکھ کر پیمبر کو حکم ان کے خلاف بھی "جہاد" کا ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (التحریم ع ۲)

اے نبی جہاد کافروں اور منافقوں سے کیجئے اور ان پر سختی کیجیے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑی بری جگہ ہے۔

یہ آیت ابھی سورہ تحریم کی تلاوت ہوئی اور بعینہٖ یہی آیت سورۃ التوبہ رکوع ۸ میں بھی وارد ہو چکی ہے۔ البتہ یہ خیال رہے کہ یہاں لفظ جہاد اپنے لغوی معنی میں یعنی سخت کوشش کے مرادف ہو کر آیا ہے۔ جہاد فقہی کے معنی میں نہیں جو بہت بعد کی اصطلاح ہے اور قرآن مجید میں اس کے لیے لفظ قتال ہے اور لفظ جہاد میں حضور صلعم کے لیے پوری گنجائش باقی رہی کہ آپ اپنے اجتہاد کی رُو سے جیسا مناسب سمجھیں جہادی معاملہ کافروں اور منافقوں کے ساتھ اُن کے اور ان کے حسب حال رکھیں۔

مکہ میں کھلا ہوا کفر و شرک تھا۔ اس مرض نفاق کا مقابلہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہی میں آ کر کرنا پڑا، کثر منافق یہیں آکر ملے اور ان میں وہ چالاک اور سخن ساز طبقہ بھی تھا۔ جو حضورؐ کی نظر سے حضورؐ کے کمال فراست و دانائی کے باوجود اپنے کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ قرآن مجید نے صراحت کر دی ہے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ۔ (التوبۃ ع ۱۳)

اور مدینہ والوں میں سے نفاق کی حد کمال پر پہنچے ہوئے ہے آپ ان کو نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں۔

اور اس کے معاً بعد ان کے انجام دنیوی و اخروی سے بھی خبر دے دی گئی۔

سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ۔ (التوبۃ ع ۱۳)

ہم ان کو دو دو بار سزائیں دیں گے اور انھیں بھیجیں گے عذاب عظیم کی طرف۔

یہ منافقین شہر مدینہ کے علاوہ دیہات و حوالی مدینہ میں بھی آباد تھے۔

وَمِنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۔ (ایضاً)

اور یہ بھی تمہارے گرد و پیش دیہاتی ہیں۔ ان میں بھی کچھ منافق ہیں۔

اور دیہاتیوں کے مزاج میں یوں بھی سختی زیادہ ہوتی ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ دیہاتی کفر و نفاق دونوں میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا ۔ (التوبۃ ع ۱۲)

یہ دیہاتی لوگ کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

غریب و تہی دست مسلمانوں پر یہ سنگ دل مسخرے منافقین برابر طنز و مزاح کرتے رہتے تھے۔ ان مفلسوں کی طرف سے جواب خود حق تعالیٰ نے دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

یہ ان (مفلس مسلمانوں) سے مسخرہ پن کرتے ہیں۔ اللہ ان کے مسخرہ پن کو ان پر الٹ دے گا اور ان کے لیے عذاب دردناک رکھا ہوا ہے۔

ان میں کے بعض بدبخت ایسے بھی تھے جن پر یہ نفاق کی لعنت بہ طور ان کی سزا یا پاداشِ عمل کے مسلط کر دی گئی ہے قرآن مجید نے ان کی نفسیت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصَّالِحِينَ فَلَمَّا آتَاهُمْ مِنْ فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

ان میں کے کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہم کو عطا کر دیا تو ہم خوب خیر خیرات کریں گے اور خوب نیک نیک کام کریں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کر دیا تو لگے وہ اس میں بخل کرنے اور روگردانی کرنے اور وہ تھے ہی بات سے پھر جانے والے سو اللہ نے اس کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا جو اللہ کے یہاں جانے کے دن تک ان میں رکھے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے وعدہ خلافی کی۔ اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے رہے تھے۔

انھیں بڑا ناز اپنی چالاکی اور رازداری پر تھا۔ سمجھتے تھے کہ ان کے راز چھپے کے چھپے رہ جائیں گے۔ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس زعم باطل کو توڑا ہے اور انھیں یاد دلایا ہے کہ ان کا سابقہ تو خدائے دانندہ اسرار و خفایا سے ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۔ (التوبۃ ع ۱۰)

کیا انھیں اس کی خبر نہیں ہے کہ اللہ کو ان کے دل کا راز اور سرگوشی ان کی سب معلوم ہے اور اللہ غیب کی ساری باتوں کو جانتا ہے۔

ان کی ریاکاری و منافقت کا یہ کمال تھا کہ انھوں نے اپنی ایک مسجد کھڑی کر لی تھی۔ بہ ظاہر تمام تر عبادت و ذکرالٰہی کے لیے۔ لیکن دل میں مقصد یہ تھا کہ اس میں جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی جائیں اور اسلام و امت اسلامی کی بربادی کے منصوبے تیار کیے جائیں۔ قرآن مجید نے اس کا بھی پول کھول دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف حکم دیا کہ آپؐ ہرگز اس کی طرف رُخ نہ کریں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا۔

(التوبۃ ع ۱۳)

اور وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے مسجد اس غرض سے بنا کھڑی کی ہے کہ (اس کے ذریعہ سے) ضرر پہنچائیں اور کفر پھیلائیں، اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دیں۔ اور (اس شخص کو اس میں پناہ دیں جو اس کے قبل بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑ چکا ہے اور یہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہم تو بجز بھلائی اور کوئی نیت ہی نہیں رکھتے۔ اللہ گواہ ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس مسجد میں کبھی کھڑے بھی نہ ہوں۔

اور یہ تو ان کے لیے ایک معمولی سی بات تھی کہ ایک بار جب ایک جہاد گرمیوں کے موسم میں پڑا تو یہ لوگ لگے مسلمانوں کو مشورہ دینے، کہ اس سخت موسم میں کہاں نکلو گے گویا جہاد بھی ان کے خیال میں کوئی سیر و تفریح کی چیز یا پکنک کے قسم کی تھی۔ قرآن نے ان کا قول نقل کر کے جواب بھی کتنا سخت دیا ہے:

قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (التوبۃ ع ۱۱)

کہنے لگے کہ تم لوگ گرمی میں نہ نکلو۔ آپؐ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ اس سے کہیں بڑھ کر گرم ہے۔ کاش یہ اتنا سمجھتے! یہ لوگ تھوڑے دن ہنس لیں اور بہت دن روتے رہیں اپنے کرتوتوں کے بدلے۔

پیغمبر کی سفارش اور دُعائے مغفرت جس درجہ مؤثر اور زود رس ہوتی ہے ہر مسلمان کو معلوم ہے اور قرآن مجید خود اس کی اہمیت بار بار جتا چکا ہے لیکن منافقین کے قلب چونکہ شمہ ایمان بھی نہیں رکھتے اس لیے قرآن مجید نے براہِ راست حضورؐ کو مخاطب کر کے تصریح کر دی کہ ایسوں کے حق میں آپؐ تک کی دُعائے مغفرت کام نہ دے خواہ آپ کتنی ہی کرتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔

(التوبۃ ع ۱۰)

آپؐ ان کے حق میں استغفار کریں یا ان کے حق میں نہ کریں۔ آپؐ ان کے حق میں استغفار اگر ستر بار بھی کریں تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ آپؐ نے اپنی نہایت رحمدلی کی بناء پر اس آیت کے باوجود ایک رئیس المنافقین کی نماز جنازہ پڑھائی اور لفظ "ستر" کے عدد سے فائدہ اُٹھا کر یہ کہا کہ میں استغفار ستر سے زیادہ بار کروں گا (حالانکہ آپ جیسے فصیح اللسان سے بڑھ کر کون

اس نکتہ سے واقف ہو سکتا تھا کہ محاورہ زبان میں ستر سے مراد کثرت استغفار ہے نہ کہ کوئی معین عدد) اس پر یہ حکم قطعی طور پر نازل ہو گیا کہ ایسوں کی نہ کبھی نماز پڑھئے اور نہ ان کی قبر پر ہی ہو جئے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۔ (التوبۃ ع ۱۱)

اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پر کبھی نماز نہ پڑھئے اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہو جئے۔

بڑی جڑھ ان دلوں کو آیات احکام سے رہتی اور جہاد و قتال کے احکام سن کر تو ان کی جان ہی سوکھ جاتی۔ قرآن مجید نے اس منظر کی یوں عکس کشی کی ہے:

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۔ (محمد ع ۳)

جب کوئی سورت صاف صاف نازل ہوتی ہے اور اس میں ذکر جہاد کا بھی ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھتے ہیں کہ جیسے کسی پر بیہوشی طاری ہو گئی ہو عنقریب ان کی کمبختی آنے والی ہے۔

بڑے جز بز یا اس وقت ہوتے۔ جب ان کے اسرار فاش ہو جاتے تھے اور قرآن مجید خود یا رسول اللہ ہی کی زبان سے انھیں اس قسم کی آیتیں سنوا دیتا تھا۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۔ (ایضاً)

اللہ خوب جانتا ہے ان کی خفیہ باتوں کو۔

اور انتہائی تکلیف اور بدحواسی ان پر اس وقت طاری ہوتی جب رسول ہی کی زبان سے انھیں اس قسم کے تنبیہی پروانے وصول ہوتے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۔ (محمد ع ۴)

جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور اگر ہماری مشیت یہ ہوتی تو ہم آپ کو ان کا پورا پتہ بھی بتا دیتے اور آپ ان کو ان کے حلیے سے پہچان لیتے اور آپ اُن کو طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

اپنی مادی دنیوی زندگی میں یہ کسی سے دبے ہوئے نہ تھے بلکہ ان کی معاشرت معلوم ہوتا ہے خاصی بلند و ممتاز تھی اور ان کے ظاہر میں ایک طرح کی کشش یا دلکشی بھی تھی۔ قرآن مجید کی شہادت ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۔ (المنافقون ع ۱)

آپ ان کو دیکھیں تو اُن کے قدو قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں، اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ اُن کی سننے لگیں۔

ان کی ظاہری خوشحالی اور خوش اقبالی بھی خاصی دھوکے میں ڈالنے والی تھی۔ رسول اللہ کو خاص طور پر اس خطرے سے

آگاہی دے دی گئی اور حقیقتِ حال سے پردہ اٹھا دیا گیا۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ۔ (التوبۃ ع ۱۱)

ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں۔ اللہ کو تو بس یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کے واسطے سے انھیں دنیا میں بھی مبتلائے عذاب رکھے اور ان کا دم بھی ایسی حالت میں نکلے کہ یہ کافر ہوں۔

ایک پوری سورۃ انھیں کے نام پر المنافقون پارہ ۲۸ میں موجود ہے جس کی ایک آیت چند منٹ قبل پیش ہو چکی ہے لیکن درحقیقت اس سورت میں پورا عکس اس طبقہ کی زندگی کا آگیا ہے۔ یہ لوگ رسول اللہ کے سامنے آکر اپنی اسلامیت بگھارتے اور اپنے اپنے ایمان و اطاعت کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ جو تمام تر باطل ہوتا۔ ارشاد ہوا ہے :۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ۔ (المنافقون ع ۱)

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ اس کی بھی گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین پکے جھوٹے ہیں۔ ان کا حاصل عمر ان کی ساری کمائی ان کی جھوٹی قسمیں ہیں۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (ایضاً)

ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تو یہ لوگ اللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں۔ بے شک بہت ہی برے ہیں ان کے اعمال جو وہ کر رہے ہیں۔

اسی سے ملتی ہوئی آیت اسی سورہ مجادلہ میں بھی آچکی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ۔ (مجادلہ ع ۳)

ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے پھر اللہ کی راہ سے روکتے رہتے ہیں تو ان کے لیے عذاب ہے ذلت والا۔

اس آیت سے معاً پہلے اس طبقہ کا تعارف اس کی یہود دوستی کی حیثیت سے کرکے اس کا انجام یوں پیش کیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (المجادلہ ع ۲)

کیا آپ نے ایسے لوگوں پر نظر نہیں کی (یعنی انھیں منافقین پر) جو ایسی قوم سے دوستی کیے ہوئے ہیں جن پر اللہ کا غضب ہے (یعنی قوم یہود سے) ایسے لوگ نہ تم ہی میں ہیں نہ انھیں میں ہیں، جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں اور اسے جانتے بھی ہوتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے عذاب شدید تیار کر رکھا ہے۔ بے شک

بہت ہی بُرے ہیں جو (اعمال) وہ کیا کرتے ہیں۔

ان کی ظاہری خوشحالی اور خوش اقبالی سے دھوکا کھانے پر ایک بار پھر تنبیہ کردی ہے۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ (ایضاً)

ان کے مال اور ان کی اولاد انھیں اللہ سے ذرا نہ بچا سکیں گے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اب پھر اسی سورت منافقون کی طرف آجائیے جس کے بیان کا سلسلہ چل رہا تھا۔ انھوں نے ایمان کا اظہار کیا۔ مگر معاً کفر کو اپنے دل میں جگہ دے لی۔ اس کا وبال یہ پڑا کہ ان کے دلوں پر قبول حق کی طرف سے مہر سی لگ گئی اور سمجھ بوجھ کا گویا مادہ ہی ان سے چھن گیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ (المنافقون ع ۱)

یہ سب اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ سو ان کے دلوں پر مُہر کر دی گئی تو یہ سمجھتے بوجھتے نہیں۔

اُن کے دل چور ہیں اور بدطبیعت کے بُزدلے ہیں۔ اس لیے کہیں سے کوئی آواز بلند ہوئی اور یہ اُسے اپنے ہی اُوپر سمجھے۔ ہر غل پکار کو اپنے ہی اُوپر خیال کرتے ہیں۔

انابت و خشیت کا گذران کے قلب میں کہاں۔ زعم و پندار میں مبتلا یہ رسولؐ کی خدمت میں اپنے استغفار کے لیے حاضر ہونے کے بجائے اُوپر سے اکڑے اکڑے پھرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔ (المنافقون ع ۱)

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمھارے لیے رسول اللہؐ استغفار کریں تو یہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ ان کو دیکھیں گے کہ تکبر کرتے ہوئے بے رُخی کرتے ہیں۔

یہ بھی صراحتہً بتادیا گیا، جیساکہ سورۂ توبہ کی ایک آیت کے ذیل میں پہلے بھی گذر چکا ہے کہ رسول اللہ صلعم جیسے زبردست مستغفر کی دُعائے مغفرت بھی ایسے شامت زدوں کے حق میں قبول نہ ہوگی۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (ایضاً)

ان کے حق میں سب برابر ہے، خواہ آپ اُن کے لیے استغفار کریں یا استغفار نہ کریں۔ اللہ ان کی ہرگز مغفرت نہ کرے گا۔

عملی حالت ان کی یہ تھی کہ خود صاحب ثروت مسلمانوں کو ترغیب دیتے رہتے تھے کہ رسولؐ کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو۔ مالی امداد کی طرف سے مایوس ہو کر یہ بھیڑ خود ہی چھنٹ جائے گی۔ گویا رسولؐ دین حق کی تبلیغ کے لیے بندوں کی امداد کے تمام تر محتاج تھے۔ قرآن مجید نے ان کے اس حمق پن کی پردہ دری یوں کی ہے:۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۗ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ - (ایضاً)

یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسولؐ خدا کے گرد و پیش ہیں، ان پر کچھ خرچ نہ کرو۔ یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی کے ہیں سارے خزانے آسمانوں اور زمینوں کے البتہ منافقین اسے سمجھتے نہیں۔

اور پھر منافقین کے جو یہ دم داعیے تھے کہ میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد مسلمانوں کو تہس نہس کر ڈالیں گے۔ ان کی اس بدفہمی کا پردہ بھی قرآن نے یوں چاک کیا ہے :-

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۚ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ - (ایضاً)

یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ واپس گئے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو نکال دے گا۔ حالانکہ عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسولؐ کی اور مومنین کی، البتہ منافقین اسے جانتے بوجھتے نہیں۔

سب سے بڑھ کر جامع و اکمل اور ساتھ ہی عبرت انگیز مرقع اس طبقہ کا سورۃ الحدید میں نظر آتا ہے گو ذرا طویل ہے لیکن رسول اللہ صلعم کی زندگی میں آپ کے اس حاضر طبقہ کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے سیاق یوم حشر کا ہے۔ اب آگے سنیئے :-

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا - فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ -

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے کہیں گے (جس وقت وہ جنت کو جا رہے ہوں گے اور ان کے ارد گرد نور ہوگا) ہمارا انتظار کر لو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں انھیں جواب ملے گا کہ لوٹ جاؤ اپنے پیچھے کی طرف پھر روشنی تلاش کرو۔ اس کے بعد ان کے اور ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندرونی طرف رحمت ہوگی اور بیرونی طرف عذاب۔ منافقین (اب) مسلمانوں کو کیا پکاریں گے کیا ہم تمھارے ساتھ (دنیا میں) نہ تھے وہ (جواب) میں کہیں گے کہ تھے تو بیشک تم نے خود ہی اپنے کو گمراہی میں پھنسا لیا تھا اور تم منتظر رہتے تھے، اور تمھاری بیہودہ آرزوؤں نے تمھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تم پر اللہ کا حکم آ پہنچا اور تم کو اس بڑے فریبیئے نے اللہ کے باب میں دھوکے میں ڈال رکھا تھا غرض

آج تم سے کوئی فدیہ نہ قبول کیا جائے گا اور نہ کافروں سے تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمھاری رفیق ہے، اور کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

انکشاف حقائق کے وقت کی یہ صحیح اور من وعن نقاشی کر کے دنیا میں بھی ان کی صحیح حالت کا چربا پیش کیا۔ تو یہ تھا آپ کے معاصرین کا وہ دوسرا طبقہ جس سے پیمبر اسلامؐ کو سابقہ علاوہ منکرین و مشرکین، دہریئین، ثنوئین، یہود اور نصرانیوں کے اپنی زندگی میں پڑا تھا۔

مؤمنین

چوتھا طبقہ آپؐ کے ان معاصرین مخاطبین کا ہے جنھوں نے آپؐ کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کی اور آپؐ کی زبان سے آپ کا پیام سُن، کلام الٰہی پر ایمان لائے اصطلاح میں انھیں صحابہ رسولؐ یا اصحاب رسولؐ کہتے ہیں یہ اپنے اعمال و اطوار، اخلاق و عادات میں، اپنے مرشد اعظم ہی کے ڈھرے پر چلے اور بحیثیت مجموعی ایسے نقل مطابق اصل ثابت ہوئے کہ خود دوسروں کے لیے حجت و معیار بن گئے۔ اکبرالہ آبادی نے یہی تاریخی حقیقت اپنی شاعرانہ زبان میں یوں ادا کی ہے: ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا!

لیکن اوّل تو سب ایک درجہ و مرتبہ کے نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ فرق مراتب تو لازمہ بشریت ہے پھر جن کو جو مرتبے حاصل ہوئے وہ رفتہ رفتہ صحبت ہی کی برکت سے حاصل ہوئے۔ اوّل دن سے کوئی بھی ان میں کامل نہ تھا اور پھر بڑی بات یہ کہ عصمت کامل جس کا نام ہے۔ وہ تو صرف انبیاء کرام کا حصّہ خصوصی ہے۔ خدائی معیار سے جب گرفتیں حضرات انبیاء تک پر ہوتی رہیں اور غوی اور عصیٰ تک کے فعل بے تکلف ان کے لیے قرآن مجید میں آتے رہے تو یہ غیر معصومین کی صالح و پاکباز جماعت کب روک ٹوک کے دائرہ سے باہر رہ سکتی تھی۔ قرآن ان مخلصین پر گرفتیں جابجا کرتا گیا ہے۔ کہیں اشارۃً اور کہیں صراحتہً۔

بعض نو آموزان میں ایسے تھے جو بارگاہِ نبوت کے ادب آداب سے پوری طرح واقف نہ تھے اور اپنی طبعی سادہ دلی سے کبھی کبھی حضورؐ کے تکدر و انقباض کا باعث ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جب کاشانہ مبارک پر حاضر ہوتے تو بجائے اس کے کہ حضورؐ کے برآمد ہونے کا انتظار کریں دروازے سے ہی بے تحاشا آپؐ کو چیخ کر پکارنا شروع کر دیتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ ذکر مہذب و شائستہ سلاست کے ساتھ یوں کیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (الحجرات ع ۱)

جو لوگ آپؐ کو حجروں کے باہر سے پکارنے لگتے ہیں ان میں سے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔

لفظ حجرات بہ صیغہ جمع خود اس پر دلالت کر رہا ہے کہ بیان زمانہ قیام کا ہو رہا ہے بعض ایسے بھی تھے (غالباً اہل بادیہ ہوں گے) جو مجلس مبارک میں آ کر چیخ چیخ کر بولتے اور ذرا احترام ملحوظ نہ رکھتے۔ انھیں ادب سکھایا گیا کہ دھیمی آواز سے بولیں اور قرآن مجید نے ایسی ہدایات کو بالکل ہی نذر اجمال نہیں کیا ہے بلکہ خاصے بسط و تفصیل سے کام لیا ہے کہ آئندہ نسلوں کو بھی سمجھنے میں کوئی الجھاؤ نہ باقی رہ جائے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (الحجرات ع ۱)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیمبر کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولو، جیسا آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولتے ہو کہیں تمھارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمھیں خبر تک نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ ہدایت خاص مومنین کو کی جا رہی ہے جن کے ذہن میں رسول اللہ کی ارادی بے حرمتی کا شائبہ تک نہیں آ سکتا تھا۔ اب اس نفی کے ساتھ اثبات کا، سلب کے ساتھ ایجاب کا اور نہی کے ساتھ امر کا پہلو بھی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ (الحجرات۔ ع ۱)

بے شک جو لوگ پست رکھتے ہیں اپنی آوازوں کو رسول اللہ کے سامنے تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے خاص کر دیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم۔

یہ تو آداب مجلسی و معاشری پر توجہ دہانی کی ایک مثال ہوئی اسی طرح کوتاہیاں کبھی عبادات کے دائرہ میں ہو جاتی تھیں، چنانچہ ایک بار حضور خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ مسجد کے باہر سے کسی تجارتی قافلہ یا تماشہ کے گزرنے کی آواز آئی اور سامعین خطبہ چھوڑ ادھر لپک گئے۔ اس پر بھی صراحت کے ساتھ ٹوکا گیا۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ۔ (الجمعۃ ع ۲)

اور یہ جب تجارت یا تماشا دیکھ پاتے ہیں تو ادھر لپک جاتے ہیں اور آپ کو (خطبہ میں) کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کے ہاں جو (اجر) ہے وہ تماشہ اور تجارت سے بڑھ کر ہے۔

کوئی کوئی ان میں سے ایسے بھی نکلے جو جہاد کے موقع پر کچھ پا گئے لیکن اپنی وقتی غفلت کا کفارہ انھوں نے جان و دل سے ادا کیا اور اللہ تعالیٰ کو آخر رضامند بھی کر لیا۔ قرآن مجید نے ایسوں کی تعداد کل تین بتائی ہے اور ان کا تذکرہ خود پیمبر اور اصحاب مہاجرین و انصار کے مدحیہ تذکرہ پر عطف کر کے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ

اور اللہ نے ان تینوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ زمین جب باوجود اپنی فراخی کے

ہیں لیکن اشارہ خصوصی اسی جماعت صحابہ کی جانب ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات ع ۱)

یہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیوی زندگی میں) بڑے نیک کار تھے۔ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق تھا۔

ان کی عبادتی شب بیداریوں اور استغفاری سحر خیزیوں کی شہادت ایک اور سلسلہ میں بھی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ۔ (المزمل ع ۲)

آپ کا پروردگار واقف ہے (اے پیغمبر) کہ آپ رات میں کھڑے رہتے ہیں قریب دو تہائی یا آدھی رات یا تہائی رات کے اور آپ کے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی۔

رفاقت معیت اور صحابیت کے معنی بھی یہی تھے کہ عبادتوں، ریاضتوں اور مشقتوں میں بھی اپنے آقا یا "صاحب" کے نقش قدم پر چلا جائے۔

اور ایک نقشہ بھی انھیں پاکبازوں کی روزانہ زندگی کا قرآن مجید نے پیش کیا ہے (گو الفاظ یہاں عام و وسیع ہیں) جس میں ان کے معمولات، اخلاق عبادات، معاملات سب کے خط و خال صاف نظر آسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ (الفرقان ع ۶)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر مسکنت کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب ان سے جاہل لوگ بات کرتے ہیں تو رفع شر کی بات کہہ دیتے ہیں۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذاب جہنم کو دور رکھ بیشک جہنم برا ٹھکانا اور برا مقام ہے اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے قابل مرحمت رکھا ہے اُسے ہلاک نہیں کرتے، مگر ہاں حق پر اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا اُسے سابقہ سزا سے پڑے گا۔

صحابہ کے معتبر حالات میں کتابیں اُردو میں بھی حدیث و سیر سے ماخوذ ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور عربی میں تو خیر موجود ہی

ہیں لیکن اشارہ خصوصی اسی جماعت صحابہ کی جانب ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات ع ۱)

یہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیوی زندگی میں) بڑے نیک کار تھے۔ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی (سب) کا حق تھا۔

ان کی عبادتی شب بیداریوں اور استغفاری سحر خیزیوں کی شہادت ایک اور سلسلہ میں بھی ملاحظہ ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ۔ (المزمّل ع ۲)

آپ کا پروردگار واقف ہے (اے پیغمبر) کہ آپ رات میں کھڑے رہتے ہیں قریب دو تہائی یا آدھی رات یا تہائی رات کے اور آپ کے ساتھیوں کا ایک گروہ بھی۔

رفاقت معیت اور صحابیت کے معنی بھی یہی تھے کہ عبادتوں، ریاضتوں اور مشقتوں میں بھی اپنے آقا یا "صاحب" کے نقش قدم پر چلا جائے۔

اور ایک نقشہ بھی انھیں پاکبازوں کی روزانہ زندگی کا قرآن مجید نے پیش کیا ہے (گو الفاظ یہاں عام و وسیع ہیں) جس میں ان کے معمولات، اخلاق عبادات، معاملات سب کے خط و خال صاف نظر آسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ۔ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ (الفرقان ع ۶)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر مسکنت کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب اُن سے جاہل لوگ بات کرتے ہیں تو رفع شر کی بات کہہ دیتے ہیں۔ اور جو راتوں کو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ اور قیام میں لگے رہتے ہیں اور جو دُعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے عذابِ جہنّم کو دُور رکھ بیشک جہنّم بُرا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے قابل مرحمت رکھا ہے اُسے ہلاک نہیں کرتے۔ مگر ہاں حق پر اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا اُسے سابقہ سزا سے پڑے گا۔

صحابہ کے معتبر حالات میں کتابیں اُردو میں بھی حدیث و سیر سے ماخوذ ہو کر شائع ہو چکی ہیں اور عربی میں تو خیر موجود ہی

ہیں۔ ان کی دی ہوئی تفصیلات کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ قرآن مجید نے کس اعجاز کے ساتھ ان کی تصویر کشی کر دی ہے۔ اقرآنی بیان ابھی ختم نہیں ہوا۔ اسی رکوع کی چند اور سطریں بھی قابل مطالعہ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا۔

(الفرقان رع ۶)

اور یہ لوگ ناجائز مجمعوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر بے ہودہ مشغلوں کے پاس سے گزرتے بھی ہیں تو سلامت رَوی کے ساتھ گذر جاتے ہیں اور جب اُنھیں نصیحت کی جاتی ہے، ان کے پروردگار کے احکام کے ذریعہ سے تو یہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے اور یہ لوگ دُعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا دے ایسوں کو بالا خانے عطا ہوں گے۔ بہ سبب ان کے ثابت قدم رہنے کے اور ان کو اس میں دُعا اور سلام ملے گا۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہ کیسا اچھا ٹھکانا اور مقام ہے۔

قُدسیوں کی جماعت کا اطلاق اگر اس جماعت پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔ اللہ کے ہاں اس جماعت کے شرف و عظمت کا اندازہ اس سے فرمائیے کہ جس طرح حضور انورؐ کی آمد و ظہور کی پیش خبریاں اگلی آسمانی کتابوں میں درج تھیں اسی طرح اس جماعت کا نقشہ بھی توریت اور انجیل جیسے گرامی صحیفوں میں درج رہ چکا ہے۔

سورۃ الفتح کی ایک آیت ابھی کچھ ہی دیر ہوئی آپ کے سامنے پیش ہو چکی ہے۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ الخ اس سے متصل اور اس کے معاً بعد قرآن مجید ہی میں ہے :۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ۔ اُن کے اوصاف توریت میں درج ہیں۔

اعجاز قرآنی کا کرشمہ ملاحظہ ہو کہ بے شمار تحریفات و تصرفات کے بعد بھی توریت موجودہ میں یہ الفاظ آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔

"فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا۔" (استثناء ۔ ۳۳ : ۲)

اور یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ فاران مکہ معظمہ ہی کی ایک پہاڑی کا نام ہے اور پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے بعد جتنے صحابیوں یا "قدوسیوں" کا ساتھ ہوا تھا ان کی تعداد بھی دس ہی ہزار تھی۔

توریت میں اس کے بعد ہے۔

"اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشین شریعت ان کے لیے تھی"

قرآن مجید کے الفاظ اشداء علی الکفار آپ سن چکے ہیں۔ اس کی مطابقت "آتشین شریعت" سے دیکھئے۔

دشواری کسی کو نہیں پیش آسکتی۔ آگے توریت میں ہے :-

"ہاں وہ اپنی قوم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔"

قرآن مجید کے الفاظ رحماء بینھم ابھی آپ کے کان میں گونج ہی رہے ہوں گے اور ان کی کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے اور آخر میں توریت میں اس سلسلے میں ہے۔

"اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور تیرے قدموں کے نزدیک بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔"

اسے پڑھ کر قرآن مجید کے بھی یہ الفاظ اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے رکعا سجدا یبتغون فضل من اللہ ورضوانا توریت کا بیان آپ نے سن لیا۔ اب انجیلی مدح صحابہ بھی سماعت فرمائیں۔ اس لیے کہ قرآن مجید نے توریت کے معاً بعد انجیل کا نام بھی لیا ہے اور کہا ہے :-

وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ۔ ~~(الفرقان ع ۴)~~

اور انجیل میں ان کا وصف یہ ہے کہ وہ جیسے کھیتی ہیں کہ اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا پھر وہ اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی۔

موجودہ محرف انجیلوں سے بھلا اس عبارت کی کسی درجہ میں بھی تصدیق و توثیق کی اُمید ہو سکتی تھی؟ لیکن نہیں۔ مماثل عبارتیں اب بھی انجیلوں میں باقی رہ گئی ہیں۔ انجیل متی باب ۱۳ کی آیات ۳۱، ۳۲ جب چاہے پڑھ کر دیکھ لیجئے اور اس وقت تو سن لیجئے :

"آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر آکر بسیرا لیتے ہیں۔"

اور آپ چاہیں تو ایسی ہی عبارتیں انجیل مرقس باب ۴ آیات ۳۰ تا ۳۲ میں نیز انجیل لوقا باب ۱۳ آیات ۱۸، ۱۹ میں نکال کر پڑھ سکتے ہیں۔

ان مخلص شاگردوں اور جانباز رفیقوں نے رسولؐ کا ساتھ ہجرت و ترک وطن میں دیا۔ جہاد و قتال میں دیا، اور رسولؐ کے دین کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ صحیفۂ ربانی اپنے کمال ذرہ نوازی، اور بندہ پروری سے اپنے ان بندوں کی روداد اخلاص اپنے اوراق میں برابر درج کرتا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ہے :-

لٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ

لیکن رسولؐ اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ (ہو کر) ایمان لائے

جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (توبہ ع ۱۱)

انہوں نے جہاد کیا اور اپنی جان سے اور اپنے مال سے انھیں کے لیے تو بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ تو فلاح یاب ہیں۔

رضائے الٰہی کے اس معزز تمغہ کے بعد اگر اس طبقہ کے ہر فرد کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہٗ کہنے اور لکھنے کا دستور ہم مسلمانوں میں پڑ گیا تو اس میں حیرت کی کوئی بات ہی نہیں ——— ایک دوسرا پروانہ مغفرت و مغفوریت ان باعمل پیروان رسولؐ کے حق میں اور ملاحظہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (انفال ع ۱۰)

اور جب ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا نیز جن لوگوں نے (انھیں) اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہی (سب) لوگ تو ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں۔ انھیں کے لیے مغفرت ہے اور بہترین روزی۔

صحابیانِ رسولؐ کی جو دو بڑی تقسیمیں، مہاجرین اور انصار کی ہیں قرآن مجید نے یہاں اس تقسیم کو قبول ہی نہیں کیا۔ بلکہ دونوں گروہوں کی مدح کامل اس ایک آیت کے اندر کر دی۔ ایک گروہ وہ تھا جو اپنے مقتضیات ایمان کی تکمیل کی خاطر ہر طرح کے خطرے برداشت کر کے اور کڑی سے کڑی مصیبتیں جھیل کے اپنے وطن مالوف مکّہ معظمہ سے ہجرت کر کے اور بے خانماں ہو کر دارالہجرۃ مدینہ منورہ کو آیا تھا اور دوسرا طبقہ مدینہ ہی کے باشندوں کا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے مقتضیات ایمان ہی کی تکمیل کی خاطر ان مصیبت زدوں کی پذیرائی کی تھی۔ ان لے گھروں کو نئے سرے سے گھر بار والا بنایا اور ان کی خدمت اور مہمان داری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ایمان کا حق ادا کرنے والے، قرآن یہاں صاف شہادت دیتا ہے کہ یہ دونوں ہی گروہ رہے ہیں۔ جہاں دوسری جگہ ان دونوں گروہوں کو ان کے اصطلاحی ناموں "مہاجرین و انصار" سے یاد کیا ہے اور مدح صحابہ کا قرآنی نمونہ پیش کر دیا ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (توبہ ع ۱۴)

اللہ نے توجہ فرمائی پیمبر کے حال پر اور ان مہاجرین و انصار کے حال پر بھی جنھوں نے پیغمبر کا ساتھ ایسی تنگی کے وقت میں دیا۔ بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل میں کچھ تزلزل پیدا ہو چلا تھا۔ پھر اللہ نے ان کے حال پر رحمت سے توجہ فرما دی۔ بیشک وہ ان پر بہت شفیق بہت مہربان ہے۔

ساعۃ العسرۃ کے لفظ میں عموم ہے۔ مہاجرین و انصار دونوں نے حضورؐ کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا لیکن اہل تفسیر و اہل تاریخ نے اشارہ خصوصی یہاں غزوہ تبوک کی جانب سمجھا ہے جس کی تیاریوں کے وقت سامنا غیر معمولی دشواریوں کا کرنا پڑا تھا۔ مبارک ہیں وہ اُمتی جن کا ذکر صحیفہ ربانی میں ذکر رسولؐ کے ساتھ ایک جگہ اور ان کی مدح و تحسین اسی طرح کھل

کرائی ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (توبہ ع ۱۳)

اور جو مہاجر اور انصار سابق و مقدم ہیں نیز وہ جنھوں نے ان کی پیروی کی نیک کرداری میں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔ اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے بہت بڑی کامیابی یہ ہے۔

رضی اللہ عنھم کا فقرہ اب تو کھل کر ان قدسیوں کے حق میں وارد ہو گیا اور جب یہ صحابہ مہاجرین و انصار تو ممدوح الٰہی تھے ہی آیت نے یہ بھی صاف کر دیا کہ بعد والے جو ان کی پیروی کریں گے۔ وہ بھی حق تعالےٰ کی طرف سے سزاوار مدح و ستائش ٹھہر جائیں گے اور باحسان کی قید نے ایک اور نکتہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ یعنی تابعین کا اتباع معتبر وہی شمار کیا جائے گا جو احسان یا حسن عمل میں ہو۔ محض معاصرت یا باہم معاصرت نہیں[1]

صحابہ سب کے سب شہری ہی نہ تھے ان کا ایک حصہ دیہاتیوں پر بھی شامل تھا۔ یہ لوگ بیچارے اپنے کمال بےنفسی سے اپنا مال لیے خدمتِ دین کے لیے حاضر رہتے تھے کہ اسی ذریعہ سے انھیں قرب خداوندی اور التفات رسول حاصل ہو اور کیسے قبول ان کے عقیدت کے نذرانوں کو حاصل ہوا اور کیسے نہ حاصل ہوتا ارشاد ہوا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (توبہ ع ۱۲)

دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے قرب عند اللہ کا اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بے شک ان کا یہ خرچ کرنا باعث قربت ہے۔ ضرور ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل کرلے گا۔ اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے۔

انھیں اعراب یا دیہاتیوں کے کفر و نفاق کا ذکر بھی قرآن مجید میں شد و مد سے آیا ہے۔ لیکن انھیں اہل بادیہ میں کیسے کیسے مخلصین و مقبولین بھی پیدا ہوئے۔ یہ اسی آیت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

مسجد نبوی میں آ کر جو صحابہ نماز پڑھا کرتے تھے ان کی پاکیزہ طینتی پاکیزہ سیرتی کی شہادت پر قرآن مجید نے اپنی مہر لگا دی ہے گو مقصود اس سیاق میں اصلاً صرف مسجد کی تقدیس کا اظہار تھا۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ

جس مسجد کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی (آتے)

---

[1] محققین نے خلیفہ یزید بن معاویہ کو "تابعین" کے زمرہ میں شامل کرنے سے اسی لیے احتراز کیا ہے کہ یہاں اتباع احسان میں نہ تھا۔

اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔ (توبہ ع ۱۳)

ہیں جو پسند کرتے ہیں اس کو کہ خوب پاک صاف رہیں اور اللہ پسند کرتا ہے خوب پاک صاف رہنے والوں کو۔

ہجرت یعنی دین کی خاطر اپنے وطن مالوف کو چھوڑ دینا بذاتِ خود ایک اتنا بڑا مجاہدہ تھا کہ اسی ایک عمل نے صحابہ مہاجرین کو بلندی مرتبہ میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۚ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (النحل ع ۶)

اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن چھوڑا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ ہم انھیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں اور آخرت کا اجر تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش کہ وہ یہ جانتے۔

انھیں مہاجرین مظلوم اور مجاہدین صحابہ کی داد ایک جگہ یوں آئی ہے کہ ان کے ہاتھ اگر حکومت آگئی تو یہ ملک کو فسق فجور سے نہیں، ظلم و ستم سے نہیں، عدل سے بھر دیں گے اور سکہ شراب، زنا کا نہیں۔ سود و قمار کا نہیں۔ خیر و صلاح تقویٰ وطاعت کا چلا دیں گے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج ع ۶)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انھیں دنیا میں حکومت دے دیں، تو یہ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں۔ حکم نیک کرداری کا دیں اور روک تمام بدکرداری کی کر دیں۔

قرآن مجید کی اس سچی پیش خبری کی تصدیق دورِ خلافتِ راشدہ نے جس طرح کی اس کی روئداد تاریخ کی زبان سے جب چاہے سُن لیجیے اور آخر یہی تو تاریخ کا وہ مثالی دور ہے جسے گاندھی جی ہمارے اپنے زمانے تک بطور مثالی حکومت کے پیش کرتے رہے ہیں۔

جنگ احزاب کا دن مدینہ کے دس سالہ دورِ محمدیؐ میں ایک سخت ترین دن ہوا ہے۔ قریش خود ہی کیا کم تھے کہ اس روز اپنے ساتھ ملک کے سارے پرقوت قبیلوں کو مدینہ پر چڑھا لائے تھے تاکہ ہر طرف سے گھیر کے اور دھاوا بول کے اس مٹھی بھر مسلم آبادی کا خاتمہ ہی کر دیں اور ظاہری سامان اور مادی آثار سب اسی کے نظر بھی آرہے تھے۔ لیکن مخلصین کی یہ جماعت اس ہولناک صورتِ حال اور مخالف ماحول سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ نہ بد دل ہوئی نہ ہراساں بلکہ سکونِ قلب و انشراحِ خاطر کے ساتھ ثابت قدمی و جانبازی کا ثبوت دیتی رہی، کلام پاک کی شہادت ملاحظہ ہو۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ (الاحزاب ع ۳)

اور جب مومنین (صادقین) نے احزاب کو دیکھا تو بولے کہ یہ وہی ہے جس کی ہم کو اللہ اور اس کے رسولؐ خبر دے چکے تھے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے سچ ہی فرمایا تھا اور اس سے ان کے ایمان و اطاعت میں اور ترقی ہی ہوئی۔

احزاب ہی کی طرح ایک دوسرے اہم و نازک موقعہ صلح حدیبیہ کے سلسلے میں بھی دین داروں کی اس جماعت کی مدح

تصریح کے ساتھ آئی ہے۔ حالت اندیشہ ناک ہو چکی تھی اور نظر آ رہا تھا کہ جنگ (جس کے لیے مسلمان تیار ہو کر بالکل ہی نہیں آئے تھے) اب چھڑی اور جب چھڑی عین اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر ان جاں نثاروں نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت آخر دم تک لڑنے مرنے کی کی تھی اصل عبارت ملاحظہ ہو، خطاب رسولِ کریمؐ سے ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا۔ (الفتح ع ۳)

یقیناً اللہ ان مومنین سے خوش ہو گیا جب کہ یہ لوگ آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ اللہ کو بھی معلوم تھا اور اس نے ان کو قریب ہی میں ایک فتح دے دی اور بہت سی غنیمتیں بھی جنھیں وہ لے رہے ہیں۔

آیت میں ان کو نوید آجل یا مژدہ اخروی کے ساتھ ایک بشارت عاجل فتح قریب کی بھی مل گئی اور اس سے متصل اور بھی بشارتیں ہیں مستقبل قریب ہی سے متعلق۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ (الفتح ع ۳)

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لو گے، سو سر دست یہ تم کو دے ہی دی ہے اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک رکھے تا کہ یہ مومنین کے لیے ایک نمونہ ہو جائے اور تا کہ تم کو ایک سیدھی سڑک پر ڈال دے اور ایک فتح اور بھی ہے جو تمھارے قابو میں ابھی نہیں آئی ہے اور اللہ اس کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے اور اللہ اس پر قادر ہے۔

یہ حضرات صحابہ اخلاق و روحانیت کی جن بلندیوں تک پہنچ چکے تھے، اُس کا تذکرہ قرآن مجید نے بکمال اعجاز خود اپنے صفحات میں محفوظ کر دیا ہے جیسا کہ آپ اب تک سن بھی چکے ہیں۔ حدیث، سیرت اور طبقات کے مجلدات میں فضائل صحابہ کی جو طویل و ضخیم روداد نظر آتی ہے وہ سب اسی متن قرآنی کی شرح و تفسیر ہے۔

یعنی کافروں سے جو مال بلا لڑے بھڑے وصول ہو جائے اس کا مصرف مہاجرین و انصار دونوں کے مرتبہ و منزلت پر اپنے بیان کی سطور و بین السطور دونوں سے روشنی ڈالتا گیا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (الحشر ع ۱)

حق ہے ان حاجت مندوں کا جو اپنے گھروں اور اپنے مال سے بے دخل کر دیئے گئے۔ وہ تلاش میں لگے رہتے ہیں، اللہ کے فضل و خوشنودی کے اور نصرت کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی یہی لوگ تو ہیں راست باز۔

یہ نقشہ تو مہاجرین کا ہوا، انصار کے جوہر جو اللہ کی نظر میں تھے۔ ان کے لیے اسی آیت سے متصل دوسری آیت تلاوت فرمائیے:۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(ایضاً)

(اور یہ مال) ان لوگوں کا بھی حق ہے جو دارالاسلام میں اور ایمان میں اُن سے قبل ہی قرار پکڑے ہوئے ہیں، محبت کرتے ہیں۔ اس سے جو ان کے پاس ہجرت کرکے آتا ہے اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (انھیں) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ (خود) ان پر فاقہ ہوا، اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہوگیا تو بس یہی ہیں فلاح یاب۔

طبعی بخل نفس پر فتح پالینے کے بعد بندوں کے معاملات میں پھر کون سا درجہ مجاہدہ باقی بھی رہ جاتا ہے؟ فرقِ مراتب سے کوئی طبقہ خالی نہیں ہوسکتا۔ انصار، مہاجرین سارے طبقات صحابہ ظاہر ہے کہ افراد کے لحاظ سے ایک سطح پر نہ تھے نہ ہو سکتے تھے کوئی کامل تھا، کوئی کامل تر۔ لیکن بہر حال مرتبہ اور درجہ مقبولیت پر فائز سب ہی تھے۔ قرآن مجید نے کتنا صحیح فیصلہ اور وہ بھی خود کردہ صحابہ ہی کو مخاطب کرکے اس باب میں سنا دیا گیا۔

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔

(الحدید ع ۱)

تم میں سے جو لوگ فتح (مکہ) سے قبل مال خود خرچ کر چکے اور قتال کر چکے وہ برابر نہیں وہ مرتبہ میں ان لوگوں سے بڑھ کر ہیں جنھوں نے خرچ اور قتال بعد میں کیا اور اللہ نے بھلائی کا وعدہ (ان) سب ہی سے کر رکھا ہے اور اللہ کو تمھارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

انبیاء سابقین کے رفیقوں، مریدوں، شاگردوں کے حالات تفصیل کے ساتھ تو معلوم نہیں لیکن حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے صحابیوں کے جتنے بھی حالات قرآن مجید و توریت و انجیل میں درج ملتے ہیں، ان کا مقابلہ ذرا قرآن ہی کی روشنی میں ہمارے رسول اکرمؐ کے جاں نثار صحابیوں سے کرکے دیکھئے تو ایک قدرت خدا نظر آتی ہے اور بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ آنحضورؐ کی شخصیت جس طرح اپنے ذاتی فضائل و کمالات کے ساتھ نوع بشری میں مثالی ہوئی ہے اسی طرح اپنے صحابیوں کے اخلاص ایثار اور فدائیت کے لحاظ سے تاریخ عالم میں ایک بالکل امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

قرآن حکیم اور اطاعتِ رسولؐ

مولانا محمد حنیف ندوی

قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس میں تشریع وقانون کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان تمام بنیادی مسائل کو بیان کیا گیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: ۸۹)

اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جس میں ہر شے کی وضاحت ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (الانعام: ۱۱۴)

حالانکہ اس نے تمہاری طرف واضح المطالب کتاب بھیجی۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ (ھود: ۱، ۲)

الرٰ۔ یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں مستحکم ہیں اور خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے بہ تفصیل بیان کر دی گئی ہیں۔

آیئے! ان آیات کی رو سے دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کس درجہ ضروری ہے اور آپؐ کے منصب یا فرائض کار میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں تاکہ ہر مسلمان صحیح خطوط پر اپنی دینی زندگی کے نقشے کو ترتیب دے سکے، قرآن حکیم کے مطالب ومعانی کو سمجھ سکے اور ان کو اپنی عملی زندگی میں سمو سکے۔ قرآن حکیم نے اس سلسلے میں دو انداز اختیار کیے ہیں۔ اکثر تو اپنی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کو بھی ضروری ٹھہرایا ہے اور کہیں صرف رسول کی اطاعت و پیروی ہی کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دینی نقطہ نظر سے قرآن کے پہلو بہ پہلو، اسلام اور فقہ وتقنین کا دوسرا سرچشمہ یا مصدر ثانی جس سے ایمان وعمل کے تقاضے مکمل ہوتے ہیں، سنتِ رسولؐ ہے:

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۳۲)

کہہ دو کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۲)

اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحمت کی جا سکے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

مومنو! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو، اور اگر کسی بات میں اختلاف پیدا ہو تو اگر خدا اور آخرت

فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ (النساء: ۵۹)

پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور رسول اور اپنے اولی الامر کے حکم کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۱)

اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۰)

ایمان دارو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو، اور تم سن رہے ہو۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا (الانفال: ۴۶)

اور خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا، ایسا کرو گے تو بزدل ہو جاؤ گے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (النور: ۵۴)

کہہ دیجیے کہ خدا کی فرمانبرداری کرو اور رسول خدا کے حکم پر چلو، اگر منہ موڑو گے تو رسول پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو ان کے ذمہ ہے اور تم پر اس چیز کا ادا کرنا ہے جو تمہارے ذمے ہے اور اگر تم ان کے فرمان پر چلو گے تو سیدھا راستہ پا لو گے اور رسول کے ذمے تو صاف صاف احکام خدا کا پہنچا دینا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ (محمد: ۳۳)

مومنو! خدا کا ارشاد مانو اور پیغمبر کی فرمانبرداری کرو اور اپنے عملوں کو ضائع نہ ہونے دو۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (مجادلہ: ۱۳)

اور خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، خدا اس سے باخبر ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (التغابن: ۱۲)

اور خدا کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم منہ پھیر لو گے تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کھول کر پہنچا دینا ہے۔

یہ وہ آیات ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں دونوں کی اطاعت و پیروی کو یکساں طور سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے یعنی جو اسلوب، انداز اور پیرایۂ اظہار اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے اختیار کیا گیا ہے، بعینہٖ وہی نہج اور طریقِ اطاعتِ رسول کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اب ان آیات پر ایک نظر ڈالتے چلیے

جن میں اطاعتِ رسولؐ کو مستقل بالذات اور منفرد دین کی اساس اور بنیاد قرار دیا گیا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج (النساء: ۸۰)
جو شخص رسول کی پیروی کرے گا تو بے شک اس نے خدا کی پیروی کی۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط (النساء: ۶۴)
اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (آل عمران: ۲۱)
لوگوں سے کہہ دیجیے اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تمھیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ (النور: ۶۳)
تو جو لوگ آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے کہ ایسا نہ ہو ان پر کوئی آفت آ پڑے یا تکلیف والا عذاب نازل ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥ (النساء: ۶۵)
آپ کے پروردگار کی قسم، یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو آپ فیصلہ کر دیں اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے تسلیم کریں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

یہ آیات اپنے مفہوم و معنی میں اس درجہ واضح ہیں کہ ہم نے ان کی تشریح و تفسیر کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا ہے، البتہ ان آیات سے جو نکات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آتے ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔

۱۔ اطاعتِ رسولؐ، دین کی اتنی اہم اساس ہے کہ اس سے انکار کفر کا مستوجب ہے۔

۲۔ اللہ کے رسول کی اطاعت رحمتِ الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

۳۔ کسی بھی فقہی و دینی مسئلے میں اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیغام پر ایمان کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں، جبکہ حضورؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کو حرزِ جان بنایا جائے۔

۵۔ اطاعتِ رسولؐ کی روگردانی سے حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے۔

۶۔ رسولؐ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے مترادف ہے۔

۷۔ ہر پیغمبر اسی لیے مبعوث ہوا ہے کہ لوگ اس کے نقشِ قدم پر چلیں۔

۸۔ محبتِ الٰہی صرف ایسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات و اعمال کی پیروی کی جائے۔

۹۔ جو لوگ آپ کی تعلیمات کی مخالفت میں سرگرم ہیں، ان کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔
۱۰۔ ایمان اس وقت تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا جب تک آنحضرتؐ کے احکام و اوامر کو پورے اخلاص سے تسلیم نہ کیا جائے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن نے آنحضرتؐ کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا ہے تو اس کو سمجھنے کے لئے نامناسب نہ ہوگا کہ پہلے تصورِ نبوت سے متعلق ان خیالات و افکار کا اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جائے۔ جو یکسر ملحدانہ اور غلط ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس موضوع میں اصل اشکال یہ ہے کہ نبوت کا مسئلہ خالص دینی ہے اور جب اس کو حل کرنے کے لئے عقل و خرد کی واماندگی پر اعتماد کیا جائے گا تو اس سے لازماً نبوت کی عظمت و حقیقت پر روشنی نہ پڑ سکے گی اور نہ یہ بات واضح ہو سکے گی کہ انبیا کی تعلیمات میں جو ایک طرح کا توافق اور ارتقاء و تسلسل پایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ جس طرح سائنس کے مسائل کو غیر سائنسی اصولوں کی روشنی میں حل نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح وہ مسائل جن کا تعلق خالصتاً دین سے ہے، ان کو غیر دینی وسائل و ذرائع کے بل بوتے پر حل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے، بعض لوگوں نے اس کے باوجود اسرارِ نبوت تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی۔ مثلاً کچھ لوگوں نے اسے کہانت کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا، حالانکہ نبوت اور کہانت میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی، جن لوگوں نے عربی ادبیات میں کاہنوں سے منقولہ اقوال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جہاں ارشاداتِ انبیا رحکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے موتی ضوفگن ہیں۔ گہرائی اور عمق ہے، وہاں کہانت میں ڈھلے ڈھلائے، بے معنی اور سطحی جملوں کے سوا کوئی چیز پائی نہیں جاتی۔ کاہن کو انبیا و رسل سے وہی نسبت حاصل ہے جو ذرہ کو آفتاب سے ـــ ان کے اقوال میں نہ صحت و بصیرت کی کوئی جھلک ہے، نہ زندگی کے مسائل سے متعلق کوئی پیغام و دعوت کا نظام پایا جاتا ہے، نہ اخلاق کو سنوارنے کی تعلیم ہے اور نہ اللہ تعالیٰ سے رشتۂ عبودیت استوار کرنے کا کوئی طریق مذکور، کیونکہ یہ ساری چیزیں انبیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ نبوت اس شدید احساس و تاثر کا نتیجہ ہے جو معاشرے میں فکر و نظر کی گمراہیوں کو دیکھ کر ایک ذہین اور حساس مصلح انسان کے دل میں ابھرتا ہے۔ ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ معاشرے میں مروجہ برائیوں کے خلاف اصلاح کا جذبہ بعض حضرات کو اس حد تک مجبور کر دے کہ وہ ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن ان کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ وہ اپنے کو فرستادہ تصور کرنے لگیں اور اپنے خیالات و افکار کو وحی و تنزیل کا نتیجہ قرار دیں۔

نبوت کی ایک توجیہ نفسیات کے ماہرین نے یہ بیان کی ہے کہ یہ ایک نوع کی ذہنی بیماری ہے اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو ذہنی و فکری لحاظ سے عدم توازن کا شکار ہے، متوازن و معقول اور قابلِ عمل نظامِ حیات پیش کر سکے، اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کو پیش کر سکے، تہذیب و تمدن کے سانچوں کو ترتیب دے سکے اور ان تمام گتھیوں کو سلجھا سکے، جن سے معاشرہ دوچار ہے۔ یہی نہیں، خود بھی ایسی پاکیزہ اور بلند زندگی بسر کر سکے، جو دوسروں کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتی ہو۔

نبوت کے بارے میں یہ ان لوگوں کی توجیہات تھیں جو ادیان کی صداقت اور سچائی پر یقین نہیں رکھتے اور محض ظن و تخمین کی بنا پر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے دیکھو لوگ ایسے بھی ہیں جو دینی ذہن رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوصف انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے اور اس مسئلے کی تہ تک نہیں پہنچ پائے۔ مثال کے طور پر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ نبوت ولایت ہی کے اس مقام

سے متعلق ایک حقیقت ہے جہاں پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت سے سالک کا قلب اس لائق ہو جاتا ہے کہ اس پر وحی و تنزیل کی تجلیات کا انعکاس ہونا شروع ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں نبوت اور ولایت میں جو فرق ہے وہ نوعیت کا نہیں درجے کا ہے۔

ہمارے نزدیک نبوت کی متصوفانہ تعبیر اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کریم سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہو پاتا کہ منصبِ نبوت سے بہرہ مند ہونے سے پہلے ہر نبی نے سلوک و معرفت کی وہ تمام منزلیں طے کی ہوں، جن کی صوفیہ نے نشان دہی کی ہے۔ مزید برآں اس سے عقیدۂ ختم نبوت کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت کسبی ہے وہبی نہیں۔ یعنی اگر آج بھی کوئی شخص تعلق باللہ کی اس منزل تک رسائی حاصل کرے جس کو معرفت و سلوک کی اصطلاح میں آخری منزل کہا جا سکتا ہے تو وہ نبوت و رسالت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو سکتا ہے حالانکہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس کا قائل نہیں۔ نبوت و ولایت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نبی وحی و تنزیل کے ذریعے جن حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے وہ تمام تر معروضی ہوتے ہیں اور ولی کے قلب و ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ موضوعی ہوتے ہیں اور ان کا تانا بانا، معاشرے کے حالات، اقدار و تعلیم و تربیت کے اسلوب و نہج سے تیار ہوتا ہے، اور ان میں جو تھوڑی بہت معروضیت پائی جاتی ہے، وہ بھی صاف اور واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر طلب ہوتی ہے۔ ان نقوش و تاثرات کو ہم کشوف تو کہہ سکتے ہیں، وحی نہیں، کشوف کی شرعی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ سالک کے ذاتی تجربات ہیں۔ لہٰذا ہر حال میں ان کی صحت کا معیار یہ ہے کہ آیا یہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق ہیں یا نہیں۔ جس طرح ایک مجتہد کا استدلال و استنباط صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی، اسی طرح کشوف میں بھی خطا و صواب دونوں کا امکان موجود ہے، بلکہ علامہ ابن تیمیہ کی زبان میں یہ کہنا چاہیے کہ کشف بھی ایک طرح کے اجتہاد ہی سے تعبیر ہے۔

دینی حلقوں میں ایک نہایت محدود اور بر خود غلط حلقہ ایسا بھی ہے جو نبوت و وحی کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی تنزیل کے لئے کسی شخص کو منتخب کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کتاب کے متن اور الفاظ و حروف کو من و عن لوگوں تک پہنچا دے۔ لیکن اس کے اقوال و تشریحات اور عمل و کردار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بھی وحی و تنزیل کا نتیجہ ہوں، لہٰذا حجت و استدلال کا جہاں تک تعلق ہے اس کا سرچشمہ صرف وہ کتاب ہو گی جو اس پر نازل ہوئی ہے۔ پیغمبر کا عمل اور ارشادات نہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے پیغمبر کی حیثیت محض مبلغ اور شارح کی ہے، شارع کی نہیں۔ ان کے ہاں ہر دور کے اہلِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے طور پر کتاب اللہ کی تشریح کریں، شرع و تقنین کے سانچوں کو ڈھالیں، دین کی جزئیات اور تفصیلات کو متعین کریں اور لوگوں کی رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔

نبوت و رسالت کا یہ گمراہ کن تصور دراصل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وحی الٰہی کا دائرہ صرف کتاب اللہ تک سمٹا ہوا ہے اور اس کی وسعتیں اور ضوفشانیاں نبی کے اعمال اور ارشادات کو متاثر نہیں کر پاتیں۔ حالانکہ وحی ایسا عمل ہے جو پیغمبر کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس لیے پیغمبر دینی حقائق کی تبیین و تشریح کے ضمن میں جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس سے منشائے الٰہی کی پوری پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: ۳،۴)	اور وہ کوئی بات خواہشِ نفس سے منہ سے نہیں نکالتا، وہ تو وحی الٰہی ہے، جو انکی طرف بھیجی جاتی ہے۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۝ (احزاب: ۲۱)	تمہارے لئے پیغمبرِ خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے

اللہ کی اطاعت اور رسول کی متابعت کو دو مختلف اور متضاد خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مختلف اظہار یا پہلو ہیں۔ اللہ تعالیٰ کتب و صحائف کے ذریعے معاشرے کے مسائل کا حل نازل فرماتا ہے اور رسول اپنے عمل کردار اور تشریحات سے وحی و تنزیل ہی کی روشنی میں ان کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ براہ راست وحی کو علما کی اصطلاح میں وحی جلی کہا جاتا ہے اور اسی کی روشنی اور تاثیر کو وحی خفی ــ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغمبر تو بھیجا گیا ہے مگر اس پر کوئی متعین کتاب نہیں نازل کی گئی، لیکن اس کے باوجود اس کی پیروی کو ضروری ٹھہرایا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر کی ذات بجائے خود حجت و دلیل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنے دور میں کتاب اللہ کی پیروی کے پہلو بہ پہلو اپنی پیروی کی بھی دعوت دی اور لوگوں سے کہا کہ اگر تم نجاتِ اخروی کے طالب ہو تو ہمارے نقشِ قدم پر چلو

حضرت نوحؑ نے فرمایا:

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعرا: ۱۰۹، ۱۱۰)	میرا صلہ تو خدائے رب العٰلمین ہی پر ہے، تو خدا سے ڈرو، اور میرے کہنے پر چلو۔

حضرت ہودؑ نے کہا:

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۲۶)	میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت صالحؑ کا ارشاد ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء: ۱۴۴)	سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت لوطؑ کا کہنا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعرا: ۱۶۲)	سو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت شعیبؑ نے اسی پیرایۂ بیان میں بن کے رہنے والوں سے فرمایا:

اِنِّي لكم رسول امين ۝ فاتقوا الله واطيعون ۝ (الشعرا: ۱۷۸، ۱۷۹)	میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں سو خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

حضرت مسیحؑ نے ان الفاظ میں بنی اسرائیل کو اپنی بعثت کے مقصد سے آگاہ کیا:

قد جئتكم بالحكمة ولابيّن لكم بعض	میں تمہارے پاس دانائی لے کر آیا ہوں۔ نیز اس لیے کہ

الذی تختلفون فیہ فاتقوا اللہ واطیعون﴿ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، تم کو سمجھا دوں۔

(الزخرف: ۶۳)

آیئے! اب یہ دیکھیں کہ ان توجیہات و تصورات کے مقابلے میں قرآن حکیم نے نبوت کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم نے واضح اور غیر مبہم انداز میں اس حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق یکسر فیضانِ ربوبیت سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ عقل و خرد کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے، بلکہ انبیا و رسل کو بھیج کر اس کی رہنمائی کی ہے:

قال ربنا الذی اعطیٰ کل شیءٍ خلقہ ثم ھدیٰ﴿ (طٰہٰ: ۵) (موسیٰ نے) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔

اس لیے کہ انسانی عقل و تجربہ بہرحال محدود و ناقص ہے۔ اس میں یہ استعداد نہیں پائی جاتی کہ وحی و تنزیل کی روشنی سے بے نیاز رہ کر تہذیب و تمدن کی گتھیوں کو کامیابی سے سلجھا سکے اور اپنے لیے ایسی راہِ عمل کا تعین کر سکے جس پر گامزن ہو کر یہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریق رہا ہے کہ ہر دور میں تسلسل کے ساتھ ایسے اشخاص منتخب کر کے مبعوث فرمائے، جو ذہنی، اخلاقی اور روحانی طور سے اس طرح کامل ہوں اور اس لائق ہوں کہ انسان کو ضلالت اور گمراہی کی پستیوں سے نکال کر رشد و ہدایت کے فرازوں تک پہنچا سکیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ﴿ (الانعام: ۱۲۴) اس کو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کسے منصبِ نبوت سے نوازے۔

نبوت و رسالت کی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ خیر و خوبی کے قافلوں کو آگے بڑھا سکیں اور شر و برائی کے قلع قمع کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں۔ اس مضمون کو قرآن نے متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، جس سے یہ بات نکھر کر فکر و نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق اللہ کی تدبیر اور نظامِ ربوبیت سے ہے۔ انسانی ماحول، معاشرے، استعداد، یا مجاہدہ و ریاضت سے نہیں:

کان الناس امۃً واحدۃً قف فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین﴿ (البقرہ: ۲۱۳) پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے تو خدا نے اُن کی طرف بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم (آل عمران ۱۶۴) خدا نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔

اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے انبیا کے لیے رسل کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:

لقد اخذنا میثاق بنی اسرآءیل ہم نے بنی اسرائیل سے عہد بھی لیا اور ان کی

وارسلنا الیھم رسلًا ط (المائدہ : ۷۰) طرف پیغمبر ارسال کیے۔

آنحضرت کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد فرمایا:

ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ و کفی باللہ شھیدًا ؕ (الفتح - ۲۸)

وہی ذات تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور حق ظاہر کرنے کے لیے خدا ہی کافی ہے۔

اسی نظامِ ربوبیت کی آخری کڑی آنحضرتؐ کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کے فرائض کار میں تین چیزیں داخل ہیں۔

۱۔ تعلیم و تبلیغ

۲۔ تزکیہ

۳۔ تبیین

جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بہ یک وقت معلم و مبلغ بھی ہیں، اور کتاب اللہ کے شارح اور مفسر بھی تعلیم و تبلیغ سے مراد یہ ہے کہ آپ اُمت کو دین کے بنیادی حقائق سے آگاہ کریں، اس کے ذہنی افق کو بلند کریں اور فکر و نظر کی صلاحیتوں کو اس طرح جلا دیں کہ خدا کی کائنات اور انسان سے متعلق امت ان تمام معلومات سے بہرہ مند ہو سکے، جس پر کہ تہذیب و تمدن کا ارتقا اور تعمیر منحصر ہے۔

تزکیے سے یہ مقصود ہے کہ آپؐ اپنے روحانی فیوض اور اسوۂ حسنہ سے امت کے اخلاق و کردار کو سنواریں، ان میں انسانی فرائض کا احساس پیدا کریں۔ ہمدردی، محبت اور تعاون و خیر سگالی کے جذبات کی پرورش کریں اور یہ بتائیں کہ انفرادی و اجتماعی سطح پر تقویٰ، پرہیزگاری اور تعلق باللہ کی منزلوں کو کیوں کر کامیابی سے طے کیا جا سکتا ہے۔

تبیین کے معنی یہ ہیں کہ قرآن حکیم میں فرائض و اعمال کے بارے میں جو کچھ بھی مذکور ہے اس کی وضاحت اپنے قول و عمل سے کریں اور جہاں جہاں بھی تشریح طلب امر و احکام مذکور ہیں وہاں ان کی تشریح کریں اور امت کو پوری پوری تفصیلات سے آگاہ فرمائیں مثلاً یہ کہ مسلمان پر شب و روز میں کتنی نمازیں فرض ہیں، قیام، رکوع اور سجود میں کیا پڑھنا چاہیے، مناسکِ حج کیا کیا ہیں نکاح، طلاق اور بیوع یا معاملات سے متعلقہ آیات کا کیا مفہوم ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور فرائض کار کے بارے میں ہم نے جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے:

کما ارسلنا فیکم رسولًا منکم یتلوا علیکم ایٰتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتٰب والحکمۃ و یعلمکم ما لم تکونوا تعلمون ؕ (البقرہ: ۱۵۱)

منجملہ اور نعمتوں کے جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں۔

یٰایھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک ؕ (المائدہ : ۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے سب کا سب پہنچا دیجیے۔

یٰاَھل الکتٰب قد جاءکم رسولنا یبیّن لکم کثیرًا مما کنتم تخفون من الکتٰب (المائدہ: ۱۵)	اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں کہ جو کچھ تم کتاب الٰہی میں سے چھپا رکھتے تھے۔ وہ اس میں سے بہت کچھ تمھیں کھول کر بتا دیتے ہیں۔
وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للناس ما نزل الیھم ولعلّھم یتفکرون ۰ (النحل: ۴۴)	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے تاکہ جو ارشادات لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر کھول کر بیان کر دیں اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔
ثم ان علینا بیانہٗ ۰ (القیمۃ: ۱۹)	پھر اس کے (یعنی قرآن کے) معانی کا بیان بھی ہمارے ذمے ہے۔

قرآنِ حکیم نے جس طرح تصورِ نبوت و رسالت کو نکھارا اور بیان کیا اور جس انداز سے آنحضرتؐ کی اطاعت و اتباع کو ضروری ٹھہرایا، اسی کا یہ نتیجہ اور فیض تھا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں نہ صرف آپؐ کے نقوشِ قدم کی پیروی کی سعادت حاصل کی بلکہ ان نقوش کو اُجاگر بھی کیا اور اُن کی حفاظت و صیانت کا اہتمام بھی کیا۔

نبی کریمؐ کا مقصدِ بعثت (قرآنِ حکیم کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

ہمارا ایمان ہے کہ سیّدِ وُلدِ آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں "خاتَمُ النّبیّین" ہیں اور صرف ایک رسُول ہی نہیں "آخِرُ الرُّسُل" ہیں اور آپ پر نبوّت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں اتمام واکمال بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد جملہ انبیاء و رُسل کے مقصدِ بعثت سے مختلف نہیں ہوسکتا وہاں یہ بھی لازمی ولابدی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے مقصد میں ایک اتمامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو جس سے نبیوں اور رسُولوں کی مقدّس جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہوجائے۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ از رُوئے قرآنِ حکیم بعثتِ انبیاء و رُسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بحیثیت خاتم النبیینؐ آخرُ المرسلینؐ آپ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

بعثتِ انبیاء کی اساسی غرض وغایت

ایمانیاتِ ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں یعنی توحید[1]، معاد[2] اور رسالت[3] یا ایمان باللہ[1]، ایمان بالآخرت[2] اور ایمان بالرّسالت[3]۔ لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجّہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کرلیتے ہیں آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلّق کی نوعیت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلمانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالمِ وجود اور سلسلۂ کون و مکان جو تاحدِّ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا بلکہ حادث بھی ہے اور ہالک[1] و فانی[2] بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اسے اللہ کہہ لیا جائے یا رحمٰن، کوئی فرق واقع نہیں ہوتا[3]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور تمام صفاتِ کمال سے بتمام وکمال

---

[1] کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ (ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) ؎ گرنہ ای درو جہ او ہستی مجو [2] کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ۝ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (سورہ رحمٰن) [3] قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ج (بنی اسرائیل ۱۱۰)

متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا ہے چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں اور نہ اختیارات میں[۱]

اس نے اس کائنات کو "بِالْحَقِّ" اور "اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی" تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلۂ تخلیق کا مزیۂ کمال ہے انسان، جسے اس نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا[۲]۔ پھر اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرما دیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جملہ مراتبِ تنزل کا حاصل بھی قرار دیا جا سکتا ہے بقول حضرت بیدلؒ

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہار نیستی از قدرِ خود ہشیار باش

— اور ایک دوسرے پہلو سے پورے سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ عروج بھی!

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۝	ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلوں میں سب سے نچلا۔

ایمان بالمعاد

کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کُل زندگی نہیں بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس کی کتابِ حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدمہ یا اس کے سفرِ حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ[۳] بقول علامہ اقبال مرحوم

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ صرف ایک عالم سے دوسرے عالم کو نقل مکانی کا نام ہے جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالمِ برزخ جس کا آغاز موت کے فوراً بعد ہو جاتا ہے اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالمِ آخرت جس کا آغاز یومِ قیامت سے ہوگا۔ بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنت و دوزخ سب اسی ایمان بالمعاد

---

[۱] قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۂ اخلاص) ۱۱۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آخری آیت)

[۲] خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (الحدیث شیخین عن ابی ہریرہؓ) اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔

[۳] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۂ ملک) پیدا کیا سلسلۂ موت و حیات تاکہ جانچے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے سب سے اچھے عمل کرنے والا۔

کی تنا صیل ہیں بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم :

وَ اللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَ اِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا ۔

(ماخوذ از خطبات نبوی)

(ترجمہ) خدا کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو۔ پھر تمہیں لازماً اُٹھا لیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو۔ پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر بدلہ مل کر رہے گا۔ بھلائی کا بھلا اور بُرائی کا بُرا۔ اور وہ یا تو جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم مل کر مبدا و معاد یا حیاتِ انسانی کی ابتداء و انتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان سے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کا تعین ہو جاتا ہے بقولِ الفاظِ قرآنی " اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ " (ترجمہ) ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسیؐ کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے واقعہ یہ ہے کہ مبداء و معاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اس کے سفر کی منزل کونسی ہے گویا بقول فانی :

ہم تو فانی جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا !

یا بقولِ غالب ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعین کے محض بطن و فرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بتا دیتا ہے۔ مطابق تمثیلِ قرآنی :

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

(سورۂ ملک - ۲۲)

بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے مُنہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر۔

(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یا پھر اُس کی کیفیت اُس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے رحم و کرم پر ہو کہ جہاں چاہے اسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی :

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔ (سورہ حج : ۳۱)	تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے، پھر اچک لیتے ہیں اسے (مردار خور) پرندے یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر۔

اور اس ع "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے گویا لا ادریت AGNOSTICISM اور ارتیابیت (SKEPTICISM) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جائے گویا:

ع "رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!"[1]

ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمان بالرسالت کے صحیح منطقی ربط کے فہم و ادراک کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جائے گا یا بالفاظِ دیگر محاسبۂ اُخروی کی اساسات کیا ہیں؟

مطالعۂ قرآن حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اسے ایک جملہ میں تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے:

انسان اوّلاً اور اصلاً تو مسئول ہے ان استعدادات فطریہ یا لطائف اصلیہ کی بنیاد پر جو ہر انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں جیسے سمع و بصر، عقل و شعور اور تفکر و اعتبار یا لطیفۂ نفس، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح ——— اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان پر اِتمامِ حجت کا اہتمام کیا ہے بذریعہ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثت انبیا و ارسال رسل

——— لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔

لطیفۂ نفس

انسان کے مذکورہ بالا لطائف ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین ہے لطیفۂ نفس جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس کا رجحان اصلی عالم اسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعتہً "اَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ" ہی کا طوفان موجزن ہے جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا مارکس نے، دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا اڈلر نے۔ اور یہی ہے

---

[1] شاد عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ

سُنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سُنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے فانی بدایونی نے اپنی منطقی انتہا تک یا یں طور پہنچایا کہ

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم! رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفۂ روح اور بالکل دوسری انتہا پر ہے لطیفۂ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب (وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ) اور جس کا تعلق ہے کلیتہً عالمِ امر سے (قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ) اور جس کا اصل رُخ ہے ع "اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن!" کے مصداق عالمِ بالا کی جانب، چنانچہ اس میں محبتِ الٰہی کا ایک جذبہ اور "لقائے رَبّ" کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سُلگتا ہے بقول اقبال مرحوم ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

— البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے تعبیر کیا ہے بعض اربابِ دانش نے شعلۂ ملکوتی سے۔

خیر و شر کا داخلی معرکہ گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ "انسان عالمِ اصغر ہے" اور واقعتہً انسان کے باطن میں سب کچھ ہی موجود ہے چنانچہ بدی کے پست ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی اور ان ہی کے مابین ایک شدید کشمکش اور مستقل جنگ جاری ہے۔ انسان کی باطنی شخصیت کے وسیع و عریض میدان کارزار میں!

مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ لیکن اس معرکۂ خیر و شر میں خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تفنگ نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نواز کر اور بہت سی قوتوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے، چنانچہ اس کی شخصیت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفۂ نفس' بھی ایک جانب مسلح ہے استعداداتِ سماعت و بصارت سے اور قوائے تعقل و تفکر سے اور دوسری جانب مسلح ہے ایک اخلاقی حِس سے جو تمیز کرتی ہے خیر و شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو بنا بریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورتِ نفسِ لوامہ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا ۢ بَصِيْرًا ○ (سورۂ دہر آیت ۲)	ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جُلے نطفہ سے تاکہ آزمائیں اسے چنانچہ بنا دیا ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا!
۲۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ○ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ○ (سورۂ شمس ۷، ۸ آیات)	اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کہ اسے بنایا ٹھیک ٹھیک، پھر ودیعت کر دی اس میں سوجھ بدی اور نیکی کی۔

۳ - لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (سورۂ قیامہ۔آیات ۱،۲)	نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں (بلکہ) قسم کھاتا ہوں میں نفس ملامت گر کی!
۴ - بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (سورۂ قیامہ آیات ۱۴-۱۵)	بلکہ انسان خود ہی گواہ ہے اپنے نفس پر، خواہ بڑا بنائے بہانے!

بنا بریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کا قابل و مستحق! یہاں تک کہ عدالت اُخروی میں ہر نفس کو اپنی جوابدہی خود ہی کرنی ہوگی اور اپنا محاسبہ خود ہی بھگتنا کرنا ہوگا۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ (سورۂ نحل۔آیت ۱۱۱)	جس دن آئے گا ہر نفس مدافعت کرتے ہوئے اپنی جانب سے ـــ اور پورا پورا صلہ مل جائے گا ہر نفس کو اپنے کیے کا!

اور نہ کوئی نفس دوسرے نفس کے کام آسکے گا، نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش یا فدیہ قبول ہوگا، نہ اسے کسی طرف سے مدد ہی مل سکے گی۔ بفحوائے الفاظ قرآنی۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ۔آیت ۴۸)	اور ڈرو اس دن سے جب نہ کام آسکے گا کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کچھ بھی ـ اور نہ قبول کی جائیگی اسکی جانب سے کوئی سفارش، اور نہ قبول ہوگا کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہوگی!

لطیفۂ قلب اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انسان میں ایک اور جوہر نایاب ودیعت فرما دیا جس میں معرفتِ ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور جملہ حقائق کونیہ بھی منعکس ہیں ہماری مراد ہے لطیفۂ قلب سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے مانند جس میں عالمِ اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے گویا اگر لطیفۂ نفس قوائے سمع و بصر اور تعقل و تفکر سے مسلح ہے جو اساس ہیں جملہ علومِ مادی و نظری کی تو لطیفۂ قلب مسلح ہے ان قوائے تفہم و تفقہ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائق کونیہ اور معارف لدنیہ کا۔ بقول شاعر:

؎	بینی اندر دل علومِ انبیاء	بے کتاب و بے معید و اوستا!
اور ؎	صد کتاب و صد ورق در نار کن	روئے دل را جانبِ دلدار کن!
اور ؎	در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا	در آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست[1]

---

[1] اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ خود کلامِ نبوت میں قلب کے لیے اسی قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں مثلاً اس مشہور حدیث میں جس کے رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الغرض لطیفۂ قلب کے ودیعت کئے جانے کے بعد انسان کی مسئولیت پر آخری مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔
بمصداقِ الفاظِ قرآنی :-

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔	یقیناً کان، آنکھ اور دل ہر ایک کے بارے میں پرسش ہو کر رہے گی

(سورۂ بنی اسرائیل) آیت ۳۶

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان فطری استعدادات کو بیکار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کرلیں :
زبروئے الفاظِ قرآنی :

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔	ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

(سورۂ اعراف) آیت ۱۷۹

خیر و شر کے خارجی داعیات

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیت کے باطنی میدانِ کارزار میں جاری ہے، اس کو تقویت پہنچانے والے کچھ داعیات خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں۔ بقول علامہ اقبال مرحوم :

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش	تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا	ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیت داخلی کشاکش ہی کی ہے، خارجی داعیات محض تقویت کے موجب ہو سکتے ہیں خواہ وہ خیر کی جانب تشویق و ترغیب پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تحریص و تحریض پر، چنانچہ نہ کسی داعیٔ شر

(حاشیہ پچھلے صفحے کا)

اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَاُ كَمَا يَصْدَاُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ!	یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آ جاتا ہے!

جس پر صحابۂ کرام نے بالکل صحیح سوال کیا کہ :

فَمَا جِلَاءُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟	حضورؐ! پھر انھیں صیقل کیسے کیا جائے؟

جواباً ارشاد ہوا :-

كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْاٰنِ!	موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت!

حتّیٰ کہ ابلیس لعین و شیطانِ رجیم تک کو یہ قوت و اختیار ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر بُرائی پر مائل کر سکے۔

بفحوائے الفاظِ قرآنی :

۱۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ○ (سورۂ حجر آیت ۴۲) — جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ زور نہیں اسوائے اس کے جس نے خود ہی تیری پیروی کی بھٹکے ہوؤں میں سے۔

۲۔ اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○ (سورۂ نحل آیت ۹۹) — اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں!

اور نہ ہی کسی داعیٔ خیر حتّیٰ کہ سیّد الاوّلین والآخرین خاتم النبیّین و آخر المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے۔

از روئے الفاظِ قرآنی :

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (سورۂ قصص آیت ۵۶) — (اے نبیؐ!) تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے چاہے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں یعنی ابلیس اور اس کی صلبی و معنوی ذریّت انسانوں میں سے بھی اور جنوں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے کہ :-

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۲۷) — وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو اور اس کے ہم جنس بھی۔ جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے۔

اور حدیث نبوی میں تصریح بھی ہے کہ "اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ"[1] یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دوران اصحابِ خیر اور اہلِ حق کے لیے تقویت و تثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں اور جس طرح شیاطین جنّ و انس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک و اشتعال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی روح ملکوتی میں نشاط و اہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکۂ حق و باطل کے دوران اہلِ حق کے قلبی سکون و اطمینان اور عملی ثبات و استقلال کا سبب بنتے ہیں۔

بفحوائے آیاتِ قرآنی :

۱۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (سورۂ احزاب، آیت ۴۳) — وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی، تا کہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اجالے میں

---

[1] صحیح بخاری

۲۔ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

(سورۂ انفال آیت ۱۲)

جب وحی (کے ذریعے حکم) فرما رہا تھا تیرا رب فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس دلوں کو جمائے رکھو اہلِ ایمان کے۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔

(حٰم السجدہ ۳۰-۳۱)

بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے۔ ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ خائف ہو نہ غمگین اور خوشخبری حاصل کرو اسی جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اتمامِ حجت اور قطعِ عذر

اب ہم آ پہنچے موضوع زیرِ بحث کی بحث اوّل کے آخری نقطے تک۔ وَهُوَ هٰذَا۔ کہ جس طرح انسان کے اصل داخلی داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائف نفس و روح لیکن اصل حجت داخلی بنتی ہیں استعداداتِ سمع و بصر و تعقل و تفکر اور حسِ اخلاقی اور تفقہ قلبی جنھیں انسان کی مسئولیت کی اساس اصلیہ کہا جا سکتا ہے، اسی طرح اصل خارجی داعیانِ خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس اور اس کی ذریت صلبی و معنوی لیکن اس ضمن میں اتمامِ حجت ہوتا ہے۔ اجرائے وحی، تنزیلِ کتب، بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رسل سے جن کی حیثیت ہے حجتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرسالت!

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

۱۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○

(سورۂ نساء آیت ۱۶۵)

(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے تاکہ نہ رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست اور (کمال) حکمت والا۔

۲۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۹)

اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آگیا ہے ہمارا رسول جو واضح کر رہا ہے تم پر (ہماری ہدایت) اس کے باوجود کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا سلسلۂ رسالت مبادا تم کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی!

گویا بعثت انبیاء اور ارسال رسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمام حجت اور قطع عذر تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔

یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و تحریص اور تحریک و تشویق کی ہے اسی طرح نبوت و رسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت و تبلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاحیں مبشرین و منذرین ہی کی ہیں جیسے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (سورۂ کہف آیت ۵۶) اور وحی و کتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ، ذکر، ذکری اور تذکرہ کے ہیں جیسے:-

۱۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر-۹)
یقیناً ہم ہی نے اتارا یہ ذکر (یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے محافظ و نگہبان۔

۲۔ طه ۝ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۝ إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ۝ (طٰہٰ -۱-۲-۳)
(اے نبی) ہم نے تم پر قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ بلکہ (اتارا اسے) صرف یاد دہانی کے طور پر ان کے لیے جو ڈرتے ہوں۔

۳۔ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ (سورۂ عبس-۱۱)
نہیں! یہ ایک یاد دہانی ہے۔

۴۔ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ۔ (سورۂ ق-آیت ۸)
سجھانے اور یاد دلانے کو، اس بندے کے لیے جو رجوع کرے!

۵۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ (سورۂ ق آیت ۳۷)
اس میں یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس ہو دل (زندہ و بیدار) یا کان لگا کر سنے پوری توجہ کے ساتھ

۶۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ (سورہ غاشیہ آیات ۲۱، ۲۲)
تو (اے نبی) تم یاد دہانی کراتے جاؤ۔ تمہارا کام تو بس یاد دہانی کرانا ہی ہے۔ ان پر داروغہ تو ہو نہیں (کہ ضرور ہدایت پر لے آؤ!)

اگرچہ ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کیلئے سب سے زیادہ جامع اصطلاح "شہادت" کی ہے اور فریضۂ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی الناس ہی ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بفحوائے الفاظ قرآنی:

۱۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝
ہم نے بھیج دیا ہے (اے بنی اسمٰعیل) تمہارے پاس ایک رسول گواہ بنا کر تم پر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک

(سورۂ مزمل - آیت ۱۵)

رسول فرعون کی جانب۔

۲ - لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج - آخری آیت)

تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر۔ اور ہو جاؤ تم گواہ پوری نوع انسانی پر!

۳ - فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔

(سورۂ نساء - آیت ۴۱)

تو کیا ہوگا اس وقت جبکہ ہم بلائیں گے ہر گروہ میں سے ایک گواہ ــ اور بلائیں گے آپ کو (اے نبیؐ) بطور گواہ ان کے خلاف!

حاصل کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرض اصلی اور ارسالِ رسل کا مقصد عمومی ہے۔ انسانوں پر اتمامِ حجت اور قطع عذر بذریعہ تبلیغ ودعوت، تلقین ونصیحت، وعظ وتذکیر اور انذار وتبشیر جن کا مجموعی حاصل ہے "شہادت علی الناس"!

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اولین بفحوائے الفاظ قرآنی :۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

(سورۂ احزاب آیات ۴۵-۴۶)

اے نبیؐ! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا کر گواہ اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن چراغ (ہدایت)

گویا معلم ومبلغ، مربی ومزکی، مبشر ومنذر اور داعی وشاہد کی جملہ حیثیتیں مشترک ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء ورسل علیہم السلام میں، اگرچہ ان اعتبارات سے بھی ع

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است!

کے مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند وبالا مقام ہے سید الاولین والآخرین کا صلی اللہ علیہ وسلم! تاہم بحیثیت خاتم النبیین وآخر المرسلین جن پر نبوت ورسالت کا اختتام ہی نہیں اتمام واکمال بھی ہوا ہے۔ آپؐ کی مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کچھ اور رہی ہے۔ وَھُوَ ھٰذَا :

بعثتِ محمدی علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اتمامی اور تکمیلی شان

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ جبکہ بہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے

کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے، وہاں پورے قرآن مجید میں اس کے لگ بھگ مفہوم کے حامل الفاظ بھی کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور تالیف "اِزَالَۃُ الْخِفَاعَنْ خِلَافَۃِ الْخُلَفَا" میں مفصل کلام کیا ہے اور انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہر نوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبر لازمی و لابدی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ایک "الہدیٰ" اور دوسرے "دینِ حق"

"اَلْھُدٰی"

"الہدیٰ" کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہو گی لیکن نظائرِ قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعیین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے "قرآن حکیم"۔ اس لیے کہ وہی "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ"[۳] بھی ہے اور "ھُدًی لِّلنَّاسِ"[۴] بھی اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"[۵] اور یہ بھی کہ "اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ"[۶] اور وہی ہے کہ جسے جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اٹھے کہ "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ"[۷]

مزید برآں سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں "ارسالِ رسل" کے ضمن میں فرمایا کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ	ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان۔

ظاہر ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں جس طرح "اَلْمِیْزَان" کو "دِیْنِ الْحَقّ" کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح "اَلْکِتٰب" ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیرِ بحث میں "اَلْھُدٰی" کا لفظ آیا ہے گویا "اَلْھُدٰی" سے مراد

---

[۳] سورۂ بقرہ: آیت ۲ "ہدایت پرہیزگاروں کے لیے"۔

[۴] سورۂ بقرہ آیت ۱۸۵ "ہدایت پوری نوعِ انسانی کے لیے"۔

[۵] سورۂ شوریٰ: آیت ۵۲ "لیکن بنا دیا ہم نے اسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے"۔

[۶] سورۂ اسراء: آیت ۹ "یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے"!

[۷] سورۂ جن: آیت ۱: ۲ "ہم نے سنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف تو ہم ایمان لے آئے اس پر"۔

[۱] سورۂ توبہ: آیت ۳۳، سورۂ فتح: آیت ۲۸، سورۂ صف: آیت ۹۔

بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے "اَلقُرآن" کے اور کچھ نہیں (واضح رہے کہ سورۃ حدید "اُمّ المُسبّحات" ہے اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ صف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیر بحث الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں)

"دِیْنِ الحقّ" اسی طرح "دین الحق" کو بھی خواہ ظاہری ترکیبِ اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اُسے ترکیبِ توصیفی بشکل ترکیبِ اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے "سچا دین" (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہر صورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری سُبحانہٗ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بفحوائے الفاظِ قرآنی:-

۱- ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ- یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے "حق"
(سورۂ حج - آیات ۶، ۶۲)

۲- وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھُلا "حق"
(سورۂ نور - آیت ۲۵)

گویا "دِین الحقّ" بالکل مساوی و مترادف ہے "دین اللہ" کے! (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیتِ زیرِ بحث کے ضمن میں دین الحق کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ دین اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں[1]) لفظِ "دین" پر توجہ کو مرکوز کیجئے نوعِ عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں بہ لفظ "اَساسُ القرآن" یعنی سورۂ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ[2] (جولامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں[3])

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزا و سزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:-

---

[1] سورۂ آلِ عمران: آیت ۸۳، سورۂ نور: آیت ۲، سورۂ نصر: آیت ۲

[2] یہاں جاہلیں نوعِ عربی کی کہاوت "كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) اور دیوانِ حماسہ کے مشہور مصرعہ کے الفاظ "دِنَّاهُمْ كَمَا دَانُوْا" (ہم نے اُن کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انھوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کر لیں اور اسے بھی کہ عربی میں دَین کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

[3] بقول آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم "ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا" (پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا بُرا!)

۱۔ اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ○ (الماعون : ۱) — تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا و سزا کو؟

۲۔ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ○ (سورۃ التین : ۷) — تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزا و سزا کے جھٹلانے پر؟

۳۔ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ○ (الانفطار : ۹) — کوئی نہیں، بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و سزا کو!

اور سورۃ فاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ "یوم" کی اضافت کے ساتھ یوم قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزا و سزا کا دن۔

پھر چونکہ بدلے اور جزا و سزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی اطاعت و متابعت کے تصور کو، لہٰذا لفظ دین نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اولاً 'اطاعت' کا مفہوم پیدا ہوا (چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ" اور ایک بار "مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ" اور چھ مرتبہ "مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ" کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں۔ جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے "حنیفاً" یا "حُنَفَاءَ" کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ کا کہ "اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ" (الزمر : ۳) اور "وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا" (النحل - ۵۲) اور بالآخر اس نے 'نظام اطاعت' کی صورت اختیار کر لی جس کی اضافت حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظام زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو جیسے سورۃ یوسف میں فرمایا :-

کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ - (آیت : ۷۶) — (ترجمہ) اس طرح ہم نے تدبیر کر دی یوسف کے لیے ورنہ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے بھائی کو روک سکتے۔

گویا مصر کے اس دور کے رائج الوقت نظام ملوکیت کو جس میں مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہ یا 'ملک' کو حاصل تھی۔ قرآن حکیم "دین الملک" سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم (SENSE) میں قرآن مجید میں استعمال کئے ہیں "دین اللہ" کے الفاظ سورۃ نصر میں :

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا — (ترجمہ) جب آگئی اللہ کی مدد اور فتح اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ

اللہ ہی کو مطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے تعبیر کیا قرآن مجید نے "دِینِ اللّٰہ" کے الفاظ سے! — (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو، جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر[1] حاکمیت کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں جمہور تعبیر کیا جائے "دِیْنُ الجمھور" کے الفاظ سے!)

البتہ قرآن حکیم میں 'دین' کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافتِ مجازی قرار دیا جانا چاہئے جیسے "دِیْنِیْ" یا "دِیْنُکُمْ" یا "دِیْنُھُمْ"۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا 'اُس کا دین' بن گیا (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دُعا کے الفاظ میں: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ . . . . الخ اسلام اصلاً تو 'دِیْنُ اللّٰہ' ہے لیکن مجازاً 'دینِ مُحَمَّدٍ' بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں فِدَاہُ اٰبَآءُنَا وَ اُمَّھَاتُنَا)

حاصل کلام یہ کہ "دِیْنِ الْحَقّ" سے مُراد ہے "دِیْنُ اللّٰہ" یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو! اور یہ دراصل خاتم النبیین و آخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس 'المیزان' کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر تدریجاً مختلف ارتقائی صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ! — اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس نظام عدلِ اجتماعی کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے "تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر"[2]

آخری بعثت کیلئے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے۔ اس کے جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے اس لیے کہ بعثتِ محمدی عَلٰی صَاحِبِھَا الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَام کا زمانہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی۔

۱۔ ایک اس اعتبار سے کہ عقلِ انسانی اپنی پوری پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یُوں کہہ لیں کہ نسلِ انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مُدّظلّہٗ جنہوں نے

---

[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

[2] لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج (الحدید : ۲۵)

مذاہب عالم، فلسفہ، تصوف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا ہے، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیح تک کا عرصہ فکر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ واقعتہً نہ کوئی نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقتہً جدید مکتب فکر یا مدرسۂ فلسفہ، اور ' فلسفۂ جدید ' کے نام سے بھاری بھر کم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں اُن کی حیثیت نئی بوتلوں میں پُرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں! — اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزون و مناسب تھی اس کے لیے کہ ع " نوع انسان را پیام آخریں " یعنی قرآن حکیم " اَلْھُدٰی " بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا تاکہ نوع انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ :-

۱- اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ
(الاسراء : ۹)
یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔

۲- وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط
(الاسرا : ۱۰۵)
اور اس قرآن کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔

۳- قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ○
(الاسراء : ۸۸)
کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔

اور اس نے پوری نوع انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ :

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔
(البقرہ : ۲۳)
اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورت!

افسوس کہ تاحال قرآن حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت، تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا ہے اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اُس کے قدموں میں ڈال دی گئیں۔ درآنحالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیئے کہ قرآن اصلاً "اَلْھُدٰی" ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی 'فکری و عملی رہنمائی' ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکرِ انسانی بطورِ خود (AS SUCH) اپنی آخری بلندیوں کو چھُو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے 'بالغ' ہو گیا تھا۔

۲۔ آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئت اجتماعیہ بھی ارتقاء کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی چنانچہ انسان اوّلاً قبائلی زندگی اور اس کے بعد شہری ریاستوں (STATES CITY) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دَور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوُری شدت کو پہنچ چکی تھی اور انسان کو تمدن و اجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اس دَور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں فرد بمقابلہ جماعت، مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالمِ انسانیت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور کی سی اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا ——— لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی' عطا کر دیا جائے جو واقعتہً "اَلْمِیْزَان" کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وَسَط کا تعین کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواء السّبیل کو پوُری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال کا اور نہ سیاسی جبر کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیشِ نظر تھا یعنی "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ"۔ وہ نبی آخر الزمان صلّی اللہ علیہ وسلّم پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابداً لآباد تک کے لیے پوُرا ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۝ (المائدہ : ۳)

آج کے دن میں نے کامل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور پوُری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو۔

لِیُظْھِرَہٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور 'لِیُظْھِرَہٗ' پر غور فرمائیے تو بحمد اللہ یہاں 'اظہار' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی 'غالب کر دینا' البتہ فعلِ اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں

---

[1] ظَھر کہتے ہیں پیٹھ کو ——— اور 'ظاھر' استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے قرآن مجید میں سورۂ صف کے آخر میں "فَاَصْبَحُوْا ظَاھِرِیْنَ" (پس وہی ہوئے غالب) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے اور عیاں کے معنی میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے! ——— اِظْھَار' بابِ افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعل متعدی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

موجود ہیں اگرچہ ان سے مراد و معنی میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ فعلِ اظہار کا فاعل وہی ذات ہے جو فعلِ ارسال کا یعنی اللہ اور دوسری رائے یہ ہے کہ "لِيُظْهِرَهٗ" میں ضمیرِ فاعلی رسول کے جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دُور جانا صحیح نہیں الّا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں اس کے باوجود عالمِ واقعہ میں قرآن مجید کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہارِ دینِ حق کے لیے عالمِ واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور رشد بد محنت و مشقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی۔ اگرچہ فاعلِ حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے۔ بمصداق الفاظِ قرآنی:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (الانفال: ۱۷)

تو انہیں (کفارِ قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا اور (اے نبیؐ) جب تم نے اُن پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ مٹھی بھر خاک) بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور رکیک در سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصور ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعمِ خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دینِ حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیتِ مذکورہ بالا نازل ہوئی۔ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سعی و جہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رُخ بہتا؟ اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہیئے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آگئے؟ اور صورتِ حال وہ تو نہیں جو "خوتے بد را بہانہ بسیار" کی کہاوت میں بیان ہوئی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ:

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں   دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف جن میں آیت زیرِ بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۂ صف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر، اور اس میں اس آیۂ مبارکہ کے فوراً بعد کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝

مسلمانوں کے جذبۂ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں اور پھر صاف صاف سُنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُر صعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (الصّف: ۱۰، ۱۱)

اے اہلِ ایمان! کیا میں رہنمائی کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب جو چھٹکارا دلا دے تمہیں دردناک عذاب سے؛ ایمان (محکم) رکھو اللہ پر اور اس کے رسُولؐ پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور کھپا دو اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی، اُخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دُنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی اور سب سے بڑھ کر یہ نصرتِ خدا و رسُول کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبُوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی ___ بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں اُن کے خلوص اخلاص کا اصل ٹسٹ یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسُول دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!

چُنانچہ سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرما دی:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ

اور تاکہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے۔

اور سورۂ صف کا اختتام بھی ہوا اس آیۂ مبارکہ پر:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ

اے اہلِ ایمان! بنو مددگار اللہ کے جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف۔

اس کے بعد پھر بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اُسے اختیارِ کُلّی حاصل ہے۔

لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیرِ مفعولی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مرجع ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسُولؐ کے جانب ___ اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسُول کے غلبے کا مطلب بھی اُن کی ذات یا اُن کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دینِ حق ہی کا غلبہ ہے!

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

'عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ' کا ترجمہ عموماً 'تمام ادیان' کر دیا جاتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس سے مُراد لے لیے جاتے ہیں 'تمام مذاہب'۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مغالطہ در مغالطہ ہے

اور اس ٹکڑے کا محتاط ترین ترجمہ تو وہ ہے جو بعض مترجمین نے "سب دین پر" کے الفاظ میں کیا اور مزید وضاحت مطلوب ہو تو صحیح ترین ترجمانی ہوگی "پُورے دین پر" یا "سارے دین پر" یا "پورے جنس دین پر" کے الفاظ سے! ظاہر ہے کہ "کُلِّہٖ" یہاں "الدّین" کا بدل ہے اور "الدین" میں لامِ تعریف کے جس قدر لامِ حصر ہونے کا امکان ہے اتنا ہی لامِ جنس ہونے کا بھی ہے۔ مزید براں پُورے قرآنِ حکیم میں نہ کہیں لفظ 'ادیان' استعمال ہُوا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں "الدین" کا ترجمہ "تمام ادیان" کرنا ممکن ہو۔ اور ان سب پر مستزاد اس مسئلے میں نصِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیتِ مبارکہ :

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ (انفال : ۳۹)	اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔

واضح رہے کہ ان تین مقامات کے علاوہ جن پر "عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کے زیرِ بحث الفاظ وارد ہوئے ہیں پورے قرآن حکیم میں یہ واحد مقام ہے جہاں "الدّین" کے ساتھ "کُلُّہٗ" بطور بدل آیا ہے اور یہاں ترجمہ "سارے ادیان" کرنا ممکن ہی نہیں صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی "پورے کا پُورا دین" یا "سارے کا سارا دین" اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پُورے کے پُورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے (جیسا کہ اس سے قبل "مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" اور "أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" اور "لَهُ الدِّينُ وَاصِبًا" کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے)

اب "الدّین" کے اصطلاحی معنیٰ ذہن میں مستحضر کرکے "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" کا ترجمہ کیجئے تو وہ یُوں ہوگا :

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الهدیٰ' (یعنی قرآن حکیم) اور دینِ حق۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کلّی کے اُصول پر مبنی نظامِ زندگی) کے ساتھ تاکہ غالب کردے وہ (یعنی رسولؐ) اُسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظامِ اطاعت یا نظامِ زندگی) پر!"

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم و معنیٰ کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ 'اظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ' کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ 'اظہار دینِ حق' دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لابُدی تھا :

۱۔ ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہی غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنیٰ ہو جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گذارہ کر سکتا ہے جس طرح علیہ اسلام کے زمانے میں عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت یا بُدھ مت اور ہندو مت

ایسے مذاہب "یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ"[۱] کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا[۲] — جب کہ دین ایک کلّی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت و آمریت یا کیپیٹلزم اور کمیونزم و سوشلزم کسی خطۂ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح دو دین بھی کسی جگہ ہم سر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے اور ان کے مابین مفاہمت پُرامن بقائے باہمی کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر مذہب کی حیثیت اختیار کرلے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے[۳]۔

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیش نظر رہنی چاہئیں :۔

ایک یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیث نبویؐ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے جیسے مذہبِ حنفی، مذہب مالکی، مذہبِ شافعی، مذہبِ حنبلی اور مذہبِ اہلِ حدیث جن کی حیثیت دینِ اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرۃ آدم تا آنحضورؐ جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی تھا، بفحوائے آیاتِ قرآنی :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى ۔ (سورۂ شوریٰ۔ آیت ۱۳)	مقرر کیا اُس (اللہ نے) تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اُس نے نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو۔

۲۔ اور دوسرے اس لیے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے

---

[۱] البراءۃ : ۲۹ "دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!"

[۲] جس کی صحیح ترین تصویر ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

[۳] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی! (اقبالؒ)

[۴] اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۂ توبہ کی محولا بالا آیت کے الفاظ "وَ ھُمْ صٰغِرُوْنَ" کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے اور رسالتِ محمدیؐ کی جانب سے نوعِ انسانی پر "شہادت" اور "اتمامِ حجت اور قطعِ عذر" (جو سلسلۂ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ آپؐ اُس دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے "غلبۂ دینِ حق" کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی، بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا جو بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ "معجزات" عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ "انسانی حریت، اخوت اور مساوات" صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور روپ کا واقعہ بھی دھار سکتے ہیں[1] اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے جا سکتے ہیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے ـــ تو اس دور کے انسان پر "دینِ حق" کی جانب سے اتمامِ حجت کیسے ہو سکتا ہے جس کے فاتح ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام و کمال اور بغایتِ توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظامِ محمدیؐ تک رسائی کی سعی و کوشش ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

---

[1] ایچ۔جی۔ویلز (H.G. WELLS) کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بغض و عناد و عداوت ہے وہ اُن رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اُس نے آنحضورؐ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کئے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A CONCISE HISTORY OF THE WORLD) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ "انسانی حریت، اُخوت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دُنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے۔ چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی ان کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمدؐ نے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی: "الفضل ما شهدت به الاعداء" (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے!

[2] چنانچہ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم و ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ رامائن اور مہابھارت یا بکرماجیت یا چندرگپت موریہ کا!)

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو | آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نُورِ مصطفےٰ او را بہاست | یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

گویا آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر عینِ اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دین اور ختم و اکمالِ نبوّت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپؐ انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم، ہجرت، جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدّوجہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پُورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپؐ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپؐ انبیاء و رُسل کی پُوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں جس میں کوئی دُوسرا نبی یا رسُول آپؐ کا شریک نہیں ہے۔

داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دُنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہُوئے آنحضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو داعیٔ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ داعیٔ انقلاب کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلاب فرانس و انقلاب رُوس سب کے سب جزوی تھے اور ان سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہُوئی جیسے انقلاب فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئتِ حکومت میں اور انقلابِ رُوس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو انقلابِ عظیم دُنیا میں برپا کیا اُس سے پُوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہُوئی اور عقاید و نظریات علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدّن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جدّوجہد

رہی آپؐ کی انقلابی جدّوجہد، تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پُوری تاریخ میں کوئی دُوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کش مکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت جہاد و قتال کی تمام منازل سے گذار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو اور یہ نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کہ آپؐ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کُل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری!) کی مختصر سی مدّت میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلی اللہِ عَلَیہ وَسَلّمَ وَفداہ اٰبآءنا وَ اُمّھاتنا!

نبویؐ طریقِ کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رُونما ہُوئی اور انقلابِ محمدیؐ کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپؐ کی انقلابی

جدو جہد کن کن مراحل سے گزری ؟ تو یہ سمجھائیے تو ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہو گی ۔

سر دست موضوع زیر بحث کی مناسبت سے دو مزید اُمور کی نشاندہی مطلوب ہے ۔

۱۔ مغربی مفکرین کی نا سمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے فہم میں مغربی مفکرین یا مستشرقین نے ۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے ، چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلغ بھی ، معلم بھی ہوتے ہیں اور مربی و مزکی بھی ، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی ، واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی ، ریفارمر (REFORMAR) بھی ہوتے ہیں اور مصلح بھی لیکن چونکہ ان پر ختم نبوت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ علم بھی ، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبر و سیاستدان بھی ۔ چنانچہ جب وہ آنحضور ؐ کی شخصیتِ مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ اُن سے کوئی تو آپ ؐ کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپ کی عظمت صرف بطور انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے[۱]۔ کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ " محمد (ؐ) بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے ۔ البتہ بحیثیت مدبر و سیاستدان کامیاب[۲] ہو گئے " اور کوئی آپ ؐ کی شخصیت کو دو مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے ، چنانچہ اُسے " مکے والا محمدؐ " اور نظر آتا ہے اور " مدینے والا " اور[۳] ! فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْجَاهِلِيْنَ !

۲۔ اُمت کا فرضِ منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ہو چکی یا وہ ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

وقتِ فرصت ہی کہاں کام ابھی باقی ہے ۔۔۔ نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

تو کیا اُمت صرف عید میلاد النبی منا کر ، یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے لیکن ؎

---

[۱] جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ :

"ONE OF GREATEST SONS OF ADAM"

[۲] جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا :

"MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET
BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN!"

[۳] جو ابہام پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک MOHAMMAD
"MOHAMMAD AT MEDINA . اور دوسری AT MECCA

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاہم ؎

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک — اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

کے مصداق گذارش ہے کہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختمِ نبوت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء و رُسل کیا کرتے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمت کے ذمے ہیں گویا خواہ دعوت و تبلیغ انذار و تبشیر، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ پر مشتمل فریضۂ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء و رُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے خواہ اعلاءِ کلمۃُ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلہٖ پر مشتمل بعثتِ محمدیؐ کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو، جملہ اہلِ ارض اور جمیع کرۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عاید ہوتے ہیں جو آنحضورؐ کے نام لیوا ہیں اور آپؐ کے نامِ نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپؐ کی اُمت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا لہٰذا آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ چنانچہ سورۂ جمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپؐ "اُمیین" کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور "آخرین" کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضورؐ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس میں بھی آپؐ نے فرمایا :۔

اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّ — میں یقیناً اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف خصوصاً

اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً ط — اور پوری نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!

ان میں سے "بعثتِ اُولیٰ" کے جملہ فرائض "شہادت علی الناس" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدین کلہٖ" دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفسِ نفیس ادا فرما دیئے خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت، تمسخر ہوا یا استہزاء، ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیت کا، مصیبتیں آئیں یا مشکلات، محنت کرنی پڑی یا مشقت، پھر خواہ شعبِ بنی ہاشم کا دور آیا یا یومِ طائف اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابنِ مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا اعضا بُریدہ لاشہ، خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حُنین کا اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی، آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور ؎

یا تن رسد بہ جاناں — یا جاں زتن بر آید!

کے مصداق آپؐ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتیٰ کہ تئیس برس کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتہً بالا ہو گیا۔ کلمۂ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا۔ اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا تا آنکہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکنافِ عرب سے

آئے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوالاکھ افراد کے مجمع سے "اَلَاهَلْ بَلَّغْتُ؟" کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ" نَشْهَدُ اِنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ !" آپؐ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے ۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ط

آپؐ کے بعد، آپؐ کی بعثت عامہ کی جملہ ذمہ داریاں اُمت کے کاندھوں پر آگئیں بفحوائے الفاظِ قرآنی : لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپؐ کے حقیقی جانشین تھے، خلافتِ راشدہ کے دوران جو واقعتہً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ آپؐ کی جانب سے تبلیغِ دین و شہادت علی الناس، اقامتِ دین، اور اظہارِ دین حق علی الدین کلہ" کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دُنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دین حق جو پورے روئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا "غریب الغرباء" بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے ؎ اُمت پہ تری آکے عجب وقت آ پڑا ہے
وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ؎ پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

اور

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ؎ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد ؎ دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

الغرض آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اپنے فرضِ منصبی کو پہچانے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عزم نو کے ساتھ کمربستہ ہو جائے تاکہ بعثتِ محمدی کا مقصد بتمام و کمال پورا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر دین محمد کا پرچم لہرا اُٹھے ؎

کی محمد سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ
اٰمِيْنَ يَارَبَّ الْعٰلَمِيْنَ !

انقلابِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا اساسی منہاج

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ :-

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "داعیِ انقلاب" کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپؐ کی تحقیر و توہین ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ "داعیِ انقلاب" کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بہ تمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران اور بھی جتنے انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور ان کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک ہی گوشے میں تبدیلی رونما ہوئی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاست و حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرمؐ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقاید و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

مزید برآں اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی خود ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جملہ مراحل سے گذار کر خود ہی کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ انقلابِ فرانس اس فکر کے نتیجے میں رونما ہوا جو والٹیر اور روسو ایسے بیسیوں مصنفوں کی تالیفات کے ذریعے تخلیق پایا اور پھیلا لیکن انقلاب عملاً کچھ اور ہی لوگوں کے ہاتھوں برپا ہوا اور اس کی بالفعل رہنمائی میں ان مفکرین کا کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح انقلابِ روس کی اساس اس فکر پر قائم ہوئی جو مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "داس کیپیٹل" کے ذریعے پیش کیا لیکن خود مارکس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان پیدا نہ ہو سکا۔ اگرچہ بعد میں ایک فعال شخص لینن نے اس فکر کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا ـــــ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت محیر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرمؐ کا کہ آپ نے ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس میں اور وہ بھی شمسی نہیں قمری، انقلابِ اسلامی کی تکمیل فرما دی اور ایک وسیع و عریض خطے پر دینِ حق کو اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔ فصلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ و اصحابہٖ وسلّم تسلیماً کثیراً کثیرا فداہ اٰباءُنا و اُمّھاتنا !

ایک فردِ واحد کی مختصر سی زندگی کے بائیس سالوں میں تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب کے از ابتدا تا انتہا جملہ مراحل طے پا جانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آنحضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران حالات و واقعات کی رفتار اتنی تیز اور انقلابی عمل کا زور (TEMPO) اتنا شدید نظر آتا ہے کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعہ میں بالعموم نگاہیں صرف تصادم و کشمکش کے مختلف مراحل و مظاہر میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور جس طرح کسی زور و شور سے بہنے والی پہاڑی ندی کو دیکھتے ہوئے انسان بالعموم اس کی سطح کے ہیجان و اضطراب

ہی سے مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اُس کی گہرائی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی اسے نہیں ملتا۔ اسی طرح انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج بھی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ چنانچہ اوّل اوّل تو سیرتِ مطہرہ سے متعلق جو مواد جمع ہوا تھا، وہ تقریباً سارے کا سارا مغازی پر مشتمل۔ تاحال بھی سیرتِ مبارکہ کے مطالعے میں اصل توجہ مرتکز رہتی ہے ہجرت سے پہلے کی PASSIVE RESISTANCE پر جس کے اہم نقوش ہیں تمام مسلمانوں پر بالعموم اور غلاموں پر بالخصوص شدید پیمانہ تشدد (PERSECUTION) ہجرتِ حبشہ، شعبِ بنی ہاشم، یومِ طائف، فیصلہ قتلِ نبوی، محاصرۂ کاشانۂ نبوت، غارِ ثور اور تعاقبِ سراقہ ابنِ مالک — اور ہجرت کے بعد کے اقدام اور (ACTIVE RESISTANCE) پر جس کے اہم اور نمایاں نشانات ہیں قریش کی معاشی ناکہ بندی، بدر، اُحد اور احزاب کا مسلح تصادم جس میں عارضی سا وقفہ ہوا صلح حدیبیہ سے جس کے ختم ہوتے ہی تصادم دوگونہ ہوگیا۔ یعنی اندرونِ عرب بھی جس کے اہم نقوش ہیں۔ فتح خیبر، فتح مکہ اور غزوۂ حنین اور بیرونِ عرب بھی جس کے نمایاں نشانات ہیں غزوہ موتہ اور سفرِ تبوک۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اس حد درجہ سلیس لیکن نہایت پُر معنی شعر کے مصداق کہ ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے؟
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

غور کرنا چاہیے کہ آنحضورؐ کی عظیم انقلابی جدوجہد کی تہہ میں کارفرما وہ اصل طریق کار اور اساسی منہج عمل کیا تھا جس کے ذریعے وہ مردانِ کار فراہم ہوئے جنھوں نے آیۂ قرآنی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(الاحزاب : ۲۳)

"اہلِ ایمان میں وہ جواں مرد ہیں جنھوں نے پورا کر دکھایا وہ عہد جو اُنھوں نے اللہ سے کیا تھا۔ پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر کے مرحوم ہو چکے اور وہ بھی ہیں جو منتظر ہیں کہ کب باری آئے اور وہ بھی اللہ کی راہ میں سر کٹا کر سبکدوش ہو جائیں۔ بہرصورت انھوں نے اپنے مُوقف سے سرِ مُو تبدیلی نہیں کی۔"

— کے مصداق انقلابِ نبویؐ کے شجرۂ طیبہ کو اپنے خون سے سینچا اور اپنی ہڈیوں اور گوشت پوست کی کھاد سے پروان چڑھایا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

قرآن حکیم کی چار اہم اصطلاحات

اس مسئلے کے حل کیلئے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دُہرایا کہ :-

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط
(سورۂ توبہ، سورۂ فتح، سورۂ صف)

یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُس کو پُورے کے پُورے دین پر!

تو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے بھی چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پُورے چار بار دہرایا۔ یعنی:

۱۔ تلاوت آیات ۲۔ تزکیۂ نفس ۳۔ تعلیم کتاب اور ۴۔ تعلیم حکمت

۱۔ چنانچہ سب سے پہلے سورۂ بقرہ کے پندرھویں رکوع کے آخر میں حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی دُعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ط وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝
(البقرہ : ۱۲۷، ۱۲۸)

اے رب ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت برپا کیجو تیری فرمانبردار ہو اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے طور طریقے۔ اور قبول فرما ہماری توبہ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب ہمارے تو مبعوث فرما تو ان میں۔ ان ہی میں سے ایک رسول جو اُن کو سُنائے تیری آیتیں اور انھیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی۔ اور تزکیہ کرے اُن کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔

۲۔ پھر تین ہی رکوعوں کے بعد اٹھارویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضورؐ کی بعثت دراصل اسی دُعائے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہے، ان ہی اصطلاحاتِ اربعہ کو دُہرایا گیا :

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝
(البقرہ : ۱۵۱)

چنانچہ بھیج دیا ہے ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمھیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمھارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمھیں ان چیزوں کی جنھیں تم نہیں جانتے تھے۔

۳۔ اگلی سورت یعنی سورۂ آلِ عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ اٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں کا جو سناتا ہے انھیں اس کی

اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (آل عمران: ۱۶۴)

آیات اور تزکیہ کرتاہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انھیں کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں

۴۔ آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۂ جمعہ میں آتا ہے:

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (الجمعۃ: ۲)

وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا اُمیوں میں ایک رسُول ان ہی میں سے جو سناتا ہے انھیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتاہے ان کو کتاب اور حکمت کی۔ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!

اور یہاں اس کی اہمیت اس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۂ جُمعہ سے متصلاً قبل ہے۔ سورۂ صف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے، اَعنی:

"ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط"

گویا آنحضورؐ کا مقصدِ بعثت ہے: "اظہارِ دینِ حق علی الدین کُلّہٖ" اور اس کے لیئے آپ کا طریقِ کار اور منہجِ عمل ہے: تلاوت آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت!

مقصد اور طریقِ کار

اس مقام پر ذرا توقف کر کے ایک اہم حقیقت پر غور کر لینا چاہیئے اور وہ یہ کہ کسی بھی اہم کام کے لیے مقصد اور طریقِ کار دونوں نہایت اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں آخری منزل پیشِ نظر رہتی ہے اور طریقِ کار میں ہر ہر مرحلے کے لوازم پر توجہ دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کا توازن ہی کسی کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن بن سکتا ہے اور جو شخص یا گروہ بیک وقت ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ وہ اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے بھری ہُوئی ہے اور خود ہمارے گرد وپیش بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت یا جماعت اپنے پیشِ نظر مقصود کے حصُول کی عجلت میں درمیانی مراحل کو پھلانگ جانا چاہتی ہے اور کسی راہِ قصیر SHORT CUT کی دلدل میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا اور وہ راہِ قصیر اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ گویا وہ کمبل کو چھوڑنا چاہے بھی تو کمبل اُسے نہیں چھوڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے اپنے متوسلین کی ہمت یہ کہہ کر بندھائی جاتی رہے کہ: ع

"اس موڑ سے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو درماندا جا!"

اور کبھی برعکس اس کے یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ذریعے ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے اور راستے ہی کو منزل قرار دے لیتا ہے نتیجۃً ساری توانائیاں ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اہلِ قافلہ وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ط کے مصداق صرف حرکت اور اس کی تیز رفتاری ہی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

اب اگر اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب طریق ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کارموزوں نہیں ہوتا تو جو لوگ خلافۃ علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے خواہش مند ہوں اُن کے لیے لازمی و لابدی ہے کہ وہ غور کریں کہ آنحضورؐ کا اصل منہج عمل کیا تھا۔ مبادا وہ بھی مذکرہ بالا افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جائیں۔

اس ضمن میں کتنی اچھی ہے وہ بات جو امام مالکؒ نے فرمائی کہ :

لَا یُصْلِحُ اٰخِرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا ؛ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی کایا پلٹ ہوئی تھی"۔

اور کتنی حیرتناک ہے یہ حقیقت کہ دورِ نبویؐ سے اس قدر قرب کے باوصف ائمہ دین کو کتنی فکر تھی اس آخری دور کی جس میں ہم جی رہے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ قرآن حکیم انقلابِ اسلامی کے لیے کسی منہجِ عمل کی جانب رہنمائی نہیں کرتا تو اسے محسوس کرنا چاہیئے کہ یہ قرآن مجید پر بھی ایک سنگین طعن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی حد درجہ ناروا سُوءِ ظن۔ اس لیے کہ مسلمانوں پر" خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے قیام کی سعی کو مستقلاً فرض اور واجب کر دینا لیکن اس کے لیے کسی واضح طریقِ کار کی نشاندہی نہ کرنا صریح ظلم قرار پائے گا۔ فَسُبْحٰنَہٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ! —

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو بفحوائے الفاظِ قرآنی : وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ"۔ اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت کو پہچانا، نہ بفحوائے الفاظِ مبارکہ :" اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا ط" قرآن حکیم ہی پر غور کیا بلکہ اسے: نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ" کے مصداق پس پُشت ڈال دیا اور صرف حصُولِ و ایصالِ ثواب کا آلہ بنا کر رکھ دیا ؎

تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

مرکز و محور۔ قرآن حکیم

اب ذرا ان چار اصطلاحات پر توجہ مرکوز فرمایئے جن میں نبی اکرمؐ کے اساسی منہجِ عمل کا بیان ہوا ہے تو سب سے نمایاں حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کا مرکز و محور خود قرآن حکیم ہے! اس لیے کہ ان میں سے پہلی اور تیسری یعنی تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب تو بالبداہت قرآن مجید ہی سے متعلق ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور چوتھی کا مدار بھی قرآن ہی پر ہے اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی : قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ[1]" (لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراضِ قلبی کی شفا بھی) تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تخلیۂ باطن درحقیقت ثمرہ ہے تلاوتِ آیاتِ قرآنی اور بفحوائے الفاظِ قرآنی : ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰۤی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ[2]" (یہ ہے وہ حکمت جو تیرے رب نے تجھ پر وحی فرمائی)

---

[1] یونس : ۵۷ [2] بنی اسرائیل : ۳۹

حکمت بھی جزوِ لاینفک ہے قرآن حکیم کا! گویا انقلاب نبویؐ کا اساسی منبع عمل پورے کا پورا گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد، یا سادہ الفاظ میں یوں کہہ لیا جائے کہ

آنحضورؐ کا آلۂ انقلاب ہے قرآن حکیم!

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں تو بیان کیا مولانا حالی نے کہ ؎

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور حد درجہ پُر شکوہ الفاظ میں بیان فرمایا علامہ اقبال نے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں وہم پیدا ست اُو — زندہ و پائندہ و گویا ست اُو

چُوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چُوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

گویا آنحضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ یہ تھا کہ قرآن حکیم "چوں بجاں در رفت" کے مصداق صحابہ کرامؓ کے باطن میں سرایت کر گیا اور اُن کے اذہان و قلوب اُس کے نُور سے منور ہو گئے نتیجتہً اُن کی زندگیوں میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ اُن کی سوچ بدل گئی اُن کا فکر بدل گیا، اُن کے عقاید بدل گئے، اُن کی اقدار بدل گئیں، اُن کے عزائم بدل گئے، اُن کے مقاصد بدل گئے، اُن کی آرزوئیں بدل گئیں اُن کی تمنائیں بدل گئیں، اُن کے دن بدل گئے، ان کی راتیں بدل گئیں، ان کی صبحیں بدل گئیں، ان کی شامیں بدل گئیں، اُن کی زمین بدل گئی، اُن کا آسمان بدل گیا، یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی! اور یہ ساری تبدیلی ثمرہ تھی ایک کتاب اور اس کے علم و حکمت اور اُس کے معلّم اور اس کی تعلیم و تربیت کا ——— فصلی اللہ علیہ وسلم! اسی لیے فرمایا آنحضورؐ نے کہ "انّما بُعِثْتُ مُعَلِّمًا" (میں تو صرف معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں[1]) واضح رہنا چاہیے کہ آنحضورؐ کا اصل ایجابی اور مثبت عمل صرف اور صرف تلاوتِ آیات و تزکیہ اور تعلیمِ کتاب و حکمت تھا۔ تصادم اور کشمکش کی وہ ساری صورتیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اصلاً مظہر ہیں اُس ردِّ عمل کا جو ایک غلط نظامِ فکر و عمل کی جانب سے دعوتِ حق کے جواب میں پیش آنا لازمی و لابدی ہے۔ تاہم اصل عمل اور ردِّ عمل کے تدارک کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کے مابین فرق و امتیاز نہ کرنا بڑی ناسمجھی ہے!

کتابِ الٰہی اور اُس کے معلّم کی ذاتِ اقدس کی عظمت تو ظاہر ہے کہ بیان تو کجا تخیل و ادراک کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتی موجودہ دَور میں تو ایک عام انسان کی تصنیف کا یہ اعجاز نگاہوں کے سامنے ہے کہ رُوئے زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر جو نظام قائم ہے وہ سب اُس کے ظہور و بروز کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً اسی لیے کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے مارکس کے بارے میں کہ ؏ "نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب!"

[1] سنن ابنِ ماجہ رح

تلاوتِ آیات

اس اجمال کی تفصیل قرآن حکیم کے طول و عرض میں تانے بانے کے مانند بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کارِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور فرائضِ دعوت و تبلیغ کے جتنے پہلو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن سب کا مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور خود قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں طوالت کے خوف کے باوجود چند اشارات ضروری ہیں :-

۱۔ قرآن حکیم کی رُو سے انبیاء و رُسل کے فرائض میں سب سے زیادہ اساسی فریضہ انذار و تبشیر کا ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں بہت سے انبیاء و رُسل کا ذکر کرکے فرمایا گیا :

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (النساء : ۱۶۵)

(یہ حضرات) رسُول بنا کر بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے تاکہ ان (کی بعثت) کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے سامنے کوئی دلیل (عذر) نہ رہ سکے!

سورۂ کہف میں بطورِ کلیہ ارشاد فرمایا :-

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۝ (آیت : ۵۶)

اور ہم نہیں بھیجتے رسُولوں کو مگر صرف مُبشّر اور نذیر بنا کر!

اور سورۂ بنی اسرائیل میں تعیّن کے ساتھ آنحضور کو خطاب کرکے فرمایا :

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ (آیت : ۱۰۵)

اور نہیں بھیجا (اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ کو مگر صرف مُبشّر اور نذیر بنا کر۔

اب دیکھئے کہ از روئے قرآن اس انذار و تبشیر کا مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہی ہے :

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :

اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ۝ وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ (بنی اسرائیل ۹-۱۰)

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے!

سورۂ کہف کا آغاز ان مُبارک الفاظ سے ہوا :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ۝ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا (کہف ۱-۲)

شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری اور اس میں اُس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار، تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے

والوں کو جو نیک اعمال کر رہے ہیں، اس بات کی خوشخبری سُنا دے کہ اُن کے لیے بہت اچھا اجر ہے۔"

اور سورۂ مریم کے اختتام پر فرمایا:

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ○ (۹۷- مریم)

پس ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لیے سہل و ساز گار بنایا کہ تم اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سُنا دو۔

سُورۂ انعام میں فرمایا:

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ ○ (آیت: ۱۹)

اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔

۲- فرائضِ نبوت کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی دُوسری اہم اصطلاح 'تذکیر' ہے۔ اس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ قرآن خود اپنے آپ کو جا بجا الذِّکر، ذِکرٰی اور تَذکِرَۃ قرار دیتا ہے۔

سُورۂ قٓ کے آخر میں یہ صریح حکم بھی دے دیا گیا کہ:

ذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ○

یعنی تذکیر کرو بذریعہ قرآنِ حکیم

۳- اِسی طرح فرائضِ رسالت کے ذیل میں قرآنِ حکیم کی ایک اہم اصطلاح 'تبلیغ' ہے چنانچہ اس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے تو اپنے نبیؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ؕ[1]" (پہنچا دو جو کچھ نازل کیا گیا تم پر تمہارے رب کی جانب سے) اور آنحضورؐ نے اُمت کو حکم دیا کہ "بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً ؕ" (پہنچا دو میری جانب سے خواہ قرآن کی ایک ہی آیت ہو!) گویا تبلیغ کا اصل موضوع قرآن مجید اور اُس کی آیاتِ بیّنات کے سوا اور کچھ نہیں!

۴- غالباً اس سلسلے کی سب سے جامع اصطلاح 'دعوت' ہے جس کے ضمن میں سورۂ نحل میں یہ جامع و مانع ہدایت دی گئی کہ:

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ (آیت: ۱۲۵)

بلاؤ اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور مَوعظۂ حَسنہ سے اور بحث و جدال کرو اس طور سے جو نہایت عمدہ ہو۔

اب غور فرمائیے کہ جیسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے حکمت بھی قرآنِ حکیم ہی کا ایک جُزوِ لاینفک ہے اور موعظۂ حسنہ کا مصداقِ کامل بھی خود قرآن مجید ہی ہے اور خواہ ملحدین ہوں یا مُشرکین، یہود ہوں یا نصاریٰ، منکرینِ قیامت ہوں یا مکذّبینِ رسالت، کافر ہوں یا منافق اِن سب کے ساتھ مفصل مباحثہ و مجادلہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ گویا دعوتِ الی اللہ یا دعوتِ الی سبیل ربّ کا اصل مبنیٰ و مدار خود قرآن حکیم ہے۔

گویا یہ تفصیل و تشریح ہوئی 'تلاوتِ آیات' کی کہ انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر اور مُباحثہ ہو یا مُجادلہ

[1] سورہ مائدہ - آیت ۶۷

دعوتِ نبویؐ کا مرکز و محور رہیں آیاتِ قرآنی۔

تزکیہ

اب آیئے عملِ تزکیہ کی جانب جس کے ضمن میں افسوس ہے کہ قرآن کی ناقدری کا معاملہ اُمتِ مُسلمہ نے آخری حد تک پہنچا دیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیت مجموعہ ہے فکر و عمل کا اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بایں معنیٰ کہ "گندم از گندم بروید، جَو ز جَو" کے مصداق غلط فکر، غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے اور صحیح عمل کے لیے تصحیحِ فکر لازمی و لابدی ہے گویا اگر کسی انسان کے فکر کی تطہیر ہو جائے اور فاسد خیالات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا جائے تو غیر صالح اعمال اور ناقص عادات و اطوار آپ سے آپ بَت جھڑ کے پتّوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے اور اگر صحیح فکر کی جڑیں ذہنِ انسانی میں راسخ ہو جائیں تو اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حَسَنہ کے برگ و بار بلا تکلف از خود نمایاں ہو جائیں گے ۔۔۔ اسی عمل (PHENOMENON) کو قرآن حکیم "يُكَفِّرْ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ" بھی قرار دیتا ہے اور "يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ" بھی۔ اور یہی قرآن حکیم کا اصل فلسفۂ تزکیہ ہے یعنی یہ کہ تزکیۂ نفس کیلئے اضافی اور مصنوعی تدابیر نہ ضروری ہیں نہ مفیدِ مطلب۔ بلکہ تزکیۂ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیرِ فکر کا اور وہ فطری ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیٰ نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِمَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے تو اصطلاحاتِ اربعہ میں تزکیہ کا ذکر آخر میں کیا تھا لیکن قرآن مجید میں بقیہ تینوں مقامات پر اس کا ذکر تلاوتِ آیات کے فوراً و معاً بعد ہوا ہے۔

تزکیۂ نفس کے ضمن میں ایک دوسری حقیقت بلاشبہ یہ بھی ہے کہ انسانی شخصیت میں فکر اور عمل کے مابین ایک اور عنصر جذبات کا بھی ہے اور ویسے تو ان کی اہمیت ہر انسان کی زندگی میں مسلّم ہے لیکن خصوصاً وہ لوگ جن کا شعور پختہ نہیں ہوتا یا جو عقلاً بالغ نہیں ہوتے اُن کی زندگیوں میں تو فیصلہ کُن اہمیت ان ہی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن **دعوت** کی اساس صرف **حکمت** ہی پر نہیں رکھتا **موعظت** پر بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو **موعظہ حسنہ** بھی قرار دیتا ہے اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ" بھی!۔

اس پس منظر میں دیکھیے کہ کس قدر افسوس ناک ہے وہ صورتِ حال جس کا نقشہ علاّمہ اقبال نے ان اشعار میں کھینچا ہے کہ :۔

صُوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست ۔۔۔ از شرابِ نغمۂ قوّال مست!
آتش از شعرِ عراقی در دلش ۔۔۔ در نمی سازد بقرآں محفلش

حالانکہ اگر جذبات کی جِلا اور سوز و گداز و کیف و سرور کی کیفیات مطلوب ہوں تو اُن کا بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن مجید ہی ہے۔ مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشیٔ ترجمۂ قرآن میں اپنے والدِ مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُر تاثیر اشعار نقل کئے ہیں :۔

سُنتے سُنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو ۔۔۔ کان بہرے ہو گئے دل بے مزہ ہونے کو ہے
آؤ سُنوائیں تمھیں وہ نغمۂ مشروع بھی ۔۔۔ کوہ جس سے خاشعاً متصدّعاً ہونے کو ہے

اس ضمن میں ذرا غور فرمایئے اور داد دیجئے اس پر کہ نفسِ امّارہ کی طوفاں خیزیوں، اور ابلیس لعین کی وسوسہ اندازیوں سے بچنے کے لیے کس قدر صحیح مشورہ دیا ہے علاّمہ اقبال مرحوم نے کہ :

کُشتنِ ابلیس کارے مُشکل است ۔۔۔ زانکہ اُو گُم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مُسلمانش کُنی ۔۔۔ کُشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی

تعلیمِ کتاب

آنحضورؐ کے طریقِ انقلاب میں تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد نمبر آتا ہے 'تعلیمِ کتاب' کا جو اصلاً عبارت ہے شریعتِ اسلامی کے اوامر و نواہی کی تعلیم اور احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ سے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں لفظِ کتاب کا اطلاق بالعموم شریعت کے قواعد و ضوابط پر ہوا ہے جیسے "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا" میں، یا "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَهٗ" میں۔ اسی طرح قرآن مجید میں کسی شے کی فرضیت و مشروعیت کے بھی "کُتِبَ" کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے: "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" — "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ" — "کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا نِ الْوَصِیَّۃُ" — "رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ" — وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ"۔

واضح رہنا چاہئے کہ تلاوتِ آیات اور تزکیے کے مراحل طے ہو جانے کے بعد ہی انسانی شخصیت کی زمین پورے طور پر تیار ہوتی ہے کہ اس میں شریعت کے اوامر و نواہی اور احکامِ الٰہی کے بیج بوئے جائیں اور وہ برّ و تقویٰ کی ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی کی صورت اختیار کر لے۔ بصورتِ دیگر فصل کا حصول درکنار، بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن مجید کا 'کتاب' والا حصہ یعنی اس کی وہ آیات و سُور جن میں حلال و حرام کے تفصیلی احکام بیان ہوتے ہیں۔ اس وقت نازل ہوا جب پورے پندرہ سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں جس میں تمام تر توجہات تلاوتِ آیات اور تزکیے پر مرتکز رہی تھیں، ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جو ان احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب تھا! اس کی سب سے نمایاں اور درخشاں مثال حرمتِ شراب کے معاملے میں ملتی ہے کہ اُدھر حُکم نازل ہوا ادھر شراب کے برتن توڑ ڈالے گئے اور پھر ان لوگوں نے کبھی شراب کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جن کی گھُٹّی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور پوری پوری عمریں پینے اور پلانے میں گذری تھیں اور اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوا اس دور میں امریکہ ایسے تعلیم یافتہ اور مہذب و متمدن ملک میں جہاں — PROHIBITION ACT کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں اور ع

"چھُٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہُوئی"

کے آگے تمام سائنسی حقائق اور اعداد و شمار دھرے کے دھرے رہ گئے!

تعلیمِ حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے 'تعلیمِ حکمت' — حکمت اصلاً عبارت ہے انسانی عقل اور شعور کی پختگی کی اُس سطح سے جہاں پہنچ کر احکامِ شریعت کے اسرار و رموز واضح ہو جاتے ہیں اور اُن کی حکیمانہ غرض و غایت منکشف ہو جاتی ہے۔ گویا احکام بے جان اور زبردستی کے ساتھ ٹھونسے ہوئے اوامر و نواہی نہیں رہتے بلکہ فکر و عمل کے ایک حد درجہ حکیمانہ نظام کے ایسے باہم دگر منظّم و مربوط اجزا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن میں نہایت حسین توازن و توافق موجود ہو۔ یاد ہوگا، یہی اصل موضوع ہے۔ فاتحِ دورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تالیف "حُجۃ اللہِ البالغہ" کا اور یہی ہے وہ جنسِ کمیاب جسے قرآن حکیم 'خیرِ کثیر' قرار دیتا ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ
فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ (سورۂ بقرہ - آیت ۲۶۹)

(اور یہ بات بھی محض اتفاقی نہیں کہ خیر کثیر بھی نام ہے حضرت شاہ صاحب کی ایک صدر درجہ بلند پایہ حکمت تصنیف کا!) گویا حکمت کی تحصیل ہر انسان کے بس کا روگ نہیں، بلکہ یہ تعلیم و تربیت نبوی کا وہ درجہ تخصص ہے جس سے فیض یاب صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کے نفوس میں علم کی ایک پیاس فطری طور پر موجود ہوتی ہے چنانچہ ان کے لیے ظواہر پر اکتفا نا ممکن ہو جاتا ہے اور وہ حقائق باطنی کی تحقیق و تفتیش پر اسی طرح مجبور و مضطر ہو جاتے ہیں جس طرح بھوکا تحصیل غذا پر اور پیاسا تلاش ماء پر ——— وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ!! اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں!

اس ضمن میں بھی اس خیال سے کہ حکمت سے لازماً قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مراد ہے قرآن حکیم کے ساتھ ایک نادانستہ اور غیر شعوری سوءِ ظن کا امکان پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ حکمت تو قرآن کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے' اس لیے بھی کہ اس کی ایک مستقل صفت ہی "حکیم" ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی شان یہ ہے کہ:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ (سورہ ہود۔ آیت ۱)

مزید براں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں صراحتہً بھی مذکور ہے کہ:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط

اور اس سلسلے میں بھی حظ اٹھائیے اور وجد میں آئیے علامہ اقبال کے ان اشعار پر: ؎

اے کہ می نازی بہ قرآن حکیم! تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کن نکتہ شرع مبیں را فاش کن

افسوس ہے کہ ہمارے ارباب علم و فضل نے بہت کم توجہ دی قرآن حکیم کی ان اصطلاحات اربعہ پر جو قرآن مجید میں ایک نہ دو پورے چار مرتبہ دہرائی گئیں، حالانکہ بلا سبب تکرار بظاہر کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور نہ قرآن عظیم کے مصنف و مؤلف تبارک و تعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی تھی نہ عربی زبان کا دامن ہی اتنا تنگ تھا کہ ہر بار مختلف الفاظ نہ لائے جا سکتے۔ اس اعادہ و تکرار کا سبب ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اگرچہ ویسے تو قرآن مجید کا ہر ہر لفظ غالب کے اس شعر کا مصداق کامل و اتم ہے کہ ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لیکن ان اصطلاحات اربعہ کی حیثیت تو بالخصوص ایسی ہے کہ ان پر توجہات کو بالکل ع "ز بہر ہر لفظ غالب چیدہ ام میخانۂ!" کے مصداق مرتکز کر دیا جائے' اور اس کی ایک سعی بلیغ میری محدود معلومات کی حد تک' کم از کم دور حاضر اور ماضی قریب میں صرف مولینا امین احسن اصلاحی نے اپنی ایک تالیف 'مبادی تدبر قرآن' میں کی ہے۔

الغرض! انقلاب نبوی کے تکمیلی مراحل تو وہی ہیں جو ہر انقلاب میں پائے جانے لازمی ہیں یعنی دعوت و تنظیم تصادم و کشمکش، ہجرت و انقطاع اور جہاد و قتال ——— لیکن اس کا اساسی منہاج مشتمل ہے تلاوت آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت پر، جس کا مرکز و محور ہے قرآن حکیم!

انفرادی تبدیلی

اگر آپ کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی یہ "انقلاب" لانا چاہیں تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے آپ اس کے فکر کا جائزہ لیں اور تلاوتِ آیات کے ذریعے اس کے ذہن کو فاسد خیالات اور غلط نظریات سے اور اس کے قلب کو فاسد ارادوں اور غلط اُمنگوں اور خواہشات سے پاک کریں۔ اُس کے فکر کی ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی محکم اساسات پر از سرِ نو تعمیر کریں اور اس کے قلب کو نورِ ایمان سے منوّر کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر صالح اعمال اور غلط عادات و اطوار پت جھڑ کے پتوں کی طرح خود بخود جھڑ جائیں گے اور تب موزوں وقت آئے گا اس کا کہ شریعت کے اوامر و نواہی کی تلقین اسے کی جائے۔ گویا اس کے وجود پر شریعت کا نفاذ عمل میں آجائے۔ پھر اگر وہ صاحبِ استعداد ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر حکمت کی تحصیل کرے جس سے اصل انشراحِ صدر اور اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائے گا — اور اُس کی شخصیت میں اس انقلاب کو تمکّن و استقلال بھی حاصل ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ہے وہ محنت و مشقت جس کا ثمرہ بیان ہوا آنحضورؐ کے اُس حکیمانہ قول میں جو آپ نے حضرت علیؓ سے خطاب کرکے فرمایا تھا کہ "لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ" (اے علیؓ اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے) اور اگر آپ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ کی حالت وہی ہوتی جو ہمارے معاشرے میں ان بہت سے بڑے بوڑھوں کی ہوتی ہے جنھوں نے اپنی نوجوان نسل کو حوالے تو اُس نظامِ تعلیم کے کیا ہے جس کے بارے میں غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ؎

یُوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی!

اور ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

نتیجتہً کسی کے ذہن پر رسّل سوار ہے اور کسی کے ساعت، کوئی فرائڈ کا شیدائی ہے اور کوئی یونگ یا ایڈلر یا مکڈوگل کا۔ کسی پر ڈاروِن کا جادو چلا ہُوا ہے اور کسی پر ہیگل اور مارکس کا — چنانچہ خدا و آخرت اور وحی و رسالت پر ایمان و یقین کے آثار کا کوسوں پتہ نہیں لیکن تلقین ہو رہی ہے نماز اور روزے کی اور فرمائش و فہمائش ہو رہی ہے شعائرِ دینی کے احترام کے بارے میں۔ نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ نوجوان اگر نسبتاً شریف اور سعادت مند ہے تو نگاہیں نیچی کرلے اور آپ کی موجودگی میں احتراماً آپ کی خواہش بھی پُوری کر دے لیکن اگر ذرا بیباک اور جری ہو تو صاف کہہ دے کہ "چھوڑیئے ابا جان! یہ سب ڈھکوسلے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے"۔

اجتماعی انقلاب

اس معاملے میں انسانی معاشرہ یا انسانی ہیئت اجتماعیہ بھی بالکل ایک فرد واحد کے مانند BEHAVE کرتا ہے۔ ہر معاشرے میں قوم کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جسے بالعموم ذہین اقلیت

یعنی ۔ INTELLECTUAL MINORITY یا INTELLIGENTSIA یا ——— BRAIN TRUST قرار دیا جاتا ہے اور جس کی حیثیت جسدِ اجتماعی میں بالکل وہی ہوتی ہے جو فردِ واحد کے جسم میں اس کے دماغ کی۔ اگر کسی معاشرے میں اسلامی انقلاب لانا مطلوب ہو تو اولاً اس کے اس طبقے کو APPEAL کرنا۔ اور اُس کے قلوب و اذہان کو نورِ ایمانی سے منور کرنا، گویا اسے اسلام کے حق میں بالفعل CONVERT کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے یا قوم کے دوسرے طبقات کی حیثیت اعضاء و جوارح کی ہے جو قلب و ذہن کے بے دام غلام ہوتے ہیں اور ان سے صادر ہونے والے احکام کی بے چون و چرا اطاعت کرتے ہیں جو لوگ کسی معاشرے یا قوم کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کیے بغیر خواہش مند ہوں کہ معاشرہ بحیثیت مجموعی اسلام کو عملاً قبول کرلے، اُن کا خلوص و اخلاص اپنی جگہ اور نیک خواہشات اور تمنائیں اپنے مقام پر، لیکن امرِ واقعہ کے اعتبار سے اُن کی حالت بھی ان نیک مگر سادہ دل لوگوں سے کسی طرح مختلف نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

کتاب اللہ ـــ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ

تمنا عمادی

انسان کی پیدائش پر غور کیجیے۔ اس کی تقویم اور پھر تخلیق پر غور کیجیے، صُلبِ پدر سے بطنِ مادر میں جلوس کرنے سے قبل اس کے عناصر بکھرے پڑے تھے۔ انسان نے اس دنیا میں آکر ہوا، پانی، پھل، پھول، اناج سے تمتع کیا اور وہ اس کے جزوِ بدن بنے، جو تخلیقِ دگر کے لیے کام میں آئے۔ فطرتاً ہر مخلوق کے وظائف و فرائض معیّن کر دیے گئے ہیں ان میں ایک تو وہ ہیں جو اسے اس منزل میں کام آتے ہیں، جس میں وہ ہے۔ دُوسرے اُس وقت کے لیے ہیں جب وہ اگلی منزل میں قدم رکھے گا۔ انسان کو قرآن نے یاد دلایا ہے کہ کیا تم نے اپنی پہلی اُٹھان (نشأۃ الاولیٰ) کو نہیں سمجھ لیا ہے۔ پھر اس سے درسِ نصیحت کیوں حاصل نہیں کرتے؟ مقصود یہ بتانا ہے کہ کارخانہ قدرت میں ہر مخلوق کے وظائف و فرائض ہیں اور انسان بھی ان منازل سے گزرا ہے۔ پہلی منزل بطنِ مادر میں اسے وہ تمام چیزیں مہیا کر دی گئی تھیں، جس کی اسے وہاں ضرورت ہو سکتی ہے۔ جب یہ منزل گزر گئی اور وہ پیدا ہو گیا تو یہ تمام چیزیں پیدائش کے فوراً بعد اس سے لے لی گئیں۔ مگر اس دنیا میں آنے کے بعد اس کے لیے جو چیزیں ضروری ہو سکتی ہیں، وہ سب وہیں دے دی گئی تھیں۔ آنکھ، ناک، کان، منہ، اعضا و جوارح مگر عقل و شعور ابھی بالکل خام حالت میں ہیں۔ اس نکتہ پر تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس دنیا میں آنے سے پہلے تک خواہش و ارادہ و حرکت کی صلاحیت بچے میں نہیں آتی۔ مگر کہا جا سکتا ہے، ولادت سے کچھ پہلے بطنِ مادر ہی میں یہ تینوں باتیں بچے میں فی الجملہ آجاتی ہیں۔ بچہ پیٹ میں حرکت کرتا ہے اور پیدا ہونے کے وقت خود بچے کا ارادہ بھی بڑی حد تک کام کرتا ہے اور ارادہ بغیر خواہش کے نہیں ہوتا۔ بہرحال اس کو یوں سمجھیے کہ جس طرح بچے کو رُوئے زمین پر کام آنے والے سامان، آنکھیں، کان، ناک، منہ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ بطنِ مادر ہی میں ملے، اسی طرح پیدائش کا زمانہ قریب آگیا تو اصل کام آنے والی صفتیں یعنی خواہش، ارادہ اور حرکت بھی اس کو وہیں دے دی گئیں تاکہ وہ دنیا میں انھیں صفتوں کے ذریعہ اپنے اعضا سے کام لے سکے اور یہی صفتیں بچے میں ذمہ داری پیدا کرنے والی ہیں اور اب اس دنیا میں اس کو ذمہ داری زندگی بسر کرنا ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچے کو غذا خود بخود مل رہی تھی، فطرت پہنچا رہی تھی مگر پیدائش کے بعد صرف فطرت کی مدد کافی نہیں رہی۔ بچہ جب تک اپنی خواہش، اپنے ارادے اور اپنی حرکت سے کام نہ لے، اس کو غذا نہیں مل سکتی۔ ماں اسی قدر کر سکتی ہے کہ بچے کو اپنا دُودھ پلا دے۔ بچہ جب تک اپنی خواہش، اپنے ارادے، اپنے لبوں کی اور اپنے کام و زبان کی ایک خاص حرکت سے کام نہ لے، جس کو چُوسنا کہتے ہیں، اس وقت تک اس کے معدے میں غذا نہیں پہنچ سکتی۔

جیسے جیسے بچہ سیانا ہوتا جاتا ہے اس کی ذمہ داری بھی بڑھتی جاتی ہے اور ماں باپ اور گھر کے دُوسرے لوگوں سے وُہ مستغنی اور خودکفیل ہوتا جاتا ہے اور اپنی ضرورتیں خود پُوری کرنے کا ڈھنگ سیکھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ بالغ اور جوان ہوکر ایک مکمل حیوان ہوجاتا ہے، مگر صاحبِ عقل حیوان۔ حیوانی زندگی اسی قدر ہے کہ کھاؤ، پیو، اپنی خواہشیں پُوری کرو، اپنے جوڑے کے ساتھ، اپنے بال بچّوں کے ساتھ اور کسی حد تک اپنے ہم جنسوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو، دوستوں سے اپنی غرض کے ماتحت دوستی رکھو، غیروں سے مغایرت برتو، دشمنوں کے ساتھ قوت ہو تو کسی قسم کی کوئی رعایت نہ کرو۔ اپنی غرض، اپنا مفاد اگر صلح میں ہو تو غیروں سے بلکہ دشمنوں سے بھی صلح کرلو۔ وہ غرض و مفاد باقی نہ رہے تو صلح کو بالائے طاق رکھ کر جنگ چھیڑ دو۔ آپ پالتو حیوانوں کو نہ دیکھیں، ان کی اپنی فطرت آپ کے طریقِ پرورش اور آپ کے ساتھ رہنے سہنے کے باعث بہت حد تک بدل چکی ہے۔ جنگلوں میں جس طرح ہر حیوان اپنی جنس کے ساتھ آزاد زندگی بسر کرتا ہے، اس کو دیکھیں کہ وہ حقوقِ نفس، حقوقِ اہل و عیال اور حقوقِ ہم جنس کی کس طرح نگہداشت کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ عقل سے محروم ہیں۔ انسان بھی ایک حیوان ہی ہے مگر اس کو عقل دی گئی ہے اور عقل کی بدولت ساری کائنات پر اس کو تسلط قایم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

الم تروا ان اللہ سخرلکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہٗ ظاہرۃ و باطنۃ ؕ

[کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے ان سب چیزوں کو جو بلندیوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی بہت سی ظاہری و باطنی نعمتیں انڈیل دی ہیں]

اور یہ تسخیر صرف عقل ہی کی بدولت ہے۔ عقل ہی میں اللہ نے قوّتِ تسخیر بخشی ہے۔ انسان اپنی عقل کی قوّت سے بڑی سے بڑی چیزوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، اُونٹ، بڑے بڑے اژدہے، زہریلے سے زہریلے سانپ، اور بڑے بڑے شیروں کو غلام بنائے رکھتا ہے اور اب تو چاند اور مریخ بھی اس کی زد میں آنے والے ہیں، جس سے "تسخیرِ سماوات" کی تفسیر اور بھی واضح ہوجائے گی، مگر یہ ساری تگ و دو حیوانی ہی ہے۔ آج سائنس کی ساری ترقیاں عقلِ حیوانی کے کارنامے ہی ہیں یعنی انسان کی عقل اپنی حیوانیت میں، درندگی میں، خُونریزی میں، اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسروں پر زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے میں زیادہ سے زیادہ ترقی کر رہی ہے۔ انسانی فرائض کیا ہیں! اس کو کوئی جانتا بھی نہیں اور نہ بطور خود جان سکتا ہے۔

دنیا کی ساری چیزیں اللہ نے انسان کے لیے بنائیں؛ خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔ مگر انسانوں کو صرف دنیاوی زندگی میں حیوانوں کی طرح منہمک رہ کر مرجانے اور مٹ جانے کے لیے بھی نہیں پیدا کیا۔ اس کے ذمّے سب سے بڑا فریضہ بندگی (عبادت) کا رکھا ہے:

ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔

[میں نے جن وانس کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت، میری بندگی کا حق ادا کریں]

یہ مسئلہ کا دوسرا پہلو ہے مگر مادی پہلو سے فروتر نہیں کیونکہ انسان صرف مادہ کا ہی ظہور ترتیب نہیں ہے بلکہ روح و نفس بھی اس کے ساتھ پیدا ہوئے تھے اور سہیم اولی ہیں۔

عام حیوانوں کے پاس عقلِ سلیم نہیں ہے اس لیے ان کو ذمہ دار زندگی نہیں دی گئی۔ فطری بندگی یعنی اللہ تعالیٰ کے قانونِ قدرت و قانونِ فطرت کی اطاعت پر تو ہر چیز مجبور ہے اور اس اطاعت فطری کے ماتحت ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بزبانِ حال کر رہی ہے:

و ان من شئ الا یسبح بحمدہٖ۔

[ہر چیز اللہ کی حمد و تسبیح کر رہی ہے]

وان من شئ الا یسبح بحمدہٖ ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔

[ہر چیز اپنی عبادت اور اپنی تسبیح کو جانتی ہے (اور ادا کر رہی ہے) لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے]

غرض عام جمادات و نباتات کی طرح عام حیوانوں کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ انسانوں کے لیے آخرت کی زندگی ہے۔ انسان بطنِ مادر میں مقامی سامان سے زیادہ دُنیا میں کام آنے والے سامان فطرت کی مدد سے مہیا کرتا رہا اور وہاں سے آنکھیں، کان، ناک، منہ، زبان اور ہاتھ پاؤں اور ان کے ساتھ خواہش، ارادہ اور قوتِ حرکت، عقل ساتھ لایا۔ مگر اس مرحلہ پر تنہا فطرت کی مدد کا وقت ختم ہوگیا۔ اب ذمہ دار زندگی ملی تو پہلے مقامی ضروریات کی فراہمی کی صلاحیت پیدا کرنے اور حیوانی فرائض انجام دینے کا وقت، بلوغ سے قبل تک کا کافی وقت ملا۔ بلوغ کے بعد آنے والی منزل کے لیے فراہمی اسباب مفاد کی ذمہ داری بھی اب انسان کے سر آگئی اور آنے والی منزل آخرت کے نقصانوں سے بچنے اور منافع کے حاصل کرنے کی ذمہ داری بھی خود انسان ہی پر عاید ہے۔ مقامی یعنی دنیاوی فرائض کی انجام دہی باوجود اس کے کہ وُہ اپنی عقل اور خواہش و ارادہ سے کرتا رہا، مگر فطرتِ انسانی اس میں برابر اس کی مدد کرتی رہی۔ فطرت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ فطرت کے خلاف جہاں اس نے کوئی کام اپنی غلط خواہش اور بے جا ارادے سے کیا، ٹھوکر کھائی اور اس سے نقصان اٹھایا۔ یہ ہمارا ہر وقت کا مشاہدہ ہے۔ مگر مقامی دنیاوی نفع و ضرر کو تو وہ خود اپنے اور دوسروں کے تجربے سے سمجھتا رہا۔ دُوسروں سے پُوچھ کر، دُوسروں کو دیکھ کر جانتا اور سیکھتا بھی رہا۔ آنے والی منزل کے نفع و ضرر کے سمجھنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جو شخص مر کر اس آنے والی منزل میں پہنچتا ہے، پھر واپس نہیں آتا کہ اس سے وہاں کا کچھ حال معلوم ہو۔ نہ وہاں سے اپنی یا وہاں کی کچھ خبر کسی ذریعے سے بھیجتا ہے۔ اس لیے ناممکن ہے کہ کوئی انسان بطور خود آخرت کی آنے والی منزل کے نفع و ضرر کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کر سکے۔

اب یہ بات انسانوں کے خالق ہی کے ذمے تھی کہ جس طرح انسان کی ذمہ دار زندگی سے پہلے انسان ہی کی ذات کے اندر فی انفسھم ایک ہادی و رہنما انسانی فطرت رکھ دی تھی، جو بطنِ مادر میں اس کی رہبری اور مدد کرتی رہی۔ اسی طرح اب

جب کہ انسانی عقل آنے والی منزل آخرت کے نفع ونقصان کے سمجھنے سے عاجز ہے، تو وہی خالق ایک رہبر و ہادی، مددگار اپنی طرف سے انسانوں کو دے دے، جو منزل آخرت کے نفع و نقصان کو قطعی و یقینی طور سے انسانوں کو بتائے اور صحیح بالکل صحیح رہنمائی کرے۔

بطنِ مادر میں دنیاوی مفاد کی رہنمائی کے لیے فی انفسهم خود انھیں کی ذات میں فطرت انسانی ملی تھی۔ یہاں عالمِ آخرت کی رہنمائی کے لیے من انفسهم ان میں سے ایک فرد کو نبی و رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور ان پر وحی نازل فرمائی، وحی بھی صرف صُوفیانہ مکاشفات یا اشراقین یا جوگیوں اور راہبوں کے ریاضات و مجاہدات کے وجدان کی طرح محض وہمی ہی نہیں بلکہ وہ نبی و رسول ایک فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، اپنے کانوں سے اس کی بات سُنے، ایک بار نہیں بار بار کہ خود اس کو آنکھوں دیکھے کا یقین حاصل ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور جو کچھ یہ ہم سے کہہ رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی ہے اور وہ وحی رفتہ رفتہ ایک پوری کتاب بن جاتی ہے، کتاب بھی ایسی، جو قیامت تک سارے انسانوں کا دستور العمل بن سکے جو انسانوں کو دنیا میں محض حیوانی زندگی بسر کرنے سے بچا کر انسانی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بھی سکھا سکے اور عالمِ آخرت کے نفع و ضرر کو پُوری طرح بتا سکے۔ دنیا میں ایسی زندگی بسر کرنے کا ایک شارع عام قایم کر دے جس پر چل کر انسان دنیا میں بھی بہتر سے بہتر طریقے سے انسانی زندگی بسر کر سکے اور پھر مرنے کے بعد آخرت میں بھی اس کو نہایت کامیاب فرخ بخش دائمی زندگی ملے۔ رسولؐ کو حکم ہوا کہ تم اسی کتاب قرآن مجید ہی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرو: فذکر بالقرآن من یخاف وعید۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام پر خود عمل کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس قرآن کے مطابق تعلیم فرمائی اور ایک سیدھا قابلِ عمل طریقہ بنا دیا، راستہ قایم کر دیا، جس پر زندگی بھر خود چلتے رہے اور دن رات اپنے پیچھے پیچھے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی چلاتے رہے، یہاں تک کہ جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو وہ چلتا ہوا راستہ جس پر خود چلتے رہے اور صحابہ کو چلاتے رہے، اسی طرح چھوڑ کے تشریف لے گئے، جس پر صحابہ اور پھر اکابر تابعین و تبع تابعین صدیوں تک چلتے رہے، اس راستے کو قرآن مجید سبیل المؤمنین کہتا ہے، یعنی "ایمان والوں کا راستہ"۔ اور اس کو حدیث میں سنّتی وسنّة الخلفاء الراشدین فرمایا گیا ہے۔ سُنّة ہی کو فارسی میں "جادہ" اور ہندی میں "پگ ڈنڈی" کہتے ہیں۔ لوگوں کے چلتے چلتے جو قدموں کے نشانوں سے میدانوں میں راستہ بن جاتا ہے۔ غرض سبیل المومنین اور سُنّۃ نبوی ایک ہی چیز ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوة حسنة۔

[(اے مسلمانو! تمھارے لیے اللہ کے رسول کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے]

یعنی چاہے جس طبقے کا انسان ہو، اگر وہ فقیر و مسکین ہے، تو بھی اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں فقر و

مسکینیت کا بھی ایک دور ملے گا اور آپؐ کے اس دور کی زندگی کے حالات سے وہ سبق لے سکتا ہے کہ فقیری و مسکینی میں کس طرح صبر و شکر اور سیر چشمی سے زندگی آپؐ نے بسر فرمائی تھی۔ اگر کوئی مزدور ہے تو آپؐ نے مزدوری بھی کی ہے۔ ایک مزدور کو کس طرح اپنے مفوضہ فرائض انجام دینا چاہئیں۔ کام سے جی چرانا، وقت کو برباد کرنا اور مزدوری پوری لینا ایک مسلمان مزدور کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مزدوروں سے کام لے رہے ہیں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ مزدوروں کو ان کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ان کی مزدوری دے دو۔ یعنی ادائیگی میں دیر نہ کرو۔ ان کو جلد رخصت کر دو کہ وہ گھر جا کر آرام کر سکیں۔ اگر آپ حکمران ہیں تو آپ کو کس طرح عدل و انصاف کرنا چاہیے، رسولؐ کی زندگی سے اس کو سیکھیے۔ غور کیجیے جنگِ بدر میں فتح کے بعد ستر مشرکین مکہ قید ہوئے، سب کی مشکیں کسی گئیں۔ رات بھر سب اسی طرح مشک بند رہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک قیدی کے کراہنے کی آواز آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز سے پہچان لیا کہ وہ آپ کے چچا عباسؓ تھے۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا عباس کراہ رہے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ آپؐ چپ رہے۔ صحابہ نے اس کو محسوس کیا کہ وہ آپؐ کے چچا ہیں، اس لیے اُن کی کراہ سُن کر آپؐ کا قلب مبارک بے چین ہو گیا ہے۔ اس لیے لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ حکم دیں تو ان کی مشکیں ڈھیلی کر دی جائیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب قیدیوں کی مشکیں ڈھیلی کر دی جائیں۔ یہ تھا نبویؐ عدل و انصاف کبھی آپؐ نے کوئی خاص رعایت کسی عزیز و قریب کے لیے روا نہیں رکھی۔ رعایت کا وقت آیا تو سب کے ساتھ بلا تخصیص و امتیاز کی۔

تعلیمِ رسولؐ

سارے انبیا و مرسلین کی ایک ہی تعلیم رہی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ابتدائی دور میں، جیسے "مڈل" تک کی تعلیم تھی۔ جس طرح مڈل سکول ہر بستی میں ہوتا ہے اور ہر سکول میں کچھ طلبہ ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بعض بعض سکولوں میں ماحولی خصوصیات کے ماتحت دوسرے سکولوں سے کچھ جزئی فرق بھی رہتا ہے۔ مگر ان میں اصولی اختلاف نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر قوم میں، ہر ملک میں ایک رسول بھیجا گیا اور ہر رسول اپنے حلقے میں اپنی اُمت کی تعلیم کرتے رہے۔ بیک وقت متعدد رسول بھی مبعوث ہوتے رہے، کیونکہ وہ تخلیق انسانی کا ابتدائی یا وسطانی دور تھا۔ جس طرح ابتدائی درجہ کے طلبہ میں شرارتیں زیادہ ہوتی ہیں اور کھیل کود میں جی لگنے کی عمر بھی وہی ہوتی ہے۔ علم کو علم سمجھ کر نہیں حاصل کرتے بلکہ والدین اور گارجین کے دباؤ سے پڑھتے ہیں۔ اس وقت ان پر دباؤ رکھنے کے لیے طلبہ کی گوشمالیاں اور مناسب سزائیں گھر پر بھی اور سکولوں میں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح اس وقت مناسب یہی تھا کہ شریر اور سرکش قوموں پر عذاب آیا کرے تاکہ دُوسری قوموں کے لیے باعثِ عبرت ہو۔ یہ فلسفہ تادیب ہے۔

حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی حیثیت "یونیورسٹی" کی تعلیم کی سی ہے۔ انسانی ذہن اب اس قدر تیار ہو چکا ہے کہ وہ دُنیا اور دین دونوں کے مفاد کو سمجھ سکے گا۔ اب ونفس وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۝ قد افلح من زکّٰھا ۝ وقد خاب من دسّٰھا ۝ کا وقت آ گیا ہے۔ یعنی اب نفس نوع انسانی کی تربیت مکمل ہو چکی ہے۔

اس کو بتا دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ بدکاری یعنی مالک سے سرکشی کی راہ کیا ہے اور اپنے خالق و مالک کی بازپرس سے ڈرتے ہوئے بدکاریوں سے بچنے کی راہ کیا ہے۔ تو جس نے بدکاریوں اور سرکشیوں سے بچ کر اپنے نفس کو ہوا و ہوس کی گندگیوں سے پاک کر لیا تو بس وہی کامیاب رہا (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) اور جس نے اپنے نفس کو (ہوا و ہوس کی گندگیوں سے آلودہ رکھ کر) خراب کر دیا وہ ناکام رہا۔

سورۂ حدید کے تیسرے رکوع کے آخر میں ارشاد ہے:

لقد ارسلنا بالبینٰت و انزلنا معهم الکتٰب و المیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیه بأسٌ شدید و منافع للناس۔

[ہم نے کھلی کھلی دلیلوں کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری۔ اور (حق و باطل، عدل و ظلم کو تولنے پرکھنے کی) ترازو (یعنی عقل و ہوش کی ترازو انسانوں کو دی) اور لوہا (پیدا کیا) جس میں سخت جنگی قوتیں ہیں اور لوگوں کے لیے (طرح طرح کے) منافع ہیں]

اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ ان دلیلوں سے رسول تسلیم کیے جائیں۔ پھر ان پہ کتاب اتاری تاکہ اس کتاب کے مطابق وہ لوگوں کو تعلیم دیں، زبانی بھی اور عملی بھی۔ اور ہر شخص کو حق و باطل کی تمیز دی اور عدل و انصاف اور ظلم و جور کا فرق سمجھنے کی عقل دی اور پھر ایسے ظالم و سرکش جو بات سے کسی طرح بھی نہ مانیں اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان کو ظلم و ستم اور سرکشی و بغاوت سے باز نہ رکھا جا سکے، ان کے لیے لوہا بھی پیدا کر دیا کہ اس سے آلاتِ جنگ تیار کریں اور سرکشوں کو، نافرمانوں کو ان کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جا سکے مگر بہ نیتِ اصلاح محض جذبۂ انتقام میں حربے سے کام لینے کی اجازت نہیں۔ حتی تفیئ الی امر اللہ یہاں تک کہ وہ سرکش و نافرمان باغی جماعت اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے یعنی اطاعتِ حق پر آمادہ ہو جائے۔ فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ الفتنہ اشد من القتل۔ چند فتنہ پردازوں کے قتل سے پورے ملک میں فتنہ و فساد کا پھیلتے رہنا زیادہ سخت بات ہے۔ اس لیے ملک کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لیے چند فتنہ پردازوں کا قتل بھی گوارا کیا جا سکتا ہے۔ دشمن اگر ملک پر حملہ آور ہو تو اس کی مدافعت بھی ایک فریضہ ہی ہے اور مدافعت بغیر آلاتِ حرب کے ممکن نہیں۔ اسی لیے حکم ہے:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوةٍ و من رباط الخیل ترهبون به عدو الله وعدوکم و اٰخرین من دونهم لا تعلمونهم الله یعلمهم ط وما تنفقوا من شیءٍ فی سبیل الله یوف الیکم و انتم لا تظلمون ○

[(اے مسلمانو!) اور تم ان (دشمنوں، حملہ آوروں کے مقابلے اور مدافعت) کے لیے جو قوت بھی تم مہیا کر سکو (آلاتِ حرب کی قوت) اور اصطبل کے پلے ہوئے گھوڑوں سے

(اپنے کولیس رکھو) جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو مرعوب رکھ سکو اور ان (چھپے ہوئے دشمنوں) کے علاوہ دوسروں کو بھی جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو (خوب) جانتا ہے (یعنی منافقین کو) اور تم جو کچھ سامانِ مدافعت مہیا کرنے میں خرچ کرو گے، وہ پورا پورا تمھیں (اللہ کی طرف سے) ادا کر دیا جائے گا۔ تم کو (نقصان پہنچا کر تم پر) ظلم نہیں کیا جائے گا]

سامانِ ہدایت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے انسانی زندگی بسر کرنے کے لیے سب سے پہلے تو رسول مبعوث فرمایا جو زبانی و عملی تعلیم لوگوں کو دیں، پھر ان پر اپنی کتاب اتار دی تاکہ وہ اسی کتاب کے مطابق تعلیم دیں اور دُوسرے لوگ رسول سے کتاب اللہ پڑھ کر کتاب اللہ کی ہدایت اور رسول اللہ کی تعلیم کے مطابق انسانی زندگی بسر کر سکیں۔

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوتے تو تمام انسانوں کے لیے ایک ہادی و رہنما اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گئے۔ اُن پر کتاب اللہ اتاری گئی تاکہ یہ ہدایت نامہ رسولؐ کی زندگی میں اور رسولؐ کی وفات کے بعد بھی قیامت تک انسانوں کے لیے دستاویزِ ہدایت رہے۔ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اس رسولؐ اور اس کتاب پر ایمان لا کر اس کتاب کی ہدایت اور اس رسولؐ کی تعلیم کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کریں اور انسانیت کے فرائض ادا کر کے آخرت کی بہتر سے بہتر زندگی حاصل کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال بعثت کے بعد سے ہجرت تک مکے میں رہ کر ایک نہایت پختہ ایمان والے مہاجرین کی معقول جماعت تیار کر دی تھی۔ قرآن مجید میں جن کی تعریف آئی ہے:

والذین اتبعوہ فی ساعۃ العُسرۃ۔

[وہ لوگ رسول اللہ کے ساتھ لگے رہے تنگی اور دشواری کے زمانے میں]

ہجرت کے بعد بھی غزوۂ خندق تک کا زمانہ دشواریوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے انصار میں بھی ایک کافی تعداد اس آیت کے مصداق ہو سکتی ہے۔ مگر مہاجرین تو اس میں بھی شریک رہے۔ اس لیے مہاجرین کا رتبہ اس اعتبار سے ضرور فضیلتِ خاص رکھتا ہے۔ جس طرح انصار نے، جو ایثار مہاجرین کے لیے کیا اور جس طرح ان کو اپنے شہر بلکہ اپنے گھروں میں رہنے سہنے کا موقع دیا، یہاں تک کہ مال بھی مواخات کے بعد آدھا آدھا تقسیم کر دیا، خصوصی فضیلت اللہ تعالیٰ نے انصاریوں ہی کے لیے رکھی تھی۔

ہجرت کے بعد انصار نے بھی مہاجرین کی طرح صحبتِ نبویؐ سے، بالمشافہ تعلیم نبویؐ سے اور پھر مہاجرین کی روش دیکھ دیکھ کر دینِ اسلام یعنی انسانیت کی پوری تعلیم حاصل کر لی اور سارے مہاجرین و انصار جو والذین معہٗ تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہر دینی کام میں ساتھ ساتھ رہے۔ خصوصاً وہ، جو ابتدائے بعثت سے یا اس کے کچھ بعد سے مگر ہجرت کے قبل سے آپؐ کے رفیقِ راہ رہے اور ہر دینی کام میں شریک رہے اور وہ انصار جو ہجرت سے پہلے ہی ایمان لے آئے تھے یا ہجرت کے بعد ابتدائی زمانے میں ہی ایمان لائے، جن کو السّابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار فرمایا گیا ہے۔ جن کا یہ

درجہ ہے کہ نہ صرف وہ بلکہ ان کی پیروی کرنے والے بھی ایسے تھے جنھیں رضی اللّٰہ عنہم و رضوا عنہ (اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے راضی ہیں) کہا گیا۔ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا بزرگ، کیسا ہی عابد و زاہد ہو، ان "سابقون الاوّلون" مہاجرینؓ و انصار کی پیروی کے بغیر اللہ کی رضامندی کبھی حاصل نہیں کرسکتا۔ یہی اگلے مہاجرین و انصار اور پھر ان کے بعد جو لوگ ایمان لالا کر صحابۂ رسولؐ کی جماعت میں شامل ہونے لگے، یہ سب بغیر کسی باہمی اختلافِ عقاید و عبادات کے ایک ہی طریقے، ایک ہی راستے پر پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اسی طریقے، اسی راستے اور اسی روش کا نام صراطِ مستقیم بتایا گیا ہے، اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "سُنّتی" فرمایا اور اس کو قرآن مجید نے سبیل المؤمنین کہا اور صاف اور کھل کر کہہ دیا کہ:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبیّن لہ الھدٰی ویتّبع غیر سبیل المؤمنین نُوَلّہٖ ماتولّٰی ونصلہ جھنّم وسآءت مصیرا ہ

[ہدایت کی راہ جس پر واضح ہو چکی، اس کے بعد بھی اگر اس نے اس رسول کی مخالفت کی اور سبیل المومنین (ان مومنین یعنی مہاجرین و انصار کی راہ) کے سوا (کسی دوسری راہ) کا اتباع کیا، تو پھر جدھر اس نے رُخ کیا ہے، ہم اس کو اُسی طرف جانے دیں گے۔ پھر (جزا و سزا کے وقت) اس کو جہنّم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت بُری جگہ ہے پہنچنے کی]

اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ و الذین معہٗ یہی تین ذریعے ہیں ہدایت کے۔ یہ تینوں ایک دُوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے اور نہ کوئی ان تینوں میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ کر راہِ ہدایت پاسکتا ہے۔

کتاب اللہ ہر سچے مسلم کے گھر میں موجود ہے۔ محمد رسول اللہ کی سیرت پر چھوٹی بڑی کتابیں اکثر زبانوں میں موجود ہیں مگر جو شخص قرآن مجید سمجھ کر تلاوت کرتا رہتا ہے، وہ مورخین کی لکھی ہوئی سیرتِ نبویؐ سے زیادہ صحیح اور سچی سیرتِ نبویؐ خود قرآن مجید سے ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح والّذین معہٗ یعنی صحابہ کرام خصوصاً مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت بھی تاریخ کی کتابوں میں نہ دیکھیے۔ یعنی ان کے متعلق تاریخی روایات پر بھی اتنا تکیہ نہ کیجیے کیونکہ مورخین نے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کے ماتحت بہت سی تہمتیں بعض صحابہ کرام پر لگائی ہیں۔ صحابہ کی سیرت بھی آپ قرآنِ مبین ہی میں دیکھیے۔ سورۂ حجرات کی ساتویں آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے:

ولٰکن اللہ حبّب الیکم الایمان وزیّنہ فی قلوبکم وکرّہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان ط اولٰئک ھم الراشدون ہ

[(اے صحابہ!) لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنادیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں (نگینے کی طرح) جڑ دیا ہے اور کفر سے، بدکاری سے اور نافرمانی سے نفرت (تمہارے دلوں میں) ڈال دی ہے اور ایسے ہی لوگ راہِ راست پر ہوتے ہیں]

بتائیے جن لوگوں کی یہ شان قرآن مجید میں مذکور ہو، اللہ تعالیٰ نے جن کی پاک نفسی کی شہادت خود دی ہو ان کے اخلاق پر

کون انگشت نما ہوسکتا ہے؟ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو جو آپ کے آخر وقت میں ایمان لائے تھے اور پھر بعد والوں کے لیے فرمایا تھا کہ:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔

یعنی میرے صحابہ (مہاجرین و انصار) ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے تم جن کا بھی اتباع کرو گے، ہدایت پاؤ گے۔

آپؐ نے فرمایا تھا کہ میری اُمت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے ایک فرقہ نجات یافتہ ہو جائے گا اور باقی سب گمراہ ہوں گے اور جہنّم میں جائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: وہ ایک فرقہ نجات پانے والا کون ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

"ما انا علیہ و اصحابی"

[جو اس طریقے پر ہوگا جس طریقے پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں]

اور اسی طریقے کو آپؐ نے "سُنّتی" فرمایا، اور قرآن مجید میں "سبیل المؤمنین" فرمایا گیا ہے جس میں نہ کسی طرح کی فرقہ بندی تھی، نہ ان میں باہم عقاید و عبادات کا کوئی اختلاف تھا۔ سب کے سب صرف مسلم تھے، سب کا دین صرف اسلام تھا، سب کے سب قرآن مجید اور سنّتِ نبویؐ کا اتباع کر رہے تھے اور سب کے سب ایک طرح کے سبیل المومنین کے صراطِ مستقیم پر چل رہے تھے۔

وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ

یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوّت و رسالت کے سوا کسی اہم دینی و انسانی شرف کو کسی خاص زمانے یا خاندان یا ملک کے لوگوں کے لیے مخصوص نہیں فرمایا۔ ہر زمانے والوں کو، ہر خاندان والوں کو اور ہر شہر، ہر ملک والوں کو اس کا موقع دیا ہے کہ:

فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلاً۔

[جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف پہنچنے کی راہ اختیار کرلے]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی معیت زمانی اور مکانی تو بعض کفار و منافقین کو بھی حاصل تھی، اس لیے صرف زمانی و مکانی معیّت کی تو ظاہر ہے کوئی اہمیت نہیں، اصل معیّت تو ایمانی معیت ہے، جس کو آج ہم آپ اور ہر شخص حاصل کرسکتا ہے۔ صحابہؓ کو یہ شرف ضرور حاصل تھا کہ وہ ایمانی معیت کے ساتھ زمانی و مکانی معیت بھی رکھتے تھے مگر اصل سونا تو ایمانی معیت ہے، زمانی و مکانی معیت سُہاگا بن گیا۔ مگر ہم لوگ سہاگا حاصل نہیں کر سکتے، لیکن سونا تو حاصل کرسکتے ہیں، ما انا علیہ و اصحابی والے سبیل المومنین کا اتباع کر کے۔ مگر فرقہ پرستی کے ساتھ سبیل المومنین کا اتباع ناممکن ہے۔ ہر مسلم کا نصب العین صرف اتباعِ رسولؐ ہونا چاہیے۔ سبیل المومنین کا اتباع ایک واحد ذریعہ ہے اتباعِ رسولؐ کا۔ جس طرح اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا

واحد ذریعہ ہے اطاعتِ رسولؐ۔ ہم اطاعتِ رسولؐ کرکے ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اتباعِ صحابہ کرکے ہی اتباعِ رسولؐ کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی خاص شخص سے یا کسی خاص خاندان یا کسی خاص طبقے کے ساتھ دینی وابستگی پیدا کرکے اسی کا ہو رہنا اور دینی معیار کسی طبقے کو اپنے لیے بنا لینا فرقہ پرستی کی جڑ ہے اور اس سے انسان سبیل المومنین سے دُور جا پڑتا ہے اور پھر اسلام جو در اصل کل انسانیت کی تعلیم کے لیے آیا مگر افسوس اس منشائے الٰہی، اس نصب العینِ اسلام سے ہم ہی زیادہ دُور چلے گئے۔

فرائض انسانی

خالقِ کائنات نے انسانوں کو عقل دے کر پیدا کیا اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بخشی تو ان کے ذمے کچھ تو اپنے حقوق رکھے اور ہر شخص پر خود اس کے اپنے نفس کے حقوق عاید کیے اور کچھ ان کے آپس میں، بعض کے حقوق بعض پر رکھے اور پھر عام مخلوقات کے حقوق بھی ان پر رکھے۔ اب اس نکتہ پر غور کیجیے۔

حقوق اللہ

اللہ تعالیٰ کا پہلا حق یہ ہے کہ لا تشرك بالله ط ان الشرك لظلم عظيم ط اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کی قدرت و اختیار میں، اس کی عبادت میں کسی دُوسرے کو اس کا شریک نہ بناؤ، کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے، جو انسان اپنے آپ پر کرتا ہے۔ شرک کو ظلمِ عظیم کہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر مجرم اپنے کو مجرم سمجھتا ہے، ہر کافر خوب سمجھتا ہے کہ ہم اللہ کا یا رسالتِ محمدیؐ کا یا قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ مگر دنیا میں کوئی مشرک اپنے کو مشرک نہیں کہتا۔ سورج، آگ اور بعض جانوروں تک پُوجنے والے اپنے کو موحد ہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے کو مشرک نہیں سمجھتے۔ ہر مشرک اپنے شرک کی کچھ نہ کچھ تاویل کرکے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں یا بول رہا ہوں شرک نہیں ہے۔ تو جس جُرم کو مجرم جُرم ہی نہیں سمجھتا، وہ اس سے اس وقت تک باز نہیں آنے کا، جب تک اس پر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یا عقیدہ رکھتے ہیں یہ شرک ہے اور چونکہ وہ تاویل کر کرکے اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے، اس لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اپنے شرک سے باز آجائے، بخلاف ایک منکر کے کہ خدا کا منکر، رسالت کا منکر، اگر بطور خود بھی کچھ ٹھنڈے دل سے غور کرے تو اس کے ذہن میں خود بخود اللہ کے وجود اور ضرورت نبوت ورسالت کے دلائل آنے لگیں گے اور پھر اگر کسی مخلص کے سمجھانے سے سمجھ جائے گا تو باآسانی اپنے انکار سے رجوع بھی کرے گا۔

عبادت

عبادت محض اعمال سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ درحقیقت قلبی چیز ہے۔ عبادت ایک جذبہ کا نام ہے جو دل میں پیدا

ہوتا ہے اور قایم رہتا ہے۔ اس میں کمی بیشی، سکون اور جوش پیدا ہوتا رہتا ہے مگر ایک مسلم کا دل جذبۂ عبادت سے کبھی خالی نہیں رہتا۔

جذبۂ عبادت درحقیقت کئی جذبوں کا ایک مجموعہ ہے۔ والہانہ شیفتگی، عاجزانہ فروتنی، فدویانہ گرویدگی، غلامانہ تندہی، بے عذر بندگی، مخلصانہ حاضر باشی اور وفادارانہ جاں نثاری۔ ان سات جذبوں کے مجموعے کا نام ذوقِ عبادت ہے۔ چھ جذبے تو واضح ہیں "مخلصانہ حاضر باشی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود سمجھنے والا اپنے کو بارگاہِ الٰہی کی حاضری کے لیے مخلصانہ اشتیاق کے ساتھ ہر وقت تیار رکھے۔ اللہ تعالیٰ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، وہ تو کفار و مشرکین سے بھی ان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے انسان جتنا اللہ تعالیٰ سے غافل رہتا ہے اُتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دُور رہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے دُوری کا اصل باعث غفلت ہے۔ ان جذباتِ عبادت کے اظہار کے لیے کچھ اعمال بتا دیے گئے ہیں۔ ان اعمال کو مجازاً عبادت کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اظہار جذبۂ عبادت کے طریقے ہیں، جو بتا دیے گئے۔ ان بتائے ہوئے طریقوں کے سوا کسی اور طریقے سے عبادت جائز نہیں اور ہر عبادت میں کسی نہ کسی چیز کا ایثار ہے۔ مثلاً نمازوں میں وقت کا، اپنی ذاتی مصروفیتوں اور نیند کا ایثار ہے۔ روزوں میں خواہشِ نفس کا اور زکوٰۃ میں مال کا ایثار ہے اور حج میں مال کا بھی اور "عقل" کا بھی ایثار ہے۔ یہ عالم ہی دوسرا ہے۔ اللہ کی خاطر ازخود رفتگی کا عالم۔ دیوانہ وار بے سلے کپڑے پہنے ایک میدان میں پڑے رہو۔ ایک مکان کے گرد گھومتے رہو۔ دو ٹیلوں کے درمیان دوڑو، کنکریاں چنو اور پتھر پر مارو۔ کیوں؟ یہ نہ پوچھو، مالک کا حکم ہے، بجا لاؤ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (اقبالؔ)

اور یہی مطلب ہے "بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید" کا، مگر یہ منصب رسول کے سوا اور کسی کا نہیں ہوتا، یہاں تک کہ "سابقون الاوّلون" مہاجرین و انصار میں بھی کسی کا یہ منصب نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بات وحی سے فرماتے تھے، صحابہ بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے ورنہ پوچھتے تھے کہ حضورؐ یہ بات وحی سے فرما رہے ہیں یا محض بشری حیثیت سے۔ جو بات وحی سے نہیں ہوتی تھی ان میں آپؐ لوگوں کو اطاعت و اتباع پر مجبور نہیں فرماتے تھے۔

تو جس عبادت کا وقت آجائے، اشتیاق کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں حاضری کے لیے تیار ہو جانا۔ اس "مخلصانہ حاضر باشی" سے مراد ہے گویا ایک مسلم اپنے کو ہر وقت حاضر دربار سمجھے۔ جس وقت پکارو فوراً موجود ہو جائے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ط وَإِقَامِ الصَّلَوٰةِ وَإِيتَآءِ الزَّكَوٰةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ ط

[ایسے لوگ جن کو ان کی تجارت، ان کے خرید و فروخت کا کاروبار ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر دیتا، نہ نماز سے، نہ ادائے زکوٰۃ سے (وہ غافل رہتے ہیں) وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن (لوگوں کے) دل اُلٹ جاتے ہیں اور آنکھیں اُلٹ جاتی ہیں۔ یعنی مرنے کا

وقت۔ (میں یہی سمجھا ہوں، عام طور سے لوگ قیامت کا دن بھی مراد لیتے ہیں اور دل اُلٹ جائیں گے اور آنکھیں الٹ جائیں گی، ترجمہ کرتے ہیں، وہ بھی صحیح ہے)]

یہ جذبۂ عبادت جو سات جذبوں کا مجموعہ ہے، صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ ان میں سے کسی جذبے کو بھی غیر اللہ کیلئے پیدا کرنا مستقل شرک نہیں تو قریب شرک ضرور ہو جائے گا اور کسی وفات یافتہ بزرگ کے ساتھ ان میں سے کسی جذبہ کا رکھنا تو یقیناً مستقل شرک ہے۔

حقوقِ نفس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انّ لنفسك عليك حقّ۔

[تمھارے نفس کا بھی تم پر ایک حق ہے]

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یاَیّھا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم۔

[اے مومنو! تم ذمہ دار اپنی جانوں کے ہو]

اسی لیے خودکشی حرام ہے۔ روزوں میں سحر کھانے کی تاکید اسی لیے ہے کہ بھوک پیاس کی شدت ناقابلِ برداشت نہ ہو جائے۔ اپنے جسم کو ریاضات و مجاہدات کے ذریعے تکلیف دینا کوئی کارِ ثواب نہیں۔ نہ رضائے الٰہی حاصل کرنے کا یہ ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مالی صلاحیت رکھتے ہوئے پھٹے پرانے کپڑے یا محض معمولی حقیر کپڑے پہننا یا ستّو پینا اور حقیر کھانے کھانا وہ بھی بلا وجہ اور اس کو رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ قرآن میں فرمایا ہے:

قل من حرّم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہٖ والطیّبات من الرزق۔

[کہہ دو (اے رسول!) اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو زیب و زینت کی چیزیں اور پاکیزہ غذائیں پیدا کی ہیں ان کو کس نے حرام کیا ہے؟]

غرض اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی جائز و حلال نعمتوں سے جو جائز طریقوں سے حاصل کی جائیں، بلا وجہ باوجود مواقع میسر ہونے کے اپنے آپ کو ان سے محروم رکھنا دینِ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسی طرح دینی دوسرے فرائض سے اپنے کو غافل رکھ کر یا شرک و بدعت میں مبتلا ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنا تو سب سے زیادہ اپنے نفس کے حق کو پامال کرنا ہے۔

اپنے نفس کے حقوق کے مطابق فرائض بھی ہر شخص پر عاید ہیں۔ شرک و بدعت سے محفوظ رہنا۔ اور ہر گناہ کبیرہ سے خصوصاً اور عام گناہوں سے عموماً بچے رہنا، اپنے میں صفاتِ حمیدہ پیدا کرنا، بُرے خصائل سے اپنے کو پاک رکھنا، بدنامیوں سے بچنا، نیک کاری و نیک کرداری کے ذریعے نیک نامی حاصل کرنا، مگر صرف نیک نامی ہی کے لیے نیک کاری اختیار کرنا درحقیقت شرک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ و یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا کا مصداق نہ بنے۔ یعنی جس نیکی کو وہ

کرتا نہیں ہے مگر چاہتا ہے کہ یہ نیکی اس کی طرف منسوب ہو اور لوگ اس کو نیکی کی رُو سے ممدوح سمجھیں۔ جیسے بعض لوگ حاجی نہیں ہیں مگر اپنے کو حاجی مشہور کیے ہوئے ہیں۔ غرض نیکی وہی ہے جو محض اللہ کے لیے ہو۔

آپس کے حقوق و فرائض

ماں باپ کے حقوق کا ذکر قرآن میں صاف طور سے موجود ہے۔ ان کی بات ماننے کا حکم ہے۔ ان کی نافرمانی سے، ان کو دُکھ پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ کسی گناہ کی بات کا وہ حکم دیں تو ان کی وُہ بات نہیں ماننی چاہیے۔ ان کے ساتھ احسان و حُسنِ سلوک کی بار بار تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس لیے ان کے حقوق کی نگہداشت فرض ہے۔

زن و شوہر کے باہمی حقوق

زن و شوہر میں ایک کا حق دوسرے پر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ولھن مثل الذی علیھن عورتوں کا حق بھی مردوں پر اس کے مانند ہے جیسا کہ مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔ وللرجال علیھن درجۃ ۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔ مرد مہر ادا کرتا ہے، نان و نفقہ کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اس لیے اس کو ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے۔ حقوق کی مماثلت سے مراد مساوات نہیں ہے کہ مرد عورت کا مہر ادا کرے، تو عورت بھی مرد کا مہر ادا کرے۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ اگرچہ آج کل بہت جگہ یہی ہو رہا ہے بلکہ عورت کا مہر تو محض زبانی ہوتا ہے۔ خدا جانے ادا ہوگا یا نہ ہوگا، مگر مرد نکاح کے وقت لڑکی والوں سے اپنے مطالبے رکھوا لیتا ہے۔ یہ ہندوؤں کے تلک والی رسم مسلمانوں کے بعض طبقوں میں ایک لعنت کی طرح اکثر نوجوانوں پر مسلط رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لعنت سے بچنے کی ہر مسلم نوجوان کو توفیق دے۔ آمین ثم آمین

زن و شوہر کے درمیان حُسنِ معاشرت قایم رکھنے کی دونوں کو تاکید ہے۔ مردوں کو خصوصیت کے ساتھ اس کی تاکید ہے:

وعاشروھن بالمعروف۔

[ان کے ساتھ بہتر طریقے سے بسر کرو]

حدیث میں ارشاد ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَشَرُّكُمْ شَرُّكُمْ لِاَهْلِهٖ ۔

[تم میں بہتر وہی شخص ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے بہتر ہو اور تم میں بُرا وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ بُرا ہو]

اہلِ قرابت کے حقوق

قرآن مجید میں ہے:
وآت ذاالقربیٰ حقہٗ۔

[اہلِ قرابت کو ان کا حق ادا کرو]
اہلِ قرابت کا یہی حق نہیں ہے کہ وہ اگر محتاج ہوں، تو ان کی کچھ مالی مدد کرو بلکہ ان سے محبت کی رسم و راہ قایم رکھنا، بھلے بُرے میں ان کی خبر گیری کرتے رہنا، شادی غمی کے موقعہ پر ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا، وہ جس قسم کی مدد کے حاجتمند ہوں حتی الوسع ان کی اسی طرح کی مدد کرنا، ان کو بُرے کاموں سے روکنا، نیک کاری و نیک کرداری کی طرف ان کو مائل کرنا۔ (اس آیت کی تفسیر جو روایات کی بنا پر کی جاتی ہے میرے نزدیک وہ روایات محلِ نظر ہیں۔ اس لیے میں نے اس آیت کا وہی مفہوم لکھا ہے، جو الفاظ آیت سے ظاہر ہو رہے ہیں)

اقربا پروری

بہت اچھی صفت ہے بلکہ فرائض میں داخل ہے، اگر اپنے ذاتی مال سے کی جائے، اپنے ذاتی کاروبار میں غیروں کی جگہ اپنے اقربا کو ملازمت دی جائے۔ مگر دوسروں کے مال سے یا حکومت کے عہدہ دار اگر حکومت کے خزانے سے اقربا پروری کرنا چاہیں تو یہ صاف خیانت ہوگی۔ اگر آپ کے ہاتھ میں عہدوں کا تقرر ہے تو اگر امیدواروں میں آپ کا کوئی قرابت مند بھی ہے اور دُوسرے لوگ بھی، تو ایسی حالت میں آپ بہتر اور لائق امیدواروں کا انتخاب کریں، صرف اپنی قرابت کی وجہ سے اپنے قرابت دار کا انتخاب نہ کریں اور اگر آپ کا وہ قرابت دار ہی سب امیدواروں سے زیادہ لائق ہے تو صرف اس لیے کہ وہ آپ کا قرابت دار ہے اس کو نظر انداز کر کے اس سے ادنیٰ درجے کے امیدوار کو بحال کرنا صرف لوگوں کے طعنہ، اقربا پروری کے خوف سے ہوگا، اور یہ بھی درحقیقت ظلم ہی کی ایک شکل ہے۔ ایک سچے مسلم کی صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ لا یخافون لومۃ لائم یعنی ایک مسلمان کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع سے نہیں ڈرتا۔ مسلمان صرف اللہ تعالیٰ سے، قیامت کی بازپُرسی سے ڈرتا ہے۔ ایک مسلمان اپنے ہر کام کے وقت یہ سوچ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے متعلق ہم سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بازپرس کرے گا۔ آپ کا ضمیر، آپ کی دیانت اگر آپ کو ملامت کر رہی ہے تو کسی دوسرے کی ملامت کی پروا نہ کیجیے اور جو حق سمجھتے ہیں وہی کیجئے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیے، قیامت کی بازپرس اور داروگیر سے لرزتے رہیے۔

پڑوسیوں کے حقوق

قرآن مجید میں ہے: واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین احسانا وبذی

القربیٰ والیتٰمیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم ط انّ اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً ۝ (نساء - ۳۶)

[اللہ کی عبادت میں لگے رہو۔ کسی کو کسی بات میں ذرا بھی اس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھی احسان کرتے رہو اور قرابت داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، قرابت دار پڑوسی کے ساتھ، اجنبی پڑوسی کے ساتھ اور ہمنشینوں کے ساتھ اور مسافروں کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ (اب لونڈی غلام کا زمانہ نہیں ہے، تو ان کی جگہ نوکر چاکر، ماما کو سمجھیے) یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ اِترانے والوں، شیخی بگھارنے والوں کو پسند نہیں کرتا]

اس آیت کریمہ میں پڑوسیوں کے علاوہ ماں باپ، اہلِ قرابت اور یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور لونڈی غلام یا نوکر چاکر، دائی، ماما کے حقوق بھی بیان فرما دیے اور ان سب کے ساتھ احسان یعنی حُسنِ سلوک کا حکم دے کر ان سب کے حقوق ادا کرنے کو اسلامی و انسانی فرائض میں داخل فرما دیا ہے۔ مگر شروع آیت میں جو فرمایا: اللہ کی عبادت میں لگے رہو اور کسی کو کسی بات میں بھی اس کا شریک نہ بناؤ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم جس کے ساتھ بھی احسان کرو، یہ سمجھ کر احسان کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حق میرے ذمہ رکھ دیا ہے ان کے حقوق کا ادا کرنا مجھ پر فرض ہے۔ میں ان میں سے جس کے ساتھ بھی احسان کر رہا ہوں، تو ان کا حق اور اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اس لیے ان پر کبھی احسان جتانے کا خیال بھی دل میں نہ آئے اور نہ ریاکاری کی نیت سے دوسروں کو دکھانے کے لیے کسی پر احسان کرو، کیونکہ حقیقت میں یہ شرک ہے۔ جن کاموں سے اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا تھا، تم ان کاموں کو اس لیے کر رہے ہو کہ دیکھنے والے تم سے راضی اور خوش رہیں، نیکی کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور تم نیکی کر رہے ہو مخلوق میں نیک نامی اور اپنی نیک کرداری کی شہرت کے لیے اور پھر اپنی نیک نامی کی شہرت پر اِتراتے رہتے ہو کہ دس جگہ تمھاری نیک کرداریوں کے چرچے ہوتے رہیں۔ یا تم خود شیخی بگھارا کرتے ہو کہ ہم نے فلاں کے ساتھ یہ کیا اور فلاں کے ساتھ یہ کر رہے ہیں، تو یاد رکھو کہ ایسے اِترانے والے، شیخی بگھارنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ لوگ ہیں۔

حدیثوں میں پڑوسیوں کے حقوق کے متعلق بہت کچھ ہے اور اہلِ جنّت کی نشانی بتائی گئی ہے پڑوسیوں کا خوش اور راضی رہنا۔ اور اہلِ دوزخ کی نشانی بتائی گئی ہے کہ پڑوسی ان سے ناخوش اور نالاں رہتے ہیں۔

عام مسلمانوں کے حقوق

فرمایا گیا: انّما المؤمنون اخوۃٌ۔

سارے مسلمان (بلا امتیاز ذات پات اور بلا تفریق قوم و ملک سب کے سب) آپس میں بھائی بھائی ہیں،

چاہے وہ مختلف ملکوں کے، مختلف قبیلوں کے باعتبارِ سکونت یا باعتبارِ نسل و رنگ مختلف قوموں ہی کے کیوں نہ ہوں، مگر اسلام کے شیرازے سے سب کے سب منسلک ہیں، تو سب کے سب آپس میں ایک دُوسرے کے بھائی ہیں۔ ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان رکھنے والے، ایک قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے والے اسی طرح بھائی بھائی ہیں جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ اس لیے ذوی القربیٰ میں سب داخل ہیں البتہ الاقرب فالاقرب کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔ جو جتنا قریب تر ہے اُسی قدر اس کا حق پہلے ادا کرنا فرض ہوگا۔ اپنا بھائی چچیرے بھائی پر مقدم ہوگا۔ قرابت مند پڑوسی اجنبی پڑوسی پر مقدم ہوگا۔ مگر پھر بھی جو زیادہ تر ادائے حق کا محتاج ہو' وہ اس سے مقدم رکھا جائے گا، جو اس سے کم محتاج ہے۔ ایک اجنبی مسلمان اگر زیادہ محتاج قرابت مند سے ہو' تو اس اجنبی کا حق مقدم رکھنا چاہیے۔

ذمی کفّار و مشرکین کے حقوق

اسلامی مملکت میں جو کفّار و مشرکین حکومت اسلامیہ کے وفادار بن کر آباد ہوں، ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ اعلان فرمانے کا حکم دیا تھا کہ:

انبأهم بان لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين۔

ذمّی کفار کو مطلع کر دو کہ شہری حقوق ان کے لیے بھی وہی ہیں جو سب مسلمانوں کے لیے ہیں اور شہری ذمہ داریاں بھی ان پر وہی عاید ہیں جو سب مسلمانوں پر عاید ہیں۔ شہری حقوق میں ان کے ساتھ مسلمانوں کے برابر برتاؤ ملحوظ رہے گا، کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ وہ پورے امن و امان کے ساتھ اسلامی ملک میں اپنا کاروبار کر سکتے ہیں۔ اپنی مذہبی عبادتیں ادا کر سکتے ہیں۔ مگر ایسی رسمیں جو دُوسروں کے دل آزار اور مضرت رساں نہ ہوں۔

حربی دشمن کفّار کے حقوق

دشمنوں سے مدافعانہ جنگ کی اجازت ہی نہیں بلکہ حملہ آوروں کی مدافعت کا حکم ہے اور اس کے لیے ہمیشہ تیار رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مگر دشمن اگر صلح کی درخواست کرے، تو اس کی درخواست قبول کر لینے کا حکم ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لها اگر دشمن کفار صلح پر مائل ہو جائیں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ مگر خود سے پیغام صلح کرنے میں پیش قدمی سے منع فرمایا گیا ہے۔ سورہ محمدؐ کی آیت ۳۵ میں ہے:

فلا تهنوا وتدعوا الى السلم۔

تم کمزوری نہ دکھاؤ اور صلح کی درخواست نہ کرو، دشمن سے انتقام لو، تو برابر کا انتقام لو، انتقام میں زیادتی نہ کرو۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

وقاتلوا فى سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ط ان الله لا يحب

المعتدین ٥

[جو لوگ تم سے مارکاٹ کر رہے ہیں، تم بھی ان سے مارکاٹ کرو مگر اللہ کی راہ میں (یعنی محض جذبۂ انتقام میں نہیں) اور (مارکاٹ میں) حدِ انصاف سے آگے نہ بڑھ جاؤ۔ اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا]

اور سورہ بقرہ کی آیت: ۱۹۴ میں ہے:

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔

جو شخص تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر زیادتی کرو (مگر) جیسی زیادتی اس نے کی ہے یعنی دشمن کی زیادتی سے تمھاری زیادتی بڑھ نہ جائے۔

غور فرمائیے جو دین دشمنوں کے حقوق کی نگہداشت کی تعلیم دیتا ہو، اس دین سے بڑھ کر انسانیت کی تکمیل کون سا دین کر سکتا ہے؛ اس سے بڑھ کر تکمیل انسانیت کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمن اگر حالتِ جنگ میں مقابلے کی تاب نہ لا کر صلح کا پیغام دے تو قبول کر لو۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر زوردار حملہ کر دینے کا حکم نہ ہوا۔ اگر دشمن نے کوئی زیادتی کی ہے تو بدلہ لینے کی اجازت تو دی گئی مگر برابر کے بدلے کی۔ جس قسم کی اور جیسی زیادتی دشمن نے کی ہے، بس ویسی ہی زیادتی تک کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔ یہ ہے 'تکمیلِ انسانیت' اور یہ ہے فرائض انسانیت کی تعلیم، اور یہ ہے حقوقِ انسانیت کی نگہداشت۔

باہمی تعاون

آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم ہے مگر کس طرح؛ ارشاد ہے:

تعاونوا علی البرّ والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو مگر نیکوکاری کی باتوں میں اور اللہ تعالیٰ کا ڈر یاد دلا کر۔ گناہ و سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ایک بار فرمایا:

اعینوا اخاکم ظالماً او مظلوماً۔

یعنی اپنے بھائی کی مدد کیا کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ مظلوم کی مدد کو تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی مدد کر کے ہم اس کو ظلم سے بچائیں گے، مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکو، سمجھاؤ، اللہ سے، قیامت کی بازپرس سے ڈراؤ، نہ مانے تو اپنے ہاتھ پاؤں سے اس کو ظلم کرنے سے باز رکھو۔

یہ حدیث اسی آیت کی تفسیر ہے۔ مظلوم کی مدد تو تعاونوا علی البر ہے، اور ظالم کی مدد اس کو ظلم سے باز رکھ کر تعاون علی التقویٰ ہے۔ اس لیے کسی مجرم کی مدد کرنا، چاہے وہ مجرم اپنا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، اسلام نے

جائز نہیں رکھی۔ اپنا کوئی عزیز کوئی جُرم کر بیٹھے، تو اس کو سزا سے بچانے کی جدّوجہد اور مقدمات کی پیروی وغیرہ اسلام نے قطعاً حرام قرار دی ہے۔ یہاں تک کہ کسی مقدمے میں گواہی دینے سے انکار کرنا یا چھُپ جانا محض اس لیے کہ وہ گواہی اپنے کسی عزیز کے خلاف ہوگی اور اس کی گواہی سے اس عزیز کا نقصان ہوگا، یا خود اپنا نقصان ہوگا، جائز نہیں۔ چنانچہ حکم ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ؀ (نسأ، رکوع ۲۰ کا آغاز)

[اے ایمان والو! تم انصاف پر پُوری طرح قایم رہو۔ اللہ کے گواہ رہو ("اللہ کے گواہ" رہنے کا مطلب اس طرح سمجھیے: یا تو مجرم نے جُرم اللہ کے سامنے کیا ہے یا پھر کوئی معاملہ ہے دو افراد کے درمیان، سو وُہ بھی اللہ کے روبرو ہوا ہے، پس جب تم ان افراد پر گواہی دو تو یہ سمجھ کر دو کہ تم جس امر کی شہادت دے رہے ہو اس کا علیم و بصیر اللہ ہی ہے یعنی خود اللہ تعالیٰ اس کا گواہ ہے اور تمھاری گواہی بھی وہی دیکھ رہا ہے، سُن رہا ہے، لہٰذا گواہی دیتے وقت یہ باتیں اپنے ذہن میں رکھو، تب کوئی شہادت دو) اگرچہ گواہی خود تمھارے ہی خلاف ہو یا تمھارے ماں باپ کے خلاف ہو یا قرابت مندوں کے خلاف ہو۔ اگر وہ مالدار ہو یا فقیر ہو (تو تم نہ مالدار کی پالائش کرو، نہ فقیر پر ترس کھاؤ) اللہ ان دونوں کا سب سے زیادہ کارساز ہے۔ تم ہوائے نفس کا اتباع نہ کرو کہ (گواہی سے) رُوگردانی کرو اور اگر تم نے گول مول بات کہی (جس سے حقیقتِ حال چھپی رہے) یا (گواہی سے) پہلوتہی کی تو (یاد رکھو) تم جو کچھ کرو گے اللہ اس سے باخبر رہے گا]

اس تعلیم کا نام عدل و انصاف اور تکمیلِ انسانیت کی تعلیم ہے اور یہ انسانی فرائض ہیں، جن کی تعلیم کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور جس کی ہدایت کے لیے قرآن مجید اُترا۔ جس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرام کو انسان کامل کا نمونہ بنا کر دُنیا سے آخرت کی طرف کُوچ فرمایا تاکہ بعد میں آنے والے ان آسمانِ ہدایت کے چمکتے ستاروں سے ہدایت حاصل کریں اور انسان بننا سیکھیں۔ چنانچہ کئی لاکھ تابعین نے آسمانِ ہدایت کے ان روشن نجوم سے انسانیت کی تعلیم حاصل کی۔ سچ فرمایا تمھارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی بزرگیوں کو انتہا تک پہنچا دُوں۔ چنانچہ آپؐ نے ساری اخلاقی بزرگیوں کو زبانی تعلیم اور عملی تعلیم کے ذریعے دکھا دیا اور اسی کا نام تکمیلِ انسانیت ہے۔

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین

سید بدرالدین علوی

قرآن مجید کا پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا اور اس کی ہدایت اور اس کے احکام کا بغیر حذف و کمی اور بغیر تغیر و تبدل ہمیشہ قایم رہنا لازمی طور پر اس کا مقتضی تھا کہ وہ عہد نبوت ہی میں مرتب کتابی صورت میں آ جائے تاکہ اصلی معنوں میں محفوظ ہو جائے اور حذف و ترمیم اور تغیر و تبدل کا شبہ ہی مٹ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تیار ہو گیا تھا اور اس کی مکمل کتابت ہو چکی تھی، جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات اس امر کے لیے ناقابل تردید دلائل ہیں:

۱۔ قرآن مجید خود اپنے آپ کو بہت سے مقامات پر حتیٰ کہ مکی سورتوں میں بھی کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ کتاب فصلت ایاتہ۔ (مکی)	یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں واضح کر دی گئی ہیں۔
۲۔ الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب۔ (مکی)	یعنی سب تعریفیں خدا ہی کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔
۳۔ ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ۔ (مدنی)	یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔
۴۔ یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (مدنی)	یعنی پیغمبر لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔

وغیرہ وغیرہ۔

لفظ کتاب کا استعمال مکی سورتوں میں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن مجید آغاز ہی میں کتابی صورت میں مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ قرآن مجید نے جہاں اپنے خلاف کفار کے اعتراضات کو بیان فرمایا ہے، ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ:

قالوا اساطیر الاولین اکتتبھا۔ (فرقان - ۵)	یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن پچھلے لوگوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جس کو پیغمبر نے لکھا دیا ہے۔

یہ اعتراض بزمانہ نزول صرف اسی وقت درست ہو سکتا ہے، جب کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ترتیب پا کر لکھا جاتا تھا۔

احادیث و سیر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن مجید کی تحریر و ترتیب عہد نبوی میں شروع ہو گئی تھی اور وہ اسی زمانہ میں مرتب ہو گیا تھا۔ مثلاً:

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں سے بہت سے لوگوں کو کتابت وحی کے کام پر مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ اس قسم کے اڑتیس صحابہ کرام کی فہرست محدث ابن سید الناس (المتوفی ۷۳۴ھ) نے اپنی کتاب مسمّٰی "عیون الاثر" جلد دوم ص ۳۱۵، ۳۱۶ پر

دی ہے ، جو قرآن لکھا کرتے تھے ۔'السیرۃ الحلبیہ' کی جلد دوم ص ۴۲۶ پر بیس کاتبین وحی کے نام درج ہیں ۔ ان ناموں کو مصنف نے ایک روایت کی رو سے چھبیس اور ایک روایت کی رُو سے بیالیس کاتبین کے ناموں میں سے انتخاب کیا ہے۔ اس فہرست میں خلفاے اربعہؓ ، حضرت معاویہؓ ، عبداللہ بن مسعودؓ ، زید بن ثابتؓ وغیرہ شامل ہیں حضرت معاویہؓ کا کاتبینِ وحی میں ہونا "مجمع الزوائد" جلد اول ص ۶۰ ، ۶۱ اور صحیح مسلم مصری جلد دوم ص ۲۹۴ سے بھی ثابت ہے ، جہاں یہ مذکور ہے کہ ان کے والد ابوسفیان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان سے کتابت کا کام لیا جائے ، چنانچہ حضورؐ نے اس کو منظور فرما لیا تھا ۔

۴ ۔ جب کوئی وحی نازل ہوتی تھی ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبینِ وحی کو منفرداً یا مجتمعاً جیسی صورت ہوتی ، طلب فرماتے اور خود بول کر ان کو وحی لکھوا دیتے ۔ ان واقعات کا ثبوت یہ ہے :

ا ۔ قال عثمان کان اذا انزل علیه الشئ دعا بعض من یکتبه ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۴ مطبوعہ دہلی)	یعنی جب وحی نازل ہوتی ، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبوں میں سے کسی کو لکھنے کے لیے بلاتے ۔
ب ۔ عن البراء لما نزل لا یستوی القاعدون الخ دعا رسول الله زیداً فکتبها ۔ (صحیح بخاری مصری ج ۳ ص ۷۶)	یعنی حضرت براء کہتے ہیں کہ جب آیت لا یستوی القاعدون الخ نازل ہُوئی تو آنحضرت صلعم نے زید کو بلایا اور انہوں نے اس آیت کو لکھ لیا ۔
ج ۔ عن زید بن ثابت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم املی علیه لا یستوی القاعدون ۔	یعنی خود زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لا یستوی القاعدون مجھے بول کر لکھائی ۔
د ۔ عن عبد الله ابن عمرو اذ نحن عند رسول الله نکتب ۔ الخ (سنن دارمی ص ۶۸)	یعنی عبداللہ بن عمروؓ (جو کہ کاتبین وحی میں ہیں) فرماتے ہیں کہ در آنحالیکہ ہم لوگ (جماعت کاتبین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد کتابت میں مصروف تھے ۔

۵ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید لکھوانے کے بعد فرماتے تھے کہ آپ کو پڑھ کر سنایا جائے "تاکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کو درست کرا دیں ۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے :

فاذا فرغت قال اقراء فاقراۃ فان کان فیه سقط قامه ۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ، ص ۶۰)	یعنی جب میں لکھ چکتا ، تو حضرت فرماتے کہ پڑھو ۔ میں پڑھتا ، اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو آپ اس کو درست فرما دیتے ۔

۶ ۔ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی کو قرآن مجید لکھواتے ، تو یہ بھی ہدایت فرماتے کہ آپؐ کی بتلائی ہوئی ترتیب پر لکھیں ۔

ا ۔ ترتیب آیات کے متعلق یہ ارشاد وضاحت کے ساتھ احادیث میں مذکور ہے ۔ چنانچہ ترمذی میں ہے :

فیقول ضعوا ھذا الاٰیات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا و کذا۔	یعنی ان آیتوں کو اس سورت میں لکھو، جس میں فلاں فلاں باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(ترمذی ج ۲، ص ۱۳۴)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ہر سُورت جُدا جدا لکھی جاتی تھی۔

ب۔ سنن ابی داؤد کی حسب ذیل حدیث اس کا ثبوت ہے کہ سورتوں کی ترتیب عہد نبویؐ میں ہو چکی تھی:

عن حذیفۃ انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل۔۔۔۔ فصلی اربع رکعاتٍ یقرء فیھن البقرۃ و آل عمران والنساء والمائدۃ والانعام۔ (ملخصًا)	یعنی حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کو رات کو چار رکعت نماز پڑھتے ہُوئے دیکھا اور آپ نے ان میں سورہ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ اور انعام پڑھیں۔

(سنن ابی داؤد ج ۱، ص ۱۲۸، مطبوعہ نولکشور)

اس حدیث میں ان سور قرآنی کی ترتیب وہی ہے، جو موجودہ قرآن مجید میں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بقیہ سورتوں کی ترتیب بھی یقیناً عہد نبویؐ میں ہوئی ہوگی! اس حدیث کے علاوہ عہد نبویؐ میں قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے مرتب ہو جانے کی شہادت دوسری احادیث سے بھی ملتی ہے:

ا۔ ترمذی میں ہے:

۱۔ عن ابن عباس قال قال رجل یا رسول اللہ ایّ العمل احب الی اللہ قال الحال والمرتحل۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸ و ۱۱۹)	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پُوچھا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا: سفر سے اترنا اور سفر کرنا۔

دارمی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے:

قیل ما الحال والمرتحل قال صاحب القرآن یقرء عن اوّل القرآن الی اٰخرہ و من آخرہ الی اولہ کلما حل ارتحل۔ (دارمی ص ۴۴۱)	یعنی پوچھا گیا کہ سفر سے اترنے اور پھر سفر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والا جو اوّل سے آخر تک تلاوت کرتا ہے اور ختم کر لیتا ہے، تو دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ گویا جیسے ہی تلاوت کا سفر ختم کرتا ہے، ویسے ہی دوسرا سفر تلاوت کا شروع کر دیتا ہے۔

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شروع اور ختم جب ہی ہو سکتا ہے، جب پورا قرآن مجید مرتب ہو۔

۲۔ صحابہ کرامؓ کے اس استفسار پر کہ قرآن مجید کو کتنے دنوں میں ختم کرنا چاہیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف تحدیدیں بیان

فرمائی ہیں، جو پانچ دن سے لے کر چالیس دن تک ہیں۔ ترمذی میں ہے:

عن عبد اللہ ابن عمر قال قلت یا رسول اللہ فی کم اقرأ القرآن قال اختمہ فی شہر قلت انی اطیق افضل ذالک قال اختمہ فی عشرین.... اختمہ فی خمس قلت انی اطیق افضل من ذالک فما رخص لی۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۱۸)

یعنی عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں کتنے دنوں میں قرآن ختم کروں۔ آپ نے فرمایا: ایک مہینے میں۔ میں نے پھر عرض کیا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ بیس دن میں، (بالآخر یہ فرمایا) کہ پانچ دن میں ختم کرو۔ میں نے پھر عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں مگر آپ نے اور کمی کی اجازت نہیں دی۔

ایک اور روایت انہی عبداللہ بن عمرؓ سے ترمذی کے اسی صفحہ پر مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لہ اقرء القرآن فی اربعین۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چالیس دن میں قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

یہ تمام حدیثیں، جو ختم کے متعلق ہیں، اس عہد میں قرآن مجید کے مرتب ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ بغیر ترتیب نہ ابتداء ہو سکتی ہے، نہ اختتام۔ غرض اس طریقہ پر کاتبینِ وحی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے عہدِ نبویؐ ہی میں وجود میں آچکے تھے، جن میں اس وقت تک کی نازل شدہ آیات و سورتیں مرتب تھیں اور آگے اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ چار صحابہ کرامؓ کے مرتب کردہ چار نسخوں کا ثبوت صحیح بخاری مصری جلد سوم صفحہ ۱۴۳ و صحیح مسلم مصری جلد سوم صفحہ ۱۵۲ سے ملتا ہے۔ یہ نسخے حضرت معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور ابو زیدؓ کے تھے۔ اس عہد کے ان چار مرتب نسخوں پر دو نسخوں کا اضافہ رجال و طبقات کی کتابوں کے بیان سے ہوتا ہے۔ ایک تہذیب التہذیب جلد ہفتم صفحہ ۲۴۳ کی سند سے، جو حضرت عقبہؓ ابن عامر الجہنی کا تھا اور دوسرا حضرت سعد بن عبیدؓ کا، جس کا ذکر استیعاب جلد دوم صفحہ ۵۶۵ پر ہے۔

ان اقتباسات کی بنیاد پر چھ نسخوں کا وجود عہدِ نبویؐ میں ثابت ہوتا ہے۔

طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۱۲ میں اس عنوان کے تحت کہ "ان لوگوں کا ذکر، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن جمع کیا تھا" مکررات کو چھوڑ کر تین روایتوں میں دس صحابہؓ کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں چار تو وہی ہیں جو اوپر صحیح بخاری و صحیح مسلم کے حوالہ سے بیان ہوتے۔ پانچواں نام سعد بن عبیدؓ کا ہے، جو استیعاب میں مذکور ہے۔ اس کے بعد پانچ دوسرے نام یہ ہیں: حضرت ابوالدرداءؓ، خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ، تمیم داریؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور ابو ایوب انصاریؓ، خلیفہ چہارم حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ بھی جامعینِ عہدِ نبویؐ میں ہیں، چنانچہ استیعاب میں ہے:

روی ربیعۃ بن عثمان عن محمد بن کعب القرظی قال کان ممن جمع القرآن علی

یعنی ربیعہ بن عثمان نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے عہدِ نبویؐ میں جب کہ آنحضرت

عہد رسول اللہ وھو حیٌّ عثمان ابن عفان وعلی ابن ابی طالب وعبد اللہ ابن مسعود من المہاجرین و سالم مولیٰ ابی حذیفۃ ۔(استیعاب جلد ۲ ص ۴۸۵)

صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے ، قرآن اکٹھا کیا ، ان میں سے عثمانؓ بن عفان، علیؓ بن ابی طالب ، عبداللہؓ ابن مسعود اور سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہ بھی شامل ہیں ۔

اس طور پر جملہ مدوان مرتب نسخوں کی تعداد ہو جاتی ہے ۔ اس فہرست میں مجھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام نہیں ملے ۔ لیکن چونکہ یہ حضرات بلاشبہ کاتبین وحی میں داخل ہیں، اس لیے اس کا یقین کامل ہے کہ انھوں نے بھی نسخے تیار کیے ہوں گے ۔ گو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جتنی تعداد کاتبین وحی کی تھی ، اتنے ہی نسخے قرآن مجید کے مرتب ہوئے ہوں گے۔ لیکن باوجود اس یقین کے میں ان کو شمار نہیں کرتا۔ مگر ذیل میں بعض ایسے واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے مرتب نسخے عہد عہد نبویؐ میں موجود تھے، جن کو آنحضرتؐ نے بعد وفات چھوڑا۔

۱۔ صحیح مسلم میں ہے:

نہی رسول اللہ ان یسافر بالقرآن الی ارض العدو ۔(مسلم ج ۲ ص ۹۲)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قرآن مجید کے نسخوں کو غنیم کے ملک میں لے جانے سے منع فرمایا۔

۲۔ موطا امام مالک کے باب الامر بالوضوء لمن مس القرآن میں ہے:

مالک عن عبد اللہ ابن ابی بکر ابن حزم ان فی الکتاب الذی کتبہ رسول اللہ لعمرو ابن حزم ان لا یمس القرآن الا طاھر۔

(موطا امام مالک ص ۸۵، مطبوعہ مصر)

یعنی جو شخص قرآن چھونا چاہے، اس کے لیے وضو کا حکم ہے۔ امام مالک عبد اللہ ابن ابی بکر بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ ان ہدایات میں جو آنحضرت صلعم نے ابن حزم کے لیے تحریر فرمائیں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص قرآن مجید کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگائے۔

۳۔ کنز العمال میں ہے:

لا تغرنکم ھذہ المصاحف المعلقۃ۔

(کتاب مذکور جلد اول ص ۱۴۴)

(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ قرآن مجید کے نسخے لٹکے ہوئے دیکھے اور فرمایا) کہ اے لوگو! تم ان سے دھوکہ میں نہ پڑ جانا یعنی ان کا پڑھنا ہی کافی نہیں، عمل کی بھی ضرورت ہے۔

۴۔ سنن ابی داؤد میں ہے:

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ کتاب اللہ ۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے اندر ایک ایسی چیز (قرآن) چھوڑے جاتا ہوں جس کے

بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے، اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو۔ (سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲۷۰ مطبوعہ نولکشور)

یہ فرمانا اسی وقت درست ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کتابی صورت میں ہر چیز کی دسترس کے اندر ہو۔

۵۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا و شداد بن معقل علی ابن عباس فقال لهٗ شداد بن معقلٍ اترك النبی من شئ قال ما ترك الا ما بین الدفتین قال ودخلنا علی محمد بن الحنفیة و سالناه فقال ما ترك الا ما بین الدفتین۔ (بخاری جلد ۲، ص ۷۴۴)

یعنی عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد ابن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز ترکہ میں چھوڑی ہے۔ انھوں نے جواب دیا نہیں، بجز اس کے کہ جو دو پٹھوں کے درمیان ہے۔ پھر ہم محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور یہی سوال کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز نہیں چھوڑی بجز اس کے جو دو پٹھوں کے درمیان ہے۔

ان دونوں جوابوں سے علاوہ قرآن مجید بصورت کتاب لکھے ہونے کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جلد بندی کا دستور ہو چکا تھا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ:

ا۔ کیا فنِ تحریر اس زمانہ میں ایسا عام ہو چکا تھا کہ قرآن مجید کے مکتوبہ نسخوں کا بکثرت پا یا جانا فرض کیا جا سکتا ہے؟

ب۔ اور اس مقصد کے لیے کاغذ دستیاب ہوتا تھا؟ خود قرآن مجید ہی سے ان کا جواب مل جاتا ہے۔

د۔ ایک مقام پر حکم خداوندی ہے:

یٰایها الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجلٍ مسمی فاکتبوه۔ (البقرہ۔ ۲۸۲)

یعنی اے ایمان والو! جب تم کوئی قرض کا معاملہ کرو، جو مدت معینہ کے لیے ہو تو لکھ لیا کرو۔

اس عام حکم سے بہت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ فنِ تحریر اتنا عام تھا کہ ہر شخص ہر وقت اس کا انتظام کر سکتا تھا۔

اس فن کے مروّج ہونے کا مزید ثبوت حسب ذیل امور سے بھی ملتا ہے:

ا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:

لما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قالوا انهم

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا، تو لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ

لا یقرؤون کتاباً الا مختوماً فاتخذ رسول اللّٰہ خاتماً من فضۃ۔ (صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۵۸)

خط کو اس وقت تک نہیں پڑھتے، جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے حضورؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کرائی۔

۲۔ حدیبیہ کے صلح نامہ کی کتابت اتنی ثابت شدہ ہے کہ اس کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں۔

۳۔ صحیح مسلم میں ہے کہ:

لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ (جلد ۲، ص ۳۹۳)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بجز قرآن کے مجھ سے اور کوئی چیز نہ لکھو۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ لکھنا عام تھا اور بہت سے لوگ اس کو جانتے تھے۔ دُوسرے یہ کہ ایک طریقہ جاری ہوگیا تھا کہ لوگ قرآن مجید کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بولنے پر لکھا کرتے تھے۔

۴۔ صحیح بخاری میں ہے:

اکتبوا الی من تلفظ بالاسلام۔ (جلد ۲، ص ۱۱۲)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے واسطے ان لوگوں کے نام لکھ دو، جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

۵۔ تاریخی واقعہ مندرجہ طبقات ابن سعد جلد دوم صفحہ ۱۴ کہ اسیرانِ بدر جو فدیہ نہ دے سکتے تھے، ان کی رہائی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ ان میں کا ہر شخص مسلمانوں کے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھا دے۔

۶۔ فقال الا تعلمین ھٰذہ رقیۃ النملۃ کما علمتھا الکتابۃ۔

(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفاء بنت عبداللہ سے) فرمایا کہ تُو نے حفصہؓ کو چیونٹیوں کے کاٹنے کا جھاڑنا کیوں نہیں بتلایا، جیسا کہ تُو ان کو لکھنا سکھا چکی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں۔

ب۔ اس دور میں کاغذ کی دستیابی خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ ارشاد ہے:

ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھٰذا الا سحر مبین۔ (الانعام۔ ۷)

یعنی اگر ہم آپ کے اُوپر کوئی کتاب کاغذ پر لکھی ہوئی نازل کرتے اور لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو کفار یہ کہہ دیتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض کاغذ کی دستیابی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کاغذ عام طور پر دستیاب نہ ہوتا رہا ہو۔ لیکن اس کی قائم مقام کوئی اور چیز مثلاً چمڑا یا اُونٹ کی ہڈی وغیرہ آسانی سے مل جاتی تھی۔ چنانچہ چمڑے کا استعمال زمانہ جاہلیت کی

شاعری میں مذکور ہے۔ جیسا کہ مرقش اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے: ؎

الدار قفروا للرسوم کما
رقش فی ظہر لا ذیم قلم

(یعنی معشوقہ کا مکان ویران پڑا ہے، لیکن نشانات ایسے نمایاں ہیں، جیسے چمڑے پر قلم نقش بناتا ہے)

غرض یہ شبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ قرآن مجید کتابی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب ہوکر لوگوں میں رائج ہو چکا تھا۔ البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا موجودہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب وہی ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرار دی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں ہے اور اس کے حسب ذیل چار دلائل ہیں:

۱۔ سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مضبوط یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید کی نقل بذریعہ تواتر ہے۔ یعنی ہر زمانہ میں ایک ایسی بڑی جماعت نے اپنے بعد والوں کو قرآن مجید پہنچایا ہے، جس کے افراد مختلف نسلوں اور مختلف جگہوں کے لوگ تھے جو ایک دوسرے سے طویل مسافت پر بستے تھے اور پھر مختلف زمانوں میں تھے اور عقل کے نزدیک غیر ممکن ہے کہ اس اختلاف نسل اور اختلاف زمان و مکان کے باوجود سب لوگ کسی جھوٹ کو پھیلانے پر متفق ہو جائیں۔ تواتر کو قرآن مجید کے ساتھ اتنا ربط ہے کہ قرآن مجید کی تعریف ہی بلا استثناء تمام اسلامی فرقوں میں یہ قرار پائی ہے، کہ قرآن اس کتاب کا نام ہے، جو دو دفتیوں کے اندر بنقل تواتر چلی آ رہی ہے۔ علم اصول فقہ کی رُو سے تواتر کو وہ قوت حاصل ہے کہ جو خبر احاد سے ہرگز متزلزل نہیں ہو سکتی۔ (خبر احاد تواتر کا مقابل ہے، جس کے معنی انفرادی طور پر نقل کے ہیں) چاہے اس خبر احاد کو کتنی ہی بڑی طاقت و اعتبار حاصل ہو۔

قرآن مجید کے ذریعے تواتر نقل کا بیان درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تنہا بلا شرکت غیر نازل فرمایا تھا، اس لیے تنہا آپ ہی کو اس کا حق تھا کہ خود زبان مبارک سے بول کر ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اس کو جمع کریں اور لکھوائیں۔ اور آپ نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح مومنین کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کا حق بھی اپنی دی ہوئی ترتیب کے ساتھ تنہا آپ ہی کو تھا۔ چنانچہ آپ لوگوں کو اس کے پڑھنے اور یاد کرنے کی ترغیب دلاتے تھے جس کی بکثرت حدیثیں موجود ہیں، مگر بنظر اختصار یہاں صرف ایک حدیث کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

مثل الذی یقرء القرآن و ھو حافظ لہٗ مع السفرۃ الکرام۔
(صحیح بخاری، ج ۳، ص ۱۳۲)

یعنی جو شخص قرآن کو پڑھتا ہے ایسی صورت میں کہ اس کا حافظ بھی ہے، تو ایسا شخص باعظمت فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔

ان ترغیبات کے سوا ایک اور بڑی وجہ قرآن مجید کے یاد کرنے اور پڑھنے کی یہ ہے کہ پنج وقتہ نماز میں اس کی تلاوت فرض ہے اور عہد رسالت میں ہر مومن کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے سینہ میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کو محفوظ رکھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ترتیب پر ہو۔ چنانچہ ہر مسلمان اس بات کی انتہائی کوشش کرتا تھا کہ وہ براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

سے قرآن کو حاصل کرے۔ اگر کتابت نہ جانتا ہو۔ تو محض حفظ کے لیے ورنہ حفظ و تحریر دونوں کے لیے۔ رسول اللہؐ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے بعد ان سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ آپؐ کے سامنے اُس کو پڑھیں اور جب لوگ پڑھتے تو آپؐ اس کو سُنتے۔

یہ تو خود قرآن سے ثابت ہے کہ لوگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہے:

یعلمهم الکتاب و الحکمة۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

لقد اخذت من فی رسول الله بضعاً و سبعین سورة۔ (جلد دوم ص ۱۴۱)

یعنی میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے تقریباً اناسی سورتیں یاد کیں۔

اس حدیث میں پُورے قرآن کی تفصیل مذکور نہیں۔ لیکن ابن مسعودؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُورا قرآن حاصل کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی یہ ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم قرآن مقرر فرمایا اور ان کا نام سب سے پہلے رکھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائش کرکے ان سے قرآن سُنتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:

قال لی رسول الله اقراء علی القرآن فقلت اا قراء علیك و علیك انزل قال انی اشتهی ان اسمعه من غیری فقرات النساء۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۲۱)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سُناؤ۔ میں نے کہا کہ کیا میں آپؐ کو پڑھ کر سناؤں درآنحالیکہ وہ آپ ہی پر نازل ہُوا ہے، تو آپ نے فرمایا میں دوسرے لوگوں سے سننے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اس پر میں نے سورۂ نسأ تلاوت کی۔

اس طریقہ پر صحابہ کی اکثریت قرآن مجید کی حفظ و تعلیم میں مشغول تھی، جن میں خلفاے اربعہ تقدم کا حق رکھتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات کو ہر اس چیز کے ساتھ غایت درجہ کا شوق اور غیر معمولی توغل تھا، جو دین سے تعلق رکھتی تھی۔ مندرجہ ذیل واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں:

ا ——— (ا) حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہُوئی "من یعمل سوء یجز به" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ! جو آیت نازل ہُوئی ہے، کیا وُہ تمہیں نہ پڑھاؤں۔ میں نے کہا، ہاں۔ تو وہ آپ نے مجھے پڑھائی۔ (ترمذی جلد دوم، صفحہ ۱۲۹)

(ب) استدل الامام ابوالحسن الاشعری (المتوفی ۳۲۴ھ) علی حفظه القرآن بدلیل لا یرد وهو انه قال یوم القوم اقراهم الکتاب و اکثرهم قرآنا و تواتو عنه انه قدمه

یعنی امام ابوالحسن اشعری نے حضرت ابوبکرؓ کے حافظ قرآن ہونے پر ایک ایسی دلیل پیش کی ہے، جو کہ رد نہیں کی جا سکتی اور وُہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ لوگوں کی امامت ایسے شخص کو کرنی چاہیے، جو قرآن کا قاری ہونے کے اعتبار سے

الامامة - (اتقان، ص ۲۱۸) ان سب میں بہتر ہو اور جس کے سینے میں قرآن سب سے زیادہ ہو۔

یہ ہدایت اور اس کے بعد آپ کا فعل، جو بذریعہ تواتر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ ایک بہت مضبوط دلیل ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قال ابو العالیة قرأت القرآن علی عمر اربع مرات۔ (مفتاح السعادة ج ۱ ص ۳۴۶)	یعنی ابو العالیہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا دور حضرت عمرؓ کے روبرو چار مرتبہ کیا۔
۳۔ کان (عثمان) یختم القرآن فی رکعة واحدة۔ (استیعاب جلد ۲، ص ۴۴۱)	یعنی حضرت عثمانؓ ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔
۴۔ عن ابی عبد الرحمٰن السلمی قال ما رأیت اقرأ من علی۔	یعنی ابو عبد الرحمٰن السلمیؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے بڑھ کر کوئی قرآن کا قاری نہیں دیکھا۔

(استیعاب جلد ۲ ص ۴۷۶)

بہرحال سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے قرآن مجید کو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا، جن میں بہت سارے ایسے حضرات ہیں، جو خصوصیت کے ساتھ اس میں شغف رکھتے تھے اور یہ لوگ بطور معلم لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے مقرر ہوئے۔ ان میں سے چار معلموں کا تقرر صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۸۱ او صحیح مسلم جلد دوم ص ۲۹۳ اور ترمذی جلد دوم ص ۲۲۲ سے ثابت ہے۔ ان سب کتابوں میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ ابن مسعودؓ، سالمؓ، معاذ بن جبل اور ابن ابی کعبؓ کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے مقرر فرمایا۔ ان چاروں اصحاب نے بعض دوسرے صحابہ کے ساتھ، جو اس تعلیم کے لیے مقرر ہوئے تھے (کیونکہ چار کی تعداد ناکافی ہے) بے شمار اشخاص کو عہد نبویؐ میں اور آپ کے بعد مختلف مقامات پر قرآن مجید کی تعلیم دی۔ یہ امور حسب ذیل واقعات سے واضح ہوتے ہیں:

۱۔ عبادة ابن الصامت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشغل فاذا قدم الرجل مهاجراً دفعه الی رجل منا یعلّمه القرآن۔ (کنز العمال جلد ا صفحہ ۲۲۱)	یعنی عبادہ بن الصامتؓ کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہؐ مشغول ہوتے اور کوئی آدمی ہجرت کر کے آتا، تو آپ اس کو ہم انصار میں سے کسی کے سپرد کر دیتے کہ اس کو قرآن پڑھا دے۔

۲۔ استیعاب جلد اول صفحہ ۲۶۹ میں ہے کہ آپ نے قبائل قارہ اور عضل کو قرآن پڑھانے کے لیے چھ اصحاب مقرر فرمائے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"النفر ستة الذین بعثهم رسول اللہ الی رهط من عضل و القارة فی سنة ثلاث من الهجرة لیفقهوهم فی الدین و یعلّموهم القرآن وهم عاصم ابن ثابت و مرثد ابن ابی مرثد و خبیب ابن عدی و خالد ابن البکیر و زید ابن الدثنه و عبد اللہ

ابن طارقؓ

۳۔ ۱۰ھ ہجری میں قبیلہ بنی الحارث کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے واسطے خالد بن ولیدؓ کو مقرر فرمایا۔ بعث فیھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالد ابن الولید الی بنی الحارث ...... علمہم الکتاب اللہ۔

(طبری جلد سوم ص ۱۵۶، مطبوعہ مصر)

۴۔ یزید بن ابی سفیان کی درخواست پر، جو عہد فاروقی میں شام کے گورنر تھے، حضرت عمرؓ نے معاذؓ، عبادہؓ اور ابو درداءؓ کو حمص، دمشق اور فلسطین میں قرآن شریف کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا۔ اس قسم کے تقررات کی شہادت اور روایتوں سے بھی ملتی ہے جن کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی۔

۵۔ طبقات القراء ذہبی میں ہے:

قال سوید ابن عبد العزیز کان ابو الدرداٗ اذا صلی الغداۃ فی جامع دمشق اجتمع الناس للقرأۃ علیہ فکان یجعلہم عشرۃ عشرۃ وعن مسلم بن مشکم قال قال لی ابو الدرداء اعدد من یقرء عندی القراٰن فعددتہم الفا وستمائۃ ونیفاً۔

یعنی حضرت ابو درداءؓ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو دس دس آدمیوں کی جدا جدا جماعت قایم کرتے۔ ایک بار تمام طلبہ کو شمار کرانے پر معلوم ہوا کہ بہ یک وقت ایک ہزار چھ سو سے زاید طلبہ تھے۔

(طبقات القراء، ص ۶۰۶)

ان معلمین نے خود تعلیم دینے کے بعد اپنے قایم مقاموں کو مقرر کرنے کا سلسلہ جاری کیا۔ چنانچہ اپنے شاگردوں میں سے چند ممتاز لوگوں کو معلمی کی خدمت پر مامور کرتے تھے، جو نہایت توجہ سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔ پھر ان شاگردوں نے اپنے شاگردوں میں سے مستحق طلبہ کو اپنا قایم مقام بنایا۔ اس طرح یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا، جو اب تک جاری ہے۔ اس طریقہ سے بے شمار اشخاص کے ذریعہ سے، جو مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں کے سیکڑوں برس کے اندر دُنیا کے دُور و دراز مقامات میں گزرے ہیں، قرآن مجید کی روایت ہوتی چلی آتی ہے اور اسی کا نام تواتر ہے۔

قرآن مجید کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے املا اور ترتیب پر تیار ہُوئے تھے، وہ تحریر اور زبانی قرأت دونوں میں باہم مطابق تھے۔ اس لیے کہ دونوں کاموں میں خود رسُول اللہؐ کا دستِ مبارک شامل تھا اور زبانی قرأت میں اکثر تحریری نسخوں کے ساتھ مقابلہ ضروری تھا۔ بالخصوص ایسے مواقع پر جہاں تشابہ لگ جائے۔ ان میں اختلاف نہ ہونے کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ وعدۂ الٰہی ہے:

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحافظون۔ یعنی ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

اگر اختلاف ہوگیا، تو پھر حفاظت کیا ہوئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اس کی اہمیت سے پُوری طرح واقف تھے کہ

قرآن مجید کے ہر معاملہ میں توافق اور تطابق ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان کو بتلایا تھا:

لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔	یعنی اگر قرآن مجید غیر خدا کی جانب سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لیے جب خدا کی جانب سے اختلاف غیر ممکن تھا، تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انسانوں کی جانب سے اس میں اختلاف پیدا کر دیا جاتا۔

۲۔ عہد نبویؐ کی ترتیب اور موجودہ مصحف کی ترتیب میں مطابقت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے۔ اس دورے میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کی تکرار ترتیب کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی، اس سال قرآن مجید کا دور دوبار ہوا۔ دور اوّل کا واقعہ صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۴۱ میں مذکور ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دورہ غیر مرتب صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ترتیب آیات اور ترتیب سور ضروری ہے، جو بتوفیق الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اسی ترتیب کے ساتھ آپ نے قرآن مجید اُمت کو اشاعت کے لیے دیا۔ اس لئے یہ ہرگز بھی خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس ترتیب میں، جو بتوفیق الٰہی ہو چکی تھی کوئی تغیر و تبدل کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کی روایتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس ترتیب میں تغیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً:

ا۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

ان الحجاج خطب فقال ان ابن الزبیر بدل کلام اللہ فقام ابن عمر فقال کذب لم یکن ابن الزبیر لیستطیع ان یبدل کلام اللہ و لا انت۔ (جلد اوّل ص ۳۷)	یعنی حجاج نے خطبہ دیا اور کہا کہ ابن زبیرؓ نے کلام خدا کو بدل دیا۔ ابن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ جھوٹ ہے۔ نہ ابن زبیرؓ کو یہ طاقت تھی کہ وہ کلام اللہ کو بدل سکتے اور نہ تجھ کو یہ مقدور ہے۔

ب۔ صحیح بخاری میں ہے:

قال ابن الزبیر لعثمان ابن عفان والذین یتوفون منکم الخ قال قد نسختھا الآیۃ الاخری فلم تکتبھا او تدعھا قال یا ابن اخی لا اغیر شیئاً منہ من مکانہ۔ (صحیح بخاری جلد ۳ ص ۶۷)	یعنی ابن زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آیت والذین یتوفون منکم الخ ایک دوسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہے تو آپ اس آیت کو نہ لکھتے۔ یا یہ کہا کہ اس کو چھوڑ دیتے۔ اس پر عثمان نے کہا کہ اے میرے بھتیجے! میں قرآن کی کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

الغرض جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھوں میں بذریعہ تواتر موجود ہے، وہ یقیناً اسی ترتیب کے مطابق ہے، جس پر

حضرت جبرئیل علیہ السلام کا دورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سالانہ ہوا کرتا تھا۔

۳۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت کو ہفتہ پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ہر روز کے لیے ایک مقدار معین فرمالی تھی اس مقدار کا نام حزب ہے۔ حزب کی جو تفصیل حدیث میں آئی ہے، وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب سور عہد نبویؐ میں بالکل وہی تھی جو آج ہے۔ اس کی شہادت کے لیے احادیث ذیل ملاحظہ ہوں:

ا۔ عن اوس ابن حذیفة الثقفی قال کنت فی الوفدین الذین اسلموا من ثقیف ..... فقال لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم طراء علی حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتی اقضیه فسألنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم و قلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلث سور و خمس سور و تسع سور و احدیٰ عشرة سورة و ثلث عشرة سورة و حزب المفصل من قٓ حتی یختم۔ (مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۹ (۳۴۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا معمول آج قرآن مجید پڑھنے سے رہ گیا تھا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب اس مقدار معین کو ادا کر لوں، اس وقت باہر نکلوں . . . . . اس بات پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کا حزب، کس طریقہ سے مقرر کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دُوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا نو سورتوں کا، چوتھا گیارہ سورتوں کا، پانچواں تیرہ سورتوں کا اور چھٹا آخری مفصل کا جو سورہ قٓ سے ختم قرآن تک ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترتیب سور اِس وقت ہے، وہی اُس وقت بھی تھی۔

ب۔ عن واثلة ابن الاسقع قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اعطیت مکان التوراة السبع الطوال و اعطیت مکان الزبور المأیتین و اعطیت مکان الانجیل السبع المثانی و فصلت بالمفصل۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۰۷)

یعنی مجھ کو تورات کے بدلہ میں قرآن کی سات بڑی سورتیں عطا ہُوئی ہیں اور زبور کے بدلہ میں دو سو آیتوں والی سُورتیں اور انجیل کے بدلہ میں سورہ فاتحہ اور مجھ کو مفصل سورتیں عطا فرما کر فضیلت دی گئی ہے۔

عہد نبویؐ کی ترتیب سے موجودہ قرآن کی ترتیب کی مطابقت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اکابر علماے اسلام، جو مختلف قوموں اور فرقوں اور زمانوں میں گزرے ہیں، شروع سے آخر تک اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن المجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جمع ہو چکا تھا اور اس کی آیتیں اور سُورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائی تھیں اور پھر اسی ترتیب

کے ساتھ وہی مجموعہ بذریعہ تواتر مسلمانوں میں برابر چلا آرہا ہے۔ ان میں سے بعض علماء کی رائیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) سے جو قدیم ترین علماء میں ہیں، اتقان میں منقول ہے:

عن ابی وھبٍ سمعت مالکًا یقول انّما الّف القرآن علیٰ ما کانوا سمعوا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (اتقان ص۱۴۴)

یعنی قرآن کی تالیف اسی طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقہ پر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔

۲۔ امام بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) کا یہ قول بھی اتقان میں ہے:

قال البغوی فی شرح السنة الصحابة جمعوا بین الدفتین القرآن الذی انزله اللہ علیٰ رسوله فکتبوہ کما سمعوہ من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من غیر ان قدموا شیئًا اواخروا او وضعوا له ترتیبًا لم یاخذوہ من رسول اللہ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یلقن اصحابه و یعلمهم ما نزل علیه من القرآن علی الترتیب الذی ھو الاٰن فی مصاحفنا بتوقیت جبریل ایاہ علیٰ ذٰلك واعلامه عند نزول کل آیة ان ھٰذہ الاٰیة تکتب عقب اٰیة کذا فی سورة کذا۔ (اتقان ص ۱۴۴، ۱۴۵)

یعنی امام بغوی نے اپنی کتاب شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ صحابہ نے دو پٹھوں کے اندر اسی قرآن کو لکھا، جس کو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا۔ جیسا انھوں نے سُنا، ویسا ہی لکھ لیا۔ نہ اس میں کسی چیز کو آگے رکھا اور نہ کسی چیز کو پیچھے کیا، اور نہ کوئی ایسی ترتیب دی کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہ کیا ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو قرآن اسی ترتیب پر تلقین کردیتے تھے، جو اس وقت ہمارے نسخوں میں ہے اور یہ اس طور پر تھا کہ جبریلؑ بوقتِ نزول آپؐ کو بتلا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد فلاں سُورہ میں لکھی جائے۔

۳۔ ابن الحصار فرماتے ہیں:

ترتیب السور و وضع الآیات مواضعها انما کان بالوحی وکان رسول اللہ یقول ضعوا آیة کذا فی موضع کذا فقد حصل الیقین من النقل المتواتر بهذا الترتیب من تلاوة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ومما اجمع الصحابة علیٰ وضعه۔ (اتقان ص ۱۴۵)

یعنی ابن الحصار کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کی جگہیں وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ پر لکھو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور صحابہؓ کے اجماع سے جو بہ نقل متواتر ہے یہ بات بالکل یقینی ہے۔

۴۔ ابوبکر ابن انباری (متوفی ۳۲۸ھ) کا بیان ہے:

انزل الله القرآن كله الى سماء الدنيا ثم فرقه فى بضع وعشرين سنة فكانت السورة تنزل لامر يحدث والآية جواباً لمستخبر فيوقف جبريل للنبى صلى الله عليه وسلم على موضع الآية والسورة فاتساق السور كاتساق الآيات والحروف كله عن النبى صلى الله عليه وسلم فمن قدم سورةً او اخرها فقد افسد نظم القرآن۔ (اتقان، ص ۱۴۵، ۱۴۶)

ابوبکر بن الانباری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن سارے کا سارا سماءِ دنیا پر نازل فرما دیا پھر بیس سال سے کچھ زیادہ میں اس کو بانٹ دیا۔ چنانچہ سورۃ کسی پیش آمدہ واقعہ کے لیے اور آیت سائل کے سوال کے جواب میں اترتی تھی۔ تو جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت اور سورۃ کی جگہ بتلا دیتے تھے۔ اس لیے سورتوں کی ترتیب بھی مثل آیتوں کی ترتیب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرتب کردہ ہے اور اگر کوئی شخص کسی سورت کو مقدم یا موخر کرے گا، تو وہ نظمِ قرآنی کو بگاڑ دے گا۔

۵۔ برہان الدین ابوالقاسم محمود بن حمزہ ابن نصر الکرمانی المقری الشافعی (صاحب کتاب البرہان فی توجیہ متشابہ القرآن) (متوفی بعد ۵۰۰ھ) کذا فی الکشف فرماتے ہیں:

ترتيب السور هكذا هو عند الله فى اللوح المحفوظ على هذا الترتيب وعليه كان النبى صلى الله عليه وسلم يعرض على جبريل كل سنة ما كان يجتمع عنده فيه وعرضه عليه فى السنة التى توفى فيها مرتين۔ (اتقان، ص ۱۴۶)

کرمانی نے اپنی کتاب برہان میں لکھا ہے کہ سورتوں کی ترتیب اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں لوحِ محفوظ میں ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبریلؑ سے جمع شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے، جو آپ پر اس وقت نازل ہو چکا ہوتا تھا، سالِ وفات میں دو بار حضرت جبرئیل کے ساتھ دورہ ہوا۔

۶۔ طیبی (متوفی ۹۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

قال الطيبى انزل القرآن اولاً جملة واحدة من اللوح المحفوظ الى السماء الدنيا ثم نزل على حسب المصالح ثم اثبت فى المصاحف على التاليف والنظم المثبت فى اللوح المحفوظ۔ (اتقان، ص ۱۴۶)

یعنی طیبی کہتے ہیں کہ قرآن پہلے مجموعی طور پر لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر نازل ہوا۔ پھر ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ پھر اسی ترتیب کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں ہے، مصاحف میں لکھا گیا۔

۷۔ احمد ابن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (متوفی ۷۰۸ھ) فرماتے ہیں کہ:

قال ابو جعفر ابن الزبیر الآثار تشهد لذلک کقوله اقرؤا الزهراوین والبقرة وآل عمران رواه مسلم وکحدیث سعید ابن خالد صلّی رسول الله بالسبع الطوال فی رکعة رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه و فیه انه کان یجمع المفصل فی رکعة و روی البخاری عن ابن مسعود انه قال فی بنی اسرائیل والکهف و مریم و طٰهٰ والانبیاء انهن من العتاق الاول وهن من تلادی و ذکرها نسقا کما استقر ترتیبها و فی البخاری انه علیه السلام کان اذا أوی الی فراشه کل لیلة جمع کفیه ثم نفث فیها یقرأ قل هو الله احد و المعوذتین ۔ (اتقان ص ۱۰۷)

یعنی ابو جعفر ابن زبیر کہتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ترتیب کی شہادت دیتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چمکتی ہوئی سورتیں بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح سعید ابن خالد کی یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات بڑی بڑی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنفہ میں روایت کیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور بھی حدیث ہے کہ آنحضرتؐ مفصل سورتوں کو ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالتے تھے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ سب کی سب اعلیٰ درجہ کی سورتیں ہیں۔ اور یہ میرا مال موروثی ہیں۔ اس طرح ان سورتوں کا ذکر اسی ترتیب سے فرمایا، جس ترتیب کے ساتھ آج وہ ہیں۔ بخاری میں بھی یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تھے تو اپنی ہتھیلیوں کو ملا کر قل ہو اللہ اور معوذتین پڑھ کر پھونکتے تھے۔

۸۔ ابو جعفر النحاس (متوفی ۳۳۸ھ) فرماتے ہیں:

قال ابو جعفر النحاس المختار ان تالیف السور علی هذا الترتیب من رسول الله لحدیث واثلة اعطیت مکان التوراة السبع الطوال لحدیث قال فهذا الحدیث یدل علی ان تالیف القرآن ماخوذ عن النبی صلی الله علیه وسلم وانه من ذلك الوقت، وانما جمع فی المصحف علی شیٔ

یعنی ابو جعفر النحاس کہتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی یہی ترتیب رسول اللہؐ کی دی ہوئی ہے جیسا کہ حدیث واثلہ سے معلوم ہوتا ہے (یہ حدیث پہلے ذکر کی جا چکی ہے) یہ حدیث صاف بتلاتی ہے کہ قرآن کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اسی وقت کی ہے اور اس وقت کا قرآن اسی ترتیب پر ہے۔ اس لیے کہ یہ حدیث ترتیب قرآن

واحدا لانه قد جاء هذا الحديث بلفظ رسول الله على تاليف القرآن قال و ممّا يدل على ان ترتيبها توقيفي ما اخرجه احمد و ابوداؤد عن اوس ابن ابي اوس حذيفة الثقفي قال كنت في الوفد الذين اسلموا من ثقيف الخ قال فهذا يدل على ان ترتيب السور على ما هو في المصحف الآن كان على عهد رسول الله قلت ومما يدل على انه توقيفي كون الحواميم رتبت ولاءً وكذا الطواسين ولم يرتب مسبحات ولاء بل فصل بين سورها و فصل بين طسم الشعراء وطسم القصص بطس مع انها اقصر منها ولو كان الترتيب اجتهاديا لذكرت المسبحات ولاءً واخرت طس عن القصص۔ (اتقان ص ۱۴۷، ۱۴۸)

کے متعلق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں ہے۔ ابوجعفر یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے پر اوس ابن ابی اوس کی روایت بھی دلالت کرتی ہے (یہ روایت بھی اوپر گزر چکی ہے) علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حٰم سے شروع ہونے والی سورتیں مرتب لائی گئی ہیں اور اسی طرح سے طٰس والی بھی، لیکن یسبّح یا سبّح سے شروع ہونے والی سورتیں ترتیب وار نہیں بلکہ ان کے اندر فصل واقع ہے۔ اسی طرح طسم، سورہ شعراء، و طسم، سورہ قصص کے بیچ میں طس ہے۔ حالانکہ وہ ان دونوں سے چھوٹی ہے۔ اس لیے اگر ترتیب اجتہادی ہوتی تو مسبحات ترتیب وار لائی جاتیں اور طس سورہ قصص سے پیچھے لائی جاتی۔

۹۔ ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) کا بیان ہے:

والقول بان تقسيم آيات القرآن وترتيب مواضع سورة شيءٌ فعله الناس ليس هو من امر رسول الله فقد كذب هذا الجاهل وافك اتراه ما سمع قول الله تعالى ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها او مثلها وقول رسول الله في آية الكرسي وآية الكلالة و الخبر انه كان يامر اذا نزلت الآية ان تجعل في سورة في موضع كذا ولو ان الناس رتبوا سورة لما تعدوا احد وجوه ثلثة امّا ان يرتبوها على الاوّل

یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ آیات قرآنی اور اس کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور نہ اس کے رسولؐ کے حکم سے، ایسا شخص جاہل اور بہتان باندھنے والا ہے۔ کیا اس شخص نے یہ آیت نہیں سنی (جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کے عوض اس سے بہتر یا اس جیسی لا دیتے ہیں) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی اور آیۃ الکلالہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ اس کے علم میں نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے، یہ آیت فلاں سورت میں فلاں

فالاوّل نزولاً او الاطول فما دونه اوالا قصر فما فوقه فاذا لیس کذٰلک، فقد صح انه امر رسول الله لا یعارض عن الله عزّ وجلّ لا یجوز غیر ذلک اصلاً۔

(کتاب الفصل جلد ۴، ص ۲۲۱)

جگہ دی جائے اگر لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا ہوتا تو وہ اس کے تین ہی طریقے اختیار کرتے یا بترتیب نزول مرتب کرتے، یا پہلے بڑی سورتیں رکھتے، اس کے بعد چھوٹی یا پہلے چھوٹی رکھتے، اس کے بعد بڑی لیکن جب یہ صورت نہیں ہے تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے مرتب ہونا ثابت ہے اور یہ چیز خدا کی جانب سے ہونے کے معارض نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔

یہی ابن حزم قرآن مجید کے نسخوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

مات رسول الله صلی الله علیه وسلم والاسلام قد انتشر وظهر فی جمیع جزیرة العرب من منقطع البحر المعروف ببحر القلزم ماراً الی سواحل الیمن کلها الی بحر فارس الی منقطعه ماراً الی الفرات ثم الی ضفة الفرات الی منقطع الشام الی بحر القلزم وفی هذه الجزیرة من المدن والقری ما لا یعرف عدده الا الله کالیمن والبحرین وعمان ونجد وجبل طی وبلاد مضر وربیعة وقضاعة والطائف ومکة کلهم قد اسلم وبنوا المساجد لیس فیها مدینة ولا قریة ولا حلّة لاعراب الا وقد قری فیها القرآن فی الصلٰوة وعلّمه الصبیان والرجال والنساء وکتب ثم ولی ابوبکر سنتین وستة شهر فغزا فارس والروم وفتح الیمامه وزادت قراة الناس للقرآن ولم یبق بلد الا وفیه المصاحف ثم مات ابوبکر وولی عمر ففتحت بلاد الفرس

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، تو اسلام سارے جزیرۂ عرب میں پھیل چکا تھا۔ بحرِ قلزم سے لے کر ساحلِ یمن تک اور بحرِ فارس سے فرات تک اور اس جزیرہ میں بے شمار شہر اور گاؤں بسے ہوئے تھے مثلاً یمن بحرین وغیرہ جہاں کے تمام باشندے اسلام لا چکے تھے، جنھوں نے مسجدیں بنا لی تھیں اور کوئی شہر، کوئی گاؤں، کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں نمازوں میں قرآن نہ پڑھا جاتا ہو، بچے، مرد اور عورتیں سب ہی اس کو حاصل کرتے تھے اور وہ لکھا بھی جاتا تھا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ ڈھائی برس خلیفہ رہے، انہوں نے فارس وروم پر حملے کئے، یمامہ فتح کیا اور قرآن کی قراۃ لوگوں میں زیادہ پھیلی۔ کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں قرآن کے نسخے نہ ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ایران کے طول وعرض اور پورے شام ومصر کو فتح کیا۔ ان ملکوں میں بھی کوئی شہر ایسا نہ تھا، جہاں مسجدیں نہ بنی ہوں اور قرآن مجید کے نسخے نہ لکھے گئے ہوں۔ مساجد کے

طولاً وعرضاً وفتحت الشام کلها والجزیرة ومصر کلها ولم یبق بلد الا و نبیت فیه المساجد ونسخت فیه المصاحف وقراء الائمة القرآن وعلمہ الصبیان فی المکاتب شرقاً وغرباً وبقی کذلک عشرة عوام و اشهراً .... وان لم یکن عند المسلمین اذ مات عمر مائة الف مصحف من مصر الی العراق الی الشام الی الیمن فما بین ذٰلك فلم یکن اقل ۔

امام قرآن پڑھتے تھے۔ لڑکے مکتبوں میں شرق سے غرب تک قرآن حاصل کرتے تھے۔ یہ حالت دس برس اور چند ماہ رہی اور جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا ہے، اس وقت مصر سے لے کر عراق و شام و یمن وغیرہ میں قرآن مجید کے کم سے کم ایک لاکھ نسخے رہے ہوں گے۔

(کتاب الفصل جلد ۲ ص ۷۸)

۱۰۔ ملا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلّم الثبوت میں لکھتے ہیں :

اجمع اهل الحق علی ان ترتیب آی کل سورة توقیفی بامر الله و بامر رسول .... والمحققون علی ان ترتیب السور من امر رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

اہل حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہے اور محققین کا مذہب یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔

(کتاب مذکور جلد ۲ ص ۱۱ و ۱۲)

۱۱۔ مولوی سید محمد صاحب مجتہد شیعی تنزیہ الفرقان میں مولوی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے نقل کرتے ہیں :

ان القرآن کان علی عهد رسول الله مجموعاً مولفاً علی ما هو علیه الآن ۔

یعنی قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طرح مرتب اور لکھا ہوا تھا، جیسا کہ وہ آج ہے۔

(ملاحظہ ہو تاریخ القرآن مولفہ مفتی عبد اللطیف صاحب ص ۱۰۱ مطبوعہ رحمانیہ مونگیر)

۱۲۔ محمد بن الحسن حر عاملی شیعی لکھتے ہیں :

" ہر کسے کہ تتبع اخبار و تفحص تواریخ و آثار نمودہ بعلم یقینی میداند کہ قرآن در غایت و اعلیٰ درجہ تواتر بودہ و آلاف صحابہ بحفظ و نقل می کردند، آں در عہد رسولِ خدا مجموع و مولف بود۔

(" تاریخ القرآن ص ۱۰۴)

یعنی جس کسی نے بھی تاریخ و احادیث پر غور کیا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ قرآن تواتر کے اعلیٰ درجہ پر ہے۔ ہزاروں صحابی اس کو یاد بھی کرتے تھے اور دوسروں تک پہنچاتے بھی تھے اور یہ کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب طور پر لکھا ہوا تھا۔

غرض عہدِ نبویؐ میں قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب اور اس کی کتابی تدوین ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن تین روایتیں ایسی ملتی ہیں، جن سے اس بارہ میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے آیندہ سطور میں

اس پر بحث کر کے ان کی حقیقت ظاہر کی جائے گی۔

ا۔ پہلی روایت ابن شہاب زہری سے مروی ہے، جو صحیح بخاری میں تین جگہ آئی ہے۔ تفسیر سورہ توبہ میں فضائل قرآن کے باب جمع القرآن میں اور کتاب الاحکام کے باب یستحب للکاتب ان یکون امیناً عاقلاً میں صحیح بخاری کے علاوہ جامع ترمذی تفسیر سورہ توبہ میں بھی یہ روایت ہے۔ لیکن صحیح بخاری کی تینوں روایتیں اور ترمذی کی روایت سب کی سب ابن شہاب زہری عن عبید بن السباق سے مروی ہیں۔ بخاری کی سند میں زہری تک دو واسطے ہیں۔ پہلی عن ابی الیمان عن شعیب، دوسری عن موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراہیم ابن سعد تیسری عن محمد بن عبید اللہ ابی ثابت عن ابراہیم بن سعد۔ ترمذی کی روایت میں زہری تک تین واسطے ہیں۔ عن محمد ابن بشار عن عبدالرحمٰن بن مہدی عن ابراہیم بن سعد، غرض تمام طرق کا مدار زہری پر ہے، جو عبید بن السباق سے اس کو روایت کرتے ہیں۔ محدثین نے کسی روایت کو جانچنے کے دو قاعدے مقرر کیے ہیں۔ پہلا باعتبار سند، دوسرا باعتبار درایت و عقل۔ اس لیے ان روایتوں کا متن نقل کر کے انہی کے قواعد کی روشنی میں ان پر بحث کی جائے گی۔ روایت یہ ہے:

عن زید ابن ثابت قال بعث الی ابوبکر لمقتل اهل الیمامة و عنده عمر فقال ابوبکر ان عمر اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القرآن و انی اخشی ان یستحر القتل بقراء القرآن فی المواطن کلها فیذهب قرآن کثیر و انی اری ان تامر بجمع القرآن فقلت کیف افعل شیئًا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال عمر هو والله خیرٌ فلم یزل عمر یراجعنی فی ذٰلك حتّٰی شرح الله صدری للذی شرح له صدر عمر و رأیت فی ذٰلك الذی رأی عمر قال زید قال ابوبکر وانك رجل شاب عاقل لا نتهمك قد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القرآن فاجمعه قال زید فوالله لو کلفنی نقل جبل من الجبال ما کان باثقل علی مما کلفنی من	یعنی زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یمامہ میں قتل کے واقعہ کے بعد مجھ کو حضرت ابوبکرؓ نے بلا بھیجا۔ حضرت عمرؓ بھی ان کے پاس تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ نے آ کر مجھ سے کہا کہ یمامہ میں قرآن کے قاری بہت قتل ہو گئے ہیں۔ اگر لڑائیوں میں قرآن کے قاری اس طرح زیادہ قتل ہوتے رہے، تو بہت سا قرآن ضایع ہو جائے گا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: میں کیسے وہ کام کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے۔ عمرؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے۔ عمرؓ مجھ سے اس بارے میں برابر گفتگو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لیے کھول دیا، جس کے لیے عمرؓ کا سینہ کھولا تھا اور عمرؓ کی طرح میری سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔ زیدؓ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم جوان عقلمند ہو اور تمہارا دامن بھی اتہام سے پاک ہے۔ تم

جمع القران قلت کیف تفعلان شیئًا لم یفعله رسول الله قال ابوبکر هو و الله خیر فلم یزل یحث مراجعتی حتی شرح الله صدری للذی شرح الله صدر ابی بکر و عمر و رأیت فی ذٰلك الذی رآیا فتتبعت القراٰن اجمعه من العسب والرقاع و اللخاف و صدور الرجال فوجدت اٰخر سورة التوبه "لقد جاء کم رسول من انفسکم الخ" مع خزیمة او ابی خزیمة

(صحیح بخاری جلد ۳ ص ۱۴۹، ۱۵۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی تھے۔ اس لیے قرآن تلاش کر کے جمع کرو۔ زید کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کو ہٹانے پر بھی وُہ مامور کرتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ گزرتا، جتنا قرآن کا جمع کرنا میرے لیے گراں تھا۔ میں نے کہا آپ دونوں ایسا کام کرنا چاہتے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے، اور برابر اس بارے میں مجھ سے گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لیے کھول دیا، جس کے لیے ابوبکرؓ و عمرؓ کا کھولا تھا اور میں نے بھی وہی سمجھ لیا، جو انہوں نے سمجھا تھا، چنانچہ میں نے کھجور کی چھالوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں نیز اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کی تلاش شروع کر دی تو سورۂ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملیں۔

صحیح بخاری کی اس روایت میں، جو تین جدا جدا مقامات پر آئی ہے، الفاظ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے، جس کو اصطلاحِ محدثین میں اضطراب کہتے ہیں۔ اضطراب کی وجہ سے حدیث کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ وہ اختلاف یہ ہے:

بخاری کی روایت ابراہیم سے	بخاری کی روایت شعیب سے	ترمذی کی روایت
۱۔ قد استحر یوم الیمامه بقراء القراٰن	۱۔ قد استحر یوم الیمامه بالناس	۱۔ قد استحر بقراء القراٰن یوم الیمامه
۲۔ من العسب والرقاع واللخاف و صدور الرجال	۲۔ من الرقاع والاکتاف والعسب و صدور الرجال	۲۔ من الرقاع والعسب واللخاف و صدور الرجال
۳۔ فوجدت اٰخر سورة التوبه مع خزیمة او ابی خزیمة	۳۔ حتی وجدت من سورة التوبة اٰیتین مع خزیمة الانصاری	۳۔ مع خزیمة بن ثابت

۴- فالحقتها فی سورتها	۴- شعیب کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں	۴- ترمذی میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں۔

یہ اضطراب متن کا ہے، سندیں دیکھا جائے تو حسب ذیل امور قابل بحث ہیں:

۱- زہری کے متعلق میزان الاعتدال جلد سوم ص ۱۲۶ میں ہے:

کان یدلس فی النادر۔ کبھی کبھی وہ تدلیس کر جاتے تھے۔

یعنی کسی معاصر سے بغیر سنے ہوئے اس طور پر روایت کرنا کہ سنا ہوا ہونا معلوم ہو یا سُنی ہوئی بات اس طرح بیان کرنا کہ اسناد کی شناخت نہ ہو سکے۔

اور تہذیب التہذیب جلد نہم ص ۴۴۷ پر ہے:

وقد رأیتین من حدیثه عن غیر الثقات و اما ما اختلفوا فیه فلا یکون خمسین حدیثًا والاختلاف عندنا ما تفردوا به قوم فی شیئ۔

یعنی دو سو حدیثیں زہری کی غیر ثقہ لوگوں سے مروی ہیں اور وہ حدیثیں جن میں محدثین نے اختلاف کیا ہے پوری پچاس نہ ہوں گی۔ اور اختلاف کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ جس کو کسی جماعت نے منفرد ہو کر روایت کیا ہو۔

۲- زہری کی عادت ادراج، یعنی حدیث میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھا دینے کی بھی تھی۔ چنانچہ آغاز وحی والی حدیث میں "تحنث" کے بعد" وہو التعبد" ان کا ادراج ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جلد اول ص ۱۲ اور تدریب الراوی ص ۹۶)

توجیہہ النظر ص ۱۷۲ پر ہے:

والادراج بجمیع اقسامه محذورًا قال السمعانی من تعمد الادراج فهو ساقط العدالة وقد استثنٰی بعضهم من ذٰلك ما ادرج لتفسیر غریب و قد فعله الزهری۔

یعنی ادراج کی تمام قسمیں منع ہیں۔ سمعانی کہتے ہیں جو شخص قصداً ادراج کرے، اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے اس ادراج کو مستثنیٰ کیا ہے، جو کسی نادر لفظ کی تشریح کے لیے ہو اور ایسا ادراج زہری نے کیا ہے۔

۳- زہری اس روایت میں منفرد ہیں۔ کیونکہ اور کسی نے اس واقعہ کو روایت نہیں کیا ہے۔ تفرد بھی ضعف کا باعث ہے اور زہری کی اس روایت میں ادراج اور تدلیس اور تفرد یہ سب باتیں موجود ہیں، جس سے یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

۴- دوسرے راوی ابراہیم بن سعد کی بابت میزان الاعتدال جلد اول ص ۱۷ پر ہے:

ذکر عند یحیٰی ابن سعید عقیل و ابراهیم فجعل کانه یضعفهما۔

یعنی یحییٰ بن سعید کے سامنے عقیل اور ابراہیم کا ذکر ہوا تو انہوں نے ان دونوں کو ضعیف بتلایا۔

۵۔ عبید بن السباق، جو اس واقعہ کو زید بن ثابت سے روایت کرتے ہیں، ان کے نہ سنہ ولادت کا پتا چلتا ہے اور نہ سنہ وفات کا۔ تہذیب التہذیب، جو اسماء الرجال کی سب سے بڑی کتاب ہے، اس میں ان کا ذکر صرف چند سطروں میں ہے اور وہ بھی اس طور پر کہ جن لوگوں سے انہوں نے روایت کی اور جن لوگوں نے ان سے روایت کی، ان کے نام لکھ دیے ہیں، خود ان کی ذات کے متعلق صرف دو لفظ لکھے ہیں:

الثقفی المدنی۔ یعنی قبیلہ ثقیف کے اور مدینہ کے رہنے والے ہیں۔

۶۔ سورہ توبہ کی آخری آیتوں کا خزیمہ یا ابو خزیمہ سے ملنے کا بیان بھی شک کے ساتھ ہے کیونکہ یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ اور شک موجب ضعف ہے۔ یہ تو اس روایت کی روایتی حیثیت ہے۔ درایتی حیثیت یہ ہے کہ:

۱۔ تفرد اور خبر احاد ہونے کی وجہ سے تواتر کے مقابلہ میں ناقابل قبول ہے کیونکہ تواتر سے یہ ثابت ہے کہ عہد نبویؐ ہی سے پورا قرآن مرتب ہو کر بذریعہ تواتر نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس لیے اس تواتر کے مقابلہ میں یہ روایت اگر قوی بھی ہوتی، تو بھی معتبر نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ کہ اس میں مذکورہ بالا کمزوریاں بھی موجود ہیں، اس حالت میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۔ یہ روایت خود زہری کی بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ زید بن ثابتؓ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کیا تھا۔

۳۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی متفرق آیتیں پتھر کے ٹکڑوں، پتوں اور کھجور کی چھال پر لکھی ہوئی تھیں جن کی حفاظت بحیثیت مجموعی غیر ممکن ہے اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ قرآن جیسی اہم چیز اس طرح پراگندہ پڑی ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا ہو۔ یہ چیز بلّغ ما انزل الیك کے بھی خلاف ہے، کیونکہ تبلیغ کامل کی صورت صرف یہی ہے کہ کلام مجید کو مرتب اور محفوظ صورت میں لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ کسی غلل کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ دُوسری قابل غور بات یہ ہے کہ پتوں وغیرہ پر لکھے ہونے کی حالت میں ترتیب سور کا کیا ذکر، ترتیب آیات بھی قایم نہیں رہ سکتی تھی۔ حالانکہ عہد نبویؐ میں آیات کی ترتیب روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآن کی تعلیم کا مکمل انتظام ہونا ثابت ہے اور پراگندہ حالت میں جب کہ پتھر کے ٹکڑوں اور پتوں پر لکھا ہوا تھا اس کی تعلیم کس طرح ممکن ہوتی۔

۴۔ حضرت ابوبکرؓ ربیع الاوّل ۱۱ھ میں خلیفہ ہوتے۔ آپ کی مدت خلافت دو برس تین ماہ گیارہ یوم ہے۔ جنگ یمامہ ۱۱ھ کے آخر میں ہوئی ہے۔ اگر زید بن ثابتؓ نے اس جنگ کے بعد قرآن کو جمع کیا اور جیسا کہ اس روایت سے ثابت ہے، حضرت ابوبکرؓ ہی کے زمانہ میں اس کو مکمل بھی کر لیا، تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ تقریباً ڈیڑھ سال میں انہوں نے تنہا یہ عظیم الشان کام پورا کر لیا، جو بالکل خلاف عقل ہے کہ تنہا ایک شخص اتنے بڑے کام کو جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے بھی زیادہ سخت ہے، اتنی تھوڑی سی مدت میں مکمل کر لیا۔ اس کام کی دشواری کا بیان خود روایت میں بھی موجود ہے۔

۵۔ عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے اہم اور مشکل کام کو تنہا ایک شخص کی سپردگی میں دیا ہوگا، جب کہ قرآن کے

شغف رکھنے والے اور بہت سے صحابہ بلکہ ان سے بہتر زندہ موجود تھے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوالدرداءؓ وغیرہما، جن کے اسماء اُوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام حفاظ اور کتابِ صحابہ کی پُوری جماعت کے سپرد کیا جاتا، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے کہیں کم اہم یعنی نقلِ مصاحف کا کام ایک جماعت کے سپرد کیا تھا۔

۶۔ اس روایت کا یہ بیان بھی کہ جنگِ یمامہ میں بکثرت قاری شہید ہُوئے، واقعہ کے خلاف ہے۔ یوں تو اس زمانہ میں ہر مسلمان قاری و حافظ تھا، اس لیے جتنے بھی مسلمان شہید ہُوئے، سب قاری اور حافظ رہے ہوں گے، لیکن یہ لوگ اس پایہ کے نہ تھے کہ ان کی شہادت سے قرآن کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ ان میں کم تھے مشہور قراء میں سے سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہ اس جنگ میں شہید ہُوئے اس لیے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا سبب قراء کی شہادت کو قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

۷۔ قرآن مجید کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتے، جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تھا، تو آپؐ کی وفات کے بعد صحابہ اور خلفاء کا اوّلین فرض یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ اس کے کہ کسی جنگ میں قراء شہید ہُوئے ہوں یا نہ ہُوئے ہوں، قرآن کی جمع و ترتیب کا فرض انجام دیتے۔ کیونکہ قراء کی شہادت اگر نہ بھی ہوتی تو بھی موت سے کس کو مفر ہے۔ ایسی حالت میں صرف حفاظِ قرآن کی موت ہی کے اندیشہ سے یہ فرض تھا کہ صحابہ اس کو جمع و مرتب کر کے اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دیتے، جس طرح حفاظِ قرآن کو خلفاء نے جا بجا بھیجا تھا۔

۸۔ جمع و ترتیب قرآن مجید کے بارہ میں اگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور زیدؓ بن ثابت کی یہ ردّ و کد صحیح مان لی جاتے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب سے بے خبر تھے۔ حالانکہ خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ متعدد صحابہ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کر لیا تھا اور عقل اس کو باور نہیں کر سکتی کہ قرآن جمع ہو گیا ہوتا، اور یہ حضرات بے خبر رہتے۔

۹۔ سورۂ براۃ کی آخری آیتوں کا صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملنا خود صحیح بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ:

عن البراء قال اٰخر سورة نزلت کاملة براٗة۔ (بخاری جلد ۲ ص ۹۴ و جلد ۳ ص ۴۸)

یعنی قرآن کی آخری سورہ، جو مکمل نازل ہُوئی، سورۂ براۃ ہے۔

اور جب یہ سورۃ پوری نازل ہُوئی، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آخری آیتیں گم ہو گئی ہوں اور محض ایک شخص کے پاس ملی ہوں، اور تاریخی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حجاج کے مجمع میں پوری سورۂ براۃ پڑھ کر سُنائی تھی۔ (صحیح بخاری جلد سوم ص ۸۴، ۸۵)

اب اس سلسلہ کی دوسری روایت کو، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب سور میں صحابہ کا ہاتھ تھا، بہ نظر نقد دیکھنا چاہیے۔ یہ روایت ترمذی میں ہے:

حدثنا محمد ابن بشار نا یحیٰی ابن سعید و محمد ابن جعفر و ابن ابی عدی و سہل ابن یوسف

یعنی حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورہ انفال کو جو مثانی سے ہے

قالوا نا عوف ابن ابی جمیلة ثنی یزید الفارسی عن ابن عباس قال قلت لعثمان ابن عفان ما حملکم ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی والی براۃ وھی من المئین فقرنتم بینھما ولم تکتبوا بینھما سطر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ووضعتموھا فی السبع الطوال ما حملکم علی ذٰلک فقال عثمان کانت الانفال من اوائل ما نزلت بالمدینة وکانت براۃ من آخر القرآن وکانت قصتھا شبیھة بقصتھا فظننت انھا منھا فقبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا انھا منھا فمن اجل ذٰلک قرنت بینھما فلم اکتب بینھما سطر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ووضعتھا فی السبع الطوال۔

اور سورۂ براۃ کو جو مئین سے ہے، کیوں ملا دیا۔ اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ سورۂ انفال مدینہ میں پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں ہے اور سورۂ براۃ آخر میں نازل ہوئی اور دونوں کا مضمون ملتا جلتا ہے، اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ دونوں ایک ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور آپ نے یہ نہیں تبلایا کہ براۃ انفال کا جزء ہے۔ اس لیے میں نے دونوں کو ملا دیا۔ اور بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔

(ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۴)

اس روایت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ نے دی مگر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل صحابہ کا تھا جب ہی حضرت عثمانؓ نے سورۂ انفال اور براۃ کو ملا دیا۔

اس روایت کی تنقید بھی سنداً اور درایتاً دونوں کے اعتبار سے ضروری ہے۔ سند کے اعتبار سے اس میں یہ خرابی ہے کہ تمام طرق عوف ابن ابی جمیلہ سے چلتے ہیں۔ عوف کے علاوہ کسی اور راوی نے اس کو روایت نہیں کیا۔ اور اس کا یہ حال ہے کہ ابن مبارک نے اس کو قدری شیعی کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ہشتم ص ۱۶۷)

پھر اسی کتاب میں اسی صفحہ پر میزان الاعتدال کے حوالہ سے اس کو رافضی لکھا ہے ایک اور خرابی اس روایت میں یہ ہے کہ یزید الفارسی مجہول شخص ہے چنانچہ تہذیب التہذیب جلد یازدہم صفحہ ۳۷۰ میں ہے کہ:

یحییٰ ابن سعید لم یعرفہ۔

یعنی یحییٰ بن سعید جیسا فن رجال کا ماہر شخص اس یزید فارسی کو نہیں جانتا۔

درایت کے اعتبار سے حسب ذیل امور اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں:

پہلی تو یہی بات ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی بذریعہ تواتر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ روایت اس کے خلاف ہے۔

دُوسرے یہ کہ قرآن مجید، جس کی حفاظت کا وعدہ خود خدا تعالیٰ نے بڑی شد و مد سے فرمایا، کیا وُہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک اسی طرح چلتا رہا کہ لوگوں کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ سورۂ انفال اور سورۂ براۃ دو ہیں یا ایک، عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ اتنے زمانہ تک مسلمان اس سے ناواقف رہے ہوں۔ حالانکہ دوسری صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ دونوں جداگانہ سورتیں ہیں۔ سورۂ براۃ کے تمام و کمال ایک ساتھ نازل ہونے اور مجمع حجاج میں اس کی تلاوت کی روایت صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر گزر چکی ہے۔ رہا یہ سوال کہ جب دونوں سُورتیں جُداگانہ ہیں تو ان کے بیچ میں دُو سورتوں کی طرح بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دُو سورتوں کے بیچ میں بسم اللہ کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور بحکم الٰہی ترتیب دینے والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کسی تیسرے کو اس میں دخل نہیں ہے ایسی حالت میں کوئی شخص اس کا سبب نہیں جان سکتا اور یہ معاملہ بھی حروف مقطعات کی طرح رموز قرآنی میں ہے۔

تیسری روایت حضرت حذیفہؓ کی ہے، جس سے چند امور خلافِ تواتر ظاہر ہوتے ہیں۔ وُہ روایت یہ ہے:

حدثنا موسٰی حدثنا ابراهیم حدثنا ابن شهاب ان انس ابن مالك حدثه ان حذیفة ابن الیمان قدم علی عثمان وکان یغازی اهل الشام فی فتح آرمینیة اذربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القرأة وقال حذیفة لعثمان یا امیرالمؤمنین ادرك هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود والنصارٰی فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیك فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید ابن ثابت وعبد اللّٰه ابن الزبیر وسعید ابن العاص وعبد الرحمن ابن الحارث ابن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان لرهط القرشیین الثلاثة اذا اختلفتم انتم وزید ابن ثابت فی شئی من القرآن فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصاحف رد عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق قال

یعنی زہری انس سے روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمان جو فتح آرمینیا اور آذربائیجان میں شامل تھے قرآن کی قرأت میں اختلاف دیکھ کر گھبرا گئے اور واپس ہو کر حضرت عثمانؓ سے کہا امیرالمؤمنین قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے اندر بھی ویسا ہی اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان ہے۔ اس امت کی خبر لیجیے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے صحیفے منگوائے (یعنی زید بن ثابتؓ کا جمع کیا ہوا قرآن بزمانہ حضرت ابوبکرؓ) اور کہلا بھیجا کہ اس کی نقلیں لے کر واپس کر دیں گے۔ اور ایک مجلس زید بن ثابت اور تین قریشی صحابہ کی مرتب کر کے نقل کا کام ان لوگوں کے سپرد کر دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ جہاں کہیں انصاری اور قریشیوں میں اختلاف ہو، تو قریش کے محاورہ کو ترجیح دی جائے۔ ان حضرات نے نقلیں کریں اور حضرت عثمانؓ نے اصل حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا اور نقلوں میں سے ایک ایک نسخہ ہر ملک میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ قرآن کے دُوسرے نسخے جلا دیئے جائیں ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ سے زید بن ثابت کے بیٹے

ابن شهاب واخبرني خارجة ابن زيد ابن ثابت سمع زيد ابن ثابت قال فقد اٰية من الاحزاب حين نسخنا المصحف قد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقراء بها فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة الانصاري من المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فالحقناها في سورتها في المصحف۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۴۰)	خارجہ نے بیان کیا کہ اُن کے والد کہتے تھے کہ نقل کرتے وقت سورہ احزاب کی آیت من المومنین رجال الخ مجھ کو نہیں ملی۔ حالانکہ میں یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا۔ جب ہم نے اس کو تلاش کیا، تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری رض کے پاس ملی اور ہم نے اس کو اس کی سورت میں شامل کر دیا۔

اس روایت سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن مجید کی قرأۃ میں دور دراز کے ممالک میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس کو دیکھ کر حضرت حذیفہ سخت پریشان ہو گئے تھے اور حضرت عثمانؓ کو اس کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی اور یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا، تو قرآن میں بھی یہود و نصاریٰ کی کتب سماویہ کی طرح اختلاف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

دُوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا تدارک حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے والے قرآن کی نقلیں کرا کے دور دراز ممالک میں بھیج دیں اور اس نقل میں اختلاف کو اس طرح رفع کیا کہ صرف قریش کے محاورہ پر نقل کی بنیاد رکھی۔

تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے والے مصحف میں ایک آیت سورۂ احزاب کی درج نہ تھی، جس کا احساس زیدؓ بن ثابت کو عہد صدیقی میں نہ ہوا تھا اور عہد عثمانی میں نقل کے وقت اس کا احساس ہُوا۔ مجلس ناقلین میں سے اس احساس میں وہ منفرد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اور ان کے ساتھ دوسرے ناقلین نے اس آیت کی تلاش شروع کی اور آخر کار خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس وُہ آیت ملی اور اس کو قرآن مجید میں اس کی جگہ شامل کر دیا گیا۔

اس روایت پر بھی سنداً اور درایۃً تنقید ضروری ہے۔ اس کی روایتی حیثیت یہ ہے کہ اس کے راوی بھی ابراہیم اور ابن شہاب زہری ہیں، جن کے متعلق تفصیل کے ساتھ اوپر بحث ہو چکی ہے۔ اور اس تنقید میں ان تمام امور پر نظر ڈالنی ضروری ہے، جو اس روایت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی بات قرآن مجید میں عظیم الشان اختلاف کا پایا جانا ہے حالانکہ عہدِ رسالت سے لے کر عہدِ عثمانی اور اس کے بعد کے تمام زمانوں میں قرآن مجید کی جمع و تدوین اور تعلیم و اشاعت میں جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا اور جس تواتر سے وہ نقل ہوتا چلا آیا تھا اس کے بعد کسی ایسے بڑے اختلاف کا پایا جانا غیر ممکن ہے، جسے دیکھ کر حضرت حذیفہؓ گھبرا جائیں اور جس سے یہود و نصاریٰ کے سے اختلاف کا ان کو اندیشہ ہو۔

دوسرے قرآن تو قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہی ہُوا تھا اور اس کے تحفظ اور اسی شکل میں اس کو مسلمانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اور اس کو بغیر کسی تغیر کے قائم رکھنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر تھی۔ اس لیے اس کو بدلنے کی جرأت کون کر سکتا تھا۔

تیسری بات یعنی سورۂ احزاب کی ایک آیت کا نقل کے وقت پہلے نسخہ میں نہ ملنا سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جمع قرآن والی روایت میں بھی اس کا ذکر ہے کہ چند آیتیں جو کہیں مل نہیں رہی تھیں، بمشکل ملیں، وُہ سورہ براۂ کی آخری آیتیں تھیں۔ اور اس روایت میں بتلایا گیا ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت نقل کے وقت نہیں مل رہی تھی۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ پہلے بھی انھیں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع و کتابت کا کام کیا تھا، اس وقت سورۂ براۃ کی آخری آیتیں نہیں مل رہی تھیں اور سورہ احزاب والی آیت یا تو اس وقت گم نہ تھی یا ان کو اس وقت اس کا احساس نہیں ہُوا۔ اگر گم نہ تھی تو بعد میں کیسے اس صحیفہ سے گم ہو سکتی تھی، جو خود انہی کا ترتیب دیا ہُوا اور انہی کے ہاتھ کا لکھا ہُوا حفاظت کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اور پھر حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس آیت کے گم ہونے کا ان کو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ترتیب دیتے وقت احساس نہیں ہوا، تو یہ بھی غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ جیسا حافظ سورۂ احزاب کی اس آیت سے پہلی دفعہ غافل ہو اور پہلی ترتیب کے سالہا سال بعد پھر جب نسخہ ان کے سامنے لایا جائے تو اس وقت احساس ہو اس لیے عقلاً اس روایت کا یہ ٹکڑا محال معلوم ہوتا ہے اور اگر ان روایتوں کو جو تواتر کے خلاف ہیں، صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو قرآن پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اب بھی اس میں سے کچھ غائب ہو، جو وعدۂ الٰہی انا لہٗ لحافظون کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ان روایتوں کا مضمون اہل السنۃ والجماعۃ کے عقاید کے خلاف ہے۔ اس لیے قرآن کے تواتر کے مقابلہ میں یہ روایتیں ناقابل اعتبار ہیں اور روایت و درایت کے رو سے بھی غیر معتبر ہیں۔ ان تین روایتوں کے علاوہ بعض اور روایتیں بھی اختلاف قراۃ اور اختلاف ترتیب کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان سب کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وہ اخبار احاد ہیں، جو تواتر کے مقابلہ میں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ اگر خدا کو منظور رہے تو پھر کسی وقت ان روایتوں کی بھی تنقید پیش کی جائے گی۔

واللہ ھو الموفق للصواب والیہ المرجع والمآب اللّٰھم احفظنا من العقاید الباطلۃ و آراء اھل الاھواء الفاسدہ۔

پہلے سیرت نگار ــــ حضرت عروہ بن الزبیر

تحریر : خلیل ابراھیم

ترجمہ : محمد اجمل اصلاحی

حضرت عروہ بن الزبیر کا شمار مدینہ کے مشہور فقہا اور سیرت و مغازی کے اولین مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کے جو آثار ہم تک پہنچے ہیں وہ قدیم ترین اور مستند ترین تاریخی تحریروں کا نمونہ ہیں۔ جس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ان کے خاندان کو معاشرہ میں جو ممتاز مقام حاصل تھا اس کی وجہ سے عہد رسالت اور صدر اسلام کے بہت سے واقعات سے قریبی واقفیت کا انھیں موقع ملا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی تعلیم و تعلم کے لیے وقف کر دی تھی اور اس علمی زندگی پر نہ صرف یہ کہ قانع تھے بلکہ اسی کے آرزو مند بھی تھے۔ گویا اس وقت ہمارا تعارف علم کے ایک شیدائی سے ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مقالہ کی روشنی میں حضرت عروہ کی شخصیت عربوں کے یہاں، خصوصاً سیرت اور مغازی کے میدان میں، باقاعدہ تاریخ نگاری کے ایک بانی اور پیش رو کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔

حالاتِ زندگی

حضرت عروہ کی پیدائش مدینہ منورہ میں ہوئی۔ سنہ پیدائش کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ ۲۲ھ، ۲۶ھ اور ۲۹ھ کی روایتیں ہیں[1] ایک اور روایت ۲۳ھ کی ہے[2] عبدالعزیز دوری[3] نے ان تمام روایتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد موخر الذکر کو ترجیح دی ہے۔ دلیل میں وہ روایت پیش کی ہے جس کے مطابق جنگِ جمل (۳۶ھ) کے روز حضرت عروہ کی عمر تیرہ سال تھی۔ مجھے عبدالعزیز دوری کی رائے سے اتفاق ہے اور میرے نزدیک خلیفہ بن خیاط[4] نے درست لکھا ہے کہ حضرت عروہ ۲۳ھ یعنی عہد فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوئے۔

حضرت عروہ کا نسب یہ ہے: عروۃ بن الزبیر بن العوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی بن کلاب القرشی الاسدی[5] عروہ کی والدہ حضرت اسما بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہا ہیں۔ اسی وجہ سے انھیں اپنے نسب پر فخر تھا[6]

حضرت عروہ کے نشو و نما اور ان کی سیرت کی تعمیر میں ان کی عالی نسبی اور ماحول کا بڑا دخل معلوم ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت فہم دین اور روایت حدیث میں انھیں وہ رتبہ بلند ملا کہ مدینہ کے سات مشہور فقہا میں ان کا شمار ہوا[7] یہی نہیں بلکہ سیرت نبوی، غزوات اور خلفائے راشدین کے دور سے متعلق واقعات کا ایک بڑا سرمایہ انھیں کے واسطہ سے ہم تک پہنچا ہے۔

حضرت عروہ کی پیدائش جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مدینہ میں ہوئی۔ یہیں وہ پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ پھر مصر کا سفر کیا اور وہاں بنو عذرہ کی ایک خاتون سے شادی کی۔ سات سال تک مصر میں مقیم رہے[۸] کئی بار دمشق بھی گئے۔ عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک کے دربار میں بھی تشریف لے گئے۔ ولید ہی کی مجلس میں آکلہ کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا[۹]

حضرت عروہ کی تمام تر توجہ علم اور دین پر مرکوز تھی اور انھیں دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر تھی۔ اسی وجہ سے اپنے والد حضرت زبیر اور دونوں بھائیوں حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حضرت مصعب بن الزبیر کے برعکس ان کا کوئی سیاسی نصب العین نہیں تھا۔ اس کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو متعدد مورخین نے نقل کی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار حضرات عروہ، ابن عمر، مصعب اور عبدالملک بن مروان جمع تھے، اس مجلس میں تمام حاضرین نے اپنی اپنی آرزوئیں بیان کیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے جنت کی تمنا کی۔ حضرت مصعبؓ نے عراق کی حکومت اور سکینہ بنت حسینؓ اور عائشہ بنت طلحہ سے شادی کا ارمان ظاہر کیا۔ حضرت عروہ نے فرمایا کہ میری تمنا تو یہ ہے کہ دنیا میں زہد کی زندگی گزاروں اور آخرت میں جنت نصیب ہو نیز میرا شمار ان لوگوں میں ہو جن سے علم کی روایت بیان کی جاتی ہے۔ عبدالملک نے خلافت کی آرزو کی[۱۰]

حضرت عروہ کی تمنا پوری ہوئی اور ان کا شمار ممتاز فقہا اور محدثین میں ہوا۔ امام بخاری نے انھیں "بحر لا یکدرہ"[۱۱] اور ابن حجر نے ثقہ اور کثیر الحدیث لکھا ہے[۱۲]

جب ان کا پاؤں کاٹا گیا تو کسی نے کہا، بخدا ہم نے تم کو کشتی لڑنے یا دوڑ لگانے کے لئے تیار نہیں کیا۔ ہمیں تم سے جو چیز مطلوب ہے اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا ہے یعنی تمہارا تدبر اور علم[۱۳]

اسی علمی شغف کی وجہ سے عروہ نے فقہ کی کئی کتابیں مرتب کی تھیں لیکن انھیں جلا دیا۔ ان کے بیٹے ہشام کا بیان ہے کہ واقعہ حرہ کے روز ان کے والد نے اپنے فقہی مجموعے نذر آتش کر دیے۔ بعد میں وہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے تھے[۱۴] علم کی اہمیت اور قدر و قیمت کا یہی احساس تھا جس کی بنا پر اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: علم حاصل کرو کیونکہ اگر کچھ لوگوں میں تم خورد ہوگے تو دوسروں میں تمہیں برتری بھی حاصل ہو سکتی ہے[۱۵]

عروہ کے سنہ وفات میں بھی اختلاف ہے۔ مورخین نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ ابن خیاط نے ۹۳ھ لکھا ہے[۱۶] ابن قتیبہ اور ابن خلکان کے نزدیک ۹۳ھ اور ۹۴ھ دونوں کا احتمال ہے[۱۷] ابن حجر نے ۹۴ھ کو راجح قرار دیا ہے[۱۸] عبدالعزیز دوری نے لکھا ہے کہ سب سے قدیم اور مستند روایت ۹۴ھ کی ہے[۱۹] لیکن میرے نزدیک روایت کی قدامت اس کی صحت کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہو سکتی۔ دوری نے مذکورہ روایت کی ثقاہت کا ماخذ بھی نہیں لکھا۔ بہرحال ۹۳ھ اور ۹۴ھ دونوں روایتیں ہیں۔ کسی ایک کو راجح قرار دینے کے لیے میری نظر میں کوئی مثبت دلیل موجود نہیں ہے۔

بنو امیہ سے عروہ کے روابط

اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ عروہ اپنے والد اور دونوں بھائیوں کے برخلاف سیاسی مقاصد نہیں رکھتے تھے۔ نیز عبدالملک بن مروان سے مدینہ میں ان کا تعلق تھا اور ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے اموی دربار سے اگر ان کے روابط قائم ہوئے تو کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے ماخذ میں ان کے سفر دمشق کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ ایک بار اپنے بھائی عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان کے پاس تشریف لے گئے۔ اس ملاقات کا حال ابوالفرج اصفہانی نے ہشام بن عروہ کی زبانی نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ "عروہ جب عبدالملک کے دربار میں پہنچے تو عبدالملک نے انھیں تخت پر بٹھایا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ آئے اور عبداللہ بن الزبیر کو برا بھلا کہنے لگے۔ اس پر عروہ دربان سے یہ کہتے ہوئے نکل آئے کہ عبداللہ میرے حقیقی بھائی ہیں۔ جب تمہیں ان کا ذکر بد کرنا ہو تو مجھے داخل ہونے کی اجازت نہ دو۔ عبدالملک کو معلوم ہوا تو اس نے عروہ سے کہا: ہم نے آپ کے بھائی کو عداوت کی بنا پر قتل نہیں کیا۔ بلکہ اس نے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہم نے بھی کی۔ اس میں وہ مارا گیا[۲۰] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالملک نے عروہ سے اچھا سلوک کیا اور احترام سے پیش آیا۔ عروہ کی خفگی اہل شام پر تھی اس لئے خلیفہ نے ان سے کہا: "اہل شام کا وطیرہ یہ ہے کہ جب بھی کسی کو قتل کرتے ہیں تو اسے گالیاں دیتے ہیں۔"[۲۱] بلاذری نے لکھا ہے کہ عروہ سے عبدالملک کی عہد پارسائی کی دیرینہ دوستی اور مسجد نبوی کی صحبتوں ہی کا نتیجہ تھا کہ خلیفہ نے انھیں (عروہ) حجاج کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلہ میں احکامات جاری کرنے سے منع کیا۔ اس طرح حکم دیا کہ عبداللہ بن الزبیر کو تختہ دار سے اتار کر ان کے خاندان کے حوالے کر دے "تاکہ وہ ان کی تدفین کر سکیں۔ چنانچہ لاش اتاری گئی اور عروہ نے نماز جنازہ پڑھائی[۲۲]

اسی طرح ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں بھی عروہ کے ایک سفر دمشق کا تذکرہ ملتا ہے۔ اسی سفر میں ان کے بیٹے محمد بن عروہ کی موت کا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ محمد شاہی اصطبل کی چھت سے گر پڑے اور گھوڑوں نے دولتیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔[۲۳] اسی سفر میں عروہ کے پاؤں میں آکلہ ہوا اور کٹوانا پڑا جیسا کہ گذر چکا۔

عروہ کے تاریخی آثار پر جب ہم گفتگو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ دربار اموی نے سیرت نبوی سے متعلق کئی واقعات کے بارے میں ان سے استفسار کیا اور انھوں نے جواب دیا۔

اگرچہ عروہ بنو امیہ کے مخالف تھے۔ لیکن اس مخالفت کا انھوں نے برملا اظہار نہیں کیا۔ البتہ وہ ظالموں سے دور رہنے کے حق میں تھے۔ اس کا ثبوت بنو امیہ کے مظالم کے بارے میں عروہ اور علی بن حسین بن علی کی وہ گفتگو ہے جو مسجد نبوی میں ہوئی[۲۴] جوزف ہورووٹس نے عروہ کے اس موقف کی توجیہہ یہ کی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی آگ بھڑکانے سے بچتے تھے[۲۵]

عروہ کے راوی

عروہ کے حالات زندگی میں آپ نے دیکھا کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مدینہ میں گزرا۔ اسی وجہ سے صحابہ اور ابنائے صحابہ سے ان کا براہِ راست رابطہ تھا۔ اور انھیں سے عروہ کو تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد خصوصاً سیرت نبوی کے واقعات معلوم ہوئے اسی طرح عروہ کے نسب سے ظاہر ہوا کہ وہ جس گھرانے کے چشم و چراغ تھے اس کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت گہرا تھا۔ اسی ماحول اور اسی خاندانی وجاہت نے انھیں شہرت عطا کی اور علم و فضل کے بلند مقام پر سرفراز کیا۔

جن حضرات سے عروہ نے روایت کی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ذیل میں ہم صرف وہ نام درج کرتے ہیں جو ان کی روایتوں میں بار بار آتے ہیں:

والد: زبیرؓ، بھائی: عبداللہ بن الزبیرؓ، والدہ: اسماء بنت ابی بکرؓ، خالہ: عائشہؓ، علی بن ابی طالبؓ، سعد بن زید بن عمرو بن نفیلؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن ثابت، عبداللہ بن جعفرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، اسامہ بن زیدؓ، ابو ایوبؓ، ابوہریرہؓ، ام سلمہؓ ام المومنین[۲۶]۔

ان رواۃ کی فہرست پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں صحابہ اور ابنائے صحابہ میں سے وہ حضرات شامل ہیں جنھیں تاریخ اسلام میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی بیحد قدر و منزلت تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان حضرات سے عروہ کا گہرا ربط اور شناسائی رہی ہو۔ ان تمام باتوں سے عروہ کی مرویات کی تاریخی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے تاریخی آثار کا شمار جو تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متفرق طور پر ہمیں ملتے ہیں قدیم ترین اور مستند ترین روایات میں ہوتا ہے۔

عروہ کے تاریخی آثار

عروہ کے آثار صرف زبانی روایات ہی پر مشتمل نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخی مآخذ میں مدوّن طور پر بھی ملتے ہیں۔ اس طرح کے آثار کا ایک حصہ ان مراسلوں سے عبارت ہے جو دربار اموی کے استفسار پر جواباً تحریر کئے گئے[۲۷]۔

ذیل میں ہم کوشش کریں گے کہ عروہ کے تاریخی آثار کا ایک اجمالی خاکہ آپ کے سامنے آ جائے[۲۸]:

۱۔ بعثت، آپ کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی[۲۹] نبوت کی اولیات میں رویائے صادقہ، خلوت[۳۰]، نزول وحی، نزول وحی کے آثار[۳۱]، غار حرا میں عبادت اور آیت "اقرا باسم ربک ...." الخ (العلق: ۱) کا نزول، رسول اکرمؐ کی گھبراہٹ اور حضرت خدیجہ کا ورقہ بن نوفل کے پاس جانا[۳۲]۔

۲۔ اسلام کی جانب آپ کی خفیہ اور علانیہ دعوت، بت پرستی چھوڑنے کی دعوت، کچھ مردوں اور عورتوں کا قبول اسلام، مسلمانوں پر قریش کی خفگی، اُن کی ایذا رسانی، آنحضرتؐ کا قول: "دنیا میں منتشر ہو جاؤ"۔ مسلمانوں نے دریافت کیا: ہم کہاں جائیں....

اور آپ نے حبشہ کی جانب اشارہ کیا[۳۲] پھر عروہ نے ان اسباب کی جانب اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے آپ نے ملک حبشہ کا انتخاب کیا[۳۳]

۳۔ قریش کی مسلسل مزاحمت۔ عروہ بیان کرتے ہیں کہ قریش نے آں حضرتؐ کے گھر میں گندگی پھینکی[۳۴] اشراف قریش ایک روز جمع ہوئے اور کہا:

"ہم نے ایسا شخص کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے تو ہمیں بے وقوف قرار دیا۔ ہمارے آباؤ اجداد کو گالیاں دیں۔ ہمارے دین پر نکتہ چینی، ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا، ہم تو اس کی وجہ سے عجیب مخمصہ میں پڑ گئے"[۳۵]

ابو طالب کی وفات کے بعد مشرکین کی دلیری اور ایذا رسانی[۳۶]

۴۔ رسول اکرمؐ کی مدینہ ہجرت، وہ حالات جن میں ہجرت پیش آئی[۳۷] مہاجرین کی حالت اور مدینہ میں امراض کا شکار ہونا[۳۸]

۵۔ غزوہ بدر، غزوہ کے اسباب۔ جو مہاجرین و انصار بدر میں شریک ہوئے اور جو مشرکین اس میں مارے گئے ان کی فہرست[۳۹] آنحضرتؐ نے جب مشرکین کا لشکر بڑھتے ہوئے دیکھا تو دعا فرمائی: "اے اللہ تو نے مجھ پر کتاب نازل کی اور مجھ سے دونوں جماعتوں میں سے ایک پر فتح کا وعدہ کیا اور تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اے اللہ یہ قریش تیری مخالفت اور تیرے رسول کی تکذیب میں بڑے طنطنہ اور غرور سے نکلے ہیں۔ اے اللہ تیری نصرت کا خواستگار ہوں جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا۔ اے اللہ صبح ہوتے انھیں ہلاک کر۔"[۴۰]

۶۔ غزوہ قینقاع، آیت کریمہ "وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ" (الانفال: ۵۸) کا نزول اور آنحضرتؐ کا یہ آیت لے کر ان کے پاس جانا[۴۱]

۷۔ غزوہ احد، عروہ نے اس غزوہ کا اختصار سے ذکر کیا ہے[۴۲]۔ غزوہ الرجیع، عروہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب رجیع کو جاسوسی کے لیے مکہ بھیجا تاکہ قریش کے متعلق آپ کو خبر دیں، وہ نجدیہ کے راستہ سے چلے۔ جب رجیع پہنچے تو وہاں بنو لحیان سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی[۴۳]

۸۔ بنو نضیر کے بارے میں جو آیات نازل ہوئیں، غزوہ مریسیع کی جانب اشارہ[۴۴]۔

۹۔ غزوہ خندق۔ رسول اللہؐ کے بارے میں یہود کا موقف، قریش کی چڑھائی۔ خندق کی کھدائی[۴۵]

۱۰۔ غزوہ بنو قریظہ۔ سعد بن معاذ کا فیصلہ کہ لڑنے والوں کو قتل کیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قید کیا جائے اور ان کے مال و اسباب کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس پر رسول اللہؐ کا ارشاد کہ تم نے ان کے بارے میں خدائی فیصلہ کیا[۴۶]

۱۱۔ غزوہ بنی المصطلق۔ واقعہ افک کی ایک روایت عروہ سے طبری میں منقول ہے[۴۷]

۱۲۔ صلح حدیبیہ: حج کے لیے آنحضرتؐ کی روانگی، حدیبیہ میں پڑاؤ، صلح کی پیشکش، صلح کی مدت اور اس کی شرطیں[۴۸]۔

۱۳۔ غزوہ موتہ۔ عروہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جمادی الاول ۸ھ میں ایک لشکر موتہ بھیجا اور زید بن حارثہ کو

سپہ سالار مقرر کر کے فرمایا: اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سپہ سالار ہوں۔ بلقاء میں ہرقل کی فوج سے مقابلہ ہوا اور تینوں حضرات بالترتیب شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن الولید نے علم سنبھالا اور مسلمانوں کو دشمن کی زد سے نکال لائے [۴۹]

۱۴- فتح مکہ، اسباب فتح۔ رسول اللہؐ کے پاس قریش کے سفیر۔ پھر خالد بن الولید کی فتح [۵۰]

۱۵- غزوہ حنین، اس کے اسباب، حالات، آخر میں مسلمانوں کی فتح [۵۱]

۱۶- آنحضرت کی طائف روانگی، ثقیف سے جنگ، ثقفیوں کی آمد اور آں حضرت سے بیعت [۵۲]

۱۷- زرعہ بن ذی یزن کے نام آنحضرتؐ کا خط " امابعد، جب تمہارے پاس میرے قاصد معاذ بن جبل اور ان کے رفیق پہنچیں تو جو کچھ صدقہ اور جزیہ تمہارے پاس ہو اسے اٹھا کر دو۔۔۔ [۵۳] "

۱۸- اہل ہجر کے نام آپ کا خط " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد نبی کی جانب سے اہل ہجر کے نام۔۔۔۔ امابعد میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہدایت پانے کے بعد گمراہ نہ ہونا۔۔۔۔ [۵۴] "

۱۹- بنو کلال، المنذر بن ساوی، اہل یمن، ثقیف، اہل ایلۃ اور خزاعۃ کے نام آپ کے خطوط [۵۵]

۲۰- اسامہ بن زید کے حملہ کی تیاری۔ آں حضرت کا مرض الموت، وفات، آپ کی عمر [۵۶]

تاریخ و حدیث کی کتابوں میں عروہ کی جو روایات منتشر صورت میں ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عروہ کی خصوصی توجہ سیرت نبوی اور مغازی پر تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلفائے راشدین کے عہد کے بارے میں وہ خاموش رہے، اس دور کے جو واقعات عروہ کی زبانی منقول ہیں ان میں بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

عروہ نے ردّہ کی جنگوں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔ اسی طرح عہد صدیقی کے متعدد واقعات کی جانب اشارہ کیا ہے [۵۷]۔ جنگ یرموک اور جنگ قادسیہ کے بارے میں بھی بعض معلومات ملتی ہیں [۵۸] حضرت عمرؓ کے حالات [۵۹]، حضرت عثمانؓ اور ان کی شہادت کا واقعہ [۶۰] اور جنگ جمل کے بارے میں بھی ایک روایت اُن سے منقول ہے [۶۱]

عروہ کی ان روایات کی حیثیت ابتدائی خطوط کی سی ہے جو تفصیل و اجمال میں باہم ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں بعض روایات سرسری اشاروں سے عبارت ہیں، جبکہ بعض دوسری روایات بہت مفصل اور مربوط ہیں شلاً غزوہ بدر، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کی روایتیں غزوہ احد کے بارے میں کوئی قابل ذکر روایت ان سے منقول نہیں ہے [۶۲] عبدالعزیز دوری نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ تاریخ طبری میں غزوہ احد سے متعلق ایک اشارہ عروہ سے منقول ہے راقم سطور عرض کرتا ہے کہ واقدی کی مغازی میں بھی اس غزوہ کی جانب خفیف اشارہ عروہ سے نقل کیا گیا ہے [۶۳]

عروہ کے تاریخی آثار پر غور کرنے سے چند نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

۱- کسی موضوع پر عروہ کی توجہ اور دلچسپی اس کی اہمیت کے اعتبار سے نہیں ہوتی چنانچہ ایک طرف غزوہ بدر اور صلح حدیبیہ کے بارے میں جو تاریخ اسلام کے مہتم بالشان واقعات ہیں تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری طرف

غزوۂ احد کے سلسلہ میں جو مقدم الذکر واقعات سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتا اجمال اور اختصار سے کام لیتے ہیں اسی طرح نادسیا ویرموک کے بارے میں وہ اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۲۔ عروہ کی توجہ اصلاً سیرتِ رسولؐ اور مغازی پر مرکز رہی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں ان کی روایات کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بنو امیہ کے عہد میں یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ عروہ کی توجہ تاریخ سے زیادہ فقہ و حدیث کی جانب مبذول ہو گئی۔

۳۔ عروہ کے سب سے اہم آثار جو ہم تک پہنچے ہیں وہ رسائل ہیں جو عروہ نے عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک اور ولید کے کاتب ہنید کے استفسارات کے جواب میں تحریر کئے تھے۔

عروہ کا طرزِ تحریر

۱۔ اسناد:

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اسناد تحریر کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی تھی۔ یا کم از کم اس سے تحریر کو علمی رنگ اور عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن پہلی صدی ہجری میں غالباً اسے نہ وہ اہمیت حاصل تھی اور نہ وہ معیار مقرر ہوا تھا جو بعد کی صدیوں میں ہوا۔ بظاہر اس کا سبب یہ تھا کہ تاریخی واقعات پر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا، اور بہت سے صحابہ اور ان واقعات کے عینی شاہد اور شریک زندہ تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ عروہ کچھ روایات میں تو سند کا ذکر کرتے ہیں[۶۴] مگر بعض روایات میں نظر انداز کر جاتے ہیں[۶۵]۔ ہورووٹس کا خیال ہے کہ "عروہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عائشہ سے اخذ کئے ہیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا غلط ہوگا کہ عروہ اسناد کے خلاف تھے۔ اگرچہ ایسی روایات موجود ہیں جن کے راویوں کا ذکر عروہ نہیں کرتے لیکن سند اس دور میں ناگزیر نہیں تھی"[۶۶]۔

۲۔ تحریری دستاویزوں سے دلچسپی:

حضرت عروہ نے تحریری دستاویزوں پر توجہ دی اور ان سے استفادہ کیا۔ مثلاً آنحضرتؐ کے خطوط جو آپ نے حارث بن عبد کلال، شریح بن عبد کلال اور نعیم بن عبد کلال نیز خزاعہ اور زرعہ بن ذی یزن کو تحریر فرمائے[۶۷]۔ ان دوسرے مراسلوں کا بھی اضافہ کر لیجئے جن کا تذکرہ ہم نے عروہ کے تاریخی آثار کے ضمن میں کیا ہے۔ تاریخ نگاری میں آج بھی اس طرز کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔ قرآنی آیات اور اشعار سے استشہاد:

عروہ کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جب عہد نبوی کے واقعات بیان کرتے تو قرآنی آیات سے استشہاد کرتے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کو قریشی جو اذیتیں پہنچاتے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

"أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ" (غافر: ۲۸)

اسی طرح آیت کریمہ :

"و لتجدنّ أقربھم مودّۃ للذین آمنوا الذین قالوا إنا نصاری" (المائدہ : ۸۲) کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہیں[۶۸] غزوہ بنی قینقاع کا تذکرہ کرتے ہیں تو آیت "وإمّا تخافنّ من قوم خیانۃ ......" (الانفال : ۵۸) کی تلاوت کرتے ہیں[۶۹] ولید بن عبدالملک کا کاتب مزید جب ارشاد باری :

"یا أیّھا الذین آمنوا إذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھنّ" (الممتحنہ : ۱۰) کا مفہوم دریافت کرتا ہے تو عروہ ان حالات پر روشنی ڈالتے ہیں جن میں آیت کا نزول ہوا۔ اس کے بعد آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں[۷۰]

جہاں تک اشعار سے استشہاد کا تعلق ہے تو ان کی روایات میں یہ اشعار کبھی تو خود ان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں مثلاً حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حجاج کی جنگ پر عروہ نے یہ رجز پڑھا[۷۱]

أی الحواریون إلّا محمد ا ... من یقتل الیوم یبدق رشدا[۷۲]

اور کبھی واقعات میں شریک افراد سے منقول ہوتے ہیں مثلاً مدینہ ہجرت کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ جب سخت بیمار ہوئے تو عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی زبان پر یہ رجز تھا[۷۳]

کلّ امرئ مصبّح فی أھلہ ... والموت أدنی من شراک نعلہ

اور حضرت بلالؓ یہ شعر پڑھ رہے تھے[۷۴] :

ألا لیت شعری ھل أبیتنّ لیلۃ ... بفخ وحولی إذخر وجلیل

وھل أردن یوما میاہ مجنۃ ... وھل یبدون لی شامۃ وطفیل[۷۵]

عبدالعزیز دوری لکھتے ہیں کہ مدینہ کے ماحول میں جہاں شاعری کو تہذیب و ثقافت اور واقعات و اخبار میں بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ اسلوب بالکل فطری اور قدرتی تھا[۷۶]

۴۔ تاریخ نگاری میں عروہ کا نہج :

تاریخی واقعات کو پیش کرنے میں عروہ کا انداز معلوم کرنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس مراسلہ کے بعض اقتباسات درج کر دیئے جائیں جو عروہ نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک بن مروان کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا[۷۷]

"أمّا بعد فانّک کتبت إلیّ فی أبی سفیان ومخرجہ تسألنی کیف کان شأنہ؟ انّ أبا سفیان بن حرب أقبل من الشام فی قریب من سبعین راکبا من قبائل قریش کلّھا کانوا تجارا بالشام فأقبلوا جمیعا معھم أموالھم وتجارتھم فذکروا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ وقد کانت الحرب بینھم قبل ذلک ...... فلما سمع بھم ندب أصحابہ وحدثھم بما معھم من الأموال وبقلۃ عددھم فخرجوا لا یریدون إلّا أبا سفیان والرکب معہ لا یرونھا إلّا غنیمۃ لھم لا یظنّون أن یکون کبیر قتال إذ لقوھم، وھی التی أنزل اللہ عزوجل فیھا (وتودّون أنّ غیر ذات الشوکۃ تکون لکم) (الانفال : ۷)

فلما سمع ابوسفیان أنّ أصحابَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم معترضون لہ بعثَ إلی قریش....

فلما أتی قریش الخبر...... (عروہ جنگ کے لیے قریش کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں)

ولم یسمع بنفرۃ قریش رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولا أصحابہ حتی قدم النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم

بدرًا...... (پھران کی تعداد ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں) فزعموا أنّ النبی قال : القوم ما بین التسعمائۃ

الی الألف..... فالتقوا ھم والنبی ففتح اللّٰہ علی رسولہ و أخزی أئمۃ الکفر وشفی صدور المسلمین منھم۔

اس مراسلہ کا جائزہ لیجئے تو عروہ کے اسلوب تحریر کے بارے میں درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں :-

۱۔ عروہ نے جواب کے آغاز ہی میں پہلے سائل کا سوال ذکر کیا اس کے بعد جواب دیا۔

۲۔ عروہ کا اسلوب سادہ، بے تکلف اور سجع اور غریب و نامانوس الفاظ سے پاک ہے۔

۳۔ تمہیدی باتیں بھی بیان کی ہیں۔چنانچہ غزوہ بدر اور اس سے پہلے کے واقعات میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے: "وقد کانت الحرب بینھم قبل ذلک"

۴۔ غزوہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آیات سے استدلال کیا ہے۔اس نکتہ کی جانب گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

۵۔ جب کسی بات میں شک ہوتا ہے یا مطمئن نہیں ہوتے تو "زعموا" کے لفظ سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ جنگ بدر میں قریش کی تعداد کے تذکرہ میں آپ نے دیکھا۔

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ ابن خلکان، وفیات الاعیان: ج ۲ قاہرہ، ۱۹۴۸ء ص ۱۱۱

۲۔ العسقلانی، ابن حجر، تہذیب التہذیب، ج ۲ حیدرآباد ۱۳۲۶ھ ص ۱۸۳

۳۔ الدُّوری، عبدالعزیز، نشأۃ علم التاریخ عند العرب بیروت ۱۹۶۰ء ص ۲۲

۴۔ ابن خیاط، خلیفہ، التاریخ، ج ۱ دمشق ۱۹۶۷ء ص ۱۵۹

۵۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ج ۵ بیروت ۱۹۵۷ء ص ۱۷۸

۶۔ الجاحظ، عمرو بن بحر، البیان والتبیین، ج ۱، ص ۱۸۰، البلاذری، انساب الاشراف، ج ۵ القدس ۱۹۳۶ء ص ۳۷۱

۷۔ الاصفہانی، ابوالفرج، الاغانی، ج ۸ قاہرہ، طبقہ ساسی ۸۹ و ۹۳

۸۔ البلاذری، فتوح البلدان، بیروت ۱۹۵۷ء ص ۳۰۵

۹۔ ابن قتیبہ، المعارف، گوٹنجن ۱۸۵۰ء ص ۱۱۴۔ ابن خلکان، ماخذ سابق، ص ۴۱۸

۱۰۔ البلاذری: الانساب، ص ۱۸۵، ابن خلکان، ماخذ سابق، ص ۲۱

۶۵۔ الواقدی، مرجع سابق، ص ۱۵۲، ابن خیاط، مرجع سابق، ص ۵۶، بلاذری، الفتوح، ص ۲۰، ۱۰۹، ابن عبدالبر، مرجع سابق، ص ۲۳، ۵۰۔

۶۶۔ ہوروونس، مرجع سابق، ص ۲۳۔

۶۷۔ ابن سلام، مرجع سابق ص ۱۳، ۲۰، ۲۱۔

۶۸۔ ابن عبدالبر، مرجع سابق، ص ۱۴۲۔

۶۹۔ الواقدی، مرجع سابق، ص ۱۷۷۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۷۱۔ البلاذری، الانساب، ص ۳۷۵۔

۷۲۔ رجز شعر کا ترجمہ:

حامیانِ زبیر مجد و شرف حاصل کرکے رہیں گے
آج جو شخص قتل ہوگا فلاح یاب ہوگا

۷۳۔ عام خیال یہ ہے کہ "مصبح" کے معنی "مصاب بالموت صباحاً" (فتح الباری، ۱۸۶/۷ مطبع خیریہ ۱۳۲۵ھ) ہے۔ لسان العرب میں شرح کی ہے۔ "ای مأتی بالموت صباحاً لکونہ فیھم وقتئذ" (صبح) اس تشریح کی رو سے ترجمہ یوں ہوگا۔

ہر شخص کو صبح جب وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہوگا موت آنے والی ہے
اور موت اس سے جوتی کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے

علامہ ابن حجر نے ایک اور تشریح "قیل" کے لفظ سے نقل کی ہے: وقیل المراد أنہ یقال لہ وھو مقیم بأھلہ صبّحک اللہ بالخیر وقد یفجأہ الموت فی بقیۃ النھار"۔

میرے خیال میں یہ تشریح زیادہ مناسب ہے اور دونوں مصرعوں میں ربط گہرا ہو جاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا:۔

(ہر شخص کو جب وہ اپنے گھر کے لوگوں میں ہوتا ہے صبح بخیر کہا جاتا ہے حالانکہ موت جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہوتی ہے)

سیرت ابن ہشام کے انگریز مترجم A. guillaume سے رجز کے ترجمہ میں تسامح ہوا ہے ملاحظہ ہو: The life of muhammad ص ۲۸۰ (آکسفورڈ پریس ۱۹۵۵ء) مترجم۔

۷۴۔ شعروں کا ترجمہ:

(۱) اے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کیا میں ایک شب مقام فخ میں گذار سکوں گا۔ جہاں میرے ارد گرد اذخر اور جلیل ہوں گے۔

(۲) اور کیا مجنہ کے چشموں پر کبھی جا سکوں گا اور شامہ و طفیل میری نظروں کے سامنے ہوں گے!

ان شعروں میں شاعر اپنے وطن مکہ کے لیے بے قراری کا اظہار کر رہا ہے اس لئے وہیں کے مقامات اور پودوں کا ذکر کیا ہے۔ شامہ و طفیل کے بارے میں ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ پہاڑیاں ہیں مگر خطابی کا قول ہے کہ دو چشمے ہیں (الروض الانف ۵۳/۲، مطبعۃ جمالیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ، معجم البلدان ـ شامہ، طفیل۔) مترجم

۷۵ - ابن ہشام، ماخذ سابق ص ۶۰۸/۹، بلاذری، الفتوح، ص ۱۹ -

۷۶ - الدوری، ماخذ سابق ص ۷۵ -

۷۷ - الطبری، ماخذ سابق - ص ۱۲۸۴ - ۱۲۸۸ -

۷۸ - ترجمہ :

"امابعد، آپ نے مجھ سے ابوسفیان اور اس کی روانگی کے بارے میں دریافت کیا ہے تو واقعہ یہ تھا کہ ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سواروں کے ساتھ شام سے آرہا تھا۔ ان سواروں کا تعلق قریش کی تمام شاخوں سے تھا اور یہ لوگ شام میں تجارت کرتے تھے۔ یہ قافلہ جب اپنے مال تجارت اور ساز و سامان کے ساتھ آرہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے اس کا تذکرہ ہوا۔ اور دونوں فریقوں کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی...... جب آپ نے ان کی آمد کی خبر سنی تو صحابہ کو بلایا۔ اور قریش کے مال و اسباب اور ان کی قلت تعداد کے بارے میں گفتگو کی..... چنانچہ صحابہ نکلے اور ان کا نشانہ صرف ابوسفیان اور اس کا قافلہ تھا۔ وہ اسے مال غنیمت خیال کرتے تھے اور انھیں گمان تک نہیں تھا کہ تصادم کی صورت میں بھی کوئی بڑی جنگ ہوگی۔ اسی قافلہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"وتودون أن غير ذات الشوكة تكون لكم" (الانفال: ۷)

(اور تم چاہتے تھے کہ جو طاقت والا گروہ نہیں ہے وہ تمہارے ہاتھ لگے)

ابوسفیان کو جب پتہ چلا کہ صحابہ مزاحم ہوں گے تو اس نے قریش کو کہلا بھیجا..... جب قریش کو خبر ملی تو...... (عروہ جنگ کے لیے قریش کی تیاری کا ذکر کرتے ہیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو قریش کی چڑھائی کا علم نہ ہو سکا یہاں تک کہ آپ بدر پہنچ گئے...... لوگوں کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قریش کی تعداد نو سو سے ہزار تک ہے...... پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جنگ ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فتح بخشی، ائمہ کفر کو رسوا کیا اور مسلمانوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔"

ابنِ اسحٰق اور "سیرۃ الرّسول اللہ"

الفریڈ گیوم / تحسین فراقی

الفریڈ گیوم ـــــ مختصر تعارف

الفریڈ گیوم سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں شرقِ قریب اور شرقِ اوسط کے شعبے کے صدر تھے۔ وہ لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے اور بعد ازاں پرنسٹن یونیورسٹی، نیوجرسی میں عربی میں وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دینیات اور مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی زبان سیکھی۔ پہلی عالمی جنگ میں انھوں نے پہلے فرانس میں اپنی خدمات انجام دیں اور بعد ازاں قاہرہ کے عرب بیورو میں۔ جب وہ انگلستان واپس آئے تو انھیں پادری بنا دیا گیا۔ مسلم دنیا میں وہ "وراثتِ اسلام" کے ایڈیٹر کے طور پر معروف تھے۔ اس کتاب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس طرح اُنھوں نے ابنِ اسحٰق کی "سیرتِ رسول اللہ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کے آغاز میں ابنِ اسحٰق کی سیرت نگاری اور اس کے متقدمین کی سیرت نگاری پر بڑی مبسوط بحث کی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران انھیں امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر مدعو کیا گیا۔ یہاں اُنھوں نے اپنے مسلمان دوستوں کا حلقہ بہت وسیع کر لیا۔ دمشق کی عرب اکیڈمی اور بغداد کی رائل اکیڈمی نے انھیں اپنا رکن منتخب کر لیا۔ استنبول یونیورسٹی نے انھیں عیسوی اور اسلامی دینیات کا پہلا غیر ملکی لیکچرر مقرر کیا۔ گیوم کی کتاب "HEBREW AND ARABIC LEXICOGRAPHY" بھی بہت اہم ہے۔ یہ کتاب LEIDEN سے ۱۹۶۵ء میں چھپی۔ اس کتاب میں گیوم نے عربی کے وسیع منابع کے عبرانی علم اللغات سے تعلق کی وضاحت کی تھی اور دعوٰی کیا تھا کہ انھوں نے اس لغاتیاتی تقابلی مطالعے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا سراغ کو ہلر کی کاوش میں نہیں ملتا۔ اسی طرح اُنھوں نے حدیثی ادب کا ایک تعارفی مطالعہ "روایاتِ اسلام" کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب پاکستان میں ۱۹۷۷ء میں چھپی۔ گیوم کا ۱۹۶۵ء میں انتقال ہوا۔ گیوم نے سیرت ابنِ اسحٰق کے انگریزی ترجمے کی ابتدا میں جو مفصل دیباچہ لکھا ہے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس ترجمے میں جہاں "سیرت" کا لفظ واوین میں آیا ہے اس سے مراد ابنِ اسحٰق کی "سیرت الرسول اللہ" ہے۔

ابنِ اسحٰق ـــــ تعارف

محمد ابن اسحٰق ابن یسار قریباً ۸۵ ہجری میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵۱ ہجری میں بغداد میں وفات پائی۔ ان کے

دادا یسار اُس وقت حضرتِ خالدؓ بن ولید کے ہاتھ آگئے جب اُنھوں نے ۱۲ ہجری میں عین التمر کو فتح کیا۔ یسار کو شاہِ ایران کے وہاں قید کر رکھا تھا۔ خالدؓ نے انھیں متعدد دیگر قیدیوں کے ساتھ حضرتِ ابوبکرؓ کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ وہاں انھیں بحیثیت غلام کے قیس بن مخرمہ بن عبد المطلب بن عبدِ مناف کے سپرد کیا گیا اور اسلام قبول کر لینے کے بعد آزاد کر دیا گیا۔ ان کے خاندان نے اپنے ورثا کے خاندانی نام کو اختیار کر لیا۔ ان کے بیٹے اسحٰق کی ولادت قریباً ۵۰ ہجری میں ہوئی۔ ان کی والدہ ایک اور آزاد کردہ غلام کی بیٹی تھیں۔ وہ اور ان کے بھائی موسیٰ معروف راوی تھے۔ چنانچہ ابنِ اسحٰق کا رستہ عنفوانِ شباب کو پہنچنے سے پہلے ہی متعین ہو چکا تھا۔

ان کا تعلق راویوں کی اس دوسری نسل سے بنتا ہے جن میں الزُہری، عاصم بن عمر بن قتادہ اور عبداللہ بن ابوبکر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُنھوں نے عُنفوانِ شباب ہی سے خود کو روایتِ نبوی کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا ہوگا، کیونکہ تیس سال کی عمر میں وہ یزید بن ابوحبیب سے کسبِ فیض کرنے کے لیے مصر چلے گئے۔ وہاں انھیں سند کا درجہ حاصل ہو گیا کیونکہ بعدۂ یہی یزید حدیث کے سلسلے میں ابنِ اسحٰق سے استناد کرنے لگا۔ مدینہ واپسی کے بعد اُنھوں نے اس تمام لوازمے کی ترتیب و تدوین کے کام کا آغاز کیا جو وہ اکٹھا کر چکے تھے۔ الزہری سے، جو ۱۲۳ھ میں مدینہ میں تھے، مروی ہے کہ مدینہ میں "علم" کبھی کم نہ ہوگا جب تک ابنِ اسحٰق کا دم سلامت ہے اور اُنھوں نے ابنِ اسحٰق سے رسول اللہؐ کے مغازی کی تفاصیل بڑے ذوق شوق سے اکٹھی کیں۔ بدقسمتی سے ابنِ اسحٰق ' مالک بن انس کی دشمنی مول لے بیٹھے؛ جن کے علمی کام سے انھیں تنفّر تھا۔ اور یُوں جلد ہی ابنِ اسحٰق کی تحریروں اور خود ان کی استقامت پر سوال اُٹھنے لگے۔ اغلب ہے کہ سُنن پہ ابن اسحٰق کی گم شدہ کتاب مالک کے غیظ کا سبب بنی کیونکہ یہ فقہ کے میدان میں حضورِ اکرمؐ کے معمولات و سنن پہ مبنی ہوگی اور اسی لیے اختلافات بہت شدّت سے محسوس کیے گئے ہوں گے۔ ان پہ شیعی اور قدری ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ایک اور صاحب نے ان کی صداقت پہ حرف گیری کی (تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ) ابنِ اسحٰق اکثر فاطمہ زوجہ ہشام بن عروہ کو بعض احادیث کے سلسلے میں سند کے طور پہ پیش کرتے تھے۔ فاطمہ کا خاوند غصّے کے عالم میں کہا کرتا تھا کہ وہ تو کبھی اُس کی بیوی سے ملا ہی نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ چونکہ فاطمہ عمر میں ابنِ اسحٰق سے چالیس سال بڑی تھی اس لیے اس بات پہ آسانی سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ . . . . . اکثر ایک دُوسرے سے ملتے رہے۔ یہ بات معلوم نہیں کہ ابن اسحٰق کو مدینہ چھوڑنے پہ مجبور کیا گیا یا وہ اپنی مرضی سے ہجرت کر گئے۔ اتنی بات البتہ واضح ہے کہ ایک ایسی جگہ پہ ان کی وہ حیثیت کیسے ہو سکتی تھی جہاں ان کے جاسوسوں کو مقامِ محفوظ ملا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ مشرق کی جانب چل کھڑے ہوئے اور کوفہ، کنارِ دجلہ پہ آباد الجزیرہ اور رَے میں قدرے توقف کرنے کے بعد بغداد میں مقیم ہو گئے۔ جب منصور ہاشمیہ میں تھا تو وہ اس کے متوسلین میں شامل ہو گئے اور انھیں اپنی مدوّنہ احادیث کا ایک نسخہ بخشش کی امید پہ پیش کیا۔ وہاں سے وہ رَے کی جانب روانہ ہُوئے اور وہاں سے سلطنت کے نئے دار الحکومت کی جانب۔ وہ ۱۵۰ھ (یا شاید ۱۵۱ھ) میں فوت ہُوئے اور انھیں خیزُران کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

"سیرت"

"سیرت" کے پیشرو

یہ بات یقینی ہے کہ ابن اسحٰق کی "سیرۃ الرسول اللہ" کا صحیح معنوں میں کوئی بھی حریف نہیں تھا۔ لیکن اس سے پہلے متعدد کتب مغازی موجود تھیں۔ ہم نہیں جانتے وہ پہلے پہل کب لکھی گئیں، اگرچہ ہمیں پہلی صدی ہجری کے ان متعدد علماؓ کے نام معلوم ہیں جنھوں نے اہم نکات تحریر کر لیے تھے اور آنے والی نسل تک اپنا علم منتقل کر دیا تھا۔ ان میں پہلی شخصیت کا نام ابان تھا جو خلیفہ عثمانؓ کے صاحبزادے تھے [۱] وہ قریباً ۲۰ ہجری میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے اپنے والدمکرم کے قاتلوں کے خلاف حضرت طلحہؓ اور حضرتِ زبیرؓ کی مہم میں حصہ لیا۔ وہ قریباً ۱۰۰ ھ میں فوت ہوئے۔ ابن المغیرہ کے باب میں واقدی نے جو زبان استعمال کی ہے، یعنی یہ کہ "اس نے حدیث کے سلسلے میں سوائے مغازیِ رسولؐ کے اور کچھ نہیں لکھا تھا، جس کی تفصیل اسے ابان سے ملی تھی"، سے یقیناً یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن المغیرہ نے وہی کچھ لکھا جو ابان نے اسے بتایا۔ تعجب اس بات پہ ہے کہ نہ تو ابنِ اسحٰق نے اور نہ ہی الواقدی نے اس شخص کا حوالہ دیا ہے جو بعض ان معاملات کے اندرون کا گہرا علم رکھتا تھا جن کا عامۃ الناس کو کچھ علم نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے پیرو ہونے کی وجہ سے امکان اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسے شخص کے بیٹے کے ذکر نہ کرنے ہی کو ترجیح دی ہو جس نے شیعانِ علیؓ کے نزدیک ناحق خلافت سنبھال لی تھی۔ بہرحال ان کا نام فقہی احادیث کے مجموعوں کی اسناد میں اکثر آیا ہے (طبری ص ۲۳۴۰ اور ابنِ سعد جلد چہارم ص ۲۹ میں اس شخصیت کا نام ابان بن عثمان البجلی آتا ہے، جن کے بارے میں قیاس ہے کہ اُنھوں نے مغازیؐ پر ایک کتاب لکھی تھی)

ایک اہم تر شخصیت عروہؓ بن الزبیر بن العوام (۲۳ھ - ۹۴ھ) کی تھی جو حضور اکرمؐ کے چچازاد تھے۔ عروہؓ کی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ تھیں۔ وہ اور ان کے بھائی عبداللہ حضور اکرمؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرتِ عائشہؓ سے قریبی رابطہ رکھنے والوں میں تھے۔ وہ اسلام کے صدرِ اوّل کی تاریخ پر سند سمجھے جاتے تھے اور اموی خلیفہ عبدالملک ان سے اس باب میں وقتاً فوقتاً معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ یہ بات یقینی نہیں کہ اُنھوں نے کوئی کتاب لکھی ہو۔ لیکن ابنِ اسحٰق اور دُوسرے لکھنے والوں کے توسط سے ان کے نام کے حوالے سے جو متعدد روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کی روشنی میں اس دعوے کا جواز نکلتا ہے کہ وہ واقعی تاریخ اسلام کے بانی تھے [۲] .... ان کے کام کا بیشتر حصہ ان کی خالہ حضرتِ عائشہؓ کے بیانات پر مبنی ہے۔ ابنِ اسحٰق کی طرح وہ بھی بیان کردہ روایات میں شاعری کا حوالہ دینے کے عادی تھے اور اپنی اس عادت کا جواز حضرت عائشہؓ کی مثال دے کر نکالا کرتے تھے جو ہر پیش آمدہ موضوع پر اشعار پڑھا کرتی تھیں [۳] وہ رومانی شاعر عمرو بن ربیعہ کے دوست تھے لیکن ان کی نگاہ میں شاعرِ رسالتمآب حضرتِ حسان بن ثابت کی کوئی اہمیت نہ تھی [۴]

شُرحبیل بن سعد کے بارے میں، جو ایک آزاد کردہ غلام تھے ——— غالباً جنوبی عرب کے ——— سوائے اس بات کے

اور کچھ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے ایک کتاب مغازی پر تحریر کی تھی۔ ابن اسحٰق کے یہاں اُن کا حوالہ معدوم ہے اور دُوسرے لکھنے والوں کے یہاں بھی شاذ ہی ان کا حوالہ آیا ہے۔ ان کی وفات ۱۲۳ھ میں ہُوئی اور چونکہ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ سے ان کی جان پہچان تھی اس لیے وُہ یقیناً سو سال کی عمر میں فوت ہوئے ہوں گے۔ وہ حضورِ اکرمؐ کے بعض صحابہ سے روایات نقل کرتے ہیں اور موسیٰ بن عقبہؒ گواہ ہیں کہ اُنھوں نے جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے مہاجرین اور محاربین کی فہرستیں مرتب کیں۔ . . . .

ایک اور اہم تابعی وہب بن منبّہ (۳۴ھ - ۱۱۰ھ) تھے جو ایرانی النسل یمنی تھے۔ ان کے والد غالباً یہودی تھے۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے صحائف و روایات میں اپنی دلچسپی اور علم کے باعث اچھی شہرت کے حامل نہیں تھے، اور اگرچہ بہت سے زوائد جو ان کے بعد گھڑ لیے گئے تھے، ان کے سر مڑھ دیے گئے۔ ان کی کتاب المبتدأ بعد کے مسلمانوں کے، حیات الانبیأ اور دیگر انجیلی حکایات پر مبنی بیانات کے پس منظر میں جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں یہاں ان کی یمن کی داستانی تاریخ، ضرب الامثال، مسئلۂ قدر اور بعض دیگر مسائل پر (جو جزوی طور پر ابن ہشام کی کتاب التیجان میں محفوظ ہیں) لکھی گئی تحریروں سے سروکار نہیں لیکن حاجی خلیفہ کی اس روایت کی کہ وہ مغازی بھی جمع کرتے تھے، اب اس کی گم شدہ کتاب کے پاپیر دس (PAPYRI) پر ۲۲۸ھ لکھے ہوئے ایک حصّے کے دریافت ہو جانے سے تصدیق ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس مختصر سے حصّے سے ہمیں کسی نئی بات کا پتا تو نہیں چلتا لیکن بہر حال اس کی اہمیت ان معنوں میں بے حد ہے کہ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک یا اس سے چند سال قبل تک حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے بیشتر حقایق جو ہمیں مابعد کی بیشتر کتابوں میں ملتے ہیں، تحریری شکل میں محفوظ کر لیے گئے تھے۔ اس سے مزید یہ پتا چلتا ہے کہ دُوسرے اوّلین راویوں کی طرح انھیں اسناد کی یا تو بالکل ضرورت محسوس نہ ہوئی یا پھر نہایت کم۔ مس گرٹرڈ میلا میڈؒ نے مقامِ عقبہ پر اجلاس والے بیان (دیکھیے ابن ہشام کی سیرت کے ص ۲۹۹، ۲۹۳، ۲۰۰) کا اسی موضوع سے متعلق دوسرے مواد سے جو تقابلی مطالعہ کیا ہے اور تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے اس پر جو تنقید لکھی ہے اس سے وہ بعض اہم نتائج تک پہنچی ہے لیکن جس کا ہمارے موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک دلچسپ تفصیل یہ ہے کہ حضرت محمدؐ نے عباس سے خطاب کرتے ہوئے اوس اور خزرج کو "میرے اور تمھارے ماموں" قرار دیا ہے . . . .

ان کے بعد عاصم بن عمر بن قتادہ الانصاری (وفات تقریباً ۱۲۰ھ) کا نام آتا ہے۔ وہ دمشق میں حضورِ اکرمؐ کے مغازی اور صحابہ کرامؓ کے کارناموں پر درس دیا کرتے تھے اور غالباً وہ اپنے دروس کو تحریری شکل میں بھی لے آتے تھے۔ وُہ بھی اپنے اُستاد کے ناموں کا حوالہ دیتے ہوئے کسی توازن کا ثبوت نہیں دیتے۔ بعض اوقات وہ اسناد دیتے ہیں اور اکثر اوقات اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ وُہ مدینہ اس غرض سے واپس آئے کہ اپنے کام کو جاری رکھ سکیں اور ابن اسحٰق ان کے محاضرات میں شریک ہوئے۔ گاہے گاہے وُہ اپنی روایات میں اشعار بھی جڑا کرتے تھے اور بعض اوقات اس باب میں اپنی رائے بھی دیا کرتے تھے۔

محمد بن مسلم بن شہاب الزُّہری (۵۱ھ - ۱۲۴ھ) مکّہ کے ممتاز خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ اپنے آپ کو

عبدالملک، ہشام اور یزید سے متعلق گردانتے تھے اور انھوں نے اپنے چند فاخر شاگردوں کے لیے کچھ روایات حوالۂ تحریر کیں۔ انھیں بعد کے محدثین کا پیشرو گردانا جاسکتا ہے کیونکہ انھوں نے دو نوقبیل کے ان افراد کو کھنگالنے میں بہت کشٹ اٹھائے جن کے بارے میں امکان تھا کہ وہ ماضی کا علم رکھتے ہوں گے۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے خاندان کی ایک تاریخ اور مغازی پر ایک کتاب یادگار چھوڑی۔ ان کی بیان کردہ روایات کا بیشتر حصہ ان کے محاضرات کے ان اشارات کی شکل میں بچ رہا جو ان کے شاگردوں نے تحریر کر لیے اور جو ان احادیث میں محفوظ ہیں جو ان کی سند کے حوالے سے وہ ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ نوجوانی میں الزُّہری کچھ عرصہ مدینہ میں رہے ابنِ اسحٰق سے ان کی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ حج کے لیے (جنوب میں) آئے اور انھیں اکثر سیرت کے باب میں سند کا درجہ حاصل ہے۔ اپنی نسل کے وہ سب سے اہم روایت نگار تھے اور مسلّمہ احادیث کے ہر مجموعے میں ان کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں (مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے جے ہوروز کا "اسلامک کلچر" جلد دوم صفحہ ۳۳ و ببعد)

عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (وفات ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ) ابنِ اسحٰق کے اہم ترین خبر دہندوں میں سے تھے۔ ان کے باپ کو عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ حدیثِ نبویؐ کا مجموعہ مرتب کریں، خصوصیت سے وہ حدیثیں جو عمرہ بنت عبدالرحمٰن سنایا کرتی تھیں۔ عمرہ حضرت عائشہؓ کی سہیلی تھیں اور وہ ان ابوبکر کی پھوپھی تھیں۔ ان کے بیٹے عبداللہ ہی کے زمانے سے قبل یہ تحریریں کھو چکی تھیں اگرچہ عبداللہ کی کسی کتاب کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تاہم ان کی تفصیلات کبھی غالباً ان کے بھتیجے کی جمع کردہ مغازی میں محفوظ تھیں۔ ہماری توقع کے عین مطابق عبداللہ اسناد کے معاملے میں بے پروا ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ واقعات کے بہت قریب کھڑے تھے ——— ان لوگوں کے درمیان جن میں سے بیشتر ان سے واقف تھے، سو ایسی صورت میں اپنے اسناد کا ذکر کیسا؛ طبری (ج ۱ ص ۱۸۳۷) میں ایک دلچسپ اشارہ موجود ہے اس باب میں کہ ابنِ اسحٰق مطلوبہ معلومات کس طرح حاصل کرتے تھے: "عبداللہ نے اپنی بیوی فاطمہ سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسے (ابنِ اسحٰق کو) وہ کچھ بتا دے جو وہ (عبداللہ) عمرہ کی سند کے حوالے سے جانتا تھا۔"

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) نے بھی ایک کتاب المغازی اپنی یادگار چھوڑی تھی جو عروہ کی روایت سے مماثلتِ تام رکھتی ہے۔[۹]

ہمارے مصنف کے، تیسری نسل کے ایک اور معاصر موسٰی بن عقبہ (قریباً ۵۵ھ۔ ۱۴۱ھ) تھے جو خاندان الزبیر کے آزاد کردہ تھے۔ ان کی کتاب کا ایک معمولی سا حصہ یادگار رہ گیا ہے اور اسے ۱۹۰۴ء میں سخاؤ نے شائع کرایا۔[۱۰] چونکہ ایک زمانے میں یہ ابنِ اسحٰق کی اہم تصنیف سے لگا کھاتا تھا اور سیرت کے باب میں ہماری قدیم ترین شہادتوں میں سے ہے، سو میں نے اب تک باقی روایات کا ترجمہ فراہم کر دیا ہے۔[۱۱] اگرچہ مالک بن انس، الشافعی اور احمد بن حنبل ——— تینوں نہایت متاثر کن اصحاب ——— اس رائے کے حامل تھے کہ ان کی (موسٰی) کتاب نہایت اہم اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے، لیکن آنے والی نسلوں نے واضح طور پر ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ورنہ ان (موسٰی) کے

کام کا بیشتر حصہ محفوظ رہ گیا ہوتا۔[۱۲] ابن اسحٰق کبھی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ . . . . الواقدی، ابن سعد، البلاذری، طبری اور ابن سیدالناس نے بڑی فراخ دلی سے ان کو حوالہ بنایا ہے۔ موسیٰ بن عقبہ نے ان لوگوں کی فہرستیں فراہم کیں جو حبشہ گئے اور ان کی بھی جنھوں نے معرکۂ بدر میں جہاد کیا۔ وہ کبھی کبھی اسناد بھی دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہمیشہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ کسی تحریری شہادت پر بھروسا کر رہے ہیں یا زبانی روایت پر۔ بہرحال کم از کم ایک بار اُنھوں نے اس کثیر لوازمے کا حوالہ دیا ہے جو ابن عباس نے چھوڑا (دیکھیے ابن سعد صفحہ ۲۱۶)۔ وہ کہیں کہیں نظموں کے حوالے بھی لاتے ہیں۔

وہب بن مُنَبِّہ کے اس بچ جانے والے جز (مغازی) سے قطع نظر، برلن کا مخطوطہ ——— اگر وہ مستند ہے تو پھر وہ عربی میں تاریخِ ادب کا ایک قدیم ترین موجود نسخہ ہے اور اسی ایک وجہ سے یہ گہری توجہ کا طالب ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ بخاری میں موجود بعض احادیث کے ایک صدی سے زاید پیچھے تک موجود ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔

مغازی پر مشتمل دیگر کتب دُوسری صدی میں عراق، شام اور یمن میں لکھی گئیں لیکن اس بات کا شاذ ہی امکان ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ابنِ اسحٰق کے کارنامے کو متاثر کیا ہو اور اسی وجہ سے ان کتب کو سہولت سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس صدی میں ہر جگہ حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں کمال دلچسپی لی گئی۔ لیکن ہمارے اور عربوں کے علم میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو جامعیت، ترتیب و تنظیم اور باضابطہ تحریر کے اعتبار سے سیرتِ ابنِ اسحٰق سے لگا کھاسکے۔ اب اس کتاب پر گفتگو ہوگی:

"سیرت"

عرب مصنّفین کے یہاں اس کتاب کے نام ——— "کتاب المغازی"، "کتاب المغازی والسِّیَر"، "کتاب السیرت والابتدا والمغازی" ——— سبھی مل جاتے ہیں۔ البکّائی نے جو ابنِ اسحٰق کا ایک شاگرد تھا، تمام کتاب کی دو نقول تیار کیں جس میں سے ایک ابنِ ہشام (وفات ۲۱۸ھ) تک پہنچی ہوگی، جس کا اختصار کردہ متن، تحشیہ اور کہیں کہیں تبدیلی کے ساتھ ابن اسحٰق کے اصل کارنامے کے علم کے سلسلے میں ہمارا بڑا منبع ہے۔ بعض دوسرے ذرائع سے اس کا مزید حصہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔[۱۳] ابنِ ہشام کی ترمیم شدہ کتاب کے تعارف میں پس منظر میں کام کرنے والے اصولوں کا ذکر ملتا ہے۔ سخاوی کا خیال ہے کہ جس نقل کو طبری استعمال میں لائے وہ اس وقت تیار کی گئی تھی جب ابنِ اسحٰق رَے میں تھے۔ اسے سلمہ بن فضل الابرش الانصاری نے تیار کیا تھا، کیونکہ طبری ابنِ اسحٰق کا حوالہ فضل کی روایت کے مطابق دیتے ہیں۔ تیسری نقل یُونس بن بُکَیر نے رَے میں تیار کی۔ یہی نقل ابن الاثیر نے اپنی اُسُد الغابہ میں استعمال کی۔ اس نظرِ ثانی شدہ نسخے کے ایک حصّے کی نقل قرَوِیّین کی مسجد میں بمقام فاس (FEZ) موجود ہے۔ . . . . .

چوتھی نقل شام کے ہارون بن ابو عیسیٰ کی تیار کردہ تھی۔ ان آخری دُو نقول سے ابنِ سعد نے استفادہ کیا۔[۱۴] ان سب کے علاوہ فہرست میں النُّفَیلی (متوفی ۲۳۴ھ) کے ایڈیشن کا ذکر بھی ملتا ہے۔

کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کتاب ہمیشہ سے تین الگ الگ حصّوں میں موجود تھی۔ یعنی :

(ا) قصص قدیم

(ب) حضورؐ کی ابتدائی زندگی اور ان کا مشن۔ اور

(ج) انؐ کے مغازی

یہ تو محض کتاب کے تین حصّے ہیں جن میں ابن اسحٰق کے محاضرات موجود تھے۔

"مبتدا" (مبدأ) کے لیے ہمیں طبری کی تفسیر اور تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس میں پایا جانے والا پہلا حوالہ کچھ یُوں ہے" ابنِ حمید نے کہا کہ سلامہ بن الفضل نے ہمیں بتایا کہ ابنِ اسحٰق نے یُوں کہا کہ وُہ پہلی چیز جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی نور و ظلمت تھے۔ پھر اس نے انھیں جُدا کیا اور ظلمت کو رات بنایا جس کے اندھیرے پر سیاہی بڑھی ہوئی تھی اور اس نے نور کو دن بنایا ——— روشن اور منوّر"۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب کے پہلے حصّے کے عنوان کا مطلب ہے "آغازِ کائنات (GENESIS)"۔ ابنِ ہشام نے تمام درمیانی صفحات سے صرفِ نظر کیا اور حضرتِ ابراہیمؑ سے آغاز کیا جو حضورِ اکرمؐ کے جد الاجداد تھے۔ الارزقی نے اپنی "اخبارِ مکّہ" میں اس گم شدہ حصّے کے بعض اجزا کا حوالہ دیا ہے اور بعض اقتباسات المطہر بن طاہر[۱۱] نے بھی دیے ہیں۔

جہاں تک مبتداء کا تعلق ہے تو چونکہ یہ ابنِ ہشام کی نظرِ ثانی کے تحت میں نہیں آتی اس لیے سرِ دست ہمارے موضوع سے خارج ہے، اگرچہ اس بات کی اُمید کی جانی چاہیے کہ کسی دن کوئی صاحبِ تحقیق ان باقی ماندہ منابع کی مدد سے اس کا متن جمع کرے گا اور اسے شائع کر دے گا تاکہ ابنِ اسحٰق کے اس کام کو اس کی پوری کلّیت کے ساتھ پڑھا جاسکے کیونکہ یہ نہایت اہم علمی کارنامہ ہے۔ اس سلسلے میں ابنِ اسحٰق نے یہودی اور عیسائی صاحبانِ نظر اور ابوعبد اللہ وہب بن مُنبّہ (۳۴ھ — ۱۱۰ یا ۱۱۴ھ) کی معروف کتاب "کتاب المبتداء" اور "اسرائیلیات" کو بنیادی ماخذ کے طور پر برتا۔ "اسرائیلیات" کا اصل نام "قصص الانبیا" تھا۔

وہب بن منبّہ سے ابنِ اسحٰق نے آدمؑ سے یسوع مسیح تک[۱۲] اور جنوبی عرب کے قصص کے سلسلے میں، جن میں سے بعض ابن ہشام کے یہاں بھی نظر آتے ہیں، بہت استفادہ کیا۔ اس شخص نے ایک کتاب المغازی بھی لکھی تھی اور اس کا کچھ حصّہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے[۱۳]۔ ابن اسحٰق نے اس کا حوالہ صرف ایک بار دیا ہے[۱۴]۔ بات سیدھی سی ہے کہ حضورِ اکرمؐ خاتم النبیین پر لکھی گئی کتاب کو ماقبل کے انبیأ کے بارے میں تفصیل دینی ہی چاہیے تھی لیکن جنوبی عرب کے قصص یا تاریخ کا مسئلہ ایک الگ ہی وضاحت چاہتا ہے۔ گولڈ زیہر نے کافی عرصہ قبل اپنے نتائجِ فکر پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ پہلی صدی کے دُوسرے نصف میں شمال اور جنوب یعنی قریش اور انصارِ مدینہ کی مخاصمت پہلی بار تحریر میں ظاہر ہوئی۔ انصار جو اپنے جنوبی الاصل ہونے پر بھی مفتخر تھے اور اس بات پر بھی کہ اُنھوں نے حضورِ اکرمؐ کی اس وقت مدد کی جب قریشِ مکّہ ان کی جان کے درپے تھے، اپنے حکام اور شمالی الاصل لوگوں کے احساسِ تفاخر کی وجہ سے بہت کُڑھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے

غیظ و غضب کے اظہار کی ایک راہ حمیر کے عظیم ماضی کی تجلیل کی صورت میں نکالی۔ ابن اسحٰق نے کہ مدینے کی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے اپنے سرپرستوں کے جذبات کے بہرہ دار تھے، ان کے آبا و اجداد کے کمالات دہرائے اور ابن ہشام نے جو خود جنوبی الاصل تھے اپنی سیرت میں ابن اسحٰق کے اصل کام کا اس قدر حصہ ضرور محفوظ کر لیا جتنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔ ابن ہشام کے حمیری ہونے ہی کی وجہ سے ہم قدیم جنوبی عرب کے بادشاہوں کے قصص کے بعض اقتباسات تک پہنچ پاتے ہیں ——— ابن ہشام نے اس موضوع پر ایک الگ رسالہ "کتاب التیجان لمعرفۃ الملوک الزمان (فی اخبار قحطان)" لکھا۔[۱۹]

کتاب کا دوسرا حصہ جسے اکثر "المبعث" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، حضور اکرمؐ کی ولادت سے شروع ہوتا ہے اور ان کے مستقر ——— مدینہ ——— سے ہونے والی پہلی لڑائی پر ختم ہوتا ہے۔ اس حصے سے پڑھنے والا جو عام تاثر قبول کرتا ہے وہ دھندلی یادوں کا ہے ——— قصص میں تازگی نظر نہیں آتی اور ان میں قصص المغازی کی سی واضح اور بعض صورتوں میں ملنے والی ڈرامائی تفصیلات دکھائی نہیں دیتیں ——— خاص طور پر جیسی الواقدی کے یہاں ملتی ہیں ——— دلچسپی اور جوش سے مملو ——— سو اگر ایک طرف عہد مدینہ میں تفصیلات بڑی خوبی سے ترتیب دی گئی ہیں اور اس عہد کے واقعات سن وار ترتیب سے دیے گئے ہیں تو دوسری طرف اس قسم کی صحت ہمیں مکی دور میں نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس عہد کی تنقیح کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں حضور اکرمؐ کی عمر کا کچھ پتا نہیں چلتا جب وہ بحیثیت ایک مذہبی رہنما کے سامنے آئے، بعض کے نزدیک اس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس تھی، بعض کے نزدیک آپؐ پینتالیس سال کے تھے۔ ہمیں بنو نجار کے ساتھ ان کی صحیح قرابت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ ان کے لڑکپن کی غربت اس خیال سے مطابقت نہیں رکھتی تھی کہ وہ مکہ کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[۲۰] ان برسوں کی کہانی معجزانہ وقوعات پر مبنی قصص و روایات سے بھری ملتی ہے جس سے آج کے جدید پڑھے لکھے شخص کا اس عہد کی تاریخ کے سلسلے میں اعتماد کلیتہً جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔[۲۱] اس حصے میں خصوصاً (اگرچہ صرف اسی حصے میں نہیں) ابن اسحٰق پیراگرافوں کے ساتھ تاریخی تعارف تحریر کرتا ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال حضورؐ کو دی جانے والی ایذا کے متعلق اس واقعے کے ابتدائیے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے جو انھیں اہل مکہ کے ہاتھوں سہنا پڑی۔

"جب قریش اپنے اور حضور اکرمؐ (مع ان کے ایمان لانے والے ساتھیوں کے) مابین پیدا ہونے والی دشمنی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے حضور اکرمؐ کے خلاف ان احمق لوگوں کو ہفوات بکنے پر آمادہ کر دیا جو انھیں کاذب کہتے تھے، ان کی توہین کے مرتکب ہوتے تھے اور انھیں شاعر، کاہن، غیب دان اور آسیب زدہ ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ لیکن اس تمام تر صورت حال کے باوجود حضور اکرمؐ نے تبلیغ کا وہ کام جاری رکھا جس کا حکم انھیں ان کے رب کی طرف سے دیا گیا تھا ——— بغیر کچھ چھپائے، اُن کے مذہب باطلہ کو ناپسند کرتے ہوئے، ان کی نفرت کو ابھارتے ہوئے، اُن کے بتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اور انھیں ان کی گمراہی میں مبتلا رہنے دیتے ہوئے۔"[۲۲]

(ابن اسحٰق کا) یہ بیان کسی روایت پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان احوال کا من و عن ملخص ہے جن کا ذکر اس دور کے سلسلے میں قرآن حکیم کی مختلف آیات میں آیا ہے۔

رہا مغازی کی تاریخ کا مسئلہ تو اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کم و بیش تمام کے تمام قصص چشم دید گواہوں کے بیانات پر مبنی ہیں اور ان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خصوصیات

ابن اسحٰق کی ثقاہت کے بارے میں مسلمان نقادوں کی آرا ایک خصوصی مبحث کا تقاضا کرتی ہیں لیکن یہاں مصنف کی احتیاط اور انصاف کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے۔ کسی بھی بیان کے آغاز میں ایک لفظ جو بار بار آتا ہے وہ زَعَمَ یا زَعَمُوْا (اس نے یا انھوں نے دعویٰ کیا) ہے۔ تو گویا یہاں مصنف نے اشارہ چھوڑ کر ذرا کھل کر بات کی ہے کہ یہ روایت غیر صحیح بھی ہوسکتی ہے، اگرچہ اس کے برعکس یہ ٹھوس اور قابلِ اعتماد بھی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ صرف صفحہ ۹۰ تا ۱۴۸ مصنف نے اس قسم کے چودہ یا اس سے بھی زیادہ انتباہات کیے ہیں جبکہ یہ جملہ بار بار آتا ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ فلاں بیان غلط ہے یا صحیح۔ اسی قسم کی احتیاط (اگر اسے تشکیک پر محمول نہ کیا جائے) کا ایک اور اشارہ فِیْمَا ذُکِرَ لِیْ قسم کی تصریح میں بھی ملتا ہے، جیسا کہ اس جن کے واقعے کے سلسلے میں جو حضورؐ کی عبادت کے دوران کی جانے والی تلاوت سنا کرتا تھا، یا حضورِ اکرمؐ کا حضرتِ عمرؓ کو سوید کو قتل کرنے کا حکم، جبرئیلؑ کی حضورؐ سے ملاقات اور ایک عورتؓ کے ہاتھوں قتل ہونے والے ایک مرد کو دو شہیدوں کے برابر انعام کے سلسلے میں تصریحات کی گئی ہیں۔ اسی مفہوم کی ایک اور تصریح فِیْمَا بَلَغَنِیْ میں موجود ہے۔

شاذ ہی ابن اسحٰق نے ان روایات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جنھیں وہ مدوّن کرتے ہیں، قطع نظر ان مندرجہ بالا تصریحات کے جن سے ان کے ذہنی تحفظات کا احساس ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ واقعی اپنی کسی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو یہ بہت اہم ہوتی ہے۔ حضورِ اکرمؐ کے سفرِ معراج کے سلسلے میں یروشلم جانے اور آسمانوں کی طرف معراج کے باب میں ان کے (ابنِ اسحٰق کے) باطنی تموّجات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکایتِ سفرِ معراج کے سلسلے میں پڑھنے والے کو جا بجا ان تحفظات اور حدود کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ابنِ اسحٰق اس کا آغاز ایک روایت سے کرتے ہیں جو ان تک کئی روایات کے ذریعے پہنچی (بَلَغَنِیْ) اور انھوں نے ان تمام روایات کو یکجا کر دیا ہے جو انھوں نے ان لوگوں سے سنیں (ذُکِرَ)۔ یہ تمام مسئلہ دراصل لوگوں کے ایمان کو پرکھنے والی کسوٹی ہے خصوصاً ان لوگوں کے ایمانوں کو جو ذہانت کا بہرہ وافر رکھتے ہیں یہ یقیناً ایک عملِ الٰہی تھا لیکن واقعۃً ہوا کیا، ہم کچھ نہیں جانتے۔ ابنِ اسحٰق کی یہ رائے نہایت حزم و احتیاط سے ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے:

کَیْفَ شَاءَ (خدا نے جیسا چاہا، اسے دکھایا)

ابنِ مسعودؓ کے الفاظ فِیْمَا بَلَغَنِیْ عَنْہُ کو ابنِ اسحٰق نے بطور آغازِ کلام کے استعمال کیا ہے۔ حکایتِ معراج سے کہیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ ایک رؤیا (خواب) تھا۔ الحسن کا بیان زیادہ واضح ہے کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب حضورِ اکرمؐ مکہ واپس تشریف لاتے، انھوں نے قریش کو بتایا کہ وہ یروشلم سے ہو کر آئے ہیں۔ سو اس بیان سے بعض "مسلمانوں" کے

یقین پر اس قدر بار پڑا کہ وہ حضورؐ کے سلسلے کے واقعاتِ وحی سے بھی منکر ہو گئے، اگرچہ حضورؐ نے یروشلم کے متعلق صحیح ترین تفصیلات انھیں سُنا دی تھیں۔ پس نہایت حیران کن بات یہ ہے کہ الحسن اپنی روایت کو قرآن کی ایک سورت (۱۳ : ۶۲) کے حوالے سے ختم کر دیتے ہیں "ہم نے رؤیا تخلیق کیا اور تجھے دکھایا تاکہ لوگوں کے ایمان کو پرکھا جا سکے۔" اس صورت میں الحسن کی روایت بہ تمام و کمال جڑ سے اُکھڑ جاتی ہے کیونکہ اگر معراج حالتِ خواب میں ہوا تو پھر اس میں ناقابلِ یقین کون سی بات تھی؟ اس کے بعد حضرت عائشہؓ کی روایت آتی ہے (جو ان کے والد کے خاندان کے کسی فرد کی بیان کردہ ہے) کہ شبِ معراج صرف حضورِ اکرمؐ کی رُوحِ مبارک نے علوی سفر کیا، اُن کا جسم تو من وعن مکہ ہی میں رہا۔ معاویہ بن ابو سفیان کی ایک روایت بھی اسی مفہوم کی ہے۔ اب اس امر سے کہ حضورِ اکرمؐ سے اس بارے میں سوالات کیے گئے کہ آیا ان کا یہ سفر جسمانی تھا یا روحانی، یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابنِ اسحٰق کے دَور سے پہلے ہی اس مسئلے پر بحث چھڑی ہُوئی تھی۔ یہاں ابنِ اسحٰق ایک نہایت گہری بات کہتے ہیں جس کا فی الاصل مفہوم یہ ہے کہ یہ بات سرے سے غیر ضروری ہے کہ آیا حضورؐ کا معراج حقیقی تھا یا رؤیائی، بہر حال یہ خدا ہی کی طرف سے تھا اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں ملنے والی ہدایت کے نتیجے میں اپنے بیٹے اسحٰقؑ کو ذبح کرنے کی مکمل تیاری کر لی تھی کیونکہ ان کے نزدیک رات کے وقت حالتِ نوم میں دیے جانے والے الوہی حکم اور دن کی روشنی میں حالتِ بیداری میں صادر ہونے والے حکم میں کوئی فرق نہیں تھا، اسی طرح حضورِ اکرمؐ کا خواب بھی اتنا ہی حقیقی تھا جتنا کہ حضورؐ کا واقعی جسمانی معراج! یہ تو صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کیا واقعہ ہُوا۔ لیکن حضورِ اکرمؐ نے واقعۃً وہ کچھ دیکھا جس کے دیکھنے کا اُنھوں نے دعویٰ فرمایا، اور خواہ وہ حالتِ خواب میں تھے یا عالمِ بیداری میں، نتیجہ ایک ہی ہے۔۔

. . . . یہ بات افسوسناک ہے کہ قاری پر ابنِ اسحٰق کی ذہانت اور ذہنی بصیرت کا جو تاثر مرتسم ہوتا ہے وہ اس آخری پیرے کی صورت میں بکھر جاتا ہے جو علوی سفر سے متعلق ہے اور جس نے اتفاقی طور پر طربیہ خداوندی؎ کے توسط سے یورپی ادبیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ انھوں نے سوائے معراج جسمانی کے ہر قسم کے تجربے کو خارج از بحث قرار دے دیا ہے اور اس سے پہلے کہ ابنِ اسحٰق خود اپنی آرا پیش کرتے، اسے ایک انتہائی نوٹ کے ساتھ مدوّن ہونا چاہیے تھا۔ امکانِ غالب یہ ہے کہ اس پیرے کے بے جا ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ اُن کے خطبے کا ایک اقتباس ہے۔ بہر حال ہم کوئی بھی توجیہ کریں، واقعہ یہ ہے کہ اس سے ان کے بیانِ ثبوت کے تاثر کو ضعف پہنچتا ہے؎

یہ جملہ کہ "خدا ہی بہتر جانتا ہے" اتنا واضح ہے کہ اس پر رائے زنی کی ضرورت نہیں۔ مصنف بعض اوقات یہ جملہ اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ دو متناقض روایات کو مدون کرتا ہے اور طے نہیں کر پاتا کہ ان میں کون سی درست یا نادرست ہے۔ مصنف کی غایت درجہ احتیاط پسندی کا ایک اور ثبوت اس جملے کی شکل میں ملتا ہے کہ "خدا مجھے حضورِ اکرمؐ سے ایسے الفاظ منسوب کرنے سے محفوظ رکھے جو اُنھوں نے استعمال نہ فرمائے۔" مدینہ میں حضورِ اکرمؐ کے اہلِ مدینہ سے پہلے خطاب اور اپنے صحابہ کو یہ حکم کہ وہ اپنے ساتھی کو اپنا بھائی بنا لیں، کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے آغاز میں "فِيمَا بَلَغَنِي" کا جملہ دُہرایا ہے۔

ابنِ اسحٰق اکثر و بیشتر مکّہ اور مدینے سے ملنے والی روایات کے متناقض متون نہیں دیتے۔ سو حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ دلچسپ ہے۔[۳۶] یہ بات حضورِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی دَور کے بارے میں حصولِ معلومات کے باب میں مصنّف کی تلاشِ تامہ کی وضاحت کرتی ہے۔ اُن کے نزدیک پہلا بیان مدینہ کے راویوں کے اس بیان پر مبنی ہے: جب عمرؓ کو علم ہوا کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اُنھوں نے انھیں مار اپیٹا، لیکن جب انھوں نے اپنی بہن کے رُخسار پر زناٹے کا طمانچہ مارنے کے نتیجے میں خُون کی لکیر دیکھی اور ساتھ ہی اس کا استقلال بھی، تو وہ بہت پشیمان اور متاثر ہُوئے، اور اُنھوں نے قرآن کے اُس ورق کو دکھانے کی فرمایش کی جس کی تلاوت کی جارہی تھی۔ اسے پڑھنے کے بعد وہ واقعی اس کے کلامِ الٰہی ہونے کے قائل ہوئے اور اسلام لانے کے لیے حضورؐ کی خدمت میں چلے گئے۔

عبداللہ بن ابو نجیح المکّی اپنے دوساتھیوں (جن کے نام اُنھوں نے دیے ہیں) یا ایک گم نام راوی کی اسناد پر ایک دُوسرا بیان دیتے ہیں۔ ان کے بموجب حضرت عمرؓ اصل میں ایک رات خانہ کعبہ میں حضورؐ کی تلاوتِ کلامِ پاک سے متاثر ہوکر اسلام لائے تھے۔ پہلے بیان کے مطابق حضرت عمرؓ اپنی بہن کی تلاوت سے متاثر ہوئے تھے اور اُنھوں نے قرآن کا وہ ورق طلب کیا تھا تاکہ خود اس کا مطالعہ کرسکیں، جبکہ دُوسرے بیان کے مطابق وہ حضورؐ کی نجی عبادت و تلاوت سے متاثر ہُوئے تھے۔ بیان کی ابتدا میں فیما بلغنی کا سابقہ ملتا ہے لیکن اس جملے کو اس واضح اور صریح بیان کی روشنی میں منسوخ سمجھنا چاہیے کہ یہ مدینہ کے لوگوں میں گردش کرتا ہُوا ایک مسلّمہ خیال تھا۔ ابنِ اسحٰق یہ بات کہہ کر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ واللہ اعلم بالصّواب۔

ادبی اور تاریخی تنقید میں ایک مشکل مسئلہ ان متناقض روایات کی شکل میں سامنے آتا ہے جو طبری جیسے ان تھک شخص نے ابنِ اسحٰق کے دو شاگردوں یُونس بن بُکیر اور سلامہ بن الفضل سے اکٹھی کیں جبکہ سلامہ بن الفضل کو اس باب میں ابنِ اسحٰق کے ایک اور شاگرد علی بن مجاہد سے مدد ملی تھی۔ اوّل الذکر (یونس بن بکیر) نے کوفہ کے مقام پر ان کے محاضرات میں شرکت کی تھی اور دُوسرے دو حضرات نے مقامِ رَے پر۔ تینوں حضرات کا دعویٰ ہے کہ ابنِ اسحٰق نے عفیف نامی شخص کی سند پر اُنھیں جو کچھ بتایا وہ اسے آگے پیش کر رہے ہیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

قصص الانبیا سے شدید طور پر متاثر ہونے اور شیعیت کے لیے نرم گوشہ رکھنے سے قطعِ نظر، میرا خیال ہے کہ ہر شخص اس بات کی توثیق کرے گا کہ "سیرت رسول اللہ" دیانت داری اور صداقت کے ساتھ نیز غیر جانب داری کے ساتھ — جو بالعموم ایسی تحریروں میں خال خال ہی نظر آتی ہے — لکھی گئی ہے۔

الزہری کے قصّے کو لیجیے جسے اس کی اولاد، جائداد، جان سب بخش دی گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے

زندگی پھیکی نظر آتی تھی کیونکہ اس کے قبیلے کے بہترین لوگ مارے گئے تھے۔ اب کوئی بھی اس قصّے کو یہ تسلیم کیے بغیر نہیں پڑھ سکتا کہ یہاں ہمیں امرِ واقعہ کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی لائقِ اعتنا ہے کہ سوائے ایک غیر جانبدار مورّخ کے یہ کس کا حوصلہ تھا کہ وہ اپنی کتاب میں ایسے اشعار شامل کر لیتا جن میں حجاز کے یہودیوں کی نجابت اور فیاضی کو سراہا گیا تھا۔ ابنِ اسحٰق کے باب میں قدماء کا شکّی رویّہ مجھے مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں ابنِ اسحٰق کے مابعد کی حیات الرسولؐ پر مبنی کتب سے اس کا تقابل کر کے دیکھنا چاہیے کہ تاریخی اور مثالی پیغمبر میں کیا فرق ہے[۳۱]

شاعری

"سیرت" میں شامل نظموں کے مستند ہونے کے سلسلے میں ابنِ ہشام نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے، اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں۔ بہرحال اس طرح کی تمام شاعری کو بیک جنبشِ قلم رد کرنے کے رویّے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ جنگِ بدر کے شرکاء کی شاعری کے بارے میں (خواہ اس میں حسّان بن ثابت کے اشعار شامل ہوں یا نہ ہوں جن کے بارے میں اُنھوں نے کہا ہے کہ یہ اشعار (ابو اسامہ) بدر کے شرکاء کی جانب منسوب تمام شاعری سے زیادہ مستند ہیں، دیکھیے صفحہ ۵۳۴) ابنِ ہشام "سیرت" میں شامل شاعری کے معتدبہ حصّے کے بارے میں اپنے گھر سے شکوک کا اظہار کرتا ہے۔ بہرکیف ابنِ اسحٰق کو اس وقت تک ایسی شاعری کے شمول کے بارے میں جس کا معتدبہ حصّہ واقعی جعلی ہے، الزام نہیں دیا جا سکتا جب تک مکمل تحقیق و تفتیش نہ کر لی جائے اور جو اب تک کی نہیں کی گئی۔ صفحہ ۴۰۴ اور صفحہ ۲۸، پر جن نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اُنھوں نے عاصم بن قتادہ سے حاصل کیں جبکہ صفحہ ۵۹۰، ۷۸۹ اور ۷۹۳ والی نظمیں عبد اللہ بن ابوبکر[۳۲] کے حوالے سے نقل کی گئیں ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ بھی اشعار کے حوالے دیا کرتا تھا[۳۳]

اُس شاعری کے ایک ابتدائی دور کا نقاد الجُمحی (متوفی ۲۳۱ھ) جو اگرچہ ابنِ اسحٰق پر محاکمہ کرتے ہوئے شاید قدرے یک رخا اور غیر متوازن ہو گیا ہے، لبعض ایسے نتائج نکالتا ہے جو خاصا وزن رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "محمد بن اسحٰق ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے شاعری کو دھچکا لگایا، اس کا حلیہ بگاڑا اور ہر قسم کے کوڑے کرکٹ کو مدوّن کر دیا۔ وہ سیرتِ رسولؐ کے سلسلے میں سند کا درجہ رکھتا تھا اور لوگ اس کی سند سے شاعری کا حوالہ دیتے تھے۔ وہ تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتا تھا کہ وہ شاعری کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے اور یہ کہ اس نے تو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا کہ جو شاعری اس تک پہنچی، اسے دوسروں تک منتقل کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اس نے "سیرت" میں ایسی نظمیں بھی درج کر دی ہیں جو ان مردوں اور عورتوں سے منسوب کی گئیں جنھوں نے ایک ایسی سطر بھی نہیں لکھی تھی —— بلکہ اس نے تو حد یہ کر دی کہ عاد اور ثمود کی نظمیں بھی اس میں شامل کر دیں، کیا وہ خود سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ان قوموں کو تو تباہ ہوئے ہزاروں سال کا عرصہ ہو چکا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے کہ "اللہ نے عاد اور ثمود کو تباہ کر ڈالا اور ان کا نام و نشان تک نہ چھوڑا[۳۴]" اور یہ کہ عاد کے بارے میں قرآن میں آیا "کیا تمھیں ان کا نام و نشان دکھائی دیتا ہے؟[۳۵]" اور

یہ کہ "خدا ہی جانتا ہے عاد اور ثمود کے بارے میں اور ان کے بارے میں جو ان کے بعد آئے"[۳۶] سو یہ نظمیں اس تک کس ذریعہ سے پہنچیں؟ ان میں سے بعض نظموں کے طبری نے حوالے دیے ہیں[۳۷]

ابن الندیم[۳۸] تو اس سے بھی آگے جاتا ہے کہ ابنِ اسحٰق ان جعل سازوں کی سازباز میں شریک تھا جنھوں نے اس کے لیے شعر گھڑے اور جب اس سے ان اشعار کو اپنی کتاب میں شامل کرنے کے لیے کہا گیا، اس نے یہی کیا اور یوں ان بھاٹوں اور سخیف الکلام لوگوں کے سبب اپنی رسوائی کا موجب بھی بنا[۳۹]

یہ بات واضح ہے کہ اس زمانے میں "سیرت" میں شامل شاعری پر نقد و نظر صرف تاریخی یا اس سے کم تر درجے میں ادبی یا اسلوبی حوالوں ہی سے ممکن ہے۔ اس شاعری کا کچھ حصہ جو حملوں، جھڑپوں، قبائلی تفاخر اور مراثی پر مشتمل ہے۔ وہ تو معاصر منابع ہی سے آیا ہے اور کوئی بھی معقول آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مکی اور مدنی شعراء میں اس قسم کے شعری مقابلے ہوا ہی کرتے تھے۔ قدیم عرب معاشرے کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ یہی شعری ترشحات ہی تو ہیں جیسا کہ ہوروونز نے خیال ظاہر کیا ہے کہ قبل از اسلام شاعری میں اس قسم کے شعری مقابلے عام ہوا کرتے تھے اور مزید بر آں یہ کہ قدیم عبرانی تاریخ کے بیانات میں شعر کو اکثر گھسیڑ دیا جاتا تھا اور اس وقت کے موجود اَبطال (HEROES) کی زبانی ان کا بیان ہوتا تھا، پس ان نظموں سے قطع نظر جو اصل میں ان متعدد مشاغل کی منطقی ضرورت کے طور پر لکھی جاتی تھیں، شاعری نسلی جمعیت کا اٹوٹ انگ تھی جسے کوئی بھی تاریخ نگار نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ابنِ اسحٰق نے اپنی سیرت میں جو شاعری شامل کی اگر وہ تمام کی تمام اس معیار کی ہوتی جس کی توقع اس کے تمام قارئین کو عادتاً تھی، تو ان پر غالباً اس نوعیت کا کوئی الزام نہ لگایا جا سکتا لیکن جب انھوں نے اپنی "سیرت" میں ایسے اشعار بھی شامل کر لیے جو بدیہی طور پر پیش پا افتادہ تھے اور ساتھ ہی ساتھ صورتِ واقعہ کے خلاف بھی، اور بھٹس اور مصنوعی بھی (جیسا کہ اکثر ہیں) تو عربوں کی ارتقا یافتہ جمالیاتی حس نے، جو شاعری کے معاملے میں تو بے حد لطیف اور نازک واقع ہوئی ہے، اُسے رد کر دیا۔ جیسے کہ الجمحی نے کہا ہے کہ ابنِ اسحٰق نے اپنے بڑے اہم اور عمدہ کارنامے میں اس قسم کی بیہودہ شاعری کو شامل کر کے خود شاعری کو رُسوا کر دیا اور اس سے اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہ نکل سکی کیونکہ جو کچھ اچھا تھا، اس میں کہیں زیادہ وُہ کچھ ملا دیا گیا تھا جو بُرا اور ناقص تھا۔ گمانِ غالب ہے کہ خود ابنِ اسحٰق کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی (مشمولہ) شاعری میں کہیں گڑبڑ ہے کیونکہ لکھنے والوں کا یہ ایک عام معمول ہے کہ کسی نازک لمحے پر آنے والے بیان میں وہ شعر داخل کر دیتے ہیں (جیسا کہ خود ابنِ اسحٰق نے بعض اوقات کیا ہے) جب کہ بدر اور اُحد کے نثری بیان کے بعد ابنِ اسحٰق نے مختلف "شعرا" کے تمام "کلام" کا یک قلم ڈھیر لگا دیا ہے گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہو کہ یہی کچھ میرے حوالے کیا گیا ہے۔ مجھے شاعری میں کوئی ذوق اور درک نہیں۔ تم اپنے لیے انتخاب خود کر لینا۔[۴۰] بہرحال خواہ ابنِ اسحٰق کی جو بھی کوتاہیاں تھیں، یہ بات ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ ابنِ ہشام اکثر اس طرح کا انتباہ (اپنی کتاب میں) درج کرتے ہیں کہ ان کے پیشِ نظر جو متن ہے اس میں ایسی سطور اور الفاظ شامل ہیں جنھیں ابنِ اسحٰق کی سند حاصل نہیں ہے۔

یہ وہ موضوع ہے جس کے لیے مفصل اور محتاط ادبی تنقید کی ضرورت ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ کلیشیہ، تشبیہات اور استعارات کی تاریخ پر کوئی ایسا شخص تحقیق کرے جو ادب الجاہلیہ اور اُموی دَور کی شاعری کا پُوری طرح مزاج شناس ہو۔ جب تک یہ ابتدائی کام مکمل نہ ہو جائے "سیرت" میں شامل شاعری کے بارے میں بحیثیت مجموعی کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا۔ قدیم شاعری نے جعل سازوں، چربہ سازوں اور ماہرینِ لغات کے ہاتھوں بہت سے دُکھ جھیلے ہیں اور مابعد کے شعرا کے دیوان جھُوٹے راوی کی دستبرد سے نہیں بچ سکے۔ شاعرِ رسالت مآبؐ حضرتِ حسّان بن ثابتؓ کے نام بہت سی منظومات منسوب ہیں جنھیں اگر وہ سُن پاتے تو خود بھی حیرت زدہ رہ جاتے۔ اور ایسے شاعر تو مقابلۃً شاذ ہی ملیں گے کہ جن کے دواوین پر تو اُنھیں کے نام درج ہیں اور ان میں ایسے الحاقی عناصر بالکل موجود نہ ہوں جو اُن کی کاوشِ فکر نہیں۔[۴۱]

جن دنوں یہ سطور لکھی جا رہی تھیں، لندن یُونیورسٹی میں دو مقالات لکھے گئے، جن میں پہلا ڈاکٹر محمد احمد عظم کا لکھا ہوا ہے جس میں "سیرت" میں موجود شاعری کے اسلوب، زبان اور اس کے مستند ہونے کے باب میں گفتگو کی گئی ہے جبکہ دُوسرا مقالہ ڈاکٹر ڈبلیو عرفت کا ہے جس میں دیوانِ حسان بن ثابت بھی شامل ہے۔ ان دونو حضرات کے نتائجِ فکر کا خلاصہ پیش کرنا شاید بے جا نہ ہوگا۔

"سیرت" میں جتنے عرصے کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے اور خود اس کتاب کے مدوّن ہونے کے درمیان دو المناک واقعات آتے ہیں۔ پہلا تو واقعۂ کربلا ہے، جب امام حسینؑ اور اہلِ بیت کو ۶۱ھ میں شہید کر دیا گیا، اور دُوسرا ۶۳ھ میں مدینے کے سلب و نہب کا واقعہ جس میں کم و بیش دس ہزار انصار کو مع حضورؐ کے اسّی کے قریب ساتھیوں کے شہید کیے جانے کے بارے میں بتایا گیا ہے" سیرت" میں شامل شاعری کے معتدبہ حصّہ کو اس مخصوص المناک پس منظر میں پڑھا جانا مقصود تھا۔ اس کا مقصد اسلام میں انصار کے مقامِ عظمت کو نہ صرف اس حیثیت سے کہ اُنھوں نے حضورِ اکرمؐ کا اس وقت ساتھ دیا جب قریش ان کی مخالفت کر رہے تھے بلکہ بحیثیت اُن افراد کے بھی متعین کرنا مقصود تھا کہ وہ بادشاہوں سے متوارث ہیں۔ حضورِ اکرمؐ حضرت عبدالمطلب کے پوتے تھے جو ہاشم اور بنی النجار کی ایک خاتون کے بیٹے تھے اور اس لحاظ سے یمنی النسل تھے۔ حضرت عبدالمطلب کا مرثیہ لکھتے وقت حضرتِ حسّانؓ کہتے ہیں کہ تمھاری والدہ خزاعہ کی خالص نسل سے تھی ..... سبا کے زُعما سے اس کا شجرۂ نسب ملتا ہے۔[۴۲]

حضورِ اکرمؐ کو دی جانے والی اس بڑی مدد سے قطع نظر —— یعنی یہ کہ انھیں اس وقت رہائش مہیا کی گئی جب قریش کے ہاتھوں انھیں ہجرت کرنا پڑی —— انصار کافی عرصہ پہلے سے قریش کے شراکت دار تھے۔ سو کیا یہ قصیّ کا سوتیلا بھائی رضاح نہیں تھا جس نے یمن سے آنے والے قریش کے آباؤ اجداد کی مدد کی؟ اگر انصار مددگار ثابت نہ ہوتے تو اسلام کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ حضرتِ حسّان بن ثابتؓ کا خیال ہے کہ انصار کے آباؤ اجداد کی جانب سے مدد نہ ملنے کی صورت میں قریش مکہ میں رسوخ حاصل نہ کر سکتے۔[۴۳]

صفحہ ۸ اپر انصاری شیعہ پروپاگنڈا صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے "وہ شخص جسے تم نے شہید کردیا ہم میں سے بہترین تھا۔ وہ شخص جو کبھی زندہ تھا ہمارا آقا ہے اور تم سارے بھی حاکم ہو" ——— ان جملوں سے اکثر لوگ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں اشارا امام حسینؓ کی شہادت کی جانب ہے اور حاکموں سے مراد "اُموی" ہیں۔ تبّع نے مکّہ پر فوج کشی کی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اس کے تقدس اور احترام کو بھی ملحوظ رکھا جبکہ اس کے برعکس اُمویوں کے ہاتھوں اس سے ہونے والے سلوک کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے جب حجاج نے اس پر گولہ باری کی۔

اس شاعری کی زبان کا بڑے حزم واحتیاط سے جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر عظم اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ بھی عہدِ رسالت سے متعلق نہیں ہے۔

ڈاکٹر عرفت بھی ان اشعار کے باب میں جو حسان بن ثابتؓ سے منسوب ہیں، کم وبیش اسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یہاں صرف چند نمایاں دلائل پیش کیے جائیں گے۔ اس کا خیال ہے کہ انصار کا وہ قصیدہ (ص ۸۹۳) جو کعب بن زہیر سے منسوب ہے اسی قافیے اور بحر میں ہے جس میں الاخطل کی نظم ہے جو اس نے یزید کی تحریک پر لکھی۔ اُس نظم میں اس قسم کے جملے ملتے ہیں "انصار کے عماموں کے نیچے گھٹیا پن اور رذالت ہے۔" ان دونو نظموں کے بعض متعلقہ حصّوں کے محتاط تقابل کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ "سیرت" میں پائی جانے والی نظم "اغانی" میں پائی جانے والی نظم کا جواب ہے۔

عبداللہ بن ابوبکر سے منسوب ہے کہ اُنھوں نے کہا "غزوۂ حرّا کے زمانے تک انصار کی عزّت اور ان کی دھاک دونو قائم تھے۔ اس کے بعد لوگوں کے حوصلے بڑھ گئے کہ وہ ان پر حملے کریں اور یُوں ان کا مقام گر گیا۔" یہی وہ حالات ہیں جن کی روشنی میں، نہ کہ ان حالات میں جب حضور اکرمؐ کے رفقاؓ روزانہ اپنے قوت ووقار میں بڑھتے چلے جاتے تھے، اس جملے کا پس منظر تلاش کرنا چاہیے: "تم دیکھو گے کہ کوئی بھی ہمیں آلۂ کار کے طور پر استعمال نہیں کرے گا سوائے اس رذیل شخص کے جو گمراہ ہو چکا ہے۔" (ص ۶۲۶)

صفحہ ۴، ۴ پر ایک نظم موجود ہے جسے ابنِ ہشام نے حضرتِ حسانؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن سے منسوب کیا ہے حالانکہ یہ نظم واضح طور پر کسی بعد کی نسل کے عہد سے متعلق ہے "میرا قبیلہ تو وُہ ہے جس نے حضور اکرمؐ کو پناہ دی اور ان پر اس وقت ایمان لائے جب سوائے چند منتخب عظماؓ کے جو نیک لوگوں کے نقیب پیش رس اور انصار کے معاونین میں سے تھے، اس سرزمین کے تمام لوگ کفار تھے۔" اس نظم کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص حضورِ اکرمؐ کے باب میں اپنی سابقہ خدمات کا ذکر کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس نظم کی زبان حضرتِ حسانؓ سے منسوب کرنا عیب سا لگتا ہے۔ حضرت حسانؓ ہی تو تھے جو نئے آنے والے بے گھر اور بے ٹھکانہ لوگوں کو "جلابیب" کہا کرتے تھے اور انھیں نہ ٹلنے والی مصیبت خیال کرتے تھے۔ اُنھوں نے مہاجرین میں سے کسی شخص کو اپنے یہاں پناہ نہ دی اور نہ ہی وہ ان میں سے کسی کے برادرِ (معنوی) بنے۔ پچھلی نسل کی جانب ایک مزید واضح حوالہ صفحہ ۹۲۰ پر پایا جاتا ہے (ابنِ ہشام نے اسے بھی عبدالرحمٰن سے منسوب کیا ہے) جو یُوں ہے "وہ لوگ حضورِ اکرمؐ کے انصار تھے اور وہی میرے لوگ ہیں، جب میں اپنا حسب نسب بیان کرتا ہُوں

تو میں انہی لوگوں ہی سے متعلق ٹھہرتا ہوں "۔

ڈاکٹر عرفت نے بتایا ہے کہ "سیرت" میں حضرتِ حسانؓ کی جانب ۸ نظمیں منسوب کی گئی ہیں۔ ان میں سے پندرہ کی صحت یا تو مکمل طور پر مشکوک ہے یا ان کی مکمل نفی کی گئی ہے۔ صفحہ ۲۰ پر پائی جانے والی نظم کا متن اپنی متبادل صورتوں میں اس طریقۂ کار کی نشان دہی کرتا ہے جس کے تحت حضرتِ حسانؓ کی جانب منسوب اشعار کا جعلی ادخال ہوا اور اضافی اشعار گھڑے گئے۔ یہاں طبری صرف پہلے پانچ اشعار کا حوالہ دیتا ہے؛ "دیوان" میں پہلے مصرعے کے بعد دو اشعار ملحق کیے گئے اور دو کا آخر میں اضافہ کیا گیا۔ اس کے برعکس "سیرت" میں شامل آخری تین اشعار دیگر مستند لوگوں میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتے۔ "اغانی" میں یہ نظم اور بھی طویل ہے ——— مصعب کی روایت کے مطابق مگر الزہری کی سند کے بغیر۔

حضرت حسانؓ کی جانب منسوب جعلی شاعری کا ایک ثبوت صفحہ ۲۶۹ پر ملتا ہے جو اصل میں بعد کے شعراء کی نسل سے متعلق ہے۔ یہاں حضورؐ کی مدحت نہیں کی گئی بلکہ ان کے "گھرانے" کی: "وہ لوگ کتنے نجیب ہیں جن کے فریق پیغمبرؐ ہیں . . . . وہ زندہ لوگوں میں بہترین ہیں"۔ جب ہماری نگاہ اس غصّے کی جانب جاتی ہے جو انصار کو عموماً اور حضرتِ حسانؓ کو خصوصاً اس وقت آیا جب جنگِ حنین کے بعد مالِ غنیمت میں سے انھیں کچھ حصّہ نہ ملا تو اس صورت میں اس سطر کا کہ "ان سے جو کچھ مل جائے لے لو جب کہ وہ غصّے کے عالم میں ہوں اور جو شے وہ نہ دیں اسے خاطر میں نہ لاؤ" ذکر بے محل سا لگتا ہے۔

ایک اور نکتہ جو حضرتِ حسانؓ کی جانب منسوب نظموں کا ابطال کرتا ہے یہ ہے کہ ان میں قبیلۂ اوس کو اکثر بڑی عظمت دی گئی ہے۔ یہ بات مانی نہیں جا سکتی کہ ایک خزرجی (قبیلۂ خزرج کا فرد) اپنے قبیلے کے کارناموں کو نظر انداز کر دے یا انھیں دُوسرا درجہ دے جیسا کہ ہم صفحہ ۴۵۵ پر دیکھتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام آنے کے کافی عرصہ بعد تک ان دونو قبائل میں دشمنی قائم رہی۔ بعد کے آنے والے ایک انصاری کی کتاب کی ایک سامنے کی مثال صفحہ ۱۱۰ پر درج ہے جس میں ایک نظم کا آغاز یُوں ہوتا ہے: "اے میرے لوگو! کیا تقدیر کو ٹالا جا سکتا ہے، کیا پچھلے اچھے دن لوٹ سکتے ہیں؟" یہ رویّہ (جو اس جُملے میں ظاہر ہے) ایک مسلمان کے لیے حضورِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں ممکن ہی نہیں۔

علاوہ ازیں جب حضرتِ حسانؓ سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے کہ "ایک ایک کر کے بہترین مسلمان رخصت ہو گئے۔ (دیکھیے صفحہ ۷۹۹) تو یہ بات یاد رکھنا کافی ہو گا کہ حضورِ اکرمؐ کے تمام اہم صحابہ جنگِ اُحد میں بچے رہے لیکن جب اس غیر محتاط جعل ساز نے یہ بات لکھی تو تمام بہترین مسلمان واقعی مدّت ہوئی، اپنے خالقِ حقیقی سے مل چکے تھے۔ لیکن اس جعل ساز کا اصل مقصد جس تک ہماری رسائی ابھی نہیں ہو سکی تھی یہ تھا کہ خاندانِ ہاشم کی تجلیل کی جائے یعنی یہ کہ وہ اقرب الی اللہ ہیں۔ "اُس نے ان پر اپنی دانش نازل فرمائی اور انہی میں وہ کتاب لانے والا مقدس شخص شامل ہے"۔ گویا یہاں شیعانِ علی اللہ کے دوست اور ولی ہیں اور حضورؐ بھی اس گھرانے کے ایک رکن سے ہیں۔ اس گھرانے کو دانشِ نورانی ودیعت کی گئی ہے۔

ان دو مقالات سے اس نازیبا زبان کی بھی قلعی کھل جاتی ہے جو ان میں بیشتر نظموں میں استعمال کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان مشکلات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے جن کا ایک مترجم کو اس وقت سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ عربی ترکیب الکلام

اور علم ہیئتِ لسان کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ قصہ مختصر، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات (صاحبانِ مقالات) نے مستند دلائل کی بنیاد پر یہ بات صاف کر دی ہے کہ قدیم نقادوں خصوصاً النجمی کے فیصلے بہ تمام و کمال، جواز و انصاف پر مبنی ہیں۔[۲۴]

گم شدہ اصل نسخے کی جزوی تعویض (RESTORATION)

ایک وقت تھا جب ابنِ اسحٰق کے اصل نسخے کا متن کم از کم پندرہ روایتوں میں موجود تھا۔[۲۵]

۱۔ ابراہیم بن سعد	(۱۱۰ - ۱۸۴ھ)	مدینہ
۲۔ زیاد بن عبداللہ البکائی	(متوفی ۱۸۳ھ)	کوفہ
۳۔ عبداللہ بن ادریس الاودی	(۱۱۵ - ۱۹۲ھ)	"
۴۔ یونس بن بکیر	(متوفی ۱۹۹ھ)	"
۵۔ عبدہ بن سلیمان	(متوفی ۱۸۷/۸۸ھ)	"
۶۔ عبداللہ بن نمیر	(۱۱۵ - ۱۹۹ھ)	"
۷۔ یحییٰ بن سعید الاموی	(۱۱۴ - ۱۹۴ھ)	بغداد
۸۔ جریر بن حازم	(۸۵ - ۱۷۰ھ)	بصرہ
۹۔ ہارون بن ابو عیسیٰ		بصرہ؟
۱۰۔ سلمہ بن الفضل الابرش	(متوفی ۱۹۱ھ)	رَے
۱۱۔ علی بن المجاہد	(" ۱۸۰ھ)	"
۱۲۔ ابراہیم بن المختار		"
۱۳۔ سعید بن بزیع		
۱۴۔ عثمان بن ساج		
۱۵۔ محمد بن سلمہ الحرانی	(متوفی ۱۹۱ھ)	

میرا مقصد یہ رہا ہے کہ جس حد تک بھی ممکن ہو ابن اسحٰق کے اصل متن کو خواہ اس صورت میں جس صورت میں یہ ابنِ اسحٰق کے قلم سے نکلا، خواہ جس انداز میں اُنھوں نے اپنے سامعین کو لکھوایا، بعد کی آنے والی کتب میں شامل اقتباسات کی مدد سے اور "مبداء" والے حصّے کو نظر انداز کرتے ہوئے جیسا کہ ابنِ ہشام نے کیا (جن کی پیش کردہ وجوہ میں سے ایک سے مجھے کم از کم اتفاق ہے) بحال کیا جائے۔ پہلے پہل تو میں یہ سوچنے پر آمادہ ہُوا کہ اصل متن کا بہت سا حصّہ کھو چکا تھا اور ممکن ہے کہ واقعی کھو چکا ہو، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ حضور اکرمؐ کی ذات پر کیے جانے والے ناپاک حملے جن کا ذکر ابنِ ہشام نے اپنے ابتدائیے میں کیا ہے اور کہیں نہیں ملتے، لیکن بحیثیتِ مجموعی میرا خیال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے ابنِ اسحٰق نے جو کچھ لکھا اس کا معتدبہ حصّہ

ہمارے پاس ہو۔ یہ ضرور ہے کہ حضرتِ علیؓ کی شان میں اور حضرتِ عباسؓ کے خلاف بہت کچھ کہا گیا لیکن اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس قسم کا لوازمہ اس دَور کے متعلق ہمارے علم میں کوئی خاص اضافہ کر سکے گا۔ امکانِ غالب ہے کہ ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث وہ مقطوعات ہیں جو پیراگراف ہیں اور جن میں وہ معلومات یکجا ہیں جو ابنِ اسحٰق نے یہود و نصاریٰ سے حاصل کیں لیکن امکانِ کلّی ہے کہ "مبداء" میں ان کا معتدبہ حصّہ موجود تھا۔ بہرحال یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اقتباسات جو رہنے دیے گئے ہیں ان کی بنا پر اس کے بعض ابتدائی نقّادوں نے غم و غصّہ کا اظہار کیا ہو ابن الکلبی کی کتاب الاصنام میں مبالغہ آمیز امید آرائی سے احتراز کی تنبیہ موجود ہے۔ یاقوت نے اپنی معجم البلدان میں اس (کتاب الاصنام) سے کثیر اقتباسات دیے ہیں جو قدیم عرب جاہلیت کے حوالے سے اتنے دلچسپ اور اہم ہیں کہ عظیم نولدیکہ نے اس امید کا اظہار کیا کہ وہ اس وقت یقیناً زندہ رہے گا جب تک گم شدہ اصل متن دریافت نہیں ہو جاتا۔ وہ واقعی زندہ رہا۔ لیکن اصل متن کے یاقوت کے محولہ اقتباسات سے تقابل کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ عملاً تمام قابلِ قدر حصّہ اپنایا جا چکا تھا اور اصل متن کی دریافت سے کسی خاص اہم بات کا علم ممکن نہیں تھا۔ البتہ "سیرت" کے موضوع کی نوعیت کے سے کام میں اس بات کا امکان غالب ہے کہ اس کا مدیر و مولّف (جیسے کہ ابنِ ہشام) بیان کو کہیں توڑ موڑ دے۔

وہ مصنّفین جن کے یہاں اصل متن کے کچھ حصّے کی بازیافت ممکن ہے، یہ ہیں:

۱۔ محمد بن عمر الواقدی (متوفی ۲۰۷ھ)

۲۔ ابو الولید محمد بن عبداللہ الازرقی ——— اپنے جدِ امجد کے توسّط سے (متوفی قریباً ۲۲۰ھ)

۳۔ محمد بن سعد (متوفی ۲۳۰ھ)

۴۔ ابو عبداللہ محمد بن مسلم بن قتیبہ (متوفی ۲۷۰/۲۷۶ھ)

۵۔ احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ)

۶۔ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ)

۷۔ ابو سعید الحسن بن عبداللہ السیرافی (متوفی ۳۶۸ھ)

۸۔ ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ)

۹۔ ابو الحسن علی بن الاثیر (متوفی ۶۳۰ھ)

۱۰۔ یوسف بن یحییٰ التادلی المعروف بہ الزیات (متوفی ۶۲۷ھ)

۱۱۔ اسماعیل بن عمر بن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ)

۱۲۔ ابو الفضل احمد بن علی ..... بن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ / بمطابق ۱۴۴۹ء)

ہمارے مقصد کے لیے مندرجہ بالا کتب میں الطبری کی اہمیت سب سے زیادہ ہے جس کے متن کی بنیاد سلمہ اور یونس بن بُکیر کی روایت پر ہے ....

۱ - الواقدی : اس کی کثیر تصانیف میں سے صرف "مغازی" بچی ہے - ۱۸۵۶ء میں اس کا ایک تہائی حصہ فان کریمر نے ایک کمزور مخلوطے کی بیان پر شائع کیا اور جب تک یہ کتاب پوری طرح مرتب نہیں ہو پاتی، اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ممکن نہیں۔ ولہاوزن نے اس کا جو ملخص متن شائع کیا اس سے قاری کو تمام اہم حقائق کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن اس کے تلخیص کے اسلوب نے اسے متن میں موجود ان اشکالات سے صرفِ نظر کرنے کا موقع فراہم کر دیا جو فی الاصل تشریح طلب ہیں۔ بلاشبہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا حوالہ دینا نہیں چاہتا تھا جو مغازی پر بحیثیت ایک سند کے پہلے ہی خاصی شہرت کا حامل تھا اور یوں حوالہ دے کر وہ ظاہر کرتا کہ اس کی کتاب اپنے پیشرو کی کتاب کی ایک توسیع محض کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ اس بات کا کسی طرح بھی امکان نہیں کہ اس نے ابن اسحٰق کی کتاب یا روایتی قصص سے استفادہ کیا ہو کیونکہ وہ براہِ راست اپنی اسناد یعنی الزہری، معمر اور بعض دیگر راویوں کے حوالے دیتا ہے۔ اس کے برعکس اس نے ابن اسحٰق کی، جس کا اس نے نہایت گرمجوشی سے بحیثیت مورخ، ماہر سلسلۃ النسب اور راوی کے ذکر کیا ہے، کہیں تخفیف نہیں کی۔ جس نے شاعری منتقل کی اور جو حدیث و روایت کا انتھک متلاشی تھا اور پوری طرح قابلِ اعتماد تھا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ واقدی بطور خاص اس قسم کا مصنف نہیں ہے جس سے اپنے علم کی موجودہ صورتِ حال میں ہم "سیرت" کے اصل کو مدون کر سکیں لیکن چونکہ اس کا بیان اکثر و بیشتر ابن اسحٰق کے بیانات (کتاب) کے متوازی چلتا ہے ——— بعض اوقات اس کے قصص کی ملخص صورت میں اور بعض اوقات توسیعی انداز میں ——— تو اگر وہ اس کا واحد معاون نہیں تو کم از کم قابلِ قدر معاون ضرور ہے۔ جب تک اس کی مغازی چھپ نہیں جاتی اور اس کا مطالعہ اس طرح کر نہیں لیا جاتا جیسا اس کا حق ہے، اس وقت تک دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ ممکن نہیں۔ ایک بات بہرحال بڑی واضح ہے اور وہ یہ کہ واقدی اپنی کتاب میں اکثر ایسے قصص بیان کرتا ہے جو چشم دید گواہوں سے منسوب ہیں اور ان سے ان واقعات پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو ابن اسحٰق کے یہاں غیر واضح ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "سیرت" بغیر واقدی کے نامکمل ہے[۴۹]۔

۲ - الازرقی : الازرقی کی "اخبارِ مکہ" آثارِ قدیمہ کے باب میں بہت کارآمد ہے۔ اس کی سند عثمان بن ساج ہے۔

۳ - ابن سعد کی "اخبار النبی" بھی جس طرح بھی اس نے اپنے شاگردوں کو کم و بیش منتقل کی (مفید ہے)۔ ۳۰۰ھ میں ابن معروف نے اسے "طبقات" میں شامل کر لیا۔ برلن ایڈیشن کی جلد اوّل الف، ب اور جلد دوم الف، ب انبیائے قبل از اسلام، حضورِ اکرمؐ کی ولادت، ان کے مقصدِ حیات، ان کی ہجرت، ان کے مغازی اور ان کے وصال، تدفین اور وصال پر لکھے گئے مراثی سے متعلق ہے۔ بعض معاملات کے باب میں ابن سعد کے پاس بمقابلہ ابن اسحٰق کہنے کو بہت کچھ ہے، مثلاً مکتوباتِ نبوی، سفراء، حضورؐ کی آخری علالت وغیرہ البتہ قبل اسلام کے عرب سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ مغازی کے سلسلے میں اس کا اہم منبع واقدی ہے۔ "طبقات" حضورؐ کے صحابہؓ اور حدیث کے راویوں بشمول تابعینؒ سے بحث کرتی ہے۔

۴ - ابن قتیبہ کی کتاب "المعارف" میں بعض مختصر اور غلط اقتباسات ملتے ہیں۔

۵ - البلاذُری کی "فتوح البلدان" ہمارے علم میں بہت کم اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ڈی جوئیجے کے اشاریے میں بارہ حوالے ملتے ہیں، ان میں پہلے دو، جن کا تتبع نولدیکہ نے کیا اور جو بقول جوئیجے "سیرت" میں شامل نہیں ہیں، کو وہاں کبھی جگہ نہ ملتی کیونکہ وہ ابن اسحٰق کی فقہ پر لکھی گئی ایک گم شدہ کتاب سے متعلق ہیں۔ ان کا تعلق اس مسئلے سے ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین پر کس قدر پانی روک سکتا ہے تاآنکہ وہ اس کے کھیت سے اُبھر کر ہمسائے کے کھیت میں چلا جائے۔ آخری پانچ حوالے خلفا کے زمانے سے متعلق ہیں اس لیے ہمارے موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات ان سے طبری کے بیان کو تقویت ملتی ہے اور کم از کم ایک حوالے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ روایت کو زبانی طور پر محفوظ نہیں کیا گیا تھا کیونکہ مختلف فیہ قرأت میں صرف نقطے کے پہلے حرف سے دوسرے حرف پر منتقل ہوجانے اور نتیجۃً تیسرے حرف کے غلط پڑھے جانے ہی کی صورت میں وجود میں آ سکتی تھیں۔ حوالے مختصر اور جامع ہیں اور ان سے اس صداقت کی تو کامل نشاندہی ہوجاتی ہے جس کی مصنّف کو اپنے مقصد کے لیے ضرورت تھی لیکن کلی صداقت کی نہیں جو (شاید) غیر متعلق تھی۔

۶ - **طبری**: نولدیکہ نے ابن ہشام کے تصحیح شدہ نسخے میں شامل کردہ اضافات کی ایک فہرست دی ہے[۵۱] اور "سیرت" کے اصل نسخے کے ایک شاہد کے طور پر اس کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اس کی تفسیر سے "مبداء" کے گم شدہ حصے کی بازیافت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی جہاں اس کے مغائرات (VARIANTS) صرف اسلوبی ہیں اور ان سے عبارت متاثر نہیں ہوتی وہاں میں نے اُنھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ عملاً وہ تمام مغائرات لائیڈن ایڈیشن کے حواشی میں آپ کو مل جائیں گے۔ طبری چار تصحیح شدہ نسخوں سے واقف تھا جو اُوپر دی گئی فہرست میں ۴، ۷، ۹ اور ۱۰ نمبر پر آتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ محوّلہ نسخہ یونس بن بُکیر کا ہے۔ ایک موقعہ پر (صفحہ ۱۰۷۴، سطر ۱۲) وہ رائے دیتا ہے کہ ہشام بن محمد (الکلبی وفات ۲۰۴/۲۰۶ھ) کی نسبت ابن اسحٰق کا بیان زیادہ اطمینان بخش ہے۔ ابن ہشام کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور "سیرت" میں اس وقت موجود بہت سی شاعری کو حذف کر دیتا ہے۔ کیا اس کے منتخبات میں اس کے ذوق کا دخل تھا، کیا وہ اس میں سے کچھ کو غیر متعلق سمجھتا تھا یا کیا وہ اسے جعلی تصور کرتا تھا۔ مجھے اس باب میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔ وہ اکثر ایسی اسناد دیتا ہے جو ابن اسحٰق کے یہاں نہیں ملتی (مزید دیکھیے صفحہ ۱۰۹۴، سطر ۱۲) کم از کم ایک موقعہ پر یُوں لگتا ہے کہ بیان کو دوبارہ ڈھالا گیا ہے (دیکھیے واقدی صفحہ ۲۲۴ مع طبری صفحہ ۱۲۷۱) طبری اکثر دیگر قدما کی طرح تصلیہ اور ترضیہ حذف کر دیتا ہے[۵۲] ابن ہشام نے کعب کی نظم اور اس نظم سے پیدا شدہ اشتعال اور اس کے نتیجے میں ہونے والے قتل کے ذکر کو حذف کر دیا ہے۔ (دیکھیے صفحہ ۶۵۱ مع طبری صفحہ ۱۴۴۵)

۷ - **السیرافی**: السیرافی، واقدی کے کام پر ایک دلچسپ اضافہ ہے۔ (صفحہ ۸۸۲)

۸ - **الماوردی** کے پاس اضافے کے لیے کوئی اہم مواد نہیں۔

۹ - ابن الاثیر کا میلان (اپنی "کامل" میں) اپنی اسناد کو یکجا کر دینے کی جانب ہے اور یُوں وہ ان تمام بیانات کی کلیت کی مدد سے اور ضمنی تفاصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہموار اور رواں بیان فراہم کرتا ہے۔ تاہم وہ

ابنِ اسحٰق کے دس بار حوالے دیتا ہے۔[۵۳]

۱۰۔ ابن الزیات (دیکھیے صفحہ ۴۰ ۶ واقدی)

۱۱۔ ابن کثیر بعض اوقات ابنِ ہشام سے حرف بہ حرف متفق ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ ابنِ بُکیر کا حوالہ دیتا ہے اور یُوں اس کے پیش کردہ قصص وہی ہیں، صرف لفظ مختلف ہیں۔ میں اس روایت کا خصوصی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

۱۲۔ ابن حجر: اس کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔[۵۴]

ابنِ اسحٰق کی شہرت

ہمارا مقصد یہ تھا کہ بطور مورخ ابن اسحٰق کے مستند ہونے کے ضمن میں ان کے ہم مذہب لوگوں کی رائے درج کی جائے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان حضرات کی رائے ان کی (ابنِ اسحٰق کی) بعض دیگر تصانیف کے باعث بہت متاثر نظر آتی ہے جن میں سے ایک یعنی "سنن" کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کیا ہے۔ ابویوسف (وفات ۱۸۲ھ)[۵۵] نے بکثرت اس کے حوالے دیے ہیں۔ لیکن یہ کتاب زیادہ دیر تک اپنا وجود باقی نہ رکھ سکی اور جلد ہی معدوم ہو گئی۔ اگر ہم اس کتاب کے مندرجات سے واقف ہوتے جو اپنی قدامت کے باعث مسلمانوں کی روزمرہ زندگیوں کو بے حد متاثر کر سکتی تھی بشرطیکہ اسے حضور اکرمؐ کے افعال، الفاظ کے دیگر راویوں کے بیانات کو چیلنج کرنے کا موقعہ ملتا، یُوں ہم کہیں زیادہ بہتر صورت میں ابنِ اسحٰق پر ہونے والی اس جرح و تنقید کی اہمیت اور مطابقت کا اندازہ لگانے کے قابل ہوتے جب یہ (تنقید) نہایت غیر مبہم طور پر مخاصمانہ تھی۔ صرف اس کی کتاب "سیرت" ہی کو ہدفِ تنقید نہیں بنایا جاتا بلکہ خود اس کی ذات کو بھی۔ اور اگر سنّت پر ان کی کتاب ان فقہی مدارس کی مخالف تھی جو ابھی اپنے ارتقا کی منزل میں تھے تو ظاہر ہے کہ ابنِ اسحٰق شدید طنز و مذمت سے کہاں بچ سکتے تھے۔ اس حقیقت سے صرفِ نظر نہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ وسٹنفیلٹ نے ابوالفتح محمد بن محمد بن سیدالناس الیعمری الاندلسی (متوفی ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء) کے حوالے سے جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں عام نوعیت کی احادیث اور حضورؐ کی سنّت سے متعلق احادیث میں نمایاں فرق و امتیاز نظر آتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بیٹا بیان کرتا تھا کہ ان کے والد نے اپنی مُسند میں ابنِ اسحٰق کی روایت کردہ احادیث شامل کیں لیکن سُنن پر اسے سند قرار دینے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ "سیرت" میں بعض ایسی حکایات موجود ہیں جن سے بعض مسائل و معاملات میں حضورِ اکرمؐ کے معمولات کا پتا چلتا ہے اور لہٰذا مستقبل میں پیش آنے والے ایسے ہی مسائل و معاملات میں یہ دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی ایک مستند رہنما کا حکم رکھتے ہیں اور اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ایک یا دو صورتوں میں ان افعال کی تہہ میں کام کرنے والا اصول بعد کے فقہاء کے اخذ کردہ نتائج سے ٹکراتا ہے، یہ حکایات "سیرت" کا غیر اہم حصہ ہیں اور یہ بات بے کھٹکے کہی جا سکتی ہے کہ ابنِ حنبل نے ابنِ اسحٰق پر بطور سند ہونے کے جو اعتراض کیا ہے وہ تنہا ابن اسحٰق کی گم شدہ کتاب "سنن" پر ہوتا ہے۔

جیسے کہ گولڈزیہر نے کافی عرصہ پہلے کہا تھا کہ اسلام میں روایتِ حدیث کا میدان اصل میں جنگ آزما فرقوں کا

میدان ہے جو لوگوں کے اذہان و اعمال پر غلبہ جمانے کے لیے کوشاں ہیں اور اس ذیل میں سند حضور اکرمؐ سے منسوب معروضہ یا جعلی مثال سے لیتے ہیں۔ حدیث یا مجموعہ حدیث جس قدر قدیم ہوگا اتنا ہی اس صورت میں اس قسم کے رجحان کا وجود کم نظر آئے گا لیکن ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ابنِ اسحٰق کبھی کبھی حضرت عباسؓ پر حضرت علیؓ کی برتری و عظمت کی ترغیب کا شکار ہو جاتے تھے۔ قاری کو یہ بات قطعاً غیر متعلق محسوس ہوگی جب وہ خود ٹھیک اس بات کا مطالعہ کر سکتا ہے کہ حضرتِ عباسؓ کی پوزیشن کیا تھی ——— یہ اول مخالفانہ تھی، دوم غیر جانب دارانہ، اور آخر کار جب مسئلہ بالکل صاف ہو گیا تھا، ایک پکے مسلمان تھے۔ بات صاف ہے کہ چونکہ ابنِ اسحٰق نے حضرتِ ابوبکرؓ کی شدید وفاداری اور حضرتِ عمرؓ کی اٹوٹ رفاقت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی، سو اس صورت میں وہ حضرتِ علیؓ کے دعاوی کے متعصب اور غیر متوازن حامی نہیں رہتے . . . . . ابنِ اسحٰق نے حضرت علیؓ کے ان دو بزرگوں (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی بے شمار خدمات کی کہیں تخفیف نہیں کی۔

خالص فن کے نقطۂ نظر سے حدیث کی تاریخ میں، یعنی حدیث کے ان جامع مجموعوں میں جنھیں تمام سُنّی العقیدہ مسلمان مستند اور مقدس خیال کرتے ہیں، ابنِ اسحٰق حضورِ اکرمؐ کے باب میں معلومہ تمام تفاصیل کے ایک دیانت دار اور صاف گو جامع ہونے کے باوجود، معمولی جگہ کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ روزمرہ کے ایسے معمولات کے باب میں ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا جن سے حدیث کی شرعی و قانونی کتب بھری پڑی ہیں، یا ان کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ انھوں نے اپنی "سنن" میں شامل کر دیا تھا۔ اگر وہ حضورِ اکرمؐ کے الفاظ نقل کرتے تو وہ ان کے بیان میں کسی واقعۂ خاص سے متعلق ہوتے ——— یعنی وہ لفظ تو اصلاً بعض حالات کے نتیجے میں صادر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ البخاری اس کے باوجود کہ وہ اکثر اپنے ابواب کے عنوانات میں ابن اسحٰق کا ذکر کرتا ہے لیکن حدیث کے باب میں شاذ ہی اس کا حوالہ دیتا ہے تا آنکہ اس حدیث کی کسی اور اسناد سے تصدیق نہ ہوتی ہو۔ مسلم جو احادیث کو صحیح، حسن اور ضعیف کے طور پر درجہ بند کرتا ہے، ابنِ اسحٰق کو دُوسرے درجے میں رکھتا ہے۔ جو کوئی تھوڑا بہت بھی تاریخی شعور رکھتا ہے، اس کی نظر میں یہ ایک شدید ناانصافی تھی لیکن اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ تیسری صدی کے نصف تک حدیث کی ہیئت اس کے مافیہ کے مقابلے میں زیادہ وقیع سمجھی جاتی تھی اور سلسلہ رواۃ بے عیب ہوتا تو کسی بھی بات کو ان میں شامل کیا جا سکتا تھا۔

ابنِ اسحٰق کے سلسلے میں مسلم کی جو رائے تھی اس کا بہترین اور جامع ملخص ابن سیّد الناس نے اپنی کتاب "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" میں دیا ہے۔ اس نے ابنِ اسحٰق کے سلسلے میں ان تمام حوالوں کو جنھیں وہ تلاش کر سکتا تھا تلاش کیا، یہ حوالے اس کے حق میں بھی تھے اور اس کے خلاف بھی اور پھر ابنِ اسحٰق پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا۔ متعلقہ اقتباس تو وانفیڈیؔ کے یہاں ملے گا جس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہے۔ اس بیان کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

(الف) وہ لوگ جو ابنِ اسحٰق کے حق میں تھے:

الزُہری: "مغازی کے ذیل میں جس شخص کے پاس بہترین معلومات ہیں وہ ابنِ اسحٰق ہیں۔ مدینہ میں اس وقت تک علم رہے گا جب تک ابنِ اسحٰق کا دم سلامت ہے"۔

شعبہ (۸۵ - ۱۶۰ھ): "حدیث میں قابلِ اعتماد۔ اپنے حافظے کے حوالے سے روات کا امیر"۔

سفیان بن عُیینہ (۱۰۷ - ۱۹۸ھ): "میں اس کی صحبت میں کم و بیش ستر سال تک بیٹھا[۵۵] اور اہلِ مدینہ میں سے کوئی بھی نہ تو اسے شک سے دیکھتا تھا نہ اس کی برائی کرتا تھا"۔

ابوزُرعہ (متوفی ۲۸۱ھ): پرانے علماء نے اس سے استفادہ کیا اور محدثین نے اسے آزمایا اور کھرا پایا۔ جب اس نے دُہیم کو مالک کے ابنِ اسحٰق پر عدمِ اعتماد کے بارے میں یاد دلایا تو اس نے بتایا کہ اس عدمِ اعتماد کا تعلق اس کے راوی ہونے کی صداقت سے نہیں بلکہ اس کے قدری ہونے سے متعلق ہے۔

ابوحاتم: اس کی روایات دوسرے لوگ نقل کرتے ہیں۔

ابن المدینی: حدیث اصل میں چھ افراد کا حصہ تھی۔ پھر یہ بارہ افراد کا حصہ بنی جن میں سے ایک ابنِ اسحٰق تھے۔

الشافعی: جو شخص مغازی کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اسے ابنِ اسحٰق سے رجوع کرنا چاہیے۔

عاصم بن عمر بن قتادہ: جب تک ابنِ اسحٰق زندہ ہے، علم لوگوں کے درمیان رہے گا۔

ابومعاویہ: ایک عظیم دماغ، لوگ اپنی (معلوم) حدیثیں اسے سناتے تھے تاکہ اس کے قوی حافظے میں محفوظ رہ سکیں۔

البخاری: الزہری مغازی کے باب میں معلومات ابنِ اسحٰق سے لیتا تھا۔

عبداللہ بن ادریس الاودی اس کے تجربہ پر متحیر رہتا تھا اور اکثر اس کے حوالے دیا کرتا تھا۔

مصعب: جن وجوہات کی بنا پر اسے ملعون کیا جاتا تھا، ان کا حدیث سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یزید بن ہارون: اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ حدیث کا عظیم راوی کون تھا، تو میں کہوں گا "ابنِ اسحٰق"!

علی بن المدینی: اس کی بیان کردہ احادیث صحیح ہیں۔ مدینے میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ ہاشم بن عروہ کی جانب سے اس پر کیے جانے والے اعتراض میں کوئی جان نہیں۔ اسے موخرالذکر کی بیوی سے جوانی کے ایام میں گفتگو کا موقع ملا ہوگا احادیث کے باب میں اس کی صداقت اپنا ثبوت آپ ہے۔ میں صرف دو احادیث بتا سکتا ہوں جو عدمِ اسناد کے باعث ناقابلِ رد ہیں[۵۶]

العجلی: (وہ) قابلِ اعتماد (تھا)

یحییٰ بن معین: روایت کے باب میں ٹھوس اور قابلِ یقین۔

احمد بن حنبل: حدیث کے باب میں جیّد۔

(ب) اس کے بعد مصنف وہ سب کچھ بیان کرتا چلا جاتا ہے جو ابنِ اسحٰق کے خلاف کہا گیا ہے۔ غیر اہم تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے ہمارے پاس مندرجہ ذیل اعتراضات باقی رہ جاتے ہیں جنھیں ابنِ سید الناس معرضِ بحث میں

لاتا اور اُن کی تردید کرتا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن نُمیر نے کہا کہ ابنِ اسحٰق نے جب معروف لوگوں سے سُنی سُنائی باتوں کو روایت کیا تو اکثر صورتوں میں تو اس کی بیان کردہ روایات ٹھیک اور سچی تھیں لیکن بعض اوقات اس نے ایسے بے معنی اقوال بھی بیان کر دیے جن کے راوی مجہول الحال تھے۔ یحییٰ بن القطان کبھی ان کا حوالہ نہیں دیتا تھا۔ امام احمد بن حنبل ابنِ اسحٰق کو پسندیدگی سے حوالہ بناتے تھے لیکن جب یہ نکتہ اُٹھایا گیا کہ یہ قصص (بیان کردہ) کتنے حسن ہیں تو وہ حیرانی سے مسکراتے۔ ان کا بیٹا اعتراف کرتا تھا کہ اس کے باپ احمد نے اپنی "مُسند" میں ابنِ اسحٰق کی روایت کردہ بہت سی احادیث کو شامل کیا لیکن خود اُس نے (بیٹے نے) ان کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ جب اُس سے پُوچھا گیا کہ کیا اس کے والد اوامر و نواہی کے باب میں ابنِ اسحٰق کو سند سمجھتے تھے، تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ وہ خود بھی اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتا تھا جس کی روایت صرف ابنِ اسحٰق نے کی ہو۔ وہ کوئی ایسی روایت تو بیان کرتا تھا جو اس نے متعدد لوگوں سے اکٹھی کی لیکن یہ نہیں بتاتا تھا کہ اس کے الگ الگ حصے کس نے فراہم کیے۔ ابن المدینی کہا کرتا تھا کہ بعض اوقات تو اس کی بیان کردہ روایات بہت حسن ہوتی تھیں۔ المیمونی کی روایت تھی کہ ابن معین (۱۵۶ - ۲۳۳ھ) کہا کرتا تھا کہ وہ (ابنِ اسحٰق) ضعیف (راوی) تھا۔ لیکن بعض دُوسرے اس روایت کی نفی کیا کرتے تھے۔ الدُّوری کہا کرتا تھا کہ وہ قابلِ اعتماد تھا۔ لیکن امام مالک اور دُوسرے فقہا کی طرح اسے فقہ میں استناد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ النسائی کہا کرتا تھا کہ اس کی روایت ثقہ نہ تھی۔ الدارقُطنی کہا کرتا تھا کہ اپنے باپ کے حوالے سے ابنِ اسحٰق کی بیان کردہ روایت قانونی سند کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ ہاں یہ صرف اس حد تک استعمال کی جا سکتی تھی کہ اسے پہلے سے مسلّمہ بات کی تصدیق کے لیے حوالہ بنایا جا سکے۔ ابو داؤد الطیالسی (۱۳۱ - ۲۰۳ھ) کی روایت تھی کہ حماد بن سالمہ کہا کرتا تھا کہ جب تک میں بہت مجبور نہ ہو جاؤں، میں ابنِ اسحٰق کے حوالے سے کوئی حدیث روایت نہیں کروں گا۔ جب مالک بن انس نے اس کا ذکر کیا تو کہا کہ وہ تو دجّال اور کذّاب ہے۔ جب ہاشم بن عروہ کو بتایا گیا کہ اس نے (ابنِ اسحٰق نے) بعض احادیث فاطمہ کے حوالے سے روایت کی ہیں تو اس نے کہا: "بدمعاش، جُھوٹ بولتا ہے۔ وہ میری بیوی سے کب ملا؟" جب عبداللہ بن احمد نے اپنے باپ کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ یہ بات ابنِ اسحٰق کے خلاف نہیں جاتی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اس نے فاطمہ سے مکالمہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہوگی اور اسے (اس کے خاوند کو) اس بات کا علم نہ ہوگا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ مالک جُھوٹا تھا۔ ابنِ ادریس کہتا تھا کہ میں نے مالک سے مغازی کے سلسلے میں گفتگو کی اور یہ بھی بتایا کہ ابنِ اسحٰق کا دعوٰی تھا کہ وہ ان کا (مغازی کا) جرّاح ہے۔ اس کے جواب میں اس نے (مالک نے) کہا "ہم نے اسے مدینہ سے نکال باہر کیا تھا۔" مکی بن ابراہیم کہا کرتا تھا کہ اسے ابنِ اسحٰق کے محاضرات میں شریک ہونے کا موقعہ ملا، وُہ اپنے بال رنگا کرتا تھا، جب اس نے صفاتِ الٰہیہ سے متعلق احادیث بیان کیں تو وہ وہاں سے اُٹھ آیا اور پھر کبھی نہ گیا۔ ایک دُوسرے موقعہ پر اس نے کہا کہ جب اس نے (ابنِ اسحٰق کے) محاضرات کو الوداع کہی وہ رَے کے مقام پر اس وقت تک اس کے بارہ محاضرات میں شریک ہو چکا تھا۔

المفضل بن غسّان کہتا تھا کہ میں اس وقت موجود تھا جب یزید بن ہارون، البکّائی کے یہاں پائی جانے والی

احادیث بیان کر رہا تھا اور بہت سے اہلِ مدینہ اسے سُن رہے تھے۔ جب اس نے ابنِ اسحٰق کا ذکر کیا تو وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیئے" اس نے جو کچھ کہا اس کا ایک شمّہ بھی ہمیں نہ بتاؤ، ہم خود اس سے بہتر جانتے ہیں" یزید ان کے درمیان (انھیں منانے) گیا لیکن وہ اس کی بات سننے ہی نہیں تھے۔ مجبوراً اسے وہاں سے جانا پڑا۔

ابو داؤد کہتے تھے کہ اُنھوں نے احمد بن حنبل کو کہتے سنا کہ ابنِ اسحٰق حدیث سے محبت کرنے والا آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے دُوسرے لوگوں کی تحریروں کو (متعلقہ بہ حدیث) بھی اپنی تحریروں میں شامل کر لیا۔ ابو عبداللہ کہتا تھا کہ وہ ابن اسحٰق کو مُوسیٰ بن عبیدہ الربذی پر ترجیح دیتا تھا۔ احمد کہتا تھا کہ وہ درمیانی واسطوں کے بغیر احادیث اس طرح بیان کرتا تھا گویا وہ اس کے کسی ساتھی نے اس سے روایت کی تھیں جبکہ ابراہیم بن سعد کی کتاب میں جہاں کہیں حدیث آتی ہے وہ کہتا تھا "الف نے مجھے بتایا"۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تھا تو وہ کہتا تھا" الف نے کہا"۔

ابو عبداللہ کہتا تھا کہ ابنِ اسحٰق بغداد آئے اور انھوں نے ان لوگوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جو الکلبی اور بعض دوسروں کے حوالے سے احادیث بیان کرتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا (ابنِ اسحٰق کا) کہ حدیث کے باب میں (الکلبی) سند نہیں تھا۔ الفلاس (متوفیٰ ۲۴۹ھ) کہتا تھا کہ وہب بن جریر سے اُس ملاقات کے بعد، جس میں اس نے اس (وہب ابن جریر) کے سامنے وہ کتاب مغازی پڑھی جو ابنِ جریر کو ابنِ اسحٰق سے اپنے والد کے واسطے سے حاصل ہوئی تھی، ہم یحییٰ بن قطان سے ملے جس نے کہا کہ ہم اس سے جھُوٹ کی پوٹ لائے ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول تھا کہ" مغازی" اور اسی قبیل کے دیگر معاملات میں ابنِ اسحٰق کی گفتگو ضبطِ تحریر میں لائی جاسکتی تھی لیکن فقہی معاملات میں مزید توثیق ضروری تھی۔ اگرچہ ان کی روایت کردہ احادیث کا کثیر حصّہ بغیر مناسب اسناد کے تھا لیکن وہ (احمد بن حنبل) ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس وقت تک جب تک وہ یوں بیان کر رہے ہوتے کہ" الف نے ہمیں بتایا"، "ب نے مجھے اطلاع دی" اور" میں نے سنا"۔ ابنِ معین' ابنِ اسحٰق کو فقہی معاملات میں سند کے طور پہ لانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ابو حاتم کہتا تھا کہ وہ حدیث کے معاملے میں کمزور تھے لیکن افلح بن سعید پہ قابلِ ترجیح تھے اور ان کی روایات کو ضبطِ تحریر میں لایا جاسکتا تھا۔ سلیمان التیمی انھیں جھوٹا کہتا تھا اور یحییٰ بن قطان کہتا تھا کہ وہ اس کی بیان کردہ حدیث کا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہے، وہ جھُوٹا تھا۔ جب یحییٰ نے وہیب بن خالد سے پوچھا کہ کیا چیز اسے یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ابنِ اسحٰق جھُوٹے تھے تو اس نے بتایا کہ مالک نے قسم کھائی تھی کہ وہ جھُوٹا ہے اور اس نے اپنے اس موقف کے لیے ہاشم بن عروہ کی قسم کو بطور دلیل پیش کیا تھا۔ موخرالذکر کے اس موقف کی وجہ یہ تھی کہ ابنِ اسحٰق اس کی بیوی فاطمہ کے حوالے سے احادیث روایت کرتے تھے۔

ابوبکر الخطیب کا قول تھا کہ بعض مستند محدثین اس کی احادیث کو بطور قانونی شہادت کے قبول کرتے تھے جبکہ بعض دُوسرے نہیں کرتے تھے۔ اس کی سند کی تردید کی منجملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شیعی تھا، اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ انسان آزاد ارادے کا مالک ہے۔ اس کی اسناد ناقص تھیں، جہاں تک اس کی صداقت کا

تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

البخاری انھیں بطور سند حوالہ بناتے تھے اور مسلم اکثر ان کا حوالہ دیتے تھے۔ ابو الحسن بن القطان انھیں "حسن" کے درجے میں رکھتا تھا کیونکہ لوگ ان کے افکار کو متنازعہ سمجھتے تھے۔ جہاں تک فاطمہ سے روایت کا تعلق ہے الخطیب نے ہمیں ایک اسناد مہیا کی ہے جو ابن اسحٰق اور فاطمہ سے ہوتی ہوئی اسماؓ بنت ابی بکر تک پہنچتی ہے "میں نے ایک عورت کو حضور اکرمؐ سے سوال کرتے اور کہتے سُنا" میری ایک سوکن ہے اور میں اسے مشتعل کرنے کے لیے جھوٹ مُوٹ خود کو اپنے خاوند سے مطمئن ظاہر کرتی ہُوں"۔ حضورِ اکرمؐ نے فرمایا: "جو کوئی بھی اپنے آپ کو اُس سلوک پر مطمئن ظاہر کرتا ہے جو سرے سے اس سے کیا ہی نہیں گیا اس کی مثال اس شخص کی ہے جس نے اُوپر تلے دو جُھوٹے لباس پہن لیے ہوں[59]۔ ابوالحسن کہتا تھا کہ فاطمہ سے یہی روایت تھی جس نے ابن اسحٰق کی شہرت کو نقصان پہنچایا اور جس کی بنا پر اس کے شوہر ہشام نے اسے جھوٹا قرار دیا۔ مالک نے اس کی تقلید کی اور دُوسروں نے اس کی نقل کی۔ بہرحال اس کی سند کے حوالے سے اور بھی کئی احادیث موجود ہیں۔

ابن سید الناس نے مصنف "مغازی و سیرُ" کے دفاع میں جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی تعریف کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ وہ فوراً بات کی تہہ تک جا پہنچتا ہے اور بتاتا ہے کہ ایسی باتوں میں اصلیت کا کس قدر قحط ہے۔ اگرچہ خطیبوں کی طرح وہ تنقید کرتا ہے لیکن وُہ بن کہے یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ اوّلیں دَور کے لکھنے والوں نے احادیث کی اسناد بھی مہیا کی ہوں گی جنھیں آنے والی نسلوں کے ان شدید مطالبات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جن کے سامنے جعلی احادیث کا پورا سمندر موجزن تھا جو رسول اکرمؐ اور ان کے صحابہؓ سے منسوب کر دیا گیا تھا۔ ابن سید الناس کی سلامت روی اور عقل سلیم "تدلیس" کے اس الزام سے متفق نہ ہو سکتی تھی جس نے روایت کے سلسلے کی کسی کڑی کو حذف کر کے یا اصل راوی ہی کے بیان پر اکتفا کر کے بعد کے دَور میں خود بخود احادیث کو غیر مستند قرار دے دیا۔ اس ضمن میں اس کا خیال تھا کہ اگرچہ بعض جگہ ابن اسحٰق کی روایات میں مکمل دستاویزی شہادتوں کی کمی ہوتی ہے لیکن وہ جو مفہوم و مافیہ بیان کرتے ہیں، اس میں ان کی صداقت پر کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور جہاں تک ان کے شیعی اور ان پر قدری ہونے کے الزام کا تعلق ہے، وُہ کسی دُوسرے میدان میں تو یقیناً صحیح ہوگا لیکن "سیرت" سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ مکی بن ابراہیم ان کے محاضرات کو اس وقت چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا جب اس نے ابن اسحٰقؒ سے صفات الٰہیہ سے متعلقہ روایات سنیں؛ جب اس قسم کے مسائل زیر بحث آتے تھے تو قدماء میں سے اکثر ان کا پُوری طرح ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

یزید کا بیان کردہ قصہ، کہ اہل مدینہ ابن اسحٰقؒ کی سند سے بیان کی جانے والی روایات نہیں سُنتے تھے۔ کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ یزید ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ آخر اہل مدینہ یہ روایات کیوں نہیں سُننا چاہتے تھے؛ اس صورت میں ہم صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم ایک صحیح اور سچی حدیث پر محض اس وجہ سے اعتراض جڑ دیں کہ ہمارے نزدیک اس میں نقص ہے۔ ہم پہلے ہی اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یحییٰ القطان ان کی کسی حدیث کا حوالہ

نہیں دیتا تھا اور وُہیب کی سند (بتوسط مالک) پر اُنھیں کاذب قرار دیتا تھا اور یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ اہلِ مدینہ کے اس رویّے کا باعث، جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، یہی شخص تھا۔ احمد بن حنبل اور ابن المدینی نے ہشام کے اعتراضات کا شافی جواب دیا ہے۔

جہاں تک نُمیر کے الزام کا تعلق ہے کہ ابنِ اسحٰق مجہول الحال لوگوں کی سند کے حوالے سے احادیث روایت کرتے تھے تو ایسی صورت میں اگر ان کا اعتبار اور دیانت روایت کے لائق نہ بھی ہوں تب بھی شک ان اور ان کے اطلاع دینے والوں میں منقسم ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ہم جانتے ہیں کہ وُہ قابلِ اعتماد ہیں تو ایسی صورت میں الزام ان مجہول الحال لوگوں پر آتا ہے نہ کہ اُن پر۔ اسی قسم کے اعتراضات سفیان ثوری اور دیگر راویانِ حدیث پر کیے گئے ہیں جن کی حدیثیں اسی طرح باہم متخالف ہیں اور ان میں سے جو مجہول الحال لوگوں پر مبنی ہیں وہ تو رد کر دی جاتی ہیں اور جو معلوم الحال لوگوں سے مروی ہیں انھیں قبول کر لیا جاتا ہے۔ سُلطان بن عُیینہ نے جریر الجوفی سے ایک ہزار سے متجاوز احادیث سُننے کے بعد اسے ترک کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود وُہ اس کی سند اور حوالے سے احادیث روایت کرتا تھا۔ شعبہ کئی روایات اس کے اور دیگر راویوں کے حوالے سے بیان کرتا ہے جن کو "ضعیف" کا طعن دیا جاتا تھا۔

جہاں تک احمد کی اس شکایت کا تعلق ہے کہ وُہ احادیث کو ان میں شامل لوازمے کے فراہم کنندگان کے نام لیے بغیر مرکب صُورت میں ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان راویوں کے الفاظ اگرچہ متعدد ہوتے تھے لیکن متفق علیہ ہوتے تھے۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ان کے معانی ملتے جلتے ہوتے۔ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ واثلہ بن اسقع نے کہا "اگر میں تمھیں کسی حدیث کا مفہوم بیان کر دُوں (من وعن ان الفاظ میں نہیں جو بیان کیے گئے تھے) تو تمھارے لیے یہ کافی ہے۔" علاوہ ازیں محمد بن سیرین کہتا تھا کہ وہ دس مختلف محدثین سے احادیث سُنتا تھا جو دس مختلف الفاظ میں ہوتی تھیں لیکن ان کے معانی ایک ہی ہوتے تھے۔ احمد کی یہ شکایت، کہ ابنِ اسحٰق دُوسرے لوگوں کی تحریروں کو اپنے بیانات میں شامل کر لیتے تھے، اس قابل نہیں کہ اسے سنجیدگی سے لیا جائے تا آنکہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اُنھیں ان تحریروں کو دُہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ ہمیں اس اسلوبِ روایت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے: یعنی یہ کہ اگر الفاظ صاف طور پر زبانی روایت کے متقاضی نہ ہوں، پھر تو تدلیس کا اعتراض قائم رہتا ہے[۶۰] لیکن ہمیں اس وقت تک اس الزام کو قبول نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ الفاظ کا صاف طور پر یہ مطلب نہ ہو۔ اگر وہ (ابنِ اسحٰق) واضح طور پر یہ کہیں کہ اُنھوں نے لوگوں کو فلاں بات کہتے سُنا جبکہ در اصل اُنھوں نے ایسی بات بالکل نہیں سُنی تھی تو یہ بالکل سفید جھُوٹ اور صریح تدلیس ہے۔ ابنِ اسحٰق کے باب میں ایسی بات کہنا قطعاً غلط ہے تا آنکہ لفظ ہمیں ایسا سوچنے پر مجبور نہ کر دیں[۶۱]

جب ابنِ احمد نے اپنے باپ کے حوالے سے یہ بات کہی کہ وہ ابنِ اسحٰق کو فقہی معاملات میں سند نہیں مانتے تھے۔ حالانکہ وہ غیر فقہی معاملات میں اسے سند ماننے کے معاملے میں بڑے فراخدل تھے (تو واقعہ یہ ہے کہ) "مغازی" اور "سیرتِ رسول" کا بیشتر حصہ انھی غیر فقہی معاملات پر مشتمل ہے تو ایسی صورت میں اُنھوں نے اس بُری رائے کا اطلاق "سنن" کے علاوہ دیگر معاملات پر بھی کیا۔ ابنِ اسحٰق کی سچّی شہرت اس قسم کے الزام کو خارج از امکان قرار دیتی ہے۔

جہاں تک یحیٰی کی اس بات کا تعلق ہے کہ وہ قانونی معاملات میں قابلِ اعتماد تو تھے لیکن سند کا درجہ نہیں رکھتے تھے تو ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ انھیں قابلِ اعتماد تو کہا گیا ہے۔ اگر صرف العُمَری اور مالک جیسے لوگ ہی قابلِ قبول ہوتے تو ایسی صورت میں قابلِ قبول اسناد صرف گِنی چُنی ہی رہ جاتیں! یحیٰی بن سعید نے غالباً آنکھیں بند کر کے مالک کی تقلید کی کیونکہ اس نے مالک سے وہ کچھ سُنا جو ہشام نے ابنِ اسحٰق کے بارے میں کہا تھا۔ قانونی معاملات میں ابنِ اسحٰق کو سند ماننے پر اس کے انکار کا جواب احمد کے باب میں دیا جا چکا ہے۔ یحیٰی نے ان روایات اور دیگر روایات میں مکمل قبول یا صریح ردّ کے سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔

ابنِ اسحٰق کی شہرت پر کیے جانے والے دیگر اعتراضات ایسے نکات کی بنا پر ہیں جو واضح نہیں کیے گئے۔ اور اکثر صورتوں میں عوامل غیر شائستہ ہیں۔ رہا فقہی معاملات کا مسئلہ تو ان میں بھی ابُوعیسٰی الترمذی اور ابوحاتم بن حبّان (متوفی ۳۵۴ھ) نے انھیں بطور سند استعمال کیا ہے۔

اگر مستند علماٗ نے ابنِ اسحٰق کے حق میں فتوے نہ دیے ہوتے تو ان کے مخالفین کی تردید ممکن ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صرف چند الزامات ہی اس کے قصص کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کافی ہوتے کیونکہ کسی ایسے شخص کی اچھی ساکھ پر چند خفی یا جلی حملے ہی کافی ہوتے ہیں کہ اس کی شہرت کو برباد کر دیں جس کے سابقہ حالات کا علم نہ ہو اور پھر جب غیر جانبدار نقاد نے اس کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو۔

ابوحاتم نے اپنی کتاب (متعلقہ بہ راویانِ ثقہ) میں کہا تھا کہ وہ دو اشخاص جنھوں نے ابنِ اسحٰق پر اعتراضات وارد کیے، ہشام اور مالک تھے۔ اوّل الذکر اس بات سے انکاری تھا کہ انھوں نے (ابنِ اسحٰق نے) فاطمہ سے روایات سنی ہیں لیکن جو کچھ اس نے کہا ہے اس سے کسی شخص کی احادیث کے ضمن میں صداقت اور ثقاہت پر اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ الاسود اور علقمہ جیسے صحابہؓ نے حضرت عائشہؓ کی آواز سُنی تھی حالانکہ انھیں دیکھا نہیں تھا۔ بعینہٖ ابنِ اسحٰق فاطمہ سے روایات سُنا کرتے تھے اور پردہ درمیان میں لٹکتا رہتا تھا۔ جہاں تک مالک کا تعلق ہے سو جو کچھ اس نے کہا وہ لمحاتی اور وقتی تھا اور بعدازاں اس نے ابنِ اسحٰق سے انصاف کیا۔ حجاز میں ابنِ اسحٰق سے زیادہ کوئی شخص شجرہ ہائے نسب اور مغازی سے واقف نہیں تھا اور وہ کہا کرتے تھے کہ مالکؒ ابواصباح کا آزاد کردہ غلام ہے۔ جبکہ مالک کا موقف تھا کہ وہ قبیلے کا ایک پورا اور مکمل فرد تھا۔ پس دونوں میں ٹھن گئی تھی اور جب مالک نے مؤطا مرتب کی تو ابنِ اسحٰق نے کہا "یہ کتاب میرے پاس لاؤ کہ میں اس کا جرّاح ہوں"۔ یہ سُن کر مالک کا جواب تھا "وہ دجّال اور کذّاب ہے۔ وہ یہود کی سند کے حوالے سے احادیث روایت کرتا ہے"۔ جھگڑا جاری رہا تاآنکہ ابنِ اسحٰق نے عراق جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بعدازاں ان میں صلح ہو گئی اور مالک نے انھیں پچاس دینار اور اپنی کھجور کی فصل کا نصف بطور الوداعی تحفے کے نذر کیا۔ مالک انھیں بطور روایت نگار کے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں اسے جو بات ناپسند تھی وہ یہ کہ ابنِ اسحٰق ان یہود کا تتبع کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے نیز دُہ خیبر، قریظہ، النّضیر اور اسی قبیل کے دُوسرے غیر مصدقہ قصص و واقعات

ان کے آباؤ سے معلوم کر چکے تھے۔ اپنی "مغازی" میں ابن اسحٰق ان لوگوں سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان لوگوں کی روایات درست اور ثقہ ہیں۔ مالک خود قابلِ اعتماد اور ثقہ راویوں پر انحصار کرتا تھا۔
مصنف یہ رائے دے کر اپنی بات ختم کرتا ہے کہ مالک کے عربی النسل ہونے کے دعوے کو چیلنج کرنے میں پہل کرنے والا ابن اسحٰق نہیں تھا کیونکہ الزہری اور دیگر کئی راوی بھی یہی بات کہہ چکے تھے۔[۶۲]

ترجمہ

میں نے انگریزی محاورے کا خون کیے بغیر متن کے اصل کو جس حد تک ممکن ہوا، برقرار رکھا ہے۔ شاعری کا ترجمہ کرتے وقت میں نے اس کی رُوح کو قائم رکھا ہے اور منظوم ترجمے کی کہیں کوشش نہیں کی سوائے تُک بندی اور سجع کے۔ ان دو امور میں یہی مناسب معلوم ہوتا تھا کہ تُک بندی کو تُک بندی ہی کی شکل میں پیش کیا جائے اور کمزور قوافی کو ایسے کمزور قوافی ہی کی شکل میں پیش کیا جائے جو ان سے گئے گزرے ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کوشش میں متن کی صحت تو کسی حد تک متاثر ہوئی ہے لیکن عام مفہوم اور لہجہ زیادہ دیانت اور کامیابی سے منتقل ہوا ہے۔
کتاب بہت طویل ہے اور میں نے کہیں کہیں بغیر مفہوم خبط کیے بعض حصّے حذف کر دیے ہیں۔ مثلاً ابن ہشام کا بتکرار یہ عمومی بیان کہ "یہ شعر میری ایک "غزل" میں ملتا ہے"، میں نے اسے نکال دیا ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ وہ مصرعہ جو عام طور پر اس کے شواہد میں سے ایک ہے، وُہ اپنے سہارے پر تو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح میں نے براہِ راست گفتگو میں آنے والے مکالمات کو انگریزی قواعد کے مطابق بالواسطہ طرز پر مختصر کر دیا ہے سوائے اس کے کہ جب قائل کے اپنے الفاظ ہی کی ادائیگی لازمی تھی یا وہ لفظ بذاتہٖ اہم تھے۔ آخری بات یہ ہے کہ میں نے متعلقہ افراد کے پہلی دفعہ ذکر کرنے کے بعد شجرۂ نسب کے فارمولا کو حذف کر دیا ہے۔
میرے پیشرؤوں نے "سیرت" کے ترجمہ میں بہت سی ٹھوکریں کھائی ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ میں بھی کئی فروگزاشتوں سے بچ نہ سکا ہوں گا۔ وائل کے ترجمے کے بارے میں، جسے اب ترجمہ ہوئے قریباً ایک صدی ہو گئی ہے[۶۳] نولدیکہ کی رائے نگاہ میں رہنی چاہیے "جی وائل کا ترجمہ (۱۸۶۴، سٹٹگارٹ) ٹھس اور بیہودہ ہے اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے ناکافی و نامکمل۔ لیکن چونکہ یہ کتاب ("سیرت") نہایت اہم ہے اس لیے اس کے ایک نئے ترجمے کا جواز بنتا ہے"، جبکہ ولہاؤزن کے ترجمۂ الواقدی میں متن کی مشکلات کو خاموشی کے ساتھ نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ "سیرت" میں شامل شاعری جیسا کہ نولدیکہ نے بدر کی شاعری کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ ان کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے، اس کے متعدد مترادفات کے سبب، سوا ابوذر کی سرسری تشریح و تفسیر کسی صورت بھی مفید نہیں ہے۔[۶۴]

متن

میں نے صفحوں کے نمبر لگانے میں وسٹنفیلٹ کے ۱۸۵۸ - ۶۰ کے عمدہ اور مستند متن کا تتبع کیا ہے۔ لیکن وُہ متن

جس کی میں نے فی الاصل پیروی کی ہے وہ قاہرہ ایڈیشن ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۷ء ہے جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے چار جلدوں میں مرتب کیا ہے جس کے صفحے کے حاشیے میں ابوذر اور سُہیلی کے متعدد حواشی درج کیے گئے ہیں جنھیں وسٹنفیلٹ نے اپنے قابلِ قدر ایڈیشن کی دُوسری جلد میں منتقل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس سے استفادہ کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کی عمدہ اور جلی ٹائپ آنکھوں کو سکون بخشتی ہے۔ جب مجھے متون کے مختلفات کا حوالہ دینا پڑا ہے تو اسے سی (قاہرہ ایڈیشن) اور ڈبلیو (وسٹنفیلٹ) کی مختصر شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مدیر ابنِ ہشام

عبدالملک بن ہشام بصرہ میں پیدا ہوئے۔ بمقام فسطاط (مصر) ۲۱۸ یا ۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔ البتہ کرنکو کا خیال ہے کہ اُن کی وفات کچھ سال بعد ہوئی ہوگی۔[۶۵] زیرِ نظر کتاب کی تدوین کے علاوہ اُنھوں نے اپنی "کتاب التیجان" کے لیے ابنِ اسحٰق کے علم سے استفادہ کیا، جو وہب بن مُنبّہ سے ماخوذ ہے۔ وہ اصول جن کے تحت اُنھوں نے اپنے پیشرو کی کتاب سے بے تکلفی برتی ہے، ان کا خاکہ اُنھوں نے اپنے ابتدائیے میں دیا ہے، سو ان کے یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں وہ بطور ماہرِ لسانیات کے کسی قدر مشہور رہتے اور اپنی "شواہد" میں غیر معمولی الفاظ کے معانی کی وضاحت کر کے وُہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے قابل ہو گئے تھے۔ اپنے متن سے الگ یہ سطورِ "سیرت" کے سلسلے کی شدید مشکلات میں سے چند ایک ہیں اور اب واقعتاً بہت حد تک غیر ضروری ہیں کیونکہ عربوں نے اپنی زبان کے لغت اور قاموس تیار کر لیے ہیں۔ بعض اوقات وہ نسبی تفصیلات فراہم کر کے ہمارے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن شاذ ہی ان کے پاس ابنِ اسحٰق کی کتاب میں شامل کسی سطر کی مفید وضاحت کے لیے کچھ کہنے کو ہوتا ہے۔

سُہیلی کے یہاں ہمیں بعض ایسی احادیث بھی ملتی ہیں جنھیں یا تو ابنِ ہشام نے حذف کر دیا یا وُہ اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، جن کی تفصیل یُوں ہے:

واقدی ۱۸۳ = سہیلی ۱۸۳،

واقدی ۳۲۷ = سہیلی جلد دوم ص ۲ و بعد

وہ ابنِ ہشام کی یادداشتوں میں موجود ایک غلطی کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غلطی یا اُن کی ہے یا البکائی کی، کیونکہ یونس کے یہاں متن صحیح ملتا ہے۔ امکان یہی ہے کہ غلطی ابن ہشام ہی کی تھی کیونکہ ان کی یونس کے ساتھ باقاعدہ میل ملاقات بھی جیسا کہ اُنھوں نے صفحہ ۳۰۸ پر اعتراف کیا ہے فیما بلغنی یُونُس۔

ان کی ایک اور غلطی ان کا یہ بیان ہے جس کی رُو سے ابنِ اسحٰق نے عمرو بن اُمیہ کی اس مہم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جسے رسولِ اکرمؐ نے ابوسفیان بن حرب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا اور یہ کہ کس طرح اُس نے خُبَیب کی لاش صلیب سے اتاری جسے باندھ دیا گیا تھا (صفحہ ۹۹۳)۔ طبری ابنِ اسحٰق کے بیان کردہ اس واقعے کو ضبطِ تحریر میں لایا ہے جو ابنِ ہشام کے

بیان کردہ اُلجھے ہُوئے واقعے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یُوں لگتا ہے کہ ابنِ ہشام نے ایک ایسا واقعہ ترتیب دیا ہے جس کے منابع ایک سے زیادہ ہیں اور بڑے نا ملائم طریقے سے واحد متکلم سے واحد غائب پر آجاتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق عمرو نے صلیب کو (ظاہر ہے کہ لاش ابھی اس پر ٹنگی ہوئی تھی) ایک گہری گھاٹی میں اٹھا پھینکا۔ صلیب (خَشَبہ)[۶۶] (ایک درخت کا موٹا تنا، جس پر ایک شخص کا جسم رکھا یا لٹکایا جا سکتا ہے) کو کوئی شخص سوائے چند گز کے، مشکل ہی آگے لے جا سکتا تھا جبکہ محافظ بھی ساتھ ہی کھڑے ہوں، چنانچہ اس باب میں ابنِ اسحٰق کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے "عمرو نے درخت سے لاش الگ کی اور تقریباً چالیس قدم چلا (کتنی واضح تفصیل ہے!) محافظوں کو اپنا پیچھا کرتے سُنا، ایک جھٹکے کے ساتھ لاش کو گرایا اور جتنی سُرعت سے بھاگ سکتا تھا بھاگ کھڑا ہوا"۔

سُہیلی جلد دوم صفحہ ۱۴۶ میں ایک دلچسپ نوٹ موجود ہے جس کے مطابق ابنِ ہشام کی اس غلط بیانی کا ابتدائی دَور ہی میں احساس کر لیا گیا تھا۔ وہ مزید یہ کہتا ہے کہ ابنِ ابو شیبہ کی مسند میں شامل قصّے میں ایک دلچسپ اضافہ موجود ہے اور وہ یہ کہ جب اُنھوں نے اسے درخت کے تنے سے کھول کر الگ کیا تو زمین اسے نگل گئی۔ ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابنِ ہشام کا بیان کردہ قصہ تو حقایق اصلیہ اور اس ناقابلِ یقین افسانے کے بین بین ہے۔ بدقسمت آدمی کی لاش جسے عمرو نے حاصل کرنے کی بہادرانہ کوشش کی تھی، اسے زمین پر پڑے بھونڈے پن سے پھینک دیا گیا۔ اگلا قدم، اس لاش کو وادی کی دیوار میں پیدا ہونے والی ایک فطری قبر میں تدفین کے رنگ میں پیش کرنا تھا۔ آخری مرحلہ ایک معجزے کے ذریعے مناسب تدفین کا مہیا کیا جانا تھا۔[۶۷]

اب جس بات کی وضاحت باقی رہ جاتی ہے یہ ہے کہ ابنِ ہشام نے ایسا دعویٰ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی کہ ابنِ اسحٰق نے ابُوسفیان کے قتل اور خُبَیب کی لاش کے حصول ——— دونوں ناکام کوششوں کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ اگر ابنِ اسحٰق نے ان دونوں میں سے ایک واقعہ بھی بیان نہیں کیا تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ ابنِ ہشام ان دونوں واقعات کا ذکر کریں؟ چونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابنِ اسحٰق نے ان روایات کے حوالے سے، جو عمرو کے اپنے خاندان کے ناتے بیان کی گئی تھیں اور جو بعد کی صدیوں میں بھی زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں موجود تھیں، صورتِ واقعہ کی وضاحت کی تھی اس لیے ہم یہ شک کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابنِ ہشام نے ثبوت و شہادت میں مداخلت کی ہے۔

شاید ابنِ ہشام کی سب سے بڑی خدمت "سیرت" میں شامل شاعری کے مستند یا غیر مستند ہونے کے بارے میں تنقیدی تجزیہ ہے، اور یہ تجزیہ صرف اسی صورت میں نہیں جب وہ یہ بات ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں کہ تمام یا کچھ اسناد بعض نظموں کو کُلّہم مسترد کر دیتی ہیں بلکہ اس صورت میں بھی جب وہ ابنِ اسحٰق کے بیان کی تصحیح کرتے ہیں اور اشعار کے اصل خالقوں کی نشان دہی کرتے ہیں[۶۸]۔ سیوطی ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتا تھا۔ اس کی روایت ہے کہ ابوذر نے کہا تھا کہ ابنِ ہشام نے چار میں سے ایک ایسا عظیم ملخّص فراہم کر دیا جو اپنے منابع سے کہیں بہتر ہے۔[۶۹] سُہیلی بیان کرتا ہے کہ اس نے ایک کتاب لکھی جس میں "سیرت" میں شامل شاعری کے مشکل لغات کی تشریح

درج کی۔ سُہیلی کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب اس نے خود نہیں دیکھی تھی۔ اگر یہ فراہم ہوسکتی تو اس سے ہم پر آسانی سے واضح ہوجاتا کہ ابنِ ہشام کی معاصر نسل کا ان نظموں کے بارے میں فی الاصل کیا موقف تھا۔

موسیٰ بن عُقبہ کی گُم شدہ کتاب کا کچھ حصہ

یہ حصہ ان بیس اقتباسات پر مشتمل ہے جو مع اپنی اسناد کے مکمل ہیں۔ ان میں سے بعض اقتباسات تو بعض مواقع پر حضورِ اکرمؐ کے ارشادات ہیں اور بعض ان کی زندگی کے واقعات وقصص۔ ان اقتباسات کا جامع واضح طور پر اس بات پر زور دیتا ہے کہ اصل کتاب تو دس حصّوں پر مشتمل تھی۔ پس یہ نتیجہ کہ کتاب میں کبھی "سیرت" بہ تمام وکمال موجود تھی مبنی برانصاف لگتا ہے۔ آخری شق جعلی لگتی ہے[۱]، کیونکہ اس میں موسیٰ (متوفی ۱۴۱ھ) کی جانب سے خلاصہ نویس ابوہریرہ بن محمد بن النقاش (متوفی ۷۸۲ھ) کے لیے ایک اجازت درج ہے۔

۱۔ شہاب نے سالم بن عبداللہ سے اور سالم بن عبداللہ نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کو فرماتے سُنا "جب میں نیند میں تھا، میں نے خواب دیکھا کہ میں کعبہ کا طواف کر رہا ہوں، میں نے دو آدمی دیکھے جن میں سے ایک کھڑے سیدھے بالوں والا تھا اور اس کے سر سے پانی نچڑ رہا تھا، جب میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ تو جواب ملا "عیسیٰ ابنِ مریم"۔ میں وہاں سے لوٹا تو میں نے ایک سُرخ آدمی دیکھا جس کے سر پر گھنے گھنگھریالے بال تھے، وہ کانا تھا، اُس کی آنکھ کچھ اس طرح تھی جس طرح (پانی میں) انگور تیر رہا ہو۔ میں نے استفسار کیا کہ وہ کون ہے؟ جواب ملا: "دجّال"۔ اس سے بعید مماثلت رکھنے والا شخص ابنِ قطن الخزاعی ہے[۱]۔

یہ حدیث البخاری (جلد دوم صفحہ ۳۶۸ سطر ۱۹ سے صفحہ ۳۶۹، سطر ۴) میں بھی انہی سے ملتے جلتے لفظوں میں آئی ہے۔ اس کا ابنِ اسحٰق ص ۲۶۹ سے بھی تقابل کرنا چاہیے۔ یہ الزہری سے بھی مروی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ حضورِ اکرمؐ نے عیسیٰؑ کو معراج کے دوران دیکھا ——— اس حالت میں کہ عیسیٰؑ کے چہرے پر تل یا مہاسے تھے جو یوں لگ رہے تھے جیسے پانی کے قطرے۔ یہاں جو "دو آدمیوں" کا حوالہ آیا ہے تو یہ غالباً دو مصلوب چوروں کی طرف اشارا ہے۔

۲۔ ابنِ شہاب: مسلمانوں کے لیے مدینہ میں جُمعہ کی نماز کا اہتمام کرنے والا پہلا شخص مصعب بن عُمیر تھا۔ ابن شہاب سے ہمیں ایک اور حدیث کا پتا چلتا ہے جو سراقہ سے مروی ہے اور اس واقعہ سے مختلف ہے۔

پہلا بیان ابنِ سعد (جلد سوم، حصّہ اوّل، صفحہ ۸۳، سطر ۲۵) سے متفق ہے اور دوسرا بظاہر ابنِ اسحٰق صفحہ ۲۹۰ سطر ۵ اور ابنِ سعد جلد سوم حصّہ اول صفحہ ۸۴ سے۔

۳۔ عبدالرحمٰن بن مالک بن جُعشم المدلجی جس نے درج ذیل روایت اپنے والد سراقہ بن جُعشم سے سنی[۲]: جب حضورِ اکرمؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کی تو قریش نے سَو اونٹوں کا انعام مقرر کیا اس شخص کے لیے جو انھیں واپس

لے آئے" سے الیٰ انتہا "میرا صدقہ رسولؐ کے لیے"۔

یہ اقتباس لازمی طور پر وہی ہے جو ابنِ اسحٰق کے یہاں صفحہ ۴۳۱ - ۴۳۲ پر پایا جاتا ہے اگرچہ ان میں کئی لفظی اختلافات بھی ہیں یہ امر واضح ہے کہ ابنِ اسحٰق کے بیان کو نکھارا گیا ہے اور موسیٰ روایت کو اس کی سادہ ترین شکل میں بیان کرتا ہے۔ مزید دیکھیے بخاری جلد سوم صفحہ ۳۹ - ۴۱ - ۴۰ - اور واقدی (ولہاؤزن صفحہ ۳۷۴)

۴ - ابنِ شہاب کا بیان ہے کہ عروہ بن الزبیر نے کہا کہ الزّبیر نے حضورِ اکرمؐ سے اس وقت ملاقات کی جب وہ مسلمانوں کے ایک کارواں کے ساتھ تجارت کرنے کے بعد شام سے پلٹ رہے تھے۔ اُنھوں نے رسولِ اکرمؐ کے ساتھ بعض اشیاء کا تبادلہ کیا اور الزبیر نے حضورِ اکرمؐ اور حضرتِ ابوبکرؓ کو کچھ سفید ملبوسات دیے۔

بخاری میں بھی یہی بیان ہے، دیکھیے جلد سوم صفحہ ۴۰ - ابنِ سعد کے یہاں نام مختلف ہیں، دیکھیے ابنِ سعد جلد سوم حصہ اوّل صفحہ ۱۵۲، سطر ۱۹ -

۵ - نافع بروایت عبداللہ بن عمر: بعض صحابہؓ نے رسولِ اکرمؐ سے پُوچھا: "کیا آپ مُردوں سے خطاب فرما رہے ہیں؟" اُنھوں نے فرمایا: "جو کچھ میں کہتا ہُوں تم مُردوں سے بہتر نہیں سُن سکتے۔"

بخاری میں بھی یہی بیان ہے، بخاری جلد سوم صفحہ ۷، سطر ۱۰، ۱۱ - اور مزید دیکھیے ابنِ اسحٰق صفحات ۴۵۳ و بعد، جہاں حضرت عائشہؓ کے یہ الفاظ اس امر کی تردید میں ملتے ہیں کہ مُردے سُنتے ہیں - وُہ جانتے ہیں لیکن وہ سُنتے نہیں۔

۶ - ابنِ شہاب بروایت انس بن مالک: بعض انصار نے حضورِ اکرمؐ سے التجا کی کہ وُہ اُن کے بھانجے عباس کا زرِ فدیہ معاف فرما دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بخدا اسے ایک پائی بھی معاف نہیں کی جائے گی۔

نیز بخاری جلد سوم صفحہ ۶۹، سطر ۱، ۲ و مزید طبری صفحہ ۱۳۴۱، ابنِ قتیبہ کی کتاب "معارف" صفحہ ۷۷۔ زخاؤ کو انصار اور عباس کے درمیان موجود رشتے پر تعجب ہُوا ہے اور وُہ بھول گیا کہ عباس کی دادی سلمٰی بنت عمرو الخزرجی تھی۔ مزید دیکھیے بخاری جلد دوم صفحہ ۲۰۸ سطر ۱۸ و بعد۔

۷ - ابنِ شہاب بروایت عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک السّلمی معہ دیگر روایت کنندگان: عامر بن مالک بن جعفر جو نیزہ بازی کا استاد مانا جاتا تھا حضورؐ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہُوا جب وہ مشرک تھا۔ حضورِ اکرمؐ نے اسے اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا مگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے حضورِ اکرمؐ کو ایک تحفہ دیا۔ لیکن آپؐ نے یہ کہہ کر تحفہ لینے سے انکار کر دیا کہ وہ کسی مشرک سے تحفہ قبول نہیں کر سکتے۔ عامر نے کہا: "اے نبیؐ! میرے ساتھ اپنے جو نمائندے بھیجنا چاہو بھیج دو، ان کی حفاظت میرے ذمے ہو گی۔" سو حضورِ اکرمؐ نے مبلّغین کی ایک جماعت روانہ فرمائی جس میں المنذر بن العمرو السعیدی بھی تھا جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ قبیلۂ نجد میں جاسوسی کرتے ہوئے جلد ہی موت سے ہمکنار ہو گیا۔ جب عامر بن طفیل نے اس جماعت (کی آمد) کے متعلق سنا تو اس نے بنی عامر سے کہا کہ وہ اس جماعت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن اُنھوں نے عامر بن مالک کے وعدے کا پاس کرتے ہوئے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے

بنی سُلَیم سے درخواست کی۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیے اور انھوں نے بئرِ معونہ کے مقام پر انھیں شہید کر دیا سوائے عمرو بن امیہ الضمری کے جسے عامر بن طفیل نے گرفتار کر لیا اور بعد ازاں رہا کر دیا۔ جب وہ بچ بچا کر حضورِ اکرمؐ کے پاس پہنچا تو آپؐ نے فرمایا: "کیا تم اکیلے ہی بچے ہو؟"

یہ ابنِ ہشام کے یہاں دیے جانے والے بیان (ص ۶۴۸ و بعد نیز مزید دیکھیے طبری ص ۱۴۴۲ و بعد نیز واقدی (وِلہاوزن ص ۳۲۷) کے مقابلے میں بہت مختصر بیان ہے۔

۸۔ اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہ بروایت سالم بن عبد اللہ بروایت عبد اللہ بن عمر: بعض صحابہؓ حضرتِ اسامہؓ کی قیادت کے باب میں اُلجھ رہے تھے۔ حضورِ اکرمؐ اُٹھے اور فرمایا: "اگر تم اسامہ کے باب میں اُلجھ رہے ہو تو اسی طرح تم ان کے باپ کی قیادت کے باب میں اُلجھا کرتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ وہ قائد و سالار کے طور پر بہت موزوں تھا۔ وہ میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ایک تھا اور یہ شخص (اس کا بیٹا) اُس کے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ پس اس سے اچھا سلوک کرنا جب میں اس دنیا میں نہ رہوں کیونکہ یہ تم سب میں سے اچھا ہے۔"

مزید دیکھیے بخاری جلد دوم صفحہ ۴۴۰، جلد سوم صفحہ ۱۳۳، ۱۹۲، نیز ابنِ ہشام صفحہ ۹۹۹ سطر ۱۴، صفحہ ۱۰۰۶ سطر ۲۰ و بعد۔

۹۔ سالم بن عبد اللہ بروایت عبد اللہ بن عمر: حضورِ اکرمؐ حضرتِ فاطمہؓ کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا کرتے تھے۔ زخاؤ نے اس کی وضاحت بخاری جلد دوم صفحہ ۱۴۴ اور جلد سوم صفحہ ۱۴۵ سے کی ہے جہاں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "اگر فاطمہؓ (بنت محمدؐ) بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا۔"

۱۰۔ عبد اللہ بن فضل بروایت انس بن مالک: میں اپنے قبیلے کے ان لوگوں کا ماتم کر رہا تھا جو جنگِ حرہ میں مارے گئے تھے۔ تب زید بن ارقم (متوفی ۶۸ھ) نے مجھے شدید طور پر مغموم و ملول محسوس کرتے ہوئے خط لکھا اور حضورِ اکرمؐ کے حوالے سے لکھا کہ اس نے حضورؐ کو یہ کہتے سُنا تھا: "خدایا! انصار کو معاف کر دینا اور ان کے بیٹوں کو، اور میں رحمت کی درخواست کرتا ہوں ـــ اُن کے پوتوں کے لیے۔"

اسی سے مماثل ابنِ ہشام کی "سیرت" میں بیان صفحہ ۸۸۶، باب ۱۲ اور واقدی صفحہ ۳۸۰۔

۱۱۔ عبد اللہ بن الفضل: کچھ لوگ انسؓ کے ساتھ تھے اور انھوں نے اس سے زید بن ارقم کے بارے میں رائے طلب کی۔ اس نے کہا وہی تو ہے جس کے بارے میں رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "وہی تو ہے جس پر اللہ نے کان کے رستے بہت سی رحمتیں نازل کی ہیں۔"

وہ مخبر تھا: مزید دیکھیے: ابنِ ہشام صفحہ ۷۲۶، اوفی اللہ لہٗ باُذُنِہ کی جگہ ابنِ ہشام کے یہاں (صفحہ ۷۲۷، سطر ۱۷) اوفا بنا اللہ باُذُنِہ ملتا ہے۔ زیادہ اغلب یہ ہے کہ اختلاف غلط خوانی کے باعث ہے نہ کہ زبانی روایت کی وجہ سے: واقدی (برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر ۱۶۱۷ الیف، ۹۵ ا ے) وَافَتْ اُذُنُكَ وَصَدَّقَ اللّٰهُ حَدِيثَكَ۔

۱۲۔ شہاب بروایت سعید بن المسیب بروایت عبداللہ بن کعب بن مالکؓ: "رسولِ اکرمؐ نے اُس دن بلال سے کہا" : اُٹھو اور اعلان کردو کہ صاحبِ ایمان ہی جنّت میں جائے گا اور یہ کہ خدا اپنے دین کی نصرت کسی بُرے شخص کے ذریعے نہ کرے گا"۔
یہ واقعہ اُس وقت ہُوا جب حضورِ اکرمؐ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو اہلِ جہنّم میں سے تھا۔

۱۳۔ نافع بن عبداللہ بن عمر سے روایت ہے : فتحِ خیبر کے بعد یہودنے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ انھیں اس شرط پر وہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے کہ وُہ وہاں کھیتی باڑی کریں گے اور کھجور کی آدھی فصل ان کا حصّہ ہوگی رسول اللہؐ نے فرمایا :

"ہم تمھیں اس بات کی اجازت اس وقت تک دیں گے جب تک ہماری مرضی ہوگی"۔

اور وُہ وہاں رہے تا آنکہ حضرتِ عمرؓ نے انھیں وہاں سے نکال دیا (یہاں چھ یا سات لفظ غائب ہیں) ۔ یہ فرماتے ہوئے حضورِ اکرمؐ نے اپنی آخری علالت میں تین باتوں پر زور دیا : رہاویوں ، داریوں ، سبائیوں اور اشعریوں کو ایسی زمین ملنی چاہیے جہاں سے سو بار رشتر فصل اُٹھ سکے، یہ کہ اسامہ بن زیدؓ کے مشن کو جاری رہنا چاہیے اور یہ کہ جزیرہ نمائے عرب میں دو مختلف مذاہب کو باقی نہیں رہنے دینا چاہیے"۔

عملاً ابنِ ہشام کے یہاں بھی (صفحہ ۷۷۶) یہی الفاظ آئے ہیں سوائے اس کے کہ سبائیوں کا ذکر نہیں آیا۔

۱۴۔ مندرجہ بالا شق کے سلسلے کی اسناد : حضرتِ عمرؓ، یہود ، عیسائیوں اور مجوسیوں کو مدینے میں اپنا کاروبار کرنے کے لیے تین دن سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ کہا کرتے تھے "دو مذاہب اکٹھے نہیں رہ سکتے"۔
اور اُنھوں نے یہود و نصارٰی کو جزیرہ نمائے عرب سے نکال دیا۔

۱۵۔ ابنِ شہاب بروایت عروہ بن الزبیر بروایت مروان بن الحکم اور المسوَر بن مخرمہ : جب رسول اکرمؐ نے لوگوں کو ہوازن کے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت مرحمت کی تو انھوں نے فرمایا : مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے تمھیں اجازت دی ہے یا نہیں دی۔ پس واپس چلے جاؤ تا آنکہ تمھارے قائد تمھارے معاملات کے باب میں ہمیں رپورٹ مہیّا کریں۔ وہ لوگ پلٹ گئے اور ان کے قائدین نے ان کی تربیت کی اور وہ رسول اللہؐ کی جانب واپس آ گئے اور انھیں بتایا کہ ان کے صحابہ نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اور انھیں ان کے قیدی ساتھیوں کی بازیافت کی اجازت دے دی تھی۔

حوالے کے لیے دیکھیے، ابنِ ہشام صفحہ ۸۷۷

۱۶۔ ابنِ شہاب بروایت سعید بن المسیّب اور عُروہ بن الزبیر : ہوازن کے قیدیوں کو جنھیں حضورِ اکرمؐ نے آزاد کر دیا تھا تعداد میں چھ ہزار تھے جن میں مرد، عورتیں اور بچّے شامل تھے۔ حضورؐ نے بعض بے سہارا عورتیں قبیلہ قریش کے بعض افراد کی تحویل میں دے دیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوف اور صفوان بن اُمیہ شامل تھے جنھیں دو عورتوں کو جو اب لونڈیوں کی حیثیت سے تھیں، رہنے یا چلے جانے کا اختیار دے دیا تھا اور اُنھوں نے (عورتوں نے) اپنے قبیلے کو رجوع کرنے کو ترجیح دی۔

مزید دیکھیے : واقدی (ولہاؤزن) صفحہ ۴۰۵

۱۷۔ اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہ اپنے چچا موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتے ہیں جو ابنِ شہاب سے روایت کرتے ہیں: حضورِ اکرمؐ نے ۱۰ھ میں حجۃ الوداع ادا کیا۔ اُنھوں نے لوگوں کو مناسک بتائے اور میدانِ عرفات میں اپنے اُونٹ الجُدعا پر بیٹھ کر انھیں خطاب کیا۔

مزید دیکھیے ابنِ ہشام صفحہ ۹۶۸ اور واقدی صفحہ ۴۳۰

۱۸۔ ابنِ شہاب بروایت عروہ بن الزبیر بروایت المسوَر بن مخرمہ بروایت عمرو بن عوف جو بنی عامر بن لُوَیّ کا اتحادی تھا جو بدر میں حضورِ اکرمؐ کے ساتھ تھا ؛ حضورِ اکرمؐ نے ابوعبیدہ بن الجرّاح کو یکساں محصول لانے کے لیے بھیجا۔ اُنھوں نے بحرین کے لوگوں سے صلح کرلی تھی اور ان پر العلاء بن الحضرمی کو مقرر کیا تھا۔ جب ابوعبیدہ بحرین سے مذکورہ رقم لے کر لوٹے، انصار نے ان کے آنے کی خبر سُنی اور اُن (ابوعبیدہ) کے آنے کا وقت وہی تھا جو حضورؐ کی نمازِ فجر کا وقت تھا۔ جب اُنھوں نے (انصار نے) حضورِ اکرمؐ کو دیکھا تو وُہ اُن کے رستے میں رُک گئے۔ حضورؐ نے اُنھیں دیکھ کر تبسّم فرمایا اور کہا: "میرا خیال ہے کہ تم نے ابوعبیدہ کی واپسی کی خبر سُن لی ہے اور یہ بھی کہ وُہ کچھ رقم بھی اپنے ساتھ لایا ہے۔" جب اُنھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو آپؐ نے مزید فرمایا: خوش رہو اور اس شے کی اُمید رکھو جو تمھارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔ بخدا مجھے تمھارے باب میں مفلسی کا خوف نہیں۔ مجھے خوف اس بات کا ہے کہ تمھیں اس قدر آسائشات مل جائیں گی کہ تم اپنے سے پہلے کے لوگوں کی طرح گمراہ ہو جاؤ گے۔"

اسی سے مماثل روایت کے لیے دیکھیے بخاری جلد سوم صفحہ ۶۸، سطر ۱۸ و بعد۔

۱۹۔ سعد بن ابراہیم بروایت ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف: ایک دن عبدالرحمٰن بن عوف حضرتِ عمرؓ کی معیت میں تھے اور اُنھوں نے (عبدالرحمٰن بن عوف نے) الزبیر کی تلوار توڑ ڈالی، لیکن اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تلوار کس نے توڑی۔ تب حضرتِ ابوبکرؓ اُٹھے اور لوگوں سے اپنے باب میں معذرت کرتے ہُوئے خطاب کیا" میں ایک لمحے کے لیے بھی امارت کا خواہاں نہیں تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اس کے لیے ظہور و خفا میں دعا کی یا اس کی خواہش کی۔ لیکن میں انتشار سے ڈرتا تھا۔ امارت ملنے میں کوئی سُرور نہیں۔ مجھے ایک ایسی اہم ذمہ داری سونپ دی گئی ہے جس کے لیے مجھ میں قوّت نہیں۔ میں اس ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہُوں کہ خدا مجھے قوّت اور حوصلہ دے۔ میری خواہش ہے کہ کاش کوئی ایسا شخص جس میں اس سے عُہدہ برآ ہونے کی زیادہ صلاحیت ہے، میری جگہ ہوتا۔ مہاجرین نے ان کے طرز کو قبول کیا اور حضرتِ علیؓ اور زبیر بن العوام نے کہا" ہم تو صرف اس بات پر برہم تھے کہ ہمیں شوریٰ میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب جبکہ حضورِ اکرمؐ کا وصال ہو گیا ہے، حضرتِ ابوبکرؓ امارتِ عظمیٰ کے موزوں ترین حقدار ہیں۔ وہ ان کے یارِ غار تھے اور ہم ان کی عظمت اور برتری کو تسلیم کرتے ہیں اور حضورِ اکرمؐ نے انھیں اس وقت امامت کی ذمہ داری سونپی جب ابھی وہ ہمارے درمیان تھے۔

یہاں اس مختصر انتخاب میں نہایت مجمل تبصرہ بے جا نہ ہوگا۔ شق نمبر ۱۲ واضح طور پر مسلم کے مستقبل کے بارے میں پریشان کن سوال سے متعلق ہے جبکہ شق نمبر ۱۸ بعد از واقعہ "پیش گوئی" سے متعلق ہے۔ لامحالہ یہ شقیں قاری کے ذہن میں شکوک پیدا کرتی ہیں۔

اس انتخاب میں سے بحیثیت مجموعی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جامع (ابن ہشام) کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں، یعنی یہ کہ حضور اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ الزبیر کی محبت شق نمبر ۴ سے ظاہر ہے۔ شق نمبر ۹ میں شیعانِ علیؓ کے خصوصی سوچ بچار کے متقاضی دعووں کو نپٹایا گیا ہے، جبکہ شق نمبر ۱۹ بیان کرتی ہے کہ حضرت علیؓ علی الاعلان حضرت ابوبکرؓ کو حضور اکرمؐ کا جانشین تسلیم کرتے تھے۔ شق نمبر ۶ سے ظاہر ہے کہ عباس کو زرِ فدیہ ادا کرنا پڑا اس کے باوجود کہ انصار نے اس کی معافی کی درخواست کی تھی۔ شق نمبر ۱۰ الحرّہ کے میدان میں اُمویوں کے ہاتھوں کام آنے والوں کے ماتم سے متعلق ہے اور اس میں حضور اکرمؐ کی ان شہداء اور ان کے پوتوں کے لیے مغفرت کی دُعا مندرج ہے۔

موسیٰ کی ہمدردیاں واضح طور پر خاندانِ انصار اور الزبیر کے ساتھ تھیں، صرف یہی لائق اعتماد نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس شیعانِ علیؓ کی حیثیت ثانوی نظر آتی ہے۔ بین السطور میں اُمویوں کے ہاتھوں الحرّہ کے مقام پر ہونے والے سلب و قتل کی مذمت کی گئی ہے اور عباس کو رسولِ اکرمؐ کے ایک باغی کے طور پر پیش کیا گیا ہے جسے حضورؐ کی مخالفت کی وجہ سے ایک ایک پائی ادا کرنے کا پابند کیا گیا۔

موسیٰ بن عقبہ نے انصار اور العباس کے باب میں کم و بیش وہی باتیں کہی ہیں جیسی کہ ابنِ اسحٰق نے کہیں تا آنکہ ان کی سیرت کے مدبر و مدوّن ابنِ ہشام نے ان کی کتاب کی تہذیب و تنقیح کی، اگرچہ انھوں نے شیعانِ علیؓ کے باب میں ایک مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا۔[۲۷]

حواشی

۱ - دیکھیے حاجی خلیفہ جلد دوم ص ۱۰۰۸

۲ - ای۔ زخاؤ (سخاؤ) : ابنِ سعد (طبقات) جلد سوم، باب ۲۳ و بعد

۳ - جے۔ فک : محمد ابنِ اسحٰق ص ۸، نوٹ ۲۷، مزید دیکھیے، جے ہورووز (اسلامک کلچر ۱۹۲۷) ص ۵۳۸

۴ - ابنِ سعد، طبری اور بخاری ان سے بے حد مستفید ہوئے ہیں۔

۵ - فشر: اسانید ص ۴۶

۶ - ہورووز: اسلامک کلچر ص ۲۵۱

۷ - ابنِ حجر: تہذیب التہذیب (۱۰) ص ۳۶۱

۸ - لی موند اوریینتال، شمارہ ۲۸، ۱۹۳۴ء، ص ۱۷ - ۵۸

۹ - دیکھیے جے۔ فک کی کتاب ص ۱۱

۱۰ - رسالے کا نام

۱۱ - اُس جگہ دیکھیے جہاں ان میں سے بعض کی ثقاہت پر کچھ شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔

۱۲ - گولڈزیہر: MOHAMMADANISCHE STUDIEN، جلد دوم ص ۲۰۷ سے پتا چلتا ہے کہ یہ بات نویں صدی ہجری تک اسی طرح گردش میں تھی۔

۱۳ - آگے دیکھیے۔

۱۴ - طبقات جلد سوم، باب دوم، ص ۵۱، سطور ۱۷ - ۱۹

۱۵ - ترجمہ و تدوین از کلیمان ہوآر: PUBLICATIONS DE L' ECOLE DES LANGES ORIENTALES VIVANTESTIVI جلد ۱۶، ۱ - ۲، پیرس ۱۸۹۹ - ۱۹۱۹

۱۶ - ان مشمولات کے خلاصے کے لیے دیکھیے: طبری جلد اوّل

۱۷ - دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

۱۸ - دیکھیے ص ۲۰

۱۹ - حیدر آباد دکن ۱۳۴۲ھ

۲۰ - گیوم کے نزدیک بڑے یا عظیم کا تصور وہی مادی تصور ہے جو مستشرقین سے خاص ہے۔ حضور اکرمؐ کا جس "بڑے"

خاندان سے تعلق تھا۔ وہ مادی حوالے سے نہیں بلکہ اپنی بلند نسبی، شرافت، وعدہ ایفائی اور دیگر اعلیٰ انسانی اقدار کے ناتے سے بڑا تھا۔ (مترجم)

۲۱۔ کاش مستشرقین میں "مادیات" سے ماورا دیکھنے کی صلاحیت بھی ہوتی۔ یورپ میں اب معجزات کے اعتراف کی جگہ مضحکہ خیز توہمات کی تقدیس و تجلیل نے لے لی ہے۔ (مترجم)

۲۲۔ صفحہ ۱۸۲ نیز دیکھیے صفحہ ۱۸۰، ۲۳۰ و مواضع کثیرہ

۲۳۔ دیکھیے صفحہ ۲۸۱، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۰۸

۲۴۔ دیکھیے صفحہ ۲۲۲، ۲۳۵ و مواضع کثیرہ۔ حضور اکرمؐ کی ولادتِ باسعادت کے وقت بے پناہ روشنیوں کے ظہور کے سلسلے کے قصص کا بیان بڑے محتاط انداز اور انتباہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۱۰۲

۲۵۔ منام

۲۶۔ یہ عیسوی روایت ہے۔ قرآنِ حکیم میں حضرتِ اسماعیلؑ کی قربانی کا ذکر آیا ہے، حضرتِ اسحٰق کی قربانی کا نہیں۔ (مترجم)

۲۷۔ دیکھیے آسن پیلیچو اُلس کی کتاب: اسلام اینڈ دی ڈوائن کامیڈی، ۱۹۱۹

۲۸۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ یہاں ابنِ ہشام نے متن میں مداخلت کی ہو؟

۲۹۔ صفحہ ۴۰، ۴۴، ۳۴۴

۳۰۔ صفحہ ۲۲۴ - ۲۲۹

۳۱۔ نولدیکہ نے "اسلام" (ایڈیشن ۱۹۱۴) میں "سیرت" کے کئی واقعات و خصوصیات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جنھیں گھڑنا ممکن ہی نہ تھا اور جو حقائق کے گہرے علم کی وضاحت کرتے ہیں۔

۳۲۔ نیز دیکھیے صفحہ ۹۵۰ - ۹۵۱، مزید دیکھیے طبری میں مماثل اقتباسات، صفحہ ۱۶۳۲، ۱۶۳۵

۳۳۔ مزید دیکھیے طبقاتِ ابنِ سعد جلد سوم صفحہ ۲۴۱

۳۴۔ سورۃ ۵۳: ۵۱

۳۵۔ سورۃ ۶۹: ۸

۳۶۔ سورۃ ۱۴: ۹

۳۷۔ بحوالۂ سابقہ دیکھیے ہوروز صفحات ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۲

۳۸۔ الفہرست، قاہرہ صفحہ ۱۳۶

۳۹۔ صفحہ ۱۰۸

۴۰۔ اگر الجُمحی پر یقین کر لیا جائے تو پھر ان کا (ابنِ اسحٰق کا) رویہ کچھ ایسا ہی تھا۔

۴۱۔ میں اس حد تک تو شاید ہی جا سکوں کہ یہ دعویٰ کر دوں کہ پانچویں صدی کے عمرو بن قمیہ نے "سیرت" میں مشمولہ

شاعری پر براہِ راست اثر ڈالا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ان میں مماثلت خاصی ہے۔ عربی شاعری کے موضوعات کے تسلسل کے ساتھ دُہرائے جانے کی ناگزیر روایت موجود ہے۔ نسلاً بعد نسلٍ بدوی زندگی بہت کم مختلف رہی۔ صحراؤں نے ان کے افق کا احاطہ کر رکھا تھا اور نتیجۃً اونٹ اور گھوڑے، جنگ اور اس کا اسلحہ، فیاضی اور قبائلی تفاخر ان کے گیتوں کا مستقل موضوع تھے۔ ان موضوعات کے اولیں گانے والوں کا سراغ لگانا باعثِ تضییعِ اوقات ہو گا۔

لیکن پھر بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ درج ذیل موضوعات عمرو کے یہاں بھی ملتے ہیں اور "سیرت" میں بھی: وہ فیاض شخص جو موسم سرما میں بھوکے مہمان کے لیے اونٹ ذبح کرتا ہے جبکہ اس موسم میں امرا بھی قحط کے ہاتھوں غربت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں، جب رشتہ دار بھی ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ شخص جو آڑے وقت میں ضیافت کا اہتمام کرتا ہے، جب اُونٹنیوں کے تھن خشک ہو چکے ہوتے ہیں ——— کڑاہی اونٹ کے کوہان کی چربی سے بھری ہُوئی ——— وُہ لوگ جو مہمان نوازی کے طور پر قمار بازی کرتے ہیں اور تیروں کی نشان دہی کے مطابق رقم آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ جنگ تو (شیریں) دودھ کی طرح ہے۔ جنگ تو دودھیل اونٹنی ہے۔ جنگ اس طرح خُون بہاتی ہے جس طرح کنویں سے بالٹیاں نکالی جاتی ہیں۔ جنگ تو کنویں سے صبح کے وقت پیا جانے والا شیریں اور خنک گھونٹ ہے ——— شمشیر کے پھل کو دزاع نے جوہر دار کر دیا ہے، تپتی دوپہر دن کا سفر جب مکڑی بھی آرام کر رہی ہوتی ہے ——— گھوڑا جو بھاگ کر جنگلی گدھے سے بھی آگے نکل جاتا ہے ——— جنگجوؤں کے خُود سورج کی تیز روشنی میں چمک رہے ہیں، زرہ کی کڑیاں اس طرح چمک رہی ہیں جیسے جھنور ہلکورے لے رہا ہو ——— یہ تشبیہات خواہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں لیکن دوسرے شعرأ کے یہاں بھی اس قسم کے پیش پا افتادہ مضامین کی موجودگی میں یہ کہنا کہ عمرو نے ("سیرت" کی شاعری) کو گہرے طور پر متاثر کیا، خطرے سے خالی نہیں۔ مزید برآں ہم جس شاعر کی بات کر رہے ہیں وُہ اُموی دور کا جعلی شاعر تھا۔ سو میرے ایک سابقہ ساتھی ڈاکٹر عبداللہ الطیب کا ایک اشارہ یاد آتا ہے جس کے مطابق "سیرت" میں شامل شاعری اور "وقعت صفّین" بہت مماثل ہیں۔ اگر اس اشارے کی روشنی میں مزید تحقیق کی جائے تو بہت سے دِل چسپ انکشافات کا امکان ہے۔ اس باب میں ابن ہشام کے حواشی بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ صفحہ ۹۰، پر وہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ "ہم نے تم سے اس کی تفسیر و تعبیر پر بھی بحث کی ہے جس طرح ہم نے اس کے منزّل من اللہ ہونے پر بحث کی" عمار بن یاسر نے ایک اور جنگ (صفّین) کے حوالے سے کہے اور اس بات کا امکان نہیں کہ یہ بات عبداللہ بن رواحہ نے فتح مکّہ کے موقع پر کہی ہو کیونکہ اہلِ مکّہ تو مشرکین تھے اور ان کا قرآن پر ایمان نہیں تھا، اس لیے کسی دوسری تفسیر و تعبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴۲۔ صفحہ ۱۱۳

۴۳۔ یُوں لگتا ہے کہ حضرتِ حسان بن ثابتؓ سے اس مفہوم کے جعلی اشعار منسوب کیے گئے ہیں۔ (مترجم)

۴۴۔ مزید دیکھیے مصنف (الفریڈ گیوم) کا مضمون "جدید تحقیقات کی روشنی میں سیرت رسول اللہؐ" اسلامک کوارٹرلی ریویو، ۱۹۵۴ء

۴۵۔ میں نے فک کے قابلِ تعریف مقالے میں شامل فہرست کو اپنایا ہے۔ اس کے صفحہ ۴۴ پر مکمل سوانحی تفصیلات موجود ہیں، اس مقالے میں جن قصبوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں افرادِ مذکورہ ابنِ اسحٰق کے محاضرات سُنتے تھے۔

۴۶۔ واضح رہے کہ "سیرت رسول اللہؐ" کا اصل متن دریافت ہو چکا ہے۔ یہ ایک خطی نسخہ ہے جسے نامور عالم ڈاکٹر حمید اللہ مرتب کر رہے ہیں۔ (مترجم)

۴۷۔ میرا ایک دوست جے۔ ایم۔ بی جونز برٹش میوزیم میں موجود دو مخطوطات کی مدد سے ایک ایڈیشن تیار کر رہا ہے۔

۴۸۔ الطبری جلد سوم صفحہ ۲۵۱۲

۴۹۔ مصیبت کے ان ایام میں مَیں نے ان دونوں فتوحاتِ علمی کا ساتھ ساتھ ترجمہ شائع کرنے کا اپنا اصلی منصوبہ بڑے تامل کے بعد ترک کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ متذکرہ بالا عالم اس کام کو بڑی کامیابی سے تکمیل سے ہمکنار کریں گے۔

۵۰۔ مزید دیکھیے ہورووز (بحوالہ سابقہ) اور اوٹولوتھ کی کتاب DAS CLASSENBUCH DES IBN SA'AD, لیپزگ ۱۸۶۹

ابنِ اسحٰق کے یہاں دیے گئے حوالوں کے لیے دیکھیے نولدیکہ کی جرمن زبان میں لکھی گئی کتاب تاریخِ قرآن یعنی GESCHICHTE DES QORANS

۵۱۔ تاریخ قرآن (نولدیکہ) جلد دوم ص ۱۳۹ و بعد

۵۲۔ مزید دیکھیے الشافعی کے کاتب کا دستخط شدہ مخطوطہ۔ جدید ایڈیشن میں ایک ہی صفحے پر دس یا اس سے بھی زیادہ دفعہ "تصلیہ" کی موجودگی سے عقیدت کی جگہ غلامی کی بُو آتی ہے اور یہ ایک اختراع ہے اگرچہ اس سے مخطوطہ کی تاریخ کا پتا چلانے میں تو مدد ملتی ہے لیکن ایک جدید مطبوعہ نسخے کے قاری کے لیے تکلیف دہ آزمائش پیدا کر دیتی ہے۔

۵۳۔ تاریخ قرآن (جلد دوم) صفحہ ۱۴۳

۵۴۔ پروفیسر کرنکو نے ایک خط میں لکھا کہ الحکیم النیشا پوری کی "مستدرک" میں یونس بن بُکیر کے توسط سے "سیرت" کے اقتباسات ملتے ہیں لیکن چونکہ اس ضخیم کتاب کا اشاریہ مرتب نہیں کیا گیا اس لیے میرے لیے "سیرت" کے اقتباسات سے ان اقتباسات (مستدرک) کا تقابل ممکن نہیں تھا۔ مزید یہ دیکھیے کہ ابنِ ہشام کے تحت میں سُہیلی کی "رَوض الاُنف" میں موجود اقتباسات کے باب میں کیا کہا گیا ہے۔

۵۵۔ دیکھیے فک صفحہ ۱۸

۵۶۔ جلد دوم : ۱۰۔ ۲۳

۵۷۔ چونکہ ابنِ اسحٰق کا انتقال ۱۵۰ ھ میں ہُوا اس لیے یہ بات ممکن ہی نہیں تھی۔

۵۸ - غالباً ان کا تعلق " سنن " سے ہے۔

۵۹ - اس کا بھی " سیرت " سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۰ - اس خاص اصطلاح کا مفہوم سیاقِ کلام سے تو واضح ہے۔ ولہاوزن نے اس کا جو متبادل ———— FALSCHE NAMEN UNTERSCHIEBEN دیا ہے وہ کُلی طور پر صحیح نہیں ہے۔

۶۱ - ابنِ اسحٰق کی الکلبی کی بیان کردہ روایات کے باب میں ناپسندیدگی والا مبحث غیر ضروری ہے اسی لیے یہاں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

۶۲ - مزید بحث، اور زیرِ نظر اور مابعد کے لکھنے والوں کے متعلق جامع اور مانع حوالوں کے لیے دیکھیے : فک، باب دوم

۶۳ - تاریخ قرآن صفحہ ۱۳۰

۶۴ - رسالۂ علومِ آشوریات یعنی ———— ZEITSCHRIFT FÜR ASSYRIOLOGIE ————

: ۲۷، ص ۱۶۱

۶۵ - اسلامک کلچر جلد دوم، صفحہ ۲۳۱

۶۶ - خَشَبہ : اَلْخَشَبُ موٹی لکڑی، ج - خَشَب و خُشُب و خُشْب و خُشْبان (مترجم)

۶۷ - تاہم اس بات کا امکان ہے کہ غَیَّبُوا اللّٰہُ عَنْھُمْ کا مطلب ایک مافوق الفطرت فعل ہو، اگرچہ ان الفاظ کا بظاہر یہ مطلب معلوم نہیں ہوتا۔

۶۸ - مثال کے طور پر دیکھیے صفحہ ۶۱۳، جہاں اُن کا یہ کہنا بجا ہے کہ ایک شعر کا خالق حُیَیرہ نہیں بلکہ جُنُوب تھا۔

۶۹ - المُظہر (قاہرہ) سے حال ہی میں شائع ہونے والا تاریخ سے معرّٰی نسخہ صفحہ ۸۰ نے دیکھیے زخاؤ طٹ ۱/۱۶ وبعد

۷۰ - حضورِ اکرمؐ فتنۂ دجّال سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے اعوذ بك من فتنة المسيح الدجّال - فتنۂ دجّال سے متعلق حضورؐ سے جتنی احادیث مروی ہیں ان سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ ایک بڑا فتنہ (دجّال) ظاہر ہونے والا ہے۔ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، کون ہوگا، اس باب میں ان احادیث میں کہیں صراحت نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی حضورؐ نے فرمایا کہ دجّال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے اور کبھی یہ کہ شام اور عراق کے درمیان منطقے سے۔ مدینہ میں ابنِ صیّاد نامی یہودی بچہ پیدا ہوا تو آپؐ نے قیاس فرمایا کہ شاید یہی دجّال ہو۔ فلسطین کے ایک نومسلم تمیم داری نے حضورؐ کو بتایا کہ اس نے بحیرہ عرب یا بحیرہ روم میں ایک جزیرے پر ایک شخص کو دیکھا جو خود کو دجّال کہتا تھا کہ حضورؐ نے اس بات سے بھی اختلاف نہیں فرمایا لیکن یہ ارشاد فرمایا کہ دجّال مشرق سے ظاہر ہوگا۔ حضورؐ کے ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ دجّال کے باب میں حضورؐ کو اللہ کی طرف سے اتنا ہی علم دیا گیا تھا کہ دجّال ظاہر ہونے والا ہے۔ آپؐ کے باقی ارشادات بربنائے وحی نہیں تھے، بلکہ قیاس کی بنیاد پر تھے۔ (مترجم) ۲ے VIDE SUPRA (اوپر دیکھیے)

ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام

محمد اجمل اصلاحی

فہرست مشمولات

(۱)

ابنِ ہشام

۴۵۲ ——— ۴۶۴

۱۔ حالاتِ زندگی ۴۵۳

۲۔ شیوخ و اساتذہ ۴۵۹

۳۔ علمی مرتبہ ۴۶۲

۴۔ تلامذہ ۴۶۳

۵۔ تصنیفات ۴۶۴

۶۔ وفات ۴۶۵

(۲)

سیرت ابنِ ہشام

۴۶۵ ——— ۴۸۹

۱۔ مولف سیرت ۴۶۶

۲۔ راوی سیرت ۴۶۷

۳۔ ابن ہشام کا کارنامہ ۴۶۸

۱۔ تلخیص و تدوین جدید ۴۶۹

۲۔ تہذیب متن ۴۷۱

۳ ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۴۷۲

۴ حواشی و تعلیقات ۴۷۲

۵ شعری مراد کی تحقیق و تنقید ۴۷۴

۶۔ حواشی کی چند نمایاں خصوصیات ۴۷۶

۴۔ ابن ہشام کے مآخذ ۴۷۸

۱- اسناد میں ابن ہشام کا منہج ۴۷۹
۲- معروف مآخذ ۴۸۰
۳- مجہول مآخذ ۴۸۳
۵- مقبولیت و اشاعت ۴۸۴
۶- شرحیں ۴۸۵
۷- تلخیصات ۴۸۶
۸- منظومات ۴۸۷
۹- تراجم ۴۸۸
۱۰- ایڈیشن ۴۸۸

(۳)

حواشی اور حوالہ جات ۴۸۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابنِ ہشام اور سیرت ابنِ ہشام

ابنِ ھشام

علمی دنیا کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ سیرتِ نبوی کے موضوع پر سب سے پہلی مبسوط اور جامع کتاب محمد بن اسحٰق (م سنہ ۱۵۱ھ) نے لکھی لیکن اسے وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اس کی اس تلخیص کو حاصل ہوئی جسے ابنِ ہشام نے تیار کیا۔ یہاں تک کہ سیرت ابن اسحٰق سیرت ابنِ ہشام کے نام سے مشہور ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ابن ہشام کے بارے میں اتنی تفصیلات بھی محفوظ نہیں ہیں جو ابنِ اسحٰق کے بارے میں عام طور پر مل جاتی ہیں۔ چند سطریں ہیں جو تمام تذکرہ نگار ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آ رہے ہیں اور بس۔

ابنِ ہشام کا سب سے قدیم ماخذ مورخ مصر حافظ ابن یونس (۲۸۱ — ۳۴۷) کی "تاریخ الغربا القادمین علی مصر" ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن ابن ہشام کے حالات پر ابن یونس نے جو کچھ لکھا تھا اسے قفطی نے "انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ" میں محفوظ کر لیا ہے حافظ ابن یونس کا زمانہ ابن ہشام سے بہت قریب ہے۔ اوّل الذکر کی پیدائش اور موخر الذکر کی وفات کے درمیان صرف تریسٹھ (۶۳) سال کا فاصلہ ہے۔ نیز حافظ ابن یونس خود مصری ہیں اور مصر کے علماء پر انہوں نے دو کتابیں مرتب کیں ایک تو ان شخصیات کے بارے میں جن کا وطن اصلی مصر تھا۔ دوسری کتاب جس کا ذکر اوپر گذرا ان غیر مصری علماء کے حالات میں تھی جنہوں نے مصر میں قیام کیا اس زمانی اور مکانی قربت کی بنا

پر ابن یونس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ابن ہشام کے بارے میں مفصل اور مستند معلومات فراہم کریں گے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے غالباً اسی شہرت ابن ہشام کی غیر معمولی شہرت کی بنا پر۔ نہایت اختصار سے کام لیا اور تفصیل میں جانا غیر ضروری اور تحصیل حاصل خیال کیا۔

اس مضمون میں تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کے ساتھ خود ابن ہشام کی تالیفات کی مدد سے ابن ہشام کے حالات زندگی اور ان کے شیوخ و تلامذہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد سیرت ابن ہشام پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے!

حالاتِ زندگی

(۱)

ابن ہشام کا نام عبدالملک تھا اور کنیت ابو محمد[۲]۔ باپ کا نام ہشام اور دادا کا ایوب۔ آگے کا سلسلۂ نسب محفوظ نہیں رہا۔ البتہ اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ابن ہشام نسلاً یمنی تھا۔ تذکرہ نگار عام طور پر "الحمیری" یا "المعافری" یا "الحمیری المعافری" یا "الحمیری الاصل المعافری الیمنی" کی نسبتوں کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

"معافری[۳]" کی نسبت ایک مشہور یمنی قبیلہ کی جانب ہے جو معافر بن یعفر کی نسل سے ہے[۴]۔ اس قبیلہ کے افراد یمن کے علاوہ اندلس اور مصر میں آباد ہوئے۔ یمن کا ایک "مخلاف" (صوبہ) جہاں یہ قبیلہ آباد تھا "مخلاف المعافر" کے نام سے معروف تھا۔ اس علاقے کی چادریں مشہور تھیں[۵]۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے جب مصر فتح کیا تو ان کے لشکر میں اس قبیلہ کے افراد کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ سنہ ۲۱ھ میں فسطاط کی آبادکاری اور محلوں کی تقسیم پر جن لوگوں کو مامور کیا گیا تھا ان میں معاویہ بن خدیج تجیبی، شریک بن سمی غطیفی اور عمرو بن مخزم خولانی کے ساتھ قبیلہ معافر کے ایک ممتاز فرد جبریل بن ناشرة معافری بھی تھے۔ قبیلہ معافر کا علاقہ "خطۃ المعافر" رصد سے سقایہ ابن طولون تک پھیلا ہوا تھا[۶]۔

ہمدانی، نویری اور یاقوت[۹] وغیرہ سے معافر کا جو سلسلۂ نسب لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلہ زید بن کہلان کی شاخ ہے۔ نویری نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصر میں معافر کے جو لوگ آباد ہیں وہ اپنا سلسلۂ نسب یہی بتاتے ہیں[۱۰]۔ اس صورت میں حمیری کے ساتھ معافری کی مطابقت مشکل ہے۔ اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا معافر نام کا کوئی قبیلہ حمیر کی شاخ بھی ہے دوم یمن اور مصر کے معافری حمیر سے تعلق رکھتے ہیں یا کہلان سے پہلے سوال کے جواب میں عرض یہ ہے کہ ابن ہشام نے کتاب التیجان میں جس کا موضوع شاہان حمیر کی تاریخ ہے حمیر کے ایک بادشاہ المعافر بن یعفر بن سکسک بن وائل بن حمیر[۱۱] کا تذکرہ کیا ہے۔ معافر کا اصل نام نعمان تھا اور اپنے باپ یعفر کے بعد حکمران ہوا۔ اس کے بعد جب اس کے بیٹے اسجم بن المعافر کو حکومت ملی تو حمیری سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ حمیری اور معافری دونوں نسبتوں میں اصل و فرع کا تعلق ہے۔

اب دوسرے سوال کا جواب ملاحظہ ہو:

۱۔ ابن ہشام نے سابق الذکر معافر بن یعفر کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ اسے کھڑا دفن کیا جائے پھر ادریس بن سنان سے نقل کیا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں یمن میں ایک غار کا سراغ لگا جس میں سونے، جواہرات اور اسلحہ کے ساتھ سنگِ مرمر کا ایک ایستادہ ستون ملا جس کا سرا سیسے سے بند کیا گیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے ستون توڑنے کا حکم دیا۔ اس ستون کے خول میں ایک بوڑھے شخص کی کھڑی لاش ملی جس کے سر پہ سونے کی ایک تختی تھی اور اس پہ حمیری زبان میں

ایک رجز لکھا ہوا تھا۔[۱۲]

اس رجز کو نقل کرنے کے بعد ابن ہشام نے امام لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) کا حوالہ دیا ہے (انھیں "اہلِ مصر و ولاۃ المعافر" میں شمار کیا ہے۔ امام لیث کے نزدیک یہ رجز منحول (جعلی) ہے گویا ابن ہشام نے اس قصہ کے بارے میں جو معافر بن یعفر حمیری کے متعلق مشہور ہے امام لیث بن سعد کا حوالہ دیا جو خود معافر کے امرائیں سے تھے۔

اسی موقع پر ابن ہشام نے فتح مصر اور اس میں معافر کی شرکت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری معافر کا رشتہ اسی حمیری بادشاہ معافر بن یعفر سے ہے۔

۲- ہمدانی نے صفتہ جزیرۃ العرب میں معافر کی کچھ بستیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف طور پر انھیں حمیر کی شاخ بتایا ہے۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو:[۱۳]

ساکن ھذہ المواضع من بطون حمیر من ولد المعافر بن جعفر

ان بستیوں میں حمیر کے بطون میں سے معافر بن یعفر کی اولاد آباد ہے۔

ابن ہشام کے یمنی ہونے پر اتفاق کے ساتھ "تقریباً" کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا کہ حافظ ابن یونس نے انھیں "ذہلی"[۱۴] اور ابن حجر نے "سدوسی"[۱۵] لکھا ہے۔ سیرت ابن ہشام کے محققین مصطفیٰ السقا وغیرہ کو نسبتوں کے اس اختلاف سے پریشانی لاحق ہوئی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"ابن ہشام کا نام عبدالملک بن ہشام بن ایوب حمیری ہے۔ بعض راوی ابن ہشام کو معافر بن یعفر کی جانب منسوب کرتے ہیں بعض ذہل سے رشتہ جوڑتے ہیں اور بعض سدوسی بتاتے ہیں۔ اس بارے میں کوئی قطعی رائے آپ کو نہیں ملے گی۔ یہ صورت حال ہر اس شخص کو پیش آتی ہے جس کے دعویدار ایک سے زیادہ شہر ہوں اور جس نے اپنے خاندانی وطن سے دور زندگی گزاری ہو خاص طور پر جبکہ اس کا خاندان نسبی لحاظ سے اس درجہ کا نہ ہو کہ لوگ اس کے نسب کے نقطہ روایت کا اہتمام کریں۔"

حمیری اور معافری کی حد تک تو بات صاف ہو چکی ہے کہ دونوں نسبتیں درحقیقت ایک ہی ہیں جہاں تک ذہلی اور سدوسی کا تعلق ہے تو یہاں بھی صورتحال مختلف نہیں ہے۔ اکثر ایک ہی نام کے بہت سے قبائل ہوتے ہیں اور ناواقف شخص کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وضاحت کے طور پر اس نسبت کا ذکر کیا جاتا ہے جو نسب کا صحیح تعین کرتی ہو۔ چنانچہ ذہل کے نام سے دو قبائل ہیں اور دونوں کا تعلق بکر بن وائل سے ہے۔ دونوں کا سلسلۂ نسب ملاحظہ ہو۔[۱۶]

۱- ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل۔

۲- ذہل بن شیبان بن ثعلبہ بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل

مقدم الذکر ذہل بن ثعلبہ موخر الذکر ذہل بن شیبان بن ثعلبہ کا چچا ہوتا ہے۔ سدوس بن شیبان بن ذہل بن ثعلبہ کا تعلق مقدم الذکر سے ہے۔ ذہل بن ثعلبہ اور ذہل بن شیبان دونوں سے بہت سی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ذہلی کی نسبت دونوں سلسلوں میں مشترک ہے اس لئے تعین کے لئے فروعی قبیلہ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ فیروز آبادی لکھتے ہیں:[۱۷]

"ذہل دو ہیں: ذہل بن شیبان اور ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ۔ حافظ یحیی اور امام احمد (راجح قول کے مطابق) کا تعلق ذہل بن شیبان سے

ہے۔البتہ قاضی ابو طاہر الذہلی سدوسی ہیں۔" مشہور تابعی قتادہ بن دعامہ (۶۰ – ۱۱۷ھ) اور امام لغت ابو فید مؤرّج بن عمرو (م ۱۹۵ھ) کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

اس تشریح کے بعد نسبتوں کا یہ اختلاف چار قبائل کے بجائے صرف دو میں محدود ہو جاتا ہے یعنی ایک خیال یہ ہے کہ ابن ہشام حمیری معافری یعنی قحطانی ہے جیساکہ سہیلی اور عام تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ ذُہلی سدوسی یعنی عدنانی ہے جیساکہ ابن یونس اور ابن حجر نے لکھا ہے۔ قفطی نے ابن یونس کی رائے کو ترجیح دی ہے لکھتے ہیں:

"یہ جو سہیلی نے ذکر کیا ہے اس کی بنیاد ظن وقیاس پر ہے۔ ابن ہشام کے نسب اور وفات کے سلسلہ میں مستند بات مقدم الذکر ہے (یعنی ذہلی ہیں، سن وفات میں اختلاف کا ذکر آگے آ رہا ہے) اس لئے کہ اس کے ناقل حدیث و تاریخ میں مصر کے امام ابو سعید عبدالرحمن بن یونس مصری ہیں۔"

ابن مکتوم نے قفطی کی تردید کی ہے۔ ان کے نزدیک "سہیلی کے بارے میں قفطی کا یہ کہنا کہ ان کی رائے کی بنیاد ظن وقیاس پر ہے غلط ہے۔ سُہیلی جیسا جلیل القدر عالم جب کسی شخص کی پیدائش و وفات کا ذکر کرتا ہے تو گمان کی بنیاد پر نہیں بلکہ نقل کی بنیاد پر کرتا ہے"۔[18]

ابن مکتوم کی مندرجہ بالا عبارت کے بارے میں یہ کہنا غالباً زیادتی اور خوردہ گیری کے مترادف ہوگا کہ سہیلی کی تائید میں انہوں نے صرف "پیدائش ووفات" کا ذکر کیا ہے اس لیے "نسب" پر اس کا اطلاق نہ ہوگا۔[19]

واقعہ یہ ہے کہ حافظ ابن یونس کے علمی مرتبہ، مصری ہونے کی وجہ سے تاریخ مصر میں ان کے اختصاص اور ان کی معلومات کی قدر و قیمت نیز ابنِ ہشام کے عہد سے انتہائی قربت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا بیان زیادہ مستنداً و راجح ہو جیساکہ قفطی نے لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مختلف قرائن ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے نسب کے سلسلہ میں ہمارا رجحان سہیلی کی جانب ہے

۱۔ ابنِ ہشام کے سلسلۂ نسب کا اختصار جو یمنی قبائل کی عام خصوصیت ہے۔

۲۔ یمن کی تاریخ و قصص سے ابن ہشام کی دلچسپی

۳۔ فسطاط میں مستقل قیام

۴۔ حافظ ابن کثیر نے تاریخ وفات کے سلسلہ میں سُہیلی پر ابن یونس کے بیان کو ترجیح دی ہے لیکن نسب کے بارے میں وہ بھی سہیلی کے ہم نوا ہیں۔

ابن یونس نے "ذُہلی" کی نسبت سے اگر ابن ہشام کے اصلی نسب کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے تو ممکن ہے ذُہلی سے مُراد ذہلی الولاء ہو، انساب میں یہ طریقہ اتنا عام ہے کہ ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بصرہ میں ابن ہشام کا قیام ذُہلی قبیلہ سدوس کے ساتھ رہا ہو اس وجہ سے ذُہلی اور سدوسی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی قبیلہ میں آکر قیام کرتا ہے اور اسی کی جانب منسوب ہو جاتا ہے مثلاً ابن اسحٰق نے غزوہ بدر کے شرکاء کے تذکرہ میں حضرت معاذ بن جبل کو بنو عدی بن نابی بن عمرو بن سواد بن غنم میں شمار کیا ہے لیکن ابنِ ہشام نے تصریح کی ہے کہ "معاذ بن جبل کا تعلق بنو سواد سے نہیں ہے۔ ابن اسحٰق نے ان کو بنو سواد کی جانب محض اس وجہ سے منسوب کیا ہے کہ ان کا قیام انھیں کے ساتھ تھا۔"[20] مغازی کے ابتدائی مصنفین میں ایک نام سلیمان بن طرخان تیمی ابو المعتمر بصری کا آتا ہے۔ ابن الصلاح

اور ابن حجر وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ اُن کا نسبی تعلق بنو تمیم سے نہیں تھا البتہ قیام ان کے پاس تھا۔[۲۱]

ابن ہشام کے نسب پر اس گفتگو کے آخر میں جو خاصی طویل ہو گئی یہ انکشاف دلچسپی کا باعث ہو گا کہ خود ابن ہشام نے سیرت النبی یا کتاب التیجان میں اپنے نسب کا کہیں ذکر نہیں کیا اور ہمیشہ ابو محمد عبد الملک بن ہشام یا صرف ابن ہشام یا صرف ابو محمد پر اکتفا کیا۔

(۲)

ابن ہشام کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ اس سلسلہ میں ہماری محدود اطلاع کے مطابق کوئی قیاس آرائی بھی اب تک نہیں کی گئی ہے۔ یہاں اس مسئلہ کو چھیڑنا اور اس پیچیدگی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو خود ابن ہشام کی بعض عبارتوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابن اسحٰق نے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر سے روایت کی ہے کہ عقبہ بن ابی معیط کو عاصم بن ثابت بن ابی الاقلح نے قتل کیا تھا۔ ابن ہشام نے اس پر یہ نوٹ لکھا ہے[۲۲]

قال ابن هشام: ويقال: قتله علي بن أبي طالب فيما ذكر لي ابن شهاب الزهري وغيره من أهل العلم۔	ابن ہشام نے کہا: ایک قول یہ ہے کہ عقبہ کو علی بن ابی طالب نے قتل کیا جیسا کہ ابن شہاب زہری اور دوسرے اہلِ علم نے مجھ سے بیان کیا۔

اس عبارت میں "لی" کے لفظ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ اس سے صراحت ہوتی ہے کہ ابن ہشام نے ابن شہاب زہری سے بغیر کسی واسطہ کے استفادہ کیا تھا۔ امام زہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا اس لیے ابن ہشام کا سن پیدائش کم از کم ۱۱۲ھ کے لگ بھگ ماننا ہوگا۔ ابن ہشام کا انتقال چونکہ راجح قول کے مطابق ۲۱۸ھ میں ہوا اس لئے ان کی عمر سو سال سے زائد ہوگی۔ لیکن سیرت النبی کی مندرجہ بالا عبارت کی صحت محلِ نظر ہے اس لئے کہ پوری سیرت میں یہ واحد مقام ہے جہاں امام زہری سے براہِ راست اخذ و استفادہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے استقصار کے مطابق ابنِ ہشام کے حواشی میں امام زہری کے چودہ (۱۴) حوالے ہیں۔ ان حوالوں میں پانچ قسم کی عبارتیں استعمال کی گئی ہیں۔[۲۳]

۱۔ بلغني عن الزهري یا بلغنا عن الزهري (۱: ۶۹، ۷۰/ ۲: ۲۵۳، ۲۸۳، ۴۲۴، ۵۲۴)

۲۔ فيما ذكر ابن شهاب الزهري (۱: ۳۲۷، ۶۸۳ (مکرر) ۲: ۳۸۸، ۴۰۰)

۳۔ ذكر ابن شهاب الزهري عن عبيد الله بن عتبة عن ابن عباس (۱: ۴۱۲)

۴۔ حدثني من أثق به من أهل الرواية في إسناد له عن ابن شهاب الزهري عن عبيد الله بن عبد الله عن ابن عباس (۲: ۴۱۶، ۲: ۴۹۴)

۵۔ حدثني الثقة أنه حدث عن ابن شهاب الزهري (۲: ۲۵۳)

ابتدائی تین عبارتوں سے پتہ نہیں چلتا کہ ابنِ ہشام اور زہری کے درمیان کتنے واسطے ہیں لیکن چوتھی اور پانچویں سے صاف ظاہر ہے کہ درمیان میں ایک سے زیادہ واسطے ہیں۔

امام زہری ابن اسحٰق کے شیخ ہیں جبکہ ابن ہشام نے سیرۃ النبی براہِ راست ابن اسحٰق سے بھی حاصل نہیں کی جن کا انتقال ۱۵۱ھ میں ہوا بلکہ ابن اسحٰق کے شاگرد زیاد بکائی (م ۱۸۳ھ) سے روایت کی۔ گویا ابنِ ہشام اور امام زہری کے درمیان دو واسطے پائے جاتے ہیں۔ اس وضاحت

کی روشنی میں یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ عبارت میں "لی" کا لفظ غلطی سے در آیا ہے اور یہاں بھی بعض دوسرے مقامات کی طرح "فیما ذکر ابن شھاب الزھری الخ" ہے یا "لی" کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے۔ ابن ہشام کی سندوں میں یہ انداز بھی ملتا ہے مثلاً: ذکر لی عن أبی عثمان النھدی" (۱: ۴۷۷) تعجب ہے کہ سیرت کے محققین کو اس حوالہ نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا۔ اس عبارت پر اختلاف نسخ کا کوئی حاشیہ بھی نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کے تمام نسخوں میں یہاں تک کہ وسٹنفلٹ کے ایڈیشن میں بھی یہی الفاظ ہیں یاد رہے کہ وسٹنفلٹ کے ایڈیشن کی بنیاد سُہیلی کے نسخہ پر ہے۔ جو قاضی ابوبکر ابن العربی سے منقول ہے۔ اگر اس نسخہ میں بھی عبارت اسی طرح ہے تو الروض الانف میں سُہیلی کا اس پر توجہ نہ کرنا اور بھی حیرت انگیز ہے۔

سیرت النبی کے بعد ابن ہشام کی دوسری کتاب التیجان کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی ایک روایت پر ہماری نگاہ ٹھہرتی ہے۔ یہ روایت "حدثنی" کے لفظ سے قاضی محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم انصاری[24] سے مروی ہے۔ قاضی محمد بن ابی بکر کا انتقال ۱۳۲ھ میں ہوا۔ اگر یہ سند صحیح ہے تو اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابن ہشام کا سن پیدائش کم از کم ۱۲۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جائے۔ لیکن کتاب التیجان کا جو ایڈیشن شائع ہوا ہے وہ بہت ناقص اور تصحیفات و تحریفات سے مملو ہے۔ نیز کتاب التیجان کی روایت میں کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

(۴)

دوسری صدی ہجری کا زمانہ علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے اسلامی تاریخ کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اپنے علمی سرمایہ کا تحفظ اور اس کی تعبیر و تفسیر، دوسری زبانوں کے علمی خزانوں کو عربی میں منتقل کر کے اپنے ذخیرہ میں اضافہ اور توسیع، بیشتر علوم و فنون کی تشکیل و تدوین، تصنیف و تالیف کی گرم بازاری، فقہی و ادبی دبستانوں کا قیام اور عربی و عجمی تہذیبوں کے امتزاج و تفاعل سے ایک نئے اسلامی تمدن کی داغ بیل اس عہد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اس عہد کے علمی و تہذیبی منظر نامے پر جن شہروں نے سب سے پائیدار اور تابدار نقوش ثبت کئے ہیں ان میں بصرہ کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ بصرہ کی علمی فضا پر شعر و ادب کا رنگ غالب تھا۔ مربد کے سدا بہار میلوں نے اس رنگ کو اور شوخ بنا دیا تھا[25] گھر گھر علم و ادب کا چرچا تھا، تابعین و تبع تابعین کا چشمۂ فیض رواں تھا، تفسیر و حدیث، لغت و نحو اور انساب و اخبار کے منتخب روزگار ائمہ و اساطین جمع تھے۔ ابو عمرو بن العلاء، (م ۱۵۴ھ) یحیی بن سعید قطان (م ۱۹۸ھ) سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) عبدالوارث تنوری (م ۱۸۰ھ) خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۵ھ) یونس بن حبیب (م ۱۸۲ھ) سیبویہ (م ۱۸۰ھ) ابو عبیدہ (م ۲۱۰ھ) اصمعی (م ۲۱۳ھ) ابوزید انصاری (م ۲۱۵ھ) مورج سدوسی (م ۱۹۵ھ) قطرب (م ۲۰۶ھ) خلف الاحمر (م ۱۸۰ھ) نضر بن شمیل (م ۲۰۳ھ) غرض کس کس کا نام گنایئے کہ ہر شخص اپنے فن کا امام عالی مقام تھا۔

ابن ہشام نے اسی عہد اور اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، ہوش سنبھالا، شہر کے نامور علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ درس و مذاکرہ کی مجلسوں میں شریک ہوئے اور مروجہ علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔

کتاب التیجان کے مطالعہ سے ابن ہشام کے گھرانے کی علمی دلچسپیوں کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ ابن ہشام نے اپنے باپ اور دادا ایوب کی سندوں سے جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تاریخ و قصص سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لئے یہ کہنا بیجا

نہ ہوگا کہ تاریخ وقصص کا ذوق ابنِ ہشام کو ورثہ میں ملا تھا۔ تفسیر و حدیث اس وقت کی ثقافت کا جزو لاینفک اور سارے علوم و فنون کا ماخذ اور سرچشمہ تھے اس لئے ان سے واقفیت ناگزیر تھی۔ ان کے علاوہ جن علوم پر ابنِ ہشام نے اپنی خصوصی توجہ مرکوز کی وہ نحو، لغت، روایت شعر انساب اور مغازی ہیں[۲۶]۔

روایت اور سماع کو اس عہد کے تعلیمی نظام میں اساس اور کلید کی حیثیت حاصل تھی تشنگانِ علم دور دراز کا سفر کرتے، صعوبتیں برداشت کرتے اور ماہرین کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کرتے۔ ابنِ ہشام کے تعلیمی سفروں کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ تذکرہ نگار ان کے حالات میں بصرہ کے علاوہ صرف مصر کا ذکر کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ مصر جانے سے پہلے انہوں نے دوسرے علمی مراکز کا بھی سفر کیا ہوگا، اس لیے کہ ان کے شیوخ میں کوفی اور مدنی علماء بھی ہیں۔ کوفہ بصرہ کا ہم چشم اور ہم قدم تھا، تہذیب التہذیب میں زیاد بکائی کے حالات میں تصریح ہے کہ ابنِ ہشام نے سیرت النبیؐ کی روایت ان سے کوفہ ہی میں کی تھی[۲۷]۔

مصر کا سفر کب پیش آیا اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ابنِ ہشام نے بصرہ کو خیرباد کہا اور مصر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی؟ ماخذ سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ کتاب التیجان میں ایک جگہ ابنِ ہشام نے امام مصر لیث بن سعد (۹۲-۱۷۵) سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے[۲۸]۔ امام لیث کی وفات ۱۷۵ھ ہی میں ہوئی[۲۹]۔ کتاب التیجان ہی میں ایک روایت ابنِ لہیعہ (ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن لہیعہ) سے حدثنی کے لفظ سے نقل کی ہے[۳۰]۔ ابنِ لہیعہ کا سن وفات ۱۷۰ھ اور دوسری روایت کے مطابق ۱۷۴ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابنِ ہشام اس سے پہلے مصر پہنچ چکے تھے۔

مصر میں قبیلۂ معافر کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا فسطاط میں ایک مستقل محلہ "خطۃ المعافر" کے نام سے ابتدا ہی سے آباد تھا۔ ممکن ہے مصر کوچ کرنے کا ایک محرک اپنے وطن اصلی کی بظاہر بازیافت اور قدر شناسی و عزت افزائی کی توقع بھی رہی ہو۔ امام لیث بن سعد کے علاوہ جن کا شمار ابنِ ہشام نے "ولاۃ المعافر" میں کیا ہے، مصر کے دوسرے علماء شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ان سے استفادہ کیا۔

مصر میں ابنِ ہشام کی ملاقات امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴) سے ہوئی۔ ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ جب امام شافعی مصر تشریف لائے تو انہوں نے ابنِ ہشام سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب کلام عرب سنایا[۳۱]۔ امام شافعی ۱۹۹ھ اور ایک قول کے مطابق ۲۰۱ھ میں مصر پہنچے تھے اور وفات تک وہیں قیام رہا[۳۲]۔ امام شافعی ابنِ ہشام سے بہت متاثر اور لغت میں ان کی مہارت کے قائل تھے[۳۳]۔ سیرت النبی میں ابنِ ہشام نے امام شافعی سے ایک روایت بھی نقل کی ہے[۳۴]۔ یہ روایت اگرچہ خود ابنِ ہشام نے براہِ راست بھی سنی تھی لیکن امام شافعی کا واسطہ بھی ساتھ ہی نقل کیا جس سے ابنِ ہشام کے بیان کی تائید بھی ہوتی ہے اور امام شافعی سے تعلق کا اظہار بھی۔

مصر میں ابنِ ہشام نے اپنی سیرت کا درس دیا اور یہیں انھیں وہ سعادت مند شاگرد ملے جنہوں نے سیرت کی اشاعت کی اور آخر میں مصر ہی میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی

شیوخ واساتذہ

تذکروں میں زیاد بکائی کے سوا ابنِ ہشام کے کسی اور شیخ کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن سیرت ابنِ ہشام اور کتاب التیجان کے مطالعہ سے جہاں

ان کے بعض اساتذہ کے نام ملتے ہیں وہیں ان کی کثرت تعداد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ابن اسحٰق نے ایک قصیدہ حضرت علی بن ابی طالب کی جانب منسوب کیا ہے اس پر نقد کرتے ہوئے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ حضرت علی کے بجائے کسی اور کا ہے جیسا کہ بعض علمائے شعر نے مجھ سے ذکر کیا۔ ماہرین شعر میں سے کسی شخص کو میں نے نہیں دیکھا جو اسے حضرت علی کا قرار دیتا ہو (لم ار احداً منهم يعرفها لعلی)[35] اسی طرح بہت سے شیوخ کا ذکر کنایۃً کیا ہے مثلاً "غیر واحد من اہل العلم" (ایک سے زیادہ اہل علم) "بعض اہل العلم من اہل مکۃ"، "بعض اہل الیمن"، "بعض بنی تمیم"، "رجل من قریش من اہل العلم" وغیرہ

ایک سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زیاد بکائی کے علاوہ ابن اسحٰق کے دوسرے شاگردوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ (غیر زیاد)[36]

ذیل میں سیرت النبی اور کتاب التیجان کی مدد سے ابن ہشام کے شیوخ و اساتذہ کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ اس فہرست میں صرف وہ نام شامل کئے گئے ہیں جن سے اخذ و استفادہ کی ابن ہشام نے تصریح کی ہے۔ "قال" اور "ذکر" کے الفاظ سے جو روایتیں منقول ہیں چونکہ ان میں واسطہ کا احتمال ہے جیسا کہ ہم سیرت پر گفتگو کرتے ہوئے بیان کریں گے اس لئے انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ امام زہریؒ کا نام بھی اس فہرست میں شامل نہیں ہے اگرچہ ان سے ایک روایت "ذکر لی" (مجھ سے ذکر کیا) کے الفاظ سے ملتی ہے اس پر بحث گزر چکی ہے سیرت اور التیجان دونوں کی فہرستیں علٰحدہ ذکر کی ہیں۔

الف : زیاد بن عبداللہ بکائی (م ۱۸۳ھ) عبدالوارث بن سعید تنوری (۱۰۲ — ۱۸۰ھ) عبداللہ بن وہب (۱۲۵ — ۱۹۷ھ) یونس بن حبیب نحوی (۹۰ — ۱۸۲ھ) ابو زید انصاری (۱۱۹ — ۲۱۵ھ) ابو عبیدہ معمر بن المثنی (۱۱۰ — ۲۰۹ھ) خلف الاحمر (تقریباً ۱۸۰ھ) خلاد بن قرۃ بن خالد سدوسی، ابوبکر الزبیری (م ۱۸۴ھ) مسلمۃ بن علقمہ مازنی، ابن عمرو بن العلاءؒ (معاویہ) امام شافعی (۱۵۰ — ۲۰۴ھ) قاضی عمر بن حبیب بصری (م ۲۰۷ھ)۔

ب : ابن لہیعۃ (م ۱۷۰ھ یا ۱۷۴ھ) محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم (م ۱۳۲ھ) اسد بن موسیٰ (م ۲۱۲ھ) ہیثم بن عدی (۱۳۰ — ۲۰۹ھ) انس (غالباً انس بن عیاض بن ضمرۃ لیثی مدنی م ۱۸۵ھ ہیں) حماد بن اسحٰق، ابو عبداللہ الایلی[37]، عامر بن جریر انصاری۔

اس مجمل فہرست کے بعد ابن ہشام کے چند ممتاز شیوخ کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ یونس بن حبیب نحوی (۹۰ — ۱۸۲ھ)

یونس بن حبیبؒ[38] کا شمار ان اکابر علمائے نحو میں ہوتا ہے جن کی آرا پر بصری اسکول کی بنیاد ہے۔ ابو عمرو بن العلاءؒ (م ۱۵۴ھ) کے شاگرد تھے۔ بصرہ میں ان کے حلقۂ درس میں طلبۂ ادبا اور فصحائے اعراب کا زبردست ہجوم ہوتا تھا۔ ابو زید انصاری، ابو عبیدہ، سیبویہ، کسائی اور فرا جیسے علمائے عربیت نے ان سے استفادہ کیا۔ خلیل بن احمد فراہیدی کے بعد سیبویہ نے اپنی کتاب میں سب سے زیادہ اقوال جس شخص کے نقل کئے ہیں وہ یہی یونس نحوی ہیں۔ نحو کے بہت سے مسائل اور قیاسات میں یونس منفرد ہیں۔ ابو زید انصاری کا قول ہے کہ میں یونس بن حبیب کے حلقہ میں دس سال تک شریک رہا اور مجھ سے پہلے خلف الاحمر نے بیس سال تک حاضری دی۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں چالیس سال تک یونس کے پاس جاتا رہا اور روزانہ اپنی تختیاں ان کے املا سے بھر لیتا تھا۔[39]

یونس کی ثقاہت کے بارے میں ابراہیم حربی کی یہ رائے بہت اہمیت رکھتی ہے کہ بصرہ کے علمائے عربیت "اصحاب اہوا" تھے البتہ چار

شخصیتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: ابوعمرو بن العلاء، خلیل بن احمد، یونس بن حبیب، اصمعی۔

یونس کی تصنیفات میں معانی القرآن، کتاب اللغات، کتاب النوادر، کتاب الامثال وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

۲۔ ابو زید انصاری (۱۱۹ - ۲۱۵ھ)

سعید بن اوس بن ثابت ابو زید انصاری[۴۰] بصرہ کے مشہور اور ثقہ امام نحو و لغت تھے۔ ابو عمرو بن العلاء کے شاگرد اور ابو عبید قاسم بن سلام، ابو حاتم سجستانی اور سیبویہ کے استاذ ہیں۔ شاعری، لغت اور نوادر سے خاص شغف تھا۔ نحو میں انھیں یونس سے کمتر اور اصمعی اور ابو عبیدہ سے برتر خیال کیا جاتا ہے۔ ابو زید نے لغت کے موضوعات پر جو کتابیں مرتب کی ہیں ان میں نحو کے جس قدر شواہد ملتے ہیں اتنے کسی اور شخص کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ بصری علمائے لغت و نحو میں ابو زید انصاری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اہل کوفہ سے روایت کی چنانچہ ابو زید کی کتاب النوادر کا بیشتر حصہ مفضل ضبی سے منقول ہے۔ بصرہ میں ابو زید کا مستقل حلقہ تھا جس میں طلبہ شریک ہوتے تھے۔ ابو زید کی ثقاہت پر اتفاق ہے۔ ابو داود اور ترمذی نے ان کی روایتیں بھی نقل کی ہیں۔ خود ابو زید کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ سیبویہ اپنی کتاب میں جب اخبرنی الثقہ، سمعت من اثق بہ، یا حدثنی من اثق بعربیتہ کہتا ہے تو اس کی مراد ابو زید سے ہوتی ہے۔

ابو زید کی کتابوں میں ایک کتاب النوادر سعید شرتونی کی کوشش سے بیروت سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ لغات القرآن، خلق الانسان، اللامات، الجمع، التثنیہ، المصادر وغیرہ کے نام سے ابو زید کے بہت سے رسائل کا ذکر ملتا ہے۔

۳۔ عبدالوارث بن سعید تنوری (۱۲۰ - ۱۸۰ھ)

حافظ ابو عبیدہ عبدالوارث بن سعید تنوری[۴۱] بصرہ کے مشہور حفاظ حدیث میں سے تھے ابن سعد نے "ثقہ حجۃ" اور امام نسائی نے "ثقہ ثبت" لکھا ہے یحییٰ بن معین نے تنوری کو "اثبت شیوخ البصریین" میں شمار کیا ہے۔ محرم ۱۸۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

۴۔ ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ (۱۱۰ - ۲۰۹ھ)

ابو عبیدہ[۴۲] بنو تیم کا مولیٰ اور جامع کمالات شخصیت کا مالک تھا۔ ابو عمرو بن العلاء اور یونس نحوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ تلامذہ میں ابو عبید قاسم بن سلام، ابو حاتم سجستانی، مازنی، اثرم اور عمر بن شبہ قابل ذکر ہیں۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ ابو عبیدہ کا خاص میدان غریب اللغہ اور ایام و اخبار عرب کا موضوع تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں کی تاریخ، انساب اور لغت و اشعار کے بارے میں ابو عبیدہ کا علم بحر زخار کی مانند تھا۔ ان موضوعات پر ابو عبیدہ نے تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں جن میں مجاز القرآن اور نقائض جریر و الفرزدق شائع ہو چکی ہیں[۴۳]

۵۔ عبداللہ بن وہب (۱۲۵ - ۱۷۰ھ)

عبداللہ بن وہب بن مسلم قرشی مصری[۴۴]۔ ابو محمد کنیت تھی۔ قریش سے ولاء کا تعلق تھا اس لئے قرشی کہلائے۔ فقہ اور حدیث کے ایسے متبحر اور باکمال عالم تھے کہ "دیوان العلم" لقب پڑ گیا۔ بیس سال تک امام مالک کی صحبت میں رہے، امام مالک عبداللہ بن وہب کے بڑے معترف تھے اور اپنے خطوط میں انھیں "مفتی اہل مصر" سے خطاب کرتے تھے۔ امام مالک کی موطا کو انہوں نے الموطأ الصغیر اور الموطأ الکبیر کے نام سے مجموعوں میں مدون کیا تھا۔ ہارون بن عبداللہ زہری کا بیان ہے کہ امام مالک کے کسی قول کے بارے میں اہل مدینہ کے درمیان جب اختلاف ہوتا تو وہ ابن وہب کی آمد کا انتظار کرتے اور انھیں سے دریافت کرتے۔ ابن وہب کے شیوخ میں امام مالک، امام لیث، ابن جریج، عمرو بن الحارث،

حیین بن عبد اللہ معافری، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ جیسے ائمہ شامل ہیں ان سے روایت کرنے والوں میں خود ان کے شیخ امام لیث بن سعد کے علاوہ یحییٰ بن بکیر، علی بن المدینی اور یونس بن عبد الاعلیٰ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ ابوزرعہ کا قول ہے کہ میں نے ابن وہب کی تقریباً تیس ہزار حدیثوں کی تحقیق کی جو انہوں نے مصر اور غیر مصر میں بیان کیں لیکن مجھے ان میں کوئی بے اصل حدیث نہیں ملی۔ محدثین نے بالاتفاق ابن وہب کی توثیق کی ہے۔

۶۔ ابوبکر زبیری (م ۱۸۴ھ)

عبد اللہ بن مصعب بن ثابت بن عبد اللہ بن الزبیر ابوبکر زبیری مصعبی[۴۵]۔ ابو حازم، ہشام بن عروہ اور موسیٰ بن عقبہ کے شاگرد ہیں۔ ہارون رشید نے انھیں مدینہ اور یمن کا گورنر مقرر کیا۔ خطیب بغدادی نے ان کی جلالت قدر اور حسن کردار کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۴ھ میں انتقال کیا۔

۷۔ خلف الاحمر

ابو محرز خلف بن حیان مولی بلال بن ابی بردۃ[۴۶]۔ بلند پایہ شاعر اور ماہر نقاد و سخن شناس تھا۔ شمر کا قول ہے کہ خلف الاحمر پہلا شخص ہے جس نے بصرہ میں سماع کی ابتدا کی۔ خلف الاحمر کی ثقاہت کے بارے میں ابتدا ہی سے اختلاف رہا ہے۔ اگر ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ خلف الاحمر اشعار گھڑ کر شعرائے متقدمین کی جانب منسوب کر دیتا تھا تو دوسری طرف ابن سلام کا قول ہے کہ ہمارے اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ خلف سب سے بڑا سخن شناس اور راست گو تھا۔ خلف سے جب ہم کسی واقعہ کی روایت کرتے یا وہ ہمیں کوئی شعر سناتا تو ہمیں اس کا غم نہیں ہوتا تھا کہ ہم نے اسے صاحب واقعہ یا خود شاعر کی زبان سے نہیں سنا۔ یاد رہے کہ ابن سلام نے عربی شاعری میں وضع و نحل کے موضوع پر سب سے زیادہ لکھا ہے اور حماد راویہ اور ابن اسحٰق پر شدید نکتہ چینی کی ہے[۴۷]۔

۸۔ ھیثم بن عدی (۱۳۰۔۲۰۶ھ)

ابو عبد الرحمٰن طائی ثعلی بحتری کوفی[۴۸] مشہور راوی اور اخباری تھا۔ منصور، مہدی، ہادی اور ہارون رشید کا ہمنشین رہا۔ کلام عرب، ایام عرب اور تاریخ و انساب کا زبردست خزانہ اس کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے۔ ابن الندیم نے ھیثم کی پچاس سے اوپر کتابوں کا ذکر کیا ہے مثلاً کتاب المعمرین، کتاب بیوتات قریش، نسب طی، المثالب الکبیر، المثالب الصغیر، الوفود، خطط الکوفہ، ولاۃ الکوفہ، طبقات الفقہاء والمحدثین، النوادر، تاریخ الاشراف الکبیر، تاریخ الاشراف الصغیر وغیرہ۔

ابن ہشام کے چند شیوخ کے بارے میں جو مختصر معلومات مندرجہ بالا صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن علوم کو ابن ہشام نے اپنی صلاحیتوں کا محور بنایا تھا اُن کی تکمیل کے لئے ان علوم کے نامور اور یکتائے روزگار ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان کے بے کراں علم سے سیراب ہوئے۔

علمی مرتبہ

ابن ہشام نے یوں تو تمام مروجہ علوم کی تحصیل و تکمیل کی تھی لیکن تاریخ و سیرت اور علوم عربیہ میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ نحو میں ان کی مہارت کا یہ حال تھا کہ "نحوی" ان کے نام کا جزو بن گیا تھا۔ "ادیب، اخباری، نسابہ (ماہر انساب)" وہ صفات ہیں جو ہر تذکرہ نگار ابن ہشام کے حالات

میں ضرور لکھا ہے :

حافظ ابن کثیر (۷۰۱ - ۷۷۴ھ) نے ابن ہشام کے حالات میں امام شافعی کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے جس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے نقل کیا ہے کہ امام شافعی ابن ہشام کے بارے میں کہتے تھے :[۴۹]

"حجۃ فی اللغۃ" لغت میں حجت ہیں

امام شافعی کا یہ ارشاد جو خود بلند پایہ ادیب شاعر تھے بہت اہمیت رکھتا ہے ابن کثیر نے ابن ہشام کے حالات میں لکھا ہے :

وکان اماما فی اللغۃ والنحو ابن ہشام لغت اور نحو میں امام تھے۔

البدایۃ والنہایہ میں ایک قصیدہ مکمل نقل نہ کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے ابن کثیر نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ "یہ قصیدہ مکمل ہم نے صرف اس لئے درج نہیں کیا امام عبدالملک بن ہشام نے جو لغت کے امام تھے ذکر کیا ہے کہ اکثر علمائے شعر اس کی صحت کے منکر ہیں۔"[۵۰]

حافظ ابن یونس نے ابن ہشام کو ثقہ قرار دیا ہے اور ہمارے محدود علم کے مطابق کسی نے تجریح و تضعیف نہیں کی بلکہ ہر تذکرہ نگار اور مورخ نے ان کا ذکر احترام اور اعتراف کے ساتھ کیا ہے۔

تلامذہ

ابن ہشام کے تذکرہ نگاروں نے ان کے حالات میں ان کے کسی شاگرد کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ سیرت ابن ہشام کی روایت کی سندوں اور رجال کی کتابوں کے مطالعہ سے ابن ہشام کے تین تلامذہ کا پتہ چلتا ہے۔[۵۱]

۱۔ محمد بن عبداللہ (م ۲۴۹ھ)

۲۔ احمد بن عبداللہ (م ۲۷۰ھ)

۳۔ عبدالرحیم بن عبداللہ (م ۲۸۶ھ)

حسن اتفاق سے یہ تینوں تلامذہ ایک دوسرے کے حقیقی بھائی ہیں اور تینوں کا شمار حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ ان کے والد کا سلسلۂ نسب یہ ہے : عبداللہ بن عبدالرحیم بن سعید[۵۲] (س، ع، ی، د) بن ابی زرعہ زہری برقی۔ ان کے جد امجد ابو زرعہ قبیلہ بنی زہرہ کے مولی تھے اس لئے زہری کہلائے "برقی" (بسکون راء) کی نسبت ایک مشہور علاقہ "برقہ" کی جانب ہے جو ہمدانی کے بیان کے مطابق فسطاط سے دو سو بیس (۲۲۰) فرسخ پر آباد تھا۔ حافظ ابن یونس نے احمد بن عبداللہ کا ذکر اہل برقہ اور محمد بن عبداللہ کا اہل مصر میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ محمد بن عبداللہ اور ان کے بھائی برقہ میں تجارت کرتے تھے اس لئے برقی کی نسبت سے مشہور ہوئے حالانکہ ان کا تعلق مصر سے ہے۔

۱۔ محمد بن عبداللہ کی کنیت ابو عبداللہ تھی۔[۵۳] ابن ہشام کے علاوہ عمرو بن ابی سلمہ، اسد بن موسیٰ، موسیٰ بن ہارون، یحییٰ بن حسان، حمیدی، فریابی، ابو عبدالرحمٰن مقرئی اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے روایت کی۔ کتاب الضعفاء کے مصنف اور اس فن میں یحییٰ بن معین کے شاگرد ہیں۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے صاحبزادے عبداللہ، ابو داود، نسائی، عبیداللہ بن یحییٰ بن یحییٰ، محمد بن عبدالسلام خشنی، ابو حاتم، محمد بن معانی عمر بن بجیر اور مطرف بن عبدالرحمٰن بن قیس قابل ذکر ہیں۔ ابن یونس نے ثقہ قرار دیا ہے۔ ۲۴۹ھ میں انتقال کیا۔

۲۔ حافظ احمد بن عبداللہ کی کنیت ابوبکر ہے[۵۴]۔ ان کے شیوخ میں عمرو بن ابی سلمہ، سعید بن ابی مریم، اسد بن موسیٰ، ابو صالح کاتب اللیث اور اسی طبقہ کے دوسرے محدثین شامل ہیں۔ امام ذہبی نے انھیں "حافظ متقن" اور سمعانی نے "ثقہ ثبت" لکھا ہے۔ حافظ ابوبکر کے شاگردوں میں محمد بن اسمٰعیل بن الفرج المہندس اور احمد بن علی مدائنی مشہور ہیں۔ ذہبی نے صحابہ کے حالات پر حافظ ابوبکر کی ایک کتاب کا بھی ذکر کیا ہے لیکن سمعانی نے لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کتاب الصحابہ دراصل۔ ان کے بھائی محمد بن عبداللہ کی تصنیف ہے مگر وہ مکمل نہ کر سکے تو احمد بن عبداللہ نے اسے مکمل کیا اور اس کا درس دیا، دونوں کی سند ایک ہے۔ حافظ ابوبکر کا انتقال رمضان ۲۷۰ھ میں ہوا۔

۳۔ تیسرے بھائی عبدالرحیم بن عبداللہ کی کنیت ابوسعید ہے۔ سیرت ابن ہشام کی روایت میں یہ بھی اپنے دونوں مقدم الذکر بھائیوں کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کے شاگردوں میں عبداللہ بن جعفر بن الورد اور طبرانی کا ذکر ملتا ہے۔ ذی قعدہ ۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

تصنیفات

تذکرہ نگاروں نے ابن ہشام کی درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱۔ تہذیب سیرۃ ابن اسحٰق

یہی کتاب سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا مفصل تعارف آئندہ صفحات میں آئے گا۔

۲۔ کتاب التیجان فی ملوک حمیر[۵۵]

مآخذ میں اس کتاب کو مختلف ناموں سے ذکر کیا گیا ہے مثلاً "انساب حمیر و ملوکہا"، "شرح انساب حمیر و ملوکہا"، "التیجان فی اخبار ملوک الزمان" اس کتاب کی بنیاد وہب بن منبہ کی اس کتاب پر ہے جس کا ذکر "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر و اخبارہم و قصصہم و قبورہم و اشعارہم" کے نام سے وہب بن منبہ کے حالات میں ملتا ہے۔ ناموں کے اختلاف کے باوجود کتاب ایک ہی ہے جسے ابن ہشام نے اپنے حواشی اور اضافوں کے ساتھ مرتب کیا۔ ابن ہشام نے اس کتاب کی روایات اسد بن موسیٰ (۱۳۲ — ۲۱۲ھ) سے کی ہے[۵۶]۔ مکمل سند کتاب التیجان کے سرورق پر اس طرح ہے:

"اسد بن موسیٰ عن ابی ادریس بن سنان عن جدہ لامہ وہب بن منبہ" اس سند میں جو کتاب التیجان میں متعدد بار اسی طرح منقول ہے۔ دو غلطیاں ہیں:

۱۔ "ابی" اور "ادریس" کے درمیان "الیاس" چھوٹ گیا ہے۔ ابوالیاس ادریس بن سنان کی کنیت ہے۔

۲۔ ابوالیاس ادریس بن سنان اور اسد بن موسیٰ کے درمیان "عبدالمنعم" کا نام چھوٹ گیا ہے جو ادریس بن سنان کے بیٹے ہیں[۵۷]۔ اس لیے کہ عبدالمنعم کے بارے میں ابن ابی حاتم نے اسمٰعیلؒ بن عبدالکریم سے نقل کیا ہے کہ ان کی شیر خواری کے زمانہ ہی میں ان کے والد ادریس کا انتقال ہو چکا تھا۔ عبدالمنعم کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی اور ابن سعد کے مطابق تقریباً سو سال اور ابن ندیم کے بقول سو سال سے اوپر عمر پائی[۵۸]۔ گویا ادریس کا انتقال ۱۳۰ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اس صورت میں اسد بن موسیٰ کی ان سے روایت کیسے ممکن ہے جبکہ اسد بن موسیٰ کی پیدائش ۱۳۲ھ میں ہوئی۔

الروض الانف میں سہیلی نے متعدد مقامات پر کتاب التیجان کے حوالے دیئے ہیں[۵۹] اور ہمدانی نے کتاب الاکلیل کے آٹھویں حصہ میں کثرت سے اقتباسات نقل کئے ہیں[۶۰]۔

یہ کتاب آصفیہ لائبریری حیدر آباد، برٹش میوزیم لندن اور برلین کے تین مخطوطات کی بنیاد پر کرنکو اور مصححین دائرۃ المعارف العثمانیہ کی کوششوں سے ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوئی[۶۱]۔

۲۔ شرح ما وقع فی اشعار السیر من الغریب

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ابن ہشام نے مغازی کے شعری مواد کو موضوع بنایا تھا اور اشعار کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی تھی سہیلی کے انداز بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری تھی[۶۲]۔

تذکروں میں صرف انھیں تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ ابن ہشام کی تصنیفات کی فہرست اتنی مختصر نہیں رہی ہوگی[۶۳]۔ ابن ہشام کے سب سے قدیم اور قریب العہد تذکرہ نگار حافظ ابن یونس نے تو صرف سیرۃ ابن ہشام ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ ابن ہشام کی شہرت ابتداً ہی سے ایک نحوی اور امام لغت کی حیثیت سے ہوئی۔ قفطی نے انباہ الرواۃ میں ابن ہشام کے ترجمہ کا عنوان جو غالباً ابن یونس سے منقول ہے اس طرح لکھا ہے:

"عبد الملک بن ہشام بن ایوب الذہلی النحوی"

فن نحو سے صرف "واقفیت" کی وجہ سے کوئی شخص ہرگز "نحوی" کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا جب تک کہ اس فن میں خاطر خواہ مہارت اور کوئی تصنیف نہ ہو لیکن نحو پر ابن ہشام کے کسی رسالہ کا سراغ نہیں ملتا۔ بظاہر سیرت ابن ہشام کی غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے اُن کے تلامذہ سیرت ہی کی روایت و اشاعت میں مصروف رہے اور ابن ہشام کی دوسری کتابوں کی جانب توجہ نہیں کی اور وہ ضائع ہوگئیں۔

وفات

ابن ہشام کے سن وفات کے بارے میں دو قول ہیں: مورخ مصر حافظ ابن یونس (م ۳۴۷ھ) نے مکمل تاریخ وفات تیرہ (۱۳) ربیع الآخر ۲۱۸ھ لکھی ہے جبکہ سیرت ابن ہشام کے شارح سہیلی (م ۵۸۱ھ) نے صرف سن وفات ۲۱۳ھ ذکر کیا ہے۔

ابن ہشام کے نسب اور سن وفات کے بارے میں سہیلی کی رائے پر قفطی نے جو تنقید کی ہے اور ابن کثوم نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اس سے پہلے گذر چکا ہے۔ ابن یونس کا زمانی و مکانی قرب بھی پیش نظر ہے اس کے بعد ابن کثیر کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو انہوں نے البدایہ والنہایۃ میں ۲۱۳ھ کے واقعات میں ابن خلکان کے حوالہ سے سہیلی کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں:

والصحیح أنه توفي سنة ثمان عشرة	صحیح یہ ہے کہ ابن ہشام کی وفات ۲۱۸ھ میں ہوئی جیسا
ومائتين كما نص عليه ابوسعيد بن يونس	کہ ابوسعید بن یونس نے تاریخ مصر میں تصریح کی ہے
في تاريخ مصر۔	

اسی وجہ سے ابن کثیر نے یہاں صرف اس حوالہ پر اکتفا کیا اور ابن ہشام کے حالات ۲۱۸ھ کے واقعات میں لکھے، ہمارے خیال

بلیں ابن یونس کے بیان کو اس لیے بھی مستند ہونا چاہیے کہ انہوں نے ابنِ ہشام کی تاریخ وفات میں سہیلی کی طرح صرف سن نہیں لکھا جو معلومات کے ناقص ہونے کی دلیل ہے بلکہ تاریخ، مہینہ اور سن سب کا ذکر کیا ہے۔ ابو الفداؒ (م ۷۳۲ھ) نے ۲۱۸ھ کو "قیل" سے ذکر کیا ہے جبکہ یافعی[۶۴] (م ۷۶۸ھ) سیوطی[۶۵] (م ۹۱۱ھ) اور ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ کحالہ نے معجم المؤلفین میں ۲۱۳ھ کے لیے سیر النبلاء (مخطوط ۷ : ۲۳۶) کا حوالہ دیا ہے حالانکہ العبر میں ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے ابن ہشام کے حالات ۲۱۸ھ کے ضمن میں لکھے ہیں اور ۲۱۳ھ کی جانب اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

معاصرین میں جرجی زیدان، زرکلی اور کحالہ نے سہیلی کی تقلید کی ہے جبکہ براکلمان اور استوری نے ابن یونس کی روایت کو ترجیح دی ہے۔

سیرت ابن ہشام

مؤلف سیرت

سیرت ابن ہشام جس نے ابن ہشام کو شہرت عام اور بقائے دوام عطا کیا در اصل سیرت ابن اسحٰق کی تلخیص و تہذیب ہے۔

ابن اسحٰق[۶۶] کا نام محمد بن اسحٰق بن یسار تھا، قیس بن مخرمہ بن المطلب بن عبد مناف کے مولی تھے اس لئے مطلبی کہلائے۔ ابن اسحٰق کے دادا یسار ۱۲ھ میں عین التمر کی فتح میں قید ہو کر آئے تھے۔ ابن اسحاق کی پیدائش مدینہ میں ہوئی اور وفات بغداد میں سن وفات ۱۵۰ھ اور ۱۵۳ھ کے درمیان ہے۔ ابنِ خلکان نے ۱۵۱ھ کو راجح قرار دیا ہے۔

ابن اسحٰق امام زہری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں تحصیلِ علم کا ایسا شوق تھا کہ مدینہ سے نکلے اور اسکندریہ، کوفہ، جزیرہ، رے اور حیرہ کی سیاحت کرتے ہوئے بغداد پہنچے۔ دار السلام راس آ گیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اس طویل علمی سفر میں بے شمار شیوخ سے استفادہ کیا۔ ابن اسحٰق کی روایتوں اور کتب رجال کی روشنی میں ابن اسحٰق کے شیوخ کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) تک پہنچتی ہے۔[۶۷]

روایت حدیث میں ابنِ اسحٰق کے مرتبہ کے بارے میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ محدثین کی اکثریت انھیں ثقہ قرار دیتی ہے۔[۶۸] امام مسلم نے "متابعات" میں ان کی روایت نقل کی ہے۔ ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی ان کی روایتیں درج کی ہیں سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، یحییٰ بن سعید قطان جیسے ماہرین فن رجال نے ابن اسحٰق کی توثیق کی ہے اور ان کی حدیثوں سے استناد کیا ہے سب سے سخت نکتہ چینی امام مالک بن انس نے کی ہے جس کی پشت پر دونوں کی باہم چشمک کارفرما ہے ابن خلکان نے فیصلہ کن رائے دی ہے فرماتے ہیں:[۶۹]

"محمد بن اسحٰق بیشتر علماء کے نزدیک حدیث میں "ثبت" تھے، اور جہاں تک مغازی اور سیر کا تعلق ہے تو اس فن میں ان کی امامت سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔

ابن اسحٰق نے مغازی میں ایسا کمال پیدا کیا کہ خود ان کے شیخ امام زہری فرماتے ہیں:

من أراد المغازي فعليه بابن إسحٰق — جو شخص مغازی کا علم حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحٰق سے رجوع کرے

امام شافعی سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا گیا ہے[41]:

من أراد أن يتبحر في المغازي فهو عيال على محمد بن اسحٰق۔

جو شخص مغازی میں تبحر حاصل کرنا چاہے وہ محمد بن اسحٰق کا دستِ نگر ہے۔

سیرت و مغازی کے موضوع پر یوں تو ابنِ اسحٰق سے پہلے اور ان کے معاصرین میں متعدد علماء نے کتابیں لکھیں لیکن جو شہرت و مقبولیت مغازی ابن اسحٰق کے حصہ میں آئی وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہو سکی۔ دوسری کتابیں یا تو ضائع ہو گئیں یا تاریخ و سیر کی کتابوں میں اقتباسات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اس کے برعکس ابن اسحٰق کی مغازی ہمارے پاس ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی شکل میں موجود ہے۔

مغازی ابن اسحٰق کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابن ہشام جیسا خادم مل گیا جس نے اس کی تہذیب و تنقیح کا کام انجام دیا اور اس پہلو سے ابنِ ہشام سیرت ابن اسحٰق کی شہرت و مقبولیت میں شریک ہی نہیں شریک غالب ہے۔

راوی سیرت

فیوک (FUCK) نے ابن اسحٰق کے پندرہ (۱۵) شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق ثابت ہے کہ انہوں نے مغازی کی روایت کی[42]۔ ان میں یونس بن بکیر شیبانی (م ۱۹۹ھ) مسلمہ بن الفضل الابرش انصاری (م ۱۹۰ھ) ہارون بن ابی عیسی شامی یحیی بن سعید بن العاص اموی (م ۱۹۴ھ) محمد بن عبداللہ بن نصیر ہمدانی ابو عبدالرحمن کوفی نفیلی (م ۲۳۴ھ) اور ابراہیم بن سعد بن ابراہیم زہری (م ۱۸۲ھ یا ۱۸۵ھ) کی روایتوں کے اقتباسات تاریخ و طبقات کی کتابوں میں ملتے ہیں[43]۔ لیکن ابن اسحٰق کے تلامذہ میں سب سے زیادہ مشہور اور مستند روایت زیاد بکائی کی ہے۔ ابن ہشام کی سیرت کی بنیاد اسی روایت پر ہے۔

ابو محمد زیاد بن عبداللہ بن طفیل بن عامر قیسی عامری بکائی[44] کا شمار صاحب اتقان حفاظ حدیث میں ہوتا ہے۔ کوفہ کے رہنے والے تھے اور کوفہ ہی میں ۱۸۳ھ میں انتقال کیا۔ ابن اسحٰق کے علاوہ عبدالملک بن عمیر، حمید الطویل، عاصم الاحول، اعمش، یزید بن ابی زیاد اور حجاج بن ارطاۃ وغیرہ سے روایت کی۔ بکائی سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابو غسان نہدی، سہل بن عثمان، یوسف بن حماد اور عبداللہ بن سعید بن ابان اموی قابلِ ذکر ہیں۔

سیرت نبوی سے بکائی کے عشق اور شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ اس کے حصول کے لئے اپنا گھر بار فروخت کر کے ابن اسحٰق کے ساتھ ہو لیے اور ان کے ہمراہ گھومتے رہتے تا آنکہ ان سے مغازی کی سماعت مکمل کر لی یہی نہیں بلکہ اپنی روایت کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لئے دوبارہ اس کی سماعت کی۔ اسی وجہ سے ان کی روایت کو سیرت ابن اسحٰق کی دوسری روایتوں پر فوقیت حاصل ہوئی۔

امام بخاری نے اپنی تاریخ میں بکائی کے بارے میں وکیع بن الجراح کا قول نقل کیا ہے کہ "زیاد کا مرتبہ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ حدیث میں غلط بیانی سے کام لیں" امام ترمذی سے یہ چوک ہوئی کہ انہوں نے اس جملہ کو الٹ دیا اور وکیع کی جانب یہ منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا "زیاد بن عبداللہ اپنے شرف اور بلندی کے باوجود حدیث میں غلط بیانی سے کام لیتے تھے"[45]۔ سہیلی لکھتے ہیں کہ امام ترمذی کو وہم ہوا۔ وکیع نے زیاد کے بارے میں وہی بات کہی تھی جو بخاری نے تاریخ میں نقل کی ہے ورنہ اگر وکیع ان پر کذب کا الزام لگاتے تو امام بخاری و مسلم ان سے

ایک حدیث بھی نقل نہ کرتے جس طرح کہ انہوں نے الحارث الاعور اور ابان بن عیاش کی کوئی روایت اس لئے نہیں درج کی کہ متقدم الذکر پر شعبی نے اور موخر الذکر پر شعبہ نے یہی الزام لگایا۔ بکائی کے بارے میں امام سُہیلی کا یہ قول قولِ فیصل کا درجہ رکھتا ہے کہ "بکائی کی توثیق و تزکیہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ امام بخاری نے کتاب الجہاد اور امام مسلم نے متعدد مقامات پر ان کی روایتیں نقل کی ہیں۔"

بعض محدثین نے روایت حدیث کے سلسلہ میں انھیں ضعیف قرار دیا ہے لیکن ابن اسحٰق سے مغازی کی روایت میں ان کے ثقہ ہونے کے وہ بھی قائل ہیں اور ابن اسحٰق کے دوسرے راویوں پر انھیں ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ صالح بن محمد کہتے ہیں کہ کتاب المغازی کی صحیح ترین روایت زیاد کی ہے۔ زیاد فی نفسہ ضعیف ہیں لیکن اس کتاب میں وہ سب سے زیادہ "ثبت" ہیں۔ ابن معین سے — جنہوں نے "زیاد بکائی ابن اسحٰق کے بارے میں ثقہ ہیں" کہہ کر گویا دوسرے شیوخ سے نقل و روایت میں زیاد کی تضعیف کی ہے۔ جب عثمان دارمی نے دریافت کیا کہ میں مغازی کی روایت یونس بن بکیر کے شاگردوں سے حاصل کروں یا دوسروں سے تو انہوں نے فرمایا :

اکتب عن اصحاب البکائی — بکائی کے اصحاب سے نقل کرو

ابن ادریس کا قول ہے کہ ابن اسحٰق سے روایت کرنے والوں میں ان سے زیادہ "ثبت" کوئی نہیں اس لئے کہ ابن اسحٰق نے اپنی کتاب انھیں دو بار املا کرائی تھی۔

ابن تغری بردی کے الفاظ ہیں :

وھو أتقن من روی عنہ السیرۃ — سیرت جن لوگوں سے منقول ہے ان میں سب سے زیادہ صاحبِ اتقان زیاد بکائی ہیں۔

سخاوی نے اپنی کتاب الاعلان بالتوبیخ میں سیرت ابن اسحٰق کے راویوں میں بکائی اور یونس بن بکیر کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ دونوں میں بکائی زیادہ ثقہ ہیں (اولھما أوثقھما)

یہ ابن ہشام کی بالغ نظری اور سیرت نبوی کی تدوین میں ان کی انتہائی احتیاط اور اہتمام کی دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت ابن اسحٰق کے لئے سیرت کے اس شیدائی کا انتخاب کیا جس کے بارے میں محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کی روایت مستند ترین روایت ہے۔ ابن ہشام کے نزدیک بکائی کس درجہ ثقہ اور معتبر تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق کی ان مرویات کو ابن ہشام نے سیرت سے خارج کر دیا جن کی تصدیق زیاد بکائی نے نہیں کی۔

ابن حجر کا خیال ہے کہ ابن ہشام نے زیاد بکائی سے سیرت کی روایت کوفہ میں کی۔ لیکن اس کی از سر نو تدوین اور تلخیص و تہذیب کا کام بصرہ میں شروع ہوا اور تنقیح و تحقیق کا سلسلہ مصر کے زمانۂ قیام تک جاری رہا۔

ابن ہشام کا کارنامہ

سیرت ابن ہشام کی روایت کی توثیق کے بعد آئیے ابن ہشام کے اس عظیم کارنامہ کا جائزہ لیں جس کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ابن اسحٰق کے کارنامہ سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

کتاب کے آغاز میں خود ابن ہشام نے اپنے کام کے بعض بنیادی پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ ابن ہشام کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو (صفحہ ۴)

"میں انشاء اللہ اس کتاب کو اسمٰعیل بن ابراہیمؑ کے ذکر سے شروع کروں گا، اور اسمٰعیلؑ سے آنحضرتؐ تک اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے یکے بعد دیگرے ان لوگوں کا ذکر ہوگا جو آپؐ کے آباؤ اجداد میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بھی لکھوں گا۔ اختصار کی وجہ سے ان کے سوا حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے دوسرے لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا۔ اختصار ہی کے پیش نظر بعض ایسی روایات کو بھی خارج کروں گا جن کا ذکر ابن اسحاق نے اس کتاب میں کیا ہے لیکن ان میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے نہ ان کے بارے میں قرآن مجید کی کوئی آیت نازل ہوئی۔ نیز ان سے کتاب کی کسی بحث کی توجیہہ، تشریح یا تائید بھی نہیں ہوتی۔ ان اشعار کو بھی شامل نہیں کروں گا جن کے بارے میں ان ماہرین شعر کو جن سے میری ملاقات ہوئی کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اسی طرح بعض وہ باتیں بھی قلم انداز کر دی ہیں جن کے بیان کرنے سے زبان آلودہ ہوتی ہے یا ان سے کسی کی دلآزاری ہوتی ہے یا بکائی نے ان کی روایت پر اطمینان ظاہر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے علم و روایت کی حد تک انشاء اللہ اس کا استقصا کروں گا۔"

مذکورہ بالا عبارت میں ابن ہشام نے اپنے کام کے منفی رُخ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اس لیے کہ اس کا تعلق ابن اسحٰق کی کتاب میں حذف و ترمیم سے تھا اور ابن ہشام کی وضاحت کے بغیر اس کے اسباب کا علم ممکن نہ تھا لیکن مثبت طور پر ابن ہشام نے سیرت کی جو خدمت کی ہے اس کی جانب آخر میں ایک سرسری اشارہ پر اکتفا کیا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، کتاب خود شاہد عدل ہے۔ نیز ابن ہشام کی عالی ظرفی اور خاکساری کو خود سرائی گوارا نہ ہوئی۔

تلخیص و تدوین جدید

ابن ہشام کی مذکورہ تبدیلیوں کو ہم "سیرت ابن اسحٰق کی تلخیص و تدوین جدید" کا عنوان دے سکتے ہیں جو سیرت ابن ہشام کی تیاری میں "روایت" کے بعد دوسرا قدم تھا۔ ان تبدیلیوں کی پانچ بنیادیں تھیں:

۱۔ ترکیز

ہر چند کہ ابن اسحٰق کی اصل کتاب مفقود ہے لیکن مختلف ماخذ میں اس کے جو اقتباسات ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب خاصی ضخیم تھی اور اس کے تین حصے تھے: المبتدا، المبعث، المغازی۔ پہلے حصہ "المبتدا" میں حضرت عیسیٰؑ تک رسالت کی تاریخ، عرب بائدہ اور جاہلی یمن کی تاریخ، عرب قبائل اور ان کی بت پرستی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی آباؤ اجداد اور اہل مکہ کے رسوم و عقائد سے بحث تھی۔ یہ حصہ دراصل سیرت النبی کا مقدمہ تھا۔ کتاب کا دوسرا حصہ "المبعث" آپؐ کی ولادت باسعادت سے شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ میں آپؐ کی مکی زندگی کے بارے میں معلومات جمع کی گئی ہیں۔ تیسرا حصہ "المغازی" مدنی زندگی کی تاریخ ہے[۴۹]۔ ابن ہشام نے اپنے بیان کے مطابق اس مواد میں اختصار کی غرض سے حسب ذیل تبدیلیاں کیں:

آنحضرتؐ سے قبل رسالت کی تاریخ اور عرب بائدہ کا ذکر حذف کر دیا اور سیرت کا آغاز حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا اور ان کی اولاد میں سے

بھی صرف ان لوگوں کا تذکرہ کیا جو آپ کے براہ راست اجداد میں شامل تھے۔ اسی طرح ابن اسحٰق کی کچھ روایات کو اس لئے خارج کر دیا کہ :

الف : ان روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہیں تھا۔

ب : قرآن مجید میں ان کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ج : ان سے کتاب کی کسی بحث کی توجیہہ و تعلیل نہیں ہوتی۔

د : ان سے کسی مسئلہ کی تشریح و توضیح نہیں ہوتی۔

ہ : ان سے کسی بحث کی تائید نہیں ہوتی۔

ابنِ ہشام نے بعض قصائد کو بھی اسی وجہ سے حذف کر دیا کہ پورے قصیدہ میں مثلاً صرف ایک شعر میں غزوہ بدر کا ذکر تھا (۲: ۳۸)

اس تبدیلی سے ابنِ ہشام کا مقصد ابنِ اسحٰق کی کتاب سے ان مباحث کو خارج کرنا تھا جن کا سیرت سے براہ راست تعلق نہیں ہے علمی و تاریخی حیثیت سے ان مباحث کی جو بھی قیمت رہی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ سیرت کے نقطۂ نظر سے یہ مباحث غیر ضروری تھے اور اصل موضوع سے ان کا رشتہ برائے نام تھا۔

۲۔ توثیق

ان مباحث کے علاوہ ابنِ ہشام نے وہ قصائد بھی حذف کر دیے جن کے بارے میں سارے ناقدین اور رواۃ شعر نے لاعلمی ظاہر کی، اس طرح موضوع شاعری کا ایک بڑا حصہ سیرت سے خارج ہو گیا۔ اسی طرح ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی وہ مرویات بھی حذف کر دیں جو زیاد بکائی کے علم و روایت کی رو سے صحیح نہیں تھیں۔ اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ سیرت النبی کی یہ تدوین زیادہ سے زیادہ مستند ہو۔

۳۔ تطہیر

ابن اسحٰق کی کتاب میں حذف کی تیسری بنیاد جو ابن ہشام نے ذکر کی ہے اسے ہم تطہیر کا نام دے سکتے ہیں — ابن اسحٰق کے مروی قصائد میں بہت سے اشعار فحش ہجو اور بدزبانی و بے حیائی کا نمونہ تھے۔ ابنِ ہشام نے ایسے تمام اشعار سے سیرت کو پاک کیا قطع نظر اس سے کہ یہ اشعار مشرکین کے ہوں یا مسلمانوں کے۔[۹]

۴۔ دلآزاری کا اندیشہ

حذف کی چوتھی بنیاد اخلاقی ہے اور اگر اس کا محل متعین طور پر ایک ہی ہے جیسا کہ موجودہ دور کے محققین کا خیال ہے تو اسے ہم "سیاسی" بھی کہہ سکتے ہیں۔[۱۰] ابن ہشام نے اپنے بیان کے مطابق کتاب کی بعض مرویات کو اس لئے حذف کر دیا کہ ان کا ذکر دلآزاری کا موجب تھا حذف کی یہ بنیاد غیر علمی ہے اور سیرت کے بارے میں یہ شبہ پیدا کرتی ہے کہ اس طور پر ابن ہشام نے کتنی ہی معلومات حذف کر دی ہوں گی، لیکن حذف و ترمیم کے عمل میں ابن ہشام نے جس دیانتداری اور دقت نظر کا ثبوت دیا ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ شبہ باقی نہیں رہتا خود اس بنیاد پر سیرت میں جہاں حذف بیان کیا جاتا ہے اگر اس کا مطالعہ کریں تو ابن ہشام کا "اخفاء" "اظہار" سے کم تر نظر نہ آئے گا۔

غزوہ بدر کے قریشی قیدیوں کی جو فہرست ابن اسحٰق نے پیش کی ہے وہ خاندانوں کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے ہر خاندان کے قیدیوں کا ذکر کر کے ان کی تعداد ساتھ ہی لکھ دی ہے۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کا ذکر ہے اور ان میں صرف عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن الحارث کا نام لیا گیا ہے اور تعداد نہیں بتائی جبکہ دوسرے تمام قبائل کے ساتھ "رجلان"

(دو آدمی) "سبعۃ نفر" (۷ آدمی) وغیرہ جیسے الفاظ ہیں۔ فہرست کے آخر میں ابن اسحٰق کا یہ نوٹ بھی درج ہے کہ ہمارے علم کے مطابق ان قیدیوں کی تعداد ۴۳ ہے۔ اس نوٹ کی روشنی میں مذکور قیدیوں کو شمار کیا جائے تو ایک عدد کم ہوتا ہے اور صرف ۴۲ تعداد ہوتی ہے۔ ابن اسحٰق کے نوٹ سے متصل ابن ہشام نے یہ وضاحت کی کہ "اس تعداد میں ایک اور شخص بھی شریک تھا جس کا نام ہم نے ذکر نہیں کیا" (۱:۷)

اتنی تصریحات کے بعد اور اس زمانے میں جب سارے لوگ اس سے واقف ہوں کہ غزوہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے ابن ہشام کو زیادہ مورد الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۵۔ تقاضائے فن

بعض مقامات پر حذف کی بنیاد خالص ادبی اور فنی ہے۔ ابن ہشام نے اپنے مقدمہ میں اس کا ذکر ضروری نہیں سمجھا لیکن حذف کے دوسرے مواقع کی طرح یہاں بھی وضاحت کر دی ہے۔ مثلاً حسان بن ثابتؓ کے جواب میں ابو سفیان بن الحارث بن عبد المطلب کا ایک کافیہ قصیدہ ہے جس کے دس اشعار ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ اسکے بعد لکھتے ہیں:

"اس قصیدہ میں کچھ شعر باقی رہ گئے ہیں جنھیں ہم نے اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے قوافی میں قبیح اختلاف پایا جاتا ہے۔" (۲:۲۱۳)

تہذیبِ متن

مذکورہ بالا مواد حذف کرنے کے بعد ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی روایت کو بعینہٖ نقل نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھیں وجوہ سے بہت سے مقامات پر متن کے الفاظ میں ترمیم بھی کی خصوصاً اشعار میں ابن اسحٰق کی روایت کے بجائے معتبر اور مشہور راویان شعر کی روایت کو ترجیح دی ہے مثلاً ابن اسحٰق نے عمرو بن الحارث بن مضاض کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ قصیدہ کا بارھواں شعر ہے:

الم تنکحوا من خیر شخص علمتہ   فأبناؤہ منا ونحن الأصاھر

ابن ہشام نے مکمل قصیدہ نقل کرنے کے بعد یہ نوٹ لکھا (۱:۱۱۶)

"قولہ: "فابناؤہ منا" عن غیر ابن اسحٰق" شاعر کا قول "فابناؤہ منا" ابن اسحٰق سے مروی نہیں ہے۔

اسی طرح ابن اسحٰق نے جنگ بدر سے آنحضرتؐ کی واپسی کے حال میں لکھا ہے:

"ثم خرج حتی إذا کان بعرق الظبیۃ قتل عقبۃ بن أبی معیط"

اس عبارت پر ابن ہشام کا حاشیہ ملاحظہ ہو (۱:۶۴۴)

قال ابن ھشام: "عرق الظبیۃ" عن غیر ابن اسحٰق"

بعض مقامات پر کسی مشرک شاعر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ لفظ استعمال کیا تھا۔ ابن ہشام نے اس لفظ کو نکال کر اس کی جگہ کوئی مناسب لفظ رکھ دیا ہے مثلاً حارث بن ہشام بن المغیرۃ کا ایک رائیہ قصیدہ جس کے تین شعر یہ ہیں:

فیال لؤی ذبّوا عن حریمکم   وآلھۃ لا تترکوھا الذی الفخر

توارثھا آباؤکم وورثتم   أواسیھا والبیت ذا السقف والستر

فما الحلیم قد أرا دهلاککم   فلا تعذروه آل غالب من عذر

پورا قصیدہ نقل کرنے کے بعد ابن ہشام نے یہ صراحت کی ہے:

"اس قصیدہ کے دو لفظ جو ابن اسحٰق کی روایت میں تھے ہم نے بدل دیے ایک شعر کے آخر میں "الفخر" اور دوسرے شعر کے شروع میں "فما الحلیم" اس لئے کہ ان الفاظ میں شاعر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔" (۱ : ۱۱)

ان مقامات پر ابن ہشام نے ان الفاظ کی نشاندہی نہیں کی۔ جو ابن اسحٰق کی روایت میں تھے اور جن کی جگہ پر دوسرے الفاظ کا انتخاب کیا گیا۔ اسی طرح آخری صورت کے سوا دوسری جگہوں پر ترمیم کے مقصد کی بھی وضاحت نہیں کی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس ترمیم و تصرف کا مقصد متن سیرت کو خوب تر، مفید تر اور زیادہ پاکیزہ اور معتبر بنانا تھا۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

اس موقع پر ناگزیر طور پر ایک شبہ ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ حذف و ترمیم کے اس طویل اور گوناگوں مراحل سے گزرنے کے بعد ابن ہشام کے واسطہ سے سیرت النبی کی جو روایت ہم تک پہنچی ہے اس میں روایت ابن اسحٰق کا حلیہ اس قدر بدل چکا ہوگا کہ اس کی شناخت ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوگی اور ابن اسحٰق کے سلسلہ میں اس روایت پر اعتماد کرنا صحیح نہ ہوگا۔

یہ شبہ یقیناً درست ہوتا اگر ابن ہشام نے اپنے قاری کو ان تبدیلیوں سے بے خبر رکھا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں ابن ہشام نے غیر معمولی احتیاط اور دیانت داری کا مظاہرہ کیا ہے اور پوری سیرت میں اپنی جانب سے جہاں کہیں کوئی معمولی سی ترمیم بھی کی ہے۔ اس کی جانب اشارہ ضرور کر دیا ہے تاکہ ابن اسحٰق کی روایت خلط ملط نہ ہونے پائے۔ ابن اسحٰق کے سلسلہ میں ابن ہشام کی غایت درجہ احتیاط کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو: مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت علیؓ ایک رجز پڑھ رہے تھے۔ پھر اسے حضرت عمار بن یاسرؓ پڑھنے لگے، جب یہ رجز خوانی طویل ہوئی تو ایک صحابی کو گمان گذرا کہ رجز میں ان پر تعریض کی گئی ہے۔ یہ صحابی کون تھے؟ ابن ہشام نے اُن کا نام نہیں بتایا لیکن ابن اسحٰق نے نام ذکر کیا تھا۔ ابن ہشام کی دیانت داری دیکھئے کہ صراحت کرتے ہیں (۲ : ۲۹۷)

وقد سمی ابن اسحٰق الرجل۔   ابن اسحٰق نے ان صحابی کا نام لیا تھا۔

روایت ابن اسحٰق کے بارے میں ابن ہشام نے ہمیں پوری روشنی میں رکھا ہے اور ہم نہایت آسانی سے ابن اسحٰق کے متن کو ابن ہشام کے حواشی سے علٰحدہ کر سکتے ہیں اور یہ متن یقیناً مستند ترین متن ہوگا۔ گیوم نے LIFE OF MUHAMMAD میں ایسا ہی کیا ہے۔

حواشی اور تعلیقات

سیرت ابن اسحٰق کی روایت، تلخیص اور تہذیب کے بعد ابن ہشام نے نہایت اہتمام اور تحقیق سے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھیں جن کی وجہ سے سیرت کی افادیت میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ ان حواشی کی تعداد گیوم کے مطابق (۹۱۲) نو سو بارہ اور انگریزی ترجمہ کی روشنی میں ان کا حجم کل کتاب کے تقریباً آٹھویں حصہ کے برابر ہے۔

یہ حواشی ضرورت اور موقع کے لحاظ سے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ سب سے طویل حاشیہ ازواج مطہرات پر ہے جو تقریباً چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان حواشی کے مطالعہ سے جو تحقیق و تفحص کا اعلیٰ نمونہ اور ابن ہشام کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا روشن ثبوت ہیں پتہ چلتا ہے کہ سیرت النبی کی خدمت میں ابن ہشام نے اپنی ساری صلاحیتیں نچوڑ کر رکھدی ہیں۔

یہ حواشی سیرت کے اعلام و انساب کی تحقیق، ابن اسحٰق کے روایت کردہ شعری مواد کی چھان بین، ابن اسحٰق کی معلومات پر اضافہ و استدراک، ابن اسحٰق سے اختلاف، اوہام و اغلاط پر تنبیہ اور ان کی تصحیح، دوسری روایتوں کا ذکر یا کسی اور روایت کی ترجیح، ابن اسحٰق کے بیان کی تائید اور ان کے حق میں مزید دلائل، اجمال کی تفصیل، شبہات کا ازالہ، مشکل الفاظ کی تشریح اور دوسرے بیشمار و بیش قیمت تاریخی و ادبی افادات پر مشتمل ہیں۔

ابن ہشام نے اپنے حواشی میں ابن اسحٰق کی جن غلطیوں کی تصحیح کی ہے وہ مختلف قسم کی ہیں بعض کا تعلق اعلام کے نسب سے ہے مثلاً ابن اسحٰق نے قطبہ بن عامر کا نسب اس طرح بیان کیا۔

"قطبہ بن عامر بن حدیدہ بن عمرو بن غنم بن سواد" (۱ : ۴۴)

ابن ہشام نے حاشیہ لکھ

قال ابن هشام: عمرو بن سواد، وليس لسواد ابن يقال له غنم۔	ابن ہشام نے کہا: عمرو بن سواد کا کوئی بیٹا غنم نام کا نہیں تھا۔

اسی طرح عبدالرحمٰن جشمی کا نسب ابن اسحٰق نے یہ لکھا:

"عبدالرحمن بن مالک بن جعشم" (۱ : ۴۸۹)

ابن ہشام نے اس کی تصحیح یوں کی ہے:

قال ابن هشام: عبد الرحمٰن بن الحارث بن مالک بن جعشم۔

یعنی عبدالرحمٰن ملک کے بیٹے نہیں ہیں جیسا کہ ابن اسحٰق کے نسب سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ پوتے ہیں ان کے باپ کا نام حارث ہے۔

بعض غلطیوں کا تعلق سیرت کے واقعات سے ہے مثلاً ابن اسحٰق نے حارث بن سوید کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس نے غزوہ احد میں مجذر بن زیاد بلوی اور بنی ضبیعہ کے ایک فرد قیس بن زید کو قتل کیا تھا۔ لیکن ابن ہشام کے نزدیک صرف مجذر کو قتل کیا تھا (۱ : ۵۲۰)

اسی طرح اشعار کی نسبت اور پس منظر میں ابن اسحٰق سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کی تصحیح بھی ابن ہشام نے کی ہے۔ مثلاً ابن اسحٰق نے ابو قیس صرمتہ بن ابی انس کے ایک قصیدہ میں افنون تغلبی کا ایک شعر شامل کر دیا۔ افنون کا نام صُریم بن معشر ہے صرمہ اور صریم کی لفظی قربت کی وجہ سے غالباً اشتباہ ہوا۔ ابن ہشام نے اس کی تصحیح کی (۱ : ۵۱۳)

ابن اسحٰق کی مرویات پر ابن ہشام نے جو قابل قدر اضافے کئے ہیں ان میں چند کا ذکر بطور مثال کیا جاتا ہے۔

ابن اسحٰق نے غزوہ بدر کے قیدیوں میں ۴۳ اشخاص کا ذکر کیا ہے، ابن ہشام نے اس تعداد پر ۲۳ کا اضافہ کیا ہے (۲ : ۷-۸)

اسی طرح غزوہ احد میں جو مسلمان شہید ہوئے ان کی تعداد ابن اسحٰق نے [illegible] بیان کی ہے۔ ابن ہشام نے پانچ ناموں کا اضافہ

کیا ہے۔ (۲: ۱۲۷)
آنحضرتؐ کی وفات پر ابن اسحٰق کی روایت سے حضرت حسان بن ثابت کے اشعار ذکر کرنے سے قبل ابو زید انصاری کی روایت سے حضرت حسان ہی کے دو طویل اور مستند مرثیے نقل کئے ہیں۔ (۲: ۶۶۶ - ۶۷۰)

ابن ہشام امام لغت تھے سیرت کے اشعار میں جو مشکل اور نا مانوس الفاظ آتے ہیں ان کی تشریح سے انھیں بہت دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بھی تصنیف کی تھی جیسا کہ گذر چکا۔ یہ کتاب اگرچہ ضائع ہوگئی لیکن سیرت ابن اسحٰق پر اس جہت سے جو کام انہوں نے کیا ہے اس کی روشنی میں مذکورہ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

مذکورہ کتاب میں ان کی کوشش صرف سیرت کے شعری مواد تک محدود تھی لیکن سیرت ابن اسحٰق میں اس کا خصوصی میدان قرآنی آیات ہیں الفاظ کی شرح میں ابن ہشام کا عام نہج یہ ہے کہ وہ لفظ کی تشریح میں کلام عرب سے استشہاد کرتے ہیں اور ساتھ ہی شاعر کے پورے نام اور شواہد کے مشکل الفاظ کی بھی وضاحت کرتے جاتے ہیں۔ لفظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں تو ہر معنی کے لیے شواہد پیش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تشریح میں اپنے شیوخ کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ جو شعر پیش کرتے ہیں وہ اگر کسی قصیدہ کا جزء ہے تو اس کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں الفاظ کی یہ شرح کبھی کبھی طویل ہو جاتی ہے مثلاً ارشاد باری " فمنهم من قضیٰ نحبه " میں لفظ "نحب" کی تحقیق پورے ایک صفحہ میں ہے (۲: ۲۴۸)

شعری مواد کی تحقیق و تنقید

سیرت ابن اسحٰق کی ایک نہایت اہم خدمت جو ابن ہشام نے کی وہ ابن اسحٰق کے روایت کردہ شعری مواد کی تحقیق و تنقید ہے[۸۲]۔
ابن اسحٰق پر ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے سیرت النبی میں موضوع و منحول اشعار بھر دیئے۔ اس سلسلہ میں ابن سلام نے خاص طور پر سخت نکتہ چینی کی۔ ابن اسحٰق نے اگرچہ یہ معذرت پیش کر کے اپنے کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی کہ وہ شاعری کے مرد میدان نہیں ہیں ان کے سامنے جو قصائد پیش کئے جاتے ہیں وہ انھیں نقل کر لیتے ہیں لیکن ناقدین کو ان کے اس جواب سے تشفی نہیں ہوئی اس لئے کہ ابن اسحٰق نے عاد و ثمود تک کے اشعار درج کر لئے تھے جن کے بارے میں قرآن مجید کی شہادت ہے کہ وہ دنیا سے اس طرح نیست و نابود ہو گئے کہ ان کا نام و نشان باقی نہیں رہا[۸۳]۔

ابن ہشام کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سیرت ابن اسحٰق کے شعری ذخیرہ کا جائزہ لیا ایک ایک قصیدہ کی تحقیق کی۔ کلام عرب کے جو معتبر راوی اور نقاد اس وقت موجود تھے ان سے استفسار کیا اور ان کے بیانات ریکارڈ کئے۔ فن کی کسوٹی پر بھی پرکھا اور ہر قصیدہ کو اس کے پایۂ استناد کے مطابق درج کیا۔ اشعار کی تحقیق میں ابن ہشام کی محنت اور کاوش کا اندازہ درج ذیل مثال سے کیا جا سکتا ہے۔

ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران حضرت علیؓ یہ رجز پڑھتے تھے:

لا یستوی من یعمر المساجدا   یدأب فیه قائما و قاعدا

ومن یری عن الغبار حائدا

ابن ہشام نے اس کی تحقیق کی کہ یہ رجز کس کا ہے۔ اس تحقیق کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے ایک سے زیادہ (غیر واحد) علمائے شعر سے اس رجز کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے جواب دیا کہ ہم کو بس یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب نے یہ رجز پڑھا تھا، یہ معلوم نہیں کہ یہ رجز خود انھیں کا ہے یا کسی اور کا۔" (۱: ۴۹۷)

اسی طرح ابن اسحٰق نے ایک قصیدہ حضرت علیؓ کی جانب منسوب کیا ہے جس میں بنو النضیر کی جلا وطنی اور کعب بن الاشرف کے قتل کا ذکر ہے۔ اس قصیدہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کوئی عالم شعر ایسا نہیں تھا جس کے دروازے پر ابن ہشام نے دستک نہ دی ہو جیسا کہ ان کے اس نوٹ سے ظاہر ہے:

"یہ قصیدہ حضرت علی بن ابی طالب کے بجائے کسی اور مسلمان کا ہے جیسا کہ بعض علمائے شعر نے مجھ سے ذکر کیا اور علمائے شعر میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا جو اسے حضرت علی کے قصیدہ کی حیثیت سے جانتا ہو۔" (۲: ۱۹۶)

سیرت ابن اسحٰق کے اشعار کے سلسلہ میں ابن ہشام کے نہج کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ ان اشعار کی تحقیق میں انہوں نے اپنے دور کے معتبر اور معروف رواۃ شعر سے رجوع کیا اور جو قصائد کسی راوی کے علم میں نہیں تھے یا خود انھیں موضوع معلوم ہوئے انھیں حذف کر دیا۔ ان اشعار کو بھی حذف کر دیا جن میں بدکلامی یا صحابہ پر سب و شتم تھا، اس کے علاوہ فنی سقم اور طوالت کے اندیشے سے بھی اشعار خارج کئے جیسا کہ گزر چکا۔

۲۔ روایت کے اعتبار سے اشعار کا جو مرتبہ اور ان کے بارے میں معتبر راویوں کی جو رائے ہے اسے بیان کرنے کے لیے اسی طرح کے مناسب اور متعین الفاظ کا انتخاب کیا۔ یہ عبارتیں چار طرح کی ہیں جن سے اس شعری مواد کی درجہ بندی ہوتی ہے:۔

۱۔ لم أر أحدا من أهل العلم بالشعر يعرفها

۲۔ اكثر اهل العلم بالشعر ينكر هاله

۳۔ اكثر أهل العلم بالشعر ينكر نيهاله

۴۔ بعض أهل العلم بالشعر ينكر هذا الشعر له أو ينكر أكثرها

۳۔ ابن ہشام نے اشعار کے رد و قبول میں اپنی تنقیدی بصیرت بھی استعمال کی ہے اور بغیر کسی راوی کے حوالہ کے مستقل فیصلہ کن تبصرے بھی کئے ہیں مصطفیٰ السقا اور ان کے رفقاء نے سیرت ابن ہشام پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں امام شافعی اور ابن ہشام کی ملاقات پر تعجب ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ذہبی اور ابن کثیر بیان کرتے ہیں کہ ابن ہشام جب مصر آئے تو امام شافعی نے ان سے ملاقات کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب کلام عرب سنایا اس روایت پر تعجب ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ابن ہشام اس کتاب میں ابن اسحٰق سے ایسے اشعار نقل کرتے ہیں جو واضح طور پر گھڑے ہوئے ہیں لیکن ان اشعار کے بارے میں خود کوئی قطعی رائے نہیں دیتے اور کہتے ہیں: اسی طرح علمائے شعر نے ہم سے بیان کیا، گویا ان کی رائے نقل کرتے ہیں اور ذوق کو حکم نہیں بناتے جو اس شخص کو حاصل ہونا چاہیے جس نے اشعار کا اس طرح استقصا کیا ہو۔"

قطع نظر اس سے کہ ابنِ کثیر اور ذہبی کی عبارت کو سمجھنے میں مقدمہ نگاروں سے چوک ہوئی اور صحیح صورت یہ ہے کہ امام شافعی جب مصر آئے تو انہوں نے ابن ہشام سے ملاقات کی۔ ابن ہشام پہلے سے مصر میں مقیم تھے۔[۸۴] سقا وغیرہ کا مذکورہ بالا تبصرہ غیر ذمہ دارانہ ہے۔ اول تو انہوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ ابن ہشام کے دَور میں "روایت" کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ کلام عرب کے مستند رواۃ موجود تھے ان کی مدد سے اس کی تحقیق کی جا سکتی تھی اور ابن ہشام نے معتبر ترین علمائے شعر سے رجوع کیا۔ دوم یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ابن ہشام نے اشعار کے سلسلہ میں اپنی کوئی رائے نہیں دی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ابن اسحٰق نے تبع کا ایک شعر نقل کیا ہے اس پر ابن ہشام نے یہ حاشیہ لکھا (۱ : ۲۳)

الشعر الذی فی ھذا البیت مصنوع — اس بیت میں جو شعر ہے وہ گھڑا ہوا ہے

فذلک الذی منعنا من إثباتہ — اسی وجہ سے ہم نے اس کو درج نہیں کیا۔

ابن اسحٰق نے عکرمہ بن عامر کے اشعار نقل کئے ہیں۔ ابن ہشام نے ان میں سے صرف تین شعر درج کئے اور لکھا (۱ : ۵۲)

ھذا ما صحّ لہ منھا — اس قصیدہ میں عکرمہ کے اتنے ہی اشعار ثابت ہیں۔

بعض جگہوں پر "ھذا ما صحّ لہ منھا مما روی ابن اسحٰق منھا" کے الفاظ ہیں۔

اسی طرح بعض قصائد کے بارے میں ابن ہشام نے اپنی پسندیدگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حضرت حسان کا ایک قصیدہ غزوۂ اُحد کے متعلق نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے :

مَنَعَ النَّومَ بِالعِشَاءِ الهُمُومُ — وخيالٌ إِذا الْغَوْرُ النُّجُومُ

قصیدہ نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں (۲ : ۱۴۹)

"ھذہ أحسن ما قیل" — یہ بہترین قصیدہ ہے جو (اس موضوع پر) کہا گیا

ابن اسحٰق نے امیہ بن ابی الصلت کا ایک مرثیہ زمعہ بن الاسود اور بنو اسد کے مقتولین پر نقل کیا ہے۔ اس مرثیہ میں فنی خامیاں ہیں اور متعدد اشعار وزن سے ساقط ہو گئے ہیں۔ ابنِ ہشام نے خلف الاحمر اور دوسرے راویوں کی روایت کی مدد سے اسے ازسرِ نو مرتب کیا ہے۔ ابن ہشام کا نوٹ ملاحظہ ہو :

ھذہ الروایة لھذا الشعر مختلطة، لیست بصحیحة البناء، ولکن انشدنی ابو محرز خلف الاحمر وغیرہ، روی بعض ما لم یرو بعض (۲ : ۲۳) — اس مرثیہ کی یہ روایت گڈمڈ ہو گئی ہے۔ اس کی تالیف صحیح نہیں ہے۔ خلف الاحمر وغیرہ نے مجھے یہ مرثیہ اس طرح سنایا۔ بعض کی روایت بعض سے مختلف ہے۔

۴۔ اشعار کی تحقیق و تنقید کے بعد ان کے پس منظر کی وضاحت، قائل کی تلاش، اختلاف روایت کا ذکر اور دوسرے ملاحظات اس پر مستزاد ہیں۔

حواشی کی چند نمایاں خصوصیات

ابنِ ہشام کے حواشی کے مواد پر نظر ڈالنے کے بعد ان کی چند نمایاں خصوصیات کا ذکر مناسب ہو گا جو ایک سرسری مطالعہ میں سامنے آتی ہیں :

۱۔ سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حواشی برمحل، ضرورت کے مطابق اور مرکز ہیں۔ ابن ہشام نے اس کا شدت سے التزام کیا ہے کہ قلم اصل موضوع سے دور نہ جانے پائے اور سیرت النبی غیر ضروری مباحث و مسائل میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ جنگ فجار میں آنحضرت ﷺ کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے اس جنگ کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہے۔ معلومات کی وسعت ورازنفسی کی مقتضی تھی مگر سلسلۂ کلام ٹوٹ جانے کے اندیشہ سے قلم روک دیا اور لکھا:

"فجار کی داستان اس سے زیادہ طویل ہے۔ میں نے صرف اس وجہ سے اس کا استقصا نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔" (۱: ۱۸۷)

اسی طرح یوم ذی نجب اور یوم جبلہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"یوم جبلہ اور یوم ذی نجب کا قصہ اس سے زیادہ طویل ہے جتنا کہ ہم نے ذکر کیا، لیکن اس کے استقصا میں وہی سبب مانع ہے جس کا ذکر میں نے یوم فجار کے واقعہ میں کیا ہے۔" (۱: ۲۰۱)

بعض مواقع پر واقعہ کو بیان کرنے کے بجائے صرف اس کا حوالہ دے دیا ہے۔ مثلاً ابن اسحٰق نے عثمان بن الحویرث کا ذکر کیا ہے جو اسلام سے قبل قیصر روم کے دربار میں گئے اور عیسائی ہو گئے تھے۔ اس پر ابن ہشام لکھتے ہیں:

"قیصر کے ساتھ عثمان بن الحویرث کا ایک قصہ ہے جسے بیان کرنے میں وہی سبب مانع ہے جس کا ذکر میں نے جنگ فجار کے واقعہ میں کیا ہے" (۱: ۲۲۴)

ابن ہشام کو نحو میں اس درجہ دخل تھا کہ ابن یونس سے لے کر آج تک تمام تذکرہ نگار انہیں "نحوی" کی نسبت سے یاد کرتے ہیں لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ سیرت میں آیات و اشعار کی غیر معمولی کثرت کے باوجود ایک جگہ بھی ان کی نحوی تشریح نہیں ملے گی۔ سیرت ابن ہشام کے مطالعہ سے مغازی، انساب اور لغت میں ابن ہشام کے تبحر کا اندازہ قدم قدم پر ہوتا ہے لیکن ان کی علمی زندگی کے اس گوشے کی جانب جسے سب سے نمایاں خیال کیا جاتا ہے گمان بھی نہیں گذرتا۔ پوری سیرت میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں "نحو" کا حوالہ ملتا ہے۔ سورۂ فیل کی آخری آیت میں "عصف ماکول" کی تشریح کرتے ہوئے ابن ہشام نے ایک رجز کا ٹکڑا نقل کیا ہے (۱: ۵۵)

فَصُيِّرُوا مِثْلَ كَعَصْفٍ مَأْكُول

اس میں کاف حرف جر مثل کا مضاف الیہ واقع ہو رہا جو بظاہر قابلِ اعتراض ہے۔ اس کی توجیہ و تفصیل موجب طوالت تھی اس لئے ابنِ ہشام نے صرف اس کا حوالہ دے دیا۔

قال ابنِ هشام: ولهذا البيت تفسير في النحو

ابنِ ہشام نے کہا: نحو میں اس بیت کی تشریح ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن ہشام کو اپنے رہوار قلم پر کتنا قابو ہے۔ سر مو اسے بہکنے نہیں دیتے۔

۲۔ علمی دیانت داری۔

سیرت کی روایت میں ابن ہشام کی دیانت داری پر گفتگو اوپر گذر چکی ہے۔ اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ابن ہشام کے

حواشی میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔

۳۔ غیر جانبداری

ابن ہشام نے فحش ہجو کی وجہ سے بہت سے قصائد و اشعار حذف کر دیے جیسا کہ گذر چکا لیکن بعض اہل علم کا یہ دعویٰ قطعاً صحیح نہیں کہ ابنِ ہشام نے صرف مشرکین کے اشعار حذف کئے ہوں، اس بارے میں ابنِ ہشام نے اپنے اصول کی سختی سے پابندی کی ہے اور کسی طرح کے تعصب اور جانبداری سے کام نہیں لیا چنانچہ اگر امیہ بن ابی الصلت کے قصیدہ سے دو شعر اس لئے حذف کئے کہ ان میں اس نے صحابہ کی ہجو کی تھی (۲ : ۳۰) تو دوسری طرف عتبہ بن ابی وقاص کی ہجو میں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کئے تھے حضرت حسان کے قصیدہ کے دو شعر بھی اس وجہ سے حذف کر دیے کہ ان میں فحش ہجو تھی (۲ : ۸۱)

اسی طرح ہند بنت عتبہ جس نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا اس کے رجز کے جواب میں ہند بنت اثاثہ بن عباد بن المطلب کے رجز کی تین ابیات اسی بنیاد پر حذف کیں۔ ہند بنت عتبہ ہی کی ہجو میں حضرت حسان نے دالیہ، ذالیہ، رائیہ تین قصیدے کہے۔ ابنِ ہشام نے صرف موخر الذکر کا ایک شعر نقل کیا اور بقیہ دونوں قصائد مکمل حذف کر دیے اور اس کی وجہ دی "اقذاع" یعنی فحش گوئی تھی (۲ : ۹۳)

۴۔ سیرت نبوی کی عظمت

ابن ہشام کے حواشی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ ہشام کو سیرت نبوی سے محبت ہی نہیں تھی بلکہ انھیں اس موضوع کی عظمت اور جلالت شان کا مکمل شعور بھی تھا۔ سیرت ابن اسحٰق کی از سرِ نو تدوین میں انہوں نے جس اہتمام اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا منحول اشعار، بے اصل واقعات، غیر متعلق مباحث اور فحش ہجویات سے جس طرح اسے پاک کیا اور پھر جس طرح اس کی خدمت کی اس کے پیچھے درحقیقت یہی جذبہ کار فرما تھا۔

۵۔ شائستہ طرزِ تحریر

ابن ہشام کا قلم بہت شائستہ، پروقار اور ایجاز پسند واقع ہوا ہے۔ ابن اسحٰق کی کتنی ہی غلطیوں کی تصحیح کی، ان کی ناقص معلومات پر اضافہ کیا لیکن کیا مجال کہ قلم سے کوئی ایسا لفظ ٹپک جائے جس سے خود پسندی کی بو آئے "اخطأ ابنِ اسحٰق" کہنا بھی گوارا نہیں ہے۔ بس اپنی بات کہہ دی اور قاری کو اندازہ ہو گیا کہ اس میں ابن اسحٰق کی غلطی کی تصحیح کی گئی ہے۔ اُوپر کچھ مثالیں گذری ہیں ان پر دوبارہ اس پہلو سے نظر ڈال لیں کہ تصحیح میں ابن ہشام کا انداز کیسا شریفانہ اور مہذب ہے۔

ابن ہشام کا اسلوب ایک علمی اسلوب ہے اور وہ تمام خوبیاں جو ایک علمی اسلوب کا طرۂ امتیاز ہو سکتی ہیں ابنِ ہشام کے یہاں موجود ہیں جیسا کہ گذشتہ مباحث سے بخوبی عیاں ہے۔

ابنِ ہشام کے مآخذ

ابن ہشام نے اپنی تعلیقات میں جن مآخذ سے استفادہ کیا ہے ان سب کی تعداد معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ان کے حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں مغازی اور روایت شعر کے جو اساطین موجود تھے ان سب سے رجوع کرنے کی انہوں نے کوشش کی تھی۔ اسی طرح جتنے مآخذ کا حوالہ

دیاہے ان سب کا تعین بھی دشوار ہے اس لئے کہ بہت سی سندوں میں انہوں نے اپنے قریبی راوی کا حوالہ دینے کے بجائے ابتدائی ماٰخذ کا حوالہ دیا ہے، اور بہت سے مقامات پر اپنے راوی کے نام کی صراحت نہیں کی بلکہ اشاروں اور کنایوں کی زبان استعمال کی ہے۔ لیکن ابن ہشام کے ماٰخذ پر گفتگو سے پہلے مناسب ہوگا کہ اسناد میں ان کے نہج کی تحقیق کی جائے۔

اسناد میں ابن ہشام کا نہج

ابن ہشام نے اپنی سندوں میں درج ذیل الفاظ استعمال کئے ہیں:

۱- حدثنی ، حدثنا

۲- اخبرنی

۳- سمعت

۴- رواہ لی

۵- انشدنی

۶- ذکر لی ، ذکر لنا

۷- ذُکر لی (بصیغۂ مجہول)

۸- عن

۹- ذکر

۱۰- قال

۱۱- بلغنی ، بلغنا

ابتدائی سات الفاظ واضح طور پر براہ راست استفادہ پر دلالت کرتے ہیں۔ "عن" کے لفظ سے سیرت میں جو روایتیں ہیں وہ بھی متصل ہیں، "بلغنی" میں واضح طور پر راوی کا ذکر نہیں ہوتا، البتہ قال اور ذکر کے الفاظ محل نظر ہیں، ان الفاظ کے سلسلہ میں ابن الصلاح نے لکھا ہے:[۸۵]

"یہ اور اس طرح کے الفاظ محدثین کے نزدیک سماع پر محمول ہوں گے اگر راوی کی شیخ سے ملاقات اور اس سے سماع معلوم ہو خاص طور پر اگر اس کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ اسی روایت میں قال فلاں کہتا ہے جو اس نے شیخ سے سنی ہو۔"

اس پہلو سے جب ہم ابن ہشام کی ان سندوں کا جائزہ لیتے ہیں جو قال اور ذکر کے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں تو ان میں کچھ نام ایسے نظر آتے ہیں جن سے ابن ہشام کی ملاقات ممکن نہیں مثلاً عمر مولی غفرۃ (۲ : ۸۷) زید بن اسلم (۲ : ۴۹۲ ، ۵۶۹) اسی طرح بعض لوگوں سے دوسری روایتیں ابن ہشام نے کسی واسطہ سے نقل کی ہیں۔ مثلاً ابوعمرو المدنی سے ابن ہشام نے بعض روایتیں قال (۲ : ۶۴۱) ذکر (۲ : ۱۸۶)

اور زعم (۲ : ۵۰۰) کے الفاظ سے درج کی ہیں اور بعض روایتیں ابو عبیدہ (۲ : ۵۹) اور ابن ابی عمرو بن العلاً (۱ : ۵۹۲) کے واسطہ سے نقل کی ہیں۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت قال کے لفظ سے (۱ : ۵۸۰) اور بعض دوسری روایتیں بعض اہلِ العلم (۱ : ۴۸۶) یا بلغنی عن الحسن (۱ : ۶۷۵) کے الفاظ سے منقول ہیں۔

دوسری طرف بہت سے نام ابن ہشام کے معاصرین کے ہیں اور ممکن ہے ابن ہشام نے ان سے استفادہ بھی کیا ہو لیکن اس فہرست میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس سے ابن ہشام کی ملاقات ثابت ہو یا خود ابن ہشام نے سیرت میں کسی دوسری جگہ ان سے حدثنی وغیرہ جیسے الفاظ سے روایت کی ہو مثلاً عبداللہ بن جعفر بن المسور بن المخرمتہ (م ۱۷۰ھ) وکیع بن الجراح (م ۱۹۷ھ) عبدالعزیز بن محمد دراوردی (م ۱۸۶ھ) خلیل بن احمد فراہیدی (م ۱۷۵ھ) سفیان بن عیینہ (م ۱۹۸ھ) ربیع بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدری مدنی، سعید بن ابی زید انصاری۔

قال اور ذکر کے الفاظ سے جو روایتیں ابن ہشام نے نقل کی ہیں ان میں بعض کے بارے میں جہاں یہ امکان ہے کہ ابن ہشام نے براہ راست سُنی ہوں وہیں گمان غالب یہ ہے کہ ابن ہشام نے کتابوں سے جو روایتیں اور اقوال اخذ کئے ہیں انھیں قال اور ذکر کے الفاظ سے درج کیا ہے۔ سورہ فیل میں لفظ سجیل کی تحقیق "ذکر بعض المفسرین" کے لفظ سے نقل کی ہے (۱ : ۵۵) اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ غریب القرآن یا معانی القرآن یا تفسیر کی کسی کتاب سے یہ شرح لی گئی ہے۔ ایک روایت امام مالک بن انس سے "ذکر" ہی کے لفظ سے نقل کی ہے (۲ : ۳۵۵) جو بظاہر موطا کے ان دو مجموعوں میں سے کسی سے ماخوذ ہے جو ابن ہشام کے مصری شیخ اور امام مالک کے تلامذہ عبداللہ بن وہب نے مرتب کئے تھے۔

معروف مآخذ

ابن ہشام کے متعین مآخذ جن کا ذکر انہوں نے صریح الفاظ میں کیا ہے اور ان سے براہِ راست استفادہ کیا ہے حسبِ ذیل ہیں ان کے نام کے سامنے ان سے منقول روایتوں کی تعداد بھی درج کی جاتی ہے:

۱۔ ابو عبیدہ معمر بن مثنی	:	۴۵
۲۔ ابو زید انصاری	:	۳۱
۳۔ یونس نحوی	:	۵
۴۔ خلف الاحمر	:	۵
۵۔ خلاد بن قرہ	:	۵
۶۔ عبدالوارث بن سعید تنوری	:	۵
۷۔ ابن ابی عمرو بن العلاً	:	۱
۸۔ امام شافعی	:	۱
۹۔ عمرو بن حبیب	:	۱
۱۰۔ عبداللہ بن وہب	:	۱

۱۱- ابوبکر زبیری :

۱۲- مسلمہ بن علقمہ مازنی :

زیاد بکائی سے یوں تو سیرت ابن اسحٰق مکمل مروی ہے لیکن ایک روایت ابن ہشام نے ایسی بھی نقل کی ہے جسے بکائی نے اپنے دوسرے شیخ مسعر بن کدام سے نقل کیا ہے (۱: ۳۴۲) بکائی سے قطع نظر مندرجہ بالا فہرست میں دو شیوخ ایسے ہیں جن سے ابن ہشام نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے ایک ابوعبیدہ معمر بن المثنی دوسرے ابوزید انصاری۔ عبدالوارث تنوری سے چار روایتیں صلوٰۃ خوف کے سلسلہ میں نقل کی ہیں اور ایک جگہ ابوالعاص بن الربیع کی امانت کے سلسلہ میں ابوعبیدہ کی روایت کی تائید میں ان کا حوالہ دیا ہے۔ ذیل میں ہم ابتدائی پانچ شیوخ کے حوالوں کو موضوع کے اعتبار سے مرتب کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ابن ہشام نے سیرت کے تاریخی یا شعری یا لغوی مواد کی تحقیق میں کس کو زیادہ ترجیح دی ہے:

	سیرت و تاریخ	شاعری	انساب	لغت
۱- ابوعبیدہ	۲۰	۱۴	۳	۸
۲- ابوزید انصاری	۱	۲۹	—	۱
۳- یونس نحوی	—	۱	—	۴
۴- خلف الاحمر	—	۴	۱	—
۵- خلاد بن قرۃ	۱	۲	۲	—

تاریخ و مغازی میں ابوعبیدہ کے مقابلہ میں دوسروں کے حوالے صفر ہیں اس لئے کہ یہ ابوعبیدہ کا خاص میدان تھا۔ سیرت کے شعری مواد کی تحقیق میں سب سے زیادہ اعتماد ابوزید انصاری پر کیا گیا ہے جن کی ثقاہت پر اتفاق ہے اور جنھیں نوادر اور کلام عرب سے زیادہ شغف تھا۔ ابوزید کے بعد اس سلسلہ میں زیادہ حوالے ابوعبیدہ کے ہیں جن کی تعداد بظاہر (۱۴) ہے لیکن اس میں چار حوالے شواہد کے طور پر ہیں اس لئے سیرت کے اشعار کی تحقیق میں اصلاً دس ہی حوالے ہیں۔ کلام عرب کے راویوں میں خلف الاحمر کی شخصیت متنازع فیہ رہی ہے لیکن ابن ہشام نے خلف سے استفادہ کیا ہے۔ سیرت کے اشعار کے سلسلہ میں اصلاً خلف کے صرف تین حوالے ہیں اور ان میں بھی ایک جگہ دوسرے رواۃ شعر خلف کے ساتھ شریک ہیں۔ اس طرح تنہا خلف کے دو ہی حوالے ہوئے۔ ایک حوالہ بطور شاہد اور دوسرا نسب کے بارے میں ہے۔ انساب کے موضوع پر ابوعبیدہ کو بہت عبور حاصل تھا اور اس پہلو سے اس کے صرف تین حوالے کم معلوم ہوتے ہیں جبکہ انساب کے بارے میں ابن ہشام کے حواشی کی تعداد بہت ہے۔ الفاظ کی تحقیق کے سلسلہ میں زیادہ حوالے ابوعبیدہ اور یونس نحوی کے ہیں۔ ابن ہشام نے سیرت النبی کی قرآنی آیات کے الفاظ پر خاص توجہ کی ہے اور ان کی تحقیق و تشریح کی ہے چنانچہ مذکورہ حوالوں میں ابوعبیدہ کے ایک حوالہ کے سوا جو غریب الحدیث سے متعلق ہے باقی تمام غریب القرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابوعبیدہ کی تصنیفات میں غریب الحدیث کے موضوع پر بھی ایک کتاب تھی۔ غریب القرآن پر ابوعبیدہ کی کتاب مجاز القرآن چھپ چکی ہے (مگر افسوس ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے) غریب القرآن پر یونس نحوی کی بھی ایک کتاب ہے۔ یہ کتابیں ابن ہشام کی مرویات میں ضرور رہی ہوں گی

اور آیات کی لغوی تشریح میں انہوں نے ان سے استفادہ کیا ہوگا۔

امام شافعی کے واسطہ سے ایک روایت "عمر بن حبیب عن ابن اسحٰق" سے نقل کی ہے جو خود ابن ہشام نے بھی براہ راست عمر بن حبیب سے سنی تھی۔ چنانچہ اس کی سند اس طرح ذکر کی ہے:

ابن هشام عن نفسه وعن الشافعي، عن عمر بن حبيب، عن ابن اسحٰق (۲: ۶۱۲)

عمر بن حبیب بن محمد بن مجالد عدوی مامون کے عہد میں بصرہ کے قاضی تھے۔ ابن اسحٰق، ہشام بن عروہ، ابن عجلان، ابن عون، ابن جریج وغیرہ کے شاگرد ہیں۔ ۲۰۷ھ میں انتقال کیا۔ محدثین نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے۔ ابن عدی کے نزدیک "حسن الحدیث" ہیں اور "ضعف" کے باوجود ان کی حدیث درج کی جائے گی جبکہ ابن حبان کے نزدیک ان سے استدلال صحیح نہیں۔ ابن ہشام نے مغازی میں ان کا صرف یہی ایک حوالہ دیا ہے لیکن اس کی روایت میں جذام سے زید بن حارثہ کے غزوہ میں "ارض خشین" کا ذکر آیا ہے اس پر ابن ہشام نے عمر بن حبیب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابن اسحٰق کی جو روایت ان کے ذریعہ ملی ہے اس میں "ارض حسمی" ہے۔

ابن ہشام نے ایک مقام پر امام زہری (م ۱۲۴ھ) کا حوالہ "ذکر لی" (۱: ۶۴۴) کے لفظ سے دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن ہشام نے امام زہری سے براہ راست استفادہ کیا ہے لیکن راقم الحروف کے خیال میں یہاں یا تو "لی" کا لفظ غلطی سے داخل ہوگیا ہے یا اس کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے جیسا کہ ابن ہشام کے سن پیدائش کی بحث میں گزر چکا۔

اسی طرح ایک جگہ ابن ہشام نے عبدالمطلب کے تین شعر نقل کئے ہیں، تیسرے شعر سے پہلے "زاد الواقدی" (۱: ۵۱) کے الفاظ ہیں، یعنی تیسرے شعر کا اضافہ واقدی نے کیا ہے۔

واقدی (م ۲۰۷ھ) ابن ہشام کا معاصر ہے، اس کا حوالہ بعید از قیاس نہیں ہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ عبارت سیرت کے کسی راوی کا اضافہ ہے جو متن میں داخل ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ:

۱۔ اس سے پہلے "قال ابن ہشام" نہیں ہے جو ابن ہشام کے ہر حاشیہ کے شروع میں آتا ہے۔
۲۔ پوری سیرت میں واقدی کا ذکر صرف اسی ایک جگہ آیا ہے۔
۳۔ "زاد الواقدی" کے الفاظ صرف وسٹنفلٹ کے ایڈیشن میں ہیں۔
۴۔ واقدی کا یہ تنہا حوالہ بھی مغازی کے کسی واقعہ کے بارے میں نہیں ہے جس میں واقدی کو مہارت تھی بلکہ ایک شعر کے سلسلہ میں ہے جو تعجب خیز امر ہے۔

مذکورہ بالا مآخذ سے ابن ہشام نے براہ راست استفادہ کی تصریح کی ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مآخذ کا حوالہ قال اور ذکر جیسے الفاظ سے دیا ہے۔ یہ مآخذ حسب ذیل ہیں:

ابن شہاب زہری (۱: ۶۸۳، ۲: ۱۲، ۳۸۸، ۴۰۰) مالک بن انس (۲: ۳۵۵) زید بن اسلم (۲: ۴۹۲، ۵۶۹) ابو عمرو مدنی (۲: ۱۸۶، ۶۴۱) عمر مولی غفرۃ (۲: ۸۷) یزید بن حبیب بن عبدالرحمٰن (۲: ۸۰) سفیان بن عیینہ (۲: ۲۲۷، ۳۵۹) عبدالعزیز دراوردی (۲: ۵۱۹) عبداللہ بن جعفر بن المسور بن المخرمۃ (۲: ۴) وکیع (۲: ۳۱۹) سعید بن ابی زید انصاری (۲: ۸۱) حسن بصری (۱: ۵۸۰) خلیل

(۱: ۶۱۲) عبداللہ بن حسن بن حسن (۲: ۶۳۵) ابو عمرو بن العلاؒ (قرأ ۲: ۶۲۷)

بلاغات ابن ہشام میں درج ذیل ناموں کے حوالے ہیں:

ابن شہاب زہری (۱: ۶۹، ۷۰-۲: ۳، ۲۵۳، ۳۸۳، ۴۲۴، ۵۲۲)

عکرمہ (۲: ۸۶) زید بن اسلم (۲: ۵۰۰) حسن بصری (۱: ۶۷۵، ۲: ۳۰۳) ابن ابی نجیح (۱: ۵۶۲) یحییٰ بن سعید (۲: ۴۱۶) اسعید

بن المسیب (۲: ۴۰۴) مجاہد (۲: ۳۲۱)

مجہول صیغہ "ذُکر لی" سے دو حوالے ہیں:

ابو عثمان نہدی (۱: ۷۷۴) علی بن زید بن جدعان (۲: ۵۱۵)

بلاغات اور "ذُکر لی" کے مجہول صیغہ سے جو روایتیں ہیں ان میں ظاہر ہے ابن ہشام نے اپنے قریبی راوی اور سند کو حذف کر دیا ہے لیکن قال اور ذکر والی روایتوں کے بارے میں قیاس یہی ہے کہ وہ کتابوں سے ماخوذ ہیں جیسا کہ سند میں ابن ہشام کے نہج کے سلسلہ میں گذر چکا ہے۔

مجہول مآخذ

ابن ہشام کے نامعلوم مآخذ کی دو قسمیں ہیں:

(الف) وہ مآخذ جن کا تعارف کسی حوالہ سے کرایا گیا ہے اور کسی نہ کسی درجہ کا تعین ہو جاتا ہے۔ یہ حوالے کئی طرح کے ہیں:

۱۔ وطن کا حوالہ مثلاً بعض اہل الیمن (۱: ۷)

۲۔ قبیلہ کا حوالہ مثلاً بعض بنی تمیم (۲: ۵۶۳) رجل من الانصار او من خزاعۃ (۱: ۴۳۸)

۳۔ تخصص علمی کا حوالہ مثلاً بعض المفسرین (۱: ۵۵) اہل العلم بالمغازی (۱: ۶۳۶) اہل الروایۃ (۲: ۴۱۶) اہل العلم بالشعر (۱: ۱۹۶) الرواۃ للشعر (۱: ۶۱۹) اہل العلم بالروایۃ للشعر (۲: ۴۴۹)

۴۔ وطن اور علم دونوں کا حوالہ مثلاً بعض اہل العلم من مکۃ (۱: ۶۴۴)

۵۔ قبیلہ اور علم دونوں کا حوالہ مثلاً بعض اہل العلم بالشعر من بنی تمیم (۲: ۵۹۵) رجل من قریش من اہل العلم (۲: ۴۱۸)

۶۔ جرح و تعدیل کے الفاظ کا حوالہ مثلاً حدثنی الثقۃ (۲: ۵۱۷) حدثنی من اثق بہ (۲: ۶۰۶)

۷۔ "بعض اہل العلم" یا "غیر واحد من اہل العلم" جیسے الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں۔

۸۔ "غیر زیاد" (زیاد کے علاوہ) کے لفظ سے ابن اسحٰق کے دوسرے شاگردوں سے روایت لی ہے (۲: ۶۴) ایک شاگرد عمر بن حبیب کا ذکر ایک جگہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ ابن اسحٰق کے کن شاگردوں سے ابن ہشام نے اخذ کیا ہے اس کا پتہ نہیں چلتا۔

(ب) مجہول مآخذ کی دوسری قسم وہ ہے جن کا کسی طرح کا تعارف نہیں تھا اور انھیں حذف کر کے صرف ابتدائی راوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بلاغات، صیغہ مجہول "ذُکر لی" (مجھ سے ذکر کیا گیا) اور "قال و ذکر" والی روایتیں اسی قسم میں داخل ہیں۔

مقبولیت اور اشاعت

سیرت ابن اسحٰق کی تلخیص و تہذیب اور تحقیق و تنقیح کا جو کارنامہ ابن ہشام نے انجام دیا وہ اتنا بلند پایہ اور عظیم الشان تھا کہ اس نے اصل کتاب کی شہرت پر خطِ تنسیخ پھیر دیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ابن اسحٰق کی سیرت ناپید اور ابن ہشام کی تلخیص زندہ جاوید ہو گئی۔

سیوطی نے ابوذر سے نقل کیا ہے کہ فرماتے تھے:[۸۸]

"وہ تلخیصیں جنھیں اجہات پر فوقیت حاصل ہوئی چار ہیں: زبیدی کی مختصر العین، زجاجی کی مختصر الزاہر، ابن ہشام کی مختصر سیرۃ ابن اسحٰق، فضل بن سلمہ کی مختصر الواضحۃ"[۸۹]

امام سخاوی لکھتے ہیں:[۹۰]

"امام ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی کتاب کی روایت زیاد بکائی سے کی، پھر اس کی ایسی تہذیب و تنقیح کی کہ وہی مرجع بن گئی"۔

مورخ مصر حافظ ابن یونس نے جن کی پیدائش ابن ہشام کے انتقال کے صرف تریسٹھ (۶۳) سال بعد ہوئی لکھا ہے کہ "ابن ہشام نے اس سیرت میں جس کی روایت وہ ابن اسحٰق سے کرتے ہیں مختلف مقامات پر حذف و اضافہ کے ذریعہ اس کی تہذیب کی اور اب تو وہ "سیرت ابن ہشام" کے نام ہی سے جانی جاتی ہے"۔ (صارت لا نعرف إلا بسيرة ابن هشام)

ابن یونس کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہشام کی جانب سیرت کی نسبت شروع سے ہی رائج تھی۔ ابن یونس نے مزید لکھا ہے کہ "اہلِ مصر کو سیرت ابن ہشام سے بیحد عشق ہے (فرط غرام) اور کثرت سے اس کی روایت کرتے ہیں اور اہلِ مصر ہی کے ذریعہ یہ سیرت دوسرے شہروں میں پہنچی"[۹۱]

اس میں شبہ نہیں کہ مصر میں بے شمار لوگوں نے سیرت ابن ہشام کی روایت کی ہوگی لیکن سیرت کی ترویج و اشاعت کی سعادت خاص طور سے ان تین برقی بھائیوں کے حصہ میں آئی جن کے واسطہ سے یہ کتاب مشرق و مغرب کے مختلف گوشوں میں پہنچ کر عام ہو گئی۔ ابن ہشام کے ان تینوں تلامذہ کے مختصر حالات لکھے جا چکے ہیں ذیل میں ہم ان کے ان شاگردوں کا نام درج کر رہے ہیں۔ جن کے ذریعہ سیرت ابن ہشام کی روایت شائع و ذائع ہوئی:

۱۔ ابوبکر احمد بن عبداللہ[۹۲] سے سیرت کی روایت محمد بن اسمٰعیل بن الفرج المہندس نے کی۔

۲۔ ابوسعید عبدالرحیم بن عبداللہ سے ابو محمد عبداللہ بن محمد بن جعفر بن الورد بن زنجویہ بغدادی اور ابوالعباس احمد بن اسحٰق بن عتبہ رازی نے کی۔

۳۔ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ سے ابومروان عبیداللہ بن یحییٰ، محمد بن عبدالسلام خشنی اور مطرف بن عبدالرحمٰن بن قیس نے کی۔

ابن خیر اشبیلی کو سیرت ابن ہشام ان تمام واسطوں سے پہنچی تھی[۹۳]۔ سیرت کے بعض نسخوں میں محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی کے ایک شاگرد ابو محمد بن عبدالواحد کا نام بھی آیا ہے[۹۴]۔

ان برقی بھائیوں نے سیرت ابن ہشام کی محض روایت کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی احادیث میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ ابن ہشام نے ایک شعر بغیر نسبت کے نقل کیا ہے (۱: ۲۰) سہیلی نے اس کے بارے میں برقی کا یہ افادہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس

شعر کی نسبت اعشیٰ کی جانب کی گئی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ شعر بنو سالم کی ایک بڑھیا کا ہے۔[۹۵]

ابن ہشام کی تلخیص کے بعد ہی سے اصل سیرت ابن اسحٰق کی ضرورت کا احساس کم ہونے لگا تھا۔ چنانچہ یعقوبی (احمد بن ابی یعقوب بن جعفر، ابن واضح اخباری) جو تیسری صدی ہجری کا مورخ ہے اپنی تاریخ کے دوسرے حصہ میں جو سیرت النبی سے شروع ہوتا ہے ابن ہشام ہی کی روایت سے استفادہ کرتا ہے۔[۹۶]

حافظ ابن عبدالبر قرطبی (۳۶۸-۴۶۳ھ) نے اپنی سیرت الدرر فی اختصار المغازی والسیر میں ابن ہشام ہی کو ماخذ بنایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں[۹۷]:

"ہماری اس کتاب میں ابن اسحٰق سے جو روایت بھی منقول ہے وہ عبدالوارث بن سفیان عن قاسم بن اصبغ عن محمد بن عبدالسلام الخشنی عن محمد بن البرقی عن ابن ہشام کی سند سے ہے۔"

سیرت ابن ہشام کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے جلیل القدر علماء نے اس کی تلخیص کی، شرح لکھی، حواشی اور استدراکات سے مزین کیا اور اسے نظم کا جامہ پہنایا ذیل میں اس طرح کی چند کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شروح

۱۔ الروض الانف

سیرت ابن ہشام کی سب سے مشہور شرح امام ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد سہیلی اندلسی مالقی (۵۰۸-۵۸۱ھ) کے قلم سے ہے۔[۹۸] امام سہیلی تاریخ، لغت، ادب اور قرأت کے ماہر تھے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی اور اندلس کے دوسرے علمائے کبار سے شرف تلمذ حاصل تھا الروض الانف کی تالیف کا آغاز محرم ۵۶۹ھ میں مالقہ میں ہوا اور اسی سال جمادی الاولیٰ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مقدمہ میں سہیلی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا مواد ایک سو بیس (۱۲۰) سے زائد کتابوں سے جمع کیا ہے۔ الروض الانف سیرت کے بارے میں بیش قیمت معلومات اور نادر افادات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب ۱۳۳۲ھ میں مطبع جمالیہ مصر سے دو حصوں میں شائع ہوئی۔ ایک ایڈیشن عبدالرحمٰن وکیل کی تحقیق و تعلیق سے دارالکتب الحدیثہ قاہرہ سے تین حصوں میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء شائع ہوا۔ ایک تیسرا ایڈیشن طہٰ عبدالرؤف سعد کی کوشش سے ۱۹۷۳ء میں مکتبۃ الکلیات الازہریہ قاہرہ سے چار حصوں میں سیرت ابن ہشام کے ساتھ شائع ہوا۔

۲۔ الاملاء علی سیرۃ ابن ہشام

اندلس کے مشہور ماہر عربیت ابوذر مصعب بن محمد بن مسعود خشنی[۹۹] (۵۳۵-۶۰۴ھ) نے سیرت ابن ہشام کے مشکل الفاظ کی ایک شرح لکھی جسے مستشرق پال برونل (P. BRONNLE) نے "شرح غریب سیرۃ ابن اسحٰق" کے نام سے مطبعہ ہندیہ مصر سے ۱۳۲۹ھ میں دو حصوں میں شائع کیا۔ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ (۳۹۲) میں ابوذر خشنی کی ایک کتاب "الاملاء علی سیرۃ ابن ہشام" کا ذکر کیا ہے مصطفیٰ السقاء وغیرہ کے نزدیک یہ کتاب مقدم الذکر کے علاوہ ہے لیکن فی الحقیقت دونوں کا مسمیٰ ایک ہی ہے جیسا کہ اس کتاب کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ تنبیہات ابن الوقشی

قاضی ابوالولید ہشام بن احمد وقشی طلیطلی[۱۰۰] (۴۰۸ - ۴۸۹ھ) پانچویں صدی ہجری کے مشہور اندلسی عالم ہیں۔ حدیث و فقہ، کلام و منطق اور شعر و انساب پر زبردست عبور تھا۔ یاقوت نے لکھا ہے کہ تاریخ و ادب کے کبار مصنفین پر انہوں نے جو تنبیہات و استدراکات لکھے ہیں ان سے ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ، وسعت مطالعہ اور مہارت و اتقان کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی ابوالولید نے سیرت ابن ہشام کی روایت اپنے شیخ ابوعمر احمد بن محمد طلمنکی سے کی تھی، ابن ہشام کے علاوہ ابونصر کلاباذی اور دارقطنی کی کتابوں پر بھی ابن الوقشی نے تنبیہات لکھی تھیں۔

۴۔ کشف اللثام فی شرح سیرۃ ابن ہشام

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی[۱۰۱] (۷۶۲ - ۸۵۵ھ) تفسیر و حدیث، فقہ و اصول اور تاریخ و ادب کے بلند پایہ عالم تھے۔ صحیح بخاری کی مشہور شرح عمدۃ القاری ۲۱ جلدوں میں انہیں کے قلم سے ہے۔ سیرت ابن ہشام کی یہ شرح بھی انہیں کی تصنیف ہے۔ ۸۰۵ھ میں اس شرح سے فارغ ہوئے۔ کشف الظنون کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح مکمل نہیں تھی (۱۰۱۲)

۵۔ المبرۃ فی حل مشکل السیرۃ

یہ شرح یوسف بن عبدالہادی صالحی (۸۴۰ - ۹۰۹ھ) نے لکھی تھی۔ موصوف کی شہرت محدث، فقیہ، متکلم، نحوی اور صوفی کی حیثیت سے ہے طبقات المحدثین پر ایک کتاب سات جلدوں میں لکھی تھی۔ ابن المبرد کے لقب سے مشہور رہے۔ سیرت ابن ہشام کی اس شرح کا ذکر براکلمان نے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شرح مختصر ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ظاہریہ میں محفوظ ہے (۳: ۴۱)

تلخیصات

۱۔ بلوغ المرام

سیرت ابن ہشام کی یہ تلخیص عہد ممالیک کے مشہور شاعر و ادیب ابن حجۃ حموی تقی الدین ابوبکر بن علی بن عبداللہ قادری حنفی[۱۰۳] (۷۶۷ - ۸۳۷ھ) صاحب ثمرات الاوراق کے قلم سے ہے۔ پورا نام "بلوغ المرام من سیرۃ ابن ہشام والروض الانف والاعلام" ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب میں سیرت ابن ہشام کے ساتھ سہیلی کی دو کتابوں الروض الانف اور کتاب التعریف و الاعلام بما فی القرآن من الاسماء والاعلام کی تلخیص بھی کی گئی ہے۔ براکلمان کے مطابق اس کتاب کا ایک نسخہ بغداد کے مکتبۃ الاوقاف میں محفوظ ہے۔

۲۔ الذخیرہ فی مختصر السیرہ

یہ اختصار بعض اضافوں کے ساتھ ساتویں صدی کے شافعی عالم برہان الدین ابراہیم بن محمد بن المرحل دمشقی[۱۰۴] (م ۶۳۰ھ) نے تیار کیا اور اسے اٹھارہ مجلسوں پر مرتب کیا تھا۔ یہ اختصار ۶۱۱ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

۳۔ مختصر سیرۃ ابن ہشام

عماد الدین احمد بن ابراہیم واسطی[۱۰۵] (۶۵۶ - ۷۱۱ھ) ساتویں صدی کے حنبلی عالم ہیں تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں، براکلمان نے ان کے قلم سے سیرت ابن ہشام کے ایک اختصار کا ذکر کیا ہے جو برلین وغیرہ میں محفوظ ہے۔ یہ تلخیص ۷۱۱ھ یعنی مؤلف کے انتقال کے سال مکمل ہوئی تھی۔

۴۔ خلاصۃ السیرۃ النبویۃ

علی بن الامام المؤید باللہ نے خلاصۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے تلخیص کی تھی جس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔[۱۰۶]

دور حاضر میں متعدد اہل علم نے سیرت ابن ہشام کی تہذیب و تلخیص کا کام کیا ہے جن میں سب سے نمایاں اور ممتاز کوشش عبدالسلام ہارون نے کی ہے یہ معاصر تلخیصات بھی ملاحظہ ہوں ۔

۵ - تہذیب سیرۃ ابن ہشام

عبدالسلام ہارون کی یہ تلخیص جو عالم عرب کے مشہور محقق ہیں ۴۷۱ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں الموسستہ العربیۃ الحدیثۃ قاہرہ سے شائع ہوا۔

۶ - تقریب السیرۃ النبویہ لابن ہشام

تصنیف و شرح : محمد عبدالعزیز اسمٰعیل شیرازی، ۵۹۶ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۶۱ء میں مصطفٰی البابی الحلبی قاہرہ سے شائع ہوئی۔

۷ - السیرۃ النبویۃ لابن ہشام

تلخیص و پیشکش : عمر عبدالعزیز امین صفحات : ۱۱۹ - الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر قاہرہ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ۔

۸ - فی ظلال السیرۃ

تلخیص و پیشکش : محمد لبیب البوھی صفحات : ۱۴۰، ۱۹۷۵ء میں دار الشعب قاہرہ سے شائع ہوئی ۔

منظومات

سیرت ابن ہشام کو جن علماء اور شعراء نے نظم کا جامہ پہنایا ان میں درج ذیل ناموں کو شہرت ہوئی ۔

۱ - ابو نصر فتح بن موسیٰ خضراوی قصری (۵۸۸ - ۶۶۳ھ)[۱۰۷]

اندلس میں پیدا ہوئے، تونس، مصر اور شام وغیرہ کا سفر کیا۔ سیوط کے قاضی مقرر ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ نظم پر زبردست قدرت تھی۔ زمخشری کی المفصل، ابن سینا کی الاشارات اور ابن ہشام کی سیرت کو نظم کیا۔ یہ منظوم سیرت رائیہ اور بارہ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔

۲ - ابو محمد عبدالعزیز بن احمد دمیری دیرینی مصری (۶۱۲ - ۶۹۴ھ)[۱۰۸]

شیخ عزالدین بن عبدالسلام کے شاگرد اور مفسر، فقیہ، صوفی اور ادیب و شاعر تھے، تفسیر کے موضوع پر ایک طویل ارجوزہ نظم کیا تھا جو تین ہزار دو سو (۳۲۰۰) ابیات پر مشتمل تھا۔ متعدد کتابیں نظم کیں جن میں سیرت ابن ہشام بھی تھی ۔

۳ - قاضی محمد بن ابراہیم فتح الدین بن الشہید (۷۲۸ - ۷۹۳ھ)[۱۰۹]

دمشق کے کاتب السر، فن تفسیر کے ماہر اور فاضل انشاپرداز اور شاعر تھے۔ ابن تغری بردی نے لکھا ہے کہ ابن الشہید نے ابن ہشام کی سیرت نبویہ مشطور مرجز میں نظم کی تھی جو پچاس ہزار ابیات پر مشتمل تھی۔ ابن قاضی شہبہ کا بیان اس سے مختلف ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابن الشہید نے کئی کتابوں کو سامنے رکھ کر سیرت النبی کو تین جلدوں میں نظم کیا تھا جو ۲۵ ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔ کتاب کا نام "الفتح القریب فی سیرۃ الحبیب" رکھا تھا، الروض الانف کے افادات مزید اضافوں اور اشکالات کے ساتھ اس میں شامل کیے تھے دمشق اور قاہرہ میں اس کا

درس دیا اور ایک جلد کی شرح بھی لکھی جو بارہ جلدوں پر مشتمل تھی۔

۴۔ حافظ زین الدین عبدالرحیم بن الحسن عراقی کردی (۷۲۵-۸۰۶ھ)[110]
فقہ و قرأت اور نظم سے شغف تھا۔ مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ابن الصلاح کی علوم الحدیث بیضاوی کی المنہاج اور ایک کتاب غریب القرآن کے علاوہ سیرت ابن ہشام ایک ہزار اشعار میں نظم کی۔

تراجم

۱۔ سیرت ابن ہشام کا فارسی ترجمہ سیر النبی کے نام سے ۶۱۳ ایک سعد بن زنگی کے حکم سے ہوا تھا جس کے نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مترجم نے جس کا نام معلوم نہیں سیرت ابن ہشام مصر میں پڑھی تھی اور ایران واپسی کے بعد ابارکوہ میں اس کا ترجمہ بودلین کے مخطوطہ کے مطابق ۶۱۲ھ میں اور ایک دوسرے مخطوطہ کے مطابق ۶۲۰ھ میں شروع کیا تھا۔[111]

۲۔ اردو میں سیرت ابن ہشام کا ایک ترجمہ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔ ایک ترجمہ ۱۹۱۰ء میں لاہور ہی سے شائع ہوا۔[112] ایک اور اردو ترجمہ قطب الدین احمد حیدرآبادی کے قلم سے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

۳۔ انگریزی ترجمہ مشہور مستشرق اور لندن یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے سابق پروفیسر گیوم A. GUILLAUME نے THE LIFE OF MUHAMMAD کے نام سے کیا۔ گیوم نے سیرت سے ابن ہشام کے حواشی علٰحدہ کرکے انھیں آخر میں یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ابن اسحٰق پر مفصل مقدمہ ہے۔ یہ ترجمہ اکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۴۔ لاطینی زبان میں سیرت ابن ہشام کا ترجمہ ڈی یونگ P. DE JONG (۱۸۳۲-۱۸۹۰ء) نے ڈی خویہ M. J. DE GOEJE (۱۸۳۶ء-۱۹۰۹ء) کے تعاون سے کیا جو لائڈن سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

۵۔ جرمن زبان میں سیرت کا ترجمہ وایل WEILS. (۱۸۰۸-۱۸۸۹ء) نے کیا اور اسے حواشی و تعلیقات کے ساتھ دو جلدوں میں (۱۸۴۴ء تا ۱۸۶۴ء) اسٹٹگارٹ سے شائع کیا۔

ایڈیشن

ہماری محدود اطلاع کے مطابق اب تک سیرت ابن ہشام کے مندرجہ ذیل ایڈیشن نکل چکے ہیں۔[113]

۱۔ سیرت ابن ہشام کا اولین ایڈیشن بولاق مصر سے ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ بولاق ہی سے دوبارہ تین حصوں میں ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں شائع ہوئی۔

۳۔ وسٹنفلٹ F. WUSTENFELD (۱۸۰۸-۱۸۹۹ء) نے تین حصوں میں جرمن زبان میں تعلیقات کے ساتھ گوٹنگن سے ۱۸۵۸ء تا ۱۸۶۰ء میں شائع کیا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ لیبزیک سے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔

۴۔ ۱۳۲۴ھ میں مطبعہ خیریہ مصر سے تین حصوں میں ایک ایڈیشن چھپا جس پر شیخ محمد طہطاوی کی مختصر تعلیقات تھیں۔

۵۔ شیخ طہطاوی کی تعلیقات کے ساتھ دوبارہ ۱۳۴۷ھ میں شائع ہوا۔
۶۔ الروض الانف کے حاشیہ پر ۱۳۲۹ھ تا ۱۳۳۲ھ میں مطبعۃ الجمالیہ قاہرہ سے ایک ایڈیشن چھپا۔
۷۔ ایک ایڈیشن ابن قیم کی زاد المعاد کے حاشیہ پر ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا۔
۸۔ ۱۹۳۶ء میں سیرت ابن ہشام کا ایک نفیس اور تحقیقی ایڈیشن مصطفی السقا، ابراہیم الابیاری اور احمد شبلی کی کوشش سے مطبعۃ الحلبی مصر سے ۴ حصوں میں شائع ہوا یہی ایڈیشن دوبارہ ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں اسی مطبعہ سے شائع ہوا۔
۹۔ ۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) میں محی الدین عبد الحمید کی تصحیح سے ایک ایڈیشن ۴ حصوں میں المکتبۃ التجاریہ مصر سے شائع ہوا۔ یہی ایڈیشن دوبارہ ۱۹۷۱ء میں بھی چھپا۔
۱۰۔ ڈ۔ یونج نے ڈ۔ خویہ کے اشتراک سے ۱۸۶۵ء میں لائڈن سے سیرت کے لاطینی ترجمہ کے ساتھ اس کا متن بھی شائع کیا تھا۔
۱۱۔ الروض الانف کے ساتھ عبد الرحمٰن وکیل کی تحقیق و شرح سے ایک ایڈیشن دار الکتب الحدیثہ قاہرہ سے چار حصوں میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔
۱۲۔ سیرت کا ایک ایڈیشن (غالباً الروض الانف کے ساتھ) چار حصوں میں طٰہٰ عبد الرؤف سعد کی تعلیقات کے ساتھ مکتبۃ الکلیات الازہریۃ قاہرہ سے شائع ہوا (نشرۃ الابداع جولائی ۱۹۷۴ء ص ۱۲)

حواشی اور حوالہ جات

۱۔ ابن ہشام کے حالات کے لیے جن مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :

(الف) قدیم مآخذ

- سہیلی (م ۵۸۱ھ) الروض الانف ۱ : ۵ (مطبعۃ الجمالیۃ، مصر ۱۳۳۲ھ)
- خشنی (م ۶۰۴ھ) شرح السیرۃ ۱ : ۳ (مطبعہ ہندیہ مصر ۱۳۲۹ھ)
- قفطی (م ۶۴۶ھ) انباہ الرواۃ ۲ : ۲۱۱ - ۲۱۲ (تحقیق ابو الفضل ابراہیم، دار الکتب ۱۳۷۱ھ)
- ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) ۲ : ۳۴۹ (تحقیق محی الدین عبد الحمید، مکتبۃ النہضۃ مصر)
- ابو الفداء (م ۷۳۲ھ) ۲ : ۲۹ - ۳۰
- ذہبی (م ۷۴۸ھ) العبر ۱ : ۳۷۴ (تحقیق المنجد، کویت ۱۹۶۰ء)
- یافعی (م ۷۶۸ھ) مرآۃ الجنان ۲ : ۷۷ - ۷۸ (حیدر آباد ۱۳۳۸ھ)
- ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) البدایۃ والنہایۃ ۱۰ : ۲۸۱ - ۲۸۲۔
- سیوطی (م ۹۱۱ھ) حسن المحاضرۃ ۱ : ۳۰۶ (مطبعۃ ادارۃ الوطن مصر ۱۲۹۹ھ)

- و سیوطی : بغیۃ الوعاۃ : ۳۱۵ (مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۶ھ)
- و ابن العماد (م ۱۰۸۹ھ) شذرات الذہب ۲ : ۴۵ (بیروت)

ابن ہشام کے حالات درج ذیل قدیم ماخذ میں بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان میں بعض غیر مطبوعہ ہیں اور بعض مطبوعہ ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے :

- و ابن قاضی شہبہ (۸۵۱ھ) طبقات اللغویین والنحاۃ ۲ : ۱۱۱ - ۱۱۲
- و تلخیص ابن مکتوم : ۱۲۰ - ۱۲۱
- و ذہبی : سیر اعلام النبلاء ۷ : ۲۳۶
- و عیون التواریخ (وفیات ۲۱۳ھ)

سیر اعلام النبلاء کا حوالہ کحالہ سے ماخوذ ہے، باقی حوالے نفطی پر ابوالفضل ابراہیم کی تعلیق سے نقل کئے گئے ہیں۔

(ب) جدید ماخذ

- و زرکلی : ۴ : ۳۱۴ (طبع دوم)
- و کحالہ : ۶ : ۱۹۲ (دمشق ۱۳۸۰ھ)
- و براکلمان : ضمیمہ ۱ : ۲۰۶ (لائڈن ۱۹۳۷ء)
- و براکلمان : اردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۷۳۰
- و اسٹوری : ۲ - ۱۷۲ - ۱۷۳ (مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء)
- و جرجی زیدان : تاریخ آداب اللغۃ ۲ : ۱۷۴ - ۱۷۵ (تعلیقات شوقی ضیف)
- و مقدمہ مصطفی السقا وغیرہ ۱ : ۱۷ - ۱۸ (سیرت ابن ہشام)
- و مقدمہ محی الدین عبدالحمید ۱ : ۱۲ - ۳۰ (سیرت ابن ہشام)
- و مقدمہ گیوم (انگریزی ترجمہ سیرت ابن ہشام)
- و ہدیۃ العارفین ۱ : ۶۲۴
- و یوسف احمد مطورع، جہود علماء النحو فی القرن الثالث الہجری (مطبعہ حکومۃ الکویت ۱۳۹۶ھ)

۲ - زرکلی نے ابنِ ہشام کا لقب جمال الدین لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ لقب شرح شذور الذہب کے مصنف اور مشہور امام نحو ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن احمد بن عبداللہ بن ہشام انصاری مصری (۷۰۸ - ۷۶۱ھ) کا ہے۔

۳ - "معافری" میں میم اور عین مہملہ پر فتحہ اور فاء پر کسرہ ہے (ابن خلکان ۲ : ۳۵۰، اللباب فی تہذیب الانساب ۳ : ۱۵۴) مقریزی کی خطط میں ہر جگہ "مغافر" چھپا ہے، محی الدین عبدالحمید کے مقدمہ سیرت اور بعض دوسری کتابوں میں میم کو ضمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۴ - قبیلہ معافر کے لیے ملاحظہ ہو: الیتجان : ۵۸ - ۶۴، مقریزی ۲ : ۷۶، ۷۹، المغرب : ۱۴۰ - ۱۴۱، کندی : الولاۃ والقضاۃ ص ۴۴،

۴۵ ، ۱۱۵ ، ۳۵۲،۲۵۵ ، ۲۸۱ ، نہایۃ الارب ۲ : ۳۰۳ ، الاکلیل ۱۰ : ۱-۲ تاریخ ابن خلدون ۲ : ۸۸، معجم البلدان (معافر)
لسان العرب (عضر) بحوالہ معجم قبائل العرب ۳ : ۱۱۵ ، زرکلی ۸ : ۱۶۸

۵- سیرت ابن ہشام ۲ : ۵۸۹ (اس مقالہ میں سیرت کے اس ایڈیشن کا حوالہ دیا گیا ہے جو مصطفی السقا، ابیاری اور شلبی کی تحقیق سے دوسری بار ۱۳۷۵ھ میں شائع ہوا ہے) لسان العرب (عضر)

۶- خطط المقریزی ۲ : ۷۶، ۷۹، (مطبعۃ النیل مصر ۱۳۲۴ھ)

۷- (المعافر بن یعفر بن مالک بن الحارث بن مرہ بن ادد بن زید بن عمرو بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا) الاکلیل ۱۰ : ۱-۲ (تحقیق محب الدین خطیب المطبعۃ السلفیہ قاہرہ ۱۳۶۸ھ)

۸- نہایۃ الارب ۲ : ۳۰۳ (دار الکتب ۱۳۴۲ھ) نہایۃ میں "عمرو بن عریب" کی جگہ "یشجب بن عریب" ہے۔

۹- معجم البلدان ۸ : ۹۲ (مطبعۃ السعادہ ، مصر ۱۳۲۳ھ) یاقوت نے ادد اور زید بن کہلان کے درمیان کا سلسلۂ نسب اس طرح لکھا ہے:
ادد بن ہمیسع بن عمرو بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان ۔

۱۰- "الیہ ترجع المعافر فی انسابہا"

۱۱- التیجان : ۵۶ (حیدر آباد ۱۳۴۷ھ) میں "وائل بن حمیر" ہے تصحیح تاریخ ابن خلدون قسم اول ۲ : ۸۸ (دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء) سے کی گئی ہے۔

۱۲- ہمدانی نے الاکلیل ۸ : ۱۸۱ (تحقیق نبیہ امین فارس برنسٹن ۱۹۴۰ء) میں کتاب التیجان کا یہ حصہ رجز تک نقل کیا ہے۔

۱۳- صفۃ جزیرۃ العرب : ۹۹ (لائڈن ۱۸۸۴ء) ان بستیوں کے نام یہ ہیں : حرازۃ ، صحارۃ ، عزازۃ ، دمینہ ، یزداد ۔

۱۴- ملاحظہ ہو انباہ الرواۃ اور ابن خلکان وغیرہ ۔

۱۵- تہذیب التہذیب ۳ : ۳۷۵

۱۶- ابن قتیبہ : المعارف : ۴۴۴ ، ۴۵ (تصحیح الصاوی، مطبعہ رحمانیہ مصر ۱۳۵۳ھ) سمعانی ورق ۲۹۳ (گب میموریل، لائڈن ۱۹۱۲ء)

۱۷- القاموس ۲ : ۳۸۰ (دار المامون ۱۳۵۷ھ)

۱۸- ابن مکتوم کی عبارت ابو الفضل ابراہیم نے قفطی کے حاشیہ میں نقل کی ہے۔

۱۹- ڈاکٹر یوسف احمد مطوع : جہود علماء النحو فی القرن الثالث الہجری : "وہذا الذی عقب بہ ابن مکتوم لایتناول الا الکلام عن وفاۃ ابن ہشام لاعن نسبہ"۔

۲۰- سیرت ابن ہشام ۱ : ۶۹۹

۲۱- تہذیب التہذیب ۴ : ۲۰۱ ، مقدمہ ابن الصلاح : ۱۵۲

۲۲- سیرت ابن ہشام ۱ : ۶۴۴

۲۳- "ذکر" کے لفظ سے زہری کے حوالوں میں سے دو سندوں کے ترجمہ میں گیوم نے تحت غلطی کی ہے جو گمراہ کن ہے، پہلی سند کی عبارت یہ ہے:

فیما ذکر ابن شہاب الزہری (۱: ۳۲۷) جیسا کہ ابن شہاب زہری نے ذکر کیا گیوم کا ترجمہ ملاحظہ ہو (ص ۳۷۷، حاشیہ ۷۹۷)

ACCORDING TO WHAT AL ZUHRI TOLD ME

دیانت داری کا تقاضا تو یہ تھا کہ ترجمہ میں "ابن شہاب" بھی ہوتا جیسا کہ متن میں ہے لیکن یہ (ME) کا اضافہ تو بہت ہی افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔ دوسرے حوالے کے الفاظ ہیں:

فیما ذکر ابن شہاب وغیرہ (۲: ۴۰۰) جیسا کہ ابن شہاب وغیرہ نے ذکر کیا۔

یہاں بھی گیوم نے "ذکر" کا ترجمہ TOLD ME کیا ہے (ص ۴۴، حاشیہ ۴۲۴) حالانکہ یہی حوالہ بعینہٖ انہیں الفاظ میں ایک جگہ مکرر آیا ہے (۱: ۶۸۳) اور وہاں ترجمہ (SAID) کیا ہے

اسی طرح ابن ہشام نے ایک جگہ عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے ایک روایت "ذکر" کے لفظ سے نقل کی ہے (۲: ۵۱۹) اور وہاں بھی گیوم نے ترجمہ میں یہی غلطی کی (۶۸۳، حاشیہ ۸۹۰) ان تمام مقامات پر گیوم کا ترجمہ اس وقت درست ہوتا جب متن میں "ذکرلی" یا "حدثنی" یا "اخبرنی" ہوتا۔

۲۴۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ۹: ۸۰

۲۵۔ مربد کی ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے لیے دیکھئے، سعید افغانی: اسواق العرب: ۲۹۵-۴۵۲ (دارالفکر دمشق ۱۳۷۹ھ / ۱۹۶۰ء)

۲۶۔ ہدیۃ العارفین (۱: ۶۲۴) میں ابن ہشام کے بارے میں لکھا ہے کہ "کان عالماً بالسیر والنجوم" لیکن نجوم سے ابن ہشام کے تعلق کا سراغ کسی ماخذ سے نہیں ملتا نیز سیر اور نجوم کا ایک ساتھ ذکر بھی تعجب خیز ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عبارت میں تحریف ہے اور (النجوم) کے بجائے (النحو) ہونا چاہیئے۔

۲۷۔ تہذیب التہذیب ۳: ۳۷۵۔

۲۸۔ التبیان: ۶۴۔

۲۹۔ لیث بن سعد کے حالات کے مآخذ کے لئے دیکھیے: زرکلی ۶: ۱۱۵، کحالہ ۸: ۱۶۲۔

۳۰۔ التبیان: ۱۳۵، ابن لہیعہ کے لیے دیکھئے: ابن خلکان ۲: ۲۴۲-۲۴۴، ابن خلکان نے ابن لہیعہ کی تاریخ پیدائش ۹۷ھ (سبع و تسعین) اور عمر ۸۱ سال لکھی ہے اس لحاظ سے سن وفات ۱۷۸ھ ہوتا ہے۔

۳۱۔ ابن کثیر سے سیوطی نے بھی نقل کیا ہے۔ حسن المحاضرۃ ۱: ۳۰۶،

۳۲۔ ابن خلکان ۳: ۷۰ء۔

۳۳۔ بغیۃ الوعاۃ: ۳۱۵۔

۳۴۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۶۱۲۔

۳۵۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۱۹۶۔

۳۶۔ سیرت ابن ہشام ۲: ۶۴۔

۳۷ - التیجان میں ابوعبدالایلی ہے تصحیح الاکلیل ۸: ۱۶۱ سے کی گئی ہے۔

۳۸ - بغیۃ الوعاۃ : ۴۲۶ ، نزہتہ الالبا : ۵۹ ، دوسرے مراجع کے لئے دیکھئے زرکلی ۹ : ۴۴۳ ، کحالہ ۱۳ : ۲۴۷ -

۳۹ - تہذیب التہذیب ۱۲ : ۱۷۹ -

۴۰ - تاریخ بغداد ۹ : ۷۷ - ۸۰ ، نزہتہ الالبا : ۱۷۳ ، بغیۃ الوعاۃ : ۲۵۴ فہرست ابن ندیم : ۸۱ ، زرکلی ۳ : ۱۴۴ ، اردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۸۱۱ -

۴۱ - تذکرۃ الحفاظ ۱ : ۲۵۷ ، تہذیب التہذیب ۶ : ۴۴۱ ، زرکلی ۴ : ۳۲۹ -

۴۲ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۵۵ ، نزہتہ الالبا : ۱۳۷ ، فہرست ابن ندیم : ۷۹ ، زرکلی ۸ : ۱۹۱ -

۴۳ - مجاز القرآن فواد سزگین کی تحقیق سے دو حصوں میں چھپی اور نقائض بیون کی تصحیح سے لائیڈن میں ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۲ء میں چھپی -

۴۴ - تذکرۃ الحفاظ ۱ : ۳۰۵ ، تہذیب التہذیب ۶ : ۷۱ ، میزان الاعتدال ۲ : ۸۶ زرکلی ۴ : ۲۸۹ ، کحالہ ۶ : ۱۶۲ -

۴۵ - تاریخ بغداد ۱۰ : ۱۷۳ - ۱۷۹ لسان المیزان ۳ : ۳۶۱ -

۴۶ - بغیۃ الوعاۃ : ۲۴۲ ، نزہتہ الالبا : ۶۹ ، ابن ندیم : ۴۷ ، زرکلی ۲ : ۳۵۸ -

۴۷ - طبقات ابن سلام : ۲۳ ، ۲۰۶ (تحقیق محمود شاکر ، دار المعارف ۱۹۵۲ء)

۴۸ - ابن ندیم : ۴۵ ، معجم الادبا ، ۱۹ : ۳۰۴ - ۳۱۰ (دار المامون)

۴۹ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۱۵ -

۵۰ - البدایۃ والنہایۃ ۳ : ۲۴۴ -

۵۱ - ابن ہشام کے ان برقی تلامذہ کے حالات کے لئے عمومی طور پر ملاحظہ ہو :
ابن ماکولا : الاکمال ۱ : ۴۸۰ - ۴۸۱ (حیدر آباد) معجم البلدان (برقہ) سمعانی ۲ : ۱۷۲ (حیدر آباد)

۵۲ - برقیین کے ان جد اعلیٰ کا صحیح نام سُعَیبَہ (س، ع، ی، ہ) ہے ابن ماکولا کے مطابق اسے "بسکون المہملۃ وفتح التحتانیہ ثم ھا" سے ضبط کیا جائے گا۔ (۵ : ۶۸) یہ نام عام طور پر مآخذ میں محرف ہے بعض میں "سعید" (معجم البلدان - برقہ ، سمعانی) اور بعض میں "سعد" (تذکرۃ الحفاظ ۲ : ۱۴۸ ، فہرست ابن خیر : ۲۳۳) چھپا ہے -

۵۳ - محمد بن عبداللہ کے لیے دیکھئے : تذکرۃ الحفاظ ۲ : ۱۴۸ ، حسن المحاضرۃ ۱ : ۱۹۷ تہذیب التہذیب ۹ : ۲۶۳ ، شذرات الذہب ۲ : ۱۲۰ ، کحالہ ۱۰ : ۲۲۴

کحالہ نے معجم المولفین میں "محمد البرقی" کا ترجمہ دو جگہوں پر لکھا ہے ، گویا دو شخصیتیں ہیں ۔ سن وفات دونوں کا ۲۴۹ھ لکھا ہے ۔ ایک جگہ (۱۰ : ۲۲۴) "محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم الزہری مولاہم المصری المعروف بابن البرقی" نسب ذکر کیا ہے اور تصنیفات میں کتاب الضعفاء کا ذکر ہے ۔ دوسری جگہ (۱۰ : ۱۵۸) نسب "محمد بن عبدالرحیم بن ابی زرعۃ البرقی" ہے اور تصنیفات میں تالیف فی مختصر ابن عبدالحکم الصغیر اور کتاب فی التاریخ والطبقات کا ذکر کیا ہے اور حوالہ ابن فرحون : ۲۳۳ - ۲۳۴ کا دیا ہے ۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ دو شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخصیت ہے جو ابن البرقی کے نام سے مشہور رہے ۔ کحالہ کو غالباً نسب کے

اختلاف سے دھوکا ہوا۔ تذکرہ نگار اکثر نسب کو مختصر اور درمیان کی کڑیاں حذف کر دیتے ہیں، چنانچہ ابن فرحون نے بظاہر محمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم بن سعید بن ابی زرعہ کے بجائے محمد بن عبد الرحیم بن ابی زرعہ لکھ دیا ہوگا (افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس الدیباج المذہب موجود نہیں ہے) نیز ملاحظہ ہو ابن الفرضی: ۱۴-۱۵۔

اسی طرح مطبوعہ سیرت ابن ہشام کے آخر میں (۲: ۶۷۱) مخطوطہ کا ایک نوٹ درج کیا ہے اس میں بھی عبد اللہ کا نام حذف کر کے محمد بن عبد الرحمن البرقی لکھ دیا ہے۔ اس نوٹ میں ایک اور غلطی یہ ہوگئی ہے کہ عبد الرحیم کو عبد الرحمن کر دیا۔

۵۴۔ تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۴۸-۱۴۹، المنتظم ۵: ۱۵۷، کحالہ ۱: ۲۸۶۔

۵۵۔ براکلمان (۱: ۲۰۷) نے "کتاب التیجان لمعرفۃ ملوک الزمان فی اخبار قحطان" لکھا ہے۔

۵۶۔ اسد بن موسیٰ کے حالات کے لئے دیکھئے تہذیب التہذیب ۱: ۲۶۰

۵۷۔ جوزف ہورووتس (سیرت نبوی کی ابتدائی کتابیں اور ان کے مؤلفین ترجمہ شاہد احمد فاروقی دہلی ۱۹۷۴ء) نے وہب بن منبہ کے حالات میں (۴۳) عبد المنعم کو وہب کا پوتا اور ادریس بن سنان کو وہب کا داماد قرار دیا ہے۔ فاروقی نے اس کی تصحیح یوں کی کہ ادریس کے باپ سنان کو وہب کا نواسا بنایا (۵۱) حالانکہ وہب کے نواسے سنان نہیں بلکہ ادریس بن سنان ہیں۔ تہذیب کی عبارت یہ ہے (۱: ۱۹۴)۔

ادریس بن سنان الیمانی ابو الیاس الصنعانی ابن بنت وہب بن منبہ والد عبد المنعم۔

اس عبارت کا ترجمہ اس طرح ہوگا:

ادریس بن سنان یمانی جن کی کنیت ابو الیاس اور نسبت صنعانی ہے وہب بن منبہ کے نواسے اور عبد المنعم کے باپ ہیں۔

۵۸۔ لسان المیزان ۴: ۷۳۔

۵۹۔ الروض الانف ۱: ۱۲/۲: ۱۰۵، ۲۱۸۔

۶۰۔ الاکلیل ۸: ۱۰۸، ۱۴۸، ۱۶۱، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۹۹، ۲۰۴، ۲۱۱، ۲۱۶، ۲۲۰۔

۶۱۔ التیجان کے ساتھ اخبار عبید بن شریہ الجرہمی بھی چھپی۔ اسلامک کلچر حیدر آباد (اپریل ۱۹۲۸ء) میں کرنکو نے ان دونوں کتابوں پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "THE OLDESL BOOKS ON ARABIC FOLKLORE" اس مضمون میں التیجان اور اخبار عبید کے مشمولات کا جائزہ لیا گیا تھا۔

۶۲۔ الروض الانف: ۵ (فیما ذکر لی)

۶۳۔ زرکلی (۴: ۳۱۴) نے ابن ہشام کی مطبوعہ تصانیف میں ایک کتاب "القصائد الحمیریہ" کا بھی ذکر کیا ہے۔ مآخذ میں اس نام کی کوئی کتاب ابن ہشام کی جانب منسوب نہیں کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ کوشش کے باوجود یہ سراغ نہ لگ سکا کہ یہ کتاب کب اور کہاں چھپی۔ خیال ہوتا ہے کہ کسی نے کتاب التیجان سے حمیری قصائد علیحدہ کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیے ہوں گے۔

کرنکو اور اس کی تقلید میں نبیہ امین فارس (مقدمہ الاکلیل جزء ثامن) نے اخبار عبید بن شریہ جرہمی کے بارے میں خیال

ظاہر کیا ہے کہ اس کا جامع بھی ابنِ ہشام ہی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اخبار عبید میں ابن ہشام نے اپنے تصنیفی منہج کے مطابق "قال ابنِ ہشام" کہیں نہیں لکھا۔ کتاب کے شروع میں صرف "برقی" کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ برقی نے یہ کتاب ابنِ ہشام سے حاصل کی ہوگی۔ برقی کبیر محمد بن عبداللہ جس طرح ابن ہشام کے شاگرد ہیں اسی طرح براہِ راست اسد بن موسیٰ سے بھی انہوں نے روایت کی ہے۔

۶۴۔ یافعی (۲: ۷۷-۷۸) نے وفات کا مہینہ "رجب" لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۶۵۔ حسن المحاضرۃ ۱: ۳۰۶ میں "لثلاث خلت من ربیع الآخر" چھپا ہے۔ "خلت" سے پہلے "عشرۃ" چھوٹ گیا ہے۔

۶۶۔ ابن اسحٰق کے مآخذ کے لئے ملاحظہ ہو: زرکلی ۶: ۲۵۲، کحالہ ۹: ۴۴ اُردو انسائیکلوپیڈیا ۱: ۴۲۰-۴۲۲، نیز دیکھئے جوزف ہورووتس (اردو ترجمہ) ۱۰۹-۱۳۰۔

۶۷۔ جواد علی: تاریخ طبری کے مآخذ (ترجمہ نثار احمد فاروقی) ۱۲۵۔

۶۸۔ خطیب نے تاریخ بغداد (۱: ۲۱۴-۲۳۴) اور ابن سید الناس نے عیون الاثر کے شروع میں ابن اسحٰق پر عائد کردہ تمام الزامات سے مفصل بحث کی ہے۔

۶۹۔ ابنِ خلکان ۳: ۴۰۵۔

۷۰، ۷۱۔ سہیلی: ۵ نیز دیکھئے ابن خلکان حوالہ سابق۔

۷۲۔ ہورووتس: ۱۲۲۔

۷۳۔ سیرت ابن اسحٰق کے مختلف نسخوں کے لئے دیکھئے: تاریخ طبری کے مآخذ: ۱۱۸۔

۷۴۔ زیاد بکائی کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ بغداد ۸: ۴۷۶-۴۷۸ تہذیب التہذیب ۳: ۳۷۵، سمعانی ورق ۸۸ (گب میموریل) ۲: ۲۹۰ (حیدرآباد) النجوم الزاہرۃ ۲: ۱۱۱ (طبع اول ۱۳۴۱ھ دار الکتب مصریہ) ابن خلکان ۲: ۸۶-۸۷، زرکلی ۳: ۹۲

۷۵۔ "زیاد اشرف من أن یکذب فی الحدیث"

۷۶۔ "زیاد بن عبداللہ علی شرفہ یکذب فی الحدیث"

۷۷۔ سہیلی: ۵۔

۷۸۔ تہذیب التہذیب ۳: ۳۷۵۔

۷۹۔ ہورووتس: ۱۱۹-۱۲۱، جواد علی (۱۲۱) نے کتاب الخلفاء کو بھی سیرت کا ایک جزء قرار دیا ہے۔

۸۰۔ ہورووتس: ۱۱۹۔

۸۱۔ مثلاً سیرت ابن ہشام ۱: ۲۶۸، ۳۱۳، ۴۱۳/ ۲: ۱۹، ۲۰، ۱۷۷۔

۸۲۔ سیرت ابن اسحٰق کے شعری سرمایہ پر ہورووتس کا ایک مضمون اسلامیکا ۲: ۳۰۸ میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور مضمون جو ڈاکٹر سامی مکی العانی کے قلم سے مجلۃ آداب المستنصریۃ کی جلد اول کے پہلے شمارہ میں ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں "دراسۃ فی شعر السیرۃ النبویۃ لابن اسحٰق"

کے عنوان سے شائع ہوا ہے - مؤخرالذکر مضمون جس سے راقم نے استفادہ کیا ہے بہت جامع ہے -

۸۳ - طبقات الشعراء : ۹

۸۴ - ابن کثیر کی عبارت جسے سیوطی نے بھی حسن المحاضرہ میں بعینہٖ نقل کیا ہے درج ذیل ہے -

"وقد كان مقيما بمصر، واجتمع به الشافعي حين وردها وتناشدا من أشعار العرب شيئا كثيرا"

سیوطی کے یہاں "قد" نہیں ہے اور "اشیاء کثیرۃ" ہے -

مصطفی السقاوغیرہ نے اس عبارت کے پہلے ٹکڑے پر غور نہیں کیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابن ہشام پہلے سے مصر میں مقیم تھے ورنہ "ورد" کا فاعل امام شافعی کے بجائے ابن ہشام کو نہ قرار دیتے - نیز امام شافعی مصر ۱۹۹ھ اور ایک قول کے مطابق ۲۰۱ھ میں پہنچے جبکہ ابن ہشام اس سے بہت پہلے کم از کم ۱۷۵ھ سے قبل پہنچ چکے تھے -

۸۵ - مقدمہ ابن الصلاح : ۵۱

۸۶ - عمر بن حبیب کا نام مصطفی السقاوغیرہ کے تحقیقی ایڈیشن میں عمرو (واو کے ساتھ) چھپا ہے - انڈکس (۶۹۷) میں بھی اسی طرح ہے - زاد المعاد کے حاشیہ پر سیرت کا جو ایڈیشن چھپا ہے اس میں بھی عمرو (واو کے ساتھ) ہے (۲ : ۲۹۷) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غلطی مخطوطہ کی ہے -

۸۷ - تہذیب التہذیب ۷ : ۴۳۱ - ۴۳۳ -

۸۸ - المزہر ا : ۸۷ (تحقیق ابوالفضل ابراہیم وغیرہ طبع دوم حلبی مصر)

۸۹ - کتاب العین خلیل نحوی کی مشہور کتاب ہے - محمد بن الحسن زبیدی (م ۳۷۹ھ) نے اس کی تلخیص کی - الزاہر فی معانی الکلام الذی یستعملہ الناس، ابوبکر محمد بن القاسم الانباری (م ۳۲۸ھ) کی تصنیف ہے جس کا اختصار عبدالرحمٰن بن اسحٰق زجاجی (م ۳۴۰ھ) نے تیار کیا - الواضحہ فی تجوید الفاتحہ شیخ برہان الدین ابراہیم بن عمر (م ۷۳۲ھ) کا ایک دالیہ قصیدہ ہے جو بائیس (۲۲) شعروں پر مشتمل ہے (حاشیہ المزہر)

۹۰ - الاعلان بالتوبیخ : ۱۵۸ (تحقیق روزنتھل بغداد ۱۳۸۲ھ)

۹۱ - انباہ الرواۃ ۲ : ۲۱۲ -

۹۲ - فہرست ابن خیر (۲۳۶) میں ابوبکر محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی الکبیر ہے جو صحیح نہیں - ابوبکر احمد بن عبداللہ کی کنیت تھی - محمد بن عبداللہ کی کنیت ابوعبداللہ تھی -

۹۳ - فہرست ابن خیر : ۲۳۳ - ۲۳۶

۹۴ - سیرت ابن ہشام ۲ : ۶۷۱

۹۵ - الروض الانف ۱ : ۲۶

۹۶ - یعقوبی ۲ : ۳ (المکتبۃ الحیدریۃ، نجف ۱۳۸۴ھ)

۹۷ - الدرر : ۲۷۵ (تحقیق شوقی ضیف، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ قاہرہ ۱۳۸۶ھ)

۹۸ - سہیلی کے مآخذ کیلئے ملاحظہ ہو: کحالہ ۵ : ۱۴۷، زرکلی ۴ : ۸۶ -

۹۹ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۹۲ -

۱۰۰ - بغیۃ الوعاۃ : ۴۰۹، لسان المیزان ۶ : ۱۹۳، ابن بشکوال : ۱۴۳۷، زرکلی ۹ : ۸۰، کحالہ ۱۳ : ۱۴۷ -

۱۰۱ - بغیۃ الوعاۃ : ۳۸۹، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۷۰، دوسرے مآخذ کے لئے دیکھئے زرکلی ۸ : ۳۸، کحالہ ۱۲ : ۱۵۰ -

۱۰۲ - کحالہ ۱۳ : ۲۸۹ -

۱۰۳ - زرکلی ۲ : ۴۳، اردو انسائیکلوپیڈیا ۱ : ۴۸۴، براکلمان ۲ : ۱۹

۱۰۴ - کحالہ ۱ : ۱۰۷، ہدیۃ العارفین : ۱۵

۱۰۵ - ہدیۃ العارفین ۱ : ۱۰۴، براکلمان ۱ : ۲۰۶، ۱ : ۲۸۰

۱۰۶ - براکلمان، ضمیمہ ۱ : ۲۰۶ -

۱۰۷ - ابن قاضی شہبۃ : طبقات الشافعیہ ۲ : ۱۸۵ (تحقیق عبدالعلیم خاں - حیدرآباد) بغیۃ الوعاۃ : ۳۷۲، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۲۴، سبکی : ۵ : ۱۴۶ (مطبعہ حسینیہ طبع اول) ذیل مرآۃ الزمان ۲ : ۳۲۷، ہدیۃ العارفین : ۸۱۴، کشف الظنون : ۱۰۱۲، زرکلی ۵ : ۳۳۲، کحالہ ۸ : ۵۰

۱۰۸ - ابن قاضی شہبۃ ۲ : ۲۳۳، سبکی ۵ : ۷۵، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۳۳ کشف الظنون : ۱۰۱۲، زرکلی ۴ : ۱۳۷، کحالہ ۵ : ۲۴۱ -

۱۰۹ - ابن قاضی شہبۃ ۳ : ۲۱۹، النجوم الزاہرۃ ۱۲ : ۱۲۵، الدرر الکامنۃ ۳ : ۲۹۶، انباء الغمر ۳ : ۹۳، کشف : ۱۰۱۲، زرکلی ۶ : ۱۹۰، کحالہ ۸ : ۲۱۸ -

۱۱۰ - ابن قاضی شہبہ ۴ : ۳۳، حسن المحاضرۃ ۱ : ۲۸۴ دوسرے مآخذ کے لئے ملاحظہ ہو زرکلی ۴ : ۱۱۹، کحالہ ۵ : ۲۰۴ اور ابن قاضی شہبہ کے محقق کا حاشیہ -

۱۱۱ - اس ترجمہ کے مخطوطات کے لیے ملاحظہ ہو اسٹوری C. A. STOREY کی کتاب PERSIAN LITERATURE مطبوعہ لندن ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۷ء ص ۱۷۲-۱۷۳ -

۱۱۲ - قاموس الکتب شائع کردہ انجمن ترقی اُردو پاکستان -

۱۱۳ - سیرت ابن ہشام کے مختلف ایڈیشنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل مآخذ سے رجوع کیا گیا ہے : براکلمان : انسائیکلوپیڈیا میں براکلمان کا مقالہ اور اس کی تاریخ ادب ۱ : ۱۴۱ (لائڈن ۱۹۴۳ء) سرکیس : معجم المطبوعات العربیۃ : ۲۷۶ (مصر ۱۳۴۶ھ) سٹوری کی مذکورہ کتاب، جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ نشرۃ الایداع کے مختلف شمارے - ڈاکٹر عالی کا مقالہ "دراستہ فی شعر السیرۃ النبویۃ لابن اسحٰق"

طبقات ابنِ سعد (سیرتِ نبوی کا قدیم ماخذ)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

محمد بن سَعد بن منیع البصری الزّہری (۱۶۸ھ/۷۸۴ء - ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) عام طور پر اپنے مختصر نام ابن سعد سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی کنیت ابو عبداللہ تھی[1]۔ وہ ۱۶۸ھ/(۷۸۴ء) میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ جوانی میں تحصیلِ علم کے لیے بغداد پہنچا اور یہاں اپنے استاد محمد بن عمر الواقدی کے سکریٹری کی حیثیت سے رہا چنانچہ اُسے "کاتب الواقدی" بھی کہا جاتا ہے۔

محمد بن عمر الواقدی ابو عبداللہ محمد بن عمر بن واقد[2] السہمی مدنی بنو اسلم کے مولا تھے اس لئے اسلمی بھی کہلاتے ہیں۔ یہ تاریخ اسلام کے قدیم ترین مورخوں میں سے ایک ہیں۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور حفاظِ حدیث میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے متعدد شیوخ سے حدیث کی سماعت کی جن میں مالک بن انس، سفیان ثوری، معمر بن راشد بھی شامل ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ الواقدی مالک بن انس اور سفیان کی رائے کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

الواقدی کا پیشہ تجارت تھا اور یہ گندم کی خرید و فروخت کرتے تھے لیکن کسی وجہ سے اُن کی تجارت ٹھپ ہو گئی اور یہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تلاشِ معاش میں نکل پڑے انہوں نے ہارون الرشید کے زمانے میں عراق کا رُخ کیا (۱۸۰ھ) اور وہاں کسی طرح یحییٰ بن خالد برمکی کے دربار میں باریاب ہوئے اُس نے انھیں بہت فائدہ پہنچایا اور خلیفہ کے دربار تک ان کی رسائی ہو گئی اس نے الواقدی کو بغداد کی قضا کا عہدہ دیا جس پر یہ آخر عمر تک فائز رہے[3]

---

[1] الفہرست (ابنِ ندیم) اردو ترجمہ محمد اسحٰق بھٹی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور جون ۱۹۶۹ء۔
کتاب الاعلام جلد ۷ ص ۶ دائرۃ المعارف الاسلامیہ (عربی) جلد ۱/ ۱۹۰

[2] ملاحظہ ہو: معجم الادباء جلد ۱۸ صفحہ ۲۷۷ - ۲۸۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۱/ ۳۱۷۔
وفیات الاعیان ج ۱/ ۵۰۶، تاریخ بغداد ج ۳/ ۳-۲۱، میزان الاعتدال ج ۳/ ۱۱۰،
تہذیب التہذیب ج ۹/ ۳۶۳ - ۳۶۸، عیون الاثر ج ۱/ ۱۷،
بروکلمان ج ۱/ ۱۴۱ (۱۳۵) ضمیمہ ۱/ ۲۰۷، جرجی زیدان ۲/ ۱۴۷، الزرکلی ۷/ ۲۰۰ - ۲۰۱

[3] یحییٰ بن خالد سے ملاقات، دربار خلافت میں باریابی اور عہدۂ قضا پر فائز ہونے کی تفصیلی رپورٹ کے لئے دیکھئے:
[جوزف ہورووتس: سیرۃ نبویؐ کی اولیں کتابیں اور ان کے مولفین، مترجمہ نثار احمد فاروقی]
جو اسی جلد میں شامل ہے۔

الواقدی کی تصانیف میں جن کتابوں کے نام معلوم ہیںؐ ۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ کتاب المغازی ۔ یہ متعدد بار چھپی ہے اور اس کا ایک اچھا ایڈیشن مارسیڈن جونس کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ فتح افریقیہ (دو جلدیں) مطبوعہ

۳۔ فتح العجم (مطبوعہ)

۴۔ فتح مصر والاسکندریہ (مطبوعہ)

۵۔ تفسیر القرآن الکریم (غیر مطبوعہ)

۶۔ اخبار مکہ

لہ ابن الندیم (الفہرست اُردو ترجمہ ص ۲۳۶-۲۳۸) کہتا ہے کہ الواقدی "نیک کردار شیعہ تھا جو تقیہ کا پابند تھا۔" اس نے الواقدی کی ۲۸ تصانیف کے نام گنائے ہیں :

۱۔ کتاب التاریخ والمغازی والمبعث

۲۔ کتاب اخبار مکہ

۳۔ کتاب الطبقات

۴۔ کتاب فتوح الشام

۵۔ کتاب فتوح العراق

۶۔ کتاب الجمل

۷۔ کتاب مقتل الحسین علیہ السلام

۸۔ کتاب السیرۃ

۹۔ کتاب ازواج النبی علیہ السلام

۱۰۔ کتاب الردۃ والدار

۱۱۔ کتاب حرب الاوس والخزرج

۱۲۔ کتاب صفین

۱۳۔ کتاب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۴۔ کتاب امر الحبشۃ والفیل

۱۵۔ کتاب السقیفۃ وبیعۃ ابی بکر

۱۶ کتاب المناکح

۱۷۔ کتاب ذکر القرآن

۱۸۔ کتاب سیرۃ ابی بکرؓ و وفاتہ

۱۹۔ کتاب مراعی قریش والانصار فی القطائع و وضع عمر الدواوین وتصنیف القبائل ومراتبہا وانسابہا

۲۰۔ کتاب الرغیب فی علم القرآن وغلط الرجال

۲۱۔ کتاب مولد الحسن والحسین ومقتل الحسین علیہ السلام

۲۲۔ کتاب ضرب الدنانیر والدراہم

۲۳۔ کتاب تاریخ الفقہاء

۲۴۔ کتاب الآداب

۲۵۔ کتاب التاریخ الکبیر

۲۶۔ کتاب غلط الحدیث

۲۷۔ کتاب السنۃ والجماعۃ وذم الہوی وترک الخوارج فی الفتن

۲۸۔ کتاب الاختلاف (اہلِ مدینہ و کوفہ کے فقہی اختلافات کے موضوع پر)

۷- کتاب الطبقات الکبیر

۸- فتوح العراق

۹- سیرۃ ابی بکرؓ و وفاتہ

۱۰- تاریخ الفقہاءٗ

۱۱- کتاب الجمل

۱۲- کتاب صفین

۱۳- مقتل الحسین

۱۴- ضرب الدنانیر والدراہم

۱۵- کتاب فتوح الشام (مطبوعہ) یہ بھی الواقدی سے منسوب ہے لیکن اسے الحاقی سمجھا جاتا ہے اس کا اردو ترجمہ بھی مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔

مندرجہ بالا کتابوں میں سے اکثر کے لیے یہ شبہ کیا گیا ہے کہ ان کی نسبت الواقدی سے مشکوک ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مغازی اور فتوح سے متعلق روایات جمع کرنے کا الواقدی نے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ خطیب بغدادی کہتا ہے :-

کان الواقدی کلّما ذکرت لہٗ وقعۃٌ	الواقدی کے سامنے جب کوئی واقعہ بیان کیا جاتا تھا تو
ذھب الی مکانھا فعاینہ واشھر	وہ موقع پر پہنچ کر اس جگہ کا معاینہ کرتا تھا۔ اس سے
من روی عنہ کاتبہ محمد بن سعد	روایت کرنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور اس کا کاتب
صاحب کتاب الطبقات الکبیر[1]	محمد بن سعد مؤلف کتاب الطبقات الکبیر ہے۔

ابن الندیم نے الواقدی کی تصانیف کی ایک فہرست دی ہے اور محمد بن اسحٰق کا یہ قول نقل کیا ہے :

قال محمد بن اسحٰق : قرأت بخطٍّ -	محمد بن اسحٰق نے کہا : میں نے پرانے خط میں لکھا ہوا
عتیقٍ قال : خلف الواقدی بعد وفاتہٖ	دیکھا ہے کہ الواقدی نے اپنی وفات کے بعد چھ سو صندوق
ستمائۃ قمطرٍ کتبًا کلّ قمطرٍ منھا حمل	کتابوں سے بھرے ہوئے چھوڑے اور ان میں سے ہر صندوق
رجلین وکان لہ غلامان مملوکان	دو آدمی اٹھا سکتے تھے اس کے پاس دو زر خرید غلام تھے
یکتبان اللیل والنھار[2]	جو اس کے لیے دن رات لکھتے رہتے تھے[2]

حافظ ابوداؤد کہتے ہیں کہ الواقدی ۳۰ ہزار غریب احادیث کی روایت کرتے تھے یہ مغازی، سیر، اخبار، ایام الناس اور

---

[1] خطیب بغدادی : تاریخ بغداد ج ۳/ ۳-۲۱،

[2] ابن الندیم الفہرست ۱/ ۹۸ نیز دیکھیے ہوارٹ (CLEMENT HUART) ۱۷۵ : اردو ترجمہ ۲۲۷

وقائع اور فقہ کے حافظ تھے۔ انہوں نے ابن جُریج، ابن عجلان، معمر بن راشد اور ثور بن یزید سے بھی ملاقات کی تھی امام ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ یہ اسلام کی تاریخ کے بارے میں" امین الناس" (لوگوں میں سب سے زیادہ ایماندار) تھے۔ امام بخاری کا قول ہے کہ ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا بہتر ہے۔ محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر میں اُسے ثقہ نہ سمجھتا تو ہرگز اس سے روایت نہ کرتا۔ مُصعب بن الزبیر کا کہنا ہے کہ" واللہ ہم نے الواقدی جیسا دوسرا نہیں دیکھا" اور یہ بھی کہا کہ" الواقدی ثقہ اور مأمون ہے۔"

ابراہیم حربی کہتے ہیں اگر" مالک بن انس اور ابن ابی ذؤیب کے مسائل الواقدی کے سوا کسی راوی کے ذریعے سے آئیں تو اُن کی تصدیق مت کرو۔"

حافظ الدراوردی انھیں" امیر المومنین فی الحدیث" کہتے ہیں۔ محمد بن سلام الجمحی کا کہنا ہے کہ" عالم دہر ہیں"۔ یزید بن ہارون نے کہا کہ الواقدی ثقہ ہے اور اس کے ثقہ ہونے کی تصدیق ابو عبید قاسم بن سلام نے بھی کی ہے لیکن محدثین جیسے ابن معین، ابو حاتم النسائی، ابن عدی، ابن راھویہ، دارقطنی سب کے سب اُسے" ضعیف" کہتے ہیں لیکن اخبار الناس" سیر، فقہ اور دوسرے سارے فنون میں اُسے ثقہ مانتے ہیں۔

ابن سعد کا قول ہے کہ الواقدی نے کہا:" ایسا کوئی نہیں ہے جس کی کتابیں اس کے حفظ سے زیادہ نہ ہوں، مگر میرا حافظہ میری تصانیف سے زیادہ ہے۔"

یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ جب جانب غربی (بغداد) سے الواقدی منتقل ہوئے تو اُن کی کتابوں کے ۱۲۰ بھاری بنڈل تھے بعض نے چھ سو قمطر مقدار بتائی ہے۔ قمطر کتابیں رکھنے کے صندوق کو کہتے ہیں۔

الواقدی نے ۷۷ سال کی عمر پائی ۲۰۷ھ/ ۸۲۳ء میں بغداد میں انتقال ہوا اور مقابر خیزران میں مدفون ہوئے۔[1]

جن راویوں نے الواقدی سے سماعت کی اُن میں سب سے پہلے ابوالقاسم الاًصبغ ہیں۔

(۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے مدینہ اور کوفہ کے سفر بھی کئے تھے۔ وہاں دوسری صدی ہجری کی متعدد ممتاز علمی شخصیتوں کے علاوہ اس نے تاریخی آثار کی بھی لازماً زیارت کی ہوگی مدینہ کا سفر غالباً ۲۰۰ھ سے پہلے پیش آیا تھا اس نے وہاں بعض حضرات سے ۱۸۹ھ میں ملاقات کرنے کا تذکرہ کیا ہے اور مدینہ کے جن راویوں سے اُس نے اخذ کیا ہے وہ سب تیسری صدی ہجری کا آغاز ہونے

---

[1] ابن الندیم کہتا ہے کہ" مجھے ابو عبداللہ واقدی نے اپنی تاریخ ولادت ۱۳۰ھ بتائی۔ واقدی کی وفات ۱۱ ذی الحجہ سوموار کی شب کو ۲۰۷ھ میں ہوئی اس نے ۷۸ سال کی عمر پائی اور قبرستان خیزراں میں دفن ہوا، نماز جنازہ محمد بن سماعہ نے پڑھائی۔

(الفہرست ۲۳۷)

سے پہلے ہی رحلت کر چکے تھے۔

ابن سعد کے ایک جدّ اعلیٰ بنو ہاشم کے موالی میں سے تھے لیکن خود ابن سعد کو کسی سے نسبت ولایت نہیں تھی۔ اُسے الزُّھری کیوں کہا جاتا ہے اس کی تاویل کرنا مشکل ہے خاندانی نسبت بنو ہاشم سے بہر حال ثابت ہے مگر خود ابن سعد کو بنو زُہرہ سے ایسی کوئی نسبت حاصل تھی، اس کا ثبوت موجود نہیں ہے۔

اپنے سیر و سفر کے دوران وہ اہم علمی شخصیتوں سے ملاقات کر کے روایات حاصل کرتا رہا اور کتابیں فراہم کرتا رہا۔ انھیں سب مکتوب اور غیر مکتوب روایات سے اس نے اپنی تصانیف میں فائدہ اُٹھایا ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد کا بہت بڑا عالم زبردست محدث اور "صاحب تصانیف کثیرہ تھا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ کتاب الطبقات الکبیر اس کی واحد تصنیف نہیں ہے بلکہ اور بھی کتابیں رہی ہوں گی لیکن ہمارے ماخذ اس کی صرف دو تالیفات کے نام اور بتاتے ہیں ان میں سے ایک الطبقات الصغیر ہے جو غالباً اسی الطبقات الکبیر کا خلاصہ رہا ہوگا اور دوسری کتاب اخبار النبی ہے جس کا ذکر ابن الندیم نے بھی کیا ہے[1] لیکن یہ بھی غالباً طبقات ہی کے پہلے دو اجزا کی طرف اشارہ ہے جن میں سیرۃ نبوی کی تفصیلات جمع کر دی گئی ہیں۔

ابن سعد کی کتاب الطبقات الکبیر کا ذکر ابن الندیم کے بعض نسخوں میں نہیں ہے لیکن فارسی ترجمہ جس نسخے پر مبنی ہے اس میں تذکرہ موجود ہے اور اس کے لیے یہ لکھا ہے کہ الواقدی، الکلبی[2]، ہیثم بن عدی، اور المدائنی کے انداز پر لکھی ہے اور اس کا ایک جز کتاب الطبقات الصغیر ہے۔ اس کے علاوہ ایک تصنیف "کتاب الجمل" بتائی ہے[3]۔

ابن سعد کے شیوخ

ابن سعد نے اپنے عہد کے علمی مراکز کے سفر کئے تھے اور وہاں کی علمی شخصیات سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔ چنانچہ اس کے شیوخ میں یہ نام بھی ملتے ہیں:

۱۔ سُفیان بن عُیَیْنَہ

۲۔ ابو الولید الطیالسی

۳۔ ابو جعفر محمد بن سعدان الضریر الکوفی[4] (۱۶۱ھ / ۲۳۰ھ)

۴۔ وکیع بن الجراح

۵۔ سلیمان بن الحرب

---

[1] ابن الندیم: الفہرست (اردو ترجمہ) ۲۳۸

[2] محمد بن السائب بن بشر بن عمرو بن الحارث الکلبی نسابہ متوفی ۱۴۶ھ / ۷۶۳ء (الاعلام ۷/۳)

[3] ابن الندیم: الفہرست (فارسی ترجمہ) ۲۶۹ - ۲۷۰

[4] انہوں نے عبد اللہ بن ادریس اور ابو معاویہ الضریر سے روایت کیا ہے اور ان سے ابن سعد اور احمد بن حنبل نے روایات لی ہیں یہ نحوی اور قاری تھے اور ثقہ تھے۔ یاقوت حموی معجم الادباء جلد ۸ صفحات ۲۰۱ - ۲۰۲ (طبع دار المستشرق بیروت)

۶۔ ھُشَیم ۔

۷۔ الفضل بن دُکَین ۔

۸۔ الولید بن مسلم ۔

۹۔ معن بن عیسیٰ ۔

علمائے رجال نے ان سب شیوخ کی عدالت پر گواہی دی ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابن سعد نے جو کچھ سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ ہر طرح لائقِ اعتماد اور قابلِ استناد ہے اس لئے زمانہ مابعد کے تقریبًا سب مورخوں نے ابن سعد کو مستند مانا ہے ۔ خطیب بغدادی کا قول ہے :۔

"مُحَمَّدُ بْنُ سَعْدٍ عِنْدَنَا مِنْ اهلِ العَدَالَةِ وَحَدِيثُهُ يَدُلُّ عَلَى صِدْقِهِ فَانَّهُ يَتَحَرَّى فِي كَثِيرٍ مِنْ رِوَايَاتِهِ"[1]

محمد بن سعد ہمارے نزدیک عادل راویوں میں سے ہے اس کی روایت ہی اُس کی سچائی ظاہر کر دیتی ہے کیونکہ وہ اکثر روایات میں حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

ابن خلکان نے بھی اُسے "صدوق وثقہ" بتایا ہے[2] اور ابن حجر العسقلانی نے أحدُ الحفّاظِ الكبارِ الثّقاتِ المُتحرّين (حدیث کے بڑے، ثقہ، اور تحقیق کرنے والے راویوں میں سے ایک) لکھا ہے اور اس کے علم و فضل، فہم و فراست اور شرف کو سراہا ہے بلکہ لوگوں نے اُسے اُس کے استاد الواقدی پر فضیلت دی ہے ۔ السّخاوی نے تو یہ لکھا ہے کہ اگرچہ اس کے استاد ضعیف ہیں مگر یہ خود ثقہ ہے[3]

---

[1] خطیب : تاریخ بغداد جلد ۵ ص ۳۲۱

[2] ابن خلکان : وفیات الاعیان ۱/۵۰۷ ۔

[3] محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد شمس الدین السّخاوی (۸۳۱ - ۹۰۲ھ / ۱۴۲۷ - ۱۴۹۷ء) مستند مورخ، حدیث، تفسیر اور ادب کے جید عالم تھے ان کا خاندان مصر کے ایک گاؤں سخا سے تعلق رکھتا تھا اس لئے السّخاوی کہلاتے ہیں مگر یہ خود قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں وفات پائی ۔ انہوں نے اسلامی ممالک کی طویل سیاحت کی تھی اور تقریبًا دو سو کتابیں تالیف کیں جن میں سے چند یہ ہیں : الضوء اللّامع فی أعیان القرن التاسع (مطبوعہ) بارہ جلدوں میں ہے اس میں السّخاوی نے خود اپنا حال بھی لکھا ہے جو تقریبًا ۳۰ صفحات میں آیا ہے ۔ اس کے علاوہ شرح الفیہ العراقی (مطبوعہ) یہ مصطلح حدیث میں ہے ۔ المقاصد الحسنہ (مطبوعہ) یہ بھی فنِ حدیث میں ہے ۔ القول البدیع فی احکام الصلوٰۃ عن الحبیب الشّفیع (مطبوعہ) الاعلان بالتوبیخ لمن ذمّ التاریخ (مطبوعہ) یہ فن تاریخ نویسی کے موضوع پر ہے ۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر محمد منوّر کا کیا ہوا، مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہو چکا ہے ۔ انگریزی ترجمہ مع مقدمہ فریز روزنتھال نے (MUSLIM HISTORIOGRAPHY) کے نام سے چھاپا ہے ۔

ان کی تصانیف میں التبر المسبوک (غیر مطبوعہ) ذیل لتاریخ المقریزی (جس کا کچھ حصہ چھپا ہے) وجیز الکلام فی الذیل علی کتاب الذہبی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

ہمیں ایسی صرف چند روایات ملتی ہیں جن سے ابن سعد کا ضعف کسی درجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابن سعد کے شاگرد الحسین بن فہم مصعب الزبیری کے پاس بیٹھے تھے ادھر سے یحییٰ بن معین کا گذر ہوا تو اُن سے مصعب نے کہا: "ابوزکریا۔ ہم سے محمد بن سعد الکاتب نے ایسا بیان کیا ....."

اس پہ یحییٰ نے کہا: "جھوٹ بولا"

خطیب بغدادی نے اس روایت کی تاویل یوں کی ہے کہ جس روایت کو یحییٰ بن معین نے جھوٹ بتایا وہ اُن ضعیف روایات میں سے کوئی ہوگی جنھیں الواقدی بیان کیا کرتا تھا اور اسی قصے کی بنیاد پر ابن تغری بردی نے لکھا ہے۔

"وَثّقَه جَمِیعُ الحفّاظِ ماعَدا یحییٰ بن مَعِین" — انھیں یحییٰ بن معین کے سوا سب محدثوں نے ثقہ مانا ہے"

دوسری روایت میں ہے کہ ابن ابی حاتم نے اپنے باپ سے ابن سعد کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا "ٹھیک ہے" یعنی زیادہ پُرزور الفاظ میں تعریف نہیں کی اور یہ کہا کہ میں نے اُسے دیکھا تھا کہ القواریری سے احادیث پوچھ رہا ہے۔

تیسری روایت ابن طیفور کے یہاں ہے کہ جب المامون نے اسحٰق بن ابراہیم کو لکھا کہ سات فقہا کو میرے پاس بھیج دو۔ تو اُس نے جن فقہاء کو دربار خلافت میں روانہ کیا ان میں سے ایک محمد بن سعد بھی تھے۔ یہ لوگ آئے تو المامون نے ان کا امتحان لیا اور اُن سے مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں پوچھا۔ ان سب نے قرآن کو "مخلوق" بتایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دول الاسلام (غیر مطبوعہ) الجواہر والدُّرَر فی ترجمۃ شیخ الاسلام ابن حجر العسقلانی (غیر مطبوعہ) دو جلدوں میں، الکوکب المضیٔ (غیر مطبوعہ) جس میں اپنے بعض معاصروں کے تراجم لکھے ہیں، الجواہر المجموعہ (غیر مطبوعہ) فن ادب میں، التحفۃ اللطیفہ فی اخبار المدینۃ الشریفہ (غیر مطبوعہ) یہ مدینہ کی تاریخ ہے جسے وفاء الوفاء سے زیادہ ضخیم بتایا جاتا ہے۔ بُغیۃ العلماء والرواۃ (غیر مطبوعہ) کتاب رفع الاصر عن قُضاۃ مصر کا ذَیل (ضمیمہ) اسی طرح "الذیل علی طبقات القراء" لابن الجزریؒ (غیر مطبوعہ) اور الغایہ فی شرح الہدایہ (غیر مطبوعہ) عمدۃ القاری والسامع (غیر مطبوعہ) فن حدیث میں۔ القول التام فی فضل الرمی بالسہام (غیر مطبوعہ) الشافی من الألم فی وفیات الأمم فی القرنین الثامن والتاسع (آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں وفات پانے والے اعیانؒ اکابر کے تراجم) تاریخ المدینتین، التاریخ المحیط، الطبقات المالکیہ تلخیص تاریخ الیمن تلخیص طبقات القراء، الرحلہ السکندریہ الرحلۃ الحلبیۃ الرحلۃ المکیہ وغیرہ ہیں۔

حالات وتفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں: الاعلام ۷/ ۶۷-۶۸ الضوء اللامع ۸/ ۲-۳۲ / الکواکب السائرہ ۱/ ۵۳ - شذرات الذہب ۸/ ۱۵، خطط مبارک ۱۲/ ۱۵، النور السافر ۱۶، ابن ایاس ۲/ ۳۲۱، تاریخ العراق ۳/ ۱۴، آداب اللغۃ ۳/ ۱۶۹، الفہرس التمہیدی ۱۳۸۱، ایضاح المکنون ۱/ ۲۷، ۳۳۸، بروکلمان ۲/ ۴۳ (۳۴) ضمیمہ ۲/ ۳۱

اگر یہ حکایت صحیح ہے تو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے اپنی شہرت سے بغداد میں کیا فائدہ اٹھایا اور دوسرے بہ ظاہر ہے کہ طبقۂ محدثین اس سے خوش نہیں رہا ہوگا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ احمد بن حنبل جو فتنۂ خلق قرآن کے سب سے بڑے مخالف تھے، اُن سے ابن سعد کے تعلقات خوشگوار تھے کیوں کہ ایسی روایت بھی ملتی ہے کہ احمد بن حنبل ہر جمعہ کو ایک آدمی ابن سعد کے پاس بھیجا کرتے تھے جو الواقدی کے روایات کے دو جُزء لے جاتا تھا جنھیں ابن حنبل پڑھنے کے بعد اگلے جمعہ کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ اور اُن سے آگے کے اجزاء منگا لیتے تھے۔

وفات

ابن سعد کے تلامذہ میں احمد بن عبید، ابن ابی الدنیا، البلاذری، الحارث بن أبی أسامۃ اور الحسین بن فہم وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ ابن الفہم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے ۴ جمادی الثانیہ سنہ ۲۳۰ھ کو ہفتہ کے دن بغداد میں انتقال کیا اور مقبرہ باب الشام میں دفن کیے گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔

مگر ابن ابی حاتم کا قول ہے کہ وہ ۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔ الصفدی نے سال وفات ۲۲۲ھ لکھا ہے۔ لیکن ان سب میں ابن الفہم کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ وہ ابن سعد کے ان دو شاگردوں میں سے ایک ہے جنھوں نے طبقات کی روایت کی ہے اور الصفدی کی روایت کا غلط ہونا اسی سے ثابت ہے کہ طبقات میں اُن حضرات کے تراجم بھی موجود ہیں جنھوں نے ۲۲۸ھ یا ۲۲۹ھ میں وفات پائی[1] اور ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ تراجم بعد میں ناقلوں نے اضافہ کر دیے ہیں۔ ابن ابی الحاتم کی روایت میں سال وفات ہندسوں میں ملتا ہے لفظوں میں نہیں اور ہندسوں میں غلطی ہو جانا بخوبی ممکن ہے۔

(۳)

ابن سعد نے صرف حدیث، اخبار، سیرۃ اور مغازی ہی پر توجہ مبذول نہیں کی بلکہ اس نے غریب الحدیث اور فقہ کے موضوعات پر بھی لکھا ہے۔ نحویوں اور لغویوں سے اس کے تعلقات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس میدان میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ ابو زید الانصاری سے اس کے تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح محمد بن سعدان الضریر[2] (۱۶۱ - ۲۳۱ھ) مشہور قاری تھے اُن سے ابن سعد کا تعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس نے قراتوں کے اختلاف کا علم بھی حاصل کیا ہوگا۔

---

[1] مثلاً: طبقات ابن سعد ج ۵/۳۲۶۔

[2] محمد بن سعدان کوفہ کے باشندے اور نابینا تھے یہ نحو کے علاوہ اختلاف قرأت میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اس موضوع پر اُن کی بعض تالیفات بھی ہیں جن میں الجامع اور المجرّد کے نام ہمیں معلوم ہیں۔

حالات کے لیے ملاحظہ ہوں:

نکت الہمیان ۲۵۲۔ بغیۃ الوعاۃ ۴۵۔ غایۃ النہایۃ ۲/۱۴۳۔ تاریخ بغداد ۵/۳۲۴۔

نزہۃ الالبّاء ۲۱۲، معجم الادباء ۱۸/۲۰۱ - ۲۰۲، الزرکلی ۷/۸

ابن الجزری کا بیان ہے کہ قرآن کی سات قراءات (سبعۃ احرف) کی روایت ابن سعد نے الواقدی سے، اور ابن سعد سے الحارث بن ابی اسامہ نے کی ہے۔

فنِ تراجم رجال میں ابن سعد کا وسیع علم یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ علم الانساب کا بھی ماہر رہا ہوگا چنانچہ اس نے جن رجال کے تراجم لکھے ہیں اُن کی اولاد و اعقاب کا حال بھی لکھتا ہے اور اگر وہ غیر معقب (لا ولد) رہے ہیں تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں اس نے اپنے استاد الواقدی کے علاوہ ابن اسحٰق، ابن عُمارۃ الانصاری اور ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات بھی درج کی ہیں۔ موخر الذکر سے ابن سعد نے کتاب "جمہرۃ الانساب" کی روایت کی ہے۔

طبقات اور اُن کی تدوین

"طبقات" دراصل تراجم رجال کی تدوین کا وہ طریقہ ہے جس میں افراد کے نام اُن کی پشتوں کے یا طبقات کے لحاظ سے درج کئے جاتے ہیں۔ مثلاً طبقہ محدثین، طبقہ فقہاء، طبقہ مفسرین وغیرہ۔ یا انھیں شہروں کی رعایت سے تقسیم کیا جاتا ہے: کوفی، بصری، شامی، مدنی وغیرہ۔ ابن سعد نے تراجم کو اصحاب اور تابعین کے طبقات میں تقسیم کیا اور پھر اُن کی ذیلی تقسیم علمی و دینی مراکز کے اعتبار سے کی ہے۔

کتاب الطبقات الکبیر یا الطبقات الکبری جسے عام طور پر "طبقات ابن سعد" کہا جاتا ہے ایک ضخیم کتاب ہے جس کا ابتدائی خاکہ پندرہ جلدوں میں تھا اور اس کا مقصد اُن رجال کے تراجم اور اُن کے بارے میں مستند روایات جمع کرنا تھا جن کے نام تاریخ اسلام میں آتے ہیں یا جنھوں نے ابتدائی مغازی میں شرکت کی تھی یا جن کے وسیلے سے علوم اسلامیہ کی اشاعت ہوئی یا جو لوگ ابن سعد کے زمانے تک مختلف میدانوں میں سرگرم عمل تھے۔

اس کتاب کو اس نے اپنے استاد الواقدی کی "کتاب الطبقات" کے نمونے پر ترتیب دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الواقدی کی کتاب کا بڑا حصہ بھی طبقات ابن سعد میں آگیا ہے اور اس پر اُن روایات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جو ابن سعد نے بطور خود دوسرے شیوخ سے یا کتابی مآخذ سے فراہم کی ہوں گی۔ اس طرح ابن سعد کی کتاب الطبقات اتنی جامع ہو گئی ہے کہ پہلی دو صدیوں میں اصحاب رسولؐ، تابعین اور تبع تابعین کی تمام علمی و سیاسی اور دینی سرگرمیوں کے بارے میں اس سے زیادہ مستند معلومات کا دوسرا کوئی ذخیرہ نہیں ہے اور مختلف روایات کے اندر ایسی ضمنی اور جزوی تفصیلات آگئی ہیں جنھیں باہم جوڑ کر ہم اس عہد کے اسلامی معاشرہ کی ایک واضح تصویر تیار کر سکتے ہیں۔

الواقدی کی توجہ صرف معلومات کی کثرت کی طرف رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ روایات جمع کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے جرح و تعدیل رواۃ کے جو اُصول بنائے ہوں گے اُن میں لچک پیدا کرنا ضروری تھا۔ اس لئے اس نے ایسی روایات بھی اخذ کر لی ہیں جن کی موجودگی میں بعض حضرات نے اس شُبہ کا اظہار کیا ہے کہ وہ مسلکاً شیعی

تھا[1] اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب میں رطب و یابس سبھی وافر مقدار میں بھرا ہوا ہے۔ الواقدی کی بہ نسبت ابن سعد کا رجحان جزئیات، توسّع اور تنوع کی طرف ہے اِسی لئے اُس کی کتاب میں بعض ایسے ابواب ملیں گے جو اتنی تفصیل اور کثرت روایات کے باوجود الواقدی کے یہاں بھی نہیں ہیں مثلاً:

ذکر کُنیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[2]۔ ذکر ما کانَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعوذ بِہٖ ویعوذبہ جبریل[3] وغیرہ

الواقدی نے عہدِ جاہلیت کی تاریخ کی طرف بھی بہت کم التفات کیا ہے۔ اسی لئے قدیم انساب اور تاریخ انبیاء کے ابواب میں ابنِ سعد کے ہاں ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات غالب ہیں۔ اور جن روایتوں میں الواقدی کا نام نہیں آیا ہے وہ غالباً ابن سعد کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

الواقدی کی روایات کی کثرت کو دیکھتے ہوئے ابن الندیم کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے الواقدی کی تصانیف سے اپنی کتابیں مرتب کی ہیں۔ چنانچہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبائل عرب کے وفود کی آمد کا حال اور تفاصیل درج ہیں وہاں اکثر الواقدی اور الکلبی کی روایات بھی ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

ابنِ سعد کے دوسرے مآخذ

الواقدی کی کتاب الطبقات کے علاوہ ابنِ سعد نے دوسرے مصادر سے بھی پورا فائدہ اٹھایا ہے ان میں:

۱۔ کتاب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ کتاب وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ کتاب اخبار مکّہ

۴۔ کتاب السیرہ

۵۔ کتاب طعم النبی

۶۔ کتاب المغازی

خاص طور سے نمایاں ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب المغازی کا تو بڑا حصہ طبقات ابنِ سعد میں ضم ہو گیا ہے لیکن ابنِ سعد نے صرف اسی پر

---

[1] اس کی بحث ہم نے دوسرے موقع پر کی ہے۔ ملاحظہ ہو: "سیرۃ نبوی کی اولین کتابیں اور اُن کے مؤلفین" میں الواقدی کا ترجمہ اور اس پر ہمارا حاشیہ۔

[2] طبقات ابنِ سعد ۱-۱ : ۶۶۔

[3] طبقات ابن سعد ۲-۱/ ۱۴۔

اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مصادر سے حاصل ہونے والی معلومات اس پر اضافہ کر دی ہیں ان میں رُویم بن یزید المقری سے مغازی ابن اسحٰق کی روایات اخذ کی ہیں [1]

بعض دوسری روایات ابو معشر السندی کی کتاب المغازی پر منتہی ہوتی ہیں۔

تیسرا راوی اسمٰعیل بن عبداللہ بن ابی اُویس مدنی ہے جس نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کو روایت کیا ہے۔

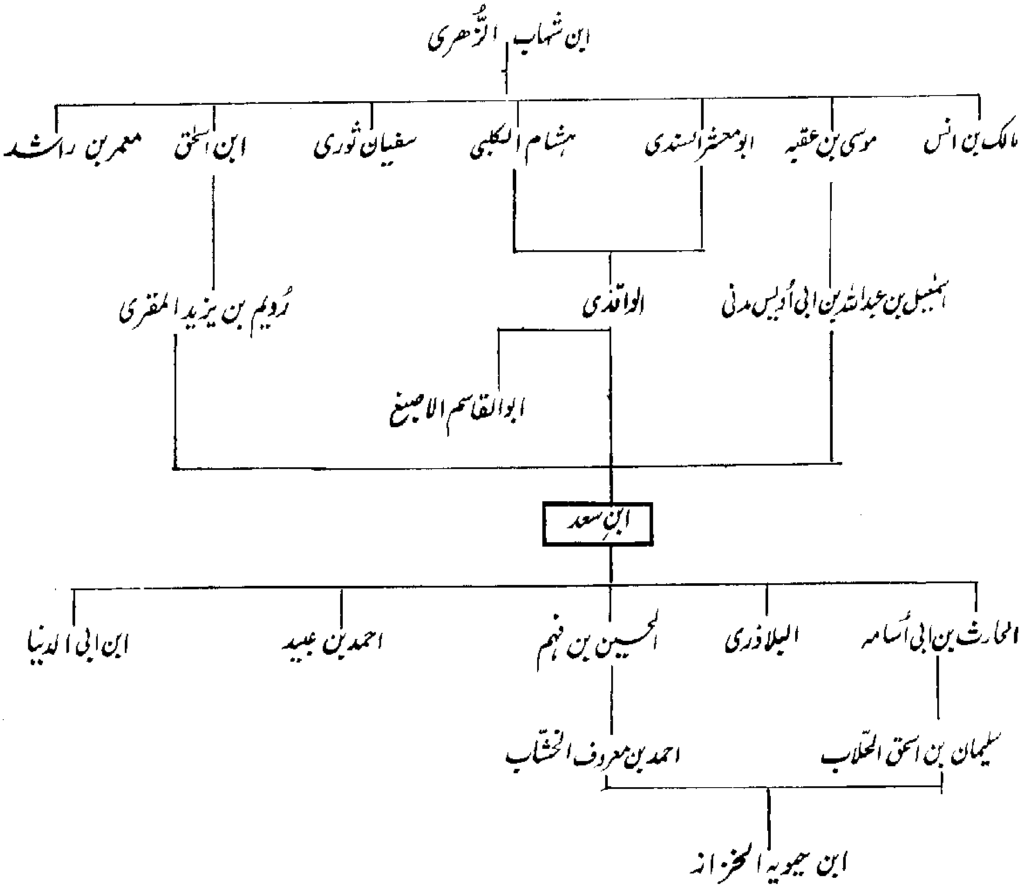
اس طرح سیرۃ نبوی والا حصہ گویا مغازی کے موضوع پر لکھی جانے والی چار اولیں کتابوں پر مشتمل ہے۔ان کے علاوہ بھی دوسری متفرق روایات اور دوسری تالیفات کے اقتباسات طبقات ابن سعد میں کثرت سے آئے ہیں۔

موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحٰق دونوں الزھری کے شاگرد ہیں اور الواقدی کی روایات میں سے ایک کا اتصال الزُھری تک بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ الواقدی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحٰق کی روایات سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے کہیں ان کا نام لیا ہے اور کہیں نہیں لیا۔ اس طرح ابن سعد کی بہت سی روایتوں کا بنیادی مصدر ایک ہی ہو جاتا ہے۔

---

[1] محمد بن اسحٰق بن یسار (وفات ۱۵۰ یا ۱۵۱ یا ۱۵۲ھ) مقابر خیزران (بغداد) میں ابو حنیفہ کی قبر کے پاس مدفون ہیں انہوں نے سب سے پہلے سیرۃ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مغازی کی تالیف کی۔ یہ عاصم بن عمر بن قتادہ، یزید بن رومان، محمد بن ابراہیم، ابن شہاب الزھری، الاعمش، فاطمہ بنت المنذر بن الزبیر (زوجہ ہشام بن عروۃ) وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ مدینہ چلے گئے تو ابراہیم ابن سعد کے سوا کوئی ان سے روایت نہ کرتا تھا پھر العباس بن محمد کے ساتھ الجزیرہ (عراق) آئے اور یہاں کے لوگوں نے ان سے مغازی کی سماعت کی پھر رَے میں گئے تو یہاں کے راویوں نے ان سے خوب روایات اخذ کیں۔ پھر بغداد میں آ کر مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ان پر قدری اور شیعہ ہونے کا الزام بھی ہے۔ احمد بن یونس کا قول ہے کہ اصحاب مغازی سب شیعہ میلانات کے ہیں جیسے ابن اسحٰق، ابو معشر، یحییٰ بن سعید اُموی وغیرہ اسی طرح اصحاب تفسیر جیسے السّدی اور الکلبی۔ یاقوت حموی کہتا ہے کہ محمد بن اسحٰق کے لیے اشعار گھڑے جاتے تھے جنھیں وہ موقع بموقع اپنی کتب مغازی میں ٹانک دیتا تھا اس سے راویوں میں وہ نکو بن گیا۔ اس نے انساب کے اندراج میں بھی اکثر غلطی کی ہے اور وہ یہود و نصاریٰ کی روایات بھی بے تکلف قبول کر لیتا تھا اور ان لوگوں کو اپنی کتاب میں "اھل العلم الاوّل" کہہ کر یاد کرتا ہے۔ اصحاب حدیث اُسے ضعیف سمجھتے ہیں اور اس پر یہ اتہام لگانے میں۔ اس کی کتاب الخلفاء الاموی نے روایت کی ہے اور کتاب المبتدا، ابراہیم بن سعد اور محمد بن عبداللہ بن نُمیر النفیلی (ف ۲۳۴ھ) نے۔ (ملاحظہ ہو معجم الادباء جلد ۱۸ ص ۵-۸ طبع بیروت)

شجرۂ روایت



اس سے ظاہر ہے کہ ابن سعد کے رُواۃ میں کم از کم تین راوی ایسے ہیں جنھیں محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے یعنی: ہشام بن محمد بن السائب الکلبی، الواقدی اور ابومعشر السندی۔ ہشام الکلبی کے بارے میں محدثین کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے باپ محمد بن السائب الکلبی سے زیادہ ثقہ ہے اگرچہ وہ اپنے باپ ہی کی روایات نقل کرتا ہے۔

الواقدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے تقریباً بیس ہزار غریب احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی ہیں اور دوسری بے سروپا باتوں کی روایت بھی کرتا ہے۔ ابومعشر کے بارے میں خود ابن سعد نے لکھا ہے "کان کثیر الحدیث ضعیفا" (وہ حدیث کی بہت زیادہ روایت کرنے والا، مگر ضعیف تھا) اس کے باوجود سب نے اُسے مغازی میں ثقہ مانا ہے۔

فن حدیث میں علمائے سیرۃ و اخبار کی حیثیت پر جرح و تعدیل کرتے ہوئے محدثین نے اپنے خاص اصولوں کی پابندی کی ہے اور کہیں کہیں وہ زیادہ سخت گیر بھی ہو گئے ہیں خود الواقدی کو ایک جماعت نے قابلِ اعتماد مانا ہے اور اس کے علم و فضل کا بھی سب نے اعتراف کیا ہے۔ ابنِ سلام الجمحی کا قول[1] ہے کہ :

" محمد بن عمر الواقدی عالم دهره" محمد بن عمر الواقدی اپنے زمانے کا جیّد عالم تھا۔

امام مالک کو جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو وہ الواقدی سے سوال کیا کرتے تھے۔ الدَّرَاوَردی نے اُسے "امیر المؤمنین فی الحدیث" کہا ہے۔ مصعب زبیری کا قول ہے کہ ہم نے اُس کا ثانی نہیں دیکھا۔" واللہ مارأینا مثلہ قط"

ایک مورخ کی حیثیت سے الواقدی کو اپنے منصب اور ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اُس نے اُن تمام مقامات کی زیارت کی اور ہر جگہ کو بچشم خود وہاں جا کر دیکھا، جن مقامات کا مغازی کی روایتوں میں نام آتا ہے۔ بعض لوگوں نے شہادت دی ہے کہ ہم نے اُسے "حُنین" کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا جہاں وہ میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھنے گیا تھا۔

محدثین نے جس کوتاہی کے لیے الواقدی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے وہ عیب اُس کے شاگرد ابن سعد کے ہاں بھی موجود ہے یعنی وہ بہت سی سندوں کو یک جا کر کے سب کی روایتوں سے ایک مجموعی روایت بنا لیتا ہے اور ایک راوی کے بیان میں دوسرے کا بیان شامل کر دیتا ہے اس کا مقصد بظاہر کثرت روایات کی وجہ سے ایجاز و اختصار کی راہ اختیار کرنا ہے یعنی کچھ عبارتیں اور واقعات متعدد روایتوں میں مشترک ہوتے ہیں اُن کا بار بار دُہرانا لاحاصل ہے۔ کچھ جزئیات ایک روایت میں ہوتی ہیں دوسری میں نہیں ہوتیں، اس لیے وہ تمام روایتوں کا مشترک حصہ یک جا کر دیتا ہے اور اس میں ہر روایت کی انفرادی اطلاع کو سمو دیتا ہے اور سب کی سندیں یک جا کر دیتا ہے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے اوّلیں راوی جن سے میں نے اخذ کیا ہے یہ لوگ ہیں اور وہ رُواۃ زیادہ تر معروف اشخاص ہوتے ہیں۔ ابن سعد کے زمانے تک علماء یہ امتیاز آسانی سے کر لیتے ہوں گے کہ کون سی روایت اور کون سی تفصیل کس راوی نے بیان کی ہو گی اور اسی واقعہ سے متعلق، دوسرے راوی کے بیان میں کیا کمی بیشی پائی جاتی ہے لیکن آج ہمارے لیے یہ امتیاز کرنا بہت مشکل ہے۔ محدثین کے نزدیک یہ طریقہ سند نہ ہونے کی برابر ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے راوی کی ذمہ داری متعین نہیں ہو پاتی۔

---

[1] محمد بن سلام (بہ تشدید لام) (۱۵۰ - ۲۳۲ھ / ۷۶۷ - ۸۴۶ء) بن عبید اللہ الجمحی (بہ نسبت ولایت) ابو عبد اللہ، فن ادب میں امام عصر مانا جاتا ہے یہ بصرہ کا باشندہ تھا۔ بغداد میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کا مصنف ہے جن میں طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین، بیوتات العرب، غریب القرآن لکھی ہیں۔ یہ عقیدے کے اعتبار سے قدری تھا اس لئے محدثین نے کہا کہ اس سے اشعار کی روایت کرو۔ حدیث کی نہیں۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو: ارشاد الاریب ۷/۱۳، ابن الندیم ۱۱۳، میزان الاعتدال ۳/۶۶ لسان المیزان ۵/۱۸۲، تاریخ بغداد ۵/۳۲۷، طبقات النحویین ۱۹۷، بغیۃ الوعاۃ ۴۷، الوافی بالوفیات ۳/۱۱۴ نزہۃ الالبا ۲۱۶، کتاب اللباب ۱/۲۳۶، طبقات فحول الشعراء، کتاب الاعلام ۷/۱۶۔

الواقدی خود مدینہ کا باشندہ ہے۔ اسی طرح موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحٰق اور ابومعشر بھی "مدینہ اسکول" کے راوی ہیں اس لیے ابن سعد کو بھی اسی دبستانِ روایت کا نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔

الواقدی کے بغداد میں قیام پذیر ہوجانے سے سیرۃ نگاری کا مدنی دبستان بھی بغداد کو منتقل ہوگیا تھا۔ ابن اسحٰق اور ابومعشر بھی وہیں رہے پھر ابن سعد نے الواقدی کا علم حاصل کیا۔ ان شیوخ میں سے تقریباً سبھی کسی نہ کسی حیثیت میں عباسی دربار خلافت سے متمتع ہو رہے تھے۔ ابن سعد اور ابومعشر نے تو عباسیوں سے نسبتِ ولا قائم کر لی تھی اور ابن اسحٰق اور الواقدی کو دربار سے مدد معاش ملتی تھی۔

دراصل بعض ابتدائی کوششوں یا استثنائی صورت حال کو چھوڑ کر ــ امویوں کے زمانے میں سیرۃ و مغازی کی تدوین کا زیادہ اہتمام بھی نہیں ہوا۔ ڈی ایس مرجولیث (D. S. MARGOLIOUTH) کا خیال ہے کہ سیرۃ کی تدوین اُمویوں کے سیاسی مقاصد کے خلاف ہوتی کیوں کہ اس میں خاندان بنو ہاشم اور حضرت علی کی خدمات اور فضائل و مناقب کا بیان ہونا ناگزیر تھا، اسی لئے اُمویوں نے دورِ جاہلی کے ادب و شعر اور ملوکِ عجم کے قصص و سیر پہ زیادہ توجہ مرکوز رکھی اور مغازی و سیرۃ کی تدوین کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ تاریخ صدر اسلام کی کوئی کتاب سرکاری سطح پہ مدون نہیں ہوئی لیکن ان مورخوں کو عباسی خلفاء کے زمانے میں شاہی سرپرستی اور اقتصادی امداد برابر ملتی رہی۔

(۴)

تقسیم طبقات

ابن سعد نے اپنی کتاب کی پہلی دو جلدوں کو سیرۃ نبوی کے لئے وقف کیا ہے اس کے بعد اُن حضرات کا بیان ہے جو عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ میں فتوی دیتے تھے۔ پھر اصحاب رسول اور تابعین کے تراجم ہیں اور یہ اس کتاب کے باقی تمام اجزاء پہ پھیلے ہوئے ہیں آخری جلد صرف خواتین کے حالات پہ مشتمل ہے۔

طبقات کی تقسیم دو طرح پہ ہوئی ہے۔

۱۔ زمانی تقسیم ۲۔ مکانی تقسیم

رعایت زمانی (CHRONOLOGICAL ORDER) تو اِن تراجم میں شروع سے آخر تک ملحوظ رہی ہے، اس میں سب سے پہلے اُن صحابہ کے حالات ہیں جنھیں اسلام لانے کا شرف پہلے نصیب ہوا اور جو "السابقون الاوّلون" کہلاتے ہیں یہ وہ اصحاب ہیں جنھوں نے ہجرت حبشہ میں حصہ لیا یا فتح مکہ سے قبل اسلام لائے وغیرہ۔

اسی طرح مہاجرین و انصار میں سب سے پہلے بدری اصحاب کو لیا ہے کیونکہ بدر میں حصہ لینے والوں کی فضیلت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

طبقات کی ایسی تقسیم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابن سعد نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دواوین کی تیاری میں کیا تھا۔

اس زمانی تقسیم کے بعد مکانی تقسیم ہے اس میں اصحاب و تابعین کا تذکرہ اُن کے شہروں کے لحاظ سے کیا گیا ہے مثلاً مکہ، مدینہ، طائف، یمن، یمامہ، کوفہ، بصرہ، دمشق اور مصر وغیرہ۔ اس مکانی ترتیب میں بھی زمانی درجہ بندی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک طبقہ میں عموماً ایک نسل یا دس بیس سال کی مدت حاوی ہوتی ہے۔ ابن سعد کے ہاں دو طبقوں کے درمیان اوسطاً بیس سال کا زمانی بُعد پایا جاتا ہے مثلاً تیسرا طبقہ سنہ ۱۰۱ھ سے سنہ ۱۱۳ھ تک پھیلا ہوا ہے اور چوتھے طبقے میں سنہ ۱۲۶ھ سے سنہ ۱۳۲ھ تک کے تراجم درج ہوئے ہیں۔

اس تقسیم میں ایک عیب یہ ہے کہ ایک ہی شخص کا حال متعدد مقامات پر آسکتا ہے مثلاً کوئی صحابی بدری تھے، ایامِ رسولؐ میں فتویٰ دیتے تھے اور پھر کسی دوسرے شہر میں جا کر بس گئے تھے، اس صورت میں لامحالہ اُن کا ترجمہ تینوں طبقات میں درج ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد کو بھی اس دشواری کا احساس تھا اور اس کا علاج اُس نے یہ سوچا کہ ایسی شخصیت کا ترجمہ ایک طبقہ میں تفصیل سے درج کر دیتا ہے اور دوسرے طبقات میں صرف چند امور کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔

روایات کے حصول میں ابن سعد نے خود کو اتنا منہمک رکھا ہے کہ صحابہ کے حالات وہ خاصی تفصیل سے قلمبند کرتا ہے اور ہر صحابی کے بارے میں متعدد روایات یکجا کر دیتا ہے مگر جیسے جیسے وہ اپنے زمانے سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، تراجم میں تفصیلات کا رجحان بھی کم تر ہوتا چلا گیا ہے حالانکہ اُسے اپنے معاصرین کے حالات لکھنے میں سب سے زیادہ تفصیل کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔

خود ابن سعد کی شخصیت اِن روایات میں کہیں نمایاں نہیں ہوتی اُس نے اپنی ذات کو سندوں کے پیچھے چھپا دیا ہے بلکہ اکثر عبارت پڑھتے ہوئے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اس کا راوی محمد بن سعد ہے یا اس کا کوئی شاگرد (مثلاً الحارث بن ابی اُسامہ) روایت کر رہا ہے۔ ایسے مواقع پر سند اس طرح آتی ہے۔ "حدثنا محمد بن سعد . . . ." گویا اصل راوی وہ نہیں بلکہ اس کا شاگرد ہو گیا ہے۔

اس کتاب میں بہت سی موضوع روایات بھی داخل ہو گئی ہیں اور ایسا ہر اُس کتاب میں ہونا بالکل فطری بات ہے جس کی بنیاد زبانی روایات پر رکھی گئی ہو۔

اکثر روایات پر ابن سعد نے تعلیقات یا (NOTES) نہیں لکھے ہیں مگر کہیں کہیں وہ محاکمہ کرتا ہوا ملتا ہے اور اگر دو رائیں معارض ہوتی ہیں تو اپنی رائے یا ترجیح کا اظہار کر دیتا ہے مثلاً معد بن عدنان کے نسب میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اس پر ابن سعد نے حاشیہ دیا ہے۔

ولم أر بينهم إختلافاً [1]

اسی طرح وہ ہشام الکلبی سے روایت لیتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا جب انتقال ہوا تو حضور کی عمر ۲۸ ماہ تھی۔ بعض نے سات ماہ بیان کی ہے مگر ابن سعد کہتا ہے:

"والأول أثبت أنه توفي ورسول الله صلى الله عليه وسلم حمل" [2]

اور پہلی روایت زیادہ ثابت ہے کہ جب والد ماجد کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطن مادر میں تھے۔

---

[1] الطبقات ۱-۱/ ۲۹، ۶۲، ۶۴، ۶۸ ، [2] الطبقات ۱-۱/ ۶۲ -

اسی طرح ایک روایت آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر تشریف لے گئے اور وہاں روئے۔ ابن سعد کہتا ہے کہ یہ غلط ہے:

لیس قبرها بمکة وقبرها بالأبواء[1] — اُن کی قبر مکہ میں نہیں بلکہ ابواء میں ہے۔

یا مثلاً حُمید بن عبد الرحمٰن کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں نے بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ انہوں نے ۱۰۵ھ میں انتقال کیا مگر یہ غلط ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ۹۵ھ صحت سے زیادہ قریب ہے[2]

وہ ہشام الکلبی سے نقل کرتا ہے کہ جنگ بدر میں السائب بن مظعون شریک تھے عثمان بن مظعون نہیں۔ اُس پر یہ نوٹ دیتا ہے:

وذلک عندنا منه وهْلٌ لأن اصحاب	اور ہماری رائے میں یہ اُس سے چوک ہوئی ہے اس
السيرة ومن يعلم المغازی يثبتون	لیے کہ سیرۃ نگار اور جو لوگ مغازی کا علم رکھنے والے ہیں
السائب بن عثمان بن مظعون فيمن	وہ سب السائب بن عثمان بن مظعون کا نام اُن لوگوں
شهد بدرًا وشهد أحدًا والخندق	کی فہرست میں درج کرتے ہیں جنھوں نے بدر، احد، خندق
والمشاهد كلها[3]	اور دوسرے تمام مشاہد میں حصہ لیا تھا۔

ابن سعد اپنی روایات میں اشعار کا استعمال بھی خاصی مقدار میں کرتا ہے مگر یہ بہر حال ابن اسحٰق سے بہت کم ہیں جس کی کتاب المغازی کا پانچواں حصہ شاعری پر مشتمل ہے اور یقیناً اس نے الواقدی کی بہ نسبت بھی اشعار کم استعمال کئے ہیں۔

طبقات کی اہمیت

ابن سعد کی اس تالیف کتاب الطبقات الکبیر کی اہمیت اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اس سے پہلے طبقات کے موضوع پر الواقدی کی تالیف کے سوا اور کسی کتاب کا نام ہمیں نہیں ملتا ہے اور الواقدی کی یہ تالیف ناپید ہو چکی ہے۔ اس حیثیت سے یہ سب سے قدیم ماخذ اور تاریخ اسلامی کے مصادر میں نہایت قیمتی حوالے کی کتاب ہے اس کے بعد تو اسماء الرجال کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن ابن سعد کے سامنے الواقدی کی تصنیف کے سوا دوسرا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔

طبقات کی تقسیم کے انداز پر جو کتابیں بعد کو لکھی گئیں، ابن سعد اُن سب کے لئے نمونہ بنا رہا اور تقریباً سب مؤلفین نے ابن سعد سے خوشہ چینی کی ہے خواہ اس کا حوالہ انہوں نے دیا ہو یا نہ دیا ہو۔

البلاذری (صاحب فتوح البلدان) کے ابن سعد سے گہرے مراسم تھے چنانچہ 'انساب الاشراف' اور 'فتوح البلدان' دونوں

---

[1] الطبقات ۱-۱/۷۴، معجم البلدان ۱/۷۹۔

[2] الطبقات جلد ۵/۱۱۵۔

[3] الطبقات ۳-۱/۲۹۲۔

پر ابن سعد کا واضح اثر موجود ہے۔

سیرۃ میں بھی ابن سعد نے جو فصول قائم کی ہیں اور جس طرح کے ابواب میں سیرۃ کے مواد کو تقسیم کیا ہے، بعد میں آنے والے سیرۃ نگاروں نے اسی انداز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں مثلاً ابونعیم اور البیہقی وغیرہ

ابونعیم الاصبہانی کی کتاب 'حلیۃ الاولیا' کا انداز (PATTERN) وہی ابن سعد والا ہے اور اسناد کا بھی وہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے جو ہمیں ابن سعد کے ہاں ملتا ہے۔

مگر اس پہ حیرت ہے کہ ابن عبدالبر القرطبی نے الاستیعاب میں طبقات ابن سعد سے استفادہ کا اعتراف نہیں کیا بلکہ وہ کہتا ہے میں نے طبقات الواقدی سے فائدہ اُٹھایا ہے جسے محمد بن سعد نے اور اُن سے ابراہیم بن موسیٰ بن جمیل نے روایت کیا ہے۔ مؤخر الذکر راوی اندلس کا باشندہ ہے یہ مشرق کی طرف ہجرت کر گیا تھا وہاں احمد بن حنبل، ابن ابی الدنیا، ابن قتیبہ اور ابن سعد سے سماعت کی تھی اندلسیوں میں ابن سعد کی شہرت زیادہ نہیں تھی بلکہ طبقات الواقدی سے علماً زیادہ واقف تھے چنانچہ الکلاعی البلنسی نے اپنی کتاب الاکتفاء میں ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ، الواقدی اور مصعب الزبیری کے حوالے تو دیے ہیں مگر ابن سعد اور اس کی طبقات کا کہیں نام تک نہیں لیا۔ البتہ دوسرے اندلسی عالم ابن ابی بکر (متوفی ۷۴۱ھ) نے اپنی کتاب التمہید والبیان فی مقتل الشہید عثمان میں ابن سعد سے نقل کیا ہے یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے [1]

ابن الاثیر مؤلف 'اُسد الغابہ' نے اپنی کتاب میں ابن مندہ، ابونعیم ابن عبدالبر اور حافظ ابوموسیٰ محمد بن ابی بکر بن ابی عیسیٰ الاصبہانی کی تالیفات سے اخذ کیا ہے۔ گویا ابن سعد کی کتاب سے بالواسطہ فائدہ اٹھایا ہے مگر اس کا نام نہیں لیا یہ تجاہل معنی خیز ہے۔

ابن عساکر کی تاریخ دمشق، الذہبی کی تاریخ الاسلام اور تجرید اسماء الصحابہ و سیر اعلام النبلاء اور الاصابہ، تہذیب التہذیب وغیرہ کے اہم ترین مصادر میں سے ایک طبقات ابن سعد بھی ہے ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں بھی اس سے اقتباسات لیے ہیں۔ ابن تغری بردی نے اعتراف کیا ہے کہ النجوم الزاہرۃ میں ہم نے طبقات سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح المقریزی کی کتاب امتاع السماع اور دوسری کتب رجال کا حال ہے کہ ان سب نے طبقات ابن سعد سے خوب استفادہ کیا ہے۔

ابن سعد کی کتاب کا کچھ حصہ ہمیں الحارث بن ابی اُسامہ کی روایت سے ملا ہے اور کچھ الحسین بن فہم سے پہنچا ہے یہ دونوں ابن سعد سے روایت کرتے ہیں اور الحارث نے براہ راست الواقدی سے بھی روایت کی ہے الحارث سے ابوایوب سلیمان بن اسحٰق الحلاب نے اور ابن فہم سے ابوالحسن احمد بن معروف الخشاب نے روایت کی ہے۔ یہ دونوں روایتیں ابوالحسن ابن حیویہ الخزاز کے پاس جمع ہوگئیں اور پھر متعدد راویوں نے ان کو پھیلایا حتیٰ کہ محدث شام شمس الدین ابوالحجاج یوسف بن خلیل دمشقی سے شرف الدین محمد بن عبدالمومن الدمیاطی تک سلسلہ مل گیا۔

---

[1] اس مطالعہ کے اس حصہ میں، اور بعض دوسرے مواقع پر بھی ہم نے مارسیدن جونس کے مقدمہ کتاب المغازی اور الطبقات الکبیر (طبع بیروت) کے مقدمہ سے استفادہ کیا ہے۔

کتاب الطبقات الکبیر پچھلی صدی تک غیر مطبوعہ تھی اور بہت سے علماء کی اس تک رسائی نہیں تھی۔ ۱۹۰۳ء میں جرمن مستشرقین کی ایک جماعت نے طبقات کی ترتیب و تحقیق متن کا کام شروع کیا یہ ایڈورڈ زخاؤ[1] (E. SACHAU) کی نگرانی میں ہوا مختلف جلدوں کی ترتیب میں جن علماء نے اعانت کی ان میں جوزف ہورووٹس (JOSEPH HOROVITZ)، متورخ بروکلمان (KARL BROCKLEMANN) شوالے (SCHWALLEY) لبرٹ (LEBRET) میسز، استرستین[2] KARL VILHELM ZETTERSTEEN وغیرہ شامل ہیں۔ ان حضرات کے سامنے طبقات کے پانچ مخطوطات رہے جن کی تفصیل طبقات کے مقدمہ (جرمنی) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

---

[1] کارل ایڈورڈ زخاؤ (KARL EDWARD SACHAU) [۱۸۴۵ - ۱۹۳۰ء] جرمن مستشرق، ۱۸۶۹ء میں جامعہ ویانا میں سامی زبانوں کا استاد مقرر ہوا اور ۱۸۷۶ء میں برلن یونیورسٹی میں مشرقی لغات کا۔ شام اور عراق میں طویل سفر کئے اور جرمن میں ایک سفرنامہ لکھا۔ برلین میں مدرسہ شرقیہ قائم کیا۔ البیرونی کی الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ شائع کی اور ماللہند من مقالہ بھی۔ طبقات ابن سعد کی چار جلدیں اس نے مرتب کیں بعد میں دوسروں نے اس کام کی تکمیل کی۔ اسی طرح الجوالیقی کی المعرب من الکلام الاعجمی بھی ایڈٹ کی۔

الاعلام ۶ / ۶۴ المستشرقون ۱۱۸

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۲۹ء)

معجم المطبوعات ۱۰۱۵

[2] کارل ولہلم استرستین (KARL VILHELM ZETTERSTEEN) (۱۸۶۶ - ۱۹۵۳ء) مشہور مستشرق، سویڈن کے شہر اورسا (ORSA) میں پیدا ہوا اور اپسالہ یونیورسٹی OPSALA سے پی ایچ ڈی کیا (۱۸۹۵ء) اور وہیں سامی زبانوں کا استاد مقرر ہو گیا۔ اس نے مصر، شام، تیونس وغیرہ ممالک اسلامیہ کی خوب سیاحت کی۔ ایک مجلّہ بھی العالم الشرقی کے نام سے نکالا۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں متعدد آرٹیکل لکھے۔ سویدی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا (۱۹۱۷ء) ایک کتاب سویدی زبان میں مشرقی زبانوں کے موضوع پر لکھی۔ ایک کتاب سیرۃ کے موضوع پر ہے۔ ایران کا سفرنامہ بھی شائع کیا۔ اس نے متعدد اہم متون ایڈٹ کئے۔ سب سے اہم تہذیب اللغۃ للازھری ہے طبقات ابن سعد کی پانچویں اور چھٹی جلد کی تحقیق و ترتیب بھی اسی کا کارنامہ ہے نیز طرفۃ الاصحاب للاشرف الرسولی، شمس العلوم لنشوان حمیری، (اس کے دو جز ایڈٹ کئے اور باقی کام پروفیسر س۔ ڈیڈرینگ کے سپرد کر دیا تھا) تاریخ سلاطین مصر والشام (مجہول المصنف) معارج الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ، آکفیہ ابن معط الزوادی فی النحو وغیرہ۔ یہ کبھی اپنے مقالات عبدالرحمن کے قلمی نام سے بھی لکھتا تھا یا حروف ثلاثہ K.V.Z کا استعمال کرتا تھا۔ اس کے باپ کا نام الکزنڈر موریس استرستین A.M.ZETTERSTEEN تھا۔ مجلہ مجمع العلمی العربی ج ۷ / ۳۳۰ - ۳۳۴ میں اس نے اپنے خود نوشت حالات لکھے ہیں اور اسی مجلہ میں ایک مضمون ڈیڈرنگ S. DEDRANG کے قلم سے جلد ۲۹ (صفحات ۱۴۰ - ۱۴۳) شائع ہوا تھا۔ الاعلام ج ۶ / ۶۴

(۵)

طبقات ابن سعد میں سیرۃ کا مواد

کائنات کی تخلیق کا بیان سیرۃ نبوی کا دیباچہ ہے اس میں آفرینش عالم کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ قرآن نے اس موضوع پر صرف چند اشارے کیے ہیں اور اُن میں خرافی عنصر MYTHOLOGICAL ELEMENT اگر ہے بھی تو برائے نام۔ البتہ آفرینش جسے سیرۃ نگاروں کی اصطلاح میں مبتدا، مبتدأ الخلق، مبدأ وغیرہ بھی کہا جاتا ہے اس کی تفصیلات کا ماخذ عموماً توراۃ ہے یا پھر تالمود TALMUD اور دوسری یہودی روایات جنھیں ہمارے علما "اسرائیلیات" کہتے ہیں۔ ابن سعد نے اس حصے کو تقریباً نظرانداز کر دیا ہے پھر بھی اس نے ابتدائی حصے میں خلق آدم اور نفخ روح وغیرہ کا بیان کیا ہے۔

کائنات کی آفرینش کے بعد آدم اور حوا کی تخلیق، جنت میں اُن کا قیام اور وہاں سے ہبوط کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس میں سیرۃ نگار صرف اسی تفصیل پر قناعت نہیں کرتے جو قرآن نے بیان کی ہے بلکہ توراۃ کی روایات اور اسرائیلی حکایات کی آمیزش کر کے اُسے خاصا مفصل بنا دیتے ہیں۔ آدم و حوا کا بیان گویا تاریخ نبوت کا آغاز ہے چونکہ مسلم مورخین کا نظریہ یہ رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اتفاق سے مبعوث نہیں ہوگئے تھے بلکہ آپ پوری تاریخ نبوت و رسالت کا آخری باب تھے خاتم الانبیاؑ تھے اور وہی دعوت لے کر آئے تھے جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاؑ نے پیش کی تھی جس کے حوالے جا بجا قرآن میں ملتے ہیں اور جسے مفسروں نے دوسرے مصادر کی مدد سے خاصا واضح کر کے پیش کیا ہے اس لیے قصص الانبیاؑ کا یہ حصہ گویا سیرۃ کا دوسرا تمہیدی باب بن جاتا ہے جس میں آدم کے زمین پر آنے سے لے کر حضرت عیسٰی کے آسمان پر جانے تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ حضرت عیسٰی اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا زمانہ فترۃ کہلاتا ہے جس میں کوئی دوسرا نبی مبعوث نہیں ہوا۔

اسی ذیل میں اُن اقوام کا تذکرہ بھی آجاتا ہے جن کے درمیان یہ انبیاؑ ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی دعوت پر لبیک نہیں کہا۔ اس لئے قہر الٰہی کا شکار ہوگئیں۔

ابن سعد نے حضرت حوا اور حضرت ادریس کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ پیغمبر نوح کے بارے میں اُن کے سفینے اور طوفان کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے بارے میں کچھ روایات بیان کر کے دوسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ حضرت آدم اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کتنا عرصہ گذرا ہے دنیا کی عمر شمار کرنے کا یہ طریقہ بائبل کے اثر سے اسلامی کتابوں میں بھی آگیا ہے۔

قصص الانبیاؑ کے ان حصوں میں ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی روایات کثرت سے لی گئی ہیں اور ان میں انبیاء کے نسب بھی بیان ہوئے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پدری اور مادری سلسلہ نسب بھی الکلبی کی روایت سے بیان ہوا ہے حضور کی اناؤں اور کھلائیوں کے بارے میں بھی معلومات جمع کی ہیں پھر قصی بن کلاب اور قریش کی دوسری اہم شخصیتوں کے حالات ہیں جو حضور کی بعثت سے پہلے سربرآوردہ مانے جاتے تھے۔ اس کے بعد عبدالمطلب بن ہاشم اور عبداللہ بن عبدالمطلب کا حال ہے

ان کے آخری سفر شام، بیماری اور وفات اور مدفن کی تفصیلات بیان کی ہیں[۱]۔ ایک روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ سے کیا کیا ترکہ میں ملا تھا[۲]۔

پھر حضورؐ کی ولادت سے متعلق روایات ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ ربیع الاول کو دوشنبہ کے دن پیدا ہوئے تھے اور یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے جو ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ پر چڑھائی کی تھی جس کا حوالہ سورہ "الم ترکیف" میں ہے، اس واقعہ کو رسول اللہؐ کی ولادت کے وقت ۵۵ راتیں گذری تھیں۔ ابو معشر سندی کا قول ہے کہ آپ کی ولادت ۲ ربیع الاول کو ہوئی۔ ماہ و تاریخ کے بیان میں روایات کا یہ اختلاف تقویم کی تبدیلیوں کے باعث ہے۔ تمام روایات میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ ولادت باسعادت پیر کے دن ہوئی اور عام الفیل میں ہوئی۔

ولادت سے پہلے حضرتؐ کی والدہ ماجدہ نے بشارت آمیز خواب دیکھے تھے بعض روایتوں میں وہ خواب بیان ہوئے ہیں۔ کچھ روایات یہ بتاتی ہیں کہ حضورؐ مختون پیدا ہوئے تھے اور آپ کی نال بھی قدرتی طور پر کٹی ہوئی تھی[۳]۔

حضرت آمنہ کا انتقال ابواء میں ہوا اور وہیں آپ کی قبر ہے[۴]۔ عمرہ حدیبیہ کے موقع پر حضور کا گذر ابواء سے ہوا تو آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی بھی زیارت کی، اس کی مرمت کرائی اور اس کے پاس بیٹھ کر روئے یہاں تک کہ جتنے صحابی موجود تھے وہ بھی سب رونے لگے۔[۵]

حضور کے دادا عبدالمطلب کی وفات ۸۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ دوسری روایات میں اُن کی عمر ایک سو دس سال اور ایک سو بیس سال بھی بیان کی گئی ہے اس وقت رسول اللہ کا سن شریف آٹھ سال تھا۔ وہ حجون کے[۶] مقام پر دفن ہیں اُمّ ایمن نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہؐ کو عبدالمطلب کی قبر کے سرہانے روتے ہوئے دیکھا تھا[۷]۔

رسول اللہؐ جب تجارتی سفر پر شام کی طرف تشریف لے جاتے تھے تو وہاں بعض عیسائی راہبوں سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی تھی[۸]۔ آپ کے چچا ابوطالب بھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ابوطالب کا انتقال ۱۵ شوال کو بعثت کے دسویں سال میں ہوا[۹]۔

۱۔ الطبقات ج ۱ : ۹۹ ۔ ۲۔ ایضاً ۱ : ۱۰۰

۳۔ الطبقات ج ۱ : ۱۰۳ ۔ ۴۔ الطبقات ۱/۱۱۶ ، معجم البلدان ۱/۷۹ ۔

۵۔ ایضاً ۱/۱۱۶

۶۔ معجم البلدان ۲/۲۲۵ ۔

۷۔ الطبقات ۱/۱۱۹ ۔

۸۔ ایضاً ۱/۱۲۱ ، ۱/۱۵۴ ، ۱/۱۵۶ ،

۹۔ الطبقات ۱/۱۲۵ ۔

اُن کی وفات سے ایک ماہ پانچ دن کے بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی ۶۵ سال کی عمر پا کر انتقال فرمایا[1]

بعثت سے قبل کے واقعات حکیم بن حزام کی روایت سے آتے ہیں۔ انہوں نے طویل عمر پائی تھی۔ چنانچہ حرب الفجار اور حرب الفضول میں رسول اللہؐ کی شرکت کا حال انھیں کے حوالے سے بیان ہوا ہے[2]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کے نکاح کی روایت نفیسہ بنت منیہ کے حوالے سے آئی ہے۔ حضور کی اولاد میں حضرت ابراہیم کے سوا سب صاحبزادے اور صاحبزادیاں حضرت خدیجہ ہی کے بطن سے تھیں اس لیے مشہور شیعی مؤرخ اور نسابہ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کے حوالے سے آپؐ کی اولاد کا بیان ایک علٰحدہ باب میں ہوا ہے اور حضرت ابراہیم کے لئے علٰحدہ باب مختص کیا گیا ہے[3]

مصر کے بادشاہ مقوقس نے حضور کی خدمت میں دو قبطی کنیزیں حضرت ماریہ قبطیہ اور سیرین، ایک خچر (یعفور) اور ایک گھوڑی (دُلدل) ہدیہ کے طور پر بھیجی تھیں۔ حضورؐ نے سیرین کو حضرت حسان بن ثابتؓ کی تحویل میں دے دیا اور حضرت ماریہ قبطیہ کو اپنی ملک ہونے کا شرف بخشا تھا۔ انھیں کے بطن سے حضرت ابراہیم ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ حضرت ماریہؓ کو رسول اللہؐ نے اپنی جاگیر العالیہ میں رکھا تھا یہ وہ جگہ ہے جو اموال بنی نضیر میں سے آں حضرت کے حصے میں آئی تھی[4] حضرت ابراہیم کی ولادت سے حضرت ماریہؓ آزاد کر دی گئی تھیں اور حضور نے فرمایا تھا۔

أَعتقَ أُمَّ ابراهيمَ وَلَدُها[5] — ابراہیم کی ماں کو اس کے بیٹے نے آزاد کر دیا

جناب ابراہیم کا انتقال ۱۶ ماہ کی عمر میں سہ شنبہ ۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ کو ہوا اور آں حضرت نے اُن کے انتقال پر حُزن و ماتم کا اظہار فرمایا تھا[6] ان کی قبر پر حضور نے پتھر رکھنے کا حکم دیا اور قبر پر پانی سے چھڑکا ؤ کیا گیا تھا۔

قدیم آسمانی صحیفوں میں آں حضرت کی آمد کی بشارتیں اور نبوت کی علامتیں نیز اس دور کے عرب میں یہود و نصاریٰ کے علماء کی آراء اور پیش گوئیوں کا بیان کرنے کے بعد ایک علٰحدہ باب میں "مبعث" کا حال لکھا گیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ عبد الملک ابو سلیمان نے ابو جعفر سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

بُعِثتُ إلى الأحمرِ والأسودَ — میں سرخ اور سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

اور اس کی تشریح بھی خود عبد الملک نے کی ہے کہ

الأحمرُ الناسُ والأسودُ الجنُّ — سرخ سے مراد انسان ہیں اور سیاہ سے مراد جنات ہیں

لیکن خالد بن معدان کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

در میں تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، اگر وہ لبیک نہ کہیں تو عرب کی طرف، اور وہ بھی نہ مانیں تو قریش کی طرف اور وہ

---

[1] الطبقات ۱/۱۲۵ - [2] الطبقات ۱/۱۲۷ - [3] الطبقات ۱/۱۳۴ -
[4] الطبقات ۱/۱۳۴ - [5] الطبقات ۱/۱۳۴ - [6] الطبقات ۱/۱۳۶ -
[7] الطبقات ۱/۱۴۶ -

بھی اعراض کریں تو بنو ہاشم کی طرف، اور وہ بھی تسلیم نہ کریں تو تنہا اپنے لئے۔"

بعثت اور ختم نبوت کے سلسلے کی دوسری روایات و احادیث بھی ہیں لیکن احمر اور اسود کی جو تشریح عبدالملک نے کی ہے اُن روایات کی روشنی میں اس کا مفہوم یہی لینا چاہیے کہ آں حضرت کالی اور گوری تمام نسلوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

ابن سعد نے بعثت (اعلان نبوت) کی تاریخ ۱۷ رمضان ۴۰ھ ولادت نبوی بتائی ہے[1]۔ پھر نزول وحی کے آغاز، اولین آیات قرآنی، اور وحی نازل ہونے کے وقت آں حضرت کی کیفیات کا بیان ہوا ہے۔

اس کے بعد دعوت اسلام اور ہجرت حبشہ کا ذکر آتا ہے[2] یہ ہجرت ماہ رجب ۵ھ بعثت میں ہوئی تھی۔ ابن سعد نے مہاجرین حبشہ کی فہرست بھی دی ہے[3]۔

حبشہ کی طرف دوسری ہجرت میں ۸۳ مرد اور ۱۱ عورتیں قریش کی شامل تھیں سات افراد دوسرے قبائل کے تھے[4] وہاں ان مہاجرین نے آں حضرت کے مدینہ کو ہجرت فرماتے کی خبر سنی تو ۳۳ مرد اور ۸ عورتیں حبشہ سے واپس آ گئی تھیں ان میں سے دو مرد مکہ میں انتقال کر گئے اور سات کو اہلِ مکہ نے نظر بند کر دیا تھا باقی نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ان میں سے ۲۴ افراد بدر میں شریک ہوئے[5]۔

ربیع الاول ۷ھ میں رسول اللہؐ نے نجاشی کو خط لکھا اور اسلام لانے کی دعوت دی یہ خط لے کر عمرو بن امیۃ الضمری گئے تھے۔ ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے شوہر عبیداللہ بن جحش نے بھی حبشہ کو ہجرت کی تھی اور وہاں وہ عیسائی ہو گیا تھا اسی حال میں انتقال ہوا تب رسول اللہؐ نے نجاشی کو خط لکھ کر ام حبیبہؓ سے اپنا نکاح کیا تھا[6]۔

رسول اللہؐ کے سفر طائف کا حال علیحدہ باب میں ہے۔ یہاں آپ نے دس دن قیام فرمایا تھا[7]۔ ہجرت سے ۱۸ ماہ قبل ہفتہ کی شب میں ۱۷ رمضان کو واقعہ معراج پیش آیا تھا[8]۔ یہ الواقدی کی روایت ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرۃ وغیرہ سے ہے مگر عروہؓ، عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایات میں یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال قبل ۱۷ ربیع الاول کا بتایا گیا ہے[9]۔

بیعت عقبۂ اولیٰ میں جن بارہ افراد نے شرکت کی تھی اُن کے نام دیے ہیں اس کے بعد ہی مصعب بن عُمیر کو قبائل اوس و خزرج میں تعلیم قرآن کے لئے مامور کیا گیا تھا[10]۔

اس کے بعد بیعت عقبۂ ثانیہ کا حال آتا ہے[11]۔

---

[1] الطبقات ۱/۱۹۴ -
[2] الطبقات ۱/۲۰۳ -
[3] الطبقات ۱/۲۰۴ -
[4] الطبقات ۱/۲۰۷ -
[5] الطبقات ۱/۲۰۷ -
[6] الطبقات ۱/۲۰۸ -
[7] الطبقات ۱/۲۱۲ -
[8] الطبقات ۱/۲۱۳ -
[9] الطبقات ۱/۲۱۴ -
[10] الطبقات ۱/۲۲۰ -
[11] الطبقات ۱/۲۲۱

مدینہ کو آں حضرت کی ہجرت کے سلسلے میں ابن سعد نے تفصیلی روایات درج کی ہیں اور ان روایات کو معمر بن راشد[۱]، ابن شہاب الزہری، عروۃ ابن الزبیر اور حضرت عائشہ کے ذریعے سے اخذ کیا ہے[۲]۔ اس سفر کی مختلف منزلیں اور راستے کی روداد بیان ہوئی ہے مدینہ میں نزول کی تاریخ دو شنبہ ۲ ربیع الاول بتائی ہے۔ دوسری روایت میں تاریخ ۱۲ ربیع الاول آئی ہے۔ یہ ہجرت شدید گرمی کے موسم میں ہوئی تھی چنانچہ جو مہاجر پہلے سے مدینہ پہنچ چکے تھے اور وہاں رسول اللہ کی تشریف آوری کے منتظر تھے وہ راستے میں کھڑے ہو کر آپ کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب دھوپ ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی تو اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف واپس ہو جاتے تھے۔

کان المهاجرون قد استبطاؤا رسول الله صلّی الله علیه وسلّم فی القدوم علیهم فكانوا یغدون مع الانصار الی ظهر حرة العصبه فیتحینون قدومه فی اوّل النهار فاذا أحرتهم الشمس رجعوا الی منازلهم[۳]

مہاجرین یہ خیال کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے میں دیر ہو گئی ہے وہ روز صبح کو انصار کے ساتھ شدید دھوپ میں کھڑے ہو کر دن کے اول حصے میں رسول اللہ کی تشریف آوری کا انتظار کیا کرتے تھے اور جب دھوپ انھیں جھلنے لگتی تھی تو اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان رسول اللہ نے مواخاۃ کا رشتہ قائم فرما دیا تھا۔ ابن سعد نے صحابہ کے تراجم میں حتی الوسع ایسی سب روایات جمع کر دی ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کس کے درمیان یہ رشتہ قائم ہوا تھا۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے بیان میں الزہری کی روایت یہ ہے کہ آں حضرت کی اونٹنی نے اسی جگہ قیام کیا تھا جہاں مسجد نبوی واقع ہے یہ زمین سہل اور سہیل نامی دو یتیم انصاری لڑکوں کی ملکیت تھی جسے آں حضرت نے دس دینار میں خریدا تھا اور سعد بن زرارۃ نے مسجد تعمیر کی تھی۔ اس کی بنیاد تقریباً ۳ گز گہری تھی اور پتھر سے اٹھائی گئی تھی پھر اینٹیں استعمال ہوئی تھیں۔ اس زمین میں عہد جاہلیت کی کچھ قبریں بھی تھیں جنھیں مسمار کر دیا گیا تھا اور ان میں سے جو ہڈیاں برآمد ہوئی تھیں انھیں چھپا دیا گیا تھا[۴] اس مسجد کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا اور اس کے تین دروازے تھے[۵]

تحول قبلہ کے بارے میں متعدد روایات ہیں۔ ابن عباس کا قول ہے کہ ہجرت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی گئی اسی لئے یہ مسجد القبلتین کہلاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تحول قبلہ دو شنبہ ۱۵ رجب کو ۱۷ ماہ بعد ہجرت ہوا اور ہجرت کے

۱۔ معمر بن راشد (۹۵-۱۵۳ھ / ۷۱۳-۷۷۰ء) ابن ابی عمرو الازدی الحدانی ابوعروۃ، فقیہ، حافظ حدیث، متقن، ثقہ، اہل بصرہ میں سے تھے وہیں پیدا ہوئے اور شہرت پائی پھر یمن چلے گئے تھے وہاں سے واپس آنا چاہا تو اہل یمن نے آنے نہ دیا اور وہاں ان کی شادی کر دی۔ یہ تمین رجال حدیث میں سے ہیں اور یمن میں پہلے تصنیف کرنے والے ہیں تفصیل دیکھو تہذیب التہذیب ۱۰/۲۴۳ میزان الاعتدال ۳/۱۸۸، تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۷۸، شرح الفیۃ العراقی ۱/۳۲، الجرح والتعدیل ۴-۱/۲۵۵، ابن الندیم (فلوجل) ۹۴ میں انھیں کوفی لکھا گیا ہے۔

۲۔ الطبقات ۱/۲۳۳، ۳۔ الطبقات ۱/۲۳۳، ۴۔ الطبقات ۱/۲۳۹، ۵۔ الطبقات ۱/۲۴۰۔

اٹھارویں مہینے میں روزے فرض ہوئے۔[1]

اس کے بعد مسجد قباء کا بیان ہے[2]۔ ہشام بن عروۃ اور دوسرے محدثین کا قول ہے کہ قرآن میں اسی کو (أسس علی التقوی) کہا گیا ہے۔ پھر وہ روایات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنے کے لیے آں حضرتؐ کبھی پیادہ اور کبھی سوار ہو کر تشریف لے جاتے تھے اسی لئے حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اگر مسجد قباء آفاق کے اُس سرے پر بھی ہوتی تو ہم اُس کی زیارت کرنے کے لئے اونٹوں کو تھکا دیا کرتے[3] اس کے بعد اذان کا بیان ہے۔ یزید بن رومان نے عروۃ بن الزبیر سے اور ابن شہاب الزہری نے سعید بن المسیّب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں اذان نہیں تھی۔ پکارنے والے گلی کوچوں میں جا کر ندا دے آتے تھے "الصّلاۃ جامعۃ"۔ جب قبلہ تبدیل ہوا تو آں حضرتؐ کو اذان کا خیال آیا کسی نے ناقوس تجویز کیا، کسی نے بھونپو۔ ابھی یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ مسلمانوں کو اقامتِ نماز کی اطلاع دینے کا کیا ذریعہ اختیار کیا جائے کہ عبداللہ بن زید الخزرجی نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص سبز لباس پہنے اور ہاتھ میں ناقوس لیے جا رہا ہے، اُنہوں نے پوچھا "کیا یہ ناقوس بیچتے ہو؟"

اُس نے کہا: "تم اس کا کیا کرو گے؟"

انہوں نے کہا: "اسے بجا کر لوگوں کو نماز کی اطلاع دیا کروں گا۔"

اُس شخص نے کہا کہ میں اس سے بہتر چیز تمہیں بتلائے دیتا ہوں۔ پھر اذان کے کلمات تعلیم کیے۔ جب انہوں نے یہ خواب آں حضرتؐ سے بیان کیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ بلالؓ کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ الفاظ انھیں یاد کرا دو۔ اتنے میں حضرت عمر فاروقؓ آئے اور انہوں نے بھی ایسا ہی خواب بیان کیا[4] فجر کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا اضافہ حضرت بلالؓ نے کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے باقی رکھا[5]

ایک باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور اُستنِ حنانہ کا بیان ہے[6] پھر صفہ اور اصحاب صفہ ہیں۔ واثلہ بن الاسقع نے ان کی تعداد (۳۰) بتائی ہے ان میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ بھی شامل تھے۔

مکتوبات وفرامین

اس حصے کا سب سے اہم اور قابلِ قدر باب وہ ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و فرامین کا بیان ہوا ہے، جو آپ نے ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو دعوتِ اسلام کے سلسلے میں بھیجے تھے۔ بہت سے مکتوبات کا متن بھی ابن سعد نے درج کیا ہے۔ اکثر حالات میں یہ بھی بتایا ہے کہ مکتوب مبارک کس کے ہاتھ بھیجا گیا ان مکتوبات کی روایت کرنے والوں کے نام

---

[1] الطبقات ۱/۲۴۲ نیز ۱/۲۴۸ ، [2] الطبقات ۱/۲۴۴ - [3] الطبقات ۱/۲۴۵ [4] الطبقات ۱/۲۴۶

[5] الطبقات ۱/۲۴۸ ، [6] الطبقات ۱/۲۴۹ - ۲۵۴ -

حسبِ معمول خلط ملط کر دیے ہیں مگر اس فہرس میں معمر بن راشد، الزہری، عبیداللہ بن عتبہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جن مکتوبات کا ابنِ سعد نے حوالہ دیا ہے وہ صلح حدیبیہ (ذی الحجہ ۶ھ) کے بعد لکھے گئے تھے ان خطوط پر ثبت کرنے کے لیے آں حضرتؐ نے اپنی چاندی کی مہر بھی تیار کرائی تھی۔ جس کی شکل بیضوی تھی سب سے اوپر اللہ اس کے نیچے رسول اور آخری سطر میں محمد لکھا ہوا تھا۔



پہلے ہی دن (محرم ۷ھ) چھ قاصد روانہ کیے گئے تھے یہ جن لوگوں کی طرف مامور ہوئے تھے ان کی زبانوں سے واقف تھے۔

الشعبی کا بیان ہے کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطوط میں قریش کے طریقہ قدیم کے مطابق باسمک اللھم لکھا کرتے تھے۔ جب یہ آیہ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا نازل ہوئی تو حضورؐ نے بسم اللہ لکھا اور جب دوسری آیۃ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوئی تو آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوانا شروع کر دیا تھا[۱] آنحضرتؐ خطوط پر کبھی گواہ کا نام بھی لکھواتے تھے۔ کبھی ایک گواہ کبھی دو کبھی زیادہ[۲] کبھی گواہ نابالغ بھی ہوتے تھے جیسے حضرات الحسنؓ اور الحسینؓ کی گواہی ایک خط پر موجود ہے جو اُس وقت کم سن رہے ہوں گے۔ بعض خطوط پر خدا اور اس کے رسولؐ کی گواہی کافی سمجھی گئی۔ کسی پر لکھا ہے "من حضر" (جو موجود تھا)۔

یہ خطوط اکثر چمڑے پر لکھے جاتے تھے چنانچہ ایک خط کے بارے میں یہ روایت موجود ہے کہ مکتوب الیہ نے اس سے اپنے پانی بھرنے کے ڈول میں پیوند لگا لیا تھا[۳] بعض روایتوں سے سرخ چمڑے پر خط لکھنا ثابت ہے[۴]

بعض حالتوں میں ترجمانی کی ضرورت بھی پڑتی تھی اور خود آں حضرتؐ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اگر وہ تم سے عجمی زبان میں بات چیت کریں تو کہہ دینا کہ ترجمہ کرو[۵]

ان مکتوبات و فرامین میں سے اکثر کو الواقدی نے بچشم خود دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ابن سعد نے ایک باب میں "وفادات العرب" کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ اور اُن تمام وفود اور رسالتوں کی تفصیل دی ہے جو فتح مکّہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمام عرب علاقوں سے آرہے تھے۔ ابن سعد نے (۷۲) وفود کا بیان کیا ہے۔

اہلِ کتاب سے تعلقات

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے دورِ اوّل کے مسلمانوں کے تعلقات کیا رہے ہیں، اس موضوع پر بھی طبقات میں بہت سا

۱؎ الطبقات ۱/۲۶۴ ، ۲؎ الطبقات ۱/۲۸۹ ، ۳؎ الطبقات ۱/۲۸۱ ، ۴؎ الطبقات ۱/۳۰۲ -
۵؎ الطبقات ۱/۲۸۲ -

مواد بکھرا ہوا ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں تین طبقوں کے پیرو شامل تھے۔ کچھ تو وہ لوگ تھے جو عرب کے عہد جاہلیت کے مذاہب پر تھے اِن کو قرآن کی اصطلاح میں مُشرک کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قبیلے کا بُت علیحدہ تھا اور ہر مقصد کے لئے نیا بُت بنا لیا گیا تھا۔ دورِ جاہلیت کے بعض اصنام کا حوالہ قرآن میں بھی موجود ہے اور باقی اصنام کی تفصیل ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی کتاب الاصنام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا طبقہ یہود کا تھا۔ یہ زیادہ تر مدینہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے اور یمن میں بھی ان کی کثیر آبادی تھی۔ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بھی تھا۔ کتابیں بھی تصنیف کرتے تھے اور انہوں نے بائبل کی شرح میں نیز اپنے فقہی مسائل کی تفسیر میں لاکھوں روایات اور قصے بھی گھڑ لیے تھے۔ گویا اس دور کے عرب میں یہود علمی اعتبار سے ترقی یافتہ اور متمدن تھے۔

شام اور اس کے اطراف میں عیسائیوں کی کثرت تھی چنانچہ وہاں کے گرجاؤں میں کاہن اور راہب اپنی مذہبی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے ان راہبوں سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعثت سے قبل ملاقات کی ہے جس کا حوالہ کتب سیرۃ کی متعدد روایات میں ملتا ہے۔

خاص کہ اور اس کے اطراف میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو خواہ عیسائی ہوں یا یہودی یا عرب کے مقامی مذاہب کے پیرو ہوں، لیکن وہ صحف سماوی کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کی تشریح و تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔

جب اسلام کی دعوت آئی تو ان میں سے جو لوگ اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوئے اُن میں ایک تو وہ طبقہ تھا جو صدقِ دل سے مسلمان ہُوا اور تعلیمات اسلامی کو اس نے مکمل طور پر قبول کر لیا اگرچہ وہ جن تہذیبی و مذہبی روایات کے زیرِ سایہ بچپن سے پروان چڑھے تھے ان کے اثرات کو اپنے دل و دماغ سے مکمل طور پر محو نہیں کر سکتے تھے اور اس کی جھلک اُن کے اعمال و اقوال میں برابر نظر آتی ہے دوسرا طبقہ وہ تھا جو حالات کی مجبوری اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے مسلمان ہوا۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر آخر کار اسلامی رنگ غالب آ گیا اور مورخین کی اصطلاح میں (" ثم حَسُنَ إسلامُه) پھر اُن کا اسلام اچھا ہو گیا۔ کچھ وہ بھی تھے جو اگرچہ مسلمان رہے مگر ان کے دل و دماغ پر وہی قدیم روایات غالب رہیں۔

ایک طبقہ وہ تھا جس نے اسلامی گروہ میں شامل ہو کر رخنے پیدا کرنے کے لئے اسلام قبول کیا تھا اور وہ اکثر اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

اس دور کے علمائے اہل کتاب میں عام طور پر یہ بات شائع تھی کہ عرب میں ایک نبی کا ظہور ہو گا۔ علماء اُس نبی منتظر کی صفات بھی بیان کیا کرتے تھے کعب الاحبار[1] مشہور تابعی ہوتے ہیں یہ پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ اسرائیلی روایات کا بہت بڑا

---

[1] کعب الاحبار کے ترجمہ اور اُن کی روایات کے لیے دیکھیے :

FARUQI (N.A.) EARLY MUSLIM HISTORIOGRAPHY

(DELHI 1978) PP. 88-91

ذخیرہ ان کے ذریعے سے ہماری کتابوں میں منتقل ہوا ہے اُن سے ایک بار عبداللہ بن عباس رضؓ نے پوچھا کہ توراۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال کیا ملتا ہے تو انہوں نے کہا:

نجدہ محمد بن عبد اللہ مولدہ بمکۃ ومھاجرہ الی طابۃ ویکون ملکہ بالشام لیس بفحاش ولا بصخاب فی الأسواق ولا یکافئ بالسئیۃ ولکن یعفو ویغفر[1]

ہم (توراۃ میں) یہ پاتے ہیں کہ اُن کا نام محمد بن عبداللہ، مولد مکہ، دار ہجرت طیبہ، ہے ان کی حکومت شام میں ہوگی۔ وہ فحاش نہیں ہیں اور نہ بازار میں زور سے بولتے ہیں نہ بدی کا بدلہ بدی سے دیتے ہیں بلکہ معاف کرتے ہیں اور خطاؤں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

ایسی ہی روایت عبداللہ بن سلام سے بھی آئی ہے یہ بھی یہودیت سے اسلام کی طرف آئے تھے اور کتب یہود کا اچھا علم رکھتے تھے[2] عیسائی علما بھی انجیل میں آں حضرت کی صفات کا مذکور ہونا بیان کیا کرتے تھے اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر کہیں ایسی عبارتیں دیکھتے تھے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات ظاہر ہوتی ہوں تو اُن عبارتوں کو محو کر دیتے تھے یا چھپا دیا کرتے تھے یا اُن میں تحریف کر کے بیان کرتے تھے[3]

آں حضرت کے فضائل و اخلاق اور سیرۃ طیبہ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محامد اخلاق و شمائل جو ابن سعد کی جمع کردہ روایات سے ظاہر ہوتے ہیں اُن کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان میں کہیں مبالغہ یا تصنع کا شائبہ نہیں ہے۔ راویوں نے آں حضرت کی جو صفات عالیہ بیان کی ہیں وہی ہیں جو ہم آپ کے اعمال و افعال میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کے اخلاق بیان کریں تو انہوں نے فرمایا کہ "آپ کا اخلاق قرآن تھا۔"

یعنی جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ آں حضرتؐ کا عمل تھا۔ اس سے زیادہ مختصر اور جامع تبصرہ سیرۃ طیبہ پر شاید نہ کیا جا سکے کتب رجال سے حضرت عائشہ رضؓ کی فصاحت و بلاغت کی گواہی ملتی ہے اور سیرۃ نبوی پر اُن کا یہ تبصرہ اس کی ایک مثال ہے۔

حضرت انس رضؓ نے فرمایا کہ آں حضرتؐ تمام انسانوں میں بہترین اخلاق والے تھے کبھی سڑک پر زور سے گفتگو نہ فرماتے تھے۔ فحش کا شائبہ بھی نہ تھا، برائی کا بدلہ نہیں لیتے تھے بلکہ درگذر فرماتے تھے۔

زید بن ثابت سے سیرۃ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں آں حضرتؐ کے پڑوس میں رہتا تھا اور جب

---

[1] الطبقات ۱/۳۶۰ - [2] ان کے بارے میں تفصیلات کے لئے دیکھیے:

FARUQI (N.A): EARLY MUSLIN HISTORIOGRAPHY.PP,155-164

[3] الطبقات ۱/۳۶۳ -

وحی نازل ہوتی تھی تو میں ہی لکھتا تھا۔ جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ کھانوں کا تذکرہ ہوتا تھا تو آں حضرتؐ بھی ہماری باتوں میں حصہ لیتے تھے، اور کیا کیا بات بتاؤں؟

ہشام بن عروۃ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضورؐ گھر میں ہوتے تھے تو اپنے کپڑوں کو پیوند خود لگا لیتے تھے اور اپنے جوتے کی مرمت خود کر لیا کرتے تھے[۱] آں حضرت نے جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کبھی اپنے ہاتھ سے کسی مرد یا عورت کو نہیں مارا[۲]۔ جب آپ کے سامنے دو راستے ہوتے تھے تو جو آسان ہوتا اُسے اختیار فرماتے تھے۔ آپ شرم و حیا میں کنواری لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے تھے[۳]

آپ کا چہرۂ مبارک ایسا آئینہ تھا کہ جب کوئی بات ناگوار ہوتی تھی تو آپ کے چہرے پر تاثرات سے معلوم ہو جاتا تھا۔

آپ سے کبھی کسی سائل نے کوئی سوال کیا تو آپ نے اُسے "نہیں" کہہ کر نہ جانا۔ ہر ایک کا سوال پورا کرتے تھے[۴] اگر آپ کو کوئی کام نہ کرنا ہوتا تھا تو انکار نہ فرماتے تھے خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو وضو فرماتے تھے[۵]

آپ کی بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ بے پالان کے گدھے پر سواری کرتے اور غلام کے گھر دعوت ہوتی تو تشریف لے آتے[۶] کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیتے تھے[۷] اپنی بکری کو اپنے ہاتھ سے باندھتے تھے[۸] آپ کی تعلیم ترکِ دنیا کی نہیں تھی چنانچہ آپ نے فرمایا:

"میں نماز پڑھتا ہوں۔ سوتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، افطار کرتا ہوں نکاح کرتا ہوں، جو کوئی میری سنّت سے انحراف کرے وہ میری اُمت میں سے نہیں ہے"[۹]

آں حضرت کی مجلس میں دنیا کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ آپ کے سامنے اشعار پڑھے جاتے تھے لوگ ہنستے تو آپ بھی تبسم فرماتے تھے[۱۰] مسجد میں دورِ جاہلیت کے اشعار اور حکایات بھی سنائی جاتی تھیں آپ ان سے کبھی تنفر کا اظہار نہ فرماتے تھے[۱۱]

آں حضرت کا کلام فصیح و بلیغ تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر کلام فرماتے تھے جابر بن عبداللہ نے کہا کہ حضورؐ کے کلام میں "ترسیل و ترتیل" تھی[۱۲] یعنی ما فی الضمیر کو پوری طرح ادا فرماتے اور الفاظ کو وضاحت سے ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ خطبہ ارشاد فرماتے وقت آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں آواز بلند ہو جاتی تھی اور اس میں زور پیدا ہو جاتا تھا[۱۳]

انس بن مالک کہتے ہیں: جب آں حضرت سے کوئی شخص ملتا اور مصافحہ کرتا تھا تو جب تک وہ شخص خود اپنے ہاتھ علیحدہ نہ کر لیتا تھا۔

۱؎ الطبقات ۱/۳۶۶ -
۲؎ الطبقات ۱/۳۶۷ -
۳؎ الطبقات ۱/۳۶۸ -
۴؎ الطبقات ۱/۳۶۸ -
۵؎ الطبقات ۱/۳۶۹ -
۶؎ الطبقات ۱/۳۷۰ -
۷؎ الطبقات ۱/۳۷۲ -
۸؎ الطبقات ۱/۳۷۱ -
۹؎ الطبقات ۱/۳۷۲ -
۱۰؎ الطبقات ۱/۳۷۲ -
۱۱؎ الطبقات ۱/۳۷۲ -
۱۲؎ الطبقات ۱/۳۷۵ -
۱۳؎ الطبقات ۱/۳۷۷ -

حضور اپنا دست مبارک نہ کھینچتے تھے اور جب وہ رخصت ہوتا تھا تو جب تک وہ منہ نہ پھیر لیتا تھا، آں حضرت اپنا روئے مبارک اُس کی طرف سے نہ پھیرتے تھے[1]

راستے میں آپ تیز تیز چلتے تھے اور اِدھر اُدھر نہ دیکھتے تھے[2] حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں۔

مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَسْرَعَ فِي مِشْيَتِهِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَنَّ الْأَرْضَ تُطْوٰى لَهُ إِنَّا لَنَجْهَدُ وَهُوَ غَيْرُ مُكْتَرِثٍ[3]	میں نے چلنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تیز رفتار کوئی نہیں دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے لیے زمین لپیٹی جا رہی ہے ہم کوشش کر کے بھاگتے تھے اور وہ بے تکلف چلتے تھے۔

آپ کھانا کبھی تکیہ (ٹیک) لگا کر نہ کھاتے تھے اور تین انگلیوں سے کھاتے تھے[4] راستے میں بچوں تک کو سلام فرماتے تھے[5] کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے کبھی سواری پر نہ جاتے تھے[6] فرماتے تھے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل وہ ہے جس میں دوام ہو۔ خواہ وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو[7]

آپ اندھیرے مکان میں نہ بیٹھتے تھے[8] فصل کے ابتدائی میوے آپ کی خدمت میں لائے جاتے تھے تو انھیں چومتے تھے اور آنکھوں سے لگاتے تھے اور فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ كَمَا أَرَيْتَنَا أَوَّلَهُ فَأَرِنَا آخِرَهُ[9]	یا اللہ جیسے ان کا آغاز ہمیں دکھایا ہے ایسے ہی ان کی آخری فصل بھی دکھائیو۔

ہدایا قبول فرماتے تھے مگر صدقہ ہرگز نہ لیتے تھے[10] کبھی کوئی مشتبہ چیز تناول نہ فرماتے تھے[11] مٹھائی اور شہد آپ کو بہت مرغوب تھا[12] ہانڈی میں بھی کھا لیتے تھے[13] البتہ پیاز سے آپ کو رغبت نہ تھی فرماتے تھے کہ تم لوگ کھاؤ۔ میرے پاس فرشتہ (جبریل) آتا ہے اس لئے میں پرہیز کرتا ہوں[14] اسی طرح گوہ (سوسمار) کا گوشت نہیں کھاتے تھے[15] مگر دوسروں کو اس کے کھانے سے منع نہیں فرمایا[16]

دنیا کی چیزوں میں آپ کو خوشبو، ازواج مطہرات، اور کھانا پسند تھا[17] آپ گھر سے باہر تشریف لاتے تو خوشبو سے راستے مہک جاتے تھے[18]

---

[1] الطبقات ۱/۳۷۸، [2] الطبقات ۱/۳۷۹، [3] الطبقات ۱/۳۸۰، [4] الطبقات ۱/۳۸۱،
[5] // ۱/۳۸۲، [6] // ۱/۳۸۵، [7] // ۱/۳۸۴، [8] // ۱/۳۸۶،
[9] // ۱/۳۸۷، [10] // ۱/۳۸۸، [11] // ۱/۳۹۱، [12] // ۱/۳۹۲،
[13] // ۱/۳۹۲، [14] // ۱/۳۹۵، [15] // ۱/۳۹۵، [16] // ۱/۳۹۷،
[17] // ۱/۳۹۸، [18] // ۱/۳۹۹۔

آپؐ کو تحفہ میں عطر دیا جاتا تھا تو بہت خوشی اور رغبت سے قبول فرماتے تھے[1] آپ کی مجلس میں کبھی خوشبوؤں کی دھونی بھی دی جاتی تھی[2]

اس کے ساتھ ہی آپؐ کی زندگی ایسی سادہ اور کٹھن تھی کہ ابن عباس کا قول ہے کئی کئی وقت کے مسلسل فاقے ہو جاتے تھے[3] عام طور سے جَو کی روٹی کھائی جاتی تھی۔ شدت گرسنگی میں پیٹ سے پتھر باندھ لیتے تھے[4] چار چار مہینے تک گیہوں کی روٹی کھانے کا موقع نہیں ملتا تھا[5] پڑوس کے انصاری کبھی ہدیہ میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے تو اسی پہ گذر ہو جاتی تھی[6] آپ نے کبھی متواتر دو وقت کھانا پیٹ بھر کر نہیں کھایا[7]

آپ کا وصال ہوا تو آپ کی چادر ایک یہودی کے پاس ایک وسق (وزن) جَو کے بدلے میں گروی رکھی ہوئی تھی[8] مگر یہ معاشی حالت فتح خیبر سے پہلے تھی۔ جب اموالِ خیبر آئے تو آپ کی اور اصحاب کی معاشی حالت نسبتہً بہتر ہو گئی تھی[9]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے مسجد کوفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو حضرت علی نے فرمایا:

كَانَ رسول الله صلّى الله عليه وسلّم أَبيَضَ اللَّونِ مُشْرَبًا حُمْرَةً، أَدْعَجَ الْعَيْنِ، سَبْطَ الشَّعرِ، كَثَّ اللِّحيَةِ، سَهْلَ الْخَدِّ، ذَا وَفْرَةٍ، دَقِيقَ الْمَسْرُبَةِ، كَأَنَّ عُنُقَهُ إِبْرِيقُ فِضَّةٍ، لَهُ شَعرٌ مِنْ لَبَّتِهِ إِلَى سُرَّتِهِ يَجْرِي كَالْقَضِيبِ، لَيْسَ فِي بَطْنِهِ وَلَا صَدْرِهِ شَعرٌ غَيْرُهُ، شَثْنُ الْكَفِّ وَالْقَدَمِ، إِذَا مَشَى كَأَنَّمَا يَتَحَدَّرُ مِنْ صَبَبٍ، وَإِذَا قَامَ كَأَنَّمَا يَنْقَلِعُ مِنْ صَخْرٍ، إِذَا الْتَفَتَ الْتَفَتَ جَمِيعًا، كَأَنَّ عَرَقَهُ فِي وَجْهِهِ اللُّؤْلُؤُ، وَلَرِيحُ عَرَقِهِ أَطْيَبُ مِنَ الْمِسْكِ الْأَذْفَرِ، لَيْسَ بِالْقَصِيرِ وَلَا بِالطَّوِيلِ، وَلَا بِالْعَاجِزِ، وَلَا اللَّئِيمِ، لَمْ أَرَ قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ صلّى الله عليه وسلّم[10]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ گورا سرخی مائل تھا۔ گہری سیاہ آنکھیں، ڈھیلے بال گھنی داڑھی، رخساروں پر گوشت کم تھا، بال گھونگھر والے اور گھنے تھے سینے سے شکم مبارک تک بالوں کی باریک لکیر تھی۔ آپ کی گردن چاندی کی صراحی جیسی لگتی تھی ہنسلی سے ناف تک بال تھے اس کے سوا آپ کے سینے پر یا بدن پر اور بال نہیں تھے۔ ہتھیلی اور پاؤں کے تلوے دبیز تھے جب آپ چلتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ کسی بلندی پر سے اتر رہے ہیں اور کھڑے ہوتے تو پھرتی سے کھڑے ہوتے تھے۔ جب کسی طرف مڑتے تو پورے مڑ جاتے تھے۔ آپ کے چہرے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمکتے تھے اور آپ کے پسینے میں مشک سے زیادہ خوشبو تھی نہ آپ لمبے تھے نہ کوتاہ قامت تھے نہ آپ کے جسم میں کوئی عیب تھا نہ ڈھیلے ڈھالے تھے۔ میں نے آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کسی کو آپ

۱؎ الطبقات ۱/۳۹۹ ، ۲؎ الطبقات ۱/۴۰۰ ، ۳؎ الطبقات ۱/۴۰۰ ، ۴؎ الطبقات ۱/۴۰۰
۵؎ ″ ۱/۴۰۱ ، ۶؎ ″ ۱/۴۰۳ ، ۷؎ ″ ۱/۴۰۴ ، ۸؎ ″ ۱/۴۰۸
۹؎ ″ ۱/۴۰۹ ، ۱۰؎ ″ ۱/۴۱۰ ـ

جیسا انہیں دیکھا صلی اللہ علیہ وسلم۔

دوسری روایات میں بھی آں حضرت کا حلیہ مبارک بیان ہوا ہے جن کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

كانَ رَسُول اللّٰه صلّى الله عليـه وسلّم ضخمَ الهامةِ، عَظِيمَ العَيْنَيْنِ، أهْدبَ الأشفارِ، مُشْربَ العَيْنَيْنِ حُمرةً كثَّ اللحيةِ، أزْهَرَ اللّونِ، إذا مَشَى تكفّأ كأنّما يَمْشِي فِي صُعُدٍ وإذا التفتَ التفتَ جَمِيعًا، شثن الكفَّيْنِ والقَدَمَيْنِ.....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر بڑا تھا، آنکھیں بڑی بڑی تھیں، پلکیں گھنی اور لمبی لمبی — آنکھوں کا رنگ سرخی مائل، داڑھی گھنی، رنگ چمکتا ہوا تھا۔ جب آپ چلتے تو ایسے جھکے ہوئے سے ہوتے جیسے بلندی پر چڑھ رہے ہیں، اور جب کسی طرف مڑتے تو پورے مڑ جاتے تھے آپ کی دونوں ہتھیلیاں اور تلوے دبیز تھے.....

..... ضخم الكراديس، طويل المَسْرُبَةِ، إذا مشى تكفّأ تكفؤًا كأنّما يَنحطّ من صببٍ..... كانَ ليس بالذاهب طولاً وفوق الرّبعه، إذا جاء مع القوم غمرهم، أبيضَ، شديد الوضح ضخم الهامة، أغرّ أبلج أهدبَ الأشفار، شثن الكفّين والقدمين إذا مشى تقلّع كأنّما ينحدر من صببٍ.....

.....آپ کے کندھے چوڑے تھے، سینے پر بالوں کی ایک لمبی لکیر تھی جب آپ چلتے تو اس طرح جھکتے تھے جیسے بلندی سے نیچے اتر رہے ہیں۔ آپ بہت لمبے نہ تھے بس ذرا نکلتا ہوا (میانے سے کچھ زیادہ) قد تھا۔ جب آپ لوگوں کے ساتھ آتے تو ان سب میں نمایاں ہوتے تھے خوب کھلتا ہوا گورا رنگ تھا، سر بڑا تھا پیشانی روشن تھی، بھویں علیحدہ تھیں پلکیں گھنی اور لمبی تھیں تلوے اور ہتھیلیاں دبیز تھیں جب آپ چلتے تو اس طرح آگے کو جھکتے تھے جیسے بلندی سے اتر رہے ہیں ....

.....لم يكن بالطّويل المُمَغّط ولا بالقصير المُتَرَدِّد، كانَ ربعة من القوم ولم يكن بالجعد القطط ولا السّبط، كانَ جعدًا رَجلًا ولم يكن بالمُطهّم ولا المكلثم وكان في وجهه تدوير أبيَض..... جليل المُشاش والكتد، أجرد بين كتفيه خاتم النبوّة...... وهو خاتم النبيّين، أجود النّاس كفًّا وأجرأ النّاس صدرًا وأصدق النّاس لهجة، وأوفى النّاس بذمّة

نہ تو آپ بہت لمبے تھے اور نہ نمایاں طور پر پستہ قد تھے بلکہ میانہ قد تھا اسی طرح نہ آپ کے بال چھوٹے گھنگھریلے تھے نہ لمبی لمبی سیدھی زلفیں تھیں، بلکہ ہلکے گھونگھر والے گیسو تھے اسی طرح نہ آپ موٹے تھے نہ رخسار زیادہ بھرے ہوئے تھے۔ آپ کے چہرے میں ایک روشن ہالہ تھا..... چہرے مہرے سے جلالت ظاہر تھی دونوں کندھوں کے درمیان بال نہیں تھے اور وہاں مہر نبوت تھی۔ آپ خاتم النبیین تھے لوگوں میں سب سے زیادہ سخاوت کرنے والے تھے اور سب سے زیادہ جری اور شجاع تھے سب سے زیادہ صادق القول تھے اور اپنے وعدے کو سب سے زیادہ پورا کرنے والے تھے اور سب سے زیادہ

وألينهم عريكة وأكرمهم عشرة من رآه بديهة هابه، ومن خالطه معرفة أحبّه......

.....أسود الحدقة..... وهو إلى الطول أقرب عظيم المناكب..... مقرون الحاجبين صلت الجبين بعيد ما بين المنكبين.... في عينيه حمرة حسن اللحية، حسن الفم، تام الأذنين، يقبل جميعًا ويدبر جميعًا......

ما مسست ديباجة ولا حريرة ولا شيئًا قط ألين من كف رسول الله صلّى الله عليه وسلّم ولا شممت مسكة ولا عنبرة ما أطيب من ريحه..... كان ضخم القدمين كثير العرق ....شبح الذّراعين..... كان الشمس تجري في جبهته....ضخم السّاقين عظيم الساعدين ضخم المنكبين لعيد ما بين المنكبين رحب الصّدر رجل الرأس أحسن النّاس لونا....عليه سحوليتان إزاره تحت ركبتيه بثلاث أصابع أو أربع اذا نعطف بردائه...... لم يحط به فهو متأبّطه تحت إبطه.....ضليع الفم منهوس العقب......[وجهه] مثل الشمس والقمر مستدير...... يبلغ شعره شحمة أذنيه عليه حلّة

نرم مزاج تھے ملنے جلنے میں سب سے زیادہ باوقار تھے جو آپ کو اچانک دیکھتا وہ مرعوب ہوتا تھا اور جو آپ سے مل کر آپ کو جان لیتا تھا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا تھا۔

.... آپ کی آنکھوں کی پتلیاں سیاہ تھیں آپ کا قد طول سے قریب تھا کندھے بڑے تھے بھویں ملی ہوئی تھیں، کشادہ اور ابھری ہوئی پیشانی تھی دونوں کندھوں کے درمیان خوب فاصلہ تھا (سینہ چوڑا تھا)..... آپ کی آنکھوں میں سرخی چھائی رہتی تھی داڑھی خوب صورت تھی منہ بھی حسین تھا، کان پورے اور بھرے بھرے تھے آپ پورے آگے اور پیچھے مڑتے تھے۔

میں نے کوئی ریشمی کپڑا یا دیبا یا کوئی اور چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم اور ملائم نہیں چھوئی نہ کوئی مشک یا عنبر رسول اللہؐ کی خوشبو سے زیادہ خوشبودار سونگھا آپ کے تلوے دبیز تھے اور آپ کو پسینہ بہت آتا تھا۔ دونوں بازو لمبے چوڑے تھے.... آپ کی پیشانی میں سورج چمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا..... پنڈلیاں دبیز تھیں دونوں کلائیاں چوڑی تھیں کندھے چوڑے تھے دونوں کندھوں کے درمیان خوب فاصلہ تھا، سینہ چوڑا تھا، سر میں کچھ گھونگھر تھا آپ کا رنگ لوگوں میں سب سے اچھا تھا۔ آپ کے اوپر گاڑھے کی دو چادریں ہوتی تھیں اور تہ بند گھٹنوں سے تین چار انگل نیچا ہوتا تھا۔ جب آپ اپنی چادر موڑتے تھے تو وہ آپ کو لپٹتی نہ تھی (چھوٹی ہونے کی وجہ سے) اس لیے آپ اس کا کنارا اپنی بغل میں دبا لیتے تھے۔ آپ کا منہ چوڑا تھا کمر پر زیادہ گوشت نہیں تھا آپ کا چہرہ چاند سورج کی طرح گول تھا آپ کے بال کان کی لو تک پہنچتے تھے — آپ

حمراء...... حسن المضحك، أكحل
العينين جميل دوائر الوجه قد ملأت
لحيته مالدن هذه إلى هذه وأشار
بيده إلى صدغيه حتى كادت
تملأ نحره)
إذا مشى مشى مجتمعاً ليس فيه كسل....
أبيض مليحاً مقصداً...... ما رأيت
أحداً أجود ولا أنجد ولا أشجع ولا
أوضأ من رسول الله صلّى الله عليه
وسلّم........ كان شيبه في
عنفقته وناصيته ولو شاء أعدّها
لعددتها...... شديد سواد الرأس
واللحية..... كان رسول الله صلّى الله
عليه وسلّم يسلّم عن يمينه
حتى يرى بياض خدّه ثم يسلّم
عن يساره حتى يرى بياض خدّه
...... ما رأيت بطن رسول الله صلّى
الله عليه وسلّم قطّ إلّا ذكرت
القراطيس المثنيّة بعضها على
بعض.... ما رأيت رجلاً مثله متجرّداً
كأنّه فلقة قمر...... يفترش
رجله اليسرى حتّى يرى ظاهرها
أسود........ شديد البطش
.... ينقص من شاربه لا يضحك
إلّا تبسّماً ولا يلتفت إلّا جميعاً.......
...... كان حسن الوجه حسن الصّوت

سُرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ باچھیں بہت خوبصورت
تھیں۔ سرگیں آنکھیں تھیں چہرے کے نقوش بہت حسین
تھے آپ کی داڑھی یہاں سے یہاں تک بھری ہوئی تھی
(یہ کہہ کر راوی نے اپنی دونوں کنپٹیوں کی طرف اشارہ کیا
جس سے اس کا گلا ڈھک گیا)
جب آپ چلتے تو بڑے اطمینان سے چلتے تھے اور کسی
طرح کا کسل (چال میں) نہ ہوتا تھا آپ کا گورا رنگ
ملاحت لیے ہوئے تھا۔ آپ نہ موٹے تھے نہ دُبلے تھے
.... میں نے کوئی سخی کوئی دلیر، بہادر، رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کشادہ رو نہیں دیکھا..... آپ کی
داڑھی میں اور پیشانی پر سفید بال تھے اور ایسے تھے کہ
اگر میں انھیں گننا چاہتا تو گن سکتا تھا.... آپ کے
سر اور داڑھی کے بال گھنے سیاہ تھے.... جب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داہنی طرف سلام پھیرتے تھے تو
آپ کے گالوں پر (بالوں کی) سفیدی دیکھی جا سکتی تھی اور جب
بائیں جانب سلام پھیرتے تو آپ کے بائیں رخسار کی سفیدی
نظر آتی تھی.... جب کبھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا شکم مبارک دیکھا مجھے ایک دوسرے میں لپٹی ہوئی مصری
چادریں (قرطاس) یاد آ گئیں..... میں نے آپ
کے پیروں جیسے کسی کے ننگے پیر نہیں دیکھے یہ معلوم
ہوتا تھا کہ دو چاند کے ٹکڑے ہیں......
آپ اپنا بایاں پاؤں فرش پر پھیلاتے تھے (نماز کے
قعود کی حالت میں) تو اس کی پُشت کی کچھ سیاہی ظاہر ہوتی
تھی۔..... آپ کی گرفت سخت تھی.... اپنی مونچھیں تراشتے
تھے کبھی (زور سے) نہ ہنستے تھے بس ہلکی مسکراہٹ ہوتی تھی۔
اور جب کسی طرف مڑتے تھے تو پورے ملتفت ہو جاتے

ولم يكن يُرجّع وكان يمدّ بعض المدّ...... لا يُصلّي شيئاً من صلاته وهو جالس فلما دخل في السّن جعل يجلس حتى اذا بقي من السورة اربعون آية اوثلاثون آية قام فقرأها ثم سجد...... كان إذا سجد يُرى بياض إبطيه ..... يسجد في أعلى جَبهَتِهِ مع قُصاص الشّعر...... كان فخماً مُفخماً يتلألأ وجهه تلألؤ القمر ليلة البدر أطول من المربوع وأقصر من المُشذّب عَظيم الهامة رَجِل الشعر إن انفرقت عقيصته فرق وإلّا فلا يجاوز شعره شحمة اذنيه إذا هو وفّره، أزهر اللّون، واسع الجبين أزج الحواجب سوابغ في غير قُرَن بينهما عرق يدرّه الغضب أقنى العرنين۔ له نور يعلوه يحسبه من لم يتأمّله أشمّ، كثّ اللّحية، ضليع الفم، مفلّج الأسنان، دقيق المسربة كأن عُنُقَه جِيد دمية في صفاء الفضّة معتدل الخلق بادن متماسك سواء البطن والصدر، عريض الصدر .... النور المتجرد، موصول ما بين

تھے ۔ آپؐ کا چہرہ بہت حسین تھا، آواز بہت دلکش تھی، آپ الفاظ کو چباتے نہ تھے بلکہ الفاظ کو کسی قدر کھینچ کر ادا فرماتے تھے ..... کبھی آپؐ نے بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی۔ مگر جب سن شریف زیادہ ہو گیا تو (نماز میں) بیٹھنے لگے تھے مگر جب سورۃ میں تیس چالیس آیات باقی رہ جاتی تھیں تو کھڑے ہو کر پڑھنے لگتے پھر سجدے میں جاتے ..... جب آپ سجدے میں جاتے تھے تو دونوں بغلوں کی سفیدی دیکھی جا سکتی تھی - آپؐ اپنی پیشانی سے بالائی حصے سے سجدہ کرتے تھے جس میں تھوڑی سی بالوں کی لٹ بھی شامل ہو جاتی تھی .... آپؐ الفاظ کو زور دے کر ادا فرماتے.... آپؐ کا چہرہ ایسے چمکتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔ آپؐ پستہ قد سے بلند تھے اور لمبے قد والے سے چھوٹے تھے (درمیانہ قد تھا) سر بڑا تھا بال ہلکے گھونگھر والے تھے اگر آپ کے بالوں کی لٹ کھلتی تھی تو بال نرم نظر آتے تھے ورنہ نہیں آپ کے گیسو کان کی لَوؤں سے نکلے ہوئے ہوتے تھے جب آپؐ انھیں پھیلاتے تھے۔ رنگ چمکتا ہوا تھا، کھلی ہوئی پیشانی تھی لمبی گھنی بھویں تھیں مگر ملی ہوئی نہ تھیں۔ اُن کے بیچ میں پسینہ رہتا تھا جو غصے کی حالت میں حرکت کرتا تھا ناک کا بانسہ اٹھا ہُوا تھا۔

اس میں ایسی چمک تھی کہ جو اس پر غور نہ کرے وہ آپ کو مغرور سمجھے گھنی داڑھی تھی دہن کشادہ تھا دانت کھُلے کھُلے تھے سینے اور شکم کے درمیان بالوں کی پتلی لکیر تھی آپ کی گردن لمبی پتلی اور خوب صورت تھی اور اپنی صفا میں چاندی جیسی نظر آتی تھی۔ آپ متناسب الاعضا تھے ٹھہرا ہوا بدن تھا سینہ اور شکم برابر تھا سینہ چوڑا تھا....... آپ کا جسم اکہرا خوش نما تھا۔

اللبة والسرة بشعر يجرى كالخط عارى الثديين والبطن مما سوى ذلك اشعر الذراعين و المنكبين وأعالى الصدر، طويل الزندين رحب الراحة، سبط القصب ......سائل الاطراف خمصان الأ خمصين مسيح القدمين ينبوعنها الماً اذا زال قلعاً، يخطوتكفواً ويمشي هوناً ذريع المشية إذا مشى كانما ينحط من صبب ......خافض الطرف نظره الى الارض أطول من نظره الى السما يعنى جلّ نظره الملاحظة، يسبق اصحابه يبدر من لقيه بالسلام...... متواصلًا للاحزان، دائم الفكرة ليست له راحة لا يتكلم في غير الحاجة طويل السكت يفتتح الكلام ويختمه بأشداقه ويتكلم بجوامع الكلام فصل لا فضول ولا تقصير دمثاً ليس بالجافي ولا المهين يعظم النعمة وان دقت لا يذم منها شيئاً لا يذم ذواقا ولا يمدحه، لا تغضبه الدنيا وماكان لها فاذا تعوطي الحق لم يعرفه أحد ولم يقم لغضبه شيء حتى

ہنسلی سے ناف تک بالوں کی ایک لکیر تھی اس کے سوا چھاتیوں پر اور شکم پر بال نہیں تھے دونوں بازوؤں اور کندھوں پر بال تھے اور سینے کے اوپری حصے پر تھے آپؐ کے ہاتھ لمبے تھے ہتھیلی چوڑی تھی گیسو لمبے تھے .... نگاہیں نیچی تھیں پیٹ بہت دبا ہوا تھا۔ پیروں میں پسینہ بہت آتا تھا۔ جب آپؐ چلتے تو آگے کو جھکے ہوتے تھے اور جما کر قدم رکھتے تھے۔ پُروقار انداز میں چلتے تھے، رفتار میں تیزی تھی اور ایسے چلتے تھے جیسے بلندی سے اُتر رہے ہیں ..... نگاہیں نیچی تھیں اور زمین کی طرف آپؐ کی نگاہ اس سے کہیں زیادہ طویل ہوتی تھی جتنی آسمان کی طرف ہوتی تھی۔ آپؐ کی نگاہ زیادہ تر گوشۂ چشم سے ہوتی تھی۔ آپؐ اپنے ساتھیوں سے آگے رہتے تھے اور راستے میں جو ملتا تھا اُسے سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ آپؐ ہمیشہ غمگین نظر آتے تھے اور فکر میں رہتے تھے کبھی ہشاش بشاش نہ رہتے بے ضرورت گفتگو نہ فرماتے، طویل خاموشی میں رہتے، کلام کا آغاز اور اختتام کرتے ہوئے آپ کی باچھیں کھلی تھیں اور نہایت فصیح گفتگو فرماتے تھے جس میں نہ کوئی لفظ فالتو ہوتا تھا نہ کوئی فضول بات ہوتی تھی نہ کوئی کمی رہتی تھی۔ نہایت نرم خو تھے کلام میں نہ کھردرا پن تھا نہ کمزوری تھی ہر نعمت کی تعظیم کرتے تھے چاہے وہ تھوڑی ہی ہو اور کبھی ہرگز اس کی بُرائی نہ کرتے تھے۔ کسی ذائقے کی نہ بُرائی کرتے تھے نہ تعریف کرتے تھے۔ دنیا اور اس کی چیزیں آپ کو خشمگیں نہ کرتی تھیں جب آپ کو حق مل جاتا تھا تو کسی کو پتا بھی نہ چلتا تھا (یعنی اترا کر اس کا تذکرہ نہ کرتے تھے) اور آپ کو غصہ آتا تو کوئی شے غلبہ حاصل کرنے میں مانع نہیں ہوسکتی تھی۔

يَنتصِرُ له، لا يغضب لنفسه ولا يَنْتَصِرُ لها، إذا أشار أشار بكفّه كلّها وإذا تعجّب قلبها وإذا تحدّث اتّصل بها، يضرب براحته اليمنى باطن إبهامه اليسرى وإذا غضب اعرض واشاح وإذا فرح غضّ طرفه، جُلّ ضحكه التبسّم ويفترّ عن مثل حَبّ الغمام..............

كان دخوله لنفسه مأذوناً له في ذلك فكان إذا أوى الى منزله جزّأ دخوله ثلاثة اجزاء جزءاً لله، وجزءاً لأهله وجزءاً لنفسه ثم جزّأ جزءه بينه وبين الناس فيرد ذلك على العامة بالخاصة ولا يدّخر عنهم شيئاً وكان من سيرته في جزء الأمّة إيثار أهل الفضل باذنه وقسمه على قدر فضلهم في الدين فمن هم ذو الحاجة ومنهم ذو الحاجتين ومنهم ذو الحوائج فيتشاغل بهم ويشغلهم فيما أصلحهم والأمّة من مسألته عنهم وإخبارهم بالذي ينبغي لهم ويقول

مگر یہ غصہ اپنے نفس کے لیے نہ تھا نہ اس میں غلبہ پانے کی کوشش فرماتے تھے (یعنی کامل بے نفسی تھی) جب آپؐ اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے اور جب تعجب کا اظہار فرماتے تو ہتھیلی کو اُلٹا کرتے اور جب گفتگو فرماتے تو دونوں ہتھیلیوں کو باہم ملا اور دائیں ہتھیلی پر اپنے بائیں انگوٹھے کا نچلا حصہ مارتے تھے اور جب غصہ ہوتے تو اعراض کرتے اور نگاہ بچاتے تھے جب خوش ہوتے تو نگاہیں نیچی کر لیتے۔ آپؐ کی ہنسی ہلکی مسکراہٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور دانت اولے کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ آپؐ اپنی خلوت میں (اللہ کی طرف سے) اپنے اوقات کے مالک تھے مگر جب آپؐ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے (گھر میں رہنے کے اوقات کو) تین حصوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک حصہ اللہ کے لیے، دوسرا اہلِ بیت کے لیے تیسرا اپنے لیے ——— پھر اپنے حصے کو بانٹ کر کچھ اپنے لیے اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے کر دیتے اور اُسے خاص طور سے عوام پر خرچ کرتے اور (عام لوگوں سے) کوئی چیز بچا کر نہ رکھتے اور آپؐ کی سیرت یہ تھی کہ امت کے حصے میں سے اہلِ فضل کو ترجیح دیتے تھے اور اُن کا حصہ دین میں ان کی فضیلت کے بقدر ملتا تھا ان میں ایک حاجت والے بھی ہوتے، دو حاجتوں والے بھی اور زیادہ حاجتوں والے بھی۔ آپ اُن کا درد بٹاتے اور انھیں اس کام میں لگاتے جو اُن کے لیے اور اُمّت کے لیے بہتر ہوتا اور انھیں بتاتے کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور فرماتے کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ اُن لوگوں تک یہ بات

لیُبَلِّغ الشاهد الغائب. وأبلغونی حاجةَ من لا یستطیع إبلاغی حاجته فإنّه من أبلغ سلطاناً حاجة من لا یستطیعُ إبلاغها إیّاه ثَبّت الله قدمیه یوم القیامة. لا یُذکر عنده إلّا ذلک ولا یُقبل من أحد غیره یدخلون رُوّاداً ولا یفترقون إلّا عن ذواق و یخرجون أدلّة...

......کان رسول الله صلّی الله علیه وسلّم یخزن لسانه إلّا مما یَعنیهم ویؤلّفهم ولا یُفرّقهم ویکرم کریم کل قوم و یولیه علیهم و یحذر النّاسَ ویحترس منهم من غیر أن یطوی عن أحدٍ بِشرَه ولا خُلُقه ویتفقّد أصحابه ویسأل النّاس عمّا فی النّاس ویحسّن الحسن ویقوّیه ویُقبّح القبیح ویوهنه، معتدل الأمر غیر مختلف، لا یَغفل مخافة أن یغفلوا، لکلّ حال عنده عتاد، لا یقصر عن الحق ولا یجوزه الّذین یلونه من النّاس خیارهم، أفضلهم عنده أعمّهم نصیحة، و أعظمهم عنده منزلة أحسنهم مواساة ومؤازرة۔

پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ اور فرماتے کہ ان لوگوں کی حاجتیں میرے پاس لاؤ جو اپنی حاجت مجھ تک نہیں پہنچا سکتے اور جو شخص ایسا کرے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی غیر مستطیع کی حاجت بادشاہ تک پہنچاتا ہے اللہ قیامت کے دن اُسے ثابت قدم رکھے گا آپ کے سامنے اس کے سوا اور کسی بات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا اور دوسر دل سے بھی آپ اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے لوگ آپ کی مجلس میں جاسوس بنکر آتے تھے مگر جب وہاں سے اٹھتے تھے تو ایک مزہ لیکر اٹھتے تھے اور رہنما بن کر نکلتے تھے......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کلام سے) اپنی زبان کو روکتے تھے مگر جہاں اس سے لوگوں کو مدد ملے اور اُن کی دلداری ہو اور اُن میں انتشار پیدا نہ ہو (وہاں کلام فرماتے تھے)۔ آپ ہر قوم کے سردار کی عزت کرتے تھے اور اُسے اُن کا حاکم مقرر کرتے تھے آپ لوگوں سے احتیاط کرتے تھے اور چوکنا رہتے تھے مگر کوئی شخص آپ کے چہرے سے یا اخلاق سے اس احتیاط کا پتا نہیں لگا سکتا تھا۔ آپ اپنے اصحاب کے حالات کی پوچھ گچھ کرتے تھے اور لوگوں سے اُن کے معاملات کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتے اچھی چیز کو پسند فرماتے بُری چیز سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے اور اسے حقیر سمجھتے تمام امور میں اعتدال برتتے اور یہ نہ تھا کہ کبھی کچھ کرتے کبھی کچھ۔ آپ اس اندیشہ سے غفلت نہ کرتے تھے کہ کہیں اور لوگ بھی غافل نہ ہو جائیں ہر حال کا سامان آپ کے پاس تھا۔ حق سے کبھی کوتاہی نہ کرتے اور کبھی دین (کا اصول) آپ سے تجاوز نہ کرتا تھا۔ آپ کے پاس اچھے لوگ آتے تھے اور اُن میں سب سے افضل آپ کے نزدیک وہ ہوتا تھا جس کی خیر خواہی خلق زیادہ عام ہوتی تھی۔ اور سب سے زیادہ اس کی منزلت فرماتے تھے جو زیادہ ہمدردی و غمگساری کرنے والا ہوتا تھا۔

......كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم لا يجلس ولا يقوم إلّا على ذكرٍ، لا يُوطنُ الأماكن بنهىٰ عن إيطانها وإذا انتهى إلى قوم جلس حيث انتهى به المجلس ويأمر بذلك يعطي كلّ جلسائه بنصيبه لا يحسب جليسُه أن أحداً أكرم عليه منهُ من جالسه أو فاومه في حاجةٍ صابره حتّى يكون هو المُنصرفُ ومن سأله حاجة لم يردّه إلّا بها أو بميسورٍ من القول، قد وسع الناس منه بسطه وخلقه فصار لهم أباً وصاروا في الحق عنده سواءً مجلسه مجلس حلمٍ وحياءٍ وصبرٍ وأمانة لا تُرفعُ فيه الأصوات ولا تؤبن فيه الحُرَم ولا تُنثى فلتاته متعادلين يتفاضلون فيه بالتقوىٰ متواضعين يوقّرون فيه الكبير ويرحمون فيه الصغير، ويؤثرون ذا الحاجة، ويحفظون أو يحوطون الغريب۔

...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے بیٹھتے ذکر کرتے تھے کسی ممنوع جگہ پر نہ ٹھہرتے تھے جب کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے تھے اور اسی کا اپنے اصحاب کو حکم فرماتے تھے۔ اپنے تمام اہلِ مجلس کو ان کا حصہ دیتے تھے اور کوئی بیٹھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ دوسرا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اس سے زیادہ مکرم ہے، جو کوئی آپؐ سے ملتا تھا یا کسی حاجت میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوتا، آپ کو صابر پاتا تھا یہاں تک کہ وہ خود ہی پلٹ (کر چلا) جائے۔ جو کوئی آپ سے کچھ سوال کرتا تھا اُسے کبھی ردّ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ اس کی حاجت پوری کر دیں یا اُسے بہت نرم جواب دے دیں۔ لوگوں کے لیے آپ کی سادگی اور آپ کا اخلاق ایسا وسیع تھا کہ آپ اُن کے باپ کی طرح ہو گئے تھے اور وہ سب آپ کے لیے معاملۂ حق میں برابر تھے۔ آپ کی مجلس حلم وحیا اور صبر و امانت کی مجلس تھی، کوئی وہاں اونچی آواز سے نہ بولتا تھا نہ وہاں کسی کی عیب جوئی یا الزام تراشی کی جاتی تھی۔ نہ غیبت ہوتی تھی نہ کلام میں خوردہ گیری۔ سب انصاف پسند تھے جو تقوے ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے تھے، خاکسار تھے اپنے بزرگوں کا احترام کرتے تھے اپنے چھوٹوں پر رحم کرتے تھے حاجت مند پر ایثار کرتے تھے، مسافر کی حفاظت اور نگہبانی کرتے تھے۔

......كان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم دائم البِشرِ، سهل الخُلقِ، ليّن الجانب ليس بفظٍ ولا غليظٍ ولا صخّابٍ ولا فحّاشٍ ولا عيّابٍ، يتغافل عمّا لا يشتهي ولا يدلّس منه ولا

...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کشادہ رُو تھے، نرم اخلاق والے، ملائم پہلو والے، کھرّے اور سخت نہ تھے نہ شور مچانے والے اور فحش گو اور عیب جُو تھے جس چیز کو آپ ناپسند فرماتے اُس سے تغافل فرماتے تھے نہ اُس سے خود کو آلودہ

يجنب فيه، فقد ترك نفسه من
ثلاث: المراء والاكثار ومما لا
يعنيه، وترك الناس من ثلاث:
كان لا يذمّ أحداً ولا يعيّره ولا يطلب
عورته ولا يتكلم إلا فيما رجا
ثوابه، إذا تكلم أطرق جلساؤه
كأنما على رؤسهم الطير، فاذا
سكت تكلموا ولا يتنازعون عنده
من تكلم أنصتوا له حتى يفرغ
حديثهم عنده، حديث أوّليتهم
يضحك مما يضحكون منه ويتعجب
مما يتعجبون منه، ويصبر
للغريب على الجفوة في منطقه
ومسألته حتى اذا كان أصحابه
ليستجلبونهم وليقول: إذا رأيتم
طالبَ الحاجة يطلبها فأرفدوه ولا
يقبل الثناء إلّا من مكافئ، ولا
يقطع على أحد حديثه حتى يجوز
فيقطعه بنهي أو قيام.

......كان سكوت رسول الله صلى
الله عليه وسلم على اربع: على الحلم
والحذر والتقدير والتفكر. فأمّا
تقديره ففي تسوية النظر والاستماع
من النّاس وأمّا تذكره أو تفكره ففيما يبقى
ويفنى وجمعَ الحلم والصبر فكان لا يغضبه
شئ ولا يستنفره، وجُمع له الحذر في

کرتے نہ اس کی طرف مائل ہوتے۔ آپؐ نے اپنے آپ کو تین باتوں
سے چھڑا لیا تھا، جھگڑے سے، طلب مال سے، اور بیہودہ باتوں
سے۔ اور تین باتوں میں لوگوں کو چھوڑ دیا تھا: آپ کسی کی بُرائی
نہ کرتے تھے نہ اس پہ عیب لگاتے تھے نہ اس کی ڈھکی چھپی باتوں
کو دیکھنا چاہتے تھے اور نہ کسی سے ایسی کوئی بات کرتے تھے جس
میں ثواب کی امید نہ ہو جب آپؐ کلام فرماتے تو تمام اصحاب
یوں سر جھکائے رہتے جیسے اُن کے سروں پہ پرندے بیٹھے ہوں جب
آپ خاموش ہوتے تب وہ کلام کرتے تھے اور آپ کے سامنے
جھگڑا نہیں کرتے تھے کوئی بولتا تھا تو اُسے چپ کر دیتے تھے
تا آنکہ آپ سے اُن کی بات تمام ہو جائے۔

جس بات پر سب ہنستے تھے آپ بھی ہنستے تھے اور جسے سب
پسند کرتے آپ بھی کرتے تھے اگر کوئی پردیسی آنکلتا تو گفتگو میں اس
کے گنوار پن کو اور اس کے سوال کو صبر سے برداشت کرتے تھے
یہاں تک کہ اصحاب اُن کے لیے سبب بن جاتے تھے آپؐ
فرماتے کہ جب تم کسی طالب حاجت کو دیکھو کہ وہ کچھ
طلب کر رہا ہے تو اُس کے ساتھ لگ جاؤ آپ کسی سے
تعریف سننا پسند نہ فرماتے مگر وہ جو بدلہ میں ایسا کرتا۔ نہ کسی کی
بات کاٹتے جب تک کہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے اس وقت کسی بات
سے رد کرنے یا کوئی حکم دینے کے لیے ایسا کرتے تھے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت چار چیزوں میں تھا
حلم میں، پرہیز میں، تقریر میں، تفکر میں۔
آپ کی تقریر لوگوں کے سننے اور دیکھنے میں برابر تھی اور آپ
کا تذکر و تفکر فنا و بقا میں تھا۔ آپؐ نے حلم
اور صبر کو جمع کر لیا تھا اور کوئی شے آپ کو غضب ناک
نہیں کر سکتی تھی نہ آپ کسی شے کی طلب کرتے تھے اور آپ کا
پرہیز چار چیزوں میں جمع کر دیا گیا تھا: نیکی کا اختیار کرنا تاکہ

اربع: أخذه بالحسنى ليقتدى به وتركه القبيح ليتناهى عنه، واجتهاد الرأي فيما أصلح أمته والقيام فيما جمع لهم الدنيا والآخرة[1]

اس کا اتباع کیا جائے اور برائی سے بچنا تاکہ اس سے دوسرے بھی بچیں اور آپ کی رائے کا اجتہاد اس چیز میں جو امت کے لئے اصلح ہو اور ان باتوں کا حکم جن میں دین و دنیا دونوں جمع ہو گئے ہوں۔

اسی طرح ابن سعد نے ایک فصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کاندھوں کے درمیان مہر نبوت کے بارے میں روایات دی ہیں۔ آپ کے بالوں کے بارے میں جو روایات ملتی ہیں انھیں علیحدہ جمع کر دیا ہے[2] اور آپ کے سر مبارک اور ریش مقدس میں جو سفید بال تھے اُن کا وصف جداگانہ فصل میں بیان ہوا ہے[3] بعض روایتوں میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب لگایا ہے۔ ابن سعد نے ایسی مرویات کو بھی یک جا کر دیا ہے[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کو ابتدا ہی میں محفوظ رکھنے کا اہتمام ہوا ہے۔ عثمان بن عبداللہ بن موہب کہتے ہیں کہ ہم حضرت ام سلمہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایک تھیلی نکالی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک تھے اور ان پر مہندی کا رنگ کیا ہوا تھا۔ ربیعہ بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے موئے مبارک دیکھا تو وہ سرخ رنگ کا تھا اور مجھے یہ بتایا گیا کہ خوشبوؤں کے اثر سے اس کا ایسا رنگ ہو گیا ہے[5] بالوں کے اور ان میں خضاب کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث روایت کی گئی ہیں جن میں آپ نے فرمایا کہ یہودیوں، عیسائیوں سے اور اہل عجم سے مماثلت نہیں ہونی چاہیے[6]

الفضل بن دکین نے اپنے شیوخ سے روایت کی ہے کہ آں حضرت مونچھوں کی صفائی اطراف (کناروں) سے کرتے تھے: يأخذ الشارب من اطرافه[7]

آپ کو سفید لباس پسند تھا[8] کبھی سرخ جوڑا بھی زیب تن فرماتے تھے[9] بعض روایات سے زعفرانی لباس پہننا بھی ثابت ہے[10]

يصبغ ثيابه كلها بالزعفران حتى العمامة۔

آپ اپنا سارا لباس زعفران سے رنگتے تھے حتیٰ کہ عمامہ بھی[11]

حضرت اسماء بنت ابی بکر کے مولیٰ عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت اسماء کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبّہ

---

۱ الطبقات الکبیر ج ۱/۴۱۰-۴۲۵ ۔ ۲ ایضاً ۱/۴۲۷-۴۳۱ ۔
۳ ایضاً ۱/۴۳۱-۴۳۶ ، ۴ ایضاً ۱/۴۳۷-۴۳۸ ۔
۵ ابن سعد ۱/۴۳۷ ، ۶ ایضاً ۱/۴۳۹ ، ۷ ایضاً ۱/۴۴۹ ، ۸ ایضاً ۱/۴۴۹ ۔
۹ ایضاً ۱/۴۵۰ ، ۱۰ ایضاً ۱/۴۵۱ ، ۱۱ ایضاً ۱/۴۵۳

محفوظ تھا۔ یہ رسول اللہؐ سے حضرت عائشہؓ کو ملا تھا اور اُن سے اسمأ بنت ابی بکرؓ کو۔ اس کا دھوون بطور تبرک مریضوں کو پلایا جاتا تھا[1] بعض روایات میں یہ بیان ہوا ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ سیاہ پگڑی باندھے ہوئے تھے[2] نماز میں سجدہ کرتے ہوئے آپؐ اپنی پگڑی پیشانی سے اوپر سرکا لیا کرتے تھے[3] آپ کے عمامے کی چھور دونوں کندھوں کے درمیان لٹکی رہتی تھی[4] عروۃ بن الزبیر کہتے ہیں کہ آپؐ کو ایک عمامہ ہدیہ میں دیا گیا جس میں کلغی لگی تھی آپ نے اُسے کاٹ دیا، پھر عمامہ پہنا[5] ایک بار آپؐ کو ریشمی قبا نذر کی گئی آپ نے اُسے پہن کر نماز پڑھی اور (نماز سے واپس آکر) ناپسندیدگی کے ساتھ اُسے بہت تیزی سے اتار کر پھینکا اور فرمایا "پرہیزگار کے لیے اس کا پہننا مناسب نہیں[6]۔"

عروۃ بن الزبیرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی چادر جسے پہن کر وفود سے ملاقات کیا کرتے تھے حضرموت کی بُنی ہوئی تھی یہ طول میں چار گز اور عرض میں دو گز ایک بالشت کی تھی۔ اسے خلفاء نے محفوظ رکھا اور وہ عیدین کے موقع پر اسے پہنا کرتے تھے۔ یہ بہت پُرانی اور بوسیدہ ہو گئی تھی[7]

ابن عباسؓ نے ہمیں آپؐ کی قمیص کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ چھوٹی اور تنگ آستینوں کی تھی اور زیادہ لمبی نہ تھی[8]

آپؐ گھر میں کوئی ایسی چیز دیکھتے جس پر صلیب کا نشان ہوتا تو اُسے توڑ دیتے تھے[9] دنیا کے عیش و آرام سے آپؐ کو قطعاً رغبت نہیں تھی۔ فرمایا:

ما أنا والدنیا إلّا کراکب	مجھے دنیا سے کیا لینا ہے، میری مثال تو اس سوار کی
استظلّ تحت شجرۃٍ ثم راح	سی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے سائے
وترکھا[10]	میں بیٹھ جاتا ہے پھر اُسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔

نافع مولی ابن عمر نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ ابتداً میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سونے کی انگوٹھی بنوائی تھی اور اس کا نگینہ آپؐ ہتھیلی کی طرف چھپا کر رکھتے تھے۔ جب اُسے اپنے داہنے ہاتھ میں پہنتے تھے۔ پھر اور اصحاب نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوانی شروع کر دیں تو آپؐ نے ایک دن منبر پر بیٹھ کر وہ انگوٹھی اپنے دست مبارک سے نکالی اور فرمایا کہ:

إنّی کنت ألبس ھذا الخاتم وأجعل	میں یہ انگوٹھی پہنا کرتا تھا اور اس کا نگینہ اپنی ہتھیلی کی طرف
فصّہٗ من باطن کفّی، فرمی بہ	(چھپا کر) رکھتا تھا پھر آپ نے اُسے پھینک دیا اور فرمایا:
وقال: واللہ لا ألبسہ أبداً[11]	خدا کی قسم اب اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔

---

[1] الطبقات ابن سعد ۱/۴۵۴، [2]، [3] الطبقات الکبیر ۱/۴۵۵. [4] ایضاً ۱/۴۵۶
[5] الطبقات ۱/۴۵۶، [6] ایضاً ۱/۴۵۷، [7] ایضاً ۱/۴۵۸.
[8] ایضاً ۱/۴۵۹، [9] ایضاً ۱/۴۶۵، [10] ایضاً ۱/۴۶۷،
[11] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۰۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ آپ نے قیصر کی طرف ایک خط بھیجا جس پہ مُہر نہیں لگائی تھی۔ لوگوں نے کہا کہ اگر آپ کا خط مُہر لگا ہوا نہیں ہوگا تو اُسے پڑھا نہیں جائیگا۔ تب آپ نے چاندی کی ایک مہر تیار کرائی اور اس پہ "محمد رسول اللہ" کندہ کرایا[1]۔ یہ مُہر آپ کے بعد خلفائے راشدین کے پاس رہی۔ حضرت عثمان غنی رضؓ کے ہاتھ سے بئر اریس میں گر گئی۔ اُنہوں نے اس کنوئیں کی صفائی میں تین دن تک بہت مبالغہ کیا مگر وہ انگوٹھی نہ ملنی تھی نہ ملی[2]۔ حضرت عثمان رضؓ نے اس کے بعد وہ کنواں پٹوا دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپؐ کے لیے یہ انگوٹھی سعید بن العاص حبشہ سے لائے تھے اور انتقال کے وقت یہی انگشتری آں حضرتؐ کے دست مبارک میں موجود تھی۔ حضرت علی رضؓ نے اپنے زمانے میں اسی انداز کی اپنی انگشتری بنوائی تھی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تاکہ وہ احکام اسلام کی تعلیم دیں تو اُن کے ہاتھ میں بھی ایک چاندی کی انگوٹھی تھی جسے وہ احکام پر لگا دیا کرتے تھے اور اس انگوٹھی پر بھی "محمد رسول اللہ" کندہ کیا ہوا تھا۔ اس پہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ معاذؓ کی ہر چیز ایمان لے آئی ہے حتیٰ کہ انگوٹھی بھی[3]۔

الفضل بن دُکین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نعل مبارک حضرت انس بن مالک کے پاس محفوظ تھے[4]۔ دوسری روایت سے ظاہر ہے کہ سنہ ۱۱۰ھ یا سنہ ۱۱۱ھ تک یہ نعلین موجود تھے۔ یہ فاطمہ بنت عبید اللہ بن عباس کے پاس تھے[5]۔ روایات کہتی ہیں کہ آپؐ نماز ننگے پاؤں بھی پڑھتے تھے اور جوتے پہن کر بھی پڑھتے تھے۔

کان اکثر صلوات النبی صلی اللہ علیہ وسلّم فی نعلیہ[6]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اکثر جوتے پہن کر نماز پڑھتے تھے۔

آپؐ کے پاس ایک ہاتھی دانت کی کنگھی تھی جس سے بالوں کو سنوارتے تھے[7]۔ ابن شہاب الزہری نے عُبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے روایت کیا کہ مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو ہدایا بھیجے تھے ان میں ایک چینی کا پیالہ بھی تھا جس میں آپ پانی پیا کرتے تھے[8]۔ ایک پیالہ انس بن مالک کے پاس تھا جس میں کچھ چاندی تھی یا چاندی کا تار باندھا گیا تھا۔ ایک خوشبو لگانے کا پیالہ پیتل کا تھا[9]۔

ابن سعد نے آپؐ کی تلواروں، زرہ بکتر، ڈھال، نیزے، خنجر، گھوڑے اور اونٹوں کے لیے بھی علیحدہ علیحدہ باب رکھے ہیں۔

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۱۔

[2] الطبقات ۱/۴۷۳۔ اریس ایک کنوئیں کا نام ہے یہ مدینہ میں واقع تھا اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے چھٹے سال میں یہ انگشتری اس کنوئیں میں گری تھی۔ اریس غالباً عبرانی زبان کا لفظ ہے اور بظاہر یہ کوئی یہودی نام ہے۔ یہ کنواں حضرت عثمان کی جاگیر میں واقع تھا۔

(معجم البلدان ۱/۲۹۸)

[3] الطبقات الکبیر ۱/۴۷۶۔ [4] ایضاً ۱/۴۷۸، [5] ایضاً ۱/۴۷۹، [6] ایضاً ۱/۴۸۰، [7] ایضاً ۱/۴۸۴۔ [8] ایضاً ۴۸۵، [9] ایضاً ۱/۴۸۵۔

وہ کہتا ہے کہ جنگ اُحد کے وقت آپؐ کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جسے مدینہ میں بنو فزارہ کے ایک شخص سے دس اوقیہ میں خریدا تھا۔ اُس اعرابی نے گھوڑے کا نام ضرس (سخت مزاج تندخو) رکھا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام سکب (سبک روح، چُست، پھرتیلا) رکھا[1]۔ بعد کو رسول اللہؐ کے پاس جو گھوڑے اور خچر رہے اُن میں ایک کا نام لزاز تھا یہ مقوقس نے ہدیہ کیا تھا، دوسرا اللحیف تھا یہ ربیعہ بن ابی البراءؓ نے آپؐ کو نذر کیا تھا۔ تیسرا الظرب تھا یہ فروۃ بن عمیر جذامی نے آں حضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا ایک گھوڑا تمیم الداری نے بھی نذر کیا تھا اس کا نام الورد تھا یہ آں حضرتؐ نے حضرت عمر فاروقؓ کو عطا فرما دیا تھا۔ ایک خچر عُفیر تھا جو مقوقس نے بھیجا تھا اور ایک دُلدل تھا یہ حضرت معاویہؓ کے زمانے تک زندہ رہا[2]۔ الزہری کا بیان ہے کہ دُلدل فروۃ بن عمر جذامی نے نذر کیا تھا۔

ایک بار عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم کو خط لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں کے نام لکھ بھیجو۔ ابوبکر بن حزم نے اُن تمام مرد، عورتوں اور غلاموں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کر کے بھیج دی جنھیں رسول اللہؐ کی خدمت کا شرف حاصل ہوا تھا[3]۔ ابن سعد نے مختلف روایتوں سے خدام کے یہ نام دیے ہیں:

ہند، اسماء، انس بن مالک، سلمی، خضرہ، رضوی، میمونہ بنت سعد، برکۃ (امّ ایمن) زید بن حارثہ، ابوکبشہ، انسۃ، سائح شقران، سفینہ، ثوبان، رباح، یسار، ابورافع، فضالۃ، ابومویہبہ، رافع مولی سعید بن العاص، مدعم، کرکرۃ[4]

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں اور حجروں کا بیان ہوا ہے[5]۔ آں حضرتؐ کے نو گھر اور حجرے تھے ان میں ازواج مطہرات رہتی تھیں یہ گارے اور پکی اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی گورنری کے زمانے میں مسجد نبوی کی توسیع کرنے کے لئے ان کو ڈھایا گیا تھا۔ جب یہ گرائے جا رہے تھے تو سارا مدینہ ڈھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ ان حجروں کو مسجد میں شامل کرنے کے لئے الولید بن عبدالملک نے تحریری حکمنامہ بھیجا تھا[6]۔ ان حجروں کی چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ انھیں ہاتھ سے چھوا جا سکتا تھا۔ ان کے دروازوں پر بالوں کی کملی کے پردے پڑے تھے۔

(۶)

طبقاتِ ابنِ سعد میں مغازی اور مدنی زندگی کا بیان

الطبقات الکبیر کی دوسری جلد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات و سرایا کا بیان ہوا ہے۔ پہلے ابن سعد نے اس سے بحث کی ہے کہ کُل مغازی کی تعداد کتنی ہے یہ ۲۷ سے ۴۷ تک بتائی گئی ہے۔ پھر ہر غزوہ اور سریہ کے نام سے بحث کی ہے، اُن کا زمانہ وقوع کیا تھا اور اس میں کیا پیش آیا۔

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۴۹۰، [2] الطبقات ۱/۴۹۱، [3] ایضاً ۱/۴۹۷-۴۹۸، [4] ایضاً ۱/۴۹۸،
[5] ایضاً ۱/۴۹۹۔ [6] ایضاً ۱/۴۹۹۔

آپؐ نے پیر کے دن ۱۲ ربیع الاوّل کو مدینہ میں نزول فرمایا تھا بعض روایات ۲ ربیع الاول بتاتی ہیں[1] آپؐ نے ہجرت کے سات ماہ کے بعد (رمضان سنہ ۱ھ) پہلا جھنڈا حمزہ بن عبدالمطلب کے لیے تیار کیا جو سفید رنگ کا تھا۔

غزوۂ ذی العُشیرہ (جمادی الآخرہ سنہ ۲ھ) ہجرت سے ۱۶ ماہ بعد ہوا اس موقع پر رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب کا لقب دیا[2] تھا۔

رجب سنہ ۲ھ میں ہجرت کے ۱۷ ماہ بعد سریہ عبداللہ بن جحش الاسدی پیش آیا عبداللہ بن جحش جو مال غنیمت لے کر آئے وہ تمام اصحاب میں تقسیم ہوا اور اس میں سے خُمس بھی نکالا گیا۔ یہ اسلام میں پہلا خُمس تھا[3]

سنہ ۲ھ ہی میں غزوہ بدرالکبریٰ پیش آیا۔ اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا جو حضرت عثمانؓ سے منسوب تھیں[4]

بدر میں جو قیدی بنائے گئے تھے اُن کے لیے رسول اللہؐ نے یہ فدیہ مقرر کیا کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا سکھا دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس وقت اہلِ مدینہ لکھنا نہیں جانتے تھے زید بن ثابت نے اسی سلسلے میں لکھنا سیکھا تھا۔ غزوہ بدر رمضان کے مہینے میں ہوا تھا اور یہ شدید گرمی کا زمانہ تھا۔ اس میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ بھی قضا کر دیا تھا[5]

جنگ اُحد میں اُبَیّ بن خلف الجمحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے قتل ہوا[6] شہدائے اُحد کے لیے گنج شہیداں بنایا گیا۔ ایک قبر میں کئی کئی شہید مدفون ہوئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد سے واپس ہوتے تو مدینہ میں مغرب کی نماز پڑھی۔ اس وقت انصار کی عورتیں شہدائے اُحد کا ماتم کر رہی تھیں آں حضرت نے گریہ و ماتم کی آواز سنی تو فرمایا:

"لکنّ حمزة لا بواکی لہ" مگر حمزہ بن عبدالمطلب کے لیے تو رونے والیاں بھی نہیں ہیں۔

تب انصار کی عورتیں رسول اللہؐ کے گھر آئیں اور انہوں نے حضرت حمزہ کا ماتم کیا۔ اُس دن سے یہ قاعدہ ہو گیا کہ جب کسی گھر میں مرت ہوتی تھی تو پہلے سید الشہدا حضرت حمزہ کا ماتم کیا جاتا تھا، پھر اپنی میت کو روتے تھے[7]

سنہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اس معاہدے کی تکمیل کے بعد قربانی کی رسم ادا کی گئی تھی[8] اسی موقع پر ایک پیڑ کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی اور خلفائے راشدین کے زمانے میں لوگ وہاں جا کر نفل نمازیں پڑھ کر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وہ پیڑ ہی کٹوا دیا تا کہ اُس جگہ کو عبادت گاہ نہ بنا لیا جائے[9] اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ تاریخی آثار و شواہد کو محفوظ رکھنے کا جذبہ شروع ہی سے موجود تھا۔

---

[1] یہ دس دن کا فرق شمسی اور قمری تقویم کی وجہ سے ہے۔

[2] الطبقات الکبیر ۲/۱۰، [3] ایضاً ۲/۱۱، [4] ایضاً ۲/۱۲، [5] ایضاً ۲/۲۱، [6] ایضاً ۲/۴۳،
[7] الطبقات ۲/۴۴، [8] ایضاً ۲/۱۸، [9] ایضاً ۲/۱۰۰۔

غزوۂ خیبر (۷ھ) میں ہوا، اسی موقع پر زینب بنت الحارث نے جو سلام بن مشکم کی زوجہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دے دیا تھا۔ آپ کے اصحاب میں بشر بن البراء اس زہریلے کھانے کی وجہ سے انتقال بھی کر گئے۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ زینب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتل کر دیا[1] خیبر بھی رمضان میں ہوا۔ اس میں کچھ نے روزہ رکھا تھا اور کچھ مسلمانوں نے نہیں رکھا تھا[2]

خیبر کی اراضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں ہی کو نصف بٹائی پر دے دی تھی کیونکہ آپ کے پاس زمین کی نگرانی اور کاشت کے لئے عمال نہیں تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے جب دیکھا کہ یہود سازشوں میں ملوث ہیں تو رسول اللہؐ کے کئے ہوئے بٹائی کے معاہدے کو منسوخ کر دیا اور یہود کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا[3]

۲۰ رمضان ۸ھ جمعہ کے دن خانہ کعبہ فتح ہوا۔ آپ نے معاذ بن جبل کو تعلیم فقہ کے لئے مکہ میں مامور فرمایا۔ اس دن آپ حرم محترم میں بغیر احرام باندھے داخل ہوئے تھے[4] فتح مکہ میں مال غنیمت کچھ نہیں ملا تھا۔

حنین کے موقع پر (۸ھ) شدید گرمی کا موسم تھا۔ اس میں مال غنیمت بہت ہاتھ آیا تھا جس کی تفصیل ابن سعد نے دی ہے[5] تقسیم اموال کے سلسلے میں انصار میں کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خطاب فرما کر مطمئن کیا۔ یہ پوری تقریر کتاب الکامل للمبرد میں بھی موجود ہے[6]

سریہ الطفیل بن عمرو الدوسی ایک بت ذوالکفین کو مسمار کرنے کے لیے تھا یہ بت طائف میں رکھا ہوا تھا۔ اس میں جس سامان حرب کا بیان ہوا ہے۔ اس میں دبابہ اور منجنیق کے نام بھی ملتے ہیں[7] غزوہ طائف (شوال ۸ھ) کے حال میں لکھا ہے:

كان معه من نسائه ام سلمة وزينب فضرب لهما قبتين وكان يصلى بين القبتين حصار الطائف كله فحاصرهم ثمانية عشر يوماً و نصب عليهم المنجنيق ونثر الحسك سقبين من عيدان حول الحصن[8]	آپ کے ساتھ ازواج مطہرات میں ام سلمہ اور زینب تھیں ان دونوں کے لیے دو ڈیرے لگا دیے تھے اور آپ دونوں ڈیروں کے بیچ میں نماز پڑھتے تھے آپ نے طائف کا محاصرہ ۱۸ دن تک کیا اور ان پر منجنیق نصب کر دی تھی جن سے کانٹے دار گولے برسائے جاتے تھے۔

دوسری روایت میں اس محاصرہ کی مدت چالیس دن بیان ہوئی ہے۔

غزوہ تبوک (۹ھ) کے موقع پر ۳۰ ہزار پیادے اور ۱۰ ہزار سوار تھے۔ اس معرکے کے بعد بعض مسلمانوں نے اپنے ہتھیار فروخت کرنے شروع کر دیے اور یہ کہا کہ اب جہاد ختم ہو گیا رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

---

[1] الطبقات ۱۰۷/۲، [2] ایضاً ۱۰۶/۲، [3] ایضاً ۱۱۴/۲، [4] ایضاً ۱۴۰/۲، [5] ایضاً ۱۵۲/۲،
[6] ایضاً ۱۵۴/۲، [7] ابن سعد ۱۰۷/۲، [8] ابن سعد ۱۵۸/۲،

لاتزال عصابة من أمتی یجاهدون علی الحق حتی یخرج الدجال[۱]

میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق کے لیے جہاد کرتا رہے گا تا آنکہ دجال ظاہر ہو جائے۔

ذی الحجہ ۹ھ میں آپؐ نے حجۃ الوداع کی تیاری کی اور حضرت ابوبکر صدیق کو امیر حج مقرر کیا[۲] مقام عرج میں حضرت علی بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔

ابن سعد نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے اور ہر عمرہ ماہ ذی قعدہ میں کیا[۳] آپ نے صرف ایک ہی حج کیا یہ پہلا اور آخری حج تھا۔ ۲۵ ذی قعدہ کو آپ مدینہ سے برآمد ہوئے۔ تمام ازواج مطہرات بھی ساتھ تھیں۔ اس موقع پر آپ نے خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرمایا جس کا متن ابن سعد نے مختلف روایتوں سے دیا ہے۔ بیت اللہ کا طواف آپ نے اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر کیا۔ چاہ زمزم کے پاس پہنچ کر ڈول سے پانی نکالا، اُسے نوش فرمایا اور باقی پانی میں اپنا لعاب دہن شامل کر کے کنوئیں میں واپس ڈال دیا۔

صفر ۱۱ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کی قیادت میں لشکر کی تیاری کا حکم دیا اسی زمانے میں آپؐ کی آخری علالت کا آغاز ہوا۔ اس وقت آپ حضرت میمونہ کے گھر میں تھے۔ آخری زمانے میں وحی متواتر آ رہی تھی ابن سعد نے یہ روایات بھی دی ہیں کہ لبید بن الاعصم یہودی نے آپ پر جادو کر دیا تھا اور اس کی خبر آپ کو وحی کے ذریعے دی گئی تھی[۴]

ایک یہودی عورت نے جو زہر آپ کو دیا تھا اس کا اثر آخری وقت تک باقی تھا[۵] بعض روایات میں کہا گیا ہے کہ آپ کا مرض الموت ۱۳ دن رہا۔

آخری زمانے میں آپ جنت البقیع تشریف لے گئے شہداء کی قبروں پر فاتحہ پڑھی آپ کی آخری دعا یہ تھی:

رب اغفرلی والحقنی بالرفیق۔

اے اللہ مجھے بخش دے اور میرے رفیق سے ملا دے۔

آپ بے چینی سے بار بار اپنے سر اور سینے کو چھوتے تھے۔ بہت تیز بخار اور شدید درد سر تھا[۶] کبھی معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) پڑھ کر اپنے اُوپر دم کرتے تھے[۷] آخری بار دو اصحاب کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد نبوی میں نماز ظہر پڑھنے کے لیے تشریف لائے حضرت ابوبکرؓ امامت کر رہے تھے[۸] اور آپ حضرت عباسؓ اور حضرت علی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تشریف لائے تھے۔ ابن سعد کہتا ہے کہ

أن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم صلّی فی مرضہ بصلاۃ أبی بکر رکعۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ مرض میں ابوبکر کے پیچھے نماز فجر کی ایک رکعت پڑھی اور دوسری رکعت

---

[۱] ابن سعد ۱۶۷/۲، [۲] ایضاً ۱۶۸/۲، [۳] ایضاً ۱۷۰/۲/۱۷۱
[۴] ایضاً ۱۶۷/۲، [۵] ایضاً ۲۰۳/۲، [۶] ایضاً ۲۱۰/۲
[۷] ایضاً ۲۱۱/۲، [۸] ایضاً ۲۱۸/۲۔

من الصبح ثم قضى الركعة الباقية	قضا کی۔ الواقدی کہتا ہے کہ یہ ہمارے اصحاب
قال محمد بن عمر: ورأيت هذا الثبت	(راویوں) کے نزدیک مسلّمات میں سے ہے رسول
عند أصحابنا أن رسول الله صلى الله	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی امامت
عليه وسلم صلى خلف أبي بكر[1]	میں نماز پڑھی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ نے سترہ (۱۷) نمازوں کی امامت کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے گھر کے سوا باقی سب دروازے جو مسجد نبوی میں کھلتے تھے بند کرا دیے گئے[2] حضرت عباس بن عبدالمطلب نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ آپ نے یہ دروازے کیوں کھلوائے تھے اور اب بند کیوں کرا دیے"۔

تو آپ نے فرمایا:

يا عباس ما فتحت عن أمري ولا	اے عباس نہ میں نے اپنی مرضی سے کھولے تھے نہ
سددت عن أمري[3]	اپنی مرضی سے بند کیے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب رسول اللہؐ تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ کسی نبی کی روح قبض نہیں کی جاتی مگر اُسے پہلے (جنّت میں) اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے اور (زندگی اور موت کے درمیان) اختیار دے دیا جاتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا اُن کا سر مبارک میرے گھٹنوں پر تھا، وہ تھوڑی دیر کے لیے غش ہو گئے پھر افاقہ ہوا تو گھر کی چھت کو دیکھتے رہے اور فرمایا:

اللهم الرفيق الأعلى	اے میرے اللہ، اے رفیق اعلیٰ!

اور یہ آخری الفاظ تھے جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے[4]

جب آپ کا مرض بڑھنے لگا تھا تو ازواج مطہرات سے اجازت لے کر حضرت میمونہؓ کے گھر سے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے آئے تھے، یہاں آپ الفضل بن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے تھے[5]

ہشام بن عروہ کی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے کہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے زمانے میں حبشہ کے ایک چرچ کا تذکرہ کیا جو ماریہ کا چرچ کہلاتا تھا، اور کہا کہ وہ بہت خوب صورت ہے اور اس میں تصاویر بھی ہیں، ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ یہ چرچ حبشہ میں دیکھ کر آئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا" یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور اُسے تصویروں سے آراستہ کرتے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک سب سے بُرے ہیں[6]"

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاؑ کی قبور کو مساجد بنا لیا، میں تمھیں اس سے منع کرتا ہوں ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اور یہ فرمایا کہ

---

[1] ابن سعد ۲/۲۲۳، [2] ایضاً ۲/۲۲۷، [3] ایضاً ۲/۲۲۸۔

[4] ایضاً ۲/۲۲۹، [5] ایضاً ۲/۲۳۲، [6] ایضاً ۲/۲۴۰۔

لایبقین دینان بأرض العرب	عرب کی زمین پر دو مذہب نہیں رہیں گے[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اصحاب نے یہ مشورہ کیا کہ آپ کو مسجد نبوی میں دفن کیا جائے لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ؐ نے بار بار تکیر فرائی ہے کہ قبور انبیاء کو مسجد نہ بنایا جائے۔ تب یہ رائے قرار پائی کہ جس حجرے میں آپ کا وصال ہوا ہے اسی میں دفن کیا جائے[2]

ابنِ سعد نے حدیث قرطاس بھی تفصیل سے بیان کی ہے۔ ابنِ عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعرات کو بیمار ہوئے تھے۔ جب درد شدید ہوا تو آپ نے ایک دن فرمایا: میرے پاس دوات اور صحیفہ[3] (لکھنے کا سامان) لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایک خط (کتاب) لکھ دوں تو تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

إئتونی بدواة وصحیفة أکتب لکم
کتابًا لا تضلوا بعده أبدًا۔[4]

حاضر الوقت اصحاب میں سے[5] ایک نے کہا۔

أنّ نبی اللہ لیھجر! قال فقیل له: ألا نأتیك بما طلبت؟ قال: أوَ بعد ماذا؟ قال فلم یدعُ به[6]	رسول اللہ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ اُن سے کہا گیا کیا جو کچھ طلب کیا گیا ہے وہ ہم نہ لائیں؟ کہا: اور پھر کیا؟ کہا: پھر (رسول اللہؐ نے) دوبارہ طلب نہیں فرمایا۔

حضرت ابن عباس ہی کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ جب دوات اور صحیفہ طلب فرمایا تو اصحاب نے آپس میں "تنازعہ" شروع کر دیا اور ایک پیغمبر کے سامنے ایسی تکرار مناسب نہ تھی کچھ اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"دعونی، فالذی أنا فیه خیر ممّا تدعونی إلیه وأوصی بثلاث قال: أخرجوا المشرکین من جزیرة العرب وأجیزوا الوفد بنحوِ ممّا کنت أجیزھم و سکت عن الثالثة فلا أدری قالھا فنسیتھا او سکت عنھا عمدًا[7]	مجھے چھوڑ دو، میں جس عالم میں ہوں وہ اِس سے کہیں اچھا ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔ پھر تین وصیتیں فرمائی۔ ایک یہ کہ مشرکوں کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔ دوسرے یہ جس طرح وفود کو اجازت دیتا تھا اسی طرح ان کو اجازت دی جائے اور تیسری بات سے خاموش رہے۔ اب یہ پتا نہیں کہ اُنہوں نے فرمایا اور میں بھول گیا یا وہی عمداً ساکت رہے۔

---

[1] ابن سعد ۲/۲۴۰ ، [2] ایضاً ۲/۲۴۱ ،

[3] صحیفہ سے مراد پارچہ PARCHMENT ہے۔ کاغذ اس زمانے تک عرب میں نہیں پہنچا تھا۔ [4] ابن سعد ۲/۲۴۲ ۔

[5] ابن سعد نے یا اس روایت کے راوی نے نام ظاہر نہیں کیا۔ [6] ابن سعد ۲/۲۴۲ ۔

[7] ابن سعد ۲/۲۴۲ تیسری وصیت کے بیان کو مبہم رکھنا بھی معنی خیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں عمداً سکوت اختیار کرتے، یہ سکوت خود راوی کا ہے۔

نعیم بن یزید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قلم دوات اور کاغذ خود حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے طلب فرمایا تھا[1]

ابن عباس کہتے ہیں کہ قلم اور کاغذ حضرت عمرؓ سے طلب کیا تھا۔ اور انہوں نے یہ کہا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم شدید درد میں ہیں اور تم لوگوں کے پاس قرآن موجود ہے"۔ اس پر اہل بیت میں اختلاف ہوا اور وہ تکرار کرنے لگے[2] جب یہ تکرار زیادہ ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوموا عنی (میرے پاس سے چلے جاؤ)

العباس بن عبدالمطلب نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گے میں مرض الموت میں بنو عبدالمطلب کے چہرے خوب پہچانتا ہوں۔ چلو ہم دونوں اُن سے امر خلافت میں مشورہ کرلیں اگر وہ ہمارے بارے میں فرمائیں گے تو پتا چل جائے گا اور کسی غیر کے لیے فرمائیں گے تو ہم اُن سے اس موضوع پر گفتگو کرسکیں گے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا[3]

والله لئن سئلنا ها رسول الله صلی الله علیه وسلم فمنعنا ها لا یعطینا ها الناس أبداً فوالله لا نسأله أبداً۔

خدا کی قسم اگر ہم نے امر خلافت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا اور انہوں نے (ہمارے لیے) انکار فرما دیا تو پھر لوگ ہمیں (خلافت) ابد تک نہیں دیں گے۔ اس لیے ہم ہرگز نہیں پوچھیں گے

حضرت عائشہؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مرض الموت میں حضرت فاطمہ زہراؓ رسول اللہؐ کی سی چال چلتی ہوئی تشریف لائیں۔ آپ نے انھیں اپنے دائیں یا بائیں پہلو کی طرف بٹھایا اور سرگوشی میں کچھ فرمایا تو حضرت فاطمہ رونے لگیں، پھر آپ نے کچھ فرمایا تو فوراً وہ ہنسنے لگیں حضرت عائشہ نے پوچھا کہ رسول اللہ نے کیا فرمایا؟ تو حضرت فاطمہ نے فرمایا کہ "یہ راز کی بات ہے میں نہیں بتاؤں گی"۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا "میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی اور تم جنت میں تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہو"۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات کے بعد کسی نے حضرت فاطمہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا[4]

انس بن مالک کہتے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری وقت آیا تو آپ یہ الفاظ فرما رہے تھے، اس طرح کہ الفاظ سینے میں اٹک رہے تھے اور زبان سے پوری سہولت سے ادا بھی نہیں ہو رہے تھے:

الصلوة وما ملکت أیمانکم[5] نماز ـ اور تمہارے غلام

ایک روایت میں یہ ہے کہ آخری وقت میں کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کو غسل کون دے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ "جو میرا زیادہ قریبی رشتہ دار ہو، پھر اُس سے قریب"۔ رجالٌ من اهل الأدنى فالأدنى

پھر دریافت کیا، اور آپ کو کفن کیسا دیا جائے؟ فرمایا: اگر تم چاہو تو اسی لباس میں (جو پہنے ہوئے ہوں) دفن کر دینا یا پھر مصری کپڑا، یا یمانی جوڑا ٹھیک رہے گا۔ پھر پوچھا: اور نماز کون پڑھائے؟ آپ نے فرمایا مجھے غسل دے کر کفن پہنا کر میرے پلنگ کو اسی حجرے میں قبر کے کنارے رکھ دینا اور سب باہر چلے جانا میری نماز سب سے پہلے جبریل پڑھیں گے پھر دوسرے فرشتے۔ پھر تم لوگ گروہ گروہ آکر نماز ادا کرلینا۔ پہلے مرد نماز پڑھیں پھر عورتیں۔ سلام بھیجنا میرے اُن اصحاب پر جو اب نہیں ہیں اور اُن پر جو قیامت تک میری پیروی کریں گے، اور میرے دین پر رہیں گے[6]

---

[1] ابن سعد ۲/۲۴۳ ، [2] ابن سعد ۲/۲۴۴ ، [3] ابن سعد ۲/۲۴۵ ، [4] ایضاً ۲/۲۴۷ ، [5] ابن سعد ۲/۲۵۳ ، [6] ابن سعد ۲/۲۵۶ ۔

سیرت کی جو تفصیلات ابن سعد نے فراہم کی ہیں وہ ایک بنیادی خاکے کی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ حتی الامکان تاریخ اور سنہ بتانے کا بھی التزام کرتا ہے اور تاریخوں کے اختلاف کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ ایک ہی واقعہ کے لیے مختلف راویوں سے ملنے والی روایات علیحدہ سلسلۂ اسناد کے ساتھ درج کرتا ہے اور کہیں کہیں محاکمہ بھی کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام، مرض، وفات، تدفین کی تفصیلات طبقات کی دوسری جلد میں بیان ہوئی ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں سیرۃ کا خاکہ کس طرح ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس فہرست سے ہو سکتا ہے:[1]

جلد اوّل

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب۔
۲۔ آں حضرت کے سلسلۂ نسب میں جو انبیاء ہوئے، اُن کا بیان۔
۳۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام
۴۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام
۵۔ حضرت آدم اور آں حضرت علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ
۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ نسب میں ماؤں کا بیان ۔ یعنی ننھیالی شجرہ
۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد قصی بن کلاب، عبد مناف بن قصی، ہاشم بن عبد مناف وغیرہ
۸۔ عبد المطلب بن ہاشم
۹۔ عبد المطلب نے اپنے بیٹے (عبد اللہ) کو قربان کرنے کی نذر کی تھی۔
۱۰۔ عبد اللہ بن عبد المطلب کی حضرت آمنہ بنت وہب سے شادی
۱۱۔ جن عورتوں نے عبد اللہ بن عبد المطلب کو شادی کے پیغام دیے اُن کا بیان
۱۲۔ حضرت آمنہ کا زمانۂ حمل
۱۳۔ حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی وفات (۹۹/۱)
۱۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت[2] (۱۰۰/۱)

---

[1] یہ مکمل فہرست نہیں ہے بلکہ پہلی اور دوسری جلد میں سیرۃ سے متعلق جو مواد ملتا ہے اُس کا انتخاب اس نظر سے کیا گیا ہے کہ ابن سعد کی جزئیات نگاری کا اندازہ ہو سکے

[2] پہلی روایت: ولادت پیر کے دن ۱۰ ربیع الاول کو ہوئی۔ اصحاب فیل کے واقعہ کو (جو نصف محرم میں ہوا تھا) ۵۵ راتیں گذر چکی تھیں۔

دوسری روایت:

ابو معشر نے کہا آپ پیر کے دن پیدا ہوئے، ربیع الاول کی دو راتیں گذر چکی تھیں۔ پیر کے دن پر تمام راویوں کا اتفاق ہے۔ اور یہ بھی متفق علیہ ہے کہ یہ عام الفیل تھا۔

۱۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور کنیت

۱۶- اُن کے نام جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا، آپ کے دودھ شریک بہنوں اور بھائیوں کے نام (۱/۱۰۹)

۱۷- حضرت آمنہ کی وفات

۱۸- عبدالمطلب کا آپ کو اپنی نگرانی میں لینا۔

۱۹- عبدالمطلب کی وفات کے بعد حضرت ابوطالب[1] کا آپ کی پرورش کرنا اپنے چچا کے ساتھ پہلی بار ملک شام کا سفر اور وہاں راہب بحیرا سے ملنا۔

۲۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ میں بکریاں چرانا۔

۲۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حرب الفجار میں شریک ہونا (۲۰ سال کی عمر میں)

۲۲- حلف الفضول میں آپ کی شرکت (۲۰ سال کی عمر میں)

۲۳- ملک شام کی طرف آپ کا دوسرا سفر (۲۵ سال کی عمر میں) اور عیسائی راہب سے ملاقات

۲۴- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا سے نکاح (حضرت خدیجہؓ کی ولادت عام الفیل سے پندرہ سال قبل۔ نکاح کے وقت عمر ۴۰ سال)

۲۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

۲۶- ذکر ابراہیم بن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (عمر ۱۶ ماہ)

۲۷- کعبہ کی تعمیرِ نو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت

۲۸- اعلانِ نبوت

۲۹- وحی آنے سے پہلے علاماتِ نبوت (۱/۱۵۰ تا ۱/۱۶۹)

۳۰- نزول وحی کے بعد علاماتِ نبوت (۱/۱۷۰)

۳۱- آپ کی بعثت[2] اور مقصد بعثت (۱/۱۹۲)

۳۲- آپ کی بعثت کا دن (بروایت ابن عباس: پیر کا دن)

(پہلی وحی ۱۷ رمضان پیر کے دن سنہ ۴۱ بعد ولادت مقام حرا میں)

---

[1] ابوطالب کی وفات نصف شوال سنہ ۱۰ بعثت نبوی میں ہوئی (۱/۱۲۵) اُن کی عمر ۸۰ سے متجاوز تھی ان سے ایک ماہ پانچ دن کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے انتقال فرمایا۔ اُن کی عمر ۶۵ سال تھی۔

[2] آپ نے فرمایا: "بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِي فَإِلَى الْعَرَبِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِي فَإِلَى قُرَيْشٍ فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِي فَإِلَى بَنِي هَاشِمٍ فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لِي فَإِلَيَّ وَحْدِي" (میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں اگر وہ لبیک نہ کہیں تو عرب کی طرف وہ بھی نہ مانیں تو قریش کی طرف، وہ بھی ساتھ نہ دیں تو بنی ہاشم کی طرف اور وہ بھی دعوت قبول نہ کریں تو تنہا اپنی طرف۔)

۳۳۔ نزولِ وحی کا بیان

۳۴۔ سب سے پہلے قرآن کا کون سا حصہ نازل ہُوا

۳۵۔ نزولِ وحی کے وقت شدت کی کیفیت

۳۶۔ عام لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا

۳۷۔ قریش کا ابوطالب سے شکایت کرنا

۳۸۔ ارضِ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت (۱/۲۰۳) (یہ رجب ۵ھ بعثت میں ہوئی) مہاجرین کی فہرست۔

۳۹۔ ارضِ حبشہ سے واپسی کے اسباب (۱/۲۰۵)

۴۰۔ ارضِ حبشہ کی طرف دوسری ہجرت (۱/۲۰۷)

۴۱۔ قریش کا محاصرہ کرنا (۱/۲۰۶) (۷ھ سال بعثت)

۴۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف کی طرف تشریف لے جانا۔
(بروایت: حکیم بن حزام) ۲۷ شوال ۱۰ھ بعثت

۴۳۔ معراج (۱۷ رمضان ہجرت سے ۱۸ ماہ قبل ہفتہ کی شب) اسی سال نماز فرض ہوئی۔

۴۴۔ شعب ابی طالب سے بیت المقدس تک اِسراء (۱۷ ربیع الاول، ہجرت سے ایک سال قبل)

۴۵۔ حج کے موقع پر قبائل عرب کو دعوت اسلام

۴۶۔ اوس و خزرج کو دعوت اسلام

۴۷۔ بیعت العقبۃ الاُولیٰ (۱۲ اشخاص)

۴۸۔ بیعت العقبۃ الثانیہ (۷۰ اشخاص)

۴۹۔ مکہ میں آپؐ کا قیام۔ بعثت سے ہجرت تک

۵۰۔ مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دینا

۵۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا ہجرت کرنا

۵۲۔ مدینہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان مواخاۃ

۵۳۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مسجد تعمیر کرنا (۱/۲۳۹)

۵۴۔ بیت المقدس سے کعبہ کو قبلہ تبدیل کرنا (۱/۲۴۱) ۱۶ ماہ بعد ہجرت

۵۵۔ مسجد قُبا کا بیان

۵۶۔ اذان دینے کی ابتدا

۵۷۔ صوم رمضان کا فرض ہونا (۱/۲۴۸)

۵۸ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر

۵۹ - صفۂ رسول اور اصحاب الصفہ (۱/ ۲۵۵)

۶۰ - وہ جگہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کی نماز ادا فرماتے تھے

۶۱ - بادشاہوں کی طرف خطوط بھیجنا۔ اس حصے میں ابن سعد نے (۱۱۰) خطوط کا ذکر کیا ہے۔

۶۲ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب قبائل کے وفود (ابن سعد نے ۷۱ وفود کے آنے کا ذکر کیا ہے اور ہر وفد کی تفصیل جداگانہ دی ہے)

۶۳ - توراۃ و انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت

۶۴ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا بیان (۱/ ۳۶۴)

۶۵ - صفتِ کلام رسالت

۶۶ - صفت قرأت و حسنِ صوت (۱/ ۳۷۵)

۶۷ - صفت خطبۂ آں حضرت

۶۸ - حسنِ خلق

۶۹ - آپ کی چال کا بیان

۷۰ - آپ کے کھانے

۷۱ - حسنِ اخلاق

۷۲ - آپ کی نماز

۷۳ - قبول ہدیہ اور ترک صدقہ کے سلسلے میں آپ کا رویّہ

۷۴ - آپ کا کھانا اور پسندیدہ غذا

۷۵ - کھانے پینے میں آپ کا پرہیز کن چیزوں سے تھا

۷۶ - ازواج مطہرات اور خوشبوؤں سے آپ کی رغبت

۷۷ - آپ کی پُر مشقت زندگی

۷۸ - آپ کا حلیۂ مبارک اور ڈیل ڈول وغیرہ (۱/ ۴۱۱)

۷۹ - دونوں کندھوں کے درمیان مُہرِ نبوت کا بیان (۱/ ۴۲۵)

۸۰ - آپ کے بال (۱/ ۴۲۷)

۸۱ - آپ کے بالوں میں سفیدی (۱/ ۴۳۱)

۸۲ - آپ نے بالوں میں خضاب کیا یا نہیں

۸۳- پچھنے لگوانے کا بیان (۱/ ۴۴۳)
۸۴- مونچھ ترشوانے کا بیان
۸۵- آپ کا لباس (سفید، سرخ، زعفرانی، سبز، اونی، سیاہ)
۸۶- ریشمی لباس کا پہننا اور پھر ترک کرنا۔
۸۷- لباس کی قسمیں اور طول و عرض
۸۸- پاجامہ، قمیص، کرتہ وغیرہ
۸۹- ایک لباس میں نماز ادا کرنا۔
۹۰- آپ کا بستر
۹۱- چٹائی جس پر نماز پڑھتے تھے۔
۹۲- سونے کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۰)
۹۳- چاندی کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۱) چاندی کے پالش کی انگوٹھی (۱/ ۴۷۳) نقش خاتم (۱/ ۴۷۴)
۹۴- آپ کی خاتم مبارک کے گم ہو جانے کا قصہ۔
۹۵- آپ کا نعل مبارک (۱/ ۴۷۸)
۹۶- آپ کے موزے، مسواک، کنگھی، سرمہ دانی، آئینہ اور پیالہ (۱/ ۴۸۲ - ۴۸۴)
۹۷- آپ کی تلواریں (۱/ ۴۸۵) زرہ بکتر (۱/ ۴۸۷) ڈھال (۱/ ۴۸۹) نیزے، کمانیں، گھوڑے، چوپائے، اونٹ (۱/ ۴۹۲)
اونٹنیاں، بکریاں۔
۹۸- آپ کے خدام، موالی (۱/ ۴۹۷)
۹۹- آپ کے گھر اور ازواج مطہرات کے حجرے (۱/ ۴۹۹)
۱۰۰- آپ کے صدقات۔
۱۰۱- وہ کنوئیں جن کا پانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیا تھا (۱/ ۵۰۳)

طبقات: دوسری جلد

۱- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مغازی، سرایا، اُن کے نام اور تاریخیں اور یہ کہ کل کتنے مغازی اور سرایا ہیں (۲/ ۵)
(۲۷ غزوات اور ۴۷ سرایا)
ان میں سے ہر سریّہ اور ہر غزوہ کا جداگانہ بیان اور اُن کی توقیت۔
۲- فتح مکّہ

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمرہ (۲/۱۷۰)

۴۔ حجۃ الوداع (۲/۱۷۲)

۵۔ سریہ زید بن اُسامہ

۶۔ آپ کا وقتِ وفات

۷۔ آپ نے انتقال فرمانے سے پہلے جبریل علیہ السلام کے سامنے قرآن دہرایا (۲/۱۹۴)

۸۔ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا تھا۔

۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلانے کا بیان

۱۰۔ انتقال سے پہلے جنت البقیع میں تشریف لے گئے اور شہداءؓ کے لیے فاتحہ پڑھی۔

۱۱۔ مرض الموت کا آغاز، درد اور شدّتِ مرض (۲/۲۰۶)

۱۲۔ آپ کن چیزوں سے پناہ خداوندی طلب کرتے تھے۔

۱۳۔ آپ نے مرض الموت کے زمانے میں اصحاب کے ساتھ نماز پڑھی۔

۱۴۔ آپ نے حکم دیا کہ ابوبکر امامت کریں (۲/۲۱۵)

۱۵۔ مرض الموت میں ابوبکرؓ کو آپ کی وصایا۔

۱۶۔ آپ نے حکم دیا کہ حضرت ابوبکر کے سوا اور سب کے دروازے مسجد نبوی میں بند کر دیے جائیں (۲/۲۲۷)

۱۷۔ آپ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ آخری کلمات

۱۸۔ آپ نے ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ آخری وقت حضرت عائشہ کے حجرے میں رہیں (۲/۲۳۱)

۱۹۔ انتقال سے پہلے آپ نے مسواک کی (۲/۲۳۳)

۲۰۔ انتقال سے پہلے آپ نے چھ دینار تقسیم کیے (۲/۲۳۴)

۲۱۔ ازواج مطہرات نے حبشہ کے ایک چرچ کی خوبصورتی کا تذکرہ کیا۔ آپ نے اپنے بارے میں ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

۲۲۔ آپ نے وصیت نامہ لکھنے کی خواہش کی (۲/۲۴۲)

۲۳۔ آپ کے مرض وفات میں جانشینی کے مسئلے پر حضرت عباس بن عبدالمطلب اور حضرت علی بن ابی طالب کا مکالمہ (۲/۲۴۵)

۲۴۔ مرض وفات میں آپ کی گفتگو حضرت فاطمہ زہرا سے۔

۲۵۔ اُسامہ بن زید سے آپ کی گفتگو۔

۲۶۔ انصار سے آپ کی گفتگو۔

۲۷۔ آپ نے کیا وصیتیں فرمائیں (۲/۲۵۳)

۲۸۔ آپ کی وفات۔

۲۹۔ آپ نے جانشینی کے لیے کوئی وصیت نہیں کی اور انتقال کے وقت آپ کا سر مبارک حضرت عائشہ کی گود میں تھا (۲/ ۲۶۰)

۳۰۔ دوسری روایت :۔ آپ کا سر مبارک حضرت علی کی گود میں تھا (۲/ ۲۶۲)

۳۱۔ آپ پر حبیرہ کی بُنی ہوئی چادر ڈالی گئی۔

۳۲۔ حضرت ابوبکر نے آپ کے جسد مبارک کو بوسہ دیا۔

۳۳۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں۔ آپ کی وفات کی خبر میں شک کر رہے تھے۔ (حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا (۲/ ۲۶۶)

۳۴۔ اس کا بیان کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنے دن بیمار رہے اور کس دن انتقال فرمایا (۲/ ۲۷۲) لہ

۳۵۔ وہ قمیص جس میں آپ کو غسل دیا گیا (۲/ ۲۷۵) کس نے غسل دیا (۲/ ۲۷۷) کس نے کفن دیا (۲/ ۲۷۹) غسل دینے والوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی تھی (۲/ ۲۷۸) گھر کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔

۳۶۔ آپ کو تین کپڑوں کا کفن دیا گیا، حنوط کیا گیا (۲/ ۲۸۸)

۳۷۔ آپ کے جنازے کی نماز میں امام کوئی نہیں تھا (۲/ ۲۸۸) کیونکہ آپ حیاتِ ظاہری و باطنی میں امام امت تھے۔

۳۸۔ قبر میں کس نے اتارا (۲/ ۲۹۱) العباس، الفضل، قثم بن عباس، علی بن ابی طالب اور شقران۔

۳۹۔ موضع دفن کا مشورہ حضرت ابوبکر نے دیا (۲/ ۲۹۲)

۴۰۔ آپ کی قبر کا بیان (۲/ ۲۹۴) ابوطلحہ نے لحد تیار کی (۲/ ۲۹۶) قبر کے اوپر اینٹیں رکھی گئیں (۲/ ۲۹۷)

۴۱۔ قبر میں کیا رکھا گیا۔ سرخ چادر کا ایک ٹکڑا قبر میں رکھا گیا۔ (۲/ ۲۹۹)

۴۲۔ قبر میں کون اُترا (۲/ ۳۰۰)

۴۳۔ مغیرہ بن شعبہ آخری صحابی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قبر سے جدا ہوئے (۲/ ۳۰۲)

۴۴۔ آپ کی تدفین کا بیان

۴۵۔ قبر پر پانی چھڑکا گیا (۲/ ۳۰۶)

۴۶۔ قبر مبارک زمین سے قدرے اونچی بنائی گئی۔

۴۷۔ اس کے اوپر سرخ کنکریاں بچھائی گئیں۔

۴۸۔ مقبرہ کی اندرونی حالت۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اس کی ایک دیوار گر گئی تھی (۲/ ۳۰۷)

۴۹۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنی عمر پائی (۲/ ۳۱۰) ابن عباس کی رائے میں مکی عہد پندرہ سال تھا اور آپ کی عمر ۶۵ سال)

لہ۔ ۱۹ صفر ۱۱ھ چہار شنبہ سے مرض وفات شروع ہوا، ۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو پیر کے دن انتقال فرمایا۔
دوسری روایت :۔ ۲۹ صفر ۱۱ھ سے بیماری شروع ہوئی اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو انتقال فرمایا۔ اگلے دن (سہ شنبہ) تدفین ہوئی۔ ایک اور روایت بدھ کے دن تدفین ہوئی۔

۵۰۔ آپ کی وفات کا سوگ اور ماتم۔

۵۱۔ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر زار و قطار روتے تھے (۲/۳۱۲)

۵۲۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ کو کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا (۲/۳۱۲)

۵۳۔ سب سے زیادہ صدمہ حضرت علی بن ابی طالب کو تھا (۲/۳۱۲)

۵۴۔ آپ کی میراث اور ترکہ (۲/۳۱۴) حضرت فاطمہ نے میراث طلب کی حضرت ابوبکر نے میراث دینے سے انکار کردیا (۲/۳۱۵) حضرت فاطمہ نے تاحیات حضرت ابوبکر سے کلام نہیں کیا۔ حضرت علی بن الحسین کا قول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت کوئی درہم و دینار یا غلام ترکہ میں نہیں چھوڑا (۲/۳۱۷)

۵۵۔ آپ کا قرض کس نے ادا کیا (۲/۳۱۷) حضرت علی ہر سال منادی کراتے تھے کہ جس کسی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ مطالبہ ہو وہ اُن سے طلب کرے پھر حضرات حسن وحسین نے بھی یہ عمل جاری رکھا (۲/۳۱۹)

۵۶۔ آپ کے مرثیے کس کس نے لکھے (۲/۳۱۹)

ابوبکر الصدیق؛ عبداللہ بن انیس؛ حسان بن ثابت؛ ابو عمر والشیبانی؛ کعب بن مالک؛ اروی بنت عبدالمطلب؛ عاتکہ بنت عبدالمطلب؛ صفیہ بنت عبدالمطلب؛ ہند بنت اثاثہ بن عباد؛ عاتکہ بنت زید بن عمرو؛ ام ایمن۔ ہند بنت الحارث بن عبدالمطلب۔

ان عنوانات سے طبقات ابن سعد میں سیرۃ کے مواد کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی طبقات میں کبار صحابہ کے بارے میں تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ ابن سعد ہمیں بتاتا ہے کہ عہد رسالت میں افتاء کا منصب ابوبکرؓ اور عمرؓ کے پاس تھا حضرت عثمان نے منبر سے یہ اعلان کیا کہ جو حدیث ابوبکر اور عمر کے زمانے میں بیان نہیں کی گئی اس کی روایت کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے (۲/۳۳۶) حضرت علی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنایا تھا۔ حضرت عمر اُس مشکل مسئلہ سے خدا کی پناہ طلب کرتے تھے جس میں حضرت علی کا مشورہ شامل نہ ہو (۲/۳۳۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود نے آخری زمانے میں قرآن اخذ کیا تھا اور ستر (۷۰) سورتیں لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تھیں (۲/۳۴۲)

ابوموسیٰ الاشعری بہت خوش الحان تھے اور وہ بصرہ کے لوگوں کو قرآن تعلیم کیا کرتے تھے۔ معاذ بن جبل فقیہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم شرائع کے لئے انھیں یمن کی طرف بھیجا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصحاب رسول کی ایک شوریٰ یا مجلس قانون ساز تھی اس میں تین مہاجر اور تین انصار تھے۔ اصحاب رسول میں سے بعض نے تقریباً کل قرآن جمع کر لیا تھا۔ مجمع بن جاریہ کے پاس ایسا ہی نسخہ تھا جس میں دو یا تین سورتیں نہیں تھیں۔ (۲/۳۵۵) حضرت عثمان نے جمع قرآن کا کام عہد فاروقی میں شروع کیا تھا۔ اور یزید بن ابی سفیان نے شام سے ایک خط حضرت عمر فاروق کی خدمت میں بھیج کر انھیں قرآن کی جمع وتدوین کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا تھا۔ (۲/۳۵۶) حضرت زید بن ثابت نے عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھی تھیں اس لیے کہ ان زبانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خطوط آتے تھے (۲/۳۵۸) حضرت زید علم الفرائض سے بھی خوب واقف تھے حضرت عمر

نے علمائے وقت کو فتویٰ دینے کے لیے مختلف شہروں میں روانہ کیا تھا اور انھیں تاکید کر دی تھی کہ اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیں۔ زید بن ثابت کے فتاویٰ دینی کی ایسی گہری سوجھ بوجھ کا آئینہ تھے کہ مروان بن عبدالملک نے اپنے کاتبوں کو پس پردہ بٹھا کر اُن کے فتاویٰ قلمبند کرا لیے تھے۔ (۲/۳۶۱) ابن عباس کا مسلک تشریع یہ تھا کہ پہلے قرآن سے سند لیتے تھے اس میں واضح رہنمائی نہ ملے تو حدیث سے استناد کرتے تھے اور اس میں بھی سند موجود نہ ہو تو عمل شیخین (ابوبکر و عمر) کو دیکھتے تھے اور آخری درجے میں اپنے اجتہاد کو کام میں لاتے تھے (۲/۳۶۶) ان سے مسائل دین کے علاوہ ایام عرب، ذفائع، انساب اور تفسیر میں بھی سوالات کیے جاتے تھے قرآن کے مشکل الفاظ کی تشریح میں وہ جاہلی دور کے شعراء کے کلام سے مدد لیتے تھے (۲/۳۶۷) حضرت عمر امور خلافت میں ابن عباس سے مشورہ کرتے تھے اور اُسے بہت اہمیت دیتے تھے۔ ابن عباس نے الواح (تختیوں) پر احادیث نبوی لکھ رکھی تھیں (۲/۳۷۱) اور اکابر صحابہ سے مغازی کی تفصیلات معلوم کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بھی احادیث کا ایک صحیفہ مرتب کر رکھا تھا (۲/۳۷۳)

سیرۃ نبوی کی تفصیلات کے علاوہ طبقات ابن سعد میں صدر اسلام کی پوری معاشرت کے بارے میں معلومات کا ایسا عظیم الشان خزانہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ان بکھری ہوئی جزوی تفصیلات کی مدد سے ہم اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کی پوری تصویر تیار کر سکتے ہیں۔

ابن سعد نے جن شیوخ سے روایات لی ہیں اُن میں موسیٰ بن عقبہ، ابومعشر، ابن اسحق، الواقدی، الکلبی اور عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری بھی ہیں۔ ان حضرات نے بدر و احد کے شرکاء کی فہرستیں بھی تیار کر رکھی تھیں۔ انساب کے بارے میں وہ اکثر روایات الکلبی اور عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری سے اخذ کرتا ہے۔

صحابہ و تابعین کے بارے میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ جنگ احد میں کس کو کتنے زخم لگے تھے اور کون کون ایک ساتھ قبر میں دفن کیا گیا۔ مختلف قبائل کے اصنام جو کعبہ میں رکھے ہوئے تھے ان میں سے کس قبیلے کا بت کس نے توڑا؟ کس کا قاتل کون تھا اور کس کے اعقاب کہاں بسے ہوئے ہیں۔ اگر کسی کی نسل منقطع ہو گئی تو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے۔ عموماً تاریخ اور سال درج کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کس کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی۔ قبر میں کس نے اتارا۔ بہت سے اصحاب رسول کا حلیہ بھی اس نے بیان کر دیا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کون کس طرح کا خضاب استعمال کرتا تھا۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ بدر و اُحد میں شرکت کرنے والے اصحاب رسول زیادہ تر چالیس سال سے کم عمر کے تھے۔ دارالارقم میں چھپ کر نماز ادا کرنے والے مسلمانوں کی فہرست اس نے یزید بن رومان کے حوالے سے درج کی ہے اور ابوبکر بن عمرو بن حزم کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ ہجرت مدینہ کے موقع پر کون مہاجر کس انصاری کا مہمان ہوا تھا۔ مدینہ میں مہاجرین کا ابتدائی احوال عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ تراجم صحابہ میں ابن سعد نے جس ترتیب کا لحاظ رکھا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

۱۔ نسب

۲۔ نام

۳۔ کنیت

۴۔ زمانہ قبول اسلام

۵۔ ہجرۃ (حبشہ و مدینہ)

۶۔ مدینہ پہنچ کر کہاں اُترے

۷۔ کس کی مواخاۃ کس سے ہوئی

۸۔ کن مشاہد و غزوات و سرایا میں شرکت کی

۹۔ مناقب

۱۰۔ ازواج و اولاد

۱۱۔ ترکہ

۱۲۔ مدفن

۱۳۔ نمازِ جنازہ

۱۴۔ سنہ وفات (ماہ و یوم کے ساتھ)

۱۵۔ حلیہ

۱۶۔ اعقاب

ابن سعد نے سیرۃ اور صدرِ اسلام کے سلسلے میں بہت سے مکتوبات اور دستاویزات کا یا تذکرہ کیا ہے یا اُن کا متن درج کر دیا ہے۔

جنگ اُحد میں حضرت حمزہ کی شہادت کا حال تفصیل سے دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ عہد کیا تھا کہ حضرت حمزہ کے قصاص میں ستر مشرکین کا مُثلہ کریں گے تو یہ آیت نازل ہوئی وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ تب رسالت مآبؐ نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا (۳/۱۴) اُحد میں مقتولین زیادہ تھے اور کفن کا کپڑا کم تھا اس لیے ایک ایک چادر میں تین تین شہیدوں کو رکھا گیا۔ مدینہ میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ رونے والیاں پہلے حضرت حمزہ کا ماتم کرتی تھیں پھر اپنے مُردے کو روتی تھیں۔ اُحد کے شہدا کی تعداد (۷۰) تھی اور ان میں صرف چار مہاجرین تھے۔ حضرت فاطمہ زہرا، حضرت حمزہ کی قبر پر تشریف لے جایا کرتی تھیں اور اس کی مرمت کراتی تھیں (۳/۱۹)

ابن سعد ہمیں حضرت علی کی اولاد کے نام بھی بتاتا ہے۔ اُن کے فرزندوں میں ایک کا نام ابوبکر تھا، ایک فرزند عثمان اور ایک عمر بن علی تھے۔ کل اولاد ۱۴ لڑکے اور ۱۹ لڑکیاں تھیں (۳/۲) حضرت علی ہجرت مدینہ کے موقع پر ۱۵ ربیع الاول کو وہاں پہنچے تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تیرہ دن کے بعد اور اُن کی مواخاۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہوئی تھی۔ انہوں نے غزوۂ تبوک کے سوا ہر غزوہ میں شرکت کی تھی (۳/۲۳)

ابن سعد نے حضرت علی کا حلیہ بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بالکل سفید، گھنی اور چوڑی ڈاڑھی تھی، فربہ جسم، کندھوں پر گوشت، بھاری پنڈلیاں، قمیص پاجامہ پہنتے اور سیاہ عمامہ باندھتے تھے۔ آپ کا کرتا گھٹنوں تک نیچا ہوتا تھا (۳/۲۷) ہاتھ میں ایک کوڑا رہتا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں انگشتری پر "محمد رسول اللہ" کندہ کیا ہوا تھا (۳/۳۰)۔ جنگ جمل میں مقتولین کی تعداد تیرہ ہزار تھی۔ حضرت علی نے چار سال ۹ ماہ خلافت کی ہفتہ کی شب میں ۱۹ رمضان ۴۰ھ کو شہید کیے گئے اور کوفہ میں جامع مسجد کے پاس میدان میں دفن ہوئے (۳/۳۸) اُن کی عمر ۶۳ سال تھی

انہوں نے ترکہ میں صرف ۷۰۰ درہم چھوڑے تھے جو ایک غلام خریدنے کے لئے رکھے تھے۔

زید الحب کو حکیم بن حزام نے سوق عکاظ میں خریدا تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا مگر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نہیں گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کو ترجیح دی۔ اُمّ المومنین زینب بنت جحش کا نکاح اول زید بن حارثہ سے ہی ہوا تھا۔ سلیمان بن یسار کی روایت ہے کہ زید بن حارثہ سب سے پہلے مسلمان تھے (۳/۴۴) انہوں نے ۵۵ سال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۸ھ میں انتقال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وفات پر ہچکیاں لے کر روئے تھے۔ سعد بن عُبادہ نے کہا: یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا: ھذا شوقُ الحبیبِ إلی حبیبہٖ (یہ دوست کا اپنے دوست کے لیے اظہارِ محبت ہے)

حضرت عثمان غنی خوبصورت، نازک ناک نقشے والے، درمیانہ قد، گندمی رنگ تھے طویل ڈاڑھی تھی جسے مہندی سے رنگین کرتے تھے کندھے چوڑے تھے اور سر پہ گھنے بال تھے بعض دانتوں پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا (۳/۵۸)

بیعت عثمان ۲۹۔ ذی الحجہ ۲۳ھ کو ہوئی تھی۔ ۲۴ھ کے امیر حج عبد الرحمٰن بن عوف تھے اور ۳۵ھ کے عبد اللہ بن العباس درمیان کے ہر سال خود عثمان غنی امیر حج ہوتے تھے۔ محاصرے کے دوران میں لوگ حضرت عثمان سے جا کر ملتے تھے لیکن حضرت علی کو ان کے رشتہ داروں نے نہیں ملنے دیا (۳/۶۸) انصار نے حضرت عثمان سے کہا تھا کہ ہم جنگ کرنے کو آمادہ ہیں مگر حضرت عثمان نے قتال بین المسلمین کو پسند نہیں کیا۔ شہادت کے دن حضرت عثمان کا روزہ تھا۔ محاصرہ کرنے والے مصری، کوفی اور بصری تھے۔ اکثر اصحاب رسول یہ سمجھتے تھے کہ قتل تک نوبت نہیں پہنچے گی۔ محاصرین کو عراق سے کمک پہنچ رہی تھی۔ شہادت کے وقت محمد بن ابی بکر نے آپ کی داڑھی پکڑ لی تھی اور عمرو بن الحمق سینے پر سوار ہو گیا تھا۔ قرآن کریم اس وقت حضرت عثمان کے سامنے رکھا تھا اور اس پہ بائیں طرف لہو کے چھینٹے گرے تھے۔ عمرو بن الحمق نے نیزے سے ۹ زخم لگائے تھے (۳/۷۴) حضرت عثمان صاف ستھرا لباس پہنتے تھے، خوشبو لگاتے تھے۔ ۸۲ سال عمر ہوئی۔ مدت خلافت بارہ سال میں بارہ دن کم تھے۔ نماز جنازہ جُبیر بن مطعم نے پڑھائی۔ جنازے میں کل سترہ (۱۷) افراد شریک تھے اور ابن سعد کہتا ہے کہ صرف چار آدمی تھے جلدی جلدی لاش اٹھا کر بقیع میں لے گئے اور پوشیدہ دفن کیا گیا (۳/۷۹) حضرت حسن قاتل عثمان کا نام نہیں لیتے تھے اور حضرت علی فرماتے تھے واللہِ ما قتلتُ ولا أمرتُ ولکن غُلِبتُ (خدا کی قسم نہ میں نے قتل کیا نہ اس کا حکم دیا، بلکہ مجھے مغلوب کر لیا گیا) ۔ (۳/۸۳) ایک روایت یہ ہے قاتل عثمان مصری تھا۔

عتبہ بن غزوان عہد فاروقی میں بصرہ کے عامل تھے اور اس شہر کی پلاننگ انہوں نے ہی کی تھی۔ الزبیر بن العوام کے مدینہ میں گیارہ مکان تھے دو گھر بصرے میں، ایک کوفے میں اور ایک مصر میں تھا (۳/۱۰۸) اُن کے اموال کا مجموعی اندازہ ہشام بن عروۃ کی روایت میں ۵۱ یا ۵۲ الف الف (لاکھ؟) کیا گیا ہے (۳/۱۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عُمیر کو تعلیم اسلام کے لئے مدینہ بھیجا تھا وہاں انہوں نے جمعہ کے دن دار سعد بن خیثمہ میں بارہ مسلمانوں کو جمع کیا اور یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں پڑھا گیا۔ (۳/۱۱۸) مدینہ میں مسلمانوں کے گھروں کی پلاننگ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی (۳/۱۲۶)

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف ریشمی لباس پہنتے تھے جس کی مالیت چار پانچ سو درہم ہوتی تھی ان کا قد طویل اور باریک ناک نقشہ تھا رنگ گورا

سرخی مائل تھا۔ انہوں نے ترکہ میں سونے کی اینٹیں چھوڑی تھیں اور ایک بیوی کو ترکہ ۸۰ ہزار ملا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص بھی مالدار تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور صرف ایک بیٹی وارث ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے دو تہائی مال کے لئے وصیت کر جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ انہوں نے عرض کیا تو کیا آدھا؟ فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا: اچھا ایک تہائی۔ فرمایا: نہیں۔

إِنَّكَ أَن تَتْرُكَ وَلَدَكَ أَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَتْرُكَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ۔

(تم اپنی بیٹی کو مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے اچھا ہے کہ وہ تنگدست ہو اور دوسرے لوگ اس کی کفالت کریں)

انہوں نے دو لاکھ پچاس ہزار درہم ترکہ میں چھوڑے (۱۴۹/۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود مکہ میں سب سے پہلے قرآن کو شائع کرنے والے تھے۔ مدینہ میں ان کا گھر مسجد نبوی کی پشت پر تھا اور بدر میں انہوں نے ابوجہل کو قتل کیا تھا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم بھی تھے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا تھا اور انھیں سفر میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان تبرکات میں ایک تکیہ، ایک گدا، مسواک، نعلین اور ایک لوٹا شامل تھا (۱۵۳/۳) جب رسول اللہ کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو یہ آپ کے نعلین مبارک اٹھا کر اپنی بغل میں رکھ لیتے تھے، اور واپسی میں آپ کو پہننے کے لیے نعلین پیش کرتے تھے۔ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔ ٹانگیں پتلی پتلی تھیں، قد چھوٹا اور جسم نحیف تھا۔ عمدہ لباس پہنتے اور خوشبو لگاتے تھے (۱۵۷/۳) خضاب نہیں کرتے تھے۔ ان کے بال گندھے ہوئے تھے لٹیں کانوں پر رہتی تھیں ہاتھ میں لوہے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ انہوں نے انتقال سے پہلے اپنا وصیت نامہ لکھا تھا اور الزبیر بن عوام اور عبداللہ بن الزبیر کو وصیت کی تھی کہ میری لڑکیوں کی شادی اُن کی مرضی سے کی جائے۔ (۱۵۹/۳) ایک غلام کے لیے وصیت کی کہ وہ اگر پانسو درہم ادا کر دے تو آزاد ہو جائے گا۔ اپنے کفن کے لیے انہوں نے شرط لگا دی تھی کہ دو سو درہم سے زیادہ مالیت کا نہ ہو اور مجھے عثمان بن مظعون کے پاس دفن کیا جائے۔ عبداللہ بن مسعود نے ساٹھ سال سے زیادہ عمر پائی ۳۲ھ میں انتقال ہوا عمار بن یاسر نے نماز جنازہ پڑھائی مگر ابن سعد کہتا ہے کہ عثمان بن عفان کا نماز پڑھانا ثابت ہے۔ رات کے وقت دفن کئے گئے۔ ترکہ میں ۹۰ ہزار درہم چھوڑے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق پہلے مسلمان تھے (۱۷۱/۳) انہوں نے سب سے پہلے نماز پڑھی جب مسلمان ہوئے تو ان کا اثاثہ چالیس ہزار درہم تھا۔ پانچ ہزار درہم لے کر مدینہ آئے تھے اور تجارت شروع کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پر روزانہ صبح و شام تشریف لے جایا کرتے تھے (۱۷۲/۳) یہ شام سے سفید کپڑوں کی درآمد کرتے تھے اور جب مدینہ میں داخل ہوئے تو سفید لباس پہنے ہوتے تھے مدینہ میں ان کا گھر مسجد نبوی کے پاس تھا۔ عام الفتح میں جب مسلمانوں نے پہلا حج کیا تو امیر حج ابوبکر صدیق ہی تھے (۱۷۷/۳) آں حضرت کے مرض وفات میں نماز بھی انہوں نے ہی پڑھائی تھی۔ (۱۷۸/۱)

الزھری کی روایت واقعہ قرطاس کے بارے میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر کے بارے میں ہی وصیت کرنا چاہتے تھے (۱۸۰/۳) حضرت عائشہؓ نے بھی ایک روایت میں یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر جانشین کرتے تو ابوبکر کو بناتے پھر عمر کو پھر ابوعبیدہ بن الجراح کو۔ حضرت عمرؓ ابوعبیدہ ہی کو امیر بنانا چاہتے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر سے پہلی بیعت بشیر بن سعد نے کی تھی مسلمانوں

نے دیکھا کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی امامت دے کر دین کا امام بنایا ہے تو انھیں دنیا کا امام بھی کیوں نہ مانا جائے۔ (۱۸۳/۳)

ابن عباس کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک بار آدھی نماز ابو بکر نے اور آدھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی (۱۸۳/۳)

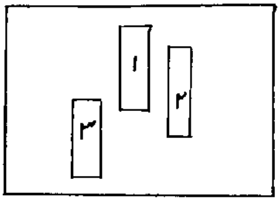
.خلافت ابو بکر میں عمرؓ قاضی تھے اور ریونیو کا محکمہ ابو عبیدہ کے پاس تھا خلیفہ ہونے کے بعد بھی ابو بکر کپڑوں کی گٹھری کاندھے پر رکھ کر بازار جاتے تھے۔ ان کی بیعت ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ کو ہوئی تھی (۱۸۶/۳) اس وقت ان کا مکان السنح (SUNHA) میں مدینہ کے نواح میں تھا اور اپنی زوجہ حبیبہ بنت خارجہ کے ساتھ وہاں رہتے تھے اس مکان کی چھت اُون ڈھانپ کر بنائی تھی وہاں سے مدینے تک پیدل آیا کرتے تھے اور عشا کی نماز پڑھ کر واپس جاتے تھے۔ خلیفہ ہونے کے بعد چھ ماہ تک سُنح میں رہے۔ تجارت اور معاشی خوش حالی کو پسند کرتے تھے مگر خلافت کی ذمہ داریوں نے اس مشغلہ کو چھڑا رکھا تھا۔

حضرت ابو بکر دبلے پتلے تھے۔ جسم پر گوشت کم تھا رنگ سفید تھا آنکھیں گہری تھیں چہرہ عرق آلود رہتا تھا داڑھی کو مہندی لگاتے تھے (۱۸۸/۳)

انہوں نے وصیت کی تھی مجھے پرانے کپڑے کا کفن دیا جائے۔ ان کے انتقال پر حضرت عمر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ حضرت ابو بکر نے اپنا جانشین نامزد کرنے سے پہلے اکابر سے مشورہ کیا تھا (۱۹۹/۳) وصیت کی کتابت عثمان بن عفان نے کی تھی مگر وصیت میں حضرت عمر کا نام لکھوانے سے پہلے ہی حضرت ابو بکر بے ہوش ہو گئے تھے۔

حضرت ابو بکر نے ۷ جمادی الآخرہ کو ٹھنڈ میں غسل کر لیا تھا اس سے پندرہ دن بخار رہا۔ زمانہ علالت میں حضرت عمر نماز پڑھاتے تھے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان کے گھر آمنے سامنے تھے۔ ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳ھ کو انتقال ہوا مدت خلافت دو سال تین ماہ اور دس دن تھی عمر ۶۳ سال ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں تین سال چھوٹے تھے۔ نماز جنازہ قبر اور منبر نبوی کے درمیانی حصے میں حضرت عمر نے پڑھائی۔ عمر، عثمان، طلحہ بن عبداللہ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے قبر میں اُتارا تھا۔ (۲۰۶/۳)

حضرت ابو بکر نے وصیت کی تھی کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دفن کیا جائے اُن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کے قریب ہے۔ قبر زیادہ اُبھری ہوئی نہیں ہے اُوپر سُرخ کنکریاں پڑی ہیں۔ روضے کا اندرونی نقشہ اس طرح ہے کہ



درمیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے اس کے بائیں جانب حضرت ابو بکر صدیق ہیں جن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک کے قریب ہے اور داہنی طرف حضرت عمر بن الخطاب ہیں جن کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے قریب ہے (۲۱۰/۳) حضرت ابو بکر کی وفات کے وقت اُن کے والد ابو قحافہ حیات تھے اور اُنہوں نے میراث میں اپنا حصہ اپنے پوتوں کو دے دیا تھا چھ ماہ اور چند روز کے بعد محرم ۱۴ھ میں ابو قحافہ بھی ۹۷ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ صہیب بن سنان رومی تمام مشاہد میں شریک تھے اور مغازی بیان کیا کرتے تھے (۲۲۹/۳) انہوں نے

شوال ۲۰ھ میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا۔ بلال بن رباح حضرت ابوبکرؓ کے مولی تھے انہوں نے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ یہ اسلام کا اظہار کرنے والے پہلے سات مسلمانوں میں سے ایک تھے مدینہ کو ہجرت کرنے کے بعد سعد بن خیثمہ کے مکان میں فروکش ہوئے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے دواوین کی ترتیب کی تو یہ شام کو ہجرت کر گئے تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے اذان دی تھی اور جب مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریف لاتے ہوئے دیکھ لیا کرتے تھے تب اقامت کہتے تھے (۲۴۴/۳) فتح مکہ کے دن انہوں نے خانہ کعبہ میں اذان دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اذان دینی چھوڑ دی تھی اور شام کی طرف چلے گئے تھے وہیں انتقال کیا (۲۰ھ) ان کا رنگ سیاہ تھا جسم نحیف اور قد لمبا، بال بہت تھے گالوں پر گوشت کم تھا۔

ارقم بن ابی الارقم کے حال میں ابن سعد ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا گھر کوہ صفا پر تھا جہاں ابتداً میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان لانے والے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہیں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ بعد میں اس کا نام دارالاسلام ہو گیا تھا اسے الارقم نے وقف کر دیا تھا اور وقف نامہ ان الفاظ میں لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: ھذا ما قضی الارقم فی ربعه ما حاز الصفا انها محرمة بمكانها من الحرم لا تباع ولا تورث شهد هشام بن العاص وفلان مولی هشام بن العاص۔

(یہ الارقم نے اپنے اس مکان کے بارے میں فیصلہ کیا ہے جو الصفا کے کنارے واقع ہے کہ یہ اپنی جگہ حرم کی طرح محترم ہے نہ اسے بیچا جائے گا نہ یہ وراثت میں چلے گا۔ اس پر ہشام بن العاص اور ان کے فلاں مولی گواہ ہیں)

یہ مکان ابوجعفر عباسی خلیفہ کے زمانے تک محفوظ تھا اور اس نے زبردستی اسے خرید لیا تھا اور اس کا بیعنامہ ۱۷ ہزار دینار میں ہوا تھا، ابوجعفر نے یہ مکان خیزران کو دے دیا تھا جس نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا (۲۴۴/۳)

حضرت عمر بن الخطاب کو لقب فاروق اہل کتاب نے دیا تھا۔ تاریخ اور سنہ ہجری لکھنے کا رواج انہوں نے شروع کیا اور پہلی تاریخ ربیع الاول ۱۶ھ سے لکھی (۲۸۱/۳) سب سے پہلے قرآن بھی کتابی صورت میں انہوں نے جمع کیا۔ کوفہ اور بصرہ کی پلاننگ بھی عہد فاروقی میں ہوئی اور ان دونوں شہروں میں مختلف قبائل کے لحاظ سے بسائے گئے تھے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ اکابر اصحاب رسول کو گورنر نہیں بناتے تھے۔ انہوں نے مسجد نبوی میں کنکریٹ ڈلوائی تھی اور حضرت عباس بن عبد المطلب کا گھر مسجد میں شامل کر لیا تھا دواوین کی ترتیب کے لیے انہوں نے اصحاب رسول کی فہرستیں تیار کرائی تھیں (۲۹۵/۳) اور پنشن پانے والوں کے رجسٹر بنائے تھے (محرم ۲۰ھ) اہل بدر کی اولاد کے لیے حضرت عمرؓ نے دو دو ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا تھا مگر حضرات حسن وحسین کو پانچ پانچ ہزار درہم دیے تھے (۲۹۷/۳) اس اصول کے لحاظ سے زید بن اسامہ کا وظیفہ عبد اللہ بن عمر سے زیادہ تھا۔ ہر قبیلے کا رجسٹر علیحدہ تھا اور وظیفہ حضرت عمرؓ خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے تھے۔ وہ کیسا معاشی نظام چاہتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے:

عن زید بن أسلم عن أبیه قال: سمعت عمر بن الخطاب یقول: واللہ لئن بقیت الی هذا العام المقبل لألحقن آخر الناس بأولهم ولأجعلنهم رجلا واحدا۔

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

لئن بقيت الى الحول لالحقن آسفل الناس باعلاهم۔

(خدا کی قسم اگر میں اس آنے والے سال تک زندہ رہ گیا تو آخری آدمی کو پہلے سے ملا دوں گا اور سب کو "ایک آدمی" بنا کر چھوڑ دوں گا۔

دوسری روایت: اگر سال تمام تک زندہ رہا تو سب سے نچلے آدمی کو سب سے اونچے آدمی سے ملا دوں گا) (۳۰۲/۳)

ایک راوی سائب بن یزید کا بیان ہے کہ "عام رمادہ" میں اس نے حضرت عمر کو دیکھا تھا تو اُن کے پاجامے میں سولہ پیوند تھے (۳۲۰/۳) ان کا قد لمبا تھا، تیز تیز چلتے تھے بڑی بڑی مونچھیں تھیں جنھیں غصّے میں تاؤ دیتے تھے۔ بالوں کو مہندی سے سرخ کرتے تھے۔ کپڑے میں چمڑے کا پیوند بھی لگا لیتے تھے (۳۲۸/۳) خلافت کے زمانے میں ان کے پاس ایک ہی پاجامہ تھا۔ آخر وقت میں انہوں نے جو وصایا کی تھیں اُن میں فرمایا تھا کہ میں کتاب اللہ کا اتباع کرنے کی وصیت کرتا ہوں، جب تک تم اس کی پیروی کرو گے گمراہ نہیں ہو سکتے اور مہاجرین سے حسن سلوک کرنا کیونکہ لوگ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ (اگر مہاجرین وہ ہیں کہ گھٹیں گے بڑھیں گے نہیں) اور انصار کا خیال رکھنا یہ وہ ہیں جن کی وادی میں اسلام نے پناہ لی تھی اور عرب کا خیال کرنا یہی تمہاری "اصل اور مادّہ" ہیں اور تمہیں اہلِ ذمہ کے لیے وصیت کرتا ہوں کیونکہ ان کا ذمہ تمہارے نبی نے لیا ہے۔

حضرت عمر کی اقتصادی پالیسی یہ تھی کہ معاشی نابرابری کو ختم کر دینا چاہتے تھے فرمایا:

واللہ لئن سلمنی اللہ لادعن أرامل اھل العراق لا یحتجن إلی احد بعدی ابداً (۳۳۷/۳)

(خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے سلامت رکھا تو عراق کی بیواؤں کو اس حالت میں چھوڑ جاؤں گا کہ وہ میرے بعد ہرگز کسی کی محتاج نہ رہیں)

اُن کی شہادت ایک غلام کے ہاتھ سے ہوئی جس نے زہر میں بجھے ہوئے چاقو سے تیرہ مسلمانوں کو زخمی کیا تھا ان میں سے ۹ کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت عمر نے ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کو دس سال پانچ ماہ گیارہ دن خلافت کرنے کے بعد انتقال کیا۔ حضرت عثمان کی بیعت ۳ محرم ۲۴ھ کو ہوئی (۳۶۵/۳) صہیب بن سنان نے نماز جنازہ پڑھائی۔ عثمان بن عفان، سعید بن زید، صہیب بن سنان اور عبداللہ بن عمر نے قبر میں اتارا۔

ہشام بن عروۃ کا بیان ہے کہ الولید بن عبدالملک کے زمانے میں روضۂ نبوی کی ایک دیوار گر گئی تھی اُسے دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے بنیاد کھودی گئی تو ایک قبر میں پَیر ظاہر ہوئے لوگ گھبرائے اور یہ سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم مبارک ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اُن قدموں کو پہچان سکے۔ عروۃ بن الزبیر بلائے گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم مبارک نہیں بلکہ یہ عمر رضی اللہ عنہ کے پانو ہیں (۳۶۹/۳)

عثمان بن مظعون کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک لذات اور ترکِ دنیا پر وعید فرمائی۔ کثرت عبادت اور رہبانیت کی ممانعت کی (۳۹۵/۳) ان کا انتقال ہجرت سے ۳۰ ماہ بعد ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آنسوؤں سے روئے تھے (۳۹۶/۳) یہ جنت البقیع میں دفن ہونے والے پہلے مسلمان تھے اِن کی قبر مرتفع تھی۔

عبیدۃ بن الجراح نے اپنی انگوٹھی پر "الخمس للہ" کندہ کرا رکھا تھا (۴۱۲/۳) سعد بن معاذ تعلیم قرآن دیا کرتے تھے اِن کے بارے میں ابراہیم النخعی نے کہا۔

"أن النبی علیہ السلام مدّ علی قبر سعد ثوباً أو مدّ وھو شاھد" (۴۳۱/۳)

(نبی علیہ السلام نے سعد کی قبر پر کپڑا پھیلایا، یا وہ پھیلایا گیا اور آپ دیکھتے رہے)
لوگ ان کی قبر سے تبرک لے جاتے تھے۔

أخذ انسان قبضة من تراب قبر سعد فذهب بها ثم نظر إليها بعد ذلك فإذا هي مسك (۴۳۱/۳)

(ایک شخص سعد کی قبر کی مٹی ایک مٹھی میں بھر کر لے گیا پھر اُسے دیکھا تو وہ مشک تھا)

سعد کی عمر انتقال کے وقت ۳۷ سال تھی وہ بہت حسین و جمیل، سرخ سفید، دراز قد تھے۔ داڑھی خوبصورت آنکھیں سیاہ تھیں (۴۳۳/۳)

حضرت ابوایوب انصاری (متوفی ۵۲ھ) کے لئے ابن سعد کہتا ہے کہ ان کی نسل منقطع ہوگئی تھی۔ قد انقرض ولده فلا نعلم له عقبا (۴۸۴/۳)

نعیمان بن عمرو بدری صحابی تھے معمر بن راشد کی روایت ہے کہ یہ یا ان کا لڑکا چار یا پانچ مرتبہ نبیذ پی کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ نے ہر بار کوڑے لگوائے کسی شخص نے ان پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
لا تلعنه فانه يحب الله ورسوله (لعنت مت بھیجو کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں) (۴۹۴/۳)

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلق کرایا تھا تو آپ کے موئے مبارک بہت سے اصحاب نے لے لیے تھے اور انھیں محفوظ رکھا تھا۔ (۵۰۶/۳)

عبداللہ بن عمرو اور عمرو بن الجموح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبر میں دفن کرایا تھا اور یہ ایسی جگہ واقع تھی جہاں سے برسات کا پانی گزرتا تھا۔ ۴۶ سال کے بعد یہ قبر دوبارہ کھل گئی تو لوگوں نے دیکھا کہ دونوں لاشیں بدستور موجود ہیں اور کفن بھی ویسا ہی ہے۔ یہاں سے ان کی لاشیں نکال کر دوسری جگہ علیحدہ علیحدہ دفن کیا گیا (۵۶۳/۳)

سعد بن عبادہ کی والدہ عمرۃ بنت مسعود نے مدینہ میں ربیع الاول ۵ھ میں انتقال کیا اس وقت رسول اللہؐ غزوۂ دومۃ الجندل پر تشریف لے گئے تھے اور سعد بن عبادہ آپ کے ساتھ تھے۔ سفر سے واپس آکر رسول اللہؐ نے ان کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھی۔ سعد کی ماں نے کوئی نذر مان رکھی تھی جسے پورا کرنے سے پہلے اُن کا انتقال ہوگیا۔ سعد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم اس کی منت پوری کردو (۶۱۵/۳) سعد نے پوچھا کہ اگر میں والدہ کے انتقال کے بعد ان کے لیے کچھ صدقہ کروں تو کیا اس سے انھیں کچھ فائدہ ہوگا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر سعد بن عبادہ نے المخراف میں اپنی جائداد والدہ کے نام پر صدقہ کردی۔ دوسری روایت میں ہے کہ سعد نے اُن کے نام پر پانی پلانے کی سبیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لگوائی (۶۱۵/۳) بعد میں کسی نے الحسن سے پوچھا کہ یہ سبیل صدقہ ہے اس کا پانی پینا جائز ہے یا نہیں تو انہوں نے فرمایا کہ سعد بن عبادہ کی سبیل سے ابوبکر و عمر نے بھی پانی پیا ہے۔

یہ سیرۃ، مغازی، صدر اسلام اور کبار اصحاب رسولؐ کے بارے میں ابن سعد کی دی ہوئی تفصیلات کا صرف ایک خاکہ ہے اور طبقات کی ابتدائی تین جلدوں پر مبنی ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طبقات ابن سعد میں معلومات کی کیسی فراوانی ہے اور جزئیات کی فراہمی میں ابن سعد نے کتنا اہتمام کیا ہے۔

تاریخ یعقوبی ـــــ سیرت نبویؐ کا ایک اہم قدیم ماخذ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

تاریخی پس منظر

طلوعِ اسلام کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ان اہم ترین اور سب سے قدیم موضوعات میں غالباً سرِفہرست ہے جس نے اہلِ دل اور صاحبانِ قلم دونوں کے دامانِ خیال کو کھینچا ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے علمی ظرف، ذہنی رجحان اور فنی مذاق کے مطابق پہلے تو اپنا دامنِ طلب بھرا اور پھر دوسرے مشتاقانِ پرتوِ جمالِ الٰہی و نبوی کے قلب کے سرور اور آنکھوں کے نور کا اپنے بس بھر بندوبست کیا۔ محدثینِ کرام نے اقوال و افعال و تقاریرِ نبویؐ کی معمولی سے معمولی جزئیات کو فنِ حدیث کے زاویۂ نگاہ سے محیط کر لیا، تو مفسرینِ عظام نے کلامِ الٰہی کے تعلق سے تعبیراتِ نبوی کو محصور کیا۔ مغازی نگاروں کو فتوحاتِ اسلامی کے خیرہ کن پس منظر میں جنگ و جدال کی دنیا پسند آئی اور انھوں نے معرکہ ہائے نبوی کو سیرت کا ایک اہم ترین پہلو بنا دیا۔ خالص سیرت نگاروں کو حیاتِ رسولؐ کے ہر پہلو سے کام تھا اس لیے از اول لمحۂ زندگی تا دمِ واپسیں ہر جزئیہ قلم بند کیا گیا۔ نسب نگاروں نے عرب قبائلی نظام کے پس منظر میں جب اشراف کے انساب سے بحث کی تو حیاتِ رسول کو سرنامہ بنا دیا کہ مفاخرِ عرب کے تاج میں نورِ محمدی شاہ ہیرا تھا۔ عالمی تاریخ لکھنے والوں کی تصانیف میں سیرتِ مبارکہ عہدِ زرّیں کا درجہ حاصل کر گئی۔

سیرتِ نبوی سے دلچسپی و تعلقِ خاطر مسلمانوں کو پہلے دن سے رہا کیونکہ وہ کلامِ الٰہی کے بعد مذہب و قانونِ اسلام کا دوسرا منبعِ حیات و سرچشمۂ فیض ہے۔ خود عہدِ نبوی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ سے دلچسپی و عقیدت کے ساتھ ساتھ جستجو، تفحص اور روایت کے ثبوت ملتے ہیں[1]۔ عہدِ خلافت راشدہ میں دلچسپی اور روایت دونوں میں اضافہ ہوا کہ اب وہ ذاتِ بابرکات لوگوں کے درمیان موجود نہ تھی۔ جنھوں نے آپ کو دیکھنے کی سعادت نہ پائی تھی وہ بیقرار دل اور مشتاق نظروں سے ان سے پوچھتے جو صحبتِ نبویؐ کے شرف سے سرفراز تھے اور صحابہ کرام محبت و عقیدت کی زبان سے مگر ضبط و صبر کا دامن تھام کر اپنے حبیب مکرمؐ کی باتیں کرتے[2]۔ عام طور پر سیرتِ مبارکہ کے واقعات مجالس میں، گھروں یا مسجدوں میں بیان کیے جاتے[3]۔ صحابہ کرامؓ نے "روایت" کی جو بنیاد ڈالی اسی کو دوسری نسل کے لوگوں نے فن کا درجہ دے دیا اور رواۃ یا راویوں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا[4]۔ غیر محتاط راویوں نے ضبط و احتیاط سے کام نہ لیا تو سیرت کے واقعات میں قصّے (قصص) شامل ہو گئے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ داستان گوئی یا داستان طرازی کی بہت سی غیر تاریخی چیزوں کو سیرت کا جز بنا دیا گیا حالانکہ یہ داستان گو (قاص) کے اپنے ذاتی رجحانات، سیاسی میلانات اور مذہبی خیالات کا زائیدہ تھا[5]۔ قاص کے پہلو بہ پہلو اخباری

بھی تھے جو تاریخی واقعات کو پوری احتیاط سے قلم بند کرتے تھے اور اس کے لیے اسناد کو ضروری قرار دیتے تھے تاکہ وقوعِ واقعہ کے عینی شاہدوں تک سلسلۂ کلام دراز کرکے اپنی تحریر کے لئے سندِ اعتبار فراہم کی جائے۔(۶)

سیرتِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو —— مغازی —— کا فن پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں ہی ضبطِ تحریر میں آنے لگا تھا۔ خلیفہ سوم کے صاحبزادے ابان بن عثمان (تقریباً ۲۰ھ/۶۴۱ء تا ۱۰۰ھ/۷۱۸ء) اب تک معلومات کے مطابق اس فن کے پہلے نقاش تھے۔ ان کے بعد ان سے اہم تر تھے۔ عروہ بن زبیر بن عوام (۲۳ھ/۶۴۴ء تا ۹۴ھ/۷۱۳ء) جن کی متعدد روایات کتب تاریخ میں ملتی ہیں اور ان کے علاوہ وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان (۶۵ھ/۶۸۴ء تا ۸۶ھ/۷۰۵ء) کو تحریری یادداشتیں بھی بھیجا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ان کو بجا طور سے تاریخِ اسلام کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ شرحبیل بن سعد (متوفی ۱۲۳ھ/۷۴۱ء) جو غالباً ایک یمنی مولیٰ تھے اس سلسلہ کی ایک اور پرانی کڑی تھے۔ لیکن ان سے زیادہ اہم ایک یمنی تابعی وہب بن منبہ (۳۴ھ/۶۵۴ء تا ۱۱۰ھ/۷۲۸ء) تھے جو غالباً یہودی خاندان کے فرد تھے۔ کچھ تو انھوں نے خود اور کچھ ان کے بعد دوسروں نے ان کے نام سے منسوب کرکے سیرتِ نبویؐ میں اسرائیلیات کو جگہ دی خاص کر سلسلۂ انبیا کے بیان میں۔ مغازی نگاروں کے اسی سلسلے میں عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری (متوفی ۱۲۰ھ/۷۳۸ء) کے قریب تھے جو دمشق و مدینہ میں مغازی پر مجالس منعقد کرتے اور بعد میں ان کو قلم بند کر لیتے۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری (۵۱ھ/۶۷۱ء تا ۱۲۴ھ/۷۴۲ء) اگرچہ خلیفہ عبدالملک اموی کے دربار سے وابستہ تھے لیکن فنِ مغازی میں ان کی امامت پر اس وابستگی سے ذرا میل نہ آیا تھا۔ عہدِ عمر بن عبدالعزیز (۹۹ھ/۷۱۷ء تا ۱۰۱ھ/۷۱۹ء) میں عبداللہ بن ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم (متوفی ۱۳۰ھ/۷۴۷ء یا ۱۳۵ھ/۷۵۲ء) نے مغازی پر ایک نوشتہ خلیفۂ وقت کے ملاحظہ کے لئے تیار کیا تھا۔ ان کا ایک معاصر ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (متوفی ۱۳۱ھ/۷۴۸ء یا ۱۳۷ھ/۷۵۴ء) نے بھی ایک مغازی پر کتاب چھوڑی تھی۔ لیکن ان سب مغازی نگاروں میں موسیٰ بن عقبہ (تقریباً ۵۵ھ/۶۷۵ء تا ۱۴۱ھ/۷۵۸ء) کی مغازی کو جو اعتبار ملا وہ کسی کے حصّہ میں نہ آیا(۷)۔ لیکن ان کی مغازی وقت کی دست برد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی اور واقدی (۱۳۰ھ/۷۴۷ء تا ۲۰۷ھ/۸۲۲ء) اس فن کے امام بے مثال بن کر دوسری صدی ہجری میں ابھرے۔(۷ الف)

فنِ سیرت پر پہلی جامع کتاب جو ہمیں دستیاب ہے وہ محمد ابن اسحاق (۸۵ھ/۷۰۴ء تا ۱۵۱ھ/۷۶۷ء) کی سیرتِ رسول اللہ ہے جو ابنِ ہشام (متوفی ۲۱۳ھ/۸۲۸ء یا ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کی تہذیب السیرۃ النبویہ کی شکل میں ملتی ہے۔(۸) یہ کتاب مدتوں سیرت نگارانِ رسول کے لئے مشعلِ راہ بنی رہی اور آج بھی اس کی امامت سے کسی کو انکار نہیں۔ مدتوں اس کی خیرہ کن روشنی میں کسی دوسری کتابِ سیرت کا چراغ نہ جل سکا۔ لیکن اس کے علاوہ وقتی مطالبوں اور عصری تقاضوں نے بھی علمی مذاق بدل دیا تھا۔ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی میں اُمتِ اسلامی کی تہذیبی و تمدنی ترقی اس قدر ہو چکی تھی کہ طالبانِ علم کے لئے مختلف جولان گاہیں بن گئی تھیں۔ وہ "امت" کے گوناگوں معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے "رواۃ" اور "اخباریوں" کو تاریخ و تہذیبِ اسلام کے مختلف پہلوؤں سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اس صدی کے "اخباریوں" میں عوانہ بن حکم (متوفی ۱۴۷ھ/۷۶۴ء)، ابومخنف (متوفی ۱۵۷ھ/۷۷۴ء)، سیف بن عمر (متوفی ۱۸۰ھ/۷۹۶ء)

اور مدائنی (متوفی ۲۲۵ھ/ ۸۳۹ء) امامت و مقتدائیت کے مقام پر فائز ہیں[۹]۔ تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی نے تہذیبِ اسلامی کے ایک نئے دور کا مطالعہ کیا۔ یہ زمانہ "علم کے سفر" کا تھا جس کو محدثین نے شروع کیا تھا۔ خلافتِ اسلامی کے مختلف صوبوں اور مراکز میں علم کی مسندیں بچھی تھیں۔ تشنگانِ علم ان چشم ہائے حیات سے سیراب ہونے جاتے اور اپنے ظرف بھر دامن بھر لاتے تھے۔ اسی سفرِ علمی نے وسعتِ نگاہ پیدا کی اور تیسری صدی ہجری میں تاریخ اسلامی عالمی تاریخ کا جزو بن گئی اور سیرتِ نبوی اس کا ایک درخشاں باب۔ اس صدی کے اہم ترین ستون تاریخ تھے۔ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۰ھ/ ۸۸۲ء) ابوحنیفہ دینوری (م ۲۸۲ھ/ ۸۹۷ء)، بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء)، یعقوبی (متوفی ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کے بعد) اور طبری (متوفی ۳۱۰ھ/ ۹۲۳ء)۔ ان سب اساطین تاریخ اسلامی کا نقطۂ نظر عالمی تھا۔ اور اسی بنا پر ان کی کتبِ تاریخ حضرت آدم ابوالبشر سے شروع ہوتی ہیں اور ان کے اپنے عہد پر ختم ہوتی ہیں[۱۰]۔

مصنف: حیات و رجحانات

کسی فنی یا علمی شاہکار کا تجزیہ و تحلیل کرتے وقت اس کے فن کار یا قلم کار کی حیات و رجحانات کا جائزہ ازبس ضروری ہے کیونکہ بسا اوقات اس کی زندگی کے کوائف، خاندانی حالات، موروثی ترکۂ خیالات، مذہبی معتقدات، سماجی و معاشرتی تعلقات، سیاسی نظریات، فقہی یا مسلکی رجحانات نہ صرف اس کی نگارشات میں منعکس ہوتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر ان کی علمی سمت بھی متعین کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے مورخ یعقوبی کے بارے میں ہماری معلومات کافی تشنہ ہیں لیکن قدیم و جدید مآخذ میں جو کچھ ملا ہے اس کی بنیاد پر اس کی حیات کی تاریخ کو مرتّب کیا جا سکتا ہے۔

حیاتِ مورخ کے بارے میں ہمارا سب سے قدیم ماخذ —— اب تک کی معلومات کے مطابق —— ساتویں صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی کا مشہور مصنف یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ/ ۱۲۲۸ء) ہے جس نے اپنی معجم الادباء میں ابوعمر محمد بن یوسف بن یعقوب مصری کندی (متوفی بعد ۳۵۵ھ/ ۹۶۶ء) کی اساس پر کہا ہے کہ یعقوبی کا پورا نام احمد بن ابی یعقوب اسحاق بن جعفر بن وہب بن واضح تھا مگر وُہ اپنی نسبت یعقوبی کے ذریعہ زیادہ معروف ہے۔ یاقوت نے اس کو اخباری عباسی بھی گردانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ روایت میں اعلیٰ مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ خاندان عباسی سے نسبتِ شرف رکھتا تھا۔ عباسی کی توضیح یاقوت کے بیان میں نہیں ملتی تاہم وہ اس کو بنو ہاشم کا مولیٰ قرار دیتا ہے اور شاید یہی ایک سبب ہو۔ تاریخ الیعقوبی کے مخطوطے پر "الکاتب العباسی" تحریر ملتا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ غالباً کسی عباسی خلیفہ کا یا کم از کم اس کے کسی اہم متوسل کا کاتب (سیکریٹری) رہا ہوگا۔ شاید یہ عباسی ہونے کا بہتر جواز فراہم کرتا ہے۔ یاقوت نے یعقوبی کا سنہ وفات ۲۸۴ھ/ ۸۹۷ء بتایا اور کہا ہے کہ اس کی بہت سی تصانیف تھیں جن میں کتاب التاریخ، کتاب اسماء البلدان، کتاب فی اخبار الامم السالفۃ اور کتاب مشاکلۃ الناس لزمانہم اہم ترین تھیں۔ یاقوت کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابِ تاریخ کافی ضخیم تھی، کتاب البلدان ایک جلد میں تھی اور گذشتہ قوموں کے حالات پر کتاب کافی مختصر تھی۔ اس کے علاوہ

یاقوت کے یہاں خاموشی ہے۔[۱۱]

جدید مورخین و مولفین میں اسماعیل پاشا بغدادی نے اپنی دونوں کتابوں میں یاقوت کے بیان پر کوئی اضافہ نہیں کیا[۱۲]۔ عمر رضا کحالہ نے بھی مزید کوئی روشنی نہیں ڈالی[۱۳]۔ خیرالدین زرکلی نے اپنی مشہور عام کتاب الاعلام میں نسبتاً کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یعقوبی ایک مورخ و جغرافیہ نویس تھا۔ وہ بغداد کا باشندہ تھا اور اس کا دادا خلیفہ عباسی ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ/ ۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/ ۷۷۵ء) کے موالی میں سے تھا۔ وہ سرد و گرم ممالک دور دراز چشیدہ تھا۔ عالم اسلامی میں خوب گھوما پھرا تھا۔ ایک مدت تک ارمینیا میں مقیم رہا۔ سرزمین پاک و ہند بھی پہونچا اور دوسرے عربی دیار بھی گیا۔ مورخوں میں اس کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ یاقوت کے علاوہ دوسروں نے ۲۸۲ھ/ ۸۹۵ء اور ۲۷۸ھ/ ۸۹۱ء یا اس کے بعد بھی بتائی ہیں لیکن اب اس کی تاریخ وفات ترجیحی طور پر ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کے بعد کسی وقت تسلیم کی جاتی ہے کیونکہ اس کی کتاب البلدان میں اس کے کچھ اشعار درج ہیں جو اس نے ۲۹۲ھ/ ۹۰۷ء کی عیدالفطر کی چاندرات کو نظم کئے تھے۔[۱۴]

تاریخ یعقوبی کے بیروت ایڈیشن میں مورخ و صاحب کتاب پر کوئی مقدمہ نہیں ہے[۱۵]۔ تاہم نجف کے ایڈیشن میں مرتب سید محمد صادق بحرالعلوم کا انتہائی مختصر مقدمہ ہے جس سے تشنگانِ علم کی تشنگی اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کے مقدمہ سے زرکلی کے بیان پر چند اور باتوں کا اضافہ ملتا ہے۔ مثلاً یعقوبی کا ارمینیا میں ۲۶۰ھ میں موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلامی میں اس کا سفر شام و اندلس بھی معلوم ہوتا ہے۔ جن اشعار کی طرف زرکلی کے بیان میں اشارہ گزرا وہ بقول بحرالعلوم مصر کے حاکم وقت خاندان بنو طولون کے جلالتِ شان و عیش و عشرت کے بارے میں کہے گئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یعقوبی تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی کے اوائل میں موجود تھا۔ بحرالعلوم کا خیال ہے کہ یعقوبی ابوحنیفہ دینوری کا معاصر تھا[۱۶]۔ لیکن اسے صرف دینوری ہی کی معاصرت کا شرف حاصل نہیں تھا بلکہ وہ ابن قتیبہ، بلاذری اور طبری سے بھی نسبتِ ہمعصری رکھتا تھا اگرچہ اس کا علم و اعتراف ہمیں ان میں سے کسی بھی مورخ کے بیان سے نہیں ملتا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز دوری کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں جعفری یا شیعی رجحانات کی عکاسی کی ہے[۱۷]۔ اگرچہ قدیم یا متوسط ماخذ و مستند مورخین و مولفین کے یہاں اس نکتہ پر کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا ہے تاہم تاریخ یعقوبی کی داخلی شہادتیں اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان شہادتوں کا ذکر کتاب کے مندرجات کے تجزیے و تحلیل کے وقت بار بار آئے گا۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مورخ جانبدار حضرت علی و حسن کے زمانۂ حکومت کو تو خلافت سے تعبیر کرتا ہے جبکہ باقی تمام خلفا ——— حضرات ابوبکر و عمر سے لے کر خلیفہ عباسی معتمد علی اللہ تک ——— کے عہود حکومت کو 'ایام' سے یاد کرتا ہے[۱۸]۔ بظاہر یہ بڑی معصوم اور غیر اہم سی ادا معلوم ہوتی ہے لیکن ان دو الفاظ کے پیچھے خلافت کے بارے میں اُمتِ مسلمہ کے دو اہم ترین فرقوں کے سیاسی اور کسی حد تک مذہبی نظریہ کی پوری تاریخ چھپی ہوئی ہے[۱۹]۔ یعقوبی کی تاریخ میں اہلبیت یا خاندانِ علی ابن ابی طالب سے عقیدت کی قربان گاہ پر تاریخی شعور اور علمی غیر جانبداری یا فنی معروضیت کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ مورخانہ معیارِ صداقت سے کسی تاریخی تحریر کا یہ بڑا سقم ہے۔

جب ذاتی خیالات یا فرقہ وارانہ رجحانات کی کارفرمائی تاریخِ اسلامی پر کسی کتاب میں اس حد تک ہو تو نہ صرف یہ کہ واقعات و حقائق کے انتخاب و انضباط میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے بلکہ اکثر و بیشتر واقعات کو مسخ کرنے کا مکروہ عمل شروع ہو جاتا ہے ۔ مورخ اپنے من بھاتے نقطۂ نظر اور پسندیدہ نظریے کی آنکھ سے تاریخی واقعات پر نظر ڈالتا ہے ۔ چن چن کر وہ ان واقعات کو لیتا ہے جو اس کی رائے کے حق میں ہوتے ہیں اور ان حقائق کو نظر انداز کر دیتا ہے جو اس کے نظریہ کی کاٹ کرتے ہیں یا اس سے میل نہیں کھاتے ۔ پھر عملِ جانبداری اور غیر معروضی طریقہ کار کا اثر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وُہ اپنی محبوب شخصیات و افراد کو تعریف و توصیف کے فلکِ ہفتم پر بٹھا دیتا ہے ۔ اس کے ممدوحین دوسروں یا اس کے قاریوں کو بھی اتنے ہی اونچے عظیم اور بے مثل نظر آئیں جتنا کہ وہ ان کو خود اپنی چشمِ تصور میں دیکھتا ہے غیر محتاط و غیر دیانتدار مورخ اس مقصد کے حصول کے لیے پھر دو مورخانہ جرم کرتا ہے :

اوّل یہ کہ وہ ان کی مدح سرائی کا لازمہ دوسروں یا مخالفین کی نکتہ چینی، تنقیص حتیٰ کہ کردار کشی میں سمجھتا ہے ۔

دوم یہ کہ وہ قصیدہ نگاری کے دوسرے لوازم ——— مبالغہ ، غلط تعبیر اور جعلی شواہد ——— کا سہارا لیتا ہے ۔

یعقوبی کی تاریخ کے یہ مذکورہ بالا کمزور نکات اس کے سیرتِ نبوی کے باب میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ۔ تفصیل تو اپنی جگہ پر آئے گی یہاں اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ابتدائی مسلموں کے باب میں یعقوبی نے عام مورخین اور سیرت نگاروں کی روش سے بالکل الگ طرز اپنایا ہے ۔ وہ حضرت خدیجہ کو عورتوں میں اول مسلمان حضرت علی کو مردوں میں اول مسلم اور موخر الذکر بزرگ کے بعد حضرات زید بن حارثہ اور ابو ذر غفاری کو بالترتیب دوسرا اور تیسرا مسلم مرد قرار دیتا ہے ۔ پھر محض اشک شوئی کی خاطر لفظ قِیلَ (کہا گیا) سے، جو روایت کے مرجوح یا ناقابلِ اعتبار ہونے کی عرب تاریخ نویسی میں نشانی ہے، حضرت ابوبکر کو حضرت ابو ذر غفاری سے پہلے کا مسلمان بتا دیا۔[۲۰] یعنی اب بھی یعقوبی ابن اسحاق ابن سعد، بلاذری ، ابن ہشام جیسے مورخین اور ان مورخین کے تمام سلسلہ رواۃ کی ان روایتوں کو ذکر کرنے یا ان کا حوالہ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا جن کے مطابق حضرت ابوبکر پہلے مسلمان تھے۔[۲۱]

اسی طرح یعقوبی نے اموی صحابہ کرام کے ساتھ بھی ظلم روا رکھا ہے اور کہیں ان کے بارے میں حقائق چھپا لیتا ہے اور کہیں مسخ کر دیتا ہے ۔ دو مثالیں حاضر ہیں ۔ یعقوبی کو اس کا تو اعتراف ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار دخترانِ ملک صفات تھیں مگر ان میں سے وہ صرف دو کی شادی کا ذکر کرتا ہے ۔ حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے اور اس رشتہ کو حکم ناطق الٰہی اور فیصلۂ خداوندی قرار دیتا ہے ۔[۲۲] حضرت زینب کی شادی کے سلسلے میں وہ افترا پردازی کا مرتکب ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہجرت نبوی کے وقت طائف میں اپنے شوہر ابوالعاص بن بشر بن عبد دُہمان ثقفی کے پاس تھیں۔[۲۳] ظاہر ہے کہ اسے اس سفید جھوٹ پر اموی دشمن رجحانات نے آمادہ کیا تھا اور اس کا قلب و دماغ و دین اس حق کے اعتراف سے باز رکھتا تھا کہ حضرت زینب خاندانِ عبدِ شمس کے ایک فرد ابوالعاص بن ربیع کے نکاح میں تھیں، کسی ثقفی کے عقد میں نہیں۔[۲۴] اسی طرح وُہ بدر کے بعد حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ لانے کی سعادت حضرت عباس بن عبد المطلب ہاشمی کے نصیب میں لکھ دیتا ہے[۲۵] محض اس لیے کہ وہ اس کا شرف حضرت ابوالعاص اموی کو دینا نہیں چاہتا۔[۲۶] اسی طرح حضرات رقیہ اور ام کلثوم کی یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفان اموی[۲۷] سے شادی کی طرف وہ بالکل اشارہ نہیں کرتا کہ اس سے ایک اموی فرد اور نتیجتاً پورے اموی

خانوادے کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ صہارت و ازدواج کا شرف نصیب ہوجاتا ہے جو اس کے اپنے مزعومات کے علاوہ اس کا ہم خیال و ہم نوا و ہم نظریہ مبلغوں اور مومنوں کی تبلیغ و عقیدے کی کاٹ کرتا ہے۔ لیکن جو کہا گیا ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے یا جھوٹے کو یاد نہیں رہتا وہی یعقوبی کے ساتھ ہوا کم از کم حضرت زینب کے معاملے میں۔ سنہ ۶ھ میں حضرت زید بن حارثہ کے سریہ عیص (جس کو وہ سریہ قردہ کہتا ہے) کے بیان میں یعقوبی حضرت زینب کے شوہر کا صحیح نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے نکاح کی بنا پر حضرت زینب کو حضرت ابو العاص بن ربیع کے پاس لوٹا دیا تھا۔[۲۸] لیکن اسی سلسلہ میں وہ مزید گل افشانی یہ کرتا ہے کہ حضرت زید نے اس سریہ میں جن لوگوں کو قید کیا تھا ان میں معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص بھی تھے جو خلیفہ عبد الملک بن مروان کے جدّ تھے۔ اس بیان میں آخری فقرہ محض اُموی دشمن رجحان کے تقاضے کی تسکین کی خاطر بڑھایا گیا ہے پھر یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ خلیفہ اُموی کے جد حضرت حکم بن ابی العاص تھے[۲۹] اور مذکورہ بالا قیدی اگر واقعی وُہ قید بھی ہوا تھا تو خلیفہ مذکور کا چچا تھا، نیز دوسرے تمام مورخوں نے اس سریہ کے قیدیوں میں اس کا نام نہیں گنایا ہے مصعب زبیری اور بلاذری کے بیان کے مطابق معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص غزوۂ اُحد کے بعد جنگی جرم کی پاداش میں بحکم رسالت قتل کیا گیا تھا[۳۰]۔ بلاذری کا بیان ہے کہ وہ عبد الملک بن مروان کی ماں عائشہ بنت معاویہ کا باپ تھا۔ یعقوبی نے اگر سچ بولا ہوتا تو وہ اپنے مخالف کے خلاف زیادہ مضبوط و محکم مقدمہ قائم کر سکتا تھا۔

یعقوبی کے اندازِ نگارش تاریخ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ تاریخی واقعات کو مذہبی رنگ دیتا ہے اور خالص انسانی کارناموں اور کاموں کی تائید و شہادت ماورائی یا دینیاتی عناصر سے فراہم کرتا ہے اور اس معاملہ میں کبھی کبھی غلو و مبالغہ کے علاوہ من گھڑت اور اساطیری انداز کی روایات سے بھی کام لینے میں دریغ نہیں کرتا۔ بنیادی طور پر یہ روایات قاص (داستان گو) ادب کا حصہ ہیں جو خوش عقیدہ قصہ گوؤں نے اپنے ممدوحین کی جلالتِ شان اور عظمتِ مقام دکھانے اور ثابت کرنے کیلئے گھڑ کر تاریخ و سیرت کا حصہ بنا دیا ہے۔ عام طور سے اس دیومالائی روایات کی ابتدا و روشناسی کی ذمہ داری وہب بن منبّہ کے کندھوں پر ڈالی جاتی ہے۔[۳۱] لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس فنِ پُرفن کی ایجاد و اشاعت میں تمام قاص اور غیر ذمہ دار مورخ اپنے بس بھر حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس غیر تاریخی ——— اور بلاشبہ غیر اسلامی ——— عنصر سے ابن اسحاق اور بلاذری جیسے اوّلین سیرت نگار بھی پاک نہیں ہیں۔[۳۲] یعقوبی نے اس میدان میں اختصاص و امتیاز کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کے ذیل میں یعقوبی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اس مبارک ساعت کے اثر سے شیاطین کو رجم کیا گیا، ستارے زمین پر گر پڑے، زلزلہ آگیا، جملہ جادوگر اور کاہن اندھے ہوگئے، ایوان کسریٰ کے تیرہ کنگورے (شرافے) گر پڑے اور صد ہزار سال سے روشن آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ کسریٰ انوشیرواں نے ان پیاپے عجائب سے خوفزدہ ہو کر نعمان بن منذر ——— حیرہ کے ماتحت و باجگذار حکمراں ——— کو حکم بھیجا کہ وہ کسی عرب کاہن سے دریافت کرے کہ عرب میں کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوا محکوم باجگذار نے حکم کی تعمیل کی اور ایک عرب کاہن نے ولادتِ نبوی کو ان عجیب و غریب واقعات کا ذمہ دار قرار دیا۔ اسی طرح اہل کتاب کے ایک عالم نے آپ کی ولادت کو اہل کتاب کے لیے بربادی (ویل) اور

اہلِ عرب کے لیے سعادت کا پیش خیمہ بتایا۔ والدہ ماجدۂ رسول نے حمل و ولادت کی وُہ انسانی تکلیف نہ محسوس کی جو بشریت کا تقاضا ہے اور انھوں نے اپنے بطنِ مبارک سے بلند ہونے والے نورِ محمدی میں قصورِ شام کی جھلک دیکھی اور سمجھ لیا کہ نومولود دنیا و عقبیٰ کا سید ہوگا۔"(۴۳)

ایامِ رضاعت کے دوران حلیمہ سعدیہ کے گھر میں خیر و برکت کے نزول کی تفصیلات جو کافی عام ہو چکی ہیں بیان کرنے کے بعد یعقوبی نے شقِ بطن اور جسمِ اطہر سے تمام بشری اور مادی آلائش دُور کرنے کا قصّہ بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی بنو سعد کے علاقے سے واپسی پر آپ کی عمر کے ضمن میں کہا ہے کہ آپ چار یا پانچ سال کی عمر میں دس سال کے معلوم ہوتے تھے۔ یہ بہتر صحت کا فیض نہیں، آسمانی معجزہ تھا۔(۴۴) اسی طرح یعقوبی نے ایک روایت یہ بھی بیان کی ہے کہ عبدالمطلب جب سیف بن ذی یزن کے پاس مکہ کا ایک وفد تہنیت لے کر گئے تو یمنی حکمران نے ان سے خلوت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقبل کی عظمت کی پیشگوئی کی اور یہود سے بچائے رکھنے کو کہا کہ وہ بدبخت لوگ ولادت نبوی کے بعد سے مسلسل آپ کے بارے میں سازشی گفتگو کرتے رہتے تھے۔(۴۵) آپ کے بچپن کے ایک اور معجزہ کا یوں ذکر کیا ہے کہ ——— مکہ پر کئی برس سے قحط کے بادل منڈلا رہے تھے۔ بالآخر ایک ندائے ہاتف نے آپ کے حوالے سے ایک شیخ اکبر کا حلیہ بیان کرکے بشارت دی کہ دعا کرنے سے بارش ہو گی۔ چنانچہ عبدالمطلب نے آپ کو ساتھ لے کر میدان میں خالقِ سماوات و امطار سے دعا کی جو فوراً مستجاب ہوئی۔(۴۶) یعقوبی کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضور پُر نور نے بچپن ہی میں اپنی بعثت کے متعلق خواب دیکھا تھا نیز عبدالمطلب نے بوقتِ مرگ اپنے فرزند ابوطالب کو اپنے عظیم پوتے کو نبی مبعوث بتا کر اخفائے حال کا حکم دیا تھا۔ اسی طرح مورخ کا مزید اصرار ہے کہ بیس برس کی عمر میں آپ میں علاماتِ نبوت ہویدا تھیں اور اہلِ کتاب آپ کے بارے میں مسلسل گفتگو کرتے، آپ کی نشانیاں بیان کرتے اور آپ کے ظہور کے قُرب کی بشارت دیتے رہتے تھے۔(۴۷)

بعثت کے باب میں بھی یعقوبی نے اسی طرح کی کئی روایات بیان کی ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتی ہیں۔ رسالت لانے سے پہلے حضرت جبریل نے پہلے کبھی سامنے آکر، کبھی چھپ کر درخت یا پہاڑ کی اوٹ سے اور کبھی آسمان کے فراز سے پکارا کہ دل مہبطِ انوارِ الٰہی بننے کے قابل ہو جائے۔ اس مقدمۂ رسالت میں فرشتۂ آسمانی نے رجس من الاوثان (بت پرستی کی آلائش) سے بچنے کی ہدایت کی۔ پھر سنیچر اور اتوار کی رات کو آپ کے سامنے آئے اور پھر بالآخر دوشنبہ، جمعرات یا جمعہ کو پیغامِ رسالت لائے تو ساتھ اپنے جنت کی قالینوں میں سے ایک قالین (درنوکاً) بھی لائے اور اس پر آپ کو بٹھا کر پہلے رسول ہونے کی بشارت دی۔ پھر "اقرأ" پڑھائی۔ ایک روایت کے مطابق جبریل آپ کے ساتھ دس سال یا تادمِ واپسیں رہے اور اسرافیل تین برس تک وکیل رہے۔ ورقہ بن نوفل نے پیشگوئی کی تھی کہ اگر آپ کے ساتھ جبریل رہے تو قتل و غلامی کے احکام لائیں گے اور اگر میکائیل رہے تو نرمی و شفقت کا سلوک تجویز کریں گے۔ گویا قضا و قدرِ الٰہی قوتِ نافذہ نہ تھی فرشتہ کی فطرت و کارِ منصبی کا عمل دخل ہونے والا تھا۔ بعثت کے وقت شیاطین پر شہابِ ثاقب کی مار پڑی اور ابلیس نے یہ نظارہ دیکھ کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی عالمِ کون و مکاں سے دنیائے فانی میں وارد ہوا پورے عالم کے تمام اصنام لڑھک گئے

اور تمام نار آتشکدہائے آذری بجھ گئی۔[۳۸]

معراج کے بیان میں یعقوبی نے جبریل کے حضورِ والا کی سواری کے لیے نہ صرف براق لانے کا ذکر کیا ہے بلکہ اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ وہ خچر سے چھوٹا، گدھے سے کچھ بڑا جسم میں تھا اور اپنے کانوں کو مسلسل پھڑ پھڑاتے رہتا تھا، اس کے ڈو پر تھے اور اس کی نگاہ کے فاصلہ تک اس کے قدم پڑتے تھے اور اس پر ایک یاقوت کی چادر پڑی تھی۔[۳۹]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بنو ہاشم کے سماجی قطع تعلق کے بیان میں یعقوبی نے یہ حاشیہ آرائی کی ہے کہ مقاطعہ کے صحیفہ کے کاتب منصور بن عکرمہ عبدری کے ہاتھ مفلوج ہوگئے اور تین سال کی مدت کے بعد جبریل نے رسول کریم کو اور آپ نے ابوطالب کو خبر دی کہ سوائے ان مقامات کے جہاں نام الٰہی درج ہے صحیفہ کے بقیہ تمام حصوں کو دیمک چاٹ گئی۔ چنانچہ کعبہ پہنچ کر جب صحیفہ منگوایا گیا تو اس پر اسّی کی اسّی مُہریں جو مقاطعین نے روزِ اوّل سے لگا دی تھیں بدستور لگی تھیں لیکن اندر صحیفہ ندارد۔[۴۰]

حضرت خدیجہ کی وفات کے موضوع پر گفت گو کرتے ہوئے یعقوبی نے ایک عجیب وغریب داستان طرازی کی ہے۔ حضرت خدیجہ عالمِ نزع میں دُوسری دنیا کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں کہ رسول کریم تشریف لاتے ہیں اور تسلّی وتشفی کے کلمات کے بعد حضرت خدیجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جنت میں اپنی سوکنوں (ضراتك) سے آپ کا سلام پہونچا دیں۔ استفسار پر آپ وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ نے جنت میں میری شادی تم سے کی تھی اسی دن میری اور تین شادیاں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم اور حضرت موسیٰ کی بہن کلثوم سے بھی کردی تھی[۴۱] ظاہر ہے کہ یہ بیان قصہ گویوں کے زرخیز دماغ کا زائیدہ ہے۔ وفاتِ خدیجہ کے بعد حضرت فاطمہ گریہ وزاری کرتی ہیں تو حضرت جبریل نازل ہوتے ہیں اور حضور پُرنور کے ذریعہ حضرت فاطمہ کو تسلّی دیتے ہیں کہ خداوند رحیم وکریم نے ان کی ماں کے لیے ایک شاندار محل بنا دیا ہے۔[۴۲]

یعقوبی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس قسم کے متعدد ماورائی عناصر کو تاریخی واقعات میں داخل کر دیا ہے۔ اور ان چیزوں سے اس کا مقصد یہ تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک شخصیت کے اردگرد ایک مافوق البشری ہالۂ عظمت کھینچا جائے تو دوسری طرف اہل بیت اور خاندانِ حضرت علی اور بنو ہاشم کے لیے بالخصوص اور اپنے دوسرے ممدوحین کے لیے بالعموم آسمانی عظمت کا خرق اساطیری فراہم کیا جائے۔ حالانکہ حقیقت میں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وتقدس کے لیے ان داستانی کہانیوں کی ضرورت تھی نہ آپ کے اہل بیت وصحابہ کرام کی جلالتِ شان کے لیے ان کی حاجت۔ ان کی عظمت مآبی کا سب سے بڑا شاہد خود خدائے مطلق وقادر وعلیم تھا اور پھر ان کے عظیم وبے مثال کارنامے۔ لیکن یعقوبی کو ان بشری کارناموں اور شہادت ربانی کے علاوہ کچھ اساطیری روایات ضروری معلوم ہوتی تھیں لہٰذا اس نے ہر موقع ومحل پر اپنی محبوب شخصیات کے لیے ایسی چیزوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بنو ہاشم کی فضیلت اور بنو ہاشم کے سیاسی حامیوں کی تقدس مآبی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ میرے اللہ نے مجھ سے چار شخصوں کے بارے میں

وعدہ فرمایا ہے : میرے والد، والدہ، چچا اور ایک بھائی کے لیے جن کی موت جہالت میں ہوئی۔ (۴۳) اس موضوع حدیث میں صاف اشارہ ابوطالب اور ان کے بڑے صاحبزادے طالب اور والدینِ رسول کریم کی مغفرت کی طرف ہے۔ علماً کے نزدیک یہ معاملہ بحث طلب ہے لیکن کم از کم یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ابوطالب اور ان کے فرزند اکبر اسلام نہیں لائے تھے۔ (۴۴)

ہجرتِ رسول کریم کے بارے میں یعقوبی کا بیان بڑا دلچسپ مگر غیر تاریخی ہے۔ چند سطروں میں رسول کریم کے حضرت ابوبکر کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لیے روانگی کا ذکر کرنے کے بعد سارا زورِ کلام شب ہجرت کے ایک "ماورائی واقعہ" پر صرف کیا گیا ہے۔ مورخ کا دعویٰ ہے کہ اس اہم رات اللہ تعالیٰ نے حضرات جبریل و میکائیل سے فرمایا کہ میں نے دونوں میں ایک کے لیے موت مقرر کر دی ہے تو کون موت اختیار کرتا ہے اور کون حیات، اور کون اپنے ساتھی کے لیے غم خواری کرتا ہے۔ مگر دونوں فرشتوں نے حیات کو موت پر ترجیح دی۔ اللہ نے سرزنش کے لہجہ میں دونوں کو وحی کی کہ کیا تم دونوں علی بن ابی طالب کی طرح نہیں بن سکتے تھے۔ میں نے محمدؐ اور علیؓ کے درمیان مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کیا اور ایک کی عمر دوسرے سے بڑھا دی۔ علیؓ نے موت کو اختیار کیا اور محمدؐ کو بقا مل گئی۔ اور علی ان کے بستر میں سو گئے۔ لہٰذا تم دونوں اتر کر جاؤ اور ان کے دشمن سے ان کی حفاظت کرو۔ چنانچہ تعمیلِ حکمِ الٰہی میں دونوں فرشتے نازل ہوئے۔ جبریل حضرت علی کے سرہانے اور میکائیل ان کے پائنتی بیٹھ کر رات بھر دشمن کے پھینکے پتھروں کو بچاتے اور سونے والے کی حفاظت کرتے رہے۔ جبریل حضرت علی بن ابی طالب کو مخاطب کر کے آفریں بھیجتے رہے کہ "اللہ اکبر، تمھاری کیا جلالت شان ہے کہ خدا تم پر سات آسمانوں کے فرشتوں کے سامنے تم پر فخر کرتا ہے۔" اسی ضمن میں یعقوبی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس غار میں رسول کریم نے پناہ لی تھی اس پر کبوتری نے انڈے دیے اور دشمن جو تعاقب میں تھے اندھے ہو گئے۔ (۴۵) لیکن یعقوبی نے غار کے اندر جھانک کر اس صاحبِ رسول کی عظمت کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا ہے جس کا ذکر شاندار الفاظ میں خود ذات برتر و اعلیٰ نے کیا ہے۔ (۴۶)

اس قدر تفصیل سے روایت بیان کرنے کے بعد یعقوبی نے ایک اور ماورائی قصہ یوں بیان کیا ہے کہ قریش کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلِ ہجرت کی خبر اس وقت تک نہ ہوئی جب تک ندائے ہاتف نے سعدان (دو سعد) کا حوالہ اپنی خبر میں نہ دیا۔ قریش اور رجز بز ہوئے کہ سعد تو کئی تھے اور ان سے مراد سعد ہذیم، سعد تمیم اور سعد بکر ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اس الجھن کو مٹانے غیب نے دوسری رات سعد اوس اور سعد خزرج کے واضح نام لے کر دور کر دیا اور صراحت کر دی کہ منزلِ مقصود ہجرت مدینہ تھا۔ (۴۷)

ظاہر ہے کہ یعقوبی کا مقصد انصار مدینہ بالخصوص حضرات سعد بن معاذ اوسی اور سعد بن عبادہ خزرجی کے تقدس کو ظاہر کرنا ہے ورنہ مکے کا بچہ بچہ اس وقت جانتا تھا کہ مسلمانوں کی واحد پناہ گاہ یثرب کا شہر تھا جس کو مدینۂ رسول ہونے کا شرف حاصل ہونا مقدر ہو چکا تھا۔

اسی طرح حضرت علی اور حضرت فاطمہ کی شادی خانہ آبادی کے بیان میں یعقوبی نے آسمانی تائید فراہم کی ہے۔ اس کے مطابق کارِ خیر کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "یہ نکاح اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، خود میں نے نہیں۔" (۴۸) یعقوبی کو محض رسول کریم کے عمل کے تقدس و جلالت کا یقین نہیں تھا اس لیے اس نے اس کارِ خیر کو کارنامۂ خداوندی قرار دینا ضروری سمجھا۔

جہاد و قتال کی اجازتِ الٰہی ملنے کے بعد، یعقوبی کا بیان ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل کو ایک تلوار دے کر اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ آپ اس تلوار سے اس وقت تک قتال کریں جب تک کہ قریش اور دوسرے کفار جہاں توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی کا اقرار نہ کر لیں[۴۹]۔ بظاہر اس روایت سے یعقوبی کی تشفی نہ ہوئی تو اس نے دوسری جگہ وضاحت کر دی کہ وُہ تلوار ذوالفقار تھی[۵۰]۔ اس پوری کدو کاوش کے پیچھے یعقوبی کی یہ آرزو کارفرما تھی کہ ذوالفقار کو تائیدِ الٰہی حاصل ہونا تسلیم کر لیا جائے۔ اور یہ مشہور ہے کہ ذوالفقار حضرت علی کے نام و نسبت سے زیادہ مشہور ہے جو دوسرے مستند مورخین کے بیان کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے مالِ غنیمت میں بطور صفی پائی تھی اور بعد میں حضرت علی کو عنایت کر دی تھی[۵۱]۔

ہمارے عوام میں غزوۂ خیبر میں حضرت علی کے عظیم الشان کارنامے کی بنا پر ان کو فاتح خیبر ہونے کی شہرت بھی حاصل ہے، اور ساتھ ہی ان سے کچھ عجیب و غریب واقعات بھی منسوب ہیں۔ یعقوبی نے آنجناب کو فاتح خیبر تو نہ کہا ہے لیکن اس ارشادِ نبوی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب قلعۂ مرحب — قموص — کئی بار کی کوششوں کے بعد فتح نہ ہوا تو آپ نے فرمایا کہ کل میں اس شخص کو جھنڈا دوں گا جس کو اللہ اور اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔ دوسرے دن آپ نے حضرت علی کو پرچم عطا فرمایا۔ حضرت علی نے یہودیوں کے طاقتور ترین شخص مرحب کو قتل کر دیا اور خیبر کے طاقتور ترین و مستحکم ترین قلعہ کے سنگین دروازے کو جس کا طول و عرض و عمق کئی کئی ہاتھ تھا اکھاڑ کر اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اسی عظیم فتح کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب حبشہ سے واپس ہوئے اور سیدھے خیبر پہونچے۔ اور یعقوبی کی روایت ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے فتح خیبر سے زیادہ خوشی ہوئی ہے یا قدوم جعفر سے[۵۲]۔ علمائے تاریخ و دین نے دونوں واقعات و احادیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ واقدی وغیرہ قدیم مورخوں کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مرحب کے قاتل حضرت محمد بن مسلمہ انصاری تھے اور وہی قلعہ قموص کے فاتح[۵۳]۔

ماورائی عناصر کے ذریعے بنو ہاشم کی عظمت و تقدیس کی آخری مثال غزوہ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت کے عظیم واقعہ سے متعلق ہے۔ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کشفِ عالمِ امکاں میں حضرت جعفر کے سریر (تخت) کو سب سے مقدم دیکھا تو آپ نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ میں نے تو زید کو مقدم رکھا تھا۔ جبریل نے عرض کیا کہ "جعفر کو اللہ نے آپ کی قرابت کی بنا پر مقدم کر دیا[۵۴]۔" یہ اور متعدد مذکورہ بالا مثالیں یہ حقیقت بصراحت واضح کرتی ہیں کہ یعقوبی کا مذہب طرفداریِ بنو ہاشم تھا اور وہ ان کی عظمت و تقدیس ثابت کرنے میں مافوق البشری یا ماورائی عناصر و دنیا سے تائید و توثیق فراہم کرتا ہے اور تاریخی واقعات میں مذہبی رنگ سازی کے عمل و دخل کو نہ صرف جائز سمجھتا ہے بلکہ اپنے مقصد کے حصول یا اپنے نظریے کی تائید کے لیے دُور از کار روایات، فنِ قصص کے داستان نما بیانات اور من گھڑت احادیث بھی نقل کرتا ہے۔ تاریخ نگاری میں اس قسم کا اسلوب و انداز جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اور طرفہ ستم یہ کہ مذہبِ خداوندی و دینِ رسول بھی اس قسم کی چیزوں کی تائید نہیں کرتا۔

یعقوبی کے یہاں اسرائیلیات کو بھی خاصا عمل دخل حاصل ہے۔ وہ یہود و نصاریٰ کے حوالے سے ان اسرائیلی روایتوں کو تاریخی حقائق کے روپ میں بیان کرتا ہے جس سے اس کا متعلقہ بیان مجروح ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کا

تاریخی استناد کمزور و پست ۔ اگرچہ سیرت نبوی کے حصہ میں یعقوبی نے اسرائیلیات کو کم جگہ دی ہے تاہم دو چار مثالیں مل جاتی ہیں۔ اوپر حوالہ آچکا ہے کہ اہل کتاب نے آپ کی ولادت باسعادت کے وقت ہی آپ کے نبی ہونے کی شہادت دے دی تھی اور مسلسل آپ کے بارے میں سازشی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل کا بیان حضرات جبریل و میکائیل کی وکالت وصحبت کی فطرت کے بارے میں گزر چکا ہے لیکن ایک عجیب وغریب اسرائیلی روایت غزوۂ خندق کے ذیل میں بیان ہوئی ہے۔ جس کے مطابق اسی غزوہ کے دوران یا متصلاً بعد یہود کی ایک جماعت، جس میں حی بن اخطب اور سلام بن ابی الحقیق بھی شامل تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض گذار ہوئی کہ آپ پر " الٓمٓ " نازل ہوئی۔ آپ نے اقرار کیا تو حی بن اخطب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر نبی کی حکومت و بادشاہت (ملك) کا اندازہ (قدر) مقرر و مقدر فرمادیتا ہے۔ اس لیے " الف " کا عدد ایک، " لام " کا تیس اور " میم " کے چالیس، کل عدد ہوا ۷۱۔ تو گویا ۷۱ سال آپ کی سلطنت ہوگی۔ انھوں نے پھر پوچھا: کیا اس کے علاوہ کوئی اور عدد ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، المص ہے۔ یہودیوں نے اس کے حروف کی عددی قوت جوڑ کر ۱۳۱ سال بتائے پھر استفسار پر " الر " اور " المر " بتائے جن کی عددی طاقت بالترتیب ۲۳۱ اور ۲۷۱ سال ہوئی۔ یہودیوں نے تب اعتراف کیا کہ آپ کا معاملہ وہ نہیں سمجھ سکے۔ غالباً آپ کو " الم "، " المص "، " الر " اور " المر " سبھی عنایت ہوئے ہیں جس کا مطلب ہوگا کہ کل ۷۰۴ سال آپ کی حکومت ہوگی۔ یعقوبی کی روایت ظاہر ہے کہ اسرائیلیات کے بھان متی کے پٹارے کا کنبہ ہے ورنہ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ صرف یہی حروف مقطعات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا نہیں ہوئے بلکہ متعدد دوسرے بھی ہیں اور جن کا مجموعہ غالباً ہزارہا ہزار سال بنے گا۔(۵۵)

تاریخ یعقوبی میں بعض حقائق دوسری متداول و مشہور سیرتوں کے مقابلے میں مختلف ہیں۔ چونکہ وہ متعدد دوسرے ماخذ کے متفقہ بیانات کی نفی کرتے ہیں اس لیے ان کی صحت پر خاصا قوی شبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً حضورِ اکرم کے والد ماجد کی وفات کا وقت، جنگِ فجار میں ابتداءً ابوطالب کا شرکت سے انکار اور اس بنا پر دوسروں کا انکار، حضور کی حضرت خدیجہ کی شادی کا پس منظر، ابتدائی مسلمانوں کی ترتیبِ قبولِ اسلام، ابوطالب کا ایذاءِ رسولِ کریم پر انتقام کا ارادہ اور زعماءِ قریش سے سلوک، وغیرہ۔ تفصیل تاریخ کے تجزیے میں آرہی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً تاریخ یعقوبی میں سیرت نبوی پر دستیاب مواد کی تحلیل و تجزیہ کیا جائے تاکہ سیرت کے اس قدیم ماخذ سے تعارف بھی ہوجائے اور اس کی خامیوں اور خوبیوں کی پرکھ بھی کی جاسکے۔

تاریخ یعقوبی میں سیرتِ نبوی کا مواد

یعقوبی نے اپنی تاریخ عالمی رنگ میں لکھی ہے۔ چنانچہ حضرت آدم سے آغاز کیا ہے اور دوسرے انبیائے کرام کے تذکرہ مسعود سے گزرتے ہوئے اس نے ایران و عرب کی ماقبل اسلام تاریخ بیان کی ہے۔ یہ جلد اول پر مشتمل ہے۔(۵۶) جلد دوم کو ایک لحاظ سے اسلامی تاریخ کا ماخذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا آغاز مورخ کے ایک مختصر مقدمہ کے بعد رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے ہوتا ہے اور خلیفہ معتمد علی اللہ کے عہدِ خلافت کے آخر ـــــ ۲۵۹ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اہم ایڈیشن مستشرق ہوتسما (HOUTSMA) نے ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے شائع کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں بیروت سے دار صادر نے اپنا دیدہ زیب ایڈیشن نکالا جو دو جلدوں میں ہے۔ اس ایڈیشن میں مقدمہ، مرتب کا نام، اشارہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ البتہ کہیں کہیں مختصر تعلیقات ہیں۔ آخری اہم ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں نجف سے سید محمد صادق بحر العلوم کے ایک مختصر مقدمے، جو محض تین صفحات پر مشتمل ہے اور مختصر تعلیقات کے ساتھ تین جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں متنِ کتاب کے حوالے بیروت ایڈیشن کے ہیں۔[۵۷] ان کے علاوہ دو ایک اور ایڈیشن بھی نکلے۔

مورخ لیعقوبی نے عرب تاریخی روایات کے مطابق اپنی معلوماتِ سیرتِ نبوی کے تمام اہم راویوں اور اخباریوں کا مختصراً ذکر مقدمہ میں کر دیا ہے۔ دوسرے عرب مورخین کے طریقے کے برعکس جو اپنی ہر ہر خبر اور روایت کی علٰحدہ علٰحدہ سند بیان کرتے ہیں یعقوبی نے اپنے مختصر مقدمے میں اپنے تمام راویوں اور شیوخ کے نام گنا دئے ہیں۔ متنِ کتاب میں سند شاذ و نادر اور مختصراً ذکر ہوئی ہیں۔ یہ غالباً اس بنا پر تھا کہ یعقوبی ایک "کتاب مختصر" تالیف کرنا چاہتا تھا۔

یعقوبی نے مقدمے میں اپنے جن راویوں کے نام لئے ہیں ان کی تعداد تیرہ ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ اسحاق بن سلیمان بن علی ہاشمی (متوفی ۱۷۸ھ/ ۷۹۴ء) جو بنو ہاشم کے شیوخ میں سے ایک تھے۔[۵۸]

۲۔ ابو البختری وہب بن وہب قریشی (م ۲۰۰ھ/ ۸۱۵ء) جو جعفر بن محمد (م ۱۴۸ھ/ ۷۶۵ء) وغیرہ اپنے رجالِ سند سے بیان کرتے ہیں۔[۵۹]

۳۔ ابان بن عثمان، یہ بھی جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں۔[۶۰] (۲۰ھ/ ۶۴۱ء تا ۱۰۰ھ/ ۷۱۸ء)

۴۔ محمد بن عمر واقدی جو اپنی روایات موسٰی بن عقبہ وغیرہ جیسے راویوں سے لیتے ہیں۔[۶۱]

۵۔ عبد الملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ/ ۸۲۸ء) جو زیاد بن عبد اللہ بکائی سے اور وہ محمد بن اسحاق مطلبی سے روایت کرتے ہیں۔[۶۲]

۶۔ ابو حسان زیادی جو ابو المنذر کلبی وغیرہ رجال سے نقل کرتے ہیں۔[۶۳]

۷، ۸۔ عیسٰی بن یزید بن دأب (۱۷۱ھ/ ۷۸۷ء) اور ہیثم بن عدی طائی (متوفی ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء)، یہ دونوں عبد اللہ بن عباس ہمدانی سے نقل حدیث کرتے ہیں۔[۶۴]

۹۔ محمد بن کثیر قریشی، ابو صالح وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔[۶۵]

۱۰۔ علی بن محمد بن عبد اللہ بن ابی سیف مدائنی۔[۶۶] (۱۳۵ھ/ ۷۵۲ء تا ۲۲۵ھ/ ۸۴۰ء)

۱۱۔ ابو معشر مدنی (م ۱۷۰ھ/ ۷۸۶ء)۔[۶۶ الف]

۱۲۔ محمد بن موسٰی خوارزمی منجم۔[۶۶ ب] (متوفی بعد ۲۳۲ھ/ ۸۴۷ء) (۶۶ ب)

۱۳۔ ماشاء اللہ، جو سنین اور اوقات کے صحیح حساب ازروئے نجوم وہیئت دیتے ہیں۔[۶۶ ج]

یعقوبی کے تمام شیوخ اور رواۃ قابلِ اعتبار رہیں اور اپنے اپنے فن کے مردِ میدان۔ ان میں ابان بن عثمان کی موجودگی قابلِ حیرت بھی ہے اور باعثِ رشک بھی۔ اس سے یعقوبی کے معتدل و متوازن رویّہ کی نشان دہی ہوتی ہے اور ساتھ ہی اس کی روایتوں میں غیر جانبداری کا عنصر نسبتاً بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یعقوبی کو فنِ استناد میں جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ دو ہیئت دانوں اور منجموں ــــ خوارزمی اور ماشاء اللہ ـــــ کی شمولیت ہے۔ تاریخ یعقوبی کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اہم ترین واقعاتِ تاریخِ اسلام کا حساب ہیئت و نجوم کے اعتبار سے بھی بالالتزام دیتا ہے اور یہ طریقہ اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے مواد میں بھی اپنایا ہے جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔ مورخ کے اس التزام سے یہ بات کسی حد تک سہی مگر ثابت ہوتی ہے کہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں ہیئت و نجوم کا مطالعہ اور علم کافی ترقی کر چکا تھا، اتنا کہ اس نے غیر فنی علوم میں بھی عمل دخل حاصل کر لیا تھا۔ یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا۔ یعقوبی کے سلسلۂ رواۃ کے بارے میں دو اور نکات اہم ہیں۔ اول یہ کہ ان میں سے بیشتر سے یعقوبی کی ملاقات نہیں تھی یا یعقوبی نے ان کو اپنے بچپن میں دیکھا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یعقوبی نے اپنے سلسلۂ اسناد میں تسلسل و تواتر کے اصول کو نظر انداز کر دیا ہے اور اپنے معاصر و ملاقاتی شیوخ و راویوں کا نام نہیں لیا ہے بلکہ ان سے ایک یا کئی درجے بعد کے راویوں سے جو مشہور رو امامِ فن سمجھے جاتے ہیں روایت لی ہے۔ دوم یہ کہ یعقوبی نے متن کتاب میں اپنی روایتوں کے سلسلۂ سند کو بالکل نہیں بیان کیا ہے البتہ کہیں کہیں وہ کسی مشہور راوی جیسے واقدی یا جعفر بن محمد کا نام لے لیتا ہے۔ اس لیے اس کی بیشتر روایتوں کے اصل راوی یا سلسلۂ اسناد کو جاننا ناممکن ہے۔ یہ دونوں چیزیں اصل میں استناد کے درجہ کو گراتی اور پایۂ اعتبار کو کم کرتی ہیں۔

سیرت نبوی کا بیان "مولد رسول اللہ" کی سرخی اور ولادت نبوی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ علوم ہیئت و نجوم کے اعتبار سے پہلے یعقوبی آپ کی ولادت کے وقت ستاروں کا حال اور سیاروں کی منازل بتاتا ہے۔ پھر ولادتِ نبوی کے معجزات یا عالم مکان پر اس کے اثرات کا ذکر کرتا ہے جن کا کافی بڑا حصہ اوپر مصنف کے رجحانات کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ رسول کریم کے والد ماجد عبداللہ کا اور ان کی بی بی آمنہ سے شادی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ کی ولادت 'زمزم' کے کھودنے کے دس سال اور شادی کے دس ماہ یا ایک سال آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں یعقوبی' جعفر بن محمد کی سند پر مشہور عام روایت کے برعکس بیان کرتا ہے کہ ولادت باسعادت کے دو ماہ بعد والد محترم کا انتقال ہوا تھا اور دوسری روایت کے مطابق پورے ایک سال بعد انتقال ہوا تھا۔ یعقوبی پھر بصراحت کہتا ہے کہ بعض کی روایت یہ ہے کہ آپ والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے لیکن یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ آپ کے والد کی وفات آپ کی ولادت کے بعد ہوئی تھی۔[۲۶]

اس کے بعد یعقوبی مختصراً ثویبہ (باندی ابولہب) کے دودھ پلانے، حلیمہ سعدیہ کے گھر ایّامِ رضاعت گزارنے چار یا پانچ سال کی عمر مبارک میں واپس مکہ آنے، عمر شریف کے چھ سال اور تین ماہ بعد والدہ ماجدہ کے بعمر تیس سال ابواء میں وفات پانے اور دادا کی کفالت کا ذکر کرتا ہے۔ حسبِ دستورِ ہوا خواہانِ بنی ہاشم یعقوبی خواجہ عبدالمطلب کے موحد ہونے، منکرات عبادت اصنام سے بچنے، صاحبِ فیل (مکہ پر حبشی حملہ کے قائد ابرہہ) سے نہ ملنے کا ذکر کرتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور عبدالمطلب کو ابراہیم ثانی بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعۂ فیل کے عذاب کی بشارت والدِ رسول لائے تھے۔ پھر

عبدالمطلب کے تمام اولادِ امجاد کو صاحبانِ شرف و عظمت بتاتا ہے۔[۶۸] یہ یعقوبی کے شرف و دیانت کی بات ہے کہ وہ عبدالمطلب کی وفات کے بعد کعبہ کی تولیت اور حکومت ان کے فرزند اکبر زبیر اور سقایہ اور رسول کریم کی کفالت ابو طالب کے پاس جانے کی وصیتِ جد کا ذکر کرتا ہے۔[۶۹] لیکن یہاں وہ عبدالمطلب کی عظمت شان کو ظاہر کرنے کی خاطر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کہ قیام "قیامت کے دن خداوند قدوس میرے دادا عبدالمطلب کو انبیاء کی ہیئت اور بادشاہوں کے لباس میں ایک امت کی شکل میں اٹھائے گا" بیان کرتا ہے۔[۷۰] بظاہر یہ حدیث مشتبہ ہے اور بنو ہاشم کی مبالغہ آمیز قصیدہ خوانی کی ایک اور کڑی۔ پھر وہ ابو طالب کی تنگی و عسرت کے باوجود بہترین کفالتِ رسول اور عمر شریف کے نویں سال میں بُصریٰ کے سفر اور واقعۂ راہب کو بیان کرتا ہے۔[۷۱] اس کے بعد آپ کی چچی حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم (زوجۂ ابی طالب) کی ممتا، آپ کے ساتھ محبت آمیز سلوک، ان کی وفات پر رسول کریم کی شدتِ گریہ کا ذکر کرتا ہے۔[۷۲]

"الفجار" کی سرخی کے تحت وہ قیس و کنانہ کی مشہور جنگ کا ذکر کرتا ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ یا بیس سال کی عمر میں شرکت کی تھی۔ یعقوبی کا رجحان اس روایت کو قبول کرنے کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ جنگ فجار ماہ محترم رجب میں ہو رہی تھی جبکہ از روئے قاعدۂ عرب جنگ نہیں ہونی چاہیے، اس لیے ابو طالب نے شرکت سے انکار کیا تھا اور ان کے انکار کی وجہ سے عبداللہ بن جُدعان تیمی اور حرب بن امیہ اموی نے بھی انکار کر دیا تھا مگر زبیر بن عبدالمطلب کو بجبر و اکراہ نکلنا اور شامل ہونا پڑا تھا۔ دوسری روایت کو اگرچہ یعقوبی نے بیان کیا ہے تاہم لفظ "قیل" سے شروع کر کے کہتا ہے کہ ابو طالب اور ان کے ساتھ رسول کریم جنگِ فجار میں شریک ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یعقوبی کا مقصد بڑا معصوم و نیک تھا اور وہ یہ کہ ابو طالب کو ماہِ حرام کی حرمت کی ہتک کے الزام سے بچالے۔ لیکن دوسرے تمام مورخین و سیرت نگارانِ رسول کا اس پر اتفاق ہے کہ ابو طالب اپنے خاندان بنی ہاشم و بنی امیہ کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر اس جنگ میں شریک ہوئے تھے اور ان کے انکار کی اور کوئی روایت کہیں نہیں ملتی ہے۔[۷۳] اس ذیل میں یعقوبی کی دیانت کا ذکر کرنا اور اس کو اس کا شرف دینا چاہیے کہ اس نے جنگ فجار کے بعد شام میں حرب بن امیہ بن عبد شمس جو دوسرے مورخین کے مطابق اس جنگ میں قریشی اتحاد کے سالار اعلیٰ ——— قائد ——— تھے، کی چند ماہ بعد وفات کا ایک مختصر سے جملہ میں ذکر کیا ہے۔[۷۴]

"حلف الفضول" کی تیسری سرخی کے تحت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس معاہدۂ حق و انصاف میں بعمر زائد از بیس سال شرکت اور معاہدہ کی تعریف میں آپ کے کلام اور معاہدہ کے مقصد کا ذکر کیا ہے۔[۷۵] پھر "بنیان الکعبہ" کی سُرخی کے تحت تعمیر کعبہ کا واقعہ اور اس میں رسول کریم کے دست اقدس کے ذریعہ حجرِ اسود کے نصب کیے جانے کا مشہور واقعہ مختصر طور سے بیان کیا۔ یعقوبی نے یہاں ایک اہم اضافہ یہ کیا ہے کہ کعبہ میں اس وقت چھت نہیں تھی۔[۷۶] پھر "تزویج خدیجہ بنت خویلد" کے عنوان کے تحت حضرت خدیجہ سے آپ کی شادی بعمر پچیس یا تیس سال کا بیان ہے۔ لیکن یعقوبی نے یہاں حضرت خدیجہ کی عمر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔[۷۷] البتہ ان کی وفات کے بیان میں ان کا سن ۶۵ سال بتایا ہے جو عام روایت کے مطابق ہے۔[۷۸] شادی کے بیان میں البتہ یعقوبی نے ایک روایت حضرت عمار بن یاسر کی سند پر بیان کی ہے کہ ایک بار خدیجہ اور عالم

(خدیجہ کی بہن) نے آپ کو صفا و مروہ کے درمیان دیکھا اور ہالہ نے خود حضرت عمار کے ذریعہ رسول کریم کو خدیجہ کا پیغام دیا۔ رسول نے قبول کیا اور دوسرے دن آپ اپنے چچاؤں کے ساتھ خدیجہ کے گھر گئے اور ابوطالب نے نکاح پڑھا۔[۹] اس روایت میں حضرت عمار والا ٹکڑا اضافہ الحاقی معلوم ہوتا ہے اور اس کا مقصد حضرت عمار کی عظمت شان ان کے سیاسی رجحان کے سبب ظاہر کرنا ہے۔ یعقوبی نے حضرت خدیجہ سے آپ کے قبل از شادی تجارتی تعلقات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے البتہ خویلد بن اسد (خدیجہ کے والد) کی اس شادی پر بحالتِ نشہ رضامندی اور بحالتِ ہوش ناراضگی کی عمومی روایت بیان کی ہے پھر ابن اسحاق کی اس روایت کا حوالہ بھی دیا ہے کہ خویلد نے خود اپنے ہاتھوں سے شادی کی تقریبات برضا و رغبت انجام دی تھیں۔ پھر ان کی موت کی تاریخ بیان کی ہے۔ یعقوبی نے یہ بھی کہا ہے کہ اس شادی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار اولادیں: ایک فرزند اور تین دختر —— قاسم، رقیہ، زینب اور ام کلثوم —— بعثت سے قبل اور بعثت کے بعد دو اولادیں: ایک فرزند اور ایک دختر —— عبداللہ جو طیب اور طاہر بھی کہلاتے تھے اور فاطمہ —— تولد ہوئی تھیں۔[۸]

"البعث" کی سرخی کے تحت واقعۂ بعثت اور اس کے متعلقات کا نسبتاً تفصیلی بیان ہے۔ مورخ نے پہلے آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملنے کو بیان کیا، پھر کہا ہے کہ ماہِ بعثت ایک روایت کے مطابق ربیع الاول اور دوسری کے مطابق رمضان تھا۔ عجم کے مہینوں میں سے شباط تھا۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ شباط ربیع کے مطابق تھا یا رمضان کے۔ البتہ وہ بوقت بعثت ستاروں و سیاروں کی منازل مفصل بیان کرتا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح جبریل علیہ السلام آئے اور پیغامِ خداوندی لائے۔ جبریل و میکائیل کے معاملہ کو ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ اولیں نماز جو فرض ہوئی وہ ظہر تھی، جبریل نے آپ کو وضو سکھایا، نماز پڑھائی اور آپ کو جمعہ کے دن پہلی نمازِ ظہر پڑھتے دیکھ کر امت میں پہلے خدیجہ نے پھر حضرت علی نے نماز پڑھی۔ اولین مسلمانوں کے بارے میں یعقوبی کے رجحان و نقطۂ نظر کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ گیارہ اولیں مسلمانوں کے درمیان ساتواں نام خالد بن سعید بن العاص اموی کا بھی ہے۔[۸۱] ایک اموی کے اس طرح اسلام لانے کا ذکر کرنے کا شرف مورخ کو ملنا چاہیے۔ پھر مکہ میں تین سال خفیہ تبلیغ، قریش کی زبانی نکتہ چینی، اظہار و اعلانِ اسلام اور نتیجہ میں قریش کا پہلے استہزا اور پھر تعذیب کا ذکر کرنے کے بعد ایذا دینے والوں میں ابولہب، حکم بن ابی العاص، عقبہ بن ابی معیط، عدی بن حمراء ثقفی، عمرو بن طلالہ خزاعی کے ناموں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد مذاق اڑانے والوں (مستھزؤن) کا ذکر ہے۔ یہ سب نام دوسرے مآخذ سے ملتے جلتے ہیں۔[۸۲] یہاں یعقوبی کے اعتدال اور دیانتِ تاریخی کی داد دینی چاہیے کہ اس نے دشمنانِ رسول میں جہاں خواہ مخواہ دوسرے اموی اشخاص کو نہیں شامل کیا ہے وہاں ایمانداری سے اعتراف کر لیا ہے کہ سب سے بڑا موذی خود آنحضرت کا چچا ابولہب ہاشمی تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس فہرست میں ابوجہل مخزومی کا نام بدنامی نہیں ہے۔ پھر رسول کریم کی ابوطالب کی حمایت و سرپرستی اور قریش سے عم کریم کی مدافعت کا واقعہ ہے۔ اس ذیل میں ابوطالب کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ دشمنوں نے ایک بار آپ پر اونٹ کی گندگی ڈال دی تو ابوطالب تلوار لے کر انتقام لینے نکلے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک انھوں نے دریدہ دہنوں کے منہ پر گندگی نہ ڈال دی۔[۸۳] تعجب ہے کہ یعقوبی نے حضرت حمزہ کا ذکر نہیں کیا جن سے یہ واقعہ منسوب ہے اور

ان کے شرف کو ابوطالب کے حق میں کیوں لکھ دیا۔ غالباً مورخ اشارتاً وکنایتاً یہ کہنا چاہتا ہے کہ مکہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حامی و ناصر صرف ابوطالب اور ان کا گھرانا تھا۔ چنانچہ واقعۂ معراج کے بیان میں، جس کو وہ "الاسرا" کی سُرخی کے تحت بیان کرتا ہے، کہتا ہے کہ آسمان کی سیر کے بعد آپ سیدھے ابوطالب کی صاحبزادی ام ہانی کے گھر اُترے اور ام ہانی کو سب سے پہلے واقعہ سنایا جس پر انھوں نے آپ کو واقعہ معراج بیان کرنے سے منع کیا۔ دوسری طرف ابوطالب نے جب آپ کو گھر نہ پایا تو ان کے اوسان گم ہو گئے کہ کہیں قریش نے اغوا نہ کر لیا ہو یا قتل نہ کر دیا ہو۔ چنانچہ صبح سویرے ابوطالب، بنو عبدالمطلب کے ستّر افراد کے ساتھ نکلے، ہر ایک کو ایک شفرۃ (چھری) دے کر قریش کے ہر شخص کے پاس بٹھا دیا اور ان کو ہدایت کر دی کہ اگر واپسی پر میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھو تو ان سب کا کام تمام کر دینا۔ بہر حال وہ آپ کو ام ہانی کے گھر سے ڈھونڈ لائے اور قریش کو جتا دیا کہ ناکامی کی صورت میں ان کا کیا ارادہ تھا۔ قریش نے مستقبل میں آپ کو نہ ستانے کا وعدہ کیا۔[۸۴] ظاہر ہے کہ یہ دونوں روایتیں غلط ہیں۔ ابوطالب میں مکّہ میں اتنی تاب نہ تھی کہ وہ قریش کے خلاف ایسا کوئی جرأت مندانہ اقدام کر سکیں۔ اس سے عجیب تر ام ہانی کا معاملہ ہے۔ دوسری تمام روایات سے متفقہ طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ام ہانی فتح مکہ تک اسلام نہیں لائی تھیں اور وہ اپنے شوہر کی دشمنیٔ رسول میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر ان کے شوہر پکے دشمنِ رسول فتح مکہ تک رہے۔[۸۵] غالباً کیا، صراحتاً یہ دونوں روایتیں ام ہانی کو الزامات سے بچانے اور ان کو اور ان کے والد مکرم کی توقیر مزید بڑھانے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

"الںذارۃ" کے تحت یعقوبی نے تعمیلِ حکمِ خداوندی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علانیہ تبلیغِ اسلام کے آغاز در کوہ مروہ پر اوّلین خطبۂ نبوی یا اوّلین دعوت الی الحق کا ذکر کیا لیکن عجیب وغریب انداز سے۔ اس کا بیان ہے کہ پہلے سب بنو فہر (قریش کے تمام چھوٹے بڑے خاندان) جمع ہوئے، پھر آپ ان میں سے بنو ہاشم کی اوّلین شاخ سے آخری شاخ یعنی بنو فہر سے بنو عبدالمطلب کا نام لیتے گئے اور دوسرے تمام غیر ہاشمی خاندان واپس ہوتے گئے تا آنکہ صرف بنو ہاشم رہ گئے۔ ان کو آپ نے دارِ حارث بن عبدالمطلب میں جمع کیا۔ کل چالیس آدمی تھے۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ نے پیغامِ حق پیش کیا تو ابولہب نے سخت مخالفت کی اور آپ کو برا بھلا کہا البتہ جعفر بن ابی طالب، عبیدہ بن حارث اور بنو ہاشم میں سے خلق عظیم نے اسلام قبول کر لیا۔[۸۶] یعقوبی کا یہ بیان دُوسرے سیرت نگارانِ رسول سے کافی مختلف ہے۔ موخر الذکر خاندان بنو ہاشم کے سامنے تبلیغ اسلام کو ایک الگ واقعہ بتاتے ہیں جو صرف آپ کے قریب ترین اعزّہ (عشیرتك الاقربین) کے لیے تھا اور کوہ صفا پر دعوتِ حق پورے مکہ والوں کے لیے تھا۔[۸۷] ایک اعتبار سے یہ تبلیغ اسلام کے دو مرحلے تھے۔ پھر دوسرے تذکرہ نگار پہلے واقعہ میں بنو ہاشم میں سے صرف حضرت علی کے قبول اسلام کا ذکر کرتے ہیں، بنی ہاشم میں اور کسی کے اسلام کا ذکر نہیں کرتے۔ جہاں تک حضرات جعفر بن ابی طالب اور عبیدہ بن حارث کے اسلام لانے کا تعلق ہے تو عام سیرت نگاروں نے اول الذکر کو مہاجرین حبشہ میں اور ثانی الذکر کو بدری صحابہ میں شمار کر کے ان کے ابتدا میں مسلمان ہونے کا ذکر ضرور کیا ہے تاہم ان کے قبولِ اسلام کے پس منظر کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔[۸۸] ابن سعد نے البتہ اپنی طبقات میں دونوں مذکورہ بالا ہاشمیوں کے اسلام لانے کا زمانہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں قیام و تبلیغِ اسلام سے پہلے کا بتایا ہے۔[۸۹] رہے خلق عظیم، تو یعقوبی نے محبت میں زیب داستان کا یہ ٹکڑا لگا دیا ہے۔ اسی مبحث میں دشمنانِ رسول کی سختی اور

تعذیب خاص کر کے زور دے سہارا مسلمانوں پر بیان کیا ہے اور چند "مستضعفین" کے نام بھی گنائے ہیں اور حضرت سمیہ والدۂ حضرت عمار بن یاسر کو اسلام میں پہلی شہید قرار دیا ہے۔[۹۰] جس کی تائید بلاذری کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔[۹۱] یعقوبی کے اس پورے بیان میں بعض بڑے اور اہم ابتدائی صحابہ کرامؓ جیسے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت عثمان اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف وغیرہ متعدد حضرات کے قبول اسلام کا کوئی حوالہ نہیں ملتا جبکہ حضرت عمرو بن عنبسہ سُلمی کے قبولِ اسلام کی کئی سطری روایت الگ سے درج ہے۔[۹۲] کیا یہ قریش کے دوسرے قبائل کے شرفِ قبولیت اسلام میں اولیت کو چھپانے کی جانبدارانہ اور غیر دیانتدارانہ کوشش تھی ؟

"مہاجرۃ الحبشۃ" کی دوسری سُرخی کے تحت ہجرت حبشہ کی تفصیلات کے بیان میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ مہاجرین کی تعداد بیاسی مرد اور ان کی ازواج و اولاد کا ذکر ایک دو جملوں میں ہے پھر سارا زورِ کلام حضرت جعفر بن ابی طالب کی تقریر، نجاشی کے دربار میں ان کی قدر و منزلت اور ان کی بزرگی و برتری پر صرف کر دیا گیا ہے یا پھر قریشی وفد کے دو ارکان عمرو بن عاص سہمی اور عمارہ بن ولید مخزومی جو مہاجرین حبشہ کو وہاں سے واپس لانے کے لیے گیا تھا کے آپسی اختلافات خاص کر حضرت عمرو بن عاص کی مبینہ چالاک فطرت کو اجاگر کرنے میں۔ اس بیان میں سارا زور حضرت جعفر پر ہے۔ اس پورے بیان سے یعقوبی دو شکار کرتا ہے، ایک حضرت جعفر کے اعلیٰ کردار کو اجاگر کرنا اور دوسرے حضرت عمرو بن عاص کے سازشی یا ناقابلِ اعتبار رویہ کو روشنی میں لانا۔[۹۳] یہ نکتہ اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ واقعہ تحکیم کا سارا الزامِ ناکامی موصوف کے سر پر ڈال دیا جاتا ہے۔

پھر "حصار قریش لرسول اللہ وخبر الصحیفہ" کے ذیل میں یعقوبی نے رسولِ کریمؐ، ابتدائی مسلمانوں اور ان کے اخلاقی معاونین بنو ہاشم کے سماجی مقاطعے اور قریش کے صحیفۂ مقاطعہ کا ذکر کیا ہے۔[۹۴] اس بیان میں مورخ کا زور مسلمانوں اور بنو ہاشم کی تکلیف و فقر و فاقہ سے زیادہ صحیفۂ مقاطعہ کے غیبی طور سے دیمک کی نذر ہو جانے پر ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یعقوبی نے یہاں بھی اس معجزہ کے زیر اثر خلق عظیم کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے جس کی تائید کسی اور ابتدائی ماخذ سے نہیں ہوتی۔[۹۵]

ایک صفحہ کے ایک بیان میں یعقوبی نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند اکبر قاسم کی چار سال کی عمر میں وفات کا اسی عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے ایک ماہ بعد آنجناب کے دوسرے شیر خوار صاحبزادے عبداللہ کا انتقال ہوا۔ حضرت خدیجہ نے حسرت سے کہا کہ کاش بچہ کا دودھ تو چھوٹ جاتا! آپ نے اس پر حضرت خدیجہ کو تسلی دی کہ ان کا دودھ چھوڑنا جنت میں ہوگا لیکن اس کے بعد یعقوبی نے جو ٹکڑا جوڑا ہے وہ سراسر اسلامی شریعت کے منافی ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے بعد حضرت خدیجہ نے دریافت کیا کہ آپ سے میری جو اولاد ہوئی اور مر گئی وہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: جنت میں۔ پوچھا کہ کیا بغیر کسی عمل کے۔ فرمایا کہ اللہ کو ان کے اعمال کا بہتر علم ہے۔ پھر حضرت خدیجہ نے یہی سوال اپنی اس اولاد کے بارے میں پوچھا جو رسولِ کریمؐ سے پہلے شوہروں سے ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں جہنم میں ہونے کی بشارت ملی اور دوسرے سوال کا وہی پہلا جواب ملا۔[۹۶] یعقوبی نے بڑا ستم کیا کہ اپنے ممدوحین کی توقیر و تعظیم بڑھانے کے لیے اسلام کے اصولوں کا بھی لحاظ نہ کیا۔

اس کے بعد جو سرخی یعقوبی نے لگائی اور اس کے ذیل میں جو معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ خاص اس کی تاریخ کا امتیاز ہیں۔

"مانزل من القرآن بمکۃ" کے تحت اس نے قرآن مجید کی مکی سورتوں کو بیان کیا ہے اور محمد بن حفص کوفی اور محمد بن کثیر اور محمد بن سائب کلبی اور ان کی ابوصالح سے اور ابوصالح کی ابن عباس کی روایت کی سند پر کہا ہے کہ کل بیاسی سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں جن کی ترتیب یہ ہے:

۵	۴	۳	۲	۱
۵۔المدثر	۴۔المزمل	۳۔والضحیٰ	۲۔القلم	۱۔سورہ الاقرا/علق
۱۰۔اللیل	۹۔الاعلیٰ	۸۔التکویر	۷۔المسد یا ابی لہب	۶۔الفاتحہ
۱۵۔الکوثر	۱۴۔العصر	۱۳۔الرحمٰن	۱۲۔الانشراح	۱۱۔الفجر
۲۰۔عبس	۱۹۔النجم	۱۸۔الفیل	۱۷۔الماعون	۱۶۔التکاثر
۲۵۔ایلاف قریش	۲۴۔التین	۲۳۔البروج	۲۲۔والشمس	۲۱۔لیلۃ القدر
۳۰۔ق	۲۹۔المرسلات	۲۸۔الھمزہ	۲۷۔القیامہ	۲۶۔القارعہ
۳۵۔الاعراف	۳۴۔ص	۳۳۔القمر	۳۲۔الطارق	۳۱۔البلد
۴۰۔مریم	۳۹۔الفاطر	۳۸۔الفرقان	۳۷۔یٰسٓ	۳۶۔الجن
۴۵۔بنی اسرائیل	۴۴۔القصص	۴۳۔النمل	۴۲۔الشعرآ	۴۱۔طٰہٰ
۵۰۔الانعام	۴۹۔الحجر	۴۸۔یوسف	۴۷۔ہود	۴۶۔یونس
۵۵۔حم عسق	۵۴۔حم السجدہ	۵۳۔حم والمومن	۵۲۔لقمان	۵۱۔الصافات
۶۰۔حم الشریعۃ	۵۹۔الدخان	۵۸۔الزمر	۵۷۔حمد سبا	۵۶۔الزخرف
۶۵۔النحل	۶۴۔الکھف	۶۳۔الغاشیہ	۶۲۔الذاریات	۶۱۔الاحقاف
۷۰۔الرعد	۶۹۔المومنون	۶۸۔الانبیاءٔ	۶۷۔ابراہیم	۶۶۔نوح
۷۵۔النبأ	۷۴۔المعارج	۷۳۔الحاقہ	۷۲۔الملک	۷۱۔الطور
	۷۹۔العنکبوت	۷۸۔الروم	۷۷۔الانفطار	۷۶۔النازعات

یعقوبی نے اوپر کہا ہے کہ کل بیاسی سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں لیکن اپنی فہرست میں اس نے تین کم گنائی ہیں۔ مورخ کو خود بھی اعتراف ہے کہ حضرت ابن عباس کی اس روایت سے کچھ دوسرے لوگوں کو اختلاف ہے۔ لیکن یہ اختلاف معمولی ہے اور یہ دوسری روایتوں اور موجودہ مصحف میں سورتوں کے مکی مدنی ہونے کے معاملے سے تطابق پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا تھا سورت سورت نہیں، چنانچہ جس سُورت کا اوّلیں حصہ مکہ میں نازل ہوا اس کو مورخ نے مکی ہی شمار کیا ہے چاہے اس کا باقی حصہ یا تکملہ مدینہ میں نازل ہوا ہو۔ یہی معاملہ مدنی سورتوں کا ہے۔ مورخ کے مطابق بسملہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) کے نزول سے سورۃ کا فصل معلوم ہوتا ہے۔ یعقوبی نے یہاں ایک اسرائیلی روایت درج کی ہے کہ تورات ۶ رمضان کو نازل ہوئی اور اس کے پندرہ سو سال بعد ۱۲ رمضان کو زبور نازل ہوئی، زبور کے ۸ سو یا ۶ سو سال

بعد ۱۸ رمضان کو انجیل کا نزول ہوا۔ بعض کا بیان ہے کہ قرآن مجید ۲۰ رمضان کو نازل ہوا۔ جعفر بن محمد کی روایت ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم میں جس چیز، فن کا غلبہ ہوتا ہے اس میں اس قوم کے نبی کو اغلب بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں سحر کا غلبہ تھا لہٰذا ان کو طلسم ساحری و فرعونی توڑنے کا فن عطا ہوا۔ حضرت داؤد کے زمانے میں صنعت و حرفت اور لہو لعب کا زور تھا اس لیے ان کو لوہے کو نرم کرنے کا فن اور لحنِ داؤدی عطا ہوا۔ حضرت سلیمان کے زمانے میں تعمیرات و عجائبات کا غلبہ تھا اس لئے ان کو جنات پر قدرت، ہوا پر تصرف اور طیور پر حکومت ملی۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ بعثت میں طب کا زور تھا لہٰذا ان کو احیاءِ موتی اور امراض لاعلاج سے شفایابی کا فن دیا گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میمنت لزوم میں کلام و خطابت، سجع و قافیہ، خطابت و بلاغت کا زور تھا اس لیے آپ کو معجز کلام قرآن عطا ہوا(۹۷)۔ یعقوبی کا یہ باب ہماری دوسری متداول سیرتوں میں نہیں ملتا اس لیے بڑا وقیع ہے کہ وہ ہمیں قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیبِ نزول کا علم دیتا ہے۔

"وفات خدیجہ و ابی طالب" کے ذیل میں یعقوبی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو سب سے بڑے مونس و غمگسار کے اٹھ جانے کا ذکر کیا ہے۔ تین سال ہجرت سے قبل پہلے حضرت خدیجہ نے داغِ مفارقت دیا پھر بقول مورخ وفاتِ زوجہ محترمہ کے تیسرے دن ابوطالب نے بعمر ۸۶ یا ۹۰ سال وفات پائی۔ مورخ نے اس کے علاوہ باقی زورِ کلام رسول کریم کی "جنتی ازواج" اور وفات ابوطالب کے غم پر صرف کیا ہے(۹۸)۔

اگلی سرخی کے تحت مورخ نے بیان کیا ہے کہ وفاتِ ابی طالب کے بعد جب قریش کی جرأت بڑھ گئی تو آپ نے اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کیا اور ان کی نصرت و حمایت چاہی مگر کسی نے آپ کی مدد نہ کی۔ پھر آپ کے سفرِ طائف کا ذکر ہے۔ اور اس کے آخر میں یہ بھی بیان کیا ہے طائف میں عتبہ اور شیبہ سے آپ کی ملاقات ہوئی تو ان دونوں نے اپنا نصرانی غلام عداس آپ کے پاس بھیجا اور وہ آپ سے مل کر متاثر ہوا اور مسلمان ہوا(۹۹)۔ یعقوبی نے یہ نہیں بتایا کہ دونوں اُمویوں نے اپنے غلام کے ہاتھ آپ کے لیے انگور کا خوشہ بطور تحفہ بھیجا تھا(۱۰۰)۔

عام طور پر مورخ اور سیرت نگار اوس و خزرج کے مدینہ میں باہم دست بگریباں ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی مسلسل جنگ جوئی اور نبرد آزمائی میں بعاث کی جنگ کا حوالہ دیتے ہیں جس نے ان دونوں کی کمر توڑ دی تھی۔ یعقوبی نے ان کی ماقبل اسلام جنگوں میں سے تیرہ جنگوں کے نام گنائے ہیں اور ان کی مکہ میں آمد کے ذیل میں انصار کی کمزوری، یہود بنی نضیر و بنی قریظہ کی جرأت، قریش مکہ سے انصاریوں کی استمداد، انکار کی صورت میں طائف والوں سے معاہدہ کرنے کی ناکام کوشش، رسول کریم سے ملاقات اور انصاریوں کے چھ افراد کا قبولِ اسلام، بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ، حضرت مصعب بن عمیر کی مدینہ بطور معلم و مبلغ روانگی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ آنے کی درخواست وغیرہ موضوعات کو ایک ایک دو دو جملوں میں بیان کیا ہے۔

پھر اگلے عنوان "خروج رسول اللہ من مکۃ" میں دو تین جملوں میں رسول کریم کی ہجرت کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور بیشتر بحث حضرت علی کے بستر نبوی پر سونے کے واقعہ سے ہے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے(۱۰۱)۔

"قدوم رسول اللہ المدینۃ" کے ذیل میں یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ آپ دوشنبہ ۸ ربیع الاول کو مدینہ پہنچے اور دوسری

روایت کے مطابق ۱۲ ربیع الاوّل کو جمعرات کے دن۔ بوقتِ آمد نبوی ستاروں اور سیاروں کا حال دینے کے بعد آپ کے کلثوم بن ہدم، سعد بن خیثمہ اور حضرت ابوایوب انصاری کے گھروں میں مہمان رہنے اور پھر اپنے حجروں میں منتقل ہونے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ایک نئی یعقوبی اندازکی روایت بیان کی ہے۔ اور وہ یہ کہ شادی سے پہلے ہی حضرت علی حضرت فاطمہ کو مدینہ مکّے سے لے کر آئے۔(۱۰۲) حالانکہ دُوسرے سیرت نگاروں کا کہنا یہ ہے کہ آپ نے مدینہ سے حضرت زید بن حارثہ کو زادِ راہ دے کر اپنی ازواج و اولاد کو لانے کے لئے بھیجا تھا۔(۱۰۳)

پھر اگلی سُرخی "افتراض الصوم والصلٰوۃ" کے تحت صیامِ رمضان کی فرضیت، تحویلِ قبلہ، مسجدِ نبوی کی تعمیر، حضرات بلال وام مکتوم کے اذان دینے کے واقعات کے مختصر ذکر کے ساتھ یہ ٹکڑا بھی لگا دیا ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کا غلام کلاب منارہ بھی مزدوری کرتا رہا تھا اور مزید یہ بھی کہا ہے مسجدوں میں اس زمانے میں منارے نہیں ہوتے تھے۔(۱۰۴)

پھر ایک الگ سُرخی کے تحت مدینہ میں ۳۲ سورتوں کے نازل ہونے کا اہم باب ہے۔ یعقوبی کے مطابق مدنی سورتوں کی ترتیبِ نزول یہ تھی:

۱- ویلٌ للمطففین	۲- البقرہ	۳- الانفال	۴- آل عمران	۵- الحشر
۶- الاحزاب	۷- النور	۸- الممتحنہ	۹- الفتح	۱۰- النساء
۱۱- الحج	۱۲- الحدید	۱۳- محمدؐ	۱۴- الدہر	۱۵- الطلاق
۱۶- لم یکن الذین	۱۷- الجمعہ	۱۸- تنزیل السجدہ	۱۹- المومن	۲۰- المنافقون
۲۱- المجادلہ	۲۲- الحجرات	۲۳- التحریم	۲۴- التغابن	۲۵- الصف
۲۶- المائدہ	۲۷- البراۃ	۲۸- النصر	۲۹- الواقعۃ	۳۰- العادیات

۳۱، ۳۲- معوذتین (دونوں ساتھ ساتھ)

اس کے بعد یعقوبی نے سب سے آخری آیت کے بارے میں مختلف روایتیں دی ہیں۔ ان میں یعقوبی نے سورہ مائدہ کی آیت تمیّن "الیوم اکملت لکم دینکم الخ" کو صحیح ثابت اور صریح روایت قرار دیا ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتال کی آیتِ اجازت کے نازل ہونے کے بعد قتال کی تیاری کرنے کا ذکر ہے اور تلوارِ آسمانی کے نزول کا بھی۔ پھر پہلا سریہ حضرت حمزہ کا سریہ بتایا گیا ہے۔(۱۰۵)

اس کے بعد یعقوبی نے الگ الگ عناوین کے تحت اہم غزوات کا بیان دیا ہے۔ غزوۂ بدر کے بیان میں اس کی بعض جزئیات دوسروں سے مختلف ہیں۔ مثلاً جنگ کے دن جب حضرت عباس نے مکی لشکر کے لیے دس اونٹ ذبح کیے اور ان کو پکانے کے لیے دیگوں میں چڑھایا گیا تو دیگیں اُلٹ گئیں۔ ابُولہب نے خود شرکت نہ کی مگر ایک روایت کے مطابق چار ہزار درہم سے مدد کی۔ مسلمانوں کی تعداد تین سو بتاتا ہے اور دُوسری روایت کے مطابق ۸۱ مہاجر اور ۲۲۲ انصار کا ذکر کرتا ہے۔ بدر کے ستّر قیدیوں میں

اڑسٹھ سے فدیہ لیا گیا۔ حضرت عباس نے اپنا فدیہ ستر اوقیہ اور اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی ستر اوقیہ ادا کیا (یعنی کل نو ہزار آٹھ سو درہم بحساب چالیس درہم فی اوقیہ) یعقوبی مزید کہتا ہے کہ اس فتح کے بعد عربوں نے رسول اللہ کے پاس اپنے وفود بھیجے جو قرینِ قیاس ہے۔ لیکن ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جو قطعی قرینِ قیاس نہیں ہے۔ ربیعہ نے جب کسریٰ سے ذی قار کی جنگ غزوۂ بدر کے چار پانچ ماہ بعد لڑی اور ربیعہ نے تہامی کا شعار "یا محمد یا محمد" اپنایا تو انھوں نے کسریٰ کی فوجوں کو ہرا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "یہ پہلا موقع ہے کہ عرب نے عجم سے بدلہ لیا ہے اور وہ میری وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں"۔ یعقوبی کا یہ بیان ہے کہ اسی سال آپ نے دونوں عیدیں منائیں، مصلّٰی میں نماز پڑھی۔ ایک راستے سے گئے اور دوسرے سے آئے اور عید قرباں میں ایک بکری ذبح کی۔[۱۰۶]

جنگِ اُحد کے ضمن میں یعقوبی کہتا ہے کہ ایک خواب نے آپ کو مدینہ میں رہ کر جنگ کرنے کو کہا تھا مگر انصار نے باہر نکلنے پر اصرار کیا۔ دوسرے مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار و مہاجرین کے جوشیلے افراد نے جن میں تجربہ کار و نوجوان دونوں شامل تھے میدانِ جنگ میں لڑنے پر اصرار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار بتاتی ہے لیکن منافقوں اور ان کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے ساتھ چھوڑنے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بوقتِ شکست رسول کریم کے ساتھ صرف تین صحابہ ـــــ حضرات علی، زبیر اور طلحہ ـــــ کے رہ جانے کا ذکر کیا ہے جس کی تصدیق دوسرے مآخذ سے نہیں ہوتی۔[۱۰۷]

یعقوبی نے یہودیوں کے ایک قبیلہ بنو قینقاع سے رسول کریم کی جنگ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تاہم غزوہ اُحد کے بعد بنو نضیر اور غزوہ خندق کے بعد بنو قریظہ کے خلاف رسول کریم کے اقدامات کا روایتی ذکر ہے۔ اس سلسلہ میں یعقوبی بنو نضیر کی وجہ تسمیہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک پہاڑ نضیر پر مقیم ہونے کے سبب سے اس نام سے پکارے گئے۔ یہی بات وہ بنو قریظہ کے سلسلہ میں بھی کہتا ہے لیکن موخر الذکر کے بارے میں ایک اور روایت بیان کرتا ہے کہ قریظہ ان کے جد کا نام تھا۔ وہ دونوں کو عرب قبیلہ جذام کی ایک شاخ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ بنو قریظہ عادیا بن السموال کے زمانے میں یہودی ہو گئے تھے۔[۱۰۸] غزوہ بنی النضیر کے موقعہ پر سلام بن اور یامین نضری کا قبول اسلام[۱۰۹] اور تحریم شراب کا نازل ہونا بیان کرتا ہے۔ اسی طرح غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر آنحضرت کے یہودیوں کو عبدة الطاغوت، وجوہ القردة والخنازیر کہنے اور بعد میں یہودیوں کے ملامت کرنے پر آپ کے حیا سے پیچھے ہٹ آنے کا ذکر ہے جو صحیح نہیں ہے۔ باقی تفصیلات دوسرے مآخذ کی طرح ہیں۔

غزوہ خندق میں یعقوبی نے مسلمانوں کی کل تعداد سات سو بتائی ہے جو غلط ہے۔[۱۱۰] باقی تفصیلات دوسروں کی طرح ہیں سوائے یہودیوں کے حروف مقطعات پر بحث کے تذکرہ کے جس پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے۔ غزوہ بنو مصطلق کے بیان میں یعقوبی کا یہ بیان کہ حضرت جویریہ بنت حارث کے باپ، چچا اور زوج مقتول ہوئے تھے صحیح نہیں ہے۔[۱۱۱] لیکن یعقوبی کی مورخانہ دیانتداری ہے کہ اس واقعہ کے بعد معاملۂ افک میں حضرت عائشہ کی برأت اور قرآن مجید میں ان کی پاکدامنی کی شہادت کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے۔ دوسرے مورخوں کی مانند یعقوبی نے بھی بنو مصطلق کے صدقات پر حضرت ولید بن عقبہ اموی کی تقرری کا مختصراً ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیت ۶ کے نزول کا بھی۔[۱۱۱ الف]

حدیبیہ کی صلح کے باب میں یعقوبی نے سب کے خلاف معاہدہ کو صرف تین سال کے لیے ہونا بتایا ہے[۱۱۲]۔ باقی تفصیلات دوسروں کی مانند ہیں۔ خیبر کے غزوہ کے ذکر میں مورخ نے کہا ہے کہ اس کے چھ قلعے (حصون) ـــــ سلالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربطہ ـــــ تھے اور ان میں بیس ہزار جنگجو تھے جبکہ دوسروں کے یہاں دس ہزار کی تعداد ملتی ہے بتفصیل سے حضرت علیؓ کے مرحب کو قتل اور قلعہ کے دروازے کو اکھاڑنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت جعفر کی آمد، پہلے بنو ہاشم پھر تمام مسلمانوں میں پیداوار کی تقسیم کے بعد یعقوبی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں مکہ قحط کا شکار تھا اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ مکہ کے تین شیوخ ـــــ ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ بن خلف اور سہیل بن عمرو ـــــ کے پاس سامان و سونا بھیجا۔ اول الذکر نے قبول کر لیا اور فقراء قریش میں تقسیم کر دیا اور اس صلہ رحمی پر رسول کریم کی خاص عرب لہجے میں تعریف کی مگر باقی دونوں نے انکار کر دیا۔ پھر یعقوبی کے مرحب کی بہن زینب کے زہر آلود کھانا کھلانے کا واقعہ مختصر طور سے بیان کیا ہے اور حجاج بن علاط کے سفر مکہ کا بھی۔ لیکن تعجب ہے کہ یعقوبی نے خیبر کی شرائط صلح کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ فدک، تیما، وادی القریٰ کے متنازعہ مسائل کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا ہے[۱۱۳]۔

فتح مکہ کی تفصیلات یعقوبی کے یہاں بھی وہی ہیں جو دوسرے مآخذ میں ملتی ہیں اور تقریباً یہی معاملہ غزوۂ حنین کی جزئیات کا ہے[۱۱۴]۔ البتہ اس غزوہ میں بنو ہاشم اور خاص کر حضرت علی کی مصاحبت رسول اور جنگ میں پامردی کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ محاصرۂ طائف کے باب میں یعقوبی کا بیان ہے کہ آپ نے حضرت علی کو آگے بھیجا جبکہ دوسرے تمام مآخذ نے حضرت ابو عامر اشعری کے بھیجے جانے کا ذکر کیا ہے[۱۱۵]۔ اسی طرح محاصرۂ طائف اٹھا لینے کے بعد حضرت ابوسفیان بن حرب کو محاصرہ پر خلیفۂ رسول اور حضرت علی کو کسر اصنام پر مامور کرنے کا معاملہ بھی صرف یعقوبی کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے بعد غزوہ موتہ کے ذکر میں حضرت جعفر بن ابی طالب کی جلالتِ شان، ان کی شہادت، ان کے گھر والوں کا نوحہ، رسول کریم کا غم، حضرت فاطمہ کا تین دن جعفری خاندان کے لیے کھانا بھیجنے کا معمول اور اس کا بنو ہاشم میں سنت بننا زیادہ اجاگر کیا گیا ہے[۱۱۶]۔

"الغزوات التی لم یکن فیہا قتال" کے عنوان کے تحت یعقوبی نے ان غزواتِ نبوی کا ذکر کیا ہے جن میں جنگ و جدال نہیں ہوا۔ ان میں ابواء، بواط، ذی العشیرہ، الکدر، حمراء الاسد، بدر الموعد اور آخریں کا مختصر اور روایتی ذکر ہے البتہ تبوک کا سبب یا مقصد حضرت جعفر بن ابی طالب کا قصاص لینا بتایا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ اس غزوہ میں مالدار مسلمانوں کا نفقات کثیر خرچ کرنے کا ذکر ضرور ہے لیکن ان کے نام نہیں گنائے گئے ہیں جبکہ بکائین (رونے والوں) کے نام دیے گئے ہیں[۱۱۷]۔

"الامراء علی السرایا والجیوش" کی نسبتاً مفصل بحث میں ۳۲ سرایا، ان کے امراء، ان کے منازل اور ان اسباب و نتائج کو مختصر طور سے دیا گیا ہے[۱۱۸]۔ اور اس کے معاً بعد بغیر کسی سرخی کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنروں (امراء) اور بعض عاملین صدقات کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فہرستِ عمالِ نبوی مکمل نہیں ہے کیونکہ اس میں کل ۲۳ افراد کے نام مذکور ہیں[۱۱۹]۔ بہرحال یہ یعقوبی کے شرف و دیانت کی بات ہے کہ اس نے عہدِ نبوی کے تقریباً تمام اموی امراء کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد نبی کریم کے سفیروں اور بادشاہوں کے نامہائے مبارک کا ذکر ایک علٰحدہ عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔ کل تیرہ سفیروں اور ان کے منزلوں کے نام مذکور ہیں۔ اس ذیل میں یعقوبی نے بعض باتیں ایسی کہی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ہیں۔ اول یہ کہ قیصر روم کا رسول کریم کے نامۂ مبارک کے جواب میں آپ کی رسالت کا اقرار کرنا، آپ کے ذکر خیر کو انجیل میں پانے کی شہادت کا اعتراف کرنا اور آپ کے قدم مبارک دھو کر سعادت پانے کی آرزو کا اظہار کرنا۔ اس کا جواب موصول ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ جب تک میرا نامہ اس ملک میں رہے گا تب تک ان کا ملک باقی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ یعقوبی نے حضرت عمار بن یاسر کی سفارت کا ذکر کیا ہے جو ایہم بن نعمان غسانی کے دربار میں گئی تھی۔ اس کا اور کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ اس ذیل میں یعقوبی نے بعض انفرادی مہموں کا ذکر کیا ہے جو مشرکین اور یہود کے بعض فتنہ پرداز لوگوں کے قتل کی غرض سے بھیجی گئی تھیں۔[۱۲۰]

وفود عرب کے بیان میں یعقوبی نے اگرچہ صرف تیس سے کچھ زیادہ وفدوں کے آنے کا ذکر کیا ہے جو ابن سعد کے جامع بیان کے مقابلہ میں کافی تشنہ ہے تاہم یعقوبی کا بیان اس لحاظ سے وقیع ہے کہ اس نے ہر وفد کے رئیس کا ذکر بالالتزام کیا ہے جو دوسروں کے بیانات پر ایک اضافہ کرتا ہے کیونکہ بشمول ابن سعد تمام مورخین اور سیرت نگار اس کا التزام نہیں رکھتے ہیں۔[۱۲۱]

کُتّاب النبی کے بیان میں یعقوبی نے صرف ۱۲ کاتبین رسول کا ذکر کیا ہے جو عہد نبوی میں وحی، خطوط اور معاہدے لکھا کرتے تھے۔ ان میں حضرات علی، عثمان، عمرو بن عاص، معاویہ بن ابی سفیان، شرحبیل بن حسنہ، عبداللہ بن سعد، مغیرہ بن شعبہ، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، حنظلہ بن ربیع، ابی بن کعب، جہیم بن صلت اور حصین نمیری کے نام تو موجود ہیں مگر اور دوسرے بہت سوں کے نام غائب ہیں یہ خاصی ناقص فہرست ہے۔[۱۲۲] اس کے بعد چار نامہائے مبارک بنام اہل یمن، ہمدان، نجران و ہجر کے متون کا ذکر ہے، اور صلح نجران کا بھی۔ یعقوبی نے اہلِ نجران سے رسول کریم کے مباہلہ کرنے کی غرض سے "پنجتن پاک" کے نکلنے اور اہل نجران کے انکار کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کے بعد "ازواجِ رسول" کے ذیل میں تیرہ یا گیارہ ازواج مطہرات کے اسمائے گرامی بیان کیے ہیں اور تفصیل دی ہے کہ کس کس زوجہ سے آپ کا نکاح مکمل ہو گیا تھا اور کس کس سے نہیں۔ اس کی بعض تفصیلات ایسی ہیں جو قابل کلام ہیں۔[۱۲۳] اس کے بعد "مولد ابراہیم بن رسول اللہ" کی سرخی کے تحت صاحبزادۂ رسول کی ولادت، رضاعت، عمر اور وفات کا مختصر ذکر ہے لیکن اسی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ پر "سوتیاڈاہ" کا الزام بھی ہے۔ بعد میں حضور کے آزاد کردہ غلاموں، باندیوں، آپ کے رایات، تلواروں، تیر کمانوں، گھوڑوں، ناقوں، خچروں وغیرہ نیز آپ کے لباس، گھر کے برتنوں، چال ڈھال، بال و حلیہ، خاتم وغیرہ کا بھی بہت مختصر ذکر ہے۔[۱۲۴]

یعقوبی نے سیرت نبوی پر اپنے باب میں سب سے زیادہ صفحات خطبات و مواعظ نبوی کے لیے وقف کیے ہیں اور تقریباً پورے بیس صفحات ہیں، ۸۹ تا ۱۰۸۔ یعقوبی نے آپ کے تمام احسن المواعظ جمع کر دیے ہیں اور اس کا یہ قول صحیح ہے کہ اخلاق شریفہ پیدا کرنے اور حُسنِ سیرت سے انسان کو متصف کرنے کے لیے ان خطبات نبوی اور مواعظ حسنہ کی مثال گوہر شب چراغ سے کسی طرح کم نہیں۔[۱۲۵]

حجۃ الوداع کے بیان میں یعقوبی نے کافی تفصیلات جن کا تعلق آپ کے خطبات، مناسکِ حج وغیرہ سے ہی دی ہیں اور واپسی کے سفر میں غدیر خم کا قیام بروز ۱۸ ذی الحجہ کا ذکر ضرور کیا ہے تاہم صرف حدیث نبوی فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ،

اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عادا ہ [ترجمہ: میں جس کا مولیٰ/دوست ہوں علی بھی اس کے دوست ہیں، اے اللہ! جو ان سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس کا دشمن ہو جا] کے بیان کرنے پر اکتفا ہے۔(۱۲۶)

وفاتِ نبوی کے ذیل میں ۲ ربیع الاول تاریخ وفات بتائی ہے جو دوسری روایات سے مختلف ہے اور کہا ہے کہ عجم کے مہینوں میں اذار کا مہینہ تھا۔ عقرب کا قران تھا پھر ماشاء اللہ منجم اور خوارزمی کے حسابات کے مطابق بوقتِ وفات ستاروں و سیاروں کی منازل دی ہیں۔ اسی کے ذیل میں ایک غریب روایت یہ دی ہے کہ حضرت عمر شدتِ غم میں کہتے پھرتے تھے کہ آپ کی وفات نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے بلکہ آپ حضرت موسیٰ کی طرح غائب ہو گئے ہیں اور چالیس دن بعد لوٹیں گے اس روایت کے پیچھے امام غائب کے تصور کو سند اعتبار دلانے کی خواہش چھپی معلوم ہوتی ہے۔(۱۲۷) وفات نبوی کے بعد حضرت فاطمہ کی وفات کا ذکر ہے جو متعدد روایات کے مطابق تین راتوں، چالیس یا ستر دن یا چھ ماہ بعد ہوئی۔ تدفین میں صرف حضرات سلمان و ابوذر اور ایک روایت کے مطابق حضرت عمار حاضر تھے۔ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح یعقوبی نے حضرت فاطمہ اور ازواج مطہرات نبوی کے درمیان مبینہ شکر رنجی کی ایک من گھڑت داستان بھی بیان کی ہے کہ بعض ازواج نے حضرت فاطمہ کے غسلِ میت میں حاضر ہو کر شرکت کی اجازت چاہی۔ حضرت فاطمہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم میرے بارے میں وہی کہنا چاہتی ہو جو تم نے ایسے موقع پر میری ماں کے بارے میں کہا تھا۔ غالباً یعقوبی کو علم نہیں تھا کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے وقت ان ازواجِ مطہرات میں سے کوئی بھی نہ رسول کریم کے نکاح میں تھی نہ جنازے کی تقریبات میں شریک۔ لیکن الزام لگانے والوں کو صحت و عدم صحت سے کیا تعلق؟

یعقوبی نے "صفۃ رسول اللہ" کے تحت آپ کا حلیہ و شمائل مبارک، "المشبھون برسول اللہ" کے ذیل میں آپ کے حلیہ کے چھ حضرات جن میں پانچ ہاشمی اور ایک نامعلوم غیر ہاشمی تھے کے نام، ایک اور سرخی کے تحت آپ کی دادیوں کے نام حضرت آدم علیہ السلام تک، بوقتِ وفات آپ کے عمال و امراء، صوبجات و عاملین صدقات جن کی تعداد صرف ۱۶ دی گئی ہے اور تمام فاطمہ نامی والداؤں/ماؤں اور دادیوں کے نام دیے گئے۔(۱۲۸) آپ کی سیرت پر اپنی تاریخ کے ایک سو بائیس(۱۲۲) صفحات یعقوبی نے وقف کیے ہیں۔

مذکورہ بالا تحلیل و تجزیے سے تاریخ یعقوبی کی بحیثیت ماخذِ سیرت نبوی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ یعقوبی کو بحیثیت سیرتِ نگارِ رسول یہ شرف ملنا چاہیے کہ اس نے اپنی عالمی تاریخ کے ذیل میں عہد نبوی کا بڑا جامع اور مختصر بیان پیش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس "کتاب مختصر" میں اس پورے عہد کی مکمل تفصیلات کی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم یعقوبی کو اس الزام بلکہ ارتکاب جرم سے بری نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس نے بلا وجہ یا غیر تاریخی انداز سے بعض قصے سیرت نبوی میں شامل کر دیے۔ ان کے بجائے اگر وہ تاریخی واقعات پر کچھ مزید توجہ دیتا تو سیرتِ رسول کا باب اور زیادہ وقیع ہو جاتا۔ تاریخ یعقوبی میں اگر اسناد کی تمن کے درمیان عدم موجودگی سے قاری کو راحت ملتی ہے اور اس کے مطالعہ میں خلل اور اس کے ذہن پر روایت پسندی کا بوجھ نہیں پڑتا تو دوسری طرف اس کے بیانات کی فنی اور تاریخی حیثیت مجروح اور پایۂ استناد کمزور ہو جاتا ہے۔ یعقوبی کی زبان پر قدرت، سلاست، دریائے آمد کی سبک خرامی اور مختصر الفاظ میں زیادہ معانی ادا کرنے کی صلاحیت اس کی تاریخ کی ایک

نمایاں خصوصیت ہے۔ اگر مورخ کی طرفداریٔ بنی ہاشم و بنو طالب کو ذہن میں رکھا جائے تو قاری بہت سے غیر مورخانہ اور غیر دیانتدارانہ بیانات کی چھان پھٹک خود کر کے حقیقت اور افسانہ طرازی کو سمجھ لے گا۔ بہرحال تاریخ یعقوبی اپنی تمام خامیوں کے باوجود اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی کا ایک اہم ماخذ ہے جس سے کوئی بھی دیانتدار مورخ یا طالبِ تاریخ صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

تعلیقات و حوالہ جات

(۱) حدیث نبوی پر تمام کتابیں اس واقعہ کے حوالے فراہم کرتی ہیں۔

(۲) ابنِ سعد، طبقاتِ کبریٰ، بیروت ۶۰-۱۹۵۷ء، آٹھ جلدیں۔

(۳) عبدالعزیز دوری کا مضمون "THE IRAQ SCHOOL OF HISTORY TO THE 9TH CENTURY — A SKETCH" HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST میں، لندن ۱۹۶۲ء، ص ۴۷۔

(۴) الفریڈ گلیوم (A. GUILLUME) کا مقدمہ بر ترجمہ سیرت ابن اسحاق THE LIFE OF MUHAMMAD لندن ۱۹۵۵ء ص xiv - xvii؛ نیز عبدالعزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا؛ جوزف ہورووتس کا مضمون "THE EARLIEST BIOGRAPHIES OF THE PROPHET AND THEIR AUTHORS."، ISLAMIC CULTURE، حیدرآباد، اول (۱۹۲۷ء) ص ۵۹ - ۵۳۵؛ جلد دوم (۱۹۲۸ء) ص ۵۰ - ۲۲ وغیرہ۔

(۵) عبدالعزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا

(۶) ایضاً

(۷) ان ابتدائی سیرت نگاروں کے لیے ملاحظہ ہو: گلیوم کا مقدمہ؛ جوزف ہورووتس کا مضمون؛ نثار احمد فاروقی کی کتاب EARLY MUSLIM HISTORIOGRAPHY، ادارہ ادبیات دلی ۱۹۷۹ء، باب نہم ص ۸۰ - ۲۱۴۔

(۷ الف) محمد بن عمر واقدی، کتاب المغازی، تحقیق مارسدن جونس، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء، مرتب کا مقدمہ ص ۱۵-۵ اور ص ۳۵ - ۲۹۔

(۸) گلیوم کا مقدمہ؛ منٹگمری واٹ کا مضمون "THE MATERIALS USED BY IBN ISHAQ"، HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST، ص ۳۴ - ۲۳

(۹) عبدالعزیز دوری کا مضمون، ص ۴۸؛ نثار احمد فاروقی، ص ۸۸ - ۲۸۱

(۱۰) عبدالعزیز دوری ص ۵۳ - ۵۲

(۱۱) یاقوت حموی، معجم الادباء، مکتبہ عیسی البابی مصر (غیر مورخہ)، جلد پنجم، ص ۵۴ - ۱۵۳

(۱۲) اسماعیل پاشا بغدادی، کتاب ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، مکتبہ بہیہ استانبول ۱۹۴۵ء، ص ۲۱۹؛ ہدیۃ العارفین فی اسماء المؤلفین وآثار المصنفین استانبول ۱۹۵۱ء، جلد اول، ص ۲۵۲ (ب)۔

(۱۳) عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین، دمشق، ۱۹۵۰ء، جلد اول ص ۱۶۱۔ عمر رضا کحالہ نے اپنی کتاب میں ابن حیان کی المقبس، جلد ششم ص ۵۳-۵۴ اور عاملی کی اعیان الشیعۃ، جلد دہم ص ۲۶-۳۰ کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کتابوں میں بھی مورخ یعقوبی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا ورنہ کحالہ نے ضرور یاقوت کے بیان پر کچھ اضافہ کیا ہوتا۔ افسوس کہ یہ دونوں مذکورہ بالا کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں۔

(۱۴) خیر الدین زرکلی، الاعلام، مصر طبع دوم (غیر مورخہ)، جلد اوّل ص ۹۱ الف - ۹۰ ب

(۱۵) تاریخ الیعقوبی، دار صادر، بیروت ۱۹۶۰ء

(۱۶) تاریخ الیعقوبی، نجف ایڈیشن ۱۹۶۵ء، مرتبہ سید محمد صادق بحر العلوم، جلد اوّل ص د-ب

(۱۷) عبد العزیز دوری کا مضمون مذکورہ بالا

(۱۸) تاریخ یعقوبی کے متن کے تمام حوالے اس کے بیروت ایڈیشن کے ہیں۔ ملاحظہ ہو: جلد دوم ص ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۶۲، ۱۶۸، ۲۱۴، ۲۱۹۔ نیز صفحات ما بعد۔

(۱۹) اصحاب النص والتعیین جو حضرت علی اور ان کی اولاد امجاد کی امامتِ ربانی میں یقین رکھتے ہیں وہ حضرت علی اور ان کے صاحبزادے حضرت حسن کی خلافت کے سوا تمام خلفائے راشدین واموی وعباسی کی خلافت کو ناجائز، غیر دستوری اور غاصبانہ قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: آرنلڈ (T.W. ARNOLD)، THE CALIPHATE، لندن ۱۹۶۵ء ص ۱۱-۱، ہملٹن گب (H.A.R. GIBB)، STUDIES ON THE CIVILIZATION OF ISLAM، لندن ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۱ و ما بعد۔

(۲۰) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۲۳

(۲۱) ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ گلیوم)، ص ۱۱۵-۱۱۴ کے نزدیک حضرت ابوبکر تیسرے مسلمان تھے؛ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت، ۱۹۵۷ء، جلد سوم ص ۱۷۱-۱۷۲؛ بلاذری، انساب الاشراف، دار المعارف مصر ۱۹۵۹ء، جلد اول ص ۱۱۲ وغیرہ

(۲۲) تاریخ یعقوبی، دوم ص ۲۰ اور ص ۴۱

(۲۳) ایضاً ص ۴۲

(۲۴) تفصیلات اور مآخذ کے لیے ملاحظہ کیجئے: خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیہ میں ازدواجی تعلقات" برہان دہلی، مئی ۱۹۸۰ء ص ۱۴-۱۲

(۲۵) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۴

(۲۶) حضرت ابوالعاص اموی اسلام لانے سے قبل جنگ بدر میں قریشی فوج کے ساتھ تھے۔ اسی میں قید ہوئے۔ رہائی کے وقت انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زینب کو مکہ سے مدینہ بھیج دینے کا وعدہ کیا تھا جسے انھوں نے پُورا کیا۔ اس واقعہ کو ابن اسحاق، واقدی، بلاذری، ابن سعد، طبری، دوسی نے بیان کیا ہے اور بخاری نے اپنی صحیح میں باب فضائل اصحاب النبی میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون مذکورہ بالا۔

(۲۷) خاکسار کا مضمون مذکورہ ص ۱۷-۱۵

(۲۸) لیعقوبی، دوم ص ۱۷

(۲۹) مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، مصر ۱۹۵۳ء، ص ۱۵۹ وغیرہ

(۳۰) مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، ص ۱۷۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ۳۸-۳۲۷

(۳۱) عبدالعزیز دوری کا مضمون ص ۴۷-۴۶؛ گلیوم کا مقدمہ ص xv؛ نثار احمد فاروقی ص ۹۳-۹۲۔ نیز ملاحظہ کیجئے فرانز روزنتھال (FRANZ ROSENTHAL) کا مضمون "THE INGLUENCE OF THE BIBLICAL TRADITION ON MUSLIM HISTORIOGRAPHY" HISTORIANS OF THE MIDDLE EAST، ص ۴۳-۴۱

(۳۲) ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ گلیوم) ص ۶۹-۸۰ وغیرہ؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۹۶-۹۵ وغیرہ۔

(۳۳) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۹-۸

(۳۴) ایضاً ص ۱۰

(۳۵) ایضاً ص ۱۲

(۳۶) ایضاً ص ۱۳

(۳۷) ایضاً ص ۱۴

(۳۸) ایضاً ص ۲۳-۲۲

(۳۹) ایضاً ص ۲۶

(۴۰) ایضاً ص ۳۲-۳۱

(۴۱) ایضاً ص ۳۵

(۴۲) ایضاً ص ۳۵

(۴۳) ایضاً ص ۳۵

(۴۴) ابوطالب کے اسلام لانے کے بارے میں کسی ابتدائی مورخ یا سیرت نگار نے کچھ نہیں کہا ہے۔ صحابہ کرام کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کو اصحاب رسول میں شمار نہیں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ، ص ۹۲-۱۹۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۲۳۶، نیز ملاحظہ ہو: ابن اثیر، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ؛ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب؛ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ فی تمیز الصحابہ وغیرہ۔

(۴۵) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۹

(۴۶) قرآن مجید، سورہ توبہ آیت ۹

(۴۷) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۰ (۴۸) ایضاً ص ۴۱

(۴۹) ایضاً ص ۴۴ (۵۰) ایضاً ص ۸۸

(۵۱) بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۵۴۱ کا بیان ہے کہ ذوالفقار نامی تلوار عاص بن منبّہ سہمی کی تھی جو بدر میں مقتول ہوا تھا۔ اور یہی زیادہ صحیح روایت ہے۔ مگر دوسروں نے اس کو منبّہ بن حجاج سہمی یا اس کے بھائی بنیہ سہمی کی تلوار بھی کہا ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے صفحات ۲۹۴، ۴۴۳، ۵۱۵ اور ۵۲۱۔

(۵۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۶

(۵۳) واقدی، کتاب المغازی، ۵۷-۶۵۵ - واقدی نے دونوں روایتیں دی ہیں۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کے بارے میں جو روایت ہے وہ واقدی نے محمد بن فضل کی جابر سے، زکریا بن زید کی عبداللہ بن ابی سفیان سے، مجمع بن یعقوب وغیرہ کی سند پر بیان کی ہے۔

(۵۴) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۵ (۵۵) ایضاً ۱۵

(۵۶) ایضاً، بیروت ایڈیشن ۱۹۶۰ء

(۵۷) جیمس ہیسٹنگز (مرتب) ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS ایڈنبرا ۱۹۶۴ء، جلد ہشتم ص ۳۴۶ الف کا خیال ہے کہ تاریخ لیعقوبی ۸۹۱ء میں تصنیف کی گئی تھی۔

(۵۸) خیرالدین زرکلی، الاعلام، طبع دوم، جلد اول، ص ۲۸۷ الف۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس کے پڑپوتے تھے اور عباسی حکومت کے امراء میں سے۔ عہد ہارون رشید میں ۱۷۰ھ میں مدینہ کے گورنر تھے اور اس کے بعد سندھ، مکران اور مصر کے بھی گورنر رہے۔

(۵۹) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد نہم ص ۱۵۰ ب ص ۱۵۱ الف۔ وہب بن وہب کا تعلق بنو مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ کا قریش تھا۔ ان پر احادیث گھڑنے کا الزام تھا۔ ہارون رشید کے عہد میں مدینہ سے بغداد آ گئے اور مہدیہ کے قاضی لشکر بھی رہے۔ ان کے بزرگ جعفر بن محمد حضرت حسین شہید کے پڑپوتے تھے۔ بخاری نے ان کی روایت نہیں لی۔ ملاحظہ کیجئے ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، اول ص ۱۶۶۔

(۶۰) ابن سعد، طبقات، بیروت، ۱۹۵۷ء، پنجم ص ۵۳-۱۵۱۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان کے صاحب علم صاحبزادے۔

(۶۱) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، اول ص ۲۴۸

(۶۲) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد چہارم ص ۳۱۴۔ مشہور سیرت نبوی السیرۃ النبویہ (ابن اسحاق کی سیرت رسول اللہ کے ایڈیٹر)

(۶۳) تلاش کے باوجود ان کے بارے میں تفصیل نہ مل سکی۔

(۶۴) خیرالدین زرکلی، الاعلام، جلد پنجم ص ۲۹۸ لیثی بکری تھے، انساب و روایت کے عالم، مدینہ کے باسی خلیفہ مہدی عباسی اور اس کے

فرزند ہادی کے دربار میں معظم مگر وضع شعر وحدیث میں متہم۔ ہیثم بن عدی طائی، کوفہ کے باسی، ادب ونسب کے عالم۔ خلفاء عباسی منصور ومہدی وہادی ورشید کے ندیم۔ علماء حدیث کے نزدیک غیر ثقہ: الاعلام، نہم ص ۱۵-۱۱۴۔

(۶۵) غیر معروف راوی ہیں۔ متداول کتابوں میں ان کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔

(۶۶) خیر الدین زرکلی، الاعلام، جلد پنجم ص ۱۴۰۔ مشہور راوی اور مصنف۔

(۶۶ الف) حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے شمس الدین ذہبی (متوفی ۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء) کی کتاب تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد دکن ۱۹۵۵ء اوّل ص ۳۵-۲۳۴۔

(۶۶ ب) خیر الدین زرکلی، الاعلام، ص ۲۳۷۔ مشہور ریاضی دان اور فلکیات کا عالم نیز مورخ۔ مامون عباسی کے عہد میں خلیفہ کے کتب خانے کا نگران تھا۔

(۶۶ ج) تراجم اور سیر کی کتابوں میں ان کے بارے میں معلومات نہیں ملتی ہیں۔

(۶۷) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۰-۷۔ ابن اسحاق (انگریزی ترجمہ) ص ۶۹ نے صرف ایک روایت دی ہے کہ نبی کریم بطن مادر ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ بلاذری، انساب الاشراف، اول ص ۹۲ نے متعدد روایتیں دی ہیں: اوّل وہ ابن اسحاق کی روایت کی تائید کرتا ہے اور اسی کو ثبت (صحیح ومسلّم) قرار دیتا ہے۔ دوسری روایت میں وہ آپ کی عمر بوقت وفات والد سات ماہ اور تیسری روایت میں بیس ماہ سے کچھ اوپر بتاتا ہے۔

(۶۸) تاریخ الیعقوبی، دوم، ص ۱۲-۱۰۔ یعقوبی نے عبد المطلب کے دس لڑکے اور چار لڑکیاں بتائی ہیں۔ لیکن زبیری، کتاب نسب قریش ص ۲۰-۱۷ نے بارہ فرزندوں اور چھ دختروں کے نام گنائے ہیں اور ان کی تفصیلات دی ہیں۔ جبکہ ابن حزم اندلسی، جمہرۃ انساب العرب، مصر ۱۹۴۸ء ص ۱۳ نے سات فرزندوں کے نام گنا کر کہہ دیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی فرزند تھے البتہ دختروں کے معاملے میں وہ یعقوبی کی تائید کرتے ہیں۔ بہرکیف زبیری کا بیان زیادہ صحیح ہے کیونکہ اس کی تصدیق بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۹۰-۸۷ سے بھی ہوتی ہے۔ مزید تصدیق ابن اسحاق ص ۷۳ وما بعد سے ہوتی ہے۔

(۶۹) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۲۔ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۸۸-۸۷ وغیرہ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر" برہان دہلی جنوری ۱۹۸۰ء۔ یعقوبی نے عبد المطلب کی عمر ایک سو بیس یا ایک سو چالیس سال بتائی ہے لیکن بلاذری، مذکورہ بالا ص ۸۴ کا خیال ہے کہ ان کی صحیح عمر ۸۸ سال تھی۔ ابن اسحاق کی روایت (ص ۷۹) کہ سقایہ حضرت عباس کو ملا تھا صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ اس وقت بچے تھے۔

(۷۰) تاریخ الیعقوبی، دوم ص ۱۱۴

(۷۱) ایضاً، ص ۱۴۔ ابن اسحاق ص ۸۲-۷۹ نے آپ کی سفرِ شام کے وقت عمر نہیں دی ہے جبکہ بلاذری، انساب اوّل

ص ۹۶ میں بارہ سال ہے۔

(۷۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۴ - نیز ملاحظہ ہو زبیری، نسب قریش ص ۴۰ جس کے مطابق جو اسلام لائیں اور ہجرت کی اور مدینہ میں وفات پائی۔

(۷۳) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۶ - ۱۵ - ابن اسحاق ص ۸۲ نے تین چار سطروں میں فجار کی جنگ کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں آپ کی یا آپ کے خاندان کی شرکت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلاذری، انساب اوّل ص ۱۰۳ - ۱۰۰ نے آپ کے اپنے چچاؤں کے ساتھ جنگ میں شرکت کا ذکر کیا ہے۔ بلاذری کے یہاں اس پر تو اختلاف ملتا ہے کہ آپ شریک تھے یا نہیں لیکن آپ کے چچاؤں کی شرکت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۷۴) ایضاً۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے خاکسار کا مضمون بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت پر۔

(۷۵) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۱۸ - ۱۷

(۷۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۰ - ۱۹ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۸۷ - ۸۴؛ بلاذری، انساب، اول ص ۱۰۰ - ۹۹۔

(۷۷) ایضاً ص ۲۰ نیز ابن اسحاق ص ۸۳ - ۸۲ اور بلاذری، انساب، اول ص ۹۸ -

(۷۸) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۵

(۷۹) ایضاً ص ۲۰

(۸۰) ایضاً

(۸۱) ایضاً ص ۲۴ - ۲۲ - ابن اسحاق ۱۰۴ - ۱۰۷؛ بلاذری، انساب، اوّل ص ۱۰۶ - ۱۰۳

(۸۲) ایضاً ص ۲۴ - نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۱۳۹ - ۱۱۱؛ بلاذری، اوّل ص ۲۴ - ۱۱۲ نیز ص ۵۶ - ۱۲۵۔

(۸۳) ایضاً ص ۲۵

(۸۴) تاریخ لیعقوبی ص ۲۶ - ابن اسحاق ص ۸۰ - ۱۸۱ نے کہا ہے کہ واپسی پر رسول کریم کی تصدیق کرنے کے سبب حضرت ابوبکر کو صدیق لقب ملا تھا۔

(۸۵) بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۳۶۲ کا بیان ہے کہ فتح مکّہ کے دن ام ہانی بنت ابی طالب کے شوہر کا نام ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی تھا۔ ہبیرہ نے اسلام قبول نہیں کیا اور بھاگ کر نجران چلا گیا جہاں وہ بحالتِ شرک مرگیا۔ نیز ملاحظہ ہو ص ۴۵۹ ابن سعد، طبقات، جلد ہشتم ص ۵۲ - ۱۵۱ اور ص ۴۷

(۸۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۸ - ۲۷

(۸۷) ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۲۰ - ۱۱۷؛ بلاذری، انساب، اول ص ۲۲ - ۱۱۷

(۸۸) ابن اسحاق ص ۱۴۶؛ بلاذری، انساب الاشراف، اوّل ص ۱۹۸

(۸۹) ابن سعد، طبقات، سوم ص ۵۰ (عبیدہ بن حارث کے لئے) اور چہارم ص ۳۴ -

(۹۰) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۸

(۹۱) بلاذری، انساب، اول ص ۱۵۸

(۹۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۲۳

(۹۳) ایضاً ص ۳۰ - ۲۹ - ابن اسحاق ص ۵۵ - ۱۴۶ اور بلاذری، انساب اول ص ۲۲۷ - ۱۹۸ نے بہت تفصیل سے ہجرتِ حبشہ اور اس کے متعلق واقعات بیان کیے ہیں۔ اور دونوں نے حضرت عمرو بن عاص کے بارے میں اس بدنما واقعہ کا حوالہ تک نہیں دیا ہے۔ البتہ بلاذری نے دوسرے انداز سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔(ص ۳۳ - ۲۳۲)

(۹۴) ایضاً ص ۳۲ - ۳۱

(۹۵) ابن اسحاق ص ۶۱ - ۱۵۹ اور بلاذری، انساب، اوّل ص ۲۵ - ۲۲۹

(۹۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۲

(۹۷) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۳۵ - ۳۳

(۹۸) ایضاً، ص ۳۵ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۹۲ - ۱۹۱ اور بلاذری، انساب اوّل ص ۷ - ۲۳۶

(۹۹) ایضاً ص ۳۶

(۱۰۰) ابن اسحاق ص ۹۴ - ۱۹۳

(۱۰۱) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۰ - ۳۷ - اس کی تائید ابن اسحاق ص ۲۰۶ - ۱۹۷ اور بلاذری، انساب، اوّل ص ۵۴ - ۲۲۸ سے ہوتی ہے۔

(۱۰۲) تاریخ لیعقوبی، انساب، اوّل ۷۰ - ۲۶۹

(۱۰۳) بلاذری، انساب، اوّل ص ۷۰ - ۲۶۹

(۱۰۴) تاریخ لیعقوبی، دوم، ص ۴۲

(۱۰۵) ایضاً ص ۴۴ - ۴۳

(۱۰۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۴۶ - ۴۵

(۱۰۷) ایضاً ص ۴۸ - ۴۷ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۹۰ - ۲۷۰، بلاذری، انساب، اول ص ۳۸ - ۳۱۱

(۱۰۸) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۳ - ۵۰

(۱۰۹) ابن اسحاق ص ۴۱ - ۲۴۰ (عبداللہ بن سلام کے اسلام کے لیے) اور بلاذری، انساب اول ص ۲۶۶

(۱۱۰) ابن سعد، دوم ص ۶۶ نے مسلم لشکر کی تعداد تین ہزار بتائی ہے۔

(۱۱۱) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۳ - نیز ملاحظہ کیجئے ابن اسحاق ص ۹۳ - ۴۹۲؛ بلاذری، انساب، اوّل ص ۴۲ - ۳۴۱

(۱۱۱ الف) واقعۂ مصطلق کے بارے میں قرآنی آیات کے نزول پر بحث کے لیے دیکھئے خاکسار کا مضمون مجلہ تحقیقات اسلامی علیگڑھ کے جنوری کے شمارے میں۔

(۱۱۲) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۶ - ۵۴ - ابن اسحاق ص ۵۰۴ - ابن سعد، دوم ص ۹۷ اور واقدی ص ۶۱۱ دس سالہ معاہدہ بتاتے ہیں اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

(۱۱۳) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۵۷ - ۵۶

(۱۱۴) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۱ - ۵۸ اور ص ۶۴ - ۶۲

(۱۱۵) ملاحظہ کیجئے بلاذری، انساب، اول ص ۳۶۶

(۱۱۶) تاریخ لیعقوبی، دوم ص ۶۶ - ۶۵

(۱۱۷) ایضاً ص ۶۸ - ۶۶ - ابن اسحاق ص ۲۰۲، ابنِ سعد، دوم ص ۱۶۵ - بلاذری، انساب اول ص ۳۶۸ وغیرہ غزوۂ تبوک کا سبب رومی یا بازنطینی حملے اور اجتماع کو قرار دیتے ہیں۔

(۱۱۸) ایضاً ص ۷۵ - ۶۹ - مکمل بحث و تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجئے مونٹگمری واٹ، MUHAMMAD AT MEDINA، آکسفورڈ ۱۹۵۶ء ص ۳۳۹ تا ۳۴۳، نیز خاکسار کی آنے والی کتاب ORGANISATION OF GOVT. UNDER THE PROPHET، باب سوم - نیز بلاذری، انساب اوّل ص ۸۲ - ۳۷۱

(۱۱۹) ایضاً ص ۷۷ - ۷۶ - نیز خاکسار کی انگریزی مذکورہ بالا کتاب کے ابواب چہارم و پنجم۔

(۱۲۰) ایضاً ص ۷۸ - ۷۷ - نیز ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۵۹ - ۶۵۲ - بلاذری، انساب، اول ص ۵۳۱۔

(۱۲۱) ایضاً ص ۸۰ - ۷۹ -

(۱۲۲) ایضاً ص ۸۲ - ۸۰ - تفصیلات کے لیے خادم کی کتاب کا باب چہارم۔

(۱۲۳) ایضاً ص ۸۶ - ۸۴ - موازنہ کے لیے ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب اول ۴۵۴ - ۳۹۹ -

(۱۲۴) ایضاً ص ۸۸ - ۸۷

(۱۲۵) ایضاً ص ۱۰۸ - ۸۹

(۱۲۶) ایضاً ص ۱۱۲ - ۱۰۹ - موازنہ کے لیے ملاحظہ کیجئے: ابن اسحاق ص ۵۲ - ۶۴۹ - ابن سعد، دوم ص ۸۹ - ۱۷۲ -

(۱۲۷) ایضاً ص ۱۱۵ - ۱۱۳ - ابن اسحاق ص ۸۳ - ۶۸۲؛ ابن سعد، دوم ص ۶۰ - ۲۵۸؛ بلاذری، انساب اول ص ۵۶۹ -

(۱۲۸) ایضاً ص ۲۲ - ۱۱۶ -

ابنِ حزم الاندلسی اور جوامع السیرۃ

تحریر : ڈاکٹر احسان عباس، ڈاکٹر ناصر الدین اسد

ترجمہ و اضافہ : محمد اجمل اصلاحی

تقدیم و تعارف

سیرت نبوی پر علامہ ابن حزم کی کتاب 'جوامع السیرۃ' کا یہ تعارف دراصل اس مقدمہ کا اردو ترجمہ ہے جو کتاب کے محققین ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد نے شروع میں اس کتاب پر لکھا ہے۔ سیرت پر یہ گرانقدر کتاب پہلی بار دونوں صاحبان کی مشترک کوشش سے منظرِ عام پر آئی اور دار المعارف مصر سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد دونوں ہی عربی زبان کے معروف اور بلند پایہ ادیب، نقاد، محقق اور مصنف ہیں۔ ڈاکٹر احسان عباس ۱۹۲۰ء میں فلسطین میں پیدا ہوئے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری قاہرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ایک عرصہ سے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ پچاس سے زائد کتابوں کے مصنف، محقق اور مترجم ہیں۔ اندلس پر 'المکتبۃ الاندلسیۃ' کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور متعدد کتابیں شائع کیں۔ چند اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں :

۱۔ تاریخ الادب الاندلسی (دو حصوں میں ہے)
۲۔ تاریخ النقد الادبی عند العرب
۳۔ العرب فی صقلیۃ
۴۔ فن الشعر
۵۔ فن السیرۃ
۶۔ عبدالوہاب البیاتی

اس کے علاوہ ابن حمدیس صقلی کا دیوان اور ابن حزم کے رسائل ایڈٹ کیے، شوقی ضیف اور احمد امین کے اشتراک سے خریدۃ القصر کے دو حصوں کی تحقیق کی۔ ترجموں میں ارسطو کی کتاب الشعر اور ٹی ایس ایلیٹ قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ناصر الدین اسد نے جاہلی شاعری کے مآخذ اور ان کی تاریخی قدر و قیمت پر اپنے معرکۃ الآرا مقالہ پر

قاہرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ قاہرہ اور دمشق کی اکیڈمیوں کے رکن ہیں۔ ایک مدت تک اردن یونیورسٹی کے ریکٹر اور لیبیا یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے۔

فلسطین میں جدید عربی شاعری، جدید افسانہ اور فلسطین و اردن کے جدید ادبی رجحانات پر متعدد کتابوں کے علاوہ جاہلی شاعری پر ان کی دو تصنیفات اہم ہیں۔ ایک تو ڈاکٹریٹ کا مذکورہ مقالہ جو "مصادر الشعر الجاہلی وقیمتہا التاریخیۃ" کے نام سے دار المعارف قاہرہ سے شائع ہوا۔ اس موضوع پر ایسی محققانہ کتاب اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔ اس مقالہ نے بالواسطہ طور پر جاہلی شاعری کے بارے میں مارگولیتھ اور طٰہٰ حسین کے نظریات کا قلع قمع کر دیا۔ دوسری کتاب "القیان والغناء فی الشعر الجاہلی" ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دو جاہلی شعراء قیس بن الخطیم اور حادرہ کے دواوین بھی ایڈٹ کیے ہیں۔

"جوامع السیرۃ" کی تحقیق کا کام ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصر الدین اسد کے اشتراک اور احمد محمد شاکر کی نظر ثانی سے انجام پایا۔ ان حضرات کے سامنے چونکہ جوامع السیرۃ کا ایک ہی مخطوطہ تھا اور اس وقت تک ابن عبد البر کی کتاب الدُّرَر فی اختصار المغازی والسِّیَر شائع نہیں ہوئی تھی، اس لئے بہت سی غلطیاں رہ گئیں جن کی جانب ڈاکٹر شوقی ضیف نے الدُّرَر کے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے۔ جوامع السیرۃ کے ساتھ ابن حزم کے پانچ دوسرے رسائل بھی شائع کئے جو مخطوطہ میں سیرت کے ساتھ منسلک تھے وہ رسائل یہ ہیں:

۱۔ القرآات المشہورۃ فی الامصار الآتیۃ مجیئ التواتر

۲۔ أسماءُ الصحابۃ الرواۃ وما لکلِ واحدٍ من العدد

۳۔ اصحاب الفتیا من الصحابۃ ومن بعدھم

۴۔ جمل فتوح الاسلام بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۵۔ أسماءُ الخلفاء والوُلاۃ وذکر مددھم

"جوامع السیرۃ" کے مقدمہ میں ابن حزم کی تاریخ نگاری اور کتاب کی خصوصیات نیز مخطوطہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی لیکن ابنِ حزم کے حالات زندگی سے تعرض نہیں کیا گیا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ حالات و تصنیفات کا ایک مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے، چنانچہ اس مضمون کا پہلا حصہ جو "مصنف" کے ذیلی عنوان سے ہے مترجم کا اضافہ ہے مضمون کے بعض اجزاء اصل موضوع سے غیر متعلق تھے اس لیے انھیں حذف کر دیا گیا۔ مصنف کے حالات کے مآخذ اور حوالہ جات ظاہر ہے مترجم کے ہیں لیکن اس کے علاوہ ذیلی عناوین اور متفرق حواشی بھی مترجم کی جانب سے ہیں، ان حواشی کے بعد قوسین میں "مترجم" کا لفظ درج کر دیا گیا ہے۔

۲۷ شعبان ۱۴۰۱ھ — محمد اجمل اصلاحی مدیر معاون مجلہ ثقافۃ الہند

آزاد بھون، نئی دہلی ۲

مُصنّف

جوامع السیرۃ تاریخِ اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیت علامہ ابنِ حزم کی تصنیف ہے علامہ کا نام اور سلسلۂ نسب یہ ہے[۱]:

ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح بن خلف بن معدان بن سفیان بن یزید[۲]۔ ابن حزم کے جدِ امجد یزید فارسی نژاد اور حضرت معاویہؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیان کے حلیف تھے۔ مشرق میں جب عباسیوں کا آفتاب طلوع ہوا اور بنو امیہ نے اندلس میں اپنی سلطنت قائم کی تو ابن حزم کے جدِ اعلیٰ خلف نے بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ اندلس کا رخ کیا اور لبلہ کے ایک گاؤں مُنت لیشم میں سکونت پذیر ہوئے۔ ابنِ حزم کے والد احمد بن سعید[۳] صاحب علم ادیب اور انشا پرداز تھے۔ بنو امیہ سے دیرینہ روابط اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے منصور بن ابی عامر اور اس کے بعد مظفر بن منصور کے عہد میں منصبِ وزارت پر فائز ہوئے۔ رمضان ۳۸۴ھ مطابق نومبر ۹۹۴ء میں ابن حزم نے قرطبہ میں جب آنکھیں کھولیں تو عیش و عشرت کے سارے اسباب مہیا تھے۔ پھولوں کی سیج پر پروان چڑھے۔ بچپن بڑے ناز و نعم میں گذرا، تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا، ذرا ہوشیار ہوئے تو ان کے والد نے ایک مرد صالح ابوالحسین بن علی فاسی کو ان کا اتالیق اور سرپرست مقرر کیا۔ ابوالحسین کی رہنمائی میں ابن حزم نے اپنا علمی سفر بڑی تیز گامی سے طے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، غیر معمولی ذہانت، بلا کا حافظہ اور حاضر دماغی پھر ذوق و شوق کی فراوانی اور اس کے ساتھ یکسوئی و جانفشانی اور فراغت و خوشحالی۔ غرض سارے حالات سازگار تھے چنانچہ مختلف علوم و فنون میں بہت جلد حیرت انگیز مہارت پیدا کر لی۔ مگر ابن حزم نے جب اس عالمِ ہست و بود میں قدم رکھا تھا تو بنو امیہ کا چل چلاؤ تھا۔ ابھی ناز پروردہ ابن حزم اپنی زندگی کی چودہ بہاریں ہی دیکھ پائے تھے کہ قرطبہ سیاسی شورشوں کی آماج گاہ بن گیا۔ ابن حزم کا خاندان قدرتی طور پر سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ ان کے والد نے سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کی اور مغربی قرطبہ میں اپنے محل کو چھوڑ کر مشرقی حصہ کے قدیم مکان میں منتقل ہو گئے اور ۴۰۲ھ میں وفات پائی۔

شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھا اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ ۴۰۴ھ میں ابن حزم نے مجبوراً قرطبہ کو خیر باد کہا اور مُریّہ چلے گئے مگر وہاں بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ مُریّہ کے حاکم خیران نے ان پر اموی سلطنت کے احیاء کا الزام لگایا اور ایک ماہ قید کرنے کے بعد جلا وطن کر دیا۔ یہ جلا وطنی ان کے لئے زیادہ صبر آزما ثابت نہیں ہوئی۔ بَلَنسیہ میں عبدالرحمٰن بن محمد نے خلافت قائم کی تو ابن حزم اس کی تائید و حمایت کے لیے بلنسیہ پہنچے اور خلیفہ کے دستِ راست بنے رہے۔ غرناطہ کی مہم میں عبدالرحمٰن کو شکست ہوئی تو ابن حزم اس کے ساتھ تھے۔ عبدالرحمٰن کو قتل کیا گیا اور ابن حزم دشمن کے ہاتھوں قید ہوئے۔ ایک مدت تک جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد ۴۰۹ھ میں قرطبہ واپس آئے اور اپنی علمی مصروفیات میں منہمک ہو گئے۔ آلِ حمود کا زوال ہوا تو پھر بنو امیہ کا چراغ روشن ہوا اگرچہ یہ روشنی پائیدار ثابت نہیں ہوئی۔ ۴۱۴ھ میں اہل قرطبہ نے عبدالرحمٰن بن ہشام بن عبدالجبار المستظہر کو خلیفہ بنایا جو اپنی ناتجربہ کاری کے سبب دو ماہ کے بعد قتل کیا گیا۔ ابن حزم المستظہر کے وزیر تھے، اس کا قتل ہوا تو پھر یہ جیل پہنچے۔

بہ ہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیدا است

اس کے بعد ابن حزم۔ یاقوت کے بیان کے مطابق۔ ہشام المعتد باللہ (۴۱۸ - ۴۲۲) کے عہد میں وزیر بنے المعتد باللہ آخری اموی حکمران تھا جس کی معزولی کے بعد اندلس سے اموی سلطنت کا جنازہ نکل گیا اور طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا۔ اب ابن حزم سیاست سے یک قلم کنارہ کش ہو کر ہمہ تن علم و تحقیق بحث و مذاکرہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

اس دور میں ان کی علمی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں۔ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کے لیے اندلس کی مختلف ریاستوں مثلاً قیروان، میورقہ، بلنسیہ اور اشبیلیہ کا سفر کیا۔ ان اسفار کے دوران افادہ و استفادہ کے علاوہ علماً سے مناظرے اور مناقشے بھی ہوئے۔ اگر ایک طرف ابن حزم کے احباب و تلامذہ کا حلقہ وسیع ہوا تو دوسری طرف ان کے مخالفین کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

ابن حزم اپنی خاندانی وجاہت، فارغ البالی، اموی سلطنت سے قدیم وابستگی، حق گوئی و بے باکی، ندرت فکر، وسعت نظر اور انفرادیت کی وجہ سے مالکی فقہا اور حکام دونوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ابن حزم کا بے کراں علم تنگی چشم حسود کو کیوں کر راس آسکتا تھا، چنانچہ یہ فقہا مسلسل حکام کے کان بھرتے اور ابن حزم کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے رہے۔ ان کے ہاتھوں ابن حزم کو سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔ کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جو ظالموں نے استعمال نہ کیا ہو۔ تکفیر و تضلیل کی، بے بنیاد الزامات لگائے، بنو امیہ کی ہوا خواہی کے ساتھ ناصبیت کی جھوٹی تہمت تراشی، حکام کو برانگیختہ اور عوام کو برگشتہ کیا، طلبہ کو استفادہ اور قربت سے روکا۔ اس کے نتیجہ میں حکام نے قید و بند اور جلاوطنی کی سزائیں دیں لیکن سب سے زیادہ روح فرسا اور شرمناک سانحہ اشبیلیہ کے حکمران معتضد بن عباد (۴۳۴ - ۴۶۱ ھ) کے زمانہ میں پیش آیا۔ اس نے ابن حزم کی بہت سی تصنیفات کو نذر آتش کر دیا اور برسر عام ان کی کتابیں پارہ پارہ کی گئیں ؎

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

ابن حزم کو حالات نے بہت سخت جان بنا دیا تھا۔ اس واقعہ سے ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے البتہ ان کے لہجہ کی تندی اور خشمناکی میں اضافہ ہو گیا۔ حریفوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فَإِنْ تُحْرِقُوا الْقِرْطَاسَ لَا تُحْرِقُوا الَّذِي
تَضَمَّنَهُ الْقِرْطَاسُ بَلْ هُوَ فِي صَدْرِي
يَسِيرُ مَعِي حَيْثُ اسْتَقَلَّتْ رَكَائِبِي
وَيَنْزِلُ إِنْ أَنْزِلْ وَيُدْفَنُ فِي قَبْرِي
دَعُونِي مِنْ إِحْرَاقِ رَقٍّ وَكَاغِدٍ
وَقُولُوا بِعِلْمٍ كَيْ يَرَى النَّاسُ مَنْ يَدْرِي
وَإِلَّا فَعُودُوا لِلْمَكَاتِبِ بَدْأَةً
فَكَمْ دُونَ مَا تَبْغُونَ لِلّٰهِ مِنْ سِتْرٍ

ترجمہ : (تم کاغذ تو جلا سکتے ہو مگر اس کی تحریر جلا نہیں سکتے کہ وہ کاغذ پر نہیں میرے سینے میں محفوظ ہے۔ یہ علم سفر و حضر ہر جگہ میرے ساتھ رہتا ہے اور میرے ساتھ ہی میری قبر میں جائے گا۔
کاغذ اور کھال جلانے کی بزدلانہ روش ترک کرو۔ علم کے میدان میں اترو اور اپنا سرمایہ پیش کرو تاکہ دنیا دیکھے کہ کون صاحبِ علم ہے۔ اگر یہ بس میں نہیں ہے تو پھر مکتب میں واپس جاؤ۔ ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے)

آخر کار ابن حزم لبلہ میں واقع اپنے آبائی گاؤں میں خانہ نشین ہو گئے۔ عوام و خواص کی مخالفت کے باوجود جو مخلص تشنگانِ علم خدمت میں حاضر ہوتے وہ ان کے علوم و معارف کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے۔ سارا وقت مطالعہ، تحقیق اور تصنیف و تالیف میں گزرتا۔ اسی قابلِ رشک حالت میں ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۰۶۴ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا فرحمہ اللہ و سامحہ۔

ابن حزم کا ابتدائی رجحان اپنے ہم وطنوں کے برخلاف شافعی مسلک کی جانب تھا، بعد میں انہوں نے ظاہری مسلک اختیار کیا اور اس کی تائید و تاسیس اور نشر و اشاعت میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ظاہری مسلک کی خوش قسمتی تھی کہ جس زمانے میں قاضی ابن ابی یعلی مشرق میں فقہ ظاہری کی جگہ فقہ حنبلی کو رواج دے رہے تھے اندلس میں ابن حزم جیسا نابغہ مل گیا جو ہر میدان میں اپنے ہم عصروں سے سیکڑوں قدم آگے تھا۔

ابن حزم نے اگر ایک طرف وقت کے مشاہیر علما مثلاً ابن جسورؒ (متوفی ۴۰۱ھ) ابن عبدالبرؒ (متوفی ۴۶۳ھ) ابن الفرضیؒ (متوفی ۴۰۳ھ) ابوعمر طلمنکیؒ (متوفی ۴۲۹ھ) ابوالخیار ظاہریؒ (متوفی ۴۲۶ھ) عبداللہ بن ربیع تمیمیؒ (متوفی ۴۱۵ھ) ابوالقاسم ازدیؒ (متوفی ۴۱۰ھ) قاضی حمام بن احمدؒ (متوفی ۴۲۱ھ) قاضی یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن مسعودؒ (متوفی ۴۰۲ھ) وغیرہ سے استفادہ کیا تھا تو دوسری طرف اندلس کے پورے علمی ذخیرہ کو ہضم کیا تھا۔ ان کی علمی شخصیت بڑی جامع کمالات اور ہمہ جہت تھی۔ تفسیر و حدیث و فقہ و اصول، تاریخ و انساب، سیاسیات و نفسیات، تاریخ مذاہب و فرق، عقائد و خلافیات ادب و شاعری سب پر یکساں عبور تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تگ و تاز کا دائرہ منطق اور فلسفہ تک وسیع تھا۔

سیاسی اور مذہبی مخالفتوں کے طوفان میں بھی تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا اور عوام و خواص کی بے اعتنائی کے باوجود مختلف علوم و فنون پر کتابوں کا انبار لگا دیا۔ یاقوت کے بقول کثرتِ تصانیف میں امام طبری کے سوا متقدمین میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ ابن حزم کے بیٹے ابورافع الفضل کا بیان ہے کہ ان کے پاس ان کے والد کی کتابیں انہیں کے خط میں تقریباً چار سو جلدوں میں موجود تھیں جو تقریباً اسی ہزار اوراق پر مشتمل تھیں[13]

فقہ حدیث پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "الایصال الی فهم کتاب الخصال الجامعة المحمل شرائع الاسلام فی الواجب والحلال والحرام وسائر الاحکام علی ما أوجبه القرآن والسنة والاجماع" اس کتاب میں فقہی مسائل میں صحابہ، تابعین اور بعد کے ائمہ اسلام کے اقوال، ان کے موافق و مخالف دلائل اور ان کے بارے میں تمام قوی اور ضعیف احادیث سندوں کے ساتھ ذکر کی تھیں اور پھر سب پر نقد و جرح کے بعد ان مسائل کی تحقیق و تنقیح کی تھی۔ ظاہری نظام فقہ پر ابن حزم کی تصنیف المحلی کے بارے میں شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کا قول ہے کہ اسلام کے علمی ذخیرہ میں ابن حزم کی

'المحلیٰ' اور شیخ موفق (ابن قدامہ) کی 'المغنی' کا کوئی جواب نہیں[۱۴] 'المحلیٰ' کا پہلا ایڈیشن لائڈن سے چھپا تھا۔ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء میں زیدان ابوالمکارم حسن اور حسن زیدان طلبہ کی تصحیح سے ۹ جلدوں میں قاہرہ سے ایک عمدہ ایڈیشن نکلا۔ اصولِ فقہ پر ابن حزم کی معرکتہ الآرا کتاب الاحکام فی اصول الاحکام کے آٹھ حصے دو جلدوں میں شیخ احمد محمد شاکر کی تحقیق سے شائع ہوئے ہیں مذاہب و فرق پر مشہور کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل کئی بار چھپ چکی ہے اردو میں مولانا عبداللہ عمادی کے قلم سے اس کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں حیدرآباد سے شائع ہوا سیرت پر ابن حزم کی کتاب "جوامع السیر" کا تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انساب پر ایک کتاب جمہرۃ انساب العرب لیوی پروونسال کی کوشش سے ۱۹۴۸ء میں قاہرہ سے چھپی تھی ۱۹۶۲ء میں اس کا نفیس ایڈیشن عبدالسلام ہارون کی تحقیق سے شائع ہوا۔ اخلاق و نفسیات میں ابن حزم کی بصیرت اور بالغ نظری دیکھنی ہو تو ان کے دو رسالوں مداواۃ النفوس اور طوق الحمامہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اوّل الذکر کا ایک تحقیقی ایڈیشن عبدالرحمٰن محمد عثمان کی تحقیق سے قاہرہ سے متعدد بار چھپ چکا ہے۔ طوق الحمامہ کا موضوع عشق و محبت ہے۔ محبت کی ماہیت، مراتب، کیفیات اور نفسیات پر بڑی دیدہ وری سے روشنی ڈالی ہے۔ اس رسالہ کے متعدد ایڈیشن عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانوں میں نکل چکے ہیں۔ ابن حزم کے شاگرد رشید حمیدی نے ان کا مجموعہ کلام بھی مرتب کیا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ ابن حزم نے تاریخی، سیاسی اور اختلافی مسائل پر بے شمار رسائل لکھے جن میں سے کچھ طبع ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر احسان عباس نے ۱۹۶۰ء میں "الرد علی ابن نغریلۃ الیہودی و رسائل اخریٰ" کے نام سے ابن حزم کے رسائل کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ اس سے قبل ۱۹۴۰ء میں سعید الافغانی نے "المفاضلۃ بین الصحابۃ" دمشق سے شائع کیا تھا۔ "نقط العروس فی تواریخ الخلفاء" کا ایک تحقیقی ایڈیشن ڈاکٹر شوقی ضیف کی کوشش سے ۱۹۵۱ء میں طبع ہوا۔

ابن حزم کی یہ تمام کتابیں مصنف کی وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر، اجتہادِ فکر اور زورِ استدلال کا شاہکار ہیں۔ ابن حزم کا اسلوب واضح اور رواں، لہجہ تند و تیز، تنقید سخت، قلم بیباک اور فیصلے بے لاگ ہوتے ہیں۔ حریفوں کو دنداں شکن جواب دینے کے قائل تھے۔ مزاج میں کچھ تو طبعی حدت تھی جو شدتِ احساس اور بعض امراض کا نتیجہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن حزم جن تلخ حالات سے گزرے تھے اور مخالفین نے جو اذیتیں پہنچائی تھیں ان کی وجہ سے ابن حزم کی زبان و قلم میں زہر ہی زہر بھر گیا تھا۔ مقلد اور تنگ نظر علما کی تردید میں ابن حزم نے ان ائمہ مجتہدین اور علمائے متقدمین کی بہت سی رایوں پر تنقید کی جن کی رائے سے معمولی اختلاف بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ ابن حزم جیسے حکیم و مفکر اور پاک دل و پاکباز سے ہمیں توقع تھی کہ ان کی تنقید کا لہجہ بھی متوازن اور پاکیزہ ہو گا مگر ایسا نہ ہو سکا، ابن عریف ابن حزم کے قلم کو حجاج کی تلوار سے تشبیہ دیتے تھے[۱۵] لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک ابن حزم کے ان حاسدوں اور مخالفوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے طوق الحمامہ کے مشک بیز گوہر بار قلم کو خونریز و شعلہ بار بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس شخص کی کتابیں بر سرِ عام نذرِ آتش کی گئی ہوں اس سے شبنم مزاجی اور شیریں مقالی کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے؟ بہر حال فقہاء و حکام کی ساری مخالفتوں اور تکفیر و تضلیل کے

باوجود ابن حزم کو علم کے دربار میں شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی۔

وجہ تالیف

فرض کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ جوامع السیرۃ کی تصنیف سے ابن حزم کا مقصد اپنے طلبہ کے لیے ایک ایسی جامع اور مختصر کتاب مرتب کرنا تھا جس سے استفادہ اور مراجعت آسان ہو جیسا کہ انہوں نے اپنے بہت سے تاریخی رسائل مثلاً رسالہ "نقط العروس" اور رجال قراءات، حدیث، فتوحات اور تواریخ خلفاء وغیرہ یہ اپنے دوسرے رسائل میں کیا ہے۔ نیز وہ اس کتاب میں سیرت نبوی پر وہ بنیادی مواد فراہم کرنا چاہتے تھے جس سے سیرت کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے یہ تعلیمی مقصد اس سیرت کی تصنیف کا ایک قوی محرک رہا ہو جس نے ابن حزم جیسے عالم کے لیے مہمیز کا کام کیا ہو، لیکن تنہا یہی ایک محرک نہ تھا۔ جو لوگ اہل ظاہر کے یہاں عام طور پر اور ابن حزم کے یہاں خاص طور پر "نقل" — اور سیرت نقل کا ایک اہم حصہ ہے۔ اور تکثیر سنن کی اہمیت سے واقف ہیں انھیں نظر آئے گا کہ ایک نئے طرز سے سیرت کا مطالعہ، اس کے مواد کی ترکیز و تلخیص اور اسے قلمبند کرنا خود ان کے مسلک کا ایک جزء ہے۔ "نقل" ظاہری مسلک کی ایک اساس ہی نہیں، بلکہ ابن حزم کے نزدیک "نقل" ہی وہ خصوصیت ہے جو ملتِ اسلامیہ کو ساری ملتوں میں ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے مذاہب پر ابن حزم نے جو سخت تنقید کی ہے اس کی بنیاد ان کے یہاں یہی "نقل" کی کمی اور ناقلین کا ناقابلِ اعتماد ہونا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے خیال میں یہ مذاہب بے لاگ تنقید کی تاب نہیں لا سکتے۔

لیکن سیرت نبوی نقل کا صرف ایک حصہ ہی نہیں ہے بلکہ ابن حزم کی نظر میں کمال انسانی کی معراج بھی ہے۔ اس لئے سیرت اگر ان کا محبوب موضوع ہو اور وہ لوگوں کے لئے اُسے آسان، عام فہم اور واضح انداز میں پیش کرنا چاہتے ہوں تو کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے جس کا عقیدہ یہ ہو کہ "جو شخص آخرت کی فلاح، دنیا کی دانائی، عدل و انصاف سارے محاسن اخلاق کی جامعیت اور تمام خوبیوں سے آراستہ ہونا چاہتا ہو تو اسے جہاں تک ممکن ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا اور آپ کے اخلاق و کردار کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے"[۱۶]۔ اس سے سیرت نبوی سے انتہائی شغف اور راز سمجھ اس کی تدوین کے اسباب و محرکات کے بارے میں زیادہ دریافت کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

معاملہ کی اہمیت میں اور اضافہ ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سیرتِ رسولؐ ابن حزم کے نزدیک آپ کی نبوت کی حقانیت کا ایک روشن اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ معجزہ دلائل نبوت میں سے ہے لیکن آپ کی سیرت وہ معجزہ ہے جس کی طاقت، تاثیر اور معنویت تمام مادی معجزات سے زیادہ ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں:

> "جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بغور مطالعہ کرے گا وہ لامحالہ آپ کی تصدیق پر مجبور ہو گا۔ آپ کی سیرت گواہی دے گی کہ آپ حقیقت میں اللہ کے رسولؐ ہیں۔ اگر اس کے سامنے آپ کی سیرت کے سوا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہو تو یہی اس کے لئے کافی ہے"[۱۷]۔

ابن حزم اپنی یہ رائے مثالوں کے ذریعہ واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"آپ کا نشوونما۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ۔ جہالت کے ماحول میں ہوا۔ آپ نہ پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے۔ دو بار کے سوا کبھی ملک کے باہر نہیں گئے : ایک بار بچپن میں چچا کے ساتھ شام کے قریبی علاقہ میں گئے ، دوسری بار بھی مہینں کا سفر کیا اور زیادہ روز قیام نہیں رہا کبھی اپنی قوم سے علیحدہ نہیں رہے پھر اللہ تعالیٰ نے جب سارے عرب کو آپ کے زیر نگیں کیا تو نہ آپ کے اندر کوئی تغیر واقع ہوا۔ اور نہ آپ کے اخلاق و کردار میں کوئی فرق رونما ہوا۔ یہاں تک کہ جب انتقال ہوا تو آپ کی زرہ کنبہ کی نان جویں کے لئے چند صاع جو کے عوض رہن تھی ، کبھی آپ کے ہاتھ میں دینار و درہم رات بھر نہیں رہے۔ جو مل جاتا زمین پر بیٹھ کر کھا لیتے، اپنی جوتیاں خود سیتے ، کپڑوں میں پیوند لگاتے اور اپنے اوپر ہمیشہ دوسروں کو ترجیح دیتے ۔ ایک جلیل القدر صحابی کا قتل ان کے دشمن یہودیوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ ایسے صحابی جن کا قتل کسی لشکر کے لئے قیامت سے کم نہیں لیکن اس کی وجہ سے دشمنوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اس واقعہ کے بہانے آپ نے ان کا خون نہیں بہایا کسی ایک آدمی کو بھی قتل نہیں کیا۔ ان کی جائداد کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ خود اپنی جانب سے سو اونٹنیاں خون بہا میں دیں جبکہ اس وقت آپ اپنے معاش کے لیے ایک اونٹ کے محتاج تھے ۔ ۔ ۔ [۱۸]"

اسی جذبہ بلکہ اسی اسلوب میں ابن حزم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی، اور اس کے دو مباحث علامات نبوت اور آپ کے اخلاق و عادات پر خصوصی توجہ دی۔ یہی دونوں موضوعات ان کی دوسری تحریروں میں بھی بار بار سامنے آتے ہیں[۱۹]۔ اس لئے کہ یہ آپ کی نبوت کے شاہد عدل ہیں نیز مؤخر الذکر کمال اخلاق کے عملی پہلو کا آئینہ دار ہے ۔

مآخذ

ابن حزم نے اپنی سیرت کے دو مآخذ کا ذکر کیا ہے ۔ ایک تو ابوحسان زیادی کی تاریخ دوسرے خلیفہ بن خیاط کی تاریخ[۲۰]۔ یہ دونوں کتابیں ناپید ہیں۔ ان کے کچھ متفرق اقتباسات بعض تاریخوں میں ملتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا تو مشکل ہے کہ یہ دونوں کتابیں ابن حزم کی نظر سے گذری تھیں یا انہوں نے بالواسطہ ان سے استفادہ کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ تاریخ خلیفہ بن خیاط بقی بن مخلد کی روایت سے اندلس میں بہت پہلے پہنچ چکی تھی[۲۱] اور بقی ابن حزم کے نزدیک "شیخ المفسرین والمحدثین" ہیں ۔

سیرت ابن حزم کے عمومی ڈھانچہ سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر ان کا اعتماد سیرت ابن اسحٰق پر ہے خاص طور پر جب وہ ایک ایک غزوہ پر گفتگو کرتے ہیں اور ہر غزوہ میں شریک ہونے والے مسلمان و مشرکین اور شہید ہونے والے مسلمانوں کے نام درج کرتے ہیں۔ روایت ابن اسحٰق کی اس سختی سے پیروی کرنے کے نتیجہ میں ایک عجیب صورت پیدا ہو گئی ہے ابن حزم نے اکثر اشخاص کا مکمل نسب بھی ذکر کیا ہے اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے وہ خود اس موضوع پر " الجمہرۃ "

جیسی کتاب کے مصنف ہیں اصل حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے انساب کے سلسلہ میں بھی ابن اسحٰق ہی کی روایت کا انتخاب کیا ہے جبکہ "جمہرۃ" میں اسے اختیار نہیں کیا، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ دونوں کتابوں کے زمانہ تصنیف میں طویل فاصلہ رہا ہو یا جمہرۃ کی تصنیف کے وقت جو کتابیں پیش نظر تھیں ان میں ابن اسحٰق کی روایت شامل نہیں تھی۔

ہمیں تقریباً یقین ہے کہ ابن حزم جیسے وسیع المطالعہ اور سیرت نبوی سے غیر معمولی دلچسپی رکھنے والے مورخ کی نگاہ سے سیرت کی بہت سی کتابیں گذری ہوں گی خاص طور پر موسیٰ بن عقبہ کی مغازی، سعید بن یحییٰ اموی کی کتاب السیر، ابوداؤد سجستانی اور ابو جعفر احمد بن قتیبہ کی اعلام النبوۃ، کیونکہ یہ تمام کتابیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سی تصنیفات اس وقت تک اندلس میں پہنچ چکی تھیں اور اندلسی علماء کے درمیان ان کی روایت اور مطالعہ کا سلسلہ جاری تھا[۲۲]

ابن حزم نے سیرت کی تصنیف میں اپنے شیخ اور معاصر ابو عمر بن عبدالبر مصنف "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" سے بھی استفادہ کیا۔ یہ کتاب اگرچہ مکمل صورت میں ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا کہ ابن حزم نے اس پر کس حد تک اعتماد کیا ہے[۲۳] لیکن اس کے کچھ اقتباسات جو ابن سید الناس نے محفوظ کر دیے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اپنے شیخ کی کتاب سے متعدد عبارتیں معمولی تصرف سے نقل کی ہیں[۲۴] الا یہ کہ یہ فرض کیا جائے کہ دونوں مصنفین یعنی ابن عبدالبر اور ابن حزم نے کسی تیسرے ماخذ سے استفادہ کیا ہو جو ہماری دسترس میں نہیں ہے[۲۵]

مقبولیت واہمیت

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن سید الناس کے سوا سیرت ابن عبدالبر کا سراغ ان کے بعد کے دوسرے مصنفین کے یہاں نہیں ملتا جبکہ سیرت ابن حزم کو ایک قابلِ اعتماد ماخذ کی حیثیت حاصل ہوئی اور چھٹی صدی ہجری کے بعد سیرت کے موضوع پر قلم اٹھانے والے متعدد مصنفین نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ابن کثیر نے سیرت ابن حزم سے دو اقتباسات نقل کئے ہیں ایک البدایہ والنہایہ میں دوسرا الفصول میں۔ موخرالذکر سیرت پر ابن کثیر کی ایک مختصر کتاب ہے سب سے زیادہ اقتباسات مقریزی کے یہاں ملتے ہیں۔ مقریزی کی کتاب امتاع الاسماع کا جو حصہ چھپا ہے اس میں ابن حزم کے پندرہ اقتباسات ہیں۔ مواہب لدنیہ کے مصنف نے بھی ایک مختصر عبارت لی ہے جیسے دیار بکری نے "تاریخ الخمیس" میں کئی جگہ نقل کیا ہے۔

ان اقتباسات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ابن حزم نے بعض شدید اختلافی مسائل خاص طور پر واقعات کی تاریخ اور ان کے زمانۂ وقوع کے سلسلہ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ بعض اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے سیرت ابن حزم کی اہمیت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہوتا ہے:

(الف) "اسی تاریخ کو (غریب) مہاجرین کی سہولت کے لئے زکوٰۃ فرض کی گئی جیسا کہ ابو محمد بن حزم نے ذکر کیا ہے بعض علماء کا قول ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی وہ معلوم نہ کر سکے کہ زکوٰۃ کب فرض ہوئی[۲۶]"

(ب) حافظ ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم لکھتے ہیں: غزوہ بنی المصطلق سے مسلمانوں کی واپسی میں اہل افک

نے چہ میگوئیاں کیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ صحیح سندوں سے ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ اس سلسلہ میں سعد بن عبادہ کے ساتھ سعد بن معاذ کی تکرار ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ راوی کا وہم ہے۔ اس لئے کہ سعد بن معاذ کا انتقال فتح بنو قریظہ کے بعد ہو چکا تھا اس میں کوئی شک نہیں اور بنو قریظہ کا واقعہ ذیقعدہ ۴ھ کے اواخر میں ہوا جبکہ غزوہ بنی المصطلق سعد بن عبادہ کے انتقال کے ایک سال چھ مہینے بعد شعبان ۶ھ میں پیش آیا۔ اور دونوں صاحبان کی تکرار غزوہ بنی المصطلق کے پچاس روز کے بعد ہوئی[۲۷]"

(ج) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی (یعنی عمرہ حدیبیہ میں مسلمانوں کی) تعداد سات سو تھی مگر ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ قطعی طور پر "شدید" وہم "ہے، ان کی صحیح تعداد جس میں کوئی شک نہیں تیرہ سو سے پندرہ سو تک تھی[۲۸]

ابن حزم کی تاریخ نویسی اور جوامع السیرۃ کی خصوصیات

ان مثالوں سے۔ اور اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں۔ جوامع السیرۃ کی انفرادیت دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے امتیازی وصف اور ابن حزم کی تاریخ نگاری کی خصوصیات پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔

نص کے تجزیہ میں یہ دقت نظر، دیدہ ریزی، غور و فکر اور موازنہ کے بعد صحیح روایت کا انتخاب ان غلط فہمیوں کی تصحیح جو عجلت یا قلت تدبر کی بنا پر صادر ہوتی ہیں ابن حزم کی تاریخ نگاری کی وہ خصوصیات ہیں جن کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

ان خصوصیات و اوصاف کی موجودگی میں ابن حزم کا قطعی اور فیصلہ کن لہجہ جو ان کے اسلوب تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے اور "لاشک" (کوئی شک نہیں) اور "لابد" (لازمی طور پر) کے الفاظ کی تکرار نہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے اور نہ گراں گزرتی ہے۔ اس لیے کہ ان پرزور اور ادعائی الفاظ کا سرچشمہ وہ یقین و اعتماد ہے جس کی بنیاد غیر جانبدارانہ علمی تحقیق اور قطعی طور پر ثابت شدہ نقل پر ہوتی ہے۔

تاریخوں کی تعیین و اندراج میں سخت احتیاط، تحقیق اور باریک بینی میں ابن حزم اپنے معاصرین میں اس حد تک معروف تھے کہ ان کے شاگرد حمیدی جہاں بھی اپنے استاذ کی روایت کو دوسروں کے مخالف پاتے ہیں وہاں "ابو محمد أعلم بالتواریخ" (ابن حزم کو تاریخوں کا زیادہ علم ہے) یا اسی مفہوم کا کوئی جملہ لکھتے ہیں[۲۹]

اسی وجہ سے سیرت ابن حزم میں آپ واقعات کی تاریخ کے سلسلہ میں ایک قطعی رائے پائیں گے جس میں کوئی تردد یا تذبذب نہیں ہے۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ ابن حزم ایک زبردست محقق اور نہایت محتاط مورخ ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ہجری تقویم کے بارے میں خود ان کی ایک مستقل رائے ہے۔ وہ ماہ ربیع الاول کو جس میں آنحضرت نے مدینہ ہجرت فرمائی ——— ہجری تقویم کا پہلا مہینہ قرار دیتے ہیں اور اسی سے واقعات سیرت کی تاریخ لکھتے ہیں۔ اس سے ابن حزم کی غرض اس ہجری تقویم کی مخالفت نہیں ہے جس پر حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمان متفق رہے ہیں اور جب

تک خدا کو منظور ہو گا متفق رہیں گے یعنی ماہ محرم کو ہجری تقویم کے نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل رہے گی - دراصل ان کا یہ طریقہ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے تاریخوں کے تعین میں زیادہ دقیق، موزوں اور قرین صواب ہے، خاص طور پر جبکہ مورخین نے واقدی کی طرح واقعات کی تاریخیں لکھنا چھوڑ دیا کہ فلاں واقعہ مثلاً آں حضرتؐ کی مدینہ آمد کے پندرھویں یا سولھویں مہینے کے شروع میں ہوا، اور اس کے بجائے یوں لکھنے لگے کہ فلاں واقعہ ۲ھ یا ۳ھ میں پیش آیا۔ ظاہر ہے محرم کو ہجری تقویم کا پہلا مہینہ قرار دینے کے بعد دونوں تعبیروں میں مہینوں کا فرق پڑ جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ واقعات کے زمانی تعین میں اختلافات بہت ہیں اور ابن حزم کی رائے سے ان میں مزید ایک رائے کا اضافہ ہوتا ہے لیکن ابن حزم اپنی رایوں کو جس وثوق اور اطمینان سے بیان کرتے ہیں اس کی وجہ سے ہم ان کی جانب مائل ہوتے ہیں اور انھیں ترجیح دیتے ہیں - وہ تنہا شخص ہیں جن کے یہاں جنگ کے وقوع یا زکوٰۃ کی فرضیت کی تاریخ پر یہ وثوق ہمیں ملتا ہے - یاد رہے کہ یہ وثوق خود اعتمادی میں غلو یا محض خود رائی پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد تحقیق و تدقیق پر ہے گذشتہ صفحات میں آپ نے دیکھا کہ اس تحقیق اور تنقید کے نتیجہ میں کس طرح تاریخوں کے سلسلہ میں بہت سی غلطیاں درست کیں۔ مثلاً واقعہ افک میں سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کے درمیان مبینہ تکرار کا مسئلہ گذر چکا ہے۔

اس فیصلہ کن قطعیت کے ساتھ ابن حزم کے یہاں ایک اور خصوصیت پائی جاتی ہے جو دراصل ظاہری مسلک کی دین ہے اس میں شبہ نہیں کہ سیرت کے اپنے مزاج اور مطلوبہ اختصار کی وجہ سے ابن حزم کو اس کا موقع نہ مل سکا کہ اپنے مسلک کی تائید میں نصوص سے احکام کا استنباط کر سکیں اسی لئے واقعات کی تشریح میں ظاہریت کھل کر سامنے نہیں آسکی لیکن اس تنگ دائرے میں اگر ذرا گنجائش ملی ہے تو بڑی دلچسپ صورت پیدا ہوئی ہے اور وہی فیصلہ کن انداز سامنے آیا ہے جس میں ابن حزم مشہور رہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب ابن حزم اپنے فریق کے مقابلہ میں نص کا سہارا لیتے ہیں -

اس کی ایک نمایاں مثال غزوہ بنی قریظہ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ہر شخص بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کرے۔ مسلمان جب چلے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ہم نماز ادا کریں گے اس لئے کہ وقت ہو جانے کے بعد تاخیر کرنے کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔ دوسروں نے کہا کہ ہم تو وہیں نماز ادا کریں گے جہاں ادا کرنے کا آپ نے حکم دیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نے عصر کی نماز رات میں ادا کی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو کسی فریق کو آپ نے سرزنش نہیں کی۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد ابن حزم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جہاں تک سرزنش کا سوال ہے تو وہ اس شخص کو کی جاتی ہے جس نے قصداً دیدہ و دانستہ معصیت کا ارتکاب کیا ہو، لیکن جو خیر کی نیت سے اس کی تعبیر کرے تو اگرچہ اس کا عمل درست نہ ہو پھر بھی سرزنش کا مستحق نہیں ہو گا۔ خدا جانتا ہے کہ اگر وہاں ہم ہوتے تو اس روز عصر کی نماز بنو قریظہ میں ہی ادا کرتے خواہ وہاں پہنچنے میں کئی دن گذر جاتے۔ جس طرح مزدلفہ کی شب کو مغرب کی نماز آپ نے عشا کے وقت میں اور عرفہ کے روز عصر کی نماز ظہر کے وقت میں منتقل کر دی اسی طرح اس روز عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچنے تک موخر کر دی، ان صورتوں میں باہم کوئی فرق نہیں ہے اور اطاعت ضروری ہے۔"[۱۳۵]

ابن حزم کے تاریخی مسلک کی صرف یہی خصوصیات نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی تندی اور سخت گیری کے باوجود وہ ایک انصاف پسند اور دیانت دار مورخ کی صفات سے بہرہ ور تھے۔ دیانتداری ان کی ایک عام خصوصیت ہے جو صرف سیرت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے سب میں یہ جلوہ گر ہے۔

ابن حزم پر یہ الزام سراسر ناانصافی پر مبنی ہے کہ وہ ابن حیان کے بقول بنو امیہ کے حامی اور دوسرے اہل قریش کے مخالف تھے[۳۱] یہ الزام اس شخص پر سخت زیادتی ہے جو زندگی بھر حق کا جویا اور شیدائی رہا۔

اگر ابن حیان کی مراد اندلس کے بنی امیہ سے ہے تو بلا شبہ وہ دولت اسلامیہ کی شیرازہ بندی اور اسلام کی راہ میں ان کے جہاد کی قدر کرتے تھے اور اس پہلو سے ان کے مداح تھے۔ لیکن اگر مشرق کے بنو امیہ مراد ہیں تو یہ سراسر غلط ہے[۳۲] ابن حزم کی تحریروں میں اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ وہ بنو امیہ کی بیجا حمایت اور پاسداری کرتے تھے۔ تو اریخ خلفا پر ان کے رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل تھے اور مروان بن الحکم کو باغی سمجھتے تھے ان کے نزدیک مروان کو خلافت کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا[۳۳] ایک دوسری جگہ تو وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ "امیر المومنین حضرت عبداللہ بن الزبیر رض کے خلاف خروج سے پہلے مروان پر کوئی جرح میرے علم میں نہیں ہے[۳۴]"

واقعہ حرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ واقعہ بھی اسلام کی مصیبت کبریٰ اور (اس کے آہنی قلعہ کا) سب سے بڑا شگاف تھا، اس لئے کہ اس میں باقی صحابہ، اجلۂ تابعین اور مسلمانوں کی چیدہ و برگزیدہ شخصیتوں کو کھلم کھلا ناحق تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا[۳۵]۔"

حضرت عبداللہ بن الزبیر کے قتل کے بارے میں لکھتے ہیں: "ابن الزبیر رض کا قتل اسلام کی ایک مصیبت اور شگاف تھا اس لئے کہ ان کو برملا ناحق قتل کرنے اور پھانسی دینے پھر حرم کی بے حرمتی کی وجہ سے سارے مسلمانوں کی تذلیل ہوئی[۳۶]۔"

اس طرح کے الفاظ اس شخص کی زبان پر بار بار نہیں آسکتے جو بنو امیہ کا متعصب حامی ہو یا ان کے دور میں پیش آنے والے ہر واقعہ کی توجیہ اور تاویل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔

تاریخ نگاری میں ابن حزم کا غالب رجحان تلخیص کی جانب تھا، جیسا کہ انہوں نے سیرت میں کیا ہے۔ چنانچہ تمام اشعار اور قصے خارج کر دیئے۔ نقط العروس اور دوسرے رسائل بھی اسی نہج پر ہیں۔

تلخیص میں ان کے نہج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ متفرق مواد کو ایک عنوان کے تحت جمع کر دیتے ہیں مثلاً ایک فصل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امرائے کے نام لکھتے ہیں۔ دوسری میں سرایا درج کرتے ہیں اور تیسری میں آپ کی ازواج و اولاد کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک طرح کے مواد کو ایک عنوان کے تحت درج کرتے ہیں اور مقصد جدت و ندرت ہوتا ہے مثلاً ان لوگوں کی فہرست جو اپنے باپ کی زندگی میں خلیفہ ہوئے، خلفاء میں جن کے دو نام تھے، سب سے کم سن خلیفہ، غیر قریش میں سے جو خلیفہ ہوئے ...... الخ[۳۷] اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ترکیز کی وجہ سے یہ رسائل طلبہ کے لیے بہت مفید و مددگار ثابت ہوتے ہیں اور انھیں متفرق مواد بغیر کسی کد و کاوش کے یکجا مل جاتا ہے۔

اس طریقہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن حزم مطالعہ کے دوران ہمیشہ نوٹس لیتے رہتے تھے اور اس طرح کے رسائل درحقیقت انھیں نوٹس سے مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ طرز کچھ ابن حزم کی ایجاد نہیں ہے۔ ان سے پہلے ابن قتیبہ نے کتاب المعارف اور ابن حبیب نے کتاب المحبر میں یہی طرز اختیار کیا تھا۔

سیرت ابنِ حزم کا نام

ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ذکر کیا ہے کہ ابن حزم کی ایک کتاب "السیرۃ النبویۃ" ہے[۳۸] سخاوی نے مغازی اور سیر کی کتابوں کے ضمن میں لکھا ہے کہ "سیرت پر ابو محمد بن حزم کی مستقل تصنیف ہے"۔ سخاوی نے کتاب کا نام صراحت سے ذکر نہیں کیا۔[۳۹] ہمارے مخطوطہ کے سرورق پر "کتاب السیرۃ النبویۃ لابن حزم" درج ہے۔ پھر کتانی کی "التراتیب الاداریۃ" سے معلوم ہوا کہ کتاب التخریج کے مصنف خزاعی نے جن کتابوں سے استفادہ کیا تھا ان میں ابن حزم کی "کتاب جوامع السیرۃ" بھی تھی۔[۴۰] خزاعی (۷۱۰ — ۷۸۱ھ) آٹھویں صدی میں گزرے ہیں۔ ابن حزم کی سیرت کا نام جس انداز سے لکھا ہے اس سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس میں کسی تصرف سے کام نہیں لیا ہے، کیونکہ جب "السیرۃ النبویۃ" کہنا ممکن ہے تو کتاب کے لیے ایک نیا نام اختراع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

پس یہ نام "جوامع السیرۃ" ہی اس کتاب پر چسپاں ہوتا ہے اور اس طرح کی تصنیف کے لئے یہی مناسب بھی ہے کیونکہ تاریخ نگاری میں ابن حزم کا جو نہج ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کی تعبیر کے لیے "جوامع" سے زیادہ موزوں لفظ مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ "السیرۃ النبویۃ" کے نام سے اس کتاب کو یاد کرنا ناموں کے سلسلہ میں ایک قسم کا تساہل ہے جو بہت عام ہے۔ ہم اکثر "الکامل فی التاریخ" کو تاریخ ابن الاثیر یا "عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر" کو سیرت ابن سید الناس کہتے ہیں جبکہ اصل نام یہ نہیں ہے۔

"جوامع السیرۃ" اپنی حقیقت اور معنویت دونوں اعتبار سے چونکہ موزوں تھا اس لئے اس کتاب کے لیے ہم نے اسی نام کا انتخاب کیا اور وہ نام مسترد کر دیا جو مخطوطہ کے سرورق پر درج ہے اور جس کا ذہبی نے ذکر کیا ہے، اس لئے کہ ممکن ہے ذہبی کی نظر سے یہی نسخہ گذرا ہو۔ الغرض نام ایک ہی ہے متعدد نہیں ہیں اور "جوامع السیرۃ" ہماری نگاہ میں زیادہ راجح اور اقرب الی الصواب ہے۔

مخطوطہ اور اسکی سند

جہاں تک اس مخطوطہ کا تعلق ہے جس کی بنیاد پر یہ متن شائع کیا جا رہا ہے تو یہ عرب لیگ کے معہد المخطوطات میں ہندوستان کے حبیب گنج گلکشن سے آیا ہے۔[۴۱] کاتب نے مخطوطہ کے آخر میں لکھا ہے کہ اس نے ۱۳۵۴ھ میں اس کی کتابت مکمل کی۔ گویا یہ مخطوطہ حال کا لکھا ہوا ہے۔ اصل نسخہ جس سے یہ منقول ہے مدینہ منورہ کے مکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت پاشا میں موجود ہے جس کی

کتابت آٹھویں صدی ہجری میں ۷۷۶ھ میں یعنی ابوحیان نحوی کے انتقال (۷۴۵ھ) کے تقریباً تیس سال بعد ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل نسخہ کا کاتب ایک نامعلوم شخص ہے جس تک ابوحیان سے سیرت کی روایت پہنچی تھی۔

اگر اس راوی کو ہم مستثنیٰ کر دیں جس سے ابوحیان کے تعلق کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے تو ان راویوں کے سلسلہ میں جن کے نام ہمارے مخطوطہ کے دوسرے صفحہ پر مذکور ہیں متعدد ممتاز شخصیتیں نظر آتی ہیں اور ان میں سے بیشتر ابن حزم کی سیرت اور اس کے ساتھ ظاہری مسلک کے بھی وارث اور امین ہوئے:

۱۔ ابوحیان اثیرالدین محمد بن یوسف جیانی غرناطی (۶۵۴ - ۷۴۵ھ)[42] مشہور ماہر نحو اور مفسر تھے، البحرالمحیط انھیں کی تصنیف ہے۔ ابوحیان نے اندلس میں اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس سیرت کی روایت کی، اپنے تعلیمی اسفار میں ظاہریہ کے دو شیوخ سے ان کی ملاقات ہوئی: ابوالعباس احمد بن علی بن خالص اشبیلی اور ابوالفضل محمد بن محمد بن سعدون فہری شنتمری۔ اپنے استاذ عبداللہ بن محمد بن ہارون طائی سے غالباً ان کی ملاقات قرطبہ میں ہوئی جن سے انہوں نے دوسری کتابوں کے ساتھ سیرت ابن حزم کی بھی روایت کی ۶۷۹ھ میں جب ابوحیان نے مصر کیلئے رخت سفر باندھا تو وہ ابن حزم کی تمام کتابوں کی روایت کر چکے تھے چنانچہ مصر میں ان کے بعض تلامذہ نے ان سے ان کتابوں کی روایت کی۔ ابوحیان اپنے استاذ کے قدیم مسلک پر قائم رہے۔ چنانچہ انہوں نے کتاب المحلیٰ کا اختصار "النور الاجلی فی اختصار المحلیٰ" کے نام سے تیار کیا۔ صفدی کا خیال ہے کہ ابوحیان نے جب دیکھا کہ مصر کے لوگوں کا رجحان ظاہری مسلک کی جانب نہیں ہے تو اسے چھوڑ کر شافعی مسلک اختیار کر لیا۔ لیکن محلی سے ان کی دلچسپی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں ایک طویل عرصہ تک اپنے قدیم مسلک پر ہی قائم رہے۔ صفدی کے سوا دوسرے تذکرہ نگاروں کے نزدیک "وہ ظاہری ہی رہے" ابن حجر کے اس بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ابوحیان کہتے تھے کہ جس کے دل میں ظاہری مسلک جاگزیں ہو جائے تو اس کا چھوڑنا اس کے لیے ممکن نہیں[43]"

مشرق پر ابوحیان کا صرف یہی احسان نہیں ہے کہ انہوں نے ابن حزم کی کتابوں کا تعارف اہل مشرق سے کرایا بلکہ "انھیں نے لوگوں کے اندر ابن مالک کی نحوی کتابوں کے مطالعہ کا حوصلہ پیدا کیا اور ترغیب دی نیز ان کے ادق مسائل کو عام فہم بنایا اور تشریح کی" مغربی ثقافت اور علماء مغرب کے تعارف اور ان کے ناموں کے صحیح تلفظ میں ابوحیان کی حیثیت ایک دیانتدار سفیر کی تھی۔ اہل مغرب چونکہ بلاد فرنگ کے ہمسایہ ہیں اس لیے ان کے نام اور الفاظ بھی ان کی زبان سے قریب ہیں۔

۲۔ ابوحیان کے شیخ عبداللہ بن محمد بن ہارون بن عبدالعزیز بن اسمٰعیل طائی (۶۰۳ - ۷۰۲ھ)[44] اندلسی مہاجرین میں تھے لیکن انہوں نے قیام کے لئے تونس کا انتخاب کیا۔ اپنے دور کے مروجہ علوم مثلاً قرأت، لغت، حدیث اور نحو کے عالم تھے۔ سیرت نبوی سے خاص شغف تھا چنانچہ اپنے ایک عزیز حافظ ابوزکریا حمیری سے "الروض الانف" کی سماعت کی۔ سیرت کی سماعت احمد بن علی الفوام نحوی سے کی۔ اسی طرح شمائل کی سماعت ایک اور استاذ سے کی۔ سیرت ابن حزم کی روایت اپنے شیخ ابوالقاسم بن لقی سے کی۔ موطا اور مبرد کی کامل کا درس بھی ان سے کیا۔ ابن لقی کے آخری راوی یہی عبداللہ بن محمد طائی ہیں۔ مآخذ سے یہ اندازہ نہیں

ہوتا کہ وہ ظاہری تھے لیکن اس کے خلاف بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ان کے بارے میں معروف تھا کہ ان کے اندر کسی قدر تشیع اور حضرت معاویہ اور ان کے شہزادے یزید سے بیزاری پائی جاتی تھی۔ اس پہلو سے استاذ اور شاگرد (ابوحیان) کے درمیان مماثلت نظر آتی ہے۔ موخر الذکر کا میلان بھی حضرت علی کی محبت اور ان سے صف آرا ہونے والوں کی مخالفت کی جانب تھا۔[45]

۳- ابن ناظر (۶۰۳ – ۶۷۹)

پورا نام حسن (یا حسین) بن عبدالعزیز بن محمد بن ابی الاحوص تھا۔[46] موصوف نے بھی ابن بقی کے آگے اشبیلیہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اصلاً بلنسیہ کے باشندے تھے مگر غرناطہ میں پرورش ہوئی۔ اندلس کے مختلف علاقوں کا سفر کیا اور ماہر فن شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استفادہ کیا یہاں تک کہ "متعدد علوم کے حامل، حدیث و تفسیر کے حافظ اور ادب، لغت اور تاریخ کے ماہر ہوئے" روایات اور اسانید کے ضبط میں بھی مشہور تھے۔

"تدریس اور قضا کے عہدوں پر فائز رہے یہاں تک کہ غرناطہ میں انتقال کیا۔ ابوحیان نے ان کا ذکر اپنے مالقہ کے شیوخ میں کیا ہے اور لکھا ہے: ان کے اندر تھوڑا سا ترفع اور دنیا بیزاری تھی اس لیے کہ ان سے کمتر لوگوں کو دنیا نے ان سے بلند رتبہ عطا کیا۔"

۴- ابن بقی قرطبی (۵۳۷ – ۶۲۵)

ابوالقاسم احمد بن یزید بن بقی اموی قرطبی[47] مغرب کے قاضی القضاۃ اور اندلس کے بڑے باکمال اور جلیل القدر عالم تھے۔ اشبیلیہ میں بنی الباجی اور قرطبہ میں بنی مخیث کے سوا پورے اندلس میں ایسا علمی اور ممتاز خانوادہ نہیں گذرا۔ مراکش اور اس کے بعد اپنے شہر کے قاضی ہوئے تو فیصلے ظاہری مسلک کے مطابق کیے۔ عہدہ قضا سے علاحدہ ہوئے تو ان سے استفادہ کے لئے لوگ ٹوٹ پڑے۔ ابن بقی نے سہیل سے الروض الانف کی سماعت کی تھی اور ایک سال کی عمر میں شریح بن محمد نے انھیں روایت کی اجازت دی۔ اس اجازت میں سیرت ابن حزم بھی شامل تھی اسی لئے ابن بقی شریح سے بسند اجازت روایت کرنے والے آخری شخص سمجھے جاتے ہیں

۵- شریح بن محمد رعینی (۴۵۱ – ۵۲۹)

شریح بن محمد بن شریح رعینی اشبیلی[48] ابن حزم کے براہ راست شاگرد ہیں لیکن بظاہر انھیں بھی سیرت ابن حزم کی اجازت کمسنی میں ملی تھی اس لیے کہ ابن حزم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس طور پر شریح ابن حزم سے اجازت پانے والے آخری لوگوں میں ہیں۔ موصوف قاری، محدث، حافظ اور بہترین مقرر تھے۔ ابن بشکوال مصنف الصلۃ نے ان سے ملاقات کی تو شریح نے انھیں روایت کی اجازت دی۔ ابن بقی کے واسطہ سے ابن الابار سے ان کی روایت متصل ہے۔ وہ کتاب التکملہ میں اسی سند سے ابن حزم کی روایتیں نقل کرتے ہیں۔[49]

۶- ابن بُربال حجاری (۴۱۶ – ۵۰۲)

ابوبکر عبدالباقی بن محمد بن سعید بن بُربال[50] کی نسبت اندلس کے ایک شہر وادی الحجارۃ کی جانب ہے۔ منذر بن المنذر،

ابوالولید ہشام بن احمد کنانی، ابو محمد قاسم بن فتح، ابو عمر طلمنکی وغیرہ سے روایت کی۔ آخری عمر میں مُریّہ میں قیام کیا۔ طویل عمر پائی اور بلنسیہ میں انتقال ہُوا۔

یہ وہ حضرات ہیں جن کی روایت ابن حزم کی تمام کتابوں کے سلسلہ میں عام طور پر اور سیرت کے سلسلہ میں خاص طور پر منقول ہے۔ سند کے آخری نام کے واسطہ سے یہ کتاب مشرق میں پہنچی۔ یہ تمام لوگ چونکہ ارباب علم وفضل ہیں اس لئے ان کی روایت کی بہت اہمیت ہے اور انکی سند صحت کے اعتبار سے عالی سند ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ابو حیان سے منقول نسخہ کے کاتب کے پاس ایک اور نسخہ بھی تھا جو غالباً اس کے استاذ کا تھا۔ اس کے شروع میں یہ عبارت درج تھی :

"کتب إلی القاضی ابوالحسن شریح بن محمّد بن شریح الرعینی من حمص الاندلس قال أنبأنا ابو محمّد علی بن احمد بن سعید بن حزم الظاهری الحافظ، قال وقرأت علی ابی محمّد بن عبد الله بن محمّد بن مرزوق الیحصبی الاندلسی بمصر عن ابی بکر عبد الباقی بن محمّد بن بریال الحجاری۔"

یہ نسخہ اور اس کی اصل دونوں ناپید ہو چکے ہیں۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے وہ اور اس کی اصل جو مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے دونوں بہت بعد کے ہیں بعض مخصوص حالات کی وجہ سے مدینہ منورہ کا نسخہ حاصل کرنا ممکن نہ ہوا تو مجبوراً ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے اس نسخہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ اس نسخہ کے کاتب شیخ ابو عبداللہ سورتی ایک محقق اور دقیق النظر عالم ہیں اور انہوں نے جو کچھ نقل کیا ہے اس کے ضبط میں بڑی کاوش کی ہے۔ سہیلی کے حاشیہ پر مطبوعہ سیرت ابن ہشام سے مقابلہ اور خود مصنف سیرت ابن حزم کی دوسری کتاب جمہرۃ انساب العرب سے جگہ جگہ استفادہ بھی کیا ہے۔ متن کی جس عبارت میں ترمیم کی ہے اسے حاشیہ پر اور تصحیحات سیاق عبارت میں درج کی ہیں۔ کہیں کہیں متن کی عبارت کو اسی صورت میں رہنے دیا ہے اور تصحیح اس کے سامنے حاشیہ پر "صح" کی علامت سے درج کی ہے۔ اس طرح سورتی صاحب نے نقل میں غایت درجہ دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مطبوعہ سیرت ابن اسحٰق پر زیادہ اعتماد کرنے کی وجہ سے بعض جگہ ان سے غلطی ہوئی ہے لیکن ترمیم شدہ عبارت کی بازیافت یا اس کی تصحیح کا کام آسان ہے اس لئے کہ جو ترمیم و اصلاح بھی انہوں نے کی ہے اس میں دیانت داری کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ شیخ ابو عبداللہ سورتی نے حاشیہ پر کچھ تعلیقات بھی لکھی ہیں ان میں جو مناسب نظر آئیں انھیں ہم نے شامل کر لیا ہے اور صراحت کر دی ہے کہ یہ مخطوطہ کے حاشیہ سے منقول ہیں۔ معلوم ہوتا ہے مدینہ منورہ کے نسخہ میں جس سے ابو عبداللہ سورتی نے نقل کیا ہے بہت سے مقامات پر اضطراب اور کہیں کہیں نقص تھا، چنانچہ جہاں تک ان سے ہو سکا درست کیا اور جہاں اضافہ ضروری تھا اضافہ کیا۔ بعض ایسی غلطیاں بھی درست کی ہیں جو ابن حزم جیسے دقیق النظر عالم سے نہیں ہو سکتیں۔ اس کے باوجود کچھ مقامات ایسے رہ گئے تھے جہاں اصلاح و تصحیح کی ضرورت تھی چنانچہ ہم نے یہ خدمت انجام دی۔ متن میں اگر کوئی اضافہ کیا تو اسے بریکٹ کے درمیان درج کیا ہے۔ بعض غلطیاں جو طباعت کے بعد سامنے آئیں انھیں آخر میں اشاریہ اعلام کے حاشیہ میں درست کر دیا ہے۔

ضبطِ انساب کے اہتمام میں ایک دلچسپ اور اہم حقیقت کا سراغ لگا ہیں سے باخبر رہنا ہر اس شخص کے لیے انتہائی ضروری ہے جو انساب کی تحقیق اور اسما کو صحت کے ساتھ ضبط کرنا چاہتا ہو۔ انساب کے مطالعہ میں چار روایتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو دراصل تاریخ انساب کے چار دھاروں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اوّل واقدی کی روایت، دوم ابن عمارہ انصاری کی روایت (خاص طور پر انصار کے نسب میں) سوم ابن اسحٰق کی روایت چہارم ابن الکلبی کی روایت۔ ان روایتوں کے درمیان اختلاف کی بہت سی صورتیں ابن سعد نے محفوظ کر دی ہیں۔

مزید براں یہ بھی یاد رہے کہ ان چاروں روایتوں کے ساتھ ساتھ بعض اسما کی قرأت میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک کو آپ ادبا کا مسلک اور دوسرے کو محدثین کا مسلک کہہ سکتے ہیں، اگرچہ فریقین کے اختلاف سے متاثر ہونے والے اسما کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

حواشی و حوالہ جات

لے ڈاکٹر ناصر الدین اسد اور ڈاکٹر احسان عباس نے مضمون کے شروع میں ابن حزم کے حالاتِ زندگی کے لیے درج ذیل ماخذ کا حوالہ دیا ہے :

۱۔ حمیدی : جذوۃ المقتبس، شمارہ : ۷۰۸ (الدار المصریہ ۱۹۶۶ء)

۲۔ فتح بن خاقان : مطمح الانفس ص : ۵۵ (مطبعۃ الجوائب ۱۳۰۲ھ)

۳۔ الذخیرۃ ۱ : ۱۴۰

۴۔ المغرب، شمارہ : ۲۵۳

۵۔ تذکرۃ الحفاظ ۳ : ۲۴۱

۶۔ لسان المیزان ۴ : ۱۹۸-۲۰۲

۷۔ سعید افغانی کی کتاب " ابن حزم الاندلسی ورسالتہ فی المفاضلۃ بین الصحابۃ " کا مقدمہ۔

۸۔ ابن حزم پر Palacios Asin کی کتاب۔

ابن حزم کے حالات کے لئے مزید ماخذ ملاحظہ ہوں :

۹۔ الضبی : بغیۃ الملتمس، میڈرڈ ۱۸۸۵ء شمارہ : ۱۲۰۴ و ۱۲۰۴

۱۰۔ قفطی : اخبار الحکماء، طبع الخانجی، مصر ص : ۱۵۶ ۔

۱۱۔ صاعد اندلسی : طبقات الامم۔ بیروت ۱۹۱۲ء ص : ۷۵-۷۷ ۔

۱۲۔ مقری : نفح الطیب، المطبعۃ الازہریہ، مصر ۱۳۰۲ھ ۱ : ۳۵۸-۳۶۲

۱۳۔ یافعی : مرآۃ الجنان، حیدر آباد، ۳ : ۷۹-۸۱ ۔

۱۴۔ ابن الخطیب : الاحاطہ فی اخبار غرناطہ مطبوعہ ۱۳۱۹ھ ۳ : ۱۴۴

۱۵۔ ابن العماد : شذرات الذہب قاہرہ ۱۳۵۰ھ ۲ : ۲۹۹

۱۶۔ ابن بشکوال : الصلۃ ، الدار المصریہ ۱۹۶۶ء ص : ۴۱۵، شمارہ : ۸۹۴

۱۷۔ ابن خلکان : وفیات الاعیان، محی الدین عبدالحمید، ۱۹۴۸ء مصر ۳ : ۱۳-۱۷، شمارہ : ۴۲۱ -

۱۸۔ یاقوت : معجم الادباء، دارالمامون، ۱۲ : ۲۳۵ - ۲۵۷، شمارہ : ۶۳

جدید مآخذ میں دیکھیے :

۱۹۔ بروکلمان ۱ : ۳۹۹ تکملہ ۱ : ۶۹۲

۲۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پاکستان ۱ : ۴۸۵ - ۴۹۴

۲۱۔ ابن حزم تالیف الوزہرہ، ۱۳۷۳ھ قاہرہ، اردو ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء

قلمی مآخذ اور مستشرقین کی تحقیقات کے لئے الاعلام، معجم المؤلفین، المستشرقون از نجیب العقیقی اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی جانب رجوع کیجئے (مترجم)

[1] تذکرۃ الحفاظ، حیدر آباد ۱۳۷۶ھ تیسرا ایڈیشن ۳ : ۱۱۴۶ — ۱۱۵۵

[2] حمیدی ، ص : ۱۲۶ ، شمارہ ۲۱۵

[3] ایضاً ، ص : ۱۰۷ ، شمارہ ۱۸۱

[4] ایضاً ، ص : ۳۶۷ ، شمارہ ۸۷۴

[5] ایضاً ، ص : ۲۵۴ ، شمارہ ۵۳۷

[6] ایضاً ، ص : ۱۱۴ ، شمارہ ۱۸۷

[7] ایضاً ، ص : ۳۵۰ ، شمارہ ۸۱۴

[8] ایضاً ، ص : ۲۶۱ ، شمارہ ۵۵۱

[9] ابن بشکوال ، ص : ۳۵۳، شمارہ : ۷۵۸ -

[10] حمیدی ، ص : ۱۹۹ ، شمارہ : ۳۹۵

[11] ایضاً ص : ۳۷۷ ، شمارہ : ۸۹۸

[12] معجم الادباء ۱۲ : ۲۳۹

[13] تذکرۃ الحفاظ ص : ۱۱۵۰

[14] ایضاً

[15] رسالہ مداواۃ النفوس و تہذیب الاخلاق، طبع محمد ادہم کتبی، مصر ص : ۱۳ -

۱۷۔ الفصل فی الملل ۲ : ۹۰

۱۸۔ ایضاً، نیز جوامع السیرۃ : ۴۱

۱۹۔ مثال کے طور پر دیکھئے الفصل ۲ : ۸۶

۲۰۔ جوامع السیرۃ : ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۹

۲۱۔ فہرست ابن خیر ص : ۲۳۰

۲۲۔ فہرست ابن خیر ص : ۲۳۰ - ۲۲۷ -

۲۳۔ سیرت ابن عبدالبر کا نفیس ایڈیشن ڈاکٹر شوقی ضیف کی تحقیق سے المجلس الاعلی للشئون الاسلامیہ قاہرہ نے ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ فاضل محقق نے اپنے مقدمہ میں الدرر سے ابن حزم کے اخذ و استفادہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ الدرر کی مدد سے جوامع السیرۃ کی متعدد غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو مقدمہ کا اردو ترجمہ اسی جلد میں۔ (مترجم)

۲۴۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر ا : ۱۱۰

۲۵۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے اسے بعید از قیاس قرار دیا ہے (مترجم)

۲۶۔ امتاع الاسماع ص : ۵۰ جوامع السیرۃ ص : ۹۷ (مضمون نگار) یہ تحقیق حافظ ابن عبدالبر کی ہے جسے ابن حزم نے بغیر حوالہ کے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو۔ الدرر ص : ۱۰۱ (مترجم)

۲۷۔ امتاع الاسماع ص : ۲۱۵، جوامع السیرۃ ص : ۲۰۶ (مضمون نگار) یہ رائے بھی حافظ ابن عبدالبر سے ماخوذ ہے، ملاحظہ ہو الدرر ص : ۹۴ (مترجم)

۲۸۔ امتاع الاسماع ص : ۲۷۶، جوامع السیرۃ ص : ۲۰۷ -

۲۹۔ دیکھئے مثلاً جذوۃ المقتبس ص : ۲۹۳ -

۳۰۔ دیکھئے جوامع السیرۃ ص : ۱۹۲، ابن کثیر نے ابن حزم کے نقطہ نظر پر تبصرہ کیا ہے ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ۴ : ۱۸۱

۳۱۔ ابن سعید : المغرب، تحقیق شوقی ضیف، دارالمعارف، ا : ۳۵۵

۳۲۔ ابن بسام وغیرہ نے ابن حیان کا جو اقتباس نقل کیا ہے اس میں مشرق اور اندلس کے تمام قدیم و جدید بنوامیہ کے حکام کی حمایت، ان کی صحت امامت کا اعتقاد، دوسرے اہل قریش سے بیزاری کا ذکر ہے۔ ابن حیان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن حزم پر ناصبیت کا الزام بھی تھا۔ اصل عبارت ابن بسام قسم اول ا : ۱۴۲ سے نقل کی جاتی ہے:

"وکان مما یزید فی شنآنہ تشیعہ لامرأ بنی امیۃ ماضیھم وباقیھم بالمشرق والاندلس واعتقادہ لصحۃ امامتھم، وانحرافہ عمن سواھم من قریش حتی نسب إلی النصب لغیرھم"

ناصبیت کے الزام کی تحقیق کے لیے ابن حزم کا رسالہ "المفاضلہ بین الصحابہ" کا مطالعہ کرنا چاہیے ابوزہرہ نے بھی تفصیل سے اس پر بحث کی ہے (مترجم)

۳۳ ملاحظہ ہو ابن حزم کا رسالۃ الخلفاء ضمیمہ جوامع السیرۃ ص : ۳۵۹ - ۳۶۰
۳۴ المحلی ۱ : ۲۳۶
۳۵ رسالۃ الخلفاء ص : ۳۵۷
۳۶ ایضاً ص : ۳۶۰
۳۷ ملاحظہ ہو نقط العروس، متفرق صفحات
۳۸ تذکرۃ الحفاظ : ابن حزم کا ترجمہ
۳۹ الاعلان بالتوبیخ ص : ۸۹
۴۰ الترتیبات الاداریۃ شیخ عبدالحی کتانی کی تصنیف ہے۔ مطبعۃ اہلیۃ رباط سے ۱۳۴۶ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ملاحظہ ہو مقدمہ ص : ۲۴
۴۱ سیرت ابن حزم کا ایک قلمی نسخہ برلین (شمارہ ۹۵۱۰ ب م ۴ ۵۹) میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو بروکلمان ضمیمہ اول ص : ۶۹۰
۴۲ مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو : بلوی کا سفرنامہ تاج المفرق مخطوطہ دارالکتب المصریہ (شمارہ ۱۰۵۳ جغرافیا) ورق : ۵۲، صفدی : اعیان العصر نسخہ دارالکتب (شمارہ ۱۰۹۱، تاریخ) ج : ۷ قسم اول : ورق : ۶۷، نکت الھمیان ص : ۲۸۰، نفح الطیب ۱ : ۸۲۵ میں اعیان العصر سے نقل کیا ہے، ابن حجر : الدرر الکامنۃ شمارہ : ۸۳۲ نیز دیکھیے : بغیۃ الوعاۃ ص : ۱۲۱، درۃ الحجال شمارہ : ۵۶، شذرات الذھب ۶ : ۱۴۵
۴۳ الدرر الکامنۃ ۴ : ۳۰۴
۴۴ ابن ہارون طائی کے حالات کے لئے دیکھیے : اعیان العصر ج : ۳، قسم : ۲ ورق : ۲۳۶، الدرر الکامنۃ شمارہ : ۴ : ۲۲۲، درۃ الحجال شمارہ : ۹۲۵ شذرات الذھب ۶ : ۷
۴۵ الدرر الکامنۃ ۴ : ۳۰۶
۴۶ حالات کے لئے دیکھیے : بغیۃ الوعاۃ ص : ۲۳۴، النباھی : تاریخ قضاۃ الاندلس ص : ۱۲۷ الاحاطہ ۱ : ۲۹۲، مسالک الابصار ۱۱ : ۱۴۷، ابن الزبیر نے صلۃ الصلہ میں بھی ابن ناظر کے حالات لکھے ہیں۔
۴۷ حالات کے لئے دیکھیے : ابن الابار : التکملۃ، شمارہ : ۲۹۲، تاریخ قضاۃ الاندلس ص : ۱۱۷، شذرات الذھب ۶ : ۱۱۲، ابن الزبیر : صلۃ الصلۃ ۔
۴۸ ابن بشکوال : الصلۃ، شمارہ : ۵۲۶ ۔ ۴۹ مقدمہ التکملۃ ۔
۵۰ حالات کے لئے دیکھیے : صلۃ ابن بشکوال، شمارہ : ۸۲۷، بغیۃ الملتمس شمارہ : ۱۱۲۵ معجم السلفی ورق : ۱۳۸، معجم البلدان : وادی الحجارۃ، تاج العروس (برل) صاحب قاموس نے ان کے دادا کا نام برآل (الف کے ساتھ) لکھا ہے۔ زبیدی نے اس پر تعاقب کیا کہ صحیح یا کے ساتھ ہے جیسا کہ حافظ وغیرہ نے ضبط کیا ہے ۔

الدُّرر فی اختصار المغازی والسِّیَر

تحریر: ڈاکٹر شوقی ضیف / ترجمہ: محمد اجمل اصلاحی

تقدیم

[سیرت نبوی پر ابنِ عبدالبر کی کتاب "الدُّرَر فی اِختصارِ المغازی والسِّیَر" کا یہ تعارف ڈاکٹر شوقی ضیف کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب مصر کے مشہور ادیب، مقتدر نقاد اور مصنف ہیں۔ موصوف نے کلیۃ الآداب قاہرہ یونیورسٹی سے "الادب ومذاہبہ فی الشعر العربی" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوا اور بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۹ء تک اس کے سات ایڈیشن نکل چکے تھے۔ ڈاکٹر شوقی ضیف ادب، تاریخ ادب اور تنقید پر کم و بیش دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ چند مشہور کتابیں درج ذیل ہیں:

۱۔ تاریخ الادب العربی
۲۔ الفن ومذاھبہ فی النثر العربی
۳۔ التطور والتجدید فی الشعر الاموی
۴۔ دراسات فی الشعر العربی المعاصر
۵۔ الادب العربی المُعاصر فی مصر
۶۔ شوقی شاعر العصر الحدیث
۷۔ فی النقد الادبی
۸۔ البلاغۃ: تطور و تاریخ
۹۔ البحث الادبی
۱۰۔ مع العقاد

ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے بعض مخطوطات بھی ایڈٹ کر کے شائع کئے مثلاً "المُغرب فی حلی المَغرب" اور "الدُّرَر فی اِختصارِ المغازی والسِّیَر"۔ موخر الذکر کتاب المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیۃ کی جانب سے ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ڈاکٹر صاحب نے ۱۸ صفحات پر مشتمل ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں کتاب کے مصنف حافظ ابن عبدا...

کے مختصر حالات کے ساتھ "الدُّرر" کی اہمیت درجہ استناد، خصوصیات نیز اس کے مخطوطہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ سیرت ابن عبدالبر کے تعارف کے لئے اِس سے بہتر مضمون ممکن نہ تھا اِس لئے اِسی کا ترجمہ کیا گیا۔ موقع کی مناسبت سے بعض سطریں حذف کر دی گئی ہیں۔ آخر میں تمام حواشی اور حوالہ جات ایک کے سوا مترجم کے قلم سے ہیں۔] (محمد اجمل اصلاحی)

مصنّف

سیرت نبویؐ کے موضوع پر اس کتاب کے مصنف امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبرّ بن عاصم النَّمَری ہیں[1]۔ ابن عبدالبر ۲۴ ربیع الاوّل ۳۶۸ھ بروز جمعہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ ایک علمی گھرانے میں پرورش ہوئی۔ ان کے والد کا شمار قرطبہ کے فقہا و محدثین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم دلائی۔ ان کا انتقال ہوا تو ابن عبدالبر کی عمر ۱۴ سال تھی۔ والد کے انتقال کے بعد نہایت جانفشانی اور استقلال کے ساتھ تحصیل علم میں لگے رہے اور اپنے دور میں فقہ و حدیث، تاریخ و مغازی اور اخبار و انساب کے ممتاز اور جلیل القدر علما سے استفادہ کیا مثلاً ابو عمر ابن المکوی[1]، ابن الفرضی[2]، عبدالوارث بن سفیان[4]، خلف بن قاسم[5]، ابو محمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمومن[6]، سعید بن نصر[7]، محمد بن ابراہیم بن سعید[8]، احمد بن قاسم بن عبدالرحمن تاہرتی[9]، احمد بن محمد بن احمد ابن الجسور[10]، ابو عمر الباجی[11] وغیرہ

پانچویں صدی ہجری کے شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ابن عبدالبر کا شمار قرطبہ کے نامور علما میں ہونے لگتا ہے۔ پھر جلد ہی وہاں کے حالات خراب ہوتے ہیں۔ فتنوں کی آگ بھڑکتی ہے۔ اموی حکومت کا قصر زمیں بوس ہوتا ہے اور اس کے ملبہ پر اندلس کے مشہور ملوک طوائف کی ریاستیں قائم ہوتی ہیں۔ ہر بڑا شہر ایک خود مختار حاکم کے زیر نگیں ہوتا ہے۔ قرطبہ کے مسلسل خلفشار کی وجہ سے وہاں کے بہت سے علما نے ہجرت کی اور نو وارد ان بساطِ سیاست کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس لئے کہ ہر امیر اپنے شہر اور ریاست میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں علما، ادبا اور شعرا کو جمع کرنا چاہتا تھا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان شدید منافست و مسابقت جاری تھی۔ قرطبہ کو خیرباد کہنے والوں میں حافظ ابن عبدالبر بھی تھے۔ وہاں سے نکل کر ابن عبدالبر نے مغربی اندلس کے شہر بطلیوس کا رُخ کیا جہاں بنو الافطس کی حکمرانی تھی۔ بنو الافطس ابن عبدالبر کے ساتھ انتہائی اعزاز و اکرام سے پیش آئے اور انھیں اپنی ریاست کے دو شہروں رشبونہ اور شنترین کا قاضی مقرر کیا۔ پھر ابن عبدالبر مشرقی اندلس چلے گئے اور بلنسیہ اور دانیہ میں قیام کیا۔ مؤخر الذکر سے دلچسپی کی وجہ غالباً وہاں کے حکمران مجاہد کی شخصیت تھی۔ مجاہد کو علوم قرآن و حدیث میں دخل تھا۔ "علما سے محبت کرتا اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا۔ علما کی قدر دانی میں اس کا شہرہ دور تک پھیل گیا تھا۔ اور ہر طرف سے لوگ اس کے شہر دانیہ کا قصد کرتے تھے۔" ابن عبدالبر کے ایک صاحبزادے بڑے ماہر انشا پرداز اور ادیب تھے[12]۔ مجاہد نے انھیں اپنے "دواوین" میں ملازمت دی اور جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے علی (۴۳۶ - ۴۶۸ھ) نے انھیں دواوین اور کاتبین کا صدر مقرر کیا۔ پھر ایک حادثہ پیش آیا۔ ابن عبدالبر کے صاحبزادے علی بن مجاہد کا ایک پیغام لے کر اشبیلیہ کے امیر معتضد (۴۳۶ - ۴۶۱ھ) کے پاس گئے معتضد

نے ان کا جبر مقدم کرنے کے بجائے انہیں جیل بھیج دیا۔ آخر کار ابن عبدالبر خود معتضد کے پاس اس کی شان میں قصیدہ لکھ کر لے گئے[12] اور رحم کی درخواست کی۔ چنانچہ معتضد نے جلد ہی انہیں رہا کر دیا اور وہ دانیہ واپس آ گئے اور ۴۵۸ھ میں انتقال کیا۔ غالباً بیٹے کے انتقال ہی کی وجہ سے ابن عبدالبر نے دانیہ سے شاطبہ کا رخ کیا اور وہیں ۹۵ سال کی عمر میں ۴۶۳ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی[13]۔ اس عمر دراز کے سبب انہیں اپنے بیٹے اور بہت سے شاگردوں کی مفارقت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ مثلاً ابن حزم تقریباً بیس سال ان سے چھوٹے تھے اور تقریباً سات سال قبل وفات پائی۔

ابتداً میں ابن عبدالبر کا رجحان ظاہری مسلک کی جانب تھا جو فقہ و تشریع میں قیاس کو ناپسند کرتا اور ظاہر قرآن و سنت پر احکام کی بنیاد رکھتا ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اپنے بیشتر اساتذہ اور ہم وطنوں کی طرح انہوں نے بھی مالکی مسلک اختیار کر لیا۔ ابن عبدالبر کے مزاج میں اعتدال اور توازن تھا۔ اسی وجہ سے بعض مسائل میں امام شافعیؒ کی جانب میلان رکھتے تھے۔ ان کا دامن تعصب اور جانبداری سے پاک تھا۔ تحقیق کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا اسے بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لیتے۔

ابن عبدالبر کے تذکرہ نگار حدیث نبویؐ پر ان کی وسعت نظر اور کثرت روایت پر متفق ہیں، چنانچہ ان کے شاگرد حمیدی فرماتے ہیں:

"فقیہ، حافظ، کثیر الروایۃ: قرأت، فقہی اختلافات، علوم حدیث اور علم رجال کے ماہر تھے، قدیم اساتذہ سے سماعت کی تھی۔ شیوخ کی تعداد بہت تھی۔"

قاضی ابوالولید باجی کے نزدیک "اندلس میں علم حدیث میں ابو عمر ابن عبدالبر کا کوئی ثانی نہ تھا۔" ابن بشکوال کی رائے ہے:

"اپنے دور کے امام اور یکتائے روزگار تھے۔ حصول علم میں بڑی جانفشانی کی اور مختلف النوع علوم حاصل کئے اور ایسی مہارت پیدا کی کہ اپنے پیشرو اندلسی علماء پر فوقیت پائی۔"

ابن سعید نے حجاری کا قول نقل کیا ہے کہ "ابن عبدالبر علم شریعت اور روایت حدیث میں بلا استثناء اندلس کے امام اور حافظ تھے۔ سب پر گوئے سبقت لے گئے۔ ان کی تصنیفات خود ان کی عظمت کی گواہ ہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

بے شمار علماء نے ان سے حدیث کی سماعت اور ان کی کتابوں کی ترویج و اشاعت کی جنہیں خود مصنف کے زمانے میں بھی اور بعد میں بھی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

فقہ و حدیث پر ابن عبدالبر کی ایک کتاب "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" ہے۔ اس کے بارے میں ابن حزم کی رائے یہ ہے کہ "فقہ حدیث کے موضوع پر اس جیسی کتاب میرے علم میں نہیں چہ جائیکہ اس سے بہتر ہو۔" دارالکتب المصریہ میں اس کتاب کا ایک ٹکڑا محفوظ ہے۔ ابن عبدالبر نے اس کا اختصار "التقصی لما فی الموطا من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے کیا تھا۔ حدیث و فقہ پر ان کی تصنیفات میں ایک کتاب "الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار مما رسمہ الامام مالک فی الموطا من الرأی والآثار" ہے جس میں انہوں نے موطا کی شرح لکھی اور اس کے ابواب کو اپنے انداز میں مرتب کیا پھر بعد میں خود ہی اس کا اختصار "الکافی فی الفقہ علی مذہب اہل المدینہ" کے نام سے تیار کیا۔ فقہی تصانیف میں "اختلاف اصحاب مالک بن انس واختلاف روایاتہم عنہ" لکھی ہے۔

قراءات اور علوم قرآن پر "البیان عن تلاوۃ القرآن"، "التجوید والمدخل الی العلم بالتجوید" اور "الاکتفاء فی قراءۃ نافع

وابی عمرو بن العلا' بتوجیہ ما اختلفا فیہ" قابلِ ذکر ہیں۔

ایک مشہور کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ وما ینبغی فی روایتہ وحملہ" ہے۔ احمد بن عمر محمصانی بیرونی نے اس کی تلخیص ایک جلد میں کی ہے جو شائع ہو گئی ہے۔[۱۱۹]

سیرت نبوی پر ابن عبدالبر نے "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" لکھی جس کا تعارف آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے سوانح پر "الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو شائع ہو چکی ہے۔ صحابہ کے حالات میں ان کی ضخیم تصنیف "الاستیعاب" ہے جو مطبوعہ ہے، روایات اور تاریخ میں جن صحابہ کا بھی ذکر آیا ہے سب کا استقصار کیا۔ ان کے مختصر حالات لکھے اور انھیں حروف معجم کے مطابق مرتب کیا۔

ابن عبدالبر کی دو کتابیں جو ایک ہی ساتھ شائع ہوئیں "القصد والامم فی التعریف باصول انساب العرب والعجم" اور "الانباہ علی قبائل الرواۃ" ہیں۔

ابن عبدالبر شعر و ادب کے ذوق سے بھی بہرہ ور تھے، وقتاً فوقتاً طبع آزمائی بھی کرتے۔ امیر بطلیوس مظفر بن الافطس کے لئے منتخب اشعار اور دلچسپ سبق آموز حکایتوں کا ایک مجموعہ "بہجۃ المجالس وانس المجالس"[۱۲۰] کے نام سے مرتب کیا تھا۔ دار الکتب المصریہ میں اس کتاب کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

ابن عبدالبر کی تصنیفات کا تذکرہ ابن بشکوال نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

"تصنیف و تالیف میں خوش اوقات اور صاحب توفیق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تصنیفات سے دنیا کو فائدہ بخشا۔ حدیث و فقہ میں گہری بصیرت کے ساتھ علم الانساب اور تاریخ میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔"

الدرر کے مآخذ

ابن عبدالبر نے الدرر کے خطبہ میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کے بعد کے واقعات و حالات پر لکھی ہے اور موسیٰ بن عقبہ کی مغازی اور محمد بن اسحٰق کی سیرت النبیؐ کو ماخذ بنایا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں موسیٰ بن عقبہ کا انتقال ۱۴۱ھ میں ہوا جبکہ موخر الذکر کی وفات ۱۵۰ھ یا بعض روایات کے مطابق ۱۵۱ھ میں ہوئی۔ ان دونوں حضرات کی کتابوں کو عرصہ دراز تک سیرت النبیؐ کے بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ سیرت پر قلم اٹھانے والے سارے ہی مصنفین ان سے استفادہ کرتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ بہت سی قدیم کتابوں کی طرح یہ دونوں کتابیں بھی ناپید ہو گئیں۔ اب سیرت ابن اسحٰق کا صرف ایک ٹکڑا کتب خانہ رباط میں محفوظ ہے۔ جہاں تک ابن ہشام کی روایت کا تعلق ہے تو وہ مکمل نہیں ہے بلکہ اصل کتاب کی تلخیص و تہذیب ہے اور وہ بھی ابن اسحٰق سے براہِ راست روایت نہیں ہے بلکہ ان کے شاگرد زیاد بن عبداللہ بکائی سے منقول ہے۔ سیرت ابن ہشام متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی مختصر سیرت الدرر ابن اسحٰق کی کتاب سے مرتب کی ہے جو ابن ہشام اور دوسرے

راویوں کی روایت سے ان تک پہنچی ہے۔ وہ حجۃ الوداع پر گفتگو کرتے ہوئے واضح طور پر لکھتے ہیں۔[۱۸]

"ہماری اس کتاب میں ابن اسحٰق سے جو روایتیں منقول ہیں۔ ان میں ہماری ایک سند یہ ہے:
"عن عبد الوارث بن سفیان، عن قاسم بن أصبغ، عن محمّد بن عبد السّلام الخشنی، عن محمّد بن البرقی[۱۹]عن ابن هشام، عن زیاد البکائی، عن محمّد بن اسحٰق۔"

دوسرا ماخذ یونس بن بکیر کی روایت ہے جو میں نے عبداللہ بن محمد بن یوسف کو پڑھ کر سنائی ہے سند یہ ہے" عبد الله بن محمّد بن یوسف عن ابن مفرج، عن ابن الاعرابی، عن العطاردی، عن یونس بن بکیر، عن ابن اسحٰق۔"

تیسرا ماخذ ابراہیم بن سعد کا نسخہ ہے۔ یہ بھی میں نے عبدالوارث بن سفیان کو پڑھ کر سنایا ہے بسند یہ ہے
"عبد الوارث بن سفیان، عن قاسم بن أصبغ، عن عبید بن عبد الواحد البزّار، عن (احمد بن) محمّد بن ایّوب، عن ابراهیم بن سعد، عن ابن اسحٰق۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر نے سیرت ابن اسحٰق کے سلسلہ میں صرف ابن ہشام کی روایت پر قناعت نہیں کی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یونس بن بکیر (فاس میں قرویین کے کتب خانہ میں روایت یونس بن بکیر کا ایک نسخہ محفوظ ہے) اور ابراہیم بن سعد کی روایتوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس طور پر ابن عبدالبر کے سامنے ابن اسحٰق کی کتاب کے تین نسخے تھے۔

اسی مقام پر ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب سے جو روایتیں لی ہیں ان کا ماخذ وہ نسخہ ہے جو انہوں نے عبدالوارث بن سفیان اور احمد بن محمد بن احمد بن الجسور کو پڑھ کر سنایا۔ مکمل سند یہ ہے: "عن قاسم بن أصبغ عن مطرف بن عبد الرّحمٰن، بن قیس عن یعقوب، عن ابن فلیح، عن موسیٰ بن عقبة۔" اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:[۲۰]

"اس سلسلہ میں میری کچھ اور سندیں اور روایتیں ہیں جن کا ذکر میں نے کتاب الصحابۃ کے شروع میں کیا ہے۔"

کتاب الصحابۃ سے مراد "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" ہے۔ الاستیعاب میں ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ کی روایتوں کی دو سندیں ذکر کی ہیں، ایک تو مذکورہ بالا سند۔ دوسری" عن خلف بن قاسم، عن ابی الحسن، عن ابی العباس بن محمّد بن عبد الغفار المعروف با بن الون المصری، عن جعفر بن سلیمان النوفلی، عن ابراهیم بن المنذر الحزامی، عن محمّد بن فلیح، عن موسیٰ بن عقبة۔"

اسی جگہ ابن عبدالبر بعض دوسرے ماخذ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فہرست" میں واقدی وغیرہ کی کتاب کی اپنی روایت ذکر کی ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں نظر انداز کر دیا ہے۔"

"فہرست" اس رجسٹر یا کتابچہ کو کہتے ہیں جس میں علماء اپنے شیوخ سے کتابوں کی روایت اور اس کی مختلف سندیں تفصیل

سے درج کرتے ہیں۔ ابن عبدالبر نے بھی اس طرح کی ایک "فہرست" مرتب کی تھی اس کی جانب اشارہ ہے الاستیعاب کے آغاز میں واقدی کی دونوں کتابوں طبقات اور مغازی کی سندیں نقل کی ہیں۔ طبقات کی سند یہ ہے:

"قرأته على احمد بن قاسم التاهرتي، عن محمد بن معاوية القرشي، عن ابراهيم بن موسى بن جميل، عن محمد بن سعد كاتب الواقدي، عن الواقدي"

مغازی کی سند ملاحظہ ہو:

"أخبرني به خلف، عن قاسم، عن ابي الحسن، عن ابي العباس بن المون، عن جعفر بن سليمان النوفلي، عن ابراهيم بن المنذر الحزامي، عن الواقدي"

ابن عبدالبر کتاب الدرر میں اپنے مآخذ کا ذکر مکمل کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"ابوبکر بن ابی خیثمہ کی کتاب میں — یہ کتاب میں نے عبدالوارث، عن ابی القاسم سے روایت کی ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ حدیثیں ہیں"

الاستیعاب کے شروع میں ابن عبدالبر نے تصریح کی ہے کہ "میں نے ابن ابی خیثمہ کی مکمل کتاب ابوالقاسم عبدالوارث بن سفیان بن جبرون کو پڑھ کر سنائی عبدالوارث نے ابومحمد قاسم بن اصبغ بن یوسف شیبانی سے اور موخرالذکر نے ابن ابی خیثمہ ابوبکر احمد بن زہیر بن حرب سے روایت کی"۔

الاستیعاب میں متعدد احادیث ابن ابی خیثمہ سے مذکورہ سند سے نقل کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راویوں کے جرح و تعدیل کے موضوع پر تاریخ کبیر کے علاوہ سنن پر بھی ابن ابی خیثمہ کی کوئی تصنیف تھی۔

ابن عبدالبر نے انھیں مآخذ کا تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ مآخذ ہیں جن کے ذکر کا اہتمام انہوں نے نہیں کیا۔ مثلاً الدرر کی بیشتر احادیث۔ وہ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبدالمؤمن سے روایت کرتے ہیں۔ موصوف کے بارے میں حمیدی کا بیان ہے[1] کہ "انہوں نے عراق وغیرہ کا سفر کیا۔ اسمٰعیل بن محمد الصفار، ابوبکر محمد بن بکر بن عبدالرزاق (جو ابن داسہ صاحب ابی داود سلیمان بن الاشعث السجستانی سے مشہور ہیں) ابوبکر احمد بن جعفر بن مالک قطیعی صاحب عبداللہ بن احمد بن حنبل، احمد بن سلیمان النجاد، محمد بن عثمان بن ثابت صیدلانی صاحب اسمٰعیل القاضی وغیرہ سے سماعت کی اور اندلس میں حدیث کا درس دیا۔ حافظ ابوعمر ابن عبدالبر نے ان سے نقل کر کے ہم سے حدیث بیان کی"۔

حمیدی ابن عبدالبر کے شاگرد ہیں۔ ان کی شہادت کے مطابق ابن عبدالبر کی روایت عبدالمومن سے متصل ہے۔ اور ان احادیث و اخبار کا سلسلہ جو ابن عبدالبر ان سے نقل کرتے ہیں براہ راست ابن داسہ عن ابی داود السجستانی سے مل جاتا ہے۔

ابن عبدالمؤمن کے علاوہ کچھ احادیث و اخبار ابن عبدالبر نے سعید بن نصر سے نقل کئے ہیں۔ ان کے بارے میں حمیدی جذوۃ المقتبس میں[2] ...

"سعید نے قاسم بن اصبغ بیانی اور محمد بن معاویہ قرشی سے سماعت کی اور ان سے فقیہ حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر نے روایت کی۔"

سیرت ابن عبدالبر میں ان کی سند ان کے شیخ قاسم سے متصل ہے۔

کچھ روایتوں میں محمد بن ابراہیم کا حوالہ ملتا ہے۔ ان کے بارے میں حمیدی لکھتے ہیں:[۲۴]

"ابن ابی القرامید کے نام سے معروف ہیں۔ محمد بن معاویہ قرشی سے روایت کی ... ان سے روایت ابوعمر ابن عبدالبر نمری نے کی اور فرمایا: اپنی کتابوں کے ضبط اور روایتوں کے فہم میں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔ ان کی ایک کتاب ہے جس میں انہوں نے یحییٰ بن معین کے اقوال ۴۰ اجزا میں جمع کئے ہیں۔ اس کتاب کی روایت ان سے ابن عبدالبر کے ذریعہ ہم کو ملی ہے۔"

سیرت میں محمد بن ابراہیم کی سند محمد بن معاویہ قریشی سے متصل ہے۔

"سریہ بئر معونہ" میں ابن عبدالبر نے ایک حدیث احمد بن عبداللہ بن محمد بن علی یعنی ابوعمر باجی سے نقل کی ہے۔ باجی کے بارے میں حمیدی کے الفاظ یہ ہیں:

"ان سے اکابر کی ایک جماعت نے روایت کی ہے۔ ان میں فقیہ حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن عبدالبر سے ہماری ملاقات ہے۔"

حمیدی نے باجی کے شیوخ میں حسن بن اسمٰعیل کا ذکر کیا ہے۔[۲۵] ابن عبدالبر نے جو حدیث باجی سے نقل کی ہے اس کی سند حسن سے متصل ہے۔

بعض واقعات میں سعید بن یحییٰ اموی کا نام بھی آیا ہے۔[۲۶] بظاہر اموی کی کتاب "السیر" بھی ابن عبدالبر کا ایک ماخذ تھی۔

کہیں کہیں ابن عبدالبر حدیث کی سند مختصر کر دیتے ہیں اور اس کے راویوں کا مکمل سلسلہ درج نہیں کرتے، اس طرح کی عبارتوں پر اکتفا کرتے ہیں: روی عن عبادۃ بن الصامت، قال ابن شہاب الزہری، قال معمر، ذکر ابن جریج، روی سفیان الثوری، قال ابوداؤد الطیالسی، قال وکیع، قال سعید۔

استناد اور قدر و قیمت

حمیدی نے ابن عبدالبر کے حالات میں ان کی تصنیفات میں کتاب "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" کا ذکر کیا۔ ان کے بعد ایک سے زیادہ تذکرہ نگار اس کتاب کا شمار ابن عبدالبر کی تصنیفات میں کرتے رہے ہیں۔ خود کتاب کے اندرون میں اس کی قطعی شہادت موجود ہے کہ یہ ابن عبدالبر کی تالیف ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں لکھا ہے۔ ابن عبدالبر نے موسیٰ بن عقبہ ابن اسحق اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں کے سلسلہ میں اپنی کچھ سندیں نقل کی ہیں اور مکمل سندوں کے لیے اپنی دوسری کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کا حوالہ دیا ہے جس میں زیادہ تفصیل سے سندیں بیان کی ہیں۔

کتاب الاستیعاب کا تنہا یہی ایک حوالہ نہیں ہے بلکہ جا بجا اس کتاب کے حوالے ہمیں ملتے ہیں۔ چنانچہ خطبۃ الکتاب میں اس کا حوالہ ہے جس کا ذکر ہم آئندہ صفحات میں کریں گے۔ جو حضرات قبول اسلام میں حضرت علی کی اولیت کے قائل ہیں ان کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں[27]: "اس قول کے تابعین اور آثار کا ذکر کتاب الصحابہ کے متعلقہ باب میں کیا ہے[28]۔"

جو مہاجرین غزوہ بدر میں شریک ہوئے ان کی فہرست میں حضرت خباب بن الارت رضی کا نام درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ وہ قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ تمیمی ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں[29]: "ان کے نسب، ولاء اور حلف کے بارے میں جو اختلاف ہے اس کا ذکر کتاب الصحابہ میں ان کے نام کے باب میں کیا ہے[30]۔"

غزوہ احد میں جو مہاجرین شہید ہوئے ان میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی بھی تھے۔ ان کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت حمزہ کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے پھر لکھتے ہیں[31]: "ہم نے ان کا واقعہ کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے[32]۔"

واقعہ رجیع اور اس میں حضرت خبیب بن عدی رضی کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[33]:

"ہم نے ان کا واقعہ اور مکہ میں جن حالات سے وہ دوچار ہوئے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں بیان کیا ہے[34]۔"

حضرت خبیب رضی کو جب مشرکین پھانسی دینے کے لئے لے جا رہے تھے تو انہوں نے کچھ شعر کہے تھے۔ ان میں سے دو شعر نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "ان کے علاوہ متعدد شعر ہیں جو ہم نے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں نقل کئے ہیں۔" الاستیعاب میں ان اشعار کی تعداد دس ہے۔

فتح مکہ کے بیان میں لکھتے ہیں[35]: "عمرو بن سالم نے آنحضرت کو کچھ شعر سنائے جو میں نے کتاب الصحابہ میں ان کے تذکرہ میں نقل کئے ہیں[36]۔"

وفود کے باب میں حضرت حتات بن یزید مجاشعی کے تذکرہ میں جن کی مواخات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کے ساتھ کرائی تھی ابن عبدالبر لکھتے ہیں[37]: "ان کا واقعہ کتاب الصحابہ میں ان کے حالات میں بیان کیا ہے[38]۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[39]: "آپ کے غلام شقران حاضر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ان کی درخواست کا ذکر ہم نے کتاب الصحابہ کے شروع میں کیا ہے[40]۔"

الدرر میں ابن عبدالبر نے اپنی کتابوں میں صرف الاستیعاب ہی کا حوالہ نہیں دیا ہے، بلکہ کتاب "التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید" کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ کتاب کے شروع میں وحی کی صورتوں اور کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں[41]: "اس موضوع پر سیر حاصل بحث ہم نے کتاب التمہید میں حضرت عائشہ رضی کی مذکورہ حدیث کی شرح میں کی ہے۔"

کتاب کے آخر میں آپ کے مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی کی امامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں[42]: "مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی کے ساتھ آپ کی امامت کا مفہوم، آپ دونوں میں جو آگے تھا اس کی جگہ اور اس بارے میں ہماری اپنی رائے کتاب التمہید میں ملے گی۔"

اس سیرت میں ابن عبدالبر نے جن حضرات سے احادیث و روایات نقل کی ہیں اور ابن عقبہ، ابن اسحٰق اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں کی سندوں میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے ان کے بارے میں تحقیق گذر چکی ہے کہ وہ تمام کے تمام ابن عبدالبر کے شاگرد حمیدی کے بیان کے مطابق ان کے شیوخ ہیں جن سے انہوں نے روایت کی ہے۔

اس پوری بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر کی جانب اس سیرت کی نسبت مستند اور کسی شک شبہ سے بالاتر ہے

ابن عبدالبر نے الدرر کے مقدمہ میں لکھا ہے[۴۳]:

"اس کتاب میں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، عہد رسالت کے ابتدائی حالات، غزوات اور اُن میں آپ کے طریق عمل کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے۔ اس لئے کہ آپ کی ولادت، پرورش اور اہم واقعات کا ذکر صحابہ کے حالات پر اپنی کتاب کے شروع میں کر چکا ہوں۔ یہ کتاب صرف بعثت اور اس کے بعد کے بقیہ حالات کے لئے لکھی ہے..... اس کی ترتیب مکمل طور پر ابن اسحٰق کی طرز پر ہے۔ آپ کے غزوات اور جہاد کے ذکر میں جو بات میرے پیش نظر رہی ہے وہ یہ کہ اختصار سے کام لیا جائے۔ واقعہ آسانی سے ذہن نشین ہو جائے اور حشو و زوائد اور مختلف بحثوں کو گڈمڈ کرنے کے بجائے صرف اہم اور نمایاں باتوں کے بیان پر اکتفا کیا جائے۔"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ابن عبدالبر کا مقصد سیرت نبویہ پر ایک مختصر تصنیف پیش کرنا ہے۔ اس مقصد کی وضاحت صرف کتاب کے مقدمہ ہی میں نہیں کی ہے بلکہ اس کے لئے جو نام تجویز کیا ہے اس سے بھی بخوبی ظاہر ہے، گویا ابن عبدالبر نے جب دیکھا کہ سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں غیر ضروری اور غیر متعلق مباحث پائے جاتے ہیں تو انھیں خیال ہوا کہ وہ صرف آبدار موتیوں کو چن لیں اور ان سے ایک خوب صورت اور بیش بہا ہار تیار کریں۔ اس مختصر کتاب کا آغاز ابن عبدالبر نے بعثت اور اس کے بعد کے غزوات اور واقعات سے کیا ہے۔ جہاں تک بعثت سے قبل کے حالات کا تعلق ہے مثلاً آپ کی ولادت باسعادت، سلسلۂ نسب، والدین اور جد امجد کی وفات، حضرت ابوطالب کی کفالت، آپ کا نشوونما، بعثت سے پہلے کے مراحل اور حضرت خدیجہؓ سے شادی وغیرہ تو ان کا ذکر اس سے پہلے اپنی دوسری کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب کے شروع میں کر چکے تھے اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کی بنیاد ابن اسحٰق کے نہج پر رکھی ہے، مغازی کے بیان، تسلسل اور غزوات میں جو مسلمان شریک اور شہید ہوئے، اسی طرح جو مشرکین قتل یا قید کئے گئے ان کے ناموں کی فہرست میں ابن اسحٰق سے مطابقت بالکل واضح ہے لیکن کتاب کے عمومی ڈھانچہ میں اس اتفاق کے باوجود بہت سے مواقع پر جہاں انھوں نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن ابی خیثمہ کی کتابوں یا اپنے اساتذہ کی روایات سے اضافے کئے ہیں وہاں اُن کی حیثیت مستقل ہو جاتی ہے اور جب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابن عبدالبر کا شمار حدیث نبوی کے ان کبار حفاظ میں ہوتا تھا جو دقت نظر، تحقیق اور احتیاط میں مشہور تھے نیز علم الانساب صحابہ کے حالات اور ان کے اسماء کو صحت کے ساتھ ضبط کرنے میں مہارت رکھتے تھے تو اس سیرت کی قدر و قیمت اور واضح ہو جاتی

ہے۔ ابن عبدالبر خود بیان کرتے ہیں، کہ انہوں نے موسیٰ بن عقبہ کی کتاب اور سیرت ابن اسحٰق کے سلسلہ میں صرف ایک روایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کتابوں کی مختلف روایات کو سامنے رکھا اور موازنہ کیا اور ان کے ساتھ واقدی اور ابن ابی خیثمہ کی تحریروں اور اپنے شیوخ کی روایات کا بھی اضافہ کیا اور ان سب کی روشنی میں سیرت نبویؐ پر ایک مستند کتاب مرتب کی۔

سیرت کی بعض تفصیلیں ابن عبدالبر نے بغیر سند کے شروع کی ہیں۔ اس صورت میں بظاہر طویل غور و فکر، تلاش و تفحص اور تحقیق و موازنہ کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں انہیں پیش کرتے ہیں۔

سیرت کے ضمن میں ابن عبدالبر کے بعض منفرد خیالات بھی ہمیں ملتے ہیں۔ یہ خیالات چونکہ فقہ و حدیث کے ایک بلند پایہ اور جلیل القدر عالم کے ہیں اس لئے عام اور مشہور رائے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں ان کا بڑا وزن ہے مثلاً اللہ اور اس کے رسول پر اول اول ایمان لانے والوں میں ابن عبدالبر نے حضرت عائشہ بنت ابی بکر الصدیقؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کمسن تھیں (وھی صغیرۃ[۴۴]) اس سے اس مشہور قول کی تردید ہوتی ہے جس کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں حضرت عائشہؓ سے جب زفاف ہوا تو ان کی عمر نو سال تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عبدالبر کے نزدیک یہ بات ثابت شدہ ہے کہ وہ اول بعثت میں یعنی ہجرت مدینہ سے تقریباً تیرہ سال قبل اسلام لائیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ بعثت کے وقت ان کی عمر کم از کم چار سال رہی ہو تاکہ قبول اسلام میں ان کی اولیت تسلیم کی جا سکے۔

اسی طرح ابن عبدالبر کے نزدیک رمضان کے روزے ہجرت کے پہلے سال میں فرض ہوئے جبکہ مشہور خیال یہ ہے کہ ہجرت کے اٹھارہویں مہینے فرض ہوئے[۴۵]۔

خیبر کے مال غنیمت کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خیبر مکمل جنگ کے بعد فتح ہوا ہے[۴۶]۔ ابن سید الناس نے اس رائے پر تفصیل سے بحث کی ہے[۴۷]۔

اسی طرح بعض احادیث پر جو ثابت نہیں ہیں یا ابن عبدالبر کے نزدیک مشکوک ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے مثلاً جنوں کے اسلام لانے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو روایات منقول ہیں اور بعض میں پانی نہ ملنے کی وجہ سے نبیذ سے آں حضرت کے وضو کرنے کا ذکر ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۴۸]:

"ابن مسعود سے یہ روایت مختلف سندوں سے جو سب کی سب قوی ہیں تواتر کے ساتھ وارد ہوئی ہے، بجز ابوزید کی روایت کے جس میں نبیذ سے وضو کا ذکر ہے۔ کیونکہ ابوزید مجہول شخص ہے اور ابن مسعود کے اصحاب میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ جنوں کے ذکر میں سورہ الرحمٰن اور سورہ جن (قل اوحی إلیّ انه استمع نفر من الجن) اور سورہ احقاف کی آیات (واذ صرفنا إلیک نفرا من الجن یستمعون القرآن) الخ کافی ہیں۔"

گویا اس سلسلہ میں ابن عبدالبر قرآنی نص پر بغیر کسی زیادتی کے اعتماد کرنا چاہتے ہیں۔

ابن عبدالبر کی دقت نظر اور تحقیق کا اندازہ غزوہ بنی المصطلق یا غزوہ مریسیع کے بارے میں اس اقتباس سے کیا جا سکتا ہے[۴۹]:

"اسی غزوہ میں اہل افک نے حضرت عائشہؓ پر بہتان لگایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں بری قرار دیا اور ان کی برأت کے لیے قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔ یہ روایت کہ سعد بن معاذ نے اس بارے میں سعد

بن عبادہ سے تکرار کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تکرار سعد بن عبادہ نے اسید بن حضیر سے کی تھی۔ ایسا ہی ابن اسحٰق نے زہری عن عبیداللہ بن عبداللہ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ یہی صحیح ہے اس لئے کہ سعد بن معاذ کا انتقال بنو قریظہ سے آنحضرت کی واپسی میں ہی ہو چکا تھا۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں اور غزوہ مریسیع کے وقت وہ زندہ تھے اور نہ شریک ہوئے تھے۔"

گذشتہ سطور سے آپ کو اندازہ ہوا ہو گا کہ یہ کتاب (جس کا تعارف ہم پیش کر رہے ہیں وہ) سیرت کے موضوع پر ایک محققانہ کتاب ہے جو صرف سیرت کی مشہور کتابوں ہی سے استفادہ نہیں کرتی بلکہ حدیث کی کتابیں اور ثقات کی روایت بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ مزید برآں اخبار و احادیث کے درمیان موازنہ، صحیح نتیجہ تک رسائی، اشخاص کے ناموں میں پوری باریک بینی توقف کی جگہ توقف اور موزوں رائے کا انتخاب، حدیث اور رجال حدیث کا وسیع علم ضعیف اور قوی کا امتیاز یہ ساری خصوصیات اس سیرت میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

اس سیرت کی اہمیت اور قدر و منزلت کا اسی دور میں یہ عالم تھا کہ ابن عبدالبر کے شاگرد ابن حزم نے جب سیرت پر اپنی کتاب "جوامع السیرۃ" لکھنے کا ارادہ کیا تو "الدرر" کو مشعلِ راہ بنایا۔ جوامع السیرۃ کا نفیس تحقیقی ایڈیشن دارالمعارف سے شائع ہو چکا ہے [۵]۔ ابن حزم نے اس کتاب کے شروع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب، پیدائش، عمر، وفات، علامات نبوت، حج، عمرے، غزوات و سرایا، حلیہ، اسماء، امراء، کاتبین، محافظین، موذنین، خطباء، شعراء، سفراء، بعض بادشاہوں کو اسلام کی دعوت، ازواج و اولاد اور آپ کے اخلاق و عادات پر اختصار سے روشنی ڈالی ہے۔ اس حصہ میں ابن عبدالبر سے ان کی موافقت نہیں ہوتی اس لئے کہ ـــ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ابن عبدالبر نے الاستیعاب کے آغاز میں اس بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس پر اکتفا کرتے ہوئے الدرر میں ان مسائل سے تعرض نہیں کیا ہے۔ لیکن اس حصہ کے بعد جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو بیشتر صفحات میں ابن عبدالبر سے ان کی مطابقت صاف نظر آتی ہے۔ اس امر کی جانب خود سیرت ابن حزم کے ناشرین نے بھی ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے [۵]

"ابن حزم نے اپنی سیرت میں اپنے شیخ اور معاصر ابو عمر ابن عبدالبر مصنف "الدرر فی اختصار المغازی والسیر" سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مکمل صورت میں ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے اندازہ ہوتا کہ ابن حزم نے کس حد تک اس پر اعتماد کیا ہے، لیکن اس کے تھوڑے بہت اقتباسات جو ابن سید الناس نے محفوظ کر دیے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حزم نے اپنے شیخ کی کتاب سے متعدد عبارتیں معمولی تصرف سے نقل کی ہیں۔ الا یہ کہ یہ فرض کیا جائے کہ دونوں مصنفین یعنی ابن عبدالبر اور ابن حزم نے کسی تیسرے ماخذ سے استفادہ کیا ہے جو ہماری دسترس میں نہیں ہے۔"

سیرت ابن حزم کے ناشرین کی نظر سے ابن عبدالبر کی کتاب کا نسخہ اگر گذرا ہوتا تو انھیں یقین ہو جاتا کہ ابن حزم نے بعثت کی بحث (ص ۴۴) سے آخر تک ابن عبدالبر کی کتاب کے اکثر صفحات جا بجا معمولی تصرف سے نقل کئے ہیں۔ یہ خیال کہ ممکن ہے دونوں کا کوئی تیسرا مشترک ماخذ رہا ہو اس لئے صحیح نہیں ہے کہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب کے ماخذ

متعین طور پر بیان کئے ہیں۔ جبکہ ابن حزم نے ان مباحث میں جہاں وہ ابن عبد البر کے ساتھ ہوتے ہیں کسی ماخذ کا پتہ نہیں دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غزوات کی ترتیب، ان کے درمیان پیش آنے والے واقعات، ان میں شریک ہونے والے مسلمان اور مشرکین اور جو مسلمان شہید ہوئے اور جو مشرکین ہلاک ہوئے یا قید کئے گئے ان کے ناموں کی تفصیل میں ابن حزم ابن اسحٰق کے نقش قدم پر چلتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی وہ ابن عبد البر کے پیرو ہیں۔ ابن عبد البر کے خطبۃ الکتاب کا اقتباس اوپر گزر چکا ہے ابن حزم نے اپنے شیخ کی پیروی صرف کتاب کی ترتیب، واقعات اور اشخاص کے ناموں ہی میں نہیں کی ہے بلکہ اکثر ان کی عبارتیں بھی معمولی تصرف سے نقل کر دی ہیں اور کہیں کہیں تو بغیر کسی تصرف کے ہو بہو درج کر دی ہیں۔ اسی طرح ابن عبد البر کے بہت سے خیالات اور تحقیقات کی بھی خوشہ چینی کی ہے جس کی نگاہ سے ابن عبد البر کی کتاب نہ گزری ہو وہ انھیں ابن حزم کے فکر و اجتہاد کا نتیجہ خیال کرے گا۔ مثلاً ابن عبد البر کے نزدیک حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو مہاجرین حبشہ میں شمار کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:[۵۳]

"بعض روایتوں میں مذکور ہے اور بعض اہل سیر کا خیال ہے کہ حبشہ ہجرت کرنے والوں میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے لیکن یہ صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی ایک جماعت کے ساتھ یمن سے مدینہ کے ارادہ سے نکلے تھے۔ یہ لوگ کشتی پر سوار تھے۔ ہوا کا رُخ ایسا ہوا کہ کشتی حبشہ کی طرف چلی گئی۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری وہاں مقیم رہے یہاں تک کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آئے۔"

اس کا موازنہ "جوامع السیرۃ" (ص ۵۸) سے کیجئے۔[۵۴]

اسی طرح ابن عبد البر کے نزدیک زکوٰۃ ہجرت اور مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کے بعد فرض ہوئی[۵۵] موازنہ کے لئے دیکھئے "جوامع السیرۃ" (ص ۹۷)[۵۶]

بدر میں شریک ہونے والے مہاجرین کی تعداد ابن عبد البر نے چھیاسی لکھی ہے[۵۵]۔ جبکہ ابن اسحٰق نے تراسی بیان کی ہے موازنہ کے لئے دیکھئے "جوامع السیرۃ" (ص ۱۲۲)

اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ واقعۂ افک کے سلسلہ میں ابن عبد البر سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کے درمیان جھڑپ کا انکار کرتے ہیں کیونکہ اول الذکر کا انتقال واقعہ سے پہلے ہو چکا تھا (ص ۲۰۲) موازنہ کے لئے ملاحظہ ہو "جوامع السیرۃ" (ص ۲۰۶)

انکار و خیالات، اشخاص کی فہرست اور متن کی عبارتوں میں سیرت ابن حزم اور سیرت ابن عبد البر میں اتنی مطابقت ہے کہ اول الذکر کے بڑے حصہ کو ہم نے سیرت ابن عبد البر کے دوسرے نسخہ کی حیثیت سے سامنے رکھا اور ہمارے نسخہ میں جو تصحیف یا نقص ہے اس کی تصحیح میں اس سے فائدہ اٹھایا اور ہمیں یقین ہے کہ اگر سیرت ابن حزم کے ناشرین کے پاس ابن عبد البر کی کتاب کا نسخہ رہا ہوتا تو اپنے نسخہ کے متن کو بہت سے مقامات پر انہوں نے درست کیا ہوتا، بلاشبہ انہوں نے سیرت ابن حزم کی تصحیح اور عبارتوں کے درمیان جو خلا ہیں ان کو پُر کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے لیکن اب بھی کچھ مقامات ایسے رہ گئے ہیں جن کی جانب ابن عبد البر کی کتاب سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کہیں کسی لفظ میں تصحیف ہو گئی ہے اور کہیں بعض نام چھوٹ گئے

ہیں۔ تصحیح سے عبارت کا تسلسل قائم ہو جاتا ہے مثلاً: ص ۶۹ پر ایک عبارت ہے:

"ثم قدم إلى مكة ابو الحيسر انس بن رافع فی مائة من قومه"

صحیح عبارت سیرت ابن عبدالبر (ص ۷۰) میں ملاحظہ ہو:

"وقدم مكة ابو الحيسر انس بن رافع فی فتية من قومه" نیز دیکھئے سیرت ابن ہشام ص ۶۹۔ ص ۸۸:

"ثم ان اباجهل والحارث بن هشام اتيا المدينة وكلما عياش بن ابی ربيعة وشان اخاهما لامهما وابن عمهما" سیرت ابن عبدالبر میں یہ عبارت اس طرح ہے: "وكان اخاهما لامهما وابن عمهما" (ص ۷۱) سیرت ابن حزم میں "ابن عمتها" کھلی ہوئی تصحیف ہے۔

اسی صفحہ پر ابن حزم نے حضرت عمرؓ کے ساتھ مدینہ ہجرت کرنے والوں کے نام ابن عبدالبر سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ اس فہرست میں مخطوطہ کے کاتب نے درج ذیل نام چھوڑ دیے ہیں:

"ایاس، وعاقل، وعامر، وخالد بنو البكير الليثی حلفاء بنی عدی بن كعب"

نام اکثر چھوٹ گئے ہیں۔ ابن عبدالبر کی کتاب سے انہیں مکمل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک اور مثال اگلے صفحہ سے درج کرنا کافی ہوگا۔ عبارت یہ ہے: "ونزل حمزة بن المطلب وحليفة ابومرثد كناز بن حصين الغنوی وزيد بن حارثة الكلبی مولی رسول الله صلی الله عليه وسلم علی كلثوم بن الدم" (ص ۸۳)

صحیح عبارت ابن عبدالبر کے یہاں ملاحظہ ہو: "ونزل حمزة بن عبدالمطلب وحليفاه: ابومرثد الغنوی وابنه مرثد بن ابی مرثد وزيد بن حارثة، وأنسة، وابوكبشة موالی رسول الله صلی الله عليه وسلم علی كلثوم بن الهدم" (۸۴)

مطبوعہ سیرت ابن حزم یا زیادہ صحیح لفظوں میں سیرت ابن حزم کے اس نسخہ میں جسے شائع کیا گیا ہے اس طرح کے مسلسل

ص ۱۰۶: "سمع رسول الله صلی الله عليه وسلم [يأمر] بتحويل القبلة"

"یامر" کا لفظ قوسین میں درج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ مخطوطہ میں چھوٹ گیا ہے۔ ابن عبدالبر کی کتاب میں اس کی جگہ "یخطب" ہے (ص ۱۰۹)

ص ۱۱۲: "عرض الرسول علی اصحابه فی وقعة بدر مصارع رؤس الكفر من قريش مصرعا مصرعا، يقول: هذا مصرع فلان ومصرع فلان فما عدا احد منهم مضجعه" ابن البر کے یہاں مضجعہ کی جگہ پر "مصرعه" ہے (ص ۱۱۳)

ص ۱۱۹: "وعامر بن فهيرة......من مولدی الأسد"

سیرت ابن عبدالبر میں "من مولدی الأزد" ہے (ص ۱۲۳)

ص ۱۳۳: "ومن بنی مرضخة وهو عمرو ابنی غنم بن أمية"

صحیح عبارت "الدرر" میں ہے: "ومن بنی مرضخة وهو عمرو بن غنم بن أمية" (ص ۱۴۱)

ص ۱۵۶: "اشار رسول الله صلی الله عليه وسلم أن لا يخرجوا إليهم وأن يتحصنوا بالمدينة فان

" تندموا منها فانلهم على افواه الازقة "

صحیح عبارت سیرت ابن عبدالبر میں یوں ہے: " أشار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی أصحابه أن لا یخرجوا إلیهم وأن یتحصنوا بالمدینة، فان نزلوا منها فاتلوهم علی أفواه الازقة " (ص ۱۵۴)

ص ۱۵۸: " وکان فی المشرکین یومئذ خمسون فارسا " (ص ۱۵۵)

صحیح عبارت ابن عبدالبر میں ہے:

ص ۱۶۱: " وکان قد قتل اصحاب اللواء من المشرکین حتی سقط فرفعته عمرة بنت علقمة "

اب ابن عبدالبر کی عبارت ملاحظہ ہو: [59]

" وقتل صاحب لواء المشرکین فسقط لواءهم فرفعته عمرة بنت علقمة " اس طرح عبارت بھی صحیح ہو جاتی ہے اور سیاق بھی درست ہو جاتا ہے۔

ص ۱۶۵: " وحید الأصیرم دبه رمق یسیر فقال بعضهم لبعض: واللہ إن هذا الاصیرم فأجابه لقد ترکنا و وإنه لمنکر هذا الامر "

ابن عبدالبر میں " فأجابه " کے بجائے " ماجابه " ہے جس سے جملہ درست ہو جاتا ہے (ص ۱۶۱)

ص ۲۰۴ " وذلک لشر وقع لبنی جهجاه بن مسعود الغفاری أجیر عمر بن الخطاب وبین سنان بن وبرا لجهنی "

صحیح عبارت ابن عبدالبر میں یوں ہے: " ذلک لشر وقع بین بنی جهجاه - " (ص ۲۰۱)

اس طور پر سیرت ابن عبدالبر کی مدد سے سیرت ابن حزم کے مطبوعہ نسخہ کی تصحیفات و تحریفات اور عبارت میں جو نقص رہ گیا ہے اس کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

شاید سب سے اہم شخصیت جس نے ابن عبدالبر کی سیرت سے استفادہ کیا وہ ابن سید الناس متوفی ۷۳۴ھ ہیں۔ انہوں نے اپنی طویل سیرت النبی " عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر " میں سیرت ابن عبدالبر کو بھی ایک ماخذ کے طور پر پیش نظر رکھا۔ عیون الاثر قاہرہ سے دو جلدوں میں چھپ گئی ہے۔ اس کتاب میں وہ ابن عبدالبر کی سیرت سے بہت سے فقرے اور فصلیں، بیشتر ان کے نام کی صراحت کے ساتھ، نقل کرتے ہیں۔ اشخاص کے ناموں، سیرت کے واقعات اور ابن عبدالبر کی رایوں پر بہت سے مقامات پر بحث بھی کی ہے۔ ابن عبدالبر کا ذکر ہمیشہ بڑے عزت و احترام سے کرتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں جب اپنی سیرت کے ماخذ کی سندیں ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں:

" اس کتاب میں ابو عمر سے جو مواد لیا گیا ہے وہ کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر سے ماخوذ ہے۔ کتاب الدرر ان کتابوں میں ہے جنھیں میں نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، اور ان کی سند یہ ہے: عن شیخه ابی الحسین محمد بن احمد بن السراج عن خاله ابی بکر بن

خبر عن ابی الحجاج الشنتمری عن ابی علی الغسانی عن ابن عبد البر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سید الناس نے ابن عبد البر کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں وہ ایک ایسے نسخہ سے ماخوذ ہیں جس کی نسبت متعین اور سند مؤلف تک متصل ہے۔ نیز مصنف سے لے کر ابن سید الناس تک ثقہ شیوخ اس نسخہ کی روایت ایک دوسرے سے کرتے رہے ہیں۔ اس سے اس نسخہ کی قدر و قیمت اور درجۂ استناد بہت بلند ہو جاتا ہے۔

ہمارا قیاس ہے کہ جس نسخہ کو ہم شائع کر رہے ہیں وہ اسی نسخہ کی نقل ہے جو ابن سید الناس کے والد محمد بن محمد بن عبداللہ الاشبیلی مقیم قاہرہ کے ساتھ اندلس سے مصر منتقل ہوا، ممکن ہے ان کے صاحبزادے نے اپنے لیے اس کی کوئی نقل تیار کی ہو اور وہ رائج ہو گئی ہو یا خود والد ہی کا نسخہ ان کے مصری تلامذہ کے ذریعہ رائج ہوا ہو۔ اس قیاس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ہمارے نسخہ کی عبارتیں۔ حتی کہ جہاں بظاہر غلطی یا تصحیف بھی ہے۔ ابن سید الناس کے اقتباسات سے ملتی جلتی ہیں۔ مثال کے طور پر شعب ابی طالب میں بنی ہاشم اور بنی المطلب کے دخول اور قریش کے مقاطعہ کے سلسلہ میں ہمارے نسخہ ۶۰ اور عیون الاثر (۱/۱۲۷) میں ایک عبارت ہے:

"لیسلموا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم برمته إلی قریش"

"الرمتہ" رسّی کو کہتے ہیں، یہاں اس سے مراد عہد ہے، ممکن ہے اس لفظ میں تصحیف ہوا اور یہ صحیح لفظ "یزمته" ہو، اسی صفحہ پر ہمارے نسخہ اور ابن سید الناس دونوں کی عبارت ہے:

"فما لکم أن ترجعوا عما احدثتم علینا وعلی أنفسکم"

ہمارے نسخہ کے حاشیہ میں "أحدثتم" کی تصحیح "أخذتم" سے کی گئی ہے جو سیاق کے اعتبار سے زیادہ برمحل ہے معلوم ہوتا ہے یہاں بھی لفظ میں تصحیف ہو گئی ہے۔

ابن سید الناس کی سیرت میں ابن عبد البر کے اقتباسات غیر معمولی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ اقتباسات کتاب کے آغاز اور بعثت نبوی کے ذکر ہی سے ملنے لگتے ہیں۔ بعثت کے سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ابن عبد البر نے پیش کی ہیں ان میں اور کتاب کی دوسری متفرق روایات میں دونوں کے درمیان مطابقت پائی جاتی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں پر جو لوگ بے محابا مظالم ڈھا رہے تھے ان کے سلسلہ میں ابن عبد البر نے جو حدیث نقل کی ہے اسے ان کے حوالہ کے ساتھ ابن سید الناس نے درج کیا ہے (۱/۱۰۱) اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استہزا کرنے والوں پر جو پیراگراف ابن عبد البر نے لکھا ہے اسے نقل کیا ہے (۱/۱۱۳) ابن عبد البر آگے ہجرت حبشہ پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ ابن سید الناس عنوان میں ان کی پیروی کرتے ہیں (۱/۱۱۵) اور باب کے آغاز میں جو حدیث ابن عبد البر نے درج کی ہے وہ اور بہت سا مواد بھی نقل کرتے ہیں۔ اس کے بعد ابن عبد البر نے ایک باب "باب فی ذکر دخول بنی هاشم بن عبد مناف وبنی عبد المطلب بن عبد مناف فی الشعب وما لقوا من سائر قریش فی ذلک" قائم کیا ہے ابن سید الناس نے یہ پورا باب نقل کیا ہے (۱/۱۲۷) چند صفحات کے بعد جنوں کے قبول اسلام اور اس بارے میں حضرت

عبداللہ بن مسعود سے مروی احادیث پر ایک فصل ہے جس کا مکمل مواد سیرت ابنِ سید الناس میں منتقل ہو گیا ہے (۱۳۶/۱) ابن عبدالبر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے قبائل عرب کو اسلام کی دعوت اور عقبہ اولی ثانیہ و ثالثہ پر گفتگو کی ہے ابن سید الناس نے ابن عبدالبر کے ساتھ سیرت کی دوسری کتابوں کا مواد بھی شامل کیا ہے۔ پھر حضرت عمرؓ کی ہجرت مدینہ پر جو پیراگراف ابن عبدالبر نے لکھا ہے اسے نقل کرتے ہیں (۱۷۴/۱) اسی طرح ہجرت سے قبل خود مہاجرین کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مواخات کرائی اس کا تذکرہ اور اس کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخات ہوئی اس کے کچھ پہلو ابن عبدالبر سے نقل کئے ہیں (۱۹۹/۱) ابن عبدالبر جب مغازی کا بیان شروع کرتے ہیں تو ایک ایک غزوہ میں ابن سید الناس ان کے قدم بہ قدم چلتے ہیں اور واقعات یا اسمائے اعلام میں اکثر ابن عبدالبر اور دوسرے سیرت نگاروں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں۔ ابن عبدالبر کی طرح وہ بھی سریۂ عبداللہ بن جحش کے بعد ٹھہر کر تحویل قبلہ پر گفتگو کرتے ہیں (۲۳۰/۱) اور ہجرت سے قبل مکہ میں نماز کعبہ کی جانب رخ کر کے پڑھی جاتی تھی یا بیت المقدس کی جانب اس بارے میں جو اختلاف ہے اس سے متعلق روایات ابن عبدالبر کی کتاب التمہید اور کتاب الاستذکار سے نقل کرتے ہیں۔ غزوہ بدر میں جو مسلمان شہید ہوئے اور جو کفار قریش مارے گئے یا قید کئے گئے ان سے متعلق تفصیلیں بھی ابن عبدالبر کے حوالہ سے نقل کی ہیں (۲۸۶/۱) غزوہ بدر کے بعد ابن عبدالبر نے جو فصل لکھی ہے (ص ۱۳۹) اس کی تلخیص بھی کی ہے (۲۹۲/۱) بعض اوقات ابن سید الناس ابن عبدالبر سے نقل تو نہیں کرتے لیکن دوسرے اصحاب سیر اور ان کے درمیان موازنہ ضرور کرتے ہیں اور اس موازنہ اور استدراک میں ابن عبدالبر کی کتاب "الاستیعاب" ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ خیبر کی قہراً فتح اور غنائم کی تقسیم پر جو پیراگراف ابن عبدالبر نے لکھا ہے[1] اسے نقل کرنے کے بعد ابن سید الناس نے ابن عبدالبر کی رائے پر طویل بحث کی ہے (۱۳۷/۲)

اس کثرت سے ابن عبدالبر کے اقتباسات نقل کرنے کی وجہ سے سیرت ابن سید الناس کتاب الدُّرر فی اختصار المغازی والسیر کا تقریباً ایک نسخہ بن جاتی ہے۔ ہم نے ایک سے زیادہ مقامات پر اس کی مدد سے متن کی تصحیح کی ہے۔ خلا کو پُر کیا ہے اور کاتب نے بعض جگہوں پر تصحیف و تحریف کے جو گل کھلائے تھے انھیں درست کیا ہے۔

سیرت ابن عبدالبر کا مخطوطہ

ہمارے سامنے اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہے جو دارالکتب المصریہ میں محفوظ ہے (رقم ۵۲۳ تاریخ) یہ نسخہ مکمل ہے اگرچہ بظاہر اس کا پہلا ورق جس پر کتاب کا نام درج تھا بہت پہلے ضائع ہو چکا تھا اور اس کی جگہ پر دوسرا ورق لگایا گیا جس پر کتاب کا نام اس طرح درج ہے :

"کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر للحافظ ابی عمر بن عبد البر

النمری، رحمہ اللہ تعالیٰ - آمین"

نام کے بائیں جانب تاج العروس فی شرح جواہر القاموس کے مصنف محمد مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) متوفی ۱۲۰۵ھ کے قلم سے یہ عبارت ہے :

"انتداه، وعلى وقفيته ألفاه، العبد لله، محمّد مرتضى الحسيني، عفى عنه حامد الله ومصليا ومسلما على بنيه ومستغفرا"

اِسی صفحہ پر یہ تحریر بھی ہے :

"محصتر من جامع محرم افندی الشهير بالكردی، وأضيف فی ۵ راكتوبر سنة ۱۸۸۱ء"

مندرجہ بالا تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ مذکورہ تاریخ میں جامع الکردی سے دار الکتب المصریہ منتقل کیا گیا، جامع کردی اس سے پہلے مدرسہ محمودیہ کے نام سے معروف تھی، جسے استاذ محمود نے باب زویلہ کے قریب شارع قصبۂ رضوان پر قائم کیا تھا۔

کتاب کے چھٹے ورق پر کاتب نے مصنف کی کنیت "ابو عمر" غلطی سے واو کے ساتھ "ابو عمرو" لکھ دی ہے۔ حاشیہ پر اس کی تصحیح یوں کی گئی ہے :

"هذه الكراريس من كتاب السيرة النبوية للحافظ أبي عمر بن عبد البر ولكن ناسخها يجعله أبا عمر وبالواو، وهو غلط، فليصلح"

زبیدی نے جن کی ملکیت میں یہ نسخہ تھا اس استدراک کے پہلو میں لکھا ہے :

"هذا خط الحافظ أبي الخير السخاوي رحمه الله، وكتبه محمّد مرتضى"

ابو الخیر سخاوی سے مراد الضوء اللامع فی القرن التاسع کے مشہور مصنف شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس مخطوطہ کی توثیق کے لئے کافی ہیں۔ سخاوی جیسے مورخ نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور زبیدی جیسے محقق کی ملکیت میں رہا ہے۔

یہ نسخہ عام قلم سے دو مختلف رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ ایک تو خط نسخ ہے جو واضح اور روشن ہے اور اس میں بعض الفاظ کو حرکتوں کے ذریعہ ضبط کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات خط ثلث میں لکھے گئے ہیں۔ دوسرا عام خط ہے، نقطے بہت کم لگے ہیں۔ الفاظ کو ضبط بھی نہیں کیا گیا ہے۔ متن کے مقابلہ میں عنوانات جلی قلم سے لکھے گئے ہیں۔ حاشیوں پر تصحیح و استدراک ہے۔ بظاہر اس نسخہ کی کتابت آٹھویں صدی ہجری میں انجام پائی، ہمارا قیاس اُوپر گذر چکا ہے کہ ممکن ہے، یہ اس نسخہ کی نقل ہو جس سے ابن سید الناس نے اپنی کتاب عیون الاثر میں استفادہ کیا ہے۔

مخطوطہ میں جا بجا "قلت" کا لفظ اور اس کے بعد ابن عبد البر کے کلام پر تعلیقات و استدراکات ملتے ہیں اور "قلت" کا قائل اپنی تعلیقات میں اکثر سہیلی متوفی ۵۸۱ھ کی کتاب "الروض الانف" سے استفادہ کرتا ہے۔ جس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ سہیلی کے بعد کا کوئی عالم ہے۔ ابن عبد البر کی کتاب التمہید اور کتاب الاستذکار کے حوالے بھی ان تعلیقات میں ملتے ہیں۔ کہیں کہیں "قلت" کی جگہ "فائدہ" یا "ھھنا لطیفۃ" کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں

تعین سے پہلے "قلت" جیسا کوئی لفظ نہیں ہے لیکن تعلیق کے الفاظ میں کوئی ایسا اشارہ بہر حال ملتا ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ اصل کتاب کی عبارت نہیں ہے۔ مثلاً ابن عبدالبر پر تنقید یا آخر میں خاتمہ، استدراک کی کوئی علامت ہوتی ہے جیسے "یرجع الکلام"۔ "عاد الکلام"۔ "واللہ اعلم"۔ "واللہ الموفق"۔ "باللہ التوفیق"۔ "والحمد للہ"۔ "والحمد للہ رب العالمین"۔ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ تعلیقات اصل نسخہ کے حاشیہ پر رہی ہوں اور ہمارے مخطوطہ کے کاتب نے انھیں متن کے اندر داخل کر دیا ہو، یا خود کاتب مخطوطہ کوئی عالم ہو جس نے ان تعلیقات کا اضافہ کیا ہو۔ بہر حال میں نے ان ساری تعلیقات کو اصل کتاب سے نکال کر حاشیہ میں ستارہ کے نشان سے درج کر دیا ہے تاکہ میرے نمبروار حواشی سے ممتاز رہیں، ان تعلیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا محدث ہے، سیرت اور حدیث کی مختلف کتابوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ سنی فقیہ ہے جسے فقہاء کے اختلافات اور ان کے طرق استنباط کا علم ہے۔ بلغت، نحو اور بعض مسائل میں سیبویہ وغیرہ کے اختلافات سے بخوبی واقف اور علم معانی و بیان کا ماہر ہے۔ ان تعلیقات و استدراکات کو متن سے محض اس لئے خارج کر دیا گیا ہے کہ سیرت ابن عبدالبر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آئے۔

حواشی

(۱) ابن عبدالبر کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو:

حمیدی: جذوۃ المقتبس، طبع قاہرہ: ۳۴۴

ابن بشکوال: الصلۃ، طبع قاہرہ: ۶۱۶

ضبی: بغیۃ الملتمس: ۴۷۴

فتح بن خاقان: مطمح الانفس: ۶۱

ابن سعید: المغرب، دار المعارف، ۲: ۴۰۷

ابن خلکان: وفیات الاعیان (تصحیح محی الدین عبدالحمید، مکتبۃ النہضۃ ۶: ۶۹)

ابن فرحون: الدیباج

ابن العماد: شذرات الذھب، پہلا ایڈیشن، قاہرہ: ۳۵۷

ذہبی: تذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ حیدر آباد، ۳: ۳۰۶

یافعی: مرآۃ الجنان، حیدر آباد، ۳: ۸۹

ذہبی: العبر فی خبر من غبر، کویت، ۳: ۲۵۵ (شوقی ضیف)

حواشی از مترجم

(۲) فاضل مضمون نگار نے "ابوعمر المکوی" لکھا ہے جبکہ موصوف ابن المکوی سے معروف ہیں۔ حمیدی کے الفاظ ہیں: "ابوعمر احمد بن عبدالملک بن ہاشم المعروف بابن المکوی الاشبیلی" ملاحظہ ہو جذوۃ المقتبس: ۱۳۲۔

(۳) حالات کے لئے دیکھئے: حمیدی: ۲۵۴۔

(۴) حالات کے لئے دیکھئے: حمیدی: ۲۹۵۔

(۵) ایضاً: ۲۱۰۔

(۶) 〃 : ۲۵۲۔

(۷) 〃 : ۲۳۴۔

(۸) ابن عبدالبر کے شیخ کا نام "محمد بن ابراہیم بن سلیمان" لکھا ہے جو غلط ہے۔ ترجمہ میں ہم نے تصحیح کر دی ہے۔ اصل میں ڈاکٹر شوقی ضیف سے یہاں تسامح ہو گیا ہے۔ اس کی وضاحت حاشیہ نمبر ۲۴ میں ہم کریں گے۔ محمد بن ابراہیم بن سعد کے حالات کے لئے دیکھئے: حمیدی: ۴۱۔

(۹) حالات کے لیے دیکھئے: حمیدی: ۱۴۱۔

(۱۰) ایضاً: ۱۰۷۔

(۱۱) ایضاً: ۱۲۸۔

(۱۲) ان کا نام ابومحمد عبداللہ بن یوسف تھا۔ دیکھئے ابن بشکوال ۱: ۲۷۹۔

(۱۳) ابن خلکان نے ان کا سن وفات ۴۸۰ھ لکھا ہے۔ (۶: ۶۹)

(۱۴) عام طور پر تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے مگر حمیدی نے ابوالحسن علی بن احمد عابدی سے ۴۶۰ھ نقل کیا ہے (۳۶۹)

(۱۵) بغیۃ الملتمس میں اس کتاب کا نام "التجوید والمدخل الی علم القرآن بالتجرید" لکھا ہے۔

(۱۶) یہ اختصار مطبعۃ الموسوعات سے ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوا تھا پھر ۱۹۲۸ء میں مکمل کتاب مصر سے شائع ہوئی۔

(۱۷) کتاب کا پورا نام "بہجۃ المجالس وانس المجالس بما یجری فی المذاکرات من غرر الابیات ونوادر الحکایات" ہے، دو جلدوں میں ہے (حمیدی: ۳۶۹) ۱۹۱۱ء میں مصر سے "جواہر الحکما" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس میں ابن مقفع کی الادب الکبیر کے ساتھ بہجۃ المجالس کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔

(۱۸) الدرر: ۲۷۵-۲۷۶

(۱۹) ابن ہشام کے شاگرد محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم البرقی مراد ہیں۔

(۲۰) ملاحظہ ہو الاستیعاب ۱: ۹

(۲۱) حمیدی : ۲۵۲ -

(۲۲) ایضاً : ۲۳۴ -

(۲۳) ایضاً : ۴۱ -

(۲۴) حاشیہ نمبر ۴ میں ہم نے لکھا ہے کہ ابن عبدالبر کے شیخ محمد بن ابراہیم بن سعید کے سلسلہ میں ڈاکٹر شوقی ضیف سے تسامح ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے ان کے جدامجد کا نام "سعید" کے بجائے "سلیمان" لکھا اور یہاں یہ غلطی ہوئی کہ "ابن ابی القرامید" کی جگہ "ابن المدماتہ" لکھ دیا۔ اصل میں جذوۃ المقتبس کے صفحہ ۴۱ پر محمد بن ابراہیم کے نام سے دو شخصیتوں کے حالات ہیں، ایک تو محمد بن ابراہیم بن سلیمان کا جو "ابن المدماتہ" کے نام سے مشہور تھے، ادیب و شاعر تھے۔ حمیدی نے ان کے تین شعر بھی نقل کئے ہیں۔ ان کے ترجمہ کا نمبر ۱۶ ہے ان کے بعد ہی ابن عبدالبر کے شیخ محمد بن ابراہیم بن سعید ابو عبداللہ کا تذکرہ ہے جو "ابن ابی القرامید" سے معروف ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے چوک ہوئی کہ نام مقدم الذکر کا لیا اور بقیہ حالات موخر الذکر کے ترجمہ سے نقل کئے۔

(۲۵) حمیدی : ۱۲۸ و ۱۲۹ -

(۲۶) الدرر : ۴۰ -

(۲۷) ایضاً -

(۲۸) الاستیعاب ۱ : ۴۷۰

(۲۹) الدرر : ۱۲۳

(۳۰) الاستیعاب ۱ : ۱۶۴

(۳۱) الدرر : ۱۶۲

(۳۲) الاستیعاب ۱ : ۳۵۲

(۳۳) الدرر : ۱۶۹

(۳۴) الاستیعاب ۱ : ۱۶۷

(۳۵) الدرر : ۲۲۵

(۳۶) الاستیعاب ۲ : ۴۵۹

(۳۷) الدرر : ۲۷۱

(۳۸) الاستیعاب ۱ : ۱۵۳

(۳۹) الدرر : ۲۸۷

(۴۰) الاستیعاب مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۱۸ھ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے شروع میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین

کے سلسلہ میں شقران کا کوئی ذکر نہیں ہے (ا : ۱۹ - ۲۰) جلد دوم (مطبوعہ ۱۳۱۹ھ) میں جہاں شقران کے حالات ہیں وہاں بھی صرف آپ کے غسل کے وقت شقران کی موجودگی کا ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو (ص ۶۱۰) ڈاکٹر شوقی ضیف نے کتاب الدرر میں اس موقع پہ کوئی حاشیہ نہیں لکھا۔

(۴۱) الدرر : ۳۳

(۴۲) ایضاً : ۲۸۷

(۴۳) ایضاً : ۲۹

(۴۴) ایضاً : ۴۱ - ابن عبدالبر کی اس عبارت پر کتاب کے حاشیہ نگار نے لکھا ہے کہ یہاں حضرت عائشہؓ کا ذکر غلط فہمی پر مبنی ہے (ذکر العائشۃ وھم منہ) اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ الاستیعاب کے شروع میں ابن عبدالبر نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ "حضرت عائشہؓ سے مکہ میں حضرت سودہ سے قبل اور ایک قول کے مطابق ان کے بعد شادی کی، علماً کا اس پر اتفاق ہے کہ زفاف مدینہ میں ہوا . . . . جبکہ وہ نو سال کی تھیں۔ عقد کے وقت ان کی عمر چھ سال اور ایک قول کے مطابق سات سال تھی" (ا : ۱۹) پھر حضرت عائشہؓ کے حالات میں لکھتے ہیں: "حضرت عائشہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے دو سال قبل مکہ میں شادی کی۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ دوسروں نے تین سال قبل بیان کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال اور ایک روایت کے مطابق سات سال تھی۔ زفاف مدینہ میں ہوا اس وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ اس بارے میں علماً کے درمیان میرے علم کی حد تک کوئی اختلاف نہیں" (۲ : ۷۶۴) ڈاکٹر صاحب کو ابن عبدالبر کی ان عبارتوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔

(۴۵) الدرر : ۱۰۵ طبری ۲ : ۴۱۷

(۴۶) الدرر : ۲۱۴

(۴۷) ابن سیدالناس ۲ : ۱۳۷

(۴۸) الدرر : ۶۴

(۴۹) الدرر : ۲۰۲

(۵۰) یہ اس صورت میں ہوگا جب ہم یہ مانیں کہ غزوہ مریسیع، غزوہ بنو قریظہ کے بعد ہوا لیکن ابن سعد (ج ۲ ق ۱ ص ۴۵) کے نزدیک غزوہ مریسیع شعبان ۵ھ میں ہوا جبکہ غزوہ خندق اور بنو قریظہ ذیقعدہ میں ہوا۔ اس شکل میں یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے۔

(۵۱) یہ ایڈیشن ڈاکٹر احسان عباس اور ڈاکٹر ناصرالدین اسد کی تحقیق اور شیخ احمد محمد شاکر کی نظر ثانی سے شائع ہوا ہے۔

(۵۲) مقدمہ جوامع السیرۃ : ۸

(۵۳) الدرر : ۵۴

(٥٤) الدُرَر : ١٠١ -

(٥٥) ایضاً : ١٢٥ -

(٥٦) سیرت ابن ہشام، تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ، طبع دوم ١٣٧٥ھ ١ : ٦٨٥

(٥٧) سیرت ابن عبدالبر اور سیرت ابن حزم کے اس موازنہ اور مقابلہ میں مقدم الذکر کے تمام حوالے میری جانب سے ہیں۔ شوقی ضیف نے صرف جوامع السیرۃ کے حوالے درج کئے ہیں۔ (مترجم)

(٥٨) سیرت ابن ہشام (تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ) ١ : ٤٢٧

(٥٩) اصل مضمون میں "صاحب للواء من المشرکین" ہے جو طباعت کی غلطی ہے (مترجم)

(٦٠) الدرر : ٥٨ -

(٦١) ایضاً : ٢١٤ -

قاضی عیاض

محمد عبد الحکیم شرف قادری

حافظ الحدیث امام علامہ قاضی ابو الفضل عیاض بن عمرو بن یحصبی ۴۷۶ھ/ ۱۰۸۳ء میں بمقام سبتہ پیدا ہوئے آپ کا خاندان اندلس کا رہنے والا تھا آپ کے جد امجد پہلے فاس میں اور پھر سبتہ میں رہائش پذیر ہوئے [1]

اکتساب علم بیس سال کی عمر میں حافظ الحدیث قاضی ابو علی غسانی صدفی کے خرمنِ علم سے خوشہ چینی کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ اندلس تشریف لے گئے اور اجلّہ علمائے سے اکتساب فیض کیا اور جواہر علم وحکمت کا ذخیرہ جمع کیا۔ آپ کے اساتذہ میں محمد بن حمدین، ابو علی بن سکرہ، ابو الحسین سراج، ابو محمد ابن عتاب، ہشام بن احمد اور ابو بحر بن العاص وغیرہم مشاہیر شامل ہیں، فقہ میں ابو عبد اللہ محمد بن علیٰ تمیمی اور قاضی ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ المسیل سے استفادہ کیا، علامہ ذہبی نے آپ کے اساتذہ میں ابو محمد بن عتاب[3] کا بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے آپ کے اساتذہ میں ابن رشد اور ابن الحاج کا شمار کیا ہے [4]

محمد فرید وجدی لکھتے ہیں، ابو القاسم بن بشکوال "کتاب الصلہ" میں فرماتے ہیں" قاضی عیاض طلب علم کے لئے اندلس تشریف لائے تو انہوں نے قرطبہ میں علماٗ کی ایک جماعت سے علم حاصل کیا اور حدیث کا بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ حدیث شریف کی طرف ان کی بڑی توجہ تھی اور حدیث کے جمع وضبط کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ وہ علم میں حد یقین کو پہنچے ہوئے تھے۔ اعلیٰ درجہ کی ذکاوت وفطانت اور بلند فہم وفراست کے مالک تھے۔

مسائل فقہیہ میں حضرت امام مالک کے مقلد تھے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔ د القاضی عیاض بن موسیٰ بن عیاض العلامۃ ابو الفضل الیحصبی السبتی المالکی الحافظ احد الاعلام [6]

منصب قضا ایک مدت تک سبتہ اور غرناطہ میں "قاضی" رہے۔ آپ کے شاگرد ابن بشکوال فرماتے ہیں قرطبہ میں تشریف لائے تو ہم نے ان سے اکتساب فیض کیا، فقیہہ محمد بن حمادہ سبتی فرماتے ہیں حضرت قاضی عیاض اٹھائیس سال کی عمر میں مناظرہ کرنے لگے اور پینتیس[35] سال کی عمر میں منصب قضا پر فائز ہوئے [8]۔

تلامذہ حضرت قاضی عیاض قدس سرہ سے ان گنت علماء نے علم وفضل حاصل کیا۔ چند شاگردوں کے نام یہ ہیں، عبد اللہ بن احمد العصری ۲۔ ابو جعفر بن القصیر الغرناطی ۳: ابو القاسم خلف بن بشکوال[9] حافظ الحدیث۔ ۴ فقیہہ ابو محمد الاشیری عبد اللہ بن محمد المغربی[10]۔ ۵۔ ابو بکر عبد اللہ بن طلحہ بن احمد بن عطیۃ المحاربی الغرناطی المالکی [11]

شعر وشاعری چونکہ حضرت قاضی عیاض، علوم حدیث، نحو، نقہ، کلامِ عرب اور عرب کے ایام وانساب کی معرفت میں مہارت تامہ رکھتے تھے اس لئے بڑے دلآویز شعر کہتے تھے [12]

نمونہ کلام :

أَقُولُ وَقَدْ جَدَّ ارْتِحَالِي وَغَرَّدَتْ	میں یہ اشعار اس وقت کہہ رہا ہوں کہ جب کوچ کا عزم صمیم ہو گیا
حُدَاتِي وَزُمَّتْ لِلْفِرَاقِ رَكَائِبِي	مرے حدی خواں نغمہ سرا ہو چکے ہیں اور فراق کے لئے سواریوں کو نکیل ڈالی جا چکی ہے
وَقَدْ غَمَشَتْ مِنْ كَثْرَةِ الدَّمْعِ مُقْلَتِي	میری آنکھیں کثرت گریہ کے سبب بینائی کھو چکی ہیں۔
وَصَارَتْ هَوَاءً مِنْ فُؤَادِي تَرَائِبِي	اور فرط غم سے خانۂ دل اس طرح ویران ہوا کہ ساتھیوں کا خیال بھی میرے دل سے محو ہو گیا ہے
رَعَى اللهُ جِيرَانًا الْقُرْطُبَةَ الْعُلَى	اللہ تعالیٰ قرطبہ عالیہ کے ہمسایوں کی حفاظت فرمائے۔
وَسَقَى رُبَاهَا بِالْعِهَادِ السَّوَاكِبِ	اور اس کے ٹیلوں کو مسلسل بارشوں سے سیراب فرمائے۔
غَدَوْتُ بِهِمْ مِنْ بِرِّهِمْ وَاحْتِفَائِهِمْ	ان کی نیکی اور ہمدردی سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ
كَأَنِّي فِي أَهْلِي وَبَيْنَ أَقَارِبِي [۳۹]	گویا میں اعزہ اور اقربا میں ہوں

ایک دفعہ قاضی عیاض ایک کھیت کے پاس سے گزرے جس میں گل لالہ کے چند پودے لہلہا رہے تھے انہوں نے برجستہ ایک قطعہ کہا جس میں عجیب تشبیہ بیان فرمائی :

	ترجمہ
أُنْظُرْ إِلَى الزَّرْعِ وَقَامَاتِهِ	کھیتی اور اس کے پودوں کی قد و قامت کو دیکھو
تَحْكِي وَقَدْ مَاسَتْ أَمَامَ الرِّيَاحِ	جن کے سرخ پھول زخموں کی مانند ہیں
كَتِيبَةً خَضْرَاءَ مَهْزُومَةً	اور جو ہواؤں کے سامنے خم کھاتے ہوئے یوں معلوم ہوتے ہیں
شَقَائِقُ النُّعْمَانِ فِيهَا جِرَاحٌ [۴۰]	جیسے سبز پوش لشکر شکست کھا کر اور زخمی ہو کر بھاگ رہا ہے۔

تصانیف فقیہہ محمد بن حمادہ سبتی فرماتے ہیں۔ حضرت قاضی عیاض کے زمانہ میں سبتہ میں اُن سے بڑھ کر کثیر التصانیف کوئی نہ تھا انہوں نے اپنے شہر میں وہ بلندی اور برتری حاصل کی جس تک اُن کے شہر والوں میں سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا، مگر اس علم و فضیلت نے اُن میں تواضع اور خشیت الٰہیہ کو زیادہ کر دیا۔[۴۱] ابن خلکان فرماتے ہیں۔ قاضی عیاض حدیث اور علوم حدیث، نحو لغت، کلام عرب اور ان کے ایام و انساب میں اپنے وقت کے امام تھے۔[۴۲]

تصانیف کے نام ۱۔ الشفاء بتعریف حقوق المصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) ۲۔ ترتیب المدارک وتقریب المسالک فی ذکر فقہاء مذہب مالک۔ ۳۔ العقیدہ، ۴۔ شرح حدیث ام زرع (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کا نام بغیۃ الرائد لما تضمنہ حدیث ام زرع بیان کیا ہے) ۵۔ جامع تاریخ اندلس اور مغرب کے بادشاہوں کی تاریخ جس میں سبتہ کی تاریخ اور وہاں کے علماء کا تذکرہ بھی ہے۔ ۶: مشارق الانوار فی اقتفاء صحیح الآثار، موطا امام مالک، بخاری شریف اور مسلم شریف کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۷۔ اکمال المعلم فی شرح مسلم، امام ابو عبداللہ محمد بن علی المازری (م ۵۳۶ھ) کی شرح مسلم: المعلم لفوائد کتاب مسلم کا تکملہ ہے۔ ۸۔ التنبیہات المستنبطہ فی شرح مشکلات المدونۃ والمختلطۃ، فوائد حدیث پر مشتمل ہے۔ اس میں امام ابو عبداللہ

عبدالرحمٰن القاسم (۱۹۱ھ) کی تصنیف المدونۃ فی فروع المالکیہ، پر معروضات بھی ہیں۔[۸] یہ کتاب تنبیہات کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فن میں اس جیسی اور کوئی کتاب نہیں لکھی گئی[۹]۔ ۹۔ الاعلام بحدود قواعد الاسلام ۱۰۔ الغنیۃ اپنے مشائخ کا تذکرہ[۱۰] ۱۱۔ الاصبیماع فی ضبط الروایہ وتقیید السماع، ۱۲۔ المعجم فی شرح ابن سکرۃ حضرت شیخ ابوعلی الحسین بن محمد السرقسطی الاندلسی الصدفی (م ۵۱۴ھ) اور ان کے مشائخ کا تذکرہ، ۱۳: نظم البرھان علی صحۃ جزم الاذان ۱۴۔ مقاصد الحسان فی مایلزم الانسان، ۱۵۔ غنیۃ الکاتب وبغیۃ الطالب[۱۱]۔ ۱۶۔ العیون الستۃ فی اخبار سبتۃ، ۱۷۔ الاجوبۃ المخیرۃ عن الاسئلۃ المحیرۃ، ۱۸۔ اخبار القرطبیین، ۱۹۔ السیف المسلول علی من سب اصحاب الرسول، ۲۰۔ الصفا تحریر الشفاء، ۲۱۔ مطامح الافہام فی شرح الاحکام[۱۲]، ۲۲۔ غریب الشھاب[۱۳]۔

وفات

حضرت امام علامہ قاضی عیاض رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندگی بھر دین اور حدیث رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے اور ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ء میں مراکش میں وفات پا گئے۔ آپ کے فرزند ارجمند ابوعبداللہ محمد بن عیاض قاضی دانیہ کا بیان ہے کہ ان کا وصال نو جمادی الاخری بروز جمعہ نصف شب کے وقت ہوا[۱۴]۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انھیں ایک یہودی نے زہر دیا تھا جس کے اثر سے اُن کی وفات ہوئی[۱۵]۔

شفا شریف

امام علامہ قاضی عیاض قدس سرہ العزیز کی جملہ تصانیف علم و ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں علماً و فضلاً نے انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ امام علامہ محی الدین بن شرف النووی شرح مسلم میں جگہ جگہ ان کا حوالہ دیتے ہیں، امام بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں اور حافظ الحدیث علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں جابجا ان سے فوائد و نکات احادیث میں خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ شارحین حدیث جہاں "قال القاضی" کہتے ہیں وہاں "قاضی عیاض" ہی مراد ہوتے ہیں لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ان کی تصنیف الشفا بتعریف حقوق المصطفٰے (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو حاصل ہوئی۔ محقق محدثین نے اس سے استناد کیا اور مابعد کے سیرت نگاروں نے اسے ماخذ کی حیثیت دی۔ بلاشبہ یہ کتاب دلوں کا نور اور ایمان کی رونق ہے اور کیوں نہ ہو جب اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و فضائل صحیح اور مستند احادیث سے بیان کئے گئے ہیں۔

بارگاہِ رسالت میں شفا شریف کی مقبولیت

کسی کتاب کی مقبولیت کے لئے اس سے بڑھ کر کیا سند ہو سکتی ہے کہ بارگاہِ رسالت میں مقبول ہو جائے۔ شفا شریف کے لئے سب سے بڑا امتیاز یہی ہے، ایک دفعہ آپ کے بھتیجے نے خواب میں دیکھا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان پر ہیبت طاری ہو گئی حضرت قاضی عیاض قدس سرہ نے ان کی حالت کو محسوس کر لیا اور فرمایا بھتیجے، میری کتاب شفا کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اسے اپنے لئے دلیل راہ بناؤ۔ گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے یہ منصب و کرامت اس کتاب کی بدولت ملی ہے[۱۶]۔

علماً اعلام نے نظم و نثر میں اس کتاب کی توصیف کی ہے۔ شہرۂ آفاق مورخ علامہ مصطفیٰ بن عبداللہ المشہور بہ حاجی خلیفہ فرماتے ہیں:

وَھُوَ کِتَابٌ عَظِیْمُ النفع کثیر الفائدۃ لم یؤلف مثلہ فی الاسلام شکر اللہ سبحنہ وتعالیٰ سعی مؤلفہ وقابلہ برحمتہ وکرمہ[۱۷]۔

لسان الدین خطیب تلمسانی فرماتے ہیں:

	ترجمہ
شِفَاءُ عِيَاضٍ لِلصُّدُوْرِ شِفَاءٌ	شفا قاضی عیاض دلوں کی شفاء ہے
وَلَيْسَ لِفَضْلٍ قَدْ حَوَاهُ خِفَاءٌ	اور جس فضیلت پر مشتمل ہے وہ مخفی نہیں۔
هَدِيَّةُ بِرٍّ لَمْ يَكُنْ لِجَزِيْلِهَا	یہ ایک نیک شخصیت کا ہدیہ ہے
سِوَى الْأَجْرِ وَالذِّكْرِ الْجَمِيْلِ كِفَاءٌ	جس کا بدلہ صرف ثواب اور ذکر جمیل ہے
وَفَى لِنَبِيِّ اللّٰهِ حَقَّ وَفَائِهِ	انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفا کا حق ادا کر دیا ہے۔
وَأَكْرَمُ أَوْصَافِ الْكِرَامِ وَفَاءٌ	اور کریموں کا بہترین وصف وفا ہی ہے۔
وَجَاءَ بِهِ بَحْراً يَفُوْقُ بِفَضْلِهِ	وہ ایسا سمندر لائے ہیں جو اپنی برتری کے لحاظ سے
عَلَى الْبَحْرِ طَعْمٌ طَيِّبٌ وَصَفَاءٌ	پانی کے سمندر سے فائق، خوش مزہ اور صاف ہے
وَحَقَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ بَعْدَ وَفَاتِهِ	انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آں کے حق کی رعایت کی ہے
رَعَاهُ وَإِغْفَالُ الْحُقُوْقِ جَفَاءٌ	اور آپ کے حقوق سے غفلت جفا ہے۔
هُوَ الذُّخْرُ يُغْنِيْ فِي الْحَيَاةِ غَنَاؤُهُ	وہ ایسا ذخیرہ ہے جس کی دولت زندگی میں غنی کر دیتی ہے
وَيَنْزِلُ مِنْهُ لِلْبَنِيْنَ رِفَاءٌ	اور اس کی برکتیں بیٹوں کو (اولاد کو) پہنچتی ہیں
هُوَ الْأَثَرُ الْمَحْمُوْدُ لَيْسَ يَنَالُهُ	وہ ایسی یادگار ہے جو پرانی نہیں ہوتی۔
دُثُوْرٌ وَلَا يُخْشَى عَلَيْهِ عَفَاءٌ	اور اس کے فنا ہونے کا خوف بھی نہیں کیا جا سکتا
حَرَصْتُ عَلَى الْإِطْنَابِ فِيْ نَشْرِ فَضْلِهِ	اگر وفا نے میری ہمنوائی کی تو میں اس کی فضیلت اور بزرگی کو بھرپور طریقہ
وَتَمْجِيْدِهِ لَوْ سَاعَدَتْنِيْ وَفَاءٌ [۲۸]	پر پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں

حضرت ابوالحسین زبدی فرماتے ہیں:

	(ترجمہ)
كِتَابُ الشِّفَاءِ شِفَاءُ الْقُلُوْبِ	کتاب الشفاء (بلاشبہ) دلوں کی شفاء ہے
قَدِ ائْتَلَقَتْ شَمْسُ بُرْهَانِهِ	جس کے برہان کا سورج پوری طرح جگمگا رہا ہے
فَأَكْرِمْ بِهِ ثُمَّ أَكْرِمْ بِهِ	تو اس کی عزت و تکریم کرتا رہ
وَأَعْظِمْ مَدَى الدَّهْرِ مِنْ شَانِهِ	اور زندگی بھر اس کی عظمت شان بیان کرتا رہ
إِذَا طَالَعَ الْمَرْءُ مَضْمُوْنَهُ	جب کوئی شخص اس کے مضمون کا مطالعہ کرتا ہے
رَسَى فِي الْهُدَى أَصْلُ إِيْمَانِهِ	تو اس کے ایمان کی جڑ ہدایت میں مضبوط ہو جاتی ہے۔
وَجَاءَ بِرَوْضِ التُّقَى نَاشِقاً	وہ تقویٰ اور نظافت کا ایسا باغ لائے
أَرَائِحَ أَزْهَارِ أَفْنَانِهِ	جس کی شاخوں کے پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی ہے

وَنَالَ عُلُوْمًا تُرَقِّيْهِ فِي	انہوں نے ایسے علوم پائے جو
الثُّرَيَّا السَّمَاءِ وَكَيْوَانِهِ	انھیں آسمان کے ثریا اور زحل تک لے جاتے ہیں
فَلِلّٰهِ دَرُّ اَبِي الْفَضْلِ اِذْ	حضرت ابی الفضل (قاضی عیاض) کی خوبی خدا کے لئے ہے
جَرٰى فِي الْوَرٰى نَيْلُ اِحْسَانِهِ	جن کا فیض احسان تمام مخلوق میں جاری ہے
يُقَرِّرُ قَدْرَ نَبِيِّ الْهُدٰى	وہ اپنے مدلل بیان سے نبی ہدایت اور افضل الخلق ﷺ
وَخَيْرِ الْاَنَامِ بِتِبْيَانِهِ	کی عظمت شان بیان کرتے ہیں
فَجَازَاهُ رَبِّي خَيْرَ الْجَزَاءِ	میرا رب انھیں بہترین جزا دے
وَجَادَ عَلَيْهِ بِغُفْرَانِهِ	اور انھیں اپنی مغفرت سے نوازے
وَمِنْهُ الصَّلٰوةُ عَلَى الْمُجْتَبٰى	اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ترین ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم)
وَاَصْحَابِهِ ثُمَّ اَعْوَانِهِ	اور آپ کے صحابہ اور معاونین پر رحمت کاملہ نازل فرمائے
مَدَى الدَّهْرِ لَا يَنْقَضِيْ دَائِمًا	جو آخر زمانہ تک ختم نہ ہو اور
وَلَا يَنْتَهِيْ طُوْلَ اَزْمَانِهِ [29]	طویل زمانہ تک انتہا نہ ہو

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں :-

ترجمہ

لَمَّا رَأَيْتُ كِتَابَ الشِّفَاءِ	جب میں نے منتخب ترین ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شمائل کے بیان میں
فِي شَمَائِلِ صَاحِبِ الْاِصْطِفَاءِ	کتاب شفا دیکھی۔
اَجْمَعَ مَا صُنِّفَ فِي بَابِهِ مُجْمَلًا مِنَ الْاِسْتِيْفَاءِ	جو اس موضوع پر اجمالاً احاطہ کرنے والی کتابوں سے جامع ترین ہے
بِعَدَمِ اِمْكَانِ الْوُصُوْلِ اِلَى انْتِهَاءِ الْاِسْتِقْصَاءِ	کیونکہ کماحقہ احاطہ تک رسائی ممکن ہی نہیں۔
قَصَدْتُ اَنْ اَخْدُمَهُ بِشَرْحٍ [30]	تو میں نے شرح کیساتھ اس کی خدمت کا ارادہ کیا۔

بعض ادبا نے کہا :-

ترجمہ

عُوِّضْتَ جَنَّاتِ عَدْنٍ يَا عِيَاضُ	اے قاضی عیاض آپ کو شفا کی
عَنِ الشِّفَاءِ الَّذِيْ اَلَّفْتَهُ عِوَضٌ	تالیف کے عوض جنات عدن دی جائیں
جَمَعْتَ فِيْهِ اَحَادِيْثًا مُّصَحَّحَةً	آپ نے اس میں صحیح حدیثیں جمع کی ہیں
فَهُوَ الشِّفَاءُ لِمَنْ فِيْ قَلْبِهِ مَرَضٌ [31]	اس لئے ہر اس شخص کے لیے عین شفا ہے جس کے دل میں مرض ہے۔

علامہ یوسف ابن اسماعیل نبہانی فرماتے ہیں : ومنهم من توسط وكان مذهبه حسن الاقتصاد فمن المختصرين الامام البارع القاضي عياض حيث بكتابه الشفاء الذي سار في الآفاق ووقع على قبوله الاتفاق [32]

(الانوار المحمدیہ من المواهب اللدنیہ)

بلند پایہ امام قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اختصار کے ساتھ سیرت پاک پر کتاب لکھی، مشہور آفاق بالاتفاق مقبول کتاب شفاؑ پڑھنے والے کے لیے بہت کافی ہے،

حضرت علامہ احمد شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں۔

واسمه موافق لمسماه فان السلف الصالحين قالوا انه جرب قراته لشفاءِ الامراض وفك

عقد الشدائد وفيه امان من الغرق والحرق والطاعون ببركته صلى الله عليه وسلم اذا

صح الاعتقاد حصل المراد [۴۳]

شفاؑ شریف کا اسم اس کے مسمّٰی کے موافق ہے کیونکہ سلف صالحین فرماتے ہیں اس کا پڑھنا بیماریوں کی شفا، مشکلات کی گرہیں کھولنے میں مجرب ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں ڈوبنے، جلنے اور طاعون کی مصیبتوں سے امان ہے اور اگر اعتقاد صحیح ہو تو مراد حاصل ہو جاتی ہے۔

شفاؑ شریف کا ماخذ اور جرح و تعدیل

علامہ خفاجی فرماتے ہیں کہ شفاؑ شریف کا ماخذ شفاؑ ابن سبع ہے۔ شفاؑ قاضی عیاض میں بھی بعض ضعیف حدیثیں آگئی ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے انھیں موضوع قرار دیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفاؑ" میں ان تمام حدیثوں کی نشاندھی کی ہے۔ ایسے مقامات پر ہم نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کی قاری کو ضرورت ہو [۴۴]

مضامین شفاءؑ

شفاؑ شریف چار قسموں پر مشتمل ہے:

قسم اول: اللہ تعالیٰ کی جانب سے قول و فعل کے ذریعے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ عظیمہ کا اظہار اس قسم میں چار باب ہیں۔ پہلا باب: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنائے جمیل۔ اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

دوسرا باب: اللہ تعالیٰ نے حبیب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرت کی تکمیل فرمائی اس باب میں ستائیس فصلیں ہیں۔

تیسرا باب: احادیث صحیحہ جن سے بارگاہ الٰہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کا پتہ چلتا ہے اس میں بارہ فصلیں ہیں

چوتھا باب: وہ آیات و معجزات جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے دست مبارک پر ظاہر فرمائے اس میں تیس فصلیں ہیں۔

قسم ثانی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حقوق جو تمام مخلوق پر واجب ہیں اس قسم میں چار باب ہیں:

پہلا باب: حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ کی اطاعت فرض ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب: محبوب رب ذوالجلال صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ سے اخلاص لازم ہے اس باب میں چھ فصلیں ہیں۔

تیسرا باب: حضور سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر لازم ہے۔

چوتھا باب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کا حکم اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

قسم ثالث: سرور ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو امور جائز ہیں اور جو امور ممتنع ہیں یہ قسم کتاب کی جان اور پہلے ابواب کا نتیجہ ہے۔ پہلے ابواب تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اس قسم میں دو باب ہیں۔

پہلا باب : امور دینیہ میں، اس میں سولہ فصلیں ہیں۔

دوسرا باب : امور دنیویہ میں، اس میں نو فصلیں ہیں۔

قسم رابع : سرور ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تنقیص کرنے یا گالی بکنے کا حکم۔ اِس قسم میں تین باب ہیں۔

پہلا باب : وہ امور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نقص اور سب (گالی) ہیں اس باب میں دس فصلیں ہیں۔

دوسرا باب : بارگاہ اقدس کے گستاخ کا حکم اور اس کی سزا۔

تیسرا باب : بارگاہ الٰہی میں رسولان گرامی، ملائکہ، کتب سماویہ، اہل بیت کی شان میں گالی بکنے والے کا حکم اس باب میں پانچ فصلیں ہیں۔[۳۵]

شروح و تعلیقات

شفاء شریف کی مقبولیت عامہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ افاضل کی بہت بڑی جماعت نے اس پر شروح اور حواشی لکھے ہیں، اس کتاب سے استفادہ کرنے والوں کا شمار ہی مشکل ہے۔ ذیل میں کشف الظنون کے حوالے سے چند شروح اور تلخیصات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ شیخ محمد بن احمد اسنوی شافعی (م ۷۶۳ھ) نے شفا کی تلخیص کی۔

۲۔ شیخ استاذ ابو عبداللہ بن حسن مخلوف الراشدی المعروف بابرکان نے تین شرحیں لکھیں، بڑی شرح الغنیہ دو جلدوں میں، الغنیۃ الوسطیٰ، اور چھوٹی شرح ایک ایک جلد میں لکھی۔

۳۔ حافظ عبداللہ ابن احمد بن سعید بن یحییٰ الزموری نے شرح لکھی۔

۴۔ ابو عبداللہ محمد بن علی بن ابی الشریف الحسنی التلمسانی نے بہترین شرح، المنہل الاصفیٰ فی شرح ما تمس الحاجۃ الیہ من الفاظ الشفاء لکھی یہ شرح مذکورۃ الصدر دوسری اور تیسری سے ماخوذ تھی اور یہ ۶ صفر ۹۱۰ھ میں مکمل ہوئی۔

۵۔ شمس الدین محمد بن محمد الدلجی الشافعی العثمانی (م ۹۴۷ھ) نے الاصطفار لبیان معانی الشفار کے نام سے لکھی اور ۱۲ شوال ۹۳۵ھ میں مکمل کی۔

۶۔ امام ابو الحسن علی بن اقبرس الشافعی نے ۸۶۲ھ میں شرح لکھی،

۷۔ عمر العرضی نے چار جلدوں میں شرح لکھی۔

۸۔ ابو ذر احمد بن ابراہیم الحلبی (م ۸۸۴ھ) نے شرح لکھی لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔

۹۔ امام ابو المحاسن عبدالباقی الیمانی نے الاکتفاء فی شرح الفاظ الشفاء لکھی۔

۱۰۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے "مناہل الصفا فی تخریج احادیث الشفا" لکھی۔

۱۱۔ حافظ برہان الدین ابراہیم ابن محمد الحلبی (م ۸۴۱ھ) نے المقتفیٰ فی حل الفاظ الشفا لکھی۔

۱۲۔ علامہ تقی الدین ابو العباس احمد بن محمد الشمنی (م ۸۷۳ھ) نے مزیل الخفاء عن الفاظ الشفا کے نام سے حاشیہ لکھا، ۸۴۷ھ میں مکمل کیا،

۱۳۔ محمد بن خلیل بن ابو بکر ابو عبداللہ الحلبی المعروف القباقبی نے زبدۃ المقتفیٰ فی تحریر الفاظ شفا (م ۸۴۱ھ) میں لکھی۔ نمبر ۱۲ اور

نمبر بارہ اور تیرہ دونوں شرحیں علامہ برہان الدین حلبی کی شرح سے ماخوذ ہیں۔

۱۴۔ علامہ شہاب الدین احمد بن رسلان الرملی الشافعی (م ۸۴۴ھ) نے حاشیہ لکھا۔

۱۵۔ عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل بن ابراہیم جماعۃ الکنانی القدسی (م ۸۶۱ھ) نے بعض الفاظ کی شرح لکھی۔

۱۶۔ سید قطب الدین عیلی الصفوی، ان کی شرح بطریق مزج ہے۔

۱۷۔ علامہ زین الدین بن الاشعاتی الحلبی۔

۱۸۔ علامہ رضی الدین محمد ابن ابراہیم المعروف بابن الحنبلی الحلبی نے موارد الصفاء و موائد الشفاء لکھی۔

۱۹۔ قطب الدین محمد بن محمد بن الخیضری (م ۸۹۴ھ) نے الصفاء بتحرّ الشفاء لکھی۔

۲۰۔ علامہ یوسف بن ابی الفتح الدمشقی الامام السلطانی المعروف بالسقیفی (م ۱۰۵۷ھ)۔

۲۱۔ محمد بن عبدالسلام البنانی نے نداء الحیاض فی شرح الشفاء للقاضی عیاض لکھی۔

۲۲۔ الحاج نجیب ایعنتابی[۲] مدرس مدینہ منورہ (۱۲۱۹ھ)۔

۲۳۔ الشیخ حسن العدوی الحمزاوی[۳] نے المدد الفیاض لکھی۔

۲۴۔ علامہ احمد شہاب الدین الخفاجی نے نسیم الریاض فی شرح الشفاء للقاضی عیاض لکھی۔

۲۵۔ علامہ علی بن سلطان محمد القاری (ملا علی قاری) نے شرح شفاء لکھی۔

اس وقت آخری دو شرحیں مقبول اور متداول ہیں شرح الشفاء حضرت ملا علی قاری نسیم الریاض کے حاشیہ پر چھپی ہے ہوئی چار جلدوں میں دستیاب ہے۔

شفاء شریف ۱۲۷۶ھ میں مصر میں چھپی اس کے حاشیہ پر علامہ جلال الدین سیوطی کی شرح مناہل الصفاء اور علامہ حسن العدوی الحمزادی کی شرح المدد الفیاض چھپی۔ ۱۲۹۰ھ میں پہلی جلد مطبع خلیل آفندی میں اور دوسری جلد ۱۳۱۲ھ میں مطبع عثمانیہ میں چھپی اور فاس میں بالترتیب ۱۳۰۵ھ اور ۱۳۱۳ھ میں چھپی اس کے بعد متعدد ایڈیشن شائع ہوئے مطبع مصطفےٰ البابی الحلبی مصر سے علامہ شمنی کے حاشیہ کے ساتھ چھپ چکی ہے پاکستان میں بھی مصری ایڈیشن کا عکس چھپ چکا ہے۔

حواشی

[۱] شمس الدین ابو عبداللہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) تذکرۃ الحفاظ (حیدر آباد دکن) ج ۴ صفحہ ۹۶

[۲] الذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۶

[۳] الذہبی الامام۔ العبر فی من غبر (مطبوعہ کویت ۱۹۶۳ء) ج ۴ صفحہ ۱۲۲

[۴] شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین، صفحہ ۳۴۶

[۵] محمد فرید وجدی دائرہ معارف القرن العشرین (دار المعرفۃ بیروت) ج ۶ ص ۷۹۴۔

۶ الذہبی، العبر، ج ۴، صفحہ ۱۲۲
۷ الذہبی صفحہ ۱۲۳۔
۸ الذہبی تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ صفحہ ۹۷
۹ الذہبی صفحہ ۹۸۔
۱۰ الذہبی العبر صفحہ ۱۷۵
۱۱ الذہبی صفحہ ۳۰۳۔
۱۲ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۳۴۶
۱۳ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی صفحہ ۳۴۷۔
۱۴ الذہبی تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۸
۱۵ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۹۷۔
۱۶ ابن خلکان، (مطبوعہ دار الثقافتہ بیروت) ج ۳ صفحہ ۴۸۳
۱۷ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۴۴۔
۱۸ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین صفحہ ۳۴۵
۱۹ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۳۶۔
۲۰ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بستان المحدثین، صفحہ ۳۴۵
۲۱ عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین (مکتبہ المثنی بیروت)
۲۲ اسماعیل باشا البغدادی، ہدیۃ العارفین (مکتبہ المثنیٰ بغداد) ج ۱ ص ۸۰۵۔
۲۳ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۷
۲۴ مقدمہ شفاء شریف مع حاشیہ علامہ شمنی، مطبوعہ المکتبہ التجاریۃ الکبریٰ مصر بحوالہ الدیباج المذہب للعلامہ برہان الدین ابن فرحون المالکی۔
۲۵ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ صفحہ ۹۸۔
۲۶ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین صفحہ ۳۴۴۔
۲۷ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، مطبوعہ مکتبہ المثنی، بغداد، ج ۲ صفحہ ۱۰۵۳۔
۲۸ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۳-۳۴۲۔
۲۹ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۴-۳۴۳۔
۳۰ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۵۵
۳۱ احمد شہاب الدین الخفاجی العلامہ، نسیم الریاض (مطبوعہ بیروت ج ۱ صفحہ ۵۲
۳۲ علی ابن سلطان محمد القاری الامام، شرح شفاء (برحاشیہ نسیم الریاض) مطبوعہ بیروت، ج ۱ ص ۵۲۔
۳۳ احمد شہاب الدین الخفاجی الامام العلامہ، نسیم الریاض ج ۱ صفحہ ۴۔
۳۴ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ج ۲ صفحہ ۱۰۵۳
۳۵ حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ج ۲، ص ۵-۱۰۵۴۔
۳۶ اسماعیل باشا بغدادی، ایضاح المکنون علی کشف الظنون، ج ۲ صفحہ ۵۲۔
۳۷ یوسف الیان سرکیس، معجم المطبوعات العربیہ، مکتبہ مثنیٰ، بغداد ج ۲ صفحہ ۱۳۹۷
۳۸ ایضاً۔

ابنِ کثیر (سیرت نگارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خان ندوی

ابنِ کثیر (۷۰۱-۷۷۴ھ) آٹھویں صدی ہجری کے بڑے شامی علماء میں سے ہیں، وہ امام ابنِ تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کے عزیز ترین شاگرد، ان کے ہم مسلک اور جہادِ سیف وقلم میں کم از کم قلم کی حد تک ان کے شریک کار تھے، ان کو تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ و سیرت اور تراجم کے فنون میں کامل دستگاہ حاصل تھی، جس پر ان کی چھوٹی اور بڑی متعدد تصانیف گواہ ہیں جن کی تعداد چونتیس تک پہنچتی ہے۔ ان کی تفسیری عظمت اور تاریخی شہرت ان کی "تفسیر القرآن الکریم" اور عام تاریخ "البدایة والنہایة" جیسے مفصل مبسوط عظیم علمی کارناموں کی رہینِ منت ہے۔

ان کی تصنیفات میں سیرت نبوی پر ان کی مختصر اور مطول دو کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے اور خود انھوں نے بھی ان دونوں کا تذکرہ حوالہ کے طور پر اپنی کتابوں میں جا بجا کیا ہے[1]۔ اور ان کے اکثر ترجمہ نگار بھی کم از کم ان کی مختصر سیرت نبوی کو "سیرة صغیرة"[2] یا "الفصول فی سیرة الرسول"[3] صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے علاحدہ کتاب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اور ایک روایت کے مطابق یہ مختصر سیرت "الفصول فی اختصار سیرة الرسول" صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مصر میں ۱۳۵۸ھ میں چھپ بھی چکی ہے[4] لیکن اس مطبوعہ مختصر سیرت تک ہماری رسائی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔

---

[1] ابنِ کثیر، تفسیر القرآن الکریم، مطبعة الحلبی، القاہرة، ۱۳۷۱ھ، سورة الاحزاب، آیت نمبر ۲۶، ۴۷۸/۳، ابن کثیر، فضائل القرآن، مطبعة الحلبی، القاہرہ، ۱۳۷۱ھ ص ۱۶، ابنِ کثیر، البدایة والنہایة، مطبعة السعادة، القاہرة ۱۹۵۸-۵۱ء، ۲۹۴/۱۴، ابن کثیر، مولد الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تحقیق صلاح الدین المنجد، دار الکتاب الجدید بیروت ۱۹۶۱ء ص ۱۴

[2] ابن قاضی شہبہ، طبقات الشافعیة، تحقیق ڈاکٹر عبد العلیم خان، دائرة المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ہندوستان ۱۳۹۰-۱۴۰۰ھ، ۱۱۴/۳، ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مکتبة القدسی، مصر، ۱۹۵۱-۵۰ء ۲۳۱/۶۔

[3] اسمٰعیل باشا البغدادی، ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون، وکالة المعارف، استنبول، ترکی ۱۹۴۷-۴۵ء، ۱۹۴/۲، اسمٰعیل باشا البغدادی، ہدیة العارفین فی أسماء المؤلفین وآثار المصنفین وکالة المعارف، استنبول ترکی ۱۹۵۵-۵۱ء ۲۱۵/۱، عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین، مطبعة الترقی، دمشق، ۱۳۸۱-۷۶ھ، ۲۸۴/۲، فہرست کتب خانہ ایا صوفیا، نمبر ۳۳۳۹، ص ۳۰۔

[4] احمد محمد شاکر، عمدة التفسیر عن الحافظ ابنِ کثیر، دار المعارف، القاہرة ۱۳۷۶ھ ۳۵/۱۔

ان کی مطوّل سیرت نبوی اگرچہ ان کے قدیم ترجمہ نگاروں سے مخفی رہی، لیکن ان کے جدید ترجمہ نگار اس طویل سیرت کے نام سے ناواقف نہیں ہیں[۵]۔ مگر علیٰحدہ سے اس طویل سیرت کا پتہ اب تک نہیں چلایا جا سکا ہے اور مصطفیٰ عبدالواحد نے چار حصوں میں ابن کثیر کی جو "السیرۃ النبویۃ" اور اس کے ضمیمہ کے طور پر "شمائل الرسولؐ و دلائل نبوۃ و فضائلہ وخصائصہ" علیٰحدہ سے شائع کی ہے۔ وہ حقیقتاً ابن کثیر کی تاریخ "البدایۃ والنہایۃ" ہی سے من وعن ماخوذ ہے۔ کیونکہ مصطفیٰ عبدالواحد کا خیال ہے کہ یہی ابن کثیر کی وہ مطوّل سیرت نبوی ہے، جس کا حوالہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے[۶]، اور یہی راقم سطور کا بھی رجحان ہے[۷]۔ لہٰذا اس مقالہ میں ابن کثیر کے سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے مطالعہ کے لئے ہم ان کی عام تاریخ کی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں موجود طویل ترین سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو بنیاد بنائیں گے۔

یہ سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام اسلامی تاریخ کی طویل ترین کتاب "البدایۃ والنہایۃ" کے تقریباً ایک تہائی (⅓) حصہ اور بڑی تقطیع (۸" × ۱۱") کے پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے[۸]۔ جس کی طوالت پر بجا طور سے لوگوں کی نظریں اٹھتی ہیں اور اس کو تاریخ نگاری میں دینی اہتمام کے غلبہ کا ثمرہ تصور کیا جاتا ہے[۹]۔

چنانچہ عام مسلمان مؤرخین کی عادت کے برخلاف، ابن کثیر نے اس عام تاریخی کتاب کے مفصل ترین سیرت نبوی کے حصہ میں "متعلقات سیرت" کے طور پر مزید چار اجزا "شمائل" و "دلائل" اور "فضائل" و "خصائص" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اضافہ کا ارادہ ظاہر کیا[۱۰]۔ جبکہ وہ ان موضوعات کے ساتھ ایک الگ باب میں "اسماء" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طبع کرنے کا تہیہ پہلے ہی سے کئے ہوئے تھے[۱۱]۔ لیکن مطبوعہ "البدایۃ والنہایۃ" اور اس سے ماخوذ "السیرۃ النبویۃ" اور "شمائل الرسولؐ" میں نہ کہیں اسماء مبارکہ کا باب ملتا ہے، اور نہ ہی علیٰحدہ سے فضائل وخصائص کے ابواب

۵؎ ایضاً ۱/۴۴، اور عبدالرزاق حمزۃ، الباعث الحثیث الی معرفۃ علوم الحدیث: شرح اختصار علوم الحدیث لابن کثیر، مکتبۃ محمد علی صبیح واولادہ، مصر ۱۳۷۷ھ ص۱۷

۶؎ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، تحقیق ومقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد، مطبعۃ الحلبی، القاہرۃ ۱۳۸۴ھ، ۱/۱۲-۱۳، اور ابن کثیر، شمائل الرسولؐ تحقیق ومقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد، مطبعۃ الحلبی، القاہرہ ۱۳۸۶ھ، ص الف

۷؎ مسعود الرحمٰن خان الندوی، ابن کثیر: حیاتہ ومؤلفاتہ، مرکز الدراسات الآسیویۃ الغربیۃ، جامعۃ علی گڑھ الاسلامیۃ الہند ۱۹۰۹ء، ص ۱۰۷-۱۰۸

۸؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۵۲ - ۶/۳۰۰

۹؎ فرانز روزنتال، علم التاریخ عند المسلمین، عربی ترجمہ ڈاکٹر صالح احمد العلی، مکتبۃ المثنیٰ، بغداد ۱۹۶۳ء ص۲۰۳

۱۰؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۶/۱۱

۱۱؎ ایضاً ۲/۲۵۲، ۲۶۶

لیکن ان کی مذکورہ "سیرت" اور "شمائل" کے محقق مصطفیٰ عبدالواحد نے فضائل کے باب کی علٰحدہ سے موجودگی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[۱۲]، جس سے ہم کو اختلاف ہے[۱۳]۔ کیونکہ انہوں نے ابنِ کثیر کی جس وضاحت کو بنیاد بنایا ہے، اس کی مندرجہ ذیل زیرِ خط عبارت ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہوئے نقل تک نہیں کیا ہے۔ ابنِ کثیر دلائلِ نبوت کے آخری باب "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے ہم پلہ بلکہ ان سے برتر معجزات کی دلیل" کو قائم کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے استاد ابن الزملکانی کا وہ مولد (رسول اللہ علیہ) دیکھا جس کو انہوں نے ابن اسحٰق وغیرہ سے خلاصہ کیا ہے۔ اور اس کے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فضائل بھی بیان کئے اور اس باب میں ایک فصل قائم کی[۱۴] لیکن وہ اس کو مکمل نہ کر سکے۔ لہٰذا ابنِ کثیر دوستوں کے اصرار پر اجر و ثواب کی امید میں اس کی تکمیل کے لیے مستعد ہوئے۔

غالباً یہ مذکورہ معجزات ہی کی فصل تھی، لیکن مصطفیٰ عبدالواحد نے اس "فصل" کی وضاحت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور صرف "فضائل" کے لفظ میں الجھ کر ابن کثیر کی سیرت نبوی میں علٰحدہ سے فضائل کے باب کی موجودگی ثابت کرنے کے درپے ہو گئے۔ حالانکہ اس طرح تو وہ مذکورہ سیرت میں "خصائص" کے باب کی موجودگی کی اطلاع بھی ہم کو دے سکتے تھے، جس کا انہوں نے صفائی سے انکار کیا ہے[۱۵]۔ بلکہ خود ابنِ کثیر نے مذکورہ عبارت کے آس پاس تھوڑا اوپر اور نیچے دو بار بہت زیادہ وضاحت سے "خصائص" کے باب کا اس طرح حوالہ دیا ہے کہ گویا وہ اس کو لکھ چکے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ "خصائص کے باب میں ان چیزوں کا ذکر گذر چکا ہے۔ جو دیگر انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھیں" اور دوسرے صفحہ پر وہ پھر لکھتے ہیں "جیسا کہ ہم ان کے خصائص اور شمائل میں ذکر کر چکے ہیں"[۱۶]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن کثیر کے اس شک و شبہ اور ابہام و غموض سے بالاتر حوالے اور مصطفیٰ عبدالواحد کے مذکورہ مغالطے کے باوجود ابنِ کثیر کی سیرت نبوی میں علٰحدہ سے فضائل و خصائص کے ابواب موجود نہیں ہیں اور مصطفیٰ عبدالواحد نے جس مذکورہ آخری باب کو فضائل کا باب سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اگر اس کے عنوان اور مواد دونوں کا مقابلہ دلائل کے سابقہ مواد سے کیا جائے تو صرف یہ فرق سامنے آتا ہے کہ دلائل میں سے جو کچھ پہلے بغیر مقابلہ کے بیان کیا گیا تھا، اب اس کے متعلقہ حصہ کو اس باب میں موازنہ کے ساتھ دہرا دیا گیا ہے۔

---

[۱۲] ابنِ کثیر، شمائل الرسول، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد - ص د

[۱۳] مسعود الرحمٰن خان الندوی، ابنِ کثیر: دراسة تحليلية لكتاب البداية والنهاية، مركز الدراسات الآسيوية الغربية، جامعة علی گڈھ الاسلامية - الهند - سنہ ۱۹۸۰ء، ص ۴۳، ۴۵

[۱۴] ابنِ کثیر، البداية والنهاية ۶/۲۵۸ -

[۱۵] ابنِ کثیر، شمائل الرسول - مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد ص د

[۱۶] ابنِ کثیر، البداية والنهاية ۶/۲۵۷ اور ۲۵۸

اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ فضائل کو ابن کثیر کی سیرت کا آخری حصہ قرار دینا، خود ابن کثیر کی مقرر کی ہوئی ترتیب کے خلاف ہے، جس کی انہوں نے کئی جگہ خود نشاندہی کی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ سیرت کے بعد پہلے اسماء مبارکہ پھر شمائل، پھر دلائل اور پھر فضائل اور سب سے آخر میں خصائص ترتیب دینا چاہتے تھے[17] لیکن وہ سیرت کے بعد اسمائے مبارکہ نہ بیان کر سکے، بلکہ اس حصہ کو شمائل سے شروع کیا، اور اس کے بعد وہ دلائل کی تقسیم در تقسیم میں ایسے الجھے کہ اپنی مقرر کردہ ترتیب بھی بھول گئے اور آخر کار رسول اللہ کی سچی پیش گوئیوں اور آپ کے معجزات کے موازنہ کے آخری دو ابواب[18] پر سیرت ختم کر دی اور تاریخ خلفاء راشدین کی طرف متوجہ ہو گئے۔

بہر حال یہ شمائل و دلائل کا حصہ بھی خود بڑی تقطیع کے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے[19]۔ حالانکہ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں یہ مواد یا حدیث کی کتابوں کے بعض ابواب یا سیرت کی ضمنی فصول کے عنوانات یا مستقل کتابوں کے موضوعات تھے اور عام تاریخ کی کتابوں سے ان کا قریب یا دور کا کوئی ربط نہ تھا بلکہ ابتدائی سیرت اور مغازی کی کتابیں بھی اس رنگ سے دور تھیں۔ ان میں آپ کی نادرۂ روزگار شخصیت اور قابلِ تقلید نمونہ ذات گرامی کو قرآنی آیت کریمہ "ھل کنتُ إلا بشرا رسولا[20]" کے مصداق تاریخی حقائق و واقعات کی روشنی میں پیش کیا گیا تھا، جس سے خاص کر اسلامی معاشرہ کے تشریعی مسائل میں ہمیشہ روشنی حاصل کی گئی اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی۔

لیکن بعد کے سیرت نگاروں کے نزدیک آپؐ کی بشریت اور رسالت کی جامع" تاریخ ساز ہادی و رہبر شخصیت کلامی اور صوفیانہ اغراض و مقاصد کے سامنے دھندلانے لگتی ہے، چنانچہ ایک طرف علم کلام کے رواج اور اہلِ کتاب سے مناظرہ و مجادلہ کی گرم بازاری میں سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے آپؐ کے معجزات کے مقابلہ و موازنہ اور برتری ثابت کرنے پر زور قلم صرف ہوا، تو دوسری طرف ہمارے صوفیائے کرام کا طبقہ جس کی اپنی ذاتی بزرگی ماورائے بشری کرامات پر قائم ہے، لہٰذا ان کے نزدیک آپؐ کی عظمت تقدس کی دبیز چادر کے بغیر کیسے تصور کی جا سکتی تھی؛ خواہ اس کے لیے "موضوع احادیث، گڑھے ہوئے قصوں اور اسلام میں داخل ہونے والی غیر قوموں کی بے بنیاد کہانیوں، باطنی عقائد اور فلسفوں اور صوفیہ و زہاد اور عارفین کے خوابوں[21]" کا سہارا ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ اسی لیے سیرت کی متاخر کتابوں میں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اولیں کتابوں میں بیان کردہ سیرت کے قریب نہیں رہ گئی، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے حدیث کا دامن تھامے رکھا تھا، کیونکہ وہ لوگ آپؐ کی عظمت کے احساس کے باوجود آپؐ کو صحیح احادیث کی روشنی ہی میں دیکھتے رہے[22]۔"

---

[17] ابن کثیر: البدایة النهایة: ۲/۲۵۲، ۲۶۶، ۶/۱۰

[18] ایضاً ۶/۱۸۲-۲۵۶، ۲۵۷ - ۳۰۰

[19] ایضاً ۶/۱۱ - ۳۰۰ [20] سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹۳

[21] محمد توفیق حسین کا مقالہ "عن سیرة النبی محمدؐ"۔ کتاب ماسا ھم به المؤرخون العرب فی المئة سنة الأخیرة فی دراسة التاریخ العربی وغیرہ۔ ھیئة الدراسات العربیة فی الجامعة الامیریکیة۔ بیروت: ۱۹۵۹ء ص ۲۸،

[22] الدکتور احسان عباس، فن السیرة، دار بیروت، ۱۹۵۶ء - ص ۱۷-۱۸

لیکن ابن کثیر جو خود بلند پایہ ناقد محدث تھے، اور سیرت میں کامیابی سے متعلقہ مواد کو صحیح احادیث کی روشنی میں پرکھ چکے تھے، دلائل کے باب میں تحقیق سے زیادہ سابق مؤلفین کی طرح جمع و احاطہ اور پھر اس مواد کی تقسیم در تقسیم اور مقارنہ و موازنہ کی رو میں بہہ گئے اور یہاں جیسی موسوعی و قاموسی (ENCYCLOPEDIC) شخصیت اور مزاج کے حامل عالم سے بعید بھی نہیں۔ ان جیسے علماً اکثر معلومات کے بحر زخار میں غوطے کھاتے ہوئے ایک وادی سے دوسری وادی میں نکلے ہیں اور بنیادی موضوع سے ہٹ کر فروعی موضوعات میں الجھے ہیں۔ ان کے ہاں زود نویسی میں احاطہ و شمول جہاں ایک قابلِ تعریف حیرت ناک صفت ہے۔ وہیں اختصار نویسی میں انتخاب و اختیار کی صفت سے تہی دامنی تعجب خیز ہے۔

اسی طرح ابن کثیر بھی اس عام تاریخی کتاب کی سیرت نبوی کے حصے میں ایسے کھوئے کہ سیرت ہی کے ہو کر رہ گئے اور سیرت میں بھی شمائل و دلائل پر قلم اٹھایا تو "محدث و نقیہ کے لئے ناگزیر اہم معلومات[۲۳]" فراہم کرنے کی فکر میں ایسے ڈوبے کہ اس سے نکلنا دوبھر ہو گیا۔ اس لئے اس سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے حیرت نہ ہونا چاہیے اگر آپ ایک دم سے اپنے کو کسی خالص فقہی[۲۴] مسئلہ میں الجھا ہوا پائیں اور اصول و فروع فقہ کی کتابوں[۲۵] کے حوالے نظر کے سامنے سے گزرنے لگیں یا کسی حدیث کی کتاب کے مطالعہ کا شبہ ہونے لگے۔

بہرحال ابن کثیر کی یہ سیرت نبوی اپنے عظیم دائرہ کار، وسیع ذخیرۂ معلومات اور متنوع مصادر سیرت کے لحاظ سے انفرادی حیثیت کی مالک ہے جس میں انہوں نے تین متنوع مختلف اور مستقل موضوعات پر سابق مؤلفین کے جمع کئے ہوئے لامتناہی مواد کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ یعنی سیرت، شمائل اور دلائل، جس کا مختصر ترین خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ سیرت

ابن کثیر نے اس سیرت کو اپنی سہولت کی خاطر سات حصوں میں تقسیم کیا ہے، جن میں سے ہر ایک کو "کتاب" کا نام دیا ہے۔ یعنی کتاب المبعث[۱]، کتاب المغازی[۲]، کتاب البعوث[۳]، کتاب الوفود[۴]، کتاب حجۃ الوداع[۵]، کتاب الشمائل[۶] اور کتاب الدلائل[۷]،

---

۲۳ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۶/۱۱۔

۲۴ جیسے نمازِ ظہر میں تاخیر (۳/۶۰) محرم رشتہ دار کی ملکیت اور آزادی کا حکم (۳/۲۹۶) بعد میں اسلام لانے والے شوہر کا پہلے اسلام لانے والی بیوی سے رجوع کا حق (۳/۳۲۳) جہاد میں نمازِ خوف کا حکم (۴/۸۲، ۱۱۰) بیٹے کی اپنی ماں کے دوسرے نکاح میں ولایت کا حکم (۴/۹۱) علامتِ بلوغ (۴/۱۲۵) مستطیع پر حج کا واجب ہونا (۴/۱۸۰) نکاح متعہ (۴/۱۹۳ - ۱۹۴، ۳۱۸) مسائلِ حج (۵/۱۱۰، ۱۴۲، ۱۵۸، ۱۶۴ - ۱۶۶) نماز میں بیٹھے ہوئے امام کی اقتداء (۵/۲۶۳) اختلاطِ نسب میں قیافہ کا حکم (۵/۳۱۲) خف پر مسح (۶/۲۴) وغیرہ وغیرہ۔

۲۵ جیسے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ (۵/۱۲۴) ابو عبید القاسم بن سلام کی کتاب الأموال (۳/۳۴۵) ابن السماک کی کتاب المناسک (۵/۱۶۳) ابن الصباغ کی کتاب المسائل (۴/۲۲۰) ابو حامد کی تعلیقۃ (۴/۲۲۰) اور امام النوادی کے فتاوی (۳/۱۱۲) وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر ہر ایک کو "کتاب" کو متعدد ابواب، متنوع ضمنی فصول اور لاتعداد ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے، لیکن ان کی یہ ظاہری جامع و مانع اور شامل تقسیم ان کی سیرت کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ میں در آنے سے روک سکی ہے، اور نہ ہی اس کا مواد ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے یا تکرار سے بچ سکا ہے، جس کی بنیادی وجہ نیز گریز و انتخاب کے بجائے زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرنے کا شوق، بلکہ ہوس، سابق سیرت و تاریخ و حدیث کی کتابوں کے ابوابِ سیرت کی تقلید اور قدیم طریقے کے مطابق ہجرت کے بعد کے واقعات کی سن وار ترتیب ہے، جس کے لئے وہ اپنے زمانہ کے رائج اسلوب اور ذاتی مزاج کی وجہ سے معذور رہیں۔

۱۔ سیرت یا حیاتِ طیبہ

اس سیرت نبوی کی حیاتِ طیبہ کے حصہ سے متعلق مواد کی ترتیب کے مختلف اسلوب کے لحاظ سے اس کی دو بڑی تقسیمیں کی جا سکتی ہیں۔ یعنی ہجرت مدینہ سے قبل کے حالات و واقعات جن کو ترتیب زمنی کا لحاظ کرتے ہوئے موضوعات (CHRONICLES) کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے، اور ہجرت مدینہ منورہ کے بعد کے حالات و حوادث، غزوات اور جنگیں اور بعض تراجم (اعیان کے حالات زندگی) جن کو سن وار (ANNALS) ترتیب کے لحاظ سے جمع کیا گیا ہے۔

الف۔ ماقبل ہجرت واقعات

فطری طور پر اس سیرت کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب و نسب کے باب سے ہوئی ہے جس کا افتتاح اس موقعہ کے لئے مناسب ترین آیت قرآنی " اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ "[۲۶] سے کر کے روم کے بادشاہ ہرقل کے سوال کے جواب میں ابوسفیان کا حقیقت پر مبنی قول کہ " وہ ہم میں عالی نسب ہیں" اور پھر ہرقل کا تصدیقی بیان نقل کیا ہے کہ خدا کے " رسول قوم کے عالی نسب لوگوں ہی میں بھیجے جاتے ہیں"۔ اس کے بعد آپ کے بعض اسمار مبارکہ کی طرف مجملاً اشارہ کرتے ہوئے، ان کو سیرت کے آخر میں علٰحدہ سے مفصل طور پر جمع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، جس کو وہ مطبوع البدایۃ والنہایۃ کی حد تک پورا نہ کر سکے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر آپ کے نسب پر تاریخی روایات کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے، اس کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں عدنان تک ملایا ہے جہاں سے حضرت آدم علیہ السلام تک باقی نسب کی تفصیل کے لیے اپنی "تاریخ" میں حجاز کے عربوں کے بیان اور تاریخ طبری کا حوالہ دے کر آپ کے نسب کے سلسلہ میں اختلافی احادیث کا جائزہ لیا ہے اور کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

دوسرے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے دن مہینہ و سال کے تعین کے لئے احادیث و تاریخی روایات بیان کرتے ہوئے جمہور کے مسلک کی نشاندہی بھی کرتے گئے ہیں۔ ضمناً آپ کے والدین کے عقد مبارک کا تذکرہ بھی آیا ہے اور اس مبارک شب میں ایک نئے دور کی آمد آمد کی خبر دینے والی نشانیوں کے تذکرہ کے بعد آپ کی دایاؤں، دودھ پلانے والیوں، خاص کر حلیمہ السعدیہ کا پورا

---

[۲۶] سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲۴

واقعہ اور ان کے ہاں آپؐ کے قیام کے دوران پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ پھر چھ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد آپؐ کے دادا عبدالمطلب اور ان کے بعد آپؐ کے چچا ابو طالب کے سایۂ عاطفت میں پرورش، سفر شام اور بحیری راہب کا مشہور قصہ، حرب فجار اور حلف الفضول میں شرکت، ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے عقد مبارک اور تعمیر کعبہ کی تجدید میں شرکت کے اہم واقعات حسب توفیق تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ اور جابجا اشعار سے استشہاد کرتے ہوئے بیان کئے ہیں۔

اس کے بعد کتاب البعث کی ابتداء اہل کتاب علماء اور عرب کاہنوں کے نبی موعود کے متوقع ظہور اور جزیرہ نمائے عرب میں اس کے لئے ایک عام انتظار کی کیفیت کے تفصیلی بیان سے ہوتی ہے، جس میں تاریخی روایات کے علاوہ وسیع پیمانے پر آیات قرآنی احادیث اور سابق آسمانی کتابوں کی بشارتوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چھ[۶] مستقل ابواب قائم کئے ہیں، جن میں سے پہلے[۱] باب میں جنات و شیاطین سے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کاہنوں کی آپؐ کے ظہور سے متعلق شہادتوں کا تذکرہ ہے۔ دوسرے[۲] باب کی ابتداء امام بخاری کی روایت کی ہوئی مشہور حدیث[۲۷] سے ہوتی ہے، جس میں پہلے سچے خواب، پھر تنہائی سے مناسبت اور غار حرا میں عبادت گزاری، فرشتہ کی آمد اور "اقرأ باسم ربک الذی خلق ..."[۲۸] الخ کے نزول کی تفصیلات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر و تاریخ، نزول وحی میں رکاوٹ، جنات و شیاطین کی آسمانی باتوں کی سن گن لگانے سے محرومی، وحی کا سلسلہ دوبارہ جاری ہونا اولیں اسلام لانے والوں کا بیان الگ الگ فصلوں میں بنیادی طور پر حدیث کی کتابوں سے اور آخری فصل سیرت و تاریخ کی کتابوں سے لی گئی ہے۔ تیسرا[۳] باب پیغام خداوندی کی تبلیغ و اشاعت کے حکم سے متعلق ہے، جس کی ابتداء قرآنی آیت "و أنذر عشیرتک الاقربین[۲۹] ... الخ اور دیگر آیات قرآنی سے ہوئی ہے اور پھر اس حکم کی اطاعت میں آپؐ کا قریش کو صفا کی چوٹی پر سے دعوت دینا، ان کا ردعمل اور آپؐ کو اس دعوت سے باز رکھنے کی کوشش، آپؐ کے چچا ابو طالب سے بے نتیجہ شکایت پر قریش کا مایوسی اور جھنجھلاہٹ میں آپؐ کے دعوئ نبوت کا مذاق و استہزاء اور پھر آپؐ کا اور آپؐ کے صحابہ کرام کا اذیت رسانی کے طویل سلسلہ سے سابقہ وغیرہ واقعات سیرت و تاریخ اور احادیث کی کتابوں کی مدد سے طبع کئے گئے ہیں۔ چوتھا[۴] باب پیغام خداوندی کی حقانیت پر مشرکین سے حدیث و قرآن کی روشنی میں بحث و مباحثہ پر مشتمل ہے۔ پانچواں[۵] باب مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہے اور اسی باب میں قریش کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی شدت میں بنی ہاشم سے مقاطعہ کا معاہدہ اور ان کا شعب ابی طالب میں حصار، پھر مذکورہ معاہدہ کا خاتمہ اور اس زمانہ میں آپؐ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرنے والی نشانیوں کا ذکر اور اسراء و معراج کا واقعہ بنیادی طور پر مؤرخین اور معجزہ شق القمر زیادہ تر محدثین کی روایات کی بنیاد پر جمع کیا گیا ہے اور اس

۲۷؎ الامام البخاری، الصحیح، المجلس الأعلی للشئون الاسلامیۃ، القاہرۃ، ۱۳۸۶ھ ۱/ ۵-۶

۲۸؎ سورۃ العلق، آیات نمبر ۱-۵

۲۹؎ سورۃ الشعراء آیات نمبر ۲۱۴-۲۲۰

کے بعد آپ کے چچا ابو طالب اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کی وفات کے حادثات اور آپ کے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ اور ام المؤمنین حضرت سودہؓ سے عقد مبارک، سفرِ طائف اور ایذا رسانی اور گستاخی کا سامنا، موسم حج میں عرب قبیلوں میں دعوت و تبلیغ کا کام، انصار کے وفود کی سال بہ سال آمد اور ان میں اسلام کی دعوت کی مقبولیت، عقبۂ اولیٰ اور عقبۂ ثانیہ کی بیعت وغیرہ کے واقعات بنیادی طور پر سیرت و تاریخ کی کتابوں کے حوالوں اور حدیث کے مجموعوں کی مدد سے بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ چھٹا باب مکہ سے مدینہ ہجرت کے بیان سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں خود آپؐ کی حضرت ابو بکر الصدیقؓ کے ساتھ ہجرت کا واقعہ بہت تفصیل سے سیرت نگاروں، مؤرخین اور محدثین کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب المبعث کے مذکورہ ابواب میں پہلے باب کے علاوہ اشعار بہت کم نقل کئے گئے ہیں۔

ب۔ مابعد ہجرت واقعات

ہجرتِ مدینہ کے بعد کے واقعات "سن وار" عنوانات کے تحت سال بہ سال جیسے جیسے پیش آتے گئے بیان کئے گئے ہیں۔ سالانہ شاہ سرخی کے علاوہ سیرت کی سابق بنیادی تقسیم کتاب ضمنی فصول اور ذیلی عنوانات یہاں بھی برقرار ہیں، صرف ابواب کی تقسیم سالانہ واقعات کی ترتیب سے متاثر ہوئی ہے، لیکن یہ ابواب سیرت کے آخر اور شمائل و دلائل کے حصوں میں پھر کثرت سے ملنے لگتے ہیں۔

ان سالانہ واقعات میں فطری طور پر غزوات و سرایا کا ذکر غالب ہے، اہم غزوات بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ سیرت، تاریخ اور حدیث کی کتابوں کے علاوہ متعلقہ آیات قرآنی سے استدلال اور اشعار سے استشہاد میں کوتاہی نہیں کی گئی ہے۔ غزوات و سرایا میں جھنڈا جن صحابہ کرام کے ہاتھ میں دیا گیا، اُن کے نام اور جھنڈے کا رنگ بھی جہاں تک معلوم ہوا تحریر کیا گیا ہے، آپؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں آپ کے عمال کے ناموں کی نشاندہی کی فکر بھی رکھی گئی ہے اور اس سب کے ساتھ سیرتِ نبوی کے دوسرے پہلو اور دیگر واقعات بھی نظر سے بالکل اوجھل نہیں ہوتے ہیں۔ اہم وفیات اور نومولودین کا تذکرہ اکثر غزوات و واقعات کے درمیان میں آگیا ہے، بعض سالوں کے آخر میں متعلقہ سال کے "جملہ حوادث کی فصل" بھی قائم کی ہے جس میں انہوں نے اس سال ہی کے مذکورہ غزوات اور واقعات کی طرف مختصراً اشارہ اور وفیات اور نومولودین کے مختصر ترین ذکر پر اکتفا کیا ہے اور اکثر تو یہ فصل ترتیب دینے سے بھی رہ گئی ہے، کچھ غزوات و سرایا اور واقعات و وفیات وغیرہ کی تکرار بھی ملتی ہے، جس کی وجہ ان کی تاریخوں کے سلسلہ میں سابق مؤرخین و محدثین کا اختلاف ہے۔ لیکن ابن کثیر نے جس تاریخ کو زیادہ صحیح سمجھا ہے۔ وہاں پر تفصیل بیان کی ہے اور دوسری جگہ صرف مختصر اشارہ یا حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے۔

بہرحال ہجرت کے سال اول کے واقعات کی ابتدا فطری طور پر تاریخ اسلامی کے ہجرت مدینہ سے متعین کرنے کے بیان سے ہوتی ہے، جس میں حضرت عمر الفاروقؓ کے دورِ خلافت میں اس کی ضرورت، مشورہ، اختلاف رائے اور پھر سالِ ہجرت کے ماہِ محرم (جبکہ آپؐ خود مکہ میں تشریف رکھتے تھے) سے تاریخ اسلامی کی ابتدا پر اتفاق کا ذکر ہے اور پھر علیحدہ فصلوں اور ذیلی عنوانات کے تحت مسجد قباء کی تاسیس، عبداللہ بن سلام کا اسلام، مدینہ میں پہلی نماز جمعہ اور خطبہ، مسجد نبوی کی بنیاد اور اس کے فضائل، مہاجرین کی بیماری اور

مدینہ کے حق میں بیماریوں سے حفاظت کی آپؐ کی مقبول دعا، انصار و مہاجرین میں مؤاخاۃ، مدینہ کے یہودیوں سے صلح کا معاہدہ، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی رخصتی، نماز مقیم میں اضافہ، اذان کی مشروعیت، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کے سرایا (فوجی مہمات یا جنگی دستوں) کے ذکر کے علاوہ ہجرت مدینہ کے بعد پہلے وفات پانے والے اور پہلے نومولود بچوں کا تذکرہ بھی ہے، اور سال کے آخر میں ایک علیحدہ مختصر فصل میں مذکورہ واقعات، وفیات اور نومولودین کی طرف پھر اشارہ کیا ہے۔

دوسرے سال ہجرت کی ابتدا کتاب المغازی سے ہوئی ہے جس کو انہوں نے علمائے یہود کی اسلام اور مسلمان دشمنی، اوس و خزرج سے سازباز، اور ان میں سے بعض کے تقیہ کے طور پر اسلام لانے کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ پھر اس سال کے تمام غزوات سرایا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں خاص طور پر غزوۂ بدر کو اس کی اہمیت کے پیش نظر بنیادی طور پر ابن اسحاق کی روایت سے اور بوقت ضرورت دیگر مؤرخین و محدثین کی مدد سے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس میں طرفین کے مقتولین اور قیدیوں کی تعداد، مال غنیمت کی تقسیم، آپؐ کی کامیاب و کامران مدینہ واپسی، نجاشی کی غزوۂ بدر کے نتیجہ میں خوشی، مکہ میں غم و ماتم، فدیہ کی ادائیگی سے قریش کے قیدیوں کی رہائی کے علاوہ آخر میں بنیادی طور پر ضیاء الدین محمد المقدسی کی کتاب الاحکام الکبیر سے شرکائے بدر صحابہ کرامؓ کے ناموں کی پہلے ہجری حروف کی ترتیب سے اور پھر کنیت کی بنیاد پر مرتب کردہ فہرست اور ان کی فضیلت کی احادیث اور اس غزوہ کے بارے میں طرفین کے اشعار نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ غزوات کے ذکر کے دوران مختلف واقعات بھی بیان کئے ہیں، جن میں قابل ذکر تحویل قبلہ، ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت، النضر بن الحارث اور عقبہ بن معیط کا قتل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کی ہجرت، حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے عقد مبارک اور رخصتی وغیرہ موضوعات ہیں اور آخر میں اس سال کے جملہ حوادث کی فصل ہے جس میں بعض مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ اور اس سال کی وفیات اور نومولودین کا مختصر ترین ذکر ہے۔

تیسرے سال کے غزوات و سرایا میں سب سے مفصل ذکر غزوۂ اُحد کا ہے، اور اس کے ذیل میں حضرت حمزہؓ کی شہادت کا سانحہ، ان کی نماز جنازہ، طرفین کے مقتولین کی تعداد، مشرکین کا تتبع اور طرفین کے اس غزوہ کے بارے میں اشعار کے علاوہ کعب بن الاشرف کے قتل کا قصہ، اور حرمت خمر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس سال کے آخر میں ایک مختصر فصل میں وفیات و مولودین کے علاوہ حضرت عثمانؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے عقد مبارک کا تذکرہ ہے۔

چوتھے سال کے غزوات و سرایا میں غزوۃ الرجیع اور بنو النضیر کی جلاوطنی کی کسی حد تک تفصیل بیان کرنے کے بعد غزوۂ بنی لحیان کے ضمن میں صلاۃ الخوف کا ذکر آیا ہے۔ اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل نسبتاً سابق سالوں کی فصلوں سے طویل ہے جس میں حسب عادت وفیات و مولودین کے ذکر کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ام المؤمنین زینب بنت خزیمہؓ اور ام المؤمنین ام سلمہؓ سے عقد مبارک اور اس ضمن میں بیٹے کی ماں کے دوسرے عقد کے موقعہ پر ولایت کی فقہی حیثیت کا مختصر ذکر بھی آ گیا ہے۔

پانچویں سال کے واقعات میں غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے، اس کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات، ابو رافع سلام بن ابی الحقیق اور خالد بن سفیان الہذلی کے قتل، عمرو بن العاص کی نجاشی سے ملاقات اور نجاشی کی ان کو اسلام کی تلقین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ام المؤمنین ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان اور ام المؤمنین زینبؓ بنت جحش سے عقد مبارک

اور حجاب کے حکم کا نزول وغیرہ موضوعات بیان کئے ہیں، لیکن اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل موجود نہیں ہے۔

چھٹے(۶) سال کے غزوات و سرایا میں غزوۂ ذی قرد، اور غزوۂ بنی المصطلق کسی قدر تفصیل سے اور غزوہ (صلح) حدیبیہ زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد، اس سال کے دیگر سرایا علٰحدہ فصل میں واقدی (بحوالہ بیہقی) کی روایت سے ذکر کئے ہیں۔ نیز اس سال کے دیگر واقعات میں مشہور حدیث الافک (ام المومنین حضرت عائشہؓ پر بے بنیاد تہمت کا قصہ) بھی قابلِ ذکر ہے اور اس سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل میں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق فرضیت حج، مسلمان عورتوں کے مشرکین سے نکاح کی حرمت کے علاوہ مذکورہ غزوات میں سے بعض کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن وفیات و مولودین کا ذکر نہیں ہے۔

ساتویں(۷) سال کے غزوات میں خاص کر غزوۂ خیبر اور خیبر کے قلعوں کی فتوحات، شہداء اور اراضی کی تقسیم بہت تفصیل سے بیان کرنے کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھیوں کی حبشہ سے واپسی، عمرۃ القضاء اور اُم المؤمنین حضرت صفیہؓ اور اُم المؤمنین حضرت میمونہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مبارک قابلِ ذکر موضوعات ہیں۔ لیکن سال کے آخر میں جملہ حوادث اور وفیات و مولودین کا ذکر یہاں بھی نہیں ہے۔

آٹھویں(۸) سال کی ابتداء حضرت عمروبن العاصؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت عثمان بن طلحہؓ اور انتہا حضرت کعب بن زہیرؓ کے اسلام لانے کے واقعات سے ہوئی ہے اور ان کے درمیان غزوات و سرایا کے ضمن میں غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ ہوازن (حنین) اور غزوۂ طائف اور ان کے درمیان پیش آنے والے تمام واقعات بہت تفصیل سے ترتیب دینے کے بعد عمرۃ الجعرانہ کا بیان کیا ہے، اور اسی سال فتح مکہ سے پہلے کتاب البعوث کی ابتداء ہو گئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملوک عالم کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے وفود اور پیغامات کی روانگی کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ اور آخر میں اس سال کے جملہ حوادث کی فصل میں مذکورہ غزوات کی طرف مختصراً اشارہ کیا ہے، لیکن اس میں وفیات کا ذکر نہیں ہے۔

نواں سال غزوۂ تبوک کے تفصیلی بیان سے شروع ہوا ہے اور آپ کے تبوک میں قیام کے دوران ہی قیصرِ روم کے پیامبر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے آمد اور ایلہ کے بادشاہ اور جرباء اور اذرح کے لوگوں سے مصالحت، رومہ کے حاکم کی حضرت خالد بن الولیدؓ کے ہاتھوں گرفتاری اور مصالحت کے اہم واقعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان کے بعد مسجد ضرار کا واقعہ اور اس کا انہدام، غزوۂ تبوک میں شرکت سے پیچھے رہ جانے والوں کو تنبیہ، ثقیف کے وفد کی آمد اور اسلام، عبداللہ بن اُبی کی موت، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امیرِ حج کی حیثیت سے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ روانگی اور قربانی کے دن حضرت علیؓ کی زبانی مشرکین کے آئندہ سال سے حج پر پابندی، ننگے بدن بیت اللہ کے طواف کی ممانعت، اس سال آئے ہوئے مشرکین کو مکہ سے واپسی کے لیے چار ماہ کی مہلت، جس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے عہد و پیمان کے علاوہ تمام دوسرے عہد و پیمانوں کے خاتمہ کے اعلان کا مفصل بیان تحریر کیا ہے اور سال کے آخر میں جملہ حوادث کی فصل میں بعض مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ کے علاوہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ کی وفات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہاں سال کے واقعات ختم کرنے کے بجائے امام بخاری کی تقلید میں کتاب الوفود قائم کیا ہے جس میں عرب قبائل کی فوج در فوج آمد اور ان کے اسلام لانے کے واقعات بہت تفصیل سے ترتیب دیے گئے ہیں۔

(۱۰) دسواں سال اسلام کی دعوت کو عام کرنے اور خدا کے پیغام کو بندگانِ خدا تک پہنچانے کے لئے حضرت خالد بن الولید رضؓ کو نجران اور ان کے بعد حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضؓ اور حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن بھیجنے سے شروع ہوتا ہے، جن کی مدد کے لئے بعد میں حضرت خالد بن الولید رضؓ اور حضرت علی رضؓ کو بھی یمن بھیجا گیا۔ اس کے فوراً بعد کتاب حجۃ الوداع کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس کی چھوٹی بڑی تمام تفصیلات جیسے مدینہ سے روانگی، قیام کی منزلیں، نماز کے مقامات، احرام (افراد، تمتع یا قران) تلبیہ، مکہ میں داخلہ طواف رمل، صفا، و مروہ کے درمیان سعی، بطحا میں قیام، عرفہ میں وقوف، مزدلفہ میں شب گذاری، صبح سویرے منیٰ کے لیے روانگی رمی، قربانی، طواف بیت اللہ کے لئے مکہ روانگی، منیٰ واپسی، تشریف کے دوسرے دن منیٰ تاریخی خطبہ، مکہ واپسی، مدینہ سے روانگی اور راستہ میں جحفہ کے قریب غدیر خم نامی مقام پر مشہور خطبہ جو بعد میں حضرت علی رضؓ کے طرفداروں کے لئے ان کی دوسرے صحابہ کرام پر فضیلت اور فوقیت کی ایسی دلیل بنا کہ اس پر اب تک دفتر کے دفتر سیاہ کئے جا چکے ہیں، جبکہ جمہور اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک اس خطبہ سے حقیقتاً یمن کے قیام کے زمانہ میں حضرت علی رضؓ پر بے جا الزاماتِ جور و جفا سے برائت اور ان شکایات کا ازالہ مقصود تھا جو بعض لوگوں کو آپ سے پیدا ہوئی تھیں۔ بہرحال حجۃ الوداع کا یہ مفصل بیان بنیادی طور پر احادیث کی روشنی میں اور بوقت ضرورت سیرت و تاریخ کی کتابوں کی مدد سے اور کہیں کہیں فقہی آرا کے حوالوں سے ترتیب دیا گیا ہے اور اس سال کے آخر میں بھی جملہ حوادث کی فصل اور وفیات وغیرہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔

(۱۱) گیارہواں سال ہجرت آپؐ کی حیات طیبہ کا آخری سال تھا، لہذا اس کا افتتاح پیغام رسالت کی تکمیل، حق کی فتح، اسلام کا غلبہ اور دیگر اشاراتِ قرآنی کی حامل آیات سے کیا ہے، لیکن سابق مؤرخین و محدثین کی نقل میں ابن کثیر سانحۂ ارتحال کے بیان سے پہلے آپ کے حج غزوات و سرایا کی تعداد، ملوک عالم کے نام آپ کے پیغامات اور قاصدین کے ذکر کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور پھر آیات قرآنی اور احادیث کی روشنی میں آپ کے سانحۂ وفات سے متعلق اشارات ایک مستقل فصل میں جمع کئے ہیں، جس کے بعد مرض الموت کی ابتدا، کیفیت، شدت، حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کو پنج وقتہ نمازوں کی امامت کا حکم، اور خود بعض اوقات ان کی امامت میں نماز کی ادائیگی، جان کنی اور اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لئے جدائی کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ پھر "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور دفن سے پہلے کے اہم واقعات کی فصل" کے زیرِ عنوان حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کی بیعتِ خلافت کے سلسلہ میں تصفیہ بنی ساعدۃ میں ان کو آپؐ کا جانشین مقرر کئے جانے کا مکمل واقعہ بنیادی طور پر امام احمد بن حنبل کی روایت اور دیگر محدثین و مؤرخین و سیرت نگاروں کی مدد سے بیان کر کے حضرت ابو بکر الصدیق رضؓ کی اقدمیت اور اسبقیت پر مہاجرین و انصار صحابہ کرام کا اجماع ثابت کیا ہے اور حضرت علی رضؓ کے طرفداروں کے ان کے لئے خلافت کی وصیت کے دعویٰ کو رد کرتے ہوئے ان تمام روایات اور ان کے راویوں پر بحث کی ہے جن کا ذکر اس ضمن میں آتا ہے۔ پھر آپؐ کی سیرت مبارکہ کی طرف لوٹتے ہوئے، وفات کا وقت اور دن اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تعین، غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور دفن کا حال، قبر مبارک کی جگہ کا تعین صحابہ کرام رضؓ پر اس اندوہناک صدمہ کا اثر اور تعزیت کے سلسلہ کی احادیث و روایات، اہلِ کتاب کو آپؐ کی وفات کے دن کا سابق علم اور عرب قبائل ارتداد کی وبا پھیلنے کی طرف صرف اشارہ کر کے تفصیل آئندہ تاریخی حالات کے لئے اٹھا رکھی گئی ہے اور حضرت حسان بن ثابت رضؓ اور ابو سفیان بن الحارث کے

مرثیوں کے اشعار پر وفات کے بیان کی تکمیل ہوئی ہے۔

اس کے بعد متعدد ابواب قائم کئے ہیں، جن میں سے پہلے باب میں آپؐ کے ترکہ کے بارے میں احادیث جمع کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سوائے کچھ زمین کے کوئی چیز میراث میں نہیں چھوڑی تھی اور اس زمین کو بھی اللہ کے لئے صدقہ کر دیا تھا۔ دوسرے[2] باب میں حدیث" لا نورث، ماترکنا ہ صدقۃ" پر بحث کرتے ہوئے فدک کی زمین اور آپؐ کے خیبر کے حصّہ کے بارے میں حضرت فاطمہ رضؓ اور حضرت عباسؓ کا حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ سے اختلاف اور پھر ناراضگی کا ذکر آیا ہے، جس میں ابن کثیر نے حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کے مؤقف کی تائید اور حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ سے مصالحت اور تجدید بیعت کا ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک حضرت علیؓ کی حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کے ہاتھ پر پہلی بیعت تمام صحابہ کے ساتھ ثابت ہے۔ تیسرے[3] باب میں امہات المومنین، آپؐ کی مخطوبات (منگیتریں) جن سے نکاح کی نوبت نہیں آئی، سراری (باندیاں) اور اولاد کا تذکرہ الگ الگ فصلوں میں کیا ہے۔ چوتھے[4] باب میں آپ کے غلام، لونڈیوں، خدمت گاروں، وحی لکھنے والے کاتبین اور اُمناء کے حالات ابجدی حروف کی ترتیب اور بعد میں کنیت کے اعتبار سے مستقل فصلوں میں تحریر کئے ہیں اور پانچویں[5] باب میں آپ کی زندگی کی یادگار نشانیوں اور سواریوں وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے اور یہاں ابن کثیر نے سیرت کا بنیادی حصہ ختم کر کے "کتاب" کی تقسیم اور عنوان کو برقرار رکھتے ہوئے مزید چار کتابوں میں شمائل و دلائل اور فضائل و خصائص کے بیان کرنے کی وضاحت کی ہے، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فضائل و خصائص کے حصے طبع البدایۃ والنہایۃ اور اس سے ماخوذ سیرت اور شمائل میں نہیں ملتے، لہٰذا یہاں صرف شمائل اور دلائل کا خلاصہ پیش کیا جائیگا۔

۲۔ شمائل یا صفات و اخلاق مبارکہ

ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کی کتاب الشمائل کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جس کے پہلے[1] باب میں انہوں نے آپؐ کا حسن چہرہ مہرہ، بال، مونڈھے، بازو، بغل، پاؤں، ٹخنے، قد، بدن کی خوشبو اور دونوں شانوں کے درمیان خاتم نبوت سے متعلق معلومات جمع کی ہیں۔ دوسرے[2] باب میں آپؐ کی عام صفات و کمالات کو اجاگر کرنے والے بیانات تحریر کئے ہیں اور تیسرے[3] باب میں آپؐ کے اخلاق و عادات، جود و سخا، ظرف و مزاح، زہد و عبادت اور شجاعت کے اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ یہ پوری "کتاب" بنیادی طور پر امام ترمذی کی الشمائل اور دیگر احادیث کے مجموعوں کی روشنی میں تیار کی گئی ہے، سوائے آخر کی ایک فصل" سابق آسمانی کتابوں میں مذکور آپؐ کی صفات" محدثین اور مؤرخین کے حوالوں سے ترتیب دی گئی ہے۔

۳۔ دلائل یا آپؐ کی زندگی کے اعجازی گوشے

اس سیرت کے آخری حصہ کے طور پر ابن کثیر نے کتاب دلائل النبوۃ ترتیب، جو اس سیرت کے طویل ترین حصوں میں سے ایک ہے۔ اس میں انہوں نے دلائل نبوت کو پہلے معنوی اور حسی دلائل میں تقسیم کیا ہے:

معنوی دلائل میں انہوں نے قرآن[1] شریف کو بطورِ معجزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپؐ کے اخلاق[2] و عادات و صفات کو بھی

اپنے استاد امام ابن تیمیہ کی اتباع میں اسی ضمن میں شمار کیا ہے، اور ان ہی کی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح کی متعلقہ آخری نص کو بحرفہ نقل کر دیا ہے۔

اور پھر حسّی دلائل کے علٰحدہ مستقل باب کو آسمانی اور زمینی دلائل میں تقسیم کیا ہے:

آسمانی دلائل میں معجزہ[1] شق القمر کا ذکر فطری تھا، جس کے متعلق تمام احادیث کی مختلف روایتیں جمع کرنے کے بعد اس غیر معمولی واقعہ کی عالم میں شہرت کے ضمن میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ "ایک سے زیادہ مسافروں نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسا ہیکل! (مجسمہ یا عمارت؟) دیکھا جس پر لکھا ہوا تھا کہ وہ اس رات میں بنایا گیا ہے جس میں شق قمر ہوا تھا"[3] اور اس معجزہ کے ضمن میں حضرت علیؓ کے نماز عصر ادا کرنے کے لئے آپؐ کے حکم سے "سورج کو اس کے غروب ہونے کے بعد لوٹانے والی حدیث" کے سنداً و متناً پر طویل بحث کرتے ہوئے، مخالف اور موافق مصنفین کی کتابوں کے حوالوں سے ان کی آراء کو پیش کیا ہے اور اس حدیث کو موضوع اور ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا۔ اس کے علاوہ آسمانی دلائل میں نماز استسقاء کے بعد آپؐ کی دعا[2] کی فوری قبولیت اور اسی طرح قریش کے خلاف آپؐ کی بددعا[3] کی قبولیت کو بھی شمار کیا ہے اور ان سے متعلق احادیث اور بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

اور زمینی دلائل کو علٰحدہ فصل میں جمادات وحیوانات سے متعلق دلائل میں تقسیم کیا ہے:

جمادات سے متعلق دلائل میں آپؐ کے ہاتھ کی انگلی کی برکت سے پانی کی زیادتی، ہنگامی ضرورت کے موقعوں پر کھانے کی چیزوں (دودھ، گھی، کھجور، آٹا، جَو وغیرہ) یا مال (سونا وغیرہ) میں برکت، درخت کا آپؐ کے حکم کی تابعداری کرنا، کھجور کے تنے کا آپؐ کے فراق پر غم و گریہ، کنکریوں کا آپؐ کے ہاتھ میں تسبیح پڑھنا، بتوں کا آپؐ کے اشارے پر گر جانا وغیرہ واقعات سے متعلق احادیث اور ان کی مختلف روایتوں کا بہت تفصیل سے احاطہ کیا ہے۔

اور حیوانات سے متعلق دلائل میں جنگلی اور پالتو جانوروں اور پرندوں (اونٹ، بکری، بھیڑیا، شیر، ہرنی، گوہ، گدھا اور ایک سرخ پرندہ وغیرہ) کا آپؐ کی تعظیم، ادب، سجدہ، رسالت کی گواہی یا مالک کی بدمعاملگی کی شکایت وغیرہ کے واقعات سے متعلق احادیث اور ان کی مختلف روایتوں کو بہ تفصیل جمع کرنے کے علاوہ، آپؐ کی امت کے اولیا کی بعض کرامات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر نقل کیا ہے۔ نیز بعض فوت شدہ افراد اور ایک دن کے بچّہ کا آپؐ کی رسالت کی شہادت دینا، آپؐ کی دعا سے مختلف امراض سے بیماروں کی شفایابی، یا اولاد و مال کی کثرت وغیرہ غیر معمولی کرامات ظاہر کرنے والے واقعات سے متعلق مختلف روایات کا انبار جمع کر دیا ہے اور غالباً یہ ان کی سیرت کا سب سے کمزور حصہ ہے۔ جس کی طرف ان کی شمائل اور دلائل کے محقق مصطفیٰ عبدالواحد نے بھی اشارہ کیا ہے اور ثابت شدہ دلائل کی موجودگی میں ایسی کمزور، موضوع، مشکوک یا خلافِ عقل روایات کی بھرمار سے احتراز کا مناسب مشورہ دیا ہے۔[31]

---

[30] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ۔ ۶/۷۷۔ [31] ابن کثیر، شمائل الرسولؐ، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد صفحہ ج۔ د

دلائل نبوت کی مذکورہ تقسیم در تقسیم اور اس کی غیر معمولی تفصیلی ترتیب کے بعد ابن کثیر نے تین باب اور قائم کئے ہیں ۔ جن میں سے پہلے[1] باب میں مشرکین و یہود کے آزمائشی سوالات کے جواب میں آپؐ کی سابق آسمانی کتابوں کے مطابق صحیح معلومات کا تذکرہ دلائل نبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے ایک مستقل فصل میں مختلف آسمانی کتابوں کے نام بنام حوالوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی بشارتیں بھی جمع کر دی ہیں ۔ دوسرے[2] باب میں بہت تفصیل سے تمام ایسی احادیث اور ان کی مختلف روایتیں ذکر کی ہیں جن کا تعلق غیبیات سے تھا اور وہ آپؐ کی حیات میں اور مابعد وفات آپ کی پیش گوئیوں کے مطابق صحیح ثابت ہوئیں اور تیسرے[3] باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا مقابلہ سابق انبیاء کرام علیہم السلام سے کر کے آپؐ کے معجزات کو ان کے معجزات کے ہم پلہ یا ان سے برتر ثابت کرتے ہوئے ایسے معجزات کا ذکر بھی کر دیا ہے جو آپؐ سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہو سکے اور اس آخری باب کو انہوں نے اپنے استاد ابن الزملکانی کی مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہشام بن عمار کی کتاب المبعث کی بنیاد اور دیگر احادیث کے مجموعوں کی مدد سے ترتیب دیا ہے اور پھر اس سیرت نبوی کو محدث و ادیب اور لغوی جمال الدین ابو زکریا یحییٰ الصرصری (وفات ۶۵۶ھ) کے مدح نبوی کے دیوان کے چند اشعار پر ختم کیا ہے ۔

ابن کثیر کی مفصل ترین سیرت نبوی کے اس انتہائی مختصر خلاصہ کے بعد اب ہم ان کے مصادر اور ماخذ (SOURCES) کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کریں گے ۔

مصادر و مآخذ

اس سیرت نبوی کے پہلے[1] حصہ یعنی سیرت یا حیات طیبہ کی معلومات اور مواد میں فطری طور پر سیر و مغازی اور تاریخ کی مشہور و معروف کتابیں پیش پیش ہیں اور دوسرے[2] حصہ شمائل یا صفات و اخلاق مبارکہ میں شمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستقل کتابیں یا احادیث کے مجموعوں کے مستقل ابواب اصل و بنیاد ہیں اور تیسرے[3] حصے دلائل نبوت یا آپ کی زندگی کے اعجازی گوشوں میں دلائل نبوت موضوعات سے متعلق مستقل کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور ان تینوں قسم کی مستقل فنی کتابوں کے پہلو بہ پہلو ان کے بیانات کی تائید و تصحیح یا تردید و انکار کے لیے ابن کثیر نے اپنے علمی مزاج و شخصیت کے مطابق قرآنی آیات، مشہور تفاسیر، سابق آسمانی کتابوں کے علاوہ خاص طور پر حدیث شریف کے وسیع ذخیرہ صحاح و مسانید و سنن کے مجموعوں کو ایک طرح سے کھنگال ڈالا ہے ، اور ان سے اور فن جرح و تعدیل اور رجال و تراجم کی کتابوں سے بڑے پیمانے پر مدد لی ہے ۔ چونکہ وہ تینوں حصوں میں مشترک ہیں، چنانچہ یہاں ہم بہ ترتیب مذکور ان کی سیرت نبوی کے مصادر کا جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

۱۔ سیر و مغازی اور تاریخ کی کتابیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں جو شروع میں "المغازی" (یعنی غزوات اور جنگوں) کے نام سے مشہور ہوئیں "در حقیقت آپؐ کے عہد رسالت کی تاریخ پر مشتمل تھیں[۳۲]" اگرچہ ان میں زیادہ زور غزوات و فتوحات کی تفصیلات جمع کرنے پر دیا گیا تھا ۔ ان کی

۳۲؎ الدکتور عبد العزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، المطبعۃ الکاثولیکیۃ، بیروت، ۱۹۶۰ء، صفحہ ۲۰

اخلاقی و تعلیمی اور تشریعی و اداری فطری ضرورتوں کے علاوہ آپ کی احادیث کی تدوین و تصنیف کی طرح آپ کی جمع و ترتیب کی وجہ بھی آپ کی قابلِ تقلید نمونہ ذاتِ والا صفات سے مسلمانوں کا غیر معمولی تعلق، اسلامی مفاخر اور روحِ جہاد کو زندہ رکھنے کے قابلِ قدر جذبات بھی تھے اور صدرِ اول ہی سے احادیث کے مجموعی ذخیرہ کے ساتھ ساتھ سیرت کی چھوٹی بڑی تمام تفصیلات کی جمع و ترتیب اور حفاظت کی فکر اور اس کے اہتمام کی طرف مدینہ میں مسلمان علماء کی توجہ مبذول ہونا شروع ہوگئی تھی، چنانچہ آپ کی سیرت کے ابتدائی راویوں میں مشہور صحابہ کی اولاد اور دیگر تابعین میں ابان بن عثمان ؓ بن عفان (۲۰ - ۱۰۵ھ تقریباً)، عروۃ بن الزبیر بن العوام (۲۳ - ۹۴ھ) شرحبیل بن سعد (وفات ۱۲۳ھ) اور وہب بن منبہ (وفات ۱۱۰ھ) پہلے طبقہ کے مشہور علماء ہیں اور دوسرے طبقہ کے مشہور لوگوں میں عبد اللہ بن ابی بکر بن حزم (وفات ۱۳۵ھ) عاصم بن عمر بن قتادہ (وفات ۱۲۰ھ) اور محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (وفات ۱۲۴ھ) ہیں، لیکن ان دونوں طبقوں کی مدون کتابیں ہم تک نہیں پہنچ سکیں، بلکہ ان کی روایاتِ سیرتِ نبوی ان کے بعد کے تیسرے طبقہ کے بعض اہم مؤلفین کی کتابوں میں شامل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں، جس کے اہم ارکان موسیٰ بن عقبہ (وفات ۱۴۱ھ) معمر بن راشد (وفات ۱۵۰ھ) محمد بن اسحٰق (وفات مابین ۱۵۰-۱۵۳ھ) جن کی سیرت ابو محمد عبد الملک بن ہشام الحمیری (وفات ۲۱۸ھ) نے بروایت زیاد البکائی (وفات ۱۸۳ھ) حاصل کی اور اسی طبقہ کے افراد میں محمد بن عمر الواقدی (وفات ۲۰۷ھ) اور ان کے شاگرد محمد بن سعد (وفات ۲۳۰ھ) کا بھی شمار ہے[33]

سیرت نبوی کے مذکورہ راویوں اور مؤلفین میں سے ابن کثیر نے جن حضرات کی روایات و اقوال نام کے حوالوں کے ساتھ مستقل طور پر بیان کئے ہیں، اُن کا مختصر تعارف اور ابن کثیر کی سیرت میں ان کی اہمیت پر کچھ روشنی عندرجہ ذیل سطور میں ڈالی جائے گی اور ان کے علاوہ دیگر مؤرخین اور ان کی کتابوں کا بھی ذکر آئے گا جن کے حوالے مذکورہ سیرت میں ملتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس "مدنی اسکول" کا تذکرہ ناگزیر ہے، جو کیے بعد دیگرے تین نسلوں کی مسلسل اور مربوط کوششوں سے وجود میں آیا تھا، یعنی عروۃ بن الزبیر، ان کے شاگرد ابن شہاب الزہری اور ان کے شاگرد موسیٰ بن عقبہ جو روایات کی تنقید و تحقیق میں قابلِ تعریف قدرت و صلاحیت کے مالک تھے۔ ان پیشرو سیرت نگاروں نے اس فن کو محدثین کے طریقۂ کار کے مطابق اسناد کی رعایت کرتے ہوئے پروان چڑھایا اور سیرت کے خدوخال متعین کئے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات بے وزن ہو جاتی ہے جو مغازی کے اصول عوامی قصوں میں تلاش کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، ابن کثیر خود اپنے علمی ورثہ اور انداز فکر سے اس طریقہ کے حامی اور پرستار تھے۔ چنانچہ ان کا اس مدرسہ فکر کے افراد سے متاثر ہونا، جا بجا تحسین کرنا، ان کی روایات کو اپنی سیرت میں اہم جگہ دینا، بلکہ ترجیح دینا قرینِ قیاس ہے، چنانچہ غزوۂ بدر کے مقتول مشرکین اور قیدیوں کی تعداد کے بارے میں واقدی کے اجماع کے دعویٰ کو صرف عروۃ اور موسیٰ کے اختلاف کی وجہ سے ابن کثیر بلاتردد یہ کہتے ہوئے رد کر دیتے ہیں کہ " وہ دونوں اس میدان کے امام ہیں اور ان کے اتفاق کے بغیر اجماع کا دعویٰ ناممکن ہے، اگرچہ ان کا قول صحیح حدیث کے مقابلہ میں مرجوح ہی کیوں نہ ہو"[34]

۳۳ـ محمد توفیق حسین، مقالہ: "عن سیرۃ النبی محمدؐ" کتاب ماساہم بہ المؤرخون العرب فی المئۃ سنۃ الأخیرۃ فی دراسۃ التاریخ العربی ص۲۵-۲۶ ـ ۳۴ـ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۳۲۸

عروۃ ابن الزبیر (۲۳-۹۴ھ) مشہور محدث اور فقیہ اور فن مغازی کے مؤسس اور اس کے "اولین مصنفین" میں شمار ہوتے ہیں۔[۲۵] ان کی مغازی کا کچھ حصہ بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین جیسے ابن اسحٰق، واقدی، طبری، ابن سید الناس اور ابن کثیر کی کتابوں کے ذریعے اقتباسات کی شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی بعثت، ابتدا، دعوت، قریش کی مخاصمت، ہجرت حبشہ و مدینہ، غزوات و سرایا، ملوک عالم کے نام مراسلت اور آپؐ کی زندگی کے آخری ایام کے علاوہ خلافت راشدہ کے زمانہ جنگ جمل تک کے بعض واقعات پر مواد جمع کیا تھا[۳۶] اور ابن کثیر کی تاریخ میں اموی زمانہ کے بعض تراجم تک ان کی روایات اور اقوال ملتے ہیں اور سیرت نبوی کے حصے میں قریش کے ہاتھوں کعبہ شریف کی تجدید سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تیس صفحات پر ان کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ جن میں اکثر غزوات و واقعات کی تاریخیں، ان میں شریک اشخاص کے ناموں کے بارے میں ان کے اقوال و اختیارات دوسرے مؤرخین کی تصدیق یا اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں اور ان کی روایات کم نقل کی گئی ہیں اور بعض جگہ ان کے مغازی کا حوالہ بھی دیا ہے[۳۷] لیکن ظاہر ہے کہ ان کی روایات و اقوال میں ابن کثیر کا اعتماد بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین پر تھا۔

ابن شہاب الزھری (۵۸-۱۲۴ھ) بھی محدث و فقیہ ہیں، انہوں نے عروۃ بن الزبیر کے علاوہ اپنے زمانہ کے نامی گرامی محدثین سے علم حدیث حاصل کیا، مدنی روایات و احادیث کی وسیع پیمانے پر تلاش و تحقیق کی، اور قوی یادداشت کے باوجود جو کچھ سنا اس کو لکھا، انہوں نے سب سے پہلے اپنے مغازی کو نہ صرف یہ کہ "سیرۃ" کا نام دیا، بلکہ اس فن کو متعین شکل و صورت اور واضح دائرہ کار عطا کیا۔ جس کی صرف خانہ پری بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخین کے ذمہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ ابن اسحاق، واقدی، طبری، بلاذری، ابن سید الناس ابن کثیر وغیرہ کی کتابوں میں ان کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس میں بعض سابق انبیاء کرام علیہم السلام سے متعلق روایات کے علاوہ رسالت سے پہلے آپؐ کی زندگی سے متعلق بعض معلومات، نسب اور بعض دلائل نبوت بیان کرنے کے بعد، ابتداء وحی، مکی زندگی کے اہم واقعات ہجرت حبشہ، قریش کا مقاطعہ، ہجرت مدینہ، غزوات و سرایا، سفارات، وفود کی آمد، آپؐ کی بیماری اور وفات سے متعلق معلومات کے ساتھ خلافت راشدہ کے زمانہ کے حالات کو عروۃ سے زیادہ تفصیل سے جمع کیا ہے اور اموی خلفاء کی عمر اور

---

۳۵ ایضاً بحوالہ واقدی ۹/۱۰۱، السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ تحقیق و تعلیق فرانز روزنثال، عربی ترجمہ اور مقدمہ صالح احمد العلی، مطبعۃ العانی، بغداد، ۱۳۸۲ھ ص ۱۵۹، حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، وکالۃ المعارف استنبول ۱۳۶۲-۶۰ھ ۲/۱۷۴۷۔

۳۶ ان کے تاریخی مقام و مرتبہ ان کی مغازی کے مکتوبات اور نمونوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری کی کتاب بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص ۲۱-۲۲ ص ۶۱-۶۷ اور ص ۱۳۷-۱۴۲۔

۳۷ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۴۱، ۵/۲۵۴، ۲۵۵

مدتِ حکم کے بارے میں کچھ معلومات طبری میں مل جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں تاریخی تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے[۳۸] بعض واقعات و غزوات کی تاریخیں بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اسناد کا التزام کیا ہے اور ایک واقعہ کے بارے میں مختلف تاریخی روایات کا احادیث سے مقابلہ کر کے ان میں توافق پیدا کرنے اور ان کو ایک سیاق میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے[۳۹]۔ اس طرح ان کا یہ کارنامہ محدثین کی احتیاطی پابندیوں اور پیش بندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ صرف ترقی کی جانب ایک قدم تھا، جس نے فنِ تاریخ میں واقعات نگاری کے ایک نئے اسلوب کو جنم دیا، بلکہ حقیقتاً انہوں نے مدینہ میں تاریخی اسکول کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں قائدانہ کردار انجام دیا۔

ابنِ کثیر کی سیرت نبوی میں عروۃ کے مقابلہ میں زہری کی روایات زیادہ بیان کی گئی ہیں، چنانچہ ان کا حوالہ آپؐ کے نسب شریف سے لے کر انتہائے سیرت میں خدمت گاروں کے تذکرے تک پچپن[۵۵] صفحات پر ملتے ہیں اور یہ روایات زیادہ تر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور غزوات سے متعلق ہیں اور ان میں وہ روایات بھی ہیں جو سیرت ابن ہشام میں ذکر نہیں کی گئی ہیں[۴۰]، جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دیگر سیرت نگاروں، مورخین اور محدثین سے حاصل کی گئی ہیں۔ اگرچہ ابن کثیر نے دوبارہ زہری کی "سیر" (سیرت) کا حوالہ دیا ہے، لیکن پہلی بار سہیلی اور دوسری بار یعقوب بن سفیان کی روایت سے[۴۱] اور دیگر روایات کے تتبع سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ موسیٰ بن عقبہ، ابنِ اسحٰق، امام بخاری اور بیہقی کے واسطہ سے لی گئی ہیں، اور باقی کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔

موسیٰ بن عقبہ (۵۵-۱۴۱ھ) مدنی مدرسہ کے تیسرے رکن ہیں، جنہوں نے اپنے استاد زہری کے علمی ورثہ کو آگے بڑھایا اور دیانتداری اور باریک بینی سے مدنی مکتبِ فکر کے اسلوب کی پیروی کی، اور اپنے پیشرووں سے زیادہ اسناد کا التزام اور واقعات کی تاریخوں کا اہتمام کیا، انہوں نے زہری کی مؤلفات کے مکتوب مواد خاص کر دستاویزی معلومات، اور زبانی روایات سے بھی استفادہ کیا، لیکن تحریری مواد تک میں کتاب کے بجائے راوی پر اعتماد کیا۔ ان کی مغازی کے اقتباسات بھی ابن اسحٰق، واقدی، طبری، ابن سید الناس اور ابن کثیر کے ہاں ملتے ہیں، جس کو ان کے بھتیجے اسمٰعیل بن ابراہیم بن عقبہ (وفات ۱۵۸ھ) نے روایت کیا[۴۲]، جس کی بعد کے علما نے بڑی تعریف و تحسین کی[۴۳]،

---

[۳۸] ان کے تاریخی مقام و مرتبہ، ان کے مغازی کے محتویات اور نمونوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر عبدالعزیز الدوری کی کتاب بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص ۲۳-۲۵، ص۷۶-۱۰۲ اور ص۱۴۳-۱۵۱۔

[۳۹] الدکتور جواد علی، مقالہ "موارد تاریخ الطبری، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱/۱ ذوالقعدۃ ۱۳۶۹ھ ص۱۵۴ اور ۱/۳ ۱۳۷۴ھ ص ۳۹-۴۰

[۴۰] الدکتور عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص۱۱

[۴۱] ابنِ کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۹۶، ۳۰۰۔ [۴۲] ابنِ سعد، الطبقات الکبری، دار صادر بیروت ۱۳۷۷ھ، ۵/۴۱۸۔

[۴۳] ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، ۵۲-۱۹۵۳ جلد ۲ جزء ۱، ص ۱۵۴، ابن حجر: تہذیب التہذیب دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۳۲۵-۲۷ھ ۱۰/۳۱۶، حاجی خلیفہ کشف الظنون ۲/۱۷۴۷، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، ص۲۷، جواد علی، موارد تاریخ الطبری مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ۱/۳ ۱۳۷۴ھ ص۴۰

اور کئی صدیوں تک متداول رہی، چنانچہ خود ابن کثیر کے استاد شمس الدین ابو عبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳ - ۷۴۸ھ) نے اس کو "ابو نصر الفارسی سے مزۃ (دمشق) میں پڑھا"[۴۴] اور عصر حاضر میں الویس سپرینگر (ALOYS SPRENGER) کے بیان کے مطابق دمشق میں ان کو اس کے مخطوطہ کی موجودگی کی اطلاع دی گئی تھی لیکن وہ اس کو دیکھ نہیں سکے[۴۵] جس کی وجہ سے یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب خود ابن کثیر کی دسترس سے دور نہ رہی ہوگی۔ چنانچہ ان کی روایات و اقوال کا ابن کثیر نے ایک سو تیس صفحات پر حوالہ دیا اور عروۃ اور زہری کی جا بجا بکھری ہوئی معلومات کے مقابلہ میں موسیٰ کی مغازی سے زیادہ مرتب انداز میں پابندی کے ساتھ ابن اسحٰق کی روایات کی تکمیل یا ان سے اختلاف یا زیادتی و کمی واضح کرنے کے لئے مفصل روایتیں از ابتداً تا انتہا سیرت نقل کی ہیں اور بعض جگہ تو موسیٰ کی روایات کو ابن اسحٰق پر مقدم رکھا ہے[۴۶] اس طرح موسیٰ بن عقبہ کی مغازی ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل دینے والی اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔

محمد ابن اسحٰق (وفات ۱۵۱ھ) مدنی اسکول کے ایسے نمائندہ ہیں جنہوں نے محدثین اور وھب بن منبہ (۳۴ - ۱۱۰ھ) جیسے قصہ گو حضرات کے مواد اور اسلوب کو جمع کرنے کی پہلی کوشش کی، چنانچہ انہوں نے اپنی مشہور سیرۃ میں احادیث، تاریخی روایات، اسرائیلیات، عوامی قصوں اور صحیح و موضوع شعر کو مبالغہ کے عنصر کے ساتھ جمع کیا، جس کی وجہ سے فطری طور پر مدینہ میں ان پر سخت تنقید ہوئی۔ لیکن کوفہ و بصرہ کے اخباری مدرسہ تاریخ میں اس کو وہاں کے رجحانات سے میل کھانے کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا گیا اور پھر ابن ہشام کی تہذیب و تنقیح کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے محدثین نے بھی اپنی رائے بدل دی اور اس کو نہ صرف استحسان کی نظر سے دیکھا، بلکہ اس کی معلومات پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سیرت و تاریخ کی کتابوں کے بنیادی مصدر کی حیثیت سے استعمال کیا۔

ابن اسحٰق کی یہ سیرت اپنے مواد کے لحاظ سے درحقیقت ایک عام تاریخی کتاب معلوم ہوتی ہے، جس کے عام طور پر تین حصے بتائے جاتے ہیں:۔

۱۔ المبتدأ: یعنی سابق انبیاء و رسل علیہم السلام کی تاریخ از ابتدائے آفرینش اور اس ضمن میں یمن کی تاریخ، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل اور دور جاہلیت کے عرب قبائل اور ان کے بتوں کے تذکرہ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد اور اہل مکہ کی دینی اور مذہبی رسوم و رواج کا بھی ذکر گیا ہے۔

۲۔ المبعث: یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تا ہجرت مدینہ۔

۳۔ المغازی: یعنی مدینہ میں آپ کی حیات طیبہ تا وفات جس میں آپ کے غزوات و سرایا وغیرہ کا بیان بھی ہے اور ان آخری دو حصوں میں اول اسلام لانے والے مہاجرین و انصار، شرکائے غزوات اور ان میں مقتولین اور قیدیوں کے اسماء کی فہرستیں بھی ترتیب دی گئی ہیں۔ نیز پہلے حصہ میں روایات شاذ و نادر سند سے بیان کی گئی ہیں، جبکہ دوسرے اور تیسرے حصہ میں

---

[۴۴] الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۳۳۳-۳۴ھ، ۱/۱۴۰۔

[۴۵] یوسف ھورووتس، المغازی الاولیٰ و مؤلفوھا، عربی ترجمہ حسین نصار، مطبعۃ الحلبی مصر ۱۳۶۹ھ، ص ۷۔

[۴۶] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۴۶، ۴۸۔

سند کا اہتمام کیا گیا ہے[47]۔ اور ڈاکٹر جواد علی ان کی تاریخ الخلفاء کو بھی اسی کتاب کا آخری حصہ شمار کرتے ہیں، جو آپؐ کے بعد کے خلفاء کی تاریخ پر مشتمل تھی[48]۔

بدقسمتی سے اس کتاب کے بیشتر حصے ضائع ہو گئے، سوائے ان روایات کے جو بعد کے مفسرین و محدثین اور مؤرخین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔ خاص کر سیرت پاک کا بیشتر حصہ ابن ہشام کی مشہور سیرت میں زیاد البکائی کی روایت سے محفوظ ہوا اور طبری نے اپنی تاریخ و تفسیر میں انبیاء سے متعلق اکثر معلومات کو محفوظ کیا۔ جیسے کہ ابو الولید الازرقی نے مکہ مکرمہ سے متعلق معلومات کو محفوظ کیا اور کہا جاتا ہے کہ آخر زمانہ میں ان کی مذکورہ کتاب کا مکمل نسخہ دریافت ہوا ہے، جس کو اشاعت کے لئے تیار کیا جا رہا ہے[49]۔

بہر حال جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ابن اسحٰق کی غیر محتاط روش کی وجہ سے ان کی سیرت ابتداً میں محدثین کی تنقید اور اعتراض کا نشانہ بنی لیکن بعد میں ابن ہشام کے ہاتھوں تہذیب و تنقیح کے بعد دھیرے دھیرے ان کی طرف محدثین کا رویہ نرم ہوتا گیا اور ان کی روایات کو سند کا درجہ حاصل ہوتا گیا، چنانچہ خود ابن کثیر جیسے محدث و ناقد سیرت نگار بھی نہ صرف اس سیرت سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ اس کو "منارۂ نور" اور "قابلِ فخر کارنامہ" کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں اور اس کے مصنف کے بارے میں امام شافعیؒ کی رائے بار بار دہراتے ہیں کہ "فن مغازی میں سب لوگ ابن اسحٰق کے احسان مند ہیں[50]"۔ انہوں نے ابن اسحٰق کی روایات و اقوال ماقبل اور مابعد سیرت نبوی بھی سنہ ۱۲۴ھ تک بیان کئے ہیں لیکن ان کو حقیقی مصدر کا اولیں مقام سیرت نبوی کے حصہ میں دیا ہے، بلکہ ان سے اپنی سیرت کا خاکہ حاصل کیا۔

ان کی روایات کو دیگر سیرت نگاروں اور مؤرخین کی روایات پر ترجیح دی ہے اور اپنی سیرت کی بنیاد بنایا ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحات پر ان کے لاتعداد حوالے دیے ہیں اور بعض جگہ ان سے مکمل فصلیں کی فصلیں نقل کی ہیں اور پھر دوسرے مصادر حدیث و سیرت و تاریخ سے اس پر اضافہ کیا ہے۔

یہاں ابن اسحٰق کے مشہور شاگردوں اور ان کی سیرت کے راویوں میں زیاد بن عبداللہ البکائی (وفات ۱۸۳ھ) اور یونس بن بکیر (وفات ۱۹۹ھ) کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جن میں سے اول الذکر زیادہ موثوق ہیں[51]، اور ان ہی کی روایت سے ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی مذکورہ سیرت کو حاصل کیا تھا۔ لیکن ان کی خود کوئی تصنیف نہ تھی، بہرحال ان کی روایات بعد کے مورخین اور سیرت نگاروں کی کتابوں میں

---

[47] ابن الندیم، الفہرست، المطبعۃ الرحمانیۃ، القاہرۃ ۱۳۴۸ھ، ص ۱۳۶۔ محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمدؐ" کتاب ماساھم بہ المؤرخون العرب فی المئۃ سنۃ الاخرۃ ص ۲۶، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ ص ۲۷-۳۰

[48] ڈاکٹر جواد علی "موارد تاریخ الطبری"، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ج ۱ شمارہ ۱ - ذوالقعدۃ ۱۳۶۹ھ ص ۲۰۶۔

[49] محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمدؐ"، کتاب ماساھم بہ المؤرخون العرب الخ ص ۲۶

[50] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ۔ ۳/۹۵، ۴/۶۳، ۱۴۹، ۱۰/۱۰۹

[51] السخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ ص ۱۵

ملتی ہیں۔ جن سے خود ابن کثیر نے صرف بارہ دفعہ ان کے نام کے حوالے کے ساتھ روایات نقل کی ہیں[۵۲]۔

لیکن یونس بن بکیر جو خود صاحب مغازی تھے[۵۳]۔ اور ان کی اکثر روایات بھی ابن اسحٰق سے مروی تھیں، ابن کثیر نے ان سے اول الذکر کے مقابلہ میں بہت زیادہ اخذ کیا ہے۔ چنانچہ سیرت پاک کی ابتدا سے انتہا تک ستر صفحات پر ان کے حوالے دیئے ہیں۔ جن میں بعض جگہ ان کی مغازی یا سیرۃ ابن اسحٰق پر "زیاداتؒ" (اضافوں) کا حوالہ بھی دیا ہے[۵۴]۔ لیکن ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ان کی روایات کے تتبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی روایات براہِ راست ان کی مغازی سے حاصل نہ کر سکے، چنانچہ ایک جگہ سہیلی کے حوالے کی وضاحت بھی ملتی ہے[۵۵]۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی روایات کا ماخذ بھی دیگر سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، کیونکہ مذکورہ تمام روایات سہیلی کے ہاں بھی نہیں ملتیں۔

اسی ضمن میں ابن ہشام (وفات ۲۱۸ھ) کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ جنہوں نے ابن اسحٰق کی مذکورہ سیرت کو زیاد البکائی کی روایت سے اخذ کرکے اس کی نامناسب روایات اور غیر ثابت شدہ اشعار کو حذف کر دیا۔ فروگذاشتوں کی تصحیح کی اور نامکمل بیانات کا اضافہ کیا اور اس نئی ترتیب و تہذیب و تنقیح کے ذریعہ اس کو محدثین کے لئے قابل قبول بنا دیا۔ اس طرح حقیقتاً اس سیرت کو ابن اسحٰق اور ابن ہشام کی مشترکہ تصنیف کہا جا سکتا ہے، جس کو دائمی شہرت اور عام قبولیت کے ساتھ ساتھ وہ سند اعتماد و اعتبار نصیب ہوئی، جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ کبھی کم نہ ہوئی، بلکہ سیرت پاک کے قابلِ اعتبار قدیم ترین مرجع و مصدر کی حیثیت سے اس کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ یہ کتاب بار بار چھپتی رہی ہے۔ مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی کی تحقیق و تشریح اور فہارس کے ساتھ اس کا قیمتی نسخہ ۱۹۳۶ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔

ابن کثیر نے بھی اپنے سیرت پاک کے حصہ میں اس عظیم الشان سیرت سے بھرپور استفادہ کیا اور ابن اسحٰق کے مجمل بیانات کی تفصیل، مبہم مقامات کی توضیح اور متروک معلومات کی تکمیل کے لئے ایک سو اکیاسی صفحات پر اس کے حوالے دیتے ہوئے اس کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا، ان کے ملاحظات سے فائدہ اُٹھایا اور ان کو بہ نظر استحسان دیکھا اور ان کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی ہے۔ اور ابن ہشام کے اعتراض کی وجہ سے ابن اسحٰق کے بیان کردہ بہت سے قصائد کو ابن کثیر نے مکمل نقل نہیں کیا ہے۔ جیسے غزوۃ الابواء کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کا قصیدہ اور اس کے جواب میں الزبعری کا قصیدہ مکمل نقل کرنے سے اس لئے گریز کیا ہے کہ ابن ہشام نے ذکر کیا ہے کہ اکثر علمائے شعر ان دونوں قصائد کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن ان کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں ان کے چچا ابو طالب کے قصیدہ کے بارے میں نہیں مانی ہے، بلکہ اس کو بہت تعریف کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح ان کے

---

[۵۲] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۰۵، ۳/۵۰، ۶۳، ۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۹، ۱۳۴، ۲۲۲، ۲۲۳، ۳۲۰، ۴/۲۹۱

[۵۳] الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۱/۲۹۹، الیافعی، مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد ۱۳۳۷-۳۹ھ، ۲/۲۶

[۵۴] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۳/۱۲۵، ۴/۳۳۲، ۶/۲۸۲

[۵۵] ایضاً ۳/۱۲۵، اور السہیلی، الروض الانف، مطبعۃ الجمالیۃ، مصر ۱۳۳۲ھ ۱/۲۵۸

اُعشٰی بن قیس کے حرمتِ خمر کی وجہ سے اسلام سے اعراض کے قصہ کو ہجرت سے پہلے لکھنے پر اعتراض کیا ہے کیوں کہ ان کے نزدیک مدینہ میں غزوۂ احد اور غزوۂ بنی قریظہ کے بعد خمر کی حرمت پر اجماع ہے، اسی طرح جعفر بن ابی طالبؓ اور معاذ بن جبل کے درمیان مؤاخاۃ کے قصہ پر شک کا اظہار کیا ہے، کیونکہ جعفرؓ فتح خیبر کے بعد مدینہ تشریف لائے تھے[56] بہرحال یہ اور اس طرح کے دوسرے اعتراضات کے باوجود (کہ جن سے ابن کثیر کی معلومات کا کوئی مصدر نہیں بچ سکا ہے) یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ابن کثیر کی سیرت کی تشکیل میں ابن ہشام کا مرتبہ بھی ابن اسحٰق کے ہم پلہ ہے۔

اور سیرۃ ابنِ ہشام کے ضمن میں اس کی مشہور شرح الروض الأنف کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جو ابو القاسم عبدالرحمٰن السہیلی (۵۰۸ - ۵۸۱ھ) کی تالیف ہے اور ابن کثیر اس کی حسنِ ترتیب، واضح اسلوب بیان اور اس کے مصنف کی ذہانت، صلاحیت اور طباعی کے قائل تھے[57] اسی لئے سیرۃ ابن ہشام پر ان کے اضافوں، استدراکات، ملاحظات اور دیگر مفید معلومات سے وسیع پیمانے پر فائدہ اٹھایا ہے، ان کے حوالے اکسٹھ[61] صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، جن میں کئی بار ان کی مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت ملتی ہے[58]

بہرحال ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ابن اسحٰق اور ابن ہشام کے بعد السہیلی کے اہم مقام و مرتبہ کے باوجود ابن کثیر ان کی تمام آراء سے اتفاق نہیں کرتے، چنانچہ نجاشی کی وفات سہیلی کی طرح ۹ھ میں نہیں، بلکہ ۸ھ میں مانتے ہیں اور تاریخ اسلامی کی ماہِ ربیع الاوّل سے ابتداء کے سہیلی کے خیال کو رد کرتے ہوئے ماہِ محرم سے تسلیم کرتے ہیں اور آیت کریمہ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ ..... الخ سہیلی کی طرح مسجد قباؐ پر نہیں بلکہ مسجد نبوی پر محمول کرتے ہیں اور اسراء کے واقعہ کے ساتھ سہیلی کے اذان کے ذکر کو غلط تصور کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس کی مشروعیت پہلے سال ہجری میں ہوئی ہے اور جبریل کے گھوڑے کے "حیزوم" نام سے اتفاق نہیں کرتے اور متعہ کی تین بار حرمت اور اباحت کو بعید سمجھتے ہیں اور صلاۃ الفتح کی آٹھ رکعت کو ایک سلام کے بجائے ہر دو رکعت پر سلام کے قائل ہیں[59] بہرحال تحقیق و تنقید کے میدان میں ان اختلافی آراء سے اُن کی شخصیت مجروح نہیں ہوئی ہے، بلکہ معلومات کے سرچشمہ کی حیثیت سے ان کی اہمیت برقرار رہی ہے۔

مدینہ کے محافظ مدرسہ سیرت و تاریخ اور ابن اسحٰق کی نسبتاً آزادانہ روش کی طرف اشارہ کے بعد واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد کا تذکرہ ضروری ہے جن کے ہاتھوں اس فن کے آخری خدوخال متعین ہوئے، اور بعد کے لوگوں نے ان کی پیروی کی۔

محمد بن عمر الواقدی (۱۳۰ - ۲۰۷ھ) جنہوں نے ابن اسحٰق کے مقابلہ میں زیادہ احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے زمانہ کے محدثین کے محافظ مکتب فکر کو مطمئن نہ کر سکے، لہٰذا ان کو حدیث میں ضعیف گردانا گیا، لیکن سیرت و مغازی اور فتوح و فقہ میں ان کو قابلِ اعتبار سمجھا گیا[60] چنانچہ ان کی مغازی جو مدنی عہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، جس کی معلومات اور اسلوب میں وہ ابن اسحٰق کے مقابلہ میں

---

[56] ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ ۳/۴۴ ، ۵۷ ، ۱۰۲-۱۰۳ ، ۲۲۷ ـ

[57] ایضاً ۲/۱۸۳ ، ۱۲/۳۱۸ ـ [58] ایضاً ۲/۲۹۷ ، ۳/۲۲۰ ، ۳۴۱ ، ۵/۲۵۶ ، ۲۸۱ ـ

[59] ایضاً ۳/۷۸ ، ۲۰۷ ، ۲۰۹ ، ۲۲۳ ، ۲۸۱ ، ۴/۱۹۲ ، ۳۰۰ ـ

[60] یوسف ہوروفتس، المغازی الأولی ومؤلفوہا ص۱۲۳-۱۲۴

زیادہ دقتِ نظر کا ثبوت دیتے ہوئے مدنی مدرسہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے اپنے موضوع کا خاکہ پیش کر کے تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ اپنی معلومات کے بنیادی مصادر، اور غزوات کی فہرست فراہم کرتے ہیں، غزوات کی تاریخیں متعین کرتے ہوئے آپؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں متعین اُمرا کے نام دیتے ہیں، پھر ان غزوات کے واقعات تاریخی تسلسل سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اسناد کے التزام تاریخوں کی تحقیق، اشعار کے اقتباس اور عوامی قصوں سے اجتناب میں ابن اسحٰق سے زیادہ محتاط ہیں[61]۔ چنانچہ واقعات وغزوات کی تاریخوں اور اماکن و اشخاص کے تعین میں ان پر زیادہ اعتبار کیا جاتا ہے۔

ابنِ کثیر بھی ان کو تاریخ کے میدان کے بڑے اماموں میں شمار کرتے ہیں[62]۔ اور ان کی قدردانی میں بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ سیرت نبوی کے مغازی کے حصہ میں ان کی روایات و اقوال ابن اسحٰق کی روایات کے درمیان بکثرت نقل کرتے ہیں، اسی طرح ان کے حوالے سے امہات المؤمنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، غلاموں و لونڈیوں، خدام، محرّرین اور شمائل و دلائل تک کی فصلوں میں بہت سی معلومات دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، لیکن بظاہر ابنِ کثیر کو ان سے براہ راست استفادہ کا موقعہ نہ مل سکا، صرف ایک جگہ کتاب الردّۃ[63] کا حوالہ آیا ہے لیکن ان کی مغازی اور فتوح الشام وغیرہ کا کہیں ذکر تک نہیں کیا ہے اور ان روایات کے تتبع سے پتہ چلتا ہے کہ ابن کثیر نے ان کی روایات "تاریخ طبری" سے کم اور بیہقی کی دلائل النبوۃ سے زیادہ تر حاصل کی ہیں۔

محمد بن سعد (۱۶۸-۲۳۰ھ) جو کاتبِ واقدی کے نام سے بھی مشہور ہیں، ان تصنیفات میں ایک کتاب اخبار النبی (علیہ الصلاۃ والسلام) بھی ذکر کی گئی ہے[64] جو غالباً طبقات ابن سعد کی ابتدائی دو جلدوں میں شائع شدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال ابن اسحٰق کی سیرت (یا سیرۃ ابن ہشام) کے بعد یہ دوسری سیرت ہے جو ہم تک مکمل پہنچی ہے۔ اور اس میں انہوں نے سیرت نبوی کے خاکہ کے آخری خد و خال متعین کئے ہیں اور واقدی سے زیادہ اپنی معلومات کی ترتیب اور تنظیم، دستاویزات کا زیادہ مکمل مجموعہ اور ملوک عالم کے نام آپؐ کے بھیجے ہوئے پیغامات اور قاصدین کی تفصیلات فراہم کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے ماقبل بعثت تاریخ میں ان انبیاء کرام علیہم السلام کی تاریخ بھی بیان کی ہے جن کا آپ کی رسالت سے رشتہ ہے، پھر آپ کے آباؤ اجداد کے ذکر کے بعد آپ کے بچپن کے حالات، بعثت سے قبل و مابعد آپ کی نبوت پر شاہد علامات اور آپ کی دعوت کے ابتدائی حالات تاہجرت مدینہ بیان کئے ہیں اور مدنی عہد میں آپ کے احکامات، عرب وفود کی آمد، آپ کے اخلاق، طریقہ زندگی، غزوات وفات، تجہیز وتکفین وتدفین، میراث وغیرہ کے متعلق معلومات مرتب کرنے کے بعد اور مراثی جمع کر دیئے ہیں۔ اور انہوں نے آپ کے شمائل و فضائل و دلائل کی بھی وسیع معلومات فراہم کیں جو بعد میں شمائل و دلائل کے ادب کے لئے نمونہ قرار پائیں[65]۔

---

[61] عبدالعزیز الدوری بحث فی نشاۃ علم التاریخ عند العرب ص۳۱-۳۲، جواد علی، موارد تاریخ الطبری ۳/۱، ۱۳۷۳ھ ص۴۰-۴۲۔

[62] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۲۳۴-۲۳۵۔ [63] ایضاً ۴/۱۹۔ [64] ابن الندیم، الفہرست ص۱۴۵۔

[65] یوسف ہوروفتس، المغازی الاولی ومؤلفوھا، ص۱۲۷-۱۲۸، محمد توفیق حسین، مقالہ "عن سیرۃ النبی محمد"، کتاب ما ساھم بہ المؤرخون العرب، ص۲۷، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشاۃ علم التاریخ عند العرب ص۳۲ جواد علی موارد تاریخ الطبری ۳/۱ ۱۳۷۳ھ ص۴۲۔

بہرحال توقع کے برخلاف ابن کثیر نے ان سے زیادہ استفادہ نہیں کیا، حالانکہ ابن کثیر اور ابن سعد کی سیرتوں کا خاکہ ایک دوسرے سے بہت ملتاجلتا ہے، لیکن ابن کثیر نے ان کے صرف تیئیس صفحات پر حوالے دیئے ہیں، جن میں سے بعض روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب، پیدائش، سفر شام، تحویل قبلہ، سترکا غزوۂ بدر صحابہ کرام، فتح مکہ اور وفات سے متعلق ہیں اور زیادہ امہات المؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد، غلاموں، خدام، محررین اور دیگر صحابہ کے تراجم میں پائی جاتی ہیں اور شمائل میں صرف تین بار ان کا حوالہ ہے، جبکہ دلائل میں ان کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔

سیرت کے ان ابتدائی اہم مصادر کے بعد اب ان دیگر مصادر سیرت کا سن وار تذکرہ کیا جائیگا، جن کے کم وبیش حوالے ابن کثیر نے دیئے ہیں۔

سیف بن عمر التیمی (وفات ۱۸۰ھ) عراقی مدرسہ تاریخ کے مؤلفین میں شمار ہوتے ہیں، اور پہلے درجہ میں اپنے قبیلہ تمیم کی روایات سے استفادہ کرتے ہیں، ان کی سیرت پر مستقل کوئی کتاب بیان نہیں کی گئی ہے لیکن بعد کے واقعات پر ان متعدد کتابیں بتائی جاتی ہیں[66] وہ اگرچہ اکثر مؤرخین ومحدثین کے نزدیک ضعیف شمار کئے گئے ہیں[67] لیکن ابن کثیر نے طبری کی تقلید میں واقدی اور مدائنی (۱۳۵-۲۲۵ھ) جیسے مؤرخین کی روایات کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد اور فتوحات میں ان کی روایات طبری سے نقل کی ہیں، لیکن سیرت کے حصہ میں ابن کثیر نے ضمنی طور پر اُن کی جو روایات مسیلمہ کذاب کے قتل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور امہات المؤمنین کے بعد تراجم میں بیان کی ہیں[68]، وہ "تاریخ طبری" میں نہیں ملتیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے مصادر تاریخ سے ماخوذ ہیں۔

ہیثم بن عدی (۱۱۴-۲۰۷ھ) تاریخ و انساب کے مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان پر عدم تحقیق اور اسناد کے بارے میں تساہل برتنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ بہرحال پچاس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف ہیں[69]، جن میں سے، یہاں قابلِ ذکر عام تاریخ میں کتاب التاریخ علی السنین (سن وار تاریخ) انساب میں تاریخ الاشراف الکبیر اور اسلامی فرقوں کی تاریخ میں کتاب الخوارج ہیں اور اس آخری کتاب کو ابن کثیر نے "بہترین کتاب[70]" قرار دیا ہے، اور خوارج کے بیان میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے[71]، لیکن سیرت کے حصہ میں ان کے واسطہ سے صرف دو روایتیں کسی کتاب کے حوالے کے بغیر بیان کی ہیں[72]۔

---

[66] ابن الندیم، الفہرست، ص۱۳۷، عبدالعزیز الدوری، بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب، ص۳۷۔

[67] ابن حجر، تہذیب التہذیب ۴/۲۹۵، جواد علی، موارد تاریخ الطبری، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۷۳ھ ۳/۱ ص۴۸۔

[68] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴/۱۹، ۵/۲۵۶، ۲۶۲، ۲۷۱، ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۰۶

[69] ابن الندیم، الفہرست ص۱۴۶، ان کی کتابوں کے اقتباسات کے عنوانات کے لئے دیکھئے عبدالعزیز الدوری۔ بحث فی نشأۃ علم التاریخ عند العرب ص۴۲-۴۳، حاشیہ ۵۔

[70] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۷/۳۰۶۔

[71] ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ ۷/۲۷۳-۳۲۸

[72] ایضاً ۳/۲۸، ۵/۳۰۷

ابن عائذ الدمشقی (۱۵۰-۲۳۳ھ) شرکاء غزوۂ بدر کے سلسلہ میں واقدی کے اقوال نقل کرتے ہوئے ابن کثیر نے صرف آٹھ بار ان کا حوالہ دیا ہے، جس میں ایک بار ان کی مغازی کی کتاب کی وضاحت بھی کی ہے، لیکن اس سے اپنی سیرت میں بالکل کام نہیں لیا ہے، شرکاء بدر کے علاوہ اس کا صرف ایک بار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں حوالہ ملتا ہے[43]

خلیفہ بن خیاط (وفات ۲۴۰ھ) محدث و مؤرخ و نسابہ کی حیثیت سے مشہور ہیں، ان کی تصنیفات میں تاریخ کے دس اجزاء اور طبقات کے آٹھ اجزاء بتائے جاتے ہیں[44]، اور خود ابن کثیر ان کو تاریخ کے اماموں میں شمار کرتے ہیں[45]، لیکن نہ ان کے حالات زندگی میں ان کی کسی تصنیف کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ان کے اقوال و روایات بیان کرتے ہوئے کسی کتاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ انہوں نے سیرت نبوی کے حصہ میں صرف چودہ صفحات پر ان کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر غزوات و فتوحات کی تاریخوں کے تعین اور اعیان کی تاریخ اور مکانِ وفات اور عمر کی تحدید وغیرہ میں بیان کئے ہیں، جو بظاہر دیگر مؤرخین سے حاصل کئے گئے ہیں۔

سعید بن یحییٰ الاموی (وفات ۲۴۹ھ) بھی صاحبِ مغازی ہیں۔ انہوں نے اپنے باپ یحییٰ بن سعید بن ابان (وفات ۱۹۴ھ) اور چچا سعید سے علمِ حدیث حاصل کیا[46]۔ ان کے باپ ابن اسحٰق کے خاص شاگردوں میں تھے، انہوں نے ان سے نہ صرف فنِ مغازی حاصل کیا، ان کی کتابیں روایت کیں، بلکہ اس فن کو پروان چڑھایا، اس میں اضافہ کیا اور فتنۂ ارتداد اور غزوات پر دو کتابیں بھی لکھیں[47]۔ اس طرح سعید بن یحییٰ کو اپنے خاندان سے فنِ مغازی اور اس کا کثیر مواد ورثہ میں ملا، جس سے انہوں نے اپنی مغازی ترتیب دی اور اس کو ہمارے سیرت نگار نے خود بھی دیکھا تھا اور بیالیس (۴۲) صفحات پر بکھرے ہوئے اس کے حوالوں سے سیرت نبوی خاص کر غزوۂ بدر و احد میں وہ روایتیں، اقوال اور اشعار اخذ کئے جو ان کو سیرۃ ابن اسحٰق میں نہ مل سکے اور بعض جگہ اس کو "مغازی" یا "السیرۃ" کے نام سے یاد کیا ہے[48]۔

ابن کثیر کی البدایۃ و النہایۃ میں اموی کی خاص روایات ماقبل سیرت بھی بیان کی گئی ہیں، اسی طرح مابعد سیرت بھی دو ایک روایات مل جاتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مغازی بھی عام تاریخی کتابوں کے انداز پر مرتب ہوئی تھی۔

---

[43] ابن کثیر ۳/۳۱۵، ۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۱-۳۲۳، ۳۲۵، ۵/۳۰۷

[44] الذہبی تذکرۃ الحفاظ، ۲/۲۲، ابن خلکان، وفیات الاعیان و أنباء أبناء الزمان، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ القاہرۃ، ۲/۱۴، حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۱/۲۹۳، ۲/۱۰۹۹، الزرکلی، الاعلام، الطبعۃ الثانیۃ مطبعۃ کوستا تسوماس و شرکاہ ۱۳۷۳-۱۳۷۸ھ ۲/۳۶۱۔

[45] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۳۲۲۔

[46] البغدادی، تاریخ بغداد، مطبعۃ السعادۃ القاہرۃ، ۱۳۴۹ھ، ۹/۹۰، الذہبی تذکرۃ الحفاظ ۱/۲۹۸، الذہبی، میزان الاعتدال، مطبعۃ السعادۃ القاہرۃ، ۱۳۲۵ھ، ۳/۲۳۰، ابن حجر، تہذیب التہذیب، ۴/۷۹

[47] ابن الندیم، الفہرست، ص۱۳۶، ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ۱/۲۴۱، یاقوت الحموی معجم الادباء، مطبعۃ المامون القاہرۃ ۱۳۵۵-۱۳۵۷ھ ۱۸/۹، جواد علی مقالہ "موارد تاریخ الطبری"، مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۸۰ھ ج۸، ص۴۳۴۔

[48] ابن کثیر، البدایہ والنہایۃ ۳/۳۱۵، ۳۳۹، ۴/۳۰

الزبیر بن بکار (۱۷۲-۲۵۶ھ) انساب و تاریخ کے عالم اور صاحبِ کتب مصنف تھے[۷۹]۔ ابن کثیر نے ان سے خاص کر عربوں اور قریش کے انساب سے متعلق معلومات حاصل کیں، لیکن سیرت نبوی میں صرف بارہ دفعہ ان کا حوالہ ملتا ہے اور وہ روایات و اقوال آپ کی ولادت، والدین کی وفات، مقتولین غزوۂ اُحد اور حضرت خدیجہ سے آپ کی اولاد سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد عباسی تراجم میں ۲۵۵ھ تک ان کے اقوال و روایات ملتے ہیں، لیکن کہیں بھی ان کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، البتہ سہیلی کی روایات کے ضمن میں ان کی چند روایات[۸۰] سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سہیلی اور دیگر مؤرخین کے واسطہ سے ابن کثیر نے ان کی روایات اخذ کی ہیں۔

یعقوب بن سفیان الفسوی (وفات ۲۷۷ھ) ایران نژاد بڑے حفاظ حدیث میں سے تھے اور ان پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بولنے کا الزام تھا لیکن ذہبی اور ابن کثیر کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے، ان کی تصنیفات میں التاریخ الکبیر اور کتاب المعرفۃ بیان کی جاتی ہے جو تراجم کی کتاب ہے[۸۱]۔ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں اور خاص کر اس کے شمائل و دلائل کے حصہ میں ان کے حوالے ستاون[۵۷] صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ان کی روایات بیہقی کی دلائل النبوۃ کے واسطے سے بیان کی گئی ہیں۔

ابن ابی خثیمہ (۱۸۵-۲۷۹ھ) محدث و فقیہ اور مؤرخ و ادیب تھے۔ انہوں نے بھی عام تاریخ میں ابتدائے آفرینش سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دی، جس میں محدثین کے اصول کی رعایت کرتے ہوئے سند کے ذکر کا التزام کیا[۸۲]۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بھی ابن کثیر کی پہنچ سے دور رہی اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابی سفیان سے عقد مبارک، آپ کی اولاد، غلاموں، لونڈیوں، محررین اور دلائل نبوت کے باب میں صرف گیارہ جگہ جو روایات و اقوال بیان کئے ہیں وہ دیگر مؤرخین کی مدد سے حاصل کئے۔

امام نسائی (۲۱۵-۳۰۳ھ) کی مشہور سنن اور خصائص علی کا تذکرہ آگے آئے گا۔ یہاں ان کی کتاب الیوم واللیلۃ جس کے حوالے سے عام تاریخی نوعیت کی چار روایات، اور کتاب السیر جس کا صرف ایک بار حوالہ آیا ہے[۸۳] کا ذکر ضروری ہے۔

ابن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی تاریخ الرسل والملوک مشہور، قدیم ترین عام تاریخ کی کتاب اپنے زمانہ تک اسلامی تاریخ نگاری کے عروج و ترقی کی نمائندہ مثال اور نمونہ ہے۔ وہ نہ خود زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہی، بلکہ اس نے اپنے سے پہلے کے اکثر سیر و مغازی اور تاریخ کے مؤلفین کی تاریخی روایات، اقوال اور معلومات کا بنیادی سرمایہ ہم تک پہنچایا اور ان کی تحریروں کے نمونے فراہم کئے، جو اکثر نادر و نایاب

۷۹؎ ابن الندیم، الفہرست، ص ۱۶۰-۱۶۱، جواد علی، مقالہ "موارد تاریخ الطبری" مجلۃ المجمع العلمی العراقی ۸/۴۲۶-۴۲۷۔

۸۰؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۰۴، ۴/۴۲ اور السہیلی، الروض الانف، ۱/۷۲، ۲/۱۴۲

۸۱؎ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ۲/۱۴۵-۱۴۶۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۱۱/۵۹-۶۰، ابن حجر، تہذیب التہذیب ۱۱/۳۸۵، السخاوی، الاعلان ۱۷۶، ۲۳۹، ۳۱۷، ۳۳۰۔

۸۲؎ ابن الندیم، الفہرست ۳۲۱، الذہبی، تذکرۃ الحفاظ ۲/۱۵۶

۸۳؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۳/۲۷۶، ۴/۳۹، ۲۵۴، ۵/۳۲۲، (الیوم واللیلۃ) ۴/۲۵۲ (السیر)

ہیں۔ بعد کے تمام مؤرخین نے اس سے فیض حاصل کیا، اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ اسلامی تاریخ کے بنیادی اہم اور ناگزیر مصدر کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہا، جو آئندہ بھی کم نہ ہوگا۔

ابن کثیر نے ناگزیر حالات کے علاوہ ہمیشہ اپنے مصادرِ معلومات کے انتخاب میں احتیاط برتی۔ انہوں نے محدثین کے پسندیدہ اصولوں کو اپنانے والے راویوں کی روایات اور مؤلفین کی کتابوں پر اعتماد کیا۔ وہ خاص کر عام تاریخ کے مؤلفین سے استفادہ میں زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ چنانچہ المدائنی (وفات ۲۲۵ھ) ابن قتیبہؒ [۸۴] (وفات ۲۷۶ھ) البلاذری (وفات ۲۷۹ھ) الدینوری (وفات ۲۸۲ھ) اور الیعقوبی (وفات ۲۸۴ھ) جیسے تیسری صدی ہجری کے مشہور ائمہ فن کو نہ صرف اپنی سیرت کے حصہ بلکہ عام تاریخ میں بھی حیرت انگیز طور پر نظر انداز کیا ہے لیکن طبری کے سلسلہ میں ان کا رویہ طبعاً مختلف تھا، کیونکہ اس قیمتی تاریخی خزانہ کے مؤلف سے ان کی علمی، فکری، مزاجی اور تصنیفی مناسبت مماثلت، مشابہت اور ہم آہنگی تھی، دونوں مفسر، محدث، فقیہ و مؤرخ تھے اور ان فنون میں دونوں کی عظیم تصنیفات تھیں، اس لئے ابن کثیر کے نزدیک ان کی قدر و منزلت فطری بھی تھی۔ اور ان سے وسیع پیمانے پر استفادہ قرین قیاس بھی۔ چنانچہ انہوں نے جہاں ان کی تفسیر سے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصہ میں بنیادی کام لیا، وہیں تاریخ اسلام، خاص کر خلافت راشدہ سے ان کی تاریخ کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا اور سیرت نبوی کے حصہ میں سیرۃ ابن اسحٰق، سیرۃ ابن ہشام اور حدیث کے بعض مجموعوں کے بعد ان ہی کی تاریخ کو زیادہ تر اور بعض جگہ تفسیر کو بھی اپنی معلومات کا سرچشمہ قرار دیا، ان کی بے شمار روایات، اقوال و اختیارات اخذ کئے اور اکثر قدیم مفسرین کی تفسیری روایات و نکات اور مؤرخین و سیرت نگاروں کے تاریخی بیانات ان سے نقل کئے اور بار بار قدر دانی اور احسان مندی کے ساتھ ان کے حوالے دیئے۔

ابو محمد علی بن حزم الاندلسی (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) عالم و ادیب اور صاحب مذہب (ظاہری) فقیہ کی کتاب السیرۃ کا حوالہ غزوۂ بنی قریظہ کے لئے نفیر کے موقع پر ان کی فقہی رائے کے ضمن میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں "اگر ہم وہاں ہوتے تو نماز عصر بنی قریظہ پہنچ کر ہی پڑھتے، خواہ وہاں کئی دن بعد ہی کیوں نہ پہنچتے" جو ابن کثیر کے نزدیک "ان کے ظاہری مذہب کے عین مطابق ہے۔" اور غالباً ان کی اسی سیرت سے ابن کثیر نے ام المؤمنین ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے رسول اللہ سے عقد مبارک اور غزوۂ خیبر کے موقع پر کچی پیاز اور لہسن کی حرمت کے سلسلہ میں ان کی روایات اخذ کی ہیں [۸۵] حجۃ الوداع پر ان کی ایک اور کتاب کا ذکر آگے آئے گا۔

الخطیب البغدادی (۳۹۲ - ۴۶۳ھ) مشہور محدث و مؤرخ جن کی کتاب تاریخ بغداد ان کی دیگر تصانیف کے مقابلہ میں زیادہ مقبول اور زبان زدِ عام و خاص ہے، انہوں نے اس میں بغداد اور اس کے گرد و نواح کی تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی معلومات کو جمع کیا اور بغداد میں وارد ہونے والے صحابہ کرامؓ کا ذکر کیا، اور پھر اس مردم خیز خطہ کے علماء و فضلاء (خاص کر علم حدیث سے تعلق رکھنے والے) نیز خلفاء و وزراء اور امراء سلطنت کے حالات زندگی ابجدی حروف کی ترتیب سے بیان کئے، پھر کثرت سے مشہور اشخاص کے تراجم لکھے اور

۸۴؎ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف کا حوالہ ابن کثیر نے صرف ایک بار بحیرٰی راہب کے قصہ میں دیا ہے، البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۸۶

۸۵؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۱۸، ۱۴۵، ۱۹۳

آخر میں خواتین کے حالات پر اس کو ختم کیا۔ اس طرح انہوں نے شہروں سے نسبت کی بنیاد پر تراجم کی بنیاد ڈالی اور آنے والوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ فراہم کیا، جس نے بعد میں بہت رواج پایا۔ لیکن ابن کثیر کی سیرت کے حصہ میں ان کے حوالے معدودے چند ہیں[86] جبکہ ان کی تاریخ میں عصرِ عباسی کے اوائل سے لے کر ۴۵۲ھ تک کے اعیان کے حالاتِ زندگی ان کے حوالوں سے پٹے پڑے ہیں۔

القاضی عیاض بن موسی السبتی المالکی (۴۷۶-۵۴۴ھ) کی مشہور کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ سے ابن کثیر نے رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے اسم مبارک اور ولادت کے بارے میں تین خبروں کے علاوہ دلائل کے باب میں حدیث ردّ الشمس بعد مغیبہا۔ شہادتِ نبوت دیتے ہوئے حیوانات کے کلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آپؐ کے معجزات کا مقابلہ کرتے ہوئے ان سے معدودے چند روایات لی ہیں[87] جن میں سے بعض سے اختلاف کیا ہے اور بعض جگہ ان کی مذکور کتاب کا حوالہ دیا ہے۔

ابن عساکر الدمشقی (۴۹۹-۵۷۱ھ) جن کی تصنیفات میں تاریخ دمشق بہت مشہور ہوئی، انہوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے دمشق سے ربط و تعلق کو واضح کر کے خطیب کی تاریخ بغداد کے نمونہ پر دمشق سے تعلق رکھنے والے نامی گرامی اشخاص کے حالاتِ زندگی ترتیب دیئے۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی میں ابتدا سے انتہا تک تہتّر صفحات پر ان کی روایات، اقوال، اختیارات اور تاریخی تراجم کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں۔ خاص کر دلائل نبوت کے حصہ میں ابن عساکر کی مذکور تاریخ کی ابتدا میں دلائل نبوت کے باب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور جابجا ان کی تاریخ کے نام کی وضاحت کی ہے[88] نیز ان کی قدر و منزلت کے اعتراف کے باوجود ان کے ضعیف احادیث کی نشاندہی کئے بغیر گذر جانے پر تعجب کا اظہار کیا ہے[89]

سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ سیرت کے ضمنی موضوعات کو بیان کرتے ہوئے ابن کثیر نے ان موضوعات پر لکھی ہوئی مستقل کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہیں، جن کا ذکر یہاں کر دینا مناسب ہے۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی کے جامعین کے ضمن میں شارح ترمذی ابوبکر بن العربی (۴۶۸-۵۴۳ھ) کی الأحوذی کا ایک بار حوالہ آیا ہے[90] اور ابوبکر محمد بن جعفر بن سہل الخرائطی (۲۴۰-۳۲۷ھ) کی ھواتف الجانّ و عجائب ما یحکی عن الکھان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی رات ظاہر ہونے والی نشانیوں سے لے کر، سیف بن ذی یزن اور راہبوں و کاہنوں کی پیش گوئیوں اور ان کے تابع جنّات و شیاطین سے سنے سنائے اشاروں کو بکثرت اخذ کیا ہے اور کئی جگہ مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت بھی کی ہے[91] اسی طرح اسرا و معراج کے بیان میں باری تعالیٰ کی رؤیت بالعین کے مسلک کا تذکرہ کرتے ہوئے ابو زکریا محی الدین النواوی (۶۳۱-۶۷۶ھ) کے فتاویٰ کا حوالہ

---

۸۶ ایضاً ۵/۳۳۸، ۳۴۸، ۶/۷۸ ۸۷ ایضاً ۲/۲۵۹، ۲۶۴، ۶/۱۰، ۸۶، ۱۴۶، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۸۲۔

۸۸ ایضاً ۲/۲۷۰، ۳۴۷، ۳/۷۱، ۵/۲۵۴، ۶/۱۲۳، ۲۹۶۔

۸۹ ایضاً ۵/۲۰۸، ۳۵۴-۳۵۵ — ۹۰ ایضاً ۲/۲۵۲،

۹۱ ایضاً ۲/۲۹۸، ۲۸۴، ۳۲۸-۳۴۶ —

دیا ہے[۹۲] اور غزوۂ بدر کے بیان میں حضرت حسان بن ثابتؓ کے ایک شعر کے سلسلہ میں ابن عبد ربہ کی العقد الفرید کا حوالہ آیا ہے[۹۳]۔ اور شرکائے غزوۂ بدر کے اسمائے گرامی کی فہرست ضیاء الدین محمد بن عبد الواحد المقدسی کی کتاب الاحکام الکبیر کی بنیاد پر ابجدی حروف سے ترتیب دی ہے اور اس میں تصحیح و اضافہ کیا ہے[۹۴]۔ فتح خیبر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہود خیبر سے نصف محصولات اراضی پر معاملہ کے بیان میں ضمناً حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ان کے جلا وطنی کا تذکرہ کرتے ہوئے، یہودیوں کی ان کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے جو انہوں نے سنہ ۳۰۰ھ کے بعد سے مؤلف کے زمانہ تک وقتاً فوقتاً جزیہ معاف کرانے کے لئے جھوٹے گھڑے ہوئے مکتوبات نبوی پیش کر کے کیں اور اس ذیل میں ابن کثیر نے خود اپنی کتاب بطلان الجزیۃ عن یہود خیبر کے حوالہ کے ساتھ ساتھ ابن الصباغ (۴۰۰ - ۴۷۷ھ) کی المسائل اور ابو حامد محمد بن یونس الفقیہہ (۵۳۵ - ۶۰۸ھ) کی تعلیقۃ اور ابن المسلمۃ کی اس موضوع پر مستقل کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے[۹۵]۔

اسی طرح لقیط بن عامر کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے ضمن میں عبداللہ بن الامام احمد بن حنبل کی روایت بیان کر کے اس کے دیگر شواہد کے ضمن میں امام بیہقی کی البعث والنشور (جو ان کی کتاب الاسماء والصفات کا ایک باب ہے) عبدالحق الاشبیلی کی العاقبۃ اور القرطبی (وفات ۶۷۱ھ) کی التذکرۃ فی احوال الآخرۃ کا حوالہ دیا ہے[۹۶] اور حجۃ الوداع کے بیان میں ابوذر الھروی کی المناسک[۹۷] اور امام ابن حزم (۳۸۴-۴۵۶ھ) کی حجۃ الوداع پر ایک جلد میں مستقل کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ جس کے بارے میں ابن کثیر کی رائے تھی کہ "وہ اچھی کتاب ہے، لیکن اس میں ابن حزم کو کہیں کہیں وہم ہوا ہے[۹۸]۔" لہٰذا اس کتاب سے معلومات لیتے وقت ضروری موقعوں پر ابن کثیر اپنے اختلاف کا اظہار کرتے جاتے ہیں[۹۹]۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی میں سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں اور ان کے مؤلفین کے اس مختصر جائزہ اور تعارف کے بعد اب شمائل کی کتابوں کا ذکر کیا جائے گا۔

۲۔ شمائل کی کتابیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، آپ کی صفات و اخلاق و عادات کی ہر چھوٹی بڑی بات اور اہم اور غیر اہم پہلوؤں سے مسلمانوں کو ہمیشہ عشق و شیفتگی و وارفتگی کا تعلق رہا ہے چنانچہ پہلے راویوں نے اس باب کی معلومات زبانی ایک سے دوسری نسل تک پہنچائیں اور پھر اہل تصنیف و تالیف علماء نے اس باب کے مواد کو بہت اہتمام سے جمع اور محفوظ کیا، چنانچہ حدیث نبوی کے مجموعوں کی چھوٹی بڑی ہر کتاب کے عبادات و معاملات، اخلاق و آداب اور زہد و تقشف کے ابواب میں اس سلسلہ کا مواد جا بجا بکھرا ہوا ملتا ہے لیکن ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ)

۹۲؎ ایضاً ۳/۱۱۲، ۶/۲۷۷

۹۳؎ ایضاً ۳/۲۷۹

۹۴؎ ایضاً ۳/۳۱۴ - ۳۲۸

۹۵؎ ایضاً ۴/۲۱۹-۲۲۰، ۵/۲۵۲، ۱۲/۱۰۲، ۱۴/۱۹

۹۶؎ ایضاً ۵/۸۲-۸۳

۹۷؎ ایضاً ۵/۱۶۳،

۹۸؎ ایضاً ۵/۱۰۹

۹۹؎ ایضاً ۵/۱۰۹ - ۲۰۷

کے زمانہ سے پہلے اس موضوع پر مستقل و منفرد کتابوں میں امام ترمذی ۔ ابوعیسی محمد بن سورۃ ۔ (۲۰۹ - ۲۷۹ھ) کے علاوہ ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری (وفات ۴۳۲ھ) کی کتاب شمائل النبی کے نام سے بیان کی جاتی ہے[۱۰۰] لیکن امام ترمذی کی شمائل کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ آخر الذکر کو حاصل نہ ہوسکی، غالباً اسی لئے ابن کثیر نے بھی اس کو نظر انداز کیا ۔ جبکہ امام ترمذی کی مذکور شمائل سے انہوں نے اپنی سیرت نبوی کے حصہ میں مدد لینے کے ساتھ اس سے فطری طور پر اپنی شمائل کے حصہ کا خاکہ حاصل کیا ہے اور اس کو اپنی معلومات کا بنیادی ماخذ و مصدر بنایا ہے اور جابجا اس کے نام کا حوالہ دیا ہے اور اس حصہ کی ابتدا ہی میں بہت صفائی سے یہ وضاحت کی ہے کہ :

"علمائے ماضی و حال نے اس باب میں مستقل اور غیر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں ۔ ان میں سب سے بہتر طریقہ پر جمع کرنے والے امام ترمذی ہیں ۔ جنہوں نے اس باب میں اپنی مشہور کتاب منفرداً تصنیف کی، جس کے ان تک متصل سند کے ساتھ سماع کا شرف ہم کو حاصل ہے، اس کتاب سے ہم ان کی جمع کی ہوئی بنیادی معلومات حاصل کریں گے اور اس پر محدث و فقیہ کے لئے ناگزیر اہم معلومات کا اضافہ کریں گے"[۱۰۱]

اور حسب وعدہ انہوں نے اپنے اس ارادہ کی تکمیل سیر و مغازی و تاریخ کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ خاص کر حدیث کے تمام معروف و مشہور مجموعوں سے وسیع پیمانے پر مدد لے کر کی ہے، جس پر غالباً اب مزید اضافہ کی گنجائش نہیں ہے ۔

۳۔ دلائل کی کتابیں

دلائل نبوت کا مواد بھی قدیم علماء و محدثین کی توجہ سے محروم نہیں رہا ہے ۔ بلکہ ابتدا تدوین ہی سے حدیث کے مجموعوں کے مختلف ابواب سیرت، علامات نبوت اور معجزات وغیرہ میں اس باب سے متعلق معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور اس کے بعد اس موضوع پر مستقلاً لکھنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے ۔ چنانچہ صرف دلائل النبوۃ کے نام سے کتابیں لکھنے والے مصنفین کے نام ترتیب وار اس طرح بیان کئے جاتے ہیں ۔ ابن قتیبہ (وفات ۲۷۶ھ) امام ابوداؤد (وفات ۲۷۵ھ) ابواسحق ابراہیم بن اسحق العربی (وفات ۲۸۵ھ) ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی (وفات ۴۳۰ھ) ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری (وفات ۴۳۲ھ)، ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی (وفات ۴۵۸ھ) ابوالقاسم اسماعیل بن محمد الاصبہانی (وفات ۵۳۵ھ)[۱۰۲] لیکن ابن کثیر نے ان کتابوں میں سے صرف ابونعیم الاصبہانی اور امام بیہقی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور باقی کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ نیز اس نام سے لکھنے والے دیگر مصنفین کے حوالے بھی دیئے ہیں جیسے ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم الرازی (وفات ۲۶۴ھ)، قاسم بن ثابت العوفی (وفات ۳۰۲ھ) ابن شاہین (وفات ۳۸۵ھ) اور ابومحمد عبداللہ بن حامد الفقیہ ۔

---

[۱۰۰] حاجی خلیفہ، کشف الظنون، ۲/۱۰۵۹، امام ترمذی کی شمائل کی متعدد متاخر شرحوں کا ذکر بھی اسی حوالہ میں مل جائے گا۔

[۱۰۱] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۶/۱۱

[۱۰۲] حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۱/۷۶۰

بہرحال اب یہاں ہم صرف ان ہی کتابوں کا تذکرہ کریں گے جن سے ابن کثیر نے استفادہ کیا ہے یا ان کا حوالہ دیا ہے:

ابو زرعۃ الرازی (۲۰۰-۲۶۴ھ) کی دلائل النبوۃ کا ابن کثیر نے "عظیم الشان کتاب" کی حیثیت سے تعارف کرایا ہے[۱۰۳] اور خلافِ عادت ان کی روایات پر سکوت اختیار کیا ہے، جس سے ان پر ابن کثیر کا اعتماد ظاہر ہوتا ہے، لیکن ان سے کما حقہٗ استفادہ نہ کر سکے صرف معدودے چند بار سیرت کے آخر اور دلائل کے باب میں ان کی روایات بیان کی ہیں[۱۰۴] جن میں بعض جگہ ان کی دلائل کی بھی وضاحت کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی روایات دیگر مصنفین کے واسطہ سے حاصل کی گئی ہیں۔

اسی طرح قاسم بن ثابت العوفی (۲۵۵-۳۰۲ھ) کی دو روایتوں[۱۰۵] میں سے ایک بار اگرچہ ان کی کتاب الدلائل کا حوالہ دیا ہے لیکن خود سہیلی کے واسطہ کی وضاحت کر دی ہے اور دوسری روایت بھی سہیلی کے ہاں موجود ہے[۱۰۶] لہٰذا ظاہر ہے کہ اس میں بھی وہی ان کا ماخذ ہے۔

اسی طرح ابن شاہین (۲۹۷-۳۸۵ھ) کی دلائل النبوۃ کا حوالہ بھی ابن کثیر کی سیرت و دلائل کے حصوں میں ہماری نظر سے صرف دو بار گذرا ہے[۱۰۷] جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ابن کثیر کا ماخذ دوسرے مصنفین ہیں۔

لیکن ابو نعیم الاصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ) کی دلائل النبوۃ اس فن کی وہ قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی اور ابن کثیر نے بھی اس سے کما حقہٗ فائدہ حاصل کیا۔ اس کتاب میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور آسمانی کتابوں میں آپ کے ذکر کو بیان کرنے کے بعد آپ کی حیات طیبہ کے اعجازی پہلو پیش کئے ہیں، جن سے آپ کی نبوت کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن اس باب میں انہوں نے غیر محتاط روش اختیار کرتے ہوئے کھوٹا کھرا سب جمع کر دیا ہے[۱۰۸] مگر ابن کثیر اس کتاب کی تعریف میں رطب اللسان معلوم ہوتے ہیں۔ اور تین جلدوں کی اس کتاب کے "معلومات سے بھرپور ہونے" اور اس میں "اسلام لانے والوں کے بیان کی جامعیت" اور "آپ کی ولادت باسعادت کے باب میں مسیحی اور یہودی علماء اور عربوں کی زبانی مفصل روایات اور بیانات جمع کرنے" کی خاص طور پر تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی تینتیسویں[۳۳] فصل میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات کا موازنہ دیگر انبیاء کے فضائل و معجزات سے کیا ہے[۱۰۹]۔ بہرحال ابن کثیر نے اس تاثر کے نتیجہ میں اس کتاب سے مغازی کے حصہ کے علاوہ اپنی سیرت کے ہر حصہ میں بہت زیادہ اخذ کیا ہے، تقریباً سو[۱۱۰] صفحات پر ان کے حوالے بکھرے ہوئے ہیں، جن میں بار بار ان کی دلائل کے نام کی وضاحت ملتی ہے اور اکثر ان کی روایات کے ضعف پر تنبیہہ و تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔

اس باب کی دوسری کتاب جس سے ابن کثیر نے بہت فائدہ اٹھایا ہے امام بیہقی کی دلائل النبوۃ ہے۔ بیہقی نے اس میں خاص طور پر

۱۰۳؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۲۵۹۔

۱۰۴؎ ایضاً ۴/۲۵۹، ۵/۳۵۶، ۶/۶۰، ۷۵، ۷۷، ۲۷۸، ۲۸۳، ۲۸۴۔

۱۰۵؎ ایضاً ۳/۲۷۲، ۳۰۸۔

۱۰۶؎ السہیلی، الروض الانف ۱/۶۹، ۸۵ ۱۰۷؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۳۰۷، ۶/۶۸۔

۱۰۸؎ ابن کثیر، شمائل الرسول، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد

۱۱۰؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۲/۳۱۹، ۳/۳۷، ۶/۲۵۸، ۲۶۲، ۲۹۸۔

حسی معجزات کے سلسلہ میں بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، لیکن روایات و احادیث کے اکثر جامعین کی طرح اس میں ضعیف، موضوع اور جھوٹی روایات کی بھی بھرمار کر دی ہے[۱۱۰]

لیکن ابن کثیر کے ہاں اس کتاب کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہے، چنانچہ ابن کثیر کی سیرت نبوی کے لگ بھگ پانچ سو صفحات پر ان کے حوالے بکھرے ہوئے ہیں، جن میں اکثر ان کی دلائل کی کتاب کے نام کی وضاحت کی گئی ہے۔ انہوں نے اس کتاب سے نہ صرف دلائل کے حصہ میں جو اس کی روایات سے پٹا پڑا ہے، بلکہ سیرت نبوی کے تمام اجزا خاص کر مغازی کے باب میں بھی ایسی روایات نقل کیں جن پر ان کو کسی حد تک اطمینان ہوا، نیز انہوں نے اپنی سیرت کے اکثر ابواب کی ترتیب بھی ان سے لی[۱۱۱]۔ اور واقدی اور یعقوب بن سفیان وغیرہ کے اقوال و روایات بھی ان سے حاصل کئے۔ اس طرح ابن کثیر کی سیرت نبوی کی مجموعی تشکیل میں اس کتاب کا بھی اہم اور بنیادی مقام ہے۔

آخر میں اس فن کی ایک اور کتاب ابو محمد عبداللہ بن حامد الفقیہ کی دلائل النبوۃ کا ذکر ضروری ہے، جس کے حوالے ابن کثیر کی سیرت کے دلائل کے حصہ میں سترہ (۱۷) صفحات پر ملتے ہیں، جن میں کئی جگہ مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت بھی کی ہے اور انہوں نے اس کو "گرانقدر نفیس معلومات اور عظیم فوائد والی کتاب[۱۱۲]" کی حیثیت سے بار بار پیش کیا ہے اور خاص کر ان میں انبیاء سابقین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے درمیان موازنات کو بنظر استحسان دیکھا ہے اور ان کو بکثرت نقل کیا ہے[۱۱۳]۔

اور دلائل کے ضمن میں جن دیگر کتابوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں قرب قیامت کے وقت ظاہر ہونے والے فتنوں پر لکھی ہوئی مخصوص کتابوں میں پہلی کتاب امام بخاری کے شیخ نعیم بن حماد الخزاعی (وفات ۲۲۸ھ) کی کتاب الفتن والملاحم ہے، اس کے حوالے سے ابن کثیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؐ کی پیش گوئیوں کے مطابق پیش آنے والے واقعات کے ذیل میں متعدد روایات لی ہیں، جو سولہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں[۱۱۴]۔ اور اس سلسلہ کی دوسری کتاب ابو صالح الخلیل بن احمد بن عیسیٰ بن الشیخ کی کتاب کتاب الفتن والملاحم ہے، جس کا حوالہ صرف ایک بار اس روایت کے ذیل میں آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت میں کبھی کوئی خلافت حاصل نہ کر سکے گا[۱۱۵]۔

اسی طرح بعث و نشور یا حیات بعد الموت پر لکھی ہوئی کتابوں میں ھشام بن عمّار (۱۵۲ھ - ۲۴۵ھ) کتاب المبعث کے حوالے دلائل کے حصہ میں شہادت رسالت اور معجزات کے مقارنہ کے سلسلہ میں آئے ہیں، جن میں ان کی کتاب کے دو بابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے: پہلا باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کے معجزات اور دوسرا باب آپؐ کی نبوت کی تصدیق میں فوت شدہ لوگوں کی گفتگو اور ان کے عجیب و غریب حالات اور اس کو ابن کثیر نے مذکورہ کتاب کا آخری باب بتایا ہے[۱۱۶]۔ لیکن صلح حدیبیہ کے بارے میں ان کی ایک روایت امام بخاری کے حوالے

---

۱۱۰ ابن کثیر، شمائل الرسول، مقدمہ مصطفیٰ عبدالواحد ص ح

۱۱۱ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۹۵، ۳/۳۴، ۳۶، ۸۳، ۱۰۷، ۱۰۸، ۲۱۳، ۳۰۷، ۴/۸۱، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۷۸، وغیرہ

۱۱۲ ایضاً ۶/۱۴۲، ۲۵۸، ۲۶۳، ۲۷۷۔

۱۱۳ ایضاً ۶/۱۳۷-۲۹۸۔

۱۱۴ ایضاً ۶/۲۰۴-۲۵۲

۱۱۵ ایضاً ۶/۲۳۲۔

۱۱۶ ایضاً ۶/۱۵۷، ۱۵۸، ۲۶۵، ۲۷۰، ۲۷۸، ۲۸۱۔

سے بیان کی ہے[۱۱۷]۔ اس موضوع سے متعلق دوسری کتاب حافظ، محدث اور ہر فن مولا مصنف ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا (۲۰۸-۲۸۱ھ) کی کتاب من عاش بعد الموت سے اولیائے امت کی کرامات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ان سے ایسے قصے بیان کئے ہیں جن سے احیائے موتی ثابت ہوتا ہے[۱۱۸]۔ اس کے علاوہ ان کا حوالہ مغازی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں چار بار آیا ہے[۱۱۹]، اور ان روایات کی نوعیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مذکور کتاب ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب محدث و مؤرخ محمد بن المنذر بن سعید الھروی (وفات ۳۰۲ھ) جو شکّر کے لقب سے معروف ہیں۔ کی کتاب العجائب الغریبہ ہے جو روایت بیان کی ہے ابن کثیر نے اطعام کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احیائے موتی کا معجزہ بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کتاب کا نام دوسری جگہ الغرائب والعجائب بتایا گیا ہے[۱۲۰] جبکہ اس کا نام عمر رضا کحالہ نے العجائب والجواھر بیان کیا ہے[۱۲۱]۔ اس سلسلہ میں امام بیہقی (۳۸۴-۴۵۸ھ) کی البعث والنشور کا حوالہ صرف ایک جگہ آیا ہے[۱۲۲] اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی اس کتاب سے کس حد تک فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

دلائل کے ضمن ہی میں ابن کثیر کے استاد کمال الدین ابوالمعالی محمد بن علی (۶۶۶-۷۲۷ھ)۔ جو ابن الزملکانی کے نام سے مشہور ہیں۔ کی کتاب مولد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ جو خود ابن کثیر کی وضاحت کے مطابق ان کی دلائل کے آخری باب "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر انبیاء کے مشابہ بلکہ برتر معجزات پر دلیل" کے اضافہ کا باعث بنی، اس کو ابن الزملکانی نے سیرۃ ابن اسحٰق وغیرہ سے خلاصۃً اخذ کیا تھا اور خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ابن کثیر کے زیرِ نظر تھا، لیکن ان کے خیال میں اس کے آخر میں فضائل کے ذیل کی ایک فصل کا ابن الزملکانی احاطہ نہ کر سکے تھے۔ لہٰذا ابن کثیر نے مذکورہ فصل کے مواد کو اس باب کی بنیاد بنا کر از سرِ نو ترتیب و تبویب اور تہذیب و اضافوں کے ذریعہ اس کو مکمل کیا اور بار بار مذکورہ مولد کے حوالے دیئے[۱۲۳]۔

اسی ضمن میں ابن کثیر کے دوسرے نامی گرامی استاد امام ابن تیمیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) کی ردّ نصاریٰ میں کتاب الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ اس کتاب کے آخر میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اخلاق و اعمال کو دلائل نبوت کے اعتبار سے پیش کیا ہے اور ابن کثیر نے ان کے "صحیح نتیجہ خیز مسلک اور بلیغ اندازِ بیان جس کے سامنے ہر سوچنے سمجھنے والا سپر ڈال دیتا ہے" کی تعریف کرتے ہوئے اس فصل کو پورا کا پورا نقل کیا ہے[۱۲۴]۔ نیز اہلِ کتاب کے ہاں بارہ عظماء (بڑوں) کی روایت کو بارہ شیعی اماموں پر محمول کرنے کے خلاف بھی ان کا قول ایک جگہ نقل کیا ہے[۱۲۵]

۱۱۷؎ ایضاً ۱۷۳/۴ — ۱۱۸؎ ایضاً ۱۵۳/۶ - ۱۵۸، ۲۹۲-۲۹۳، ۱۱۹؎ ایضاً ۲۸۹/۳، ۴۵/۴، ۲۶۶/۵، ۲۷۲-

۱۲۰؎ ایضاً ۱۰۹/۶، ۲۹۳- ۱۲۱؎ عمر رضا کحالۃ، معجم المؤلفین، مطبعۃ الترقی، دمشق، ۱۳۷۶-۱۳۸۱ھ ۵۱/۱۲-

۱۲۲؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۸۳/۵- ۱۲۳؎ ایضاً ۲۵۸/۶-۲۹۳-

۱۲۴؎ ایضاً " " ۷۰/۶-۷۴-

۱۲۵؎ ایضاً " " ۲۵۰/۶-

سیرت نبوی کے آخر امور دلائل کے باب شیعہ سنی اختلافی احادیث کا ذکر ضمناً آیا۔ اور ابن کثیر ان کی تحقیق و جستجو پر مجبور ہوئے تو انہوں نے اس سلسلہ کا سارا مخالف اور موافق دفتر کھنگال ڈالنے کی کوشش کی۔ یہاں اس موضوع کی دو حدیثیں قابلِ ذکر ہیں، پہلی حدیث غدیر خم کے نام سے مشہور ہے، یہ در اصل وہ مشہور و معروف خطبۂ نبوی ہے جو آپؐ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں جحفہ کے قریب غدیر خم نامی مقام پر دیا تھا اور دوسری حدیث "ردّ الشمس بعد مغیبہا" ہے جس کا پسِ منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر سو رہے تھے، جس کی وجہ سے حضرت علیؓ کی نمازِ عصر قضا ہوگئی، بیداری پر جب آپؐ کو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو آپؐ نے دعا فرمائی۔ اور سورج حضرت علیؓ کی نمازِ عصر کی ادائیگی کے لئے واپس ہوگیا۔

بہر حال یہ دونوں ان احادیث میں سے ہیں جن کو حضرت علیؓ کے طرفدار ان کی دوسرے صحابہ کرامؓ پر فضیلت اور فوقیت پر محمول کرتے ہیں اور ابن کثیر اس غلط ترجمانی کے بخیئے ادھیڑنے کے لئے مستعد اور بے چین نظر آتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں حدیثوں کی مختلف روایتوں کو نقل کرتے ہوئے اور ان کے سند و متن پر کلام کرتے ہوئے حدیث و تاریخ کے تمام اہم مجموعوں اور ان موضوعات پر مستقلاً لکھی ہوئی مخصوص کتابوں کے حوالوں کے انبار لگا دیتے ہیں اور صفحات پر صفحات سیاہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پہلی حدیث سے صرف حضرت علیؓ کی ان الزامات جور و جفا سے برأت ظاہر ہوتی ہے، جو ان پر یمن کے قیام کے زمانہ میں لگائے گئے تھے، لیکن دیگر صحابہ پر ان کی فضیلت و فوقیت کہیں سے بھی ثابت نہیں ہوتی۔

اس سلسلہ میں امام نسائی (۲۱۵-۳۰۳ھ) کی کتاب خصائص علی قابل ذکر ہے، جو انہوں نے حضرت علیؓ سے اہلِ دمشق کے تنفر کو دور کرنے کے لئے لکھی تھی[126] اور ابن کثیر نے اس سے مذکورہ حدیث کی بحث میں استفادہ کیا[127] اسی طرح ابن کثیر نے ابن جریر الطبری (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی حدیث غدیر خم کے بارے میں دو جلدوں پر مشتمل کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے، جس کا علم ان کو ان کے استاد شمس الدین ابو عبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی معرفت ہوا تھا، اور ذہبی نے اس کو طبری کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخہ سے نقل کی ہوئی کتاب میں پایا تھا اور ابن کثیر نے اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی کہ "طبری نے اس کتاب میں اکثر محدثین کی عادت کے مطابق کھرا کھوٹا اور صحیح و سقیم سب جمع کر دیا ہے"[128]

دوسری حدیث کو ابن کثیر موضوع سمجھتے تھے اور اس کے بیان میں انہوں نے جن مصادر کا حوالہ دیا ہے، ان میں مورخ و محدث ابو بشر محمد بن احمد الدولابی (۲۲۴-۳۱۰ھ) کی کتاب الذریة الطاهرة ہے، لیکن ان کی روایات کو موضوع بتایا ہے[129]۔ اور ابن حزم (۳۸۴-۴۵۶ھ) کی الملل والنحل کا حوالہ اس حدیث کے رد میں دیا ہے[130] اور ابو بکر محمد بن حاتم بن زنجویہ البخاری کی إثبات إمامة ابی بکر الصدیق میں ان کے استدلال سے فائدہ اٹھایا ہے[131] اور ابو القاسم عبید اللہ بن عبداللہ بن احمد الحسکانی کے ایک

---

126 الذهبی، تذکرة الحفاظ، ۲/۲۴۲ - ۲۴۳

127 ابن کثیر، البدایة والنهایة، ۵/۱۶۳، ۲۱۰، ۶/۸۵-

128 ایضاً ۵/۲۰۸ - ۲۱۴، ۷/۳۴۶ - ۳۵۰

129 ایضاً ۶/۷۸، ۸۶ -

130 ایضاً ۶/۸۷

131 ایضاً ۶/۷۹، ۸۵، ۲۸۲ -

جزولعنوان مسالة فی تصحیح ردّ الشمس و ترغیم النواصب الشُمس سے ان کی روایات کے بہت سے طُرق حذف و اضافہ کے ساتھ لئے اور ان کے استدلال سے بھی فائدہ اٹھایا[۱۳۲] اور مشہور شیعی عالم جمال الدین ابومنصور حسن بن یوسف المطہر الحلی (۶۴۸-۷۲۶ھ) کی کتاب منہاج الاستقامة فی إثبات الإمامة کے بارے میں ابن کثیر کی رائے تھی کہ "انہوں نے اس میں معقول و منقول میں گڈمڈ کیا ہے، پھر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جائیں کیونکہ وہ صحیح راستہ سے ہٹ گئے تھے[۱۳۳]۔" لہٰذا ان کی روایات کو مردود ٹھہرایا ہے، ان کے نتائج پر غلط مبحث کا الزام لگایا ہے اور سخت تنقید کی ہے[۱۳۴] اور یہاں پر انہوں نے پھر اپنے استاد ابن تیمیہ کی طرف رجوع کیا ہے اور ان کی کتاب منہاج السنة فی نقض کلام الشیعة والقدریة کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جس میں ابن المطہر کی مذکور کتاب کا رد کیا گیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اس سے استفادہ کیا ہے[۱۳۵]

ابن کثیر کی سیرت نبوی کے تینوں حصوں سیرت، شمائل اور دلائل سے براہِ راست تعلق رکھنے والے مصادر کی علیحدہ مستقل فنی کتابوں کے اس تعارف کے بعد اب ان مصادر کا ذکر کیا جائے گا، جن کا تعلق صرف کسی ایک حصہ سے نہیں بلکہ وہ ان کی سیرت کے مذکور تینوں حصوں میں مشترک ہیں جیسے تفاسیر، آسمانی کتابیں اور احادیث کے مجموعے اور رجال و تراجم اور جرح و تعدیل کی کتابیں ان مصادر میں بھی خاص طور پر ان مصادر کو نمایاں کیا جائیگا جن سے اس سیرت کی تشکیل میں وسیع پیمانہ پر مدد لی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ مصادر عام طور پر وہ ہیں جو ابن کثیر کی حقیقی تعلیم و تربیت، علمی اختصاص، فکری مزاج اور ان کے تصنیفی کارناموں سے پوری طرح میل کھاتے ہیں۔

۴- قرآن شریف کی تفسیریں

ابن کثیر خود صاحبِ طرز مفسّر تھے، ان کی تفسیر القرآن الکریم معروف و مشہور اور مقبولِ عام ہے۔ اس میں انہوں نے "قرآن کی تفسیر قرآن، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر صحابہ و تابعین کرام کے آثار کی روشنی میں بیان کی ہے۔ مجرد رائے سے تفسیر ان کے نزدیک حرام ہے" اور اسرائیلیات کے باب میں ان کا موقف یہ ہے کہ اگر وہ "قرآن و حدیث کے موافق ہوں تو اُن کو قبول کرتے ہیں۔ مخالف ہوں تو رَدّ کر دیتے ہیں اور اگر موافق یا مخالف نہ ہوں تو وہ نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب بلکہ ان کو موقوف سمجھتے ہوئے تقویت یا استشہاد کے لئے ان کے بیان کو جائز سمجھتے ہیں[۱۳۶]"

مذکورہ تفسیر میں اس طریقۂ کار کی پابندی تو فطری تھی، لیکن یہ ابن کثیر کا امتیاز تھا کہ انہوں نے اس کو اپنی "تاریخ کے ابتدائی حصہ یعنی سابق انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات میں بھی کامیابی سے اپنانے کی کوشش کی اور اس کو آیات قرآنی سے استشہاد، تفسیری نکات سے استدلال اور مختلف قدیم معتبر تفسیروں کے حوالوں سے بھر دیا، اس کے بعد سیرت نبوی کے حصہ میں ضروری مقامات پر اگرچہ آیات قرآنی سے استشہاد میں کوتاہی

---

[۱۳۲] ابن کثیر، البدایة والنهایة ۶/۸۰-۸۷ ۔ [۱۳۳] ایضاً ۱۴/ ۱۲۵

[۱۳۴] ایضاً ۶/۸۶، ۸۷، ۲۸۲، ۲۸۳ ۔

[۱۳۵] ایضاً ۶/ ۸۳، ۸۵-۸۶، ۲۵۰ ۔

[۱۳۶] ابن کثیر، تفسیر القرآن الکریم ۱/۳-۵، ۳/۱۸۱-۱۸۲، ابن کثیر، البدایة والنهایة ۱/۶-۷، ۲/۱۳۲-۱۳۴ ۔

نہیں کی گئی، لیکن تفسیری نکات اور کتابوں کے حوالوں کے بارے میں گزشتہ روش برقرار نہ رہ سکی، کیونکہ سیر و مغازی اور تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متعلقہ مواد کی فراوانی نے ان کو تفسیری کتابوں میں موجود کمیاب مواد سے بے نیاز کر دیا لہٰذا سیرت و مغازی کے حصہ میں محسوس طور پر تفسیری کتابوں کا غالب رنگ کم ہو گیا لیکن معدوم نہیں ہوا، بلکہ آپ کی حیات طیبہ، مغازی اور دیگر واقعات سے متعلق تمام آیات قرآن سے استشہاد اور بوقت ضرورت تفسیری کتابوں سے مدد حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی ہے اور مابعد سیرت بھی ان فصلوں میں ان کے حوالے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں، جن کا تعلق دینی اعتقادات اور مذہبی اختلافات سے ہے۔

بہر حال اس دھندلاتے ہوئے رنگ کے زیر اثر بھی جن تفسیروں کے کم و بیش حوالے ابن کثیر کی سیرت اور مغازی کے حصوں میں مل جاتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

تفسیر السُدی الکبیر (وفات ۱۲۷ھ) جن پر طبری اور ابن ابی حاتم کی طرح ابن کثیر نے بھی اعتماد کیا، لیکن سیرت میں ان کا ذکر بہت کمیاب ہے[137]۔ تفسیر عبدالرزاق (۱۲۶ - ۲۱۱ھ) یہ بھی ابتداً تاریخ سے ابن کثیر کا اہم مصدر ہے، لیکن سیرت میں معدودے چند حوالے آئے ہیں[138]۔ تفسیر بقی بن مخلد (۲۰۱ - ۲۷۶ھ) جن کا ذکر صرف ایک مرتبہ سہیلی کے حوالے سے آیا ہے[139]۔ تفسیر طبری (۲۲۴ - ۳۱۰ھ) جو صحابہ و تابعین سے ماثور تفسیری روایات، نکات اور معلومات کا خزانہ ہے، اور جس کو خود ابن کثیر "بے نظیر"[140] سمجھتے تھے، اور اس سے ابتدائی تاریخ کے علاوہ سیرت میں بھی استفادہ کیا ہے[141]۔ تفسیر ابن ابی حاتم (۲۴۰ - ۳۲۷ھ) جس کو ابن کثیر نہ صرف تفسیر طبری بلکہ اپنے زمانہ تک کے تمام مفسرین پر "مکمل طور سے آثار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے"[142] فوقیت دیتے تھے۔ لہٰذا اس سے بھی ابتدائی تاریخ کے بعد سیرت و مغازی کے حصہ میں خاصا فائدہ اٹھایا ہے[143]۔ تفسیر ابن مردویہ (۳۲۳ - ۴۱۰ھ) جس کا ذکر ابن کثیر کی تاریخ میں بھی نسبتاً کم آیا ہے لیکن غزوۂ بدر تک اس کے حوالے مل جاتے ہیں[144]۔ تفسیر القاضی الماوردی (۳۶۴ - ۴۵۰ھ) کا حوالہ صرف دوبارہ دیا ہے[145] اور ان سب کے علاوہ ابن کثیر نے خود اپنی تفسیر القرآن الکریم کا ابتداً تاریخ سے انتہا سیرت تک بار بار حوالہ دیا ہے۔

۵۔ آسمانی کتابیں

ابن کثیر اسلامی علوم و فنون میں مہارت کے ساتھ ساتھ دیگر آسمانی مذاہب اور ان کی کتابوں کا بھی گہرا ناقدانہ مطالعہ رکھتے تھے۔

---

۱۳۷ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۳/۱۶، ۲۰، ۲۵۱، ۲۷۵، ۲۸۴، ۳۰۱، ۳۰۳، ۴/۱۴۵، ۶/۳۵۔

۱۳۸ ایضاً " ۲/۲۵۵، ۲۸۶، ۳/۱۹، ۲۰۹، ۲۱۶، ۴/۳۰، ۲۱۳، ۳۰۴۔

۱۳۹ ایضاً ۲/۲۶۶۔ ۱۴۰ ایضاً ۱۱/۱۴۵۔

۱۴۱ ایضاً ۳/۴۴، ۱۱۲، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۴/۱۴۶، ۱۴۸، ۵/۱۶۷، ۳۴۶، ۳۴۸، ۶/۲۸۴ وغیرہ۔ ۱۴۲ ایضاً ۱۱/۱۹۱۔

۱۴۳ ایضاً ۳/۴۰، ۴۴، ۴۴، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۹۳، ۲۷۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۴/۲۵، ۷۴، ۱۱۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۳۲۵، ۶/۱۰، ۶۱، ۱۹۱۔

۱۴۴ ایضاً ۳/۶، ۲۲، ۱۲۹، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۹۸۔ ۱۴۵ ایضاً ۴/۱۱۰، ۳۰۱۔

جس پر ان کی تفسیر و تاریخ اور زیرِ بحث سیرت میں آسمانی کتابوں کے حوالے اور تنقیدیں شاہد ہیں۔ نیز وہ مناظرہ بھی ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے زمانہ کے ایک عیسائی عالم متبرک بشارۃ (لقب منخائیل) سے ۷۶۱ھ میں اہلِ کتاب کے دین اور ان کے تینوں طوائف، ملکیتہ، یعقوبیتہ اور نسطوریتہ کے اعتقادات کی نصوص" کے بارے میں کیا تھا اور پھر اس عالم کے بارے میں یہ رائے دی تھی کہ" وہ کچھ کچھ سمجھتا ہے"۔[۱۴۶]

بہرحال ابن کثیر کی سیرتِ نبوی میں بھی ان آسمانی کتابوں کا یکجا حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی سابق بشارتوں اور پیش گوئیوں کے سلسلہ میں آیا ہے۔ جہاں پر توراۃ کے پانچوں اسفار (اجزاء) سفر زبور (یا مزامیر داؤد) اور ارمیا، اشعیا اور حزقیل کے صحف اور کتاب النبوات والانجیل سے معلومات حاصل کی گئی ہیں[۱۴۷]۔ لیکن اس کے علاوہ جہاں آسمانی کتابوں کی معلومات ملتی ہیں وہ براہِ راست مذکورہ مصادر سے ماخوذ معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ مسلمان مفسرین و محدثین اور مؤرخین و سیرت نگاروں سے حاصل کی ہوئی لگتی ہیں۔

۶۔ حدیث کے مجموعے

ابن کثیر بنیادی طور پر بلند پایہ محدث تھے، اکثر حدیث کے مجموعے ان کو حفظ یا مستحضر تھے، محدثین کے مسلک کی ان پر گہری چھاپ تھی۔ شرح حدیث، جمع و تخریجِ احادیث، فنِ رجال اور اصطلاحِ حدیث میں ان کی متعدد قیمتی تصنیفات تھیں[۱۴۸]۔ اور غالباً صحیح احادیث کی روشنی میں اسلامی تاریخ مرتب کرنا ان کا مقصد تھا، اس لئے ان کی تاریخ کے ابتدائی حصہ سے سیرتِ نبوی کی انتہا تک حدیث کا اتنا گہرا رنگ نظر آتا ہے کہ اکثر قاری کو" تاریخ و سیرت کے بجائے مجموعۂ احادیث کی کتاب کے مطالعہ کا گمان (بلکہ بدگمانی) ہونے لگتی ہے۔ کسی واقعہ کے سلسلہ میں کوئی" تاریخی خبر یا روایت نقل کرتے ہوئے ان کا ذہن بہت سرعت سے دوسرے حدیثی مصادر کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور وہاں وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتے، بلکہ متعلقہ تاریخی خبر یا روایت کے حدیثی نظائر و شواہد کو ایک پر ایک کر کے جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر اَولیٰ و اَصلح کی تلاش میں ان پر علم حدیث کی روشنی میں نئی بحث شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس خبر یا روایت کی ان کے اطمینان کی حد تک ایک محدث کے نقطۂ نظر سے تصدیق یا تردید ہو جائے۔

حدیث کے ان مجموعوں میں قدیم ترین معتبر کتاب صاحبِ مسلک فقیہ اور مشہور مدنی محدث امام مالک بن انس (۹۳ - ۱۷۹ھ) کی موطا

---

[۱۴۶] ایضاً ۱۴/ ۳۱۹ - ۳۲۰ -   [۱۴۷] ایضاً ۶/ ۱۷۸-۱۸۱ -

[۱۴۸] ان تصنیفات میں قابلِ ذکر کتابیں یہ ہیں :

۱۔ صحیح البخاری کی غیر مکمل شرح ، ۲۔ صحیح مسلم پر زیادات و حواشی ، ۳۔ مختصر ابن حاجب کی احادیث کی تخریج ،
۴۔ جامع المسانید والسنن کے نام سے ایک عظیم الشان مجموعۂ احادیث ۵۔ رجال و نقد میں التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل
۶۔ اصطلاح حدیث میں اختصار علوم الحدیث لابن حاجب ، ۷۔ اختصار کتاب المدخل الی کتاب السنن البیہقی۔
۸۔ کتاب المقدمات اور دیگر رسالے، ان کتابوں کے تفصیلی تعارف کے لئے راقم کی کتاب ابن کثیر: حیاتہ و مؤلفاتہ کے چوتھے باب کی تیسری فصل ملاحظہ فرمائیں صـ۹۲ - ۱۴۹

ہے، جو انہوں نے عباسی خلیفہ المنصور (۱۳۶ - ۱۵۸ھ) کی فرمائش پر ترتیب دی تاکہ وہ لوگوں کو اس کے مطابق عمل پر آمادہ کر سکے۔ ابن کثیر نے امام مالک کی عظمت و تحسین کے ساتھ چالیس[۴۰] صفحات پر ان کے حوالے دیے ہیں جس میں ان کی روایات یا فقہی اقوال نقل کئے گئے ہیں اور بعض جگہ ان کی مذکورہ کتاب کے نام کی وضاحت کی ہے۔[۱۴۹]

اور صحاح حدیث میں امام بخاری[۱۵۰] (۱۹۴ - ۲۵۶ھ)، امام مسلم[۱۵۱] (۲۰۴ - ۲۶۱ھ) ابن خزیمہ[۱۵۲] (۲۲۳ - ۳۱۱ھ) اور ابن حبان[۱۵۳] (وفات ۳۵۴ھ) کے مشہور و معروف صحیح احادیث کے مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔ خاص کر امام بخاری اور امام مسلم کی صحیحین سے (جن کے وہ بجا طور پر قائل و مداح تھے) ابتدا تا تاریخ کی طرح سیرت نبوی کی تقریباً ہر فصل میں بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی بیان کی ہوئی اکثر احادیث کو کبھی اصل و بنیاد بنا کر اور کبھی نظیر و شاہد کے طور پر نقل کیا ہے۔ اس لیے زیر بحث سیرت کی تشکیل میں صحیحین کا مقام بھی سیرو مغازی و تاریخ کے بنیادی اہم مصادر کے ہم پلہ ہے۔ اور حدیث کی کتابوں میں امام احمد بن حنبل کی مسند کے سوا کوئی اور کتاب ان دونوں کی شریک اور سہیم نہیں ہے۔

اور صحیحین کے ذیل میں ان پر استدراک یا شرح یا اطراف کے طور پر مرتب کی ہوئی کتابوں کا ذکر بھی مناسب ہے، جیسے امام الحاکم (۳۲۱ - ۴۰۵ھ) کی المستدرک جو انہوں نے بخاری و مسلم کی شرائط کی رعایت کرتے ہوئے ترتیب دی، اور ابن کثیر نے ان کی روایات اور استدراکات کے حوالے اڑتیس[۳۸] صفحات پر دیئے، اور کہیں کہیں خود امام حاکم پر بھی استدراک کیا،[۱۵۴] اور ایک جگہ ان کے تشیع کی طرف بھی اشارہ کیا۔[۱۵۵] اسی طرح مہلب بن ابی صفرۃ (وفات ۴۳۵ھ) کی شرح البخاری[۱۵۶] اور قاضی عیاض (۴۷۶ - ۵۴۴ھ) کی شرح مسلم[۱۵۷] کے ناموں کی ایک ایک بار وضاحت کی ہے۔ اور محی الدین النواوی (۶۳۱ - ۶۷۶ھ) کی شرح مسلم کا اگرچہ نام نہیں لیا ہے، لیکن سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بعض روایات مذکورہ شرح سے ماخوذ ہو سکتی ہیں۔[۱۵۸] اور ابن کثیر نے اپنے استاد اور خسر جمال الدین ابو الحجاج یوسف المزی (۶۵۴ - ۷۴۲ھ) کی تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الأطراف سے بھی استفادہ کیا ہے، اور اس کا حوالہ متعدد جگہ دیا ہے۔[۱۵۹]

حدیث کی دیگر کتابوں میں امام ترمذی (۲۰۹ - ۲۷۹ھ) الجامع الکبیر[۱۶۰] کی روایات کا بھی ابن کثیر کی سیرت نبوی میں قابلِ لحاظ حصہ ہے۔ دو سو[۲۰۰] سے زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے ان کے حوالوں میں سے بیشتر ان کی مذکورہ کتاب سے لی گئی ہیں، باقی ان کی شمائل سے ماخوذ ہیں۔

---

۱۴۹ ایضاً ۵/۱۱۱، ۱۲۹، ۲۳۷ وغیرہ۔

۱۵۰ تقریباً سات سو صفحات پر ان کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں اکثر ان کی صحیح کی وضاحت کی گئی ہے۔

۱۵۱ پانچ سو[۵۰۰] صفحات سے زیادہ پر ان کے حوالے پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی صحیح کا نام بھی حوالے کے طور پر بار بار لیا گیا ہے۔

۱۵۲ ان کی صحیح کے حوالے بہت کم ملتے ہیں ۳/۲۰۹، ۲۳۲، ۵/۳۸۶، ۳۰۳، ۶/۱۹۳، ۲۷۷

۱۵۳ ان کے حوالے صرف ستائیس[۲۷] صفحات پر دیئے گئے ہیں۔ ۱۵۴ ایضاً ۲/۲۴۲، اس کے علاوہ ایک ایک بار ان کی الاکلیل اور الصحیح کا حوالہ بھی ایک ایک بار آیا ہے ۳/۲۴۲، ۲۹۸۔ ۱۵۵ ایضاً ۲/۲۳۳۔ ۱۵۶ ایضاً ۳/۱۱۵ جو غالباً سہیلی کے واسطہ سے لیا گیا ہے، دیکھئے الروض الانف ۱/۲۴۴۔ ۱۵۷ ایضاً ۳/۸۔ ۱۵۸ ایضاً ۳/۷، ۸، ۶/۲۷۷۔

۱۵۹ ایضاً ۳/۲۶۱، ۴/۲۰۴، ۵/۱۰، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۷۸، ۶/۳۴، ۹۱، ۱۳۰۔ ۱۶۰ ایضاً ۳/۱۶۹، ۴/۹۲۔

جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اسی طرح اس کتاب پر ابوبکر بن العربی کی شرح جو الاحوذی کے نام سے مشہور ہے اس کا حوالہ بھی ایک بار آیا ہے[۱۶۱]۔

حدیث کی کتابوں میں سنن کے مجموعوں نے بھی ابن کثیر کی سیرت کی تشکیل میں اہم حصہ لیا ہے، لیکن وہ صحاح کی مذکورہ کتابوں سے فروتر ہے، جیسے سنن ابن ماجہ (۲۰۹ - ۲۷۳ھ) جس کے نام کی وضاحت کے ساتھ اگرچہ تاریخ کے ابتدائی حصہ میں صرف ایک بار حوالہ آیا ہے[۱۶۲]، لیکن سیرت کے حصہ میں ابن ماجہ کی روایات ایک سو سینتالیس[۱۴۷] صفحات پر مذکور رہیں۔ جو بظاہر ان کی سنن ہی سے ماخوذ ہیں اور سنن ابی داؤد (۲۰۲ - ۲۷۵ھ) جس کی روایات، سیرت و شمائل میں دو سو دس[۲۱۰] صفحات پر نقل ہوئی ہیں اور اکثر اس کتاب کا حوالہ دیا ہے[۱۶۳]۔ نیز ان کا مرسل احادیث کا مجموعہ المراسیل بھی ابن کثیر کے زیرِ نظر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے نام کی صراحت بھی دو جگہ کی ہے[۱۶۴] اور النسائی (۲۱۵ - ۳۰۳ھ) کی چھوٹی اور بڑی دونوں سنن سے ابن کثیر نے فائدہ اٹھایا ہے اور تقریباً دو سو صفحات پر بکھرے ہوئے ان کے اقوال و روایات میں بعض جگہ ان کے ابواب تک کے حوالے دیئے ہیں[۱۶۵] اور بیان کیا ہے کہ ان کو ان دونوں کے سماع کا شرف حاصل تھا[۱۶۶]۔ الدارقطنی (۳۰۶ - ۳۸۵ھ) کی سنن کے نام کی اگرچہ ابن کثیر نے وضاحت نہیں کی ہے لیکن سولہ[۱۶] صفحات پر ان سے ماخوذ روایات بظاہر اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔ اگرچہ تاریخ کے شروع میں ایک جگہ ان کی کتاب الافراد کا حوالہ بھی دیا ہے[۱۶۷]۔ اور سنن البیہقی (۳۸۴ - ۴۵۸ھ) بھی اُن ہی کتابوں میں سے ہے جن سے ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کا مواد حاصل کیا ہے اور بعض جگہ نام کے ساتھ اس کے حوالے بھی دیئے[۱۶۸]۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ ابن کثیر کی توجہ کا اصل مرکز ان کی کتاب دلائل النبوۃ تھی، جس کے سامنے ان کی دیگر کتابوں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے جیسے الاسماء والصفات (جس کے ایک باب البعث والنشور کا حوالہ بھی علیحدہ آیا ہے) اور الخلافیات جن کا نام کے ساتھ صرف ایک ایک بار حوالہ آیا ہے[۱۶۹] اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر کس حد تک اعتماد کیا گیا ہے۔

حدیث کے مذکورہ مجموعوں کے بعد ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل میں مسند کے نام سے مشہور حدیث کے مجموعوں کا نمبر آتا ہے، جن میں اہم ترین مقام مسند الامام احمد بن حنبل (۱۶۴ - ۲۴۱ھ) کا ہے، جس کو حقیقتاً ان کے بنیادی مصادر میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ابن کثیر کو اس کتاب سے اتنا شغف تھا کہ احمد محمد شاکر کے بقول وہ ان تین اشخاص میں سے ایک تھے، جن کو "اس مسند کی صحیح معرفت حاصل تھی، اور گویا کہ وہ ان کے نوکِ زبان پر تھی"[۱۷۰]۔ لیکن ان کی تفسیر، تاریخ اور سیرت کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو حدیث کے تمام قدیم مشہور مجموعے بھی اسی طرح مستحضر تھے جیسے کہ مسندِ مذکور، اور ان کو ان کا صحیح علم، استفادہ کا ملکہ اور استعمال کا وہ سلیقہ حاصل تھا، جو کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مسند سے بھی صحیحین بخاری و مسلم کی طرح بہت زیادہ کام لیا، تقریباً چھ سو[۶۰۰] صفحات پر اس کے حوالے ابن کثیر کی سیرت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حقیقتاً انہوں نے مذکورہ تینوں کتابوں کے بیشتر حصہ کو اپنی

---

۱۶۱ ایضاً ۲/۲۵۲۔ ۱۶۲ ایضاً ۱/۲۴۴۔ ۱۶۳ ایضاً ۳/۲۵۵، ۴/۴۲، ۳۳۲، ۵/۱۷۶، ۶/۲، ۲۰۹ وغیرہ

۱۶۴ ایضاً ۵/۷۷، ۲۶۱۔ ۱۶۵ ایضاً ۴/۲۵۲، ۵/۲۰۹۔ ۱۶۶ ایضاً ۱۱/۱۲۳۔

۱۶۷ ایضاً ۱/۳۳۳۔ ۱۶۸ ایضاً ۵/۱۱۲، ۱۵۸، ۱۶۳۔

۱۶۹ ایضاً ۲/۲۵۲، ۵/۸۳، ۱۳۹، ۱۷۰ احمد بن حنبل، المسند، مقدمہ و تحقیق احمد محمد شاکر، طبع سوم دار المعارف القاہرہ سنہ ۱۳۶۸ھ، ۱/۲

تاریخ و سیرت میں ہوتا ہے اور ان کی مدد سے ان معلومات کی تصدیق، تصحیح یا تردید کی ہے جو ان کو سیر و مغازی و تاریخ یا شمائل و دلائل کی کتابوں سے حاصل ہوئی تھیں، اور ہمارے اندازہ کے مطابق سیرت کی ابتدا سے انتہا تک ابن کثیر کے بنیادی مصادر سیرۃ ابن اسحٰق اور سیرۃ ابن ہشام کا مقابلہ کرنے والی حدیث کی یہی تین کتابیں ہیں جنہوں نے ان کا قدم بہ قدم ساتھ دیا ہے اور ابن کثیر کی سیرت نبوی کی تشکیل میں وہی بنیادی مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے جو مذکورہ دونوں سیرتوں اور شمائل ترمذی اور دلائل اصبہانی اور دلائل بیہقی کو ان کے متعلقہ حصوں میں حاصل ہوا ہے۔

ابن کثیر نے امام احمد بن حنبل کی کچھ روایات ان کے بیٹے عبداللہ (۲۱۳ - ۲۹۰ھ) کے واسطے سے بھی حاصل کی ہیں[۱۷۱]۔ اور ابتداً تاریخ میں ایک جگہ عبداللہ مذکور کی کتاب الزیادات کا بھی حوالہ دیا ہے[۱۷۲]۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی مسند پر دس ہزار حدیثوں کا اضافہ کیا تھا[۱۷۳]۔

امام احمد کی مذکورہ مسند کے علاوہ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں دیگر مشہور مسانید کے مؤلفین کی روایات بھی نقل ہوئی ہیں بعض سے کم اور بعض سے زیادہ، جیسے مسند ابی داؤد الطیالسی (۱۳۳ - ۲۰۴ھ) جن کی روایات تریسٹھ[۶۳] صفحات پر ملتی ہیں۔ جن میں ایک بار مسند مذکور کا حوالہ دیا ہے[۱۷۴] اور مسند الامام الشافعی (۱۵۰ - ۲۰۴ھ) جن کے اقوال و روایات کے حوالے سینتالیس صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جو اکثر سیرت کے آخری حصہ میں ہیں اور ان میں ایک بار ان کی مسند کا نام لیا ہے جیسے کہ ایک بار ان کی مشہور کتاب الرسالۃ کا بھی حوالہ دیا ہے[۱۷۵] اور مسند عبد بن حمید (وفات ۲۴۹ھ) ان کی صرف تین روایات بیان کی ہیں۔ جن میں ایک بار اس مسند کی طرف بھی اشارہ کیا ہے[۱۷۶]۔ اور مسند ابی بکر البزار (وفات ۲۹۲ھ) ان کے حوالے ترپن[۵۳] صفحات پر دیے گئے ہیں، جن میں اکثر ان کی مسند کی وضاحت ہوتی ہے[۱۷۷] اور مسند ابی یعلی الموصلی (وفات ۳۰۷ھ) جن کے حوالے پینتالیس صفحات پر ملتے ہیں۔ جو اکثر سیرت کے آخری حصہ میں ہیں اور ان میں کئی بار ان کی مسند کے نام کی وضاحت ملتی ہے[۱۷۸]۔

اور حدیث کی دیگر کتابوں کے مصنفین میں ابن ابی شیبۃ (وفات ۲۳۵ھ) کی روایات کا بیس صفحات پر ذکر ہے، جن میں سے بعض جگہ ان کی کتاب المصنف کا حوالہ بھی آیا ہے[۱۷۹]۔ اور اس کتاب کے بارے میں ابن کثیر کا خیال تھا کہ "ایسی کتاب نہ کسی نے پہلے کبھی لکھی۔ اور نہ بعد میں[۱۸۰]"۔ اسی طرح ابن ابی عاصم (۲۰۶ - ۲۸۶ھ) کا سیرت کے حصہ میں دوبارہ تذکرہ آیا ہے جن میں ایک بار اُن کی کتاب المولد کا حوالہ دیا ہے، جبکہ تاریخ کے شروع میں ان کی کتاب السنۃ کا حوالہ دیا تھا[۱۸۱]۔ جو "سلف کے طریقہ پر احادیث صفت کا مجموعہ ہے[۱۸۲]"۔

---

[۱۷۱] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۴/۵، ۳۸، ۷۳، ۸۰، ۲۱۰، ۲۱۱۔ [۱۷۲] ایضاً ۱/۷۶۔

[۱۷۳] الزرکلی، الاعلام ۴/۱۸۹ بحوالہ ابن حجر، تہذیب التہذیب۔ [۱۷۴] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۴/۳۳۱۔

[۱۷۵] ایضاً ۵/۱۵۲، ۱۴۲۔ [۱۷۶] ایضاً ۳/۶۲، ۱۴۱، ۶/۲۷۶۔ [۱۷۷] ایضاً ۳/۱۲۵ وغیرہ۔

[۱۷۸] ایضاً ۵/۱۱۳ وغیرہ [۱۷۹] ایضاً ۲/۲۶۰، ۵/۱۱۱، ۶/۲۷۶۔ [۱۸۰] ایضاً ۱۰/۳۱۵۔

[۱۸۱] ایضاً ۲/۳۲۳، ۶/۲۸۳، ۱/۱۱۔ [۱۸۲] ایضاً ۱۱/۸۴۔

اور عین ممکن ہے کہ مذکور کتاب المولد اسی کا حصہ ہو۔

اور معاجم حدیث میں طبرانی (۲۶۰-۳۶۰ھ) کی المعجم الکبیر کا تذکرہ ان کے پینتیس[۳۵] صفحات پر پھیلے ہوئے حوالوں میں کئی جگہ ملتا ہے[۱۸۳] اور عادت کے مطابق ان کی روایات کی تعریف کے ساتھ کمزور مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ نیز ایک بار ان کی کتاب المناسک کا بھی حوالہ دیا ہے[۱۸۴]

۷۔ تراجم اور نقد رجال کی فنی کتابیں

حدیث کے ان تمام قدیم مجموعوں کے علاوہ ابن کثیر کی سیرت نبوی میں معاجم صحابہ کرام کے مؤلفین سے بھی بعض جگہ روایات اور اکثر جگہ فنی معلومات اور ناقدانہ آراء یعنی توثیق و تضعیف کے اقوال وغیرہ حاصل کئے گئے ہیں اور بعض موقعوں پر ان کی کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ جیسے ابو القاسم عبداللہ البغوی (۲۱۳-۳۱۷ھ) کے سترہ[۱۷] حوالوں میں بعض جگہ ان کی معجم الصحابۃ کا ذکر کیا ہے[۱۸۵] اور ابو عبداللہ محمد بن اسحٰق بن مندہ (۳۱۰-۳۹۵ھ) کے بیس حوالوں میں ان کی کتاب دو نام سے ذکر کی گئی ہے۔ یعنی معرفۃ الصحابۃ اور معجم الصحابۃ[۱۸۶] جو بظاہر ایک ہی کتاب کے دو نام معلوم ہوتے ہیں اور ابو موسیٰ المدینی جن کی کسی کتاب کی ابن کثیر نے وضاحت نہیں کی ہے، لیکن ان کا نام اسماء صحابہ کرام کے جمع کرنے والوں کے ذیل میں آیا ہے[۱۸۷] اور ابو نعیم الاصبہانی (۳۳۶-۴۳۰ھ) کی معرفۃ الصحابۃ جس کا مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ابن کثیر کے پاس موجود تھا۔[۱۸۸] مگر حوالہ کے طور پر اس کے نام کی وضاحت ابن کثیر نے صرف ایک بار کی ہے[۱۸۹]۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ امہات المؤمنین اور آپؐ کی اولاد، غلام، لونڈیوں اور کتاب وغیرہ کے حصہ کی ابو نعیم کے حوالہ سے دی ہوئی معلومات و اقوال ان کی مذکور کتاب ہی سے لئے گئے ہیں، ان کے علاوہ ابن عبدالبر (۳۶۸-۴۶۳ھ) کے سترہ حوالوں میں ان کی کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب کی وضاحت بھی متعدد جگہ ملتی ہے[۱۹۰] اور ابن الاثیر (۵۵۵-۶۳۰) کے تیس حوالوں میں انکی مشہور کتاب أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ کا سیرت اور تراجم صحابہ کرام میں بار بار تذکرہ آیا ہے[۱۹۱]۔ اور اس کتاب کی جمع و ترتیب کی تعریف کی ہے[۱۹۲]

۱۸۳؎ ایضاً ۴/۳۶۶، ۵/۵۹، ۶/۴۰۔ ۱۸۴؎ ایضاً ۵/۱۷۵۔

۱۸۵؎ ایضاً ۵/۳۱۳، ۳۱۵، ۳۳۲،

۱۸۶؎ ایضاً ۳/۱۲۷، ۳۴۶، ۵/۳۳۲، عمر رضا کحالہ ان کی معرفۃ الصحابۃ کے علاوہ ایک اور کتاب طبقات الصحابۃ والتابعین کا ذکر کرتے ہیں، لیکن معجم الصحابۃ ان کے لئے بھی نامعلوم ہے۔ معجم المؤلفین ۹/۴۲)

۱۸۷؎ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ ۵/۹۴، ۳۵۶۔ ۱۸۸؎ ایضاً ۱۲/۴۵، ۱۳/۳۹

۱۸۹؎ ایضاً ۵/۹۴۔ ۱۹۰؎ ایضاً ۲/۲۶، ۴/۳۹، ۳۷۳، ۵/۵۷، ۲۶۹، ۳۳۰، ۳۵۴، ۳۵۶، وغیرہ۔

۱۹۱؎ ایضاً ۳/۱۵۶، ۱۶۱، ۳۲۹، ۳۷۰، ۴/۹۰ وغیرہ۔

۱۹۲؎ ایضاً ۵/۳۵۶۔

حدیث کے متذکرہ بالا متنوع عظیم ذخیرہ کو اپنی سیرت میں سمیٹتے وقت ظاہر ہے کہ ابن کثیر کو صحیح و غیر صحیح احادیث میں تمیز کرنے کے لیے غریب، مشکل اور موضوع احادیث کے ماہر مؤلفین کے اقوال اور ان کی فنی کتابوں کی مدد کی ضرورت پڑی، چنانچہ ان علماء کے اقوال بکثرت اور کہیں کہیں ان کی کتابوں کے ناموں کے حوالے بھی ابن کثیر نے دیے، جیسے قاسم بن ثابت العوفی (۲۵۵-۳۰۲ھ) کی غریب الحدیث[193] ابو جعفر الطحاوی (۲۳۹-۳۲۱ھ) کی مشکل الحدیث[194] اور ابن الجوزی (۵۰۸-۵۹۷ھ) کی الموضوعات[195]

اسی طرح اس عظیم الشان ذخیرہ حدیث میں سے اولیٰ و اصلح کی تلاش و جستجو کے دوران متنازع راویوں کے حالات کی چھان بین سے واسطہ پڑا اور وہ تمام مذکور محدثین کے اقوال کے علاوہ قدیم ترین ماہر علمائے نقد کے اقوال و آثار کا ذکر کرنے پر مجبور ہوئے جیسے یحییٰ بن معین (۱۵۸-۲۳۳ھ) علی بن المدینی (۱۶۱-۲۳۴ھ)، عمرو بن علی الفلاس (۱۶۰-۲۴۹ھ) ابو سلیمان الجوزجانی (وفات ۲۵۹ھ) ابو حاتم الرازی (۱۹۵-۲۷۷ھ) اور ابو زرعۃ الدمشقی (وفات ۲۸۱ھ) اور ان کے علاوہ انہوں نے مندرجہ ذیل علمائے نقد کے اقوال اور جا بجا ان کی کتابوں کے حوالے بھی دیے جیسے ابن عدی (۲۷۷-۳۶۵ھ) کی کتاب الکامل[196] اور الدارقطنی (۳۰۶-۳۸۵ھ) کی کتاب الافراد جس کے بارے میں ابن کثیر کا خیال تھا کہ "بڑے بڑے مردِ میدان ناقد امام اور نادرۂ روزگار حفاظ حدیث کے لیے اس جیسی کتاب ترتیب دینا تو الگ رہا، ان کے لیے اس کا سمجھنا بھی مشکل ہے[197]۔" اس کتاب کا حوالہ تو ابن کثیر نے اپنی تاریخ کے ابتدائی حصہ میں صرف ایک بار ہی دیا ہے[198]۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کے تمام اقوال جو اکثر راویوں کی توثیق یا تضعیف میں بیان ہوئے ہیں۔ وہ دارقطنی کی اسی نادرۂ روزگار کتاب سے لئے گئے ہیں۔ اس باب میں ابن کثیر نے اپنے ناقد استاد اور خسر جمال الدین ابو الحجاج یوسف المزی (۶۵۴-۷۴۲ھ) کے بھی توثیق و تضعیفِ رواۃ میں بکثرت اقوال نقل کئے ہیں اور بعض جگہ ان کی مشہور کتاب تہذیب الکمال فی اسماء الرجال کے حوالے بھی دیے ہیں[199]۔ اور ان سے حاصل کی ہوئی زبانی معلومات بھی جا بجا جمع کر دی ہیں[200]۔ اسی طرح اگرچہ ان کے دوسرے استاد شمس الدین ابو عبداللہ محمد الذہبی (۶۷۳-۷۴۸ھ) کی میزان الاعتدال فی نقد اسماء الرجال کے نام کا حوالہ سیرت کے حصہ میں نہیں ملتا۔ لیکن ان کی ناقدانہ آراء متنازعہ احادیث و رجال کے سلسلہ میں مل جاتی ہیں[201]۔

ابن کثیر کی سیرت نبوی کے مذکورہ متنوع مصادر و مآخذ کے اس مختصر جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی محنت و جاں فشانی اور صبر و استقامت سے اس جامع و شامل سیرت کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا ہے اور اپنے زمانہ تک کے سیرت و شمائل و دلائل

---

۱۹۳ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲/۲۹۲ ۔
۱۹۴ ایضاً ۶/۸۵، ۸۶، ۲۸۲ ۔
۱۹۵ ایضاً ۳/۱۳۴، ۷۸، ۷۹، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۲۸۲ ۔
۱۹۶ ایضاً ۵/۳۴۷ ۔
۱۹۷ ایضاً ۱۱/۳۱۷ ۔
۱۹۸ ایضاً ۱/۳۲۳ ۔
۱۹۹ ایضاً ۳/۳۱۵ ۔
۲۰۰ ایضاً ۴/۱۹۴، ۵/۳۴۷، ۶/۲۴۴، ۲۵۸، ۲۷۶ ۔
۲۰۱ ایضاً ۵/۲۰۹، ۲۱۲ ۔ ۲۱۴، ۶/۷۹، ۲۵۱، ۲۸۲ ۔

کے اہم مواد کو اس میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے، اور بڑی حد تک تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب آئندہ صفحات میں ان کی سیرت کے ان اہم موضوعات کو مختصراً سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں بکھرا ہوا ہے جیسے طریقہ کار، علمی دیانت، ترتیب کتاب، اسلوب بیان اور مذکورہ سیرت کی مقبولیت وغیرہ۔

حاصل بحث

۱۔ طریقۂ کار

ابن کثیر نے اپنی سیرت نبوی کی ترتیب و تدوین کے طریقۂ کار کی الگ سے کوئی وضاحت نہیں کی ہے، سوائے ان اشاروں کے جو ان کی تاریخ البدایۃ والنہایۃ کے ابتدائی حصہ میں ان کے تفسیرِ قرآن کے مسلک اور مقبول و مردود اور موقوف اسرائیلی روایات سے متعلق ہیں[۲۰۲] اور جن کا ذکر قرآنی تفاسیر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

لیکن ان کا یہ تفسیری طریقۂ کار اور اسرائیلیات کے بارے میں مذکورہ مؤقف جس طرح ان کی عام تاریخ کے لیے کافی بنیاد نہیں فراہم کرتا، اسی طرح ان کی مذکورہ سیرت کی تدوین کے لئے بھی اس کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ کیونکہ اسرائیلی روایات کا اصل میدان سابق انبیاء کرام اور ان کی قوموں کی تاریخ تھی، جن کا مجمل ذکر قرآن کریم نے صرف عبرت و موعظت کے نقطۂ نظر سے کیا تھا اور بعد میں ان مجمل اشاروں کی غیر ذمہ دارانہ تفصیلی خانہ پری عیسائی اور یہودی علماء سے سنے سنائے قصوں اور داستانوں کی بنیاد پر رکھی گئی اور ان کو رواج دیا گیا، لیکن مستند مسلمان علماء نے ان کو کبھی قابلِ اعتنا تو کیا، ان کے ذکر کو بھی مستحسن نہ سمجھا، بلکہ ان کو اسرائیلیات کا مخصوص نام دے کر اسلامی روایات و احادیث سے بالکل الگ تھلگ رکھا اور ان کا گذر سیرت پاک کی روایات میں اس لئے نہیں ہو پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ روزِ روشن کی طرح عیاں رہی اور اس میں باہر سے درآمد کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی اور قصہ گو واعظین کے زیبِ داستان کے لئے خیال آرائی اور مبالغہ آمیزی پر مبنی بیانات کو نہ صرف یہ کہ وقت کے علماء نے پسند نہ کیا بلکہ ان کے نامۂ اعمال میں ان کے میلانات و رجحانات اور ان کی غیر محتاط روش کا پردہ چاک کر کے بعد کے آنے والوں کو ان کی روایات سے محتاط رہنے کے لئے ہوشیار کر دیا۔

بہرحال زیرِ بحث سیرت نبوی میں ابن کثیر کا طریقۂ کار معلوم کرنے کے لئے ان کی سیرت کا تتبع ضروری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سیرت کے بنیادی مصادر اصحابِ سیر و مغازی و تاریخ اور اہلِ حدیث علماء اس سلسلہ میں ان کے لئے نمونہ و مثال رہے ہیں، خاص کر ابن اسحٰق، ابن ہشام، سہیلی اور طبری جن سے انہوں نے اپنی سیرت کا ڈھانچہ اخذ کیا اور انہی کے طریقۂ کار پر عمل پیرا ہوئے اور شمائل کے حصہ میں امام ترمذی کی اتباع کی اور دلائل کے حصہ میں امام بیہقی اور ابو نعیم الاصبہانی کے طریقِ کار کو عمومی طور پر اپنا رہنما بنایا اور سیرت کے تینوں مذکور حصوں میں امام بخاری، امام مسلم اور امام احمد بن حنبل سے بھی گہرا تاثر قبول کیا، اور ان کے اسِ

---

[۲۰۲] ایضاً ۱/۶-۷، ۲/۱۳۲-۱۳۴۔

دیگر محدثین کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے سند کے ساتھ روایت اور سلسلۂ سند اور کبھی کبھی متن کی تنقیدی بحث و تحقیق اور احادیث و روایات کی صحت و ضعف اور استناد و اعتبار کا درجہ بیان کرنے کا اہتمام و التزام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

لیکن دلائل نبوت کے باب میں ان کا تساہل حیرت انگیز بھی ہے اور تعجب خیز بھی اور اس کا عذر خواہ وہ سابقین کی تقلید ہو یا عجائب و غرائب سے دلچسپی یا احاطہ و شمول کا شوق جنون[۲۰۳] بہرحال عذر بدتر از گناہ کے مصداق ہے۔ لیکن اس لئے قابل درگذر بھی ہے کہ وہ اکثر خود ہی اس کی طرف توجہ مبذول کراتے جاتے ہیں۔

۲۔ علمی دیانت

ان کی عالمانہ شان و عظمت کے مطابق یہ ان کی خوبی ہے کہ وہ اپنے مصادر و مآخذ کی خود ہی نشاندہی کرتے جاتے ہیں اور عام طور پر احادیث کے علاوہ سیر و مغازی و تاریخ کے مواد میں بے ضرورت نقل حرفی سے کام نہیں لیتے، کیونکہ ان کے سامنے جو وافر مواد تھا اس کو اپنی سیرت میں ضم کرنے میں یہ ممکن بھی نہ تھا اور مسلسل مربوط سیرت نگاری کے لئے ایک مستحسن اور مطلوب قدم بھی۔ اس لئے حتی الامکان وہ اپنے سامنے ایک واقعہ سے متعلق تمام روایات کو رکھ کر اختصار و تلخیص حذف و اضافہ، زیادتی و کمی اور تقدیم و تاخیر سے کام لیتے ہوئے، ان کو اپنی زبان میں ایک سیاق میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بوقت ضرورت اس میں اضافی معلومات اور اختلافی نکات کو نمایاں کرنے کے لیے اکثر ان مؤلفین کے نام اور کبھی کبھی اُن کی کتابوں کے حوالے دیتے جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار کے ضمنی فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ سابق مؤلفین کی حق شناسی اور قدر دانی کے فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ان کی بہت سی ایسی کتابوں کے نام، ان کی آراء اور اُن کے اقتباسات کے نمونے محفوظ ہوگئے جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ نیز خود ان کے مصادر و مآخذ پر بعد کے زمانہ میں تحقیقی کام کرنے والوں کو سہولت فراہم ہوگئی۔ جس کے لیے کم از کم راقم تو بہت زیادہ شکر گزار ہے

۳۔ تنقیدی غیر جانبداری

ان کی ایک اور قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذکورہ مصادر مآخذ سیرت میں سے کسی کو بھی آنکھ بند کر کے قبول یا رد نہیں کیا ہے، بلکہ ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھی ہیں اور اپنے علم و بصیرت اور ضمیر کی روشنی میں سیاق و سباق کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے معلومات اور اقتباسات حاصل کئے ہیں اور بوقتِ ضرورت ان پر کلام بھی کیا ہے، تعریف و تحسین کے موقعوں پر بخل سے کام نہیں لیا، اور بھول چوک مغالطہ، بے محل استنتاج اور غلط رائے پر خاموش نہیں رہے، بلکہ قدماء کی سبقت اور عظمت کا خیال کئے بغیر کھل کر گرفت کی، چنانچہ ہماری نظر سے مذکورہ مصادر میں کوئی ایسا اہم مصدر نہیں گذرا، جس کی بوقت ضرورت انہوں نے تصحیح تنقید یا اس پر استدراک نہ کیا ہو۔

---

[۲۰۳] ایضاً ۲/۳۱۹، ۳۵۶، ۳/۱۴۵، ۵/۹۶-۹۷، ۶/۲۹۶،

۴۔ ترتیبِ کتاب

سیرت کی ترتیب کے سلسلہ میں جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ابن کثیرؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہجرت مدینہ سے پہلے تک کے حالات و واقعات و حوادث " موضوعات کی ترتیب زمانی " کے لحاظ سے بیان کئے ہیں، جس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک واقعہ سے متعلق تمام مواد ایک جگہ مِل جاتا ہے جبکہ ہجرت کے بعد کے حالات و واقعات اور غزوات و فتوحات " سن وار " ترتیب کے لحاظ سے بیان کئے ہیں، لیکن مہینہ تاریخ اور دن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ قدیم تاریخی واقعات میں اس کا لحاظ رکھنا ناممکن تھا۔ بہرحال اس طریقۂ کار کا سقم اس وقت بری طرح محسوس ہوتا ہے جب کئی سالوں میں پیش آنے والے واقعات، جنگوں وغیرہ کی تفصیلات کے لئے قاری کو مسلسل کئی کئی سالوں کے حالات کی ورق گردانی کرنا پڑتی ہے اور اس تسلسل کے ٹوٹنے کا اثر خود مؤرخ یا سیرت نگار پر کبھی تکرار کی شکل میں اور کبھی سہو و نسیان کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

لیکن ابن کثیر کی سیرت کے مابعد ہجرت حصہ میں " سن وار " تقسیم کے باوجود اس عیب کو ابھرنے نہیں دیا گیا ہے، جیسا کہ بعد کے تاریخی حصہ میں پیش آیا ہے، کیونکہ ہجرت کے ابتدائی دس گیارہ سال میں ایسے واقعات پیش نہیں آئے۔ ابن کثیر نے مذکورہ ابتدائی سالوں کے واقعات کو " .... سن ہجری کے واقعات " یا " .... سن ہجری کے واقعات کا ذکر " یا صرف " ..... سن ہجری " کے عنوان سے شروع کیا ہے اور پھر انہوں نے ہر سال کے واقعات کو بھی حسب سابق موضوعات یا علیحدہ مستقل فصول کے تابع کر دیا ہے بعض سالوں کے آخر میں اس سال کے " جملہ حوادث " کی فصل قائم کی ہے، لیکن اس کا التزام نہیں کیا ہے وفیات کا ذکر اکثر سال کے درمیان میں گذر چکا ہے، اس لئے سال کے آخر میں ان کے ذکر کی پابندی بھی نہیں کی گئی ہے اور ان کے حالاتِ زندگی کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ بھی نہیں ملا ہے۔

۵۔ اسلوبِ بیان

ابن کثیر کی بہترین علمی استعداد کے ساتھ ساتھ ان کی " ادبی صلاحیت بھی اچھی تھی، اور وہ شعر بھی کہہ لیتے تھے "[۲۰۴] لیکن وہ کوئی پیشہ ور ادیب و شاعر نہ تھے کہ بات میں بات پیدا کرنے کے لیے لفظی سجع و سجع اور اسلوب کی زیبائی اور عبارت کی جمال آرائی میں اپنا فنی کمال ثابت کرنے پر زور دیتے، ان کی علمی تحریر جان دار پختہ، بے عیب اور فکر و معانی سے لبریز ہے اور انداز بیان تصنع اور تکلف سے پاک سادہ سلجھا ہوا، اور دلنشین ہے۔

۶۔ مقبولیت

ابن کثیر ان خوش قسمت مصنفین میں ہیں جن کی تصنیفات ان کی زندگی میں بھی مشہور اور مقبول عام و خاص ہوئیں اور ان کے بعد بھی

۲۰۴۔ ابن قاضی شہبہ، طبقات الشافعیۃ، ۳/۱۱۵، النعیمی، الدارس فی تاریخ المدارس مطبعۃ الترقی، دمشق، ۱۳۶۷ھ ۱/۳۷، طاشکبری زادہ مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد ۱۳۲۸ھ-۱۳۵۶ھ ۱/۲۲، ابن العماد، شذرات الذہب ۶/۲۳۱۔

متداول رہیں۔ چنانچہ ان کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ "اُن کی تصنیفات ان کی زندگی ہی میں ملک ملک پہنچیں اور ان کی وفات کے بعد بھی لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا[۲۰۵]" اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر و بیشتر مشہور کتابیں زمانہ کی دست بُرد سے محفوظ رہیں اور ہم تک پہنچ سکیں۔

ان کی زیرِ بحث سیرت کے سلسلہ میں بھی مقبولیتِ عام و خاص کی بات صحیح ہے، جس کی مندرجہ ذیل واقعہ تصدیق کرتا ہے جو خود ابنِ کثیر کی زبانی ان کی تاریخ میں نقل ہوا ہے۔ اوّل عشرہ ماہ رجب ۷۶۳ھ کے واقعات میں وہ رقم طراز ہیں کہ "قاضی عماد الدین الشیرازی ایک صاحبزادہ نے ایک درسِ حدیث کا پروگرام ترتیب دیا جس میں عماد الدین بن السراج نے البدایۃ والنہایۃ میں جو کچھ آیا ہے، اس پر گفتگو فرمائی، ان کے پاس بہت سے لوگ اور ایک جمّ غفیر جمع تھا، اور انہوں نے میرے ہاتھ سے لکھی ہوئی سیرت نبوی دمشق کے قبۃ النسر کے نیچے اس کرسی پر سے پڑھی جہاں سے قرآن شریف کی تلاوت کی جاتی ہے[۲۰۶]۔"

اسی طرح ان کے ترجمہ نگاروں نے بھی ان کی اس سیرت کی تعریف و توصیف کی ہے۔ چنانچہ ابن قاضی شہبہ کا خیال تھا کہ "ابن کثیر کی تاریخ میں سب سے بہتر ان کی سیرت نبوی ہے[۲۰۷]" اور سخاوی نے بھی اس سیرت کی تعریف کی ہے[۲۰۸]۔ اور لکھا ہے کہ شہاب الدین احمد بن اسمٰعیل الابشیطی (وفات ۸۳۵ھ) کی سیرت کی جامع کتاب میں منجملہ اور مصادر کے ابنِ کثیر کی تاریخ میں مذکور سیرت پر مشتمل ہے[۲۰۹]۔

خاتمہ

اس بحث میں ابن کثیر کی سیرت نبوی کے اس مختصر جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اس سیرت کی ترتیب و تدوین میں کتنی عرق ریزی اور جگر سوزی سے کام لیا ہے، انہوں نے علم حدیث کے فنی اختصاص کی روشنی میں اپنے مصادرِ سیرت کا انتخاب کیا اور عام طور پر ان مؤرخین و سیرت نگاروں کو جن کی فن حدیث سے علمی اور تصنیفی مناسبت مسلّم تھی اور تقریباً ساڑھے سات سو سال پر پھیلی ہوئی طویل مدت میں اسلامی علوم و فنون کی متعلقہ علمی و فنی اور اختصاصی تخلیقات کو کھنگال ڈالا اور سیر و مغازی و تاریخ کی معروف و مشہور کتابوں کے علاوہ آسمانی کتابوں، قرآنی تفسیروں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جزئی پہلوؤں سے متعلق اکثر و بیشتر عام و خاص کتابوں کے مواد کو قابلِ اعتبار ذخیرۂ حدیث کے ساتھ بہت تفصیل سے پہلی بار ایک جگہ سلیقہ سے جمع کر دیا اور پھر اس کو علم حدیث کے ماہرانہ فنی ادراک کی روشنی میں پرکھا اور اس طرح تاریخ و سیرت کے باب میں قابل قدر نئے طریقے اور عظیم علمی ذخیرہ کا اضافہ کیا، جو ایک طرف ان کو دوسرے مؤرخین اور سیرت نگاروں سے ممتاز کرنے والی خصوصیت ہے، تو دوسری طرف ان کے بعد سیرت پر کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ۔

---

۲۰۵ ابنِ حجر، الدرر الکامنۃ فی اعیان المئۃ الثامنۃ، دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۰ھ، ۳۷۴/۱، السیوطی، ذیل طبقات الحفاظ للذہبی، مطبعۃ توفیق، مصر، ۱۳۴۷ھ، ۳۶۱-۳۶۲، الشوکانی، البدر الطالع بمحاسن القرن السابع، مطبعۃ السعادۃ، القاہرہ ۱۳۴۸ھ، ۱۵۳/۱۔

۲۰۶ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، ۲۹۴/۱۴۔

۲۰۷ حاجی خلیفہ، کشف الظنون ۲۲۸/۱۔ ۲۰۸ السخاوی، الجواہر والدرر، ضمیمہ الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ ص ۳۵۹۔

۲۰۹ السخاوی، الاعلان ص ۱۶۲-۱۶۳۔

علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی

محمد عبدالحکیم شرف قادری

حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل بن یوسف بن اسماعیل بن ناصر الدین نبہانی قدس سرہ فلسطین کی شمالی جانب واقع قصبہ اجزم میں ۱۲۶۵ھ/۹-۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے یہ قصبہ اس وقت حیفا کے حدود میں واقع ہے، عرب کے ایک بادیہ نشین قبیلہ بنو نبہان کی نسبت سے نبہانی کہلاتے ہیں، قرآن پاک والد ماجد شیخ اسماعیل نبہانی سے پڑھا، اسی سال کی عمر کے باوجود ان کے حواس بالکل صحیح اور صحت بہت عمدہ تھی اکثر و بیشتر اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرتے وہ ہر روز دس پارے کی تلاوت کرتے پھر ایک ہفتے میں تین قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے۔

پھر علامہ نبہانی جامع ازہر مصر میں داخل ہوئے اور محرم ۱۲۸۳ھ سے رجب ۱۲۸۹ھ تک تکمیل علم میں مصروف رہے، علامہ فرماتے ہیں میں نے وہاں ایسے ایسے محقق اساتذہ سے استفادہ کیا کہ اگر ان میں ایک بھی کسی ولایت میں موجود ہو تو وہاں کے رہنے والوں کو جنت کی راہ پر چلانے کے لیے کافی ہو اور تن تنہا تمام علوم میں لوگوں کی ضروریات کو پورا کر دے۔

چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

۱۔ علامہ سید محمد دمنہوری شافعی (م ۱۲۸۶ھ)
۲۔ علامہ شیخ ابراہیم الزور خلیلی شافعی (م ۱۲۸۷ھ)
۳۔ علامہ شیخ احمد الاجہوری شافعی نابینا (م ۱۲۹۳ھ)
۴۔ علامہ شیخ حسن العدوی المالکی (م ۱۲۹۸ھ)
۵۔ علامہ شیخ سید عبدالہادی نجا الابیاری (م ۱۳۰۰ھ)
۶۔ علامہ شیخ شمس الدین محمد الانبابی الشافعی (اس وقت کے شیخ الازہر)
۷۔ علامہ شیخ عبدالرحمٰن الشربینی الشافعی
۸۔ علامہ شیخ عبدالقادر الرافعی الحنفی الطرابلسی؛ (شامی پر التحریر کے نام سے دو جلدوں میں ان کا حاشیہ ہے)
۹۔ علامہ شیخ یوسف برقاوی حنبلی، شیخ المشائخ علامہ ابراہیم السقا الشافعی (م ۱۲۹۸ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ۔

علامہ نبہانی سب سے زیادہ اپنے استاذ علامہ ابراہیم السقا کے معترف اور مداح دکھائی دیتے ہیں، ان سے شیخ الاسلام زکریا انصاری کی شرح تحریر اور شرح منہج اور ان پر علامہ شرقاوی اور بجیرمی کے حواشی پڑھے اور تین سال تک اُن سے فیض یاب ہوئے، انہوں نے علامہ نبہانی کو سند دیتے ہوئے ان القاب سے نوازا ہے۔

الامام الفاضل والهمام الكامل والجهبذ الابر، اللوذعي الاريب والالمعي الاديب

ولدنا الشيخ يوسف بن الشيخ اسمٰعيل النبهانی ايده الله بالمعارف ونصر له

اندازہ کیجئے کہ اساتذہ کی نظر میں علامہ نبہانی کی کتنی قدر و منزلت تھی، اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ مذہباً شافعی تھے۔

جب علامہ کے علم و فضل کا چرچا ہوا تو بیروت میں محکمۃ الحقوق العلیا کے رئیس (وزیر انصاف) مقرر کئے گئے، ایک عرصہ تک اس منصب پر فائز رہے، آخر عمر میں انہوں نے اپنے اوقات عبادت اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دیئے اور ایک عرصہ مدینہ طیبہ میں رہے۔

حضرت علامہ نبہانی قدس سرہ نے اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، ان کی تمام تصانیف مفید ہیں اور مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ ان کی تمام تصانیف حدیث شریف اور اس کے متعلقات سے وابستہ ہیں، حدیث شریف کے علاوہ انہوں نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی فرمائی ہے سیرت مبارکہ، علم الاسانید، اکابر علماء و مشائخ کا تذکرہ، درود شریف اور بارگاہ رسالت میں پیش کئے جانے والے قصائد و جواہر جو خود علامہ نے لکھے یا مذاہب اربعہ کے متقدمین اور متاخرین علماء نے لکھے، ان کی تصانیف کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی تمام کتابیں چھپ چکی ہیں، بلکہ بعض کتابوں کے تو کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا عطا محمد گولڑوی مدظلہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی، امام احمد رضا بریلوی اور علامہ نبہانی کا وصف مشترک یہ تھا کہ انہوں نے پوری زندگی نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عشق و محبت میں بسر کی اور تاحیات عشق رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا درس دیتے رہے، دین اسلام کی خدمت ان کا سرمایۂ حیات اور قرآن و حدیث کی تبلیغ و اشاعت ان کا وظیفۂ زندگی تھا۔

علامہ نبہانی نے سات سو پچاس اشعار پر مشتمل قصیدۃ الرائیۃ الکبریٰ لکھا جس میں دین اسلام اور دیگر ادیان کا تقابل پیش کیا ہے بالخصوص عیسائیت کا تفصیلی رد کیا ہے کیونکہ عیسائی آئے دن اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے رہتے تھے، دوسرا قصیدۃ الرائیۃ الصغریٰ پانچ سو پچاس اشعار پر مشتمل لکھا جس میں سنت مبارکہ کی تعریف و توصیف اور بدعت کی مذمت کی اور اُن اہل بدعت مفسدین کا بھرپور رد کیا جو اجتہاد کا دعویٰ کرتے ہیں اور خدا کی زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔

ان قصائد کو آڑ بنا کر بعض کفار اور منافقین نے سلطان عبدالحمید، سلطان ترکی کے کان بھرے کہ علامہ نبہانی ان قصائد کے ذریعے تمہاری رعایا میں انتشار پھیلا رہے ہیں چنانچہ ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں جب علامہ مدینہ طیبہ پہنچے تو انھیں شاہی حکم کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔

علامہ فرماتے ہیں:

حُبِستُ فِی المَدِینَۃِ مُدَّۃً اُسبُوعٍ لٰکِن بِالاِکرَامِ وَالاِحتِرَامِ[۲]

"مجھے مدینہ طیبہ میں ایک ہفتے تک قید رکھا گیا، لیکن عزت و احترام کے ساتھ"

قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنی خلیفہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہما اس واقعہ کا عینی شاہد تھے انہوں نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا اور مولانا الحاج محمد منشا تابش قصوری نے اسے قلم بند کیا، انہی کے الفاظ میں تفصیل لاحظہ ہو:

ایک دفعہ سلطان عبدالحمید نے مدینہ منورہ کے گورنر بصری (پاشا) کو علامہ نبہانی کی گرفتاری کا حکم دیا، گورنر بصری علامہ کا انتہائی معتقد تھا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلطان کا حکم نامہ پیش کیا، علامہ نبہانی ملاحظہ فرماتے ہی گویا ہوئے:

سَمِعتُ وَقَرَأتُ وَاَطَعتُ

میں نے سنا، پڑھا اور اطاعت کی

گورنر بصری عرض کرنے لگا حضرت اگر فتاری تو ایک بہانہ ہے گورنر ہاؤس تشریف لائیے آپ میرے ہاں بحیثیت

مہمان ہی ہوں گے، اس بہانے مجھے میزبانی کا شرف حاصل ہو جائے گا جو علماء و فضلا اور مشائخ آپ سے ملاقات کے لئے آئیں گے وہ بھی میرے ہی مہمان ہوں گے، آپ کے عقیدت مندوں پر گورنر ہاؤس کے دروازے ہر وقت کھلے رہیں گے، آپ کا گورنر ہاؤس میں قیام قید نہیں محض سلطان کے حکم کی تعمیل کا ایک حیلہ ہے۔

حضرت علامہ یوسف نبہانی عالم اسلام کی ممتاز شخصیت تھے، ہم عصر علماء و مشائخ کے ان کے ساتھ گہرے مراسم تھے ان کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح بڑی تیزی سے عالم اسلام میں پھیل گئی خاص و عام سراپا احتجاج بن گئے، مگر علامہ یوسف بالکل مطمئن، گھبراہٹ اور پریشانی کا نام تک نہیں تھا پھر بھی علماء و زعماء ملت نے ملاقات کے دوران علامہ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کی رہائی کے لئے سلطان سے اپیل کرتے ہیں علامہ نے فرمایا: اگر آپ کو اپیل کرنا منظور ہے تو سلطانِ وقت کی بجائے سلطانِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں صلوٰۃ و سلام کے ساتھ یوں استغاثہ عرض کریں:

صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ صَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ صَلَاةً وَسَلَامًا عَلَيْكَ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَلَّتْ حِيْلَتِيْ أَنْتَ وَسِيْلَتِيْ أَدْرِكْنِيْ يَا سَيِّدِيْ
يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

حضرت قطب الوقت (مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنی قدس سرہ) نے فرمایا چنانچہ ہم نے اگلی تین دن تک ہی اس درود شریف کے ساتھ استغاثہ پیش کیا تھا کہ سلطان عبدالحمید کے گورنر بصری کو پیغام ملا حضرت الشیخ یوسف النبہانی کو باعزت بری کر دیا جائے۔

علامہ نبہانی فرماتے ہیں:

جب حکومت پر واضح ہو گیا کہ میں پورے خلوص کے ساتھ دین اسلام کی خدمت کر رہا ہوں اور دین متین اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کر رہا ہوں تو میری رہائی کا حکم صادر کر دیا گیا اور حکومت کے ذمہ دار افراد نے گرفتاری پر معذرت پیش کی۔

علامہ نبہانی کی تصانیف عالیہ کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ الفتح الکبیر فی ضم الزیادات الی الجامع الصغیر، جامع صغیر اور اس کے حاشیہ "زیادۃ الجامع الصغیر" پر مشتمل ہے، یہ دونوں کتابیں چودہ ہزار چار سو پچاس حدیثوں پر مشتمل تھیں علامہ نبہانی نے انھیں حروف معجم کے مطابق مرتب کیا ہر حدیث کے بارے میں بتایا کہ یہ کس نے روایت کی ہے اور ان کا اعراب بھی بیان کیا، یہ کتاب مطبعہ مصطفےٰ البابی الحلبی و اولادہ مصر کی طرف سے تین جلدوں میں علامہ کے وصال کے بعد چھپی۔

۲۔ منتخب الصحیحین: تین ہزار دس حدیثوں پر مشتمل ہے اور اعراب و حرکات مکمل طور پر لگائے گئے ہیں۔

۳۔ قرۃ العینین علی منتخب الصحیحین: منتخب الصحیحین پر حاشیہ۔

۴۔ وسائل الوصول الی شمائل الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

۵۔ افضل الصلوات علیٰ سید السادات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

۶ ـ الاحادیث الاربعین فی وجوب طاعۃ امیر المومنین ـ
۷ ـ النظم البدیع فی مولد الشفیع صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ـ
۸ ـ الھمزیۃ الالفیہ (طیبۃ الغرا) فی مدح سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ـ
۹ ـ الاحادیث الاربعین فی فضائل سید المرسلین ـ
۱۰ ـ الاحادیث الاربعین فی امثال افصح العالمین ـ
۱۱ ـ قصیدہ سعادۃ المعاد فی موازنۃ بانت سعاد ـ
۱۲ ـ مثال نعلہ الشریف صلی اللہ علیہ وسلم
۱۳ ـ حجۃ اللہ علی العالمین فی معجزات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ـ
۱۴ ـ سعادۃ الدارین فی الصلوٰۃ علی سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم ـ
۱۵ ـ السابقات الجیاد فی مدح سید العباد صلی اللہ علیہ وسلم ـ
۱۶ ـ خلاصۃ الکلام فی ترجیح دین الاسلام ـ
۱۷ ـ ہادی المرید الی طرق الاسانید ثبتہ الجامع النافع ـ
۱۸ ـ الفضائل المحمدیۃ ترجمہا لبعض السادات العلویۃ للغۃ الجاویہ ـ
۱۹ ـ الورد الشافی یشتمل علی الادعیہ والاذکار النبویۃ ـ
۲۰ ـ المزدوجۃ الغرا فی الاستغاثۃ باسماء اللہ الحسنیٰ ـ
۲۱ ـ المجموعۃ النبہانیۃ فی المدائح النبویہ واسماء رجالہا (چار جلدوں میں)
۲۲ ـ نجوم المہتدین فی معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم، والرد علی اعداء اخوان الشیاطین ـ
۲۳ ـ ارشاد الحیاری فی تحذیر المسلمین من مدارس النصاریٰ التی اہلکت دین المسلمین ـ
۲۴ ـ جامع الثناء علی اللہ وہو یشتمل علی جملۃ من احزاب اکابر الاولیاء ـ
۲۵ ـ مفرج الکروب، ویلیہ حزب الاستغاثات، ویلیہ احسن الوسائل فی نظم اسماء النبی الکامل ـ
۲۶ ـ ویلیہ کتاب الاسماء فیما لسیدنا محمد من الاسماء ـ
۲۷ ـ البرہان المسدد فی اثبات نبوۃ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ودلیل التجار الی اخلاق الاخیار ـ
۲۸ ـ والرحمۃ المہداۃ فی فضل الصلاۃ وحسن الشرعۃ فی مشروعیۃ صلاۃ الظہر بعد الجمعہ ورسالۃ ـ
۲۹ ـ التحذیر من اتخاذ الصور والتصویر، وتنبیہ الافکار لحکمۃ اقبال الدنیا علی الکفار ـ
۳۰ ـ سبیل النجاۃ فی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ـ
۳۱ ـ القصیدۃ الرائیۃ الکبریٰ فی مجموعۃ منہا سعادۃ الانام فی اتباع دین الاسلام ـ

۳۲ - ومختصر ارشاد الحیاری ۔

۳۳ - الرائیۃ الصغریٰ فی ذم البدعۃ و مدح السنۃ الغرأ ۔

۳۴ - جواہر البحار فی فضائل النبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم (چار جلدوں میں)

۳۵ - تہذیب النفوس فی ترتیب الدروس مختصر ریاض الصالحین للنووی ۔

۳۶ - اتحاف المسلم جعلہ خاصا بما ذکرہ صاحب الترغیب والترہیب من احادیث البخاری ومسلم ۔

۳۷ - جامع کرامات الاولیأ ومعہ رسالۃ لہ فی اسباب التالیف (دو جلدوں میں) ۔

۳۸ - دیوان المدائح المسمی العقود اللؤلؤئیۃ فی المدائح النبویۃ ۔

۳۹ - الاربعین، اربعین من احادیث سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، وہو کتاب نفیس جامع ۔

۴۰ - الدلالات الواضحات شرح دلائل الخیرات، ذیلہا المبشرات المنامیۃ ۔

۴۱ - صلوات الثنا علیٰ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۴۲ - القول الحق فی مدح سید الخلق صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۴۳ - الصلوات الالفیۃ فی الکمالات المحمدیۃ ۔

۴۴ - ریاض الجنۃ فی اذکار الکتاب والسنۃ ۔

۴۵ - الاستغاثۃ الکبریٰ باسماء اللہ الحسنیٰ ۔

۴۶ - جامع الصلوات علیٰ سید السادات ۔

۴۷ - الشرف فی المؤبد لآل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۴۸ - الانوار المحمدیۃ مختصر المواہب اللدنیۃ ۔

۴۹ - صلوات الاخیار علی النبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم ۔

۵۰ - تفسیر قرۃ العین من البیضاوی والجلالین ۔

۵۱ - البشائر الایمانیۃ فی المبشرات المنامیۃ ۔

۵۲ - الاسالیب البدیعۃ فی فضل الصحابۃ واقناع الشیعۃ[۵] ۔

علامہ نبہانی اسلام کا درد رکھنے والے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے انہوں نے اپنے زمانے میں دیکھا کہ مسلمان اپنے بچوں کو عیسائی مشنری سکولوں میں داخل کرواتے ہیں جہاں انھیں انگریزی زبان اور کچھ دنیاوی علوم سکھائے جاتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بچے، عیسائیوں کی عبادت میں شریک ہوتے ہیں، اس کیفیت نے انھیں شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا، چنانچہ انہوں نے ایک رسالہ "ارشاد الحیاری فی تحذیر المسلمین من مدارس النصاریٰ" لکھا اور بڑے زوردار انداز میں مسلمانوں کو اس قبیح طریقے سے منع کیا، یہ رسالہ ایک مقدمہ، چالیس فصول اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے ۔

اس رسالہ میں انھوں نے اپنا ایک نوٹ بھی نقل کیا ہے جو کئی سال پہلے انھوں نے اپنی تصنیف " افضل الصلوات علی سید السادات " کے آخر میں لکھا تھا اس کا عنوان تھا۔

عظیم مصیبت جس کا نوٹس لیا جانا ضروری ہے

فرماتے ہیں:

فرنگی جو سکول اسلامی ممالک میں کھولتے ہیں، ان میں طالب علم کے داخلے کے لیے اہم ترین شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر دن عیسائی لڑکوں کے ساتھ عبادت کے لیے گرجا جائے گا اور ان جیسے دینی افعال سرانجام دے گا اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، اور جسے یہ شرط منظور نہ ہو اسے وہ داخلہ نہیں دیتے۔ بیروت میں بھی ایسے سکول موجود ہیں اور ان میں مسلمانوں کے کچھ بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں مثلاً مدرسہ لیسوعیہ اور مدرسۃ المطران المارونیہ۔

ہم اس بنا پر عیسائیوں کو ہدف ملامت نہیں بنا سکتے کیوں کہ وہ اپنے سکولوں میں اپنے مقاصد کے تحت کام کر رہے ہیں اپنی شرائط صاف صاف بیان کر دیتے ہیں اور کسی کو داخلے پر مجبور نہیں کرتے، البتہ وہ مسلمان ضرور عظیم ملامت کے مستحق ہیں جو راضی خوشی اپنے بچوں کو ان سکولوں میں داخل کرواتے ہیں، بچہ وہیں رہتا اور سوتا ہے اور شرط کے مطابق گرجے میں بھی جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ سچا مسلمان اپنی اولاد کو اس خطرے میں صرف اسی صورت میں داخل کر سکتا ہے کہ یا تو اسے ان شرائط اور قواعد کا علم نہیں یا پھر اس بارے میں اسے حکم شرعی معلوم نہیں۔ جہاں تک ان کی شرط کا تعلق ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے۔ رہا حکم شرعی تو وہ شریعت مبارکہ کی کتابوں میں مذکور ہے اور کسی عالم پر مخفی نہیں ہے۔

میں اس جگہ شفا شریف سے امام قاضی عیاض کی عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تاکہ ہر کسی کو یہ حکم معلوم ہو جائے اور کسی پر مخفی نہ رہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کے آخر میں متعدد امور کفریہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

" اسی طرح ہم اس شخص کو کافر قرار دیں گے جس سے ایسا فعل سرزد ہو جس کے بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہو کہ وہ کافر ہی سے صادر ہو سکتا ہے اگرچہ وہ اس فعل کے باوجود مسلمان ہونے کی تصریح کرتا ہو، مثلاً بت، سورج، چاند، صلیب اور آگ کو سجدہ کرنا، یہود و نصاریٰ کے ہمراہ ان کی عبادت گاہوں (گرجوں وغیرہ) میں جانا، ان کا خصوصی لباس پہننا۔ مثلاً زنار (جینئو) باندھنا اور سر کا درمیانی حصہ منڈوانا۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ افعال کافر ہی سے صادر ہو سکتے ہیں اور یہ افعال کفر کی علامت ہیں اگرچہ ان کا مرتکب مسلمان ہونے کی تصریح کرتا ہو۔"

اس امام کی عبارت کے ظاہر ہونے، دین اسلام کے حکم شرعی کے پہچاننے اور ان سکولوں میں داخلے کی شرائط واضح ہو جانے کے بعد کسی مسلمان کے لیے بے خبری کا عذر باقی نہیں رہتا ——— اس کے بعد بھی جو شخص اپنے بچوں کو ان جیسے سکولوں میں رکھے گا وہ یقین سے محروم اور دین کے معاملہ میں بے پروا واقع ہوا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے غضب سے اس کی پناہ مانگتے ہیں[1] ایک جگہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے عیسائیوں کے اہتمام، بے پناہ دولت صرف کرنے اور سکولوں کے قیام کے علاوہ دور دراز دیہات میں جا کر بچوں اور جہلا کو جمع کر کے پادریوں کا عیسائیت کی تبلیغ

کرنے کا ذکر کر کے مسلمانوں کی حالت زار پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک طرف عیسائیوں کی یہ حالت ہے دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر مسلمان اپنے دین اسلام کی اشاعت کی پروا نہیں کرتے، ان لوگوں کی طرح مال و دولت خرچ نہیں کرتے، اپنے شہروں اور اولاد پر وارد ہونے والے شرک اور شکوک و اوہام کو دور کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے، کیا یہ قبیح ترین رسوائی، شدید ترین خسارہ اور خوفناک محرومیت نہیں ہے؟ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ کفر، ایمان پر حملہ آور ہے، گمراہی بڑھ چکی ہے اور سرکشی پھیلتی جا رہی ہے[۲]"

اللہ تعالیٰ نے علامہ نبہانی کو نظم و نثر میں حیرت انگیز قدرت عطا فرمائی تھی۔ ان کے بعض قصائد تو کئی کئی سو اشعار پر مشتمل ہیں، ایک قصیدہ "النظم البدیع فی مولد الشفیع صلی اللہ علیہ وسلم" میں عرض کرتے ہیں:

یا ربنا بجاهه لدیکا   انا توسلنا به الیکا

معتمدین ربنا علیکا   وطالبین الخیر من یدیکا

فالهم اکل سبیل الرشد

ترجمہ: "اے اللہ! نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جو عزت و منزلت تیری بارگاہ میں ہے ہم تیری بارگاہ میں اس کا وسیلہ پیش کرتے ہیں۔

تجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور تجھ سے بہتری کی دعا کرتے ہوئے (عرض کرتے ہیں کہ) تو سب کو راہ ہدایت عطا فرما۔"

یا رب وارحم امة المختار   فی کل عصر وبکل دار

واحرسهم من سلطة الاغیار   فی سائر البلاد والاقطار

فی کل غور وبکل نجد[۳]

ترجمہ: "اے اللہ! نبی مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی امت پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں رحم فرما۔

اور انھیں تمام شہروں اور اطراف میں سربلند اور پست جگہ غیروں کے تسلط سے محفوظ فرما۔"

عرب ممالک میں علامہ نبہانی اور ہندوستان میں امام احمد رضا بریلوی نہ صرف یہ کہ ہم عصر تھے بلکہ افکار و نظریات میں ایک دوسرے سے ہم آہنگی رکھتے تھے، علامہ نے امام احمد رضا کی تصنیف لطیف "الدولۃ المکیہ" پر زوردار تقریظ لکھی ہے، فرماتے ہیں:

سید عبدالباری سلمہ اللہ تعالیٰ (ابن سید امین رضوان مدنی) نے یہ کتاب الدولۃ المکیہ میرے پاس بھیجی میں نے اول سے آخر تک اس کا مطالعہ کیا اور اسے تمام دینی کتابوں میں بہت ہی نفع بخش اور مفید پایا، اس کے دلائل بہت قوی ہیں جو بڑے امام اور علامۂ اجل سے ہی ظاہر ہو سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی رہے اور اپنی نوازشات سے انھیں راضی رکھے اور ان کی پاکیزہ امیدوں کو برلائے، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے توسل سے بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مصنف ایسے افراد زیادہ سے زیادہ پیدا فرمائے جو ائمۂ اعلام ہوں، اسلام کے حامی ہوں اور کفار اور اہل بدعت کے رد میں مشغول رہیں، ایسے علماء عظیم مجاہد اور دین کی حدود کے محافظ ہیں[۱]

حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی قدس سرہ کا وصال بیروت میں ۱۳۵۰ھ/ ۱۹۳۲ء ماہ رمضان المبارک کی ابتدا میں ہوا آپ کا آخر تک یہ معمول رہا کہ باقاعدگی سے فرض ادا کرنے کے علاوہ کثرت سے نوافل ادا کرتے اور بارگاہ رسالت میں ہدیۂ درود و سلام پیش کرتے، عبادت اور اتباع سنت کا نور آپ کے چہرہ پر جگمگاتا رہتا تھا۔[۱۲]

حجۃ اللہ علی العالمین

علامہ نبہانی کی شہرۂ آفاق تصنیف "حجۃ اللہ علی العالمین فی معجزات سید المرسلین" ہے اس میں انہوں نے وہ تمام دلائل یکجا کر دیئے ہیں جو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے ثبوت پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ کتاب ایک مقدمہ چار اقسام اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ معجزہ کا معنی اور اس کا دیگر خوارق سے فرق۔

۲۔ دیگر انبیاء و مرسلین کو جو معجزہ اور جو فضیلت بھی دی گئی اس جیسی بلکہ اس سے بڑھ کر فضیلت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دی گئی اور یہ کہ آپ نبی الانبیاء ہیں۔

۳۔ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات باقی انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات سے تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ظہور میں بھی زیادہ ہیں نیز ان کے معجزات ختم ہو گئے اور آپ کے بعض معجزات قیامت تک باقی رہیں گے۔

۴۔ متعدد طریقوں سے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی روایات سے آپ کی نبوت یقینی طور پر ثابت ہوتی ہے۔

کتاب کی پہلی قسم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بشارتوں پر مشتمل ہے اور اس میں آٹھ باب ہیں۔

۱۔ کتب سماویہ کی بشارتیں
۲۔ احبار (علماء اہل کتاب) کی بشارتیں
۳۔ راہبوں کی بشارتیں
۴۔ کاہنوں کی بشارتیں
۵۔ جنوں کی بشارتیں
۶۔ بتوں سے سنی گئی بشارتیں
۷۔ متفرق بشارتیں
۸۔ قلم قدرت کی بشارتیں

دوسری قسم نور محمدی کی خلقت سے ولادت باسعادت تک ظاہر ہونے والے خوارق اور دلائل نبوت، یہ قسم چار ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ تخلیق نور کی ابتدا سے پاکیزہ پشتوں اور طاہر رحموں سے منتقل ہوتے ہوئے شکم مادر تک پہنچنے کی تفصیلات۔

۲۔ مدت حمل اور وقت ولادت کے بعض عجائب۔

۳۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں قیام کے دوران پیش آنے والے خرق عادت واقعات۔

۴۔ بعثت سے پہلے واقع ہونے والے بعض خوارق۔

تیسری قسم میں اعلانِ نبوت سے وصال تک کے معجزات ہیں، اس میں بارہ ابواب ہیں۔

۱۔ معجزہ قرآن پاک اس باب کو چار فصلوں میں تقسیم کر کے بتایا ہے کہ (۱) قرآن پاک اکمل اور اعظم معجزہ ہے۔ ۲۔ قرآن پاک کے اعجاز کے چند پہلو، ۳۔ گزشتہ و آئندہ مغیبات کی خبر۔ ۴۔ قرآن پاک کی فضیلت تلاوت کی فضیلت اور آداب۔

۲۔ عالم بالا سے متعلق معجزات، اس میں واقعہ معراج، فرشتوں کا دیکھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا، سورج کا پلٹنا اور شیاطین کو شہاب مارے جانے کا بیان ہے۔

۳۔ مردوں کو زندہ کرنے سے متعلق معجزات، مثلاً والدین کریمین کا زندہ کیا جانا اور آپ پر ایمان لانا اور دیگر مردوں کا زندہ کرنا۔

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے بیماریوں کی شفا اور اخلاق و اعیان کی تبدیلی۔

۵۔ پتھروں کا بولنا، رسالت کی گواہی دینا اور اطاعت کرنا۔

۶۔ حیوانات کا گفتگو کرنا، رسالت کی گواہی دینا اور اطاعت کرنا۔

۷۔ گزشتہ اور آئندہ کی غیبی خبریں دینا۔

۸۔ دعا کی قبولیت سے متعلق معجزات

۹۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے طعام اور دودھ کا زیادہ ہونا۔

۱۰۔ آپ کی مبارک انگلیوں سے پانی کا نکلنا اور آپ کی دعا سے بارش کا برسنا۔

۱۱۔ متفرق معجزات۔

۱۲۔ معنوی معجزات یعنی فضائل و شمائل کا کمال۔

چوتھی قسم میں بعد از وصال ظاہر ہونے والے معجزات بیان کئے ہیں جو نبوت و رسالت کی سچائی کی دلیل ہیں، اس میں تین باب ہیں۔

۱۔ وصال کے بعد رونما ہونے والے متفرق معجزات

۲۔ آپ کی بارگاہ میں عرض حاجت کرنے والوں کی مرادوں کا بر آنا، قیدیوں، جنگل میں گم کردہ راہوں اور بھوک پیاس کے ماروں کا فریاد کرنا اور مشکلات کا حل ہونا۔

۳۔ علامات قیامت۔

خاتمہ میں کرامات اولیا کو ثابت کر کے یہ بتایا ہے کہ اولیا کی کرامتیں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معجزہ ہیں، اس اعتبار سے آپ کے معجزات کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔

مختصر یہ کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق جس قدر فضائل و کمالات اور معجزات میسر ہو سکے علامہ نبہانی نے بڑی خوب صورتی سے اپنی اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں، اس سے اس احساس کو تقویت ملے گی کہ جب اتنی عظیم اور جامع کمالات ہستی کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام اور فرامین کی اطاعت ضروری ہے اور آپ نے کبھی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کی تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں کہ احکام خداوندی سے بے نیاز رہ سکیں اور حبیب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اتنی کامل و اکمل

ذات کو ہمارا رہبر درہ نما بنایا ہے تو ہم آپ کی راہ سے ہٹ کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میندار سعدی کہ راہِ صفا
تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ

مآخذ

۱۔ علامہ نبہانی کے خود نوشت حالات جو "الشرف المؤبد لآل محمد" کے آخر اور "شواہد الحق" کی ابتدا میں درج ہیں:

۲۔ یوسف بن اسماعیل نبہانی علامہ : الدلالات الواضحات ص ۱۳۹

۳۔ محمد منشا تابش قصوری، مولانا : اغثنی یا رسول اللہ ص ۱۵

۴۔ یوسف بن اسماعیل نبہانی علامہ : الدلالات الواضحات ص ۱۲۹

۵۔ شواہد الحق (تعارف مصنف) ص ۸ - ۹

۶۔ یوسف بن اسماعیل النبہانی، امام : ارشاد الحیاری (مطبع حمیدیہ، مصر) ص ۱۶ - ۱۵

۷۔ ایضاً " " ص ۵۱

۸۔ یوسف بن اسماعیل النبہانی، امام : حجۃ اللہ علی العالمین ص ۳ - ۲۵۲

۹۔ ایضاً ضمیمہ الدلالات الواضحات ص ۱۲۹

۱۰۔ الدولۃ المکیہ مطبوعہ کراچی ص ۷۷

۱۱۔ محمد حبیب اللہ بن مایابی الجکنی : شواہد الحق (تعارف) ص ۱۰

ابن الجوزی اور سوانحِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

غلام جیلانی برق

ابن الجوزی کا پورا نام ابو الفرج عبد الرحمٰن جمال الدین بن علی بن محمد القرشی البکری الحنبلی (۵۱۰ - ۵۹۷ھ = ۱۱۱۶ - ۱۲۰۰ء) تھا۔ آپ بغداد کے ایک محلہ جوزہ میں سکونت پذیر تھے۔ اور اسی نسبت سے جوزی کہلاتے تھے۔ مختلف اساتذہ سے درس لیا۔ اور رفتہ رفتہ اپنے مطالعہ ومحنت کی بدولت تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ آپ ایک فصیح البیان واعظ، بلندپایہ محقق اور عظیم المرتبت مصنف تھے۔ اندازاً تین سو کتابیں لکھیں جن میں سے المنتظم فی تاریخ الملوک الامم، کتاب صفۃ الصفوہ (اولیاء و صوفیہ کے حالات)، کتاب القصاص (داستان سراؤں کا ذکر)، سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، الوفاء فی فضائل المصطفیٰ، قصص الانبیاء، مولد النبی صلعم، فی مفردات القرآن بہت وقیع واہم ہیں۔ آپ نے ایک کتاب تلقیح فہوم الاثر کے نام سے حضور صلعم کے حالات پر بھی لکھی تھی، جسے مولانا محمد یوسف بریلوی نے ۱۲۸۶ھ = ۱۸۶۹ء میں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیا۔ یہ جید برقی پریس دہلی میں چھپی تھی۔

یہ کتاب ۳۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں ایک ہزار کے قریب عنوانات ہیں۔ ان میں سے چند عنوانات کا ملخص حاضر ہے؛

حضورؐ کی ولادت

اس بات پر تو سب سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ حضور صلعم ماہ ربیع الاول میں سوموار کو پیدا ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ میں اختلاف ہے۔ کوئی[1] ۲ ربیع الاول بتاتا ہے، کوئی آٹھ، کوئی دس اور کوئی بارہ۔ حضورؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی وفات حضورؐ کی ولادت سے پہلے ہوگئی تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق اُس وقت آپ کی عمر دو ماہ تھی۔ بعض سیرت نگار سات ماہ بتاتے ہیں اور بعض دیگر دو سال چار ماہ۔ لیکن پہلا قول صحیح تر سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی وفات پر حضرت آمنہؓ (والدۂ رسول مقبول) نے ایک مرثیہ کہا تھا، جس کا ایک شعر یہ تھا، ؎

---

[1] ابن خلدون اور طبری ۱۲۔ ربیع الاول کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ابو الفداء ۱۰۔ ربیع الاول لکھتے ہیں۔ اور قاضی سلیمان منصور پوری ۹۔ ربیع الاول مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء کو صحیح مانتے ہیں۔ ریاضی کے ایک فارمولے کے مطابق ۲۲۔ اپریل ۵۷۱ء کو سوموار تھا اس لیے یہی تاریخ درست معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو رحمۃ للعالمین ج ۱۔ طبع لاہور ۱۹۴۹ء، ص ۴۲۔

دَعَتْہُ المَنَایَا دَعْوَۃً فَاَجَابَھَا

وما ترکت فی الناس مثل ابنِ ھاشمٍ

(موت نے اسے دعوت دی اور اُس نے قبول کرلی۔ اب دنیا میں ابنِ ہاشم (عبداللہ) کی نظیر باقی نہیں رہی)

حسب و نسب

حضور صلعم کا نسب نامہ اکیس پُشتوں یعنی عدنان تک تو مُتّفقٌ علیہ ہے۔ لیکن بعد کے ناموں میں اختلاف ہے۔ متفق علیہ نسب نامہ (بریکٹ میں اصلی نام درج ہے):

محمد بن عبداللہ[1] بن عبدالمطّلِب[2] (اصلی نام عامر یا شیبہ) بن ہاشم[3] (عَمْرو) بن عبدِمناف[4] (مُغیرہ) بن قُصَیّ[5] (زید) بن کلاب[6] بن مُرّہ[7] بن کعب[8] بن لُوَیّ[9] بن غالِب[10] بن فِہر[11] بن مالِک[12] بن نَضْر[13] بن کِنانہ[14] بن خُزَیمہ[15] بن مُدرِکہ[16] بن اِلیاس[17] بن مُضَر[18] بن نزار[19] بن مَعَدّ[20] بن عَدنان[21]۔

عدنان کے بعد ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تین کالم ملاحظہ فرمائیے:

تنقیح کے مطابق	"نسب نامۂ رسول" کے مطابق (اختلافات عربی رسم الخط میں)	بائبل کے مطابق ابراہیم و آدم کے درمیان ناموں کا اختلاف
عدنان بن اُدَدُ[22] بن زید[23]	عدنان بن اَدّ بن اُدَدُ	
بن یَقدُدُ[24] بن یَقدُمُ[25]	بن ھمیع بن سلامان	
بن اَلہُمَیسَع[26] بن نَبت[27]	بن ثابت بن حمل	
بن قیذار[28] بن اسماعیل[29]	بن قیذار بن اسماعیل	
بن ابراہیم[30] بن تارِح[31]	بن ابراہیم بن آزر	
بن ناحُور[32] بن سارُوع[33]	بن ناخور بن شاروخ	اردو بائبل میں ناحُور
بن ارعو[34] بن فَالِغ[35]	بن ارعو بن فالغ	〃 〃 〃 ارغو
بن عابِر[36] بن شالِخ[37]	بن غابر بن شالخ	〃 〃 〃 عابِر
بن اَرفَخشَد[38] بن سام[39]	بن ارفخشد بن سام	
بن نُوح[40] بن مَلک[41]	بن نوح بن لامِک	
بن متوشلخ[42] بن اخنوخ[43]	بن مُتوَشلَح بن اخنوخ	

بن الیردؑ بن مہلائیلؑ	بن بیارد بن مہلائیل	اردو بائبل میں یارد
بن قینانؑ بن انوشؑ	بن قینان بن انوش	
بن شیثؑ بن آدمؑ علیہ السلام	بن شیث بن آدمؑ۔	

حضورؐ کی والدہ، نانیاں اور دادیاں

حضورؐ کی والدہ کا اسم مبارک آمنہ بنتِ وَہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ تھا۔ والدہ کی طرف سے شجرہ یوں چلتا ہے:

آمنہ بنتِ مُرّہ بنتِ اُمِّ حُبَیب بنتِ بَرّہ بنتِ قلابہ بنتِ ہند۔

حضورؐ کی چند دادیاں یہ تھیں:

۱۔ فاطمہ بنتِ عَمر بن عائذ والدۂ حضرت عبد اللہ

۲۔ صَخرہ بنتِ عبد بن عمران والدۂ فاطمہ

۳۔ تَخمُر بنتِ عَبد بن قُصَیّ والدۂ صخرہ

حضورؐ کی رِضاعی مائیں

سب سے پہلے حضورؐ کو ابولہب کی ایک کنیز ثُوَیبَہ نے دُودھ پلایا تھا۔ پھر آپ حلیمہ بنتِ عبداللہ السعدیہ کے سپرد ہو گئے حلیمہ آپ کو اپنے قبیلے میں لے گئی اور اڑھائی برس کے بعد واپس لائی۔ ابنِ قُتَیبہ دِیناوری (۸۲۸ ـ ۸۹۶ء) لکھتے ہیں کہ پانچ برس بعد واپس لائی تھی۔

حضرت آمنہ کی وفات اور ما بعد

حضورؐ چھ برس کے تھے کہ حضرت آمنہ اپنے بعض اقارب کو ملنے کے لیے مدینہ گئیں وہاں ایک ماہ رہیں۔ حضورؐ بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر اَبْوَاء (مدینہ کے جنوب میں اسّی میل دُور) میں بیمار پڑ گئیں۔ چند روز بعد اللہ سے جا ملیں۔ اور ابواء ہی میں دفن ہُوئیں۔ اس کے بعد آپؐ کو آپ کے دادا عبد المطلب نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ تقریباً دو برس بعد آپ کے دادا بھی چل بسے اور آپؐ اپنے چچا ابوطالب کے سپرد ہو گئے۔

تجارتی سفر

جب آپؐ کی عمر بارہ برس دو ماہ اور دس دن ہُوئی تو ابوطالب آپ کو ایک تجارتی سفر میں اپنے ہمراہ لے گئے۔ جب

مدینہ سے کوئی دو سو میل شمال کی طرف ایک بستی تیماء میں وارد ہوئے۔ تو وہاں کے راہب نے کہا کہ اگر آپ اپنے اس بھتیجے کے ہمراہ شام میں پہنچے تو وہاں کے یہود اسے قتل کر ڈالیں گے کیونکہ اس میں آنے والے نبی کی تمام علامات پائی جاتی ہیں اور یہود کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ وُہ عرب میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ ابو طالب وہیں سے لوٹ آئے۔

پچیس برس کی عمر میں آپ حضرت خدیجہ کا مالِ تجارت لے کر شام کی طرف گئے اور اتنے کامیاب رہے کہ حضرت خدیجہ نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا جو آپ نے منظور فرما لیا۔ اور ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ جب آپ کی عمر ۴۹ سال ۸ ماہ اور ۱۱ دن ہُوئی تو ابو طالب وفات پا گئے اور صرف تین دن (اور بروایتے پانچ یوم) بعد حضرت خدیجہؓ بھی دار الخلد کو روانہ ہوگئیں۔ آپ کو معراج کی سعادت پچاس سال اور تین ماہ کی عمر میں نصیب ہُوئی تھی اور ۵۳ برس کی عمر میں ہجرت فرمائی۔

حضورؐ کے چچے

حضورؐ کے گیارہ چچے تھے:

۱۔ سب سے بڑا حارث تھا۔ اس نے چاہِ زمزم کھودنے میں اپنے والد کی مدد کی تھی۔

۲۔ ابُوطاہر زُبیر۔ جو شجاعت اور گھڑ سواری میں مشہور تھا۔

۳۔ ابو طالب۔ آپ کا اصلی نام عبد مناف اور کنیت ابو عتبہ تھی۔ حضرت علیؓ آپ ہی کے فرزند تھے۔

۴۔ حضرت ابُو یَعلیٰ حمزہؓ۔ جو غزوۂ اُحُد میں ایک غلام وحشی بن حَرب کی ضرب سے شہید ہُوئے تھے۔

۵۔ ابولہب کا اصلی نام عبد العزیٰ تھا۔ یہ حضورؐ کا شدید دشمن تھا۔ جب بدر میں کفارِ مکہ کو شکست ہُوئی تو یہ غم اور صدمے سے صرف سات دن بعد مرگیا۔

۶۔ غیداق جحل بن عبد المطلب جو فیاضی میں مشہور تھا۔

۷۔ المقوِّم، جو حضورؐ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔

۸۔ صفار۔ یہ بھی اسلام آنے سے پہلے مرگیا تھا۔

۹۔ حضرت عباسؓ۔ یہ اسلام و جاہلیت ہر دو میں حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کا انتظام کیا کرتے تھے۔ آپ کا جنازہ حضرت عثمانؓ نے پڑھایا تھا۔

۱۰۔ قُثَم۔ ان کے حالات ہم تک نہیں پہنچے۔

۱۱۔ حَجل۔ 〃 〃 〃 〃 〃

حضورؐ کی پھوپھیاں

حضورؐ کی چھ پھوپھیاں تھیں: یعنی (۱) اُمِ حکیم البیضاء (۲) بَرّہ (۳) عاتکہ (۴) صَفِیّہ (۵) اَروٰی اور

(۶) اُمیمہؓ ۔ ان میں صرف حضرت صفیہؓ اسلام لائی تھیں۔

حضورؐ کی کنیزیں

حضورؐ کی کنیزیں یہ تھیں:

۱۔ ماریہ قبطیہ، جو آپ کی خدمت میں اسکندریہ کے امیر مُقوقِس نے بھیجی تھی۔

۲۔ ریحانہ بنتِ زید بن عَمرو بنو نضیر سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ نے اسے آزاد کر کے زوجیت میں لے لیا تھا۔

۳۔ بعض سیرت نگار اس فہرست میں جمیلہ، میمُونہ، اُمِّ ایمن، خضرہ، خولہ، اُمیمہؓ، رُقیّہ اور صفیہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔

حضورؐ کے خدّام و غلام

سیرت نگاروں نے غلاموں اور خادمانِ رسول کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ یہ لوگ مختلف اوقات پر حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تھے۔ اِن سب کو حضورؐ نے آزاد کر دیا تھا۔ اِن کے نام یہ ہیں:

ابُو رافع اَسلم (جو حضورؐ کو حضرت عباسؓ نے دیا تھا)، احمر، اُسامہ بن زید، اَفلح، اَیمنؓ، ثوبان، ذکوان، رافِع، رباح الاسوَد، زید بن حارثہ (جو آپ کو حضرت خدیجہؓ نے دیا تھا)، سابِق، سالِم، سلمان الفارسی، سُلَیمُ الدّوسی، سعید بن کندیر، شقران صالح (جو آپ کو عبدالرحمٰنؓ بن عَوف نے پیش کیا تھا)، ضُمیرہ، عبیداللہ بن اَسلم، عُبَید بن عبد الغفار، فَضالہ یمانی، فَضالہ، مِدعَم، نافِع، نُفَیع، نُبَیہ، واقِد، وَرْدان، ہِشام، یَسار (یہ حضور کے اونٹ چراتا تھا)، ربیعہ (آپ کو وضو کراتا تھا)، ابنِ مسعود (آپ کے جوتوں کا خیال رکھتا تھا)، عقبہ (خچر پر متعین تھا)، ابو اُثیلہ، ابوالحمراء، ابورافِع، ابوالسَّمح، ابوضُمیرہ، ابوعُبَید، ابومُویہبہ اور ابو واقد۔ بعض سیرت نگاروں نے کچھ اور نام بھی لکھے ہیں، مثلاً: مُجَبّر، ثعلبہ، بلال بن حارث وغیرہ۔ لیکن ہم انھی ناموں پہ اکتفا کرتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اسّی کے قریب تھی۔

حضورؐ کی اولاد

آپ کی اولاد کے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہَیثَم بن عَدی، ہِشام بن عُروہ سے روایت کرتا ہے اور یہ اپنے والد سے، کہ حضورؐ کے تین بچے تھے، عبد مناف، عبد العُزّیٰ اور قاسم۔ باقی سیرت نگار ہیثم کو کذّاب قرار دیتے ہیں۔ بایں دلیل کہ جس رسول نے زندگی بھر توحید کا درس دیا ہو، وہ اپنے بچّوں کو مشرکانہ نام کیسے دے سکتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ کے چار بیٹے تھے: قاسم، طاہر، عبد اللہ اور مُطَیّب (یا طَیّب)۔ بعض کے ہاں طاہر ہی کا دوسرا نام طیب تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ طیب اور مطیب توام بھائی تھے اور اسی طرح طاہر و مطہر بھی۔ زیادہ قابلِ اعتماد

روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے تین ہی بیٹے تھے : قاسم، جو دو سال زندہ رہا۔ عبداللہ اور طیب، یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ حضورؐ کا چوتھا فرزند ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھا۔ وفات کے وقت اسکی عمر سولہ یا اٹھارہ ماہ تھی۔

آپؐ کی چار بیٹیاں تھیں۔ سب کی سب حضرت خدیجہؓ کی اولاد۔ سب سے بڑی کا نام زینب تھا جس کی شادی حضرت خدیجہ کے بھانجے ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اُمامہ جو بعض اوقات نماز میں حضورؐ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی تھی، زینب ہی کی بیٹی تھی۔ غزوۂ بدر میں ابوالعاص بھی کفارِ مکہ کے ہمراہ شریک ہُوا تھا اور قید ہو گیا۔ حضرت زینب نے انھیں رہا کرانے کے لیے اپنا ہار بطور فدیہ حضورؐ کے پاس بھیجا۔ حضورؐ نے ہار کو دیکھا تو اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسو ٹپکنے لگے۔ آپ نے ابوالعاص کو رہا کر دیا۔ ہار واپس بھیج دیا۔ اور ابوالعاص سے کہا کہ یا تو اسلام لاؤ اور یا میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ اس نے یہ بات مان لی۔ حضورؐ نے زید بن حارثہ کو اس کے ساتھ کر دیا اور وُہ چند روز بعد حضرت زینبؓ کو مدینے میں لے آیا۔ زینبؓ کی وفات ۸ھ میں ہُوئی تھی اور خود حضورؐ نے اسے قبر میں اتارا تھا۔

دوم : اُمّ کلثوم، جس کا نکاح ابولہب کے بیٹے عُتبہ سے ہُوا، ابھی رخصتی نہیں ہُوئی تھی کہ آیت تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ خود ہلاک ہو) نازل ہُوئی۔ ابولہب نے بیٹے کو حکم دیا کہ محمد (صلعم) کی دونوں بیٹیوں رُقیہ اور اُمّ کلثوم، جن سے تمہارا نکاح ہو چکا ہے، کو طلاق دے دو۔ اور اس نے تعمیل کی۔ رُقیہ کا نکاح چوتھے سالِ نبوت میں حضرت عثمانؓ سے ہوا تھا۔ آپ کا ایک ہی بیٹا تھا، نام عبداللہ۔ دس سال کے بعد آپ بیمار پڑ گئیں اور ہجرت کے سترھویں ماہ میں، جب حضورؐ غزوۂ بدر سے واپس آ رہے تھے، فوت ہو گئیں۔ حضورؐ مدینہ میں داخل ہُوئے تو آپ دفن ہو چکی تھیں۔

سوم : رقیہ کی وفات کے بعد حضورؐ نے اُمّ کلثوم بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دے دی۔ آپ کی وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی تھی۔[1]

چہارم : فاطمۃ الزّہراء، جنھیں بعض سیرت نگار رقیہ سے دو سال بڑی قرار دیتے ہیں۔ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ سال پہلے یعنی ۶۰۵ء میں ہُوئی تھی۔ حضرت علیؓ سے آپ کا نکاح ۲ھ میں ہوا۔ آپ کی چار اولادیں تھیں : حسنؓ، حسینؓ، زینبؓ اور اُمّ کلثوم۔ بعض نے محسن اور رُقیہ کا بھی نام لیا ہے۔ لیکن ان کی روایات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اُمّ کلثوم کا نکاح حضرت فاروقِ اعظم عمرؓ بن خطاب سے ہوا تھا۔ اس سے زید پیدا ہوا۔ فاروقِ اعظمؓ کی وفات کے بعد عون بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ اس کی وفات کے بعد محمد بن جعفر سے نکاح ہوا۔ یہ بھی جلد وفات پا گئے اور آخر میں عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات رحلتِ رسول سے چھ ماہ بعد اور بروایتے تین ماہ بعد ہُوئی تھی۔ اُس وقت آپ کی عمر ۲۹ برس (قمری) کے قریب تھی۔ آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعض روایات میں حضرت عباسؓ کا نام آیا ہے اور بعض میں خود حضرت علیؓ کا۔ لیکن پہلا قول صحیح تر ہے۔

حضورؐ کے مرکب

مرکب سے مراد سواری کا جانور ہے، خواہ وُہ گھوڑا، خچر اور اونٹ ہو یا خر۔ آپؐ نے زندگی میں صرف سات گھوڑوں

---

[1] درست اس طرح ہے کہ حضرت رقیہ عتبہ بن ابولہب اور حضرت ام کلثوم عتبہ کے بھائی عتیبہ کی زوجہ تھیں۔ جب سورہ تبت یدا ابی لھب نازل ہوئی تو دونوں بھائیوں نے باپ کے کہنے پر ان کو طلاق دے دی۔ دونوں بیٹیاں بعد ازاں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان غنیؓ کے عقد میں آئیں اور اسی نسبت سے آپ ذوالنورین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (ادارہ)

یہ سواری کی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ اَلسَّکب ۔ یہ حضورؐ کا پہلا گھوڑا تھا۔

۲۔ مُرتَجِز ۔ یہ ایک اعرابی سے خریدا تھا۔

۳۔ لزاز ۔ یہ اسکندریہ کے بادشاہ مُقوقِس نے بھیجا تھا۔

۴۔ اَلظَّرِب ۔ جو ربیعہ بن البرا نے پیش کیا تھا۔

۵۔ اَلوَرد ۔ جو تمیم الداری نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔

۶۔ لُحَیف یا لُحَیف

۷۔ یَعسُوب

اُونٹ:

۸۔ قَصواء ۔ اسے عَضباء اور جَدعاء بھی کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے سو درہم میں خریدی تھی اور اسی پر سوار ہو کر ہجرت فرمائی تھی۔

خچر اور گدھا:

۹،۱۰۔ مُقوقِس نے حضورؐ کی خدمت میں ایک خچر بھیجا تھا، جس کا نام تھا شَہباء یا دُلدُل۔ اور ایک گدھا جو یعفور کہلاتا تھا۔

حضورؐ کے دُودھیالے جانور

حضورؐ نے دُودھ کی خاطر کئی جانور پال رکھے تھے۔ ان میں کچھ اُونٹنیاں تھیں اور کچھ بھیڑ بکریاں۔ اونٹنیوں کے نام یہ تھے:

عَجوَہ، زَمزَم، سُقیا، بَرَکہ، وَرسہ، اَطلال، اَطراف، غَوثہ (یا غَیثہ)، یَمن، قمر، حَنّاء، سَمراء، عَرِیس، سَعدِیہ، یسیرہ، لِغُوم، رَیا، مَہرَہ، شَقراء اور بُردہ۔

حضورؐ کی تلواریں

آپؐ کی تلواروں کے نام یہ تھے: قلعیا، جو صحرا کے ایک گاؤں قلع سے آئی تھی۔ بتار، حتف، مخذم، رسوب۔ عَضب اور ذوالفقار جو آپؐ نے حضرت علیؓ کو عنایت کر دی تھی۔

حضورؐ کی کمانیں

روحاء، بیضاء، صفراء (یا شوحط)، اَلکتوم، زَوراء، سداد۔

طبقات کے مصنف ابنِ سَعد لکھتے ہیں کہ جب حضورؐ کو مدینہ کے ایک یہودی قبیلہ بنو قَینُقاع سے لڑنا پڑا تو وہاں سے آپؐ کو تین نیزے اور تین کمانیں ملیں۔ کمانوں کے نام بیضاء، صفراء اور روحاء تھے۔

حضورؐ کے نیزے

آپؐ کے پاس کل چار نیزے تھے۔ یعنی اَلمُثوِی، اَلمُتُثَنِیّ۔ باقی دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

حضورؐ کی ڈھالیں

آپؐ کے پاس تین ڈھالیں تھیں، الزَّلُوق۔ اَلفُتق۔ اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔

حضورؐ کی زرہیں

سَعدِیَہ، فِضَّہ، ذاتُ الفُضول، ذاتُ الوِشاح، ذات الحواشی، بَتراء، سُغدِیَہ اور خِرنِق۔

رسولِ اکرمؐ کے سیرت نگار

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ

مشرق و مغرب کی اکثر علمی زبانوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک پر مختلف درجہ اور مختلف ضخامت کی اس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں کہ حصر و شمار سے باہر ہے چنانچہ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر مارگولیتھ نے "محمدؐ اور ظہورِ اسلام" کے نام سے آں حضرتؐ کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی تو اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا:

"حضرت محمد (صلعم) کے سیرت نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جس کو ختم کرنا ناممکن ہے، لیکن اس میں جگہ پانا باعث شرف ہے"۔[1]

تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ جس کی طرف پروفیسر ممدوح نے اشارہ کیا ہے، بدستور جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مقالہ ہذا میں سردست ان عربی کتابوں کا ذکر بطور تعارف کیا جاتا ہے جو فن سیرت میں اصلی یا ثانوی مصادر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور فی زمانہ مروج و متداول ہیں اور جن کا دینی اور تاریخی مقالوں اور کتابوں میں اکثر حوالہ آتا ہے۔ اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مستند اور تازہ ترین معلومات فراہم کی جائیں اور مطبوعہ کتابوں کے بہترین اڈیشنوں اور ان کے مستند اور متداول تراجم کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے تاکہ اہلِ ذوق کو ان کی طرف رجوع کرنے میں آسانی ہو۔

سیرت کے مطالعہ کی ضرورت

غیر مسلموں کا سیرت نبوی کے ساتھ اعتنا بیشتر اس وجہ سے ہے کہ وہ اس جلیل القدر داعی دین کے حالات زندگی معلوم کرنا چاہتے ہیں، جس کی تعلیم نے دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا اور ایک ایسی امت تیار کر دی، جس نے اپنے شاندار کارناموں سے جریدۂ روزگار پر اپنا نام ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا ہے۔ مگر مسلمانوں کے لیے سیرتِ نبوی کا مطالعہ محض ایک علمی مشغلہ نہیں ہے بلکہ ایک اہم دینی ضرورت ہے۔ خداوند کریم نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اے ایمان والو! تمہارے لئے پیغمبر خدا کی ذات گرامی میں ایک اچھا نمونہ موجود ہے"۔ (سورۂ احزاب)

لہذا مسلمانوں کے لئے ضروری ٹھہرا کہ وہ اس بات کو دریافت کریں کہ رسول اللہؐ نے وہ کون سا نمونہ پیش کیا ہے جس کو قرآن کریم میں اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔ رسولِ مقبولؐ کا اسوہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں لامحالہ ان کی سیرت پاک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

جو لوگ رسول خداؐ (صلعم) کے ہم وطن اور ہمعصر تھے اور جن کو آپ سے بالمشافہ اصولِ اسلام سیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، آپؐ کا

---

[1] "MOHAMMED AND THE RISE OF ISLAM" BY D.S. MARGOLIOUTH, P iii - LONDON, 1905

اُسوہ ان کے سامنے تھا، لیکن جب آنحضرتؐ نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی، تو بعد کی نسلوں کے لئے آپ کی سیرت مبارک احادیث اور روایات کی روشنی ہی میں شمع ہدایت کا کام دے سکتی تھی۔ اس دینی ضرورت کے اقتضاء سے اہل اسلام نے اپنے ہادیٔ برحق کے احوال و اقوال کو اس احتیاط اور تفصیل سے محفوظ کر لیا ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ :

" اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا اور اس کے حلیہ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا ہے۔"

آپؐ کی شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، طرزِ معاشرت، خورد و نوش، لباس و پوشش اور نشست و برخاست کی ایک ایک تفصیل اس طرح قلمبند کر لی ہے کہ کسی شخص کے حالاتِ زندگی آج تک اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکے۔ آنحضرتؐ کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے اکثر بانیوں کی تصویریں ناتمام ہیں، چنانچہ زرتشت کے متعلق آج تک یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ایران کے کس خطہ میں اور کس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس بارے میں جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے، وہ علماء کا محض قیاس اور تخمینہ ہے۔ اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ۳۳ سالہ زندگی کے صرف آخری تین سالوں کا حال معلوم ہے جو انہوں نے یہود کی اصلاح کی کوشش میں گزارے تھے اور جن کی کیفیت مروجہ اناجیل میں مذکور ہے۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ تاریکی کے پردے میں مستور ہے حتیٰ کہ ان کی پیدائش اور وفات دونوں کے متعلق مختلف مذاہب اور اقوام کی روایات اور آراء میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے، جس سے ایک عام آدمی کے لئے ان کی زندگی ایک چیستان بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس داعی اسلام کی زندگی اور ان کے مشن کے ہر شعبہ کے متعلق اس قدر کثیر اور وافر مواد اور مسالہ موجود ہے جس کا سمیٹنا ایک مؤرخ کے لئے بے حد مشکل کام ہے ؎

داماںِ نگہ تنگ و گُلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ تو از تنگیٔ داماں گلہ دارد

سیرت نگاری کی ابتداء

رسولِ خدا کی ذاتِ گرامی ابتدائے نبوت ہی سے ان کے اصحاب کی غیر معمولی توجہ کا مرکز بن گئی تھی؛ چنانچہ آنحضرتؐ کے حینِ حیات بہ دستور یہ شروع ہو چکا تھا کہ جب ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان سے ملتا تو وہ اس سے آنحضرتؐ کے حالات دریافت کرتا اور وہ اس کے جواب میں کسی تازہ وحی یا آنحضرتؐ کے کسی تازہ فرمان کا ذکر کرتا۔ آپؐ کی وفات کے بعد جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، آپ کے پیروؤں کے دل میں اپنے پیشوا کی ذات مبارک، ان کے اخلاق و عادات اور ان کی تعلیم و تلقین کے دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔ اس شوق جستجو سے رفتہ رفتہ روایات کا ایک وسیع ذخیرہ پیدا ہو گیا جو سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا۔ آخر کار جب مسلمانوں کے ہاں دوسری صدی ہجری میں تصنیف و تالیف کا رواج ہوا تو اہلِ علم نے ان روایات کو قلمبند کرنا اور ان کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنا شروع کیا جن روایات کا تعلق عقائد و عبادات سے تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہو سکتے تھے، ان سے علم حدیث کی کتابیں مدون ہوئیں اور ان روایات سے جن میں آنحضرتؐ کے حالاتِ زندگی مذکور تھے۔ فن سیرت کا سرمایہ تیار ہوا۔ اور وہ روایات جن میں رسول پاکؐ کے غزوات یعنی جنگوں کے واقعات مذکور تھے، فن مغازی کا موضوع قرار پائیں، چونکہ رسول مقبولؐ کی زندگی میں ان کے غزوات کو تاریخی لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے بعض اوقات "مغازی" کا اطلاق تمام فن سیرت پر ہوتا ہے۔

سیرت نبوی کے قدیم مصادر

صحابہ کرامؓ کے عہد میں صرف قرآن مجید کے جمع و تسطیر کا اہتمام ہو سکا اور پہلی صدی ہجری میں اسلام

اور داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے متعلق مختلف نوع کی جو روایات مسلمانوں میں شائع ہوئیں وہ سینہ بسینہ نقل ہوتی رہیں۔ ان کو اس خیال سے قلمبند نہیں کیا گیا تھا کہ کہیں قرآن پاک کے متن کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔ پہلی صدی کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ نے دیکھا کہ جن صحابہ کرامؓ کے سینوں میں رسولِ خداؐ کے ارشادات اور دیگر تاریخی روایات کا ذخیرہ محفوظ تھا وہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں یا ہو چکے ہیں۔ اس سے ان کو اندیشہ ہوا کہ اسلامی اخبار و روایات کے مٹنے سے کہیں سنت نبوی کا علم بھی نہ مٹ جائے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر اسلامی روایات کی جمع و کتابت شروع ہوئی۔

رسولِ پاکؐ نے اپنی عمر عزیز کے آخری دس سال مدینہ میں گزارے تھے، اور ان کی وفات کے بعد اکثر صحابہ نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے مدینہ ہی حدیث نبوی اور روایات اسلامی کا سب سے پہلا مرکز قرار پایا۔ یہاں کے سب سے بڑے عالم امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری تھے، جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی فرمائش پر اسلامی روایات و آثار کی جمع و کتابت کا آغاز کیا۔ خلیفہ ممدوح کی مدت خلافت صرف ڈھائی سال ہے اس لئے اس مختصر سے عرصہ میں روایات کی تدوین کا کام مکمل نہ ہو سکا۔ لیکن ان کی تحریک سے مختلف علمی مرکزوں میں روایات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا کام شروع ہو گیا۔ مدینہ کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ بصرہ میں امام حسن بصری اور ابراہیم نخعی اور کوفہ میں امام شعبی نے روایات کے جمع کرنے میں خاص کوشش صرف کی۔

امام زہری مکہ میں ۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری ہے۔ آپ قریش کے مشہور خاندان بنو زہرہ میں سے تھے، اس لئے زہری کہلائے۔ آپ تابعی تھے اور آپ نے بہت سے صحابہ کرامؓ کو بذاتِ خود دیکھا تھا اور ان سے معلومات حاصل کی تھیں۔ مدینہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے اور ان سے رسولِ کریمؐ کے حالات اور ارشادات کے بارے میں پوچھتے اور ان کو قلمبند کرتے اپنی عمر کے آخری حصہ میں دمشق کے اموی دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اموی حکمرانوں کی فرمائش پر انہوں نے سیرت اور مغازی پر مستقل کتابیں لکھی تھیں، لیکن وہ کتابیں ہم تک نہیں پہنچیں، لیکن ان کی سند سے بہت سی متفرق روایات بعد کے مصنفین کے ہاں ملتی ہیں۔ آپ نے ۱۲۴ھ میں وفات پائی اور حجاز میں شغب کے مقام پر مدفون ہوئے جہاں ان کی اراضی تھی۔ امام زہری کی علمی جستجو اور ان کے درس کی وجہ سے لوگوں میں سیرت و مغازی کا بڑا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے حلقہ درس سے جو باکمال لوگ اٹھے ان میں سے دو عالموں یعنی موسیٰ بن اسحاق نے اس فن میں خاص شہرت پائی۔

موسیٰ بن عُقبہ (متوفی ۱۴۱ھ) حضرت زبیر بن العوام کے موالی میں سے تھے۔ انہوں نے عہدِ رسالت کی اخبار و روایات کے جمع کرنے میں کمال جانفشانی کا ثبوت دیا۔ یہاں تک کہ "صاحب المغازی" کے لقب سے مشہور رہے۔ امام مالک بن انس ان کے بڑے مداح تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ اگر فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو۔ ان کی کتاب مغازی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے روایات کی صحت کا بڑا اہتمام کیا۔ چنانچہ آپ کم عمر اور بے سمجھ لوگوں کی روایت نہیں لیتے تھے بلکہ ہمیشہ پختہ عمر اور پختہ فہم کے لوگوں سے روایت حاصل کرتے تھے۔ اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب دیگر کتب مغازی سے مقابلتہً مختصر ہے۔ عقبہ کی کتاب المغازی مدت تک شائع رہی اور واقدی، ابن سعد اور

لے امام زہری کے لیے ملاحظہ کیجیے تہذیب التہذیب لابن حجر بذیل "محمد بن مسلم"۔

طبری کی کتابوں میں اس کے اکثر حوالے ملتے ہیں، لیکن مرورِ ایام سے آخر کار ناپید ہوگئی۔ اس وقت تک اس کا ایک قطعہ ملا ہے، جسے پروفیسر زخاؤ نے جرمن ترجمہ کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں شائع کر دیا تھا۔[1]

محمد بن اسحٰق دیگر علوم کی طرح تاریخ نویسی کا آغاز بھی بنو عباس کے زمانے میں ہوا اور اس کی ابتدا سیرت نگاری سے ہوئی۔ فنِ سیرت میں محمد بن اسحٰق مطلبی (متوفی ۱۵۰ھ) نے اس قدر شہرت پائی کہ امامِ فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہوئے۔ محمد بن اسحٰق تابعی تھے، اور مدینہ میں سکونت رکھتے تھے۔ انہوں نے متعدد صحابہ کو دیکھا تھا اور ان سے عہدِ رسالت کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ ابن اسحٰق نے مصر کا سفر اختیار کیا اور بعد ازاں بغداد گئے جہاں انہوں نے خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور اسکی خدمت میں اپنی "سیرت" پیش کی۔ علامہ بلاذری کا بیان ہے ابن اسحٰق نے یہ کتاب خلیفہ مذکور ہی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ بہر حال جس زمانے میں امام مالک بن انسؒ نے علمِ حدیث میں اپنی مشہورِ عالم کتاب "موطا" تالیف کی تھی، تقریباً انہی ایام میں ابن اسحٰق نے اپنی سیرت تصنیف کی اور اپنی زندگی کے آخری دن بغداد ہی میں بسر کئے اور اپنی وفات کے بعد وہیں مدفون ہوئے۔

ابن اسحٰق کی سیرت میں اس قدر جامعیت، تفصیل اور معلومات کی فراوانی تھی کہ اکثر اہلِ علم نے اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے سیرتِ نبوی کے بارے میں اس پر پورا پورا اعتماد کیا اور اس کو اپنا ماخذ بنایا۔ چنانچہ امام طبری اور دیگر مورخین نے ابن اسحٰق سے بکثرت روایت کی ہے اور ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ کے سیرت والے حصہ میں اس کا جا بجا حوالہ دیا ہے۔ غرضیکہ ابن اسحٰق کی سیرت اپنے فن میں ایک منفرد اور اساسی حیثیت رکھتی ہے اور بعد کے زمانے میں جس کسی نے سیرتِ نبوی کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اسے ابن اسحٰق کی خوشہ چینی کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا۔ ساتویں صدی ہجری میں فارس کے حکمران ابوبکر سعد زنگی کی فرمائش پر سیرت ابن اسحٰق کا فارسی ترجمہ تیار ہوا تھا، جس کے قلمی نسخے پیرس کے قومی کتب خانہ الٰہ آباد پبلک لائبریری اور دار العلوم دیوبند میں پائے جاتے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے ابن اسحٰق کی تالیف ناپید ہوگئی لیکن حال ہی میں اس کے بعض اجزاء مراکو میں دریافت ہوئے ہیں، جن کو ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) ایڈٹ کر رہے ہیں۔ ان کے تازہ مراسلہ سے معلوم ہوا کہ مطبوعہ اوراق کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحات کے قریب ہوگی۔

سیرت ابن ہشام محمد بن اسحٰق کے بعد عبد الملک بن ہشام نحوی کا زمانہ آیا، جس کا سنہ وفات ۲۱۳ ہجری اور بعض کے نزدیک ۲۱۸ھ ہے۔ اس نے ابن اسحٰق کی سیرت کی تلخیص و تہذیب کی۔ اس کے ابتدائی حصہ کا تعلق سیرتِ نبوی سے نہ تھا اس لئے اسے چھوڑ دیا، مشکل اور غریب الفاظ کے معنے لکھے۔ اشعارِ مندرجہ کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق اپنی رائے قلمبند کی اور بعض واقعات کا اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی تالیف کو جو صورت دی وہ اتنی مقبول ہوئی کہ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اصل کتاب کو فراموش کر دیا، چنانچہ آج کل لوگوں کے درمیان ابن اسحٰق کی جو کتاب متداول ہے وہ یہی ابن ہشام کی تلخیص ہے، جو "سیرت ابن ہشام" کے نام سے مشہور ہے۔ سیرت ابن ہشام کو سب سے پہلے جرمن مستشرق ویسٹن فیلڈ (WUSTENFELD) نے ۱۸۶۰ء میں گوٹنگن سے اصل عربی میں شائع کیا۔ ایک مدت کے بعد یہ کتاب مصر میں کئی مرتبہ طبع ہوئی۔ ان طباعتوں میں بہترین ایڈیشن وہ ہے جسے مصطفیٰ السقاء، ابراہیم ابیاری

---

[1] EDWARD SACHAU : DAS BERLINER FRAGMENT DES MUSA IBN UQBA IN SITZUNGSBERICHTE D. PREUSS. AKADEMIC DER WISSENSCHAFTEN. BERLIN 1904, P. 449.

اور عبد الحفیظ شبلی کی تصحیح و تحشیہ سے مطبع مصطفیٰ بابی حلبی نے ۱۳۵۵ھ (مطابق ۱۹۳۶ء) میں قاہرہ سے چار جلدوں میں شائع کیا۔ بہت سے مشکل الفاظ کو مشکول کرنے کے علاوہ ایڈیٹر صاحبان نے بہت سے توضیحی حواشی بھی لکھے ہیں، جو اکثر سہیلی کی شرح سے ماخوذ ہیں اور ازبس مفید ہیں۔

سیرت ابن ہشام کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ پروفیسر وائل (GUSTAV WEIL) نے ۱۸۶۴ء میں اس کا جرمن ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس کے نوّے سال بعد پروفیسر الفریڈ گیوم (GILLAUME) نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ پروفیسر مذکور کو چند ایک عرب علما کا تعاون حاصل تھا۔ اس لئے ان کا ترجمہ اپنی صحت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے۔ اس انگریزی ترجمہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ فاضل مترجم نے ابن اسحٰق کے ان مقامات کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جن کو ابنِ ہشام نے چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ تاریخ طبری وغیرہ میں محفوظ ہیں۔[1] سیرت ابن ہشام کے چند ایک اُردو تراجم بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک ترجمہ وہ ہے جسے مولوی محمد انشاء اللہ ایڈیٹر اخبارِ وطن نے مولوی محمد حلیم انصاری کی مدد سے ۱۹۱۴ء میں مکمل کیا اور لاہور سے دو حصوں میں شائع کیا۔ یہ ترجمہ ملخص ہے۔ دوسرا اُردو ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی نے تیار کیا اور عبد الرحیم اینڈ برادر تاجران کتب نے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں دو حصوں میں شائع کیا۔ مترجم نے اکثر عربی اشعار بغیر ترجمہ کے چھوڑ دیے ہیں لیکن باقی ترجمہ خاصا گوارا ہے لیکن یہ ترجمہ اب نایاب ہو چکا ہے۔ تیسرا ترجمہ مولوی قطب الدین احمد محمودی کے قلم سے ہے جو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے پہلے دو حصے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئے تھے، لیکن یہ ترجمہ دکن کے سیاسی انقلاب کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

سیرت ابن ہشام کی اہمیت کے پیشِ نظر امام ابو القاسم عبد الرحمٰن السہیلی نے اس کی ایک شرح "الروض الأنف" کے نام سے لکھی تھی، جو سلطان مراکش کے صَرفہ سے مصر میں ۱۳۳۲ھ میں طبع ہو چکی ہے۔ امام موصوف اندلس کے ضلع مالقہ میں وادی سہیل کی ایک بستی میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے سہیلی کہلائے۔ علم تفسیر، حدیث نبوی اور رجال کے علاوہ تاریخ اور انساب کے بڑے ماہر تھے۔ تمام عمر تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ ان کے حافظہ اور تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ الروض الأنف جیسی ضخیم شرح کی املا چار پانچ ماہ کی مدت میں ختم کر دی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "میں نے یہ شرح ایک سو بیس کتابوں کی مدد سے لکھی اور اس کی املا محرم ۵۶۹ھ میں شروع کر کے اسی سال کے جمادی الاُولیٰ میں ختم کر دی۔ میں نے اس میں ایسے علمی نکات بیان کئے ہیں جو میں نے اپنے اساتذہ سے حاصل کئے تھے۔"[2]

غرضکہ اس شرح میں ایسی معلومات ملتی ہیں جو خود اصل کتاب میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی لئے بعد کے مصنفوں نے سیرت نبوی کے سلسلہ میں سہیلی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

---

[1] THE LIFE OF MUHAMMAD: A TRANSLAION OF IBN ISHAQUE SIRAT RASUL ALLAH, WITH AN INTRODUCTION AND NOTES BY A GUILLAUME, OXFORD U. PRESS 1955.

[2] الروض الانف تالیف الامام السہیلی جزء اوّل صفحہ ۳ (مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۲ھ) ابن ہشام کے دو اُردو ترجمے (۱) عبد الجلیل صدیقی۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۳ء (۲) شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ مقبول اکیڈمی لاہور (ادارہ)

متقدمین کی مؤلفات

سیرت ابن ہشام کے علاوہ متقدمین کی تالیف میں سیرت نبوی کے سلسلہ میں ذیل کی چار کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں :

۱۔ کتاب المغازی مؤلفہ الواقدی

محمد بن عمر واقدی (سنہ ۱۳۰ھ تا سنہ ۲۰۷ھ) کا شمار اسلام کے اکابر مؤرخین میں ہوتا ہے۔ ابن سعد کے قول کے مطابق وہ سنہ ۱۳۰ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور اپنے جدِ امجد واقد کے نام پر واقدی کہلائے۔ اسلامی اخبار و روایات کو جمع اور مدون کرنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ چنانچہ خلیفہ ہارون الرشید جب سنہ ۱۷۰ھ میں حج کے لیے حجاز آیا اور مدینہ منورہ میں وارد ہُوا۔ تو اس موقع پر واقدی ہی نے اس کی رہبری کی تھی اور اسے مدینہ کے قدیم آثار اور تاریخی مقامات دکھائے تھے۔ بعد ازاں خلیفہ المامون نے اسے بغداد کے مغربی حصہ کا قاضی مقرر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقدی کو خلیفہ موصوف کا خاصا تقرب حاصل تھا کیونکہ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا اور اس نے اپنا وصیت نامہ لکھوایا تو خلیفۂ وقت کو اپنا وصی بنایا اور خلیفہ نے بذاتِ خود اس کی وصیت کا اجرا کیا۔

ابن الندیم بغدادی نے کتاب الفہرست میں اور یاقوت حموی نے معجم الادبا میں واقدی کی بیس اکیس کتابوں کے نام گنوائے ہیں[۱] جو بیشتر تاریخی نوعیت کی ہیں اور خصوصیت کے ساتھ غزواتِ نبوی اور فتوحاتِ اسلامی کے متعلق ہیں۔ ان میں سے "کتاب المغازی" ہم تک اپنی مکمل صورت میں پہنچی ہے۔ اس میں رسول کریمؐ کے غزوات کا جو بیان ہے وہ ابن اسحاق کے بیان سے زیادہ مفصل اور مبسوط ہے۔ امام طبری اور دوسرے مؤرخوں نے واقدی کو مغازی کے بارے میں سند مانا ہے اور اپنی کتابوں میں اس سے بہت سے اقتباسات لئے ہیں۔ واقدی نے واقعات کی تاریخیں معین کرنے کا خاص التزام کیا ہے اور مستشرقین کی تحقیق یہ ہے کہ واقدی نے ملکی فتوحات اور دیگر تاریخی واقعات کے جو سنین لکھے ہیں، ان کی سریانی تاریخوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

خان کریمر نے گزشتہ صدی میں واقدی کی کتاب المغازی کا جو اڈیشن کلکتہ سے شائع کرایا تھا ایک ناقص اور نامکمل نسخہ پر مبنی تھا۔ کتاب المغازی کا ایک مکمل، صحیح اور خوشخط نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اور جرمن مستشرق ولہاؤزن (WELLHAUSEN) نے کتاب کا جو جرمن ترجمہ سنہ ۱۸۸۲ء میں برلن سے شائع کیا تھا، وہ اسی نفیس نسخہ پر مبنی تھا۔ حال میں مسٹر جونز (JONES) نے اس نسخہ کو بڑی محنت سے ایڈٹ کر دیا ہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے تین ضخیم جلدوں میں سنہ ۱۹۶۴ء میں شائع کر دیا[۲]۔ مسٹر جونز نے کتاب المغازی کو بصورت احسن منظر عام پر لاکر تاریخ اسلام کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

---

[۱] کتاب الفہرست لابن الندیم البغدادی، مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۴۴۔ واقدی کے لئے دیکھئے نیز وفیات الاعیان لابن خلکان جلد ثانی۔ مطبوعہ قاہرہ

[۲] KITAB AL-MAGHAZI OF AL-WAQDI, EDITED BY J.M.B. JONES 3 VOLS 1200 PP. OXFORD PRESS, 1964.

۲۔ کتاب الطبقات الکبیر لابن سعد

محمد بن سعد (۱۶۸ھ تا ۲۳۰ھ) واقدی کے شاگرد تھے اور اس کی تالیفات کی کتابت کیا کرتے تھے، اسی لئے "کاتب الواقدی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بعد ازاں بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے صحابہ کرامؓ اور تابعین کے حالات میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو اپنی ضخامت اور جامعیت کی بنا پر "کتاب الطبقات الکبیر" کہلاتی ہے۔ ابتدائی حصہ میں خاص رسول کریمؐ کی سیرت کا بیان ہے۔ اس کے بعد صحابہ، صحابیات اور تابعین کے حالات مندرج ہیں۔ ابتدائی حصہ یعنی "اخبار النبی" میں ابن سعد نے اپنے استاد واقدی کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا ہے، تاہم بعض واقعات کے متعلق اس نے دوسرے مصادر سے بھی معلومات حاصل کی ہیں، جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ بہر حال یہ کتاب اسلام کی پہلی دو صدیوں کے مشاہیر کے حالات میں ایک بے مثال تالیف ہے، اور سیرت نبوی کے قدیم اور نہایت قیمتی مصادر میں شمار ہوتی ہے۔

ابن سعد کی اس لاجواب تالیف کو اختصار کے خیال سے "طبقات ابن سعد" بھی کہتے ہیں۔ پروفیسر زخاؤ (SACHAU) نے چند دیگر جرمن فضلاء کے تعاون سے اسے آٹھ جلدوں میں شائع کر دیا تھا۔ اشاریے ان کے علاوہ ہیں۔ پہلی دو جلدیں سیرت نبوی کے لیے وقف ہیں اور آٹھویں جلد صحابیات کے حالات میں ہے۔ چند سال ہوئے بیروت میں طبقات ابن سعد کا جو ایڈیشن طبع ہوا تھا وہ پروفیسر زخاؤ والے ایڈیشن کی نقل ہے۔ طبقات ابن سعد کے اکثر حصوں کا اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ کے اہتمام سے شائع ہو چکا ہے۔

۳۔ "انساب الاشراف" مؤلفہ علامہ بلاذری

احمد بن یحییٰ البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں۔ انہوں نے بغداد میں نشوونما پائی تھی اور وہاں کے نامور علماء مثل ابن سعد اور المدائنی وغیرہ سے علم حاصل کیا تھا ان کی متعدد تالیفات میں سے دو اہم کتابیں ہم تک پہنچی ہیں: کتاب فتوح البلدان اور کتاب انساب الاشراف۔ "انساب الاشراف" عربوں کی ایک جامع تاریخ ہے، جس کی ترتیب ان کے نامور خاندانوں کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔ سب سے پہلے بنو ہاشم کا بیان ہے جو رسول خدا (صلعم) کا خاندان ہے اور اس ضمن میں پوری سیرت نبوی آگئی ہے۔ اس کے بعد بنو عباس، بنو امیہ اور دیگر خاندانوں کا ذکر ہے۔ اس عہد کے دیگر مؤرخوں کی طرح بلاذری نے بھی انساب الاشراف کی تالیف میں یہ طرز اختیار کیا ہے کہ مختلف عنوان قائم کر کے ان کے ذیل میں متعدد روایات کو ان کے اسناد کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور ان کو ایک مسلسل بیان کی صورت نہیں دی جیسا کہ آج کل کی تاریخی کتابوں کا دستور رہا ہے۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، انساب الاشراف کا ابتدائی حصہ سیرت نبوی پر مشتمل ہے۔ اس میں اکثر روایات وہی ہیں جو دوسرے مورخین نے اپنے اسناد کے ساتھ بیان کی ہیں، لیکن بعض روایات ایسی بھی ہیں جو اور کہیں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ بہر حال انساب الاشراف کا یہ ابتدائی حصہ بھی سیرت کے بنیادی مصادر میں شمار ہونے کے لائق ہے، جس کو فاضل معاصر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایڈٹ کر کے ایک مستقل مجلد کی صورت میں ۱۹۵۹ء میں قاہرہ سے شائع کر دیا ہے۔ یہ ایڈیشن جس کے صفحات کی تعداد ۶۲۷ ہے، استنبول کے ایک نادر قلمی نسخہ پر مبنی ہے۔

۴۔ تاریخ الرسل والملوک مؤلفہ امام طبری

امام محمد بن جریر طبری (متوفی سنہ ۳۱۰ھ) طبرستان میں پیدا ہوئے اسی لئے طبری کہلائے۔ ایام جوانی میں تحصیل علم کے لیے بغداد آئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ساری عمر یہیں تعلیم و تالیف میں بسر کر دی۔ تاریخی روایات کے جمع و تدوین میں اپنے تمام پیشرو مورخین پر سبقت لے گئے۔ چنانچہ ان کی تاریخ اسلام کی پہلی تین صدیوں کے متعلق معلومات کا ایک ایسا بےبہا خزانہ ہے جو عربی ادب میں عدیم النظیر ہے۔ امام موصوف نے بہت سی تاریخی روایات کو مختلف مصادر سے بے کراساد کے ساتھ یکجا کر دیا ہے اور ان کو ترتیب زمانی کے اعتبار سے سن وار لکھا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کو مختلف راویوں کی زبانی مختلف صورتوں میں قلمبند کیا ہے۔ اس طرزِ تالیف سے اگرچہ سلسلہ کلام طویل ہو گیا ہے لیکن راویوں کی اور ان کی روایات کی تنقید آسان ہو گئی ہے۔ تاریخ طبری گویا تاریخ اسلام کی ایک SOURCE-BOOK ہے۔

زمانے کی دست برد سے تاریخ طبری کے اجزا بکھر گئے تھے اور اکثر علما اس کے مکمل نسخہ کے حصول سے ناامید ہو چکے تھے۔ ان حوصلہ فرسا حالات میں لائیڈن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈی خویے (DE GOEJE) نے اس کو مکمل طور پر شائع کرنے کے لیے کمر ہمت باندھی۔ اس کے منتشر اجزا کو مختلف کتب خانوں سے جمع کیا اور چند دیگر فضلاء کے تعاون سے بیس سال کی مسلسل محنت کے بعد اس کا ایک شاندار اڈیشن بارہ جلدوں میں شائع کیا اور اشاریہ کے علاوہ مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی تیار کی جو ۷۲۷۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ طبری تقریباً ناپید ہو چکی تھی۔ مگر پروفیسر ڈی خویے کی ہمت اور علم دوستی قابلِ صد ستائش ہے کہ انہوں نے امام طبری کی بےنظیر تاریخ کو از سر نو زندہ کیا۔ مصر میں تاریخ طبری کے جو نسخے چھپے ہیں، وہ اسی مغربی اڈیشن کی نقل ہیں۔ ان مصری طباعتوں میں بہترین اڈیشن وہ ہے جو محمد ابوالفضل ابراہیم کی تصحیح سے قاہرہ کے دارالمعارف کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ (قاہرہ سنہ ۱۹۶۰ء) تاریخ طبری کا جو حصہ سیرت نبوی سے متعلق ہے وہ خاصا ضخیم ہے اور جامعہ عثمانیہ کے اہتمام سے اردو میں منتقل ہو کر حیدر آباد دکن میں طبع ہو چکا ہے۔ تاریخ طبری کا یہ حصہ بھی سیرت نبوی کے نہایت اہم مصادر میں شمار ہوتا ہے۔

متاخرین کی تالیفات

سیرت نبویؐ کے متعلق متاخرین کی کتابیں بکثرت ہیں، جن کا حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ذیل کی کتابیں زیادہ مشہور رہیں اور زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں:۔

۱۔ کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفٰےؐ

اس معروف اور مقبول کتاب کے مصنف قاضی ابوالفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض ہیں جو بالعموم قاضی عیاض کے نام سے مشہور رہے۔ آپ سنہ ۴۹۶ھ میں سبتہ (مراکو) کے شہر میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ پھر قرطبہ چلے گئے، اور وہاں ابوالولید ابن رشد اور بہت سے دیگر فضلا سے فیض حاصل کیا اور علم حدیث میں تخصص پیدا کیا۔ بعد ازاں سبتہ کے قاضی مقرر ہوئے اور داد گستری میں بڑا نام پایا۔ آپ نے تقریباً بیس کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ مشہور "کتاب الشفا" ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے رسول پاکؐ کے فضائل، محاسنِ اخلاق اور معجزات و کرامات کو ایسے مؤثر اور دلپذیر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے رسولِ مقبولؐ کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت ٹپکتی ہے۔

کتاب الشفا استنبول، قاہرہ اور ہندوستان میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے اور اس کا اُردو ترجمہ حافظ محمد اسماعیل کاندھلوی کے قلم سے "شمیم الریاض" کے نام سے مطبع منشی نولکشور لکھنؤ کی طرف سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مصر کے مشہور ادیب شہاب الدین خفاجی (متوفی ۱۰۶۹ھ) نے کتاب الشفا کی ایک مبسوط شرح لکھی تھی جو ۱۲۶۷ھ میں استنبول میں چار جلدوں میں طبع ہوئی تھی[۱]

۲۔ عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر

اس کتاب کے مؤلف مصر کے مشہور عالم حافظ ابوالفتح ابن سید الناس (۶۷۱ھ تا ۷۳۴ھ) ہیں۔ انہوں نے علوم اسلامیہ دینیہ میں سے حدیث نبوی میں تخصص پیدا کیا اور ایک مدت تک مدرسہ ظاہریہ میں حدیث کا درس دیتے رہے۔ مذکورہ بالا کتاب جس کا موضوع سیرت نبوی ہے، بڑی جامع اور متین ہے اور معتبر اور مستند روایات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے، محدثین کے طریق پر سند کے ساتھ نقل کیا ہے قاہرہ میں دو جلدوں میں ۱۳۵۶ھ میں طبع ہو چکی ہے

۳۔ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد

اس کتاب کے مصنف حافظ ابن قیم الجوزیہ (۶۹۱ھ تا ۷۵۱ھ) ہیں، جو آٹھویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم دین تھے اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کے شاگرد رشید اور زندگی بھر کے رفیق تھے کتب سیرت میں "زاد المعاد" اس لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں رسولِ پاکؐ کے حالات اور عہد رسالت کے واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ہر موقع پر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ رسول مقبولؐ کے فلاں قول یا فلاں فعل سے کیا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان کے حالات اور معمولاتِ زندگی میں ہمارے لئے کیا کچھ سامانِ موعظت موجود ہے۔ غرضکہ اس کتاب میں امت کے سامنے رسول کریمؐ کا اسوۂ حسنہ اس طرح کھول کر رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس سے شمع ہدایت کا کام لے سکتی ہے۔ یہ قابلِ قدر کتاب اپنی غیر معمولی دلچسپی اور افادیت کی وجہ سے مصر میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ عہد حاضر کے ایک مصری عالم شیخ محمد ابو زید نے "ہدیٰ الرسول" کے نام سے اس کا اختصار کر دیا ہے اور اس سے ان دقیق مسائل کو نکال دیا ہے جو طبقہ علما کے ساتھ مخصوص تھے تاکہ عوام بھی اس مفید کتاب سے براہِ راست فیض یاب ہو سکیں۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس اختصار کا اُردو میں ترجمہ کر دیا تھا جو الہلال بک ایجنسی کی طرف سے ۱۹۲۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ (پوری کتاب کا ترجمہ از رئیس احمد جعفری ۱۹۶۲ء میں نفیس اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا۔ ادارہ)

۴۔ المواھب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ تالیف القسطلانی

ابوالعباس احمد بن محمد شہاب الدین قسطلانی مصر کے ایک جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے جو ۸۵۱ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۹۲۳ھ میں رحلت کر گئے! انہوں نے صحیح البخاری کی شرح "ارشاد الساری" کے نام سے لکھ کر بڑی شہرت پائی۔ ان کی دوسری اہم کتاب

---

[۱] قاضی عیاض کے مزید حالات کے لئے ملاحظہ ہو حافظ ابوالعباس المقری کی تالیف "ازہار الریاض فی اخبار قاضی عیاض" جو تونس میں طبع ہو چکی ہے۔
کتاب الشفا کا ایک اور اردو ترجمہ منزل نقشبندیہ لاہور سے ۱۳۴۱ھ میں شائع ہوا۔ از حافظ احمد علی شاہ ٹیالوی (ادارہ)

"المواہب اللدنیہ" فنِ سیرت میں ہے اور بڑی مشہور اور مقبول ہے اور دو ضخیم جلدوں میں ۱۲۸۱ھ میں قاہرہ میں طبع ہو چکی ہے[1]

"المواہب اللدنیہ" کی مقبولیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مفصل شرح محمد بن عبد الباقی زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ) کی ہے جو علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ زرقانی جو مصر کے ایک قریہ زرقان کی طرف منسوب ہیں، اپنے وقت کے ایک جیّد عالم اور مشہور استاد تھے۔ انکی کتاب سیرتِ نبوی کے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ایک بے بہا گنجینہ ہے فاضل شارح نے ہر واقعہ اور ہر موضوع کے متعلق مختلف مصادر سے ضروری مواد یکجا کر دیا ہے، جس سے مختلف روایات کا باہمی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ اور تحقیق و تدقیق میں آسانی رہتی ہے۔ یہ شرح کیا ہے گویا سیرت نبویؐ کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے وسیع النظر مصنّفین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ زرقانی کی شرح سب سے پہلے بولاق کے سرکاری مطبع میں ۱۲۷۸ھ میں آٹھ ضخیم جلدوں میں طبع ہوئی۔ یہ طبع اوّل سب سے بہتر ہے، کیونکہ بعد کی طباعتیں کاغذ اور چھپائی کے لحاظ سے ناقص ہوتی چلی گئی ہیں۔

۵۔ الخمیس فی احوال انفسِ نفیس

یہ کتاب شیخ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۹۶۶ھ) کی تالیف ہے اور چونکہ پانچ حصّوں میں منقسم ہے، اس لیے بالعموم "تاریخ الخمیس" کے نام سے مشہور ہے، اس کا بیشتر حصہ جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، سیرت نبویؐ کے لیے وقف ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کتبِ سیرت کے علاوہ تفاسیر قرآن، کتبِ حدیث اور دیگر نوعیت کی بہت سی کتابوں سے ماخوذ ہے جن کی تعداد ایک سو بائیس ۱۲۲ ہے اور جن کے نام مصنّف نے اپنی کتاب کی ابتدا میں لکھ دیے ہیں۔ اس وجہ سے اس کے مضامین میں جامعیت کے ساتھ ساتھ بڑا تنوع پیدا ہو گیا ہے اور علمائ نے اسے ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اسے فن سیرت کی اہم اور مستند کتابوں میں شمار کیا ہے۔ تاریخ الخمیس کے ایک قلمی نسخہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ دیار بکری نے اس کی تالیف سے ۹۴۰ھ میں فراغت پائی تھی۔ تاریخ الخمیس سب سے پہلے قاہرہ کے مطبع وہبیہ میں ۱۲۸۳ھ میں مصطفیٰ بن محمد کی تحقیق و تصحیح سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کا ایک اور اڈیشن مطبع عبدالرزاق میں ۱۳۰۲ھ میں دو جلدوں میں طبع ہوا۔

۶۔ انسان العیون فی سیرۃ الامین المامون

سیرت کی یہ مقبول کتاب علامہ علی بن برہان الدین حلبی (متوفی ۱۰۴۴ھ) کی تالیف ہے، اسی لئے اپنے مؤلف کے نام پر "سیرتِ حلبیہ" کے نام سے مشہور ہے، جیسا کہ مؤلف نے اپنی تالیف کی ابتدا میں صراحت کر دی ہے یہ کتاب فنِ سیرت کی دو معروف کتابوں سے ماخوذ ہے یعنی حافظ ابن سید الناس کی "عیون الاثر فی فنون السیر" اور شمس الدین شامی کی "سبل الھدیٰ والارشاد فی سیرۃ خیر العباد" جو عام طور پر "سیرت الشامی" کے نام سے مشہور ہے۔ جہاں تک "عیون الاثر" کا تعلق ہے بڑی معتبر اور مستند کتاب ہے لیکن اسناد کے التزام نے اسے طویل تر بنا دیا ہے، لہٰذا علامہ حلبی نے اس سے استفادہ کرتے وقت اس کی

---

[1] علامہ قسطلانی کے لیے دیکھئے شذرات الذہب لابن العماد بذیل ۹۲۳ھ

المواہب اللدنیہ کا اردو ترجمہ از عبدالجبار خان حیدر آباد دکن سے ۱۳۷۰ھ میں شائع ہوا۔ (ادارہ)

اسناد کو حذف کر دیا ہے۔ باقی رہی "سیرت الشامی" اس میں ہر قسم کی ضعیف اور سقیم روایتیں بھی شامل ہیں۔ اس لئے حلبی نے ان کے بارے میں انتقاد و احتیاط سے کام لیا ہے۔

"سیرت حلبیہ" مصر میں کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۳۲۰ھ میں قاہرہ سے تین جلدوں میں شائع ہوا تھا جس کی مجموعی ضخامت بارہ سو صفحات کے قریب ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دیگر کتب سیرت کے مقابلہ میں "سیرت حلبیہ" کافی مفصل ہے۔ اس ضخامت اور تفصیل کی وجہ یہ ہے کہ سیرت اور مغازی کے واقعات لکھنے کے علاوہ مصنف نے بہت سے ایسے مسائل سے بھی بحث کی جن کا تعلق عقائد اور عبادات وغیرہ سے ہے۔

بہرحال "سیرت حلبیہ" اپنے فن کی مشہور اور متداول کتابوں میں سے ہے۔

نقشہ شمار حروفِ تہجّی

قرآن مجید میں جتنی بار ہر ایک حرف آیا ہے

ا	۴۸۹۹۲	ض	۶۸۲
ب	۱۲۲۲۸	ط	۱۳۰۷
ت	۲۴۰۴	ظ	۷۸۲
ث	۳۱۰۵	ع	۹۲۷۴
ج	۴۲۳۲	غ	۹۲۱۱
ح	۴۱۲۰	ف	۴۴۱۸
خ	۲۱۰۵	ق	۶۶۱۲
د	۵۹۷۲	ک	۱۰۶۲۸
ذ	۴۷۳۹	ل	۳۳۵۲۰
ر	۱۲۶۴۰	م	۲۶۵۱۵
ز	۳۵۸۰	ن	۴۴۱۹۰
س	۵۹۷۶	و	۲۵۵۸۹
ش	۲۱۱۵	ہ	۱۶۰۷۰
ص	۲۰۰۸۳	ی	۲۵۹۰۹
		لہ	

لہ نقشہ میں کُل حروف کا مجموعہ نہیں دیا گیا تھا جو کہ جمع کرنے سے ۳۲۶۹۹۸ بنتا ہے۔

سیرتِ نبوی کی اوّلین کتابیں اور اُن کے مؤلفین

تحریر: جوزف ہورووِتس / ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

یہ فاضلانہ مضمون مشہور جرمن مستشرق جوزف ہورووِتس JOSEPH HOROVITZ نے جرمن زبان میں لکھا تھا جسے ۱۹۲۶ء میں محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم نے انگریزی زبان میں منتقل کیا اور یہ اسلامک کلچر کی پہلی جلد (۱۹۲۷ء) اور دوسری جلد (۱۹۲۸ء) میں بالاقساط شائع ہوا۔ عربی زبان میں اس کا ترجمہ حسین نصّار نے کیا جو مصر سے ۱۹۴۹ء میں چھپا۔ میں نے اسے اُردو میں منتقل کرتے ہوئے انگریزی اور عربی تراجم سے مساوی طور پر فائدہ اٹھایا ہے اور خود بھی بعض جگہ وضاحتی اشارے شامل کر دیئے ہیں۔

(نثار فاروقی)

باب (۱)

مغازی کی ابتداء

عربی ادب کے تین میدان ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال و اقوال کا ماخذ کہنا چاہیے یعنی: حدیث سیرۃ اور تفسیر۔ ان میں سے ہر ایک کا بنیادی عنصر "شخصی روایت" ہے جو تینوں میں ایک ہی طرح آتی ہے یعنی متنِ حدیث کو سلسلۂ اسناد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے لیکن تینوں موضوعات کی کتابیں جو انھیں روایات پر مشتمل ہیں ان کو مختلف ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں۔ حدیث کے مجموعے انھیں موضوعاتی تقسیم سے ترتیب دیتے ہیں (مثلاً: مصنّفات، جن میں صحاح ستّہ شامل ہیں) یا اُن اصحاب رسول کے ناموں سے جن تک سلسلۂ اسناد پہنچتا ہے (مثلاً: مسانید جیسے مُسند احمد بن حنبل) ــ البتہ سیرۃ کی کتابوں میں یہ روایات، حوادث کی تاریخی ترتیب سے آتی ہیں۔ اور تفسیر بالحدیث میں انھیں اُن آیاتِ قرآنی کے لحاظ سے رکھا جاتا ہے۔ جن سے یہ متعلق ہوں۔

حقیقتاً ان تینوں موضوعات میں سے کوئی بھی باعتبارِ مواد یکساں کتابیں پیش نہیں کرتا بلکہ انفرادی تالیفات اس مجموعۂ روایات سے مواد کا انتخاب کرنے میں خاصی مختلف ہیں۔ یہ اختلاف کبھی تو مؤلف کے اُن نظریات کی وجہ سے ہوتا ہے جنھیں سامنے رکھ کر وہ تالیف کرتا ہے کبھی اُس معیارِ نقد و جرح کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جو اِن روایات سے اخذ کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر تینوں موضوعات کی وہ تالیفات جنھیں ممکن حد تک جامع کہا جا سکے مثلاً: واقدی کی کتاب المغازی اور امام احمد بن حنبل کی مُسند ـــ بنیادی طور پر ایک ہی مواد رکھتی ہیں۔ ہمیں واقدی کے ہاں مشکل سے کوئی ایسی حدیث ملے گی جو مسند احمد بن حنبل میں درج نہ

ہوئی ہو۔ احادیث نبوی کے سارے ذخیرے کو یک جا کرنے کی ایک قابل ذکر کوشش A HANDBOOK OF EARLY MUHAMMADAN TRADITION کے نام سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ پروفیسر وینسنک WENSINCK نے لائڈن میں یہ کتاب چھاپ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اسی طرح اگر آئندہ یہ ممکن ہُوا کہ الطبری نے جو احادیث اپنی تفسیر میں درج کی ہیں انھیں یک جا کر دیا جائے تو احادیث کی حد تک تینوں موضوعات کے کل بنیادی مواد کا جائزہ لینا آسان ہو جائیگا۔

اصحاب رسول کے بعد تابعین کی نسل نے رسول اللہ کے اقوال اور افعال کی اُن روایتوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا جو اُن کے زمانے میں رائج تھیں۔ اگرچہ ان روایات کی قدر و قیمت مشکوک ہے کہ بعض صحابہ احادیث نبوی کو صحائف یا کتب کی شکل میں مدوّن کرتے تھے[۱]۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تابعین کی نسل میں اس طرح کی کتابیں نا پید نہیں تھیں جنھوں نے اپنا مواد اصحاب رسول سے حاصل کیا تھا۔ تابعین میں ایسے حضرات موجود تھے جو مغازی کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ مغازی کا مطلب ہے "جنگیں" لفظی معنوں کے لحاظ سے تو اس صنف تحریر کو غزوات رسولؐ و اصحاب رسولؐ تک محدود ہونا چاہیے تھا، مگر عموماً اس کا اطلاق رسول اللہؐ کی مکمل حیات مبارکہ (سیرۃ) پر کیا جانے لگا۔ یہاں ہم مغازی کے اُن علماٗ کا ذکر کریں گے جو بالخصوص تابعین میں ہوتے اور ان کی تالیفات کا بیان ہوگا۔ ہم اُن کے صرف اسی کارنامے کو نہیں لیں گے بلکہ اُن سے متعلق جو بھی اہم باتیں ہمیں معلوم ہیں ان سب سے بحث ہوگی۔ پھر ایک یا دو فصلوں میں اُن کے بعد آنے والی نسل یعنی تبع تابعین سے تعلق رکھنے والے علمائے مغازی کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد اوّلین کتب سیرۃ کے باقاعدہ مؤلفین مثلاً ابن اسحٰق اور اس کے معاصرین اور واقدی و ابن سعد کو لیں گے۔

۱۔ ابان بن عثمان

تابعین میں مغازی کے عالم کی حیثیت سے ہم سب سے پہلے ابان بن عثمان اور اُمّ عمرو بنت جُندب کا نام لے سکتے ہیں[۲]۔ اُن کی پیدائش کسی طرح ۲۰ھ سے بعد کی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ۳۶ھ میں وہ اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ حضرت عائشہؓ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ساتھ اُس مہم میں[۳] شریک ہو سکیں جو اُنھوں نے قتل عثمان (۳۵ھ) کا قصاص طلب کرنے کو شروع کی تھی۔ اس مہم کے دوران انھیں حضرت عائشہ کے پاس ایک قیدی کے بارے میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ اُس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟[۴] اس کے بعد چالیس برس تک انہوں نے سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ تا آں کہ عبدالملک نے ۷۵ھ میں انھیں مدینہ کا والی مقرر کیا[۵]۔ انھیں گورنر بنانے میں خلیفہ نے کچھ نہیں کیا بلکہ یہ سبب ہوا کہ ان کا پیشرو بغیر خلیفہ سے اجازت لیے دربار میں حاضری دینے دمشق پہنچ گیا اور انھیں اپنا وکیل بنا کر چھوڑ گیا[۶]۔ ابان ۸۳ھ تک سات سال مدینہ کے گورنر رہے۔ پھر عبدالملک نے انھیں برطرف کر دیا[۷]۔ گورنری کے زمانے میں خلیفہ انھیں ہر سال امیرِ حج نامزد کرتا تھا۔ بلکہ ۸۱ھ میں جنگی دشواریوں کی وجہ سے انھیں خلیفہ کا حکم بروقت نہیں مل سکا اور انھوں نے بطور خود امارت حج کا اعزاز حاصل کرنا چاہا تو اپنے نسب کی بزرگی کی بنا پر اور اپنے قرابت داروں کی اعانت سے یہ عہدہ اپنے قبضے میں رکھنے سے انھیں کوئی نہیں روک سکا[۹]۔ ان کے عہد امارت ہی میں مدینہ کی بعض بڑی شخصیتوں مثلاً جابر ابن عبداللہ صحابی رسولؐ محمد ابن الحنفیہ حضرت علی کے فرزند اور عبداللہ بن جعفر حضرت علی کے بھتیجے کا انتقال ہوا۔ ان سب کی نماز جنازہ ابان ہی نے پڑھائی[۱۰]۔ اس کے سوا

ان کی سرکاری مصروفیات کا ہمیں زیادہ علم نہیں ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے ایک نیا قاضی مقرر کیا[۱۱] جعلی سکّے بنانے والوں کو سزا دی[۱۲] اور اہلِ مدینہ کے صاع (ناپ کا پیمانہ) میں اضافہ کیا[۱۳]

ان کی وفات کے بارے میں ہماری معلومات غیر یقینی ہیں۔ انھیں وفات سے ایک سال پہلے فالج کا اثر ہو گیا تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ الولید کے عہد (۸۶ - ۹۶ھ) میں مرے اور ابن سعد کا خیال ہے کہ ان کی وفات یزید ثانی (۱۰۱ - ۱۰۵ھ) کے زمانے میں ہوئی۔ بلکہ بعض لوگ عہد یزید ثانی کے اواخر (۱۰۵ھ) میں بتلاتے ہیں۔

ابان کا شمار فقہائے مدینہ میں ہوتا ہے[۱۴] کہا جاتا ہے کہ انھیں اپنے باپ کے فتاویٰ حفظ تھے[۱۵] کچھ روایات اس کی نفی کرتی ہیں کہ انھوں نے اپنے والد سے احادیث کی سماعت کی تھی[۱۶]

ابان کو زمرۂ محدثین میں اچھی شہرت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کے علاوہ ابوالزناد اور الزہری نے ان سے حدیث کی سماعت کی تھی۔ اگرچہ احادیث کی سندوں میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے مگر سیرۃ کی کتابوں سے قطعاً غیر حاضر ہے۔ ہمیں ان کا ذکر ابن اسحٰق اور الواقدی کے یہاں یا ابن سعد کی کتاب کے ان حصوں میں جو سیرۃ سے متعلق ہیں ہرگز نہیں ملے گا[۱۷] یہ صحیح ہے کہ ابن سعد نے واقعۂ بدر میں العباس اور دوسرے ہاشمیوں کی گرفتاری کا حال ابان بن عثمان کی روایت سے لکھا ہے[۱۸] لیکن اس خبر کا اسناد (ابان عن معاویہ بن عمّار عن جعفر بن محمد متوفی ۱۴۸ھ) ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں ابان بن خلیفہ عثمان مراد نہیں ہیں بلکہ یہ شیعی مؤلف ابان بن عثمان البجلی ہے[۱۹] موخرالذکر نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا موضوع "المبدأ والمبعث والمغازی" ہے اور شاید یہ وہی ہے جس کا تذکرہ یاقوت نے معجم البلدان (۴: ۵۵) میں کیا ہے اور اسے "صاحب المغازی" کہتا ہے۔ لیکن ہمارے ابان خلیفہ کے بیٹے ہیں اور انہوں نے بھی مغازی میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی۔

ابن سعد میں ایک مغیرہ بن عبدالرحمٰن کے بارے میں کہا گیا ہے:[۲۰] "یہ قابلِ اعتماد تھے مگر انھوں نے بہت کم احادیث کی روایت کی ہے۔ البتہ کچھ مغازی جو انھوں نے ابان بن عثمان سے اخذ کیے تھے، ان کے سامنے کثرت سے پڑھے جاتے تھے اور وہ ہمیں ان کی تعلیم کی اجازت دیا کرتے تھے[۲۱]" یہ مغیرہ مسلمہ کی فوج میں تھے جس نے ۹۶ھ میں ایشیائے کوچک کا رُخ کیا تھا[۲۲] اور جسے ۹۹ھ میں عمر ثانی (بن عبدالعزیز) نے واپس آنے کا حکم دے دیا تھا[۲۳] مغیرہ ابان بن عثمان الخلیفہ ہی سے مغازی اخذ کر سکتے تھے۔ ابان بن عثمان البجلی سے نہیں، جو اُن سے دو یا تین نسلوں کے بعد پیدا ہوئے۔

یہ مغازی جو ابان سے مغیرہ نے روایت کیے، اصطلاحی معنوں میں "کتاب" نہیں تھے بلکہ سیرۃ سے متعلق اخبار کا مجموعہ تھے اور غالباً اس مجموعے میں سے بھی جو مذکورۂ بالا صحائف یا کتب کے مماثل تھے ہم تک کچھ نہیں پہنچا۔

بہرحال ابان کا تذکرہ اس اعتبار سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایک خاص مجموعہ مغازی کا فراہم کیا۔ فی الواقع قتل عثمان کے بعد مدینہ اسلامی حکومت کا مرکز نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ ایک طویل عرصے تک عرب کی اعلیٰ سوسائٹی کا مرکز رہا جو مدینے کے انصار اور مکّے کے مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اس میں خاندان بنی امیہ کے انصار بھی شامل تھے جنھوں نے اب دمشق میں اپنی

حاصل رائج کر لی تھی۔ مدینے کے ان حلقوں میں صرف مذہبی علوم ہی ذوق وشوق سے حاصل نہیں کئے جاتے تھے بلکہ موسیقی اور شعر وشاعری کا چرچا بھی ہو رہا تھا۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ علما اور شاعروں میں کوئی ربط نہیں تھا یا سب علمائے دین شعر کے مخالف تھے بلکہ خود مدینے میں ایسے علمائے دین موجود تھے جو اعلیٰ درجے کے شاعر تھے جن کی بہترین مثال عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود کے پوتے ہیں جو رسول اللہؐ کے ساتھ احد میں شریکِ جنگ تھے۔

ان عبید اللہ کے لیے ابو الفرج الاصفہانی نے کتاب الاغانی میں ایک فصل مخصوص کی ہے[۲۴] جس میں ان کی شاعری کے نمونے ہیں۔ ایسا ہی ابن سعد نے کیا ہے[۲۵] یہ مدینہ کے سات فقیہوں میں سے ایک ہیں۔ جب وہ قبیلہ ہذیل کی ایک دوشیزہ پر عاشق ہوئے تو انہوں نے باقی چھ فقہا کے نام ایک قصیدے میں محبوبہ کو خطاب کر کے گنوائے ہیں اور انھیں اپنی محبت کی شدت پر گواہ بنایا ہے[۲۶]:

أُحِبُّكِ حُبًّا لَوْ عَلِمْتِ بِبَعْضِهِ ... لَجُدْتِ وَلَوْ يَصْعُبْ عَلَيْكِ شَدِيدُ
وَحُبُّكِ يَا أُمَّ الصَّبِيِّ مُدَلِّهِي ... شَهِيدِي أَبُو بَكْرٍ وَأَيُّ شَهِيدُ
وَيَعْلَمُ وَجْدِي الْقَاسِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ ... وَعُرْوَةُ مَا أَلْقَى بِكُمْ، وَسَعِيدُ
وَيَعْلَمُ مَا أُخْفِي سُلَيْمَانُ عِلْمَهُ ... وَخَارِجَةُ يُبْدِي لَنَا وَيُعِيدُ
مَتَى تَسْأَلِي عَمَّا أَقُولُ فَتُخْبَرِي ... فَلِلْحُبِّ عِنْدِي طَارِفٌ وَتَلِيدُ

۱۔ میں تجھ سے اتنی شدید محبت کرتا ہوں کہ اگر تجھے اس کا ذرا بھی علم ہو جائے تو تیرا دل نرم پڑ جائے اور محبت کی یہ شدت تجھے کسی مشکل میں ڈالنے والی نہیں ہے۔

۲۔ اور تیری محبت نے، اے بچّے کی ماں — میرے حواس چھین لیے ہیں، اس پر ابو بکر گواہ ہیں اور کیسے گواہ ہیں۔

۳۔ اور قاسم بن محمد کو بھی میرا دردِ دل معلوم ہے اور تجھ سے جو مجھ پر گذری ہے وہ عروۃ اور سعید بھی جانتے ہیں۔

۴۔ سلیمان بھی اپنی گواہی نہیں چھپائیں گے اور خارجہ بھی اس کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں۔

۵۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر تو اس کی تصدیق کرے گی تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ میری محبت تازہ اور شاداب ہے۔

ان مشہور فقہا میں جو شاعر تو نہیں تھے لیکن نقدِ شعر کا اچھا ذوق رکھتے تھے، ایک سعید بن المسیّب بھی ہیں جو ان چھ فقیہوں میں شامل ہیں جنھیں عبید اللہ نے اپنی محبّت پر گواہ کیا ہے۔ یہ ابو ہریرہ کی بیوی کے فرزند اور علم حدیث کے مستند عالم تھے۔ جب نوفل بن مساحق نے مسجد نبوی میں انھیں سلام کیا۔ یہ اپنے شاگردوں اور مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھے تھے۔ نوفل نے پوچھا: "سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ عبد اللہ بن قیس الرقیات یا عمر بن ابی ربیعہ"[۲۷] اس وقت خود عبد اللہ بن قیس ان کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے تازہ ترین کلام کے بارے میں اُن کی رائے جاننا چاہی[۲۸]۔ کتاب الاغانی میں ایک روایت ہے[۲۹] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محتاط رائے دینے کو یہ جماعت کتنا پسند کرتی تھی۔ عبد اللہ بن عمر کہتے ہیں: "میں حج کرنے چلا، راستے میں ایک حسین عورت کو دیکھا جو اپنی گفتگو میں فحش ادائیں دکھاتی تھی، میں نے اپنا اونٹ اس کے قریب لا کر کہا: "اے اللہ

کی بندی، تو حج کو جا رہی ہے، کیا تو اللہ سے نہیں ڈرتی؟" اس پر اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی جو خوبصورتی میں سورج کو شرما رہا تھا، اور بولی:

"چچا میاں، ذرا سوچو تو، میں وہ عورت ہوں کہ العرجی نے جس کے بارے میں یہ کہا ہے:

من اللاء لم یحججن یبغین حسبة ولکن لیقتلن البرئ المغفلا

(یہ ان عورتوں میں سے ہے جو اس لیے حج نہیں کرتیں کہ اللہ کی رضا حاصل کریں، بلکہ بے گناہ اور معصوم لوگوں کا قتل عام کرنے جاتی ہیں)

میں نے کہا: "اچھا تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ اس حسین چہرے کو دوزخ کی آنچ سے بچائے۔"

سعید بن المسیب نے یہ قصہ سُنا تو بولے: خدا کی قسم اگر عراق کے قابل نفرت لوگوں میں سے کوئی ہوتا تو اس عورت سے یوں کہتا: "دفان ہو، خدا تجھے سمجھے۔" مگر ابن عمر کا جواب اہل حجاز کی ذہانت لیے ہوئے ہے۔"

اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم اصل موضوع سے زیادہ دُور نہیں گئے ہیں، اگرچہ بظاہر یہی محسوس ہوگا، اصل میں یہاں سعید کے کچھ حالات بیان کرنا ضروری تھے اس لیے کہ ہم ان کے اس قول کے ممنون ہیں کہ "مدینہ کے اشراف کی سوسائٹی میں مغازی گفتگو کا پسندیدہ موضوع تھا۔" الطبری نے ان کا بیان نقل کیا ہے:[۳۰] "جب ہم مروان بن الحکم کے پاس تھے"۔ یقیناً یہ اس زمانے کی بات کر رہے ہیں جب غالباً ۵۶ھ میں مروان مدینہ کا گورنر تھا۔ "دربان اندر آیا اور بولا: ابو خالد حکیم بن حزام آئے ہیں۔"

اس نے کہا "آنے دو۔"

جب حکیم اندر آئے تو اس نے کہا "خوش آمدید ابو خالد۔ قریب آجاؤ۔"

مروان صدر مجلس سے ہٹ گیا یہاں تک کہ دونوں کے درمیان تکیہ آگیا۔ اب مروان نے ان سے کہا "ہمیں بدر کا قصہ سنائیے!"

تب حکیم نے کہنا شروع کیا: "ہم چلے ......" وغیرہ۔

ایسا ہی عمل عبدالملک بن مروان نے خلیفہ ہونے کے بعد کیا۔ وہ کبار تابعین سے بدر کے حالات معلوم کیا کرتا تھا۔

اب ہم پھر ابان کی طرف آتے ہیں۔ بڑے فقہا اور محدثین کے بارے میں یہ جاننے کے بعد کہ وہ شاعری کا ذوق رکھتے تھے ہمیں یہ سُن کر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ابان بھی شعر کے رسیا تھے۔ ابو الزناد کہتے ہیں[۳۱] کہ میں نے مشکل سے ان کی کوئی مجلس ایسی دیکھی ہوگی جس میں انہوں نے مدینہ کے یہودی شاعر الربیع بن الحقیق کے اشعار نہ پڑھے ہوں۔

سَئِمْتُ وَاَمْسَیْتُ رهنَ الفِرا شِ مِنْ جُرمِ قَومِي وِمن مَغرَمِ

وَمن سَفَهِ الرَّأیِ بَعدَ النُّهَی وَغَیبِ الرَّشادِ وَلَمْ یُفهَمِ

فَلَوْ اَنَّ قَومی اَطَاعُوا الحَلِیمَ لَمْ یَتَعَدَّوا وَلَمْ یُظلَمِ

وَلٰکِنَّ قَوْمِیْ أَطَاعُوا الْغُـــوا ةَ ، حَتّٰی تَعَاشَ أَھْلُ الذَّم
فَأَوْدَی السَّفِیْـــهُ بِرَأْیِ الْحَلِیْمِ وَانْتَشَرَ الْاَمْرُ لَھُمْ مُبْرَمُ

۱۔ اب جو میں بستر میں پڑا ہوں تو اپنی قوم کے جرم و خطا سے عاجز ہوں۔
۲۔ اور ان کی احمقانہ حرکتوں سے جو سمجھانے کے باوجود سرزد ہوئیں، انھوں نے سیدھے راستے میں عیب نکالے اور بات کو سمجھ کر ہی نہ دیا۔
۳۔ اگر میری قوم نے عاقلوں کی رائے پر عمل کیا ہوتا تو نہ ان پر زیادتی ہوتی نہ ظلم ہوتا۔
۴۔ مگر انھوں نے تو بہکانے والوں کا اتباع کیا یہاں تک کہ دشمن (کاٹنے کے بعد سانپ کی طرح) اُلٹ گئے۔
۵۔ احمقوں نے عقلمندوں کے معاملے کا ایسا ستیاناس کر دیا کہ اب کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا۔

یزید بن عیاض کہتے ہیں[۳۲] کہ اپنے گورنری کے زمانے میں ابان نے صرف یہی غلطی کی تھی کہ حضرت علی کے بھتیجے عبداللہ بن جعفر کو خوش کرنے کے لیے خود دمشق کے دربار میں پہنچے جبکہ عبداللہ اپنے بانسری بجانے والے غلام کو بھیجنے پر آمادہ تھے . . . . . .

۲۔ عروۃ بن الزبیر

ابان کی ولادت کے کچھ ہی زمانے بعد عروۃ بن الزبیر پیدا ہوئے۔ یہ بھی مغازی کے ایسے ہی عالم تھے۔ ان کے مجموعہ روایات سے، ابان کے برعکس بہت کچھ ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے عروۃ بھی اسلام کے قدیم طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے حجاج بن یوسف کے ایک طنزیہ جملے کے جواب میں[۳۳] اس پر فخر کیا ہے کہ وہ صدر اول کی سب سے زیادہ شریف مسلمان خاتون سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مکالمہ غالباً ۷۵ھ میں ہوا۔ واقعہ یوں ہے کہ عروہ نے عبدالملک سے باتیں کرتے ہوئے اپنے بھائی عبداللہ کا تذکرہ اُن کی کنیت ابوبکر سے کیا۔ حجاج نے اس پر ملامت کی:

"تیری ماں مرے، تو ایک منافق کا ذکر امیرالمومنین کے سامنے کنیت کے ساتھ کرتا ہے۔"

"یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟" عروۃ نے جواب دیا۔ "جو جنت کی سردار عورتوں کا بیٹا ہے۔ میری ماں اسما بنت ابی بکر ہے، نانی صفیہ بنت عبدالمطلب ہے، خالہ عائشہؓ ہے اور پھوپھی خدیجہؓ بنت خویلد؟"

عروۃ کے دادا العوام حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے، ان کے باپ الزبیر سابقون الاولون میں سے تھے اور ان کے بھائی عبداللہ جن کا ابھی ذکر ہوا ان مکی اور مدنی اصحاب رسولؐ کی اولاد کے قائد تھے جنھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ۶۴ھ سے ۷۲ھ تک مکہ میں حکومت کی۔

عروۃ، عبداللہ سے کئی سال چھوٹے تھے اس لیے کہ عبداللہ نے اپنے چھوٹے بھائی کی ولادت کی خبر اس وقت سنی تھی جب وہ ۲۶ھ میں افریقہ[۳۴] پر چڑھائی کر کے مدینہ واپس آئے ہیں۔ عروۃ نے جنگ جمل (۳۶ھ) میں شرکت نہیں کی تھی جس میں ان کے باپ کام آئے۔ اس لیے کہ یہ اس وقت صرف دس سال کے تھے۔ ان کے مقابلے

میں ابان کچھ ہی بڑے تھے[۳۵]۔ مگر وہ معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ اس زمانے میں عروۃ شہر ہی میں رہے۔ سنہ ۴۶ھ میں پہلی بار ان کا نام ایک سیاسی واقعہ کے ذیل میں آتا ہے: جب خالد بن المہاجر نے اپنے مقتول چچا عبدالرحمٰن بن خالد کے خون کا قصاص لیا[۳۶]۔

معاویہ کی حکومت (۴۱ھ - ۶۰ھ) کے آخری زمانے میں اور ۵۵ھ کے بعد کسی وقت عروۃ اپنے کچھ حامیوں کے ساتھ مسجد نبوی میں روزانہ رات کو باقاعدہ اجتماع کرتے تھے اور قبیصہ کا بیان ہے[۳۷] جو اس جماعت کا ایک رکن تھا اور بعد کو خلیفہ عبدالملک کا معتمد بن گیا تھا کہ اس جماعت کے ممبروں میں اُس کے اور عروہ کے علاوہ مصعب بن الزبیر، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، عبدالملک بن مروان، عبدالرحمٰن بن مسور، ابراہیم بن عبدالرحمٰن اور عبیداللہ بن عبداللہ شامل تھے[۳۸]۔ رات کے ان جلسوں کی ایک کہانی ہمارے لیے ابن خلکان نے محفوظ کر دی ہے[۳۹]۔ مگر اس قصے میں موازنے کے لیے اس نے عبداللہ بن الزبیر کا نام بھی شرکا میں شامل کر دیا ہے جب کہ ایسے نام چھوڑ دیے ہیں جو قصے کی مناسبت سے غیر ضروری تھے۔ وہ کہتا ہے: "عبدالملک بن مروان، عبداللہ بن الزبیر اور اُن کے دونوں بھائی عروۃ اور مصعب، معاویہ بن ابی سفیان کے عہد حکومت میں مسجد حرام میں جمع تھے، کسی نے کہا: "آؤ ہم سب اپنی اپنی خواہش بیان کریں" عبداللہ نے کہا: "میری تمنا ہے کہ دونوں مقدس شہروں (مکہ اور مدینہ) پر حکومت کروں اور خلیفہ بن جاؤں" مصعب بولے: "میری آرزو ہے کہ دونوں عراقوں پر قبضہ کروں اور قریش کی دو حسین ترین عورتیں سکینہ بنت الحسین اور عائشہ بنت طلحہ میرے نکاح میں ہوں" عبدالملک بن مروان نے کہا "میری تمنا یہ ہے کہ ساری دنیا پر حکومت کروں اور معاویہ کا جانشین بنوں"۔ عروۃ نے کہا: "مجھے ان میں سے کوئی تمنا نہیں ہے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ دنیا میں زاہدانہ زندگی گزاروں، آخرت میں سرخرو رہوں اور اُن لوگوں میں شمار کیا جاؤں جن سے علم کی روایت کی جاتی ہے"۔ چنانچہ زمانہ بدلا۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی مراد کو پہنچا اسی لیے عبدالملک کہا کرتا تھا کہ "جو کوئی دنیا میں جنتی آدمی کو دیکھنا چاہے وہ عروۃ بن الزبیر کو دیکھ لے"۔

مدینہ میں عروۃ کا قیام تقریباً سات سال نہیں رہا جب وہ مصر میں تھے۔ اس بارے میں خود عروۃ کہا کرتے تھے:[۴۰]

"میں نے سات سال مصر میں گذارے اور وہاں شادی کی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ بوجھ سے دبے ہوئے ہیں، اُن پر اُن کی طاقت سے زیادہ بار ڈال دیا گیا ہے۔ اگرچہ عمرو نے یہ ملک صلح اور معاہدے کی رُو سے حاصل کیا تھا اور ان پر کچھ ٹیکس لگا دیئے تھے۔"

ہمیں یہ معلوم ہے کہ جس زمانے میں اُن کے بھائی نے یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے[۴۱] عروۃ مصر میں تھے۔ دوسری طرف عبداللہ نے سنہ ۶۴ھ میں مصر کے لیے جو گورنر نامزد کیا تھا اسے اگلے ہی سال وہاں سے آنا پڑا تھا اس لیے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عروۃ نے جو سات سال مصر میں گذارے یہ ۵۸ھ سے ۶۵ھ تک کا زمانہ ہوگا۔ عبداللہ کی خلیفہ سے جنگ میں عروۃ بھی اپنے بھائی کے ساتھ تھے اور جب ۷۲ھ میں اپنے بھائی کی خاطر لڑتے ہوئے مصعب بھی مارے گئے تو عروۃ کو اُن کا ترکہ پہنچا تھا[۴۲] اور جب عبداللہ کا محاصرہ مکہ میں ہوا تو یہ اپنے بھائی کے ساتھ رہے[۴۳]۔ عبداللہ کے قتل اور اُن کے مقصد

کی ناکامی کے بعد (۷۳ھ) عروۃ سیدھے عبدالملک کے دربار میں پہنچ گئے جواب مستقل طور پر خلیفہ تھا اور جس کے ساتھ آخرعہد معاویہ میں عروۃ راتوں کو مسجد نبوی میں جمع ہوتے تھے، جس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے۔ عبدالملک کے دربار میں عروۃ کی حاضری سے متعلق متعدد مماثل روایات ملتی ہیں[۴۴] یہاں عبداللہ بن فائد کی روایت درج کی جاتی ہے:

"عروۃ ایک بہترین اونٹ پر سوار ہوئے اور اس سے پہلے دمشق جا پہنچے کہ حجاج کے قاصد عبداللہ بن الزبیر کے مقتول ہو جانے کی خوش خبری لائیں۔ جب وہ عبدالملک کے دروازے پر آئے تو انھیں باریابی دی گئی۔ انہوں نے "خلیفہ" کہہ کر سلام کیا، عبدالملک نے جواب دیا، خوش آمدید کہا اور گلے سے لگایا۔ پھر انھیں تخت پر اپنے ساتھ بٹھایا۔ پھر عروۃ نے کہا:

تَمُتُّ بِأَرْحَامٍ إِلَيْكَ قَرِيبَةٍ

وَلَا قُرْبَ لِلْأَرْحَامِ مَالَمْ تُقَرَّبِ

(ہم تجھ سے قریبی رشتہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر کوئی رشتہ قریبی نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے قریب کیا نہ جائے)

پھر باتیں کرتے رہے، یہاں تک کہ عبداللہ کا تذکرہ ہوا۔ عروۃ نے کہا: "ابوبکر[۴۵] ہم سے جدا ہو گئے۔" عبدالملک نے کہا: "کیا ہوا؟" کہا: "قتل کر دیے گئے، خدا اُن پر رحمت کرے۔" اس پر عبدالملک سجدے میں گر پڑا۔ عروہ نے کہا: حجاج نے ان کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا ہے اس سے کہو کہ لاش ان کی ماں کے حوالے کر دے۔" اس نے کہا: بہتر۔ اور سولی دینے کے بارے میں جو اطلاع ملی تھی اس پر اظہارِ رنج کیا اور حجاج کو لکھا: "خبردار عروہ کو میں نے امان دے دی ہے۔" تیس دن کے اندر وہ شام سے مکہ واپس آ گئے۔ حجاج نے سولی سے عبداللہ کا جسد اُتار کر اُن کی ماں کے حوالے کر دیا تھا (ماں نے لاش کو غسل دیا، مگر پانی پڑنے سے جسم اُدھڑنے لگا۔ وہ کہنے لگیں: "مجھے خواب میں اُم المقطع (ٹکڑے ہونے والے بچے کی ماں) کہا گیا تھا، میں المنذر کو سمجھی تھی کیونکہ تلوار سے اس کے ٹکڑے کیے گئے تھے۔ اپنے بیٹے کو نہیں سمجھی تھی" پھر ایک ایک عضو علیحدہ دھویا، ان کو جوڑ کر دفن کیا[۴۶] عروہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

عبدالملک عروہ کا اتنا ہی احترام کرتا تھا جتنی اس سے توقع کی جا سکتی تھی، مگر عروہ کے بیٹے ہشام کا کہنا ہے کہ عروہ کو بعض دمشق والوں سے شکایت تھی[۴۷] ایک دن عروہ عبدالملک کے ساتھ بیٹھے تھے، کچھ لوگ آئے اور عبداللہ بن الزبیر کا ذکر شروع کیا عروہ دربان سے یہ کہتے ہوئے نکل گئے "عبداللہ بن الزبیر میرے ماں باپ کا فرزند تھا جب تمھیں اس کا تذکرہ کرتا ہو تو مجھے باریابی نہ دیا کرو۔"

عبدالملک کو جب معلوم ہوا تو کہا "ہم نے تمہارے بھائی کو عداوت سے قتل نہیں کیا، بلکہ اس نے حکومت طلب کی ہم نے بھی طلب کی، اس میں وہ مارا گیا۔ اہل شام کا یہ وطیرہ ہے کہ جسے قتل کرتے ہیں اُسے بُرا بھلا بھی کہتے ہیں۔ اگر ہم کسی کو تم سے پہلے باریابی دیں اور ایسا شخص آ جائے جو بدزبانی کرنے والا ہو تو تم اندر مت آؤ، اور اگر کسی دوسرے کو باریابی مل جائے جب کہ تم یہاں بیٹھے ہو تو اُٹھ کر باہر چلے جاؤ۔"

عبدالملک سے عروہ کی اور ملاقاتوں کا حال ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں یہ جانتے ہیں کہ عروہ کے مدینے واپس آنے کے

بعد علمی موضوعات پر ان دونوں میں خط و کتابت رہتی تھی۔

دوبارہ پھر عروہ دمشق گئے جب ۸۶ھ میں ولید تخت حکومت پر بیٹھا۔[48] اس وقت ان کے ہم رکاب ان کا بیٹا اور ان کے خاندان کا ایک دوست شاعر اسماعیل بن یسار بھی تھا۔[49] اس دوسرے سفر دمشق میں عروہ پر ایک بلا نازل ہوگئی۔ ان کا بیٹا محمد، شاہی اصطبل کی چھت سے گر پڑا، جہاں سے جھانک کر وہ گھوڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے الف ہو رہے تھے۔ انہوں نے دولتیاں مار مار کر ہلاک کر دیا۔ خود عروہ کو بھی زہر پھیل جانے کی وجہ سے اپنی ایک ٹانگ کٹوانی پڑی تھی۔[50]

محمد کے مرثیے میں اسماعیل بن یسار نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ کتاب الاغانی میں محفوظ ہے اور اس افسوس ناک حادثے کے بارے میں ہشام بن عروہ کی روایت بھی درج ہے، وہ کہتا ہے: "پھر عروہ ولید بن عبدالملک کے پاس پہنچے اور اپنے پیر کے زخم کی شکایت کی۔ ان سے کہا گیا کہ اسے قطع کرادو۔ بولے مجھے لنگڑا بننا پسند نہیں۔ اب وہ زخم گھٹنے تک پہنچ گیا۔ ان سے کہا گیا: "یہ اگر گھٹنے تک آ گیا تو تم مر جاؤ گے۔ مجبوراً کٹوا دیا، اور ان کے چہرے پر کوئی ناگواری کا اثر نہیں تھا۔ کاٹنے سے پہلے اُن سے کہا: ہم آپ کو ایسی دوا دیتے ہیں جس کو پی کر درد کا احساس نہیں ہوگا۔ بولے "کوئی ضرورت نہیں، یہ دیوار مجھے اس تکلیف سے بچائے گی ..." اور محمد بن عروہ بن الزبیر — جن کی ماں الحکم بن ابی العاص بن امیہ کی بیٹی تھی — ولید کے اصطبل میں ایک چبوترے سے گر پڑے۔ ایک گھوڑی نے اپنے سُموں سے مار مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔ ایک شخص عروہ کے پاس تعزیت کے لئے آیا تو عروہ نے کہا، اگر تم میری ٹانگ پر افسوس کرنے آئے ہو تو میں اس پر صبر کر چکا۔" اس نے کہا کہ میں تو محمد کی تعزیت کو حاضر ہوا ہوں۔" بولے: "اسے کیا ہوا؟" تب انھیں یہ ماجرا سنایا گیا، انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

وَكُنْتُ إذا الأيَّامُ أحدثن هالكا ‏ أقولُ شَوىً، ما لم يُصِبْنَ حَمِيمِي

(جب زمانہ کوئی ستم ایجاد کرتا تھا تو میں کہا کرتا تھا: "یہ تو کچھ بھی نہیں! مگر یہ اُس وقت تھا کہ میرے کسی عزیز پر آفت نہیں آئی تھی۔")

"یا اللہ! تو نے میرا ایک عضو چھین لیا مگر باقی اعضا تو موجود ہیں، ایک بیٹے کو مجھ سے جُدا کر دیا تو دوسرے بیٹے ہیں، اگر تو انھیں لیتا ہے تو باقی بھی تو ہی رکھتا ہے، اور آزمائش میں ڈالتا ہے تو عافیت بھی تجھی سے ملتی ہے۔" جب وہ مدینے آئے تو اپنے العقیق والے محل میں مقیم ہوئے۔

دوسرے متعدد بیانات میں بھی عروہ کی ٹانگ کٹ جانے کا یہی حال ملتا ہے۔[51] ان میں سے ایک یہ ہے:[52]

"عیسیٰ بن طلحہ، عروہ کے پاس آئے، یہ اس وقت الولید بن عبدالملک کے دربار سے واپس آئے تھے اور ٹانگ کٹ چکی تھی۔ عروہ نے اپنے کسی بیٹے سے کہا: "ذرا میری ٹانگ کھول دو تاکہ یہ تمہارے چچا دیکھ لیں۔" اس نے ایسا ہی کیا۔ عیسیٰ نے کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے ابو عبداللہ ہم نے تمھیں کشتی لڑنے یا دوڑ لگانے کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ہمارے لیے اس چیز کو باقی رکھا جس کے ہم محتاج تھے یعنی تمہارا علم اور ذہانت۔"

عروہ نے کہا: "تمھاری طرح کسی نے بھی میری ٹانگ کے بارے میں میری ڈھارس نہیں بندھائی۔"

امراء بنی امیہ میں سے ایک امیر عمر بن عبدالعزیزؒ جب مدینے کے گورنر تھے (۸۷ھ یا ۹۳ھ) تو عروہ ان کے پاس اکثر جایا کرتے تھے۔ عروہ ان دس فقہا میں سے ایک تھے جنھیں مدینے کا والی ہونے کے بعد عمرؒ نے مشورے کے لئے طلب کیا[۵۵]۔ ابن سعد نے ایک حدیث بنوی عروہ سے روایت کی ہے جو عمرؒ نے اس وقت بیان کی تھی جب وہ مدینے میں مسجد تعمیر کر رہے تھے (۸۸ھ) اس کے باوجود عروہ نے گورنر سے اس وقت شدید احتجاج کیا تھا جب اس نے ان کے قول کو جھٹلایا کہ "حضرت عائشہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والدین کے سوا کسی سے اتنی محبت نہیں کرتی تھیں جتنی عبداللہ بن الزبیرؓ سے[۵۶]"۔

مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کی آگ بھڑکانے سے عروہ بہت بچتے تھے چنانچہ ان سے یہ قول منسوب[۵۷] ہے کہ "علیؓ اس سے بہت زیادہ متقی تھے کہ وہ قاتلین عثمانؓ کی مدد کرتے اور عثمانؓ بھی اس سے کہیں زیادہ پرہیزگار تھے کہ علی ان کو قتل کرا دیتے عروہ حضرت کے ایک پوتے علی بن الحسین (ف ۹۲ھ یا ۹۴ھ) کے ساتھ مسجد نبوی کے عقبی حصے میں ہر شام کو بیٹھا کرتے تھے۔ ایک بار ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی اس میں عبداللہ بن حسن بھی شریک تھے وہ بیان کرتے ہیں[۵۸]: "ایک رات ہم باتیں کر رہے تھے۔ یہ عبدالملک یا الولید کا زمانہ تھا"۔ بات کا رخ بنو امیہ کے جور و ستم کی طرف پھر گیا جو انہوں نے اپنے عہد اقتدار میں کیے اور سب لوگ بے بسی سے دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اللہ کے عذاب سے خوف ظاہر کیا جو بنی امیہ پر کیا جائے گا۔ اس پر عروہ نے علی سے کہا: "اے علیؓ جو شخص ظلم سے خود کو علیحدہ رکھتا ہے اور جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ ظالموں کے فعل سے نفرت کرتا ہے تو خواہ وہ ان کی طرف تھوڑا سا میلان رکھتا ہو، جب ظالموں پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا، تو خدا سے امید کی جاتی ہے کہ وہ شخص محفوظ رہے گا"۔

پھر عروہ نے مدینہ چھوڑ دیا اور العقیق چلے گئے[۵۹]۔ عبداللہ نے کہا: "اور میں وہاں سے نکل کر سویقہ میں مقیم ہو گیا"۔

یہاں جو کلمات عروہ سے منسوب ہوئے ہیں جس میں اموریوں کے استبداد کا حوالہ ہے، یہ غالباً انھوں نے حکام دمشق سے اپنا تعلق باقی رکھنے پر اپنے دفاع میں کہے ہیں جن سے انھوں نے اپنی اطاعت کا انکار نہیں کیا اور مدینے میں رہ کر بھی ان سے رابطہ قائم رکھا۔

عروہ کے سال وفات کے بارے میں ہمیں قطعیت سے معلوم نہیں ہے[۵۹]۔ البتہ بہت سے ثقات اُن کا انتقال ۹۴ھ میں بتلاتے ہیں۔ انہوں نے الفرع کے پاس اپنی جاگیر مجاج میں وفات پائی۔ اُن کے بیٹوں میں محمد اور ہشام کا ہم نے پہلے بھی کئی بار نام لیا ہے، ان کے سوا چھ بیٹوں کے نام ہمیں اور معلوم ہیں[۶۰]۔

عروہ بحیثیت محدث بڑی شہرت کے مالک ہیں، اور وہ مدینہ کے سات فقہا میں سے ایک ہیں۔ اپنے خاندانی رشتوں کی وجہ سے انھیں صدر اسلام کی بہت سی روایات اولین ذرائع سے فراہم کرنے کے مواقع حاصل تھے، یعنی اپنے والد بزرگوار سے، اپنی ماں سے اور سب سے زیادہ خالہ عائشہ سے۔ جن سے وہ کثرت سے ملتے اور سوالات کرتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں[۶۱] کہ میں نے اور عروہ نے ابن عمر سے دریافت کیا کہ رسول اللہ نے کتنے عمرے کیے تھے، اُن کے جواب سے ہماری تشفی نہیں ہوئی تو عروہ عائشہؓ کے پاس گئے۔ انہوں نے دوسرا ہی جواب دیا۔

جن حضرات نے عروہ سے روایت کی اُن میں ہشام بن عروہ اور محمد بن مسلم بن شہاب الزہری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اُن کے بیٹے ہشام اطلاع دیتے ہیں کہ واقعہ حرّہ کے دن (۶۳ھ) جس میں یزید نے مدینے والوں کو شکست دی تھی، عروہ نے اپنی فقہ کی کتابیں جلا ڈالی تھیں[۶۲] بعد میں اس نقصان پر بہت رنج کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کتابوں کے بارے میں علم نہیں جو اُن کے پاس ہوں یا جن پر انہوں نے کچھ شرح وغیرہ لکھی ہو[۶۳]

عروہ نے ثقہ راویوں سے جو اخبار حاصل کیے تھے وہ اپنے شاگردوں کو زبانی ہی منتقل نہیں کیے بلکہ صدر اسلام کے حوادث پر انھوں نے اپنی معلومات کو مدوّن بھی کیا تھا۔ اس طرح کے کئی مدون رسائل ہمیں ابن اسحٰق، الواقدی اور الطبری کی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ الطبری میں جو اقتباسات درج ہیں اُن کا خطاب غالباً خلیفہ عبدالملک سے ہے۔ دوسروں میں ابن ابی ہُنیدہ مخاطب ہے جو خلیفہ الولید کے دربار سے متوسل تھا۔

ابتداً ہی عبدالملک اکثر فقہا کی صحبت میں بیٹھتا تھا[۶۴] اور نوجوانی میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کا شائق تھا[۶۵] خلیفہ عثمان کے فتاویٰ اُسے زبانی یاد تھے اور ابو ہریرہ، ابوسعید الخُدری وغیرہ صحابہ سے اُس نے احادیث سُنی تھیں[۶۶]۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر اس نے مدینہ کی طرف رجوع کیا[۶۷] جسے وہ علم حدیث کا مرکز جانتا تھا اور مغازی کے موضوع پر عروہ سے معلومات حاصل کیں۔ جن کو وہ اپنے زمانہ قیام مدینہ سے ہی اس موضوع پر سند سمجھتا تھا اور جن سے عبداللہ کی بغاوت کے فرو ہونے کے بعد خوشگوار تعلقات ہو گئے تھے۔

عبدالملک کے نام عروہ کے رسائل کا پہلا اقتباس جو الطبری[۶۸] میں محفوظ ہے، حبشہ کو ہجرت کرنے سے متعلق ہے اس کے ساتھ طویل سلسلۂ اسناد ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے:

"ابان العطّار قال: ثنا هشام بن عروة عن عروة، انه كتب الى عبد الملك بن مروان......"

(ابان العطار نے کہا: مجھ سے ہشام بن عروہ نے بیان کیا، ان سے عروہ نے بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو لکھا.....")

دوسرے اقتباس میں بھی ہمیں یہی سند ملتی ہے[۶۹] فرق اتنا ہے کہ اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: "عن عروة انه قال. ...." اس میں یہ نہیں ہے کہ "کتب إلی عبد الملک" — بہر حال اس میں شک نہیں کہ یہ بھی عبدالملک کے نام اُن کے مراسلے کا ہی ایک اقتباس ہے اس لیے کہ باعتبار موضوع یہ پچھلے اقتباس سے مربوط ہے کیونکہ پہلے میں حبشہ کو ہجرت کرنے کا بیان ہے جس کا باعث پہلا "فتنہ" تھا اور دوسرا اقتباس مدینہ کو اصحاب رسول کی ہجرت کا بیان پیش کرتا ہے جو دوسرے "فتنے" کے سبب ہوئی۔ عروہ نے لفظ "فتنہ" قرآن کی آیۃ (۸ : ۳۹) کی رُو سے استعمال کیا ہے اور دوسرے اقتباس میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جس میں ہجرت نبوی کا ذکر ہے[۷۰]۔ یہاں بھی سلسلۂ اسناد وہی ہے بس وہی فرق ہے کہ آخر میں ہے: "انہوں نے کہا"۔ یہ نہیں ہے کہ "انھوں نے عبدالملک کو لکھا"۔ بظاہر یہ تینوں اقتباس ایک ہی مراسلے سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے عبدالملک کو لکھا تھا۔ آگے چل کر ہمیں یہ بات زیادہ واضح لفظوں میں ملتی ہے۔ اُسی سلسلۂ اسناد کے بعد[۷۱]۔

"ثنا هشام بن عروة عن عروة أنه كتب إلى عبد الملك بن مروان: أما بعد: فانك كتبت
إليّ في أبي سفيان ومخرجه تسألني كيف كان شأنه ...."

(ہم سے ہشام بن عروہ نے بہ روایت عروہ بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو لکھا: " اما بعد تم نے ابوسفیان اور اُن کے حملے کے بارے میں لکھا ہے اور مجھ سے پوچھا ہے کہ اس کا ماجرا کیا تھا ....")

اس کے بعد غزوہ بدر کا مفصل حال ہے جو ان لفظوں سے شروع ہوا ہے: " كان من شأنه ان أبا سفيان ":
.... (ابوسفیان کا یہ حال تھا ......) وغیرہ - اس میں بھی عروہ نے کثرت سے قرآنی آیات کا حوالہ دیا ہے۔

ایک اور اقتباس کا آغاز یوں ہے [3]:

ثنا هشام بن عروة عن عروة أنه كتب إلى عبد الملك بن مروان: فانك كتبت إليّ
تسألني عن خالد بن الوليد: هل أغار يوم الفتح وبأمر من أغار؟"

(ہشام بن عروہ نے، اُن سے عروہ نے، بیان کیا کہ انہوں نے عبدالملک بن مروان کو خط لکھا۔ اما بعد: تم نے خط لکھ کر خالد بن الولید کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا ہے کہ کیا انہوں نے فتح مکہ کے دن حملہ کیا تھا اور کس کے حکم سے کیا تھا؟")

اور جواب اس طرح شروع ہوتا ہے " إنه كان من شأن خالد ....." (خالد کا حال یہ تھا ....) وغیرہ

اس لیے اگر ہم دوسرے اقتباسات میں، اُسی سلسلۂ اسناد کے بعد صرف یہ دیکھتے ہیں کہ " ہشام بن عروہ نے بیان کیا اُن سے عروہ نے بیان کیا، کہا: " وغیرہ — تو اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ بھی عبدالملک کو لکھے گئے جواب ہی کا مزید اقتباس ہے اس لیے کہ پہلے اقتباس کے آخری الفاظ، اس اقتباس کے شروع میں آ گئے ہیں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبدالملک کو مراسلے کا ایک ٹکڑا دوسرے اقتباس میں پیش کر دیا گیا ہے۔ نیز الطبری نے عبدالملک کو عروہ کے جواب کا ایک مختصر ٹکڑا محفوظ کر دیا ہے جس میں خلیفہ نے حضرت خدیجہ کی وفات کا سنہ پوچھا تھا۔" دوسرا اقتباس عبدالملک کے اس سوال کا جواب ہے کہ کیا رسول اللہ نے الاشعث بن قیس کی بہن سے نکاح کیا تھا [4]؟

عبدالملک یا الولید کے استفسار میں جو کچھ عروہ نے رسائل لکھے اُن کی روایت تو ہشام بن عروہ نے کی ہے، اور ابن ابی ہُنیدہ کو، عروہ [5] نے جو جواب لکھا اس کا متن الزہری کی بدولت ہم تک پہنچا ہے - ابن ابی ہُنیدہ خلیفہ الولید کا گہرا دوست تھا اس نے قرآن کی سورہ (۶۰ : ۱۰) کے متعلق استفسار کیا تھا۔ عروہ نے اس "تاریخی پس منظر کی وضاحت کی ہے جس کی طرف سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے [6]۔

عروہ کی جو روایات یہاں نقل کی گئیں یہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ کے خاص وقائع سے متعلق تدوین کی ہوئی قدیم ترین روایات ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں، ساتھ ہی یہ عربی زبان کی مورخانہ نثر کا سب سے پرانا نمونہ بھی ہیں۔ اگرچہ کسی قدیم ماخذ میں [7] یہ نہیں کہا گیا کہ عروہ نے مغازی کے موضوع پر کوئی تالیف کی تھی، لیکن اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے حیاتِ رسول کے بہت سے

اہم واقعات جمع کیے اور انھیں آیندہ نسلوں کو منتقل کیا۔ جو اقتباسات ہم تک پہنچے ہیں ان سے بھی بظاہر ہوتا ہے کہ عروہ اپنے تحریری رسائل کا مواد اُن احادیث سے حاصل کرتے تھے جو انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ اگرچہ عام طور پر وہ اپنے مراجع کا حوالہ نہیں دیتے، لیکن ہجرت نبوی کے بیان میں اس کا استثنائی موجود ہے جہاں انہوں نے بتادیا ہے کہ یہ اُن معلومات پر مبنی ہے جو انہوں نے حضرت عائشہ سے حاصل کی تھیں[۸۲]۔ مزید برآں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے احادیث نبوی کا حوالہ دیا ہے وہ بھی انھیں اسی ماخذ سے ملی ہوں گی[۸۳] لہٰذا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ عروہ اسانید کے خلاف تھے یا اپنا ماخذ چھپاتے تھے۔ خود رسائل بتا رہے ہیں کہ وہ سند کا التزام کرتے تھے اگرچہ انہوں نے مکتوبات میں اسناد کا چنداں اہتمام نہیں کیا ہے۔ اس زمانے میں ۔ ۷۵ھ کے لگ بھگ ۔ اسناد کا طریقہ پوری طرح رائج ہوچکا تھا لہٰذا کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ عروہ کی سند سے، اور دوسرے معتبر حضرات کی توثیق سے، جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں بغیر تحقیق کیے ان کی صحت سے محض اس لیے منکر ہو جائے کہ عروہ کے مراسلوں میں سند کا حوالہ کہیں کہیں آیا ہے۔

ایک سے زیادہ مواقع پر عروہ نے حدیث کی اہمیت کا اظہار کیا ہے[۸۴] وہ برابر اپنے بیٹوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ علم حدیث حاصل کرکے وہ اپنے وجود کو ناگزیر بنا سکتے ہیں[۸۵] ان کے بیٹے ہشام کا کہنا ہے کہ عروہ کبھی اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کہتے تھے[۸۶] بلکہ حدیث سے استنباط کرتے تھے۔ عروہ کی بہت سی حدیثیں ہمیں ملتی ہیں جو زیادہ تر اُن کے فرزند ہشام نے اور الزہری نے روایت کی ہیں اور یہ احادیث کے مستند مجموعوں میں اسی طرح شامل ہیں جیسے سیرۃ کی کتابوں میں۔ ابن اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور طبری نے خاص طور پر ان احادیث کا بڑا ذخیرہ محفوظ کر دیا ہے۔ سیرۃ رسول کی قدیم ترین کتابیں جو ہمارے پاس ہیں ان کا بہت بڑا حصہ عروہ کے مجموعۂ روایات پر مبنی ہے۔ اگرچہ بعض اخبار اُن سے غلط بھی منسوب ہو گئے ہوں پھر بھی سیرۃ کے بڑے حصے پر عروہ کے حق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان اخبار میں بھی اکثر حضرت عائشہ کی سند دی گئی ہے۔ اُن کے اور بہت سے صحابہ و صحابیات کے سوا، ایسی متعدد روایات ہیں جن کے لیے عروہ نے کوئی سند نہیں بتائی ہے۔ یقیناً اُس عہد میں اسناد کا رواج تھا لیکن اس وقت تک یہ لازماً ضروری نہیں ہوا تھا۔ علاوہ بریں عروہ لکھی ہوئی دستاویزات کو بھی اپنا ماخذ بناتے تھے۔ مثلاً انہوں نے وہ خط نقل کیا ہے[۸۷] جو رسول اللہ ؐ نے اہل ہجر کو لکھا تھا عروہ سے جو روایات پہنچی ہیں وہ رسول اللہ ؐ کی حیات کے ہر دور سے متعلق ہیں، اس کے علاوہ ابتدائی خلفاؑ کے عہد کا حال بھی بتاتی ہیں

یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ عروہ نے صرف احادیث نبوی جمع کرنے کا اہتمام کیا یا اس عہد کے اخبار ہی فراہم کیے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر فقیہہ اور محدث تھے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یہی اُن کے بہت سے معاصرین کا حال تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بھی شاعری کے مخالف نہ تھے۔ ابوالزناد نے اُن کے بارے میں کہا ہے[۸۸] "میں نے عروہ سے زیادہ شعر کی روایت کرنے والا کسی کو نہیں پایا۔"

لوگوں نے اُن سے کہا "آپ کتنے شعر پڑھتے ہیں، اے ابو عبداللہ!"

انہوں نے جواب دیا "کیا جتنے شعر میں پڑھتا ہوں یہ اس سے بھی زیادہ ہیں جو عائشہ پڑھتی ہیں؟ شاید ہی کوئی بات ایسی ہوئی

ہو جس پر انہوں نے ایک آدھ شعر نہ سُنا دیا ہو۔"

اگرچہ یہاں حضرت عائشہ کی مثال بے محل ہے اس سے صرف مغازی میں اشعار کے استعمال کا جواز پیش کرنا مقصود ہوگا، لیکن اس سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ عروہ شاعری کو پسند کرتے تھے۔ اسمٰعیل بن یسار شاعر سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے[89] جسے وہ اپنے ساتھ عبدالملک اور الولید کے دربار میں لے گئے تھے اور جس نے اُن کے بیٹے محمد کا مرثیہ لکھا تھا۔ قبیلہ قریش کے مشہور غزل گو شاعر عمر بن ابی ربیعہ سے بھی ان کی دوستی تھی[90] البتہ رسول اللہؐ کے شاعر خاص حسّان بن ثابت کے بارے میں اُن کی رائے اچھی نہیں تھی[91]

مزید برآں شاعری کا یہ ذوق ان کے گھرانے کے دوسرے افراد کو بھی ملا تھا: ان کے بھائی عبداللہ، جن پر الزام لگایا گیا تھا[92] کہ معن بن اوس کے اشعار کو اپنے نام سے منسوب کر دیتے ہیں، شعر کے زندہ دل نقاد معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے بھائی جعفر بحیثیت شاعر معروف تھے، ان کے متعلق کتاب الاغانی میں ایک علیحدہ باب ہے جس میں ان کا کلام بھی درج ہے جو عروہ کو خطاب کر کے لکھا گیا تھا[93] خود عروہ کے کچھ طنزیہ اشعار کتاب الاغانی میں محفوظ ہیں[94] جو عائشہ بنت طلحہ کے حج پر کہے گئے تھے۔ اُن اخبار تاریخی میں بھی جو اُن سے مروی ہیں عروہ شعر چسپاں کرنے سے نہیں جھجکتے[95] یہ اشعار ان لوگوں سے منسوب ہیں جنھوں نے خود اُن حوادث میں حصہ لیا تھا۔ بنا بریں ابوالزنّاد کے اس بیان میں کچھ صداقت ضرور ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عروہ نے رسول اللہؐ کی حیات سے متعلق جو اخبار و احادیث اپنے تلامذہ کو روایت کیں اُن میں ایسے اشعار بھی سمو دیے جو اُن وقائع میں حصّہ لینے والوں نے لکھے تھے ما بعد یہی بعد کو ابن اسحٰق نے کیا۔

۳۔ شُرحبیل بن سعد

ابان اور عروہ کے برخلاف، جو دونوں مسلمانوں کے طبقۂ اشراف سے تعلق رکھتے تھے، مغازی لٹریچر کی تاریخ میں تیسرا قابلِ ذکر نام ایک غلام کا ہے: یعنی شرحبیل بن سعد جو مدینے والے بنی خطمہ کے مولیٰ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی (ف ۴۰ ھ) کو دیکھا تھا[96] ۱۲۳ھ میں ان کا انتقال ہوا[97] اور سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ جن صحابہ سے انھوں نے حدیث اخذ کی، ان میں زید بن ثابت، ابو ہریرہ اور ابو سعید الخدری شامل ہیں[98] خود شُرحبیل کا بیان ہے کہ وہ الاسواف میں[99] زید بن ثابت کی جاگیر میں جا کر رہے تھے اور موسیٰ بن عقبہ شہادت دیتے ہیں کہ شرحبیل نے مدینہ کو ہجرت کرنے والوں کی فہرست بنائی تھی، اسی طرح ان اصحاب کے نام لکھ لیے تھے جنھوں نے بدر اور احد کے غزوات میں حصّہ لیا۔ سفیان بن عُیینہ کا قول ہے[100] کہ مغازی اور اصحاب بدر کے حالات کا ان سے بہتر جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن بڑھاپے میں ان کے حواس ذرا مختل ہو گئے تھے[101] اور ان کے افلاس کی وجہ سے کوئی اِن کی بات کو سچ نہیں مانتا تھا۔ اس لیے کہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر یہ کسی کے پاس جائیں[102] اور وہ انھیں کچھ نذرانہ دے تو یہ کہہ دیں گے کہ "تیرا باپ بدر میں موجود نہیں تھا۔" یا ایک اور موقع پر کہا گیا ہے[103] کہ یہ "مغازی کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے لیکن لوگوں نے الزام لگایا کہ جس کا کوئی تعلق واقعہ سے نہ ہو یہ پیدا کر دیتے تھے۔ چونکہ یہ محتاج تھے اس لیے لوگ ان کے مغازی کو ساقط الاعتبار سمجھتے تھے۔"

جب موسیٰ بن عقبہ نے یہ الزامات سُنے تو کہا: "لوگ خواہ مخواہ اس شخص کے خلاف ہوگئے ہیں جو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے تکلیف دہ زندگی گزار رہا ہے۔"

موسیٰ بن عقبہ نے تو اس طرح ان کی حمایت کی مگر ابن اسحٰق کو ان سے کد تھی، جب کسی نے سوال کیا کہ "شرحبیل سے تم نے کتنی احادیث لی ہیں؟" تو اس نے کہا تھا:[۵] "اچھا کیا کسی نے شرحبیل کی حدیث کو بھی اخذ کیا ہے؟"

دوسری کتابوں میں بھی شرحبیل کے خلاف رائیں ملتی ہیں، لیکن سب کا یہ خیال نہیں ہے۔ ابن حبان نے انھیں ثقات میں شمار کیا ہے۔ ابن اسحٰق اور الواقدی ان سے روایت نہیں لیتے مگر ابن سعد نے رسول اللہؐ کے قبا سے مدینہ کو ہجرت کرنے کی خبر ان سے اخذ کی ہے۔ اس خبر میں شرحبیل نے کوئی سلسلۂ اسناد نہیں دیا، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ دوسری روایات میں بھی ان کا یہی معمول رہا ہوگا۔ اس اقتباس سے دوسرا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ شرحبیل نے اپنے آپ کو اصطلاحی معنوں میں مغازی تک ہی محدود نہیں رکھا تھا۔

۴۔ وہب بن منبہ

مغازی کے یہ تین عُلما جن کا ہم نے ذکر کیا یعنی ابان، عروہ اور شرحبیل مدینہ کے رہنے والے تھے اور وہیں انھوں نے زندگی بسر کی۔ لیکن ان کے خلاف چوتھی شخصیت وہب بن منبہ[۸] جو تابعین کی نسل میں تھے اور انھیں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جنوبی عرب کے باشندے تھے، اور ان کی اصل ایرانی تھی۔ ان کی ولادت ایک ایسے فارسی خاندان میں ہوئی جو اسلام سے پہلے نوشیرواں کسریٰ کے عہد میں ایران سے آ کر جنوبی عرب میں بس گیا تھا۔ یہ لوگ ابنا کہلاتے تھے۔ وہب کے پردادا اُسوار کا نام بھی فارسی تھا۔ ایک صریحاً غلط بیان کے مطابق وہب نے ۱۰ھ میں اسلام قبول کیا۔[۹] جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہجرۃ سے پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام کا قول[۹] جو ابن الندیم نے نقل کیا ہے ناقابل تسلیم ہے کہ وہب اہلِ کتاب تھے اور بعد میں ایمان لے آئے تھے۔ یہ بات زیادہ صحیح ہے کہ وہ مسلمان ہی پیدا ہوئے اور واقدی کا اشارہ شاید ان کی طرف نہیں بلکہ ان کے باپ کی طرف ہے جن کے بارے میں یہ احتمال ہے کہ انھوں نے ۱۰ھ میں اسلام قبول کیا۔

اس میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہب ۳۴ھ میں پیدا ہوئے۔[۱۰] یہ ان حالات سے بھی مطابقت رکھتا ہے جو اُن کی زندگی کے متعلق ہمیں معلوم ہیں صنعا کے قریب ایک جگہ ذمار اُن کا مولد بتائی جاتی ہے۔ ان کے بھائیوں میں ہمام، مُعقل اور غیلان کا نام آتا ہے۔ الثعلبی[۱۱] نے معاویہ اور وہب کے ایک مکالمے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ خلیفہ الولید کو مسجد دمشق کی تعمیر کے وقت ۸۸ھ میں پتھر کا ایک ٹکڑا ملا جس پر کسی اجنبی زبان میں کچھ کندہ تھا وہ اس نے پڑھوانے کے لیے وہب کے پاس بھیجا۔[۱۲] وہب ایک زمانے تک اپنے وطن میں قاضی رہے۔ سماک بن الفضل[۱۳] نے اس دور کا ایک قصہ بیان کیا ہے: "ہم عروہ بن محمد امیر یمن کے پاس[۱۴] تھے۔ ان کے ساتھ وہب بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ آئے اور انھوں نے عامل کی شکایت کی اور اس کے بارے میں بُری رپورٹ دی۔ وہب نے عروہ کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر عامل کے سر پہ اس زور سے مارا کہ خون نکل آیا۔ اس پر عروہ ہنسے اور کہا "تم ابو عبداللہ ہمیں الزام دیتے تھے اور خود بھڑک گئے!" وہب نے کہا "کیوں نہ بھڑکوں، ان سے تو خوابوں کا پیدا کرنے والا بھی ناراض ہے اور کہتا ہے (سورۃ ۴۳ آیہ ۵۵):

"فلما اسفونا انتقمنا منھم" جب وہ ہمیں غضب دلاتے ہیں تو ہم ان سے انتقام لیتے ہیں
یہاں وہب نے خدا کو "خالق احلام" (خوابوں کا پیدا کرنے والا) کہا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ خوابوں کو بہت اہمیت دیتے
تھے اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ سچے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر آخر میں یہ بات جاتی رہی تھی[115] اور اُن کا خیال تھا کہ یہ قاضی کا عہدہ قبول
کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یہ صرف وہب ہی کا خیال نہیں ہے۔ بہت سے دیندار لوگوں کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ سرکاری
عہدے قبول کرنے کو ناپسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے صفائے باطن جاتی رہتی ہے۔
ایک اور موقع پر وہب کو زاہدانہ زندگی بسر کرنے والا بتایا گیا ہے[116] کہا جاتا ہے کہ "انھوں نے چالیس سال تک کسی
جاندار کو گالی نہیں دی، بیس سال تک عشا اور فجر کے درمیان وضو نہیں کیا۔ . . . اور چالیس سال تک بستر پر نہیں سوئے"
کہتے ہیں ایک زمانے میں وہ عقیدۂ قدر کے قائل تھے[117] لیکن بعد میں اس سے رجوع کر لیا تھا کیوں کہ یہ وحی کے خلاف تھا۔
سنہ ۱۰۰ھ میں وہ مکہ میں موجود تھے[118] یہاں انہوں نے متعدد ممتاز فقیہوں سے ملاقات کی۔ عمر کے بالکل آخری حصے
میں وہ قید کر دیے گئے تھے مگر اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا[119] البتہ وہ دین کی خاطر اس قید و بند پر راضی تھے اور کہتے تھے: "خدا نے
ہمارے لیے قید کا حکم دیا تو ہم نے اس کی عبادت اور زیادہ کر دی"۔ بظاہر یہ قید یمن کے گورنر یوسف بن عمر الثقفی کے حکم سے
تھی جو سنہ ۱۰۶ھ سے سنہ ۱۲۰ھ تک والیٔ یمن رہا۔ کسی نامعلوم سبب سے اس نے سنہ ۱۱۰ھ میں وہب کے کوڑے لگوائے یہاں تک
کہ وہ مر گئے[120]
وہب کو عام طور سے ثقہ راوی سمجھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے ابن عباس، جابر اور ابو ہریرہ وغیرہ سے روایت کی
مگر رواۃ نے مدینہ کے دوسرے تابعین کے مقابلے میں ان سے بہت کم اخذ کیا ہے۔ امام بخاری نے ان سے ایک حدیث
درج کی ہے جس کا سلسلۂ اسناد وہب تے اپنے بھائی ہمام کے واسطے سے ابو ہریرہ تک پہنچایا ہے لیکن ادب عربی میں جو
کثیر روایات وہب سے منسوب ہیں ان کا سلسلۂ اسناد ہمیں شاذ و نادر ہی ملتا ہے[121]
وہب بعض باتوں میں مدنی اصحاب سے مختلف ہیں، مثلاً: وہ اہل کتاب کی احادیث پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ وہب
سے جو مغازی منسوب ہیں ان کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اُن روایات کو جانچنا ہوگا جو دوسرے موضوعات سے متعلق انہوں نے
چھوڑی ہیں۔ جن میں خاص طور سے تاریخ اہل کتاب کا موضوع ہے یا ان کے وطن (یمن) کی تاریخ ہے۔ اہل کتاب کی روایات
سے وہب کی خصوصی دلچسپی کا حال اس بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ستّر یا بہتر یا تہتر یا بانوے صحائف سماوی
کا مطالعہ کر رکھا تھا[122]۔ ان دعووں کی تصدیق کرنا ضروری نہیں اس لیے کہ کتب مقدسہ (صحف) کی یہ تعداد خود ہی بتا رہی ہے
لیکن اس میں تو شک نہیں کہ وہب نے اپنے ہم وطن یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے جو یمن میں خاصی تعداد میں بستے
تھے، اہلِ کتاب کے مذہبی صحیفوں سے اچھی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ وہب کے بیشتر اقوال یہودی اور مسیحی کتابوں کے مندرجات سے کلی مطابقت رکھتے ہیں البتہ کچھ آپ مختلف ہیں ان کے بیانات
بقول ابن سعد[123] "احادیثِ انبیا کے علاوہ زاہدوں کے قصے اور بنی اسرائیل کے اخبار" پر مشتمل ہیں۔ یہ اقوال بعد کی نسلوں کو ان کے
تلامذہ نے منتقل کیے جن میں سے کچھ اُن کے خاندانی افراد بھی تھے۔ وہب نے جو مواد جمع کیا تھا اسے خصوصیت سے ان کے پوتے عبدالمنعم

نے محفوظ رکھا اور آئندہ نسل تک پہنچایا۔ وہب کی "کتاب المبتدا" جسے الثعلبی نے اپنی تالیف عرائس المجالس میں عبدالمنعم کی روایت سے استعمال کیا ہے، الفہرست میں ان کی "تالیف" بتائی گئی ہے[۱۲۴] "المبتدا" سے مُبتدا الخلق مراد ہے۔ لیکن اس رسالے میں اہلِ کتاب کے اخبار کی بنیاد پر صرف نوع انسانی کے آغاز کی تاریخ ہی پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ قصص الانبیاء یعنی قدیم رسالت کی تاریخ بھی موجود ہے[۱۲۵]

قصص الانبیاء کی روایات میں خاص طور سے وہب ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر انھوں نے بقول ابن سعد اُن عُبّاد کی تاریخ بھی لکھی تھی جو نبوت کے مرتبے تک نہیں پہنچے اور جب حاجی خلیفہ، وہب کی تالیف قصص الاخیار کا حوالہ دیتا ہے[۱۲۶] تو اس سے شاید یہی عُبّاد مراد ہیں جن کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے۔

حاجی خلیفہ نے وہب سے ایک اور "کتاب الاسرائیلیات" بھی منسوب کی ہے لیکن غالباً یہ قدیم زمانے میں اس نام سے مشہور نہیں تھی۔ مثلاً یاقوت اس کے بارے میں یوں کہتا ہے کہ "وہب نے پرانی کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے جو اسرائیلیات کے نام سے مشہور ہیں[۱۲۷]" یعنی اس نے یہ لفظ وہب کے اسرائیلی مصادر کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حاجی خلیفہ جسے 'کتاب الاسرائیلیات' کہتا ہے، وہ یہی "کتاب المبتدا" ہے اور اسے بعد کے زمانے میں "اسرائیلیات" کہا گیا ہے۔ بہر حال متاخرین کی کتابوں میں وہب کی "اسرائیلیات" نامی کتاب کے بہت سے اقتباسات ملتے ہیں، مگر چونکہ اُن سے بہت سی غیر صحیح روایات بھی منسوب کر دی گئی ہیں اس لیے ان بیانات پر بہت کم اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ اقتباسات اتنے کافی نہیں ہیں کہ ان کی مدد سے وہب کی مبینہ کتاب "اسرائیلیات" کی بازیافت ہو سکے۔ اگر اس نے فی الواقع اس نام سے کوئی کتاب لکھی تھی ۔ بہر حال وی شووین (V. CHAUVIN) نے اُسے جمع کرنے کی کوشش کی ہے[۱۲۸]

یہ طے ہے کہ وہب نے اپنی کتاب المبتدا میں صرف یہودی ماخذ ہی استعمال نہیں کیے بلکہ مسیحی اخبار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ابن قتیبہ، الطبری، المسعودی اور الثعلبی کی متعدد روایات اسے ثابت کرتی ہیں۔ ان قدیم کتابوں میں وہب سے منسوب روایات اکثر ایک دوسرے سے معارض ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ان اخبار میں طرح طرح کی تحریف اور اختلافِ نسخ شامل ہوتے رہے ہیں اور بعد میں آنے والے علماء نے اُن تمام قصص کی چھان بین نہیں کی ہے جو وہب سے منسوب ہیں اور جن کی اصلیت مشتبہ ہے ۔ ابن قتیبہ نے اصلی "کتاب پیدایش" اور وہب کے اخبار کے کچھ اختلافات ظاہر کیے ہیں ۔ مگر ابن ہشام کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہب نے "کتاب مقدس" کا متن بڑی احتیاط سے استعمال کیا ہے۔ اس اختلاف کی توضیح میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو وہب کی جمع کردہ روایات کو بعد میں نشر کرنے والوں نے پیشہ ور قصہ گویوں کے انداز پر ڈھال کر بدل دیا ہے یا پھر وہب ہی نے یہ ترمیم کر دی ہو گی ۔

وہب نے اپنی ایک خاص تالیف "کتاب الملوک المتوجۃ من حمیر و اخبارہم وغیر ذلک[۱۲۹]" میں اپنے وطن (یمن) کی قدیم اسطوری تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب ہمیں دستیاب نہیں ہے لیکن بظاہر یہ وہی ہے جس سے ابن ہشام نے اپنی ہنوز غیر مطبوعہ کتاب التیجان کا مقدمہ تیار کیا ہے اپنی اس کتاب میں جس سے ابن ہشام نے فائدہ اُٹھایا ہے

وہب نے اہلِ کتاب کے مصادر کو نوع انسانی کی آفرینش کی تاریخ بیان کرنے میں استعمال کیا ہے ۔ وہ نہ صرف کتاب پیدایش کے

ناموں اور اعداد کے عبرانی متن کے مطابق حوالے دیتے ہیں بلکہ اس کے سریانی ترجمے کی غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتے جاتے ہیں
وہب کی تالیف "فتوح" جس کا حاجی خلیفہ نے ذکر کیا ہے[۱۳۲] دوسرے مؤرخوں کے علم میں نہیں ہے مگر ابن سعد نے وہب کی تالیف "حکمت" کا نام لیا ہے[۱۳۳] اور ہسپانوی فہرست نگار ابوبکر محمد بن خیر[۱۳۴] (متوفی ۵۷۵ھ) کو اس کتاب کے ایک نسخے کا علم تھا جس کی سند وہب کے بھتیجے عقیل تک پہنچتی ہے۔ یہ اس نے اپنے چچا سے اخذ کیا تھا۔ اس تالیف میں حکیمانہ مقولے ہیں اسی طرح کی ایک تالیف "موعظہ" تھی جس کا حوالہ اسی ہسپانوی نے دیا ہے[۱۳۵] ابوبکر محمد ابن خیر نے وہب سے زبور کا ایک ترجمہ بھی منسوب کیا ہے جسے وہ "زبور داؤد ترجمہ وہب بن منبہ" کہتا ہے۔ اس بحث کی تکمیل کے لئے یہاں کتاب القدر کا تذکرہ بھی کر دینا چاہیے جسے بقول یاقوت وہب نے تصنیف کیا تھا۔[۱۳۶]

وہب کی یہ ساری کتابیں جن کا اب تک ہم نے ذکر کیا ہے مغازی سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں جو ہماری موجودہ بحث کا اصل موضوع ہے۔ لیکن اگر ہم مغازی کے مفہوم کو وسیع تر معنوں میں سمجھ لیں، جس کی ضرورت بھی ہے اور جیسا کہ یہ اسلام کے قرونِ اولیٰ میں سمجھا بھی گیا ہے اور پھر رسول اللہؐ کی پوری حیاتِ مبارکہ پر اس کا اطلاق کریں تو وہب کی یہ سب کتابیں ہماری بحث کے دائرے میں آجاتی ہیں کیونکہ یہ سیرۃ کا دیباچہ ہیں اور آنحضرتؐ سے قبل رسالت کی تاریخ بتاتی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے وہب کے بارے میں لکھا ہے[۱۳۷] کہ انھوں نے مغازی جمع کیے تھے مگر قدیم کتب سیرۃ میں کہیں بھی ان کا حوالہ رسول اللہ کی زندگی کے ادوار میں نہیں آتا ہے۔ پھر بھی حاجی خلیفہ کا بیان درست ہے۔ سی ایچ بیکر (C. H. BECKER)[۱۳۸] نے شوت رائنہارڈ (SHOTT-REINHARDT) کے ذخیرۂ اوراقِ بردی PAPYRI میں جو اب ہائیڈل برگ HEIDELBERG میں محفوظ ہے ایک مجموعہ دریافت کیا ہے جو بظاہر اسی "کتاب المغازی" کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ جزء ۲۲۸ھ میں گویا وہب کی وفات سے تقریباً سو سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:-

"محمد بن بکر ابو طلحہ نے ہم سے بیان کیا، اس نے کہا کہ ہم سے عبدالمنعم نے اپنے باپ ابوالیاس سے اور انہوں نے وہب سے روایت کی۔۔۔۔۔"

یہ سند جو اس کتاب کے مشمولات کو وہب کی روایت ثابت کرتی ہے بار بار اس کے متن میں دہرائی گئی ہے۔ مگر وہب یہ کبھی بیان نہیں کرتے کہ انھوں نے اپنا مواد کن راویوں سے لیا ہے۔ ہائیڈلبرگ کا مخطوطہ اس امر کی تائید کرتا ہے جو ہمیں الطبری وغیرہ سے معلوم تھا کہ وہب عموماً "اسناد" کا استعمال نہیں کرتے تھے۔

یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ وہب کے پوتے عبدالمنعم[۱۳۹] اپنے دادا کی کتابوں کی روایت اپنے باپ اور وہب کے داماد ادریس سے کرتے ہیں[۱۴۰] لیکن ادریس نے براہ راست وہب سے کچھ روایت نہیں کیا ہے بلکہ وہ ابوالیاس کے طریق سے کہتے ہیں[۱۴۱] جنھوں نے بقول ابوبکر محمد بن خیر وہب کی "موعظہ" کی روایت بھی کی ہے۔

ہائیڈلبرگ کا بردیہ ظاہر کرتا ہے کہ وہب نے 'مغازی' کو محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے چنانچہ اس میں عقبۂ کبریٰ کی تاریخ بھی موجود ہے، دارالندوہ میں قریش کی میٹنگ کا حال بھی ہے، ہجرت کی تیاریوں کا ذکر ہے پھر خود ہجرت کا بیان ہے، رسول اللہؐ کے مدینہ پہنچنے اور غزوہ بنو خثیمہ کی روداد بھی ہے۔ اگر ہمیں ان اوراقِ بردی سے کوئی ایسی نئی معلومات حاصل

نہیں ہوئیں جو سیرۃ اور مغازی کی بعد میں لکھی جانے والی مکمل کتابوں میں نہیں ہیں۔ تو اس سے یہ اہم نکتہ ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۱ھ میں یا اس سے بھی پہلے سیرۃ اور مغازی اسی طرح بیان ہوتے تھے جیسے وہ بعد کی تصنیفات میں ضبط ہوتے ہیں۔

کتب متاخرین سے وہب ان امور میں نمایاں ہیں کہ وہ اپنے رواۃ کا نام نہیں لیتے اگرچہ اُن سے بالالتزام اخذ کرتے ہیں، یا نثری قصے میں قصیدے اور اشعار شامل کر دیتے ہیں جنھیں اُن حوادث میں حصہ لینے والوں یا اُن کے معاصروں سے منسوب کرتے ہیں، اور یہی قدیم زمانے سے عرب کے قصہ گویوں کی عادت رہی ہے۔

باب (۲)

ابن اسحٰق کے شیوخ

۱۔ عبداللہ بن ابی بکر بن حزم

تابعین کے بعد آنے والی نسل میں بہت سے علمائے حدیث ہوئے، مگر اُن میں سے تین نام ایسے ہیں جن کا یہاں خاص طور پر ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ انہوں نے مغازی کی طرف خصوصی توجہ کی تھی۔ ہماری مُراد عبداللہ بن ابی بکر بن محمد، اور عاصم ابن عُمر بن قتادۃ اور محمد بن مسلم الزہری سے ہے۔ یہ تینوں مدینہ اسکول کے پیرو اور ابن اسحٰق کے اہم شیوخ میں سے ہیں۔

عبداللہ بن ابی بکر ایک مدنی خاندان میں پیدا ہوئے۔ عہدِ نبوی میں اُن کے اجداد نے اسلام کی بڑی خدمت کی تھی۔ چنانچہ عبداللہ کے جدِ اعلیٰ کو رسول اللہؐ نے یمن کی طرف بھیجا تھا تاکہ وہاں کے باشندوں میں اسلامی تعلیمات کا پرچار کریں[۱۴۲] اور وہ نجران میں رسولؐ کے گورنر کی حیثیت سے رہے تھے۔[۱۴۳] عبداللہ کے دادا محمد بن عمرو واقعۂ حرّہ (۶۳ھ) میں کام آئے تھے۔[۱۴۴] جب اُمویوں نے اہلِ مدینہ کو شکست دی تھی۔ مروان بن الحکم جو بعد کو خلیفہ ہو گیا تھا، اُنھیں میدانِ جنگ میں پڑا ہوا دیکھ کر ٹھہر گیا تھا اور کہتا تھا "خُدا تم پر رحمت کرے۔ میں نے کتنے ستونوں کے پاس تمھیں نماز میں طویل قیام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" پھر عبداللہ کے باپ ابو بکر ۸۶ھ سے مدینہ کے قاضی رہے۔ اِسی سال عمر بن عبدالعزیز مدینہ کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔[۱۴۵] یہ فقہِ اسلامی کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔[۱۴۶] اور اس علم میں اَبان بن عثمان کے شاگرد تھے۔[۱۴۷] خلیفہ سلیمان نے ۹۶ھ میں عہدۂ قضا کے ساتھ انھیں[۱۴۸] مدینہ کا گورنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ اُن سے پہلے اُمویوں کی حکومت میں کسی مدنی کو یہ عہدہ[۱۴۹] نہیں ملا تھا مگر ان کے پاس یہ منصب عمرِ ثانی کے آخر عہد تک[۱۵۰] رہا۔ انھیں یزید ثانی نے گورنری[۱۵۱] سے معزول کیا مگر وہ نئے گورنر کے زمانے میں بھی قضا کے منصب پر طویل عرصے تک برقرار رہے،[۱۵۲] جس سے اُن کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اور جس نے ایک بار اُنھیں پٹوایا بھی تھا۔[۱۵۳] ابو بکر کو دوبارہ ۱۱۴ھ میں چند سال کے لیے مدینے کی گورنری ملی تھی۔[۱۵۴] اُنہوں نے ۱۲۰ھ میں یا اس سے چند سال قبل انتقال کیا۔[۱۵۵]

ابو بکر نے جب علمِ حدیث میں اپنے بیٹے کی دلچسپی کا حال دیکھا تو انھیں نصیحت کی کہ ہر حدیث کے مواد کا پورے سیاق و سباق کے ساتھ

مطالعہ کیا کریں۔ انھیں عمر ثانی کی طرف سے یہ حکم ملا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث یا کوئی قدیم روایت یا عمرۃ بنت عبدالرحمٰن کی حدیث ہاتھ آئے اُسے قلمبند کر لو، اس لیے کہ مجھے علم کے ضائع ہو جانے اور عالموں کے گذر جانے کا خوف پیدا ہو گیا ہے۔"

عمرۃ جن کا ابھی ذکر آیا ہے حضرت عائشہ زوجِ النبیؐ[156] سے قریبی تعلقات کی وجہ سے اُن احادیث واخبار کا اچھا علم رکھتی تھیں جو انھیں عائشہ سے ملی تھیں۔ ابو بکر کو اُن کا بھتیجا[157] ہونے کے ناتے اُن سے اخذ کرنے کے اچھے مواقع ملے تھے۔ بایں ہمہ عمر ثانی کے حکم سے مرتب کی ہوئی یہ کتابیں اگلی ہی نسل تک ناپید ہو چکی تھیں[158]۔ ابو بکر کے بیٹوں میں سے محمد بن ابی بکر (متوفی ۱۳۲ھ) بھی اپنے باپ کی طرح مدینے کے قاضی ہو گئے تھے[159]۔

البتہ اُن کے دوسرے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر۔ جن کی وجہ سے ہم نے اُن کے اتنے رشتہ داروں کا حال لکھا ہے۔ حکومت کی ملازمت سے کنارہ کش رہے۔ الزہری کا بیان ہے (اور ان کے بارے میں اُس کی رائے یہ ہے کہ مدینہ میں ان کا ثانی نہیں تھا) کہ ان کے باپ جب تک زندہ رہے[160] تو اُن کی دنیوی حیثیت اور شہرت کے سامنے ان کی شہرت دبی رہی۔ عبداللہ اپنے باپ کی وفات کے بعد تقریباً دس یا پندرہ سال زندہ رہے اور ۱۳۰ھ یا ۱۳۵ھ میں[161] انھوں نے انتقال کیا۔

عدالتی نظام اور اہلِ مدینہ کے مروّجہ قانون میں جو تعارض پیدا ہوتا تھا اُس کا اظہار ایک مکالمے میں ہوتا ہے جو عبداللہ اور اُن کے بھائی قاضی محمد کے درمیان ہوا[162]۔ "جب انھوں نے ایک مقدمے میں حدیث کے خلاف فیصلہ دیا تو گھر واپس آنے پر اُن کے بھائی نے، جو ایک دیندار انسان تھے، اُن سے پوچھا کہ "بھائی جان میں نے سُنا ہے آج آپ نے ایک ایسے ایسے مقدمے میں یہ فیصلہ دیا ہے۔" محمد نے کہا: "جی ہاں"۔ اس پر عبداللہ نے کہا: "تو پھر حدیث کہاں گئی؟ حالانکہ معاملات کا تصفیہ حدیث کے مطابق ہونا چاہیئے"۔ قاضی محمد نے کہا: "مگر میں سماجی قانون کو کیسے نظر انداز کر دیتا"۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ اہلِ مدینہ کا رواجی ضابطہ جس پر وہ صدیوں سے عامل ہیں، اُن کی نظر میں حدیث سے زیادہ قابلِ عمل تھا۔

ابنِ اسحٰق، واقدی، ابن سعد اور الطبری کے مختلف اقتباسات سے ہم راویانِ حدیث میں عبداللہ کی سرگرمیوں کا ایک اندازہ لگا سکتے ہیں، خصوصاً جو کچھ انھوں نے مغازی کے میدان میں کیا ہے اور "الفہرست" سے ہمیں معلوم ہوتا ہے[163] کہ انہی عبداللہ کے بھتیجے عبدالملک بن محمد القاضی نے جو خود بھی قاضی تھے اور ۱۷۶ھ میں فوت ہوئے ایک "کتاب المغازی" لکھی تھی۔ یہ کتاب جو بظاہر ناپید ہو چکی ہے، اُن روایات سے تیار ہوئی ہو گی جو انھوں نے اپنے چچا سے سُنی تھیں[164]۔ چنانچہ انہی عبدالملک کے ایک بھائی عبدالرحمٰن سے بہت سی روایات "الواقدی" نے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے چچا سے اخذ کی تھیں۔ عبداللہ کے اقوال لفظ "مغازی" کے محدود معنوں ہی پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ انھوں نے رسول اللہؐ کے ابتدائی عہد اور ایامِ شباب کے بارے میں بھی روایات جمع کی تھیں، مگر عام طور پر ان کا نام اخبارِ غزوات کے سلسلے میں ہی سامنے آتا ہے۔ انھوں نے "وفود" (قبائلِ عرب کے وفود جو رسول اللہ کی خدمت میں آئے) کے متعلق خاص طور سے مواد فراہم کیا ہے اور رسول اللہ کی وفات کے بعد قبائلِ عرب کے ارتداد (ردّہ) کے اخبار کی روایت کی ہے۔ اس کے بعد آنے والے زمانے کے حوادث مثلاً: عثمانِ غنی کے آخری ایام کی خبریں بیان کی ہیں[165]۔ عبداللہ کا خاندانی مکان

اُس گھر سے ملا ہوا ہی تھا جس میں حضرت عثمان شہید ہوئے تھے[166] اور اُن کے پَر دادا کو اُن حالات کا علم تھا جن کا انجام حضرت عثمان کی شہادت کی شکل[167] میں رُونما ہوا تھا۔ عبداللہ نے اپنی بیشتر روایتوں میں راویوں کا نام نہیں بتایا، مگر بعض حالتوں میں وہ نام بھی لیتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسناد کو لازمی نہیں سمجھتے۔ اُن کے اخبارات کا ایک قابلِ لحاظ حصّہ اُن کی بڑی خالہ عُمرۃ کی سند پر منتہی ہوتا ہے، جو انھوں نے زبانی حاصل کیا تھا۔ کہیں انھوں نے اپنی بیوی فاطمہ کے واسطے سے بھی یہ روایات لی ہیں۔ جنھوں نے عُمرۃ سے براہِ راست اخذ کی تھیں[168]۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دکھانے کے لیے کہ اس عہد میں عورت مرد بے تکلف ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے، ہم ایک روایت کو بطورِ مثال پیش کریں، جو عبداللہ کے شاگرد ابنِ اسحٰق کو عُمرۃ سے پہنچی تھی۔ ابنِ اسحٰق کہتے ہیں[169] کہ جب میں عبداللہ سے ملا تو انھوں نے اپنی بیوی سے کہا: "تم نے جو کچھ عُمرۃ بنت عبدالرحمٰن سے سُنا ہے، محمد کو بتا دو"۔ تب اُن کی بیوی نے عُمرۃ کے اقوال سُنائے۔ مزید برآں بعض اوقات عبداللہ نے ایسے سوالوں کا جواب دینے سے قصداً احتراز بھی کیا ہے جن کو وہ چاہتے تو حل کر سکتے تھے، مثلاً انھوں نے مدینے کے اُن دو شخصوں کے نام بتانے سے انکار کر دیا جنھوں نے رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی اُس وقت کی تھی جب آپ کی فوجیں 'الحِجر' کے پاس خیمہ زن تھیں۔ اُن دونوں اشخاص کو اِس خلاف ورزی کی سزا بھی دی گئی تھی، اگرچہ آخر میں اُن کی جاں بخشی ہو گئی تھی۔ ابنِ اسحٰق کہتے ہیں:

"عبداللہ بن ابی بکر نے کہا کہ اُن دونوں کے نام مجھے عبّاس بن سَہل نے بتا دیے تھے مگر یہ وعدہ لیا تھا کہ میں اِسے راز میں رکھوں گا، چنانچہ عبداللہ نے مجھے وہ نام بتلانے سے انکار کر دیا"[170]۔

عبداللہ نے صرف اُن اخبار کو جمع کر لینے پر اکتفا نہیں کیا جو انھیں ملتے رہے بلکہ اِتنے ابتدائی دَور میں انھوں نے اِن اخبار کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مدوّن کرنے کی کوشش بھی کی تھی[171]۔ چنانچہ انھوں نے غزواتِ نبوی کی فہرست تاریخی ترتیب کے ساتھ تیار کی تھی جو ابنِ اسحٰق نے اپنی کتاب میں درج کی ہے[172]۔ راویوں کے بیانات کے علاوہ انھوں نے لکھی ہوئی کتابوں اور دستاویزوں کی طرف بھی توجہ کی مثلاً وہ خط جو رسول اللہؐ نے ملوکِ حمیر کو بھیجا تھا۔ یا وہ دستاویز جو آنحضرتؐ نے اُن کے پردادا عمرو بن حزم کو ساتھ رکھنے کے لیے اُس وقت دی تھی جب اُنھیں اہلِ نجران کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لیے روانہ کیا تھا[174]۔ اپنے دوسرے پیشرو راویوں کی طرح ۔ جن کا ہم شروع میں تذکرہ کر چکے ہیں ۔ عبداللہ بھی وقائع بیان کرتے ہوئے، ان میں حصّہ لینے والوں کی زبان سے بکثرت اشعار پڑھواتے ہیں[175]۔ اس کی مثالیں مغازی میں، یا رسول اللہؐ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے حوادث کے بیان میں خوب ملیں گی[176]۔ عبداللہ کا گھرانا شاعری کا رسیا تھا۔ 'کتاب الاغانی' میں ایک قصہ ملتا ہے کہ ابوبکر بن محمد کے ایک بیٹے نے (اور یہ طے نہ ہو سکا کہ یہ خود عبداللہ تھے یا اُن کے بھائیوں میں سے کوئی تھا) ایک بار فرزدق کو چیلنج کیا کہ وہ حسّان بن ثابت کے ایک قصیدے کا جو اُن کا پسندیدہ تھا، جواب لکھ کر دکھائے[177]۔

"یربوعی نے کہا کہ ابراہیم بن محمد بن سعد بن ابی وقاص الزہری نے بیان کیا کہ اَبان بن عثمان کی گورنری کے زمانے میں (۷۵-۸۲ھ) الفرزدق آیا۔ الفرزدق کثیر اور میں مدینہ کی مسجد میں بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ چھریرے بدن کا ایک نوجوان ہلکے پیلے رنگ

کے کپڑے پہنے نمودار ہوا۔ وہ ہماری طرف بڑھا اور بغیر سلام کیے بولا: "تم میں فرزدق کون ہے؟" میں نے اس ڈر سے کہ یہ بھی (ابراہیم کی طرح) قریشی نہ ہو، اُس سے کہا: "کیا عربوں کے ایک شاعر اور سردار سے اس طرح خطاب کرتے ہیں؟" وہ بولا کہ "اگر یہ سچ ہوتا تو میں کبھی اس طرح بات نہ کرتا۔" اس پر الفرزدق نے اُس سے کہا: "صاحبزادے تم ہو کون؟" وہ بولا: "میں بنو انصار میں سے ایک ہوں، پھر بنو نجار کا فرد ہوں، پھر ابوبکر بن حزم کا بیٹا ہوں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اپنے تئیں عرب کا شاعرِ اعظم سمجھتے ہو اور یہی رائے تمہارے بارے میں بنو مُضر بھی رکھتے ہیں۔ (انصار خود کو جنوبی عرب کی نسل سے سمجھتے تھے اور بنو مضر شمالی عرب کے تھے، اسی قبیلے سے الفرزدق کا تعلق تھا) دیکھو ہمارے شاعر حسّان بن ثابت نے (یہ مدینہ کے تھے اور رسول اللہؐ کے صحابی شاعر تھے) ایک قصیدہ لکھا ہے، جو میں تمھیں سُناتا ہوں اور ایک برس کی مہلت دیتا ہوں، اگر اس مدّت میں تم نے اس قصیدے کا جواب لکھ لیا، تب تو تم عرب کے شاعرِ اعظم مان لیے جاؤ گے ورنہ محض جھوٹے اور مکّار ہو۔" پھر اُس نے حسّان کے یہ شعر پڑھے:

لَنَا الْجَفَنَاتُ الْغُرُّ يَلْمَعْنَ بِالضُّحَىٰ
وَأَسْيَافُنَا يَقْطُرْنَ مِنْ نَجْدَةٍ دَمَا
مَتَىٰ مَا تَزُرْنَا مِنْ مَعَدٍّ بِعُصْبَةٍ
وَغَسَّانَ نَمْنَعْ حَوْضَنَا أَنْ يُهَدَّمَا
أَبَىٰ فِعْلُنَا الْمَعْرُوفَ أَنْ نَنْطِقَ الْخَنَا
وَقَائِلُنَا بِالْعُرْفِ أَلَّا تَكَلَّمَا
وَلَدْنَا بَنِي الْعَنْقَاءِ وَابْنَيْ مُحَرِّقٍ
فَأَكْرِمْ بِنَا خَالًا وَأَكْرِمْ بِنَا ابْنَمَا

۱۔ ہمارے شاندار گھوڑے دن کی روشنی میں چمکتے ہیں اور ہماری تلواریں میدانِ کارزار میں لہو ٹپکاتی ہیں۔

۲۔ جب مَعدّ اور غسّان والے اپنی جماعت لے کر ہمارے مقابلے پر آتے ہیں تو ہم انھیں اپنی حوضوں کو ڈھانے نہیں دیتے۔

۳۔ ہمارا اچھے کام کرنے کا جذبہ، ہمیں لغو باتیں بکنے سے روکتا ہے اور ہمارا اچھی باتیں کہنا ہمیں یا وہ گوئی نہیں کرنے دیتا۔

۴۔ ہم نے بنو العنقاء کو اور مُحرّق کے دو بیٹوں کو جنم دیا ہے۔ ہم ننھیال کی طرف سے بھی شریف ہیں اور اپنے بیٹوں کے اعتبار سے بھی۔)

یہ قصیدہ اُس نے آخر تک پڑھا اور کہنے لگا: "میں اس کے لیے تمھیں ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر چلا گیا تو فرزدق غصّے میں بھرا ہوا اُٹھا، اُس کی چادر کا پلّو زمین میں گھسٹ رہا تھا مگر اس وقت فرزدق کو کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ مسجد سے نکل گیا تو کثیّر میرے قریب آیا اور کہنے لگا: "کیسا فصیح و بلیغ کلام تھا، اس انصاری کا، اور کتنی روشن دلیلیں تھیں، کیا

پیارا قصیدہ تھا۔" اُس روز ہم دن بھر فرزدق اور انصاری کی گفتگو کرتے رہے۔ اگلی صبح کو میں اپنے گھر سے نکل کر پھر اُسی ٹھکانے پر پہنچا اور کُثیّر بھی آ کر بیٹھ گیا اور وہی فرزدق کی بات چھڑ گئی۔ ہم نے کہا: "یہ تو معلوم ہو کہ اُس بھلے آدمی نے کیا کیا؟" اتنے میں فرزدق کئی رنگوں کا دھاری دار یمنی لباس پہنے نمودار ہوا، اور اُس کے بال دو لٹوں میں بٹے ہوئے تھے۔ وہ اُسی جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں کل بیٹھا تھا اور بولا: "انصاری نے کیا کیا ہے؟" ہم نے فرزدق کی دلجوئی کے لیے انصاری کی مذمت شروع کر دی تو فرزدق کہنے لگا: "خدا اُسے غارت کرے، نہ میں کبھی ایسے کسی شخص سے ملا ہوں، نہ میں نے ایسے اشعار سُنے ہیں۔" پھر فرزدق کہنے لگا کہ جب میں کل تم سے جُدا ہو کر اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو میں نے شاعری کے ہر فن میں زور لگا کر دیکھ لیا مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں گونگا ہوں اور گویا میں نے کبھی شعر کہا ہی نہ تھا۔ جب فجر کی اذان ہو گئی تو میں نے اپنی اونٹنی کا کجاوہ کسا اور اُس کی مہار سنبھال کر اُسے مدینے کے قریب ذُباب کی پہاڑیوں تک لے گیا اور وہاں اونچی آواز سے پکار پکار کر کہا: (اُس مؤکل یا جن سے جو فرزدق کی شاعری میں مدد کرتا تھا) "ارے ابو لُبینہ اپنے بھائی کی مدد کرو۔" تب میرا سینہ اس طرح جوش کھانے لگا جیسے ہانڈی میں اُبال آتا ہے۔ میں نے اونٹنی کو وہیں باندھ دیا اور اُس کے بازوؤں سے تکیہ لگا کر بیٹھ گیا اور جب تک ۱۱۳ شعر نہ ہو گئے وہیں بیٹھا رہا۔" جب فرزدق ہمیں یہ اشعار سُنا رہا تھا، وہی انصاری جوان اچانک آ گیا۔ اُس نے ہمارے قریب آ کر سلام کیا اور کہنے لگا کہ "میں نے جو مہلت تمھیں دی تھی اُسے گھٹانے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ تم جب بھی ملو گے تم سے دریافت کروں گا کہ تم نے کیا کیا۔" فرزدق نے کہا: "بیٹھ جاؤ" اور پھر اشعار سُنانے شروع کیے:

عَزَفْتَ بِاَعْشَاشٍ وَّمَا كِدْتَ تَعْزِفُ

وَاَنْكَرْتَ مِنْ حَدْرَاءَ مَا كُنْتَ تَعْرِفُ

(اب تو اعشاش (جگہ کا نام) سے کترا کر جا رہا ہے حالانکہ تیرا اُس سے کترانا مشکل ہے اور تو نے حُدراء کی (نام محبوبہ) اُن باتوں کو پہچاننے سے انکار کر دیا ہے جنھیں تو خوب جانتا تھا)

جب فرزدق یہ قصیدہ پڑھ چکا تو وہ نوجوان مُنہ لٹکائے ہوئے اُٹھا اور ہمارے درمیان سے کھسک گیا، اِدھر وہ گیا اور اُدھر اُس کے باپ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کچھ اور انصاری شیوخ کے ساتھ وہاں آ پہنچے، اُن سب نے ہمیں سلام کیا اور کہنے لگے "اے ابو فراس (یہ فرزدق کی کنیت ہے) تمھیں ہمارا حال اور رسول اللہ کی نظر میں ہماری قدر و منزلت کا حال معلوم ہے اور انھوں نے ہمارے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ بھی تم جانتے ہو ہمیں پتا چلا ہے کہ ہمارے ایک بیوقوف شخص نے تم سے معارضہ کیا ہے ہم تمھیں خدا اور رسول کا واسطہ دے کر اور رسول اللہ نے ہمارے بارے میں جس سلوک کی ہدایت فرمائی ہے اُسے یاد دلا کر تم سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہمیں ہجو لکھ کر رسوا نہ کرنا۔"

یرٰبُوعی نے کہا کہ ابراہیم بن محمد بن سعد نے کہا کہ میں اور کُثیّر بھی سفارش کرتے رہے جب ہم نے زیادہ اصرار کیا تو فرزدق کہنے لگا: "جاؤ اس قریشی (یعنی ابراہیم بن محمد بن سعد) کی وجہ سے تمھیں بخشے دیتا ہوں۔"

یہ واقعہ عبداللہ یا اُن کے کسی بھائی کے زمانۂ شباب کا معلوم ہوتا ہے، اس سے ایک بار پھر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اہلِ فقہ و حدیث شاعری اور اُس کی تنقید کی طرف بھی کتنا قوی میلان رکھتے تھے۔

۲- عاصم بن عمر

عاصم بن عمر بن قتادۃ ایک مدنی گھرانے میں پیدا ہوئے جو اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں میں سے تھا۔ اُن کے دادا قتادۃ بنو ظفر میں سے تھے۔ یہ انصاری قبیلہ تھا جس نے غزوۂ بدر میں رسول اللہ کے ساتھ مل کر جہاد کیا تھا۔[178] قتادۃ حُنین میں اپنے قبیلے کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے۔[179] البتہ عاصم کے والد عمر کے بارے میں ہمارے مآخذ کچھ زیادہ نہیں بتاتے۔[180] بس اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے حدیث کی سماعت کی اور پھر یہ علم اپنے بیٹے کو منتقل کیا۔ عبداللہ بن ابی بکر کے باپ کی مثال کے برعکس انہوں نے مدینے کی شہری زندگی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا نہ کسی سرکاری خدمت سے متعلق رہے۔ اُن کے بیٹے عاصم، اقتصادی مشکلات سے آزاد نہیں تھے اسی سبب سے انہوں نے مجبور ہو کر دارالخلافہ کا رُخ کیا، جیسا کہ اُن کے زمانے میں اکثر اہلِ علم، اضطراری حالت میں کرتے تھے اور دربارِ خلافت سے مالی مدد پاتے تھے۔ چنانچہ اس میں انھیں کامیابی ہوئی اور اُس وقت کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے (جو اموی خلفاء میں اس لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت تھے کہ انھیں مدینے کے صالحین کو دیکھنے ہی سے خوشی حاصل ہوتی تھی) اُن کی مالی امداد کی۔ ابنِ سعد ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے[181] کہ عاصم، عمر بن عبدالعزیز سے ملے تو انہوں نے اُن کا قرضہ ادا کر دیا اور اُن کو حکم دیا کہ دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو رسول اللہ کے مغازی کی تعلیم دیا کریں، چنانچہ یہ ایسا ہی کرتے تھے، پھر مدینے واپس آ گئے تھے۔" خلیفہ عمر بن عبدالعزیز، جنھوں نے جمع و تدوینِ حدیث کا خصوصی اہتمام کیا تھا، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، اسے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ دمشق کے عام آدمیوں کو کوئی عالم اور فقیہ مغازی کی تعلیم دیتا رہے۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عاصم سیرۃ اور مغازی کے مشہور عالم[182] تھے اور وہ ثقہ راویوں میں شمار ہوتے ہیں[183] ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اُمویوں کو خوش کرنے کے لیے رسول اللہ کی تاریخ میں کتر بیونت کی ہوگی، جس طرح ہم یہ نہیں مانتے کہ اسماعیل عمر بن عبدالعزیز پسند کر سکتے تھے یا انھیں اس کی ترغیب دے سکتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کا زمانۂ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک رہا اور عاصم زیادہ سے زیادہ ۱۰۱ھ تک مدینہ واپس آ چکے تھے، جہاں وہ تقریباً بیس سال تک تشنگانِ علم کو سیراب کرتے رہے اور ۱۱۹ھ یا اس کے کچھ ہی بعد انھوں نے انتقال فرمایا۔[184]

عاصم، ابنِ اسحٰق اور الواقدی کے اہم رُواۃ میں سے ایک ہیں جنھوں نے اُن سے خاص طور پر مغازی کی روایات اخذ کی ہیں، مگر عاصم نے رسول اللہ کے زمانۂ شباب اور آپ کی مکّی زندگی کی تفصیلات جمع کرنے پر بھی توجہ کی ہے، جیسا کہ ابنِ سعد کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ عاصم اکثر اپنی اسناد بھی بیان کرتے ہیں۔ مگر کبھی انھیں نظرانداز بھی کر جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے اسناد کے معاملے میں اُن کا رویہ بھی وہی ہے جو عبداللہ بن ابی بکر کا ہے۔ وہ جن وقائع کی روایت کرتے ہیں اُن کے بنیادی کرداروں کی زبان سے اکثر اشعار بھی پڑھواتے ہیں۔[185] ابنِ اسحٰق کے ایک فقرے سے ظاہر ہوتا ہے[186] کہ وہ صرف اخبار ہی جمع نہیں کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی اپنی رائے کا اظہار کر کے اس حادثے کے محرکات کی طرف بھی اشارہ کر دیتے تھے۔ ابنِ اسحٰق کہتا ہے: "عاصم بن عمر نے کہا واللہ العباس بن قتادۃ نے رسول اللہؐ کو یہ مشورہ (کہ وہ انصار سے باقاعدہ حلف کر لیں۔ حالانکہ انصار اس کے بغیر بھی ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے آمادہ تھے) اس لیے دیا تھا کہ معاہدہ سے انھیں قابو میں کر لیا جائے۔" اور عبداللہ بن ابی بکر نے بھی اس رائے کو اور اس کے معارض عاصم کی رائے کو قابلِ توجہ انداز میں پیش کیا ہے۔

۳- ابن شہاب الزہری

عبداللہ اور عاصم دونوں انصاری تھے مگر محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب، کی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا نام بنو زہرہ ہے۔ اسی سے ان کا لقب الزہری ہوا ہے۔ یہ ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں پیدا ہوئے، بعض روایات میں سالِ ولادت ۵۶ھ یا ۵۷ھ یا ۵۸ھ بھی ملتا ہے[۱۸۷] اُن کے پردادا عبداللہ بن شہاب معرکۂ بدر میں اہلِ مکہ کے ساتھ رسول اللہ ؐ سے لڑتے[۱۸۸] تھے، اور جنگِ اُحد میں انہوں نے تین مکیوں کے ساتھ مل کر رسول اللہ ؐ کو قتل کرنے کی سازش بھی کی تھی[۱۸۹] اور عملاً انھیں زخمی کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے[۱۹۰] یہ بات اُن کے پرپوتے کے لیے قدرتی طور پر تکلیف دہ رہی ہو گی، اسی لئے وہ جہاں اِس سازش کا تذکرہ کرتا ہے وہاں اپنے پردادا کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ انہوں نے اِس میں کیا حصہ لیا تھا[۱۹۱]۔ الزہری کے باپ عبداللہ بن الزبیر کے ساتھ تھے جب انہوں نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا[۱۹۲] مگر خود الزہری اپنے لڑکپن کے زمانے میں ہی ۶۴ھ میں مروان سے[۱۹۳] ملے تھے، جیسا کہ خود انہوں نے ہمیں بتایا ہے، پھر وہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے اور آخر کار دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی، مگر وہ اکثر اپنے شہر مدینہ جاتے رہتے تھے۔ دمشق کو اُن کی ہجرت سے پہلے ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا جس کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے[۱۹۴]:

" الزہری سے غیر ارادی طور پر ایک قتل ہو گیا تھا، چنانچہ یہ اپنے گھر سے نکلے اور آبادی سے باہر خیمہ لگا کر بیٹھ گئے اور کہتے تھے کہ کسی گھر کی چھت مجھے پناہ نہیں دے سکتی۔ ایک دن علی بن الحسین اُن کے پاس سے گذرے اور فرمایا کہ " ابنِ شہاب تمھاری مایوسی تو تمھارے گناہ سے بھی زیادہ شدید ہے۔ تم اللہ سے ڈرو اور استغفار کرو، اور مقتول کے وارثوں کے پاس خون بہا ادا کرنے کا پیغام بھیجو اور اپنے گھر کو واپس چلے جاؤ۔" الزہری کہا کرتے تھے کہ لوگوں میں سب سے بڑا احسان میرے اوپر علی بن الحسین کا ہے۔"

اگر شیعی مورخ الیعقوبی[۱۹۵] کا بیان درست ہے تو الزہری نے اپنی جوانی کے زمانے میں عبداللہ بن الزبیر سے لڑائی میں خلیفہ عبدالملک کو اپنی خدمات پیش کی تھیں، اور جب عبدالملک نے حج بیت اللہ کی طرح بیت المقدس کا حج کرنے کا قصد کیا یہ وہ زمانہ تھا کہ مکہ میں خلیفہ کے مخالفوں کی طاقت عروج پر تھی۔ تو جن لوگوں نے مکہ کی زیارت پر پابندی لگ جانے کا شکوہ کیا اُن سے خلیفہ نے کہا تھا: "یہ ابن شہاب الزہری موجود ہیں، ان سے پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ (بِمَكَّةَ) وَمَسْجِدِي (بِالْمَدِينَةِ) وَمَسْجِدُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ (بِأُورْشَلِيم)" یعنی تین مسجدوں کی زیارت کے لیے سفر کیا جا سکتا ہے، ایک مسجد الحرام، دوسری مسجد نبوی، اور تیسری مسجد بیت المقدس۔"

فی الواقع صحاح ستہ میں، معمولی لفظی تغیر کے ساتھ، اس مفہوم کی حدیث موجود ہے اور مسند احمد بن حنبل میں بھی پائی جاتی ہے، عموماً اس کی سند یوں ہے: " الزُّهْرِي عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ"۔ لیکن بعض جگہ الزہری کا نام ندارد ہے۔ یہ بات کہ عبدالملک نے اِس حدیث کو ثقہ بنانے کیلئے الزہری کو استعمال کیا ہو اسی وقت درست ہو سکتی تھی، جب اس واقعہ کے ساتھ الزہری کے رُواۃ کا تذکرہ بھی کیا جاتا۔ اگر خلیفہ نے مذکورۂ بالا الفاظ واقعی کہے تھے تو یہ ۶۵ھ سے ۷۳ھ کے درمیان کا قصہ ہوگا جب عبداللہ بن الزبیر نے بغاوت کر رکھی تھی؛ اور زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ

۷۲ھ کی بات ہو، یہی وہ سال ہے جب عبدالملک نے "قُبّۃُ الصَّخرۃ" تعمیر کیا تھا، جیسا کہ آج تک اُس مسجد میں لگا ہوا کتبہ ظاہر کر رہا ہے۔ مگر ۷۳ھ میں الزُّہری صرف ۲۳ سال کے تھے اور اتنی کم عمر میں بحیثیت محدّث کے انھیں ایسا امتیاز مل جانا خلافِ قیاس ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت میں تنہا ان کا نام لینا ہی کافی سمجھا جاتا ہو۔ اگر ہم یعقوبی کے بیان کو صحیح سمجھیں تو یہ ماننا چاہیے کہ الزُّہری مدینے سے چل کر خلیفہ کے دربار میں پہنچے ہوں اور انھوں نے یہ حدیث جو رواۃ مدینہ سے سُنی تھی، خلیفہ کو پہنچائی ہو تاکہ وہ اس سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کر سکے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ الزہری نے خود ہی یہ حدیث گھڑلی ہوگی۔ اُس دَور میں اہلِ دمشق کے لیے یہ دشوار نہیں تھا کہ وہ حدیث کے مانے ہوئے علماء سے کسی روایت کی تصدیق حاصل کرلیں اور اگر کسی کو اِس حدیث پر شبہ ہوتا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ چھان بین نہ کرتا۔ اِس حدیث کی صحت کے بارے میں خواہ کسی کا کچھ بھی خیال ہو، لیکن یہ باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ الزُّہری نے یہ حدیث سعید بن المُسیّب کی زبان سے سُنی ہوگی جن کے بارے میں اکثر یہ کہا گیا ہے[196] (یہ خوابوں کی تعبیر دینے میں مشہور تھے) کہ انھوں نے ایک خواب کی تعبیر بیان کی تھی جو اِس مقصد سے اُن تک پہنچایا گیا تھا اور اس تعبیر میں عبدالملک کے حریف (عبداللہ بن الزبیر) کی بدبختی اور عبدالملک کی خوش بختی ظاہر ہوتی تھی۔

عمر بن حبیب بن قُلَیع بیان کرتے ہیں[197] "ایک دن میں سعید بن المُسیّب کے پاس بیٹھا ہُوا تھا، اُس زمانے میں میری معاشی حالت بہت خراب تھی اور قرض میں بال بال بندھا ہوا تھا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جاؤں، کیا کروں، اِس لیے سعید بن المُسیّب کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ ایک شخص اُن کے پاس آیا اور کہنے لگا: "ابو محمّد (یہ سعید کی کنیت تھی) میں نے ایک خواب دیکھا ہے"۔ انھوں نے پوچھا "کیا دیکھا"۔ اُس نے کہا کہ "میں نے دیکھا کہ عبدالملک بن مروان کو میں نے پکڑ کر زمین پر گرا دیا ہے، پھر اُسے اوندھا کرکے اُس کی کمر میں چار میخیں ٹھونک دی ہیں"۔ سعید نے کہا کہ "یہ خواب تمھارا دیکھا ہوا نہیں ہو سکتا"۔ اُس نے کہا: "نہیں میں نے ہی دیکھا ہے"۔ سعید نے کہا: "ہرگز نہیں، تم خود ہی سچ سچ بتا دو، نہیں تو میں نام ظاہر کیے دیتا ہوں"۔ تب اُس نے کہا کہ "الزبیر نے دیکھا ہے اور اُنھی نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے"۔ سعید نے کہا کہ "اگر اُن کا خواب سچا ہے تو عبدالملک انھیں قتل کردے گا اور عبدالملک کے صُلب سے چار بیٹے پیدا ہوں گے جو خلیفہ بنیں گے"۔ عمر بن حبیب نے کہا کہ اب میں شام میں خلیفہ عبدالملک سے جا کر ملا اور انھیں سعید بن المُسیّب کی بیان کردہ تعبیر سنائی، جس سے وہ خوش ہوئے، مجھ سے سعید کی خیر و عافیت اور حال چال پوچھتے رہے۔ میں نے انھیں بتایا۔ پھر خلیفہ نے میرے قرض کی ادائیگی کا حکم دیا اور بھی میرے ساتھ سلوک کیا"۔

عمر بن حبیب ہی کی طرح الزُّہری نے بھی کیا۔ بشرطیکہ ہم یعقوبی کی بات صحیح مانیں کہ انعام کی اُمید میں سعید کے منہ سے سُنی ہوئی حدیث خلیفہ تک پہنچانے کے لیے دمشق گئے۔ بہر حال اُس وقت الزُّہری زیادہ دنوں تک دمشق میں نہیں ٹھہرے ہوں گے، اگر وہ وہاں واقعی گئے ہی ہوں۔ دمشق کو اُن کی مستقل ہجرت بعد کا واقعہ ہے، جیسا کہ خود انھوں نے "الاشعث کی بغاوت کا زمانہ"[198] بتایا ہے یہ ۸۱ھ یا ۸۲ھ کا واقعہ ہے[199]۔ پہلے وہ قبیصہ سے ملے تھے جو عبدالملک کا خاتم بردار تھا[200] اور یہ خلیفہ کا اُس زمانے سے معتمد علیہ تھا جب خلیفہ مدینے کا گورنر تھا[201]۔ قبیصہ نے انھیں عبدالملک سے ملوایا[202]۔ اس کے لیے تقریب یہ

پیدا ہو گئی کہ ایک دن خلیفہ نے پوچھا: "امہات الاولاد کی وراثت کا مسئلہ تم میں سے کسے معلوم ہے؟" اُس وقت الزُّہری کا نام لیا گیا اور انھیں خلیفہ کے دربار میں طلب کیا گیا۔ پہلے خلیفہ نے اُن کا نسب پوچھا پھر یاد دلایا کہ الزُّہری کے والد نے عبداللہ بن الزبیر کے ساتھ خروج میں شرکت کی تھی۔ اِس کے بعد اُنھیں بیٹھنے کی اجازت دی اور اُن کا قرض ادا کر دیا۔[۲۰۳] الزُّہری اپنے قبیل کے بہت سے لوگوں کی طرح اِسی اُمید میں دمشق گئے تھے کہ اُن کی تنگ دستی دُور ہو جائے گی۔[۲۰۴]

ایک اور روایت یہ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے خلیفہ نے اپنے مدینے کے گورنر کے ذریعے سعید بن المُسیّب سے الزُّہری کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں[۲۰۵] اور یہ سب روایات یعقوبی کے اُس بیان سے میل نہیں کھاتیں جس کی رُو سے عبدالملک الزُّہری کو ایک طویل عرصے سے جانتا تھا اور الزُّہری کو خلیفہ کے دربار میں کسی تقریب تعارف کی یا سعید بن المسیّب کی سفارش کی ضرورت نہیں تھی۔ غالباً یعقوبی کا بیان اس امرِ واقعہ پر مبنی ہے کہ بعد کے زمانے میں الزُّہری ایک مشہور و معروف محدّث تھے اور یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ خلیفہ سے اُن کے گہرے روابط تھے، مگر لوگ ان تعلقات کا آغاز واقعی زمانے سے تقریباً دس سال قبل سمجھتے رہے تھے۔ اِس گمان کو تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ جس حدیث کا ہم ابھی حوالہ دے چکے ہیں اُس کی اسناد میں الزُّہری کا نام آتا ہے۔

عبدالملک کے جانشین خلفاء کے زمانے میں بھی الزُّہری دمشق میں مقیم رہے جنھوں نے الزُّہری کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔[۲۰۶] خود الزُّہری ہمیں اطلاع[۲۰۷] دیتے ہیں کہ وہ اپنے چچا مالک بن شہاب کی بیٹی کا پیغام لے کر ولید بن عبدالملک کے پاس گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ داستان طرازوں نے اس واقعہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، اس لئے کہ ہمیں 'الفہرست'[۲۰۸] میں ایک کتاب کا نام ملتا ہے جس کا عنوان ہے: "کتب الزّھری وابنة عمّه الذین سارُوا إلی ھشام بن عبدالملک"۔[۲۰۹] یہ الولید کی جگہ ہشام کا نام ایک اور موقع پر بدلا گیا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے۔ عمر بن عبدالعزیز کے عہدِ خلافت (۹۹ھ - ۱۰۱ھ) میں الزُّہری مفتیٔ شرع تھے۔[۲۱۰] یہ بات ایک سے زیادہ ماخذوں میں بتائی گئی ہے[۲۱۱] کہ عمر کے جانشین یزید نے انھیں قاضی مقرر کیا تھا۔ مگر یزید ثانی الزُّہری سے ایسی علمی قابلیت کی توقع رکھتا تھا جو عام قاضیوں کی لیاقت سے مختلف ہو۔ اسی لیے ایک بار اُس نے ایک قصیدے کے مصنف کا نام دریافت کرنے کے لیے اُن سے رجوع کیا تو یہ استفسار بے سبب نہیں تھا۔[۲۱۲]

"یزید ثانی اور اس کی کنیز حبابہ ایک رات کو چھت پر بیٹھے تھے اور وہ الأحوص کے شعر گا رہی تھی۔ یزید نے اُس سے پوچھا "یہ اشعار کس کے ہیں؟" اُس نے کہا: "بچشمانِ شما، مجھے معلوم نہیں"۔ آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی مگر اُس نے کہا کسی کو الزُّہری کے پاس بھیجو، شاید انھیں معلوم ہو گا۔ الزُّہری حاضر کیے گئے، تو وہ یزید کے خوف سے سراسیمہ ہو رہے تھے۔ جب وہ یزید کے پاس اُوپر چھت پر لے جائے گئے تو اُس نے کہا: "ڈرو نہیں، میں نے تمھیں ایک اچھی بات کے لیے بُلایا ہے یہ بتاؤ کہ یہ اشعار کس کے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "اے امیر المومنین الأحوص بن محمد کے ہیں"۔ (یہ مدنی شاعر تھا۔ اُسے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے دَھلک کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔) خلیفہ نے پوچھا: "آج کل وہ کیا کر رہا ہے؟" انہوں نے کہا ایک مدت سے دھلک میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہا ہے۔" خلیفہ نے کہا: "مجھے عمر (ابن عبدالعزیز۔ سلیمان کے جانشین) پر

حیرت ہے کہ انھوں نے اُس کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتی"۔ حکم ہوا کہ اُسے آزاد کیا جائے اور چار سو دینار بطور انعام مرحمت ہوتے اُس رات کو الزُّہری اپنی قوم انصار کے لوگوں کی طرف واپس آئے اور یہ مژدہ سُنایا۔

جیسے اِس موقع پر ایک مدنی کو آزاد کرانے میں الزُّہری نے حصہ لیا ایسے ہی متعدد مواقع پر انہوں نے اہلِ مدینہ کی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لی۔ یزید ثانی نے ۱۰۱ھ میں حجاز کا نیا گورنر مقرر کیا تو الزُّہری نے گورنر کو بعض اہم اور مفید مشورے دیئے۔ اگرچہ نئے گورنر نے اپنی خاص مصلحتوں کی وجہ سے اُن مشوروں پر عمل نہیں کیا۔[۲۱۴]

الزُّہری سخاوت میں مشہور تھے۔ فائد بن اشرم نے ایک قصیدے[۲۱۴] میں اُن کی مدح کی ہے اور قرّۃ بن عبدالرحمٰن،[۲۱۵] الزُّہری کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "میں نے کوئی اور شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نظر میں دینار و درہم اتنے بے وقعت ہوں گویا وہ مینگنیاں ہیں"۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ یہ قرضہ نئے خلیفہ ہشام[۲۱۶] (۱۰۵ھ - ۱۲۵ھ) نے ادا کیا تھا۔ الزُّہری ہشام کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں[۲۱۷] مدد دیتے تھے۔ خلیفہ نے انھیں اور ابوالزّناد کو اپنا مقرب بنا لیا تھا۔ ایک دن الزُّہری ہشام بن عبدالملک کی مجلس میں پہنچے اور ابوالزّناد عبداللہ بن ذکوان پہلے سے وہاں موجود تھے۔ ہشام نے اُن سے پوچھا: "اہلِ مدینہ کو عموماً کس مہینے میں تنخواہ تقسیم ہوتی ہے؟" الزُّہری نے کہا: "مجھے علم نہیں"۔ پھر ابوالزّناد سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ محرم میں۔ اِس پر ہشام نے الزُّہری سے کہا کہ ابوبکر لو آج تمھاری معلومات میں بھی اضافہ ہوگیا"۔ الزُّہری نے جواب دیا کہ امیرالمؤمنین کی مجلس ہے ہی ایسی جگہ جہاں سے علم حاصل کیا جاتا ہے"۔[۲۱۸]

خلیفہ اور اُس کے درباری فقیہ علاّمہ (الزُّہری کو "علاّمہ" کہا جاتا تھا) کے درمیان ہمیشہ ایسی نرم گفتگو نہیں ہوتی تھی۔ الشافعی[۲۱۹] ہمیں اپنے چچا کے واسطے سے یہ روایت بھی سُناتے ہیں: "ایک دن سلیمان بن یسار ہشام کی مجلس میں پہنچے تو اُس نے پوچھا: "قرآن کی آیتہ" الَّذِی تَوَلّٰی کِبْرَہٗ " (سورۃ ۲۴ - آیتہ ۱۱) میں کس شخص کی طرف اشارہ ہے (یہ آیتہ واقعۂ افک سے متعلق ہے) سلیمان نے جواب دیا کہ "عبداللہ ابن اُبَیّ بن سلول کی طرف"۔ اس پر ہشام نے کہا: "تم جھوٹ بولتے ہو، یہ علی کی طرف ہے۔ ابنِ شہاب تم بتاؤ کس کی طرف ہے؟" الزُّہری نے بھی کہا: "عبداللہ بن اُبَیّ مراد ہے"۔ خلیفہ نے کہا: "تم بھی جھوٹے ہو، یہاں علی ہی مراد ہیں"۔ الزُّہری نے کہا: "میں جھوٹا ہوں؟ خدا کی قسم اگر آسمانوں سے ندا دی جائے کہ خدا نے جھوٹ بولنا حلال کر دیا ہے میں تب بھی نہ بولوں گا۔ مجھ سے سعید بن المسیّب نے، عُروۃ نے، عبیداللہ اور علقمۃ بن وقاص نے، خود عائشہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ" اِنَّ الَّذِی تَوَلّٰی کِبْرَہٗ عَبْدُاللّٰہِ بْنَ اُبَیّ"۔ (قرآن میں جس کے لیے کہا گیا ہے کہ اُس نے بات کا تبنگڑ بنا دیا وہ شخص عبداللہ بن اُبَیّ تھا)۔ اس پر حاضرین بحث کرنے لگے تو ہشام نے کہا: "یہاں سے چلے جاؤ، خدا کی قسم ہمارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ تم جیسوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں"۔[۲۲۰] الزُّہری نے کہا: "کیا بات ہے، نہ تم میری دھونس میں ہو، نہ میں تمھاری۔ مجھے الگ کرو"۔ خلیفہ نے کہا: "نہیں، تم لاکھوں کے مقروض ہو"۔ الزُّہری نے کہا کہ "یہ بات تم خوب جانتے ہو، اور تم سے پہلے تمھارے باپ بھی جانتے تھے کہ میں نے یہ قرض تمھارے بھروسے پر نہیں لیا ہے"۔ اس پر ہشام نے کہا: "ہمیں شیخ کو غضبناک نہیں کرنا چاہیئے، وہ فوراً کھری کھری سُنانے لگتے ہیں"۔ پھر حکم[۲۲۱] دیا اور اُن کا لاکھوں روپے کا قرض ادا کر دیا گیا۔

جب کسی نے یہ بات الزُّہری کو بتائی تو انھوں نے کہا: "خدا کا شکر و احسان ہے، یہ سب اُسی کی طرف سے ہوتا ہے"۔

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہشام کا قصہ نہیں ہے[۲۲۲] بلکہ الولید تھا جس نے یہ بے سود کوشش کی تھی کہ الزُّہری کو استعمال کر کے ابنِ اُبَیّ کا الزام حضرت علی کی طرف منتقل کر دے۔

ابوالزِّنَاد نے الزُّہری اور ہشام کے درمیان ہونے والا ایک اور مکالمہ بھی نقل کیا ہے[۲۲۳] "میں ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پہنچا تو دیکھا کہ الزُّہری بھی بیٹھے ہیں اور یہ دونوں الولید کی بُرائی بیان کر رہے ہیں۔ میں الگ تھلگ بیٹھا رہا اور میں نے اس بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ذرا دیر کے بعد معلوم ہوا کہ الولید باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔ اُسے اجازت دی گئی، وہ آیا، مگر غصّے میں بھرا ہوا تھا، ذرا دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ جب ہشام مَرا، اور الولید نے حکومت سنبھالی، اُس نے مدینے (کے گورنر) کو لکھ کر مجھے طلب کیا۔ میں حاضر کیا گیا تو مجھ سے کہنے لگا: "تمھیں اُس بھینگے (ہشام مراد ہے) کی اور الزُّہری کی گفتگو یاد ہے؟" میں نے کہا: "جی ہاں۔ مگر میں نے تو اُس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا"۔ اُس نے کہا: "تم سچ کہتے ہو، مگر جانتے ہو مجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا: "نہیں"۔ تو بولا کہ اُس کی پشت پر جو خادم کھڑا تھا اُس نے مجھے بتایا تھا۔ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ فاسق الزُّہری اگر آج زندہ ہوتا تو میں اُسے قتل کروا دیتا"۔

لیکن الزُّہری بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر الولید حاکم ہو گیا تو انھیں کیا پھل ملے گا۔ انہوں نے پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ جیسے ہی ہشام کی آنکھیں بند ہوں گی وہ فوراً بازنطینی[۲۲۴] حکومت کی حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ مگر وہ الولید کی تخت نشینی (۱۲۵ھ) تک زندہ ہی نہ رہے اور ۱۷ رمضان ۱۲۴ھ کو وفات پا گئے[۲۲۵]۔ انھیں حجاز کے علاقہ "شغب" میں دفن کیا گیا، یہ وہ جگہ ہے جو انھیں اُمویوں[۲۲۶] سے جاگیر میں ملی تھی۔

الزہری اکثر حجاز جاتے رہتے تھے، حتیٰ کہ دمشق کو ہجرت کرنے کے بعد بھی وہ ۱۱۹ھ میں حج کرنے گئے تھے[۲۲۸]۔ مگر سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ الزُّہری نے اپنا طالب علمی کا زمانہ مدینہ میں گزارا تھا اور اِسی شہر میں اُن کے اُس علم کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کی وجہ سے انھیں دارالخلافہ میں اتنا اثر و رسوخ مل سکا۔ خود الزُّہری ہمیں بتلاتے ہیں[۲۲۹] کہ انہوں نے کس طرح سب سے پہلے عبداللہ بن ثعلبہ سے اپنی قوم کا نسب سیکھا۔ ایک دن اُن کے اُستاد سے کسی نے طلاق کا کوئی مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے اُسے سعید بن المسیّب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا، تب یہ بھی سعید سے ملے۔ "سعید کو لوگوں میں بڑی عزت حاصل تھی، اس لیے کہ وہ متقی اور پرہیزگار تھے اور بادشاہ کے یا کسی کے بھی آگے حق بات کہنے سے نہ جھجکتے تھے، خود کو دربار سے الگ تھلگ رکھتے تھے اور اپنے علم میں بھی یکتا تھے۔ اس کے ماسوا بڑی جچی تُلی رائے دیتے تھے۔ میری یہ ہمت تو نہیں تھی کہ اُن سے براہِ راست مسئلہ پوچھ لوں، یوں کہتا تھا کہ فلاں شخص کا یہ خیال ہے مگر فلاں یوں کہتا ہے، تب وہ اپنا جواب بتلاتے تھے"۔

اسی طرح ایک اور موقع پر ہمیں یہ رپورٹ ملتی ہے[۲۳۰]۔ "ہم سعید بن المسیّب کی صحبت میں رہتے تھے مگر اُن سے مسئلہ نہیں پوچھتے تھے۔ ہاں کوئی شخص آتا تھا اور اُن سے کچھ دریافت کرتا تھا تو وہ بولنا شروع کرتے تھے یا کسی وقت خود بھی آمادۂ سخن ہو جاتے تھے"۔

ثعلبہ بن ابی مالک نے بھی الزہری کو سعید کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا تھا، اور الزہری "دس سال تک متواتر یوں حاضر رہے گویا ایک دن رہے ہیں"[۲۳۱] الزہری نے سعید بن المسیب کو "قریش کے چار سمندر" (بحور قریش الاربعۃ) میں شمار کیا ہے، جن میں باقی تین عروۃ، اور ابو سلمہ بن عبدالرحمن اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ ہیں[۲۳۲]۔ ایک موقع پر انھوں نے اس علمی خزانہ کا موازنہ کیا ہے جو انھیں عروۃ سے ملا (انھیں وہ "بحر بے کراں" (بحر لا ینزف)[۲۳۳] کے لقب سے یاد کرتے ہیں) اور جو عبید اللہ سے پہنچا تھا، پھر کہتے ہیں: "میں نے جن عالموں کی صحبت اختیار کی ان کے پاس جو کچھ تھا سب حاصل کر لیا۔ عروۃ کی خدمت میں بیٹھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی زبان سے جو کچھ سنتا تھا وہ مانوس معلوم ہونے لگا۔ مگر عبید اللہ بن عتبہ کا معاملہ ان سے مختلف تھا، ان کے پاس جب بھی گیا کوئی نئی بات لے کر اٹھا۔"

الزہری عبید اللہ کی ایسی خدمت گذاری بھی کرتے تھے جو ایک شاگرد اپنے استاد کی کرتا ہے[۲۳۵]: "میں عبید اللہ بن عبد اللہ کے لیے پانی بھرتا تھا، جب وہ اپنی باندی سے پوچھتے تھے کہ دروازے پر کون کھٹکا کر رہا ہے تو وہ کہتی تھی کہ آپ کا چندھا غلام ہے"[۲۳۶] (غلامک الاعمش)

عبید اللہ نے، جو شاعر بھی تھے (جیسا کہ ہم ایک اور مضمون میں بحث کر چکے ہیں) اور اس پایہ کے تھے کہ ابن عبدالبر نے انھیں "افقہ الشعراء وا شعر الفقہاء" (شاعروں کے زمرے میں سب سے زیادہ فقہ کے جاننے والے اور فقیہوں میں سب سے اچھے شاعر) کہا ہے۔ اپنے بعض اشعار میں الزہری سے خطاب کیا ہے جو کتاب الاغانی میں نقل ہوئے ہیں[۲۳۷]۔

عراک بن مالک نے الزہری کو اہل مدینہ کا سب سے بڑا عالم کہا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عروۃ، سعید اور عبید اللہ کا علم سمیٹ لیا تھا۔ ان کے بارے میں اس طرح کی بہت سی رائیں ملتی ہیں، بس اگر ان پر کوئی اعتراض ہے تو یہی ہے کہ وہ اموی خلیفہ سے میل جول رکھتے تھے۔ مکحول کہتے ہیں[۲۳۸]: "الزہری بھی کیا آدمی تھے، اگر بادشاہوں کے دربار میں جا کر خود کو خراب نہ کیے ہوتے۔"

اور الزہری خود فخریہ کہا کرتے تھے، جب اپنے ہی ایک شاگرد کی کم کوشی اور اس کے مقابلے میں اپنے علم کو عام کر دینے کی صلاحیت کا موازنہ کرتے تھے کہ[۲۳۹] "کسی نے میری طرح علم کو شائع کیا ہے نہ اسے میری طرح بے دریغ خرچ کیا ہے۔"

ان کی ہمہ دانی بھی ضرب المثل تھی[۲۴۰]۔ اللیث کہتے ہیں: "نہ میں نے ابن شہاب جیسا کوئی جامع علوم دیکھا، نہ ان سے بڑا عالم کسی کو پایا اگر تم انھیں وعظ کہتے ہوئے سنتے تو بے اختیار بول اٹھتے کہ ان سے اچھا کوئی نہیں کہتا اور علم الانساب میں ان کی واقفیت کا حال دیکھتے تو کہتے کہ ان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر وہ قرآن اور حدیث کی گفتگو کرتے تھے تو ان کی تقریر میں ایک طرح کی جامعیت ہوتی تھی۔"

ابراہیم بن سعد نے اپنے باپ سعد سے پوچھا کہ ابن شہاب نے آپ لوگوں پر کس بات میں فوقیت حاصل کی۔ تو سعد[۲۴۱] نے کہا: "وہ مجلسوں میں سامنے سے داخل ہوتے تھے، ان کے پیچھے سے نہیں آتے تھے اور محفل میں کوئی مرد یا عورت جوان یا بوڑھا باقی نہیں رہتا تھا جس سے وہ معلومات فراہم نہ کرتے ہوں، پھر انصار کے گھروں میں جاتے تھے اور وہاں بھی پوچھ تاچھ کرتے تھے اور ان میں بھی کوئی جوان یا بوڑھا یا بڑھیا ایسی نہ بچتی تھی، جس سے وہ سوالات نہ کرتے ہوں۔ حد یہ ہے کہ پردہ نشین عورتوں

تک سے معلومات جمع کرلاتے تھے۔"

ابن سعد[۲۴۲] کے یہاں یہ جواب ذرا مختلف انداز میں ملتا ہے۔" ابن شہاب علم میں ہم سے اس لحاظ سے برتر تھے کہ ہم مجلسوں میں ادب سے بیٹھتے تھے اور ابن شہاب دَرّانہ داخل ہوتے تھے، اپنی چادر کو سینے پر سمیٹ کر بیٹھ جاتے اور جو جی میں آتا، پوچھتے رہتے جبکہ ہم نوعمری کی وجہ سے لحاظ میں ہی رہ جاتے تھے۔"[۲۴۳]

زیادہ سے زیادہ اخبار جمع کرنے کا انھیں شوق تھا اور اس کے لیے بہت قوی حافظہ درکار تھا۔ الزّہری حافظے کی تقویت کے لیے شہد کا استعمال کرتے تھے۔[۲۴۴] وہ اپنی شبینہ محفلیں اُسی طرح شہد نوشی سے آراستہ کرتے تھے جیسے مے نوش شراب سے کرتے ہیں اور کہتے تھے: "بس پلائے جاؤ اور باتیں کیے جاؤ۔"

کہا جاتا ہے کہ ایک بار ہشام نے اُن کی قوّتِ حافظہ کا امتحان لینے کا ارادہ کیا، اُس نے الزّہری سے کہا کہ اُس کے کسی لڑکے کے واسطے کچھ احادیث املا کرا دیں۔ انھوں نے کاتب کو بُلوایا اور اُسے چار سو حدیثیں لکھوا دیں۔ کچھ زمانے کے بعد جب الزّہری ہشام سے ملے تو اُس نے اُن سے کہا کہ وہ کتاب تو ضائع ہوگئی۔ الزّہری نے کہا کوئی بات نہیں، پھر کاتب کو بُلوایا اور احادیث لکھوا دیں۔ جب ہشام نے اُس کا پہلی کتاب سے مقابلہ کرکے دیکھا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں احادیث جمع کرنے والوں میں اپنے ہی استعمال کے لیے ان حدیثوں کو کتابی صورت میں مدوّن کر لینا تابعین کے وقت تک ایک عام بات ہو چکی تھی۔ ابوالزناد جو الزّہری کے ہم سبق اور دربارِ خلافت میں اُن کے رفیق رہے ہیں، کہتے ہیں:[۲۴۵] "ہم اور الزّہری (معلومات فراہم کرنے کے لیے) دَورے پر نکلتے تو الزّہری کے پاس کتابیں اور تختیاں ہوتی تھیں اور ہم اس پر ہنسا کرتے تھے مگر وہ جو کچھ سنتے تھے اُسے قلمبند کر لیتے تھے۔"

اور محمد بن عکرمہ کہتے ہیں:[۲۴۶] "ابن شہاب اکثر الأعرج کے پاس جایا کرتے تھے۔ الأعرج قرآن لکھتے ہوتے تھے۔ وہ ان سے کوئی حدیث پوچھتے اور اُس کو لکھ لیتے پھر زبانی یاد کرتے اور جب یاد ہو جاتی تو وہ پرچہ پھاڑ دیتے تھے۔"

صالح بن کیسان بھی روایت کرتے ہیں:[۲۴۸] "میں اور الزّہری ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آؤ احادیث لکھ لیں۔" کہا: "جو کچھ رسول اللہ سے پہنچا تھا، ہم نے لکھ لیا۔" پھر کہا: "آؤ جو کچھ صحابہ سے پہنچا ہے وہ بھی لکھ ڈالیں۔" کہا: "انھوں نے لکھ لیا اور میں نے نہیں لکھا، چنانچہ وہ کامیاب رہے اور میں پھسڈی رہ گیا۔" اِن سب روایات میں اُن یادداشتوں کی طرف اشارہ ہے جو ذاتی استعمال کے لئے مرتب کی جاتی تھیں، البتہ ان یادداشتوں کا عوام کے لیے دستیاب ہونا زمانہ[۲۴۹] مابعد کا رواج ہے اور غالباً عمر ثانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علما کو یہ طریقِ کار اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ ہم ابھی پڑھ چکے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن ابی بکر سے ایسی ہی فرمائش کی تھی اور بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی طرف سے الزّہری کو بھی ایسا ہی حکم ملا تھا۔[۲۵۰] بہرحال ایک موقع پر بروایتِ معمر الزّہری نے "اِن اُمرا" (ھٰؤلاء الأمراء) کو اپنی بسیار نویسی کی عادت کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ کہتے ہیں:

"كُنَّا نَكْرَهُ كِتَابَ الْعِلْمِ حَتّٰى اَكْرَهَنَا عَلَيْهِ هٰؤُلَاءِ الْاُمَرَاء فَرَأَيْنَا اَلَّا يَمْنَعَهُ اَحَدٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔"

(ہم علم کو لکھنا پسند نہیں کرتے تھے مگر ان امیروں نے ہمیں مجبور کیا تو ہم نے بھی طے کر لیا کہ اب کسی مسلمان کو اس سے محروم نہ رکھا جائے)[۲۵۱]۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ہشام نے انھیں کاتب کو املا کرانے پر آمادہ کیا تھا، یہ بات ذہن میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ وہ ابتداً میں حدیث لکھوانے یا اپنے لکچروں کو قلمبند کرانے کے مخالف بھی تھے تو اُس گول مول[۲۵۲] جواب کا مطلب واضح ہو جاتا ہے جو الزہری نے اللیث کو دیا تھا۔ اللیث نے کہا: "ابوبکر (الزہری کی کنیت) اگر تم عام لوگوں کے لیے ان کتابوں کو مرتب کر دو تو تحسین ہو جاؤ گے"۔ الزہری نے جواب دیا: "اس علم کو کسی نے مجھ سے زیادہ عام نہیں کیا ہے"۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو شخص چاہے وہ مجھ سے حدیث کی سماعت کر سکتا ہے مگر جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ میں اسے کتابی شکل میں مدون کر دوں تو میں یہ نہیں کر سکوں گا۔ ممکن ہے کہ یہ تصریح اُس عہد سے پہلے کی ہو جس کا ابھی اوپر ذکر آ چکا ہے اور جہاں وہ کہتے ہیں: "جب ہم اپنی کتابیں امراء تک پہنچانے کے لیے مجبور کر دیے گئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اُن کتابوں سے عام مسلمانوں کو محروم رکھا جائے"۔ اس معاملے میں وہ اِس حد تک گئے کہ اُن پر یہ نکتہ چینی[۲۵۳] کی گئی کہ حدیث کا ایک مجموعہ جو الزہری ہی کی روایات پر مشتمل تھا، آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے کے لئے مرتب ہوا اور الزہری کے سامنے نظر ثانی کے لیے پیش کیا گیا، تو انھوں نے اُسے سرسری نظر سے بھی نہیں دیکھا اور اُسے شائع کرنے کی اجازت دے دی۔ ایک روایت کے مطابق یہ اجازت ابراہیم بن الولید کو دی گئی تھی لیکن جیسا کہ گولڈزیہر نے اچھی طرح وضاحت کر دی ہے[۲۵۴]۔ اس روایت میں وہ ابراہیم مراد نہیں ہو سکتا جو بعد میں خلیفہ بنا تھا۔ بہر طور اس صورت میں یہ بات ممکن ہو جاتی ہے کہ اس مجموعہ میں وہ روایات داخل ہو جائیں جو الزہری نے کبھی سُنی بھی نہ ہوں خواہ اُن میں الزہری کا نام لیا جاتا ہو۔ مگر ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ الزہری نے اُموی خلفاء کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے خود روایات گھڑ کر شامل کر دی ہوں گی۔

الزہری کے شاگرد مَعمر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دمشق میں اُموی خلفاء کے کتب خانے میں ڈھیر ساری جلدیں تھیں جن میں الزہری کا جمع کیا ہوا علمی مواد تھا۔ معمر کے الفاظ یہ ہیں[۲۵۵]:

"كُنَّا نَرَى أَنَّا قَدْ أَكْثَرْنَا عَنِ الزُّهْرِيِّ
حَتَّى قُتِلَ الْوَلِيدُ فَإِذَا الدَّفَاتِرُ قَدْ
حُمِلَتْ عَلَى الدَّوَابِّ مِنْ خَزَائِنِهِ،
يَقُولُ: (معمر) مِنْ عِلْمِ الزُّهْرِيِّ"

"ہم یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہم نے الزہری سے بہت زیادہ علم
حاصل کر لیا ہے، تا آنکہ الولید قتل ہوا تو اس کے
خزانوں سے کتابوں کا ذخیرہ چوپایوں پر لاد کر لایا گیا (معمر
نے) کہا یہ سب الزہری کے علم پر مشتمل تھا"

اس بیان میں زمانہ ولید ثانی کے قتل کا بتایا گیا ہے اور یہ ۱۲۶ھ کا واقعہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ الولید الزہری کا دشمن تھا، مگر بظاہر اس کے لیے کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے اسلاف کے حکم سے جمع کی ہوئی کتابوں اور یادداشتوں کے ذخیرے کو ضائع کرنے کا حکم دے سکتا تھا۔ معمر کے اس بیان کے مقابلے میں جو ایک تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے الزہری کی زوجہ کے مقولے کی اہمیت ایک چٹکلے کی سی رہ جاتی ہے جس نے کہا تھا: "یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ شاق ہیں"۔ یہ قول

صرف متاخر مصادر میں پایا جاتا ہے [۲۵۶] اور اس میں وہی کتابیں مراد ہو سکتی ہیں جو الزُّہری نے اپنے استعمال کے لیے بطور یادداشت تیار کی تھیں۔ یہاں وہ مدوّنات یقیناً مقصود نہیں ہیں جو الزُّہری نے جمہور کے لیے یا اپنے خاص طلب گاروں کے لئے تیار کی ہوں گی۔

الزُّہری خود ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ انہوں نے "اسنانُ الخلفاءِ" (خلفاء کے سنین) اپنے دادا کے لیے مرتّب کی تھی۔ یہ وقائع کی ایک فہرست تھی جس سے طبری نے بھی دو اقتباسات لیے ہیں [۲۵۸]۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خالد بن عبداللہ القسری کی فرمائش سے انہوں نے شمالی عرب کے قبائل سے متعلق ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی [۲۵۹] مگر یہ کبھی مکمل نہیں ہوئی۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرۃ بن عبدالرحمٰن کا قول کہ

"لم یکن للزُّہری کتاب اِلَّا کتابُ نَسَبِ قومِہٖ"	الزُّہری نے سوائے اپنی قوم کے نسب پر ایک کتاب کے اور کوئی کتاب نہیں لکھی۔

اسی سے متعلق ہے۔ خالد نے اپنے لئے سیرۃ کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش بھی الزُّہری سے کی تھی [۲۶۰]۔

لہٰذا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ الزُّہری نے اپنی یادداشت کے لیے جو کچھ لکھا ہو اُس کے علاوہ خالد کی اور اُمویوں کی فرمائش سے بھی کتابیں لکھی تھیں اور خاص طور سے ایک کتاب سیرۃ کے موضوع پر بھی تھی۔ لیکن اُن کی کوئی مستقل تصنیف ہمارے ہاتھوں میں نہیں پہنچی ہے بلکہ احادیث کے مجموعوں میں "الزُّہریات" کے عنوان سے جو کچھ ملتا ہے وہ بعد کے مؤلفوں نے جمع کیا ہے، یا وہ فقرے اور اقتباسات ہیں جو سیرۃ کی کتابوں اور اسلام کے صدرِ اوّل کی تاریخوں میں منتشر ہیں۔ جیسا کہ ابن سعد کے دیے ہوئے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے، الزُّہری نے "مغازی" کو محدود معنوں میں نہیں لیا ہے بلکہ رسول اللہؐ کی پوری حیاتِ طیبہ کی طرف توجہ کی ہے اور انہوں نے خالد کی فرمائش [۲۶۱] سے جو کتاب مرتّب کی تھی اُس کے لیے خود ہی لفظ "سیرۃ" استعمال کیا ہے [۲۶۲]۔

الزُّہری اپنی جمع کردہ روایات زیادہ تر اسناد کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مگر وہ انھیں حذف بھی کر جاتے ہیں۔ کبھی وہ ایک ہی حادثہ کے بارے میں متعدد روایات جمع کر دیتے ہیں اور پھر اُن سے مجموعی خبر نکال لیتے ہیں اور اُسے سب راویوں کی مجموعی سند کے ساتھ درج کرتے ہیں [۲۶۳]۔ وہ حوادث میں حصہ لینے والوں کی طرف سے اشعار بھی داخل کر دیتے ہیں۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ وہ شعر کے رسیا تھے۔ حمّاد بن زید روایت کرتے ہیں کہ الزُّہری احادیث بیان کرنے کے بعد کہا کرتے تھے کہ آؤ اب کچھ گپ شپ اور شعر و شاعری ہو جائے اس لیے کہ کان تھک چکے ہیں مگر ابھی روح پیاسی ہے۔"

باب (۳)

۳۔ الزُّہری کے تلامذہ

ا۔ موسیٰ بن عقبہ

ہمیں الزُّہری کے تلامذہ میں تین شخصیتوں کا حال معلوم ہے، جنھوں نے مغازی کے موضوع پر کتابیں تالیف کیں۔ ان کے نام ہیں: موسیٰ بن عقبہ، معمر بن راشد اور محمد بن اسحٰق۔ اور اتفاق سے یہ تینوں مسلمانوں

کے طبقۂ اشراف سے نہیں تھے بلکہ مُوالی تھے۔

موسیٰ بن عقبۃ بن ابی عیاش، الزبیر بن العوام کے خاندان کے موالی تھے یا زیادہ قطعیت سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ الزبیر کی بیوی[۲۶۵] اُم خالد کے موالی تھے اور ان کے نانا خود ابن الزبیر کے موالی تھے[۲۶۶]۔ ان دونوں کے خاندانی روابط بہت گہرے تھے۔ ان کا سالِ ولادت یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔ موسیٰ نے ایک سوال کے جواب میں کہ کیا تم نے کسی صحابی کو دیکھا ہے[۲۶۷]؟ یہ کہا تھا کہ "میں نے جب (پہلا) حج کیا تو عبداللہ بن عمر مکّہ میں موجود تھے، اور اسی سال نجدۃ الحروری (خارجیوں کا ایک لیڈر) بھی حج کو آیا تھا۔ مکّہ میں نجدہ اور اس کے پیروؤں کی موجودگی سے متعلق الطبری نے ایک روایت محفوظ کر دی ہے، وہ کہتا ہے: "۶۸ھ میں (اس کا مطلب یہ ہوا کہ عبداللہ بن الزبیر کی خلافت کے زمانے میں) میدانِ عرفات میں چار پھریرے اُڑ رہے تھے۔ ابن الحنفیۃ اور ان کے اصحاب ایک جھنڈے کے نیچے تھے...... ابن الزبیر کا دوسرا جھنڈا تھا...... ان دونوں کے پیچھے نجدۃ الحروری تھا اور اُن کے بائیں طرف بنواُمیّۃ کا عَلم لہرا رہا تھا۔" پھر الطّبری کہتا ہے: "ابنِ عمر اس اندھیرے کے خلاف ابن الزبیر کے بعد ہی صف آرا ہوئے تھے۔"[۲۶۸]

بنا بریں اس میں شک نہیں کہ موسیٰ بن عقبۃ نے ۶۸ھ میں حج کیا ہو گا اور اُن کی ولادت بہر حال ۵۵ھ تک ہو چکی ہو گی۔ الواقدی کہتا ہے:[۲۶۹]

كانَ لابراهيمَ وموسىٰ ومحمّد بني عُقبةَ حلقةٌ في مسجدِ رسول اللهِ صلّى اللهُ عليه وسلّم وكانوا كلُّهم فُقهاءَ ومحدِّثين وكانَ موسىٰ يُفتي ۔	عقبۃ کے تینوں بیٹے ابراہیم، موسیٰ اور محمد مسجدِ نبوی میں اپنا حلقۂ درس رکھتے تھے۔ یہ سب فقہ و حدیث کے عالم تھے مگر (سب سے چھوٹے) موسیٰ سے فتویٰ لیا جاتا تھا۔

ہمیں موسیٰ کی پبلک لائف کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے۔ بظاہر وہ اُموی دربار سے الگ تھلگ رہے اور زوالِ بنی اُمیّہ کے تقریباً دس سال بعد یعنی ۱۴۱ھ میں انتقال کیا[۲۷۰]۔

موسیٰ بن عقبۃ کا شمار مغازی کے ماہر علماء میں ہوتا ہے۔ مالک بن انس کا قول ہے:[۲۷۱]

عليكم بمغازي موسىٰ بن عقبةَ فانّه ثقةٌ...... وفي روايةٍ فانّه رجلٌ ثقةٌ طلبَها على كِبَرِ السّنّ ولم يكثرْ كما كثّر غيرُه ۔	موسیٰ بن عقبہ سے مغازی کا علم حاصل کرو اس لیے کہ وہ بھروسے کے قابل ہیں ...... اور ایک روایت میں یوں ہے کہ وہ ثقہ انسان ہیں کیونکہ انہوں نے بڑی عمر کے باوجود علم حاصل کیا اور دوسروں کی طرح (روایات کا) ڈھیر نہیں لگایا۔

اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موسیٰ بن عقبۃ کی "کتاب المغازی" ضخامت میں کم رہی ہو گی اور اس جملے میں مالک بن انس نے

غالباً "الواقدی" پر چوٹ کی ہے جن کی کتاب المغازی میں وہ اکثر عیب نکالتے رہتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کے مغازی کی روایت ان کے بھتیجے اسمٰعیل بن ابراہیم بن عقبہ نے کی ہے[۲۷۳]، جو ۱۵۸ھ میں فوت ہوئے۔ ان مغازی کو یاقوت[۲۷۳] نے ابونعیم کے مختصر میں استعمال کیا ہے اور کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ الوئس اسپرنگر ALOYS SPRENGER کو دمشق میں بعض حضرات نے اس کتاب کی موجودگی کا یقین دلایا تھا لیکن وہ اس کی زیارت کرنے میں ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "تاریخ الخمیس" کے مؤلف دیار بکری نے اس سے استفادہ کیا تھا[۲۷۴]۔ اس کی کتاب ۹۴۰ھ میں مکمل ہوئی ہے۔ ہمارے پاس اس کتاب کے دس اجزا میں سے ہر جزو کا ایک یا اس سے زیادہ احادیث پر مشتمل ایک ملخص موجود ہے۔ یہ پرشن اسٹیٹ لائبریری PRUSSIAN STATE LIBRARY کی ملکیت ہے اور اس کے عربی متن کو جرمن ترجمے کے ساتھ ایڈورڈ زخاؤ E. SACHAU نے ۱۹۰۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس رسالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب (جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی) محدود معنوں میں مغازی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں کم سے کم ہجرۃ کا بیان تو موجود ہی ہے۔ الزہری سے موسیٰ نے سب سے زیادہ روایات نقل کی ہیں۔ یہ بات ہمیں ابن معین کے بیان سے بھی معلوم تھی۔

كتابُ موسىٰ بن عقبة مِنْ أصَحّ هذه الكُتُب[۲۷۵]	مغازی کی کتابوں میں موسیٰ بن عقبہ کی کتاب بروایت الزہری صحیح ترین ہے۔

یہ جو بغیر کسی سند کے ادعا کیا گیا ہے[۲۷۶] کہ موسیٰ نے الزہری سے حدیث کی سماعت کی ہی نہیں تھی، اسے ہم کسی حال میں تسلیم نہیں کرتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ نے براہ راست الزہری سے کوئی مواد اخذ نہ کیا ہو بلکہ ان کے کسی اور شاگرد کے ذریعہ یا ان کی تحریری یادداشتوں سے حاصل کیا ہو۔ مذکورہ بالا رسالۂ برلن کے متعدد مقامات پر جہاں موسیٰ کہتے ہیں: "قالَ ابنُ شهابٍ" یا "زَعَمَ ابنُ شهابٍ" وہاں بھی یہ حوالہ الزہری کے مدونات کی طرف ہو سکتا ہے۔ لیکن کم سے کم ایک موقع پر اسی رسالۂ برلن میں یہ بھی ہے کہ

"حَدَّثَني الزُّهريُّ"	مجھ سے الزہری نے بیان کیا

اس رسالۂ برلن کے علاوہ بھی ہمیں ابن سعد کے یہاں موسیٰ کے متعدد اقتباسات ملتے ہیں جس نے اس کتاب کی وہ روایت استعمال کی ہے جو موسیٰ کے بھتیجے اسمٰعیل نے کی تھی[۲۷۷]۔

ابن سعد کی تیسری اور چوتھی جلد کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موسیٰ کی کتاب میں حبشہ کو ہجرت کرنے والوں کی فہرستیں شامل تھیں۔ اسی طرح اس میں العقبہ کی دونوں بیعتوں میں حصہ لینے والوں۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جنگ بدر میں لڑنے والوں کی فہرست تھی۔ یہ اسی طرح کی فہرست ہو گی جیسی شرجیل بن سعد نے تیار کی تھی[۲۷۸] (ملاحظہ ہو باب اوّل) ان فہرستوں کے بارے میں مالک کا بیان ہے کہ:

مَن كَانَ فِي كتابِ موسىٰ قد شهدَ بدرًا فقد شهدَها، ومن لم يكن فيه فلم يشهدها۔	موسیٰ کی کتاب میں جس شخص کے بارے میں لکھا ہوا ہے کہ وہ بدر میں موجود تھا، وہ ضرور موجود تھا، اور جس کا نام اس میں نہیں ہے وہ وہاں نہیں تھا[۲۷۹]

ابن سعد کے اُستاد الواقدی نے موسیٰ کی کتاب سے مختلف احادیث اخذ کی ہیں مگر "کتاب المغازی" میں وہ ان کا حوالہ شاذ و نادر ہی دیتا ہے[۲۸۰]۔ یہ واقعہ ہے کہ الواقدی کے ذریعے سے ابن سعد نے موسیٰ کی روایات کثرت سے لی ہیں۔ الطبری نے بھی اپنی "تاریخ" میں موسیٰ کی بہت سی روایات درج کی ہیں، ان میں عہدِ نبوی کے حوادث کے علاوہ بعض روایات خلفائے راشدین کے عہد سے بھی متعلق ہیں بلکہ بعض تو عہدِ اموی تک پہنچی ہیں[۲۸۲]؛ کتاب الاغانی میں[۲۸۳] زید بن عمرو کا ایک بیان ظاہر کرتا ہے کہ موسیٰ نے تاریخِ ماقبل اسلام پر بھی توجہ کی تھی۔

موسیٰ کے اوّلین راوی اور پیش رو اُن کے نانا ابو حبیبہ ہیں، جن کے حوالے سے انھوں نے بعض حوادث ۹۱ھ تک کے بیان کیے ہیں[۲۸۴]۔ موسیٰ اسناد کا التزام کرتے ہیں اور ان کے جو اقتباسات محفوظ ہیں اُن میں شاید ہی کہیں کوئی سند محذوف ہوئی ہو۔ مگر ان اسناد سے یہ اندازہ ہونا بہت مشکل ہے کہ موسیٰ نے ان میں کتنا مواد کتابوں سے لیا ہے۔ ایک[۲۸۵] موقع پر تو انھوں نے صریحاً ابن عباس کے ایک صحیفے کا حوالہ دیا ہے: "وَضَعَ عِندَنا کُرَیب (مولیٰ عبداللہ بن عباس المتوفّٰی عام ۹۸ھ). حِملَ بَعیرٍ أو عِدلَ بَعیرٍ مِن کُتُبِ ابنِ عبّاس۔ قال، علیّ بن عبد اللہ بن عبّاس إذا أرادَ الکتابَ کتبَ إلیہ: اِبعثْ إلیّ بصحیفۃِ کذا و کذا قال: فینسَخُھا فیَبعثُ إلیہ باحداھما"

(کریب مولیٰ ابن عباس متوفیٰ ۹۸ھ) نے ابن عباس کی کتابوں میں سے ایک بارِ شتر ہمارے پاس لا کر رکھ دیں اور بتایا کہ اگر کبھی ابن عباس کے بیٹے علی کو کسی کتاب کی ضرورت ہوتی، تو وہ لکھ کر بھیجتے تھے کہ فلاں کتاب میرے پاس بھیج دو، پھر اُسے نقل کر کے واپس کر دیتے تھے۔"

ان صحیفوں کے علاوہ موسیٰ کے پاس کچھ اصلی دستاویزیں بھی تھیں چنانچہ وہ اس خط کا حوالہ دیتے ہیں جو رسول اللہؐ نے المنذر بن ساویٰ کو بھیجا تھا[۲۸۶]۔ موسیٰ کی کتاب میں تاریخی ترتیب سے لکھے ہوئے واقعات بھی ملتے ہیں[۲۸۷] اور کبھی کبھی وہ قصائد بھی بطورِ شہادت پیش کرتے ہیں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے[۲۸۸]۔

۲۔ مَعْمَر بن راشد

معمر بن راشد ۹۶ھ کے لگ بھگ بصرہ[۲۸۹] میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ قبیلۂ ازد کی شاخ بنو حُدّان کے موالی تھے[۲۹۰]۔ معمر نے اپنی جوانی کے زمانے میں بصرہ کے مشہور محدث قتادہ بن دعامہ (متوفی ۱۱۴ھ) سے حدیث کی سماعت کی تھی[۲۹۱]۔ پھر طلبِ علم کی خاطر سیاحت اختیار کی[۲۹۲]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیاحت کا آغاز حسن بصری کی وفات (۱۱۰ھ) کے بعد ہوا، کیونکہ یہ اُن کے جنازے میں شریک تھے[۲۹۳]۔ انھوں نے یمن کی طرف رحلت کی تھی[۲۹۴]۔ یہاں ان سے پہلے کوئی محدث نہیں گیا تھا[۲۹۵]۔ یمن کی راجدھانی صنعاء میں لوگوں نے انھیں مستقل قیام اختیار کرنے کی ترغیب دی اور اس میں وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے، اس لیے کہ انہوں نے وہاں شادی کر لی تھی[۲۹۶]۔ اس کے بعد وہ کبھی کبھی بصرہ جاتے رہتے تھے۔ مثلاً اپنی والدہ کے انتقال پر گئے تھے[۲۹۷]۔ مگر پھر یمن کو واپس آ گئے تھے اور وہیں ۱۵۴ھ میں (یا بعض دوسری روایات کے مطابق اس سنہ سے ذرا پہلے) اٹھاون سال کی عمر[۲۹۸] میں وفات پائی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے یہ اُڑا دی تھی کہ یہ مرے نہیں، روپوش ہو گئے ہیں مگر ان کے شاگرد عبدالرزاق نے صراحت کی ہے کہ وہ صنعاء میں اپنے خاندان ہی میں مرے اور ان کی بیوہ سے صنعاء

کے قاضی نے عقد کر لیا تھا۔[۲۹۹]

معمر بن راشد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے اخلاق اور کردار[۳۰۰] کے مالک تھے۔ انھیں حدیث کے میدان میں بھی اچھی شہرت حاصل ہے۔ ان کے بارے میں ابن جریج کا قول بتایا جاتا ہے کہ: "اس شخص کی پیروی کرو، کیونکہ اس کے معاصرین میں کوئی بھی اس سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔"[۳۰۱] "الفہرست" سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک "کتاب المغازی"[۳۰۲] لکھی تھی۔ مگر ہم تک اس کتاب کے صرف چند فقرے ہی پہنچے ہیں۔ یہ زیادہ تر الواقدی اور ابن سعد کی کتابوں میں ہیں اور کچھ البلاذری اور الطبری کے یہاں ملیں گے ان کی بیشتر روایات الزہری تک پہنچتی ہیں معمر نے صراحتہً بتایا[۳۰۳] ہے کہ انھوں نے الزہری سے سوالات کیے تھے۔ جب انہوں نے طلب علم کے لیے خود کو وقف کیا تھا تو الزہری کی مجالس میں خاص طور سے حاضر رہے ہوں گے۔ ابن معین[۳۰۴] نے مالک اور یونس کے ساتھ معمر کو الزہری کے ثقہ ترین راویوں میں شمار کیا ہے۔ معمر نے بھی مغازی کو محدود معنوں میں نہیں رکھا ہے بلکہ قدیم انبیاؑ اور اہل کتاب کی تاریخ کی طرف بھی توجہ کی ہے اور الطبری نے اس حصے سے اپنی کتاب میں خاصا اخذ کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے رسول اللہ کی ہجرت سے پہلے کی تاریخ پر مواد فراہم کیا ہے۔[۳۰۵] مزید برآں ابن سعد اور الطبری کی تاریخوں میں معمر کے حوالے سے عہد عثمان و معاویہ کے اہم واقعات نقل ہوئے ہیں۔

معمر اُن رُواۃ میں سے ہیں جن سے الواقدی نے کثرت سے روایات لی ہیں۔ ابن سعد نے اُن کے اخبار عبدالرزاق بن ہمام کے واسطے سے لیے ہیں۔ موخر الذکر یمن کے باشندے اور معمر کے شاگرد تھے۔ ان کا انتقال ۲۱۱ھ میں ہوا اور "الفہرست"[۳۰۶] سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک "کتاب المغازی" بھی تالیف کی تھی۔ یہ کتاب شاید ان کے استاد کی تالیف ہی کا نیا ایڈیشن ہو گی۔ معمر کے یمنی شاگردوں میں وہب بن منبہ کے بھتیجے عبدالمنعم بن ادریس بھی تھے۔[۳۰۷]

۳۔ محمد بن اسحاق

الزہری کے تلامذہ کی صف میں تیسرے محمد بن اسحاق ہیں جن کی تالیف "کتاب المغازی" نے اُن کے سب ہم عصروں اور پیشروؤں کی شہرت کو ماند کر دیا ہے۔ ان کی تالیف سیرۃ کے موضوع پر پہلی تحریر ہے جو ہمیں اقتباسات کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک مکمل اور خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں ملی ہے۔ اگرچہ اس میں بہت سے نقائص بھی ہیں۔ ابن اسحاق کی حیات و تصنیفات پر یوحنا فیوک JOHANN FÜCK نے اپنی کتاب "محمد بن اسحاق" میں تفصیل سے بحث کی ہے، یہ کتاب ۱۹۲۵ء میں فرانکفرٹ کنارِ رود ماین FRANKFURT - AM - MAIN سے شائع ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم نے اس کتاب کے مطالب سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور جہاں ضروری معلوم ہوا ہے اُس کے بیانات کی مزید وضاحت بھی کر دی ہے۔

ابن اسحاق کا جنم بھی ایک موالی گھرانے میں ہوا۔ ان کے دادا یسار جو غالباً عیسائی عرب تھے، ۱۲ھ میں عراق کے مقام عین التمر پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد گرفتار کر کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مدینہ[۳۰۸] کو بھیجے گئے تھے، جہاں وہ قیس بن مخرمہ بن عبدالمطلب کے خاندان کے غلام بن کر رہے اور اسلام لانے پر آزاد کر دیے گئے تھے۔ یسار کے تین بیٹے تھے ان میں سے اسحاق نے صبیح[۳۰۹] نامی ایک غلام کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا، جس کے بطن سے ایک لڑکا محمد پیدا ہوا، یہی آگے چل کر "کتاب المغازی" کا مشہور عالم مصنف ہوا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق ۸۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ اس کا قرینہ یہ ہے، اور اس کی طرف اگسٹ فیشر (AUGUST FISCHER) نے بھی اشارہ کیا ہے کہ جن رُواۃ سے ابن اسحاق نے براہِ راست اخذ کیا وہ سب ۱۰۰ھ کے بعد مرے ہیں اور مدینے کے مشہور محدثین کی وہ جماعت جس کے افراد ۹۰ھ تک زندہ تھے اُن میں سے کسی کا نام ابن اسحاق کے شیوخ کی فہرست میں نہیں آتا۔ الواقدی نے بھی ایک خبر ایسی نقل کی ہے جس سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے۔[310] وہ کہتا ہے:

"كَانَ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ يَجْلِسُ قَرِيبًا مِنَ النِّسَاءِ فِي مُؤَخَّرِ الْمَسْجِدِ فَيُرْوَى عَنْهُ أَنَّهُ كَانَ يُسَامِرُ النِّسَاءَ فَرُفِعَ إِلَى هِشَامٍ وَهُوَ أَمِيرُ الْمَدِينَةِ وَكَانَتْ لَهُ شَعْرَةٌ حَسَنَةٌ فَرَقَّقَ رَأْسَهُ وَضَرَبَهُ أَسْوَاطًا وَنَهَاهُ عَنِ الْجُلُوسِ هُنَالِكَ۔"

"محمد بن اسحاق مسجد کے پچھلے حصّے میں عورتوں کے قریب جاکر بیٹھتے تھے۔ اُن کے بارے میں یہ کہا گیا کہ عورتوں سے گپ شپ کرتے ہیں۔ یہ معاملہ ہشام تک پہنچایا گیا وہ اُس وقت مدینے کا گورنر تھا۔ ابنِ اسحاق کے بہت خوب صورت بال تھے، گورنر نے حکم دیا کہ ان کا سر مونڈ دیا جائے علاوہ بریں کوڑے بھی لگوائے اور کہہ دیا کہ خبردار آئندہ اس جگہ نہ بیٹھنا۔"

اسمٰعیل کی گورنری کا زمانہ ۱۰۶ھ سے ۱۱۴ھ تک رہا، اس لئے ابن اسحاق کی عمر اس وقت بیس اور تیس سال کے درمیان ہوگی۔

محمد سے پہلے ان کے باپ اسحاق احادیث جمع کرنے سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیٹے نے اپنی کتاب میں ان کی اکثر روایات درج کی ہیں۔ اس لیے یہ خیال بے جا نہیں ہے کہ ابن اسحاق کو بھی بچپن ہی سے روایات جمع کرنے کا شوق رہا ہوگا، بعد میں انہوں نے عاصم بن عمر، عبداللہ بن ابی بکر اور الزہری جیسے نامور عالموں کی خدمت میں حاضری دے کر اپنے علم کو اور وسعت دی، ان تینوں حضرات کو ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں اپنی معلومات کے سرچشمے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس کے علاوہ دوسرے مآخذ سے بھی مواد فراہم کیا ہے۔ چنانچہ تقریباً ایک سو راوی تو صرف مدینے کے ہیں جن کا حوالہ ابنِ اسحاق کی کتاب میں ملتا ہے۔

ابنِ اسحاق ۱۱۵ھ میں اسکندریہ آئے[312] اور یہاں بطورِ خاص یزید بن ابی حبیب (متوفی ۱۲۸ھ) سے حدیث کی سماعت کی، یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے علمِ حدیث کا پودا مصر کی سرزمین[313] میں لگایا تھا۔ ابنِ اسحاق مصر سے براہِ راست عراق کو نہیں گئے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہاں سے پہلے مدینہ آئے تھے، یہی خیال پروفیسر فیوک FUCK نے بھی ظاہر کیا ہے۔ غالباً ایسے ہی کسی موقع[314] پر وہ مدینے آئے ہوئے تھے جب ۱۲۳ھ میں[315] استاد الزہری نے حاضرین سے ان کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۳۲ھ میں سُفیان بن عُیَیْنَہ ان سے مدینے میں ملے ہیں[316]۔ لیکن ہشام بن عروۃ اور مالک بن انس سے اختلافات کے باعث انھیں اپنے وطن میں رہنا دوبھر ہوگیا۔ ہشام کے باپ عُروۃ کی (جن پر پہلے باب میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے) روایات ابن اسحاق نے الزہری کے واسطے سے لی تھیں۔ ان کے علاوہ عروۃ کے مولی یزید بن رومان سے بھی بھرپور استفادہ کیا تھا۔ خود ہشام بن عروۃ بھی کبھی کبھی ابن اسحاق کے رُواۃ کی صف میں نظر آجاتے ہیں، جنھوں نے (الزہری اور یزید بن رومان کی طرح) اپنے

باپ کا جمع کیا ہوا ذخیرۂ علم بڑی مقدار میں ہم تک منتقل کیا ہے لیکن انھوں نے بعض خاص مواقع پر ابن اسحاق کو غیر ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ اس بارے میں ابن قتیبہ کہتا ہے[۲۱۷]:

"وکانَ (ابن اسحٰق) یروی عن فاطمة بنت المنذر بن الزبیر وھی امرأة ھشام بن عروة فبلغ ذلک ھشاماً فأنکرہ وقال: "أھو کان یدخل علی إمرأتی"؟

(ابن اسحاق فاطمہ بنت المنذر بن الزبیر سے روایت بیان کیا کرتے تھے، یہ ہشام کی بیوی تھیں۔ جب ہشام کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس کی تردید کی اور کہا: "کیا وہ میری بیوی سے ملتا ہے؟")

اسی طرح کا ایک بیان الفہرست[۲۱۸] میں پایا جاتا ہے:

"یروی (ابن اسحاق) عن فاطمة بنت المنذر زوجة ھشام بن عروة فبلغ ھشاماً ذلک، فأنکرہ وقال، متی دخل إلیھا ومتی سمع منھا۔"

(ابن اسحاق فاطمہ بنت المنذر، زوجۂ ہشام بن عروۃ سے روایت کیا کرتے تھے، جب ہشام نے سُنا تو اس سے انکار کیا اور کہا یہ میری بیوی سے کب ملے اور اس سے کب سُنا ہے؟")

ہشام کا جواب جو یاقوت نے معجم[۲۱۹] میں نقل کیا ہے اس کے مقابلے میں ذرا مبہم ہے:

"أھو کان یدخل علی امرأتی۔ کأنّہ ینکر ذلک" — کیا وہ میری بیوی سے ملے ہیں؟ یہ انہوں نے اس لہجے میں کہا جیسے اس بات کی تردید کر رہے ہوں۔

لیکن یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں تھی۔ ہم بہت سے جامعینِ احادیث کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہوں نے عورتوں سے روایات اخذ کی تھیں۔ عبداللہ بن ابی بکر بھی عُروۃ کی طرح اشرافِ مدینہ میں سے تھے اور ان کے بیان میں ہم پہلے پڑھ چکے ہیں (ملاحظہ ہو باب دوم) کہ انھیں اس بات پہ کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اُن کی بیوی عمرۃ اُن کے ایک شاگرد سے خود روایت بیان کر دے اور یہ شاگرد ابنِ اسحاق کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہوسکتا اور غالباً ہشام کو بھی اپنی بیوی کے روایت کرنے پر اعتراض نہ ہوا ہوگا۔ جو خود ہشام سے عمر میں خاصی بڑی تھیں، اور ابن اسحاق سے تو ۳۰ - ۴۰ سال بڑی ہوں گی۔ البتہ ہشام کو ابن اسحاق کے کبھی اپنے گھر آنے کا حال معلوم نہیں ہو گا اس لیے انھوں نے ان روایات پر شک کا اظہار کیا۔

ہاں الموطا کے مشہور مؤلف مالک بن انس کی مخالفت کے اور ہی اسباب ہیں۔ یہ بات متعدد بار کہی گئی ہے کہ ابن اسحاق قدریہ عقائد[۲۲۱] رکھتے تھے۔ ابو زرعۃ کا بیان ہے کہ دُحیم (متوفی ۲۴۵ھ) نے اُن سے کہا کہ ابن اسحاق سے مالک بن انس کی خصومت ان کے قدری عقائد کی بنا پر تھی[۲۲۲]۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابن اسحاق مالک کی علمیت کے قائل نہ تھے اور ابن اسحاق کے ایک شاگرد عبداللہ بن ادریس نے مالک کا ایک قول نقل کیا ہے[۲۲۳]:

"کنتُ عند مالک بن انس فقال لہ رجلٌ: إنّ محمد بن اسحٰق یقول: إعرضوا علیّ علم مالک بن انس فإنّی أنا بیطارہ۔ فقال مالک: أنظروا إلی دجّالٍ من الدجاجلة یقول إعرضوا

عَلَیٰ عِلْمِ مَالِکٍ ‘‘

(میں مالک بن انس کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ ’’مالک کا علم میرے سامنے رکھو کیونکہ میں ہی اُس کا جراح ہوں‘‘ مالک کہنے لگے بڑ گروہ دجاجلہ کے اس دجّال کو تو ذرا دیکھو کہتا ہے کہ مالک کا علم میرے سامنے رکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ‘‘)

راوی، جسے اس روایت سے دلچسپی صرف ایک لغوی نظیر کی وجہ سے تھی، کہتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے کسی کو دجّال کی جمع دجاجلہ استعمال کرتے نہیں سُنا۔

اپنے استاد الزہری کے برخلاف ابن اسحاق کا دمشق کے دربار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ غالباً اُموی خاندان کا زوال (۱۳۲ھ) اور عباسیوں کا تختِ خلافت پر قبضہ بھی ابن اسحاق کے ترکِ وطن کا ایک اضافی سبب رہا ہوگا۔ بہرحال ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ وہ[۳۲۴] مدینہ چھوڑ کر پہلے کوفہ پہنچے، وہاں سے الجزیرہ اور رَے ہوتے ہوتے بغداد آئے، جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت تک رہے۔ ایک اور روایت ان مقامات پر اُن کے قیام کی بعض جزوی تفصیلات بھی مہیا کرتی ہے[۳۲۵]۔

’’وکَانَ محمّد بن اسحاق مع العبّاس بن محمّد بالجزیرۃ (حَیثُ کانَ العبّاسُ والیاً فی عَام ۱۴۲ھ) وکَانَ قَصَدَ أَبَا جَعفَرِ المنصُور (الذی تَولّیٰ الخِلافۃ من عام ۱۳۶ھ إلی ۱۵۸ھ ولکنّہ تحوّلَ إلی بَغدَادَ فی عام ۱۴۶ھ للمّرۃ الأولی) بالحِیرَۃ فَکَتَبَ إلیہ المَغازی۔ فَسَمِعَ منہ أھلَ الکوفۃ بِذٰلکَ السّبب وسَمِعَ منہ أھلُ الجزیرۃ حِین کانَ مَعَ العبّاسِ بن محمّد۔ وأتی الرّی (حیثُ کان یَعیشُ ولیُّ العَھدِ المَھدی مِنْ قبل عام ۱۵۱ھ) فَسَمِعَ منہ أھلُھا۔ فَرُواتُہ من ھذہ البُلدان اکثر مِمّن رَوی عنہ مِن أھلِ المدینۃ۔ وأتی بَغدادَ فأقَامَ بِھا إلی أن مَاتَ بِھَا‘‘

(محمد بن اسحاق الجزیرۃ میں العباس بن محمد کے ساتھ رہے (العباس ۱۴۲ھ میں یہاں کے گورنر تھے) پھر وہ ابوجعفر المنصور کے دربار میں الحیرہ پہنچے (یہ ۱۳۶ھ سے ۱۵۸ھ تک خلیفہ رہا مگر پہلی بار اس نے ۱۴۶ھ میں بغداد کو راجدھانی بنایا تھا) یہاں انھوں نے المنصور کے لیے مغازی قلمبند کیے۔ اس لیے اُن سے اہلِ کوفہ کو بھی روایات سننے کا موقع ملا، جیسے اُن کے العباس بن محمد کے ساتھ رہنے کے زمانے میں الجزیرۃ کے لوگوں کو ملا تھا۔ پھر وہ رَے چلے آئے۔ (یہاں ۱۵۱ھ سے پہلے ولی عہد المہدی رہتا تھا) تو یہاں کے باشندوں نے بھی اُن سے روایات اخذ کیں۔ اسی لیے ان علاقوں میں اُن سے روایت کرنے والوں کی تعداد اہلِ مدینہ سے زیادہ ہے۔ رَے سے وہ بغداد پہنچے اور تا آخر حیات وہیں رہے۔‘‘)

ابنِ اسحاق بغداد میں ۱۵۰ھ یا ۱۵۱ھ[۳۲۶] میں مرے اور خیزران کے قبرستان میں دفن کیے گئے[۳۲۷]۔

اس روایت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انھوں نے خلیفہ کے لیے مغازی قلمبند کیے، اس کا لازماً یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ

اس کے لیے سرکاری طور پر مامور کیے گئے تھے۔ کیونکہ "کتاب المغازی" کے راویوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو یہ مواد اُن روایات کی بنیاد پر تیار کیا جو انھیں مدینے میں دستیاب ہوئیں، پھر جو کچھ انھیں مصر میں ملا وہ اس کتاب میں شامل کیا گیا لیکن اس میں کہیں بھی عراق کے کسی راوی کا نام نہیں آیا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ کتاب ابن اسحاق نے اپنا آبائی وطن ہمیشہ کے لیے چھوڑنے سے پہلے ہی ختم کر لی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک مدنی کا حال بھی معلوم ہے جس نے ابنِ اسحاق کی کتاب سے روایت کی ہے یعنی ابراہیم بن سعد (متوفی ۱۸۴ھ)۔ ہاں یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کو خوش کرنے کے لیے ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں معمولی تبدیلیاں کیں یا ایسے حصّوں کو حذف کر دیا جنھیں خلیفہ ناپسند کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہمیں اس کتاب میں کم سے کم ایک واقعہ ایسا ملتا ہے جس کا تذکرہ خلیفہ کے خلافِ مزاج ہو سکتا تھا یعنی خلیفہ کے جدِ اعلیٰ العباس نے بدر کی لڑائی میں مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر رسول اللہؐ کا مقابلہ کیا تھا۔ اور ابنِ اسحاق نے اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔[۴۲۸] وہ بدر کے قیدیوں میں العباس کا نام بھی لکھتا ہے مگر العباس نے اپنی مرضی کے خلاف رسول اللہؐ سے جنگ کی تھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں کہا گیا ہے، جو ابن اسحاق کے ہاں ابن عباس کے حوالے سے آئی ہے۔[۴۲۹] اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ العباس اور ان کی زوجہ ایک مدت سے اسلام کے حامی تھے، اگرچہ انہوں نے کھلم کھلا بدر کے دن تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، اس طرح کی ایک اور روایت کی سند العباس کے ایک مولیٰ تک پہنچتی ہے۔[۴۳۰] اس کا امکان کہ محمد بن اسحاق نے یہ روایات اپنی کتاب میں عباسیوں کو خوش کرنے کے لیے داخل کی ہوں، نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے مدنی شاگرد ابراہیم بن سعد نے، جن کا پہلے نام لیا جا چکا ہے، یہ قول نقل کیا ہے کہ العباس نے قید ہونے کے بعد اپنے بھتیجے[۴۳۱] کی نبوت کا اقرار کر لیا تھا۔ لیکن ابن اسحاق کے یہ اقوال خواہ پہلی بار اُس وقت کتاب میں داخل کیے گئے ہوں جب وہ اپنا وطن ترک کر کے نکلے ہیں، انہوں نے یہ نہیں کیا کہ العباس کے رول کو سرسری طور پر بیان کر دیں، جیسا کہ بعد میں ابنِ ہشام اور الواقدی نے کیا ہے۔

ابنِ اسحاق کی کتاب کا نام "کتاب[۴۳۲] المغازی" ہے اور یہ فی الاصل تین حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے یعنی "المبتدا"، "المبعث" اور "المغازی"۔[۴۳۳] اس لیے کہ اس میں اسلام سے پہلے نبوت کی تاریخ بھی ہے اور رسول اللہؐ کے ایّام شباب اور آپ کی مکی زندگی کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے آخر میں مدنی زندگی کا حال ہے۔ یہ کتاب ہمارے پاس اپنی اصلی اور مکمل صورت میں نہیں آئی ہے اس کا ایک مخطوطہ قسطنطنیہ کی کوپرولو لائبریری (KUPRULU LIBRARY) میں محفوظ ہے اور کتب خانے کی وضاحتی فہرست دیکھنے والے کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ مخطوطہ 'کتاب المغازی' کو اصلی شکل میں پیش کرتا ہے۔ مگر میں نے اس کا بغور معائنہ کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ بھی ابنِ ہشام ہی کا نسخہ ہے۔ یہ نسخہ وستنفیلڈ ایڈیشن (گوتنجن (GOTTINGEN) ۱۸۵۹ء) اور طبع بولاق کی صورت میں عام طور پر دستیاب ہے۔[۴۳۴] الطبری اور دوسرے مورخوں کے ہاں ابنِ اسحاق کے جو اقتباسات ملتے ہیں اُن کا تقابلی مطالعہ نسخۂ ابنِ ہشام سے کیا جائے تو ہمیں کتاب کی اصلی صورت کا اندازہ کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔

ابنِ ہشام (متوفی ۲۱۸ھ) جس نے ابن اسحاق کے بلا واسطہ راوی البکائی (متوفی ۱۸۳ھ) سے روایت کی ہے، اپنے مقدمے میں خود لکھتا ہے کہ اس نے ابن اسحاق کی کتاب میں اپنی طرف سے کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ چنانچہ اس نے آدم سے ابراہیم

تک اہلِ کتاب کی تاریخ کو خارج کر دیا ہے، اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سوائے رسول اللہ کے اجداد کے اور کسی کا تذکرہ کا خذ نہیں کیا۔۱۰ اسی طرح اس نے ابنِ اسحاق کی اُن روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن میں رسول اللہؐ کا تذکرہ نہیں ہے، یا جن کی طرف قرآن کوئی اشارہ نہیں کرتا، یا جن میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ابن اسحاق کی دوسری روایات کی تائید ہوتی ہو، یا کسی نکتے کی شرح ہو، یا کوئی اور مناسبت پائی جاتی ہو۔ یہ سب حذف کرنے کا مقصد کتاب کو مختصر کرنا تھا۔ مگر بعض محذوفات کے دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مثلاً اس نے وہ قصائد ترک کر دیئے ہیں جن کے بارے میں علمائے شعر نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی طرح جن واقعات سے کسی کی دل آزاری ہو سکتی تھی وہ بھی نکال دیئے گئے، یا جن باتوں سے کسی پر الزام عائد ہوتا تھا انھیں بھی باقی نہیں رکھا گیا اور آخری بات یہ کہ ان روایتوں کو بھی شامل نہیں کیا گیا جو اگرچہ ابنِ اسحاق کے ہاں موجود تھیں مگر البکائی نے ان سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا۔ ابن ہشام نے اس میں بہت سی تصحیحات کی ہیں۔ انساب اور لغت سے متعلق موضوعات پر مفید اضافے کیے ہیں اور ایسے مواقع پر بتا بھی دیتا ہے کہ یہ اُس کا اضافہ ہے، لیکن اس نے ابن اسحاق کے متن میں کوئی تغیر نہیں کیا۔ اس کی تلخیص میں صرف انھیں مواقع پر توجیہی اشارات ملتے ہیں جہاں اس نے کوئی عبارت حذف کر دی ہے۔ ابنِ اسحاق کی اصلی کتاب کے جو اقتباسات دوسری کتابوں میں ملتے ہیں اور ابن ہشام نے ترک کر دیئے ہیں اُن کی مدد سے ہم حذف شدہ حصّوں کی بازیافت کر سکتے ہیں، اس طرح نسخہٗ ابن ہشام کا خلا بڑی حد تک پُر ہو جاتا ہے۔ الطبری نے اپنی تاریخ ہی میں نہیں، تفسیر میں بھی انبیاے بنی اسرائیل سے متعلق ابن اسحاق کے طویل اقتباسات بکثرت نقل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح الازرقی نے مکّہ کی تاریخ قدیم پر ابن اسحاق کا جا بجا حوالہ دیا ہے اور وہ عبارتیں نقل کی ہیں جو ابنِ ہشام کی تلخیص میں موجود نہیں ہیں۔ ابنِ ہشام کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "المبتدا" والے حصّے کو چھوڑ کر دوسرے حصّوں میں برائے نام کٹوتی ہوئی ہے۔ اس موقع پر ہمیں سب سے بڑھ کر الطبری سے مدد ملتی ہے کہ ہم ابنِ ہشام کے محذوفات کی بازیافت کر سکیں مثلاً اس نے بدر میں العباس کی گرفتاری کا حال درج کیا ہے[۲۳۶] جو ابن ہشام نے "بعض لوگوں" کے خوف سے نکال دیا تھا، جیسا کہ ہم ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ "لوگ" عباسی حکمران ہی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم اس مواد کا بغور مطالعہ کریں جو اقتباسات کی شکل میں دوسری تاریخوں میں محفوظ ہے اور ابن ہشام کے نسخے میں نہیں ملتا تو ابن اسحاق کی اصلی کتاب کا خاکہ کچھ اس طرح کا تیار ہوتا ہے

(الف) تاریخ ماقبل اسلام — "المبتدا"— جسے چار حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلا حصّہ ابتدائے آفرینش سے حضرت عیسٰی تک وحی و رسالت کی تاریخ ہے اور اس سے ابنِ ہشام نے سب سے زیادہ حذف کیا ہے۔ چونکہ ہر موقع پر ابن اسحاق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع ہوں، اُس نے اس فصل میں بھی ایسے حسابات لگائے ہیں۔ اس میں وہب بن منبّہ کی روایات اور ابن عباس کی روایات کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ یہودی اور مسیحی مصنفوں کے اقوال، کتابِ مقدس (توراۃ) کے اقتباسات اور قرآنی آیات کے حوالے بکثرت دیئے گئے ہیں۔ رجالِ توراۃ کے علاوہ قدیم عرب اقوام میں سے عاد و ثمود کا ذکر ہے، جن کی طرف خدا نے انبیا بھیجے تھے، جیسا کہ قرآن میں بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی طسم و جدیس کا بیان بھی کیا ہے، جن کا قرآن نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ "المبتدا" کی دوسری فصل جس پر کچھ مواد ابن ہشام کے نسخے میں محفوظ ہے[۲۳۷] اور جس کی تکمیل تاریخ طبری

کی مدد سے کی جاسکتی ہے[۳۳۸]، وہ عہد جاہلیّت میں یمن کی تاریخ ہے۔ قرآن کے مطالعے نے یمن کی تاریخ سے علما کی دلچسپی پہلے ہی بڑھا دی تھی، سورۃ ۸۵ میں "اصحاب الاخدود" کا بیان ہے، اس سے ہمارے علما اس طرف متوجہ ہوئے کہ یمن میں عیسائیت اور یہودیت کے فروغ کا زمانہ تحقیق کریں، کیونکہ تفاسیرِ ماثورہ کہتی ہیں کہ ان آیات میں یہودی بادشاہ ذونُواس کے سقوط کی طرف اشارہ ہے اسی طرح "اصحاب الفیل" (سورۃ ۱۰۵) کا مطالعہ کرتے ہوئے یمن کے حبشی گورنر ابرہہ کی فوج کی تفصیلات درکار تھیں، جو کعبہ کو ڈھانے کی اپنی اسکیم میں خدا کے حکم سے ناکام ہوگیا تھا۔ مبتدأ کا تیسرا حصہ عرب قبائل اور ان کی اصنام پرستی[۳۳۹] سے بحث کرتا ہے اور چوتھے میں رسول اللہؐ کے قریبی اجداد اور اہلِ مکہ کے رسوم[۳۴۰] و عقائد سے بحث کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی "المبتدأ" کے حصے میں اسناد نہیں ہیں۔ اس کی پہلی فصل میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

(ب) المبعث۔ اس حصے میں رسول اللہؐ کی مکی زندگی، آپ کی ہجرت اور شاید مدنی زندگی کے پہلے سال کی مہمات کا بیان ہوتا ہے۔ اس جزو میں اسانید کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور ابنِ اسحاق زیادہ تر اپنے مدنی اساتذہ کے حوالے سے روایات درج کرتا ہے۔ انھیں وہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہے اور آغاز میں انفرادی روایات کے بیشتر مشمولات کا خلاصہ بھی دے دیتا ہے۔ اسی حصے میں اُن اخبار کے علاوہ جو سند کے ساتھ یا بغیر سند کے پیش کیے گئے ہیں، ایک ایسی دستاویز بھی ملتی ہے جسے صرف ابنِ اسحاق نے شامل کیا ہے اور زمانۂ مابعد کے کسی مغازی نویس نے نہیں لیا ہے۔ یہ رسول اللہؐ کا وہ معاہدہ ہے جو آپؐ نے مدنی قبائل سے کیا تھا، اور جسے مدینے کا "سماجی ضابطہ" کہا گیا ہے[۳۴۱]۔ اس کے علاوہ مختلف فہرستوں کا ایک سلسلہ ہے[۳۴۲] جس میں پہلے ایمان لانے والوں کی فہرست، حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے نام، انصار میں سے پہلے مسلمان ہونے والوں کی فہرست، العقبۃ کی دونوں بیعتوں میں شرکت کرنے والوں کی فہرست، اُن مہاجرین و انصار کی فہرست جنھوں نے مہاجرین کا مدینے میں استقبال کیا تھا، اور اُن لوگوں کے نام جن سے رسول اللہؐ نے مُواخاۃ کا رشتہ قائم کیا تھا، یہ سب شامل ہیں۔

(ج) المغازی۔ یہ رسول اللہؐ کی مدنی زندگی کی تاریخ ہے، جس میں مشرکینِ عرب سے پہلی جنگ سے لے کر آنحضرتؐ کی وفات تک کے حالات آجاتے ہیں۔ اس حصہ میں شروع سے آخر تک غزوات ہی کا بیان ہے، بس آپ کے آخری مرض اور وفات کا حال قدرے تفصیل سے آجاتا ہے۔ یہاں باضابطہ اسناد کی پابندی ہوتی ہے۔ ابنِ اسحاق کے رُواۃ اُس کے مدنی شیوخ ہیں، جن میں نمایاں حیثیت الزہری، عاصم بن عُمر، اور عبداللہ بن ابی بکر کی ہے، جن سے ابن اسحاق تاریخی ترتیبِ واقعات میں بھی بھرپور فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ان حضرات سے اخذ کیے ہوئے مواد میں ابنِ اسحاق نمایاں اضافے بھی کرتا ہے، یہ اضافات کچھ تو وہ اخبار ہیں جو اُسے دوسرے ذرائع سے دستیاب ہوئے اور کچھ اُن حوادث میں حصّہ لینے والے مردوں اور عورتوں کے رشتہ داروں کے اقوال ہوتے ہیں[۳۴۳]۔ غزوات کا حال لکھنے میں ابنِ اسحاق ایک مقررہ ضابطے کی پابندی کرتا ہے، پھر اپنے ثقہ اُستادوں کے بیانات سے مرتب کی ہوئی ایک مجموعی رپورٹ درج کرتا ہے پھر اُس بنیادی واقعہ سے متعلق وہ انفرادی روایات بیان کر کے اس خبر کی تکمیل کر دیتا ہے جو اس نے دوسرے ذرائع سے فراہم کی ہوں[۳۴۴]۔ مغازی میں بھی فہرستیں بکثرت شامل ہوتی ہیں چنانچہ اُس نے بدر میں لڑنے والوں، زخمی اور گرفتار ہونے والوں، اُحد میں شہید ہونے والوں، اور غزوہ خندق، خیبر، موتہ اور طائف میں

شہادت پانے والوں اور حبشہ سے واپس آنے والے مہاجروں کی فہرستیں دی ہیں۔

فیوک (Flick) نے ابنِ اسحاق کے پندرہ شاگردوں[345] کی فہرست بنائی ہے، جن کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ انھوں نے ابن اسحاق کی 'کتاب المغازی' سے روایت کی تھی۔ ان میں سے ایک ابراہیم بن سعد ہیں، جن کا نام پہلے بھی آچکا ہے، یہ مدینے کے باشندے تھے۔ باقی سب شاگردوں نے سیرۃ النبی سے متعلق ابنِ اسحاق کی اس کتاب کو کوفہ، رے یا بغداد میں حاصل کیا۔ ان روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور نسخہ البکّائی کا ہے جس پر ابنِ ہشام نے اعتماد کیا ہے۔ الطبری کے بہت سے اقتباسات کی روایت سلمۃ بن الفضل (متوفی ۱۹۱ھ) تک پہنچتی ہے۔ ایک خط سے جو از راہِ کرم مسٹر ایف کرنکو (F. KRENKOW) نے میرے پاس بھیجا ہے، میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حاکم نیشاپوری کی 'مستدرک' میں جو اب حیدر آباد سے چھپ گئی ہے، مغازی سے متعلق ایک خاص فصل ہے جس میں ابنِ اسحاق کی کتاب کے متعدد اقتباسات ہیں، اور اُن میں سے بیشتر یونس بن بکیر (متوفی ۱۹۹ھ) کے نسخے سے لیے گئے ہیں۔ ایسا ہی ابن الاثیر نے اسد الغابۃ میں اور ابن حجر نے الاصابۃ میں کیا ہے۔ ابنِ اسحاق کے سب سے آخری اقتباسات بظاہر ابنِ حجر[346] کے یہاں محفوظ ہیں لیکن ابنِ ہشام کی تلخیص کے عام طور پر شائع ہو جانے کی وجہ سے بہت پہلے سے اصل کتاب کی ضرورت کا احساس ختم ہو چکا تھا، چنانچہ الیعقوبی (متوفی تقریباً ۳۰۰ھ) اسی ملخص ابن ہشام کے اقتباسات دیتا ہے[347]۔

ابن اسحاق کے شیوخ میں سب سے اہم شخصیت الزُّہری کی ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو ارتباط تھا اس کا اظہار کبھی کبھی اسانید کے الفاظ میں ہوتا ہے مثلاً: وہ کہتا ہے: "حَدَّثَنِیَ محمد بن مُسلم الزُّھرِیّ" یا "سَأَلتُ ابنَ شِہَاب الزُّھری" یا "حَدَّثَنِی الزُّھریُّ ..... قَد جَمعتُ لکَ الَّذِی حَدَّثَنِی القَومُ"[348]۔ ابنِ اسحاق نے الزُّہری کو ایک دستاویز بھی بھیجی تھی جو اُسے مصر میں یزید بن حبیب سے ملی تھی۔ یہ اُن وفود سے متعلق تھی جو رسول اللہ ﷺ نے مختلف حکمرانوں کی طرف سفارتی مشن پر بھیجے تھے۔ ابنِ اسحاق اس دستاویز کے مشمولات کی تصدیق الزُّہری سے کرانا چاہتے تھے[349]۔

ابنِ اسحاق کے شیوخ میں الزُّہری، عبداللہ بن ابی بکر اور عاصم بن عمر کے علاوہ بھی کچھ حضرات ہیں، جن میں عبداللہ بن الزبیر کے حامیوں کا نام لیا جا سکتا ہے[350]۔ ابن اسحاق نے عروۃ بن الزبیر کے مولیٰ یزید بن رومان ہی سے عروۃ کی روایات اخذ نہیں کیں بلکہ آلِ زبیر کے دوسرے موالی[351] سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ خاندانِ زبیر کے دوسرے افراد مثلاً عروۃ کے دونوں بیٹے یحییٰ اور ہشام[352]، یا عروۃ کے بھتیجے عمر بن عبداللہ[353] اور محمد بن جعفر[354] اور یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بھی[355] اس کے شیوخ میں شامل ہیں۔

جس طرح ابنِ اسحاق نے حدیث اور تفسیر میں علمائے اسلام سے استفادہ کیا (اور میدان میں اُس کے سب سے بڑے اُستاد ایک مولیٰ، محمد بن ابی محمد[356] تھے) یا اُن سے مغازی کی تعلیم حاصل کی، اسی طرح اُس نے یہودیوں، عیسائیوں اور پارسیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے غیر مسلم عالموں کی مدد بھی حاصل کی۔ چنانچہ وہ اپنے رُواۃ میں "بعض اھلِ العلم من اَھلِ الکتابِ الاَوّل" (بعض یہودی علماء) کا حوالہ دیتا ہے، کبھی اُنھیں "اَھلُ التَّوراۃ" کہتا ہے، کہیں عجمیوں کی تاریخ کے جانکار

کوؔ مَن یَسُوق الاحادیثَ عنِ العَجمِ[۳۵۷] "کہہ کر یاد کرتا ہے۔ بظاہر علمائے مدینہ میں وہ پہلا شخص ہے جس نے ان لوگوں کے اقوال کو قبول کیا ہے اور بعد میں اس بات پر اُسے مطعون بھی کیا گیا۔ جنوبی عرب میں وُہب بن منبّہ نے ابن اسحاق سے پہلے اسی طرح کے غیر اسلامی اخبار بے تکلف جمع کیے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ اہلِ کتاب کے قصّوں میں ابن اسحاق نے متعدد مواقع پر وُہب بن منبّہ کا حوالہ دیا ہے، اور اُسے وہب کی روایات المغیرۃ بن ابی زُبید کے واسطے سے ملی ہیں۔[۳۵۸] وہب کے بعد ابن اسحاق قدیم ترین عرب مصنّف ہے جس نے توراۃ اور انجیل کی عبارتیں لفظی ترجمہ کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کی ہیں۔ چنانچہ وہ کتاب پیدائش (۲۲/۵۰) کے فقرے یہ کہہ کر درج کرتا ہے[۳۵۹] " و فی التوراۃ " اسی طرح کتاب پیدایش (۴/۹-۱۶) کا حوالہ " وَیزعَم اَھلُ التورٰاۃ۔ " کہہ کر دیتا ہے۔ یوحنّا (۱۵/۲۳) کی عبارت کے ساتھ لکھتا ہے " مِمّا اَثبتَ یوحنّس الحواری[۳۶۱] " (یہ JOHN THE EVANGELIST کی عبارت ہے)، لیکن جہاں ابنِ اسحاق نے برقلیطس اِغریقی (GREEK PARACLETE) کی جگہ مُنحمنّا (MANAHHAMANA) کا نام لکھ دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فقرے اُسے اُس ترجمے کے مطابق ملے ہیں جسے (PALESTINIAN—CHRISTIAN) "فلسطینی مسیحی" کہا جاتا ہے۔[۳۶۲]

بعض شجرہ ہائے نسب سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب مقدس کے عین مطابق ہیں مثلاً، اولادِ اسمٰعیل کا شجرۂ نسب کتاب پیدایش (۲۵/۱۳-۱۶) سے حرف بحرف مطابقت رکھتا ہے۔[۳۶۳]

ابنِ اسحاق بعض فہرستیں، خطوط اور دستاویزیں بھی عموماً بغیر اسناد کے درج کرتا ہے۔ یہ اُسے اُن کتابوں سے حاصل ہوئی ہوں گی جو اُس کی دسترس میں تھیں۔ عبداللہ بن ابی بکر اس کے استاد تھے جن کے خاندان میں رسول اللہؐ کا وہ خط محفوظ تھا جو انھیں یمن بھیجتے وقت دیا گیا تھا، اور جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو باب دوم) انھیں عبداللہ نے رسول اللہؐ کے وثائق کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا اور اِن دستاویزوں کو ابنِ اسحاق ہمیشہ اُن کے ہی حوالے سے درج کرتا ہے۔[۳۶۵] ایک دستاویز اس کے مصری شیخ یزید بن حبیب کے حوالے سے[۳۶۶] بھی ملتی ہے۔

ابنِ اسحاق کے پیش رو حضرات نے اپنے مجموعوں میں نثری دستاویزوں اور اخبارات کے ساتھ پہلے ہی سے اشعار کی آمیزش شروع کر دی تھی، مگر جہاں تک ہمیں علم ہے جتنی کثرت سے اشعار کا استعمال ابنِ اسحاق نے کیا ہے متقدمین میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ الفہرست کا مؤلف ابن الندیم کہتا ہے:[۳۶۷]

وُیُقالُ کانَ یُعْمَل لَہ الأشعَارُ وَیُؤتیٰ	کہا جاتا ہے کہ ابن اسحاق کے لیے اشعار گھڑے جاتے
بِھَا. وَیُسألُ اَن یُدْخِلَھا فِی کِتابِہٖ	تھے پھر اس کے پاس لائے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ
فی السّیرۃ، فَیَفْعَل. فضمّن کِتابُہ	انھیں اپنی کتاب سیرۃ میں شامل کر لے اور وہ کر لیتا تھا۔
مِنَ الاشعارِ مَا صَارَبِہ فَضِیْحَۃً عِنْدَ رُوَاۃِ	چنانچہ اس کی کتاب میں ایسے اشعار آ گئے جن سے رُواۃِ
الشّعْرِ۔	شعر رسوا ہو گئے۔

اس سے پہلے محمد بن سلام الجُمحِی (متوفی ۲۳۱ھ) بھی ابن اسحاق پر نکتہ چینی کر چکا ہے اور کہتا ہے کہ ابن اسحاق اپنی صفائی میں یہ کہتے

ہیں کہ میں شعر کا نقاد تو ہوں نہیں، لوگ جو کچھ مجھے دیتے ہیں اُسے قبول کر لیتا ہوں۔ لیکن یہ تو عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے، کیونکہ ابنِ اسحاق نے اپنی روایات میں ایسے مردوں اور عورتوں کی زبان سے شعر پڑھوا دیے ہیں جنھوں نے زندگی میں ایک مصرع بھی موزوں نہ کیا ہوگا۔ ان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہی ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ عاد اور ثمود کے قصائد نقل کیے ہیں۔ اور یہ نہ سوچا کہ ان اقوام کو صفحۂ ہستی سے مٹے ہوئے بھی ہزاروں سال ہو چکے، اتنے طویل زمانے تک کن لوگوں نے ان اشعار کو زبانی یاد رکھا ہوگا؟ الطبری نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالے سے عاد و ثمود کے زمانے کے کچھ قصائد نقل کیے ہیں۔ اور ابن ہشام یہ صراحت کرتا ہے کہ ابنِ اسحاق نے اپنی کتاب میں زیادہ تر ایسے قصائد درج کیے ہیں جن سے علمائے شعر ناواقف ہیں اور خود ابنِ اسحاق شاذ ہی ان راویوں کا نام ظاہر کرتا ہے جن سے یہ اشعار اُسے ملے ہیں۔ مدنی زندگی کے بعض حوادث سے متعلق اشعار اُسے اپنے استاد عبداللہ بن ابی بکر سے ملے ہیں۔[۲۷۰] جیسا کہ وہ خود ہی اظہار کرتا ہے لیکن عبدالمطلب کی لڑکی کا ایک مرثیہ جو اُس نے اپنے باپ کی وفات پر لکھا تھا اور جسے ابن اسحاق نے تمام و کمال نقل کیا ہے اس کے بارے میں ابنِ ہشام یہ وضاحت[۲۷۱] کرتا ہے۔

"وَلَمْ أَرَىٰ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالشِّعْرِ	مجھے کوئی عالمِ شعر ایسا نہیں ملا جو ان اشعار سے واقفیت
يَعْرِفُ هَـٰذَا الشِّعْرَ إِلَّا أَنَّهُ لَمَّا رَوَاهُ	کا مدعی ہو مگر چونکہ ابن اسحاق نے اِن کی روایت سعید
عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ السَّعِيْدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ	بن المسیب کے بیٹے محمد کے نام سے کی ہے اس لیے
كَتَبْنَاهُ"	یہاں درج کر لیے گئے ہیں۔"

یہاں اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ اشعار اُس مدنی فقیہ کے بیٹے نے صرف روایت ہی نہیں کیے بلکہ وہی ان کے خالق بھی ہو سکتے ہیں تو کچھ غلط نہ ہوگا اگرچہ ان کے والد کو ان شعروں کا مؤلف نہ بھی سمجھا جائے جنھیں شعر و شاعری سے خصوصی اور گہرا تعلق تھا۔[۲۷۲]

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح جو اشعار داخل کر لیے گئے ہیں انھیں کیسے پرکھا جائے اور کیا ابنِ اسحاق پر الجمحی کی تنقید درست ہے؟ بہت سے قصائد جو ابنِ اسحاق نے اپنے یہاں درج کیے ہیں اور خصوصاً وہ جو مدنی حوادث سے متعلق ہیں، ان کی صحت پر شک کرنے کی کوئی معقول وجہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کا بڑا حصہ ابنِ ہشام کے زمانے تک علمائے شعر کے نزدیک مستند سمجھا جاتا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ خود ابنِ اسحاق ان قصائد کے بڑے حصے کو علی الاطلاق مستند نہ سمجھتا ہو، البتہ اُس نے علمائے شعر کی طرح ان کے استناد کو پرکھنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، اور نہ اس مسئلے کو اس سے زیادہ اہمیت ہی دی۔ جہاں اس نے ان اشعار کا درج کرنا مناسب سمجھا انھیں شامل کر لیا، ایک تو اس سبب سے کہ اشعار سے قصے میں رنگینی پیدا ہوتی تھی اور دوسرے اس لیے کہ یہ پرانے داستان سراؤں کی روایت بھی تھی کہ وہ قصے میں جا بجا اشعار شامل کر دیا کرتے تھے۔[۲۷۳] "سیرۃ نبوی میں شعری اقتباسات" کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں ہم نے بتایا تھا کہ ایسے اقتباسات ایام العرب اور اسلامی غزوات کی روایتوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں بلکہ سیرۃ ابن اسحاق کی طرح ان میں شاعرانہ معرکہ آرائیوں کا ذکر بھی ہے، جن میں دو متحارب قبیلوں کے شاعر ایک دوسرے کی ہجو گوئی کرتے ہیں اور دوسرا شاعر پہلے فریق کو اسی بحر و قافیہ میں جواب دیتا ہے۔ عہدِ جاہلی میں ہمیں اوس و خزرج کی لڑائیوں کا حال بھی معلوم ہے، جن میں شاعر اپنے قبیلے کے ترجمان کا رول ادا کرتا ہے۔ یہی معاملہ بعد کو مغازی میں ملتا ہے (مثلاً حسان بن ثابت

اور عبداللہ بن رواحہ)۔ ابنِ اسحاق نے ان قصائد کے درج کرنے میں غیر معمولی غیر جانب داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ رسول اللہؐ کے دشمنوں کے ہجویہ اشعار بھی بے تکلف لکھتا ہے بلکہ بعض مواقع پر ابنِ ہشام کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ زیادہ تیکھے اشعار کو دھیما بنا دے یہاں اس بات پر زور دینا بھی ضروری ہے کہ یہ نظمیں لازماً بیانیہ انداز کی نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں بکثرت حوالے نثری روایات و اخبار کے پائے جاتے ہیں اور یہ صرف ابنِ اسحاق کی درج کردہ نظموں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ ابتدائی دور کے تمام مورخوں اور راویوں کے بارے میں علی الاطلاق درست ہے۔ یہ اشعار رزمیہ سے زیادہ غنائی رنگ کے ہوتے ہیں، اور خود راوی کی تصنیف نہیں ہوتے بلکہ یا تو اُن حوادث میں حصہ لینے والا کوئی کردار ان کی تخلیق کرتا ہے کبھی خود ہیرو یا اس کے قبیلے کا اور کوئی فرد ان اشعار کا خالق ہوتا ہے، اور وہ اُس مخصوص حادثے سے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتا ہے کبھی یہ اشعار عورتوں کی زبان سے بھی ادا کرائے جاتے ہیں خصوصاً جب کسی کی موت پر ماتم کرنا مقصود ہوتا ہے اور ابنِ اسحاق شاید پہلا مؤلف ہے جس نے بعض حوادث سے متعلق کثیر منظوم مواد کو متعلقہ فصل کے آخر میں یکجا بھی کر دیا ہے، جب کہ دوسرے مواقع پر وہ بھی قدیم قصہ گویوں کی طرح نثر میں اشعار کا پیوند لگاتا جاتا ہے[۳۷۴]

ابنِ اسحاق کو اپنے شیوخ سے جو روایات ملیں اُن میں اُس نے اپنی جمع کی ہوئی بہت سی روایتیں اور اقوال شامل کر کے سیرۃ نبوی کو بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ اپنی اس پیش کش میں وہ ناموں کی فہرستیں، متعلقہ دستاویزیں اور اشعار بھی شامل کرتا جاتا ہے۔ ان میں بھی کچھ مواد اُسے اپنے استادوں سے پہنچا تھا، اور کچھ اُس نے بطورِ خود جمع کیا تھا۔ یہ ترتیب و تنظیم بجائے خود ایک بڑا کام ہے چاہے ابنِ اسحاق سے پہلے کچھ اور لوگوں نے بھی یہ کام کیا ہو، تب بھی اُسے اس لحاظ سے اولیت کا شرف حاصل رہے گا کہ اُس نے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار کو نہ صرف ایک تناسب کے ساتھ اپنی تالیف میں پیش کیا ہے، بلکہ انبیائے سابقین کے حالات شامل کر کے سیرۃ کے موضوع میں وسعت پیدا کر دی اور اُسے تاریخ رسالت بنا دیا۔ جہاں تک اِس مواد کی ترتیب کا تعلق ہے، ابنِ اسحاق نے مختلف انفرادی روایات کو بڑی خوش اسلوبی سے باہم مربوط کیا ہے اور اُن کے آغاز میں ایسی مختصر عبارتیں خود درج کر دی ہیں جن میں اُن روایات کے مطالب کا خلاصہ آجاتا ہے[۳۷۵]۔ دوسرے یہ کہ وہ اکثر مختلف راویوں کی متعدد خبروں کو ملا کر ایک عمومی روایت تیار کر لیتا ہے، ایسا ہی پہلے اُس کے استاد الزہری نے بھی اکثر احوال میں کیا ہے۔

ابنِ اسحاق کی جمع کردہ روایات کے پایۂ استناد کے بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ وہ خود بھی اکثر مواقع پر "فِیمَا یَزْعُمُونَ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ" (اور لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے) جیسے معترضہ جملے لکھ کر اپنے شک کا اظہار کر دیتا ہے۔ لیکن ادبی حیثیت سے اِس کتاب کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اور اس لحاظ سے اس کی قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ عربی نثر کی ان قدیم ترین کتابوں میں سے ہے جو دستبردِ زمانہ سے بچ بچا کر ہم تک پہنچی ہیں۔

"الفہرست" میں ایک "کتاب الخلفا" ابنِ اسحاق سے اور منسوب ہوئی ہے[۳۷۶] اور الطبری نے اپنی تاریخ میں خلفائے راشدین کے عہد کے حالات بیان کرتے ہوئے ابنِ اسحاق کو اکثر بطورِ سند پیش کیا ہے۔ بظاہر اس نے مغازی فراہم کرنے کا خصوصی اہتمام کیا تھا اور پھر انھیں تاریخ وار مرتب کیا، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور کے دوسرے حوادث مثلاً: حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت،

کے بارے میں بھی ابن اسحاق نے مواد جمع کیا تھا۔ اس سے ایسے اخبار بھی روایت کیے گئے ہیں جو عہدِ اُموی کے متفرق حوادث سے علاقہ رکھتے ہیں۔ لیکن جو اقتباسات محفوظ رہ گئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ اُن کی مدد سے ہم ابنِ اسحاق کی "کتاب الخلفا" کا خاکہ دریافت کر لیں یا اُس کے موضوع کی نوعیت سمجھ سکیں۔

باب (۴)

۴ ۔ ابنِ اسحٰق کے بعد

۱۔ ابو مَعشَر السِّندی

اب ہمیں ابنِ اسحٰق کے ایک نوجوان مُعاصر کا تذکرہ کرنا ہے، جس کے مغازی کے اقتباسات ہمارے لیے واقدی اور ابنِ سعد وغیرہ نے محفوظ کر دیے ہیں۔ یہ ابو مَعشر ہے، جسے عام طور پر السندی کہا جاتا ہے۔ اس لقب سے ظاہر ہے کہ یہ خود یا اس کے اجداد میں سے کوئی ترکِ وطن کر کے سندھ سے عرب پہنچا تھا۔ اگر ابو نعیم[۳۷۷] کا قول درست ہے، جس میں وہ اپنا ماخذ ظاہر کیے بغیر کہتا ہے کہ:

اِنَّ اَبَا مَعشَرٍ سِندِیٌّ، وکانَ اَلکنَ یَقُولُ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بنُ قَعبٍ یُرِیدُ کَعبٍ"	ابو معشر سندھ کے رہنے والے تھے۔ اُن کی زبان میں ہکلاہٹ تھی، یوں کہا کرتے تھے کہ ہم سے محمد بن قعب نے بیان کیا اور کعب مراد لیتے تھے۔

تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُن کے والدین عربی الاصل نہیں تھے۔ مگر "السندی" کے لقب کا اطلاق اُس عرب پر بھی ہو سکتا ہے جو سندھ میں بس گیا ہو، کیونکہ ۹۲ ھ سے سندھ بھی عرب خلافت کا ایک صوبہ تھا۔ ابو معشر کے پوتے[۳۷۸] داؤد بن محمد بیان کرتے ہیں کہ اُن کے دادا یمن کے باشندے تھے۔ اس سے ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ ابو معشر کے والد نے سندھ سے یمن کو ہجرت کی ہوگی یہی پوتا خاص طور سے بیان کرتا ہے کہ ابو معشر کا رنگ گورا[۳۷۹] تھا، دراں حالیکہ ابو مُسہر نے اُن کا رنگ کالا بتایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ابو معشر اپنا شجرہ ماں کی طرف سے حَنظَلَۃ بن مالک کے خاندان سے ملاتے تھے۔[۳۸۰] اُن کا اصلی نام عبدالرحمٰن بن الولید تھا، جیسا کہ ان کے ایک اور پوتے الحسین نے بیان کیا ہے۔[۳۸۱] جب انھیں "سرقہ" کر کے مدینہ کے بازار میں غلام کی حیثیت سے بیچا گیا تو اُن کے آقاؤں نے، جو قبیلۂ بنی اسد کے لوگ تھے، ان کا نام 'نجیح' رکھا تھا۔[۳۸۲] یہاں جو "سرقہ" کہا گیا ہے یہی بات اُن کے مذکورۂ بالا پوتے داؤد کے ایک اور بیان میں ہے[۳۸۳] اور اس سے شاید اُن کی "گرفتاری" مراد ہے۔ یہ یمامہ اور بحرین میں یزید بن المُہلّب سے جنگ کے دوران پکڑے گئے تھے۔ پھر یہ غلام ہی کی حیثیت سے اُمّ موسیٰ بنت منصور الحمیریہ کے ہاتھ لگے جو خلیفہ المنصور کی بیوی اور خلیفہ المہدی کی ماں[۳۸۴] تھی۔ اس نئی مالکہ نے ان کو آزاد کیا۔[۳۸۵] دوسرے مصادر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی دوسری عورت سے اپنی آزادی (بذریعہ مکاتبت۔ جس میں مقررہ رقم بالاقساط ادا کی جاتی ہے۔) خریدنی شروع کی تھی کہ اس اثنا میں انھیں اُمّ موسیٰ نے خرید لیا، اور آزاد کر دیا۔[۳۸۶] پھر انہوں نے عباسیوں سے نسبتِ ولایت قائم کر لی۔ چنانچہ یہ

بنو حنظلہ سے اپنی نسبت پر اتنا ناز نہیں کرتے تھے جتنا حکمران خاندان سے اس تعلق پر فخر کرتے تھے[۳۸۷]۔ جب خلیفہ المہدی حج کرنے کے لیے مدینے[۳۸۸] آیا، تو ابو معشر کو اپنے ساتھ بغداد لیتا گیا، جیسا کہ ہمیں خود ابو معشر نے بتایا ہے[۳۸۹]۔ وہاں انھیں خلیفہ نے ایک ہزار دینار دیے اور حکم دیا کہ یہیں دربار میں رہو اور درباریوں کو فقہ کی تعلیم دیا کرو۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں یہ بہت کچھ بدل گئے تھے اور ان کی عقل ماؤف ہوگئی تھی[۳۹۰]۔ یہ ۱۷۰ھ میں بغداد میں فوت ہوئے[۳۹۱]، وہاں کے بڑے قبرستان میں دفن کیے گئے اور ہارون الرشید نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی[۳۹۲]۔

محدث کی حیثیت سے ابو معشر کی شہرت کو بعض لوگوں نے تسلیم نہیں کیا ہے البخاری کہتے ہیں[۳۹۳]: "ان کی حدیثوں سے اختلاف کیا جاتا ہے۔" اور ابن سعد کا قول ہے کہ ان کی احادیث تو بہت ہیں مگر ضعیف ہیں[۳۹۴]۔ ابن حجر نے بہت سی رائیں نقل کی ہیں[۳۹۵] جو سب ان کے خلاف جاتی ہیں۔ مگر مغازی کی روایات میں انھیں سند سمجھا گیا ہے۔ احمد بن حنبل انھیں "بصیر فی المغازی" (مغازی میں بصیرت رکھنے والا) کہتے ہیں اور الخاطلی کا خیال[۳۹۷] ہے کہ "ابو معشر کا علم میں اور تاریخ میں ایک مقام ہے۔ ائمہ نے ان کی تاریخ سے استناد کیا ہے، مگر انھیں حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔"

"الفہرست"[۳۹۸] سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو معشر نے ایک "کتاب المغازی" بھی لکھی تھی اور اس کتاب کے متعدد اقتباسات الواقدی کی "کتاب المغازی" میں پائے جاتے ہیں کسی فصل کے شروع میں جب وہ تمام رُواۃ کے نام گنا تا ہے، تو وہاں خاص طور پر ان کا حوالہ بھی دیتا ہے[۳۹۹]۔ ابن سعد کے یہاں سیرۃ کے اقتباسات دیکھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابو معشر نے اپنے مغازی میں رسول اللہؐ کی مکمل حیات مبارکہ سے متعلق روایات فراہم کی تھیں۔ ابن سعد اپنے مغازی کے شیوخ کی فہرست میں بھی ان کا نام دیتا ہے اور ان کے حوالے سے تراجم صحابہ بھی بیان کرتا ہے[۴۰۰]۔ رسول اللہؐ کی ابتدائی زندگی کے واقعات میں بھی ابن سعد اور الطبری دونوں کے یہاں[۴۰۱] ابو معشر کا نام ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغازی کے علاوہ ابو معشر نے صدر اسلام کے حوادث کی ایک تجزیاتی "تاریخ" بھی سنہ وار لکھی تھی۔ یہ ۱۷۰ھ تک کے وقائع تھے۔ آخری واقعہ جو اُن کی کتاب سے الطبری نے اخذ کیا ہے، وہ خلیفہ الہادی کی وفات ہے، جو ۱۷۰ھ کے موسم بہار میں ہوئی تھی۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد خود ابو معشر بھی مر گئے۔ مغازی میں وہ لازماً نہیں تو اکثر اپنی سند بیان کرتے ہیں۔ مگر تاریخ میں انھوں نے کوئی اسناد نہیں دیا۔ اُموی خلیفہ عبدالملک سے متعلق مندرجۂ ذیل بیان جو ابن سعد کے یہاں ملتا ہے، وقائع تاریخی کے سلسلے میں ابو معشر کے طریقِ کار کی شاید مناسب مثال ہے[۴۰۲]:

> "عبدالملک بن مروان دمشق میں جمعرات کے دن، ۱۵ شوال ۸۶ھ کو مرا۔ اس وقت وہ ساٹھ سال کا تھا۔ جس دن سے اُس کی بیعت لی گئی، اُس دن سے وفات تک، اُس کی مدتِ حکومت اکیس سال اور ڈیڑھ مہینہ رہی۔ اس میں سے نو سال عبداللہ بن الزبیر سے جنگ کرنے میں صرف ہوئے۔ پھر شام کی خلافت اُس پر مسلّم ہوگئی، اور مصعب کی شہادت کے بعد وہ عراق کا بھی تنہا مالک ہوگیا۔ عبداللہ بن الزبیر کی شہادت کے بعد، اور لوگوں کے اُس پر متفق ہونے کی حالت میں وہ تیرہ سال اور چار ماہ خلیفہ رہا، اس میں سات راتیں کم رہ گئیں۔ (یعنی ۱۳ سال ۳ ماہ اور ۲۳ یوم) یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ ۸۵ سال کی عمر میں مرا۔ مگر پہلا قول ثابت

ہے اور یہی صورت تاریخ ولادت کے معاملے میں ہے۔"

۲- الواقدی

ابو معشر کی طرح محمد بن عمر الواقدی کا تعلق بھی مدینے کے موالی طبقے سے ہے۔ اُن کے دادا کا نام واقد تھا اس لیے انھیں واقدی کہا جاتا ہے اور مدینے کے قبیلے بنی اسلم کے فرد عبداللہ بن ابی بریدہ سے اُن کی نسبتِ ولایت تھی، اس لیے الاسلمی بھی کہلاتے ہیں[۴۰۳]۔ اپنے شاگرد ابن سعد کی روایت کے مطابق الواقدی ۱۳۰ھ[۴۰۴] مدینے میں پیدا ہوئے۔ یہ مروانِ ثانی کی خلافت کا زمانہ تھا۔ ان کی ماں سائب خاثرہ کی پرپوتی تھیں[۴۰۵]۔ یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے مدینے میں شاعری کی تھی[۴۰۶] اور اس کے باپ جنگی قیدی بنا کر ایران سے لائے گئے تھے، اس لحاظ سے الواقدی کی رگوں میں کچھ عجمی خون بھی گردش کر رہا تھا۔ اپنے وطن مدینہ میں الواقدی نے مشہور محدثوں سے احادیثِ نبوی کی سماعت کی تھی اور جب خلیفہ ہارون الرشید مدینے کی زیارت کے لیے آیا ہے — یہ غالباً ۱۷۰ھ کا واقعہ[۴۰۷] ہے — تو مدینے کے مقاماتِ مقدسہ کی رہ نمائی کے لیے الواقدی ہی کا نام تجویز ہوا تھا۔ اس بارے میں خود الواقدی کا تفصیلی بیان موجود ہے جو ہمارے لیے ابن سعد[۴۰۸] نے محفوظ کر دیا ہے:

"جب امیر المومنین ہارون الرشید نے حج کیا تو وہ مدینے بھی آئے اور انھوں نے یحیٰی بن خالد سے کہا کہ میرے لیے کوئی ایسا شخص تلاش کرو جو مدینے سے اور یہاں کے قابلِ دید مقامات سے واقفیت رکھتا ہو اور یہ بتا سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل علیہ السلام کس طرح آتے تھے اور وہ کس طرف سے آتے تھے؟ نیز شہیدوں کے مزارات کی نشاندہی کر سکے۔ یحیٰی بن خالد نے پوچھ تاچھ کی تو ہر ایک نے میرا ہی نام لیا، چنانچہ اس نے مجھے بلوایا۔ میں گیا تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ بولا: "شیخ صاحب! امیر المومنین خدا ان کا اقبال رکھے، یہ چاہتے ہیں کہ تم عشاء کی نماز یہیں پڑھو، پھر ہمارے ساتھ مقدس مقامات کی زیارت کے لیے چلو۔ ان کے بارے میں ہمیں ضروری باتیں بتاؤ، اور وہ جگہ دکھاؤ جہاں جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے اور تم ہمارے ساتھ ساتھ رہو۔ جب میں عشاء کی نماز سے فارغ ہوا تو دیکھا کہ شمعیں روشن ہو چکی تھیں۔ میں دو آدمیوں کے پاس آیا جو دو خچروں پر سوار تھے۔ یحیٰی نے پوچھا: "وہ شخص کہاں ہے؟" میں نے کہا: "حاضر ہوں جناب!" پھر انھیں ساتھ لے کر مسجد سے متصل گھروں تک آیا اور بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں جبریل علیہ السلام آیا کرتے تھے۔ وہ دونوں اپنی سواریوں سے اُتر پڑے اور دو دو رکعتیں پڑھیں، پھر دیر تک خدا سے دعا مانگتے رہے، پھر سوار ہوئے اور میں آگے آگے چل رہا تھا۔ میں نے کوئی قابلِ زیارت جگہ نہیں چھوڑی جہاں انھیں لے کر نہ گیا ہوں، ہر مقام پر وہ نماز پڑھتے تھے اور گڑگڑا کر دعا مانگتے تھے۔ اسی طرح گھوم پھر کر ہم مسجدِ نبوی میں واپس آ گئے، پو پھٹ چکی تھی اور موذن اذان دے رہا تھا۔ جب وہ شاہی فرودگاہ پر آئے تو مجھ سے یحیٰی نے کہا: شیخ صاحب! ابھی چھوڑنا نہیں، میں نے صبح کی نماز وہیں مسجد میں ادا کی۔ اب وہ مکہ کو روانہ ہونے والے تھے۔ دن نکلنے پر یحیٰی بن خالد نے مجھے اپنی مجلس میں باریاب کیا۔ اس نے مجھے اپنے قریب ہی بٹھایا اور کہنے لگا: امیر المومنین، خدا اُن کا اقبال رکھے، اب تک برابر رو رہے ہیں تم نے انھیں جن مقامات کی زیارت کرائی، اُن سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے تمھارے لیے دس ہزار درہم کا حکم دیا ہے' یہ کہہ کر اُس نے ایک مُنہ بند تھیلی میرے

آگے ڈال دی اور کہنے لگا: "تو شیخ صاحب، خدا تمھیں مبارک کرے۔ ہم تو آج روانہ ہو رہے ہیں، اگر ہم جہاں کہیں بھی ٹھہرے ہوئے ہوں، تمھیں ہم تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی، انشاء اللہ۔ چنانچہ امیرالمومنین چلے گئے۔ میں اپنے گھر آیا اور وہ مال میرے ساتھ تھا، اُس سے میں نے جتنا قرضہ تھا وہ ادا کیا، ایک لڑکے کی شادی کی اور چین سے بسر ہونے لگی۔"

دربار خلافت سے اپنے ان تعلقات کا الواقدی نے ۱۸۰ھ میں فائدہ اُٹھایا[۲۰۹] اس زمانے میں اُس کا حال پتلا تھا، وہ سیدھا بغداد پہنچا اور وہاں سے رَقّہ آیا جہاں اُن دنوں خلیفہ ہارون الرشید ٹھہرا ہوا تھا[۲۱۰] اس سفر کا حال بھی ابن سعد نے خود الواقدی کی روایت سے بیان کیا ہے[۲۱۱]:

"پھر ہمیں زمانے نے ستایا تو اُمّ عبداللہ (واقدی کی بیوی۔ اُن کی کنیت ابوعبداللہ تھی) نے کہا یہاں کیوں پڑے ہو، تمھیں تو امیرالمؤمنین کے وزیر جانتے ہیں اور انھوں نے تم سے کہا تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں، تم اُن سے آکر مل سکتے ہو۔ چنانچہ میں مدینے سے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ عراق میں ملیں گے۔ عراق آیا، اور امیرالمومنین کے بارے میں پوچھا، تو معلوم ہوا کہ وہ رقّہ میں ہیں۔ میں نے مدینے کو واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر پھر خیال آیا کہ وہاں تو میری حالت بہت سقیم ہے، اس لیے رَقّہ ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نخاس پہنچا تاکہ سواری کرایہ پر لوں، وہاں کچھ نوجوان سپاہی مل گئے، جو رقّہ ہی جا رہے تھے، انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے: "شیخ صاحب کہاں جاؤ گے؟" میں نے اپنا اتا پتا بتایا اور کہا کہ مجھے رَقّہ جانا ہے۔ پھر ہم نے ساربانوں کے کرایہ پر غور کیا تو وہ ہماری برداشت سے باہر تھا۔ تب انہوں نے کہا: "بڑے میاں، کیا تم کشتی میں سفر کر سکتے ہو؟ کیونکہ وہ سستی رہے گی اور سفر بھی اچھا گذرے گا۔" میں نے کہا میں یہ سب باتیں نہیں جانتا تم ہی فیصلہ کر لو۔ چنانچہ ہم کشتیوں کی طرف گئے اور اُن کا کرایہ چکایا۔ میں نے اُن لوگوں سے زیادہ نیک، رحمدل اور محتاط لوگ کم ہی دیکھے ہیں، وہ میری اس طرح خدمت کرتے تھے اور میرے لیے کھانے کا انتظام کرتے تھے، جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کے لیے کرتا ہے۔ آخر ہم رقّہ کے گھاٹ پر اُترے۔ یہ گھاٹ بہت خراب تھا انھوں نے اپنے کپتان کو اپنی تعداد لکھ کر دے دی تھی اور مجھے بھی اُس فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ ہم کچھ دن وہیں پڑے رہے، پھر ہم سب کے پرمٹ آ گئے جن میں ہر ایک کا نام درج تھا۔ اب ہم سب لوگ گھاٹ پر اُترے اور میں بھی ان لوگوں کے ساتھ ایک سرائے میں ٹھہر گیا، یہاں چند روز رہا۔ پھر میں نے یحییٰ بن خالد تک باریابی کی کوشش کی، مگر یہ کام کٹھن معلوم ہوا تو میں ابوالبختری کے پاس آیا، یعنی وہب ابنِ وہب کے پاس جو اُن دنوں قاضی تھے۔ وہ مجھے جانتے تھے، میں اُن سے ملا تو کہنے لگے: "ابوعبداللہ تم نے غلطی کی اور دھوکا کھا گئے۔ خیر میں تمھارا تذکرہ کر دیکھوں گا۔ اب میں صبح شام اُن کے دروازے کے چکر لگانے لگا، یہاں تک کہ جو کچھ میری گرہ میں تھا سب خرچ ہو گیا اور مجھے اپنے ساتھیوں سے شرم آنے لگی، کپڑے سب پھٹ گئے، اور آخر کار میں ابوالبختری کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ میں نے ساتھیوں سے تو کچھ کہا نہیں، چپکے سے مدینے کا رستہ لیا۔ کبھی کشتی میں سوار ہوتا تھا کبھی پیدل چلتا تھا۔ اسی طرح سُلیحین تک آ گیا۔ ایک دن وہاں کے بازار میں سرگشت کر رہا تھا کہ ایک قافلہ مل گیا، جو بغداد سے آ رہا تھا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی تو معلوم ہوا کہ مدینے والے ہیں اور امیر قافلہ بکار الزبیری ہیں، جنھیں امیرالمومنین نے مدینے کا قاضی بنانے کے لیے بُلا بھیجا تھا۔ زبیری سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ ذرا ستا لیں، تب ان سے جا کر ملوں گا۔ جب انہوں نے کچھ دیر آرام

کر لیا تو میں جا پہنچا۔ وہ ناشتا کر چکا تھا۔ میں نے ملنے کی اجازت طلب کی، اس نے بلا لیا۔ میں نے جاکر سلام کیا۔ اس نے پوچھا، "ابوعبداللہ وطن سے غیر حاضری کے اس زمانے میں کیا کرتے رہے؟" اب میں نے ساری کتھا سنائی اور ابوالبختری کا معاملہ بھی بتایا، وہ کہنے لگا، "تم ابوالبختری کو جانتے نہیں، وہ نہ کسی سے تمھاری تعریف کرے گا، نہ کسی کے سامنے تمھارا تذکرہ کرنا گوارا کرے گا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے کہا: "اب تو یہی ٹھانی ہے کہ مدینے واپس چلا جاؤں۔" بولا "یہ بھی غلط ہے۔ مدینے سے تم جن حالات میں نکلے ہو وہ تمھیں معلوم ہی ہیں، مناسب اقدام یہ ہوگا کہ تم میرے ساتھ چلو، میں یحییٰ سے تمہارا تذکرہ کر دوں گا۔"

میں اُس قافلے کے ساتھ سوار ہو کر پھر رقہ آ گیا، جب ہم نے گھاٹ کو پار کر لیا، تو اُس نے پوچھا: "کیا میرے ساتھ ہی ٹھہرو گے؟" میں نے کہا: "نہیں میں اپنے دوستوں میں جاکر ٹھہروں گا اور تم سے تڑکے ہی آکر ملوں گا، تاکہ ہم اکٹھے یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی تک چلیں، انشاءاللہ۔"

اب میں اپنے دوستوں میں پہنچا تو وہ بھونچکے رہ گئے، جیسے میں آسمان سے ٹپک پڑا ہوں۔ پھر کہنے لگے: "ابوعبداللہ کیا حال ہے؟ ہمیں تو تمھاری بہت فکر تھی۔" میں نے سارا ماجرا سنایا۔ سب لوگوں نے کہا کہ "ہاں زبیری کا پیچھا مت چھوڑنا، کھانے پانی کی تم فکر مت کرو، یہاں موجود ہے۔"

تڑکے ہی میں الزبیری کے دروازے پر جا پہنچا، مجھے بتایا گیا کہ وہ یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر گئے ہیں، تو میں بھی وہیں پہنچا۔ باہر انتظار میں کھڑا رہا، کچھ دیر کے بعد وہ برآمد ہوا، اور مجھے دیکھ کر کہنے لگا: "ارے ابوعبداللہ، میں تمھارا تذکرہ کرنا تو بھول ہی گیا، خیر، تم یہیں ڈیوڑھی پر ہی ٹھہرو، میں ابھی آیا۔" تھوڑی دیر کے بعد دربان میرے پاس آیا، اور کہنے لگا: "اندر آ جاؤ" میں بہت پھٹی ٹوٹی حالت میں اندر داخل ہوا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور اس کے ختم ہونے میں تین یا چار روزے اور رہ گئے تھے، جب مجھے یحییٰ نے ان حالوں میں دیکھا تو اس کے چہرے پر غم کے تاثرات اُبھر آئے۔ اُس نے سلام کا جواب دیا اور اپنے نزدیک ہی بٹھا لیا۔ اس کے پاس بہت سے لوگ بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے ایک کے بعد ایک بات کرتا رہا، اور میں جواب سے کتراتا رہا، جب بولتا تھا تو بے تکی اور بے موقع بات کہتا تھا اور لوگ صحیح جواب دیتے تھے، تو چُپ رہ جاتا تھا۔

جب مجلس برخاست ہوئی، سب لوگ نکلے، میں بھی چلا۔ اتنے میں یحییٰ بن خالد کا نوکر آیا اور مجھے باہر پردے کے پاس ملا۔ کہنے لگا کہ "وزیر نے یہ حکم دیا ہے کہ تم رات کا کھانا اُن کے ساتھ ہی کھاؤ۔" میں نے واپس آکر سارا معاملہ اپنے ساتھیوں کو بتایا اور یہ بھی کہا کہ ڈر یہ ہے کہ اُس نوکر نے کسی اور کے دھوکے میں مجھے مدعو نہ کر لیا ہو، کچھ ساتھی کہنے لگے۔ "تو کیا ہے؟ یہ دو روٹیاں اور تھوڑا پنیر موجود ہے اور یہ سواری ہے، تم سوار ہو کر چلو، غلام پیچھے رہے گا، اگر دربان نے تمھیں باریابی دے دی تب تو یہ توشہ تم غلام کو دے دینا اور اگر باریابی نہ ملے تو کسی مسجد کا رُخ کرنا، وہاں بیٹھ کر کھا لینا اور مسجد سے پانی لے کر پی لینا۔

میں گھر سے نکلا، اور یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا۔ لوگ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے۔ جب دربان نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا، "شیخ صاحب کہاں رہ گئے تھے؟ آپ کی تلاش میں کئی بار ہرکارہ دوڑ چکا ہے۔" میں نے اپنی پوٹلیا تو غلام کو تھمائی اور اُس سے انتظار کرنے کو کہہ کر خود اندر داخل ہوا، تو دیکھا کہ سب لوگ جمع ہیں۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اب وضو کے

لیے پانی لایا گیا ہم نے وضو کیا اور میں سب لوگوں کے مقابلے میں وزیر سے قریب بیٹھا تھا۔ اب روزہ افطار کیا۔ تھوڑی دیر میں عشا کا وقت ہو گیا تو ہم نے یحییٰ کے پیچھے نماز پڑھی، پھر اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ اب یحییٰ نے سوالات کرنے شروع کیے اور میں خاموش رہا، دوسرے لوگ جواب دیتے رہے، مگر وہ جوابات میری رائے کے خلاف تھے۔

جب رات ڈھلنے لگی، تو سب لوگ اُٹھے۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ اب مجھے ایک غلام ملا۔ اور بولا کہ "وزیر کا حکم ہے کہ تم کل پھر آؤ، مگر آج جس وقت آئے تھے اس سے ذرا پہلے۔" اس نے مجھے ایک تھیلی تھما دی، یہ تو پتا نہیں چلا کہ اس میں کیا تھا، پر میں خوشی سے پھول گیا۔ اب میں اپنے غلام کی طرف چلا اور سوار ہوا۔ وہ حاجب میرے ساتھ تھا۔ میں لپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور ان سے کہا: "ذرا چراغ منگاؤ۔" اب تھیلی کھول کر دیکھا تو اس میں دینار تھے۔ وہ لوگ کہنے لگے "کیا دیا۔" میں نے کہا کہ غلام یہ کہہ گیا ہے کہ کل پھر بلایا ہے، اور اس وقت سے ذرا پہلے جب آج گیا تھا۔ دینار گنے تو پانسو تھے۔ کسی نے کہا: "تمھارے لیے ساری خریدنا میرا کام رہا۔" کوئی بولا: "زین لگام اور دوسری ضروریات میں خرید لاؤں گا۔" تیسرا بولا: "تمھیں حمام کرانا، داڑھی کو خضاب لگانا اور خوشبو میں بسانا میری ڈیوٹی ہوگی۔" ایک کہنے لگا: "کپڑے میں خرید کر لاؤں گا۔" دیکھو لوگ کیسے بڑھیا لباس میں رہتے ہیں۔" میں نے سو دینار گن کر اس شخص کو دیے جس کے پاس خرچ کا حساب کتاب رہتا تھا۔ اور سب لوگ قسم کھا کر کہنے لگے کہ ہم تمھارے مال میں ایک دینار یا درہم کی بھی گڑبڑ نہیں کریں گے۔

صبح کو سب نکلے، اور جس نے میرے لیے جو سامان لانے کا ذمہ لیا تھا وہ اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ ظہر کی نماز پڑھتے وقت تک میں اچھا خاصا مردِ معقول نظر آنے لگا۔ باقی رقم لے کر میں زبیری کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھے ذرا ٹھاٹ میں دیکھا تو بہت خوش ہوا۔ میں نے سارا ماجرا سنایا۔ پھر بولا: "میں مدینے جا رہا ہوں، کچھ کہنا سننا ہے؟" میں نے کہا: ہاں میں نے بیوی بچوں کو جس حال میں چھوڑا تھا، وہ تمھیں معلوم ہی ہے۔" اسے دو سو دینار دیے کہ ان کو پہنچا دے۔ پھر وہاں سے نکلا اور بچی کھچی رقم لے کر اپنے ساتھیوں میں آیا۔

اب میں نے عصر کی نماز پڑھی اور خوب بن سنور کر یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا۔ دربان نے مجھے دیکھا تو کھڑا ہو گیا، اور اندر جانے کی اجازت دی۔ میں یحییٰ کے سامنے آیا اور اس نے میرے ٹھاٹ دیکھے تو اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں اس کی مجلس میں بیٹھا اور اس سے اب باتیں کرنی شروع کیں اور پہلے اس نے جو باتیں پوچھی تھیں ان کے جو جوابات تھے، سب دیے، یہ سب باتیں دوسرے لوگوں کی بتائی ہوئی باتوں سے مختلف تھیں میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ لوگوں کی بھویں چڑھی ہوئی ہیں یحییٰ ادھر ادھر کی باتیں پوچھتا رہا۔ میں ہر بات کا جواب دیتا رہا، اور سب ہم بجود بیٹھے رہے، کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

مغرب کا وقت ہوا تو یحییٰ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی پھر کھانا لایا گیا ہم سب نے مل کر کھایا پھر یحییٰ نے عشا کی نماز پڑھائی۔ اب سب اپنی اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ گئے اور باتیں شروع ہوئیں۔

اب یحییٰ لوگوں سے کوئی سوال کرتا تھا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرتے تھے۔ جب اُٹھنے کا وقت آیا تو سب کے ساتھ میں بھی چلا آیا۔ دیکھا تو پھر ہرکارہ میرے پیچھے ہے۔ کہنے لگا کہ وزیر کا حکم یہ ہے کہ تم روزانہ شام کو اسی وقت آیا کرو جیسے آج آئے تھے، یہ کہہ کر ایک تھیلی پکڑا دی۔ میں گھر آیا اور دربان کا ہرکارہ مجھے گھر تک چھوڑ گیا۔ اپنے ساتھیوں میں آکر میں نے چراغ بیچ میں رکھا، اور وہ تھیلی اپنے

ساتھیوں کی طرف لڑھکا دی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ باغ باغ ہو گئے۔

اگلا دن آیا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے قریب ہی کہیں میرے لیے ایک مکان تلاش کرو اور ایک باندی خرید دو، ایک غلام روٹی پکانے والا ہونا چاہیئے اور گھر کا سارا دھندا جمع کر دو۔ ظہر سے پہلے پہلے انہوں نے یہ سب چیزیں بھی فراہم کر لیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ آج روزہ میرے ساتھ ہی افطار کرو، اس پر وہ بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔

میں مقررہ وقت پر روزانہ یحییٰ بن خالد کے دربار میں جاتا رہا، ہر بار مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھتا تھا اور ہر رات کو مجھے پانسو دینار دیتا تھا۔ اب عید کی چاندرات آگئی۔ اس نے کہا "ابو عبداللہ، کل امیر المومنین سے ملنے کے لئے بہترین لباس قاضیوں کا سا پہن کر آنا اور اُن کے سامنے بیٹھ جانا، وہ لازماً پوچھیں گے یہ کون ہے، تو میں تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ عید کی صبح کو میں بڑے طمطراق سے نکلا اور بھی ہزاروں انسان تھے امیر المومنین بھی عید گاہ کی طرف تشریف لائے' وہ بار بار میری طرف دیکھتے تھے۔ میں برابر اُن کے مصاحبوں میں ڈٹا رہا۔ واپس آکر میں یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور امیر المومنین کے محل میں تشریف لے جانے کے بعد یحییٰ سے ملاقات کی، وہ کہنے لگا "ابو عبداللہ، تمہارے بارے میں امیر المومنین برابر مجھ سے پوچھتے رہے، میں نے انھیں حج کا قصہ یاد دلایا اور بتایا کہ تم وہی شخص ہو جس نے ہمیں اُس رات کو مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرائی تھی۔ انھوں نے تمہارے لیے تیس ہزار درہم کا عطیہ مرحمت فرمایا جو میں تھیں ان شاء اللہ کل ادا کر دوں گا۔"

آج پھر میں واپس آگیا اور اگلے دن پھر یحییٰ بن خالد سے ملا، اور اس سے کہا کہ خدا وزیر کی ہر دلی مراد پوری کرے — میری ایک حاجت اور ہے جو وزیر سے، خدا انھیں اقبال مند رکھے، مانگنی ہے۔ کہنے لگا: "وہ کیا ہے؟" میں نے کہا گھر جانے کی اجازت چاہتا ہوں، کیونکہ بیوی بچوں سے ملنے کا اشتیاق حد سے سوا ہو گیا ہے۔ کہنے لگا ابھی مت جاؤ۔ مگر میں برابر اُس سے اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ اُس نے اجازت دے ہی دی۔ پھر مجھے تیس ہزار درہم ادا کرائے۔ میرے لیے ایک کشتی مع تمام لوازم کے تیار کیے جانے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ میرے لیے شام کی نادر چیزیں خرید کر ساتھ کر دی جائیں" تاکہ مدینے کو بطور سوغات لے جا سکوں۔ نیز اپنے عراقی وکیل کو حکم دیا کہ میرے لیے مدینے تک کی سواری کا انتظام کرے، اور مجھے ایک دھیلا اس مد میں خرچ کرنا نہ پڑے۔ میں اپنے ساتھیوں میں آیا تو یہ سب قصہ انھیں سنایا۔ میں نے اُن لوگوں کو قسم دلا کر کہا کہ مجھ پر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا تھا وہ سب مجھ سے لے لیں مگر وہ قسم کھانے لگے کہ ہرگز ایک درہم بھی نہیں لیں گے۔ خدا کی قسم میں نے ایسے اخلاق والے لوگ کم ہی دیکھے ہیں۔ اب بتاؤ کہ اگر میں یحییٰ بن خالد سے محبت رکھتا ہوں تو کیا یہ بات "قابلِ ملامت ہے؟")

یہ آخری الفاظ بتا رہے ہیں کہ الواقدی نے یہ واقعہ یحییٰ برمکی کے زوال (۱۸۷ھ) کے بعد بیان کیا ہوگا۔ کیونکہ اس سے پہلے تو اُسے یحییٰ سے محبت ظاہر کرنے پر ملامت کا خوف ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ایک اور موقع پر بھی اس نے یحییٰ کی داد و دہش کا بہت اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔[۴۱۲]

یحییٰ دوسروں کی امداد کرنے میں کتنا فراخ حوصلہ تھا، اس کی ایک اور مثال الواقدی کے شاگرد ابنِ سعد کے یہاں ملتی ہے جسے ہم یہاں درج کرتے ہیں، اس مثال سے اُس دور کی گھریلو زندگی اور سماجی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

" مجھ سے عبداللہ بن عبیداللہ نے بیان کیا": میں الواقدی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ یحییٰ بن خالد کا ذکر چھڑ گیا۔ الواقدی نے اُس کے لیے دعائے مغفرت کی اور دیر تک رحمت کی دعا کرتا رہا تو ہم نے اُس سے کہا کہ ابو عبداللہ تم اس کے لیئے اس قدر دعائے رحمت کر رہے ہو، کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ ایسے شخص کے لیے بھلا کیوں نہ دُعائے مغفرت کروں جس کا ایک واقعہ تمھیں ابھی سناتا ہوں: شعبان کا مہینا ختم ہوتے میں دس دن سے بھی کم رہ گئے تھے اور گھر میں نہ آٹا تھا، نہ ستو تھے، نہ کوئی اور ساز و سامان تھا۔ میں نے اپنے دل میں تین دوستوں کو چھانٹا اور سوچا کہ اُن سے اپنی ضرورت بیان کروں۔ میں اپنی بیوی امِّ عبداللہ کے پاس آیا تو وہ کہنے لگی:" ابو عبداللہ، تمھیں آخر ہو کیا گیا ہے؟ یہ وقت آ گیا اور گھر میں کھانے پینے کی کوئی شے موجود نہیں ہے اور رمضان سر پہ کھڑا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے تین دوستوں کے نام سوچ رکھے ہیں، اُن سے اپنی حاجت بیان کروں گا۔ اُس نے پوچھا کہ وہ عراقی ہیں یا مدنی؟ میں نے بتایا کہ اُن میں سے کوئی عراقی ہے اور کوئی مدنی ہے۔ بولی میں بھی تو سنوں کون کون ہیں؟ میں نے نام لیا کہ فلاں۔ کہنے لگی کہ ہاں ہے تو خاندانی پیسے والا بھی ہے، مگر احسان جتائے گا، میری رائے میں اُس سے سوال کرنا مناسب نہیں"۔ پھر میں نے دوسرا نام لیا تو بولی کہ" یہ بھی اچھے خاندان کا، اور مالدار ہے، مگر کنجوس ہے، میری رائے میں اِس کے پاس جانا بھی مناسب نہیں"۔ پھر میں نے کہا: اچھا تو" فلاں"۔ کہا: یہ بھی شریف آدمی ہے، دریا دل بھی ہے، مگر اس کے پلّے کچھ نہیں۔ میرا خیال ہے اس سے کہنے میں کچھ حرج نہیں۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس سے ملاقات ہوئی، تو بہت خندہ پیشانی سے ملا، اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا، پھر کہنے لگا:" ابو عبداللہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے اُسے بتایا کہ رمضان سر پہ ہے اور میرا ہاتھ ان دنوں تنگ ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا: اچھا اس تکیے کی تہ کھولو اور وہ تھیلی نکال لو، جو کچھ اس میں ہے سب جھاڑ لو اور اپنے کام میں لاؤ"۔ میں نے دیکھا تو وہ کھلائے ہوئے درہم تھے۔ خیر وہ تھیلی میں نے اٹھالی اور اپنے گھر پہنچا اور اُس شخص کو بلایا جو بازار سے میرا سودا سلف لایا کرتا تھا اور کہا لکھو:" دس قفیز (ایک پیمانہ ہے) ایک قفیز چاول، اتنی ہی شکر وغیرہ، اسی طرح سب ضروریات لکھوا دیں۔

ابھی میں لکھوا ہی رہا تھا کہ دروازہ پر کھٹکا ہوا، میں نے کہا دیکھو تو کون ہے؟ باندی نے آکر بتایا کہ" فلاں بن فلاں بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب تشریف لائے ہیں۔ میں نے کہا:" اندر بلا لو۔ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا، انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ" سیدی" کیسے تشریف آوری ہوئی؟" وہ کہنے لگے:" چچا میاں اس لیے گھر سے نکلا ہوں کہ رمضان سر پہ آ گئے ہیں اور میرے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے"۔ میں ذرا دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، پھر اُن سے کہا کہ" اس تکیے کی تہ کھولو، اور تھیلی میں جو کچھ ہے سب لے لو"۔ انہوں نے تھیلی نکال لی، میں نے اپنے ساتھی سے کہا بس تم چلے جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ اب پھر امّ عبداللہ آئیں اور بولیں:" یہ نوجوان جو آیا تھا اِس کے لیے تم نے کیا کیا؟" میں نے کہا" ساری تھیلی اُس کو دے دی"۔ اُس نے کہا" بہت اچھا ہوا، خدا نے تمھیں نیکی کی توفیق دی"۔

اب میں نے ایک اور دوست کا خیال کیا جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا تھا اور جوتے پہن کر سیدھا اُس کے گھر پہنچا۔ میں نے دروازہ پر دستک دی اُس نے اندر بلا لیا۔ میں اندر پہنچا تو اُس نے آداب تسلیمات کے ساتھ اپنے قریب بٹھا لیا اور

پوچھا کہ "ابوعبداللہ کیسے زحمت کی"۔ میں نے اُسے بتایا کہ "رمضان قریب ہے، اور میرے پاس کچھ نہیں ہے"، تو وہ کچھ دیر تک فکر میں ڈوبا رہا، پھر کہنے لگا کہ "اچھا اس تکیے کے نیچے سے تھیلی نکالو، اور آدھی رقم تم لے لو، آدھی میرے لیے چھوڑ دو"۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بالکل میری والی ہی تھیلی ہے میں نے اُس میں سے پانسو درہم نکال لیے اور پانسو چھوڑ دیے، اب اپنے گھر آیا اور اس شخص کو پھر بلوایا جو میرا سودا لایا کرتا تھا اور اُسے لکھوانا شروع کیا: پانچ قفیز آٹا ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ"۔ اس نے سب ضروریات لکھ لیں۔

ابھی ہم اس سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ پھر دروازہ پر دستک ہوئی۔ میں نے نوکر سے کہا، دیکھو کون ہے؟ اس نے واپس آکر بتایا کہ کوئی شریف لازم معلوم ہوتا ہے"۔ میں نے کہا" اندر بلا لو۔ وہ آیا تو اُس نے یحییٰ بن خالد کا ایک خط دیا، جس میں اُس نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ میں نے قاصد سے کہا تم ذرا باہر چلو۔ پھر میں نے کپڑے بدلے اور اپنی سواری پر گھر سے نکلا۔ وہ خادم میرے ساتھ تھا۔ جب یحییٰ بن خالد کی ڈیوڑھی پر آیا اور اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ صحن میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو میں نے سلام کیا۔ اس نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا، اپنے قریب بٹھایا، اور آواز دی: "ارے لڑکے ان کے لیے تکیہ لاؤ"۔ اب میں اُس کے نزدیک بیٹھ گیا، وہ کہنے لگا: "ابوعبداللہ جانتے ہو۔ میں نے اس وقت کیوں بلایا ہے"؟ میں نے کہا: "نہیں"۔ بولا: "مجھے تمہارا خیال کر کے رات بھر نیند نہیں آئی کہ یہ ماہِ مبارک آرہا ہے اور تمھارے پاس کچھ نہیں ہے"۔ میں نے کہا: "خدا وزیر کو سلامت رکھے، میری داستان تو بڑی طولانی ہے"۔ کہنے لگا: "جتنی زیادہ طویل کہانی ہوگی میں اتنی ہی دلچسپی سے سنوں گا"۔ میں نے اسے اپنی بیوی کی بات سنائی اور اپنے اُن تین دوستوں کا قصہ سنایا اور اُس نے اُن تینوں کے بارے میں جو رائیں ظاہر کی تھیں، وہ بتائیں پھر اُس طالبی (سیدزادہ) کا آنا بتایا اور اُس دوست کا قصہ بھی سنایا۔ جس نے اپنی تھیلی میں سے آدھی رقم میرے حوالے کر دی تھی۔ اب یحییٰ نے نوکر کو آواز دی، "لڑکے دوات لاؤ" اور اپنے خزانچی کو ایک رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں پانسو دینار آگئے۔ کہنے لگا: "ابوعبداللہ لو اس سے اپنا رمضان کا خرچ چلاؤ"۔ پھر ایک اور چٹھی خزانچی کو لکھی، تو ایک تھیلی آگئی، جس میں دو سو دینار تھے اور بولا "یہ اُمِ عبداللہ کے لئے ہیں، اُن کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا صلہ"۔ پھر ایک اور چٹ اُٹھائی، اور ایک تھیلی آگئی، جس میں دو سو دینار تھے، وہ بولا یہ اس سیدزادہ کے لیے ہیں۔ پھر ایک اور رقعہ لکھا اور دو سو دینار کی ایک اور تھیلی آگئی، بولا یہ تمھارے ساتھ سلوک کرنے والے شخص کا صلہ ہے، پھر کہنے لگا:" ابوعبداللہ اب جاؤ خدا حافظ"۔ میں فوراً سوار ہوا اور پہلے اُس دوست کے پاس آیا جس نے اپنی تھیلی میں سے آدھا مال مجھے دیا تھا اور اُسے میں نے اس کے دو سو دینار ادا کیئے اور یحییٰ بن خالد کا معاملہ اُسے بتایا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ پھر میں اُس طالبی کے پاس گیا اور اُس کی تھیلی اُسے دی اور یحییٰ بن خالد کا قصہ سنایا، اُس نے دُعائیں دیں اور شکر ادا کیا۔ پھر میں اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اُمِ عبداللہ کو بلایا اور اسے تھیلی دکھائی، اس نے بھی دعائیں دیں اور جزائے خیر طلب کی۔ تو اب بتاؤ کہ برامکہ سے خصوصاً یحییٰ بن خالد سے محبت کرنے پر میں ملامت کا مستحق ہوں؟

المسعودی[۴۱۳]، یاقوت[۴۱۴] اور ابنِ خلکان[۴۱۵] نے یہی قصہ بعض جزوی اختلافات کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مامون الرشید کے عہد کا واقعہ ہے، مگر ابن سعد کا بیان قدیم ترین ہے اور خود الواقدی سے مروی ہے۔

ایک اور روایت، جس کا راوی مجہول[۴۱۶] ہے، یہ ہے کہ ہارون الرشید نے الواقدی کو بغداد کے مشرقی حصے کا قاضی بنا دیا تھا۔

دوسری خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۷ھ میں قاضی تھا، یہ ہارون الرشید ہی کا عہد ہوا۔[417] مگر قدیم ترین تراجم میں اس کا حوالہ نہیں پایا جاتا۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ المامون نے الواقدی کو المہدی کے لشکر کا قاضی بنا دیا تھا، یہ جگہ رصافہ بھی کہلاتی تھی[418] اور یہی بغداد سے جانب شرق واقع تھی۔[419] مگر یہ ۲۰۴ھ کے اوائل کی بات[420] ہے، جب الواقدی بغداد آیا تھا۔ مامون الرشید الواقدی پر اعتماد کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک بار الواقدی نے خلیفہ سے درخواست کی کہ اُس پر قرض بہت ہو گیا ہے، اسے ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔[421] الواقدی اپنی فیاض طبیعت کے باعث اکثر مقروض رہتا تھا۔[422] خلیفہ نے درخواست کے حاشیے پر لکھا: "تمھارے اندر دو صفات ہیں، سخا اور حیا۔ سخاوت کے سبب سے تو یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ تمھیں ملتا ہے سب اُڑا دیتے ہو اور حیا تمھیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ اپنا صرف تھوڑا سا قرضہ ظاہر کرو، اس لیے ہم نے حکم دیا ہے کہ جو تمھارا مطالبہ ہے اُس کا دوگنا تمھیں دیا جائے۔ اگر اب بھی ہم تمھاری حاجت کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہوں تو یہ تمھاری اپنی کوتاہی ہے اور اگر اس سے تمہاری ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو آئندہ اور بھی کشادہ دستی سے خرچ کرو، اس لیے کہ اللہ کے خزانے کھلے ہوئے ہیں اور نیکی میں اعانت کے لیے اُس کے ہاتھ ہمیشہ وسیع ہیں۔ تمھیں نے ایک بار مجھے یہ حدیث سنائی تھی، جب تم ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الزبیر سے فرمایا تھا کہ اے زبیر رزق کے خزانوں کی کنجیاں عرش کے سامنے پڑی رہتی ہیں اور اللہ سبحانہ بندوں کے رزق ان کے خرچ کے مطابق نازل کرتا رہتا ہے، جو زیادہ خرچ کرتا ہے اس کے رزق میں زیادتی کر دی جاتی ہے جو اپنا خرچ گھٹاتا ہے (کنجوسی کرتا ہے) اس کا رزق بھی گھٹا دیا جاتا ہے۔" الواقدی نے کہا کہ میں اس حدیث کو بھول چکا تھا، اس کے یاد دلانے کی خوشی مجھے خلیفہ کے انعام سے زیادہ ہوئی۔"

الواقدی نے خلیفہ المامون کے عہد میں وفات پائی، خلیفہ کو الواقدی نے اپنی وصیتیں جاری کرنے کے لیے نگران بھی بنایا تھا۔[423] اُس کی وفات ۲۰۷ھ کے اواخر میں ۷۸ سال کی عمر میں ہوئی اور خیزران کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔[424]

الواقدی اپنے عہد کے تمام علوم حاصل کرنے کا شائق تھا، چنانچہ جتنی کتابیں بھی اسے مل سکیں اُس نے سب کی نقل حاصل کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ وفات کے وقت اس نے چھ سو پیٹیاں کتابوں سے بھری ہوئی چھوڑی تھیں۔[425] یہ اُن دو غلاموں کی لکھی ہوئی تھیں جو اُس کے لیے دن رات نقل کا کام کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دو ہزار دینار اس نے کتابوں کی خریداری پر صرف کیے تھے۔ یہی کتب خانہ اس کی ان تمام علمی سرگرمیوں کی اساس تھا جو مختلف شعبہ ہائے علوم پر حاوی تھیں۔ الفہرست میں اُس کی ۲۸ تصانیف کے نام ملتے ہیں۔[426] اسی طرح یاقوت نے معجم الادبا میں ایک فہرست درج کی ہے جو بنیادی باتوں میں ابن ندیم کے بیان سے مختلف نہیں ہے۔[427] یہاں وہ فہرست درج کی جاتی ہے:

(الف) کتب فقہ و علوم قرآنی و حدیث وغیرہ .....

۱۔ کتاب الاختلاف — اس کتاب میں کوفی اور مدنی فقہا کے اختلافات بیان ہوئے ہیں جو شفعہ، صدقہ، عُمرٰی وغیرہ فقہی مسائل سے متعلق ہیں۔[428]

۲۔ کتاب غلط الحدیث

۳۔ کتاب السنة والجماعة وذمّ الهویٰ[۲۲۹]

۴۔ کتاب الذکر القرآن

۵۔ کتاب الأدب

۶۔ کتاب الترغیب فی علم القرآن[۲۳۰]

(ب) کتب تاریخی

۷۔ التاریخ الکبیر

۸۔ التاریخ والمغازی والبعث

۹۔ اخبار مکّة

۱۰۔ ازواج النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم

۱۱۔ وفاة النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم

۱۲۔ السّقیفة وبیعة أبی بکر

۱۳۔ سیرة ابی بکر ووفاته

۱۴۔ الرِدّة والدّار

۱۵۔ السّیرة

۱۶۔ أمر الحبشة والفیل

۱۷۔ حرب الأوس والخزرج

۱۸۔ المناکح[۲۳۱]

۱۹۔ یوم الجمل

۲۰۔ صفّین

۲۱۔ مولد الحسن والحسین

۲۲۔ مقتل الحسین[۲۳۲]

۲۳۔ فتوح الشّام

۲۴۔ فتوح العراق

۲۵۔ ضرب الدّنانیر والدّراهم

۲۶۔ مراعی قریش والانصار فی القطائع ووضع عمر الدواوین[۲۳۳]

۲۷- طبقات

۲۸- تاریخ الفقہاء

مندرجہ بالا فہرست میں مذکورہ کتابوں کے علاوہ ابن سعد نے ایک "کتاب طُعَم النّبی" بھی الواقدی سے منسوب کی ہے[۴۳۴] بظاہر اس کتاب میں اُن محاصل کا بیان ہوگا جو خیبر کی جاگیر سے رسول اللہؐ کی ازواج مطہرات اور دوسرے افراد کو دیئے جاتے تھے اور غالباً یہ "المراعی" کی ایک فصل رہی ہوگی - اسی وجہ سے ابن الندیم اور یاقوت کے یہاں اس کا نام موجود نہیں ہے۔ کتب تاریخی میں سے دو (یعنی نمبر ۱۶، ۱۷ بلکہ شاید ۱۹ بھی) مکہ اور مدینے کی دورِ جاہلیت کی تاریخ سے بحث کرتی ہیں۔ باقی میں سے چار کتابیں (۸- ۱۰- ۱۱- ۱۵) سیرۃ نبوی یا اُس سے متعلقہ موضوعات پر ہیں اور بقیہ تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رونما ہونے والے تاریخی حوادث کا ذکر ہے - ان کتابوں کے بہت سے اقتباسات دوسری تاریخوں میں محفوظ ہیں مثلاً: "کتاب الرِدّۃ والدّار" کے طویل اقتباسات ابن حُبَیش (متوفی ۵۸۴ھ) کی ہنوز غیر مطبوعہ "کتاب غزوات" میں پائے جاتے ہیں جس سے CAETANI لیونی کیتانی ڈیوک آف سرمونیٹا نے اپنی تالیف "حولیاتِ اسلام" ANNALI DELL' ISLAM کی فصل "رِدّۃ" میں فائدہ اٹھایا ہے - اس میں رسول اللہ کی وفات کے بعد ہونے والی عرب قبیلوں کی بغاوت کا حال ہے۔ الواقدی کی یہ کتاب پہلے زمانے میں اسپین میں بھی معروف رہی ہے، چنانچہ ابوخیر (متوفی ۵۷۵ھ) اپنی فہرست میں اس کا ذکر کرتا ہے[۴۳۵] اور اسے "کتاب الردّۃ" کہتا ہے، جبکہ یہ زمانہ مابعد کی کتابوں میں "کتاب الردّۃ والدّار" کے نام سے مذکور ہوئی ہے - ہوسکتا ہے کہ "یوم الدّار" سے ان لوگوں کی مراد خلیفہ عثمان کی شہادت کا دن ہو، جیسا کہ یہ پہلے کہلاتا تھا مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ۱۱ھ کے واقعہ ردۃ کو الواقدی نے ۳۵ھ کے یوم الدّار سے ایک ہی کتاب میں کس طرح مربوط کیا ہوگا - شاید یہ دو الگ الگ مستقل تالیفات رہی ہوں اور بعد کو غلطی سے انہیں جوڑ دیا گیا ہو[۴۳۶] شہادت عثمان سے متعلق الطبری کے یہاں الواقدی کے متعدد اقتباسات ہیں جن کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ وہ "کتاب الدّار" سے ماخوذ ہوں گے[۴۳۷] "التاریخ الکبیر" کے بارے میں بظاہر یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس میں اسلامی تاریخ کے سارے اہم واقعات تاریخی ترتیب سے جمع کر دیئے گئے ہوں گے اور یہ کم سے کم ۱۷۹ھ تک کے حوادث ہوں گے[۴۳۸] الطبری نے اس کتاب سے بھی بہت سے اقتباسات لیے ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الواقدی نے یہ کتاب اپنے بغداد میں قیام پذیر ہونے سے پہلے تمام کر لی تھی -

الواقدی کی کتاب الطبقات سے (اور الہیثم بن عدی کے بعد الواقدی اس انداز پر کتاب لکھنے والا پہلا شخص ہے)[۴۳۹] ہمیں اُس کے شاگرد ابن سعد کی اسی قسم کی تالیف کی اساس معلوم ہوتی ہے - مؤخر الذکر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ الواقدی نے زیادہ تر مدنی اصحاب رسول اور ان کی اولاد کے طبقات سے بحث کی تھی - ان کے ساتھ کوفہ اور بصرہ کے محدثین کے طبقات کا بیان تھا اگرچہ اس میں کچھ زیادہ نظم و ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا[۴۴۰] الواقدی کی کتاب الطبقات کو ہم ایک طرح سے سیرۃ کے موضوع پر اس کی دوسری تالیفات کا تکملہ سمجھ سکتے ہیں - ابن سعد نے اپنی کتاب کے متعلقہ ابواب میں ان کتابوں میں سے اُن سے فائدہ اٹھایا ہے جن میں ازواج مطہرات کا ذکر ہے یا رسول اللہ کی وفات کا بیان ہے - ایک اور کتاب کی ایک فصل سے بھی اُس نے مواد

حاصل کیا ہے، جس میں رسول اللہ کے مکتوبات یک جا کر دیے گئے تھے۔ مگر اس کا تذکرہ علیحدہ تالیف کی حیثیت سے نہیں آتا اور شاید یہ "سیرۃ" ہی کا ایک باب تھا۔ الواقدی کی سیرۃ یا "کتاب البعث" (جس میں ظاہر البعثت نبوی سے ہجرت تک کے واقعات قلمبند ہوئے تھے) کے اقتباسات بھی ابن سعد کے یہاں مختلف مواقع پر پائے جاتے ہیں ابن سعد نے تاریخ اہلِ کتاب کے سلسلے میں ایک یا دو جگہ الواقدی کا حوالہ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو الواقدی زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مگر مکی زندگی کے واقعات کے ذیل میں الواقدی کا حوالہ کثرت سے ملتا ہے۔

الواقدی کی اتنی ساری تصانیف میں اگر کوئی کتاب مکمل حالت میں ہم تک آئی ہے تو وہ اس کی "کتاب المغازی" ہی ہے، الفریڈ خان کریمر نے اس کتاب کا پہلا تہائی حصہ" بلوتھکا انڈیکا" میں شائع کیا تھا یہ اس ناقص مخطوطہ پر مبنی تھا جو اُسے دمشق میں ملا تھا[442]۔ اِسی کتاب کا ایک ناقص اور دوسرا کامل مخطوطہ برٹش میوزیم میں بھی محفوظ ہے۔ جرمن زبان میں اس کا خلاصہ جو لیس ویل ہاؤزن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے شائع کیا ہے وہ انھیں نسخوں پر مبنی ہے۔ آوگسٹ فشر اب اس کا پورا عربی متن لائپزش میں اشاعت کے لئے تیار کر رہے ہیں[443]۔

اپنی "کتاب المغازی" کے آغاز میں الواقدی نے اُن راویوں کی ایک فہرست درج کی ہے جن سے وہ بکثرت روایت کیا ہے۔ اس میں ۲۵ نام ہیں۔ اس کے شاگرد ابن سعد نے بھی ان میں سے گیارہ راویوں کے لیے کہا ہے کہ یہ الواقدی کے اہم رواۃ میں سے ہیں[444]۔ اس فہرست پر ایڈورآرڈزا خاؤ نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[445]۔ اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ الواقدی نے بہت کم عمری میں اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے بعض رواۃ ۱۵۰ھ کے تھوڑے ہی عرصے بعد مرگئے، اس وقت الواقدی کی عمر ۲۵ سال یا اس سے بھی کم رہی ہوگی۔ ان راویوں میں تقریباً سب ہی یا تو مدینے کے باشندے ہیں، یا وہاں مقیم رہے ہیں، اس لحاظ سے ہم الواقدی کو "مدینہ اسکول" کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فہرست ان سب ناموں کی نہیں ہے جن کی روایات الواقدی نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں بلکہ یہ اُن لوگوں کے نام ہیں جن سے وہ بنیادی روایت اخذ کرتا ہے۔ اس میں کبھی انفرادی روایت بیچ میں آجاتی ہے جس کے لیے ہر بار وہ علیحدہ اسناد بھی درج کرتا ہے۔ ویل ہاؤزن نے اپنے ترجمے کے ساتھ جو فہرست رواۃ کی دی ہے۔ اس میں الواقدی کے سارے ہی راویوں کا نام آگیا ہے۔ ان سب بالواسطہ یا بلاواسطہ راویوں میں ممتاز یہی مؤلفین مغازی ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں، یعنی الزہری، معمر اور ابو معشر۔ کبھی کبھی موسیٰ بن عقبہ کا نام بھی نظر آجاتا ہے۔ مگر ابنِ اسحاق کا قطعاً کہیں حوالہ نہیں آیا۔ یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے، کیونکہ الواقدی نے ایک بیان میں جس کا اقتباس الطبری کے یہاں موجود ہے، ابنِ اسحاق کی بہت تعریف کی ہے[446]۔ وہ کہتا ہے:

"وہ مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عربوں کے ایام، انساب اور اخبار کا علم رکھنے والوں میں سے تھے اور کثرت سے اشعار کی روایت کرتے تھے، کثیر الحدیث تھے، عالم متبحر اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے شائق تھے، ساتھ ہی اِن سب فنون میں قابلِ اعتماد بھی تھے۔"

اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں[447] ہے کہ الواقدی نے ابن اسحاق کی کتاب سے فائدہ اٹھایا تھا، بلکہ ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے متقدمین میں سب سے زیادہ مواد اُسی سے اخذ کیا، شاید یہی سبب ہو کہ اس نے ابن اسحاق

کا نام ہی سرے سے اُڑا دیا تاکہ اُس کا بار بار ذکر کرنے سے یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ کتنا زیادہ استفادہ اس سے کر رہا ہے۔ بس آخر میں اس نے "وغیرھم قد حدثنی ایضاً ہی کے تحت ابن اسحاق کو رکھنا گوارا کر لیا۔

مگر الواقدی نے ابن اسحاق کے علاوہ بھی اُن تمام مصادر سے استفادہ کیا تھا جن کا حصول کسی طرح بھی اُس کے لیے ممکن تھا۔ اُس کے یہاں بہت کچھ وہ ہے جو ابن اسحاق کے یہاں بھی نہیں ملتا یا کم سے کم ابن اسحاق نے اُن راویوں کے حوالے سے بیان نہیں کیا ہے جن کا نام الواقدی لکھتا ہے۔ چنانچہ مدنی زندگی کے اخبار و حوادث میں اُس کی تالیف ابن اسحاق کی کتاب سے زیادہ جامع ہے، اگرچہ اس حصے کی بیشتر احادیث تاریخی نوعیت کی نہیں ہیں بلکہ انھیں فقہی مسائل سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور اس لحاظ سے الواقدی کی 'کتاب المغازی' کتبِ احادیث کے زُمرے میں آ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ الواقدی ایک کے بعد دوسری حدیث درج کر دیتا ہے اور اپنی کوئی شرح یا حاشیہ لکھ کر دونوں میں ربط و تسلسل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جیسا کہ ابن اسحاق کا معمول ہے۔

الواقدی قصائد کا استعمال بھی کثرت سے کرتا ہے۔ اگرچہ اُس کی کتاب کے جو مخطوطات ہمیں ملتے ہیں اُن میں بہت سے قصائد نہیں پائے جاتے، اس کا سبب یا تو یہ ہوگا کہ خود الواقدی نے ان مواقع پر یہ اشعار چسپاں نہیں کیے تھے، یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کے ناقلوں میں سے کسی نے تلخیص کرتے ہوئے ان اشعار کو حذف کر دیا ہوگا۔

لیکن اگر ہم ان سب اشعار کو بھی شمار میں رکھیں تب بھی ان کی تعداد ابن اسحاق کے درج کیے ہوئے اشعار کی مقدار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اپنے متقدمین کی تحریروں کے علاوہ الواقدی[۴۴۸] نے بنیادی وثائق اور دستاویزوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہوئے وہ کبھی تو اپنے شیوخ کے نقل کردہ متن پر انحصار کرتا ہے اور کبھی اپنی تحقیق ذاتی سے اس کی عبارت درج کرتا ہے۔ یہ کبھی تو متقدمین کی عبارت سے مطابق ہوتی ہے، کبھی اُس کی اپنی معلومات پر مشتمل ہوتی ہے[۴۴۹]۔ "کتاب المغازی" میں الواقدی نے رسول اللہؐ کے بعض احکام اور معاہدے درج کیے ہیں۔ ابن سعد کے یہاں اُس فصل میں جو رسائل نبوی سے متعلق ہے، زیادہ تر الواقدی ہی کے اس مجموعہ پر اعتماد کیا گیا ہے جو اس نے اپنی اور اپنے شیوخ کی محنت سے فراہم کیا تھا۔

مغازی کی ترتیب میں الواقدی نے ایک سوچی سمجھی اسکیم پر عمل کیا ہے۔ وہ اس طرح شروع کرتا ہے کہ کسی غزوہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے کس سنہ میں نکلے اور کب واپس تشریف لائے۔ اس کے بعد غزوہ کی خبریں ہوتی ہیں۔ جو ابواب ذرا طویل ہیں ان میں پہلے ایک بنیادی روایت درج کر دیتا ہے جو بہت سی انفرادی روایات کا مجموعہ ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ خاص خاص اخبار جوڑ دیے جاتے ہیں۔ آخر میں عموماً یہ بتاتا ہے کہ مدینے سے رسول اللہؐ کی غیر حاضری کے زمانے میں وہاں کس کس نے نیابت کی۔ پھر اس حادثے کی طرف اشارہ کرنے والی قرآنی آیات یا اشعار وغیرہ درج کر دیتا ہے اسی طرح ناموں کی فہرستیں وغیرہ......"

الواقدی اپنی کتاب میں ضمیرِ واحد متکلم کا استعمال شاذ ہی کرتا ہے۔ ہاں اسناد میں کبھی کبھی وہ خود آ جاتا ہے مثلاً "حدثنی

کذا وکذا" (مجھ سے ایسا ایسا بیان کیا گیا) اس کے باوجود الواقدی کو صرف متقدمین کی روایات کا جامع اور مرتب ہی نہیں سمجھنا چاہیے۔ حوادث کی تاریخوں کا تعین کرنے میں وہ اپنے پیش رو حضرات پر فوقیت رکھتا ہے اور اس کی کتاب نری معلوم حقائق کی تکرار ہی نہیں ہے بلکہ مستقل ریسرچ کا نتیجہ ہے[450]۔ علاوہ بریں، الواقدی نے اصولِ حدیث سے متعلق اپنے ریمارکس بھی لکھے ہیں۔ ابن سعد نے[451] الواقدی کا ایک مفصل رسالہ محفوظ کر دیا ہے جس میں وہ کسی اور کی سند دیے بغیر اپنے (ذاتی) خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسناد کا اتنا اہتمام کرنے والے کسی مصنف کے لیے جو اپنی سوانحی تفصیلات کے سوا (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کبھی کوئی تفصیلی عبارت بغیر ضروری اسناد درج کیے ہوئے نہ لکھتا ہو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اگرچہ محدثین الواقدی کو ثقہ نہیں سمجھتے[452] مگر سیرۃ، مغازی، فتوح اور فقہ میں وہ سند کا درجہ رکھتا ہے[453]۔ تاریخ میں اس کی دلچسپی فی الواقع ظہورِ اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ ابن اسحاق کے علی الرغم اس نے زمانۂ جاہلیت کے وقائع پر بہت ہی کم توجہ دی ہے اور اس سے بھی کمتر وہ تاریخِ رسالت کی طرف التفات کرتا ہے، چنانچہ ابراہیم الحربی کا قول ہے[454] کہ "الواقدی عہدِ اسلامی کی تاریخ کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا، مگر دَورِ جاہلیت پر اُس کی معلومات صفر ہیں۔"

"الفہرست" میں الواقدی کو شیعہ بتایا گیا ہے[455]۔ مگر وہ معتدل شیعہ تھا۔ اس کی تائید میں خود الواقدی کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ حضرت علیؓ کی ذات من جملہ معجزاتِ نبوی تھی۔ جس طرح وہ عصائے موسوی جو اژدر میں تبدیل ہو گیا تھا، حضرت موسیٰؑ کا معجزہ تھا، اور جس طرح مُردوں کو جلانا حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ تھا وغیرہ۔" مگر قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اللہ کے تعریفی کلمات جو مثلاً ہمیں ابنِ اسحاق کے یہاں ملتے ہیں الواقدی نے یا تو نقل ہی نہیں کیے یا انھیں ہلکا کر کے پیش کیا ہے۔ چنانچہ الواقدی نے حضرت علیؓ کے بارے میں رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل نہیں کیا[456] جو ابن اسحاق کی سیرۃ میں موجود ہے:

"أفلا ترضى يا علي ان تكون مني بمنزلة هارون من موسىٰ"	اے علی کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہارا وہی درجہ ہے جو ہارون کا موسیٰ کے ساتھ تھا۔

اسی طرح وہ کلمات جو رسول اللہ نے سورۂ توبہ نازل ہونے کے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جو ابنِ اسحاق[457] نے نقل کیے ہیں:

"لا يُؤدِّي عنِّي الا رجل من أهلِ بيتي"	تبلیغ رسالت کا کام میرے اہلِ بیت میں سے صرف ایک شخص پُورا کرے گا۔

حضرت علی کی منقبت کے کلمات کو حذف کر دینا یا انھیں ہلکا کر کے پیش کرنا ایک ایسے مؤلف سے حیرت انگیز ہے جسے شیعیت سے متصف کیا جاتا ہو، اور اس کی تاویل میں بس وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ابن الندیم نے اپنے قول پر بطورِ توضیح کہی ہے کہ الواقدی تقیہ کیے ہوئے تھا[458] یعنی وہ اپنے تشیع کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بعض دوسرے مقامات پر الواقدی نے اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جہاں حضرت علی کے لیے مدح کے اقوال لکھے ہیں وہیں ایسی باتیں بھی درج کر دی ہیں جو اُن کے خلاف پڑتی ہیں، مثلاً اُس نے یہ خبر نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات حضرت عائشہ کی گود میں ہوئی اور یہ قول بھی نقل کر دیا ہے کہ حضرت علی کی گود میں انتقال فرمایا تھا[459]۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ الفہرست کا مؤلف سب سے پہلا اور شاید تنہا مؤلف ہے جس نے الواقدی کو شیعہ بتایا

ہے حتیٰ کہ شیعوں کی کتب رجال میں بھی اُس کا نام نہیں پایا جاتا۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں دیکھ چکے ہیں، الواقدی کو عباسی خلفا کی سرپرستی حاصل تھی اور ظاہر ہے کہ یہ صرف حکمران خاندان کا احترام ہی تھا کہ اس نے بدر میں گرفتار ہونے والے دشمنانِ رسول کی فہرست میں سے العباس کا نام حذف کر دیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے مشرکین قریش کے لشکر کو سامانِ رسد فراہم کیا تھا۔ (مطعمون) اُن کی فہرست[۶۰] میں العباس کے نام کی جگہ صرف "فلاں" لکھا ہے۔ اسی طرح یہ قول بھی حاکموں کو خوش کرنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیت المال سے وظیفہ پانے والوں کی جو فہرست تیار کی تھی اُس میں سب سے پہلا نام العباس کا تھا۔[۶۱]

۳۔ محمدؐ بن سعد

مغازی کے جن مؤلفین کا ہم یہاں تذکرہ کر رہے ہیں اُن میں آخری نام محمد بن سعد کا ہے جسے الواقدی کا کاتب کہا جاتا ہے، اس کی کتاب کو ایڈورڈز خاؤ نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر ایڈٹ کیا ہے[۶۲] اور اس کے بارے میں اوٹولوتھ نے ۱۸۶۹ء میں ایک کتاب[۶۳] بھی لکھی ہے۔

محمد بن سعد بن منیع ۱۶۸ھ میں بصرے میں پیدا ہوا۔[۶۴] پھر وہ مدینے اور دوسرے شہروں میں رہا۔ ہم اُسے ۱۸۹ھ میں مدینے میں پاتے ہیں۔[۶۵] اُسے اگر الحسین بن عبداللہ بن عبیداللہ بن العباس[۶۶] کا مولیٰ کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ وہ خود الحسین کا مولیٰ تھا بلکہ یہ نسبت اُس کے دادا اور شاید باپ کو حاصل تھی کیونکہ الحسین کا انتقال ۱۴۰ھ یا ۱۴۱ھ میں ہو چکا تھا۔[۶۷] خود ابن سعد کے قول سے ظاہر ہے کہ عباسی خاندان کی یہ شاخ الحسین کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی[۶۸] اور ابن سعد کا اس شاخ سے کسی طرح کا علاقہ نہیں رہا تھا۔ بعض مراجع میں ابن سعد کو الزہری کی نسبت سے یاد کیا گیا ہے، اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ خود اُس نے یا اُس کے باپ نے قبیلہ قریش کی شاخ بنو زہرہ سے نسبت ولایت قائم کر لی ہوگی۔ الواقدی سے اُس کے روابط بغداد میں پیدا ہوئے اور بقول مؤلف الفہرست اس نے الواقدی کی تصانیف سے اپنی کتابوں کا زیادہ تر مواد حاصل کیا۔ ابن الندیم نے ابن سعد کی تصانیف میں صرف "کتاب اخبار النبی" کا ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن سعد نے صرف یہی کتاب اس شکل میں تالیف کی تھی جس میں یہ زمانہ مابعد میں شائع ہوئی۔ یہ اس نے اپنے شاگردوں کو روایت کی تھی تاکہ وہ اس کی روایت دوسروں سے کر سکیں۔ مگر "الطبقات" اپنی موجودہ صورت میں سب سے پہلے الحسین بن فہم (۲۱۱ - ۲۸۹ھ) نے محفوظ کی۔ پھر ۳۰۰ھ کے لگ بھگ ابن معروف نے ان دونوں کتابوں کو یکجا کر دیا[۶۹] اور "کتاب اخبار النبی" کو طبقات کا پہلا جز بنا دیا۔

اخبار النبی جو برلن ایڈیشن کے جزء اول، قسم اول، اور جزء ثانی کی قسم اول و ثانی پر مشتمل ہے، اس میں ایک تمہیدی فصل بھی ہے جس میں انبیائے پیشین کی تاریخ بیان ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ کے اجداد کا بیان بھی ہے۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایامِ طفولیت سے زمانۂ بعثت تک کا حال ہے، اسی میں دو فصلیں وہ ہیں جن میں وحی اول سے پہلے اور بعد کی علامات نبوۃ بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد پہلی دعوتِ اسلام سے ہجرت تک کے واقعات قلمبند ہوئے ہیں پہلی جلد کے دوسرے جز میں مدنی زندگی کے حالات ہیں جن میں وہ خاص طور پر رسول اللہ کے فرامین، عرب قبائل کے وفود آپ کے شمائل، طرزِ زندگی اور اثاث البیت کا تذکرہ کرتا ہے دوسری جلد کا پہلا جز غزوات نبوی کے لیے مخصوص ہے یعنی اس میں

مغازی اپنے لفظی معنوں میں ملحوظ رہے ہیں۔ دوسری جلد کے دوسرے حصے میں سیرۃ نبوی کا اختتامیہ ہے۔ یہ کئی مفصل فصلوں میں ہے، جن میں آپ کے مرض الموت، انتقال، تدفین اور میراث کا بیان ہے۔ اسی میں وہ مراثی بھی شامل ہیں جو مختلف لوگوں نے آپ کی وفات پر لکھے تھے۔ ان سب امور کے بعد اسی جلد میں جو کچھ ہے اس کا سیرۃ نبوی سے براہِ راست کوئی علاقہ نہیں بلکہ یہ مدینے کے نامور فقہا کے تراجم ہیں، یہاں سے گویا "طبقات" کا عملاً آغاز ہوتا ہے۔ اس ضمیمے کے پہلے باب کا عنوان "آخر اخبار النبی" یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ بیان ہوگا وہ سیرۃ سے متعلق نہیں ہے۔

ابن اسحاق کے بعد ابن سعد ہی وہ اولین مؤلف سمجھا جاتا ہے جس کی لکھی ہوئی سیرۃ مکمل حالت میں ہم تک پہنچتی ہے اور چونکہ الواقدی کی کتاب المغازی کے سوا ہمارے پاس سیرۃ پر کوئی مکمل کتاب نہیں ہے، اس لیے اس کو پہلا ہی مؤلف کہا جا سکتا ہے۔ ابن سعد نے بعض بعض مواقع پر ابن اسحاق سے زیادہ تفصیلات دی ہیں مثلاً ان فصلوں میں جو رسول اللہ کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں یا آپ کے رسائل و سفارات سے بحث کرتی ہیں، خصوصاً وہ حصے جو مرض اور وفات کے بارے میں ہیں جبکہ بعض دوسرے امور میں وہ سرسری گذر جاتا ہے، جن سے ابن اسحاق نے مفصل بحث کی ہے، جیسے اسلام سے پہلے عربوں کی وہ تاریخ، جس کا رسول اللہ کے اجداد سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ ابن سعد کے یہاں مواد کی باضابطہ تنظیم کا رجحان بھی ملتا ہے۔ وہ غالباً پہلا مؤلف بھی ہے جس نے "علامات النبوۃ" کو یک جا کیا ہے، اس سے زمانہ مابعد میں "دلائل النبوۃ" جیسی کتابوں کی تالیف کی گئی۔ اسی طرح اس نے اپنی کتاب کی فصل بصفتہ اخلاق رسول اللہ لکھ کر شمائل کے موضوع پر تصانیف کا راستہ ہموار کر دیا۔[۲۷]

ابن سعد اپنے تاریخی مواد میں الواقدی پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ الواقدی کا حوالہ تاریخ اہل کتاب کے ذیل میں بہت ہی کم دیتا ہے اور اس موضوع پر اس کا سب سے بڑا راوی ہشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے۔ مگر مدنی دور کے حوادث پر اس کا اہم مرجع الواقدی ہی ہے، اگرچہ ابن سعد نے دوسرے ذرائع سے فراہم کی ہوئی معلومات کو سمو کر ان روایات قصص کو کہیں کہیں طویل بھی کر دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی مدنی زندگی اور وہاں آپ کے کارناموں کے بارے میں بھی سب سے بڑا ذریعہ معلومات الواقدی ہی ہے اور اسی کی روایات کو دوسرے رُواۃ کے بیان سے جوڑ کر ابن سعد نے زیادہ تفصیلی بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس جن فصول میں رسول اللہ کے اخلاق و عادات کا بیان ہوا ہے، وہاں ابن سعد الواقدی سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ان مواقع پر الواقدی کا نام شاذ ہی نظر آتا ہے۔ جہاں عملاً "مغازی" ہی کا بیان آیا ہے ابن سعد[۲۸] شروع میں اپنے اہم راویوں کی فہرست درج کرتا ہے، جس میں الواقدی کا نام وہ نمایاں طور پر اور اپنے بلا واسطہ راوی کی حیثیت سے دیتا ہے، اسی طرح ترتیم بن یزید جس سے اس نے ابن اسحاق کی روایت اخذ کی اور حسین بن محمد جس نے ابو معشر کی روایات منتقل کیں اور اسماعیل بن عبداللہ جو موسیٰ بن عقبۃ کا راوی ہے اس فہرست میں ملتے ہیں۔ اس طرح ابن سعد کو اپنے علمائے متقدمین کے سرمایہ تک پہنچنے کے مواقع ملے ہیں، مگر مغازی کے معاملے میں وہ زیادہ تر الواقدی ہی پر اعتماد کرتا ہے۔ اگر ہم الواقدی کی "کتاب المغازی" سے ابن سعد کے بیانات کا تقابلی مطالعہ کریں تو ظاہر ہوگا کہ وہ الواقدی پر بیشتر اور ابن اسحاق، ابو معشر یا موسیٰ بن عقبۃ پر اس سے کمتر اعتماد کرتا ہے۔ ان غزوات میں سے ہر غزوہ کی تفصیلی روایت وہ اپنا ماخذ بتائے بغیر درج کرتا ہے، کیونکہ اس نے ابتدا ہی میں سب راویوں کے نام اکٹھے لکھ دیے

ہیں، پھر اُس بڑی روایت کے بعد وہ انفرادی روایتیں دیتا ہے، یہ بعض غزوات کے بارے میں بہت کثیر ہیں؛ ان میں سے ہر انفرادی روایت کے ساتھ اُس کا خاص اسناد بھی بیان کرتا ہے، اس اعتبار سے مغازی کے بیان میں ابن سعد کو الواقدی سے ایسی ہی نسبت ہے جیسی الواقدی کو ابن اسحاق سے ہے۔ مگر الواقدی کبھی کبھی ابنِ اسحاق کا سرے سے نام ہی نہیں لیتا، جبکہ ابن سعد کبھی یہ حقیقت نہیں چھُپاتا کہ اس کا اہم ماخذ الواقدی ہے۔ ہمیں یہ بات شروع ہی میں بتا دینی چاہیے کہ ابن سعد اپنی تالیف کی یکسانی کو باقی رکھنے کی خاطر بڑی روایت یا اساسی قصہ کے بیچ میں اپنے جمع کیے ہوتے اضافی مواد کو درج نہیں کرتا، بلکہ ایسی سب معلومات وہ لازماً آخر میں دیتا ہے، یہ طریقہ الواقدی کے برعکس ہے۔ ایک خصوصیت میں ابن سعد نے بھی الواقدی کے انداز کو پوری طرح نبھایا ہے، یعنی وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ رسول اللہ کی مدینے سے غیر حاضری کے زمانے میں وہاں کون حاکم رہا تھا، اور یہ کہ لشکر میں جھنڈا کس کے پاس تھا۔ یہ صحیح ہے کہ الواقدی نے بھی یہ سوالات اُٹھائے ہیں، مگر وہ ہر موقع پر لازماً ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکا ہے۔ ابن سعد نے رسول اللہ کے مرض الموت اور پھر وفات سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں غیر معمولی محنت کی ہے، یہاں بھی اُس کا خصوصی ماخذ الواقدی ہی نظر آتا ہے اور ابنِ سعد نے اُس کی "کتاب وفات النبی" سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن خود اُس نے ان روایات میں بہت عظیم اضافے کئے ہیں۔

ابن سعد اپنی کتاب میں مشکل ہی سے کہیں ذاتی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ قصہ سے متعلق بعض اقوال کو چھوڑ کر وہ شاید ہی کوئی بات ایسی کہتا ہو جس کا ماخذ نہ بتاتا ہو۔ اس نے اپنے شیوخ سے جو زبانی روایات لی ہیں۔ اُن کے علاوہ بعض دستاویزوں کے پورے متن بھی درج کیے ہیں۔ اسی طرح جن قصائد کا اس نے حوالہ دیا ہے، خصوصاً مراثی، اُن کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ مگر اس معاملے میں وہ الواقدی سے بہت مختلف ہے اور ابن اسحاق کے ساتھ ہم اس کا نام ایک ہی سانس میں نہیں لے سکتے۔

ابن سعد کی کتاب میں "الطبقات" جو زخاؤ ایڈیشن کی تیسری جلد سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کے آغاز میں وہ اپنے اہم رواۃ کی فہرست بھی دیتا ہے، اس میں بھی الواقدی کے علاوہ ہمیں ابن اسحاق، ابو معشر و موسیٰ بن عقبۃ کے نام نظر آتے ہیں، جن کی روایات اُس نے ان کے بالواسطہ یا بلا واسطہ شاگردوں سے حاصل کی ہیں۔ یہاں وہ اپنے راویوں میں معن بن عیسیٰ مدنی (متوفی ۱۹۸ھ) الفضل بن دُکین کوفی (متوفی ۲۱۹ھ) اور ہشام بن محمد بن السائب الکلبی الکوفی (متوفی ۲۰۴ھ) کا ذکر بھی کرتا ہے، موخر الذکر کا باپ محمد بن السائب مشہور نسّاب ہوا ہے۔ لیکن انصار کے نسب پر وہ شاید ایک اور راوی سے اخذ کرتا ہے جس کا نام عبداللہ بن محمد بن عمارۃ الانصاری ہے۔ یہ کتاب نسب الانصار کا مؤلف بھی تھا اور غالباً یہی عبداللہ بن محمد بن عمارۃ بن القداح ہے جس کا حال الذہبی کی "میزان" میں ملتا ہے، اس کے بارے میں ہمیں اور کچھ علم نہیں ہے۔

جہاں تک صحابہ وصحابیات کے تراجم و احوال کا تعلق ہے، "طبقات" کو سیرۃ نبوی کا اہم تکملہ سمجھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں پوری کتاب کی آٹھ جلدیں مخصوص ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ آپ کی گھریلو یا پبلک زندگی میں حصہ لیا، یا وہ اصحاب ہیں جنھوں نے آپ کے اعمال و اقوال کی روایت کی۔ اصحاب رسول کے تراجم کے بعد تابعون کا حال آتا ہے، جنھیں ذات نبوی سے براہ راست کوئی شخصی ربط قائم کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہاں میں طبقات کی دوسری خصوصیات کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کیونکہ لوتھ نے نہ صرف اپنے رسالے میں جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے، ان خصائص سے سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ اس کے علاوہ اپنے ایک مضمون

"طبقات کی اصل اور ان کی اہمیت" میں اس نے طبقات ابن سعد اور طبقات الواقدی کا موازنہ بھی کیا ہے[۴۷۹]۔ ابھی حال ہی میں ایڈورڈز خاؤ نے تیسری جلد (پہلا حصہ) کے ابتدائیہ میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ ابن سعد کے طریق کار سے بحث کی ہے۔

زمانۂ مابعد کی تاریخی تالیفات میں جن میں مثلاً الطبری، المسعودی یا الیعقوبی کی کتابوں کے نام لیے جا سکتے ہیں، سیرۃ نبوی تاریخ عالم کے ایک حصے کی حیثیت سے شامل کی جاتی ہے۔ یہ بہت مؤخر زمانے میں ہوا ہے کہ مؤلفوں نے علیحدہ سیرۃ ہی کے موضوع پر کتابیں لکھنے کی طرف دھیان دیا ہو، ان میں الحلبی[۲] (متوفی ۱۰۴۴ھ) اور ابن سید الناس (متوفی ۷۳۴ھ) بھی ہیں جن کی کتابوں میں ان مؤلفینِ مغازی کا، جن سے ہم بحث کر رہے تھے، پھر بار بار حوالہ دیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گولڈ تسیہر نے اس موضوع پر کچھ مواد اکٹھا کیا ہے۔ دیکھو: GOLDZIEHER : MUHAMMDANISCHE STUDIEN. VOLUME II P. 9 (اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ فاروقی)

نیز ZEITSCHRIFT DER DEUTSCHEN MORGANLADISCHEN GASELLSCHAFT VOL. 71 P. 439

(یعنی جرمن مستشرقین کی جماعت کا مجلہ۔ جلد ۷۱۔ ص ۴۲۹)

(لیکن یہ خیال درست نہیں۔ تدوین حدیث کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کی کتاب کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مرتبہ رسالہ "صحیفہ ہمام بن منبہ" طبع حیدر آباد ۱۹۵۶ء بھی ملاحظہ ہوں۔ فاروقی)

۲۔ الطبری ۱/۳۰۵۶

۳۔ " ۱/۳۱۰۴

۴۔ " ۱/۳۱۲۶

۵۔ " ۲/۸۷۳

۶۔ ابن سعد ۵/۱۱۲

۷۔ الطبری ۲: ۱۱۲۷

۸۔ الطبری ۲: ۹۴۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۵، ۱۰۳۹، ۱۰۴۶، ۱۰۸۵۔

۹۔ الاغانی ۳: ۱۰۷

۱۰۔ الطبری ۳: ۲۳۳۹، ابن سعد ۵: ۱۱۳

۱۱۔ ابن سعد ۵: ۱۱۳

۱۲۔ البلاذری: الفتوح ۴۷۰

۱۳۔ الواقدی (ترجمہ ولہوزن) ۲۸۸

۱۴۔ النووی ۱۲۵، ابن حجر: تہذیب ۱ : ۹۷

۱۵۔ ابنِ حجر: تہذیب ۱ : ۹۷

۱۶۔ 〃 ۱ : ۹۷

۱۷۔ ابن سعد نے ابان کا ذکر سیرۃ کے موضوع سے ہٹ کر کیا ہے جہاں حضرت عمر کے آخری کلمات کا بیان ہے جنھیں ابان نے اپنے باپ سے سُنا تھا۔ ابن قتیبہ (کتاب الشعر والشعرا) کہتا ہے کہ یہ اس خبر کے راوی ہیں کہ رسول اللہ نے کعب بن زہیر کو اپنی چادر عطا فرمائی تھی جسے معاویہ نے خرید لیا تھا اور اسے اموی خلفا خاص موقعوں پہ اوڑھتے تھے۔

۱۸۔ ابن سعد ۴ : ۲۹، الطبری ۱ : ۱۴۲۱

۱۹۔ فیوک Fück: محمد بن اسحاق ۸، ۲۷ ۔

۲۰۔ ابن سعد ۵ : ۱۵۶

۲۱۔ ابن سعد ۵ : ۱۸۵

۲۲۔ الطبری ۲ : ۱۳۰۵

۲۳۔ ایضاً ۲ : ۱۳۴۶

۲۴۔ کتاب الاغانی ۸ : ۹۲ - ۱۰۱

۲۵۔ طبقات ۵ : ۱۸۵

۲۶۔ الاغانی ۸ : ۹۶ یہ سات گواہ ہیں: اُبوبکر بن عبدالرحمٰن، القاسم بن محمد، عروۃ بن الزبیر، سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، خارجہ بن زید اور خود عبیداللہ۔

۲۷۔ الاغانی ۱ : ۵۰

۲۸۔ 〃 ۴ : ۱۶۳

۲۹۔ 〃 ۱۷ : ۱۲۰

۳۰۔ الطبری ۱ : ۱۳۱۳

۳۱۔ الاغانی ۲۱ : ۹۲

۳۲۔ البلاذری : الانساب (مرتبہ اہلورد) ۲۰۹

۳۳۔ البلاذری : الانساب ۶۳

۳۴۔ الاغانی ۶ : ۵۹ ابن خیثمہ کا قول ہے (ابن حجر: تہذیب ۷ : ۱۸۴) کہ یوم جمل کے موقع پہ عروہ تیرہ سال کے تھے۔ اس لحاظ سے ان کا سنہ ولادت ۲۳ھ ہوا۔

۳۵- ابن سعد ۵ : ۱۳۳، الطبری ا : ۳۱۰۳ تا ۳۱۱۳

۳۶- الطبری ۲ :۸۲، نیز LAMMER : ETUDES SUR LE REGNE DE MUAWIYA LER 3:218 SEQ.
(یعنی معاویہ اول کے عہدِ حکومت کا تاریخی مطالعہ جلد ۳ ص ۲۱۸ و بعدہ)

۳۷- قبیصہ بن ذؤیب الخزاعی

۳۸- البلاذری : الانساب ۲۵۷

۳۹- ابن خلکان : الوفیات طبع بولاق ا : ۲۹۹

۴۰- البلاذری: الفتوح (تحقیق دی غویہ) ۲۱۷

۴۱- الجمحی : طبقات الشعراء (تحقیق ہل) ۳۵

۴۲- الأغانی : ۱۴ : ۱۶۸

۴۳- البلاذری : الانساب : ۴۷

۴۴- الواقدی بحوالہ البلاذری : الانساب ۶۵، ۶۱، امیر بن حفص کی روایت ۶۳ المدنی عن عبداللہ بن سعید ۶۲

۴۵- عبداللہ بن الزبیر کی کنیت ہے، اس کے استعمال پر الحجاج کے اعتراض کا حوالہ اوپر آ چکا ہے۔

۴۶- قوسین کی عبارت انگریزی مضمون میں نہیں ہے، بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھی ہے، حسین نصار نے عربی متن کو اپنے ترجمے میں شامل کر لیا ہے۔ ہم نے اس کا بھی ترجمہ کر دیا۔ (اشارہ)

۴۷- الاغانی ۱۶ : ۴۵ -

۴۸- ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴- عروہ کی وفات ۹۴ھ میں ہوئی -

۴۹- الاغانی ۴ : ۱۱۹

۵۰- الاغانی ۱۶ : ۴۵ (طبع بولاق)

۵۱- ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴، ابن خلکان ا : ۵۶۸، الذہبی : تہذیب ۵، عروہ ایضاً

۵۲- ابن الماجشون فی کتاب الاغانی ۱۶ : ۴۶ -

۵۳- الطبری ۲ : ۱۱۸۳ (احکام شریعت میں مشورہ طلب کرنے کے لیے بلایا تھا۔)

۵۴- ابن سعد ۳ (الف) : ۸۲

۵۵- الاغانی ۸ : ۹۳

۵۶- المبرد : الکامل ۴۴۴

۵۷- ابن سعد ۵ : ۱۳۵

۵۸- العقیق میں ایک کنواں بھی "بئر عروہ" کے نام سے مشہور تھا۔ دیکھو معجم البلدان ا : ۴۲۳ ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴ -

۵۹۔ ابن سعد ۵ : ۱۳۵، ابن قتیبہ : المعارف ۱۱۴، البخاری : تاریخ

۶۰۔ ابن قتیبہ : المعارف ۱۴۴

۶۱۔ الطبری ۱ : ۱۷۶۵

۶۲۔ ابن سعد ۵ : ۱۳۳

۶۳۔ الذہبی : تہذیب (تحقیق FISCHER) ان رجال کے تراجم جن سے ابن اسحاق نے روایت کی۔

۶۴۔ ابن سعد ۵ : ۱۶۷

۶۵۔ ایضاً ۵ : ۱۶۴

۶۶۔ ایضاً ۵ : ۱۷۴

۶۷۔ ایضاً ۵ : ۱۷۳

۶۸۔ الطبری ۱ : ۱۱۸۰

۶۹۔ " ۱ : ۱۲۲۴

۷۰۔ " ۱ : ۱۲۳۴

۷۱۔ آیۃ یہ ہے "وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ فان انتھوا فان اللہ بما یعملون بصیر (القرآن ۸ : ۳۹)

۷۲۔ الطبری ۱ : ۱۲۸۴

۷۳۔ " ۱ : ۱۶۳۴

۷۴۔ " ۱ : ۱۶۵۴

۷۵۔ " ۱ : ۱۶۳۶

۷۶۔ " ۱ : ۱۹۷۰

۷۷۔ " ۱ : ۱۷۷۰

۷۸۔ " ۳ : ۲۴۵۸

۷۹۔ ابن ہشام ۳ : ۳۴۰، الطبری : تفسیر ۸ : ۴۲

۸۰۔ آیۃ کریمہ ہے : یاایھا الذین آمنوا اذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھن، اللہ اعلم بایمانھن فان علمتموھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار، لا ھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن، وآتوھم ما انفقوا، ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا آتیتموھن اجورھن، ولا تمسکوا بعصم الکوافر، و سئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا، ذلکم حکم اللہ یحکم بینکم واللہ علیم حکیم۔ (القرآن ۶۰ : ۱۰)

۸۱۔ دیکھو حاجی خلیفہ۔

۸۲- الطبری ۱ : ۱۲۳۵

۸۳- ایضاً ۱ : ۱۲۳۷، ۱۲۸۸، ۱۶۲۵

۸۴- ابن سعد ۵ : ۱۳۳

۸۵- ابن حجر : تہذیب ۷ : ۱۸۲

۸۶- ایضاً ۷ : ۱۸۳

۸۷- البلاذری : فتوح ۱۷۹

۸۸- ذہبی بحوالہ FISCHER : BIOGRAPHIEN

۸۹- الاغانی ۴ : ۱۱۹

۹۰- ایضاً ۱ : ۶۴

۹۱- ایضاً ۴ : ۱۵

۹۲- المبرد : الکامل ۳۵۷

۹۳- الاغانی ۱۳ : ۱۰۵ و بعد

۹۴- ایضاً ۱۰ : ۶۰

۹۵- الطبری ۱ : ۲۳۴۸، الاغانی ۳ : ۱۵

۹۶- ابن حجر : تہذیب ۴ : ۳۲۱ و مابعد

۹۷- ایضاً ۴ : ۳۲۱

۹۸- ابن سعد ۵ : ۲۲۸، ابن حجر ۴ : ۳۲۱، الذہبی (تحقیق فیشر) نیز مجلہ جماعتِ مستشرقینِ جرمنی ۴۴ : ۱۲ Z.D.M.G XLIV.12

۹۹- یاقوت : معجم البلدان ۱ : ۲۶۹

۱۰۰- ابن حجر ۱۰ : ۳۶۱ (ابن حجر نے یہ خبر اس طرح بیان کی ہے: شرجیل ابو سعد مغازی کے عالم تھے۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ جن لوگوں نے غزوہ بدر میں شرکت نہیں کی تھی یہ انھیں بھی شامل کر دیتے ہیں یا جو اُحد میں موجود نہیں تھے انھیں وہاں مقتول بتا دیتے ہیں۔ چونکہ یہ مفلس تھے اس لیے ان کا اعتبار جاتا رہا تھا۔ موسیٰ بن عقبہ نے جب سُنا تو کہا کہ لوگ اس شخص پر زیادتی کرتے ہیں جو بڑھاپے میں گھسٹ رہا ہے۔ انھوں نے شہدائے بدر واحد کے نام رجسٹر میں درج کر لیے اسی طرح مہاجرین حبشہ و مدینہ کو بھی لکھ لیا" اس خبر سے صاف ظاہر ہے کہ رجسٹر میں درج کرنے والے موسیٰ بن عقبہ تھے نہ کہ شُرجیل بن سعد جیسا کہ جوزف ہورووتس نے سمجھا ہے۔ حسین نصار)

۱۰۱- ابن حجر ۴ : ۳۲۱

۱۰۲- ابن سعد ۵ : ۲۲۸

۱۰۳- ابن حجر ۴ : ۳۲۱

۱۰۴- الذہبی : ۴۳۷
۱۰۵- ابن حجر ۴ : ۳۲۱
۱۰۶- ابن سعد ۱ : ۱۶۰
۱۰۷- وہب کے لیے دیکھو:

LIDZBATSKI : DE LEGENDIS QUAE DICUNTUR PROPHETICIS

۱۰۸- الطبری ۱ : ۱۷۶۳
۱۰۹- ایضاً ۱ : ۱۷۶۳
۱۱۰- ابن حجر ۱۱ : ۱۶۸
۱۱۱- مصنف کتاب عرائس المجالس فی قصص الانبیاً -
۱۱۲- المسعودی : مروج الذہب ۲، ۱۱۹ (طبع بولاق)
۱۱۳- الذہبی (تحقیق فیشر) : ۴۴۰
۱۱۴- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یمن کے اس گورنر کا تذکرہ دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔ ان کی گورنری کا زمانہ ۷۵ ھ سے ۴۷ ھ کے درمیان کسی وقت ہوگا جس عہد کے یمنی عالموں کے نام پردۂ خفا میں ہیں۔
۱۱۵- الذہبی : ۴۴۰
۱۱۶- ایضاً : ۴۳۹، ابن سعد ۵ : ۳۹۶
۱۱۷- یاقوت : معجم الادباً ۷ : ۲۳۲، الذہبی : ۴۴۰
۱۱۸- الذہبی : ۴۴۰ -
۱۱۹- ایضاً : ۴۴۲
۱۲۰- الذہبی : ۴۴۲، ابن حجر ۱۱ : ۱۶۸ وہب کا سنہ وفات معلوم کرنے کے لیے دیکھو معجم الادباً ۷ : ۲۳۲ و ابن سعد ۵ : ۳۹۶ -
۱۲۱- باستثناء الطبری ۱ : ۱۴۱۶
۱۲۲- ابن سعد ۵ : ۳۹۶ - لزبرسکی ۴۴ و بعد
۱۲۳- ابن سعد ۷ : ۹۷
۱۲۴- ابن ندیم : الفہرست ۹۴
۱۲۵- دیکھو ابن قتیبہ : کتاب المعارف ۴ - جس میں "مبتدأ الخلق و قصص الانبیاً" کو فنون المعارف میں سے پہلا "فن" ظاہر کیا گیا ہے۔
۱۲۶- منبر ۶ ۳ ۹۴
۱۲۷- معجم الادباً ۷ : ۲۳۲ -

۱۲۸- نسخۃ مصریہ من الف لیلۃ ولیلۃ : ۵۷

LA RECENCION EGYPTIENNE DES MILLE ET UNE NUITS 57 F

۱۲۹- یاقوت : معجم الادباء ۷ : ۲۳۲

۱۳۰- لزبرسکی : ۸ LIDZBARSKI : 8

۱۳۱- "کتاب الملوک المتوجہ من حمیر" اور "کتاب التیجان" دونوں دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے چھپ گئی ہیں۔ انھیں علما کی ایک جماعت نے مستشرق کرنکوف کے مشورے سے ترتیب دیا ہے۔ موخرالذکر نے اسلامک کلچر (۱۹۲۸ء) میں اس پہ ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا۔ (مترجم)

۱۳۲- نمبر ۸۹۳۲ -

۱۳۳- ابن سعد ۷ : ۹۷ جہاں وہب کے پوتے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ وہب کی کتابوں اور "حکمت" کے پڑھنے والے تھے۔

۱۳۴- BIBLIOTHECA ARAB - HISPANA IX 129

۱۳۵- BIBIOTHECA ARAB-HISPANA VOl. IX P. 294

۱۳۶- معجم الادباء ۷ : ۲۳۲ - ابن حجر ۹ : ۱۶۸

۱۳۷- رقم ۱۲۴۶۴

۱۳۸- PAPYRI SCHOTT-REINHART NO. 8

۱۳۹- ابن سعد ۷ : ۱ : ۹۷ - ابن قتیبہ : معارف ۲۶۱ - فہرست : ۹۴ -

۱۴۰- "عبدالمنعم بن ادریس بن سنان بن ابنۃ وہب"۔ وہب کی دختر کے شوہر ادریس نہیں تھے جیسا کہ جوزف ہورووتس نے لکھا ہے بلکہ صحیح صورت وہ ہے جو ہم نے اوپر لکھی یعنی ادریس کے باپ سنان وہب کے نواسے تھے۔ ابوالیاس غالباً ان کی کنیت ہے۔ (فاروقی)

۱۴۱- مجھے کتب رجال میں ابوالیاس کے بارے میں کچھ نہیں ملا۔ وہب کے داماد ادریس بن سنان کی کنیت بھی ابوالیاس ہے۔ مگر ہائیڈل برگ کے اوراق بردی میں عام طور سے یوں ملتا ہے: "عبدالمنعم عن ابیہ عن ابی الیاس"۔ (ج۔ھ)
عبدالمنعم کے باپ ابوالیاس کا ترجمہ دیکھیے ابن حجر: "تہذیب التہذیب ۱ : ۱۹۴"، بظاہر ہائیڈل برگ کے بردیہ کی عبارت محرّف ہے اور اس میں ایک "عن" زائد ہے۔ (مترجم)

۱۴۲- ابنِ ہشام ۴/۲۴۱ "اور جب اُن کا وفد واپس ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عمرو بن حزم کو اُن کی طرف بھیجا تاکہ انھیں اسلامی شعائر اور اصولِ دین کی تعلیم دیں اور اُن سے صدقات وصول کریں۔"

۱۴۳- الطبری ۱/۱۸۵۲ "رسول اللہ نے سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے بعد جن عاملوں کو یمن کی طرف بھیجا تھا یہ اُن میں سے ایک تھے۔ باذام کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کی ولایت شہر بن باذام، عامر بن شہر الہمدانی، عبداللہ بن قیس، ابوموسیٰ الاشعری، خالد بن سعید بن العاص، طاہر بن ابی ہالہ، یعلیٰ بن اُمیّہ اور عمرو بن حزم میں تقسیم کر دی گئی تھی۔" الطبری تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب رسول اللہؐ نے انتقال فرمایا تو عمرو بن

حزم نجران کے عامل تھے (۱/۱۹۸۲)

۱۴۴۔ الطبری ۲/ ۱۷/ ۴۱۶

۱۴۵۔ الطبری ۲/ ۱۱۹۱" یہ اس سال (۸۰ھ) مدینہ کی قضا پر فائز تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے ابوبکر بن عمرو بن حزم فائز تھے" نیز الطبری کا بیان ہے (۲/۱۲۵۸) کہ عثمان بن حیّان ۹۳ھ میں مدینے کے والی ہو کر آئے اور انہوں نے ابوبکر بن حزم کو قاضی مقرر کیا"

۱۴۶۔ الذہبی: (تحقیق: فیشر۔ تراجم ۹۰)" ابن وہب نے مالک سے روایت کی کہ اہل مدینہ میں کسی کو اتنا علم اور تجربہ قضا کا نہیں تھا جتنا ابوبکر بن حزم کو تھا۔ نیز دیکھو: ابن حجر ۱۲/ ۳۹۔

۱۴۷۔ الذہبی: ۹۰" عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے بیان کیا کہ اُن کے باپ نے ابان بن عثمان سے قضا سیکھی تھی"

۱۴۸۔ الذہبی: ۸۹" انھیں سُلیمان سے اور عمر بن عبدالعزیز سے قضا اور امارۃ اور موسم (امارۃ حج) مدینہ کے لیے حاصل تھا"

نیز دیکھو: الطبری ۲/ ۱۲۸۲ و ۱۳۰۵۔

۱۴۹۔ ابن حجر: ۱۲/ ۳۹" ابوبکر بن حزم کے سوا انصار مدینہ میں سے کوئی امیر نہیں ہوا۔ یہ وہاں کے قاضی بھی تھے"

۱۵۰۔ الطبری ۲/ ۱۳۴۶" اس سال (۹۹ھ) ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے لوگوں کے ساتھ حج کیا یہ مدینہ میں عمرِ ثانی کے گورنر تھے" نیز الطبری کہتا ہے" اس سال (۱۰۰ھ) ابوبکر بن محمد بن حزم نے لوگوں کے ساتھ حج کیا" (الطبری/ ۱۳۵۸)

۱۵۱۔ الطبری ۲/ ۱۳۷۳" ابوبکر بن حزم سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ: جب عبدالرحمٰن ابن الضحاک مدینے میں داخل ہُوا اور اس نے مجھے معزول کیا تو ایک دن میں اُس سے ملنے گیا"

۱۵۲۔ الطبری ۲/ ۱۳۷۳" اور یہ معاملہ بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ان کے پاس بنو فہر (یعنی قریش) کے ایک شخص اور ایک نجاری (انصاری) کا مقدمہ پیش ہوا تو اُنھوں نے نجاری کے حق میں فیصلہ دیا۔ [یہاں قومی عصبیت کی پاسداری مراد ہے۔ بنو نجار انصاری مدنی تھے اور بنو فہر قریشی مکّی] (نثار احمد فاروقی)

۱۵۳۔ الطبری ۲/ ۱۴۵۲۔ الواقدی کہتا ہے کہ خالد کی معزولی کے دن ابوبکر بن عمرو بن حزم کو خط ملا، جس میں اسے مدینے کا والی مقرر کیا گیا تھا چنانچہ وہ منبر پر چڑھے اور چھ دن تک نماز پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ محمد بن ہشام مکہ سے آکر مدینہ کے گورنر ہوئے۔

۱۵۴۔ الذہبی/ ۹۱۔" الہیثم بن عدی، یحییٰ بن بکیر اور ابو مثنیٰ نے کہا کہ انھوں نے ۱۱۷ھ میں انتقال کیا۔ واقدی، ابن سعد اور ایک جماعت کا قول ہے کہ ۱۲۰ھ میں فوت ہوئے"

۱۵۵۔ الذہبی/ ۹۱" یہ اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا کرتے تھے کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم حدیث سے شغف رکھتے ہو، اور محدثوں کی صحبت میں بیٹھتے ہو کسی حدیث میں آگے نہ بڑھنا جب تک اس کا پچھلا حصہ نہ سن لو اور پھر پورے سیاق و سباق کی روشنی میں استدلال کرنا"

۱۵۶۔ ابن سعد ۲/ ۱۳۴" عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد ابن عمرو بن حزم کو لکھا:" أن أنظر ما كان من حديث رسول الله صلّى الله عليه وسلّم أو سنّة ماضية أو حديث عمرة بنت عبد الرحمٰن فاكتبه. فإني قد خفت

…وس العلم وذہاب أهله" اور ابنِ حجر کہتا ہے (۱۲/۳۹) ابنِ وہب نے مالک سے روایت کی، جنھیں عمر بن عبدالعزیز نے والی بنایا تھا۔ اور انھیں لکھا کہ عَمرۃ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم ہے اُسے قلمبند کرلیں"۔

۱۵۷۔ ابنِ حجر ۱۲/۴۳۸ "عمرۃ بنت عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارۃ، انصارِ مدینہ میں سے تھیں اور حضرت عائشہؓ کی سہیلی تھیں، جن سے انہوں نے روایت کی ہے۔ اُمِ ہشام بنت حارثہ بن النعمان اور حبیبہ بنت سُہل ان کی خالائیں تھیں"۔

۱۵۸۔ ابنِ حجر ۱۲/۳۹ "میں نے اُن کے بیٹے عبداللہ بن ابی بکر سے ان کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ضائع ہوگئیں۔

۱۵۹۔ الطبری ۳/۲۵۰۵ "اور محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمر بن حزم مدینے کے قاضی تھے۔ یہ مسجد میں مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بنو عباس کے ابتدائی عہد یعنی ۱۳۲ھ میں وفات پائی اس وقت اُن کی عمر ۷۲ سال تھی۔

۱۶۰۔ ابنِ حجر/۱۶۵ ج ۵ "مالک نے کہا کہ: مجھ سے ابن عزایہ نے بیان کیا۔ کہا: کہ مجھ سے ابن شہاب نے کہا" مدینے میں کون ہے (یعنی سب سے ممتاز عالم) بتاؤں؟" اور کہا کہ: عبداللہ بن ابی بکر کی مثل کوئی نہیں ہے۔ مگر وہ پسند نہیں کرتے کہ جب تک اُن کے والد بقیدِ حیات ہیں اِن کی قابلیت کا شہرہ زیادہ کیا جائے"۔

۱۶۱۔ ابن حجر/ج ۵ ص ۱۶۵ ۔" انھوں نے ۱۳۵ھ میں انتقال کیا، بعض نے ۱۳۰ھ لکھا ہے، یہ بھی کہتے ہیں، انھوں نے ۷۰ سال کی عمر پائی"۔

۱۶۲۔ الطبری ۳/۲۵۰۵۔

۱۶۳۔ الفہرست/۲۲۶ "عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمرو بن حزم انصاری ۱۷۶ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، جہاں وہ ہارون کی طرف سے قاضی تھے۔ اُن کی کئی کتابیں ہیں، جن میں سے ایک "کتاب المغازی" ہے"۔ اور ابنِ سعد (۷، ق ۲، ص ۶۵) کہتا ہے کہ: "یہ قلیل الحدیث تھے"۔

۱۶۴۔ وِلہوزن نے اپنی فہرست میں سہواً ان کا نام بجائے عبدالرحمٰن بن محمد بن ابی بکر کے عبدالرحمٰن بن ابی بکر لکھ دیا ہے۔

۱۶۵۔ الطبری ج ۱: ص ۳۰۰۹ "محمد نے کہا، مجھ سے عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز نے عبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے حوالے سے بیان کیا کہا کہ" موذن آیا اور اس نے عثمان کو نماز کی اطلاع دی تو انہوں نے کہا کہ میں گھر سے نکل کر نماز نہیں پڑھوں گا، جو لوگ پڑھنے والے ہیں اُن سے جاکر کہو"۔

۱۶۶۔ الطبری ۱/۳۰۰۵ " لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے کہ عمرو بن حزم نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ اُن کا گھر عثمان بن عفان کے پڑوس میں تھا"۔

۱۶۷۔ الطبری ۱/۲۹۸۹ "عمرو بن حزم انصاری نکل کر مصریوں کے پاس آئے، جو ذی خشب میں موجود تھے اور انھیں یہ خبر سُنائی، پھر اُن کے ساتھ چل کر مدینے آئے"۔ نیز دیکھو الطبری ۱/۳۰۰۱۔ ۳۰۲۱۔

۱۶۸۔ ابن ہشام ۴/۳۱۴ "ابن اسحٰق نے کہا: مجھ سے عبداللہ بن ابی بکر نے اُن سے اُن کی بیوی فاطمہ بنت عمارۃ نے اور اُن سے عَمرۃ بنت

عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارۃ نے اور اُن سے عائشہ نے ۔"

۱۶۹ - الطبری ۱/۱۸۲۷ - مگر ابن ہشام صرف یہ کہتا ہے کہ "محمد بن اسحٰق نے کہا کہ مجھ سے یہ واقعہ فاطمہ نے بیان کیا"۔

۱۷۰ - ابن ہشام ۴/۱۶۵

۱۷۱ - ابنِ جریر الطبری ۳/۲۴۴۱ - "عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو ابن حزم نے کہا کہ رسول اللہ کی صاحبزادی زینب کی وفات شروع سنہ ۸ھ میں ہوئی ۔" نیز ۳/۲۴۴۷ میں ہے : "عبداللہ بن ابی بکر بن حزم نے کہا کہ "جس نے اِن کی (مراد اُمّ حبیبہؓ زوج النبیؐ) شادی کرائی اور جس شخص کے پاس نجاشی نے (حبشہ میں) شادی کا پیغام بھیجا وہ خالد بن سعید بن العاص تھے اور یہ ۷ھ کا واقعہ ہے"

۱۷۲ - الطبری ۱/۱۷۵۹ - " محمد بن اسحٰق نے کہا کہ عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا آپؐ نے جن غزوات میں بنفسِ نفیس شرکت فرمائی - اُن کی تعداد ۲۶ ہے - ان میں پہلا غزوہ 'ودّان' ہے اسی کو "غزوۃ الابواء" بھی کہتے ہیں پھر غزوۂ بواط "۔ الخ - نیز دیکھیے الطبری ۱/۱۷۵۸ - " مجھ سے محمد بن اسحٰق نے اُن سے عبداللہ بن ابی بکر نے بیان کیا اور کہا کہ مدینے آنے کے وقت سے وفات تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعوث و سرایا کی تعداد ۳۵ ہوتی ہے ۔"

۱۷۳ - الطبری ۱/۱۷۱۷ ۔ " مجھ سے محمد بن اسحاق نے ، اُن سے عبداللہ بن ابی بکر نے ، بیان کیا : کہا کہ رسول اللہ کے پاس ملوکِ حمیر کا خط آیا تو رسول اللہ نے انھیں جواب میں لکھا :" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - من محمد النبی رسول اللہ إلی الحارث بن عبد کلال ...... الخ ۔"

۱۷۴ - ابنِ ہشام ۴/۲۴۱ ۔ " ان کے وفد کی واپسی کے بعد رسول اللہ نے اُن کی طرف عمرو بن حزم کو ارسال فرمایا تاکہ وہاں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کریں ، انھیں سنت اور معالم اسلام سکھائیں ، اُن سے صدقات وصول کریں - انھیں رسول اللہ نے ایک خط لکھ کر دیا تھا جس میں اُن کی ذمہ داریاں درج تھیں اور احکامات بیان کیے گئے تھے ، وہ یوں تھا :" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - ھذا بیانٌ من اللہ ورسولہ ..... الخ ۔"

۱۷۵ - ابنِ ہشام ۳/۱۰۸ -

۱۷۶ - ابنِ ہشام ۴/۱۳ و ۱۸ - الطبری ۱۷۲۲ اور ۱۷۲۴ - ابن ہشام کے یہاں ان فقروں میں عبداللہ کا نام نہیں آیا ہے - دیکھو ابنِ ہشام ۴/۲۲۸ و ۲۳۰ نیز الطبری ۱۹۰۵ و ۲۳۵۴ -

۱۷۷ - النقائض (تحقیق : بیون) ۵۴۶ - نیز ملاحظہ ہو : الاغانی ۸/۱۹۳ - ۱۹/۲۸ -

۱۷۸ - ابنِ ہشام ۲/۳۴۳ " ومن بنی ظفر ثم من بنی سواد بن کعب وکعب ھو ظفر ... قتادۃ بن النعمان "

۱۷۹ - الواقدی (نشر، ولہوزن) ۳۵۸ -

۱۸۰ - ابنِ حجر ۷/۴۸۹ " عمر بن قتادۃ بن نعمان الظفری الانصاری المدنی - روی عن أبیہ وله صحبة . عن علی بن الحسین - روی عنه ابنه عاصم "

۱۸۱ - ابنِ سعد کا جو مخطوطہ ہمیں دستیاب ہے - اُس میں عاصم کا ترجمہ نہیں ملتا ، مگر الذہبی (نشر فیشر) اور ابنِ حجر ۵/۵۳ - نیز المزی

(رک: سخاویؔ "دراسات") ۱۸۱۔ نے اُس کا اقتباس دیا ہے۔ ابن سعد کہتا ہے: "کَانَ رِوَایَةٌ لِلْعِلْمِ وَلَهٗ عِلْمٌ بِالْمَغَازِیْ وَالسِّیْرَةِ۔ اَمَرَهٗ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ اَنْ یَّجْلِسَ فِیْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَیُحَدِّثَ النَّاسَ بِالْمَغَازِیْ وَمَنَاقِبِ الصَّحَابَةِ فَفَعَلَ۔"

اور الذہبی ۲۲ میں ہے: "وَفَدَ عَلٰی عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ فَقَضٰی دَیْنَہٗ وَاَمَرَہٗ اَنْ یَّجْلِسَ فِیْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَیُحَدِّثَ النَّاسَ فَفَعَلَ، ثُمَّ رَجَعَ اِلَی الْمَدِیْنَةِ۔"

۱۸۲۔ ابن قتیبہ: المعارف ۲۳۶: "ھُوَ صَاحِبُ السِّیَرِ وَالْمَغَازِیْ۔"

۱۸۳۔ الذہبی ۲۲: "وَثَّقَہٗ ابْنُ مَعِیْنٍ وَجَمَاعَةٌ" ابن معین اور ایک گروہ نے انھیں ثقہ قرار دیا ہے۔

۱۸۴۔ ابن قتیبہ، المعارف ۲۳۶: "تُوُفِّیَ سَنَةَ عِشْرِیْنَ وَمِائَةٍ" ۱۲۰ھ میں انتقال کیا۔

۱۸۵۔ ابن ہشام: ۲/۶۷/۴/۱۳

۱۸۶۔ ابن ہشام: ۲/۸۹: "وَاَمَّا عَاصِمُ بْنُ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ فَقَالَ: وَاللّٰهِ، مَا قَالَ ذٰلِكَ الْعَبَّاسُ اِلَّا لِیَشُدَّ الْعَقْدَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ وَاَمَّا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَ مَا قَالَ ذٰلِكَ الْعَبَّاسُ اِلَّا لِیُؤَخِّرَ الْقَوْمَ تِلْكَ اللَّیْلَةَ رَجَاءَ اَنْ یَّحْضُرَهَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ اُبَیِّ ابْنُ سَلُوْلٍ فَیَکُوْنَ اَقْوٰی لِاَمْرِ الْقَوْمِ۔" (اور عاصم بن عمر بن قتادہ نے کہا کہ خدا کی قسم العباس نے یہ بات اس نیت سے کہی تھی کہ قوم کو رسول اللہ سے کیے ہوئے عہد کا پابند بنا دیں۔ مگر عبداللہ بن ابی بکر کا قول ہے کہ اس کا مقصد اُس رات میں لوگوں کو اتنا ٹھہرانا تھا کہ عبداللہ بن ابی سلول آ جاتے جو قوم کا ایک بااثر شخص تھا۔)

۱۸۷۔ الذہبی/۴۳: "المزی نے کہا، احمد بن صالح المصری نے کہا کہ لوگ اُن کی ولادت ۵۰ھ میں بیان کرتے ہیں اور خلیفہ نے کہا کہ ۵۱ھ ہے اور ابن بکیر نے کہا کہ ۵۶ھ صحیح ہے۔"

۱۸۸۔ ابن قتیبہ: المعارف: ۲۳۹: "ان کے دادا عبداللہ بن شہاب معرکۂ بدر میں مشرکین کے ساتھ لڑے تھے۔"

۱۸۹۔ ایضاً۔ "یہ اُن لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے یوم اُحد میں باہم عہد کیا تھا کہ اگر رسول اللہؐ ہماری نظر پڑیں گے تو ہم انھیں قتل کر دیں گے یا اُن سے لڑتے ہوئے کام آ جائیں گے۔ یہ لوگ عبداللہ بن شہاب، اُبی بن خلف، ابن قمیئہ اور عتبہ بن ابی وقاص تھے۔"

نیز ملاحظہ ہو: الواقدی (ولہوزن) ۱۱۶۔ ابن سعد ج ۲ ق ۱ ص ۴۲

۱۹۰۔ ابن ہشام ۳/۸۴: "ابن ہشام نے کہا کہ ربیح بن عبدالرحمٰن بن ابی سعید الخدری نے اپنے باپ سے اور انھوں نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا کہ اُس دن عتبہ بن ابی وقاص نے رسول اللہ پر تیر چلاتے جن سے آنحضرت کے نچلے داہنی طرف کے دانت شہید ہو گئے اور نچلا ہونٹ زخمی ہوا اور عبداللہ بن شہاب الزہری نے آپ کی پیشانی کو زخمی کیا۔"

۱۹۱۔ ابن ہشام ۳/۸۵ نیز الطبری ۱/۱۴۰۷۔

۱۹۲۔ ابن قتیبہ ۲۳۹: "وَکَانَ اَبُوْ مُسْلِمِ بْنُ عُبَیْدِ اللّٰهِ مَعَ ابْنِ الزُّبَیْرِ۔"

۱۹۳۔ ابن حجر ۹/۴۵۱: "وَرَوٰی عَنْبَسَةُ عَنْ یُوْنُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: وَفَدْتُّ اِلٰی مَرْوَانَ وَاَنَا مُحْتَلِمٌ۔" (ابن

شہاب نے کہا جب میں مروان سے ملا ہوں تو بالغ ہو چکا تھا۔)

۱۹۴۔ ابن سعد ۱۵۸/۵

۱۹۵۔ تاریخ الیعقوبی (تحقیق: ہوتسما) ۳۱۱/۲ "وقالوا: وتمنعنا من حج بیت اللّٰہ الحرام وھو فرض من اللّٰہ علینا۔ فقال لھم عبد الملک: ھذا ابن شہاب الزھری یحدثکم أن رسول اللّٰہ قال: لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد المسجد الحرام ومسجدی ومسجد بیت المقدس۔ (لوگوں نے کہا کہ تم ہمیں حج سے روکتے ہو حالانکہ وہ ہم پر اللہ کی طرف سے فرض ہوا ہے۔ عبدالملک نے کہا یہ ابن شہاب الزہری موجود ہیں تمھیں حدیث سنائیں گے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تین مسجدوں کے لیے سفر کیا جاتا ہے، ایک مسجد بیت الحرام، دوسری میری مسجد اور تیسری مسجد بیت المقدس")۔ (عبدالملک کا مطلب یہ تھا کہ وہاں مکہ میں عبداللہ بن الزبیر کا قبضہ ہے تو دمشق والے بیت المقدس کی زیارت کے لیے جا سکتے ہیں۔ اس کا بھی اتنا ہی ثواب ہے جتنا بیت اللہ کی زیارت کا ہے۔ فاروقی)

۱۹۶۔ البلاذری: الانساب (نشر آہورڈ): ۱۵۹ "المدائنی عن ابراھیم بن سعد: ان عبد الملک رأی فی منامہ کان امراتہ المخزومیۃ قلعت رأسہ، ثم قطعت منہ عشرین قطعۃ فبعث الی سعید بن المسیب من سألہ عن الرؤیا، فقال: تلد منہ ولدا یملک عشرین سنۃ" (المدائنی نے ابراہیم بن سعد سے روایت کی کہ عبدالملک نے ایک بار خواب میں دیکھا گویا اس کی مخزومی بیوی نے اُس کا سر اکھاڑ لیا ہے اور اُس پر بیس ٹھوکریں لگائی ہیں۔ خلیفہ نے سعید بن المسیب سے تعبیر معلوم کرنے کے لیے ایک آدمی بھیجا۔ سعید نے یہ تعبیر دی کہ اس عورت سے تمھارے ایک لڑکا پیدا ہوگا جو بیس سال حکومت کرے گا۔") اور اسی کتاب میں (۲۲۳) ہے: "المدائنی قال: رأی عبد الملک کانہ بال فی الکعبۃ فبعث الی سعید بن المسیب من سألہ عن ذلک" (المدائنی نے کہا کہ عبدالملک نے خواب میں دیکھا کہ خانۂ کعبہ میں پیشاب کر رہا ہے تو اُس نے سعید بن المسیب کے پاس تعبیر پوچھنے کے لیے آدمی بھیجا۔")

۱۹۷۔ ابن سعد ۹۱/۵۔ مگر انساب البلاذری (ص ۲۲۳) میں راوی کا نام حبیب بن منیع ملتا ہے۔

۱۹۸۔ الطبری ۱۰۵۲/۲ "اور اس سال (۸۱ھ) عبدالرحمٰن ابن محمد بن الاشعث نے حجاج کی مخالفت کی اور اُس سے جنگ کے لیے خروج کیا۔ یہ ابومخنف کا قول ہے جس کی روایت اس نے ابوالمخارق الراسبی کے حوالے سے کی ہے۔ مگر الواقدی کا خیال ہے کہ یہ واقعہ ۸۲ھ کا ہے۔

۱۹۹۔ البخاری۔ تاریخ/۹۳ "میں ابن الاشعث کی بغاوت کے زمانے میں دمشق آیا۔"

۲۰۰۔ ابن سعد ج ۷ ق ۲ ص ۱۵۷ "قبیصۃ بن ذؤیب ..... ان سے الزہری نے روایت کی ہے اور یہ عبدالملک بن مروان کے خاتم بردار تھے۔"

۲۰۱۔ البلاذری الانساب ۲۵۷ "قبیصۃ بن ذؤیب نے کہا: معاویہ کی خلافت کے آخر زمانے میں رات کو ہم مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، یعنی میں مصعب بن الزبیر ..... اور عبدالملک بن مروان"

۲۰۲- ابن سعد ۷/۱۵۷ " انھوں نے الزہری کو عبدالملک بن مروان کے دربار میں داخل کرایا تھا " نیز دیکھو ابن قتیبہ: المعارف ۲۲۸-
۲۰۳- الذہبی: ۷۰" قبیصۃ بن ذؤیب کی صحبت میں رہا۔ پھر عبدالملک نے ایک دن حلقے میں ایک آدمی بھیج کر دریافت کرایا کہ تم میں سے امہات الاولاد کی وراثت کے قانون کسے یاد ہیں تو میں نے کہا: " مجھے " چنانچہ عبدالملک کے پاس مجھے بھیج دیا گیا۔ اس نے پوچھا: تم کون ہو۔ میں نے اپنا نام و نسب ظاہر کیا، تو کہنے لگا اگرچہ تمہارا باپ فتنوں میں خوں ریزیاں کرتا تھا، مگر خیر بیٹھو پھر کچھ مسئلے پوچھتا رہا اور آخر میرا قرض ادا کر دیا "
۲۰۴- الذہبی: ۷۰" ضاقت حال الزهري فخرج الى الشام " (الزہری کا حال تنگ ہوا تو وہ شام کو چلے گئے۔)
۲۰۵- البخاری (تاریخ) ۹۳ " قال: من انت قلت: محمد بن مسلم بن عبيد الله. ثم كتب الى هشام بن اسمٰعيل ان ابعث الى سعيد بن المسيب فسله " (اس نے پوچھا، تم کون ہو۔ میں نے کہا: میں محمد بن مسلم بن عبید اللہ ہوں۔ پھر خلیفہ نے ہشام بن اسمٰعیل کو لکھا کہ سعید بن المسیب کے پاس کسی کو بھیج کر معلومات حاصل کرو۔")
۲۰۶- ابن سعد ۷/۱۵۷- ابن قتیبہ: المعارف ۲۲۸ " ووصله ففرض له وصار من اصحابه " (یہ اس سے ملے اس نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ اس کے ندیموں میں شامل ہو گئے۔)
۲۰۷- البخاری: (تاریخ) ۱۰۴" قال: سمعت الزهري قال: قدمت على الوليد ابن عبد الملك اخطب اليه ابنة عمّي ابنة مالك بن شهاب فتعشينا فخرجنا " (کہا میں نے الزہری کو کہتے سنا، میں الولید بن عبدالملک کے پاس اپنے چچا مالک بن شہاب کی بیٹی کا رشتہ لے کر گیا۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا، پھر چلے ......)
۲۰۸- الفہرست میں کتاب کا یہی نام لکھا ہے، مگر یہ غلط ہے۔ صحیح یوں ہوگا: " كتاب الزهري وابنة عمه الذين ساراني هشام بن عبد الملك " (ح۔ نصار)
۲۰۹- الفہرست ۳۰۷
۲۱۰- ابن عبدالحکم: (تحقیق: ٹوری) ۱۰۴: " ثم خاصمهما الاصبغ اليه، وابن شهاب قاضيه يومئذ فقضى ابن شهاب لابن خارجة بالدار " (اس کے بارے میں الاصبغ نے جھگڑا کیا۔ ابن شہاب اس زمانے میں قاضی تھے انہوں نے گھر کا فیصلہ ابن خارجہ کے حق میں کیا۔)
۲۱۱- الذہبی: ۷۲- " جعل يزيد بن عبد الملك ابن شهاب قاضياً " (یزید بن عبدالملک نے ابن شہاب کو قاضی بنا دیا تھا) ابن قتیبہ: ۲۳۹- " وكان يزيد بن عبد الملك استقضاه " (اور یزید بن عبدالملک ان سے مقدمات فیصل کراتا تھا)
۲۱۲- الاغانی ۴/۴۹
۲۱۳- الطبری ۲/۱۴۵۶- " قال محمد بن عمر حدثني ابراهيم بن عبد الله بن ابي فروة عن الزهري: قال: قلت لعبيد الرحمن بن الضحاك انك تقدم على قومك وهم ينكرون كل شيء خالفت فعد فيما اجمعوا عليه ..... قال الزهري فلم يأخذ بشيء من ذلك وعادى الانصار طراً وضرب ابابكر بن حزم ظلما وتعديا

ز... فیما بقی منهم شاعر الا عیاه ولا صاح الا عابه وأنباه بالشتم " (محمد بن عمر نے کہا : مجھ سے ابراہیم بن عبداللہ بن ابی فروۃ نے الزہری کے حوالے سے بیان کیا، کہا : " میں نے عبدالرحمن بن الضحاک سے کہا "تم اپنی قوم میں (گورنر ہو کر) جا رہے ہو۔ یہ لوگ ہر اُس بات کو ناپسند کرتے ہیں جو اُن کے قومی رواج کے خلاف ہو، اِس لیے جس بات پر اُن کا اجماع ہو تم بھی اُسی کی پابندی کرنا ...... الزہری نے کہا، مگر اُس نے اِن میں سے ایک بات بھی نہیں مانی، اور سارے انصاریوں کو دشمن بنا لیا اُس نے ابوبکر بن حزم کو بلا وجہ ظلم و تشدد کر کے پٹوایا۔ ایک شاعر بھی ایسا نہیں بچا جس نے اُس کی ہجو نہ لکھی ہو اور نہ کوئی درویش ایسا تھا جس نے اُس پر ملامت نہ کی ہو، اور بُرا بھلا نہ کہا ہو "

۲۱۴ - الذہبی : ۷۱

فدع ذا واثن على أكرم محمد ... واذكر فواضله على الاصحاب
واذا يقال من الجواد بماله ... قيل الجواد محمد بن شهاب
اهل المدائن يعرفون مكانه ... وربيع ناديه على الاعراب

("یہ سب چھوڑو، اور دریا دل محمد کی ثنا خوانی کرو، اور اُسے اپنے ساتھیوں پر جو فضیلتیں حاصل ہیں اُن کا بیان کرو، جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ سخاوت کرنے والا کون ہے ؟ تو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ محمد بن شہاب۔ مدائن والے بھی اُس کا مرتبہ جانتے ہیں اور اُسے عربوں میں جو عزت حاصل ہے اُس سے واقف ہیں۔")

۲۱۵ - الذہبی : ۶۸۔

۲۱۶ - ایضاً ۷۰ قال : سعید بن عبد العزیز : ادی هشام عن الزهری سبعة آلاف دینار دینا" (سعید بن عبدالعزیز نے کہا کہ ہشام نے الزہری کا سات ہزار دینار کا قرض چکایا تھا۔)

۲۱۷ - ایضاً ۷۰ "وکان یؤدب ولده" (یہ اُس کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔)

۲۱۸ - ابن خلکان ۱/۵۷۱۔

۲۱۹ - الذہبی : ۷۲

۲۲۰ - یہاں بھی فاضل مضمون نگار سے ترجمے میں غلطی ہوئی ہے۔ اصل عبارت ہے " انا ان نهتبج الشیخ و ذکر کلمة " اس کا ترجمہ وہی ہوگا جو ہم نے درج کیا۔ (فاروقی)

۲۲۱ - فاضل مضمون نگار نے یوں لکھا ہے کہ "ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ تمہاری روایت اخذ کریں"۔ لیکن الذہبی کی اصل عبارت ہے۔ " ما ینبغی لنا ان نحمل عنک " جس کا ترجمہ ہماری رائے میں وہی ہے جو اوپر درج کیا گیا۔ (فاروقی)

۲۲۲ - البخاری : (مغازی) " عن الزهری قال : قال لی الولید بن عبد الملک ابلغک ان علیاً کان فیمن قذف عائشة " (الزہری نے کہا کہ مجھ سے ولید بن عبدالملک نے پوچھا کیا تمہیں ایسی کوئی روایت ملی ہے کہ عائشہ پر الزام لگانے والوں میں سے ایک علی بھی تھے) نیز ملاحظہ ہو فتح الباری میں اس کے ہم مضمون فقرے (ج ۷/۳۳۶) اور محمد بن اسحٰق (ت : فیوک) ۱۰۔ توضیح نمبر ۳۴۔

۲۲۳- کتاب الاغانی ۶/۱۰۶ -

۲۲۴- ایضاً "حدثنی ..... مصعب عن ابی الزناد ، قال : اجمع الزہری علی ان یدخل الی بلاد الروم ان ولی الولید بن یزید- فمات الزہری قبل ذلک (مجھ سے کہا .... مصعب نے ابو الزناد سے روایت کیا کہ الزہری نے طے کر رکھا تھا کہ حبیب الولید بن یزید حاکم ہوگا تو وہ رومی مملکت میں چلے جائیں گے مگر الزہری اس کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی مرگئے -)

۲۲۵- الذہبی : ۴۷- قال ضمرة بن ربیعة وغیره ، مات سنة ثلاث وعشرین وهذا وهم- وقال ابراهیم بن سعد وطائفة سنة اربع وعشرین. وقال الزبیر بن بکار وغیره سنة اربع فی سابع عشر رمضان بشغب فی امواله- وشذ ابن یونس الصدفی فقال : فی رمضان سنة خمس وعشرین ومائة والصحیح سنة اربع " ضمرة بن ربیعہ وغیرہ نے کہا کہ ۱۲۳ھ میں مرے مگر یہ مغالطہ ہوا ہے- ابراہیم بن سعد اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ ۱۲۴ھ سال وفات ہے- الزبیر بن بکار وغیرہ کا قول ہے ۱۷؍رمضان ۱۲۴ھ کو شغب میں اپنی جاگیر میں فوت ہوئے ابن یونس الصدفی اپنے اس قول میں تنہا ہے کہ رمضان ۱۲۵ھ میں انتقال کیا- ان میں صحیح قول ۱۲۴ھ ہی ہے -

۲۲۶- ابن قتیبہ ۲۳۹- "ودفن بماله علی قارعة الطریق. لیمر مار فیدعو له والموضع الذی به اخر عمل الحجاز واول عمل فلسطین وبه ضیعته " (یہ اپنی جاگیر میں شارع عام پر دفن کیے گئے تاکہ اُدھر سے گذرنے والے فاتحہ پڑھیں اور یہ جگہ صوبۂ حجاز کی آخری حد اور صوبۂ فلسطین کی ابتدائی حد پر واقع ہے ، یہاں ان کا گاؤں ہے-)
نیز دیکھو : محمد بن اسحق (فیوک) ۱۰- توضیح نمبر ۳۹ -

۲۲۷- الذہبی : ۷۰- "وفد الزہری علی عبد الملك واستوطن الشام وكان يتردد الى الحجاز ويحج " (الزہری عبدالملک سے ملے اور شام کو اپنا وطن بنا لیا ، مگر وہ حجاز کو جاتے رہتے تھے اور حج بھی کرتے تھے-)

۲۲۸- الطبری ۲/۱۴۳۵ " وحج بالناس فی هذه السنة (یعنی سنہ ۱۱۹ھ) ابو شاكر مسلمة بن هشام بن عبد الملك وحج معه ابن شهاب الزهری فی هذه السنة "
(اس سال یعنی ۱۱۹ھ میں ابو شاکر مسلمۃ بن ہشام بن عبدالملک امیر حج تھے اور اسی سال اُن کے ساتھ ابن شہاب الزہری نے بھی حج کیا-)

۲۲۹- ابن سعد ۲/۱۳۱ " کنت اجالس عبد الله بن ثعلبة بن صعير العذری اتعلم منه نسب قومی ، فاتاه رجل جاهل يسأله عن المطلقة واحدة تنتين ثم تزوجها رجل فدخل بها ثم طلقها ، على كم ترجع الى زوجها الاول- قال "لا ادری ، اذهب الى ذلك الرجل واشار له الى سعيد بن المسيب- قال : فقلت فی نفسی ، هذا اقدم من سعيد يدهر اخبرنی انه عقل رسول الله صلى الله عليه وسلم مج على وجهه ففهمت فاتبعت السائل حتى سأل سعيد بن المسيب فلزمت سعيدا فكان هو الغالب على علم المدينة والمستفتى ..... وكان لسعيد بن المسيب عند الناس قدر كبير " (میں عبداللہ بن ثعلبۃ بن صعیر العذری کی صحبت میں بیٹھتا تھا اور اُن سے اپنی قوم کا نسب سیکھتا تھا- ایک دن اُن کے پاس ایک جاہل شخص آیا اور اُس نے ایک ایسی عورت کے بارے میں مسئلہ پوچھا جسے پہلے دو بار طلاق دی گئی پھر اس سے دوسرے شخص نے نکاح کیا اور خلوت صحیحہ کے بعد اُسے طلاق دے دی- تو اب وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس کتنی عدت گذار کر واپس

جا سکتی ہے۔ انہوں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ تم اس شخص کے پاس جاؤ اور سعید بن المسیب کی طرف اشارہ کیا۔ الزہری نے کہا کہ میں نے دل میں سوچا کہ یہ تو عمر میں سعید سے بڑے ہیں، اور مجھے بتلاتے تھے کہ انہوں نے (عالم شیرخوارگی میں) رسول اللہ کا زمانہ پایا تھا اور آنحضرتؐ نے (برکت کے لئے) ان کے منہ میں کُلّی کی تھی۔ میں اُٹھ کر سائل کے پیچھے ہو لیا، یہاں تک کر اس نے سعید سے مسئلہ پوچھ لیا۔ اب میں نے سعید کی خدمت میں حاضری کو لازم کر لیا۔ وہ مدینہ کے علم پر حاوی تھے اور اُن سے فتاوی لیے جاتے تھے۔ ... سعید بن المسیب کو لوگوں میں بڑی عزت حاصل تھی ....)

۲۳۰ - الذہبی ۹۹ -

۲۳۱ - ابن سعد ۲/۱۳۱: "كنتُ اجالس ثعلبة بن ابي مالك قال: فقال لي يوماً تريد هذا. قال۔ قلتُ: نعم۔ قال: عليك بسعيد بن المسيب قال فجالسته عشر سنين كيوم واحدٍ" (میں ثعلبۃ بن ابی مالک کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن انھوں نے کہا کیا تم یہ (فقہی مہارت) چاہتے ہو۔ میں نے کہا "جی ہاں" بولے تو پھر سعید بن المسیب کی خدمت کو لازم کرو۔ بولے: "میں پھر دس سال تک ان کی مجلس میں اس طرح (بلا ناغہ) حاضر رہا جیسے یہ ایک ہی مسلسل دن تھا۔)

۲۳۲ - ایضاً "عن معمر قال، سمعتُ الزهري يقول: أدركتُ من قريش اربعة بحورٍ: سعيد بن المسيب وعروة بن الزبير وابا سلمة بن عبد الرحمٰن وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة" معمر نے کہا میں نے الزہری کو کہتے سُنا ہے کہ میں نے قریش میں (علم کے) چار سمندر دیکھے: سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ۔)

۲۳۳ - ابن سعد ۲/۱۳۴: "حدثني ابو يوسف الماجشون انه سمع ابن شهاب يقول: كنتُ اذا حدثتني عروة ثم حدثتني عمرة، يصدّق عندي حديث عروة فلما تبحرتهما اذا عروة بحر لا ينزف" (ابو یوسف الماجشون نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے ابن شہاب کو یہ کہتے سنا ہے۔ جب مجھ سے عروۃ کوئی حدیث بیان کرتے تھے اور پھر (وہی حدیث) عمرۃ بیان کرتی تھیں، تو میرے نزدیک عروۃ کی روایت زیادہ معتبر ہوتی تھی اور جب میں نے ان دونوں کے علم کو جانچا تو یہ دیکھا کہ عروۃ ایک بحر بے پایاں ہیں۔)

۲۳۴ - ابن حجر ۷/۲۳

۲۳۵ - الذہبی: ۷۱ -

۲۳۶ - فاضل مضمون نگار نے غلامک الاعمش کا ترجمہ یہ کیا ہے؟ آپ کا غلام جس کی آنکھوں میں آنسو بھرے رہتے ہیں۔" (فاروقی)

۲۳۷ - الاغانی: ۸/۹۵ "قال عبيد الله لابن شهاب الزهري۔

اذا قلتُ اما بعدُ لم يثنِ منطقي ... فحاذر اذا ما قلتُ كيف اقول

اذا شئتَ ان تلقى خليلاً مصافياً ... لقيتَ واخوانُ الثقاتِ قليلُ

(عبیداللہ نے ابن شہاب الزہری کے لیے کہا ہے: "جب میں اما بعد کہہ کر تقریر شروع کرتا ہوں تو پھر میری زبان فرفر چلتی ہے۔ مگر جب میں خود یہ کہنے لگوں کہ "کیا کہیے" تو پھر سمجھ لو۔ تم اگر کسی مخلص دوست سے ملنا چاہتے ہو تو مل سکتے ہو مگر دنیا میں بھروسے کے لائق ثقہ انسان

بہت ہی تھوڑے ہوتے ہیں۔")

۲۳۸- ابن حجر ۹/۴۴۸ "وقال اللیث عن جعفر بن ربیعۃ: قلتُ لعراک ابن مالک من افقہُ اهل المدینۃ، فذکر سعید بن المسیّب وعروۃ وعُبَید اللہ بن عبد اللہ قال عراک واعلمھم عندی جمیعاً ابنُ شھاب لانّہ جمع علمھم علی علمہ"

(اللیث نے جعفر بن ربیعہ کے حوالے سے کہا میں نے عراک بن مالک سے پوچھا کہ مدینہ کا سب سے بڑا فقیہہ کون ہے تو انہوں نے سعید بن المسیّب، عروہ اور عبید اللہ بن عبد اللہ کے نام لیے۔ عراک نے کہا، مگر میرے نزدیک ان سب میں بڑے عالم ابن شہاب ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے علم میں اُن کا علم جمع کر لیا ہے۔")

۲۳۹- الذہبی : ۶۹

۲۴۰- ابن حجر ۹/۴۴۹

۲۴۱- ابن حجر ۹/۴۴۹

۲۴۲- ابن سعد ۲/۱۳۵

۲۴۳- لسان العرب میں تحت مادہ "تل" "وفی حدیث سعد بن ابراھیم ماسبقنا ابن شھاب من العلم بشئ الّا انّا کنّا ناتی المجلس فیستنتل ویشدّ ثوبہ علی صدرہ ای یتقدّم" (ح۔ نضار)

۲۴۴- الذہبی ۷۰۔

۲۴۵- ایضاً ۶۹۔

۲۴۶- ایضاً ۶۷۔

۲۴۷- ایضاً ۶۷

۲۴۸- ایضاً ۶۷

۲۴۹- عبد الملک نے عروۃ سے وہ اخبار طلب کئے ہوں گے جو بعض حوادث سے متعلق قلمبند کیے گئے۔ یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اُس خاص حادثہ کے بارے میں "حدیث" بیان کریں اور شاید یہی وجہ تھی کہ عُروۃ نے سندوں کو ترک کر دیا تھا۔

۲۵۰- گولڈزیہر: دراساتِ اسلامیہ ۲/۲۱۰۔

۲۵۱- ابن سعد : ۲/۱۳۵- الذہبی ۷۱ "فرأیتُ ألّا أمنعہ مُسلماً" (تو میں نے سوچا کہ کسی مسلمان کو اس سے محروم نہ رکھوں۔) نیز دیکھو- گولڈزیہر: دراساتِ اسلامیہ ۲/۳۸۔

۲۵۲- الذہبی : ۶۸

۲۵۳- ایضاً : ۶۹ "وقال انس بنُ عیاض عن عبید اللہ بن عمر، قال کنتُ أری الزّھری یُعطی الکتاب فلا یقرؤہ ولا یُقرأ علیہ فیُقال لہ: نروی ھذا عنک؟ فیقول: نعم" (انس بن عیاض نے عبید اللہ بن عمر کے حوالے سے کہا کہ

ہم دیکھتے تھے کہ الزہری کتاب دیتے تھے ؛ نہ وہ اسے پڑھتے تھے نہ وہ انھیں پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ پھر کوئی کہتا کیا ہم اسے آپ کے حوالے سے روایت کرسکتے ہیں۔ تو وہ کہتے : "ہاں"۔)

۲۵۴ - گولڈ زیہر : دراسات اسلامیہ ۲/ ۳۸ - نوٹ ۲ -

۲۵۵ - ابن سعد ۲/ ۱۳۶ - نیز الذہبی ۱: ۷۱ -

۲۵۶ - ابن خلکان ۱/ ۵۷۱ "وکان اذا جلس فی بیته وضع کتبه حوله فیشتغل بها عن کل شیٔ من امور الدنیا فقالت له امراته یوماً: واللہ لھذہ الکتب اشد علی من ثلاث ضرائر" (یہ جب گھر میں بیٹھتے تو ان کے چاروں طرف کتابیں ہوتی تھیں اور دنیا ومافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتے تھے، اس پر ایک دن اُن کی بیوی نے کہا کہ یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ شاق ہیں") نیز دیکھو ابوالفداء ۱/ ۲۵۶

۲۵۷ - الطبری ۲/ ۲۴۸

۲۵۸ - ایضاً : اس کا ایک اقتباس یہ ہے "ومات یزید بن معاویة وھو ابن تسع وثلاثین، وکانت ولایته ثلاث سنین وستة اشھر فی قول بعضھم ویقال ثمانیة اشھر" (یزید بن معاویہ مرا تو وہ ۳۹ سال کا تھا اور اس کی حکومت بعض کے قول کے مطابق تین سال چھ ماہ اور بعض کے نزدیک تین سال آٹھ ماہ رہی")

ایضاً ۱۲۶۹ "الزہری اس بارے میں کہتے ہیں" حدثت عن ابن وھب عن یونس عنه: ملک الولید عشر سنین الا اشھرا " (اس بارے میں ابن وہب کی یونس سے روایت ہے بحوالہ الزہری کہ الولید نے ایک ماہ کم دس سال حکومت کی")

۲۵۹ - الاغانی ۱۹/ ۵۹ "قال المدائنی فی خبرہ واخبرنی ابن شہاب قال: قال لی خالد بن عبداللہ القسری کتب لی النسب، فبدأت بنسب مضر وما اتممته۔ فقال اقطعه قطعه اللہ مع اصولھم" (المدائنی نے اپنی خبر میں کہا کہ مجھے ابن شہاب نے خبر دی کہا کہ مجھ سے خالد بن عبداللہ القسری نے کہا : میرے لیے نسب لکھ دو تو میں نے مضر سے شروع کیا مگر اُسے اختتام تک نہیں پہنچا سکا۔ پھر کہا میں نے اس کو قطع کیا خدا نے اس کی جڑیں ہی کاٹ دیں۔)

۲۶۰ - الاغانی ۱۹/ ۵۹ "قال واکتب لی السیرة، فقلت له فانه یمر بی الشیٔ من سیرة علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیه فاذکرہ فقال: لا، الا ان تراہ فی قعر الجحیم" (کہا میرے لیے سیرۃ پر ایک کتاب لکھ دو۔ میں نے اس سے کہا : اگر سیرۃ علی بن ابی طالب صلوات اللہ علیہ سے متعلق کچھ باتیں اس میں آئیں تو کیا انھیں بھی بیان کردوں : کہنے لگا : نہیں۔ مگر یہ کہ تم انھیں غلطیاں کرتے ہوئے دیکھو، تو لکھو)"

۲۶۱ - دیکھو فیوک : "محمد بن اسحٰق" ۲ - توضیح ۲۴ -

۲۶۲ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الزہری کی کچھ اور تصانیف بھی تھیں جن تک فاضل مضمون نگار پروفیسر ہورووتس کی رسائی نہیں ہوسکی۔ مثلاً شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی نے اپنی کتاب "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم اھل التوریخ" میں لکھا ہے :-

" درّدی یونس بن یزید مشاھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن الزھری۔" (یونس بن یزید نے الزہری کے حوالے سے رسول اللہ ؐ کی جنگوں کا حال قلمبند کیا تھا۔)

۲۶۳۔ دیکھو ابن ہشام ۳/۳۰۹۔ (نیز الطبری ۱/۱۵۱۸، مسند احمد بن حنبل ۲/۱۹۴۔ البخاری: (صحیح) (حدیث الافک)

" حدثنی الزھری عن علقمۃ بن وقاص وعن سعید بن جبیر وعن عروۃ بن الزبیر عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ قال: کل قد حدثنی بعض ھذا الحدیث وبعض القوم کان أدعی لہ من بعض وقد جمعت لک الذی حدثنی القوم" (الزہری نے علقمہ بن وقاص اور سعید بن جبیر اور عروہ بن الزبیر اور عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ کے حوالے سے مجھ سے بیان کیا اور کہا کہ اس حدیث کا ایک ایک حصہ ان میں سے ہر ایک نے روایت کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے زیادہ محتاط ہے۔ میں نے تمہارے لیے سب کے اقوال کو یک جا کر دیا ہے۔")

۲۶۴۔ الذہبی: ۴۳۔

۲۶۵۔ ابن حجر: تہذیب ۱۰/۳۶۰۔ الذہبی (تحقیق ذہبیتر) ۱/۴۳۷

۲۶۶۔ ابن سعد: ۵/۲۲۱

۲۶۷۔ ابن حجر: ۳۶۲

۲۶۸۔ الطبری: ۲/۷۸۲

۲۶۹۔ ابن حجر: ۳۶۲۔ الذہبی: ۴۳۸

۲۷۰۔ ابن حجر: ۳۶۲۔ الذہبی: ۴۳۸۔ البخاری (تاریخ) ۱۶۶

۲۷۱۔ ابن حجر: ۳۶۱

۲۷۲۔ ابن سعد: ۵/۳۱۰ نیز

SACHAU(E) DAS BERLINER FRAGMENT DES MUSA IBN UQBA (SITZUNGS-BERICHTE DER PREUSSICHEN AKADEMIE DER WISSENSCHAFTEN. 1904)

(یعنی برلن کی علمی اکادمی کی سالانہ روداد ۱۹۰۴ء)

۲۷۳۔ تحقیق دستنفیلڈ ۴/۱۰۰۸ نیز دیکھیے: ۳/۸۷۲

۲۷۴۔ تاریخ الخمیس ۲/۹۶۔ نیز دیکھیے: ۱/۵۳۹

۲۷۵۔ ابن حجر: ۳۶۱

۲۷۶۔ ابن حجر: ۳۶۲

۲۷۷۔ ابن سعد: ۲/۱۔ ۳/۱

۲۷۸۔ یہ ہم شرحبیل کے حالات میں لکھ چکے ہیں کہ انہوں نے ایسی کوئی فہرست تیار نہیں کی تھی۔ (احسین نقاد)

۲۷۹- ابنِ حجر، ۲۶۱-

۲۸۰- دیکھو ترجمۂ ولہوزن ۸۰- ۳۴۴- ۴۰۳-۴۰۴-

۲۸۱- ابنِ سعد: ۳/ ۲۴۱- ۸/ ۱۰، ۱۱، ۱۷۱، ۱۹۰، ۱۹۱- اِن حوالوں کے لیے اور ابنِ سعد کے یہاں مذکور دوسرے راویوں کے حوالے کے لیے، میں ہرڈاکٹر گوتشلک HERR DR. W. GOTTSCHALK کا ممنون ہوں جنھوں نے لطفاً اپنے قلمی انڈکس سے انھیں نقل کرکے بھیجا- (ج-ہ)

۲۸۲- ابنِ سعد: ۵/ ۲۸۳- البلاذری: (تحقیق: اَہلورڈ) ۲۲۰

۲۸۳- کتاب الاغانی: ۳/ ۱۶

۲۸۴- الطبری: ۲/ ۱۲۳۱

۲۸۵- ابنِ سعد: ۵/ ۲۱۶

۲۸۶- البلاذری: (تحقیق: دی غوبیہ) ۳/ ۸

۲۸۷- تاریخ الخمیس: ۱/ ۵۳۹

۲۸۸- ابنِ سعد: ۳/ ۲۴۱

۲۸۹- ابن حجر، ۳ ۲۴۳

۲۹۰- ایضاً: ۲۴۳

۲۹۱- البخاری (تاریخ) ۱۱۸- ابنِ سعد: ۷- ۲/۲ - النّوَوی: ۵۶۹

۲۹۲- ابنِ حجر: ۲۴۳

۲۹۳- ابنِ حجر: ۳ ۲۴۳- النّوَوی: ۵۶۹

۲۹۴- ابنِ حجر: ۳ ۲۴۳- النّوَوی: ۵۶۹- ابنِ قتیبۃ: المعارف ۲۵۳- ابنِ سعد: ۵/ ۳۹۷

۲۹۵- النّوَوی: ۵۶۹

۲۹۶- ابنِ حجر: ۲۴۵- النّوَوی: ایضاً

۲۹۷- ابنِ سعد: ۵/ ۳۹۷

۲۹۸- ابنِ حجر: ۲۴۵- الطبری: ۳/ ۲۵۲۲

۲۹۹- ابنِ سعد: ۵/ ۳۹۷- ابنِ حجر: ۲۴۵

۳۰۰- ابنِ سعد: ۵/ ۳۹۷ -

۳۰۱- ابنِ حجر: ۲۴۵-

۳۰۲- تحقیق: خلوجل (یہاں انھیں غلطی سے کوفی بتایا گیا ہے) ص ۹۴

۳۰۳- البلاذری : (تحقیق : دی غویہ) ۲۲

۳۰۴- النّووی : ۶۹ ۵

۳۰۵- ابنِ رُستہ : ۶۳ BIBLIOTHECA GEOGRAPHORUM VOl III
(یعنی مکتبۂ جغرافیہ ج ۳- اس میں عہد جاہلی کے یثرب کی تاریخ سے متعلق اخبار محفوظ ہیں۔)

۳۰۶- تحقیق : فلوجل ۲۲۸

۳۰۷- ابنِ سعد : ۷ ب/۹۷

۳۰۸- الطبری ۱/۲۱۲۲- البلاذری : (تحقیق : دی غویہ) ۲۴۷- فیوک : ۱۷- توضیح ۲-

۳۰۹- القسطلانی ۴/۳۲۸

۳۱۰- یاقوت : (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/۴۰۰- الفہرست ۹۲-

۳۱۱- یاقوت نے ہشام کا نام لکھا ہے، اگرچہ وہ ۸۲ھ سے ۸۶ھ تک مدینہ کا گورنر تھا، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ اس موقع پر وہ والی سے وہ مراد ہو، یہاں یقیناً اس کا بیٹا اسمٰعیل مراد ہے۔ الفہرست میں گورنر کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔

۳۱۲- ابنِ ہشام- مقدمہ- ص" م" (نسخۂ مصطفیٰ البابی)

۳۱۳- GOLDZIHER : MUHAMMADANISCHE STUDIEN VOl. II P. 73
(یعنی درسات اسلامیہ- ج ۲ ص ۷۳) نیز فیوک : (FÜCK) ۲۰- توضیح نمبر: ۲۷-

۳۱۴- البخاری (التاریخ) ۲۲۱

۳۱۵- ابنِ خلکان ۱/۶۱۲

۳۱۶- البخاری (التاریخ) ۱۵۵-

۳۱۷- ابنِ قتیبۃ : کتاب المعارف (تحقیق : وستنفیلڈ WIUSTENFELD) : ۲۴۷

۳۱۸- الفہرست (تحقیق : فلوجل FLÜGEL) ۹۲-

۳۱۹- معجم البلدان (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/۳۹۹

۳۲۰- ان کی ولادت سنہ ۸۴ھ میں ہوئی۔ دیکھو ابن حجر : تہذیب التہذیب : ۱۲/۴۴۴

۳۲۱- ابنِ قتیبۃ : کتاب المعارف ۳۰۱-

۳۲۲- ابنِ حجر : تہذیب التہذیب ۹/۴۲- فیوک : (FÜCK) ۲۰- توضیح ۴۰-

۳۲۳- یاقوت (تحقیق : مارگولیتھ MARGLIOUTH) ۶/۴۰۰

۳۲۴- ابنِ سعد : ۷/۹۷-

۳۲۵- یاقوت (تحقیق : مارگولیتھ) ۶/۳۹۹- نیز ابن قتیبۃ : المعارف ۲۴۷-

۳۲۶- ابن سعد: ۷/ ۶۷- اور دوسرے سوانحی تراجم۔
۳۲۷- یاقوت (تحقیق: مارگولیتھ) ۶/ ۳۹۹
۳۲۸- الطبری ۱/ ۱۳۴۱- ابن سعد: ۴/ ۷- الطبری: ۱/ ۱۳۴۴-
۳۲۹- ابن ہشام: ۲/ ۲۸۱- الطبری: ۱/ ۱۳۲۳- ابن سعد: ۴/ ۵
۳۳۰- ابن ہشام: ۲/ ۳۰۱- الطبری: ۱/ ۱۳۳۹-
۳۳۱- ابن سعد: ۴/ ۷
۳۳۲- ابن سعد: ۶/ ۲۷۶- ۷/ ۸۱- ابن قتیبۃ: کتاب المعارف ۲۴۷- مزید عبارت دیکھیے: فیوک (FÜCK) ۳۴- توضیح: ۱
۳۳۳- فیوک (FÜCK) ۳۴- توضیحات: ۵- ۶ (دہ فقرات درج کئے ہیں جن میں یہ اشارے ملتے ہیں)
۳۳۴- وستنفیلڈ (WUSTENFELD. GOTTINGEN. 1859) "مصطفی البابی الحلبی واولادہٗ کا ایڈیشن (قاہرہ: ۱۹۳۶ء) اس مضمون کی تحریر کے وقت تک شائع نہیں ہوا تھا چونکہ وہی اب آسانی سے دستیاب ہے اس لیے اس کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں (حسین نصار)
۳۳۵- ابن ہشام: ۱/ ۴ (مصطفی البابی)
۳۳۶- الطبری ۱/ ۱۳۴۱- دیکھو فیوک (FUCK) ص ۳۶- توضیحات ۲۲- ۳۲- ان سے معلوم ہو گا کہ ابن اسحاق کے اصل نسخے سے دوسری کتابوں میں کون سی عبارتیں ملتی ہیں۔
۳۳۷- ہورونس نے سیرۃ ابن ہشام کے حوالے وستنفیلڈ کے مرتبہ ایڈیشن ہی سے دیے ہیں مگر عربی ترجمہ میں حسین نصار نے مصطفی البابی الحلبی و اولادہ کا شائع کردہ نسخہ سامنے رکھا ہے، جسے مصطفیٰ السقا، ابراہیم الابیاری اور عبدالحفیظ شلبی نے سلسلہ مطبوعات "تراث الاسلام" میں چھاپا تھا ہمارے سامنے اس کا ۱۹۵۵ء والا ایڈیشن ہے۔ (فاروقی)
۳۳۸- الطبری ۱: ۸۰۱- ۸۵۸
۳۳۹- ابن ہشام وستنفیلڈ ۴۹- ۷۰- مصطفی البابی ۱/ ۷۸- ۹۳-
۳۴۰- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۷۱- ۱۰۱- مصطفی البابی) ۹۳- ۱۶۶-
۳۴۱- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۳۴۱ (مصطفی البابی ایڈیشن) ۲/ ۱۴۷
دوسرا مولف ابن سید الناس ہے جو ابن اسحاق کے بعد اس دستاویز کا حوالہ اپنی کتاب "عیون الآثار" میں دیتا ہے، نیز دیکھو:

WENSINCK: MOHAMMED EN DE JODEN TE MEDINA, LEYDEN, 1908

یعنی "محمد اور یہود مدینہ میں" (لیدن ۱۹۰۸ء) ص ۸۲
۳۴۲- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۶۲- ۲۰۸- ۲۰۷- ۲۸۸- ۳۰۵- ۳۲۲- ۳۴۴- ۳۴۴- (مصطفی البابی) ۱/ ۲۴۴- ۲/ ۳- ۴۳- ۸۶- ۹۷- ۱۲۰- ۱۵۰-
۳۴۳- فیوک (FÜCK) ۴۴- توضیحات ۷۸- ۸۲ (اس حصے میں اسناد کے ساتھ ایسے کمس اقوال درج ہوئے ہیں)

۳۴۴- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۴۸۵-۵۱۵-۶۱۱ - ۶۰۷-۶۹۷-۷۶۸-۸۸۷-۷۸۱-۸۰۱ - ۸۷۵ (مصطفی البابی) ۳۳۳/۲ -
۸/۳ و ۱۲۹ تا ۱۳۵ اور ۲۶۴ و ۳۵۷ - ۴/۱-۱۲ و ۳۰ و ۱۰۱ -

۳۴۵- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۴۴ -

۳۴۶- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۴۴- توضیح : ۸

۳۴۷- فیوک : محمد ابن اسحاق : ۳۲ -

۳۴۸- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۵، ۱۵۶ / ۳۱۷، ۵۵۷ و ۷۷۹ (مصطفی البابی) ۳۵۷/۱، ۱۳۳/۲، ۲۱۳ و ۳۰۹/۳، ۳۷۱- نیز ملاحظہ ہو
فیوک : ۱۰- توضیح : ۳۸ -

۳۴۹- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۷۲، (مصطفی البابی) ۲۵۵/۴، الطبری ۱۵۶۰/۱۔

۳۵۰- الذہبی (تحقیق فیشر FISCHER) تراجم الصحابہ ۸۴- ابن حجر تہذیب التہذیب - ج ۱۱ ص ۳۲۵ -

۳۵۱- "وہب بن کیسان" ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۵۱ (مصطفی البابی) ۳۶۴/۱- "اسمٰعیل بن ابی حکیم" (وستنفیلڈ) ۱۵۴
(مصطفی البابی ۲۵۴/۱ -

۳۵۲- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۷۷، ۳۱۳، ۴۱۳ (مصطفی البابی) ۳۰۹/۱- ۳۳۶ - ۳۴۰ - ۵۸۲ -

۳۵۳- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۲۷۷ - ۴۱۲ - (مصطفی البابی) ۵۷/۲، ۲۳۸

۳۵۴- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۳۴۸، ۴۷۱، ۷۹۱، ۷۹۷، ۸۰۹، ۸۲۰، ۸۱۵، ۹۸۱- (مصطفی البابی) ۴۷/۲، ۱۵۶، ۲۲۳،
۳۱۶ و ۴۷/۳، ۱۰۱، ۲۵۲، ۳۰۷،

۳۵۵- ابنِ ہشام (WÜSTENFELD) ۴۴۷ - ۴۶۱ - ۴۶۵ - ۴۸۰ - ۵۷۰ - ۶۸۰ - ۶۹۴ - ۸۱۵ (مصطفی البابی) ۱۳۳/۲ - ۲۸۳
۳۰۲ - ۳۰۷ - ۳۲۶ - ۸۲/۳ - ۹۱ - ۱۸۲ -

۳۵۶- فیوک : (FUCK) محمد ابن اسحاق : ۲۹ توضیح ۲۲ -

۳۵۷- الطبری ۱۱۰۰، ۱۲۱، ۱۸۹، ۲۱۲ - ۳۱۳ - ۳۷۷ (ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۹۷ (مصطفی البابی) ۳۲۸/۱) -
نیز مقابلہ کیجیے : GOLDZIHER : DIE RICHTUNGEN IN DER ISLAMISCHER KORANAUSLEGUNG. P. 90
(یعنی گولڈ تسیہر : مسلمانوں میں تفسیر کے رجحانات ص ۹۰)

۳۵۸- فیوک : ۲۶

۳۵۹- الطبری : ۱۲۱۳/۱

۳۶۰- الطبری : ۱۴۱/۱

۳۶۱- ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۴۹- (مصطفی البابی) ۲۴۸/۱

۳۶۲- NOLDEKE-SCHWALLEY: GESCHICHTE DES QORANS, V. I P. 9 (یعنی نولدکے شوالے : تاریخ القرآن جلد ۱ ص ۹)

۳۶۳ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۴ (مصطفی البابی) ۱/۲ - ۳۶۴ - ابن اسحٰق نے رسول اللہؐ کے ایک خط کے بارے میں، جو آپؐ نے کسی قبیلے کو لکھا تھا، یہ بیان کیا ہے " وَكَتَبَ لَهُمْ كِتَاباً وَهُوَ عِنْدَ هُمْ " (آپؐ نے ان کو ایک خط لکھا تھا جو اس قبیلے کے پاس محفوظ تھا)

۳۶۵ - ابن ہشام (WUSTENFELD) ۹۵۵ (مصطفی البابی) ۴/ ۲۳۵ - الطبری ۱/ ۱۷۱۷، ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۵۹ (مصطفی البابی) ۴/ ۲۳۷ - الطبری ۱/ ۱۷۲۴ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۹۱ (مصطفی البابی) ۴/ ۲۳۹ - الطبری ۱/ ۱۷۲۷ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۶۵ (مصطفی البابی) ۲/ ۲۴۱ - الطبری ۱/ ۱۷۴۸ -

۳۶۶ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۹۹۲ (مصطفی البابی) ۴/ ۲۴۵ - الطبری ۱/ ۱۷۴۰ ۳۶۷ - الفہرست (تحقیق فلوجیل FLUGEL) ۹۲ معجم البلدان (تحقیق: مارگولیتھ MARGOLIOUTH) جلد ۲ ص ۴۰۰ -

۳۶۸ - الجمحی: طبقات الشعراء: (تحقیق ہیل HELL) ۴: - ۳۶۹ - الطبری ۲۳۹/ - ۲۳۷ - ۲۴۱ - ۲۴۲ -

۳۷۰ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۶۸۹، ۶۹۳، ۸۱۸ (مصطفی البابی) ۴/ ۱۳، ۱۸، ۲۹ -

۳۷۱ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۰۸ (مصطفی البابی) ۱/ ۱۷۹ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۱۱۱ (مصطفی) ۱/ ۱۸۳ اسے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ باقی مرثیوں کا تعلق بھی محمد ابن سعید سے ہے۔

۳۷۲ - جوزف ہورووٹس کی اس رائے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف ایک روایت محمد بن سعید بن المسیب پر اشعار گھڑنے کا الزام لگانے کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح محض یہ بات کہ سعید بن المسیب شعر و شاعری کو پسند کرتے تھے، انھیں وضع و تحریف کا مرتکب قرار دینے کا ثبوت فراہم نہیں کر سکتی حالانکہ وہ عظیم المرتبہ تابعی تھے اور زمرۂ محدثین میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا جب بیٹے ہی کا مرتکب وضع ہونا محلِ نظر ہے تو باپ کا معاملہ تو اور بھی زیادہ بعید از قیاس بات ہے (حسین نصار)

۳۷۳ - ISLAMICA II 308 یعنی مجلۂ الاسلام، جلد ثانی ص ۳۰۸ و بعد

۳۷۴ - ابن ہشام (وستنفیلڈ) ۵۱۶، ۶۱۱، ۶۴۳، ۶۵۹، ۷۰۰، ۷۲۳، ۷۷۲، ۷۹۸، ۸۲۸، ۸۵۷، ۹۲۹ - (مصطفی البابی) ۳/ ۸ - ۴۵، ۱۳۵ - ۱۷۷، ۱۸۵، ۲۰۴، ۲۶۶ - ۲۸۳ - اس سے پہلے عبید بن شریۃ نے اپنے اخبار میں کثرت سے اشعار و قصائد کا استعمال کیا ہے۔ دیکھیے اخبار عبید بن شریۃ الجرہمی طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد" (نثار فاروقی)

۳۷۵ - اس سے میری مراد ابن ہشام (نسخہ وستنفیلڈ) کے عنوانات نہیں ہیں جو نہ ابن اسحاق کے یہاں ہیں نہ ابن ہشام سے لیے گئے ہیں بلکہ زمانہ مابعد کے کسی ناقل نسخہ کا اضافہ معلوم ہوتے ہیں، یہاں وہ عبارتیں مراد ہیں جو ابن اسحاق اپنے اخبار کے شروع میں تمہیداً درج کرتا ہے۔

۳۷۶ - الفہرست (تحقیق۔ فلوجل FLUGEL) ۹۱ - معجم البلدان (تحقیق مارگولیتھ MARGOLIOUTH) ۶/ ۴۰۱ -

۳۷۷ - یاقوت: (تحقیق وستنفیلڈ) ۳/ ۱۹۶ نیز السمعانی: الانساب ۳۱۴۳ -

۳۷۸ - ابن حجر: تہذیب التہذیب ۱۰/ ۴۲۱ "قال داؤد بن محمد بن ابی معشر حدثنی ابی انه كان اصله من اليمن... وكان ابيض ازرق سمينا" (داؤد بن محمد بن ابی معشر نے بیان کیا کہ مجھے میرے باپ نے بتایا کہ ان کی اصل یمن کی تھی.... وہ گورے تھے، آنکھیں نیلی تھیں اور موٹے تھے)

۳۷۹ - کبھی کبھی بصرے کو بھی السند کے نام سے پکارا گیا ہے، کیونکہ اس شہر میں اس نام کا ایک محلہ تھا جس میں کثرت سے اہل سند آباد تھے۔ بصرہ بندرگاہ بھی تھی جہاں سے مسافر سوار ہوا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ابو معشر کی نسبت اسی محلہ کی طرف ہو۔ (حسین نصار)

۳۸۰ ـ الذہبی: التحقیق: زخاؤ (نیز STUDIEN P. 11 (یعنی دراساتِ اسلامیہ)

۳۸۱ ـ الذہبی: (ماسبق) ۱۰) "کانَ ابو معشرٍ یذکرُ أنّه من وُلدِ حنظلة بن مالكٍ" (اور ابو معشر کہا کرتے تھے کہ وہ حنظلہ بن مالک کی اولاد میں ہیں)

۳۸۲ ـ حوالہ ماسبق "وقال ابوبکر الحسین بن محمد بن أبی معشر: حدّثنی أبی قال: کانَ إسمُ أبی معشر قبل أن یُسرق عبد الرحمن بن الولید بن هلال" (ابوبکر الحسین بن محمد بن ابی معشر نے کہا کہ اُن کے باپ نے انھیں بتایا کہ ابو معشر کے "چرائے جانے" سے پہلے ان کا نام عبدالرحمن بن الولید بن ہلال تھا)

۳۸۳ ـ حوالہ ماسبق "فسرق فبیع بالمدینة فاشتراه قومٌ من بنی أسد فسمّوه نجیحًا" (پھر انھیں اغوا کر لیا گیا اور یہ مدینے میں بیچے گئے اور انھیں بنو اسد کے لوگوں نے خرید کر ان کا نام نجیح رکھا)

۳۸۴ ـ ابن حجر ۱۰/ ۴۲۱ "وسُبی فی وقعة یزید بن المهلب بالیمامة والبحرین" (اور یہ بحرین و یمامہ میں یزید بن مہلب کی جنگ میں اسیر ہوئے تھے)

۳۸۵ ـ الطبری ۳/ ۴۲۲ ـ وکانت أمّ موسیٰ الحمیریة ولدت له (یعنی للمنصور) جعفرًا والمهدی" (اُمّ موسیٰ حمیری تھی اور اس نے خلیفہ المنصور کے دو بیٹوں جعفر اور المہدی کو جنم دیا تھا)

۳۸۶ ـ حوالہ ماسبق (ابن حجر) ثم اشتُرِیَ لامّ موسیٰ بن المهدی فاعتقته (پھر انھیں موسیٰ بن المہدی کی ماں کے لیے خریدا گیا۔ اس نے انھیں آزاد کر دیا)

۳۸۷ ـ ابن الندیم: الفہرست ۹۲ "وکان مکاتبًا لامرأةٍ من بنی مخذوم وعَتَقَ" (اور یہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت کے مُکاتب تھے پھر آزاد ہو گئے)

ابن سعد ۵/ ۳۰۹ "وکان مکاتبًا لامرأةٍ من بنی مخذوم فادّی وعُتِقَ، فاشترت أمّ موسیٰ بنت المنصور الحمیریة ولائه" یہ بنو مخزوم کی ایک عورت کے مکاتب تھے پھر انھوں نے مقررہ رقم ادا کر دی تو آزاد ہو گئے اور اُمّ موسیٰ بنت المنصور حمیری نے ان کی ولایت خرید لی، نیز المقدسی مرتبۂ سخاؤ (E. SACHAU : STUDIEN) اور البخاری نے اپنی "تاریخ" میں کہا ہے کہ یہ اُمّ سلمہ کے مولیٰ تھے۔

۳۸۸ ـ المقدسی ۱۰: "قال لی: ولاؤنا فی بنی هاشم أحبّ إلیّ من نسبی فی بنی حنظلة" (انھوں نے مجھ سے کہا کہ بنو ہاشم سے میری نسبتِ ولایت بنی حنظلہ کے نسبی تعلق سے مجھے زیادہ پیاری ہے)

۳۸۹ ـ الطبری ۳/ ۴۸۲ -

۳۹۰ ـ ابن حجر؛ تہذیب التہذیب ۱۰/ ۴۲۱ "وقدم المهدی فی سنة ستین ومئة فاستصحبه معه الی العراق" (اور المہدی سنہ ۱۶۰ھ میں (حج کرنے) آیا تو انھیں اپنے ساتھ عراق لیتا گیا۔)

الذہبی ۱۰- "انّ المهدی قدم المدینة سنة ستین ومئة فاشخص ابا معشرٍ معه الی العراق: وامر له بالف دینارٍ وقال تکون بحضرتنا فتفقّه من حولنا" (المہدی ۱۶۰ھ میں مدینہ آیا تو انھیں اپنے ساتھ عراق لے گیا۔ وہاں ان کو ایک ہزار دینار بخشش دی اور کہا کہ تم ہمارے ساتھ رہو اور ہمارے متعلقین کو فقہ کی تعلیم دیا کرو۔")

۳۹۱ ـ ابن حجر حوالہ ماسبق ۴۲۲ "وتغیّر قبل أن یموت بسنتین تغیّراً شدیداً" (اور انتقال سے دو سال پہلے ان میں بہت تبدیلی پیدا ہو گئی تھی)

الذہبی ۲: کہتا ہے "حتی کان یخرج منه الریح ولا یشعر بها" (حتی کہ ان کا وضو ٹوٹ جاتا تھا اور انھیں خبر نہ ہوتی تھی)

السمعانی ۳۱۳ "وکان ممّن اختلط فی آخر عمره. وبقی قبل أن یموت سنین فی تغیّر شدید لا یدری ما یحدث به لکثرة المناکیر فی روایته من قبل اختلاطه" (یہ ان لوگوں میں سے تھے جو بڑھاپے میں سٹھیا جاتے ہیں، چنانچہ مرنے سے کئی سال پہلے

سے حواس باختہ ہو گئے تھے انھیں یہ خبر ہی نہ ہوتی تھی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اس بدحواسی سے پہلے بھی اپنی روایات میں متضاد باتیں کہہ جاتے تھے)

۳۹۲ ـ ابن سعد ۵ / ۳۰۹ ـ ابن قتیبۃ : المعارف ۲۵۳ ـ السمعانی ۳۱۳

ابن حجر ۱۰/ ۳۲۲ ـ الفہرست ۹۳ کے مطابق انھوں نے الہادی (متوفی ۱۶۹ھ) کے زمانے میں انتقال کیا۔

۳۹۳ ـ السمعانی ۳۱۳ ـ الذہبی ۲ ۳۹۴ ـ البخاری : تاریخ ۱۹۹ ۳۹۵ ـ ابن سعد ۵ / ۳۰۹

۳۹۶ ـ تہذیب ۱۰/ ۳۲۰ ۳۹۷ ـ المقدسی ۹ ۳۹۸ ـ ابن حجر ۱۰/ ۳۲۲

۳۹۹ ـ تحقیق : فلوجل (FLÜGEL) ۹۳ ۴۰۰ ـ دیکھو ولہاؤزن کا اشاریہ ولہاؤزن ۳۲۱ میں الواقدی نے ان سے ایک خبر معلوم کی ہے جو اسے کسی اور راوی سے ملی تھی۔ ۴۰۱ ـ ابن سعد ۲ ق ۱/ ۳/ ۲۱ ۴۰۲ ـ الطبری ۱/ ۱۱۹۵

۴۰۳ ـ ابن سعد ۵ / ۳۱۴ اور ما بعد الطبری ۲ / ۲۰۷ ۱۱ ـ ۴۰۴ ـ ابن سعد ۷/ ۷۷، (۲ ق ۲/ ۷۷) "محمد بن عمر بن واقد الاسلمی مولیٰ عبداللہ بن بریدۃ الاسلمی"

۴۰۵ ـ ابن سعد ۵/ ۳۲۱ "قال محمد بن سعد اخبرنی (یعنی محمد بن عمر) انہ ولد فی سنۃ ثلاثین ومئۃ فی اٰخرِ خلافۃِ مروانَ بنِ محمد" کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۳۰ھ میں یعنی مروان بن محمد کی خلافت کے آخری زمانے میں پیدا ہوا تھا)

۴۰۶ ـ کتاب الاغانی ۷/ ۱۳۹ "وزعم ابن خرداذبہ أنّ امّ محمد بن عمر الواقدی..... بنت عیسی بن جعفر بن سائب خاثر" (ابن خرداذبہ کا خیال ہے کہ محمد بن عمر الواقدی کی ماں عیسیٰ بن جعفر بن سائب خاثر کی بیٹی تھی)

۴۰۷ ـ جوزف ہورووِتس کی اس رائے سے اتفاق کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ سائب خاثر عربی قصائد لکھنے والا پہلا مدنی شاعر نہیں تھا بلکہ یہ ایک خاص غنائیہ انداز کی شاعری میں پہل کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی اختلافِ آراء ہے اور طوالت کے خوف سے یہاں صرف ہم الاغانی کی روایت (۷/ ۱۸۸) کا اقتباس دے رہے ہیں۔ ابوالفرج الاصفہانی کہتا ہے "وقال ابن الکلبی وابو غسان وغیرھما: وھو اول من حمل العودَ بالمدینۃ وغنّی بہ..... قال ابن الکلبی: وھو اوّل صوتٍ غُنی بہ فی الاسلام فی الغناء العربی المتقن الصنعۃ.....وقال ابن الکلبی: سائب خاثر اوّل من بالعربیۃ الغناء الثقیل" (ابن الکلبی اور ابوغسان وغیرہ نے کہا کہ یہ مدینے میں پہلا شخص ہے جس نے عود بجایا اور اس پر گایا..... اور ابن الکلبی نے کہا: یہ اسلام میں پہلی گانے والی آواز تھی جس نے عرب موسیقی کے فنّی کمال کے ساتھ گانا گایا..... اور ابن الکلبی نے کہا کہ سائب خاثر پہلا شخص تھا جس نے عرب کا پکّا گانا گایا۔ (حسین نصّار)

۴۰۸ ـ الطبری ۳/ ۷۰۵ ـ ہارون الرشید نے ۱۸۰ھ میں دوبارہ حج کیا تھا۔ الطبری ۳/ ۶۴۵ میں ہے کہ ۱۸۰ھ میں حج سے واپس آتے ہوئے ہارون الرشید بصرہ میں ٹھہرا تھا۔

۴۰۹ ـ ابن سعد ۵/ ۳۱۸ و ما بعد "وحدثنی احمد بن صبیح، قال: حدثنی عبداللہ بن عبید اللہ قال: قال لی الواقدی حجّ امیرالمؤمنین ہارون الرشید فوردَ المدینۃ فقالَ لیحییٰ بن خالد" ـ (احمد بن صبیح نے مجھ سے بیان کیا کہ مجھے عبداللہ بن عبیداللہ نے بتایا کہ مجھ سے الواقدی نے کہا کہ امیرالمؤمنین ہارون الرشید نے حج کیا تو وہ مدینہ آئے اور انھوں نے یحییٰ بن خالد سے کہا...") (آگے وہی روایت ہے جو متن میں درج ہوئی (نثار فاروقی)

۴۱۰ ـ ابن سعد ۷/ ۷۷ "وکان من اھل المدینۃ فقدم بغداد فی سنۃ ثمانین ومئۃ فی دینٍ لحقہ فلم یزل بہا وخرج

الی الشّام والرّقّۃ "(یہ مدنی تھے اور سنہ ۱۸۰ھ میں بغداد آئے تھے کیونکہ یہ مقروض ہو گئے تھے وہاں رہتے رہے پھر شام اور رقّۃ کی طرف چلے گئے)

۴۱۱ - الطبری ۳/۶۴۶ "ثمّ شخص (یعنی ھارون الرشید) من مدینۃ السّلام الی الرّقّۃ" (سنۃ ۱۸۰ھ) "(پھر وہ ہارون الرشید) بغداد سے سنہ ۱۸۰ھ میں رقّہ چلا گیا"

۴۱۲ - ابن سعد ۵/ ۳۱۵ ومابعد ۴۱۳ - ابن سعد ۵/ ۳۱۹ ۴۱۴ - مروج الذہب (طبع قاہرہ) ۲/ ۲۶۲

۴۱۵ - یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۸ ۴۱۶ - یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۶ ۴۱۷ - ابن حجر ۹/ ۳۶۴

۴۱۸ - الطبری ۳/ ۱۰۳۷ ۴۱۹ - یاقوت (تحقیق وستنفیلڈ) ۳/ ۶۷۷ ۴۲۰ - ابن سعد ۵/ ۳۱۴-۷/ ۷۷ -

ابن قتیبۃ: کتاب المعارف ۲۵۸ - یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۵ - السمعانی: ۵۷۷ - (ابن خلکان ۱/ ۲۳ نے ابن قتیبہ کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ الواقدی بغداد کے مغربی علاقے کے قاضی تھے۔ حالانکہ ابن قتیبہ کہتا ہے کہ غربی علاقے کے قاضی نے الواقدی کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی۔) نیز ابن سعد ۵/ ۳۲۱ -

۴۲۱ - ابن حجر ۹/ ۳۶۵ "وکان جواداً کریماً مشھوراً بالسّخاء" (یہ بہت دریادل تھے اور اپنی سخاوت کے لئے شہرت تھے)

۴۲۲ - یاقوت (تحقیق مارگولیتھ) ۷/ ۵۶ -

۴۲۳ - ابن سعد ۵/ ۳۲۱ "واوصی محمّدُ بنُ عُمرالی عبد اللہ بنِ ھارون امیرالمؤمنین فقبل وصیّتہ وقضٰی دَینَہ"

(الواقدی نے ہارون الرشید کے بیٹے عبداللہ کو اپنا وصی بنایا تھا، اس نے وصیت کی تکمیل کی اور اس کا سارا قرض ادا کر دیا)

۴۲۴ - ابن سعد ۵/ ۳۲۱-۷/ ۷۷ - ابن قتیبۃ: ۲۵۸ - الفہرست: ۹۸ ۴۲۵ - الفہرست: ۹۸ ؛

۴۲۶ - الفہرست (تحقیق فلوگل ۹۸ FLUGEL) " وترک الخوارج فی الفتن " ۴۲۷ - یاقوت: معجم الادبا ۷/ ۵۸

۴۲۸ - الفہرست میں اس کتاب کے کچھ ابواب بھی بتائے گئے ہیں۔ ۴۲۹ - الفہرست میں یہ اضافہ ہے۔

۴۳۰ - اصل میں نام یوں تھا ہے "کتاب الترغیب فی علم القرآن وغلط الرجال" اسلامک کلچر میں طباعت کی غلطی سے اس حاشیے کا نشان کتاب نمبر ۱۷ پر لگ گیا ہے (نثار فاروقی)

۴۳۱ - یہ غالباً عورتوں سے متعلقہ مسائل شریعت کی کتاب ہو گی، مگر یاقوت نے اسے تاریخی کتابوں کے ذیل میں شمار کیا ہے، تو یقین ہے کہ اس میں کچھ تاریخی مواد بھی رہا ہو گا۔

۴۳۲ - الفہرست میں ایک مخصوص تالیف "مقتل الحسن" کا حوالہ بھی ہے۔

۴۳۳ - الفہرست نے آخر میں یہ اضافہ کیا ہے " وتصانیف القبائل ومراتبھا وانسابھا "

۴۳۴ - ابن سعد ۸/ ۳۲ ۴۳۵ - BIBLIOTHECA ARABO-HISPANA IX, 237

یعنی اسپین کی کتب عربی کی فہرست جلد ۹ صفحہ ۲۳۷ ؛

CAETANI : ANNALI DELL 'ISLAM, ANNO 11, 70 F - ۴۳۶

(یعنی کیتانی: حولیات اسلام ۱۱ھ / ۷۰ ف

۴۳۷ - الطبری ۱/۲۹۹۱ - ۳۰۶۰ ۴۳۸ - الطبری ۳/۶۳۹

LOTH : ZEITSCHRIFT DER DEUTSCHEN MORGENLANDISCHEN GELLSCHAFT VOL. 23 P. 603 - ۴۳۹

(یعنی مجلہ جماعتِ مستشرقینِ جرمنی جلد ۲۳ صفحہ ۶۰۳ پر لوث کا مضمون)

۴۴۰ - لوث (LOTH) حوالۂ ماسبق صفحہ ۶۰۴، ۶۰۷ نوٹ نمبر ۴ -

ابن سعد ۵/۳۱۴ - الواقدی نے ایک محدث کی تاریخ وفات درج کی ہے جن کا انتقال مدینے میں ۱۸۶ھ میں ہوا تھا - یہ کتاب بھی غالباً مدینے میں مکمل ہوئی مگر بعد کو اس میں کچھ اضافات بغداد میں کیے گئے -

۴۴۱ - ابن سعد کی کتاب کے باب سیرۃ میں اور الواقدی کی کتاب میں ربط تلاش کرنے کے لیے دیکھو:

BANETH (D.H) : BEITRAGE FAR KRITIK AND ZUR SPRACHLICHLICHEN VERSTANDIS DER SCHREIBEN MUHAMMADS. DISSERTATIONS — AUSZUG BERLIN 1920

(یعنی ڈی - ایچ - بانث: مراسلات نبوی پر تنقیدی اضافات اور ان کے لغوی مطالب "چیدہ مقالات" برلن ۱۹۲۰ء)

۴۴۲ - دیکھو کتاب المغازی - الواقدی بتحقیق الفرڈ فون کریمر - کلکتہ ۱۸۵۶ء

KREMER (ALFRED VON) : WAQIDI'S HISTORY OF MOHAMMA 'S COMPAIGNS, CALCUTTA, 1856.

اس میں الواقدی کی تالیف کتاب کے صفحہ ۶۰ کی سطر ۱۰ تک ہے - بعد میں جو کچھ ہے یہ زمانۂ مابعد کی ایک اور تالیف سے ماخوذ ہے اسی طرح صفحہ ۱ سطر ۹ سے صفحہ ۹ سطر ۲ تک جو کچھ ہے اس کا بھی الواقدی سے کچھ سروکار نہیں -

۴۴۳ - تحقیق کریمر (KREMER) نمبر ۱ سطر ۹ تا ۲ سطر ۶

۴۴۴ - ابن سعد ۲/۱ سطور ۳ - ۱۰ - الواقدی کے شیوخ کی ایک فہرست جو چند ناموں پر مشتمل ہے، جنھوں نے الواقدی کو مغازی رسول کی روایت دی، تمہیں ابن سعد جزو اول قسم ثانی کے صفحہ ۱۵ پر ملتی ہے - دوسرے آٹھ ناموں کی فہرست جس میں الواقدی کے اساسی رواۃ کے نام ہیں اور جنھوں نے "طبقات" کی روایت کی ہے وہ اسی کتاب کے جز ثالث میں صفحہ ۱ پر ملے گی -

۴۴۵ - SACHAU : STUDIEN FUR ALTESTEN GESCHICHTSUBERLIEFERUNGBER ARABER, P. 21.

(یعنی ایڈورڈ سخاؤ: "تاریخِ عرب کے قدیم راویوں کا مطالعہ" ص ۲۱ -

۴۴۶ - الطبری ۳ / ۱۲/ ۲۵۱۲ ۴۴۷ - اس کے ثبوت میں ذیل یا وزن ۱۲ میں ملیں گے - نیز ملاحظہ ہو :

HOROVRTTZ (JOSEPH): DE WAQIPIT LIDROQUI KITAB AL MAGAZI

INSCRIBITUR BERLIN, 1898, 9 seq.

یعنی یوزف ہورووِتس "الواقدی کی کتاب المغازی کے مخطوطے کے بارے میں" برلن ۱۸۹۸ء، صفحہ ۹ و مابعد۔

۴۴۸ - ابن سعد ۱/ ۳۹ "یقول الواقدی حدثنی عبد اللہ بن جعفر الزہری قال وجدتُ فی کتاب ابی بکر بن عبد الرحمٰن بن المسوَر...... الخ (الواقدی کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر الزہری نے کہا کہ میں نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن المسور کی کتاب میں دیکھا ہے ......الخ۔)

اور اسی کتاب میں (۲/ ۲۹) یہ ہے: "حدثنی موسیٰ بن محمد بن ابراھیم بن الحارث التیمی، قال: وجدتُ ھذا فی صحیفۃٍ بخطِّ ابی فیھا...." (موسیٰ بن محمد بن ابراہیم بن الحارث التیمی نے کہا میں نے اپنے باپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں دیکھا۔

۴۴۹ - یہی الواقدی نے کہا ہے۔ ابن سعد - ق ۲/ ۳۷ "قال محمد بن عمر نسختُ کتاب اھلِ اذرح، فاذا فیہ......"

(الواقدی نے کہا میں نے اہل اذرح (جگہ کا نام) کی ایک کتاب نقل کی تھی تو اس میں دیکھا......")

۴۵۰ - ولہوزن ۱۵ - ۴۵۱ - ابن سعد ۲ ق ۲/ ۱۲۶ سطر ۲۵ تا ۱۲۸ سطر ۱۲

۴۵۲ - الواقدی کی جرح کے لیے دیکھو: ابن حجر ۹/ ۳۶۳ - و مابعد نیز یاقوت: معجم الادبا ۷/ ۵۵ -

۴۵۳ - ابن سعد ۵/ ۳۱۴ - یاقوت، حوالہ سابق ۴۵۴ - ابن حجر ۹/ ۳۶۵ -

۴۵۵ - تحقیق فلوجل (FLUGEL) ۹۸ "وکان یتشیّع حسن المذھب ..... وھو الّذی روی انّ علیاً علیہ السّلام :

"کان من معجزاتِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کالعصا لموسیٰ علیہ السّلام واحیاء الموتیٰ لعیسیٰ بن مریم علیہ السّلام، وغیر ذلک من الاخبار" (یہ شیعہ تھے اور معتدل مذہب رکھتے تھے ....انھوں نے ہی یہ روایت کی ہے کہ حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک تھے، بالکل اسی طرح جیسے عصا حضرت موسیٰؑ کا معجزہ تھا، یا مُردوں کو زندہ کرنا حضرتِ عیسیٰؑ کا معجزہ تھا، یا اسی طرح کے اور اخبار" (جوزف ہورووِتس)

"(ابن الندیم کے سوا کسی نے الواقدی کو شیعہ نہیں لکھا - وہ کہتا ہے "کان یلزم التقیۃ" (یہ تقیہ کیے رہتے تھے) مؤلف اعیان الشیعہ (جلد ۴۶ صفحہ ۱۷۱) اور مؤلف "الذریعہ الی تصانیف الشیعۃ" (جلد ۳ ص ۲۹۳) نے الفہرست ہی کی بنیاد پر اس کا ترجمہ اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے لیکن ابن ابی الحدید جہاں الواقدی کی کوئی روایت درج کرتا ہے اور اس کے بعد کسی شیعی ماخذ کا حوالہ دیتا ہے تو "وفی روایۃ الشیعۃ" کے الفاظ سے حد بندی کر دیتا ہے، اس کا صریح مطلب یہ ہے کہ وہ الواقدی کی روایت کو مسلک شیعہ کی نمائندہ نہیں سمجھتا۔ خود الواقدی نے اپنے مغازی میں ایسی روایات بیان کی ہیں جو کسی شیعہ مؤلف کے قلم سے نہیں نکل سکتیں، خواہ وہ تقیہ کئے ہوئے ہو، مثلاً: ابن اسحٰق نے یوم بدر کے مقتولین کی فہرست میں لکھا ہے کہ طعیمہ بن عدی کو حضرت علی نے قتل کیا۔ مگر الواقدی نے اس کی تردید کی ہے اور کہتا ہے کہ طعیمہ کو قتل کرنے والے حمزہؓ تھے، علی نہیں تھے - اسی طرح یوم

احد میں صُوَاب کو کس نے قتل کیا، اس میں اختلافِ روایات ہے اور مختلف رُواۃ نے تین نام لیے ہیں کوئی کہتا ہے اُس کے قاتل سعد بن ابی وقاص تھے، کوئی حضرت علی کا نام بتاتا ہے، اور کسی کا بیان ہے کہ قزمان نے اُسے ہلاک کیا تھا۔ الواقدی نے تینوں بیانات کا حوالہ دے کر اپنی رائے بھی لکھی ہے کہ قزمان کا قاتل ہونا ثابت ہے۔ الواقدی کی کتاب المغازی، جواب مکمل حالت میں مرتب ہو کر ہمارے سامنے ہے اُس میں اُن صحابیوں کی فہرست ملتی ہے جو یوم اُحد میں بھاگے تھے، اسے الواقدی نے اس طرح شروع کیا ہے: "کان ممّن تولّی فلان والحارث بن حاطب...." جو لوگ بھاگے ان میں فلان اور الحارث بن حاطب وغیرہ تھے.....) ابن ابی الحدید نے اس فہرست میں حضراتِ عمر و عثمان کے نام بھی لکھے ہیں۔ البلاذری نے یہی فہرست الواقدی سے نقل کی ہے تو اُس میں عثمان کا نام ہے۔ عمر کا نہیں ہے (انساب ۱/۳۲۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی مخطوطہ میں عمر و عثمان دونوں کے نام تھے یا اِن میں سے ایک کسی کا نام تھا، مگر اس نسخہ کے ناقل کو اس فہرست میں عمر و عثمان کے نام ناگوار ہوئے اور اُس نے اُن کی جگہ لفظ "فلان" لکھ دیا۔ جن لوگوں نے بنیادی مخطوطہ کے مطابق لکھے ہوئے نسخے دیکھے ہوں گے، انھوں نے یہ گمان کر لیا کہ الواقدی شیعہ تھا۔ بہرحال الواقدی کے تشیع کو تسلیم کرنے کے لیے صرف ابن الندیم کا قول ناکافی ہے، جب کہ اسی کا معاصر الطوسی اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کرتا۔ دوسرا قیاس اس سے بنا ہو گا کہ الواقدی سے "مقتل الحسن"، "مقتل الحسین" اور "مولد الحسن والحسین" جیسی کتابوں کی تالیف منسوب ہے۔

(نثار احمد فاروقی)

۴۵۶۔ ابن ہشام ۴/۱۶۳ (وستنفیلڈ ۵۸۹) نیز الواقدی (ولہوزن) ۲۹۳

۴۵۷۔ ابن ہشام ۴/۱۹۰ (وستنفیلڈ ۹۲۱) الواقدی (ولہوزن) ۴۱۶ اور ابن سعد ۲/۱۲۷ کا نوٹ

۴۵۸۔ الفہرست ۹۸۔

۴۵۹۔ ابن سعد ۲ ق ۲/۵۰ سطر ۱۲ تا ۱۵ اور سطر ۲۴۔

۴۶۰۔ ابن سعد ۲ ق ۲/۵۰ سطر ۱۲ تا ۱۵ اور سطر ۲۴۔

تحقیق کریمر ۱۴۰۔ الواقدی ایک خبر میں جو ابن سعد (۴/۶) کے یہاں موجود ہے العباس کی گرفتاری کا بیان کرتا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو:

NOLDEKE IN THE Z.D.M.G. VOL. 52, P. 21 SEQ.

(یعنی مضمون نولدکہ در مجلۂ جماعۃ مستشرقین جرمنی جلد ۵۲، صفحہ ۲۱ و مابعد

۴۶۱۔ ابن سعد ۳ ق ۱/۲۱ نیز

CAETANI: ANNALI DELL' ISLAM, ANNO 20, PP. 264, 266, 341.

(یعنی کیتانی: تحولیات اسلام، سنہ ۲۰ ھ، صفحہ ۲۶۴، ۲۶۶، ۳۴۱۔

۴۶۲۔ IBN SAD: BIOGRAPHIEN MUHAMMADS SEINER GEFAHRTEN UND DER SPAREREN TRAGER DES ISLAMS BIS SUM 230 DER FLUCHT, 19 VOLS. LEIDEN, F. J BRILL, 1904-28

(یعنی ابن سعد: تراجم محمد والصحابہ والتابعین تا سال ۲۳۰ ھ - ۱۹ جلدیں - ای جے بریل لائیدن - ۱۹۰۴ء تا ۱۹۲۸ء)

۴۶۳۔ LOTH (OTTO): DAS CLASSENBUCH DES IBN SA'D, LEIPZIG, 1869.

یعنی اٹولوث: طبقات ابن سعد، لیپزگ ۱۸۶۹ء)

۴۶۴ - ابن سعد، ق ۲/ ۹۹

۴۶۵ - ابن سعد ۵/ ۳۱۴ - لکتہ (ابا علقمۃ الفزاری) عمر حتی لقیناہ سنۃ تسع وثمانین ومئۃ بالمدینۃ. (کہ ابو علقمۃ الفزاری زندہ رہا، یہاں تک کہ ہم اس سے ۱۵۸ھ میں مدینے میں ملے تھے)

۴۶۶ - ابن سعد، ق ۲/ ۹۹ - البلاذری فتوح ۳۱۹ میں ہے کہ یہ بنو ہاشم کے موالی تھے۔

۴۶۷ - ابن حجر ۲/ ۳۴۲

۴۶۸ - ابن سعد ۵/ ۲۳۱

۴۶۹ - ابن خلکان ۱/ ۶۴۲

۴۷۰ - الفہرست (تحقیق فلوجل) ۹۹

۴۷۱ - LOTH (OTTO) : DAS CLASSENBUCH DES IBN SA' DLEIPZIG, 1869.

(یعنی اوٹو لوتھ: طبقات ابن سعد صفحہ ۲۵ ومابعد)

۴۷۲ - NOLDEKE-SCHWALLY: GESCHICHTE DES QORANS, VOL. II, P. 135.

۴۷۳ (یعنی نولدکہ شوالی: تاریخ القرآن - ۲، ص ۱۳۵)

۴۷۴ - ابن سعد ۱ ق ۱/ ۲۱-۲۲

۴۷۵ - ابن سعد ۲ ق ۱/ ۱

دیکھو زخاؤ: مقدمہ ابن سعد، جلد سوم صفحہ (XXVII)

ہورووتس: مقدمہ ابن سعد، جلد سوم ق ۲ صفحہ (V) ومابعد

SACHAU: STUDIEN P. 32 SEQ.

(یعنی زخاؤ: دراسات ۳۲ ومابعد

DE GOEJE: Z.D.M.G VOL. 57, P. 379.

یعنی مضمون دی غویہ در مجلہ مستشرقین جرمنی جلد ۵۷ صفحہ ۳۷۹

RECKENDORF. IN ORIENTALISTISCHE LITERATRZEITUNG, 1923. P. 352.

۴۷۶ - یعنی رانکدورف در صحیفہ آداب شرقیہ ۱۹۲۳ء، صفحہ ۳۵۱

Z.D.M.G. VOL. 23, P. 593 SEQ.

۴۷۷ - یعنی مجلہ جماعت مستشرقین جرمنی، جلد ۲۳، صفحہ ۵۹۳ ومابعد

یہ السیرۃ الحلبیۃ کے مؤلف علی بن برہان الدین الحلبی ہیں۔ (حسین ن...)

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ

نقوش

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۲

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد دوم

شمارہ نمبر ۱۳۰

دسمبر ۱۹۸۲ء

مُدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ۔ لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

طلوع

رسولؐ اللہ ایک نظر میں

(۱) رسولؐ اللہ ایک نظر میں	۷
(۲) رسالت نامہ	۴۳

سیرتِ نبویؐ کی توقیت

(۱) سیرت نبویؐ (توقیت کی روشنی میں)	۵۱
(۲) درست تاریخیں	۵۹
(۳) مہینوں اور موسموں میں اختلاف	۶۰
(۴) تیسری قسم کی نامطابقتیں	۶۴
(۵) صحیح توقیت کی مثالیں	۶۶
(۶) توقیتی تضاد کی چوتھی قسم	۶۷
(۷) واقعاتی ترتیب میں تضاد	۷۰
(۸) اہلِ مکہ کا نظام سنی	۷۹
(۹) مدنی کلینڈر	۱۱۶
(۱۰) دو دستاویزی تصور	۱۲۴
(۱۱) دو تقویمی نظریہ کی ابتدا	۱۲۸
(۱۲) توقیتی اختلافات کا واقعاتی ترتیب پر اثر	۱۳۲
(۱۳) ابن حبیب کی دستاویز	۱۳۸
(۱۴) ابن حبیب اور محبر کی حیثیت	۱۳۸
(۱۵) کتابتی سہو اور دوسری قسم کی غلطیاں	۱۴۱
(۱۶) [illegible] کی غلطیاں	۱۴۴
(۱۷) مضمون اور نقص میں التباس	۱۴۵
(۱۸) [illegible] الفاظ کی [illegible]	۱۴۵
(۱۹) ہجرت	۱۵۳
(۲۰) غزوہ احد	۱۶۴
(۲۱) غزوہ حمراء الاسد	۱۶۶

(۲۲) غزوۂ بدرِ موعد ۱۷۰
(۲۳) غزوۂ ذات الرقاع ۱۷۳
(۲۴) صلح حدیبیہ ۱۷۷
(۲۵) غزوۂ خیبر ۱۸۳
(۲۶) فتح مکہ ۱۸۷
(۲۷) غزوۂ تبوک ۱۹۴
(۲۸) حجۃ الوداع ۱۹۸

الرّسالات النّبویہؐ

مکتوب الیہ:

۱۔ النجاشی ملک حبشہ ۲۱۷
۲۔ قیصرِ روم ۲۲۰
۳۔ کسریٰ بن ہرمز ۲۲۲
۴۔ مقوقس والیِ اسکندریہ ۲۲۴
۵۔ الحارث بن ابی شمر غسانی ۲۲۶
۶۔ ہوذۃ بن علی الحنفی ۲۲۷
۷۔ جیفر اور عبد بن الجلندی ۲۲۷
۸۔ المنذر بن ساوی العبدی ۲۲۹
۹۔ اہلِ ہجر ۲۳۰
۱۰۔ اہلِ یمن ۲۳۰
۱۱۔ اہلِ یمن ۲۳۰
۱۲۔ جبلہ بن الایہم ۲۳۱
۱۳۔ ذی الکلاع ۲۳۲
۱۴۔ اہلِ نجران ۲۳۲
۱۵۔ ربیعہ بن ذی مرحب ۲۳۳
۱۶۔ بنو لخم ۲۳۳
۱۷۔ خالد بن ضماد الازدی ۲۳۴
۱۸۔ عمرو بن حزم ۲۳۵
۱۹۔ حصین بن اوس الاسلمی ۲۳۵
۲۰۔ یزید بن الطفیل ۲۳۶
۲۱۔ بنی قنان بن ثعلبہ ۲۳۶
۲۲۔ عبد یغوث بن وعلہ ۲۳۶
۲۳۔ زیاد بن الحارث ۲۳۶
۲۴۔ یزید بن المحجل ۲۳۷
۲۵۔ قیس بن الحصین ۲۳۷
۲۶۔ بنی قنان بن یزید ۲۳۷
۲۷۔ عاصم بن الحارث ۲۳۷
۲۸۔ بنو معلویہ بن جرول ۲۳۷
۲۹۔ عامر بن الاسود ابن عامر ۲۳۸
۳۰۔ بنی جوین طائی ۲۳۸
۳۱۔ بنی معن طائی ۲۳۸
۳۲۔ بنی اسد ۲۳۸
۳۳۔ جنادہ بن الازدی ۲۳۹
۳۴۔ سعد ہذیم ۲۳۹
۳۵۔ بنی زرعہ اور جہینہ کے بنی الربعہ ۲۳۹
۳۶۔ بنی جعیل ۲۳۹
۳۷۔ الاسلم الخزاعی ۲۴۰
۳۸۔ عوسجہ بن حرملہ الجہنی ۲۴۰
۳۹۔ بنی شنخ ۲۴۱
۴۰۔ بنی الجرمز بن ربیعہ ۲۴۱
۴۱۔ عمرو بن معبد الجہنی ۲۴۱
۴۲۔ بلال بن الحارث المزنی ۲۴۱
۴۳۔ بدیل وبسر وسروات بنی عمرو ۲۴۲
۴۴۔ العداء بن خالد بن ہوذۃ ۲۴۲
۴۵۔ مسیلمۃ الکذاب ۲۴۲
۴۶۔ سلمۃ بن مالک ۲۴۳
۴۷۔ العباس بن مرداس السلمی ۲۴۳
۴۸۔ ہوذہ بن نبیشہ السلمی ۲۴۳
۴۹۔ الاجب ۲۴۳
۵۰۔ راشد بن عبد السلمی ۲۴۳
۵۱۔ حرام بن عبد عوف ۲۴۳
۵۲۔ الزبیر بن العوام ۲۴۴
۵۳۔ نعیم بن مسعود ۲۴۴
۵۴۔ جمیل بن رزام العدوی ۲۴۴
۵۵۔ حصین بن نضلۃ الاسدی ۲۴۴
۵۶۔ بنی غفار ۲۴۴
۵۷۔ بنی ضمرۃ بن بکر ۲۴۴
۵۸۔ الہلال صاحب البحرین ۲۴۵
۵۹۔ اسیبخت بن عبد اللہ ۲۴۵
۶۰۔ اہلِ ہجر ۲۴۵
۶۱۔ المنذر بن ساوی ۲۴۶
۶۲۔ المنذر بن ساوی ۲۴۶
۶۳۔ العلاء بن الحضرمی ۲۴۷
۶۴۔ ضغاطر الاسقف ۲۴۷
۶۵۔ بنی جنبہ یہود مقنا ۲۴۸
۶۶۔ یحنہ بن روبہ اور سروات اہلِ ایلہ ۲۴۹
۶۷۔ جبلِ تہامہ کے گروہ بند ۲۴۹
۶۸۔ بنی غادیا ۲۵۰
۶۹۔ بنی عریض ۲۵۰
۷۰۔ بنی زہیر بن اقیش ۲۵۱
۷۱۔ ابوظبیان الازدی ۲۵۱
۷۲۔ حبیب بن عمرو الغامدی ۲۵۲
۷۳۔ الولید بن جابر ۲۵۲
۷۴۔ سمعان بن عمرو بن قریط ۲۵۲
۷۵۔ فروۃ بن عمرو الجذامی ۲۵۳
۷۶۔ بکر بن وائل ۲۵۳
۷۷۔ الشعیر بن عداء ۲۵۴
۷۸۔ الحارث بن عبد کلال و نعیم بن عبد کلال والنعمان ۲۵۴
۷۹۔ عبد القیس ۲۵۵

۸۰۔ اقیالِ حضرموت	۲۵۶	۸۵۔ سعید بن سُفیان الرعلی	۲۵۷	۹۰۔ خَثْعم	۲۵۹	۹۵۔ اُکیدر	۲۶۳
۸۱۔ فُرْوہ بن نفاثہ	۲۵۶	۸۶۔ عُتبہ بن فرقد	۲۵۸	۹۱۔ ثمامہ والحُدّان	۲۶۰	۹۶۔ یحنہ بن روبہ	۲۶۴
۸۲۔ مطرّف بن الکاہن	۲۵۶	۸۷۔ سلمہ بن مالک	۲۵۸	۹۲۔ بارق الازدی	۲۶۰	۹۷۔ اہلِ اذرح	۲۶۵
۸۳۔ نہشل بن مالک	۲۵۷	۸۸۔ بنی خباب کلبی	۲۵۸	۹۳۔ وائل بن حُجر	۲۶۱	۹۸۔ اہلِ جربا و اذرح	۲۶۶
۸۴۔ بنو ثقیف	۲۵۷	۸۹۔ مہری بن الابیض	۲۵۹	۹۴۔ اہلِ نجران	۲۶۲	۹۹۔ اہلِ مقنا	۲۶۱

حقیقتِ توحید

(۱) قرآن کے اوّلین مخاطب — ۲۶۹
(۲) قرآن کا طرزِ استدلال — ۲۶۹
(۳) قرآنی استدلال کی اساس — ۲۷۰
(۴) بعض ضروری تنبیہات — ۲۷۱
(۵) توحید کے عمومی دلائل — ۲۷۳
(۶) ضد سے ضد کا وجود — ۲۸۰
(۷) توحید کے دلائل انفس میں — ۲۹۰
(۸) علم و یقین کی فطری طلب — ۲۹۵
(۹) فطرتِ انسانی کا علو — ۲۹۷
(۱۰) توحید کے خصوصی دلائل — ۳۰۲
(۱۱) شرک کے لیے کوئی دلیل نہیں — ۳۰۴
(۱۲) لوازم سے استدلال — ۳۰۶
(۱۳) دلیل عدل — ۳۱۵
(۱۴) اہلِ کتاب اور منافقین — ۳۱۶
(۱۵) توحید کے اثرات — ۳۲۰
(۱۶) توحید کی اہمیت — ۳۲۴

حقیقتِ وحی

(۱۷) وحی — ۶۸۳
(۱۸) لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ — ۶۹۸

سیرۃ النبیؐ [جلد ہفتم]

(۱) حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے — ۳۳۰
(۲) سلطنت اور دین کا تعلق — ۳۴۲
(۳) عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت — ۳۶۵

مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ

(۱) مکہ کی قدیم تاریخ ۴۰۳
(۲) مدینہ کی قدیم تاریخ ۴۲۲
(۳) مدینہ کا قدیم نام ۴۲۴
(۴) یہود کی آمد ۴۲۵
(۵) یہود کا بسایا ہوا شہر یثرب ۴۲۷
(۶) یثرب کہاں واقع تھا ۴۲۰
(۷) یہود نے یثرب کی سکونت کیوں اختیار کی ۴۲۹
(۸) اوس اور خزرج کی آمد ۴۳۰
(۹) بعاث ۴۳۱
(۱۰) قبائلی تقسیم ۴۳۴
(۱۱) اسفل اور عالی کی بستیاں ۴۳۵
(۱۲) یثرب کی تعمیرات اور مکانات ۴۳۵
(۱۳) ہجرت کی نوعیت ۴۳۸
(۱۴) دارالخلافہ کے لیے جگہ کا انتخاب ۴۳۹
(۱۵) حرم مدینہ ۴۴۳
(۱۶) حرم مدینہ کی حدود ۴۴۴
(۱۷) اسلام میں اولین مسجد ۴۴۵
(۱۸) مسجد نبویؐ کی تعمیر ۴۴۶
(۱۹) ازواج مطہرات کے حجرے ۴۴۹
(۲۰) مہاجرین کی آبادکاری ۴۵۳
(۲۱) شہر کی توسیع ۴۵۵
(۲۲) گلی کوچے ۴۵۶
(۲۳) حمام اور طہارت خانے ۴۵۷
(۲۴) قبرستان اور عید گاہ ۴۵۹
(۲۵) باغات ۴۵۹
(۲۶) خندق ۴۶۰
(۲۷) سرکاری مہمان خانہ ۴۶۰
(۲۸) مدینہ کی مساجد ۴۶۲

(۲۹) مدینہ کی فوجی چھاؤنی	۴۶۵

فخرِ موجودات کی مکّی اور مدنی زندگی

(۱) مکّی زندگی	۴۶۹
(۲) ایّامِ قبل نبوت	۴۷۰
(۳) آغازِ نبوت	۴۷۶
(۴) ایّامِ وحی و الہام	۴۷۸
(۵) آغازِ دعوت	۴۷۸
(۶) پہلا مسلمان	۴۷۹
(۷) سابقین اوّلین	۴۸۱
(۸) انذارِ عشیرہ	۴۸۱
(۹) دار الارقم	۴۸۴
(۱۰) اسلامِ حمزہؓ	۴۸۵
(۱۱) اسلامِ عمرؓ	۴۸۶
(۱۲) حصارِ شعب	۴۸۷
(۱۳) مدنی زندگی	۴۹۱

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) تعارف	۵۱۵
(۲) شادی اور عائلی زندگی	۵۲۱
(۳) روحانی تحقیق کا محرک	۵۲۵
(۴) اسلام جدید ترین منشور	۵۳۱
(۵) نیا دین کیوں؟	۵۳۴
(۶) [illegible]	۵۳۵
(۷) [illegible] ہندومت	۵۳۷
(۸) [illegible]	۵۳۹
(۹) [illegible]	۵۳۹
(۱۰) عیسائیت	۵۴۰
(۱۱) پیغام اور اس کے متعلقات	۵۴۴
(۱۲) پیغمبرؐ پر ایمان	۵۴۴

(۱۳) آخرت پر ایمان ۵۴۸
(۱۴) تبلیغِ اسلام اور اس کے نتائج ۵۵۱
(۱۵) معراج ۵۶۰
(۱۶) یثرب (مدینۃ النبیؐ) ۵۶۴
(۱۷) جمعہ کا پہلا اجتماع ۵۶۷
(۱۸) مدینہ کو ہجرت کا فیصلہ ۵۶۷
(۱۹) مہاجرین کی آباد کاری ۵۷۱
(۲۰) اہلِ مکہ کا ردِّ عمل ۵۷۲
(۲۱) میثاق النبیؐ ۵۷۳
(۲۲) دفاعی معاہدے ۵۷۶
(۲۳) مکّہ سے تعلقات ۵۷۹
(۲۴) مالیاتی اصلاحات ۵۸۷
(۲۵) خطبہ حجۃ الوداع ۵۸۹
(۲۶) حج کے معانی ۵۹۳
(۲۷) عرب قبائل سے تعلقات ۵۹۶
(۲۸) یہود سے تعلقات ۶۰۲
(۲۹) خارجہ تعلقات ۶۰۵
(۳۰) بحران ۶۱۲
(۳۱) سماوہ ۶۱۳
(۳۲) ہندوستان ۶۱۳
(۳۳) ترکستان ۶۱۵
(۳۴) چین ۶۱۵
(۳۵) اسلامی معاشرہ کی تنظیم ۶۱۶
(۳۶) رسول اللہؐ کی تعلیمات کا تحفظ ۶۲۳
(۳۷) حدیث اور سُنّہ ۶۲۷
(۳۸) سیرتِ رسولؐ ۶۲۹
(۳۹) وثیقہ جات نبویؐ ۶۲۹
(۴۰) عقل اور فوق الفطرت ۶۳۰
(۴۱) رسولِ اکرمؐ کی تعلیمات ۶۳۳
(۴۲) اسلامی قوانین ۶۳۸

(۴۳) رسول اللہؐ کی عائلی زندگی ۶۴۳
(۴۴) ملازم اور غلام ۶۴۴
(۴۵) ازواجِ مطہرات ۶۴۶
(۴۶) حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ۶۴۷
(۴۷) حضرت سودہؓ ۶۴۸
(۴۸) حضرت عائشہ صدیقہؓ ۶۴۹
(۴۹) حضرت حفصہؓ ۶۵۲
(۵۰) حضرت زینبؓ اُمّ المساکین ۶۵۲
(۵۱) اُمّ [illegible] ہندؓ ۶۵۳
(۵۲) زینبؓ بنت جحش ۶۵۴
(۵۳) حضرت جویریہؓ ۶۵۵
(۵۴) حضرت اُمّ حبیبہؓ ۶۵۶
(۵۵) صفیہؓ بنت حیی ۶۵۷
(۵۶) حضرت میمونہؓ ۶۵۸
(۵۷) رسولِ خداؐ کی عادات ۶۵۸
(۵۸) دورِ نبویؐ کا معاشرہ ۶۶۲
(۵۹) معاشرتی آداب ۶۶۴
(۶۰) معاشرتی آداب ۶۶۴
(۶۱) عقیقہ ۶۶۵
(۶۲) معاشرے کی خصوصیات ۶۹۰
(۶۳) رسول اللہؐ کے کام پر ایک نظر ۶۷۰
(۶۴) رسولِ خداؐ کا وصال ۶۷۴
(۶۵) دفن اور جانشینی ۶۷۸
(۶۶) [illegible] ازواجؓ ۷۳۴
(۶۷) قصیدہ بردہ شریف ۷۴۰

[illegible] سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

میں نے متعدد دن اور راتیں اِس انتظار میں گزاریں کہ وُہ لمحۂ عالیہ آئے کہ مَیں اپنے تئیں سیرتِ سرورِ کونینؐ پیش کر سکوں۔ وہ لمحہ آیا۔ میرے جذبات و احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

خدا نے مجھے لکھنے کی صلاحیّت دی ہے۔ ہزاروں صفحات کالے کیے ہیں۔ مگر آج لکھنے بیٹھا ہُوں تو قلم رُک رہا ہے۔ یا الٰہی! ماجرا؟

ذہن نے بات سُجھائی، جس کی تعریف خدائے ذوالجلال نے کی ہو، اُن کے بارے میں تیرا قلم کیا لکھے گا؟

مَیں سوچ میں پڑ گیا۔

مقابلہ عشق اور قلم کے درمیان آن ٹھہرا۔ دونوں امتحان سخت اور مَیں ناتوان، حواس بے ٹھکانہ ہونے لگے۔

قدرے سنبھلا تو ہاتف نے کہا: "حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"ہُوں!"

"حدِ ادب کا مقام ہے۔"

"یا الٰہی! مَیں کیا کروں؟ حضورؐ! مَیں کیا کروں؟"

میری التجا پر دوبارہ غیبی آواز آئی: "آج تک کوئی انسان، ایسا پیدا نہیں ہُوا جس نے رسولِ خداؐ کے بارے میں لکھا ہو اور اُن کا حق ادا کیا ہو۔"

مَیں ایک بار پھر سناٹے میں آ گیا۔ جُھرجُھری لی تو مَیں کہہ رہا تھا "مَیں حضورؐ کا اُمّتی ہُوں۔ مَیں اِس کام کے لیے خود حضورؐ سے اجازت لے کر آیا ہُوں۔"

اس پر ہاتف نے کہا: "تو پھر لکھ!"

جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

تب میں نے گھر والوں سے کہا: "مجھے چادر اُڑھا دو کہ یہ سنّت میرے رسولؐ کی ہے۔"

محمد طفیل

اس شمارے میں

پہلی جلد تکنیک اور مصادر کے بارے میں تھی۔ یہ جلد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس جلد میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ واقعات کو چھوا اور چھوڑ دیا والا قصہ نہیں بلکہ حق ادا کرنے والا معاملہ ہے۔

اس جلد میں مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ پر تفصیلی مضامین ہیں۔ جو بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں۔ سیرت کی دوسری کتابوں میں اتنی تفصیل نہ ملے گی۔ اسی طرح سیرۃ النبی (سید سلیمان ندوی) کی ساتویں جلد کے بھی تین اہم مضامین پیش کیے جا رہے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ سے لاہور تشریف لائے تھے۔ میں نے اُن سے گزارش کی تھی کہ وہ مجھے سیرت پر ایسا مواد دیں جو نایاب ہو۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "کراچی جا رہا ہوں، وہاں سید سلیمان ندوی کے گھر میں سیرۃ النبی کی ساتویں جلد کا مواد ہے وہ لا کر آپ کو دوں گا۔"

چنانچہ مسودہ کراچی سے آیا۔ مولانا نے فرمایا: اعظم گڑھ جا کر اس کی فوٹو کاپیاں بھجوا دوں گا۔ بقول مولانا موصوف یہ معاملہ مجلس عاملہ میں گیا۔ عاملہ نے فیصلہ کیا کہ پہلے یہ سب کچھ معارف میں چھپے گا، اس کے بعد نقوش میں۔ چنانچہ دونوں صورتیں تکمیل پذیر ہوئیں۔ میں ادارہ معارف کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں کہ اہلِ علم کو یوں نوازا گیا۔

اس نمبر میں ایک اور اہم مضمون سیرۃ النبی میں توفیقی تضادات اور اُن کے حل پر ہے۔ ایسے مضامین کہ جن کی افادیت دائمی ہو خال خال نظر آتے ہیں۔ یہ سلسلہ مضامین رسالہ "برہان" میں چلا اور اہلِ علم سے تحسین کے کلمات سے نوازا گیا۔

اس نمبر میں ڈاکٹر حمید اللہ کی انگریزی کتاب "محمدؐ رسول اللہ" کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی سیرتِ رسولؐ کے لیے وقف ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ اس موضوع پر لکھا وہ سیرت کا آبرومندانہ سرمایہ ہے۔ ہم نے سیرت پر پوری کتاب اس لیے چھاپ دی کہ مربوط حالات بھی سامنے آسکیں۔

الرسالات پر جو مضمون ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے یا مولانا امین احسن اصلاحی کا جو مضمون توحید پر ہے یا مولانا محمود حسن کا جو مضمون "وحی" پر ہے۔ یہ سب ایسے مضامین ہیں جو ہمیشہ مشعلِ راہ کا کام دیتے رہیں گے اور لکھنے والوں کے لیے خیر و برکت کا باعث بنیں گے۔

یہ جلد اپنے موضوعات کے اعتبار سے بے حد اہم ہے

[محمد نقوش]

رسول اللہؐ ـــــ ایک نظر میں

نعیم صدیقی

وَإِذَا نَظَرْتَ إِلَى أَسِرَّةِ وَجْهِهِ
بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ (ابوکبیر ہذلی)

جب میں نے اس کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی، تو اس کی
شانِ درخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی ٹکڑہ ابر میں بجلی کوندرہی ہو۔

"یہ چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا" ـــــ عبداللہ بن سلام

ایک جھلک[1]

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیا علیہم السلام) اکثر غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی رہنمائی، تہذیبوں کی تعمیرِ نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے افکار و کردار سے بنتی ہے۔ سیرت پاک کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسنِ انسانیتؐ کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضا کا تناسبِ خاص، اس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی کے مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہیِ قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا رُخِ زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالمِ واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضورؐ کے حُسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک پا سکتے ہیں، وہ حضورؐ کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پا سکتے ہیں۔

حضورؐ کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے۔ خود ہی حضورؐ نے اُمت کو اس سے باز رکھا کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے

---

[1] دوسری کتابیں بھی سامنے ہیں لیکن اس موضوع کے لیے مآخذ زیادہ تر شمائل ترمذی کا منت کش رہا۔

دریے ورے نہ رُک سکتا۔ حضورؐ کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے۔ اور اس کے اعزاز کے لیے کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضورؐ کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کون سا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضورؐ کے عالمِ خیال اور کردار کا گوشہ بہ گوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسمِ مبارک محمدؐ تھا بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضورؐ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لیے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیا اور صلحا کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جائیں۔

لیکن حضورؐ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں حضورؐ کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحابِ روایت نے ہم تک پہنچا دیا ہے۔ یہاں ہم اس کی لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضورؐ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے —— ایک تعارف !!

حضورؐ کے چہرۂ اقدس، قد و قامت، خد و خال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہے وہ بہرحال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت، صبر و استقامت، راستی و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصافِ حمیدہ کا جامع تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ کے جسمانی نقشے میں روحِ نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے اور آپؐ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبہ کی ایک دلیل تھی۔ اس موقع پر آپؐ کا ایک ارشاد یاد آیا، فرمایا:

وان تقوی اللّٰہ تبیض الوجوہ۔

خدا کا تقویٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔

نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے۔ نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتابِ حق کی ایک جھلک!

وجاہت ———

"میں نے جونہی حضورؐ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپؐ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔"[1] (عبداللہ بن سلام)

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں رسولِ خدا! دیکھتے ہی میں نے کہا واقعی یہ اللہ

---

[1] یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حُصَین تھا۔ سرورِ عالم کے مدینہ آنے پر یہ دیکھنے کو گئے، دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا، بعد میں اسے انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔ (سیرۃ المصطفٰےؐ، مولانا ادریس کاندھلوی ج ۱ ص ۳۴۰-۳۵۰)

کے نبی ہیں[1]" (ابو رمثہ تیمی)

"مطمئن رہو، میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمہارے ساتھ بدمعاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔"[2] (ایک معزز خاتون)

"ہم نے ایسا خوب رُو شخص اور نہیں دیکھا، ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے۔"[3] (ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)

"حضورؐ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا گویا آفتاب چمک رہا ہے۔" (ابو ہریرہؓ)

"اگر تم حضورؐ کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔" (ربیع بنتِ معوذ)

"دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا۔" (حضرت علیؓ)

"میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضورؐ کو دیکھ رہا تھا، آپؐ اس وقت سُرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ مَیں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپؐ کو، بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرمؐ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔" (حضرت جابر بن سمرہ)

"خوشی میں حضور کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑہ ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے۔" (کعب بن مالک)

"چہرے پر چاند کی سی چمک تھی۔" (ہند بن ابی ہالہ)

چہرہ

"بدر کی طرح گولائی لیے ہوئے۔" (براء بن عازب)

"چہرہ بالکل گول نہیں تھا، ہلکی گولائی لیے ہوئے۔" (حضرت علیؓ)

"پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار، باریک اور گنجان، دونوں جُدا جُدا، دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہو جاتا۔" (ہند بن ابی ہالہ)

"مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی۔" (کعب بن مالک)

---

[1] شمائل ترمذی [2] مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضورؐ کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ کہہ کر اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجوائے دیتا ہوں، بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی کہ بغیر جان پہچان کے معاملہ کر لیا۔ اس پر سردار قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبداللہ نے بیان کیا جو خود شریکِ قافلہ تھے۔ بعد میں حضورؐ نے طے شدہ قیمت سے زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوا دیں۔ (سیرت النبیؐ مولانا شبلی مرحوم جلد دوم صفحہ ۳۸۰۔ المواہب اللدنیہ جلد ۱ صفحہ ۲۴۴) [3] یہ خواتین حضورؐ کی خدمت میں ابو قرصافہ کے ساتھ بیعتِ اسلام کے لیے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے اُنھوں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ (المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۵۵)

رنگت ———

"نہ چُونے کی طرح سفیدی، نہ سانولا پن۔ گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی۔" (حضرت انسؓ)
"سفید سُرخی مائل۔" (حضرت علیؓ)
"سفید مگر ملاحت دار۔" (ابو الطفیل)
"سفید، چمک دار۔" (ہند بن ابی ہالہ)
"گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا۔" (حضرت ابو ہریرہؓ)

آنکھیں ———

"آنکھیں سیاہ — پلکیں دراز۔" (حضرت علیؓ)
"پتلیاں سیاہ، نظریں نیچی، گوشۂ چشم سے دیکھنے کا حیادارانہ انداز۔" (ہند بن ابی ہالہ)
"سفید حصے میں سُرخ ڈورے — آنکھوں کا خانہ لمبا — قدرتی سُرمگیں۔" (جابر بن سمرہ)

ناک ———

"بلندی مائل — اس پر نورانی چمک — جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی۔" (ہند بن ابی ہالہ)

رخسار ———

"ہموار اور ہلکے — نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا۔" (ہند بن ابی ہالہ)

دہن ———

"فراخ۔" (جابر بن سمرہ)
"بہ اعتدال فراخ۔" (ہند بن ابی ہالہ)

دندانِ مبارک ———

"باریک — آبدار — سامنے کے دانتوں میں خوشنما ریخیں۔" (حضرت ابنِ عباسؓ)
"تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی ہوتی۔" (حضرت انسؓ)

ریش ———

"بھرپور اور گنجان بال۔" (ہند بن ابی ہالہ)

گردن ———

"پتلی، لمبی — جیسے مورتی کی طرح خوب صورتی سے تراشی گئی ہو۔"
"گردن کی رنگت چاندی جیسی اُجلی اور خوشنما۔" (ہند بن ابی ہالہ)

سر ———

"بڑا — مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

بال ———

"قدرے خمدار"۔ (حضرت ابوہریرہؓ)

"نہ بالکل سیدھے تنے ہوتے — نہ زیادہ پیچدار"۔ (قتادہؓ)

"ہلکا خم لیے ہوتے"۔ (حضرت انسؓ)

"گنجان — کبھی کبھی کانوں کی لَو تک لمبے، کبھی شانوں تک"۔ (براء بن عازب)

درمیان سے نکلی ہوئی مانگ"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"بدن پر بال زیادہ نہ تھے — سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر"۔ (حضرت علیؓ۔ ہند بن ابی ہالہ)

"کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصہ پر تھوڑے سے بال تھے"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

مجموعی ڈھانچہ

"بدن گٹھا ہوا — اعضا کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط"۔ (ہند بن ابی ہالہ)

"بدن موٹا نہیں تھا"۔ (حضرت علیؓ)

"قد — نہ زیادہ لمبا تھا، نہ پست! — میانہ"۔ (حضرت انسؓ)

"قامت مائل بہ درازی — مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا"۔ (براء بن عازب)

"پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا"۔ (امِّ معبد)

"دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضورؐ کا جسم (باوجود فقر و فاقہ کے) زیادہ تر و تازہ اور توانا تھا"[1] (المواہب ج ۱ ص ۳۱۰)

"میں نے رسول اللہؐ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا"[2] (ابن عمر)

---

[1] مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے عمرہ کیا تو سَو اونٹ بہ نفسِ نفیس ہانکے اور ان میں سے ۶۳ کو بدستِ خود نحر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔

[2] مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کُشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضورؐ کسی ملحقہ وادی میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لیے کوئی معیارِ صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیشِ نظر حضورؐ نے کشتی کرنا پسند کر لیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپ نے اسے پچھاڑ لیا۔ اسی رکانہ پہلوان کے بیٹے ابوجعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں سے لی ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے اور بیہقی نے سعید بن جُبیر کی دوسری روایت کی ہے جس میں آتا ہے کہ حضورؐ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابوالاسود جمحی بھی ہے۔

(المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۰۲ - ۳۰۳)

کندھے اور سینہ ———

"سینہ چوڑا ——— سینہ اور پیٹ ہموار۔" (ہندبن ابی ہالہ)

"سینہ چوڑا۔" (براء بن عازب)

"مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ۔" (ہند بن ابی ہالہ۔ براء بن عازب)

"کندھوں کا درمیانی حصہ پُرگوشت۔" (حضرت علیؓ)

بازو اور ہاتھ ———

"کلائیاں دراز ——— ہتھیلیاں فراخ ——— انگلیاں موزوں حد تک دراز۔" (ہندبن ابی ہالہ)

"ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے مَیں نے چُھوا ہو اور وہ حضورؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم وگداز ہو۔" (حضرت انسؓ)

قدم ———

"پنڈلیاں پُرگوشت نہ تھیں ——— ہلکی ہلکی سُتی ہوئی۔" (جابر بن سمرہ)

"ہتھیلیاں اور پاؤں پُرگوشت ——— تلوے قدرے گہرے ——— قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے۔" (ہندبن ابی ہالہ)

"ایڑیوں پرگوشت بہت کم۔" (جابر بن سمرہ)

ایک جامع لفظی تصویر

یوں تو حضورؐ کے متعدد رفقا نے حضورؐ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کیے ہیں لیکن امِ معبدؓ نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وادیِ ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافرِ حق جب اپنی منزلِ اوّل (غارِ ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قومِ خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضورؐ اور آپ کے ہمراہی پیاسے تھے فیضانِ خاص تھا کہ مریل سی بھوکی بکری نے اس لمحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضورؐ نے بھی پیا، ہمراہیوں نے بھی، اور کچھ بچ رہا۔ امِ معبد کے شوہر نے گھر آکر دُودھ دیکھا تو اچنبھے سے پُوچھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ امِ معبد نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پُوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنّا ہے۔ اس پر امِ معبد نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ امِ معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا، نہ کسی طرح کا تعصب، بلکہ جو کچھ دیکھا من وعن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے[1]۔ اس کا جو ترجمہ مولفؒ رحمۃ للعٰلمین نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۷

"پاکیزہ رُو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ پیٹ باہر نکلا ہوا نہ سر کے بال گرے ہوئے، زیبا، صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ، گویا دلبستگی لیے ہوتے، دُور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشیِ الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی، میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے، نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، زیبندہ منظر والا قد، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وُہ کچھ کہتا ہے تو چُپ چاپ سنتے ہیں، جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو[1]۔"

لباس

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے اس کی وضع قطع، قصر و طول، رنگت، معیار، صفائی، اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرمؐ کے لباس کے بارے میں حضورؐ کے رفقاءؓ نے جو معلومات دی ہیں وُہ بڑی حد تک حضورؐ کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضورؐ نے لباس کے معاملہ میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۔ (اعراف ۔ ۲۶)	اے اولادِ آدم! ہم نے تمھارے ستر ڈھانکنے والا اور تمھیں زینت دینے والا لباس تمھارے لیے مقرر کیا ہے۔ اور لباس تقویٰ بہترین لباس ہے۔

دُوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقیکم الحر و سرابیل تقیکم بأسکم" (تمھیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لیے قمیصیں اور زرہیں فراہم کیں — النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضورؐ کا لباس ساتر تھا، زینت بخش تھا۔ اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔ حضورؐ کو کبر وریا سے بُعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا:

انما انا عبدٌ البس کما یلبس العبد[2]۔	میں تو بس خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔

---

[1] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۰۷ [2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۲۸

ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لیے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوۃ) تہ بند، قمیص اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامتِ کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا اس لیے اس سے سخت تنفر تھا۔[1] دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضورؐ نے ممنوع ٹھہرایا[2] تاکہ اُمّت میں اپنی خودی اور عزتِ نفس برقرار رہے، نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔ چنانچہ حضورؐ نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن، آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، نظافت و نفاست اور وقار کا حضورؐ کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضورؐ کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آئیے حضورؐ کے لباس پر ایک نگاہ ڈالیں۔[3]

کُرتا (قمیص) بہت پسند تھا۔ کُرتے کی آستین نہ زیادہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کے لیے جو کُرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کُھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے، کُرتا پہنتے ہوئے سیدھا ہاتھ ڈالتے، پھر اُلٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے (داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کا استعمال حضورؐ کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے)

عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپؐ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں) اور وہ آپؐ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کو ساتھ لیے ہوئے حضورؐ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لیے ایک خاص وزّان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے تولو (اتزن وارجح)۔ وزّان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سُنے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے توجہ دلائی الا تعرف نبیك؟ (تم اپنے نبی پاک کو پہچانتے نہیں) وہ ہاتھ چُومنے کو بڑھا تو آپ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہرحال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پُوچھا کہ

---

[1] بہت سی روایات ہیں مثلاً سالم کی روایت اپنے والد سے، مندرجہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔ لباس شہرت" پر وعید از ابن عمر مندرجہ ترمذی، احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ۔

[2] مثلاً روایتِ ابن عمر مندرجہ احمد و ابوداؤد۔

[3] تفاصیل کے حوالے نہیں دیے جا رہے۔ ماخذ کے طور پر زیادہ تر شمائلِ ترمذی، زاد المعاد اور المواہب اللدنیہ سامنے ہیں۔

کیا آپ اسے پہنیں گا؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہو گا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہلِ فارس کا لباس تھا اور تشبّہ سے حضورؐ کا اجتناب (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزا کو حضورؐ قبول فرماتے تھے) آپؐ نے جواب دیا: ہاں پہنوں گا سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی، کیونکہ مجھے حفظِ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں[۱]

سر پر عمامہ باندھنا پسندِ خاص تھا، نہ بہت بھاری ہوتا تھا نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے، گز لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان اڑس لیتے۔ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے[۲] بر بنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لیے ایک خاص کپڑا (عربی نام "قناع") بالوں پر استعمال کرتے، جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً مٹیالا، خاکستری مائل یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے۔ اور فتح مکہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بموجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا۔ اور اسے آپؐ نے مشرکین کے مقابلے پر امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی۔ سفر پر نکلتے تو اٹھتی ہوئی باڑ دار ٹوپی استعمال فرماتے۔ سوزنی نما سلے ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔

اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی، ۲½ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے، کبھی ایک پلو سیدھے بغل سے نکال کر اُلٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لیے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حِبَرَہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی، اس میں سُرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے لیے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اُسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے، احتیاطاً گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے (مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی

---

[۱] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۳۶-۷

[۲] ایک رائے یہ ہے کہ ایسا بیماری (خصوصاً دردِ سر) کی حالت میں ہوا۔

آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپؐ ہی نے مسلسل تربیت کر کر کے برسوں میں بلند کیا) کوئی جُوں وغیرہ نہ آگھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدِّباب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو۔"[1] سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیبِ تن فرمایا۔ آپ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے اُمّت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جُبّہ بھی پہنا (بخاری و مسلم)۔ سُرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیبِ بدن کیا۔ طیلسانی قسم کا کسروانی جُبّہ بھی کبھی کبھی پہنا (المواہب اللدنیہ[2]) جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قولِ قرآنی کی کہ "پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا۔" بس یہ ہے کہ معمولِ عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لیے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوبِ خاطر تھا۔ فرمایا: "حق یہ ہے کہ تمہارے لیے مسجدوں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے۔"[3] فرمایا: "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مُردوں کو کفن دو، کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں۔"[4]

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سُرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا (لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا)، لیکن ہلکے سُرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپؐ نے پہنے، ہلکا زرد (مٹیالا یا شُتری) رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضورؐ کا جُوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپّل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے، ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا، دُوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جُوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت دو انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا، اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے، کبھی بیٹھ کر بھی، پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی، اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہِ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے، انھیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے ان کو

---

[1] عن عمرو ابن شعیب عن ابیہ (ترمذی) و عن ابی الاحوص عن ابیہ (نسائی)

[2] بروایت اسمآ بنت ابی بکر (مسلم)

[3] ابو داؤد، ابن ماجہ

[4] عن سمرہ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

آپؐ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا، کبھی حبشی پتھر کا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پترا یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی، کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہننے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضورؐ خطوط پر مُہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرینِ صحت ہے کہ انگوٹھی مُہر کی ضرورت سے بنوائی تھی۔ اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

وضع قطع اور آرائش

حضورؐ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے۔ ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے، کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے زاید بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے۔ اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مُو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے زاید بال بہ نفسِ نفیس تراشے۔ فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "آکرِمھا" (ان کو سنوار کے رکھو)[1]

یہ تاکیدیں حضورؐ نے اس لیے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں خصوصاً رنگِ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت اُبھرتی ہے تو غلیظ رہنا علوِ مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سدِباب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور بستر کے قریب:

۱۔ تیل کی شیشی
۲۔ کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی)
۳۔ سُرمہ دانی (سیاہ رنگ کی)
۴۔ قینچی
۵۔ مسواک
۶۔ آئینہ
۷۔ لکڑی کی ایک پتلی کھپچی

---

[1] روایت ابوہریرہ و ابو داؤد

سُرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے۔ آخر رات میں حاجات سے فارغ ہوکر وضو کرتے، لباس طلب کرتے، اور خوشبو لگاتے، ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مُشک اور عُود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دُھونی لیا کرتے۔ ایک عطر دان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ اپنے دستِ مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشہور بات یہ ہے کہ آپؐ جس کوچے سے گزر جاتے تھے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضائیں بتاتی تھیں کہ:

"گزرگیا ہے ادھر سے وہ کاروانِ بہار"

خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے ماتحت آپ نے مردوں کے لیے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے، اور عورتوں کے لیے وُہ جس کا رنگ نمایاں ہو، مہک مخفی رہے۔

رفتار

حضورؐ کی چال عظمت، وقار، شرافت اور احساسِ ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اونچائی سے نیچے کو اُتر رہے ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں گویا زمین آپؐ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹتی جارہی ہے۔" رفتار تیز ہوتی، قدم کُھلے کُھلے رکھتے۔ آپ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابوہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے۔" حضورؐ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ "زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو۔" (سورۂ لقمان)

تکلّم

تکلّم انسان کے ایمان، کردار اور مرتبے کو پُوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور۔ یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضورؐ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈُوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہوجاتی۔ لیکن حضورؐ کے کمالاتِ خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپؐ تفکرات اور مسائل مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے۔ لیکن دُوسری طرف لوگوں میں خُوب گھلنا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفت گوؤں کا دَور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسّم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں

عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضورؐ کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری، ایک سلطنت کے مسائل، ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنھیں حضورؐ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے، کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلاضرورت فضول بات چیت نہ کرتے"[1]

لیکن آپؐ ایک داعی تھے، اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لیے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لیے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہٰذا دوسری صورتِ حال حضرت زیدؓ بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ "جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضورؐ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضورؐ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضورؐ بھی اس میں شامل رہتے"[2] اس کے باوجود آپؐ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی وما ینطق عن الھوٰی کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ اُم معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ "گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی" الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ — نہ کوتاہ سخن نہ طویل گو۔" تاکید، تفہیم اور تسہیلِ حفظ کے لیے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دُہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے، مکروہ اور فحش اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن حارث کا بیان ہے کہ "میں نے حضورؐ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا" یہ مسکراہٹ حضورؐ کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی۔ اور رفقائے کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی، بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لیے ٹیک سے اُٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دُہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (GESTURES) سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لیے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے، کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے، کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے، کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو اُلٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں اُنگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو اُلٹ دیتے کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اُلٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے، کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے، کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

---

[1] شمائل ترمذی باب کیف کان کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] شمائل ترمذی باب ما جاء فی خُلُقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قریشِ مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی، وحی کی لسانِ مبین نے حُسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق ہے کہ حضورؐ افصح العرب تھے۔ حضورؐ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی، ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ایک قول (الحرب خدعة) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "ھی لغة النبیؐ" یہ نبی اکرمؐ کی مخصوص زبان تھی، بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا اور بہت سے مروّج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو نہد کے لوگ آئے تو گفتگو ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا: "اے اللہ کے نبی! ہم آپؐ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ آپؐ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے" فرمایا اور خوب فرمایا: "ان اللہ عزّ وجل ادّبنی فاحسن ادبی ونشأتُ فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عزّ وجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوقِ ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے) ایک موقعے پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ تعجب سے سُن رہے تھے۔ پُوچھا اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؛ حضورؐ نے وضاحت کی۔ اس پر جناب صدیقؓ کہنے لگے "میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سُنا ہے لیکن آپؐ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سُنا" یہاں بھی وہی بات حضورؐ فرماتے ہیں: "ادّبنی ربی ونشأت فی بنی سعد" اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے: "اے اللہ کے رسولؐ! کیا بات ہے کہ آپؐ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں، حالانکہ آپؐ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوتے" فرمایا: "کانت لغت اسمٰعیل، قد درست فجاء بی بھا جبریل فسفظینھا" (میری زبان اسمٰعیل علیہ السّلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبریل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی)[1] مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی زبان معمولی عربی نہ تھی بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسمٰعیلی زبان سے ملتا تھا، اور جبریل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابرِ تاریخ خصوصاً انبیا جو ایک مشن لے کر ماحول سے کش مکش کرتے ہیں۔ اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اُٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے، مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

حضورؐ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپؐ کو "جوامع الکلم" عطا کیے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اعطیت بجوامع الکلم"[2]

---

[1] تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المواہب اللدنیہ ج ۱، ص ۲۵۶

[2] روایت ابوہریرہ (مسلم)

جوامع الکلم حضورؐ کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالمؐ اپنی مثال آپ تھے۔ اور اسے خصوصی عطیاتِ رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے:

۱۔ المرء مع من احبّ: آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبّت رکھتا ہو۔

۲۔ "اَسْلِمْ تَسْلِمْ": تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے۔[1]

۳۔ "انما الاعمال بالنیات": اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

۴۔ "لیس للعامل من عمله الا ما نواہ": کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

۵۔ "الولد للفراش وللعاهر الحجر": بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے اور زانی کے لیے پتھر۔

۶۔ "الحرب خدعة": جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

۷۔ "لیس الخبر كالمُعَايَنَة": شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

۸۔ "المجالس بالامانة": مجالس کے لیے امانت (رازداری) لازم ہے۔

۹۔ "ترك الشر صدقة": بُرائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

۱۰۔ "سیّد القوم خادمهم": قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

۱۱۔ "كل ذی نعمة محسوداً": ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

۱۲۔ "الكلمة الطيبة صدقة": حُسنِ گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

۱۳۔ "من لا یرحم لا یُرحم": جو (مخلوق پر، خصوصاً انسانوں پر) رحم نہیں کرتا اس پر (خدا کی بارگاہ سے) رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشاداتِ رسالتمآب بلحاظ الفاظ، بلحاظِ اسلوب، بلحاظِ رُوح بالعموم پہچانے جاتے ہیں۔ اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضورؐ کے جو اجزائے کلام ہیں وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آہنگ ٹھاٹھ، ان میں معنوی گہرائی، دل پر اثر کرنے والی رُوحِ اخلاص کلامِ نبویؐ کے امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کیے جائیں۔

"میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں، نظامِ اجتماعی کے لیے سمع و طاعت کی تاکید کرتا ہوں، خواہ (اسے چلانے کے لیے) کوئی حبشی غلام ہی (برسرِ قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ

---

[1] نامۂ دعوت بنام ہرقلِ روم

رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہوں گے۔ پس (ایسے حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اس کو مضبوطی سے تھامو، اسے ڈاڑھوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"[۱]

عمرو بن عَبَسَہ نے حضورؐ سے کچھ باتیں کیں، جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضورؐ نے دیئے۔ اس چھوٹے سے مکالمہ کو ملاحظہ کیجیے:

"اس (دعوت و تحریک کے) کام میں ابتداءً کون کون آپؐ کے ساتھ تھا؟"

"ایک مردِ آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلالؓ)"۔

"اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟"

"پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔"

"ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟"

"صبر اور سخاوت"۔

"کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔"

"کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟

"جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔"

"کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟"

"جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے۔"

"کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟"

"ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمھارے پروردگار کو ناپسند ہیں۔"

"کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟"

"اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے۔"

"کون سی گھڑی (عبادت کے لیے) سب سے بڑھ کر ہے؟"

"رات کا پچھلا پہر"۔[۲]

ایک بار دریافت کیا گیا کہ انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟ فرمایا: "الفم والفرج"۔[۳]

---

[۱] مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ [۲] مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان

[۳] روایتِ ابوہریرہؓ (ترمذی)

یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرم گاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا، روزی کا ناپاک ہونا، اور جنسی جذبات کا بے راہ رَو ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور ظلم بھی انھی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپؐ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ آپؐ نے مختصراً جس فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرزِ فکر، اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وُہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے۔ ملاحظہ ہو:

"المعرفۃُ رأس مالی، والعقل اصل دینی، والحب اساسی، والشوق مرکبی، وذکر اللہ انیسی والثقۃُ کنزی، والحزنُ رفیقی، والعلم سلاحی، والصبر ردائی، والرضا غنیمتی، والعجز فخری، والزُّھد حرفتی، والیقین قوّتی، والصدقُ شفیعی، والطاعۃُ حسبی، والجھاد خُلقی، وقُرّۃُ عینی فی الصّلوٰۃ۔"[1]

ترجمہ: "عرفان میرا سرمایہ ہے عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے، شوق میری سواری ہے، ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے، اعتماد میرا خزانہ ہے، حُزن میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لیے وجہِ اعزاز ہے، زُہد میرا پیشہ ہے، یقین میری طاقت ہے (لفظ قُوت ہو تو غذا ہے)، صدق میرا سفارشی ہے، طاعت میرا بچاؤ ہے، جہاد میرا کردار ہے، اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔"

حسنِ تمثیل کی بے شمار زرّیں مثالیں آپ کے کلام میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپؐ نے بدوؤں کے ذہن نشین کرا دیئے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجئے:

"مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر موسلا دھار بارش ہو، پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پُوری طرح جذب کیا اور مُرجھایا ہوا سبزہ اس سے تر و تازہ ہوگیا اور نئی بُوٹیاں کثرت سے اُگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصّہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اپنے اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے لوگوں کے لیے مفید بنایا۔ انھوں نے اس کو پیا پلایا اور کھیتیوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسا جو چٹیل میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کرکے رکھا، نہ جذب کرکے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے علمِ دین میں سُوجھ بُوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے

[1] ملاحظہ ہو: روایت حضرت علیؓ، مندرجہ "الشفا" از قاضی عیاض

اسے فائدہ پہنچا۔ اس نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دُوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس دعوت کو سُن کر سر نہیں اُٹھایا۔ اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے۔"

آپؐ کے اندازِ گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جاسکتا ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ:

"قُولوا للنّاسِ حسناً۔"

(لوگوں کو حُسنِ تکلم سے خطاب کرو)

آپ کا حُسنِ کلام سادگی کی شان لیے ہُوئے تھا۔ بناوٹی کلام سے آپؐ کو بُعد تھا۔ فرمایا:

ابعدکم منی یوم القیٰمة الثرثارون المتشدقون المتفیھقون۔

تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دُوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔

اسی طرح آپؐ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ حضورؐ کے چمن زارِ تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لعانی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ رُوئی سے آپؐ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا، باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب ہر آن کی پریشانیوں کے خارزار درپیش تھے۔

خطابت

تکلم ہی کا ایک اہم جز خطابت ہے۔ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے۔ اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یُوں بھی عربوں کی دولت تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضورؐ بہت بلند رہے، فریضۂ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپؐ کی زبان کبھی نسیمِ سحر کی طرح، کبھی آبِ جُو کی طرح اور کبھی تیغِ برق دم کی طرح متحرک ہوجاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپؐ نے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوتِ خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطابت فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدانِ جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جُھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسبِ ضرورت حرکت دیتے۔ تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہٖ یا والذی نفس محمد بیدہٖ۔ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یا محمدؐ کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے، لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسانِ اعظمؐ کے خطابات دِلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حُنین و طائف کے معرکہ کے بعد حضورؐ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا تو مؤلفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم رؤسائے مکّہ کو اس میں بہت سا حصّہ دیا تاکہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہوجائیں انصار میں کچھ لوگوں نے

عجیب سے احساسات کی رَو دوڑا دی، کہا گیا کہ :

"رسول اللہؐ نے قریش کو خُوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خُون کی بُوندیں ٹپک رہی ہیں۔"

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصلِ غنیمت دُوسرے لوگ لے جاتے ہیں۔"

یہ چرچے حضورؐ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ جواب ملا کہ آپؐ نے جو سُنا وہ صحیح ہے۔ مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کہیں، کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں۔" واقعہ کی تحقیق کے بعد آپؐ نے یہ تقریر کی :

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسُودہ حال کیا؟

(ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلا شبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے) ——— "نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی، تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ، اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہِ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔" [1]

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھیے، خنجرِ خطابت کی اس دھار کو دیکھیے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی، پھر اس کی روانی دیکھیے، مطالب کے موڑ دیکھیے، پھر یہ غور کیجیے کہ کس طرح خطیبؐ نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پُوری طرح اُبھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اُٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں۔"

ابتدائی دورِ دعوت میں کوہِ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَهْلَهٗ وَ اللّٰهِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَّا کَذَبْتُکُمْ وَ لَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَّا غَرَرْتُکُمْ وَ اللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ خَاصَّةً وَّ اِلَی النَّاسِ کَافَّةً وَ اللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْٓءِ سُوْٓءًا وَ اِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا۔" [2]

---

[1] بخاری، جلد دوم، ص ۶۲۰
[2] جمہرۃ الخطب ص ۵

ترجمہ: "قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرضِ محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر (بفرضِ محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دوچار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں میں تمہاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تم کو لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سو جاتے ہو، اور پھر مرنے کے بعد تم کو جی اٹھنا ہے، جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو، تم سے لازماً تمہارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمہیں بھلے کا بدلہ بھلا اور برے کا بدلہ برا ضرور ملنا ہے۔ پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ۔"

کیا ہی سادہ اندازِ بیان ہے، کتنا عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

حضورؐ کے معرکۃ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان، اخلاق اور اقتدار تینوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطۂ عام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکیٔ مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالمِ بالا بنا لیتے ہیں مگر حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ علٰحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا۔ درحقیقت آپؐ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی، یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے۔ اس میں "کسے را باکسے کارے نباشد" کی فضا بڑی انسانیت کش ہو گئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم حضورؐ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جدا جدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے

اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دُوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا:

"اَجْلِسُ کما یجلس العبد۔" (اسی طرح اُٹھتا بیٹھتا ہوں، جس طرح خدا کا ایک بندہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ (روایت عائشہؓ)

اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے، کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اُٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلۂ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصّے چھڑ جاتے اور ان پر خُوب ہنسی بھی ہوتی[1] صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہل مجلس کے چہروں سے اُکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فردِ مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپؐ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پُورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اُس وقت تک رُخ نہ پھیرتے جب تک وُہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پُوری کر کے مُنہ نہ ہٹا لیتا آپؐ برابر اپنا سر اسی کی طرف جُھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے، اِلّا یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے یا چہرے پر ناگواری آجاتی یا اُٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جاتے ناپسندیدہ باتوں سے یا تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ براہِ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے، بلکہ عوامی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریقِ اظہار تھا کہ یا تو شخصِ متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدمِ التفات دکھاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپؐ بئس اخو العشیرۃ یا بئس ابن العشیرۃ (اپنے گروہ کا بُرا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔"[2]

---

[1] روایت جابرؓ بن سمرہ (مسلم)

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۱ (بخاری)

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دیتے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کہتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساسِ تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سُن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے مَسَحَ اللّٰهُ عنكَ ما تكره (خدا تم سے ہر اس شے کو دُور کرے جو تمھیں بُری لگے) ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے : حَسَنَةٌ حسنة ، ابلِ و اخلق (یعنی خوب ہے خوب دیر تک پہنو ، بوسیدہ کرو) بدسلوکی کا بدلہ بُرے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دُوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے ساتھ اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے۔ کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا آدمی ہو یا رفقاء میں سے ہمیشہ " لبّیک" (حاضر ہُوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سرہانے بیٹھ کر پُوچھتے: "كَيْفَ تَجِدُكَ ؟" (تمھاری طبیعت کیسی ہے ؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر۔ کھانے کو پُوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلّی دیتے اور فرماتے: " لا بأس! إن شاء الله طَهُورٌ" (فکر کی کوئی بات نہیں خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفا کے لیے دعا فرماتے۔ حضرت سعدؓ کے لیے تین بار دُعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پُرسی بھی کی۔ ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیے ہُوئے پیدل خاصی دُوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہُوئی تھی) حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے دیکھا۔ پھر وضو کیا، پانی کے چھینٹے دیے، دُعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پُوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے، عالمِ نزع میں بلایا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے، صبر کی نصیحت کرتے اور چلّانے اور بُکا کرنے سے روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دُعا کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا ——— تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو ——— کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا۔ ملاحظہ ہو زاد المعاد، ج ۱، ص ۱۴۵۔) تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسمیت مسلّط ہے کہ میت والے گھر میں دُوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلسِ تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے، بعض اوقات پیشانی چُوم لیتے۔ کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دُعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے، جیسے یا ابا ہریرہ کے بجائے "ابا ہر"۔ حضرت عائشہ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرتے، پیار کرتے، دُعا فرماتے، ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے فرماتے یعنی خرقة خرقة فی عین کل بقه[1] ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا، إِنَّهُمْ لَمِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھُو لیتا ہے بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا، کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا: "یَاذَا الْاُذُنَیْن"۔ (او، دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابو عمیر کا پالا ہُوا ممولا مر گیا۔ تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضورؐ آئے تو پکار کر کہا "یا ابا عمیر! ما فعل النُّغَیر (ابو عمیر! تمھارے ممولے کو کیا ہُوا) عبد اللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے صاحبزادے میاں راستہ میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبد اللہ کے کان پکڑ کر کہتے "یا غدر! یا غدر!" (او دھوکے باز، او دھوکے باز) سفر سے آ رہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پہ بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے، بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے۔ آپؐ کے پیشِ نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریکِ اسلامی کی علمبردار ہو گی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق اپنے ضعیف العمر والد کو (جو بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے) بیعتِ اسلام کے لیے آپؐ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا: انھیں کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے آپؐ اسے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی اور اس کا کام کر کے دیا[2]۔

ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے دیکھا تھا اور حضورؐ کی مروت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپؐ کے حُسنِ کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:

---

[1] بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے (ہر مچھر کی آنکھ میں ٹڈی کا جبڑہ ہے) مگر بظاہر یہ ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر ملک میں بچوں کو بہلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۵

"میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپؐ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا، نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا، اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپؐ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا۔"

اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا — بجز اس کے کہ آپؐ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانونِ الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی

اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اُتر جاتا ہے۔ باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے، گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی دی، گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضورؐ کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ "رسولِ خداؐ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟" انھوں نے جواب میں فرمایا: آپؐ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے (کہ ان میں کوئی جُوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو) بکری کا دُودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے[1] نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے، اپنے جُوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانکے لگا لیتے، بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالتے، کوئی خادم ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرا دیتے۔ (مثلاً) اسے آٹا پسوا دیتے، کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے[2] بازار جانے میں عار نہ تھی، خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسولِ خداؐ جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں، "آلین الناس بساما ضاحکا۔ (سب سے زیادہ نرم خُو، متبسّم، خندہ جبین) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ "کبھی کسی خادم کو جھڑکا نہیں" حق یہ ہے کہ رسولِ خداؐ سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پُوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسولِ خداؐ گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا، کچھ وقت اہل و عیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے۔ پھر انھی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات و حاجات لے کر آتے[3] دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱، ص ۲۹۳

[3] ایضاً ج ۱، ص ۲۹۳

ازواجِ مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپؐ کو کرنا ہوتا۔ پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپؐ کے ذمے تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقۂ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواجِ مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپؐ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔ گھر ایک انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مدّوجزر رہتا۔ اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی، اور تبسموں کی لمعانی بھی، محبتیں بھی کارفرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں۔ اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضورؐ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی، کبھی کبھار قصّہ گوئی بھی ہوتی، اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے۔ مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کرکے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا۔ حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں اور رسولِ خدا دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلّفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہؓ سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمھیں ضرور کھانا ہوگا۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ اُدھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمھارے مُنہ پر مَل دُوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہؓ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلّفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سودہؓ سے کہا کہ تم اس کے مُنہ پر ملو تاکہ حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ مکرر ہنسے[۲]

ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ آئے تو حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا، غضب ناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اسی غصے میں جناب صدیقؓ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا: دیکھا! ہم نے تمھیں اس شخص سے کیسے بچا لیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصوّر سے فروتر جانتے ہیں، اور خصوصاً نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پُتلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش۔ حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا۔ اور اس میں سارے انسانی جذبات کام کرتے تھے۔ مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وُہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پر ہوتے تو اہل و عیال سے عام باتیں ہوتیں۔ کبھی گھریلو امور پر، کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پہ۔ یہاں تک کہ کبھی قصّہ کہانی بھی سُناتے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے امِ زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت امِ زرع اپنے خاوند ابو زرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ خاتمے پر حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمھارے حق میں ویسا ہی ہُوں جیسا کہ ابو زرع امِ زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دُوسرے موقع پر کوئی قصّہ

---

[۱] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔

[۲] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۶-۷

سُنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصّوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے) حضورؐ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپؐ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے[1]

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دُوسرے نصف حصّے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک اور وضو کے بعد تہجّد ادا فرماتے[2] قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے[3] صحابہؓ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کو غفرانِ خاص سے نوازا ہے قَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ پھر اس قدر حضورؐ جان کیوں گھلاتے ہیں۔ فرمایا: اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں[4])

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپؐ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزاری جائے جیسے مسافر گزارتا ہے۔ فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو منتہا بنائیں اور دُنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں۔ اور جنھیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں، اور پھر ان میں مگن رہ کر تکلف اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں اور نہ ان میں اسباب جمع کیے اور نہ ان کی زینت و آرائش کی۔ ان کے گھر بس[5] بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں[6]۔ ان میں گرمی سردی سے بچنے کا اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ داری (PRIVACY) کا بندوبست تھا اور حفظانِ صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے[7] حضورؐ نے مسجد کے ساتھ ازواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوا لیے تھے۔ بجز صفائی کے اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوقِ نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہؓ کو تاکید فرمائی: "گھروں کے آنگن صاف رکھو"[8]

ساز و سامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا، جس پر لوہے کے پتّر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا، روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوا۔ بستر چمڑے کے گدّے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السّمر

[2] زاد المعاد

[3] شمائل ترمذی باب ما جاء فی عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[4] ایضاً

[5] زاد المعاد فی تدبیر لامر السکن ج ۳ ص ۱۴۲۔ [6] ایضاً

[7] روایت ابن المسیب (ترمذی)

بھی استعمال میں رہا، جو دوہرا کرکے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کرکے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعود) رو دیئے۔[1]

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لائیے۔ واقعۂ ایلاء کے زمانے میں انھوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ادھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف مُٹھی بھر جَو رکھے ہیں، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے، یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی کہ "قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے"۔ فرمایا: "عمر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ لوگ دُنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے"۔[2]

اکل و شرب

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی۔ زیادہ ترجیح دست، گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے۔ نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی، ثرید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خربوزہ، ککڑی، لوکی، کھچڑی، مکھن وغیرہ اشیا شامل تھیں۔ دُودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (تُرنگی) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر اور خربُوزہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مریضوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر جَو کے ستّو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستّو پیش کیے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ امراء کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطور خاص دُو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ، پانی ملا دُودھ (جسے کچّی لسّی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبیذ بھی قرینِ ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے۔ لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہٰذا پھنکوا دیتے۔ بہ روایت ابومالک اشعری یہ بھی فرمایا کہ میری اُمت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے (چنانچہ سلاطینِ مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا)

---

[1] ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی، باب ما جاء فی فراش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۴۰ نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امرأتہ، روایت عبداللہ بن عباس۔

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا، اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شانِ فقر کے خلاف سمجھتے، اسی طرح دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلافِ مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کانچ، مٹی، تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دسترخوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلافِ معمول تھا' دو زانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے۔ کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے۔ مگر یہ پر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا[1]۔ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو لتھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھائے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی الٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے جاتے مگر صاحبِ خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ تقاضائے مروت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپؐ بھی اٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے، نیز طلبِ رزق فرماتے اور صاحبِ خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت آپؐ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ کر کے سانس لیتے اور ہر بار آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمد للہ والشکر للہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے دور چلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے، مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے۔ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے"۔ کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سونگھنا ناپسند تھا۔ سانس میں بو کا ہونا چونکہ خلافِ مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے[2]

---

[1] روایت عمر بن امیہ (بخاری و مسلم) نیز روایتِ عائشہؓ (ابو داؤد و بیہقی)

[2] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی (ابواب متعلقہ)

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دُوسری طرف اکثر اوقات فقر وفاقہ کا عالم درپیش رہا۔جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔فرمایا:

"اکل کما یاکل العبد۔"

(میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے)

نشست و برخاست

کبھی اُکڑوں بیٹھتے،کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے،کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم اُلٹے ہاتھ پر۔فکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کریدتے۔ سونے کے لیے سیدھی کروٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔کبھی چت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے۔مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا۔اور اس سے منع فرماتے تھے۔ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا۔کھلی چھت پر جس کی پردے کی دیوار نہ ہو سونا اچھا نہ سمجھتے،وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سُورتیں (سورۂ اخلاص اور معوّذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔ سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خرّاٹے لیتے۔رات میں قضائے حاجت کے لیے اُٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے[1] سونے کے لیے ایک تہ بند علیحدہ تھا۔کُرتہ اُتار کر ٹانگ دیتے۔

بشری حاجات

ضرورت کے لیے چونکہ اُس دَور میں گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اِس لیے حضور جنگل جاتے۔عموماً اتنی دُور تک جاتے (دو، دو میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اُڑیں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔کبھی بارش میں نہاتے تو تہ بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

سفر

سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔سواری کو تیز چلاتے، پڑاؤ سے صبح کے وقت کُوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (CAMP LIFE) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصہ لیتے۔چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی

---

[1] شمائل ترمذی

سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے۔ آپؐ نے بھی لکڑیاں چُننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپؐ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کےلیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں۔[۱] سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر سے رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضورؐ میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پر کارفرما تھے آپؐ بہت ہی صاحبِ احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور رنج میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضورؐ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے لیے سنگدل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پُر ہنگامہ ہوتی ہے گھر کی پھیکی اور بدمزہ۔ آپؐ کو ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے۔ اور جہاں وُہ منہ لگاتیں وہیں مُنہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں حبشیوں کے ورزشی کرتب اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی آپؐ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پُوچھتے کہ "کیا تم سیر ہوگئی ہو؟" وہ کہتیں: "ابھی نہیں"۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔[۲] حضرت صفیہؓ کو اونٹ پر سوار کرانے کے لیے آپؐ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجنابؐ اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہؓ دونوں گر پڑے۔ ابُوطلحہ ساتھ تھے۔ دوڑے ہُوئے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا: پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے اُونٹوں کو تیز چلایا تو فرمانے لگے: "دیکھو، آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے"۔[۳] اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ حلال شے کو حرام نہ کرو۔[۴]

اپنے بچوں کے لیے بھی حضورؐ کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیم کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کے گھر جو مدینہ کے بالائی حصّے میں رکھا گیا تھا ان کو دیکھنے کے لیے خاصہ فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دُھواں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔[۵]

---

[۱] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۴   [۲] ایضاً ص ۲۹۶   [۳] مسلم و بخاری

[۴] مغربی اہلِ قلم نے حضورؐ کی اس صاف سُتھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور ذمہ دار ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکاکت تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انھیں نفسانیت گھناؤنی پستیوں میں گراتی رہتی ہے۔ حضورؐ کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرۂ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگِ پاکیزگی نمایاں تھا۔ آپؐ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حدود میں رکھ کر باحسن طریق پُورا کیا، اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا۔   [۵] بروایت انسؓ

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اُٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ ان کے صاحبزادوں امام حسنؓ و امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے، ان کو کندھوں پر سوار کرتے، ان کے لیے گھوڑا بنتے۔ حالتِ نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے۔ ایک بار اقرع بن حابس نے آپؐ کو جنابِ حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں مَیں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا مگر آپؐ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

انہی ابراہیم صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپؐ کی موجودگی میں ہوئی ام ایمن (کنیز) چلا چلا کے رونے لگیں۔ حضورؐ نے منع فرمایا، تو وہ کہنے لگیں کہ آپؐ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وُہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی ام کلثوم کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا[۱]۔ اپنے رونے کی کیفیت کو خود بیان فرمایا "آنکھیں اشک آلودہیں، دل غم زدہ ہے، مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے:

حسبی اللہ نعم الوکیل۔

رونے میں اُونچی آواز نہ نکلتی بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے اور ہانڈی کے اُبلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دلِ حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن ورد زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبد اللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کر کے قرآن سُنا۔ وہ جب سورۂ نساء کی اس آیت پر پہنچے "فکیف اذا جئنا . . . ." (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کر کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا کے لائیں گے) تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا[۲]۔

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذباتِ ہمدردی و شفقت کا جو حضورؐ کو ساری انسانیت سے تھی اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے! حیرت ہے کہ اس نزاکتِ احساس کے ساتھ ساتھ حضورؐ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

ذوقِ مزاح

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسولِ خدا خندہ رُوئی کی صفت سے متصف تھے۔ بلکہ فرمایا:

---

[۱] شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی بکاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

[۲] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷

"تبسمك فی وجه اخیك صدقة۔"

(تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کارِ خیر ہے)

آپؐ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے کہ کان بسامًا ضاحکًا۔ عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائضِ حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپؐ کا یہ حال تھا کہ "قد کان یباسط اصحابه بما یولج جبتهٔ فی القلوب"[1] یعنی آپؐ ایسے بے تکلفانہ اندازِ مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقا کے دلوں میں آپؐ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپؐ ہنسی، دل لگی کی باتیں کرتے۔ اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلافِ حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی نہ کسی کی دلآزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے۔ حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ "آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟" ارشاد فرمایا: "ہاں! مگر خلافِ حق کوئی بات نہیں کہتا۔"

یہاں ہم حضورِ پاکؐ کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں[2]:

○ کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا: ہم تمھیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے۔ سائل نے حیرت سے کہا کیں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

○ ایک بڑھیا نے آکر عرض کی کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضورؐ نے مزاحاً کہا: "اے امِ فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی۔ وہ روتی ہوئی اُٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا: اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جائے گا، بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ عُرُبًا اَتْرَابًا مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

○ زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپؐ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضورؐ کے کام کراتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جن کی قیمت حضورؐ باصرار ادا فرماتے) چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے حضورؐ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے پھر جب معلوم ہوا تو فرطِ اشتیاق میں حضورؐ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے: یا رسول اللہؐ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا، گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا: تم خدا کی نگاہ میں

---

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷

[2] بیشتر واقعات شمائل ترمذی سے لیے گئے ہیں۔ باب ماجاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ناکارہ نہیں ہو۔

○ ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر علیؓ کے آگے ڈالتے رہے آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھالیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

○ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ خوب ہنسے اور آپؐ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیے۔ ہوا یہ کہ عامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے ایک دشمن فرد زد پر تھا، وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا، سعد کے تیر کارگر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جونہی ڈھال سے سر نکالا، تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ اس بُری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اُوپر کو اُٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اِس رنگِ مزاح کا حال سُن کر تعجب ہوتا تھا، کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشّف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رونی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں، دوسرے حضورؐ کی عبادتِ رب، حضورؐ کی خشیت، حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نمونۂ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقشے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابنِ عمرؓ سے پوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہؐ کے رفقا بھی ہنسا کرتے تھے؟" انھوں نے فرمایا: "ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل لگی ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے۔" (روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دَور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہؓ کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپؐ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

تفریحات

متوازن زندگی کا ایک لازمی جزو تفریحات (جائز حدود میں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جزو ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظامِ حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اُٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپؐ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا، کبھی تنہا اور کبھی رفقا کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے

اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دُور سے تیر کر ایک دُوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا ساتھی حضورؐ نے جناب ابوبکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنوئیں میں پاؤں لٹکا کے اس کے دہانے پر بیٹھتے[1]

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے۔ ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گالیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسولؐ کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انھیں گانے دو[2]

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے۔ (روایت عائشہ و محمد بن الحاطب الجمحی) حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی میں نے اس کا نکاح کر کے دیا تو حضورؐ نے فرمایا: "عائشہؓ! تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں حالانکہ قبیلۂ انصار گانے کو پسند کرتا ہے"۔ ایک دُوسری روایت میں (غالباً اسی موقعے سے متعلق) یہ آتا ہے کہ "تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتا "اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فَحَیَّانَا وَ حَیَّاکُمْ" (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے۔ پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں)۔ ایسی ہی ایک بزمِ عروسی میں بچیاں کچھ گا رہی تھیں حضرت عامر بن سعد نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیانِ رسولؐ! اے شرکائے بدر! تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے؟" جواب ملا: جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ، ہمیں رسول اللہ نے اس کی اجازت دی ہے[3]

از انجملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی، اس سے تو آپؐ کو بُعد تھا۔ آپؐ کو نغمۂ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دُوسری طرف ذوقِ شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظِ مقصد) کی قدر فرماتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا۔ اور ایک نیا معیارِ نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے۔ اور صحابہ شعر بھی سنایا کرتے۔ شاعرانِ عرب کے

---

[1] شمائل ترمذی۔ مختلف ابواب

[2] روایت عائشہؓ (مسلم۔ باب ما یقول الجواری فی العید)

[3] ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب اعلان نکاح۔

کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرع پسندیدگی سے پڑھا:

"اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ"

(آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے)

دُوسرا مصرع ہے:

"وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ"

(دُنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں)

حضرت شرید سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے اُمیہ بن ابی صلت کے سَو شعر سُنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدانِ جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسّان اور کعب بن مالک سے دشمنانِ اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسّان کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں"۔

یہ بھی فرمایا کہ:

"مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی"۔

چند متفرق ذوقیات

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات و اطوار کا ذکر کرتے ہیں جنہیں کسی دُوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جا سکا۔

- کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے۔ اور کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔
- خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مُہر لگواتے۔
- حضورؐ اوہام پسندی سے پاک تھے اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔ بُرے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنیٰ شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔
- سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے: گھوڑے کے ایال میں قیامت تک کے لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ، منہ، ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

○ شور، ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی۔ ہر کام میں سکون و وقار اور نظم و ترتیب چاہتے۔ نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ "علیکم بالسکینۃ"۔ (تمہارے لیے سکون و وقار لازم ہے)۔ یوم عرفہ کو ہجوم تھا بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و سکون کا حکم دیا اور فرمایا: "فان البر لیس بالایضاع"۔ (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)[1]

اخلاق

حضور پاکؐ کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جا سکتا۔ وہاں تو پُوری زندگی حُسنِ خلق ہی کی تفسیر ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: "کان خلقہ القرآن"۔ انس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ "کان احسن الناس وکان اجود الناس وکان اشجع الناس"[2]۔ احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی (ماسوا ان باتوں کے جو حکمِ الٰہی کے تحت تھیں) اور دُوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا، ہر کسی سے عفو فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بیدادگروں کو معاف کیا اور منافقین و اشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا آپ نے کبھی نہ نہیں کی[3]۔ (موجود ہوا تو دے دیا، کبھی قرض لے کر دیا، نہیں موجود ہُوا تو دُوسرے وقت آنے کو کہا، یا سکوت اختیار کیا) اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریہ حق کو لے کر تنِ تنہا اُٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جمے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غارِ ثور ہو یا اُحد و حنین کے معرکے، ہر موقع پر یقینِ محکم کا مظاہرہ کیا۔

---

[1] بخاری و مسلم [2] مسلم باب فی شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] باب ما سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رسالتؐ نامہ ـــــ دریا بہ حباب اندر

ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم اے پی ایچ ڈی

ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی القرشی البغدادی (۵۱۱ھ - ۵۹۷ھ) اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہہ، ادیب، مؤرخ، مفسر اور محدث تھے۔ آپ کی ساری زندگی تالیف و تدریس میں بسر ہوئی۔ آپ کی تصانیف ایک سو میں کے قریب ہیں، ان میں سے ایک "تلقیح" ہے جس میں آپ نے حیاتِ رسولؐ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ۴۸۴ صفحات کی اس کتاب میں اس قسم کے سیکڑوں عنوان ہیں یعنی، حضورؐ کی دادیوں کے نام، حضورؐ کی دائیوں کے نام، حضورؐ کی کنیزوں کے نام، حضورؐ کی پھوپھیوں کے نام، حضورؐ کی ازواج کے نام، حضورؐ کی تلواروں کے نام، حضورؐ کی ڈھالوں کے نام، حضورؐ کی مہمات کے نام ـــــ وقس علیٰ ھذا

ذیل کے عنوانات و تفصیلات ابن جوزی کی محولہ کتاب سے ماخوذ ہیں:-

۲۲ر اپریل ۵۷۱ء ـــــ ولادت (۹ ربیع الاوّل ۱ھ) عام الفیل (مطابق یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی) بعد از صبح صادق قبل از طلوع - بروز سوموار

تقریباً ایک ہفتہ بعد ـــــ حلیمہ سعدیہؓ کی آغوشِ رضاعت میں

پانچ سال کی عمر میں ـــــ پھر آغوشِ مادر میں

چھ سال کی عمر میں ـــــ والدہ ماجدہ کا انتقال

آٹھ سال کی عمر میں ـــــ دادا (عبدالمطلب) کی وفات

بارہ سال کی عمر میں ـــــ شام کا پہلا تجارتی سفر

۲۵ سال کی عمر میں ـــــ حضرت خدیجہؓ سے نکاح

۳۰ سال کی عمر میں ـــــ قوم کی طرف سے الامین کا خطاب

۳۵ سال کی عمر میں ـــــ تمام قبائل کی طرف سے حکم (ثالث) دیوارِ کعبہ میں حجرِ اسود نصب کرنے کے وقت

۳۷ سال کی عمر میں ـــــ غارِ حرا میں خلوت اور عبادت و تفکر

ـــــ حضرت علیؓ کی کفالت

۴۰ سال کی عمر میں ـــــ نزولِ وحی

۳ سنہ نبوی ۴۳ سال کی عمر میں ـــــ چالیس زن و مرد کا اسلام قبول کرنا۔

۵ سنہ نبوی ۴۵ سال کی عمر میں ـــــ حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے صحابہؓ کو حکم

سنہ ۶ نبوی ۴۶ سال کی عمر میں ——— حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام قبول کرنا۔

سنہ ۷ نبوی ۴۷ سال کی عمر میں ——— کفارِ قریش کی جانب سے بائیکاٹ اور شعب ابی طالب میں محصور ہونا

سنہ ۱۰ نبوی ۵۰ سال کی عمر میں ——— معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) کا خاتمہ، چچا ابوطالب کا انتقال، حضرت خدیجہؓ کی وفات، تبلیغ اسلام کے لیے طائف کا سفر، حضرت عائشہؓ سے نکاح۔ رخصتی چار سال کے بعد ہوئی تھی، معراج کا واقعہ

سنہ ۱۱ نبوی ۵۱ سال کی عمر میں ——— یثرب (مدینے) کے چھ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱۲ نبوی ۵۲ سال کی عمر میں ——— یثرب (مدینے) کے بارہ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱۳ نبوی ۵۳ سال کی عمر میں ——— (یثرب (مدینے) کے ۷۲ آدمیوں کا قبول اسلام

سنہ ۱ ہجری ۵۴ سال کی عمر میں ——— مدینے کے شہری نظم و نسق کی دیکھ بھال۔

ہجرتِ مدینہ

سنہ ۲ ہجری ۵۵ سال کی عمر میں ——— کفار کا پہلا حملہ (واقعۂ بدر) کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار اور مسلمان ۳۱۳ تھے۔

سنہ ۳ 〃 ۵۶ سال کی عمر میں ——— کفار کا دوسرا حملہ (واقعۂ اُحد)

سنہ ۴ ھ ۵۷ سال کی عمر میں ——— بنی عامر کی چالبازی اور قاریوں کی شہادت

سنہ ۵ ھ ۵۸ سال کی عمر میں ——— کفار کا تیسرا حملہ (واقعۂ خندق) حملہ آوروں کی تعداد ۱۲ اور ۱۵ ہزار کے درمیان تھی۔

سنہ ۶ ھ ۵۹ سال کی عمر میں ——— صلح حدیبیہ حضورؐ کے ہمراہ ۱۴۰۰ اصحابہ تھے۔

سنہ ۷ ھ ۶۰ سال کی عمر میں ——— فتح خیبر بادشاہوں کو دعوت نامے

سنہ ۸ ھ ۶۱ سال کی عمر میں ——— موتہ کا واقعہ، فتح مکہ اور حنین کا واقعہ

سنہ ۹ ھ ۶۲ سال کی عمر میں ——— واقعۂ تبوک مسلمانوں کا حج ادا کرنا۔ وفود کی آمد

سنہ ۱۰ ھ ۶۳ سال کی عمر میں ——— حج الوداع اور مشہور آخری خطبہ

سنہ ۱۱ ھ ۶۳ سال کی عمر میں ——— علالت و رحلت

نبی کریمؐ کی ازواجِ مطہرات

ازواجِ مطہرات کی تعداد میں مؤرخین میں بڑا اختلاف ہے مگر ۱۲ امہات المومنین میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے دو کا حضورؐ کے سامنے انتقال ہو گیا تھا یعنی حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہ اور ۱۰ حضورؐ کی وفات کے وقت موجود تھیں

نام ازواج مطہرات :-

۱۔ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ ——— قریش کے قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ وفات سنہ ۱۰ میں

۲۔ حضرت سودہ بنت زمعہؓ ——— قریش سے تھیں۔

۳۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ ——— قریش کے قبیلہ بنو تیم سے تھیں ان کے والد حضرت ابوبکرؓ تھے۔

۴۔ حضرت حفصہ بنت عمرؓ ——— حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی تھیں۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔

۵۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہؓ ——— بنو بکر بن ہوازن سے تھیں۔ ام المساکین کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

۶۔ حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہؓ ——— قریش کے مشہور قبیلے بنو مخزوم سے ان کا تعلق تھا۔

۷۔ حضرت جویریہ بنت حارثؓ ——— بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔

۸۔ حضرت زینب بنت جحشؓ ——— بنو اسد بن خزیمہ سے تھیں۔

۹۔ حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ ——— قریش کے مشہور قبیلہ بنو امیہ کے رئیس ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔

۱۰۔ حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطبؓ ——— ان کا تعلق یثرب کے یہودی قبیلہ بنی نضیر سے تھا۔

۱۱۔ حضرت میمونہ بنت حارثؓ ——— ان کا انتقال ۶۱ھ میں ہوا۔

۱۲۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ ——— انھیں مقوقس شاہ مصر نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا، حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ کی صاحبزادیاں اور صاحبزادے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں اور تین صاحبزادے تھے:۔

سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی صاحبزادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی ان کی ماں حضرت خدیجہؓ نے اپنی خالہ کے لڑکے ابوالعاص بن ربیعؓ الاُموی کے ساتھ کر دی۔ ان کا انتقال ۸ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ ان کے بطن سے ایک فرزند اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ سیدہ زینب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی قبل از اسلام ابولہب کے لڑکے عتیبہ کے ساتھ ہوئی ظہور اسلام کے بعد ابولہب نے اپنے بیٹے سے طلاق دلوادی اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان بن عفانؓ سے ہوگئی ۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا۔

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سیدہ رقیہؓ سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتبہ کے ساتھ قبل از اسلام ہوئی تھی اور انھیں بھی ابولہب نے عتبہ سے طلاق دلوا دی تھی۔ سیدہ رقیہؓ کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شادی بھی حضرت عثمان غنیؓ کے ساتھ کر دی۔ اس لیے عثمان غنیؓ کو ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۹ھ میں بمقام مدینہ منورہ انتقال فرمایا۔

سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوا۔ انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد ۳ رمضان ۱۱ھ کو انتقال فرمایا۔ ان کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت امام حسنؓ، حضرت حسینؓ اور دو لڑکیاں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ پیدا ہوئیں۔ حضرت ام کلثومؓ کی شادی فاروق اعظمؓ سے ہوئی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادے تھے، جن کے نام ابراہیم، طاہر اور قاسم تھے۔ انہوں نے عالم طفولیت ہی میں انتقال فرمایا۔ طاہر اور قاسم حضرت خدیجہؓ کے بطن سے۔ اور ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔

آپؐ کا لباس

آپؐ سفید لباس بے حد پسند فرماتے۔ زیادہ تر روئی کا لباس پہنتے تھے، صوف اور کتان کا لباس بھی کبھی کبھی پہن لیتے تھے، جُبّہ، قبا، قمیص، ازار، عمامہ، ٹوپی، چادر، حلہ، موزہ یہ سب آپؐ نے پہنے ہیں، سبز رنگ کی یمنی چادر آپؐ کو بہت پسند تھی۔ جو بُردِ یمانی کے نام سے مشہور تھی۔ سُرخ لباس کو منع فرماتے تھے کبھی کبھی سیاہ عمامہ آپؐ نے باندھا ہے۔ ٹوپی بھی پہنا کرتے اور اسے عمامہ کے نیچے پہننے کی تاکید کرتے تھے۔

حضورؐ کا اسلحہ

تلواریں : آپؐ کے پاس ۹ تلواریں تھیں، جن کے نام یہ ہیں: ماثور، العضب، قلعی، البتار، الحتف، الرسُوب، المخذم اور ذوالفقار۔

زرہیں : ان کی تعداد سات تھی؛ ذات الفضول لوہے کی زرہ تھی، جسے آپؐ نے ایک یہودی کے پاس گروی رکھا تھا اور اس سے تین صاع غلہ اپنے عیال کے لیے قرض لیے تھے۔ اسکے علاوہ ذات الوشاح، السّعدیہ، ذات الحواشی، فِضّہ، البترا، الخرنق تھیں۔

کمانیں : چھ تھیں، جن کے نام یہ ہیں: الزوراً، الروحاً، الصفراً، البیضاً، الکتوم اور شوحظ۔

ڈھالیں: دو تھیں: الزلوق، الفتق۔

عہد نبویؐ کی مساجد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد کی تعمیر پر بھی زور دیا تھا اور اس امر کی تاکید فرمائی کہ جو مسلم ہو، وہ اپنے مقام پر عبادت کے لیے ایک مسجد فوراً تیار کرے۔ آپؐ کے مبارک عہد میں بڑی بڑی آبادیوں میں کئی مساجد تھیں صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے علاوہ ۹ مساجد تیار ہو چکی تھیں۔ جن میں علٰحدہ علٰحدہ پانچوں وقت نماز ہوتی تھی: مسجد بنو عمرو ؓ، مسجد بنو ساعدہ، مسجد بنو عبید، مسجد بنو زریق، مسجد بنو سلمہ، مسجد بنو غفار، مسجد بنو اسلم، مسجد بنو جہینہ، مسجد بنو بیاضہ۔

آنحضرت کے مؤذنین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار مؤذن تھے دو مدینہ طیبہ میں، بلال بن رباحؓ اور عمرو بن ام مکتوم قرشی العامریؓ نابینا۔ ایک قبا میں سعد القرظؓ اور ابو محذورہ اوس بن مغیرہ بن جمحیؓ مکہ میں۔

آپؐ کی سواری کے جانور

گھوڑے : آپؐ کے سات گھوڑے تھے اور کسی صفت خاص کی وجہ سے ان کے مختلف نام تھے سکب، لُحیف، شجا، ظرب، لزاز، مرتجز اور الورد۔

خچر : پانچ خچر تھے، ایک دلدل نامی جو مقوقس شاہ مصر نے، دوسرا فضہ نامی فروۃ الجذامی نے تیسرا صاحب ایلہ نے، چوتھا دومۃ الجندل کے حکمران نے اور پانچواں نجاشی شاہ حبش نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

گدھے : تین تھے، ایک یعفور جو مقوقس شاہ مصر نے بھیجا تھا، دوسرا فروۃ الجذامی نے اور تیسرا حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ نے ہدیۃً پیش کیا تھا۔

اونٹ : ان کی تعداد تین بتائی جاتی ہے جن میں سے ایک کا نام القصویٰ تھا جس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔

بکریاں : آپؐ کی ملک میں ایک سو بکریاں تھیں سو سے زیادہ ہوتیں تو ان کو ذبح کر دیتے اور پوری ایک سو رکھتے۔

سرورِ کونینؐ کے قاصد

۱۔ حضرت عثمان بن عفانؓ الاموی	قریش مکہ کی جانب	۲۔ حضرت عمرو بن اُمیہ الضمریؓ	نجاشی شاہ حبش کے پاس بھیجے گئے۔
۳۔ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ	ہرقل قیصر روم	۴۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ	خسرو پرویز شاہ ایران
۵۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اللخمیؓ	مقوقس شاہ مصر	۶۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ	حارث ابی شمر شاہ غسان
۷۔ حضرت سلیط بن عمروؓ	ہوذہ بن علی اور ثمامہ بن اثال کی جانب	۸۔ حضرت عمرو بن العاص السہمیؓ	جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی الازدی رئیسانِ عمان
۹۔ حضرت علاء بن الحضرمیؓ	منذر بن ساوی حاکم بحرین	۱۰۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومیؓ	حارث بن کلال حمیری
۱۱۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	یمن	۱۲۔ حضرت معاذ بن جبلؓ	یمن
۱۳۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ	ذوالکلاع الحمیری	۱۴۔ حضرت عیاش بن ربیعہ المخزومیؓ۔	حارث، مسرح اور نعیم بن عبدالکلال کی طرف
۱۵۔ حضرت حارث بن عمیرؓ	بصریٰ کے حاکم		

مقرر کردہ محصلین

وہ صحابہ کرامؓ جنھیں آنحضرت نے مختلف قبائل اور علاقوں کا انتظام سونپ دیا تھا، جو جزیہ، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے۔

۱۔ حضرت صفوان بن صفوانؓ	بنو عمرو پر	۲۔ حضرت عدی بن حاتمؓ	بنو طے و بنو اسد پر	۳۔ حضرت عمر فاروقؓ	مدینہ منورہ پر
۴۔ حضرت ابوجہم بن حذیفہؓ	بنو لیث "	۵۔ حضرت بریدہ بن حصیب السلمیؓ	بنو غفار و اسلم "	۶۔ حضرت عباد بن بشیرؓ	بنو سلیم و مزینہ "
۷۔ حضرت ضحاک بن سفیانؓ	بنو کلاب "	۸۔ حضرت رافعؓ	بنو جہینہ "	۹۔ حضرت قیس بن عاصمؓ	بنو سعد "
۱۰۔ " عمرو بن العاصؓ	بنو خزارہ "	۱۱۔ حضرت بشر بن سفیانؓ	بنو کعب "	۱۲۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ	نجران "
۱۳۔ " عبداللہ بن رواحہؓ	خیبر "	۱۴۔ " زیاد بن لبیدؓ	حضرموت "	۱۵۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	یمن "
۱۶۔ " عمرو بن سعید بن العاصؓ	تیماء "	۱۷۔ " ابان بن سعیدؓ	بحرین "	۱۸۔ حضرت عبداللہ بن لیثؓ	بنو ذبیان "

مدینہ میں نائبین

وہ صحابہ کرام رضؓ جنھوں نے مدینہ میں آپؐ کی نیابت کی :

۱	حضرت سعد بن عبادہ الخزرجی رضؓ	غزوۂ ابواء کے موقع پر
۲	حضرت سعد بن معاذ الاوسی رضؓ	غزوۂ بواط کے موقع پر
۳	حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسد رضؓ	غزوۂ عشیرہ کے موقع پر
۴	حضرت زید بن حارثہ رضؓ	غزوۂ سفوان کے موقع پر
۵	حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبد المنذر رضؓ	غزوۂ بدر کے موقع پر
۶	حضرت ابن ام مکتوم رضؓ	غزوۂ بنو سلیم کے موقع پر
۷	حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبد المنذر رضؓ	غزوۂ بنو قینقاع کے موقع پر
۸	حضرت ابو لبابہ بشیر بن عبد المنذر رضؓ	غزوۂ سویق کے موقع پر
۹	حضرت عثمان بن عفان رضؓ	غزوۂ بنو غطفان کے موقع پر
۱۰	حضرت ابن ام مکتوم رضؓ	غزوۂ بحران کے موقع پر
۱۱	حضرت ابن ام مکتوم رضؓ	غزوۂ احد کے موقع پر
۱۲	حضرت عثمان بن عفان رضؓ	غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر
۱۳	حضرت عبد اللہ بن عبد اللہ رضؓ	غزوۂ بدر الصغریٰ کے موقع پر
۱۴	حضرت سباع بن عرفطہ الغفاری رضؓ	غزوۂ دومۃ الجندل کے موقع پر
۱۵	حضرت ابو ذر غفاری رضؓ	غزوۂ بنو مصطلق پر
۱۶	حضرت نمیلہ بن عبد اللہ رضؓ	غزوۂ خیبر کے موقع پر
۱۷	حضرت ابو رہم کلثوم بن حصین غفاری رضؓ	فتح مکہ کے وقت
۱۸	حضرت محمد بن مسلمہ انصاری رضؓ	غزوۂ تبوک کے موقع پر

عمال نبویؐ (گورنر)

حضرت باذان بن ساسان رضؓ	والی یمن
حضرت شہر باذان رضؓ	والی صنعا
حضرت علاء بن الحضرمی رضؓ	والی بحرین
حضرت علی بن ابو طالب رضؓ	والی اخماس یمن
حضرت خالد بن سعید رضؓ	والی صنعا
حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومی رضؓ	والی کندہ
حضرت عمرو بن العاص رضؓ	والی عمان
حضرت ابو سفیان بن حرب رضؓ	والی نجران
حضرت یزید بن ابو سفیان رضؓ	والی تیما
حضرت عتاب بن اسید رضؓ	والی مکہ
حضرت معاذ بن جبل رضؓ	والی جند
حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضؓ	والی مآرب
حضرت زیاد بن لبید رضؓ	والی حضرموت

بیعت عقبہ اولیٰ کے چھ افراد

عقبہ کے مقام پر یثرب کے ان چھ افراد نے آپؐ کے ہاتھ پہ بیعت کی اور اسلام لائے۔

۱۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہ رضؓ۔ ۲۔ عوف بن حارث رضؓ۔ ۳۔ رافع بن مالک رضؓ۔ ۴۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ رضؓ۔ ۵۔ عقبہ بن عامر بن نابی رضؓ۔ ۶۔ جابر بن عبد اللہ رضؓ

رسول اکرمؐ کے مدنی نقیب

ہجرت سے پہلے مدینے کے جن بارہ اصحاب کو حضورؐ نے نقیب بنایا تھا، ان میں نو خزرج کے تھے اور تین اوس کے اور یہ سب قبائل مدینہ کے رؤسا تھے:

۱۔ اسید بن حضیر رضؓ۔ ۲۔ ابو الہیثم بن التیہان رضؓ۔ ۳۔ سعد بن خیثمہ رضؓ۔ ۴۔ سعد بن زرارہ رضؓ۔ ۵۔ سعد بن الربیع۔ ۶۔ عبد اللہ بن رواحہ رضؓ۔ ۷۔ سعد بن عبادہ رضؓ۔

۸۔منذر بن عمروؓ ۔ ۹۔ براؓ بن معرورؓ ۔ ۱۰۔عبداللہ بن عمروؓ ۔ ۱۱۔عبادہ بن الصامتؓ ۔ ۱۲۔رافع بن مالکؓ ۔

حضورؐ کے آزاد کردہ غلام

زید بن حارث، ابورافع اسلم، ثوبان، ابوکبشہ، شقران، رباح، یسار، مدغم، ذکوان، افلح، ابومویہبہ، آنسہ، ضمیرہ بن ابی ضمیرہ، عبیداللہ بن اسلم، عُبید بن عبدالغفار، فضالۃ الیمانی، ابوعسیب احمر، اسامہ بن زید، انجشہ، ایمن بن اُم ایمن، زید بن بولا، سابق، سالم، سلمان فارسی، مہران، ابوعبدالرحمٰن نافع، واقد، الواثیلہ، ابوالحمراءؓ، ابوالسمح، ابوعبید، حُنین، بدر، حاتم، باذام، دوس، رُوَیفع، سعد، سعید، غیلان، کُریب، محمد، نامیبہ، کحول، نہیک، نفیع مردان، ابوصفیۃ، ابوقیلہ، ابوالقیط، وغیرہ وغیرہ کل ۶۶ ۔ (ابن الجوزی ۔ تلقیح ص۱۸)

حضورؐ کے کاتبانِ وحی

ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، اُبی بن کعبؓ، زید بن ثابت انصاریؓ، معاویہؓ، حنظلہ بن الربیع الاسیدیؓ، ابان بن سعیدؓ، خالد بن سعید بن العاصؓ، علاءؓ بن حضرمی، رضوان اللہ علیہم اجمعین (تلقیح ص۳۷)

حضورؐ کے محافظ

سعد بن ابی وقاص، سعد بن مُعاذ، عبّاد بن بشر، ابوایوب انصاری، ذکوان بن عبدقیس انصاری، محمد بن مَسلمہ انصاری، بلال رضی اللہ عنہم (تلقیح ص۳۸)

وہ لوگ جن کی شکل و صورت حضورؐ سے ملتی تھی

۱۔جعفر بن ابی طالبؓ، ۲۔حسین بن علیؓ ۔ ۳۔قثم بن عباسؓ ۔ ۴۔ ابوسفیان بن حارثؓ ۔ ۵۔سائب بن عُبیدؓ ۔
۶۔مسلم بن مُعتّبؓ ۔ ۷۔کابس بن ربیعہ بن مالک اسامیؓ ۔ (تلقیح ص۳۸)

حضورؐ کے خُدام

۱۔ انسؓ آپ کے گھر میں کام کرتا ۔ ۲۔ ربیعہ بن کعبؓ وضو کراتا ۔ ۳۔ابن مسعودؓ جوتے پہناتا ۔
۴۔عقبہ بن عمروؓ خچر کی دیکھ بھال کرتا ۵۔ بلالؓ ۶۔سعد ۔ ۷۔عامر ۸۔ بکیرؓ ۹۔اَسود بن مالکؓ ۔
۱۰۔ ایمنؓ ۱۱۔ ثعلبہؓ ۱۲۔سالمؓ ۱۳۔سابقؓ ۱۴۔ ہلال بن حارثؓ اور ۲۵ دیگر مختلف کام کرتے تھے ۔
(کل ۳۹ ۔ تلقیح ص۱۷)

عہدِ رسولؐ کے مفتی

خلفائے اربعہؓ ۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اُبی بن کعبؓ ۔ عبداللہ بن مسعودؓ ۔ مُعاذ بن جبلؓ ۔ عمار بن یاسرؓ ۔ حُذیفہؓ ۔ زید بن ثابتؓ ابوالدرداءؓ ۔ سلمانؓ ۔ ابوموسیٰ اشعریؓ ۔ (ایضاً ص۲۲۵)

ہجرت

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلعم ہجرت کے لئے مکّہ سے بارہ ربیع الاوّل کو سوموار کی شام کو نکلے تھے اور اگلے سوموار کو قبل از دوپہر مدینہ میں وارد ہوئے تھے۔ پہلے قبا میں کلثوم بن الہدم کے ہاں ٹھہرے۔ اس کی جلد وفات ہوگئی اور آپ سعد بن خیثمہ کے ہاں منتقل ہو گئے۔ تین دن کے بعد مدینہ میں بنی سالم کے ہاں چلے گئے۔ وہاں اپنی زندگی کا پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ یہ مدنی زندگی کا بھی پہلا جمعہ تھا۔ بعداز جمعہ حضور صلعم ناقہ پہ سوار ہو گئے اور ناقہ چل پڑی۔ بنو نجّار کے مساکن میں حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر کے سامنے جا بیٹھی۔ حضورؐ اتر کر ابو ایوبؓ کے گھر چلے گئے۔ مسجد نبوی اور حضورؐ کے حجرے تیار ہونے تک وہیں رہے۔

بعداز ہجرت پہلے سال حضورؐ نے انصار و مہاجرین کے درمیان سلسلۂ مواخات قائم کیا۔ دوسرے سال کعبہ کو قبلہ بنایا گیا — تبدیلِ قبلہ کا حکم ۱۵ رمضان کو نمازِ ظہر کے دوران دوسری رکعت میں آیا تھا۔ اسی سال حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ غزوۂ بدر ہوا۔ تیسرے سال حضرت حفصہؓ اور زینبؓ بنتِ خزیمہ حضورؐ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت حسن بن علیؓ پیدا ہوئے۔ چوتھے سال حسینؓ بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ حضرت عائشہ کے ہار ٹوٹنے کا واقعہ پیش آیا۔ پانچویں سال دومۃ الجندل۔ خندق اور بنو قریظہ کے غزوات ہوئے۔ اسی سال زینبؓ بنتِ جحش حضورؐ کے نکاح میں آئی۔ چھٹے سال معاہدۂ حُدَیبیہ ہوا۔ ساتویں سال غزوۂ خیبر ہوا۔ اسی سال سلام بن مشکمؓ کی بیوی زینبؓ نے حضورؐ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا نیز امِ حبیبہ، میمونہ بنتِ حارث اور صفیہ بنتِ حیی حضورؐ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ اسی سال ابو ہریرہؓ اسلام لائے اور شاہِ مقوقس سے تین تحائف دُلدل۔ یعفور (گدھا) اور حضرت ماریہ قبطیہؓ موصول ہوئے۔

آٹھویں سال میں جنگِ موتہ ہوئی۔ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ اسلام لائے۔ مکّہ فتح ہوا۔ غزوۂ حُنین پیش آیا۔ ماریہ سے ابراہیم کی ولادت اور حضورؐ کی دختر زینبؓ کی وفات ہوئی۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اسلام لانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

نویں برس میں غزوۂ تبوک ہوا۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر حج کے لئے بھیجا۔ حضورؐ کی بیٹی امِ کلثوم کی وفات ہوگئی۔ اس میں قبائل کے وفود اسلام و متابعت کا پیغام لے کر مدینہ پہنچے۔ اسی سال مسجد ضرار گرائی گئی۔

دسویں سال میں حضورؐ نے حجۃ الوداع کیا۔ مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعد ازاں ۱۲ ربیع الاوّل کو پیر کے دن حضورؐ کو اللہ نے بلا لیا۔

سیرتِ نبویؐ کی توقیت

(CHRONOLOGY)

سیرتِ نبویؐ (توقیت کی روشنی میں)

مولوی اسحٰق النبی علوی

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یاد رہے گی کیونکہ اس زمانے میں دُنیا ایک عجیب وغریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی، جس کے ایک ہی ہاتھ میں بیک وقت تخریب وتعمیر دونوں کے جوہر موجود تھے، عرفِ عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا اگرچہ جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی، لیکن اس کی عمومی اور آناً فاناً مقبولیت نے ثابت کردیا کہ یہ وقت کی آواز تھی، جو کہیں سے بھی اُٹھتی ضرور سُنی جاتی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرقِ وسطیٰ پر چھاگئی، جہاں سے اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ "جزیرہ نما" سے نکلنے کے فوراً ہی بعد اس تحریک کے علمبرداروں نے ایک ایسی بے نظیر تہذیب اور لاثانی تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جس نے انسانیت کو آگے بڑھانے میں حیرت خیز کام انجام دیئے، اور جو آج بھی تاریخ تمدن کے طالب علموں کے لیے باعثِ کشش اور جاذبِ توجہ ہیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتداء پیغمبرِ اسلام کی سیرۃ یا بالفاظِ دیگر آپ کے اُن احکام وافعال سے ہوتی ہے جو اس تحریک کو منظم کرنے، چلانے اور کامیاب بنانے میں اختیار کیے گئے تھے، اس اعتبار سے، اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصّہ حد درجہ اہم ہے اور تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلِ تحریک کو سمجھنے کے لیے اس حصّے کا بغور مطالعہ کرے، کیونکہ بلا اِس کے اسلام کی اصل رُوح سمجھنا دشوار رہے۔

مسلمانوں کا دعوےٰ ہے کہ انھوں نے اپنے عظیم پیغمبر کی تعلیمات اور حالاتِ زندگی کے جزئیات کو محفوظ کرنے کے لیے جو جدّوجہد کی، اور جو جو طریقے اختیار کیے، خود ان کی نظیر تاریخِ عالم میں ڈھونڈے سے نہ ملے گی، یہ دعویٰ بڑی حد تک سچا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے جس بے اندازہ محنت، احتیاط اور تلاش وتنقید کا ثبوت دیا ہے، وہ واقعی قابلِ داد ہے، اور اگرچہ آج تاریخی روایات کو جمع کرنے اور ان پر جرح وتنقید کے کچھ اور اصُول بھی رائج ہو چکے ہیں لیکن یہ پُرانے اصول اور طریقے ہنوز اپنی جگہ ہیں اور ان کی حمایت میں بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

تاریخی نقطۂ نظر سے پیغمبرِ اسلام کی سرگزشت کو تین بڑے حصّوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی:

(۱) عہدِ ماقبلِ نبوّت (۲) مکّی عہد (۳) مدنی عہد

عمومی تاریخ میں یہ آخری حصّہ خاص اہمیّت رکھتا ہے، کیونکہ اسی نقطہ سے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا

ہے اور اسی مقام سے اسلامی تحریک جو اس وقت تک خاموش اور "پُرامن" تھی شمشیر بکف ہو کر عملی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخ اسلام کے طالب علموں کے لیے آنحضرتؐ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا آپ کی تنظریاتی، تعلیم کا، کیونکہ یہ آپ کی عظیم انقلابی تحریک کا عملی پہلو ہے، اور اس سے ہمیں وہ تمام درجہ بدرجہ تنظیمی اور سیاسی ترقیاں نظر آسکتی ہیں جن کی بدولت اسلام، مذہب کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ معاشرہ اور مضبوط سیاسی طاقت میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک فرد میں نظریات پیش کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انصرامی قابلیت اور پھر رہنمائی کا جوہر، کارخانۂ قدرت میں سب سے زیادہ نادرالوقوع عجوبہ ہے[1]۔

اس نظر سے دیکھئے تو کسی بھی مصلح، رہنما، ہادی، قائد یا فاتح میں بیک وقت اتنے اوصاف نظر نہیں آتے جتنے تنہا رسولؐ عربی کی ذات میں قدرت نے ودیعت کئے تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت نے اگر ایک طرف بالکل نئے قسم کے دینی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظریات و تصوّرات پیش کرکے دُنیا سے منوا لئے تو دوسری طرف دس سال کی قلیل مدّت میں ایک ایسی عظیم اور مائل بہ عروج ریاست اور ترقی پذیر سلطنت کی خود اپنے ہاتھوں سے تشکیل و تاسیس بھی کی جس نے اگلے آٹھ دس سال کے اندر ہی برّ اعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ کی دو مضبوط ترین شہنشاہیتوں کو نیست کر ڈالا[2]۔

یہ سلطنت صحرائے عرب سے اُٹھی ہوئی عارضی آندھی نہ تھی جو فوراً اُتر جاتی بلکہ ایک مضبوط اور مستحکم نظام تھا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں وادیٔ سندھ سے لے کر بحر ارل (ARAL) تک اور ارل سے لے کر اٹلانٹک ATLANTIC تک ایک ہی پرچم

---

[1] MY STRUGGLE. XI

[2] ڈاکٹر منگانا جیسے مخالف کا خیال ہے:

"IN ANY CASE, WHATEVER VIEW WE MAY TAKE OF THE CLAIMS OF MOHAMMAD NO ONE CAN DENY THAT HE WAS A GREAT MAN".

"A MAN WHO PUT AN END IN LESS THAN 10 YEARS TO TWO FORMIDABLE KINGDOMS THE KINGDOM OF THE OLD ACHIMENIDES REPRESENTED BY THE CLASSIC SASSANIDES AND THAT OF ROMAN CAESARS OF EASTERN COUNTRIES BY MEANS OF SOME CAMEL DRIVERS OF ARABIA, MUST BE AT ANY RATE TAKEN INTO CONSIDERATION. A CONTROLLER OF CONSCIENCE AND SOUL TO SO MANY MILLIONS AND IN THE PLAIN LIGHT OF CIVILIZATION, IS INDEED GREATER THAN ALEXANDER AND BOUNAPARTE KNOWN ONLY TODAY IN HISTORICAL BOOKS,.: A. MINGANA LEAVES P XXIV.

کو سربلند کر دیا، جو بڑی مدت تک اسی شان و شکوہ سے لہراتا رہا، اور آج بھی جبکہ ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں، دنیا کے ایک بڑے حصے پہ سایہ فگن ہے۔

اس عظیم سلطنت کی ابتدا ان چھوٹی چھوٹی مہموں اور معرکہ آرائیوں سے ہوئی تھی جن کو سیرت کی اصطلاح میں غزوات و سرایا" کہا جاتا تھا اور جو اس اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں کہ اسلام کی تابناک تاریخِ سیاست کا پہلا باب انھیں سے شروع ہوتا ہے۔

سیرۃ کی کتابوں میں ان غزوات و سرایا کے جو دلچسپ حالات ملتے ہیں وہ اتنی تفصیل کے ساتھ ہیں کہ ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ آنکھوں دیکھا حال نہیں، مثلاً ہر غزوے یا سریے کی اصل وجہ، مقامِ جنگ، اس کا مدینے یا کسی اور مشہور مقام سے فاصلہ مع سمت، امیرِ جیش، یا علمبردار کا نام، پرچم کا رنگ، مسلم فوج کا شعار، شرکا کی پوری تعداد مع اسمائے مشاہیر، بایں صراحت کہ مثلاً ان میں کتنے اوسی تھے کتنے خزرجی، پھر ان سب کے حلفا اور دوستوں کی نام بنام نشان دہی، موافق اور مخالف سواروں کی طاقت، گھوڑوں کے نام، نیز یہ کہ کون کس شخص کے ہاتھ سے قتل یا مجروح ہوا؟ اور کس آیے سے؟ پھر وہ تمام خاص خاص گفتگوئیں جو آپس میں یا فریقین کے درمیان ہوئیں، مخالفوں کی جنگی طاقت، اسیرانِ جنگ کے نام، غنائم کی تفصیل، حتیٰ کہ معرکہ کا مہینہ، تاریخ اور دن تک متعین کیا گیا ہے۔ اور کسی وجہ سے تاریخ و یوم کی کوئی صراحت نہ مل سکی تو مہینہ ضرور نظر آئے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ تفصیلات اُس وقت تک بیان نہیں کی جا سکتیں جب تک ان کو فوراً ہی قلم بند نہ کر لیا جائے بالخصوص تاریخ اور دن کا صحیح تعیّن بلا لکھے ممکن نہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر واقعی یہ روایات درست ہیں اور ان تفصیلات کی حیثیت افسانوی نہیں تو اُن کے رُواۃ کے سامنے براہِ راست کچھ ایسی دستاویزیں تھیں جس کا تعلق عہدِ رسالت، بلکہ عہدِ غزوات سے تھا۔

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے ہمیں روایاتِ سیرۃ پر تنقید کا حق پہنچتا ہے اور اصولی طور پر ہماری نظریں کتبِ سیرۃ کے ابتدائی ماخذوں کی طرف اُٹھتی ہیں کیونکہ تاریخ صرف مستند ماخذوں کے بیان کردہ واقعات کا نام ہے۔

اس سلسلے میں عمومی تصور یہ ہے کہ یہ جملہ روایتیں، دوسری اور تیسری صدی ہجری سے پہلے ضبطِ تحریر میں نہیں آسکی تھیں[1] چنانچہ اکثر علماءِ تاریخ کا خیال ہے کہ ابن اسحٰق (المتوفی ۱۵۰ھ) اسلام کے پہلے مؤرخ ہیں[2] جنھوں نے پیغمبرِ اسلام کی سیرت کو سب سے پہلے لکھا اور ان منتشر زبانی روایات کو یکجا کیا جو ان کے زمانے میں مُتداول تھیں، گویا اسلام کی یہ ابتدائی تاریخ عباسیوں کے عہد میں پہلی بار لکھی گئی جب کہ ظہورِ اسلام کو تقریباً سوا سو، ڈیڑھ سو سال گزر چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اسلامی تاریخ کا یہ ابتدائی حصہ محض چند شکوک اور مشتبہ روایات کا مجموعہ رہ جاتا ہے جس کی نہ کوئی دستاویزی حیثیت باقی رہتی ہے، نہ تاریخی افادیت، یہ بات قطعاً خارج از قیاس ہے کہ چار پانچ پشتیں گزر جانے کے بعد بھی واقعاتی تفصیلات جوں کی توں اپنے اصلی رنگ میں باقی رہیں، یا یہ کہ ان کا بڑا حصہ ضائع نہ ہو جائے جس کے خلاً

[1] سرسید، خطبات/۳۱۵ [2] (A HISTORY OF HISTORICAL WRITINGS VOL. IP 335)

کو پُر کرنے کے لیے ان میں رائج الوقت روایات، عقائد اور تصورات شامل نہ ہو جائیں۔

اس کے مقابلے میں جب ہم ان روایات کی ساخت، ہیئت اور دوسری تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو ان میں قدیم سادگی کی پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ واقعاتی تسلسل تک نظر نہیں آتا، جگہ جگہ روایتیں تشنہ رہ جاتی ہیں، درمیان سے ٹوٹ جاتی ہیں اور کسی جوڑنے والے کا پتہ نہیں چلتا، عباسی عہد کے عقائد اور مزعومات اتنی کم روایتوں میں محسوس ہوتے ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوتے بغیر نہیں رہتا کہ روایات سیرۃ کا بڑا حصہ اس دور سے پہلے ضبطِ تحریر میں آ چکا تھا۔

اس صورت میں اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ روایتیں، ابتدائی مدوّنینِ سیرۃ کو بعض قدیم تر ماخذوں سے مکتوبی صورت میں پہنچی تھیں جن کا تعلق عہدِ رسالت یا عہدِ صحابہ سے تھا[1]۔ تو اس خیال کی تائید میں بہت سی تاریخی شہادتیں اور قیاسات پیش کئے جا سکتے ہیں بلکہ مثبت دلائل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ رسالت کے یہ ریکارڈ عبداللہ بن عباس۔ ابان بن عثمان۔ عروہ بن زبیر وغیرہ قرنِ اوّل کے مصنفین کو پہنچیا یقینی تھے، مگر مشکل یہ ہے کہ روایاتِ سیرت کا ایک قابلِ لحاظ حصہ پھر بھی سائنٹفک تنقید کا متحمل نہیں ہوتا اور نتیجے میں تمام روایتوں کو مشکوک بنا دیتا ہے، خاص طور پر توقیتی CHRONOLOGICAL حصہ پر نہ صرف واقعاتی ترتیب کا مدار ہے بلکہ رُواۃ اور مُدوّنینِ سیرت کے ذہنی رجحانات، مثلاً صداقت، یا وضّاعی، جانچنے کے لیے سب سے اہم کلید کا کام دے سکتا ہے۔ کیونکہ صرف اسی حصّے کی جانچ علوم ریاضیّہ کی مدد سے بآسانی ممکن ہے، جس کے جوابات کبھی غیر یقینی نہیں ہوتے۔

سیرت کی کتابوں کو دیکھئے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم تاریخ میں مؤرخین اسلام کا یہ ایک بے مثال کارنامہ تھا کیونکہ جس عہد میں اصولاً یہ توقیتی صراحتیں ریکارڈ ہو جانا چاہئیں، اس میں دنیا کا بڑا حصہ اس درجہ تاریخی شعور سے خالی نظر آتا ہے کہ ہر اہم واقعے کو مؤقت بتاریخ و یوم اور ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ٹھیک ٹھیک زمانہ متعین کیا جائے جیسا کہ کتبِ سیرت کا عام دستور رہے۔

سیرت کی کتابوں میں یوں تو سینکڑوں واقعات کو موقت کیا گیا ہے اور یہ تاریخیں اگرچہ بلا کسی ادنیٰ شبہ کے اس طرح بیان کی گئی ہیں کہ گویا سب کی سب دستاویزی تھیں مگر جب ان کی جانچ ریاضی کے اصولوں پر کی جاتی ہے تو حیرتناک نتائج نکلتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسلام کی اس ابتدائی تاریخ میں سچائی کے عناصر کم اور تبلیغی تصور زیادہ ہے، کیونکہ تقریباً تمام اہم واقعات کی توقیتی صراحتوں میں بظاہر اس درجہ تضاد اور تناقض نظر آتے ہیں کہ ان روایات کو تاریخ کا مرتبہ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ نہ دن تاریخوں سے مطابقت کرتے ہیں نہ مہینے موسموں سے، اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ جملہ صراحتیں محض جعلی اور قدیم واعظینِ اسلام کی محض وقتی ذہانت کی پیداوار تھیں جن کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ان کی جانچ کسی طرح ممکن ہے۔

یہ تاریخی تضادات گوناگوں ہیں (کہ کتابتی سہو اور تصحیفی غلطیوں کو چھوڑ کر) مندرجہ ذیل پانچ قسموں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

اوّلاً :۔ ایسی تاریخیں ملتی ہیں، جو روایتی ایّام سے مطابقت نہیں کرتیں۔

---

[1] اس بحث کے لیے دیکھئے میرا مقالہ "تدوین سیرت پر ایک نظر"، جو عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

ثانیاً :۔ ایسی تاریخیں موجود ہیں جو ہمارے موسموں کا ساتھ نہیں دیتیں ۔

ثالثاً :۔ ایسی تاریخیں نظر آتی ہیں جن کی تکذیب دوسرے علمی ذرائع سے ہو جاتی ہے ۔

رابعاً :۔ ایک ہی واقعہ کے متعلق دو مختلف اور متضاد تاریخیں نظر آتی ہیں جن میں وجہ ترجیح مشکل ہے ۔

خامساً :۔ واقعات کی ترتیب زمانی میں مؤرخوں کے اختلاف موجود ہیں ۔

مگر اس کے ساتھ ہی یہ عجیب بات ہے کہ بہت سی تاریخیں ہر اعتبار سے صحیح اور قابل اعتماد بھی نظر آتی ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد اور تناسب کم ہے، تاہم اسی یقین دہانی کے لیے کافی ہیں کہ واقعاتِ سیرت کے جمع کرنے میں ابتدائی مدونین کے سامنے کوئی بنیادی مواد ضرور موجود تھا ورنہ اصولاً یہ بھی غلط ثابت ہوتیں ۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سیرت کے ابتدائی مصنفین یا وقائع نگاروں کا سلسلہ اگرچہ عہدِ صحابہ بلکہ ایک طرح خود عہدِ رسالت سے جا ملتا ہے، لیکن اس عہد کی کتابیں چونکہ آج موجود نہیں اسی لیے قدیم مدونینِ سیرت میں صرف دوسری اور تیسری صدی کے مصنفین رہ جاتے ہیں جن کی تصنیفات پر اگر امتحانی نظر ڈالی جائے تو تقریباً دو تہائی واقعات مشتبہ ہو جاتے ہیں، ایک تہائی تاریخیں جو صحیح ثابت ہوتی ہیں وہ نسبتاً کم اہمیت رکھنے والے واقعات سے تعلق ظاہر کر کے اس معمّہ کو اور پیچیدہ کر دیتی ہیں کہ اہم واقعات کے ریکارڈ کہاں گئے؟ اور موجودہ ریکارڈ کہاں سے آئے؟

واقعہ کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ تمام اصناف کے توقیتی تضادات کا قسم وار جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ صحیح اور غلط توقیتی صراحتوں کا تناسب کیا ہے؟

ذیل میں قسمِ اوّل یعنی تاریخ و ایام کی عدم مطابقتیں ملاحظہ ہوں ۔

(۱) ابن اسحٰق نے ہجرت کے ذیل میں ایک طویل اور دلچسپ قصہ سنانے کے بعد آنحضرتؐ کی "قبا" میں آمد کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱؁ھ بیان کی ہے[۱] یہ تاریخ مجمع علیہ ہے اور صدرِ اوّل کے تمام مؤرخوں نے اسی کو اختیار کیا ہے، حتیٰ کہ بہت سے مستشرقین بھی اس سے اختلاف کی جرأت نہ کر سکے[۲] مگر اس تاریخ کو جب ریاضی کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ سیرت کی کتابوں میں اتنے اہم واقعہ کی تاریخ بھی صحیح محفوظ نہیں، چنانچہ تقویمی حساب سے ۱۲ ربیع الاوّل ۱؁ھ کو بجائے دوشنبہ کے جمعہ کا دن پڑتا ہے ۔

اس غلطی کو سب سے پہلے شاید البیرونی نے پکڑا، اور حسابی قاعدوں سے ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے اور تاریخِ ہجرت حقیقتاً ۱۲ ربیع الاوّل نہیں، بلکہ ۸ ربیع الاوّل تھی[۳] کیونکہ دوشنبہ آٹھ ۸ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے چونکہ یہ مسئلہ خالص حسابی تھا اس لیے عہدِ حاضرہ کے کئی بڑے بڑے مستشرقین[۴] حتیٰ کہ بعض علمائے اسلام نے بھی ہتھیار ڈال دیئے[۵] اور معاً روایت کی تغلیط کر دی، مگر شاید یہ نہ سوچا کہ

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

---

[۱] ابن ہشام ۲/۱۳۰، ۱۴۰ نیز دیکھیے واقدی/۴، ابن سعد ۲/۲، مسعودی التنبیہ و الاشراف/۲۴۲؛ البدء والتاریخ ۴/۲۷۷

[۲] MUIR I HL [۳] آثار الباقیہ (سخاؤ) ۳۲۷ ۔ MONTGOMRY

[۴] MARGOLIOUTH, ENS P XX 212 [۵] مولانا شبلی سیرۃ/۲۷۰

چنانچہ دوسری مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

۲ - ۲ ھ میں پیغمبر اسلام نے قریش کی تجارتی ناکہ بندی کرنا چاہی تو اس سلسلے میں کئی اقدامات کئے گئے اور مختلف اوقات میں چھوٹی بڑی مہمیں روانہ ہوتی رہیں، "غزوۂ ینبع" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مہم ۲ رشعبان ۲ھ کو پنجشنبہ کے دن روانہ ہوئی تھی[۱] حساب کے موجب ۲ رشعبان کو پنجشنبہ ممکن نہیں بلکہ یکشنبہ تھا۔

۳ - اسی ۲ ھ میں آنحضرتؐ نے حجاز کے ساحلی علاقے کے متعدد قبائل سے سیاسی اور تجارتی اغراض کے تحت کئی معاہدے کئے تھے، بنو اسلم اور غفار سے جو معاہدے ہوئے تھے ان کے لیے ایک روایت کے موجب سہ شنبہ ۱۴ رشعبان ۲ھ کو پیغمبر اسلام تشریف لے گئے تھے۔[۲] اصول تقویم کے حساب سے یہ تاریخ بھی صحیح نہیں اور ۱۴ رشعبان ۲ھ کو جمعہ پڑتا ہے۔

۴ - یہ واقعات اگرچہ کم مشہور اور چھوٹے چھوٹے ہیں، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن حبیب سیرت کے معاملے میں کوئی سند نہیں، مگر بدر کی عظمت سے کسے انکار ہوگا؟ اسلام کی پوری تاریخ محاربات میں، اس سے اہم واقعہ شاید کوئی دوسرا نہیں، علمائے سیرت نے بھی اس کی تفصیلات محفوظ رکھنے کی جس درجہ کوششیں کی ہیں، وہ کسی دوسرے واقعہ کو نصیب نہ ہوسکیں، اس لیے یہ امید بالکل بجا تھی کہ کتب سیرۃ میں کم سے کم اس واقعہ کی صحیح تاریخ ضرور محفوظ ملے گی، چنانچہ نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ دوسرے علمائے سیر بھی متفق ہیں کہ یہ معرکہ ۱۷ رمضان ۲ھ کو جمعہ کے دن پیش آیا تھا[۳]

مستدرک حاکم میں عامر بن ربیعہ بدری سے جو روایت منقول ہے، اس سے اگرچہ ایک ہلکے سے اختلاف کا پتہ چلتا ہے جو قمری مہینوں میں نیا نہیں، یعنی یہ معرکہ بدر بجائے ۱۷ کے ۱۶ رمضان کا واقعہ ہے[۴] تاہم جمعہ کے دن، اور ۱۶ یا ۱۷ رمضان پر سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ سب سے قدیم سیرت نگار عروہ بن زُبیر نے بھی جمعہ کا دن اور ۱۶ یا ۱۷ دو تاریخیں بیان کی ہیں[۵] مگر جب اس تاریخ کا مقابلہ تقویمی جدولوں سے کیا جاتا ہے تو از روئے حساب ۱۶ رمضان ۲ ہجری کو بجائے جمعے کے دوشنبہ اور ۱۷ کو سہ شنبہ پڑتا ہے۔

اسی سنہ کے ایک اور بڑے واقعہ کی تاریخ کا امتحان کیجئے۔

۵ - غزوہ بنو قینقاع معرکۂ بدر کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کا واقعہ ہے، اور جس طرح معرکۂ بدر مشرکین قریش کے مقابلے میں پہلا کامیاب محاربہ تھا، ٹھیک اسی طرح یہ غزوہ یہودیوں کے خلاف پہلی کامیاب آویزش تھی۔

سیرت نگار پورے وثوق سے اس مہم کی تاریخ شنبہ ۱۵ رشوال[۶] بیان کرتے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں ہجری تقویم ۱۵ رشوال ۲ھ کو سہ شنبہ بتاتی ہے۔

اسی طرح غزوۂ سویق کی تاریخ ملاحظہ ہو۔

۱ے ابن حبیب ۱۱۱/ ۲ے ایضاً ۳ے ابن سعد ۱۳/۲، واقدی ۳/، ابن ہشام ۲۵۶/۱، طبری ۲۸۰/۲ ۴ے مستدرک ۳۵۸/۳

۵ے الدر المنثور ۱۸۸/۳ ۶ے واقدی ۱۷۷/ - ابن سعد ۲/، نیز دیکھئے زرقانی ۵۵۰/۱

۶۔ بیان کیا جاتا ہے کہ معرکۂ بدر میں شکست کے بعد قریش کو جو شدید نقصانات پہنچے تھے، اُن کا انتقام لینے رئیس مکہ ابوسفیان نے ذوالحجہ ۲ھ میں عین مدینہ پہنچ کر شب خون مارنا چاہا۔ چنانچہ قریش کا لشکر جوائی مدینہ میں داخل ہو گیا، اس واقعہ کی تاریخ یکشنبہ ۵ ذوالحجہ[1] مذکور ہے۔ مگر تقویمی شہادت یہ ہے کہ ۵ ذوالحجہ ۲ھ کو بجائے یکشنبہ کے سہ شنبہ تھا۔

تاریخ و ایام کی یہ نامطابقتیں صرف ۱ھ و ۲ھ تک محدود نہیں بلکہ ان کا سلسلہ آخر تک یوں ہی چلا گیا ہے اور خاص طور پر اہم واقعات کی تاریخیں روایتی ایام سے مطابقت نہیں کرتیں۔ چنانچہ ۳ھ کا سب سے اہم واقعہ ملاحظہ ہو۔

۷۔ معرکۂ اُحد سے زیادہ ناقابلِ فراموش مہم شاید کوئی دوسری نہیں، کیونکہ اس میں ایک طرف مسلمانوں کا کثیر اتلافِ جان ہوا تھا تو دوسری طرف خود پیغمبر اسلامؐ بھی شدید زخمی ہوئے تھے، اس غزوہ کی مستند ترین اور مجتمع علیہ تاریخ ۱۱ شوال ۳ھ بیان کی جاتی ہے اور ہفتے کے دن پر سب کا اتفاق ہے۔

تقویمی حسابات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی غلط ہے اور ۱۱ شوال کو ہفتہ نہیں بلکہ چہار شنبہ تھا[2]۔

۸۔ اُحد کے بعد ۴ھ کا سب سے مشہور واقعہ غزوۂ بنو نضیر ہے، جس کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۴ھ متعین ہے[3]۔ مگر تقویمی حسابات سے یہ تاریخ بھی مطابقت نہیں کرتی۔ کیونکہ از روئے حساب ۱۲ ربیع الاوّل ۴ھ کو سہ شنبہ کی جگہ پنجشنبہ آتا ہے۔

۹۔ اسی ۴ھ کی ایک دوسری مہم غزوہ بدر موعد کے نام سے مشہور ہے، جس کی تاریخ پنجشنبہ مستہل شعبان بیان کی گئی ہے[4]۔ یہ تاریخ بھی حسابی رُو سے غلط ہے اور مستہل شعبان کو یکشنبہ یا دوشنبہ کا دن آنا چاہیے۔

۱۰۔ ۶ھ کا سب سے اہم واقعہ جو اسلامی تاریخ پر حد درجہ مؤثر ہوا، خسرو پرویز (شاہِ ایران) کا قتل ہے۔ اس کی تاریخ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کی گئی ہے[5] (اس میں شاید ۷ھ سہو کتابت ہے) تاہم یہ تاریخ نہ ۷ھ میں درست بیٹھتی ہے نہ ۶ھ میں، کیونکہ حسابی قاعدہ سے ۱۰ جمادی الاولیٰ ۶ھ کو سہ شنبہ نہیں پڑتا بلکہ یک شنبہ آتا ہے اور ۷ ہجری میں پنجشنبہ۔

سب سے آخر میں مجھے دو واقعات کی تاریخیں اور پیش کرنا ہیں جن کا تعلق ۸ھ سے ہے یعنی فتحِ مکہ اور غزوۂ حُنین کی، جو اسلامی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۱۔ بیان کیا جاتا ہے کہ فتحِ مکہ کے سلسلے میں مسلمان فوجیں چہار شنبہ ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو نکلی تھیں[6]۔ اور یوم فتح جمعہ ۲۰ رمضان ۸ھ متعین ہے[7]۔ مگر حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ ۱۰ کو چہار شنبہ ممکن ہے نہ ۲۰ کو جمعہ بلکہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو دوشنبہ آتا ہے۔

---

[1] واقدی ۳/۱۸۲، ابن سعد ۲/۴، مواہب ۱/۱۱۵، عیون الاثر ۱/۲۹۶، دیار بکری ۱/۴۱۰ زرقانی ۱/۵۵۲۔ [2] البدایہ والنہایہ ۴/۹ مواہب ۱/۱۱۶، عیون الاثر ۲/۱ دیار بکری ۱/۴۱۹ [3] ابن حبیب ۱۱۳ [4] ایضاً [5] طبری ۲/۹۱، نیز دیکھئے ابن خلدون ۲/۳۸۔ [6] ابن سعد ۲/۹۷، نیز دیکھئے ابن ہشام ۴/۴۳ طبری ۲/۱۱۴۔ البدایہ ۴/۲۸۵ [7] ابن سعد ۲/۹۹، دیار بکری ۲/۸۷۔

اسی طرح غزوۂ حنین کی تاریخ بھی تقویمی حسابات، پر پوری نہیں اترتی، کیونکہ از روئے روایت ۶ ر شوال ۸ھ کو ہفتے کے دن مسلمان فوجیں مکّے[1] سے روانہ ہوئی تھیں، مگر حسابی قاعدے سے ۶ ر شوال ۸ھ کو ہفتہ ممکن نہیں بلکہ پنجشنبہ کا دن تھا۔

سطورِ بالا میں جو روایتی تاریخیں پیش کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو یہ جملہ سراسر قطعی جعلی ہیں اور صرف اس لیے وضع کی گئی ہیں کہ ان کے ذریعہ واقعاتِ سیرت کو وزن دار کیا جائے اور ان زبان زد کہانیوں کو تاریخی مرتبہ دے دیا جائے جو دوسری صدی میں مروج تھیں یا جیسا کہ بعض مستشرقین کا خیال ہے، ہمارے متداولہ حسابات میں کہیں ایسا جھول ہے جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں، مگر اس تصور کے امکانات یوں کم ہو جاتے ہیں کہ انھیں حسابات سے بعض تاریخیں بالکل صحیح بھی ثابت ہوتی ہیں اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ غلطیاں مروجہ حسابی طریقے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ اگر یہ حسابات غلط ہوتے تو مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخیں بھی غلط ہو جاتیں، حالانکہ یہ تاریخیں بالکل صحیح ہیں، ملاحظہ ہوں،

درست تاریخیں

(۱) ۲ھ کے ابتدائی واقعات میں ایک غزوہ طلب کرز بن جابر فہری کے نام سے مشہور ہے۔ ابن حبیب نے اس کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ ر جمادی الاُخریٰ بیان کی ہے[2]۔ ہجری تقویم کے بموجب یکم جمادی الاُخریٰ کو چہارشنبہ تھا، اس اعتبار سے ۱۲ ر جمادی الاُخریٰ کو یک شنبہ آتا ہے مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں، قمری مہینوں میں اس ایک روزہ فرق کی کوئی اہمیت نہیں اور ابن حبیب کی صراحت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

(۲) سیرت کی کتابوں میں ایک چھوٹا سا واقعہ سریّہ عبداللہ ابن اُنیس کہلاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے محرم ۴ھ میں عبداللہ کو بنو ہذیل کے سردار سفیان بن خالد کو قتل کرنے کے لیے متعین کیا تھا۔ اس واقعہ کی تاریخ خود عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ "میں مدینے سے دوشنبہ کے دن ۵ ر محرم کو نکلا[3]" حسابی رُو سے یہ تاریخ بالکل صحیح ہے اور ۵ ر محرم کو دوشنبہ ہی کا دن پڑتا ہے۔

(۳) ۵ھ کے مشہور غزوۂ خندق کی تاریخی صراحت کا ابتدائی حصّہ بھی تقریباً صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ابن حبیب کا بیان ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ اس غزوہ کے لیے پنجشنبہ ۸ شوال کو نکلے تھے[4]۔ ہجری تقویم کے بموجب یکم شوال ۵ھ کو دوشنبہ تھا، اس حساب سے پنجشنبہ کی ۸ ر کے بجائے ۱۱ ر شوال ہوتی ہے، گویا صرف ایک دن کا فرق پڑتا ہے، جو قابلِ التفات نہیں۔

(۴) اسی طرح عمرۂ حدیبیہ کی تاریخ بھی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ آنحضرتؐ حدیبیہ کے لیے دوشنبہ کے دن یکم ذیقعدہ کو عازمِ مکہ ہوئے تھے[5]۔ ہجری تقویم کے مطابق یکم ذیقعدہ ۶ھ کو (۲۹ ر کا چاند مان کر) اگرچہ یک شنبہ پڑتا ہے، لیکن ایک دن کا یہ فرق ایسا نہیں کہ تاریخ کو غلط قرار دیا جا سکے اور اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو پھر دوشنبہ ہی کی پہلی ہو گی۔

(۵) ۷ ہجری کا سب سے مشہور واقعہ عُمرۃ القضا ہے۔ ابن حبیب نے اس کی تاریخ بھی دوشنبہ ۶ ر ذیقعدہ[6] بیان کی ہے حسابی رُو سے ذیقعدہ ۷ھ کی پہلی تاریخ کو (۲۹ ر کا چاند مان کر) پنجشنبہ تھا، اس لیے دوشنبہ کا دن بجائے ۶ ر کے ۵ ر کو پڑتا ہے لیکن "۳۰"

---

[1] ابن سعد ۲ / ۱۰۸ [2] ابن حبیب / ۱۱۱ [3] واقدی / ۳۳۱ ؛ نیز دیکھئے ابن سعد ۲ / ۳۱ ، دیار بکری ۱ / ۴۵۰ [4] ابن حبیب / ۱۱۳ [5] ابن سعد ۲ / ۶۹ ، قسطلانی ۱ / ۱۶۳

[6] ابن حبیب / ۱۱۵ ؛

کا چاند مان لیا جائے تو یہ تفاوت بھی نہیں رہتا۔

(۶) سب سے آخر میں پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت کا ریکارڈ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، ابن سعد نے اس کی تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بیان کی ہے[1] یہ تاریخ اس اعتبار سے متفق علیہ ہے کہ کلینی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے[2]۔ تقویمی قاعدے سے (۲۹) کا چاند مان کر ۱۲ ربیع الاول چہارشنبہ کو تھی، لیکن اگر ۳۰ کا چاند مان لیا جائے تو ۱۲ ربیع الاول کو ٹھیک دوشنبہ پڑتا ہے۔

مذکورہ بالا سرسری تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ منجملہ (۱۸) توقیتی صراحتوں کے کم از کم چھ[6] صحیح اور بارہ غلط ہیں، گویا ⅓ حصہ صحیح اور ⅔ غلط پھر جو صحیح بھی ہیں، اُن میں سوائے پیغمبرِ اسلامؐ کی رحلت اور غزوۂ خندق کے اور کوئی واقعہ ایسا اہم نہیں جو بدر و اُحد یا فتح مکہ اور حُنین کا مقابلہ کر سکے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مصنفین اس قسم کی توقیتی صراحتوں کے شجرِ ممنوعہ تک جاتے ہوئے ڈرتے ہیں اور ان کی کتابوں میں دو ایک واقعات کی تاریخیں بھی نہیں ملتیں، تاہم حیرت ہے کہ مہینوں اور سالوں کو ابھی تک ترک نہیں کیا گیا۔ حالانکہ موسمی شہادتیں ان کے خلاف بھی صف آرا ہیں میں یہاں اُن کے کچھ نمونے اور مثالیں پیش کرتا ہوں:۔

مہینوں اور موسموں میں اختلاف

(۱) سب سے پہلے غزوۂ بدر کو لیجئے مختلف تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق خاص موسمِ گرما سے تھا۔ جب کہ موسم پورے شباب پر آچکا تھا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے دن شدید گرمی تھی، اور تمازتِ آفتاب کا یہ عالم تھا کہ مقتولینِ بدر کی لاشیں اُسی روز (شام سے پہلے) سڑ گئی تھیں[3]۔ خود قرآن سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ موسم کافی سخت تھا، اور مسلمان بارش کی دُعائیں مانگنے پر مجبور تھے۔ (اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ[4]) جن کو شرفِ قبولیت بخشا گیا، قرآن میں اس غیر متوقع بارش کا ذکر اس تفصیل اور انداز سے کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرمائی بارش نہ تھی، بلکہ موسم گرما کی شدّت دُور کرنے کے لیے ایک کرشمۂ قدرت تھا، مگر حسابی قاعدے سے رمضان ۲ھ فروری اور مارچ ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے جب کہ حجاز میں گرمی نہیں ہوتی۔

(۲) ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے جو عین بدر کے بعد کا ہے، اور جس سے خود غزوۂ بدر کے صحیح موسم کا نقشہ سامنے آجاتا ہے، اہلِ سیر کہتے ہیں کہ شوال ۲ھ میں (بدر سے واپسی کے بعد) ایک شاتمِ رسُول یہودی کو جس کا نام ابو عفک تھا کسی مسلمان نے قتل کر دیا، روایت میں صراحت ہے کہ یہ زمانہ موسمِ گرما کا تھا اور یہودی گرمی کی شدت کی وجہ سے کھلے آسمان کے نیچے صحن میں سو رہا تھا[5]۔ یہ واقعہ خاص مدینے کا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف اس واقعہ کا بلکہ معرکۂ بدر کا تعلق بھی موسمِ گرما سے تھا، کیونکہ ایک وسطِ رمضان کا واقعہ ہے تو دوسرا اوائلِ شوال کا، تاہم ان دونوں واقعات کی توقیت بظاہر غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس طرح حجاز میں فروری اور مارچ کے مہینے موسمِ گرما میں شامل نہیں اسی طرح مدینہ میں اپریل کا موسم اتنا گرم نہیں ہوتا کہ لوگ کھلے آسمان کے نیچے سو سکیں، حسابی رُو سے شوال ۲ھ مارچ اپریل ۶۲۳ء سے مطابق ہوتا ہے۔

---

[1] ابن سعد ۱/۳۷ [2] کلینی الواب التاریخ [3] مسلم ۹/۹۲ مصر ابن سعد ۲/۱۵ [4] قرآن ۸/۱۱

[5] واقدی ۱۷۵/۱، ابن سعد ۲/۱۹ -

(۳) اسی طرح غزوۂ اُحد کا مہینہ شوال ۳ھ بیان کیا جاتا ہے، تاریخ میں صراحت موجود ہے۔ اس لڑائی کے دنوں میں تازہ اور نورَس کھجوریں (رطب) بافراط موجود تھیں[1] مدینہ میں تازہ کھجوروں کا موسم ویسے تو وسطِ جولائی سے پہلے شروع نہیں ہوتا، لیکن بعض قسمیں مثلاً حلیبہ وغیرہ جلد آجاتی ہیں، اور آخر جون میں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس غزوہ کا موسم کم سے کم آخر جون ہونا چاہیئے۔ مگر ہجری تقویم کے بموجب شوال ۳ھ، مارچ اپریل ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے جب کہ مدینے میں کھجوروں کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا، اس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یا تو اس لڑائی کا صحیح مہینہ رواۃ کے ذہن سے اُتر گیا، یا پھر متذکرہ بالا تفصیلات صحیح نہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اُحد کی ان تفصیلات سے بدر کے موسم کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ غزوۂ اُحد بدر سے ٹھیک ایک سال بعد کا واقعہ ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر معرکۂ اُحد کے زمانے میں تازہ کھجوریں موجود تھیں تو بدر کا موسم بھی اسی کے لگ بھگ ہوگا۔

اس قسم کی توقیتی نامطابقتیں ایک دو واقعات تک محدود نہیں بلکہ اِن کا سلسلہ کافی طویل ہے۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

(۴) مورخین کہتے ہیں کہ غزوہ موتہ کے بعد جمادی الاخریٰ ۸ھ میں پیغمبر اسلام نے شامی سرحد کے عرب قبائل کو ہموار کرنے کے لیے عمرو بن عاص کو روانہ کیا تھا[2] سیرت نگاروں کی اصطلاح میں اس مہم کو "سریۂ ذاتِ سلاسل" کہتے ہیں، روائتی صراحتوں سے اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ سریہ موسمِ سرما میں روانہ ہوا تھا، مستدرک حاکم میں ایک روائت خود عمرو بن عاص سے مروی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں اس بلا کی سردی تھی کہ وہ ایک بار صبح کو غسل تک نہ کر سکے، اور نماز تیمم سے پڑھانا پڑی تھی[3]
مگر ہجری تقویم کے مطابق یہ جمادی الاخریٰ ستمبر، اکتوبر ۶۲۹ء کا متوازی مہینہ ثابت ہوتا ہے۔ جو عرب میں عین بہار کا زمانہ ہے، (یاد رہے کہ مورخین کے قول کے بموجب اس واقعہ سے صرف ایک ماہ پہلے غزوۂ موتہ (جمادی الاولیٰ ۸ھ) کا موسم کافی گرم تھا۔) (وَذٰلِکَ فِیْ حَرٍّ شَدِیْدٍ[4]) جس سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ متذکرہ بالا موسمی تصریحات غلط ہیں یا پھر اس سریہ کا صحیح مہینہ محفوظ نہیں رہا۔

(۵) اس سلسلے میں مجھے چند مثالیں اور پیش کرنا ہیں، جن میں پہلے فتح مکہ کی مثال پر غور فرمایئے۔
اس غزوہ کے متعلق مورخینِ اسلام کا عام بیان یہ ہے کہ "یہ رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، نیز یہ کہ مسلمان فوجیں جب مدینہ سے نکلی تھیں تو صائم تھیں، خود پیغمبرِ اسلامؐ کا بھی روزہ تھا، اور سب مسلمان بھی روزہ دار تھے، گرمی کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ جو اس غزوہ میں آنحضرتؐ کے ہمرکاب تھے، کہتے ہیں "میں نے رسول اللہؐ کو عرج میں دیکھا کہ آپؐ گرمی کی وجہ سے سر پر پانی بہا رہے تھے،

---

[1] MUIR LIFE P. 267 واقدی/۲۲۱ [2] طبری ۳/۲ ۱۰۴، ابن ہشام ۲/۲۷۲ [3] مستدرک ۱/۱۷۷ نیز دیکھیئے البدایہ والنہایہ ۴/۲۷۴ [4] طبری ۳/۱۱۰ -

کیونکہ آپ روزہ دار تھے [۱]، مگر اس کو کیا کیجئے کہ حسابی رُو سے رمضان ۸ھ کا متبادل مہینہ دسمبر اور جنوری ثابت ہوتا ہے اور ہم انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ خاص موسم سرما میں آنحضرتؐ کو سر پر پانی بہانے کی نوبت کس طرح آئی ؟

(۶) اس بات کا اندازہ کہ فتح مکہ کے زمانہ میں موسم گرما پورے شباب پر تھا، غزوۂ حنین کی تفصیلات سے بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں غزوے تقریباً ایک ہی پیندر ھواڑے کے ہیں۔

ایک صحابہ کا بیان ہے کہ "ہم رسول اللہؐ کے ہمراہ غزوۂ حنین میں شریک تھے، تو ایک سخت اور شدید گرم دن میں (فی یوم قائظ شدید الحر) روانہ ہوئے اور ایک درخت کے سایہ میں قیام کیا۔ جب سورج ڈھل گیا تو میں نے اپنی زرہ پہنی اور گھوڑے پر سوار ہوا [۲]۔"

یہ واقعہ ۶ شوال ۸ھ کا ہے جو اندو ئے حساب ۲۷ جنوری ۶۳۰ء کو پیش آنا چاہیئے اس لیئے ظاہر ہے کہ یا تو یہ موسمی تفصیلات غلط ہیں یا ان دونوں غزووں کی مبیّنہ تاریخوں کو غلط قرار دینا پڑے گا۔

اب میں صرف دو مثالیں اور پیش کر کے ناظرین سے التجا کروں گا کہ وہ ان متضاد روایات کی روشنی میں واقعاتِ سیرت کی توفیقی اُلجھنیں ملاحظہ کریں، ان میں سے پہلی مثال سریّۂ علقمہ بن مجزز کی ہے اور دوسری غزوۂ تبوک کی جو پیغمبر اسلام کا آخری غزوہ ہے

(۷) کہتے ہیں کہ فتح مکہ سے تقریباً ۶ ماہ بعد ربیع الآخر ۹ھ میں آنحضرتؐ نے ایک فوجی دستہ علقمہ بن مجزز کی سرکردگی میں جدہ روانہ کیا تھا۔ اس دستے کی واپسی کے متعلق یہ تفصیل ملتی ہے کہ سپاہی الاؤ لگا لیتے، جن پر کھانا بھی پکتا اور وہ تاپتے بھی [۳] (یصطلون علیھا ولیصطنعون) اس صراحت سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس سریّہ کا موسم فی الجملہ سرد تھا اور سپاہی آگ تاپنے پر مجبور تھے، بیان کیا جا چکا ہے کہ از روئے روایات، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کا موسم انتہائی گرم تھا اس لیے ربیع الآخر ۹ھ میں (ان واقعات سے چھ مہینے بعد) قدرتی طور پر سردی کا زمانہ ہونا چاہیئے جس سے یہ الاؤ لگانے کا قصہ صحیح معلوم ہوتا ہے مگر ہجری حساب سے، ربیع الآخر ۹ھ ۱۸ جولائی ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے یعنی شدید موسم گرما سے، اس لیے یا تو ربیع الآخر کی صراحت غلط قرار دینا پڑے گی یا الاؤ پر تاپنے کی کہانی ؟

(۸) اسی طرح غزوۂ تبوک کا موسم بھی روائتی مہینے سے مطابقت نہیں کرتا جو رجب ۹ ہجری کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرِ اسلامؐ نے مسلمانوں کو اس غزوہ پر چلنے کی ترغیب دی تو منافقین نے بہکانا شروع کیا اور کہا اتنی شدید گرمی میں نہ نکلو (لا تنفروا فی الحر [۴]) اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جہنم کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے (قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا) مگر ان موسمی صراحتوں کا مقابلہ جب ہجری تقویم سے کیجئے تو رجب ۹ھ اکتوبر، نومبر ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے اور رمضان شوال کے مہینے جن میں مسلمان فوج تبوک سے واپس آئی تھی۔ دسمبر، جنوری اور فروری سے مطابقت کرتے ہیں۔

ان موسمی نامطابقتوں کو دیکھتے ہوئے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ روایات سیرت اور خاص طور پر ان کی توقیتی صراحتوں کی بظاہر کیا

---

[۱] مستدرک ۱/۴۳۲ نیز دیکھئے موطا: ماجاء فی الصیام فی السفر۔ [۲] ابن سعد ۲/۱۱۲ [۳] ابن سعد ۲/۱۱۸
[۴] ایضاً ۹۔

وقعت رہ جاتی ہے؟ اور ہم کس طرح یقین کرسکتے ہیں کہ یہ روایات ہم تک معتبر ذرائع سے پہنچی ہیں؟ تاہم بعض خوش عقیدہ مستشرقین کی رائے ہیں اس قسم کے موسمی تفاوت صرف اس بات کا نتیجہ ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت جو عربی کیلنڈر رائج تھا، وہ موجودہ ہجری کیلنڈر سے بہت کچھ مختلف تھا، مگر اس خیال کو قبول کرنے میں بھی چند در چند دشواریاں اور رُکاوٹیں ہیں، کیونکہ کتبِ سیرت میں متعدد واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن کی موسمی تفصیلات موجودہ کیلنڈر سے پوری طرح مطابقت کرتی ہیں اور بہ کسی عنوان نہیں کہا جا سکتا کہ واقعات کی تزقیت کے سلسلے میں مروجہ کیلنڈر بیکار ہے، یہاں ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

موسمی مطابقت کی مثالیں

(۱) ۳ھ کا ایک مشہور واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کی رُوداد ہے، کہتے ہیں کہ ربیع الاوّل کے مہینے کی ۱۴ تاریخ تھی اور چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے فضا کو منوّر کئے ہوئے تھا۔ کعب کے قاتل جب اُس کے دروازے پر پہنچے تو وہ اندر تھا، اُن کی آواز سے باہر نکلا اور گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ یہ لوگ کچھ دیر چاندنی میں ٹہلتے رہے، پھر ایک جھرنے ( ) کے قریب بیٹھ گئے[1] اور شبِ ماہتاب کی رعنائیوں کا لطف لینے لگے، کعب کا سر مُعطّر تھا۔ اس کے بالوں کی بھینی بھینی خوشبو نے پوری فضا کو مُعطّر کر دیا تھا، قاتل بار بار اُس کے بالوں کی لٹیں سونگھتے اور چھوڑ دیتے، مگر ایک بار انھیں لٹوں کو کس کے پکڑ کر کھینچ لیا اور سر تن سے جدا کر دیا۔

یہ پوری داستان موسمِ بہار کی ایک سُتھری چاندنی کو یاد دلاتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے، کیونکہ ربیع الاوّل ۳ھ کی ۱۴ تاریخ ۶ ستمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتی ہے، جو حجاز میں آغازِ بہار کا زمانہ ہے۔

اس واقعہ کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا موجودہ کیلنڈر بیکار نہیں، ایک دوسرا واقعہ اور ملاحظہ ہو جو اسی ۳ھ کا ہے۔

(۲) غزوۂ "بدر" کے بعد جب قریش نے یہ محسوس کر لیا کہ ان کی تجارتِ شام غیر محفوظ ہو گئی اور خطرے سے خالی نہیں تو انھوں نے عراق سے تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہے۔ تجویز کیا گیا کہ موسمِ سرما (شتاء) میں ایک قافلہ "عراق" بھیجا جائے، چنانچہ یہ قافلہ روانہ ہوا، مگر مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہو گئی، قافلہ جب "قردۃ" کے پاس پہنچا تو زید بن حارثہ نے اس کو جا لیا۔ اس سریّہ کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۳ھ[2] بیان کی جاتی ہے اور تمام سیرت نگار اس پر متفق ہیں، کہ یہ واقعہ "شتاء" یعنی موسمِ سرما کا ہے۔

یہ تاریخ بھی بالکل درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ از روئے حساب جمادی الاخریٰ ۳ھ نومبر و دسمبر ۶۲۴ء سے مطابق ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ مروّجہ کیلنڈر ناقابلِ اعتبار ہے۔

(۳) اسی طرح غزوۂ خندق کا موسم بھی روایتی تاریخ سے مطابقت کرتا ہے۔ کتبِ سیرت میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ جنگ موسمِ سرما ہی میں ہوئی تھی[3] سردی اور بادو باراں کی یہ کیفیت تھی کہ محاصرین کے خیموں اور راوٹیوں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ جاتی تھیں، کھانا پکانے کے ظروف الٹ پلٹ جاتے۔

---

[1] ۲۷۴ / ۱۱۹ دیار بکری ۱/۴۱۶

[2] واقدی/۱۹۵، ابن سعد ۲/۲۴ - ابن سیدالناس/۳۰۵ قسطلانی/

[3] ابن ہشام ۳/۲۴۲ طبری ۳/۵۱ -

آگ نے جلنے کی قسم کھالی تھی، ان پریشانیوں سے تنگ آکر جب قریش نے محاصرہ اٹھایا تو آنحضرتؐ نے کچھ آدمی مقرر کرنا چاہے کہ وہ دشمن کی فوج کی خبریں پہنچائیں، مگر یہاں بھی خوف، بھوک اور سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی کھڑا نہ ہوا۔[1]

اس غزوے کی تاریخ شوال ۵ھ بیان کی جاتی ہے جو حسابی قاعدے سے فروری، مارچ ۶۲۶ء کے مطابق ہوتی ہے، چونکہ مدینے میں یہ زمانہ سخت سردی کا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ بھی موسم سے مطابق ہے۔

(۴) اس سلسلے میں مجھے صرف ایک اور مثال پیش کرنا ہے جو غزوۂ "موتہ" کی ہے، اس غزوے کا روائتی موسم تاریخ سے مطابقت کرتا ہے۔ کیونکہ "طبری" میں یہ صراحت ہے کہ یہ واقعہ موسم گرما کا تھا۔ (وَذٰلِکَ فِیْ حَرٍّ شَدِیْدٍ[2])

مورخین اس کی تاریخ جمادی الاولی ۸ھ بیان کرتے ہیں، جو ہجری تقویم کے موجب اگست و ستمبر ۶۲۹ء سے مطابقت ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مہینے سردی کے نہیں۔

ان مثالوں سے جہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا واقعات مروجہ کلینڈر کے حساب سے درست ہیں، وہیں یہ شبہ بھی ممکن نہیں کہ عہد رسالت میں ہمارا یہ کلینڈر رائج نہ تھا، یا اس کلینڈر کے بموجب واقعات ریکارڈ نہیں کئے گئے۔ یہ سچ ہے کہ اس سرسری جائزے میں منجملہ بارہ[۱۲] واقعات کے آٹھ واقعے اس حساب پر پورے نہیں اترے لیکن چار[۴] واقعے جو پورے اترتے ہیں، ان کو کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

تیسری قسم کی نامطابقتیں

تیسری قسم ایسے واقعات کی ہے، جن کی توثیق جانچ عصری تاریخ یا فلکی حسابات سے ممکن ہے۔ ان میں منجملہ پانچ واقعات کے تین بظاہر غلط اور دو صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے اہم "صوم عاشورہ" کی روائتیں ہیں، جو بیشتر حدیث کی کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ عاشورے کا روزہ دسویں محرم کو مسنون ہے اور آنحضرتؐ ہمیشہ اسی تاریخ کو یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ مدینے پہنچے تو ایک دن آپ نے دیکھا، کہ مدینے کے یہودیوں میں "صوم عاشورہ" کی رسم منائی جا رہی ہے، اس پر آپؐ نے خود بھی روزہ رکھا اور جملہ مسلمانوں کو اس کی تاکید فرمائی[3] اس دن سے یہ سنت عام ہو گئی اور آج تک چلی آرہی ہے، ہر سال بہت سے مسلمان دسویں محرم کو یہ روزہ رکھ رہے ہیں۔

یہودیوں میں یہ روزہ ماہ تشری کی دسویں تاریخ کو رکھا جاتا تھا، جو ان کے مذہبی سال کا ساتواں مہینہ تھا۔[4] اس اعتبار سے اصولاً اس سال عربی ماہ محرم اور یہودی ماہ تشری کو بالکل متوازی ہونا چاہیئے تاکہ دونوں مہینوں کی دسویں تاریخ ایک ہی دن پڑے اگر تعجب ہے کہ تقویمی حسابات کی روشنی میں ہماری روائتیں صحیح ثابت نہیں ہوتیں "البیرونی" نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ ان روایات پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ "یہ جملہ روایات از روئے حساب غلط اور بالکل بے اصل ہیں" میں یہاں اس کی اصل عبارت پیش کرتا ہوں۔

---

[1] طبری ۳/۵۲

[2] طبری ۳/۱۱۶

[3] بخاری عاشورہ

[4] BIBLE DISTRESSING FEAST

"لوگوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مدینہ پہنچ کر یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا جب آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس روز خدا نے فرعون کو غرق اور حضرت موسیٰ ؑ اور بنی اسرائیل کو نجات دی تھی، یہ سن کر آنحضرت صلعم نے فرمایا "کہ یہودیوں کے مقابلے میں ہم موسیٰ ؑ سے زیادہ قریب ہیں" چنانچہ اسی روز آپ نے روزہ رکھا، اور صحابہ کو بھی تاکید کی کہ وہ یہ روزہ رکھیں، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورے کے روزے کا نہ آپ نے حکم دیا نہ ممانعت کی"

"علمی تحقیقات سے یہ روایت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ جس سال ہجرت ہوئی اس کے محرم کی پہلی تاریخ کو جمعے کا دن اور ۱۶ تموز ۹۳۲ سکندری تھی، لیکن اس روز کا یہودی تقویم سے مقابلہ کیا جاتے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سال کا پہلا دن یکشنبہ ۱۲ ایلول مطابق ۲۹ صفر تھا، لہٰذا عاشورے کا روزہ سہ شنبہ ۹ ربیع الاوّل کو ہونا چاہیئے اور آنحضرت صلعم کی ہجرت ربیع الاوّل کے نصف اوّل میں ہوئی تھی [1]

اس کے بعد آگے چل کر لکھتا ہے :-

"اور عاشورہ کسی طرح محرم میں واقع نہیں ہوا (کیونکہ از روئے حساب) ہجرت سے ۳-۱۰ سال پہلے اور بیس سے تیس سال بعد ایسا ہو سکتا ہے، اس لیے یہ دعوےٰ بالکل غلط ہے کہ رسول اللہ صلعم نے عاشورے کے دن اس بنیاد پر روزہ رکھا تھا کہ وہ اس سال (قمری) کے پہلے مہینے (محرم) کی دسویں تاریخ تھی۔ اور دونوں تاریخیں یعنی دسویں تشری اور دس محرم ایک دن واقع ہوئی تھیں [2]"

ظاہر ہے کہ اگر البیرونی کا یہ حسابی اعتراض صحیح ہے تو روایاتِ عاشورہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی اور کتب حدیث کا کم سے کم ایک باب بند ہو جاتا ہے۔

(۲) یہ روایتیں سنہ ۱ھ یا سنہ ۲ھ سے متعلق تھیں اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اب سنہ ۶ھ کی ایک اور روایت پر غور فرمایئے جو سیرت کی کتابوں میں ملتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم میدانِ حدیبیہ میں تھے کہ شاہ ایران خسرو پرویز کے قتل کی اطلاع پہنچی [3] بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ یہ اطلاع تاریخ و یوم کی صراحت کے ساتھ بذریعہ وحی آئی تھی [4] اور بتایا گیا تھا کہ کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے سہ شنبہ ۱۰ جمادی سنہ ۷ھ کو قتل کر دیا، اسی روایت میں سنہ ۷ھ تو بالبداہت سہو کتابت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عمرۂ حدیبیہ متفقہ طور پر سنہ ۶ھ کا واقعہ ہے تاہم کئی اور غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو قابلِ گرفت ہیں، مثلاً :-

(الف) اگر سنہ ۷ھ کے بجائے سنہ ۶ھ بھی مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ آنحضرت صلعم تک اس قتل کی اطلاع کم سے کم چھ ماہ بعد پہنچی کیونکہ حدیبیہ ذیقعدہ سنہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ اور یہ جمادی الاولیٰ کا۔

---

[1] آثار الباقیہ (سخاؤ) THEY CHRONOLOGY OF ANCIENT NATIONS C. E. SACHAU P. 327

[2] ایضاً [3] طبری ۲/۱۴۳ [4] ابن خلدون ۲/۳۸ نیز دیکھئے طبری ۳/۹۱

(ب) ۶ھ اور ۷ھ دونوں میں تاریخ و ایام کی مطابقتیں مفقود ہیں (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)

(ج) سب سے بڑھ کر یہ کہ کسریٰ کے قتل کی تاریخ یورپی[1] مورخوں کے یہاں بھی محفوظ ہے جس کی رُو سے یہ واقعہ ۲۷ یا ۲۹ فروری ۶۲۸ء کا قرار پاتا ہے، اس کے مقابلے میں جمادی الاولیٰ ۶ھ ۸ استمبر ۶۲۷ء سے مطابق ہوتا ہے اور ۷ھ میں جمادی الاولیٰ ۶ ستمبر ۶۲۸ء کو شروع ہوا تھا۔

چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ نے پوری متانت سے اس روایت کی تغلیط کی ہے[2]۔

(۳) اسی طرح آنحضرتؐ کے صاحبزادے ابراہیم کی تاریخ رحلت حسابی قاعدوں سے بالبداہت غلط ثابت ہوتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی رحلت کا واقعہ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر ۱۰ھ کا ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش ذوالحجہ ۸ھ[3] میں کسی تاریخ کو ہوئی تھی۔ صحاح کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سترہ[4] یا اٹھارہ[5] مہینے زندہ رہے[6]۔ اس حساب سے متذکرہ بالا تاریخ بظاہر صحیح اور قابل اعتماد نظر آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ روایتیں بھی ملتی ہیں کہ جس روز اُن کا انتقال ہوا تھا، اسی روز سورج کو گہن لگا تھا، جس پر آنحضرتؐ کو ایک یادگار خطبہ دینا پڑا[5]۔

از روئے حساب ہیئت یہ سورج گرہن ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا[6]۔ جس کا متوازی ہجری مہینہ شوال ۱۰ھ آتا ہے۔ گویا یہ واقعہ ۲۹ شوال کا تھا، اس طرح ظاہر ہے کہ ربیع الاوّل یا ربیع الآخر کی روایات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

متذکرہ بالا تینوں مثالوں سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روایات سیرت کی جانچ اگر دوسرے علمی ذرائع سے کی جاتی ہے تو یہ اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں، مگر میرے نزدیک یہ خیال غلط ہے اور کتب سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کو علم ہیئت اور عصری تاریخ کی پوری تائید حاصل ہے۔ میں یہاں دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

صحیح توقیت کی مثالیں

(۱) بیان کیا جاتا ہے کہ جمادی الاخریٰ ۵ھ میں ایک چاند گرہن ہوا تو مدینے کے یہودیوں نے تھالیاں بجانا شروع کیں[7]۔ اُن کا خیال تھا کہ چاند پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

از روئے ہیئت یہ چاند گرہن ۹ نومبر ۶۲۶ء کو ہوا تھا، جو ۱۴ جمادی الاخریٰ ۵ھ سے مطابق ہوتا ہے[8]۔ اس وقت بنو قریظہ کے یہودی مدینے میں موجود تھے۔

(۲) اسی طرح اہل سیر کا متفقہ بیان ہے کہ حُدیبیہ کے فوراً بعد ذوالحجہ ۶ھ (مطابق اپریل مئی ۶۲۸ء) میں آنحضرتؐ نے قیصر و کسریٰ کے پاس سفارتیں روانہ کی تھیں[9]۔ ان میں قیصر کو جو سفارت بھیجی گئی تھی، اس کی تاریخ یونانی مصنفین کے یہاں محفوظ

---

[1] E. G. BBON - DECLINE - VOL III P. 315 نیز دیکھئے روداد معارف اسلامیہ اجلاس دوم ۱۹۳۲ء انگریزی حصہ

[2] معارف ۱۹۴۲ء [3] ابن سعد ۱/۱۹ [4] دیکھئے بخاری، نیز دیکھئے دیار بکری ۱/۱۴۲۔

[5] MARGOLIOUTH RISO P XX [6] MUIR LIFE 430 [7] دیار بکری ۱/۴۶۹

[8] التنبیہ والاشراف ۲/۷۴ [9] دیار بکری ۲/۲۹ ابن سعد ۲/

ہے، مارگولیتھ MARGOLIOUTH کہتے ہیں کہ "عرب اور یونانی مصنفین کے نزدیک اس سفارت کی تاریخ متفق علیہ ہے اور یہ قصہ خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں توقیتی (CHRONOLOGICAL) غلطی نہیں[1]"۔

بعض قدیم یورپی مؤرخین نے یہ تاریخ اپریل ۶۲۸ء متعین کی ہے جو سیرت نگاروں کی تاریخ یعنی ذوالحجہ ۶ھ سے عین مطابق ہے کیونکہ ہجری تقویم کے بموجب ذوالحجہ ۶ھ سہ شنبہ ۱۲ اپریل کو شروع ہوا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کتب سیرت میں ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن کی تصدیق موجودہ علمی ذرائع بھی کرتے ہیں، اور اگرچہ بظاہر ان کتابوں میں قدم قدم پر تقویمی اغلاط اور تضاد نظر آتے ہیں لیکن ان کا ایک حصہ پھر بھی نقادانِ فن کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ دوسرے حصہ کے تقویمی اغلاط اور تضادات کی بنیادی اور مادی وجہ کیا ہے؟ اور اس میں مدونین سیرۃ کی بے احتیاطی یا ادائگی بھول چوک کو دخل ہے، یا کوئی اور بات ہے؟

توقیتی تضادات کی چوتھی قسم

اب میں قارئین کے سامنے سیرت کے توقیتی تضادات کی چوتھی قسم پیش کرتا ہوں جو سب سے زیادہ واضح اور ایک عرصۂ دراز سے معرضِ بحث میں آ چکی ہے، مگر اس کا حل علمائے اسلام کی سمجھ میں بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک روایت کو کسی نہ کسی طرح ترجیح دے دی جائے اور دوسری کو راوی کی بھول یا مختصر لفظوں میں کذب پر محمول کر کے رد کر دیا جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ قدیم کتب سیرت میں اکثر واقعات کے متعلق دو مختلف مہینوں کے نام ملتے ہیں مثلاً:۔ (۱) ایک مصنف (ابن اسحٰق نے) "بدر اولیٰ" یا غزوہ کرز بن جابر فہری کی تاریخ جمادی الاخریٰ ۲ھ بیان کی ہے[2] تو دوسرے مؤرخ (واقدی) نے یہی واقعہ ربیع الاول ۲ھ کا قرار دیا ہے[3] اس قسم کی بہت سی مثالیں کتب سیرت میں موجود ہیں، اور خاص طور پر ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان ایسے اختلافات اور تضادات سب سے زیادہ نمایاں ہیں، جس کی وجہ سے شروع ہی میں تاریخ کے کم سے کم دو مکاتب خیال پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ کئی مشہور مصنفین اگر ابن اسحٰق کے ساتھ ہیں، تو اسی درجے اور مرتبے کے متعدد علمائے تاریخ واقدی کے ہم نوا ہیں، بہر صورت ان تضادات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۲) ابن اسحٰق کے بیان کے مطابق آنحضرتؐ جب بدر سے مدینے تشریف لے آئے تو سات آٹھ دن کے اندر ہی بنو سلیم کی جنگی تیاریوں کی اطلاع ملی، جس پر آپؐ نے فوراً ہی دیارِ بنو سلیم کی طرف کوچ کر دیا[4]۔ طبری[5] اور ابن حبیب[6] نے جو ابن اسحٰق کے مکتب خیال کے مصنفین ہیں، اس غزوے کی تاریخ شوال ۲ھ بیان کی ہے[7] جن کے تتبع میں ابن خلدون[8] وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد وغیرہ کے نزدیک یہ واقعہ محرم ۳ھ کا ہے[9] چنانچہ مقدسی[10] اور مسعودی[11] وغیرہ

---

[1] MARGOLIOUTH RISE P. 365 [2] ابن ہشام ۲/۲۵۱ [3] واقدی/ ۳ ابن سعد ۲/۴

[4] ابن ہشام ۳/۴۶، [5] طبری ۲/۲۹۸۔ ابن حبیب/ ۱۱۱ [6] ابن خلدون ۲/۲۱ [7] واقدی/ ۱۸۳ ابن سعد ۲/۲۱،

[8] مقدسی/ ۱۹۷ [9] التنبیہ والاشراف/ ۲۴۳۔

وغیرہ کی مہریں اسی تاریخ پر ثبت ہیں، اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن اسحٰق کے مکتبِ خیال کے نزدیک یہ واقعہ غزوۂ سویق (ذوالحجہ ۲ھ) سے بہت پہلے کا ہے، اور واقدی کے مکتب تاریخ کی رائے میں غزوۂ سویق کے بعد کا۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا سب سے نمایاں اثر واقعاتی ترتیب اور اس کے ساتھ ہی اسباب و علل پر پڑتا ہے چنانچہ قرونِ وسطیٰ کی تقریباً تمام کتابیں اسی قسم کے اختلافات سے حد درجہ متاثر ہیں۔

(۳) ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:۔

سیرت کی کتابوں میں ایک واقعہ "غزوۂ ذی امر" کے نام سے موسوم ہے، ابن اسحٰق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ذوالحجہ ۲ھ کی آخری تاریخوں میں شروع ہوئی تھی[۱] اس کے مقابلے میں واقدی نے اس کی تاریخ ربیع الاول ۳ھ بیان کی ہے[۲] ابن کثیر نے ان دونوں بیانات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ سویق سے واپس ہوئے تو مدینے میں ذوالحجہ کا بقیہ مہینہ یا اس کے لگ بھگ قیام کیا، اس کے بعد نجد پر غطفان کے ارادے سے لشکر کشی کی اور یہی غزوۂ ذی امر ہے اور واقدی کا قول ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی کہ ذی امر میں غطفان کی ایک جماعت جو بنی ثعلبہ بن محارب کی شاخ ہے، جمع ہوئی ہے اور اس کا ارادہ تخریب کا ہے۔ تو آپ مدینے سے پنجشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاول کو نکلے[۳]"

گویا ابن اسحٰق اور واقدی کی تاریخوں میں تقریباً ڈھائی تین مہینے کا فرق ہے، جو توقیتی اعتبار سے کم نہیں۔ یہی دو ڈھائی مہینے کا فرق ایک اور مثال سے واضح ہوتا ہے۔

(۴) ابن اسحٰق نے سریہ زید بن حارثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو قردہ کی طرف روانہ کیا گیا تھا (اور جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) بیان کیا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے چھ ماہ بعد کا ہے[۴] جس کے حساب سے اس کی تاریخ ربیع الاول ۳ھ متعین ہوتی ہے لیکن واقدی نے صراحت کی ہے کہ یہ سریہ جمادی الاولیٰ ۳ھ میں روانہ کیا گیا تھا[۵]، گویا وہی دو ڈھائی مہینے کا فرق یہاں بھی نظر آ رہا ہے اور تقریباً یہی فرق غزوۂ بدر موعد کی توقیتی صراحتوں میں ہے۔

(۵) ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ شعبان ۴ھ میں پوری تیاری[۶] سے اسی غزوے کے لیے نکلے تھے مگر واقدی کے نزدیک یہ واقعہ ذیقعدہ ۴ھ[۷] کا ہے، تاہم اسی سنہ کے ایک واقعہ میں توقیتی اختلاف نسبتاً بہت طویل ہے۔

(۶) ابن اسحٰق نے غزوۂ بدر موعد سے پہلے اور غزوۂ بنو نضیر کے بعد جمادی ۴ھ میں ایک اور غزوے کا تذکرہ کیا ہے جو ذات امر کی

---

[۱] ابن ہشام ۳/۴۸، ۴۹ نیز دیکھئے طبری ۲/۲۹۹ ابن خلدون ۲/۲۲ (ابن خلدون نے محرم کی تاریخ بیان کی ہے۔)
[۲] واقدی/۱۹۲ ابن سعد ۲/۲۳ مقدسی ۴/۱۹۷۔ [۳] البدایہ والنہایہ ۴/۲ نیز دیکھئے دیار بکری ۱/۴۱۲ [۴] البدایہ ۴/۲ [۵] واقدی/۱۹۵ نیز دیکھئے ابن سعد ۲/۲۴ مقدسی ۴/۱۹۸ [۶] ابن ہشام ۳/۲۲۰، نیز دیکھئے طبری ۳/۴۱ ابن سیدالناس/۵۳ [۷] واقدی/ابن سعد ۲/۴۲۔

طرح غطفان اور ثعلبہ کے خلاف اقدام تھا، مغازی کی اصطلاح میں اسکو غزوۂ ذات الرقاع کہا جاتا ہے[۱] لیکن واقدی کے نزدیک یہ واقعہ محرم ۵ھ کا ہے[۲] یعنی ابن اسحٰق اور واقدی کی توقیت میں تقریباً آٹھ ماہ کا فرق ہے؛

(۷) ۷ھ میں بھی یہ فرق نمایاں ہے، چنانچہ ابن اسحٰق نے غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم ۷ھ بیان کی ہے[۳] مگر واقدی کے نزدیک اس کی صحیح تاریخ جمادی الاولیٰ[۴] ۷ھ ہے یعنی تقریباً ۴ ماہ کا فرق۔

اس قسم کے توقیتی اختلافات اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی کی روایات میں زیادہ ہیں تاہم دوسرے مؤرخین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، اور متعدد اکابر کی روایتیں آپس میں متصادم ہیں، میں یہاں ان کے بھی دو ایک نمونے پیش کرتا ہوں۔

(۸) تحویلِ قبلہ کے متعلق عام روایت یہ ہے کہ شعبان[۵] ۲ھ کا واقعہ تھا، مگر امام زہری کی ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ قبلے کی تبدیلی جمادی ۲ھ[۶] میں ہوئی تھی۔

(۹) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ روایتی اختلاف معرکۂ اُحد کی توقیت کے سلسلے میں ہے، نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی بلکہ جملہ مؤرخینِ اسلام کا سوفی صدی اتفاق ہے کہ معرکۂ اُحد کا تعلق شوال ۳ھ سے تھا۔

واقدی نے ابن اسحٰق کی طرح پوری آب و تاب اور بڑی صراحت سے اس واقعہ کو شوال ۳ھ ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے، لیکن بیان کرتے کرتے ایک ایسی روایت بھی لکھ گئے ہیں جس سے دھوکہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں نگاہوں کی شہادت تو غلط نہیں، یہ روایت عبدالحمید بن جعفر کی ہے، جو اُنھوں نے اپنے والد سے نقل کی تھی، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ اُحد (شوال کا نہیں بلکہ) محرم ۳ھ کا واقعہ تھا[۷]۔

کتبِ سیرت میں اس نمونے کی اور بھی کئی روایتیں ہیں تاہم میں ایک اور مثال پیش کرکے قارئین کی توجہ پانچویں قسم کے تضادات کی طرف منعطف کروں گا۔

(۱۰) ۶ھ کا ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عُرینہ کے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے مہمان تھے مگر کچھ عرصہ بعد اُنھیں مہمانوں نے میزبان کی اُونٹنیاں چُرائیں اور بھاگ نکلے جس پر کرز بن جابر فہری کو اُن کے تعاقب میں بھیجا گیا، اس واقعہ کی تاریخ قسطلانی کی زبان سے سُنیئے وہ کہتے ہیں:۔

> "یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۶ھ کا ہے اور بخاری نے اس کا تذکرہ حدیبیہ کے بعد کیا ہے، جو ذیقعدہ کا واقعہ تھا، اور واقدی کے نزدیک یہ شوال میں ہوا، جس سے ابن سعد اور ابن حبان بھی متفق ہیں[۸]۔"

اشکالِ بالا سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کتبِ سیر میں واقعاتی ترتیب تو کجا صحیح مہینے بھی متعین نہیں، تاہم واقعاتی ترتیب کے سلسلے

۱؎ ابن ہشام ۳/۲۴۴۴ نیز دیکھیئے ابن سیدالناس ۵۲/۲ ۲؎ واقدی/۴ ابن سعد ۲/ ۳؎ ابن ہشام ۴/۰ ۴؎ واقدی/۴ ۵؎ طبری ۲/۲۶۵ مقدسی ۴/۱۸۴، تلقیح ابن جوزی/۲۰ ۶؎ عیون الاثر/۲۳۱ ۷؎ واقدی/۳۱۷، ۳۱۸؛ ۸؎ مواہب/۱۶۰، البدایہ ۴/۱۶۹ نیز دیکھیئے دیار بکری ۲/۱۰؛

میں کچھ بعض دلچسپ نمونے ملاحظہ فرمائیے جو خود قدماء کے لیے باعث حیرانی رہے۔

واقعاتی ترتیب میں تضاد

(۱) ابن اسحٰق اور واقدی دونوں اساطین سیرت نے سلسلۂ غزوات کی ابتداء "غزوۂ الواء" سے کی ہے، جو متفقہ طور پر صفر ۲ھ کا واقعہ ہے[1] لیکن امام بخاری نے اپنی کتاب "المغازی" کی ابتداء میں زید بن ارقم کی ایک روایت بیان کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی بالکل ابتدائی مہم غزوۂ ذات العشیرہ تھی۔

امام بخاری نے روایت نقل تو کردی، لیکن شروع ہی میں ایک نوٹ لگانا پڑا کہ ابن اسحاق کی رائے میں "غزوہ الوا" پہلا غزوہ ہے[2] اسی طرح واقدی نے بھی سلسلۂ غزوات کی ابتداء اگرچہ "غزوۂ الوا" ہی سے کی ہے لیکن ان کو یہ صراحت کرنا پڑی کہ زید بن ارقم کی روایت کے بموجب غزوۂ ذات العَشیرہ پہلا غزوہ ہے[3]

(۲) اسی سلسلے میں سب سے زیادہ حیران کن مثال "غزوۂ تبوک" اور حج ابوبکر کی ہے جو دونوں ۹ھ کے واقعات ہیں، علمائے سِیَر کا اتفاق ہے کہ غزوۂ تبوک ۹ھ کا واقعہ ہے[4] اور حج ابوبکر ذوالحجہ ۹ھ لیکن عکرمہ بن زبیر جو سیرت کے سلسلے میں سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر حج سے فارغ ہو کر مدینے پہنچے تو آنحضرت "غزوۂ تبوک کے لیے نکلے گویا[5] "غزوہ تبوک" ذی قعدہ ۹ھ کے بعد کا واقعہ ہے۔

یہ ہیں نمونے ان تقویمی اشکال اور توقیتی تضادات کے جن کے باعث واقعات سیرت کی بہت سی تفصیلات واقعی ایک معمہ بن گئی ہیں اور حیران ہی نہیں بلکہ واقعی مجھے شکوہ ہے کہ مسلمان مصنفین نے اب تک اس طرف کیوں پوری توجہ نہیں کی، کیونکہ میری رائے میں یہ توقیتی صراحتیں جو بظاہر غلط نظر آ رہی ہیں، کسی طرح جعلی یا فرضی نہیں بلکہ حقیقت کی نظر سے دیکھئے تو یہ غلطیاں ہی خود اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہیں کہ مدوّنین سیرت نے انتہائی دیانتداری کا ثبوت دیا ہے اور بلا اس بات کا لحاظ کیے کہ یہ روایتیں بادی النظر میں صحیح ہیں یا غلط ان کو درج واقعات کرنے میں گریز نہیں کیا اور قدیم ریکارڈوں میں جو کچھ بھی ملا سپرد قلم کر دیا۔

علمائے مغرب نے اس معمے کو حل کرنے کی واقعی طرح طرح کی کوششیں کیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ جو لوگ بیکانی اور مصری خطوط کو پڑھنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، وہ اس سلسلے میں کیوں ناکام رہے، بہرحال یہ علمائے مغرب ہی تھے جنھوں نے غالباً سب سے پہلے ان غلطیوں کو اس بات پر محمول کیا کہ یہ عربوں کے قدیم نظام تقویم کا نتیجہ ہیں جس کو مسلمانوں نے ۱۰ھ کے بعد بھلانا شروع کر دیا تھا۔

سر ولیم میور (W. MUIR) نے اپنی مشہور کتاب LIFE OF MOHAMED کی توقیتی بنیاد پرسیوال (PERCEVAL) کے نظریہ تقویم پر رکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اہل مکہ کا سنہ ابتداءً خالص قمری تھا، پانچویں صدی کے آغاز میں یہودیان عرب کی تقلید کے طور پر اس قمری سنہ کو شمسی سنہ میں (LUNI SOLAR) تبدیل کر دیا گیا، اس سلسلے میں جاہلی عربوں کے پیش نظر یہ موٹا اصول رہا کہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر دیا جائے جس وقت یہ طریقہ اختیار کیا جا رہا تھا، تو یہ

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۹۰، واقدی/۳ [2] دیکھئے بخاری کتاب المغازی [3] دیکھئے واقدی/۴ [4] ابن حبیب/۱۱۵

[5] الدر المنثور ۳/۱۰۸۔

لحاظ رکھا گیا تھا کہ ایامِ حج میں حاجیوں اور زائرین حرم کو خوراک کی کمی سے دوچار ہونا نہ پڑے اس لیے زمانۂ حج خریف AUTUMN میں مقرر کیا گیا تھا، مگر سالِ شمسی حسابات کے مقابلے میں پھر بھی ایک دن چھوٹا رہا، اس لیے دو سو سال بعد رفتہ رفتہ ایامِ حج بجائے اکتوبر کے مارچ میں آنے لگے تا آنکہ حجۃ الوداع میں آنحضرتؐ نے اس طریقے کو بھی ختم کر دیا[1]

پرسیوال کی جدولِ مطابقت ذیل میں دی جاتی ہے:[2]

انگریزی مہینے	عربی مہینے
اپریل	محرّم
مئی	صفر
جون	ربیع ۱
جولائی	ربیع ۲
اگست	جمادیٰ ۱
ستمبر	جمادی ۲
اکتوبر	رجب
نومبر	شعبان
دسمبر	رمضان
جنوری	شوال
فروری	ذیقعدہ
مارچ	ذوالحجّہ

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں مکی سنہ قمری شمسی (LUNI SOLAR) تھا قطعی طور پر درست اور ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں، مگر میور یا پرسیوال کا یہ تصوّر کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا یا اُن کے حسابات میں کوئی خاص کوتاہی تھی، صحیح نہیں، بلکہ میرے خیال میں ان علمائے کے تصوّر کی اسی غلطی نے اُن کو صحیح نتائج پر پہنچنے سے روک دیا (جیسا کہ آپ آئندہ محسوس کریں گے) یہاں یہ سمجھ لیجیے کہ پرسیوال کے حسابات بنیادی طور پر غلط ہیں اور اس درجہ غلط ہیں کہ اس قسم کی غلطیاں کم سے کم علمائے مغرب سے کمتر ہوتی ہیں۔

اس نظریے سے صرف ہجرت اور غزوۂ بدر وغیرہ کے کچھ ایام و تاریخ بظاہر درست معلوم ہونے لگتے ہیں یعنی ۱۲ ربیع الاوّل سلہ کو

---

[1] MUIR LIFE P. C. II

[2] MUIR LIFE P. N.

دوشنبے ہی کا دن پڑتا ہے، جو تاریخ ہجرت ہے، اسی طرح غزوۂ بدر کی تاریخ یعنی ۱۷ رمضان ۲ھ کو جمعہ ہی آتا ہے مگر ان دو ایک تاریخوں کی ظاہری مطالبقت سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اور اُلجھ جاتا ہے اور اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو واقعات کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں خاص طور پر موسمی تصریحات میں اس درجہ بُعد ہو جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان علمائے کتب سیرت کا بغائر نظر مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں؟

پرسیوال اور میور کے نظریے میں کئی خامیاں ہیں، اوّل تو یہی کہ اگر (بحث کی خاطر) اس کو قبول بھی کر لیا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ عہدِ رسالت[ع] میں بھی ایک کلینڈر تھا، جیسا کہ "میور" کا خیال ہے، تو جن واقعات کی توقیتی تصدیق ہمارا موجودہ کلینڈر کر چکا ہے سب کے سب غلط ہو جائیں گے اور تقریباً ایک تہائی (۱/۳) واقعات کی صحیح تاریخوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اس نقصان کو برداشت کیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ بقیہ دو تہائی (۲/۳) واقعات کی توقیتی صراحتیں درست ہو جاتیں، مگر یہاں کیفیت یہ ہے کہ دو ایک تاریخوں کے علاوہ جو محض اتفاقی طور پر بظاہر درست نظر آتی ہیں سب کی سب غلط ہیں۔ ان اغلاط کی بھی کچھ نہ کچھ توجیہ کر لی جاتی، بشرطیکہ واقعاتِ سیرت کی موسمی اور فلکی تصریحات کے تضاد ختم ہوتے نظر آتے جو حقیقتاً کتبِ سیرت کا سب سے کمزور پہلو اور تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا عیب معلوم ہوتے ہیں۔

مجھے واقعی تعجب ہے کہ "میور" جیسے مُتبحّر عالم اور نقّاد نے اس ناکارہ تقویم کو بلا پرکھے کس طرح قبول کر لیا اور صرف قبول ہی نہیں کیا، بلکہ اپنی اعلیٰ تصنیف کی بنیاد بھی اسی پر ڈال دی جو توقیتی اعتبار سے اس درجہ گمراہ کُن ہے کہ واقعاتِ سیرت کے موسم بالکل اُلٹے ہو جاتے ہیں اور جو واقعہ گرما کا تھا، وہ ٹھیک سرما میں پہنچ جاتا ہے، یہاں اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) سب سے پہلے واقعۂ ہجرت کو لیجیے جس کی تاریخ و یوم کی صراحت دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل[1] اس تقویم کے حساب سے صحیح بیٹھتی ہے، اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ پرسیوال کا حساب غلط نہیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ یہ ۱۲ ربیع الاوّل ۲۸ مئی ۶۲۲ء[2] سے مطابق ہوتی ہے، یعنی عین موسم گرما سے جب کہ خاص طور پر مکّہ کا موسم شدید تر ہوتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام تاریخوں میں یہ روایت متواتر چلی آ رہی ہے، اور خود میور نے بھی اس کو پوری آب و تاب کے ساتھ لکھا ہے، کہ ہجرت کی رات میں پیغمبرِ اسلام[ص] نے اپنے بستر پر حضرت علی[رض] کو سونے کا حکم دیا تھا، اور اپنی چادر عطا فرمائی تھی، کہ وہ اس کو اوڑھ کر آرام فرمائیں، حالانکہ مکّہ کا موسم مئی میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ کوئی شخص معمولاً کسی قسم کا کپڑا اوڑھ کر سو سکے، اور وہ بھی بند مکان میں، علاوہ ازیں جب پیغمبرِ اسلام[ص] مدینے پہنچتے ہیں تو روایتوں میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اس وقت فصلِ خریف سمیٹی جا رہی تھی[3]، جو مدینے میں عام طور پر آخر ستمبر سے نومبر تک سمٹتی ہے، مئی جون میں اور فصلِ خریف کا تصور کس درجہ دلچسپ ہے؟

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

(۲) اوراقِ گزشتہ میں آپ کسی جگہ پڑھ چکے ہیں کہ بدر کا موسم روائتی اعتبار سے گرم تھا، اور اتنا گرم تھا کہ مسلمان بارش کی

---

[1] MUIR - LIFE P. 168 [2] MUIR LIFE P. 138 [3] بخاری باب ہجرت النبی[ص]، نیز دیکھیے ابن سعد ۱/ ۱۶۰

دُعائیں کرنے پر مجبور تھے، پھر جب یہ بارش ہوئی تو خود قرآن نے اس کو احسانِ الٰہی کے طور پر پیش کیا "میور" کی تقویم کے بموجب یہ بارش جنوری کی ایک رات میں ہوئی تھی اور مسلمانوں کے لیے اس درجہ لذّت آفریں تھی کہ انھیں رات بھر گہری نیند آتی رہی۔[۱]

(۳) اسی طرح الوعفک کے قتل کے واقعے کو "میور" نے فروری ۶۲۳ء[۲] کا قرار دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ جس رات وہ قتل ہوا، مکان سے باہر صحن COURT YARD میں سو رہا تھا۔ مگر فروری کے مہینے میں بوڑھے الوعفک کا باہر سونا کس قدر تعجب خیز ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ خود "میور" کی صراحتوں کے بموجب مدینے کا سرمائی موسم انتہائی شدید ہوتا ہے۔[۳]

(۴) اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ مثال غزوۂ اُحد کی ہے، جس کی تاریخ میور نے جنوری ۶۲۵ء[۴] قرار دی ہے اور اس کے ساتھ ہی تازہ کھجوروں (رطب FRESH DATES) کی موجودگی کے واقعات بھی پوری تفصیل سے بیان کئے ہیں[۵]۔ جبکہ یہ بات "میور" کے علم سے باہر نہ ہونا چاہیے کہ مدینے میں تازہ کھجوروں کا موسم آخر جون یا جولائی سے پہلے ممکن نہیں،

اسی طرح تمام واقعاتِ سیرت کے موسم (جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں) اس تقویم کی زد میں آنے کے بعد اُلٹے ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اس سورج گرہن کی تاریخ جو ۲۸ جنوری ۶۳۲ء کو ہوا تھا، خود میور نے جون و جولائی ۶۳۱ء[۶] قرار دی ہے، جو فلکی حسابات کی روشنی میں قطعاً ممکن نہیں۔ اس لیے میری رائے میں اس پر مزید تبصرہ غیر ضروری ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی جاہلی تقویم کی بازیافت کے سلسلے میں یہ کوشش بالکل ابتدائی نوعیت کی تھی، اور اس میں زیادہ دقتِ نظر سے واقعات کو نہیں جانچا گیا تھا تاہم علمائے مغرب کی نظر میں یہ مسئلہ ہمیشہ کھٹکتا رہا اور نئے نئے نظریات پیش کئے گئے۔ جس میں مشہور مستشرق، ولہاوزن J. WELHAUSEN نے بھی دلچسپی لی، اور انھوں نے متعدد واقعات کی موسمی شہادتوں کو اکٹھا کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ "بعض حالتوں میں" اگر ان تاریخی روائتوں کو ڈھائی مہینے آگے بڑھا دیا جائے تو موسموں سے مناسب تطبیق[۷] ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم نظریہ شاید ونکلر WINCELER نے پیش کیا تھا جس کی تفصیلات بدقسمتی سے میرے پیش نظر نہیں، صرف مارگولیتھ کا یہ بیان ہے کہ:-

"اور ونکلر کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی ہے کہ مدینے کی تقویم (CALANDERS) مکے کی تقویم سے غالباً مختلف تھی، دونوں شہروں میں ایک ہی نام کے مہینے مختلف اقدارِ زمانی رکھتے تھے، اس کی عربی تقویم کی اصلیت کے متعلق تحقیقات نیں جن کو (NIELSEN) نے اور وسعت دی، ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتی۔"[۸]

اس بیان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ونکلر کی رائے میں واقعاتِ سیرت پر دو تقویموں کی کارفرمائی تھی، جو میری رائے میں

---

۱ MUIR LIFE P 222 ۲ MUIR LIFE P 222 ۳ MUIR LIFE 240
۴ MUIR LIFE P 240 ۵ MUIR LIFE 243 ۶ MUIR LIFE P. 267
۷ ۸ MARGO LIOUTH XX

قطعاً قابلِ قبول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مارگولیتھ نے ایسی کوئی تشریح نہیں کی۔ ونکلر کی رائے میں ان دو تقویموں کی ابتداء وانتہا کس نقطہ سے ہوئی تھی۔ صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ "ونکلر کا نظریہ ہجرت کے ابتدائی سالوں کے واقعات کی تاریخیں متعین کرنے میں کوئی عملی اہمیت نہیں رکھتا" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس مستشرق کے نظریہ کو قبولِ عام نہ ہو سکا، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ شاید بعض پیچیدہ حسابات پر مبنی تھا، تاہم مجھے انتہائی ممنونیت سے اس کا اعتراف کرنا ہے کہ میرا دو تقویمی نظریہ ونکلر کے اس تصوّر کا نتیجہ ہے جس کی اگرچہ ادنیٰ ترین تفصیل بھی میرے پیشِ نظر نہیں، اور ہو سکتا ہے کہ اس مستشرق کے تصوّرات کی گذرگاہ میری تفہیمات سے بالکل جُدا ہو، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ دو تقویمی نظریہ واقعاتِ سیرۃ کی باقاعدہ جانچ کا منطقی نتیجہ ہے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً ایک تہائی واقعات سیرت نے جن میں ایام وتواریخ کی تفصیلات بھی شامل ہیں، موسمی صراحتیں بھی موجود ہیں اور فلکی حسابات کے ساتھ عصری تاریخ کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ وسٹنفیلڈ کی عام قمری تقویم سے مطابقت کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عہدِ رسالت میں کوئی اور کلینڈر موجود ہو یا نہ ہو، لیکن ہمارا مروّجہ کلینڈر ضرور رائج تھا اور اگرچہ اس سے کتنا ہی کم کام لیا جاتا ہو، مگر اس کے وجود سے انکار ممکن نہیں، اب رہیں دو تہائی واقعات کی توقیتی صراحتیں تو میرے نزدیک یہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی ہیں جو عہدِ رسالت میں سنہ ۱۰ھ تک رائج رہی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک قیمتی مقالے کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات کے ذیل میں لکھا تھا مگر اس میں ضمنی طور پر مکّے کی جاہلی تقویم بھی زیرِ بحث آگئی ہے اور فاضل مقالہ نگار نے صرف صلح حُدیبیہ کے متعلق کچھ تاریخی اختلافات پیش کر کے ان کی توجیہ اصولِ نسیٔ کے تحت کرنا چاہی ہے۔

اس مقالے میں انھوں نے دو تقویموں کا تصوّر ایک خاص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کا اقدام کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقالہ محض سرسری طور پر لکھا گیا تھا، اس لیے نتائج قابلِ اطمینان نہ نکل سکے۔ میں یہاں ان کی جدول تقویم پیش کرتا ہوں جو اگرچہ صرف سنہ ۶ھ سے لے کر سنہ ۱۰ھ تک کی مکّی اور مدنی تقویم کے تطابق کی کوشش پر مبنی ہے، لیکن اس کے ذریعہ فاضل مقالہ نگار کا پورا اصولِ تقویم سمجھ میں آسکتا ہے جو میری رائے میں بالکل اُلٹا ہے اور جس پر میں آئندہ تبصرہ کروں گا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے نظریۂ تقویم کے پہلو میں موجودہ ہجری

AND IT HAS BEEN POINTED OUT BY WINCKLER THAT THE CALANDAR OF MEDENAH MAY WELL HAVE BEEN DIFFERENT FROM THAT OF MECCAK, THE SAME MONTHS HAVING QUITE DIFFERENT VALUES AT TWO CITIES. HIS INVESTIGATION INTO THE ORIGIN OF THE ARABIC CALENDER, WHICH HAVE BEEN AMPLIFIDE BY D. NEELSEN ARE OF NO PRACTICAL IMPORTANCE FOR FIXING THE DAILS OF EVENTS DURING THE EARLY YEARS OF THE HIJRAT – (MARGOLOUTH RISE XX)

تقویم کو رکھنے کی کوشش کی گئی۔

"جدول"

مدنی	مکی	سنہ ۶ھ	مدنی	مکی
محرم	ربیع ۱		رجب	رمضان
صفر	ربیع ۲		شعبان	شوال
ربیع الاول	جمادی ۱		رمضان	ذیقعدہ
ربیع الثانی	جمادی ۲		شوال	ذوالحجہ
جمادی ۱	رجب		ذیقعدہ	×
جمادی ۲	شعبان		ذوالحجہ	محرم

سنہ ۷ھ مکی	سنہ ۷ھ مدنی	سنہ ۸ھ مکی	سنہ ۸ھ مدنی	سنہ ۹ھ مکی	سنہ ۹ھ مدنی	سنہ ۱۰ھ مکی	سنہ ۱۰ھ مدنی
محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع الاول	صفر	ربیع الاول	صفر	صفر
ربیع الاول	ربیع ۲	ربیع الاول	ربیع الثانی	ربیع الاول	ربیع الثانی	ربیع الاول	ربیع الاول
ربیع الثانی	جمادی ۱	ربیع الثانی	جمادی ۱	ربیع الثانی	جمادی ۱	ربیع الثانی	ربیع الثانی
جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان
رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	ذیقعدہ	شوال	شوال
ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذوالحجہ	ذیقعدہ	ذیقعدہ
ذوالحجہ	محرم	ذوالحجہ	محرم	ذوالحجہ	×	ذوالحجہ	ذوالحجہ

اس جدول پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ واقعاتِ سیرت کی توفیقی تشریحات ممکن نہیں۔

اس سلسلے میں راقم الحروف کے سامنے بھی ایک نظریہ ہے جس کو علمائے تاریخ کے رُوبرو اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ ان کے غور و فکر کی کسوٹی پر اس کی آزمائش ہو سکے، اس نظریہ کا مختصر الفاظ میں خلاصہ یہ ہے:۔

"ظہورِ اسلام کے وقت جزیرہ نمائے عرب میں کئی تقویمیں رائج تھیں جن میں ایک مکّے میں رائج تھی، یہ تقویم قمری شمسی تھی اور ایک خاص نقطۂ فصلی سے شروع ہو کر اسی نقطے پر ختم ہوتی۔ اس تقویم میں وقتاً فوقتاً کبیسہ مہینے اضافہ ہوتے رہتے۔ اس کے مقابلہ میں مدینہ میں ایک دوسری تقویم رائج تھی جو خالص قمری تھی، مگر دونوں تقویموں کے مہینے ہم نام تھے، مہاجرینِ مکّہ جب مدینہ پہنچے تو اپنے ساتھ مکّی تقویم بھی لے گئے۔ اس طرح ہجرت کے بعد مدینے میں بیک وقت دو تقویمیں رائج ہو گئیں، جس کے نتیجہ میں بعض لوگوں نے مکّی تقویم کے بموجب یادداشتیں مرتب کیں اور بعض نے مدنی کلینڈر کے مطابق، اس بناء پر ابتدائی مدونینِ سیرت یا اُن کے رواۃ کی جو تاریخیں مل سکیں وہ دونوں تقویموں پر مبنی تھیں، ان میں سے مکّی تقویم اس وقت ناپید ہے جس کی وجہ سے واقعاتِ سیرۃ کی مکمل توقیتی تشریح ممکن نہیں، اگر مکّی تقویم کی بازیافت کر لی جائے تو ہر قسم کی توقیتی اُلجھنیں ختم ہو جائیں گی۔"

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے تحت ہمیں اولاً ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے مختلف توقیتی معیاروں پر ایک سرسری نظر ڈالنا پڑے گی، اگر خاص طور پر مکّی نظامِ تقویم کی بازیافت اور مدنی کلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کرنا ہوگا، اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ دونوں تقویمیں واقعاتِ سیرۃ پر کس درجہ مؤثر ہیں۔

اس ذیل میں مجھے افسوس ہے کہ میں مارگولیتھ (MARGOLOWTH) کے اس ہمت شکن خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ موجودہ زمانے میں۔

"جاہلی تقویم کا بنانا بہرحال ناممکن ہے جو وسٹنفیلڈ کی پوری تفصیلات کا بدل ہو سکے[1]"

اس لیے کہ اوّل تو اسلام کی ابتدائی تاریخ بڑی حد تک ہمارے سامنے ہے جس میں جاہلی عہد کے بہت سے اشارے ملتے ہیں، دوسرے خود روایاتِ سیرت ہماری رہنمائی کر سکتی ہیں اور صحیح راستہ متعین کرنے میں مدد دے سکتی ہیں، بنا بریں مجھے مایوسی نہیں بلکہ پوری اُمید ہے کہ مکّی نظامِ تقویم کی بازیافت قطعاً ممکن ہے۔

(۲)

اوراقِ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے بہت پہلے عربوں میں توقیتی تصوّرات موجود تھے، اور اگرچہ قدیم عربی کتبات و آثار

---

[1] IT IS NOT HOWEVER POSSIBLE TO MAKE OUT ENOUGH OF THE PRE-ISLAMIC CALENDER TO SUBSTITUTE A DETAILED SCHEME FOR WUSTENFELDS (MARGOLIATH RISE - P. XIX)

لے یہ مضمون رسالہ برہان میں مئی ۱۹۶۹ء سے لے کر دسمبر ۱۹۶۹ء تک مسلسل چھپتا رہا ہے۔ اُسے یہاں یکجا کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

میں عام طور پر سنین وشہور نظر نہیں آتے؛ تاہم جنوبی عرب میں کچھ کتبے ایسے ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی کی ابتدائی سے پہلے یہ دستور شروع ہو گیا تھا، چنانچہ یمن میں "میحوض بن ابحض" (MIABHUD BIN ABHAD) کا سنہ جو غالباً ۱۱۵ ق م میں جاری کیا گیا تھا ابرہہ کے زمانے تک رائج رہا اور اس کے ایک کتبے پر موجود ہے۔[1]

مسعودی اور دوسرے علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں میں بڑی کثرت سے سنین رائج تھے، اور ہر قبیلے میں جُدا جُدا مشہور واقعات یا اکابر کے نام سے شمارِ ایام کیا جاتا تھا[2] حتیٰ کہ غیر ملکی سنہ تک رائج ہو گئے تھے، مثلاً یہودی سنہ یا سنہ سکندری[3] جو اگرچہ یہود و نصاریٰ تک محدود تھے مگر عربی تاریخ پر مؤثر ہیں، میں دوسرے سنوں کی تفصیلات میں جانا غیر ضروری سمجھتا ہوں، مگر ان دونوں سنوں کا تذکرہ چونکہ کئی جگہ آئے گا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کے مہینوں کے نام بیان کر دیئے جائیں:-

یہودی سنہ کی ابتداء مذہبی طور پر تو "ماہ نیسان" سے ہوتی تھی، لیکن عام کاروبار میں عرصہ دراز سے ماہِ تشری پہلا مہینہ شمار کیا گیا تھا، اس اعتبار سے مہینوں کی ترتیب حسب ذیل تھی[4]

۱۔ تشری ۔ ۷	۵۔ شباط ۔ ۱۱	۹۔ سیوان ۔ ۳
۲۔ مہوان ۔ ۸	۶۔ ادار ۔ ۱۲	۱۰۔ تموز ۔ ۴
۳۔ کسلیو ۔ ۹	۷۔ نیسان ۔ ۱	۱۱۔ آب ۔ ۵
۴۔ تبت ۔ ۱۰	۸۔ ایار ۔ ۲	۱۲۔ ایلول ۔ ۶

یہودی مہینے اگرچہ قمری تھے، لیکن ہر دوسرے تیسرے سال مخصوص عہدے دار سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کر دیا کرتے تھے[5] یہ اضافہ جس سال ہوتا، اس میں ماہِ "آدار" کے بعد ایک مہینہ بڑھا دیا جاتا جس کو "وادار" کہتے تھے[6] (دوسرا آدار)

ماہِ تشری کی ابتدا آج کل مسی رویت قمر سے تسلیم کی جاتی ہے جو ۵ ستمبر سے لے کر ۵ اکتوبر تک ہوتی ہے[7] گویا تشری ہمیشہ اعتدالِ ربیعی میں رہتا ہے۔

یہودیوں کی طرح عرب کے مسیحی قبائل میں بھی ایک علیحدہ سنہ رائج تھا[8] جو خالص شمسی تھا، اس سن کے مہینوں کے نام اگرچہ

---

[1] ENCYCLOPIADIA OF ISLAM VOL. I 377

[2] مسعودی التنبیہ والاشراف/۲۰۲، ۲۰۴، نیز دیکھئے طبری ۲/ ۲۵۳، طبری ۱/ ۹۸

[3] طبری ۱/ ۹۸

[4] BIBLE DICTIONARY BY SMITH VOL II 416

[5] TALMUD TRACT SANHADRIN نیز دیکھئے ENCY OF ISLAM VOL. III 856

[6] BIBLE DICTIONARY VOL. II P. 416 نیز دیکھئے (CHAMBERS' ENCYCLOPADIA

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہودی تقویم سے حاصل کئے گئے تھے، لیکن طریقۂ تقویم رومی (JULIUN) اختیار کرلیا گیا تھا، اور مہینے بجائے رویت قمر کے جو لینی حسابات سے شروع ہوتے سنہ کی ابتدا بجائے جنوری کے اکتوبر سے کی جاتی تھی، ذیل میں اس سنہ کے مہینوں کے نام دیئے جاتے ہیں، جو مصر و شام میں آج تک رائج ہیں۔

۱ - تشرین اوّل - اکتوبر		۵ - شباط	- فروری	۹ -	حزیران	جون	
۲ - تشرین آخر - نومبر		۶ - آذار	- مارچ	۱۰ -	تموز	جولائی	
۳ - کانون اوّل - دسمبر		۷ - نیسان	- اپریل	۱۱ -	آب	اگست	
۴ - کانون آخر - جنوری		۸ - ایار	- مئی	۱۲ -	ایلول	ستمبر	

ان کے علاوہ متعدد قبائل میں کچھ اور سنین بھی رائج تھے، جن کے نہ صرف مہینوں بلکہ دنوں تک کے نام جدا جدا تھے[۱]، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت ملک عرب میں کوئی ایک ایسا مرکزی سنہ موجود نہ تھا، جس پر سب کا مدار ہو۔ پھر جن مقامات پر مخصوص سنہ رائج تھے، وہاں بھی جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

مثلاً ایک زمانے میں اہل مکہ بنائے کعبہ سے شمار ایام کیا کرتے تھے، پھر بخت نصر کے حملے سے حساب لگایا جانے لگا جس کو عام التفرق کہا جاتا تھا، اس کے بعد عام الغدر جاری کیا گیا[۲] اور سب سے آخر میں "عام الفیل" کی بنیاد ڈالی گئی۔ چنانچہ سنہ ہجری کی ابتدا تک[۳] مکہ میں یہی سنہ رائج تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سنہ محض مکے یا اس کے قرب و جوار کے لیے مخصوص تھے اور صرف مقامی دینی حیثیت رکھتے تھے، اور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) لیکن البیرونی نے آثار الباقیہ ۲/۱۴ (ستاؤ) میں بیان کیا ہے کہ یہودی سال کی ابتدا ایسے چاند سے ہوتی جس کی رویت ۲۷ آب (اگست) سے لیکر ۲۴ ایلول (ستمبر) ممکن ہوتی، تاریخی نقطۂ نظر سے البیرونی کی یہ شہادت بظاہر نہایت اہم ہے اور اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم البیرونی کے زمانے میں یہودی سال ۲۷ اگست سے شروع ہو سکتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ شاید ایران اور عراق کے یہودیوں تک محدود تھا۔ جہاں فصلیں پہلے تیار ہو جاتی ہیں، ورنہ شام اور فلسطین کے یہودی اس تاریخ سے ابتداء نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ فلسطین میں جو کی فصل وسط اپریل سے پہلے تیار نہیں ہوتی جس کی وجہ سے عید فسح کا تیوہار جو ساتویں مہینے (یعنی نیسان) کی ۱۴ تاریخ کو ہمیشہ منایا جاتا اپریل کے لگ بھگ ہونا چاہیئے، چنانچہ جوزیفس (JOSIPHOS) نے یہودی ماہ نیسان کو مقدونی مہینے "X ANTHECUS" اور مصری مہینے "PHARMUTHI" سے مطابقت دی ہے۔

دیکھئے 5 ،۱۰ ,III JOSIPHOS ANT

مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے SMITH BIBLE DIC VOL II P. 417 طبری ۹۸/۱

[۱] البیرونی آثار ۷۴/۳، ۷۵، نیز دیکھئے ابن سیدہ ۴۲/۹، طبری ۹۸/۱ [۲] ابن حبیب ۶/۹، ۷

[۳] طبری ۲۵۳/۲ ؎

کم از کم مدینے میں مہاجرین کے آنے سے پہلے رائج نہ تھے، چنانچہ مسعودی کے بقول اہلِ مدینہ میں یہ دستور تھا کہ وہ اپنے اطام سے ـ یعنی ان قلعوں یا گڑھیوں سے جو جنگ کی غرض سے بنائی جاتیں[۱] شمارِ ایام کرتے تھے۔

مسعودی کی شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مکے اور مدینے میں قطعی طور پر دو سنہ رائج تھے، اور دونوں شہروں میں شمارِ ایام کے طریقوں میں بیّن فرق تھا۔ بنابریں میں پہلے مکی تقویم کی بازیافت کی کوشش کروں گا اور بعد ازاں مدنی کلینڈر کی ضروری بناوٹ پر غور کیا جائے گا۔

اہلِ مکہ کا نظامِ سنی تمام قدیم قوموں میں ماہ و سال کا انحصار محض چاند کی گردشوں پر تھا، یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام زبانوں میں مہینے کے لیے جو لفظ ملتے ہیں اُن سب کا تعلق چاند سے ہے، مثلاً فارسی لفظ "ماہ" اور ہندی مہینہ چاند کی طرف اشارہ کر رہا ہے، اسی طرح انگریزی لفظ (MONTH) لاطینی (MENSIS) جرمن (MOND) اور (MONAT) اور سنسکرت کے ماسہ (मास) کا تعلق چاند ہی سے ہے[۲]۔

یہ خصوصیت آریائی زبانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سامی زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نظر نہیں آتیں، چنانچہ سال کے لیے عربی لفظ سنہ غالباً "سن" (SIN) دیوتا کی یادگار ہے، جو تمام سامی قوموں میں چاند کا دیوتا شمار ہوتا تھا[۳] اور قدیم بابلیوں میں اس کا لقب الٰہ الثلاثین THE GOD THIRTY تھا[۴]۔ جنوبی عرب میں سِن دیوتا کے نام کے حامل متعدد کتبے نکلے ہیں[۵]۔

عربی زبان میں سال کے لیے دوسرا لفظ "عام" ہے، اس لفظ کا تعلق بھی چاند سے معلوم ہوتا ہے۔ قدیم عرب چندرماں دیوتا کو "عم" بھی کہتے تھے[۶]۔ اسی طرح لفظ تاریخ شاید "یرخ" سے بنا ہے۔ جو فلسطین میں چاند کو کہا جاتا تھا[۷]۔ سب سے بڑھ کر عربی لفظ "شہر" جس کے معنی آج بھی مہینے کے ہیں، قدیم آرامیوں میں، چندرماں دیوتا کا نام تھا جنوبی عرب میں چاند کے لیے عام طور سے استعمال ہوتا تھا[۸]۔

---

۱ التنبیہ والاشراف/۲۰۶ ۲ DICTIONARY OF THE BIBLE W SMITH VOL II P. 415

۳ THE RELIGION OF THE SEMITES - W. R. SMITH P. 532, 659
THE RELIGION OF THE ANCIENT WORLD G. RAWLINSON P. 59, 61
ENCYCLOPAIDIA OF THE RELIGION AND ETHICS VOL P.

خاص عربوں کے لیے دیکھیے: ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL I P 379

۴ CHALIDIA RAGAZIN P. 240 ۵ ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL I 379

۶ IBID P. 379, 380

۷ DIC OF THE BIBLE 415 طبری اور البیرونی نے لفظ تاریخ کا رشتہ فارسی لفظ "ماہ روز" سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، اُن کا بیان ہے کہ "ماہ روز" سے "مورخ" بنا اور "مورخ" سے تاریخ وغیرہ ـ طبری۔

۸ ARTHUR JEFFERY (FOREIGN VACABULARY, P. 187
نیز دیکھیے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۰۶

حقیقت یہ ہے کہ قدیم انسان کو زمانے کا ادراک ہُوا تو اس کو سورج کے طلوع اور غروب کے بعد وقت کی سب سے بڑی اکائی جو ملی، وہ صرف چاند کی مقررہ اوقات پر رویت ہی تھی، جو ایک مُدّت یا دقفے کے گذرنے اور دوسرے کے شروع ہوجانے کا، گویا ایک قدرتی اعلان تھا، ابتداءً یہی چھوٹا سا وقفہ تمام انسانی ضروریات کے لیے کافی تھا، لیکن انسانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ وقت کا یہ دائرہ تنگ تر ہوتا چلا گیا، اور ایک وقت ایسا آیا کہ اب انسان کو شمارِ ایام کے لیے اس سے بڑے وقفے کی ضرورت تھی۔

مسلسل تجربات نے ہمارے اجداد پر یہ بات واضح کردی تھی کہ چاند جب بارہ[1] مرتبہ نمودار ہو کر غائب ہوجاتا ہے تو موسم پھر عود کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس لیے بارہ[1] قمری مہینوں کا یہ وقفہ ایک سال فرض کر لیا گیا اور اس طرح شمارِ ایام میں ایک سہولت پیدا ہو گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سال کو بارہ ماہ اور ہر مہینے کو چار ہفتوں پر سب سے پہلے وادیٔ فرات کے سامی باشندوں یعنی کلدی بابلیوں (CHALDS BABYLONIANS) نے تقسیم کیا تھا[2]۔ اور ان ہی لوگوں نے ہفتے کے دنوں اور برو ج شمسی کے نام رکھے تھے، ہفتے کے سات دن شاید اس لیے مقرر کیے گئے تھے[3] کہ یہ دقفہ چاند کی ماہانہ گردش کا ایک چوتھائی حصہ ہے، یعنی (7×4 = 28) اور شاید اسی حساب کے رُو سے عربوں نے منازلِ قمر کی تعداد بھی اٹھائیس قرار دی تھی۔

چونکہ ایک قمری مہینہ از روئے حساب (29.53) دن کا ہوتا ہے اس لیے بارہ قمری مہینے یا ایک قمری سال (29.53×12 = 354.36) دن کا ہوا، لیکن فصلوں اور موسموں کا انحصار گردشِ قمر پر نہیں بلکہ سورج کی اُس ظاہری گردش پر ہے جو (365.24) دن میں تمام ہوتی ہے، اس بنا پر موسمی اعتبار سے، سورج اور چاند کی سالانہ گردشوں میں (10.88) یعنی تقریباً گیارہ دن کا فرق رہتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کمی ایام کے باعث قمری مہینے موسموں کا ساتھ نہیں دے سکتے جس کو پورا کرنا قدیم قوموں کے لیے اشد ضروری تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ قدیم میں ہر قوم کے مذہبی تیوہار اگر ایک طرف مخصوص مہینوں میں مقرر کیے جا چکے تھے تو دوسری طرف یہ بات بھی فرائض دینی میں داخل تھی کہ زائرین جب دیوتاؤں کے پاس حاضر ہوں تو اپنی زرعی اور حیوانی پیداواروں کے اوّلین حاصل بھی پیش کریں[4]۔ اس بنا پر تیوہاروں کے متعین کرنے میں یہ خیال ناگزیر تھا کہ وہ ہمیشہ فصلوں اور موسموں سے مطابقت کرتے رہیں تاکہ

---

[1] تعجب ہے کہ رومیوں میں ابتداءً صرف ۱۰ قمری مہینوں کا سال ہوتا، یعنی مارچ سے لے کر دسمبر تک (دیکھیے CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL II, 611) اس بات کا اندازہ ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے ناموں سے بھی ہوتا ہے "SEPT" سات "OCT" آٹھ "NOV" نو "DEC" دس۔

[2] RAGOZIN, CHALDIDIA P. 230, 2?? [3] بعض علماء کا خیال ہے کہ ہفتے کے سات دن سبع سیارگان کی مناسبت سے مقرر کیے گئے، یہ خیال اس حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام بلاشبہ سیاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں مگر جہاں تک تعلق ہے یہ خیال شاید صحیح نہیں کیونکہ قدمائے کرۂ فلکی کو ٹھیک اٹھائیس منازلِ قمر پر تقسیم کیا تھا۔ اس اعتبار سے ہفتہ دائرۂ فلکی کا ¼ ہے۔

[4] مثلاً یہودیوں میں آج تک دستور ہے کہ ماہِ نیسان میں یعنی پہلے مہینے کی چودھویں تاریخ زوالِ آفتاب اور (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

یاتری بہ آسانی نذر لانے لاسکیں۔

اس سلسلہ میں ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا جاسکتا تھا کہ محض فصلی مشاہدات کے ذریعہ تعیین ماہ کر دیا جائے اور مہنت یا پروہت کچھ عرصہ پہلے اعلان کر دیں کہ تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ اس کے مراسم اجتماعی طور پر ادا ہوسکیں، چنانچہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقہ کار بھی بڑے عرصہ تک جاری رہا۔

البیرونی نے یہودیوں کے ایک فرقے کے متعلق بیان کیا ہے کہ ان میں عید فسح کا تیوہار منانے کے لیے یہ دستور تھا کہ ایک متدین عالم ۲۳ شباط کو شہر سے باہر جاتا اور جَو کے کھیتوں کا معائنہ کرتا، اگر جَو کی بالوں میں نوکیں نکل آتیں تو اس تاریخ سے پچاس دن شمار کرکے عید فسح کا تیوہار مقرر کر دیتا۔ ورنہ سالِ رواں میں ایک ماہ کا اضافہ ضروری تھا۔[1]

ظاہر ہے کہ یہ بالکل ابتدائی اور سادہ طریقہ کار جیسا کہ خود البیرونی کا خیال ہے مقامی اور غیر مرکزی معبدوں کے لیے جتنا آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے مرکزی معبدوں کے لیے جہاں دُور دُور سے یاتری آتے، اتنا ہی دشوار اور ناقابلِ عمل بھی تھا، کیونکہ ہر سال پجاریوں اور پروہتوں کو دُور دراز مقامات تک اعلان کرانا اور اطلاعیں بھیجنا کچھ سہل کام نہ تھا، ضرورت یہ تھی کہ ایک سال قبل عین مندر یاترا کے وقت جبکہ جملہ زائرین موجود ہوں اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اگلے سال تیوہار کا مقدس مہینہ کب آنے والا ہے؟ تاکہ یاتری ٹھیک وقت پر یاترا کے لیے آسکیں۔

اس مقصد کے لیے ایک دوسرا طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاسکتا تھا کہ ہر تیسرے سال مستقل طور پر ایک ماہ کا اضافہ ہوتا رہے کیونکہ تین شمسی سالوں کے دن (1096) ہوتے ہیں، اس کے مقابلہ میں تین قمری سال اور ایک ماہ کے دن 1093 ہوں گے، گویا سال میں صرف ایک دن کا فرق پڑے گا، جو ابتداءً قطعی طور پر غیر محسوس ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فرق بڑھتے بڑھتے کچھ ہی عرصہ میں مہینوں اور سالوں کا ہو جائے گا اور صرف تیس سال میں پورے ایک مہینے کا فرق موسموں کو منحرف کر دے گا، جس کے لیے نئے سرے سے اقدامات کی ضرورت ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) غروبِ آفتاب کے درمیان عید فسح منائی جاتی ہے جس کے لیے بائبل میں یہ حکم ہے "تم اپنے غلّے کے پہلے حاصل میں سے ایک پولا کاہن کے پاس لاؤ اور وہ اپنے خداوند کے حضور ہلائے تاکہ وہ تمہاری طرف سے قبول ہو (اخبار ۲۳ : ۴ تا ۱۰، ۱۲) خود عربوں میں چند رطل دیوتا (عمی انس یا عمیانس) کو ظہورِ اسلام کے وقت تک بھینٹیں دی جاتی تھیں، ابن کلبی نے صراحت کی ہے کہ قرآن مجید کی آیات ..... " وجعلوا للّٰہ مما ذرا من الحرث والانعام نصیباً فقالوا ھذا للّٰہ بزعمھم و ھذا لشرکائنا " سے مقصد عمیانس کے لیے بھینٹیں ہیں، یقسمون لہ من انعامھم وحروثھم قسماً بینہ وبین اللّٰہ "کتاب الاصنام / ۴۳ نیز دیکھئے یاقوت ۶ / ۲۲۷ -

[1] آثار الباقیہ البیرونی / ۶۹ -

نیز دیکھئے DIC OF BIBLE (SMITH) VOL II P. 416

میور (MUIR) کا خیال ہے کہ اہلِ مکہ میں یہی طریقہ رائج تھا اور اسی وجہ سے ظہورِ اسلام کے وقت تک موسموں میں تقریباً چھ ماہ کا فرق پڑ چکا تھا۔[1]

اس کے مقابلے میں ایک تیسرا طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ ہر آٹھ قمری سالوں میں تین ماہ کا اضافہ کر دیا جائے جس سے نتائج میں کم فرق پڑتا ہے کیونکہ آٹھ قمری سال اور تین قمری ماہ کے دن (2923) ہوتے ہیں اور آٹھ شمسی سالوں کے دن تقریباً (2922) ہوں گے۔ گویا آٹھ سال میں تقریباً ڈیڑھ دن کا فرق (1.55) رہتا ہے۔ "البیرونی" کا خیال تھا کہ اہلِ مکہ اسی طریقے پر کاربند تھے۔[2]

اس سلسلے میں سب سے صحیح طریقہ وہ تھا جو اہلِ یونان نے دریافت کیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۴۳۲ ق م میں ایک یونانی ریاضی دان میٹون (METON) نے علمی طور پر یہ انکشاف کیا کہ قمری مہینے یعنی ۱۹ قمری سال اور سات ماہ، پورے اُنیس شمسی سالوں کے برابر ہوتے ہیں۔[3] اس لیے اگر اُنیس قمری سالوں میں سات قمری مہینوں کا انضمام کر دیا جائے، تو شمسی اور قمری سالوں کی تعدادِ ایام میں صرف برائے نام فرق رہے گا۔

اس ۱۹ سالہ دور کو جس میں (235) قمری مہینے ہوتے ہیں اصطلاحاً میٹنی دور (METONIC CYCLE) کہا جاتا ہے۔ یہ اصول چونکہ عملاً سادہ اور فلکی مشاہدات کے اعتبار سے بڑی حد تک غیر تنقی تھا، اس لیے خوب مقبول ہوا، اور نہ صرف یونان بلکہ تمام مشرقِ وسطیٰ میں جہاں جہاں بھی قمری سنہ رائج تھے بحیثیت اصول تقویم تسلیم کر لیا گیا حتیٰ کہ یہود جیسی قدامت پسند قوم نے بھی اپنا لیا چنانچہ البیرونی کے بقول شام و عراق کے یہودی اسی طریقے پر کاربند تھے۔[4]

ان حسابی اصولوں کے علاوہ زمانۂ قدیم میں ایک طریقہ یہ بھی رائج تھا کہ محض فلکی مشاہدات پر تقادیم کی بنیاد رکھی جاتی، اور شمارِ ایام میں بُروجِ شمسی اور منازلِ قمر (نچھتروں) سے مدد لی جاتی تھی جیسا کہ ہندوستان میں آج تک دستور ہے، لیکن یہ طریقہ غالباً صرف ستارہ شناس قوموں تک محدود تھا کیونکہ اس میں پورے نجومی ادراک کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جملہ طریقے ابتداءً صرف اس لیے اختیار کئے گئے تھے کہ مندروں کی مذہبی حکومتیں اپنی سالانہ آمدنی کو جو زرعی بھینٹوں اور چڑھاووں کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی، بہرصورت برقرار رکھنا چاہتی تھیں اور اس بات پر مجبور تھیں کہ ہر دوسرے تیسرے سال تیوہاروں کو تعویق یا تاخیر میں ڈال دیا جائے، تاکہ فصلیں تیار ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے اُنھیں، ہر دوسرے تیسرے ایک "لوند" کا مہینہ بڑھانا پڑتا تاکہ قمری سال فصولِ شمسیہ سے تجاوز نہ کرنے پائیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ "کبیسہ" سالوں کے تعین یا سال

---

[1] MUIR - LIFE P. CII

[2] البیرونی کا بیان ہے کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس سال میں نو ماہ کا انضمام کرتے تھے۔ جس کے یہی معنی ہوتے ہیں، کیونکہ (8 × 3 = 24) اور (3 × 3 = 9) دیکھیے آثار الباقیہ /۱۲

[3] CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL = III P. 226
IBID VOL : V 285

[4] آثار الباقیہ صفحہ ۱۴۲ - نیز دیکھیے SMITH BIBLE DIC VOL II, P. 416 یہودیوں نے یہ طریقہ ۳۶۰ء میں قبول کیا تھا۔

اعلان میں عوام الناس کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا، بلکہ اس مقصد کے لیے مندروں کی مذہبی حکومتوں نے علیحدہ محکمے قائم کر رکھے تھے، جن کے فیصلے اٹل ہوتے۔

رومیوں میں جولیس سیزر (JULIUS CAESER) کے عہد تک یہ اختیار چند ہاتھوں تک محدود رہا جو اکثر و بیشتر اپنے عہدے اور اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاتے اور بالعموم ایسا ہوتا کہ کسی خاص شخص سے انتقام لینے کے لیے یا کسی دوست کے فائدے کو مدِنظر رکھ کر سال کو گھٹا بڑھا دیا جاتا۔ ان بے عنوانیوں کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد موسموں اور مہینوں میں سرے سے کوئی مطابقت نہ رہی۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ جولیس (JULIUS) کے زمانے میں ایک بار موسمِ بہار کے تیوہار، موسمِ گرما میں جا پڑے جس کی بنیاد پر قیصر نے اس تقویم پارینہ کو روم سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیا[1] اور نئی تقویم کے اجراء کا اعلان کیا جس کا قمری مہینوں سے کوئی تعلق نہ تھا، موجودہ مسیحی سنہ اسی جولین سنہ کی یادگار ہے اور جولائی کا مہینہ قیصر کے نام پر آج تک چلا آ رہا ہے۔

یہودیوں میں بھی سالوں کو کبیسہ قرار دینے یا نہ دینے کا کام ہمیشہ مخصوص ہاتھوں میں رہا اور یہ عہدہ ناشی (NASHI)[2] کے جو اُن کا سب سے بڑا عالمِ دین ہوتا، کسی بھی دوسرے شخص کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ کبیسہ سالوں کے تعین کے متعلق کوئی رائے زنی کر سکے۔ صرف ناشی (NASHI) ہی کو تمام تر اختیارات تھے کہ اعلان کبیسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، واضح رہے کہ بائبل (BIBLE) میں کبیسہ کا کوئی ذکر نہیں، اور سال کے صرف بارہ ۱۲ مہینے مذکور رہوئے ہیں۔[3]

عربوں میں ظہورِ اسلام تک تعینِ کبیسہ کا محکمہ بنو کنانہ کے ایک خاندان میں موروثی چلا آ رہا تھا جس عالم کے سپرد یہ خدمت ہوتی، اُسے "قلمس" یا "ناسی" کہا جاتا تھا۔[4] یہ لوگ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم شمار ہوتے تھے، اور ان کے تمام فیصلے بالکل اٹل ہوتے، کسی بھی شخص میں یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کے فیصلے کو رد کر سکے۔ "نُسَاۃ" عرب کی بے عنوانیوں اور اپنے اختیاراتِ تمیزی کے غلط استعمال کا گلہ نہ صرف اوراقِ تاریخ میں آج تک محفوظ ہے بلکہ قرآن نے اس شکوہ کو حیاتِ دوام عطا کر دی ہے، «یحلونه عاماً و یحرمونه عاماً»[5]

یہی وہ "نُسَاۃ" تھے جن کے ہاتھ میں اہلِ مکہ کا پورا نظامِ تقویم تھا اور یہی قمری ایام کو شمسی ایام میں تبدیل کر کے، ایامِ حج اور زیارتِ بیت اللہ کا زمانہ منقلب کرتے تھے۔

قمری شمسی تقویم کی بالکل ابتدائی غرض یہ ظاہر کی جا چکی ہے کہ مرکزی معبدوں پر ہدایا اور فصلی نذرانوں کی آمد میں دشواریاں نہ

---

[1] CHAMBERS ENCYCLOPAIDIA VOL ii P.641

[2] TALMUD TRACT SAMHEDRIN P. II ENCYCLOPAIDIA OF ISLAM VOL. III P. 586

[3] BIBLE DICTIONARY SMITH MOUTH

[4] ...... ویتولی ذالک النساۃ من کنانۃ المعروفون بالقلامیس واحد ھو قلمس وھوا لبحرالعزیم ابوثمامہ جنادہ بن عون بن امیہ بن قلع بن عباد بن قلع بن حذیفہ وکانوا کلھم نساۃ۔ آثار الباقیہ/۱۲

[5] قرآن ۹ : ۳۸

[6] دیکھئے ابن حبیب

ہوں، اور تمام اہم تہوار فصلوں اور موسموں سے مطابقت کرتے رہیں تاکہ مندروں کی سالانہ آمدنی بحال رہے۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکے کا معبد دنیا کے قدیم ترین معبدوں میں سے ایک تھا۔ عربوں کا دعویٰ تھا کہ اس کی بنیاد (تقریباً دو ہزار قبل مسیح میں) حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی، اس دعوے کی تائید قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی ہوتی ہے[1]۔ اور اگرچہ اس تصور سے بعض یورپی علماء کو انکار ہے[2]

تاہم کچھ صدائیں اس کی موافقت میں بھی بلند ہوئی ہیں، راڈویل (RODWELL) نے آیات (۲: ۱۲۷ وغیرہ) کی تشریح کرتے ہوئے ایک مستند مصنف کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ "اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی بھی معقول وجہ نہیں کہ کعبے کی بُنیاد اس طرح پڑی تھی جس طرح قرآن نے بیان کی ہے[3]" اس دعوے سے قطع نظر، مختلف شہادتوں سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مکے کے معبد کی تاریخ سنہ عیسوی سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی، ہیروڈوٹس HERODOTS نے جو چوتھی صدی قبل مسیح کا مصنف ہے "کعبے" کے معبد کا تذکرہ کیا ہے[4]۔ ڈائڈورس (DIODORUS SICULUS) نے سنہ عیسوی سے تقریباً پچاس سال پہلے اس عظیم مرکزی معبد کا پتہ دیا ہے[5] جس کی بنیاد پر میور MUIR اور پالمر (PALMER)[6] وغیرہ کعبے کی قدامت پر استدلال کرتے ہیں، بہرصورت یہ سب کو تسلیم ہے کہ مکے کا یہ مشہور معبد ظہورِ اسلام سے بہت پہلے پورے عرب کا مرکزی مندر بن چکا تھا اور جن ایام میں یہاں سالانہ اجتماع ہوتے تو پورا عرب ان کے احترام میں ہتھیار رکھ دیتا، مسلسل تین مہینے ہر قسم کی خونریزیاں رک جاتیں[7]، اور عرب کے گوشے گوشے سے حاجی یہاں پہنچنا شروع ہو جاتے۔

اپی فنیس (EPIPHENAS) عربی تقویم کے ایک مہینے کا نام (AGGATHUL "BAITH")[8] بیان کیا ہے جو غالباً ذوالحجہ[9] کی ایک شکل ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہاں اطراف و اکناف سے زائرین آتے اور تحائف لاتے، جن کے لیے سازگار موسموں کی ضرورت تھی۔ بلکہ میور (MUIR) کے خیال کے بموجب خود ان زائرین کی غذائی ضروریات[10] کے لیے فصلوں اور موسموں کا لحاظ ناگزیر تھا، اس بنا پر ظاہر ہے کہ یہاں شمسی تقویم کے بغیر چارہ نہ تھا، جو معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اجرامی پرستش میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور جس کو بالآخر قرآن نے کفر میں زیادتی کا موجب قرار دے کر ختم کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے:-

---

۱ قرآن: ۲: ۱۲۷ — ۲ MUIR-LIFE P.Cii — ۳ RODWELL-QURAN P.351

۴ 351 MUIR LIFE P.Cii.Ciii

۵ IBID Ciii — ۶ PALMER QURAN P XVI

۷ MARGOLIOUTH RISE P. 5 — ۸ ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM "HAJJ" P. 200

اگرچہ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ مہینہ کسی شمالی معبد کے حج سے متعلق ہوگا۔

۹ حج البیت کی شکل ہے۔

۱۰ MUIR LIFE P. C II

"بیشک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں "یوم خلق السمٰوٰت والارض" کے مطابق ۱۲ مذکور ہوتی ہے، جس میں سے چار حرام مہینے ہیں۔
یہی قائم رہنے والا دین ہے، سو ان مہینوں میں آپس میں ظلم نہ کرو .... بلاشبہ "نسی" کا مہینہ کفر میں زیادتی کا موجب ہے، اس سے کافر گمراہ ہوتے ہیں، علاوہ ازیں کسی سال اس کو حرام مہینہ قرار دیتے ہیں اور کسی سال اس کو حلال کر دیتے ہیں تاکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حرام مہینوں کی تعداد میں موافقت پیدا کریں، سو اُس مہینے کو حلال قرار دیتے ہیں، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔"

ان آیات کی تشریح میں اگرچہ بعض علمائے اسلام نے جو شاید اصول کبیسہ سے واقف نہ تھے، لفظ "نسی" کی ایسی تشریحات کی ہیں، جن سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ صرف حرام مہینوں کے حلال کر دینے کا ایک عجیب و غریب طریقہ تھا جو جاہل اور وحشی عربوں نے محض غارت گری کے لیے نکال لیا تھا، لیکن امام رازی نے آیاتِ بالا کی تشریح کرتے ہوئے جو اقوال لکھے ہیں، ان میں سب سے زیادہ قریب الفہم یہ ہے:-

......لوگوں نے یہ بات جان لی، کہ وہ اپنا حساب قمری سنہ پر مرتب کریں گے، تو حج کبھی گرمی میں جا پڑے گا اور کبھی سردی میں اور حاجیوں کے لیے سفر باعثِ مشقت تھے، اور وہ اُن سے کاروبار اور تجارت میں اس لیے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے، کہ دوسرے شہروں کے لوگ ایسے ہی اوقات میں آسکتے تھے، جو ان کے لائق اور موافق ہوں، اس لیے اُنھوں نے یہ سمجھ کر کہ معاملے کی بنیاد قمری سنہ پر رکھی جائے تو یہ دنیوی مصالح کے خلاف ہوگا، اس کو ترک کر دیا اور سالِ شمسی کا اعتبار کرنے لگے، چونکہ شمسی سال قمری سال سے ایک معین مدت کے بقدر زائد ہوتا ہے، اس بنا پر "کونڈ" کی ضرورت پڑی، اس کونڈ کے باعث اُنھیں دو باتیں حاصل ہوئیں۔

(۱) یہ کہ اُنھوں نے بعض سالوں کو اس بڑھوتری کو کھپانے کے لیے "۱۳" ماہ قرار دیا۔

(۲) یہ کہ حج بعض قمری مہینوں سے دوسرے مہینوں میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ (تفسیر کبیر ص ۴۳۴ - ۴۳۵)

اس تشریح سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک (یعنی ۹ھ تک) اہل مکہ میں یہ طریقہ رائج رہا، کہ وہ حسبِ ضرورت سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے اپنی قمری تقویم کو شمسی حسابات کے مطابق کر لیا کرتے تھے، جس سال یہ اضافہ ہوتا، وہ سال بجائے بارہ مہینے کے تیرہ (۱۳) مہینے کا شمار کیا جاتا جس کی ممانعت کا اعلان بعد میں قرآن مجید نے ان الفاظ میں ضروری سمجھا:

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک کتاب اللہ میں مہینوں کی تعداد صرف ۱۲ ہے۔"[1]

البیرونی نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عربوں کا یہ طریقہ بعض ایسے حسابات فلکی پر مبنی تھا کہ جب قمری سال شمسی سال سے بقدر ایک ماہ چھوٹا ہونے کو آتا تو اس میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے پھر شمسی بنا لیا جاتا۔

---

[1] ۹ : ۳۶

"اور زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اس بات پر نظر رکھتے تھے کہ ان کے سال اور شمسی سال میں کیا فرق ہے ؟ جو از روئے حساب دس[۱۰] دن اکیس[۲۱] گھڑی اور پانچ پل کا ہوتا اور جب وہ اپنے سنہ میں ایک ماہ کے بقدر ہو جاتا تو وہ اپنے سنہ میں ایک ماہ کا اضافہ کر دیتے، لیکن یہ عمل اس مفروضے پر کرتے تھے کہ فرق دس[۱۰] دن اور بیس[۲۰] گھڑی کا ہے، اس کام کی انجام دہی قبیلہ کنانہ کے "نُسَاۃ" جن کو قلامس کہا جاتا تھا، کرتے تھے[۱]"

البیرونی کے علاوہ دوسرے مورخین اور علمائے اسلام نے بھی عربوں کے طریقۂ نسی کی بہت کچھ وضاحتیں کی ہیں، جن کا تذکرہ میں بعد میں کروں گا، یہاں مجھے البیرونی اور البیرونی کے بعض متبعین کی ایک خاص تاریخی غلطی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ البیرونی کا خیال تھا کہ اہلِ مکہ نے ظہورِ اسلام سے تقریباً دو سو سال پہلے یہ طریقہ یہودیوں سے سیکھا تھا[۲]۔ چنانچہ میور MUIR نے شاید اسی خیال کو قبول کر کے اس پر اتنا اور اضافہ کر دیا کہ اہلِ مکہ بالالتزام ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے قمری ایام کی کمی پوری کر لیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کا سال شمسی سال کے مقابلہ میں بقدر ایک یوم چھوٹا رہتا ہے[۳]۔

یہ دونوں خیال تاریخی نقطۂ نظر سے بالبداہتہ غلط معلوم ہوتے ہیں۔ البیرونی کا قول تو خود آثار الباقیہ کی تصریحات سے غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربوں نے یہ طریقہ یہودیوں سے حاصل کیا تھا تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان دونوں کے طریقۂ حساب میں بھی مشابہت تھی، اور یہ دونوں ایک ہی اصول پر مبنی تھے، حالانکہ خود البیرونی نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس سال میں نو ماہ کا اضافہ کرتے تھے[۴]۔ جب کہ یہودیوں میں ہر انیس سال میں سات ماہ کے اضافے کا دستور تھا[۵]۔

رہا میور (MUIR) کا خیال کہ عرب ہر تیسرے سال (بلا کسی حسابی اُلجھاؤ کے) ایک ماہ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے، تاریخی اعتبار سے بالکل بے سند ہے، بلکہ اوراقِ تاریخ میں اس کے خلاف پیہم شہادتیں ملتی ہیں (جن کو آپ عنقریب ملاحظہ فرمائیں گے) یہاں البیرونی کی یہی شہادت کہ اہلِ مکہ ہر چوبیس[۲۴] سال میں نو ماہ کا اضافہ کرتے تھے، پیش کی جا سکتی ہے[۶]۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ENCYYCLOPAEDIA OF ISLAM) میں بھی یہی خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عربوں نے اپنا طریقۂ نسی یہودیوں سے حاصل کیا تھا جو نہ صرف عربوں میں بلکہ خود یہودیوں میں بھی ظہورِ اسلام کے وقت تک بے قاعدہ

---

[۱] آثار الباقیہ/۱۲

[۲] البیرونی کا قول ہے :- وکان اخذ ذالک من الیھود قبل ظھور الاسلام تقریب من مائتی سنۃ آثار الباقیہ/۱۲ نیز دیکھئے قانون مسعودی/۹۲

[۳] MUIR -- LIEF C II

[۴] ..... کانوا یکبسون کل اربع وعشرین سنۃ قمریۃ بتسعۃ اشھر" آثار الباقیہ/۱۲

[۵] آثار الباقیہ سخاؤ (SACHAW) /۱۳

[۶] آثار الباقیہ/۱۲

حسابات پر مبنی تھا۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ عربوں کے متعلق ہمارے بعض علماء کا یہ تصور کر وہ قطعاً جاہل اور ابتدائی علوم تک سے بے بہرہ تھے۔ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تاریخی مسائل کو حل کرتے وقت بھی اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ مستشرقین سے بھی یہی غلطی سرزد ہوئی اور عرب جاہلیت کے تمام نجومی تصورات جن کے حوالے اوراقِ تاریخ میں جگہ جگہ بڑی کثرت کے ساتھ موجود ہیں[۲] محض اس مفروضے پر نظر انداز کر دیئے گئے کہ ان میں ذاتی طور پر صلاحیتِ تقویم موجود نہ تھی۔

یہ اسی ابتدائی غلطی کا نتیجہ تھا کہ علمائے یورپ اس معمولی مسئلہ (مسئلۂ تقویم کو) حل نہیں کر سکے، حالانکہ جاہلی روایات و آثار کی مدد سے یہ بات اس وقت بھی ممکن تھی اور آج بھی ممکن ہے۔ اس بات کی تردید کہ عربوں کا طریقۂ نسی محض یہودیوں کی بے ضرر تتبع و تقلید پر مبنی تھا، خود قرآن مجید کے ان الفاظ سے ہو جاتی ہے:۔

"بلا شبہ نسی کفر میں زیادتی کا موجب ہے، ایک سال اس کو حلال کر دیتے ہیں اور ایک سال حرام۔"[۳]

جس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسی کا یہ طریقہ کفر و شرک میں زیادتی کا موجب تھا اور اس میں یہودیت کی بجائے اجرام پرستی کے عناصر اور مشرکانہ خیالات کو بڑا دخل تھا جو اس وقت پورے عرب پر چھائے ہوئے تھے۔

جاہلی عربوں کی ذہنی تاریخ کے ابتدائی اوراق سے لے کر آخری سطور تک اس بات کی شاہد ہیں کہ تمام سامی قوموں کی طرح ان میں اجرام سماوی کی پرستش کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل رہا ہے۔[۴] کتبات اور تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب چاند، سورج، عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ، زحل، شعریٰ (عشتار) نسر[۵] حتیٰ کہ منازل[۶] قمر تک کی پرستش کرتے، ان کی عیدیں مناتے اور زرعی و حیوانی پیداواروں میں اُن کے حصے مقرر کرتے تھے۔[۷] تقریباً تمام بڑے بڑے معبود، آسمانی معبود تھے۔ لات[۸]، مناۃ اور عزیٰ کی تثلیث غالباً اجرامی تثلیث تھی، ہبل شمسی دیوتا تھا۔[۹] سورج کی پرستش بڑے قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھی، جس کی تصدیق قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح تقریباً سب کے سب مندر اجرام فلکیہ کے ہیکل ثابت ہوتے ہیں۔ بیتِ غمدان کو زہرہ کا ہیکل بتایا

---

[۱] ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL III P. 856

[۲] ENCYCLOPAEDIA OF RELEGION AND ETHICS P. 660

[۳] قرآن ۹ : ۳۷ [۴] خود سر ولیم میور کا بھی خیال ہے کہ عربوں میں صابیت یا ستارہ پرستی کا رواج نہایت قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی رائے میں کعبے کا سات بار طواف اسی ستارہ پرستی کی سنت ہے۔ نیز ملاحظہ ہو۔

ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS P. P3660 ARABS ANCIENT

[۵] ان سب کے لیے دیکھیے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I ARABS.

[۶] کتاب الاصنام محمد احمد زکی پاشا [۷] ایضاً ذکر عمیانس /۴۳ [۸] ROBERTSAN SMITH 56.

[۹] ROBERTSAN SMITH RELIGION OF SMITIS

جاتا ہے[1]

"ذوالخلصہ" اور "طائف" کا بیت اللات شمسی ماتا دیوی لات کا مندر تھا[2]۔ خود بنائے ابراہیمؑ یعنی کعبے کے متعلق یہ تصورات تھے کہ یہ حقیقتاً زحل کا ہیکل تھا جس کو بانی اول نے مخصوص طوالع میں تعمیر کیا تھا[3]۔

قطع نظر اس سے نہایت ہی قدیم زمانے سے لے کر ظہورِ اسلام تک عربوں میں ادیانِ شمسیہ کے آثار جگہ جگہ پائے جاتے ہیں؛ قرآن مجید کی شہادت کے بموجب "ملکۂ سبا" "آفتاب پرست تھی[4]۔ مؤرخین عرب قوم سبا کے مورث کا نام عبدالشمس بتاتے ہیں[5]۔ عہدِ رسالت تک بنو تمیم سب کے سب آفتاب پرست تھے[6] اور ان کے یہاں آفتاب کا ایک علیحدہ مندر بھی موجود تھا۔ "بنو اُد"، بنو ضبہ، ثور، عدی، عکل اور ثور سب کی پرستش کرتے تھے[7] اور شاید بنو اُد کا سلسلہ نسب بھی سورج دیوتا سے ملتا تھا کیونکہ زمانۂ قدیم میں اُد (ADAD)[8] سورج کو کہا جاتا تھا، خود قریش کے مشاہیر اور اجداد میں اُد اور عبدالشمس جیسے نام ملتے ہیں۔

یونانیوں کا مشہور دیوتا "اپالو" (APOLO) تھا جو سورج کا مظہر خیال کیا جاتا تھا، اس کی ماں کا نام "لیٹو" (LETO) یا لیٹونا (LETONA) مشہور ہے، موجودہ زمانے کے علماء کا فیصلہ ہے کہ ان دونوں دیوتاؤں کی اصلیت عرب ہے، جو ریگستانِ عرب سے سفر کر کے یونان پہنچے تھے[9]۔ ان علما کی رائے میں اپالو (APOLO) "ہبل" کی بگڑی ہوئی صورت ہے اور لیٹو (LETO) لات کا یونانی تلفظ، مکے میں اسی سورج دیوتا کی قیمتی مورتی جو عقیق سُرخ کی بنی ہوئی تھی، عین خانۂ کعبہ میں سب سے بلند مقام پر رکھی تھی، اور اس کے جلو میں لات، منات، عزیٰ کی اجرامی مورتیاں نصب تھیں[10]۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت خود کعبہ "بیت اللہ"

---

[1] ...... "ومنها بیت غندان الذی بمدینة صنعا الیمن بناہ ضحاک علی اسم الزهره" شہرستانی/۴۳۲۔

[2] لات کے لیے دیکھیے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM – VOL. III P. ... SMITH S P. ...70.

[3] ...... "وبهذا انعرف کذب من قال ان بیت الله الحرام انما هو بیت زحل بناہ البانی الاول علی طوالع معلومة واتصالات مقبولة وصاع ببیت زحل"، شہرستانی/۴۳۱ [4] قرآن ٭ [5] ابن حبیب/۳۶۴

[6] ابن حبیب/۳۱۶ [7] ... M. RAGOZIN CHALIDIA P-171 [8] دیکھیے ابن خلدون ۱/۳۲۳

[9] BUT WE MAY POINT OUT IN CONCLUSION THAT IN ALL PROBATUS THE GREEKS BORROWED FROM ARABIA AT AN CARLY PERIOD THRONGH SOUTH ARABIAN IN CENCE MERCHENTS THERE APOLLO AND HIS MOTHER LETO (LATIRFORM) LONTONA- (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL I P. 380

[10] یاقوت ۸/۴۴۳ نیز دیکھیے ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM VOL II 327

[11] ابوعبیدہ کا بیان ہے "كانت اللات والعزى ومناة اصناماً من حجارة فى جوف الكعبة" مثیر العزم ابن جوزی/۱۱۲

سے زیادہ "بیت الاجرام" بنا ہوا تھا۔

بخاری میں ہے کہ فتح مکہ سے پہلے کعبے کے گرد (۳۶۰) مورتیاں نصب تھیں[۱]۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عین مطاف کے اندر تھیں اور سیسہ پلا کر جما دی گئی تھیں[۲]۔ جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ مورتیاں پتھر کی نہ تھیں بلکہ فلزی چھوٹے چھوٹے اصنام تھے جن کو کعبے کے گرد نصب کیا گیا تھا، اوّل تو یہ "۳۶۰" کا عدد جس سے خود بخود ہمارا ذہن، ایک دائرہ یا کرۂ فلکی کے (۳۶۰) درجات کی طرف منتقل ہوتا ہے (جس میں سورج کی گردش ہوتی ہے) دوسرے یہ کہ ان مورتیوں کے عین وسط میں "ہُبل" یعنی سورج دیوتا کی مورتی کا ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ غالباً ان سب کا تعلق دائرۂ فلکی ہی سے تھا، جو اجرام پرستوں کے طواف کے لیے ایک مقدس "نشانِ راہ" کا کام دیتے تھے،

ظہورِ اسلام کے وقت عربوں میں فلکیات کا درک اچھا خاصا نظر آتا ہے، چنانچہ ان کتابوں سے قطع نظر جن میں خاص طور پر اسی موضوع پر بحث کی گئی ہے، خود قرآن مجید سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ جاہلی عربوں میں نجومی ادراکات بہ ہمہ وجوہ موجود تھے اور اگرچہ اس مقدس کتاب نے جاہلی عربوں کے علوم و فنون اور ارتقائے تہذیب و تمدن کے موضوع کو نہیں چھوا ہے، تاہم جس طرح ہر کتاب میں اپنے عہد اور ماحول کی کچھ نہ کچھ عکاسی ہوتی ہے اور ایسی باتیں آجاتی ہیں جو اس زمانے میں بیشتر رائج اور متداول ہوتی ہیں، اسی طرح قرآن میں بھی، بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں، جن کا تعلق جاہلی سماج کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے تھا چنانچہ اپنے عہد کے علوم فلکیہ کے متعدد حوالے قرآن میں موجود ہیں۔

مثلاً قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ عرب نہ صرف منطقۃ البروج سے واقف تھے[۳]۔ بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں سورج اور چاند کس طرح حرکت کرتے ہیں[۴]؟ اور مستقر الشمس کہاں ہے[۵] یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ منجمین عرب سورج کے دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں[۶] یعنی سرمائی اور گرمائی مطلع سے واقف تھے، (گویا خطوط جدی اور سرطان کا انھیں علم تھا) سیاروں کی اُلٹی اور سیدھی[۷] رفتار (استقامت اور رجعت) سمجھنا مشکل ہے، مگر وہ سمجھتے تھے، آسمان پر سبع سیارگان کے[۸] مدار الگ الگ ہیں، ان مداروں سے عربوں کو پوری واقفیت تھی، اور غالباً اسی وجہ سے انھوں نے افلاک کی تعداد سات قرار دی تھی جس کو "سبع طرائق[۹]" یعنی (سات راستے یا مدار) بھی کہا

---

[۱] بخاری / تجرید بیان فتحِ مکہ   [۲] ابن ہشام ۴/۵۹

[۳] قرآن: ۱:۸۵، ۶۱:۲۵، ۱۶:۱۵، علمائے لغت کے نزدیک لفظ "بروج" بَرَج سے مشتق ہے جس کے معنی "ظاہر ہونا" ہیں۔ (دیکھئے بیضاوی نیز لسان العرب ۳/۳۳) لیکن بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اس کی اصل یونانی یا لاطینی (BURGUS) ہے جو فصیلِ شہر کے منارہ کو کہتے تھے۔ (JEFFRY 78) اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی جاہلی علم ہیئت و نجوم پر یونانی اثرات موجود تھے۔

[۴] ۲۵ : ۶۱   [۵] ۳۶ : ۳۸ - نیز دیکھئے کتاب الانوار   [۶] ۵۵ : ۱۷، نیز دیکھئے کتاب الانوار / ۱۴۱ -

[۷] قرآن ۸۱ : ۱۶   [۸] ۲۳ : ۱۷ ؛

جاتا تھا، ان آسمانوں میں سے ایک کو ہماری زمین سے منطق قرار دیتے تھے[1]۔ غالباً یہ بات بھی اُن کے علم میں تھی کہ "کسوفِ شمسی" اجتماع نیرین[2] کا نتیجہ ہوتا ہے۔ "مواقع النجوم"[3] یا دوسرے الفاظ میں اُن عقدوں سے بھی واقف تھے جن سے خاص خاص ستارے شناخت کئے جاتے ہیں، علم نجوم کا آخری یا شاید پہلا شاہکار جنم کنڈلیاں[4] اور زائچہ سازی ہے، عرب اس معاملے میں بھی پیش پیش تھے اور انسانی قسمتوں کو گردشِ افلاک سے وابستہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سمندر میں جہاز رانی اور صحرا میں شتربانی دونوں یکساں حیثیت رکھتی ہیں اہل عرب ان دونوں کو سر کرنے میں "قطب" اور دوسرے ستاروں سے مدد لیتے[5]۔ منازلِ قمر یا الزائچہ فلکیہ کا علم تو شاید بہت ہی صحیح تھا، کیونکہ ہر شخص کی ضروریات اُن سے وابستہ تھیں اور تقویم کا کلیتہً مدار انھیں پر تھا[6]۔

خود قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کی تقویم پورے طور پر، بروج اور منازلِ قمر سے وابستہ تھی اور کیوں نہ ہوتی، اس لیے کہ ان کی تمام تر عبادات کا انحصار مخصوص طوالع، صحیح اوقات اور مقررہ ساعتوں پر تھا، قرآن مجید میں ہے :۔

"مبارک ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بُرج بنائے، اور ان میں سراج یعنی سورج، اور نورانی چاند کو مقرر کیا" (۲۵ : ۶)

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک سورج اور چاند بروجِ فلکی میں مقررہ حرکتیں کرتے رہتے تھے،
ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے :۔

"اور چاند کے لیے ہم نے ٹھیک اندازہ کے مطابق منازل مقرر کر دیں، حتّٰی کہ وہ سُوکھی ٹہنی کی شکل میں عود کرتا رہتا ہے" (ہلال کی شکل اختیار کر لیتا ہے) (۳۶ : ۳۹)

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک چاند کی مختلف شکلیں (ہلال سے لے کر بدر تک اور بدر سے لے کر دوسرے ہلال تک) انھیں منازل کے اندر مقررہ حسابات کے تحت تبدیل ہوتی رہتی تھیں، تیسری جگہ ان منازل سے سنین اور شہور کا تعلق نہایت ہی واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے :۔

"(اللہ کی ذات) وُہ ہے، جس نے سُورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا، اور اس کی منزلیں ٹھیک اندازے کے مطابق مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب جان سکو" (۱۰ : ۵)

جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ عربوں میں ماہ و سال نہ تو میٹونی دور (MOTONIE CYCLE) کے پابند تھے، اور نہ ان میں یہودیوں کے طریقۂ کبیسہ کی کوئی منزلت تھی، بلکہ عربی سنین و شہور کا تعلق صرف بروج اور منازلِ قمر کے صحیح حسابات پر تھا، یعنی ہندوؤں کی طرح راسوں اور نچھتروں پر جس کی وجہ سے ان کے حسابات کو زیادہ صحیح ہونا چاہیئے۔

دنیا کی مشرک قوموں میں اجرامِ سماوی کی پرستش کرنے والوں کو ایک خاص وجہِ امتیاز حاصل ہے، جو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگر دیکھا جائے تو ان کے عجیب و غریب توہمات نے ہمارے موجودہ علم ہیئت کی بنیاد آج سے ہزاروں سال پہلے

---

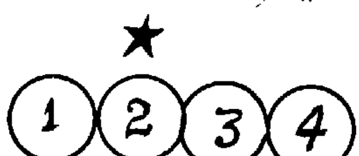
[1] ۳۷ : ۶ [2] ۷۵ : ۸ [3] ۵۶ : ۷۵ [4] ۵۵ : ۵، ۴۸ : ۶ [5] ۶ : ۹۷ [6] ۱۰ : ۵

رکھ دی تھی، نہ صرف یہ کہ سورج اور چاند کی سالانہ رفتار، منازلِ قمر کا پورا پورا البعد، بروج میں نیّرین کے ٹھیک ٹھیک مقام دریافت کرنے کے اصول، کسوف و خسوف دریافت کرنے کے قاعدے، سیاروں اور ستاروں کے سالانہ اُتار چڑھاؤ انھیں لوگوں نے دریافت کئے، بلکہ موجودہ علمِ ہیئت کے ۸۰ فی صدی اصول آج بھی وہی ہیں جو ہزاروں سال پہلے رائج کر دیئے گئے تھے۔

"بروج" اور "منازل" کی تقویمی افادیت سمجھنا کچھ زیادہ پیچیدہ یا مشکل مسئلہ نہیں، اور اگر ہم طلوعِ فجر سے کچھ پہلے یا غروبِ آفتاب کے کچھ بعد (ایک خاص وقت مقرر کر کے) اس بات کا مشاہدہ شروع کر دیں کہ اُفقین اور سمت الراس پر کون کون ستارے موجود ہیں اور ان ستاروں کو اچھی طرح شناخت کر لیا جائے تو چند ہی روز میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان ستاروں کے ارتفاع میں مسلسل فرق پڑ رہا ہے اور ان کے مقامات پیہم تبدیل ہو رہے ہیں۔ مشرق سے کچھ نئے ستارے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے اور مغرب میں ان کے متقابل ستارے دیکھتے دیکھتے غروب ہو جائیں گے، سمت الراس پر آج جو ستارے تھے، وہ چند ہی روز میں مغرب کی جانب جھکے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ مشاہدہ اگر مسلسل جاری رہے تو اُفقین اور سمت الراس پر ستارے بالکل بدل جاتے ہیں، اور جن ستاروں سے مشاہدہ شروع کیا گیا تھا وہ کہیں سے کہیں نکل چکتے ہیں اور ساتھ ہی موسم بھی بدلتا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً موسمِ بہار میں جو ستارے غروبِ آفتاب کے وقت اُفقِ مشرق کے قریب نظر آتے ہیں وہ موسمِ گرما میں شام کے وقت سمت الراس میں پہنچ جاتے ہیں اور ان کی جگہ کچھ نئے ستارے طلوع ہونے لگتے ہیں۔ اُفقِ مغرب میں جو ستارے تھے، وہ بالکل نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ وہ ستارے لے لیتے ہیں جو سمت الراس میں مشاہدہ کئے گئے تھے، اس سے اگر ایک طرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سورج ستاروں میں اپنا مقام بدلتا رہتا ہے تو دوسری جانب یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسی تبدیلی کا اثر موسموں اور فصلوں پر بھی پڑتا ہے۔

اگر دن کے وقت ستارے نظر آسکتے تو سورج کی یہ حرکتِ مجازی ایک ہی دن میں نظر آجاتی، فرض کیجئے کہ ۲۰ اگست کی صبح کو ہمیں قلب الاسد (REGULUS) نظر آسکتا تو ہم دیکھتے کہ سورج تارے سے تھوڑا جنوب و مغرب کو ہے، یہ مشاہدہ اگر تمام دن جاری رہتا تو شام کو ستارہ سورج سے شمال میں نظر آتا۔



دوسرے دن صبح کو سورج ہمیں ③ پر نظر آتا اور شام ہوتے ہوتے ④ پر پہنچ جاتا[1]۔ اس طرح کچھ ہی دن میں سورج اور ستارے کا بُعد بڑھتے بڑھتے کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا۔

چونکہ سورج دن بھر میں اپنے قطرِ مرئی کے برابر فاصلہ طے کر لیتا ہے اس لیے سورج کی ستاروں میں یہ رفتار آسانی سے نظر آسکتی

---

[1] ہیئتِ جدید ۱۵/۱

02062

تھی، لیکن مشکل یہ ہے کہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے سورج کا صحیح مقام دریافت کرنے کے لیے دوسرے وسائل اختیار کرنا پڑتے ہیں تاکہ فصلی پیش بینی سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

قدیم قوموں نے اس سلسلے میں متعدد طریقے اختیار کیے تھے جن میں سب سے زیادہ سہل طریقہ یہ تھا کہ چاند کی مختلف رویتوں کے ذریعہ سورج کا صحیح مقام دریافت کیا جائے کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص اور قریبی تعلق ہے۔

ستاروں میں سورج جس راستے سے گزرتا نظر آتا ہے اُسے اصطلاحاً طریق الشمس یا مدار شمسی (ECLIPTIC) کہا جاتا ہے، یہ راستہ کرۂ فلکی میں ایک "دائرۂ عظیمہ" (GREAT CIRCLE) بناتا ہے جس کو سورج پورے ایک سال یعنی (۲۴/۱ - 365) دن میں طے کرتا ہے، مدار شمسی کے اردگرد جو "مجامع النجوم" ہیں ان کو "بروج" کہا جاتا ہے، جاہلی منجمین نے منطقۃ البروج ZODIACAL BELT کو ۱۲ مہینوں کی مناسبت سے ۱۲ حصوں میں تقسیم کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ سورج ہر "بُرج" میں ایک ماہ رہتا ہے، ان بروج کے نام حسب ذیل تجویز کیے گئے تھے:۔

(۱) حمل (۲) ثور (۳) جوزا (۴) سرطان (۵) اسد (۶) سنبلہ (۷) میزان (۸) عقرب (۹) قوس (رامی) (۱۰) جدی (۱۱) دلو (۱۲) حوت[1]۔

چونکہ چاند کا مدار، مدارِ شمسی سے تھوڑا مختلف ہے اور کچھ اس طرح واقع ہے کہ یہ دونوں مدار ایک دوسرے پر پانچ درجے کا زاویہ بناتے ہیں، اس لیے مدارِ قمری، مدارِ شمسی کو دو مقامات پر قطع کرتا ہے یہ دونوں مقام عقدتین (NODS) کہلاتے ہیں، عرب ان میں سے ایک عقدے کو "راس" اور دوسرے کو "ذنب" کہتے تھے، جس نقطے پر چاند "منطقۃ البروج" کے جنوب سے شمال کو گذرتا ہے اس کو "راس" کہا جاتا ہے اور دوسرے کو "ذنب" چاند اپنی ماہانہ گردش میں ۱۴ دن منطقۃ البروج سے شمال کی جانب رہتا ہے، اور ۱۴ دن جنوب کی طرف، علاوہ ازیں سورج اور چاند کی رفتار میں بھی بیّن فرق ہے، یعنی سورج جتنا فاصلہ ۱۳ دن میں طے کرتا ہے چاند اسی فاصلے کو تقریباً ایک دن میں ختم کر لیتا ہے۔ اس لیے منجمینِ عرب نے چاند کی یومیہ رفتار کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی منزلیں علیحدہ مقرر کی تھیں۔ یہ منزلیں بھی اگرچہ منطقۃ البروج ہی کے بعض مخصوص ستاروں کو انتخاب کرکے مقرر کی گئی تھیں، لیکن عربوں نے ان کی تعداد ۲۸ قرار دی تھی، گویا ہر برج میں ۲⅓ منزلیں شمار کی جاتی تھیں، ان منازل کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شرطان (۲) بطین (۳) ثریّا (۴) دُبران (۵) ہقعہ (۶) ہنعہ (۷) ذارع (۸) نثرہ (۹) الطرف (۱۰) جبھہ (۱۱) زبرا، (۱۲) صَرفہ (۱۳) اعوا (۱۴) سماک (۱۵) عفزا (۱۶) زبانی (۱۷) اکلیل (۱۸) قلب (۱۹) شولہ (۲۰) نعائم (۲۱) بلدہ (۲۲) سعد ذابح (۲۳) سعد بلع، (۲۴) سعد السعود (۲۵) سعد الاخبیہ (۲۶) فرغ مقدم (۲۷) فرغ موخر (۲۸) رشا[2]

جاہلی منجمین کی تصریحات کے بموجب سورج سال بھر میں ان منازل کو اس طرح طے کرتا تاکہ سوائے "جبھہ" کے ہر منزل میں ۱۳ دن لگتے،

---

[1] کتاب الانواء ۱۲۱ کتاب الازمنۃ والامکنۃ ۱/۷۰ نیز دیکھیے مخصص ابن سیدہ ۹/ ۱۲، ۱۴؛

[2] کتاب الانواء ۱۲، آثار الباقیہ (سخاؤ) ۱/ ۳۵۱، ۳۵۲۔ الازمنۃ والامکنۃ ۱/۱۸۹ مخصص ۹/۹؛

صرف "جبھہ" میں ۱۴ دن شمار کئے جانے تھے[1] جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک شمسی سال عمومی طور پر ۳۶۵ (تین سو پینسٹھ) دن کا تسلیم کیا جاتا تھا[2] کیونکہ ۲۸ منازل کو اگر ۱۳ دن سے ضرب دی جائے اور جبھہ کا ایک دن بڑھا دیا جائے تو جواب تین سو پینسٹھ (28 X 13 + 1 = 365) سے آئے گا۔

یہ گویا منجمین جاہلیت کا نجومی سال تھا جس کا تعلق رویتِ ہلال سے نہ تھا، تاہم اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ان کے سالانہ حسابات کا مدار محض سورج کی گردشوں پر تھا اور قمری مہینے رائج نہ تھے بلکہ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ منجمینِ جاہلیت خود سورج کے صحیح مقام کا اندازہ چاند کی مختلف رویتوں کے مشاہدے سے کرتے تھے کیونکہ چاند کے منور حصے کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ کا چاند ہے؟ اور سورج اور چاند میں اس وقت کتنے درجے کا بُعد ہو چکا ہے۔

مثال کے طور پر چاند بحالتِ بدر سورج کے عین بالمقابل تقریباً ۱۸۰ درجے کا زاویہ مستقیم بناتا ہے۔ سات یا آٹھ تاریخ کو اس کی شکل "دو نیم" ہو جاتی ہے جس کو اصطلاحاً "تربیع" کہتے ہیں اور سورج، چاند اور زمین کا زاویہ تقریباً ۹۰ درجے کا ہوتا ہے، اسی طرح ۳ تاریخ کو سورج اور چاند کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۴۰ درجے کا ہوتا ہے، اس لیے چاند جب کسی تاریخ کو ان منازل میں نظر آئے گا تو ہم چاند کے صرف منور حصے اور اس کے گرد و پیش کے ستاروں کو دیکھ کر سورج کا صحیح مقام دریافت کر سکتے ہیں اور پوری طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت سورج کس برج یا منزل میں موجود ہے جس کے نتیجے میں موسمی اور فصلی کیفیات کیا ہونا چاہئیں، چنانچہ ابن قتیبہ، مرزوقی اور البیرونی وغیرہ نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ منجمینِ عرب ان نچھتروں کی مدد سے موسمی حالات اور فصلی تبدیلیوں کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے تھے اور ان کی تمام تر فصلی اور موسمی پیشین گوئیوں کا انحصار انھیں منازل یا انواء فلکیہ کے مشاہدات پر تھا۔

مثلاً اعتدالین (EQUINOXES) کا اندازہ وہ منزل شرطان کے طلوع اور سکوت سے لگاتے تھے جو ان کے نزدیک پہلی نوء تھی، جب سورج اس نوء میں داخل ہوتا تو یہ اعتدالِ ربیعی VERNAL EQUINOX کا زمانہ سمجھا جاتا، اور جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں قدم رکھتا تو اعتدالِ خریفی AUTUMNAL EQOINOX کا، ـــ دونوں حالتوں میں دن رات برابر تسلیم کئے جاتے۔ چنانچہ ایک منجم کہتا ہے:۔

"اور جب سورج شرطان میں داخل ہوتا ہے تو زمانہ اعتدال ہوتا ہے، اور دن رات برابر ہو جاتے ہیں"[3]

ایک اور جاہلی منجم کا قول ہے:۔

جب شرطان طلوع ہوتی ہے تو زمانہ مساوی ہو جاتا ہے"[4]

---

[1] کتاب الانواء/۷، قزوینی عجائب/۴۲ ، [2] ...... قال ابو اسحٰق الزجاجی ان السنة اربع اجزاء کل جزء منها سبعة انواء، کل نوء منها ثلاثة عشر یوماً ویزداد فیها یوماً لتتم السنة ثلثمائة وخمسة وستین یوماً وهو المقدار قطع الشمس فلک البروج۔ قزوینی/۵۱ (4×7×13+1 = 365)

[3] ...... فاذا حلت الشمس بینهما اعتدال الزمان واستوی اللیل والنهار۔ قزوینی/۴۲ ،

[4] "اذا طلع الشرطان استوی الزمان" ابن قتیبہ/۱۸

عربوں کے نزدیک "شرطان" بُرجِ حمل" کے ابتدائی تاروں کا نام ہے، بلکہ یوں کہیئے کہ برجِ حمل کی ابتدا اسی "شرطان" سے ہوتی تھی، ہیئت دان کہتے ہیں کہ یکشنبہ ۲۲ مارچ ۲۸۵ء کو ۲۳ بجکر ۱۸ منٹ پر (انڈین اسٹینڈرڈ ٹائم کے بموجب) "نقطۂ اعتدالِ ربیعی" (VERNALE QUINOX) اور "راس الحمل" (FIRST POINT OF AROIS) یعنی "شرطان" ایک دوسرے سے بالکل مطابق تھے[1]

اس پر اتنا اور اضافہ کیجئے کہ موجودہ حسابات کی روشنی میں بھی سورج ۲۱ مارچ کو نقطۂ اعتدالِ ربیعی پر ہوتا ہے اور ابن قتیبہ نے سورج کے شرطان میں داخلے کی تاریخ بھی یہی بیان کی ہے:۔

"اور آفتاب کا شرطان میں داخلہ ماہ آزار (یعنی مارچ) کی بیس راتیں گزار کر ہوتا ہے[2]"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربوں کا مندرجہ بالا اصول کہ سورج جب "شرطان" میں داخل ہوتا ہے تو دن رات برابر ہو جاتے ہیں، شاید ۲۸۵ء کی یادگار ہے، جب کہ نقطۂ اعتدالِ ربیعی اور منزلِ شرطان میں بُعد نہ تھا[3] اس خیال کی تصدیق خود البیرونی کی اس شہادت سے ہوتی ہے کہ شرطان سے منازلِ قمر کی ابتدا صرف عرب کرتے تھے ورنہ دوسری قوموں میں ثریا سے ابتداء کی جاتی ہے[4]

عرب طلوع اور سقوط "شرطان" دونوں سے حساب لگاتے تھے کیونکہ جب چاند بحالتِ بدر اس منزل میں داخل ہوتا تو پھر دن رات برابر ہو جاتے، اس وقت سورج، چاند کے عین بالمقابل برج میزان میں ہوتا یعنی ۲۲ ستمبر کو جو "اعتدالِ خریفی" (AUTUMNAL EQUINOX) کا زمانہ ہوتا ہے اور یہی سقوط "شرطان کا زمانہ سمجھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان منازل کی ترتیب اور تعین میں جاہلی عربوں نے نہایت ہی صحیح فلکی حسابات کو پیش نظر رکھا تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے یہاں منطقۃ البروج کو دائرے کی شکل میں پیش کیا جائے جس میں سورج اور چاند گردش کرتے ہیں۔

اور جو ابن قتیبہ اور مرزوقی وغیرہ کی صراحتوں کے بموجب بروج اور منازل قمر دونوں پر مشتمل ہو تاکہ آنے والے مباحث کے سمجھنے اور تقویم سازی میں آسانی ہو سکے، اور ہم سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کو پیش نظر رکھ کر یہ اندازہ لگا سکیں کہ جاہلی منجمین ان انوا

---

[1] THE INITAL POINT OF NIRAYANA OR SIDEREAL ZODIAE COINCIDED WITH THE MEAN EQUINOCTIAL POINT (VIZ THE FIROR POINT OF AREIS) OF THE MEAN VERNAL EQUINOX DAY OF 285 A.D. WHICH OCCURRED ON SUNDAY MARCH 22, 23 18 I.S.T. OF THAT YEAR ALMANAE 1962 ~~PREFACE~~ PAGE 2

[2] ..... وحلول الشمس بینهما العشرین لیلة تخلو من اذار" ابن قتیبہ ۱۸/ نیز دیکھئے قزوینی ۴۲/ مرزوقی ۱/ ۱۷۷

[3] آجکل ان بروج کے مقامات تبدیل ہو چکے ہیں اور بُرجِ حمل نے حوت کی اور حوت نے دلو کی جگہ لے لی ہے، علیٰ ہذا القیاس ہر برج اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے۔ [4] آثار الباقیہ (سخاؤ) / ۳۴۲۔

کے طلوع و سقوط سے موسموں اور فصلوں کا ادراک کس طرح کر لیا کرتے تھے۔

ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ ہر بُرج میں حسبِ ترتیب ذیل ۲ ۱/۳ منزلیں تسلیم کی جاتی تھیں:۔

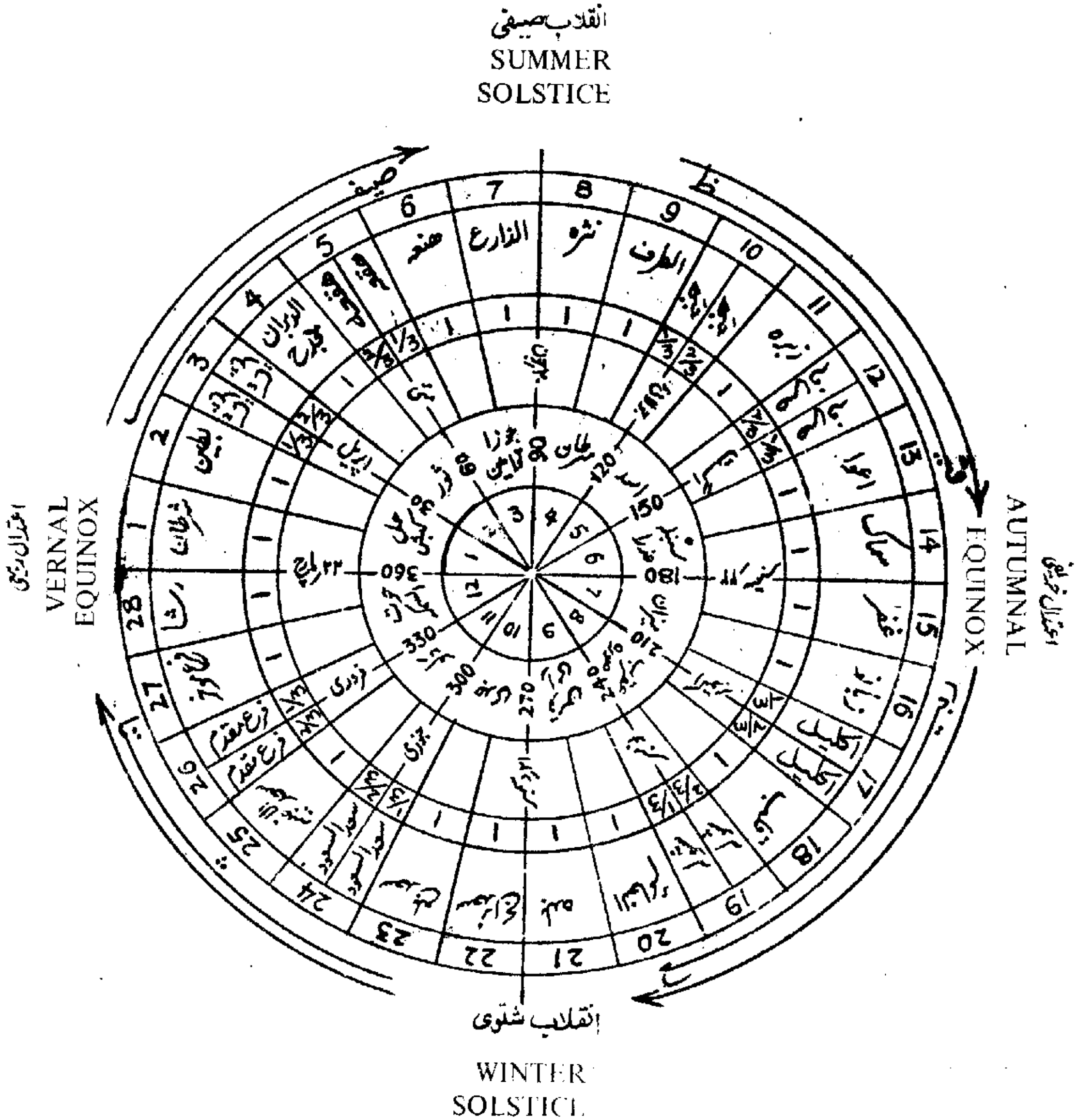
۱۔ برج حمل میں :——— شرطان، لبطین، اور ۱/۳ ثریّا
۲۔ " ثور " :——— ۲/۳ ثریا، دبران " ۲/۳ ہقعہ
۳۔ " جوزا " :——— ۱/۳ ہقعہ، ہنعہ " ذارع
۴۔ " سرطان " :——— نثرہ، الطرف " ۱/۳ جبھہ
۵۔ " اسد " :——— ۲/۳ جبھہ، زبرہ، اور ۲/۳ صرفہ
۶۔ " سنبلہ " :——— ۱/۳ صرفہ، اَعوا، اور سماک
۷۔ " میزان " :——— عفرا، زبانی اور ۱/۳ اکلیل
۸۔ " عقرب " :——— ۲/۳ اکلیل، قلب اور ۲/۳ شولہ
۹۔ " قوس " :——— ۱/۳ شولہ، لغائم اور بلدہ
۱۰۔ " جدی " :——— سعد زابح، سعد بلع اور ۱/۳ سعد السعود
۱۱۔ " دلو " :——— ۲/۳ سعد السعود، سعد الاخبیہ اور ۲/۳ فرغ مقدّم
۱۲۔ " حوت " :——— ۱/۳ فرغ مُقدّم، فرغ مؤخّر اور رشا[۱]

اس صراحت کی روشنی میں اگر ہم برج حمل سے لے کر برج حوت تک ان انواء کو دائرے کی شکل میں پیش کریں تاکہ ہر برج اور ہر نوء کے متقابل ستارے دریافت کئے جاسکیں تو اس کی صورت یہ ہو گی (دیکھئے صفحہ)

چونکہ شرطان میں سورج کا داخلہ عرب منجمین کے نزدیک ۲۱ مارچ کو ہوتا تھا اس لیے میں نے دوسرے برج میں سورج کے داخلے کی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں۔

اس دائرے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کو علم نجوم میں کافی ادراک تھا۔ چنانچہ ابن قتیبہ، مرزوقی، قزوینی، اور خود البیرونی نے بھی ان انواء کے طلوع اور سقوط کے موسمی اور فصلی اثرات اور ان کے ذیل میں جاہلی منجمین کے دلچسپ مُسجّعات اور مختلف خارموں نے نقل کر کے صفحے کے صفحے رنگین کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کے حسابات اور خارمے کس درجہ صحیح تھے، میں یہاں ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

۱؎ کتاب الانوار / ۱۲۱


انقلاب صیفی
SUMMER
SOLSTICE
اعتدال ربیعی
VERNAL
EQUINOX
اعتدال خریفی
AUTUMNAL
EQUINOX
انقلاب شتوی
WINTER
SOLSTICE

البیرونی نے اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے، کہ جاہلی عرب ان الوآ سے موسموں کا اندازہ کس طرح لگاتے تھے۔ ایک جاہلی منجّم کا قول اس طرح پیش کیا ہے:۔

"جب چاند بحالتِ بدر ثریا میں ہو تو "شتا" کی ابتدا ہوتی ہے۔[1]"

اس کی تشریح کرتے ہوئے خود البیرونی نے لکھا ہے کہ جب چاند ثریا میں بحالت بدر ہوگا، اس وقت سورج سمت مخالف میں برج عقرب میں ہوگا۔ (یعنی آخر اکتوبر میں، یہ سردیوں کی ابتداء کا زمانہ ہے)

البیرونی نے ایک اور قول اس طرح نقل کیا ہے:۔

"جب چودہ تاریخ کا چاند دبران کے پاس پہنچے تو موسم سرما کل زمین کو لپیٹ لیتا ہے۔[2]"

اس کی تشریح یوں کی ہے کہ چاند بحالتِ بدر دبران میں ہوگا تو سورج اس وقت برج عقرب میں اٹھارہویں منزل یعنی قلب عقرب کے پاس ہوگا، اور پوری دنیا میں موسم سرما کی آمد آمد ہو جائے گی، یعنی ابتداء نومبر میں (دیکھئے دائرۂ فلکی ص۔)

یہی نہیں کہ عرب چاند کو صرف بحالتِ بدر دیکھنے سے موسم کا اندازہ لگاتے تھے بلکہ ہر منزل میں چاند کی مختلف ہیئتوں کے اصول مقرر تھے، جس سے صحیح صحیح موسمی پیشینگوئیاں کی جا سکتی تھیں، چنانچہ البیرونی نے ایک قول اس طرح نقل کیا ہے:۔

"جب تیسری رات کا چاند ثریا میں ہو تو موسم سرما ختم ہوتا ہے۔[3]"

گویا جاہلی منجمین کے سامنے سورج اور چاند کا ہر زاویہ موجود تھا، جس کا مفہوم وہ بخوبی سمجھتے تھے، اور ان الوآ کے ذریعہ موسموں اور فصلوں کا صحیح صحیح ادراک رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے جب کہ یہ الوآ ان کے دین کا ایک جزو تھیں، اور ان کی عبادت داخلِ مذہب تھی۔

احمد زکی پاشا نے کتاب الاصنام (ابن کلبی) کے تکملہ میں "جبھہ" کی پرستش کا ذکر کیا ہے۔[4] جو دسویں نوء ہے۔ ابن قتیبہ نے دبران (چوتھی نوء) کے متعلق یہ حدیث نقل کی ہے:۔

"اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے سات سال تک بارش روکے رکھے اور اس کے بعد پانی پڑے تو منکرین کا ایک گروہ یہی کہے گا کہ یہ بارش "نوء مجدح" نے کی ہے (مجدح دبران کو کہتے ہیں)[5]"

---

[1] اذا ما البدر تنوم مع الثریا اتاک البرد اولہ شتاء۔ البیرونی / ۳۳۷

[2] اذا ما کان الدبران یوما لاربع عشرۃ قمر التمام فقد حف الشتا لکل ارض۔ البیرونی / ۳۳۷

[3] آثار الباقیہ / ۳۳۷۔

[4] دیکھئے کتاب الاصنام — جبھہ جب طلوع ہوتی ہے تو عرب میں تازہ کھجوروں (رطب) کی افراط (اور تقریباً تمام اقسام کے پھلوں کے پکنے) کا زمانہ ہوتا ہے (دیکھئے مخصص ابن سیدہ) — اور جب اس کا سقوط ہوتا ہے تو یہ اونٹوں (اور اونٹوں کے ساتھ تمام چھوٹے بڑے جانوروں کا) تولیدی وقت ہوتا ہے۔

[5] ابن قتیبہ / ۳۷۔ نیز دیکھئے مسند ۳ / ۷ ؛

دبران قلب عقرب کے بالکل مقابلے میں واقع ہے، سورج جب قلب عقرب میں ہوتا ہے تو یہ سرِ شام مشرق سے طلوع ہوتی نظر آتی ہے، یعنی آخر اکتوبر اور شروع نومبر میں جو حجاز میں عین برسات کا زمانہ ہے غالباً اسی لیے عربوں نے بارشوں کو اسی نوء سے منعلق کیا تھا، (دیکھیے دائرۂ فلکی صــ)

ایک اور حدیث اس طرح ہے:۔

"جو کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالے کی رحمت سے بارش ہوئی تو وہ میرا مومن اور کواکب کا کافر ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں نوء نے پانی برسایا، وہ میرا منکر اور مومنِ کواکب ہے[1]"

ان احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ اندازہ مشکل نہیں کہ جاہلی عربوں کی موسمی تقویمات کا تعلق بیشتر اِن انواء ہی سے تھا، اور وہ سورج اور چاند کے مختلف زاویوں کا پتہ بھی ان انواء کے طلوع و غروب سے لگا سکتے تھے۔

ان نتائج کی روشنی میں یہ بات نسبتاً آسان ہوجاتی ہے کہ جاہلی تقویم کا سراغ تلاش کرنے کے لیے ہم اپنے قدم اور آگے بڑھائیں اور قیاسات کو مزید وسعت دیں۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ عربوں کے نزدیک پہلی نوء شرطان تھی، جس میں سورج ۲۱ مارچ کو داخل ہوتا تھا، جو ٹھیک اعتدالِ ربیعی کا زمانہ ہوتا ہے، اس بناء پر اگر یہ فرض کرلیا جاتا کہ عربوں کی تقویم کی ابتدا بھی اسی نقطہ سے ہوتی تھی تو غالباً بیجا نہ تھا۔ کیونکہ بعض دوسری قوموں کی تقویمیں بھی یہیں سے شروع ہوتی تھیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کی تائید تو واقعاتی شہادتوں سے ہوتی ہے اور نہ منجمینِ عرب اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ عربوں میں فصلوں کی ابتداء اعتدالِ خریفی سے کی جاتی تھی، جو اس کا بالکل متضاد نقطہ ہے۔ ابن قتیبہ کا بیان ہے:۔

"اور عرب زمانوں کے اوقات کی حد بندی میں بجز مندرجہ ذیل طریقوں کے اور کوئی طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے، اور نہ سال کا آغاز ربیع سے کرتے تھے بلکہ وہ تحدیدِ اوقاتِ فصول میں اپنے وطن کی جانی پہچانی آمد گرما و سرما اور ان کے اختتام اور نباتات کے پھوٹنے اور بڑھنے اور گھاس پات کے نکلنے اور خشک ہونے کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور زمانوں کے شمار میں فصل خریف سے ابتدا کرتے، اور وہ اس کا نام "ربیع" رکھتے ہیں کیونکہ ربیع کا آغاز برسات میں ہوتا ہے اس کے بعد جاڑے کی فصل آتی ہے پھر جاڑے کے بعد صیف کا موسم ہوتا ہے اور یہ وہی موسم ہے جس کو لوگ ربیع کہتے ہیں اور اس فصل میں درختوں میں کونپلیں نکلتی ہیں اور اسے صیف اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے، اور گھاس سوکھ جاتی ہے۔ اور کچھ لوگ اسے ربیع الثانی کہتے ہیں[2]"

---

[1] بخاری نیز دیکھیے موطا الاستمطار بالنجوم

[2] کتاب الانواء/۱۰۳ نیز دیکھیے کتاب الازمنہ ۱/۲۷۴

تاج العروس میں ابو یحییٰ بن کناسہ کا قول ابنِ قتیبہ کے بیان سے بھی زیادہ واضح ہے :-

"ازہری نے ابو یحییٰ بن کناسہ سے جو اس معاملے میں علامہ تھا، سال کے زمانوں اور اس کی فصلوں کے بارے میں نقل کیا ہے کہ سال کے چار زمانے ہوتے ہیں، "ربیع الاوّل" اور یہی عام لوگوں کے نزدیک خریف کہلاتا ہے، اس کے بعد شتا (موسمِ سرما) پھر صیف "اور یہ" ربیع الآخر" ہے اور پھر قیظ (موسمِ گرما) اور یہ سب عرب بادیہ کا قول ہے، نیز وہ کہتا ہے کہ جو ربیع ایرانیوں کے نزدیک خریف ہے وہ ایلول کی ۳ تاریخ کو شروع ہوتی ہے اور شتا "کانونِ اوّل" کی ۳ تاریخ کو، اور صیف جو ایرانیوں کے نزدیک ربیع ہے "آذار" کے پانچ دن گزرنے پر شروع ہوتی ہے اور قیظ جو ایرانیوں کے نزدیک "صیف" ہے، ۵ حزیران کو شروع ہوتی ہے[1]"

ان صراحتوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عربوں کے نزدیک موسمِ بہار یا فصلِ ربیع کا آغاز اعتدالِ خریفی سے ہوتا تھا۔ ابنِ کناسہ نے ہر فصل کی ابتدا ہونے کی سُریانی تاریخیں بھی لکھ دی ہیں۔

ابنِ قتیبہ نے بھی بالکل یہی صراحت کی ہے :-

"ربیع الاوّل کا آغاز جو خریف ہے "ایلول" کے تین دن گزرنے کے بعد ہوتا ہے اور جاڑے کا آغاز "کانون اوّل" کے تین دن گزار کر "صیف" کی ابتداء جو "ربیع الثانی" ہے "آذار کے پانچ دن گزرنے کے بعد اور قیظ کا آغاز حزیران کے چار دن گزار کر[2]"

جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عرب طلوعِ شرطان سے حساب نہیں لگاتے تھے بلکہ سقوطِ شرطان پر ان کے حسابات کا مدار تھا، یعنی جب شرطان صبح کو مغرب میں غروب اور شام کے وقت مشرق سے طلوع ہوتی تو نظر آتی یا بالفاظِ دیگر جب چاند بحالتِ بدر اس نوء میں نظر آسکتا، یہ زمانہ ٹھیک اعتدالِ خریفی کا سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابنِ قتیبہ نے نوء کے معنیٰ ہی "سقوطِ نجم" بیان کئے ہیں[3]۔

---

[1] تاج العروس ۵/۳۴۰، ۳۴۱ نیز دیکھئے کتاب الازمنہ والامکنہ ۱/۲۷۴، ۲۷۵، اور لسان العرب ۱/۴۶۰، ۴۶۱

[2] کتاب الانواء/۱۰۲۔ نیز دیکھئے الازمنہ ۱/۱۷۶۔ آثار الباقیہ/۳۲۵

[3] کتاب الانواء میں نوء کے معنیٰ اس طرح بیان کئے گئے ہیں "معنی النوء" سقوط النجم منها المغرب مع الفجر (کتاب الانواء/۶) یعنی صبح کے وقت جب نجوم (الاخذ مغرب کی سمت غروب ہوتے نظر آتے ہیں اس کو نوء کہا جاتا تھا کیونکہ پھر یہی ستارے شام کو مشرق سے طلوع ہوتے معلوم ہوں گے یہ سقوطِ نجم کا صحیح اور آسان اندازہ چاند کی ۱۳ یا ۱۴ تاریخ کو ہوتا ہے جب کہ چاند بحالتِ بدر مشرق سے نمودار ہو کر صبح کو مغرب میں غروب ہوتا ہے، اس وقت جو تارے چاند سے متصل ہوتے ہیں ان کے سقوط کے صحیح وقت کو ایک عام نظر بھی پہچان سکتی ہے، دیکھئے کتاب الانواء/۱۱، نیز دیکھئے مخصص ابن سیدہ ۹/۱۳

میرا خیال ہے کہ عربوں کے فلکی حسابات چونکہ بیشتر مشاہداتِ عینی پر مبنی تھے اس لیے شام کے وقت جب ستارے مشرق سے طلوع ہوتے تو ان کے فلکی حسابات کی ابتدا بھی اسی نقطے سے ہوتی۔ بہر صورت ابن قتیبہ اور ابن کناسہ کی نشان دہی کے بموجب عربوں کی فصول چہار گانہ کو اگر ترتیب دار رکھا جائے اور سُریانی مہینوں کو ان کے پہلو میں رکھ کر دیکھا جائے، تو نتیجہ حسب ذیل ہوگا:۔

۱۔ ربیع الاوّل	۳؍ ایلول	۳؍ ستمبر
۲۔ شتا	۳؍ کانون اوّل	۳؍ دسمبر
۳۔ صیف (ربیع الثانی)	۵؍ آذار	۵؍ مارچ
۴۔ قیظ	۴؍ حزیران	۴؍ جون

گویا عربوں کے موسم بہار کی ابتدا جس کو وہ ربیع الاوّل کہتے تھے "ستمبر" سے تسلیم کی جاتی تھی، اب اگر یہ فرض کر لیا جائے، کہ جاہلی تقویم کی ابتدا بھی اسی نقطہ سے ہوئی تھی اور ان کی تقویم کے تمام مہینے انھیں چار فصلوں پر بعینہٖ اسی ترتیب کے ساتھ بٹے ہوئے تھے، جیسا کہ البیرونی کا خیال ہے تو گویا ہمیں جاہلی تقویم کا ایک سرا ہاتھ آگیا۔

البیرونی کا بیان ہے کہ:۔

"عربوں کے مہینے چار فصلوں پر تقسیم تھے، جو فصلِ خریف سے شروع ہوتے تھے جس کو (اہل عرب) فصل ربیع کہتے تھے، اس کے بعد موسم سرما آتا، بعد ازاں بہار کا موسم جس کو صیف اور بعض لوگ "ربیع الآخر" کہتے تھے، اس کے بعد موسم گرما آتا جو قیظ کہلاتا تھا[1]"

البیرونی کی اس اہم شہادت کے مطابق اگر بطور تجربہ عربی مہینوں کو محرم سے شروع کر کے ترتیب وار ان چار فصلوں پر تقسیم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ حسب ذیل ہوگا اور میرے نزدیک اس قیاس سے حیرت خیز نتائج نکل سکتے ہیں جو تاریخ کی بہت سی گتھیاں سلجھانے کو کافی ہیں، میں نے جدول ذیل میں سُریانی مہینوں کے ساتھ ساتھ اُن کے متبادل انگریزی مہینے بھی لکھ دیئے ہیں:۔

اعتدالِ خریفی ۲۲؍ ستمبر	۱۔ محرم	ربیع الاوّل	۳؍ ایلول	ستمبر
	۲۔ صفر		تشرین اوّل	اکتوبر
	۳۔ ربیع		تشرین آخر	نومبر
انقلاب شتوی ۲۱؍ دسمبر	۴۔ ربیع[2]	شتا[2]	۳؍ کانون اوّل	دسمبر
	۵۔ جمادی[1]		کانون آخر	جنوری
	۶۔ جمادی[2]		شباط	فروری
اعتدالِ ربیعی ۲۱؍ مارچ	۷۔ رجب	صیف[3]	۵؍ آذار	مارچ
	۸۔ شعبان		نیسان	اپریل
	۹۔ رمضان		ایار	مئی
انقلاب صیفی ۲۱؍ جون	۱۰۔ شوال	قیظ	۴؍ حزیران	جون
	۱۱۔ ذیقعدہ		تموز	جولائی
	۱۲۔ ذوالحجہ		آب	اگست

[1] آثار الباقیہ/۳۲۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ عرب سات کے موسم کو ربیع کہتے ہیں، ۱/۳۷۱ (عرب میں برسات سرما میں ہوتی ہے)

یہ فرض کرنے کے بعد کہ عربی تقویم کا پہلا مہینہ محرم ہمیشہ نقطۂ اعتدالِ خریفی یا سقوط سرطان کے متصل چاندوں سے شروع ہوتا اور ما بقی مہینے اس کے پیچھے پیچھے علی الترتیب نقشۂ بالا کے مطابق چکر کاٹتے رہتے، ہمیں اس نظریئے کو مختلف کسوٹیوں پر جانچنا چاہیئے۔ سب سے پہلے عربی مہینوں کے ناموں پر غور فرمائیے مثلاً ربیع کے بعد جس کے معنی بہار کے ہیں اور جو عربوں کے نزدیک برسات سے شروع ہوتی، جمادی کا نام نظر آتا ہے، جو خواہ مخواہ ہمارے ذہنوں کو موسم سرما کی طرف لے جاتا ہے۔ مرزوقی کا بیان ہے کہ جمادی کے ذیل میں موسم گرما کا ذکر اشعار عرب میں نہیں ملتا، بلکہ اس کا ذکر ہمیشہ موسم سرما کے ساتھ ہوا ہے۔ سرمائی راتیں سخت اندھیری ہوتی ہیں، ایک شاعر کہتا ہے :

فِی لَیلَةٍ من جمادی ذات اندیة
لا یبصر الکلب من ظلماتها الطنبا[1]

جمادی کے بعد رجب اور شعبان کے مہینے آتے ہیں، اور پھر رمضان جس سے گرمی کے جلتے ہوئے موسم کا تصور یقینی ہے، عربی مہینوں کے ناموں کی موسمی ساخت پر البیرونی اور مرزوقی وغیرہ نے لغوی بحث بھی کی ہے[2] اور البیرونی نے بتایا ہے کہ جس زمانے میں یہ نام رکھے جا رہے تھے، اس وقت موسموں کا پورا لحاظ رکھا گیا تھا، نقشۂ بالا کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمادی، دسمبر اور جنوری سے مطابقت رکھتا تھا اور رمضان مئی جون سے۔

(۲)

ان لغوی شہادتوں کے علاوہ جو اگرچہ انتہائی اہم ہیں اور واقعاتی تاریخ سے زیادہ مرتبہ رکھتی ہیں، مارگولیتھ MARGOLIOUTH نے قدیم یونانی مصنفین کی شہادت سے بیان کیا ہے کہ عرب جاہلی دور میں تین خریف (AUTUMN) کے مہینے اور ایک مہینہ بہار کا حرام قرار دیا جاتا تھا[3] جس میں جنگجو قبائل ہتھیار اُتار دیتے تھے اور ہر قسم کی خونریزیاں رک جاتی تھیں، چنانچہ نانوسس

---

[1] الازمنہ ۱۲۸ [2] مرزوقی کا قول ملاحظہ ہو :...... ان کثیراً من علماء الرواة یزعمون ان شهری ربیع انما سمیا للربیع، وان جمادین انما سمیتا للشتاء ووجود الماء۔ وان شعبان انما سمی شعبان لاشتعاب الظعن ایا هو عن المرابع للمحاضر، وان شهر رمضان لشدة الحر والرمض وان الصفر السبب الی الزمان الذی یسمی صفری، وهذا الذی ذکروا امر قریب لا سعید فی الوهم لانا علی الترتیب نجد ازمان السنة عندهم۔ الازمنہ/۱۲۷، ۱۲۸

[3] مارگولیتھ کے الفاظ ملاحظہ ہوں :
"FOR THREE AUTUMN MONTHS AND ONE SPRING MONTH A TURCE OF GOD WAS OBSERVED BY MANY TRIBES WHO THEREIN LAID DOWN THERE ARMS OF SHED NO BLOOD"

اور اسی جگہ حاشیہ پر مذکور ہے : (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

NONNOSUS اور پروکوپیس (PROCOPIUS) نے ان محترم مہینوں کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے :-
" دو ماہ انقلابِ صیفی کے بعد اور ایک مہینہ وسطِ بہار کا محترم خیال کیا جاتا تھا)۔"
اس صراحت سے بھی متذکرہ بالا نقشہ کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے، انقلابِ صیفی SUMMER SOLSTICE ۲۱ رجون کو ہوتا ہے، اور نقشۂ بالا کے بموجب ذی قعدہ اور ذو الحجہ بالترتیب جولائی اور اگست سے مطابق ہوتے ہیں، اسی طرح ایک مہینہ وسطِ بہار کا نقشۂ بالا کے مطابق رجب کا آتا ہے جو مارچ اور اپریل سے مطابق ہونا چاہیئے۔ ولہازن نے بھی رجب کو بہار (SPRING) اور محرم کو خریف (AUTUMN) سے مطابقت دی ہے[1]۔
اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے، بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا:
نہ "فرع" کوئی چیز ہے نہ "عُتَیرہ"۔ "فرع" اُونٹ کے پہلے بچے (اوّل النتاج) کو کہتے تھے جس کو وہ بتوں کے لیے ذبح کرتے تھے اور "عُتَیرہ" کی قربانی بھی رجب کے مہینے میں کی جاتی " (بخاری)
عُتَیرہ بکری یا بھیڑ کے پہلے بچے (اوّل مانتیج) کو کہا جاتا تھا[2]
لسان العرب کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب "فرع" یعنی اُونٹ کے پہلے بچے کی قربانی اس درجہ ابتدائی عمر میں کرتے کہ اس کا گوشت ہنوز لبلبا ہوتا اور پوست سے چھڑانا مشکل ہوتا[3]۔
ڈاٹی[4] DOUGHTY کا بیان ہے کہ عرب میں اُونٹ کا تولیدی زمانہ CALVINGTIME فروری اور مارچ کا ابتدائی حصہ ہے[5]۔ رابرٹس اسمتھ ROBERTSONSMITH کے بیان کے بموجب یہ تخصیص صرف اُونٹ کے بچوں کے لیے نہیں، بلکہ عرب میں ہر چھوٹے بڑے جانور کا تولیدی زمانہ تقریباً یہی ہے[6] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروری اور مارچ میں جتنے بھی اوّل النتاج ہوتے وہ عام دستور کے مطابق رجب کے مہینے میں دیوتاؤں کی نذر کر دیئے جاتے، نیز یہ کہ رجب کا مہینہ بھی اس تولیدی زمانہ کے بالکل متصل ہوتا، کیونکہ فرع کے ذیل میں جو صراحتیں ملتی ہیں اُن سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ قربانیاں تقریباً وسط یا آخر مارچ تک ہو جاتیں۔
غالباً اسی بنیاد پر ولہاوزن نے اسرائیلیوں کے مشہور تیوہار فسح کو جو ماہِ نسان میں منایا جاتا "رجب کے تیوہار سے مطابقت دی ہے[7]" کیونکہ یہودی بھی اپنا یہ تیوہار تقریباً اسی زمانے میں مناتے جب کہ سورج برجِ حمل میں ہوتا اور اپنی پیداواروں کے

(از حاشیہ گزشتہ صفحہ) NONNOSUS AND PROCOPIUS "TWO MONTH AFTER THE SUMMER SOLSTICE AND ONE IN MID SPRING" (MARGOLIOUTH RESE P 5)

[1] ENCYCLOPIADIA OF ISLAM VOL IIP.

[2] لسان العرب ۶/۲۱۰ نیز دیکھیے نہایہ غریب الحدیث ۳/۲۶۵

[3] لسان العرب ۱۰/۱۲۰ نیز دیکھیے: نہایہ غریب الحدیث ۳/۱۹۵

[4] THE CALVING TIME FOR CAMELS IS IN FEBRUARY AND EARLY MARCH W. R. SMITH RELIGIONS OF SMITES 465

[5] IBID P. 227 - 228

[6] IBID

پہلے حاصل (FIRST FRUITS) اور بھیڑوں اور بکریوں کے یک سالہ بچے لیواہ کی نذر کرتے۔

اگر یہ مطابقت ٹھیک ہے تو اس سے یہ اہم نتیجہ نکلتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں یہودی اور عربی تقویم تقریباً ایک ہی نقطہ فصلی سے شروع ہوتی، کیونکہ "رجب" کی طرح یہودیوں کا ماہ نیساں بھی "ساتواں" مہینہ شمار کیا جاتا تھا اور دونوں مہینوں کا تعلق آغازِ بہار سے تھا۔

علاوہ ازیں تاریخ کی مضبوط ترین شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں قوموں کا پہلا مہینہ یعنی محرم اور تشری بھی ایک ہی نقطۂ فصلی سے شروع ہوتے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مستحکم دلیل عاشورے کی روائتیں ہیں جن کو میں یہاں کسی قدر تفصیل سے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہی روائتیں حقیقتاً میرے پورے نظریۂ تقویم کا مرکزی نقطہ ہیں اور سچ پوچھئے تو انھیں نے میری رہنمائی اس جدید نظریئے کی طرف کی ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہی احادیث پوری جاہلی تقویم کے لیے قولِ فیصل کا حکم رکھتی ہیں۔

مشہور واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ نے مدینے پہنچ کر یہود کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا تو مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ یہودی یہ روزہ اپنی تقویم کے مطابق ماہِ تشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھا کرتے تھے، جو ہمیشہ ستمبر اور اکتوبر کے متوازی رہتا، ابن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

> "آنحضرتؐ مدینے تشریف لائے تو انھوں نے یہودیوں کو عاشورے کا روزہ رکھتے دیکھا، اس پر آپؐ نے فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ وہ صالح دن ہے، جس میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو دشمنوں کے ہاتھ سے نجات دی تھی اس لیے موسیٰؑ نے اُس روز روزہ رکھا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمھارے مقابلے میں ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں، اس کے بعد آپؐ نے بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی حکم دیا۔"[1]

انھیں ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت اس طرح ہے:۔

> "جب آنحضرتؐ مدینے تشریف لائے تو یہودیوں کو صومِ عاشورہ رکھتے پایا، آپؐ نے اُن سے دریافت کیا تو بولے یہ وہ دن ہے کہ اس روز موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالےٰ نے فرعون پر فتحمندی عطا کی تھی، اور ہم اس کی عظمت کے لیے روزہ رکھتے ہیں، اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہم تمھارے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہیں، اس کے بعد آپؐ نے اس روزہ کا حکم دیا۔"[2]

---

[1] بخاری۔ نیز دیکھئے مسند ۴/۲۶۴۴ اور ۲۸۳۲/۴ [2] بخاری۔ بظاہر ابن عباس کی ان دونوں روائتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آنحضرتؐ کے سامنے مدینے کے یہودیوں کے یومِ عاشوراء کی غلط توجیہہ کی گئی یا اسلامی رواۃ غلط سمجھے کیونکہ خروج بنی اسرائیل کا واقعہ ماہ تشری کا نہیں۔ (دیکھئے خروج ۱۲: ۱-۶)

ایک اور روایت ابو موسیٰ اشعری سے اس طرح ہے، وہ فرماتے ہیں :-

"کہ آنحضرتؐ مدینے تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشورے کی عظمت کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں؛ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہم اس روزے کے زیادہ حق دار ہیں، اور اس روزے کا حکم دیا۔" (بخاری)

اِن تینوں روائتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عاشورے کا روزہ نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ خود پیغمبرِ اسلامؐ نے عین اُس دن رکھا تھا جس روز یہودیوں کے عاشورے کا دن تھا۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ یہودی یہ روزہ ماہِ تِشری کی ۱۰ تاریخ کو رکھا کرتے تھے جو ان کی تقویم کا پہلا مہینہ شمار ہوتا تھا اور مسلمانوں میں بھی یہ روزہ ۱۰ محرم کو مسنون ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس سال پہلی بار مدینے میں یہ روزہ رکھا گیا تھا کم سے کم اس سال عربوں کا ماہِ محرم یہودی "تشری" کے عین مطابق تھا، جو ہمیشہ اعتدالِ خریفی میں آتا تھا۔

ان روایات سے اکثر مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ رسُول اللہؐ نے یہ روزہ یہود کی تقلید میں اختیار کیا تھا[1]۔ مگر واقعاتی طور پر یہ خیال صحیح نہیں۔ بلکہ زمانۂ جاہلیت میں قریشِ مکہ بھی یہ روزہ رکھا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں :-

"یوم عاشورہ کا روزہ زمانۂ جاہلیت میں قریش رکھا کرتے تھے اور رسُول اللہ بھی رکھتے تھے، جب آپؐ مدینے تشریف لائے تو خود آپؐ نے بھی روزہ رکھا۔ اور اس کا حکم بھی دیا، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو جس نے چاہا یہ روزہ رکھا اور جس نے چاہا ترک کیا۔" (بخاری)

یہی نہیں بلکہ جس طرح یہودی اُس روز اپنے مقدس معبد کی سالانہ صفائی کرنے کی رسم ادا کرتے۔ ٹھیک اسی طرح قریش بھی اسی عاشورے کے دن "بیت اللہ" کے سجانے، بنانے اور اس پر غلافِ کعبہ چڑھانے کی رسم بجا لاتے۔

حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے :-

"قریش رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھتے اور اُسی دن وہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے، تو جب اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے، رسُول اللہؐ نے فرمایا، جس کا جی چاہے، روزہ رکھے، جس کا جی چاہے ترک کر دے۔" (بخاری)

حضرت عائشہ رضؓ کی ان دونوں روائتوں کو ایک ساتھ پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالباً یہ رسم پوری سامی دنیا یا کم سے کم ابراہیمؑ کی اولاد[2] میں مشترک چلی آتی تھی اور قریش بھی ایامِ جاہلیت میں اسی خاص دن یہ نسلی شعار پوری سرگرمی اور ٹھیک ٹھیک اوقات پر انجام دیتے تھے۔

---

[1] MARGOLIOUTH RISE P. 250 [2] آلِ ابراہیمؑ سے مراد شمالی عرب کے اصلی باشندے ہیں۔

اگر اس زمانے میں "بیت المقدس" کی تطہیر ہوتی تو مکے میں بھی "بیت اللہ" پر ٹھیک اُسی روز غلاف چڑھایا جاتا، فلسطین کے باشندے اگر اس دن روزہ رکھتے تو قریش میں بھی یہی دستور تھا، غرض شمال سے جنوب تک یہ تیوہار آلِ ابراہیم میں مشترک معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی "وَالْفَجْرِ" کی تفسیر اور عبید بن عُمیر کی محرم کے متعلق تصریحات قابلِ لحاظ ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" سے مراد محرم ہے جو "فجر السنہ" ہے، گویا لیالِ عشر سے مراد عاشورے تک کی دس راتیں ہیں۔[1]

عُبید بن عُمیر سے روایت ہے:-

> محرم الٰہی مہینہ ہے اور وہ سنہ کی ابتدا ہے جس میں بیت اللہ پر غلاف چڑھایا جاتا ہے اور جس سے لوگ شمار ایام کرتے ہیں۔[2]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشورے کا روزہ یہود مدینہ کی تقلید کا نتیجہ نہ تھا بلکہ قریش بھی زمانۂ جاہلیت میں اس دن کی تقدیس کرتے اور روزہ رکھتے، ہاں! ہجرت سے پہلے مدینے کے لوگوں میں عاشورے کا رواج قطعاً نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ عین عاشورے کے دن صبح تک اہلِ مدینہ بے خبر تھے کہ آج انھیں روزہ رکھنا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہاں کے باشندے نسلاً جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک مدنی صحابی سلمہ بن اکوعؓ کہتے ہیں:-

> "آنحضرتؐ نے عاشورے کے دن لوگوں میں اعلان کی غرض سے ایک آدمی روانہ کیا کہ جس کسی نے کچھ کھا لیا ہے، وہ اب کچھ نہ کھائے اور روزہ رکھے اور جس نے کچھ نہیں کھایا، وہ اب نہ کھائے۔"
>
> (بخاری)

ایک اور مدنی روایت جو ربیع بنتِ مُعوّذ سے ہے ملاحظہ ہو، جس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ اعلان صرف انصار کی بستیوں تک محدود تھا، فرماتی ہیں:-

> "نبی علیہ السلام نے عاشورے کی صبح کو انصار کی بستیوں میں کہلا بھیجا کہ جس نے بغیر روزے کے صبح کی ہو، تو وہ باقی دن بلا کچھ کھائے پیئے پورا کرے اور جس شخص نے روزے کی حالت میں صبح کی ہو وہ روزہ رکھے۔"
>
> (بخاری)

ان دونوں مدنی روائتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اہلِ مدینہ میں باوجود یہودی اثر و رسوخ کے عاشورے کا

---

[1] البدایۃ ۳/۲۰۷ نیز دیکھئے طبری ۲/۲۵۳

[2] بدایۃ ۳/۲۰۷

تیوہار موجود نہ تھا،[1] اور پیغمبرِ اسلام کی ہجرت کے بعد عین عاشورے کے دن صبح کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ مدینے کے لوگ بھی یہ تیوہار منائیں چنانچہ ان بستیوں میں اعلان کی ضرورت پڑی، اور کہلا بھیجا گیا کہ آج کوئی شخص کچھ نہ کھائے، نہ پیئے بلکہ روزہ رکھے۔

متذکرہ بالا تمام روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ عاشورے کا روزہ بیشتر اُسی روز رکھا جاتا تھا جس روز یہودی یوم عاشورہ مناتے، پیغمبرِ اسلامؐ نے جب اس روزے کا حکم دیا تو اُسی دن کا لحاظ رکھا، ہاں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اسی حکم میں اتنی ترمیم کر دی گئی کہ مسلمانوں کو یہ روزہ یہودیوں سے صرف ایک دن پہلے یا بعد رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"رسُول اللہؐ نے فرمایا کہ عاشورے کا روزہ رکھو، اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرو، اور یا تو ایک روز قبل رکھو یا ایک دن بعد۔"[2]

یہ روایت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عہدِ رسالتؐ میں عربوں کا "ماہ محرم" اور یہودیوں کا "ماہ تشری" بالکل یا اکثر و بیشتر متوازی ہوتے اور مسلمانوں اور یہودیوں کے روزے میں زیادہ سے زیادہ صرف ایک دن کا فرق رہتا، چنانچہ ابنِ عباسؓ کی ایک دوسری روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔

الحکم بن الاعرج کہتے ہیں کہ ایک بار میں عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا تو وہ زمزم سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے، میں بھی بیٹھ گیا اور ان سے عاشورہ کے متعلق سوال کئے:

"میں نے کہا یوم عاشورہ کے متعلق مجھے بتایئے تو فرمایا کہ اس کے متعلق کیا دریافت کرتے ہو، میں نے کہا اس کے روزے کے متعلق، فرمایا جب تم محرم کا چاند دیکھو تو اس سے حساب لگاؤ اور جب نو کی صبح ہو جائے تو اسی صبح کو روزہ رکھو، میں نے عرض کیا کہ کیا رسُول اللہؐ یوں ہی روزہ رکھتے تھے، فرمایا، ہاں![3]

ان احادیث پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عربی تقویم کا ماہِ محرم جس میں یہ روزہ مسنون ہے، عہدِ رسالتؐ میں اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر یہودیوں کے "ماہِ تشری" سے مطابق رہتا جو بغیر اس صورت کے ممکن نہیں کہ ہم اصولِ کبیسہ کے تحت عربی تقویم کی ابتدا ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے کریں۔

---

[1] معلوم نہیں کہ اہلِ مدینہ کو اس روزے سے اس درجہ اجتناب کیوں تھا، اس لیے کہ امیر معاویہ کے زمانے میں پھر ایک بار یہی سوال اٹھا تو انھوں نے علمائے مدینہ کو چیلنج کیا اور آنحضرتؐ کی اس سلسلہ کی حدیث سنائی۔ حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ جس سال امیر معاویہ نے حج کیا تو عاشورے کے دن وہ منبر پر چڑھے اور فرمایا "اے اہلِ مدینہ تمھارے علماء کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہؐ سے سُنا، آپ اس دن کو عاشورے کا دن فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ (اگرچہ) یہ روزہ تم پر فرض نہیں ہے، لیکن میں روزہ دار ہوں، تو جس کا جی چاہے روزہ رکھے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔ (موطا، صیام یوم عاشورہ)

[2] مسند ۴/۲۱۵۴۔ [3] مسند ۴/۲۱۳۵ نیز دیکھیے ۲۵۴۰/ ـ نیز دیکھیے ۲۲۱۴

اس سلسلے میں یہ خیال کہ صرف ہجرت کے پہلے سال ماہِ محرم چکّر کاٹ کر یہودیوں کے ماہِ تشری کے مطابق ہو گیا تھا، از روئے حساب بالکل غلط ہے اور اسی بناء پر البیرونی نے متذکرہ بالا تمام احادیثِ صحیحہ کو حسابی قاعدے سے باطل قرار دیا ہے۔

البیرونی کے پورے استدلالات مقالۂ اوّل پر پیش کئے جا چکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ عبارت دوبارہ پیش کرنا ہے :۔

"...... لیکن یہ روائت صحیح نہیں، کیونکہ امتحانی شہادتیں ان کے خلاف ہیں اور وہ اس طرح کہ ہجرت کے سال پہلی محرم کو جمعہ کا دن اور ماہ تموز ۹۳۳ سکندری کی ۱۶ تاریخ تھی مگر جب ہم حساب لگاتے ہیں تو اس سال یہودیوں کے سنہ کا آغاز یکشنبہ ۱۲ ایلول کو ہوا تھا جو ۲۹ صفر کے مطابق تھا۔ اس حساب سے عاشورے کا دن سہ شنبہ ۹ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے...... اور محرم میں اس کا وقوع یا تو اس سال سے کئی برس پہلے ممکن ہے یا کچھ اُوپر بیس برس بعد ہونے والا تھا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے اس لیئے عاشورے کا روزہ رکھا کہ وہ اس سال دسویں (محرم) کے مطابق تھا۔"[1]

البیرونی کا یہ خیال اگرچہ قمری حسابات کی بنیاد پر بظاہر ٹھیک معلوم ہوتا ہے، لیکن جب وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں "قمری شمسی" سال استعمال ہوتا تھا اور عربی فصُول کی ابتداء ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے ہوتی تھی نیز یہ کہ عربی مہینے انھیں فصول چہارگانہ پر بٹے ہوئے تھے تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ احادیثِ صحیحہ کو غلط قرار دیا جائے۔

اس پر اتنا اور اضافہ کیجئے، کہ نہ صرف اہلِ مکّہ بلکہ شاید پورے مشرقِ وسطیٰ کے سنین کی ابتداء (بجز عراق اور ایران کے) اعتدالِ خریفی ہی سے ہوتی تھی، چنانچہ مرزوقی نے عربی تقویم کی خریف سے ابتداء ہونے پر یہی دلیل پیش کی ہے، اُن کا بیان ہے :۔

"اور منجملہ ان قوموں کے جنھوں نے اسے خریف سے شروع کیا ہے، شام کے سُریانی بھی ہیں، کیا آپ اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کے سنہ کا آغاز تشرینِ اوّل (اکتوبر) سے ہوتا ہے، جو صدرِ خریف ہے۔ ابتدائی موسمِ برشگال کا آغاز ہے اور شاید عرب بھی اپنی تقویم اسی نقطہ سے شروع کرتے تھے اور انھوں نے اس کا آغاز ابتدائی موسمِ برشگال (وسمی) کو قرار دیا تھا جس طرح کہ وہ زمانے اور انواء (منازلِ قمر) کی تقسیم میں مقدم رہتا ہے، بنا بریں وہ شروع برسات کو مقدم کرنے میں اپنے پُرانے رسوم پر قائم رہے۔"[2]

مرزُوقی کے اس بیان سے جہاں بظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں عربی تقویم بھی پڑوسی قوموں کی طرح ہمیشہ "خریف" سے شروع ہوتی تھی، وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے عربوں کے نزدیک فصلوں اور انواء کا آغاز و اختتام بھی اسی نقطۂ فصلی سے

---

[1] البیرونی آثار/۳۳۰ - یہ ملحوظ رہے کہ مقالۂ اوّل صفحہ ۲۸ میں البیرونی کی اس عبارت کا ترجمہ سخاؤ کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے اور مذکورۂ بالا ترجمہ اصل عربی سے براہِ راست کیا گیا ہے۔ [2] الازمنہ والامکنہ ۱/۱۶۷

ہوتا تھا، گویا اُن کی تقویم اور انواء اسی طرح لازم و ملزوم تھیں جس طرح ہندوؤں کے نچھتر اور مہینے۔

بنابریں میری رائے میں مکّے کی جاہلی تقویم کی بازیافت اب چنداں مشکل نہیں رہی بلکہ اگر دیکھا جائے تو بڑی حد تک سامنے آچکی ہے اور اب صرف یہ کام باقی ہے کہ دائرۂ "انواء و بروج" کو پیش نظر رکھ کر حسابی قاعدوں کی مدد سے عہدِ رسالتؐ کے ایسے چاندوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویت سورج کے بُرج میزان میں داخل ہونے سے کچھ پہلے یا بعد نقطۂ اعتدال خریفی کے متصل نہ ہوئی ہو اور جن کے دوران میں چاند بحالتِ بدر برج حمل میں رونما ہو سکے۔ ایسے مہینوں کو مکّی تقویم کا پہلا مہینہ یعنی محرم قرار دے کر سال کے باقی مہینوں کو اسی حساب سے نامزد کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ایک سہل تر طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ عام قمری تقویم سے صرف ایسے قمری مہینوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویتِ قمر نقطۂ اعتدال خریفی (۲۲ ستمبر) کے متصل ہوئی ہو، خواہ یہ چاند ستمبر میں ہوئے ہوں یا ابتدائی اکتوبر میں اور ان مہینوں کو سال کا پہلا مہینہ قرار دے کر پوری تقویم مرتب کر لی جائے کیونکہ عہدِ رسالتؐ میں از روئے حساب سورج تقریباً اسی زمانے میں بُرج میزان میں داخل ہوتا تھا اور آغازِ خریف کا زمانہ سمجھا جاتا تھا۔

اس طریقے کے تحت سلھ سے لے کر سنلھ تک صرف چار کبیسہ سالوں کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ دس شمسی سالوں کے دن (3652) ہوتے ہیں اور دس قمری سالوں کی تعداد ایّام (3543) ہوتی ہے گویا (۱۰۹) دن یا بالفاظِ دیگر تین ماہ انیس دن کا فرق پڑتا ہے جس کو قمری شمسی تقویم میں صرف اسی صورت سے پورا کیا جا سکتا ہے کہ پورے چار ماہ کا اضافہ کر دیا جائے جس کے نتیجے میں گیارھویں سال خود بخود شمسی اور قمری تقویم کی تعداد ایّام تقریباً مساوی ہو جائے گی۔

آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ البیرونی اور البیرونی کے بعد سر ولیم میور (MUIR) کو اس بات پر پورا اصرار تھا کہ اہلِ مکّہ نے اپنا طریقۂ "نسی" یہودیانِ مدینہ سے حاصل کیا تھا، اس خیال کی اگرچہ تردید کی جا چکی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا سکتا کہ یہودی اور مکّی تقویم کی ابتداء (اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر و بیشتر) ایک ہی نقطۂ فصلی سے ہوتی، اور غالباً یہی مشابہت تھی جس کو پیش نظر رکھ کر البیرونی یا اس کے کسی ابتدائی راوی کو اتنا عظیم دھوکا ہوا، تاہم اس اصول کی روشنی میں کہ عہدِ رسالتؐ میں یہودی اور عربی تقویم (ایک حد تک) متوازی چل رہی تھی، مکّے کی گم شدہ تقویم کی بازیافت کا ایک طریقہ یہ بھی ممکن تھا کہ خود یہودیوں کی تقویم کی مدد سے جو ہنوز زندہ ہے، عربوں کی مُردہ تقویم میں جان ڈالی جائے مگر میری رائے میں یہ طریقہ اس لیے مناسب نہ تھا کہ ظہورِ اسلام کے وقت اس میں موجودہ یکسانیت اور ہم آہنگی نظر نہیں آتی، اور مختلف مقامات پر کبیسہ سالوں کے بالکل مختلف فارمولے رائج ملتے ہیں البیرونی نے بڑی صراحت کے ساتھ ان اختلافات کو بیان کیا ہے، جس کو دیکھ کر یہ فیصلہ دُشوار ہو جاتا ہے کہ مدینے اور حجاز میں کونسا فارمولا رائج تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی قوم میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اتنے مختلف اصول کس طرح قابلِ عمل تھے۔

بنابریں میری رائے میں سب سے زیادہ سہل اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ عام حسابی قاعدوں کی مدد سے سنہ وار ایسے چاندوں کا انتخاب کر لیا جائے جن کی رویت نقطۂ اعتدال خریفی (۲۲ ستمبر) کے متصل ہوئی ہو، اور ان کو سال کا پہلا مہینہ شمار کر کے پورا کلینڈر مرتب کر لیا جائے۔

نئی تقویم کے بموجب یہ چاند حسبِ ذیل ہو سکتے ہیں :-

سنہ ۱ھ	یکشنبہ	۱۲ ستمبر ۶۲۲ء
سنہ ۲ھ	ہفتہ	۱ اکتوبر ۶۲۳ء
سنہ ۳ھ	پنجشنبہ	۲۰ ستمبر ۶۲۴ء
سنہ ۴ھ	دوشنبہ	۹ ستمبر ۶۲۵ء
سنہ ۵ھ	ہفتہ	۲۸ ستمبر ۶۲۶ء
سنہ ۶ھ	پنجشنبہ	۱۷ ستمبر ۶۲۷ء
سنہ ۷ھ	چہارشنبہ	۵ اکتوبر ۶۲۸ء
سنہ ۸ھ	دوشنبہ	۲۵ ستمبر ۶۲۹ء
سنہ ۹ھ	جمعہ	۱۴ ستمبر ۶۳۰ء
سنہ ۱۰ھ	چہارشنبہ	۲ اکتوبر ۶۳۱ء

یہ جملہ چاند ایسے ہیں جن کی ہم تاریخ کو سورج یقیناً برج میزان میں اور چاند بحالت بدر اس کے مقابل برج حمل میں ہونا چاہیئے۔ ان میں صرف سنہ ۸ھ ایک ایسا سال ہے جو مروجہ یہودی تقویم کے اصول پر پورا نہیں اترتا، مگر میرے نزدیک اہلِ مکہ چونکہ محرم کی ابتدا ہمیشہ ایسے چاند سے کرتے تھے، جس کی رویت نقطۂ اعتدالِ خریفی سے نزدیک تر ہوتی، اور سورج مہینے کے بڑے حصے یا کم از کم نصف ماہ تک برج میزان میں رہتا، اس بنا پر ظاہر ہے کہ اہلِ مکہ ستمبر کی رویتِ ہلال کو محرم کا مدخل کسی طرح قرار نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ یہ نقطۂ اعتدالِ خریفی سے پیچھے رہے گا، اور چاند بحالت بدر بجائے برج حمل کے حوت میں ہو گا۔ بوجوہِ بالا میری رائے میں مکی تقویم کی ابتدا صرف اُن چاندوں سے ممکن تھی، جن کی فہرست میں نے اُوپر دی ہے۔

اب صرف یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ سنہ ۱ ہجری سے سنہ ۱۰ ہجری تک کن کن سالوں کو کبیسہ اور غیر کبیسہ قرار دیا جائے اور کبیسہ مہینے سال کے آخر میں بڑھائے جائیں یا وسطِ سال میں، جیسا کہ یہودیوں میں یہ دستور تھا۔

یہ مسئلہ نہایت مشکل ہے اس لیے کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثبت شہادت نہیں جس کو قاعدۂ کلیہ کے طور پر پیش کیا جا سکے، بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مہینے سال کے آخر میں بڑھتے اور بعض مورخوں کا بیان ہے کہ شروعِ سال میں بڑھائے جاتے، جس سے صرف اس قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ نساۂ عرب کبھی آخر سال میں ان کا اضافہ کرتے، کبھی شروعِ سال میں اور ایک دو روایتیں درمیانِ سال کی بھی ملتی ہیں۔

مثلاً شہرستانی کا بیان ہے :-

"اور ان میں کچھ لوگ وہ تھے جو مہینوں میں "نسی" کرتے تھے، اور وہ ہر دوسرے برس میں ایک ماہ اور ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کیا کرتے اور جب اس سال حج کرتے تو [illegible]

یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم نحر ذوالحجہ کے مہینے میں قرار دیں، یہاں تک کہ اسی بڑھائے ہوئے مہینے کی دسویں تاریخ کو یوم نحر قرار دیتے۔" (شہرستانی ۲/۲۴۴)

مسعودی نے اپنی کتاب التنبیہ والاشراف میں شہرستانی کے مقابلے میں زیادہ واضح الفاظ استعمال کئے ہیں:-

"اور وہ ہر تین سال میں ایک مہینے کی اس طرح بیشی کرتے کہ سال میں سے ایک مہینہ گرا دیتے۔ اور اگلے مہینے کو اس بڑھائے ہوئے مہینے کا نام دے دیا کرتے اور یوم ترویہ اور یوم عرفہ اور یوم النحر کو اس مہینے کی آٹھ، نو اور دس تاریخ کو مناتے تھے، پس سال کے باقی مہینوں میں بھی یہی صورت دورہ کرتی رہتی اور وہ اس طرح دوسری اُمتوں سے اُن کے شمسی سال کی مدت اور وقت میں قریب آجاتے۔"

وہ لوگ یہی کرتے رہے تا آنکہ اسلام ظاہر ہوا، اور رسول اللہؐ نے مکہ فتح کیا، اس کے بعد ابوبکرؓ کو آنحضرتؐ نے ہجرت کے نویں سال حج کو بھیجا اور انھوں نے لوگوں کے ساتھ حج کیا اور یہ مشرکوں کا آخری حج تھا۔

(التنبیہ والاشراف/۲۱۹)

شہرستانی اور مسعودی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسی کا یہ مہینہ ہر دوسرے تیسرے سال ہمیشہ ذوالحجہ کے بعد بڑھایا جاتا بلکہ اس سال خاص حج کی تین بڑی رسمیں جو یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم النحر کو ہوتیں، روک لی جاتیں اور ان رسوم کو اس بڑھائے ہوئے مہینے کی آٹھویں، نویں اور دسویں تاریخ کو ادا کیا جاتا تاکہ آنے والے مہینے کا نام محرم رکھا جاسکے اور سال پھر محرم کے مقدس مہینے سے شروع ہوکر ذوالحجہ پر ختم ہو۔

نیز ان سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ نُسّاۃِ عرب کبیسہ کے مہینے کو ہمیشہ ذوالحجہ کا مہینہ قرار دیتے، جو حرام مہینہ شمار ہوتا تھا، مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ قرآنِ مجید میں صراحت ہے کہ کبھی اس مہینے کو حلال قرار دیا جاتا اور کبھی حرام؛ "يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا"

بنا بریں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قلامسہ ہمیشہ اس مہینے کو ذوالحجہ کا نام دینے کے پابند تھے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ کچھ اور بھی اصول مقرر تھے جس سے یہ مہینہ حلال ہو جاتا۔

متعدد علماء کا خیال ہے کہ ایامِ جاہلیت میں ماہِ محرم کا حقیقی نام "صفر" تھا، جب یہ مہینہ حرام کیا جاتا تو اس کو محرم کہتے ورنہ صفر ہی کے نام سے پکارا جاتا، چنانچہ بلوغ الارب میں ہے کہ ایامِ حج میں قلمّس جمرۃ العقبہ کے پاس کھڑے ہوکر اعلان کرتا کہ:-

"میں نے اس سال صفر کے دو مہینوں میں سے آخری صفر کو حرام قرار دیا ہے، اور پہلے صفر کو حلال کر دیا۔ اور اس طرح دونوں رجبوں (رجب اور شعبان) کے درمیان عمل کرتے۔" (بلوغ الارب ۲/۲۹۸)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بڑھایا جاتا اور گاہ گاہ رجب اور شعبان کے درمیان بھی؛

مرزوقی کی بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے کہ یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بھی بڑھتا۔

اور ذوالحجہ میں جب عرب حج کے لیے جمع ہوتے تو اعلان کرنے والا کھڑا ہوتا اور اعلان کرتا کہ اے لوگو! ہم نسی کرنا چاہتے ہیں اور اس کو فرض کر دینا چاہتے ہیں؛

اے لوگو! محرم صفر ہے اور صفر محرم اکبر ہے تو محرم میں قتال وغیرہ حلال کر دیتے اور صفر میں حرام کر دیتے۔" (المرزوقی)

گویا جب "نسی" کے مہینے کو حلال کیا جاتا تو اس کو ذوالحجہ کے بعد بڑھا کر اس کا نام صفر رکھ دیتے اور اس کے بعد کے مہینے کو محرم قرار دے دیا جاتا، اور جب اسے حرام کرنا مقصود ہوتا، تو اس کا نام "ذوالحجہ" یا "محرم" ہی ہوتا اور محرم کے بعد والے مہینے کو بھی محرم قرار دیا جاتا۔

ولہاوزن (WELHOUSEN) کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ مہینہ محرم اور صفر کے درمیان بڑھایا جاتا، لیکن مسعودی اور شہرستانی کے بیانات کی روشنی میں جو اوپر گزر چکے ہیں، ولہاوزن کے اس خیال کو قاعدہ کلیہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی، اس پر ابن حبیب کے مندرجہ ذیل بیان کا اور اضافہ کیجئے۔

"پس ان قلمسون میں سے ایک قلمس ایام تشریق میں حجر میں کھڑا ہوتا، اور ان کو فتویٰ دیتا، اس کے علاوہ کسی اور شخص سے سوال نہیں کیا جاتا، پس ان میں سے ایک شخص کعبے کے دروازے کے پاس کھڑا ہوتا اور دوسرا حجر میں، پھر ان میں سے ہر ایک کہتا:۔

"انا الذی لا اعاب ولا احاب ولا یرد قضنا" پھر اگر اس کے پاس کچھ لوگ ایسے آتے جو محرم میں لوٹ کھسوٹ چاہتے وہ اس سے محرم کو پیچھے ہٹا دینے کی درخواست کرتے جس پر وہ ان کی خاطر حساب لگاتا اور کہتا کہ سال صفر اول رہے گا، اور یہ بات وہ اس حساب سے کہتا جس پر سنہ کا دورہ نہ ہوتا، اور وہ سال چاندوں سے شروع نہ ہوتا، اور نہیں جانا جاتا تھا کہ یہ مہینہ کیا ہے، تو لوگ اس پر عمل درآمد کرتے اور محرم پیچھے ہٹا دیا جاتا اور صفر مقدم کر دیا جاتا، اس طرح ایک سال محرم کو حلال اور دوسرے سال حرام کر دیتے۔" (ابن حبیب/۱۵۷)

ابن حبیب نے اگرچہ جاہلی نساۃ پر بہت کچھ الزام لگانے کی کوشش کی ہے تاہم اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عرب جاہلیت کے تقویمی حسابات کا مدار حقیقتاً رویت قمر پر نہیں تھا، "وکانت لا تاخذ بالاھلۃ ولا تدری ماذلک"، بلکہ روایات قمر کو حسابوں کے مطابق کرنا پڑتا۔

بہر حال مندرجہ بالا بیانات پر مجموعی نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نساۃ عرب کبھی تو نسی کا مہینہ سال کے آخر میں بڑھاتے اور کبھی شروع سال میں، جس کا اعلان بہر صورت ذوالحجہ ہی میں کیا جاتا، جب یہ مہینہ سال کے آخر میں بڑھایا جاتا تو اسی سال حج کی بعض بڑی رسمیں روک لی جاتیں جو اس بڑھائے ہوئے مہینے میں ادا کی جاتیں، اس طرح جب یہ مہینہ شروع سال میں بڑھایا جاتا تو نساۃ کو اختیار ہوتا کہ وہ اس مہینے کو صفر قرار دیں یا محرم، گویا یہ بات نساۃ مکہ کے ہاتھ میں تھی، کہ زائرین حج کی واپسی پر امن و آشتی ہو جائے یا اس پروانۂ امن کو واپس لے لیا جائے جو مذہب نے ان کی سہولت کے لیے جاری کیا تھا۔

میری رائے میں "یُحِلُّونَہٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُونَہٗ عَامًا" کا فتویٰ ہو سکتا ہے کہ بعض فلکی حسابات اور اجرامی دین کے محرمات پر مبنی ہو، لیکن اس میں نساۃ مکہ کی اغراض بھی وابستہ ہو جائیں اور ان کے اختیارات تمیزی کو غلط راستوں

پر ڈال دیتیں۔

بہرحال یہ مسئلہ ہنوز تشنہ ہے کہ سنہ ۱ ہجری سے سنہ ۱۰ ہجری تک نسی کے مہینے سال کے آخر میں بڑھائے گئے تھے یا ابتداء سال میں، یا دہ کون سا سنہ تھا، جس میں یہ مہینہ آخر میں بڑھایا گیا تھا اور کس سنہ کی ابتداء "نسی" سے کی گئی تھی، اس سلسلے میں مجھے یہ اعتراف کرنا ہے کہ تلاش و کوشش کے باوجود بھی اوراقِ تاریخ میں کوئی اشارہ نہ مل سکا، جس کی بناء پر کوئی اصول یا قاعدہ کلیہ پیش کیا جا سکے۔ ہاں اتنی بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس سال یہ اضافہ سال کے آخر میں ہوتا، اُس سال مکہ میں زائرین اور حجاج کا اجتماع ایک مہینے زیادہ رہتا، کیونکہ حج کی تین بڑی رسمیں یعنی یوم ترویہ، یوم عرفہ اور یوم النحر اس سال نسی کے مہینے میں ادا کی جاتیں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کو حرام مہینہ قرار دیا جاتا، لیکن جس سال نسی کا مہینہ ابتدائے سال میں یعنی محرم و صفر کے درمیان بڑھایا جاتا۔ اس سال ایامِ حج قدرتاً ٹھیک وقت پر آتے اور حجاج کو زیادہ زحمتِ انتظار نہ کرنا پڑتی۔

میرا خیال ہے کہ سال کے آخر میں اضافہ پردہنوں، تاجروں اور مذہبی علماء کی تقدیس اور مذہبی لوٹ کے لیے ایک بڑا اچھا جواز تھا، جس کو نساۃ مکہ جب چاہتے لکھ سکتے تھے بہرصورت میں نے یہ کیا ہے کہ ابتدائی دو سالوں یعنی سنہ ۱ اور سنہ ۲ کے آخر میں اور آخری دو سالوں یعنی سنہ ۸ اور سنہ ۹ کی ابتداء میں یہ اضافے اس طرح کئے ہیں کہ ہلالِ محرم ہمیشہ اعتدالِ خریفی کے متصل رہے اور ایامِ حج سورج کے برج سنبلہ میں ہونے کی حالت میں آئیں اور میری رائے میں یہ اضافے شاید ہوئے بھی اسی طرح تھے۔

سنہ ۹ کا اضافہ بالبداہت سنہ ۸ کے ایامِ حج میں کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ مشرکینِ قریش کا یہ آخری حج تھا، اس طرح سنہ ۶ کا اضافہ سنہ ۵ کے ایامِ حج میں ہوا ہوگا، ان اصولوں کے ماتحت اگر سنہ ۱ سے لے کر سنہ ۱۰ تک جداولِ تقویم بنائی جائیں تو وہ حسب ذیل ہوں گی۔

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵
محرم ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء دوشنبہ	محرم ۲ اکتوبر ۶۲۳ء یکشنبہ	محرم ۲۱ ستمبر ۶۲۴ء جمعہ	محرم ۱۰ ستمبر ۶۲۵ء سہ شنبہ	محرم ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء یکشنبہ
صفر ۱۳ اکتوبر، چہار شنبہ	صفر ۳۱ اکتوبر، دوشنبہ	صفر ۲۰ اکتوبر، شنبہ	صفر ۹ اکتوبر، چہار شنبہ	صفر ۲۸ اکتوبر، سہ شنبہ
ربیع الاوّل ۱۱ نومبر، پنجشنبہ	ربیع الاوّل ۳۰ نومبر، چہار شنبہ	ربیع الاوّل ۱۹ نومبر، دوشنبہ	ربیع الاوّل ۸ نومبر، جمعہ	ربیع الاوّل ۲۶ نومبر، چہار شنبہ

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵
ربیع الآخر ۱۱ر دسمبر، شنبہ	ربیع الآخر ۲۹ر دسمبر، پنجشنبہ	ربیع الآخر ۱۸ر دسمبر، سہ شنبہ	ربیع الآخر ۷ر دسمبر، شنبہ	ربیع الآخر ۲۶ر دسمبر، جمعہ
جمادی الاولیٰ ۱ر جنوری ۶۲۳ء یکشنبہ	جمادی الاولیٰ ۲۸ر جنوری ۶۲۴ء شنبہ	جمادی الاولیٰ ۱۷ر جنوری ۶۲۵ء پنجشنبہ	جمادی الاولیٰ ۶ر جنوری ۶۲۶ء، دوشنبہ	جمادی الاولیٰ ۲۴ر جنوری ۶۲۷ء شنبہ
جمادی الاُخریٰ ۸ر فروری، سہ شنبہ	جمادی الاُخریٰ ۲۶ر فروری یکشنبہ	جمادی الاُخریٰ ۱۵ر فروری، جمعہ	جمادی الاُخریٰ ۴ر فروری، سہ شنبہ	جمادی الاُخریٰ ۲۳ر فروری، دوشنبہ
رجب ۹ر مارچ، چہارشنبہ	رجب ۲۷ر مارچ، سہ شنبہ	رجب ۱۷ر مارچ، یکشنبہ	رجب ۶ر مارچ، پنجشنبہ	رجب ۲۴ر مارچ سہ شنبہ
شعبان ۸ر اپریل، جمعہ	شعبان ۲۵ر اپریل، چہارشنبہ	شعبان ۱۵ر اپریل دوشنبہ	شعبان ۴ر اپریل، جمعہ	شعبان ۲۳ر اپریل پنجشنبہ
رمضان ۷ر مئی، شنبہ	رمضان ۲۵ر مئی، جمعہ	رمضان ۱۵ر مئی، چہارشنبہ	رمضان ۴ر مئی، یکشنبہ	رمضان ۲۳ر مئی، شنبہ
شوال ۶ر جون، دوشنبہ	شوال ۲۴ر جون، یکشنبہ	شوال ۱۳ر جون پنجشنبہ	شوال ۲ر جون، دوشنبہ	شوال ۲۲ر جون دوشنبہ
ذیقعدہ ۵ر جولائی، سہ شنبہ	ذیقعدہ ۲۴ر جولائی، سہ شنبہ	ذیقعدہ ۱۳ر جولائی، شنبہ	ذیقعدہ ۲ر جولائی، چہارشنبہ	ذیقعدہ ۲۱ر جولائی، سہ شنبہ
ذوالحجہ ۴ر اگست، پنجشنبہ	ذوالحجہ ۲۲ر اگست، چہارشنبہ	ذوالحجہ ۱۱ر اگست، یکشنبہ	ذوالحجہ ۳۱ر جولائی، پنجشنبہ	ذوالحجہ ۲۰ر اگست، پنجشنبہ
ذوالحجہ نسی ۲ر ستمبر، جمعہ	××××××	××××××	ذوالحجہ نسی محرم ۳۰ر اگست، شنبہ	××××××

سنہ ۶	سنہ ۷	سنہ ۸	سنہ ۹	سنہ ۱۰
محرم ۱۸ ستمبر ۶۲۷ء، جمعہ	محرم ۶ اکتوبر ۶۲۸ء پنجشنبہ	محرم ۲۶ ستمبر ۶۲۹ء، سہ شنبہ	محرم ۱۵ ستمبر ۶۳۰ء، شنبہ	محرم ۴ اکتوبر ۶۳۱ء پنجشنبہ
محرم الثنی، صفر ۱۸ اکتوبر، یکشنبہ	صفر ۴ نومبر، جمعہ	صفر ۱۵ اکتوبر، چہارشنبہ	محرم الثنی، صفر ۱۴ اکتوبر، یکشنبہ	صفر ۲ نومبر، شنبہ
صفر ۱۶ نومبر، دوشنبہ	ربیع ۱ ۴ دسمبر، یکشنبہ	ربیع ۱ ۲۴ نومبر، جمعہ	صفر ۱۳ نومبر، سہ شنبہ	ربیع ۱ یکم دسمبر، یکشنبہ
ربیع ۱ ۱۶ دسمبر، چہارشنبہ	ربیع ۲ ۲ جنوری ۶۲۹ء دوشنبہ	ربیع ۲ ۲۳ دسمبر، شنبہ	ربیع ۱ ۱۲ دسمبر، چہارشنبہ	ربیع ۲ ۳۱ دسمبر، سہ شنبہ
ربیع ۲ ۱۴ جنوری ۶۲۸ء پنجشنبہ	جمادی ۱ یکم فروری، چہارشنبہ	جمادی ۱ ۲۲ جنوری ۶۳۰ء دوشنبہ	ربیع ۲ ۱۱ جنوری ۶۳۱ء، جمعہ	جمادی ۱ ۲۹ جنوری ۶۳۲ء چہارشنبہ
جمادی ۱ ۱۳ فروری، شنبہ	جمادی ۲ ۲ مارچ، پنجشنبہ	جمادی ۲ ۲۰ فروری، سہ شنبہ	جمادی ۱ ۹ فروری، شنبہ	جمادی ۲ ۲۸ فروری، جمعرات، جمعہ
جمادی ۲ ۱۳ مارچ، یکشنبہ	رجب ۱ اپریل، شنبہ	رجب ۲۳ مارچ، پنجشنبہ	جمادی ۲ ۱۱ مارچ، دوشنبہ	رجب ۲۹ مارچ، یکشنبہ
رجب ۱۲ اپریل، سہ شنبہ	شعبان ۱ مئی، دوشنبہ	شعبان ۲۰ اپریل، جمعہ	رجب ۹ اپریل، سہ شنبہ	شعبان ۲۸ اپریل، سہ شنبہ
شعبان ۱۱ مئی، چہارشنبہ	رمضان ۳۱ مئی، چہارشنبہ	رمضان ۲۰ مئی، یکشنبہ	شعبان ۹ مئی، پنجشنبہ	رمضان ۲۷ مئی چہارشنبہ، پنجشنبہ
رمضان ۱۰ جون، جمعہ	شوال ۲۹ جون، پنجشنبہ	شوال ۱۸ جون، دوشنبہ	رمضان ۷ جون، جمعہ	شوال ۲۶ جون، جمعہ
شوال ۹ جولائی، شنبہ	ذیقعدہ ۲۹ جولائی، شنبہ	ذیقعدہ ۱۸ جولائی، چہارشنبہ	شوال ۷ جولائی، یکشنبہ	ذیقعدہ ۲۵ جولائی، شنبہ
ذیقعدہ ۸ اگست، دوشنبہ	ذوالحجہ ۲۷ اگست، یکشنبہ	ذوالحجہ ۱۶ اگست، پنجشنبہ	ذیقعدہ ۵ اگست، دوشنبہ	ذی الحجہ ۲۴ اگست، دوشنبہ
ذوالحجہ ۶ ستمبر، سہ شنبہ	××××××	×××××××	ذوالحجہ ۴ ستمبر، چہارشنبہ	××××××

ان جدولوں کو میں نے اس اصول پر مرتب کیا ہے کہ قمری تاریخوں میں ہفتے کا جو دن DAY OF THE WEEK متداولہ تقویموں میں تسلیم کر لیا گیا ہے وہ علی حالہٖ برقرار رہے، اس سلسلہ میں کننگھم (CUNINGHAM) اور وسٹنفلڈ (WUSTENFELDS) کی تقویموں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا گیا ہے جن کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔

عام تقویمی قاعدہ یہ ہے کہ قمری سنین میں محرم کے تیس اور صفر کے اونتیس ۲۹ دن شمار کیے جاتے ہیں، اسی طرح ایک مہینہ تیس کا اور دوسرا اونتیس ۲۹ کا مانا جاتا ہے، مگر ان جدولوں میں مذکورہ بالا اصول کے تحت اس طریقے کی خلاف ورزی کرنا پڑی تاکہ بین الاقوامی تقویموں سے بہر حال مطابقت رہے۔ مثلاً ۲ سنہ کے محرم کو تیس دن کا اور صفر کو اُنتیس دن کا شمار کرنا چاہیئے جس کے حساب سے صفر ۲ سنہ سہ شنبہ یکم نومبر ۶۲۳ء کو شروع ہوتا مگر وسٹنفلڈ کی تقویم میں ایک قمری مہینہ دوشنبہ ۳۱ اکتوبر کو شروع ہو رہا تھا جو میرے نظریہ کے بموجب مکی صفر ۲ سنہ سے مطابق تھا، اس لیے میں نے صفر کی پہلی تاریخ بجائے یکم نومبر کے ۳۱ اکتوبر قرار دی ہے' تاکہ مسلمہ تاریخوں اور دنوں سے پوری مطابقت رہے، یہی طریقہ دوسرے مہینوں کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اس لیے ہو سکتا ہے، کہ کہیں کہیں قارئین کو ایک دن کا فرق محسوس ہو، لیکن یہ فرق ایسا نہیں جو کسی طرح بھی قابلِ لحاظ سمجھا جائے، کیونکہ قمری تقویموں میں اس قسم کا یک روزہ فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور اکثر و بیشتر ہر تاریخ کی کتاب میں نظر آتا ہے جس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں' کبھی یہ فرق اختلافِ رویت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی تقویمی اصولوں کے اختلاف کے باعث، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واقعہ نگار کو صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوتی، یا غلط فہمی ہو جاتی ہے، بہر حال یہ مسئلہ ایسا نہیں جو زیادہ قابلِ بحث ہو۔

مقالۂ گزشتہ میں چند در چند مثالیں دے کر یہ بات پیش کی گئی تھی کہ واقعاتِ سیرۃ کی تقریباً ۳/۲ روایات مروّجہ تقویمی اصولوں پر پوری نہیں اُترتیں، کبھی دن تاریخوں سے مطابقت نہیں کرتے، کبھی مہینے موسموں سے، جن کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ اس قسم کے جملہ واقعات مکے کی گم شدہ تقویم کے مطابق ریکارڈ کیے گئے تھے، اس تقویم کا انکشاف کر لیا جائے تو یہ تضاد دُور ہو سکتے ہیں' اب جبکہ میرے دعوے کے بموجب اس گم شدہ تقویم کی بازیافت کر لی گئی ہے تو اصولاً ان تمام واقعات کی توقیتی صراحتوں کو مجموعی طور پر ان جدولوں پر پورا اُترنا چاہیئے، دو چار تاریخوں کی درستی کے معنی اتفاقات بھی ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ ان جدولوں کی پوری افادیت تو مقالۂ چہارم میں قارئین کے سامنے آئے گی جہاں دو تقویمی نظریے کا ہر پہلو پیش کیا جائے گا، اور سیرۃ کی تقریباً جملہ توقیتی شہادتوں کی روشنی میں اس کو پرکھنے کی کوشش کی جائے گی، تاہم قارئین اگر چاہیں تو بطورِ خود ان جدولوں کی ابتدائی آزمائش فرما سکتے ہیں، میں دو ایک مثالیں دے کر طریقۂ عمل کی وضاحت کیے دیتا ہوں۔

مقالۂ اوّل میں راقم الحروف نے قسم وار توقیتی تضادات کی مثالیں پیش کی ہیں، انھیں مثالوں سے ابتدائی تین قسموں کی جانچ فرما کر دیکھیے۔ مثلاً:

ہجرت کی مجمع علیہ تاریخ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱ سنہ بیان کی گئی ہے، جو عام قمری تقویموں پر پوری نہیں اُترتی، اس کے لیے میری ۱ سنہ کی جدول میں ربیع الاوّل ملاحظہ فرمائیے جو پنجشنبے کے دن شروع ہو رہا ہے، اس حساب سے ۱۲ ربیع الاوّل

———کو دو شنبہ ہی پڑے گا۔

اسی طرح دوسرے واقعات کی تاریخوں اور دنوں کا امتحان کیا جا سکتا ہے، ان میں بعض ریکارڈ ایسے بھی ملیں گے جن میں ایک دن کا فرق محسوس ہوگا، لیکن اس فرق کو نظرانداز کر دینا چاہیے۔

موسمی مطابقت کا اندازہ انگریزی مہینوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ہر قمری مہینے کے نیچے لکھ دیئے گئے ہیں مثلاً: بدر، اُحد، فتح مکہ اور حنین وغیرہ تمام غزوات کا تعلق از روئے روایات موسمِ گرما سے معلوم ہوتا ہے، مگر عام تقویمی اعتبار سے یہ سرمائی واقعات سمجھے جاتے تھے ان جدولوں سے معلوم ہوگا کہ یہ غلط فہمی محض مکی تقویم کو فراموش کر دینے کا نتیجہ تھی، کیونکہ ان جملہ واقعات کی تاریخیں مئی، جون اور جولائی سے مطابق ہو جاتی ہیں اسی طرح سرمائی واقعات مثلاً سریۂ ذاتِ سلاسل، سریۂ علقمہ بن مجزز وغیرہ کی تاریخیں سرمائی مہینوں سے پوری طرح مطابقت کرتی ہیں۔

۲۷ جنوری سنہ ۶۳۲ء کا سورج گرہن جو ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے روز ہوا تھا، ربیع الآخر سے اور خسرو پرویز کی تاریخ قتل فروری سنہ ۶۲۸ء جمادی سنہ ۷ھ سے عین مطابق ہے، میں مقالۂ چہارم میں پوری تفصیل سے ان مطابقتوں کو پیش کروں گا اس لیے اس سرسری مطابقت سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ واقعاتِ سیرۃ کے توقیتی تضاد پوری طرح حل ہو چکے ہیں اور ہمیں اپنی تحقیقات ختم کر دینا چاہیے۔

مدنی کلینڈر (۳)

میں نے اپنے نظریہ میں جہاں واقعاتِ سیرۃ پر مکی تقویم کی اثر اندازی کا اظہار کیا ہے، وہیں یہ بات بھی پیش کی ہے کہ سیرت کے بہت سے واقعات کی توقیتی صراحتوں پر ایک خاص قمری تقویم کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے، جو میری رائے میں مدنی تقویم کے نام سے موسوم ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش کی جا چکی ہے کہ اگرچہ یہ دونوں تقویمیں اصولی اور بنیادی طور پر مختلف تھیں، لیکن ان کے مہینے قطعاً مشترک الاسم معلوم ہوتے ہیں۔

اوراقِ گزشتہ میں مکی تقویم کی بازیافت کے بعد اب یہی دو مسئلے (یعنی مدنی تقویم اور اس کے مشترک الاسم مہینے) قابلِ غور رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک مدنی تقویم کی جداگانہ حیثیت کا تعلق ہے تو تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینے میں مکی یا کوئی اور بیرونی سنہ بجز یہودی سنہ کے رائج نہ تھا، نیز یہ کہ مدینے کا سنہ مکی سنہ سے بالکل مختلف تھا، سمہودی کا بیان ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ مدینہ اپنے "آطام" سے شمارِ ایام کیا کرتے تھے اور البیرونی کی شہادت کے مطابق مدنی لوگوں میں مشاہیر کے نام سے سنین چلانے کا دستور بھی موجود تھا۔

اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اہلِ مدینہ کے سنہ ہمیشہ قمری ہوتے تھے، اور ان میں قمری شمسی (LUNI SOLAR) سنین کا رواج مطلقاً نہ تھا۔

زمانۂ قدیم میں قمری شمسی تقویم کی ابتدائی غرض اور حقیقی افادیت بجز اس کے اور کچھ نہ تھی، کہ اس کے ذریعہ مرکزی معبدوں پر میلا یا اور زرعی پیداواروں کے اوّلین حاصل ٹھیک وقت پر پہنچ سکیں،

ظہورِ اسلام کے وقت حجاز کے تین بڑے شہروں یعنی مکّے، طائف اور مدینے میں "صرف مدینہ ہی ایک ایسا شہر تھا جہاں کوئی بڑا یا مرکزی معبد نظر نہیں آتا، قرب و جوار میں چند چھوٹے چھوٹے مندر ملتے ہیں، ان کی اوراق تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں۔ قبولِ اسلام سے پہلے مدینے کے لوگ "مناۃ" کے خاص طور پر پرستار تھے، لیکن اس دیوی کا مندر بھی مدینے میں نہ تھا، بلکہ مکّے کے قریب مشلّل میں تھا۔ سال میں صرف ایک بار جب مدینے کے حاجی مکّے پہنچتے تو اس مندر کی زیارت بھی کرتے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کو اپنی تمام ضروریات میں قمری شمسی تقویم کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

اس خیال کو مزید تقویت یوں ہوتی ہے کہ جن مقامات پر قمری شمسی تقویم کا رواج ہوتا وہاں اس کے حسابات کو درست رکھنے کے لیے مستقل عہدے دار مقرر کئے جاتے، چنانچہ رومیوں، یہودیوں اور خود اہلِ مکّہ کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان میں "نساۃ" کے محکمے بالکل منتقل تھے۔ مدینے کے لوگ اگرچہ مذہبًا اہلِ مکّہ سے بہت کچھ مختلف اور آزاد تھے، تاہم تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ اُن کے یہاں بھی یہ محکمہ یا "نسی" کرنے والوں کا عہدہ موجود تھا، حالانکہ اس شہر کے متعلق ظہورِ اسلام کے زمانے کے حالات کافی محفوظ ہیں۔

قطع نظر اس سے خود واقعاتِ سیرت کی توقیتی شہادتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت مدینے میں ایک خالص قمری تقویم رائج تھی۔ میں نے مقالۂ گزشتہ میں متعدد واقعات ایسے پیش کئے ہیں، جو ایک خالص قمری تقویم کے مطابق ریکارڈ کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جن کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر مدینے میں کوئی خالص قمری تقویم رائج نہ تھی تو یہ ریکارڈ کہاں سے آئے اور کس نے کئے؟ کیونکہ مہاجرینِ مکہ کا سنہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے قمری شمسی تھا۔

یہ تمام شہادتیں اس بات کے حق میں بیان کی جاتی ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت مدینے میں جو تقویم رائج تھی، وہ خالص قمری تھی، لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی یقینی معلوم ہوتی ہے کہ اس تقویم میں جو مہینے اور دن رائج تھے اُن کے نام وہی تھے جو مکّی تقویم میں مستعمل ہوتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مورخین نے بڑی صراحت کے ساتھ متعدد جاہلی سنین اور شہور کے نام گنائے ہیں جو مختلف قبائل میں رائج تھے اور یہ نام عربی تقویم کے مروّجہ ناموں سے بالکل مختلف بھی ہیں، بلکہ ان کے دنوں تک کے نام الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ یہ نام مدینے میں بھی رائج تھے۔

اہلِ مدینہ سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں روایتیں منقول ہیں، اور مدنی صحابہ نے اپنی روایتوں میں بڑی کثرت سے مہینوں اور دنوں

کے نام بھی لیے ہیں، لیکن سیرت اور حدیث کی کتابوں میں شاذ ہی ایک روایت بھی ایسی نہیں جس میں مروجہ ناموں کے علاوہ کوئی اور نام لیا گیا ہو۔

یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اگر مدینے میں مہینوں اور دنوں کے کچھ اور نام رائج ہوتے تو کبھی نہ کبھی کسی مدنی راوی کی زبان سے وہاں کا مروّجہ نام ضرور نکلتا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان ناموں کا تذکرہ اکثر و بیشتر رواۃ کی زبان پر ہوتا۔

پیغمبرِ اسلام کے آخری خطبۂ حج یعنی حجۃ الوداع میں بلا شبہ "رجبِ مُضر" کا نام آیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نام کا کوئی اور مہینہ دوسرے قبائل میں موجود تھا، آپ نے تخصیص کی خاطر "مُضر" کا اضافہ کر کے اس اشتباہ کو دور کر دیا لیکن اگر دیکھیے تو اس کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں کہ اہلِ مکہ کے اثر سے اُن کے مہینے دُور اور نزدیک قبائل میں مقبول کر لئے گئے تھے۔

مختلف النوع سنین اور ان کے مشترک الاسم مہینے تاریخ میں کوئی عجوبہ شے نہیں۔ آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں کہ "یہودی" اور سریانی سنین کی بناوٹ میں بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں سنین ہنوز زندہ ہیں اور ایک سنہ آج بھی قمری شمسی اصولوں پر چل رہا ہے، جبکہ دوسرا خالص شمسی سنہ ہے۔ حالانکہ دونوں سنوں کے مہینے تقریباً مشترک الاسم ہیں، یہی کیفیت بکرمی، فصلی اور بنگلہ سنہ کی ہے۔ جس کے مہینے مشترک لیکن اصولِ تقویم جُدا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اہلِ مدینہ نے اپنے قمری سنہ کے مہینوں کے نام اسی طرح اہلِ مکہ سے لیے تھے جس طرح شام کے مسیحیوں نے اپنے کلنڈر کے مہینے یہودی تقویم سے۔

بہرصورت واقعاتِ سیرت کی توقیتی شہادتیں بتاتی ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں مدینے کے اندر دو قسم کی تقویمیں کارفرما رہیں، جن میں ایک خالص قمری تھی، اور دوسری قمری شمسی، مگر ان دونوں کے مہینوں اور دنوں کے نام قطعاً مشترک تھے۔

یہ تقویمیں کم سے کم ۹ سنہ ۱ھ تک پہلو بہ پہلو چلتی رہیں، حتیٰ کہ ۹ سنہ تک مکّی تقویم کو مسلمانوں کی دینی تقویم کا مرتبہ بھی حاصل رہا۔ اور تمام مہاجر و انصار اسی کے ماہِ محرم میں صومِ عاشورہ اور اسی کے ماہِ رمضان میں روزے رکھتے رہے ۲ سنہ کے بعد اور ۹ سنہ کی ابتداء میں جب پیغمبرِ اسلامؐ نے اس تقویم کی تنسیخ کا اعلان فرمایا تو مسلمانوں کا مذہبی سنہ بجائے مکّی کے مدنی بن گیا جو آج تک اسی طرح قمری چلا آرہا ہے۔

مدنی سنہ کو اسلامی سلطنت کی قبولیت کا شرف خلیفۂ ثانی کے عہد کا واقعہ ہے اور اسی زمانے میں اس کا نام ہجری سنہ قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت میں اس سے نسبتاً کم واقعات ریکارڈ کئے گئے تھے۔

ہجری سنہ میں صرف بارہ قمری مہینے ہوتے ہیں، ایک قمری مہینہ چونکہ 29.53 دن کا ہوتا ہے اس لیے بارہ قمری ماہ یا ایک قمری سال 354.36 دن کا ہوا، لیکن عملی طور پر ایک سال 353 دن سے کم اور 355 دن سے زیادہ کا نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ تین متواتر ماہ انتیس (۲۹) دن کے ہو سکتے ہیں، اور چار متواتر ماہ تیس (۳۰) دن کے۔

منجمین حساب کی آسانی کے لیے محرم کو تیس (۳۰) دن کا اور صفر کو انتیس دن کا شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مہینہ تیس دن کا اور

دوسرا انتیس کا قرار دیا جاتا ہے، ہر ۳۰ سالہ دور میں گیارہ سال ذوالحجہ کو بھی ۳۰ دن کا شمار کرتے ہیں[1]، لیکن یہ سب حسابی طریقے ہیں، سچ یہ ہے کہ حسابی رویت اور حقیقی رویت میں عملاً فرق پڑتا رہتا ہے جس کی وجہ سے عموماً توقیتی غلطیاں ہو جاتی ہیں، چاند ہوتا ہے اور نظر نہیں آتا، چاند نہیں ہوتا ہے اور ہم مان لیتے ہیں۔ بہرحال میں یہاں سنہ ۱ھ سے لے کر سنہ ۱۱ھ تک کی جدول تقویم پیش کرتا ہوں جن میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کا دن اور عیسوی تاریخ لکھ دی گئی ہے اور ان جدولوں کو میں نے کننگھم اور وسٹنفلڈ کی تقویموں سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا ہے۔

سنہ ۱	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵	سنہ ۶
محرم جمعہ ۱۶ر جولائی سنہ ۶۲۲ء	محرم سہ شنبہ ۵ر جولائی	محرم یکشنبہ ۲۴ر جون	محرم پنجشنبہ ۱۳ر جون	محرم دوشنبہ ۲ر جون	محرم شنبہ ۲۳ر مئی
صفر یکشنبہ ۱۵ر اگست	صفر پنجشنبہ ۴ر اگست	صفر سہ شنبہ ۲۴ر جولائی	صفر شنبہ ۱۳ر جولائی	صفر چہارشنبہ ۲ر جولائی	صفر ۲شنبہ ۲۲ر جون
ربیع الاول دوشنبہ ۱۳ر ستمبر سنہ ۶۲۲ء	ربیع الاول جمعہ ۲ر ستمبر	ربیع الاول چہارشنبہ ۲۲ر اگست	ربیع الاول یکشنبہ ۱۱ر اگست	ربیع الاول پنجشنبہ ۳۱ر جولائی	ربیع الاول سہ شنبہ ۲۱ر جولائی
ربیع الآخر چہارشنبہ ۱۳ر اکتوبر	ربیع الآخر یکشنبہ ۲ر اکتوبر	ربیع الآخر جمعہ ۲۱ر ستمبر	ربیع الآخر سہ شنبہ ۱۰ر ستمبر	ربیع الآخر شنبہ ۳۰ر اگست	ربیع الآخر پنجشنبہ ۲۰ر اگست
جمادی الاولیٰ پنجشنبہ ۱۱ر نومبر	جمادی الاولیٰ دوشنبہ ۳۱ر اکتوبر	جمادی الاولیٰ شنبہ ۲۰ر اکتوبر	جمادی الاولیٰ چہارشنبہ ۹ر اکتوبر	جمادی الاولیٰ یکشنبہ ۲۸ر ستمبر	جمادی الاولیٰ جمعہ ۱۸ر ستمبر
جمادی الاخریٰ شنبہ ۱۱ر دسمبر	جمادی الاخریٰ چہارشنبہ ۳۰ر نومبر	جمادی الاخریٰ دوشنبہ ۱۹ر نومبر	جمادی الاخریٰ جمعہ ۸ر نومبر	جمادی الاخریٰ سہ شنبہ ۲۸ر اکتوبر	جمادی الاخریٰ یکشنبہ ۱۸ر اکتوبر
رجب یکشنبہ ۹ر جنوری سنہ ۶۲۳ء	رجب پنجشنبہ ۲۹ر دسمبر	رجب سہ شنبہ ۱۸ر دسمبر	رجب شنبہ ۷ر دسمبر	رجب چہارشنبہ ۲۶ر نومبر	رجب دوشنبہ ۱۶ر نومبر
شعبان سہ شنبہ ۸ر فروری	شعبان شنبہ ۲۸ر جنوری سنہ ۶۲۴ء	شعبان پنجشنبہ ۱۷ر جنوری سنہ ۶۲۵ء	شعبان دوشنبہ ۶ر جنوری سنہ ۶۲۶ء	شعبان جمعہ ۲۶ر دسمبر	شعبان چہارشنبہ ۱۶ر دسمبر
رمضان چہارشنبہ ۹ر مارچ	رمضان یکشنبہ ۲۶ر فروری	رمضان جمعہ ۱۵ر فروری	رمضان سہ شنبہ ۴ر فروری	رمضان شنبہ ۲۴ر جنوری	رمضان پنجشنبہ ۱۴ر جنوری سنہ ۶۲۸ء

[1] اس سلسلے میں دیکھیے میرا مقالہ جو ماہنامہ "زندگی رامپور" جون ۱۹۶۲ء میں شائع ہو رہا ہے اور جس میں سنہ ہجری کے مداخل کے استخراج کے طریقے اور عیسوی سنہ سے مطابقت کے اصول پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ میں نے بخوفِ طوالت اس حصے کو زیرِ نظر مقالے سے علیحدہ کر دیا ہے۔ (علوی)

سنہ	سنہ ۲	سنہ ۳	سنہ ۴	سنہ ۵	سنہ ۶
شوال جمعہ ۸ر اپریل	شوال سہ شنبہ ۲۷ر مارچ	شوال یکشنبہ ۱۷ر مارچ	شوال پنجشنبہ ۶ر مارچ	شوال دوشنبہ ۲۲ر فروری	شوال شنبہ ۱۳ر فروری
ذلیقعدہ شنبہ ۷ر مئی	ذلیقعدہ چہارشنبہ ۲۵ر اپریل	ذلیقعدہ دوشنبہ ۱۵ر اپریل	ذلیقعدہ جمعہ ۴ر اپریل	ذلیقعدہ سہ شنبہ ۲۴ر مارچ	ذلیقعدہ یکشنبہ ۱۳ر مارچ
ذوالحجہ دوشنبہ ۶ر جون	ذوالحجہ جمعہ ۲۵ر مئی	ذوالحجہ چہارشنبہ ۱۵ر مئی	ذوالحجہ یکشنبہ ۴ر مئی	ذوالحجہ پنجشنبہ ۲۳ر اپریل	ذوالحجہ سہ شنبہ ۱۲ر اپریل

سنہ ۷	سنہ ۸	سنہ ۹	سنہ ۱۰	سنہ ۱۱	سنہ ۱۲
محرم چہارشنبہ ۱۱ر مئی	محرم دوشنبہ یکم مئی	محرم جمعہ ۲۰ر اپریل	محرم سہ شنبہ ۹ر اپریل	محرم یکشنبہ ۲۹ر مارچ	
صفر جمعہ ۱۰ر جون	صفر چہارشنبہ ۳۱ر مئی	صفر یکشنبہ ۲۰ر مئی	صفر پنجشنبہ ۹ر مئی	صفر سہ شنبہ ۲۸ر اپریل	
ربیع الاوّل شنبہ ۹ر جولائی	ربیع الاوّل پنجشنبہ ۲۹ر جون	ربیع الاوّل دوشنبہ ۱۸ر جون	ربیع الاوّل جمعہ ۷ر جون	ربیع الاوّل چہارشنبہ ۲۷ر مئی	
ربیع الآخر دوشنبہ ۸ر اگست	ربیع الآخر شنبہ ۲۹ر جولائی	ربیع الآخر چہارشنبہ ۱۸ر جولائی	ربیع الآخر یکشنبہ ۷ر جولائی	ربیع الآخر جمعہ ۲۶ر جون	
جمادی الاولیٰ سہ شنبہ ۶ر ستمبر	جمادی الاولیٰ یکشنبہ ۲۷ر اگست	جمادی الاولیٰ پنجشنبہ ۱۶ر اگست	جمادی الاولیٰ دوشنبہ ۵ر اگست	جمادی الاولیٰ شنبہ ۲۵ر جولائی	
جمادی الاخریٰ پنجشنبہ ۶ر اکتوبر	جمادی الاخریٰ سہ شنبہ ۲۶ر ستمبر	جمادی الاخریٰ شنبہ ۱۵ر ستمبر	جمادی الاخریٰ چہارشنبہ ۴ر ستمبر	جمادی الاخریٰ دوشنبہ ۲۴ر اگست	
رجب جمعہ ۴ر نومبر	رجب چہارشنبہ ۲۵ر اکتوبر	رجب یکشنبہ ۱۴ر اکتوبر	رجب پنجشنبہ ۳ر اکتوبر		
شعبان یکشنبہ ۴ر دسمبر	شعبان جمعہ ۲۴ر نومبر	شعبان سہ شنبہ ۱۳ر نومبر	شعبان شنبہ ۲ر نومبر		
رمضان دوشنبہ ۲ر جنوری ۶۲۹ء	رمضان شنبہ ۲۳ر دسمبر	رمضان چہارشنبہ ۱۲ر دسمبر	رمضان یکشنبہ یکم دسمبر		

سنہ ۷	سنہ ۸	سنہ ۹	سنہ ۱۰	سنہ ۱۱	سنہ ۱۲
شوال چہارشنبہ ۱ر فروری	شوال دوشنبہ ۲۲ر جنوری سنہ ۶۳۰	شوال جمعہ ۱۱ر جنوری سنہ ۶۳۱	شوال سہ شنبہ ۳۱ر دسمبر		
ذلقعدہ پنجشنبہ ۲ر مارچ	ذلقعدہ سہ شنبہ ۲۰ر فروری	ذیقعدہ شنبہ ۹ر فروری	ذلقعدہ چہارشنبہ ۲۹ر جنوری		
ذوالحجہ شنبہ ۱ر اپریل	ذوالحجہ پنجشنبہ ۲۳ر مارچ	ذوالحجہ دوشنبہ ۱۱ر مارچ	ذوالحجہ جمعہ ۲۸ر فروری		

گزشتہ مہینے یہ دلچسپ اتفاق ہوا کہ جن مضامین کی مجھے سخت ضرورت تھی وہ یہیں مل گئے، یعنی پرسیوال (PERCEVAL) اور محمود پاشا فلکی کے "نظریات" جن کے دلائل دیکھ کر یہ اطمینان ہو گیا کہ میرا طرزِ فکر غلط نہیں۔

پرسیوال اور محمود پاشا دونوں کے اصل مقالات فرانسیسی زبان میں شائع ہوئے تھے جن میں اول الذکر کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر (ISLAMIC CULTURE VOL XXI-1947) میں شائع ہو چکا ہے۔ محمود پاشا فلکی کی کتاب کا ترجمہ سب سے پہلے احمد زکی آفندی نے "نتائج الافہام" کے نام سے عربی میں کیا تھا۔ اس کتاب کو مولوی سید محی الدین خان صاحب جج ہائیکورٹ (حیدر آباد) نے اُردو کا جامہ پہنایا اور ۱۸۹۸ء میں نول کشور پریس نے شائع کیا۔

ان دونوں علمائے کے نظریات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پرسیوال کے نزدیک نو مکی سنہ "قمری شمسی" تھا (اگرچہ حسابات غلط تھے) اور محمود فلکی کی رائے میں "خالص قمری" تھا۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ دونوں نے واقعاتِ سیرت کی تاریخوں کو بہت کم قابلِ اعتنا سمجھا، اور اپنے دلائل میں صرف دو دو تین تین واقعات پیش کر کے نظریات مکمل کر لیے، حالانکہ محمود فلکی تھوڑی سی جستجو کے بعد درجنوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ بہر صورت ان دونوں مقالات کو یا تو اپنی کتاب میں بطور ضمیمہ شائع کر دوں گا یا ان کے نظریات اور دلائل کی تھوڑی بہت وضاحت کر دی جائے گی۔ ——— (علوی)

مقالۂ اوّل میں واقعاتِ سیرت کے توفیقی تضادات کا ابتدائی جائزہ لینے کے بعد میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سیرت کے واقعاتی ریکارڈوں پر دو قسم کی تقویموں کی کارفرمائی معلوم ہوتی ہے جن میں ایک "خالص قمری" تھی اور دوسری "قمری شمسی" (SUNI SOLAR) جس کو میں نے "سنی تقویم" کا نام دیا تھا۔

مقالۂ دوم میں اس "قمری شمسی" تقویم کی بازیافت کی کوشش کی گئی تھی جو میری رائے میں ٹھیک ٹھیک دریافت کر لی گئی ہے، اور یقین ہے کہ خود قارئین نے بھی اس کی ابتدائی آزمائش کر کے یہی نتیجہ نکالا ہوگا۔

مدینے کی "خالص قمری" پہلے ہی سے باعثِ نزاع نہ تھی، اس لیے زیرِ نظر مقالے میں بظاہر یہ آسان تھا کہ واقعاتِ سیرت

کو علی الترتیب پیش کر کے ان دونوں تقویموں پر منطبق کر دیا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ جن روایات پر ڈیڑھ ہزار سال کی کہنگی کے آثار یعنی کتابتی اغلاط، فہمی غلطیاں مصنفین کے سہو موجود ہوں۔ اُن کا فوری انطباق آسان نہیں۔

علاوہ ازیں خود اس نظریہ پر بعض اصولی سوالات بلکہ یوں کہیئے کہ شبہات بھی پیدا ہوتے ہیں جن پر تطبیق سے پہلے غور کر لینا ضروری ہے مثلاً :۔

پہلا سوال مقالۂ اوّل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ پرسیوال (PERCIVAL) اور میور کے نزدیک بھی مکی سنہ "قمری شمسی"[1] تھا، جو میرے دعوے کے عین مطابق ہے، نیز ونکلر (WINCKLER) اور نیلسن (NEILSEN) کا یہ تصور بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت مکے اور مدینے کی تقویمیں بالکل جدا جدا تھیں، مگر دونوں تقویموں کے مہینے مشترک الاسم تھے[2] یہ خیال بھی بعینہٖ وہی ہے جو خود پیش کر رہا ہوں، بلکہ میں نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ ونکلر کے اسی تصور نے میرے ذہن میں دو تقویمی تصورات کو جنم دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ شاید ڈاکٹر حمید اللہ کے سامنے بھی ونکلر کا یہی تصور تھا، کیونکہ انھوں نے بھی مکی اور مدنی تقویموں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اصولی طور پر ان علمائے کے تصورات تقریباً وہی تھے جو میں پیش کر رہا ہوں تو پھر میرے اور ان علماء کے نظریات میں بنیادی فرق کیا ہے ؟ اور کیا وجہ ہے کہ اُن کے حسابات سے سیرت کے توقیتی مسائل حل نہیں ہوتے ؟

اس سلسلہ میں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میور اور پرسیوال سے تو بظاہر یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے عرب جاہلیت کی تقویمی صلاحیتوں کو پورے طور پر نہیں سمجھا اور یہ رائے قائم کر لی کہ جاہلی عربوں میں حسابی کم فہمی کے باعث، عہدِ رسالت میں ایام حج مارچ میں آنے لگے تھے اور رسال اپنی قدیم جگہ سے ہٹ گیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تصور بنیادی طور پر صحیح نہ تھا اسی لیے ان کا نظریہ واقعاتِ سیرت کی توقیتی توجیہ کرنے میں ناکام رہا۔

ونکلر WINCKLER کے دو تقویمی نظریے[2] کی تفصیلات میرے سامنے نہیں البتہ ڈاکٹر حمید اللہ کا قیمتی مقالہ "عہدِ نبوی کے عربی ایرانی تعلقات" اس وقت میرے سامنے ہے جس میں فاضل مقالہ نگار نے دو تقویمی تصور کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے، اور جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں، ایک جدولِ تقویم بھی شامل کی ہے جسے میں نے مقالۂ اوّل میں بجنسہٖ نقل کر دیا ہے[3]۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عہدِ رسالت میں مکی اور مدنی تقویمیں پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں، میرے اور ڈاکٹر حمید اللہ کے تصورات میں کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ایک بنیادی اور نہایت ہی اہم فرق یہ ہے کہ ان کی رائے میں یہ دونوں تقویمیں سنہ ۱۰ھ میں جا کر ایک ہو گئی تھیں اور ذوالحجہ سنہ ۱۰ھ دونوں تقویموں کے اعتبار سے مشترک ایام میں آیا تھا، جس کے کھلے معنیٰ یہ ہوتے ہیں کہ محرم سنہ ۱۱ھ بھی مشترک ایام میں آیا ہو گا۔

---

[1] دیکھیے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۸۸

[2] دیکھیے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۹۳

[3] دیکھیے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۹۴ / ۲۹۵ ء

اگر یہ خیال صحیح ہے کہ مکی تقویم ہمیشہ اعتدالِ خریفی سے شروع ہوتی تھی اور اگر یہ روایتیں غلط نہیں کہ عہدِ رسالت میں صومِ عاشوراء ہمیشہ محرم میں رکھا جاتا تھا، جو یہودیوں کے یومِ عاشوراء سے صرف ایک دن آگے پیچھے[1] ہوتا تو یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ ۱۱ھ میں مکے اور مدینے کی تقویموں کے ایام و شہور مشترک ہو گئے تھے۔

اس سلسلہ میں "البیرونی" کی جرح و تنقید پہلے پیش کی جا چکی ہے اور آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس عظیم ریاضی دان نے احادیثِ عاشوراء کو غلط ثابت کرنے میں یہی دلیل پیش کی ہے کہ عہدِ رسالت میں "ماہِ تشری" اور "ماہِ محرم" ایک ساتھ نہیں آ سکتے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا اس ذیل میں صرف یہ استدلال ہے :-

"کہ جنابِ رسالت مآب صلعم نے ذی الحجہ ۱۰ھ میں سالِ کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبۂ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت "انما النسئ زیادۃ فی الکفر الآیۃ" کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا "ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" اور متفقہ طور پر اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع تھے۔"[2]

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر اہم نظریئے کے لیے محض یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ "متفقہ طور پر اس کی یہ تشریح کی جاتی ہے۔" بالخصوص اس حالت میں کہ اس مرادی معنی کی پشت پر (بجز چند علماء کے اقوال اور قیاسات کے) تاریخی، واقعاتی یا حسابی شہادتوں میں سے ایک چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی نہیں، اور بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ ۱۰ھ میں مکی اور مدنی تقویمیں ایک ہو گئی تھیں، تو پھر ایسی تاریخی روایات اور واقعات کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ جو مروجہ تقویم کی مدد سے حل نہیں ہوتے، مثلاً اسی سن کے سورج گرہن کے واقعے کو لیجیئے جو روایتی طور پر ربیع الاوّل یا ربیع الآخر ۱۰ھ میں ہوا تھا، لیکن از روئے حسابِ ہیئت اس کی تاریخ ۲۷ جنوری ۶۳۲ء متعین ہوتی ہے جو ہجری کلنڈر کے بموجب ۲۸ شوال ۱۰ھ سے مطابق ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس دوسرے واقعات کی بھی یہی کیفیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غلطی صرف ڈاکٹر حمید اللہ ہی کے قلم سے نہیں ہوئی، بلکہ اتنی عام ہے کہ غالباً ہر محقق کو اسی جگہ ٹھوکر لگی، میور اور پرسیوال نے بھی اسی تصور کے تحت ۱۰ھ میں مکی اور مدنی تقویم کو ہم زمانہ قرار دے[3] کر واقعاتِ سیرت کی توقیتی صراحتوں کو کہیں سے کہیں رکھ دیا ہے۔

جہاں تک "ان الزمان قد استدار" کے صحیح مفہوم کا تعلق ہے تو میں نے اس کی تشریح مقالۂ چہارم میں حجۃ الوداع کے ذیل میں کی ہے، یہاں یہ سمجھ لیجیئے کہ ۹ھ میں مکی تقویم کو منسوخ کیا گیا تھا اور مدینے کی خالص قمری تقویم اختیار کر لی گئی تھی جس کے باعث موسم

---

[1] دیکھیئے برہان جولائی ۱۹۶۴ء / ۱۱ [2] معارف ۱۹۴۲ء

[3] پرسیوال کے نظریہ کے لیے دیکھیئے (ISLAMIC CULTURE XXI - 1947

حج پہلی بار مارچ ۶۳۱ء میں آیا تھا،

دوسرا سوال

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرے اس نظریئے سے صرف قسم اوّل، دوم اور سوم کی توفیق الحسنیں ہی وجود ہوتی ہیں؟ یا یہ نظریہ چوتھی اور پانچویں قسم پر بھی حاوی ہے[1]؟ اور ایسے واقعات کے تضادات کو بھی دور کر دیتا ہے جن کی توقیت میں قدیم علمائے سیرت کو اس درجہ اختلاف تھا کہ دو مکاتبِ تاریخ وجود میں آ گئے تھے[2] کیونکہ اگر یہ نظریہ ان تضادات کو دور نہیں کرتا تو قوی شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ تصور محض ایک تاریخی وہم اور حسابی مغالطے سے زیادہ نہیں؛

واقعہ یہ ہے کہ دو تقویموں کی موجودگی کے لیے صرف اتنا ثبوت کافی نہیں کہ ہم کچھ واقعات کی تاریخیں ایک جدول سے اور کچھ دوسری جدول سے درست کر دکھائیں، کیونکہ جب ایک سے زیادہ جدولوں کی مدد سے توقیتی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کی جائے گی، اگرچہ یہ واقعات غلط ہی ریکارڈ کیے گئے ہوں، خود بخود بڑی حد تک درست نظر آنے لگیں گے، اور قدرتاً کچھ واقعات ایک جدول پر اور کچھ دوسری پر پورے اترتے محسوس ہوں گے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی تیسری تقویم کا اور ادّعا کر دیا جائے تو ہر توقیتی صراحت خواہ وہ کتنی ہی غلط ہو سو فیصدی صحیح ثابت ہو جائے گی۔

دو تقویموں کی بیک وقت موجودگی، اصولاً صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب ایک ہی واقعے کے متعلق دو ایسی جدا گانہ توقیتی صراحتیں مل سکیں جو علیحدہ علیحدہ کلینڈروں کے مطابق ریکارڈ کی گئی ہوں اور وہ بظاہر کتنی ہی مختلف یا متضاد معلوم ہوں، لیکن جب حساب لگایا جائے تو ان سے صرف ایک ہی زمانہ متعین ہو سکے، کیونکہ یہ تصور قطعاً خارج از قیاس ہے کہ دو تقویموں کی موجودگی ہیں، واقعات کا ریکارڈ کرتے وقت ایک ہی راوی نے کبھی مکّی اور کبھی مدنی تقویم استعمال کی ہو گی بلکہ اس کے مقابلہ میں معمولی عقل COMMON SENCE یہ چاہتی ہے کہ اگر واقعی عہدِ رسالت میں دو تقویمیں رائج تھیں تو ایسے رواۃ نے جو مکّی تقویم کے عادی تھے مکّی اور جو مدنی کے عادی تھے مدنی تقویم استعمال کی ہو گی۔

دو دستاویزی تصور

ظاہر ہے کہ اس صورت میں بہت سے واقعاتی ریکارڈ ایسے بھی ہونا ضروری ہیں، جو بیک وقت دونوں تقویموں کے بموجب ریکارڈ کیے گئے ہوں، گویا "دو تقویمی" نظریئے کو قبول کرنے سے پہلے اصولاً ہمیں "دو دستاویزی" تصور اختیار کرنا پڑے گا، جس کی تائید میں تاریخی شہادتیں درکار ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ دو تقویمی نظریئے کے لیے "دو دستاویزی نظریہ" بالکل ابتدائی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر واقعاتِ سیرت میں "دو دستاویزی" کارفرمائی کا پتہ نہیں چلتا تو دو تقویموں کی موجودگی ثابت ہونا ممکن نہیں، بنا بریں اصولاً ہمیں پہلے اس مسئلے پر غور کرنا ضروری ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ سیرت کے ابتدائی ماخذوں پر ایک سیر حاصل بحث چاہتا ہے جس کا یہاں موقع نہیں تاہم میں کوشش کروں گا کہ تفصیلات کو ترک کر کے مغالطے کو محض تقویمی دائرے تک محدود رکھا جائے۔

---

[1] ان قسموں کے لیے دیکھیے "برہان" مئی ۱۹۶۴ء / ۲۶۷ [2] دیکھیے برہان مئی ۱۹۶۴ء / ۲۸۳

آپ جانتے ہیں کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ چند در چند ہیں جن کی آخری کڑیاں ایسے صحابہ سے جا ملتی ہیں جنھوں نے اپنا آنکھوں دیکھا، یا کانوں سنا حال کسی نہ کسی نہج سے ابتدائی مصنفین، مثلاً عبداللہ بن عباسؓ، ابان بن عثمانؓ، عروہ بن زبیرؓ اور دوسرے علماء مغازی تک پہنچایا، اور انھوں نے ان ذخائر کو قلمبند کرکے آنے والی نسلوں کے حوالے کیا، لیکن یہ قدیم ریکارڈ چونکہ آج موجود نہیں اس لیے متاخرین کے یہاں ان میں سے اکثر روایات کی آخری سند صرف دو ائمہ مغازی یعنی ابن اسحاق المتوفی (۱۵۱ھ) اور واقدی المتوفی (۲۰۷ھ) کے ناموں پر جاکر ختم ہوجاتی ہے۔

ان دونوں کی منزلت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اول الذکر یعنی ابن اسحاق تو صحابہ کے عہد سے اتنے قریب ہیں کہ انھیں تابعی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نیز انھوں نے متعدد بڑے بڑے علماء کا فیضِ صحبت پایا، کئی اعلیٰ پایہ کے اساتذہ کے شاگرد رہے، ان کے عہد میں کئی عمدہ لائبریریاں معرضِ وجود میں آچکی تھیں[1] جن کا تعلق براہِ راست کتبِ سیرت و احادیث سے تھا۔ امام زہری کے

---

[1] (۱) مثلاً ایک ذخیرۂ کتب کا پتہ مشہور صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلتا ہے جو ابن اسحاق کے وقت تک ضائع نہ ہونا چاہیے۔ حسن بن امیہ ضمری کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار ابوہریرہؓ کے سامنے ایک روایت بیان کی تو انھوں نے اس سے انکار کیا، میں نے کہا کہ یہ روایت تو میں نے خود آپ سے سنی ہے، بولے اگر تم نے یہ مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس مکتوبی صورت میں ہوگی، اس کے بعد انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور گھر لے گئے اور مجھے رسول اللہ کی حدیثوں کی کثیر التعداد کتابیں دکھائیں (فارانا کتبا کثیرۃ من احادیث رسول اللہ) (دیکھیے جامع ابن عبدالبر) (۲) اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک عمدہ ذخیرۂ کتب نظر آتا ہے، مشہور سیرۃ نگار موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں جو ابن اسحاق کے معاصر بھی تھے، کہ ایک بار "کریب" نے جو ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے ابن عباس کی (مملوکہ) کتابیں اس تعداد میں میرے سامنے رکھ دیں کہ ایک بار شتر ہوئیں، کریب نے بتایا کہ عبداللہ کے صاحبزادہ علی کو جب کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے لکھ بھیجتے...... (دیکھیے ابن سعد) (۳) عروہ بن زبیر جو سیرۃ کی سب سے بڑی سند سمجھے جاتے ہیں ایک عمدہ کتب خانے کے مالک تھے۔ (V. VOCCA) کا بیان ہے کہ انھوں نے ایک اہم کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں گوناگوں مضامین کی کتابیں تھیں، یہ کتب خانہ تاریخی اور قانونی دونوں قسم کی کتابوں پر مشتمل تھا (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM. VOL. IV. P. 1047) (۴) مشہور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے والد عبدالعزیز بن مروان (المتوفی ۸۶ھ) کو بھی کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے ایک بار کثیر بن مرہ کو لکھا تھا کہ تمھارے پاس رسول اللہؐ کے صحابیوں کی جو حدیثیں ہوں ان کی نقل مجھے بھیج دو، سوائے ابوہریرہ کی کتاب کے کیونکہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ "الا حدیث ابی ھریرۃ فانہ عندنا" (ابن سعد، ۷/۱۵۷) (۵) خلفائے بنو امیہ کو سیاسیات کے ساتھ ساتھ علمی کاموں سے عام طور پر دلچسپی رہی، چنانچہ امیر معاویہؓ کے عہد میں عبداللہ بن عباسؓ، عروہ بن زبیرؓ، آبان بن عثمان، ابوالاسود، اور وہب بن منبہ وغیرہ جیسے عظیم سیرۃ نگاروں کے ساتھ ساتھ، کعب احبار اور عبید بن شریہ جیسے اہل علم بھی نظر آتے ہیں، خود امیر معاویہ کے پوتے، خالد بن یزید بھی اعلیٰ پایہ کے سائنٹسٹ اور مصنفین کی فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا تھا، عبدالملک بن مروان نے امام زہری کو درباری عالم کا مرتبہ دے کر علوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے، عمر بن عبدالعزیز نے سرکاری طور پر حدیثیں جمع کرائیں اور دفتر کے دفتر لکھوا ڈالے۔ کہتے ہیں کہ امویین (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شاگردِ خاص اور اس پائے کے تلامذہ میں سے تھے، جن سے خود اُستاد تک نے استفادہ کیا تھا[۱] کہتے ہیں، کہ امام زہری کے دروازے پر دربان مقرر تھا، کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آنے پائے، لیکن ابن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں[۲]" سیرت میں ان کا مرتبہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ جیسے محتاط محدث نے اُن سے استناد کیا ہے حتیٰ کہ اپنی کتاب المغازی کی ابتدا، گویا کہ ان کے نام سے کی ہے۔

ثانی الذکر یعنی واقدی کو اگرچہ ایک خاص مکتبِ خیال یعنی "معذرت پسند" علمائے نے آج کل بہت بدنام کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن اُن کے متعلق ابن کثیر جیسے محدّث کی رائے یہ ہے:-

"اور واقدی کے پاس عمدہ تفصیلات اور اکثر واقعات کی تحریر شدہ تاریخیں تھیں اور وہ اس فن (یعنی سیرت کے ائمہ کبار میں تھے، اپنی ذات سے صدوق اور کثیر روائتیں بیان کرنے والے تھے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "تکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاھیل" میں ان کی عدالت کے متعلق بیان کیا ہے[۳]"

واقدی پر سب سے سنجیدہ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ "یہ شیعہ[۴] تھے، لیکن میری رائے میں یہ اعتراض بالکل ایسا ہی ہے جیسا ابن اسحاق کے متعلق یہ خیال کہ وہ یہود و نصاریٰ[۵] سے روایت کرنا جائز سمجھتے تھے، حالانکہ تاریخ کی نظر میں یہ دونوں باتیں عیب نہیں۔ واقدی کے زمانہ میں مامون الرشید کا کتب خانہ کافی اہمیت رکھتا تھا، لیکن حیرت ہے خود اس عظیم مورخ کے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کے چھ سو بھرے ہوئے کتاب وا[۶] بیان کئے جاتے ہیں تحقیقی ذوق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جب اپنی کتاب لکھی تو متعدد واقعات اور معاہدے خاص عہدِ رسالت کی دستاویزوں کو سامنے رکھ کر لکھے۔

اِن دونوں اساطینِ سیرت کی تالیفات پر غور کیا جاتا ہے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر جو ابتدائی دستاویزیں تھیں اُن میں بہت سی بقید ایّام و شہور مدوّن کی گئی ہوں گی، اس لیے دونوں کے یہاں تقریباً تمام واقعات کو مؤقّت کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے بلکہ کچھ واقعات تو ایسے ملتے ہیں جن میں دن اور تاریخ کے علاوہ گھڑی اور گھنٹہ تک کا خیال رکھا گیا ہے[۷] ظاہر ہے کہ تاریخ وایّام کی یہ صراحتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی مصنف کے پیشِ نظر کما حقہٗ تفصیلات نہ ہوں۔

ابن اسحاق اور واقدی کی روایات کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں بہت سی روائتوں کے ماخذ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے آگے) کے زوال کے بعد ان کے سرکاری کتب خانے سے جب کتابیں منتقل ہوئیں تو صرف امام زہری کی کتابیں گھوڑوں اور اونٹوں کے ذریعے روانہ کی گئیں۔ [۱] (ALFRED GUILLAUME P. [۲] مولانا شبلی سیرۃ ۱/۲۳

[۳] ابن کثیر، البدایہ ۳/۲۳۴ [۴] ابن ندیم/۱۴۴ [۵] شبلی سیرۃ ۱/۲۴ [۶] ابن ندیم/۱۴۴۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ایک کتاب دان میں صرف ۲۰ کتابیں رہتی تھیں تو ۱۲ ہزار کتابیں ہونا چاہئیں۔

[۷] مثلاً دیکھئے ابن ہشام/ واقعہ ہجرت، طبری/ قتل خسرو پرویز کی تاریخ وغیرہ۔

ایک حد تک مشترک تھے، اس لیے کہ واقعات متعلقہ کی توقیت اور دوسری تاریخی تفصیلات میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں، مثلاً مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخی روایتوں کے ماخذ تقریباً مشترک معلوم ہوتے ہیں۔

واقعۂ ہجرت[1]، غزوۂ ابواء[2]، غزوۂ عشیرہ[3]، غزوۂ بدر[4]، غزوۂ سویق[5]، غزوۂ احد[6]، غزوۂ حمراء الاسد[7]، غزوۂ بنو نضیر[8]، غزوۂ دومۃ الجندل[9]، غزوۂ مُریسیع[10]، غزوۂ حدیبیہ[11]، فتح مکہ[12]، حنین[13] وغیرہ اور اگرچہ ان غزوات میں سے کچھ کی تفصیلی تاریخوں میں تھوڑا بہت اختلاف بھی ہے لیکن جہاں تک مہینوں کا تعلق ہے وہ قطعاً مشترک ہیں۔

ان کے مقابلے میں مندرجہ ذیل واقعات کی تاریخوں پر نظر کیجیے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور واقدی کے بعض ماخذ بالکل مختلف تھے اور باوجودیکہ واقدی کے سامنے ابن اسحٰق کی پوری کتاب موجود تھی، پھر بھی اُنھیں اپنی تحقیق اور اس کے نتائج پر اس درجہ اعتماد بلکہ اصرار تھا کہ انھوں نے ابن اسحٰق کی بیان کردہ بہت سی تاریخوں اور توقیتی صراحتوں کو چُھوا تک نہیں اور اپنے ماخذوں کو برقرار رکھا۔ میں نے مقالۂ اوّل میں بھی ان واقعات کا سرسری تذکرہ کیا ہے اور یہاں بھی دوبارہ فہرست دیتا ہوں۔

واقعات	بروایت ابن اسحٰق	بروایت واقدی
۱۔ غزوۂ کُرز بن جابر فہری	جمادی الاخریٰ ۲ھ	ربیع الاوّل ۲ھ
۲۔ غزوۂ بنی سُلَیم	شوال ۲ھ	محرم ۳ھ
۳۔ غزوۂ ذی امر	محرم ۳ھ	ربیع الاوّل ۳ھ
۴۔ سریہ زید بن حارثہ	ربیع الاوّل ۳ھ (بدر سے چھ ماہ بعد)	جمادی الاخریٰ ۳ھ
۵۔ غزوۂ احد	شوال ۳ھ	محرم ۴ھ (بروایت عبدالحمید بن جعفر)
۶۔ حادثۂ رجیع	شوال؍ذلقعدہ ۳ھ (اُحد کے بعد)	صفر ۴ھ
۷۔ غزوۂ بدر موعد	شعبان ۴ھ	ذلقعدہ ۴ھ
۸۔ غزوۂ ذات الرّقاع	جمادی الاوّل ۴ھ	محرم ۵ھ
۹۔ غزوۂ کرز الیٰ عرنیین	جمادی الاولیٰ ۶ھ	شوال ۶ھ
۱۰۔ غزوۂ خیبر	محرم ۷ھ	جمادی الاولیٰ ۷ھ

ان واقعات کے توقیتی اختلافات سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ابن اسحٰق اور واقدی نے غیر دیانت داری سے کام نہیں لیا تھا، تو ان دونوں کے ابتدائی ماخذ بالکل جُدا جُدا تھے۔

اس طرح ہم سیرت کی ابتدائی تدوین سے کم از کم دو مساوی درجے کے ماخذوں یا دستاویزوں کی کارفرمائی محسوس کرتے ہیں۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف دستاویزوں میں ایک ہی واقعہ کے متعلق جو دو مختلف مہینوں کے نام لیے گئے ہیں اُس کی بنیادی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ کیا واقعی ابن اسحٰق اور واقدی کے رواۃ ان واقعات کے توقیت کے سلسلہ میں اتنے ہی زیادہ مختلف الخیال تھے کہ وہ متفقہ طور پر واقعات کا صحیح مہینہ بھی بیان نہیں کر سکتے تھے یا پھر یہ تمام ایّام و شہور کی صراحتیں

محض فرضی اور صرف زیبِ داستان کے لیے سمجھی جائیں جن میں شرکاء کی عینی شہادتوں کو دخل نہ تھا۔

دوتقویمی نظریہ کی ابتداء

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے حقیقی معنوں میں دوتقویمی نظریئے کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں جبکہ یہ دستاویزیں یا دوسرے الفاظ میں یادداشتیں ضبطِ تحریر میں آرہی تھیں تو اُن کے رُواۃ کچھ مہاجر تھے اور کچھ انصار، غالباً مہاجرین کی یادداشتیں اور روایات سب کی سب مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ ہوئی تھیں، جن کے مقابلے میں انصار اپنی قدیم خالص قمری تقویم استعمال کر رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ ان یادداشتوں کو تابعین کے عہد میں اکٹھا کیا گیا تو اس بات کا لحاظ نہیں رہا کہ اصل دستاویزوں میں کونسی دستاویز مکی تھی اور کونسی مدنی؟ دونوں تقویموں کے مہینے چونکہ مشترک الاسم تھے اس لیے ان سب کو اُسی ایک کلینڈر کی تاریخیں سمجھ لیا گیا جو مدونین کے زمانے میں جاری تھا، یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ابن اسحٰق اور واقدی، بلکہ دوسرے قدیم مصنفین کے یہاں بھی مکی اور مدنی توقیت کا ایک عجیب اختلاط نظر آتا ہے۔

میرے اس دعوے کا متذکرہ بالا توقیتی اختلافات محض دو دو دستاویزوں، اور دو تقویموں کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں، ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ میری "مکی تقویم" کے پہلو میں اگر "عام قمری تقویم" رکھ دی جائے تو یہ تمام اختلافات اُسی آن ختم ہو جاتے ہیں۔

قارئین کو اس کا مکمل اندازہ تو "مقالہ چہارم" میں ہو سکے گا، جہاں اس قسم کے تمام واقعات سے ترتیب وار اور پوری بحث کی گئی ہے، تاہم یہاں صرف مندرجہ ذیل واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔

۱۔ غزوۂ کرز بن جابر فہری کے متعلق واقدی نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ ربیع الاوّل ۲ھ کا ہے[۱] اس کے مقابلے میں ابن اسحاق نے اس کو جمادی الاخریٰ کا واقعہ قرار دیا ہے[۲] جمادی الاُخریٰ ۲ھ مدنی ۳۰ نومبر ۶۲۳ء کو شروع ہوا تھا[۳] مکی جدول تقویم میں ربیع الاوّل ۲ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے[۴] گویا یہ واقعہ ۳۰ نومبر ۶۲۳ء کے بعد کا ہے۔

۲۔ اسی طرح غزوۂ بنو سُلیم بروایت واقدی محرم ۳ھ کا واقعہ ہے[۵] لیکن ابن اسحٰق نے اس کی تاریخ بدر کے عین بعد شوال ۲ھ بیان کی ہے[۶] ہجری تقویم کے بموجب محرم ۳ھ ۲۴ جون ۶۲۴ء کے مطابق تھا[۷] میری مکی تقویم کے بموجب شوال ۲ھ بھی عین اُسی تاریخ شروع ہوا تھا[۸] گویا واقدی کی تاریخ مدنی ہے اور ابن اسحٰق کی مکی۔

۳۔ غزوۂ ذی امر کے متعلق واقدی کی روایت یہ ہے کہ آنحضرتؐ ربیع الاوّل ۳ھ[۹] میں بنو غطفان کی طرف روانہ ہوئے تھے، ابن اسحٰق نے اس غزوے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ آنحضرتؐ جب غزوۂ سویق سے واپس آئے تو ذوالحجہ کا باقی مہینہ یا اس کے لگ بھگ مدینے میں رہے اس کے بعد غطفان سے جنگ کے لیے نکلے، اور یہی غزوۂ ذی امر ہے[۱۰]۔

۱؎ ابن ہشام ۲/۲۵۱ ۲؎ واقدی ۲/ ۳؎ دیکھیے برہان جولائی ۶۴ء/۲۹ ۴؎ ایضاً/۲۰ ۵؎ واقدی/۱۸۳ ۶؎ ابن ہشام ۳/۴۶ ۷؎ دیکھیے برہان جولائی ۶۴ء/۲۹، ۸؎ برہان/۲۱، ۹؎ واقدی/۱۹۱ ۱۰؎ ابن ہشام ۳/۴۹۔

غزوۂ سویق متفقہ طور پر ذوالحجہ کا واقعہ ہے[1]۔ اس لیے غزوۂ ذی امر بھی اسی ذی الحجہ کے آخر اور ابتدائی محرم میں ہونا چاہیئے۔ ہجری حساب سے ربیع الاوّل سنہ ۳ھ ۲۲ راگست ۶۲۴ء کو شروع ہوا تھا[2]۔ اور میری مکی تقویم کے موجب ذوالحجہ مکی کی ابتدا بھی عین اُسی تاریخ یعنی ۲۲ راگست کو ہوئی تھی[3]۔

۴۔ سریۂ زید بن حارثہ کے متعلق ابن اسحٰق کی یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ سریہ بدر سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے[4]۔ جنگ بدر رمضان سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی[5]۔ اس لیے یہ واقعہ ربیع الاوّل سنہ ۳ھ میں ہونا چاہیئے۔ اس کے مقابلے میں واقدی کی روایت کے بموجب یہ واقعہ جمادی الاخریٰ سنہ ۳ھ میں پیش آیا تھا[6]۔ ہجری تقویم کے بموجب جمادی الاُخریٰ سنہ ۳ھ ۱۹ ر نومبر ۶۲۴ء کو شروع ہوا تھا[7]۔ مکی تقویم کے مطابق ربیع الاوّل سنہ ۳ھ بھی اسی نومبر کو شروع ہوا ہے[8]۔

۵۔ غزوۂ اُحد سنہ ۳ھ کا سب سے مشہور واقعہ ہے اور اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی دونوں نے اس کی تاریخ شوال سنہ ۳ھ بیان کی ہے[9]۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، واقدی نے عبدالحمید بن جعفرؒ[10] کی ایک غیر مشہور روایت درج کرکے اس کی مشہور توقیت میں اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ یہ واقعہ شوال سنہ ۳ھ کا تھا یا محرم سنہ ۴ھ کا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی دو تقویمی کارفرمائی کا ایک دلچسپ نمونہ ہے، چنانچہ ہجری تقویم کے بموجب محرم سنہ ۴ھ ۱۳ رجون ۶۲۵ء کو شروع ہوا تھا[11]۔ اور میری مکی تقویم میں شوال سنہ ۳ھ بھی اسی ۱۳ رجون کو شروع ہو رہا ہے[12]۔ جس سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ اس غزوے کے متعلق شوال کی توقیت مکی ریکارڈوں کے مطابق کی گئی تھی اور یہ روایت مدنی حسابات کی آئینہ دار ہے۔

۶۔ غزوۂ احد کے بعد ابن اسحٰق نے ایک واقعہ "یوم رجیع" کے نام سے بیان کیا ہے[13]۔ اور امام بخاری نے بھی خود ابن اسحٰق کے حوالے سے اس کو اُحد کے بعد کا واقعہ قرار دیا ہے[14]۔ اوپر گزر چکا ہے کہ غزوۂ اُحد متفقہ طور پر شوال سنہ ۳ھ کا واقعہ سمجھا جاتا ہے، اس لیے ابن حبیب نے اس کی تاریخ آخر شوال سنہ ۳ھ ہی بیان کی ہے[15] جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حادثہ شروع ذلیقعدہ سنہ ۳ھ میں پیش آیا۔ بخلاف اس کے واقدی نے اس واقعہ کی تاریخ صفر سنہ ۴ھ بیان کی ہے[16] جس کے تتبع میں ابن سعد وغیرہ نے بھی اسی تاریخ کو قبول کیا ہے[17]۔ یہ متضاد تاریخیں بھی دو تقویمی کارفرمائی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ ہجری تقویم کے موجب صفر سنہ ۴ھ کی ابتدا ۱۲ رجولائی ۶۲۵ء کو ہوئی تھی[18]۔ اور میری مکی تقویم کے موجب ذلیقعدہ[19] سنہ ۳ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے۔ گویا ابن اسحٰق کی اسناد کا ریکارڈ مکی تھا اور واقدی کا مدنی۔

---

[1] واقدی/۳، ۱۸۲ ابن ہشام/ [2] دیکھیے برہان جولائی/۲۹ [3] ایضاً/۲۱ [4] البدایہ ۴/۴ [5] ابن ہشام ۲/۲۷۸، واقدی/۳ ، [6] واقدی/۱۹۵ [7] دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۴ء/۱۹ [8] برہان/۲۰ [9] دیکھیے ابن ہشام، نیز دیکھیے واقدی/۳ [10] واقدی/۲۱۷، ۲۱۸ [11] دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۴ء/۲۹ ؛ [12] برہان/۲۱ [13] ابن ہشام [14] بخاری [15] ابن حبیب/۱۱۷ [16] واقدی/۴ [17] ابن سعد ۲/۳۹ [18] دیکھیے برہان جولائی ۱۹۶۴ء/۲۹ ؛ [19] برہان/۲۱

۷ - اسی طرح غزوۂ "بدر موعد" کی تاریخ واقدی کے یہاں ذیقعدہ ۴ھ سنہ مذکور ہوئی ہے[1]۔ مگر ابن اسحٰق کے یہاں شعبان ۴ھ ملتی ہے[2]، عام قمری تقویم کے حساب سے ذیقعدہ ۴ھ ۴ اپریل ۶۲۶ء کو شروع ہوا تھا[3]۔ اس کے مقابلے میں مکی شعبان ۴ھ کی ابتدا بھی اسی ۴ اپریل کو ہوئی تھی[4] گویا ابن اسحٰق نے اس واقعہ کی مکی تاریخ بیان کی ہے اور واقدی نے مدنی مہینے کا نام لیا ہے۔ مزید نظر دوڑائیے تو پتہ چلتا ہے کہ دونوں ریکارڈوں میں صرف مہینے کا اختلاف ہے، تاریخ میں نہیں، چنانچہ ابن سعد نے صراحت کی ہے کہ یہ ہلال ذیقعدہ کا واقعہ تھا[5]۔ اس کے مقابلے میں ابن حبیب کے یہاں مستہل شعبان مذکور ہے[6]۔ گویا ایک راوی کے نزدیک یہ ذیقعدہ کی چاندرات کا واقعہ تھا اور دوسرے کے نزدیک یکم شعبان کا، جس سے دو تقویمی نظریئے کی صحت میں شبہ نہیں رہتا۔

۸ - بالکل یہی کیفیت غزوۂ "ذات الرقاع" کی ہے، واقدی کا بیان ہے کہ یہ غزوہ محرم ۵ھ کا واقعہ تھا[7]۔ لیکن ابن اسحٰق نے اس کی تاریخ جمادی الاولیٰ ۴ھ بیان کی ہے[8]۔ میری مکی تقویم کے بموجب محرم ۵ھ ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء کو شروع ہوا تھا[9] اور قمری تقویم کی رو سے جمادی الاولیٰ ۴ھ بھی اسی تاریخ کو شروع ہو رہا ہے[10]۔

اس غزوے کی تاریخ بھی دونوں ریکارڈوں میں بالکل مشترک ہے۔ ابن سعد کے نزدیک یہ ۱۰ محرم کا واقعہ تھا[11]۔ اور ابن حبیب کے نزدیک ۱۰ جمادی[12] الاولیٰ کا، جس سے یہ پورا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی رواۃ دو علیحدہ علیحدہ تقویمیں استعمال کر رہے ہیں۔

میری مکی تقویم کی رو سے جمادی ۶ھ ۱۳ فروری[13] ۶۲۸ء کو شروع ہوا تھا اور اسی تاریخ کو قمری شوال کی بھی ابتداء ہوئی تھی[14]۔

۹ - غزوۂ خیبر کی تاریخوں کا بھی یہی حال ہے، واقدی کے بیان کے بموجب غزوۂ خیبر جمادی الاولیٰ ۷ھ کا واقعہ تھا[15]، لیکن ابن اسحٰق نے اس کو محرم ۷ھ میں ظاہر کیا ہے[16]، بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذی قرد جو ذی الحجہ ۶ھ کا واقعہ تھا[17]، غزوۂ خیبر سے صرف تین دن پہلے کی بات ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خیبر پر فوج کشی محرم سے کچھ پہلے شروع ہوگئی تھی۔

مدنی تقویم کے بموجب جمادی الاولیٰ کی پہلی تاریخ ۷ ستمبر ۶۲۸ء سے مطابق تھی[18]۔ مکی تقویم کے بموجب ذوالحجہ مکی بھی

---

۱ واقدی /۴ ۲ ابن ہشام ۳/۲۲۰ ۳ دیکھئے برہان جولائی ۱۹۶۴ء/۲۹ ۴ برہان/۲۱

۵ ابن سعد ۲/- ۶ ابن حبیب /۱۱۲ ۷ واقدی /۴ ۸ ابن ہشام ۳/۲۱۴ ۹ برہان جولائی ۱۹۶۴ء/۳۰

۱۰ ایضاً /۲۹ ۱۱ ابن سعد ۲/۴۳ ۱۲ ابن حبیب /۱۱۳ ۱۳ دیکھئے برہان جولائی ۶۴ء/۲۲

۱۴ ایضاً /۲۹ ۱۵ واقدی /۴ ۱۶ ابن ہشام ۳/۳۴۲ ۱۷ کتاب المغازی

۱۸ دیکھئے برہان /۳۰

اسی تاریخ کو شروع ہوا تھا[1]۔

ان دسوں مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس زمانے میں یہ واقعات ریکارڈ کئے گئے تھے تو مکی اور مدنی تقویمیں دوش بدوش چل رہی تھیں اور ابتدائی رُواۃ اپنے اپنے طریقے پر ان واقعات کا ریکارڈ کر رہے تھے۔ ریکارڈ جب مختلف اساتذہ اور مصنفین کے ہاتھوں سے گزرتے ہوئے ابن اسحٰق اور واقدی تک پہنچے، تو ان کی کتابوں میں اختلافات کا ہونا بالکل قدرتی تھا۔

تاہم حیرت ہے کہ واقدی نے ان ماخذوں پر اتنا بھروسا کیا کہ اپنے عظیم پیش رو یعنی ابن اسحٰق کی بیان کردہ توقیت کو چھوا تک نہیں، حالانکہ ان کی گراں پایہ تصنیف واقدی کے سامنے رہی۔

غالباً یہ روایتیں عہد صحابہ ہی میں خلط ملط ہو گئی تھیں | سطور بالا میں جن واقعات کی تاریخوں پر امتحانی نظر ڈالی گئی ہے۔ اگر صرف انھیں تاریخوں کو سامنے رکھ کر مزید غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور واقدی کو جس زمانے میں یہ تاریخیں پہنچی تھیں تو مخلوط ہو چکی تھیں، یعنی یہ نہیں ہوا کہ مثلاً ابن اسحٰق کو صرف مکی تاریخیں ملی ہوں اور واقدی کو صرف مدنی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ابتدائی اساتذہ اور مدونین سیرت یا یوں کہیے کہ ابتدائی جامعینِ روایات کے عہد میں یہ اختلاط ہو چکا تھا، چنانچہ نقشہ ذیل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

واقعات	ابن اسحٰق	واقدی
غزوۂ کرز بن جابر فہری	مدنی	مکی
غزوۂ بنو سلیم	مکی	مدنی
سریہ زید بن حارثہ	مکی	مدنی
غزوۂ ذی امر	مکی	مدنی
غزوۂ اُحد	مکی	مدنی
حادثۂ رجیع	مکی	مدنی
غزوۂ بدر موعد	مکی	مدنی
غزوۂ ذات الرقاع	مدنی	مکی
سریۂ کرز بن جابر الی عرنیین	مکی	مدنی
غزوۂ خیبر	مکی	مدنی

اس نقشے سے اگرچہ اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق اور ان کے اساتذہ کے ماخذ بیشتر مکی ریکارڈ تھے اور واقدی کا سرمایہ زیادہ تر مدنی ریکارڈوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ان اساطینِ سیرت کے دور سے بہت پہلے عامۃ الناس تو کیا علماء اسلام تک مکی اور مدنی تقویم کے امتیازات بھول چکے تھے اور یہ توقیتی روایتیں آپس میں پوری طرح خلط ملط ہو چکی تھیں، چنانچہ ابن اسحاق کے یہاں کم از کم دو ریکارڈوں (یعنی ۱ و ۸) کی تاریخیں مدنی معلوم ہوتی ہیں اور واقدی کے یہاں یہی تاریخیں مکی

[1] برہان / ۲۲

نظر آتی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک ضروری سوال اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس قسم کا اختلاط اُن مشترک توقیتی روایات میں بھی ممکن ہے یا نہیں، جو ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان "مختلف فیہ" نہیں، اور اگر ان روایتوں میں بھی موجود ہے تو پھر اس بات کا اندازہ کس طرح لگایا جائے کہ فلاں واقعے کا ریکارڈ مکّی تقویم کے موجب ہوا تھا اور فلاں کا مدنی تقویم کے ذریعہ، کیونکہ ان کی تاریخوں کے "متفق علیہ" ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس بجائے "دو گواہوں" کے صرف "ایک گواہ" رہ جاتا ہے اور وہ بھی ایسا جس کے متعلق یہ قیاس مشکل ہے کہ اس کے ذہن میں کون سی تقویم تھی، گویا تاریخی طور پر جو "مختلف فیہ" روایات تھیں، وہ اس نظریئے کی بدولت (توقیتی اعتبار سے) زیادہ قابلِ وثوق نظر آ رہی ہیں اور متفق علیہ تاریخوں کے متعلق یہ فکر دامن گیر ہے کہ ان کا صحیح زمانہ کس طرح متعین کیا جائے۔

اس سلسلے میں میرا طریقۂ کار حسب ذیل ہے :۔

۱ - ابن اسحٰق اور واقدی کی "مختلف فیہ" روایات کے علاوہ عام روایتوں میں بھی جگہ جگہ دو تقویمی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس طرح تقریباً ۱۹، ۲۰ واقعات کا زمانہ بآسانی متعین کیا جا سکتا ہے۔

۲ - کئی واقعات ایسے ملتے ہیں جن کے موسم تلاش کرنا ممکن ہیں، ان موسموں کی وساطت سے صحیح تاریخ معلوم کی جا سکتی ہے اور پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ رواۃ کے ذہن میں مکّی تقویم تھی یا مدنی۔

۳ - کچھ واقعات ایسے ہیں جن کی تاریخیں عصری تاریخ یا علم ہیئت کی شہادت کے ذریعے متعین کی جا سکتی ہیں، مثلاً کسریٰ کے قتل یا چاند گرہن وغیرہ کی توقیت وغیرہ۔

۴ - اسی طرح بہت سے واقعات کا زمانہ جو مندرجہ بالا واقعات کے متصل ظہور میں آئے تھے، خود بخود متعین ہو جائے گا۔

۵ - تاریخ و ایام کی مطابقت اور عدم مطابقت کی شہادتیں بھی افادیت سے خالی نہیں مگر ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

۶ - سب سے آخر میں ایک قیاسِ تاریخی رہ جاتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

توقیتی اختلافات کا واقعاتی ترتیب پر اثر ان توقیتی اختلافات کا اثر ظاہر ہے کہ کتبِ سیرت کی واقعاتی ترتیب پر ناگزیر تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی مصنفین سیرت کے یہاں یہ ترتیبی اختلافات اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور بعض اوقات تو خود ان مصنفین کی روایات کا صحیح مفہوم سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر واقدی اور ابن سعد نے صفر ۴ھ کے دو واقعات بہ ایں صراحت بیان کئے ہیں، کہ یہ ہجرت سے ۳۶ مہینے بعد ظہور میں آئے تھے[1] اس میں سے ایک "بیر معونہ" اور دوسرا "رجیع" کا واقعہ ہے، رجیع کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ ان دونوں میں واقدی نے بیر معونہ کے واقعے کو متقدم قرار دیا ہے اس واقعے کا ماحصل یہ ہے کہ صفر ۴ھ میں ابو عامر کا رئیس مدینے آیا اور پیغمبر اسلامؐ کو مشورہ دیا کہ اطرافِ نجد میں کچھ مبلغین

---

[1] واقدی / ۳

روانہ کئے جائیں۔ اس پر آپؐ نے تعلیم یافتہ مبلغین کی ایک بھاری جماعت روانہ کر دی، یہ لوگ جب بنو عامر کی بستیوں میں پہنچے تو سب کے سب قتل کر ڈالے گئے[1]۔ ابن اسحٰق کے نزدیک بھی یہ واقعہ صفر ۴ھ ہی کا ہے، لیکن رجیع سے تقریباً تین ماہ بعد کا[2]۔ واقعہ رجیع کے متعلق واقدی کا بیان یہ ہے کہ اسی صفر ۴ھ میں عضل و قارہ کے کچھ لوگ مدینے آئے اور پیغمبر اسلامؐ سے استدعا کی ان کے ساتھ کچھ ایسے افراد کر دیئے جائیں جو تعلیم اسلام دے سکیں[3] اس پر کچھ چیدہ افراد اُن کے ہمراہ کر دیئے گئے۔ یہ لوگ جب بنو لحیان کی بستیوں میں پہنچے، تو میزبانوں نے مہمانوں سے دھوکا کیا اور تقریباً سب کو قتل کر ڈالا صرف خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ کو گرفتار کر کے لے گئے اور قریش کے حوالے کر دیا۔

واقدی اور ابن سعد دونوں نے صراحت کی ہے کہ خبیب کو قریش نے فوراً قتل نہیں کیا اور یہ اس وقت تک ان کی قید میں رہے جب تک حرام مہینے (جن میں خون ریزیاں ممنوع تھیں) نہ گزر گئے۔ واقدی کے الفاظ یہ ہیں ...... "فلما انسلخت الاشهر الحرام ......"[4] اور تقریباً یہی لفظ ابن سعد نے اختیار کئے ہیں "حتی خرجت الاشهر الحرم"[5]۔ جوں ہی یہ حرام مہینے ختم ہو گئے قریش نے خُبیب کو تنعیم میں لے جا کر قتل کر دیا اور سُولی دے دی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی خُبیب کو صفر ۴ھ میں روانہ کیا گیا تھا، اور وہ جاتے ہی گرفتار ہو گئے تھے، تو ان مورخوں کے نزدیک "انقضائے اشہر حرم" سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ "صفر" کے بعد "رجب" تک کوئی حرام مہینہ نہیں آتا پھر "رجب" بھی تنہا مہینہ ہے اور "اشہر حرم" کی شرط پوری کرنے کے لیے کچھ اور حرام مہینے درکار ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر یہ تفصیلات صحیح ہیں تو خبیب ۴ھ میں قتل نہیں ہوئے۔ بلکہ محرم ۵ھ ختم ہونے کے بعد قتل کئے گئے اور پورے ایک سال قریش کی قید میں رہے جو نہایت بعید از قیاس بات ہے۔

اس کے مقابلے میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ابن اسحٰق نے رجیع کے متعلق یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ احد سے کچھ دن بعد کا ہے[6]۔ غزوۂ احد چونکہ شوال ۳ھ میں ہوا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ "خبیب" ذیقعدہ میں گرفتار ہوئے تھے[7] جو حرام مہینہ تھا، اس لیے قریش نے اُن کو قید میں ڈال دیا اور رجب تک ذوالحجہ اور محرم کے حرام مہینے ختم نہ ہو لئے، اُن کو قتل نہیں کیا گیا، غور فرمایئے کہ ان تفصیلات کو دیکھتے ہوئے واقدی کی توقیت کس درجہ مشتبہ ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ واقدی کو اس واقعہ کی مدنی تاریخ ملی تھی، یعنی صفر ۴ھ جو ذیقعدہ مکی کا متوازی مہینہ تھا، واقدی سے یہ غلطی ہوئی کہ انھوں نے اس "صفر" کو وہی "صفر" ۴ھ سمجھ لیا جس میں حادثۂ بیر معونہ ہوا تھا، حالانکہ یہ مدنی صفر تھا، جو معرکۂ اُحد کے (یعنی محرم کے) بعد آیا تھا۔

---

[1] واقدی / ۳۴۶، ابن سعد ۲ / ۳۶ نیز دیکھئے البدایۃ ۴ / ۷۲، طبری ۳ / ۳۳، ۳۴ [2] دیکھئے ابن ہشام ۳ / ۱۹۳؛
[3] واقدی / ۳۴۷، ابن سعد ۲ / ۳۹ [4] واقدی / ۳۴۸ [5] ابن سعد ۲ / ۴۰ [6] ابن ہشام ۳ / ۱۷۸۔ [7] خود واقدی کے یہاں بھی اتفاقاً اس ذیقعدہ کا ذکر آ گیا ہے، دیکھئے / ۳۴۸؛

پھر اس غلطی کی بنا پر دوسری غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے اس واقعہ کو حادثہ بیر معونہ سے متقدم قرار دے دیا جس کی بنیادی وجہ یہی دو تقویمی کارفرمائی تھی۔

(مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے مقالہ چہارم "واقعہ رجیع" اور حادثہ بیر معونہ)

ایک اور شبہ کا ازالہ

آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا ہے کہ واقدی اور ابن سعد نے واقعۂ رجیع اور بیر معونہ کے متعلق جو تقویمی صراحت کی ہے، اُس میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں "علیٰ راس ستۃ وثلثین شھرا"[1] بلکہ عام طور پر تمام غزوات و سرایا کے سلسلے میں اُنھوں نے اسی قسم کے الفاظ اختیار رکھئے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کتنے مہینے بعد پیش آیا تھا جس سے یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ اُن کے اصل ماخذوں میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے تھے اور اصل رواۃِ سیرت نے واقعات کو بیان کرنے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا کہ فلاں واقعہ ہجرت سے کتنے عرصے بعد کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ واقدی اور ابن سعد کے مخصوص طرز بیان یا طریق توقیت سے تعلق رکھتے ہیں، اصل روایتوں میں یہ لفظ نہ تھے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ انھیں روایتوں کو جب ابن اسحٰق یا دوسرے مورخین، حتیٰ کہ کسی قدیم سے قدیم راوی نے بیان کیا ہے تو یہ طریقہ اختیار نہیں کیا اور کسی نے یہ نہیں بتایا کہ فلاں واقعہ ہجرت سے اتنے مہینے بعد کا ہے۔

چنانچہ ابن اسحٰق جب کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو ان کے تمہیدی جملوں کا الگ انداز ہوتا ہے مثلاً بدر کے بعد غزوۂ بنو سلیم کی ابتدا یوں کی ہے :-

"جب رسول اللہؐ (مدینہ سے) تشریف لائے تو صرف سات راتیں قیام فرمانے پائے تھے کہ بنو سلیم پر بذاتِ خاص لشکر کشی فرمائی[2]"

یا اس کے بعد غزوۂ سویق کے تمہیدی الفاظ یہ ہیں :-

"بعد ازاں ذی الحجہ کے مہینہ میں ابو سفیان بن حرب کا غزوۂ سویق ہے اور اس حج کا انتظام مشرکوں کے ہاتھ میں تھا[3]"

غزوۂ ذی امر کا تعارف اس طرح کراتے ہیں :-

"تو جب رسول اللہ غزوۂ سویق سے واپس تشریف لائے تو ذی الحجہ کے باقی مہینے یا اس کے لگ بھگ مدینے میں قیام فرمایا، اس کے بعد غطفان پر فوج کشی کی اور یہی غزوۂ ذی امر ہے[4]"

ظاہر ہے کہ اصل روایتوں میں اگر وہی الفاظ ہوتے جو واقدی یا ابن سعد نے بیان کئے ہیں تو ابن اسحٰق کا طرز بیان بھی بالکل ویسا ہی یا اُس کے لگ بھگ ہوتا۔

---

[1] واقدی ۳/ - ابن سعد ۲/ ۳۹ [2] ابن ہشام ۳/ ۴۶ [3] ابن ہشام ۳/ ۴۷ [4] ابن ہشام ۳/ ۴۸
نیز دیکھئے البدایہ والنہایہ ۴/ ۲

اس طرح ابن اسحٰق کے ان تمہیدی جملوں کا تعلق بھی اصل روایات سے کچھ نہیں، بلکہ حقیقتاً یہ خاص ابن اسحٰق کا "طرزِ توقیت" ہے۔ اس لیے ان دونوں ائمۂ سیرت کے مخصوص اندازِ بیان اور طرزِ توقیت سے ہمیں اس مغالطے میں نہ پڑنا چاہیئے۔ کہ ان کے اصل ماخذوں میں اس قسم کی عبارتیں موجود تھیں یا اصل رواۃ سیرت کا یہی "طرزِ توقیت" تھا، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف ان کی ذاتی فہم اور دو تقویمی کار فرمائی کا منطقی نتیجہ ہے۔

واقعے کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں غزوۂ "بدر موعد" اور "غزوۂ ذات الرقاع" کے توقیتی اختلافات اور خاص طور پر ترتیب پر غور فرمایئے، ابن اسحٰق اور واقدی کے مکاتب تاریخ میں یہ اختلاف مدتوں سے چلا آرہا ہے کہ ان میں کون سا واقعہ مقدّم ہے اور کون سا مؤخّر، چنانچہ مورخین کا ایک گروہ جو ابن اسحٰق کا ہمنوا ہے۔ "غزوۂ ذات الرقاع" کو مقدّم سمجھتا ہے اور واقدی کے ہم خیال علماء غزوۂ بدر موعد کو، لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ یہ دونوں واقعات غزوۂ بنو نضیر کے بعد ظہور میں آئے تھے۔

میری رائے میں اس اختلاف کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ابن اسحٰق کو "بدر موعد" کی مکی تاریخ یعنی "شعبان" پہنچی تھی، اور غزوۂ ذات الرقاع کی مدنی یعنی "جمادی" بخلاف اس کے واقدی کو "بدر موعد" کی مدنی تاریخ یعنی "ذیقعدہ" پہنچی تھی اور "ذات الرقاع" کی مکی یعنی "محرم ۵ھ"

ابن اسحٰق اور واقدی کے زمانے میں چونکہ صرف ایک تقویم پر عمل ہو رہا تھا، اور مکی تقویم عرصۂ دراز سے تقویم پارینہ بن چکی تھی اس لیے ان تمام مہینوں کو صرف ہجری مہینے سمجھ لیا گیا، اور اسی اعتبار سے واقعات کو مرتب کر دیا گیا، اس قسم کی غلطیوں کو مندرجہ ذیل مثال سے سمجھیئے۔

فرض کیجئے کہ پرانے مخطوطات کے کسی تاجر کے یہاں آپ کو تین قدیم ورق ملتے ہیں، ان میں سے ایک پر "غزوۂ بنو نضیر" کا حال درج ہے اور اس میں مذکورہ واقعے کی تاریخ ربیع الاول بیان کی گئی ہے، دوسرے پر "بدر موعد" کا حال، اور اس کی تاریخ شعبان درج ہے اور تیسرے پر "غزوۂ ذات الرقاع" کی روداد کے ساتھ اس کی تاریخ "جمادی" بیان کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ان اوراق میں کسی پر یہ صراحت بھی موجود ہے کہ یہ تینوں واقعات ۱۲ ماہ کے اندر ہی پیش آئے تھے اور ان میں "غزوۂ بنو نضیر" سب سے مقدّم ہے۔

اسی طرح کے تین ورق مجھے ملتے ہیں، جن میں "غزوۂ بنو نضیر" کی تاریخ تو وہی "ربیع الاوّل" درج ہے مگر "بدر موعد" کی "ذیقعدہ" اور "ذات الرقاع" کی "محرم" باقی تمام صراحتیں تقریباً وہی موجود ہیں، جو متذکرہ بالا اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان اوراق کو سامنے رکھ کر میرے اور آپ کے تاریخی نتائج اور واقعاتی ترتیب میں بیّن فرق ہوگا۔ آپ جب ان واقعات کو ترتیب دیں گے تو کالم "الف" کے مطابق اور میری ترتیب کالم "ب" کے مطابق ہوگی:

(۱) "الف"	(۱) "ب"
غزوۂ بنو نضیر ربیع الاوّل	غزوۂ بنو نضیر ربیع الاوّل

"ب"	"الف"
(۲)	(۲)
غزوۂ بدر موعد ا رشعبان	غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ رجمادی الاولیٰ
(۳)	(۳)
غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ رمحرم	غزوۂ بدر موعد ا رشعبان

آپ "غزوۂ ذات الرقاع" کو "بدر موعد" کے بعد اس لیے جگہ نہیں دے سکتے کہ اس طرح یہ واقعہ غزوۂ بنو نضیر سے ۴ا مہینے بعد جا پڑے گا، اور ایک سال کی شرط ٹوٹ جائے گی اور میں غزوۂ ذات الرقاع کو بدر موعد سے اس لیے مقدم نہیں کر سکتا کہ میرے ورق میں اس کی تاریخ محرم ہے۔ ایک ایسا محرم جو غزوۂ بنو نضیر سے بہر صورت بعد میں آیا تھا۔

بعینہٖ یہی مثال ابن اسحٰق اور واقدی کی ترتیب کی ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکی تقویم کے فراموش ہو جانے کے بعد جب غیر مسلسل اور غیر مربوط تاریخی یادداشتیں علمائے تاریخ کو ملیں تو ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ محض اپنی ذہانت اور حسابات کی روشنی میں ان واقعات کو ترتیب دیں۔

مزید دستاویزیں مباحث گزشتہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ دو قسم کی دستاویزوں پر مشتمل تھے، جن میں ایک پر مکی تقویم کی کارفرمائی تھی اور دوسری پر مدنی کی۔

"دو دستاویزوں" کے لفظ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ سیرت کے ابتدائی ماخذ صرف دو افراد تھے جنھوں نے خود عہد رسالت ﷺ میں تدوین سیرت کا کام ختم کر لیا تھا، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ خیال نہ تو تاریخی اعتبار سے صحیح ہے اور نہ واقعاتی شہادتیں اس کا ساتھ دیتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد رسالت ﷺ کی بہت سی مکتوبی یادداشتوں کا تذکرہ اوراقِ تاریخ میں ملتا ہے۔ ان کو موجودہ اصطلاح میں کسی مستقل یا مرتب کتاب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ میری دانست میں ان مکتوبات کا مقصد "تصنیف" نہ تھا، بلکہ یہ محض نجی ضروریات کے لیے ایک قسم کے نوٹ تھے، جو اشاعت کی غرض سے ضبطِ تحریر میں نہیں آئے تھے، تاہم اتنی بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھیں یادداشتوں کا سہارا لے کر متعدد صحابہ نے روایتیں بیان کی تھیں اور بعض حالتوں میں

اُن کے بعد تابعین اور شاگردوں تک بھی پہنچیں، لیکن ایسا بھی ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد ان کے لکھنے والوں کے نام متعین کرنا دشوار ہو گیا، مثلاً امام زہری کے زمانے میں یزید بن ابی حبیب المصری کی جو کتاب ملی تھی[1]، اس کے مصنف کا نام اس کتاب کے منکشف تک کو نہ معلوم ہو سکا اس لیے ہم یہ قیاس تو کر سکتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں متفرق واقعات کی نجی یادداشتیں ضبطِ تحریر میں آ رہی تھیں، لیکن ان یادداشتوں کو تاریخی ترتیب دینا صرف تدوینِ سیرت کا کام تھا جن کو بہت کچھ قطع و برید سے کام لینا پڑا ہوگا۔

توقیتی نقطۂ نظر سے ان یادداشتوں یا دستاویزوں کو اگرچہ دو ہی قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن اگر واقعہ نویس ایک سے زیادہ تسلیم کر لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ ایک ہی واقعے کے متعلق یہ ابتدائی یادداشتیں متعدد ہونا چاہئیں، جن میں کچھ مفصل ہو سکتی ہیں اور کچھ مجمل، چنانچہ کتبِ سیرت کی محتاط ورق گردانی سے ہمیں اس کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر کسی ایک ایسے واقعے کو لیجئے جو ابن اسحٰق اور واقدی دونوں کے نزدیک کسی خاص تاریخ میں ہوا ہو، اور اس کے بعد اس واقعے کی توقیتی تفصیلات پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں روایتیں بہت سی باتوں میں مختلف ہیں۔ مثلاً غزوۂ سویق جو ان دونوں کے نزدیک ذوالحجہ ۲ھ کا واقعہ ہے، بنیادی طور پر ایک ہی تقویم سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب مزید تاریخی تفصیلات تلاش کی جاتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس واقعے کو کم سے کم دو ابتدائی راویوں نے بیان کیا ہوگا، اس لیے کہ ابن اسحٰق کے یہاں اس غزوے کا کوئی دن یا تاریخ مقرر نہیں، صرف مہینے کا نام ملتا ہے[2]، بخلاف اس کے واقدی کے یہاں اس کی پوری صراحت موجود ہے:

"رسول اللہ ؐ یکشنبے کے دن ۵؍ ذوالحجہ کو نکلے۔"[3]

ظاہر ہے کہ اس روایت کا اگر ایک ہی راوی ہوتا تو ابن اسحٰق نے بھی یہی تفصیل بیان کی ہوتی،

اسی طرح فتح مکّہ کے واقعہ کو لیجئے، ابن اسحٰق کے یہاں اس واقعے کے متعلق "دن" کی کوئی صراحت نہیں ملتی، صرف ۱۰؍ رمضان مذکور ہے[3] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ واقدی کے پیشِ نظر جو دستاویز تھی اس میں پوری صراحت موجود تھی۔

"اور رسول اللہ ؐ چہار شنبے کے دن ۱۰؍ رمضان کو نکلے۔"[4]

غور فرمائیے کہ اگر یہ تفصیل ابن اسحٰق کی نظر سے بھی گزرتی یا اُن کی کسی سند نے اس کو بیان کیا ہوتا تو وہ اس کو کیوں قبول نہ کرتے؟

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ روایاتِ سیرت کے ابتدائی ریکارڈ بیشتر متفرق اور منتشر تھے، جیسے جیسے مسلمانوں میں تصنیف و تالیف کا شوق اور شعور پیدا ہوتا گیا، ویسے ویسے ان کی علمی پیاس نے گم شدہ ذخائر کے سوتے تلاش کر لیے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن اسحٰق کے بعد ابن ہشام اور واقدی کے بعد ابن سعد کے یہاں مزید معلومات کا خزانہ برابر بڑھتا رہا۔

---

[1] طبری ۲/۸۵ [2] واقدی ۳/ ۱۸۲ [3] ابن ہشام ۴/۴۲ [4] ابن سعد ۲/ ۹۷

ابن حبیب کی دستاویز

اس سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کام وہ ہے جو ابن حبیب المتوفی (۲۴۵ھ) کی "کتاب المحبر" میں نظر آتا ہے۔

ہر چند کہ "محبر" سیرت کی کتاب نہیں، بلکہ بعض بہت ہی مفید، عمدہ اور گوناگوں معلومات کا ایک چھوٹا سا کشکول ہے جس میں پیغمبرِ اسلام کے غزوات و سرایا کی بھی ایک مفصل فہرست دو علیحدہ علیحدہ بابوں میں دی گئی ہے۔

"غزوات النبیؐ" کے عنوان سے جو باب[1] ہے۔ اس میں تئیس واقعات کی ترتیب وار فہرست دی گئی ہے۔ ان واقعات میں کم از کم ۲۶ کی تفصیلی تاریخیں درج ہیں، باقی چھ واقعات کے صرف مہینے متعین کئے گئے ہیں۔

سرایا کے ذیل میں صرف ایک سریہ (یعنی سریہ غالب بن عبداللہ اللیثی) کی پوری تاریخی صراحت ملتی ہے[2]۔ باقی سرایا کی صرف مجمل فہرست کتاب میں شامل کی گئی ہے جس میں اکثر واقعات کے مہینے بھی نامزد نہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالباً ابن حبیب کو ان واقعات کی پوری توقیتی صراحتیں نہ مل سکی تھیں۔

حیرت ہے کہ ابن حبیب کی فہرستِ غزوات میں جو تاریخیں ملتی ہیں وہ دوسری سیرۃ یا تاریخ کی کتابوں سے کیفیت اور کمیت دونوں میں زائد ہیں۔ ابن اسحٰق تو خیر بہت متقدم ہیں، متاخرین میں ابن کثیر تک کے یہاں اتنی صراحتیں ناپید ہیں جن کے سامنے اسلاف کا بہت بڑا ذخیرۂ معلومات موجود تھا چنانچہ کتاب المحبر کے ایڈیٹر، ڈاکٹر حمید اللہ کو یہ نوٹ لکھنا پڑا۔

"کتاب المحبر میں تمام کتبِ مغازی کے مقابلے میں بعض غزوات کی تاریخوں میں اختلاف ہے، متنبہ رہیے![3]"

اس صورت میں دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے لیے ابن حبیب کی یہ تاریخی تفصیلات کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔؟

ابن حبیب اور محبر کی حیثیت

ابن حبیب تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل کے مصنف ہیں، یہ واقدی اور ابن ہشام سے قریب العہد اور ابن سعد المتوفی (۲۳۰ھ) کے معاصر تھے، اس اعتبار سے ان کا شمار متقدمین میں ہوتا ہے۔ تقریباً ۴۵ کتابیں تصنیف یا تالیف کیں۔ جن میں سے ان کی کتاب "المحبر" کو ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ ابن ندیم[4]، خطیب بغدادی[5]، اور یاقوت حموی[6] وغیرہ نے ان کی تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور البیرونی اور اصفہانی وغیرہ نے ان سے استناد کیا ہے[7]۔ اس اعتبار سے یہ کہنا تو شاید غلط ہو گا کہ غزوات و سرایا کی تاریخیں بیان کرنے میں اس فاضل مصنف نے احتیاط سے کام نہیں لیا، پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ہمیں ان کی ابتدائی سند یا ماخذ اصلی کا کوئی علم نہیں، اور جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے، عام طور پر کسی سیرت یا مغازی کی کتاب میں ابن حبیب جیسی تاریخی تفصیلات نظر نہیں آتیں، گویا اس لحاظ سے ابن حبیب "منفرد" ہیں، ہاں طبری کے یہاں کچھ واقعات کی تاریخیں وہی ملتی ہیں، جو ابن حبیب نے بیان کی تھیں، اور اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یا تو طبری نے یہ تاریخیں خود ابن حبیب سے لی ہیں یا ان دونوں کا کوئی مشترک ماخذ تھا، جو آج ہمارے سامنے نہیں، میرا خیال ہے

---

[1] دیکھئے ابن حبیب / ۱۱۱ [2] ابن حبیب / ۱۱۷ [3] ابن حبیب / ۱۱۰ [4] ابن ندیم فہرست / ۱۰۶ [5] خطیب بغدادی / ۲ [6] یاقوت ۶ / ۴۷۴ [7] دیکھئے آثار، کتاب الاغانی ۱۰ / ۱۴۹

کہ مشترک ماخذ کا ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، اس لیے کہ طبری کے یہاں کچھ الفاظ زیادہ نظر آتے ہیں جن کو ابن حبیب نے غالباً اختصار کی خاطر حذف کر دیا ہے، بہرحال یہ تاریخیں حسب ذیل ہیں :۔

ابن اسحٰق اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ بدر کے بعد مدینے پہنچتے ہی پیغمبر اسلامؐ نے بمشکل ایک ہفتے آرام فرمایا ہوگا، کہ بنو سلیم اور غطفان کے اجتماع کی اطلاع مدینے پہنچی[1] جس کو سن کر آپؐ فوراً ہی بنو سلیم کی طرف بڑھے اور "قرقرۃ الکدر" تک جا پہنچے، اس غزوے کی تاریخ اور دن کسی قدیم سیرت نگار کے یہاں محفوظ نہیں، مگر ابن حبیب کا بیان ہے :۔

"قرقرۃ الکدر کی جانب جمعہ یکم شوال کو کوچ فرمایا[2]"

طبری نے اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ :۔

"بعد ازاں قرقرۃ الکدر پر لشکر کشی کی تو آپؐ مدینے سے جمعہ کے دن ارتفاع شمس کے بعد یکم شوال کو نکلے[3]"

اسی طرح ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے "غزوۂ بنی قینقاع" کی کوئی واضح توقیتی صراحت نہیں کی ہے۔ لیکن واقدی اور ابن سعد کے یہاں اس کو نصف شوال ۲ھ کا واقعہ ظاہر کیا گیا ہے[4] بخلاف اس کے ابن حبیب نے اس کی تاریخ سب سے ہٹ کر، صفر ۳ھ بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ :۔

"بنی قینقاع کا محاصرہ یکشنبے کے دن ۷ صفر کو کیا[5]"

طبری نے بھی اس غزوے کے سلسلے میں ایک قول صفر ہی کے متعلق نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "گمان کیا جاتا ہے، کہ نبی علیہ السلام نے ان سے ۹ صفر کو جنگ کی[6]"

ابن حبیب نے لفظ "سَبع" (سات) اور طبری نے "تِسع" (نو) استعمال کیا ہے، اس لیے یہ اختلاف بظاہر تجنیس خطی کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ ورنہ جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے، وہ غالباً مشترک تھا۔

اس مشترک دستاویز کی سب سے بڑی شہادت سریۂ غالب بن عبداللہ اللیثی ہے جو طبری کے بقول اسی ۳ھ بلکہ عین اُس زمانے کا واقعہ ہے جب پیغمبر اسلامؐ بنو سلیم پر حملہ آور تھے، اس واقعے کی توقیت نہ تو ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے کی ہے اور نہ واقدی اور ابن سعد نے، لیکن ابن حبیب لکھتے ہیں کہ :

"نبی (صلعم) نے غالب بن عبداللہ اللیثی کو یکشنبے کے دن ۱۰ شوال کو روانہ کیا تو ان کی بنو سلیم سے مڈبھیڑ ہوئی اور جنگ ہوئی۔ اور یہ لوگ ہفتے کے دن جب کہ شوال کے ۱۴ دن باقی تھے مالِ غنیمت کے ساتھ واپس ہوئے[7]"

طبری کے یہاں بھی بعینہٖ یہی تاریخی تفصیلات کچھ اضافے کے ساتھ ملتی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ :۔

---

[1] ابن ہشام ۳/۴۶ [2] ابن حبیب /۱۱۱ [3] طبری ۲/۲۹۸ [4] واقدی ۱/۱۷۷۔ ابن سعد ۲/۱۹ [5] ابن حبیب /۱۱۲
[6] طبری ۲/۲۹۸ [7] ابن حبیب /۱۱۷

"اور بعض مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ جب پیغمبرِ اسلام غزوۂ کدر سے مدینہ واپس آئے اور آپ نے بلا لڑائی کے دشمن کے مویشیوں اور گلوں کو ہانک لیا تھا، اور آپ کی اس غزوے سے تشریف آوری جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے ۱۰ شوال کو ہوئی تھی تو آپ نے غالب بن عبداللہ اللیثی کو یکشنبے کے دن ۱۰ شوال کو بنی سُلیم کی طرف روانہ کیا، اُن کی جنگ ہوئی اور انہوں نے بنو سُلیم کے مویشی پکڑ لیے، اور مالِ غنیمت کے ساتھ ہفتے کے دن جب کہ شوال کی ۱۴ راتیں باقی تھیں واپس آئے۔"[1]

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن حبیب اور طبری کا ماخذ کوئی مشترک دستاویز تھی، جو اس وقت ہمارے سامنے نہیں۔ اور پرکی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان غزوات و سرایا کی تاریخی تفصیلات کے ذیل میں ابن حبیب کے سامنے جو دستاویز تھی وہ کم سے کم طبری کے زمانے تک متداول رہی اور قابلِ استناد سمجھی جاتی تھی، اور ہر چند کہ ابن حبیب کی طرح طبری نے بھی اس سند کی کوئی ادنیٰ نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ ہر جگہ "وَقَالَ بَعْضُهُمْ" کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دستاویز اتنی اہم ضرور تھی، کہ طبری جیسے محتاط مؤرخ نے اس کو قابلِ نقل سمجھا۔

اس طرح ہم ابن اسحٰق اور واقدی کی دستاویزوں کے علاوہ ایک تیسری ضمنی دستاویز سے روشناس ہوتے ہیں۔

یہاں میں اتنی بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ابن حبیب، ابن اسحٰق کے مقابلے میں واقدی سے زیادہ قریب العہد تھے، لیکن "محبر" میں جو تاریخیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر ابن اسحٰق کی تاریخوں کو ایک طرح تفضیل مزید یا تکملہ کہی جا سکتی ہیں، واقدی کی منفرد تاریخوں میں سے ابن حبیب نے کسی ایک تاریخ کو قبول نہیں کیا ہے۔[2]

(۴)

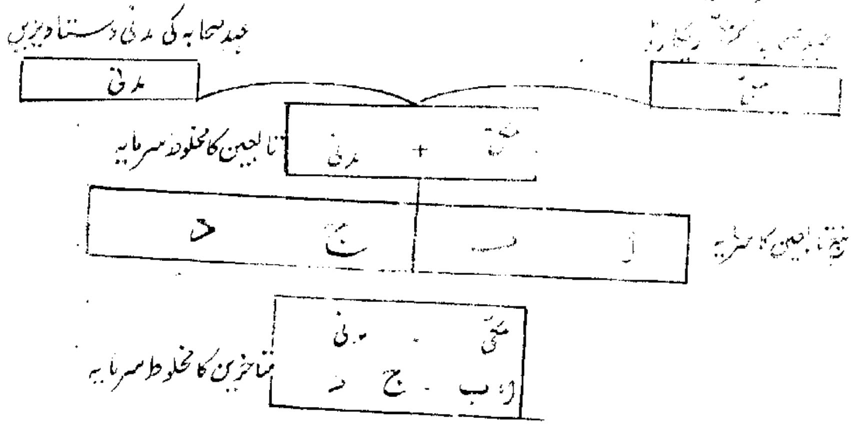
چوتھی دستاویز ابن اسحٰق، واقدی اور ابن حبیب کی بیان کردہ تاریخوں کے علاوہ کچھ اور تاریخیں بھی ہیں جو متفرق طور پر کتبِ سیر و تاریخ میں ملتی ہیں، اور جن کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ماخذ بھی صدرِ اوّل کے ریکارڈ ہوں گے، اس لیے اگر ان سب کے مجموعہ کو چوتھی ضمنی دستاویز کا نام دے دیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ان چاروں دستاویزی ریکارڈوں کے لیے میں نے علاماتِ ذیل اختیار کی ہیں:-

ابن اسحٰق کے ماخذ	واقدی کے ماخذ	ابن حبیب وغیرہ کے ماخذ	دوسری روایات کے ماخذ
ا	ب	ج	د

---

[1] طبری ۲/ ۲۹۹۔ [2] یہاں یہ بات بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبیب کی فہرستِ غزوات کتابتی سہو و اغلاط کی بنا پر حد درجہ معمون کر رہ گئی ہے۔ اس کی چند مثالیں اس مقالے میں پیش کی جائیں گی۔

اس طرح تقویمی اعتبار سے سیرت کا موجودہ سرمایۂ تاریخی حسب ذیل نقشہ سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے :-



ش

کتابتی سہو اور دوسری قسم کی غلطیاں

گزشتہ مباحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے موجودہ سرمایۂ سیرت میں (تاریخی اعتبار سے روایات ا، ب، ج، د کو سب سے بڑا دخل ہے جو ابن اسحٰق، واقدی، ابن حبیب
اور دوسرے متقدمین کے ماخذ اصلی تھیں، اس سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری موجودہ روایاتِ سیرت (تمام کی تمام) بعینہٖ وہی ہیں جو
اُن اصلی دستاویزوں سے سیرت نگاروں کو پہنچی تھیں، اور ان میں کتابتی سہو، تصحیفی غلطیاں یا تفہیمی اغلاط کا کوئی دخل نہیں ہے یہاں
اس بات کو دیکھنا ہے کہ کیا یہ دستاویزیں اپنی اصل صورت میں ہم تک پہنچی ہیں، یا ان پر امتدادِ زمانہ کے اثرات بھی معلوم ہوتے ہیں۔
یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ زمانۂ قدیم میں اگرچہ صحتِ نقل کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا تھا، شاگردان خاص جب اپنے شیوخ
اور اساتذہ سے اُن کی مرویات لیتے تو اپنے مکتوبات کو اُن کے سامنے پڑھ کر سناتے تاکہ امکانی غلطیوں کا راستہ بند ہو سکے، باوجود
اس کے کتابتی سہو اور نقل در نقل کی غلطیاں ایسی نہ تھیں جو انسانی فطرت سے باہر ہوں۔
بائبل اور قرآن سے زیادہ صحتِ کتابت کا فخر شاید دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں، لیکن ان میں بھی اختلافاتِ قرأت موجود
ہیں جو بالبداہتہ کتابتی اختلافات کا نتیجہ ہیں۔ اس صورت میں یہ بات بالکل خارج از قیاس ہے کہ روایاتِ سیرت میں خواہ اُن کا تعلق
ایام شہور سے ہو یا دوسری اصناف روایت سے، اس قسم کے اختلافات یا غلطیاں موجود نہیں۔
لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخی روایات کا تعلق چونکہ بیشتر حسابات اور ریاضی سے ہے اس لیے
ان کی غلطیاں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور ان کی صحت و عدمِ صحت کی تمیز حسابی قاعدوں سے ممکن ہے۔
روایاتِ سیرت پر غور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقویمی اعتبار سے ان میں اگر بعض غلطیاں ہیں تو بیشتر وہی قسم کی کتابتی سہو
اور تفہیمی اغلاط، کتابتی سہو بیشتر اس نوعیت کے ہیں کہ مشترک الاسم مہینوں کے ذیل میں کاتبوں کی بے احتیاطی سے چند مقامات پر
"ربیع الاول" "آخر" ہو گیا ہے اور "آخر" "اول"، تاریخوں کے ... بعض جگہ "عشرین" "عشرہ" بن گیا ہے اور "ستین"، "بقین"

ایک دو جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی لفظ لکھنے سے رہ گیا ہے اور کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جن کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مصنفین کوئی مخطوطہ صحیح طور پر پڑھ نہ سکے تھے اور جتنا پڑھ سکے وہی درج کر دیا گیا، کچھ غلطیاں تساہل اور بے پرواہی کا نتیجہ بھی معلوم ہوتی ہیں۔

بہرحال تقریباً تمام قسم کی غلطیاں ایسی ہیں جو نقل در نقل کا قدرتی نتیجہ ہیں، میں یہاں سب سے پہلے ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جو ربیع الاوّل اور ربیع الآخر یا جمادی الاولیٰ اور جمادی الاُخریٰ کے ذیل میں ہوئی ہیں اور جن کو ناقلینِ مابعد کی عدم توجہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ابنِ ہشام کے موجودہ نسخوں میں ابنِ اسحٰق سے یہ روایت ملتی ہے :۔

"اس کے بعد رسول اللہؐ ربیع الاوّل کے مہینے میں قریش کے ارادے سے نکلے، یہاں تک کہ بواط پہنچے جو رضویٰ کے قریب ہے، بعد ازاں مدینے واپس آئے اور لڑائی نہیں ہوئی اور آپؐ نے ربیع الآخر کا بقیہ حصہ اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے مدینے میں قیام فرمایا۔"[1]

اسی روایت کو ابن حمید نے سلمہ کی وساطت سے ابنِ اسحٰق سے لیا تھا جس کو "طبری" نے یوں نقل کیا ہے :۔

"اس کے بعد رسول اللہؐ ربیع الآخر" کے مہینے میں قریش کے ارادے سے نکلے، یہاں تک کہ "بواط" پہنچے جو رضویٰ کے قریب ہے، بعد ازاں مدینے واپس آئے اور لڑائی نہیں ہوئی اور آپؐ نے ربیع الآخر کے بقیہ حصے اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے مدینے میں قیام فرمایا۔"[2]

ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں صرف ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کا فرق ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ طبری کے پیشِ نظر جو نسخہ تھا اس میں بجائے "ربیع الاوّل" کے "ربیع الآخر" مرقوم تھا، سیرت ابن اسحٰق کے فارسی ترجمے کا جو مخطوطہ[3] میرے پیشِ نظر ہے اس میں بھی اس غزوے کو "ربیع الاوّل" کا ظاہر کیا گیا ہے جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ خود ابنِ اسحٰق کے مختلف نسخوں میں سے کسی نسخے میں ربیع الاوّل تھا اور کسی میں ربیع الآخر۔

واقدی اور ابن سعد کے موجودہ نسخوں میں اس واقعے کی تاریخ ربیع الاوّل[4] بیان کی گئی ہے، لیکن قدماء میں ابنِ حبیب کے یہاں اس غزوہ کی تاریخ ربیع الآخر ہی[5] ملتی ہے جس کی وجہ سے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس واقعہ کی روایات کے اصل ماخذوں میں ربیع الاوّل مذکور تھا، یا ربیع الآخر، میری رائے میں ربیع الآخر کو یوں ترجیح دی جا سکتی ہے کہ روایت کے آخری حصے میں "بقیہ ربیع الآخر کے" الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن سے گمان ہوتا ہے کہ ابن اسحٰق نے روانگی کی تاریخ بھی ربیع الآخر ہی بیان کی ہوگی۔

ربیع کے ذیل میں اوّل و آخر کی غلطیاں کئی اور مقامات پر بھی ملتی ہیں، مثلاً غزوۂ "دومۃ الجندل" کے متعلق ابن اسحٰق اور واقدی کے موجودہ نسخوں میں ربیع الاوّل کی تاریخ ملتی ہے[6] لیکن ابن کثیر کے سامنے جو واقدی کا نسخہ تھا، اس میں "ربیع الآخر" مذکور تھا۔

---

[1] ابن ہشام ۲/ ۲۳۸ ۔ [2] طبری ۲/ ۲۶۰ [3] مخطوطہ ورق ۲۴۸ رضا لائبریری رام پور/ نمبر ۱۸۸۸ فارسی [4] واقدی ۳/ ۳ ابن سعد ۲/ ۳ [5] ابن حبیب/ ۱۱۱ [6] ابن ہشام واقدی/ ۴

چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"اور واقدی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کا دومۃ الجندل کی طرف خروج "ربیع الآخر" میں ہوا[1]"

اسی طرح سریّہ عکاشہ بن محصن کے ذیل میں واقدی کے موجودہ نسخوں میں ربیع الآخر[2] مذکور ہے، لیکن طبری کے یہاں ربیع الاوّل[3]۔

سریّہ محمد بن مسلمہ (ذی قصہ) کے ذیل میں "طبری"[4] کے یہاں ربیع الاوّل ملتا ہے لیکن واقدی کے یہاں ربیع الآخر[5]، سریّہ خالد بن ولید کے متعلق (جو بنی عبد المدان کی طرف بھیجا گیا تھا) طبری کی ترجیحی رائے یہ ہے کہ واقعہ ربیع الآخر کا ہے جب کہ خود ان کے سامنے ربیع الاوّل کے الفاظ بھی موجود تھے، چنانچہ سنہ۱۰ھ کے ذیل میں مرقوم ہے :۔

"تو آنحضرت ﷺ نے خالد بن ولید کو ربیع الآخر میں روانہ کیا، اور کہا جاتا ہے کہ ربیع الاوّل میں اور کچھ لوگ جمادی الاولیٰ میں بتاتے ہیں[6]"

گویا طبری کے زمانے میں بھی ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کا اختلاف پیدا ہو چکا تھا اور کچھ نسخوں میں "اوّل" تھا، کچھ میں "آخر"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کتابتی سہو دو مختلف مصنفین کی کتابوں کا محتاج نہیں ہے، بلکہ آپ ایک ہی مصنف کی کتاب میں ایک ہی سطر کے بعد کتابتی سہو ملاحظہ فرما سکتے ہیں، چنانچہ ابن حبیب کے موجودہ نسخے میں جس کو ڈاکٹر حمید اللہ نے اڈیٹ کیا ہے، غزوۂ بنو نضیر کے ذیل میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

"اور آنحضرت ﷺ سہ شنبہ کے دن ۱۲ ربیع الآخر کو ان کی یعنی بنو نضیر کی طرف نکلے اور ۵ ربیع الآخر کو واپس ہوئے[7]"

گویا ۱۲ ربیع الآخر کو بنی نضیر کی طرف کوچ کیا گیا اور اسی مہینے کی ۵ تاریخ کو واپسی ہوئی، یہ غلطی اتنی موٹی تھی کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کی تصحیح کر کے بجائے ربیع الآخر کے ۱۲ ربیع الاوّل لکھ دیا، لیکن کئی مقامات پھر بھی ایسے رہ گئے جو ہنوز قابلِ نظر ہیں، (جن کو میں ابھی پیش کروں گا)

اوّل و آخر کے ذیل میں بعینہٖ یہی کیفیت جمادیٰ کے سلسلے میں بھی ملتی ہے، ابن سعد نے سریّہ زید بن حارثہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اور یہ واقعہ ہلال جمادی الاخریٰ کا ہے[8]"

یہی تاریخ واقدی کے موجودہ نسخوں میں ہے، لیکن ابن کثیر کے سامنے جو واقدی کا نسخہ تھا اس میں اس سریّہ کی تاریخ

---

[1] البدایہ والنہایہ ۴/ ۹۲ [2] واقدی / ۵ [3] طبری / [4] طبری / [5] واقدی / ۵

[6] طبری ۳/ ۱۵۶ [7] ابن حبیب/ ۱۱۳ [8] واقدی / ۱۹۵

مستہل جمادی الاولیٰ" مذکور ہے :-

"اور ... کا بیان ہے کہ اس سریہ کے لیے زید بن حارثہ کا خروج ہلال جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے[1]"

ظاہر ہے کہ یہ اختلاف بھی کتابتی سہو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، بالکل ایسی ہی غلطیاں ابن حبیب کے یہاں بھی موجود ہیں، چنانچہ غزوۂ ذات العشیرہ کے ذیل میں مذکور ہے:-

"اور غزوۂ ذات العشیرہ یکم جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے ...... اور آنحضرتؐ جمادی الاخریٰ کے آٹھ دن باقی تھے کہ واپس ہوئے[2]"

گویا یکم جمادی الاولیٰ کو پیغمبرِ اسلامؐ اس غزوہ کے لیے نکلے تھے اور ۲۱ یا ۲۲ جمادی الاُخریٰ تک مدینے سے باہر رہے، (یعنی تقریباً ایک ماہ ۲۱ روز) لیکن دوسری ہی سطر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۲ جمادی الاُخریٰ کو جب کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کیا تھا تو آنحضرتؐ مدینے میں موجود تھے، اور آپؐ نے کرز کا پیچھا بدر تک کیا تھا، چنانچہ بدر اولیٰ کے سلسلے میں خود ابن حبیب نے جو تاریخ بیان کی ہے وہ یہ ہے:-

"(اور بدر اولیٰ کے لیے) دوشنبہ کے دن ۱۲ جمادی الاخریٰ کو نکلے[3]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات العشیرہ کی واپسی کی تاریخ ابن حبیب نے بجائے ۲۲ جمادی الاُخریٰ کے ۲۲ جمادی الاولیٰ لکھی ہوگی، کیونکہ اتنی موٹی حسابی غلطی کم از کم ابن حبیب جیسے مصنف کے قلم سے ممکن نہیں۔

تاریخ دیوم کی غلطیاں

کتبِ سیرت میں تاریخ دیوم کی کتابتی اغلاط کی مثالیں بھی موجود ہیں، جن میں کم سے کم ایک مثال ایسی ہے کہ اس میں غالباً لفظ "عشرین" "عشرہ" بن گیا ہے۔ واقدی کی کتاب المغازی میں قتل کعب بن اشرف کی تاریخ ۱۴ ربیع الاوّل[4] بیان کی گئی ہے۔

واقدی نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ اس تاریخ آنحضرتؐ مدینے ہی میں موجود تھے[5]۔ لیکن چند ہی سطروں کے بعد "غزوۂ ذی امر" کے ذیل میں جو بقول واقدی اسی مہینہ کا واقعہ ہے، مندرجہ ذیل الفاظ ملتے ہیں:-

"رسول اللہؐ پنجشنبہ کے دن ۱۲ ربیع الاوّل کو ذی امر کے لیے نکلے[6]"

گویا کعب بن اشرف کے قتل سے دو روز پہلے ۱۲ ربیع الاوّل کو آپؐ مقام ذی امر کی طرف کوچ فرما چکے تھے، ظاہر ہے کہ یہ غلطی بھی محض کتابتی سہو ہے اور واقدی نے شاید لثنتی عشرہ کے بجائے ۲۲ تحریر کیا ہوگا۔ اس لیے کہ از روئے حساب ۱۲ تاریخ پنجشنبہ کا دن بھی نہیں ... بلکہ ۲۲ ہی کو پڑتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی بھی بہت قدیم ہے، اس لیے کہ واقدی کے شاگرد خاص ابن سعد نے جب اس روایت کو لیا تو ۱۲ ربیع الاوّل ہی درج کیا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ۴/۵ [2] ابن حبیب/۱۱۰ [3] ابن حبیب/۱۱۱ [4] واقدی/۱۸۸ [5] واقدی/۱۸۸

[6] واقدی/۱۹۳

مضنین اور یقین میں التباس

ابن حبیب کے یہاں ایک بہت دلچسپ کتابتی سہو غزوۂ سویق کے ذیل میں نظر آتا ہے جس کی اصل وجہ خود میری کتابت کی غلطی سے ظاہر ہوئی۔

"محبر" میں اس غزوے کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:۔

"خَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ علیہ یوم الاحد لسبع مضین بقین من ذی الحجۃ ورجع علیہ لثمان بقین من ذی الحجۃ۔"[1]

گویا آنحضرتؐ غزوۂ سویق کے لیے ۲۲ کو نکلے اور ۲۱ کو مراجعت فرما ہوئے، ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے اس غلطی کے متعلق یہ ہے، کہ غالباً اصل عبارت یوں ہوگی:۔

"خَرَجَ لثمان بقین ورجع لسبع بقین"[2]

لیکن میں نے جو نوٹ لیا تھا، اس میں دونوں جگہ لفظ "بقین" کچھ اس طرح لکھا تھا کہ اس کو مسلسل "مضنین" پڑھتا رہا، اور اس میں وہ کتابتی سقم نظر نہ آیا جس کی طرف ڈاکٹر حمید اللہ نے توجہ دلائی تھی، گویا یہ حسابی غلطی میری غلط نویسی سے خود بخود دور ہوگئی میرا خیال ہے کہ اصل نسخوں میں بھی دونوں جگہ "بقین" کی جگہ "مضین" ہی ہوگا جس کو قدیم ناقلوں نے "بقین" پڑھ کر درج کتاب کر دیا۔ یہ غلطی بھی قدیم نسخوں کی معلوم ہوتی ہے اور اس کا الزام ابن حبیب یا ابن حبیب کے ناقلین کو نہیں دیا جا سکتا، بلکہ غالباً یہ الفاظ ابن حبیب کے اصل ماخذوں میں موجود تھے جو طبری اور ابن حبیب کی مشترک دستاویز کہی جا سکتی ہے، اس لیے کہ طبری کے یہاں بھی تھوڑی قطع برید کے ساتھ اس غزوے کے متعلق ایک روایت یہ بھی موجود ہے:۔

"کہ رسول اللہؐ نے یکشنبہ کے روز ذوالحجہ کی سات راتیں باقی تھیں کہ لشکرکشی فرمائی"[3]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبری نے روایت کا آخری جزو یعنی "رجع علیہ لثمان لقین من ذی الحجہ" اسی حسابی غلطی کے پیش نظر ترک کر دیا۔ "سبع لقین" کے بجائے "سبع مضین" پر ایک قیاس یہ بھی ہے کہ دوسرے مورخین مثلاً واقدی اور ابن سعد کے یہاں اسی غزوے کی تاریخ "خمس خلون" مذکور ہوتی ہے[4] جو "سبع مضین" سے قریب تر ہے، اور ہو سکتا ہے، کہ راوی کے نزدیک یہی تاریخ ہو۔

سقوطِ الفاظ کی مثالیں

مخطوطات کی نقل در نقل میں سقوطِ الفاظ کی غلطیاں اتنی عام ہیں کہ ان پر کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے عام طور پر یہ غلطیاں مشکل سے گرفت میں آتی ہیں، لیکن تاریخوں کا مسئلہ چونکہ حسابی مسئلہ ہے۔ اس لیے جلد سمجھ میں آجاتا ہے۔ چنانچہ غزوۂ بواط کے متعلق اس قسم کی ایک غلطی ملاحظہ ہو:۔

"ابن حبیب کی موجودہ عبارت یوں ہے:۔

"(آنحضرتؐ) دوشنبہ کے دن ۳ ربیع الآخر کو نکلے، بعد ازاں دوشنبہ کے دن ۲۰ ربیع الآخر کو واپس ہوئے"[5]

معلوم ہوتا ہے کہ کسی بے احتیاط ناقل کے قلم سے "لثلاث عشرۃ خلون" کی بجائے "لثلاث خلون" کے الفاظ نکل گئے اور لفظ "عشرۃ"

---

[1] ابن حبیب /۱۱۱ [2] ایضاً [3] طبری ۲/۲۹۹ [4] واقدی /۳، ۱۸۲، ابن سعد ۲/ ۲۰، قسطلانی ۵/۱۱۱ [5] ابن حبیب /۱۱۰

لکھنے سے رہ گیا ہے کیونکہ از روئے حساب جب کسی مہینے کی ۲۰ کو دوشنبہ ہوگا تو اس سے پہلے ہفتوں میں صرف ۱۳ اور ۶ تاریخ کو دوشنبہ ہوسکتا ہے، اس بناء پر ظاہر ہے کہ یہاں صرف یہی قیاس کیا جاسکے گا کہ روایت میں "لثلاث عشرۃ خلون" مذکور تھا۔

اس واقعہ کی تاریخ کے ذیل میں ایک دوسری غلطی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ کتابوں میں بجائے "ربیع الآخر" اس کی تاریخ "ربیع الاول" درج ہوگئی ہے جس کے خلاف متعدد قرائن ہیں جو مقالہ چہارم میں پیش کئے گئے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے دلچسپ کتابتی سہو حضرت ابوسعید خدری کی ایک روایت میں نظر آتا ہے۔ ابن اسحٰق اور دوسرے سیرت نگاروں نے (سوائے واقدی اور ابن سعد کے) غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم ۷ ؁ھ بیان کی ہے، صرف واقدی اور ابن سعد نے اسے جمادی الاولیٰ ۷ ؁ھ کا واقعہ ظاہر کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ابن سعد نے ابوسعید خدری کی ایک روایت بھی نقل کی ہے جو حسب ذیل ہے:

"بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ خیبر کے لیے ۸ رمضان کو نکلے اور بہت سے لوگوں کے روزے تھے۔"[1]

قدیم سیرت نگاروں میں سے کسی ایک نے بھی غزوۂ خیبر کو رمضان میں ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ بخاری میں تو یہ صراحت موجود ہے کہ صرف دو غزوے یعنی بدر اور فتح مکہ رمضان میں ہوئے تھے، اس بناء پر ابوسعید خدری کی روایت کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن قسطلانی نے "مواہب" میں اس غلطی کو محض کتابتی سہو قرار دیا ہے، چنانچہ مذکور ہے:

"ابن سعد اور ابن ابی شیبہ نے ایک غریب روایت ابوسعید خدری سے یہ بیان کی ہے کہ "ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ خیبر گئے، یہ رمضان کی ۱۸ تاریخ تھی" اگرچہ اس کی اسناد حسن ہے لیکن روایت (پھر بھی) غلط ہے، غالباً یہ لفظ حُنین تھا جو غلطی سے خیبر ہوگیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ حُنین غزوۂ فتح (مکہ) کے بعد ہوا تھا، اور غزوۂ فتح کے لیے رسول اللہ ﷺ بالیقین رمضان میں نکلے تھے۔"[2]

حُنین کو اگرچہ بدخطی کی بناء پر خیبر پڑھا جاسکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس روایت کے بعض دوسرے الفاظ پڑھنے اور سمجھنے میں بھی کہیں اور غلطی ہوئی ہے، اس لیے کہ غزوۂ حنین بھی ۱۸ رمضان کا واقعہ نہیں، بلکہ شاید آخر رمضان یا شوال کا واقعہ ہے۔

اسی طرح غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کی تاریخیں ہیں، جن کی ابتدائی دستاویزوں میں کچھ ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں، جن کی تصحیح فی الوقت مشکل ہے، خندق کی تفصیلی تاریخ ابن حبیب نے بھی بیان کی ہے اور واقدی نے بھی، اور دونوں کے یہاں ایک ہی نمونہ کی غلطیاں ہیں، جن سے یہ اندازہ ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ تاریخیں جب ابتدائی یادداشتوں سے نقل کی گئی تھیں، تو خود ناقلین نے اُن کو پورے طور پر نہیں سمجھا تھا، اور یہ تاریخیں خواہ ابتدائی یادداشتوں کی بدخطی کی وجہ سے خواہ مسودات کے نقص کی بنیاد پر قطعاً غلط نقل ہوئی تھیں۔

ابن حبیب نے غزوۂ خندق کی تاریخ اس طرح بیان کی ہے:

"کہ آنحضرت ﷺ پنجشنبہ کے دن ۱۰ شوال کو نکلے اور سہ شنبہ کے دن یکم ذیقعدہ کو یہ لڑائی ختم ہوئی۔"[3]

---

[1] ابن سعد ۲/ ۷۸۔ [2] قسطلانی مواہب / ۱۷۳ [3] ابن حبیب / ۱۱۳۔

عام تمدنی تقویم کے بموجب اگرچہ ۱ شوال ۵ھ کو چہار شنبہ آتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ پنجشنبہ بھی ممکن ہے، لیکن روایت کا دوسرا حصہ بہر طور پر غلط ثابت ہوا ہے، اس لیے کہ جب ۱ شوال کو پنجشنبہ ہوگا تو یکم ذیقعدہ کو ہفتہ ممکن نہیں بلکہ چہار شنبہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح واقدی اور ابن سعد کی تاریخیں بھی غلط معلوم ہوتی ہیں؛ ابن سعد کا بیان ہے :۔

"اور رسول اللہ[۱] دوشنبہ کے دن ۸ ذیقعدہ کو نکلے اور مشرکین نے پندرہ راتیں محاصرہ کیا اور رسول اللہ چہار شنبہ کو جبکہ ذیقعدہ کی سات راتیں باقی تھیں واپس تشریف لائے۔"[۱]

اول تو یہ واقعہ ذیقعدہ کا نہیں، بلکہ اس سے متقدم مہینے یعنی شوال کا ہے۔ جس پر موسمی قرائن موجود ہیں، دوسرے یہ کہ بالفرض اگر اس کو ذیقعدہ کا واقعہ تسلیم کر بھی لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ ۸ ذیقعدہ کو دوشنبہ کا دن تھا، تو اس سے پندرہ دن کے بعد ۲۲ ذیقعدہ کو پھر دوشنبہ ہی کا دن ہوگا، نہ کہ چہار شنبہ کا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقدی اور ابن سعد کے یہاں غزوۂ خندق اور غزوۂ بنو قریظہ کی تاریخیں مخلوط ہو گئی تھیں۔

بہر صورت ان غزوات کی تاریخیں نہ ابن حبیب کے یہاں ٹھیک ہیں اور نہ ابن سعد اور واقدی کے یہاں، از روئے حساب صحیح ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی کتابت میں کب اور کہاں غلطی ہوئی تھی۔

سیرت کی کتابوں میں بعض غلطیاں ایسی بھی موجود ہیں جو محض مولفین مابعد کے تساہل اور عدم توجہی کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہیں، مثلاً دیار بکری نے غزوۂ بنو لحیان کے متعلق ابن اسحٰق کی طرف یہ روایت منسوب کی ہے کہ ان کی رائے میں یہ واقعہ شعبان[۲] ۶ھ کا تھا، حالانکہ ابن ہشام نے ابن اسحٰق سے جو روایت بیان کی ہے، اس میں صاف طور پر اس واقعہ کو جمادی الاولیٰ[۳] ظاہر کیا ہے۔ طبری نے ابن حمید سے جو روایت بیان کی ہے اس میں بھی جمادی الاولیٰ ۶ھ[۴] درج ہے حتیٰ کہ سیرت ابن اسحٰق کے فارسی ترجمہ میں بھی شعبان نہیں بلکہ جمادی ۶ھ[۵] ہے۔ علاوہ ازیں عام طور پر تمام مولفین مابعد نے ابن اسحٰق سے جو روایتیں بیان کی ہیں، وہ سب کی سب جمادی الاولیٰ کی ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیار بکری کو پھر یہ شعبان کی روایت کہاں سے ملی؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سہو کاتب یا خود مؤلف کی عدم توجہی کا نتیجہ ہے۔

(۴)

زیر نظر مقالہ میری کتاب "حل التضاد" کا حصہ دوم ہے گزشتہ مقالوں میں جو نظریہ پیش کیا جا چکا ہے اس کو واقعات سیرت پر منطبق کرنا ضروری تھا، اس

---

[۱] ابن سعد ۲/۴۸ [۲] دیار بکری ۲/۵

[۳] ابن ہشام ذکر غزوۂ بنو لحیان [۴] طبری، ذکر غزوۂ بنو لحیان

[۵] مخطوطہ رام پور ۱۸۸۸ء

عرصے میں کچھ کم نشو واقعات کی تاریخوں کی آزمائش کی گئی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ گنتی کی چند تاریخوں کے علاوہ سب کی سب صحیح ثابت ہوئی ہیں۔

مسلمانوں کے اسلاف کا یہ ایک ایسا بے مثال کارنامہ ہے جس پر حیرت و استعجاب پیدا ہوتا ہے اور بے اختیار داد نکلتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں یہ واقعات قلمبند کئے جا رہے تھے، دنیا اس درجہ تاریخی شعور سے خالی تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات تک کو مؤقت کیا جاتا ہے۔

پھر تقریباً پونے چودہ سو سال سے یہ تاریخیں عملی حالت پر چلی آ رہی ہیں، ان میں بیشتر ایسی تاریخیں ہیں جو متداول اصولوں پر صحیح ثابت نہیں ہوتی تھیں جن پر اعتراضات کئے جا سکتے تھے جن کو غلط قرار دیا جا سکتا تھا لیکن علمائے اسلام کی دیانت کا تقاضہ یہ تھا کہ بلا کسی ادنیٰ الٹ پھیر کے انھیں بجنسہٖ برقرار رکھا جائے چنانچہ یہ آج تک محفوظ ہیں۔

یہ سلسلہ کم سے کم دس قسطوں تک چلتا، (جو میری ہمت سے باہر تھا) اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ہر سال کا کم سے کم ایک واقعہ بجنسہٖ شائع کر دیا جائے اور باقی واقعات کا اختصار یا ان کے متعلق اشارے پیش کر دوں تاکہ قارئین کو اس نظریے کو پرکھنے کا پورا موقع ملے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کتاب شائع ہونے سے پہلے، یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ صاف ہو جائے۔

(علوی)

گذشتہ مباحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ واقعاتِ سیرت پر دو دستاویزی کارفرمائی بدرجہ اتم موجود ہے جس کے باعث واقعاتی توقیت اور ترتیب خاص طور پر متاثر ہوئی اور علت و معلول کے اکثر سلسلے منقطع ہو گئے جو تاریخی واقعات کی تفہیم کے لیے سب سے ضروری شے تھے، بدیں وجہ ضرورت تھی کہ ان واقعات کو از سرِ نو مرتب کر کے پیش کیا جائے۔

اس مقصد کے لیے ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ واقعاتی توقیت کے لحاظ سے پوری سیرت دوبارہ لکھی جائے، جو میری رائے میں ایک بالکل علیحدہ موضوع اور جداگانہ بحث ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں تاریخ نویسی کے زاویے تبدیل ہو چکے ہیں اور سب سے ضروری بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہر واقعہ کی جانچ تقریباً انھیں اصولوں پر ہو جو علوم طبیعیہ کے لیے ہم نے مقرر کئے ہیں، اور جس طرح طبیعیات و کیمیا میں اشیاء کے خواص اور ان کے عمل اور ردِّ عمل سے نتائج نکالے جاتے ہیں، کم و بیش وہی طریقہ تاریخی واقعات کو پیش کرتے وقت سامنے رہنا چاہئیں اور ان کے سلسلۂ علت و معلول اور اثر و باز اثر پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر واقعہ خواہ کتنا ہی حقیر اور مختصر کیوں نہ ہو، نتیجہ ہوتا ہے، بہت لمبے سلسلۂ واقعات کا جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں اور جن کا مکمل احاطہ کسی طرح ممکن نہیں، تاہم ایک تاریخی واقعے کو سمجھنے کے لیے کم سے کم اس قدر ضروری ہے کہ اس واقعہ کا پس منظر اور پورا ماحول ہمارے سامنے ہو اور اس کی اصلی علت کا پتہ چل جائے۔ خاص طور پر پیغمبرِ اسلام کی سیرت کے لیے یہ سب سے ضروری بات ہے کیونکہ آپ کی ذاتِ گرامی سے وہ عظیم تحریک جس کو عرفِ عام میں "اسلام" کہا جاتا ہے، کچھ اس طرح وابستہ اور منسلک ہے کہ بلا اس تحریک کو سمجھے خود آپ کی شخصیت گم ہو جاتی ہے اس لئے ایک سیرۃ نویس کا فرضِ اوّلین یہ ہو جاتا ہے کہ پہلے اس تحریک کے قدرتی عوامل اور محرکات پر غور کرے اور یہ دیکھے کہ مشیتِ ایزدی نے اس تحریک کو عرب کے ریگزاروں سے کس طرح ابھارا تھا اور نیز یہ کہ عہدِ جاہلیت کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی حالات کے ساتھ ساتھ اسلام کی

جزیرہ نما عرب کے جغرافیائی تقاضوں، اور عرب قوموں کی نسلی افتادِ طبیعت کا حتی المقدور جائزہ لے تاکہ اس زمانے کے ذہنی رجحانات، حیاتی کشمکش اور علمبرداران اسلام کی ذاتی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکے، اور دریافت کیا جا سکے کہ اس "الٰہی تحریک" کے بالکل ابتدائی اور فطری تقاضے کیا تھے، جو اس کے آناً فاناً فروغ اور قبولِ عام کا باعث بنے۔

انسانی تاریخ چونکہ ہر واقعے کی "مادی توجیہ" چاہتی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ہم پیغمبرِ اسلامؐ کے حالاتِ زندگی کو ہاتھ لگانے کے اس وقت تک مجاز نہیں جب تک ان کی مادی توجیہات ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہم ان کی روشنی میں اس "عظیم ترین انسان" کے ایک ایک حکم اور ایک ایک عمل کو نہ پرکھ سکیں۔

ظاہر ہے کہ یہ کام ایک علٰحدہ فرصت اور کچھ نئے مقدمات کے بغیر ممکن نہیں۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جا سکتا تھا کہ آپؐ کی ابتدائے حیات سے آخر عمر تک کے حالات محض توقیتی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ اس طرح پیش کر دیئے جائیں کہ قارئین کتبِ سیرت کو پیش نظر رکھ کر خود تاریخی نتائج نکال سکیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ کام اس لیے بھی زیادہ مشکل بلکہ ایک طرح ناممکن ہے کیونکہ سیرت یا تاریخ کی کتابوں میں ہجرت سے پہلے کے واقعات کی کوئی واضح توقیت نہیں ملتی، عہدِ ماقبلِ نبوت ایک طرف بعثت کے بعد کے حالات کی تاریخیں بھی محفوظ نہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ آپؐ کے مشن کا مکی حصہ جو بعض حیثیتوں سے انتہائی اہم ہے، توقیتی اعتبار سے بالکل تشنہ اور غیر واضح نظر آتا ہے، حالانکہ یہ حصہ وہی ہے جس کا ایک ایک لمحہ، نظریاتی جنگ، ذہنی کش مکش اور فکری جدل کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریک کی تدریجی گر مضبوط نشوونما میں صرف ہوا تھا، چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے پہلی بار کس تاریخ کو تبلیغ شروع کی تھی؟ ابوبکرؓ اور دوسرے رفقا کب اسلام لائے؟ بلالؓ اور ان جیسے اور غلاموں کو خرید کر آزاد کرا دینے کی کیا تاریخ تھی؟ جس سے عملاً لپماندہ اور غریب طبقے کی ہمت افزائی ہوئی، اسی طرح ہم نہیں جانتے کہ مہاجرینِ حبشہ نے جب ہجرت کی تو وہ کونسا مہینہ تھا یا اسلامی تحریک کے خلاف عمومی بائیکاٹ کا رزولیوشن کس تاریخ منظور یا ضبطِ تحریر میں آیا تھا؟ وعلیٰ ہذا القیاس تقریباً تمام دوسرے واقعات اسی طرح تشنۂ توقیت ہیں۔

مکی عہد کا یہ توقیتی فقدان نقادانِ تاریخ کے لیے ایک نیا زاویۂ فکر پیش کرتا ہے، کیونکہ قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس فقدان کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں جب کہ مدنی عہد کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات بھی مؤقت کیے گئے ہیں مکی دور کے کسی بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم واقعے کی تاریخ نہیں ملتی؟ یہ سوال حقیقتہً بہت زیادہ توجہ کا محتاج ہے۔ خاص طور پر تاریخ اسلام کے ان "انتہا پسند" علما کے لیے جو کلیتہً اسلامی روایات کے تحریری ریکارڈوں کے قائل نہیں۔

ان میں سے پہلا گروہ ایسے نقادانِ تاریخ کا ہے جن کو شبہ ہے کہ یہ سارا ریکارڈ [illegible] مابعد کی جعل سازی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس [illegible] مقابلے میں دوسرا گروہ ایسے خوش فہم علمائے اسلام کا ہے جن کے خیال میں اس قسم کی تمام تر توقیتی روایات [illegible] [illegible] غیر معمولی حافظے کا نتیجہ تھیں، اور جن کو مؤلفِ سیرت [illegible] سو اسو ڈیڑھ سو سال بعد پہلا [illegible] ریکارڈ کرنا شروع کیا تھا۔

متذکرہ بالا فقدان دونوں کمیوں کو بیک وقت دعوتِ فکر دیتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ :

(ا) اگر یہ توقیتی صراحتیں فی الحقیقت مورخین اسلام کی جعلسازی تھیں تو کیا وجہ ہے کہ یہی جعلسازی مکی عہد کے واقعات میں نظر نہیں آتی؟ سامنے کی بات ہے کہ جو لوگ مدنی عہد کے متعلق اس فعل کے مرتکب ہو سکتے تھے وہ مکی دور کو کس طرح تشنہ چھوڑ دیتے؟

(ب) اسی طرح علمائے اسلام سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ توقیتی صراحتیں محض زبانی روایات، یا صحابہ اور تابعین کے عجیب وغریب حافظے کا نتیجہ تھیں تو یہی معجزہ مکی واقعات کے ذیل میں کیوں ناکام رہا؟ اور ان میں یہ صراحتیں کیوں موجود نہیں؟ وہی صحابی، وہی عربی حافظہ، وہی احکام اور واقعات۔ سب لگن، مگر ان واقعات کی توقیت مفقود۔

ظاہر ہے کہ مکی عہد کا یہ توقیتی فقدان مدنی عہد میں ایک خاص "مادی" تبدیلی کا پتہ دیتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ہجرت کے فوراً بعد اسلامی تنظیم میں کوئی نہ کوئی "بنیادی ترقی" ضرور ہوئی تھی۔ ایک ایسی ترقی جو مکی دور میں موجود نہ تھی اور صرف مدینے جا کر پیدا ہوئی۔

میری رائے میں یہ ترقی مدینے کی شہری ریاست پر اسلام کے سیاسی اقتدار کی صورت میں پہلی بار رونما ہوئی جو بہت جلد ایک باضابطہ مملکت یا باقاعدہ سلطنت میں تبدیل ہوتی چلی گئی اور جس کے کارپردازوں اور منتظمین نے سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ضروریات کے لیے ان واقعات کو ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ کتبِ تاریخ میں اکثر و بیشتر صرف ایسے واقعات کی تاریخیں ملتی ہیں جن کا تعلق سیاسی مہمات سے تھا۔

سیاسی اقتدار صحیح معنی میں "تاریخ گر" ہوتا ہے، وہ نہ صرف قوموں کی تاریخ پیدا کرتا ہے بلکہ ان کی زندگی میں وہ جملہ محاسن بھی پیدا کرتا چلا جاتا ہے جن کی اس قوم کو ضرورت پڑتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اس اقتدار کی پشت پر ایک ترقی پسند مقصد اور آگے بڑھانے والی تاریخ کارفرما ہوتی ہے۔

بظاہر یہی وجہ ہے کہ مدنی عہد کی تاریخ، توقیتی اعتبار سے جس درجہ مالا مال ہے، مکی عہد اسی نسبت سے تہی دامن نظر آتا ہے، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی کے ابتدائی ترپن ۵۳ سال کے حالات توقیتی تفصیلات کے ساتھ واضح طور پر نہیں پڑھ سکتے، بلکہ اس دور کے واقعات کا صرف تخمینی اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اس کتاب کا موضوع چونکہ پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت نہیں، بلکہ واقعاتِ سیرت میں جو بظاہر توقیتی تضادات نظر آتے ہیں، ان کا ایک حل پیش کرنا ہے، اس لیے میں نے صرف ایسے واقعات سے بحث کی ہے جن کی تاریخیں واضح طور پر متعین ہیں اور جو مکی تقویم فراموش کر دینے کی وجہ سے مشتبہ سمجھی جاتی تھیں، یہ تاریخیں واقعۂ ہجرت سے شروع ہوتی ہیں اور آخر تک مسلسل چلی جاتی ہیں اس لیے میں نے کتاب کے اس حصے کی ابتدا واقعۂ ہجرت سے ہی کی ہے۔

اس حصے میں تمام واقعات (بجز ایسے واقعات کے جو ایک دوسرے سے متعلق ہیں) علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت پیش کیے گئے ہیں مگر ان کی ایسی تمام تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں جن کا تعلق براہِ راست یا بالواسطہ توقیت سے نہ تھا تاہم اس قسم کی تفصیلات کو برقرار رکھا گیا ہے جن کو اڑا دینے سے واقعات کی تاریخی نوعیت ختم ہو جاتی۔

واقعات بیان کرنے میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ان کا معمولی تعرف مختصر الفاظ میں کرا دیا جائے اور کہیں ضرورت پیش آئی ہے تو واقعاتی تسلسل برقرار رکھنے کے لیے کسی قدر تفصیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ حتی الوسع اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کا جو تاریخی تعلق ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے تاکہ قارئین کو واقعاتی ترتیب کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

کتبِ سیرت میں بعض واقعات اس درجہ مختلف التوقیت نظر آتے ہیں کہ بظاہر ایک ایک دو دو سال کا فرق محسوس ہوتا ہے، اور ان کی نسبت علماء تاریخ کی آرا بھی متضاد نظر آتی ہیں، اوّل تو بیشتر ایسے واقعات میں خود دو تقویمی نظریہ توازن پیدا کر دیتا ہے لیکن اگر کہیں مزید تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو وہ بھی کر دی گئی ہے۔

تقریباً سو سوا سو[۱۲۵] چھوٹے بڑے واقعات میں سے جو سیرت کی مختلف کتابوں میں متفرق نظر آتے ہیں فی الحال کچھ کم ستر واقعات انتخاب کرکے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ ان پر اس "جدید نظریے" کی آزمائش کی جا سکے، باقی واقعات کو اس لیے نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ اس نظریہ کے خلاف شہادت دیتے بلکہ صرف اس لیے ترک کر دیئے گئے ہیں کہ یا تو ان پر دو تقویمی کارفرمائی کا پتہ نہیں چلا، یا یہ متعین نہیں ہو سکا کہ وہ کس تقویم کے مطابق ریکارڈ کیے گئے تھے۔

تمام واقعات سنہ وار پیش کیے جا رہے ہیں اور ہر سنہ کا ایک علیحدہ چارٹ بھی دیا جا رہا ہے جو مکّی اور مدنی دونوں تقویموں پر مشتمل ہے، یہ چارٹ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ "مکی" اور "مدنی" تقویموں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کے درمیان جولین (JULIUN) کلینڈر رکھ دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں میں جو تفاوت چل رہا تھا، وہ بالکل واضح ہوتا چلا جائے، اور دریافت کیا جا سکے کہ کون سا "مکی" مہینہ کس "مدنی" مہینے سے مطابق ہوگا، اور یہ دونوں مہینے عیسوی اعتبار سے کس تاریخ شروع ہوئے تھے، ساتھ ہی ان مہینوں کے پہلو میں واقعات کے عنوانات بھی لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ قارئین کو ہر واقعے کی توقیتی آزمائش میں پوری سہولت رہے، اگر کسی واقعے کا ریکارڈ مکّی اور مدنی دونوں تقویموں کے بموجب ہوا تھا، تو چارٹ کے دونوں جانب اس کی بھی نشان دہی کر دی گئی ہے۔

کچھ واقعات ایسے بھی تلاش کیے گئے ہیں اور کیے جا رہے ہیں، جن کی تاریخیں اور دونوں تقویموں پر پوری نہیں اترتیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ان کا تناسب کیا ہے، اور کیا وجہ ہے کہ یہ غلط ثابت ہو رہی ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ قارئین کے پیشِ نظر اس مسئلہ کے جملہ پہلو آ جائیں جن سے ایک قابلِ قبول تاریخ مرتب ہو سکے۔

واقدی اور ابن سعد کے یہاں دو تین چھوٹے چھوٹے واقعات کے سنہ بظاہر غلط معلوم ہوتے ہیں، جن پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، ان واقعات کو میں نے فی الحال ترک کر دیا ہے۔

۲۷۱

نوٹ: ان جدولوں میں داہنی جانب مکّی تقویم ہے، بائیں جانب موجودہ ۲۱ء اور ہجری مہینے ہیں، درمیان میں جولین تاریخیں درج کی گئی ہیں تاکہ دریافت کیا جا سکے کہ کون سا مہینہ کس تاریخ و یوم کو شروع ہو رہا تھا۔ (مصنّف)

	مکّی	جولین تاریخ ایام وسٹنفیلڈ	مدنی ہجری
	محرّم	۱۳ ستمبر سنہ ۶۲۲ء دوشنبہ	ربیع الاوّل
	صفر	۱۳ اکتوبر چہارشنبہ	ربیع الآخر
۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ، ہجرت	ربیع الاوّل	۱۱ نومبر پنجشنبہ	جمادی الاولیٰ
	ربیع الآخر	۱۱ دسمبر شنبہ	جمادی الاُخریٰ
	جمادی الاولیٰ	۹ جنوری سنہ ۶۲۳ء یکشنبہ	رجب
	جمادی الاُخریٰ	۸ فروری سہ شنبہ	شعبان
	رجب	۹ مارچ چہارشنبہ	رمضان
	شعبان	۸ اپریل جمعہ	شوّال
	رمضان	۷ مئی شنبہ	ذیقعدہ
	شوّال	۶ جون دوشنبہ	ذوالحجّہ
	ذیقعدہ	۵ جولائی سہ شنبہ	محرم سنہ ۲
	ذوالحجّہ	۴ اگست پنجشنبہ	صفر
	ذوالحجّہ نسی	۲ ستمبر جمعہ	ربیع الاوّل

ہجرت

ربیع الاوّل سنہ ۱

یہ واقعہ (غالباً) پنجشنبہ یکم ربیع الاوّل سنہ ۱ کا ہے۔ کہ سرداران قریش نے مکے کے "دار الندوہ" (SENATE HOUSE) میں تمام شرفاء شہر کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ اسلام اور داعیٔ اسلام کے متعلق آخری اور قطعی فیصلہ کیا جا سکے۔

اس اجلاس میں تقریباً ہر خاندان کے رئیس مثلاً ابو سفیان، ابوجہل، نضر بن حارث، اُمیہ بن خلف وغیرہ شریک تھے بحث کا موضوع یہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال کو پیش نظر رکھ کر کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، جن سے یہ نیا فتنہ (فتنۂ اسلام) دب سکے؟

کچھ لوگوں نے یہ رائے پیش کی کہ داعیٔ اسلام کو پابہ زنجیر کر کے حبسِ دوام کی سزا دی جائے[1]۔ اس کے مقابلہ میں دوسری رائے یہ تھی کہ محض جلا وطنی کافی ہے، ایک تیسری رائے یہ تھی کہ آنحضرتؐ کو قتل کر دیا جائے[2] اس کا پیش کرنے والا ابوجہل تھا، جو قریش میں بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا، اہلِ مجلس نے اسی رائے سے اتفاق کر لیا۔

قبائلی زندگی میں ایک انسان کی جان، خود اس کی نہیں، بلکہ اس کے قبیلے کی مقدس امانت سمجھی جاتی تھی، خطرہ یہ تھا کہ اس صورت میں نہ صرف بنوہاشم، بلکہ تمام بنو عبد مناف، ایک ہو جائیں گے، اور مکہ خانہ جنگی کا مرکز بن جائے گا، آخر طویل بحث و مباحثہ کے بعد اس پر اتفاق ہو گیا کہ ہر خاندان سے ایک ایک فرد چن لیا جائے اور ان منتخب اشخاص کی پوری جمعیت قتل کی ذمہ دار ہو[3]۔

پیغمبرِ اسلامؐ کو دار الندوہ کے اجلاس کی نیت اور ارادے کا علم ہوا[4]، تو آپؐ نے دوپہر ہی سے اقامت گاہ خالی کر دی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:۔

"ہم دوپہر کو ابوبکرؓ کے گھر بیٹھے تھے کہ کسی نے اُن سے کہا کہ رسول اللہؐ چہرے پر مقنع ڈالے تشریف لاتے ہیں، حالانکہ معمولاً آپؐ اس وقت کبھی تشریف نہ لاتے تھے[5]"

آپؐ نے آتے ہی حضرت ابوبکرؓ سے تخلیے میں بات چیت کی، اور ہجرت کا ارادہ ظاہر فرمایا، تو وہ فوراً رفاقت کے لیے تیار ہو گئے[6]۔

ابن اسحٰق کے بیان کے بموجب آنحضرتؐ اور ابوبکرؓ دونوں اسی وقت عقبی دروازے سے نکل گئے۔ (فخرجا من خوخة لابی بکر فی ظهر بيته) اور غارِ ثور میں پناہ لی، جو مکے سے جنوب میں ہے[7]۔

---

[1] ۲/۱۲۴، ابن سعد ۱/۱۵۳ [2] ابن ہشام ۲/۱۲۵، ابن سعد ۱/۱۵۳ طبری ۲/۲۴۳ [3] ابن سعد ۱/۱۵۳، ابن ہشام ۲/۱۲۶، طبری ۲/۲۴۵ [4] ابن سعد ۱/۱۵۳، ابن ہشام ۲/۲۹ [5] بخاری/باب ہجرۃ النبیؐ [6] نیز دیکھیے یہی روایت ابن ہشام ۲/۱۲۹ [7] ابن ہشام ۲/۱۳۰، مقدسی ۴/۱۷۱، طبری ۲/۲۴۷ [8] MARGOLIOUTH RISE P. 208

ادھر قریش نے رات میں مکان کا محاصرہ کر لیا، اور آپؐ کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے اندر جھانک کر دیکھا تو بستر خالی نہ تھا، صبح سو معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کی جگہ حضرت علیؓ بستر پر سوتے رہے تھے[1] یہاں سے یہ لوگ دوڑے ہوئے ابوبکرؓ کے گھر گئے، وہ بھی نہ ملے تو یقین ہو گیا کہ دونوں ہجرت کر گئے، چونکہ ابھی وقت کم گذرا تھا اور گمان تھا کہ دونوں مکّے کے قرب و جوار میں گرفتار کیے جا سکیں گے، اس لیے فوراً سو اونٹوں کے انعام کا اشتہار جاری ہوا[2]، اور لوگ تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

پیغمبر اسلامؐ اور ابوبکرؓ تین شبانہ روز "غار ثور" میں رہے[3]۔ ہر روز عبداللہ بن ابی بکر آتے اور اہل مکّہ کی خبریں پہنچاتے حتیٰ کہ ابوبکرؓ کے گھر سے کھانا بھی آتا، غار ثور میں اس سہ روزہ قیام کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔

اولاً یہ کہ: رات کی تاریکی کچھ کم ہو جائے تاکہ چاندنی میں سفر آسان اور زیادہ سے زیادہ فاصلے تک ہو سکے، دوم یہ کہ قریش کے امکانی تعاقب کا خطرہ باقی نہ رہے۔

ارباب سیرت لکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ دوشنبے کی رات میں عازم مدینہ ہوئے تھے۔

طبری کا بیان ہے:۔

"آنحضرتؐ کا خروج، دوشنبے کا واقعہ ہے اور مدینے میں ورود دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کا واقعہ ہے[4]"

اس حساب سے پہلا دوشنبہ ۵ ربیع الاول کو پڑتا ہے۔ چنانچہ ابن سعد نے صراحت کی ہے:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خروج، دوشنبے کی رات میں ربیع الاول کی چار راتیں گزار کر ہوا[5]"

تمام متقدمین کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو دوشنبے کے دن وارد قبا ہوتے تھے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے:۔

"رسول اللہؐ مدینے میں ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبے کے روز تشریف لائے جبکہ دوپہر ہو چکا تھا، اور سورج سمت الراس پر تھا[6]"

واقدی فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہؐ دوشنبے کے دن ۱۲ ربیع الاول کو مدینے پہنچے[7]"

ابن سعد کے نزدیک یہ تاریخ مجمع علیہ ہے:۔

"اور آنحضرتؐ نے جب مکّے سے ہجرت فرمائی تو آپؐ دوشنبے کے دن ۱۲ ربیع الاول کو مدینے پہنچے اور یہ تاریخ مجتمع علیہ ہے[8]"

---

۱ ابن سعد ۱/۱۵۳، ۱۵۴، ۲ ابن ہشام ۲/۱۲۶ ۳ ابن ہشام ۲/۱۳۰، ابن سعد ۱/۱۶۰ -
۴ طبری ۲/۲۵۴، ابن ہشام ۲/، ۵ ابن سعد ۲/۲ نیز دیکھیے ابن سعد ۱/۱۵۷، ۶ ابن ہشام ۲/،
۷ واقدی /۲ ۸ ابن سعد ۲/۲ ،

چنانچہ مسعودی[1]، مقدسی[2]، طبری[3] وغیرہ تمام بڑے بڑے مصنفین نے اسی کو اختیار کیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مستشرقین اور علمائے یورپ[4] بھی اس سے انکار نہ کر سکے، شیعہ اکابر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں[5]۔

البتہ البیرونی اور اس کے بعد چند نئے مصنفین سیرت مثلاً مارگولیتھ MARGOLIOUTH[6] ایچ جی ویلز H. G. WELLS مولانا شبلی[7] وغیرہ کے نزدیک یہ تاریخ ۸ ربیع الاول مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی جس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام قمری حساب سے ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو دوشنبہ ممکن نہیں، خالص قمری تقویم کی جدولوں کے مطابق دوشنبے کا دن صرف ۸ ربیع الاول کو پڑتا ہے، اس لیے آج کل یہی تاریخ مقبول ہوتی جا رہی ہے۔

مگر میرے نظریۂ تقویم کے بموجب ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو دوشنبہ ہی کا دن تھا، کیونکہ اس سال مکی ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ پنجشنبہ ۱۱ نومبر ۶۲۲ء کے مطابق تھی، جس کے حساب سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبے کا دن اور جولین GULIAN تاریخ ۲۲ نومبر ۶۲۲ء ہونا چاہیے جو روایات کے عین مطابق ہے۔

یہاں مجھے پرسیوال PERCVAL کے نظریہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے، جس کو پیش نظر رکھ کر سر ولیم میور نے اپنی گراں قدر کتاب لکھی ہے، کیونکہ اس نظریہ کے بموجب بھی ۱۲ ربیع الاول ۱ھ کو دوشنبہ کا دن پڑتا ہے اور دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ نظریہ صحیح ہے، لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس نظریہ سے واقعات سیرت کے موسم بالکل الٹے ہو جاتے ہیں، اسی واقعہ کو دیکھیے کہ یہ میور کے نزدیک ۲۸ جون ۶۲۲ء کا ہے[9] یعنی انتہائی موسم گرما کا، لیکن تمام کتب سیرت میں یہ روایت ملتی ہے کہ ہجرت کی شب حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے بستر پر خود آنحضرتؐ کی اونی چادر (برد) اوڑھ کر سو گئے تھے[10] اس روایت کو میور نے بھی پوری آب و تاب سے بیان کیا ہے، حالانکہ ماہ جون میں مکہ کا موسم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص معمولاً اونی کپڑے یا چادر اوڑھ کر سو سکے، روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ مدینے میں داخل ہوئے تو فصل خریف سمیٹی جا رہی تھی، گو میری دانست میں موسم آخری ہو چلا تھا[11]۔

---

1. التنبیہ والاشراف / ۲۴۳ 2. البدء والتاریخ ۴ / ۱۷۷ 3. طبری ۲ / ۲۵۴

4. MENTO GOMN P – MUIR LIFE TOV, ANDRAIS – THE MAN AND HIS FAITH P. 5 – MOHAMED THE PROPHET OF ALLAH P. 61

5. کلینی ابواب التاریخ 6. H. G. WELLS – OUT LINE P. 600 MARGOLIOUTU RISE 471

8. سیرت النبیؐ ۱ / ۲۷۷ 9. IT WAS MONDAY JUNE 28 A D 622 - MUIR - LIFE 168

10. ابن ہشام ۲ / ۱۲۶، ابن سعد ۱ / ۱۵۴، طبری ۲ / ۲۴۳، ۲۴۴ 11. بخاری میں ہے کہ جب رسول اللہؐ مدینے پہنچے تو عبد اللہ بن سلام ایک نخلستان میں فصل خریف چن رہے تھے، "وھو فی النخل لاھلہ یخترف لھم" باب ہجرۃ النبی، نیز دیکھیے ابن سعد ۱ / ۱۶۰ ع

۱۲ ربیع الاوّل "قبا" میں آمد کی تاریخ ہے، جو حوالیٔ مدینہ میں ایک چھوٹی سی بستی تھی، یہاں انصار کے کئی خاندان آباد تھے، جن میں غالباً سب سے ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، اس خاندان کے رئیس کلثوم بن ہدم تھے، جو مہاجرین کی پہلے سے میزبانی کر رہے تھے، آنحضرتؐ بھی یہیں مقیم ہوئے[1]

"قبا" میں اگرچہ آپؐ کی اقامت تقریباً دو ہفتے (چودہ راتیں[2] "اربع عشر لیلۃ") رہی، جیساکہ انس بن مالک کی روایت سے ثابت ہے، (یعنی تقریباً ۲۵ یا ۲۶ ربیع الاوّل تک) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں آپ شہر آتے جاتے رہے، چنانچہ ۱۶ ربیع الاوّل کو جمعہ کے دن آپؐ نے خاص مدینے میں نماز ادا فرمائی[3] اور پہلا خطبہ بنو سالم کے محلّے میں دیا۔

مدینے میں جب تعمیرِ مسجد کا انتظام شروع ہوا، تو آنحضرتؐ ابو ایوبؓ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ جہاں تقریباً سات مہینے قیام فرمایا۔

ذیل میں ان واقعات کی تاریخوں پر دوبارہ نظر ڈالئے!

۱ ۔ غارِ ثور کو روانگی	جمعہ ۲ ربیع الاوّل	مطابق ۱۲ نومبر ۶۲۲ء
۲ ۔ غار میں سہ روزہ قیام	جمعہ تا دوشنبہ ۲ تا ۵ ربیع	" ۱۲ تا ۱۵ نومبر ۶۲۲ء
۳ ۔ قبا میں آمد	دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل	" ۲۲ نومبر ۶۲۲ء
۴ ۔ مدینہ میں نمازِ جمعہ	جمعہ ۱۶ ربیع الاوّل	" ۲۶ نومبر ۶۲۲ء
۵ مدینہ میں مستقل قیام	یکشنبہ یا دوشنبہ ۲۵، ۲۶ ربیع	" ۵ دسمبر ۶۲۲ء

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ چودہ دن کے بعد جمعہ کو آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے[4]، لیکن صحیح روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ "قبا" میں آنحضرتؐ کا ورود دوشنبے کو ہوا تھا، تو چودہ دن کے بعد پندرھویں دن پھر دوشنبہ ہی ہوگا، نہ کہ جمعہ، علاوہ ازیں مولانا نے یعقوبی سے ایک زائچہ بھی نقل کیا ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں، اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ورودِ قبا کی صحیح تاریخ ۲۰ ستمبر ہے جس کو مولانا نے اختیار کیا ہے، تو بھی یہ زائچہ ٹھیک نہیں بیٹھتا، کیونکہ ۲۰ ستمبر کو سورج برجِ میزان کے قریب ہوتا ہے، نہ کہ برجِ سرطان میں، جیساکہ اس زائچہ میں دکھایا گیا ہے۔

سنہ ۲، ۳

اصل کتاب میں اگرچہ اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے مگر یہاں میں صرف غزوۂ ذات العشیرہ اور الوا، کی تفصیلات پر غور کیا جائے گا۔ باقی واقعات کی توقیت صرف مجملاً پیش کی جا رہی ہے۔

۱ ۔ صومِ عاشوراً بیان کیا جا چکا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے مدینے پہنچ کر عاشورے کے روزے کا حکم دیا تھا، یہ واقعہ بالبداہت سنہ ۲ کا ہے سنہ ۱ کا نہیں، کیونکہ آپؐ نے ربیع الاوّل سنہ ۱ میں ہجرت فرمائی تھی اور آپؐ کی ہجرت

---

[1] ابن ہشام ۲/ طبری ۲/ [2] بخاری میں انس بن مالک سے روایت ہے۔ [3] ابن ہشام ۲/
[4] سیرت النبیؐ ۱/ ۲۷۷ء

کے بعد پہلا یوم عاشورا محرم ۲ھ میں آیا تھا (پوری تفصیلات کے لیے دیکھیے برہان / جولائی ۱۹۶۲ء)

۲-۳ - غزوۂ ذات العشیرہ غزوۂ ابوا دیکھیے صفحہ نمبر ۱۱۰ مقالۂ ہذا۔

۴ - غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری

ابن اسحٰق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جمادی الاخریٰ ۲ھ کا تھا، چنانچہ ابن حبیب نے اس کی تاریخ ۱۲ جمادی الاخریٰ ۲ھ ہی بیان کی ہے، بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد کے نزدیک یہ واقعہ ربیع الاوّل ۲ھ کا ہے، دو تقویمی جدول کی رُو سے یہ دونوں مہینے متبادل ہیں؛ اس لیے ان روایات میں تضاد نہیں رہتا، ابن حبیب نے اس کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ۱۲ جمادی کو دوشنبہ تھا جو اگرچہ حسابی رُو سے ۱۳ کو پڑتا ہے، مگر یہ ایک دن کا فرق، قابلِ لحاظ نہیں۔

۵ - غزوۂ بواط

اس غزوہ پر جانے کی تاریخ ابن حبیب کے موجودہ نسخے میں ۳ ربیع الآخر یوم دوشنبہ نظر آتی ہے مگر ساتھ ہی تاریخ مراجعت دوشنبہ ۲۰ ربیع الآخر بیان کی گئی ہے۔ یہ دونوں تاریخیں آپس میں مطابقت نہیں کرتیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ روانگی بجائے ۳ کے ۱۳ تھی کیونکہ ۲۰ کو جب دوشنبہ ہوگا تو اس سے پہلے صرف ۶ اور ۱۳ کو دوشنبہ ممکن ہے۔ (دیکھیے برہان ستمبر ۱۹۶۲ء) اس تاریخ میں بھی صرف ایک دن کا فرق محسوس ہوتا اور مکی تقویم کے بموجب ۱۲ کو دوشنبہ پڑتا ہے۔

۶ - تحویلِ قبلہ

امام زہری نے اس واقعے کی تاریخ جمادی ۲ بیان کی ہے مگر عام روایات میں شعبان ملتی ہے۔ اس واقعے پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے چنانچہ ۲ھ میں مکی جمادی ۲ مدنی شعبان کا متبادل مہینہ تھا۔

۷ - سریۂ عبداللہ بن جحش

یہ واقعہ مکی رجب کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ روایات سے ثابت ہے کہ قریش کے نزدیک یہ حرام مہینہ تھا، جس کی خلاف ورزی پر انھوں نے سخت احتجاج کیا تھا۔

۸ - غزوۂ ینبع

ابن حبیب نے اس کی تاریخ پنجشنبہ ۲ شعبان ۲ھ بیان کی ہے، جو بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ ہوا تھا۔ (مقابلہ کیجیے برہان مئی / ۲۸۶)

۹ - بنو غفار اور اسلم سے معاہدات

ابن حبیب نے بیان کیا ہے کہ ان معاہدات کے لیے پیغمبرِ اسلامؐ سہ شنبہ ۱۴ شعبان کو عازمِ سفر ہوئے تھے، مکی تقویم کے بموجب ۱۴ شعبان ۲ھ کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے، اور یہ ریکارڈ یقیناً مکی ہے۔ (مقابلہ کیجیے برہان مئی / ۲۸۶)

غزوۂ بدر

اس غزوے کی مشہور تاریخ اگرچہ جمعہ ۱۷ رمضان ہے مگر سیرت کی سب سے بڑی سند عروہ بن زبیر نے اس کی تاریخ ۱۶ رمضان بھی بیان کی ہے (دُرِّ منثور ۳ / ۱۸) حسابی قاعدے سے رمضان کی پہلی اگرچہ جمعہ کو تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رواۃ کے نزدیک جمعرات کی پہلی تسلیم کی گئی تھی، جس کے اعتبار سے ۱۶ رمضان کو ہی جمعہ پڑتا ہے، روایات سے اس غزوے کا موسم گرم ثابت ہوتا ہے۔ چونکہ مکی تقویم کے بموجب رمضان ۲ھ جون ۶۲۴ء سے مطابق تھا، اس لیے یہ ریکارڈ بھی مکی معلوم ہوتا ہے۔ (مقابلہ کیجیے برہان مئی / ۲۶۹)

۱۱ - غزوۂ بنو سُلیم ابن اسحٰق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کا تعلق شوال ۲ سنہ سے تھا، مگر واقدی نے اس کی تاریخ محرم ۳ سنہ بیان کی ہے، دو تقویمی نظریہ سے یہ تضاد کلیتہً دُور ہو جاتا ہے۔

۱۲ - قتلِ ابو عفک اس واقعے کی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ شدید موسم گرما کا تھا، مکی جدول تقویم کی رُو سے شوال ۲ سنہ جون سے مطابق ہے، اس لیے یہ مکی ریکارڈ معلوم ہوتا ہے۔ (مقابلہ کیجیے برہان مئی ۴/۲)

۱۳ - سریۂ غالب بن عبداللہ اس واقعے کی تاریخ پر غزوۂ بنو سُلیم کے ساتھ اصل کتاب میں پوری بحث کی گئی ہے۔

۱۴ - غزوۂ بنو قینقاع اس غزوے کی تاریخ واقدی نے ہفتہ نصف شوال بیان کی ہے، مکی تقویم کے بموجب ۱۴ یا ۱۵ شوال کو ہفتے ہی کا دن پڑتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مکی ریکارڈ تھا، ابن حبیب نے اس کی تاریخ یکشنبہ، صفر ۳ سنہ بیان کی ہے جو غالباً یہودیوں کی جلا وطنی کی تاریخ ہے، یہ تاریخ مدنی معلوم ہوتی ہے، اس واقعے پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

۱۵ - نکاح حضرت فاطمہؓ طبری نے اس کی تاریخ آخر صفر بیان کی ہے جو غالباً مدنی روایت ہے، علمائے شیعہ یکم ذوالحجہ پر متفق ہیں جو مکی ریکارڈ معلوم ہوتا ہے[1]۔ جدولِ تطبیق کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداً ذوالحجہ مکی، آخر صفر مدنی سے متصل تھی۔

۱۶ - غزوۂ سویق اس واقعہ کا مہینہ ابن اسحٰق اور واقدی کے درمیان متفق علیہ ہے، مگر واقدی نے اس کی تاریخ یکشنبہ ۵ ذوالحجہ بیان کی ہے، جو مکی حساب پر قطعاً درست اُترتی ہے۔

۱۷ - قتلِ کعب بن اشرف اس کا ریکارڈ مدنی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مکی ربیع الاوّل ۳ سنہ موسم سرما میں آیا تھا۔

۱۸ - غزوۂ ذو امر اس واقعے کی توقیت پر بھی دو تقویمی کارفرمائی کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ ابن اسحٰق کی صراحت سے اس کی تاریخ آخر ذوالحجہ ۲ سنہ ثابت ہوتی ہے جب کہ واقدی کے نزدیک یہ ربیع الاوّل ۳ سنہ کا واقعہ تھا، جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲ سنہ میں ذوالحجہ اور ربیع الاوّل متبادل مہینے تھے۔

---

[1] روایت شیعہ کی تائید ہو جاتی ہے اور روایات کا اختلاف بھی اس سے دُور ہو سکتا ہے۔

سنہ ۲، ۳

	مکی	جولین	مدنی ہجری	
۱۰ محرم سنہ ۲ یوم عاشورا[1]	محرم	۲ اکتوبر سنہ ۶۲۳ بجشنبہ	ربیع ۲	
غزوۂ ابوا پہلا غزوہ بروایت ابن اسحٰق و واقدی وغیرہ	صفر	۳۱ اکتوبر دوشنبہ	جمادی ۱	غزوۂ ذات العشیرہ پہلا غزوہ بروایت بخاری (زید بن ارقم)
غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری بروایت واقدی و ابن سعد	ربیع ۱	۳۰ نومبر چہارشنبہ	جمادی ۲	غزوۂ طلب کرز بن جابر فہری، بروایت ابن اسحٰق، بروایت ابن حبیب ۱۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۲
غزوۂ بواط - واپسی دوشنبہ ۲۰ ربیع الآخر، ابن حبیب	ربیع ۲	۲۹ دسمبر پنجشنبہ	رجب	×
تحویل قبلہ بروایت زہری	جمادی ۱	۲۸ جنوری سنہ ۶۲۴ء شنبہ	شعبان	تحویل قبلہ - (عام روایت)
×	جمادی ۲	۲۶ فروری یکشنبہ	رمضان	
سریۂ عبداللہ بن جحش	رجب	۲۷ مارچ سہ شنبہ	شوال	
غزوہ ینبع پنجشنبہ ۲ شعبان سنہ ۲ (ابن حبیب) بنو غفار اور اسلم سے معاہدہ سہ شنبہ ۱۴ شعبان سنہ ۲	شعبان	۲۵ اپریل چہارشنبہ	ذیقعدہ	
غزوۂ بدر جمعہ ۱۶ رمضان سنہ ۲ بروایت عامر بن ربیعہ و عروہ بن زبیر	رمضان	۲۵ مئی جمعہ	ذوالحجہ	
۱۔ غزوۂ بنو سلیم، بروایت ابن اسحٰق، ۲۔ قتل ابو عفک، بروایت واقدی، ۳۔ سریۂ غالب بن عبداللہ بروایت ابن حبیب ۴۔ غزوۂ بنو قینقاع (بروایت واقدی) ۱۴ شوال ہفتہ	شوال	۲۴ جون یکشنبہ	محرم سنہ ۳	۱۔ غزوۂ بنو سلیم، بروایت واقدی و ابن سعد
×	ذیقعدہ	۲۴ جولائی سہ شنبہ	صفر	۱۔ غزوۂ بنو قینقاع بروایت ابن حبیب یکشنبہ ۷ صفر۔ ۲۔ نکاح حضرت فاطمہ بروایت طبری
۱۔ نکاح حضرت فاطمہ ۲۔ غزوۂ سویق یکشنبہ ۵ ذوالحجہ (ابن اسحٰق واقدی) ۳۔ غزوۂ ذوامر بروایت ابن اسحٰق	ذوالحجہ	۲۲ اگست چہارشنبہ	ربیع ۱	۱۔ قتل کعب بن اشرف ۱۴ ربیع الاول بروایت واقدی ۲۔ غزوۂ ذوامر بروایت واقدی

[1] مصنف نے گزشتہ اوراق میں لکھا ہے کہ یہودیوں کو روزہ دار دیکھ کر محرم کے روزے کا خیال آیا۔ ورنہ قریش بھی محرم کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس سے خود یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ مدینہ آکر نئے کیلنڈر سے سابقہ پڑ رہا تھا۔ ابتداءً رمضان غالباً مکی کیلنڈر ہی سے ہوتا رہا تھا، اور ہمیشہ موسم گرما میں آتا تھا۔ (نثار)

نوٹ :- ۶ر جون ۶۲۴ء کو چہار شنبے کے دن چاند گرہن ہوا تھا، یعنی سہ شنبے کی چودس اور چہار شنبے کی پورن ماشی تھی۔

غزوۂ ذات العُشَیرہ

غزوۂ ابوا، ودّان

جمادی الاولیٰ، صفر ۲ھ مطابق اکتوبر ۶۲۳ء

تقریباً تمام اہلِ سیر کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلی مہم جس میں پیغمبرِ اسلامؐ بنفسِ نفیس شریک تھے، غزوۂ ابوا ہے[۱] جس کو "غزوۂ ودّان" بھی کہتے ہیں، متقدمین میں ابن اسحٰق، واقدی، ابن ہشام، ابن سعد، ابنِ حبیب اور طبری وغیرہ نے اور اس کے بعد جملہ متاخرین نے سلسلۂ غزوات کی ابتدا اسی غزوے سے کی ہے۔

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ غزوۂ ابوا صفر ۲ھ کا واقعہ ہے[۲] بلکہ شرح مواہب میں تو یہاں تک ہے کہ اسی صفر میں خدا نے جہاد کی اجازت دی تھی۔[۳]

علمائے سیرت کے اس متفقہ خیال کا مقابلہ بخاری کی کتاب "المغازی" سے کیا جائے تو ایک تناقض نظر آتا ہے، اس لیے کہ امام بخاریؒ نے سلسلۂ غزوات کی ابتداء غزوۂ عشیرہ سے کی ہے اور دلیل میں زید بن ارقمؓ کی یہ روایت پیش کی ہے:-

"زید بن ارقم سے دریافت کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے کتنی لڑائیاں لڑیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ انیس[۱۹]، ان سے پوچھا گیا کہ تم کتنی لڑائیوں میں شریک تھے؟ فرمایا سترہ[۱۷] میں، پھر ان سے کہا گیا کہ سب سے پہلا غزوہ کون سا ہے؟ تو فرمایا "عُسیرہ یا عُشیرہ"[۴]

اگر یہ صحیح ہے کہ رسول اللہؐ کو "صفر" ہی میں جہاد کی اجازت دی گئی تھی، اور اسی مہینے آپؐ قریش کے کاروانی شاہراہ کی ناکہ بندی اور پڑوسی قبائل سے خیر سگالی کے معاہدے کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے (جو مدینے کی معاشی ضروریات کے لیے بے حد ضروری تھے) تو غزوۂ ذات العشیرہ اسی صفر ۲ھ میں ہونا چاہیے، اس لیے کہ حضرت زیدؓ کی شہادت ایسے شخص کی شہادت ہے جو منجملہ ۱۹ کے، انھوں میں رسول اللہؐ کے رفیقِ کار اور ساتھی رہ چکے تھے۔

اس کے مقابلے میں ابن اسحٰق اور واقدی وغیرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ (یعنی غزوۂ عُشیرہ) صفر ۲ھ کا نہیں، بلکہ جمادی الاولیٰ ۲ھ کا ہے[۵] اس طرح عام طور پر یہ مہم غزوۂ "ابوا" سے دو ڈھائی مہینے بعد کی تسلیم کی جاتی ہے۔

---

[۱] دیکھیے ابن ہشام ۲/۲۴۱، واقدی ۲/۷۔ ابن سعد ۲/۳۔ طبری ۲/۲۶۱۔ مقدسی ۴/۱۸۲۔ مسعودی التنبیہ/۲۳۵ [۲] واقدی ۲/۲۔ ابن سعد ۲/۳، ابن ہشام ۲/۲۴۰۔ قسطلانی/۹۸ [۳] شرح مواہب ۱/۴۶۶، [۴] بخاری کتاب المغازی، اس روایت کو واقدی اور طبری وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے، دیکھیے واقدی ۷/۷۔ طبری واقعات سنہ ۵ھ [۵] پیغمبرِ اسلامؐ کے غزوات کی تعداد مختلف مصنفین نے مختلف بیان کی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے بعوث اور سرایا کو بھی غزوات میں شامل کر لیا ہے۔ بعض نے ایسا نہیں کیا۔

[۶] دیکھیے ابن ہشام ۲/۲۴۹، واقدی ۳/۳، ابن سعد ۲/۴، طبری ۲/۲۶۰، ابن حبیب/۱۱۱، البدایہ ۳/۳۴۶، عیون الآثار/۲۲۶

محدثین اور سیرت نگاروں کے اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں روائتیں بظاہر مشکوک ہو جاتی ہیں اور کبھی ہم بخاری اور زید بن ارقم پر جرح کرنے لگتے ہیں اور کبھی سیرت نگاروں پر، لیکن واقعاتی طور پر جانچ کیجئے تو یہ صرف ایک تقویمی فریب ثابت ہوتا ہے جس میں سیرت نگار اور مورخ عرصۂ دراز سے مبتلا ہیں۔

۲ھ کی دو تقویمی جدولوں پر نظر ڈالئے تو مکی صفر کے مقابلے میں مدنی جمادی الاولیٰ نظر آئے گا جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ ۲ھ میں دونوں مہینے ایک ساتھ چل رہے تھے، مکی تقویم کے بموجب اُسی مہینے کا نام "صفر" تھا جو عام قمری اعتبار سے جمادی الاولیٰ کہلاتا تھا، اس طرح دونوں واقعے ایک ہی ماہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

سیرت نگاروں نے "غزوۂ ابوا" کو محض اس لیے مقدم قرار دیا کہ روایات کے بموجب یہ واقعہ "صفر" نام کے مہینے کا تھا، جو جمادیٰ سے پہلے آتا ہے، اس کے مقابلے میں ذات العشیرہ کو تیسرا غزوہ صرف اس لیے تسلیم کیا گیا، کہ از روئے روایات یہ "جمادی الاولیٰ" کا واقعہ تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مدینے کے قرب وجوار کی بستیوں سے معاہدہ کے لیے نکلے تو آپ پہلے ذات العشیرہ پہنچے جہاں "بنوضمرہ" اور "بنو مدلج" سے گفتگو ہوئی، اور معاہدے کی شرطیں طے پائیں، لیکن "بنوضمرہ" کے اصلی مساکن "ابوا" یا "ودان" میں تھے۔ چنانچہ آپ وہاں بھی تشریف لے گئے اور غالباً "بنوضمرہ" کے ساتھ معاہدے کی آخری توثیق وہیں ہوئی۔ "بنوضمرہ" کا سردار اس زمانے میں مخشی بن عمرو[1] تھا۔

ذات العشیرہ کے ذیل میں جو معاہدہ ہوا، اس کے متعلق طبری میں منقول ہے :-

"اور اس میں بنو مدلج اور ان کے حلفاء بنوضمرہ سے معاہدہ کیا۔[2]"

گویا ابتدائی معاہدہ بنو مدلج سے ہوا تھا، اور اس کے ذیل میں بنو مدلج کے حلیف بنوضمرہ سے بھی معاہدہ کیا گیا، لیکن "غزوۂ ابوا" کے ذیل میں جو معاہدہ مذکور ہے اس میں صرف بنوضمرہ کا ذکر ہے، بنو مدلج کا نہیں۔

"سو اس ذیل میں آنحضرتؐ نے "بنوضمرہ" سے معاہدہ کیا اور جس شخص سے یہ معاہدہ کیا وہ مخشی بن عمرو تھا جو اس زمانہ میں "بنوضمرہ" کا سردار تھا۔[3]"

ابن حبیب نے بھی صرف بنوضمرہ کا ذکر کیا ہے، اور بنو مدلج کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔

"سو "بنوضمرہ" سے معاہدہ کیا اور اُن کے لیے ایک تحریر لکھی اور "ودان" اور "ابوا" تک تشریف لے گئے۔[4]"

اس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ "غزوۂ عشیرہ" کے فوراً بعد آپ "ابوا" تشریف لے گئے، اس کے لیے اگر آپ "ابوا" پہلے تشریف لے جاتے اور بنوضمرہ سے معاہدے کی تکمیل ہو چکی ہوتی تو پھر غزوۂ عشیرہ میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں یہ بات بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جملہ اہل سیر کے نزدیک ان دونوں مہموں میں فوج کے علمبردار حمزہؓ بن عبدالمطلب تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک ہی فوج ان دونوں مقامات تک[5] پہنچی تھی جس کا پہلا ہدف "عشیرہ" تھا اور دوسرا "ابوا"۔

---

[1] ابن ہشام ۲/۲۴۱، ابن سعد ۲/۳، طبری ۲/۲۵۹ وغیرہ [2] ابن ہشام ۲/۲۴۹، ابن سعد ۲/۵۔ طبری ۲/۲۶۰، [3] ابن ہشام ۲/۲۴۱ (نیز دیکھئے، ابن سعد ۲/۳، طبری ۲/۲۵۹ وغیرہ) [4] ابن حبیب ۱۱۰/۱ [5] طبری ۲/۲۶۱

ذات العشیرہ کا محلِ وقوع "ینبع" سے قریب ہے بلکہ سیرت نگار اس کو "بطل ینبع" ہی قرار دیتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ فوج "ینبع" ہوتی ہوتی "الوا" پہنچی۔

ابن اسحٰق کی روایت کے بموجب "عشیرہ" سے واپسی کی تاریخ ابتدائی جمادی الاخریٰ سنہ ۲ ھ ہے۔" تو جمادی الاولیٰ اور کچھ راتیں جمادی الاخریٰ تک قیام فرمایا، اس کے بعد مدینے تشریف لائے[1]۔

مگر تاریخ "عشیرہ" سے مدینے پہنچ جانے کی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس سے کچھ ہی دن کے بعد ۱۲ر جمادی الاخریٰ کو غزوہ کرز بن جابر فہری پیش آیا تھا۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے۔

"اور آنحضرت نے "غزوۂ عشیرہ" سے واپسی پر مدینے میں بہت تھوڑی راتیں قیام فرمایا تھا، جن کی تعداد دس تک پہنچی، کہ کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر چھاپہ مارا[2]۔"

اور بقول ابن حبیب کرز کے حملے کی تاریخ ۱۲ر جمادی الاخریٰ[3]۔ اس لیے آنحضرت کو "عشیرہ" سے جمادی الاخریٰ کے ابتدائی ہفتے میں مدینے پہنچ جانا چاہیے۔

ابن سعد کے بیان کے بموجب غزوہ "ذات العشیرہ" کا مقصد ابوسفیان کے ان تجارتی کارواں پر چھاپہ مارنا تھا، جو مکے سے شام کو مالِ تجارت لیے جاتا تھا اور یہ وہی قافلہ تھا جس کی واپسی پر رمضان سنہ ۲ ھ میں بدر کی مشہور لڑائی ہوئی تھی[4]۔ مگر سیرت کی سب سے بڑی سند عروہ بن زبیر کی شہادت اس کے خلاف ہے[5]۔ عروہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان کا قافلہ مکے سے اس وقت روانہ ہوا تھا، جب سریۂ عبداللہ بن جحش میں ابن حضرمی قتل ہو چکا تھا، اور مسلمان قریش کا قافلہ لوٹ چکے تھے۔ یہ واقعہ رجب سنہ ۲ ھ کا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ عشیرہ کا تعلق ابوسفیان کے قافلے کی دیکھ بھال سے نہ تھا۔

(۵)

سنہ ۳، ۴

	مکی	جولین	مدنی	
	محرم	۳۱ر دسمبر سنہ ۶۲۴ جمعہ	ربیع ۲	
	صفر	۲۰ر اکتوبر شنبہ	جمادیٰ ۱	
۱۔ سریہ زید بن حارثہ، قردہ بدر سے چھ ماہ بعد بروایت ابن اسحٰق ۲۔ نکاح حضرت ام کلثوم	ربیع ۱	۱۹ر نومبر دوشنبہ	جمادیٰ ۲	۱۔ سریہ زید بن حارثہ قردہ بروایت واقدی و ابن سعد ۲۔ نکاح حضرت ام کلثوم

[1] ابن ہشام ۲/۲۴۹ [2] ابن ہشام ۲/۲۵۱ [3] ابن حبیب/۱۱۱ [4] ابن سعد/۲ [5] طبری ۲/۲۶۷

	مکّی	جولین	مدنی	
	ربیع۲	۱۸ر دسمبر سہ شنبہ	رجب	
	جمادی۱	۱۷ر جنوری ۶۲۵ء پنجشنبہ	شعبان	
غزوۂ بحران	جمادی۲	۱۵ر فروری جمعہ	رمضان	
	رجب	۱۷ر مارچ یک شنبہ	شوّال	
	شعبان	۱۵ر اپریل دوشنبہ	ذیقعدہ	
	رمضان	۱۵ر مئی چہار شنبہ	ذوالحجہ	
۲۔غزوۂ احد ۱۱ر شوال ۳ھ شنبہ ۳۔غزوۂ حمراء الاسد ۴۔وفد عضل وقارہ	شوّال	۱۳ر جون پنجشنبہ	محرّم ۴ھ	۱۔سریہ عبداللہ بن اُنیس ۲۔غزوۂ احد ۳۔وحمراء الاسد۔ (بروایت عبدالحمید بن جعفر)
۱۔حادثۂ رجیع بروایت ابن اسحٰق وغیرہ	ذیقعدہ	۱۳ر جولائی شنبہ	صفر	۱۔حادثۂ رجیع بروایت واقدی وابن سعد وغیرہ
	ذوالحجہ	۱۱ر اگست یک شنبہ	ربیع الاوّل	

سنہ ۳، ۴

اس سنہ کے مندرجہ ذیل سات واقعات پر بحث کی گئی ہے، جن میں سے غزوۂ احد اور حمراء الاسد کی پوری بحث یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ باقی واقعات کا اختصار یہ ہے :۔

۱۔ سریۂ زید بن حارثہ — اس مہم کے متعلق ابن اسحٰق کی تشریح یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے چھ ماہ بعد کا ہے (یعنی ربیع الاول ۳ سنہ کا) بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے اس کو جمادی الاخریٰ کا واقعہ قرار دیا ہے، اس واقعے کی تاریخوں پر بھی دو تقویمی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ جدولِ تقویم میں ربیع الاوّل ۳ سنہ مکی، جمادی الاخریٰ مدنی کے مطابق ہے۔ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ موسم سرما (شتا) کا تھا۔ جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ ربیع الاوّل ۳ سنہ نومبر دسمبر ۶۲۴ سنہ سے مطابق تھا۔

۲۔ نکاح حضرت اُمِ کلثوم — اس واقعے کے متعلق واقدی کی روایت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے ان کا نکاح ربیع الاوّل ۳ سنہ میں ہوا تھا، مگر رخصتی جمادی الاخریٰ میں ہوئی، جس کی بظاہر کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی، گمان غالب یہ ہے کہ واقدی کو اس نکاح کی دو مختلف روایتیں پہنچی تھیں، ایک ربیع کی دوسری جمادی کی، ان دونوں میں تطبیق کی خاطر انھوں نے نکاح اور رخصتی دونوں رسموں کو علیحدہ علیحدہ مہینے میں قرار دیا۔

۳۔ غزوۂ نجران — اس غزوے کی تاریخ ربیع الاخریٰ اور جمادی ۳ سنہ بیان کی جاتی ہے جو غالباً مکّی تاریخ ہے، کتاب میں اس کے مکّی ہونے کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

۴۔ سریۂ عبداللہ بن انیس — واقدی نے اس کی تاریخ محرم ۴ سنہ بیان کی ہے یعنی غزوۂ احد سے تقریباً ڈھائی ماہ بعد کی، لیکن دو تقویمی نقطۂ نظر سے یہ سریۂ غزوۂ احد سے چند روز پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے عبداللہ بن انیس کو اس لیے متعین کیا تھا کہ قریش کو سفیان بن خالد کی فوجی اعانت حاصل نہ ہو سکے جو وہ اس لڑائی کے لیے لینا چاہتے تھے، روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی تھی کہ سفیان، مسلمانوں کے خلاف فوج اکٹھی کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوج قریش کی اعانت کے لیے جمع کی جا رہی ہوگی، ورنہ تنہا بنو ہُذیل مدینے پر حملے کی جرأت نہ کر سکتے تھے، اس سریہ کی تاریخ خود عبداللہ نے دوشنبہ ۵ محرم بیان کی ہے جو از روئے حساب صحیح ثابت ہوتی ہے۔

۵، ۶۔ غزوۂ احد اور حمراء الاسد — اس پر پوری بحث صفحہ   پر ملاحظہ ہو۔

۷۔ حادثۂ رجیع — ابن اسحٰق کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احد سے کچھ بعد آخر شوّال ۳ سنہ میں عضل وقارہ کا وفد مدینے آیا تھا، جس کی درخواست پر آنحضرتؐ نے کچھ آدمی اس کے ساتھ روانہ کر دیئے تھے۔ جو کم سے کم ذیقعدہ ۳ سنہ میں روانہ ہوتے ہوں گے۔ واقدی نے اس کی تاریخ صفر ۴ سنہ بیان کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس واقعے کی توقیت پر دو تقویمی اثرات موجود ہیں۔ ذیقعدہ ۳ سنہ مکّی، صفر ۴ سنہ سے مطابق ہے (تفصیلات کے لیے دیکھئے برہان اگست ۶۴ سنہ)

معرکۂ اُحد اور غزوۂ حُمراء الاسد

شوّال (مکّی) ۳ سنہ = محرّم (مدنی) ۴ سنہ

اُوپر گزر چکا ہے کہ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے قریش مکّہ کی جو تجارتی ناکہ بندی کی تھی، وہ اس قدر کامیاب تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ

میں اہلِ مکہ کو شام اور دوسری شمالی بندرگاہوں کی تجارت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے، عراق سے بھی تجارت خطرے میں پڑ چکی تھی اور ایک چاندی سے لدا ہوا قافلہ زید بن حارثہ کے لشکر کا ہدف بن چکا تھا۔

اس تجارتی یا بالفاظِ دیگر اقتصادی ناکہ بندی کا اثر اہلِ مکہ پر نہایت کڑا ہونا چاہیئے جس سے چھٹکارے کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا، کہ یا تو وہ اسلامی تحریک کے سامنے ہتھیار ڈال دیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر مسلمانوں کے مرکز پر ایسی ضرب لگائیں جس سے اس فولادی ناکہ بندی کا جال ٹوٹ جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زید بن حارثہ کے ہاتھوں لٹنے کے چند ہی ماہ بعد قریش نے ایک مضبوط فوج فراہم کر لی جس نے شوال ۳ھ میں مدینے کا محاصرہ کر لیا۔

اربابِ سیر کہتے ہیں کہ اس ناکہ بندی کو توڑنے کے لیے قریش نے غزوۂ بدر کے بعد ہی سے تیاریاں شروع کر دی تھیں[1] یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کے پیہم دباؤ نے، اُن کی شمالی تجارت کو بالکل مفلوج کر رکھا تھا، لیکن اس کا فوری سبب واقعۂ قردہ کے غم و غصے کو ہونا چاہیئے جس میں تقریباً ایک لاکھ کی چاندی لُٹ چکی تھی۔

بہرحال شوال ۳ھ میں قریش کی فوجیں جس میں مکہ کے قرب و جوار کے قبائل اور خاص طور پر "احابیش" شامل تھے[2] بڑے سے نکلیں تو اس شان و شوکت سے کہ ان کے ہمراہ لات و عزّیٰ کی مورتیاں تھیں[3] جن کے جلو میں سوار اور پیادے دستے کوچ کر رہے تھے۔ معرکۂ اُحد سے چند روز پہلے پیغمبرِ اسلام ؐ کے چچا عباس بن عبد المُطّلب نے ایک خفیہ تحریر کے ذریعہ اس لشکر کشی کی اطلاع آنحضرت ؐ[4] کے پاس بھیج دی تھی[5] جو غالباً شروع شوال ۳ھ کو مدینے پہنچ گئی تھی، چہارشنبے[6] کے روز (غالباً ۷، یا ۸ تاریخ کو) قریش کی فوجیں "وادیِ عقیق" میں ذو الحلیفہ کے مقام پر پہنچ چکی تھیں، جس کا فاصلہ مدینے سے صرف ۵ میل ہے، مدینے کے جنوب میں چونکہ لاوے کی کثرت ہے اس لیے قریش نے اُحد کی پہاڑی کے دامن کو میدانِ کارزار تجویز کیا، اور ان کا لشکر چکر کاٹ کر[6] شمال میں پہنچا اور وہیں خیمہ زن ہو گیا۔

ہفتے کے دن صبح[7] سے لڑائی شروع ہوئی اور شاید دوپہر تک ختم ہو گئی، جس میں مسلمانوں کا شدید نقصان ہوا اور بہت سے نامور شہید کر دیئے گئے، ایک حبشی غلام نے پیغمبرِ اسلام ؐ کے چچا حضرت حمزہ ؓ پر ایسا وار کیا کہ اسلام کی یہ شمشیر بھی ٹوٹ گئی[8]، خود رسول اللہ ؐ کے چوٹیں آئیں، چہرۂ مبارک پر زخم آیا اور آپ ؐ گر پڑے، اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ ابن قمیہ کے ہاتھوں[9] آپ ؐ شہید ہو گئے اور لڑائی کا گویا خاتمہ ہو گیا۔

---

[1] ابن سعد ۲/۲۵، نیز دیکھئے واقدی ۱۹۸/ ۱۹۹، [2] طبری ۳/۱۰، البدایہ ۴/۱۰، [3] ایک راوی نے کارزارِ اُحد کا نقشہ کھینچتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ......" واقبل ابوسفیان بحمل اللات والعزیٰ " (طبری ۳/۱۴) جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لات و عزیٰ کی مورتیاں قریش اپنے ساتھ لے گئے تھے، نیز دیکھئے البدایہ ۴/۱۰ [4] واقدی ۲۰۲/ - ابن سعد ۲/۲۵ - ابن سیّد الناس ۲/۳ ؎
[5] طبری ۳/۱۴، [6] ۲/۱۱ MUIR - LIFE 253 - [7] طبری ۳/۱۱ [8] ابن ہشام ۲/۳ ؎
[9] ابن ہشام ۳/۹۹ ؎

قریش نے کشتگانِ بدر کا جی بھر کے بدلہ لیا اور شہدا کی لاشوں کا مثلہ کر ڈالا[1] معلوم ہوتا ہے کہ فتح مندی کے نشے میں سرشار سرداران قریش اسی "تادیب کو کافی سمجھتے تھے اور ان کی فوجیں واپس ہونے لگیں۔ قریش کے لشکر کا بڑا حصہ غالباً واپس ہو چکا تھا کہ سالارِ قریش کو آنحضرتؐ کے صحیح و سلامت ہونے کی اطلاع ملی، جس پر سالِ آئندہ پھر ایک بار قسمت آزمائی کا چیلنج دے کر یہ آخری دستہ بھی واپس ہو گیا۔[2]

غزوۂ حمراء الاسد

دوسرے دن یکشنبے کو علی الصبح ایک مزنی شخص یہ خبر لایا کہ مقام ملل پر قریش کا لشکر رک گیا ہے اور ابوسفیان کی خواہش ہے کہ ادھوری کامرانی کو فتح میں تبدیل کر دیا جائے۔[3] واقدی نے اس واقعے کی پوری تفصیل بیان کی ہے اور عبدالحمید بن جعفر کی یہ روایت من وعن درج کی ہے:

"جب محرم کے مہینے میں یکشنبے کی رات آئی تو عمرو بن عوف المزنی، رسول اللہؐ کے دروازے پر حاضر ہوتے اور بلالؓ اذان دے کر دروازے پر بیٹھے آنحضرتؐ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپؐ باہر تشریف لائے تو مزنی آنحضرتؐ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور بولے یا رسول اللہؐ میں اپنے گھر سے واپس آ رہا تھا، جب میں "ملل" پہنچا تو قریش وہاں خیمہ زن تھے، میں نے سوچا کہ میں ان میں جاؤں اور ان کی باتیں سنوں، تو میں ان کے پاس پہنچا اور میں نے ابوسفیان اور ان کے دوستوں کی بات چیت سنی، وہ کہتے تھے کہ ہم نے کچھ نہ کیا، اور تم نے دشمن کی شوکت و قوت توڑ دی ہے، تو چلو واپس چل کر بقیہ کا بھی قلع قمع کر دیں اور صفوان بن امیہ انکار کر رہا تھا، اس پر آنحضرتؐ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کو طلب کیا اور ان سے وہ باتیں بیان کیں، جو مزنی نے کہی تھیں، ان دونوں نے کہا کہ دشمن کے تعاقب میں چلئے، ورنہ ڈر ہے کہ وہ ہمارے اہل و عیال پر آ پڑیں گے۔"

نماز کے بعد آپؐ نے سلام پھیرا تو لوگ اکٹھا ہو گئے۔ آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ "وہ لوگوں میں دشمن کے تعاقب کے لیے جانے کا اعلان کر دیں۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ اتوار کے دن آپؐ نے مدینے میں صبح کی تو دشمنوں کے تعاقب کا حکم دیا۔ اس پر مسلمان باوجود زخموں کے نکل پڑے۔[4]

مورخین کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ اس خبر کو پا کر قریش کے تعاقب میں مقام حمراء الاسد تک تشریف لے گئے جہاں تین روز قیام فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کو غزوۂ حمراء الاسد کا نام دیا گیا ہے۔[5]

واقدی کی اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے راویٔ اوّل کے ذہن میں معرکۂ احد اور غزوۂ حمراء الاسد کی تاریخ وقوع محرم کا مہینہ تھا جیسا کہ "لما کان فی المحرم" کے الفاظ سے ظاہر ہے، حالانکہ بلا استثناء تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ

---

[1] ابن ہشام ۳/۹۸-۱۰۱ - طبری ۳/۲۴، ۲۵ - [2] ابن ہشام ۳/۱۰۰ - طبری ۳/۲۴ - [3] واقدی/۳۱۷ - [4] واقدی/۳۱۸، ۳۱۷،

[5] ابن ہشام ۳/۱۰۸، طبری ۳/۲۸، ابن خلدون ۲/۲۷

یہ دونوں غزوے شوال ۳ھ کے واقعات ہیں، چنانچہ خود واقدی نے بھی اس کو شوال ہی کے ذیل میں بیان کیا ہے[۱]۔

یہ سوال کہ غزوۂ احد محرم کا واقعہ تھا، یا شوال کا؟ میری دو تقویمی جدول سے حل ہو جاتا ہے۔ ۳ھ کی جدول تقویم میں مکی شوال مطابق ۱۳ جون ۶۲۵ء کا متوازی مدنی مہینہ "محرم" ہے جس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ یہ اختلافِ روایت محض دو تقویمی کا فرمائی کا نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ شوال کے متعلق جو روایتیں ملتی ہیں، وہ مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی تھیں۔ اس خیال کی تصدیق موسمی اشارات سے بھی ہوتی ہے، روایات بتاتی ہیں کہ غزوۂ احد اور حمراء الاسد جس موسم میں ہوئے، اس میں تازہ کھجوریں چل چکی تھیں، چنانچہ میور (MUIR) نے بصراحت بیان کیا ہے کہ غزوۂ حمراء الاسد کے دوران میں پوری مسلمان فوج کو یہی راشن تقسیم کیا گیا تھا۔

اس مقام پر لشکر نے تین دن قیام کیا اور تازہ کھجوروں پر بسر کی، ایک باافراط فصل پر جس کو اسی وقت چُنا گیا تھا[۲]۔

غزوۂ حمراء الاسد سے واپسی کے کچھ ہی دن بعد ایک جاں نثار صحابی کی بیوہ نے جن کے شوہر اسی غزوہ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ کی مع چند احباب کے اپنے باغ میں دعوت کی تو سایہ دار درختوں کے نیچے چھڑکاؤ کر کے فرش بچھایا گیا، اور کھانے کے بعد تازہ اور نورس کھجوروں (رُطب) کا ایک طباق مہمانوں کے سامنے پیش ہوا۔ روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ کھجوریں فصل کے "پہلے" یا اس سے کچھ ہی بعد کے پھل تھے[۳]۔

حجاز میں عام طور پر رطب کا موسم جون اور جولائی ہے۔ اب اگر اس واقعے کو قمری شوال ۳ھ کا قرار دیا جاتا ہے تو مارچ ۶۲۵ء کے مطابق ہوگا اور یہ زمانہ "رطب" کا ہرگز نہیں، حیرت ہے کہ میور (MUIR) نے اُحد کی تاریخ جنوری ۶۲۵ء[۴] قرار دی ہے جس میں تازہ کھجوریں تو درکنار پھول بھی نہیں ہوتا، اور اس پر مستزاد یہ کہ مذکورہ بالا دونوں روایتیں بڑی تفصیل کے ساتھ نقل بھی کی ہیں[۵]۔

اس مرحلے کے بعد ہمیں اس غزوے کی تاریخوں پر نظر ڈالنا چاہیئے، ابن کثیر کا بیان ہے:۔

"اُحد کا واقعہ ۳ھ میں ہوا، جس کو زہری، قتادہ، موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحٰق اور مالک نے بیان کیا ہے۔ ابن اسحٰق کا قول نصف شوال کا ہے، قتادہ کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ہفتے کے دن ۱۱ شوال ۳ھ کا ہے۔ مالک کے قول کے بموجب یہ دن کے ابتدائی حصے کا واقعہ ہے[۶]۔"

اِن تاریخوں میں قسطلانی نے قتادہ کی تاریخ کو متفق علیہ قرار دیا ہے، اور اگرچہ باقی تاریخیں بھی بیان کی ہیں، لیکن سب

---

[۱] واقدی ۱۹۷/ ۔

[۲]

AT THIS SPOT THE FORCE SPENT THREE DAYS AND REGALED THEMSELVES WITH "FRESH" DATE A PLENTIFULL HARVEST OF WHICH HAD JUST BEEN GATHERED (MUIR - LIFE 267)

[۳] واقدی/۳۲۱ [۴] MUIR LIFE 252 [۵] IBID - 267, 273 [۶] البدایہ ۴/۹ ۔

کی سب نقل کے ساتھ، وہ کہتے ہیں :-

"شوال ۳ھ میں ہفتے کے دن ۱۱ شوال پر سب کا اتفاق ہے، اور بعض لوگ کہتے ہیں، ۷ شوال اور بعض کے نزدیک نصف شوال تھی"[1]

ابن سید الناس نے "عیون الاثر" میں ابن عائذ کی سند سے جو مشہور سیرت نگار ہیں، ۱۱ تاریخ بیان کی ہے۔

"غزوۂ اُحد، ابن عائذ کے نزدیک شوال ۳ھ میں ہفتے کے دن ۱۱ تاریخ کو ہوا تھا"[2]

تعجب یہ ہے کہ دیار بکری نے خود ابن اسحٰق سے ایک روایت ۱۱ شوال کی نقل کی ہے[3] اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اس میں خود دیار بکری کی غلطی یا بھول چوک کو دخل نہیں ہے، تو پتہ چلتا ہے کہ ابن اسحٰق کے بعض نسخوں میں یہ تاریخ بھی موجود تھی جواب نہیں ملتی۔

بخلاف اس کے واقدی نے اس کی تاریخ ہفتہ ۷ شوال[4] اور ابن اسحٰق نے بروایت مشہور ہفتہ نصف شوال بیان کی ہے[5] جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہفتے کے دن پر سب کا اتفاق ہے، لیکن تاریخوں میں کسی غلط فہمی کے باعث اختلاف ہوگیا ہے۔ ان میں سب سے قدیم روایت قتادہ کی ہے، جو ۱۱ شوال کی ہے اور غالباً یہی صحیح ہے کیونکہ مکی شوال کی پہلی تاریخ کو موجودہ حساب کے مطابق پنجشنبہ تھا۔ اس اعتبار سے ۸ تاریخ کو ہفتہ ہونا چاہیئے لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، حسابی رویت اور واقعی رویت میں ایک دن کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اب رہی واقدی اور ابن اسحٰق کی مشہور تاریخ تو اس کے غلط ہو جانے کے متعلق میرا گمان یہ ہے کہ اس کی بڑی وجہ غالباً غزوۂ حمراء الاسد کا تاریخی اختلاط ہے کیونکہ ان دونوں واقعات میں صرف ایک دن کا آگا پیچھا ہے۔ نیز یہ کہ غزوۂ حمراء الاسد ایک ذیلی غزوہ تھا، اس لیے ابتدائی دستاویزوں میں ان دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ ہوا ہوگا، اور ہوسکتا ہے کہ ان دونوں ائمۂ سیرت کی غلط فہمی کا باعث بن گیا ہو۔

غزوۂ حمراء الاسد میں آنحضرتؐ نے ۴ دن صرف کئے تھے، اگر ۱۱ تاریخ میں یہ دن جوڑ دیئے جائیں تو ابن اسحٰق کی ۱۵ تاریخ آجاتی ہے اور اگر کم کر دیئے جائیں تو واقدی کی ۷ تاریخ بنتی ہے۔

بہرصورت میری رائے میں ابن اسحٰق اور واقدی دونوں کی تاریخیں غلط ہیں، اور ان کو صرف اسی صورت میں صحیح قرار دیا جاسکتا ہے، جب یہ فرض کرلیا جائے کہ غزوۂ اُحد مکی شوال کا نہیں، بلکہ مدنی شوال کا واقعہ ہے لیکن اس مفروضے کو تسلیم کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں۔

---

[1] مواہب ۱/ ۱۱۶ ۔

[2] عیون الاثر ۲/ ۱ ۔

[3] تاریخ الخمیس ۱/ ۴۱۹ ۔

[4] واقدی / ۱۹۸ ۔ نیز دیکھئے ابن سعد ۲/ ۲۰ ۔

[5] ابن ہشام ۳/ ۱۹ ۔ نیز دیکھئے طبری ۳/ ۱۱ ۔

سنہ ۴، ۵

	مکی	جولین	مدنی	
۱۔ سریہ ابو سلمہ۔ یکم محرم ۲۔ غزوہ دومۃ الجندل یکم محرم ۳۔ بروایت ابن حبیب	محرم	۱۰ ستمبر ۶۲۵ء سہ شنبہ	ربیع ۲	غزوہ دومۃ الجندل بروایت واقدی
۳۔ حادثہ بیر معونہ	صفر	۹ اکتوبر۔ چہار شنبہ	جمادی ۱	
۴۔ غزوہ بنو نضیر سہ شنبہ ۱۲ ربیع ۱ بروایت ابن حبیب	ربیع ۱	۸ نومبر جمعہ	جمادی ۲	
	ربیع ۲	۷ دسمبر شنبہ	رجب	
	جمادی ۱	۶ جنوری ۶۲۶ء دوشنبہ	شعبان	
۵۔ قتل ابو رافع سلام بن ابی الحقیق	جمادی ۲	۴ فروری سہ شنبہ	رمضان	۵۔ قتل ابو رافع سلام بن ابی الحقیق
	رجب	۶ مارچ پنجشنبہ	شوال	
۶۔ غزوہ بدر موعد، بروایت ابن اسحق پنجشنبہ یکم شعبان (ابن حبیب)	شعبان	۴ اپریل جمعہ	ذیقعدہ	۶۔ غزوہ بدر موعد بروایت واقدی یکم ذیقعدہ (ابن سعد)
	رمضان	۴ مئی، یکشنبہ	ذوالحجہ	
	شوال	۲ جون دوشنبہ	محرم ۵ء	
	ذیقعدہ	۲ جولائی چہار شنبہ	صفر	
	ذوالحجہ	۳۱ جولائی پنجشنبہ	ربیع ۱	
۲ غزوہ دومۃ الجندل یکم محرم	نسی	۳۰ اگست شنبہ	ربیع ۲	غزوہ دومۃ الجندل بروایت واقدی

سنہ ۴، ۵

اس سنہ کے مندرجہ ذیل چھ واقعات کو ہاتھ لگایا گیا ہے:

۱ و ۲۔ سریۂ ابو سلمہ مخزومی اور غزوۂ دومۃ الجندل | اہل سیرت بیان کرتے ہیں کہ محرم ۴ سنہ میں آنحضرتؐ نے ابو سلمہ کو ایک قلیل فوج کے ساتھ قبائلِ نجد کی طرف روانہ کیا تھا، اس کی تاریخ یکم محرم ۴ سنہ بیان کی جاتی ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہ سریہ غزوۂ دومۃ الجندل کا ذیلی سریہ تھا جو ۵ سنہ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے، کتاب میں اس کے وجوہ بیان کیے گئے ہیں، اور ظاہر کیا گیا ہے کہ غالباً غزوۂ دومۃ الجندل کا تعلق بھی ۴ سنہ سے تھا۔

۳۔ حادثۂ بیر معونہ | ابن اسحٰق اور واقدی دونوں متفق ہیں کہ یہ واقعہ صفر ۴ سنہ کا ہے، میری رائے میں یہ صفر مکی تھا، اور حادثۂ رجیع سے تقریباً چار ماہ بعد کا واقعہ ہے، جیسا کہ ابن اسحٰق کا خیال ہے۔

۴۔ غزوۂ بنو نضیر | اس واقعہ کی تاریخ ابن حبیب نے سہ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۴ سنہ بیان کی ہے جو مکی تقویم کے حساب سے ٹھیک بیٹھتی ہے۔ وسٹنفیلڈ کی تقویم کے اعتبار سے یہ تاریخ غلط ہے۔

۵۔ قتلِ ابو رافع | اس کے سلسلہ میں علمائے تاریخ مختلف الرائے ہیں کہ یہ کس سنہ کا واقعہ ہے، بعض اس کو جمادی الاخریٰ ۳ سنہ کا، بعض ۴ سنہ کا اور بعض رمضان ۶ سنہ کا واقعہ قرار دیتے ہیں، ان مختلف تاریخوں میں دو تقویمی جدول توازن پیدا کر دیتی ہے، کتاب میں اس پر پوری بحث ہے۔

۶۔ غزوۂ بدر موعد | اس پر پوری بحث برہان میں شائع ہو رہی ہے۔

غزوۂ بدر موعد

شعبان ۴ سنہ = ذیقعد ۴ سنہ

اربابِ تاریخ بیان کرتے ہیں کہ جنگِ احد میں ابو سفیان نے پیغمبرِ اسلامؐ کو چیلنج کیا تھا کہ اگلے سال پھر میدانِ بدر میں قسمت آزمائی[1] ہوگی، جہاں قریش کو ایک سال پہلے شکستِ فاش ہو چکی تھی، آنحضرتؐ کو یہ چیلنج یاد تھا، چنانچہ اس سال کافی لشکر لے کر آپؐ مقررہ ایام میں میدانِ بدر کی طرف بڑھے، قریش بھی پورے ساز و سامان کے ساتھ نکلے اور ظہران تک پہنچے ہوں گے کہ ان کی ہمتوں نے جواب دے دیا[2] اور موسم کی ناموافقت کی وجہ سے واپس چلے گئے۔

اس غزوہ کو بدر موعد کا نام اسی چیلنج کی وجہ سے دیا گیا ہے، ممکن ہے کہ اس مہم کی صرف یہی وجہ ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ

---

[1] ابن ہشام ۳/ ۲۲۰، ابن سعد ۲/ ۲۔ ابن سید الناس ۲/ ۵۴ [2] ابن ہشام ۳/ ۲۲۰، طبری ۳/ ۲۱

اس میں مدنی تجارت کو فروغ اور قریش کی تجارتی ناکہ بندی کی مصلحت کو بہت بڑا دخل تھا۔

ابن اسحٰق نے اس غزوے سے پہلے غزوۂ ذات الرقاع کا ذکر کیا ہے[1]۔

لیکن واقدی کی ترتیب[2] کے بموجب غزوۂ ذات الرقاع بدر موعد سے بعد کا واقعہ ہے، اور یہی خیال درست ہے، ابن اسحٰق نے بدر موعد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بعد ازاں رسول اللہ شعبان کے مہینے میں ابوسفیان کے وعدے کے بموجب نکلے[3]۔"

ابن حبیب نے زیادہ صراحت کے ساتھ، دن اور تاریخ بھی بیان کی ہے:

"اور پنجشنبے کے دن مستہل شعبان کو نکلے، اور چہارشنبہ کے دن ۲۰ کو واپس تشریف لائے[4]۔"

اس کے مقابلے میں واقدی اور ابن سعد کا بیان بالکل جدا ہے، طبقات میں ہے:

"رسول اللہ نے بدر موعد کے لیے لشکرکشی فرمائی، اور یہ بدر قتال سے جداگانہ غزوہ ہے اور یہ ہلال ذلقعدہ (یکم ذلقعدہ) کا واقعہ ہے[5]۔"

گویا بجز چاند کی پہلی تاریخ کے ابن اسحٰق اور واقدی کے مکاتب میں کوئی مشترک تاریخی تصور نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس غزوہ کی بھی دو ابتدائی دستاویزیں الگ الگ محسوس ہوتی ہیں جن میں سے ایک مکی تقویم کے بموجب تھی اور دوسری مدنی کے۔

میری ۴ سنہ کی جدول تقویم میں مکی شعبان کا متبادل مدنی مہینہ ذلقعدہ ہے، جس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے اور نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں دستاویزیں الگ الگ ریکارڈ کی گئی تھیں،

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ دونوں دستاویزوں میں تاریخ روانگی چاند کی پہلی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک راوی کے نزدیک یہ واقعہ یکم شعبان کا تھا، تو دوسرے کی نظر میں یکم ذلقعدہ کا۔

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ روانگی پنجشنبہ مستہل شعبان اور واپسی کی تاریخ چہارشنبہ ۲۰ شعبان بیان کی ہے، وسٹنفیلڈ کی ہجری تقویم کے مطابق ہلال ذلقعدہ ۴ سنہ کی رویت ٹھیک پنجشنبے کو ہوئی تھی، جو روایت کے عین مطابق ہے۔

۵، ۶ سنہ

	مکی	جولین	مدنی	
۱۔ غزوۂ ذات الرقاع ۱۰ محرم بروایت واقدی	محرم	۲۸ ستمبر ۶۲۶ سنہ یکشنبہ	جمادی	۱۔ غزوۂ ذات الرقاع بروایت ابن اسحٰق ۱۰ جمادی الاولیٰ بروایت ابن حبیب

[1] ابن ہشام ۳/۲۱۳، [2] واقدی / ابن سعد ۲/۴۲، ۴۳، مسعودی التنبیہ / ۲۴۷، ۲۴۸،

[3] ابن ہشام ۳/۲۲۰، نیز دیکھیے طبری ۳/۴۱، ابن سید الناس / ۵۳ [4] ابن حبیب / ۱۱۳ [5] ابن سعد / ۲/۴۲ - نیز دیکھیے واقدی /

مکی	جولین	مدنی	
صفر	۲۸ راکتوبر سہ شنبہ	جمادی ۲	۲۔ چاند گرہن
ربیع ۱	۲۶ رنومبر چہارشنبہ	رجب	×
ربیع ۲	۲۶ ردسمبر جمعہ	شعبان	۳۔ غزوۂ بنو مصطلق، ہفتہ یکم شعبان بروایت ابن حبیب، بروایت مسعودی اور قسطلانی ۲ رشعبان
جمادی ۱	۲۴ رجنوری سنہ ۶۲۷ء شنبہ	رمضان	۴۔ اہلِ مقنا کی جعلی دستاویز تاریخ اور دن غلط
جمادی ۲	۲۳ رفروری دوشنبہ	شوّال	۵۔ غزوۂ خندق پنجشنبہ ۱۰ رشوال (ابن حبیب)
رجب	۲۴ رمارچ سہ شنبہ	ذلیقعدہ	۶۔ غزوۂ بنو قریظہ ۲۵ ردن محاصرہ
شعبان	۲۳ راپریل پنجشنبہ	ذوالحجّہ	۷۔ بنو قریظہ سے واپسی، دوشنبہ ۴ رذوالحجّہ ابن حبیب
رمضان	۲۳ رمئی شنبہ	محرّم سنہ ۶ھ	۴۔ اہلِ مقنا کی جعلی دستاویز م تاریخ اور دن غلط
شوّال	۲۲ رجون دوشنبہ	صفر	
ذلیقعدہ	۲۱ رجولائی سہ شنبہ	ربیع ۱	
ذوالحجّہ	۲۰ راگست پنجشنبہ	ربیع ۲	

سنہ ۵، ۶

اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات سے بحث کی گئی ہے :

۱۔ غزوۂ ذات الرّقاع	اس پر پوری بحث بُرہان میں شائع ہو رہی ہے ۔
۲۔ چاند گرہن سنہ ۵	مورخین بیان کرتے ہیں کہ جمادی الاخریٰ سنہ ۵ میں مدینے کے اندر ایک چاند گرہن دیکھا گیا تھا، از روئے حساب ۹ نومبر ۶۲۶ء کو ایک چاند گرہن ہوا تھا، جو مدنی جمادی الاخریٰ سے مطابق ہوتا ہے۔
۳۔ غزوۂ بنو مصطلق	اس غزوے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ یہ سنہ ۵ کا واقعہ ہے یا سنہ ۶ کا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ خندق سے پہلے کا واقعہ تھا، اس کی تاریخ ہفتہ یکم شعبان (بروایت ابن حبیب) اور بروایت مسعودی ۲ شعبان بیان کی جاتی ہے رہفتہ ۲ شعبان سنہ ۵ سے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوتا ہے ۔
۴۔ اہلِ مقنا کی جعلی دستاویز	ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی مشہور کتاب الوثائق السیاسیہ میں اس دستاویز کا تذکرہ کیا ہے، جو بظاہر جعلی ہے، اس دستاویز پر تاریخ کتابت جمعہ ۳ رمضان سنہ ۵ تحریر ہے۔ یہ تاریخ نہ مکی تقویم پر پوری اُترتی ہے نہ مدنی پر ۔
۵-۶۔ غزوۂ خندق و بنو قریظہ	اِن واقعات کی صحیح تاریخیں محفوظ نہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دستاویزوں میں ان کی کتابت عیز واضح تھی، کتاب میں اُن پر پوری بحث ہے ۔ مزید ملاحظہ فرمائیے بُرہان ستمبر ۶۴ء ۔

غزوۂ ذات الرّقاع

محرم سنہ ۵ ۔ جمادی الاولیٰ سنہ ۵

قتلِ ابورافع سلام بن ابی حقیق کے ذیل میں گذر چکا ہے کہ بنو نضیر نے مدینے سے نکلنے کے بعد گویا بیڑا اُٹھایا تھا کہ اسلامی تحریک کا کُلّیتہً استیصال کر دیا جائے گا، چنانچہ انہیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اواخر سنہ ۴ میں خیبر اور مدینے کے قرب وجوار کے قبائل متحد ہونا شروع ہوئے اور قریش جو سیاسی اعتبار سے بستر مرگ پر آچکے تھے، یہودی مسیحائی سے پھر زندہ ہونے لگے جس کے نتیجے میں سنہ ۵ کا وہ مشہور معرکہ ہوا، جو غزوۂ خندق کے نام سے مشہور ہے لیکن اسی سنہ میں جنگِ خندق سے چند ماہ پہلے دو غزوے اور ہوئے تھے، یعنی غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بنو مصطلق یا مُریسیع ، یہ بھی اسی یہودی تحریک کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

غزوۂ ذات الرقاع کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ اقدام بنو غطفان اور بنو غطفان کی دوسری شاخوں یعنی بنو محارب، بنو ثعلبہ اور انمار وغیرہ کے خلاف تھا جو یہودیانِ بنو نضیر کے بہترین دوست تھے اور خیبر کے بالکل متصل رہتے تھے، خبر آئی تھی کہ یہ قبائل

مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، جس پر پیغمبرِ اسلامؐ نے انھیں منتشر کر دینے کے لیے خود ان کے مساکن تک کوچ فرمایا، ابن سعد کا بیان ہے کہ:

"سو آنحضرتؐ کے اصحاب نے اطلاع دی کہ بنو انمار اور ثعلبہ اپنے لیے جماعتیں فراہم کر رہے ہیں......
سو آپؐ نکلے"......[۱]

ابن سعد نے اسی غزوے کا مہینہ جمادی الاولیٰ ۴ھ بیان کیا ہے، یعنی غزوۂ بنو نضیر سے صرف ڈیڑھ ماہ بعد جیسا کہ عبارت ذیل سے پتہ چلتا ہے:-

"بعد ازاں آنحضرت مدینے میں غزوۂ بنو نضیر کے بعد جو ربیع الآخر اور جمادی الاولیٰ کے ابتدائی حصے کا واقعہ ہے، مقیم رہے، اس کے بعد نجد پر بنی محارب اور بنی ثعلبہ کے ارادے سے لشکر کشی فرمائی، جو غطفان کی شاخیں ہیں"[۲]

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ اور دن زیادہ تفصیل سے متعین کیا ہے۔

اور آنحضرتؐ دو شنبے کے دن ۱۰ جمادی الاولیٰ کو نکلے اور اسی مہینے میں چہار شنبے کے دن واپس تشریف لائے"[۳]

بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے اس کو محرم ۵ھ کا واقعہ قرار دیا ہے جیسا کہ طبقات میں ہے:-

"رسول اللہؐ کی ذات الرقاع پر لشکر کشی محرم میں ہوئی اور آپؐ ہفتے کی رات میں ۱۰ محرم کو نکلے"[۴]

مواہب میں اس اختلاف کی صدائے بازگشت ملاحظہ ہو:

"اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کب کا ہے، ابن اسحٰق کے نزدیک غزوۂ بنو نضیر کے بعد ۴ھ کے ربیع الآخر اور جمادی الاولیٰ کے کچھ حصے میں ہوا، اور ابن سعد اور ابن حبان کی رائے میں محرم ۵ھ کا واقعہ ہے"[۵]

اس ابتدائی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض علمائے نے اس کو غزوۂ بنو قریظہ (۵ھ) سے بھی بعد میں جگہ دی:

"اور ابو معشر کا خیال ہے کہ یہ بنو قریظہ کے بعد کا واقعہ ہے"[۶]

ظاہر ہے کہ یہ جملہ اختلافات اس دستاویزی اختلاف کا نتیجہ ہیں جو سیرت کے ابتدائی مدوّنین کو ملی تھیں چنانچہ ابن سعد اور ابن حبان کی روایت کے بموجب میری مرتبہ جدول میں مکّی محرم کو دیکھیے تو اس کا متوازی مدنی مہینہ جمادی الأخریٰ نظر آتا ہے جو دونوں دستاویزوں کے بالکل مطابق ہے، اور جس کی بنیاد پر ابن اسحٰق کی ترتیبی غلطی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ دونوں دستاویزوں میں یہ واقعہ ۱۰ تاریخ کا بیان کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک راوی کے نزدیک یہ جمادی کی ۱۰ تاریخ تھی اور دوسرے کے نزدیک محرم کی۔!

۱۔ ابن سعد ۲/ ۴۳ - ۲۔ ابن ہشام ۳/ ۲۲۲، نیز دیکھیے ابن سید الناس ۲/ ۵۲ ۳۔ ابن حبیب/ ۱۱۳ ۴۔ ابن سعد ۲/ غزوۂ ذات الرقاع، نیز دیکھیے مسعودی التنبیہ/ ۲۴۸ ۵۔ قسطلانی/ ۱۳۷، ۶۔ ایضاً

ابن حبیب نے ۱۰ رجمادی ا کو دوشنبہ بیان کیا ہے، وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب جمادی ا کی پہلی تاریخ کو یکشنبہ تھا، (مطابق ۲۸ ستمبر ۶۲۶ء) اس حساب سے دوشنبہ ۹ رجمادی کو ہونا چاہیئے، لیکن یہ ایک روزہ اختلاف ناقابلِ التفات ہے۔

ابن سعد کے موجودہ نسخوں میں محرّم کی دسویں تاریخ کو یوم السبت[1] ملتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی کسی ابتدائی ناقل کی ہے جس نے نسخہ کی خرابی کے باعث، یا بدخطی کی وجہ سے "اثنین" کے دندانوں کو "س" کے دندانے سمجھ کر سبت پڑھ لیا، ورنہ از روئے حساب ۱۰ رکو ہفتہ کسی طرح ممکن نہیں۔

سنہ ۶، ۷

	مکّی	جولین	مدنی	
	محرم سنہ ۶	۱۸ ر ستمبر سنہ ۶۲۷ جمعہ	جمادی ا	
	نسی	۱۸ ر اکتوبر یکشنبہ	جمادی ۲	
	صفر	۱۶ ر نومبر دوشنبہ	رجب	
	ربیع ا	۱۶ ر دسمبر چہارشنبہ	شعبان	
	ربیع ۲	۱۴ ر جنوری سنہ ۶۲۸ پنجشنبہ	رمضان	
۱۔ قتل خسرو پرویز۔ بروایت واقدی سہ شنبہ ۱۰ ر جمادی	جمادی ا	۱۳ ر فروری سنہ ۶۲۸ سہ شنبہ	شوال	۱۔ قتل خسرو پرویز ۲۷ ر فروری سنہ ۶۲۸ یورپی تاریخ ۲۔ سریہ کرز بن جابر فہری الی عُرنیین بروایت واقدی
۲۔ سریہ کرز بن جابر فہری بروایت ابن اسحٰق	جمادی ۲	۱۳ ر مارچ یکشنبہ	ذلقیعدہ	۳۔ غزوۂ حدیبیہ، روانگی دوشنبہ یکم ذلقیعدہ بروایت ابن سعد

[1] ابن سعد ۲/۴۳۔

	مکی	جولین	مدنی	
	رجب	۱۲ر اپریل سہ شنبہ	ذوالحجہ	۴ سفارت دحیہ بن خلیفۃ الکلبی اپریل ۶۲۸ء (یورپی تاریخ)
	شعبان	۱۱ر مئی چہار شنبہ	محرم ۷ھ	
	رمضان	۱۰ر جون جمعہ	صفر	
	شوال	۹ر جولائی شنبہ	ربیع ۱	
	ذیقعدہ	۸ر اگست دوشنبہ	ربیع ۲	
غزوۂ ذی قرد بروایت بخاری	ذوالحجہ	۶ر ستمبر سہ شنبہ	جمادی ۱	غزوہ بنولحیان بروایت ابن اسحٰق غزوہ ذی قرد

نوٹ: پچھلے دو کبیسہ سالوں میں لوند کے مہینے آخر سال میں بڑھاتے گئے تھے، اِن سالوں میں شروع میں بڑھائے گئے ہیں،

۶ ، ۷ھ

اس سنہ کے مندرجہ ذیل واقعات سے بحث کی گئی ہے:

۱۔ قتلِ خسرو پرویز اور صلح حدیبیہ | بُرہان میں پوری بحث ملاحظہ فرمائیے۔

۲۔ سریۂ کرز بن جابر فہری | اس واقعہ کی توقیت پر بھی دو تقویمی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی ایک تاریخ جمادی الاخریٰ بیان کی جاتی ہے، دوسری شوال ۶ھ، جدول ۶، ۷ھ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شوال ۶ھ مدنی کا اختتام جمادی الاخریٰ مکی کی ابتداء کے مطابق تھا۔

۴۔ سفارتِ دحیہ بن خلیفۃ الکلبی | اس کی تاریخ یورپی مصنفین کے یہاں بھی محفوظ ہے جو روائتی تاریخ سے مطابقت کرتی ہے۔

۵ ۔ غزوۂ بنو لحیان } کتاب میں تفصیلی بحث ہے۔
۶ ۔ غزوۂ ذی قرد } " " "

صُلح حُدیبیہ

جمادی الاولیٰ ۶ھ ۔ ذیقعدہ ۶ھ

ہجرت کے بعد قریش اور اسلام کی جتنی جنگیں ہوئی تھیں، ان میں ۵ھ تک حملے کی پہل ہمیشہ قریش کے ہاتھ میں رہی۔ مدینے پر پہلا حملہ جمادی ۲ھ مدنی میں کرز بن جابر نے کیا تھا، اس کے بعد ذوالحجہ ۲ھ میں خود ابوسفیان نے مدینے پر لشکرکشی کی، جس کو غزوۂ سویق کہتے ہیں، پھر ۳ھ میں معرکۂ احد ہوا، جس میں بظاہر مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس کے بعد ۴ھ میں ابوسفیان کے چیلنج کی پیش رفت میں بدر موعد کا غزوہ ہوا، ۵ھ میں قریش کے سب سے بڑے حملے کو خندق کے ذریعہ روکا گیا، جس میں قریش اور ان کے اتحادیوں کی پوری طاقت نے کام کیا تھا، لیکن کامیابی نہ ہونے کی وجہ سے ہمتیں پست ہو کر رہ گئیں، خود اعتمادی اور ساکھ ختم ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ پیغمبر اسلام نے اسی وقت پیشین گوئی فرمائی تھی کہ قریش کا یہ آخری حملہ تھا جو ہو چکا[۱]

اب ہر قسم کی پہل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، چنانچہ ۶ھ کے موسم بہار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبلۂ اسلام یعنی کعبے کی زیارت کی جائے، جو ہنوز مشرکین مکہ کے تصرف میں تھا، یہ اقدام ظاہر ہے کہ جتنا سیاسی مصالح پر مبنی تھا، اس سے کہیں زیادہ جرأت مندانہ تھا، اس لیے کہ عین اس زمانے میں جبکہ مکے کے اندر پورے عرب کے مشرکین کا اجتماع ہوتا تھا مٹھی بھر مسلمانوں کی حیثیت ہی کیا تھی۔؟

قریش کو جب آنحضرتؐ کی آمد کا علم ہوا، تو چراغ پا ہو گئے، بے دین مسلمانوں کو حج بیت اللہ کی اجازت ان کے سیاسی مفاد کے خلاف تھی، اور اگرچہ ایام حج اور ایام عمرہ میں وہ رواج اور دستور کے مطابق کسی کو زیارت بیت اللہ سے روکنے کا حق نہ رکھتے تھے[۲]۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کو روکنے کے لیے مضبوط فوجی دستے مقرر کئے گئے جنھوں نے شاہراہیں بند کر دیں، یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ نے عام راستہ ترک کر کے حدیبیہ کا راستہ اختیار کیا[۳]، اور اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کی غرض جنگ نہیں بلکہ محض عمرہ ہے[۴] ساتھ ہی حضرت عثمانؓ کو مکے بھیجا تاکہ وہ اکابر قریش کو ہر طرح مطمئن کر دیں[۵]۔

مگر اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا اور قریش اپنی ہٹ پر اڑے رہے، دریں اثنا یہ خبر اڑ گئی کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے قتل کر ڈالا جس کو سن کر رسول اللہؐ نے مکے پر حملے کا ارادہ کر لیا اور وہ مشہور بیعت لینا شروع کی جس کو تاریخ کی زبان میں "بیعت رضوان" کہا جاتا ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر اگرچہ غلط تھی، تاہم اس بیعت سے بڑے دُوررس نتائج نکلے اور قریش ایک ایسی صلح پر

۱؎ دیار بکری ۱/۴۹۲ ۲؎ MAGRO LIOUTH 345 ۳؎ طبری ۲/۲۷۴. 355
۴؎ طبری ۳/۲۷۴ ۵؎ طبری ۳/۷۷

مجبور ہو گئے، جس کی اُمید نہ تھی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ گفت و شنید کے بعد ایک صلحنامہ مرتب ہوا، جس میں فریقین نے دس سال تک ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کی گارنٹی دی[1] عمرے کے متعلق یہ طے ہوا کہ سالِ آئندہ انہی ایام میں مسلمان زیارت بیت اللہ کے لیے آ سکیں گے اور صرف تین دن میں مناسک ادا کر کے واپس چلے جائیں گے، حدود حرم میں اسلحہ لانے کی اجازت نہ ہو گی[2] ان شرائط کے ساتھ بعض دوسری شرطیں بھی تھیں، جن میں سب سے اہم شرط یہ تھی کہ قبائلِ عرب میں ہر قبیلے کو یہ اختیار ہو گا کہ خواہ وہ مسلمانوں کے وفاق میں داخل ہو، یا قریش کے ساتھ رہے[3] جس کے کھلے معنی یہ تھے، کہ فریقین کے جملہ معاہد قبائل کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل فریق کے تھے۔

ابن اسحٰق اور واقدی دونوں متفق ہیں کہ آنحضرتؐ اس عمرے کے لیے ذیقعدہ ۶ھ میں عازم مکہ ہوئے تھے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ

"اور آنحضرتؐ ذیقعدہ میں عمرے کی نیت سے نکلے، لڑائی کا ارادہ نہ تھا[4]۔"

واقدی فرماتے ہیں:

"اس کے بعد آنحضرتؐ نے ذیقعدہ میں عمرۂ حدیبیہ فرمایا[5]۔"

ابن سعد نے مدینے سے روانگی کا دن اور تاریخ بھی متعین کی ہے:

"اور آپؐ اس کے لیے دوشنبہ کے دن یکم ذیقعدہ کو روانہ ہوئے[6]۔"

وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب یکم ذیقعدہ کو یکشنبہ پڑتا ہے، مگر یہ ایک روزہ تفاوت کوئی اہمیت نہیں رکھتا، ابن حبیب نے یکم ذیقعدہ کو پنجشنبہ بیان کیا ہے[7] جو از روئے حساب غلط ہے۔

محدثین کو بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ذیقعدہ ۶ھ کا ہے، مگر محدثین اور سیرت نگاروں کی اس ہم آہنگی کے باوجود کتب سیرت میں بعض روایات ایسی ملتی ہیں، جن سے چند در چند تاریخی شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

طبری نے ایرانِ قدیم کے ذیل میں عکرمہ کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

"سو اللہ نے کسریٰ کو ہلاک کیا، اور اس کی خبر رسول اللہؐ کے پاس حدیبیہ کے زمانے میں پہنچی تو خود آنحضرتؐ اور آپؐ کے جملہ ساتھی مسرور ہوئے[8]۔"

گویا کسریٰ کا قتل اور صلح حدیبیہ ایک ہی زمانے کی باتیں تھیں، لیکن مؤرخینِ اسلام کے نزدیک کسریٰ کا قتل متفقہ طور پر جمادی الاولیٰ کا قصہ ہے۔ ابن خلدون کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کو اس قتل کی اطلاع بصراحتِ یوم و تاریخ فوراً بذریعہ وحی ہو گئی تھی:

---

[1] ابن سعد ۲/۔ [2] ایضاً [3] ابن سعد ۲/۔ [4] ابن ہشام ۳/۳۲۱، نیز دیکھئے طبری ۲/۔ [5] واقدی /۹، نیز دیکھئے ابن سعد [6] ابن سعد ۲/۶۹، نیز دیکھئے قسطلانی ۱/۱۶۲۔ [7] ابن حبیب/ ۱۱۵ [8] طبری ۲/۱۴۳..........

"فاھلک اللہ کسری وجاء الخبر الی رسول اللہ یوم الحدیبیۃ ففرح ومن معہ۔"

"اور وحی آئی کہ اللہ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا اور اس نے فلاں رات اور فلاں مہینے میں اس کو قتل کر ڈالا یعنی ۱۰ جمادی ۷ھ کو"[1]

واقدی نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ کسریٰ کے قتل کی تاریخ بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

"شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو سہ شنبے کی رات میں ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا، جبکہ چھ گھنٹے گزر چکے تھے"[2]

ان دونوں روایتوں میں ۷ھ تو بالبداہت سہو کتابت معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جب اس قتل کی اطلاع صلح حدیبیہ کے موقع پر ۶ھ میں مکے پہنچ چکی تھی، تو پھر ۷ھ کے کوئی معنی نہیں رہتے[3]، البتہ جمادی الاولیٰ اور ذوالقعدہ میں جو فرق ہے، اس پر غور کرنا ضروری ہے:

اگر واقعی مسلمان مصنفین کے یہاں کسریٰ کے قتل کی تاریخ فرضی نہیں اور یہ واقعہ جمادی الاولیٰ ۶ھ کا ہے جیسا کہ واقدی اور تمام مصنفین بیان کرتے ہیں تو پھر صلح حدیبیہ اسی جمادی الاولیٰ میں یا اس کے متصل ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اطلاع تقریباً چھ سات ماہ بعد مکے پہنچی تھی اور صلح حدیبیہ اور کسریٰ کا قتل ہم زمانہ واقعات نہیں، حالانکہ تمام مؤرخین اسلام یہی تسلیم کرتے چلے آرہے ہیں۔

ابونعیم نے دلائل نبوت میں لکھا ہے کہ رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی زمانے میں شکست ہوئی تھی جس زمانے میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا[4] اور طبری کے بقول جب اس شکست کی اطلاع حدیبیہ پہنچی تو تمام مسلمانوں میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی[5]۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علمائے تاریخ کے نزدیک یہ دونوں واقعات بالکل قریب العہد ہیں اور ان میں چھ سات ماہ کا بُعد نہیں، ان تاریخی شہادتوں کے پیش نظر ہمیں ۶ھ کی دو تقویمی جدول کا امتحان لینا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں وہ کیا رہنمائی کر سکتی ہے؟

۶ھ کی جدول سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکی جمادی الاولیٰ کا متبادل قمری مہینہ شوال ۶ھ تھا جس کے بعد ذیقعدہ آتا ہے، یعنی وہی ذیقعدہ مدنی جس میں تمام سیرت نگاروں کے نزدیک صلح حدیبیہ ہوئی تھی، اس طرح دونوں واقعات بالکل ہم عہد ہو جاتے ہیں اور کسریٰ کا واقعۂ قتل جو نینوا میں جمادی الاولیٰ کے مہینے میں ہوا تھا، اس کی اطلاع جمادی الاخریٰ کے اوائل میں مکے پہنچنا بالکل قدرتی بات ہے۔

اس تقویمی شہادت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسریٰ کے قتل کی روایت مکی تقویم کے بموجب ریکارڈ کی گئی تھی اور صلح حدیبیہ کا

---

[1] ابن خلدون ۲/۴/۲، [2] طبری ۳/۹۱: "قتل شیرویہ اباه کسری لیلة الثلاثاء لعشر لیال مضین من جمادی الاولی من سنة السبع لست ساعات مضت فیها....."[3] چنانچہ واقدی کی اس روایت کو طبری نے بھی ۶ھ کے تحت درج کیا ہے۔ دیکھیئے طبری ۳/۹۱ [4] دلائل/۱۴۴ [5] طبری ۲/۱۴۳

ریکارڈ مدنی تقویم کے مطابق چلا آرہا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں واقدی کی بیان کردہ تاریخ قتل پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، جو لبعض مورخین کے لیے باعثِ[1] شک اور موجبِ طنز[2] دہ بنی ہے، تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ اس روایت کو بھی کوئی تاریخی افادیت ہے یا نہیں؟

واقدی کا بیان ہے کہ یہ واقعہ سہ شنبہ ۱۰ رجمادی الاولیٰ کی ہے، از روئے حساب مکی جمادی الاولیٰ کی پہلی تاریخ سہ شنبہ ۱۳ رفروری ۶۲۸ء کے مطابق تھی، اس حساب سے ۱۰ رجمادی الاولیٰ کو دوشنبہ ۲۲ رفروری ۶۲۸ء ہوگی، لیکن روایت میں چونکہ سہ شنبہ کی صراحت ہے، اس بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ رویتِ قمر ایک دن بعد تسلیم کی گئی تھی اور ۱۰ رجمادی کو سہ شنبہ اور فروری کی ۲۳ تاریخ تھی۔ یورپی مصنفین میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ کس تاریخ کا ہے، گبن (GIBBON)[3] نے کسریٰ کی گرفتاری اور اس کے ساتھ ۱۸ شہزادگان[4] کا بے دردانہ قتل ۲۵ رفروری ۶۲۸ء کا واقعہ ظاہر کیا ہے اور ان کی رائے میں پانچویں دن کسریٰ کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ گویا[5] ۲۹ رفروری کو۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے خود قیصر کے ایک خط کی سند سے تاریخ قتل ۲۷ رفروری ۶۲۸ء بیان کی[6] ہے۔ اگر اس تاریخ کے ساتھ یہ روایت شامل کر دی جائے کہ کسریٰ کا قتل گرفتاری کے پانچویں دن ہوا تھا تو خسرو کی گرفتاری کا واقعہ ٹھیک ۲۳ رفروری ۶۲۸ء کا تسلیم کرنا پڑے گا۔ جو واقدی کی روایت کے بموجب تاریخِ قتل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ واقدی کے رُواۃ نے گرفتاری اور قتل دونوں کو ایک ہی دن کا واقعہ سمجھا، اس طرح واقدی اور یونانی مصنفین کی تاریخوں میں ایک نہایت ہی قریبی تعلق محسوس ہوتا ہے، اور جو فرق رہتا ہے، وہ صرف ذرائع اطلاع کے اختلافات کا قدرتی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے بہر حال عربی روایات کو یونانی مصنفین کی روایات پر یہ تفوق حاصل ہے کہ ان میں اس واقعہ کی تاریخ کے ساتھ دن بھی متعین کیا گیا ہے جو تقویمی حساب سے صحیح آتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں مسلمانوں کے ذرائع اطلاع کس درجہ صحیح تھے

ان مراحل سے گزرنے کے بعد ابھی ایک مسئلہ اور باقی ہے، جو ان سے بھی زیادہ اہم اور قابلِ غور ہے، تمام سیرت کی کتابوں میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حُدیبیہ کا تعلق ایامِ حج یا عمرہ سے تھا، اور اس فریضہ کو ادا کرنے کے لیے قبائلِ عرب جوق در جوق مکے میں جمع ہو رہے تھے، مسلمان بھی اسی غرض کے لیے وہاں پہنچنا چاہتے تھے، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعۂ حُدیبیہ مدنی ذیقعدہ

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک واقدی کی یہ روایت غلط ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "اگر واقدی کی یہ روایت کہ یہ قتل ۱۰ رجمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مان لیا جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں۔" معارف ۱۹۴۲ء

[2] E. GIBBON, DECLINE, VOL III P. 302, MARGOLIOUTH - RISE 367

[3] دیار بکری نے مقتول شہزادگان کی تعداد ۱۷ بیان کی ہے (دیار بکری ۲/ ۶۱)

[4] E. GIBBON - DECLINE - VOL III P. 315 [5] معارف ۱۹۴۲ء نیز دیکھیے روداد ادارۂ معارف اسلامیہ اجلاس دوم ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰۰ (انگریزی حصہ)

میں پیش آیا تھا، جس کا ایامِ حج سے کوئی تعلق نہیں تھا، سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدنی ذیقعدہ میں قبائلِ عرب کا یہاں اجتماع کیسا؟ اس کا جواب بھی دو تقویمی جدول دے گی۔

چنانچہ اُسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۶ھ میں مدنی ذیقعدہ کا متبادل مکی مہینہ جمادی الاُخریٰ تھا، جس کے بعد رجب کا مقدس مہینہ شروع ہوتا ہے جو مکی تقویم کے بموجب "عمرے یا حجِ اصغر" کا مخصوص مہینہ شمار ہوتا تھا[۱] اور ایامِ جاہلیت میں اس مہینے میں بھی ویسا ہی اجتماع اور ہما ہمی ہوتی تھی جیسی ذوالحجہ کے مقدس مہینے میں فرق صرف یہ تھا کہ رجب کے فریضے کو حجِ اصغر یا عمرہ کہا جاتا تھا[۲] اور ذوالحجہ کے فریضہ کو حجِ اکبر بلکہ ایامِ حج یعنی ذوالحجہ میں عربوں کے نزدیک "عمرہ" قطعاً ممنوع تھا[۳] اور اس کو بڑا گناہ سمجھتے تھے، حتیٰ کہ ۱۰ھ تک تنسیخِ تقویم کے بعد بھی (حجۃ الوداع کے موقع پر) جب آنحضرت ؐ نے حج کے ساتھ عمرے کا حکم دیا تو خود مسلمانوں پر یہ بات گراں گزری تھی[۴] اس لیے یہ بات قابلِ قیاس نہیں کہ خاص ایامِ حج میں آپؐ نے عمرے کا اعلان فرمایا ہو، بالخصوص اس حالت میں کہ آپ یہ صلح آشتی اور پُرامن طریقے پر یہ مراسم ادا کرنا چاہتے تھے۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ؐ حدیبیہ کے موقع پر عمرے ہی کے لیے تشریف لائے تھے، اور عمرے ہی کا احرام باندھا تھا، حج کی کوئی نیت نہ تھی، اس بات کی تصدیق مزید حضرت عبداللہ ؓ بن عمر ؓ کی مندرجہ ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:-

> "ابن عمر ؓ سے روایت ہے اُن سے دریافت کیا گیا کہ آنحضرت ؐ نے کتنے عمرے فرمائے؟ جواب دیا چار، جن میں سے ایک رجب کے مہینے ہی تھا (احدٰھنّ فی رجب) سوال کرنے والا کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے حضرت عائشہ ؓ سے دریافت کیا کہ اے اُمّ المومنین! کیا آپ نے نہیں سُنا کہ ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن عمر ؓ) کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ؐ نے جو عمرے کئے ان میں ایک رجب میں تھا، وہ بولیں، کہ ابوعبدالرحمٰن پر خدا رحم کرے، آنحضرت ؐ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا، جس میں خود عبداللہ موجود نہ ہوں، اور آنحضرت ؐ نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا[۵]۔"

عبداللہ بن عمر ؓ کے اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک آنحضرت ؐ نے کم سے کم ایک عمرہ رجب میں کیا تھا، جس میں بقول حضرت عائشہ ؓ عبداللہ بھی شریک تھے، اور ان کو شاہدِ عینی کا مرتبہ حاصل تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، روایات سے آنحضرت ؐ کے کل چار عمرے ثابت ہوتے ہیں۔ جن میں ایک تو یہی عمرۂ حدیبیہ ہے، دوسرا عمرۃ القضا جو ٹھیک انھیں ایام میں ۷ھ میں ادا فرمایا تھا، تیسرا فتح مکہ کے بعد عمرۂ جعرانہ کے نام سے مشہور ہے جو متفقہ طور پر

---

[۱] طبری ۳/۱۵۷۔ [۲] ...بل للعمرۃ شھر رابع من الاشھر الحرم ھو رجب اکبر الاشھر الحرم فی الحرمۃ" نیز دیکھئے طبری ۳/۱۵۷ [۳] ابن عباس کہتے ہیں "کانوا یرون ان العمرۃ فی اشھر الحج من افجر الفجور فی الارض" (بخاری ابواب الحج، مسند نیز دیکھئے بیہقی، سنن، ۴/۳۴۵ (باب العمرہ) [۴] بخاری حجۃ الوداع۔ [۵] بخاری تجرید ابواب العمرہ۔ نیز دیکھئے طبری ۳/۱۷۴۔

ذیقعدہ کا واقعہ ہے اور چوتھا عمرہ حجۃ الوداع کے ساتھ ادا فرمایا تھا۔

ظاہر ہے کہ ان چاروں عمروں میں دو عمرے یعنی عمرۂ جعرانہ اور عمرۂ حجۃ الوداع تو رجب میں ہو نہیں سکتے، اس لیے یا تو عمرۂ حدیبیہ رجب میں ہوگا یا عمرۃ القضا جس کے لیے آنحضرتؐ حسبِ معاہدہ ٹھیک اُن ہی ایّام میں عازم مکّہ ہوئے تھے جن میں عہد نامہ حدیبیہ ہوا تھا۔

میری رائے میں عمرۂ حدیبیہ تو رجب شروع ہونے سے کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے لیکن عمرۃ القضا ٹھیک رجب میں ادا کیا گیا تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ نے جو اس کے رجب میں ہونے سے انکار کیا ہے، اس کی وجہ بھی مکّی اور مدنی تقویم کا فرق معلوم ہوتا ہے جس کو انھوں نے نظر انداز فرما دیا۔

نوٹ :۔ بعض علمائے تاریخ کا بیان ہے کہ صلح حدیبیہ کے سال ایک سُورج گرہن بھی ہوا تھا مگر افسوس ہے کہ اس کا صحیح مہینہ محفوظ نہیں تاکہ اس روایت کی جانچ کی جا سکتی، البتہ اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ گرہن شاید واقعۂ حدیبیہ کے بعد ہوا تھا۔ کننگھم CUNNIGHAM نے ۱۰ راپریل ۶۲۸ء کو ایک سُورج گرہن کا پتہ دیا ہے۔ مگر معلوم نہیں کہ یہ حجاز میں نظر آ سکتا تھا یا نہیں، علمائے ہیئت غور فرمائیں۔

(۶)

سنہ ۷،۸

	مکّی	جولین	مدنی	
۱۔ غزوۂ خیبر بروایت ابن اسحٰق ۲۔ وادی القریٰ	سنہ ۷ محرم ۳	۶ راکتوبر ۶۲۸ء پنجشنبہ	جمادی ۲	غزوۂ خیبر بروایت واقدی ۳۔ سریہ زید بن حارثہ بجانب حسمٰی
	صفر	۴ رنومبر جمعہ	رجب	
	ربیع ۱	۴ ردسمبر یکشنبہ	شعبان	
	ربیع ۲	۲ رجنوری ۶۲۹ء دوشنبہ	رمضان	
	جمادی ۱	یکم فروری چہارشنبہ	شوّال	

مکّی	جولین	مدنی	
جمادیٰ۲	۲ر مارچ، پنجشنبہ	ذلیقعدہ	عمرۃ القضا
رجب	۱ر اپریل، شنبہ	ذوالحجہ	دوشنبہ ۶ر ذلیقعدہ
شعبان	یکم رمئی، دوشنبہ	محرم ۸ سنہ	
رمضان	۳۱ر مئی، چہارشنبہ	صفر	
شوال	۲۹ر جون پنجشنبہ	ربیع۱	
ذلیقعدہ	۲۹ر جولائی، شنبہ	ربیع۲	
ذوالحجہ	۲۷ر اگست، یکشنبہ	جمادیٰ۱	غزوۂ موتہ

سنہ ۷، ۸

۱۔ غزوۂ خیبر | برہان میں اس کی توقیت پر غور کیا جارہا ہے۔

۲۔ سریہ زید بن حارثہ | بجانب حسمیٰ: اس واقعے کے متعلق واقدی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ جمادی الاخریٰ سنہ ۶ کا واقعہ ہے مگر غالباً اس کا تعلق سنہ ۷ سے ہے۔ کتاب میں اس کے وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

۳۔ عمرۃ القضا | اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ذیقعدہ سنہ ۷ کا واقعہ ہے، ابن حبیب نے اس کی تاریخ روانگی دوشنبہ ۶ر ذلیقعدہ سنہ بیان کی ہے جس میں صرف ایک روز کا فرق محسوس ہوتا ہے، کیونکہ موسمی صراحت کے اعتبار سے یہ ایّام گرما کا واقعہ تھا، مدنی تقویم کے بموجب جمادی الاولیٰ اگست ستمبر سنہ ۶۲۹ء سے مطابق ہوتا ہے۔

غزوۂ خیبر

محرم سنہ ۷ – جمادی سنہ ۷

صلح حُدیبیہ کے بعد قریش کا فتنہ تو اس حد تک دب گیا تھا، لیکن یہودی سازشیں برابر جاری تھیں، مدینے سے جلا وطنی کے بعد بنو نضیر کے یہودیوں کی بڑی تعداد اگرچہ شام چلی گئی تھی، لیکن تمام سربرآوردہ خاندان خیبر ہی میں رہ پڑے

بھتے[1] جہاں سے ان کی فتنہ پردازیاں ہنوز جاری تھیں، جنگِ خندق کا باعث یہی رؤسائے بنونضیر تھے، جنھوں نے ایک طرح اس پوری مہم کا انصرام کیا تھا[2] اور اسلام کے خلاف نہ صرف بنو غطفان اور بنو سلیم کو قریش کے دوش بدوش لا کھڑا کیا تھا، بلکہ دوسرے قبائلِ عرب میں بھی ایک حرکت پیدا کر دی تھی۔ بنو غطفان جوان کے پرانے اتحادی تھے، ان کے اشارے سے مسلسل مسلمانوں کے خلاف اقدام کرتے رہتے تھے، چنانچہ غزوہ خیبر سے صرف تین دن پہلے غطفانیوں نے مدینے کی چراگاہ پر حملہ کیا تھا[3]

علاوہ ازیں سیاسی طور پر عرب کی یہ چھوٹی چھوٹی آزاد شہری مملکتیں CITY STATES ہر بڑی سلطنت کے قیام کے راستے میں ایک سنگِ گراں کا حکم رکھتی تھیں جن کو آہستہ آہستہ ہٹا دینا ضروری تھا، اگر دیکھا جائے تو اس سے عرب کی قدیم اور روایتی لامرکزیت اور آزادی تو ختم ہوتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ایک عظیم بین الاقوامی مملکت کا تصور بھی پیدا ہوتا تھا، جو اسلام کی ان تمام مساعی کا انعام تھا، اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جوں ہی پیغمبرِ اسلامؐ کو قریش سے تھوڑی سی فرصت ملی، اسلام کی قوتِ عمل کا رُخ جنوب سے شمال کو ہو گیا، اس کا پہلا ظہور غزوۂ خیبر اور وادی القریٰ کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں اور دوسرا موتہ اور تبوک کی مہمات کی شکل میں جو روم کی عظیم سلطنت کے خلاف ابتدائی اقدامات کہے جا سکتے ہیں اور جہاں سے زوالِ روم کی داستان کی ابتداء ہوتی ہے۔

بہر حال آخر سنہ ۶ یا ابتدائے سنہ ۷ میں عین اس وقت جبکہ یہودیوں کے اتحادی بنو غطفان نے مدینے کی نواح پر حملہ کیا تھا، مسلمان فوجیں خیبر کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

غزوہ خیبر کی تاریخوں میں بھی ویسا ہی اختلاف ہے جیسا دوسرے غزووں کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں اور جو قطعی طور پر دو دستاویزی کارفرمائی کا نتیجہ ہے، امام مالکؒ کے نزدیک یہ واقعہ آخر سنہ ۶ کا ہے، جس کی تائید میں ابن حزم کا قول ملتا ہے۔ ابن اسحٰق نے اس کو محرم یعنی شروع سنہ ۷ کا واقعہ قرار دیا ہے[4] لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ جس واقعہ کی ابتداء آخر سنہ ۶ میں ہوئی ہو، وہ سنہ ۷ کے آغاز تک جاری رہ سکتا ہے، چنانچہ طبری نے اس غزوہ کا تذکرہ کیا تو ان الفاظ میں:-

"بعد ازاں آنحضرتؐ آخر سنہ ۶ میں محرم کے بقیہ مہینے میں خیبر پر فوج کشی کے لیے نکلے[5]۔"

جو بظاہر امام مالکؒ اور ابن اسحٰق کی تصریحات کا آمیزہ معلوم ہوتے ہیں، بہر حال اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ اس غزوے کی ابتداً سنہ ۶ میں ہو گئی تھی جس کی تکمیل ابن اسحٰق کے قول کے بموجب محرم بلکہ صفر سنہ ۷ میں ہوئی، اس خیال کی تصدیق کہ اس مہم کا آغاز ذوالحجہ میں ہو گیا تھا، بخاری کی تصریحات سے بھی ہوتی ہے، جس کو میں ابھی پیش کروں گا، بہر صورت امام مالکؒ، ابن حزم، ابن اسحٰق اور ان کے بعد ان کے جملہ متعلقین کے نزدیک غزوۂ خیبر کا زمانہ آخر سنہ ۶ یا اوائل سنہ ۷ ہے، گویا بالفاظِ دیگر ذوالحجّہ سنہ ۶ یا محرم سنہ ۷ میں یہ مہم شروع ہو گئی تھی، بخلاف اس کے واقدی اور ابن سعد نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ جمادی الاولیٰ سنہ ۷ کا ہے[6] گویا سنہ ۷ کے تقریباً وسط کا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس غزوے کے متعلق بھی دو ابتدائی دستاویزیں موجود تھیں جن میں سے ایک امام مالکؒ اور

---

[1] طبری ۳/ ۳۸ - ابن ہشام ۳/ ۲۰۱، البدایہ ۴/ ۷۶ [2] طبری ۳/ ۷ [3] دیکھیے بخاری باب غزوہ ذی قرد [4] ابن ہشام ۳/ ۳۴۲ [5] طبری ۳/ ۹۱ [6] واقدی / ۴۔

ابن اسحٰق کا ماخذ تھی، اور دوسری واقدی کا۔

واقدی کے نزدیک غزوۂ خیبر، صلح حدیبیہ سے تقریباً چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے، جو تاریخی طور پر درست معلوم ہوتا ہے، بخلاف اس کے ابن اسحٰق کے نزدیک یہ واقعہ حُدیبیہ سے صرف ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد کا ہے، جس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کو اس غزوے کی تاریخ "محرم ۷ھ" پہنچی تھی۔ حدیبیہ ذیقعدہ ۶ھ کا واقعہ ہے، اس بنا پر اصولاً ان کو یہی نتیجہ نکالنا تھا، حالانکہ دو تقویمی نقطۂ نظر سے واقدی اور ابن اسحٰق کی روایتوں (یعنی محرم اور جمادی) میں کوئی فرق یا بُعد نہیں۔

جدولِ تقویم پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۶ھ میں مکی ذوالحجہ اور مدنی جمادی الاوّل دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اور ان دونوں کی ابتداء ۶ ستمبر ۶۲۸ء کو ہوئی تھی، اس بنا پر ان دونوں ائمۂ سیرت کی دستاویزیں ایک ہی زمانے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، بلکہ واقدی کے بیان سے ابن اسحٰق کی اتنی تائید نہیں ہوتی جتنی امام مالکؒ کے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ واقعہ آخر ۶ھ کا ہے۔

اوپر گذر چکا ہے[1] کہ خود ابن اسحٰق نے غزوۂ ذی قرد کو "جمادی الاولیٰ" کا واقعہ بیان کیا ہے، جس کے متعلق بخاریؒ کی صراحت یہ ہے کہ:-

"یہ وہ غزوہ ہے جو خیبر سے تین دن پہلے آنحضرتؐ کی اُونٹنیوں کو لُوٹنے کے سلسلہ میں ہوا تھا[2]"

یہ گویا ابن اسحٰق کی طرف سے واقدی کی ایک طرح تائید ہے، کہ غزوۂ خیبر کا تعلق بھی جمادی سے تھا، قطع نظر اس سے خود موسمی اور واقعاتی شہادتیں بھی اس بات کے حق میں ہیں کہ غزوۂ خیبر صلح حُدیبیہ (ذیقعدہ مطابق مارچ، اپریل) سے بہت بعد کا واقعہ ہے۔

تقریباً تمام سیرت کی کتابوں میں یہ روایتیں موجود ہیں کہ فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ ہزارہا من خشک کھجوروں کے ذخائر لگے تھے[3]۔ علاوہ ازیں آنحضرتؐ نے حضرت صفیہ سے نکاح فرمایا تو اس کی دعوتِ ولیمہ میں حاضرین کے سامنے خشک کھجوریں (تمر) گھی اور پنیر پیش کیا گیا، خیبر کی سب سے قیمتی اور لذیذ پیداوار یہی کھجوریں تھیں جن کو گھی اور پنیر کے ساتھ ایک چمڑے کے دسترخوان پر ڈال دیا گیا تھا اور لوگ سیر ہو کر کھا رہے تھے[4]۔ اس سے قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ فتح خیبر کے زمانے میں کھجوروں کی فصل تھی اور یہ میوہ بہ افراط دستیاب ہو سکتا تھا، حجاز میں خشک کھجور کا موسم ستمبر و اکتوبر ہے، جو ۷ھ میں مکی محرم اور مدنی جمادی کے بالکل مطابق تھا، چونکہ ان کھجوروں کے ساتھ گھی اور پنیر بھی پیش کیا گیا تھا جو صرف خشک کھجوروں کے ساتھ کھایا جاتا ہے، اس بنا پر ان کو تازہ، نورس یا گدّر کھجوریں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ابن اسحٰق کی اس بات کو اگر مان لیا جائے کہ غزوۂ خیبر صلح حدیبیہ کے متصل ہوا تھا، تو یہ دعوتِ ولیمہ مئی جون میں ہونا چاہیئے جو تازہ اور گدّر کھجوروں کا زمانہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس غزوے میں دحیہ بن خلیفۃ الکلبی کی موجودگی ثابت ہے جن کو آنحضرتؐ نے اپریل ۶۲۸ء میں قیصر کے پاس سفارت پر بھیجا تھا، جہاں وہ کچھ عرصے قیصر کے انتظار میں رہے اور جب قیصر سے ملاقات ہو گئی تو واپس آئے،

---

[1] یہ اشارہ ہے غزوۂ بنو لحیان کی طرف جو اصل کتاب میں صراحت کے ساتھ لکھا گیا۔ [2] بخاری باب غزوۂ ذی قرد۔ [3] ابن ہشام ۳/۳۶۳۔ [4] طبری ۳/۔

اس لیے ظاہر ہے کہ یہ واقعہ مئی جون کا نہیں ہو سکتا۔

سنہ ۸، ۹

	مکی	جولین	مدنی
	محرم سنہ ۸	۲۶ ستمبر ۶۲۹ سنہ سہ شنبہ	جمادی ۲
	صفر	۲۵ اکتوبر چہارشنبہ	رجب
	ربیع ۱	۲۴ نومبر جمعہ	شعبان
	ربیع ۲	۲۳ دسمبر شنبہ	رمضان
	جمادی ۱	۲۲ جنوری ۶۳۰ سنہ دوشنبہ	شوال
۱۔ سریہ عمرو بن عاص ذاتِ سلاسل	جمادی ۲	۲۰ فروری سہ شنبہ	ذیقعدہ
	رجب	۲۳ مارچ پنجشنبہ	ذوالحجہ
	شعبان	۲۰ اپریل جمعہ	محرم سنہ ۹
۲۔ فتح مکہ روانگی چہارشنبہ ۱۰ رمضان (ابن سعد) فتح مکہ جمعہ ۲۰ رمضان	رمضان[1]	۲۰ مئی یکشنبہ	صفر
۳۔ غزوۂ حنین شنبہ ۶ شوال ۴۔ غزوۂ طائف	شوال	۱۸ جون دوشنبہ	ربیع ۱
عمرۃ الجعرانہ۔ تاریخیں غلط	ذیقعدہ	۱۸ جولائی چہارشنبہ	ربیع ۲
	ذوالحجہ	۱۶ اگست پنجشنبہ	جمادی ۱

[1] فتحِ مکہ کے زمانے تک رمضان موسمِ گرما ہی میں آ رہا تھا، یعنی مکی تقویم کے مطابق تھا۔

سنہ ۸، ۹

کتاب میں ۸، ۹ھ کے مندرجہ ذیل واقعات پیش کئے گئے ہیں :-

۱۔ سریۂ عمرو بن عاص، ذاتِ سلاسل | اس سریہ کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ جمادی الآخری ۸ھ میں غزوۂ موتہ کے بعد شام کے سرحدی علاقے کی طرف روانہ کیا گیا تھا جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ موتہ سے صرف ایک ماہ بعد کا واقعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سریہ غزوۂ موتہ سے تقریباً چھ ماہ بعد مکی جمادی الاخریٰ میں روانہ کیا گیا تھا، کیونکہ اس سریہ کے زمانے میں اس بلا کی سردی تھی کہ ایک بار عمرو بن عاص صبح کو غسل تک نہ کر سکے تھے، مکی جمادی الاخریٰ فروری ۶۳۰ء کو شروع ہوا تھا۔

۲۔ فتح مکہ | اس پر تفصیلی بحث ترجمان میں ملاحظہ ہو۔

۳۔ غزوۂ حنین | ابن سعد نے اس غزوے کی تاریخ روانگی ہفتہ ۶ شوال ۸ھ بیان کی ہے۔ جو مکی تقویم کے بموجب بالکل صحیح بیٹھتی ہے، اس غزوے کا موسم بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔

۴۔ غزوۂ طائف | یہ واقعہ حنین کے فوراً بعد کا ہے۔

۵۔ عمرۂ جعرانہ | ابن سعد نے اس واقعے کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ نہ مکی تقویم پر پوری اُترتی ہے نہ مدنی پر معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخینِ اسلام کو کہیں سخت دھوکا ہوا ہے۔ کتاب میں اس پر بحث کی گئی ہے۔

فتح مکہ

(رمضان ۸ھ مکی)

فتح خیبر اور انضمام فدک و وادی القریٰ کے بعد اسلامی ریاست کی سیاسی برتری کے آثار واضح ہو چکے تھے اور اس کے مادی اور روحانی اثرات کا یہ عالم تھا کہ قیصر و کسریٰ کی سرحدیں خطرے میں پڑ چکی تھیں، گردوپیش کے تقریباً تمام قبائل نے اسلامی فوقیت تسلیم کر لی تھی اور خود بخود اسلامی وفاق میں داخل ہوتے چلے جا رہے تھے، خود قریش کا سمجھ دار طبقہ مائل بہ اسلام تھا چنانچہ خالد بن ولید اور عمرو بن عاص جیسے شمشیر زن اور مدبر مدینے پہنچ چکے تھے۔

مکے کی ”نیم مذہبی حکومت“ روز بروز مائل بزوال تھی، اور اہلِ مکہ خوف، مایوسی اور تذبذب کی اذیتوں میں مبتلا تھے جس کو مسلمانوں کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر ۸ھ میں مسلمان فوجیں مکے میں داخل نہ ہو جاتیں، تو جلد یا بدیر اہلِ مکہ طائف والوں کی طرح خود درخواستِ انضمام پیش کرتے، جنھوں نے ۹ھ میں بخوشی اپنی قسمتوں کو اسلام کے حوالے کر دیا تھا۔ بہرحال مورخین

فتح مکہ کی جو وجہ بیان کرتے ہیں، وہ یہ ہے :

معاہدۂ حدیبیہ کی رُو سے تمام قبائلِ عرب کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ حسب پسند "اسلامی وفاق" میں داخل ہو جائیں یا قریش کے ساتھ رہیں، جس کے نتیجے میں بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تھے اور بنو بکر نے قریش کی دوستی کو ترجیح دی تھی، ان دونوں قبائل میں پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی، جو اسلامی جنگوں کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے دب گئی تھی، صلح حدیبیہ کے بعد جب کچھ امن ہوا تو شنہ کے وسط میں یہ دشمنی پھر اُبھری اور جھگڑے شروع ہو گئے، جس میں قریش نے اسلحہ اور جنگی سازو سامان دے کر بنو بکر کی حمایت کی اور بہت سے قریشی نوجوانوں نے رضاکارانہ[۱] جنگ میں حصہ لیا، خزاعہ چونکہ اسلام کے اتحادی تھے۔ اور ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمے تھی۔ اس لیے حدیبیہ کا معاہدہ خود بخود ٹوٹ گیا اور مدینے سے اعلان کر دیا گیا کہ اب اس معاہدے کی کوئی قیمت نہیں، قریش کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے ابوسفیان کو تجدیدِ معاہدہ کے لیے مدینے بھیجا، مگر یہ مشن کامیاب نہ ہو سکا۔[۲]

معاہدۂ حدیبیہ کی شکست غالباً اوائلِ رمضان شنہ میں ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات میں اس کی صدائے بازگشت موجود ہے :۔

"اعلان براۃ ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان لوگوں کے لیے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا، سو چار مہینے ملک میں چلو پھرو، اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور اللہ منکرین کو رسوا کرنا ہے۔"[۳]

علمائے اسلام میں اختلاف ہے کہ یہ چار مہینے کون سے ہیں، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہاں رمضان شنہ سے لے کر ذو الحجہ شنہ تک کا زمانہ مراد ہے، اس لیے کہ اس سال حج باوجود اسلامی استیلاء کے مشرکین ہی کی زیر نگرانی ہوا تھا اور اس میں وہ تمام مراسم ادا ہوئے تھے، جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، مشرکین کا یہ آخری حج تھا۔ اس کے بعد پھر انھیں یہ اجازت نہ تھی کہ وہ داخلِ حرم ہو سکیں۔

"اور یہ شک مشرک ناپاک ہیں، تو یہ لوگ اپنے اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے اندر نہ جائیں۔"[۴]

اس آیت میں الفاظ "اپنے اس سال کے بعد (بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا) خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مہلت سالِ رواں کے اختتام تک کے لیے تھی، مکے پر فوج کشی رمضان میں ہوئی تھی اور اس رمضان سے چار ماہ بعد سال ختم ہو رہا تھا، اس لیے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں جو چار ماہ کی اجازت مذکور ہے اس سے کون سا زمانہ مراد ہے۔ نیز یہ کہ مکے پر حملہ "مکی" رمضان میں ہوا تھا۔

---

[۱] طبری ۳/۱۱۱۔ ابن ہشام ۴/۳۲۔ نیز دیکھیے ابن سعد ۲/۹۷ [۲] ابن ہشام ۴/۳۸۔ ابن سعد ۲/۹۷ [۳] ۹ : ۱، ۲، میرا گمان ہے کہ یہ آیات فتحِ مکہ سے پہلے نازل ہو چکی تھیں جن میں معاہدۂ حدیبیہ کی شکست کا اعلان تھا، کیونکہ اس معاہدے کو توڑے بغیر مکے کے خلاف کسی قسم کی فوجی کارروائی ممکن نہ تھی۔ [۴] ۹ : ۲۹ ۔

سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ ۱۰ رمضان شنبہ کو جبکہ ہر مسلمان سپاہی روزہ دار تھا، مسلمانوں کی تقریباً دس ہزار فوج مدینے سے نکلی اور عازم مکہ ہوئی، ابن اسحٰق کا بیان ہے :

"اور آنحضرتؐ ۱۰ رمضان کو نکلے، تو آپؐ کا روزہ تھا، اور آپؐ کے ساتھ سب ساتھیوں کے روزے تھے، یہاں تک کہ "کدید" پہنچے، جو عسفان اور "امج" کے درمیان ہے[۱]۔"

یہ فوج جب مکے میں داخل ہونے والی تھی تو مکے کے رئیس ابوسفیان نے جو عملی طور پر اس وقت پورے شہر کے واحد سربراہ تھے، اسلامی تفوق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا[۲] اور اس طرح بلا کسی باضابطہ مزاحمت کے مشرکین عرب کا یہ سب سے بڑا قلعہ مسخر ہو گیا[۳]۔

فوجوں کے داخلے سے پہلے اعلان کر دیا گیا تھا کہ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے یا خود اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے، اس کو امن ہے[۴]۔

کسی شخص پر یہ پابندی نہ تھی کہ فوراً تبدیلِ مذہب کرے، صفوان بن اُمیّہ کے سامنے جو ابوسفیان کے وزیر کا مرتبہ رکھتے تھے، جب اسلام پیش کیا گیا تو انھوں نے غور و فکر کے لیے مہلت مانگی، آپؐ نے فرمایا "چار ماہ[۵]" یعنی وہی پورے سالِ رواں کی مہلت جو سب کو دی گئی تھی۔

کعبے کے اندر جو اوثان تھے، نکال دیئے گئے۔ باہر جو (۳۶۰) مورتیاں تھیں، توڑ ڈالی گئیں[۶] لیکن باوجود اس کے کعبے کی تولیت اور حج کا انتظام حسبِ اعلان، مشرکین کے ہاتھ میں بجنسہٖ رہا، چنانچہ مورخین کہتے ہیں کہ اس سال حج پرانے مراسم ہی کے ساتھ ادا ہوا، طبری میں ہے :

"اور اس سال حج ان مراسم پر ہوا جن پر عرب کرتے چلے آئے تھے[۷]۔"

---

[۱] ابن ہشام ۳/۴۳ - نیز دیکھئے ابن سعد ۲/۹۷، طبری ۳/۱۱۴ [۲] ابن ہشام ۴/۴۲، ۴۳، ۴۴ - ابن سعد ۲/۹۸، طبری ۳/۱۱۶ [۳] اہلِ مکّہ اگر چاہتے تو مدافعت ممکن تھی اور مسلمان ایک طویل عرصے شہر میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، مکّے کے گرد اگرچہ فصیل نہ تھی، لیکن اس کے چو طرفہ چھوٹی بڑی پہاڑیاں کچھ اس طرح واقع ہیں کہ شہر ایک قلعہ بند وادی بن گیا ہے اور یہ پہاڑیاں فصیلِ شہر کا کام دیتی ہیں جن سے مدافعین ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے رہے ہے۔

تاریخ میں اس شہر کے تین محاصرے، بہت مشہور ہیں، پہلا محاصرہ ظہورِ اسلام سے پہلے ابرہہ نے کیا تھا، جو ناکام رہا۔ دوسرا محاصرہ یزید بن ابی سفیان کے زمانے میں حصین بن نمیر نے کیا تھا، جو لگاتار چھ مہینے جاری رہا اور بالآخر کامیابی نہ ہو سکی، تیسرا محاصرہ عبدالملک کے زمانے میں حجاج بن یوسف نے کیا، یہ بھی چھ مہینے جاری رہا اور شامی سپاہ بدقت کامیاب ہو سکی، یہ تینوں محاصرے اعلیٰ ترین فوج نے بہترین اسلحہ کے ساتھ کئے تھے جن میں سے کم از کم آخری دو محاصروں میں مشینی اسلحہ یعنی منجنیقوں وغیرہ کا آزادانہ استعمال تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ فتح پیغمبرِ اسلامؐ کی اعلیٰ حکمتِ عملی، معاملہ فہمی، تالیفِ قلوب اور حالات کو اپنی موافقت میں تبدیل کر لینے کی عمدہ ترین صلاحیتوں کا نتیجہ تھی جس نے مکّے کو بلا کسی شدید خوں ریزی کے ایک ہی دن میں ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ [۴] طبری ۳/۱۱۶ [۵] بیہقی سنن ۹/۱۱۸ [۶] ابن ہشام ۴/۶۰ [۶] ابن ہشام ۴/۵۵، ۵۹، دیار بکری ۲/۸۵، ۸۶ [۷] طبری ۳/۱۳۹

معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری موسم حج تھا، جس میں بنو فقیم کے سردار نے مقام حجر پر کھڑے ہو کر اعلانِ نسی" کیا اور آنے والے محرم کے بعد صفر اور محرم کے درمیان ایک نسی کا مہینہ بڑھا کر پرانی رسموں کو آخری بار ادا کیا تھا،

ابن اسحٰق، واقدی، اور دوسرے مصنفین اس غزوہ پر روانگی کی تاریخ ۱۰ رمضان سشنبہ بیان کرتے ہیں، ابن اسحٰق کا بیان اوپر گذر چکا ہے:

ابن سعد کے بیان کے موجب اس روز چہار شنبہ تھا، طبقات میں ہے:

"اور رسول اللہؐ چہار شنبہ کے دن دس رمضان کو عصر کے بعد روانہ ہوئے[1]"

وستنفیلڈ کی قمری تقویم کے بموجب ۱۰ رمضان سشنبہ کو بجائے چہار شنبے کے دوشنبہ آتا ہے، جو روایات سے مطابقت نہیں کرتا، جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ رمضان قمری نہیں تھا، بلکہ مکی رمضان تھا، چنانچہ مکی رمضان یکشنبہ ۲ مئی ۶۳۰ء کو شروع ہوا تھا جس کے حساب سے ۱۰ کو سشنبہ آتا ہے، گویا ایک دن کا فرق جو قابلِ لحاظ نہیں، یہ مدینے سے روانگی کی تاریخ تھی، مگر ابن سعد نے تسخیرِ مکہ کی تاریخ بھی بیان کی ہے جو مکی تقویم کے اعتبار سے قطعاً صحیح ثابت ہوتی ہے۔ طبقات میں ہے:

"اور مکہ جمعے کے دن ۲۰ رمضان کو فتح ہوا، اور رسول اللہؐ نے وہاں پندرہ دن قیام فرمایا[2]"

ابن اسحٰق نے بھی یہی تاریخ بیان کی ہے مگر اس میں جمعہ کا دن مذکور نہیں[3] بہر صورت یہ تاریخ قطعاً درست ہے، کیونکہ یکم رمضان کو یکشنبہ ہو گا، تو ۲۰ کو جمعہ ہونا یقینی ہے، اس پر اتنا اضافہ اور کیجئے، کہ ابن سعد وغیرہ نے مکے میں قیام کی مدت پندرہ دن بیان کی ہے جس کے حساب سے آنحضرتؐ کو ۶ شوال ہفتے کے دن غزوۂ حنین کے لیے نکلنا چاہیئے، چنانچہ مورخین نے حنین کو روانگی کی تاریخ یہی بیان کی ہے[4] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جملہ تاریخیں پوری احتیاط کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں اور سب کی سب مکی تقویم کے اعتبار سے ریکارڈ کی گئی ہیں، اب ہمیں اس غزوے کے موسم پر نظر ڈالنا چاہیئے۔

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان فوجیں جب مدینے سے نکلی تھیں، تو روزہ دار تھیں، اور آنحضرتؐ نے مقام کدید یا قدید پر پہنچ کر افطار فرمایا تھا، اس کے کھلے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں میں دینی طور پر ہنوز مکی تقویم رائج تھی، اور اس کے مطابق فرائضِ مذہبی انجام پاتے تھے، اس بنا پر میرے نزدیک میور (Muir) اور دوسرے مستشرقین کا یہ خیال درست نہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں رمضان کا مہینہ ہمیشہ موسم سرما ہی میں آتا تھا[5] جس کی تائید میں ان کے پاس کوئی دستاویزی شہادت نہیں، بخلاف اس کے کتبِ سیرتؐ و احادیث

---

[1] ابن سعد ۲/۹۷ - [2] ابن سعد ۲/۹۹، نیز دیکھیے دیار بکری ۲/۸۷ [3] ابن ہشام ۴/۸۰ [4] ابن سعد ۲/۱۲۱ [5] میور کی اصل عبارت ملاحظہ ہو:-

IT WAS WINTER WHEN THE FAST WAS ORDAINED AND MOHAMMED PROBABLY THEN CONTEMPLATED ITS BEMG ABUAYS KEPT IN THE SAME SEASON IN WHICH CASE THE PROHIBTION TO EAT OR DRINK DURING THE DAY WOULD NOT EVEN FOR A MONTH, HAVE INVOLVED ANY EXTREME HARDSHIP. IN COURSE OF TIME, HOWEVER.

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ نمبر ۱۹۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

میں متعدد روایتیں ایسی موجود ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہِ صیام ہمیشہ موسمِ گرما میں آتا، مستدرک حاکم میں حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نمازِ مغرب سے پہلے "رطب" (یعنی نو رس کھجوروں) سے افطار فرماتے تھے، اگر "رطب" نہ ملتیں تو پھر "تمر" (یعنی خشک کھجوروں) سے، اور اگر یہ بھی میسّر نہ ہوتیں تو صرف پانی کے گھونٹوں سے"[۱]

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ میں "رمضان" ایسے ایام میں آتا جس میں تازہ کھجوریں (رطب) مل جاتی تھیں، لیکن اگر یہ نہ ملتیں، پھر خشک کھجوروں یا پانی پر اکتفا فرماتے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ حجاز میں رطب کا زمانہ جون، جولائی ہے، اس بناء پر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ رمضان کے مہینے اکثر و بیشتر انھیں ایام میں آتے، اور اگرچہ کبھی کبھی فصل پکنے میں دیر ہوتی تو اس وقت "تمر" سے افطار فرماتے۔

ماہِ رمضان کا ایامِ گرما سے متعلق از روئے روایات بدیہی ہے، چنانچہ ایک اور روایت ملاحظہ ہو، ابو درداء فرماتے ہیں:

"ہم گرمی کے موسم میں نبی علیہ السلام کے ساتھ کسی سفر میں تھے، گرمی کی یہ شدت تھی (کہ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے) آدمی اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا، اس وجہ سے ہم لوگوں میں بجز نبی علیہ السلام اور ابن رواحہ کے اور کوئی روزے دار نہ تھا"[۲]

معلوم نہیں کہ یہ کس سفر کا قصہ ہے بہر حال خاص فتحِ مکہ کا موسم مندرجہ ذیل روایات سے پوری طرح سامنے آ جاتا ہے، جابر رضؓ سے ایک روایت یوں ہے:

"رسول اللہ ﷺ رمضان کے مہینے میں ایک سفر فرما رہے تھے کہ آپ ﷺ کے ساتھیوں میں ایک شخص پر روزہ گراں گذرنے لگا تو گرمی کی وجہ سے اس کی سواری ایک درخت کے نیچے روک دی اور آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع کی، آپ ﷺ نے اس کو افطار کا حکم دیا، اور ایک برتن منگایا جس کو لے کر خود آپ ﷺ نے پانی پیا، اور لوگ دیکھ رہے تھے"[۳]

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ نمبر ۱۹۰)

BY THE INTRODUCTION OF THE LUNAR YEAR, RAMADAN GRADULY SHIFTED TILL IT REACHED THE SUMMER SEASON; AND THEN THE PROHIBITION TO TASTE WATER FROM MORNING TILL EVENING BECAME A BURDIN HEAVY TO BEAR" MUIR LIFE 1929 193.

میور کی اس رائے کو پڑھیے اور ملاحظہ فرمائیے کہ نئی تقویم کی گمشدگی کے باعث کس درجہ غلط تاریخی نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ [۱] مستدرک حاکم ۱/۴۳۲

[۲] بخاری کتاب الصوم۔ [۳] مستدرک ۱/۴۳۳، نیز دیکھیے مسند ۵/۳۲۶۰؛

یہ واقعہ مقامِ کدید کا معلوم ہوتا ہے جس کے متعلق ابن عباسؓ کی روایت اس طرح ہے : فرماتے ہیں کہ :

"رسول اللہؐ فتح مکہ کے سال رمضان کے مہینے میں نکلے تو آپؐ کا روزہ تھا، جب کدید پہنچے تو لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے، آپؐ نے ایک برتن لیا اور اس سے پانی پیا[1] تاکہ لوگ بھی افطار کر لیں۔

موطا میں اسی واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ جس سال مکہ فتح ہوا، تو آپؐ نے اس سفر کے لیے لوگوں کو حکم دیا کہ روزہ نہ رکھیں اور فرمایا کہ دشمن کے مقابلہ میں قوی رہو، مگر آنحضرتؐ نے خود روزہ رکھا: ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ جس شخص نے مجھ سے یہ روایت بیان کی اُس نے بتایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو "عرج" میں دیکھا کہ آپؐ پیاس یا گرمی کی وجہ سے سر پر پانی بہا رہے تھے، اس کے بعد رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ آپؐ کے روزے کی وجہ سے بہت سے آدمیوں نے روزے رکھ لیے ہیں، تو جب آپؐ کدید پہنچے تو آپؐ نے ایک برتن منگایا اور پانی پیا، اس پر اور لوگوں نے بھی روزے کھول لیے[2]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ پوری روایت ابو بکر بن عبد الرحمٰنؓ نے مشہور صحابی ابو ہریرہؓ سے لی تھی جو اس سفر میں بذاتہٖ پیغمبرِ اسلامؐ کے ہمرکاب تھے، کیونکہ مستدرک میں اس روایت کا مندرجہ ذیل ٹکڑا انھیں کی سند سے بیان کیا گیا ہے :-

"میں نے رسول اللہؐ کو عرج میں دیکھا کہ آپؐ گرمی کی وجہ سے اپنے سر پر پانی بہا رہے تھے، کیونکہ آپؐ روزے دار تھے[3]"

ان تمام روایات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نہ صرف عہدِ رسالتؐ میں ماہِ رمضان ہمیشہ موسمِ گرما میں آتا بلکہ فتحِ مکہ کا تعلق بھی شدید گرمائی زمانے سے تھا۔

ان موسمی شہادتوں کو سامنے رکھ کر جب ہم وسٹنفیلڈ کی تقویم پر نظر ڈالتے ہیں تو فصلی اعتبار سے بعد المشرقین نظر آتا ہے کیونکہ ان کی تقویم کے بموجب رمضان ۸ھ دسمبر اور جنوری کا متوازی مہینہ تھا، یہاں یہ اور عرض کر دوں کہ نہ صرف وسٹنفیلڈ بلکہ میور کا زاویۂ نظر بھی یہی ہے حتیٰ کہ مولانا شبلیؒ نے جب اس غزوے کا تذکرہ کیا تو اُن کو بھی جلی عنوان سے "فتحِ مکہ رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء" لکھنا پڑا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام غلطیوں کی بنیادی وجہ صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ مورخینِ اسلام عرصۂ دراز سے مکی تقویم فراموش کر چکے تھے۔

اس جدید نظریۂ تقویم کے بموجب رمضان ۸ھ مئی جون ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے۔

---

[1] ابن سعد ۲/۱۰۰ [2] موطا، ما جاء فی الصیام فی السفر۔ [3] مستدرک ۱/۴۳۲

سنہ ۱۰،۹

	مکّی	جولین	مدنی	
	محرّم	۱۵ ستمبر سنہ ۶۳۰ شنبہ	جمادی۲	
	محرم نسی صفر	۱۴ اکتوبر یکشنبہ	رجب	
	صفر	۱۳ نومبر سہ شنبہ	شعبان	
	ربیع۱	۱۲ دسمبر چہارشنبہ	رمضان	
سریہ علقمہ بن مجزز	ربیع۲	۱۱ جنوری سنہ ۶۳۱	شوّال	
	جمادی۱	۹ فروری شنبہ	ذلیقعدہ	
	جمادی۲	۱۱ مارچ دوشنبہ	ذوالحجّہ	حج اکبر، اعلان برأت فرض حج، تنسیخ تقویم
غزوہ تبوک تاریخ روانگی دوشنبہ ۱ رجب بروایت ابن حبیب	رجب	۹ اپریل سہ شنبہ	محرّم سنہ ۱۰	
	شعبان	۹ مئی پنجشنبہ	صفر	
واپسی از تبوک	رمضان	۷ جون جمعہ	ربیع۱	
واپسی از تبوک بروایت ابن حبیب	شوّال	۷ جولائی یکشنبہ	ربیع۲	
	ذلیقعدہ	۵ اگست دوشنبہ	جمادی۱	
	ذوالحجّہ	۴ ستمبر چہارشنبہ	جمادی۲	

سنہ ۹، ۱۰

۹ھ کے صرف تین واقعات پر قلم اٹھایا گیا ہے جو ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

۱۔ سریہ علقمہ بن مجزز اس سریہ کے متعلق صراحت ملتی ہے کہ یہ ربیع الآخر ۹ھ کا واقعہ تھا۔ روایتی تصریحات سے پتہ چلتا ہے، کہ سریہ کے دوران میں سپاہی تاپنے کے لیے الاؤ لگا لیتے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ موسم سرما کا تھا، یہ تاریخ مکی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ربیع الآخر ۹ھ (مدنی) جولائی ۶۳۰ء سے مطابق ہوتا ہے، اس کے مقابلے میں مکی ربیع الآخر ۱۱ جنوری ۶۳۱ء کو شروع ہوا تھا۔

۲۔ حج ابو بکرؓ اس واقعے کی تاریخ ذیقعدہ ۹ھ بیان کی جاتی ہے جس سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ غزوۂ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے، لیکن دو تقویمی نقطۂ نظر سے یہ حج غزوۂ تبوک سے صرف ایک ماہ پہلے ہوا تھا، چنانچہ سورۂ براۃ میں اس واقعے کا تذکرہ یعنی اعلانِ براۃ، غزوۂ تبوک کے ذکر سے پہلے ہے۔ علاوہ ازیں عکرمہ نے صاف طور پر بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ جب اس حج سے واپس آگئے تو پیغمبرِ اسلامؐ غزوۂ تبوک کے لیے نکلے تھے۔

۳۔ غزوۂ تبوک اس پر تفصیلی بحث برہان میں ملاحظہ ہو۔

غزوۂ تبوک

رجب مکی ۹ھ

غزوۂ موتہ میں رومیوں اور غسانیوں کی مشترکہ فوجوں نے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچایا تھا، وہ اگرچہ کم نہ تھا لیکن "رومی عقاب" کی دور بین نظریں صحرائے عرب کے انقلابی تموج کو بغور دیکھ رہی تھیں، اور غیر مطمئن تھیں، چنانچہ مدینے میں برابر اس قسم کی خبریں آرہی تھیں کہ شمالی پڑوسی کسی بڑے حملے کی تیاری میں مصروف ہیں، خود قیصر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس وقت حمص یا دمشق میں موجود تھا۔

حنینؔ[1] کے مالِ غنیمت کا صحیح مصرف یہ تھا کہ اس کو مؤثر طور پر شمالی دشمن کے خلاف صرف کر دیا جائے جس کے لیے ایک بڑی فوج درکار تھی، اس لیے غالباً مدینے آتے ہی، آنحضرتؐ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ عام چندے کے اعلان کے ساتھ دوست اور نو معاہد قبائل سے رضاکاروں کی بھرتی شروع کر دی جائے۔

ابن اسحٰق اور واقدی کا بیان ہے کہ اس چندے میں حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار اشرفیاں مع اس تجارتی مال کے جو شام

---

[1] غزوۂ حنین، اس غزوے سے صرف آٹھ ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔

جا رہا تھا نذر کی تھیں، حضرت عمرؓ نے اپنے پورے سرمایہ کا نصف اور حضرت ابوبکرؓ نے جو کچھ حاضر تھا، سب کا سب پیش کر دیا تھا،[1] اس سے ہم دوسرے لوگوں کے عطیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

قبائل عرب نے بھی آپؐ کے ساتھ پورا تعاون کیا اور اس کثرت سے شرکت کی درخواستیں آئیں کہ باربرداری کا تو ذکر کیا، خود سپاہیوں کو سواریاں دینا ممکن نہ تھا،[2] حتیٰ کہ شرکاء کے نام تک درج فہرست نہ ہو سکے۔[3]

مورخین کہتے ہیں کہ اس لشکر کی مجموعی تعداد تیس ہزار تھی،[4] جن میں دس ہزار گھوڑ سوار فوج کے دستے تھے۔[5] یہ تعداد اتنی بڑی تھی کہ غالباً سرزمین عرب نے اتنی عظیم فوج پہلے نہ دیکھی تھی، غور کیجیے کہ میدانِ بدر میں مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ تین سو تھی لیکن اس سے صرف ساڑھے چھ سال بعد سوگنی ہوگئی، یعنی تیس ہزار۔[6]

ماسوا اس کے ۹ھ میں حکومتِ مدینہ نے سرحدی قبائل کے دل جیت لینے کے لیے عمرو بن عاص کی سرکردگی میں جو مہم روانہ کی تھی، وہ بہمہ وجوہ کامیاب تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک پانچواں کالم ان قبائل میں بھی مرتب ہو چکا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کہ آنحضرتؐ جب تبوک پہنچے، تو رومی فوج کا نام و نشان تک نہ تھا، اس بنا پر آنحضرتؐ تبوک ہی میں رک گئے اور یہیں سے مختلف مقامات پر چھوٹے بڑے دستے روانہ فرمائے، جو سب کامیاب ہوئے، بحرِ سرخ کی سب سے اہم بندرگاہ اس زمانے میں ایلہ (عقبہ) تھی، اس بندرگاہ کے حاکم نے معاہدے کے ذریعہ اسلامی دولتِ مشترکہ (COMMON WEALTH) سے وابستگی حاصل کر لی۔[7]

خالد بن ولید نے دومۃ الجندل جا کر اُکیدر کو جو وہاں کا فرمانروا تھا، گرفتار کیا اور پیغمبرِ اسلامؐ کے حضور میں پیش کر دیا۔[8] اس طرح پورے شمالی عرب نے پہلی بار اسلامی تفوق کی جھلک اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اس غزوے کی تاریخ روانگی متفقہ طور پر رجب ۹ھ اور واپسی رمضان یا شوال ۹ھ بیان کی جاتی ہے اور اگرچہ ابن اسحٰق اور واقدی کے یہاں کچھ زیادہ تاریخی صراحت نہیں، لیکن ابن حبیب کے ماخذ نے اس کو بقیدِ یوم و تاریخ بیان کیا ہے:

"اور آنحضرتؐ اس کے لیے دوشنبے کے دن یکم رجب کو نکلے اور آخر شوال میں واپس ہوئے"[9]

قسطنطنیہ کی تقویم کے بموجب یہ رجب اکتوبر و نومبر کا متوازی مہینہ تھا، یعنی موسم سرما کے آغاز کا زمانہ جس کے حساب سے واپسی جنوری میں ہونا چاہیے۔

سر ولیم میور (MUIR) اور مولانا شبلیؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ میور نے اکتوبر[10] اور مولانا شبلیؒ نے رجب ۹ھ مطابق نومبر[11]

۱ھ ابن سعد ۲/۱۱۹ ۲ھ قرآن ۳ھ بخاری میں کعب بن مالک سے روایت ہے جو اس غزوے میں شریک نہ ہو سکے تھے کہ .... والمسلمون مع رسول اللہؐ کثیر "ولا یجمعھم کتاب حافظ" ۴ھ یہ تخمینہ تھوڑا مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ ۵ھ ابن سعد ۲/۱۱۹۔ ۶ھ MUIR LIFE P. 441, 442 ۷ھ ابن سعد ۲/۱۲۰ ۸ھ ابن حبیب/۱۱۵ ۹ھ

۱۰ھ MUIR LIFE P. 439 ۱۱ھ سیرۃ النبی ۱/۵۶۳

اس غزوے کی تاریخ روانگی قرار دی ہے، اس کے مقابلے میں سیرت کی جملہ روایتیں اس بات کے حق میں ہیں کہ اس غزوے کا موسم گرم تھا کعب بن مالک کہتے ہیں :۔

"اور رسول اللہ نے یہ لشکر کشی سخت گرمی کے زمانے میں کی تھی۔[1]"

اور آگے چل کر مزید نشاندہی اس طرح کرتے ہیں :۔

"یہ غزوہ اس وقت ہوا، جب پھل اچھے ہو جاتے ہیں۔[2]"

ابن اسحٰق نے زہری وغیرہ کی سند سے اس کے موسمی نقشے کی تصویر اس طرح کھینچی ہے :۔

"اور یہ لوگوں کی تنگدستی اور خشک سالی کا زمانہ تھا اور شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ جب کہ پھل خوش آئند ہو جاتے ہیں اور لوگ اپنے باغوں اور سایہ کو پسند کرتے ہیں۔[3]"

قطع نظر ان روایات کے خود قرآن مجید نے منافقین کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ :۔

"گرمی میں نہ نکلو۔[4]"

جس کا جواب یہ دیا گیا کہ :۔

"جہنم کی آگ سب سے زیادہ گرم ہے۔[5]"

ان تمام موسمی شہادتوں سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مہم نومبر، دسمبر اور جنوری کے مہینوں کی ہرگز نہ تھی، بلکہ ایسے موسم کی تھی جب ہی پھل اچھے ہو جاتے ہیں، گرمی میں تیزی اور شدت آ جاتی ہے، لوئیں چلنے لگتی ہیں اور درختوں کے سائے باعثِ تسکین ہو جاتے ہیں، غزوۂ تبوک کے "رجب" کو مذکورہ موسم کے مطابق ہونا چاہیئے۔

میری جدولوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال مکّی رجب ۸ اپریل، مئی سنہ کے متوازی تھا جو روایتی موسم سے عین مطابق ہے۔

ابن حبیب نے اس غزوے کی تاریخ روانگی دوشنبہ یکم رجب بیان کی ہے، جو تقویمی حساب سے بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے، کیونکہ از روئے حساب یکم رجب سہ شنبہ کو شروع ہو رہا ہے، اور دوشنبے کی چاندرات تھی، مگر مجھے یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ایک تاریخ تیس ہزار فوج کی بیک وقت روانگی کی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے ابتدائی دستوں کی ہوگی، اس خیال کی تصدیق ابن سعد اور مواہب کی اس روایت سے ہوتی ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ یوم خروج پنجشنبہ کا دن تھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف دستے آگے پیچھے روانہ ہوتے رہتے تھے، آخر یہ بھی واضح کرنا ہے کہ حج ابوبکر ہیں جو میرے خیال کے مطابق اس سے ٹھیک پہلے مہینے میں ہوا تھا، حاجیانِ مدینہ کی تعداد کا اتنا کم ہونا، نیز اس میں بجز ابوبکرؓ اور علیؓ کے کسی اور بڑی شخصیت کا نظر نہ آنا، شاید اس وجہ سے تھا کہ آنحضرتؐ مع اپنے رفقاء کے اسی غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

---

[1] ابن ہشام ۴/۱۷۶، [2] ابن ہشام ۴/۱۷۶ [3] ابن ہشام ۴/۱۵۹ [4] لا تنفروا فی الحر [5] نار جهنم اشد حراً۔

	مکی	عیسوی تاریخ و یوم	مدنی	
	محرم سنہ ۱۰	۳ر اکتوبر سنہ ۶۳۱ پنجشنبہ	رجب	
	صفر	۲ر نومبر شنبہ	شعبان	
	ربیع ۱	یکم دسمبر یکشنبہ	رمضان	۱۔ سریہ علی بن ابی طالب (یمن)
۲۔ سریہ خالد بن ولید یمن۔ ۳۔ وفات ابراہیم بن رسول اللہ ۴۔ سورج گرہن ۲۷ر جنوری سنہ ۶۳۲	ربیع ۲	۳۱ر دسمبر سہ شنبہ	شوال	
	جمادی ۱	۲۹ر جنوری سنہ ۶۳۲ء چہار شنبہ	ذیقعدہ	۵۔ حجۃ الوداع کے لیے روانگی شنبہ ۲۵ر ذیقعدہ
	جمادی ۲	۲۸ر فروری جمعہ	ذوالحجہ	۶۔ حجۃ الوداع
	رجب	۲۹ر مارچ یکشنبہ	محرم سنہ ۱۱	
	شعبان	۲۸ر اپریل سہ شنبہ	صفر	۷۔ دوشنبہ ۲۸ر صفر جہاد روم کی تیاری کا حکم۔
	رمضان	۲۷ر مئی چہار شنبہ	ربیع ۱	۸۔ آخری خطبہ ہفتہ ۱۰ر ربیع الاوّل سنہ ۱۱ ۹۔ رحلت ۱۲ر ربیع الاوّل دوشنبہ
	شوال	۲۶ر جون جمعہ	ربیع ۲	
	ذیقعدہ	۲۵ر جولائی شنبہ	جمادی ۱	
	ذوالحجہ	۲۴ر اگست دوشنبہ	جمادی ۲	

سنہ ۱۰، ۱۱

یہ سال سیرت رسول اللہؐ کا اختتامی باب ہے، اس میں مندرجہ ذیل واقعات پیش کیے گئے ہیں:

۱، ۲۔ سریۂ علی بن ابی طالبؓ سریۂ خالد بن ولید

کتب سیرت میں ان دونوں واقعات کی تاریخیں علیحدہ علیحدہ بیان کی گئی ہیں جن میں بعد المشرقین ہے، حضرت علیؓ کے متعلق مذکور ہے کہ ان کو رمضان سنہ ۱۰ میں یمن بھیجا گیا تھا، اور خالد بن ولید کے متعلق ربیع الآخر کی صراحت ملتی ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ خالدؓ کو جو ہدایات دی گئی تھیں، ان میں اس بات کو صاف کر دیا گیا تھا کہ اگر اس کی ملاقات حضرت علیؓ سے ہو جائے تو وہ پوری فوج کی امارت انھیں سونپ دیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں واقعے تقریباً ہم زمانہ تھے، چنانچہ مکی تقویم کے موجب ربیع الآخر سنہ ۱۰ کا آغاز مدنی رمضان کے اختتام پر ہو رہا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ سریۂ خالد بن ولید کا ریکارڈ مکی تقویم کے موجب ہوا تھا اور جناب امیر کے سریہ کا مدنی کلینڈر کے مطابق۔

۳۔ وفات ابراہیم اور سورج گرہن: ۔ اس کی تاریخوں پر کتاب میں پوری بحث ہے۔

۴۔ حجۃ الوداع: ۔

۵۔ جیشِ اسامہ، اور رحلت رسول اللہؐ: ۔

حجّۃ الوداع

ذوالحجہ سنہ ۱۰ مدنی

فتح مکہ کے بعد حج کا انصرام مشرکین مکہ ہی کے ہاتھ میں برقرار رکھا گیا تھا، دوسرے سال ذلقیعدہ قمری میں غزوۂ تبوک کے انتظامات درپیش تھے، جو حج سے زیادہ ضروری مسئلہ تھا، اس لیے پیغمبر اسلامؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیج دیا اور خود حج نہیں فرمایا۔ اس بنا پر ابھی ارکانِ حج کی تعلیم باقی تھی، قبائل عرب کو اسلام کی روح سمجھانا تھی، حکومتِ الٰہیہ کا اعلان ضروری تھا، تمام قدیم مفاخر نیست و نابود کرنا تھے، عورتوں، غلاموں اور بے مایہ مقروضوں کے ساتھ رحم و انصاف کی تعلیم اور ان کی داد رسی کا اعلان کرنا تھا بنا بریں قمری ذلقیعدہ سنہ ۱۰ میں آپؐ نے خود حج کا ارادہ فرمایا، جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، اس کی تفصیلات تمام سیرت کی کتابوں میں ملتی ہیں، اس لیے میں یہاں صرف واقعہ کا وہ ضروری حصہ جس کا تعلق تقویم سے ہے پیش کروں گا۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ ۲۵ ذلقیعدہ کو ہفتے کے دن مدینے سے روانہ ہوئے تھے۔[1] وسٹنفیلڈ نے ذلقیعدہ سنہ ۱۰ کی پہلی تاریخ کو چہار شنبہ قرار دیا ہے، جس کی رو سے ۲۵ کو ٹھیک ہفتہ ہی آتا ہے جو روایت کے عین مطابق ہے۔

---

[1] ابن سعد ۲/۱۲۴

جب یہ قافلہ مرّ الظہران پہنچا تو دوشنبہ تھا۔

"اور دوشنبے کے دن مرّ الظہران میں تھے کہ سورج سرف میں غروب ہوا[1]"

ابن عباسؓ اور جابرؓ کی روایت کے مطابق یہ ذوالحجہ کی ۴ر تاریخ تھی، جابرؓ فرماتے ہیں:

"آنحضرتؐ ۴ر ذوالحجہ کو تشریف لائے[2]"

عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے:-

"اور آنحضرتؐ نے حج کی تہلیل فرمائی، تو آپؐ ۴ر ذوالحجہ کو تشریف لائے[3]"

گویا دوشنبہ ۴ر ذوالحجہ کے مطابق تھا، وسٹنفیلڈ کی تقویم کے بموجب اگرچہ یہ دونوں بیانات صحیح ہیں، کیونکہ از روئے حساب ذوالحجہ ۱۰ھ کی پہلی تاریخ کو جمعہ تھا، اس لیے دوشنبے کو ذوالحجہ کی ۴ر تاریخ ہی ہونا چاہیئے، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سال حج جمعہ کو ہوا تھا، یعنی جمعہ کے دن ۹ تاریخ تھی، جس کی رُو سے دوشنبہ کو بجائے چار کے پانچ تاریخ ہونا چاہیئے، اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ مکہ معظمہ میں ذوالحجہ کا چاند ۲۹ کو تسلیم کر کے بجائے جمعہ کے پنجشنبے کی پہلی تاریخ قرار دی گئی تھی اور حج اسی حساب سے ادا کیا گیا تھا[4] یہ ایک دن کا فرق ایسا نہیں جو قمری مہینوں میں نیا یا کوئی اہمیت رکھتا ہو۔

حجۃ الوداع کی تاریخی عظمت اور اہمیت کی آئینہ دار اگر کوئی شے ہے تو وہ آنحضرتؐ کا خطبۂ حج ہے، جس کا ایک ایک لفظ عالم انسانیت کو نئی روشنی اور نیا درسِ حیات دیتا ہے، اس کے جستہ جستہ ٹکڑے کتبِ سیرت و احادیث میں موجود ہیں، جن میں سے مجھے صرف ایک حصّے کا یہاں تذکرہ کرنا ہے، جس کا تعلق تنسیخِ تقویم سے تھا۔

مکی تقویم جو اجرام پرستی کا سرچشمہ بن گئی تھی، اگرچہ ۹ھ میں بذریعہ قرآن منسوخ ہو چکی تھی، لیکن آپؐ نے اپنے اس خطبے میں بھی اس کا ذکر فرمایا: اور "ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:-

"سال کے بارہ مہینے ہیں، جن میں چار مہینے قابلِ احترام ہیں، تین متواتر مہینے، ذیقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر، جو جمادی اور شعبان کے درمیان میں ہے[5]"

اس ابتدائی جملے یعنی "ان الزمان قد استدار" کا مفہوم بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سال قمری شمسی دونوں تقویمیں ایک ہی نقطہ پر جمع ہو گئی تھیں، اور ذوالحجہ کا مہینہ دونوں حسابوں سے ایک ہی زمانے میں آپڑا تھا، لیکن جیسا کہ تحریر کیا

---

[1] ابن سعد ۲/۱۲۴ [2] ابن سعد ۲/۱۲۶ [3] ایضاً [4] مولانا احمد رضا خان صاحب بریلویؒ نے جن کو علم نجوم میں کافی دسترس تھی، اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ نجومی حساب کی رُو سے ۹ر کو جمعہ نہیں پڑتا، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اس سال اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ممکن ہے، کہ بے قاعدہ رویت ہوئی ہو، تاکہ پیغمبرِ اسلام کا یہ حج جمعہ کے مقدس دن میں ہو سکے، میری رائے میں یہاں یہ بحث کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ قمری مہینوں میں رویت قمر کا انحصار محض تسلیم اور عدم تسلیم پر ہے۔ [5] بخاری تجرید کتاب بدء الخلق۔

جا چکا ہے، یہ خیال غلط ہے۔

نقشۂ تقویم کو سامنے رکھ کر قمری محرم کو ملاحظہ فرمایئے، جو اس سال ۲۹ مارچ یعنی اعتدالِ ربیعی کے عین متصل شروع ہو رہا ہے، یہ بات مسلم ہے کہ قدیم اہلِ بابل اہلِ ایران اور شاید جنوبی عرب کے باشندے اور تمام باشندگانِ ہند اعتدالِ ربیعی سے سال کا آغاز کرتے تھے جس کا رواج ہندوستان میں آج تک چلا آرہا ہے، یہودیوں کے مذہبی سنِ تقویم کا پہلا مہینہ "نیسان" بھی اسی نقطہ سے شروع ہوتا تھا، اور قرینِ قیاس یہ ہے کہ قدیم عربوں میں بھی ایک سنہ کا آغاز اعتدالِ ربیعی سے کیا جاتا تھا جبکہ سورج برجِ حمل میں داخل ہوتا، کیونکہ عربوں کا یہی خیال تھا کہ آفرینشِ عالم اعتدالِ ربیعی میں ہوئی تھی۔ ابنِ قتیبہ کا بیان ہے:

"اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو اس وقت پیدا کیا جب کہ سورج برجِ حمل میں تھا اور زمانہ اعتدال تھا۔ اور دن اور رات مساوی تھے، تو فصلوں کی ابتداء سیف سے ہوئی اور اسی کو لوگ فصلِ بہار کہتے ہیں، اور جب کبھی سورج برجِ حمل میں ہوتا ہے، تو اس سے دنیا کے لیے ایک سال گذر جاتا ہے۔"[1]

۱۱ سنہ میں قمری محرم گھوم پھر کر اسی نقطہ اعتدالِ ربیعی پر آگیا تھا اس لیے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد: "ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض" اسی سنہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، اس سے یہ مراد لینا کہ آنحضرتؐ کے نزدیک واقعی آسمان اور زمین کی تخلیق اسی زمانے میں ہوئی تھی، شدید ترین غلطی ہے اور اس سے بڑی غلطی یہ تصور ہے کہ اس زمانے میں شمسی اور قمری تقویم ایک ہو گئی تھی۔

جیشِ اسامہؓ اور رحلتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ربیع الاوّل ۱۱ سنہ مدنی

دس سال کی بے اندازہ جسمانی اور ذہنی کش مکش کے بعد پیغمبرِ اسلامؐ نے نوعِ انسانی کے لیے اگرچہ ایک نئی زمین اور نئے آسمان کی تعمیر کر دی تھی، جس کے سایہ میں پورا عالمِ انسانیت سما سکتا تھا، لیکن اس کی دعوت پر ابھی صرف جزیرہ نمائے عرب نے لبیک کہا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ دعوت دنیا کے کانوں تک پہنچی نہ تھی، لیکن ہر کام کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس دس سال میں اسلامی تحریک نے جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ صرف جزیرہ نما تک محدود تھی مگر یہ قبولِ عام بھی ایسا نہ تھا جو دوسروں کو متاثر نہ کر سکے، صحرا کے ہر ذرہ میں ایک نئی چمک، نئی دمک اور نئی لگن اور تڑپ پیدا ہو گئی تھی، جو سب کو نظر آ رہی تھی۔

فتحِ خیبر کے بعد اسلامی ریاست کی سرحدیں دنیا کی سب سے عظیم طاقت یعنی بازنطینی شہنشاہیت سے جا ملی تھیں، جس نے ابھی حال ہی میں تاجِ کیانی کو پارہ پارہ کر کے دنیا کو دوبارہ اپنی عظمت کا یقین دلایا تھا، اس سلطنت کے کرتا دھرتا رگستانی سمندر کے جدید

---

[1] ابنِ قتیبہ، کتاب الانواء/ ۱۹ ؛ ۵

توجّہ کو بنظرِ غائر دیکھ رہے تھے، چنانچہ ۸ھ کے اواخر میں خود قیصر اور قیصر کی پروردہ مصر و شام کی ریاستیں اسلامی سفارتوں کو باریاب کر کے اس کے وجود کو تسلیم کر چکی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اثر بڑی سُرعت سے شمال کی طرف بڑھ رہا تھا، کیونکہ مستبد طبقے کی عقلیں صرف اس وقت معطّل ہوتی ہیں، جب کوئی عظیم خطرہ سر پر منڈلانے لگتا ہے۔ ۸ھ کی ابتداء میں حارث بن عُمیر کو قتل کر کے جو اسلامی سفارت پر بلقا گئے ہوئے تھے، اور ۹ھ میں فروہ بن عمر گورنر معان کو سولی دے کر جنھوں نے اعلانِ اسلام کر دیا تھا، رُومی کارپردازانِ حکومت نے کسی اچھے تدبّر کا ثبوت نہیں دیا تھا، اور ان شہیدوں کے خون سے خود انھوں نے وہ شاہراہ تعمیر کر دی تھی، جس پر اسلامی فوجیں بہ آسانی گامزن ہو سکتی تھیں۔ بنا بریں ۸ھ میں غزوۂ موتہ اور ۹ھ میں غزوۂ تبوک دونوں مہموں کو رُومیوں کی اِسی بے عقلی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۰ھ کے موسمِ بہار کا بڑا حصہ اگرچہ الفرامِ حج (حجۃ الوداع) میں صرف ہو چکا تھا، مگر مسلمان فوجیں تیار کھڑی تھیں کہ جہادِ روم پر جانے کا حکم کس وقت ملتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے دو ہی مہینے بعد اس کی تیاری کا بگل بج گیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ صفر ۱۱ھ کے آخری ہفتے میں دوشنبے کے دن آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہادِ روم پر جانے کی تیاری کریں۔

"وہ کہتے ہیں کہ جب دوشنبے کا دن آیا، اور صفر کی چار راتیں باقی تھیں، تو آنحضرتؐ نے جہادِ روم کی تیاری کا حکم دیا[۱]"

معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کے راوی اوّل کے ذہن میں دوشنبے کی ۲۷ تاریخ تھی، لیکن وسٹنفیلڈ (WUSTENFELDS) کی تقویم کے بموجب دوشنبہ ۲۸ کو پڑتا ہے،

اس سے صرف ایک دن بیچ یعنی چہارشنبہ کے روز یکایک پیغمبرِ اسلامؐ کی طبیعت ناساز ہونا شروع ہوئی،

ابن سعد کا بیان ہے کہ:

"جب چہارشنبے کا دن آیا تو بخار اور دردِ سر کی ابتدا ہوئی[۲]"

ابن سعد کے رواۃ کے نزدیک یہ چہارشنبہ ۲۹ صفر کو پڑتا تھا۔

"کہتے ہیں کہ چہارشنبے کے دن صفر کی دو راتیں باقی تھیں کہ اُمّ المومنین میمونہؓ کے مکان میں علالت شروع ہوئی[۳]"

مگر جیسا کہ کہا جا چکا ہے، دوشنبے کی ۲۸ تاریخ تھی، اس لیے چہارشنبے کی بجائے ۲۹ کے ۳۰ رہونا چاہیئے۔ یہ غالباً راوی کی حسابی غلطی ہے، بہر حال تمام رفقاء تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور جُرف میں فوج اکٹھی ہونا شروع ہو گئی۔ جو غالباً عہدِ رسالتؐ

۱؎ ابن سعد ۲/۱۳۶ ۲؎ ایضاً ۳؎ ابن سعد ۳/۳،

میں فوجی پڑاؤ تھا، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اس پروگرام کو کسی طویل عرصے کے لیے ملتوی کر کے فوج کو چھٹی دے دی جائے، چنانچہ آنحضرت ؐ نے دوسرے ہی دن یعنی پنجشنبہ کے روز خود اپنے دستِ مبارک سے ایک پرچم تیار کیا اور اُسامہ بن زید کے سپرد کر کے قیادت اُن کے ہاتھ میں دے دی، طبقات میں ہے :-

"بعد ازاں جب پنجشنبہ کی صبح ہوئی، تو خود آنحضرت ؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسامہ کے لیے جھنڈا باندھا[1]"

وسٹنفیلڈ کی جدول کے بموجب یہ پنجشنبہ ۲ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے، لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ربیع الاوّل کا چاند بجائے ۲۹ کے ۳۰[2] کو ہوا تھا، یا اہلِ مدینہ اس کو دیکھ نہ سکے تھے تو پنجشنبہ کی پہلی تاریخ ہو گی جو روایت کے عین مطابق ہے۔

دوسرے پنجشنبہ یعنی ۸ ربیع الاوّل سلـہ (مطابق ۴ جون ۶۳۲ء) کو آپ ؐ کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی، تو آپ ؐ نے ایک تحریر لکھنا چاہی[3]، لیکن بیماری کی شدت تھی، اور یہ کام نہ ہو سکا، اس عرصے میں طبیعت کبھی بگڑتی کبھی سنبھلتی۔

تمام اہلِ سیرت متفق ہیں کہ اسامہ کی نامزدگی پر لوگوں میں ویسی ہی سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں جیسی ان کے باپ کی سرداری پر، اور کہنے والوں نے پھر یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اکابر صحابہ کی موجودگی میں ایک نو عمر شخص کو اتنی اہم فوج کی قیادت مناسب نہیں، تو آپ اسی بیماری کی حالت میں مسجد تشریف لائے اور خطبہ دیا، جس کا خلاصہ یہ ہے :

"لوگو! اسامہ کے لشکر کو بڑھاؤ، اور اس میں جا کر ملو، اگر تم اس کے امیر ہونے پر اعتراض کرتے ہو، تو اس سے پہلے تم نے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا اور بیشک اُسامہ ہر طرح سرداری کے لائق ہے، اور اس کا باپ بھی لائق تھا[4]"

یہ واقعہ ۱۰ ربیع الاوّل (مطابق ۶ جون ۶۳۲ء) کا ہے، جب کہ مرض اپنی پوری شدت پر تھا، آنحضرت ؐ کی خواہش تھی کہ یہ لشکر جلد از جلد روانہ ہو، چنانچہ اسی تاریخ کو اکثر صحابہ آنحضرت ؐ سے رخصت ہو کر "جرف" کو روانہ ہو گئے جہاں لشکر پڑا تھا، ابن سعد کا بیان ہے :

"اور یہ واقعہ ہفتے کے دن ۱۱ ربیع الاوّل کا ہے کہ جو مسلمان اُسامہ کے ساتھ جانے والے تھے، آنحضرت ؐ سے رخصت ہوئے[5]"

---

[1] ابن سعد ۲/۱۳۶

[2] منجمین صرف حسابی صورت کے لیے محرم کو اصولاً ۳۰ دن کا اور صفر کو ۲۹ کا شمار کرتے ہیں۔

[3] ابن سعد ۳/۳۶ ؛

[4] ابن سعد ۳/۴۱ ۔

[5] ابن سعد ۲/۱۳۶ ؛

"اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہفتے کے دن یعنی ۶ رجون ۶۳۲ء کو ربیع الاول کی ۱۰ تاریخ تھی، اور ربیع الاول کا چاند بجائے ۲۹ ر کے ۳۰ ر کا تسلیم کیا گیا تھا، کہتے ہیں کہ اسی روز مرض میں اور ترقی ہوگئی، اور آنحضرتؐ بے ہوش ہوگئے، یکشنبے کے دن مرض پوری شدت پر تھا، دوشنبے کے دن صبح کو طبیعت قدرے درست ہوگئی، آپؐ نے حجرہ کا پردہ اُٹھا کر دیکھا، تو لوگ نماز فجر میں مشغول تھے۔ یہ دیکھ کر آپؐ فرطِ مسّرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے سمجھا، آپؐ باہر آنا چاہتے ہیں، قریب تھا کہ صفیں درہم برہم ہو جائیں، آپؐ نے اشارے سے روکا، یہ جمالِ اقدس کی آخری زیارت تھی، جو فدایانِ نبوت نے کی، جوں جوں دن چڑھتا گیا، حالت بگڑتی گئی، بار بار رہوش آتا اور بار بار غشی طاری ہوجاتی، آخر کار رفیقِ اعلیٰ سے ملنے کا وقت آگیا، لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سُنے :-

"نماز اور غلام"[1]

یہ واقعہ[2] ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو دوشنبے کے دن دوپہر کے بعد کا ہے (یعنی ۸ رجون ۶۳۲ء) کا، کہ اُسامہ کا پرچم جوجرف پہنچ چکا تھا، واپس آیا اور آستانۂ نبوت پر نصب کر دیا گیا۔

"صَلُّوا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا"

رحلتِ رسول اللہ کی توقیتی جدول

جولین	مدنی	واقعات
۲۵ رمئی ۶۳۲ء ۲۶ رمئی ″	۲۸ رصفر ۱۱ھ، دوشنبہ ۲۹ ر ″ ″ سہ شنبہ	جہادِ روم کی تیاری کا حکم[3]

[1] ابن سعد ۱/ - [2] فتوفی... حین زاغت الشمس یوم الاثنین لاثنی عشر لیلۃ خلت من شہر ربیع الاول۔ ابن سعد ۱۴/۲
پیغمبرِ اسلامؐ کی تاریخ وفات میں اگرچہ اختلاف ہے اور مورخین یکم ربیع الاول اور بعض ۲ کو ترجیح دیتے ہیں، حتیٰ کہ واقدی کی کتاب المغازی میں بھی ۲ ربیع الاول مذکور ہے، لیکن واقدی کی مشہور تر روایت جس کو اکثر علماء نے قبول کیا ہے۔ ۱۲ ربیع الاول ہے۔ اس تاریخ پر علماء کی ایک جماعتِ کثیر کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ شیعہ روایت بھی اسی کی تائید میں ملتی ہے کلینی میں ہے: "ثم قبض لاثنی عشرۃ لیلۃ مضت من ربیع الاول یوم الاثنین (ابواب التاریخ) اس سے قطع نظر دوشنبہ کا دن جو متفق علیہ ہے ۱۲ ربیع الاول کے علاوہ کسی اور تاریخ کو نہیں پڑتا۔ نہ یکم کو نہ ۲، مارگولتھ نے دوشنبے کی ۷ رجون قرار دی ہے جو غلط ہے۔ دوشنبہ ۸ جون ۶۳۲ء کو پڑتا ہے۔
[3] روایت میں ۲۸ تاریخ ہے جو راوی کی حسابی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ MARGOLIQUTH RISE 471,

واقعات	مدنی	جولین
• علالت کی ابتدا [۱] ←	۳۰ رصفر ۱۱ھ ، چہار شنبہ	۲۷ رمئی ۶۳۲ء
• پرچم سازی ←	یکم ربیع 〃 پنجشنبہ	۲۸ رمئی 〃 [۲]
	۲ ر 〃 〃 جمعہ	۲۹ ر 〃 〃
	۳ ر 〃 〃 ہفتہ	۳۰ ر 〃 〃
	۴ ر 〃 〃 یکشنبہ	۳۱ ر مئی 〃
	۵ ر 〃 〃 دوشنبہ	یکم جون 〃
	۶ ر 〃 〃 سہ شنبہ	۲ ر 〃 〃
	۷ ر 〃 〃 چہارشنبہ	۳ ر 〃 〃
• واقعۂ قرطاس ←	۸ ر 〃 〃 پنجشنبہ	۴ ر 〃 〃
	۹ ر 〃 〃 جمعہ	۵ ر 〃 〃
• آخری خطبہ ←	۱۰ ر 〃 〃 ہفتہ	۶ ر 〃 〃
• مرض کی انتہائی شدت ←	۱۱ ر 〃 〃 یکشنبہ	۷ ر جون ۶۳۲ء
• رحلت ←	۱۲ ر ربیع الاوّل ۱۱ھ ، دوشنبہ	۸ ر جون [۳] ۶۳۲ء

[۱] روایت میں ۲۹ تاریخ ہے جو راوی کی حسابی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

[۲] وسٹنفیلڈ کے حساب سے یہ پنجشنبہ (۲۹ ر کا چاند مان کر) ۲ ر ربیع الاوّل کو پڑتا ہے، لیکن اگر ۳۰ ر کا چاند مان لیا جائے، یا یہ فرض کر لیا جائے کہ اہلِ مدینہ ۲۹ ر کا چاند دیکھ نہ سکے تھے تو پنجشنبہ کی ٹھیک پہلی تاریخ ہو گی، جو روایات کے عین مطابق ہے۔

[۳] بعض یورپی مصنفین مثلاً مارگولیتھ، ایچ، جی، ویلز H. G. WELLS وغیرہ نے تاریخِ رحلت ۷ ر جون قرار دی ہے جو بالکل غلط ہے، کیونکہ دوشنبہ ۷ ر کو نہیں بلکہ ۸ ر جون کو پڑتا ہے۔

اَلرَّسَالَاتُ النَّبَوِيَّہ

یعنی

رسولِ اکرم فخرِ عالم و آدم محمدِ مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے

منتخب مکتوبات و فرامین کا اردو متن

مع ترجمہ و مختصر حواشی

تحقیق

دکتور نثار احمد الفاروقی

اُستاذ مُشارِک

فی اللُّغۃ العَربیّۃ المُعاصِرۃ بجامعۃِ دلھی ، الھند

۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء

فہرس

مکتوب الیہ

۱۔ النجاشی ملک حبشہ
۲۔ قیصر روم
۳۔ کسریٰ بن ہرمز شاہِ ایران
۴۔ مقوقس والیِ اسکندریہ
۵۔ الحارث بن ابی شمر الغسانی
۶۔ ہوذۃ بن علی الحنفی گورنر یمامہ
۷۔ جیفر اور عبد بن الجلندی
۸۔ المنذر بن ساوی العبدی گورنر بحرین
۹۔ اہل ہجر
۱۰۔ اہل یمن
۱۱۔ اہل یمن
۱۲۔ جبلۃ بن الأیہم
۱۳۔ ذی الکلاع
۱۴۔ اہل نجران
۱۵۔ ربیعہ بن ذی مرحب
۱۶۔ بنو لخم
۱۷۔ خالد بن ضماد الازدی
۱۸۔ عمرو بن حزم
۱۹۔ حصین بن اوس الأسلمی
۲۰۔ یزید بن الطفیل
۲۱۔ بنی قنان بن ثعلبہ
۲۲۔ عبد یغوث بن وعلہ
۲۳۔ زیاد بن الحارث
۲۴۔ یزید بن المحجل
۲۵۔ قیس بن الحصین
۲۶۔ بنی قنان بن یزید
۲۷۔ عاصم بن الحارث
۲۸۔ بنو معاویہ بن جرول
۲۹۔ عامر بن الأسود ابن عامر بن جوین
۳۰۔ بنی جوین طائی
۳۱۔ بنی معن طائی
۳۲۔ بنی اسد
۳۳۔ جنادہ بن الازدی
۳۴۔ سعد ہذیم
۳۵۔ بنی زرعہ اور جہینہ کے بنی الربعہ
۳۶۔ بنی جعیل
۳۷۔ الأسلم الخزاعی
۳۸۔ عوسجہ بن حرملہ الجہنی
۳۹۔ بنی شنخ
۴۰۔ بنی الجرمز بن ربیعہ

۴۱ - عمرو بن معبد الجہنی
۴۲ - بلال بن الحارث المزنی
۴۳ - بُدیل و بُسر و سرواتِ بنی عمرو
۴۴ - العداءؓ بن خالد بن ہوذۃ
۴۵ - مُسیلمۃ الکذاب
۴۶ - سلمۃ بن مالک
۴۷ - العباس بن مرداس السلمی
۴۸ - ہوذۃ بن نُبیشیہ السلمی
۴۹ - الأجبّ
۵۰ - راشد بن عبد السلمی
۵۱ - حرام بن عبد عوف
۵۲ - الزبیر بن العوام
۵۳ - نُعیم بن مسعود
۵۴ - جمیل بن رزام العدوی
۵۵ - حصین بن نضلۃ الأسدی
۵۶ - بنی غِفار
۵۷ - بنی ضمرۃ بن بکر
۵۸ - الہلال صاحب البحرین
۵۹ - اُسیبخت بن عبد اللہ
۶۰ - اَہل ہجر
۶۱ - المنذر بن ساوی
۶۲ - المنذر بن ساوی
۶۳ - العلاءؓ بن الحضرمی
۶۴ - ضغاطر الأسقف
۶۵ - بنی جنبہ یہود مقنا
۶۶ - یُحنّۃ بن رؤبۃ اور سرواتِ اہل ایلہ
۶۷ - جبل تہامہ کے گروہ بند
۶۸ - بنی غادیا
۶۹ - بنی عریض
۷۰ - بنی زُہیر بن اُقیش
۷۱ - ابو ظبیان الازدی
۷۲ - حبیب بن عمرو الغامدی
۷۳ - الولید بن جابر
۷۴ - سمعان بن عمرو بن قُریط
۷۵ - فروۃ بن عمرو الجُذامیؓ
۷۶ - بکر بن وائل
۷۷ - الشُحیر بن عداءؓ
۷۸ - الحارث بن عبد کلال و نُعیم بن عبد کلال و النعمان
۷۹ - عبد القیس
۸۰ - اقیالِ حضرموت
۸۱ - نُفاثہ بن فروۃ
۸۲ - مطرف بن الکاہن
۸۳ - نہشل بن مالک
۸۴ - بنو ثقیف
۸۵ - سعید بن سُفیان الرعلی
۸۶ - عُتبہ بن فرقد
۸۷ - سلمۃ بن مالک
۸۸ - بنی جَناب کلبی
۸۹ - مہری بن الابیض
۹۰ - خَثعم
۹۱ - ثمامہ و الحُدّان
۹۲ - بارق الازدی

۹۳ - وائل بن حُجر
۹۴ - اہل نجران
۹۵ - اُکیدر
۹۶ - یحنّہ بن روبۃ
۹۷ - اہل اُذرح
۹۸ - اہل جربا و اَذرح
۹۹ - اہل مقنا

٭

مُقدّمہ

تمہید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خطوط اور دستاویزات جواب تک مختلف مصادر سے ہمیں ملتی ہیں اُن کی تعداد ڈھائی سو (۲۵۰) سے زیادہ ہے اور اُن کا متن حواشی کے ساتھ " الوثائق السیاسیہ" میں یک جا ملتا ہے دنیا کے تمام بانیانِ مذاہب میں یہ امتیاز بھی فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے کہ آپ کے مکتوبات کی کم از کم چار اصلیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ہمارے قدیم مورّخ بھی بعض خطوط کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کی شہادت دیتے ہیں۔ ایک خط اسپین کے عیسائی بادشاہوں کے قبضے میں تھا۔ ایک اور خط کے دیکھنے کا حال ابن فضل اللہ العمری نے کتاب مسالک الابصار میں لکھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اصل مکتوب اسکاٹ لینڈ کے ایک مستشرق (D.M. DUNLOP) ساکن برائڈکرک کو فلسطین کے ایک پادری سے ملا تھا، اس کا عکس پہلے جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن (جنوری ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا۔ اس خط کی جو روایات دوسری کتابوں میں (مثلاً الطبری، ابن القیم، قسطلانی اور قلقشندی) میں ملتی ہیں اُن میں بعض الفاظ کم و بیش ہیں۔ اس کی محققانہ بحث ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنے فاضلانہ مضمون میں کی ہے۔ اس خط کے جواب میں نجاشی مُلکِ حبشہ نے جو خط بھیجا تھا وہ بھی ابنِ اسحٰق اور طبری وغیرہ کے ہاں محفوظ ہے[1]۔

نجاشی کے نام رسالت مآبؐ کے مکتوب گرامی کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کہتے ہیں:

" ابھی حال میں حبشی اطالوی جنگ کی ابتدا میں اخبارون نے (ہمدم نے مصر کے اخبار البلاغ سے اور اس نے ادیس ابابا کے اخبار برہانِ اسلام سے نقل کر کے) یہ خبر شائع کی تھی کہ نجاشی نے اپنے خزانے سے آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ خط جواب تک محفوظ ہے، نکال کر مسلمانوں کے ایک وفد کو دکھایا"[2]

قدیم روایات میں بھی یہی ملتا ہے کہ نجاشی نے اس خط کو ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں مُہر بند کر کے ایک کنیز کو دے دیا تھا کہ وہ اسے

---

[1] دیکھو محمد حمید اللہ: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۲۹ - ۱۳۰

[2] ایضاً ص ۱۳۱

محفوظ کر ڈے [1]۔ ڈنلاپ نے اس اصلی مکتوب کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں دمشق میں کسی شخص نے حبشہ کے ایک پادری سے خریدا تھا اور برٹش میوزیم وغیرہ کے ماہرین نے اس کی جانچ کر لی تھی۔ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دو [2] اور خطوط پچھلی صدی میں دریافت ہوئے تھے۔ یہ خطوط مقوقس والیِ اسکندریہ اور المنذر بن ساوی کے نام ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے "مکتوب نبوی بنام ہرقلؓ" کی اصل فرانسیسی رسالہ ARABICA (۱۹۵۵ء) میں شائع کرایا تھا۔

المنذر بن ساوی گورنرِ بحرین کے نام رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامہ مبارک دمشق کے قوتلی خاندان میں محفوظ ہے اور اس کی عبارت اس متن کے مطابق ہے جو صبح الاعشیٰ، زاد المعاد اور مواہب اللدنیہ جیسی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مکتوب ۱۹۱۷ء میں خواجہ کمال الدین نے بچشمِ خود دیکھا تھا اور رسالہ اسلامک ریویو ووکنگ (۱۹۱۷ء) میں اس پر مضمون بھی لکھا تھا۔ مستشرق فلائشر (H.L.FLEISCHER) نے نہایت بودی دلیلوں کے ساتھ اسے جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس خط کا اصلی ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

عیسائی مستشرقین اپنی بدنیتی سے کبھی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم صرف عربوں کے درمیان تبلیغ کرتے رہے اور انھوں نے دوسرے ملکوں میں تبلیغی وفود بھیجے ہی نہیں، کبھی اِن واقعات کی تاریخوں پر شبہات وارد کرتے ہیں، کبھی کسی نام پر بحث کرتے ہیں کہ یہ نام نہیں تھا وہ تھا، کبھی دریافت شدہ اصلی خطوط کو جعلی بتاتے ہیں اور یہ سب وہی حرکتیں ہیں جو عیسائی اور یہودی علماء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی کرتے رہے تھے یہاں تک کہ اپنی مذہبی کتابوں میں تحریف کرنے سے بھی باز نہیں آئے [3] اور مقصد صرف یہ کہ آپ کے دعویٰ رسالت کو

---

[1] فجعله فی حُقّ من عاجٍ وخَتَمَ علیه ودَفَعه إلیٰ جاریته دیکھو:

FARUQI (N.A.): EARLY MUSLIM HISTORIOGRAPHY DELHI 1978, P. 212.

[2] اس خط کا عکس پہلی بار جرمن رسالہ ZDMG ۱۸۶۳ء میں چھپا تھا۔

[3] طبقات ابن سعد ۳۶۳/۱ میں ہے:

"عن سهل مولی عُتَیبه أنّه کان نصرانیاً من أهل مریس وانّه کان یتیماً فی حجر اُمّه وعمّه، وأنّه کان یقرأ الانجیل، قال: فأخذت مصحفاً لعمّی فقرأته حتّی مرّت بی ورقة فأنکرت کتابتها حین مرّت بی ومسستُها بیدی، قال: فنظرت فاذا فصول الورقة ملصق بغراء قال: ففتقتُها فوجدت فیها نعتَ محمّد، صلّی الله علیه وسلّم، أنّه لا قصیر ولا طویل، أبیض، ذو ضفیرین، بین کتفیه خاتم، یکثر الاحتباء ولا یقبل الصدقة ویرکب الحمار والبعیر ویحتلب الشاة ویلبس قمیصاً مرقوعاً ومن فعل ذلك فقد بَرِئَ من الکبر وهو یفعل ذلك وهو من ذرّیّة اسمعیل إسمه أحمد، قال سهل: فلمّا انتهیت الی هذا من ذکرِ محمد صلی الله علیه وسلّم جاءَ عمّی فلمّا رأی الورقة ضربنی وقال: مالكَ وفتح هذه الورقة وقرأتها، فقلت فیها نعت النّبی صلّی الله علیه وسلّم، احمد، فقال: إنّه

(باقی اگلے صفحہ پر)

باطل ثابت کرسکیں۔ پچھلی صدی میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین خطوط اپنی اصلی حالت میں دستیاب ہوئے اور ان کے چربے یا عکس بھی مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تب بھی ان مستشرق علمائے نے اپنا ہٹ دھرمی کا مسلک نہیں چھوڑا اور انھیں جھٹلاتے رہے۔ لیکن اب عربوں کی دولت نے یا مشرقِ وسطیٰ کی سیاست نے معیارِ علم وتحقیق کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ چار سال قبل رائٹر کے حوالے سے ایک خبر[۱] ان الفاظ میں شائع ہوئی تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لم یأت بعدُ "۔

(ترجمہ: سہل مولیٰ عُتیبہ سے روایت ہے کہ وہ عیسائی تھے مریس کے باشندوں میں سے۔ اور وہ یتیم تھے اس لیے اپنی ماں اور چچا کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے اور وہ انجیل پڑھا کرتے تھے۔ کہا: ایک دن میں نے اپنے چچا کی انجیل اٹھائی اور اسے پڑھنے لگا حتیٰ کہ ایک ورق پر پہنچا تو مجھے اس کی لکھاوٹ عجیب (بے جوڑ سی) لگی میں نے اُس ورق کو ہاتھوں سے چُھوا، اب جو دیکھا تو دو ورق لیئی سے چپکا دیے گئے تھے، میں نے اُسے علیحدہ کیا تو دیکھا کہ اس صفحہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت لکھی ہوئی ہے کہ ان کا قد میانہ ہوگا، رنگ گورا، دو گیسوؤں والے، کندھوں کے درمیان مُہرِ نبوت، بہت باحیا، صدقہ قبول نہیں کریں گے، گدھے اور گھوڑے کی سواری بے تکلف کریں گے، بکری دوہ لیں گے، پیوند لگی قمیص پہن لیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے پاک ہوتا ہے اور وہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔ سہیل کہتے ہیں جب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں یہاں تک پہنچا تو میرے چچا آگئے انھوں نے وہ ورق پھٹا ہوا دیکھا تو مجھے مارا اور کہا کہ تو نے کیوں اسے اُدھیڑا اور کیوں پڑھا؛ میں نے کہا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے۔ چچا نے کہا کہ یہ نبی ابھی ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔)

[۱] LETTER BY MOHAMMAD FOUND GENUINE

AMMAN, APRIL 12 (RUTER).

A LETTER WRITTEN BY PROPHET MOHAMMAD TO A SEVENTH CENTURY BYZANTINE LEADER, HANDED DOWN TO JORDAN'S KING HUSSEIN BY HIS GRANDFATHER, HAS BEEN DECLARED GENUINE BY EXPERTS IN LONDON, THE KING ANNOUNCED.

THE LETTER, WRITTEN IN THE PROPHET'S OWN HAND ON GHAZELLE HIDE, CALLED ON EMPEROR HERECULIUS TO EMBRACE ISLAM.

THE KING SAID ON TELEVISION LAST NIGHT THAT IT WAS EXAMINED BY THE DEPARTMENT OF ORIENTAL MANUSCRIPTS AT THE BRITISH LIBRARY IN LONDON AND DECLARED GENUINE.

(باقی برصفحہ آئندہ)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وہی مکتوب گرامی (بنام ہرقل) ہے جس کے لیے مستشرق کیتانی (مولف حولیاتِ اسلام) نے اوّل تو یہ زور لگایا تھا کہ اس طرح کی سفارت بھیجے جانے کے واقعے ہی کو سرے سے بے بنیاد ثابت کرے، پھر اس خط کے اصلی ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔ مگر "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" وہی برٹش میوزیم، اور وہی اس کے "ماہرین" جو مکتوب بنام "نجاشی" کو کسی قوی اور قطعی دلیل کے بغیر جعلی قرار دے رہے تھے، وہ اب ہرقل عظیم روم کے نام دریافت شدہ مکتوب نبوی کے اصلی ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف اگر انھیں کوئی ضعیف ترین یا جعلی عبارت بھی ملتی ہے تو اُسے خوب بڑھا چڑھا کر اور اہمیت دے کر پیش کرتے ہیں، لیکن جس چیز سے تاریخ اسلام کے راویوں کی تصدیق و تائید ہوتی ہو اُس میں طرح طرح کے شبہات پیدا کرنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور مکتوب مبارک بنام کسریٰ پرویز بن ہُرمز بھی اپنی اصلی حالت میں دریافت ہو چکا ہے[1] اس کی اطلاع مئی ۱۹۶۲ء میں تمام اخباروں میں آ چکی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجّد جو عربی مخطوطات کے مستند عالم اور محقق ہیں، اُنھوں نے اس مکتوب کا عکس بیروت کے روزنامہ الحیاۃ (۲۲۔مئی ۱۹۶۲ء) میں چھاپا تھا۔ یہ خط بیروت کے سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون نے دمشق میں ڈیڑھ سو اشرفی کے عوض خریدا تھا۔ یہ مکتوب مبارک بھی جھلّی پر لکھا ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و فرامین کو محفوظ کرنے کا رجحان اسلامی تاریخ کے راویوں میں شروع ہی سے رہا ہے اس کے لیے یہاں صرف چند حوالے بطورِ نمونہ پیش کرنا کافی ہوگا:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہری بن الابیض کو جو دستاویز لکھ کر دی تھی اس کے بارے میں ابنِ سعد کہتا ہے:
فکتابہ عندھم الی الیوم (آپ کا خط اُن لوگوں کے پاس آج تک موجود ہے)[2]

۲۔ نجاشی بادشاہ حبشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط کو احتیاط سے محفوظ کرا دیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

THE LETTER WILL BE KEPT AT AL-HASHEMIYAH PALACE NEAR AMMAN UNTIL A SPECIAL MOSQUE IS BUILT WHERE THE FAITHFUL WILL BE ALLOWED TO SEE IT BY THEMSELVES.

KING HUSSEIN'S FAMILY IS DECENDED FROM THE PROPHET.

(INDIAN EXPRESS, NEW DELHI. APRIL 13, 1977.)

[1] اس کے بارے میں تفصیل دیکھو: محمد حمید اللہ: "رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی" دارالاشاعت کراچی ۱۹۸۰ء

[2] طبقات ابنِ سعد ۱/۲۵۹

ودعا بحُقٍّ من عاج فجعل فيه كتابَي رسول الله صلّى الله عليه وسلّم وقال: لن تزال الحبشة بخيرٍ ما كان هذان الكتابان بين أظهرها[۱]

اس نے ہاتھی دانت کا ایک صندوقچہ طلب کیا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط رکھے اور کہا کہ جب تک یہ دونوں مقدس خطوط حبشہ میں محفوظ رہیں گے یہ ملک خیریت سے رہے گا۔

۳۔ ہشام بن محمد السائب الکلبی کی روایت ہے کہ اُس سے بنو بُحتر کے ایک شخص نے بیان کیا کہ الولید بن جابر بن ظالم بن حارثہ بن عتّاب بن ابی حارثہ بن جُدی بن تدول بن بُحتر (قبیلہ بنو طے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تھے وہاں اسلام قبول کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں ایک خط لکھ کر دیا۔

هو عند أهله بالجبلين[۲]

وہ جبلین میں اُن کے خاندان والوں کے پاس موجود ہے۔

۴۔ الشّعیر بن عدّاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دستاویز لکھ کر دی تھی وہ اس کے بیٹے نے ابنِ سعد کے سلسلۂ رواۃ میں یحییٰ بن سلمان کو دکھائی تھی۔

عبد الله بن يحيى بن سلمان قال: أراني ابنٌ لِشّعَير بن عدّاء كتاباً من رسول الله صلى الله عليه وسلم[۳]

۵۔ الواقدی کا بیان ہے کہ اُس سے اہلِ دومۃ کے ایک شخص نے اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ خط دکھایا جو اُکیدر کو لکھا گیا تھا میں نے اُسے پڑھا اور اُسے نقل بھی کر لیا:

"حدثني شيخ من أهل دومة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كتب لأكيدر هذا الكتاب وجاء ني بالكتاب فقرأته وأخذت منه نسخته."[۴]

۶۔ الواقدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوب مبارک بھی دیکھا تھا جو آپ نے اہلِ اذرح کے نام لکھا تھا۔

"ونسخت كتاب أهل أذرح فاذا فيه ....."[۵]

۷۔ ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کو بنی عُقَیل کے ایک فرد نے اپنی قوم کے بڑے بوڑھوں کے حوالے سے بتایا کہ بنی عُقَیل کا وفد کے مُطرّف بن عبد اللہ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوئے تھے۔ آں حضرت نے سُرخ چمڑے پہ ایک تحریر لکھ کر مُطرّف کو دی تھی اور یہ تحریر مُطرّف کے پاس تھی جس کی رُو سے اس قبیلے کے افراد کو العقیق میں

---

[۱] طبقات ابنِ سعد ۱/۲۹۵ و ۱/۲۶۰
[۲] ایضاً ۱/۲۸۰
[۳] ایضاً ۱/۲۸۲
[۴] الطبقات الکبیر ۱/۲۸۸
[۵] ایضاً ۱/۲۹۰

جاگیر ملی تھی[1]

اسی طرح الرقاد بن عمرو بن ربیعہ کو آپ نے الفلج میں جاگیر دی تھی اور اس کے لیے ایک دستاویز لکھی تھی جو الکلبی کے وقت تک اُن لوگوں کے پاس محفوظ تھی[2]

۹- ہشام بن محمد بن السائب کلبی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس بن سلمہ کو جو خط لکھا تھا اس کی نقل میں نے حاصل کی تھی۔

"کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقیس بن سلمۃ کتاباً نسخته[3]"۔

۱۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیصرِ روم کے نام خط لکھا تو اصحاب نے کہا کہ جس خط پر مُہر نہ ہو اُسے یہ (ایرانی بادشاہ) نہیں پڑھتے، تب آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جو بیضوی شکل کی تھی اس میں اوپر اللہ درمیان میں رسول اور نیچے کی سطر میں محمد لکھا ہوا تھا۔ آپ خطوط و فرامین پر یہی مُہر لگایا کرتے تھے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ انگشتری سعید بن العاص حبشہ سے کندہ کرا کر لائے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ انگشتری خلفائے راشدین کے پاس محفوظ رہی۔ یہ حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ سے اریس کے کنوئیں میں گر گئی تھی اُنھوں نے اسے تلاش کرانے میں بہت مبالغہ کیا۔ لیکن نہیں ملی۔ آخر انھوں نے اس کنوئیں ہی کو پٹوا دیا[4]۔

۱۱- ۱۴ ربیع الاوّل ۳ھ کو کعب بن الاشرف یہودی کے قتل کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے جو معاہدہ کیا تھا وہ کاغذ بعد کو حضرت علیؓ کے پاس محفوظ تھا[5]

وکان ذلك الکتاب مع علی رضی اللہ عنہ بعد۔

ان چند مثالوں سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات اور فرامین کو محفوظ رکھنے کا ابتدا سے اہتمام کیا گیا۔ ڈیڑھ ہزار برس کے تاریخی انقلابات کے باوجود آج بھی آپ کے چار مکتوب اپنی اوریجنل حالت میں دستیاب ہیں۔ متفرق کتب تاریخ و سیرۃ کے علاوہ مکتوبات و فرامینِ نبوی سے متعلق جو مستقل کتابیں تالیف ہوئیں اور اب دستیاب ہیں ان میں چند یہ ہیں:

۱- اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین (عربی): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات کا یہ مجموعہ ابن طولون نے مرتب کیا تھا اور دمشق سے شائع ہوا۔

۲- صبح الاعشی (عربی) القلقشندی جلد ششم

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/۳۱۲ [2] ایضاً ۱/۳۰۳ [3] ایضاً ۱/۳۲۵

[4] اس کی تفصیل کے لیے میرا مضمون "ابنِ سعد اور طبقات ابن سعد" ملاحظہ ہو۔ [5] الطبقات الکبیر ۲/۳۱-۳۴

۳۔ زاد المعاد (جلد سوم) مولفہ ابن القیم

۴۔ المواھب اللدنیہ (جلد دوم) مولفہ القسطلانی

۵۔ رسالات نبویہ (اردو) مولفہ عبدالمنعم خاں ۔ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۳۳۹ء

۶۔ بلاغ مبین (اردو) مولفہ محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۔ ندوۃ المصنفین دہلی

(مطبوعہ خواجہ پریس دہلی)

۷۔ مکتوبات نبوی (اردو) سید محبوب رضوی

ادارہ اسلامیات لاہور ۱۹۷۸ء

۸۔ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ (عربی) مولفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ
یہ کتاب عہد نبوی کی دستاویزوں کے عربی متن پر مشتمل ہے اور ۱۹۴۲ء میں پہلی بار مصر سے شائع ہوئی ۔ پھر اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں ۔ اردو میں اس کا ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات" کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے ۔

(۳)

جیسا کہ ہم نے ابتداً میں اشارہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (۲۵۰ سے زاید) مکاتیب اور وثائق مختلف مصادر میں ملتے ہیں اور یکجا سب سے زیادہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی قابلِ قدر کتاب الوثائق السیاسیہ میں دیے گئے ہیں ۔ ہم نے یہاں خاص طور پر نقوش کے سیرۃ نمبر کے لیے ان میں سے بعض اہم خطوط اور دستاویزوں کا انتخاب کر کے اُن کا متن درج کر دیا ہے ۔ بیشتر متون طبقات ابن سعد کے حوالے سے درج ہوئے ہیں ۔ یہاں اِن خطوط اور دستاویزوں کے اردو ترجمہ سے متعلق بھی دو باتیں عرض کرنا ضروری ہیں ۔ "سیاسی وثیقہ جات" کے نام سے جو اُردو ترجمہ ان دستاویزوں کا مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں :

"اس کا اردو ترجمہ سیاسی وثیقہ جات کے نام سے کسی صاحب نے مجھے مسودہ بتائے بغیر طباعت اول کی اساس پر چھاپا ہے ۔ بدقسمتی سے اصل کی ساری خصوصیتیں (مآخذ، اشاریہ وغیرہ) حذف کر دی گئی ہیں ۔ ترجمے کی صحت کا بھی میں ذمہ دار نہیں ہوں ۔"

(رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۳۱۱)

دوسری کتاب سید محبوب رضوی کی مولفہ مکتوبات نبوی جو پہلے دیوبند سے پھر ادارہ اسلامیات لاہور سے چھپی ہے اس میں عربی متن نہیں ہے صرف ترجمہ دیا گیا ہے ۔ میں نے اس ترجمہ کا متن سے مقابلہ کیا تو مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ اکثر ناقص اور بعض مواقع پر گمراہ کن ہے اس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لیے میں نے ازسرِ نو ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن یہ کلاسیکی عربی ایک خاص انداز و اسلوب کی ہے اور معاملہ ایک ایسی عظیم شخصیت سے

نسبت کا ہے کہ ترجمہ مکمل احتیاط اور صحت کے ساتھ ہونا چاہیے اس کے لیے جو وقت درکار تھا وہ میرے پاس نہیں تھا اس کے لیے میں بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہاں جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ ہر طرح قابلِ استناد ہے، لیکن اتنا کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں ترجموں سے قدرے بہتر اور زیادہ صحیح ہوگا۔

نثار احمد فاروقی

یکم ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ
شعبہ عربی
دہلی یونیورسٹی دہلی

الرِّسالاتُ النَّبَوِیَّہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ذی الحجہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپس ہوئے تو آپ نے پڑوسی ملکوں کے چھ بادشاہوں کے نام خطوط لکھوائے۔ اصحاب نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! بادشاہ ایسے خطوط نہیں پڑھتے جن پر مُہر لگی ہوئی نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دن چاندی کی ایک انگوٹھی تیار کرائی جس کا نگینہ بھی چاندی کا تھا اور اس پر تین سطروں میں محمد رسول اللہ اس طرح لکھوایا:



پھر خطوط کے آخر میں یہی مُہر لگائی اور ایک ہی دن میں چھ قاصدوں کو چھ خط دے کر مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ یہ ابتدائے محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

ان قاصدوں میں سب وُہ تھے جو اُس ملک کی زبان سے بھی واقف تھے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک لے کر جا رہے تھے[1]

۱۔ النجاشی کے نام سب سے پہلے حضورؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو حبشہ کے فرمانروا النجاشی کی طرف روانہ کیا اور النجاشی کے نام دو خطوط لکھوائے، ایک میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی اور قرآن شریف کی آیات پیش کی تھیں۔

ملکُ النجاشی نے حضورؐ کا نامۂ مبارک وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور از راہِ احترام اپنے تخت سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ ایمان لے آیا اور حق کی شہادت دی۔ اور کہا کہ اگر مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی استطاعت ہوتی تو ضرور قدمبوس ہوتا۔

پھر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا جواب لکھا جس میں حضورؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور جعفر بن ابی طالب کے

---

[1] ابنِ سعد ۱/۲۵۸

[2] کتاب الوثائق ۲/۳۴/۲۵، ۲۷۵ ۔ تاریخ الطبری ۳/۳۰

ہاتھ پر اپنے اسلام کا اظہار کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب نجاشی کے انتقال کی خبر آئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ رنج و حُزن کیا اور اُس کی غائبانہ نمازِ جنازہ چار تکبیروں کے ساتھ پڑھی تھی۔ مسلم وغیرہ کی روایت ہے کہ یہ دُوسرا نجاشی تھا جس کی نماز پڑھی تھی۔

دُوسرے خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے النجاشی کو حکم دیا تھا کہ اُم حبیبہ بنت ابی سفیان سے آپؐ کا عقد کرے۔ اُم حبیبہؓ اپنے شوہر عُبید اللہ بن جحش الاسدی کے ہمراہ حبشہ کو ہجرت کر گئی تھیں ان کا شوہر وہاں جا کر عیسائی ہوگیا تھا اور مر گیا تھا۔ اس خط میں آں حضرتؐ نے یہ بھی حکم دیا کہ جو اصحاب ہجرت کرکے وہاں گئے ہیں انھیں سوار کرا کر واپس بھیج دے۔ النجاشی نے دونوں احکام کی تعمیل کی۔ اُم حبیبہ بنت ابی سفیان سے چار سو دینار مہر کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح کرا دیا اور مسلمانوں کو سفر کی تیاری کے لیے تمام ضروری سامان دے کر دو کشتیوں میں سوار کرا دیا۔ ان کے ساتھ عَمرو بن اُمیہ الضمری بھی تھے۔ (کتاب الوفا ۲/۷۳۶)

پھر اس نے ہاتھی دانت کا ایک ڈبہ طلب کیا اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں خطوط حفاظت سے رکھ دیے اور یہ کہا کہ جب تک یہ دونوں خطوط ہمارے درمیان رہیں گے حبشہ تمام آفات سے محفوظ رہے گا۔ النجاشی کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب الطبری، ابن القیم، قسطلانی اور القلقشندی نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیا ہے۔ متن میں بعض الفاظ کم و بیش ہیں۔ اس کی بحث ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" میں ملے گی۔ یہ اصل خط دریافت ہو چکا ہے اور اس کے مطابق صحیح متن یہ ہے:

بسم الله الرحمٰن الرحيم

من محمد رسول الله الى النّجاشي عظيم الحبشه سلام على من اتّبع الهُدى امّا بعد فأنى أحمد اليك الله الّذى لا إلٰه إلّا هو الملك القدّوس السّلام المؤمن المهيمن وأشهد أنّ عيسٰى بن مريم روح الله وكلمته ألقاها إلى مريم البتول الطّيّبة الحصينت فحملت بعيسٰى من روحه ونفخه كما خلق آدم بيده وإنّى أدعوك إلى الله وحده لاشريك له والموالاة على طاعته وان تتبعنى وتوقن بالّذى جاءنى، فانّى رسول الله وإنّى أدعوك وجنودك إلى الله عزّ وجلّ وقد بلّغتُ ونصحتُ فاقبل نصيحتى والسّلام على من اتّبع الهُدى [1]

الله
رسول
محمد

[نیز طبقات ابن سعد ۳/ ۱۵]

---

[1] اس خط میں بعض الفاظ کا املا غریب ہے اس کی بحث محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" ص ۱۲۸ - ۱۲۹ پر ملے گی۔

ترجمہ: [محمد رسول اللہ کی طرف سے النجاشی عظیم حبشہ کے نام۔ سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ امّا بعد میں تمھارے سامنے اس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ملک، قدّوس، سلام، مومن اور مہیمن ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسٰی بن مریم روح اللہ ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے پاک عفّت مآب مریم پر اِلقا کیا تو وہ اللہ کی روح اور اس کے نفخ سے عیسٰی سے حاملہ ہوئیں، جیسے اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں تمھیں اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور اس کی طاعت پر دوستی کی طرف اگر تم میری پیروی کرو گے اور میرے پیغام پر یقین کرو گے تو میں اللہ کا رسول ہوں تمھیں اور تمھارے لشکر کو اللہ عزّ وجل کی طرف بلاتا ہوں میں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کر دی ہے پس میری خیر خواہی کو قبول کرو اور سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔]

اس خط کا نجاشی نے یہ جواب دیا:

إلى محمد رسول الله من النّجاشي سلامٌ عليك يا نبي الله و رحمة الله و بركاته الّذي لا إله الّا هو الّذي هداني الى الاسلام أمّا بعد فقد بلغني كتابك يا رسول الله فيما ذكرت من أمر عيسٰى فورب السّماءِ والارض إنّ عيسٰى عليه السّلام ما زاد على ما ذكرتَ ثفروقاً و إنّه كما قُلتَ وقد عرفنا ما بعثتَه إلينا وقدم ابنُ عمّك و أصحابُه واشهد انّك رسول الله وقد بايعتكَ و بايعتُ ابن عمّك و أسلمتُ على يديه لله ربّ العالمين وقد بعثت إليك بابني و إن شئت أن آتيك فعلتُ يا رسول الله فانّي أشهد أنّ ما تقول حقٌّ والسّلام عليك و رحمة الله و بركاته۔ [الوفا ۲/۷۳۵]

ترجمہ: [محمد رسول اللہ کے نام نجاشی کی طرف سے۔ اے نبی اللہ! آپ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکات ہوں اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی طرف ہدایت دی ہے۔ امّا بعد اے رسول اللہ آپ کا خط میرے پاس پہنچا آپ نے جو عیسٰی علیہ السلام کا ذکر کیا ہے تو آسمان اور زمین کے رب کی قسم عیسٰی علیہ السّلام نے بھی اُس پر ذرّہ بھر زیادہ نہیں کیا اور وہ ایسے ہی ہیں جو آپ نے فرمایا آپ نے جو دعوت بھیجی ہے اسے ہم نے جان لیا آپ کے چچا زاد بھائی اور ان کے ساتھی آئے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ میں نے آپ کی بیعت کی اور آپ کے چچا زاد بھائی کے ہاتھ پر بیعت کی اللہ رب العالمین کے واسطے۔ میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں اور آپ حکم دیں تو میں خود بھی حاضر ہو سکتا ہوں میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں سچ ہے۔ والسّلام]

مورخین کہتے ہیں کہ النجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور اس کے انتقال کی خبر ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی تھی۔ آپؐ نے نجاشی کو ایک اور خط کچھ تحفوں کے ساتھ بھیجا تھا جس کا متن ابن اسحٰق کے حوالے سے بیہقی وغیرہ نے

دیا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ھذا کتاب من محمد النبی الی النجاشی الأصحم عظیم الحبشۃ۔ سلامٌ علٰی من اتبع الھدٰی و اٰمن باللہ ورسولہ و أشھد أن لا إلٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ لم یتخذ صاحبۃ ولا ولدًا و أنّ محمّدًا عبدہٗ ورسولہ و أدعوك بدعایۃ الاسلام فانّی أنا رسولہ فأسلم تَسْلَم۔ یا أھل الکتاب تعالوا إلی کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم ألّا نعبدَ إلّا اللہ و لا نُشرك بہ شیئًا و لا یتّخذَ بعضنا بعضًا اربابًا مّن دون اللہ فان تولّوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون فان أبیتَ فعلیك إثم النصاری من قومك[1]



یہ خط پیغمبر محمدؐ کا حبشیوں کے سردار نجاشی اصحم کے نام ہے سلامتی اس شخص کے لیے ہے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں، وُہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اس کی نہ بیوی ہے نہ بچّہ۔ اور یہ بھی کہ محمدؐ اسی کا بندہ اور رسول ہے۔ میں تجھے اسلام کے بُلاوے کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اُسی کا رسول ہوں۔ اسلام لا، تو سلامت رہے گا۔ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات پر ہم تم جمع ہو جائیں جو ہمارے درمیان مشترک ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پُوجا نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی آپس ہی میں سے کسی کو اللہ کے سوا معبود نہ بنائے اگر وُہ پلٹ جائیں تو کہہ دو کہ ہم تو مسلمان ہیں اور اگر تم انکار کرو گے تو تمام نصرانی قوم کا وبال تمھاری گردن پر رہے گا۔

۲۔ قیصرِ روم کے نام اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دِحیہ بن خُلیفہ الکلبی کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک تھے) قیصرِ روم کی طرف اپنے نامۂ مبارک کے ساتھ بھیجا اور حکم دیا کہ یہ خط بُصرٰی[2] کے حاکم کو دے دیں تاکہ وہ اِسے قیصرِ روم کے پاس بھجوا دے۔ اُس زمانے میں قیصر شہر حمص[3] میں تھا۔ والیِ بُصرٰی نے وہ خط وہاں بھجوا دیا۔

---

[1] رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۲۰ - ۱۳۱

[2] بُصرٰی شام میں دمشق کے اعمال میں سے ہے [معجم البلدان ۱/۴۴۱ طبع بیروت دار صادر]

[3] حمص دمشق اور حلب کے درمیان نصف راہ پر واقع ہے۔

[معجم البلدان ۲/ ۳۰۲ - ۳۰۴]

اس کا سبب یہ تھا کہ قیصرِ روم نے ایک مَنّت مانی تھی کہ اگر روم کو ایران پر غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ قسطنطنیہ[1] سے ایلیا[2] تک پا پیادہ زیارت کے لیے جائے گا۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ اپنی یہ نذر پوری کر رہا تھا۔

قیصر نے آں حضرتؐ کا نامۂ مبارک پڑھا اور روم کے بڑے بڑے امراء جو اس کے ہمرکاب تھے انھیں حمص میں اپنی بارگاہ میں باریاب کیا اور کہا:

"اے اہلِ روم! کیا تم رُشد و فلاح چاہتے ہو تاکہ تمھارا ملک تمھارے لیے باقی رہے اور تم اس کی پیروی کرتے ہو جو عیسیٰ بن مریم نے کہا ہے؟"

رومیوں نے کہا: جہاں پناہ! وہ کیا ہے؟

بادشاہ: کیا تم اُس نبیِ عربی کی پیروی کرو گے؟

اس پر وہ سب وحشی گدھوں کی طرح بِدک گئے اور رینکنے لگے، اُنھوں نے صلیبیں بلند کر لیں۔ جب ہرقل نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو اُن کے اسلام لانے سے مایوس ہو گیا اور اُسے اُن کے سامنے اپنی جان اور اپنی سلطنت خطرے میں دکھائی دینے لگی۔ اس نے ان اُمراء کو اطمینان دلایا اور کہا:

"میں نے جو کچھ تم سے کہا وہ صرف تمھاری آزمائش کے لیے تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم اپنے دین میں کتنے پکے ہو۔ چنانچہ میں نے تمھیں ویسا ہی پایا جیسا میں چاہتا تھا۔"

یہ سُن کر وہ سب امراء سجدے میں گر پڑے۔[3]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ محمّدٍ عبدِ اللہ و رسولہٖ إلیٰ هِرَقْل عظیم الرُّوم سلامٌ علیٰ من اتّبع الهُدیٰ، امّا بعد فانّی أدعوك بدعایۃ الاسلام أسْلِم تَسْلَم یؤتك اللہ أجرَكَ مرّتَیْنِ فان تَوَلّیْتَ فعلیك إثمُ الاریسیّین: ﴿ویَا أهْلَ الکتابِ تَعَالَوْا إلیٰ کَلِمَۃٍ سواءٍ بیننا وبینکم الا نعبد إلّا اللہ ولا نُشْرِك بهٖ شیئًا ولا یتّخذَ بعضُنا بعضًا أربابًا مِّنْ دُونِ اللہ فانْ تولّوا فقولوا اشهدوا بأنّا مسلمون﴾" [کتاب الوفا ۲/۴۴ - الجامع الصحیح للبخاری]

ترجمہ: [اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف سے ہرقل بادشاہ روم کی طرف سلام ہو اس پر

---

[1] بادشاہ روم کا مستقر آج کل استنبول کہلاتا ہے۔ [معجم البلدان ۴/۳۴۸]

[2] ایلیاء بیت المقدس (یروشلم) کا قدیم نام۔ ایلیاہ کے معنی ہیں بیت اللہ۔ [معجم البلدان ۱/۲۹۳-۲۹۴]

[3] طبقات ۱/۲۵۹ - کتاب الوفا لابن الجوزی ۲/۲۰-۳۲

محمد حمید اللہ: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۱۷۳-۱۷۸

جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد میں تمھیں اسلام لانے کی دعوت دیتا ہوں اسلام لے آؤ تو سلامت رہو گے اللہ تمھیں دوگنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر روگردانی کرو گے تو اریسیوں کا گناہ بھی تمھارے سر ہوگا اے اہلِ کتاب اس کلمہ کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے کسی چیز کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کچھ لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو اختیار نہیں کریں گے، اگر وہ پلٹ جائیں تو تم کہہ دینا کہ گواہ رہو ہم مسلمان ہیں۔[1]

۴۔ کسریٰ بن ہرمز کے نام

انھیں چھ قاصدوں میں سے ایک عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی بھی تھے انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط دے کر ایران کے شہنشاہ کسریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس خط میں کسریٰ کو اسلام کی دعوت دی تھی[2]

عبداللہ بن حذافہ کا بیان ہے کہ میں نے اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا وہ اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر اُس نے اُسے (پڑھنے والے کے ہاتھ سے) لے کر پھاڑ دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بات بیان ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ:

اَللّٰھُمَّ مَزِّقْ مُلْکَہٗ (اے اللہ! اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے)

کسریٰ نے یمن میں اپنے گورنر باذان کو لکھا کہ وہ اپنے پاس سے دو تگڑے آدمی اس شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حجاز میں بھیج دے تاکہ وہ اسے گرفتار کر کے میرے پاس لے آئیں۔ چنانچہ باذان نے اپنے قہرمان[3] کو اور ایک اور شخص کو بھیجا ان کے نام بابویہ اور خرخسرہ بتائے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ ایک خط بھی دیا۔ یہ مدینہ آئے اور باذان کا خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اسے دیکھ کر آں حضرت مسکرائے اور اُن دونوں کو اسلام لانے کی دعوت دی۔ اُس وقت اُن دونوں پر لرزہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِرْجِعَا عَنِّیْ یَوْمَکُمَا ھٰذَا حَتّٰی تَأْتِیَانِی الْغَدَ فَاُخْبِرُکُمَا بِمَا اُرِیْدُ[4]	آج تو تم دونوں چلے جاؤ کل پھر میرے پاس آنا اُس وقت میں تمھیں بتاؤں گا کہ میرا ارادہ کیا ہے!

یہ دونوں اگلے دن آئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۷۳۲

[2] معجم البلدان ۵/۴۴۷ - ۴۴۸

[3] داخل خارج کا انچارج یا ٹیکس کلکٹر، اس کا نام الطبری اور کتاب الوفا میں بابویہ بتایا گیا ہے۔

[4] طبقات ۱/۲۶۰ کسریٰ بن ہرمز کے لیے دیکھو الطبری ۲/۱۷۶ - ۲۰۸

أَبْلِغَا صَاحِبَكُمَا أَنَّ رَبِّيْ قَدْ قَتَلَ رَبَّهُ كِسْرٰى فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ لِسَبْعِ سَاعَاتٍ مَضَتْ مِنْهَا۔

تم دونوں اپنے آقا تک یہ پیغام پہنچا دو کہ میرے رب نے اُس کے خداوند کسریٰ کو آج رات سات گھڑی گئے ہلاک کر دیا ہے۔

اور یہ منگل کی رات تھی۔ جمادی الاولیٰ کی دسویں یا تیرھویں تاریخ اور ۷ھ (۶۲۸ء)۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَ أَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى سَلَّطَ عَلَيْهِ ابْنَهُ شِيْرَوَيْهِ فَقَتَلَهُ۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا جس نے اسے قتل کر دیا۔

یہ سُن کر وہ دونوں باذان کے پاس آئے۔ وہ اسلام لے آیا اور دوسرے ابنائے فارس بھی جو یمن میں تھے مسلمان ہو گئے[1] نامۂ مبارک کا متن یہ ہے:

بسم الله الرحمٰن الرحيم[2]

من محمد عبد الله ورسوله إلى كسرى عظيم فارس سلامٌ على من اتّبع الهدٰى وآمن بالله ورسوله وشهد أن لا إلٰه إلّا الله وحدهٗ لا شريك له وأن محمدًا عبدهٗ ورسوله۔ ادعوك بدعاية الله فانّني انا رسول الله إلى الناس كافّةً لأنذر من كان حيًّا ويحق القول على الكافرين أسلم تسلم فان ابيته فانّما عليك إثم المجوس۔

الله
رسول
محمد

ترجمہ: [اللہ کے بندے اور رسول کی طرف سے کسریٰ عظیم فارس کے نام۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں تمھیں اللہ کی دعوت

---

[1] یہاں لفظ ابناء استعمال ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آیا ہے جو فارسی نسل کے تھے اور اہلِ حبشہ کو وہاں سے نکالنے کے بعد یمن میں آباد ہو گئے تھے۔ سیر ومغازی کے مشہور راوی وَہب بن مُنبّہ انھیں ابناء میں سے تھے۔ ان کے والد اسلام لائے تھے اور یہ ابناء اسی واقعہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

[2] یہ متن اصل کے عکس سے لیا گیا ہے اور نہایت خفیف فرق کے ساتھ وہی ہے جو کتاب الوفاء (۲/۷۳۲) میں ملتا ہے۔ الطبری ۳/۹۰ میں اس کا متن قدرے مختلف ہے۔

کی طرف بلاتا ہوں کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں جسے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں زندوں کو (آخرت سے) ڈراؤں، اور یہ بات کافروں پر بہت گراں ہے تم اسلام قبول کرو سلامت رہو گے اور اگر سرکشی کرو گے تو سارے آتش پرستوں کا عذاب تمھاری گردن پر ہوگا۔]

۴۔ مقوقس کے نام

اور حدیبیہ سے واپس آکر ذی قعدہ ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن ابی بلتعۃ اللخمی کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک تھے) قبطیوں کے سردار اور اسکندریہ[1] کے والی مقوقس کے پاس بھیجا اسے اسلام لانے کی دعوت دی تھی اور اس کے نام ایک خط تحریر فرمایا۔ جب اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچایا گیا، اس نے پڑھا اور کوئی کلمۂ خیر کہا اور خط کو لے کر ایک ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھ کر اسے سربند کیا اور اپنی کنیز کے سپرد کر دیا۔ مگر ایمان نہیں لایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لکھا:

قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ نَبِيًّا قَدْ بَقِيَ وَكُنْتُ اَظُنُّ اَنَّهُ يَخْرُجُ بِالشَّامِ وَقَدْ اَكْرَمْتُ رَسُوْلَكَ وَبَعَثْتُ اِلَيْكَ بِجَارِيَتَيْنِ لَهُمَا مَكَانٌ فِي الْقِبْطِ عَظِيْمٌ وَقَدْ اَهْدَيْتُ لَكَ كِسْوَةً وَبَغْلَةً تَرْكَبُهَا[2]	میں جانتا تھا کہ ایک نبی کی آمد ابھی باقی ہے مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا۔ میں نے آپ کے قاصد کا اکرام کیا ہے اور اس کے ہمراہ آپ کے لیے دو ایسی باندیاں[3] بھیج رہا ہوں جنھیں قبطیوں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ میں نے آپ کے لیے کچھ لباس اور ایک خچر[4] بھی بطور ہدیہ بھیجا ہے جس پر آپ سواری فرمائیں۔

ابن الجوزی کا بیان ہے کہ مقوقس نے چار باندیاں ہدیہ میں بھیجی تھیں۔

---

[1] معجم البلدان ۱/۱۸۲-۱۸۹، الطبری ۴/۱۰۸، الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۷۱۷

[2] ابن سعد ۱/۲۶۰

[3] ان دو کنیزوں میں ایک اُم المومنین حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جن کے بطن مبارک سے حضرت ابراہیم بن محمدؐ بن عبداللہ پیدا ہوئے اور سولہ ماہ کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ ان کے انتقال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت دلگیر ہوئے تھے اور فرمایا تھا:

"انّ العین تدمع و القلب یحزن و لا نقول الاّ ما یُرضی ربنا و انّا بفراقک یا ابراهیم لمحزونون۔" (الوفا ۲/۶۴۱)

دوسری حضرت ماریہ کی بہن حضرت سیرین قبطیہ تھیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا تھا۔

[4] یہ خچر سفید رنگ کا تھا اور اُس وقت تک عرب میں اس کے سوا کوئی خچر نہیں آیا تھا۔ اس کا نام دُلدُل تھا (ابن سعد ۱/۲۶۰)۔ یہ امیر معاویہ کے زمانے تک موجود تھا (کتاب الوفا ۲/۷۱۷)

اس کا جواب دیکھ کر آں حضرتؐ نے فرمایا :

ضَنَّ الْخَبِيْثُ بِمُلْكِهِ وَلَا بَقَاءَ بِمُلْكِهِ ۔ (الوفا ۲/ ۷۱۰)

خبیث نے اپنی حکومت کی وجہ سے اپنا دامن بچایا اور اس کے ملک کو رہنا نہیں ہے ۔

حاطب بن ابی بلتعہ کہتے ہیں کہ اس نے ہماری خوب خاطر مدارات کی، باریاب ہونے کے لیے ہمیں اس کے ڈیوڑھی پر زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑتا تھا مگر میں اس کے پاس پانچ دن سے زیادہ نہیں رہا۔

مقوقس کے نام اس خط کی اصل دریافت ہو چکی ہے، جس کا متن یہ ہے :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد عبد اللهِ ورسوله إلى مقوقس عظيم القبط سلامٌ على من اتّبع الهدٰى اما بعد : فإنّي أدعوك بدعاية الإسلام فأسلم تسلم يؤتك اللهُ اجرك مرّتين فان توليت فعليك اثم القبط ـ يا اهلَ الكتابِ تعالَوْا إلى كلمةٍ سواءٍ بيننا وبينكم ألّا نعبدَ إلّا اللهَ ولا نُشْرِكَ بِهِ شيئاً ولا يتّخذَ بعضُنا بعضاً أرباباً مِنْ دونِ اللهِ فانْ تولّوا فقولوا اشهدوا بأنّا مُسلمون[1]



[نیز مواہب اللدنیہ ۳/ ۲۴۷]

ترجمہ : [محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی جانب سے مقوقس عظیم قبط کے نام۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد : میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں ۔ اسلام لے آؤ سلامت رہو گے اور اللہ تمھیں دوگنا اجر دے گا اور اگر روگردانی کرو گے تو قبطیوں کا عذاب تمھاری گردن پر ہو گا۔ اے اہلِ کتاب اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہیں کریں گے اور نہ اس کا شریک کسی کو ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کچھ لوگ کچھ لوگوں کو اللہ کے برابر بنائیں گے ۔ اگر وہ روگردانی کریں تو تم گواہی دو کہ ہم مسلمان ہیں۔]

۵ ۔ الحارث بن ابی شمر الغسانی کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شجاع بن وہب الاسدی کو (جو چھ قاصدوں میں سے ایک ہیں) الحارث بن ابی شمر

---

[1] اس خط کا عکس ایک تفصیلی بیان کے ساتھ فرنچ مستشرق REINAUD نے جرنال ایشیاٹک (۱۸۵۴ء) میں شائع کرایا تھا۔ اس مضمون کی تلخیص ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے دی ہے (رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۱۵۰ و بعد) اصل مکتوب سلطان عبدالمجید والیِ ترکی نے تین سو اشرفیوں میں خرید کر اپنے محل میں محفوظ کر لیا تھا اور یہ اب ترکی کے توپ کاپی میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے ۔

الغسانیؓ کے پاس بھیجا اُس کے نام ایک مکتوب مبارک دیا اور اُسے قبولِ اسلام کی دعوت دی۔

شجاعؓ نے کہا : جب میں اُس کے پاس پہنچا تو وہ دمشق[2] کے نخلستان میں تھا اور قیصر کو اپنا مہمان بنانے کے انتظامات میں مشغول تھا جو حمص سے ایلیا (بیت المقدس) آیا ہوا تھا' میں دو یا تین دن تک اس کی ڈیوڑھی پر ٹھہرا رہا پھر اُس کے حاجب سے کہا :

"میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قاصد ہوں' جسے اُس کے پاس بھیجا گیا ہے۔"

حاجب نے کہا :

"تم اس سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ مگر فلاں' فلاں دن جب وہ برآمد ہوگا۔"

اُس حاجب نے، جس کا نام مُرّی تھا اور وہ رومی تھا، مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوالات کرنے شروع کیے۔ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا' اور یہ بتایا کہ وہ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں، تو وہ پگھل گیا حتیٰ کہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا اور بولا : میں انجیل پڑھتا ہوں اور میں نے اس پیغمبر کی یہی صفات اُس میں دیکھی ہیں، میں اس پر ایمان لاتا ہوں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ مگر مجھے الحارث سے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔

اس نے میری بہت خاطر مدارات کی اور بہت اکرام کیا۔ ایک دن الحارث برآمد ہوا، مسند پر آکر بیٹھا اور تاج اس کے سر پہ رکھا گیا۔ اس وقت مجھے باریاب کیا گیا۔ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دیا۔ اس نے پڑھا اور پھینک دیا۔ پھر بولا : مجھ سے میرا ملک کون چھین سکتا ہے ؟ میں اس کی طرف جاؤں گا، اگر وہ یمن میں بھی ہے تو وہیں پہنچوں گا۔ اسی طرح وہ اپنے جانے کا وقت متعین کرتا رہا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور حکم دیا کہ گھوڑوں کے نعل باندھے جائیں۔ پھر کہا : "اپنے آقا سے کہہ دینا جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔"

پھر قیصر کو خط لکھا اُسے میرے آنے کے بارے میں اور اپنے جواب سے متعلق آگاہ کیا۔ قیصر نے اسے جواب میں لکھا :

"تم اس کی طرف مت جاؤ، اسے نظر انداز کر دو اور مجھ سے ایلیا میں آکر ملو۔"

جب قیصر کا جواب آیا تو مجھے پھر بلایا اور کہا :

"تم کب تک اپنے سردار کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو ؟"

میں نے کہا : کل۔ پھر اس نے میرے لیے سَو مثقال سونے کا حکم جاری کیا اور پھر مجھے مُرّی ملا اس نے میرے لیے زادِ راہ اور لباس کا حکم دیا اور کہا :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا سلام کہنا۔"

میں جب آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کو آگاہ کیا تو فرمایا :

---

[1] کتاب الوفا باحوال المصطفیٰ لابن الجوزی ۲/ ۷۳۷ - ۷۳۸

[2] معجم البلدان ۲/ ۴۶۳ - ۴۷۰

بَادَ مُلْکُہٗ۔ (اس کا ملک ویران ہوگیا)

جب میں نے مُری کا سلام عرض کیا اور اس کے بارے میں آں حضرتؐ کو بتایا تو فرمایا:

صَدَقَ۔ (اُس نے سچ کہا)

الحارث بن ابی شمر نے عام الفتح میں انتقال کیا۔[1]

۶۔ ہَوذہ بن علی الحنفی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سَلیط بن عَمرو العامری کو (جو اُن چھ قاصدوں میں سے ایک ہیں) ہَوذہ بن علی الحنفی گورنر یمامہ کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے بھیجا اور ایک خط بھی دیا۔ یہ وہاں پہنچے اور باریاب ہوئے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا اور اُسے اِس طرح رَدّ کیا جسے رَدّ کرنا بھی نہیں کہہ سکتے اور رسول اللہؐ کو لکھا:

"کیا ہی اچھی بات ہے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔ میں اپنی قوم کا شاعر اور خطیب ہوں۔ عرب میرے مرتبہ سے مرعوب ہیں۔ مجھے آپ کوئی عہدہ دے دیجئے تو میں آپ کا پیرو ہو جاؤں۔"

پھر اس نے سَلیط بن عَمرو کو انعام دیا، خلعت پہنایا جو ہَجَر[2] کا بُنا ہوا تھا۔ وہ یہ سب چیزیں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور انھیں اس کی گفتگو سے مطلع کیا۔ آں حضرتؐ نے اس کا خط پڑھا اور فرمایا:

لَوْ سَأَلَنِیْ سِیَابَۃً مِّنَ الْاَرْضِ مَا فَعَلْتُ بَادَ وَبَادَ مَا فِیْ یَدَیْہِ۔	اگر وُہ مجھ سے ذرا سی بنجر زمین بھی مانگے تو میں نہیں دُوں گا، وہ خود بھی تباہ ہوا اور جو کچھ اس کے قبضے میں ہے وُہ بھی گیا۔

جب آپؐ عام الفتح سے واپس ہوئے تو جبریل علیہ السلام آئے اور اُنھوں نے آپؐ کو بتایا کہ وُہ مر چکا ہے۔

۷۔ جَیفَر و عَبد بنی الجُلَندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن العاص کو ذی قعدہ ۸ھ میں جَیفَر اور عَبد بن الجُلَندی[3] کے پاس عمان بھیجا۔ یہ دونوں قبیلہ ازد سے تھے، اور یہ دونوں اپنے باپ جَیفَر بن الجلندی کی وفات کے بعد مشترک طور پر حکمران ہوئے تھے۔ ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی۔ عَمرو کے ہاتھ ان دونوں کے لیے ایک خط بھیجا اور اسے سربند کر دیا۔

عَمرو نے بیان کیا، جب میں عُمان پہنچا تو میں نے عَبد سے ملنے کا ارادہ کیا وہ ان دونوں میں سب سے زیادہ بُردبار اور اچھے اخلاق والا تھا۔

---

[1] ابن سعد ۱/۲۶۱ - کتاب الوفا ۲/۷۳۷

[2] ہَجَر بروزن خبر معجم البُلدان ۵/۲۹۳ - الوفا باحوال المصطفیٰ ۲/۷۳۸ - تاریخ الطبری ۲/۶۴۴ - ۶۴۵

[3] الطبری ۳/۲۹ میں نام عبّاد دیا گیا ہے۔ کتاب الوفا باحوال المصطفیٰ لابن الجوزی الجزء الثانی ص ۷۴۱

میں نے کہا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں جسے تمھارے پاس اور تمھارے بھائی کے پاس بھیجا گیا ہے۔"
اس نے کہا: "میرا بھائی عمر میں مجھ سے بڑا اور ملک میں زیادہ حقدار ہے میں تمھیں اس کے پاس پہنچا دوں گا تاکہ وہ تمھارا خط پڑھ لے۔"

میں چند روز اس کی ڈیوڑھی پر انتظار میں رہا۔ پھر اس نے مجھے بلایا، میں پہنچا اور سربند خط حوالے کیا۔ اس نے لفافے کی مُہر توڑی اور خط کو آخر تک پڑھا، پھر اپنے بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے بھی اُسی طرح آخر تک پڑھا، البتہ میں نے اُس کے بھائی کو اُس سے زیادہ نرم دل پایا۔ کہنے لگا:

"آج تو مجھے چھوڑ دو، کل میرے پاس آؤ۔"

اگلے دن میں گیا، بولا:

"تم نے جو مجھے دعوت دی ہے اس پر میں نے سوچ بچار کیا، اگر جو کچھ میرے پاس ہے وہ میں کسی شخص کے حوالے کر دوں تو گویا میں عرب کا سب سے کمزور آدمی ہوں!"

میں نے کہا "تو میں کل جا رہا ہوں۔"

جب اسے میرے جانے کا یقین ہو گیا تو صبح ہونے پر اس نے مجھے طلب کیا۔ میں آیا تو اس نے اور اس کے بھائی دونوں نے اسلام قبول کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔ میرے اور صدقہ (زکوٰۃ) کی وصولی کے احکام کے درمیان سے ہٹ گیا اور اگر کسی نے میری مخالفت کی تو میری مدد پر آمادہ ہوا۔ چنانچہ میں نے وہاں کے مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی اور فقراء میں تقسیم کر دی۔ میں اس وقت تک وہاں مقیم رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر وہاں پہنچی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منؐ محمدٍ رسول اللہ إلی جیفر وعبد ابنی الجلندی السّلام علیٰ من اتّبع الهُدٰی
امّا بعد فانی أدعوکما بدعایة الاسلام أسلما تسلما فانی رسول اللہ الی النّاس کافّةً
لأنذر من کان حیًّا و یحقّ القول علی الکافرین و أنکما إن أقررتما بالاسلام ولیتکما وإن
أبیتُما أن تقرّا بالاسلام فان مُلککما زائلٌ وخیلی تحلّ بساحتکما و تظهر نبوّتی علی ملکما۔

وکتب أُبی بن کعب۔



ترجمہ: [اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے الجلندی کے دونوں بیٹوں جیفر اور عبد کی طرف۔ سلام ہو اس پر جو

لہ اس خط کا متن القلقشندی، قسطلانی وغیرہ کے ہاں ملتا ہے — اور ہم نے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" (ص ۲۴۲) سے لیا ہے۔

ہدایت کی پیروی کرتا ہے اما بعد میں تم دونوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لے آؤ سلامت رہو گے کیونکہ میں تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ سب زندوں کو (آخرت سے) ڈراؤں اور یہ بات کافروں کو بہت ہی ناگوار ہوتی ہے۔ تم دونوں اگر اسلام کا اقرار کر لو گے تو میں تمھیں (بدستور) والی بنائے رکھوں گا اور نافرمانی کرو گے تو تمھارا ملک ہاتھوں سے جانے والا ہے۔ میرے گھوڑے تمھارے صحن کو روندیں گے اور میری نبوت تمھارے ملک پر غالب ہو کر رہے گی۔]

۸۔ المنذر بن ساوی العبدی

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعرانہ[1] سے واپس آتے ہوئے العلاء بن الحضرمی کو ایرانی حکومت کے گورنر المنذر بن ساوی العبدی کے پاس بحرین[2] میں بھیجا۔ اسے اسلام کی دعوت دی اور ایک خط لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من محمد النبی رسول اللہ إلی المنذر بن ساوی۔ سلامٌ علیك فانی احمدُ إلیك اللہ الذی لا إلہ الا ھو، اما بعد، فان کتابك جاءنی و رُسُلَكَ و إنہ من صلی صلاتنا و أکل ذبیحتنا و استقبل قِبلتنا فانہٗ مُسلمٌ، لہ ما للمسلمین وعلیہ ما علی المسلمین ومن أبی فعلیہ الجزیۃ۔

[الطبری ۳/۲۹ طبع مصر تحقیق ابو الفضل ابراہیم]

ترجمہ: [محمد نبی رسول اللہ کی جانب سے المنذر بن ساوی کے نام۔ سلامٌ علیک۔ میں تم سے اُس اللہ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اما بعد تمھارا خط اور تمھارے قاصد آئے۔ جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا وہ مسلمان ہے اور اُس کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو مسلمانوں کے ہیں، اور جس نے انکار کیا اُسے جزیہ دینا ہوگا]

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب میں اپنے اسلام لانے اور رسالت کی تصدیق کرنے کا حال لکھا:

وإنی قَدْ قَرَأتُ کِتَابَكَ عَلٰی اَھْلِ	میں نے آپ کا خط ہجر والوں کو پڑھ کر سنایا
ھَجَر فَمِنْھُمْ مَنْ اَحَبَّ الْاِسْلَامَ وَ	ان میں کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اسلام کو پسند کیا
اَعْجَبَہٗ وَ دَخَلَ فِیْہِ وَمِنْھُم مَنْ	اس سے محبت کی اور اس میں داخل ہو گئے اور کچھ

---

[1] اہل الحدیث اسے جیم اور عین پر زیر اور راء پر تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اہل الادب عین ساکن اور راء خفیف کے ساتھ (جعرانہ) معجم البلدان ۲/۱۴۲ (دار صادر - بیروت)

[2] معجم البلدان ۱/۳۴۶ - ۳۴۸

كَرِهَهُ و بأرْضي مجوس ويهود فأحدِثْ اِلىّ فِيْ ذٰلِكَ أمْرَكَ۔

ایسے تھے جنھیں یہ ناگوار ہوا ۔ میری سرزمین میں مجوس اور یہودی بھی ہیں ۔ ان کے بارے میں آپ اپنا حکم مجھے لکھ کر بھیجیے۔

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا:

"اِنَّكَ مَهْمَا تُصْلِحْ فَلَنْ نَعْزِلَكَ عَنْ عَمَلِكَ وَمَنْ أَقَامَ عَلٰى يَهُوْدِيَّةٍ أَوْ مَجُوْسِيَّةٍ فَعَلَيْهِ الْجِزْيَةُ"

[تم جب تک ٹھیک رہو گے ہم تمھیں گورنری سے معزول نہیں کریں گے ۔ اور جو یہودیت یا مجوسیت پر قایم رہنا چاہے گا اس پر جزیہ عائد ہوگا]

۹ ۔ اہلِ ہجر کے نام اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوسیوں کو خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی ۔ اگر وہ انکار کریں تو اُن سے جزیہ لیا جائے اور ان کی عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے اور ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کے ساتھ ابو ہریرہؓ کو بھیجا تھا اور وصیت فرمائی تھی کہ وہ مؤخر الذکر کے ساتھ اچھا سلوک کریں ۔

فرائض صدقات : اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کو اونٹوں ، گایوں ، بکریوں ، پھلوں اور دوسرے اموال کے بارے میں (زکوٰۃ کی شرح کے) فرائض لکھ کر دیے تھے ۔ چنانچہ العلاء نے وہ خط لوگوں کو پڑھ کر سُنایا اور ان سے صدقات وصول کیے ۔

۱۰ ۔ اہلِ یمن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کے لیے ایک خط لکھا تھا جس میں انھیں شرائع اسلام کی خبر دی تھی اور جانوروں اور اموال میں زکوٰۃ کی شرح بتائی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ آپؐ کے اصحابؓ اور قاصدوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے ۔ اہلِ یمن کی طرف آپ نے حضرت معاذ بن جبل اور مالک بن مُرارہ کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا تھا ۔ اس خط میں یہ بھی اطلاع دی تھی کہ اُن کا (اہل یمن کا) قاصد پہنچا اور جو کچھ اُن لوگوں کی طرف سے اس نے پہنچایا وہ بھی لکھا تھا ۔

۱۱ ۔ اہلِ یمن کے نام اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے متعدد یمن والوں کے نام خطوط ارسال فرمائے جن میں سے چند یہ ہیں :

۱ ۔ الحارث بن عبدِ کُلال

۲ ۔ شریح بن عبدِ کُلال

۳ ۔ نُعیم بن عبدِ کُلال

۴ - نعمان قَیل ذی یزن

۵ - مَعافِر[1]

۶ - ہمدان[2]

۷ - زرعہ ذی رُعین ——— یہ حمیر[3] کا پہلا اسلام لانے والا تھا۔ اس نے اہلِ حمیر کو حکم دیا کہ صدقہ (زکوٰۃ) اور جزیہ جمع کریں، اور یہ سب مُعاذ بن جبل اور مالک بن مُرارۃ کو دے دیں۔ اور حکم دیا کہ ان دونوں (قاصدوں) کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ مالک بن مرارۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے اسلام لانے اور طاعت کرنے کی علامت کے طور پر اہلِ یمن کے قاصد تھے۔ چنانچہ ان کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا کہ :

" أَنَّ مَالِكْ بن مُرَارَة قَدْ بَلَّغَ الْخَبَر وحِفظَ الغَيْبَ -[4] مالک بن مرارہ نے خبر پہنچا دی اور غیب کی حفاظت کی۔

۱۲ - جَبَلۃ بن الأیہم

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسّان کے بادشاہ جَبَلۃ بن الایہم کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے ایک خط تحریر فرمایا[5]۔ وہ اسلام لایا اور اپنے اسلام لانے کی خبر خط کے جواب میں آں حضرتؐ کو بھی دی آپؐ کے لیے کچھ ہدایا بھیجے اور برابر مسلمان رہا یہاں تک کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانۂ خلافت میں ایک دن دمشق کے بازار میں مُزینہ کے ایک شخص نے اس کو اپنے پاؤں سے روند دیا[6]۔ وہ مزنی اس کے اوپر گرا تو اس نے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اسے پکڑ کر ابوعبیدہ بن الجرّاح کے پاس لایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس شخص کو جبلہ نے تھپڑ مارا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا : تو اس کے بھی تھپڑ لگاؤ۔

لوگوں نے کہا : کیا اسے قتل نہ کیا جائے گا ؟

کہا : نہیں۔

کہا : کیا اس کے ہاتھ بھی نہ کاٹے جائیں گے ؟

---

[1] مَعافِر یمن کا ایک قبیلہ ہے۔ معجم البلدان ۵/۱۵۳

[2] معجم البلدان ۵/۴۱۰ - ۴۱۷

[3] ایضاً ۲/۳۰۷

[4] یہاں غیب سے مراد پیغام ربانی ہے۔

[5] الطبقات الکبیر   الوفا لابن الجوزی ۲/۳۹۷

[6] دوسری اور زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ حج بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کا لباس کسی شخص کے پیروں تلے آگیا جو بنو فزارۃ کا آدمی تھا۔ جبلہ نے اس کے ایک تھپڑ رسید کر دیا جس سے اس کی ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو گیا۔ ابن الجوزی نے اس داستان کو " المنتظم " میں تفصیل سے لکھا ہے۔

کہا: نہیں۔ اللہ کا حکم قصاص کے لیے ہے۔

جبلہ نے کہا: اے لو، میں تو ایک گنوار کے برابر ہوا جا رہا ہوں۔ یہ تو بہت ہی بُرا مذہب ہے!

پھر وہ نصرانی ہوگیا اور اپنی قوم میں واپس چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ملک روم میں قسطنطنیہ چلا آیا۔ جب یہ بات حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچی تو انھیں بہت ہی ناگوار ہوئی اور انھوں نے حسان بن ثابت سے کہا: "ابو الولید! کیا تم نے بھی سنا ہے کہ تمھارا دوست جبلہ بن الایہم مرتد ہو کر نصرانی ہوگیا ہے؟"

حسان نے کہا: "انا للہ وانا الیہ راجعون، ایسا کیوں ہوا؟"

کہا کہ "مزینہ کے ایک شخص نے اس کو تھپڑ مار دیا تھا۔"

یہ سن کر حسان نے کہا: "تب تو اس نے ٹھیک ہی کیا۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ اُٹھے اور اپنا کوڑا سنبھالا اور حسان کے کوڑے لگائے۔

۱۳۔ ذی الکلاع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جریر بن عبد اللہ البجلی کو ذی الکلاع[1] بن ناکور بن حبیب بن مالک بن حسان بن تبع اور ذی عمرو کے پاس بھیجا۔ ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور یہ عہد فاروقی میں اپنے آٹھ سو غلاموں کے ساتھ اسلام لے آئے تھے۔ اسی طرح ضریبہ بنت ابرہہ بن الصباح جو ذی الکلاع کی بیوی تھی وہ بھی اسلام لائی تھی مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت تک جریر انھیں لوگوں کے پاس تھے۔ ذی عمرو نے انھیں وفات کی اندوہ ناک خبر سنائی تھی اور جریر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔

۱۴۔ اہلِ نجران[2] کے نام

نجران سے ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا۔ اس کا سربراہ وہب تھا، اور عبد المسیح اور ابو حارثہ پادری تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مباہلہ کرنے کا ارادہ کیا مگر انھوں نے مصالحت کر لی تھی اس پر آں حضرتؐ نے یہ خط لکھ دیا تھا۔ اس معاہدے کو حضرت ابو بکرؓ نے بھی باقی رکھا مگر عمر فاروقؓ نے ان کو جلا وطن کر دیا تھا اور ان کی جائداد خرید لی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو الحارث بن کعب کے پادری اور نجران کے پادریوں، کاہنوں، ان کے پیرؤوں اور راہبوں کے نام تحریر فرمایا تھا:

أنّ لهم علی ما تحت ایدیهم من قليلٍ وكثيرٍ من بيعهم وصلواتهم ورهبانيتهم وجوار الله ورسوله ولا يغيّر أسقف عن أسقفيته ولا راهبٌ عن رهبانية

---

[1] اس نے عہد جاہلیت میں خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا اور ہزاروں انسان اسے سجدہ کیا کرتے تھے۔ عہدِ فاروقی میں اسلام لانے کے بعد بہت سادہ زندگی گزاری۔ (کتاب الوفا ۲/ ۷۴۰)

[2] معجم البلدان ۵/ ۲۶۶ - ۲۷۰

ولا کاھنٌ عن کہانتہٖ ولا یُغیّر حقٌ من حقوقھم ولا سلطانھم ولا شئٌ ممّا کانوا علیہ ما نصحوا و اُصلحوا فیما علیھم غیر مثقلین بظُلمٍ ولا ظالمین[1]

یہ خط المغیرہ بن شعبہ نے لکھا تھا۔

۱۵- ربیعہ بن ذی مرحب اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ربیعہ بن ذی مرحب الحضرمی، ان کے بھائیوں اور چچاؤں کو لکھا کہ حضرموت میں ان کے اموال، عطایا، غلام، کنوئیں، درخت، پانی، سواریاں، کھیتیاں سب اُن کے ہیں اور یہ مال سب آل ذی مرحب کا ہے۔ یہ معاہدہ معاویہ بن ابی سفیان نے لکھا تھا:

أنّ لَھُمْ اَمْوَالَھُمْ وَ نَخْلَھُمْ وَ رقیقھم وَ آبارھُمْ وَ شَجَرَھُمْ وَمیاھھم وسواقیھم وَ نَبْتَھُمْ وَشَرَاجِعَھم بِحَضَرَمَوْتَ وَكُلَّ مَالٍ لآلِ ذِیْ مَرْحَبَ وَ اَنَّ كُلَّ رَھْنٍ بِأَرْضِھِمْ یُحْسَبُ ثَمَرُہٗ وَ سِدْرُہٗ وَ قَضْبُہٗ مِنْ رَھْنِہٖ الَّذِیْ ھُوَ فِیْہِ وَ أَنَّ كُلَّ مَا كَانَ فِیْ ثِمَارِھِمْ مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّہٗ لَا یَسْأَلُ لَہٗ أَحَدٌ عَنْہُ وَ أَنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ بُرَاءٌ مِنْہُ وَ اَنَّ نَصْرَ آلِ ذِیْ مَرْحَبْ عَلٰی جَمَاعَۃِ الْمسلمین وَ أَنَّ أَرْضَھُمْ بَرِیَّۃٌ مِّنَ الْجَوْرِ وَ أَنَّ أَمْوَالَھُمْ وَ أَنْفُسَھُمْ وَ زافرھا ثط الْمَلِكِ الَّذی كان یسیل إلیٰ آلِ قَیْسٍ وَ اَنَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ جَارٌ عَلٰی ذٰلِكَ ۔

ترجمہ: [ان کے اموال، نخلستان، غلام، کنوئیں، درخت، پانی کے ذخیرے، کھیتیاں اور اونٹ جو حضرموت میں ہیں سب ان کے رہیں گے، یہ سب آل ذی مرحب کا مال ہوگا۔ ان کی زمین میں جو گروی رکھی ہوئی ہیں اور جس کا پھل، لکڑی، گھاس وغیرہ اس کے ہیں جس کے پاس وہ رہے اور اس کے سارے پھل بھی۔ اس میں کوئی دعویٰ نہیں کرے گا اور اللہ اور اس کا رسول اس سے بری ہوں گے۔ آلِ ذی مرحب پر واجب ہوگا کہ مسلمانوں کی مدد کریں، اور ان کا علاقہ ظلم سے پاک رہے گا اور ان کے جان و مال بھی اُسی طرح اُن کے علاقے کی وہ باڑھ جو آل قیس تک چلی گئی ہے اور اللہ اور اس کے رسول اس کے محافظ ہیں]

۱۶- بنو لخم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے لخم کے قبیلہ حدس سے جو لوگ اسلام لائے، نماز قایم کی اور زکوٰۃ ادا کی، خدا اور رسول کا حصہ ادا کیا، مشرکوں سے علٰحدگی اختیار کی، وہ اللہ اور اس کے

---

[1] طبقات ۱/ ۲۶۶

رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمّی ہیں اور مامون ہیں ۔ اور جو اپنے دین سے پھر گیا تو اللہ اور رسول اس سے بری الذمہ ہیں۔ اور جس کے مسلم ہونے کی شہادت کسی مسلمان نے دی وہ بھی مسلمان مانا جائے گا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں محفوظ رہے گا ۔ یہ دستاویز عبداللہ بن زید نے لکھی :

مَنْ أَسْلَمَ مِنْ حدس مِنْ لَخْمٍ وَ أَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ أَعْطٰى حَظَّ اللهِ وَحَظَّ رَسُوْلِهٖ وَ فَارَقَ الْمُشْرِكِيْنَ فَاِنَّهٗ اٰمِنٌ بِذِمَّةِ اللهِ وَ ذِمَّةِ رَسُوْلِهٖ محمدٍ وَمَنْ رَجَعَ عَنْ دِيْنِهٖ فَاِنَّ ذِمَّةَ اللهِ وَ ذِمَّةَ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِهٖ مِنْهُ بَرِيْئَةٌ وَمَنْ شَهِدَ مُسْلِمٌ بِاِسْلَامِهٖ فَاِنَّهٗ اٰمِنٌ بِذِمَّةِ مُحَمَّدٍ وَ اِنَّهٗ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ[1]

[لخم کے خاندان حدس کے لوگ جو ایمان لائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کا حصہ ادا کریں مشرکوں سے قطع تعلق کر لیں وہ اللہ اور اس کے رسول محمد کے ذمّہ امان میں رہیں گے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اس سے اللہ اور اس کے رسول کا ذمّہ بھی اُٹھ جائے گا اور جو گواہی دے کسی مسلمان کے اسلام کی اسے بھی امان ہے اور وہ مسلمانوں میں شمار کیا جائے گا]

۱۷۔ خالد بن ضماد الازدی

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے خالد بن ضماد الازدی کو یہ امان نامہ لکھ کر دیا ۔ اسے اُبیّ بن کعب نے لکھا تھا :

اَنَّ لَهٗ مَا أَسْلَمَ عَلَيْهِ مِنْ أَرْضِهٖ عَلٰى أَنْ يُّؤْمِنَ بِاللهِ وَلَا يُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَيَشْهَدَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَعَلٰى أَنْ يُّقِيْمَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَيَصُوْمَ شَهْرَ رَمَضَانَ وَيَحُجَّ الْبَيْتَ وَلَا يُأْوِيْ مُحْدِثًا وَلَا يَرْتَابَ وَعَلٰى أَنْ يَّنْصَحَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَعَلٰى أَنْ يُّحِبَّ أَحِبَّاءَ اللهِ وَيُبْغِضَ أَعْدَاءَ اللهِ وَعَلٰى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ أَنْ يَّمْنَعَهٗ مِمَّا يَمْنَعُ مِنْهُ نَفْسَهٗ وَمَالَهٗ وَأَهْلَهٗ وَأَنَّ الْخَالِدَ الْأَزْدِيَّ ذِمَّةُ اللهِ وَذِمَّةُ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ اِنْ وَفٰى بِهٰذَا[2]

[اسلام لاتے وقت جو کچھ علاقہ ان کا تھا، اُن کا رہے گا بشرطیکہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اس کا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور گواہی دیں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں اور بشرطیکہ وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، رمضان کے روزے رکھیں، حج کریں اور کوئی بدعت نہ کریں، شک میں نہ پڑیں اور اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کریں اور اللہ کے دوستوں کو دوست اور اللہ کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں اور محمد نبی اللہ پر یہ شرط ہے کہ وہ جس بات سے خود کو روکتے ہیں اس سے انھیں روکیں جسے اپنے مال اور عیال کے لیے اچھا نہیں سمجھتے

---

[1] الطبقات الکبریٰ ۱/ ۲۶۶-۲۶۷

[2] ایضاً ۱/ ۲۶۷

اُسے اُن کے لیے بھی اچھا نہ سمجھیں اور خالد الازدی اگر ان شرائط کی بجا آوری کریں تو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں رہیں گے]

۱۸۔ عمرو بن حزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمرو بن حزم کو یمن کی طرف بھیجا تو ایک دستاویز لکھ کر دی جس میں شریعت کے قوانین اور ٹیکس کی شرحیں اور تعزیرات کے قوانین سمجھائے تھے۔ یہ دستاویز بھی اُبی نے لکھی تھی [1]

اسی طرح آپؐ نے تمیم الداری کے بھائی نُعَیم بن اوس کو لکھ کر دیا کہ شام کے علاقہ حبری اور عَیْنُون[2] کے سب دیہات، میدان، پہاڑ، پانی، کھیتیاں، گھوڑے اور گائیں اُن کی ہیں اور اُن کے بعد اُن کے اخلاف کی۔ اس میں دوسرا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ اس میں زور زبردستی سے گھس سکتا ہے۔ جو کوئی ظلم کرے اور ان سے زور زبردستی سے کچھ چھین لے، اس پہ اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ یہ دستاویز حضرت علیؓ نے لکھی تھی:

أَنَّ لَهُ حِبْرَى وَعَيْنُون بِالشَّامِ قَرْيَتَهَا كُلَّهَا سَهْلُهَا وَجَبَلُهَا وَمَاءُهَا وَحَرْثُهَا وَأَبْنَاطُهَا وَبَقَرُهَا وَلِعَقِبِهِ مِنْ بَعْدِهِ لَا يُحَاقُّهُ فِيهَا أَحَدٌ وَلَا يَلِجُهُ عَلَيْهِمْ بِظُلْمٍ وَمَنْ ظَلَمَهُمْ وَأَخَذَ مِنْهُمْ شَيْئًا فَانَّ عَلَيْهِ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ (الطبقات ۱/ ۲۶۷)

ترجمہ: [ملک شام میں حبری اور عینون کے دونوں گاؤں سالم، اس کے میدان، پہاڑ، کھیتی، مویشی سب اُن کے اور اُن کے بعد اخلاف کے رہیں گے ان پہ کوئی ظلم نہیں کرے گا اور اس جایداد پہ دعویدار نہیں ہوگا اور جو ایسا کرے اس پہ اللہ کی، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے]

۱۹۔ حُصَین بن اوس الاسلمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حُصَین بن اوس الاسلمی کو لکھا کہ اُنھیں الفرغین و ذات اعشاش کے علاقے دیے جاتے ہیں ان پہ دوسرا کوئی دعویدار نہ ہو یہ دستاویز بھی علیؓ بن ابی طالب نے لکھی [3]

اور بنی قرۃ بن عبداللہ بن ابی نجیح النبہانی کو لکھا کہ انھیں المظلۃ کا پورا علاقہ دیا جاتا ہے اس کی سب زمین، پانی، میدان، پہاڑ اور چراگاہ جس میں وہ اپنے مویشی چرائیں۔ یہ دستاویز معاویہ نے لکھی۔

آپ نے بنی الضباب کو جو بنی الحارث بن کعب میں سے تھے کو لکھا کہ انھیں ساربہ اور اس کا اوپری علاقہ دیا جاتا ہے جب تک یہ نماز پڑھتے رہیں، زکوٰۃ دیتے رہیں، اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے رہیں اور مشرکین سے علٰحدہ رہیں

---

[1] طبقات ۱/ ۲۶۷ یہ دستاویز عمرو بن حزم کے پوتے ابوبکر بن محمد بن حزم کے پاس محفوظ تھی۔

[2] عَیْنُون عبرانی لفظ ہے۔ یہ بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں ہے، مصر سے حج کے لیے آنے والوں کے راستے میں پڑتا تھا (معجم البلدان ۴/ ۱۸۰) [3] طبقات ۱/ ۲۶۷

اس پر کوئی دعویدار نہیں ہو سکتا۔ یہ مغیرہ نے لکھا تھا:

أَنَّ لَهُمْ سَارِبَةَ وَسَارِحَهَا لَا يُحَاقُّهُمْ فِيهَا أَحَدٌ مَّا أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَأَطَاعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَفَارَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

یزید بن الطفیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید بن الطفیل الحارثیؓ کو المضّہ کا علاقہ دیتے ہوئے لکھا کہ وہ جب تک نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکین سے جنگ کریں اس علاقے پر کوئی دوسرا دعویدار نہ ہو۔ یہ دستاویز جہیم بن الصلت نے لکھی:

أنّ لَهُ الْمَضَّةَ كُلَّهَا لَا يُحَاقَّه فيها احدٌ مَا أَقَامَ الصَّلاة و اٰتى الزكاة و حارب المشركين۔ (طبقات ۱/۲۶۸)

۲۔ بنی قنان بن ثعلبہ اور آپ نے بنی قنان بن ثعلبہ (من بنی الحارث) کو لکھا کہ اُن کے لیے مجّس کا علاقہ ہے اور ان کے جان و مال کو امان دی جاتی ہے (طبقات ۱/۲۶۸)۔ یہ دستاویز المغیرہ نے لکھی۔

أَنَّ لَهُمْ مَجَسًّا وَأَنَّهم اٰمِنُوْنَ عَلٰى اَمْوَالِهِم وَأَنْفُسِهِمْ ۔

۲۲۔ عبدیغوث بن وعلہ اور عبدیغوث بن وعلہ الحارثیؓ کو الارقم بن ابی الارقم المخزومی سے لکھوا کر دیا:

أَنَّ لَهُ مَا أَسْلَمَ عَلَيْهِ مِنْ أَرْضِهَا وَأَشْيَائِهَا يعنى نخلها مَا أَقَامَ الصَّلَاةَ وَاٰتَى الزَّكَاةَ وَأَعْطَى خُمُسَ الْمَغَانِمِ فِي الْغَزْوِ وَلَا عُشْرَ وَلَا حَشْرَ وَمَنْ تَبِعَ مِنْ قَوْمِهٖ ۔

[انھیں جو چیزیں دی گئی ہیں، زمین اور اس کے متعلقات یعنی نخلستان وغیرہ، وہ جب تک نماز پڑھیں، زکات دیں اور مالِ غنیمت میں سے خُمس ادا کریں وہ اُن کی ہیں اُن سے عُشر (لگان) نہیں لیا جائے گا، انھیں اور اُن کے بعد آنے والوں کو بے دخل بھی نہیں کیا جائے گا]

۲۲۔ زیاد بن الحارث آپ نے بنی زیاد بن الحارث الحارثیؓ کو جمّاء[1] اور اَذنبہ کا علاقہ دیا اور لکھا کہ وہ جب تک نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں اور مشرکوں سے جنگ کریں، امان میں رہیں گے۔ یہ کاغذ علیؓ بن ابی طالب نے لکھا تھا[2]

---

[1] جمّاء مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی جو العقیق سے جرف کی طرف جاتے ہوئے راستے میں آتی ہے معجم البلدان /۱۵۸)

[2] الطبقات الکبریٰ ۱/۲۶۸

۲۴ - یزید بن المحجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یزید بن المحجل الحارثی کو لکھا:
أَنَّ لَهُمْ نَمرة و مَسَاقِيها و وَادِي الرَّحْمٰنِ مِنْ بَيْنِ غَابَتِهَا وَ أَنَّه عَلٰى قَوْمِهِ مِنْ بَنِي مَالِك وَ عَقَبَة لا يُغْزَوْنَ وَلَا يُحْشَرُوْنَ۔
یہ دستاویز المغیرہ بن شعبہ نے لکھی تھی۔

۲۵ - قیس بن الحصین اسی طرح آپ نے قیس بن الحصین کو ذی الغصّۃ کا علاقہ دیا جو اُن کے خاندان[1] اور بنو الحارث اور بنو نہد کے پاس امانت رہے گا اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ رہیں گے نہ اُنھیں بے دخل کیا جائے گا اور نہ ان سے لگان لیا جائے گا جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں اور ان کے اموال میں مسلمانوں کا حق ہے۔
لِقَيْسِ بنِ الحُصَيْنِ ذِي الغُصَّةِ أَمَانَةً لِبَنِي أَبِيهِ بني الْحَارِث ولِبَنِي نَهْد اَنَّ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ وَ ذِمَّةَ رَسُوْلِهِ لَا يُحْشَرُوْنَ ولا يُعْشَرُونَ مَا اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكَاةَ وَ فَارَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَ أَشْهَدُوْا عَلٰى إِسْلَامِهِمْ وَ أَنَّ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقًّا لِلْمُسْلِمِين۔

۲۶ - بنی قنان بن یزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قنان بن یزید الحارثی کو مذود[2] اور اس کے نخلستان عطا فرمائے اور لکھا کہ جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور مشرکین سے علٰحدہ رہیں اور راستے پُر امن رکھیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں یہ ان کی جاگیر رہے گی۔
أَنَّ لهم مِذْوَدًا و سَوَاقِيَهُ ما أقاموا الصّلاة و اتوا الزكاة وفارقوا المشركين و امنوا السّبيل و أشهدوا على اسلامهم - (الطبقات ۱/ ۲۶۸ - ۲۶۹)

۲۷ - عاصم بن الحارث آپ نے عاصم بن الحارث الحارثی کو الارقم سے لکھوا کر دیا:
أَنّ لَهُ نجمة مِنْ راكس لايحاقّه فيها أحد۔

۲۸ - بنو معلویہ بن جرول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی معلویہ بن جرول (قبیلہ بنی طے) میں سے اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور جو نماز قایم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مالِ غنیمت میں سے اللہ اور اس کے رسول کا خُمس ادا کریں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اسلام پر شہادت دیں اُنھیں اللہ اور اس کے رسول کی امان حاصل ہوگی اور جس پر وہ اسلام لائے ہیں وہ ان کی اور ان کے مویشیوں کی رہایش کے لیے ہے۔ یہ دستاویز الزبیر بن العوام نے لکھی۔

(الطبقات ۱/ ۲۶۹)

---

[1] بنو نہد، بنو الحارث کے حلیفوں میں سے تھے۔ (طبقات ۱/ ۲۶۸) [2] معجم البلدان ۵/ ۹۰

۲۹ - عامر بن الاسود ابن عامر بن جُوَین الطائی عامر بن الاسود ابن عامر بن جوین الطائی کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المغیرہ بن شعبہ سے لکھوایا :

أنّ له ولقومه طيّ ما أسلموا عليه من بلادهم ومياههم ما أقاموا الصلاة وأتوا الزكاة وفارقوا المشركين۔ (الطبقات ۱/ ۲۶۹)

[علاقہ طیّ ان کے اور ان کی قوم کے لیے ہے جب تک وہ اپنے شہروں اور اپنے پانیوں میں اسلام کے ساتھ رہیں، نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں]

۳۰ - بنی جُوَین طائی کے نام آپ نے قبیلۂ طے کے خاندان بنی جُوَین کے اُن لوگوں کے نام جو ایمان لائے، جنھوں نے نماز قایم کی، زکوٰۃ ادا کی اور مشرکوں سے دور رہے، اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے رہے، اللہ کا خُمس اور نبی کا حصہ مالِ غنیمت سے ادا کرتے رہے اور اسلام پر گواہی دیتے رہے، یہ لکھا کہ انھیں اللہ اور محمد بن عبداللہ کی امان حاصل ہے، اُن کی زمینیں اور اُن کے پانی (کے ذخیرے) ان کے ہیں۔

أن لهم أرضهم ومياههم وما أسلموا عليه وغدوة[1] الغنم من ورائها مبيتة۔

یہ خط بھی المغیرۃ بن شعبہ نے لکھا۔

۳۱ - بنی معن طائی آپ نے قبیلہ بنی طے کی شاخ بنی معن کو لکھا کہ حالتِ اسلام میں جو علاقہ اور پانی کے جو ذخیرے ان کے پاس ہیں اور ان کے مویشی جہاں تک چرتے ہوئے جائیں وُہ ان کا ہوگا جب تک وہ نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اپنے اسلام کی گواہی دیتے رہیں اور راستے پُر امن رکھیں۔ یہ العلاء بن الحضرمی نے لکھا اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی۔

۳۲ - بنی اسد کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِنْ مُحَمَّدٍ النبی إلى بنی أسد، سلامٌ علیکم فإنّی أحمدُ إلیکم اللهَ الذی لا اله الا هوَ - أمّا بعد فلا تقرَبُنّ میاهَ طَیّ وأرضهم فانّه لا تَحِلُّ لکم میاهُهم ولا یَلْجِنّ أرضَهم إلّا مَن أوْلَجوا وذِمّةُ محمّدٍ بَرِیئةٌ مِمّن عصاهُ وَلْیَقُمْ قُضاعیّ ابْنُ عَمْرٍو۔

---

[1] غدوۃ الغنم سے مراد یہ ہے کہ مویشی صبح کو چرنے جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں جہاں تک وہ جائیں اور اُن کے پیچھے جتنی زمین رہ جائے وہ سب اس خاندان کی ملک شمار ہوگی۔

[محمد نبی کی طرف سے بنو اسد کے نام ۔ سلام علیکم ۔ میں اُس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ۔ اما بعد ، وہ (قبیلہ بنی) طیؔ کے پانی اور زمینوں کی طرف نہ جائیں کیونکہ اُن کے پانی تمھارے لیے جائز نہیں ہیں ، نہ اُن کی زمینوں میں داخل ہوں ، مگر وہ جو داخل کیے جائیں اور جو اس (فرمان سے) روگردانی کرے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے ذمّہ سے بری ہیں اور قضاعی ابن عمرو اس کے نگراں ہوں گے]

قضاعی بن عَمرو قبیلہ بنی عُذرۃ کے فرد تھے اور بنو اسد کے علاقے میں عامل تھے ۔ یہ خط خالد بن سعید نے لکھا ۔

۳۳ ۔ جُنادۃ الازدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط جُنادۃ بن الازدی اس کی قوم اور جو اس کی پیروی کریں اُن کے نام لکھا کہ جب تک وہ نماز قایم کریں ، زکوٰۃ ادا کریں ، اللہ اور رسول کی اطاعت کریں ، مغانم میں سے اللہ کا خُمس اور رسول کا حصّہ ادا کرتے رہیں ، مشرکوں سے علٰحدہ رہیں ، وہ اللہ اور محمد بن عبداللہ کے ذمّہ میں رہیں گے ۔

یہ خط اُبیؔ نے لکھا ۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

۳۴ ۔ سَعد ہُذیم آپ نے قضاعہ کے سَعد ہُذیم اور جُذام کے نام ایک ہی خط لکھا جس میں انھیں صدقے کے احکام تعلیم کیے اور حکم دیا کہ وہ صدقہ (زکوٰۃ) اور خُمس اپنے دو قاصدوں اُبیؔ اور عنبسہ کو یا جسے وہ دونوں مامور کریں اُسے ادا کریں ۔

۳۵ ۔ بنی زُرعۃ اور جُہَینہ کے بنی الرّبعۃ کے نام[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی زُرعۃ اور جُہَینہ کے بنی الرّبعہ کے نام لکھا کہ اُنھیں اپنے جان و مال کی امان حاصل رہے گی اور جو اُن پر ظلم کرے گا یا اُن سے جنگ کرے گا اُس کے خلاف مدد ملے گی بشرطیکہ وہ جنگ ان کے دین یا خاندان سے متعلق نہ ہو ، اور اُن کے اہلِ بادیہ میں سے بھی جو نیک اور پرہیزگار رہوں وہی معاملہ ہوگا جو شہریوں کے ساتھ ہوگا ۔

أنہم آمنون علی أنفسہم و أموالہم و أنّ لہم النّصر علی من ظلمہم أو حاربہم إلّا فی الدّین والأھل ، و لأھل بادیتہم من برّ منہم و اتّقٰی ما لحاضرتہم و اللہ المستعان ۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

۳۶ ۔ بنی جُعَیل کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جُعَیل کے نام لکھا کہ :

لہم مثل الذی لہم وعلیہم مثل الذی علیہم

---

[1] یہ ۵ھ کے معاہدوں میں سے ہے ۔ جُہَینہ یہودی قبیلہ تھا ۔ یہ مدینہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ینبوع کے قریب آباد تھا ۔

و أنّهم[1] لا يُحشرون ولا يُعشرون و أن لهم ما أسلموا عليه من اموالهم و أن لهم سعاية نصر وسعد بن بكر و ثمالة و هُذيل و بايع رسول الله صلى الله عليه وسلم على ذلك عاصمُ بن أبي صيفي وعمرو ابن أبي صيفي و الاعجم بن سفيان وعلي بن سعد ۔ (الطبقات ۱/۲۷۰)

اس دستاویز پر العبّاس بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب، عثمان بن عفّان اور ابوسفیان بن حرب نے گواہی ثبت کی۔

۳۷ - الاسلم الخزاعی

خاندان بنی خزاعہ کے اُن افراد کے لیے جو ایمان لائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھا :

من آمن منهم و أقام الصلاة و آتى الزكاة و ناصح في دين الله أن لهم النصر على من دهمهم بظلم[2] و عليهم نصر النبي صلى الله عليه وسلم إذا دعاهم و لأهل باديتهم[3] ما لأهل حاضرتهم[4] وأنّهم مهاجرون حيث كانوا۔ (الطبقات ۱/۲۷۱)

یہ خط العلاء بن الحضرمی نے لکھا اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی۔

۳۸ - عوسجہ بن حرملۃ الجہنی

بسم الله الرحمٰن الرحيم

هٰذا ما أعطى الرسول عوسجة ابن حرملة الجهني من ذی المروة أعطاه ما بين بلكثة[5]

---

[1] ابنِ سعد کہتا ہے کہ اس دستاویز پر بنی عبد مناف کو گواہ اس لیے بنایا گیا کہ بنی جُعَیل اُن کے حلفاء تھے۔ لا یُحشرون سے مراد یہ ہے کہ پانی کے ایک ذخیرے سے دوسرے ذخیرے کی طرف جلا وطن نہیں کیے جائیں گے۔ اور لا یُعشرون سے مراد ہے کہ سال میں ایک بار سے زیادہ عُشر نہیں لیا جائے گا ان لهم سعاية نصر میں سعایہ سے مراد صدقات (زکوٰۃ وغیرہ) ہیں۔

[2] دهمهم بظلم ، اچانک حملہ کرنا ظلم کے ساتھ۔

[3] أهل باديتهم ، اس قبیلہ کے وہ لوگ جو صحرا میں رہتے ہیں (بدّو)۔

[4] أهل حاضرتهم ، اس قبیلے کے شہر میں بسنے والے افراد۔

[5] بلکثة (بروزن زمزمہ) طبقات کے مطبوعہ نسخہ میں شین سے ہے۔ لیکن یہ طباعت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ بلکثہ (ثائے مثلثہ سے) ہونا چاہیے۔ ذی المروۃ کے پاس یہی جگہ ہے اور اس کی جمع بلاکث بھی مستعمل ہے۔ دیکھو معجم البلدان ۱/۴۷۸۔

إلى المصنعة إلى الجفلات إلى الجُدّ[1] جَبَلِ القبلة لا يُحاقُّه أحدٌ و من حاقّه فلا حقّ له و حقّه حقٌّ۔

[یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مروہ والے عوسجہ بن حرملہ جہنی کو بلکثہ سے مضنعہ (گڑھی) اور جفلات سے جبل القبلہ کے کنوئیں تک کا علاقہ عطا کیا ہے اس میں کوئی دوسرا دعویدار نہ ہوگا جو کوئی دعویٰ کرے گا اس کا کوئی حق نہ ہوگا اور اِن کا حق سچا سمجھا جائے گا]

اس پر عقبہ نے گواہی لکھی اور انھوں نے ہی کتابت کی۔

۳۹۔ بنی شَنْخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جُہینہ کے بنی شَنْخ کو لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا ما أعطى محمد النبيّ (صلى الله عليه وسلم) بني شَنْخٍ مِن جُهَيْنَة أعطاهم ماخطُّوا من صُفَيْنَة و ما حَرَثوا و من حاقّهم فلا حقّ لهٗ وحقّهم حقّ۔

یہ العلاء بن عقبہ نے لکھا اور گواہی ثبت کی۔

۴۰۔ بنی الجُرمُز بن ربیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی الجُرمُز بن ربیعہ کو، جو بنو جُہینہ کی ایک شاخ ہیں، لکھا کہ وُہ اپنے علاقوں میں امان سے رہیں گے اور اسلام لانے کے وقت جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ اُن کا رہے گا۔

یہ دستاویز المغیرہ نے قلمبند کی۔

۴۱۔ عَمرو بن معبد الجُہنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عَمرو بن معبد الجُہنی اور جُہینہ کی شاخ بنی الحُرَقہ اور بنی الجرمز کے ایمان لانے والوں کو لکھا جو نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور مالِ غنیمت میں سے اللہ کا خُمس اور رسولؐ کا حصّہ ادا کریں اور جو اپنے اسلام کی شہادت دے اور مشرکوں سے علیٰحدہ رہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی امان میں رہے گا اور جس مسلمان پر کوئی قرض ہوگا وہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا اور جو رہن کا سُود ہوگا باطل قرار دیا جائے گا۔ ان کا صدقہ (زکاۃ) پھلوں میں دسواں حصّہ ہوگا اور جو ان کے ساتھ مل جائے گا اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

۴۲۔ بلال بن الحارث المُزنی آپ نے بلال بن الحارث المُزنی کو لکھا:

أن له النخل و جزّعة شطْرِه ذا المزارع و النخل، و أنّ له ما أصلح به الزرع من قدس و انّ له المضّة و الجزع و الغيلة إن كان صادقاً۔

---

[1] جدّ قدیم لُغت میں کُنوئیں کے لیے آتا ہے۔ معجم البلدان ۲/ ۱۱۳

یہ معاویہ نے لکھا۔

ابنِ سعد کہتا ہے:

جزْعَۃ سے مراد جایداد ہے۔

شَطرِہٖ سے مراد ہے اس جانب کی۔ جیسے قرآن کریم میں ہے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطرَ المسجد الحرام یعنی مسجد حرام کی طرف۔

قَدَس مولیشی یا سواری کے جانور۔

اور مَضّنہ ایک جگہ کا نام ہے۔

۴۳۔ بُدَیل وبُسر وسَرَوات بنی عَمرو

أمّا بعد فانّی لم آثم مالکم ولم أضَعْ فی جنبکم وإنّ أکرمَ أھلِ تِھامۃَ علیَّ وأقربھم رَحِماً مِنّی أنتم ومن تبعکم من المُطَیّبینَ، امّا بعدُ فانی قد أخذت لمن ھاجر منکم مثلَ ما أخذتُ لنفسی ولو ھاجر بأرضہٖ إلّا ساکن مکّۃ إلّا مُعتمراً أو حاجّاً فانی لم أضع فیکم منذ سالمتُ وأنّکم غیرُ خائفینَ مِنْ قِبَلی ولا مُحصرینَ، امّا بعدُ فانّہٗ قد أسلم عَلْقَمَۃُ[۱] بنُ عُلاثَۃَ وابنا ھوذۃَ[۲] وھاجرا وبایعا علی من تَبِعھم[۳] مِن عِکْرِمَۃَ وأنّ بعضنا من بعضٍ فی الحلالِ والحرام وأنّی واللہِ ماکذبتُکم ولیحبّنّکم ربّکم۔ (الطبقات ۱/۲۷۲)

اس خط میں آپ نے سلام نہیں لکھا تھا کیونکہ یہ خط سلام نازل ہونے سے پہلے بھیجا گیا تھا۔

۴۴۔ العدّاء بن خالد بن ہوذۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے العدّاء بن خالد بن ہوذۃ اور اس کے پیروؤں کو جو خاندان عامر بن عکرمہ سے تھے۔ ایک خط خالد بن سعید سے لکھوایا اور ان کو وہ علاقہ عطا فرمایا جو المصباعہ سے الزّجّ[۴] اور لوابۃ الخرّار کے درمیان ہے۔ (الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۵۔ مسیلمۃ الکذّاب

آپ نے مسیلمۃ الکذّاب کی طرف بھی ایک نامۂ مبارک بھیجا اور اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ خط عمرو بن اُمیّۃ الضَّمری لے کر گئے۔ مسیلمۃ نے اس خط کا جواب بھی دیا تھا

---

[۱] علقمہ بن علاثہ بن عوف بن الأحوص بن جعفر بن کلاب

[۲] یہ العدّاء بن خالد و عمرو بن خالد بن ہوذۃ خاندان بنی عمرو بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ سے ہیں۔

[۳] عکرمہ بن خصفہ ابن قیس بن عیلان مراد ہیں۔ اوپر "من تبعکم من المطیّبین" سے بقول ابن سعد بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو الحارث بن فہر اور تیم بن مُرّۃ اور اسد بن عبد العزّیٰ کی طرف اشارہ ہے۔

[۴] الطبقات کے مطبوعہ نسخہ میں الزّحّ (حاء مہملہ سے) ہے لیکن جیم سے درست ہے۔ (معجم البُلدان ۲/۱۲۳)

اور یہ لکھا تھا کہ وُہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نبی ہے، اس نے تجویز پیش کی تھی کہ سرزمینِ عرب کا علاقہ آپس میں بانٹ لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلعنوُهُ لَعنَهُ اللّٰہ۔

اور یہ جواب لکھوایا:

بلغنی الکتاب الکذب والافتراء علی اللّٰہ وانّ الارض للّٰہ یورثها من یشآء من عباده والعاقبة للمتقین والسلام علی من اتبع الهدی[1]

یہ خط لے کر السائب بن العوّام گئے تھے جو حضرت الزّبیر بن العوّام کے بھائی اور عروہ بن الزّبیر کے چچا ہیں۔

۴۶۔ سلمة بن مالک کے نام آپ نے بنوحارثہ کے سلمہ بن مالک بن ابی عامر السلمی کو خط لکھا اور علاقہ مَدْفوّا عطا فرمایا اور لکھا کہ اس پر کوئی اور دعوٰی کرے تو وہ باطل ہوگا اور ان کا حق صحیح سمجھا جائے گا۔

۴۷۔ العباس بن مرداس السلمی بعض راویوں نے کہا کہ آپ نے العباس بن مرداس السلمی کو لکھا اور مدفوّا کا علاقہ عطا فرمایا۔ یہ دستاویز العلاء بن عقبہ نے لکھی اور اس پر اپنی گواہی ثبت کی۔

(الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۸۔ ہوذة بن نُبَیْشَة آپ نے ہوذة بن نبیشۃ (نُ بَ یْ شَ ۃ) السلمی اور بنی عُصَیَّہ کو الجفر[2] کے اطراف کا پورا علاقہ عطا فرمایا۔ (الطبقات ۱/۲۷۳)

۴۹۔ الأجبّ کے نام قبیلہ بنی سُلَیم کے ایک فرد الأجبّ کو آپ نے فالس عطا فرمایا، اور یہ خط الأرقم نے لکھا۔

۵۰۔ راشد بن عبد السلمی راشد بن عبد السلمی کو آپ نے غَلْوَتَیْنِ سہم (دو تیر پرتاب فیصلہ) ایک غلوۃ حجر (ایک پتھر پھینکنے کا فاصلہ) رُہاط[3] میں عطا فرمایا کہ اس پر اور کوئی دعوٰی کرے تو باطل ہوگا۔ یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

۵۱۔ حرام بن عبدعوف بنی سُلَیم کے فرد حرام بن عبدعوف کو شواق اور اذاما کا علاقہ عطا فرمایا۔ یہ بھی خالد بن سعید نے لکھا۔

---

[1] تاریخ الطبری میں اس کا متن قدرے مختلف ہے۔

[2] الجفر نواحِ مدینہ میں ایک مقام ہے۔ (معجم البُلدان طبع بیروت ۲/۱۴۶)

[3] رُہاط مکّہ سے تین میل کا فاصلہ مدینہ کے راستے پر۔ یہ بنی سعد اور بنی مسروح کا علاقہ تھا۔ معجم البُلدان ۳/۱۰۷ طبع بیروت۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵۲ - الزبیر بن العوام هذا کتابٌ من محمدٍ رّسول اللهِ للزبیر بن العوّام أنی أُعطیته شواقَ أعلاه واسفلهُ لا یحاقّه فیه أحدٌ -

یہ دستاویز علی بن ابی طالب نے لکھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۵۳ - نُعیم بن مسعود هذا ما حالف علیه نُعیم بنُ مسعودِ بنِ رُخَیلةَ الأشْجَعیّ حالفه علی النّصرِ والنصیحة وما کان أُحدٌ مکانه ما بلّ بحرٌ صوفةً -(الطبقات ۱/۲۷۴)

یہ خط بھی حضرت علی بن ابی طالب نے لکھا۔

۵۴ - جمیل بن رزام العدوی آپ نے جمیل بن رزام العدوی کو الرّمدا عطا فرمایا اور اس کے لیے دستاویز لکھ دی جس کے کاتب علی بن ابی طالب تھے۔

۵۵ - حصین بن نضلۃ الأسدی آپ نے حصین بن نضلۃ الاسدی کو المغیرہ بن شعبہ سے لکھوا کر دستاویز دی کہ ارام[1] اور کستہ اُن کا ہے اس پر کوئی دعویٰ کرے تو باطل ہوگا۔

۵۶ - بنی غفار کے نام آپ نے بنی غفار کو لکھ کر دیا کہ وہ مسلمانوں میں سے ہیں اور حقوق و فرائض میں جو معاملہ مسلمانوں کے ساتھ ہوگا وہ ان کے ساتھ ہوگا اور اللہ کے نبی نے ان کی جان و مال کو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں لیا ہے۔ اگر کوئی ان پر ظلم کرے گا تو اُنھیں مدد دی جائے گی اور جب نبی انھیں مدد کے لیے بلائیں گے تو وہ لبیک کہیں گے اور ان پر نبی کی امداد (واجب) ہوگی مگر یہ کہ کوئی دین میں جنگ کرے۔

أنهم من المسلمین لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین وأن النبی عقد لهم ذمة الله و ذمة رسوله علی اموالهم وأنفسهم ولهم النصر علی من بدأهم بالظلم، وأن النبی اذا دعاهم لینصروه أجابوه وعلیهم نصره الّا من حارب فی الدّین ما بلّ بحرٌ صوفةً وأن هذا الکتاب لا یحول دون إثم۔ (الطبقات ۱/۲۷۴)

۵۷ - بنی ضمرۃ بن بکر آپ نے بنی ضمرہ بن بکر ابن عبد مناۃ بن کنانہ کو لکھ کر دیا کہ اُن کی جان و مال کو امان ہے اور کوئی ان پر حملہ کرے گا تو ان کی مدد کی جائے گی اور ان پر بھی واجب ہے کہ نبی کی مدد کریں بشرطیکہ وہ اللہ کے دین کے لیے جنگ کریں اور جب نبی ان کو بلائیں تو لبیک کہیں، اس کے لیے وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں ہیں اور ان میں سے جو نیک اور پرہیزگار رہیں ان کے لیے مدد ہوگی۔

---

[1] ارام مکہ اور مدینہ کے درمیان پہاڑی۔ (معجم البلدان ۱/۵۲)

أنهم آمنون على أموالهم وأنفسهم وأن لهم النصر على من دهمهم بظلم وعليهم نصر النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ما بلّ بحرٌ صوفةً الا أن يحاربوا فی دين الله وأن النبی إذا دعاهم أجابوه عليهم بذلك ذمة الله ورسوله ولهم النصر على من برّ منهم واتقى ۔ (الطبقات ۱/۲۷۵)

۵۸ - الھلال صاحب البحرین

الھلال صاحب البحرینؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا:

سِلْمٌ أنت فانی أحمدُ إليك الله الذی لا إله الا هُوَ لا شريك لهُ وأدعوك إلى اللهِ وحدهُ تؤمن بالله وتطيعُ وتدخلُ فی الجماعةِ فانّهُ خيرٌ لك والسّلام على من اتبع الهُدٰی ۔ (الطبقات ۱/۲۷۵)

تم صلح پسند ہو، میں تم سے اُس اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جس کا کوئی شریک نہیں اور تمھیں اللہ واحد کی طرف بلاتا ہوں، ایمان لاؤ، اللہ کی اطاعت کرو اور جماعت میں داخل ہو جاؤ تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو۔

۵۹ - اسیبخت بن عبداللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیبخت بن عبداللہ صاحب ہجرؓ کو لکھا:

إنه قد جاء نی الأقرع بكتابك وشفاعتك لقومك وإنی قد شفّعْتُك وصدّقتُ رسولك الأقرع فی قومكَ فأبْشِرْ فيما سألتَنِی وطلبتَنی بالّذی تُحِبُّ ولكنّی نظرتُ أن أُعَلِّمَهُ وتلقانی، فان تجئْنا أُكرِمْكَ وإنْ تَقْعُدْ أُكرمك أمّا بعد فانّی لا أستهدی أحدًا وإن تُهدِ إلیّ أقبل هديّتك وقد حَمِدَ عُمّالی مَكَانَكَ وأوصيكَ بأحسن الّذی أنت عليه من الصّلاة والزّكاة وقرابة المؤمنين وإنّی قد سَمّيْتُ قومَكَ بنی عبد الله فمُرهم بالصّلاة وبأحسن العَمَلِ وابْشِرْ، والسّلام عليك وعلى قومك المؤمنين ۔

۶۰ - اہل ہجرؓ کے نام

امّا بعد فانّی أُوصيكم بالله وبأنفُسِكم ألّا تضلّوا بعدَ أنْ هُدِيتُم ولا تغوُوا بعدَ أنْ رُشِدتُم، امّا بعد فانّهُ قد جاءنی وفدُكم فلم آتِ إليهم إلّا ما سرّهم ولو أنّی إجتهدْتُ فيكم جُهدی كُلّهُ أخرجْتُكم من هجر فشفّعْتُ غائبَكم وأفضلْتُ على شاهِدِكم فاذكروا نعمةَ الله عليكم امّا بعد فانّهُ قد أتانی الّذی صنعتُم وإنّه من يُحسِنُ منكم

---

[1] معجم البُلدان ۱/۳۴۶ [2] ایضاً ۵/۳۹۳

[3] ہجر (بروزن سفر) معجم البلدان ۵/۳۹۳

لا أحملُ عليه ذنبَ المسيئِ فاذا جاءكم أمرائى فأطيعوهم وانصروهم على امر الله و فى سبيله وانّه مَنْ يّعمل منكم صالحةً فلن تضِلّ عند الله ولا عندى۔

(الطبقات ۱/ ۲۶۵-۲۶۶)

۶۱۔ المُنذر بن سَاوٰیؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے المنذر بن ساوی گورنر بحرین کے پاس العلاء بن الحضرمی کو یہ خط دے کر بھیجا تھا۔ ابنِ سعد میں اس کی روایت اس طرح ہے:

امّا بعد فانّى رسُلى قدحمدوكَ و إنّكَ مهما تُصْلِحْ أُصْلِحْ إليك و أُثِبْكَ على عملك وتنصح لله ولرسوله والسلام عليك۔

خط کا پورا متن یہ ہے:

بسم الله الرحمٰن الرّحيم

مِنْ محمّد رسُول الله إلى المُنذر بن ساوى سَلَامٌ عليك فانّى أحمدُ اللهَ اليك الّذى لا إله غيرهُ وأشهد أنْ لّا إله إلّا الله وأنّ محمداً عبدهٗ ورسولهٗ۔ امّا بعد فانّى أُذكرك الله عزّوجلّ فانّه من ينصح فانّما ينصح لنفسه وإنّهٗ من يّطع رسُلى ويتّبع أمرهم فقد أطاعنى ومن نصح لهم فقد نصح لى وإن رسلى قد أثنوا عليك خيراً وإنّى قد شفّعتكَ فى قومك فاترُكْ للمسلمين ما أسلموا عليه وعفوتُ عن أهل الذّنوب فاقبل منهم و إنّكَ مهما تصلُح فلن نعزلك عن عملك ومن أقام على يهوديّة أو مجوسيّة فعليه الجزية۔ (زاد المعاد جلد سوم ص ۶۱ بحوالہ حمید اللہ)

۶۲۔ المُنذر بن سَاوٰی کے نام دوسرا خطؓ

أما بعد فانّى قد بعثتُ اليكَ قدامةَ وأبا هريرةَ فادْفع إليهما ما اجتمع عندك

ؓ المنذر بن ساوی، ایران کی ساسانی حکومت کی طرف سے بحرین کا گورنر تھا، اس کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اصل مکتوب ۱۲۶۵ھ (۱۸۵۰ء) میں ایک فرانسیسی سیاح کو مصر کے ایک قبطی راہب سے ملا تھا۔ ایک خط مقوقس بادشاہ کے نام بھی ایک فرانسیسی سیاح کو ملا تھا اور اسے سلطان عبدالمجید والی ترکی نے خرید کر قسطنطنیہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ باریک سیاہی مائل کھال پر بھوری روشنائی سے لکھا ہوا ہے اور اس کے عکس متعدد بار شائع ہو چکے ہیں (مکتوبات نبوی ۱۶۴) کتاب الوفا ۲/ ۴۲۔

ؓ المنذر بن ساوی گورنر بحرین کے نام مکتوب نبوی کی اصل کا عکس پہلی بار جرمن مجلہ ZMDG جلد XVII (۱۸۶۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کی بحث محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" (۱۶۸-۱۷۲) میں ملاحظہ ہو۔ یہ خط دمشق کے قوتلی خاندان میں اب تک محفوظ ہے۔

من جزیة أرضك والسّلام۔ (الطبقات ۱/۲۷۶)

میں نے قدامہ اور ابوہریرہؓ کو تمھارے پاس بھیجا ہے، اپنے علاقے کا جو ٹیکس (جزیہ) جمع ہوگیا ہو وہ ان دونوں کے حوالے کر دو۔

یہ خط اُبَیؓ نے لکھا۔

۶۳۔ العلاؓ بن الحضرمی

امّا بعد فانّی قد بعثت إلی المنذرِ بن سَاوَی من یقبضُ منه ما اجتمع عنده من الجزیة فَعَجِّلْهُ بها و أبعث معها ما اجتمع عندك من الصدقةِ والعشورِ والسلام۔

(الطبقات ۱/۲۷۶)

[میں نے المنذر بن سَاوَی کے پاس ایک قاصد بھیجا ہے کہ اس نے جو کچھ جزیہ جمع کر لیا ہو وہ اس کے حوالے کر دے، تم اُسے عجلت پر آمادہ کرو اور تمھارے پاس جو صدقہ (زکوٰۃ) اور عُشر (لگان) جمع ہوگیا ہو وہ بھی جزیہ ٹیکس کے ساتھ ہی روانہ کر دو۔ والسّلام]

یہ خط بھی اُبَیؓ نے لکھا تھا۔

۶۴۔ ضغاطر الاسقف کے نام

سلامٌ علی من آمن۔ أمّا علی أثرِ ذٰلك فانّ عیسی بنَ مریم رُوحُ اللّٰہِ وکلمتُہ القاھا إلیٰ مریم الزّکیّةِ وإنّی أومنُ باللّٰہِ وما أُنْزِلَ إلینا وما أُنْزِلَ إلیٰ إبراھیم وإسمٰعیل وإسحاق ویعقوب والأسباطِ وما أوتیَ موسٰی وعیسٰی وما أوتی النّبیّوْن من ربّھم لا نفترق بین أحدٍ منھم ونحن لہٗ مسلمونَ، والسّلامُ علیٰ من اتبع الھُدٰی۔ (الطبقات ۲/۲۷۶)

[جو ایمان لائے اس پر سلام ہو اور اس کی نشانی یہ ہے کہ عیسٰی بن مریم روح اللہ ہیں اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ نے پاکدامن مریم پر القا کیا۔ اور میں اللہ پر ایمان لایا ہوں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیمؑ، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور آلِ یعقوب پر نازل کیا گیا اور جو موسٰی و عیسٰی کو دیا گیا اور دوسرے انبیاء کو دیا گیا۔ ہم انبیاء میں ایک دوسرے کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرتے اور اس کے مسلم ہیں۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے]

یہ خط دحیۃ بن خلیفہ الکلبی لے کر گئے تھے۔

۶۵ - بنی جُنبہ یہودِ مقنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقنا[1] کے یہودیوں کو لکھا ، مقنا اَیلہ کے قریب واقع ہے ۔

أمّا بعد ـ فقد نزل عليّ أيتكم[2] راجعينَ إلى قريتكم فاذا جاءكم كتابي هذا فانكم آمنون لكم ذمّة الله وذمّة رسوله وإنّ رسول الله غافرٌ لكم سيّئاتكم وكلّ ذنوبكم وإنّ لكم ذمّةَ الله وذمّةَ رسوله لا ظلمَ عليكم ولا عدًى وإنّ رسولَ الله جارُكم ممّا منع منه نفسَهُ فانّ لرسول الله بزّكم وكلّ رقيقٍ فيكم والكُراعَ والحلْقةَ[3] إلّا ما عفا عنه رسولُ الله أو رسولُ رسولِ الله وإنّ عليكم بعد ذلك رُبْعَ ما أخرجتْ نخلُكم ورُبْعَ ماصادتْ عُروكُكم[4] ورُبْعَ ما اغتزل نساؤكم وإنكم بُرئتُم بعدُ من كلّ جزيةٍ او سُخرةٍ فان سمعتُم وأطعتم فان على رسول الله ان يكرم كريمكم ويعفو عن مسيئكم ، أمّا بعدُ فالى المؤمنين والمسلمين من أطلعَ أهلَ مقنا بخيرٍ فهوخيرٌ له ومن أطلعهم بشرٍّ فهوشرٌّ له وأنْ ليسَ عليكم اميرٌ إلّا من أنفسِكم أو من أهلِ رسولِ الله والسّلام ـ (الطبقات ۱/۲۷۷)

[تمہارے قاصد ، تمہارے گانوؤں کی طرف واپس جاتے ہوئے مجھ سے ملے ۔ جب تمھیں میرا یہ خط پہنچے تو تمھیں امان ہے اور تم اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں ہو اور اللہ کا رسول تمہارے عیوب اور تمام گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے ۔ تمھیں خدا اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے کوئی تم پر ظلم و زیادتی نہیں کرے گا رسول اللہ تمھارے لیے بھی وہ ناپسند کریں گے جو وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اور رسول اللہ کے لیے تمھارے اموال اور سارے غلام اور مویشی اور ہتھیار رہیں مگر جو کچھ اللہ کے رسول تمھیں معاف کر دیں (وہ تمھارا ہے) یا رسول اللہ کے سفیر جو تمھیں بخش دیں ۔ آج کے بعد سے تم اپنے نخلستانوں سے ایک چوتھائی لگان دو گے اور ایک چوتھائی شکار کی ہوئی مچھلیاں اور ایک چوتھائی عورتوں کا کاتا ہوا سوت اس کے بعد تم ہر ٹیکس اور جزیہ سے آزاد ہو اگر تم نے فرماں برداری کی تو رسول اللہ تمھارے باعزّت افراد کا اکرام کریں گے اور تمھاری غلطیوں سے درگزر کریں گے ۔ تمام مومنوں اور مسلموں میں سے جو اہلِ مقنا سے ملے وہ ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے اور جو اُن کے ساتھ بُرائی کرے گا یہ اُس کے لیے بُرا ہوگا ۔ تمھارے امیر تم میں سے ہی مقرر کیے جائیں گے یا رسول اللہ کے خاندان سے ہوں گے ۔ والسّلام]

---

[1] معجم البلدان ۵/۱۷۸

[2] أيتكم یعنی رسلکم تمھارے قاصد (۱/۲۷۷)

[3] حلقہ : گھر میں جو سامان اور ہتھیار وغیرہ ہوں ۔

[4] لٹھے جنھیں پانی میں بہاکر اُن پر بیٹھتے تھے اور مچھلیوں کا شکار کرتے تھے ۔

۶۶ - یُحنّہ بن رُوبۃ اور سروات اہلِ اَیلۃ[1] کے نام

سِلْمٌ أنتم فانی أحمدُ إلیکمُ اللّٰہَ الّذی لا إلٰہَ إلّا ھُوَ فانّی لم أکن لأقاتلکم حتّی أکتب إلیکم فأسْلِمْ أو أعْطِ الْجزیۃَ وأطع اللّٰہَ ورسولہ ورُسُلَ رسولہ و أکرِمْھُم و اکْسُھُم کسْوۃً حَسَنَۃً غیرَ کِسْوۃ الغُزَّاءِ واکْسُ زیداً کُسْوَۃً حَسَنَۃً فمھما رضیتْ رُسُلی فانّی قد رَضِیْتُ وقد عُلِمَ الجزیۃَ فانْ أردتم أن یامَنَ البرُّ والبحرُ فاطع اللّٰہ ورسولہ ویُمنَعُ عنکم کلّ حقّ کان للعرب والعجم إلّا حقّ اللّٰہ وحقّ رسولہ و إنّک إنْ رَدَدْتَھم ولم ترُضِھم لا أخُذُ منکم شیئاً حتّی أُقاتلکم فاسْبِی الصغیر و أقْتُل الکبیرَ فانی رسُول اللّٰہ بالحق أومن باللّٰہ وکُتُبِہٖ و رُسُلِہٖ وبالمسیح بنِ مریمَ أنّہٗ کلمۃ اللّٰہ وإنی أومن بہ أنّہ رسُولُ اللّٰہ وَأتِ قبل أن یمسّکم الشّرّ فانی قد أوصیتُ رُسُلِی بکم و أعط حَرمَلۃَ ثلاثۃَ أوْسُقٍ شعیراً وإنّ حرملۃَ شَفَعَ لکم وإنّی لولا اللّٰہُ وذٰلک لم أراسِلْکُمْ شیئًا حتّی تری الجیش وإنکم إنْ أطَعْتُم رُسُلی فانّ اللّٰہ لکم جارٌ ومحمّدٌ ومن یکون منہ وإنّ رُسُلی شُرَحْبیل وأُبَیّ وحرمَلَۃَ وحریثَ بنَ الطّائیّ فانّھم مَھْما قاضَوکَ علیہ فقد رضیتُہ وإنّ لکم ذِمّۃَ اللّٰہِ وذمّۃَ محمّدٍ رسُولِ اللّٰہِ والسّلامُ علیکم إن أطعتُم وجَھّزوا أھل مَقْنا[2] إلی أرضھم۔

۶۷ - جبلِ تہامہ کے گروہ بندوں[3] کے نام

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرحیم

ھٰذا کتابٌ من محمّدٍ النّبی رسولِ اللّٰہِ لعبادِ اللّٰہ العتُقَاءِ إنّھم إن اٰمنوا وأقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکاۃَ فعبدھم حُرٌّ ومولاھم محمّدٌ ومن کان منھم من قبیلۃٍ لم یُردّ إلیھا وما کان فیھم من دمٍ أصابوہ أو مالٍ أخذُوہ فھوَ لھم وما کان لھم من دَیْنٍ فی النّاسِ رُدّ إلیھم ولا ظُلمَ علیھم ولا عُدْوانَ وإنّ لھم علی ذٰلک ذمّۃَ اللّٰہ وذمّۃَ محمّدٍ والسلام علیکم۔

(الطبقات ۱/ ۲۶۸)

---

[1] ایلہ بحرِ قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ یہ حجاز کی آخری حد اور شام کی ابتدائی سرحد پر ہے۔ یہاں یہودیوں کی آبادی تھی جن کے بارے میں قرآن میں ہے کہ انھوں نے سبت کے دن مچھلی کا شکار کیا اور ان کی صورتیں مسخ ہوگئیں۔ (معجم البلدان ۱/ ۲۹۲)

[2] مقنا، یہ بھی ایلہ کے قریب یہودیوں کی بستی تھی۔ (معجم البلدان ۵/ ۱۶۸)

[3] معجم البلدان ۲/ ۶۳

یہ خط ابی بن کعب نے لکھا۔

[یہ خط محمد نبی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے اللہ کے آزاد بندوں کی طرف ہے کہ وہ اگر ایمان لائیں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کے غلام آزاد ہیں اور اُن کے مولا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں گے اگر ان میں سے کوئی دوسرے قبیلے کا (مولا) ہوگا تو اُسے اُدھر واپس نہیں کیا جائے گا اگر انھوں نے کوئی خون بہایا ہوگا یا کوئی مال لیا ہوگا تو وہ ان کا سمجھا جائے گا اور لوگوں میں ان کا جو قرض ہوگا وہ انھیں دلایا جائے گا ان پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی اور وہ اللہ کے اور محمد کے ذمّہ میں ہوں گے والسلام علیکم]

۶۸۔ بنی غادیا[1] کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللہ لبنی غادیا أنّ لھم الذّمّة وعلیھم الجزیة ولاعداءَ ولاجلاءَ' اللّیلُ مدّ والنّھار شدّ۔ (الطبقات ۱/ ۲۷۹)

[یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خط ہے بنی غادیا کے نام۔ کہ وہ ذمّی ہیں اور ان پر جزیہ ہے اور ان سے نہ جنگ کی جائے گی نہ اُنھیں جلاوطن کیا جائے گا۔ اور یہ معاہدہ ہمیشہ کے لیے رہے گا]

یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

۶۹۔ بنی عریض[2] کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذا کتابٌ من محمد رسول اللہ لبنی عریضٍ طُعمةٌ من رسول اللہ عَشَرة أوسُقٍ شعیراً فی کُلّ حصادٍ وخمسینَ وسقاً تمراً یُوفونَ فی کُلِّ عامٍ لحینہٖ لا یظلمون شیئاً۔

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے بنی عریض کے لیے ہے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہر فصل میں دس وسق جَو اور پچاس وسق کھجور ہر سال دیتے رہیں گے اور اُن پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا]

یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی۔

---

[1] بنی غادیا یہودی قبیلہ تھا۔ اللّیلُ مدّ و النھارُ شدّ عربی محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ لیل و نہار کی تبدیلی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

[2] بنی عریض بھی یہودی تھے۔

۷۰۔ بنی زُہیر بن اُقَیش ابنِ سعد کہتا ہے کہ ہم سے اسماعیل بن ابراہیم الاسدی بن عُلَیَّہ نے الجریری اور انھوں نے ابو العلاءؔ سے روایت کی. کہا : میں مطرّف کے ساتھ سوق الابل (اونٹوں کے نخاس) میں تھا کہ ایک بدّو اپنے ہاتھ میں چمڑے کا ایک ٹکڑا لیے ہوئے آیا اور کہنے لگا : تم میں پڑھنا کون جانتا ہے ؟ میں نے کہا : میں جانتا ہوں ۔ اُس نے کہا : تو اِسے پڑھو یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے لکھ کر دیا ہے ۔ اس میں لکھا تھا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد النبی لبنی زُهَیر بنِ اُقَیشٍ حَیّ من عُکْلٍ أنّهم إنْ شهدوا أن لا اله الاّ الله وأنَّ محمدًا رسُولُ الله وفارقوا المشرکین وأقرّوا بالخُمسِ فی الغنائمهم وسهم النبی وصَفِیّتِه فانّهم اٰمنون بأمان الله ورسوله۔

[یہ محمد نبی کی طرف سے بنی زُہیر بن اُقَیش کے نام ہے جو عُکل کا ایک قبیلہ ہے کہ اگر وہ کلمۂ شہادت لا الٰہ الاّ اللہ محمد رسول اللہ پڑھیں اور مشرکوں سے علٰحدہ رہیں اور اپنے مویشیوں میں خُمس کا اور رسول کے حصّے (ادا کرنے) کا اقرار کریں تو انھیں اللہ اور اس کے رسول کی اماں حاصل ہو گی]

لوگوں میں سے کسی نے اُس بدّو سے کہا : "کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سُنا ہے ؟ ہمیں بھی سناؤ۔" اس نے کہا : ہاں ۔ لوگوں نے کہا : تو پھر ہم سے بھی بیان کرو ، اللہ تم پر رحم کرے ۔ تب ہم نے اُسے یہ کہتے سُنا :

مَن سَرّہ أن یذھب کثیر من وحَرِ الصَّدْرِ فلیصم شهر الصَّبْر و ثلاثة أیّامٍ من کُلِّ شهرٍ۔

[جو یہ پسند کرتا ہو کہ اس کے سینے کی جلن کا بڑا حصہ دُور ہو جائے تو اُسے چاہیے کہ ماہِ رمضان کے روزے رکھے اور ہر ماہ تین دن روزے سے رہے]

پھر کسی نے پوچھا : کیا یہ حدیث تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے ؟

اس نے کہا : میں سمجھتا ہوں تمھیں یہ خوف ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی حدیث منسوب نہ کر دوں ، تو خدا کی قسم اب آج کوئی اور حدیث تمھیں نہیں سناؤں گا ۔[1]

۷۱۔ ابو ظِبیان الازدی الغامدی ہشام بن محمد بن السائب الکلبی نے بیان کیا کہ ہم سے لوط بن یحییٰ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ظبیان الازدی کے نام خط لکھا جس میں اُسے اور اُس کے قبیلے کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ اس نے اپنی قوم کے چند نفر مکہ بھیج کر اس خط کا جواب دیا اُن میں مخنف ، عبداللہ، زُہیر بنو سُلَیم ، عبدشمس بن عفیف ابن زُہیر وغیرہ تھے ۔ یہ لوگ تو مکہ گئے اور آپ کے پاس مدینہ میں الحجن بن المرقع ، جُندب ابن

---

[1] الطبقات الکبیر ۱/ ۲۷۹

زُہیر، جُندیب بن کعب آئے۔ ان کے بعد چالیس آدمیوں کو لے کر الحکم بن مُغفّل آئے تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوظبیان کو خط لکھا۔ یہ ابوظبیان صحابی تھے اور انھوں نے حضرت عمر بن الخطاب کا زمانہ بھی پایا تھا۔

ابن سعد نے خط کا متن نہیں دیا ہے[1]

۷۲۔ حلبیب بن عمرو

ہشام بن محمد بن السائب الکلبی نے جمیل بن مرثد سے روایت کیا، کہا: الاَجئیین کا ایک شخص جس کا نام حلبیب بن عمرو تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے اسے یہ خط لکھ کر دیا:

هذا كتابٌ من محمد رسول الله لحبيب ابنِ عمرو أخي بني أجاءٍ ولمن أسْلَم من قومه و أقام الصّلاة و اٰتى الزكاة أنّ له مالهُ وماءه، ما عليه حاضره و باديه على ذالك عهدَ الله و ذِمّةُ رسولِهِ۔ (الطبقات ۱/۲۸۰)

۷۳۔ الولید بن جابر

ہشام بن محمد بن السائب الکلبیؒ نے بیان کیا کہ طیؔ کے قبیلہ بنی بُحتر کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا نام الولید بن جابر بن ظالم بن حارثہ بن عتّاب بن ابی حارثہ بن جُدَی بن تدُول بن بُحتر تھا۔ وہ اسلام لایا اور اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک خط لکھ کر دیا جو ابھی تک اُس کے خاندان میں علاقہ جَبلین میں[2] موجود ہے۔

۷۴۔ سِمعان بن عمرو بن قُرَیط

ابومعشر، یزید بن رومان، محمد بن کعب القرظی اور ابن شہاب الزُّہری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سِمعان بن عَمرو ابنِ قُرَیط بن عُبید بن ابی بکر بن کلاب کو عبداللہ بن عَوسَجہ العُرَنی کے ساتھ خط بھیجا۔ یہ خط چمڑے پر لکھا ہوا تھا اور انھوں نے اس سے اپنے ڈول میں پیوند لگا لیا تھا۔ اس لیے انھیں بنو الرّاقع کہا جانے لگا۔ بعد میں سِمعان مسلمان ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے[3]

جب العُرَنی نے ڈول میں پیوند لگایا تو اس کی بیٹی نے کہا، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم پر کوئی بلا نازل ہو گی کیونکہ تمھارے پاس سیّدالعرب کا خط آیا اور تم نے اس کی یہ قدر کی کہ ڈول میں چپکا لیا۔

کچھ زمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا گزر اس کے علاقے سے ہوا اور اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ تب یہ حاضرِ خدمت ہوئے اور اسلام لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم ہونے سے پہلے ہی سارا مالِ غنیمت واپس کرا دیا۔

---

[1] الطبقات ۱/۲۸۰ — [2] الطبقات ۱/۲۸۰

[3] معجم البلدان ۲/۱۰۴ — [4] الطبقات ۱/۲۸۰

۷۵ - فروۃ بن عمرو الجذامی رضؓ کے نام

حضرت فروۃ بن عمرو الجذامیؓ عمّان پر البلقاء کے علاقے میں رومیوں کے گورنر تھے۔ ایک روایت میں مُعان بھی ہے۔ یہ مسلمان ہو گئے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط لکھ کر ایک قاصد کے ہاتھ بھیجا جس کا نام مسعود بن سعد تھا، اور ہدایا میں ایک سفید خچر، ایک گھوڑا، ایک گدھا، کچھ باریک کپڑے اور زرتار لباس بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکھا :

من محمدٍ رسول اللہ إلی فروۃَ بنِ عمروٍ - امّا بعد فقد قدمَ علینا رسولُك و بلّغ ما أرسلتَ به وخبّرَ عمّا قِبَلَكُمْ و أتانا باسلامك و أنّ اللہ ھداك بھُداہُ إن اصلحت و أطَعْتَ اللہ ورسوله و أقَمْتَ الصّلٰوۃَ و اٰتیت الزّکاۃ -

[محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے فروۃ بن عمرو کے نام۔ امّا بعد۔ تمھارا قاصد آیا اور کچھ تم نے بھیجا تھا وہ پہنچایا اور تمھارے احوال سے مطّلع کیا اور تمھارے اسلام لانے کی خبر پہنچائی۔ اللہ نے تمھیں اپنی ہدایت سے نوازا ہے اگر تم امن پسند رہو، اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرو، نماز پڑھتے رہو اور زکٰوۃ دیتے رہو]

پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو انھوں نے قاصد مسعود بن سعد کو بارہ اوقیہ چاندی عطا کی۔ جب رومی بادشاہ کو فروۃ کے مسلمان ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا : اگر تم اپنے (پرانے) دین پر واپس ہو جاؤ تو ہم تمھیں (گورنری پر) بحال کر دیں گے۔ انھوں نے کہا : میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین نہیں چھوڑوں گا۔ تم جانتے ہو کہ حضرت عیسٰی نے اُن کے آنے کی بشارت دی تھی لیکن تم اپنے ملک کو بچانے کی خاطر نہیں مان رہے ہو۔ تب بادشاہ روم نے انھیں قید کر لیا، پھر قید خانے سے نکال کر قتل کیا اور سُولی پر لٹکا دیا۔[1]

۷۶ - بکر بن وائل کے نام

قتادہ نے بنی سدوس کے ایک شخص کے حوالے سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکر بن وائل کو لکھا :

أمّا بعد - فأسْلِمُوا تَسْلَمُوْا -

[تم اسلام قبول کر لو تو بچ جاؤ گے]

اُسے کوئی خط کا پڑھنے والا نہیں ملا۔ آخر بنی ضُبَیعۃ بن ربیعہ کا ایک شخص آیا اور اس نے خط پڑھا ان لوگوں کا نام بنی الکاتب پڑ گیا تھا اور رسول اللہؐ کا یہ خط لے کر ظبیان بن مرثد السدوسی آئے تھے۔[2]

---

[1] الطبقات ۱/۲۸۱ معجم البُلدان ۳/۱۵۰ کتاب الوفاء لابن الجوزی ۲/۷۴۰ - ۷۴۱

[2] الطبقات ۱/۲۸۲

۷۷ - السُّعیر بن عدّاء کے نام عبداللہ بن یحیٰی بن سلمان نے کہا کہ السّعیر بن عَدّاء کی اولاد میں سے ایک نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط دکھایا :

من محمد رسول اللہ إلی السّعیر بن عَدّاء أنّی قد أخفرتُك الرّحیم وجعلتُ لك فضلَ بنی السّبیل ۔ (الطبقات ۱/۲۸۲)

۷۸ - الحارث بن کُلال ابن شہاب الزہری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر عبدکُلال حمیری کے بیٹوں الحارث، مَسرَح اور نُعَیم کو لکھا :

سِلْمٌ أنتم ما اٰمنتم باللہِ ورسولہ و أنّ اللہ وحدہٗ لاشریك لہ بعثَ موسٰی بآیاتہٖ و خلق عیسٰی بکلماتہٖ ۔ قالت الیہودُ عُزَیرٌ ابنُ اللہِ وقالت النصارٰی اللہُ ثالثُ ثلاثۃٍ عیسی ابنُ اللہِ ۔ (الطبقات ۱/۲۸۲)

الزہری نے کہا کہ یہ خط دے کر آپ نے عیّاش بن ابی ربیعۃ المخزومی کو بھیجا اور اُن سے فرمایا' جب تم اُن کے علاقے میں پہنچو تو رات کو (بستی میں) داخل نہ ہونا، انتظار کرنا کہ صبح ہو جائے پھر خوب پاک صاف ہو جانا اور دو رکعتیں پڑھنا' اللہ سے پناہ مانگنا اور قبولیت و کامیابی کی دُعا کرنا پھر میرا یہ خط اپنے داہنے ہاتھ میں لینا اور اپنے داہنے ہاتھ سے ان کے داہنے ہاتھ میں دینا تو وہ اسے قبول کرلیں گے۔ پھر آپ نے یہ پڑھا :

لم یکن الذین کفروا من أھل الکتاب والمشرکین منفکّین فاذا فرغت منہا فقل اٰمن محمدٌ و أنا أوّل المؤمنین ۔

پھر وُہ جو بھی دلیل لائیں گے باطل ہو جائے گی اور جو بھی روشن کتاب پیش کریں گے اس کا نور زائل ہو جائے گا، وہ تمھارے سامنے (اپنی کتاب) پڑھیں گے ۔ اگر عجمی زبان میں کچھ پڑھیں تو کہنا کہ اس کا ترجمہ کرو' اور کہنا کہ میرے لیے اللہ کافی ہے اسی پر میں ایمان لایا ہُوں اور جو کچھ اس نے نازل کیا ہے، اور مجھے اس نے حکم دیا ہے کہ تمھارے ساتھ عدل کروں ۔ اللہ ہمارا تمھارا رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے ہیں ۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی حُجّت نہیں ہے ۔ اللہ ہمارے تمھارے لیے درمیان اتفاق پیدا کر سکتا ہے اور اسی کی طرف ہم سب کو جانا ہے ۔ پھر اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان سے پوچھنا کہ وہ تین لکڑیاں کہاں ہیں کہ جب وہ لائی جاتی ہیں تو یہ لوگ اسے سجدہ کرتے ہیں ۔ یہ جھاؤ کے درخت کی تین شاخیں ہیں جن پر پالش کیا ہوا ہے کچھ سفید اور کچھ زرد ان کا رنگ ہے اور ایک لکڑی گرہ دار ہے جو دیکھنے میں خیزران (نرکل) معلوم ہوتی ہے اور کالی والی موٹی سا سم کی سی ہے ۔ ان لوگوں نے وہ لکڑیاں نکالیں اور انھوں نے اُسے جلا دیا ۔

لہ الحارث بن عبدکُلال، نُعیم بن عبدکُلال اور النّعمان ذی رُعَین، ہمدان اور مَعافر کے قَیل (نواب) تھے ۔

عیاش کہتے ہیں کہ میں گیا اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ویسے ہی کیا جب میں (اُن کی بستی میں) داخل ہوا تو لوگ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے۔ میں ان کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ تین گھروں کے دروازوں پر تین بڑے پردے دیکھے، ایک پردہ اٹھایا اور بیچ کے دروازے میں داخل ہوا تو اُس گھر کے بڑے کمرے میں مجھے یہ لوگ مل گئے میں نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں، اور جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایات دی تھیں اسی طرح میں نے عمل کیا۔ چنانچہ وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک حمیر کو یہ خط لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد رسول اللہ الی الحارث بن عبد کُلال و نُعیم بن عبد کُلال والنّعمان قَیْلِ ذی رُعَین وھمدان و مَعافر، امّا بعد فانّی أحمد الیکم اللہ الذی لا إلٰہ الاّ ھو فانّہ وقع إلینا رسولکم مُنقلَبَنا من ارض الروم فلقینا بالمدینۃ فبلّغ ما أرسلتم و أنبانا باسلامکم وقتلکم المشرکین وان اللہ تعالیٰ قد ھداکم بھدایتہ ان اصلحتم واطعتم اللہ ورسولہ واقمتم الصّلاۃ وأتیتم الزکاۃ واعطیتم من المغانم خُمس اللہ وخُمس نبیّہ و صفیّہ وما کتب اللہ علی المؤمنین من الصدقۃ ومن کان علی یہودیتہ ونصرانیّتہ فانّہ لا یُغیّر عنہا و علیہ الجزیہ۔ (کتاب الوفا ۲/۴۳۷)

۷۹۔ عبد القیس کے نام

الزہری ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد القیس کو یہ خط لکھا:

من محمد رسول اللہ إلی الأکبر بنِ عبدِ القیسِ أنّہم آمنون بامان اللہ و امان رسولہ علی ما أحدثوا فی الجاھلیۃ من القُحَم و علیہم الوفاءُ بما عاھدوا ولہم أن لا یُحبَسُوا عن طریقِ المیرۃ ولا یُمنعوا صَوبَ القَطْرِ ولا یُحرَمُوا حریمَ الثِّمارِ عند بلوغہٖ والعَلاءُ بن الحضرمی أمین رسول اللہ علی برّھا و بحرھا و حاضرھا و سَرایاھا و ما خرج منہا و أھل البحرینِ خُفَراؤہ من الضَّیمِ و أعوانُہ علی الظالم و أنصارہ فی الملاحِم علیہم بذٰلک عَہْدُ اللہِ و میثاقُہ لا یُبدّلوا قولاً ولا یُریدوا فُرقۃً ولہم علی جُندِ المسلمین الشّرکۃُ فی الفَیْئِ والعدلُ فی الحکم والقصدُ فی السّیرۃ حکمٌ لا تبدیل لہ فی الفریقینِ کِلیھما واللہ ورسولہ یشہد علیہم۔ (الطبقات ۱/۲۶۳)

[محمد رسول اللہ کی طرف سے الاکبر بن عبد القیس کی طرف۔ انھیں اللہ اور اس کے رسول کی امان حاصل ہے اُن باتوں سے جو بدعنوانیاں انھوں نے عہد جاہلیت میں کیں اور جو معاہدہ انھوں نے کیا ہے اُسے

پُورا کرنا اُن پر واجب ہے۔ ان کے غلّہ اور خوراک کے راستے نہیں روکے جائیں گے اور پھلوں کے پک جانے پر اُنھیں روکا نہیں جاتے گا۔ العلاءؓ بن حضرمی رسول اللہ کے امین ہیں جو خشکی اور سمندر، جنگل اور بستی اور اس کی کل پیداوار کے نگران ہیں۔ بحرین کے باشندے ہر ظلم سے ان کی پناہ میں ہیں اور ظالموں سے لڑنے میں اُن کے مددگار رہوں گے اور میدان جنگ میں اُن کی پشت پناہی کریں گے۔ اس کے لیے ان کا عہدؔ میثاق اللہ سے ہے اس میں کوئی لفظ تبدیل نہ کریں اور اس سے علٰحدگی نہ چاہیں۔ مسلمانوں کے لشکر میں وہ مالِ غنیمت کے شریک ہوں گے اور حکم میں انصاف کریں گے اور سیرۂ پسندیدہ رکھیں گے۔ اس حکم میں دونوں فریقوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ اللہ اور اس کا رسول (اس معاہدے پر) اُن کے درمیان گواہ ہیں]

۸۰۔ اقیالِ حضرموت کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرموت کے اقیال[1] اور بڑے لوگوں کو بھی خطوط لکھے جن میں زُرعۃ، قہند، البَسّی، البُحَیری، عبدکُلال اور ربیعۃ و حُجر شامل ہیں[2]

۸۱۔ نُفاثہ بن فروۃ کے نام

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نُفاثہ بن فروۃ الدئلی ملک السماوۃ کو بھی خط لکھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ نے قبیلہ عُذرہ کو عسیب یعنی کھجور کی شاخ پر لکھا ہوا خط بھیجا جسے بنی عذرہ کا ایک شخص لے کر گیا ورد بن مرداس نے جو قبیلہ بنی سعد ہذیم کا ایک فرد تھا اس شاخ کو توڑ دیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہوا اور زید بن حارثہ کے ساتھ غزوۃ وادی القریٰ یا غزوۃ القردۃ میں شہید ہوا[3]۔

۸۲۔ مُطرّف بن الکاہن الباہلی

آپ نے مطرّف بن الکاہن الباہلی کو یہ خط لکھا:

هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله لمطرّفِ بنِ الكاهنِ ولمن سكنَ بيشةَ من باهِلَةَ أنّ مَنْ أحيا أرضاً مواتاً بيضاءَ فيها مُناخُ الأنعامِ ومُراحٌ فهي له وعليهم في كُلِّ ثلاثينَ من البقرِ فارِضٌ وفي كُلِّ أربعين من الغَنَمِ عَتُودٌ وفي كلّ خمسينَ من الإبلِ ثاغيةٌ مسِنّةٌ وليس للمصدّقِ أن يُصَدِّقَها إلّا في مَراعِيها وهم آمنون بأمانِ الله۔ (الطبقات ۱/۲۸۴)

[محمد رسول اللہ کی طرف سے مطرّف بن الکاہن کے نام اور باہلہ میں سے جو بھی اُس علاقے میں رہے کہ

---

[1] اِقیال۔ قیل (بروزن فیل) کی جمع ہے یعنی امرا اور شاہی خاندان کے افراد۔

[2] ابن سعد نے ان میں سے کسی خط کا متن نہیں دیا ہے۔ (الطبقات ۱/۲۸۴)

[3] الطبقات ۱/۲۸۴

جو کوئی بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنائے گا جس میں مویشیوں کے لیے چراگاہ اور میدان بھی ہوں تو وہ زمین اُسی کی ہوگی۔ ان لوگوں پر تینتیس گایوں میں سے ایک پوری گائے اور چالیس بکریوں پر ایک بکری اور پچاس اونٹوں پر ایک پورا اونٹ بطور زکوٰۃ واجب ہوگا، اور زکوٰۃ دینے والا ان کی زکوٰۃ چراگاہوں ہی میں ادا کرے گا اور انھیں اللہ کی امان حاصل ہوگی]

۸۳۔ نہشل بن مالک الوائلی باہلہ کے نہشل بن مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا؛ یہ خط عثمان بن عفان نے لکھا:

باسمك اللهم هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله لِنَهْشَلِ بنِ مالكٍ و من مَعَهُ من بني وائلٍ لمن أسلمَ و أقامَ الصّلاةَ و أتَى الزّكاةَ و أطاعَ الله و رسوله و أعطى من الغنمِ خُمُسَ الله و سَهْمَ النّبيّ و اشهد على اسلامه و فارق المشركين فانّه آمنٌ بامان الله و برئ إليهِ محمدٌ من الظّلمِ كُلِّهِ و أنّ لهم أنْ لا يُحْشَروا و لا يُعْشَروا وعاملهم من أنفُسِهم۔ (الطبقات ۱/۲۸۴)

[اے اللہ تیرے نام سے۔ یہ خط محمد رسول اللہ کا ہے نہشل بن مالک اور اس کے ساتھیوں کے نام جو قبیلہ بنی وائل سے اسلام لائے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتے ہیں اور اپنے غنیمت میں سے اللہ کا خُمس اور رسول اللہ کا حصہ ادا کرتے ہیں اور جو اپنے اسلام پر گواہی دیں، مشرکوں سے الگ تھلگ رہیں، انھیں اللہ کی امان حاصل ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انھیں ہر ظلم سے بچائیں گے اور انھیں زمین سے بے دخل نہیں کیا جائے گا نہ ان سے عُشر (لگان) لیا جائے گا اور ان کا عامل اُنھیں میں سے مقرر کیا جائے گا۔

۸۴۔ بنو ثقیف کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ثقیف کو لکھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول محمدؐ بن عبداللہ کے ذمّہ میں ہیں اُن شرائط پر جو اُنھیں لکھی گئیں۔ اور یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی اور اس پر الحسنؓ اور الحسینؓ نے گواہی ثبت کی۔ یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نُمیر بن خرشہ کو دیا۔ یہ دستاویز خالد بن سعید نے لکھی تھی:

هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله إلى المؤمنين، انّ عِضاهَ وَجٍّ وصيدَه لا يُعْضَدُ فمن وُجِدَ يفعل ذلك فانه يُؤخَذُ فَيُبَلَّغ النبيَّ وهذا أمر النبيّ محمدِ بنِ عبد الله رسول الله۔ (الطبقات ۱/۲۸۵)

۸۵۔ سعید بن سُفیان الرِّعلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید بن سُفیان کو یہ خط خالد بن سعید سے لکھوا کر عطا فرمایا:

هذا ما أعطى رسول الله صلّى الله عليه وسلّم سعيد بن سُفيان الرّعلى أعطاهُ نخلَ السُّوارقيّة وقصرها لا يُحاقّه فيها أحدٌ ومن حاقّهُ فلا حقّ له و حقّه حقٌّ۔

(الطبقات ۱/۲۸۵)

[اس دستاویز کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعید بن سفیان الرعلی کو سوارقیہ کا پورا نخلستان عطا فرمایا ہے اس میں اور کوئی دعویدار ہوگا تو اس کا دعویٰ باطل ہوگا]

۸۶۔ **عُتبہ بن فَرقد**

عتبہ بن فرقد کے نام یہ دستاویز معاویہ نے لکھی:

هذا ما أعطى النبي صلى الله عليه وسلم، عُتبَة بن فرقد، أعطاهُ موضعَ دارٍ بمكة يبنيها مِمّا يلى المروَة فلا يُحاقّه فيها أحدٌ ومن حاقّه فانّه لا حقّ له و حقّهُ حقٌّ۔ (الطبقات ۱/۲۸۵)

[اس دستاویز کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن فرقد کو مکّہ میں ایک گھر کی جگہ دی ہے کہ وہ مروہ کے آگے تعمیر کرلیں، اس میں کوئی اور دعویٰ کرے تو باطل سمجھا جائے گا]

۸۷۔ **سَلَمَۃ بن مالک السّلمی**

سلمۃ بن مالک السّلمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ دستاویز لکھ کر عطا فرمائی اور اس پر علی بن ابی طالب اور حاطب بن ابی بلتعہ نے گواہی ثبت کی:

هذا ما أعطى رسول الله، صلى الله عليه وسلم، سَلَمَةَ بنَ مالك السّلمى، أعطاهُ ما بين ذات الحناظى إلى ذات الأساود، لا يُحاقّه فيها أحدٌ۔ (الطبقات ۱/۲۸۵)

[یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمۃ بن مالک السّلمی کو ذات الحناظی سے ذات الاساود تک کا درمیانی علاقہ عطا فرمایا ہے اس میں اور کوئی دعویٰ کرے تو باطل ہوگا]

۸۸۔ **بنی خباب کلبی کے نام**

هذا كتابٌ من محمد النبي رسول الله لبني خبابٍ و أحلافهم و من ظاهرهم على إقام الصلاة و إيتاء الزكاة و التمسُّك بالايمان والوفاء بالعهد وعليهم فى الهاملة الرّاعية فى كلّ خمسٍ شاةٌ غيرُ ذاتِ عوارٍ والحمولةُ المائرة لهم لاغيَةٌ والسّقىُ الرّواءُ والعِذىُ من الأرض يقيمهُ الأمينُ وظيفةٌ لا يُزاد عليهم۔

شهد سعد بن عبادة و عبد الله بن أُنيس و دِحية بن خليفة الكلبى۔

(الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ خط محمد نبی رسول اللہ کی طرف سے بنی خباب اور ان کے حلیفوں کے لیے ہے اور ان کے لیے جو نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، ایمان پر مستقیم رہنے اور عہد کو پورا کرنے میں اُن کے معاون ہوں۔ چرولے کے

ساتھ اور بغیر چرواہے کے جانوروں میں انھیں ہر پانچ بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں دینا ہوگا جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ باربرداری کے جانور، جن سے اون اتاری جاتی اور جو بیکار ہوں، وہ اُن کے ہوں گے۔ آبپاشی کی زمینیں اور وسائل اور بارش سے سیراب ہونے والی زیتون کا لگان امین مقرر کرے گا جو اُن پر زیادہ نہیں کیا جائے گا۔

گواہ سعد بن عبادہ و عبد اللہ بن اُنیس اور دحیہ بن خلیفۃ الکلبی]

۸۹۔ مُہری بن الابیض

هذا كتاب محمد رسول الله لمَهْرِیّ بن ابيض على من امَنَ مِن مَهْرَةَ أنّهم لا يُؤكلون ولا يعار عليهم ولا يُعركون وعليهم اقامة شرائع الاسلام فمن بدّل فقد حارب الله و من امَنَ به فله ذمّة الله و ذمّة رسوله اللُّقَطَةُ مؤدّاةٌ والسّارحة منداةٌ والتّفَثُ السّيئة والرَّفَثُ الفُسُوْقُ وكتب محمد بن مسلمة الانصاري[1] (الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے مُہری بن الابیض کے نام ہے کہ مُہرہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اُنھیں اکھاڑا نہیں جائے گا، اُن پر حملہ نہیں ہوگا، اُن سے جنگ نہیں کی جائے گی۔ اُن پر یہ ذمہ داری ہے کہ شرائع اسلام کو قائم کریں، جو ان میں تبدیلی کرے گا وہ خدا سے جنگ کرتا ہے اور جو اُن پر ایمان لائے وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمّہ میں رہے گا۔ گری پڑی چیز واپس ہوگی اور چرنے والے مویشیوں کو سیراب کیا جائے گا گندگی، بُرائی، فحش گوئی اور بدکاری سے بچیں گے]

۹۰۔ خَثعم کے نام

خثعم والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دستاویز لکھ کر دی۔ اس پر جریر بن عبد اللہ اور حاضر الوقت صحابی نے گواہی ثبت کی۔

هذا كتابٌ من محمّد رسول الله لخثعَمَ من حاضِرِ بيشَةَ و باديتها أنّ كُلّ دَمٍ أصَبْتُمُوْهُ في الجاهلية فهو عنكم موضوعٌ ومن أسْلَمَ منكم طوعاً أو كُرهاً في يَدِهٖ حَرْثٌ من خبارٍ أو عَزَازٍ تَسْقِيهِ السّماءُ أو يرويه اللّثى فزكا عمارةً في غيرِ أزمَةٍ ولاحطمةٍ فله نشرهُ و أكله وعليهم في كُلّ سَيْحٍ العُشْرُ وكُلّ غربٍ نصف العُشْرِ۔

(الطبقات ۱/۲۸۶)

[یہ محمد رسول اللہ کا خط ہے خثعم کے لیے، ان کے صحرا میں رہنے والوں اور بستیوں میں رہنے والوں کے لیے،

---

[1] یہ خط ابنِ سعد کے زمانے تک محفوظ تھا۔ (الطبقات ۱/ ۳۵۹)

انھوں نے زمانہ جاہلیت میں جو خون کیا ہو اُس کا قصاص اٹھایا جاتا ہے اور اُن میں سے جو خوشی سے یا با دلِ نخواستہ ایمان لائے ہیں اُن میں جن کے ہاتھ میں کھیتی ہے، آبپاشی کی ہو یا آسمان سے سیراب ہونے والی اور جو قحط سالی یا آتش زنی کے دنوں کے سوا ابھری پڑی رہتی ہو اس کی پیداوار ان کے لیے ہے اور انھیں ہر سیراب زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ اور کم سیراب زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصہ دینا ہوگا۔]

۹۱۔ ثُمالۃ والحُدّان

ثمالۃ اور الحُدّان کے وفود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوئے تو آپ نے یہ دستاویز ثابت بن قیس بن شماس سے لکھوا کر دی اور اس پر گواہی سعد بن عبادۃ اور محمد بن مسلمۃ نے ثبت کی:

هذا كتابٌ من محمدٍ رسول الله لبادية الأسياف ونازلة الأجواف ممّا حازت صُحارَ ليسَ عليهم في النخل خِراصٌ ولا مِكيالٌ مُطبَقٌ حتّى يوضع في الفداء وعليهم في كُلِّ عشرةٍ أوساقٍ وسْقٌ۔ (الطبقات ۱/ ۲۸۶)

[یہ خط محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے اُن جنگل جو صحرانشینوں کی طرف ہے جو صُحارؒ کے علاقے میں جمع ہیں ان کی کھجوروں کی پیداوار میں اندازہ یا بند پیمانوں سے کام نہیں لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ سب ڈھیر کرلی جائیں اور انھیں ہر دس وسق میں ایک وسق (زکاۃ) دینا ہوگی]

۹۲۔ بارق الازدی

هذا كتابٌ من محمّدٍ رسولِ الله لبارقٍ أن لا تُجَذّ ثِمارُهم وأن لا تُرعى بلادُهم في مَربَعٍ ولا مَصيفٍ إلّا بمسألةٍ من بارقٍ ومن مرَّ بهم من المسلمين في عَرَكٍ[۲] أو جدْبٍ[۳] فله ضيافةُ ثلاثةِ أيّامٍ فاذا أينعت ثِمارُهم فلابنِ السّبيلِ اللّقاطُ يوسعُ بطنَه من غيرِ أن يقتثمَ[۴] (الطبقات ۱/ ۲۸۷)

یہ خط ابی بن کعب نے لکھا اور اس پر گواہی ابوعبیدہ بن الجراح اور حذیفۃ بن الیمان نے ثبت کی۔

[یہ خط محمد رسول اللہ کی طرف سے بارق کے لیے ہے کہ اُن کے پھلوں کو (جلدی) نہیں توڑا جائے گا اور

۱؎ معجم البلدان ۳/ ۳۹۳

۲؎ عَرَك = اُونٹوں کو چارہ کھانے کے لیے چھوڑ دینا، خاص طور سے حنظل کے جنگل میں۔

۳؎ جَدْب = وہ زمین جہاں چرنے کے لیے گھاس نہ ہو۔

۴؎ یقتثم = ساتھ میں (بہت سا سامان وغیرہ) لے جانا۔

اُن کے علاقوں میں موسمِ بہار یا جاڑوں میں جانور نہیں چرائے جائیں گے مگر بارق سے پُوچھ کر۔ اور مسلمانوں میں سے جو کوئی ان کے علاقے میں اونٹوں کی چراگاہ یا بے چارے والی زمین سے گزرے گا تو یہ اس کی تین دن تک مہمان نوازی کریں گے اور جب ان کے پھل پک جائیں تو اُس میں سے گرے پڑے پھل مسافروں کے ہوں گے جتنا بھی ان کے پیٹ میں سمائیں، مگر وہ ساتھ نہیں لے جائیں گے]

۹۳۔ وائل بن حُجر کے نام

وائل بن حُجر جب اپنی بستی کی طرف جانے لگے تو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ میری قوم کے لیے ایک خط تحریر فرما دیں۔ آں حضرتؐ نے امیر معاویہ سے فرمایا عباہلہ کہ اِقیال (امرا) کے نام لکھ دو کہ وُہ نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور چرنے والے جانوروں پر صدقہ (زکاۃ) ادا کریں اس میں خِلاطؔ[1]، وراطؔ[2]، جلبؔ[3]، جنبؔ[4] اور شِناقؔ[5] نہیں ہے۔ اُن پر یہ واجب ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی مدد کریں اور ہر دس پر ایک بار شتر (زکاۃ) ہوگی۔ جو (اپنا مال) چھپائے گا وہ سود خور (کے حکم میں) ہوگا۔

وائل نے کہا کہ یا رسول اللہ! جاہلیۃ میں جو زمین میرے پاس تھی اس کے لیے بھی فرمان لکھ دیجئے۔ آپ نے یہ تحریر فرمایا:

هذا كتابٌ من محمدٍ النبي لوائل بن حُجرٍ قَيْلِ حضرموتَ و ذٰلك أنك أسلمتَ وجعلتُ لك ما في يَديكَ من الأرضين والحُصونِ وإنّه يُوخَذ منكَ من كُلِّ عَشَرَةٍ واحِدٌ ينظرُ في ذٰلك ذوا عدْلٍ وجعلتُ لك أن لا تُظْلَمَ فيها ما قامَ الدّينُ والنّبيُّ والمؤمنون عليهِ أنصارٌ[6]۔

[یہ خط محمد نبی کی طرف سے حضرموت کے امیر وائل بن حُجر کے نام ہے۔ چونکہ تم مسلمان ہو گئے ہو میں نے تمھاری زمینیں اور قلعے تمھارے لیے کر دیے ہیں اور تم سے (ہر سال) دسواں حصّہ لیا جائے گا اور دو اہلِ عدل اس کا فیصلہ کریں گے اور ایسا (انتظام) کیا جائے گا کہ اِس (تعیّنِ لگان) میں تم پر ظلم نہ ہو جب تک دین قایم ہے اور نبی اور مومنین ہیں وہ تمھارے مددگار رہوں گے]

بعض راویوں نے یہ کہا ہے کہ الاشعث کِندی وغیرہ نے حضرموت میں وائل بن حُجر سے جائداد کے معاملے میں کچھ جھگڑا کیا اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعویٰ پیش کیا تب آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ دستاویز لکھی۔

---

[1] خِلاط = اپنے مال کو دوسرے کے مال میں ملانا
[2] وراط = دھوکا دھڑی
[3] جَلَب = قیمت گھٹانا
[4] جنب = کترانا، آنا کانی کرنا
[5] گڈمڈ کرنا
[6] الطبقات ۱/ ۲۸۷

۹۴ - اہلِ نجران کے نام

هذا كتابٌ من محمد النبي رسول الله لاهلِ نجرانَ أنّهُ كان له عليهم حكْمُه في كُلِّ ثمرةٍ صَفْراءَ أو بَيْضاءَ أو سَوْداءَ أو رقيقٍ فافْضَلَ عليهم وترك ذلك كلّهُ على ألفَيْ حُلّةٍ حُلَلِ الأواقي في كُلِّ رجَبٍ ألْفُ حُلّةٍ وفي كُلِّ صفرٍ ألفُ حُلّةٍ كُلّ حُلّةٍ أوقيةٌ فما زادت حُلَلُ الخراجِ أو نقصتْ على الأواقي فبالحساب وما قبَضُوا من دُروعٍ أو خَيْلٍ أو ركابٍ أو عَرَضٍ أُخِذَ منهم فبالحسابِ وعلى نجرانَ مثواةُ رُسُلي عشرين يومًا فدون ذلك ولا تُحبَسُ رُسُلي فَوْقَ شَهْرٍ وعليهم عاريةٌ ثلاثيْن دِرْعًا وثلاثين فرسًا وثلاثين بعيرًا إذا كان باليمنِ كَيْدٌ وماهلك ممّا أعاروا رُسُلي من دُروعٍ أو خيْلٍ أو ركابٍ فهو ضمانٌ على رُسُلي حتى يؤدّوه إليهم ولنجرانَ وحاشيتهم جِوَارُ الله وذمّةُ محمدٍ النبي رسول الله على أنفسهم وملّتهم وأرضهم وأموالهم وغائبهم وشاهدهم وبيعهم وصلواتهم لا يغيّروا أُسقفاً عن أُسْقُفيّتهِ ولا راهبًا عن رهبانيّتهِ ولا واقفًا عن وَقْفانيّتهِ وكُلّ ما تحتَ أيديهم من قليلٍ أو كثيرٍ وليس ربًا ولا دَمَ جاهليّةٍ ومن سأل منهم حقًّا فبَيْنَهم النَّصَفُ غيرَ ظالمينَ ولا مظلومين لنجرانَ ومَن أكلَ ربًا من ذي قَبَلَ فذمّتي منه بريئةٌ ولا يُؤاخذُ أحدٌ منهم بظلمِ آخَرَ وعلى ما في هٰذهِ الصحيفةِ جوار الله وذمّة النبي أبداً حتّى ياتي الله بامرهِ إن نَصَحوا وأصْلَحُوا فيما عليهم غيرَ مُثْقَلِينَ بظُلمٍ -

[یہ خط محمد رسول اللہ نبی کی طرف سے اہلِ نجران کے لیے ہے، اُن پر اگرچہ نبی کا حکم ہے اور وہ سونے چاندی اور لوہے (اسلحہ) یا غلاموں میں سے (اپنا حصہ) لے سکتے ہیں، مگر اُنھوں نے سب اُن کے لیے چھوڑ دیا اور خراج میں ایک اوقیہ (قیمت) کے دو ہزار حُلّے (لباس) سالانہ مقرر کر دیے - ان میں سے ایک ہزار حُلّے رجب کے مہینے میں اور ایک ہزار صفر کے مہینے میں دیے جائیں گے، ہر حُلّہ ایک اوقیہ (قیمت) کا ہوگا - اگر کوئی حُلّہ کم یا زیادہ قیمت کا ہوگا اس کا حساب لگا لیا جائے گا - اگر وہ حُلّوں کے بدلے زرہ بکتر یا گھوڑے یا سواری کے جانور دیں گے تو وہ بھی حساب میں لگا لیے جائیں گے - اہلِ نجران پر لازم ہے کہ وہ میرے کارندوں کو بیس دن یا کچھ زیادہ ٹھہرائیں، اور (لگان دینے کے لیے) اُنھیں ایک مہینے سے زیادہ ٹھہرنے پر مجبور نہ کریں - اگر یمن سے جنگ ہو تو وہ ۳۰ زرہ بکتر، ۳۰ گھوڑے اور ۳۰ اونٹ عاریۃً دیں گے - اگر جنگ میں کچھ زرہیں، اونٹ یا گھوڑے ضائع ہو جائیں تو اُن کے ضامن ہمارے کارندے ہوں گے یہاں تک کہ وہ (اُن کا بدلہ) ادا کر دیں - اہلِ نجران اور اُن کے ساتھیوں کے لیے اللہ اور محمد نبی

رسول اللہ کا ذمہ ہے۔ اُن کی جانیں، ملّت (مذہب)، اُن کی زمین، اموال، اُن کے غائب افراد، موجود افراد، ان کے کارندے، اُن کی نمازیں (سب کی ضمانت ہے)۔ اُن کے کسی پادری کو تبدیل نہیں کیا جائے گا نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے ہٹایا جائے گا نہ کسی واقف کو اس کی وقفانیت سے برطرف کیا جائے گا جو کچھ (جائداد) قلیل یا کثیر اُن کے قبضے میں ہے وُہ ان کی رہے گی۔ کوئی سُود نہ ہوگا اور زمانہ جاہلیت کے کسی خون کا قصاص بھی نہ ہوگا۔ اُن میں سے کوئی اگر اپنا حق مانگے گا تو اُن کے درمیان ایسے انصاف کرنے والے (مسلمان قاضی) ہوں گے جو نہ ظالم ہوں اور نہ ظلم کرنے دیں۔ اور جس نے (اسلام کے ظہور سے پہلے) کچھ سُود کھایا ہو اس سے میں بری الذمّہ ہوں۔ تم میں سے کسی کا مواخذہ دوسرے کے ظلم کے لیے نہیں کیا جائے گا۔ اس معاہدے میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے اللہ اور اس کے نبی کا ذمّہ ہے یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم ظاہر کر دے جب تک یہ خیر خواہ رہیں، آپس میں امن و سلامتی سے رہیں اور ظلم سے مجبور نہ کر دیے جائیں۔]

اس معاہدے پر ابوسفیان بن حرب، غیلان بن عمرو، مالک بن عوف النصری، الأقرع بن حابس اور المستورد بن عمرو أخو بلی اور المغیرہ بن شعبہ و عامر مولی ابوبکر نے گواہی ثبت کی۔[1]

۹۵۔ اکیدر[2] کے نام

اہلِ دُومۃ کے ایک شیخ نے محمد بن عمر الاسلمی الواقدی سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُکیدر کو یہ خط لکھا تھا۔ راوی نے وہ خط بھی دکھایا اور الواقدی نے اس کی نقل حاصل کی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا كتابٌ من محمّد رسول الله لأُكيدِرَ حين أجاب إلى الاسلام وخلعَ الأنداد والأصنام مع خالد بنِ الوليدِ سيفِ الله فى دُومة الجندَلِ وأكنافها أنّ لنا الضّاحية من الضّحلِ والبوْرَ والمعامِيَ وأغفال الأرضِ والحَلْقَةَ والسّلاحَ والحافِرَ والحِصْنَ ولكم الضّامنة

---

[1] الطبقات ۱/ ۲۸۷ - ۲۸۸

[2] اکیدر دُومۃ الجندل کا امیر تھا۔ اس مقام کے لیے دیکھیے:

معجم البلدان ۲/ ۴۸۷۔ اُکیدر عیسائی تھا اور مذکورہ بالا شرائط پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے صلح کی تھی۔ لیکن بعد کو اس نے عہد شکنی کی تو اُسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جلاوطن کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا خط کی تشریح یاقوت نے کی ہے:

الضّاحی، البارز یعنی نمایاں۔ الضّحل، کم پانی والے تالاب۔ البور، وہ زمین جس میں کچھ پیداوار نہ ہوتی ہو، افتادہ اراضی۔ المعامی، وُہ افتادہ اور بیکار زمین۔ اغفال، جہاں کچھ آثار نہ ہوں۔ حلقه، زرہیں۔ حافر، گھوڑے، خچر وغیرہ باربرداری اور سواری کے جانور۔ حصن سے مراد دُومۃ الجندل کا قلعہ۔ الضامنه، وہ محصور نخلستان جو قلعہ دُومۃ الجندل کے اندر ہے۔ المعین، بارہ مہینے جاری رہنے والا پانی۔

من النخْلِ و المعينُ من المعمور و بعد الخُمُسِ لا تُعْدَلُ سارحتُكم ولا تُعَدُّ فاردتُكم ولا يُحْظَرُ عليكم النّباتُ ولا يُؤخَذُ منكم إلاّ عُشُرُ الثّباتِ ، يقيمون الصّلاة لوقتها و تؤتون الزكاة بحقّها ، عليكم بذلك العهد و الميثاقُ و لكم بذلك الصّدقُ والوفاءُ۔

(الطبقات ۱/ ۲۸۸ ـ ۲۸۹)

[یہ تحریر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے اُکیدر کے نام ہے جب کہ اس نے خالد بن ولید سیف اللہ کے سامنے دُومۃ الجندل میں اسلام قبول کیا ہے اور بُتوں کی پُوجا چھوڑ دی ہے۔ ہمارے لیے تالاب کے اطراف کی زمینیں، غیر مزروعہ اور افتادہ زمینیں، ہتھیار کے ذخیرے اور قلعے ، چوپائے اور تمھارے لیے نخلستان اور چشمے ہیں ۔خُمس کے بعد تمھارے مویشیوں پر ٹیکس نہیں ہو گا اور (زکوٰۃ کا حساب کرنے کے لیے) اِکّا دُکّا جانوروں کو دوسرے ریوڑ میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ تمھارے لیے چراگاہوں میں باڑھ نہیں لگائی جائے گی (ممنوع نہیں ہوں گی) اور تم سے پُرانے درختوں کی پیداوار کے دسویں حصّے (عُشر) کے علاوہ کچھ نہیں لیا جائے گا، بشرطیکہ تم نماز اس کے مقررہ اوقات میں پڑھتے رہو اور زکوٰۃ اس کے حساب سے ادا کرتے رہو۔ اس پر تم سے یہ عہد و میثاق ہوا ہے اور تمھارے لیے اس کی پابندی صدق دل سے کرنا واجب ہے]

اس دستاویز پر اللہ اور تمام حاضر الوقت مسلمانوں کو گواہ بنایا گیا۔

۹۶ ـ یُحَنّہ بن رُوبہ

جب دُومۃ ، اَیلہ اور تیماء والوں نے دیکھا کہ عرب کی اکثریت مسلمان ہوتی جا رہی ہے تو انھیں خوف ہوا ، اَیلہ کا حکمران یُحَنّہ بن رُوبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اُسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علاقے میں بھی اسی طرح لشکر نہ بھیج دیں جیسے آپ نے اُکیدر کی طرف بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ اہلِ شام ، اہلِ یمن ، اہل البحر ، جربا اور اَذرح کے لوگ بھی آئے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر لی۔ آپ نے اس پر جزیہ مقرر کر دیا اور یہ دستاویز لکھوا کر دے دی۔ آپ نے اہل ایلہ پر تین سو دینار سالانہ جزیہ مقرر کیا تھا کیونکہ یہ لوگ تعداد میں تین سو ہی تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا أَمَنَةٌ من الله و محمد النبي رسول الله لِيُحَنَّةَ بنِ رَوْبَةَ وَ أَهلِ أَيلةَ لسُفُنِهِم و سيّاراتهم في البرّ والبحرِ لهم ذِمّةُ الله و ذمّةُ محمّدٍ رسول الله و لمن كان معهم من أَهل الشام و أَهل اليمن و أَهل البحرِ و من أَحدثَ حدثًا فانّهُ لا يَحُولُ مالُهُ دونَ نفسه و أنّه طيّبة لمن أخذه من النّاسِ و انّهُ لا يحلّ أنْ يُمنَعُوا ماءً يَردونه ولا طريقاً يُريدونه من برٍّ و بحرٍ ، هذا كتابُ جُهَيمِ بنِ الصَّلْتِ

و شُرَحبِيْلَ بنِ حسنَةَ باذنِ رسول اللهِ - (الطبقات ۱/ ۲۸۹)

[یہ امن نامہ اللہ اور اس کے نبی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے یُحنّہ بن رُوبۃ اور اہلِ اَیلہ[1] کے لیے ہے ۔ اُن کی کشتیاں اور سواریاں، خشکی اور سمندر میں، اللہ اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ میں ہیں اور اُن کے ساتھ جو شامی، یمنی، البحر والے ہیں (اُن کے لیے بھی یہ امان ہے) جو کوئی نئی بات کرے گا وہ اپنے مال کو اپنے سوا دوسروں کو منتقل نہیں کرے گا ۔ ہاں جو کچھ وہ لوگوں سے لیں وہ جائز ہوگا اور اُنھیں یہ جائز نہیں ہے کہ جس پانی پر وُہ اتریں اس سے دوسروں کو روکیں یا خشکی اور تری کے جس راستے پر وُہ ہوں (اس میں لُوٹ مار کریں) ۔ یہ تحریر جہیم بن الصّلت اور شرحبیل بن حسنہ کی ہے جو انھوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھی ہے]

الواقدی نے عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ عبدالرحمٰن بن جابر نے اپنے باپ (جابر) سے روایت کیا کہ انھوں نے یُحنّہ بن رُوبۃ کو دیکھا تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو ایک سونے کی صلیب اس کے ماتھے پر بندھی ہوئی تھی اس نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو اُسے چُھپا لیا اور اپنے سر کو جُھکا لیا ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُسے اشارہ کیا کہ اپنا سر اوپر اٹھاؤ ۔ پھر آپ نے اس سے صُلح کر لی اور اسے ایک یمنی چادر اوڑھائی ۔ اور حکم دیا کہ اسے بلالؓ کے پاس ٹھہرایا جائے ۔ راوی نے کہا کہ میں نے اکیدر کو بھی دیکھا تھا جب اسے خالد بن الولیدؓ لے کر آئے تھے اس کے جسم پر بھی سونے کی صلیب تھی اور ریشمی لباس پہنے ہُوئے تھا ۔

۹۷ - اہلِ اذرُحؔ[2] کے نام

الواقدی نے اس خط کی نقل بھی حاصل کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ اذرح کے لیے لکھوایا تھا ۔ یہ لوگ یہودی تھے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هذا كتاب من محمدٍ النبی لأهل أذرح أنّهم آمنون بأمان الله و محمد و أنّ عليهم مائةَ دينارٍ فى كلِّ رجبٍ وافيةً طيّبةً والله كفيلٌ عليهم بالنصح و الاحسان للمسلمين و من لجأ إليهم من المسلمين من المخافةِ والتعزير إذا خشوا على المسلمين وهم آمنون حتّى يُحَدِّثَ إليهم محمّدٌ قبل خروجه -

[یہ تحریر محمد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اہلِ اذرح کے لیے ہے کہ وہ اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان میں ہیں اور ان پر لازم ہوگا کہ وہ سَو دینار سالانہ (جزیہ) ہر رجب کے مہینے میں پورا پورا

---

[1] اَیلہ - معجم البلدان ۱/ ۲۹۲

[2] اذرُح ذریح کی جمع ہے - یہ اطرافِ شام میں ایک بستی کا نام ہے - یہ معاہدہ ۹ھ میں ہوا تھا - معجم البلدان ۱/ ۱۳۰

ادا کریں۔ اللہ ان کا کفیل ہوگا۔ اس خیر خواہی اور نیکی کے لیے جو وہ مسلمانوں کے ساتھ کریں گے اور مسلمانوں میں سے جس کی پناہ میں وہ جائیں کسی خوف سے یا تعزیر کے ڈر سے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ انھیں امان دیں یہاں تک کہ اُن کے خود واپس جانے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کچھ ارشاد فرمائیں]

یہ معاہدہ المقدسی کے زمانے تک محفوظ تھا اس کا بیان ہے کہ یہ کھال پر لکھا ہوا تھا۔

۹۸۔ اہل جَربا[1] و اذرُح کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جَربا اور اذرُح کے یہودیوں کو یہ امان نامہ لکھ کر دیا:

ھذا کتابٌ من محمّد النبی لاھل جربا و أذرح أنھم اٰمنون بامان اللہ و أمان محمّدٍ وأنّ علیھم مائۃ دینارٍ فی کلّ رجبٍ وافیۃً طیّبۃً واللہ کفیل علیھم۔

(الطبقات ۱/۲۹۰)

[یہ تحریر محمد نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اہلِ جربا و اُذرُح کے لیے ہے کہ وہ اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان میں ہیں اور انھیں ہر سال ماہِ رجب میں سَو دینار (جزیہ) سونے کے سکّے پورے دینا ہوں گے اور اللہ ان کا کفیل ہے]

۹۹۔ اہلِ مقنا[2] کے نام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مقنا کے یہودیوں کے نام یہ دستاویز لکھ کر دی:

أنھم اٰمنون بأمان اللہ و أمان محمدٍ وّ أنّ علیھم ربعَ غُزولھم و ربعَ ثمارھم۔ (الطبقات ۱/۲۹۰)

[اُنھیں اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امان ہے اور اُنھیں ٹیکس میں ایک چوتھائی (کاتا ہُوا سُوت) اور ایک چوتھائی پھل دینا ہوں گے]

---

[1] جَربا = اُذرُح کے پاس ہی ایک بستی ہے۔ یہ بھی شام کا علاقہ ہے اور ۹ھ میں فتح ہوا تھا۔ معجم البلدان ۲/۱۱۸

[2] مقنا = معجم البلدان ۵/۱۷۸

حقیقتِ توحید

اور

حقیقتِ وحی

مولانا امین احسن اصلاحی

شیخ الہند مولانا محمود حسن

حقیقتِ توحید

مولانا امین احسن اصلاحی

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بطور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے :۔

قرآن کے اوّلین مخاطب

قرآن مجید کے اوّلین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی جیسا کہ "حقیقتِ شرک" میں ہم بیان کر چکے ہیں، خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسمٰعیل تھے، جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا بھی اقرار کرتے تھے۔ ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اس کی تمام صفاتِ حسنیٰ کے بھی قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک ـــــ چنانچہ قرآن مجید نے ان گروہوں سے ان کو منکرِ خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلّمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انھوں نے ان مسلمات سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہم نے "حقیقتِ شرک" میں بیان کیا ہے دنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصور ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصور کے اردگرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمّہ کے حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوتی نہ ایمان و عمل صالح کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہدِ حاضر کی پیداوار ہے۔ اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے۔ ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

یہی وجہ ہے کہ قرآن اثباتِ الوہیت کے باب میں ہمارے متکلمین کے طریقہ پر اثباتِ باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلام مؤثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا اور وہ حکمتِ بالغہ جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر متکلمانہ

جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا بڑا حصہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ان کی رایوں اور اُن کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ ان کے سامنے کھول کے رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کر لیں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیتِ جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن چونکہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکز دین اور مبدأ ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آجائے اس وقت تک نہ اس کائنات کا معمہ حل ہو سکتا، نہ آدمی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا۔ نہ حق و باطل اور برّ و اثم کے اصول قائم ہو سکتے ہیں، نیز قرآن مجید ایک ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے۔ کسی خاص قوم یا کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس کو بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے، اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوب بیان اختیار فرمایا جس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تمام صفات کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہوتا کہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصوّر سے قاصر ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے۔ ان کے لیے جابجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اُس کے صفاتِ حسنیٰ کے تصور میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفاتِ کمال سے متصف تو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو انھوں نے اپنے اقرار سے بالکل مختلف اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں۔ ہرچند وہ خدا کے منکر نہ تھے لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت اُلجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجودِ باری کے باب میں بھی اُن کو یقین و بصیرت حاصل ہو سکے اور اس کی صفات کے تصور میں بھی اُن کے ذہن کی ساری اُلجھنیں دُور ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو منکر و ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں اُلجھنیں ہیں۔ استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو تورات اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انھوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں۔ ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی عملی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں۔ بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب بنی اسمٰعیل بھی ہیں لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

قرآنی استدلال کی اساس

اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبداء و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں :۔

۱۔ وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں الٰہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں، یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے مُنہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خُدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالق کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مُراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السموٰات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر تنبیہ کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے :

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ	ہم ان کو اپنی دلیلیں کائنات میں اور خود ان کے اندر دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے کہ وہی حق ہے، کیا تیرے پروردگار کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر ہے۔ آگاہ! وہ اپنے

اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ٥ (حمٓ السجدہ ۵۲-۵۴)	رب سے ملنے کے بارہ میں شک میں ہیں آگاہ! وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اِس آیت میں دعویٰ روزِ جزا اور قیامت ہے۔ اس پر پہلے دلائل آفاق کا حوالہ دیا ہے۔ پھر دلائل انفس کا ذکر فرمایا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورۂ ذاریات میں ہے :-

وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ وَفِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ ۔ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ ۔ (۲۰-۲۳)	اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی ہیں، کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتی ہیں اور آسمان میں تمھاری روزی ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمھیں دھمکی سنائی جا رہی ہے پس آسمان وزمین کے رب کی قسم یہ بات واقع ہو کر رہے گی بالکل اسی طرح جس طرح تمھارے لیے ایک بات کو بول دینا۔

یہاں بھی دعویٰ جزا و سزا کا وقوع ہے۔ ان آیات سے اُوپر اسی دعوے پر آسمان وزمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کے فاطر کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دُنیا کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دے اس کائنات کے سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگذشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی برائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا۔ پھر ایک جامع بات فرمائی کہ آسمان وزمین اور تمہارے نفوس کے اندر اس کی دلیلیں موجود ہیں۔ یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آسمان وزمین کے رب کی قسم بطور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں ہم نے قرآن مجید سے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرما دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی، توحید، رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

بعض ضروری تنبیہات

لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علیحدہ علیحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں اُن کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرز استدلال اور اس کی اساس استدلال میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے۔ کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں کہیں آفاق کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ کہیں ان میں سے دو کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کہیں تینوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں صرف توحید پر استدلال ہے کہیں

صرف معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیئے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقد بصیر کا کام ہے۔ پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے اس وجہ سے جو لوگ استدلال و نظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے۔ جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ بلاشبہ اہلِ ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرما دینا ہی دلیل ہے لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آیا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن نے جیسا کہ اُوپر واضح ہو چکا ہے عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کو بطور ماخذ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق و انفس کے قوانین و سُنن سے دکھائی ہے اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے۔ قرآن انھی حقائق کا داعی ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ شریعت اور عالمِ آفاق اور عالمِ انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں تنبیہہ ان امور پر اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اولین مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور اُن کی خصوصیات وحالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، یا قرآن کے طرزِ استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا سارا استدلال ظنی اور الزامی قسم کا ہے اس کو فلسفیانہ برہانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ یونانی علوم سے متاثر و مرعوب ہوئے وہ اسی سوءِ ظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے۔ وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو (العیاذ باللہ) مزبلہ سمجھ کر آئے جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، برہانیات کے جواہر ریزوں کی اُمید نہیں تھی۔ قرآن کی نسبت اسی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ و سائنس سے مرعُوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجہ کے دماغوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ خواص اور عقلاء کے مبلغ ادراک سے اس کا استدلال العیاذ باللہ فروتر ہے ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ہم اس رسالہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تاکہ دین کی حجیت واضح ہو۔

مباحث کی ترتیب

اس رسالہ میں مباحث کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے:-

توحید کے عمُومی دلائل

(۱) دلائلِ آفاق

(۲) دلائلِ انفس

توحید کے خصوصی دلائل
(۳) دلائل بلحاظ مسلمات مخاطب
(۴) پچھلی فصلوں کا خلاصہ
(۵) عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر۔
(۶) عقیدۂ توحید کی اہمیت دین میں۔

یہ رسالہ چونکہ "حقیقتِ شرک" کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے اس رسالہ کی اصلی مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے۔ بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں وضاحت کے ساتھ "حقیقتِ شرک" میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں اُن کو دلوں میں جگہ دے اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر سے محو فرما دے۔

توحید کے عمومی دلائل

دلائلِ آفاق

یہ دنیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر بلکہ ایک ایسے معبودِ حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جس کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن کے بارہ میں ہماری عقل اور ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے۔ ان امور کو قرآن کی زبان میں آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اس فصل میں بقدرِ ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱۔ کائنات کا حُسن و جمال

سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حُسن و جمال ہے جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دُنیا میں کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپّہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پرواگزر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اُس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حُسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے اردگرد حُسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے۔ دفعتاً اُس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمور دُنیا خود بخود وجود میں آگئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:۔

تبارک اللہ احسن الخالقین ——— بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

یعنی صرف اسی بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DE - SIGNER) ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہترین خالق ہے۔ بکسر خیر و برکت ہے۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت اور کمالِ خیر و برکت کا نمونہ ہے۔ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔

ظاہر ہے کہ دُنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگ حُسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی۔ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں، ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دُنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کی حس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دُنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے متصف ہے۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۔ وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۢ بَهِیْجٍ تَبْصِرَةً وَّ ذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۔ (ق ۶-۸)	کیا انھوں نے اپنے اُوپر آسمان کو نہیں دیکھا کیسا ہم نے اُس کو بلند کیا اور سجایا اور کہیں اس میں دراڑ نہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں لنگر انداز کر دیئے پہاڑ اور اُگائیں اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں بصیرت اور یاد دہانی پیدا کرنے کے لیے ہر متوجہ ہونے والے بندے کے دل میں۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلوؤں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے۔ اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دُنیا کا مشاہدہ خود بخود انسان میں خُدا اور اس کی صفاتِ حُسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِــُٔوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْکِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ	بھلا دیکھو تو اس آگ کو جس کو سُلگاتے ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا ہے یا ہم اس کو اگانے والے ہیں؟ ہم نے اس کو بنایا ہے یاد دہانی اور فائدہ اُٹھانے کی چیز مسافروں کے لیے۔

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دُنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادی ضرورت ہی کو نہیں پُورا کرتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی تخلیق میں حُسن و خوبروئی اور کمالِ صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے تنبیہ بھی کرتی ہیں اور یہ تنبیہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے بلکہ اُن کا اصلی وظیفہ ہی یہی ہے چنانچہ آیت میں تذکرہ کا لفظ 'متاع' کے لفظ پر مقدم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاد دہانی ہے

سامانِ معیشت ہوتا ان کا ایک مزید فائدہ ہے۔ جن لوگوں کی حسِ باطن بیدار ہوتی ہے ان اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی لذات کے سوا جن کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا ان کی آنکھیں خوردبینوں اور دوربینوں سے مسلح ہونے کے باوجود اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں جو فی الحقیقت ہر شئے کے اندر سب سے زیادہ اُبھری ہُوئی ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں لیکن سنتے نہیں آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔ صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفات جمال و کمال سے متصف ہے کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دُنیا بنی ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں جو چیز بنی ہے خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے۔ اُس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قابلیتوں اور بہترین قویٰ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ) نیز فرمایا (یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ) اُس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا بلکہ لُطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کئے اور مشام نوازی اور نظر بازی کے لیے پھُول بھی کھلائے اور چمن بھی اُگائے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ (اور زمین کو بنایا مخلوق کے لیے، اس میں میوے ہیں اور کھجوریں غلاف دار، اناج ہیں بھُس والے اور پھُول ہیں)

ظاہر ہے یہ صرف خلق نہیں بلکہ کمالِ خلق اور کمالِ قدرت ہے۔ صرف بخشنا نہیں بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمالِ ربُوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حُسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجُود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہُوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دُنیا کے حُسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مُدبّر ایک ہی ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجمُوعہ کے حُسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین، تناسب الاعضاء اور خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اُس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضا و اجزاء کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس مجموعی دُنیا کے حُسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اوّلاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیئے کی دکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں ہر چیز

بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی، کیونکہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق

دوسرا اہم اور قابلِ توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق (HARMONY) اور ان کی باہمی سازگاری ہے۔ اس دنیا کے مختلف اجزا میں جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے، اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات و صفات کا حامل ہے تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی و جسمانی اتصال رکھتے ہیں۔ وہ ظاہر ہے عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب و مرغوب ہے بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت و مرد میں سے جس طرح ایک کا تنہا وجود بے غایت ہے۔ اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا اسی وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدین ہی میں نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشو و نما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط و نظم کے ساتھ ہو لے تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی (MIND) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی ہے اور ان کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (ACCIDENT) ہے۔ آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور اس کے مختلف اجزا کا ارتقا بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے، تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی

ہے، کیا کوئی عاقل ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند و پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے، ہر ایک کا بطور خود ارتقا ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا، اور پھر بالکل اتفاق ہی سے یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے؟ کیا عقلِ انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم و قدرت اور ربوبیت و حکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم و حکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا اور اُن کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین و آسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے۔ مالک و متصرف ہے۔ کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان و زمین کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی، یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزا میں یہ زوجین کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں، قرآن نے اس دلیل کو مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے ہم بطورِ مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذاریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ، وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ۔ (۴۹-۵۱)	اور ہم نے ہر چیز میں سے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو پس اللہ کی طرف بھاگو میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک مت بناؤ، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے۔ معاد پر استدلال یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ ہمارے رسالہ "حقیقتِ معاد" میں آئے گی۔ توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود و بقا اس کے اضداد کے توافق و سازگاری سے ہے اور اس سے بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبر ایک ہی ہے جو ان کے اختلافات کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے پس یہ اختلافات جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہر کا اختلاف ہے اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے۔ کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں۔ ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تحتِ تصرف اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس دلیل کی تفصیل سورۂ بقرہ میں

ان الفاظ میں کی گئی ہے :۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (آیت ۲۲)	اے لوگو! اپنے اس مالک کی پیروی کرو جس نے تم سے پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ اس کے عذاب سے محفوظ رہو جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور اُتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کئے پھل تمھاری روزی کے لیے میں اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

یعنی جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصوّر کرتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبّر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے تصرف میں لائے یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ (بقرہ)	اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ رحمٰن اور رحیم، آسمانوں اور زمین کی خلقت، روز و شب کی آمد و شد، اور کشتی میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نافع چیزیں لے کر چلتی ہے اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر طرح کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں، جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں، دلیلیں ہیں (توحید کی) سمجھنے والوں کے لیے۔

سورۂ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا ہے :۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ○ وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ	اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی اور اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مر جانے کے بعد۔ بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سنیں۔ اور

لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ○ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (آیت ۶۵-۶۹)

تمھارے لیے چوپایوں کے اندر بھی غور کرنے کی جگہ ہے، ہم تم کو پلاتے ہیں ان چیزوں کے اندر سے جو ان کے پیٹوں کے اندر ہیں گوبر اور خون کے درمیان سے، خالص دودھ پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار، اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم تیار کرتے ہو نشہ اور اچھی روزی، بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ بنا پہاڑ کے اندر چھتے اور درختوں میں اور ان میں جن کو ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں پھر پھل پھل کا رس چوس اور چل اپنے رب کی ٹھہرائی ہوئی راہوں میں اطاعت کے ساتھ نکلتی ہے اس کے پیٹ سے پینے کی چیز جس کے رنگ مختلف ہیں اور جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بیشک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے۔ اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر، درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں، پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی۔ انسان ان کو پیتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ گئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں۔ جس دنیا کے اتنے بعید اجزا کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزا کی کشاکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہو سکتی، نہ مختلف ارادوں کی رزمگاہ ہو سکتی۔ ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں۔ موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان کے اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۔ (فاطر ۱۲-۱۳)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک شیریں اور پینے کے لیے خوشگوار ہے اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے اور تم دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور پہننے کے لیے زیور نکالتے ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو ان میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ اس کی شکرگزاری کرو۔ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک ایک وقت مقرر تک کے لیے چلتا ہے یہی اللہ تمہارا رب ہے اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے۔ تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں۔ پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو۔ دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک ہی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاقی ہے؟ کیا یہ تنظیم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض "نہ ماننے کی خواہش" پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

۴۔ ضد سے ضد کا وجود

اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو۔ اس کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔

جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا

اور سرسبز درخت سے تمہارے لیے آگ بنائی۔

موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (انعام ۹۶)

نکالنے والا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے وہی اللہ ہے تم کہاں بھٹکے جاتے ہو۔

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کر سکتے۔ یہاں آکر بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرت کاملہ سے تصرف کرتی رہتی ہے اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی اور ان کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا توجیہہ کریں گے؟ اور ہرے بھرے درخت سے تروتازہ پھلوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً ایک ایسی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا جو ان تمام سنن طبیعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی ہے۔ ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں کہ متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے۔ سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے۔ پھر درجہ بدرجہ اس کے اجزاء میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع اللہ کے تعدد و تنوع کی دلیل نہیں ہے۔ زمین ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے۔ ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں۔ تاہم نباتات بے شمار قسم کی اُگتی ہیں، پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں پھلوں کی شکل و صورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ و بو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے۔ ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زائد انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنا پیدا ہوتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۔ (الرعد - ۴)

اور زمین میں پاس پاس کے ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجوریں اکہرے اور دوہرے ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں تاہم پھل میں ہم ایک کو دوسرے پر بڑھا دیتے ہیں۔ بے شبہ اس میں نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔

یعنی جس شخص میں عقل ہوگی لازماً اس سے اس کو تنبہ ہوگا اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی خالق ہے جو کمالِ حکمت و قدرت اور کمالِ رحمت کے ساتھ تصرف فرما رہا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لاشریک لہ ہے کیونکہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعۂ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے

تو اس کائنات کی اس گوناگونی کو اللہ کے تعدد کی دلیل کیوں ٹھہرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہوگی کہ یہ سارے تنوعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم و قدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازہ کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵۔ مظاہرِ کائنات کی تسخیر

توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز و مقہوریت اور انقیاد و اطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہیں کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن و عظمت کے باوجود، اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق و رعد اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظامِ حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر فرمانروا ہے۔ اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب کا خالق اور سب پر آمر و متصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اسکا جواب مشرکین عرب کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز و حکیم ہے۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا تو وہ جواب دیں گے ان کو عزیز و علیم نے بنایا ہے) کیونکہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اس کائنات کا خالق کوئی ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو عزت و کبریائی اور علم و حکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو۔

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں۔ ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط، اور کسوف و خسوف کے آثار، جو ہم ان میں دیکھتے ہیں۔ دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال و تفصیل کی مختلف شکلوں میں، قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حُسنِ مجادلہ کی بہترین تصویر ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا	جب اس کو رات نے ڈھانک لیا۔ اس نے ایک ستارے
رَبِّيْ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○	کو دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا، کہا
فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّاۤ	میں غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب چاند
اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ	کو چمکتا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ جب ڈوب گیا، بولا
مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ	اگر میرے پروردگار نے میری رہبری نہ فرمائی تو لازماً میں
بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ فَلَمَّاۤ	بھٹکے لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا

اَفَاَتَ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام ۷۷-۷۸)

کہا یہ میرا رب ہے ۔ یہ بڑا ہے جب وہ بھی ڈوب گیا کہا۔ اے میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں نے اپنا رُخ یکسو ہو کر اس ذات کی طرف پھیرا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

۶ - کائنات کی محکم تدبیر

اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا، اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں - ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دُنیا مختلف قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے - دُوسری طرف یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قوت شتر بے مہار کی طرح اپنے رُخ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے، نہ وہ کسی نظام ظاہری کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع، لیکن پھر دفعتہً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے۔ کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بڑے بڑے اجرام سماویہ کسی خاص رُخ پر بڑھ چلے اور اگر وہ اسی رُخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارے کرۂ زمین سے ٹکرا جاتے اور یہ کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا۔ چنانچہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرین فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرم سماوی سے ٹکرا جائے گی لیکن جب وہ متعین وقت آیا دفعتہً اس جرم نے اپنا رُخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دُنیا کے بالکل سر پر آ گیا تھا یکایک دفع ہو گیا ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قویٰ اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھکیلتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقل بشری اور قلب انسانی کو ان جوابات سے تشفی و طمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ ان اللہ یمسک السمٰوٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ انہ کان حلیما غفورا (اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو کوئی اس کے بعد ان کا تھامنے والا نہیں بے شک وہ نہایت حلیم اور بخشنے والا ہے) اور کون ہے جو اس جواب کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دُنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس

کائنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر غور کریں تو وہاں بھی ہمیں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علمبردار پیدا ہوتے ہیں، اس پر ایک باطل نظامِ اخلاق، ایک باطل نظامِ معیشت اور ایک باطل نظامِ سیاست کے ردّے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے غلبہ کے نیچے دب کر صالح اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے۔ تاہم اس نظامِ باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی از سرِ نو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظامِ باطل کو اس طرح جھنجھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے۔ حتیٰ اذا استایئس الرسل و ظنوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا (یہاں تک کہ جب انبیاء قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور قوم کے لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کو جھوٹ عذاب کی دھمکی دی تھی۔ ہماری مدد آجاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (اور ہلا دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ پکار اُٹھتے ہیں انبیاء اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، آگاہ! اللہ کی مدد قریب ہے)

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ دنیا آپ سے آپ وجود میں آئی اور خود بخود قائم ہے یا یہ گمان کر سکے کہ یہ مختلف قویٰ اور عناصر کی ایک رزم گاہ ہے اور یہ قویٰ اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیرِ نگیں نہیں ہیں؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے۔

۷۔ ہر نظمِ اجتماعی کیلئے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو

اس عالم کا مجرد قیام ہی اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصوّر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں۔ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیمِ اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا تاراج اور انار کی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہرحال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی، سنبھلتی، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی و صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر وہ شخص کر رہا ہے جو اس پادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کونسی بات عقل سے قریب تر ہے۔ کیا مشرکین کا یہ

عقیدہ کہ آسمان وزمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور وظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دُنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم ومدبر صرف اللہ واحد وقہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا۔ یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت وانتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیونکر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۔ (انبیاء ۲۱، ۲۲)	کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں وہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ عرش کا مالک پاک ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔ (بنی اسرائیل ۴۲-۴۳)	کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے سے منازعت کی راہ ڈھونڈتے وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ کہتے ہیں

۸ - حق وباطل کی آویزش اور حق کا غلبہ

بعض قوموں کو خدا کی توحید بلکہ خود خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ دُنیا میں شر وباطل کے وجود سے پیش آیا ہے۔ ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مکھن تھا وہ ان کو نظر نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز ورحیم اور پاک وقدوس خدا کے وجود سے ہی منکر ہو گئیں۔ یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دُنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے اور وہ اس کو پیدا کر کے، دُور بیٹھے ہوئے اس کے مصائب وشدائد اور اس کے دُکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں یا پھر یہ کیا کہ خیر وشر اور نور وظلمت کے الگ الگ خدا ٹھہرا لیے اور دُنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزم گاہ بنا دیا۔ یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلتِ تدبر، قلتِ صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہوئی۔ نہ انھوں نے اس دُنیا کے اصلی مزاج وقوام کو پہچانا اور نہ حق وباطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان تمام اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم اجمال کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس دُنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

(رعد - ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پس وادیاں ایک اندازہ کے ساتھ بہہ نکلیں، پس سیلاب کے اوپر جھاگ اُبھر آئی اور اسی طرح کی جھاگ اس چاندی میں ہوتی ہے جس کو آگ میں پگھلاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا کوئی اور سامان اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ اُڑ جاتا ہے باقی جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہے وہ زمین میں ٹک جاتا ہے۔ ایسی ہی اللہ مثلیں بیان کرتا ہے۔

یعنی اس دُنیا کا اصلی مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو ہضم نہیں کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو ہضم نہیں کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور وادیاں بہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ اُبھر آتے ہیں، پھر پانی زمین میں ٹک جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے۔ یہی اس دُنیا کا اصل مزاج ہے۔ اس میں مجرّد باطل کا وجود نہیں ہے۔ باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر، جس طرح صالح درختوں اور صالح جانداروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے۔ تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو۔ حالانکہ یہ اعتراض محض تمہاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے۔ قدرت ہر گوشے میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے۔ اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق و طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس دُنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم و ثابت کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ

(انبیاء - ۱۶ - ۱۸)

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کرنے کے لیے۔ اگر ہم کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی سے بناتے اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو اس کا بھیجا نکال لیتا ہے اور باطل دفعتہً نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے ہلاکی ہے ان باتوں کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو

اس دُنیا کے اندر جو مصائب و آلام ہیں وہ اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دُنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے

قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم و قدیر خدا کی مشیت و حکمت کے تحت اور ان کی قوموں کے اخلاق و اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں۔ بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی سرکش قوم جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے۔ ان کے ذریعہ سے تباہ کر دی جائے۔ بعض حالات میں اہلِ حق بھی ان سے کچھ حصہ پاتے ہیں تاکہ ان کے ایمان و عقیدہ اور صبر و عزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات و آلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کون و فساد اور رحمت و نقمت کے الگ الگ دیوتا ہیں بلکہ صرف ایک ہی جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے جیسا کہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے۔ یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے۔ یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے۔ اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے پہلی راہ اُسکی فطرت کی راہ ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیونکہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اسکی مشیت کے تحت ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو۔ وہ اتمام حجت کے لیے ان کاموں کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیل دیتا ہے جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ پس خیر ہو یا شر کُل اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ نہ جبر محض کا دعویٰ صحیح ہے نہ اختیارِ مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے۔ شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے۔ پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں۔ ایک ہی ہے جس کے تحت تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹ - اشارات

اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات (SU GGESTIONS) میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں۔ اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بین نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں

بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے مصنوعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور عبرت و تنبہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھتی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہلِ عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے جو لوگ عرب کے خطباء اور شعرا جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ منزل یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں۔ اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی مؤثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا دل بھی بھر آتا ہے۔ قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوقِ نظر جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ "توسّم" ہے صرف دیارِ یار کے آثار و نشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجے کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو شہ دی اور کائنات کے آثار و عجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امراء القیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کر سکتی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اٹھیں۔

یہ اشاراتِ قرآن کے تمام بنیادی مسائل توحید، رسالت، معاد کے سلسلہ میں نمایاں کئے گئے ہیں۔ یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تاکہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے۔[۱]

سورۂ رعد میں فرمایا ہے:-

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ۔	اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں راضی خوشی اور مجبوراً اور ان کے سائے صبح شام۔ پوچھو کون ہے آسمانوں اور زمین کا ربّ، کہو اللہ۔

"طَوْعًا وَّكَرْهًا" کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں لیکن جو

---

[۱] اس کائنات کے اشاراتِ حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں مثلاً اگر تثلیث پیشِ نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشے سے تثلیث نمایاں ہوگی یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی سب مثلث ہوں گی میز، قلمدان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبر کی نظر ڈالے۔ وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی۔ اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے "ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار" لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے۔ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَةً

اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے انھیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرما دی کہ ان کے سائے صبح و شام خدا کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے یا ایک ساجد خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک شب زندہ دار کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے۔ پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اُٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے جس طرح ایک مصلّی سجدہ سے قیام کی حالت میں آگیا ہو اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اسی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے جو اُوپر مذکور ہوا۔

یہ صورت حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع و سجود میں ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سجدہ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے۔ آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی۔ پھر اگر ایک انسان، جو ایک با اختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے لیکن اس کے سارے وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کر رہا ہے لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار ہے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ پر عامل ہے۔ عالم اختیار اور عالم تکوینی کی یہ بے ربطی "من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید" کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں فرمایا ہے :-

اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ	کیا انھوں نے نہیں دیکھا ان چیزوں کی طرف جو خدا نے
یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا	پیدا کی ہیں لوٹتا ہے ان کا سایہ داہنے اور بائیں سے سجدہ
لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل - ۴۸)	کرتا ہوا اللہ کو اور وہ اس کے آگے ذلیل ہیں۔

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو قومیں صُغریٰ و کُبریٰ کی ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اُٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی۔ یہ چیز تربیت عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے۔ ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں کر سکتے جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈروں

پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر سکتے ہیں ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

توحید کے دلائل انفس میں

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے۔ پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دُور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل آفاق کی بنیاد درحقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم ظلمات ہوتا چنانچہ جو بلید آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں انکے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دلنشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ	اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے
أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔	اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی کیا تم نہیں دیکھتے۔

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالمِ نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے ! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہدِ فطرت

توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ "حقیقتِ شرک" کی آخری دو فصلوں میں کی ہے یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہاں ہم نے سائنس کے علماء کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصور ہوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسبابِ زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو

اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے اور نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گزاری کا جذبہ و تصور پیدا کرتا ہے یہ جذبہ نہ تو مجرد الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں عدل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے ناپتا ہے اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں ظلم عظیم یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔

اس عدل کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۔ (اعراف - ۱۷۲)

اور یاد کرو جب لیا تمھارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا ان کے اوپر کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ہاں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے "حقیقتِ شرک" کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

> بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے۔ ہمیں تو نہ اس "اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" کی کوئی خبر ہے نہ اس "بلیٰ" کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد بہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہو گا لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے صدمات جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا

ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دَور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچے کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجئے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ آپ یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے، تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلّم ذمہ داری کوئی نہیں، یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلّم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔"

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان و نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی جان و مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجئے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ ذمہ داری سے بری ہوں یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک

ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہو گا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک "میثاق غلیظ" کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کر دیں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کو سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدۂ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر

اس بات کا حقدار ہے کہ ہم اس کے عہدِ ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکرگزاری کی جائے اور اس شکرگزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھہرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ ۝ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ۝ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ۝ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ ۝

(شعراء ۶۹-۸۲)

اور سنا دو ان کو ابراہیم کی سرگزشت جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا یہ تم لوگ کس چیز کی پوجا کر رہے ہو؟ بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا ہے کہا ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے اگلے بزرگ۔ یہ تو سب میرے دشمن ہیں مگر عالم کا رب جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر ہدایت بخشتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہو گا، بلاشبہ اس بات

کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکر گزاری کی صورت میں ادا کریں اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

علم و یقین کی فطری طلب

انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو۔ وہ اپنی ہستی کی غایت، اور اس کے نیک و بد سے بالکل بے خبر ہو کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے، وہ یہ تو کرسکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کرے اور اسی پر جم جائے لیکن یہ نہیں کرسکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کے مختلف زاویوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پا کر کسی غلط چیز ہی کو اختیار کرلیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے۔ اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جاسکتا ہے لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جاسکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ! صرف اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے) یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہوجاتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے) اس کو پالینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہوجاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصور کرسکتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کرسکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہوسکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کرسکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے

نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے۔ لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر مامور نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظرانداز کردینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بتکلف انسان نے اختیار کی ہے۔ ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک "لاادری" کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور اپنے باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ انسان کے لیے بڑا ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے۔ الا آنکہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح ترجواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بنا لئے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرتِ انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ، لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (مومنون ۱۱۶-۱۱۷)

پس اللہ بادشاہ حقیقی بلند و برتر ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ باعظمت عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کو ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے بلکہ شرک کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیونکہ مشرک

ایک خدا کو تو بہر حال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے، باقی رہے شرکاء و انداد جو اس نے اپنے جی میں فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے دلائل کی۔ ان کی تردید کیلیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳۔ فطرتِ انسانی کا علو

توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرتِ انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہشمند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساسِ برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دُنیا میں آیا ہے اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی و برتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو وہ یقیناً اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ الآية میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے کبھی أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ پکار اُٹھتا ہے کبھی أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساسِ برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں بچپنے بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اُسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آکھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قوی اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کہتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے اس میں اصل ولولہ تو خُدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک اَن دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبر نفس اور علو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعترافِ حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے جو مدعی تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں" اسی لئے میں ہی رب ہوں حضرت ابراہیم نے یہ کہہ کر کہ "اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کر دو"۔ اس کے عجز کو بالکل بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا، لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا لیکن جن کی عقل دُرست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور اپنے ضعف دونوں کے توازن کو

قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و مدبّر ہستی کے آگے جھک کر اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پالیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود در در صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دنا رت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل اور بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزتِ نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ چھنال ہے جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پُر ہوگیا۔ اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہوجائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمھیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو، مجھے اس سے معاف رکھو ؎

تحمل اصحابی ولم یجل واجدی

وللناس اشجان ولی شجن وحدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں ارشاد فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ	اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحٰق، اور یعقوب کے مذہب کی، ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ اے میرے قید خانہ کے ساتھیو! کیا بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک ہی اللہ جو سب کو قابو میں رکھنے والا ہے۔ نہیں تم پوجتے

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (یوسف ۳۸-۴۰)

ہو اس کے سوا مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں اس نے حکم دیا ہے کہ نہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی فطری دین ہے مگر اکثر نہیں جانتے۔

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی رُوح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت و عزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا، لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان اپنے نفس کے علو کے باوجود، اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے ماننے بغیر اس کی فطرت کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد و قہار کی اطاعت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اس ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اسی علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (زمر-۲۹)

اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ شکر اللہ کے لیے بلکہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا، تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے؟ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے

بعد فطرتِ انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمدللہ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ انسان کے اسی علوئے فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ — کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ہے۔

یہی علوءِ نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہونے ہی کھو بیٹھتا ہے اور رفعتِ رفعت و عزت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے۔ انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے۔ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ اَوْ تَہْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ۔

اور دُوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا :

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو
وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَ	آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سُورج اور چاند
النُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ	اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے
وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَکَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْہِ	انسانوں میں سے بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر
الْعَذَابُ ط وَمَنْ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ	عذاب واجب ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے
مِنْ مُّکْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔	تو ان کو کوئی عزت دینے والا نہیں اور بے شک اللہ
(الحج - ۱۸)	کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ انسان کا ضعف و افتقار

چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے۔ ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اُگلوا لیتا ہے۔ فضاؤں میں اپنا تختِ حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے۔ ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں کسی چیز کو اُس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانونِ طبیعی کی پابند بھی ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور پھر

ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اُٹھائے اور بہرہ تمتع بھی۔ بس ایک مدت ہی تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک اَن دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ اور دوسری جگہ فرمایا ہے : وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ، اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤد، حضرت سلیمان، ذوالقرنین اور فاروق اعظم ہیں لیکن جو کم ظرف اور رذیل ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم وحشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور بولہبوں کے ائمۂ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکاء خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکاء و انداد، سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات رہ جاتی ہے جس کا دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے :۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ
كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○
(انعام - ۶۳-۶۴)

پوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور تری کی
تاریکیوں سے تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے
اور چپکے چپکے اگر اس نے ہم کو رہائی دی۔ اس آفت
سے تو ہم شکر گزاروں میں سے بنیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی
ہے جو تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر مصیبت سے
پھر تم اس کا ساجھی ٹھہراتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا :

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ

وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں یہاں
تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر

بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔

(یونس ۲۲-۲۳)

سازگار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں تند ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف سے گھیرے ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے پس جب ان کو نجات دے دی دفعتہً وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بغیر کسی حق کے۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے۔ دُنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے۔ وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حُسنِ انتظام پر مغرور رہتا ہے۔ اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے اپنے سروسامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خُدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خُدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے لیکن جب دفعتہً سازگار ہوا طوفانی بن جاتی ہے۔ کشتی ڈانواں ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرِ کاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں۔ اس کے مُنہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خُدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تُو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خُدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا، نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جُوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے۔ پھر وہی غفلت اور مستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سروسامان اور جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مُشرک بن جاتا ہے ایسے لوگوں کو خدا نے 'ختار' اور 'کفور' 'عہد شکن' اور 'ناشکر گزار' کہا ہے۔ کیونکہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مامن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خود سری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو، لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چنانچہ جُوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریبِ اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہُوئی فطرت پھر جاگ اُٹھتی ہے اور وہ خُدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور اُبھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو انما اوتیتہ علی علم (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے عَلَم گاڑ دیئے تھے جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں۔

ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امرا۔

توحید کے خصوصی دلائل

دلائل بلحاظ مسلّمات مخاطب

اوپر کی دو فصلوں میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں۔ جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے۔ ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس وسنن اور فطرتِ انسانی کے اذعانات ومسلمات پر ہے۔ اس وجہ سے، ہر چند ان کے مخاطب اوّل عرب ہیں لیکن ان کی حجت تمام بنی آدم پر، بلا امتیاز عرب وعجم اور بلا لحاظ کافر ومومن، یکساں اور عام ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کی شہادتیں بھی ہر قلب سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑلی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لئے ہوں، ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اب ہم ان دلائل کی توضیح کریں گے جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے۔ ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآن نے ان کو اپنا لیا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات ولوازم کی تشریح کر کے، مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی وفطری ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساس استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل لغو بات ہے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل ومبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلم ہے۔ انہی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ ومتکلمین کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں اور ایسے براہینات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان براہینات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلی دو فصلوں میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

ا۔ شرک کیلئے کوئی دلیل نہیں ہے

اس بات میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان کے لیے تمھارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اسے تو تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے بھی مل رہی ہے لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے۔ ان کی دلیل لانا تمھارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے چہ جائیکہ کسی کو خدا کا دست و بازو قرار دینا۔ پس اس کی اگر کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ۔ رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ۔ (مومنون)	اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ (یوسف)	تم نہیں پوجتے اس کے سوا مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے ٹھہرا لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔
اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ۔ (الروم)	کیا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کی جن کو وہ خدا کا ساجھی ٹھہراتے ہیں

اہلِ عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (الاحقاف - ۴)	کہو ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کیا چیز ہے زمین کی جو انھوں نے بنائی ہے یا کیا چیز ہے جس میں آسمانوں میں ان کا ساجھا ہے، میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی اور علمی سند اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

رہی یہ بات کہ یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن سب کو چھوڑ دیا اور ہجرت کے وقت انھوں نے

شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور برأت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے جو ان کے تمام اخلاف کے لیے ہمیشہ نشانِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔

(۲۰-۲۸)

اور کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا ہم ان کو نہ پوجتے، ان کو اس کا علم نہیں ہے وہ محض اٹکل کے تیر چلاتے ہیں کیا ہم نے اس پہلے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی وہ اپنے پاس سند رکھتے ہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایک ڈھرّے پر پایا ہے اور ہم انکے طریقہ پر راہ یاب ہیں اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحالوں نے کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک دھرّے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔ کہا کیا اگرچہ میں اس سے زیادہ ہدایت کی چیز لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے؟ بولے جو تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا پس دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو مگر اس سے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پس وہ میری رہبری فرمائے گا اور ہم نے اس اعلانِ برات کو ایک یادگار کلمہ بنایا اس کی ذریت میں تاکہ وہ رجوع کریں۔

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سرو پا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدون سرگزشت جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جاسکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت فسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی خصوصیت کے ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ تو توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذریتِ ابراہیم کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی اس کلمۂ باقیہ کی روح نہیں پہچانی۔ یہود اس نشانِ راہ کے باوجود بارہا بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراطِ مستقیم سے

وہ اس تدر دُور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گھڑ کے کھڑی کر دیں جن سے بُت پرستی کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعاتِ زندگی کا نیز خانہ کعبہ کی تعمیر اور مقصدِ تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمہارے اس دعوے کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں پیش نہیں کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدون سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال

قرآن کے استدلال خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم کرتے تھے، قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ لوازم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ صفات جو ان مانی ہوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں، نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار سے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خدا کے مسلّمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہلِ عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے بلکہ آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قویٰ اور قابلیتوں کا بخشنے والا، موت اور زندگی کا مالک اور مدبّرِ امر خدا ہی کو مانتے تھے لیکن رب یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لئے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی اسی کو مانو۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔ (یونس ۳۲)

پس وہی اللہ تمہارا حقیقی رب بھی ہے۔ پس حق کے بعد نہیں ہے مگر گمراہی۔ تو کہاں بھٹکے جاتے ہو۔

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک و حاکم اور آمر و ناہی اسی کو مانو۔ اس حق کے بعد جو ثابت ہے۔ اگر کسی اور کو بھی مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ بھی ضلالت و گمراہی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالقِ ارض و سما مانتے ہو لازم ہے کہ اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور کو مالک و حاکم نہ بناؤ۔ جو خالق ہے امر و حکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

بے شک تمہارا مالک وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں

وَالْاَرْضَ . . . . . اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔ اور زمین کو بنایا . . . . آگاہ اسی کے لیے خلق اور امر ہے ۔

جس اللہ کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو اسی کو رب بھی مانو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے۔ جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے۔ جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف و ایجاد کی بدولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو درآنحالیکہ اس کا حق کشف و ایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے۔

اسی طرح خالق کے لیے صفت علم کو لازم قرار دیا یعنی جس ذات کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط کل مانو۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خلق کیا)

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے۔ تمام نفع و ضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اور اگر تم کو اللہ کسی نقصان میں پکڑے تو اس کو نہیں دور کر سکتا مگر وہی اور اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہل عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے۔ یہ باب نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم رسالہ حقیقت شرک میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں۔ کوئی بری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ اس کائنات کا معمہ حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفات جمال و کمال کی جامع ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے جس سے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (الاعراف۔ ۱۸۰)

اور اللہ کے لیے اچھی ہی صفتیں ہیں تو انھیں صفتوں سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکاء و شفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے۔ اس عقیدہ سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ان کے ان تناقضات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعہ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے کیونکہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟ اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر، لوگوں کو نیکو کار و بدکار ٹھہرائے گا تو اس سے اس کے عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے

اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل و اطاعت کافی نہیں ہے بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمت عام، اور اس کے غفور و کریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءِ ظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہو سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھہرانا یا تو خدا کے کمالِ قدرت کی نفی ہے یا کمالِ غیرت کی کیونکہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان و زمین کا سنبھالنا مشکل ہو۔ یا پھر وہ بے غیرت ہو کہ اسے اپنے حدود و حقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ نہ لاحق ہو اور الوہیت کا تصور ان تمام عیوب و نقائص سے بالکل پاک ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم سے بے جوڑ یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور اندازِ کلام عموماً مجادلہ کا نہیں بلکہ ایک مسلّمہ حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے کیونکہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے صرف وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیئے :۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ	اور وہ کہتے ہیں خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ وہ پاک ہے
لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ	بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے
قٰنِتُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط وَ	سب اسی کے فرمانبردار ہیں، موجد ہے آسمانوں اور زمین
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	کا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہوجا
(بقرہ - ۱۱۵)	پس وہ ہو جاتی ہے۔

یہاں سُبْحٰنَهٗ (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ الوہیت کا تصور مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفو و برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو۔ وہ آسمان و زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو اور اس کی قدرتِ کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لاوے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہوم الوہیت کے شایانِ شان ہیں اور نہ تمہاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے :۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط اَلْغَنِيُّ	کہتے ہیں اللہ کے اولاد ہے۔ وہ پاک ہے، وہ مستغنی
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط اِنْ	ہے، اسی کے اختیار میں ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطَانٍ بِهٰذَا ؕ (یونس - ۶۸)

جو کچھ زمین میں ہے۔ نہیں ہے تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل۔

ایک جگہ اوثان واصنام کے ضعف وبے چارگی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ الوہیت کے تصور کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو اس خدا کا دست و بازو قرار دو جس کو قوی و عزیز مانتے ہو اور جس کی قوت و عزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ یَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ وَ اِنۡ یَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَیۡئًا لَّا یَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الۡمَطۡلُوۡبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ۝ (الحج ۷۳-۷۴)

اے لوگو! ایک مثل بیان کی جاتی ہے اس کو غور سے سنو، خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس سے اس کو واپس نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ناتواں! انھوں نے اللہ کی حقیقی قدر نہیں پہچانی۔ بیشک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں :-

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلۡفٰی ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ بَیۡنَهُمۡ فِیۡ مَا هُمۡ فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ هُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۝ لَوۡ اَرَادَ اللّٰهُ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصۡطَفٰی مِمَّا یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ۚ یُکَوِّرُ الَّیۡلَ عَلَی النَّهَارِ وَ یُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیۡلِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اَلَا هُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفَّارُ ۝ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا لیے ہیں کہتے ہیں ہم ان کو نہیں پوجتے ہیں مگر اس لیے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف سے پاس کے درجے اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں۔ اللہ نہیں راہ یاب کرے گا ان کو جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا کہ اپنے لیے اولاد بنائے تو اپنی مخلوق میں سے منتخب کر لیتا جو چاہتا وہ پاک ہے، وہ تو ایک ہی اللہ ہے سب کو قابو میں رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ، ڈھانکتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے، ہر ایک متعین وقت کے لیے چلتا ہے۔ آگاہ! وہ غالب اور

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ط يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ط ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ط اِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيْبًا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ -

(زمر - ۳ - ۸)

بخشنے والا ہے۔ تم کو پیدا کیا ایک جان سے پھر اس کی جنس سے بنائی اس کی جوڑ اور اتاریں تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ قسمیں۔ پیدا کرتا ہے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے، خلقت کے بعد خلقت، تین پردوں کے اندر، وہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کے لیے بادشاہی ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ تو کہاں بھٹک جاتے ہو، اگر تم ناشکری کروگے تو اللہ تم سے بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کیلئے ناشکری کو پسند نہیں کریگا اور اگر شکر کروگے تو اس کو پسند کرے گا اور نہیں اُٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ، پھر تمھارے رب کی طرف تمھارا لوٹنا ہے تو تم کو خبر دے گا تمھارے کئے کی۔ وہ سینوں کے بھید جاننے والا ہے اور جب انسان کو کوئی بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے۔ اس کی طرف متوجہ ہو کر، پھر جب اس کو بخش دیتا ہے اپنی طرف سے نعمت وہ بھول جاتا ہے اس کو جس کی طرف بلا رہا تھا اس سے پہلے اور اللہ کا شریک بنا لیتا ہے تاکہ اس کے رستے سے گمراہ کرے۔ کہہ دو اپنے کفر کے باوجود تھوڑا سا متمتع ہو لے تو جہنم والوں میں سے ہے۔

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے۔

(ا) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اگر ہے تو اس کو پیش کریں۔ اس دلیل کی تفصیل فصل کے شروع میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کی بیٹیاں ہیں، جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے۔ خدا کے لیے اولاد کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ خدا کو واحد اور قہار (قابو CONTROL میں رکھنے والا) ہونا چاہیے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے

بالاتر ہے۔ اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت۔ پھر ستم یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے۔ حالانکہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوہری غلطی کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے۔ دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصّے میں وہ اولاد دیتے تھے جس سے خود نفرت دیتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزا کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدل کامل کا ظہور یقینی ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ شفاعت کا تصوّر نہیں جمع ہو سکتا کیونکہ شفاعت کا تصوّر عالم کے بامقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے۔ شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیل توافق اور دلیل تسخیر (جو اُوپر بیان ہو چکی ہے) سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز و غفّار ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ 'غفّار' یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔ اس لیے اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ہ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور پھر نتیجہ نکالا۔ کہ جس نے پیدا کیا جس نے پرورش کے وسائل مہیا کئے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر، تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہ خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو۔ اسی کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ نہ ہونا چاہیے۔

(و) اس کے بعد قانونِ عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیا ڈھا دی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کرتا ہے نہ شکر کو ناپسند۔ تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر و غضب میں اپنے تئیں مبتلا کر لے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے اپنے عمل پر ہے۔ کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا ہے نہ کفر کو شکر۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔

(ز) اس کے بعد اپنے احاطۂ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے کوئی دوسرا اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا۔

(ح) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیل افتقار کے عنوان سے ہم دلائل انفس کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تنزیہات کے بعد خدا کا تصوّر جس شکل میں خُدا کے سامنے آیا اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے:۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ، لَهٗ مَا	اللہ، نہیں کوئی معبود مگر وہ، زندہ ہے اور قائم رکھنے والا، نہ اس کو اُونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ اس کے قبضہ

فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ
ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا
خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ
اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ
الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۔ (بقرہ ۲۵۵)

میں ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے ہاں بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور ان کی حفاظت اس پر گراں نہیں ہے اور وہ بلند و بزرگ ہے۔

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے اور اس میں تنزیہہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے۔

ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ
وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ہ
ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْمَلِکُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ
الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰہِ
عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ہ ھُوَ اللّٰہُ الْخَالِقُ
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی
یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔ (حشر ۲۲-۲۴)

وہ اللہ ہے، نہیں کوئی معبود مگر وہ، ڈھکے اور کھلے کا جاننے والا، وہ رحمٰن و رحیم ہے، وہی اللہ ہے نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ بادشاہ، پاک، سُکھ، امن دینے والا، معتمد، غالب، عالی جناب، متکبّر (وغیور) پاک ہے اللہ ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے خلق کرنے والا (ڈیزائنر) وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا اسی کے لیے ہیں ساری اچھی صفتیں، اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے :۔

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، اَللّٰہُ الصَّمَدُ، لَمْ یَلِدْ
وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۔

کہہ اللہ ایک ہے، اللہ با ہمہ ہے، نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

خدا کا یہ تصوّر ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہلِ عرب کو اقرار تھا۔ قرآن نے یہ کیا کہ جن صفتوں کو اہلِ عرب مانتے تھے ان کے لوازم کو بھی اُس نے اُن کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو۔ علیٰ ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی، مطالبہ کیا کہ ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے سے تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلا شرکتِ غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے لازماً وہی رب ہے اور امر و حکم کا حق اسی کو

حاصل ہے یہ نتیجہ نکالا کہ خفیہ و علانیہ اور اُمید و بیم ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے مشکلوں کو آسان کرنے والا خطرات و مصائب کا دُور کرنے والا اور اُمیدوں کو پورا کرنے والا وہی ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہُوئے اور چھپکے ہُوئے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اور اسی کو پکارو بیم و رجا میں)

سُورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ	اے لوگو! اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔

اس بندگی کے لیے جگہ جگہ یہ شرط لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی کرو۔ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ پوجا خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، پس اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہُوئے)

اسی طرح فرمایا جس رب کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ثابت ہے حمد و شکر کا سزاوار صرف وہی ہے۔ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے شکر گزاری ہے)

سورۂ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبت حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ان کو حلال و حرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال و حرام کرنا شرک ہے (دیکھو آیات ۱۶۳ - ۱۶۹ بقرہ)

سورۂ نحل (آیات ۴۸ - ۵۹) میں آسمان و زمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (پس مجھ سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا افغیر اللہ تتقون (کیا اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو)

سورہ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان و زمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یار و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالے کیا جائے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ۔	کہو کیا میں اللہ کے سوا جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے کسی اور کو اپنا مرجع بناؤں حالانکہ وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ کہو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں پہلا حوالہ کرنے والا بنوں اپنے تئیں اللہ کو

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی

کی جائے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (۳۵)

پوچھو تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے کہو اللہ حق کے لیے ہدایت کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو ہدایت نہیں پکڑ سکتے الا آنکہ ان کو ہدایت کی جائے، تو کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو۔ بندگی اسی کی کی جائے۔ استعانت اسی سے ہو۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1]۔ جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے، وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے۔ وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسا کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے۔ جو اس کو معبود مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے جو خدا کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

---

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعاء کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی شرکت اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تذلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے نیز کوئی شخص بغیر اذنِ الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی جس سے حق باطل اور باطل حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم حقیقت معاد میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے رسالہ حقیقت رسالت میں بھی تعرض کریں گے۔

۳۔ دلیل عدل

توحید کے نفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعورِ عدل کو قرآن نے عہد فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہل عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن سے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلمات عرب دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہل عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا زینہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر جا کر بٹھا دیتے بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جل شانہٗ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیئے ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے:۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ط اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا	اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے تو وہ جن کو فضیلت بخشی گئی ہے اپنی روزی اپنے مملوکوں کو نہیں دے دیتے کہ آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تم کو پاکیزہ چیزوں کی روزی دی تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کے لیے آسمان و زمین سے ذرہ برابر بھی ان کے لیے نہ رزق پر اختیار رکھتی ہیں اور نہ اختیار حاصل کر سکتی ہیں تو اللہ کیلئے مثلیں بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا

فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ، هَلْ يَسْتَوٗنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(النحل - ۷۵-۷۶)

اور اس (آزاد) کی جس کو ہم نے اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہوں گے؟ شکر اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے اور اللہ مثل بیان کرتا ہے دو آدمیوں کی۔ ایک گونگا ہے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے جہاں اس کو بھیجتا ہے کوئی کام ٹھکانے کا کر کے نہیں دیتا کیا وہ اور وہ شخص جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے رستہ پر ہے دونوں برابر ہونگے؟

یہی اساس استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے:۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى

کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں تو یہ بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔

اہلِ کتاب اور منافقین

یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم "حقیقت شرک" میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم یا تو خدا کی صفات کے صحیح تصور میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیتے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جو باتیں ان سے متناقض انھوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں ان کو تسلیم کریں۔ ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل ہم حقیقت شرک میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے محض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلّم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح علیہ السلام اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی کے لیے امر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا درحقیقت اس کو رب بنا لینا ہے زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں قرآن نے ان کی اس تاریخ سے جس کو وہ مانتے تھے۔ ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انہوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے۔ خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے

ہاں جو تقرب اور درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا تو انھی کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا۔

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خارق عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم آدم اور یحییٰ کی ولادت کو بھی خارق عادت مانتے ہو لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا کیونکہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں بشریت کی ایک مسلّم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دور کی تھی جس کی تفصیل 'حقیقت شرک' میں گزر چکی ہے۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا۔ قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے۔ "میرا باپ اور تمھارا باپ"۔ قرآن نے اس کی تعبیر رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ "میرا رب اور تمھارا رب" سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات نیز انجیلوں کی اصل زبان یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندے پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا۔ یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اور اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دور ہو گیا تھا لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی۔ ان کے دلوں کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے اس لیے اگر ایک راستہ سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت و ضعف کے باوجود ان کی فتح و کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی۔ چنانچہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرفگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں تاکہ خدا کی حمد و تسبیح میں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور اس خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے ناشکرے انسانوں کے سوا ساری کائنات اس راہ میں سرگرم سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بظاہر سنسان نظر آ رہی ہے۔ قرآن میں جو لوگ مسبّحات[1] کی رُوح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

[1] مسبحات سے ہماری مراد وہ سورتیں ہیں جو "سَبَّحَ" اور "یُسَبِّحُ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں بالعموم روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنھوں نے زبان سے اقرار پوری توحید کا کر لیا تھا مگر اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑدلے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ان کی قلت تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی رابطہ رکھا جائے (بقیہ صفحہ آئندہ)

پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اُوپر کی تین فصلوں میں جو باتیں بیان ہُوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کیے دیتے ہیں تاکہ یہ پھیلے ہُوئے مطالب بسہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آجائیں۔

(الف) ان تفصیلات سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں، قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ ٹھوس عقلی و فطری دلائل سے بالکل خالی ہے۔ وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں لیکن یہ قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اُصولوں کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے ان مسلمات سے ان پر حجت قائم کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلم ہے۔ باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے جن کی حجت عربی و عجمی اور عامی و فلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہُوا اور اب قیامت تک دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ثابت ہُوئی کہ قرآنی استدلال ہمارے متکلمین و فلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علۃ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا اور نہ وہ خلا ہی بھرتا جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ بسا اوقات اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے جس نے اپنے ارادہ سے دُنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت و رحمت کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) اور یہود و مشرکین سے بھی ناتا نہ توڑا جاتے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کی اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں سائی (PROSTRATION) ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ دُنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع و فرمانبردار ہیں اور سرِ مُو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ کے فرمانبرداروں کی تعداد تھوڑی ہے بلکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ساری کائنات خدا کی فرمانبردار اور مطیع ہے۔ اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے بلید انسانوں کے سوا جنھوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرہ اس کے ہم رکاب ہے۔

دُنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس طرح سُورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دُنیا بالاضطرار وجود میں آگئی اور اس سے اضطراراً فیض پا رہی ہے۔ نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دُنیا کو خلق کر کے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دُنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلط ہے۔ اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اُوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے۔ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرّہ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا ہے۔ نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہو گا تب بھی وہ ہو گا۔ وہ خالق ہے، باری ہے، مصوّر ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمٰن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستّار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے، وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہُوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبّت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکر گزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکر گزاری اور محبت کے تابع ہیں۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو، اسی سے فریاد کی جائے۔ جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دُکھ سکھ ہر حال میں اسی پر بھروسا کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سرّ و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصّہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تاکہ انسان اس کی توحید کا پُورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت سے آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنے رسالہ "حقیقت رسالت" میں بحث کریں گے[1]۔ یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی کی کھلی ہُوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبّر ہے جو تمام صفات حسنیٰ سے متصف ہے اور اس تمام کائنات پر آمر و متصرف ہے۔ وہی ہمارا مولا اور رب ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے۔ وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیاز مندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔ لا الٰہ الا ھو ولا رب سواہ۔

---

[1] افسوس کہ یہ رسالہ نہ میں اب تک لکھ سکا اور نہ بظاہر اس کی توقع ہے۔

توحید کے اثرات

پچھلی فصلوں میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے انسانی زندگی پر، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اس کے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دنائت و رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے جو چیزیں اس کی تابعداری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابعداری اور اطاعت کرتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے۔ غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے۔ ان کو ان داتا، خداوند نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے، ان کے لیے ہر طرح کا امر و نہی کا حق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ زندوں سے گزر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے۔ ان کو امور کائنات میں متصرف، عالم الغیب اور نافع وضار سمجھتا ہے۔ بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنا لیتا ہے اور ہر گھنی جھاڑی ہر سنسان مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ اور ہر ضرر رساں قوت اور نفع بخش طاقت اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی۔ وہ ایک مرتبہ اپنے مقام عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا۔ یہی حقیقت ہے جو سورہ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:۔

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج - ۳۱)	اور جو شخص اللہ کا ساجھی ٹھہراتا ہے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا پس اس کو چڑیا اچک لے یا ہوا اڑا لے جائے کسی دور دراز گوشہ میں۔

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگایا وہ اس کی خدمت گزار ہونے کے باوجود یہ ننگ گوارا نہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں۔ ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے لیکن انسانوں کی دنائت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہونے کے باوجود، ان میں سے ہر ایک کے در کا نقش سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ	کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ کے لیے ہی سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے

وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ (الحج - ۱۸)	اور پہاڑ اور درخت اور جانور بہتیرے انسانوں میں سے بھی۔ اور بہتیرے ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کر دیتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعتہً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اس دنیا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آجاتی ہے۔ اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنے والے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا گھڑی بھر پہلے ان کی دناءت طبع کا یہ حال تھا کہ میدان مقابلہ میں اترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں۔ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ (سرکار! اگر ہم فتحمند رہے تو مزدوری بھرپور ملے گی نا؟) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں، کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے، تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر لو، تمھارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا، رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ، زندگی ہو یا موت، ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔ پس وہ امید و بیم ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا اور اسی سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے۔ ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محبِ حق ہے اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں ہے باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی۔ اس کا خزانہ لازوال اور اس کی زندگی غیر فانی ہے۔ وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا ہے نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی ہے۔ وہ ایک سدا بہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا	کیا نہیں دیکھا کس طرح اللہ نے مثل بیان کی ایک مبارک کلمہ کی۔ وہ ایک مبارک درخت کے مانند ہے

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (ابراہیم-۲۴)

جس کی جڑیں زمین میں جمی ہوئی ہوں اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت ہر حال میں متوازن رہتا ہے اور تنگی و فراخی کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی۔ نہ وہ گھبراتے نہ مایوس ہوتے، نہ وہ اکڑتے اور نہ فخر کرتے۔ جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا خیر مقدم بھی کرتے ہیں۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔

یہ ایک موحد کا باطن ہے۔ وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح قوانین طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اسے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے۔ سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبورانہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور جو اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے وہ اسی قدر توحید میں کامل ہے۔ راہِ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس کی زندگی پر اللہ کے قرب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔

اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا ہے لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے۔ اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اس طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی

صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں۔ ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حد بندیوں کے ذریعہ سے الگ الگ کر رکھا تھا لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور ساری دُنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں۔ وہ اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدّن و معاشرت کی عمارت قائم تھی وہ اصول موجودہ دُنیا کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے۔ نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اُٹھان ہوئی تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں۔ ان کے خاتمہ کا وقت آ گیا۔ اب دُنیا کو ایک نئے نظم (NEW ORDER) کی تلاش ہے لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی صحیح جواب اب تک نہیں دیا جا سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ اب دُنیا کو قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت —— (WORLD STATE) کی ضرورت ہے جس کی بنیاد عالمگیر انسانیت کے تصور پر ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالمگیر انسانیت کا مبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جب کہ قوموں کی افرانفری کا یہ عالم ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؟ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ ہر ایک کا خدا الگ ہے۔ اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے، وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سررشتہ موجود نہیں ہے۔ مشترک سررشتہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر قومیت اور ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دُنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی۔ وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی، کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے (سورۂ نساء کے شروع میں) انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے، مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے اس میں کسی طرح کی حصّہ داری نہ ہو اور خاندان کی بنیاد وحدتِ آدم کے تصوّر پر رکھی یعنی تمام نسلِ انسانی ایک ہی آدم سے ہے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے۔ پہلی چیز نے خداؤں اور الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دُنیا کو نجات دی اور دُوسری چیز نے خاندان اور نسل و نسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے۔ سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جدوجہد کا میدان ہے، یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے۔ یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا

کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے۔ یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے۔ یہاں رنڈانڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے۔ اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں کے منکر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے، امن و عدل کے دشمن ہیں۔ وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں، جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دُنیا کے لیے نئے نظم کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں، وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالمِ انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے۔ انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کرے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جا سکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان، خواہ وہ کسی قوم و نسل سے تعلق رکھتا ہو بغیر کسی عصبیت کے اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے، اس کے اندر فطرتِ انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے۔ آفاق و انفس دونوں میں اس کی ناقابلِ انکار شہادتیں موجود ہیں باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاوی جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے، اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دُنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اُگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ کوشش ناکام ہو گی یا کامیاب ہوگی تو اس کی حیثیت حلق کی پھانس کی ہو گی اور زمین کے ادیانِ باطلہ میں ایک دین باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

توحید کی اہمیّت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اگر دل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے۔ یہی راز کہ توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے جس کے لیے چاہے گا، معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے۔ توحید، رسالت، معاد جس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو جو خالص توحید کی سورۃ ہے ثلث قرآن کہا گیا ہے۔ لیکن اگر مزید غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خُدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ

اپنے احکام و قوانین اپنے رسُول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب "حقیقت رسالت" میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ لَا اِلٰہَ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پُوری طرح واضح ہو جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسُول اور زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزو لاینفک ہے جو شخص اللہ کو واحد کہتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے، اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے۔ ہم اپنے رسالہ حقیقت معادؑ میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے۔ یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ معاد کی ساری رُوح توحید ہے جو لوگ معاد کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی شرکاء و شفعاء کو بھی مانتے ہیں جو اُن کے زعم کے مطابق ان کو بخشوا لیں گے۔ ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے۔ وہ خُدا کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داری اور اُس کے قانونِ عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین چنانچہ اہلِ عرب اور یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ انھوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت و کفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے کیونکہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے۔ اگر توحید کے تصور میں ذرا بھی خلل واقع ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اس جسم کی رُوح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ مؤثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اُٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اُسی وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں دینِ فطرت کے احکام و قوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰہًا اٰخَرَ (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کر) سے کیا اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوْحٰۤى اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ[2] (یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع و احکام درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا۔ اور اس نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر سرکنے پر راضی نہ ہوئے۔ مخالفین نے لاکھ چاہا کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کرلے۔ ذرا اپنے رویہ میں نرم ہو جائے۔ کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آجائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کرلیں (وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ) لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہ کی

---

[1] افسوس ہے کہ یہ رسالہ بھی میں اب تک نہ لکھ سکا۔ [2] دیکھو آیات ۲۲-۲۹ بنی اسرائیل۔

انھوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا لیکن اس کو اس جگہ سے نہ ہلا سکے انھوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو کر سکتے تھے۔ لیکن اسے رام نہ کر سکے معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سروری و سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں اُن کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش کی گئی۔ جب ان تدبیروں میں ناکام رہے تو مخالفین نے آخری حربہ اُٹھا لیا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے اعزہ کو، اپنے خاندان کو، اپنی املاک و جائداد کو اور اپنے مُلک و وطن کو چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں تمام انبیاء کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو پڑھو۔ ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ غور کرو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کچھ چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے؟ بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی اس کے لیے بیویوں نے شوہروں سے اور شوہروں نے بیویوں سے جُدائی اختیار کر لی۔ عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گلِ سرسبد تھے جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے، جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلہ سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں (اُقْتُلُوْا أَنْفُسَكُمْ) اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے۔ اللہ اکبر! توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروّت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اُوپر کی مختلف فصلوں میں بیان ہو چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی، جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے ظہور میں آ رہی ہیں اور جس کی طرف ہم نے پچھلی فصل میں اجمالی اشارہ کیا ہے۔ پس انبیاء کرام جو یکسر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں۔ جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے ہیں نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، نہ بیوی کو۔ جو چیز بھی اس حق کی ادائیگی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔ پس انبیائے کرام کی ساری جدوجہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے۔ وہ دُنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے

بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنادیں۔ وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالب مدد ہوں۔ نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، اُمید ہو یا بیم، ہر حال میں نظر اسی کی طرف ہو۔ وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اس کی یکتائی تسلیم کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جز نہیں ہے بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورۂ فاتحہ ہے جس کی اصلی روح خدا کی خالص شکر گزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ تبات میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ رکھ دی گئی ہیں جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت کر رہی ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے۔ اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس نے کہا۔ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں ان کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا) یعنی ان کو توحید کے رستہ پر قائم نہ رہنے دوں گا۔ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔ (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا رُوح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبح جان نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجز طرازی موسیٰؑ، جان نوازی مسیحؑ، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گی۔

آج کی صبح وہی صبح جان نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے سادہ خشک ہو گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں۔ بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اُٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اُٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شاہنشاہِ کونین عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف لائے، عزت و جلال ہوا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ اللہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمْ۔

(شبلی نعمانی)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

[جلد ساتویں]

سید سلیمان ندوی

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

سیّد سلیمان ندوی

قال اللہ تعالیٰ :

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۔ (یوسف ۔ ۸) حکم کسی کا نہیں ، مگر اللہ کا ۔

آیتِ بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں ، مگر اللہ کا ہے ، اس لیے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے ، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں :

ایک تشریعی ، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں ۔

دوسرے تکوینی ، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں ۔

ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے ، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر اُن کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی ، اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں ، اسلام نے شک و شبہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے ، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی ۔ زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے ، اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے ۔ اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں :

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۔ (یوسف ۔ ۸)	حکم نہیں ، مگر اللہ کا ۔
اَلَا لَہُ الْحُکْمُ وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ ۔ (انعام ۔ ۷)	ہاں ! اسی کے لیے حکم کرنا ہے ، اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے ۔
لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (قصص ۔ ۷)	اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۔

امرِ تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے وہ زمین ، آسمان اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا ، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے ، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کرسکتا ہے ۔ خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور

ناچار رہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ۔ (بقرہ - ۳۴)	تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔

حکومت وسلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ۔ (آل عمران - ۳)	اے اللہ! سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لیے راہِ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکامِ تکوینی کی طرح اُس کے احکامِ تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیے ہیں، ان کے تتبع سے اہلِ علم اور مجتہدینِ دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع وضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہ اہلِ عقل اپنی عقل وفہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدمِ رضا شامل ہے، یا یُوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مرتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حکمِ الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں، مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امرِ غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورۂ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر ونہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے۔ عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

۱- اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔	حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

(انعام و یوسف - ۸)

۲۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (اعراف - ۷)

ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے۔ پہلی آیت دو جگہ ہے: سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں۔

سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ۔ (انعام - ۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی بات تبلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے۔

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ (یوسف - ۸)

اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسا رکھنے والوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (اعراف - ۷)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور

حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے
ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے
پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ اَمر اور حُکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دُوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۔ (مریم ۔ ۵)	شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۔ (یٰسین ۔ ۴)	یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اُوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاءؑ اور ائمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، لیکن دُوسروں کی اطاعت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، اجرآ اور تنفیذ کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت ہے، ارشادِ الٰہی ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولو الامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماءٔ ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکامِ الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (نساء ۔ ۸)	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سُورہ میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (نساءٔ ۔ ۷)	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا

حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجالایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ (توبہ - ۴)

اہلِ کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہلِ کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قایم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکمِ الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اللّٰهَ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ (توبہ - ۵)

انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہلِ کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (آل عمران - ۷)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے۔ ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدیؓ بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدی نے کہا: "وہ ان کو معبود نہیں بناتے۔" فرمایا: کیوں نہیں، انھوں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: فَذٰلِكَ عبادتهم ایاهم[1]۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر

آپؐ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضع حکم ہے اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکمِ خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا۔ چنانچہ بعض اصول احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا	کیا تُو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے
بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو
يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ	تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لا چکے ہیں
وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ۔	وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں
(نساء - ۹)	حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے "کل معبود من دون اللّٰہ" اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانینِ الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ	اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رُو سے
هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (مائدہ - ۷)	جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام **حدود** ارشاد فرمایا ہے۔ حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے

---

[1] ترمذی تفسیر آیت توبہ

ہوئے ہیں، اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے۔ قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکامِ الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (طلاق - ۱) — یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (طلاق - ۱) — یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (نساء - ۲) — یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرے اور بلا سندِ الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرے تو اس کا نام "افترا علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ — اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں)

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (نحل - ۱۵)	چند روزہ فائدہ ہے ، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا ، بلکہ یہ بھی پیشگوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے ، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا ، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے ، اور اس حیثیت سے آپؐ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے ، لیکن حکمِ الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپؐ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتابِ الٰہی آیا :

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۔ (تحریم - ۱)	اے پیغمبر ! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں ، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے ، مگر جب آں حضرتؐ نے ایسا کیا تو اللہ تعالٰی نے اس حق کے استعمال سے آپؐ کو منع فرمایا ، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ، ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو ، اُمت کے لیے حکمِ الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے ، اس قاعدہ کی بنا پر آپؐ کے اس ترک سے اُمت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی ۔ دُوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے ، جو صحیح نہ ہوتا ، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعتِ الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے ۔ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے :

وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۔ (توبہ - ۴)	اور (یہود و نصارٰی) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے ۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کے فرمان کے مبلّغ تھے ، رسول کی اطاعت عین اللہ تعالٰی کی اطاعت ہے ، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے ، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں ۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالٰی ہے ، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے ، چنانچہ علم عقاید اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں ۔

علمِ اصولِ فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیرِ بحث آیا ہے کہ واضعِ قانون صرف اللہ تعالٰی ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا ۔

علامہ آمدی المتوفی سنہ ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں :

اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالیٰ ولاحكم الا ما حكم به و يتفرع عليه ان العقل لا يحسن و لا يقبح و لا يوجب شكر المنعم و انه لا حكم قبل ورود الشرع۔ (۱۱۳ ، ۱ مصر)	جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے، اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ بُرا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکامِ شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے، اور اسی کا قانون قانون ہے۔ اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رُو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عاید کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا، اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا بُرا کہہ سکتی ہے۔ علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاكم لا خلاف فی انه رب العٰلمين۔ (ص ۸۹ - ۲)	اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگارِ عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں:

"حُسن و قبح اور شے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا بُرا ہے، اس کے دُوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے، اور دُوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا بُرے ہونے کا عقل کی رُو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتّب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلسنّت) کے نزدیک حُسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لیے حکمِ الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔" (ص ۹۰، برحاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، ہے یہ کہ شریعت کے فیصلے سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی

مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہلِ عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہلسنّت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلکِ حق ہے۔ مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے رُو سے سمجھا جا سکتا ہے یا صرف شرع سے، تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔"
(المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام)

بعض اہلِ اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحرالعلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام اُمّت کا اجماع ہے اور ہمارے مشایخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے، اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون و حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ ایسا کہنے کی جُرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقل بعض احکامِ الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہوا یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشایخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔"

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسبِ ذیل فرق ہے:

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو، تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے

جو حکم ہو اس کے ساتھ حکمِ الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔" (ص ۱۶، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قولِ فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (بُرا) ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ اتصاف، امر و نہی سے پہلے ہی عالمِ حقیقت میں ہو چکا تھا، اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حُسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرعِ الٰہی پر مبنی ہیں۔" (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصولِ فقہ درحقیقت اصولِ فقہ کی تہذیب ہے[1]۔ اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اُوپر کی عبارت میں مصنّف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے"۔ یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرینِ قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضعِ قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضعِ شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانونِ شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقتِ خاص میں نازل ہُوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول اور کلیات، اور دُوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا، تغیر و

---

[1] تہذیب، منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو انھی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فنِ طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پُرانے اور غیر متبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھیے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تپنچے سے، ریوالور سے، توپ سے، گولے سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب ہر طرح کی گاڑیوں، سائکلوں، اسکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے۔ ان سے حادثے پیش آجائیں یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دُوسرا شبہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وُہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکامِ الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہلِ اصول کے اس مسئلے کے قیاس کا حکم صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہائے نے فتاویٰ کا پُورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دُنیا کے مختلف حصّوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قایم ہوئیں اور اب بھی قایم ہیں۔

سلطنت اور دین کا تعلق

سیّد سلیمان ندوی

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں:

ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔[1] اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قایم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا، اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنت الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے جلّ شانہٗ و تعالیٰ اسمہٗ، بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصل دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجا آوری عین احکامِ خدا کی بجا آوری ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ (نساء: ۱۱)

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپؐ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے، اُن میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرماں روا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور

---

[1] انجیل

ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی مسلمان بادشا ہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصٰی امیری فقد عصانی [1]	جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا۔ جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لیے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکمِ الٰہی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لیے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجاآوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجاآوری میں مصروف رہیں۔

حضرت داؤد کا جو قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہوجانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساسِ فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا۔

وَظَنَّ دَاوُدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا	اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) اُن کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲، ص ۲۲۳ مصر

لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ ۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (ص ۲)	اُنھوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا ، تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے ۔ اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا ۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے ، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

ما من امام يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسكنته (ترمذی ابواب الاحکام ، ۲۲)	جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا ۔
من ولى من امر المسلمين شيئًا فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عزوجل يوم القيامة دون خلته وفاقته وفقره ۔ (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴ ص ۹۴ حیدرآباد)	جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا ، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا ۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ اُنھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی ، اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموںؓ کے سوا کوئی اوٹ

ؓ چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے ، اس لیے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءؓ نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے ، مگر عام پبلک مقامات ، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی ۔

قایم نہیں کی ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا ۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمدؓ بن مسلمہ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگادی ۔ حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زادِ راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے ۔ (ابن حنبل، ج ۱، ص ۴۵ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قایم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبویؐ سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ جو اہلِ حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سُن کر ان کو مطلع کردے ۔ (ترمذی ، ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجاآوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کی پُوری توضیح کرتی ہیں ۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔ (نساء ۔ ۸)	امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو، خدا تمھیں بہت خُوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سُنتا اور دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے ۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیت کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے ۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۔ (رحمٰن ۱)
اور تول کو انصاف کے ساتھ قایم کرو، اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پُورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دُوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ ۔ (مطففین)
پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنیوالوں پر جو لوگوں سے تول کرلیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا۔ اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (مائدہ، حجرات ۶)
اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (آل عمران ۶ - ۱۴)
اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۔ (شوریٰ ۴)
بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

" ظلم " کے معنی کسی دُوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۔ (مائدہ ۷)
اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

الا ایھا الناس لا یقبل اللہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ ۔ (مستدرک ج ۴ ص ۸۹، کتاب الاحکام)
ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ

فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں
کرے گا۔

سب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دُوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرماں روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پُورے نہ اُتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع هو مسئول عن رعیتہ۔ (صحیح بخاری ج ۲، ص ۱۰۵۷، کتاب الاحکام)	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگران کار ہے، اس سے اس کے زیرِ نگرانی اشخاص کے متعلق باز پُرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسایش ہے، اور جو اس میں اُلجھ کر رہ گیا وہ اس دُنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رُسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطہا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ۔ (بخاری و مسلم حوالہ سابق)	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پُوری پُوری نہ کرے تو وہ جنت کی بُو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، اُنھوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے:

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت وهو غاش لرعیتہ الا حرم اللہ علیہ الجنۃ۔ (مسلم، کتاب الامارہ)	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے۔ عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

ان شرّ الرّعاء الحطمۃُ۔ (مسلم، کتاب الامارہ) — سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن۔

اس نے کہا: آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں۔

فوراً بولے: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاؑ فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں اُمّت کی سیاست کی باگ ہوگی۔

صحابہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہؐ! تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

فرمایا: پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو۔ (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاھُمْ۔ (صحیح بخاری) — کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق بازپرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

اللھم من ولی من امر امتی شیئًا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شیئًا فرفق بھم فارفق بہ۔ (مسلم) — اے اللہ! جو کوئی میری اُمت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا، اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے۔ ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ والرجل راع علیٰ اھل بیتہ وھو مسئول عنہم والمرأۃ راعیۃ علیٰ بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ عنہم والعبد راع علیٰ مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(مسلم و صحیح بخاری)

ہاں، تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہو گی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہو گی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔ تو ہاں، ہشیار رہو، تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت بازپرس کی جائے گی۔

لفظِ رعیّت

اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں۔ یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں۔ راعی چرواہا اور رعیت وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُر محبت معنوں میں آیا ہے، اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطین عند اللہ علیٰ منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم وما ولوا۔ (صحیح مسلم کتاب الامارہ)	بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امرأ) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے لوگوں میں اور اپنے زیرِ حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہو گی۔ ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے۔ جامع ترمذی میں ہے:

ان احب النّاس الی اللہ یوم القیامۃ وادناھم مجلسًا امام عادل وابغض الناس الی اللہ وابعدھم منہ مجلسًا امام جائر۔ (ترمذی، ابواب الاحکام)	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا۔ اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دُور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دُور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دُور ہوں گے۔ فرمایا:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم الا لم یدخل معھم الجنۃ۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارہ)	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔
ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الاحرم اللہ علیہ الجنّۃ۔ (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرِ نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غدّاری کا مرتکب ہو، اس پر جنّت حرام ہے۔
انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ فان امر بتقوی اللہ وعدل فان لہ بذلک اجرًا	امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل

وان امر بغیرہ فان علیہ وزراً۔	کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا،
(نسائی کتاب البیعۃ)	اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ
	کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امورِ دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں، یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں۔ اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جُزُ ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ علم اور اہلِ اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیے۔ حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصوّر کا غماز ہے: ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ! تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراُ کے لیے ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جن قتال و جہاد کی دعوت بر ملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصودِ اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراد ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنّم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے۔ قرآن میں ہے:

---

[1] حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ یُّوَلِّھِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَہٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَمَاْوٰہُ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ۔ (انفال ۲)	اے اہلِ ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہیے، ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔
وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (بقرہ ۲۲)	اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامتِ دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ۔ (آل عمران ۲۰)	تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کروں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے، اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ ان میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور

اقامت کے بھی ہیں۔ سورۂ نور میں ہے:

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ۔ (نور-۱)	اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔

کھلی بات ہے کہ "اللہ کے دین" سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے، اسی طرح سورۂ بقر کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (بقرہ ۲۳)	اور اُن سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے۔ سورۂ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (انفال ۴)	اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو 'دین' فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے۔ اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (انعام، یوسف)

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ۔ (انعام)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا۔ (نحل ۷)	اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سایے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے

سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے۔ مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے 'الملک' ہونے کا استحقاق اسی کو ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔ (الناس ۱)	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی' لوگوں کے معبود برحق کی۔
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ۔ (حشر ۳)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن و امان والا۔
فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (مومنون ۶)	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔
اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ (جمعہ ۱)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ جگہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو "الملك الحق" یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملك نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملك الناس " لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس " لوگوں کا پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو۔ دوسری آیت میں الملك کے ساتھ اوّل القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے۔ تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے۔ چوتھی آیت میں الملك کے ساتھ القدّوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملك کے لفظ کے اندر ظلم و سفاکی، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت | عربی میں ملك الاملاك یا ملك الملوك اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ

پایا جاتا ہے۔ اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

ان اخنع الاسماء عند اللّٰہ رجل تسمی ملك الاملاك۔	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

(صحیح بخاری، کتاب الادب)

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرمانروا کا نام خلیفہ، اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے۔ خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قایم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں۔ توراۃ میں یہ بیان صرف حضرت آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکام الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقاید ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

(بقرہ ۴)

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قایم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ یہ مضمون آج بھی پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہے۔

مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۷)	ہم اُٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قایم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ - ۴)	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔ (اعراف - ۲)	اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمھارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمھاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزّت اور سرفرازی ملی وُہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدمؑ کے حصّہ میں آئی، اسی لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پُورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی۔

سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ۔ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ	اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دُوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے

لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ۔ (انعام - ۲) اور بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح کی قوم کا جانشین فرمایا:

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ۔ (اعراف - ۹) اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ۔ (اعراف ۱۰) اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَسۡتَخۡلِفُ رَبِّىۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ۔ (ہود - ۵) تو میرا رب تمھارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے:

اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا يَشَآءُ كَمَاۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّيَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِيۡنَ۔ (انعام ۱۶) اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمھارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے، جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ۔ (نور ۷) اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا، جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ۔ (انعام ۲۰) اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنایا۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔

(یونس - ۲)

اور تم سے پہلے ہم کئی اُمتوں کو، جب انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ۔

(یونس - ۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچا لیا اور انھیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ (فاطر - ۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔

(ص - ۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَفَ سے مشتق ہے، جس کے معنی 'پیچھے کے' ہیں۔ اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمایندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ۔ — تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

(اعراف ۲۱ و مریم ۷)

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دُوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طُور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

۲- وَ اَخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ۔ (اعراف ۱۶) — میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

۳- وَلَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنَا مِنۡکُمۡ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الۡاَرۡضِ یَخۡلُفُوۡنَ (زخرف ۶) — اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے۔ پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمھارے جانشین ہوتے۔ بعض نے کہا کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمھاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قایم مقامی کے ہیں۔ لیکن اس نیابت اور قایم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النیابة عن الغیر اما لغیبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشریف المستخلف۔

(ص ۵۵، مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے سبب سے ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کی نیابت کی عزّت بخشنے کے لیے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحبِ روح المعانی تک نے ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہییں۔ میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قایم مقامی ہوگی۔ اسی اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت

اور قایم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ۔ (حدید - ۱)	اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں۔ کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے۔ کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دُوسرے معنی صحیح ہیں۔ کشاف، بیضاوی اور رُوح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما هی اموال الله بخلقه وانشاء لها وانما مولکم ایاها وخولکم للاستمتاع بها وجعلکم خلفآء فی التصرف فیها۔	وہ مال جو تمھارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمھارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمھارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم الله خلفآء فی التصرف فیها۔	وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے:

جعلکم سبحانه خلفاء عنه عزّوجلّ فی التصرف فیه من غیر ان تملکوه حقیقةً۔	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا، اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرعنوان ہے، یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ (بقرہ - ۴)	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً مِّنِّيْ يَخْلُفُنِيْ فِي الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِيْ۔

میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

ان اللہ تعالیٰ اخبر الملٰئکۃ انہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لا یحکم فیھا بین خلقہ بحکمہ۔

(ص ۱۰۴، مصر)

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ اٰدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالیٰ فی ارضہ وکذالک کل نبی استخلفھم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس وتکمیل نفوسھم و تنفیذ امرفیھم لاحاجۃ بہ تعالیٰ الیٰ من ینوبہ بل لقصور قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ بغیر وسط۔

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاؑ علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند آگے متبوعین تک کو عطا ہوتی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲- روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا۔ اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کیے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا۔ یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳- اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور رہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی۔ جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا۔ اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور رہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے، تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے۔ اس اصول بظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے۔ ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہوجائے گا۔

۴- اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جن سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے۔

فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ۷)	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے ان کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ (تین ۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (جاثیہ ۲)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا "تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے۔ مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

وَ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (بقرہ۔۳) — اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ۔ (نحل۔۲) — اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمھارے) اختیار میں کیا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ۔ (جاثیہ۔۱) — اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمھارے قابو میں کر دیا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ۔ (ابراہیم۔۵) — اور کشتیوں (جہازوں) کو تمھارے زیر فرمان کر دیا۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ۔ (ابراہیم ۵) — اور نہروں کو بھی تمھارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ (احزاب۔۹) — ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے۔ یہ امانتِ الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں، اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریت ملے ہیں۔ یہ حدیث کہ فان اللّٰہ خلق اٰدم علیٰ صورتہ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے، اور مشہور قول تخلقوا باخلاق اللّٰہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو

بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دُنیاوی اور دینی دونوں تصوّرات باہم دست وگریباں ہیں۔

اب اس کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔	میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں۔

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

مولانا سید سلیمان ندوی

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظامِ حکومت قایم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہلِ عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظامِ حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی۔ چنانچہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سرپرغرور اب تک بلند تھا۔ چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہِ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے، اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آ کر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام تھا وہ انھی دونوں میں سے کسی کے زیرِ اثر اور تابع تھے۔ یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیرِ اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قایم کی تھی جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قایم تھیں، لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آ گیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اسی بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرماں برداری میں دے دیا جائے اور

بنایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی۔ چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے۔ قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (بقرہ)

اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے بنو اور رسول تمھارا بتانے والا بنے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس اُمتِ مسلمہ کے لیے اور یہ اُمتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہلِ عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا، اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کی نذر ہو گئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے، اور قبائلِ یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلۂ دوس کے عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا۔ وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پُرخطر تھا اور ابتداً میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قایم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دُوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا۔ چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا۔ چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمھاری ساری رعایا کے عدمِ قبولِ اسلام کا گناہ بھی تمھاری ہی گردن پر ہوگا۔ اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصّع اور تختِ زرّیں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہِ حبش نے آپ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے

تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کرلیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہوسکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کردیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْیَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔

زمانہ پھر پھر کے اسی مرکز پر آگیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خودساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظام ہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ وقیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کردیا۔ یہی پیش گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

اِذَا ھَلَکَ کِسْرٰی فَلَا کِسْرٰی بَعْدَہٗ وَ اِذَا ھَلَکَ قَیْصَرُ فَلَا قَیْصَرَ بَعْدَہٗ۔

جب کسریٰ ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت، اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں وحاکم ہے، شوہر اپنے اہل وعیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ:

کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ۔

یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا۔

یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قایم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کرکے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کرکے، سب کو زیر کرکے اپنی

سرداری اور بادشاہی کا اعلان کرتا ہے اور ان تمام خُون ریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے۔ مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ سلطنت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سر افگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قایم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دُوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دُوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریق حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا، اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لیے اوّلاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رُعب و اقتدار اور شاہانہ ہیبت کو قایم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورۂ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتوِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نورِ ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

۱۔ یہ کہ وُہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساسِ اوّلین محض اخلاص قلب

اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قایم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کی رُو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی۔ یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہوگئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے اُلٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قایم کی وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہلِ عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرواز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قایم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دُوسری شاہانہ حکومتیں تھیں۔ یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں۔ اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی۔ قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خُمس قایم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا، کہتا ہے: ؎

ونـنكر ان شئـنا على الناس قولهم
ولا ينكرون القول حين نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں
اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سردارانِ قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الا للہ و رسولہ۔ — اللہ و رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کو مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان و تجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر و جواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراء علیٰ قدر مراتب

سونے چاندی کی مرصّع کرسیوں پر اور ریشمی گدّوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس و فرش حرام کیے گئے۔ سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے ناجائز ٹھہرے، امامِ وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب و دربان کے پہرے اُٹھ گئے، چاؤش و نقیب رخصت کر دیے گئے۔ طلائی و نقرئی و زمردین تخت اٹھوا دیے گئے۔ امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی۔ چنانچہ وضع و لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرقِ مراتب موجود نہ تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصّوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیبِ تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربارِ عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی، جس کے شاہانِ وقت عادی تھے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصّہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ محمدؐ کون ہیں۔ لوگ اشارہ سے بتاتے۔ صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپؐ جلوہ افروز ہوں۔ مگر اس کو بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہلبیتِ رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لیے دوہری سزا ہے۔ ایک بار ایک مخزومی خاتون بنت قیس نے چوری کی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ گراں گزرا اور انھوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔[1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے

---

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے، مثلاً کراہتہ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔

اُوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی آپ نے اس سے کو نچ دیا، جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا۔ آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ:

"آؤ اور مجھ سے قصاص لو۔"

لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔[1]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، اُنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ:

"بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔"[2]

ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سُودی معاملات کو باطل قرار دیا۔ جاہلیت کے انتقام کو مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اوّل اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا۔ اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصوّر پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا، وہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیتِ کاملہ ہی آپ کا کمال تھا۔ اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا۔ فرمایا:

"خدا کے نزدیک سب سے بُرا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو شاہ شاہان کہے۔"

ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیّدنا کہا تو فرمایا:

"یہ تو اللہ کے لیے ہے۔"

آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دوسرے انبیاؑ علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؓ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپؐ صلوٰۃِ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے گہن نہیں لگتا۔[3]

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۵۸، کتاب الحدود۔ [2] ابوداؤد [3] بخاری باب الکسوف

ایک بار ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رُعبِ نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ:

"ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا! میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا[1]!" حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپؐ نماز پڑھا رہے تھے، حالتِ نماز ہی میں ایک بدّو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔" آپؐ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدّو کو ٹوکا کہ:

"تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمتِ الٰہی کو محدود کر دیا۔"[2]

حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دُنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دُوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دُوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے۔ لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے، اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے۔ زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیرِ سلطنت سب کا سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلافِ شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے۔ زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غربا اور اہلِ حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا۔ ابو داؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شئ و ما امنعکم ان انا الاخازن اضع حیث امرت[3]	میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں، میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

---

[1] مسند ج ۳، ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریع۔ [2] بخاری ج ۲، ص ۸۸۹، کتاب الادب۔

[3] ابو داؤد ج ۲، ص ۱۵، کتاب الخروج والامارۃ۔

دوسرے موقع پر فرمایا :

انما انا قاسم و اللّٰہ یعطی۔ — میں تو صرف بانٹنے والا ہوں ، دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار رہتا تھا اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رُو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہِ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضورؐ اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آں حضرتؐ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے اس حُجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپؐ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پہ لیٹے ہُوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حُجرہ میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سُوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دُوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مُٹھی بھر جَو رکھے تھے۔ اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہُوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پُوچھا۔ عرض کی : اے اللہ کے نبیؐ! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہُوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے، اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لُوٹ رہے ہیں، اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اے ابنِ خطاب! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہؐ!

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی، یا رسول اللہؐ! دعا فرمائیے کہ خدا آپؐ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیے ہیں۔

آپؐ دفعۃً اُٹھ بیٹھے اور فرمایا :

"کیوں ابنِ خطّاب! تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں

دے دیے گئے ہیں"[1]

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعدؓ ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں۔ ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ وُہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں"[3]۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پُوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی: نہیں۔ تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے[4]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا۔ آپؐ نے حیرت سے فرمایا:

معاذ! یہ کیا؟

عرض کی: "یا رسول اللہؐ! میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو دل چاہا کہ میں بھی حضورؐ کو سجدہ کروں۔"

ارشاد ہوا کہ "خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں"[5]۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہلِ عرب خود اس کے خُوگر تھے کہ وُہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قُرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں۔ حیاتِ دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور احباب کی سربلندی سے زائد نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا

---

[1] بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الایلاد
[2] یعنی پیوند دار کپڑا (معارف)
[3] و [4] ابو داؤد، کتاب النکاح
[5] ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امرا کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقرا کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قایم فرمایا اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویا کے مقابلے میں زیادہ توجہ کے قابل تھا۔ عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا۔ ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ نگینے بھرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔[1]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات و تصنعات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، نا آشنا بدو آتا تو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے۔ اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا۔ آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا۔ مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا، اور حضورؐ اس کو شفقت سے سُنتے تھے، اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قایم رکھے یا توڑ دے۔

حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علٰحدگی اختیار کر لی۔ ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے۔ آخر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا۔ اُنھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں، سفارش ہے۔ عرض کی: تو قبول سے معذور ہوں۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

---

[1] دونوں واقعے ابو داؤد، کتاب الخراج میں ہیں۔ [2] صحیح بخاری، باب تکوین الحرۃ تحت العبد و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرۃؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فنِ جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے۔ انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنویں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا۔ اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ:

انتم اعلم بامور دنیاکم۔ — تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہوں گے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، اُنھوں نے صورتِ حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے میری اتباع ضروری ہے۔ لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں، تم آزاد ہو۔[1]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے۔ یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جن امور میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحتِ خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بذریعۂ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا منشاء الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر یہ محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپؐ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بے شُبہ ہوں۔ اُنھوں نے کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شُبہ ہیں۔ اُنھوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا۔ اُنھوں نے کہا کہ کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور

---

[1] صحیح مسلم، باب الفضائل۔

یہی گفتگو کی۔ انھوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے تھے۔ آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو اُنھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔[۱]

اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدّتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا، اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیلِ ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضورؐ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنّا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے۔ لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربّانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ ام المومنینؓ نے چہرۂ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا۔ آپ نے واقعہ بیان فرمایا۔ حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں۔ آپ خود اپنا احرام کھول دیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پروا نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امورِ تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔[۲]

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا۔ انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ

---

[۱] بخاری ج ۱، ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

[۲] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں۔ آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دُور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آب پاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ یہ سُن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لو یہاں تک کہ کھیت کی مینڈھ تک پہنچ جائے[1] یعنی پانی بھر کر مینڈھ کے اوپر سے دُوسروں کے کھیتوں میں از خُود چلا جائے، یوں نہ جانے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ:

یا رسول اللہ! انصاف فرمائیے۔

آپؐ نے فرمایا:

اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟

ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

اگر آپؐ اجازت دیجیے تو اس کی گردن اڑا دوں۔

لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا[2] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اُترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے۔ (یہ پیشگوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پُوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرضِ واجب کی حد سے گزر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے، اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے بُرے اسلوب سے بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاؔ اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور نخوت و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمّال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قایم مقام ہوتے ہیں، اس لیے اُن پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب الفقہ، ج ۲، ص ۷۶

[2] بخاری ج ۱، ص ۵۰۹، باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہدِ نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمالِ نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جُرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا۔ حکام و عمال سے فرمایا:

"ہاں، مظلوم کی بد دُعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دُعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی" اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو"۔ [1]

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سُرخ ہو گئی۔ آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا: میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو، کیونکہ جو لاد دو گے وہ نہ تمہارا مال ہو گا اور نہ تمہارے باپ کا۔

حضورؐ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفراللہ، نہیں استغفراللہ، نہیں استغفراللہ۔

اس کے بعد فرمایا:

"میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو"

مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا۔ پھر آپؐ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ "اس کے ایک اُونٹ پر جَو اور دُوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں"۔ [2]

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پہ اس کو ڈانٹا اور کہا:

"تجھ کو خبر ہے کہ تُو کس سے ہمکلام ہے؟"

بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے"

اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔ [3]

ایک دفعہ ایک بدّو اُونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ

---

[1] صحیح مسلم ج ۲، ص ۳۶۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ۔

[2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحلم۔

[3] ابن ماجہ بصاحب الحق سلطان۔

نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں۔ اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی! لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہؐ بدمعاملگی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے۔

پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا۔ اس نے پھر وہی لفظ کہے۔ لوگوں نے پھر روکا۔ آپؐ نے پھر فرمایا "اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے"۔ اور اس جملہ کو کئی بار دُہراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے۔ جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم وعفو اور حُسنِ معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: "محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی"۔ [1]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے۔ ان سے بڑھ کر وُہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمّی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت وسُست کہہ کر کہا کہ "اے عبد المطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یونہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو!"

حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کرکے کہا: "او خدا کے دشمن! تُو رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے!"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: "عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں"۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کرکے اس کو بیس صاع کھجوریں اور زیادہ دے دو۔ یہودی علم وعفو کے اس پُراثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ [2]

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وُہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا۔ اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا۔ اس گستاخ نے کہا: "میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یُوں ہی اُڑا لیں اور دام نہ دیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سُن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وُہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۲۶۸۔

[2] یہ روایت بیہقی، ابنِ حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے ——— کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (شرح شفا از شہاب خفاجی)

زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں[1]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امرا کے غرور و تجبر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں، اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دارو گیر سے برتر ہے، اس سے بھلا بُرا جو کچھ ہو وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دارو گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپؐ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی باایں ہمہ آپؐ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپ کا یہ اُسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو، اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آیندہ آنے والے امرأ اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو اُمت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوّت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب، استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روما میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قایم تھیں، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرا کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ ان کو امرأ کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امرأ و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آ سکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگیِ اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے، اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے بلکہ اس ذاتِ اقدسؐ سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سُرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی۔ صلوات اللہ تعالیٰ علیہ

---

[1] جامع ترمذی، کتاب البیوع

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے' اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا تھا، اس لیے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امرائ کے لیے مثال و نظیر کا کام دے۔ آپؐ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (آل عمران - ع ۱۷) (اے رسولؐ! امورِ سلطنت و جنگ و صلح میں) اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بہ نفسِ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ:

وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ۔ (شوریٰ ع ۴) ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہدِ نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے' اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقرا سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا" تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا، بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپؐ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، اُنھوں نے الصّلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤیا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[۱] اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آکر آنحضرت صلی اللہ

---

[۱] مصنف عبد الرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد و فتح الباری ابن حجر و روض الانف سہیلی و زرقانی (باقی برصفحہ آیندہ)

علیہ وسلم نے بیان کیا، چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔[1]

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہنچ کر آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں، باری باری سے ممتاز صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جاکر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہیں گے۔ خدا کی قسم اگر آپؐ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔ اس کے بعد جب آپ میدانِ جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جاکر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ حسبِ فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضورؐ کی اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے۔ اس پر انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جاکر قیام فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپؐ نے پھر تمام صحابہ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔[2]

اُحد کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کُوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پُرجوش جان نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے، اور حضورؐ کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا امورِ حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مالِ غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپؐ نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اگرچہ آں حضرت صلی اللہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان، نووی میں ہے: فشرعه النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلك اما بوحی او باجتهاده صلی اللہ علیہ وسلم علی مذهب الجمهور فی جواز الاجتهاد له صلی اللہ علیہ وسلم ولیس هو عملا بمجرد المنام هذا ما لا یشك فیه بلا خلاف۔

[1] ابوداؤد و ترمذی، باب بدء الاذان

(صفحہ ہذا) [2] ترمذی ص ۵۰۳، کتاب التفسیر سورۂ انفال۔

علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر بھی آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا، جس میں فرمایا کہ تمھارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں۔ جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔

تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اُٹھے کہ:

"یا رسول اللہؐ! ہم اس پر راضی ہیں۔"

آپؐ نے ان کے اس عاجلانہ اظہارِ رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی[1]

احادیث کی کتابوں کا استقصا کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکروفریب، دغل وسازش، ظلم وستم، جور و تعدّی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے۔ اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا۔ احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ:

السلطان ظل اللہ فی الارض یاوی الیہ کل مظلوم من عباد اللہ۔[2]	یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے، جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

السلطان العادل المتواضع ظل اللہ ورمحہ فی الارض۔[3]	عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد وصحیح بخاری کتاب المغازی

[2] و [3] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت

(باقی برصفحہ آیندہ)

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

"عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسنِ عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بد دیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدّی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معیّنہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں۔ ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی سے اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے۔ یہ سُن کر انھوں نے اپنی فوج ہٹا لی[1]

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہوجاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء و مزیل الالتباس عطا حلبی، لفظ سلطان، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں 'السلطان' کے معنیٰ بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت و قوت کے ہیں جو انگریزی لفظ 'پاور' کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے اس لیے اس حدیث کے معنیٰ یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظامِ حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام و آسایش کے لیے گویا زمین میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عاملِ حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمایندے ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے حدیث میں ہے:

السُّلطانُ ولیّ من لا ولیّ له۔

یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔

یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے، اس لیے اس کا ہر جائز نمایندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا۔ بادشاہ کے معنیٰ میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمودؒ کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

[1] صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش

خیال کرے گا۔ اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے۔ یورپ آج ظاہری و نمایشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے۔ ہر فرد رموزِ سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلّم ہو گیا ہے، لیکن با ایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصلِ سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیے دی جاتی ہے، لیکن با ایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حرّیت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے، لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قایم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فردِ سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجبِ عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لیے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کا نظامِ سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قایم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ چنانچہ کعب ابن اشرف کے قتل میں محمدؓ بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گرانباری بھی تھی۔

صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں عمّال مقرر کر دیے گئے تھے، تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سر رشتہ اور نظام قایم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قایم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا۔ صحیح بخاری میں عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا اتاه قوم بصدقتهم قال اللهم صلّ على آل فلان، فاتاه ابى بصدقته فقال اللهم صلّ على آل ابى اوفیٰ۔

(بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ص ۲۰۳)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا! فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ خداوندا! ابی اوفیٰ کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھ ملتا تھا، جو

عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

ان اوّل صدقة بيّضت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلّم و وجوه اصحابه صدقة طي جئت بها۔[1] (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل)	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلۂ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

صدقات قومنا[2]	یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی، حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے[3]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہوگئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جُرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اُٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہوجاتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہِ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سُود ہے، اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جُرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی تھی اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے، اپنے جُرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، اُنھوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب اُنھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یارسول اللہؐ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یارسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے۔ آپؐ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اُنھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا

---

[1] و [2] مسلم ج ۲، کتاب الفضائل

[3] صحیح بخاری ج ۱، کتاب الزکوٰة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة وکتاب الاجارة باب من اجر نفسه

کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے۔ اسی طرح بار بار وہ اعترافِ جرم کرتے رہے اور آپؐ اعراض فرماتے رہے۔ چوتھی بار آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ ان تمام مراتب کے بعد آپؐ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڈھے اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا[1]

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضورؐ نے ان کی شدتِ علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی[2]

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے، جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہمبستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے، اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے[3]

غزوۂ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلّم تھا، قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمتِ اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اُٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضورؐ نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے[4]

---

[1] ابوداؤد، ج ۲، ص ۱۴۵ و صحیح بخاری، کتاب الحدود۔

[2] ابوداؤد، باب فی اقامۃ الحد علی المریض

[3] ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود۔

[4] ابوداؤد، کتاب الدیات۔

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حدِ فاصل قایم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی۔ لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دُوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جُرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجرا سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیاوی سلطنت میں جلّاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انھوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی۔ دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دُوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وُہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قایم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جُرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحمدل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم در گزر کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے، لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے جُرم سے اغماض نہیں برت سکتی۔ عہدِ نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انھوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطبؓ ابن بلتعہ ایک صحابی تھے، انھوں نے کفارِ قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن اُڑا دُوں۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پُوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا، اس لیے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا، سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجیے کہ اس کی گردن اڑا دُوں۔ لیکن آپؐ نے فرمایا: کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہلِ بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَکُمُ الْجَنَّۃُ۔	جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمھاری قسمت میں لکھی جا چکی۔

یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے[1]

---

[1] بخاری ج ۲، کتاب المغازی، ص ۵۶۰

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ شرکتِ بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبّر اور دور اندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص و اعتماد کی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادۃ۔ — حسنِ ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

(ابوداؤد، کتاب الادب ص ۱۹۸)

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ — بعض گمان گناہ ہوتے ہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم۔ — جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویۃ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم اوکدت ان تفسدھم۔ — حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا یا عنقریب برباد کر دو گے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انھوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے، البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

وخین حضرت عقبہؓ ابن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں۔

حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگذر کرو"۔

دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترکِ شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں۔
حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگزر کرو، کیونکہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ:

من رای عورۃ فسترھا کان کمن احیی مؤدۃ[1]

جس نے کسی بُرائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خُوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبویؐ میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وُہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعتِ علم، حسنِ خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور اُن کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وُہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے، اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وُہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خُوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر وفریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظامِ اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے

[1] یہ تمام حدیثیں ابو داؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النھی عن التجسس میں ہیں۔

پہلو تہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قایم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگزر کرے، تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اُس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں شرابور ہو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے، اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں اُن میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے، بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دُور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کے لیے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ "یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔"

ابنِ خلدون نے ان سطروں میں جو آئینِ جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کا جو دُوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکام سلطنت کے عدمِ تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے، اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانونِ شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اُس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پُورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثباتِ جُرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری

کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے۔ چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا۔ — بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، اُنھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گزر شام میں ہُوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پُوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں[1]۔

دنیوی حکمران لُطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جبکہ غیر قوم کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظامِ سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قایم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا، اور اس لیے یہ ابرِ کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملاتِ حکومت میں خود آپ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے، مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہیے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں[2]۔ یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے۔
آپؐ نے پُوچھا: کیا وضو کر کے چلے تھے؟
اس نے کہا: ہاں۔
آپؐ نے دریافت فرمایا: کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟
اس نے کہا: ہاں۔
آپؐ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا[3]۔

---

[1] مسلم ج ۲، ص ۳۹۷، کتاب الادب [2] ابوداؤد ج ۲، ص ۲۴۱، کتاب الحدود [3] ابوداؤد ج ۲، ص ۲۴۲، کتاب الحدود۔ جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لیے حکم ان الحسنات یذھبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی۔ ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپؐ سے ایک ضرورت ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم اپنے کام کے لیے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہُوں۔ چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دے دیا[1]

عدیؓ بن حاتم جو مذہبًا نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے۔ جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضورؐ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں۔ لیکن جب ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گزرا تو کہہ اُٹھے کہ حضورؐ بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حُسنِ خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گزر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپ کی خدمتِ اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بیباکی کے ساتھ سوال وجواب کرتے تھے، اور حضورؐ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپؐ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا[2]

بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہوجاتے ہیں جن کے لیے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے۔

ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہوجائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا[3] لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی[4]، صبح کو گھبرا کر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جُرم کا اعتراف کیا۔

آپؐ نے دُو بار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟

انھوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں! یا رسول اللہ! مجھ ہی سے یہ حرکت ہُوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں۔

فرمایا: ایک غلام آزاد کر دو۔

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۲۹۴

[2] بخاری ج ۲ ص ۹۰۰

[3] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دے دی جائے۔ جیسے کوئی یہ کہے آج سے تُو میری ماں کے برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔

[4] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ! اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں۔
آپؐ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو۔
عرض کی: یارسول اللہ! جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے۔
آپؐ نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو۔
عرض کی: یارسول اللہؐ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے۔
آپؐ نے ان کی یہ بات سُن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ وہ تم کو اس قدر کھجور دے دے گا کہ اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ۔ وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمھارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہؐ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔[1]

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی۔ عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پہ بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت قائم ہوا اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہدِ نبوت میں پیش آئے۔

ایک دفعہ ایک بدّو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال اُلجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پُوچھے۔
فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں۔
عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟
فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو۔
پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے۔
سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟
فرمایا: نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو۔
پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا۔ اس نے پھر پُوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟
فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو۔

---

[1] ابوداؤد ج ۱، ص ۲۲۰، کتاب الطلاق۔

اتنا سوال و جواب کرکے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم ہیں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا۔ یہ سُن کر حضورؐ نے فرمایا، یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا۔ (بخاری، کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے۔

ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا۔

اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔

اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔

اس نے پھر کہا: ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟

فرمایا: اللہ عزّ و جلّ نے۔

اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟

فرمایا: ہاں۔

اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے۔

فرمایا: اس نے سچ کہا۔

کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو بھیجا۔ کیا خدا نے آپؐ کو یہ حکم دیا ہے؟

فرمایا: بے شک۔

پھر کہا: آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟

فرمایا: ہاں، سچ کہا۔

اس نے کہا: قسم ہے اُس کی جس نے آپؐ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟

فرمایا: ہاں۔

پھر کہا: آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانۂ کعبہ کا حج کریں۔

فرمایا: ہاں، سچ کہا۔

عرض کی: اس کی قسم جس نے آپؐ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟

فرمایا: ہاں۔

اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا۔

ارشاد ہوا: اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔ (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہؓ حاضر خدمت تھے اور حضورؐ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اُترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے جو ٹیک لگائے ہیں۔

اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے!

حضورؐ نے فرمایا: ہاں، کہو۔

اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا۔

فرمایا: جو چاہو پوچھو۔

اس نے کہا: میں تمھارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟

فرمایا: خدایا ہاں۔

پھر کہا: خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟

فرمایا: خدایا ہاں۔

پھر کہا: خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟

فرمایا: خدایا ہاں۔

پھر کہا: خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟

فرمایا: خدایا ہاں۔

اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں۔ (بخاری، کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھیے اور شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سُنیے:

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے۔ صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انھوں نے اسی محبت کا

ثبوت دیا۔

براءؓ بن عازبؓ ایک صحابی تھے، ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں، تو حضورؐ کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھام کر نثار ہونے لگے۔ (ابوداؤد، کتاب الحدود ۲ ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوشِ عقیدت کا سب سے بڑی امتحان گاہ میدانِ جنگ ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپؐ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہؓ بن شعبہ آپؐ کی پشت پر مسلّح کھڑے ہوئے تھے۔ عروہ گفت گو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپؐ کی ریشِ مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپؐ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو۔ عروہ نے اس جوشِ عقیدت سے متاثر ہو کر دُوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعابِ دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں۔ جب آپؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجا لانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں، جب آپؐ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے اور جسم پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجا لانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے، جب آپؐ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے۔ لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے[1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ ابن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انھوں نے کہا:

ایانا ترید یا رسول اللہ والذی	یارسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے
نفسی بیدہ لو امرتنا	اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری
ان نخیضھا البحر لاخضناھا	جان ہے، اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس
ولو امرتنا ان نضرب	سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۷۰، کتاب الشروط۔

اکبادھا الی برك الغماد لفعلنا۔
(مسلم، کتاب الجہاد ، باب غزوۂ بدر)

ڈال دیں گے ، اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[1] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوۂ اُحد میں جب آپؐ نے کفار کی جمعیت کو ذرہ گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا ، اس سے زیادہ جوشِ محبّت کی تفسیر کیا ہوسکتی ہے ، انھوں نے کہا :

بابی انت و امی لا تشرف یصبك سھم من سھام القوم نحری دون نحرك۔
(بخاری، کتاب المغازی ، غزوۂ اُحد)

میرے باپ ماں آپ پر قربان ، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھیے ، کہیں آپؐ کو کوئی تیر نہ لگ جائے ، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر ، یہ تو صحابہ اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے ، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا ، تو وُہ بھی ان کی گرویدہ ہوجاتی تھیں۔ فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہ رضؓ ابن رواحہ کو مقرر فرمایا ، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی ، اس پر یہودیوں نے کہا : "یہ تو بہت ہے۔" اُنھوں نے کہا : اچھا ! میں تخمینہ کر دیتا ہوں ، تم لوگ اس کا نصف لے لینا ، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے :

ھذا الحق به تقوم السّماء والارض قد رضینا ان تاخذہ بالّذی قلت[2]

انصاف اس کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہے ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی ، لیکن اُنھوں نے کہا ، اے دشمنانِ خدا ! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو ، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترین خلائق ہے ، اور تم کو میں بندروں اور سُوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں ، لیکن تمھاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی ، یہ سُن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قایم ہیں[3]

---

[1] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

[2] ابوداؤد ج ۲ ، ص ۷۰ ، کتاب البیوع

[3] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۳۱

زمین کا سنگار

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ـ

"جتنی چیزیں بھی زمین پر ہیں ہم نے اُن کو زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ انسانوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے کون کون اچھے اعمال والا ہے۔"

ہر شے کا زمین کے لیے زینت وجمال ہونا اسلام ہی کی نگاہ نے معلوم کیا۔ زمین پر بچھا ہُوا سبزہ زمین کے لیے اپنی خوشنمائی سے زینت ہے اور آسمان کی طرف بلند ہونے والے درخت اُن کی جھومنے والی ڈالیاں، اُن کی سایہ گستر شاخیں اپنے طور پر زمین کی رونق بن رہی ہیں۔ شوخ وشنگ رنگ رکھنے والے پھول، بھانت کا مزہ دینے والے پھل، عجیب وغریب اشکال کے اوراق، مختلف تاثیرات وخواص رکھنے والے پہاڑ، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفید سفید خیمے کھڑے کرنے والی برف اور میدانوں کی چٹیل زمین پر نرم نرم فرش بچھانے والی ریت، آبشاریں، غار، مرغزار اور جنگل، وادی دامن آبادیاں اور ویرانے اپنی اپنی حالت، اپنی اپنی وضع، اپنے اپنے محل وقوع کے لحاظ سے تمام کرۂ ارضی کے حُسن کو بڑھانے والے جمال کو ترقی دینے والے ہیں۔

یہ سب زمین کا سنگار ہیں۔ یہ سب زمین کی زینت اور زیور ہیں۔ ان کی خوبصورتی کو دکھلانے والا ہی دین الاسلام ہے۔ جو دِینُ الحُسنِ وَالجَمَال ہے۔

مکہ اور مدینہ کی قدیم تاریخ

محمد اسلم ملک

مکّہ کی قدیم تاریخ

محمّد اسلم ملک

مکہ المکرمہ دنیا کا واحد قدیم ترین شہر ہے جو آج تک آباد چلا آتا ہے۔ یہ امر کم و بیش متفق علیہ ہے کہ شہر کی بنیاد آج سے تقریباً چار ہزار سال پیشتر ۲۲۰۰ قبل مسیح[1] میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ نے رکھی تھی۔ تاہم بعض عرب مؤرخین نے شہر کے زیادہ قدیم ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ بکری[2] کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے شہر مکہ کے عبادت خانہ کو چوتھی مرتبہ تعمیر کیا تھا۔ اس سے قبل تین دفعہ یہ عبادت خانہ بنا مگر زمانے کی دست برد کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکا۔ زیادہ محتاط مورخین[3] نے بھی حضرت ابراہیم کی آمد سے قبل وہاں آبادی کے امکانات کا اظہار کیا ہے اور اکثر مستشرقین[4] نے بھی عموماً اسی رائے کو ترجیح دی ہے کہ قبیلہ بنی جرہم جس کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کا ازدواجی رشتہ قائم ہوا اس جگہ پہلے سے آباد تھا ——— گو وادیوں اور پہاڑیوں پر منتشر بدویانہ زندگی بسر کرتا تھا: پانی کی دریافت کے بعد چشمہ (زمزم) کے گرد ایک جگہ پر جمع ہو کر اس نے حضری زندگی کا آغاز کیا۔ تقدم و تاخر کی اس بحث سے قطع نظر، یہ بات کم و بیش طے شدہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے لیکر آج تک یہ شہر متواتر آباد چلا آ رہا

۱؎ ارض القرآن سید سلیمان ندوی جلد دوم ص ۱۹۰۔ نیز دیکھئے ENCYCLOPEDIA OF RELIGION & ETHICS جلد ہشتم ۱۱۵ تحت لفظ مکہ۔ "یہ تصور کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ ہے ظہور اسلام کے بعد پیدا ہوا: اصل میں یہ حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کیا ہوا نہیں۔" یہ رائے تاریخی شواہد و نظائر کے صریحاً خلاف ہے جس پر کوئی بحث کرنا فضول ہے۔ تاہم مصنف موصوف کی اختلافی رائے یہاں اس لیے درج کر دی ہے تاکہ معلوم ہو کہ مغرب میں تحقیق کے نام کیسی مضحکہ خیز اور افترا انگیز باتیں گھڑی جاتی ہیں۔

۲؎ بکری الدرۃ المکللۃ فی فتح مکہ المشرفہ المبجلہ (طبع مصر) ص ۲۳۔

نیز مولوی عبد الشکور پھلواری: تاریخ مسجد حرام ص ۳

"تاہم یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کو چوتھی مرتبہ تعمیر کیا اور یہ کہ اس کی پہلی تعمیر فرشتوں کے ہاتھوں ہوئی جیسا کہ مصنف کا خیال ہے، کسی صورت قابل قبول نہیں۔

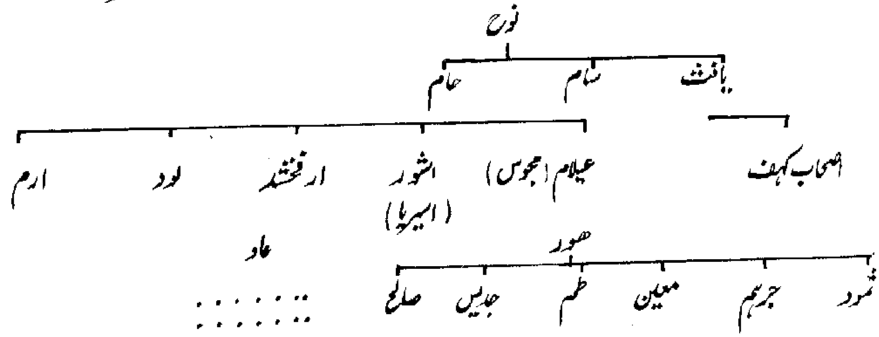
۳؎ حسنین ہیکل حیات محمدؐ

۴؎ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام زیر تحت لفظ مکہ۔

ہے اور اسے مذہبی، سیاسی یا تجارتی لحاظ سے اہمیت اور مرکزیت ہر زمانے میں حاصل رہی ہے۔

مکۃ المکرمہ کے بارے میں مزید کچھ لکھنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر عرب کی قدیم تاریخ اور قدیم اقوام کے احوال کے متعلق بیان کر دیا جائے تاکہ مابعد کے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

امم سامیہ کا مسکن اول جزیرہ نما عرب تھا[۵]۔ یہیں سے یہ لوگ نکل کر مختلف اوقات میں کنعان، بابل، حبشہ اور مصر میں پہنچے اور وہاں عظیم الشان تمدنوں کی داغ بیل ڈالی۔ تاریخ میں ان کی چار ہجرتوں کا ذکر ملتا ہے۔ پہلی ہجرت حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال قبل ہوئی جبکہ یہ لوگ عرب سے نقل مکانی کر کے مصر، فنیقیا، بابل اور سریا تک پھیل گئے۔ (ان کی آخری ہجرت ظہور قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی[۶])۔ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بھی سامی نسل سے تھا اور جن اقوام میں وہ تبلیغ کرتے، سریا، فلسطین، مصر سے ہوتے ہوئے عرب میں پہنچے ان سب کا تعلق بھی اسی نسل سے تھا۔ ابراہیمؑ کی آمد سے قبل نواح وادی مکہ میں بنی جرہم کا جو قبیلہ آباد تھا اس کے متعلق مختلف قیاسات کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ یہ قبیلہ قحطانی تھا اور اس کا ابراہیمؑ سے کوئی نسلی تعلق نہیں تھا[۷]۔ مگر یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ قبیلہ بنی جرہم اور حضرت ابراہیمؑ دونوں ایک ہی نسل امم سامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کے نسلی رشتہ کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کے شجرۂ نسب کا مطالعہ ضروری ہے جو توریت کے حوالہ سے مرتب کیا گیا ہے اور جسے ہم نے سید سلیمان ندوی کی کتاب ارض القرآن سے نقل کیا ہے[۸]۔

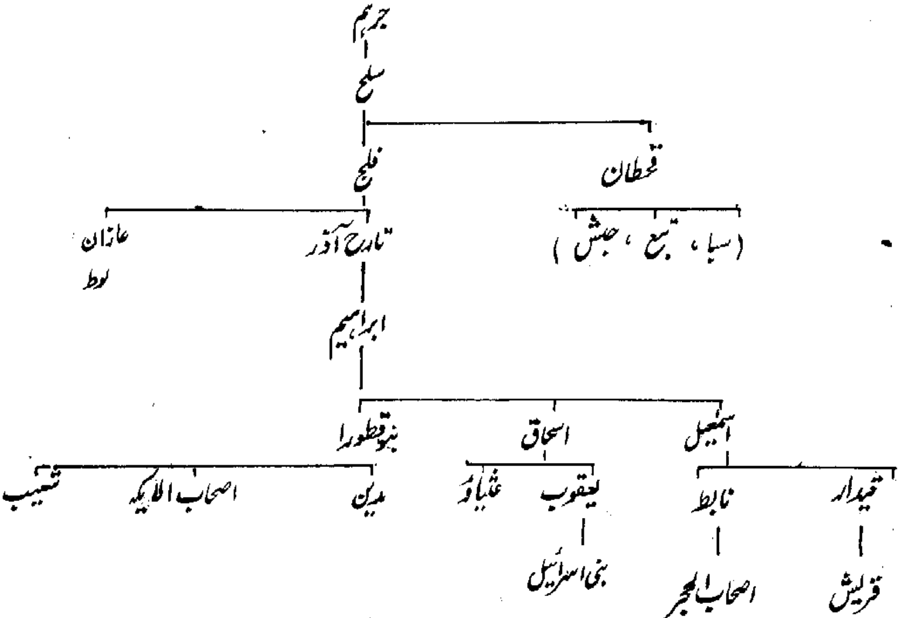


۵ ندوی: ارض القرآن جلد اول صہ ۱۰۷-۱۱۵: توریت کے بیانات، یونانی مورخین، جدید تحقیقات اور مغربی ماہرین اثریات کے حوالوں سے بڑی وضاحت کے ساتھ امم سامیہ کا اصلی وطن عربستان ثابت کیا ہے۔
نیز دیکھیے معارف (اعظم گڑھ) جلد ۲۰ ۔ ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء صہ ۲۶ مولوی زبید احمد کا مضمون "لفظ صلوات قرآن شریف میں"

۶ ندوی: ارض القرآن جلد دوم صہ ۳۸، جلد ۱ صہ ۱۲۴۔ (یہ ہجرت زیادہ پہلے ہوئی ہوگی کم از کم ۳ ہزار سال ق م کے لگ بھگ)

۷ معارف اعظم گڑھ جلد ۲۰ نمبر ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء صہ ۲۶۱ نیز ندوی۔ ارض القرآن، جلد ۲ صہ ۱۹۹

۸ جلد ۱ صہ ۱۲۴۔



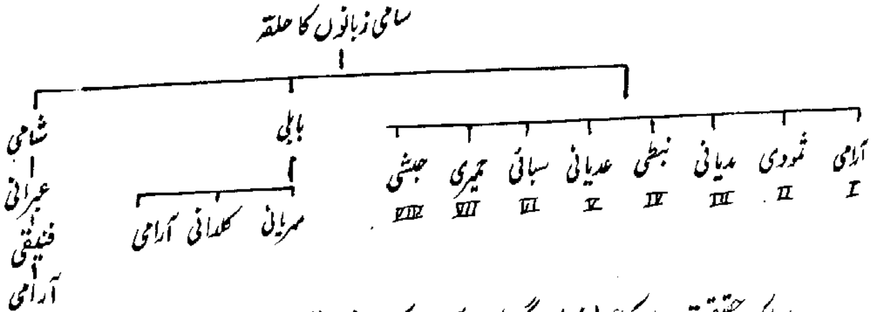
تاہم حضرت ابراہیمؑ اور بنی جرہم کی زبانیں مختلف تھیں۔ ابراہیمؑ کی زبان آرامی تھی اور بنی جرہم کی زبان عربی تھی اگرچہ کہ ظہور اسلام کی عربی سے مختلف تھی۔ زمان و مکان کے فاصلوں نے دونوں کی زبانیں مختلف سانچوں میں ڈھال کر ایک دوسرے سے جدا کر دی تھیں۔ تاہم دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ کیونکہ مخزن اور مخرج دونوں کا ایک تھا اور دونوں زبانیں سامی الاصل تھیں[9]۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے بنی جرہم ہی سے عربی زبان سیکھی[10]۔

عربی سیکھ کر عربی طور طریقے اختیار کرنے کی وجہ سے حضرت اسمٰعیل اور اس کی اولاد کو عرب مستعربہ کہا گیا ہے۔ اگر بنظر عمیق جائزہ لیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی[11]۔

عام طور پر عبرانی کو امم سامیہ کی قدیم ترین زبان سمجھا گیا ہے۔ عبرانی کو امم سامیہ کی قدیم ترین زبان سمجھنا غلط ہے۔ ان کی قدیم زبان آرامی تھی اور یہی حضرت ابراہیم کی زبان تھی۔ بائدہ، ثمود اور دیگر اقوام سامیہ اولیٰ کی زبان بھی آرامی تھی۔ کتبات بھی اسی زبان میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اور ماہرین لسانیات اس زبان کو ابتدائی عربی (PROTO - ARABIC) گردانتے ہیں۔ سامی زبانوں کے حلقہ کو سمجھنے کے لیے نیچے دیئے گئے خاکہ کو نگاہ میں رکھنا چاہیے[12]۔

---

۹ سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۲۹
۱۰ صحیح بخاری۔
۱۱ سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۲۹
۱۲ ایضاً ص ۱۳۰



یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی زبان اگر السنۂ سامیہ کی ماں نہیں تو اسے ماں کے قریب ہونے کا درجہ ضرور حاصل ہے [13]

مگر لفظ عرب زیادہ قدیم نہیں۔ پہلے پہل یہ لفظ ایک ہزار سال قبل مسیح میں سننے میں آیا۔ عبرانی میں اسے عَرَبا (ערבה) یعنی بیاباں، صحرا، میدان کہتے ہیں۔ قرآن میں اس کے لیے "وادٍ غیر ذی زرعٍ" کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ "عرب" کا لفظی ترجمہ ہیں۔ ۸۰۰ ق م میں عربی میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے —— عرب کے نام سے مشہور ہونے سے قبل اس کا نام مدبار تھا، توریت میں حضرت اسمٰعیل کے وطن کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔ مدبار کے معنی بھی غیر آباد ہونے کے ہیں۔ توریت میں عام طور پر عربستان کا ذکر "پورب کی سرزمین" اور بعد ازاں "پچھم کی سرزمین" کہہ کر کیا گیا ہے [14]

اسی ملک عرب کے صوبہ حجاز میں جسے توریت میں فاران کہا گیا ہے مکّہ کا شہر آباد ہوا [15]

مکہ کی قدیم تاریخ پردۂ اخفا میں ہے اور ہماری معلومات اس قدر ناقص، مبہم اور متضاد ہیں کہ کوئی مربوط تاریخ بیان کرنا کم و بیش ناممکن ہے۔ شہر مکہ کے آباد ہونے سے بہت پہلے اس علاقہ میں عمالیق پھیلے ہوئے تھے۔ بعد ازاں وہاں قبیلہ بنی جرہم آباد ہوگیا [16] مگر اس قبیلہ کو وہاں اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ جب یمن سے مختلف قبائل نکل کر مشرق اور شمال کی طرف آئے تو اس وقت یمن کا مشہور قبیلہ بنی اُزد (جسے بنی عک نے شکست دے کر نکال دیا تھا) مکہ کی ایک وادی بطن مر میں آکر ٹھہرا۔ اُن کے سردار ثعلبہ بن عمرو نے بنی جرہم سے مطالبہ کیا کہ میدان ان کے سپرد کر دیا جائے جرہم کے انکار پر خون ریز لڑائی ہوئی اور ثعلبہ نے میدان پر زبردستی قبضہ جما لیا۔ مگر بعد ازاں یہ دیکھ کر کہ یہاں وسائل

---

۱۳ - معارف۔ اعظم گڑھ جلد ۲۰ نمبر ۴ اکتوبر ۱۹۲۷ء ص ۲۶۰ مضمون از مولوی زبید احمد۔

۱۴ - سید سلیمان ندوی، ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۹ - ۴۷ اور ص ۵۱۔

۱۵ - ایضاً جلد ۱ ص ۹۷۔ گستاولی بان نے تمدن عرب میں توریت کے حوالے سے حجاز کا نام ادومیہ لکھا ہے۔

۱۶ - عمالیق، عملوق کی جمع ہے۔ اور یہ لفظ عم اور ملوق سے مل کر بنا ہے۔ عم عبری زبان میں قوم کو کہتے ہیں۔ عربی میں لفظ اُمّة اسی سے ماخوذ ہے۔ اور ملوق کے معنی عام وادی کے ہوتے ہیں۔ ۲ ۱/۲ ہزار سال ق م میں یہ لوگ مصر کے حکمران تھے۔ بعد میں وہاں سے ان کا اخراج ہوا اور یہ ادھر ادھر بکھر گئے (ارض القرآن جلد ۱ ص ۳۸)

معیشت کی تنگی کے سبب گزراں مشکل ہے نقل مکانی کر کے یثرب چلا گیا[۱۷]۔ یہ میدان شاید وہی ہے جہاں حجاج حج کے لیے خانہ کعبہ کی عمارت کے بالمقابل جمع ہوتے تھے۔ (عرفات میں اجتماع بعد میں شروع ہوا۔ ورنہ قصیٰ سے قبل وادی مکہ میں ہی حجاج جمع ہوتے تھے)۔ جب حضرت اسماعیل وادی مکہ میں آتے تو اس وقت یہاں بنی جرہم کا قبیلہ قرب وجوار کی وادیوں اور پہاڑیوں پر آباد تھا۔ اسی خاندان میں حضرت اسماعیل نے شادی کی اور ان کی نسل بڑھی اور پھلی پھولی۔ مگر بنی جرہم آہستہ آہستہ معدوم ہو گئے اور عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اس خاندان کا صرف ایک مرد عُبید بن شریہ جُرہمی یمن میں موجود تھا۔ جسے امیر معاویہ نے تاریخ لکھنے کا حکم دیا[۱۸]۔ اس کے برعکس خاندانِ اسماعیل حجاز، نجد اور حدود عراق تک پھیل گیا[۱۹]۔ اس بات کی تصدیق یونانی مورخ یوسیفوس نے ۱۰۰ء میں کی کہ حجاز سے لے کر عراق تک اسماعیل کے بارہ بیٹوں کا قبضہ ہے اور یوسفؑ کو کنویں سے نکالنے والے بھی اسماعیلی تاجر تھے جو سامان لے کر مصر جا رہے تھے[۲۰]۔

پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد حضرت اسماعیل نے جرہم کے سردار مضاض کی بیٹی سے شادی کی۔ جس کے بطن سے بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ ان میں قیدار اور نابت نے شہرت اور ناموری حاصل کی۔ حضرت اسماعیل نے باپ کے ساتھ مل کر خانۂ خدا کی بنیاد رکھی اور مکہ کا شہر بسایا۔ حضرت ابراہیمؑ فلسطین میں مستقل طور پر قیام پذیر رہے۔ البتہ مکہ میں دو تین مرتبہ آئے تیسری مرتبہ انہوں نے لوگوں کو حج کی دعوت دی۔ بنی جرہم سمیت گرد و نواح کے قبائل نے اس دعوت کو قبول کیا۔[۲۱] پھر ہر سال ہزاروں زائرین طواف کے لیے بیت اللہ میں آنے لگے[۲۲]۔ خانۂ خدا کی مجاورت اور خدمت حضرت اسماعیل کے اولاد کے ہاں رہی۔ مگر بعد میں تولیت کا منصب بنی جرہم میں منتقل ہو گیا۔ انتقالِ تولیت کی اصل وجوہ کا علم نہیں تاہم ایک روایت ہم تک پہنچی ہے کہ کثرت اولاد کی وجہ سے آل اسماعیل کی تعداد بڑھ گئی، وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہاں گزر اوقات ہو سکتی اُن کی کثیر تعداد نقل مکانی کر کے وہاں سے چلی گئی۔ بقیہ اولاد صغیر السن تھی، لہذا بنی جرہم تولیت خانہ خدا پر قابض ہو گئے۔ تاہم یہ قبضہ پر امن طور پر ہوا[۲۳]۔ اگرچہ یہ بات معلوم ہے کہ آل اسماعیل مکہ سے نکل کر دور دراز علاقوں میں چلی گئی مگر اس سبب سے بنی جرہم کے پاس مجاورت کا منصب منتقل ہو جانا کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مزید برآں یہ امر بھی واضح نہیں کہ کس زمانہ میں بنی جرہم کے پاس یہ منصب منتقل ہوا۔ ابن ہشام کی روایت کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ واقعہ حضرت اسماعیل کے انتقال کے فوراً بعد ظہور میں آیا۔ کیوں کہ ابن ہشام کے بقول اسماعیل کی اولاد صغیر السن تھی اور ننھیال کے ساتھ

۱۷۔ بلاذری۔ فتوح البلدان صہ ۱۷-۱۶

۱۸۔ سید سلیمان ندوی ارض القرآن جلد ۲ صہ ۲۰۰ - ۱۶۹

۱۹۔ ایضاً صہ ۵۱

۲۰۔ ایضاً صہ ۴۷

۲۱۔ طبقات ابن سعد جز ۱

۲۲۔ القرآن سورۃ الحج آیات ۲۸ - ۲۷

۲۳۔ ابن ہشام جلد ۱ صہ ۱۱۱

خوش گوار تعلقات کی وجہ سے وہ انتقال تولیت پر خاموش رہے۔[۲۴] یہ واقعہ چاہے حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے فوراً بعد ہُوا ہو یا بعد میں کسی وقت ظہور میں آیا ہو، اور اس کی وجوہات خواہ کچھ بھی بیان کی جائیں ——— جدید عہد کا مؤرخ پس پردہ ان سیاسی محرکات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو اس تبدیلی میں کام کر رہے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ خُدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے، ان کا خاندان قابلِ عزّت و احترام تھا۔ تاہم ان کے خاندان کو عرب میں سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی۔ بنی جُرہم کے ساتھ ننھیالی رشتہ قائم ہو جانے کے بعد ہی آلِ اسماعیل کو عصبیت حاصل ہوئی۔ تاہم جب بنی جرہم نے دیکھا کہ خدا کے گھر کی رکھوالی کرنے والوں کا کتنا اعزاز اور احترام ہے تو فطری طور پر ان کے دل میں بھی یہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی کہ کیوں نہ وہ خود اس منصب پر قبضہ جمالیں۔ اس بات کی تصدیق بلاذری کے بیان کردہ اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ بنی جرہم کے سردار مضاض اور سمیدع عمالقی میں جنگ تولیت کعبہ کے تنازعہ پر ہوئی، جس میں مضاض نے شکست کھائی۔[۲۵] سمیدع کو بنی جرہم کا اعزاز دیکھ کر حسد پیدا ہوا تھا۔ یہ مضاض وہ نہیں جو حضرت اسماعیلؑ کے سسر تھے بلکہ یہ غالباً بعد میں کوئی جرہمی سردار گزرے ہوں گے۔ یہ نہیں معلوم بلاذری کی روایت کس حد تک صحیح ہے۔ تاہم اس واقعہ سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ تولیت کے منصب نے حسد و رقابت کے جذبات پیدا کر دیئے اور اس غرض کے لیے سیاسی کش مکش شروع ہو گئی تھی۔ منصب تولیت سے محرومیت کے باوجود حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کی عزت و تکریم میں کوئی فرق نہ آیا اور عہد اسلام تک قریش پورے عرب میں عـزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ بات یہاں نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ قریش کے احترام اور وقار کو قصیٰ نے آکر دوبارہ بحال کیا ——— ورنہ قصیٰ سے پہلے قریش منتشر اور پراگندہ تھے۔ تولیت خانہ کعبہ سے محروم ہونے کے بعد آلِ اسماعیلؑ مکہ میں مقیم رہی اور ننھیال کے ساتھ ان کے تعلقات خوش گوار رہے۔ مگر اولادِ اسماعیل کو مکہ کی اجتماعی زندگی میں کیا مقام اور رتبہ حاصل تھا، یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے ہے کہ بنی جرہم اور قطورا (اولادِ اسماعیل) کی مکہ پر مشترکہ یا وفاقی حکومت قائم رہی۔ جو کارواں جس قبیلہ کی طرف سے گزرتا اس کا محصول وہی قبیلہ وصول کرنے کا حق رکھتا تھا۔[۲۶] فطری طور پر یہاں یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ تولیت خانہ خدا کا منصب کیا خالصتاً مذہبی قسم کا تھا یا اس کی نوعیت سیاسی بھی تھی۔ یعنی کیا شہر کی سیاسی بالادستی اس شخص یا خاندان کو از خود حاصل ہو جاتی تھی جو اس مقام پر فائز ہوتا یا یہ کہ اجتماعی زندگی میں اُسے صرف ایک بااثر فرد یا گروہ کی حیثیت حاصل ہوتی؟ واضح شواہد و نظائر کے فقدان کے پیشِ نظر کوئی قطعی بات کہنا دشوار ہے تاہم صحیح بخاری کی ایک روایت قابلِ غور ہے کہ حضرت ہاجرہ نے قبیلہ بنی جرہم کو مکہ میں سکونت رکھنے کی اجازت دے دی مگر کہا کہ پانی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔[۲۷] محولہ بالا روایت

۲۴- سیرت ابن ہشام جلد ۱ صہ ۱۱۰ -

۲۵- بلاذری فتوح البلدان جلد ۱ صہ ۵۲ : جن مقامات پر سمیدع اور مضاض نے لڑائی کی تیاری کی تھی وہاں دو مشہور عمارات تھیں۔ جن کے کھنڈرات عہد نبوی تک موجود ہے (نیز ابن ہشام) -

۲۶- محمد حمید اللہ : رسول اللہ کی سیاسی زندگی (صہ ۹ - ۴۸) - ۲۷- صحیح بخاری -

سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خاندان اسماعیلؑ کو مذہبی تقدس کی بنا پر سیاسی تفوق حاصل ہو گیا تھا اور وادی مکہ کا میدان جس کے لئے ماضی میں جرہم و اُن دیس لڑائی ہوئی تھی اب بلا شرکت غیرے خاندان اسماعیلؑ کے تصرف اور تسلط میں تھا۔ دوسرے مکہ کی سیادت کے لیے ہم نے ابن ہشام، طبقات ابن سعد اور بلاذری کے حوالوں سے اور جن غیر مربوط قسم کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تقدس اور خانہ کعبہ کی مجاورت کے ساتھ سیاسی غلبہ و تسلط اس طرح وابستہ تھا کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ تیسرے تمام قدیم شہروں میں عام طور پر مذہبی اور سیاسی قیادت یکجا رہی ہے، خصوصاً جو شہر کسی عبادت خانہ کی وجہ سے آباد ہوئے[۲۸]۔ اور سوشیالوجسٹ کی جدید تحقیقات[۲۹] بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ انسانی معاشرے کے ارتقائی مراحل میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ سیاسی اور مذہبی مناصب ایک ذات میں جمع تھے۔

اتنی بات واضح ہے کہ خاندان اسماعیلؑ کچھ دیر کے لیے بلا شرکت غیرے خانۂ خدا کا متولی رہا اور اس وجہ سے سیاسی طور پر بھی مکہ کی سیادت اس کے ہاتھ میں رہی۔ بعد ازاں یہ منصب بنی جرہم کے ہاں منتقل ہو گیا اور ممکن ہے کہ مکمل انتقال سے پیشتر، جیسا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی رائے ہے، کچھ عرصے کے لیے مکہ پر مشترکہ کنٹرول آل اسماعیلؑ اور بنی جرہم کا رہا ہو ـــ بعد ازاں بنی جرہم کو بنی بکر اور بنی غبشان نے یمن کی طرف بھگا دیا اور تولیت ایک مرتبہ پھر آل اسماعیلؑ میں آ گئی۔ جو اس خاندان کے مشہور فرد عدنان کے زمانے تک اسی خاندان میں رہی۔ جرہم کی شکست سے پہلے مورخین نے جرہم کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کی وجہ سے لوگ تنگ آ گئے۔ بنی بکر اور غبشان کون تھے؟ اور انہوں نے جرہم کو شکست دے کر مکہ کی سیادت اور کعبہ کی تولیت خاندانِ اسماعیلؑ کو کیوں سپرد کر دی؟ ان سوالات کا کوئی ٹھوس جواب موجود نہیں۔ تاہم عدنان کے زمانہ تک مکہ پر مذہبی اور سیاسی تسلط آلِ اسماعیلؑ کا تھا اور بخت نصر نے حملہ کیا تو اس کے مقابلے پر عدنان اور اس کا خاندان ہی نکلا۔ بخت نصر کا حملہ ۵۶۲ ق م میں ہوا۔ اس حملہ میں عدنان مارا گیا مگر اس کا لڑکا معد بچ گیا[۳۰]۔ اور فرار ہو گیا۔ پورا خاندان منتشر ہو گیا۔ یہ مکہ کی تاریخ کا پہلا دور ہے۔ قریش کا جد اعلیٰ فہر جس کے نام کی وجہ سے یہ خاندان مشہور و معروف ہوا، اسی زمانۂ جلاوطنی میں پیدا ہوا۔ اور خاندانِ قریش کا دوسرا اہم فرد قصی جس نے قریش کو خانہ کعبہ کی تولیت اور شہر مکہ کی حاکمیت پر بحال کیا، اسی اخراج کے دور میں پیدا ہوا۔ عدنان سے لے کر قصی کے زمانہ تک خاندان اسماعیلؑ اپنے جد امجد کے بسائے ہوئے شہر سے باہر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر یہ کہنا کہ یہ پورا دور اس خاندان کے لیے غربت و تنزل کا دور تھا، صحیح نہیں۔ تاہم قصی نے بزور شمشیر شہر مکہ کو فتح کر کے خانہ کعبہ کی تولیت پر قبضہ کر لیا اور اپنے خاندان کے منتشر افراد کو مکہ اور اس کے گرد و نواح میں جمع کیا۔ اس لیے اس کا نام "مجمع" پڑ گیا۔ یہ سن ۴۴۰ عیسوی[۳۱] کا واقعہ ہے اور اس

---

[۲۸] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز تحت لفظ "ٹاؤن پلاننگ" اور "شہر"۔

[۲۹] سید سلیمان ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۱۴۔

[۳۰] RULERS OF MECCA : GEVALD DE GAURY صـ ۲۸ نے ۴۸۰ عیسوی لکھا ہے، جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

[۳۱] دیکھیے ڈاکٹر حمید اللہ سیاسی زندگی ص ۴۔

واقعہ سے مکہ کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

تاہم جس زمانی ترتیب سے ہم نے مکہ کی قدیم تاریخ کے واقعات اوپر بیان کئے ہیں، یہ قطعی نہیں ہیں۔ سنوں کے بارے زبردست اختلاف سے قطع نظر یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ کون کون سے قبائل مکہ کی سیادت اور کعبہ کی تولیت کرتے رہے خصوصاً جبکہ خاندان اسماعیل اور قریش جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ "مکہ کے حکمران" کتاب کا مصنف جرہم کی شکست اور اخراج کا سال ۲۰۷ عیسوی تسلیم کرتا ہے اور اکثر یورپین مورخین نے یہی سن لکھا ہے۔ مصنف موصوف کے خیال کے مطابق اس کے بعد بنی خزاعہ کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ مکہ کی تاریخ کا پہلا دور یہاں پر ختم ہوا۔ اور دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ پانچویں صدی عیسوی میں جنوبی عرب سے تاجر مکہ میں آکر آباد ہوئے اور یہ شہر تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا[۳۲] یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مستشرقین شہر مکہ کی قدامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کے دیئے گئے سن کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ ان کی رائے کس حد تک متعصبانہ ہے۔

یہاں یہ سوال دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قصی کے مکہ پر قبضہ جمانے سے پہلے مکہ پر "حکمران" قبائل کی حکومت کی نوعیت کیا تھی؟ کیا پورا قبیلہ بحیثیت مجموعی حکمران ہوتا تھا یا اس قبیلہ کے سردار ہی کو حکومت کے تمام فرائض تفویض تھے اور حکمران قبیلہ کی حیثیت سردار کے سامنے محض رعایا کی نہ تھی؟ یا یہ کہ یہ حکومت شخصی طرز کی تھی جس میں قبیلہ کی رائے کو کوئی اہمیت اور عمل دخل حاصل نہ تھا؟ حکومت کرنے کا طریقہ کیا تھا؟ خانہ خدا کی تولیت کا کیا انتظام تھا؟ حجاج اور زائرین کی خدمت کا کیا بندوبست کیا جاتا تھا؟ ان سوالات کا جواب معلوم کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ قصی کے زمانۂ حکمرانی کی اصلاحات کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کیا جا سکے اور معلوم کیا جا سکے کہ قصی نے جو اصلاحات جاری کیں وہ کس حد تک اس کے اپنے ذہن کی اختراع تھیں اور کس حد تک مروجہ طرز حکمرانی کا عکس اور پرتو تھیں۔

جیرالڈ ڈی گاری نے قصی سے پیشتر مکہ کے حکمرانوں کی فہرست اپنی کتاب میں دی ہے۔ جس سے یہی نظر آتا ہے کہ مصنف موصوف تسلیم کرتے ہیں کہ مکہ میں شخصی حکمرانی کا دور دورہ تھا اور یہ کہ حکومت موروثی ہوتی تھی، ان کی دی گئی فہرست حسب ذیل ہے[۳۳]

۱- جرہم بن جہلا (JAHLA)	از ۴۷ ق م	تا ۴۴ ق م
۲- ابو ہیل بن جرہم	از ۴۴ ق م	تا ۱۴ ق م
۳- جرہم بن ابو ہیل	از ۱۴ ق م	تا ۱۶ عیسوی سن
۴- عبدالمنان بن جرہم	از ۱۶ عیسوی	تا ۴۲ء
۵- بقیلہ بن عبدالمنان	از ۴۲ء	تا ۷۶ء

۳۲- RULERS OF MECCA : GEVALD DE GAURY صـ ۲۸

۳۳- "مکہ کے حکمران" صـ ۳۳

۶- عبدالمسیح بن بقیلہ	؟		(اس کا اصل نام عمرو تھا)
۷- مواحدہ اکبر MOHADA بن عبدالمسیح	از ۱۰۶ء		تا ۱۳۶ء
۸- عمرو بن معاذ ۹- حارث بن مواحدہ	از ۱۳۶ء		تا ۱۷۰ء
۱۰- عمرو بن حارث ۱۱- بشر بن حارث ۱۲- معدالاصغر بن عمرو بن محمد	از ۱۷۰ء		تا ۲۰۶ء

۲۰۷ء میں جرہم کو نکال کر خزاعہ نے مکہ پر قبضہ کر لیا۔ خزاعہ کا سردار عمرو بن لحی تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے مکہ میں بت پرستی کو رواج دیا[۳۴]۔ خزاعہ کا آخری حکمران حُلیل تھا۔ قصی بن کلاب نے اسی سے حکومت حاصل کی[۳۵]۔

قصی کے پیش رو حکمرانوں کی حیثیت اور ان کی حکمرانی کی نوعیت پادشاہانہ اور مطلق العنان ہرگز نہیں تھی جیسا کہ جیرالڈ کا خیال ہے حکمران اپنے قبیلے کا سردار اعلیٰ ہوتا تاہم اس کے اختیارات وسیع ہوتے ٹیکس وصول کرنے اور زائرین کی خدمت گزاری اس کا فرض منصبی تھا۔ سرداری کا عہدہ وراثتاً منتقل ہوتا تھا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصب سرداری "شہنشاہیت" کا روپ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مگر ہم ان قبائلی سرداروں کو "حکمران" نہیں قرار دے سکتے اور نہ ہی ان کے اختیارات حتمی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ باوجودیکہ حُلیل نے اپنے داماد قصی کو تولیت کعبہ کے فرائض اور محاصل کی ادائیگی کے اختیارات لکھ دیئے تھے، مگر قصی کو سیادت حاصل کرنے کے لیے (حُلیل کے بعد) خون ریز لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ کیونکہ دیگر سرداران بنی خزاعہ نے حلیل کی تحریر کو قانونی سیاسی دستاویز کے طور پر فیصلہ کن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قصی نے اپنی دولت اور قوت کے بل بوتے پر مکہ پر قبضہ کیا تھا مگر اس نے بھی مطلق العنان حکمران بننے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس اشراف کے تعاون سے مکہ کا نظم و نسق چلانے کا بندوبست کیا۔ قصی کی حیثیت مرکزی تھی اور اس کا مقام و مرتبہ انتہائی اہم تھا۔ تاہم اسے مکہ کا فرمانروا نہیں کہا جا سکتا۔ مکہ یک حکمرانی کے تصور سے ابھی تک ناآشنا تھا بلکہ بعثت نبوی سے کچھ پہلے چند ایک طالع آزماؤں نے یک حکمرانی کا منصب حاصل کرنے کی جب کوشش کی تو اہل مکہ نے ان کی کوششیں ناکام بنا دیں۔ کیونکہ مکہ کا مزاج اور ماحول اسے ابھی قبول کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عثمان بن الحویرث مکہ میں زبردست مقبولیت رکھنے کے باوجود جب (رومی حکمرانوں کے بالواسطہ تعاون سے) مکہ میں "حکمرانی" کا ارادہ ظاہر کرتا ہے تو اس کو بے پناہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ اس کا اپنا خاندان اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے[۳۶] رومیوں سے نفرت کا جذبہ بھی کارفرما

۳۴- صحیح بخاری۔

۳۵- سیرت ابن ہشام جلد ۱

۳۶- محمد حمید اللہ : رسول اللہ صلعم کی سیاسی زندگی

تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی تھی کہ مکہ ابھی کسی بادشاہ یا امیر کے تسلط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب صورتِ حالات یہ تھی تو قبل مسیح میں "مکہ کے حکمرانوں" کی فہرست تیار کرنا بڑی زیادتی ہے۔

قصی بن کلاب بن مرہ کی ماں فاطمہ بنت سہل کا پہلا نکاح کلاب سے ہوا اور قصی اور زہرہ دو لڑکے پیدا ہوئے۔ بعدازاں دوسرا نکاح ربیعہ بن حرام سے ہوا۔ ربیعہ شام کا باشندہ تھا۔ جو عرب میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اپنے وطن شام واپس چلا گیا اور بیوی اور قصی اور زہرہ کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ قصی کو بڑے ہو کر جب اپنے حسب و نسب کا علم ہوا تو مکہ واپس آیا اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ خوب دولت کمائی اور شہرت حاصل کی۔ مکہ کے سردار حُلیل بن حُبشیہ کی لڑکی حبّی سے نکاح کیا۔ حلیل کے مرنے کے بعد کلید کعبہ اور سیادتِ مکہ پر قصی نے قبضہ جما لیا۔[۳۷] روایات متضاد اور مبہم ہیں۔ تاہم خلاصہ یہ ہے کہ حلیل اہل عرب سے محصول لیتا تھا قصی نے خرید کر لیا۔[۳۸] آیا حلیل نے اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے پر[۳۹] تحصیلِ محاصل کا پروانہ لکھ دیا تھا یا دھوکہ سے؟[۴۰] یہ پروانوٹ حاصل کیا گیا تھا؟ آیا حُلیل کو فروختگی کا اختیار حاصل تھا یا نہیں اور قانونی طور پر شرطِ بیع کے اس معاہدہ کی کیا حیثیت تھی اور یہ کہ حُلیل نے اتنے سستے داموں (شراب کے مٹکے کے عوض)[۴۱] محاصل کیوں فروخت کیے۔ یہ سارے سوالات تشنہ جواب ہیں اور تاریخی واقعات ان پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ آیا یہ سودا قصی کو فرزندی میں قبول کرنے کے بعد حلیل نے کیا یا پہلے؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قصی نے ایک کامیاب تاجر کے طور پر دولت اور شہرت حاصل کی۔ حُلیل، جو عیاش طبع انسان تھا قصی کا مقروض ہو گیا تو قصی نے اسے مجبور کیا کہ محصول چنگی وصول کرنے کا اختیار اسے لکھ دیا جائے۔ بعدازاں اس کی لڑکی سے نکاح کیا قصی کی طاقت اور عصبیت بڑھ گئی۔ حلیل جب مرا تو خانہ کعبہ کی تولیت قصی کو لکھ کر دے گیا۔ ممکن ہے کہ حُلیل کو محصول چنگی لینے کا اختیار اپنے قبیلے والوں نے سپرد کیا ہو اور دوسرے سرداروں کے سپرد اور فرائض ہوں۔ مکہ میں اس وقت وفاقی یا مشترک حکومت تھی، قبائل بنی خزاعہ، بنی بکر اور بنی صوفہ مل کر کاروبار چلاتے تھے۔ ممکن ہے کچھ اور قبائل بھی نظم و نسق چلانے میں شریک ہوں۔ ہر ایک کے سپرد علیحدہ علیحدہ فرائض تھے۔ مثلاً بنی صوفہ کے بارے میں واضح طور پر اطلاع ہم تک پہنچی ہے کہ وہ مناسک حج ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔[۴۲] عین ممکن ہے کہ تحصیل چنگی کا اختیار قبیلہ بنی خزاعہ کے سپرد ہو۔ اور اس طرح حُلیل نے جب محاصل وصول کرنے کا اختیار منتقل کیا تو کسی نے اس کی قانونی حیثیت کو چیلنج نہ کیا ہو؟ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ حلیل کے مرنے کے بعد مکہ کی سیادت کے لیے زبردست کش مکش کا آغاز ہو گیا۔ قصی نے منتشر قریشی قبائل کو اپنی قیادت میں جمع کیا، بنی قضاعہ سے بھی

---

۳۷ - ابن ہشام، جلد ۱ ص ۱۲۲

۳۸ - طبقات ابن سعد۔

۳۹ - حسنین ہیکل۔

۴۰ - تاریخ طبری۔

۴۱ - حسنین ہیکل۔

۴۲ - ابن ہشام جلد ۱ ص ۲-۱۲۱۔

مدد مانگی اور شام میں اپنے ماں جائے بھائیوں اذرح وغیرہ سے بھی امداد طلب کی۔ کئی معرکے ہوئے قصی کو السطح میں فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی خزاعہ اور ان کے حلیف بنی بکر شکست کھا گئے [۴۳] شکست خوردہ گروہ میں قبیلہ بنی صوفہ بھی شامل تھا جس کے سپرد مناسک حج کی ذمہ داری تھی۔ قصی نے مکہ اور تولیت کعبہ پر قبضہ کر لیا ۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قصی نے فیصلہ کن فتح حاصل کر کے دشمن قبائل کی قوت کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس کشمکش کا اختتام صلح نامہ پر ہوا جس کی رُو سے خزاعہ و بکر کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ دیگر شرائط صلح کے بارے میں اگرچہ روایات کا اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے ۔ تاہم یہ شرائط بھی قصی کے حق میں تھیں کم از کم اس زمانے کے اُصول کے مطابق ان شرائط میں بھی قصی کی جیت جھلکتی تھی۔[۴۴] ابن سعد کے مطابق خزاعہ و بکر کے مقتولین کا خون بہا نہ دلایا گیا جبکہ قریش کے مقتولین کا خون بہا دلایا گیا۔ اور چونکہ جنگ میں قصی کو بالادستی حاصل ہوئی تھی، اس لیے مکہ پر اس کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ صلح یعمر بن عوف نے کرائی۔ اس کا نام شداخ پڑ گیا۔[۴۵] کیونکہ اس نے اپنی فہم اور تدبر سے برسر جنگ فریقین کے سلسلۂ قتال کو توڑا (شداخ) تھا۔ اس واقعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جنگ و جدال کا خطرہ ٹلا نہیں تھا ۔ اور یعمر نے جب اس سلسلہ جنگ کو ختم کروا دیا تو اس کا نام شداخ مشہور ہو گیا۔ دوسرے بکری نے نواح کعبہ میں قصی کے آبسنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سکنتم حول البیت ھابتکم الناس ولم تستحل قتالکم والھجوم علیکم۔[۴۶] معلوم ہوتا ہے کہ السطح کے معرکہ کے بعد بھی خطرۂ جنگ باقی تھا ۔ اور مکہ پر زبردستی قبضہ کر لینے کے باوجود احتمال تھا کہ شکست خوردہ قبائل کہیں مکہ پر دوبارہ حملہ نہ کر دیں اور یہی سبب ہے کہ قصی نے جنگ کو دشمن کی فیصلہ کن شکست تک طول دینے کی بجائے، دشمن کی طاقت کم زور کرنے اور مکہ پر زبردستی قبضہ جمانے کے بعد معاہدۂ امن کے ذریعے مخالفین کو بیش بہا رقم بعوض خون بہا ادا کرنے پر فوری رضامندی ظاہر کر کے حاکمیت مکہ و تولیت کعبہ پر اپنے قبضہ کو قانونی حیثیت دینے کو ترجیح دی۔

قصی نے مکہ پر قبضہ ۴۲۲ء میں کیا۔ کعبہ کو از سر نو تعمیر کرایا ۔ اور پرانے شہر مکہ میں اپنے خاندان کے افراد کو بسانے کی بجائے خانہ خدا کے گرد چار طرف انھیں آباد کر کے نئے شہر کی بنیاد رکھی[۴۷]۔ اپنا مکان بھی وہیں تعمیر کیا۔ یہی مکان بعد میں دارالندوہ کے نام سے مشہور ہوا[۴۸]۔ یہ در اصل دارالامارت تھا اور یہی مقام اور حیثیت اس مکان کو قصی کے زمانہ میں بھی حاصل ہو گئی تھی۔ مکہ میں داخل ہونے والوں سے عُشر وصول کیا[۴۹]۔ حاجیوں کی دیکھ بھال اور بہتری کے لیے انتظامات کئے۔ شہری ریاست مکہ کی

---

۴۳ - ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۲۔

۴۴ - طبقات ابن سعد جلد ۱ - نیز ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۲۔

۴۵ - ابن ہشام ص ۱۲۲۔

۴۶ - بکری : الدرۃ المکللۃ ص ۷۵

۴۷ - مکہ کے حکمران ص ۳۸ ۔

۴۸ - ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۳ ۔

۴۹ - طبقات ابن سعد ۔

داغ بیل رکھی اور نظم و نسق چلانے کے لیے عسکری، عدالتی، مذہبی حصوں میں منقسم چودہ محکمہ جات بنائے اور قریش کے ۱۰ خاندانوں میں ان عہدوں کو بانٹ دیا۔

ا۔ عسکری i۔ نام عہدہ : عقاب قبہ اعنہ سفارت
ii۔ نوعیت : (عَلَم) (فوجی کیمپ) (سپہ سالاری) (مراسلت)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی اُمیہ بنی مخزوم بنی مخزوم بنی عدی

ب۔ عدالتی i۔ نام عہدہ : حکومت اشناق
ii۔ نوعیت : (مقدمات کی سماعت اور فیصلہ) (جرمانہ، خون بہا تاوان کی نگرانی)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی سہم بنی تیم

ج۔ مذہبی i۔ نام عہدہ : سقایہ احوال المجرہ رفادہ خبرگیری عمارہ سدانہ السادہ ندوہ
ii۔ نوعیت : (پانی پلانا) (اوقاف چڑھاوے) (خورد و نوش) (الگ الگ شعبوں کے نظام کا جائزہ) (کلید کعبہ)
iii۔ کس خاندان کے سپرد ہوا : بنی ہاشم بنی سہم بنی ہاشم بنی نوفل بنی ہاشم بنی عدار بنی جمح بنی اسد

لاوارث کا مال قصیٰ کو مل جاتا۔[۵۰] عام طور پہ کتب تاریخ میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لیے عہدوں کا قیام اور دیگر انتظامات قصیٰ کے اپنے ذہن رسا کی پیداوار ہیں۔ قصیٰ کی بے پایاں عسکری اور انتظامی صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں مگر محولہ بالا بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے سے پہلے مختلف پہلوؤں پہ غور کرنا ضروری ہے۔ قصیٰ شام سے حجاز آیا۔ اس کے خاندان کے لوگ ابھی تک بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے اور صحراؤں اور پہاڑیوں پہ منتشر تھے۔ جبکہ شام کا ملک تہذیبی طور پہ بہت ترقی یافتہ تھا۔ مزید برآں قصیٰ نے فتح مکہ کے لیے شام سے عسکری امداد بھی حاصل کی تھی۔ قصیٰ کی تعلیم اور تربیت شام کے متمدن ملک میں ہوئی تھی۔ لہٰذا بدوی قریشی قبائل کو تمدن کا درس قصیٰ نے دیا اور یہ رائے بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ مکہ کے نئے تمدنی دور کا جب آغاز ہوا تو اس پر شام کے تمدن کی چھاپ گہری تھی۔[۵۱] ظاہر ہے کہ شہری ریاست کے انتظام و انصرام کے لیے بہت سی چیزیں شامی طرز حکومت سے اخذ کی گئی ہوں قصیٰ کے عہد میں شام اور حجاز کے تعلقات سمجھنے کے لیے حدود ملک شام میں ملنے والے اس کتبہ کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔ اس کتبہ پر قصیٰ "مالک" کا نام درج ہے۔ یہ نام عدنانی الاصل ہے۔ شام میں یہ نام مروج نہیں رہا مورخین اور ماہرین اثریات نے امکان ظاہر کیا

۵۰۔ محمد حمید اللہ : سیاسی زندگی ص ۳۹۔

۵۱۔ سید سلیمان ندوی ۔ ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۰۲۔

ہے کہ یہ قصی رئیس قریش کے نام کا کتبہ ہے۔[۵۲] شام سے اکتساب کرنے کے علاوہ مکہ کی روایات سے بھی قصی نے بہت سی چیزیں مستعار لیں۔ مثلاً جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے قصی سے قبل مشترکہ قسم کی حکومت مکہ میں قائم تھی اور مختلف خاندانوں کو مختلف کام سپرد کئے ہوئے تھے۔ بنی سوفہ کے ذمہ خانہ کعبہ کی نگرانی اور فرائض حج کی دیکھ بھال تھی۔ بنی خزاعہ محاصل وصول کرتے تھے۔ شاید بنی بکر عسکری خدمت انجام دینے پر مامور ہوں ـــ حجاز اور شام کے امتزاج سے قصی نے ایسا نظم و نسق قائم کیا کہ بہت جلد اس کے خاندان: قریش کو پورے عرب میں اہمیت حاصل ہو گئی اور مکہ کے شہر کو شرق اوسط میں مرکزیت نصیب ہوئی۔

قصی کا انتقال ۴۸۰ء میں ہوا[۵۳]

قصی کے انتقال سے بعثت نبوی تک کے واقعات چونکہ مشہور و معروف ہیں اس لیے یہاں ان کا اعادہ کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ گو اس دور کے واقعات کی تحقیق اور جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہے مگر خوف طوالت سے ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں۔

اب شہر مکہ کے بارے میں بیان کیا جائے گا۔ کہ یہ شہر کب آباد ہوا، اس کا تعمیری منصوبہ کیا تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے کہ مکہ دنیا کا قدیم ترین شہر ہے جو آج تک آباد چلا آ رہا ہے۔ اس کی قدامت کا بڑا ثبوت اس کے نام کی قدامت ہے۔ ہزاروں برس گزرنے کے باوجود اس کا نام وہی چلا آتا ہے جو اس کے بانی اور معمار اوّل حضرت ابراہیمؑ نے تجویز کیا تھا۔ قرآنی شہادت کے مطابق یہ نام بکۃ تھا۔[۵۴] جو بعد ازاں مکہ کے نام سے مشہور ہوا۔ تاہم بکہ کا نام بھی عہد رسالت مآبؐ اور نزول وحی تک مقامی طور پر مستعمل ہو گا، ورنہ قرآن کو متروک لفظ استعمال کر کے مطالب قرآنی کو چیستان بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔

توریت میں مکہ کو "مشا" کہا گیا ہے جو توریت ہی کی دی گئی اطلاع کے بموجب بنی قحطان کی آخری آبادی تھی۔[۵۵] البتہ یہ بات واضح نہیں کہ آیا "مشا" مکہ یا بکہ کی تحریف شدہ صورت ہے یا اس کا تعلق (توریت ہی کے بیان کے مطابق) حضرت اسماعیل کے بیٹے "مسا" سے ہے۔[۵۶] مشہور رومی مؤرخ بطالمی دوسری صدی عیسوی میں اس شہر کو مکاربا (MACARBA) کہتا ہے۔[۵۷] یہ امر تشریح طلب ہے کہ بطالمی نے "مکاربا" کا نام کیوں استعمال کیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ مکاربا کے معنی عبادت خانہ (SANCTUARY) کے ہوتے ہیں

۵۲۔ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن جلد ۲ صـ ۱۰۴

۵۳۔ مکہ کے حکمران : صـ ۸ میں سن ۴۹۰ء دیا ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

۵۴۔ القرآن۔

۵۵۔ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن، جلد ۲ صـ ۹۷۔

۵۶۔ ایضاً صـ ۹۶ نیز دیکھیے ابن ہشام جلد ۱ صـ ۲، ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے ایک بیٹے کا نام "مشا" لکھا ہے۔ تاہم مسا اور مشا میں کوئی معنوی یا صوتی فرق نہیں۔

۵۷۔ سید سلیمان ندوی: ارض القرآن جلد ۱ صـ ۱۱۲۔

اور چونکہ بکہ میں خانہ خدا موجود تھا اس مناسبت سے ٹیالمی نے اسے مکاربا کہا۔[۵۸] دوسرا خیال یہ ہے کہ لفظ مکاربا دراصل مکہ اور ربہ سے مل کر بنا ہے۔ ربہ کے معنی اعظم کے ہوتے ہیں۔[۵۹] عین ممکن ہے کہ ٹیالمی نے مکہ کی بین الاقوامی شہرت، جغرافیائی اہمیت اور تجارتی مرکزیت کی وجہ سے اسے "مکہ کا عظیم شہر" کہا ہو۔ ہمارے خیال میں یہ دوسری رائے صحیح اور قرین قیاس ہے۔

یہاں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ شہر کا نام بکہ کیوں پڑا۔ اور یہ کہ آیا یہ نام خود حضرت ابراہیمؑ کا اپنا تجویز کردہ تھا یا بعد میں شہر اس نام سے منسوب و معروف ہوا۔ ابن ہشام نے اس ضمن میں مختلف روایات بیان کی ہیں: ان کا خلاصہ یہاں دیا جاتا ہے۔

۱۔ کوئی بادشاہ بکہ کی بے حرمتی کا ارادہ کرتا تو فوراً برباد ہو جاتا۔ اور یہ نام اس لیے مشہور ہوا کہ وہ ان سرکشوں کی گردنیں توڑ دیتا تھا جو اس میں کسی برائی کی داغ بیل ڈالتے۔ بک کے معنی گردن توڑ دینا کے ہیں اور دوسرے معنی ہجوم کے بھی ہوتے ہیں۔

۲۔ (بحوالہ ابوعبید) مکہ کے اندر بکہ نام کی وادی ہے اور چونکہ وہاں لوگوں کا بہت زیادہ ہجوم ہوتا تھا اس لیے اسے بکہ کہنے لگے۔

۳۔ (بحوالہ ابوعبید) بکہ بالخصوص کعبۃ اللہ کی جگہ اور مسجد ہی کو کہا جاتا ہے۔[۶۰]

پہلی روایت کے بموجب بکہ صفاتی نام تھا اور اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بکہ کا نام ابراہیمؑ نے تجویز نہیں کیا تھا بلکہ بعد ازاں شہر کی خاص صفت کی وجہ سے مشہور ہو گیا۔ مگر اس رائے کے قبول کرنے سے پہلے حسب ذیل امور پر غور کرنا ضروری ہے:۔

اولاً۔ ابن ہشام نے صفحہ مذکور پر ہی لکھا ہے کہ "زمانہ جاہلیت میں مکہ میں جو شخص سرکشی کرتا مکہ اسے اپنے اندر سے نکال دیتا اور جو ظلم و زیادتی کرتا وہ وہاں رہ نہیں سکتا تھا اس لئے اس کا نام ناسّہ مشہور ہوا"۔ نسّ کے معنی ہانکنا اور ڈانٹنا ہیں"۔ اس طرح یہ روایت اور روایت ۱ متضاد اور متناقض ہیں۔

ثانیاً۔ بکہ اور اس کے معنی کے متعلق ابن ہشام نے جو روایت (حوالہ بالا ۱) درج کی ہے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ صرف سُنی سنائی بات بیان کر دی ہے۔ اس لیے اس روایت کی اہمیت کم ہے۔ اب ایک صفت کی وجہ سے دو مختلف نام مشہور ہوئے تو اس روایت کو قبول کرنے میں ہمیں تامل ہے جو سند کے اعتبار سے کم تر درجے کی ہے۔

آگے چل کر ابن ہشام نے سند میں جو اشعار پیش کئے ہیں اس میں بکہ کے معنی "ہجوم" کے ہوتے ہیں اور ہمارے خیال میں "سرکشی" کی بجائے بکہ کے یہی معنی زیادہ قرین قیاس اور صحیح تر ہیں۔ مکہ کی دفاعی پوزیشن اور مکہ کے سرکش اور جابر حکمرانوں کے پے در پے اخراج کی وجہ سے ناسّہ کا صفاتی نام بعد میں مشہور ہو گیا ہو گا اور خود ابن ہشام کی اپنی تحقیق بھی یہی ہے۔ اس لیے انہوں نے

۵۸۔ مکہ کے حکمران صـ ۲۴۔

۵۹۔ ندوی ایضاً صـ ۱۱۲۔

۶۰۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۱۲۔

اپنی رائے پہلے پیش کر دی اور بعد میں غیر تصدیق شدہ بات کو بھی جو بازاری گپ شپ کے بطور مشہور تھی، لکھ دیا۔

ثالثاً۔ قرآن میں " ببکۃ مبارکۃ " کے الفاظ سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ بکہ کا نام شہر کے مؤسس اوّل نے تجویز کیا تھا یا کم از کم ابتداً یہی نام مشہور ہوا۔ ابن ہشام کی (محولہ بالا) تیسری روایت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی وہ خاص جگہ جہاں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے عبادت خانہ تعمیر کیا اسی جگہ کے لئے "بکہ" کا لفظ مخصوص تھا۔

دراصل بکہ جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں[61]۔ ابتداً میں یہ نام صرف خانۂ خدا کے لیے مختص تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ ابراہیمؑ کے پیروکار اور مقلدین حج اور قربانی کی رسومات ادا کرنے کے لئے وہاں جمع ہوتے تھے ___ اس میدان میں جو بیت اللہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ میدانِ عرفات میں حجاج کا اجتماع بہت بعد کی اختراع ہے[62]۔ ورنہ قصی کے زمانہ تک یہ اجتماع عین مسجد اور حرم مقدس کے سامنے ہوتا تھا۔ ابن ہشام کی (محولہ بالا) دوسری روایت کہ وہاں زائرین کا آنا بڑا ہجوم ہوتا تھا کہ وادی کا نام بکہ پڑ گیا، ہمارے خیال کو مزید تقویت پہنچاتی ہے ___ سالانہ حج کے اجتماع کے علاوہ سیاسی اور مذہبی لحاظ سے عربوں کو جو وحدت اور مرکزیت خانۂ خدا کی تعمیر سے حاصل ہوئی اس کے لیے بکہ سے بہتر کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نام پوری وادی کے لیے بلکہ اس شہری آبادی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا جو مسجد سے الگ کچھ فاصلے پر قائم ہو گئی تھی۔

گمان غالب ہے کہ اس شہری نو آبادی میں ہی حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہؓ کا سکونتی مکان واقع ہو گا۔ کیونکہ خانۂ خدا کے متصل یا نزدیک کا علاقہ "حرم" تھا اور وہاں مکان بنانا ممنوع تھا۔ البتہ قصی نے صدیوں پرانی روایت کو توڑا اور بیت اللہ کے متصل اور نزدیک رہائش رکھنے کی اجازت اپنے خاندان کے لوگوں کو عطا کی اس بنا پر کہ وہ مقدس خاندان کے لوگ ہیں اور انھیں کعبۃ اللہ کے نزدیک رہنے کا حق پہنچتا ہے[63] حالاں کہ قبل ازیں حدودِ حرم کے اندر رہائش رکھنا اور مکان بنا کر رہنا تقدس اور احترام کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ عجیب نہیں کہ اس خرابے میں اللہ کے گھر کے بعد تعمیر ہونے والا پہلا سکونتی مکان خدا پرست اور خدا شناس اسماعیلؑ کا ہو۔ بعد میں ارد گرد کی وادیوں میں اور پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے قبیلہ بنی جرہم کے بدو اس جگہ مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے۔ پانی کی بہم رسانی، زائرین کے قافلوں، اور تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت کی بدولت ضروری زندگی کے کم و بیش تمام اسباب فراہم ہو گئے۔ قرآن کی درج ذیل آیات پر اگر گہری نظر سے غور کریں تو واضح ہوتا ہے کہ نو تعمیر شہر میں نہ صرف دور و نزدیک سے آنے والے قافلۂ حجاج کا تانتا بندھ گیا بلکہ تجارتی سرگرمیوں کو بھی بہت فروغ ملا: وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا

---

61 - انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد ۳ تحت لفظ مسجد۔

62 - شاہ ولی اللہ : حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ - ص ۲۳۱ - ۲۳۰

63 - ابن ہشام ج ۱ ص ۱۱۳

منافع لھم ——————— ۵[۶۴] (اور لوگوں کو حج کے لیے اذن عام دے دو تاکہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں) معلوم ہوتا ہے کہ شہر کی رونق اور اسی مناسبت سے اس کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی اور جلد ہی یہ شہر ایک بین الملّی حیثیت اختیار کر گیا جہاں بنی جرہم کے علاوہ بھی افراد اور قبائل آکر رہنے بسنے لگے۔ سورۃ الحج کی ان آیات سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ تو تعمیر شہر مکہ میں نو وارد لوگوں کی آمد سے جو مسائل پیدا ہو رہے تھے، انھیں نمٹانے کے لیے ایک اُصول طے کر دیا گیا کہ مقامی اور باہر سے آنے والے لوگوں کے حقوق وہاں برابر ہیں۔ زیارت بیت اللہ کے علاوہ سکونت کے لیے بھی یہی اصول کارفرما تھا: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلنٰہ للناس سوآءَ نِ العاکف فیہ والباد ط ومن یرد فیہ بالحادٍ بظلم نذقہ من عذاب الیم[۶۵]۔ (جن لوگوں نے کفر کیا اور جو آج) اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں اور اس مسجد حرام کی زیارت میں مانع ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے بنایا ہے۔ جس میں مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے حقوق برابر ہیں (اور ان کی روش یقیناً سزا کی مستحق ہے) اس (مسجد حرام) میں جو بھی راستی سے ہٹ کر ظلم کا طریقہ اختیار کرے گا ہم اسے دردناک عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

ہمارے خیال کی تائید رسول اللہؐ کے ان الفاظ سے بھی ہو سکتی ہے: "..... حرمھا اللہ لا یحل بیع رباعھا ولا اجارۃ بیوتھا"[۶۶]

مکہ کو اللہ نے حرم قرار دیا ہے۔ اس کی زمینوں کا بیچنا اور اس کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا حلال نہیں ہے۔ اور ایک دوسری روایت کہ عہد عثمانؓ تک مکہ کی زمینیں سوائب (افتادہ یا شاملات) جس کو ضرورت ہوتی وہاں رہتا تھا اور جب ضرورت نہ رہتی دوسرے کو ٹھہرا دیتا۔[۶۷]

اسی اصول کے مطابق حضرت ہاجرہؑ نے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق بنی جرہم کو مکہ میں رہائش رکھنے کی عام اجازت عطا کر دی۔ ان دلائل اور تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ شہری منصوبہ بندی (TOWN PLANNING) کے متعلق بیان کردہ متذکرہ صدر اُصول حضرت اسماعیلؑ کی زندگی ہی میں طے پا چکے تھے۔ لہٰذا عارضی یا مستقل سکونت رکھنے والوں کے لیے وافر شاملات کی بآسانی دستیابی، عاکف و باد کے لیے مساوی حقوقِ شہریت (CIVIL RIGHT AND LIBERTIES) اور بلد امین کا روح افزا ماحول ظاہر ہے، آبادکاروں کے لیے بے پناہ کشش رکھتا تھا۔ لہٰذا شہر نہ صرف مذہبی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ آبادکاری کے لحاظ

۶۴۔ القرآن: الحج آیت ۲۷-۲۸۔

۶۵۔ ایضاً ۲۵۔

۶۶۔ مودودی: تفہیم القرآن جلد ۳ ص ۲۱۶ بحوالہ ابراہیم نخعی

۶۷۔ ایضاً جلد ۳ ص ۲۱۶ بحوالہ مجاہد عن علقمہ بن نضلہ۔

سے بھی" جمع ہونے کی جگہ " (بکہ) بن گیا۔ ہمارے خیال میں بکہ کے اصطلاحی معنی " آبادی " کے ہیں۔ اور ممکن ہے یہ لفظ سلاحقہ یا لاحقہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس طرح بکہ اسماعیلؑ (یعنی اسماعیلؑ کا بسایا ہوا شہر، اسماعیل کا گاؤں اور آبادی)۔ تاہم اس ضمن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ بات کم و بیش ثابت شدہ ہے کہ موجودہ نام ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا اپنا تجویز کردہ ہے[۶۸] یا اسی زمانے میں یہ نام معروف و مشہور ہو چکا تھا۔

یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ دنیا کے سب سے بڑے آبادکار تھے، ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے انہوں نے کئی اقوام و ملل تک پیغام خداوندی پہنچایا اور اسی وجہ سے ان کا نام ابراہیم: قوموں کا باپ پڑ گیا۔ وہ کئی نو آبادیوں کی نیو پہلے بھی ڈال چکے تھے[۶۹]۔ مکہ کی طرح ان کی بسائی ہوئی رملہ اور ایلیا کی بستیاں بھی آج تک موجود ہیں۔ اشاعت پیغام خداوندی کے لیے ابراہیمؑ نے اب کی مرتبہ جس جگہ کا انتخاب کیا وہ اپنے محل وقوع سیاسی اہمیت اور دفاعی نقطۂ نظر سے پہلے انتخابوں کے مقابلے میں بہت بہتر ثابت ہوئی۔ یہ کہنا کہ چونکہ اتفاقاً وادی مکہ میں چشمۂ آب اُبل پڑا اس لیے وہاں شہر بسایا گیا کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال میں جگہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا اور شہر کی تعمیر کے وقت باقاعدہ نقشہ ذہن میں رکھا گیا تھا۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کیوں کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق اپنے عہد کی سب سے زیادہ متمدن قوم سے تھا، وہ جس شہر میں پیدا ہوئے وہ تعمیر اور منصوبہ بندی کے لحاظ سے بہت منفرد حیثیت کا حامل تھا[۷۰]۔ وہ نو آبادیاں قائم کرنے کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔

۶۸۔ حسنین ہیکل: حیاتِ محمدؐ

۶۹۔ طبقات ابن سعد جلد ۱

۷۰۔ ابراہیمؑ کا شہر اور جسے اُر اور عور بھی لکھا جاتا ہے اور جسے عراق میں " مقیر" کہتے تھے کی کھدائی ۱۹۲۷ء میں سات میٹر تک کی گئی اور وہاں سے سولہ مکانات کی بنیادیں برآمد ہوئیں اور پانچ عام سڑکیں بھی برآمد ہوئیں۔ مکانات اینٹ کے بنے ہوئے تھے، ان میں ایک مکان شاہ لبید عشتاؤ کا بھی ہے جو ۱۰۰ قبل مسیح میں حکمران تھا۔ اس شاہی محل پر معمار کا نام بھی کندہ ہے۔ مکانات کی بنیادیں جو اب تک کھڑی ہیں پانچ چھ میٹر بلند ہوں گی۔ چند ستونوں کے آثار بھی ملے ہیں۔ بعض مکانوں کے باورچی خانہ میں اینٹ کا چولہا بھی ملا ہے ہر گھر میں ایک بہت بڑا صحن ہے جس کے کنارے کنارے مختلف النوع پھولوں کے درخت لگے ہوتے تھے۔ اُور کے باشندے مکانوں کے اندر مردوں کو دفن کرتے تھے کیوں کہ مکانوں کے اندر انسانوں کی ہڈیاں ملی ہیں۔ ایک مکان سے قیمتی کتب خانہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں تاریخ، ادب، علوم ریاضی کی کتابیں ٹھیکروں پہ لکھی ہوئی موجود ہیں۔ چند سو میٹر کے فاصلے پر ایک قدیم قبرستان برآمد ہوا ہے جو ساڑھے تین ہزار سال قدیم پرانا ہے۔ مردوں کو کفن پہنا کر چٹائیوں پر لٹا کر قبر میں لٹاتے۔ میت کے سرہانے برتن رکھتے جن کے آثار آج تک موجود ہیں بعض قبروں میں تانبے کے اوزار بھی ملے ہیں جن پر نقش و نگار ہیں۔ دیگر سامان زیبائش کنگھی وغیرہ بھی ملے ہیں جن میں بعض سونے اور چاندی کے ہیں۔ بابلی افواج نے ۱۹۰۰ ق م میں اس شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ بعد میں یہ شہر دوسری جگہ بسایا گیا۔ (معارف اعظم گڑھ: جلد ۲۱: ما جنوری ۱۹۲۸ء ص ۵۹-۵۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

مکہ کے صفاتی نام کئی ہیں۔ بلد امین[71]۔ باسّہ[72]۔ ام رحم۔ الحاطمہ[73] معطشہ۔ عرس۔ صلاح[74]۔ بطحا[75]۔ ام القریٰ۔ مقدسہ۔ قادسیہ۔ قریۃ النمل۔ معاد۔ طیبہ۔ عرش[76] وغیرہ۔ یہ نام بعد میں کسی خاص صفت کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

وادی مکہ شمالاً جنوباً دو میل لمبی ہے اور اس کا عرض کوہ جیاد سے کوہ قیقعان تک ایک میل ہے[77]۔ آجکل شہر کا ممتاز حصہ وہاں آباد ہے جہاں وادی کی پہنائی زیادہ ہے۔ باقی تنگ حصہ وادی میں ایک دہجی کے طور پر سلسلہ آبادی بخط مستقیم چلا گیا ہے[78]۔ حضرت اسماعیلؑ کے زمانے میں شہری آبادی شمال مشرق کی سمت کوہ قیقعان کے نزدیک واقع تھی کیونکہ خانہ خدا اور اس کے اطراف میں رہائش رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا[79] اور جس جگہ اب آبادی ہے اس کا بیشتر حصہ "حرم" سمجھا جاتا تھا خصوصاً بیت اللہ شریف کے نواح میں۔ اور یہ صرف قربانی، حج، طواف اور صلوات کی رسوم و فرائض کی ادائیگی کے لیے مختص تھا۔ شہری آبادی حدودِ حرم کے اندر شامل نہ تھی۔ اور عہد اسلام سے قبل حرم کی حدود صرف خانہ کعبہ کے اندر تک محیط تھیں حتیٰ کہ ارد گرد کے ملحق مکانات بھی حدود حرم میں داخل نہ تھے[80] اس طرح گویا مکہ کا قدیم شہر دو حصوں میں منقسم تھا، مذہبی علاقہ اور شہری آبادی۔ یہ تقسیم قصّی کے زمانے تک قائم رہی۔

مگر قصّی نے شہر مکہ فتح کرنے کے بعد شہری تقسیم کی خیالی حد بندی ختم کر کے "مذہبی علاقہ" کے اندرون سکونتی مکانات تعمیر کرنے کی اجازت دے دی اور اس طرح موجودہ شہر مکہ کی بنیاد پڑی۔ قریش کے منتشر قبائل کو پرانی آبادی میں بسانے کی بجائے، قصّی نے ان کے لیے نئی بستی بسانا زیادہ بہتر خیال کیا اور خانہ خدا کے چار طرف اس نے اپنی قوم کو قبیلہ وار آباد کر دیا[81]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) البتہ بعض مؤرخین نے قیب جدا کو ابراہیمؑ کا آبائی شہر اور جنم بھومی بتایا ہے۔ یہ شہر ملک مابین النہرین کے شمال مشرقی جانب واقع ہے اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بتایا گیا ہے۔ (معارف جلد ۳۱ ، جون ۱۹۳۲ء ص ۶۶ - ۴۶۵)

۷۱ - القرآن ۔

۷۲ - سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۱۲ ۔

۷۳ - سرسید احمد خان خطبات احمدیہ ص ۳۳۶

۷۴ - خلاصہ تاریخ مکہ : مولوی فخر الدین ص ۴ ۔

۷۵ - انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۔ (گب) تحت لفظ کعبہ ص ۳۶۹ ۔

۷۶ - عبدالشکور : تاریخ مسجد حرام ص ۲۱ ۔

۷۷ - انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ تحت لفظ مسجد ۔

۷۸ - مولوی عبدالشکور : تاریخ مسجد حرام (۱۹۰۵ء) ص ۲

۷۹ - بکری (۱۹۶۸) ص ۷۸ ۔

۸۰ - انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجز اینڈ ایتھیکس تحت لفظ مکہ ص ۵۱۳ بحوالہ ازرقی ۔

۸۱ - بکری ایضاً ص ۷۸ ۔

نئی بستی بساتے ہیں دفاعی اور سیاسی مصلحتیں بھی بلاشبہ کارفرما تھیں، تاہم قدیم پانی کے چشموں کا بیکار ہو جانا بھی ایک وجہ تھی۔ اور ممکن ہے زم زم کی بندش[82] کے بعد آب رسانی کا جو مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، قصّی نے پانی کی فراہمی کا کوئی متبادل انتظام کر لیا ہو۔ پہاڑی علاقوں میں عموماً اور حجاز میں خصوصاً زمین کے اندر پانی کے سوتے خشک ہوتے یا اپنی گزرگاہ بدلتے رہتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ پرانا ذخیرہ آب ختم ہو جانے کے بعد خانہ خدا کے اندر یا نزدیک کوئی نیا چشمہ نکل آیا ہو۔ ابن سعد کی روایت سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ شہر مکہ کے اندر قصّی کے آباد کردہ شہر ہی میں آٹھ کنویں موجود تھے۔ اور تقریباً ہر قبیلے کا الگ کنواں تھا[83] یہ کنویں عہد رسالت تک قائم رہے۔ یہ کہنا کہ صرف زم زم کا کنواں اندرون شہر واقع تھا اور باقی کنویں بیرون شہر تھے، درست نہیں ہے[84] کیونکہ ابن سعد نے بڑی وضاحت کے ساتھ اور غیر مبہم انداز میں اندرون اور بیرون آبادی کے کنوؤں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا ہے اور سب کنوؤں کے نام گنوائے ہیں۔ بلاذری نے بھی مکہ کے کنوؤں کا علیحدہ باب باندھا ہے[85] اور لکھا ہے کہ قصّی سے قبل پہاڑ کے اوپر واقع ایک چشمہ سے پانی لایا جاتا تھا۔ حرم کے نزدیک پہلا کنواں لوی بن غالب نے کھدوایا تھا[86]

قبل ازیں حدود حرم شاید کچھ اور تھیں۔ قصّی نے جب بیت اللہ کے متصل مکانات بنائے تو غالباً حدود حرم کا تعین از سر نو کیا اور وہ یہ کہ صرف مسجد ہی اب حرم متصور ہوتی تھی۔

قریش شروع شروع میں صرف سیاہ رنگ کے خیموں میں رہتے تھے، بلکہ بعض مؤرخین کا خیال یہ ہے کہ بعثت نبویؐ سے چند پشت پہلے تک مکہ خیموں کا شہر تھا۔ "...قبل مسیح میں بھی قیدار (آل اسماعیلؑ) کا ذکر خیمہ والے کہہ کر کیا گیا ہے"[87] اگرچہ مکہ میں اجالہ، اجیاد اور ابوقبیس[88] جیسے قدیم مکانات موجود تھے، تاہم اہل مکہ کی تعمیری روایات قابل فخر نہیں تھیں، ان تمام باتوں کے باوجود اگر قصّی کی بسائی ہوئی بستی کی تفصیلات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بستی بے ہنگم اور بلا منصوبہ یونہی کھڑی نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے مکمل منصوبہ بندی اور تعمیری نقشہ تھا۔ جو جگہ آبادی کے لیے چنی گئی وہاں پانی وافر مقدار میں دستیاب تھا (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)۔ اس جگہ ایک بڑا جنگل تھا جسے صاف کر دیا گیا[89]۔ یہی لکڑی بعد ازاں تعمیرات مکانات کے لیے کام میں لائی

۸۲۔ خطبات احمدیہ سرسید ص ۳۱۱۔ نیز ابن ہشام چشمہ زم زم عبدالمطلب کے زمانہ تک بند پڑا رہا حتیٰ کہ کسی کو اس کے محل وقوع کا بھی علم نہ تھا عبدالمطلب نے اس کو دوبارہ کھدوایا۔

۸۳۔ طبقات ابن سعد

۸۴۔ گب : انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۳۶۹۔

۸۵۔ بلاذری : فتوح البلدان ص ۴۴۔

۸۶۔ ایضاً ص ۴۸۔

۸۷۔ ندوی : ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۹۱۔

۸۸۔ بلاذری، فتوح البلدان جلد ۱ ص ۳-۵۲۔ ۸۹۔ ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۲۳۔

گئی۔ وادی کے نشیب کو مرکز آبادی مان کر کعبہ کے چاروں طرف قریش کے معزز قبائل کو اس طرح آباد کیا گیا کہ وسط میں خانہ خدا اور اس کے ساتھ ملحق قصیٰ کا اپنا مکان: دارالندوہ۔ اور برابر میں معزز قبائل قریش آباد کیے گئے۔

مرکز اور وسط میں محترم و معزز قریش رہتے تھے، یہ آبادی کا اندرونی حلقہ تھا۔ بیرونی حلقہ میں جو لوگ رہتے تھے، اجتماعی زندگی میں ان کا مقام دوسرے نمبر پر تھا اور شہر کے باہر جھگیوں، خیموں میں عارضی یا مستقل سکونت رکھنے والے خانہ بدوش قبائل زائرین، نو وارد اور تیسرے درجے کے شہری شامل تھے۔[۹۰] مکہ کا جدید شہر ایک لحاظ سے خالص قریش کا شہر تھا۔

شہر کا مرکز وادی کا نشیب (BOTTOM OF THE VALLEY) تھا۔ مرکز (بطحا) میں رہنے کی وجہ سے ان قریشی قبائل کو قریش بطحا کہا جاتا تھا[۹۱] یا قریش البطن[۹۲] تاہم قریش کے کئی گروہ اور خاندان پہاڑوں اور وادیوں میں ابھی تک منتشر بدویانہ زندگی گزار رہے تھے، ان کا نام قریش الظواہر مشہور رہا۔[۹۳] قریش الظواہر مرتبہ، عزت اور تکریم کے لحاظ سے فروتر سمجھے جاتے تھے۔

شہر کے بیچوں بیچ شمالاً جنوباً یمنی اور شامی تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت اور اخراج کے لیے کشادہ شاہراہ تھی۔ خانہ کعبہ کے سامنے زائرین کے اکٹھ کے لئے ایک بڑا دالان چھوڑ دیا گیا تھا۔ شروع شروع میں قریش خیموں میں رہتے رہے ہوں گے۔ مگر یہ کہنا کہ عرب میں تعمیری خلا تھا اور عرب کے مکانوں پر چوہے کی بل کا گمان ہوتا ہے، غلط ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بہت ہی جلد شروع ہو گیا کیونکہ چھت ڈالنے کے لئے کاٹے گئے جنگل کی لکڑیاں، شاخیں وغیرہ موجود تھیں اور دیواروں کی چنائی کے لیے سیاہ پتھر گرد و نواح کے پہاڑوں پر بآسانی دستیاب تھا۔ اہل مکہ کے مکانات قبیلہ وار اور فاصلے فاصلے پر تھے۔ اکثر مکانات کے درمیان دالان تھا۔ ایسا ہی ایک دالان رسول اللہؐ کے مکہ کے آبائی مکان کے سامنے بھی تھا۔ اہلیان مکہ کی تعمیرات کے میدان میں پسماندگی کی اصل وجہ اقتصادی پسماندگی تھی۔ مگر ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریباً ایک صدی پیشتر جب کاروانوں کی تجارت کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور تاجران مکہ نے خوب دولت کمائی اور اقتصادی انقلاب کے نتیجہ کے طور پر بتدریج معاشرتی تغیر رونما ہونے لگا، نئے اور جدید مکانات تعمیر ہونے لگے اور خانہ خدا کی عمارت بھی از سر نو نئے نقشہ اور ڈیزائن سے تیار کی گئی۔

۹۰۔ حسنین ہیکل

۹۱۔ گب: انسائیکلوپیڈیا۔ ص ۳۶۸۔

۹۲۔ سید سلیمان ندوی: ارض القرآن

۹۳۔ ایضاً

مدینہ کی قدیم تاریخ

محمد اسلم ملک

مدینہ آرامی زبان کے لفظ MADINTA سے مشتق ہے جس کے معنی عملداری میں شامل علاقہ[1] (AREA OF JURISDICTION) کے ہوتے ہیں مگر عام طور پر یہ لفظ بستی یا قریہ کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے[2]۔

جبلِ اُحد اور جبلِ عیر کے درمیان شمالاً جنوباً اور حرۃ واقم اور حرۃ الوبرہ کے درمیان شرقاً غرباً کم و بیش وتل مربع میل پر پھیلا ہوا یہ علاقہ انتہائی زرخیز اور شاداب ہے۔ آب و ہوا معتدل اور خوشگوار اور پانی وافر مقدار میں دستیاب ہے ساحلِ سمندر سے زیادہ فاصلہ نہیں۔ یمن اور شام کے درمیان کی قدیم تجارتی شاہراہ ——— امام المبین[3]، یہیں سے ہو کر گزرتی تھی۔ اور عہدِ رسالت مآبؐ میں قریش مکہ کے رحلۃ الصیف کے کارواں یہیں سے زادِ سفر لے کر آگے بڑھتے تھے۔ جوفِ مدینہ میں پانچ زرخیز وادیاں، مُذینیب، مہزور، زانونا، بُطحان اور قناۃ ——— تھیں۔ وادیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بستیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔ یہ بستیاں ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع تھیں۔ بستیوں کے اس مجموعہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ جب مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے اپنا علیحدہ شہر[4] بسایا۔ یہی شہر مدینۃ الرسولؐ کے نام سے مشہور ہوا اور رفتہ رفتہ یثرب کی طرح اس کا اطلاق جوف کے اندر واقع تمام آبادیوں اور قریوں پر ہونے لگا ——— یہ نام رسالت مآبؐ کے سیاسی غلبہ اور قوت کی یاد بھی تازہ کرتا ہے۔ مدینہ آنے کے بعد جوف کی ساری آبادیاں چونکہ آنجنابؐ کے ماتحت آگئیں اس لیے یہ مدینۃ الرسولؐ کہلائیں، جس کا سیاسی مفہوم تھا" رسول(ص) کے زیرِ نگین علاقہ"۔

مدینہ کے کئی نام ہیں۔ بعض کے نزدیک انتیس[5]، بعض کے نزدیک تیس[6]، بعض کے نزدیک چورانوے[7]۔ زیادہ ناموں کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مدینہ کا ہر قریہ علیحدہ نام سے موسوم تھا مثلاً قُبا، بنی حارثہ، بنی ساعدہ، بنی قریظہ وغیرہ۔ اندازہ ہے

---

[1] شارٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، تحت لفظ "مدینہ" از ایف۔ بُول ص ۲۹۱

[2] ارض القرآن ج ۲ سید سلیمان ندوی

[3] القرآن نیز ارض القرآن ج ۲ ص ۲۷۹

[4] تفصیل آگے آئے گی۔

[5] شیخ رضا۔ محمد رسول اللہ (اردو ترجمہ) ص ۲۷۲ بحوالہ معجم البلدان (یاقوت)

[6] ایضاً بحوالہ مجد شیرازی بغوی

[7] ایضاً بحوالہ وفاء الوفا (سمہوری)

کہ ہجرتِ رسولؐ کے وقت یہاں کم از کم (مختلف بطون قبائل کی) بائیس قابلِ ذکر آبادیاں تھیں۔ دوسرے اس شہر کو چونکہ رسولِ خداؐ کا شہر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس لیے بوجہ احترام اسے کئی ناموں سے پکارا جانے لگا۔ مبارکہ، منورہ، فاصحہ، بیضاء، طاہر، طیبہ وغیرہ۔

شہر کب آباد ہوا "تاریخی شواہد کی عدم موجودگی کے سبب یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ مدینہ کا شہر پہلے پہل کب اور کس نے بسایا تھا؟ اس ضمن میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ شہر بنی جرہم نے آباد کیا جو حضرت اسماعیل کے ہمعصر تھے (جرہم کی ایک شاخ)، ازد کو جب عک نے شکست دے کر وطن سے نکال دیا تو وہ گھومتے پھرتے مدینہ میں آئے، اس زمانے میں یہودی آباد تھے۔[۳]

۲۔ دوسری روایت کے مطابق یہ شہر بنی عمالقہ نے آباد کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں یہ شہر نہ صرف موجود تھا، بلکہ اتنی سیاسی اہمیت کا حامل بھی تھا کہ حضرت موسیٰ نے اسے فتح کرنے کے لیے فلسطین سے ایک لشکر روانہ کیا۔[۴]

۳۔ ابن سعد کی ایک روایت سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس جگہ بنو عمالقہ رہتے رہے ہیں۔ ان کی جائے سکونت جُحفہ تھی مگر ابن سعد ہی کے مطابق عمالقہ سے قبل یہاں عبیل آباد تھے جنہیں نکال کر عمالیق نے قبضہ کیا تھا۔[۵] عمالیق کو بھی یہاں سے نکلنا پڑا کیونکہ طغیانیوں اور سیلابوں نے ان کی بستی کو تباہ کر ڈالا۔ عربی میں جُحفہ کا مطلب ہے "بہا لے جانا"۔

۴۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ شہر کے اصل اور پہلے بانی وہی ہیں۔[۶] بعض اور مورخین نے بھی اس خیال کی حمایت کی ہے۔[۷]

ان چاروں روایات کو سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ شہر بہت قدیم زمانے سے آباد ہو گیا تھا۔ قرائن اور آثار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ جوفِ مدینہ کا جغرافیائی محلِ وقوع، دفاعی پوزیشن، خوشگوار آب و ہوا، بافراط پانی اور زرخیز وادیاں قدیم آبادکاروں کے لیے زبردست کشش رکھتی تھیں۔ مدینہ کا جغرافیائی اعتبار سے عرب سنگستان[۸] سے زیادہ قریبی تعلق رہا ہے، جو مہذب اور متمدن اقوام کا قدیم ایام سے مسکن تھا۔ اس بات کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق مدینہ کے پہلے آبادکار؛ یثرب کو حضرت نوحؑ کی ساتویں پشت کا فرد کہا گیا ہے۔ عمالیق نے ہی

۱۔ صحیح مسلم کتاب الجہاد باب فضائل مدینہ

۲۔ صحیح بخاری و مسلم ایضاً

۳۔ بلاذری۔ فتوح البلدان ص ۱۶ تا ۱۷۔

۴۔ مودودی۔ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۷۲ بحوالہ کتاب الاغانی ج ۱۹ ص ۹۴۔

۵۔ ابن سعد۔ طبقات ج ۱

۶۔ مودودی۔ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۷۲

۷۔ شبلی نعمانی۔ سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۵۸ نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مدینہ" نیز محسنِ انسانیت نعیم صدیقی ص ۲۱۰-۲۰۹

۸۔ سید سلیمان ندوی۔ ارض القرآن ج ۲ ص ۹۹-۹۸

پہلے پہل شہر بسایا تھا، جو مصر کے حکمران تھے۔ ان کے عروج کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ اندازاً یہ شہر ۱۶۰۰ قبل مسیح میں بسایا گیا ہوگا[1]

"تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو مدینہ مختلف اقوام کی آماجگاہ رہا ہے۔ ہر نو وارد قوم نے دوسروں کو دھکیل کر یا زیر کر کے شاداب وادیوں پر قبضہ کر لیا۔ غالباً عاد کے زمانے میں بھی یہاں آبادی موجود تھی، جو حضرت ابراہیم سے بھی پہلے ہو گزرے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت یہاں مستقل آبادی نہ ہو اور بنو عمالقہ ہی نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے باقاعدہ ایک قصبہ کی داغ بیل ڈالی ہو۔ عمالقہ کے بعد جرہم اور عبیل وغیرہ کے قبیلے بھی یہاں آباد رہے ہوں شاید انہی کی نسل کے باشندے عہدِ رسالتمآب میں مدینہ میں رہتے تھے[2]۔ گو سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے اُن کی کوئی وقعت نہ تھی بلکہ وہ اپنی انفرادی حیثیت بھی گم کر چکے تھے۔ عہدِ رسالت کے مدینہ میں ایسے کئی قبائل کے نام نظر سے گزرتے ہیں جو یہود کی کسی معروف شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور نہ اوس و خزرج میں سے کسی کے ساتھ ان کا سلسلۂ نسب ملتا تھا مثلاً بنی ثعلبہ۔ اس لیے اکثر مورخین نے انہیں یا تو سہواً یہودی لکھ دیا یا صرف یہ کہہ بات ختم کر دی کہ فلاں جو فلاں[3] قبیلے کے موالی ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہ مدینہ کے قدیم آبادکاروں کے باقیات تھے۔

مدینہ کا قدیم نام مدینہ کا سب سے قدیم نام جس کا سراغ تاریخ میں ملتا ہے، یثرب نہیں بلکہ سَلَع ہے۔ توریت میں متعدد مقامات پر مدینہ کا ذکر اسی نام سے کیا گیا ہے[4]۔ سَلَع مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے جو جوفِ مدینہ کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس کے دامن میں زمانۂ قدیم کے کھنڈرات عہدِ رسالت مآبؐ تک موجود تھے[5] اور مسجد نبویؐ بھی کھنڈرات پر تعمیر کی گئی تھی[6] ——— سَلَع یا صَلَع جسے سلاع اور صلاع بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے، کا مخرج ایک ہی ہے[7]۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، عربی میں اس کا مترادف رقیم ہے جسے یونانی پیٹرا کہتے تھے[8]۔ حجر بھی اسی کو کہتے ہیں۔ سَلع، صَلع، رقیم، حجر یا پیٹرا کے لفظی معنی "پتھر" کے ہیں مگر مجازاً "قریہ یا بستی مراد لی جاتی ہے[9]۔

---

[1] سید سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۱

[2] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ بوہل لفظ مدینہ

[3] تاریخ ابن خلدون ج ۱ "موالی بنی ثعلبہ" جو میثاق مدینہ میں ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہوتے تھے مگر ان کا علیحدہ نام نہیں۔

[4] کتاب السبعاہ ۴۲ باب ۱۱ درس نیز دیکھئے رحمۃ للعالمین سلیمان منصور پوری ج ۱ - نیز مناظر احسن گیلانی

[5] صحیح بخاری

[6] نسائی کتاب الصلوٰۃ عن انس

[7] انتظام شہابی

[8] سلیمان ندوی - ارض ج ۲ ص ۴۲

[9] دائرۂ صفویہ

رقیم بہت قدیم شہر تھا۔ بنو اسرائیل کے پڑوس میں واقع ہونے کی وجہ سے اسرائیلیات میں اس کا ذکر بکثرت آیا ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ اسرائیلی اس شہر کو صَلَع یا صلاع کہتے تھے۔ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ مدینہ اور رقیم کا ذکر اسرائیلی ادبیات میں خلط ملط ہو گیا ہو۔ کتاب الآغانی کی جس روایت میں مدینہ پر اسرائیلی حملے کا ذکر کیا گیا ہے عین ممکن ہے کہ وُہ حملہ رقیم پر کیا گیا ہو۔ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ رقیم پر آلِ اسرائیل نے متعدد حملے کیے۔ پہلا حملہ اس وقت کیا گیا جب بنی ادوم یہاں آباد تھے۔ حملوں کا یہ سلسلہ حضرت داؤدؑ کے زمانے تک جاری رہا تاآنکہ یہ شہر سلطنت داؤدؑ کا جزو بن گیا۔[۱]

یہود کی آمد مدینہ کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا ہُوا ہے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہاں کیا کچھ ہوتا رہا۔ حتّٰی کہ یہود کی مدینہ میں آمد کے متعلق بھی یقین سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی اور اس بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

۱۔ یہودی خود اس بات کے دعویدار ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے آخری زمانہ میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر دے کر انہیں بھیجا گیا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے یہ ہدایت دی تھی کہ فتح حاصل کرنے کے بعد مدینہ کے مشرکوں میں سے کسی ایک متنفس کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ حملے کے بعد یہودیوں نے مدینہ کے بادشاہ کے ایک نوخیز لڑکے کے سوا تمام لوگوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس لڑکے کو لے کر جب فلسطین پہنچے تو حضرت موسیٰؑ وفات پا چکے تھے اور ان کے جانشینوں نے لشکر پر یہ الزام عائد کر کے کہ انہوں نے نبی کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے، سخت تادیبی کارروائی کی دھمکی دی۔ مجبوراً اہلِ لشکر وہاں سے نکل کر مدینہ میں لگ بھگ ۱۲۰۰ قبل مسیح کے آباد ہو گئے۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۹ عرب کے اکثر قدیم شہروں کے نام کا معنیٰ "قریہ" یا "آبادی" ہوتا ہے۔ مثلاً مکہ، بلد، وادی القریٰ، دومۃ الجندل (پتھر کا بنا ہوا شہر) اور اس کے مقابلے میں دومۃ الحرا (اس شہر کی تعمیر تراشے ہوئے پتھروں کے درمیان لکڑی کے بلاک رکھ کر کی گئی ہے۔ بلاذری۔ فتوح البلدان ص ۹۳) اور دنیا کے عظیم آباد کار حضرت ابراہیمؑ کے آبائی گاؤں اُر یا عور۔ رقیم، حجر یا ہجر سب کا مطلب آبادی یا بستی ہوتا ہے۔ عور یا ار کا لفظ سفر کرتے کرتے جنوبی ہندوستان پہنچا تو جب بھی اس کے معنوں میں کوئی تبدیلی نہ ہُوئی (حمید اللہ۔ مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ) جو اور لفظوں کے لاحقہ کے طور پر استعمال ہو کر شہر / قریہ کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مثلاً منگلور وغیرہ۔

عرب جس کے معنی ویرانہ (بقول قرآن وادٍ غیر ذی زرع) ہوتے ہیں اس کے باشندے مستقل سکونت اختیار کرتے تو اس کا نام "ہی بستی" پڑ جاتا۔ جس طرح لفظ "ہجر" ہے جو حبشی یا سامی زبان کا لفظ ہے جب کوئی خانہ بدوش بدویت کو خیرباد کہہ کر شہری زندگی اختیار کر لے اسے ہجر کہا جاتا ہے۔ شروع شروع میں عرب کے شہر پتھر سے بنتے ہوں گے اس لیے ان کا نام ہی "پتھر" یا "پتھر کا بنا ہوا شہر" پڑ گیا ہوگا۔ مثلاً دومۃ الجندل، رقیم، صَلَع اور سَلَع۔

[۱] سلیمان ندوی، ج ۲، ص ۳۵

اس روایت میں یہ بات غور طلب ہے کہ یہودی خود بھی مدعی نہ تھے کہ مدینہ میں آباد ہوتے وقت انہیں سیاسی غلبہ یا قدرت حاصل تھی بلکہ خود ان کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے یہاں سیاسی پناہ حاصل کی تھی۔

۲۔ بخت نصر کے حملہ (۵۰۰ قبل مسیح) میں جب بنی اسرائیل تتر بتر ہوئے تو اُن کا ایک گروہ مدینہ میں آکر بس گیا۔

۳۔ ۷۰ء میں فلسطین پر رومی حملے کے بعد ۱۳۲ عیسوی میں جب یہودیوں کو وطن سے نکالا گیا تو یہ مدینہ، تیما، وادی القریٰ وغیرہ میں آکر پناہ گزین ہوگئے۔[1]

مورخین کا ایک طبقہ موخر الذکر رائے کو درست خیال کرتا ہے مگر ان روایات کا تجزیہ کیا جائے تو نہایت دلچسپ پہلو سامنے آئیں گے:

یہودیوں کے فلسطین سے نکلنے کی وجہ یا تو شدید داخلی اختلافات تھے یا حملہ آوروں کی تباہ کاریوں نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فلسطین سے یہودی مختلف اوقات میں مختلف اسباب کی بناء پر ترکِ وطن کر کے مدینہ اور دوسری جگہوں پر پناہ لیتے رہے۔ بعید نہیں کہ پہلا یہودی قافلہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یا اس کے بعد کے زمانے میں یہاں پہنچا ہو۔ پھر بخت نصر کے حملے اور رومیوں کی یلغار کے بعد بھی یہودیوں کے گروہ مدینہ میں آ گئے ہوں۔ اس طرح بتدریج ان کی تعداد بڑھتی گئی جمیعت فراہم ہونے کے بعد انہوں نے مدینہ کی سیاست پر قبضہ جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے اور موقع پا کر سیاسی غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ دُوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مورخین نے یہود کی مدینہ میں آمد کو اسی تاریخ سے شمار کیا ہے اور اس سے پیشتر ان کے مدینہ میں ہجرت کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا حالانکہ مدینہ میں یہودیوں نے پہلے پہل پناہ حاصل کی اور انہیں سیاسی قوت پکڑنے میں کئی صدیاں لگیں مگر اس سے بہت پہلے یہودی یہاں پہنچ چکے تھے ———

شاید سب سے اخیر میں نقلِ مکانی کر کے آنے والے بنی نضیر اور بنی قریظہ تھے۔ یہ یہودیوں کے ۱۲[3] قبیلوں میں سب سے زیادہ ممتاز[2] اور دولت مند تھے۔ انہیں باقی یہود کے مقابلے میں اپنے حسب و نسب[4] کے خالص ہونے پر فخر تھا۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہود کے وُہ گروہ جو بہت پُرانے زمانے سے مدینہ میں آکر بس گئے تھے، باہمی شادیوں[5] اور معاشرتی ارتباط کی وجہ سے باقی عربوں میں خلط ملط ہو گئے ہوں گے۔

---

[1] مودودی۔ تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۷۰۔۲۷۰

[2] ایضاً نیز فلپ کے ہٹی "تاریخ عرب" وغیرہ۔

[3] شبلی (سیرت ج ۱ ص ۲۵۸) نے ۱۲ قبائل بتائے ہیں زیادہ صحیح ۱۲ ہے۔

[4] معارف۔ اعظم گڑھ سیر الصحابہ ج ۱

[5] باہمی شادیوں کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ کعب بن اشرف کی ماں اسدی تھی اور وہ اشراف و سرداران یہود میں شمار ہوتا تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے فرستادہ لشکر کی روایت مبہم اور خلافِ قیاس معلوم ہوتی ہے البتہ اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے رقیم پر فوج کشی کے لیے مہم روانہ کی ، اور یہودی لشکری لوٹ کر واپس گئے تو داخلی اختلافات یا سیاسی انتشار کے سبب وطن سے نکل کر مدینہ (سَلَع) میں آ کر بس گئے اور اسرائیلی روایات میں یہ غلط فہمی صَلَع (رقیم) اور سلع (مدینہ) کی لفظی (اور معنوی) مشابہت کی وجہ سے پیدا ہو گئی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اس زمانے میں ، جیسا کہ ہم نے دیکھا ، مدینہ سَلَع کہلاتا تھا۔

یہود کا بسایا ہُوا شہر یثرب

یہود جب مدینہ میں پہنچے تو یہاں کوئی مستقل قریہ نہ تھا بلکہ مکانات اور آبادیاں منتشر شکل میں تھیں جن کے گرد کھیتی باڑی ہوتی تھی[۱]۔ یہاں کے قدیم باشندوں نے اپنی مدافعت کیلئے چھوٹے قلعے (آطم ؛ آطام) بنائے ہُوئے تھے۔ یہ قلعے یمنی طرزِ تعمیر سے مشابہت رکھتے تھے[۲]۔ یہودیوں نے یہاں آنے کے بعد مضبوط اور مستحکم قلعے تعمیر کیے اور اپنا علیحدہ شہر بسایا ، اس کا نام 'یثرب' تھا۔ یثرب آرامی زبان کا لفظ ہے۔ یونانی اسے IATTREPPA[۳] کہتے تھے۔ جب یہود کی پوزیشن مستحکم ہو گئی تو انہوں نے سیاسی غلبہ حاصل کر کے باقی لوگوں کو اپنا مطیع و دستِ نگر بنا لیا اور زرخیز وادیوں پر قبضہ کر لیا[۴]۔ ان کے سیاسی عروج کا آغاز اندازۃً دوسری صدی سے ہوتا ہے۔ شہر کے قدیم باشندوں کا سیاسی انتشار یہودیوں کے غلبہ اور اقتدار کا سبب بنا ہو گا۔ قوت حاصل کرنے کے بعد یہودیوں نے شہر کی بستیوں کو منظم کیا۔ زراعت کو ترقی دی ، تجارت کو فروغ دیا۔ رفتہ رفتہ یہود کے آباد کردہ شہر کی مناسبت سے جوف کی ساری آبادیوں کے مجموعے کو بھی یثرب کہا جانے لگا۔ یہی نام عہد رسالتمآبؐ تک مشہور و معروف تھا۔ آں حضورؐ نے مدینہ آنے کے فوراً بعد یثرب کا نام بدل دیا۔ کیونکہ اوّلاً یہ نام یہودیوں کے سیاسی عروج اور غلبہ کی یادگار تھا ، ثانیاً یہ لفظ ظلم و تعدّی ، بُرائی اور خرابی[۵] کے معنی دیتا ہے اور آنجنابؐ کو یہ نام ناپسند تھا کیونکہ آپؐ مجسم رحمت اور سراپا نیکی بن کر آئے تھے۔ قرآن مجید[۶] میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے تو اس واضح تصوّر کے ساتھ کہ یثرب جاہلیت اور بُرائی کا نمائندہ ہے اور مدینہ اسلام اور شوکتِ اسلام کا آئینہ دار۔

---

[۱] مستشرقین (برل — انسائیکلو پیڈیا آف اسلام : لفظ مدینہ) کی یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کھیتی باڑی کا آغاز یہود نے کیا اور یہ کہ یہود کی آمد سے پہلے مقامی باشندے خودرو کھجوروں کے باغات پر ہی گزران کرتے تھے مگر کاشتکاری سے نابلد تھے۔ البتہ یہودیوں نے کاشتکاری میں جدّت پیدا کر کے اسے ترقی دی۔

[۲] گستاولی بان : تمدن عرب (اردو ترجمہ) نیز الفِ برہل

[۳] ندوی۔ ارض ج ۲

[۴] منٹگمری واٹ "محمدؐ مدینہ میں"۔ تفصیلی بحث اس موضوع پر آگے آئے گی۔

[۵] صحیح مسلم : باب تفاصیل

[۶] القرآن سورہ المنافقون آیت ۸ ، سورہ توبہ آیت ۱۰۱ (خصوصاً) سورہ الاحزاب : آیت ۱۳/۶۰

یثرب کہاں واقع تھا؟

جس قریہ کی مناسبت سے جوف کا سارا خطہ یثرب کے نام سے مشہور تھا، وہ قریہ رسالتمآبؐ کے زمانے میں کہیں موجود تھا۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یثرب کس جگہ آباد تھا؛ تاہم بوہل کی رائے کے مطابق یہ مدینہ کے موجودہ قصبہ کے انتہائی شمال میں واقع تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

THESE SCATTERED SETTLEMENTS ONLY GRADUALLY BECOME CONSOLIDATED TO A TOWN-LIKE AGGLOMEVATION, WHICH HOWEVER LAY FARTHER NORTH THAN THE LATER TOWN AS THE NAME, YATHRIB, ACCORDING TO SAMHUDI, WAS ESPECIALLY ASSOCIATED WITH A PLACE WEST OF THE TOMB OF HAMZA WHERE THE BANU HARITH SETTLED.[1]

یعنی وہی جگہ جہاں جنگِ اُحد لڑی گئی۔ عُنیین اور جبلِ اُحد کے درمیان جہاں آپؐ نے تیر انداز مقرر فرمائے تھے غالباً اسی جگہ یثرب کا قصبہ تھا۔ عہدِ رسالتمآبؐ میں وہاں مکانات اور باغات تھے، جو اب باقی نہیں رہے۔[2] یہ بات واضح نہیں کہ آیا یہی مکانات یثرب کے باقیات میں سے تھے یا یثرب کی بربادی کے بعد کہیں قرب وجوار میں کچھ اور لوگوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا "تاہم عہدِ نبویؐ کے لوگوں کو اس بات کا مکمل شعور تھا کہ یثرب کس طرف واقع تھا؛ عموماً بنو حارثہ، بنی وائل، بنی حنظلہ، بنی واقف اور وادیٔ قناۃ اور عنیین کے ساتھ واقع قریوں کو "یثرب کا علاقہ" سمجھا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے بھی اس کی طرف لطیف اشارہ کر کے اس کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کیا ہے۔

جنگِ احزاب کے موقع پر خندق کھود کر مدینہ کے تمام قصبات اور آبادیاں محفوظ نہ بنائی جا سکی تھیں خصوصاً انتہائی شمال میں واقع بنی حارثہ، حظمہ وغیرہ کی بستیاں خندق سے باہر رہ گئی تھیں۔ جنگ کا زور بڑھا تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ قرآن نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا[3]

(جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے اہلِ یثرب اب ٹھہرنے کا موقع نہیں، پلٹ چلو اور جب ان میں سے ایک فریق اجازت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔ مگر، دراصل وہ میدانِ جنگ سے بھاگنا چاہتے تھے)

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۔ بوہل ۔ تحت لفظ مدینہ

[2] محمد حمید اللہ ۔ عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۴۱

[3] القرآن سورہ الاحزاب آیت ۱۳

بنی حارثہ وغیرہ نے اپنی بستیوں کے لیے یثرب کا لفظ استعمال کیا ہے یا تو ان کی بستیوں کو یثرب کہا جاتا تھا، یا یثرب کا قریہ اسی طرف کہیں واقع ہوگا! موخرالذکر صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یہود نے یثرب کی سکونت کیوں ترک کی؟ یہود کا قصبہ اگرچہ جوفِ مدینہ کے شمالی جانب وادی قناۃ کے نزدیک تھا، مگر ہجرتِ (رسولؐ) کے وقت اکثر یہودی قبائل خصوصاً ذی حشمت قبائل نضیر، قریظہ وغیرہ جوف کے انتہائی جنوب مشرقی سمت وادی مہزور اور وادی زنیبب میں آباد تھے۔ یہ تغیر کیسے رُونما ہوا؟ یثرب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، طغیانیوں کے سبب برباد ہوگیا ہوگا۔ اور یہودی وہاں سے نقلِ مکانی پر مجبور ہوگئے ہوں گے۔ معلوم رہے کہ وادی قناۃ اور جبل اُحد کی طرف سیلاب اور طغیانیاں اکثر آتی رہتی تھیں عہدنبیؐ کے بعد وہاں اتنے شدید سیلاب آئے کہ شہدائے اُحد کی قبریں اُکھڑ گئیں اور شہداءؓ کے جسد خاکی ظاہر ہوگئے۔ حضرت حمزہ کا مزار اسی وجہ سے دوسری جگہ بنایا گیا[1]۔ عہدِ رسالت میں وہاں جن آبادیوں کا ذکر ملتا ہے وُہ بھی بہہ گئیں کیونکہ انکا ابدہاں نام و نشان باقی نہیں رہا ہے[2]۔ یہود کی نقل مکانی کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے اور وُہ یہ کہ یہودی جب مدینہ آئے تو ایک طویل مدت تک وہ شمال میں اپنے قصبہ یثرب میں مقیم رہے۔ جب انہیں بتدریج سیاسی برتری حاصل ہُوئی تو وُہ جوف کے وسط میں آکر آباد ہو گئے[3]۔ یہود کی یہ جدید آبادی جبلِ سَلع کے دامن میں، مدینہ یا اس کے آس پاس کہیں ہوگی۔ جبل سلع اور اس کے ساتھ کی دیگر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کو دفاعی نقطۂ نظر سے جو اہمیت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر اقتدار حاصل ہونے کے بعد یہود کی نقل مکانی بالکل فطری نظر آتی ہے۔ پھر یہاں کا پانی میٹھا اور زمین بمقابلہ شمالی علاقے کے زیادہ زرخیز اور شاداب ہے۔ علاوہ ازیں نئی جائے سکونت کو سیاسی اعتبار سے جو مرکزیت حاصل ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اوس اور خزرج کی آمد کے بعد یہود اور ان نو واردوں کے درمیان جب اقتدار کی کشمکش شروع ہُوئی تو خزرجیوں نے غیر ملکی امداد[4] اور تعاون سے یہود سے اقتدار چھین لیا۔ زرخیز زمینوں سے انہیں بے دخل کر کے علاقے کے مرکزی قصبہ پر خزرج کی شاخ بنی النجار نے قبضہ کرلیا[5]۔ عہدِ رسالتمآبؐ تک یہ قبیلہ اسی جگہ آباد تھا۔ رسولِ خدا کی آمد کے وقت بنی النجار جن مکانات میں رہائش پذیر تھے وہ بھی شاید یہود کی مِلک تھے جن پر النجار نے قبضہ کر لیا تھا یہودی وہاں سے نکل کر انتہائی جنوب مشرق میں چلے گئے اور اپنی محنت اور جانفشانی سے وہاں کی زمین کو لالہ زار بنا دیا۔ عہدِ رسالتؐ میں یثرب کا یہی خِطّہ زیادہ

---

[1] سیوطی تاریخ الخلفاء

[2] جنرل اکبر حدیث دفاع نیز محمد حمید اللہ: عہد نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۱۳۱

[3] منٹگمری واٹ "ISLAM AND INTEGRATION OF SOCIETY"

[4] طبقات ابن سعد و نیز سیرت ابن ہشام

[5] منٹگمری واٹ "محمدؐ بطور مدبر مکے" و نیز "محمدؐ مدینہ میں"

آباد اور شاداب تھا اور انگور، کھجور اور دیگر باغات اسی جانب زیادہ تھے۔ البتہ یہود کا قبیلہ قینقاع بدستور وسطی حصے میں رہتا رہا۔ شاید اس وجہ سے کہ وُہ نضیر اور قریظہ کے شدید مخالف تھا اور بعید نہیں کہ انہوں نے اپنے ہم مذہب اور ہم نسل لوگوں کی مدد کرنے کی بجائے بنی خزرج کو امداد بہم پہنچائی ہو۔ قینقاع کی بستی ہجرتِ نبیؐ کے وقت جبل سلع کے مشرق میں اور رسولِ خدا کے نوآباد شہر مدینۃ الرسولؐ سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھی۔ ان کا بازار بڑا بارونق اور لوگ خوشحال اور جنگجو تھے۔

اوس اور خزرج کی آمد

اوس اور خزرج کے قبائل، یمن سے مدینہ آئے۔ یمن کے علاقہ حصن الاغراب میں جو کتبے دریافت ہُوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پر" اوس" کا لفظ کندہ ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ مدینہ کے اوس کے جدِ اعلیٰ کا نام ہے[2] اور یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ یثرب آنے سے پہلے یہ قبیلے کافی اہمیت رکھتے تھے۔ انہیں یمن کی طرف سے آنے کی وجہ سے قحطانی النسل کہا گیا ہے[3] مگر زیادہ صحیح رائے یہ ہے کہ وُہ عدنانی اور اسماعیلی عرب تھے[4] اور ان کا تعلق بنی ازد کی ایک شاخ سے تھا[5]۔ اپنی ماں کی طرف منسُوب کر کے ان دونوں قبیلوں کو بنو قیلہ بھی کہا جاتا تھا۔ واضح رہے کہ اوس اور خزرج دونوں سگے بھائی تھے۔

سدِ مآرب[6] کی تباہی یا باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے یہ یمن سے نکلے اور ڈیڑھ دو سال عربستان کے مختلف علاقوں میں گھومنے پھرنے کے بعد ۳۰۰ء[7] کے لگ بھگ یثرب میں آئے۔ یہاں یہود کا غلبہ تھا۔ ایک مدت تک تو بنی قیلہ خاموش رہے مگر جلد ہی یہود اور ان میں اقتدار اور املاک کے لیے کش مکش کا آغاز ہوگیا۔ اس ضمن میں جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ متضاد اور مبہم ہیں تاہم صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ یہود کے اقتدار کو سب سے پہلے خزرج کے فرد مالک بن عُجلان نے چیلنج کیا۔ اس طرح خزرجیوں نے شاہِ تُبّع ابوکرب[8] یا شاہِ غسان[9] ابو جُبیلہ کی مدد سے یہود سے اقتدار چھین کر اُن کی املاک پر ۴۹۲ء میں

---

۱ مودودی تفہیم القرآن ج ۵ ص ۲،۴ ۳ ونیز نقشہ گر بوہل (انسائیکلوپیڈیا) میں لکھا ہے کہ بازار و قینقاع کی آبادی مغربی سمت میں تھی ـــ مگر یہ رائے درست نہیں دیکھیے لفظ" قینقاع"

۲ سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲

۳ فلپ کے ہٹی، تاریخ عرب، شبلی نعمانی، سیرت وغیرہ

۴ سلیمان ندوی ارض القرآن ج ۲

۵ طبقات ابن سعد

۶ ندوی ج ۲ ص ۲ نیز شبلی نعمانی سیرت ج ۱ ص ۲۰۹

۷ بلاذری، فتوح البلدان ص ۱۶ (عک کے ساتھ خانہ جنگی ہُوئی تو یہ نکل کھڑے ہُوئے) ابن ہشام کے مطابق یمن سے نکلنے کے بعد یہ عک کے علاقے میں داخل ہُوئے تو ان سے جنگ ہُوئی۔ طبقات کے مطابق یثرب آنے سے پہلے یہ طائف، مکہ وغیرہ میں مارے مارے پھرتے رہے۔

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

خود قبضہ کر لیا۔ اوس نے بھی خزرجیوں کا ساتھ دیا۔ خزرج اور اوس نے یہود کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مالک اور اس کے حمایتی شاہِ تُبّع اور شاہ غسان کی تو مدد کی مگر جب مالک نے عثمان بن الحویرثؓ قریشی کی طرح اپنی بادشاہت قائم کرنا چاہی تو یہ اس کے خلاف ہو گئے۔ مالک وہاں سے فرار ہو گیا بقیہ عمر اس نے شاہِ غسان کے دربار میں مصاحب بن کر گزاری[9]۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ غسان اپنی سلطنت میں توسیع اور تجارتی شاہراہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور مالک نے اس کے ایماء پر یہ کارروائی کی۔ یہود کے تسلط سے اہلِ یثرب کو نجات ضرور مل گئی مگر غسانیوں کے یثرب پر قابض ہونے کا خواب تشنۂ تکمیل رہا۔ یہودیوں کی سیادت اور قوت ختم ہونے کے بعد خزرج کا قبیلہ بنی النجار سب سے زیادہ طاقتور بن کر ابھرا۔ مرکزی اور زرخیز علاقے پر قبضہ جما کر اپنی قوت کو مستحکم بنانا شروع کر دیا۔ جس کے خلاف اوس والوں کے دل میں حسد اور رقابت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ نتیجۃً اوس اور خزرج کے درمیان اقتدار اور املاک کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی جو ۴۹۷ء سے لے کر ۶۱۸ء یا ۶۲۰ء عیسوی تک وقفوں وقفوں کے ساتھ جاری رہی۔ ان خانہ جنگیوں میں اوس اور خزرج کی مختلف شاخوں اور یہود کے قبائل کی وفاداریاں حالات کے مطابق بدلتی رہیں۔ یثرب کے گرد و نواح کے بدوی قبائل اور شاہانِ حیرہ نے بھی بعض لڑائیوں میں مداخلت کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔

بُعاث اس خانہ جنگی کے سلسلے کی پہلی لڑائی سُمیر تھی اور آخری معرکہ بُعاث کا تھا۔ بعاث بنی قریظہ کا علاقہ تھا۔ اس لڑائی میں اوس کا سپہ سالار اعلیٰ حضرت اُسَیدؓ کا والد حُضَیر کتائب اور خزرج کا عمرو بن نعمان بیاضی تھا۔ یہ دونوں لڑائی میں مارے گئے۔ حسبِ سابق یہ لڑائی بھی غیر فیصلہ کن رہی تاہم خزرج کو زبردست ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ان کی فتح ایک دم شکست میں اس لیے بدل گئی کہ شاید اُن کے یہودی حلفاء نضیر و قریظہ نے عین موقع پر غداری کرتے ہوئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شاید یہی وجہ تھی کہ بنی النجار اور بنی سلمہ (بطون خزرج) نضیر و قریظہ کے پرانے حلیف ہونے کے باوجود ان کی مخالفت میں شدید تھے[14]۔ عبداللہ بن ابی بن سلول ——— سردار منافقین ——— جو بُعاث میں غیر جانبدار رہا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ۸ سلیمان ندوی ۹ طبقات ابن سعد نیز انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (بوہل) تحت لفظ مدینہ اور سیرت ابن ہشام۔ ممکن ہے تبع کی امداد نتیجہ خیز ثابت نہ ہوتی اور آخر کار شاہِ غسان نے ہی بھرپور مدد کی ہو۔

۱۰ شبلی: سیرۃ ج ۱ ص ۲۵۹ بحوالہ وفاء الوفاء۔ اور شیخ رضا، محمد رسول اللہؐ ص ۳۹۴ بحوالہ ابن الاثیر

۱۱ محمد حمید اللہ۔ رسول اللہؐ کی سیاسی زندگی

۱۲ طبقات ابن سعد نیز سیرت ابن ہشام۔

۱۳ سلیمان ندوی کے خیال کے مطابق "بُعاث" کا آخری معرکہ ۶۱۵ء میں ہوا جبکہ منٹگمری واٹ ("اسلام") کا خیال ہے کہ لڑائی ۶۱۸ء میں ہوئی۔

۱۴ شیخ رضا: محمد رسول اللہ ص ۲۹۸۔ بُعاث کے معرکہ میں خزرج کے حلیف اشجع اور جُہینہ تھے جبکہ اوس کے حلفاء مُزَینہ تھے نیز دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ مدینہ

۱۵ منٹگمری واٹ "اسلام" اور "محمد بطور مدبر"

۳ ہجری میں نضیر کے جلاوطن کر دیئے جانے کے فیصلہ پر اسی لیے غضبناک[1] ہوگیا تھا کہ شاید یہود کے اس قبیلہ نے لڑائی کے دوران اپنے حلفاء سلمہ و نجار کا ساتھ چھوڑ کر غیر جانبداریت اختیار کر لی تھی۔ فریقین کے اتحادیوں کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یثرب میں قبائلی نظام کی گرفت کمزور ہو چکی تھی۔ بُعاث کے معرکہ میں اوس، اور خزرج کی کئی ایک شاخیں یا تو لڑائی سے علیحدہ رہیں مثلاً خزرج میں ابن ابی کا قبیلہ اور اوس میں بنی حارثہ وغیرہ یا لڑائی میں دوسری جانب سے شرکت[2] کی جیسا کہ بنی اوس کے عبد الاشہل نے خزرج کا ساتھ دیا۔ ایسے بہت سے غیر معروف اور غیر اہم گروہ بھی تھے جن کی لڑائی میں کسی طرف سے کوئی دلچسپی نہ تھی تاہم خانہ جنگی سے پیدا ہونے والی بدامنی سے وہ نالاں ضرور تھے یعنی یہ لڑائی قبائلی اختلاف کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی بلکہ اقتصادی اور سیاسی مفادات کے لیے لڑی جا رہی تھی۔ بُعاث میں جن قبائل کو ہزیمت اٹھانا پڑی اُن کی املاک جوفِ یثرب کے وسط میں تھیں، فتح یاب گروہ کی زمینیں اس کے گرد ہلالی صورت میں جنوب میں پھیلی ہوئی تھیں۔ غیر جانبدار فریق انتہائی شمال میں نسبتاً کم زرخیز اور شاداب علاقے پر قابض تھا[3] اور یہ شاید اسی لیے لڑائی میں ملوّث نہ ہوا کیونکہ کسی کے ساتھ اس کے مفادات کا تصادم تھا اور نہ براہِ راست کسی گروہ کے ساتھ اس کے اقتصادی مفادات وابستہ تھے۔ البتہ اس فریق کے سرغنہ ابن ابی کے سامنے یہ صورت تھی کہ لڑائی کے بعد اس کے سیاسی غلبہ کی کوئی صورت نکل آئے گی اور غیر جانبدار ہونے کی وجہ سے دونوں متحارب گروہ اس کی سیادت قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بُعاث میں النجار اور سلمہ کمزور ہو گئے۔ لوگ غیر جانبدار فریق میں کٹ کٹ کر شامل ہونے لگے۔ ابن ابی نے اپنی قیادت کے لیے زمین ہموار دیکھ کر "پادشاہت"[4] کا اعلان کر دیا۔ البتہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ ابنِ ابی کی "بادشاہت" کا اعلان متفقہ تھا۔ ابن ابی کی پادشاہی کے متعلق کتب تاریخ و سیر میں جتنی روایات مذکور ہیں، ان سب کو سامنے رکھ کر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی بتدریج اپنی قوت بھی بڑھا رہا تھا اور لڑائی خونیت سے تنگ لوگ اس کی سیادت کو امن کی تلاش میں بتدریج تسلیم بھی کر رہے تھے، مگر معاملہ کہیں راہ میں اٹک گیا کیونکہ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس کی پادشاہت قائم ہوگئی تھی "شاہی تاج[5]" بنانے میں آخر کتنا عرصہ لگا ہوگا کہ ابن ابی کی پادشاہی کا مسئلہ تین سال تک لٹکا رہا۔ اور اگر یہود کے دوبارہ غلبہ اور تسلط کے بھیانک تصور نے اوس اور خزرج کے تمام بطون کو ابن ابی کی پادشاہی پر متفق کر دیا تھا تو آخر کسی مورخ نے واضح طور پر یہ کیوں نہیں لکھا کہ اس کی پادشاہت قائم اور تسلیم ہو چکی تھی۔ النجار اور سلمہ کے لیے ابن ابی کی پادشاہی کسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی

---

[1] سیرت ابن ہشام ۔ تاریخ طبرانی

[2] منٹگمری واٹ اسلام

[3] ایضاً

[4] سیرت ابن ہشام

[5] تاریخ ابن خلدون ۔ طبقات ابن سعد

اور نہ انہوں نے اسے قبول کیا۔ وقتی طور پر اگر وہ خاموش رہے تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ شکست کے بعد ان میں مزید قتل و قتال کی ہمت نہ تھی تاہم انہیں اپنی املاک سے زبردستی نکال دیئے جانے کا دھڑکا لگا رہا۔ یہ معلوم کرکے کہ اسلام کا فروغ شروع شروع میں انہی قبائل میں ہُوا جو بُعاث میں شکست کھا چکے تھے ، آنحضورؐ سے عقبہ میں سب سے پہلے یہی لوگ ملے تھے[1] اور آپؐ کی دعوت پر لبیک کہی تھی۔ عقبہ کی پہلی بیعت میں بھی یہی لوگ پیش پیش رہے تھے[2]۔ حتیٰ کہ بیعت عقبۂ ثانیہ میں بھی حضرت عباس نے اہل یثرب سے "مخاطب" اسے گروہِ خزرج[3]!" کہہ کر کیا۔ یہ بدیہی تاریخی حقیقت ہے کہ یثرب میں اسلام لانے والے زیادہ تر افراد کا بنی خزرج کے شکست خوردہ گروہ سے تعلق تھا یا ان کے حلیفی دائرہ میں شامل بطون اوس سے۔ ان میں بنی النجار کا خاندان سب سے آگے تھا اور یہی وُہ خاندان ہے جس کے ساتھ آں حضورؐ کا ننھالی رشتہ تھا۔ یہ آپؐ کے پردادا ہاشم کے سُسرال تھے اور اُن کے ساتھ تجارتی تعلقات بھی رکھتے تھے۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب کی انہوں نے پرورش کی تھی[4] اور جب سردارانِ مکّہ سے ان کا تنازعہ ہُوا تو انہوں نے اس کی عملی فوجی امداد بھی کی تھی[5]۔ بُعاث سے پہلے جب بنی الاوس کو شکست ہُوئی تھی تو مکّہ کے کفّار (جو آنحضورؐ کی اس زمانے میں شدید مخالفت پر کمربستہ تھے) سے النجار (جو رسول اللہؐ کے رشتہ دار اور حلیف بھی تھے) کے خلاف امداد طلب کرنے کی غرض سے آئے تھے[6]۔ بعید نہیں کہ شروع شروع میں بنی النجار کے لوگ ، بعاث میں شکست کھانے کے بعد (۳ سال قبل از ہجرت) رسول کریمؐ کے پاس ، بنی عبد مناف کی فوجی امداد لینے کیلئے حاضر ہُوئے ہوں ، مگر رسالت مآبؐ نے اُن کے سامنے دُوسری بہتر صورت یعنی اسلام پیش کرکے یثرب کی ہنگامہ پرور اور آتشین سیاست کا رُخ امن، آشتی ، صُلح و خیر اور تعمیر و ترقی کی طرف موڑ دیا ہو۔ تاہم ایک عظیم مدبّر اور سیاستدان ہونے کی حیثیت سے آپؐ نے قبائلی گروہ بندیوں اور سیاست کے عملی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں فرمایا۔ وُہ قبائل جو ابن ابی کی قیادت کو تسلیم کر چکے تھے اُن سے کوئی تعرض نہ فرمایا مگر ان کی کڑی نگرانی کی اور ساتھ ہی ساتھ میثاقِ مدینہ ایسی شہ کار دستاویز کے ذریعے اہل یثرب کو زیادہ پائیدار امن و امان کا مژدہ سنا کر ابن ابی کی قیادت کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ دُوسری طرف وہ قبائل جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی ان کی قدم قدم پر حوصلہ افزائی فرمائی۔ متعدد موقعوں پر آپؐ نے انصار کے سابق الاسلام قبائل کی خدمات کا اعتراف کرتے ہُوئے فرمایا: "انصار میں بہترین گھرانہ النجار کا ہے ، پھر عبد الاشہل کا ، اور اس کے بعد بنی ساعدہ کا[7]"

---

[1] و [2] سیرت ابن ہشام۔ ابن اثیر۔ طبری وغیرہ میں ناموں کی جو فہرست دی گئی ہے اس کو سامنے رکھ کر بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آں جنابؐ سے ملاقات کرنے والے لوگ النجار یا ان کے حلفاء تھے۔

[3] ترمذی ؛ بخاری : ابواب ہجرۃ

[4] سیرت ابن ہشام

[5] طبری و سیرت ابن ہشام ابن خلدون میں تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔

[6] طبقات ابن سعد ابوالحیسر اشہلی جو دیگر سردارانِ اوس آئے تھے بعاث میں مارا گیا ——— سیرت ابن ہشام وغیرہ۔

[7] صحیح مسلم و بخاری : ابواب تفضیل

واضح رہے کہ ان تینوں قبائل نے بعاث میں ایک فریق کے طور پر لڑ کر شکست کھائی تھی۔

قبائلی تقسیم

رسول اللہؐ کی آمد سے پہلے یثرب کی قبائلی تقسیم کچھ اس طرح تھی:

ا۔ یہود کے اکیس[1] کے قریب قبیلے اور اُن کی شاخیں تھیں[1]

ب۔ خزرج کے پانچ بڑے بطون تھے جو مزید کئی شاخوں میں بٹے ہُوئے تھے[2]

ج۔ اوس کے بطون اور شاخوں کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ تھی۔[3]

د۔ مدینہ کے قدیم باشندے اُن کے علاوہ تھے۔[4]

س۔ اوس و خزرج میں یہودیت کے فروغ کی وجہ سے عربی نژاد یہود کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا جن کا ذکر ان کی سیاسی و معاشرتی اہمیت کے پیش نظر "صحیفہ مدینہ" میں علیحدہ کیا گیا ہے۔ تاریخ ابن خلدون اور سیرت ابن ہشام کے یہ الفاظ ملاحظہ کریں: وان الیھود بنی عوف انہ مع المومنین وان الیھود بنی ساعدۃ، وان الیھود بنی جشم، وان الیھود بنی ثعلبۃ[5]۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عبداللہ بن ابی نے بھی یہودیت قبول کر لی تھی[6] تاہم اس کے اپنے قبیلے میں اور اس کے حامی قبائل میں یہودیت کے اثرات قوی تھے۔

قبائل کی تقسیم در تقسیم، املاک اور اقتدار کی طویل کش مکش اور نزاع نے یثرب میں عجیب بھیانک فضا پیدا کر دی تھی۔ بعاث کے بعد اگرچہ تین چار سال کا زمانہ بظاہر امن سے گزرا مگر حقیقتہً یہ حالت جنگ سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی۔ قتل کی اکا دُکا وارداتیں اکثر ہو جاتی، تنہا کسی کا باہر نکلنا دشوار تھا۔ رات کو کوئی گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ تنگ آ کر لوگوں نے آطام ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی[7] جو قبل ازیں صرف لڑائی کے موقعوں پر پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے جو ایک بار اپنے آطم میں چلا جاتا اسے کچھ نہ کہا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں نئے آطام بڑی تعداد میں تعمیر کیے گئے۔ دفاعی نقطۂ نظر سے تو یہ قلعے پہاڑ یا حرّہ پر ہی بنائے جاتے تھے۔ مگر اب مکان پر ہی برج بنا کر اسے قلعہ بند کیا جانے لگا۔ زیادہ امیر اور طاقت ور قبیلوں کے پاس زیادہ اور مضبوط قلعے ہوتے۔ بنی زید کے چودہ آطام تھے۔ اُحیحہ بن الجُلاح کا آطم سہ منزلہ تھا۔ آطم کے اندر عموماً کنواں بھی ہوتا تاکہ

---

[1] شبلی: سیرت ج ۱ ص ۲۶۸۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ۱۲ یہود خاندان تھے باقی خاندان یہودیوں کے حلیفی دائرہ میں شامل تھے یا اُن کے دست نگر۔

[2] شیخ رضا: محمد رسول اللہؐ ص ۶۸ - ۲۶۷ نیز سلیمان ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۸۰ - ۷۷ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ مدینہ۔

[3] شیخ رضا: محمد رسول اللہ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[4] شیخ رضا: محمد رسول اللہ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[5] ابن خلدون: سیرت ابن ہشام

[6] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "ابن ابی"

[7] منٹگمری واٹ ISLAM AND INTEGRATION OF SOCIETY ص ۱۴ اور ۱۷

محاصرے کے وقت پانی کا مناسب انتظام ہو۔ عام اندازے کے مطابق ہجرتِ رسولؐ کے وقت یثرب میں کم و بیش یک صد قلعے تھے[۱]

اسفل اور عالی کی بستیاں یثرب کا شہر دو حصّوں میں تقسیم تھا۔ عالی اور اسفل ——— عالی کی بستیاں حرّوں اور پہاڑوں کے اوپر جوف کے گرد دائروی شکل میں پھیلی ہُوئی تھیں۔ جنوب میں قُبا، نضیر اور انتہائی جنوب میں جبلِ عیر پر الجدر ——— مشرق میں حرہ واقم پر قریظہ، الجرف، عبدالاشہل، شمال میں خُطمہ، وائل، حارثہ، مغرب میں حرہ الوبرہ کے اُوپر جہاں بستیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلا ہُوا تھا، بنو امیہ اور بنی سلمہ رہتے تھے۔ اسفل کی آبادیاں جوف کے وسط میں نشیبی جگہ پر کم و بیش چار[۲] مربع میل علاقہ پر پھیلی ہُوئی تھیں۔ بنی ساعدہ، بلدح، بنی مُلویہ، نقیع الحقمات، بنی النجار، راتج، قینقاع، بنی حرم اسفل کی بستیاں تھیں۔ اس کے علاوہ قابلِ ذکر مقامات مرید، شحر، دُرخ، مُخزاف تھے۔

یثرب کی تعمیرات اور مکانات یثرب گنجان آباد علاقہ تھا۔ اہل یثرب کے مکانات چھوٹے چھوٹے اور باہم ملے ہُوئے اور عموماً اپنی ملوکہ زمینوں میں ہوتے۔ ذُباب سے جبل بنی عُبید تک عمارات کا سلسلہ قلعہ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ آبادیوں اور باغوں کا سلسلہ جنوب مغرب اور مغرب میں پھیلا ہُوا تھا۔ قُبا سے اُحد تک یہود کے محلے تھے[۳]۔ مکہ میں دار (بڑے گھر) اور ان کے سامنے عموماً وسیع دالان[۴] ہوتا جبکہ یثرب میں بیت (چھوٹے گھر) تھے کیونکہ یہاں جگہ کی قلت تھی۔ یثرب میں مکان کے عموماً دو دروازے ہوتے۔ ایک سامنے اور دُوسرا پشت کی جانب[۵]۔ یعنی مکان دو گلیوں کے درمیان میں واقع ہوتا اور مکان کے گرد چار دیواری ہوتی۔ باغ کے گرد اکثر چار دیواری (حائط) بنائی جاتی تھی اس لیے باغ کا نام بھی حائط پڑ گیا[۶]۔ اہل یثرب بعض اوقات حائط کے اندر رہائشی مکانات بنا کر رہتے[۷]۔ ان کی رہائشی جگہیں عموماً تنگ اور مختصر ہوتیں اور سقیفے (چوک) بھی اسی لیے بنائے گئے تھے کہ اُن کے گھروں میں بیٹھنے کی جگہ تنگ ہوتی تھی[۸]۔ تاہم یہ اجتماع گاہ یثرب کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں بے پناہ اہمیت رکھتی تھیں۔ نزاع اور خانہ جنگی کے سبب یہاں مکہ کی طرح کوئی مرکزی اجتماع گاہ ———

---

[۱] محمد حمیداللہ، عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ ص ۲۷، ۲۸

[۲] محمد حمیداللہ: امام بخاری، صحیح، نیز کتاب الاموال امام ابو عبید کتاب الزکوٰۃ

[۳] حمیداللہ: میدانِ جنگ ص ۲۹

[۴] امام بخاری: ادب المفرد ص ۲۹۸

[۵] صحیح مسلم و بخاری: کتاب التفسیر و لیس البربان تاتوا البیوت من ظهورها

[۶] حمیداللہ: میدانِ جنگ ص ۴۴

[۷] صحیح مسلم: (وغیرہ) کتاب التفسیر۔ ابوطلحہ کا مکان اس باغ کے اندر تھا جو انھوں نے راہِ خدا میں دے دیا۔

[۸] صحیح بخاری: ابواب آداب و سلام

دارالندوہ کی طرح کی قائم نہ ہوسکی اور نہ قائم ہوسکتی تھی۔ اہل یثرب کی اکثریت بُت پرست اور مشرک تھی۔ ان کی سب سے بڑی دیوی مناۃ — کا بت خانہ جوف یثرب کے بیرون ساحلِ سمندر کے نزدیک واقع تھا۔ منات، غطفان، جُہینہ، اوس، خزرج اور اکناف اطراف کے مشرک بدوؤں کی مشترک دیوی تھی تاہم یثرب میں بھی چھوٹے چھوٹے بت کدوں کا سراغ ملتا ہے[1] ہر قبیلے کا علیحدہ بُت کدہ تھا اور اس کا مہنت جو عموماً قبیلہ کا سردار بھی ہوتا بت کی نگرانی کرتا[2] اور نذر نیاز وصول کرتا مگر مکہ کے علی الرغم یہاں کوئی بڑی اور مرکزی عبادت گاہ نہ تھی جو سب لوگوں کے لیے یکساں احترام اور کشش رکھتی ہو اور اہل یثرب میں سیاسی انتشار کی ایک وجہ مذہبی عدمِ اتحاد بھی تھی۔ یہود کی تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے بُت پرستی کا زور خاصا کم ہوگیا۔ اہل یثرب کے نزدیک تبدیلیٔ مذہب کوئی اتنا بھاری جُرم نہ تھا۔ قبائلِ عرب میں سے سینکڑوں افراد کا یہودیت اختیار کرلینے کے بعد قبیلے کے اندر رہتے ہوئے تمام معاشرتی اور تمدنی مراعات بدستور حاصل کرتے رہنا ان لوگوں کی مذہبی رواداری اور فراخ دلی کا واضح ثبوت ہے۔ عرب کے اور شہروں میں بھی یہودی آباد تھے مثلاً جُرش۔ طائف جو خالص عربی نژاد بُت پرستوں کے شہر تھے وہاں یہود اور اُن کے باقاعدہ محلے ہونا[3] اور شمالی عربستان میں عیسائیوں اور یہودیوں کی تبلیغی سرگرمیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ عرب مذہبی معاملات میں اتنے تنگ نظر نہ تھے۔

اہل مکہ کے برعکس یثرب کے رہائشی مکانات پختہ، پتھر کے بنے ہوئے اور عموماً دو منزلہ ہوتے۔ مکان یا باغ کی چار دیواری بھی پتھر سے تعمیر کی جاتی[5] حضرت ابوایوب[6] انصاریؓ (جہاں آں حضورؐ نے عارضی طور پر قیام فرمایا) حضرت ابوبکرؓ (جہاں عائشہ صدیقہؓ کی والدہ اُمِ رُمّان رہتیں) عُبید بن عتیک[8]، ابن ابی الحقیق، آنحضرت[9] اور ابن عمر[10] کے مکانات دو دو منزلہ تھے الضحیان کا اُطم سہ منزلہ تھا جس کی اوپر کی دو منزلیں چاندی کی طرح سفید پتھر سے بنائی گئی تھیں اور نچلی منزل

لہ تاریخ طبری، و سیرت ابن ہشام۔ (مسلمان ابھی تک قبا ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ یثربی بُت خانوں سے نذر نیاز کا مال نکال کر لاوارث عورت کو لا دیتے جس کے مکان میں علیؓ ٹھہرے ہوئے تھے)

ٹہ سیرت ابن ہشام: (عمرو بن الجموح اور قبیلہ خطمہ کی اسلام سے عداوت کی تفصیلات)

سہ محمد حمید اللہ، "سیاسی زندگی" نیز میدانِ جنگ

کہ ہیکل: سیرت (اردو ترجمہ)

ھہ حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۲۸

لہ صحیح بخاری: ابواب ہجرت

ٹہ ترمذی، باب الملک

شہ سیرت ابن ہشام

ٹہ و نلہ بخاری: واقعہ افک نیز ابواب آداب و احکامات

لاوا کے پتھر سے تعمیر کی گئی تھی۔ نچلی منزل آج تک موجود ہے[1]۔ زینہ عموماً کھجور کی لکڑی کا ہوتا جس سے اُترنے چڑھنے میں خاصی وقت ہوتی۔ عتیک زینہ سے گر پڑا اور اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا۔ آنحضورؐ نے شاید کوئی جدت پیدا کی کیونکہ محدثین نے آپؐ کے زینے کے بارے میں لکھا ہے کہ اُترتے چڑھتے وقت یُوں معلوم ہوتا گویا زمین پر چل رہے ہیں۔

یثرب میں تہہ خانوں کا بھی رواج تھا جو گرمی سردی سے بچاؤ کے لیے استعمال کیے جاتے۔ لوگ اپنی قیمتی اشیا، ہتھیار، سامانِ خورد و نوش، زیورات عموماً تہہ خانوں میں رکھ دیتے۔ رفاعہ بن زید کا ایک ایسا تہہ خانہ تھا[2]۔ اہلِ یثرب پانی جمع کرنے کے حوضوں کو (جب اُن میں پانی نہ ہوتا) عام حالات میں نشست گاہ کے طور پر استعمال کرتے اور جنگ میں مورچہ، پناہ گاہ اور قید خانے کے بطور استعمال میں لاتے[3]۔

مکہ کے مقابلے میں اہل یثرب کی عمارات اور تعمیری روایات شاندار تھیں۔ مکہ میں قصی سے چند پشت قبل تک لوگ خیموں میں رہتے تھے[4]۔ حتیٰ کہ بعثت نبویؐ کے وقت عرب کے مقدس ترین مقام بیت اللہ کی عمارت کی کوئی چھت نہ تھی[5]۔ تجارتی فروغ کے بعد جب قریشیوں میں دولت کی ریل پیل ہوئی تو بیت اللہ کی عمارت کو گرا کر از سرِ نو بنانے کا منصوبہ بنایا گیا[6]۔ رومانوی معمار بلوائے گئے[7]۔ بڑھئی حبشہ اور قبط سے آئے[8]۔ دومۃ الجندل کے شہر کی طرح پتھروں میں لکڑی کے بلاک جوڑ کر دیواریں اٹھائی گئیں۔ یہ حبشی طرزِ تعمیر تھا، چھت لکڑی کی ڈالی گئی۔ یہ اپنے زمانے کی مکہ میں تعمیر ہونے والی سب سے زیادہ خوب صورت عمارت تھی جسے دیکھ کر لوگ حیران و ششدر رہ گئے[9]۔ بعید نہیں کہ رؤسائے مکہ نے بھی اسی زمانے میں عظیم الشان عمارات بنائی ہوں۔ اجیاد، باقیقان اور دار اجالہ کی جگہ دار ارقم جیسے وسیع اور محفوظ مکانات تعمیر ہونے لگے ہوں تاہم یثرب اس لحاظ سے بہت آگے تھا خصوصاً ثروت مند قبائل کے مکانات عمدہ اور خوب صورت تھے[10]۔

---

[1] محمد حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۴۴

[2] ترمذی: باب تفسیر القرآن [3] محمد حمید اللہ: میدانِ جنگ ص ۴۴

[4] ندوی: ارض القرآن ج ۲ ص ۱۹

[5] تاریخ طبری

[6] ایضاً۔ بعض روایات (ابن ہشام، ابن خلدون) میں تعمیرِ نو کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ طغیانی سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ یہ صحیح نہیں (دیکھیے کریسٹ ویل۔ اور غلام یزدانی کا مضمون ارمغانِ علمی میں "خانۂ کعبہ" پر۔)

[7] غلام یزدانی ص ۲۱۵ (ارمغانِ علمی مضمون خانہ کعبہ)

[8] کریسٹ ویل: EARLY MUSLIM ARCHITECTURE ص ۳ نیز طبری

[9] ایضاً

[10] بلاذری: فتوح البلدان ص ۵۲ و ۵۳ پوری تفصیلات ان مکانات کی تعمیر کے بارے میں دی گئی ہیں۔

یثرب میں مقبرے بنانے کا بھی رواج تھا[1] عام طور پر قبر پر کوئی نہ کوئی عمارت یا گنبد بنایا جاتا اور عبارت تحریر کی جاتی تھی[2] ہر محلے کا علیحدہ قبرستان تھا، بسا اوقات گھر کے اندر میت کو دفن کر دیا جاتا[3] یہ غالباً یہودیوں کا رواج تھا۔ قبروں، مقبروں اور روضوں کو پختہ کیا جاتا[4] ظاہر ہے مکانات کی تعمیر میں بھی یہ سامان استعمال ہوتا ہوگا۔

درج بالا شواہد کی روشنی میں کریسیٹ ویل[5] کی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی کہ بعثت نبیؐ کے وقت عربوں کی تعمیری روایات مفقود تھیں اور ان کے رہائشی مکانات پر بل کا گمان ہوتا تھا۔

ہجرت کی نوعیت

ہجرت دراصل رسول کریمؐ کے دفاعی منصوبۂ جنگ کا اہم حصہ تھی[6] جس کے ذریعہ آپؐ نے ایک طرف مکہ، یمن، نجران، حبشہ، شام، بحرین اور یثرب میں منتشر اور پریشان حال مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے یثرب جیسے دفاعی، تجارتی اور اقتصادی اعتبارات سے اہم شہر پر قبضہ جما لیا اور دوسری طرف اپنے پیروکاروں سے بیعتِ حرب (عقبۂ ثانیہ) لے کر کفارِ مکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے میں پہل کی اور کفار نے جوابی کارروائی کے طور پر آپؐ کے قتل کر دینے کی جب قرارداد منظور کرائی تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ معلوم رہے کہ بیعتِ حرب سے قبل بھی اور بعد میں بھی دارالندوہ میں قریش نے اسلامی تحریک کو کچلنے کے لیے کئی اجلاس منعقد کیے مگر کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکا تھا۔ آنجناب کے قتل کی قرارداد بروایت طبری بیعت کے بعد ایک اجلاس یوم الزحمۃ میں بمشکل عام منظور ہوئی ——— اور دیکھا جائے تو آں جنابؐ پر ہاتھ ڈالنا سہل نہ تھا۔ ابولہب بنو ہاشم کی سرداری پہ فائز ہونے کے بعد آپؐ کو "جاتی باہر" کر دینے کی کوشش میں ناکام رہا تھا۔ جُبَیر بن مُطعم جیسے سردارانِ مکہ کے علاوہ پورے عبد المناف[7] اور حلف الفضول کے شرکاء قبائل کی حمایت آپؐ کو آخر دم تک حاصل رہی تھی ——— دار الندوہ میں سردارانِ قریش کی طرف سے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا گیا کہ محمدؐ اور اس کے پیروکار کہیں مکہ پر حملہ نہ کر دیں[8]۔ بیعتِ حرب میں حضرت عباس انصاری کی طرف سے مکہ کو بزور فتح کر لینے کی تجویز بھی پیش کی گئی[10]۔ یثرب کے

---

[1] موطا امام مالک: کتاب الجامع (بقیع الفرقد میں روضہ کا ذکر ہے)۔ ترمذی اور ابی داؤد۔ (روضہ خاخ کا — جو مدینہ سے چند میل پر تھا)

[2] نسائی: کتاب الجنائز

[3] صحیح بخاری: ابواب الجنائز

[4] نسائی: کتاب الجنائز

[5] کریسیٹ ویل: "ارلی مسلم آرکیٹیکچر" ص ۳

[6] جنرل اکبر خان: حدیث دفاع　　[7] منٹگمری واٹ: "اسلام" نیز محمد حمید اللہ: "سیاسی زندگی"

[8] سیرت ابن ہشام و تاریخ طبری۔ (اجلاس میں اس خدشہ کا اظہار کیا گیا کہ پورا خاندانِ عبد مناف ہم پر کہیں ہلہ نہ بول دے اگر محمدؐ رسول اللہ پر ہاتھ ڈالا گیا۔　　[9] منٹگمری واٹ: اسلام

[10] تاریخ طبری　　[11] ابن ہشام نیز مسلم و بخاری: ابواب ہجرت

مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد بھی مکہ میں بلوائی گئی تھی[1] شاید اسی وقت آں حضورؐ مکہ میں ہی اسلامی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ رکھتے ہوں۔

ہجرت، یثرب کی فتح تھی[2] اور رسول اللہؐ نے اس کی طرف پہلے سے اشارہ فرمایا تھا کہ مجھے ایسی بستی میں جانے کا حکم ملا ہے جو باقی تمام آبادیوں کو کھا جائے گی[3] یثرب کے علاوہ آپ کو قنسرین اور بحرین میں سے کسی ایک مقام پر ہجرت کرنے کی اجازت ملی تھی[4] طفیل دوسی نے بھی پیش کش کی مگر آپؐ نے دفاعی پلان کے پیش نظر یثرب میں ہجرت کر جانے کو پسند کیا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب ہر لحاظ سے صحیح تھا اور آپؐ کی جنگی اور سیاسی بصیرت کا نادر نمونہ۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یثرب میں آپؐ بطور فاتح اور حکمران کے وارد ہوئے۔ اس کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ آپؐ کے لیے لفظ "مہاجر" استعمال نہیں ہوتا تھا یعنی آپؐ کی حیثیت یثرب میں آنے والے دیگر مسلمانوں سے مختلف تھی۔

دارالخلافہ کے لیے جگہ کا انتخاب یثرب میں آپؐ غیر معروف راستے سے داخل ہو کر عمرو بن عوف کے قریہ قبا میں اُترے جہاں آپؐ کا قیام چار روز رہا[7] چوتھے روز یثرب کے تمام مسلمانوں کو طلب فرمایا۔ وہ ہتھیار سجائے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ ان کی کل تعداد سنو تھی[8] قبا سے چل کر جب بنی سالم کے محلہ میں آئے تو نمازِ جمعہ کا وقت ہو گیا۔ یہاں آپؐ کی امامت میں پہلا جمعہ پڑھا گیا۔ آگے بڑھ کر بنو النجار کے محلہ میں حضرت ابو ایوبؓ کے مکان جہاں عارضی قیام کا فیصلہ آپؐ پہلے ہی کر چکے تھے[9] اقامت گزین ہوئے اور مسجد نبیؐ اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجرے تعمیر ہونے تک وہیں رہائش پذیر رہے۔ مگر اس ضمن میں روایات نامکمل اور متضاد ہیں جس کی وجہ سے اکثر مورخین کو مغالطہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان سب روایات کا نچوڑ یہ ہے کہ آپؐ نے عارضی قیام کے لیے ننھال کی آبادی میں ٹھہرنے کا فیصلہ قبا میں ہی

---

[1] ابن خلدون: "مہاجر انصار" کے عنوان کے تحت اکثر مورخین نے علیحدہ ذکر کیا ہے۔

[2] ابو الکلام آزاد: رسول رحمتؐ (تالیف: غلام رسول مہر)

[3] موطا امام مالک: کتاب الجامع

[4] ترمذی: باب المناقب

[5] صحیح مسلم: باب الهجرت

[6] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مہاجرین از ایف بوہل و ——— A. J. WENSINCK ———

[7] تاریخ طبری و سیرت ابن ہشام۔ (اس کے علاوہ طبری نے اور حوالوں سے دو اور سترہ دن ــ نسائی: کتاب الصلوٰۃ نے چودہ روز لکھا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے)

[8] طبقات ابن سعد۔ بعض اور کتب میں تعداد چالیس بتائی گئی ہے۔ یہ کل مسلمانوں کی تعداد نہ تھی (دیکھئے محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی) اور نعیم صدیقی۔ شاید یہ کل مہاجرین کی تعداد ہو۔

[9] امام بخاری: تاریخ صغیر نیز (شبلی، سیرت ج ۱ ص ۱۵۸ حاشیہ)

کر لیا تھا۔ اس غرض سے النجار کو طلب فرمایا وہ ہتھیار سجا کر معزز مہمان کو لینے کے لیے حاضرِ خدمت ہوئے[1] آپ ان لوگوں کے جلو میں بنی النجار کے محلے میں آئے اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے ہاں فروکش ہوئے البتہ النجار میں سے کس کے ہاں ٹھہریں اس کے لیے قرعہ اندازی کی گئی۔ یہ قرعہ اندازی قریوں میں کسی ایک قریہ میں ٹھہرنے کے لیے نہیں ہوئی تھی جیسا کہ بعض روایات میں کہا گیا ہے[2]۔ النجار میں سکونت اختیار کرنے کے فیصلہ کی تائید آنجنابؐ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ مسافر کسی دوسرے قریے میں جائے۔ اور ٹھہرے تو اپنے قریب ترین رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے کیونکہ وہ اس پر زیادہ حق رکھتے ہیں[3]۔ اس اعتبار سے واقعی النجار دیگر انصاری مسلمانوں کے مقابلے میں آپؐ پر زیادہ حق رکھتے تھے۔

بعد ازاں آپؐ اونٹنی[4] پر سوار ہو کر یثرب کی مختلف آبادیوں، جگہوں، قبیلوں کا جائزہ لینے کے لیے نکلے۔ صحابہؓ کی پوری جمعیت آپؐ کے ہم رکاب تھی۔ اس طرح اپنی عسکری قوت کا مظاہرہ کر کے اہل یثرب پر اپنی دھاک بٹھا دی مگر اس سفر کی اہمیت ایک اور لحاظ سے بھی ہے۔ ایک ماہرِ جنگ اور جرنیل، ایک سیاستدان اور مدبّر اور ایک ماہرِ تعمیرات کی حیثیت میں آپؐ یثرب کا معاینہ فرما رہے تھے۔ آپؐ کی عقابی نگاہوں سے یثرب کی زندگی کا کوئی پہلو اور یثرب کا کوئی اہم مقام پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ایک ماہرِ جنگ کی حیثیت سے آپؐ نے جوف کا دفاعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا، آگے چل کر جہاں آپؐ کو اسلام کے دفاع کی جنگیں لڑنا تھیں، بطور سیاستدان اور مدبّر مختلف قبائل کی قوت اور اسلام کے متعلق ان کے ردِ عمل کا اندازہ لگایا اور بحیثیت ماہرِ تعمیرات نوزائیدہ اسلامی مملکت کا دار الخلافہ تعمیر کرنے کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب کیا۔ آپؐ اونٹنی پر سوار جہاں جہاں سے گزرتے لوگ استدعا کرتے کہ یا رسول اللہؐ! ہمارے گھر حاضر ہیں، ہماری تعداد اور قوت زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں قیام فرمایئے۔ آپؐ جواباً فرماتے، خلو سبیلها فانها مامورة ——— یہاں تک کہ آپ بنی بیاضہ، بنی ساعدہ، بنی عدی بن النجار (یہ آپؐ کے ننھیال تھے) بنی مالک بن النجار سے گزرے اور آخر کار بنی مالک بن النجار کے ہاں قیام فرمایا کیونکہ اونٹنی اس جگہ بیٹھ گئی[5] یہیں مسجد نبویؐ تعمیر کی گئی[6] اور اسلامی حکومت کا دار الخلافہ اسی جگہ پر تعمیر کیا گیا مگر راویوں نے آنجنابؐ کے اس موخر الذکر سفر کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپؐ اونٹنی پر سوار ہو کر عارضی قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے نکلے تھے حالانکہ اس سفر کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ پھر جس جگہ اونٹنی بیٹھی وہ ویرانہ تھا اور وہاں سے حضرت ابو ایوب کا مکان

---

[1] نسائی: کتاب الصلوٰۃ، صحیح بخاری: ابواب مساجد طبقات ابن سعد

[2] صحیح بخاری: ابواب ہجرت

[3] صحیح مسلم: ابواب آداب سفر

[4] طبری و سیرت ابن ہشام: قبا سے نکلتے وقت آپ پیدل تھے اور دیگر صحابہ بھی پیدل چلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اونٹنی پر سوار ہو کر اس وقت نکلے جب آپؐ ابو ایوب کے ہاں فروکش ہو گئے تھے۔

[5] سیرت ابن ہشام

[6] صحیح بخاری: ابی داؤد (ابواب مساجد و صلوٰۃ)

بہت فاصلے پر تھا۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ اونٹنی تو اس جگہ بیٹھی ہو اور آپ قیام کرنے کے لیے ڈیڑھ دو میل دور حضرت ابوؓ ایوب کے ہاں گئے ہوں اور یہ بات بھی نہ تھی کہ اونٹنی ابو ایوب کی زمینوں میں اُتری ہو اور اس وجہ سے آپؐ نے زمین کے مالک کے ہاں عارضی قیام کا فیصلہ کیا ہو کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ زمین کے مالک النجار کے دو یتیم بچے تھے۔ تاریخی تنقید کی کسوٹی پر کوئی روایت بھی پوری نہیں اُترتی۔ اور صحیح رائے یہی ہے کہ حضرت ابو ایوبؓ کے ہاں قیام پذیر ہونے کے بعد آپؐ نے دارالخلافہ تعمیر کرنے کے لیے اونٹنی پر سوار ہو کر جگہ کا انتخاب فرمایا۔

دارالخلافہ کے لیے منتخب کی جانے والی جگہ کے متعلق جو روایات ملتی ہیں اُن میں زمین کے بارے مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان سب روایات کو یکجا کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ جگہ ویران، بنجر، غیر آباد تھی۔ یہاں کھنڈرات اور قبرستان تھے۔ کھجور کے درخت اور کھیتی باڑی اور اُونٹ باندھنے کی جگہ تھی[۱] تاہم یہ روایات متضاد نہیں ہیں بلکہ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ حاصل کردہ قطعۂ اراضی بہت بڑا تھا (اور ہونا بھی چاہیے تھا) اس میں کہیں کھنڈرات اور قبرستان تھے تو کہیں باغات اور کھیتی باڑی، کوئی حصّہ آباد تھا تو کوئی حصہ غیر آباد۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کے متعلق بھی جو روایات ہم تک پہنچی ہیں وُہ بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں، ان میں یہ بات واضح نہیں کہ یہ اراضی النجار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی یا سارے النجار کی مِلک تھی یا بنو ثعلبہ اس کے مالک تھے[۲] اس کی صورت یہ تھی کہ چونکہ قطعۂ اراضی بڑا تھا، اس لیے کوئی ٹکڑا یتیموں کا تھا، کوئی بنو ثعلبہ اور بنی النجار کا خصوصاً قبرستان اور اُونٹوں کا باڑہ" وغیرہ شاملات" ہونے کی وجہ سے پُورے قبیلے کی مشترک ملکیت تھے۔ روایات میں یہ بات بھی واضح نہیں کہ آیا آپؐ نے زمین بلا قیمت حاصل کی یا قیمت ادا کر کے حاصل کی[۳]، اور یہ کہ زمین کی قیمت کس نے ادا کی؟ اصل بات یہ تھی کہ آپؐ نے بنجر اور غیر آباد (عادی) زمین اور ایسی زمین جو پہلے تو مفادِ عام بلا معاوضہ لے لی (PUBLIC UTILITY) کیلئے استعمال ہوتی تھی مگر اب وہ اس مقصد کے لیے کارآمد نہ رہی تھی مثلاً قبرستان وہ بھی بلا معاوضہ قبضے میں لے لی۔ بعد ازاں سٹیٹ پالیسی یہی رہی کہ تمام عادی زمین آپؐ نے اپنے قبضے میں لے کر حسبِ خواہش اسے تقسیم فرمایا[۴]۔ البتہ زمین کے جس ٹکڑے میں کاشت کاری ہوتی تھی اس کا معاوضہ دیا گیا ہوگا۔

یہ وسیع قطعۂ اراضی اسلامی مملکت کا دارالخلافہ اور دارالامارت تعمیر کرنے کے علاوہ ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کو

---

[۱] سیرت ابن ہشام۔ طبری۔ طبقات ابن سعد۔ صحیح مسلم و صحیح بخاری (ابواب مساجد و ہجرت)۔ نسائی و ابی داؤد۔ (ابواب الصلوٰۃ و مساجد) وغیرہ

[۲] دیکھیے صحیح بخاری (ابواب مساجد) نسائی: باب الصلوٰۃ۔ سیرت ابن ہشام

[۳] دیکھیے سیرت ابن ہشام۔ طبری۔ ابن الاثیر۔ صحیح بخاری وغیرہ

[۴] ابو عبید۔ کتاب الاموال ج ۲ ۶۷۳ اور ۶۹۳ (کتاب الزکوٰۃ) نیز امام ابو یوسف: کتاب الخراج ۶۷/۶۹۔ مفتی محمد شفیع: "اسلام کا نظامِ اراضی" ص ۷

بسانے کے لیے حاصل کیا گیا تاکہ وہاں بے سروسامانی کی حالت میں گھروں سے نکلنے والے لوگوں کو رہائشی مکانات یا رہائشی پلاٹ فراہم کیے جاسکیں تاہم دارالخلافہ کے لیے کچھ اور جگہیں بھی زیرِ غور آئیں۔ شاید شروع میں آپؐ قبا کو دارالخلافہ بنانا چاہتے تھے[1] اسی وجہ سے ہجرت کرکے یثرب پہنچنے والے صحابہ کو قبا میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا[2]۔ خود بھی یہیں اُترے بلکہ قبا کی بنجر اراضی بھی حاصل کرلی۔ ابن ماجہ کی اس روایت سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ آں حضورؐ سے جب کہا گیا کہ آپؐ قبا میں قیام فرمائیں تو (تجویز کو نامنظور کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا قبا میں جو جس جگہ اُتر جائے وہ اُسی کی ہے ———— مگر بعد ازاں یثرب کی آبادیوں کا عمیق جائزہ لینے کے بعد قبا کو دارالحکومت بنانے کے ارادہ کو ترک کرکے اس جگہ کو منتخب کیا جہاں مدینۃ الرسول کی نو آبادی قائم ہوئی۔

یہ انتخاب ہر لحاظ سے موزوں تھا

یہ محض حسنِ عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت ہے کہ نیا شہر بسانے کے لیے آپؐ نے جس جگہ کا انتخاب کیا وہ ہر لحاظ سے بہترین انتخاب تھا:

یہ جگہ اسفل میں واقع تھی۔ جبلِ سلع کے نزدیک اور جوف کے مرکز میں ہونے کے سبب اس کی دفاعی اور سیاسی پوزیشن مضبوط تھی[3]۔ شہر کے جنوب اور مغرب دونوں اطراف میں بطحان اور ناقابلِ گزر غابات (جن کے گرد چار دیواری ہوتی تھی) کا سلسلہ تھا۔ تیسری جانب سلع اور دیگر چھوٹی پہاڑیاں قدرتی فصیل اور مورچہ کا کام دیتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ قدیم الایام سے یثرب میں جن اقوام کو غلبہ حاصل رہا ان کا مسکن قریب قریب اسی جگہ تھا جہاں رسول اللہؐ نے مدینہ کا شہر بسایا[4]۔

اسفل کے قبائل نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور ہجرت کے وقت 'بمقابلہ عوالی کے' یہاں اسلام کے اثرات قوی تھے۔ اسفل کی مسلمان آبادیاں مدینۃ الرسول کے مغرب، جنوب اور مشرق کے اطراف میں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، خصوصاً النجار کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور رسول اللہؐ سے قرابت داری کی وجہ سے اسلام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے پیش پیش تھا، شہر کے قریب تھا۔ یعنی ہنگامی حالات میں بر وقت امداد فراہم ہوسکتی تھی اور اس طرح شہر پر چڑھائی کرنا یا شہر کا محاصرہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا جیسا کہ جنگِ خندق میں ثابت ہوگیا۔

عوالی کی کسی بستی کو دارالخلافہ بنانے یا عوالی کے کسی مقام پر نیا شہر بسانے میں دو رکاوٹیں حائل تھیں۔ اوّلاً آپؐ کو جغرافیائی اور سیاسی مرکزیت حاصل نہ ہوسکتی تھی، جو اسفل میں ہوئی۔ ثانیاً عوالی کی بیشتر آبادیوں میں اسلام ابھی تک نہ پھیل سکا تھا، یا پھر وہاں اسلامی اثرات بہت کمزور تھے۔ عوالی جنوب مشرق میں بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی ظفر کے یہودی اور ان کے

---

[1] منٹگمری واٹ "ISLAM INTEGRATION OF SOCIETY" ص ۱۹ نیز ابن ماجہ

[2] سیرت ابن ہشام

[3] جنرل اکبر خاں، حدیثِ دفاع

[4] بحث اُوپر گزر چکی ہے۔

[5] منٹگمری واٹ "اسلام" نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تحت "مدینہ" و "محمد"

حلفائے مساکن تھے۔ مشرقی حرۂ واقم پر سوائے بنی عبد الاشہل کے تقریباً سب غیر مسلم یا مشرک قبائل رہتے تھے۔ انتہائی شمال میں عوالی کی بستیاں بنی حارثہ، حنظمہ، لوذان، بنی حبیب، بنی واقف، بنی ضُبیعہ تھیں۔ یہاں کے لوگ ابھی تک نہ صرف مشرک تھے بلکہ اسلام دشمنی میں شدید بھی تھے البتہ جنوب مغرب میں قُبا کی جانب عوالی کی مسلمان آبادیاں تھیں اور دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ کم اہمیت کی حامل نہ تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ قُبا کو ایک موقع پر دارالخلافہ بنانے کا ارادہ کرلیا، مگر جب اس سے بہتر جگہ میسّر آگئی تو ارادہ بدل دیا۔

حرم مدینہ: آجکل حرم سے مراد ہے 'OPEN CITY' یعنی ایسا شہر جس کے اندر یا گرد و نواح میں جنگ ممنوع ہو جیسا کہ 'روم' کا شہر ہے۔ حرم نیم مذہبی اور نیم سیاسی اصطلاح ہے۔ حرم مدینہ کا مذہبی مفہوم یہ تھا کہ اس علاقہ میں جو شخص جہاں چاہے قیام کرسکتا تھا، وہ امن اور پناہ میں سمجھا جاتا، خواہ وُہ مجرم ہی کیوں نہ ہوتا۔ حرم کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ فوزائیدہ مملکتِ اسلامیہ کی حدود کا تعیّن ہوگیا۔[1]

رسول اللہؐ نے یثرب جانے کے بعد جوف (کے ایک حصّہ کو) حَرم قرار دے کر مکّہ والوں کی طرح اہلِ مدینہ کو محفوظ بنانے کے علاوہ اپنی سیاسی پوزیشن بھی مستحکم بنالی۔ اب رسولِ خداؐ کی اجازت کے بغیر مدینہ سے کوئی (کارواں) نہ گزر سکتا تھا۔ اس طرح اہلِ مکّہ کی پوزیشن انتہائی کمزور ہوگئی۔ ان کے تجارتی کارواں اب خطروں کی زد میں تھے۔ اگر مکّہ والے "حرم مدینہ" کا احترام ملحوظ نہیں رکھتے تو اُن کا حرم بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔[2] دُوسرے، حرم کی وجہ سے مدینہ میں خانہ جنگی اور انتشار ختم ہوگیا حُرمتِ مدینہ کا پامال کرنے والا، وُہ خواہ کوئی بھی ہو، رسول اللہ کے سامنے جواب دہ تھا۔ صحیفہ کے یہ الفاظ کہ ومن خرج امن ومن قعد امن ــ غور طلب ہیں۔ اور اس طرح آپؐ کی حکم عدولی ممکن نہ تھی اور قانونی طور پر جوفِ مدینہ کی تمام آبادیاں رسولؐ اللہ کے زیرِ نگین آگئیں۔

یہ صحیح ہے کہ خلفشار، خانہ جنگی، قتل کی وارداتوں، املاک چھن جانے کا اندیشہ، لاقانونیت اور نزاع کی وجہ سے یثرب کے لوگ سخت نالاں تھے۔ انہیں امن اور صلح کی زبردست خواہش اور ضرورت تھی۔ اسی خواہش اور ضرورت کے پیشِ نظر رسولِ خداؐ کے اعلانِ حرم جو در اصل اعلانِ امن (DECLARATION OF PEACE) تھا، کے بعد یثرب کے تمام لوگ، خواہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم، اپنی خود مختاری سے جزواً دست بردار ہونے پر فوراً آمادہ ہوگئے یا کم از کم کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ آنجنابؐ کی دُور اندیشی اور تدبّر کی یہ بہترین مثال ہے کہ مدینہ کے تمام مکین اس اعلان کے ذریعے آپؐ کی سیادت قبول کرنے پر مجبور ہوگئے تاہم اس اعلان کے نافذ العمل ہوجانے کے پسِ پردہ رسولِ خداؐ کی عسکری قوت اور جمعیت کا رُعب بھی تھا جس نے اہلِ یثرب کی گردنوں کو اطاعت کے لیے جُھکا دیا۔ اس ضمن میں آپؐ نے جو اعلان، جسے بعد ازاں صحیفہ مدینہ میں شق کے طور پر شامل کیا گیا جاری

---

[1] سیرت ابن ہشام
[2] وثیقہ محمد حمید اللہ: عہدِ نبویؐ کے میدانِ جنگ ص ۱۱، ۱۲
[3] محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی و مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ نیز منٹگمری واٹ: "محمدؐ مدینہ میں"

فرمایا۔ اس کے الفاظ غور طلب ہیں :

وانہٗ لا یحول ھذا الکتاب دون ظالم او اثم وان من خرج امن و من قعد امن بالمدینۃ الا من ظلم او اثم[۱]

مدینہ کو حرم قرار دینے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ داخلی استحکام اور صحیفۂ مدینہ پر مختلف قبائل کے دستخط ثبت ہو جانے کے بعد نہایت واضح الفاظ میں صحیفہ میں حُرمت کا اندراج کیا گیا :

وان یثرب حرامٌ جوفہا لاھل ھذہ الصحیفۃ[۲]

حرمِ مدینہ کی حدود یہ بات واضح نہیں کہ حرم کی حدود کیا تھیں۔ صحیفہ میں "جوفِ مدینہ" کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ امام ابو یوسف نے لکھا ہے کہ حرم کا رقبہ بارہ[۱۲] مربع میل تھا[۳]۔ صحیح بخاری و مسلم کے مطابق جبلِ عیر[۴] سے جبلِ ثور تک کا علاقہ حرام تھا۔ یہ علاقہ کم و بیش بارہ[۱۲] مربع میل ہوتا ہے ——— تاہم اندازہ ہے کہ یہ حکم بعد کا ہوگا جبکہ مدینہ میں آنحضورؐ کو کامل اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔ محمد حمید اللہ رقمطراز[۵] ہیں کہ فتح مکہ کے بعد حدودِ حرم کا از سرِ نو تعین کر کے کعبؓ بن مالک کی زیرِ نگرانی حسبِ ذیل مقامات پر بُرجیاں یا مُنارے تعمیر کرائے گئے۔ ذات الجیش کے ٹیلے، مُشیرب، مخیض کے ٹیلے، حفیاء، ذی العُشیرہ، تیم۔ یہ سب مقامات ایک دُوسرے سے ایک ایک منزل یعنی بارہ[۱۲] میل کے فاصلے پر تھے۔ جبلِ تیم پر آنحضورؐ کے تعمیر کردہ مُنارے کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں یعنی امام مسلم، امام بخاری اور امام ابی یوسف نے حرم کی جن حدود کا ذکر کیا ہے وُہ فتح مکہ کے بعد کی متعین کردہ ہیں۔ قبل از فتح، حرم کی حد کم اور محدود تھی۔ اگر شروع ایام سے حرم کی سرحدات جبلِ عیر سے جبلِ سلع تک ہوتیں تو کفار نے دو موقعوں، جنگِ اُحد اور جنگِ خندق پر ان حدود کے اندر لشکر کشی کی اور اس طرح گویا حرمت کی پا مالی کا ارتکاب کیا ——— اگر واقعی حُرمت کو توڑا گیا ہوتا تو مسلمانوں کی طرف سے لازماً ردِّ عمل ہوتا۔ مگر ہمیں کوئی ایسی داخلی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کفار نے حرم کی حدود پا مال کیں۔ اور نہ ہی کسی محدث و مورخ نے، ہماری معلومات کی حد تک، اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شروع شروع میں حرم کی حدود مختصر تھیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ صحیفہ (جو باختلاف رائے ۳ھ تک مکمل ہو چکا تھا) میں جوفِ مدینہ کو حرام کہا گیا ہے اس تضاد کے بعد دو صورتیں ممکن ہیں: پہلی تو یہ ہو سکتی ہے کہ صحیفہ کے یہ الفاظ الحاقی ہوں اور اصل مسودے میں نہ ہوں[۶]۔

---

[۱] تاریخ ابن خلدون ۔ یہ الفاظ صحیفہ مدینہ میں بطور شق درج کیے گئے ہیں۔

[۲] سیرت ابن ہشام

[۳] امام ابی یوسف : کتاب الخراج عن مالک بن انس ۱۴۴/۱۴۸

[۴] صحیح بخاری و صحیح مسلم

[۵] محمد حمید اللہ : عہد نبویؐ کے میدان جنگ ص ۱۲ - ۱۳

[۶] دیکھیے وثائق السیاسیہ، محمد حمید اللہ ۔ الفاظ درج ہیں۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ "جوفِ مدینہ" سے آنحضورؐ کے زمانے میں وُہ حدود مُراد نہ لی جاتی ہوں جو آجکل لی جاتی ہیں، یعنی عیر اور ثور کی بجائے اس زمانے میں شمال کے طور پر عیر اور سلع کے درمیانی علاقے کو ہی جوفِ مدینہ کہا جاتا ہو اور یہی صورت زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ عیر سے سلع کا فاصلہ اندازۃً چار میل ہوگا۔ اگر اس زمانے میں اس جگہ کو جوف نہ بھی کہا جاتا ہو تب بھی یہ واقعہ ہے کہ ابتدائی ایام میں حرم کی حد اتنی ہی تھی۔ اور اس خیال کی تصدیق امام ابی یوسف کی بیان کردہ اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق آنحضورؐ نے فرمان جاری کیا کہ مدینہ میں چار میل کے علاقے میں کھیتی باڑی نہ کی جائے [۱] کاشت کاری سے منع کرنے کا حکم محلِ نظر ہے تاہم یہ چار میل حدِ حرم مدینہ تھی اور اتنا ہی رقبہ تھا جہاں ابتداءً اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا عظیم الشان تجربہ کیا گیا۔ دنیا میں اس سے چھوٹی کوئی اور سٹیٹ شاید معرضِ وجود میں کبھی نہیں آئی ہوگی تاہم اسلامی سلطنت کی سرحدات بتدریج بڑھتی رہیں تاآنکہ عیر اور ثور کا درمیانی علاقہ (جوفِ مدینہ) حرم قرار پایا مگر اس وقت تک اسلامی سلطنت پورے جزیرۃ العرب پر محیط ہو چکی تھی۔

اسلام میں اوّلین مسجد دارالخلافہ مدینۃ الرسول کی تعمیر کا آغاز مسجد النبیؐ سے کیا گیا۔ یہی اسلام کی پہلی مسجد ہے، تاہم کئی مورخین اور محدثین نے مسجدِ قبا کو عہدِ اسلام میں تعمیر ہونے والی اولین مسجد قرار دیا ہے [۲] اس اختلافی مسئلہ کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے چند ایک روایات بھی سامنے رہنی چاہئیں تاکہ کسی نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی رہے اور کوئی الجھن باقی نہ رہے۔

۱۔ نقیع الخضمات کی پتھریلی نشیبی جگہ جہاں ہجرتِ رسول سے پہلے حضرت اسعدؓ بن زرارہ مسلمانوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے، بلکہ نمازِ جمعہ کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

۲۔ حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ جسے بیعت النساء (۲ سال قبل از ہجرت) کے بعد آں جناب نے یثرب میں اپنا نائب اور معلم بنا کر بھیجا، با جماعت نماز کا اہتمام کراتے رہے تھے۔ جگہ کا نام مذکور نہیں، تاہم اندازہ ہے کہ یہ جگہ قبا میں ہی کہیں تھی کیونکہ مہاجرین کو اسی بستی میں آکر ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا اور شاید آں حضرتؐ نے قبا میں چار روزہ قیام کے دوران اسی جگہ نماز پڑھی۔

۳۔ بنی سالم کی بستی جہاں رسالت مآبؐ کی معیت میں پہلی نمازِ جمعہ ادا کی گئی۔

۴۔ مسجد النبیؐ کی تعمیر سے قبل جب آپؐ کا قیام حضرت ابوایوبؓ انصاری کے مکان میں تھا، آپؐ ہر جگہ نماز ادا فرما لیتے جہاں نماز کا وقت آجاتا [۳] البتہ اُونٹ باندھنے کی جگہ پر نماز پڑھنے سے احتراز فرمایا مگر بکریوں کے باڑے میں نماز ادا فرمانے میں اباحت محسوس کی [۴]

۵۔ پہلی مسجد بنی زریق ہے جہاں سب سے پہلے قرآن پڑھا گیا [۵]

---

[۱] امام ابی یوسف۔ کتاب الخراج (یہ روایت آنجناب کی زرعی ترقیاتی منصوبے کے خلاف معلوم ہوتی ہے البتہ یہ بات ممکن ہے کہ خودرو درخت یا سبزہ کاٹنے سے منع کیا ہو۔ [۲] صحیح بخاری، کتاب التفسیر نیز مسلم۔ ترمذی وغیرہ ابواب مساجد، ہجرت، تعمیر، انسائیکلوپیڈیا لفظ مسجد شبلی ج ۱ ص ۱۲۷۔ سلیمان منصورپوری ج ۱ ص ۱۴۵ [۳] ابن ماجہ: ابواب المساجد نیز تاریخ طبری

[۴] ایضاً نیز صحیح مسلم، ابواب الصلوٰۃ [۵] سیرت ابن ہشام

اس کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہے کہ ان سب جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسجد کے لیے جگہیں مختص کر دی گئی ہوں گی اور قبا جہاں مہاجرین کا عارضی کیمپ تھا اقامت صلوات کا ایسا ہی کوئی انتظام کر لیا ہو گا۔ جب آنجنابؐ یہاں تشریف لائے تو اسی مقررہ جگہ پر نماز ادا فرماتے رہے جس طرح کہ بنی سالم کے محلہ میں نمازِ جمعہ ادا فرمائی۔ دوسرے، دیکھا جائے تو چار روز میں مسجد تعمیر کرنا عملاً محال تھا جبکہ اور بھی بے شمار معاملات فوری توجہ کے مستحق تھے۔ تیسرے، اکثر مورخین نے مسجد النبیؐ اور مسجد قبا کی تعمیر کے ذکر کو خلط ملط کر دیا ہے۔ بعض کتبِ سیر میں بعینہٖ وہی تفصیلات مسجد قبا کی تعمیر کے باب میں درج کی گئی ہیں جو دوسرے اصحابِ سیر نے مسجد النبیؐ کے ضمن میں بیان کی ہیں۔ البتہ طبری نے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے چل کر واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ اس سال قبا میں بھی مسجد بنائی گئی۔ چوتھے، مدینہ کی مسجد نبویؐ کو بلحاظِ تعمیر اولیت حاصل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قبائلی عصبیتوں اور گروہی عداوتوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو کم از کم ایک خاص مدّت تک دن میں پانچ مرتبہ ایک مرکز پر جمع ہونے کا موقع فراہم کر کے ان میں فکر و عمل کی وحدت اور ایک ملّت کے احساس کو اُبھارا جائے۔ پانچویں، مملکتِ اسلامیہ کے دار الخلافہ میں اسلام کی پہلی مسجد تعمیر ہونے کا تصور اسلامی تعلیمات سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اس طرح دنیا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ نئی ملّت کا دین اور دُنیا، عبادت اور سیاست، امارت اور امامت (صلوات) ایک دوسرے سے الگ اور جُدا نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے قبا کی بجائے مدینہ کی مسجد ہی کو اسلام کی اوّلین مسجد ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا تھا کیونکہ اسلامی حکومت کا دار السلطنت قُبا نہیں مدینہ تھا اور عہدِ رسالتمآبؐ میں مسجد النبیؐ کو جو احترام اور تقدس نصیب ہوا (اور ہے) کہ خود رسولِ خدا نے اس مسجد کو بیت المقدس اور بیتِ عتیق کے ہم پایہ قرار دے کر اس کی طرف سفر اختیار کرنے کی اجازت دی[1] اور پھر جس مسجد کو آں حضورؐ نے 'میری مسجد' کہا ہو[2] اس مسجد کے مرتبے کو دوسری کون سی مسجد پہنچ سکتی ہے۔ ان حقائق اور دلائل کے پیشِ نظر یہ بات زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید نے قُبا یا کسی اور مسجد کے بجائے مسجد النبیؐ کے بارے ہی میں اسس علی التقویٰ الخ[3] کے زرّیں الفاظ کہہ کر اسے خراجِ تحسین پیش کیا اور قولِ رسولؐ کی تصدیق کی ہو۔

مسجدِ نبویؐ کی تعمیر

مسجد کا سنگِ بنیاد رسول اللہؐ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور تعمیرات کے کام کی نگرانی حضرت عمار یاسرؓ کرتے رہے[4]۔ جس جگہ مسجد تعمیر ہوئی تھی اسے برابر کر دیا گیا۔ درخت آدھے کاٹ دیئے گئے تھے[5] اور انہیں قبلہ رُخ رکھ کر پتھروں سے بندش کر دی گئی[6]۔ اس طرف سے شاید کوئی پہاڑی ندی گزرتی تھی

---

[1] صحیح بخاری: ابواب مساجد، تفصیل
[2] صحیح مسلم و بخاری ایضاً
[3] القرآن۔ سورہ توبہ آیت ۱۰۸
[4] سیرت ابن ہشام
[5] تاریخ ابن خلدون
[6] صحیح بخاری۔ ابواب المساجد: عن انس

اور اس طرح پیش بندی کے طور پر وہاں پشتہ باندھا گیا۔ مسجد کا صحن شروع میں تنگ تھا مگر اس میں، فتح خیبر کے بعد، اضافہ کر کے وسیع اور کشادہ کر دیا گیا[۱] اضافی جگہ حضرت عثمانؓ نے خرید کر مسجد میں شامل کی[۲] صحن کچا تھا، بارش ہوتی تو مسلمانوں کے پاؤں اور کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو جاتے۔ بعد ازاں صحن کے فرش پر باریک کنکریاں لا کر بچھا دی گئیں[۳] صحن کے گرد چار دیواری بنائی گئی[۴] معلوم رہے کہ اس زمانے میں بیت اللہ کے احاطے کے گرد کوئی دیوار نہ تھی[۵] مسجد نبویؐ اور حجراتِ ازواجِ مطہراتؓ کے گرد شاہراہ کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی، یہ ایک طرح کی سرکلر روڈ تھی جو مسجد کے چوطرف گھومتی تھی۔ مسجد کے تین اطراف تین دروازے تھے[۶] ایک دروازے کا نام باب[۷] القضاۃ (مسلم) اور دوسرے کا نام باب النساء[۸] تھا۔ یہ نام شاید بعد میں مشہور ہوئے ہوں۔

مسجد کی عمارت دھوپ میں پختہ کی ہوئی اینٹوں (واحد، لَبِن) سے بنائی گئی البتہ بنیادیں پتھروں سے تیار کی گئیں۔ عمارت زیادہ بلند نہ تھی[۹] شروع شروع میں چھت پر سایہ کی غرض سے کھجور کی شاخیں ڈال دی گئیں۔ بعد ازاں مٹی سے اسے لیپ دیا گیا۔ بارش ہوتی تو چھت ٹپکتی اور کیچڑ پھیل جاتی[۱۰] حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں کھجور کی شاخیں گل گئیں تو انہیں بدلوا کر نئی چھت ڈالی گئی۔ حضرت عمرؓ کے دورانِ خلافت صحنِ مسجد میں اضافہ نہ کرنے کے علاوہ چھت بھی بدلوائی گئی۔ مگر اسے ایسا ہی رکھا گیا جیسا کہ عہدِ رسالت میں تھی یعنی سترہ اٹھارہ برس میں مسجد کی چھت کم از کم تین مرتبہ بدلوا کر از سرِ نو ڈلوانے کی ضرورت پیش آئی البتہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ حکومت میں مسجد کی تعمیرِ نو کا جامع منصوبہ بنایا۔ بعض حضرات صحابہؓ کی شدید نکتہ چینی اور مخالفت کے باوجود مسجد کی دیواریں پختہ، چونا گچ اور منقش اٹھائی گئیں۔ چھت ساگوان کی لکڑی کی تیار کی گئی[۱۱] عہدِ رسالت میں جو مسجد کھجوروں کا ایک منڈوا (مسجد هم ضيقاً، مقارب السقف انما هو عريش[۱۲]) معلوم ہوتی تھی اب وہاں ایک عظیم الشان عمارت بنا دی گئی۔

مسجد میں چھ ستون کھجور کے تنوں کے کھڑے کیے گئے۔ جن کھجور کے درختوں کو کاٹ کر مسجد کے لیے جگہ صاف کی گئی تھی ان کا پشتہ باندھنے کے علاوہ مسجد کی تعمیر میں بھی انہیں استعمال میں لایا گیا۔ مسجد کے دروازوں کے چوکھٹ پتھروں کے ٹکڑوں اور

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد"

۲۔ ترمذی: باب المناقب

۳۔ صحیح بخاری: ابواب الصلوٰۃ

۴ و ۵۔ کریسیٹ ویل۔ ص ۴ مسجد کی چار دیواری سات کیوبٹ (CUBIT) اونچی تھی۔ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ "مسجد"

۶۔ کریسیٹ ویل: مسلم ارکیٹیکچر۔ ص ۲

۷۔ صحیح مسلم: ابواب مساجد/صلوٰۃ

۸۔ موطا امام مالک: کتاب الصلوٰۃ

۹۔ کریسیٹ ویل ص ۴ اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

۱۰۔ صحیح بخاری: کتاب ابواب الصلوٰۃ

۱۱۔ ابی داؤد: کتاب الطہارت

۱۲۔ ایضاً

کھڑکی کے بنائے گئے[۱]۔ اگرچہ وضاحت نہیں ملتی، تاہم اندازہ ہے کہ دروازے ایک کواڑ کے تھے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مکان کا دروازہ ایسا ہی تھا۔[۲]

شروع ایام میں قبلہ شمال کی طرف (بیت المقدس) تھا اور عمارت بھی اسی سمت تھی۔ تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد شمالی عمارت برقرار رکھی گئی البتہ جنوب میں اور عمارت بنا دی گئی۔ پہلی عمارت نوارد مہاجرین، غریب اور نادار اصحاب (صفہ) کے استعمال کے لیے مختص کر دی گئی مگر کریسٹ[۳] ویل کی رائے ہے کہ نادار اصحابؓ کے لیے عمارت جنوب مغربی سمت میں تھی۔ یہ شاید مسجد کی عمارت کا تعمیر اکڑا تھا اور شاید مسجد کے اسی کونے کو حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں بیت بازی اور گپ شپ کے لیے مختص کر دیا ہو[۴]۔ اس حصّہ کو "بُطیحاء" کہا جاتا تھا۔ خیمے مسجد کے اندر لگائے جا سکتے تھے[۵] اور غیر مسلم، مشرکوں اور یہود و نصاریٰ کو مسجد میں آنے کی اجازت تھی۔[۶]

وضو اور طہارت کے لیے مسجد میں آب رسانی کا مناسب انتظام تھا۔ مسجد کے سامنے والے دروازے کے نزدیک کھجور کے جُھنڈ میں کنواں تھا۔[۷] مسجد میں بہت جلد حمام اور طہارت خانے بھی بن گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ مسجد تعمیر کی گئی وہاں مشرکوں کی قبریں تھیں۔ قبرستان کو مسجد بنانے کے لیے منتخب کرنا محض اتفاق نہ تھا بلکہ رسول اللہؐ کے سوچے سمجھے منصوبے کا ایک حصّہ تھا۔ یثرب میں گروہ بندیوں اور تعصبات کے سبب ہر قبیلے کا علیحدہ قبرستان تھا۔ اِن قبرستانوں کو برقرار رکھ کر مسلمانوں کو بھی انہی قبرستانوں میں دفن کرنے کی اجازت دینے سے دُو خرابیاں پیدا ہوتیں۔ اوّلاً ملتِ واحدہ کا تصوّر نہ اُبھر سکتا، ثانیاً صالحین اور مشرکین کے ایک جگہ دفن ہونے سے اُن کے (مشترک) ورثاء کے دماغوں میں اسلام اور جاہلیت کا فرق واضح ہو سکتا اور نہ عقیدۂ توحید اور شرک کے درمیان حدِ فاصل کھینچی جا سکتی۔ ایک دُوسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ اُنہیں مخلوط قبرستانوں میں بدلنے کے بجائے آثارِ قدیمہ سمجھ کر باقی رکھا جاتا جس طرح ہمارے ملک میں گوروں کے قبرستان موجود ہیں ——— مگر یہ بات بھی مذہبی اور تمدنی مصالح کے خلاف تھی۔ اور اسلام میں ایسے آثارِ قدیم کے باقی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں جن سے معاشرے میں انتشار اور عقیدے میں فساد پیدا ہو۔ عہدِ جاہلیت کے بُت کدوں، دیوی دیوتاؤں کے استھانوں، متبرک مقامات اور مقدس اشیاء پر بھی یہی اصول چسپاں ہوتا ہے۔ لہٰذا رسالت مآبؐ نے بُت کدے اور قبرستان مسمار کرا دینے اور اس جگہ مسجدیں بنا دینے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا

---

۱ کریسٹ ویل نیز ابی داؤد

۲ دیکھیے ارلی مسلم آرکیٹیکچر ص ۴ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ "مسجد"

۳ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ

۴ ابی داؤد، صلوٰۃ

۵ سیرت ابن ہشام: ابن الاثیر۔ صحیح مسلم و بخاری وغیرہ

۶ نسائی، غسل

اور اندازہ ہے کہ ابتدائی زمانۂ اسلام میں مدینہ یا بیرونِ مدینہ جتنی مسجدیں تعمیر ہوئیں اکثر و بیشتر بُت خانوں کو ڈھا کر یا قبرستانوں کو ہموار کر کے تعمیر کی گئیں۔ مسجد النبیؐ کے علاوہ دو اور واضح مثالیں اس بات کی تصدیق کے لیے موجود ہیں۔ طائف کے اسلامی گورنر حضرت عثمان بن ابی العاصؓ اور [۱] (اپنے قبیلے اور وفد کے سردار) طلحہ بن علی حنیفیؓ کو حکم دیا گیا کہ وُہ بُت خانے اور گرجے کو گرا کر وہاں مسجدیں بنا دیں۔ یثرب کے مشرکین کی قبریں پختہ اور چُونے گچ ہوتیں اور اُن پر عمارت یا گنبد ہوتا۔ بعید نہیں کہ مسجدوں کے بنانے میں قبروں کا تعمیراتی سامان اکھیڑ کر استعمال کیا گیا ہو۔ مسجد النبیؐ کی تعمیر کے سلسلے میں یہ روایت ملتی ہے کہ اس کی بنیادیں پتھر سے اٹھائی گئیں (حالانکہ باقی مسجد کچی اینٹوں کی تھی)، ممکن ہے یہ پتھر اکھڑی ہوئی قبروں کے ہوں اور اسی طرح مشرکوں کے بُت کدوں اور نصاریٰ کے گرجوں کا تعمیراتی سامان مسجدیں بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔

مسجد النبیؐ، مدینہ کے عین وسط میں بنائی گئی۔ محلِ وقوع کی وجہ سے بے شمار سیاسی، معاشرتی اور مذہبی فوائد حاصل کئے گئے۔

ازواجِ مطہراتؓ کے حُجرے

مسجد النبیؐ سے ملحق دو حجرے (چھوٹے مکان[۲]) ازواجِ مطہراتؓ کے لیے تعمیر کئے گئے اس وقت آپؐ کی دو بیویاں تھیں اور دُوسری کی رخصتی بھی مدینہ آنے کے چند ماہ بعد ہُوئی۔ یہ مکانات مسجد کے مشرق میں تھے۔ ازاں بعد مکانات کی تعداد نو ہو گئی۔[۳] آنجنابؐ کے ہر نئے نکاح کے بعد نیا مکان بنا لیا جاتا۔ حجروں کی چار دیواری کچی تھی اور یہ حُجرے ایک دُوسرے سے متصل تھے[۴]

یہ مکانات جس میں آپؐ اور آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ رہائش پذیر رہے، آپؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشین حضرت ابوبکرؓ کو منتقل ہو گئے۔ حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین بنے تو وُہ بھی یہیں رہتے رہے، اور حضرت عثمانؓ نے جب مملکتِ اسلامیہ کی زمامِ اقتدار سنبھالی تو وُہ بھی انہی مکانات میں اقامت گزیں ہُوئے اور یہیں شہید ہُوئے[۵] ——— باوجودیکہ ان حضرات گرامیؓ کے اپنے اپنے مکانات بھی تھے مگر وُہ رہتے مسجد کے نزدیک والے مکانوں میں رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا ذاتی منزلہ مکان سُنح میں تھا۔ حضرت عمرؓ محلہ امیہ بن زید میں سکونت رکھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کا مدینۃ الرسولؐ کے بازار میں نہایت شاندار مکان بلکہ محل تھا۔ گویا حُجراتِ ازواجِ مطہراتؓ کی حیثیت ایوانِ صدر (PRESIDENT HOUSE) کی تھی۔ جو تعمیر ہی اس لیے ہُوئے تھے کہ مسلمانوں کا حکمران اس جگہ اقامت گزیں ہو کر معاملات کو بآسانی نپٹا سکے۔ دُوسرے، اسلام میں مذہب اور سیاست ناقابلِ تقسیم ہیں اور رسالتمآبؐ مسلمانوں کے حکمران، منتظمِ اعلیٰ اور خدا کے رسول تھے تو مسجد

---

[۱] ابن ماجہ: کتاب المساجد والجماعت۔ نیز ابی داؤد: طہارت

[۲] نسائی: ابواب الاذان

[۳] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد" (تاہم کریسٹ ویل نے چار تعداد بتائی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے)

[۴] کریسٹ ویل: ارلی مسلم ارکٹیکچر ص ۵

[۵] انسائیکلو پیڈیا "مسجد" (موطا امام مالک: الجامع)۔ عائشہ صدیقہؓ کسی دوسرے مکان میں چلی گئی تھیں۔

مسلمانوں کا عبادت خانہ اور اسلام کی پوری معاشرتی اور سیاسی زندگی کا محور اور مرکز تھی بلکہ اسے دار الامارت کہنا زیادہ صحیح ہے[1] اس لیے ایوانِ صدر کا دار الامارت کے ملحق و متصل واقع ہونا ضروری تھا تاکہ انتظامی امور اور سیاسی و مذہبی معاملات سلجھانے کے لیے سربراہِ مملکت ہر وقت موقع پر موجود رہیں[2]۔ آں جنابؐ کے جدِ اعلیٰ قصی نے فتح مکہ کے بعد جب وہاں شہری ریاست کی داغ بیل ڈالی اور اپنے تعمیری منصوبے پر عمل کرتے ہوئے شہر کو بسایا تو بیت اللہ کو از سرِ نو تعمیر کرا کے اپنا مکان (دار الندوہ) اور اپنے اقاربؓ کے مکانات کعبہ کے متصل بنوائے تھے اور قدیم اقوام کا نوآبادکاری کا طریقہ بھی یہی تھا کہ شہر کے وسط میں مقدس عمارت ہوتی اور حکمران، ذی اثر افراد کی رہائش گاہیں اس کے گرد یا متصل ہوتیں[3]۔

آں حضورؐ کے بعد بصرہ، کوفہ اور فسطاط کی نوآبادیاں (COLONIES) بعینہٖ مدینۃ الرسول کے نقشے پر بنائی گئیں[4]۔

آئیے ذرا اس "صدارتی محل" کو بھی دیکھتے چلیں جو مسلمان فرماں رواؤں کے رہنے کے لیے بنایا گیا تھا اور جہاں سرورِ دوجہاں آقائے نام دار، جنابِ رسولِ مقبولؐ گیارہ سال تک رہائش پذیر رہے اور (آخری تین سال میں) اسی محل میں رہتے ہوئے پورے جزیرۃ العرب پر حکمرانی کرتے رہے۔

یہ مکان کچی اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں مدینہ میں پتھروں کو تراش کر مکانات بنانے کا عام رواج تھا، مگر سرمائے اور وقت کی کمی کی وجہ سے اسلامی ریاست ان شاہ خرچیوں کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اور جب وسائلِ آمدن وسیع ہو گئے تو اس وقت بھی ان میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہ کیا گیا۔ ہر مکان ایک کمرے اور ڈیوڑھی پر مشتمل تھا جس کے گرد مختصر سی چار دیواری تھی۔ حویلی کا عرض کمرے کے دروازے سے مکان کے دروازے تک چھ، سات ہاتھ تھا۔ مکان کے سامنے بیٹھنے کے لیے چبوترہ بھی تھا۔ ہر کمرے کی اندر سے لمبائی اندازاً دس ہاتھ اور چوڑائی سات آٹھ ہاتھ تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا کمرہ قبلہ رخ تھا اور اس کے دروازے کا ایک کواڑ تھا۔ کواڑ کی لکڑی ساگو ان کی تھی۔ اس کا عرض ۲×۲ فٹ تھا۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ ہاتھ چھت کو لگتا تھا[5]۔ حضرت عمر فاروقؓ نے شاید اس لیے یہ فرمان جاری کیا کہ مکانات کی چھتیں اونچی مت بناؤ[6]۔ شروع میں مکانات کے دروازے مسجد میں بھی کھلتے تھے مگر بعد ازاں انہیں بند کرا دیا گیا[7] تاہم حضرت

---

۱ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ مسجد ۲ مکہ کے حکمران ص ۲۸

۳ انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا آف سوشل سائنسز تحت لفظ "CITY AND TOWN PLANNING" از LEWIS MAMFOVAL

جلد دوم ـ ص ۴۵۱ ـ ۴۵۰

۴ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد"

۵ ایضاً ـ کریسٹ ویل نیز ترمذی، کتاب التفسیر

۶ امام بخاری: ادب المفرد ۳۴۴/۱۰ ـ ۲۱۲/۴

۷ ابی داؤد، کتاب الطہارت عن عائشہ ـ کریسٹ ویل

عائشہؓ کے مکان سے ایک چھوٹی سی کھڑکی مسجد[1] میں باقی رکھی گئی جو وصالِ نبیؐ تک رہی۔ کچے مکانات کو جب لپائی یا مرمت کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہؐ یہ کام بسا اوقات خود انجام دیتے۔ کبھی کوئی صحابی ہاتھ بٹا لیتا[2]۔ مدینہ میں رہنے والے صحابہؓ کے مکانات بھی کچے تھے۔ صحابہؓ بھی لپائی اور مرمت خود کر لیا کرتے تھے[3]۔ آں جنابؐ کی یہ سادگی اور قناعت اسلامی تعلیمات کے عین مطابق تھی۔

قرآن میں رفیع الشان اور عظیم عمارات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا[4]۔ آپؐ کا ارشاد[5] ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ لوگ بلند اور منقش عمارات نہ بنانے لگیں گے اور یہ کہ ماسوائے ضرورت کے مکان تعمیر کرنے میں کوئی بھلائی نہیں[6]۔ تاہم آپؐ کے ایک دو منزلہ مکان کا بھی تذکرہ ملتا ہے جہاں آپؐ ایلاء کے ایّام میں عزلت گزیں رہے اس مکان کا زینہ نہایت کشادہ تھا۔ اترتے چڑھتے وقت یُوں معلوم ہوتا گویا زمین پر چل رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ مکان آپؐ کو یہود کے اخراج کے بعد ان کی کسی بستی میں فئے کے طور پر ملا ہو اور آپؐ نے خود اپنے لیے تعمیر نہ کیا ہو جیسا کہ کریسٹ ویل نے کہا ہے؛

"THE PROPHET HAD NO ARCHITECTURAL AMBITIONS."

شاید اسی دو منزلہ مکان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ منتقل ہو گئیں۔ وصالِ نبیؐ کے بعد اُن کا وسیع مہمان خانہ، جس کا ذکر کتب احادیث و سیر میں ہے (ادب المفرد: بخاری) اسی مکان میں تھا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ عائشہ صدیقہؓ کے مکان کا کمرہ ہی آپؐ کی آرام گاہ بنا۔

مسجد النبیؐ اور ازواجِ مطہراتؓ کے حجرات کی تعمیر کا کام کم و بیش ایک سال ہوتا رہا اور ہجرت کے دُوسرے سال ماہِ صفر[7] یا اگست/ستمبر[8] ۶۲۳ عیسوی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

دارالخلافہ کی تعمیر کا منصُوبہ ہجرت کی فرضیت کے حکم کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سیلاب اُمڈ پڑا اور آخر کار مدینہ میں مقامی باشندوں کے مقابلے میں مہاجرین کی تعداد کئی گُنا بڑھ گئی[9]۔ ان نو واردوں کی آبادکاری (Rehabilitation) کے متعلق آں حضورؐ نے شروع دن ہی سے ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ بدقسمتی سے

---

[1] نسائی۔ صحیح مسلم۔ ابی داؤد (طہارت۔ اعتکاف وغیرہ)

[2] و [3] ادب المفرد ۲۱۳

[4] القرآن، سورۃ الشعراء: آیات ۱۲۸، ۱۲۹۔ سورۃ الفجر: آیات ۶-۱۴۔ سورۃ الحجر: ۸۵-۸۴

[5] ادب المفرد ۲۱۲/۱ ، ۲۱۶/۱

[6] ترمذی

[7] تاریخ طبری

[8] منٹگمری واٹ: اسلام ص ۶۳

[9] صحیح بخاری: ابواب ہجرت

اس منصوبے کی جزئیات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد مورخین نے اس موضوع پر ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے ۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے رسول اللہؐ نے نو آبادی (COLONIZATION) اور شہری منصوبہ بندی (TOWN PLANNING) میں عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا۔ نو واردوں کی اتنی بڑی تعداد (FLUX OF IMMIGRANTS) کو اتنے محدود وسائل کے باوجود رہائش اور کام کی فراہمی کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ پھر مختلف نسلوں ، طبقوں ، علاقوں اور مختلف معاشرتی و تمدنی پس منظر رکھنے والے لوگ مدینہ میں آ آ کر جمع ہو رہے تھے ۔ ان سب کو سماجی لحاظ سے اس طرح جذب کر لینا کہ ان میں غریب الدیاری اور بیگانگی کا احساس اُبھرے ، نہ مدینہ کے ماحول میں کوئی خرابی پیدا ہو اور نہ قانون شکنی اور اخلاقی بے راہروی کے رجحانات جنم لیں — جیسا کہ عام طور پر ایسے حالات میں ہوتا ہے — رسول کریمؐ کا ایسا زندۂ جاوید کارنامہ ہے جو ماہرین عمرانیات کے لیے خاص توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے ۔ جدید شہروں میں آبادی کے دباؤ سے پیدا ہونے والے تمدنی ، سیاسی اور اخلاقی پیچیدہ مسائل سے نپٹنے کے لیے سیرت النبیؐ سے ماہرین بلاشبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ۔ دنیا کو سب سے پہلے رسالتمآبؐ نے اس راز سے آگاہ کیا کہ محض سنگ و خشت کی عمارات کے درمیان میں کوچہ و بازار بنا دینے کا نام شہری منصوبہ نہیں ؎۱ بلکہ ایسا ہم آہنگ اور صحت مند تمدنی ماحول فراہم کرنا بھی ناگزیر ہے جو جسمانی لذت ، رُوحانی بالیدگی ، دماغی اطمینان اور قلبی سکون عطا کر کے اعلیٰ انسانی اقدار کو جنم دے اور تہذیب انسانی کے نشو و نما کا سبب بن سکے ۔

دار الخلافہ کی تعمیر کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب اور اس غرض کے لیے وسیع قطعۂ اراضی پہلے ہی حاصل کر لیا گیا تھا۔ مسجد اور ازواج مطہراتؓ کے لیے مکانات بن جانے کے ساتھ دار الخلافہ کی تعمیر کا پہلا مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ دُوسرے مرحلے کا آغاز نو وارد مہاجرین کی اقامت اور سکونت کے لیے مختصر مکانات (QUARTERS) کی تعمیر سے کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ تعمیرات کے اس دُو مرحلہ جاتی منصوبے پر ایک سال یا اس سے کچھ زاید عرصہ لگ گیا۔ ورنہ صرف مسجد اور دُو حجرے بنانے کے لیے کسی صورت میں بھی ایک سال کا عرصہ نہیں لگ سکتا تھا۔ خصوصاً جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی عمارت بہت مختصر سی تھی اور دُو حجرے ، ایک ایک کمرے پر مشتمل تھے اور بروایت ابن ہشام و طبری وغیرہ مسجد اور حجروں کی تعمیر میں تقریباً سب مسلمانوں نے شرکت کی اور بڑے جوش و جذبوں کے ساتھ کام کیا ؎۲۔ اس صورت میں مسجد اور حجروں کی تعمیر کو بہت جلد مکمل ہو جانا چاہیے تھا ——— پھر ایک سال کی مدت کیسے صرف ہُوئی ؟ روایات اس بارے میں خاموش ہیں اور مورخین نے بھی اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی ہے ۔ اصل بات یہ تھی کہ اتنا زیادہ وقت منصوبے کے دُوسرے مرحلے کو عملی جامہ پہنانے میں صرف ہُوا اور منصوبے کے دُوسرے حصّے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تمام مہاجرین اور انصار بھی جوش اور

؎۱ انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز لفظ "شہر و شہری منصوبہ بندی" از ولیم ۔ بی ۔ منرو ص ۴۸۱

؎۲ طبری سیرت ابن ہشام ۔ صحیح بخاری وغیرہ ۔

ولولے کے ساتھ کام کرتے رہے جس کا ذکر اکثر مورخین نے کیا ہے۔

مہاجرین کی آبادکاری

شہر نو، مدینۃ الرسول، ایک لحاظ سے "مہاجر بستی" تھی۔ گو سارے مہاجر وہاں اقامت نہ رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ عوالی کی بستی سُنح میں رہتے تھے[1]، اور حضرت عمر فاروقؓ بنی امیہ کے قریہ میں بس گئے تھے[2] اور مدینہ میں بھی انصار کے اکا دُکا مکانات موجود ہونے کے شواہد ہیں۔ ایک انصاریہ کا کشادہ مکان (دار[3]) مدینہ کے کہیں ایک کنارے پر تھا[4]۔ ہو سکتا ہے جب مدینہ کی آبادی بڑھی ہو تو مکانات اور تعمیرات کا سلسلہ پھیل کر عہدِ رسالت مآبؐ ہی میں قریب کی آبادیوں بنی ساعدہ، بنی النجار وغیرہ سے مل گیا ہو ورنہ ریاست کی پالیسی یہ تھی کہ مدینہ کی کاؤنی میں صرف مہاجرین کو بسایا جائے۔ عوالی میں رہنے والے بنو سلمہ کے قبیلے نے جب مدینہ آکر آباد ہونے کی درخواست کی تو آپؐ نے اسے نامنظور کر دیا اور انہیں اپنے قریہ ہی میں رہنے کی ہدایت کی[5]۔ ریاست کی نوآبادی سکیم کا یہ بھی ایک اہم حصہ تھا کہ اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ کر مدینہ آنے والے لُٹے پٹے، بے سروسامان اور بے یار و مددگار مہاجروں کے قافلوں کو جائے رہائش سرکاری طور پر فراہم کی جائے بلکہ ان نوواردوں کو سرکاری مہمان خانے میں ٹھہرایا جاتا اور ان کے کھانے اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی سرکاری طور پر کیا جاتا۔ بعد ازاں ان لوگوں کو مستقل رہائش کے لیے جگہ یا مکان مہیا کرنا بھی حکومت کا فرض تھا۔ گویا مہاجرین کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کی فراہمی اسلامی حکومت کے سپرد تھی اور ہم دیکھیں گے حکومت اس بہت بھاری ذمہ داری سے مالی عُسرت اور اقتصادی وسائل کے فقدان کے باوجود، کس طرح خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوئی۔

مہاجرین کی عارضی رہائش کا انتظام مسجد کے اندر کیمپ لگا کر یا صفہ میں کیا جاتا۔ اگر مہاجرین کی تعداد زیادہ ہوتی یا قافلہ پورے قبیلے پر مشتمل ہوتا تو انہیں عموماً شہر کے باہر خیموں میں ٹھہرایا جاتا ——— تاآنکہ مستقل رہائش کا معقول انتظام نہ ہو جاتا ——— ایک حبشی عورت اسلام لانے کے بعد مدینہ میں آئی تو اسے مسجد میں خیمہ لگا کر یا چھوٹے حجرے میں ٹھہرایا گیا[6]۔ اسی طرح ایک 'بدو' جو بعد میں مرتد ہو کر مدینہ سے بھاگ گیا[7]، مسجد میں رکھا گیا تھا۔ بنی اسد کا (پورا) قبیلہ جب ہجرت کر کے آیا تو وہ شہر کے جنوب مشرق میں بقیع الغرقد میں اُترا اور خیمے لگا کر رہتا رہا[8]۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰؓ اور اُن کے ساتھی حبشہ سے دوسری ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو شہر کے مغرب کی سمت میں بطحان کے نزدیک ان کا کیمپ لگایا گیا[9]۔

آبادکاری (REHABILITATION) کے دو طریقے اختیار کیے گئے، اوّلاً یا تو کسی ذی ثروت انصاری کو کہہ دیا جاتا کہ

---

[1] ابن ماجہ: باب وفات الرسول نیز طبقات ابن سعد

[2] طبقات ابن سعد

[3] سیرت ابن ہشام

[4] ابن ماجہ: باب المسجد

[5] ترمذی: کتاب التفسیر سورۃ یاسین نیز ابن ماجہ، مسلم، بخاری وغیرہ

[6] و [7] صحیح بخاری: ابواب المساجد

[8] موطا، امام مالک، کتاب الجامع و ابن ماجہ ابواب المساجد (فی الخروج یوم العیدین من طریق ....)

[9] صحیح مسلم: ابواب الصلوٰۃ (عیدین)

وہ ایک مہاجر کی رہائش کا اپنے ہاں انتظام کرے ——— مگر خیال ہے کہ صرف شروع کے ایام میں ایسا کیا گیا جبکہ اسلامی ریاست صحیح طرح صورت پذیر ہوئی تھی اور نہ منظم اور رسولِ خداؐ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔ بہت جلد یہ طریقہ ترک کر دیا گیا کیونکہ بعد کے واقعات میں اس طرح کے رشتۂ مواخاۃ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ثانیاً ریاست مہاجرین اور خصوصاً افلاس زدہ مہاجرین کے لیے چھوٹا سا مکان (QUARTER) خود فراہم کرتی۔ مہاجروں کو ٹھہرانے کے لیے عموماً بڑے بڑے مکانات تعمیر کیے گئے۔ کنواروں کے لیے ایسے مکانات علیحدہ[1] تھے اور شاید عیال داروں کے لیے علیحدہ۔ یہ مکانات کئی کمروں پر مشتمل تھے ایک کمرہ ایک خاندان کو دیا جاتا۔ البتہ ایسے مکانات میں باورچی خانہ وغیرہ مشترکہ ہوتا[2]

بعض لوگوں کو علیحدہ کوارٹرز بھی مہیا کیے گئے۔ حضرت صہیبؓ کو ایک ایسا مکان ملا تھا[3] جو دو کمروں اور ایک ڈیوڑھی پر مشتمل تھا۔ شاید حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسی لیے یہ حکم جاری فرمایا کہ کوفہ و بصرہ کے لوگ تین کمروں سے زیادہ کا مکان نہ بنائیں اور عام سپاہیوں کے لیے سرکاری خرچ سے جو مکانات تعمیر کیے گئے وہ بھی تین ہی کمروں پر مشتمل تھے[4]۔ صہیبؓ کے مکان اور حضرت عمرؓ کے فرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے مدینہ کی کالونی میں سرکاری طور پر علیحدہ رہائش کے لیے جو مکانات بنوائے وہ تین کمروں کے تھے۔ حضرت عمار یاسرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کو بھی سرکاری کوارٹر دیئے گئے۔ خالد بن ولیدؓ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے مگر انہیں مکان کہیں مسجد النبیؐ کے نزدیک (متصل) فراہم کیا گیا[5]۔ شاید اس مکان کا پہلا مکین کسی اور جگہ منتقل ہو گیا ہوگا اور نقل مکانی کی ایسی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ مدینہ کی شدید آب و ہوا تھی جس کی وجہ سے لوگ مرتد ہو کر ہجرت سے پلٹ جاتے۔ یہاں تک کہ آنجنابؐ کو یہ اعلان جاری کرنا پڑا کہ معاشی تنگی اور شدتِ بخار سے عاجز آ کر جس نے مدینہ کو چھوڑا اللہ مدینہ کو اس سے بہتر آدمی دے گا[9]۔ حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت جعفر طیارؓ کی صورت میں واقعی مدینہ میں اپنے عہد کے بہترین لوگ رونق افروز ہوئے۔ رسول اللہؐ کے الاٹ کردہ کوارٹر پر آلاٹی کا مستقل حقِ ملکیت قائم ہو جاتا تا آنکہ مالک نقل مکانی، ارتداد وغیرہ کی وجہ سے حقِ ملکیت سے خود دستبردار نہ ہو جاتا۔ (صہیبؓ کے مقدمہ کی تفصیل صحیح بخاری، احکامات میں دیکھئے۔ یہ مقدمہ مروان کے سامنے پیش ہوا تھا جب کہ وہ مدینہ کا گورنر تھا)

---

[1] تاریخ طبری : اس کا نام کنواروں کا مکان پڑ گیا تھا۔

[2] ادب المفرد : امام بخاری ۲۰۹ [3] صحیح بخاری : احکام

[4] شبلی نعمانی : الفاروق ص ۲۲۵ (۱۹۷۱ء)

[5] ابن ماجہ : کتاب الصلوٰۃ [6] و [7] سنن ابی داؤد

[8] موطا امام مالک : اعتکاف

[9] صحیح بخاری : ابواب ہجرت : فضائل مدینہ نیز موطا امام مالک : جامع

یہ بات واضح نہیں ہے کہ مکانات کی تعمیر اور آبادکاری کی سکیم پر اُٹھنے والے اخراجات حکومت نے کس طرح برداشت کیے ہوں گے۔ خصوصی چندہ یا رضاکارانہ ٹیکس (جسے بعد ازاں عُشر اور زکوٰۃ کے نام سے مستقل کر دیا گیا) کے ذریعے یہ رقم جمع کی جاتی ہو گی یا پھر مہاجرین سے جن لوگوں کی حالت قدرے بہتر ہوتی انہیں تعمیر شدہ مکان دینے کی بجائے حاصل کردہ اراضی (ACQUIRED LAND) میں سے رہائشی پلاٹ فراہم کر دیا جاتا اور مکان وغیرہ بنانا اس کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس زمانے میں جس طرح کے مکانات بنتے ان کے بنانے کے لیے سرمایہ کی نہیں محنت (LABOUR) کی ضرورت تھی، جو آپ کے پاس بافراط موجود تھی۔ لہٰذا اس غرض کے لیے سرمایہ کی فراہمی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

شہر کی توسیع تعمیرات کا یہ سلسلہ بہت دیر تک برابر جاری رہا، یہاں تک کہ بنی قینقاع کے اخراج (۲ ہجری) کے بعد مکانات کی خاصی تعداد مسلمانوں کے ہاتھ آجانے کے سبب رہائشی قلت بہت حد تک دُور ہوگئی مگر یہ مسئلہ ختم نہ ہوا کیونکہ رہائشی سہولتوں کے مقابلے میں نو واردوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اس لیے ۵ سال ہجری (بنی قریظہ کی فتح) تک یہ مسئلہ سنگین نوعیت کا تھا۔ اس کے بعد اسلامی حکومت کے آمدنی کے وسائل بھی پیدا ہو گئے، مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی قدرے سنبھل گئی، یہودیوں کے بہت سے مکانات بھی مل گئے لہٰذا معاملہ کی سنگینی بڑی حد تک کم ہو گئی تاہم آبادکاری کا کام فتح مکہ (۸ ہجری) اور اس کے بعد بھی جاری رہا۔ فتح کے ساتھ ہی چونکہ ہجرت کی فرضیت کا حکم منسوخ ہو گیا اس لیے مدینہ میں مہاجرین کی آمد کا سلسلہ رُک گیا۔ تاہم کئی لوگ بعد از فتح مکہ بھی مدینہ میں آکر آباد ہوئے[۱] اور حصولِ تعلیم وغیرہ کے لیے آنے والوں کا بھی تانتا بندھا رہا[۲]۔

---

[۱] فتح مکہ کے بعد ہجرت کر کے آنے والے لوگوں میں حضرت عباسؓ، حضرت امیر معاویہؓ و ابوسفیانؓ مشہور ہیں۔ ان حضرات کی مہاجرت کی مورخین و محدثین نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت عباسؓ اسلام فتح مکہ سے بہت پہلے لا چکے تھے اور بعض مصلحتوں کی وجہ سے آں حضورؐ کے حکم سے مکہ ہی میں ٹھہرے رہے یا یہ کہ وہ فتح سے قبل ہی نکل کر مدینہ کی طرف آ رہے تھے یا یہ کہ ابوسفیان وغیرہ کو آنحضورؐ نے خصوصی طور پر ہجرت کی اجازت دی۔ اور بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ چونکہ فتح مکہ کے بعد اعلان معافی کر دیا گیا لہٰذا قریش کے لوگ ہجرت کر کے آسکتے تھے (تفصیل کے لیے دیکھئے زاد المعاد، ابن قیم، مدارج النبوت وغیرہ) یہ سب توجیہات قابلِ قبول نہیں ہیں اور تاریخی تنقید کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتیں۔ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ مورخین نے فرضیتِ ہجرت کی تنسیخ کے حکمنامہ کو امتناع ہجرت کا حکم سمجھ لیا حالانکہ ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ قبل از فتح اسلام لانا اور ہجرت کرنا لازم و ملزوم تھا۔ بغیر ہجرت کے کسی کا اسلام قبول ہی نہیں کیا جاتا تھا (القرآن، الانفال: ۷۲۔ ام ابی یوسف، ابی عبید، بخاری و مسلم) سوائے اس کے رسول اللہؐ بعض سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر کسی کو خصوصی اجازت دے دیں (حمید اللہ: سیاسی زندگی) مگر فتح کے بعد اسلام لانے کے ساتھ ہجرت کرنے کی شرط اڑا دی گئی۔ جو شخص اسلام لانے کے بعد ہجرت کرنا چاہتا اس کے لیے کوئی شرعی امر مانع نہ تھا کیونکہ آنحضورؐ کا یہ اعلان کہ لا ہجرت بعد الفتح (بخاری، مسلم، ابی داؤد) تحریم تنزیہی کے زمرے میں آتا ہے۔ [۲] مصنف کا مضمون "عہد نبویؐ کا نظامِ تعلیم" اسلامی تعلیم جلد ۱، شمارہ ۱

اخیر عہد نبویؐ میں مدینہ کا شہر مغرب میں بطحان تک ، مشرق میں بقیع الفرقد تک ، اور شمال مشرق میں بنی ساعدہ کے مکانات تک پھیل چکا تھا اور رسول اللہؐ نے اب وہاں مزید مکانات تعمیر کرنے سے روک دیا ۔ شہری منصوبہ بندی کے ضمن میں آنجنابؐ کا یہ اقدام زبردست اہمیت کا حامل ہے ۔ اس کی اہمیت کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جنہیں جدید صنعتی شہروں کی گھمبیر ، اخلاق باختہ اور انتشار انگیز معاشرت کا قریبی مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے اسی لیے آپؐ نے شہرِ نو (مدینہ) کو ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہونے دیا اور اس شہر کی زیادہ سے زیادہ حد پانچ سو ہاتھ[1] مقرر کی اور فرمایا کہ شہر کی آبادی اس حد سے بڑھ جائے تو نیا شہر بسائیں[2] اور آپؐ نے اپنی زندگی میں ہی اس اصول پر عمل کرتے ہوئے دو اقدام کیے ، ایک یہ کہ اضافی آبادی کو یا تو اور زمینوں میں منتشر کرنے کا حکم جاری کیا تاکہ اس طرح ایک طرف زرعی انقلاب برپا کیا جا سکے اور دوسری طرف نئے لوگوں کی رہائش کے لیے گنجائش نکالی جا سکے مثلاً حضرت سلمہ بن اکوعؓ کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ نے اُسے زمینوں پر آباد ہو جانے کا حکم دیا تھا ۔ حضرت سعدؓ کو عقیق میں منتقل کر دیا گیا ۔ اسی طرح جوفِ مدینہ کے قریوں میں اور مدینہ کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے متعلق آپؐ کا یہ ارشاد فرمانا کہ (دیہاتوں میں رہنے اور کھیتی باڑی کرنے کے باوجود) اعراب کی طرح نہیں ہیں کیونکہ یہ (جنگ کے لیے طلب کرنے پر فوراً آ جاتے ہیں (لہٰذا غنائم اور فئے میں برابر کے حصّے دار ہیں ، آپؐ کی اس پالیسی کا آئینہ دار رہے[4] ۔ اور دُوسرے یہ کہ قریظہ و نضیر کی مفتوحہ بستیوں یا جوفِ مدینہ کے دیگر قریوں میں پھیلا دیا تاکہ ایک جانب معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہونے کے امکانات ختم ہو جائیں اور دُوسری طرف صحت مند اور تعصبات سے پاک معاشرت تخلیق کی جا سکے ۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ رسالتمآبؐ نے اپنے مقاصد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ۔ آج کل چین اور کچھ مغربی ممالک میں ٹاؤن پلاننگ کے انہی زرّیں اصولوں پر جنہیں رسولِ خداؐ نے چودہ سو سال پہلے آزمایا تھا عمل کر کے معاشرتی ہیجان اور تہذیبی انتشار کی شدت کو کم کرنے میں ایک حد تک نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں[5]

گلی کُوچے آن جنابؐ سے پیشتر مدینہ میں ناجائز تصرفات عام تھے ۔ آپؐ نے اس سے سختی سے منع کر دیا[6] ۔ گلی یا کوچے کی کم سے کم چوڑائی ، جھگڑا ہو جانے کی صورت میں سات ہاتھ (ذراع) مقرر کی[7] ۔ جوفِ مدینہ کی آبادیوں

---

[1] نسائی : کتاب الصلوٰۃ

[2] روزگارِ فقیر ، فقیر وحید الدین ج ۱

[3] ابو عبید : کتاب الاموال ع ۵۲۹

[4] صحیح مسلم : ابواب ہجرت ابی داؤد وغیرہ .

[5] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز لفظ شہر و شہری منصوبہ بندی ولیم منرو نیز رسالہ سوشیالوجی جلد ۶ ، شمارہ ۱ جنوری ۶۲ء مضمون ALISON M. MACQVEN از STABILITY A CHANGE IN A SHENTY TOWN نیز کتاب PHILLIP HAUSER از URBANIZATION IN LATIN AMERICA آبادی کو منتشر کر دینے کے بارے جدید نظریات کی تلخیص انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز میں دیکھیے تحت لفظ شہری منصوبہ بندی از LEWIS MAMORD ص ۴۹-۴۵۵

[6] ابی عبید ؛ کتاب الاموال

[7] صحیح مسلم : ترمذی

میں گلیاں عام طور پر تنگ ہوتی تھیں اس لیے مدینہ کی کالونی میں بھی گلی کوچے تنگ مگر سیدھے تھے۔ باوجودیکہ آپؐ کا اور دیگر صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے مکانات مختصر تھے مگر آپؐ نے کشادہ مکانات کو پسند کیا اور فرمایا کہ خوش بخت ہے وُہ شخص جس کی جائے رہائش وسیع اور پڑوسی نیک ہو[1]۔

شہر میں پینے کے پانی کی بہم رسانی کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا۔ مدینہ میں اگرچہ پانی کی قلت نہ تھی۔ چند گز زمین کھودنے پر پانی کا چشمہ اُبل پڑتا، تاہم پینے کے لیے میٹھے پانی کے کُنویں اور چشمے بمشکل دستیاب ہوتے۔ حضرت عثمانؓ نے جو خود بھی مدینہ کی نوآبادی میں رہتے تھے، آں حضورؐ کے حکم کے مطابق اہلیانِ مدینہ کے لیے یہودیوں سے میٹھے پانی کا کنواں بئرِ رومہ خرید کر وقف کر دیا[2]۔ بعد ازاں رسول اللہؐ نے سرکاری طور پر بھی کنویں کھدوا کر مسلمانوں کی مشکل حل کر دی۔ آپؐ کے تیار کردہ ایسے ایک کنویں کا نام غرس[3] تھا۔ ایک اور کنواں مسجد نبیؐ کے سامنے کھجور کے درختوں کے نیچے بھی تھا[4]۔

حمام اور طہارت خانے

عربوں میں صفائی اور طہارت کا کوئی تصور نہ تھا۔ وُہ پاخانہ پھرنے کھُلی جگہ جاتے تھے[5] حتّٰی کہ یہودی جو اعلیٰ تہذیب و تمدن کے علمبردار اور دعویٰ دار تھے، بیت الخلاء کے تصور سے ناآشنا تھے[6]۔ وُہ غسل کرتے تو کئی مرد مل کر اور بالکل برہنہ ہو کر اور دورانِ غسل ایک دُوسرے کے جسم کو دیکھتے[7]۔ بیت الخلا اور حمام ترقی یافتہ معاشرت اور شہری زندگی کا ضروری جزو ہیں۔ آنجنابؐ نے عرب کے بادیہ نشینوں اور یہود و نصاریٰ جیسے مہذب لوگوں کو اسلوبِ زندگی بتاتے ہُوئے بیت الخلاء اور حمام کو رواج دیا اور اس ضمن میں ایسے آداب سکھائے جو عربوں کی حد تک ہی نہیں پوری نوعِ بشری کے تہذیبی ارتقا کی سمت میں اہم قدم تھا۔

دراصل اسلام جسم و جان کی پاکیزگی اور ظاہر و باطن کی صفائی پر بہت زیادہ زور دیتا ہے[8]۔ وضو، طہارت، غسل جنابت، جمعہ کا غسل (واجب) کے احکامات اسی سلسلے کی کڑیاں اور تکمیلی مراحل تھے۔ شروع شروع میں جب آپؐ غسل فرماتے تو آپؐ کی کوئی بیوی[9] یا غلام[10] آپؐ پر کپڑا تان کر پردہ کر دیتا یہاں تک کہ آپؐ نے اس ضمن میں عام حکم جاری فرمایا کہ غسل کرتے

---

[1] امام بخاری : ادب المفرد ۲۲

[2] صحیح بخاری : باب فضائل

[3] ابن ماجہ : باب غسل النبیؐ

[4] نسائی : باب غسل

[5] صحیح مسلم : باب انک بخاری وغیرہ

[6] نسائی : طہارت

[7] صحیح بخاری : ابواب غسل وطہارت

[8] القرآن، سورۃ مدثر: آیت ۳ ۱۴۔ یہ سورۃ قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور اس کا نمبر بلحاظ وحی دوسرا ہے جس میں صفائی کی تلقین زوردار انداز سے کی گئی۔

[9] صحیح بخاری : ابواب غسل وطہارت (میمونہؓ نے پردہ کیا)۔ موطا امام مالک : صلوٰۃ (عائشہؓ / فاطمہؓ نے پردہ کیا)

[10] نسائی : باب الغسل (آپؐ کے غلام ابو السمح نے پردہ کیا)

وذت پردہ کرو[1]۔ حتیٰ کہ حمام میں بھی تہمند باندھنے کی تلقین کی[2] اور مسجدیں بنا کر وہاں طہارت خانے تعمیر کرنے کی ہدایت جاری کی۔[3] اسلام کے عمومی مزاج اور آپؐ کے اس فرمان[4] کے بعد گھر گھر غسل خانے بن گئے۔ ہر مسجد کے ساتھ طہارت خانے تعمیر کیے گئے۔[5] یہ احکامات مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہی صادر کیے جا چکے تھے کیونکہ مسجد نبی کے بالمقابل طہارت خانے اور غسل خانے شروع دن ہی سے موجود تھے۔ حتیٰ کہ عہد نبیؐ ہی میں پبلک حمام بن گئے تھے[6] اور اس کی مزید تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق کوفہ، بصرہ (جو بعینہ مدینۃ الرسول کے نقشے پر بنایا گیا تھا) میں پبلک حمام کا ذکر ابتدائی ایام میں بھی ملتا ہے۔[7]

صفائی کی طرح شرم و حیا بھی اسلامی تعلیم کا جزو لازم ہے۔ آنجنابؐ جب عربوں کے جاہلی طریقے کے مطابق

بیت الخلاء اجابت کو جاتے تو بہت دُور نکل جاتے حتیٰ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے۔[8] اور عورتوں کی طرح سراپا شرم و حیا بن کر اجابت فرماتے۔[9] مدینہ آنے کے بعد بہت دنوں تک (واقعہ افک، غزوہ بنی مصطلق ۵ ہجری) ازواجِ مطہراتؓ اور مومنات پاخانہ پھرنے شہر سے باہر کھلی جگہ پر جاتی رہیں۔[10] آخر کار رسولِ خداؐ نے اس ضمن میں اصلاح کا آغاز فرمایا۔ یہودی وغیرہ مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ تمہارا رسول تمہیں پیشاب کرنے کا بھی طریقہ سکھاتا ہے۔[11] اور اس میں شبہ نہیں عرب کے خاک نشینوں کو فرماں روائی کے انداز بتانے کے ساتھ ساتھ آں جنابؐ نے طہارت اور اجابت کے آداب بھی سکھائے اور ان آداب میں ایسی ایسی حکمتیں، مصلحتیں پوشیدہ ہیں کہ اُن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہوگا۔

تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ اخیر عہد نبویؐ میں مدینہ کے ہر گھر میں بیت الخلاء، طہارت خانہ اور غسل خانہ موجود تھا۔ آں حضورؐ کے گھر میں بھی ٹٹی خانہ تھا جس کا رُخ قبلہ کی طرف تھا۔ آپؐ کا یہ فرمان کہ نہانے کی جگہ پیشاب نہ کرو[12] اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ آپؐ نے طہارت خانے اور بیت الخلاء علیحدہ علیحدہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور غسل خانے بھی الگ بنانے کو کہا۔ یہ بات معلوم رہے کہ عہدِ رسالت میں شام میں حمام اور بیت الخلاء کا رواج تھا۔[13]

البتہ ایک بات معلوم نہیں ہو سکی کہ مدینہ کے ٹٹی خانوں کی صفائی کا کیا انتظام تھا۔ کیا مدینہ کے اندر یا گردو نواح میں کوئی ایسا طبقہ موجود تھا جو صفائی کا کام انجام دیتا تھا؟ گو تاریخی شواہد موجود نہیں مگر قرائن اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔

---

[1] و [2] نسائی: باب الغسل (آپؐ کے غلام ابوالسمح نے پردہ کیا)

[3] و [4] ابن ماجہ، ابواب مساجد

[5] ابی داؤد: طہارت

[6] بلاذری، فتوح البلدان ج ۲ ص ۲۸۱

[7] صحیح بخاری و مسلم

[8] نسائی: باب طہارت

[9] صحیح مسلم، باب افک نیز بخاری وغیرہ

[10] نسائی: طہارت

[11] ابی داؤد: طہارت (عن ابن عمر)

[12] ابی داؤد: طہارت (عن ابن عمر)

[13] بخاری: ابواب الغسل و طہارت

قبرستان اور عیدگاہ رسول اللہؐ نے مشرکوں کے تمام قبائلی قبرستانوں کو مسمار کرا کر مسلمانوں کا علیحدہ قبرستان "جنت البقیع" مقرر کیا جو شہر کے مغرب میں بطحان کو عبور کر کے حرۂ او برہ کے نزدیک واقع تھا آں جنابؐ نے جاہلیت کے تمام رواجات کو بھی منسوخ کر دیا۔ اونچی یا طویل قبر بنانے، قبر پر عمارت یا گنبد تعمیر کرنے، اور اسے چونا گچ کرنے یا اس پر کسی قسم کی تحریر لکھنے سے سختی سے روک دیا۔ میت کو گھر کے اندر یا نزدیک دفن کرنے سے بھی منع کر دیا کیونکہ یہ طریقے اسلام کے صریحاً خلاف تھے[1]

قبرستان کے نزدیک جنازگاہ تھی اور عیدگاہ کے لیے وہیں کثیر بن صلت کے مکان کے نزدیک جگہ مختص کی گئی[2] (۲ ہجری) شروع میں اس جگہ پر کوئی عمارت وغیرہ نہ تھی، بعد ازاں چھوٹی سی چار دیواری بنا دی گئی جس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ یہ آثار مدینہ شہر کی چار دیواری (جو بہت بعد میں بنائی گئی تھی) سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر ہیں[3]

آں جنابؐ عید پڑھانے کے بعد قربانی بھی وہیں عیدگاہ کے نزدیک دیا کرتے تھے[4]

باغات مدینہ باغوں کی سرزمین کہلاتا تھا اور یہاں کے لوگ باغات کے بہت شوقین تھے۔ اسی وجہ سے رسالتمآبؐ نے شہر اور مسجد کی تعمیر کے وقت یہ کوشش کی کہ وہاں موجود کھجور کے درختوں کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ دیگر روایات کے مقابلے میں ابن خلدون کی یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ نصف اشجار کٹوا دیئے جو پشتہ باندھنے کے لیے کام میں لائے گئے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد النبیؐ، حجرات برائے ازواج مطہرات، اور دیگر عمارات بنانے کے لیے بھی یہ درخت کام آئے ہوں گے ——— باقی نصف کے قریب درختوں کو رہنے دیا گیا۔ مسجد النبیؐ کے دروازے کے قریب کھجور کے درختوں کا ذکر کتب احادیث میں ملتا ہے جہاں غسل خانہ اور طہارت خانہ بھی تھا اور کنواں بھی اسی جگہ تھا۔ ثمامہ بن اثال نے اسلام لانے کے لیے غسل اسی جگہ کیا۔ مسجد النبیؐ کے بڑے دروازے کے بالمقابل حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کا

---

[1] انفرادی احکامات کے لیے دیکھئے مسلم، ابن ماجہ، بخاری، ابی داؤد کے ابواب، جنائز، غسل، قبور وغیرہ

[2] صحیح بخاری: صلوٰۃ

[3] محمد حمید اللہ: میدان جنگ نیز انسائیکلوپیڈیا لفظ مسجد و مدینہ

[4] آں جنابؐ کے قربانی کا جانور اتنے دُور ذبح کرنے میں کچھ مذہبی مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ قدیم زمانہ سے عبادت کے تصور کے ساتھ قربانی جزو لاینفک رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مشرق و مغرب اور زمانہ قدیم و جدید میں جتنی عبادت گاہیں بنیں، ان کے ساتھ قربان گاہ ضرور تعمیر کی گئی۔ یہ قربان گاہیں مدوّر شکل میں عبادت خانے کے ساتھ متصلاً ہوتیں۔ اسلام میں یہ قربانی کسی شخص کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا کے لیے ہے۔ اگر رسالتمآبؐ قربانی کا جانور گھر میں ذبح فرماتے جو کہ مسجد کے متصل تھا تو بعد میں اس سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا اس لیے آپؐ نے احتیاط فرماتے ہوئے ذبح عیدگاہ میں فرمانے کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر غلام یزدانی کا مضمون "مکہ" دارالمعارف علمی، ملاحظہ کیجئے جس میں مکہ کی قربان گاہ کے متعلق محققانہ رائے قائم کی گئی ہے۔

وسیع اور شاداب باغ بیرحاء تھا جہاں آں جنابؐ اکثر تشریف لے جاتے۔ بعید نہیں کہ شہر میں اور بھی باغات ہوں۔

خندق ایرانی اثرات کے تحت اگرچہ عرب کے کئی ایک شہروں کے گرد فصیل تھی مگر یثرب کی تعمیرات پر یمنی یا حبشی اثرات زیادہ تھے لہٰذا وہاں فصیل کی بجائے یمنی طریق دفاع کے مطابق قلعے (اطم : آطام) تھے حتیٰ کہ یہود کے آباد کردہ شہر یثرب کے گرد بھی فصیل نہ تھی۔ آں حضورؐ نے بھی کوئی فصیل نہ بنائی البتہ جنگ احزاب کے موقع پر شمالی جانب حرۂ واقم سے جبلِ سلع تک خندق کھود کر شہر کا دفاع کیا۔ دیگر لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے اپنے طور پر خندق کو عیدگاہ کے مغرب سے گزار کر کافی دُور قُبا تک بڑھا دیا۔ خندق کو چونکہ بطحان نالہ میں سے گزارا گیا تھا اس لیے بطحان خصوصاً طغیانی کے ایام میں خندق میں سے ہو کر بہنے لگی۔ ایسی ہی ایک طغیانی سے عہدِ عثمانی میں مدینہ شہر کے مغربی حصے کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔

مدینہ میں نکاسیٔ آب کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں آیا کیونکہ شہر اونچی ڈھلوانی جگہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اگر کہیں سے کوئی پہاڑی ندی نالہ گزرتا تھا تو وہاں پشتے باندھ کر عمارات اور تعمیرات کو محفوظ بنا دیا گیا تھا۔

گلیوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ عرب چراغ کے استعمال سے واقف نہ تھے حتیٰ کہ ایک مدت تک گھروں میں بھی چراغ نہ جلتے تھے۔ بعد ازاں مسجدوں میں رات کے وقت روشنی کا معقول انتظام کر دیا گیا۔ شروع شروع میں خشک لکڑیاں جلا کر، بعد ازاں چراغ کا انتظام کیا گیا۔ مدینہ میں ایک ریسٹوران کا سراغ بھی ملتا ہے جو حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ چلاتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا پارچہ بافی کا کارخانہ سُنح میں تھا۔ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ابوبکرؓ کا کارخانہ سلع میں تھا۔ یا تو یہ دُوسرا کارخانہ تھا یا پھر یہ املا کی غلطی ہے۔

سرکاری مہمان خانہ آں حضورؐ کے جدِ اعلیٰ قصی نے زائرین بیت اللہ کے قیام و طعام کا شہری مملکتِ مکہ کی طرف سے سرکاری انتظام کیا تھا اور اس غرض کے لیے اہلیانِ مکہ پر خصوصی ٹیکس عائد کیا تھا۔ مہمان دارالندوہ میں ٹھہرائے جاتے یا کھلے میدان میں خیمے لگا کر رہتے۔ گھروں میں ٹھہرانے کا بھی انتظام کیا جاتا تاہم آنحضرتؐ کے زمانہ سے کچھ پہلے قریشِ مکہ نے عربوں کی مہمان داری کی شاندار روایات کے برعکس زائرین کو گھروں میں عارضی رہائش اور ان کے لیے طعام اور طواف کا مخصوص لباس (حمسی) فراہم کر کے روپے بٹورنے کا ذریعہ بنا لیا۔ سرکاری لنگر خانہ اگرچہ بند نہ ہوا تھا تاہم زیادہ تر حجاج قیام و طعام کا

---

۱ صحیح بخاری۔ نسائی۔ ابن ماجہ : ابواب تفسیر القرآن : لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ الخ

۲ طائف اور جرس کے گرد فصیل تھی۔ طائف کی فصیل ایرانی انجنیئروں نے بنائی تھی۔ طائف کے نزدیک جرس تھا۔ طائف کے ایران کے ساتھ تجارتی روابط بہت گہرے تھے۔ طائف کا معنیٰ "گھرا" ہوتا ہے۔ شہر کا نام اس لیے طائف "گھرا ہوا شہر" پڑ گیا (کریسٹ ویل۔ محمد حمید اللہ : مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ)

۳ لی بان — تمدن عرب (اردو ترجمہ) ۴ سید سلیمان ندوی : ارض القرآن ج ۲ ص ۲۹۰۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ مدینہ

۵ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام "مدینہ" ۶ محمد حمید اللہ : میدان جنگ ۷ صحیح بخاری نیز سلیمان ندوی

۸ سلیمان ندوی بحوالہ استیعاب ۹ محمد حمید اللہ : مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ۔

انتظام ذاتی طور پر ادائیگی کر کے (PAYING GUEST) کرتے[۱] عرب میں دستور تھا کہ قبیلہ کا شیخ مالِ غنیمت کا چوتھا حصّہ وصول کرتا اور اگر کوئی تجارتی قافلہ اس قبیلے کی سرحدات سے گزرتا یا حدود میں اُترتا تو اُس سے عُشر بطور محصول چنگی کے وصول کیا جاتا[۲] اس رقم سے ضروری اخراجات پُورے کرنے کے علاوہ قبیلے کے مہمانوں کے لیے طعام کا انتظام شیخ کیا کرتا تھا اور مہمان کو عموماً چوک میں ٹھہرایا جاتا۔ مکّہ میں قبیلہ کی چوک کو نادی اور یثرب میں سقیفہ کہا جاتا تھا۔ قصیٰ نے چونکہ مرکزیت کا آغاز کیا اس لیے وہاں دارالندوئی قائم ہوا۔ اور نادی کی چونکہ کوئی اہمیت نہ رہی اس لیے وہ ختم ہو گئیں۔ تاہم بعثتِ نبویؐ کے وقت مکّہ کے قرب وجوار کے قبائل کے ہاں ایسے چوک اور اجتماع گاہ موجود تھے[۳]

ہجرت کے بعد رسول اللہؐ قبائلی سرداروں کی طرح چوتھ[۴] لیتے اور زمین کی پیداوار پر عُشر بھی وصول کرتے تھے[۵]۔ گو اس وقت عشر کی حیثیت ایک رضا کارانہ چندہ کی سی تھی۔ مدینہ ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین آں جنابؐ کے مہمان تھے اور ان کے قیام و طعام کی ذمّہ داری آپؐ نے اپنے ذمّے لے رکھی تھی۔ ابتدائی ایام میں مسجد النبیؐ مہمان خانہ کا کام دیتی رہی۔ وہاں ٹھہرنے والے لوگوں کے کھانے کا انتظام آپؐ (پبلک فنڈ سے) خود فرماتے۔ کتبِ احادیث میں متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اصحاب صفہ کا کھانا آپؐ کے گھر سے آتا۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ چند اصحابؓ کو چھوڑ کر جو وہاں مستقلاً اقامت گزیں تھے، اصحاب صفہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی جو وہاں عارضی طور پر ٹھہرے ہُوئے ہوتے۔ ایک ایسے مہمان کا ذکر بھی ملتا ہے جس کے لیے بسترے کا بندوبست بھی آپؐ نے کیا۔ عُسرت اور تنگ دستی کے ابتدائی ایام میں مہمان داری کے فریضہ سے اگر آپؐ خود عہدہ برآ نہ ہو سکتے تو مہمان کو یا تو کسی صاحبِ استطاعت مخیر مُسلمان کے حوالے کر دیا جاتا یا تعداد زیادہ ہونے کی صورت[۶] میں بالخصوص چندہ کی اپیل کر کے مہمانوں اور مسافروں کے طعام اور دیگر ضروریات کا انتظام کیا جاتا۔ بعد ازاں قرآن مجید نے ابن السبیل کا انقلابی نظریہ پیش کر کے زکوٰۃ[۷] کے اخراجات کی ایک مد ابن السبیل کے لیے مختص کر دی جن میں اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے والے کے علاوہ زائرین حرمین، طالبانِ علم اور سفیر، حتیٰ کہ کاروبار یا نجی کام کے لیے سفر اختیار کرنے والے ہر قسم کے مسافر شامل تھے اور یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مہمان تھے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر عرب قبائل جن کے ساتھ آپؐ کے معاہدات ہُوئے اُن میں ایک شق مسلمان مسافروں کو کم از کم تین روز تک طعام و قیام کی سہولت دینے کے بارے میں بھی درج ہے[۸]

دیارِ یہود کے مسخر ہونے کے بعد سرکاری مہمان خانہ مسجد النبیؐ سے وہاں منتقل کر دیا گیا تاہم مسجد النبیؐ بھی اس مقصد کے لیے

---

[۱] ، [۲] ، [۳] محمد حمید اللہ ؛ MUSLIM CONDUCT OF STATE نیز "سیاسی زندگی"

[۴] القرآن، سورت الانفال، آیت ۱ رکوع ۵ جنگ بدر کے بعد اتری۔ قبل ازیں آں جنابؐ غزوات میں حاصل ہونے والے غنائم کا عرب کے جاہلی طریقے کے مطابق چوتھا حصّہ ہی وصول کرتے رہے مثلاً ابن جحش کا سریہ۔

[۵] ابو عبید، کتاب الاموال [۶] قبیلہ بنی اسد کے لیے رقم اسی طرح فراہم کی۔ ابی داؤد / نسائی : ابواب زکوٰۃ وصدقات

[۷] عبدالرحمان طاہر سورتی، مقدمہ کتاب الاموال (اردو ترجمہ) [۸] القرآن : سورۃ توبہ، آیت ۶۰

[۹] امام ابی یوسف ، کتاب الخراج ۔ وثائق السیاسیۃ ؛ محمد حمید اللہ معاہدات جذام ۔ قبائل دومۃ وغیرہ

ایک عہدِ نبوی تک استعمال کی جاتی رہی ۔ وفودِ طائف اور نجران وغیرہ آئے تو یہیں ٹھہرے[1] شاید معزز مہمانوں کے ٹھہرانے کے لیے علیحدہ انتظام دیارِ قریظہ میں کیا جاتا اور عام مہمان مسجد میں ہی ٹھہرائے جاتے ۔ حضرموت کے وفد کا سردار وائل بن حجر حرہ کی بستی (نام کا تذکرہ نہیں ہے ۔ اندازہ ہے بنی قریظہ کی بستی ہی ہوگی) میں لے جائے گئے ۔ امیر معاویہ کڑکتی دھوپ میں ننگے پاؤں ، پاپیادہ اسے چھوڑنے گئے تھے جبکہ وائل گھوڑے پر سوار تھا[2] اسی طرح طائف کے وفد کو بھی دو جگہوں پر ٹھہرایا گیا ۔

ابن سبا بن عبد الفری خزاعی کا مکان بطور جیل خانہ اور حوالات کے استعمال ہوتا جہاں آپؐ غیر ارادی[3] قاتل ، مقروض وغیرہ کو قید رکھتے ۔

دار الخلافہ مدینہ میں مرکزی مسجد کی تعمیر کے بعد حوالیٔ مدینہ کی بستیوں میں بھی مسجدیں بہت جلد بننے لگیں[4] تاہم ایک

مدینہ کی مساجد مدت تک مدینہ اور اس کے قرب و جوار کی آبادیوں کے لیے صرف مسجد النبیؐ ہی اقامت صلوٰۃ کا کام دیتی رہی ۔ بنی سلمہ کے لوگوں نے جب نماز کی سہولت کے پیش نظر اپنے قریہ سے اٹھ کر مدینہ میں آباد ہونے کی التجا کی تو آپؐ نے یہ کہہ کر اسے منظور نہ کیا کہ نماز کے لیے دور سے چل کر آنے کا ثواب زیادہ ہے ۔ سیاسی اور معاشرتی انتشار کے شکار لوگوں میں ملتِ واحدہ[5] کا تصور ابھارنے کے لیے ضروری تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مرتبہ ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا ، تاکہ قبائلی رقابتیں اور جاہلی تعصبات کی دیواریں منہدم کر کے اسلامی اخوت کی عمارت اٹھائی جا سکے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی ہجرت سے پیشتر تقریباً ہر قریہ میں لوگوں نے نماز کے لیے الگ جگہ مقرر کر رکھی تھی ۔ گمان غالب ہے کہ خاندانی عداوتوں کی وجہ سے یثربی مسلمان آں جنابؐ کی تشریف آوری سے پیشتر ایک جگہ جمع ہو کر نماز ادا نہ کر سکتے تھے اور پہلا موقع تھا کہ (قبا یا) محلہ بنی سالم میں رسولِ خدا[2] کی معیت میں مسلمانوں نے باہم مل کر نماز پڑھی ۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت نگاروں اور محدثین نے اس واقعہ کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے اور حاضر مسلمانوں کی تعداد بھی گنوائی ہے ۔ ان خاندانی اور پشتینی عداوتوں کا ختم کرنا انتہائی ضروری تھا اور ان کا توڑ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو سکتی تھی یا آپؐ کی مسجد ۔

ایک دفعہ جب مسلمانوں کی ذہنی تربیت اور فکری تبدیلی مکمل ہو گئی تو پھر حوالیٔ مدینہ کی دیگر بستیوں کو نہ صرف مسجد بنانے کی اجازت مرحمت[8] فرمائی بلکہ اس کے لیے ترغیب بھی دی ۔ وہ بستیاں جو کلاً دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں ، وہاں کے لوگوں کی سہولت اور آسانی کے پیش نظر مسجدیں بنانے کی اجازت دی گئی کیونکہ اقامت صلوٰۃ کے لیے دن میں پانچ مرتبہ چل کر مسجد النبیؐ میں حاضر ہونا بڑا کٹھن اور تکلیف دہ فریضہ تھا ۔ بعض بستیاں مدینہ کی مسجد سے چار میل[9] کے فاصلہ پر تھیں مثلاً قبا ——— اور اسی لیے

---

۱ سیرت ہشام ، طبری

۲ تاریخ ابن خلدون

۳ و ۴ محمد حمید اللہ : مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ

۵ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، لفظ مسجد (مودودی : تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۴۳ رقمطراز ہیں کہ غزوۂ تبوک تک مدینہ میں صرف دو مسجدیں تھیں مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی ۔

۶ ترمذی ، کتاب التفسیر نیز صحیح مسلم و صحیح بخاری

۷ ابن ماجہ : ابواب المساجد والجماعات

۸ صحیح بخاری ۔ (اوپر دیکھیے حدودِ حرم)

قُبا غالباً پہلی بستی تھی جسے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ملی اور اسی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ مسجد قُبا مسجد النبیؐ سے پہلے تعمیر کی گئی ۔ (تفصیلی بحث اوپر گزر چکی ہے)۔ کچھ آبادیاں اور قریے ایسے بھی تھے جہاں ابھی تک چند افراد نے اسلام قبول کیا تھا۔ ایسی آبادیوں میں مسجدیں بنانے کی ترغیب و تحریص کی گئی[1] تاکہ اس طرح وہاں اسلام کے اثرات کو تقویت پہنچے۔

ہر قبیلے کو مسجد بنانے کی اجازت دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ " اسلامی دولتِ مشترکہ " میں شامل ہر یونٹ کی داخلی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا ہے[2] اور پیہم داخلی خلفشار کی وجہ سے اہلِ یثرب چونکہ اسی طرح کے نظام کے عادی ہوگئے تھے اس لیے سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ فیصلہ دُور اندیشانہ اور مستحسن تھا۔ قبیلے کی معاشرتی اور سیاسی زندگی سقیفہ کے گرد گردش کرتی تھی۔ ہر محلہ میں مسجد بن جانے کے بعد سقیفہ کی اہمیت بتدریج کم ہوگئی ——— پھر آں جنابؐ نے لوگوں کو سقیفہ میں جمع ہونے سے روک دیا۔ لوگوں کی طرف سے جب یہ عذر پیش کیا گیا کہ اس کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں ہوتی تو آپؐ نے وہاں بیٹھنے کی تو اجازت دے دی[3] مگر اس کی کچھ شرائط طے کر دیں[4]۔ اس طرح قبائلی اجتماع گاہیں اور چوکیں وصالِ نبویؐ تک قائم رہیں مگر ان کی سیاسی و معاشرتی اہمیت قریب قریب ختم ہوگئی۔ محلے کی سطح تک ان کی جگہ محلے کی مسجدوں نے لے لی اور مرکزی طور پر اختیارات زیادہ سے زیادہ ذاتِ رسولِ مقبولؐ میں مرتکز ہوگئے اور مسجد النبیؐ مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی، سیاسی اور عسکری، تعلیمی اور تہذیبی زندگی کا محور بن گئی۔

مسجدوں کی تعمیر کے ضمن میں اگلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ایک حکمنامے کے ذریعے ہر مسلمان آبادی کے لیے مسجد بنانا لازمی قرار دے دیا[5]۔ یہ حکم فتح مکہ یا سورۂ براءت کے نزول کے بعد جاری کیا گیا ہوگا۔

تحویلِ قبلہ کے اعلان (۱۶ یا ۱۷ ماہ بعد ہجرت) کے وقت تک مدینہ میں کئی ایک مسجدیں بن چکی تھیں۔ تحویل کا حکم بنی سلمہ کی مسجد میں اترا ——— جس کی وجہ سے اس کا نام قبلتین (دو قبلوں والی مسجد) پڑ گیا۔ یہ حکم خداوندی دیگر مساجد میں آں جنابؐ کے فرستادہ مُنادی نے پہنچایا۔ مگر بعض مسجدیں اتنی دُور تھیں کہ اُن تک یہ خبر دُوسرے روز پہنچی[6]۔ حوالیٔ مدینہ میں مساجد تعمیر ہو جانے کے باوجود وصالِ نبیؐ تک جمعہ صرف مسجد النبیؐ میں ادا ہوتا تھا۔ شاید دوسری کسی بستی کی مسجد کو جمعہ کا اہتمام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد النبیؐ میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے لوگ عوالی کے دُور دراز قصبات سے آتے تھے اور اسی واسطے احادیث میں یہ روایت درج ہے کہ مسجد النبیؐ کے بعد پہلی مسجد جہاں نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھا گیا وہ بنی عبد القیس کی مسجد ہے، جو صوبہ بحرین کے شہر جواثا میں تھی[7]۔

---

[1] ابن ماجہ : ابواب مساجد

[2] و [3] ترمذی : کتاب الآداب

[4] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : تحت لفظ مسجد

[5] ابی داؤد : طہارت عن سمرہ بن جندب نیز ابن ماجہ باب تطہیر مساجد عن عائشہ ، ترمذی : کتاب الصلوٰۃ۔

[6] صحیح مسلم : ابواب الصلوٰۃ

[7] صحیح بخاری : کتاب الصلوٰۃ ، باب جمعہ

قبیلے کی مسجد بنانے کی ذمہ داری قبیلے کا سردار عموماً اپنے سر لے لیتا یا تعمیر میں پیش پیش رہتا۔ مسجدیں بنانے میں ابو اُمامہ، اسعد بن زُرارہ، عُتبان بن مالک اور سعد بن خُزیمہ کے نام کتبِ احادیث وسِیَر میں واضح طور پر آئے ہیں۔ یہ سب حضرات اپنے اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ مسجد النبیؐ کی طرح محلے کی مسجدوں میں بھی عہدِ رسالت ہی میں توسیع اور اضافے ہوتے رہے[۱]۔ ہر نئی تعمیر ہونے والی مسجد کا افتتاح رسولِ خداؐ وہاں خود نماز پڑھوا کر کرتے[۲] اور گاہے گاہے آں جنابؐ ان مساجد کا دورہ کر کے[۳] وہاں کی تعلیمی، معاشرتی سرگرمیوں کا معاینہ کرنے کے علاوہ عدالتی فیصلے بھی کرتے۔

عہدِ نبویؐ میں جوفِ مدینہ میں کل نو مسجدیں تھیں[۴]۔ پیڈرسن نے مسجد نبویؐ سمیت آٹھ[۵] مساجد کے نام گنوائے ہیں۔ خیال ہے کہ نویں مسجد مسجد الضرار ہو گی جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے، جسے آں حضورؐ نے گرا دیا اور اس کے تعمیر کرنے والے منافقین کو سزا دی۔

۳۔ قبا ——— محلہ عمرو بن عوف میں تھی۔ سعد بن خزیمہ نے سباء نامی عورت سے زمین خرید کر مسجد بنائی۔ مسجد بنانے سے پہلے اس جگہ پر گدھے باندھے جاتے تھے[۶]

۴۔ بنی قریظہ ——— یہ یہود کی بستی تھی۔ ان کے اخراج (۵ ہجری) کے بعد جب مسلمان مہاجرین کو وہاں بسایا گیا تو شاید انہوں نے وہاں مسجد بنائی ہو گی۔

۵۔ بنی حارثہ ——— شاید، یہ مسجد بھی جنگِ خندق کے بعد تعمیر کی گئی ہو گی کیونکہ بنی حارثہ خندق کے بعد اسلام لائے تھے۔

۶۔ بنی ظفر ——— یہ یہود کا ایک قریہ حرۂ واقم پر تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ مسجد بھی بعد میں بنی ہو گی۔

۷۔ بنو وائل ——— یہ قبیلہ بھی خندق کی جنگ کے بعد اسلام لایا — یہ مسجد بھی بعد کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ بنی حرام
۹۔ بنی زُریق } ——— یہ مسجدیں ابتدائی زمانے میں بنائی گئی ہوں گی۔

تاہم اس فہرست میں اضافہ کیا جا سکتا ہے:

۱۰۔ بنو سلمہ ——— یہ قبیلہ سابق الاسلام اور یہود کا سخت مخالف تھا۔ ان کا ایک مدت سے یہ تقاضا تھا کہ یہود کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی بجائے مسلمانوں کا علیحدہ قبلہ ہونا چاہیے۔ اس تقاضے کے اور آں حضورؐ کی خواہش کے جواب میں یہ حکم بنی سلمہ کی مسجد میں اُترا[۷]۔ یہ مسجد سواد بن غنیم

---

[۱] بلاذری: فتوح البلدان ص ۲ [۲] نسائی، صلوات، ابن ماجہ، مساجد فی الدار، بلاذری: فتوح ص ۲
[۳] صحیح مسلم و بخاری [۴] مودودی: تفہیم القرآن
[۵] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام تحت لفظ "مسجد" از جے پیڈرسن [۶] ترمذی: صلوات
[۷] منٹگمری واٹ: "اسلام"

بن کعب بن سلمہ نے بنوائی تھی۔

۱۱۔ عمرو بن سلمہ جس مسجد کے امام سات سال کی عمر میں مقرر ہوئے۔ یہ مسجد مدینہ سے شام جانے والے راستہ پر تھی۔[۱]

۱۲۔ بنی عبد الاشہل ——— اس مسجد میں آں حضورؐ نے کئی مرتبہ نماز پڑھوائی۔[۲]

۱۳۔ بنی معٰویہ ——— یہ اسفل کی بستی تھی۔ یہاں بھی رسولِ خداؐ نے متعدد مرتبہ نماز ادا کی۔[۳]

۱۴۔ مسجد بنی سلیم[۴]

۱۵۔ مسجد خیف ——— یہ جوف مدینہ میں تو واقع نہ تھی، مگر حج کو جاتے وقت راستے میں پڑتی تھی ۔ مدینہ سے اس کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔[۵]

۱۶ - ۱۷ - ۱۸۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ انصاری، حضرت عتبان بن مالکؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی مساجد یہاں یہ حضرات امامت کے فرائض انجام دیتے تھے ——— تاہم ان تینوں مسجدوں کے بارے میں یہ بات قطعیت سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ اوپر درج کی گئیں مسجدوں کے علاوہ تھیں۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کو گھروں کے اندر مسجدیں بنانے کی ترغیب دی[۶]۔ تاکہ صبح و شام اللہ کی پاکی اور عظمت گھروں میں بیان کی جاتی رہے اور اس ضمن میں آں جنابؐ کے اس فرمان کے بعد کہ فرائض کے علاوہ نماز کے لیے بہترین جگہ گھر ہے ——— مدینہ میں کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جہاں مسجد نہ بنالی گئی ہو۔ ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے اس عنوان کا علیحدہ باب باندھا ہے "مساجد فی الدار"۔ تاہم یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ گھر کے اندر سب سے پہلی مسجد بنانے کا شرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل ہوا۔ انہوں نے مکہ ہی میں اپنے گھر میں مختصر سی مسجد نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کے لیے بنالی تھی۔[۹]

مدینہ کی فوجی چھاؤنی

مدینہ کا شہر بنیادی طور پر ایک فوجی مستقر تھا۔ وہاں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے بلا استثناء فوجی خدمت انجام دینا لازم تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی غزوہ یا سریا پر مجاہدین کا صرف ایک حصہ روانہ کیا جاتا، اور باقی لوگوں کو شہری دفاع اور نگہداشت یا دیگر امور کی بجا آوری کے لیے وہیں چھوڑ دیا جاتا۔ اور دیکھا جائے تو مدینہ کے مخصوص حالات اور داخلی و بیرونی خطرات اور خدشات کے پیشِ نظر ایسا کرنا تھا بھی ناگزیر۔ مہم پر بھیجے جانے والے مجاہدین کے ناموں کی باقاعدہ فہرست تیار کی جاتی[۱۱]۔ غنائم میں سے بڑا حصہ شرکاء کو دیا جاتا، اور قدرے کم ایک حصہ ان لوگوں کو بھی ملتا جو لڑائی کے

---

[۱] ابی داؤد: صلوات عن عمرو بن سلمہ

[۲] ترمذی: احکامات ، ابن ماجہ: صلوات

[۳] موطا امام مالک: صلوات عن ابن عمر

[۴] بلاذری: فتوح البلدان ص ۵

[۵] ابن ماجہ: صلوات

[۶] ابی داؤد: مساجد

[۷] ابن ماجہ: مساجد فی الدار

[۸] نسائی: صلوات ، ابن ماجہ: صلوات

[۹] القرآن، سورۃ الاحزاب آیت ۳۴

[۱۰] ابی داؤد: مساجد عن عبداللہ بن مسعود

[۱۱] صحیح مسلم: کتاب الجہاد ، بخاری: عن حذیفہ وغیرہ یہ نام کہیں ۵۰۰/۷۰۰/ ۱½ ہزار (ترمذی) تک لکھے پائے گئے۔

دوران مدینہ میں مقیم رہتے[1] آں حضورؐ کا یہ فرمان کہ دو آدمیوں میں سے ایک جہاد کے لیے نکلے اور لڑتا ہوا شہید ہو جائے یا زندہ واپس لوٹے اور دوسرا گھر میں رہتے ہوئے مدافعت کرے دونوں کا اجر برابر ہے[2] انتہائی اہمیت کا حامل اور غور طلب ہے۔ اجر سے یہاں مالی منفعت بھی مراد ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر عام لام بندی کا اعلان اور لڑائی سے گریزاں (DEFAULTERS) مسلمانوں کا کورٹ مارشل (COURT MARTIAL) ظاہر کرتا ہے کہ مدینہ ایک فوجی چھاؤنی (CANTONMENT) تھی، اور اس کے مکین فوجی خدمت کے لیے کسی وقت بھی طلب کیے جا سکتے تھے۔ اخیر عہد نبویؐ میں تمام فوجیوں کا باقاعدہ رجسٹر تیار کر لیا گیا تھا جس کے دو حصے تھے، ایک میں مجاہدین کے ناموں کا اندراج تھا اور دوسرے میں منافقین کا — جو بلانے پر اکثر حاضر ہو جاتے مگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

القرآن نے مسلمان مجاہدین کو مشرکین سے قتال کے لیے گھوڑے رکھنے کی ترغیب[4] دی اور رسول اللہؐ کے اس ضمن میں متعدد فرمودات ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو رِباطِ الخیل رکھنے اور سدھارنے کے لیے بار بار ابھارا گیا[5]۔ جنگی گھوڑوں پر زکوٰۃ معاف کر دی گئی[6]۔ اسلامی حکومت کو جب مالی وسائل میسر آ گئے تو سرکاری گھوڑوں کا بھی انتظام کیا گیا اور ان کے چرنے کے لیے نقیع کی چراگاہ مختص کر دی گئی[7]، جو خالصۃً سرکاری چراگاہ تھی[8]۔ اندازہ ہے کہ غزوہ بنی قریظہ سے قبل یہ چراگاہ قائم ہو چکی تھی۔ جن مجاہدین کو سواری کی ضرورت ہوتی اور وہ خود انتظام نہ کر سکتے تو سرکاری گھوڑوں میں سے اسے سواری مہیا کی جاتی[9]۔ غزوات نبویؐ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی لشکر میں گھوڑوں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی اور دو سے بڑھ کر سینکڑوں تک پہنچ گئی[10]۔ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ عرب میں گھوڑا بڑی تعیش کی چیز سمجھا جاتا تھا اور اس زمانے کے طریق حرب و ضرب کے لحاظ سے گھوڑوں پر مشتمل رسالہ (CAVALARY) کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ رباط الخیل میں آں جنابؐ کی ذاتی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی حکومت ایک

---

[1] ابی عبید: کتاب الاموال

[2] صحیح مسلم: ابواب جہاد عن ابوسعید خدری

[3] دیکھیے جنرل اکبر خاں: حدیث دفاع نیز صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ

[4] القرآن۔ الانفال آیت ۶۰۔ (واعدوالھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم و اٰخرین من دونھم.....)

[5] صحیح بخاری، مسلم، ابی داؤد (ابواب الجہاد)

[6] ابی یوسف: کتاب الخراج و ابی عبید: کتاب الاموال

[7] و [8] صحیح بخاری

[9] ابن ماجہ: کتاب جہاد (غزوۂ تبوک وحنین)

[10] بدر میں صرف دو گھوڑے تھے (سیرت ابن ہشام) دیکھیے جنرل اکبر خاں: حدیث دفاع۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ: سیاسی زندگی، میدان جنگ

قابلِ رشک اور ناقابلِ شکست رسالہ کھڑے کرنے میں کامیاب ہوگئی جو سرکاری اور نجی گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ لڑائی کے لیے گھوڑوں کو سدھایا جاتا۔ گھڑ دوڑ کے باقاعدہ مقابلے ہوتے۔ تربیت یافتہ گھوڑے مسجد السبق سے ثنیۃ الوداع تک (پانچ میل) دوڑتے۔ غیر تربیت یافتہ گھوڑوں کی دوڑ کے لیے کم فاصلہ (۲/۳ میل) مقرر تھا۔ فوج کے لیے مختص انہی میدانوں (MILITARY GROUNDS) میں تیر اندازی (چاند ماری)، تیراکی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے بھی مقابلے ہوتے۔ بحیثیت سپہ سالارِ اعلیٰ (SUPREME MILITARY COMMANDER) آں حضرتؐ ان فوجی مشقوں کا معاینہ فرماتے اور اعلیٰ کارکردگی پر حوصلہ افزائی کے انعامات بھی عطا فرماتے۔ یہ مشقیں باقاعدگی سے منعقد ہوتیں [1]۔

عہدِ رسالت مآبؐ کے آخری دنوں میں الجرف کو لشکر کی اجتماع گاہ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ الجرف ایک فوجی مستقر (MILITARY CANTONMENT) تھا یا نہیں — تاہم یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے یہیں اکٹھی ہوتی، مجاہدینِ جنگ کی تیاریاں کر کر کے یہاں پہنچتے اور کوچ کی مقررہ تاریخ تک وہیں ٹھہرے رہتے۔ جب لشکر واپس لوٹتا تو (آپؐ کی ہدایت کے مطابق) سیدھا اپنے گھروں میں جانے کی بجائے لشکری یہاں جمع ہوتے اور ایک رات یا دن کا ایک حصہ وہاں قیام کرنے کے بعد انہیں منتشر ہونے کی اجازت دی جاتی [2]۔ اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کا یہیں اجتماع ہوا [3]۔ رسالت مآبؐ کی اچانک علالت کی وجہ سے اس کی روانگی ملتوی کر دی گئی حتیٰ کہ وصالِ نبویؐ تک لشکر وہیں رُکا رہا [4]، عہدِ صدیقِ اکبرؓ اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کے زمانۂ خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی الجرف چھاؤنی کا کام دیتا رہا — یہاں تک کہ بصرہ اور بعد ازاں کوفہ، فسطاط کی چھاؤنیوں میں لشکرِ اسلام کو ٹھہرانے کا انتظام کر لیا گیا۔ عہدِ صدیقیؓ میں شامی محاذِ جنگ کی کمان جب فیلڈ مارشل ابوعبیدہ بن جراح کے سپرد ہوئی تو وہ یکم صفر ۱۳ ہجری کو الجرف میں آگئے [5]۔ فوج گروہ در گروہ وہاں آ آ کر جمع ہونے لگی۔ حضرت ابوعبیدہ کو مع افواج کے وہاں کافی دیر تک رُکنا پڑا (کیونکہ مطلوبہ تعداد فراہم نہ ہو رہی تھی)، جب لشکر کی تعداد چوبیس ہزار تک پہنچ گئی تو انہوں نے محاذِ جنگ کی طرف کوچ کیا —

اسلامی لشکر جیسے الجرف میں بعض اوقات کئی کئی روز تک ٹھہرنا یا رُکنا پڑ جاتا (غزوۂ تبوک ——— لشکر ابوعبیدہ ——— وغیرہ) وہاں اس کے قیام کے لیے کیا انتظامات تھے۔ کیا بنی النضیر کے خالی مکانات اس مقصد کے لیے مصرف میں لائے جاتے یا فوج عارضی کیمپ لگا کر رہتی تھی۔ یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔

جُرف : ندی یا دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جس کے نیچے کی مٹی کو دریا نے کاٹ کاٹ کر بہا دیا ہو اور وہ گرنے کے

---

[1] محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف سٹیٹ، سیاسی زندگی، میدانِ جنگ۔ اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے علاوہ جنرل اکبر خان (حدیثِ دفاع و دیگر کتابیں، اسلامی طریقِ جنگ وغیرہ) نے گرانقدر کام کیا ہے۔ محمود خطاب شیت کی کتاب "آں حضورؐ بحیثیت سپہ سالار کے" (اردو ترجمہ) ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ نیز بخاری و مسلم کے ابواب (مساجد و عیدین)

[2] نسائی: جہاد، بخاری: الآداب

[3] محمد حسین ہیکل "محمدؐ"

[4] طبقات ابن سعد

[5] بلاذری: فتوح البلدان ص ۱۰۸

یہ علاقہ جرف کے جنوب مشرقی گوشے میں اس جگہ واقع تھا جو پیچھے کو
قریب[۱] ہو۔ الجرف بنی النضیر کا علاقہ تھا[۲]۔ وہاں زیادہ ٹیلے تھے[۳]۔
کے میدان اس کے قریب واقع تھے۔
جھکی ہوئی تھی۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ جگہ انتہائی اہم اور محفوظ تھی۔ فوجی پریڈ
مدینہ میں خرید و فروخت کی سہولت کے لیے علیحدہ منڈی یا بازار بنایا گیا۔ خیال ہے کہ یہ منڈی بنی قینقاع کے اخراج

مدینہ کا بازار (۲ ہجری) کے بعد قائم ہوئی ہوگی[۴]۔ کیونکہ اس سے پیشتر عبدالرحمان بن عوف اور دوسرے تجارت پیشہ مسلمان
اپنا کاروبار قینقاع کے بازار میں کرتے تھے[۵] —— قینقاع کے اخراج کے ضمن میں فوری سبب بننے والا واقعہ اس بات کی
تصدیق کرتا ہے کہ ابھی تک (۲ ہجری) مسلمان خرید و فروخت کے لیے قینقاع کے بازار میں جاتے تھے اور یہ وضاحت کہ مسلمان
عورت جس کی یہودی سناروں نے بے عزتی کی —— زیورات بنانے کے لیے گئی تھی، اس لحاظ سے غور طلب ہے کہ اخراج
کے پس پردہ مسلمانوں کے تاجر گروہ کی تجارتی رقابت بھی کارفرما تھی۔
زوراء سے دی جاتی تھی[۶] —— معلوم ہوتا ہے کہ بازار ایک جگہ اور کسی خاص ترتیب سے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ دکانیں اِدھر اُدھر
مدینہ کا بازار مسجد النبیؐ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا، کیونکہ عہد عثمانی میں نماز جمعہ کے لیے تیسری اذان بازار کے ایک مقام
منتشر شکل میں موجود تھیں۔ حضرت عثمانؓ کے رہائشی مکان کے نزدیک جو دکانیں تھیں انہیں مقاعد کہا جاتا تھا[۷]۔ ایک دوسری جگہ
دارِ ابی جہم کے نزدیک جہاں دکانوں کا جمگھٹا سا تھا بلاط کے نام سے مشہور تھی۔ ایک تیسری جگہ مسجد کے صدر دروازے کے غالباً
نزدیک ہی زوراء کہلاتی تھی۔ بازار کے یہ حصے مسجد النبی کے چوطرف بکھرے ہوئے تھے۔ بازار خاصا وسیع و عریض تھا اور
اخیر عہد نبویؐ میں نہایت بارونق اور تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ تجارت کے فروغ کے لیے جناب رسالتمآبؐ نے زبردست
کوششیں کیں جس میں سب سے اہم آپ کا یہ فرمان تھا کہ "مدینہ کی منڈی میں کوئی خراج نہیں ہے[۸]" زمانہ جاہلیت میں خفارہ کا نظام اور
قدم قدم پر محصول چنگی[۹] کی وجہ سے تجارت میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ آپؐ نے مختلف سیاسی اور عسکری مصالح کے پیش نظر یہ حکم صادر فرمایا جو
دوررس نتائج کا حامل تھا اور دراصل اس طرح آپؐ نے صرف چنگی کی لعنت ہی ختم نہ کی بلکہ جزیرۃ العرب کی تسخیر کے بعد تمام ملک میں، مدینہ
کی طرح آزادانہ درآمدات اور برآمدات کی اجازت دے کر بین الاقوامی آزاد تجارت کی داغ بیل ڈالی اور جدید تحقیقات نے اس بات کا
ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ آزاد بین الاقوامی تجارت نہ صرف اقوام ملل کے لیے بلکہ پوری نوع بشری کی مادی ترقی کے لیے ضروری ہے
جس کے ذریعے بین الاقوامی طور پر اشیاء کی قیمتیں متوازن رکھ کر عوام کو فائدہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے اور اقوام بھی خوشحال بن سکتی ہیں[۱۰]۔

---

۱ القرآن، سورۃ توبہ آیت ۱۰۹ نیز تفہیم القرآن سورہ ہذا جلد دوم ۲ بلاذری؛ فتوح البلدان ص ۳۰ ۳ صحیح بخاری
۴ منٹگمری واٹ: "محمد مدینہ میں" ۵ صحیح مسلم، ابواب ہجرت، بخاری وغیرہ ۶ موطا امام مالک: صلوٰۃ
۷ ابن ماجہ: صلوات ۸ بلاذری؛ فتوح البلدان ص ۱۵۱ ۹ تفصیلات کے لیے دیکھیے: محمد حمید اللہ: مسلم کنڈکٹ آف
سٹیٹ، نیز سیاسی زندگی۔
۱۰ تفصیلات کے لیے دیکھیے ECONOMICS: AN INTRODUCTION TO ANALYSIS POLICY از GEORGE - LEYLAND BACH
صفحات ۶۱۱ - ۱۲ - ۶۱۵ - ۶۲۰

فخرِ موجوداتؐ (آنحضرتؐ کی مکّی زندگی)

ابوالجلال ندوی

حضرت رسولِ خدا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت ہے سو ہے، ایک بے عقیدہ انسان کا بھی یہ ضروری فرض ہے، اس عظیم شخصیت کے حالات غور اور توجہ کے ساتھ پڑھے، جس نے پُوری دنیا کے فکر و تصوّر کا انداز بدل دیا۔ عرب جیسی ایک قوم کو سارے جہاں کی سیادت بخش دی۔ آخر یہ تو دیکھنا ہی چاہیے، اس ذات نے کیا کر دکھایا، جس کی وجہ سے اس کی بارگاہ میں صرف جنید و شبلی ہی نہیں، ابن سینا اور فارابی بھی باادب سر بزانو نظر آتے ہیں۔ ایک ان پڑھ، اُونٹ اور بکریوں کے چرواہے نے ایک کتاب دی، ایک دین عطا کیا، ایک طرزِ حیات سکھائی، ایک نئی سیاست دی، نیا نظامِ حکومت دیا، ایک زندہ حکمت اور سرگرم عمل دانش بخشی۔ ایسے ضوابط دینے جو پوری دنیا میں انسانوں کے ایک گروہ کا چودہ سو برسوں تک ہر مشکل اور تاریخ کے ہر نئے موڑ پر ساتھ دیتے رہے۔ آخر کیا بات ہے کہ دنیا کی ہر ملت کے مصلحین تو یہ کہتے ہیں کہ ماضی میں کچھ دھرا نہیں ہے، حال کو دیکھو اور مستقبل کو تصنیف کرو۔ لیکن اس مصلح کے ماننے والوں کو نہ صرف اس کے معتقدین بلکہ انسانیت کے بہی خواہ و دیگر مفکرین بھی پندرہ سو برس پیچھے ہی کی طرف مڑنے کی رائے دیتے ہیں۔

دنیا کے اور تمام بانیانِ مذاہب کی سیرتیں بھولے بسرے ماضی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں روپوش ہیں۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت عیسیٰؑ کی سیرتیں ہی نہیں بلکہ ان کے واقعی کبھی موجود ہونے تک کی شہادتیں محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن دنیا میں ایک ہی قابلِ اقتدار ہستی ایسی گزری ہے، جو تاریخ کے روزِ روشن میں گزری، اس کے سارے احوال مستند طور پر محفوظ ہیں۔ وُہ دنیا کا کامیاب ترین انسان تھا۔ اس کی سیرت کسی ہومر، کسی بیاس اور کسی والمیک کے شاعرانہ تخیلات کی مخلوق نہیں ہے بلکہ خود اس کے ساتھ رہنے سہنے والوں اور اس کے سوانح حیات میں برابر کے شریک کئی ہزار انسانوں کی زندہ شہادتوں سے ثابت ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیانی زمانہ میں جتنے رواۃ گزرے، سب کو ایک شخص بخوبی جان اور پہچان سکتا ہے۔ دنیا میں ایک ہی شخص کی سیرت ایسی ہے جس کی صداقت پر پورا وثوق کیا جا سکتا ہے اس نے ہم کو ایک ایسی کتاب دی ہے، جو پندرہ صدیوں تک ہماری تمام معاشی، معاشرتی، سیاسی، علمی اور فکری ضرورتوں میں کام دیتی رہی ہے۔ اس ہادیِ اقوام کے علاوہ کسی اور ہادی کی سیرت کو اٹھائیں، تو وہ معجزات اور کرامات کا انبار نظر آئے گی۔ ان خارقِ عادت کارناموں کو سُن کر ہم حیرت کر سکتے ہیں، ان کی تعظیم کر سکتے ہیں، ان پر ایمان لا سکتے ہیں، مگر ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیحؑ کے معجزے ہم نہیں دکھا سکتے، لیکن حضرت رسولِ خداؐ کے احوال پر جب ہم غور کریں گے، تو ہم کو ان کی زندگی میں قابلِ عمل اسباق ملیں گے۔ اس لیے ایک انسان اگر بے عقیدہ ہے، تب بھی اسے چاہیے کہ اس سراپا اعجاز سیرت پر غور کرے۔ آپؐ کی سیرت خود اپنے ہر قاری کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتی ہے۔ بدعقیدہ سے بدعقیدہ انسان بھی اگر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح حیات کو پڑھے گا اور آپؐ کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، تو وُہ ہرگز بدعقیدہ نہیں رہ سکے گا۔

محمد رسول اللہؐ کی سیرت اور آپؐ کی تعلیمات کا ہر پہلو بذاتِ خود ایک مستقل موضوعِ سخن بن سکتا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم کسی مخصوص پہلو کو نمایاں کرنا نہیں چاہتے۔ آپ کی مکی زندگی کے چند حوادث کو تاریخی ترتیب سے پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ ایک نظر میں ایک شخص آپ کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لے۔ پھر بطور خود آپؐ کو اور آپ کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ میرے اس مضمون کے مخاطب نہ خوش عقیدہ لوگ ہیں، نہ بد عقیدہ لوگ، میں صرف خالی الذہن افراد کی توجہ ایک قابلِ غور زندگی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کسی شخص کے حالات بخوبی سمجھنے کے لیے اس شخص کے ملک اور زمانہ کے عام حالات کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے لیکن بخوفِ طوالت اس پر مفصل گفتگو کو ہم یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

ایامِ قبل نبوت

آج سے ۱۴۳۵ برس پہلے مکہ میں دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۵۳ ق۔ھ کی صبح کو ایک خوشخبری نے قریش کے ایک ایک فرد کا چہرہ روشن کر دیا۔ عربی دستور کے مطابق ایک نوجوان ابھی ایک یا ڈیڑھ سال پہلے دیوتا کے حضور ذبح کیا جانے والا تھا۔ اس نوجوان پر اہلِ مکہ کو ترس آگیا۔ ایک کاہنہ کے مشورہ سے اُونٹوں پر اور اس نوجوان پر قرعہ ڈالا گیا۔ کئی بار کے قرعہ کے بعد طے کیا گیا کہ اس جوان کے بدلے سو اونٹ قربان کر دیے جائیں تو دیوتا راضی ہو جائے گا۔ اس نوجوان کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نوجوان کی شادی ایک شریف خاتون آمنہ بنت وہب سے ہُوئی۔ بی بی کو حاملہ چھوڑ کر یہ نوجوان شام کو گیا۔ لیکن پھر زندہ لوٹنا نصیب نہ ہُوا۔ اس نوجوان کی وفات کے چند ہی دنوں بعد یتیمِ عبداللہ کے پیدا ہونے کی خوشخبری اہلِ مکہ نے سُنی اور تقریباً ہر شخص کی زبان پر یہ ترانہ تھا: ؎

بارك فيك الله من غلام — يا ابن الذى من حومة الحمام

نجا بعون الملك العلام — فدى غداة الضرب بالسهام

بمائة من ابل سوام

(تو نہایت ہی مبارک لڑکا ہے، اے اس شخص کے بیٹے، جو موت کے مُنہ سے خداوند قدوس کی اعانت سے بچ گیا تھا۔ قرعہ کے روز اس کے فدیہ میں سو اونٹ قربان کیے گئے)

یہ فرزندِ عبداللہ اپنی صورت شکل سے بعینہٖ وہ شخص تھا جس کا حلیہ گنگنا کر حضرت سلیمان نے فرمایا تھا: ؎

خلّو محمّدیم زہ دودی

و زہ روعی بنوتِ یروشلیم

(وہ سراپا ستودہ ہے، یہ ہے میرا محبوب، اور یہ ہے میری جان، اے یروشلم کی بیٹیو!)

اس بشارت کو نہ جانتے ہُوئے اتفاق سے ماں اور دادا دونوں نے اس مولود مسعود کا نام محمدؐ رکھا۔ دادا نے صورت دیکھتے ہی خوش ہو کر پیش گوئی کر دی کہ اِنّ لابنی ہذا لشاناً (میرا یہ بیٹا ایک شاندار ہستی ہوگا)

عرب کے شرفاء کے دستور کے مطابق آپؐ کو اپنی ماں کا دُودھ پانا تو نصیب ہی نہ ہُوا یا محض چند یوم۔ سب سے پہلے آپؐ کو آپؐ کے سب سے بڑے چچا اُبولہب کی لونڈی ثُویبہ نے دُودھ پلایا، جسے اس خوشی میں ابولہب نے آزاد بھی کر دیا۔ پھر آپؐ کو بنو سعد بن بکر کی ایک خاتون حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالہ کیا گیا، وہ آپؐ کو لے کر اپنی وادی میں چلی گئیں۔ یتیم عبداللہ کی فطرت میں خدا نے عدل رکھ دیا تھا۔ حضرت

حلیمہؓ کو نہایت حیرت تھی کہ عجیب بچہ ہے۔ آپؐ نے کبھی دونوں چھاتیوں کو مُنہ نہ لگایا۔ ایک چھاتی ہمیشہ اپنے دودھ بھائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔
حضرت حلیمہؓ سے مروی ہے کہ دودھ چھڑانے کے بعد آپؐ نے جب بامعنے جملے بولنے شروع کیے، تو سب سے پہلے جو بول آپؐ کی زبان سے نکلے، وُہ یہ تھے:

اللہ اکبر کبیرا ہ والحمد للہ کثیرا ہ وسبحان اللہ بکرۃ واصیلا ؒ

نہایت حیرت کی بات یہ تھی کہ ایامِ جاہلیت میں یہ فقرے کسی کی زبان سے نہیں نکلے تھے، سب سے پہلے یتیمِ عبداللہؓ کی زبان سے یہ کلمے ادا ہُوئے۔ ان کلموں کو ادا کرتے وقت آپؐ کی عمر صرف دو یا ڈھائی سال کی تھی۔ دُودھ چھڑانے کے بعد حضرت حلیمہؓ آپؐ کو آپ کی والدہ کے پاس لے گئیں مگر مکّہ کی آب و ہوا ان دنوں خراب تھی، اس لیے حضرت آمنہؓ نے آپؐ کو حضرت حلیمہؓ کے ساتھ دوبارہ واپس کر دیا۔ حضرت حلیمہؓ کو دُودھ پلانے اور آپؐ کی پرورش کی اُجرت دی جاتی تھی، اس لیے آپؐ سے حضرت حلیمہؓ کوئی کام نہ لے سکتی تھیں۔ لیکن تین سال کے بچّے کی غیرت قابلِ توجہ ہے۔ آپؐ نے حضرت حلیمہؓ کو مجبور کر کے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے بھائی اور بہن تو دن بھر بکریاں چراتے پھریں اور میں ان کی محنت میں شریک نہ ہوں۔ مجبوراً آپؐ کو بکریاں چرانے کی اجازت دی گئی۔ آپؐ کا بکریوں کے ساتھ چراگاہوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی حلیمہؓ کی بکریوں کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔ دُودھ دینے والی بکریاں زیادہ دودھ دینے لگیں، بکرے تر و تازہ ہونے لگے۔ چراگاہ کی ہریالی بھی قدرتاً بڑھنے لگی اور بنو سعد خوش ہو گئے: ؎

لقد بلغت بالہاشمی حلیمہ   مقاماً علا فی ذروۃ العز والمجد

وزادت مواشیہا واخصب ربعہا   فقد عم ہذا السعد کل بنی سعد

(اس ہاشمی کی برکت سے حلیمہؓ نے عزت و شرف کا اونچا مقام پا لیا۔ اس کے مویشی زیادہ ہُوئے، اس کا گھر سُدھر گیا اور یہ خوش بختی تمام بنی سعد کو عطا ہُوئی)

عمر شریف جب چھ برس کی ہُوئی، تو حضرت آمنہؓ نے اپنے پاس بلایا اور آپؐ کو اپنے ساتھ لے کر مرحوم شوہر کی قبر دیکھنے کے لیے مدینہ گئیں۔ ان کے ساتھ آپؐ کی خادمہ امّ ایمن بھی تھیں۔ محلہ بنی نجار میں جہاں حضرت عبداللہ کی قبر تھی، ایک ماہ قیام کیا۔ واپسی میں بمقام ابواء ماں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا، وہیں مدفون ہُوئیں۔ حضرت اُمّ ایمن آپؐ کو مکّہ میں واپس لائیں۔ حضرت عبدالمطلبؓ جو آپؐ کے دادا تھے، اب ماں کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

عمر شریف سات برس کی ہُوئی، تو آپؐ کو آشوبِ چشم ہو گیا۔ عکاظ کے پاس ایک راہب رہتا تھا، علاجِ چشم کے لیے مشہور تھا۔ حضرت عبدالمطلبؓ آپؐ کو اس راہب کے پاس لے گئے۔ راہب نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ لڑکا تو ہُو بہو وُہی ہے جس کو حضرت سلیمان خَلُّو مُحَمَّدِیم کا لقب دے چکے تھے، اس نے حضرت عبدالمطلبؓ سے کہا کہ اس بچّے کا خاص خیال رکھنا کیونکہ میں سمجھتا ہُوں کہ خدا نے اس کو ایک عظیم الشان کام کے لیے جنم دیا ہے، جو کام سابق انبیاء انجام دیتے تھے۔

۸ھ ق ھ میں جب آپؐ کی عمر شریف آٹھ برس کی تھی، آپؐ کے دادا عبدالمطلبؓ نے بھی وفات پائی اور آپؐ کی پرورش کا بار حضرت ابُو طالب کو اٹھانا پڑا۔ حضرت ابوطالب تمام بنو عبدالمطلب میں سب سے کم آمدنی اور زیادہ خرچ والے تھے۔ اگرچہ وُہ

آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے اور آپ سے کوئی مشکل کام نہ لینا چاہتے تھے مگر آٹھ سال کے بچے کی ہمت قابلِ داد ہے۔ آپ نے غریب چچا پر اپنا پورا بار ڈالنا پسند نہ کیا۔ چچا سے باصرار اجازت لے کر دو سائے قریش کی بکریاں اجرت پر چرانا شروع کیں۔ ہر بکری کی چرائی آپ کو ایک قراط چاندی ملا کرتی تھی مگر نہیں معلوم کہ یہ قراط ماہوار ملتی تھی یا سالانہ۔ اس طرح آپ آٹھ برس کی عمر ہی سے چچا کے مالی بوجھ کو ہلکا کرنے میں شریک تھے۔

۴۳ ق ھ میں آپ کو ایک عجیب صورتِ حال کا احساس ہوا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک روز حضورؐ سے دریافت کیا کہ کیا چیز آپ نے سب سے پہلے دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ میری عمر دس سال اور چند ماہ کی تھی اور میں ایک صحرا میں تھا، دو شخص نظر آئے، ان کے جیسے چہرے اور ان کا جیسا لباس میں نے کبھی نہ دیکھا، ان کے بدن سے جیسی خوشبو پھیلتی تھی اس قسم کی خوشبو میں نے کبھی نہ سونگھی تھی، ایک نے دوسرے سے کہا کیا یہ شخص وہی ہے۔ پھر دونوں نے میرے پاس آکر میرے بازوؤں کو پکڑا مگر ان کی گرفت کا مس میں نے محسوس نہ کیا۔ پھر انھوں نے مجھے لٹا یا، مگر میں نے لٹانے کا دباؤ محسوس نہ کیا۔ پھر ایک نے کہا کہ اس کا سینہ چاک کرو، دوسرے نے سینہ چاک کیا، لیکن مجھے چیرنے پھاڑنے کا درد محسوس نہ ہوا اور نہ خون نکلا، پھر اس نے کہا کہ اس کے اندر سے غل وحسد یعنی کینہ اور ڈر نکال دو۔ اس نے جمے ہوئے لہو کا سا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا۔ پھر پہلے نے کہا کہ اس کی جگہ رافت و رحمت رکھ دو۔ اس نے چاندی جیسی ایک چیز اندر رکھ دی۔ پھر دونوں نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کو جھٹکا دیا اور کہا کہ اٹھ کر دوڑو۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ اس کے بعد میں اپنے دل میں چھوٹے پر ترس اور بڑے پر رحم محسوس کرنے لگا۔ یہ تھا آپ کا سب سے پہلا احساس، جسے بعد میں آپ نے امرِ نبوت کا پہلا شعور قرار دیا، لیکن ابھی تک آپ کو اس کا وہم تک نہ تھا کہ میں خدا کا نبی مقرر ہونے والا ہوں۔

انہی دنوں کا ایک اور عجیب واقعہ یہ ہے کہ بوآنہ نام ایک بت کی پرستش کا دن آیا۔ قریش سال میں ایک دن رات بھر اس بت کے گرد بیٹھ کر جاگا کرتے اور تبرک کے لیے اسے چھوتے اور قربانیاں گزارتے تھے، آپ کی عمر اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اب آپ کو بھی اس مذہبی رسم میں شریک ہونا چاہئے تھا۔ حضرت ابو طالب وغیرہ نے آپ کو ساتھ لے جانا چاہا۔ آپ نے جانے سے انکار کیا۔ لوگ زبردستی آپ کو ساتھ لے گئے۔ بت کے قریب جانے ہی کو تھے کہ آپ کی حالت غیر ہوگئی اور بیہوشی سی طاری ہوگئی۔ بعد میں آپ نے اپنے چچاؤں کو بتایا کہ گورے رنگ کے ایک مردِ طویل کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے ڈانٹ رہا ہے اور کہتا ہے کہ محمدؐ! دور ہی رہنا، قریب نہ آنا، اسے ہرگز نہ چھونا۔ لوگ آپ کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ پھر کسی نے آپ کو ایسی رسموں میں شرکت کے لیے نہیں کہا۔

۴۰ یا ۴۱ ق ھ میں جب کہ عمر شریف تیرہ یا چودہ برس کی تھی، ایک قافلہ تجارِ قریش کا شام کو روانہ ہونے لگا۔ اس قافلہ میں حضرت رسولِ خدا کے چچا حارث بن عبدالمطلب اور حضرت ابو طالب بھی روانہ ہونے لگے۔ آپ نے حضرت ابو طالب کی اونٹنی کی مہار تھام لی اور کہا: "چچا جان! آپ مجھے کس کے حوالے پر چھوڑے جاتے ہیں؟ میرا نہ تو باپ زندہ ہے نہ ماں۔" یہ سن کر حضرت ابو طالب نے آپ کو اپنی اونٹنی پر بٹھا لیا۔ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ بصریٰ پہنچے، وہاں ایک خانقاہ تھی جو دیرِ بحیرا کہلاتی تھی، اس میں ایک راہب رہا کرتا تھا جس کو بحیرا کہا جاتا تھا۔ یہ نام نہ تھا، عبرانی لفظ ۳، ۱ ۴، بحیر کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کے معنی وہی ہیں جو عربی میں مصطفیٰ یا مرتضیٰ کے ہیں۔ کسی بڑے عہدہ کے لیے جو منتخب کیا جاتا تھا اسے بحیر کہا جاتا تھا۔ اس راہب کا نام جرجیس تھا، وہ نسلاً عرب تھا اور

بنو عبد القیس میں سے تھا اور نصرانی مذہب کا تھا، اس کی خانقاہ کے سامنے ایک سایہ دار درخت تھا۔ قریش کا قافلہ تجارت یہاں دم لیا کرتا تھا۔ اس سال سے پہلے کبھی اس راہب نے قافلہ قریش تک آکر ان سے بات چیت نہیں کی تھی۔ لیکن اب کی بار وُہ اپنے دَیر سے نکل کر خود قافلہ میں آیا اور اہلِ قافلہ کو اپنی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ عربی دستور تھا کہ لوگ ضیافتوں میں کم عمر بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لیجاتے تھے آپؐ کو سامانِ قافلہ کے پاس چھوڑ کر خانقاہ میں گئے، تو جرجیس نے پوچھا، کیا سب اہلِ قافلہ آگئے؟ لوگوں نے کہا، ہاں، البتہ ایک کم عمر چھوکرے کو سامان کے پاس چھوڑ دیا گیا ہے۔ جرجیس نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ وُہ لڑکا تم ہی لوگوں میں سے ہے۔ لوگوں نے کہا کہ بنی عبد المطلب میں سے ایک ہے۔ تب جرجیس نے کہا: میرے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ ایک عالی نسب لڑکا میرے دستر خوان سے الگ رہے۔ حارث بن عبد المطلب اٹھے اور آپؐ کو بھی لے آئے۔ آپؐ جب آئے تو اس نے بہت غور سے آپؐ کو دیکھا اور بار بار دیکھا، تو قریش کہنے لگے کہ نہایت عجیب بات ہے ان لمحمد عند الراھب لقدرا۔ یعنی اس راہب کے دل میں محمدؐ کی بڑی قدر ہے۔ جب لوگ واپس جانے لگے، تو اس نے آپؐ کو روک لیا۔ حضرت ابو طالب بھی رُک گئے۔ راہب نے آپؐ کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔ آنکھ، کان، ناک پر غور کرنے کے بعد پشت کھولنے کے لیے کہا۔ پشت مبارک پر دونوں مونڈھوں کے درمیان ایک بڑا مسّا تھا، جس کو بالوں نے چھپا رکھا تھا، جو اس مسّے کے گرد اُگے ہوئے تھے۔ اس مہر کو غور سے دیکھا۔ پھر اس مسّے کا بوسہ لے لیا۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نے مختلف باتیں پُوچھیں، خصوصًا آپؐ کی نیند کا حال پُوچھا۔ سوال کرتے وقت اُس نے آپؐ کو لات وعزّٰی کی قسم دی کہ جو پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتانا۔ آپؐ نے لات وعزّٰی کے نام سے سخت نفرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ مجھے نہ معلوم کیوں ان بتوں اور دیوتاؤں سے سخت نفرت محسوس ہوتی ہے۔ پھر اس نے حضرت ابو طالب سے پوچھا کہ اس لڑکے سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ حضرت ابو طالب آپؐ کو برابر میرا بیٹا کہا کرتے تھے۔ آپ نے یہی جواب دیا تو جرجیس نے کہا: یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ شخص وہی ہے، جو میں خیال کرتا ہُوں تو اس کے باپ اور ماں میں سے کسی کو اس وقت زندہ نہ ہونا چاہیے۔ تب حضرت ابوطالب نے اپنا صحیح رشتہ بتایا اور آپؐ کے حالات سنائے۔ جرجیس نے کہا: بالکل ٹھیک۔ ابُو طالب میں تم کو صلاح دیتا ہُوں کہ اپنے بھتیجے کو لیکر فوراً مکہ واپس چلے جاؤ کیونکہ تمھارے بھتیجے کو ایک بڑی شان حاصل ہونے والی ہے۔ اگر اس کو کچھ یہود نے دیکھ لیا، اور وُہ بات جان لی، جو میں جان گیا ہُوں، تو اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اس روایت کی بنا پر بعض یورپی قیاس باز یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ قرآن میں کتب سابقہ کے جس قدر مضامین اور قصّے ہیں، وُہ سب آپ کو اسی راہب سے معلوم ہُوئے۔ آدمی کتنا احمق ہوتا ہے۔ مخالفت پر اترتا ہے تو ایسی ایسی باتوں کو واقعہ مان لیتا ہے، جو نا قابلِ تصور ہونے کے باوجود اس کی مخالفانہ ذہنیت کی بھی ہم نوائی کر سکتی ہوں۔ چند ساعت میں بحیرا نے تمام کتب سماویہ کے اسرار بارہ تیرہ برس کے ایک کم عمر چرواہے کو سکھا دیے اور اس نے سیکھ لیے۔ کس قدر ناممکن تصور ہے۔ بعض یورپ زدہ" مسٹر" قسم کے مدعیانِ عقل و زیرکی اس روایت کو اس لیے غلط بتاتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بحیرا نے صورت دیکھتے ہی یہ جان لیا ہو کہ یہ شخص آیندہ نبی مبعوث ہونے والا ہے اور یہ کیسے اس نے جان لیا کہ یہود اس لڑکے کو دیکھیں گے تو مار ہی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آخر کیوں مار ڈالنا چاہتے تھے؟ ایسے "عقل پرستوں" کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت سلیمان نے اپنے محبوب کا حلیہ بیان کر کے اس کو

خلومحدیم (سراپا محمد) کا نام دیا تھا اور فرمایا تھا کہ:

عینی تشنه ولبی عرقول د و دی۔

یعنی میرا محبوب کہے گا کہ:

"میری آنکھ سوتی ہے اور میرا دل جاگتا ہے۔"

اسی جواب کو سننے کے لیے بحیرا نے آپ سے آپ کی نیند کا حال دریافت کیا تھا۔ آپ کی پشت مبارک پر جو ایک خاص شناخت تھی جس کا ذکر آپ کا جسمانی حلیہ بیان کرنے والے خاتم نبوت کے نام سے کرتے ہیں۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ اس پر اس لیے غور کیا کہ حضرت یشعیاہ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ خدا اب بنی اسرائیل سے اپنا منہ چھپا لے گا (یشعیاہ ۸-۷) وہ تاریکی میں کھدیڑ سے جائیں گے:

لیکن وہ لوگ جو تاریکی میں چلتے ہیں، بڑی روشنی دیکھیں گے اور ارض صلموث[1] کے باشندوں پر نور چمکے گا (۹: ۲) ہمارے لیے ایک لڑکا تولد ہوگا ہم کو ایک بیٹا دیا جائے گا۔

ویہی ھمشرہ عل شکمو ویقرا شمو فلئ یوعصر ال حبتو رابی عدشد شلوم۔

اور نشانِ حکومت اس کے شانوں کے درمیان ہوگا۔ اس کا نام ہوگا عجیب واعظ خداوند جبار کا۔ ہدایت کا باپ، سلامتی کا شہزادہ (۹: ۶)

اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی حد نہ ہوگی۔ وہ تختِ داؤد کا اور اس کی مملکت کا تب سے ابد تک بندوبست کرے گا اور صداقت اور عدالت سے اسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیرت مندی ایسا کرے گی (۹: ۷)

مشرہ اسم آلہ شرہ (شری = سیادت) کا شکم مونڈھوں کے درمیان کا حصہ۔ آج کل کے مترجمین مشرہ کا ترجمہ حکومت اور شکم کا ترجمہ کاندھا کرتے ہیں۔ بحیرا نے دیکھا کہ اس کے سامنے ہو بہو حضرت سلیمان کا محبوب بیٹھا تھا جسے انھوں نے خلومحدیم کا نام دیا تھا۔ اس لڑکے کا نام بھی محمد تھا۔ اس کے شانوں کے درمیان ہمشرہ موجود تھا۔ بحیرا کو معلوم تھا کہ آل داؤد میں سے وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یہویقیم کی نسل سے ہیں اور یرمیاہ ۲۲: ۱۹ و ۲۲: ۳۰ و ۳۶: ۳۰ کے مطابق نسل یہویقیم ہمیشہ کے لیے تختِ داؤد سے محروم ہو چکی ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ تختِ داؤد کا موعود وارث خداوند جبار کا عجیب واعظ، امن وسلام کا شہزادہ ابی عد یہی لڑکا ہے، جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہود اس کو دیکھیں گے، تو حسد سے مجبور ہو کر اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے جس طرح ان کے اسلاف کئی انبیا کو قتل کر چکے ہیں۔

روایت ہے کہ جب حضرت ابوطالب آپ کو واپس لے جا چکے، تو کچھ یہودی بھی اس راہ سے گزرے، بحیرا سے ملے۔ آپ کا

---

[1] صلموت: عیسائی ترجمہ "موت کا سایہ" صحیح ترجمہ: ظلمات یعنی تاریکی

ذکر مذکور چھیڑا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں اپنے ارادۂ قتل کو بھی ظاہر کیا۔ جرجیس نے ان کو سمجھایا کہ اس ارادہ سے باز آؤ کیونکہ اگر واقعی یہ لڑکا وہی ہے، تو تم اسے قتل نہ کر سکو گے۔ اور اگر یہ وُہ نہیں ہے، تو پھر قتل کی وجہ کیا ہے۔ جرجیس کے سمجھانے سے یہودیوں کا وہ طبقہ بات مان گیا اور انھوں نے آپؐ کا پیچھا نہ کیا۔

۳۸ ق۔ھ میں جب کہ آپؐ کی عمر ۱۶ برس کی ہُوئی، تو اب آپؐ نے تجارت میں حصّہ لینا شروع کیا۔ ۱۵ برس کی عمر تک آپؐ بکریاں اور اُونٹ اجرت پر چراتے تھے اور یہی آپؐ کا ذریعہ معاش تھا۔ ۱۶ برس کی عمر میں سب سے پہلا تجارتی سفر آپؐ نے اپنے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے ہمراہ یمن کی طرف کیا۔ اس سفر میں آپ کے ساتھیوں نے بہت کامیاب تجارت کی۔ آپؐ کے تجارتی مشاغل نے آپؐ کو ان بہت سی خرابیوں سے واقف کرا دیا جو عربی اصول تجارت میں داخل تھیں۔ احادیث میں بیع و شرا سے متعلق جو اوامر و نواہی ملتے ہیں، ان کے پس پشت سے آپؐ کے تاجرانہ تجربات بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اس سفر کے بعد آپ نے اور بھی سفر کیے ہوں گے مگر ان سفروں کا حال ہم کو نہیں معلوم۔ ۳۴ ق ھ جب کہ آپ کی عمر ۲۰ برس کی تھی، حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ جن کی عمر اس وقت ۱۸ برس کی تھی، آپ نے ملک شام کی طرف دوسری بار بغرض تجارت سفر کیا۔ اسی سفر نے حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ کی زندگی بھر کا رفیق بنا دیا۔ اب کے سفر میں یہ خاص واقعہ پیش آیا کہ آپؐ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کسی ضرورت سے آپؐ سے الگ ایک طرف کو جا رہے تھے، ادھر سے ایک راہب آ رہا تھا، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ وُہ صاحب جو درخت کے تلے بیٹھے ہیں، ان کا کیا نام ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب۔ راہب نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ ان کو محمدؐ ہی ہونا چاہیے۔ غالباً اس نے بھی آپ کی صورت اور حلیہ دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ یہ شخص حضرت سلیمان کا "خلّو محدیم" ہی ہو سکتا ہے۔

۴۳ ق ھ میں ایک روز حضرت رسولِ خداؐ نے حضرت ابوطالب سے کہا: چچا جان! کئی راتوں سے مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ دو شخص آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "یہ تو وہی ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔" حضرت ابوطالب نے آپ کو تسکین دی کہ یہ محض خواب ہے۔ پھر آپؐ کو ایک شب ایسا محسوس ہُوا کہ ان دونوں نے آپؐ کا سینہ چیر کر قلب مبارک کو دیکھا۔ پھر کہا، یہ قلب تو بالکل پاک صاف ہے۔ حضرت ابوطالب سے اس کا بھی ذکر کیا۔ اب حضرت ابوطالب گھبرا گئے۔ آپؐ کو لے کر ایک راہب کے پاس علاج کے لیے گئے۔ اس راہب نے آپؐ کے قدموں کو غور سے دیکھا۔ پھر پشت کھول کر اس چیز کو غور سے دیکھا جس کا ذکر سفر یشعیاہ میں ہمشرہ کے نام سے آیا ہے۔ راہب نے کہا: عبد مناف! تمہارا فرزند اچھا خاصا ہے۔ اس کو کوئی مرض نہیں۔ اس کو جو شخص نظر آیا ہے، وُہ کوئی شیطان نہیں ہے بلکہ دلوں کو ٹٹولنے والا فرشتہ ہے۔ جاؤ اطمینان رکھو۔ تمہارا فرزند ایک عظیم انسان ہونے والا ہے۔

۲۸ ق ھ میں حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی خدمات مستعار لیں اور اپنا مال تجارت آپ کے حوالے کیا اور اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ شام کی طرف روانہ کیا۔ اس سفر میں بھی آپ نے اسی درخت کے پاس قیام کیا جہاں پہلے قیام کیا تھا اور بحیرا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب کے بار ایک دُوسرے راہب سے ملاقات ہُوئی، جس کا نام نسطور تھا۔ اس نے بھی حضرت رسول اللہؐ سے وہی باتیں دریافت کیں، جو بحیرا نے پوچھی تھیں۔ پھر وُہ کہنے لگا: "وہی، وہی قسم ہے انجیل کی۔" پھر آپؐ کو غور سے دیکھنے لگا۔ خزیمہ بن حکیم السلمی کو کچھ بُرے ارادہ کا خوف ہُوا اور تلوار سونت کر راہب کی طرف لپکے۔ راہب اپنے صومعہ میں بھاگ گیا اور دروازہ بند کر کے اس نے اہلِ قافلہ سے کہا: تم لوگ ناحق

ڈر گئے۔ واللہ میں اس شخص کا دشمن نہیں ہُوں بلکہ مجھے اس شخص سے بڑی محبت ہے۔ اس کی بابت جو میں جانتا ہُوں تم نہیں جانتے۔ اس شخص کو بہت جلد ایک بڑا رتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد میسرہ سے آپ کی بابت بہت سی باتیں معلوم کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے جو کہ ۴۰ برس کی تھیں اور بیوہ تھیں، پیغام نکاح بھیجا اور حضرت ابو طالب کے مشورہ سے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو امّ المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔

آغازِ نبوّت شادی کے بعد جس طرح ہر شخص کی زندگی کا رُخ بدل جایا کرتا ہے، اسی طرح اس واقعہ کے بعد آپؐ کی زندگی نے ایک نیا موڑ بدلا۔ اب تک آپؐ اُجرت لے کر لوگوں کی بکریاں اور اونٹ چراتے تھے۔ پھر اُونٹ لے کر مکّہ کے تاجروں کا مال لے کر ادھر اُدھر سفر کرتے تھے اور مال فروخت کرتے تھے۔ اب یہ کام ترک کر دیے اور حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی نگرانی فرمانے لگے اور مستقل طور پر مکہ میں قیام کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ آپؐ کی تمام اولادیں پیدا ہُوئیں۔ اب آپ کا وقت زیادہ تر خدا کی طرف توجہ اور تبتّل الی اللہ میں صرف ہونے لگا۔ مکہ میں درس و تدریس کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آپؐ کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ آپؐ اگرچہ جبلی طور پر ایک موحد اور ایک مومن کامل تھے، لیکن آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ میرا جبلی میلان ہی سچّا دین ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ " اس (قرآن) سے پہلے تجھے نہیں معلوم تھا کہ الکتاب کیا ہے اور الایمان کیا ہے" (شوریٰ) " اس سے پہلے یقیناً تمھیں خبر نہ تھی۔ (یوسف) ذریت ابراہیم کے ہر طبقے کے لیے جن میں قریش بھی داخل ہیں، یہ بات کلمہ باقیہ کی نوعیت رکھتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ کی ذات کے سوا میں تمہارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں (زخرف) اتنی بات آپؐ کو بھی معلوم تھی اور آپؐ کا طبیعی میلان اسی کلمہ باقیہ کی طرف تھا۔ لیکن اللہ نے آپؐ کو جبلی طور پر ان لوگوں میں داخل کر رکھا تھا، جن کے متعلق فرمایا تھا:

"یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور شب و روز کے آگے پیچھے آنے میں، ان اصحابِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں، جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو، کھڑے ہیں تو کھڑے، بیٹھے ہیں تو بیٹھے، بستروں پر ہیں تو بستروں پر اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں۔" (آل عمران ۱۹۰ و ۱۹۱)

اطمینان کی زندگی نصیب ہونے کے بعد آپؐ کاروبار سے فراغت کے اوقات میں اسی طریقہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو بزم و انجمن سے الگ تنہائی میں تحنث (حنث: گناہ سے بچنے بچانے) کا شوق پیدا ہوگیا اور آپؐ کئی کئی راتوں کا توشہ لے کر غارِ حرا میں چلا جایا کرتے تھے اور وہاں تحنّث فرمایا کرتے تھے۔

اللہ نے کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ہر مخلوق کو خدا نے ایک نہ ایک کام کے لیے پیدا کیا ہے، جسے وہی جانتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کا مقصودِ خلقت دُوسرے انسان کے مقصودِ تخلیق سے مختلف ہوتا ہے، جسے خدا ہی جانتا ہے۔ انبیاء کے طبقہ کو اس نے ہدایتِ خلق کے لیے پیدا کیا۔ اس عمومی مقصودِ تخلیق کے علاوہ ہر نبی کا ایک جدا مقصود ہوتا ہے، جس کا علم ابتدا میں خدا ہی کو ہوتا ہے۔ مگر جو کارنامے انجام دے کر نبی چل بستا ہے، وہ کارنامے اس مقصودِ ربانی کو ظاہر کر دیتے ہیں جس کے لیے ایک خاص نبی کو خدا نے پیدا کیا اور اسے تربیت دی۔ کوئی شے جس کو کسی مصرف کے لیے بنایا جاتا ہے، وہ اپنے اطوارِ تخلیق کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچ کر ہی اس قابل ہوتی ہے کہ اپنے مقصودِ خلقت کو انجام دے۔ ہر نبی علمِ الٰہی میں ازل سے نبی ہوتا ہے، لیکن فرائضِ نبوت کو انجام دینے کی استعداد اسے زندگی کے ایک

خاص نقطۂ عروج تک پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے ہر نبی کو ایک مخصوص درجہ کے علم لدنی اور حکمت لدنیہ سے نوازا ہے۔ فرمایا: کلا اٰتینٰہ حکما و علما (انبیاؑ) ہم نے ہر ایک کو دانش اور علم عطا کیا۔ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ اٰتینٰہ حکماً و علما وکذٰلک نجزی المحسنین (یوسف ۲۲)

اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا، تو ہم نے اس کو ایک دانش اور ایک علم دیا اور یونہی ہم اور محسنوں کو جزا دیتے ہیں۔

حضرت موسٰیؑ کے تذکرے میں فرمایا:

ولما بلغ اشدہ واستوی اٰتینٰہ حکما و علما وکذٰلک نجزی المحسنین۔ (قصص ۱۴)

اور جب وُہ اپنی توانائی کو پہنچا اور قوی ہوگیا، تو ہم نے اسے ایک دانش اور ایک علم دیا اور دیگر محسنوں کو بھی ہم یونہی اجر دیا کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں دانش وعلم سے مراد وہ دانش وعلم ہے، جو غیر نبی کو بھی نیکوکاری کے انعام کے طور پر یا موجودہ زمانے کے الفاظ میں عمدہ علمی تجربات کی وجہ سے عطا ہوتا ہے۔ حضرت رسولِ خدا کو بھی ان آیتوں کے بنائے ہُوئے قانون الٰہی کے مطابق اپنی توانائی کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچنے پر خدا نے لاہُوتی دانش وعلم سے نوازا۔ آپؐ کے پاس انسان کی لکھی ہوئی کتاب تو کوئی نہ تھی، لیکن کتاب قدرت کھلی ہوئی تھی۔ آسمان وزمین کی ساخت پر خدا کو یاد رکھتے ہُوئے آپ نے غور کیا اور اللہ نے آپؐ کو علم و دانش سے نوازا۔ حضرت موسٰیؑ کو علم و دانش سے نوازنے کے ذکر کے بعد خدا نے ان کے مدین کو روانگی کا ذکر کیا، جہاں وہ آٹھ یا دس برس بکریاں چراتے رہے۔ حضرت رسولِ خداؐ نے تین برس کی عمر سے تیرہ برس کی عمر تک بکریاں چرائیں۔ حضرت موسٰیؑ کو یہ کام بھرپور جوانی کے ایام میں کرنا پڑا۔ آٹھ یا دس برس بعد جب وہ مصر کو واپس ہونے لگے تو خدا نے کوہِ طور پر ان کو پیغمبری سے نوازا اور ان سے کلام کرتے ہُوئے ان سے فرمایا کہ تمہارے اوپر میں نے فلاں فلاں مہربانیاں کی ہیں:

فلبثت سنین فی اھل مدین ثم جئت علی قدر یا موسٰی وا صطفیتک لنفسی۔

پھر تو کئی برس مدین والوں میں مقیم رہا، پھر تُو اے موسٰی ایک انداز پر آیا اور میں نے تجھے اپنے لیے چُن لیا۔

حضرت موسٰیؑ کو ایک خاص عمر تک پہنچنے پر روحانی توانائی کا وہ مرتبہ حاصل ہُوا، جس کے بعد آپ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہُوئے۔ دوشنبہ ۱۷ رمضان ۱۳ ق ھ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی قوٰی نے اس مقررہ حدِ کمال کو حاصل کر لیا۔ جس کے بعد آپؐ بارِ نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصودِ تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہوگئے اور غارِ حرا کے اندر آپؐ پر قرآن کی پہلی وحی نازل ہُوئی۔ آپؐ سے "جئت علی قدرِ یا محمّد" فرمانے کی بجائے خدا نے فرمایا:

انا انزلناہ فی لیلۃ القدر۔

ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔

قدر کی رات سے مراد آپؐ کی زندگی کی وہ رات ہے جس میں آپؐ نے بارِ نبوت اٹھانے کے لیے درکار توانائی اور صلاحیتِ کاملہ

حاصل کرلی۔ اس رات کی بابت کافی طویل بحث کی جاسکتی ہے، جسے ہم اس موقعہ پر زیرِ بحث لانا نہیں چاہتے۔

پہلی وحی علق ا تا ۵ ہے۔ توراۃ میں جہاں جہاں حضرت ابراہیمؑ کی نماز کا ذکر ہے، ان الفاظ میں ہے کہ ویقرا ایشم یہوہ ذکرین: (پرانا عہد نامہ) عربی میں اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے قرا باسم ربہ یعنی اس نے رب کا نام پڑھا۔ علق کی پہلی آیت اسی سنّتِ ابراہیمیؑ کے احیاء کا حکم دیتی ہے۔ خلاصہ اس سورۃ کا یہ ہے: اپنے رب کا نام پڑھ، نماز سے جو منع کرتا ہے، اس کا کہا نہ مان بلکہ اپنے رب کو سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر۔ اگرچہ علق کی باقی چودہ آیتیں بہت بعد میں اُتریں مگر ربطِ آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقراء باسم ربک دراصل حکمِ نماز ہے۔

ایامِ وحی والہام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ ۱۷ رمضان ۱۳ ق ھ سے دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک ۹ یوم کم ۶۳ برس کی عمر پائی۔ جملہ ایامِ حیات ۲۲۳۱۷ دن تھے، ان میں سے ۱۴۳۵۷ دن نزولِ قرآن سے پیشتر گزرے۔ نزولِ قرآن کی جملہ مدت ۷۹۶۰ یوم تھی۔ ان ایام میں سے ۴۴۱۷ یوم آپؐ مکہ میں قیام پذیر رہے۔ روزِ ہجرت سے لے کر وفات تک کی جملہ تعدادِ ایام ۳۵۴۳ یوم تھی۔ اس مضمون میں ان آخری دنوں کے احوال پر ہی ہم نظر ڈالیں گے۔

بعض روایات کی بناء پر، جن پر تبصرہ کرنے کا محل نہیں ہے، یہ مشہور ہے کہ علق ا تا ۵ کے بعد کچھ عرصہ وحی رُکی رہی۔ پھر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیتیں اتریں۔ لیکن واقعہ کچھ اور ہے۔ ابتدائی آیتوں کے اترنے کے بعد آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو غارِ حرا کا ماجرا سنایا اور تشویش ظاہر کی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی کہ آپؐ میں فلاں فلاں اخلاقی خوبیاں ہیں۔ اس لیے خدا ہرگز آپ کو خائب وخاسر نہ کرے گا۔ پھر وہ آپ کو اپنے ابن عم حضرت ورقہ کے پاس لے گئیں، جو ایامِ جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ عبرانی میں انجیل لکھا کرتے تھے۔ ان کے سامنے آپؐ نے غارِ حرا کا ماجرا سنایا کہ ایک فرشتہ سامنے کھڑا ہے۔ اس نے تین بار کہا کہ اقراء (پڑھ)۔ آپؐ نے ہر بار جواب دیا کہ میں قاری نہیں ہوں۔ تینوں بار آپؐ کا جواب سُن کر اس نے آپؐ کو چمٹایا اور زور سے معانقہ کیا۔ چوتھی بار اس نے علق ا تا ۵ پڑھ کر سُنائی۔ حضرت ورقہ نے تمام حالات سُن کر فرمایا کہ یہ تو وہی ناموس تھا جو حضرت موسیٰؑ کے پاس بھی آیا تھا اور پیشگوئی کی اور وعدہ کیا کہ ایک وقت آئے گا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو جلا وطن ہونے پر مجبور کر دے گی، میں اس وقت تک زندہ اور قوی رہا، تو آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ حضرت ورقہ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔

آغازِ دعوت

ان آیتوں کے اترنے کے بعد آپؐ عموماً مکّہ سے نکل کر غاروں میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب ان دنوں دس برس کے لڑکے تھے اور آپؐ کے زیرِ تربیت تھے، وہ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔

ایک روز حضرت ابوطالب نے اپنے دہ سالہ فرزند اور چہل سالہ بھتیجے کو ایک غار میں چھپ کر نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا: یہ کیا دین ہے جس کا میں تم دونوں کو عامل دیکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ ہمارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ہم دونوں ملّتِ ابراہیمؑ کے مطابق خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ حضرت ابوطالب نے حضرت علیؓ سے کہا کہ تم اپنے ابنِ عم کی روش پر ہو، اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارا ابن عم تم کو خیر ہی کی تعلیم دے گا۔ اس کے بعد بتدریج مکّہ والوں کو علم ہوگیا کہ محمدؐ بن عبداللہ بھی جنھیں کسی نے آج تک دیوتا کو پُوجتے نہیں دیکھا ہے، غاروں میں چُھپ چھپ کر ایک نادیدہ خدا کو پُوجتے ہیں۔ جب تک لوگ آپؐ کو محض صابی (بے دین) باور کرتے تھے، کسی نے

کسی نے آپ کو دین اشیاع پر عمل کی طرف دعوت نہ دی۔ لیکن یہ معلوم کر لینے کے بعد محمدؐ بن عبداللہ بھی ایک معبود کے پرستار ہیں تو لوگ آپؐ کو اپنے دیوتاؤں کی طرف بلانے لگے۔ اسی سلسلے میں سورہ کافرون اور بعض دیگر سورتوں کی آیتیں، جو سورہ کافرون کی ہم مضمون ہیں، نازل ہُوئیں۔ سورہ کافرون میں خدا نے فرمایا:

"ولا انتم عابدون ما اعبد"۔

یعنی اور نہ تم پُوجو گے اسے جسے میں پوجتا ہوں۔

مشرکین کے لیے یہ نہایت حیرت کی بات تھی کہ وہ کون دیوتا ہو سکتا ہے، جسے پُوجنے سے ہم انکار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے آپؐ سے کہا کہ نسب لنا ربك۔ یعنی ہم کو اپنے رب کا نسب سناؤ۔

خدا نے حکم نازل فرمایا:

قل ھو اللہ احد ۝ اللہ الصمد ۝ لم یلد و لم یولد ۝ ولم یکن لہٗ کفواً احد ۝

جواب دے کہ وہ اللہ ہے اکیلا ہے، اللہ حاجت روا ہے حاجت ہے، نہ کسی کا باپ ہے، نہ بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی برابری والا ہے۔

اس مختصر سی سورہ میں عزیز پرستوں، مسیح پرستوں، ملائک پرستوں، جنات پرستوں، اولیاء پرستوں، کواکب پرستوں، غرض دنیا کے تمام معلوم مذاہب کو حرفِ باطل قرار دے دیا۔ شیخ سعدیؒ نے غالباً اسی سورہ کی وجہ سے کہا تھا: ؎

یتیمے کہ نا کردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

یعنی ایک یتیم نے، جو ابھی قرآن ختم نہ کر چکا تھا کئی ملتوں کے کتب خانے بے کار اور ناخواندنی بنا کر رکھ دیے۔

پہلا مسلمان

اب کفار نے طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کیں اور ان کے جواب میں آیتیں اترنے لگیں۔ ان مباحث کے دوران میں بتدریج کئی صالح افراد نے حضرت رسولِ خداؐ کے مسلک کو قبول کر لیا۔ اہلِ علم کے درمیان بحثیں ہیں کہ سب سے پہلے کون مسلمان ہوا۔ حضرت علیؓ کو ناز تھا کہ حضرت رسولِ خداؐ کے بعد پہلا مسلمان میں ہُوں۔ ان کا ناز غلط نہ تھا، لیکن چونکہ وُہ بچے تھے، اہلِ مکہ نے ان کے اسلام کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے واقعی حضرت علیؓ اور زید بن حارثہ کے بعد اسلام قبول کیا لیکن خود عہد صحابہ میں انھیں کو "اوّل الناس صدق الرسلا" کہا جاتا تھا، یعنی پہلا شخص جس نے رسولوں کی تصدیق کی۔ پہلے مردِ مسلم جنھوں نے علانیہ دلیری کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کیا، حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے روزِ اوّل ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل نے چپکے سے پہلی ہی وحی سُن کر آپؐ کی تصدیق کر دی ہو۔ لیکن اس تصدیق کو زبان سے ظاہر کرنے میں انہوں نے بھی کچھ دنوں تامّل سے کام لیا۔ سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ کے مضمون سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی جدوجہد ایک زمانہ تک بظاہر ناکام ثابت ہو رہی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا دُکھ تھا۔ سُورہ اعلیٰ میں خدا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی اور فرمایا:

فذکر ان نفعت الذکری ٥ سیذکر من یخشی ۔ (اعلیٰ)

سو تو سمجھاتا رہ سمجھانے سے ضرور فائدہ ہوگا ۔ جو خدا ترس ہے وہ ضرور سمجھے گا۔

اس آیت کے نزول کے بعد سب سے پہلے جس شخص نے پیغمبرؐ کے دین و مسلک کو قبول کرنے کا اعلان کیا ، وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔ دل سے تو کئی افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر اقرارِ اسلام میں متامل تھے اور عذر پیش کرتے تھے کہ :

ان نتبع الھدیٰ معک نتخطف من ارضنا۔ (قصص)

اگر آپؐ کے ساتھ جو ہدایت ہے ، اس کا ہم اتباع کریں ، تو ہم کو ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا۔

حضرت ابوبکرؓ بھی دل سے قبولِ اسلام کے بعد کچھ دنوں متامل رہے ۔ یہاں تک کہ وہ چالیس برس کے ہوگئے ۔ حضرت ابوبکرؓ ۵۱ ق ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱ ق ھ میں چالیس برس کے ہوئے ، تو انھوں نے علانیہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا ۔ ان کے اسلام کی داستان روایتوں کی سند سے پیش کرنے کی بجائے قرآن مجید کی ایک آیت پیش کرنا مناسب ہے ، جس میں خدا نے فرمایا ہے :

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھاً و وضعتہ کرھا وحملہ وفصالہ ثلثون شھراً۔ حتیٰ اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلیٰ والدی وان اعمل صالحا ترضٰہ واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک وانی من المسلمین۔

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے (کیونکہ) اس کی ماں دُکھ کے ساتھ اسے پیٹ میں لیے رہی اور اس نے دُکھ کے ساتھ اسے جنا اور اس کے حمل کی اور دُودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ تھی ۔ پھر جب وُہ اپنی توانائی کو پہنچا اور چالیس برس کا ہوگیا ، تو اس نے دُعا کی کہ میرے پروردگار ! مجھے توفیق و تربیت دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر بجا لاؤں ، جو تُو نے مجھ پر اور میری اماں اور باپ پر کیا ہے اور یہ کہ میں کوئی بھلا کام کروں ، جس سے تو راضی ہو جائے اور میری خاطر اولاد کو سدھار دے ۔ میں نے تیری طرف توجہ کی اور مَیں مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔

اس آیت میں صریحاً ایک ایسے انسان کا ذکر ہے جس نے چالیس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا ۔ حضرت ابوبکرؓ کے سوا شرکائے بدر میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی عمر ابتدائی ایّام تبلیغ میں چالیس برس کی رہی ہو ۔ ان کی دُعا کا حضرت سلیمان کی دعا سے مقابلہ کیجیے جو نمل ۱۹ میں منقول ہے "رب اوزعنی" سے لے کر "ترضٰہ" کے الفاظ بالکل ایک ہیں ۔ "واصلح" سے "المسلمین" تک کی بجائے حضرت سلیمانؑ نے "وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین" کہا تھا ۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی توبہ اور اپنے اسلام کا اظہار کرنے کے بعد اپنی اولاد کے لیے دُعا کی تھی کہ ان کو صالح بنا دے ۔ والدین ان کے صالح تھے ، دل سے اسلام قبول کر چکے تھے البتہ ابھی علانیہ اعلان نہیں کیا تھا ۔ اولاد نے ابھی تک اسلام نہیں قبول کیا تھا ۔ لیکن خدا نے آپ کی دعا قبول کی ۔ چنانچہ یہی ایک گھرانا تھا ، جس کے تمام افراد نے اسلام قبول کیا ۔ حضرت سلیمانؑ نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے کوئی نیک کام کرنے کی توفیق دے جس سے تُو راضی ہو جائے ، تو اللہ نے ان کو ملکۂ سبا کو مسلمان بنا لینے کی توفیق دی ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہی دُعا کی اور اللہ نے آپ کو

بھی یہ توفیق دی کہ آپ نے کئی افراد کو زمرۂ مسلمین میں داخل کیا۔

سابقین اوّلین خود حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست سمجھانے سے حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابوبکرؓ مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اعلانِ اسلام کے بعد حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ کو مسلمان کیا۔ پھر ان لوگوں کے اسلام کے بعد حضرت عثمان بن مظعونؓ حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد اور حضرت الارقمؓ بن ابی الارقم مسلمان ہوئے۔ انھیں ایّام میں حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت عمارؓ، ان کی ماں سُمَیّہ اور ان کے باپ یاسر مسلمان ہوگئے۔ ایک عرصہ تک قریش کو صرف حضرت ابوبکرؓ کے اسلام کی خبر تھی اور اصحاب نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور غالباً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء سے ایسا کیا۔ رفتہ رفتہ قریش کو اس کا پتا چل گیا کہ کئی اشخاص مسلمان ہوگئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت عمارؓ، حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ نے دلیری دکھائی اور علانیہ اسلام کو قبول کیا۔ اب کفار کو فکر لاحق ہوئی کہ اس نئے مذہب کو کسی نہ کسی طرح دبا دینا ضروری ہے۔ ابتداء میں محض استہزاء اور مذاق کے زور سے تحریکِ اسلامی کو مٹا دینا چاہا تھا کہ وہ:

> کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون ۰ واذا مروابھم یتغامزون ۰ واذا نقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین ۰ واذا راوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون ۰
>
> مومنوں پر ہنستے تھے، ان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھیں مارتے تھے۔ اپنے اہل وعیال کے پاس لوٹتے تو گپیں مارتے لوٹتے تھے اور جب ان کو دیکھتے تھے کہتے کہ یہ گمراہ لوگ ہیں۔

لیکن زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ،

> فتنوا المومنین والمومنات۔ (بروج)
>
> مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستانے لگے۔

مسلمانوں کو قبولِ اسلام کی وجہ سے جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں، ان کی تفصیل کے لیے یہ مضمون کافی نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھیے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنا معمولی قسم کے دلیر کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ وہی شخص زبان سے ادا کر سکتا تھا، جس کو ماں سے، باپ سے، بھائی سے، بیٹے سے، بی بی سے، پورے قبیلے سے کٹ جانے کی جرأت ہوتی۔ مال ومتاع سے محروم ہونے کی ہمت ہوتی۔ موت قبول کرنا عرب کے لیے کوئی مشکل امر نہ تھا لیکن طرح طرح کی اذیتوں، ذلتوں کو سہنے کے لیے تیار ہو کر ہی ایک شخص یہ کلمہ علانیہ زبان پر لا سکتا تھا۔

انذارِ عشیرہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جدّوجہد سے بہتیرے افراد نے اسلام قبول کر لیا آپ کا اپنا گھرانا تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک حضرت علیؓ کے سوا جن کو بچے ہونے کی وجہ سے قریش کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، اب تک کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا آپ کو بیحد رنج تھا۔ سنہ ق ھ میں سورۂ شعراء نازل ہوئی، جس کی ابتداء میں خدا نے فرمایا:

لعلّك باخع نفسك الّا یکونوا مومنین۔
شاید تو اس غم میں اپنا گلا گھونٹ لے گا کہ لوگ مسلمان نہیں ہوتے۔
اس سورہ میں آپ کو تسلّی دینے اور غیر مسلموں کی بعض باتوں کے جواب دینے کے بعد خدا نے فرمایا:
وانذر عشیرتك الاقربین o واخفض جناحك لمن تبعك من المومنین o فان عصوك فقل
انی بریٔ مما تعملون o
اور اپنے نہایت قریبی خاندان والوں کو خبردار کر اور مومنوں میں سے جو تیرا تابعدار ہو جائے، اس کے لیے اپنے بازو جھکا دے۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں، تو بس اتنا کہہ دے کہ میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد آپ نے پہلے حضرت عبدالمطلب کی تمام اولاد کو اپنے گھر میں دعوت دی اور ان کو سمجھایا مگر ایک حضرت علیؓ کے سوا کسی نے اسلام اس وقت قبول نہ کیا۔ لیکن اس مجلس میں جتنے شریک تھے، ان میں سے ابولہب، عتیبہ بن ابی لہب اور طالب بن ابی طالب کے علاوہ ہر شخص کو خدا نے کلمۂ اسلام قبول کرنے کی ایک نہ ایک وقت توفیق دی۔ حضرت ابو طالب کی بابت اختلاف ہے کہ انھوں نے اسلام کے کلمہ پر وفات پائی یا کلمۂ کفر پر۔ اگرچہ زیادہ مستند روایتیں ان کے اسلام قبول نہ کرنے کی شاہد ہیں۔ مگر میرا میلانِ طبعی شیعی روایتوں کی صحت کی طرف ہے۔ آلِ رسولؐ کی طرف جتنی روایتیں منسوب ہیں، وہ اسی بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ حضرت ابو طالب نے حضور صلعم کی پرورش آپ کی نو برس کی عمر سے کی۔ آپ کی عمر جب ۵۰ برس کی ہوئی، اس وقت تک برابر آپ کے لیے سینہ سپر تھے۔ حضرت علیؓ کو اسلام پر قایم رہنے کی وصیت انھوں نے کی تھی۔ آپ کے ساتھ ان کو بیحد محبت تھی۔ اپنے ایمان کو مصلحتاً عوام سے وہ چھپاتے رہے ہوں، تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ جن روایتوں سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے، ان کی نادیل ہم کر سکتے ہیں کہ مومن آلِ فرعون کی طرح وہ اپنا ایمان چھپاتے تھے۔ بہرصورت چار افرادِ خاندان کے علاوہ، جن میں حضرت عبدالمطلب کے بیٹے، پوتے، پوتی، بیٹی، نواسا، نواسی وغیرہ ۳۶ افرادِ خاندان کو خدا نے اسلام کی توفیق دی ان میں سے خصوصیت کے ساتھ حضرت جعفر بن ابی طالب کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جو اس مجلس میں تو نہیں تھے مگر اس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ مسلمان ہو گئے۔

اس مجلس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک فرد کو آواز دے کر بلایا۔ ہر خاندان سے لوگ آ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تم کو خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج آ رہی ہے، جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم لوگ یقین کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ضرور یقین کریں گے، کیونکہ تمہاری کوئی بات ہمارے علم میں آج تک جھوٹی نہیں ثابت ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تب میں تم کو ایک عذاب شدید سے آگاہ کرتا ہوں اور آپ نے عذابِ آخرت کی تشریح کی۔ ابولہب نے کہا: تبالك الهٰذا دعوتنا۔ یعنی بُرا ہو تیرا کیا تُو نے ہم کو اسی لیے بلایا ہے۔ پھر وہ سب کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے کفار نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ کارروائیوں کی انتہا کر دی۔ بہتیرے مسلمانوں کے لیے ایمان کو سلامت رکھتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن ہو گیا۔

رجب ۹ سنہ ق ھ میں آپ نے اجازت دی اور حضرت عثمانؓ بن مظعون کی قیادت میں گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ حبش کو روانہ کیا۔ قریش نے اس قافلہ کا پیچھا کیا کہ سب کو گرفتار کر لائیں۔ لیکن ساحل پر پہنچنے کے ساتھ مسلمانوں کو ایک جہاز مل گیا اور پیچھا کرنے والوں کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے یہ لوگ حبش کو روانہ ہو چکے تھے۔ شعبان یا رمضان میں سورۂ نجم نازل ہوئی جس کے اندر واقعۂ معراج کا ذکر ہے۔ یہ سورہ مجمع عام میں پوری سنائی گئی۔ آخری آیت سن کر مسلمانوں کے جس قدر افراد مکہ میں رہ گئے تھے انہوں نے سجدہ کیا۔ ان کے ساتھ ایک کافر کے علاوہ دوسرے تمام کفار نے بھی سجدہ کیا۔ قصہ طویل ہے۔ یہ مضمون تطویل کا متحمل نہیں کیونکہ باوجود اختصار طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اس واقعہ کی خبر حبش میں سارے اہل مکہ کے مسلمان ہو جانے کی نوید بن کر پہنچی۔ شوال ۹ سنہ ق ھ میں مہاجرین حبش سے واپس آ گئے۔ مگر یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے پہلے سے زیادہ انگارا بنی ہوئی تھی۔ اس لیے ۹ سنہ ق ھ کے خاتمہ سے پہلے ہی دوبارہ ان لوگوں کو حبش جانا پڑا اب کی بار چالیس سے کچھ کم مردوں اور گیارہ عورتوں کا قافلہ حبش کو روانہ ہو گیا۔ جہاں کچھ لوگ ۱ سنہ ھ تک اور کچھ لوگ ۶ سنہ ھ تک مقیم رہے۔ اب کی بار قافلۂ مہاجرین کے سردار حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب تھے۔ ان لوگوں کے حبش پہنچتے ہی عبد اللہ بن ابی زمعہ اور عمرو بن عاص کی قیادت میں قریش کا ایک وفد دربار نجاشی میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارے کچھ مجرمین آپ کے ملک میں بھاگ آئے ہیں ان کو گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کیا جائے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے ان کا عذر پوچھا، تو حضرت جعفرؓ نے ایک نہایت بلیغ تقریر کی۔ ایام جاہلیت کے احوال بیان کیے۔ پھر حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کیا۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ سنایا، اور کہا کہ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے خدا کو واحد بے شریک مان لیا۔ اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ جن خبیث کاموں کے ہم عادی تھے، ان سے توبہ کی۔ ہماری قوم چاہتی ہے کہ ہم پھر اسی خبیث مسلک پر لوٹ جائیں جس کے ہم عادی تھے۔ اس لیے انہوں نے ہم کو ستایا، دُکھ دیا، مجبور کیا اور اپنے نئے مسلک پر قایم رہتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ہمارے لیے ناممکن ہو گیا، تو ہمارے نبیؐ نے آپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کا حکم دیا۔ نجاشی نے قریش کے وفد سے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ ان کا کوئی اور جرم بھی ہے؛ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ ان میں سے کوئی آبق غلام تو نہیں ہے؛ لوگوں نے کہا: نہیں۔ تب اس نے قریش سے کہا: جب یہ آزاد ہیں، تو پھر آزاد ہیں، میں ان کو تمہارے حوالہ نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں سے کہا: اذھبوا فانتم الطلقاء۔ (جاؤ تم لوگ آزاد ہو)۔ قریش نے کہا کہ یہ لوگ حضرت مسیحؑ کے حق میں جو مانتے ہیں، وہ بھی تو ان سے پوچھیے؛ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے کہا کہ اچھا بتاؤ کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق تمہارا کیا عقیدہ ہے؛ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی ۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی اور اس کے دربار کے کئی آدمیوں کا یہ حال تھا کہ ان کے آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر بتر ہو رہی تھیں۔ اسی واقعہ کی طرف سورۂ قصص میں خدا نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے؛

الذین اٰتیناھم الکتاب من قبلہ ھم بہ یومنون o واذا یتلیٰ علیھم قالوا اٰمنا بہ انہ الحق من ربنا انا کنا من قبلہ مسلمین۔ (قصص ۵۲)

جن لوگوں کو اس کے قبل سے ہم نے الکتاب (کی سمجھ) دی ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جب وہ کتاب ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے رب کی جانب سے سچی بات یہی ہے۔ ہم تو اس کے قبل سے مسلمان ہیں۔

نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ رجب ۹ھ میں اس نے وفات پائی۔ عین بروزِ وفات خدا نے حضرت رسولِ خداؐ کو اور آپ نے مسلمانانِ مدینہ کو نجاشی کے جاں بحق ہو جانے کی خبر دی۔ آپ نے میدان میں نکل کر اپنے صحابہ کے ساتھ اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ تاریخ اسلام میں پہلی غائبانہ نمازِ جنازہ یہی تھی۔ اس نمازِ جنازہ میں جو لوگ شریک تھے، ان میں حسب ذیل اصحاب کے نام معلوم ہیں؛ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عامرؓ بن ربیعہ، حضرت ابو قتادہؓ، حضرت سہیلؓ بن حنیف، حضرت عبادہؓ بن صامت۔ اس باب میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آپؐ نے نجاشی کے مرنے کی خبر دی تو بہتوں کو ایسا محسوس ہوا کہ اللہ نے پردہ اٹھا دیا۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے لوگ تختِ حبش پر نجاشی کو بیٹھا دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی معجزہ نہ تھا۔ ۵ نبوت کا منظر لوگوں کی آنکھوں میں ۱۰ برس بعد تازہ ہو گیا تھا۔

وفدِ قریش حبش سے ناکام واپس آیا۔ قریش کا قہر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور بھڑک گیا۔ لوگوں نے کہا یہ تو غضب ہو گیا۔ نجاشی تک محمدؐ کا مرید ہو گیا ہے۔ اب اسلام سے نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پیغمبر کو قتل ہی کر دیا جائے۔ لیکن بنو عبد مناف سے خطرہ تھا کہ وہ ثار (خون کے بدلے خون) کا مطالبہ کریں گے۔ بنو عبد مناف کے گھرانے چار تھے: (۱) بنو ہاشم، (۲) بنو مطلب، (۳) بنو اُمیہ، (۴) بنو نوفل۔ قریش نے ان چاروں گھرانوں سے کہا، یا تو محمدؐ کو قتل ہونے کے لیے ہمارے حوالے کر دو، یا ہم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بنو امیہ اور بنو نوفل نے عام قبائل قریش کی حمایت اور دوستی کو ترجیح دی مگر بنو ہاشم اور بنو مطلب میں سے ایک ابولہب کے علاوہ ہر شخص نے اعلان کر دیا:

فلا واللہ نسلمہ لقومٍ ولمّا نقض فیھم بالسیوف۔

قسم ہے خدا کی تلواروں سے فیصلہ کیے بغیر اسے ہم کسی قوم کے حوالے نہ کریں گے۔

اب طے پایا کہ کوئی ایک شخص قتل کی ذمہ داری تنہا اپنے اوپر اٹھا لے تاکہ ایک خون کا بدلہ ایک ہی خون ہو۔ اس کام کی ذمہ داری عقبہ بن ابی معیط نے اٹھائی۔ ایک دن اس نے آپ کو تنہا دیکھ لیا، اپنی چادر کو رسی جیسا بنایا اور پھانسی کا پھندا بنا کر آپؐ کے گلے میں ڈال دیا اور پھندے کو کسنے لگا۔ اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ آ گئے، لپک کر عقبہ بن ابی معیط کو دھکا دیا، وہ گر پڑا اور آپؐ کی گردن سے پھندا نکال دیا۔ کچھ مسلمان اور پہنچ گئے اور آپؐ کو ارقم بن ابی ارقم کے گھر لے کر چل دیے۔ عقبہ بن ابی معیط کے طرفداروں نے اب حضرت ابوبکرؓ کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ بیہوش ہو کر گر گئے۔ آپ کے خاندان بنو تیم کو خبر ہو گئی، وہ آئے اور آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دیا۔ حالت ایسی تھی کہ سب نے یقین کر لیا کہ تھوڑی ہی دیر بعد جاں بحق ہو جائیں گے۔ لیکن بالآخر آپ کو ہوش آ گیا۔ ہوش آتے ہی آپؓ نے سب سے پہلے حضرت رسولِ خداؐ کی خیریت دریافت کی اور اپنی والدہ کو، جو مسلمان تو تھیں مگر اعلان اسلام نہیں کیا تھا، حضرت عمرؓ کی بہن کے پاس، جو مسلمان ہو چکی تھیں، مگر ابھی کسی کو ان کے اسلام کی خبر نہ تھی، بھیج کر حضرت رسولِ خداؐ کا خفیہ مستقر معلوم کر کے دار الارقم میں حاضر ہوئے، اور آپ کے ساتھ یہیں ٹھہر گئے۔ ایک ماہ تک آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ اسی گھر میں روپوش رہے۔

دار الارقم

قدیم تاریخ مسلمانوں اور اسلام کی ہم کو بتاتی ہے کہ اسلام نے ہمیشہ مظلومی کے زمانہ میں ترقی پائی ہے۔ سچائی کو جتنا ہی دبایا جاتا ہے، اتنی ہی اُبھرتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے اسلام کی قوت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ جو لوگ سختی سے

اسلام کی بیخ کنی میں حصہ لیتے تھے، ان کے دلوں میں بھی اسلام کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب آپؐ دار الارقم میں داخل ہوئے تو مشکل سے آٹھ نو آدمی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ۳۰ یوم آپؐ نے یہاں قیام کیا۔ اس مدت میں شرکائے دار الارقم کی تعداد ۳۸ ہوگئی۔ گویا ہر روز ایک مسلمان کا اضافہ ہونے لگا۔ پہلے خود حضرت رسولِ خداؐ اور حضرت ابوبکرؓ ایک ایک مردِ صالح کی تلاش میں نکلتے تھے اور جب کوئی سعید روح مل جاتی تھی تو اسے سمجھا بوجھا کر مسلمان کرتے تھے۔ لوگ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی کچھ دنوں اعلان سے احتیاط برتتے تھے کیونکہ ان دنوں لَآ اِلٰہ اِلَّا اللہ بولنا معمولی دل اور گردے والے کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ بولنا صرف جان کے لیے خطرناک نہ تھا بلکہ انسان کو اپنے ماں باپ، بھائی، اولاد سب سے کٹ جانا ہوتا تھا۔ خود اپنی کمائی کے مال و متاع سے بھی محروم ہو جانا پڑتا تھا۔ موروثی مال کا تو ذکر ہی کیا، اپنے سارے دوستوں کو دشمن بنا لینا تھا۔ اس لیے لوگ قبول اسلام کے بعد بھی اعلان سے محتاط رہتے تھے مگر اس واقعہ نے ہر سعید رُوح کے اندر مردانہ ہمت پیدا کر دی۔ پہلے کنواں پیاسے کے پاس جاتا تھا، اب پیاسا کنویں کے پاس آنے لگا۔ لوگ چپکے چپکے آنحضرت کا پتا دریافت کرتے تھے اور دار ارقم میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے اور اسی گھر کو اپنا مسکن بنا لیتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت رسولِ خداؐ کے اوپر قربان ہو سکنے کے شرف کا جب موقع ملے، قربان ہو جائیں۔ دار ارقم مسلمانوں کا پہلا دار الاجتماع کوہِ صفا پر تھا۔ یہ تیس دن مسلمانوں کے لیے نہایت مبارک ثابت ہوئے۔ حضرت رسولِ خداؐ کے ساتھ ہر گھڑی بیٹھے اور دین اسلام کے نکات کو سمجھنے کا روزانہ موقع ملا۔ ڈر اور خوف نے دلوں کو خالی کر دیا۔ ایمانوں میں جرأت پیدا ہوئی۔ روزانہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے اجازت مانگتے تھے کہ ہم کھل کر نکلیں اور دھڑلے سے اسلام کی تبلیغ کریں۔ لیکن حضرت رسولِ خدا ان کو ابھی کچھ دنوں اور محتاط رہنے کی ہدایت دیتے تھے۔

اسلامِ حمزہؓ

ایک دن ایسا ہوا کہ ابوجہل نے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا دیکھ لیا، آپؐ کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ کیا باتیں کیں؟ یہ نہیں معلوم، مگر حضرت صفیہ بنت عبد المطلب کی ایک لونڈی سُن رہی تھی اس نے جا کر حضرت حمزہ کو ساری باتیں سنائیں۔ حضرت حمزہؓ کو، جو اب تک نہایت خموشی سے دشمنانِ رسولؐ کی باتوں اور کارروائیوں کو برداشت کرتے تھے، وُہ باتیں سُن کر غصہ آگیا۔ ابُوجہل کے پاس پہنچے اور اسے بُری طرح ڈانٹا اور اُسے کہا کہ اب کبھی ایسی جرأت نہ کرنا، کیونکہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں بھی مسلمان ہُوں۔ یہ کلام اُن کی زبان سے غصہ میں نکل گیا تھا۔ پھر اپنے دل کو ٹٹولا، تو معلوم ہُوا کہ وہ واقعی ان کے دل کی آواز تھی۔ اس لیے خوشی کے ساتھ دار ارقم میں آکر کلمۂ اسلام پڑھ کر مسلمان ہو گئے اور اپنے اسلام کا اعلان حسبِ ذیل اشعار کی صورت میں کیا:

حمدت اللّٰہ حین ھدی فوادی — الی الاسلام والدین الحنیف

الدین جاء من رب عزیز — خبیر بالعباد بھم لطیف

اذا تلیت رسائلہ علینا — تذرف دمع ذی اللب الحصیف

واحمد مصطفیٰ فینا مطاع — فلا تغشوہ بالقول العنیف

خدا کا شکر ہے، اس نے میرے دل کو ہدایت دی، میں نے اسلام اور دینِ حنیف قبول کر لیا۔ یہ دین پروردگار توانا نے بھیجا ہے، جو اپنے بندوں کا خبرگیر ہے، ان پر مہربان ہے، جب اس کے رسالے ہم کو پڑھ کر سنائے

جانتے ہیں، استوار دانش والے کا آنسو بہنے لگتا ہے اور احمدؐ ہمارے درمیان برگزیدہ ہے، قابلِ اطاعت ہے،
اس لیے دیکھو اسے کبھی سست نہ کہنا۔

اسلامِ عمرؓ

حضرت حمزہؓ کے اسلام نے دارارقم کے شرکا، کی تعداد ۳۹ کر دی۔ جن غلاموں نے اسلام قبول کیا تھا، چونکہ اپنے آقاؤں کا ساتھ نہ چھوڑ سکتے تھے، وہ دارارقم میں نہ تھے۔ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے بعد قریش کو حمزہؓ ہی جیسے بہادر کی فکر ہوئی تاکہ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سر کاٹ لائے۔ اس کام کے لیے حضرت عمرؓ کو تیار کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ کسی قدر طویل ہے اور بہت دلچسپ ہے۔ مگر مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اسلام کی حقانیت کے وہ اب سے پہلے قائل ہو چکے تھے مگر آبائی دین کی محبت ابھی غالب تھی۔ اس لیے تلوار سونت کر وہ آپ کو قتل کرنے کے لیے نکلے۔ راہ میں ان کو خبر ہو گئی کہ ان کی بہن اور بہنوئی بھی مسلمان ہو چکے ہیں، پہلے ان کا قصہ تمام کر دینا چاہا۔ بہن کے گھر پہنچے اور بہن اور بہنوئی کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ لیکن بہن کو لہو لہان دیکھ کر دل نرم پڑ گیا۔ بہن نے کہا: مار ڈالو مگر کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ اور محمّد رسول اللّٰہ سے نہیں پھر سکتی۔ اب حضرت عمرؓ کا دل اور ہی ہو گیا، بہن سے وہ صحیفہ مانگا، جو وہ پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے کہا: تم ناپاک ہو اور یہ صحیفہ ناپاکوں کو نہیں دیا جا سکتا۔ اُٹھے اور فوراً غسل کیا۔ پھر صحیفہ لے کر پڑھا اور بے ساختہ کلمۂ شہادت زبان سے نکل گیا۔ حضرت خبابؓ بن الارت، جو ان کو قرآن پڑھا رہے تھے اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر ایک کوٹھڑی میں چھپ گئے تھے، باہر نکل آتے اور فرمایا: ابھی کل حضرت رسولِ خداؐ نے دُعا کی تھی، خدایا! عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابوجہل) دو میں سے کسی کو اسلام کی عزت عطا کر کے میری مدد فرما۔ خدا نے آپ کے حق میں یہ دُعا قبول کر لی۔

پھر وہ حضرت عمرؓ کو لے کر دارارقم میں پہنچے اور کارکنانِ قضا و قدر نے غلغلہ بلند کیا کہ: ؎

آمد آں یارے کہ ما مے خواستیم

عمر نکلے تھے کہ فرزندِ عبداللہ کا سر کاٹ لیں مگر اب خود عمر کے لب تھے اور فرزندِ عبداللہ کا پاؤں۔ سورۂ انفال مدنی سورہ ہے، اس میں خدا نے فرمایا:

یآیھا النبی حسبک اللّٰہ و من اتبعک من المومنین۔

اے نبی تیرے لیے اللہ کافی ہے اور جتنے مومنوں نے تیرا اتباع کیا۔

غالباً یہ آیت بھی مدنی ہے۔ لیکن مفسروں کی روایت کے مطابق یہ آیت حضرت عمرؓ کے اسلام کے عین بعد نازل ہوئی۔

(واللہ اعلم بالصواب)

غلاموں کی رہائی

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام کا زمانہ ۶ نبوی کے ابتدائی ایام کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے بعد مسلمانوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی۔ اب تک آپ کا دائرۂ تبلیغ صرف شہر تک محدود تھا۔ خدا نے ام القرٰی و من حولھا یعنی مکہ اور اردگرد والوں کو سمجھانے کا حکم سورۂ قصص اور سورۂ انعام میں اتارا۔ سب سے زیادہ مصیبت میں وہ مسلمان تھے، جو آزاد نہ تھے۔ اب "فک رقبہ" (غلاموں کی آزادی) کے لیے جدوجہد کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری دولت اس کام کے لیے وقف کر دی اور تمام غلاموں کو، جو مسلمان ہو چکے تھے، ان کے مالکوں سے

خرید کر آزاد کر دیا۔ ان آزاد ہونے والے غلاموں میں سب سے محترم نام حضرت بلالؓ کا ہے۔ ان کو گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر تپتا ہُوا پتھر رکھ دیا جاتا تھا، کوڑے مارے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ توحید سے انکار کرنے ہی پر جان بخشی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ مردِ خدا احد احد چلاتا تھا پانی بھی پینے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا تھا۔ حضرت رسولِ خداؐ کا اپنے ماننے والوں پر جو اثر تھا، اس کا مقابلہ ان بزرگوار پر مسیحیت کے اثر سے کیجیے، جن کو عیسائیوں کے خیال کے مطابق آسمان کی اور جنت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افضل انبیاء ہیں، بے بنیاد نہیں ہے۔ کہاں کوئی مصیبت سے بغیر محض مصیبت کے خوف سے حضرت مسیحؑ کے خلاف کلمۂ کفر بول کر جان بچانا اور کہاں تپتی ریت پر تپتے پتھر سے دبے ہُوئے کوڑے کھانے والے کا احد احد پکارنا۔ حضرت پطرسؓ کو ہم بُرا نہیں کہتے کیونکہ ان کی نظیر ہم کو حضرت عمارؓ بن یاسر میں ملتی ہے، لیکن پھر بھی فرق ہے۔ کیونکہ حضرت عمارؓ نے باپ اور ماں کی مظلومانہ موت دیکھی۔ اسی مظلومانہ موت کے منہ میں پھنس کر جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے کہہ دیا جسے خدا نے جیسا کہ سورہ نحل میں ہے، معاف کر دیا۔ حضرت پطرسؓ کو حضرت مسیحؑ کے اٹھ جانے کے بعد تو ضرور بلالی ایمان عطا ہوا، لیکن حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں ان کا ایمان حضرت عمار کے ایمان جیسا بھی نہ تھا۔ لیکن اگر ہم آج کے مسلمانوں کا ایمان بالرسول اور نصرانیوں کا ایمان بالمسیح ایک ترازو پر رکھیں اور ہم کو شرم اور غیرت خدا نے دی ہو، تو شاید مر ہی جانا پڑے گا۔

حصارِ شعب سنہ ۷ ق۔ھ اگرچہ مسلمانوں کے لیے نہایت سخت دور تھا، لیکن اب سب مومنوں کے دل بلالؓ کے سے ہو گئے تھے، اب کوئی مصیبت ان کے لیے مصیبت نہ تھی۔ ہر شخص اسلام کا پُرجوش مبلغ تھا۔ اطراف واکناف سے لوگ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے کو آنے لگے۔ قریش کو نہایت فکر لاحق ہو گئی۔ محرم سنہ ۷ ق۔ھ میں تمام اہل مکہ نے جن میں بنو امیہ اور بنو نوفل دو خاندان بنو عبد مناف کے بھی شریک تھے، مسلمانوں اور بنو ہاشم اور بنو مطلب سے جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود حضرت رسولِ خداؐ کے لیے سینہ سپر رہتے تھے، ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیے اور ان سب کو شعب ابی طالب میں قید ہو جانے پر مجبور کر دیا اور ایک عہد نامہ مقاطعہ لکھ کر خانہ کعبہ میں اس کو لٹکا دیا۔ دو سال تک ان کو شعب ابی طالب میں قید رہنا پڑا۔ اس زمانہ میں جو شدتیں اور تکلیفیں ان کو برداشت کرنی پڑیں، ان کی تشریح طویل ہے۔ صرف ایامِ حج میں ان لوگوں کو شعب سے نکلنے کا موقع تھا۔ ایامِ حج میں چونکہ کسی پر ظلم کرنا مشرکین مکہ بھی ناروا سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ کا اچھا موقع ملتا تھا۔ دُور دُور سے حج کے لیے جو لوگ آتے تھے، وہ بھی اس نئے دین کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شعب ابی طالب کے زمانہ میں خدا نے وہ سُورتیں نازل کیں، جن میں ان تمام لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، جن کے پاس کوئی الہامی نوشتہ نہ تھا۔ شعب ابی طالب سے رہائی کے بعد اہل کتاب کے درمیان بھی تبلیغ کے احکام نازل ہُوئے۔

حصارِ شعب کے ٹوٹنے کی صورت یہ ہُوئی کہ ایک روز رسولِ خداؐ نے اطلاع دی کہ قریش نے جو معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر محفوظ رکھا ہے، اللہ کے نام کے علاوہ تحریر کا ایک ایک حرف دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ حضرت ابو طالب ہمت کر کے شعب میں سے نکلے خانہ کعبہ کے پاس آئے۔ قریش نے سمجھا کہ اب ہمت جواب دے چکی ہے ہماری شرطیں مان لیں گے، لہٰذا خوشی سے ان کا استقبال کیا۔ حضرت ابو طالب نے حضرت رسولِ خداؐ کا بیان ان کو سنایا۔ قریش نے کہا: اگر یہ بیان غلط ثابت ہُوا تو تم کو ہماری شرط ماننی پڑے گی

اور صحیح ثابت ہُوا تو آج سے مقاطعہ ختم کر دیا جائے گا، کیونکہ یہ خدائی فیصلہ ہے۔ کاغذ تلاش کیا گیا تو خبر حرف بحرف صحیح تھی، اس لیے معاہدہ منسوخ کیا گیا۔ محرم ۱۰ ھ میں حصارِ شعب سے لوگ باہر نکلے۔

انشقاقِ قمر انبیاء اور اولیاء کے تذکروں میں عموماً معجزات اور کرامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی بہت سے معجزات کتب سیرت میں مروی ہیں۔ لیکن قرآن پاک کے اندر خدا نے معجزوں کو دلیلِ نبوّت نہیں قرار دیا ہے۔ بہتیری آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ کفّار بار بار معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن اس مطالبہ کو کسی نہ کسی جواب کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا تھا۔ اس لئے بہتیرے اصحاب ان آیتوں کی دلیل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ سورۂ انعام میں خداوند عالم نے فرمایا کہ :

وقالوا لولا نزل علیه اٰیة من ربه قل ان الله قادر علی ان ینزل اٰیة ولکن اکثرهم لا یعلمون۔ (انعام)

اور انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی (معجزانہ) آیت کیوں نہ اتاری گئی۔ جواب دے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ کوئی آیت نازل کر دے۔ لیکن بہتیرے لوگ نہیں جانتے (کہ کیا بات کس بات کی دلیل ہوتی ہے)

واقسموا بالله جهد ایمانهم لئن جاء تهم اٰیة لیؤمنن بها قل انما الاٰیات عند الله وما یشعرکم انها اذا جاءت لا یؤمنون۔ (انعام: ۱۰۹)

اور ان لوگوں نے اللہ کی پکّی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی (معجزانہ) آیت آجائے گی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور تم لوگ نہیں جانتے کہ جب وہ آئے گی، تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔

واذا جاء تهم اٰیة قالوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل الله۔ (انعام: ۱۲۴)

اور جب ان کے پاس ایک آیت آگئی، تو کہنے لگے ہم اب بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ ہم کو بھی اس کا مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔

ان آیتوں کے باوجود جو لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی معجزے سرزد ہُوتے، وُہ غلطی پر ہیں۔ البتہ خدا نے معجزوں کو دلیلِ نبوت نہیں مانا ہے۔ کیونکہ مُردہ جلا دینا جس طرح کسی کے اچھے وکیل ہونے کی دلیل نہیں اسی طرح مُردہ جلا دینا اس بات کی بھی دلیل نہیں کہ میں جو تعلیم دیتا ہُوں، وُہ برحق ہے۔ دلیل اور مدلول میں رابطہ ہونا چاہیے۔ مُردہ جلانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسی طرح قیامت کے دن مُردوں کو زندہ کر دے گا، مگر اس بات کی دلیل نہیں کہ جھُوٹ بولنا بُری بات ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معجزے سرزد ہُوتے، ان میں سے ایک کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ خدا نے فرمایا:

اقتربت الساعة وانشق القمر وان یروا اٰیة یعرضوا ویقولوا سحر مستمر ○

قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند میں شگاف پڑ گیا۔ اور اگر یہ لوگ کوئی آیت دیکھیں گے، تب بھی اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ چلتا ہُوا جادو ہے۔

اس آیت کی بنا پر کفار نے وہ قسم کھائی تھی، جو انعام ۱۱۰ میں مذکور ہے۔ ان کے قسم کھانے کے بعد ایک رات حضرت رسولِ خدا نے لوگوں کو بلا کر چاند کی طرف انگلی کی اور فرمایا: دیکھو تو۔ لوگوں نے دیکھا کہ چاند پھٹ کر دو ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ ۵ ق۔ھ کا ہے۔ روایتوں میں اس واقعہ کی تفصیلات ملیں گی۔

قرآن کا دعویٰ تھا کہ چاند میں شگاف پڑ گیا ہے۔ یہ دعویٰ نہ تھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ جرمِ فلک کا حادثہ صرف یہ تھا کہ اس میں کسی زلزلہ کی وجہ سے شگاف پڑ گیا۔ لیکن جب لوگوں نے اس کا قابلِ دید ثبوت مانگا، تو آپؐ نے چاند کی طرف اشارہ کیا تو ان کو ایسا نظر آیا، کہ چاند پھٹ کر دو چاند ہو گیا۔ جرمِ فلک پر گزرنے والے حادثے کا آنکھوں سے نظر آنیوالا منظر ایک ثبوت تھا۔ جرمِ فلک میں جب شگاف پڑا تو اس کے اندر کوئی چیز دخان جیسی نکل کر متموج ہو گئی اور اس کے تموّج نے چاند کو دو کر کے دکھا دیا۔ اس موقع پر ایک شعر نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، جسے میری چشم دید گواہی سمجھیے:۔

تیری موجوں میں چھپا ہے راز و انشق القمر
رود گنگا تیری گودوں میں بکھر جاتا ہے چاند

۳ ق۔ھ میں حضرت ابو طالبؓ اور حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ حضرت رسولِ خدا نے اس سال کو عام الحزن کا نام دیا۔ شوال یا ذی قعد ۳ ق۔ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کو ساتھ لیا اور بغرضِ تبلیغ طائف کو روانہ ہوئے۔ لیکن سرزمینِ طائف آپ کے لیے مکہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ بنو ثقیف نے آپ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا اور کہا "کیا اللہ کو رسول بنانے کے لیے کوئی اور شخص نہیں ملا۔ پھر انھوں نے چھوکروں کو اکسا دیا کہ یہ شخص مجنون ہے، اب تم جانو اور یہ مجنون جانے۔ آپؐ جدھر گزرتے، لونڈے آپ کو پتھر مارتے تھے۔ حضرت زیدؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بددعا کے لیے عرض کی۔ آپؐ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور خدا سے عرض کی:

"میرے پروردگار! میری قوم کو راہِ راست دکھا دے کیونکہ یہ بے علم لوگ ہیں۔"

لونڈوں سے جان بچا کر کسی طرح ایک باغ کی دیوار کے زیرِ سایہ بیٹھ گئے۔ اس باغ کے مالک مکہ کے رئیس تھے۔ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ۔ کفر شدید کے باوجود آپؐ کی حالت زار پر ان کو رحم آ گیا۔ باغ کے مالی عداس کو، جو ان کا غلام تھا، انھوں نے ایک طبق میں کچھ خوشے انگور کے آپؐ تک لے جانے کو کہا۔ جناب عداس ایک نصرانی عالم تھے۔ بدقسمتی سے غلام بن کر پلے تھے۔ یہ بزرگ جب خوشے لے کر آپؐ کے پاس پہنچے، تو عتبہ اور شیبہ نے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ جناب عداس آپؐ کے سر کو، ہاتھوں کو اور پاؤں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ دونوں نے عداس کو بلا کر سوال کیا کہ عداس تم یہ کیا کر رہے تھے۔ عداس نے جواب دیا:

"میرے آقا! روئے زمین پر آج اس شخص سے اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہ بات بتائی ہے، جو ایک نبی ہی بتا سکتا ہے۔"

اس کے بعد آپؐ وہاں سے مکہ کو لوٹ آئے۔

۳ ق۔ھ کے ماہِ حج سے اسلام کی تاریخ کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ مدینہ سے آ کر چھ افراد نے ایک گھاٹی کے اندر

اسلام قبول کیا۔ سنہ ۲ ق ھ کے ماہِ حج میں یہ لوگ تجدید بیعت کے لیے چھ مزید مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا، اور آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ تعلیمِ قرآن کے لیے حضرت مصعبؓ بن عمیرؓ کو روانہ کیا۔ سنہ ۱ ق ھ کے ماہِ حج میں ۷۰ انصار نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کو مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آنے کی دعوت دی اور مکّہ سے لوگوں نے یکے بعد دیگرے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ چند دنوں کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا واھجرھم ھجرًا جمیلا اور آپ نے جمعہ یکم ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو مکّہ چھوڑ دیا۔

تین یوم آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں چھپے رہے۔ دوشنبہ ۵ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو غار سے نکلے اور دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ھ کو مدینہ پہنچے۔ اس روز سے اسلامی تاریخ کا کچھ اور ہی رنگ ہوگیا۔

———

مدنی زندگی

سید مناظر احسن گیلانی

جن کوتاہ بینوں نے "دل" کا اقرار کیا تھا، لیکن "دماغ" پر ان کو اب تک شک تھا، اب ان ہی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے، جس میں "دل" سے زیادہ "دماغ" ہی کی نمائش ہوگی تاکہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے جس کے آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لیے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجربات بیّنہ کی اسی کش مکش سے وہ ترشی بھی نچوڑی جائے گی جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا، پھٹ جائے گا، جن کے پاؤں "سربلندی و علو" کے خمار کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں، تاکہ حجت پوری ہو:

لیھلك من ھلك عن بینة و یحیی من حی عن بینة ۔ (القرآن)

جو مرنا چاہے وہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے وہ بھی کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جیے۔

مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ "ھو انی علی الناس" کے فریادی کو "الناس" اور "ناس" کے ساتھ جو کچھ ہیں سب پر اس کو وزن بخشا جا رہا ہے، یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا، سلع پہاڑ کے دامن میں سب اسی پر رد کیے جا رہے ہیں، بھوکوں کے لیے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں، پیاسوں کے لیے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں، گاتے ہیں، بجاتے ہیں، باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں، ابھی ابھی جن کی حجازی چٹانیں ھلم الی یا رسول اللہ کے ساتھ پکار رہی تھیں، اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ بڑھ کر ٹھیک اسی طرح:

یا رسول اللہ ھلم الی القوۃ والمنعۃ ۔ اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آئیے۔

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں، مال حاضر کرتے ہیں، تو یہ مدینہ کا نہیں بلکہ قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس عمل کا ردِ عمل "ملاءِ اعلیٰ" سے شروع ہوا تھا، یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے جو "مکہ" میں بھی ظاہر ہوا، "ثور" میں بھی ظاہر ہوا۔

"ثور" سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا، "قبا" میں بھی ظاہر ہوا، جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لیے بند تھا، صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تاکہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے پہلا کام یہی کرے، اور اب مدینہ میں بھی اسی ردِ عمل کا ظہور ہو رہا ہے، آئندہ ہوتا رہے گا، اسی کا ظہور "کوفہ" میں بھی ہوگا، "دمشق" میں بھی ہوگا، "بغداد"

میں بھی ہوگا، "غرناطہ" و "قرطبہ" میں بھی ہوگا "قاہرہ" میں بھی ہوگا "غزنی میں بھی ہوگا" دہلی میں بھی ہوگا، اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا، کب تک ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے، اسی کی نمود ہے، اسی لیے "مدنی زندگی" کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہ تو "مکہ" ہی کے آثار ہیں جنھیں تم اب "مدینہ" میں دیکھ رہے ہو، بلکہ "مدنی" زندگی میں تم کو وُہ باتیں تلاش کرنی چاہییں جن میں "دل" سے زیادہ "دماغ" کا "اخلاق" سے زیادہ "عقل" کا تجربہ ہو۔

"مکہ" میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس "دل" سے بہتر کوئی دل نہیں، اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ "مدینہ" میں کرو، جن کو دیکھ کر کہا جاتے کہ اس "دماغ" سے بہتر کوئی "دماغ" نہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اس کے ساتھ "صفہ" کا مدرسہ بنایا گیا، لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا، مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے، پھر اس میں بڑائی کیا ہے، باوجود استطاعت قدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی، بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی، بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں، سب سے پہلے وُہ اپنے گھر سے بھی پہلے، وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے، اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہیے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وُہ آباد ہوتا ہے، تعمیری تکلفات کی وجہ سے دقت نہ ہو اس لیے سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وُہ رکھا گیا جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے، ہر جگہ گاڑ سکتا ہے، آخر تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو "علم دین" ہے، "دین علم" ہے، عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔

میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیش نظر نہیں تھے، یا آیندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے، لیکن دیکھا گیا پر سوچا نہیں گیا، آخر مسجد عرب میں بنتی ہے، عرب میں کعبہ موجود تھا، جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا، لیکن بایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔

لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا، لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ "وطنیت" کا جو بُت عرب میں صدیوں سے پُوجا جاتا تھا، اور اس زور و شور سے پُوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو "عجم" اور گونگا سمجھتا تھا، دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بُت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداءً "عربوں پر یہ "غیر ملکی" قبلہ گراں گزرا تو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انھوں نے عہد کیا تھا، جھجکے مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے، اور جو لادا گیا لاد لیا، سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کے لیے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے عرب سے الگ کیے گئے، لیکن اب عرب نہیں بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا ہے، سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے، اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمانؑ و داؤدؑ اسحاقؑ و اسماعیلؑ کے باپ ابراہیمؑ کے بنائے کعبہ کو قبلہ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ۔

اور جہاں سے تم نکلے اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف منہ موڑ دو، اور جہاں کہیں (اے مسلمانو!) تم ہو اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو۔

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کیے گئے ہیں وُہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں، پہلے غیر عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا، اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا نہ غیر عرب رہا بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آ گئی، کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا، اور بسیط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا، یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے، وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے، ایشیا بھی اس کو کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے، یورپ میں بھی جب اس کو نماز کی ضرورت ہوتی ہے تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے، اور رسٹ اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے، اور "بحر محیط" اسی صحن کا ایک حوض بحر قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے، ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل پیش کرتا ہے، اس کو یہی بتایا گیا ہے، صحیح حدیث میں ہے:

جعلت لی الارض مسجداً۔ پُوری زمین میری مسجد بنائی گئی ہے۔

"وطنیت" کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب "قومیت" اور "نسلیت" کا بُت سامنے آتا ہے، کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں، جب سنتے ہیں یا کہتے ہیں کہ "مدینہ" میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا، ان میں عقد مواخات قائم کیا گیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہُوا، مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہو کار کعبہ کے کلید بردار تھے، اور انصار قبیلہ اوس و خزرج کے کسان اور کاشت کار تھے، حالانکہ دونوں انسان تھے لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سامی نسلوں نے تورانی نسلوں کو یا برہمنوں نے شودروں کو بے رنگوں نے رنگینوں کو پھیکوں نے نمکینوں کو، آدمی کی نہیں بلکہ گھوڑوں کی اولاد بیل کی نسل سمجھا، اور اسی قسم بلکہ ان سے بدتر سلوک انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جو ان کے ہم نسل ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا، نسبی فخر ایک دیوتا تھا جو صدیوں سے ان میں پُوجا جاتا تھا، اور اس طرح پُوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے، جس طرح آج بھی اُجلے کالوں کے ساتھ دُعا تک مانگنے میں اپنی ذلت سے ڈرتے ہیں، قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا ننگ خیال کرتے تھے، جس میں کوئی غیر قریشی بیچارہ دفن ہوتا، جس طرح آج بھی شودروں کی مسان برہمنوں، چھتریوں کے مرگھٹ سے دُور ہوتی ہے، یہی مواخات کا گز تھا، جس نے اس بت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہُوا تھا، وہ اس کے ہاتھ چُومتا تھا، اور یہ ان کے قدم لیتا تھا، یہ اس کو اپنا سب کچھ بلکہ تم نے سنا ہوگا طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وُہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یُوں مخلوقات بلکہ اپنے خود ساختہ مخلوقات کے پنجوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے ربِّ قیوم کو پا لیا تھا اسی کے بعد منادی کرا دی گئی کہ اب دنیا ایک ہے ، اس کا معبود ایک ہے ، ان کا رسول ایک ہے ، ان کی کتاب ایک ہے ، ان کا کعبہ ایک ہے۔

اور دیکھو کر دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں مغرب میں، زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں ، پکارتے رہیں گے ، کیا ناقوس سے ، بوق سے ، قرنا سے ، گھنٹوں سے ، طبل سے، نقاروں سے یہ بات ممکن تھی، جس کی ابتدا اذان کے عجیب و غریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی ، متعدد وطنوں کا بُت ٹوٹ گیا، متعدد نسلوں کا صنم چُور چُور ہو گیا۔

جو توڑے گئے جٹ گئے ، جو بکھیرے گئے تھے سمٹ گئے ، الغرض جو ایک تھے وہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ وُہ ہے جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے ، محض فکر و خیال ہی نہیں ، بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا، انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا جس کو عالم پر منطبق کرنے کے لیے "کافۃ للناس" کا بشیر و نذیر اب "کافۃ الناس" کی طرف بڑھتا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اس کو اختیار تھا کہ "قرن الثعلب" کے پاس اس کو جو اخشبین (۲ پہاڑ) دیئے گئے تھے ، ان ہی کو لے کر آگے بڑھتا لیکن یہ تو پھر دل کا امتحان ہو جاتا ، حالانکہ اب تو صرف "دماغ" ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے ، دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں ، اس کو مجنوں کہنے والے کیا خود مجنوں نہیں ہیں ، جس کی عقل ، جس کے فہم کے یہ کرشمے ہیں ، اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے کیا ایسے بدبخت خود عقلی توازن سے محروم نہیں ہیں۔

راستہ اگر صاف ہوتا تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے ، کامل طور پر دکھایا نہیں جا سکتا تھا ، لیکن دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ و راست اوپر اور نیچے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں وُہ قصداً اُن ہی میں گھس کر نکلتا ہے ، اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا ہے۔

بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی طرف یلغار کرتی ہے ، جو یہودی ساہوکاروں کے سود در سود کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں ، ان کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے ، لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے ، پیدا ہونے کے ساتھ یہودی قرض خواہوں کے گھر اُٹھ کر چلا جاتا ہے ، زیادہ دن نہیں ہُوئے تھے کہ اس چھوٹی سی آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگی میں رہے سہے جوانوں اور سرداروں کو بھی کھو چکے ہیں ، ان کے ساتھ اپنے دھن سے وطن سے بچھڑے ہُوئے کچھ لوگ اور بھی شریک ہیں جن کی تعداد سَو سے زیادہ نہیں ہے ، ان کا یہ حال ہے ، دُوسری طرف سارا عرب ایک کمان بن کر اس تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے ، یہودی اپنی مہاجنی کی کساد بازاری سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعوں والوں کو مخالفت کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں ، جن کا سلسلہ مدینہ سے شروع ہو کر شام کے حدود تک پھیلا ہوا ہے ، مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہو جاتا ہے ، بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس وقت کی سب سے بڑی مشرقی طاقت

(ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم) دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دُور کے فاصلہ پر غسّانیوں کے حدود پر ہنہنا رہے ہیں اور کسریٰ کے چپراسی وارنٹ لیے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ مدینہ کے کسانوں کے سردار کو دربار شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔" یہ ان کے شہنشاہ کا فرمان ہے جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے۔

یہ اس وقت کا سماں ہے، جس وقت مدینہ میں "دماغ" کے تجربہ کے لیے نسلِ انسانی کو دعوت دی جاتی ہے، پھر کیا ہوتا ہے۔

قیدار کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا کہ ایک ہی ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھُس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے، علو و کبریائی کا جوش ان کے قدم کو جمنے نہیں دیتا تھا پھٹ کر ہوا ہو گیا، جو سب سے بڑا تھا، سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہُوا قریش کے ستر سورما مارے گئے اور یوں قیدار کی حشمت خاک میں مل گئی۔

وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر اس کونے کے پتھر پر گرے تھے، جیسا کہ کہا گیا تھا جو اس پر گرتا ہے، چور چور ہو جاتا ہے، چُور چُور ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے، وہ دوست ہو گئے۔

جن پر تلوار چلائی وہ نہیں، بلکہ جنھوں نے تلوار چلائی اُنھوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا، جنھوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا "تلوار کے زور سے پھیلایا گیا"، مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا، سب کچھ چھینا گیا، پانی چھینا گیا، کھانا چھینا گیا، گھر چھینا گیا، در چھینا گیا، اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے، اور کتنوں سے چھینا گیا، دہکتی ہوئی آگ، چمکتی ہوئی تلواروں، کھنچے ہوئے کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہُوئے، پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں، تنے ہُوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا اڑاتے ہُوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں، لیکن لیتے ہوئے نہیں، دیتے ہوئے، اکڑتے ہوئے نہیں جھکے ہوئے بدلہ چکاتے ہوئے نہیں، حطّ و عفو کرتے ہوئے:

اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ۔ — شہر کے دروازہ میں سر جھکائے اور حطّہ (یعنی گناہوں اور قصوروں کو جھاڑتے ہوئے معاف کرتے ہوئے) داخل ہونا۔

کی تعمیل کرتے ہوئے، تفسیر کرتے ہوئے، رحم و کرم، صفح و اعراض، مغفرت و درگزر، امن و امان کے پھول برساتے ہُوئے:

الیوم یوم بر و وفاء الیوم انتم الطلقاء۔ — آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے، آج تم لوگ آزاد کیے گئے۔

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کے لیے جو پہلا گھر، مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی، صرف خالق کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا، اس میں لا الٰہ الا اللہ الحمد للہ وحدہ نصر عبدہ وحزب الاحزاب وحدہ کہتے ہوئے سربسجود

ہوگئے، ابراہیمؑ کا بیت ایل پتھر کی کھدی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہوگیا، اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی، بت پرست، یہودی، عیسائی، صابی، عقل پرست سبھی ہیں، ان مختلف اقوام و قبائل کے باہمی انتشار، جنگ و جدال کو ختم کر کے ایک پُرامن آئینی نظام سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا، لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل و عریض سرزمین کا پایۂ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہوگیا تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں (عربی ہندوؤں) یہودیوں، عیسائیوں، مسلمانوں سب میں سے امن و امان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے ان کی تعداد کروڑ، لاکھ بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں، اتنی بھی نہیں جتنی "نیویارک" کی سڑکوں یا "لندن" کی شاہراہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں، یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار ہوتی ہے، بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے، یہ ہے "خونی پیغمبر" کا بہایا ہوا خون یا قصابوں کی وہ دکان جس کے شور سے گنبد گرداں بھی تھرّا اٹھا ہے، غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

اُف! برکندہ باد آنکھوں سے بداندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا جہاں سے انسانیت کی مُردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا، جہاں موت ہے، مُردوں کو، دل کے مُردوں کو وہاں زندگی نظر آرہی ہے اور جہاں سے صرف زندگی بٹ بٹ رہی ہے، انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا، جب موت کی وادی کے نام سے انھوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا، ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے جب اس میں بلاوجہ بنی قریظہ کے ان یہودیوں کو بھی شریک کر لیا جائے، جن کو خود ان کی کتاب اور ان کی شریعت نے ان ہی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی رُو سے اس وقت ناپید کیا، جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہوگی، آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی پھونک کی سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے، تو اگر ان ہی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں، اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بیچارے ان شہید معلّموں کو بھی شمار کر لیا گیا ہے، جن کو نجد والے اپنے ملک میں وعظ و تلقین، تعلیم و تذکیر کے لیے لے گئے، اور معونہ نامی کنویں پر ستّر آدمیوں کو شہید کر دیا گیا ان ہی میں وہ دس مبلّغ بھی ہیں جنھیں بے دردی کے ساتھ بلاوجہ رجیع کے مقام پر ذبح کر دیا گیا، یہ تو مسلمانوں کی طرف سے شہید ہوئے، اسی طرح فریق ثانی کے ان مقتولوں کو بھی اسی تعداد میں شریک کر لیا گیا ہے جو بجرم قصاص یا ڈاکہ یا چوری مارے گئے یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے، لوگ سوچتے نہیں، ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ یا مہم پر ہو سکتا ہے، تو وہ "بدر" ہے، جس میں بائیس مسلمانوں اور ستّر قریش کے، اسی طرح "اُحد" میں ستّر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور "بیٹل" رکھا جائے۔

بہرحال قریشیوں سے جو کچھ چھیڑ چھاڑ ہوئی، وہ اسی پر ختم ہوگئی نہ "خندق" میں بازار قتال گرم ہوا، نہ مکّہ میں خونریزی ہوئی اس کے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے، جن میں خیبر سب سے اہم ہے، اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے۔ "عیسائیوں" سے "موتہ" میں گھمسان کی جنگ ہوئی، لیکن اس گھمسان میں بھی مسلمانوں کے

کل بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا، اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے، چوروں کا پیچھا کیا گیا، باغیوں کی سرکوبی کے لیے کوئی دستہ روانہ کیا گیا تھا، جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، بہرحال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاء اللہ ثابت نہ ہوگی، حالانکہ مقابلہ میں عرب کے وحشی قبائل، طاقتور جمہوریتیں، اور بعض سلاطین بھی تھے لیکن جس کو طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا، کیوں سوچا جاتا ہے کہ اس کو کیوں کر ملا، اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا، جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمۂ دعوت و دعویٰ لا الٰہ الّا اللہ کی دلیل ہے، آخر ان واقعات میں بھی اسی کو کیوں ڈھونڈا جاتا۔

الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ و جدال جن کے خون کا افسانہ ہزار ہا بوقلموں رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان مسجود ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی، اس کی جان تو بڑی چیز ہے، اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیریوں میں کوئی نکال نہیں سکتا، امن و امان کا دور دورہ ہے عالم پر منطبق کرنے کے لیے انسانی زندگی کے جس آئین و دستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں گاڑا گیا تھا اس کے نیچے چلے آتے ہیں، بے تابانہ چلے آتے ہیں، آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں، فوج در فوج چلے آتے ہیں، وفود کا "تانتا بندھ جاتا ہے۔

پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قایم ہوا، وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا، وہی منبر ہے۔ وہی مسجد ہے، وہی جھونپڑے ہیں، وہی چھپڑے کا اکھراکڈا ہے، نہ حاجب ہیں نہ دربان ہیں، امیر بھی آتے ہیں، اور غریب بھی آتے ہیں، دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے عجب دربار سلاطین کہتے ہیں، شاہی دربار تھا کہ فوج تھی، علم تھا، پولیس تھی، جلّاد تھے، محتسب تھے، گورنر تھے، کلکٹر تھے، منصف تھے، ضبط تھا، قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں، مدرسہ تھا کہ درس تھا، وعظ تھا، افتا تھا، قضا تھا، تصنیف تھی، تالیف تھی، محراب تھی، منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں، خانقاہ تھی کہ دعا تھی، جھاڑ تھا، پھونک تھا، ورد تھا، وظیفہ تھا، ذکر تھا، شغل تھا، تحنث (چلّہ) تھا، گریہ تھا، بکا تھا، وجد تھا، حال تھا، کشف تھا، کرامت تھی، فقر تھا، فاقہ تھا، زہد تھا، قناعت تھی، کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے گا، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے، جس کو جو کہہ دیا جاتا ہے پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا، اس لیے کہ وہ سب کے لیے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا، جہاں کہیں چلنا تھا، جس زمانہ میں چلنا تھا، اسی روشنی میں چلنا تھا۔

یہ تو عرب کے لیے ہوا، عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دس سال کے عرصے میں مشرق کی سب سے بڑی قوت "پرشین ایمپائر" اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت "رومن امپائر" کے ساتھ

اطراف و جوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ، جو جاگا اس نے پایا، جو سویا اس نے کھویا۔ کسریٰ نے خط پھاڑا، اس کا ملک پھاڑ دیا گیا، "قیصر" بھی پھاڑ دیتا، اور خدا کرتا کہ وُہ پھاڑ دیتا تو وہ بھی پھٹ جاتا، لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کرا لیا۔ اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں ہُوئی۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس ہوگی۔ جیسے رومیوں کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب و غریب تجربات دینے والا پاک وجود پھر "دل" کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا جس پر لیٹنے کے بعد پھر اُٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، اللّٰھم صلّ علیہ وسلم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب بڑھیا سے قرض کر کے آیا تھا، اور جو چادر اس وقت مرض واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی، جب بعد کو دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک ایک سیاہ کمبل تھا، جس کے اُوپر تلے پیوند لگے ہُوئے تھے اس کی زرہ تیس صاع جَو پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گرو تھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کے لیے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والو! سوچ رہا ہے، دیکھ رہے ہو، جو اس بستر پر لیٹا ہُوا ہے، انصاف کے خُونیو! کیا یہی تمہ کا وُہ فقیر ہے، جس کے متعلق تمہاری گندی زبانوں نے غُل مچایا کہ وُہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا آج ہی اس کا یہ حال ہے، دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے رود دھواں اُٹھتے دیکھا؛ ایسے بادشاہ کس دُنیا میں گزرے ہیں جن کے منہ کو جَو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؛ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؛ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؛ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں پیسنے کا گھٹا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے ہیں؛ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطّہ میں پائی گئی، جس کو جس کے بچّوں کو دو دو تین تین دن بھوک کی شدت میں دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑا ہے؛

بادشاہوں کا قصر کیا اسی کو کہتے ہیں، جن کے کھجوروں کے پتوں کی چھت سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو؛

"مدینہ" کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے، اس کے طول و عرض کو تو اب بھی ناپ سکتے ہو، باہر میں اس کے کچھ بھی ہو، لیکن اندر تو اس کا وہی ہے، جو پہلے تھا۔

بہر حال دس سال تک "دماغ" کا بھی اسی طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا، جس طرح تیرہ سال تک "دل" کے مشاہدات پیش کیے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اُتارا گیا، جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی کی بھی گنجائش نہ تھی، تو دُوسری طرف ان ہی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہی، یہی وُہ گروہ تھا، جو "سینا" کی روشنی میں حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا، وہی دعویٰ جس کی

دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کا مدعی اعلان سے پہلے چمکا رہا تھا، اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا، جنھوں نے جان کر اس کو مانا تھا، یہ نسخہ ان کو پلایا گیا۔

اور کسی جنگل یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں، تلوار کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی۔ پلا کر بھی دکھایا جاتا تھا، اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا "بدر" میں جب پی کر اُترے تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور "احد" میں جو کچھ ہوا ان ہی کی بدولت ہوا جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی، مگر جب فتح ہُوا تو سب اسی نشہ میں سرشار تھے، "حنین" میں جب میدان چھُوٹا، تھوڑی دیر کے لیے چھوٹا، تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں، پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو۔ لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اس نشہ کی کمی کا ان میں نشان دیا ہے جس کا ان کو تجربہ کرایا جا رہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے جو اندر نہیں بلکہ باہر گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے، اور قرآن کہتا ہے، کہ وہ "مجاریٹی" اور اکثریت کے اس اعتماد سے بھاگے جو ان کے اندر چھپا ہُوا تھا۔

یوم حنین اذا اعجبتکم کثرتکم فلن تغن عنکم شیئا۔	اور حنین کے دن جب اپنی کثرتِ تعداد نے تم کو مغرور کر دیا۔ لیکن یہ کثرتِ تعداد تم کو فائدہ نہ پہنچا سکی۔

کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے؟

اگر یہ مقصود نہ تھا تو جس کو طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا، اس کو اس "لاؤ" اور اس "لشکر" کی کیا ضرورت تھی، یُوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ عجیب و غریب کمالات دکھاتا تھا، یہ غرض نہ ہوتی تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا، اور جب جی چاہا تو کیا خاک کی مٹھی سے اسی نے وہی کام نہیں لیا جو "ہوٹزز" کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خوُن بہاتا تھا، جس کا خون بہایا گیا، جس کی داڑھی خوُن سے دھوئی گئی، جس کے دانت توڑے گئے، جس کی پیشانی میں "زِرہ" کی کڑیاں چھپائی گئیں، نابینالو! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔

چورو! کوتوال ہی کو اُلٹے ڈانٹتے ہو، بکف چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو، حالانکہ ترسٹھ سال کی طویل مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ خونیوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا کسی کا بال بھی توڑا تھا۔

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا، قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا، یہی یہودی جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں ملتا ہے اور اب تک ہے، جب خون کے مستحق ہو چکے تھے، اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے، لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق، دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا، بہت بڑا خیر وہ شر ہے، جس کے ذریعہ سے کسی عظیم و جلیل شر کا سدِباب ہوتا ہو، قصاص میں زندگی ہے، آخر اس قانون میں اور کیا ہے، بلاشبہ ان دو توں کی موت میں ان تمام

یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی، جو ان کے بعد زندہ رہے، پھلے پھُولے، ورنہ جو منصوبے ان دونوں نے پکائے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام و نشان جاتا رہتا، جیسا کہ ہمیشہ اسی قسم کے بد باطن یہودیوں نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگرچہ ان ہی کی شریعت ان ہی کے حکم سے مٹائی گئی، لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے یہودیوں کی زندگی مستور نہ تھی، سنگ دل اور ظالم ہے وہ جراح جس نے ایک انگلی کے لیے پُورے جسم کو سڑنے دیا۔

آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے، اس کے بھی چند سال گزر چکے ہیں، اور اب وہی جو عرب کے لیے بھی تھا، عجم کے لیے بھی تھا، مردوں کے لیے بھی تھا اور عورتوں کے لیے بھی تھا، زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے، سارے جہاں کی عورتوں کے لیے قیامت تک نسلِ انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سب کے لیے ان کی تعلیم کے لیے تربیت کے لیے ان کے نمونہ کے لیے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے، شاید قدرت کی طرف سے تھا اور اس کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے، اور حیاتِ انسانی کے کامل دستور العمل کا جھنڈا اٹھایا جاتا ہے، وہ نہ "لندن" ہے نہ "پیرس" حتیٰ کہ "بمبئی" بھی نہیں اور "کلکتہ" بھی نہیں بلکہ سوچو تو بیابان کی اس کوردہ آبادی کی تمدنی و عمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے، لیکن دنیا کے اسی دُور افتادہ، ویران، ریگستان، نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہان کے "مذاہب و ادیان" اس لیے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید و تکذیب نہیں بلکہ سب کی تصدیق، سب کی تصحیح، سب کی تکمیل عملی شکل میں ممکن ہو کہ وہ "مکذب" نہیں بلکہ "مصدق" تھا اور یہی اس کے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو "وثنیت" کی شکل میں "مکہ" ہی میں موجود تھا۔ "مدینہ" آنے کے بعد اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب "یہودیت" بھی سامنے آگیا اس کے ساتھ خود "مدینہ" میں اطرافِ "مدینہ" میں وہ "نصرانیت" بھی موجود تھی جس کے زیر اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا، اور اس وقت بھی ہے، اس کے حلقہ میں "مجوسی" اور ایران کے آتش پرست زردشتی بھی شریک تھے، اور ارد گرد میں ایک فرقہ "صابئوں" کا بھی تھا، جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب کے ان "صابئوں" کا تعلق "بودھ مذہب" کے "سادھوؤں" سے تھا، یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا جسے دنیا اب نہیں جانتی ہے۔

الغرض کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت، عیسائیت، ہندویت یا وثنیت، مجوسیت، اور اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے ان تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھی، جن کے دھونے اور جن سے پاک کرنے کے لیے وہ اٹھایا گیا تھا، پس اس نے ان سب کو دھویا، ان سب کو پاک کیا، صاف کیا، جس میں جو کمی تھی سب کو پُورا کیا اور قیامت تک کے لیے پُورا کیا۔

اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اس کو کچھ لوگ دیئے، دیکھو کہ قریب قریب کچھ اسی طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمائندہ اس کی خدمت میں قدرت ہی کی جانب سے حاضر کی جاتی ہے، عورتیں اس کی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی ہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں تو اس بزرگ خاتون کے مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں، پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا، پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا، جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھیں اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا، جو عورت کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر میں لاتا ہے، کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے،

ہاں! جب سب کچھ ہو چکا "دل" کا بھی تجربہ ختم ہو چکا "دماغ" کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آ چکے قتل و خون، فتنہ و فساد کا متلاطم سمندر ملک عرب، امن و امان، راحت و آسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم نہ تھا، لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہمی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسیٹے رہے تھے، اس غلامی سے ان کو حقیقی آزادی میسر آئی، انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر موج کھائی ہوئی ہڈی کے مانند بے چین تھی، بے کل تھی، پھر اس کو اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بد اندیشہ اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ، نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا، یہ سچ ہے کہ ان کا، ان بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا، رحم کی نگاہ کبھی کی ان پر نہیں پڑی، لیکن کیا کہتے ہو، کہ "رحمۃ للعالمین" کی نظر کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں، جس طرح اب تک تھیں، ایسا نہیں ہو سکتا تھا، جو سب کے لیے تھا، وہ سب ہی کے لیے ہوا، اور یہی ہونا بھی چاہیے تھا، اس نے بے سمجھ، خام فہم، ناتجربہ کار عورتوں کا انتخاب نہیں کیا کہ ان کو دوسروں کے لیے نمونہ بنانا تھا، اور دیکھو! وقت بھی کم ہے، فرصت تنگ ہو رہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج، مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ، فہمیدہ و سنجیدہ بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکی تھیں، ان کی ایک برگزیدہ، پاک منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجوہ کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا، جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا، اس کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ تھا، کھل چکا تھا کہ کہ فتح ہو تا ہے، خدا کی زمین کا "مرکز" جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے، جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ "غیب" اور اس کے "آیات کبریٰ" جس وقت کھولے گئے تھے، آخر میں بانیٔ "کعبہ" حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اسی کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا "مرکز" اور "ام القریٰ" پر قبضہ دلانا اصل کام تھا، اس کے بعد مفصلات اور "ام القریٰ" کے "قری" جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوتے ہیں، ان کا کام آنے والوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور اسی غیبی مکاشفہ میں نہیں، بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے مختلف پیرایوں میں ہو رہے تھے، جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہو رہا ہے، پس اس کام کو کامل طور پر ختم کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ چند

عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اس کو اپنے سر لینا پڑا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی، لیکن "دماغ" کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا۔

ہیکل کی خدمت کے لیے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی، پھر دیکھو! اس ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر، گرجاؤں پر، ان کے اماموں پر، خطیبوں پر، رہبانوں پر، بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدانخواستہ اگر کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد کو آدم رو ابلیسوں کے لیے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا، جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے، اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کیے، خدانخواستہ اگر "نیم بیضہ" بھی میسر ہو جاتا تو پھر سیخ میں کتنے ہزار مرغ گھتے جاتے، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟

الغرض ان عورتوں کو "بیوی" کا مقام عطا کیا اور جس کو انسان سوچ نہیں سکتا، اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا، جس کا "دماغ" عالمگیر حکومت، عالمگیر سیاست۔ ہمہ گیر تعلیم و تربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کے سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا، جس وقت "عائلی" اور "خانگی" زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی بکشادہ پیشانی حل کر رہا تھا، اور اس آسانی کے ساتھ حل کر رہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو، لیکن بداندیشوں یا وہ خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوشگوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے، گویا سچ مچ اس خیر میں کوئی شر نہیں، اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی، ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی کو مسلسل تلخیوں سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؛ البتہ اس کا اندازہ وہ ضرور کر سکتے ہیں کہ چند بیویوں کے تعلقات کو خوشگوار رکھنا فطرت انسانی کا اعجاز نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ یہی ایک "عائلی" تجربہ بھی ان بددماغوں اور بدعقلوں کے لیے کافی ہے، جو جاننے کے بعد ماننے سے اس لیے ہچکچاتے تھے کہ "دل" میں تو نہیں لیکن "عقل" اور "دماغ" کے نظم میں ان کو بدنظمی کا اندیشہ ہوا، جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخصی، عائلی، خاندانی، قومی، سیاسی، صرف ضبط اور نظم ہے، اس کے متعلق یہ وسوسہ خود سوچنے والوں کی کیا عقلی بدنظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ، کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جو نگاہ سے اوجھل ہو، دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کے لیے جو نمونہ بنائی گئیں، ان میں سے سب کی سب سن رسیدہ تجربہ کار بیوہ عورتیں ہیں، جیسا کہ مردوں کے لیے جو جماعت نمونہ بنائی گئی ان میں بھی زیادہ تر تجربہ کار، سرد گرم چشیدہ لوگ تھے، ایک ایک ان میں ایسا تھا جو ملکوں پر بھاری، قوموں پر گراں ثابت ہوا۔

لیکن دقیقہ سنجیوں، نکتہ نوازیوں کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے، جبکہ ایک طرف اگر مردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے، جس کا "دل" جس کا "دماغ" جس کا "ظاہر" جس کا "باطن" ہر قسم کے اجنبی اثرات سے

قطعاً آزاد ہے، اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں، ان ہی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا۔ آخر وقت تک وہ اسی حال میں رہا۔

پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا جو دو سال کی عمر سے اس وقت خدمتِ مبارک سے علٰحدہ ہوئے جب لوگوں نے مرقدِ انور سے ان کو نکلتے دیکھا، کیا ظلم نہ ہوتا اگر بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر، ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا، یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں، ایک وہ طاہرہ طیبہ، صدیقہ، کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں جن کو آپ نے اپنے زیرِ اثر سات ہی سال کی عمر سے لے لیا تھا، اور قبل اس کے کہ ان کا "دل" ان کا "دماغ" کسی غیر نبوی اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرے، نویں سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا، عموماً سفر و حضر میں ساتھ رکھا۔ پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس "مظہرِ عجائب و غرائب" وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا جو کسی دُوسرے سے نہیں ملا تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب و غریب ذہن و ذکا فضل و کمال، تقویٰ و عفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہُوئی صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ تو ان کا گروہ ہی تھا، غالباً مردوں کو بھی کسی دُوسرے سے اتنا نہیں ملا؟

محدّثین سے پُوچھو! کہ وُہ کیا کہتے ہیں؟

الغرض ہر قسم کے شکوک و شبہات، وساوس و اوہام کی تاریکیوں، ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا ہُوا دعوے کا وہ آفتاب جس کی صبح کا سپیدہ حرا کے دامن سے پھُوٹا تھا "مکہ" کے افق سے چڑھتا ہوا تئیس سال کی مدّت میں مدینہ کے سمت الراس پر پہنچ کر انتہائی کمال و جمال کے ساتھ دیکھو کس شان، کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے، آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب و غریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی، اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے، جس کے باہر بھی روشنی ہے، جس کے اندر بھی روشنی ہے وہ خود بھی نور ہے، جس سے نکلا وہ بھی نُور ہے، "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" کا یہی نورانی نظارہ جس کو دُنیا کی آنکھوں کے نور نے کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن اب ہمیشہ دیکھتی رہے گی، سب کو دکھایا جائے گا، سب دیکھ رہے ہیں، "ظاہر" کے "باطن" کے "دل" کے "دماغ" کے تجربات بینہ کی شعاعوں سے "آسمانی علم" اور "لاہُوتی عرفان" کا یہ آفتاب دمک رہا ہے، چمک رہا ہے، بلکہ سچ پوچھو! تو جھبک رہا ہے، لہک رہا ہے، چھلک رہا ہے۔

عرب کا وسیع صحرا اس کے لیے تنگ ہے، وہ بڑھنا چاہتا ہے طوفان کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے، اور دیکھو کہ وُہ بڑھ گیا، چڑھ گیا، ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب و تاب، جاہ و جلال کے ساتھ کائنات، ساری کائنات کے اُفق پر اسی طرح چمک رہا ہے، جس طرح وہ اُس وقت چمک رہا تھا، جب وُہ عرب سے نکلا تھا، یقین و قطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اس کو آج والے بھی اسی طرح پا رہے ہیں، جس طرح کل والوں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا، جس وقت وہ ان کو، ان کی ایک بڑی جماعت کو اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق، باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں علانیہ تجربہ کرا رہا تھا۔

گلیلی جھیل کے چند ماہی گیر یا مگدھ دیش کے گداگر بھکشو نہیں بلکہ ہزار ہا انسان ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں ان میں بادشاہ بھی تھے اور دُنیا کے سب سے بڑے بادشاہ ان میں کمانڈر بھی تھے، اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر ان میں دماغ والے بھی تھے، سب سے زیادہ بیدار دماغ والے، ان میں دل والے بھی تھے، سب سے زیادہ

الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سی منزلیں سوچی جاسکتی ہیں۔
روشن دل والے، تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دُنیا کے آگے مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش
کر رہی تھی کہ اس وقت کی دنیا میں ان سے اُونچا کوئی نہیں ہے کہیں نہیں ہے۔
نبوت! اور کیسی عجیب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھرا ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی
آلائشوں اور کدورتوں سے پاک وصاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی
روشن فطرتوں کا ناپا ہُوا تجربہ، کتنی بے رعب، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا نپا تلا تجربہ،
چند نہیں، فوج در فوج، نسل آدم کی غٹ کی غٹ، جوق درجوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کے کسی مسئلہ یا حقیقت کے لیے
نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہوئی، اور نہ شاید آیندہ ہوسکتی ہے۔
تجربات ومشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا جس کی حفاظت ونگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں یا کسی مدرسہ
کے معلموں یا کسی انجمن کے ممبروں یا کانفرنس کے دفتریوں یا کسی افسانہ نگار مورخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں
کہ زمین پر رُوئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت وتبلیغ قرار دیا،
اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے، دنیا کی اس سب سے
بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشرواشاعت کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا۔
طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا، اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح
ایک حکومت دُوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی حالانکہ زمانہ کی اس طویل و دراز مدت میں زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان
سلطنتوں کے دُوسرے اغراض ومقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو، لیکن اس "آسمانی ودیعت" ان درخشاں تجربات
"بیّنہ" ان "عینی مشاہدات" کی غوروپرداخت، تبلیغ وحفاظت میں، سب کے نقاط وارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت
نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اس کو مل سکے اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے، اس
کے لیے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قایم ہُوئے، تصنیف وتالیف کا باب
کھولا گیا اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن، ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا
میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم یا فن کو
ملا، جتنا کہ اس عجیب وغریب نبوت کے تجربات ومشاہدات کو ملا، اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع اور کسی وقفہ کے ایک قرن
سے دُوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک نبوت کا یہ لازوال ابدی، سرمدی، قیم خزانہ منتقل ہوتا رہا، اور اس
وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں بلکہ ہر پچھلے طبقہ میں تم دیکھو گے کہ نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں
میں اضافہ ہوتا رہا، اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت نہیں، ایک اور تین کی نسبت نہیں، دُگنے اور تگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں،
بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا، اور بڑھ رہا ہے، بڑھتا رہے گا، تا آں کہ ساری نسل انسانی

اس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پُرجلال پُرشوکت جلو، بادشاہوں کے شاہانہ اور کرّے پھیرے، علماء کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی، فقر صوفیہ کی باوقار پُرعظمت نگرانی اور اُمتِ مرحومہ اسلامیہ کی فطری بیدار دماغی، طبعی ذکاوتِ حسی کے حصار میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے، اور کہنا چاہیے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا، جھوٹ ہو گا کہ ایک لمحہ، ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سج دھج کے ساتھ اُمت کے ان افراد کو ملتا رہا، اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وُہ اپنے رسول کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سیکنڈ کے لیے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وُہ اپنے رسولؐ سے غائب ہوئے سعادتِ صحبت سے بہرہ مند اگر کہہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وُہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسولؐ پڑھتا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)، وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وُہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جن کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وُہی پڑھتے ہیں جو ان کا رسولؐ پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وُہ رکھتا تھا، سبھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی، لیکن ایسا کون ہے، جس کی بندگی کی تشکیل اس طرح کی گئی، "ہو بہو" "من وعن" جیسا کہ وُہ تھا وُہ متشکل کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے، ہاں! جس طرح پہلوں کی کتاب چھینی گئی ان کو ان کے رسولوں اوتاروں سے جُدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے، ان کے ساتھ بھی سال دو سال کے لیے نہیں روز دو روز، گھنٹے دو گھنٹے، سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے کبھی (لا فعلہ اللہ) ایسا واقعہ پیش آیا، اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھیننا چاہا، وہی چھینا گیا، جس نے جُدا کرنے کا خیال پکایا، وُہی جُدا کیا گیا، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے وُہ بھی ٹوٹے گا، اور جو ان پر گرے گا وہ چکنا چُور ہو گا، پھٹے ہوئے نہیں بلکہ تاریخ کے کھلے ہُوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے یہی لکھا جائے گا۔ بہرحال یہ سلسلہ یُوں ہی جاری رہا، تا ایں کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز عہد میں نسلِ انسانی داخل ہو گئی، جس میں ہر بعید قریب، ہر دور نزدیک بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہو گیا، مکانی فاصلے حذف ہو گئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد دنیا سمجھی جاتی تھی، ایک دنیا بلکہ اگر کہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہو گئی، زمانی مسافتیں کم ہو گئیں بلکہ شاید زمانہ کے تین قسموں اور تین حصوں میں سے ایک حصہ ماضی کا تقریباً قابلِ ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے، وہ نہیں گزرتا ہے، اور جو غائب ہوتا ہے، حاضر ہی رہتا ہے، وہی نہیں جنھیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے، بلکہ دنیا کی ادنیٰ ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی وہ بھی اب انمٹ ہو گئی قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ، پریس، تار، برق، لاسلکی فون وغیرہ کی شکلوں میں فیاضی کے ساتھ وقفِ عام فرما دیا ہے، آخر آج کون گن سکتا ہے، ان ذرائع اور وسائل کو جن کے ذریعہ سے دنیا کے حوادثات و واقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہو رہی ہیں، بزن و بازار میں آج یہ چیزیں ماری ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو میسر ہیں، آج کوئی "امانت کی اندر سبھا" اور "شرر" کے ناول کو

مٹا نہیں سکتا پھر یہ اندیشہ اب کون کر سکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دُنیا کا کوئی حادثہ فنا کر سکتا ہے ؟

ان ساز و سامانوں کے بعد کس قدر عجیب ہے، اگر کہا جائے کہ جو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب میں پیدا ہوئے تھے، وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے، اور جن کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی، وہ چھٹی صدی ہی میں ہوئی تھی۔

اس زمانہ کے جب ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ہے، ان تمام بعیدوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ، خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔

آخر ہم میں کون ہے، جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت، شباب، کہولت، خلوت، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں، جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے، جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا۔ لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلی سے زیادہ محسوس کی گئی، کی جا رہی ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے، ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

اور شاید اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے، کہ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ دور از کار ہے، اس دعویٰ کا ہر مدعی فالتو، اور زمین کی پشت کا بالکل غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا، چھٹی صدی عیسوی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا، دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوک اُٹھتی ہے، یا اٹھوائی جاتی ہے، تم دیکھو! خلافِ دستور بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اس کو دُور دُراتے، دھتکارتے رہے، اُٹھنے کو تو یہ اُٹھ جاتے ہیں، لیکن چند مغالطی پینتروں کے بعد ہی ان کو خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں کوئی کام نہیں، بنی آدم کی بستیوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، پھر یُوں ہی بازاری بے روزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی، نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے مدفون ہو گئے، تاریخ شاہد ہے کہ بوالہوسیوں کے بھپاروں سے بے چین و مدہوش ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی تو قدرت کے انھیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کے مانند اس کو وہیں بٹھا دیا، چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے، حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار یا پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو۔

اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کر دی گئی تھی، اور نبوت و رسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں کے پاس کوئی نہیں آئے گا، یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے، وہی پاش پاش ہو جاتا ہے، اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا، جب بھی آخر دنیا کیا کرتی۔ آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں، ان میں

آتے ہیں، جب جانے والا بھی جا چکے، لیکن ایسا آنے والا، جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا، بڑھ رہا ہے، گنجایش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دُوسرا آئے۔

جس طرح وُہ بھیجا گیا، جن صفات و کمالات کے ساتھ بھیجا گیا اسی شان، اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے، ہر جگہ موجود ہے، ہر خطّے میں موجود ہے، اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے، جس طرح مشرق میں وہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے، شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبہائے ویحزر دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے، اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے، وہ سب کے لیے برابر ہے، سب کے لیے یکساں ہے، وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے جس میں سب سانس لیتے، اور وسعت کون و مکان کا وُہ نور ہے، جس میں سب چلتے ہیں، پلتے ہیں، پھُولتے ہیں، پھلتے ہیں، یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی، اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے، پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے، روٹی معدوم نہ ہوگی، آخر اس وقت تک کیا تھا، جواب نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی، لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پا چکی ؟

بلاشبہ جنھیں اس کی برکت میسر آئی ہے، ان میں اکثروں کا ان کا جو مرتد یا منافق نہیں ہیں، ان کا بیڑہ خطرہ سے ان شاء اللہ نکل چکا ہے، لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے ؟

پھڑ پھڑا رہے ہیں، ہندوستان کے ایک قطعۂ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صد و ہزار سے نہیں بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے، اور یہ تو صرف ہندوستان کا حال ہے، اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے ؟

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوع انسان کی سب سے بڑی آبادی ہے، کیا چین و جاپان کے ان باشندوں کی اپنے مالک سے صلح ہو چکی ہے ؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پیدا ہو چکا ہے جس نے مخلوقات کی بندگی کا جُوا گردن سے پھینک کر حقیقی اور سچّی زندگی حاصل کی ہے، لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت ابھی اسی طرح اپنے مالک سے رُوٹھی ہوئی ہے، جس طرح اس کے آباؤ اجداد رُوٹھے ہوئے تھے۔ غریب مشرق تو پسماندگان کا ملک ہے، لیکن جن کی پیش گامیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جا رہا ہے، کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے "باپ بیٹے" کے قدیم افسانے کو تو چھوڑو، لیکن جن خلقتوں کی ایجاد و تخلیق کی انھیں توفیق بخشی گئی، بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں ؟ یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں، جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں، اور آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا، تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں، اسٹیم کی طاقتوں، پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے، بزرگوں کے کارناموں، سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے

اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا، تو پچھلوں کے لیڈروں، زعیموں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت و فلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا، مگر کوئی ہوتا جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بتاتا، جن کے ساتھ فرزانہ و دانا یورپ کی روح اس طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے، آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقوں میں کیا فرق ہے، خالق سے یہ بھی دُور وہ بھی دُور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چُور وہ بھی چُور، کچھ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نئوں کے معبود بھی نئے ہیں، پرانوں کے پرانے معبودوں میں عجائب و غرائب اور نت نئے فوائد نظر آئے تھے، اور نئوں کو نئی مخلوقات میں عجائب و غرائب نت نئے فوائد نظر آ رہے ہیں، مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی قالبوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو ناپ لیا جا سکتا ہے، اگر قلبی احساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، نئوں کے قلوب میں معبودوں کے متعلق وہی کچھ بلکہ شاید کہ اس سے زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بپھر جاتے تھے، نئوں کے سامنے جا کر آج خدا کا تنہا کیا بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو، پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے، اور منہ سے کتنے تولے کف کے اڑ اُڑ کے بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں، تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں، تذکروں میں، کیا نئوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لیے بغیر کبھی گزرتا ہے، برق کا، بھاپ کا، تار کا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بنکوں کا، سرمایوں کا ان کی مختلف شکلوں، مثلاً انشورنسوں، رلیسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج دلچسپی کے ساتھ جس ذوق، شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے، مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق و شوق کے ساتھ بِسۡمِ اللّٰہِ، سُبۡحَانَ اللّٰہ، الحمدُ للّٰہ، لا الٰہ الّا اللّٰہ کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو ان ہی خداؤں کی، نعت بھی لکھتے ہیں تو ان ہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ جو پُرانے تھے وہی نئے ہیں، چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس و قوانین کے آگے یہ بھی محوِ رقص و رامشگری ہیں وہ ان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں۔

اَتَوَاصَوۡا بِہٖ بَلۡ ھُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ۔

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا، جو سب سے اُونچا تھا وہ سب سے نیچا اور اسفل سافلین کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلا شبہ یہی ہوا، یہی ہونا بھی چاہیے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں پس جس نے ایک کو چھوڑا، اس کو ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا، جو ایک سے نہیں ڈرے گا اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا جو جھکنے ہی کے لیے ہے، اس کو جھکنا ہی پڑے گا۔

لیکن ایک کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، اِنس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے، اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دیکھا نہیں جا سکتا، اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے، جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا چکھ رہے ہیں، برضا و رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی، پرانوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بیشک اس کے صلہ میں انھیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا، آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں میں کیوں اقرار کر رہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا، کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رُسوا کیا، لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کر کے بندر کے مولود مسعود ہونے پر فخر کیا، کتابیں لکھیں، دلائل قائم کیے، کر رہے ہیں، کیا انسانیت کی خواری میں اُنھوں نے کوئی کمی کی ہے اور صحیح تو یہ ہے جو ہر جسینہ کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اُٹھتے ہیں کہ نفسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے، سب انسان کے لیے ہیں، لیکن انسان کسی کے لیے نہیں، کسی مقصد کے لیے نہیں، کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا، جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں، جب اُنھوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کے لیے نہیں ہے، تو کیا اس کے بعد یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ انسان کسی کے لیے بھی ہے، "پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں؟" "ہوا" کیوں رُک جائے گی، اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آجائے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ، اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے، اگر کوئی نہ ہو، تمہارے بڑے نہ ہوں، چھوٹے نہ ہوں، کوئی نہ ہو، بے شک سب ان کے لیے ہیں، لیکن مخلوقات کے اس طویل و عریض سلسلہ میں انسان کسی کے لیے نہیں، اب اگر وہ خالق کے لیے ہی نہیں ہے تو اس سے زیادہ عبث و بے نتیجہ فضول و مہمل، بیہودہ ہستی اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اس رسوائی سے بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہو سکتی ہے؟

اور یہ ایمان کا حال ہے، عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا، جو آج کے عالموں کے پاس نہیں ہے۔

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے، جاہل شراب پیتے تھے، مردار کھاتے تھے، زنا کرتے تھے، سُود خوار تھے، جواری تھے، ایک کا خون دُوسرا پیتا تھا، املاق و افلاس کے اندیشہ سے لڑکوں کو لڑکیوں کو گور میں زندہ دفن کر دیتے تھے، لیکن یہ قصّہ کن کا سُنایا جا رہا ہے، کیا عرب کے جاہلوں کا، یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو، جسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، عرب سے باہر ایران میں ایک طرف "مزدک" زر، زمین، زن کو سب سے چھین کر سب کو دے رہا تھا اور دُوسری طرف "مانی" اور اس کے شاگرد ہاتھوں میں استرے لیے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ بُرائیاں آتی ہیں، ان ہی کا قلع قمع کر دیا جائے وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے، یہی ان کا فلسفہ تھا، لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا، آج یورپ کے ایک حصّہ میں پھر وہی "مزدک" زندہ ہو کر "بالشویک" کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے، جو اس نے کیا تھا، اور دُوسری طرف "برتھ کنٹرول" کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے۔

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دُوسرا بند کرتا ہے، اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بُدھ مت کے فلسفہ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں، "دام مارگی" پیدا ہُوئے تھے، "بانگ وویا دام مارگی" یک پائے جاتے تھے "اگھوری" ہونا آتما کی بڑی پاکی تھی، لیکن آج گندگیوں میں صفائی کے مدعی بن کر جولت پت ہیں، "اگھوریوں" کو بھی ستے ہو، اگر ان کا حال سنایا جائے بے پردگی و عریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے، اس میں جان ڈالنے کے لیے آج مغرب کا "اگھوری" جو کچھ کر رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے، الحاصل جو کچھ اس وقت تھا، جہاں تک سوچو گے کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اس کو پاؤ گے، پس آنے والا کیسے جا سکتا تھا، جب تک کہ وہ سب نہ جاتے، جس کے لیے وہ آیا تھا، بلکہ اس کی ضرورت تو اس کے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے، لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے؟ اور یہی میرا مقصد تھا، جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا، کہ "یہی وہ آنے والا ہے، جو آنے ہی کے لیے آیا" پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے، اس کی ضرورت موجود ہے، ان کو دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا، اور جب تک اس کی ضرورت ہے، نہیں جائے گا ؛ تھا، ہے، رہے گا، ابد تک رہے گا اور اس کے لیے یہی مقدر ہے،

فَاللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعَلٰى ذُرِّيَّتِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا اِبْرَاهِيْمَ فِي الْعَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ؕ

پس اے اخوان عزیز!

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۵ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۵ (القرآن)

کوشش کرو، اللہ کی طرف بُلانے میں کوشش کا پُورا حق ادا کرتے ہوئے اسی نے (اے امت اسلامیہ) تم کو چُن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی، یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے اسی نے تمہارا نام "مسلمین" رکھا پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمہارے نگراں رہیں گے اور تم دنیا کے نگراں رہو گے، پھر لوگو! نماز قایم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور زور سے پکڑ لو اللہ کو وہی تمہارا آقا ہے، پھر کتنا اچھا آقا ہے کتنا اچھا مددگار۔

جب جانے کے لیے آنے والے آتے رہے، اشخاص چُنے جاتے تھے، لیکن جب وُہ آیا جو آنے ہی کے لیے آیا تو اس کے

طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں بلکہ ایک اُمت ہی چُنی گئی، پہلے شخص مبعوث ہوتے تھے، اب ایک اُمت ہی مبعوث ہے، یہی اس امت کا "اصل منصب" اور "فرض حقیقی" ہے، جب تک وہ اس "منصب" پر قایم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے اس وقت تک ان کے رسولؐ بھی اس امت کے نگراں رہیں گے، لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے، اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے ہو تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔

یہ امت مجتبیٰ و مبعوثہ ہر قوم میں ہے، ہر ملک میں ہے، پس جو جہاں ہے وہ وہیں مبعوث ہے، اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں، مصیبت کی گھڑی وہی تھی جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا، حالانکہ اگر حضرت نوحؑ کے منکر ان کی قوم تھی، حضرت ہودؑ کے کافر، ان کی قوم تھی، قریش رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے لوگ تھے تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں، مصریوں کی قوم مصر کے قبط نہیں، یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں، پس جب تک:

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

نہ ہو تھک کر بیٹھنے کے کیا معنے ہو سکتے ہیں، وثیقہ ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔

اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ سارے دین پر وہ غالب ہو۔

اور دیکھو کہ لامذہبیت پر مذہبیت غالب ہے، چند پیشہ ور کتاب سازوں یا سبق فروش معلموں کو جانے دو، جو وساوس باقی کی روٹی کھاتے ہیں، عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے، جس طرح ہمیشہ سے تھی آخر اگر مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے، تو جس یورپ کے متعلق یہ سنایا جاتا ہے، کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لامذہب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

سچ یہ ہے، کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے، کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے، کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں، کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔

بہرحال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لامذہبوں سے زیادہ، بہت زیادہ، بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے، اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے، کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لامذہبیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب، اس لیے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں،

اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے، تو کیا حال ہوگا جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے، کچھ نہیں، کوئی کام نہیں، جب تک اصل کام نہ ہوگا، کسی کام میں کوئی برکت نہ ہوگی، بہت آرام لے چکے، تھکن مٹ چکی، کام بہت باقی ہے، ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے، اور "درا" کی اس "بانگ" پر چل پڑتے:۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(اقبال)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ترجمہ : نذیر حق

نوٹ: جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مشرق و مغرب کے علوم کے فاضل اور اسلامی علوم کے مسلّمہ عالم تسلیم کیے جاتے ہیں اسلامی تاریخ بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کی گہری اور وسیع نظر ہے اور اکثر و بیشتر مصادر و مآخذ ان کے سامنے ہیں، لیکن بایں ہمہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے سلسلے میں چند مشہور اور مقبول عام تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی تحقیق کا اندازہ اپنا ہے اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش اور تاریخِ وفات کے ضمن میں نئی تاریخیں رقم فرمائی ہیں۔ جمہور اہلِ اسلام اور مورخین نے ۱۲ ربیع الاوّل[1] عام الفیل یوم ولادت کے لیے اور ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری یوم وصال کے لیے رقم کی ہے۔ ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کو ان اور بعض دُوسری تاریخوں سے بر بنائے حسابِ تاریخی شواہد اتفاق نہیں ہے۔ اسی طرح سالِ پیدائش (عیسوی سنین) کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر صاحب اپریل ۵۷۱ء کے بجائے جون ۵۶۹ء کو ترجیحاً انتخاب کرتے ہیں۔

---

[1] ۹۔ ربیع الاوّل بھی ولادت باسعادت کے لیے بیان اور منتخب کی گئی ہے۔

باب ۱

تعارف

۱۔ ۱۷ جون ۵۶۹ء ـــــ یہ پیر کا دن تھا۔ اس روز دُنیا کے دُور افتادہ مقام مکہ میں، جو صحرائے عرب میں واقع ہے، ایک بچہ تولد ہُوا۔ دوست تو کیا، دشمن بھی اس بات کی تردید کرنے سے قاصر ہیں کہ اس بچے نے کیا مذہب اور کیا سیاست، تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود اس کی تعلیمات آج بھی نہ صرف زندہ و تابندہ ہیں بلکہ وسعت پذیر بھی ہیں اور اس کے پیرو کار بین الاقوامی امور میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے ساتھ دنیا کے تین برِ اعظموں پر حکمران ہیں۔ یہ بچہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔

۲۔ حضرت عبد اللہ اور بی بی آمنہ کے فرزند ارجمند محمد رسولؐ عربی کے سوانح نگار کو آنحضرتؐ کے بارے میں دستاویزات کی کمی سے نہیں کثرت کے باعث مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اسے آنحضرتؐ کو جو رسولِ خدا تھے ایک ایسے قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھنا ہوتا ہے جو اپنی تعلیمات کی بنیاد نزولِ وحی پر استوار کرتا ہے۔ اپنے پیش رو مرسلین کے برعکس محمدؐ محض ایک مکمل دینی نظام کے بانی ہی نہ تھے بلکہ وہ بیک وقت ایک حکمران، قانون ساز، فاتح، سالک اور معلمِ اخلاق بھی تھے۔ مزید برآں وہ ایک ایسی ہستی ہیں جن کے الفاظ اور اعمال ان کی اُمت کے لیے زندگی کے ہر شعبے میں، خواہ اس کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے، معاشرت سے ہو یا اخلاق سے، لازوال قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فطری طور پر ان کے سوانح میں غیر معمولی اور مافوق الفطرت امور کا ذکر بھی آئے گا۔

۳۔ **نسب اور ولادت** ۔ قرآن حکیم اور انجیل مقدس دونوں متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم (۱۸۰۰ ق م) کے دو بیٹے اسمٰعیل اور اسحاق تھے۔ انجیل چونکہ خاندانِ اسحاق کی تاریخ ہے لہٰذا اس میں اسمٰعیل کا ذکر اس کے سوا کہیں نہیں کہ وہ اپنے والدِ گرامی حضرت ابراہیم کی تدفین کے وقت اسحاق کے ساتھ تھے۔ قرآن چونکہ ایک اسماعیلی پیغمبر پر نازل ہوا ہے لہٰذا اس میں بعض ایسی تفاصیل بیان کی گئی ہیں جن کا ذکر انجیل میں نہیں ملتا۔ یہ تفاصیل یہاں قابلِ ذکر ہیں۔ از منۂ قدیم میں دستور یہ تھا کہ پہلا پھل خواہ وہ گھر کے پالتو جانور کے بچے کی صورت میں ہو یا فصل کی صورت میں، اللہ کی راہ میں دیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ پہلا بیٹا بھی خدا کی راہ میں قربان کرنے کا رواج تھا (جیسا کہ انجیل میں ہے: کتاب خروج ۱۳/۲۔ ۲ اور ۱۲۔ حزقی ایل ۲۰-۲۶) بعد میں یہ رواج بدل دیا گیا اور بیٹے کی جگہ کسی اور مال کی قربانی شروع ہو گئی (کتاب خروج ۳۴/ ۱۹-۲۰) تاہم آثارِ قدیمہ سے ثابت ہے کہ شروع شروع میں پہلا بیٹا اللہ کی راہ میں ذبح کیا جاتا تھا۔ ابراہیم کو بھی، جب ان کے ہاں بڑھاپے میں پہلا بیٹا پیدا ہوا، اس دستور پر عمل کرنا پڑا، جب اللہ کی طرف سے رؤیا میں ان کا بھولا ہوا فرض ـــــ

بیٹے کی قربانی ——— یاد دلایا تو انھوں نے کسی پس وپیش یا جنبشِ لب کے بغیر اس پر عمل کیا ۔ اللہ کو ان کی فرض سے یہ لگن اور ادائے بندگی اس قدر پسند آئی کہ اس نے معجزانہ طور پر نہ صرف بچے کو بچا لیا بلکہ اس کے عوض انھیں دُوسرے بیٹے اسحاق کے تولد کی خوشخبری بھی سُنائی (قرآن ۳۷ - ۱۱۲) البتہ اسماعیل کے عوض ایک دُنبے کی قربانی عمل میں لائی گئی ۔ ابراہیم کی طرف سے دُنبے کی قربانی کی یہ رسم عربوں میں زمانہ قبل از اسلام تک جاری رہی ۔ گویا یہ رسم ابراہیم کے پہلوٹھی کے بیٹے اسمٰعیل کی اولاد میں جاری تھی، اسحاق کے خاندان میں نہیں۔

۴ ۔ ابراہیم نے اسماعیل کو ان کی والدہ محترمہ بی بی حاجرہ سمیت اس جگہ منتقل کر دیا تھا جو بعد میں مکہ کہلائی ۔ اس صحرا میں چشمۂ زمزم ان کی زندگی کی ضمانت تھا ——— اور اسحاق اپنی والدہ محترمہ بی بی سارہ کے ساتھ فلسطین میں جاگزین رہے۔ ابراہیم دونوں ممالک میں باری باری آتے جاتے رہے ۔ یہ ابراہیم ہی تھے جنھوں نے کعبۃ اللہ کی تعمیر نو کی اور رب واحد کے گھر کے حج کی بنیاد رکھی ۔ حضرت اسماعیل کے وقت سے قصیؔ تک جو محمدؐ کے اسلاف کی پانچویں پشت تھے کوئی بات قابلِ ذکر نہیں ۔ مکہ شہر یا مملکت پر پہلے بعد دیگرے مختلف قبائل کی عملداری رہی : پہلے جُرہم حکمران تھے ، پھر ایاد، اور بعد میں خزاعہ کی حکمرانی قائم ہُوئی تاہم حکمرانوں میں ردّ و بدل کے باوجود اسماعیل کے اخلاف مکہ میں ہی رہائش پذیر رہے ۔ قصیؔ کے وقت سے ہم مکہ کی تہذیب اور سیاسی اصلاحات کے بارے میں یقینی طور پر بہتر معلومات رکھتے ہیں جن کے مطابق مکہ میں استبدادی بادشاہت اور مطلق العنانی کے بجائے جمہوریت ، نظامِ شوریٰ اور منتخب افراد کی حکومت کا نظام رائج ہوا ۔ ابن قتیبہ تو بازنطین (استنبول) کے ساتھ اپنے تعلقات کا بھی ذکر کرتا ہے ۔ بظاہر اس کا تعلق تھیوڈوسس اول (۳۹۵ - ۳۷۹) سے معلوم ہوتا ہے ۔ قصیؔ کے بیٹے عبد المناف نے تعلقات خارجہ کو خصوصاً تجارت کے سلسلہ میں مزید فروغ دیا اور بازنطین، ایران، حبشہ اور کِندہ (یمن) کے فرمانرواؤں کے ساتھ تاریخی معاہدہ " ایلاف " کیا ۔ جس کی یاد کو قرآن نے دوام بخشا ہے ۔ میثاق ایلاف کے تحت مناف کو کئی ممالک میں تجارتی کاروان لے جانے کا اختیار مل گیا ۔ ابن سعد کے مطابق بازنطینی سلطنت میں ان کے قافلے انقرہ تک جاتے تھے ۔ عبد المناف کے پوتے عبد المطلب کے زمانے میں بین الاقوامی صورتِ حال انتہائی نازک ہوگئی ۔ یمن کا خاندان کِندی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور ان کی جگہ حبشہ والوں نے لے لی ۔ بعد میں انھوں نے اپنے سردار ابرہہ کی قیادت میں مکہ پر فوج کشی کی ۔ ہاتھی اور ایک بڑی فوج کے مقابلہ میں فطرت مکہ والوں کی مدد کو آئی ۔ ابرہہ شکست کھا کر پسپا ہوگیا ، اور ایک وبا میں راہیِ ملکِ عدم ہوا ۔ پھر ایرانیوں نے یمن پر حملہ کر کے ابرہہ کے خاندان سے حکومت چھین لی ۔ انھوں نے ابتدا میں تو یمن کے تخت پر ایک یمنی شہزادے کو بٹھایا ۔ عبد المطلب اس شہزادے کو تخت نشینی کی مبارکباد دینے کے لیے ایک وفد لے کر یمن گئے مگر ایرانیوں نے بعد میں اس شہزادے کو بھی تاج و تخت سے محروم کر دیا ۔ اس کے بعد یمن مدائن (جسے طیسفون بھی کہتے تھے) کا ایک صوبہ یا کالونی بن کر رہ گیا۔

۵ ۔ عبد المطلب نے مکہ میں کعبہ کے سامنے زمزم کا چشمہ پھر سے جاری کیا جسے ایک مقامی جنگ میں پسپائی کے دوران خزاعہ قبائل نے بند کر دیا تھا ۔ عبد المطلب نے منّت مانی کہ اگر ان کے ہاں بارہ[۱۲] بیٹے پیدا ہوئے تو وہ ایک بیٹے کو

اللہ کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ جب ان کی خواہش پوری ہوگئی تو انھوں نے ایک بیٹے کی قربانی کا سامان کیا۔ بارہ[۱۲] بیٹوں میں سے قربانی کے لیے بذریعہ قرعہ اندازی عبداللہ کا انتخاب کیا گیا۔ مگر خاندان کے اعزہ اور دوستوں نے عبدالمطلب کو رضامند کر لیا کہ وہ عبداللہ کو قربان کرنے سے قبل کسی کاہن سے مشورہ کریں۔ چنانچہ اس دور کی ایک نامور کاہنہ سے رابطہ پیدا کیا گیا، جس نے اس مشکل کا معقول حل پیش کر دیا۔ اس کاہنہ نے تجویز پیش کی کہ قرعہ اندازی کے ذریعے بیٹے کے عوض روایتی خون بہا کی ادائیگی کا تعین کر لیا جائے اور اگر قرعہ بیٹے کے نام پر ہی نکلے تو خون بہا میں اضافہ کر کے دوبارہ قرعہ اندازی کی جائے۔ چنانچہ دس اونٹوں اور عبداللہ کے درمیان قرعہ اندازی کی گئی مگر قرعۂ فال عبداللہ کے نام پڑا۔ اب اونٹوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ بڑھتے بڑھتے اونٹوں کی تعداد سو ہوگئی تو قرعہ میں اونٹ نکل آئے۔ عبدالمطلب نے جو دیانت داری سے اپنی منت پوری کرنا چاہتے تھے، تین بار قرعہ اندازی کرائی مگر تینوں بار عبداللہ کا نام نکلا۔ چنانچہ سو اونٹ قربان کر دیے گئے۔

۶۔ حضرت عبداللہ کی شادی مکہ میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ محترمہ کا نام آمنہ تھا اور ان کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔ ان کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا جسے آگے چل کر پیغمبر اسلامؐ کا اعزاز حاصل کرنا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بیٹے کی پیدائش سے چند ہفتے قبل وفات پا چکے تھے لیکن بعض مسلّمہ سوانح نگاروں کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ کی وفات بیٹے کی پیدائش کے چند ہفتے بعد ہوئی تھی۔ عبداللہ شمال کی طرف تجارتی سفر پر گئے ہوئے تھے اور جب وہ مدینہ میں تھے جو ان کی دادی کا شہر بھی تھا، موت نے انھیں آ لیا۔ ان کی تدفین مدینہ میں ہی عمل میں آئی۔ ان کا روضہ جو ترک حکومت نے تعمیر کیا، آج بھی سعودی حکومت کے دور میں موجود ہے[۱]۔

۷۔ عظیم شخصیتوں کی ولادت کے دور میں ہمیشہ غیر معمولی واقعات رونما ہوتے ہیں، خواہ ان کا تعلق مستقبل کے عظیم ہیرو کی اس دنیا میں آمد سے ہو یا نہ ہو۔ زرتشت آگ کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے آتشکدوں میں آگ سدا روشن رکھی جاتی ہے مگر پیر، ۲۰ جون ۵۶۹ء کی رات کو مدائن کے عظیم ترین آتشکدہ میں آگ بجھ گئی جو صدیوں سے روشن چلی آ رہی تھی۔ اسی رات ایک زلزلہ آیا جس سے ایرانی شہنشاہ کے محل کے چودہ کنگرے گر گئے۔ اسی طرح کے اور بھی واقعات رونما ہوئے۔ بی بی آمنہ بیٹے کی پیدائش کے وقت تنہا تھیں۔ اچانک انھوں نے چند دراز قد خواتین کو دیکھا، جو اس مشکل وقت میں ان کے پاس آئیں۔ جب بی بی آمنہ نے ان سے دریافت کیا تو ان میں سے ایک نے کہا "میں فرعون کی بیوی آسیہ ہوں" (جس نے حضرت موسیٰ کی جان بچائی تھی جنھیں ایک صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کے سپرد کر دیا گیا تھا) دوسری خاتون مریم والدہ عیسیٰ مسیحؑ تھیں جبکہ باقیماندہ خواتین جنت کی حوریں تھیں۔ (جب نئی نبوت، ایک نئی وزارت معرضِ وجود میں آتی ہے تو قبل ازیں یہ فریضہ سر انجام دینے والے اس کے استقبال کے لیے آتے ہی ہیں، ایک خاتون کے ہاں ولادت کے وقت حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ تو نہیں آ سکتے تھے۔ چنانچہ آسیہ اور مریم

---

[۱] چند سال قبل اس جگہ سڑک تعمیر کر دی گئی ہے۔

ان کی نیابت کے لیے آگئیں) پھر فرشتوں نے اپنے پروں سے حضرت آمنہ کے جسم کو ڈھانپ لیا تاکہ انھیں ٹھنڈی ہوا نہ لگے۔ جلد ہی بچہ تولد ہوا جو فطرۃً مختون تھا۔ وہ سجدے کی حالت میں زمین پر گر گیا اور انگشتِ شہادت یُوں اٹھائی گویا خدا کی وحدانیت کا اعلان کر رہا ہو۔ بچہ ایک لمحہ کے لیے سفید رنگ کے بادل میں گُم سا ہو گیا۔ پھر غیب سے ندا آئی: "اسے مشرق و مغرب میں پھراؤ اور سمندروں میں لے جاؤ تاکہ تمام مخلوق جس میں فرشتے، درند، پرند، مچھلیاں اور دوسرے شامل ہیں اپنے نئے پیغمبر کو پہچان لیں۔" جب یہ بادل تحلیل ہو گیا تو بچہ سامنے آگیا۔ پھر اسے ایک اور بادل نے اپنی آغوش میں لے لیا اور آواز آئی " اسے تمام سابق پیغمبروں کی خوبیوں سے نوازو، اسے خلقِ آدمؑ دو، شیثؑ کا علم، نوحؑ کی جرأت، ابراہیمؑ کی طرح خدا کی محبت، اسمٰعیلؑ کی زبان دانی، اسحاقؑ کی سی تسلیم و رضا، صالحؑ کی خطابت، لوطؑ کی عقل و دانش، یعقوبؑ کا علمِ غیب، حُسنِ یُوسفؑ، مُوسیٰؑ کی استقامت، صبرِ ایوبؑ، یُونسؑ کی سی اطاعت، جُہدِ یوشعؑ، لحنِ داؤدیؑ، دانیالؑ کی سی محبت، الیاسؑ کی عظمت، یُوحنا استطباغی کی پاکبازی اور عیسیٰؑ کی بے نیازی عطا کرو اور اسے پیغمبروں کی تمام خوبیوں کے رنگ میں رنگ دو۔" یہ بادل بھی چھٹ گیا اور بچہ پھر سامنے آگیا۔ پھر تین افراد جو دراصل فرشتے تھے آئے اور اسے نقرئی سلفچی میں تین بار غسل دیا۔ پھر اسے سفید ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر چند لمحوں کے لیے اپنے پروں میں دبا کر حرارت پہنچائی اور پھر اسے اس کی ماں کے حوالے کر کے غائب ہو گئے۔ مسلمہ قدیم مصنفوں نے ایسے ہی دل نشین انداز میں آں حضورؐ کی ولادت کا نقشہ کھینچا ہے۔

۸ ۔ بی بی آمنہ نے بیٹے کا نام محمدؐ رکھا، جیسا کہ ایامِ حمل کی ابتدا میں انھیں خواب میں حکم دیا گیا تھا۔ یہ بچے کے دادا تھے جنھوں نے ازراہِ شفقت اُسے احمدؐ کہنا شروع کیا۔ عرب میں دستور تھا، جو بیسویں صدی میں بھی موجود ہے کہ شہروں میں پیدا ہونے والے بچے رضاعی ماؤں کے سپرد کر دیے جاتے تھے تاکہ وہ صحرا کی کُھلی اور تازہ ہوا میں پرورش پا سکیں۔ طائف کے قبیلہ ہوازن کی حلیمہ کو جو (ولادت باسعادت کے) چند روز بعد مکہ مکرمہ سے گزری اس بچے کو گود لینے کا شرف حاصل ہُوا، جس کے لیے وہ کبھی پشیمان نہیں ہوئیں کیونکہ یہ بچہ اپنے ساتھ ناقابلِ بیان خوشحالی لے کر آیا جب حلیمہ نے بچے کو پہلی بار اپنا دُودھ پلایا تو اس نے محض ایک چھاتی سے دُودھ پینے پر اکتفا کی۔ اور کبھی دُوسری چھاتی کو مُنہ تک نہ لگایا اور اسے اپنے رضاعی بھائی کے لیے چھوڑ دیا۔ (پیغمبروں کو بچپن ہی سے امین ہونا چاہیے) وہ کوئی چار سال صحرا میں رہا۔ اس دوران وُہ اپنی والدہ محترمہ سے ملاقات کے لیے مکہ مکرمہ آتا رہا۔ اس موقع پر دائی حلیمہ کو بچے کی پرورش کا عوضانہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ بچہ علاقائی میلوں ٹھیلوں (عکاظ وغیرہ) میں بھی اپنی رضاعی ماں کے ساتھ جاتا رہا۔ ایک روز بچے کی بڑی رضاعی بہن شیماؑ اسے اٹھا کر جا رہی تھی۔ راستے میں اس نے بچے کو اتنا گُدگدایا کہ وہ بُرا مان گیا اور غصّے میں آ کر لڑکی کو کندھے پر اتنے زور سے کاٹا کہ دانتوں کے مستقل نشان پڑ گئے۔ اس واقعہ کے کوئی پچپن سال بعد جب بوڑھی شیماؑ کو اسلامی فوج کے ایک دستے نے پکڑ کر حضور اکرمؐ کے رُوبرو پیش کیا تو اس نے بتایا کہ وہ رسول اللہؐ کی رضاعی بہن ہے۔ اس موقع پر اس نے رسولِ خداؐ کو بچپن کا یہ واقعہ بھی یاد دلایا۔ رسول اکرمؐ

کو اپنی رضاعی بہن کے کندھے پر دانتوں سے کاٹنے کا واقعہ یاد آگیا اور فطرت کے عین مطابق انھوں نے اپنی رضاعی بہن سے وہی سلوک کیا جو ایک مشفق اور محبت کرنے والے بھائی کو بہن سے کرنا چاہیے۔

۹ - حلیمہ بچّے کو رواج کے مطابق مقررہ وقت سے زاید اپنے پاس رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تھی۔ ایک روز حلیمہ کا بیٹا صحرا میں بھاگتا ہوا گھر آیا اور اسے بتایا کہ صحرا میں چند افراد آئے جنھوں نے اس کے مکی بھائی کا سینہ چاک کر دیا۔ حلیمہ اور اس کا شوہر خوفزدہ ہو کر صحرا کی طرف بھاگے۔ جب وہ موقع پر پہنچے تو محمدؐ ایک چٹان پر بیٹھے آسمان کی طرف تک رہے تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ ان اجنبی افراد نے ان کا سینہ چاک کیا، ان کا دل باہر نکالا اور دل پر سے ایک سیاہ دھبّہ کاٹ کر، یہ کہتے ہُوئے دُور پھینک دیا کہ یہ شیطانی حصّہ تھا۔ پھر انھوں نے ان کے دل کو دھو کر صاف کیا، اسے اپنی جگہ پر رکھا، چھاتی کا چاک بند کیا اور آسمان کی طرف اُڑ گئے۔ اور جب ان کی رضاعی ماں موقع پر پہنچی تو وہ ان افراد کو ہی آسمان کی وسعتوں میں محوِ پرواز دیکھ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد دائی حلیمہ نے سوچا کہ اس غیر معمولی اور متعجزاتی بچّے کو اس کی والدہ ماجدہ کے سپرد ہی کر دینا چاہیے تاکہ مستقبل میں کسی اور پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

۱۰ - پھر آمنہ بیٹے کو لے کر اس کے والد کی قبر پر گئیں جو مدینہ میں تھی۔ بنو نجار نے جو عبدالمطلب کی ننھیال تھی، اپنے مکی اعزہ سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ آمنہ بھی بنو نجار میں کوئی دو سال رہیں۔ اس دوران نوعمر محمدؐ نے ایک قریبی تالاب میں تیرنا سیکھا۔ انھیں بعد میں بھی مدینہ میں قیام کی بعض تفصیلات یاد تھیں۔ انھیں ان لڑکوں اور لڑکیوں کے نام بھی یاد تھے جن سے مل کر وہ کھیلا کرتے تھے۔

۱۱ - مدینہ سے مکہ واپسی پر بی بی آمنہ کا ابوا کے مقام پر وصال ہو گیا۔ ان کی خادمہ اُمّ ایمن بچّے کو لے کر واپس مکّہ پہنچی اور ان کے دادا عبدالمطلب کے سپرد کر دیا۔ مکّہ کے یہ معمر سردار اپنے پوتے سے ٹوٹ کر محبّت کرتے تھے۔ چند سال بعد جب عبدالمطلب اللہ کو پیارے ہو گئے تو محمدؐ جن کی عمر صرف آٹھ سال تھی، اپنے پیارے اور محبّت کرنے والے دادا کی میّت کے پیچھے روتے ہوئے چلتے رہے۔ دادا کی وفات کے بعد آنحضورؐ کے حقیقی چچا ابُو طالب نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر اب اس نوعمر لڑکے کو اپنے لیے روٹی خود کمانا تھی وہ اپنے ایک ہمسایہ ابُو مُعیط کی بھیڑیں چرانے لگے اور یُوں اپنے خاندان کے وسائل میں معمولی اضافہ کا باعث بنے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے چچا کی کپڑے وغیرہ کی دکان میں بھی ہاتھ بٹانے لگے اور بالآخر ان کی جگہ دکانداری ہی کرنے لگے، کیونکہ وہ ابو طالب کے بیٹوں کی نسبت زیادہ ذہین و فطین اور قابلِ اعتماد تھے۔

۱۲ - ان کی عمر نو سال تھی جب ان کے چچا ایک تجارتی قافلہ لے کر فلسطین کی طرف گئے۔ ابُو طالب نے یہ دیکھ کر کہ ان کا بھتیجا پیارے چچا سے عارضی جدائی پر کتنا پریشان ہے، انھیں بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں فلسطین عیسائی خانقاہوں کا گہوارہ تھا۔ ان خانقاہوں کے عیسائی راہب مسافروں کی بے لوث خدمت کے بجائے ان میں عیسائیت کی تبلیغ پر زیادہ زور دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی راہب بُحیرہ نے ابو طالب اور ان کے رفقا کو

کھانے پر مدعو کیا، محمدؐ بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر بُحیرہ نے کس زبان میں بات کی ہیں علم نہیں، غالبًا اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اپنے مہمانوں سے، جن میں وہ کمسن بچہ بھی شامل تھا، خطاب کیا۔ مگر ایک فرانسیسی مستشرق کی پروازِ تخیل ملاحظہ ہو کہ اس نے ایک پوری کتاب "بُحیرہ —— قرآن کا مصنف" کے عنوان سے سپردِ قلم کی ہے۔ کیا یہ معجزہ رونما ہو سکتا ہے کہ نو سال کی عمر کا ایک بچہ قرآن پاک کی ۱۱۴ سُورتیں چند منٹ میں حفظ کر لے اور پھر ایک نسل کے بعد ان قرآنی سُورتوں کو یہ کہہ کر اپنی اُمت کے رُوبرو پیش کرے کہ یہ اللہ کا کلام ہے؟

۱۳۔ غالبًا یہ اسی دَور کا معمولی سا واقعہ ہے جو نہایت سنگین نتائج کا حامل بنا؛ ایک روز ابو طالب اور ابو لہب دونوں بھائی کسی بات پر جھگڑے اور بالآخر لڑنے لگے۔ ابُو لہب نے ابو طالب کو زمین پر گرا لیا، ان کی چھاتی پر سوار ہو گیا اور انھیں زدوکوب کرنے لگا۔ محمدؐ بھی موجود تھے، وہ اپنے سرپرست کی امداد کو آئے اُنھوں نے ابُولہب کو دھکا دے کر گرا دیا اور یُوں ابوطالب کو موقع فراہم کیا کہ وُہ زمین سے اُٹھ کر ابولہب کو گرا سکیں۔ ابوطالب نے ابولہب کو گرا لیا اور اس کے منہ پر تھپڑ مارے ابولہب کو شدید غصہ آیا اور وُہ پکارا؛ "اے محمدؐ! میں بھی تو ابُو طالب ہی کی طرح تمھارا چچا ہُوں، تم نے اس کی مدد کی ہے میری مدد کیوں نہیں کی؟ اللہ کی قسم میرے دل میں تمھارے لیے کبھی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوگا، کبھی نہیں"۔ اور درحقیقت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ابولہب کے دل میں اپنے بھتیجے کے لیے تعصب اور نفرت میں اضافہ ہی ہوا۔

۱۴۔ چند سال بعد ایامِ حج کے دوران مکہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محمدؐ نے دورانِ جنگ اپنے ایک چچا حمزہ کو ڈھال کے ذریعے تحفظ دیا جبکہ خود حمزہ دشمنوں پر تیر برسا رہے تھے، جبکہ ایک روایت یہ ہے کہ اس جنگ میں محمدؐ نے دشمن قبیلہ کے سپہ سالار مطلب الاسینا کو نیزے سے زخمی کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ قبیلہ بھی طویل عرصہ تک اسلام کا سخت دشمن بنا رہا۔

۱۵۔ حج کے متبرک مہینوں میں خونریزی مکہ مکرمہ کے متعدد صاحبِ ضمیر افراد کے لیے سوہانِ روح تھی۔ الزبیر جو آنحضورؐ کے سب سے بڑے تایا اور خاندان کے سربراہ تھے، آگے بڑھے اور مکہ کے ایک معزز رئیس عبداللہ ابنِ جدعان کے ہاں ایک اجلاس عام طلب کیا، اس اجلاس میں ایک منشور تیار کیا گیا جو تاریخ میں "حلف الفضول"[ل] کے نام سے موسوم ہوا۔ اس معاہدہ کے تحت یہ عہد کیا گیا کہ معاہدہ کے ارکان ہر اس شخص کی مدد کریں گے جس سے زیادتی کی جائے گی۔ حضور اکرمؐ بھی جو اب نوجوان تھے، اس معاہدہ میں پیش پیش تھے۔ بعد میں جب حضورؐ پر نبوت نازل ہوئی اور انھیں صحرائے عرب میں پیغمبرِ خدا تسلیم کر لیا گیا تو بھی آں حضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس (معاہدے کے رُکن کی حیثیت سے) اعزاز سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں خواہ مجھے اللہ کے لیے سُرخ اُونٹوں کا پُورا گلّہ کیوں نہ پیش کیا جائے۔ آج بھی اگر کوئی شخص اس معاہدے کے تحت مجھے (مدد کے لیے) پکارے تو میں بھاگ کر اس کی امداد کو پہنچوں گا"۔ اس معاہدے میں ہاشم، مطلب، زہرہ اور

ل "حلف الفضول کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس معاہدے میں پہلے جو تین افراد شامل ہوئے تھے ان کے ناموں کا ایک جزو لفظ "فضل" پر مبنی تھا۔ لہٰذا اس معاہدے کو "حلف الفضول" کہا جانے لگا۔ (مترجم)

تیم کے قبائل شامل تھے ۔

۱۶ - غالباً قبائلی رقابت کی وجہ سے سعد ابن سہام "حلف الفضول" میں شامل نہ ہوئے مگر وہ اسی نوع کا کوئی اور انتظام کرنا چاہتے تھے ۔ ان کے بنو زہرہ سے خوشگوار تعلقات تھے جو رسولِ خداؐ کی والدہ محترمہ کا قبیلہ تھا ۔ چنانچہ ان دونوں قبائل نے مل کر "حلف الصلاح" (معاہدۂ صلح) کی بنیاد رکھی ۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر بنو قریش یا ان کے حلیف احابیش[1] (ان کا ملک حبشہ سے کوئی تعلق نہیں) میں سے کسی کے درمیان کوئی تنازعہ ہو تو وہ فریقین میں مفاہمت کرائیں گے ۔ بنو زہرہ چونکہ دونوں معاہدوں میں اہم حیثیت کے مالک تھے ۔ اس طرح غالباً ان دونوں معاہدوں میں بھی ایک طرح کا ربط موجود تھا ۔

شادی اور عائلی زندگی

۱۷ - محمدؐ اب چوبیس سال کے ہو گئے ۔ تجارت اور لین دین کے امور میں دیانت اور بے داغ کردار کے باعث لوگوں نے انھیں امین کا لقب دیا ۔ ان کے چچا اور سرپرست ابو طالب اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ ان کے لیے سفرِ تجارت ممکن نہ تھا ۔ چنانچہ اب یہ محمدؐ کی ذمہ داری تھی کہ وہ سالانہ میلوں ٹھیلوں کے موقع پر مختلف علاقوں میں سامانِ تجارت لے کر جائیں ۔ ایک مقامی جوان اور متمول بیوہ خدیجہؓ بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنا مالِ تجارت آنحضورؐ کے سپرد کرنے پر رضامند ہو گئیں کہ وہ ان کے غلام کے ساتھ فلسطین جائیں ۔ محمدؐ فلسطین گئے ۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور دیانت داری کے باعث وہ حضرت خدیجہ کی توقعات سے دوگنا زاید منافع کما کر مکہ واپس پہنچے ۔ وہ بھی ایک دیانت دار خاتون تھیں ۔ انھوں نے حضور اکرمؐ سے اس سفر کے عوض جو معاوضہ طے کیا تھا اس سے دوگنا رقم انھیں ادا کی ۔ دونوں کی یہ روشناسی' احساسِ رفاقت اور پھر حضرت خدیجہ کے لیے جذبات کا روپ دھار گئی ۔ محمدؐ بید شرمیلے اور اتنے غریب تھے کہ عرب کی اس متمول خاتون سے شادی کے لیے نہ کہہ سکے ۔ چنانچہ خاتون نے اپنی سہیلیوں سے مشورہ کیا اور ایک سہیلی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ محمدؐ کے سامنے خدیجہؓ سے شادی کی تجویز رکھے ۔ اور وہ رشتہ طلب کریں ۔

۱۸ - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب معاشرے میں خواتین کو نہایت بلند مقام حاصل تھا ۔ عبد المطلب کی والدہ سلمیٰ النجاریہ کے بارے میں ابنِ ہشام لکھتا ہے کہ وہ جب بھی شادی کرتیں یہ شرط طے کر لیتیں کہ انھیں کسی بھی وقت اپنے شوہر کو طلاق دینے کا حق حاصل رہے گا ۔ یہ بھی درست ہے کہ عرب میں بیٹیوں کو پیدائش کے بعد دفن کرنے کے واقعات ہوئے ہیں ۔ لیکن ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ پھر یہ واقعات انفرادی نوعیت کے ہیں اور ان کا منبع بھی عورت کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تکریم کا رجحان ہے ۔ انسانی منطق بھی عجیب ہے ۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر فرد دوسرے سے برسرِ پیکار ہو ، والدیہ چاہتے تھے کہ ان کی لڑکیاں کسی وقت دشمن کے ہاتھوں گرفتار نہ ہوں اور نہ ہی کوئی شہدہ انھیں اغوا کر کے ان کے ناموس کو

---

[1] احابیش غیر عرب تھے اور عرب میں بطور پیشہ ور سپاہ کے رہتے تھے ۔ (مترجم)

بٹہ لگائے۔ جہاں تک خدیجہ کا تعلق ہے درج ذیل تفصیلات سے زمانہ قبل از اسلام میں مکہ کے رسم و رواج کا اظہار ہوتا ہے: حضور اکرمؐ سے شادی کا معاملہ پہلے آنحضورؐ اور حضرت خدیجہ کی پیامبر کے درمیان طے ہوا۔ حضور اکرمؐ کو یقین دلایا گیا کہ اگر وہ خدیجہ کا رشتہ طلب کریں تو وہ اظہارِ رضامندی کر دیں گی۔ (مورخوں کا کہنا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے حُسن و جمال اور تموّل کی بنا پر مکہ کے متعدد با اثر افراد ان سے شادی کی پیشکش کر چکے تھے مگر انھوں نے ہر پیشکش مسترد کر دی تھی) چنانچہ محمدؐ اپنے چچاؤں، دوسرے اعزہ اور دوستوں کے ساتھ حضرت خدیجہ کے گھر گئے۔ محفل میں پہلے آنحضورؐ کے چچا اٹھے اور مختصر تقریر کی: "آپ سب محمدؐ کو جانتے ہیں۔ اہلِ قریش میں کوئی نوجوان ان کا ہم پلہ نہیں۔ وہ عزّ و شرف، نیابت اور دانش میں اہلِ قریش کے تمام نوجوانوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ ان کے پاس مال و زر کے انبار نہیں تو کیا، آپ سب جانتے ہیں دولت اور مال و زر دھوپ چھاؤں کی طرح آنی جانی ہے۔ دولت آتی ہے چلی جاتی ہے۔ محمدؐ خدیجہ بنتِ خویلد کے طور اطوار بیحد پسند کرتے ہیں اور وہ بھی ان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہیں۔" اس کے بعد خدیجہ کے چچا عمرو بن اسد کھڑے ہوئے اور دوسری باتوں کے علاوہ اُنھوں نے کہا "محمدؐ عمدہ نسل کے اُونٹ کی مانند ہیں جسے بٹھانے کے لیے مہار کھینچنا ضرور نہیں ہوتا۔" چونکہ حضرت خدیجہ کے والد انتقال کر چکے تھے اس لیے عمرو بن اسد نے اس جوڑے کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کیا۔ دونوں نے شادی کی پہلی رات ابوطالب کے گھر پر گزاری۔ پھر خدیجہ شوہر سمیت اپنے گھر میں منتقل ہو گئیں۔ اس بات میں کوئی اختلاف رائے نہیں کہ اس وقت محمدؐ ۲۵ سال کے تھے۔ جہاں تک خدیجہؓ کا تعلق ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں جبکہ متعدد دوسرے مورخوں کا کہنا ہے کہ ان کی عمر صرف ۲۸ سال تھی۔ موخر الذکر افراد کے خیال کی اس حیاتیاتی حقیقت سے توثیق ہوتی ہے کہ آنحضورؐ سے حضرت خدیجہؓ کے ہاں سات بچے، تین بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں: قاسمؓ، طاہرؓ، طیبؓ، زینبؓ، رقیہؓ، اُمِ کلثومؓ اور فاطمہؓ۔

۱۹۔ اس طرح محمدؐ کو اپنے پیارے چچا ابُوطالب سے علٰحدہ ہونا پڑا۔ اور ابوطالب اپنے کثیر عیال کے لیے روزی کمانے میں ایک معاون سے محروم ہو گئے۔ مگر محمدؐ اس صورتِ حال سے بے خبر نہ تھے۔ وہ نہ صرف ابوطالب کے ایک بیٹے علیؓ کو اپنے پاس لے گئے بلکہ اپنے دوسرے چچا عباسؓ کو بھی ابُوطالب کے دُوسرے بیٹے کو گود لینے پر رضا مند کر لیا اور یوں اپنے چچا پر خاندان کا بوجھ ہلکا کیا۔

۲۰۔ یہ قدرتی امر تھا کہ محمدؐ تجارت جاری رکھیں اور یُوں اپنی اہلیہ کے تموّل میں اضافہ کریں۔ مورّخ بتاتے ہیں کہ جب بھی کوئی حقدار حضورِ اکرمؐ کے سامنے آتا ——— ایک قحط کے دوران ان کی رضاعی ماں حلیمہ آئیں، دوسرے یتیم، بیوائیں اور بے نوا مسافر ——— وُہ انھیں امداد کے لیے اپنی اہلیہ کے پاس بھیجتے اور وہ ہمیشہ ایسے افراد کی کھلے دل سے امداد کرتیں۔ اس حقیقت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خواتین (عرب میں) اپنے مال و دولت پر مکمل اختیار رکھتی تھیں اور ان کے شوہر بھی ان کی مرضی کے بغیر ان کی دولت صرف کرنے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ پیغمبرِ خدا تجارت کی غرض سے متعدد بار یمن گئے۔ وُہ کم از کم ایک مرتبہ عُمان بھی گئے جو قبیلہ عبد القیس کا علاقہ تھا۔ غالباً وہاں وہ دبا کے بین الاقوامی تجارتی میلے کے

سلسلے میں گئے تھے جس کے بارے میں ابن الکلبی لکھتا ہے: "پھر عُمان میں سُوہار کا میلہ لگتا تھا۔ وہ مشقر سے یکم رجب کو روانہ ہوتے اور ۲۰ رجب کو سُوہار پہنچتے۔ میلہ پانچ دن جاری رہتا اور عُمان کے حکمران الجُلندہ ابن المستکبر نے (تاجروں پر) عُشر نافذ کر دیا اس کے بعد دبا میں تجارتی میلہ منعقد ہوتا جو عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ سندھ، ہند (ہندو پاک) چین کے تجّار اور مشرق و مغرب کے سوداگر اس میلہ میں شریک ہوتے۔ یہ تجارتی میلہ رجب کے آخری روز شروع ہوتا تھا لیکن دین باقاعدہ بھاؤ تاؤ کے بعد ہوتا۔ الجُلندہ ابن المستکبر (شاہِ عُمان) نے یہاں بھی تاجروں پر بطور کسٹمز ڈیوٹی عُشر نافذ کر دیا جیسا کہ اس نے سوہار کے میلہ میں کیا تھا۔ اس کا رویہ دُوسری ولایتوں کے بادشاہوں سے مختلف نہ تھا۔" اس دلچسپ پیراگراف سے بطور جملہ معترضہ ہی سہی، یہ باعثِ اطمینان بات سامنے آتی ہے کہ عرب کی ایک منڈی میں ہندی تاجر بھی شامل ہوتے تھے۔ اگر رسولِ خدا نے ظہورِ اسلام سے قبل اس تجارتی میلہ (منڈی) میں شرکت کی ہے، جیسا کہ ابنِ حنبل کی ایک روایت سے ظاہر ہے، تو ابن ہشام کی بیان کردہ ایک اور حدیث بھی بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ کہ جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا ایک وفد مدینہ منورہ میں رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ قبولِ اسلام کا اعلان کرے تو حضورِ اکرمؐ نے ان کی بابت پُوچھا: "یہ کون لوگ ہیں جو وضع قطع سے ہندی (رجال الہند) نظر آتے ہیں۔"[1] پیراگراف میں چینیوں کا ذکر بھی ہے۔ المسعودی نے غیر مبہم الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ (چینی) کشتیوں میں آیا کرتے تھے۔ وہ بحرین، عمان اور ابولہ (بصرہ) بھی جاتے تھے۔ ممکن ہے رسولِ خدا کی ان سے وہیں ملاقات ہوئی ہو۔ اور آنحضرتؐ کو نہ صرف چینیوں کی صنعت و حرفت نے متاثر کیا ہو بلکہ وہ اس لئے بھی متاثر ہوئے ہوں کہ یہ لوگ کتنی دُور سے آتے تھے۔ حضورؐ کی مشہور حدیث "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے، کیونکہ حصولِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے۔" شاید اسی تاثر کا اظہار ہے۔ ایک آخری نکتہ یہ ہے: مکی تاجر نہ صرف عرب میں اس طرح کی منڈیوں اور تجارتی میلوں میں شریک ہوتے تھے بلکہ ان کے تجارتی قافلے حبشہ، عراق اور شام ہی نہیں، انقرہ تک مار کرتے تھے جیسا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

۲۱۔ رسولِ خداؐ نے دُور دراز مقامات کا جو سفر اختیار کیا ہے اس کی کچھ تفصیل بے جا نہ ہوگی۔ پہلے دبا کو لیجئے: ابن حنبل رقمطراز ہیں جب قبیلہ ابوالقیس کا وفد رسولِ خداؐ سے ملاقات کے لیے مدینہ آیا تو آں حضورؐ نے ان کے ملک اور لوگوں کے بارے میں متعدد سوالات پوچھے۔ حضورِ اکرمؐ کے سوالات پر وہ لوگ ششدر رہ گئے اور پکار اُٹھے: "آپ تو ہم سے بہتر ہمارے ملک کو جانتے ہیں۔" اس پر رسولِ خداؐ نے جواب دیا: "میں وہاں کافی عرصہ قیام کر چکا ہُوں۔" رسول اللہؐ کے سوانح نگاروں نے واضح طور پر اور بار بار حضورؐ کے سفرِ یمن، شام و فلسطین کا ذکر کیا ہے۔ یمن کو خلیج باب المندب حبشہ سے جدا کرتی ہے۔ مکّہ کے لوگ اکثر اس خلیج کو پار کر کے حبشہ جاتے تھے اور اسی طرح حبشہ کے لوگ عرب اور مکّہ آیا جایا کرتے تھے۔ اوائل اسلام میں مکّی مسلمان ہجرت کر کے بھی حبشہ گئے تھے جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے) بعض جدید

---

[1] حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ استعمال کیے تھے۔

مصنفوں کا قیاس ہے کہ خود رسول اللہؐ بھی حبشہ گئے ہوں گے اور ان کی نجاشی سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ ان کے اس قیاس کی بنیاد اس تعارفی خط کا طرزِ تخاطب ہے جو حضور پاکؐ نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابو طالب کو شاہِ نجاشی کے نام دیا تھا۔ یہ خط خاصا بے تکلفانہ ہے اور طبری کے مطابق اس میں لکھا ہے: "میں آپ کے پاس اپنے عم زاد جعفر کو چند اور مسلمانوں کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچیں ان کی مہمان نوازی کیجئے اور ان پر ظلم نہ ہونے پائے۔ او کما قال

۲۲۔ اسی طرح کا ایک اور چھوٹا سا مگر پُر اثر واقعہ ہے جس سے رسول اللہ کا اخلاقِ حسنہ اور معاشرتی رویہ اجاگر ہوتا ہے۔ ایک نوعمر عرب لڑکا مکّہ کی منڈی میں بطور غلام فروخت ہوا۔ اس کا نام زید بن حارث تھا۔ اور اس کا تعلق شمالی عرب کے ایک بڑے قبیلہ کلب سے تھا۔ اس لڑکے کو بنو کلاب کے ایک ہمسایہ قبیلہ نے ایک تصادم کے دوران گرفتار کر لیا اور مکّہ لاکر فروخت کر دیا۔ یہ لڑکا بڑا حسین اور دانشمند تھا۔ بی بی خدیجہؓ نے اسے خرید لیا اور اسے اپنے شوہر کی خدمت میں بطور ذاتی ملازم کے پیش کیا۔ اس لڑکے کا غمزدہ باپ جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا، بیٹے کی تلاش میں دُور دُور تک مارا مارا پھرتا رہا اور بالآخر اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ بھاری رقم لے کر مکّہ پہنچا تاکہ زرِ فدیہ ادا کرکے بچّے کو آزاد کرائے۔ جب وہ رسولِ خداؐ سے ملا تو حضورؐ اس کی بپتا سے بے حد متاثر ہوئے۔ رسول اللہؐ نے کہا "بچّے کو یوں واپس خریدنے کی نسبت ایک اور بہتر طریقہ بھی ہے وہ یہ کہ میں خود بچّے سے پوچھ لیتا ہوں۔ اگر وہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو آپ ایک کوڑی ادا کیے بغیر اپنے بیٹے کو لے جا سکتے ہیں۔" اس کے بعد رسول اللہؐ نے زید کو بلایا، وہ فوراً ہی حاضرِ خدمت ہوا اور اپنے باپ کو پہچان لیا۔ جب رسولِ خدا نے زید سے جانے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بلا توقف جواب دیا" آپ نے مجھ سے جو محبت بھرا سلوک کیا ہے اس کے بعد میں آپ کے ہاں بطور غلام رہنے کو اپنے باپ کے گھر بطور آقا زندگی گزارنے پر ترجیح دیتا ہوں۔" رسولِ خداؐ اس رقّت انگیز جواب سے بیحد متاثر ہوئے انھوں نے لڑکے کا ہاتھ پکڑا اسے کعبہ کے احاطہ میں لے گئے اور سرِ عام اعلان کیا: "میں زید کو آزاد کرتا ہوں اور آج سے اسے گود لیتا ہوں۔" زید کے والد حارث گو خالی ہاتھ لوٹے مگر ان کا دل اپنے بیٹے کی پرورش کے ضمن میں اطمینان سے پُر تھا۔

۲۳۔ حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہروں سے دو بچّے تھے: ایک شوہر سے بیٹا تھا اور دوسرے سے بیٹی۔ دونوں کا نام "ہند" تھا۔ دونوں بچّے اپنے والد کے خاندان میں ہی رہتے تھے اور کبھی کبھار اپنی ماں سے ملنے آتے تھے، جہاں سے انھیں محبت کے ساتھ تحائف بھی ملا کرتے تھے۔ بیٹا ہند ابن ابی ہالہ اپنے سوتیلے والد (رسول خداؐ) سے بیحد مانوس ہو گیا تھا اور آگے چل کر وہ اسلام میں حضور اکرمؐ کے حلیہ شریف کے بارے میں سب سے بڑا راوی قرار پایا۔ وہ نہایت ہی دلنشیں انداز میں حضورؐ کا سراپا بیان کرتا ہے: "..... اُنؐ کا مُنہ یاقوتوں سے بھرا ہُوا صندوقچہ تھا۔ ان کا چہرہ چودھویں کے چاند سے زیادہ حسین تھا۔" ہند کے اس بیان میں بلاشبہ حضورؐ سے غیر معمولی محبت اور احترام پوشیدہ ہے۔

۲۴۔ تجارِ مکّہ باری باری غیر ممالک کو تجارتی قافلوں کی قیادت کرتے تھے۔ شادی سے قبل محمدؐ نے کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص سائب کے ساتھ شراکت کی، جو بعد میں بیان کرتا ہے: "میں محمدؐ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا وہ جب سامانِ تجارت

لے کر مکہ سے باہر جاتے تو واپسی پر وہ میرے سامان کی خرید و فروخت کا مکمل حساب پیش کرتے ۔ یہاں تک کہ وہ بیرونِ ملک سے آتے ہی گھر جا کر آرام کرنے یا اپنے اہلِ خاندان سے ملاقات سے قبل ہی میرے پاس آ جاتے ۔ اس کے برعکس جب مالِ تجارت لے کر ملک سے باہر جانے کی میری باری ہوتی تو میری وطن واپسی پر وہ میرا استقبال کرتے مجھ سے صرف میری صحت اور تندرستی کے بارے میں دریافت فرماتے ۔ وہ مال کے سلسلے میں کبھی ایک حرف زبان پر نہ لاتے ۔ مشترکہ کاروبار کے سلسلے میں ہم دونوں کے درمیان کبھی اختلافِ رائے نہیں ہوا ۔“

روحانی تحقیق کا محرک

۲۵ ۔ مکہ غیر اہلِ کتاب کا مذہبی مرکز تھا ۔ مکی ایک خدا کو تو مانتے تھے مگر ساتھ ہی وہ بتوں کی پوجا بھی کرتے تھے جنھیں وہ ”خدا کے حضور شفیع“ قرار دیتے تھے ۔ کعبہ اور حج کعبہ جو ان کے جدِ امجد ابراہیمؑ نے شروع کیا تھا، جاری تھا ، کعبۃ اللہ کی عظمت ہر سو مسلّم تھی ۔ جزیرہ نمائے عرب کے ہر حصہ سے لوگ ہر سال حج کے لیے مکہ آتے تھے جس کا ناقابلِ تردید ثبوت ان قبائلی وفود کی فہرست سے ملتا ہے جن سے حضور اکرمؐ نے مدینہ کو ہجرت سے قبل ملاقات کی تھی ۔

۲۶ ۔ کعبہ کے اندر اور باہر لاتعداد بُت رکھے گئے تھے ۔ ان میں سے ہُبل کو سب سے بڑا تسلیم کیا جاتا تھا ۔ چنانچہ اس بت کو کعبۃ اللہ کی چھت پر جگہ دی گئی تھی ۔ ہُبل کو فلسطین کے مقام مآب سے لایا گیا تھا ۔ اسے خرید کر لایا گیا ، کسی نے بطور تحفہ پیش کیا یا کسی اور صورت میں آیا ہمیں علم نہیں ۔ یہ پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا اور غالباً دوسرے بتوں سے خوبصورت تھا ۔ روایات کے مطابق کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھے گئے تھے جو غالباً سال کے پورے دنوں کے مساوی تھے ۔ وہاں بعض قبائل کے مخصوص بُت بھی تھے جیسے لات، منات وغیرہ ، اور مکی ان سب کی تعظیم کرتے تھے ۔

۲۷ ۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ کے غیر اہلِ کتاب کعبہ میں حج کی نماز ادا کرتے تھے ۔ ان میں (مذہبی) رواداری پائی جاتی تھی ۔ ہر شخص جس طرح چاہے رکوع یا سجود کے ذریعے عبادت کر سکتا تھا ۔

۲۸ ۔ بتوں کی پوجا کے بارے میں بعد میں ایک مسلمان نے بتایا : ” قبل از اسلام میں مکہ میں بطور غلام مقیم تھا ۔ میرا آقا ہر صبح مجھے کچھ مکھن اور دودھ کا ایک جگ دیتا جو مجھے بطور نذر منات کے سامنے رکھنا ہوتا تھا ۔ میرا آقا اکثر مجھے متنبہ کرتا ”یہ مکھن وغیرہ خود مت کھانا ورنہ بُت تمھیں اس بے حرمتی کی سزا دے گا ۔“ خدا کی قسم میں روزانہ دیکھتا تھا کہ جونہی میں بُت کے سامنے مکھن اور دودھ رکھ کر پیچھے ہٹتا ، ایک کُتا آتا ، دودھ اور مکھن چاٹ کر بُت پر پیشاب کرتا اور چلا جاتا ۔“

۲۹ ۔ کعبہ کے سامنے دو بُت تھے ، ان میں ایک مرد اساف کا اور دوسرا عورت نائلہ کا تھا ۔ ان کی بابت یہ کہانی مشہور تھی کہ وہ دونوں تخلیہ چاہتے تھے ۔ انھیں کوئی اور مناسب جگہ نہ ملی تو وہ کعبہ میں آ گئے اور گناہ کی واردات سے متبرک کعبہ کو آلودہ کر دیا ۔ خدا نے انھیں اسی آن اور اسی جگہ سزا دی اور انھیں پتھر میں بدل دیا ۔ بعد میں لوگوں نے دیکھا ان دونوں کے اجسام جو پتھر بنا دیے گئے تھے کعبہ کے احاطہ میں موجود ہیں تاکہ دوسرے ان سے عبرت پکڑیں ۔ زمانہ

قبل از اسلام میں جہالت اور ضلالت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان دونوں بُتوں کی بھی پُوجا کرتے تھے اور انھیں حاجت روا تصور کرتے تھے (غالباً یہ بات غیر ملکیوں کے بارے میں ہے جو ان دونوں بُتوں کی اصل سے ناواقف تھے) بہر حال لوگ وہاں جانوروں کی قربانی کرتے اور ان کا لہو حجرِ اسود پر چھڑکتے تھے۔

۳۰ ۔ کعبہ کی دیواروں پر روغنی تصاویر بنی ہوئی تھیں، ان میں ابراہیمؑ، اور کنواری مریمؑ کی تصویر بھی شامل تھی جس کی گود میں بچہ (عیسیٰ مسیح) تھا۔ کعبہ میں ابراہیمؑ کی تصویر کی موجودگی اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل کے مکی ابراہیمؑ کو جانتے اور ان کی تکریم کرتے تھے۔

۳۱ ۔ ہر گھر میں بھی الگ بُت یا کوئی اور چیز بطور معبود موجود تھی، جیسا کہ درج ذیل مختصر کہانی سے ظاہر ہے: جب رسولِ خدا نے مکہ فتح کر لیا اور لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ابُوسفیان کی بیوی ہندہ بھی وہاں موجود تھی۔ وُہ اپنے گھر میں موجود بُتوں کو مار مار کر توڑ رہی تھی اور کہہ رہی تھی: "ہم ایک مدّت سے تمھاری بدولت دھوکہ کھاتے رہے ہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ بھی ظہورِ اسلام سے قبل جب آنحضورؐ سے ان کی شادی ہوئی، رات کو سونے سے قبل بُتوں کی تعظیم بجا لاتی تھیں مگر جب رسولِ خدا نے انھیں بتوں کی بے بضاعتی کے بارے میں بتایا تو انھوں نے اسے ترک کر دیا۔

۳۲ ۔ عرب میں کعبہ کی خانۂ خدا کے شایانِ شان تکریم کی جاتی تھی۔ دُوسری باتوں کے علاوہ کعبہ کے اندر اور باہر پردے لگائے جاتے تھے جن میں اللہ کا گھر مستور رہتا تھا۔ کعبہ کے متولی ان پردوں کو لوبان وغیرہ جلا کر خوشبو میں بسائے رکھتے تھے۔ ۶۰۵ء میں ایک روز طوفان آیا اور آگ کی چنگاریاں اُڑ کر خانۂ خدا پر گریں جس سے پردوں میں آگ لگ گئی اور کعبہ کی پُوری عمارت جل گئی۔ طوفانِ باد کے بعد موسلادھار بارش ہُوئی جو آخری ضرب ثابت ہُوئی اور کعبۃ اللہ زمیں بوس ہو گیا

۳۳ ۔ فطری طور پر (مکّہ کے) لوگوں نے اس مقدّس عمارت کی تعمیرِ نو کا قصد کیا۔ طوفانِ باد نے سمندر کو بھی نہیں بخشا تھا۔ ایک جہاز جو مصری سامان لے کر یمن جا رہا تھا، طوفان میں گھر کر تباہ ہو گیا۔ لیکن اس کے بعض مسافروں کی جانیں کسی نہ کسی طرح بچا لی گئیں۔ جہاز کی تباہی کی اطلاع ملتے ہی مکّہ کے لوگ جہازیوں کی مدد کو پہنچے۔ انھوں نے نہ صرف جہاز کا تباہ شدہ سامان خرید لیا بلکہ جہاز میں لدے ہوئے سامان پر روایتی عشر (کسٹمز ڈیوٹی) بھی معاف کر دیا۔ انھوں نے جہاز کی تباہ شدہ لکڑی تک خرید لی۔ (ان کا خیال تھا کہ جہاز کی لکڑی کعبہ کی چھت تعمیر کرنے کے لیے استعمال ہو سکے گی) جہاز کے مسافروں میں ایک قبطی ترکھان باقوم بھی تھا جس نے کعبہ کی تعمیر میں مدد دینے کی حامی بھر لی۔

۳۴ ۔ مکّہ کے ہر شہری کو تعمیرِ کعبہ کے لیے چندہ دینے کو کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ اس متبرک عمارت کی تعمیر کے لیے صرف نیک کمائی سے امداد دی جائے۔ طوائفوں اور سُود خوروں سے کہا گیا کہ وہ تعمیرِ کعبہ کے اخراجات میں حصّہ نہ ڈالیں۔

۳۵ ۔ مگر تعمیرِ کعبہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ تعمیرِ نو سے قبل رہی سہی عمارت کو گرانا اور ملبہ صاف کرنا ضروری تھا۔ خانۂ خدا کی شکستہ دیوار پر بھی ضرب لگانے کا تصور ان لوگوں کے لیے خوفناک تھا۔ مزید برآں کعبہ کے اندر ایک گہرا گڑھا تھا جس

میں زیارتِ کعبہ کو آنے والے افراد نذر نیاز پھینکتے تھے۔ بسا اوقات بعض عاقبت نااندیش چور بھی خانۂ خدا میں گھس کر اس گڑھے سے جو ہاتھ لگتا چُرا کر لے جاتے۔ اس نوع کا ایک واقعہ ابُولہب سے بھی منسوب کیا جاتا ہے، جب وہ نوجوان تھا اس کے پاس رقص و شراب کی ایک دعوت کے لیے رقم نہ تھی چنانچہ اس نے کعبۃ اللہ میں چوری کی۔ اس نذر و نیاز کی وجہ سے ایک اژدہا بھی اس گڑھے میں قیام پذیر ہوگیا تھا۔ جب اس گڑھے کی چھت نہ رہی تو یہ اژدہا وقتاً فوقتاً گڑھے کے کنارے پر آ بیٹھتا جس کے نتیجے میں خوف و ہراس پھیل جاتا۔ انھی دنوں جب لوگوں میں کعبہ کے باقی ماندہ کھنڈرات کو گرانے یا نہ گرانے کے بارے میں صلاح مشورے جاری تھے، ایک مارخور پرندہ کہیں سے آیا وہ سیدھا اژدہا پر جھپٹا اور اسے اٹھا کر آسمان کی وسعتوں میں غائب ہوگیا۔ اس پر مکہ کے لوگ بے حد خوش ہوئے۔ جو لوگ کعبہ کے کھنڈرات کو گرا کر صاف کرنے کے حق میں تھے، ان کی پوزیشن بے حد مضبوط ہوگئی۔ انھوں نے کہا "خدا چاہتا ہے کہ ہم اس کے گھر کی تعمیرِ نو کریں، اُسی نے کعبہ کو اژدہا سے نجات دلائی ہے۔" چنانچہ ایک معمر اور معزز مکی آگے بڑھا اور کعبہ کے کھنڈرات کو صاف کرنے کی غرض سے پہلی ضرب لگائی۔ چند ضربوں کے بعد وُہ ٹھہر گیا اور بولا "آج کی رات انتظار کرلو، اگر کل صبح تک کچھ ظہور میں نہ آیا تو ہم دل و جان سے تعمیرِ نو کا کام شروع کردیں گے۔" اور حقیقتاً رات کے وقت کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ روایت ہے کہ جب دیواروں کو بنیادوں تک کھود دیا گیا تو نیچے سبز رنگ کا پتھر آگیا جو دانتوں کی طرح مضبوطی سے بچھا ہوا تھا۔ کہتے ہیں یہ کعبہ کی بنیاد تھی جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت بھری گئی تھی۔ مکہ والے اس بنیاد کو نہیں چھیڑنا چاہتے تھے بلکہ اسی کی وجہ سے خانۂ خدا کے صحیح طول و عرض اور سمت کا بھی تعین ہوگیا۔ دراصل کعبہ کی دیواریں شمال جنوب اور مشرق مغرب نہیں بلکہ شمال مشرق اور جنوب مغرب ہیں۔

۳۶۔ مکہ کے ہر شخص نے ملبہ صاف کرنے اور کعبہ کی تعمیرِ نو میں حصہ لیا البتہ خواتین اس کام میں شریک نہ تھیں۔ رسولِ خدا تعمیر کے لیے پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ وہ اپنے کندھے پر بھاری پتھر رکھ کر لاتے تھے، اُنھوں نے کندھے پر کوئی کپڑا وغیرہ نہیں رکھا تھا جس کے باعث ان کا کندھا زخمی ہوگیا۔ کعبہ کی چاروں دیواروں کی تعمیر کا کام مکہ کے مختلف قبائل کے سپرد کیا گیا تھا۔

۳۷۔ کعبہ کے دروازے کے بائیں طرف ایک کونے پر سیاہ رنگ کا ایک پتھر نصب تھا جو عمارت کے دوسرے تمام پتھروں سے رنگ میں جُدا تھا۔ یہ پتھر طواف کے لیے نقطۂ آغاز کا کام دیتا تھا۔ یہ کھوکھلا اور باہر سے بیضوی شکل کا پتھر تھا۔ حجاج (دورانِ طواف) اس پتھر کی طرف ہاتھ اٹھا کر عقیدت سے چُومتے تھے اور کعبہ کے سامنے قربان کیے جانے والے جانوروں کا خون بھی اس پر چھڑکا جاتا تھا۔ یہ پتھر زمین سے کوئی ایک میٹر کی بلندی پر ہے۔ جب تعمیرِ کعبہ کے دوران اس پتھر کو مقررہ مقام پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا تو تنازعہ پیدا ہوگیا کہ اس پتھر کو نصب کرنے کا اعزاز کسے ملنا چاہیے۔ پتھر دو دیواروں کے مقامِ اتصال پر نصب کیا جاتا تھا لہٰذا کوئی قبیلہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ پتھر اس کے دائرہ تعمیر میں نصب کیا جائے گا۔ ہر قبیلہ "حجرِ اسود" کی تنصیب کا اعزاز حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ چنانچہ مدِ مقابل قبیلہ کو پتھر کی تنصیب سے باز رکھنے کے لیے فریقین نے تلواریں سونت لیں۔ ایک معمر دانشور آگے بڑھا اور لوگوں کے جذبات کو مزید بھڑکنے سے روکتے ہوئے بولا: "اس پاک زمین پر خونریزی کیونکر ممکن ہے۔" پھر اس نے تجویز پیش کی کہ اس پتھر کی تنصیب کا

کام اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ کل صبح جو شخص سب سے پہلے کعبۃ اللہ میں آئے وہ بطور ثالث فیصلہ دے کہ یہ اعزاز کسے حاصل ہو۔ اگلی صبح رسول اللہؐ سب سے پہلے کعبہ میں آئے، ہر شخص نے ان کا خیر مقدم کیا" امین آرہا ہے، امین آرہا ہے"۔ جب آنحضورؐ کو اس تنازعہ کا علم ہُوا تو انھوں نے ایک چادر منگوائی۔ "حجرِ اسود" کو اس چادر میں رکھا اور کہا کہ تمام قبائل کا ایک ایک نمائندہ آگے بڑھ کر چادر کو اٹھائے۔ یُوں حجرِ اسود کو اس مقام تک لایا گیا جہاں اسے نصب کیا جانا تھا تو حضورؐ نے خود پتھر اٹھایا اور معینہ مقام پر نصب کر دیا۔ ہر شخص مطمئن ہو گیا۔ مکّہ کے شرفا میں ایک خاندان الجدید (معمار) کا نام آتا ہے۔ یہی وُہ خاندان ہے جسے کعبہ کی دیکھ بھال اور بوقتِ ضرورت تزئین و مرمّت کا کام سونپا گیا۔ یقیناً اس خاندان کے بانی نے کعبہ کی تعمیرِ نو کے کام میں فنّی مشورے دیے ہوں گے۔ یہ کام جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ البتہ تباہ شدہ مصری جہاز سے خریدی جانے والی لکڑی کعبہ کی چھت کے لیے پُوری نہ نکلی۔ چنانچہ انھوں نے پُورے خلوص سے فیصلہ کیا کہ کعبہ کا ایک برآمدہ سا ہونا چاہیے جس پر کوئی چھت نہ ہو اور لوگوں کو کعبہ کے اس حصہ میں ہر وقت داخل ہونے کی اجازت ہو جبکہ بقیہ عمارت جس میں دروازہ نصب ہو، سال کے مقررہ اوقات میں ہی کھولی جائے غالباً کعبہ کے اس حصّہ میں داخلہ کی فیس مقرر تھی۔ کعبہ کا یہ کھلا حصّہ جو حطیم (یا حجر) کہلاتا ہے غالباً وہی گڑھا ہے جہاں قبل ازیں لوگ نذر نیاز پھینکا کرتے تھے۔ یُوں کعبہ ایک چوکور کمرہ بن گیا جس کے ایک طرف نیم مدوّر سی تعمیر بھی موجود ہے جس کے باعث کعبہ "دل" کی طرح معلوم ہوتا ہے  کعبہ کے لیے دل کی تشبیہ کوئی حقیر بات نہیں۔ مشہور حدیث قدسی ہے: "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نہ تو زمین میں سما سکتا ہُوں اور نہ آسمان میں، البتہ میرا مکان، اگر ہے تو قلبِ مومن ہے"۔ تو اللہ کا گھر بھی دل کی شکل کا ہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک تحیّر خیز اتفاق ہے کہ لفظِ "کعبہ" عربی میں مربّع اور مدوّر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۳۸۔ کعبۃ اللہ کی عمارت کا بیرونی حصہ اگر ۳۶۰ بتوں سے سجایا گیا تھا تو اس کے اندر دیواریں تصاویر سے مزیّن کی گئی تھیں۔ یقیناً یہ تصاویر نہایت خوب صورت ہوں گی — ہم ان کے بارے میں پھر بیان کریں گے — مگر یہ معلوم نہیں کہ یہ تزئین کس نے کی تھی۔ ممکن ہے دیواروں پر تصویریں بنانے والا کوئی عیسائی ہو کیونکہ ایک دیوار پر کنواری مریم اور ان کے بیٹے مسیح کی تصویر آبی رنگوں سے بنائی گئی تھی۔ مورخوں کے مطابق فتح مکّہ کے بعد رسول اللہؐ نے کعبہ کی دیواروں کو ان تصاویر سے پاک کرا دیا تھا۔ لیکن ان کے بچے کھچے آثار کوئی نصف صدی بعد تک بھی نظر آتے رہے۔ جب عبداللہؓ ابن زبیرؓ نے کعبہ کی عمارت کو گرا کر از سرِ نو تعمیر کرایا۔ اس پر ایک حیرت انگیز حقیقت کی یاد تازہ ہوتی ہے: بخاری اور دُوسرے ذرائع کے مطابق حجرِ اسود بابا آدمؑ جنت سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابتدا میں اس کا رنگ سفید تھا مگر حجاج میں سے گنہگار افراد کے چھُونے سے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ ابن عبد ربہ نے (العقد الفرید میں) اس کی مکمل تفصیل دی ہے۔ وہ روایت کرتا ہے کہ رسولِ خداؐ نے فرمایا: "گناہ گاروں کے ہاتھوں کے لمس اور قربانی کے جانوروں کا خون ڈالے جانے سے (حجرِ اسود کا) رنگ سیاہ پڑ گیا"۔ وُہ مزید لکھتا ہے کہ جب عبداللہؓ ابنِ زبیرؓ کے دور میں کعبۃ اللہ کی عمارت از سرِ نو تعمیر کی گئی تو دیکھا گیا کہ حجرِ اسود دراصل سفید رنگ کا ہے، البتہ اس کا بیرونی مدوّر سرا سیاہ پڑ چکا تھا۔ یہ سیاہ حصّہ

تقریباً تین کیوبٹ[1] تھا۔

۳۹۔ محمدؐ ۳۵ کے سن کو پہنچ چکے تھے۔ اس وقت اللہ واحد کا پاک گھر لاتعداد بتوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ظاہر ہے حضورِ پاکؐ کی نیک رُوح کو اس سے صدمہ پہنچا ہوگا۔ چنانچہ وہ اس حقیقت پر غور کرنے لگے کہ آیا خود اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بُت کو خدا اور واجب تعظیم تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد کیا ظہور میں آیا ہم نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ قرآن (۸۔۳۵) اُن کے اندازِ عبادت کو نفرت آگیں لہجے میں "محض ہاتھ باندھنا اور سیٹیاں بجانا" قرار دیتا ہے۔ (بعض ممالک میں آج بھی بت پرستی میں یہ عناصر موجود ہیں۔ شور مچانے اور ہاتھ باندھنے کا مقصد بدروحوں کو ڈرا کر بھگانا لیا جاتا ہے)
ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زید ابن عمرو ابنِ نوفل جو عمر ابن الخطاب کے اعزہ میں سے تھے، جیسے حق کے متلاشی نے نہ صرف بت پرستی ترک کر دی تھی بلکہ وہ بتوں کو پیش کی جانے والی قربانی کے جانور کا گوشت کھانا بھی حرام تصور کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:
"اے خدا! اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تجھے کون سا اندازِ بندگی پسند ہے تو میں وہی انداز اختیار کروں۔ لیکن چونکہ میں لاعلم ہوں تو میں تیرے سامنے سجدہ کو ترجیح دیتا ہوں، وہ بھی اس حالت میں کہ میرا چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں زمین پر رکھی ہوں"۔

۴۰۔ محمدؐ زید کے قریبی دوست تھے۔ وہ مذہبی اور روحانی امور پر خود غور و فکر کے ساتھ دوستوں سے بھی تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ ہمیں ان مذہبی مباحث کی تفصیل معلوم نہیں۔ مگر روایت ہے کہ آنحضورؐ جن دوستوں کے پاس اکثر آتے جاتے تھے ان میں ایک عیسائی غلام عداس بھی تھا جو اپنے آقا کی دُکان چلاتا تھا (واضح رہے کہ خود رسولِ خداؐ بھی تاجر تھے)۔

۴۱۔ رجب (مذہب کے معاملہ میں) حضورؐ کی بے چینی بڑھی تو اُنھوں نے رمضان کا پُورا مہینہ مشہور غارِ حرا میں گزارنے کا فیصلہ کیا جو مکہ کی نواحی پہاڑی جبل النور میں واقع ہے۔ (یہ بات حیرت انگیز ہے کہ حرا کے معنی "تحقیقات" اور جبل النور کے معنی "روشنی کا پہاڑ" ہیں) کہا جاتا ہے کہ نہ صرف رسولِ خداؐ کے دوست زید ابن عمرو ابنِ نوفل بلکہ حضورؐ کے دادا عبدالمطلب بھی کبھی کبھار عبادت کے لیے غارِ حرا میں چلے جایا کرتے تھے۔ رسولِ خداؐ نے کچھ کھانے پینے کا سامان ساتھ لیا اور غارِ حرا میں چلے گئے۔ اس سامان میں سے وہ قریب سے گزرنے والے مسافروں کی خدمت بھی کرتے رہے۔ پھر ان کی محبوب اہلیہ بی بی خدیجہؓ بھی وقتاً فوقتاً کھانے پینے کا سامان غار میں پہنچاتی رہیں۔ ایک ماہ تک (غار میں) غور و فکر کے بعد، جس کی کوئی تفصیل ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ حضورؐ واپس آگئے۔ اُنھوں نے واپسی پر سب سے پہلے کعبہ کا سات بار طواف کیا اور پھر اپنے گھر گئے۔

۴۲۔ غارِ حرا میں اس قیام سے حضورؐ کو اتنی مسرت حاصل ہوئی کہ اُنھوں نے اسے اپنا سالانہ معمول بنا لیا ہم متواتر پانچ سال تک دیکھتے ہیں کہ آنحضورؐ سال میں ایک بار دنیاوی زندگی حتیٰ کہ بال بچوں سے بھی علٰحدگی اختیار کر کے ایک ماہ کے لیے غارِ حرا میں چلے جاتے، جہاں وہ یکسوئی سے خدا کی عبادت کرتے اور ان سوالات پر غور و فکر کرتے جو

---

[1] ایک قدیم پیمانہ جو ۱۸ سے ۲۲ انچ تک ہوتا تھا۔ (مترجم)

ان کے ذہن میں پیدا ہوتے۔ ممکن ہے وہ سوال یہ ہوں ، کائنات کا خالق کون ہے ؟ انسانی زندگی کا مقصد وحید کیا ہے ؟ اور بعد از مرگ کیا ہوتا ہے ؟ وغیرہ۔

۴۳۔ خوش قسمتی سے مجھے اس غار کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ جبل النور مکہ کے شرقی نواح میں شہر کے وسط سے تین چار کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حجاج جب منیٰ میں جاتے ہیں تو یہ پہاڑی ان کے بائیں ہوتی ہے۔ یہ مخروطی شکل کی بلند پہاڑی ہے جو آس پاس کے سلسلہ کوہ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ جدہ سے مکہ آنے والے بھی جبل النور کو دیکھتے ہیں اور اس کی بلندی سے متاثر ہوتے ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ پہاڑی پر چڑھائی کے دوران میں نے ایک چھوٹا سا حوض دیکھا جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ حوض ترکوں کی عملداری میں تعمیر کیا گیا تھا۔ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو یہ حوض پانی سے بھر جاتا ہے جو کچھ عرصہ تک جنگلی جانوروں کے پینے کے کام آسکتا ہے۔ غارِ حرا پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور ایسی چٹانوں سے عبارت ہے جو ایک دوسری کے اُوپر کھڑی ہیں۔ اس کے اندر سے مٹی بہہ چکی ہے اور بڑے بڑے پتھر اس کی دیواروں اور چھت کا کام دیتے ہیں۔ اندر سے غار اتنی بلند ہے کہ اس میں سیدھا کھڑا ہونا ممکن ہے۔ غار کا طول و عرض بھی اتنا ہے کہ ایک انسان اس میں سہولت سے لیٹ سکتا ہے اور سو سکتا ہے۔ غار کی لمبائی چوڑائی سے زیادہ ہے۔ قدرتی طور پر اس کا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہے۔

۴۴۔ مکہ وسیع المشرب شہر تھا، گو وہاں بُت پرستوں کی اکثریت تھی مگر وہاں ایسے افراد بھی تھے جو "سچائی" کی تلاش میں دہریے ہو گئے یا عقلیت پسندی وغیرہ کے چکر میں پڑ گئے۔ مکہ میں دو افراد کے عیسائیت قبول کرنے کی روایت بھی ملتی ہے، ان میں سے ایک تو بازنطینی عیسائیوں کی مدد سے مکہ کی بادشاہت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دُوسرا خود کو غسان کے ظالم حکمران سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ مکہ کے ملحدوں کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ وُہ ایک خدا پر یقین رکھتے تھے۔ مگر محشر اور یومِ قیامت پر ان کا اعتقاد نہ تھا۔ محمدؐ ابھی جوان ہی تھے، ان کی عمر صرف ۲۵ سال اور ان کی محبوب زوجہ کی ان سے کوئی تین سال زاید تھی۔ لیکن حضورؐ کے دل میں الہیاتی علم کی پیاس روز بروز بڑھ رہی تھی۔ حضورؐ کی طبع گرامی میں اس تبدیلی کے بعد بی بی خدیجہؓ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

۴۵۔ رسولِ خدا کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہی دنوں جب حضورؐ روحانی طور پر متحرک تھے اور ان کا بیشتر وقت عبادت اور غور و فکر میں گزرتا تھا، انھیں غیر معمولی تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی عقب سے انھیں پکار رہا ہے، اور جب وُہ پلٹتے تو وہاں کوئی بھی نہ ہوتا۔ وہ جب درختوں اور چٹانوں کے پاس سے گزرتے تو شجر و حجر انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے محسوس ہوتے۔ قدرتی طور پر آنحضورؐ خوفزدہ سے رہنے لگے۔ یہ انہی دنوں کی کیفیت ہے جب انھیں غارِ حرا میں قیام کرتے کئی سال گزر چکے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ اس عظیم لمحہ کی تیاریوں کا ایک حصہ تھا جو رسولِ خدا پر وارد ہونے والا تھا یعنی نزولِ وحی، جس کے ذریعے ان پر اللہ کا کلام نازل ہونا تھا، جس کا عام انسان جو عام سی مادی زندگی گزار رہا ہو متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یُوں ابن اسحاق کی درج ذیل روایت کی پُرمغز توجیہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جو اس نے

پہلی وحی کے بارے میں بیان کی ہے :

اللہ کا جدید ترین منشور

۴۶ - رسولِ خدا کو متواتر غارِ حرا میں جاتے پانچواں سال تھا - یہ ماہِ رمضان کے آخری دن تھے - ایک رات جب حضورؐ غار میں محوِ استراحت تھے، انھوں نے انتہائی عجیب خواب دیکھا - وہ دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ اُن سے ملاقات کے لیے آیا جس کے پاس ایک دستاویز تھی جو سلک کے قیمتی کپڑے میں ملفوف تھی - اس فرشتے نے کہا : " اے محمدؐ ! میں جبرائیل ہوں، خدا نے اپنا پیغام آپ تک پہنچانے پر مجھے مامور کیا ہے - اسے پڑھیے " " مگر میں تو اُمّی ہُوں اور پڑھ نہیں سکتا " حضورؐ نے جواب دیا - اس پر جبرائیلؑ نے حضورؐ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور انھیں اس زور کے ساتھ دبایا کہ حضورؐ نے سوچا کہ اُن کا دم گھُٹ جائے گا - پھر جبرائیلؑ نے انھیں چھوڑ دیا اور دوبارہ کہا " اسے پڑھیے " حضورؐ نے پہلے والا جواب دُہرایا تو جبرائیل نے پھر حضورؐ کو بازوؤں میں لے کر پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ بھینچا - پھر انھیں چھوڑ کر تیسری بار پڑھنے کو کہا - مگر آنحضورؐ کا جواب حسبِ سابق تھا - فرشتوں کے سردار نے تیسری بار رسولِ خدا کو انتہائی شدّت سے اپنے بازوؤں میں دبایا اور پھر چھوڑ کر کہا :

" پڑھو اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو
خُون کے ایک قطرے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بہت بڑا کرم کرنے والا ہے
جس نے سکھایا ساتھ قلم کے، سکھایا انسان کو جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا "

(القرآن ۹۶/۱-۵)

۴۷ - عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کا پہلا نزول ۲۷ رمضان کو ہوا - لیکن آنحضورؐ کے ایک عظیم سوانح نگار السہیلی نے جس روایت کو ترجیح دی ہے اس کے مطابق اوّل نزولِ وحی پیر ۱۷ رمضان المبارک ۱۳ ق ھ[1] بمطابق ۲۲ دسمبر ۶۰۹ء کو ہوا -

۴۸ - کیا رُوح پرور تصوّر ہے - ایک اُمّی مگر نہایت دیانت دار اور پاکباز تاجر کو علم و فضل کا پیغمبر قرار پانا تھا، اور منکشف کرنا تھا کہ ہر تہذیب اور ثقافت کی ترقی و بقا کا راز قلم اور تحریر میں مضمر ہے - اگر پرانے تصورات معلوم ہو جائیں تو آنے والے ان میں نئے نظریات کا اضافہ کرتے ہیں اور افراد کے اجتماعی تجربات انسانیت کے عروج کا نشان ہیں جو اسے باقی مخلوق سے ممتاز کرتے ہیں -

۴۹ - ہمارے ذرائع معلومات کے مطابق پھر جبرائیل نے ایک چٹان پہ پاؤں مارا جس سے چشمہ اُبل پڑا ——— خواب جاری ہے ——— پھر اس نے حضورؐ کو وضو کرنا سکھایا، اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح دو رکعت نماز کے ساتھ اللہ کی بندگی

---

[1] قبل از ہجرت

کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر وہ غائب ہو گیا۔

۵۰۔ محمدؐ بیدار ہوئے، وہ اس قدر خوف زدہ تھے کہ انھوں نے فوری طور پر واپس گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر کی سرد رات ایک اور وجہ تھی جس کی بنا پر انھوں نے اچانک گھر لوٹتے ہی اپنی زوجہ مطہرہ سے کہا "مجھ پر کمبل ڈال دو، مجھ پر کمبل ڈال دو۔" بالآخر جب ان کے حواس بجا ہوئے تو انھوں نے غار میں پیش آنے والے واقعات سے اپنی اہلیہ کو آگاہ کیا اور کہا: "مجھے خدشہ ہے کہ میں بھی ان کاہنوں اور نجومیوں میں شامل ہو گیا ہوں جن سے مجھے سخت نفرت ہے۔" محبت کرنے والی بیوی نے اپنے شوہر کو دلاسہ دیا اور یہ کہہ کر ڈھارس بندھائی کہ "آپ ہر حاجت مند اور غریب سے محبت، شفقت اور فیاضانہ سلوک کرتے رہے ہیں خدا آپ کے ساتھ ہے یقیناً اللہ آپ کو شیطان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

۵۱۔ اگلی صبح کو وہ حضورؐ کو اپنے عم زاد ورقہ ابنِ نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی تھے —— ایک اور روایت کے مطابق بی بی خدیجہؓ نے حضورؐ کو ابوبکرؓ کے ساتھ معمر دانشور ورقہ کے پاس بھیجا —— ابوبکرؓ آنحضورؐ سے (غالباً کسی تجارتی معاملہ میں) ملاقات کے لیے آئے تھے —— جب رسولِ خداؐ نے ورقہ کو پیش آمدہ واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بے اختیار پکار اٹھا: "قدیس فوق قدیس، قدیس فوق قدیس۔ اگر آپؐ نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تو پھر آپ اُسی تجربہ سے گزرے ہیں جس سے وادیِ سینا کے پہاڑ پر موسیٰؑ دوچار ہوئے تھے اور جہاں انھیں تورات سے سرفراز کیا گیا تھا۔ اگر میری زندگی مزید کچھ عرصہ وفا کرے، جب آپ کے لوگ آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں گے، اللہ کی قسم میں آپ کا ساتھ دُوں گا اور آپ کی مدافعت کروں گا۔" "کیا وہ اس (تجربہ) پر مجھے ظلم کا نشانہ بنائیں گے؟" رسولِ خداؐ نے نہایت بھولپن سے پوچھا۔ ورقہ نے جواب دیا: "پیغمبر کی مخالفت ضرور کی جاتی ہے۔"

۵۲۔ آہستہ آہستہ حضورؐ پرسکون ہو گئے۔ پھر غارِ حرا کے تجربہ کے بارے میں غور و فکر ان کے لیے باعثِ مسرت بن گیا۔ پھر انھیں جبرائیل کی آمد کا انتظار رہنے لگا۔ وہ اسی واردات کو پھر محسوس کرنا چاہتے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا ان کا اشتیاق تشویش کا رُوپ دھارنے لگا۔ تین سال کا طویل عرصہ گزر گیا تو مایوسی نے انھیں گھیر لیا۔ مخالفین لعن و تشنیع سے زخموں پر نمک چھڑکنے لگے۔ ایک معمر عورت نے جو حضورؐ سے سخت نفرت کرتی تھی اور جو ان کے چچا ابُولہب کی اہلیہ تھی یہاں تک کہہ دیا کہ "تمھارے شیطان نے تمھیں ٹھکرا دیا ہے اور وہ تم سے ناراض ہو گیا ہے۔" یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ صبر کا دامن حضورؐ کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا، وہ جذبات کی رَو میں بہہ گئے اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وُہ ایک پہاڑی کی آگے کو بڑھی ہوئی چٹان پر چڑھ گئے "تاکہ ناقابلِ برداشت حد تک دُکھی زندگی کا خاتمہ کر سکیں، جیسا کہ بخاری نے روایت کی ہے۔ عین اس وقت جبرائیل ظاہر ہوا اور بولا: "نہیں، آپ خدا کے پیغام بر ہیں، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بھولے نہیں، صرف اتنی سی بات ہے کہ آپ اللہ پر اپنی مرضی نہیں ٹھونس سکتے۔" پھر جبرائیل نے قرآن پاک کی یہ آیات حضورؐ کو پہنچائیں:

"قسم ہے چڑھتے دن کی اور رات کی جب (وہ) ڈھانپ لے (ہر چیز کو)، نہیں چھوڑ دیا تیرے رب نے

تجھ کو اور نہ ہی (تجھ سے) نفرت کرتا ہے اور البتہ جو بعد میں ہوگا (آخرت میں) بہتر ہے تمہارے لیے موجودہ (زندگی) سے، اور البتہ تمہارا رب عطا کرے گا تمہیں جلد پس تم راضی ہو جاؤ گے، کیا نہیں پایا اس نے تمہیں ایک یتیم اور پھر فراہم کیا (تمہارے لیے) ٹھکانا اور پایا تجھے اپنی محبت میں خود رفتہ اور پھر تمہیں (سیدھی) راہ دکھائی اور پایا تجھ کو حاجت مند (دوسروں کا) اور پھر غنی (بے نیاز) کیا (دوسروں سے) پس جو یتیم ہو اس پر ظلم مت کر اور جو سائل ہو اسے مت ڈانٹ (بھگا) اور تیرے پروردگار نے (تمہیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر۔" (قرآن ۹۳/ ۱-۱۱)

"اور تیرے پروردگار نے (تمہیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر" یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ لوگوں کو ایمان اور نیکی کی طرف بلاؤ۔ اس سے بڑی فیاضی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس راستے کی نشان دہی کر دی جائے جو اس (خدا) کی طرف جاتا ہے۔ صرف خدائے واحد پر ایمان اور غیر اللہ کو مسترد کرنا ایک طرف، خیرات، فیاضی، کمزوروں اور ناداروں کی امداد دوسری طرف۔ یہ دونوں "قطب" تھے جن میں اسلام کا کرہ قائم ہونا تھا۔ اور محمد رسول اللہؐ اس عظیم کام کی تکمیل میں منہمک ہو گئے۔ دُنیا میں ایک نیا دین وجود میں آگیا۔

باب ۲

نیا دین کیوں ؟

۵۳ ۔ آئیے ہم ذرا ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کریں کہ دنیا میں اتنے ڈھیر سارے ادیان کی موجودگی میں نئے دین کی کیا ضرورت تھی ؟

۵۴ ۔ مذہب ، اگر عام لوگوں کے لیے نہیں تو کم از کم نیک نہاد افراد کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے ۔ انسان کے بے تابانہ سوالوں کا جواب صرف اور صرف مذہب ہی فراہم کرتا ہے : میرا خالق کون ہے ؟ اس نے آخر مجھے کیوں تخلیق کیا ؟ موت کے بعد میرا کیا بنے گا ؟ وغیرہ ۔ گو لوگوں کی مختصر تعداد ان سوالات کی تحقیق و جستجو کو اپنی زندگی کا مقصد گردانتی ہے مگر یہ سوالات زندگی کے کسی مرحلے میں ہر شخص کے ذہن میں پیدا ضرور ہوتے ہیں ۔ ان سوالات کا تعلق ناقابلِ ادراک اور ماورائی امور سے ہے ۔

۵۵ ۔ روزِ ازل سے گر نہیں تو ایک طویل عرصہ سے انسان کو اس بات کا ادراک ہے کہ وہ خود اپنا خالق نہیں ہے ۔ اس کے والدین یا ان کے والدین کے سوا بھی کوئی ہستی ضرور ہے جس نے اسباب و علل کی یہ کائنات تخلیق کی ۔ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان اسے دیکھ نہیں سکتا ، مگر اسے واجب الوجود تسلیم کرنے پر مجبور رہے ۔ انسان نے جلد ہی یہ راز بھی پالیا کہ تمام انسان یکساں صلاحیتوں کے مالک نہیں اور نہ ہی ان کی عادات و اطوار میں یکسانیت ہے ۔ ایسے لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہے جو بے لوث ، مخیّر ، صادق اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے ہوں اور جن کی فطرت ہی راہِ خدا میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور اس جد و جہد میں ان کا تحفّظ کرتی ہے ۔ اگرچند مفاد پرست انھیں اللہ کے پیغمبروں کی رہنمائی کرنے سے روکتے ہیں تو دوسری طرف بتدریج لوگوں کی بڑی تعداد ان کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے جو بسا اوقات ان کی حمایت میں لڑنے مرنے پر بھی تیار ہو جاتی ہے ۔ باعث انحطاط و ذلت سے گلو خلاصی کے لیے نئی کوششوں اور نئی نسلوں کے افراد کی از سرِ نو جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ نوعِ انسانی کا پُرانا ریکارڈ ہم تک نہیں پہنچا ۔ مذہب کے شعبہ میں نئی نسلوں کو جو کچھ (پرانی نسلوں سے) ملا ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں انسانوں کی رہنمائی کے لیے آنے والے کہتے تھے : میں خدا کا ، تمہارے خالق کا پیام لایا ہوں جو اس نے مجھ پر نازل کیا ہے تاکہ میں اِسے تم تک پہنچا سکوں ۔

۵۶ ۔ ابن العربی[1] نے "فتوحاتِ مکیہ" میں رسولِ خدا کی ایک دلچسپ حدیث نقل کی ہے ۔ فرماتے ہیں : "دُنیا میں

---

[1] اسلام کے عظیم فلاسفر محی الدین ابنِ عربی صاحبِ "فتوحاتِ مکیہ"

ایک لاکھ آدم ہو گزرے ہیں اور ہم ان میں سے سب سے آخری کی اولاد ہیں"۔ ایک اور دلفریب روایت ہے: "ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے کہا: مجھے اپنا کوئی معجزہ دکھائیے۔ خدا نے موسیٰؑ کو ایک خاص مقام پر پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ ایک صحرا تھا جہاں کوئی متنفس نہ تھا صرف ایک گڑھا تھا۔ موسیٰ نے گڑھے میں ایک کنکری پھینکی۔ اچانک گڑھے میں سے آواز آئی: "کون ہو بھئی؟" موسیٰؑ نے اپنا تعارف کرایا اور آدم تک اپنا شجرۂ نسب بیان کیا —— اور موسیٰؑ کو اپنے وسیع علم پر فخر تھا —— مگر اس نظر نہ آنے والے کی آواز آئی "تم کس آدم کی بات کرتے ہو، کیونکہ ہر دس ہزار سال بعد کوئی نہ کوئی یہاں آتا ہے اور اس گڑھے میں ایک کنکری پھینکتا ہے جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو وہ بالکل وہی نام اور نسب بیان کرتا ہے جو تم نے کیا ہے اور یہ گڑھا ان کنکریوں سے بھرا چاہتا ہے"۔

۵۷۔ سو ہزار آدم! نوعِ انسانی لاکھ بار صفحۂ ہستی سے محو ہوئی اور پھر وجود میں آئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہم اپنے آدم کی طرف آتے ہیں۔ اسلامی روایات کے مطابق ان پر الہامی کتابوں کا نزول ہوا ہے۔ اور ایک حدیث رسولؐ سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ آدم کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے ہیں۔ اور وہ (رسول اللہ) آخری نبیؐ ہیں۔ سبھی پیغمبروں نے خدا کی وحدانیت کی ازلی صداقت اور حیات بعد ازممات کی تبلیغ کی ہے۔

۵۸۔ ہم حضرت آدمؑ یا ان کے بیٹے حضرت شیثؑ پر نازل ہونے والی کُتب کے مندرجات سے لاعلم ہیں۔ ہم تک جو قدیم ترین ریکارڈ پہنچا ہے وہ حنوک کے بارے میں ہے جنھیں ہم حضرت ادریسؑ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور اسلامی روایات میں انھیں تحریر کا موجد بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ "عہد نامہ جدید" میں یہودہ کے خط کے مطابق:

> "ان کے بارے میں حنوک (ادریس) نے بھی پیشگوئی کی تھی جو آدم کی ساتویں پشت میں تھے۔ انھوں نے کہا "دیکھو خداوند اپنے لاکھوں مقدسوں کے ساتھ آیا ہے تاکہ سب آدمیوں سے انصاف کرے اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کے ان سب کاموں کے باعث جو اُنھوں نے بے دینی سے کیے ہیں، اور ان سب سخت باتوں کے سبب جو بے دین گنہگاروں نے اس کی مخالفت میں کہی ہیں قصوروار ٹھہرائے"۔

مسیحی شارحین کے مطابق اس خط میں کسی آنے والے کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے تاہم حنوک کی باقیماندہ تعلیمات ہم تک نہیں پہنچ پائیں۔

۵۹۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے دَور میں متداول ادیان زرتشت، برہمنیت (ہندومت)، بُدھ مت، صابئیت، یہودیت اور عیسائیت تھے جو دُوسرے مذاہب سے زیادہ اہم اور ملکی عوام کے لیے آسانی سے قابلِ رسائی تھے۔ ان مذہبوں کو آسمانی اور انسانوں کی جاری کردہ اصنام پرستی نیز دہریت سے بہتر تصور کیا جا سکتا تھا۔ مگر ان مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب پیغمبرِ اسلام کے حقیقت پسند ذہن کو کیوں مطمئن نہ کر سکا؟

زرتشتی مذہب

۶۰۔ اُس دَور میں رائج مذاہب میں سے زرتشتی (یا زردشتی) مذہب غالباً قدیم ترین تھا مگر مکہ میں اس مذہب کا پیروکار کوئی نہ تھا تاہم مشرقی اور جنوبی عرب میں بہت سے زرتشتی

(آتش پرست) آباد تھے، جہاں مکہ کے تجارتی قافلے بکثرت آتے جاتے تھے۔ زرتشت کی کتاب "اوستا" جو "زندی" زبان
میں تھی ناپید ہو چکی تھی بلکہ اوستا کی شرح جو بہت بعد میں "پازند" زبان میں لکھی گئی تھی، اور جس کے اوراق جستہ جستہ ہم تک
پہنچے ہیں نہ صرف نظرانداز ہو چکی تھی بلکہ زرتشتوں اور مزدکیوں کے درمیان مذہبی جنگوں میں تباہ ہو چکی تھی۔ ممکن ہے زرتشت
ایک خدا 'اہورا — مزدا' — کی تعلیم دیتا ہو، لیکن عرب اسے ثنویت[1] اور خویدوگداس (تزویج محرمات[2]) کا بانی تصور کرتے ہیں۔
ممکن ہے یہ عقاید اس مذہب کی حقیقی تعلیمات میں شامل نہ ہوں، مگر ساتویں صدی عیسوی کے اوائل تک یہ مذہب اتنا بگڑ چکا تھا
کہ اس نے آگ کی پوجا کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کے پیروکار دو خداؤں یزدان (نیکی کا خدا) اور اہرمن (بدی کا خدا)
پر ایمان رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ان دونوں خداؤں کے درمیان مسلسل جنگ جاری ہے۔

۶۱۔ چنانچہ مذاہب کے بارے میں آنحضورؐ کا رویہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ ان کے دل میں خدا کی تعظیم
اس قدر تھی کہ وہ یہ تصور ہی نہ کر سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ "بدی" پیدا فرما سکتے ہیں۔ مگر ثنویت میں اہرمن کا جو تصور ہے اس کے
مطابق دو خداؤں میں مسلسل جنگ جاری ہے جس میں فتح عموماً یزدان کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خالق کو
بالواسطہ خوش کرنے کے لیے اس کی تخلیق کی تعریف بیان کی جائے۔ آنحضورؐ کے وقت میں آگ سے زیادہ طاقت ور
کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ ہر چیز کو جلانے اور تباہ کرنے پر قادر تھی۔ چنانچہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کا ایک مظہر تصور کیا جا سکتا تھا
ان کے خیال میں آگ کی تعظیم در اصل اس کے خالق کو تعظیم دینے کے مترادف تھی اور یہی تو بت پرستی تھی۔ حتیٰ کہ قدیم سے قدیم
اور کٹر سے کٹر بت پرست کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا بت اس کا خدا ہے بلکہ وہ اسے خدا کی علامت، اس کے
کسی وصف کا اظہار یا مظہر ہی تصور کرتا ہے۔ حقیقی رشتہ داروں کے درمیان شادی کو ہمیشہ ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے
اسلامی روایات کے مطابق حضرت آدمؑ جو اس دنیا کے پہلے انسان تھے، اور جن کی اہلیہ ہمیشہ دو بچوں کو جنم دیتی تھیں، ایک حمل کی
لڑکی کی شادی دوسرے حمل کے لڑکے سے کرتے تھے۔ ایک ہی حمل سے پیدا ہونے والے بہن بھائی کی شادی نہیں کی جاتی تھی۔ اور
بعد کی نسلوں میں عم زاد بہنوں یا دور کی رشتہ دار لڑکیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر جڑواں بہن بھائی کے
درمیان شادی رواج پا جاتی تو نسلِ انسانی پرندوں اور چوپایوں کی نسلوں کی طرح غیر محرک ہو کر رہ جاتی اور توام پیدائش معمول
بن جاتی۔ چنانچہ انسانی ذہن کا ارتقا اور بلندی دور پار کے رشتہ داروں کے درمیان باہمی ازدواج کی مرہونِ منت ہے۔
کچھ بھی ہو، زرتشتوں (مجوسیوں، پارسیوں اور مزدکیوں) کا تزویج محرمات ایک ایسی اختراع تھی جسے قابلِ نفرت تصور
کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے پورے زرتشتی مذہب کی مذمت کی جاتی تھی۔ وہ جس انداز میں جانوروں کو ذبح کرتے تھے
عرب اس سے بھی نفرت کرتے تھے۔

---

[1] وہ عقیدہ جس میں دو مستقل جوہر مانے جاتے ہیں مثلاً اہرمن اور یزدان۔

[2] ایک عقیدہ جس کے مطابق حقیقی بہن، بیٹی اور ماں سے شادی کسی اور سے شادی کی نسبت بہتر اور مفید تصور کی جاتی ہے۔

۶۲ - جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ زرتشت ایک خدا، فرشتوں، اللہ کے منتخب بندہ کے لیے الہام (یا وحی) جنت اور دیگر امور پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کی کتاب اویستا جو "زند" زبان میں تھی کے ایک قول کے مطابق (یشت ۱۳ - VIII xx - ۱۲۹) اس نے ایک بُت شکن کی آمد کی پیشگوئی کی ہے جس کا نام سوشیانت (سب پر رحم کرنے والا) اور استوات اریات (لوگوں کو پستی سے بلندی پر پہنچانے والا) ہوگا۔

برہمنیت (ہندو مت) ۶۳ - قرآن حکیم میں براہِ راست ہندوستانی برہمنیت کا ذکر نہیں آیا۔ اور درحقیقت پیغمبرِ اسلام کے ظہور کے وقت ہندو مت اور اس کے مدِمقابل مذہب بدھ مت کے دوران موت و حیات کی کشمکش جاری تھی۔ پیغمبرِ خدا ہندوستانیوں کو تو ضرور جانتے تھے مگر یہ کہنا محال ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہب کے بارے میں بھی کچھ جانتے تھے۔ قرآن حکیم میں یہودیوں کے طلائی بچھڑے کی جو داستان بیان کی گئی ہے اس کے مطابق اس گوسالہ کا خالق سامری نام کا ایک زرگر تھا (بائبل کا یہ کہنا کہ اس گوسالہ کا خالق حضرت موسیٰؑ کا بھائی ہارون تھا درست نہیں) اس ضمن میں چھوت چھات کا بھی ذکر آتا ہے (قرآن ۲۰/ ۸۵ - ۹۷) یہ دونوں (گاؤ پوجا اور چھوت چھات برہمنیت کے خواص ہیں۔ سامری ان کے سرداروں کا ایک گروہ ہیں اگر گاؤ پوجا ان کی نمایاں خصوصیت ہے تو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے چھوت چھات کا غیر انسانی تصور بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ پھر قرآن پاک زبور الاولین (قدیم لوگوں کی حکایات پر مبنی کتب) کا بھی ذکر کرتا ہے (۲۶/ ۱۹۶) یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ہندو برہمنوں کی متعدد مذہبی کتب ہیں وہ ان سب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ ان میں پُران (جس کے لغوی معنی قدیم کتاب کے ہیں) بھی شامل ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ اور ہندوستانی شہزادے رام کی کہانیوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ ابراہیمؑ کو ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ جب وہ اپنی اہلیہ سارہ کے ساتھ مصر پہنچے تو وہاں کے بادشاہ نے جو ایک بداخلاق ظالم تھا، سارہ کو زبردستی اٹھوا لیا اور اپنے محل لے گیا۔ مگر ایک معجزے کی بدولت سارہ کی عزت بچ گئی اور وہ شاہی تحائف کے ساتھ واپس اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ مصری بادشاہ کی بیٹی حاجرہ بھی تھی جو آگے چل کر حضرت اسمٰعیلؑ کی والدہ بنی۔ انجیل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا اصل نام "ابرام" تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ابراہیم (بابائے قوم) کا خطاب دیا تھا۔ ہندوستانی شہزادہ رام کو بھی اس کے باپ نے ملک سے نکالا تھا۔ جب وہ جنگل میں جلاوطنی کے دن پُورے کر رہا تھا تو سیلون (لنکا) کا بادشاہ (راون) اس کی خوبصورت بیوی سیتا پر عاشق ہوگیا اور اسے زبردستی اغوا کر کے لے گیا۔ سیتا بھی اپنی عزت بچانے میں کامیاب رہی۔ اس نے بعد میں ایک بڑی آگ میں سے صحیح و سلامت گزر کر ثابت کر دیا کہ وہ عفت مآب تھی۔ (ابراہیمؑ بھی آگ سے محفوظ رہے تھے) "پُران" کے علاوہ برہمنوں کی مذہبی کتابوں کے ایک سیٹ کو "وید" کہا جاتا ہے جس کا مصنف (بقول ان کے) برھما (خدا) ہے۔ ابراہیمؑ کی کتابوں کا تو قرآن میں بھی ذکر ہے اور برھما اور ابراہیمؑ کے درمیان نمایاں مشابہت پائی جاتی ہے۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا انجیل میں مذکور قُضاۃ (خداوند کی جنگوں) کی کتاب (تعداد ۲۱/ ۱۴) کو مہابھارت اور گیتا میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے؟

۶۴۔ بہرحال، برہمنیت کے پجاری گو ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں مگر وہ خدا کے مظاہر کی بھی پُوجا کرتے ہیں خواہ وہ اس کی تخلیق ہو یا اُس کی کسی خصوصیت کا اظہار ہو۔ برہمنوں کے مطابق دیوتاؤں کی تعداد چالیس کروڑ ہے ——— دیوتاؤں کی تعداد ان کے پجاریوں سے زاید ہے ——— اور گائے دیوتاؤں کے اس ہجوم کی سردار ہے۔ وہ اگر جانوروں مثلاً ناگ اور ہنومان (بندر) کی پُوجا کرتے ہیں تو وہ درختوں، پتھروں، دریاؤں، (دریاؤں کے) منبع اور سنگم، سورج، چاند اور لاتعداد دُوسری اشیا کے سامنے بھی سر جھکاتے ہیں۔ پھر وہ علم، موت اور دولت وغیرہ کو بتوں کی صورت میں بطور دیوتا پیش کرتے ہیں اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔

۶۵۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ برہمنیت ایک خاندان (برہمن) تک محدود ہے اور کوئی دُوسرا شخص ہندو نہیں ہو سکتا۔ وہی ہندو کہلانے کا حقدار ہے جو ہندو خاندان میں جنم لے۔ اس مذہب کا ایک مخصوص پہلو عقیدۂ تناسخ (اواگون) ہے۔ ایسے شخص کے لیے، جو کسی عالمگیر مذہب کا جویا ہو، ایسا مذہب جو پوری انسانیت کو اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے سکے، ہندومت (برہمنیت) کی طرف رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۶۶۔ دوسرے قدیم مذاہب کی طرح ہندومت بھی کسی آنے والا کا منتظر ہے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی کتاب اتھر۔ وید میں اِس آنے والا کا نام نری شنسا استی وشیاتی یعنی محمود جس کی تعریف و توصیف کی جائے، بتایا گیا ہے۔ اس کی گاڑی کو اُونٹ کھینچیں گے وہ اتنی تیزی سے رواں دواں ہوں گے کہ وہ آسمان کو چھُو رہے ہوں گے، وغیرہ۔ ہندوؤں کی ایک اور کتاب وشنو پُران کے باب ۲۴ میں کہا گیا ہے کہ ویدوں (حقیقی علم کی کتب) کی تعلیمات پس پُشت ڈال دی جائیں گی، قانونی ادارے عضوِ معطل ہو کر رہ جائیں گے اور تاریک دَور کا انجام قریب ہوگا تو خدا کا آخری اوتار ایک جنگجو کی شکل میں آئے گا۔ وہ سنبلہ دِپ (ریت کا جزیرہ) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوگا۔ اس کے باپ کا نام وشنو یاسا (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ ——— جس پر ہر طرح اعتماد کیا جا سکے) ہوگا۔ وغیرہ۔

بُدھ مت

۶۷۔ بدھ مت کا آغاز ہندو برہمنیت کی بُت پرستی کے خلاف بطور احتجاج کیا گیا۔ یہ کوئی مکمل نیا مذہب نہیں تھا بلکہ بُت شکنی کا ایک اصلاحی اقدام تھا۔ چنانچہ اس میں متعدد دیگر مذاہب کی خصوصیات شامل تھیں۔ مثلاً بدھ مت "تناسخ" پر بھی یقین رکھتا ہے۔ بدھ مت خیر خیرات، ترکِ دنیا اور گیان دھیان کی تعلیم دیتا ہے جس کے ذریعے انسان کو از خود حقیقی علم حاصل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ مت کا بانی ریاست کپل وستو کے بادشاہ سدودھن کا بیٹا بدھ شکی مُنی تھا۔ ایک دن اس نے جنازہ جاتے دیکھا۔ وہ اتنا متاثر ہُوا کہ گھر بار اور بال بچّوں کو چھوڑ کر نکل گیا اور رہبانیت اختیار کر لی۔ ایک روز جب وہ بڑ کے ایک درخت کے نیچے گیان میں بیٹھا تھا اسے نروان حاصل ہُوا۔ گو مہاتما بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی مگر اس کے اقوال جو اس کے چیلوں نے جمع کیے، ہم تک پہنچے ہیں۔ وہ خدا کے بارے میں خاموش ہے۔ وہ ترکِ دُنیا اور نفس کُشی کی تلقین کرتا ہے، گو بدھ نے بت شکنی کی تعلیم دی ہے مگر اس مذہب کے ظہور کے وقت موجود بت تراشوں نے خود مہاتما بدھ کے بُت تراشنا شروع کر دیے اور بُدھ مت کے انتہائی مغالطہ پیرو کار اپنے گرد کا

بُت توڑنے اور یُوں اپنے آقا کی بے حُرمتی کی جُرأت نہ کرسکے۔ چنانچہ بُدھ مت بھی دُوسرے بت پرست مذاہب کی طرح بت پرستی کی طرف مائل ہوگیا۔ یُوں خود مہاتما بدھ کے بُت کی پرستش کی جانے لگی۔

۶۸ - یہ مذہب ہندوستان اور چین کے بڑے حصّے میں پھیل گیا اور اس طرح پیغمبرِ اسلام کے ظہور کے وقت اسے ایک بڑے مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔ قرآن حکیم یا حدیث پاک میں اس مذہب کا براہِ راست کوئی تذکرہ نہیں۔ تاہم قرآن پاک کے متعدد قدیم اور جدید مفسرین نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ انجیر کا درخت (جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورہ ۹۵، آیت ایک میں آتا ہے) غالباً بڑکے اس درخت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے نیچے مہاتما بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔ اس کی جائے پیدائش کپل وستو کی وجہ سے غالباً ایک پیغمبر کو ذوالکفل (کفل یعنی کپل سے آنے والا) کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس پیغمبر کے بارے میں، جس کا ذکر قرآن پاک میں دو بار آیا ہے، قرآن یا حدیثِ پاک میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، نہ ہی دیگر اسلامی کتب میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

۶۹ - ایسا مذہب جس میں بُت پرستی شامل ہو اور جو ترکِ دنیا لازم قرار دے، عوام کی توجّہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ کیونکہ ترکِ دُنیا تو مُٹھی بھر افراد کا مقدر ہی ہوسکتی ہے۔

۷۰ - یہ عجیب بات ہے کہ مہاتما بدھ نے بھی کہا ہے کہ اس نے مذہب کو مکمل نہیں کیا بلکہ ایک متریا یا مَیتیا (سب پر رحم کرنے والا) ابھی آنا باقی ہے[1]۔

صابئیت

۷۱ - قرآن پاک میں اس مذہب کا نام تو آیا ہے مگر اس کی کوئی زیادہ تفصیل نہیں دی گئی۔ تاہم سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ صابئیت بعض الہامی کتاب پر مبنی ہے۔ ممکن ہے یہ کتاب حضرت نوحؑ پر نازل ہوئی ہو، جیساکہ دورِ جدید کے صابی دعویٰ کرتے ہیں۔ اب اس کتاب کا تو کوئی وجود نہیں البتہ اس کے مندرجات کا لُبِ لباب روایاتی انداز میں محفوظ ہے اور اس مذہب کے پیروکاروں میں مروّج ہے۔ کہاجاتا ہے کہ صابئیت کے پیروکار ستاروں کی پُوجا کرتے ہیں اور ان کے اثرات پر یقین رکھتے ہیں کبھی سات ممالک میں اس مذہب کے پیروکاروں کے معبد موجود تھے اور ان کے نام سات سیاروں کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ المسعودی کے مطابق صابی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مکہ مکرمہ کا معبد (کعبہ) زحل کے زیرِ اثر ہے جس کے لغوی معنیٰ "دوام" کے ہیں۔

یہودیت

۷۲ - قرآن پاک میں جن قدیم مذاہب کا ذکر آتا ہے، ان میں یہودیت کی سب سے زیادہ تفصیل دی گئی ہے یہودیت حضرت موسیٰ کا دین تھا۔ قرآن یہودیوں کی کتاب تورات کو الہامی تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان اور یہودی دونوں توحید پرست ہیں اور مسئلہ توحید میں ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں۔ مزید برآں قرآن پاک میں متعدد بار، غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا یہودیوں کو دوسری تمام قوموں سے برتر تصور کرتا تھا۔ فطری طور پر اس بات کا تعلق حضرت موسیٰ

---

[1] بُدھ تعلیمات ——— جو مہاتما بُدھ کے اقوال پر مبنی کتاب ہے۔

کے دورِ پیغمبری سے اور اس زمانے سے ہے جب یہودی دین موسوی کی حرف بحرف پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت محمدؐ کے دور میں دنیا بھر میں یہودیوں پر جو ظلم وستم توڑے جا رہے تھے، قرآن حکیم میں ان کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ کے قوانین کی مسلسل خلاف ورزی کی تھی۔

۷۳۔ ایسی قوم سے کوئی نیا رسول صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ اول ان کی الہامی کتاب نبی آخر الزماں کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہے — حضورِ اکرمؐ کے ظہور کے وقت یہودی اس نبی آخر الزماںؐ کے منتظر تھے — اور دوئم ان کی اس الہامی کتاب کا پوری طرح تحفظ نہیں کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ توراۃ پر جو گزری وہ المناک روایت ہے۔ اس مقدس کتاب کو پہلے بنو خد نصر[1] نے پھر انطوشس طیطوس اور دوسروں نے اسے تباہ کیا۔ یوں تورات کا آخری نسخہ تک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال یا اس سے بھی زاید عرصہ بعد محض یادداشت سے تورات کو از سرِ نو مرتب کرنے کی سعی کی گئی۔ جدید مغربی دانشوروں کی تحقیق کے مطابق تورات کا جو متن موجود ہے اس میں ابہام، آمیزش اور متعدد اغلاط اور بے جوڑ باتیں شامل ہیں۔

۷۴۔ جہاں تک حضرت موسیٰ کی طرف سے ایک اور پیغمبر کی بعثت کی پیش گوئی کا تعلق ہے وہ مندرجہ ذیل الفاظ پر مشتمل ہے:

"میں انہی میں سے تمہاری طرح (اے موسیٰ) ایک پیغمبر پیدا کروں گا، اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا، اور وہ ان سے صرف وہ بات کرے گا جس کا میں اسے حکم دوں گا۔ (باب تثنیہ[2] (تورات))

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودیت ایک سچا دین تھا۔ لیکن اب وہ فرسودہ ہو چکا تھا اور اس میں سختی بہت تھی۔ پھر خود یہودی آخری نبی کی بعثت کے منتظر تھے اور اسے برملا تسلیم کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بالکل نئے اور زیادہ نرم احکامات لے کر آنے والا تھا۔

عیسائیت

۷۵۔ حضورِ اکرمؐ نے عیسائیت کو دوسرے ادیان کی نسبت، لعض مستثنیات کے ساتھ رحیم تر پایا۔ قرآن پاک از خود تسلیم کرتا ہے کہ عیسیٰ کلام اللہ تھے، روح اللہ تھے، وہ مسیح تھے، خدا کے رسول تھے — اور جو کسی بھی دوسرے مذہب نے عیسائیوں کے بارے میں تسلیم نہیں کیا — وہ ایک عفت مآب کنواری کے بطن سے پیدا ہوئے گو ان کا کوئی باپ نہ تھا، وہ اللہ کا ایک معجزہ تھے جو اس کی قدرتِ مطلقہ کا اظہار تھا۔ قرآن یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ پر کتاب — انجیل — نازل کی۔ اس کے باوجود عقیدہ تثلیث، حضرت عیسیٰؑ کو "خدا کا بیٹا" قرار دینا اور مریم پوجا (عیسائیوں کا ایک فرقہ حضرت مریم کے بت کی پوجا کرتا ہے) کے باعث آنحضرت محمد صلعم کو اس مذہب میں بت پرستی نظر آئی۔ قرآن حکیم نے اس بات پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کو

---

[1] بعض تاریخی کتب اور حوالوں کی کتابوں میں اسے بخت نصر بھی کہا گیا ہے۔ (مترجم)

[2] انجیل کے عہد نامہ قدیم میں اسے باب "استثنا" کہا گیا ہے۔

خداوند (۱ ارباب [1]) قرار دے دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کلیسا، کلیسا کی لاتعداد کونسلوں اور ارکانِ کونسل کی تاریخ کو مدِ نظر رکھا جائے تو اس (قرآن پاک کی) سرزنش سے مفر ممکن نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے غیر مبہم اور پُر زور الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ (متی - ۵/۱۷) وہ تورات اور دیگر انبیاء کی کتب کی تنسیخ کے لیے نہیں آئے (جن کا ذکر انجیل میں موجود ہے) بلکہ وہ ان پر عمل کرانے آئے ہیں۔ اور جو کوئی بھی ان احکام سے رُوگردانی کرے گا، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں سے گر جائے گا۔ اس کے برعکس سینٹ پال نے نہ صرف اس کی تعلیم دی کہ "عیسیٰ تورات کو منسوخ کرنے والے ہیں" (رومیوں کے نام خط ۱۰/۴) بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تصدیق کی کہ:

"کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضروری باتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں۔ کہ تم بتوں کی قربانیوں سے، اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے خود کو بچائے رکھو گے تو سلامت رہو گے۔" (رسولوں کے اعمال ۱۵/۲۸)

یوں لحمِ خنزیر اور شراب کو تو حلال قرار دے دیا گیا، مگر یومِ سبت اور ختنہ کی رسم منسوخ قرار پائی۔ تورات کے تمام نسخے بھی پسِ پشت ڈال دیے گئے۔ یہ سب بُرائیاں حضرت مسیح کے حواریوں کی زندگی میں ہی مسیحیت میں راہ پا گئیں۔ بعد میں عقیدۂ تثلیث کو جنم دیا گیا۔ مسیح کو خدا کا بیٹا اور اسی مادہ کی تخلیق قرار دے دیا گیا جس سے بقول ان کے مسیح کا "باپ" عبارت ہے۔ صلیب کو مذہب اور عقیدہ کا ایک حصّہ قرار دے دیا گیا۔ مسیح اور مریم کی شبیہ اور مُورتیاں پورے مذہبی جوش و خروش سے تیار کی گئیں اور انھیں رواج دیا گیا۔

۶۔ ۷۔ یہ باور کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ حضور سرورِ کائناتؐ کے ذہن میں حضرت عیسیٰ کا تصوّر "خاندانِ اسرائیل کی گمشدہ بھیڑ" تک محدود ہو گیا تھا۔ (متی کی انجیل ۱۰/۶، قرآن ۳/۴۸-۹) یا ایسے شخص کا تصوّر تھا جو کہتا تھا "بچوں کی روٹی کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔" (متی - ۱۵ - ۲۴ - ۶) مگر محمد (صلعم) تو کسی ایسی چیز کے متمنی تھے جس میں گم ہوں افلاک وہ "رحمت برائے دو عالم" کے قائل تھے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ پر جو وحی نازل فرمائی تھی، حضرت عیسیٰ اسے ضبطِ تحریر میں لانا نہیں چاہتے تھے یا وہ اپنے پیروکاروں کو اسے ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم نہ دے سکے تاکہ اسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا جا سکے۔ چنانچہ انجیل کے بعض حصص حضرت عیسیٰ کے بعض حواریوں کی یادداشت میں محفوظ رہے۔ جب ان حواریوں، ان کے جانشینوں یا پیروکاروں نے بعد میں اپنی اپنی یادداشتیں قلمبند کیں یا اپنے رسول کی سوانح ترتیب دی تو انھوں نے اسے ہی انجیل کا نام دے دیا۔ گو ستر انجیلوں کا سراغ ملتا ہے مگر کلیسا نے ان میں سے صرف چار کو شرفِ قبولیت بخشا ہے جبکہ باقی سب کو وضعی قرار دے دیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر ان لاتعداد سوانح میں تضاد بھی موجود ہے۔ انجیل کا آرامی

---

[1] سورہ توبہ۔ آیت ۳۱۔

زبان میں نسخہ جو انجیل کی اصل زبان ہے، ناپید ہو گیا۔ اب اس کا صرف یونانی ترجمہ رہ گیا جو مروج ہے۔

۷۸۔ انجیل کے عہد نامہ جدید میں حضرت مسیح کی جو سوانح شامل ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ کی تقریروں کے بعض اقتباسات دیے گئے ہیں۔ گو ان کی تبلیغ کا دور تین سال سے زاید نہیں، وہ جانتے بھی تھے کہ ان کا انجام قریب ہے، اور انھوں نے اگرچہ مغموم مگر غیر مبہم انداز میں کسی آنے والے کی پیشگوئی کی جو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا جو ان سے ادھورا رہ گیا ہے:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمھارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا...... مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ — روحِ حق — آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے تو کچھ نہ کہے گا۔ لیکن (اللہ کی طرف سے) جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا۔ اور وُہ تمھیں مستقبل کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لیے کہ وہ جو کچھ مجھ سے سنے گا وہی تمھیں بتائے گا۔ (یوحنا - ۱۶/۷-۱۴)

۷۹۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں کی کتب کے مطابق خدا کا آخری اوتار ایک جنگ جُو کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس کی وجوہ حضرت عیسیٰ نے ایک مثال میں بیان کی ہیں (متی ۲۱/۳۳-۱۴، مرقس ۱۲/۱-۹، لوقا ۲۰/۹-۱۶) اور ہم ذیل میں سینٹ مرقس کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

"پھر وہ ان سے تمثیلوں سے باتیں کرنے لگا کہ ایک شخص نے تاکستان (انگوروں کا باغ) لگایا اور اس کے چاروں طرف باڑ بھی لگا دی۔ انگوروں کے عرق کے لیے حوض بنایا۔ ایک بُرج تعمیر کیا۔ اسے ٹھیکے پر باغبانوں کے سپرد کیا۔ اور خود کسی دور دراز ملک میں چلا گیا۔ پھل کا جب موسم آیا تو اس نے اپنے ایک ملازم کو تاکستان کے ٹھیکیدار کے پاس بھیجا تاکہ پھل میں سے اس کا حصہ وصول لائے۔ مگر انھوں نے اسے پکڑ کر خوب پیٹا اور اُسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ پھر اس نے ایک اور ملازم کو (اسی مقصد کے لیے) بھیجا۔ مگر انھوں نے اس پر سنگ باری کرکے اس کا سر پھوڑ دیا۔ اور اسے بے عزت کرکے بھگا دیا۔ پھر اس نے ایک اَور کو بھیجا تو انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ اس نے مزید کئی ملازم بھیجے، انھوں نے بعض کو پیٹا اور بعض کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب ایک باقی تھا جو اس کا پیارا بیٹا تھا۔ بالآخر اس نے یہ کہتے ہوئے اسے بھی بھیج دیا کہ وہ میرے بیٹے کا تو پاس کریں گے۔ مگر ان باغبانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہی تو اصل وارث ہے آؤ اس کا بھی کام تمام کر دیں تو یہ میراث ہماری ہو جائے گی۔ پس انھوں نے اسے قابو کر لیا اور اس کا کام تمام کر ڈالا، اور اس کی لاش تاکستان سے باہر پھینک دی۔ اب تاکستان کا مالک کیا کرے گا؟ وُہ آئے گا باغبانوں کو تباہ و برباد کر دے گا اور تاکستان دوسروں کے حوالے کر دے گا۔"

تاکستان کا مالک کائنات کا مالک ہے۔ اس نے جو ملازم یکے بعد دیگرے ارسال کیے وہ اس کے فرستادہ

رسول ہیں۔ بیٹا مسیح ہے۔ اور حملہ آور فوج کا سالارِ اعلیٰ " رسول حرب " ہے۔

۸۰ ۔ حضور اکرمؐ کے زمانے میں متداول ادیان کا یہ مختصر سا خاکہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی حضورؐ کو اطمینانِ قلب سے ہمکنار نہیں کر سکتا تھا۔ خوب تر کی تلاش اور جستجو ان میں بڑھتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں رسول اللہؐ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا جس نے بالآخر اسلام کی عظیم عمارت کو پائیہ تکمیل تک پہنچایا۔

۸۱ ۔ مگر آئیے حالات و واقعات کو خود اپنی کہانی سنانے کا موقع دیتے ہیں۔

باب ۴

پیغام اور اس کے متعلقات

۸۲۔ جب محمدؐ رسول اللہ پر دوسری بار وحی کا نزول ہُوا، جس میں انھیں یقین دلایا گیا کہ خدائے واحد نے انھیں فراموش نہیں کیا ——— بلکہ اس کے برعکس یہ اللہ تعالیٰ ہی تو تھا جس نے حضورؐ کی اس وقت رہنمائی فرمائی جب وہ خود اس کی محبت میں ازخود رفتہ تھے ——— اور انھیں حکم دیا گیا کہ" اور تیرے پروردگار نے (تمھیں) جو نعمتیں عطا کی ہیں ان کا ذکر کر" (قرآن ۹۳/۱۱) تو آنحضورؐ اپنا تمام غم بھول گئے، ان کے شبہات محو ہو گئے۔ انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کے پیغام (کی تبلیغ) پر مرکوز کر دی۔ اور دل و جان سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ (اللہ تعالیٰ کا) یہ پیغام بتدریج ایک مکمل نظریہ حیات کے قالب میں ڈھل گیا تاہم اس کے بنیادی نکات میں کوئی تبدیلی نہ آئی: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔

۸۳۔ مختصراً اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا قانون ساز ہے اور محمدؐ تمام دنیا خصوصاً بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی ترسیل کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں۔ اللہ صرف ایک ہے، اسی نے ہمیں بنایا ہے، وہی ہماری پرورش کرتا ہے۔ اسی کے حکم سے موت آتی ہے اور وہی ہماری دُنیاوی زندگی کا حساب لے گا اور پھر جیسے بھی وُہ چاہے گا سزا یا جزا دے گا۔ انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ چنانچہ اسے زندگی کے تمام شعبوں میں، خواہ یہ مسلک کا معاملہ ہو یا عقیدہ کا، معاشرتی رویہ ہو یا کچھ اور، اپنے خالق و مالک کے احکام کی پابندی کرنی چاہیے۔ اگر اس کے برعکس ہو تو اللہ تعالیٰ مختارِ کل ہے، وہ ہمیں موت کے بعد جِلا نے اور پھر سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

۸۴۔ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان دو ایسے محور ہیں جن پر دینِ محمدی قائم ہے۔ خدا ہر حالت میں اور ہر جگہ موجود ہے، وہ غیر مرئی ہے اور انسانی ادراک اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہمیں اس کا پیغام پہنچانے اور اس کی مرضی سے آگاہ کرنے کے لیے کسی ایلچی یا رسول کا تقرر ناگزیر تھا۔ پیغمبر کی بعثت ناگزیر ضرورت بن گئی۔ اُس کے احکام سے عمداً روگردانی کی روک تھام کے لیے سزا و جزا بھی ضروری تھی۔ اس ضمن میں بعض باتیں ناگزیر ہیں:

پیغمبر پر ایمان

۸۵۔ ہر مواحد کسی بحث یا تامل کے بغیر اس بات پر متفق ہے کہ ہمیں اپنے خالق کے احکام پر بلا چوُن و چرا عمل کرنا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ تو غیر مرئی ہے اور انسانی ادراک سے ماورئ، چنانچہ اس کی مرضی یا حکم کس طرح معلوم کیا جائے؟ سبھی اتفاق کرتے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ خود اپنے احکام ہم پر واضح نہ کر دے۔ انسان کے لیے خود ان احکام سے آگاہی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ عملی طور پر تمام مذاہب کا بھی اس امر پر اتفاق ہے،

کہ دوسرے تمام حیوانات کے لیے ان کی جبلّت کافی ہے مگر حیوان ناطق (انسان) محض جبلت کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ مشینی انداز میں عمل نہیں کرتا بلکہ وُہ اپنی عقل و دانش کی روشنی میں استدلال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف امور پر مختلف انسانوں کا ردِّ عمل جدا جدا ہوتا ہے۔ انسان قوتِ استدلال سے مالامال ہونے کے باعث اُسی بات پر اتفاق کرتا ہے جس کا وہ قائل ہو جائے ——— خواہ وہ از خود قائل ہو یا کوئی دُوسرا انسان اسے دلیل سے قائل کر لے ——— وُہ اگر انتہائی سنگین تعصب کا شکار نہ ہو تو وہ استدلال کے بعد اپنے فیصلے بھی بدل لیتا ہے۔ دوستوں پر اعتماد کی بدولت وہ اپنے خیر اندیش رفقا کی رائے کو اولیت بھی دیتا ہے، بچّہ (ابتدا میں) ماں کی ہر بات پر عمل کرتا ہے پھر وہ والد کے احکام کو اولیت دیتا ہے اور بوجوہ اُس کی اطاعت کا مرکز تبدیل ہو جاتا ہے۔ باپ کے بعد وہ اپنے استاد، استاد کے بعد حکمران اور روحانی پیشوا کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کے اِس رویّہ کے پس منظر میں "سزا و جزا" کا تصور ہی کارفرما ہوتا ہے۔ جب ماں کسی نافرمان بچے کو سدھارنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو والد سامنے آتا ہے، پھر سکول کا استاد اور رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ملک کے حکمران سے جا ملتا ہے جسے زندگی یا موت پر اختیار حاصل ہوتا ہے۔ مگر یہ سزا و جزا محض دنیاوی درجہ رکھتی ہے اور دنیاوی اعمال کا احاطہ کرتی ہے۔ روحانی رہبر اس کی رُوح کو تقدس سے ہمکنار کرتا ہے اور اس ضمن میں سب سے بڑا محرک اللہ تعالیٰ کا خوف ہے جو حیات بعد از ممات پر قادر ہے اور بندے کو دوبارہ زندگی دے کر نافرمانی کی سزا دے سکتا ہے۔ سب سے بڑا روحانی رہبر خود اللہ کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔

۸۶۔ اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کے نزول اور دوسروں تک ترسیل کے لیے روحانی اعتبار سے بلند ترین شخصیت کا انتخاب کرتا ہے۔ تاہم خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان تعلقات کی مختلف انداز میں تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ بعض مذاہب مثلاً زرتشتیت، برہمنیت وغیرہ منتخب شخصیت (پیغمبر) کو خدا کی تجسیم قرار دیتے ہیں؛ یعنی خدا اُس انسان میں حلول کیے ہوتا ہے۔ برہمن ہندو اسے اوتار کا نام دیتے ہیں جو اوپر سے نازل ہوتا ہے اور خدا اس کے وجود میں سمویا ہوتا ہے۔ عیسائیوں کے بعض فرقے مثلاً توحید پرست اسے صرف خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ خدا کے یہ اوتار (جو انسانی روپ میں خدا متصور ہوتے ہیں) بھی دوسرے انسانوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، وہ کھاتے پیتے ہیں اور سوتے جاگتے ہیں، وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں اور دیگر فانی انسانوں کی طرح بالآخر موت ہی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ لیکن اوقات وہ شہید کر دیے جاتے ہیں۔ "خدا" اتنا لاچار مجبور ہو اور عام انسانوں کی طرح فنا کے گھاٹ اُتر جائے، عقلِ سلیم اسے تسلیم نہیں کرتی۔ مگر یہ ممکن ہے کہ کوئی سالک راہِ خدا میں اپنی ذات کی نفی کر دے، پھر اللہ کا فضل اس کے شامل حال ہو اور وہ فنا فی اللہ ہو جائے لیکن خدا کے نبی کے رتبہ پر فائز ہونا اس سے کہیں عظیم تر مقام ہے اور یہ مقام کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر ولی فنا فی اللہ تو ہو سکتا ہے مگر ہر فنا فی اللہ کے رسول کا اعزاز حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دُوسرے مذاہب میں اس منتخب شخصیت کو "نبی" کہا جاتا ہے۔

۸۷۔ "نبی" کے بارے میں اسلامی اور یہودی نظریات میں بڑا بُعد ہے۔

۸۸۔ انجیل کے عہد نامہ قدیم کے مختلف حصّوں میں لفظ "نبی" کا استعمال ایسے بے ہنگم انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری پریشان ہوجاتا ہے۔ مثلاً: خدانے شاہ ابی ملک کو خواب میں بتایا کہ "ابراہیمؑ نبی" ہے اس کی بیوی واپس کر دو، وہ تیرے لیے (نیک) دعا کرے گا۔" (پیدائش ۲۰/۷) "خداوند نے موسٰی سے کہا: دیکھو میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا "نبی" ہوگا۔ (خروج ۷/۱)" اور موسٰی نے قوم کے بزرگوں میں سے ستر شخص اکٹھے کرکے ان کو خیمہ کے گرد کھڑا کر دیا۔ تب خداوند ابر میں ہوکر اترا اور اس نے موسٰی سے باتیں کیں اور اس روح میں سے جو اس میں تھی، کچھ لے کر اسے ان ستر بزرگوں میں ڈالا۔ چنانچہ جب روح ان میں آئی تو وہ "نبوت" کرنے لگے۔ لیکن بعد میں کبھی نہ کی۔ مگر ان میں سے دو شخص لشکر گاہ میں رہ گئے ایک کا نام اِلداد اور دوسرے کا میداد تھا..... اور لشکر گاہ میں ہی "نبوت" فرمانے لگے..... اور یشوع نے کہا اے میرے مالک موسٰی اُن کو روک۔ موسٰی نے اسے کہا کیا تجھے میری خاطر رشک آتا ہے۔ کاش! خداوند کے سب لوگ "نبی" ہوتے اور خداوند اپنی رُوح ان سب میں ڈالتا (گنتی ۱۱/۲۴-۲۹) اور موسٰی نے اسرائیلیوں کو بتایا: اور خدانے مجھ سے کہا:...... میں انہی میں سے تمھاری طرح ایک "نبی" پیدا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا (باب استثنا ۱۸/۱۷-۱۸)"...... اور اس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی "نبی" موسٰی کی مانند پیدا نہیں ہُوا" (باب استثنا ۳۴/۱۰)" اور سب بنی اسرائیل نے جان لیا کہ سموئیل خدا کا "نبی" مقرر ہوا ہے"۔ (۱۔سموئیل ۳/۲۰)"..... کیونکہ جس کو اب نبی کہتے ہیں اس کو پہلے غیب بین کہتے تھے"۔ (۱۔سموئیل ۹/۹) ایک غیر ملکی حملہ کے دوران نبی سموئیل نے ایک شخص ساؤل ابن قیس کو بطور بادشاہ منتخب کرلیا اور اسے کسی جگہ جانے کا حکم دیا..... "اور بعد اس کے تو خدا کے پہاڑ کو پہنچے گا جہاں فلستیوں کی چوکی ہے۔ اور جب تو شہر میں داخل ہوگا تو "نبیوں" کی ایک جماعت جو اونچے مقام سے اتری ہوگی، تجھے ملے گی اور ان کے آگے ستار اور دف اور بانسلی (بانسری) اور بربط ہوں گے اور وہ سب "نبوت" کرتے ہوں گے۔ تب خداوند کی رُوح تجھ پر زور سے نازل ہوگی اور تو ان کے ساتھ نبوت کرنے لگے گا، اور بدل کر اور ہی آدمی ہوجائے گا (۱۔سموئیل ۱۰/۵-۶، ۱۰-۱۱)"...... اور داؤد بھاگا اور اس رات بچ گیا۔ اور ساؤل نے داؤد کے گھر پر قاصد بھیجے کہ اس کی تاک میں رہیں اور صبح کو اسے مار ڈالیں.... اور داؤد رامہ میں سموئیل کے پاس آیا اور ساؤل کو خبر ملی کہ داؤد رامہ میں ہے اور ساؤل نے داؤد کو پکڑنے کو قاصد بھیجے اور انھوں نے جو دیکھا کہ "نبیوں" کا مجمع نبوت کر رہا ہے اور سموئیل ان کا پیشوا بنا کھڑا ہے تو خدا کی روح ساؤل کے قاصدوں پر نازل ہُوئی اور وہ بھی "نبوت کرنے لگے۔ اور جب ساؤل تک یہ خبر پہنچی تو اس نے اور قاصد بھیجے اور وہ بھی "نبوت" کرنے لگے اور ساؤل نے پھر تیسری بار اور قاصد بھیجے اور وہ بھی "نبوت" کرنے لگے۔ تب وہ آپ رامہ کو چلا..... اور خدا کی روح اس پر بھی نازل ہوئی اور وہ چلتے چلتے نبوت کرتا ہوا رامہ کے (علاقہ) نیوت میں پہنچا اور اس نے بھی اپنے کپڑے اتارے اور وہ بھی اسی طرح) سموئیل کے آگے "نبوت" کرنے لگا اور اس سارے دن اور ساری رات ننگا پڑا رہا۔ اس لیے یہ کہاوت چلی: "کیا ساؤل بھی "نبیوں" میں سے ہے"۔ (۱۔سموئیل ۱۹/۱۰-۲۴) ایک بوڑھے نبی نے خدا کے احکام سے سرتابی کی اور اسے شیر نے ہلاک کر دیا۔ (۱۔سلاطین ۱۳/۱۱-۲۴)

بت پرست بادشاہ اخی اب نبی ایلیاہ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور اس کی تلاش میں تھا۔ ایلیاہ اتفاقاً شاہی محل کے نگران سے ملا اور اسے کہا کہ وہ ایلیاہ کے بارے میں شاہ کو اطلاع دے دے۔ شاہی محل کا نگران ایک خدا ترس شخص تھا، اور وہ ایسا کرنے میں متامل تھا، اس نے کہا: "کیا میرے مالک کو جو کچھ میں نے کیا ہے نہیں بتایا گیا کہ جب ایزبل نے خداوند کے "نبیوں" کو قتل کیا تو میں نے خداوند کے نبیوں میں سے سو آدمیوں کو لے کر پچاس پچاس کر کے ان کو ایک غار میں چھپایا اور ان کو روٹی اور پانی سے پالتا رہا۔ (ایلیاہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے بادشاہ آجاتا ہے اور ایلیاہ اسے حکم دیتا ہے)..... اس لیے اب تو قاصد بھیج اور سارے اسرائیل کو اور بعل کے ساڑھے چار سو "نبیوں" کو اور یسیرت کے چار سو نبیوں کو جو ایزبل کے دستر خوان پر کھاتے ہیں، کوہ کرمل پر اکٹھا کر۔ (۱۔سلاطین ۱۸/۱۳-۱۹)

"پھر داؤد اور لشکر کے سرداروں نے آصف اور ہیمان اور یدوتون کے بیٹوں میں سے بعضوں کو خدمت کے لیے الگ کیا تا کہ وہ بربط اور ستار اور جھانجھ سے نبوت کریں (۱۔ تواریخ ۲۵/۱) "کاہن" اور "نبی" بھی نشہ میں چور اور مے میں غرق ہیں۔ وہ رویا میں خطا کرتے ہیں اور وہ عدالت میں لغزش کھاتے ہیں۔" (یسعیاہ ۲۸/۷)"........ اور نبیوں نے بعل کے نام سے نبوت کی اور ان چیزوں کی پیروی کی جن سے کچھ فائدہ نہیں"۔ (یرمیاہ ۲/۸)"..... نبی جھوٹی نبوت کرتے ہیں اور کاہن ان کے وسیلہ سے حکمرانی کرتے ہیں۔ اور میرے لوگ ایسی حالت کو پسند کرتے ہیں۔ اب تم اس کے آخر میں کیا کرو گے؟" (یرمیاہ ۵/۳۱) نبی یرمیاہ کہتا ہے: "تب خداوند نے مجھے فرمایا کہ "انبیا" میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں۔ میں نے نہ ان کو بھیجا اور نہ حکم دیا اور نہ ان سے کلام کیا۔ وہ جھوٹی رویا اور جھوٹا علم غیب بیان کرتے ہیں......"

(یرمیاہ ۱۴/۱۴) "اور ایک نبی کے وسیلہ سے خداوند اسرائیل کو مصر سے نکال لایا اور نبی ہی کے وسیلہ سے وہ محفوظ رہا۔" ہوسیع ۱۲/۱۳) نبی عاموس نے کہا: "..... میں نہ نبی ہوں نہ نبی کا بیٹا بلکہ چرواہا اور گولر کا پھل بٹورنے (اتارنے) والا ہوں۔ (عاموس ۷/۱۴)" اور اے لڑکے (یوحنا کی طرف اشارہ ہے) تو خدا تعالیٰ کا نبی کہلائے گا۔" (لوقا ۱/۷۶)

"..... یسوع ناصری کا ماجرا جو ایک نبی تھا[1]" (لوقا ۲۴/۱۹)۔

۸۹۔ انجیل کے مطالعے کے بعد یہ تعین کرنا محال ہو جاتا ہے کہ در اصل "نبی" کسے کہتے ہیں۔ اور قاری کچھ سمجھنے کے بجائے بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ انجیل کے مطابق ابراہیم، موسیٰ، یوحنا اصطباغی اور عیسیٰ مسیح نبی ہیں تو وہ بھی "نبی" ہیں جو جھوٹ بولتے ہیں ("جھوٹی نبوت کرتے ہیں") اور وہ بھی "نبی" ہیں جو اپنی زبان سے تصدیق کرتے ہیں کہ "میں نبی نہیں ہوں"۔

---

[1] انجیل کی مختلف آیات میں لفظ "نبی" اور "نبوت" کو جس بے ہنگم انداز میں استعمال کیا گیا ہے فاضل مصنف نے اس کی وضاحت کے لیے انجیل کے مختلف حصوں کے جزو پیش کیے ہیں ان کا اردو ترجمہ بائبل سوسائٹی کی "انجیل مقدس" سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

۹۰۔ قرآن حکیم کے مطابق نبی اپنے وقت کا سب سے متقی شخص اور اللہ کا سب سے زیادہ فرمانبردار بندہ ہوتا ہے۔ اسے نزول وحی یا القا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا پیغام موصول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ان پیغامات کو بسا اوقات یکجا کر کے ایک قانونی ضابطہ کی شکل دے دی جاتی ہے۔ نبی کے ذریعے بعض اوقات سابقہ الہامی کتاب منسوخ کر دی جاتی ہے اور اس کی جگہ نئی کتاب لے لیتی ہے۔ مگر بعض حالتوں میں نبی اپنے پیش رو پر نازل ہونے والی کتاب کی ہی پیروی کرتا ہے۔ فطری طور پر صاحبِ کتاب نبی دوسرے نبی سے افضل تر ہوتا ہے تاہم خدا کے پیغامبر کی حیثیت میں تمام نبیوں کا مرتبہ مساوی ہے۔ قرآن پاک میں "نبی" کے لیے مختلف متبادل الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں نبی (پیغمبر) رسول (قاصد) مرسل (ایلچی) بشیر اور مُبشّر (بشارت دینے والا) نذیر اور مُنذر (ڈرانے والا) اور ہادی (رہنما) شامل ہیں۔ قرآن پاک میں نبی کے لیے دیے گئے کسی بھی خطاب کو حضرت آدمؑ سے حضور اکرمؐ تک ہر نبی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۹۱۔ قرآن حکیم اور حدیث پاک دونوں حضرت محمد رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی قرار دیتے ہیں۔

آخرت پر ایمان

۹۲۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حشر اور یومِ قیامت پر ایمان انسان کے لیے نیکی کرنے اور بُرائی سے اجتناب کی ترغیب کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ دنیا میں ایسے فرشتہ صفت انسان بھی موجود ہیں جو اپنا فرض پُوری دیانت داری سے ادا کرتے ہیں اور اس کے لیے انھیں کسی وعدے یا وعید کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر ان کی تعداد نہایت محدود ہے۔ ایسے شیطان کے بھائی بھی ہیں جو تمام تر نگرانی اور سختی کے باوجود معاشرہ میں خلل ڈالتے ہیں اور اصول و قواعد کو تہس نہس کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بھی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ بنی نوع انسان میں غالب ترین اکثریت ایسے افراد کی ہے جن کی معمولی سی بھی نگرانی کی جائے تو وہ ناک کی سیدھ میں چلتے ہیں۔ کسی انعام کا وعدہ یا سزا کی وعید بھی ان کے رویہ پر کسی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ نسلِ انسانی کی یہی وہ غالب اکثریت ہے جن کے لیے تمام مذاہب اور تمام اصول و قوانین وجود میں آئے ہیں۔ بلاشبہ مادی سزا کا تصور مفید ثابت ہوتا ہے، مگر برائی کی ترغیب، خصوصاً ایسی صورت میں جب انسان یہ سمجھے کہ اس کا پردہ فاش نہیں ہوگا، یا وہ اتنا طاقت ور ہو کہ اسے دنیا کی کسی عدالت سے سزا کا خوف نہ ہو (مثلاً کسی ملک کا حکمران) زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے۔ حشر کے بعد یوم قیامت اور حساب کتاب کا تصور دُنیا کے طاقتور ترین حکمران کے لیے بھی سدِّ راہ بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شخص از خود نماز ادا کرتا ہے جبکہ اسے کوئی حکم دینے والا بھی نہیں ہوتا یا کوئی شخص وزارت خزانہ کی طرف سے غلطی کے باوجود پورا ٹیکس ادا کر دیتا ہے۔ اسلام دونوں طرح کی تحذیر عمل میں لاتا ہے۔ سزا دینے والے بھی موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسان کے دل میں یہ خوف بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ اسے یوم قیامت کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ظاہر ہے جسمانی اور روحانی سزا و جزا کی دوہری تحذیر محض روحانی یا محض مادی سزا و جزا کی نسبت زیادہ موثر ثابت ہوگی۔ یہ کہنے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ روحانی تحذیر پر ایمان مادی سزا کے تصور سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے، اور جب

جسمانی طور پر نگرانی ممکن ہی نہ ہو تو روحانی تحذیر ہی انسان کو برائی سے روکنے کا واحد ذریعہ رہ جاتی ہے، خصوصاً کسی نبی کے ابتدائی دور میں جب اسے ارشاد و تبلیغ کے نازک کام میں پوری آبادی کے نظریات اور تخیلات کی مخالفت کرنا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ قرآن پاک کی ابتدائی سورہ حیات بعد الممات، یوم حساب اور یوم حشر کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں۔

صلوٰۃ ۹۳۔ رواج کسی حکم پر عمل درآمد کے لیے بہترین مبلغ ثابت ہوتا ہے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ جبرائیل نے رسول اکرمؐ کو سب سے پہلے وضو اور نماز سکھائی۔ چنانچہ پیغمبرِ خدا لوگوں سے پوچھ سکتے تھے کہ "تم دن اور رات کے چوبیس گھنٹے اپنی ذات کے لیے کام یا آرام میں صرف کرتے ہو، مگر اپنے خدا اور مالک کی بندگی اور اس کے حضور میں حاضری کے لیے کتنا وقت دیتے ہو؟" انھوں نے قوم سے کسی فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرنے سے قبل ذاتی مثال پیش کی۔ ہر مذہب حتیٰ کہ بت پرستی میں بھی عبادت کا ایک طریق کار ہوتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اسلام کا طریقِ عبادت کیا ہے۔

۹۴۔ پیغمبرِ اسلام نے وضو کو نصف ایمان قرار دیا ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ اسلام بنی نوع انسان کی دنیاوی زندگی اور حیات بعداز ممات میں بہبود کا خواہاں ہے۔ چنانچہ اس مذہب کو اپنے پیروکاروں کے لیے ایسے احکام صادر کرنے چاہئیں جو ان کی جسمانی اور روحانی صحت کے لیے مفید ہوں۔ بظاہر دنیاوی احکام میں بھی اُخری بہتری کا پہلو ہونا چاہیے اور کوئی بظاہر دینی کام دنیاوی فائدے سے یکسر عاری نہیں ہونا چاہیے۔ وضو کا مقصد انسان کے جسم اور لباس کی طہارت ہے جس کی طبّی اور معاشرتی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کی علامتی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ وضو میں انسان پہلے جسم کے پوشیدہ حصّوں کی طہارت کرتا ہے، پھر ہاتھ دھوتا ہے، کُلی کرتا ہے، ناک صاف کرتا ہے، چہرہ دھوتا ہے اور پھر بازو، سر، کان اور آخر میں پاؤں دھوتا ہے۔ ہمارے یہ تمام اعضا کسی گناہ یا جرم کے ارتکاب کا ذریعہ بنتے ہیں: جماع، تحریر و تقریر، سُونگھنا، اپنے چہرے (موجودگی) سے کسی پر ناجائز دباؤ ڈالنا، زدوکوب کرنا، سوچ وبچار، سماعت اور غیر قانونی آمد و رفت ——— یہ وہ بڑے بڑے فعل ہیں جن کا ہم اپنے ان اعضاء کے ذریعے ارتکاب کرتے ہیں۔ ان اعضا کو دھونے کا مطلب ماضی کے سہو پر معذرت اور اللہ کے فضل و کرم سے مستقبل میں ایسے سہو کے ارتکاب سے بچنے کا عزم ہے۔ اگر یہ "معذرت" اور پھر "عزم" نصف ایمان ہے تو باقی نصف اس عزم پر استقامت اور ماضی کے سہو سے پہنچنے والے نقصان کی ممکن حد تک تلافی ہے۔

۹۵۔ بُدھ مت میں عبادت مراقبہ میں کھڑے رہنا ہے۔ یہودی تورات کی تلاوت کرتے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، ہم اندھے ہیں اور دیکھ نہیں سکتے تاہم اس تک رسائی کے خواہاں ہیں۔ اندھے کی تو محض الفاظ کے ذریعے ہی رہنمائی کی جاسکتی ہے چنانچہ اللہ کے کلام کی پیروی ہمیں صاحبِ کلام تک پہنچا سکتی ہے۔ دورِ جدید کی ایک تشبیہ کے مطابق خدا ماورائی ہستی ہے اس کے الفاظ آواز اور زبان کی قید سے آزاد ہیں۔ اگر ہم کلام اللہ کو موجودہ دور میں بجلی کی رَو تصور کرلیں جو غیر مرئی اور بے رنگ بھی ہے لیکن وہ بلب کو روشن کرتی ہے اور ویسا ہی

رنگ اختیار کر لیتی ہے جس رنگ کا بلب رَو سے منسلک ہو۔ بلب خدا کے نبی ہیں اور اللہ کا کلام ان کے رنگ (نبی کی زبان) میں نازل ہوتا ہے۔ اگر کوئی بجلی کی رَو کے راستے سفر کرے تو وہ یقیناً جنریٹر تک پہنچ جائے گا جہاں سے یہ رَو پھوٹتی ہے۔

تقلید پسند اور کیتھولک عیسائیوں نے کلام اللہ کی تلاوت کا یہودی طریقہ اپنا لیا ہے اور اس پر "ہم مشربی" کا اضافہ کیا ہے: وہ عبادت کے وقت معمولی خوراک اور شراب نوشی کرتے ہیں۔ یہ رسم حضرت عیسیٰ کے آخری عشائیہ کی یاد میں ادا کی جاتی ہے جس سے عیسائیوں کا مطلب مسیح کی شخصیت سے اشتراک یعنی ان میں سمو جانا ہے (اور ان کے ہاں مسیح سے مراد خدا ہے)۔

۹۶ ۔ قرآن حکیم بھی تصدیق کرتا ہے (۱۷/۴۴)؛ کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد و ثنا نہ کرتی ہو، ستارے کوہ وجبل، اشجار، جانور (۲۲/۱۸) پرندے جو قطاروں میں پرواز کرتے ہیں (۲۴/۴۱) رعد بھی (۱۳/۱۳) گھٹتے بڑھتے سائے (۱۶/۴۸) اور پانی (۸/۱۱) جس سے طہارت (وضو) کی جاتی ہے، ہر چیز (اس کی ثنا کرنے والوں میں) شامل ہے۔ اس کائنات میں موجود اشیا کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: جمادات، حیوانات اور نباتات۔ مسلمانوں کی نماز پہاڑوں کی طرح استقامت سے ایستادہ رہنے (جمادات) جانوروں کی طرح رکوع میں جھکنے (حیوانات) اور نباتات کی طرح، جن کے منہ ان کی جڑیں ہوتی ہیں، سجدہ ریزی پر مشتمل ہے۔ نماز میں بآوازِ بلند اللہ کی تکبیر کا اقرار کیا جاتا ہے (اللہ اکبر) مختلف رکعتوں میں ایک ہی عمل ستاروں کی گردش کی مانند دُہرایا جاتا ہے۔ مختلف رکعتیں سائے کی طرح بڑھتی اور گھٹتی ہیں۔ و علیٰ ہذا القیاس۔ نماز میں قرآن پاک (کلام اللہ) کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یوں مسلمان دورانِ نماز اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے وہ اپنے خالق کے اتنا قریب ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے (التحیات میں تشہد اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے مترادف ہے) جس طرح رسول اللہ ؐ نے معراج کی شب میں اللہ سے کلام کیا تھا۔ مسلمانوں کی نماز کائنات میں موجود ہر چیز کی عبادتوں کا حسین امتزاج ہے اور یوں تمام مذاہب کے طریقِ عبادت کو اسلام کے خصوصی طریق کار میں سمو دیا گیا ہے۔

۹۷ ۔ دوسرے مذہبی فرائض روزہ وغیرہ کا ذکر بعد میں آئے گا۔ شروع شروع میں روزانہ صبح اور سہ پہر کی صرف دو نمازیں تھیں۔ تہجد پیغمبر ادا کرتے تھے مگر یہ دوسروں پر واجب نہ تھی۔

باب ۴

تبلیغِ اسلام اور اس کے نتائج

۹۸۔ تبلیغِ اسلام کا عظیم کام خود رسول اللہ کے گھر سے شروع ہوا۔ ان کی اہلیہ، بچے، گھریلو ملازم اور لے پالک بیٹے (زید اور علی) آسانی سے نئے دین کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ ہرگز دروغ گوئی نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی بے لوث خدمت ان کا شعار تھا۔ اس کے بعد تبلیغ کا دائرہ رسولِ خدا کے دوستوں تک وسیع کیا گیا۔ خصوصاً حضرت ابوبکرؓ کو دعوتِ اسلام دی گئی جس کے بعد وہ اسلام کے پرجوش مبلغ بن گئے۔ ان کی کوششوں سے مکہ میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی دولت ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے میں صرف کی جو اسلام قبول کر چکے تھے اور بت پرستی ترک کرنے پر ان کے آقا انھیں جبر و تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کے بعد پیغمبرِ اسلام کے اعزہ اور اہلِ قبیلہ کو اسلام کی دعوت دینے کا مرحلہ آیا۔ حضورِ اکرمؐ کے لیے یہ سب سے مشکل کام تھا۔ ان لوگوں کا قبولِ اسلام کفار کی اس طعنہ زنی کے مسکت جواب کے لیے ضروری تھا کہ "لو اس کے تو رشتہ داروں نے جو اسے نہایت قریب سے جانتے ہیں، اس کی دعوت پر لبیک نہیں کہی"۔ نوجوانوں کے برعکس ——— جو ہمیشہ انقلاب پسند رہے ہیں ——— معمر افراد قدامت پرست ہوتے ہیں اور انھیں نئے نظریے کا قائل کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ رسول پاکؐ کے قبیلہ کے سردار ابو طالب جو ان کے حقیقی چچا بھی تھے، حضورؐ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ مگر ان کے لیے اپنے سے چھوٹے، اپنے بھتیجے کی دعوت پر باپ دادا کا مذہب ترک کرنا آسان نہ تھا۔ یہ ان کی انا کے منافی تھا۔ ان کے بعد قبیلہ میں ابُولہب کا مرتبہ تھا، وہ بھی آنحضورؐ کا چچا تھا۔ ذاتی وجوہ کی بنا پر وہ نبی کریمؐ کا سب سے بڑا دشمن بن چکا تھا۔ ابو طالب نے تو صرف آنحضورؐ کی دعوتِ اسلام قبول کرنے سے ہی احتراز کیا تھا مگر ابو لہب نے اپنے تمام وسائل رسولِ خدا کی دشمنی اور مخالفت کے لیے وقف کر دیے۔ اگر رسولِ خدا اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے اجتماع میں اپنی دعوت پیش کرتے تو ابو لہب طنزیہ گفتگو اور توہین آمیز رویہ سے کام خراب کر دیتا۔ اگر رسول اللہ قبیلہ سے باہر ارشاد و ہدایت کے لیے کام کرتے تو ابُولہب ہمیشہ موجود ہوتا اور سخت بیہودگی کا مظاہرہ کرتا۔

۹۹۔ یہ سوچ کر کہ میرے رشتہ داروں کے تعصبات اور پس و پیش ایک روز ختم ہو جائے گی، رسولِ خداؐ نے شہر کے دوسرے لوگوں پر توجہ مرکوز کر دی۔ ان کی دعوت پختہ عمر کے افراد کی نسبت نوجوانوں میں تیزی سے مقبول ہونا شروع ہوئی۔

۱۰۰۔ اس سے غیر متوقع مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے؛ معمر افراد کی دعوتِ اسلام سے بے اعتنائی اس وقت فعال دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ جب ان کے اپنے نوعمر بچوں اور دوسرے نوجوان رشتہ داروں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جب معزز اور شریف خاندانوں کے نوجوانوں مثلاً فراس ابن النضر، ابُوحذیفہ ابن عُتبہ، ہشام ابن العاص، الولید

ابن الولید وغیرہ پُرجوش طریقہ سے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تو ان کے والدین نے اسے اپنی توہین تصور کیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے بیٹوں پر ظلم و تشدد روا رکھا بلکہ رسولِ خدا کے متبرک کام میں کھلے بندوں رخنہ اندازی کرنے لگے۔ اسلام قبول کرنے والے غلاموں، مردوں اور خواتین کی حالت فطری طور پر سب سے زیادہ قابلِ رحم تھی۔ اپنے بچوں کی طرح ان پر تو کوئی رحم کھانے کو تیار نہ تھا۔ رسولِ خدا کی طرف سے یہ تصدیق کہ بُت پرست جہنم کا ایندھن بنیں گے، ان لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھی۔ لیکن جب یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان (بت پرستوں) کے آباؤ اجداد بھی جہنم میں جائیں گے تو وہ نئے دین کی حمایت کیسے کر سکتے تھے۔ مگر (رسولِ خدا کے) اس اعلان پر اشتعال و دشمنی محض بچگانہ حرکت تھی: کیا اس طرح رسولِ خدا خود اپنے اسلاف کی بھی مذمت نہیں کر رہے تھے؟

۱۰۱۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی نبوت کا شہرہ مکے سے نکل کر اردگرد کے علاقوں میں دُور دور تک پھیل گیا۔ رسولِ خدا ایامِ حج میں، جب عرب کے ہر حصہ سے قافلے حج کے لیے مکہ مکرمہ آتے تھے، خوب تبلیغ کرتے۔ اور شہر میں لوگوں کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے۔ چنانچہ بہت سے نئے لوگ جذبۂ تجسس کے تحت بھی رسولِ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے:

۱۰۲۔ ابُوذر جو کبھی راہزن تھا۔ ایک روز اس نے ایک قافلے پر حملہ کیا۔ جب حملہ کی شکار خواتین اور معصوم بچوں کی آہ و بکا اس کے کانوں میں پڑی تو اس کا ضمیر جاگ اُٹھا۔ وُہ اپنے کردار پر سخت نادم تھا۔ انھی دنوں اسے اتفاق سے معلوم ہوا کہ مکہ میں بلند اخلاقی کی ایک تحریک چلائی جا رہی ہے۔ وہ وادیِ بدر سے طویل فاصلہ طے کر کے مکہ پہنچا اور اسلام قبول کر لیا۔ پھر پیغمبرِ اسلام کے ایما پر وہ واپس اپنے علاقہ میں پہنچ کر اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہو گیا۔

۱۰۳۔ یمن کا ایک باشندہ اسلام کے خلاف کفارِ مکہ کے پراپیگنڈہ سے اس قدر متاثر اور خوفزدہ ہُوا کہ وہ جب مکہ آیا تو اس نے اپنے کانوں میں کپڑے کی کترنیں ٹھونس لیں تاکہ وُہ پیغمبرِ اسلام کی جادُو اثر تقریر نہ سُن سکے۔ مگر جلد ہی اسے اپنے اس منفی اور احمقانہ رویہ کا احساس ہو گیا، اس نے خود کو لعنت ملامت کی۔ وُہ اپنے آپ سے بولا: اس (پیغمبر) کی بات سُن لینے میں حرج ہی کیا ہے؟ میں اتنا باشعور تو ہُوں کہ اس کی باتوں کا خود تجزیہ کر سکوں۔ اور پھر اسلام کے سیدھے سادے اور معقول اصولوں نے اسے اس قدر متاثر کیا کہ اس نے اسلام کو گلے لگا لیا۔ اسی طرح حبشہ سے مکہ آنے والے بعض افراد نے بھی جو غالباً تاجر تھے، اسلام قبول کر لیا۔

۱۰۴۔ حضور اکرمؐ کے نوجوان چچا امیر حمزہؓ کا قصہ ذرا مختلف ہے: ایک روز وہ صحرا میں سیر و شکار کی مہم سے واپس آئے تو ان کی خادمہ نے انھیں بتایا کہ اُس روز ابُوجہل نے ان کے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔ حمزہؓ نے ابوجہل کے اقدام کو اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی سے تعبیر کیا۔ وُہ سیدھے ابوجہل کی طرف گئے، شکار سے واپسی کے وقت کمان ان کے ہاتھ میں تھی، انھوں نے ایک لفظ کہے بغیر اسی کمان سے ابوجہل کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ ابوجہل سخت زخمی ہو گیا۔ حمزہؓ نے اسے پیٹتے ہوئے کہا: تمھاری زیادتیوں اور ناانصافیوں کو دیکھ کر میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

۱۰۵۔ حضرت عمرؓ (خلیفہ دوم) کا قبول اسلام اپنی نوعیت کا ایک اور منفرد واقعہ ہے۔ اس وقت وُہ تیس کی

عمر کو پہنچنے والے تھے، وُہ اپنی پسند و ناپسند میں نہایت کٹر تھے۔ یہ جانے بغیر کہ اسلام کیا ہے اور اس کا کیا مطلب ہے، وہ مسلمانوں کو سزا دینے میں پیش پیش تھے خواہ وہ ان کے خاندان کے افراد ہوں یا کوئی اجنبی۔ ایک روز انھوں نے یہ عزم کیا کہ وُہ رسول اللہؐ کو قتل کر دیں گے تاکہ اس نئی مصیبت کو بیخ و بُن سے اکھاڑا جا سکے۔ انھوں نے ہتھیار سنبھالے اور رسولِ خداؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں ان کا ایک عزیز انھیں ملا۔ عمر نے اسے اپنے عزم سے آگاہ کیا۔ ان کا یہ عزیز خفیہ طور پر حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکا تھا۔ وُہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ عمر کے ساتھ حجت ناممکن ہے۔ اور وہ اپنے عزم پر ضرور عمل کریں گے۔ اس نے کہا: عمر! محمدؐ کے قبیلہ کے ساتھ جنگ مول لینے سے قبل اپنے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس غیر متوقع اطلاع سے عمر غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور سب کچھ بھول کر سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے پر پہنچ کر اُنھوں نے اندر سے قرآن حکیم کی تلاوت کی آواز سُنی یہ انھیں ملنے والی اطلاع کا بیّن ثبوت تھا۔ انھوں نے اس غضب ناک انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا کہ اندر بیٹھے ہوئے لوگ خوف زدہ ہو گئے؛ قرآن پڑھانے والے کو جلدی سے چھپا دیا گیا اور عمر کے بہنوئی نے دروازہ کھولا۔ "یہ تم کیا تلاوت کر رہے تھے؟" انھوں نے غصہ میں پُوچھا۔ "کچھ بھی تو نہیں، ہم تو بات چیت میں مصروف تھے" جواب ملا۔ عمر کا غصہ شدید تر ہو گیا اور اُنھوں نے اپنے بہنوئی کو ضرب لگائی۔ ان کی بہن شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھی اور خود بھی لہولہان ہو گئی۔ اتفاق سے اسے بھی ضرب آگئی تھی، عمرؓ اشرافِ مکہ میں سے تھے اور وہ کسی خاتون خصوصاً اپنی پیاری بہن پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ انھیں اس کا شدید رنج تھا۔ اس وقت بہن نے عمر پر ایک جذباتی ضرب لگائی۔ "ہاں ہم اسلام قبول کر چکے ہیں تم جو چاہو کر لو" وہ زخمی شیرنی کی مانند دھاڑی۔ عمر کا غصہ کافور ہو گیا۔ وُہ عاجزی سے بولے: "مہربانی کر کے مجھے وُہ دکھاؤ جس کی تم لوگ تلاوت کر رہے تھے۔" ان کی بہن ابھی غصے میں تھی، وہ بولی: "تم کافر ہو، پلید ہو اور تم اس حالت میں متبرک اوراق کو نہیں چھُو سکتے۔" "میں اب تمھارے دین کا دشمن نہیں" عمر بولے "مجھے بتاؤ کہ ان اوراق کو کیسے چھُوا جا سکتا ہے؟" اس پر بہن نے تڑسے جواب دیا: "جاؤ پہلے غسل کر کے اپنے جسم کو پاک کرو۔" عمر نے اپنی بہن کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ وُہ سب کچھ بھول گئے جواب تک ہوا تھا۔ جب وہ غسل خانے سے نکلے تو ان کی بہن نے انھیں قرآن حکیم کے چند پارے دیے۔ عمر نے قرآن حکیم کے ان اوراق کا مطالعہ کیا۔ وہ قرآن کے پیغام سے اتنے متاثر ہوئے کہ بول اٹھے: "اسلام قبول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟" اس موقع پر قرآن کا معلّم جو گھر کے اندر ہی چھپا ہُوا تھا نکل آیا اور بولا: "دو ایک روز قبل رسولِ خدا نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی تھی یا اللہ! ابُوجہل یا عمر کو دائرۂ اسلام میں داخل کر کے میری مدد فرما۔ مجھے یقین ہے اے عمر! تم رسولِ خداؐ کی اسی دعا کی برکت سے اسلام کی نعمت سے نوازے جا رہے ہو، میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں اپنے نبیؐ کے پاس لے چلتا ہُوں۔" (اس وقت حضور اکرمؐ ایک صحابی ارقم کے گھر میں چھُپے ہوئے تھے جو ایک پرجوش مگر خاموش نومسلم تھے) جب لوگوں نے (ارقم کے گھر کے دروازے پر) عمرؓ کی آواز سُنی تو وہ سخت خوف زدہ ہوئے مگر رسولِ خداؐ نے فرمایا: "ڈرو مت، وہ اکیلا ہے اور تم خاصی تعداد میں ہو۔" جب عمرؓ اندر آئے تو حضور اکرمؐ نے ان سے پرجوش مصافحہ کیا اور فرمایا: "عمر! تم کب تک غلط راہوں پر چلتے رہو گے؟"

اس کے جواب میں عمرؓ نے بآوازِ بلند مسلمان ہونے کا اقرار کیا۔ یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ موقع پر موجود مسلمانوں نے بے اختیار نعرۂ تکبیر بلند کیا اللّٰہُ اکبر (اللہ عظیم ترین ہے) آس پاس کے گھروں میں لوگ حیران ہوگئے کہ ارقم کے خاموش سے گھر میں کیا ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، "کافر تو کھلے بندوں بت پرستی کرتے ہیں ہم کیوں چھپ کر اس اللہ کی عبادت کریں۔" چنانچہ مسلمان ایک جلوس کی صورت میں کعبۃ اللہ میں گئے جس کی قیادت حضرت عمرؓ کر رہے تھے۔ انھوں نے کعبے کے صحن میں سرِعام نماز ادا کی۔ حضرت عمرؓ کی نماز میں شمولیت کسی بھی قسم کے ناگوار ردِّ عمل کو روکنے کے لیے کافی تھی۔ نماز کے بعد مسلمان خاموشی سے لوٹ آئے۔

۱۰۶۔ کافروں کے خاندانوں کے نوجوان اور غلام ہی نہیں ان کے متعلقین (زیردست) اور ان کے لے پالک بھائی (موالی) تک ان کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ عمار ابن یاسر کو جو مینی الاصل تھے اور ابوجہل کے قبیلہ مخزوم کے زیردست تھے، اتنی اذیت اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ وہ خود کو اس اذیت سے بچانے کے لیے کچھ بھی کہنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ ایک روز وہ رسولِ خدا کے پاس آئے اور بتایا کہ اسلام سے لاتعلقی اور کفر کا اقرار کرانے کے لیے ان پر کس طرح تشدد کیا جاتا ہے۔ نبیِ خداؐ نے کہا "کوئی بات نہیں، جب تک تم دل سے مسلمان ہو زبان سے ایسا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔" پانخ (دعرف سمیہ) جو عمار کی معمر والدہ تھیں اپنے بیٹے پر تشدد برداشت نہیں کرسکتی تھیں، ایک مرتبہ انھوں نے ابوجہل کو بُرا بھلا کہا اور اس کی بے عزتی کردی۔ ابوجہل غصے میں آگیا اور اس نے اپنا نیزہ بوڑھی خاتون کے پیٹ میں گھونپ کر انھیں قتل کر دیا۔ عمار کی والدہ کے نام پانخ سے جسے جدید ترکی میں پاموک کہا جاتا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترکی نژاد تھیں۔ وہ اسلام کی پہلی خاتون شہید ہیں۔ ان کا تعلق کسگرت تھا (جو ایران کے خطر زندورو کا ایک علاقہ ہے)

۱۰۷۔ رسولِ خدا کی ذات بھی کافروں کی طرف سے اذیت کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔ ان کے دروازے پر کانٹے اور کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ ان کی گلی میں خصوصاً اس وقت کانٹے بچھا دیے جاتے تھے جب حضورِ اکرمؐ رات کو دیر سے گھر لوٹتے تھے اور گلیوں میں روشنی نہیں ہوتی تھی۔ جب آں حضورؐ کعبہ میں نماز ادا فرماتے اور سجدے میں ہوتے تو شرپسند کافر ان کے سر یا پیٹھ پر بھاری پتھر یا قربان کیے جانے والے جانوروں کی اوجھڑی رکھ دیتے تھے۔ وعلیٰ ہذالقیاس

۱۰۸۔ انسانی فطرت ایک سربستہ راز ہے اور (مختلف امور پر) افراد کا ردِّ عمل یکساں نہیں ہوتا۔ رُکانہ مکّہ کا ایک پیشہ ور پہلوان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اتنا شہ زور تھا کہ اگر وہ کسی جانور کی کھال پر کھڑا ہو جاتا اور بہت سے افراد اس کھال کو کھینچتے تو کھال پھٹ جاتی مگر رُکانہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایک روز وہ رسولِ خدا کے پاس گیا اور بولا "اگر تم مجھے پچھاڑ لو، میں تمھیں اللہ کا نبی مان لوں گا۔" بعض روایات کے مطابق اس نے اس کشتی پر اپنی بھیڑوں کے غلہ کا ایک تہائی بطور شرط پیش کرنے کا بھی اعلان کیا۔ مقابلہ ہوا اور اسے شکست ہوگئی مگر اسے اطمینان نہ ہوا اور اس نے دوبارہ مقابلہ کی استدعا کی۔ جب رسول پاکؐ نے اسے متواتر تین بار پچھاڑ دیا تو اس نے رونا شروع کر دیا، اور بولا: "میں

اپنی تمام بھیڑوں کے شرط میں ہار جانے کے متعلق اپنی بیوی سے کیا کہوں گا!" رسولِ خدا نے اپنی عالی ظرفی کے باعث اس کی تمام بھیڑیں واپس کر دیں۔ مگر رسولؐ اسلام کی مہربانی پر خوشگوار ردِ عمل کے بجائے وہ پھر بھاگ کر کافروں کے ٹولہ میں پہنچ گیا۔ اور ان سے بولا، "محمدؐ کو نقصان نہ پہنچاؤ، اسے محفوظ رکھو، اگر تمھیں کبھی کسی بیرونی قبیلہ سے مقابلہ درپیش ہو تو تم کہہ سکتے ہو کہ تمھارے پاس ایک ایسا جادوگر ہے جس پر کوئی قابو نہیں پا سکتا۔ خدا کی قسم! محمدؐ محیّر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے، وہ اس دَور کا عظیم ترین جادوگر ہے۔"

۱۰۹ - ابوجہل تو اور ہی طرح کے احساس میں مبتلا تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا: میں جانتا ہوں محمدؐ جو کچھ کہتے ہیں، درست ہے۔ مگر قبل ازیں اُن کا قبیلہ خیرات وغیرہ کرتا تھا تو ہم بھی اسی طرح کرتے تھے۔ جب وہ پُر تکلف دعوتوں کا اہتمام کرتے تو ہم بھی جواب میں شاندار دعوت کر دیتے غرضیکہ ان کا قبیلہ شان و شوکت کے اظہار کے لیے جو بھی عمل کرتا ہم اس کے جواب میں پورے اُترتے، اب محمدؐ کا قبیلہ فخر سے کہتا ہے کہ "اللہ نے ہمارے ہاں نبی مبعوث فرمایا ہے"۔ بھلا ہم اپنے قبیلہ میں نبی کہاں سے لائیں۔ نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا کہ محمدؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔

۱۱۰ - مکہ میں نیک دل اشراف کی بھی کمی نہ تھی۔ جب کبھی آوارہ لڑکے (بڑوں کے ایما پر) گلیوں میں آنحضورؐ کا تعاقب کرتے، ان پر پتھر وغیرہ پھینکتے اس وقت اگر رسولِ خدا ابوسفیان کے گھر کے قریب ہوتے تو حضورؐ اس گھر میں پناہ حاصل کر سکتے تھے ابوسفیان خود آوارہ چھوکروں کو ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ جب یہ آوارہ منش لڑکے بھاگ جاتے تو حضورِ اکرم اپنی راہ لیتے۔ ایک روز بزدل اور کمینے ابوجہل نے رسولِ خدا کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو جو چھوٹی سی تھیں، دیکھا۔ اس نے حضرت فاطمہؓ سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ اس ملعون کو کوسے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس پر ابوجہل نے حضرت فاطمہؓ کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا اور وہ رونے لگیں۔ ابوسفیان اُدھر سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے بچی سے رونے کا سبب پوچھا۔ جب حضرت فاطمہؓ نے انھیں ماجرا بتایا تو ابوسفیان نے بچی کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ سیدھے ابوجہل کے پاس گئے اور اس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے، پھر انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ وہ ابوجہل کے منہ پر تھپڑ ماریں اور اپنا بدلہ چکائیں۔ سیدہؓ نے ابوجہل کو تھپڑ لگایا اور مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ فطری بات ہے کہ جب رسولؐ اللہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ ابوسفیان کے لیے اظہارِ تشکر کیے بغیر نہ رہ سکے۔

۱۱۱ - مکہ کا معاشرتی ڈھانچہ ایسا تھا کہ لوگ قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ گو داخلی اور خارجہ امور میں مکہ کے تمام قبائل ایک وفاق کی طرح اجتماعی طور پر عمل کرتے تھے مگر داخلی معاملات میں ہر قبیلہ مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھا۔ ہر قبیلہ کے اندر زبردست اتحاد اور ہم آہنگی تھی۔ وہ سب دُکھ سُکھ میں ایک دُوسرے کے ساجھی تھے، گویا "ایک سب کے لیے اور سب ایک کے لیے" کا اصول ان میں کارفرما تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر کسی ایک قبیلے کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ آسانی سے کسی دُوسرے قبیلے کے کسی فرد کو نقصان پہنچا سکے۔ رسولِ خدا کا قبیلہ بڑا طاقتور تھا۔ نہ صرف یہ کہ بنو ہاشم تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ ان کا عم زاد قبیلہ بنو المطلب کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی تھا۔ بنو ہاشم کا ایک اور طاقتور قبیلہ بنو خزاعہ سے بھی قریبی اتحاد تھا۔ پھر ان کے مدنی رشتہ دار جن کا تعلق بنو نجار سے تھا ہر وقت رسولِ خدا کے خاندان کی

امداد کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضورؐ کے مخالفین اس وقت تک رسولِ خداؐ سے دشمنی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جب تک بنو ہاشم کے سردار جناب ابُوطالب رسول اللہؐ کے پشت پناہ تھے۔ ابوطالب نے چونکہ اسلام قبول نہیں کیا تھا، لہٰذا کفارِ مکہ کو توقع تھی کہ وُہ ایک دن اپنے بھتیجے کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ کفارِ مکہ کا ایک وفد ابوطالب کے پاس آیا اور ان سے کہا: "آپ کا بھتیجا محمدؐ شہر میں غیر ضروری طور پر کشیدگی پھیلا رہا ہے۔ اس نے خاندانوں میں پھُوٹ ڈال دی ہے اور دوستوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اگر وہ اس طرح روپیہ پیسہ چاہتا ہے تو ہم اسے مطلوبہ رقم ادا کرنے کو تیار ہیں۔ اگر وُہ شادی کا خواہشمند ہے تو ہم شہر کی حسین ترین دوشیزہ اس کے عقد میں دے دیتے ہیں۔ اگر وہ اقتدار چاہتا ہے تو ہم اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں، مگر صرف ایک شرط پر کہ وہ ہمارے معبودوں (بتوں) کو بُرا بھلا کہنے اور ہمارے اسلاف کے مذہب کی توہین کا سلسلہ بند کر دے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر سمجھ لو کہ تم اپنے قبیلہ کے خلاف پُورے مکہ کے لوگوں کی متحدہ دشمنی کو دعوت دے رہے ہو۔" جناب ابوطالب نے اس معاملہ پر غور کا وعدہ کر لیا۔ پھر انھوں نے رسول اللہؐ کو پُوری صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مکہ کے لوگوں کی پیشکش مسترد کرنے سے قبل دوبارہ غور کر لیں۔ لیکن نبی خداؐ نے فوراً جواب دیا: "اگر وُہ (مکی کفار) میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند رکھ دیں تو بھی میں اسلام کی دعوت میں ایک ذرہ برابر تبدیلی کرنے کو بھی تیار نہیں جس کا حکم مجھے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اللہ عظیم ترین ہے۔ وُہ میری ہر طرح حفاظت کرے گا۔" حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ سسکیاں بھرتے ہوئے اپنے چچا سے رخصت ہو گئے مگر جناب ابوطالب نے انھیں آواز دے کر واپس بُلایا اور انھیں بتایا کہ وُہ کبھی اپنے بھتیجے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

۱۱۲۔ کفار کا ایک اور وفد آیا اور مصالحت کی تجویز پیش کی۔ "ہم محمدؐ کے خدا کی عبادت کے لیے تیار ہیں"۔ انھوں نے کہا "مگر محمدؐ کو بھی ہمارے معبودوں کی عبادت کرنا ہو گی۔ اس طرح ان دونوں میں سے جو بھی سچا ہو گا وہ ہمیں فائدہ پہنچائے گا۔ اور اس طرح دوہری بندگی سے ہم میں سے کسی کو کچھ نقصان بھی نہ ہو گا۔" اس پر رسولِ خداؐ نے قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات پڑھتے ہوئے کفار کی تجویز کو حقارت سے ٹھکرا دیا:

"کہہ دو اے کافرو!
نہ میں تمھارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں
اور نہ ہی تم میرے معبود کی عبادت کرتے ہو
اور نہ میں تمھارے معبودوں کی عبادت کروں گا
اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے
تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین" (۱۰۹/ ۱-۶)

۱۱۳۔ کفارِ مکہ اس پر اور بھی مشتعل ہو گئے اور انھوں نے اسلام کے نام لیواؤں پر مظالم کا سلسلہ تیز تر کر دیا۔ رسولِ خداؐ نے جب دیکھا کہ وُہ اپنے پیروکاروں کو جن کا تعلق دوسرے قبائل سے ہے تحفظ نہیں دے سکتے تو انھوں نے

ان لوگوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کو کہا۔ رسولِ خدا نے انھیں بتایا کہ "حبشہ کا بادشاہ انصاف پسند ہے۔ اس کی قلمرو میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔" ممکن ہے نبی کریمؐ کو شاہِ حبشہ کے بارے میں کسی تجارتی سفر کے دوران یہ باتیں معلوم ہوئی ہوں۔ حضورؐ شام، فلسطین، اومان (عُمان) اور یمن کا سفر کر چکے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آنحضرت کسی تجارتی سفر کے دوران یمن سے باب المندب عبور کر کے حبشہ بھی گئے ہوں۔ پیغمبرِ خدا کے ایک خط میں جس کا ذکر علامہ طبری نے کیا ہے، لکھا گیا ہے: "میں نے اپنے عم زاد جعفر کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کے ساتھ چند اور مسلمان بھی ہیں، اگر وہ آپ کے پاس آئے تو اس سے حُسنِ سلوک کریں۔ اس پر ظلم نہ کریں۔" یہ ایک تعارفی خط معلوم ہوتا ہے جو رسولِ خداؐ نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابوطالب کو اس وقت دیا تھا جب وہ ہجرت کر کے شاہِ نجاشی کے دربار میں گیا تھا۔ جب حبشہ میں ہجرت کر کے جانے والے مسلمانوں سے حُسنِ سلوک روا رکھا گیا تو مکہ سے مزید مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ اس سے کفارِ مکہ کے غیظ و غضب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

۱۱۴۔ مکہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ رُونما ہُوا جس سے غلط فہمی نے جنم لیا۔ ایک روز رسولِ خدا نماز کے دوران قرآن حکیم کی بعض آیات (۵۳/ ۱۹-۲۰) باآوازِ بلند تلاوت فرما رہے تھے۔ ان آیات میں مکہ میں پُوجے جانے والے دو بڑے بتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے "کیا تم لات اور عُزّٰی کو دیکھتے ہو۔۔۔۔" اس کے بعد بعض لوگوں نے سُنا "وہ عظیم معبود ہیں اور وُہ اپنے پُوجنے والوں کی شفاعت کر سکتے ہیں۔" بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ الفاظ شیطان نے کہے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے رسولِ خدا نے یہ الفاظ سوالیہ انداز میں کہے ہوں (درحقیقت قرآن پاک میں متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن کا آغاز تو سوالیہ الفاظ سے نہیں ہوتا مگر ان میں سوال پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ۴۔ ۹، ۷۔ ۱۱۵۔ تاہم اوپر جن الفاظ کا ذکر ہے وہ قرآن حکیم میں موجود نہیں ہیں) پھر رسولِ خدا رکوع میں جھکے اور بعد ازاں سجدہ میں چلے گئے۔ جو لوگ رسولِ خدا سے دور کعبہ کے صحن میں نماز ادا کر رہے تھے اُنھوں نے حضور پاکؐ کی قرأت براہِ راست نہیں سُنی تھی بلکہ ایک مکّی مکبّر کی آواز ان تک پہنچی تھی جس نے حضورؐ کی زبان مبارک سے ادا ہونے الفاظ کو غلطی سے "مُثبت" سمجھا اور بتوں کی "کبریائی اور شفاعت" پر مشتمل الفاظ کو باآوازِ بلند دُہرا دیا۔ پھر رسولِ خدا کی اقتدا میں رکوع اور پھر سجدہ میں چلا گیا۔ جب یہ بات پھیلی اور رسولِ خدا کو بھی اس کا علم ہُوا تو انھوں نے بتوں کی تعریف کی تردید کی۔ گو غلط فہمی تو دُور ہو گئی مگر اس کے بعد کفارِ مکہ کے غیظ و غضب کی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ اُنھوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ایک وفد ترتیب دیا جو شاہِ نجاشی سے ملا۔ کفار کے وفد نے شاہ کے درباریوں کو رشوت دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا اور مطالبہ کیا کہ اسلام کے پیروکاروں کو حبشہ سے نکال باہر کیا جائے۔ شاہِ نجاشی نے مہاجرین کو بھی طلب کیا اور ان کا موقف سنا اس نے کفارِ مکہ کی سازش کی بُو سُونگھ لی اور ان کا غیر منصفانہ مطالبہ یکسر مسترد کر دیا۔

۱۱۵ء حبشہ کے مشن میں ناکامی کے بعد کفارِ مکہ نے جناب ابوطالب پر دباؤ بڑھانا شروع کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کا ساتھ چھوڑ دیں۔ ایک وفد ان سے ملا جس نے کہا "محمدؐ آپ کا حقیقی بیٹا تو نہیں محض لے پالک ہو سکتا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ ہم اس (محمدؐ) کے عوض آپ کو مکّہ کا خوب صورت اور ذہین ترین نوجوان پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے اپنا

بیٹا بنالیں۔" اس پر ابوطالب نے انھیں طنز و حقارت سے لبریز جواب دیا: "میں تو اپنا بیٹا تمھارے حوالے کر دوں تاکہ تم اس کی گردن مارسکو، لیکن تمھارے بیٹے کو پالنے پوسنے کے لیے اپنے پاس رکھ لوں، یہ کہاں کا انصاف ہے،"

۱۱۶ - اب کفارِ مکہ نے مشاورت کی اور جنگ کا خطرہ مول لیے بغیر ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ مکہ کے تمام اسلام دشمن قبائل ان کے قریبی علاقہ کے اتحادیوں خصوصاً احابیش[1] نے رسولِ خدا کے خاندان کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا "کوئی شخص رسولؐ اللہ کے خاندان کے کسی فرد سے بات چیت نہیں کرے گا، نہ ان کے ہاتھ کوئی شے فروخت کرے گا نہ ان سے خریدے گا اور نہ ہی ان کو اپنی لڑکی کا رشتہ دے گا نہ ان کا رشتہ قبول کرے گا۔" چنانچہ حضور اکرمؐ کا قبیلہ مکہ سے نکل کر ایک الگ تھلگ نواحی علاقہ میں چلا گیا جہاں بچّوں اور خواتین پر کفارِ مکہ کی تیراندازی یا سنگ باری کی آسانی سے مدافعت کی جاسکتی تھی۔ ابولہب جس کی قسمت میں ہدایت نہیں لکھی تھی اپنے قبیلہ سے جُدا ہوگیا اور اس نے کفارِ مکہ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ وہ مکہ میں ہی رہا (جہاں غالباً اس کی معمولی سی دکان تھی) حضورؐ کے خاندان کے بائیکاٹ کا فیصلہ باقاعدہ ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور تحریری معاہدہ کعبہ کی ایک دیوار پر لٹکا دیا گیا۔ یہ بائیکاٹ مسلسل کئی سال جاری رہا اور اس دوران فدایانِ رسول کو ناقابلِ برداشت مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس دوران رسولِ خدا کے قبیلہ میں بیاہی جانے والی خواتین مثلاً حضرت خدیجۃ الکبریٰ وغیرہ کے عزیز و اقارب چوری چھپے اناج وغیرہ محصورین کو بھجواتے تھے۔ ایامِ حج میں یہ لوگ بیرونِ مکہ سے آنے والے تاجروں سے ضرورت کی اشیا خرید سکتے تھے۔ مگر ان کے آمدنی کے تمام وسائل ختم ہوچکے تھے، ان کی تجارت تباہ ہوگئی اور صرف اخراجات کا بار رہ گیا۔

۱۱۷ - ایک روایت ہے کہ ایک روز رسولِ خدا نے اپنے رفقا کو بتایا کہ کفار نے اُن کے بائیکاٹ کا جو معاہدہ کعبہ میں لٹکا رکھا تھا، اسے دیمک چاٹ گئی ہے۔ پوری دستاویز پر صرف "اللہ" اور "محمد" کے نام باقی رہ گئے ہیں۔ ابوطالب نے کفارِ مکہ کو بھی اس سے آگاہ کیا۔ مکیوں نے جاکر دیکھا تو رسولِ خدا کی بات درست پائی۔ وہ سخت متعجب ہوئے مگر ان پر کوئی مثبت اثر نہ ہُوا، بائیکاٹ کے خلاف بعض انفرادی کوششیں موثر ثابت ہوئیں۔ ان میں سے ایک شخص جو بھوک اور پیاس سے بلکتے بچّوں کی آہ و بکا برداشت نہ کرسکا، اپنے ایک معتمد دوست سے ملا اور اس سے مشورہ کیا۔ اس کا دوست بھی بچّوں پر یوں ظلم وستم کا مخالف تھا، مگر کوئی آواز بلند کرنے سے قبل مزید افراد کا تعاون حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کوششیں جاری رہیں اور مختلف قبائل کے چھ ہم خیال افراد مل گئے۔ اُنھوں نے ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا تاکہ اس سلسلے میں پیش رفت کے لیے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔ اگلی صبح کو ان میں سے ایک نے کعبہ میں کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ وہ (رسولِ خدا کے قبیلہ کے) بائیکاٹ کا مخالف ہے۔ ابوجہل نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس پر وہ چھ ہم خیال افراد باری باری اُٹھے انھوں نے اعلان کیا کہ ان کے قبیلے بائیکاٹ کے معاہدہ سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ اس پر عمل درآمد کے پابند نہیں ہیں۔

---

[1] ان احابیش کو حبشہ کے لوگوں سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ حبشی تو تھے مگر ان کا تعلق عرب قبیلہ بنو کنعان سے تھا۔

۱۱۸۔ اس کے بعد حضورِ اکرمؐ کا خاندان واپس مکّہ آگیا۔ تنگ دستی اور عسرت کے ان سالوں میں متعدد افراد کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے جو رسولِ خدا کی شریکِ حیات تھیں، داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے بعد جناب ابو طالب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے جو رسولِ خدا کی سب سے مضبوط پشت پناہ تھے۔ اب ابو لہب قبیلہ کا سردار بن گیا۔

۱۱۹۔ کچھ وقت خاموشی اور رنج والم میں گزر گیا۔ مکّہ کی ایک معمر خاتون سودہ قبولِ اسلام کے بعد اپنے شوہر سمیت حبشہ چلی گئی تھیں۔ سودہ کا شوہر سکران حبشہ میں قیام کے دوران عیسائیت کی طرف مائل ہو گیا۔ مگر سودہ تمام تر دباؤ اور ترغیب و تحریص کے باوجود اسلام پر استقامت سے ڈٹی رہیں۔ سکران کا انتقال ہو گیا تو سودہ مکّہ لوٹ آئیں۔ رسولِ خدا نے اس معمر خاتون کی استقامت کو سراہا۔ رسولِ خدا نے ان سے نکاح کی تجویز پیش کی اور انھوں نے یہ اعزاز بخوشی قبول کر لیا۔ ظاہر ہے سودہ خاتون کا کوئی بچہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ رسول اللہ کے بچوں کی نہایت پیار اور محبت سے دیکھ بھال کرتی تھیں۔

۱۲۰۔ ابو لہب زیادہ دیر تک رسولِ خدا کے خلاف دلی نفرت کو چھپا نہ سکا۔ اس نے جلد ہی حضورِ اکرمؐ کے سماجی بائیکاٹ کا بہانہ ڈھونڈ لیا اور انھیں باغی قرار دے دیا۔ اب کوئی بھی شخص کسی خوف و خطر کے بغیر حضورؐ کی جان لے سکتا تھا۔ ان حالات میں کسی اور قبیلہ کی پناہ حاصل کرنے کے بجائے رسولِ خدا نے ہجرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا۔ طائف کا قصبہ مکّہ سے دو دن کی مسافت پر تھا۔ وہاں حضورؐ کے ماموں رہتے تھے۔ آپ ان لوگوں کو آزمانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اپنے بیوی بچوں کو گھر میں چھوڑ کر آں حضور اپنے وفادار ملازم زید ابنِ حارث کے ہمراہ طائف گئے، انھوں نے اپنے ماموں سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ جب اُنھوں نے طائف کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دی تو ان کا ردِ عمل غیر متوقع طور پر کفارِ مکّہ سے بھی زیادہ سخت اور مخالفانہ تھا۔ انھیں فوری طور پر شہر سے نکل جانے کو کہا گیا۔ آوارہ چھوکرے اُن کے پیچھے لگ گئے۔ اُنھوں نے شدید سنگباری کر کے رسولِ خدا اور ان کے ملازم کو شدید زخمی کر دیا۔ رسولِ پاکؐ نے ایک شخص کو باغ کے دروازے پر کھڑے دیکھا جس نے انھیں پناہ دی اور اللہ کے رسولؐ پر سنگباری کرنے والے آوارہ منش لڑکوں کو تعاقب کر کے بھگا دیا۔ یہ باغبان ایک عیسائی غلام تھا۔ اس نے رسولِ خدا کی مہمان نوازی کی اور انھیں کچھ پھل کھانے کو دیے۔ حضورِ انورؐ نے پھل کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھی تو عیسائی غلام کو ان کے بارے میں کرید ہوئی۔ چنانچہ اس نے رسولِ خدا سے مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال شروع کر دیا۔ اسی اثنا میں آوارہ چھوکروں کا ہنگامہ فرو ہو گیا تو خدا کے نبیؐ واپس مکہ آ گئے۔ راستے میں حضورؐ نے رات نخلہ کے مقام پر بسر کی۔ اُنھوں نے نماز ادا کی اور بے یار و مددگار مصائب میں مبتلا رہنے پر اللہ میاں سے شکوہ بھی کیا۔ وہ مایوس تو ہرگز نہیں تھے اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اسلام کا عظیم پیغام جو اللہ تعالیٰ نے انھیں ودیعت فرمایا تھا لوگوں تک پہنچانے کی ہمّت بھی دے۔ پیغمبرِ خدا نے اس رات جو دعا مانگی اس کا متن جوں کا توں محفوظ ہے اور مسلمان اسے بے حد متبرک تصور کرتے ہیں۔ خدا نے اپنے نبیؐ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور رسولِ خدا پر قرآن پاک کی ۷۲ ویں سورہ "جن" نازل ہوئی۔ اس سے حضورؐ کی حوصلہ افزائی

بھی ہوئی کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مطلع کیا کہ اس رات کچھ جن رسولِ خدا کے قریب سے گزرے انھوں نے رسول اللہ کو قرآن حکیم کی تلاوت کرتے سنا۔ جنوں پر انکشاف ہوا کہ موسیٰ کے بعد وہ نئے نبیؐ مبعوث ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسلام قبول کیا اور یہ عزم لے کر چلے گئے کہ وہ دوسرے اجنّہ میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ سورہ جن کے آغاز میں ہی کہا گیا ہے: "مجھے بتایا گیا ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن پاک سنا . . ." اس کا یہ مطلب ہے کہ خود رسولِ خدا (اس رات) اپنے آس پاس ان غیر مرئی ملاقاتیوں کی موجودگی سے لاعلم تھے۔

۱۲۱۔ پیغمبر واپس مکّہ کے نواح میں غارِ حرا کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ انھوں نے ایک پیامبر اپنی والدہ محترمہ کے ایک قریبی عزیز کے پاس بھیجا کہ وہ رسولِ خدا کو اپنی پناہ میں لے لیں۔ مگر اس عزیز نے انکار کر دیا۔ پھر انھوں نے اپنی نئی اہلیہ سودہ کے ایک عزیز کو آزمایا جو رسولؐ خدا کے خاندان کے بائیکاٹ کا زبردست مخالف رہا تھا اور چوری چھپے انھیں کھانے پینے کی اشیا بھی بھجوایا کرتا تھا۔ اس نے پیغمبر کو پناہ دینے کی حامی بھرلی۔ اس نے اپنے خاندان کے چند دیگر افراد کے ساتھ ہتھیار سنبھالے اور غارِ حرا میں گئے تاکہ رسولِ خدا کو بحفاظت مکّہ لا سکیں۔ اس نے کعبہ کے صحن میں للکار کر کہا کہ اس نے محمّد کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔

معراج

۱۲۲۔ مکّہ میں کسی مفید کام کے لیے نہ گنجائش تھی اور نہ ہی اس کی کوئی اُمید تھی۔ رسولِ خدا اپنا بیشتر وقت عبادت اور غور و فکر میں گزارتے تھے۔ مکّہ میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے فروغ کی گنجائش نہیں تھی بلکہ جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے اُن کے لیے آزادانہ عبادت اور اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی بھی مفقود تھی۔ طائف سے واپسی کے فوراً بعد آنحضورؐ جناب ابُوطالب کے گھر گئے، غالباً وہ اپنے پیارے چچا کے اہلِ خانہ کو طائف کے رشتہ داروں کے ناروا سلوک کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ رسولِ خدا کو یقیناً ابوطالب کی یاد نے ستایا ہو گا جن کی زندگی میں انھیں ہر طرح سے تحفظ حاصل تھا۔ آپ نے رات اپنے مرحوم چچا کے ہاں بسر کی، وہاں اُنھوں نے ایک متبرک خواب دیکھا:

۱۲۳۔ رسول اللہ نے دیکھا کہ گویا وہ کعبۃ اللہ کے صحن میں موجود ہیں۔ جبرائیل آئے اور رسول اللہ کو جگا کر اللہ کا پیغام پہنچایا۔ خدا نے اپنے نبی کو عرش پر ملاقات کی دعوت دی تھی۔ جبرائیل رسول پاکؐ کی سواری کے لیے جنت سے براق لائے تھے۔ رسولِ خدا براق پر سوار ہو کر آسمانوں کو روانہ ہوئے جبکہ جبرائیل ان کے پائلٹ کے طور پر آگے آگے محوِ پرواز تھا۔ ایک لمحے میں رسول اللہ پہلے آسمان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جبرائیل نے رسول اللہ کی آمد کا اعلان کیا اور پہلے آسمان کے دربان نے تصدیق کے بعد در وا کر دیا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے رسول اللہ کا استقبال اپنے بیٹے کی حیثیت سے پدرانہ محبّت اور فخر کے ساتھ کیا جو کسی بھی باپ کو اپنے عظیم بیٹے پر ہو سکتا ہے۔ رسولِ خدا کو پہلے آسمان کے عجائبات کی سیر بھی کرائی گئی۔ پھر وہ سب دوسرے، تیسرے، چوتھے اور بالآخر ساتویں آسمان پر پہنچے۔ ہر آسمان پر ایک یا دو پیغمبروں نے نبی آخر الزماںؐ کا استقبال کیا،

ان میں عیسیٰ مسیح ، یوحنا، اصطباغی ، ہارون اور موسیٰ وغیرہ شامل تھے۔ ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ رسول اللہ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دوسرے مرسلین نے تو حضورؐ کا اپنے بھائی کی طرح استقبال کیا جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کا خیر مقدم اپنے بیٹے کے طور پر کیا۔ انھوں نے یوں سرفراز کیے جانے پر انھیں مبارک باد دی۔ ہر آسمان پر رسولِ خدا کو ناقابلِ بیان عجائبات دکھائے گئے۔ پھر یہ مختصر سا قافلہ ایک بلند مقام پر پہنچا جہاں بیری کی طرح کا ایک درخت (سدرہ) ناقابلِ عبور سرحد کا نشان فاصل بناتا ہے۔ جبرائیل نے یہ کہہ کر رسولِ خدا سے واپسی کی اجازت طلب کی کہ "اگر میں اس حد سے آگے گیا تو اللہ کا نور مجھے جلا کر خاک کر دے گا۔ آپ چونکہ مدعو ہیں لہٰذا آپ آگے جا سکتے ہیں۔" پھر جبرائیل نے حضورؐ انور کو آگے جانے کا راستہ بتلایا۔ مختلف نشانیوں کی مدد سے رسولِ خدا ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں انھوں نے صریر خامہ سنی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام وصول کر کے متعلقہ ہستیوں تک پہنچائے جاتے تھے۔ رسولؐ اللہ آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ وہ حظیرۃ القدس تک پہنچ گئے۔ جب ان کے اور خدا کے درمیان دو کمانوں کے مساوی یا اس سے بھی کم فاصلہ (قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی) رہ گیا تو وہ ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور تحیۃ (پُر نیاز و پُر خلوص سلام) پیش کیا فوراً ہی جواب ملا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

رسولِ خدا نے التحیات (سلام و نیاز) جاری رکھا اور دوسروں کو اللہ کی مہربانیوں اور عنایات میں شریک کرنے کی خاطر مزید کہا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔

"پھر خدا نے اپنے بندے پر وحی نازل کی جو وہ نازل کرنا چاہتا تھا۔" (قرآن ۵۳/۱۰)

اس نے اگر موسیٰؑ پر سینائی میں دس احکام نازل فرمائے تھے تو اس نے محمدؐ پر بارہ احکام نازل فرمائے (قرآن ۱۷/۲۳-۳۹) جو زیادہ جامع ہیں اور نہایت عمدہ ضابطۂ اخلاق وضع کرتے ہیں:

۱۔ اور حکم دیا تیرے پروردگار نے کہ نہ عبادت کرو مگر اللہ کی،

۲۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان (حسنِ سلوک) کرو......،

۳۔ اور دے قرابت داروں کو حق ان کا۔ اور ضرورت مندوں کو اور مسافروں کو......،

۴۔ اور اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ کر نہ رکھ اور نہ ہی اسے بالکل ہی کھول دے....، (نہ تو اسراف کر اور نہ ہی کنجوسی کو اپنا)

۵۔ اپنے بچوں کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کر.....،

۶۔ اور زنا کے قریب بھی مت جا.....،

۷۔ اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے ناحق قتل نہ کر......،

۸۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جا مگر جس طریقہ سے کہ بہتر ہو جب تک وُہ اپنی قوت (اکثریت) کو پہنچے ......،

۹۔ عہد کو پُورا کرو ......،

۱۰۔ اور ناپ تول کر دو تو پُورا ناپو اور صحیح ترازو سے تول کر دو۔

۱۱۔ اور جس بات کی تجھے خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ، بیشک کان، آنکھ اور دل سے (ان کے کاموں کے بارے میں) باز پرس ہوگی۔

۱۲۔ اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل ......۔

خدا نے یہ بات منظور کرتے ہوئے کہ اس کے فضل و کرم کا سزاوار صرف نبیؐ کو ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ کے نیک بندوں کو بھی اس میں سے حصّہ ملنا چاہیے۔ فرمایا کہ نیک بندے دن میں پچاس بار نماز ادا کرکے (عبادت کرکے) میری رحمت کے خزانہ میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے (ملاقات کے بعد) رسولؐ کو واپس زمین پر جانے کی اجازت دی تو خدا نے عرش کے خزانہ میں سے ایک قیمتی تحفہ اپنے نبی کو ودیعت کیا۔ رسول اکرمؐ کی ایک حدیث کے مطابق اس تحفہ کا ذکر قرآن پاک کی دوسری سورہ کی آخری دو آیات میں کیا گیا ہے۔ ہم پڑھتے ہیں "خدا کسی شخص کو اس کی استطاعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا" بھلا نوعِ انسانی کے لیے، اپنی تمام تر کمزوریوں کے پیشِ نظر اس سے بہتر اور کون سا تحفہ ہو سکتا ہے! اگر خدا ہماری استطاعت کے مطابق ہم پر فرائض عائد نہ کرتا بلکہ جو احکام چاہتا نافذ کر دیتا تو روزِ قیامت ہم کہاں کھڑے ہوتے ؛ عرش بریں سے واپسی پر جبرائیل نے آنحضورؐ کو دوزخ اور جنّت کی سیر کرائی۔ وہ جنّت الفردوس میں مختلف پیغمبروں سے بھی ملے جنھوں نے شاندار اعزاز پانے پر رسولِ خدا کو مبارکباد دی۔ حضرت موسیٰؑ کو جب معلوم ہُوا کہ مسلمانوں کے لیے دن میں پچاس نمازوں کا حکم ہُوا ہے تو انھوں نے اپنی قوم کے تلخ تجربہ کا ذکر کیا اور رسول اللہؐ سے کہا کہ وُہ نمازوں کی تعداد میں کمی کے لیے بارگاہِ ایزدی میں استدعا کریں۔ چنانچہ رسولِ خدا کی بار بار درخواست پر اللہ تعالیٰ نے پچاس کی جگہ پانچ نمازوں کا حکم فرما دیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ نے یہ وعدہ فرمایا کہ ان پانچ نمازوں کا اجر پچاس نمازوں کے برابر ہی ہوگا۔ (قرآن ۶/۱۶۰) اور تب اللہ کے نبیؐ نے اعلان کیا کہ :

"نماز مومن کی معراج ہے۔"

ایک اور روایت کے مطابق "نماز ہر مسلمان کے لیے خدا کا قرب (کا ذریعہ) ہے"۔ البتہ خدا کے حضور ہر شخص کے لیے خدا کی قربت کا درجہ (اللہ کے نزدیک) اس کے تقوٰی کے مطابق جُداگانہ ہوگا۔ جو لوگ اسلامی طریقِ عبادت (نماز) کو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دورانِ نماز بندہ اپنے خالق سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتا ہے (التحیات للہ) پھر جب اسے روحانی طور پر اپنے مالک کی حضوری حاصل ہوتی ہے (تشہد) وہ بالکل اسی طرح عمل کرتا ہے جیسے رسول اللہؐ نے شبِ معراج میں حضوری کے وقت کیا تھا۔ رسولِ خدا واپسی پر پہلے بیت المقدس میں اُترے جہاں تمام سابق پیغمبر آپ کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ یہاں دو رکعت نفلِ شکرانہ ادا کیے گئے تمام پیغمبروں کی متفقہ درخواست پر حضور اکرمؐ نے امامت فرمائی۔ اور

وہاں سے رسول اللہؐ مکہ میں واپس اپنے بستر پر پہنچ گئے۔

۱۲۴۔ خدا چونکہ ہر جگہ موجود ہے لہٰذا کسی مادی فاصلے کو طے کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن پاک نے معراج کے لیے لفظ "رؤیا" (خواب) استعمال کیا ہے۔ خود رسولِ خدا فرماتے ہیں معراج کے وقت "میں نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھا"۔ چند سال بعد حضورؐ کی محبوب اہلیہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آپؐ سے واقعہ معراج کی تفصیل دریافت کی۔ ظاہر ہے حضرت عائشہؓ دوسرے صحابہ کی نسبت حضورؐ کے قریب تر تھیں لہٰذا وہ اس تفصیل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔ اُن سے روایت ہے کہ "یہ ایک روحانی سفر اور خواب تھا"۔ علامہ المقریزی نے لکھا ہے: "حضورؐ کے دو صحابیوں حذیفہؓ اور معاویہؓ نے بھی غیر مبہم انداز میں یہی رائے ظاہر کی ہے"۔ تاہم عبد اللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ معراج ایک جسمانی سفر تھا۔ معراج کی نوعیت (جسمانی یا روحانی) خواہ کچھ بھی ہو یہ ایک عظیم ترین تجربہ تھا جو کسی انسان کو حاصل ہوا۔ حضرت ادریسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت یعقوبؑ اور متعدد دوسرے مرسلین کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی تجربہ سے گزرے تھے۔ حضرت موسٰیؑ کو وادیِ سینا میں کوہِ طور پر اللہ کی تجلی دکھائی گئی۔ مگر محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے حظیرۃ القدس کی بلندیوں تک پہنچنے کی اجازت سے سرفراز فرمایا۔ ہمیں سفرِ معراج کو محض سیر و تفریح پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی روحانی غایت پر نظر رکھنی چاہیے۔ روایات کے مطابق معراج کا عظیم ترین واقعہ ۲۷ رجب المرجب کو پیش آیا تھا۔

۱۲۵۔ اگلے روز جب حضورؐ نے سفرِ معراج کا اعلان فرمایا تو ہر شخص کا ردِ عمل اس کی افتادِ طبع کے مطابق تھا۔ حضرت ابوبکرؓ تو اتنے پُر یقین تھے کہ انھوں نے رسولِ خدا سے تصدیق کیے بغیر ہی اس واقعہ کو درست قرار دیا جس کے بعد حضور اکرمؐ کے دربار سے اُنھیں "صدیق" کا خطاب ملا۔ کفار نے اس واقعہ کو جھوٹ گردانا اور تمسخر اڑایا۔ کفار میں سے چند ایک نے جو سفرِ تجارت کے سلسلہ میں بیت المقدس جا چکے تھے، کہا کہ بیت المقدس کا نقشہ بیان کیا جائے۔ وُہ یہ بھول گئے کہ خود محمدؐ بھی تو حضرت خدیجہؓ کے کاروانِ تجارت کی نگرانی کرتے ہوئے بیت المقدس سے آگے بصرہ تک جا چکے تھے۔ کفار نے بعض اور احمقانہ سوالات بھی کیے۔ وہ اس امر کو خاص طور پر حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے کہ محمدؐ کو خواہ رؤیا میں ہی کیوں نہ ہو، خدا نے شرفِ ملاقات بخشا ہے۔ اس کے بعد کفار کی دشمنی اور مسلمانوں پر ان کے مظالم میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ایک یمنی الطفیل الدوسی نے واقعہ معراج کے فوری بعد مکہ کا دورہ کیا۔ اس نے بلا تعصب اسلام کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا کہ اسلام نہایت معقول مذہب ہے اور بُت پرستی سے کہیں ارفع و برتر ہے اس نے نہ صرف یہ کہ فوری طور پر اسلام کی حقانیت کا اقرار کر لیا بلکہ اسلام کا ایک پر جوش مبلغ بن کر یمن لوٹا۔ چند سال بعد وُہ پھر مدینہ منورہ میں رسولِ خدا کی خدمت میں حاضری کے لیے آیا۔ اس کے ساتھ اس کے قبیلہ کے اسّی کے لگ بھگ خاندان بھی تھے جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے۔ جب طفیل نے مکہ میں اسلام قبول کیا تو اس نے رسول اللہؐ کو یمن آنے کی دعوت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ یمن میں ذوالکفین نامی بت خانہ تھا جسے کعبہ کا مدِ مقابل تصور کیا جاتا تھا۔ اس بت خانہ کے محافظ خاندان پر قبیلہ کا طفیل جیسا ادنیٰ فرد بھلا کیسے فوقیت حاصل کر سکتا تھا۔

باب ۵

یثرب —— مدینۃ النبیؐ

۱۲۶۔ پناہ کی تلاش جاری رہی۔ ایامِ حج کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ منیٰ کے میدان میں رسولِ خداؐ ایک قبیلہ کے وفد سے دوسرے قبیلہ کے وفد کے کیمپ میں جاتے ہیں، وہ حج پر آنے والوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ ان قبائلی نمائندوں کو ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ اُن کی پناہ میں تبلیغِ اسلام کا موقع فراہم کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ رسول اللہؐ ان سے بظاہر یہ ناقابلِ یقین وعدہ بھی کرتے ہیں کہ " اگر تم اسلام قبول کر لو تو بہت جلد تم دُنیا کی دو بڑی سلطنتوں ——— بازنطینی اور ساسانی ——— کے مالک بن جاؤ گے۔" ابولہب جو حضورؐ کا جانی دشمن اور چچا تھا، حضورؐ کے پیچھے جاکر ان قبائلی نمائندوں سے ملاقات کرتا اور انھیں انتباہ کرتا کہ اگر انھوں نے محمدؐ کو پناہ دی تو انھیں شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابولہب رسولِ خداؐ پر طرح طرح کے بہتان بھی باندھتا۔ روایت ہے کہ اُس روز رسولِ خداؐ نے پندرہ کے لگ بھگ قبائل کے نمائندوں سے رابطہ پیدا کیا۔ ان لوگوں نے مختلف ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ بعض نے تو پیغمبرؐ کو جھڑک کر کیمپ سے نکال دیا۔ اور بعض نے نرم الفاظ میں بہانے بنا کر ٹال دیا، مگر رسولِ خداؐ نے حالات کی پروا کیے بغیر اسلام کی دعوت جاری رکھی۔ رسولِ خداؐ کی سولھویں کوشش اُمید کی کرن بن کر چمکی۔ حضورِ اکرمؐ کی اس کامیاب کوشش پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رسولِ خداؐ نے جن پندرہ قبائل سے بے سُود رابطہ قائم کیا تھا وُہ پُورے جزیرہ نمائے عرب کے نمائندہ تھے۔ ابنِ ہشام کی روایت کے مصداق ایامِ حج میں شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی اور وسطی عرب سے لوگ مکہ مکرمہ آتے تھے جو اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ حج کعبہ عرب کے چند قبیلوں تک محدود نہ تھا بلکہ پُورا عرب اس پر اعتقاد رکھتا تھا۔ کعبۃ اللہ کی اس روحانی برتری سے مکّہ کے تجار خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ چونکہ مکّہ کے علاقہ میں نہ تو زراعت ہوتی تھی، نہ صنعت وحرفت کا وجود تھا اور نہ ہی کوئی اور دلکشی تھی جس کے سہارے مکّہ کو عرب کا بین الاقوامی تجارتی شہر بنایا جا سکتا۔

۱۲۷۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، منیٰ میں رسول اللہؐ کی سولھویں کوشش کامیابی کا پیغام لائی۔ مدینہ کے کوئی چھ افراد پر مشتمل گروپ جن کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا وُہی قبیلہ جس سے رسولؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ محترمہ تعلق رکھتی تھیں، منیٰ میں حجامت بنوا رہا تھا جو حج کی آخری رسم ہے۔ وُہ بڑے جمرہ کے قریب الگ تھلگ جگہ پر بیٹھے ایک دوسرے کے بال کاٹ رہے تھے۔ قبیلہ خزرج نے حال ہی میں مدینہ کے ایک اور قبیلہ اوس پر جو ان کے عم زاد اور مدمقابل تھے، شاندار فتح حاصل کی تھی (ان دنوں بنو اوس کا ایک وفد کفارِ مکّہ سے فوجی معاہدہ کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا)، یہودیوں کے

ہمسایہ ہونے کے باعث بنوخزرج دوسرے عرب قبائل کی نسبت الہامی کتب، وحیِ نبی اور متوقع نبی آخرالزماں کی آمد کے تصورات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ تھے۔ جب رسولِ خدا نے ان کے سامنے خوش الحانی سے قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کی اور اپنی نبوت کے بارے میں وضاحت کی تو مدینہ کے ان افراد کو یاد آیا کہ کس طرح (ان کے ہمسائے) یہودی جو ان کے مقابلے میں مجبور و لاچار تھے، طنزاً کہا کرتے تھے کہ "کچھ عرصہ انتظار کرو جلد ہی اللہ کا آخری نبی آنے والا ہے اور اس کی معیت میں ہم تم لوگوں پر بالادستی حاصل کرلیں گے۔" مدینہ والوں نے محسوس کیا کہ رسولِ خدا نے ان کے سامنے جو کچھ بیان کیا ہے اور جس انداز میں دعوتِ اسلام پیش کی ہے، اس کے پیشِ نظر نبی آخرالزماں کے ظہور کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا تو ہم پیش قدمی کرکے موقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں! مدنی وفد کے ارکان نے سوچا جلد ہی انھوں نے تبادلۂ خیال کیا تو انھوں نے اپنے اندر اتفاق رائے پایا چنانچہ انھوں نے نہ صرف فوری طور پر اسلام قبول کرلیا بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ واپس یثرب (مدینہ) جاکر اسلام کی تبلیغ کریں گے پھر اس کے جو نتائج ہوں گے آئندہ سال اسی جگہ ان سے رسولِ خدا کو آگاہ کریں گے ..... اور اگلے ایامِ حج "اچھی فصل" کی خوشخبری لے کر آئے۔

۱۲۸۔ بنواوس اور بنوخزرج کے درمیان خونی معرکوں نے صاحبِ فکر اہلِ مدینہ کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ فاتح اور عددی اعتبار سے برتر بنوخزرج اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علاقہ میں اپنی بالادستی قائم کرنے اور یوں یثرب میں مستحکم امن کے قیام کا تہیّہ کیے ہوئے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے سربراہ قبیلہ ابنِ اُبَیّ کو یثرب کا بادشاہ قرار دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس کا طلائی تاج بنوانے کے لیے زرگر کو آرڈر بھی دے دیا تھا۔ بنواوس اپنے بھائیوں کے ساتھ مہلک جنگوں سے سخت برگشتہ تھے۔ مگر وہ ابن اُبَیّ کی بادشاہت قبول کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ حج سے واپس آنے والے بنوخزرج کے چھ افراد امن اور بھائی چارے کا جو پیغام لے کر آئے تھے جلد ہی شہر میں پھیل گیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ بنوخزرج کے علاوہ بنواوس بھی اسلام قبول کرنے لگے۔ مدینہ میں اسلام کے ان چھ مبلّغوں کے سر یہ سہرا بھی ہے کہ انھوں نے بنواوس پر اپنی فوجی برتری کو فراموش کردیا اور اسلام قبول کرنے والے بنواوس کے افراد کو بھائیوں کی طرح گلے لگا لیا۔ چنانچہ اگلے موسمِ حج میں بارہ خاندانوں نے اپنے نمائندے بھیجے "تاکہ منیٰ میں رسولِ خدا کی خدمت میں سلامِ نیاز پیش کرسکیں۔ ان میں سے نو کا تعلق بنوخزرج سے اور تین کا بنواوس سے تھا۔ اُنھوں نے پیغمبر کے رُوبرو حلفِ وفاداری اٹھایا اور وعدہ کیا کہ "وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا سے اجتناب برتیں گے۔ (غربت و تنگدستی کے خوف سے) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے اور نہ (خواتین) بُہتان کی اولاد لائیں گی جسے وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی) بنالیں۔ نہ کسی نیک بات میں آپ (اے محمدؐ) کی نافرمانی کریں گے (قرآن ۶۰/۱۲) اس کے بعد اللہ کے نبیؐ نے مدینہ میں اپنے بارہ نقیب (نمائندے) نامزد کیے اور ان میں سے ایک کو نقیب النقباءُ (ان کا سربراہ) مقرر کیا ——— آنے والے سالوں کے دوران بھی جب پورا مدینہ مشرف بہ اسلام ہوگیا ان نقیبوں کی تعداد بارہ ہی رہی ——— مدنی وفد کے ارکان نے رسولؐ اللہ سے استدعا کی کہ انھیں اسلام کے آداب

سکھانے کے لیے کسی معلّم کی خدمات فراہم کی جائیں۔ چنانچہ رسولِ خداؐ نے مصعبؓ ابن عُمیر کو ان کے ساتھ کر دیا۔ (اُس کے بھائی ابوالروم کی والدہ یونانی النسل تھی، ممکن ہے وہ دونوں حقیقی بھائی ہوں۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں اور بازنطینیوں کی جنگوں کے باعث یونانی لڑکیاں اور لڑکے بطور غلام خریدے اور فروخت کیے جاتے تھے۔ ایسے کئی غلام اور لونڈیاں عرب گھرانوں میں موجود تھیں۔ عکرمہ ابن ابوجہل کے گھر میں ایک یُونانی غلام موجود تھا۔ طائف کے بعض گھرانوں میں بھی یونانی النسل غلام اور لونڈیاں موجود تھیں)

۱۲۹۔ مصعبؓ نے مدینہ میں جو کام کیا اس سے مدینہ کے اُس دور کے معاشرہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ وہاں اسلام کے ہمدردوں نے مصعبؓ کو بتایا کہ فلاں شخص کو قابو کرنا انتہائی مشکل ہوگا۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول کرلے تو آپ کی راہ میں پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ یہ جانتے ہی مصعبؓ نے اُس شخص کے باغ کا رُخ کیا وہ کھجوروں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گیا اور خوش الحانی سے قرآن حکیم کی تلاوت شروع کر دی۔ اس شخص کے قبیلہ کے بعض افراد محض مصعبؓ کی خوش الحانی سے متاثر ہوکر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب قبیلہ کے سردار کو اپنے باغ میں ایک شخص کی مداخلت بے جا کا علم ہوا تو وہ نیزہ لہراتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے گرج کر مصعب سے کہا "تم میری اجازت کے بغیر میرے باغ میں کیوں داخل ہوئے، دفع ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں نیزے میں پرو دوں گا۔" مصعب اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا اور میٹھی آواز میں بولا "آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔ مگر آپ میری بات سُن لیں۔ اگر آپ کو میری بات ناگوار گزری تو میں فوراً دفع ہو جاؤں گا۔" سردار نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بولا: "تمھاری بات منصفانہ ہے۔ کہو کیا چاہتے ہو؟" تب مصعب نے نہایت ہی خوش الحانی سے قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت کی۔ اکھڑ عرب سردار اس سے بے حد متاثر ہوا، اس نے مصعب سے دریافت کیا "یہ تم کیا تلاوت کر رہے ہو۔ اس کا مطلب کیا ہے؟" مصعب نے اسے بتایا "یہ قرآن پاک کی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمدؐ پر نازل فرمائی ہیں۔ وہ اللہ کے رسول ہیں، وہ قرآن کے مبلّغ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ صرف ایک ہے، خدا کے بنائے ہوئے بُتوں کی پُوجا روا نہیں۔ یہ کائنات خدا نے ہی بنائی ہے۔ قرآن کا مقصد سب سے انصاف، احسان اور ایک خدا کی اطاعت ہے۔" عرب سردار کے لیے اتنا ہی کافی تھا وہ بول اٹھا "ان اصولوں سے وابستگی کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟" مصعب نے اسے بتایا کہ اسے رسول اللہؐ پر ایمان لانا ہوگا۔ چنانچہ اس نے نیزہ اٹھایا اور اسی جوش و خروش سے واپس چلا گیا جس طرح مصعب کا سُن کر وہاں آیا تھا۔ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو جس کا وہ سردار تھا، اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ جب قبیلہ کے سارے افراد غلام اور ملازم جمع ہو گئے تو اس نے چلا کر سوال کیا "میں کون ہوں؟" اسے یُوں غصّے میں دیکھ کر اس کے اہل قبیلہ نے جواب دیا "آپ ہمارے سردار ہیں، عقل و دانش میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں اور آپ بڑے شجاع ہیں۔" تب اس نے اپنا نیزہ ہوا میں لہرایا اور بولا "اگر تم نے ابھی اور اسی وقت اسلام قبول نہ کیا جس کی تعلیم وہ مکّی مصعب دیتا ہے تو میں تمھارا سب سے بڑا دشمن ثابت ہُوں گا۔" اور سُورج غروب ہونے سے قبل پورا قبیلہ اسلام سے مشرف ہوچکا تھا۔

جمعہ کا پہلا اجتماع

۱۳۰- مصعب کی کامیابیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر رسولِ خدا کو اپنی کامیابیوں سے تحریری طور پر مطلع کرتا رہتا تھا۔ غالباً وہ اپنے خطوط میں حضورِ اکرمؐ سے مزید ہدایات اور ایسے سوالوں کے جوابات بھی طلب کرتا رہتا تھا جو مدنی لوگ اس سے دریافت کرتے تھے یا کر سکتے تھے۔ ایک روز اسے پیغمبرؐ کا ایک خط موصول ہوا جو اس کے ایک سابقہ خط کے جواب میں تحریر کیا گیا تھا۔ رسولؐ اللہ کے خط میں لکھا تھا: "ہر جمعہ کو ——— اس روز جب یہودی اگلے دن یوم سبت منانے کی تیاری کرتے ہیں ——— دوپہر کے بعد مسلمانوں کی نماز باجماعت کا اہتمام کرو اور خود اس کی امامت کرو۔ چنانچہ پہلے جمعہ کی نماز میں بارہ افراد شریک ہوئے۔

۱۳۱- اس وقت نہ مکّہ اور نہ ہی مدینہ ایک مسلمان ملک تھا تاہم مدینہ میں مسلمانوں کو اپنے ضمیر کے مطابق عمل ... کی آزادی میسر تھی۔ چنانچہ ایک غیر مسلم ملک میں جیسا کہ مدینہ ان دنوں تھا، رسولِ خدا نے نمازِ ظہر کی جگہ جمعہ ادا کر... حکم دیا۔ روایات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ مصعبؓ نے پہلی نمازِ جمعہ کے دوران خطبہ دیا تھا یا نہیں۔ تاہم جب... رسولِ خدا ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہ باقاعدگی سے خطبۂ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

... کو ہجرت کا فیصلہ

۱۳۲- جب حج کا اگلا موسم آیا تو پانچ سو مدنی حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ مصعبؓ بھی ان میں شامل تھا۔ یہ سب مسلمان نہیں تھے بلکہ ان میں صرف ۷۴، مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ مسلمانوں میں دو خواتین بھی شامل تھیں جن میں سے ایک کے ہاں مکّہ میں ولادت بھی ہوئی۔ چاند کی چودھویں شب کو منیٰ میں مدینہ سے آنے والوں کے ساتھ اللہ کے نبی کی ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ مدینہ کے لوگ ایسی رازداری سے منیٰ میں پہنچے کہ ان کے ساتھ آنے والے غیر مسلموں اور ان کے کیمپ میں مقیم دیگر افراد کو بھی اس کی ہوا تک نہ لگی۔ وہ یکے بعد دیگرے رسولِ خدا کی خدمت میں پیش ہوئے، اسلام لانے کا اقرار کیا اور یہ کہتے ہوئے حضورؐ سے "بیعت"[1] کی: "ہم اسی طرح آپ کا تحفظ کریں گے جس طرح ہم اپنے اہلِ خانہ کا تحفظ کرتے ہیں، خواہ اس کے لیے ہمیں اسود و احمر (ساری دنیا) سے جنگ ہی کیوں نہ کرنا پڑے، ہم ہر صورت میں آپ کا ساتھ دیں گے خواہ آپ کے مدِمقابل ہمارے رشتہ دار ہوں یا کوئی اجنبی۔" پھر انھوں نے رسولِ خدا کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ وہ رسولِ خدا کے میزبان ہوں گے اور ہر طرح سے ان کی حفاظت کریں گے۔ اس وقت رسولِ خدا کے ساتھ ان کے نہایت دانشمند چچا حضرت عباسؓ بھی تھے انھوں نے مدنی مسلمانوں کی پیشکش کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یقیناً تمھیں ساری دنیا سے جنگ کا سامنا ہوگا۔ اگر تم نے مدینہ جانے کے بعد محمدؐ کو بے یار و مددگار چھوڑنا ہے تو بہتر ہے انھیں مدعو نہ کرو۔ کیونکہ وہ یہاں اپنے خاندان کی پناہ میں ہیں ......"

---

[1] یہ دوسری بیعتِ عقبہ کہلاتی ہے۔

اس پہ مدنی مسلمانوں نے اپنے خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ رسولِ خدا کو دعوت دے کر جن خطرات سے دوچار ہو سکتے ہیں، ان کا انھیں پوری طرح احساس ہے۔ رسولِ خدا مدنی مسلمانوں کے اظہارِ وفاداری سے مطمئن ہو گئے اور فرمایا: "آج کے بعد تمھارا خون میرا خون ہے۔ تمھارا خون بہنے کا مطلب میرا خون بہنا ہے۔ میں تمھارا ہوں اور تم میرے ہو۔"

۱۳۳۔ کفارِ مکّہ کو بھی منیٰ کے واقعات کی سن گن ملی مگر وہ اس کی تصدیق نہ کر سکے تاہم انھوں نے محسوس کیا کہ خطرہ بڑھ رہا ہے۔ شمال میں ان کی تجارت کے راستے مدینے سے ہو کر گزرتے تھے جو منقطع ہو سکتے تھے۔ مدنی قبائل کی مدد سے مستقبل میں مکہ پر فوج کشی بھی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ کفارِ مکّہ کے چند نمائندے مدنی حجاج کے کیمپ میں آئے اور پوچھ گچھ کرنے لگے۔ اتفاق کی بات ہے کہ انھوں نے مدینہ کے غیر مسلموں سے رابطہ قایم کیا جنھوں نے حلفاً بتایا کہ انھیں کسی ایسے واقعہ کا علم نہیں اور یہ کہ ان کے علم کے بغیر ایسا کوئی اجتماع منعقد نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سچے بھی تھے۔ اس پر مکی کفار کے نمائندے مطمئن ہو گئے تاہم بعد میں انھیں مدنی مسلمانوں اور رسولِ خدا کے درمیان عہد و پیمان کا علم ہو گیا۔ مگر اس وقت تک مدینہ کے مسلمان منیٰ سے جا چکے تھے۔ تاہم ایک مدنی مسلمان ان کے ہتھے چڑھ گیا جسے انھوں نے خوب دق کیا لیکن بعد میں یہ محسوس کر کے اسے چھوڑ دیا کہ اس کی موت کی صورت میں اس کا سارا قبیلہ کفارِ مکّہ کے خلاف سرگرم ہو جائے گا۔

۱۳۴۔ مکہ کے مسلمان چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں خاموشی سے مدینہ روانہ ہونے لگے جہاں انھیں خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ کوئی دو ماہ کے عرصہ میں رسولِ خدا، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے اہلِ خانہ کے سوا کوئی مسلمان مکہ میں نہ رہا۔ البتہ وہ مسلمان مکہ میں موجود تھے جنھیں زبردستی روک لیا گیا یا ان کے خاندان والوں نے انھیں قید کر رکھا تھا۔ ان میں کچھ تو نوعمر بچے تھے اور باقی غلام وغیرہ تھے۔ ایک بہت اچھا مسلمان بھی مکہ میں تھا وہ زرگر تھا اور اس نے خاموشی سے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اس شہر میں مقیم رہا۔ اغلباً وہ رسولِ خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے مکّہ میں مقیم تھا تاکہ حضور کو مکّہ کے حالات و واقعات سے باخبر رکھ سکے۔ البلاذری کے مطابق وہ مسلمانوں کے لیے خفیہ طور پہ کام کرتا تھا۔ مدینہ سے جو خفیہ ایجنٹ مکہ بھیجے جاتے تھے وہ انھیں پناہ دیتا تھا۔ رسولِ خدا کے چچا عباسؓ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں تاہم ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ مقدس چشمہ زمزم کے محافظ و نگران اور مکّہ شہر کی حکمران کونسل کے معزز رکن تھے۔

۱۳۵۔ کفارِ مکّہ نے ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے والے مسلمانوں کی املاک ضبط کر لیں۔ انھوں نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی جو تاریخ میں یوم الزحمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مجلسِ مشاورت میں ایک قرارداد منظور کی گئی: "محمدؐ کو قتل کر دیا جائے مگر اس قتل میں کوئی ایک یا دو افراد نہیں بلکہ مکّہ کے تمام قبائل سے منتخب نوجوان شامل ہوں گے۔ چونکہ قتل کی ذمہ داری لاتعداد قبائل پہ عاید ہو گی اس لیے پیغمبر کا قبیلہ قاتلوں کے خلاف اعلانِ جنگ سے باز رہے گا اور خون بہا پر اکتفا کے لیے مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ خون بہا مشترکہ فنڈ سے ادا کر دیا جائے گا۔" کفار کا یہ منصوبہ اتنا خام تھا کہ اسے خفیہ رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ایک روز حضورِ اکرمؐ کی ایک خالہ بھاگی بھاگی آئی اور رسولِ خدا کو سب کچھ بتا دیا ——— غالباً اس نے یہ سب

اپنے شوہر کے خاندان والوں سے سنا تھا ——— کہ رسولِ خدا کو رات کے وقت قتل کرنے کی سازش تیار کر لی گئی ہے۔

۱۳۶۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ نبی اکرمؐ اسی وقت حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور انھیں بھی اس سازش سے آگاہ کیا دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مکّہ سے ہجرت کریں گے۔ یہ ربیع الاوّل کے ابتدائی دن تھے اور راتیں چاند کی روشنی سے منور نہیں ہوتی تھیں فیصلہ کے مطابق دونوں کو رات کے اندھیرے میں مکّہ سے نکل کر ایک نواحی پہاڑی کے غار (غارِ ثور) تک جانا تھا۔ وہاں رات بسر کرنے کے بعد اس وقت مدینہ کو روانہ ہونا تھا۔ جب مکّہ میں ان کی تلاش کی مہم سرد پڑ جائے۔ ابوبکرؓ نے سواری اور رہنما کا انتظام اپنے ذمّے لے لیا۔ رسولِ خدا نے اپنے ئے پالک بیٹے علیؓ کو حکم دیا کہ وہ رات کے وقت ان کے بستر پر سو جائے۔ رسولِ خدا نے وہ تمام امانتیں بھی حضرت علیؓ کو سونپ دیں جو مکّہ کے لوگوں نے آنحضورؐ کے پاس جمع کرا رکھی تھیں تاکہ یہ اصل مالکوں تک پہنچائی جا سکیں حضرت علیؓ نے یہ فرض ادا کرنے کے بعد مدینہ پہنچنا تھا۔ ان انتظامات کے بعد رسولِ خدا حضرت ابوبکرؓ کے گھر آگئے۔ کافی رات گئے وہ مکان کے عقبی حصّہ میں ایک کھڑکی کے ذریعہ باہر نکلے اور کوہِ ثور پر چڑھنے لگے۔ راستے میں ابوبکرؓ کو ایک دوست نے پہچان لیا مگر وہ کوئی شبہ پیدا کیے بغیر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوگئے۔ روایات کے مطابق جب وہ دونوں غارِ ثور کے دہانے پر پہنچے تو صدیق اکبرؓ پہلے غار میں داخل ہوئے تاکہ غار کو صاف کر سکیں۔ انھوں نے اپنا جُبہ پھاڑ کر غار کے اندر موجود سوراخ بھی بند کیے مبادا ان میں سے کوئی سانپ نکل آئے۔ مگر ان کی یہ احتیاط ناکام رہی، ایک سوراخ میں سے سانپ نکل آیا اور اس نے ابوبکرؓ کی ایڑی میں ڈس لیا۔ اُنھوں نے تکلیف برداشت کرنے کی کوشش کی مگر آنسو ان کی آنکھوں سے رواں ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے زانو پر سر رکھے استراحت فرما رہے تھے چند آنسو رسولِ خدا کے چہرہ مبارک پر گرے اور وہ نیند سے بیدار ہوگئے جب رسولِ خدا کو علم ہوا تو انھوں نے سانپ کی ڈسی ہوئی جگہ پر اپنا لعابِ دہن ملا جس سے حضرت ابوبکرؓ کی تکلیف جاتی رہی۔ اسی اثنا میں ایک مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بُن دیا۔ اگلی صبح کو کبوتروں کے ایک جوڑے نے غار کے دہانے میں گھونسلا بنا لیا اور اس میں انڈے دے دیے۔ یہ انتظام کیا گیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ایک صاحبزادی غار میں روزانہ کھانا پہنچائے گی اور ان کا ایک بیٹا روزانہ رات کو انھیں مکّہ کی صورتِ حال سے آگاہ کرے گا۔ رسولِ خدا اور حضرت ابوبکرؓ کی رُوپوشی سے ان کے اہلِ خانہ کو کچھ پریشانی تو ضرور ہوئی مگر کوئی سنگین واقعہ رُونما نہیں ہُوا۔ کفارِ مکہ نے رسولِ خدا کی جگہ ان کے اہلِ بیت کو سزا دینے سے گریز کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو نوجوان پیغمبرؐ کے قتل پر مامور کیے گئے تھے وہ تمام رات ان کے گھر کے باہر کھڑے رہے۔ لیکن اندر داخل نہیں ہوئے حالانکہ ان کی راہ میں کوئی رُکاوٹ نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ علی الصبح جب رسولِ خدا نمازِ فجر کی ادائیگی کے لیے کعبۃ اللہ جائیں گے تو وُہ ان پر حملہ کرکے انھیں تہ تیغ کر دیں گے۔ غالباً عرب کے رواج یا توہم پرستی کی وجہ سے انھیں حضورؐ کے گھر میں داخل ہونے کی جُرأت نہیں ہوئی۔

۱۳۷۔ کفّارِ مکّہ نے اب حضورؐ کی تلاش شروع کی۔ اُنھوں نے ایک کھوجی کی خدمات حاصل کیں اور رسولِ خدا کے نقشِ پا کی مدد سے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ یہ کھوجی نقشِ پا کی مدد سے کفارِ مکہ کو غارِ ثور کے دہانہ تک لے گیا، مگر وہاں مکڑی کے جالے اور کبوتر کے انڈے دیکھ کر کفار دھوکا کھا گئے۔ تین دن کی تلاش و جستجو کے بعد کفارِ مکہ کو یقین

ہوگیا کہ رسول اللہؐ مکہ کے آس پاس کہیں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے رسول اللہؐ کی گرفتاری کے لیے انعام مقرر کر دیا، مگر اس کے بعد نگرانی نرم ہوگئی۔ جب پیغمبرؐ نے غار کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو دو اونٹ اور ایک رہنما جس کا انتظام حضرت ابوبکرؓ نے کیا تھا آ گئے۔ اور یُوں یہ ننھا سا قافلہ مدینہ کی طرف روانہ ہُوا۔ قافلہ کا رہنما جان بوجھ کر معروف راستوں سے ہٹ کر چلتا رہا، جن پر کفارِ مکہ کے حلیفوں سے مُڈبھیڑ کا امکان تھا تاہم سراقہ بن مالک مُدلجی نے انھیں دیکھ لیا اور انھیں پہچان لیا۔ دراصل وہ اس انعام کے لالچ میں آ گیا جس کا اعلان کفارِ مکہ نے کر رکھا تھا۔ وہ ایک توہم پرست شخص تھا، اس نے رسولِ خدا اور ان کے رفیق کو نقصان پہنچانے کی سوچنے سے قبل تیر سے فال نکالی تو فال نفی میں تھی، چنانچہ انعام و اکرام کے لالچ کے باوجود وہ اس قافلے کی راہ روکنے سے گریزاں رہا۔ پھر جب وہ گھوڑے کے ریت میں ٹھوکر کھانے کے سبب گر گیا تو اس نے نہ صرف رسولِ خدا اور ان کے رفیق کی راہ روکنے کا خیال کلی طور پر ترک کر دیا بلکہ ان سے معافی مانگی اور انھیں اپنا مہمان بنانا چاہا مگر اس کی پیش کش شکریہ کے ساتھ مسترد کر دی گئی۔ رسولِ خدا اور صدیق اکبرؓ کو آٹھ دن تک طویل سفر کرنا پڑا۔ کسی روز انھیں اپنے زادِ سفر سے بہتر کھانے پینے کو مل جاتا۔ راستے میں ایک معمر خاتون اُمِ معبد کے خیمے میں انھوں نے ایک بوڑھی بکری دیکھی جو چلنے سے بھی معذور تھی اور چراگاہ تک بھی نہیں جا سکتی تھی، اُس روز معجزانہ طور پر اس بکری نے اتنا دودھ دیا جو رسولؐ خدا کے قافلہ کے علاوہ معمر خاتون کے خاندان کے لیے بھی کافی تھا۔ اثنائے راہ میں ایک اور واقعہ رُونما ہُوا: ینبوع کے قریب بنواسلم کے لوگوں نے قافلہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کی اس وقت رسولِ خدا بنواسلم کے علاقہ سے گزر رہے تھے۔ مگر قبیلہ کا سردار قرآن حکیم کی دلکش آیات سُنتے ہی مسلمان ہوگیا جس کے بعد اس نے رسولِ خدا اور ان کے رفقا کو "گارڈ آف آنر" پیش کیا۔ قبیلہ کے محافظ اس قافلہ کو اپنی حدود کے آخر تک چھوڑ آئے۔

۱۳۸۔ رسولِ خدا کی ہجرت کی اطلاع مدینہ پہنچ چکی تھی، شہر کے لوگ بے چینی سے ہادیِ برحق کے منتظر تھے۔ وہ روزانہ مدینہ کے جنوب میں قُبا کے قریب ایک بلند پہاڑی پر جسے ثنیات الوداع کہا جاتا ہے، جمع ہوتے اور تمام دن انتظار کرتے۔ ایک روز ـــــ پیر ۱۲ ربیع الاوّل/ ۳۱ مئی ۶۲۲ء ـــــ جب لوگ مایوس ہو کر پہاڑی سے واپس جا چکے تھے شہر میں ایک بلند مینار سے کسی نے دُور سے ایک مختصر قافلہ شہر کی سمت بڑھتے دیکھا۔ چنانچہ لوگ دوبارہ رسول اللہؐ کے استقبال کے لیے جمع ہُوئے انہوں نے اپنا بہترین لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اور وہ پُوری طرح مسلح تھے لڑکوں اور لڑکیوں نے دفیں سنبھالیں وُہ ایسی مسرت اور خلوص سے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، ہم آہنگ ہو کر ایک استقبالیہ نظم گا رہے تھے: ؎

طلع البدر علینا ‏ ‏ ‏ من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ‏ ‏ ‏ ما دعا للہِ داع
ایّھا المبعوث فینا ‏ ‏ ‏ جئت بالامر المطاع

(چودھویں کا چاند ہمارے سامنے نکلا ثنیات الوداع سے

جب تک اللہ سے دعائیں کی جاتی رہیں، اس وقت تک اس کا شکر ادا کرنا ہم پر فرض ہے
اے! کہ اللہ نے تمھیں ہمارے لیے بھیجا۔ تُو ایسے احکام لایا جن کی اطاعت فرض ہے)

۱۳۹۔ قُبا کے قریب پہنچ کر رسولِ خدا نے کھجوروں کے ایک جھُنڈ میں کچھ دیر آرام کیا۔ یہاں ایک کے بعد لوگوں کا دُوسرا گروہ آتا رہا اور رسولِ خدا کی خدمت میں سلامِ نیاز پیش کر کے ان کا خیر مقدم کرتا رہا۔ فوراً ہی رسولِ خدا نے دُوسرے لوگوں سے مل کر یہاں ایک جھونپڑی تعمیر کی جو مسجد کا کام دیتی تھی۔ رسولِ خدا پانچوں وقت نماز کی امامت فرماتے۔ اپنا باقی وقت وہ تبلیغِ اسلام میں صرف کرتے، لوگوں کو نیکی اور احسان کی تلقین فرماتے اور عام لوگوں کے جن میں مدینہ کے انصار اور مکہ کے مہاجر شامل تھے مسائل حل کرنے کی سعی فرماتے۔ مکی مہاجرین کے پاس روزگار کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چند روز بعد رسولِ خدا قُبا کے نزدیک اپنے عارضی مستقر سے نکلے تاکہ اپنے مستقل قیام کا انتظام کر سکیں۔ وہ ناقہ پر سوار تھے۔ ہر قدم پر ایک وفد آتا اور رسولِ خدا سے اپنے ہاں قیام کی استدعا کرتا، وہ ایک ہی جواب دیتے: "میری ناقہ میرے قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرے گی، اسے نہ روکو، وہ جس جگہ چاہے گی بیٹھ جائے گی۔" ناقہ چلتی رہی اور کئی کلومیٹر سفر کے بعد ایک کھلی جگہ پر بیٹھ گئی۔ رسولِ خدا نے اسے ایڑ لگا کر اٹھایا تو وہ چند قدم چل کر واپس آئی اور پھر اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں سے اسے اٹھایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی جگہ کو اپنے نبیؐ کے قیام کے لیے پسند فرما لیا تھا جس جگہ اونٹنی پہلے بیٹھی ہوئی تھی اور اٹھائے جانے کے بعد جہاں تک جا کر واپس اپنی جگہ آ گئی تھی، زمین کا وہ ٹکڑا تھا جسے پیغمبرؐ کو اپنے لیے منتخب کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہ قطعہ زمین خرید لیا "تاکہ وہاں ایک مسجد اور چند کمرے بنائے جا سکیں جن میں رسول اللہؐ اور ان کے اہلِ بیت رہ سکیں۔ اس قطعۂ زمین کے قریب ایوب سلطان (ابو ایوبؓ انصاری جو اب استنبول میں ابدی نیند سو رہے ہیں) کا مکان تھا۔ وہ رسولِ خدا کے دادا حضرت عبدالمطلب کی والدہ کے قبیلہ میں سے تھے۔ اس غیر متوقع اور اللہ کے فرستادہ مہمان کی آمد پر ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ رسولِ خدا کا سامان اپنے گھر لے گئے اور اپنے گھر کی تعمیر تک رسولِ خدا ابو ایوبؓ انصاری کے مہمان رہے۔

مہاجرین کی آبادکاری

۱۴۰۔ سینکڑوں مکی مسلمان مدینہ میں پناہ لے چکے تھے۔ ان کی یہاں کوئی جائیداد وغیرہ نہ تھی۔ انھیں مقامی معیشت میں کھپانا وقت کی اشد ضرورت تھی۔ خود رسول اللہؐ کو بھی ایک حد تک یہی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ مکہ سے کچھ رقم لائے تھے جس سے انھوں نے متعدد اونٹنیاں اور بکریاں خریدیں جن سے ان کے اہلِ بیت اور گھر میں آنے والے مہمانوں کی ضروریات بخوبی پُوری ہونے لگیں: کھانے کے وقت جو شخص بھی موجود ہوتا رسولِ خدا اسے کھانے میں شریک کر لیتے۔ متعدد مدنی مسلمانوں نے اپنے اپنے باغ میں ایک ایک کھجور کا پھل حضورؐ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ بعد میں رسول اللہؐ نے مدینہ، خیبر اور فدک میں زرعی زمینیں خریدیں۔ یہ زمینیں مُسلم ریاست کی ملکیت تھیں، ان کی پیداوار سے رسولِ خدا اپنی اور اپنے اہلِ بیت کی ضروریات پوری کرتے اور جو کچھ بچ جاتا وہ بیت المال کے سپرد کر دیتے تاکہ نادار اور ضرورت مند مسلمانوں کی حاجت پُوری کی جا سکے۔ مدینہ کا ایک خاندان رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے اپنا دس سالہ بیٹا انس حضورؐ کی خدمت میں بطور ملازم پیش کیا۔ یہ خاندان

اپنے اس فرزند پر فخر کرتا تھا کیونکہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں لکھ پڑھ سکتا تھا۔

۱۴۱۔ مکی مہاجروں کی فلاح و بہبود کے ضمن میں رسولِ خداؐ نے ایک اجلاس عام طلب کیا۔ انھوں نے تجویز کیا کہ مدینہ کے باوسیلہ اور متمول مسلمان ایک ایک مکی کو اپنا بھائی بنا لیں۔ دونوں بھائیوں کے خاندان مل کر کمائیں اور کھائیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ترکہ میں بھی حصہ دار ہوں۔ رسولِ خداؐ کی تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ انھوں نے خود انفرادی خوبیوں کی بنا پر ایک ایک مکی اور ایک ایک مدنی کا انتخاب کر کے انھیں بھائی بھائی بنا دیا[1]۔ یہ انتظام کئی سال تک جاری رہا۔ مکی مسلمان طفیلی بن کر رہنے کے خواہشمند نہیں تھے۔ جب انھوں نے محنت سے کافی دولت پیدا کر لی تو انھوں نے اپنے مکی بھائیوں کی املاک ان کے سپرد کر دیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر آزادانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔

۱۴۲۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے: حضرت عمرؓ نے اپنے مدنی بھائی سے کہا "ایک دن میں آپ کے باغ کو سینچنے کا کام کروں گا اور آپ دربارِ رسالت میں حاضری دیں۔ اس روز جو آیاتِ قرآنی نازل ہوں، سیاسی اور معاشرتی فیصلے کیے جائیں اور جو کچھ بھی پیش آئے شام کو مجھے سب کچھ بتائیں۔ اگلے روز آپ باغ میں کام کریں اور میں رسول اللہؐ کی خدمت میں رہوں اور جو کچھ گزرے آپ کو بتاؤں۔ ایک اور مکی عبدالرحمان ابن عوف کو اس کے مدنی بھائی نے کہا: "یہ میری جائداد ہے، اس کا نصف آپ کی ملک ہے۔ میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے آپ ایک کا انتخاب کر لیں، میں اسے طلاق دے دوں گا اور آپ اس سے شادی کر لیں۔۔۔۔" اس پر ابن عوف نے کہا "خدا آپ کو آپ کی املاک اور اہلِ خانہ مبارک کرے مجھے صرف مقامی منڈی کا راستہ بتا دو۔۔۔۔" عبدالرحمان ابنِ عوف منڈی میں گئے، انھوں نے کچھ اشیا ادھار خریدیں اور اسی وقت فروخت کر دیں، انھوں نے دن میں یہ عمل کئی بار دہرایا۔ شام تک کی خرید و فروخت کے بعد انھوں نے اتنا کما لیا کہ نہ صرف دکانداروں کا تمام قرضہ بیباق کر دیا بلکہ ان کے پاس رات کے کھانے کے لیے کافی پیسے بچ گئے۔ چند روز بعد وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے نیا قیمتی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے نئی نئی شادی کی ہے۔ جلد ہی عبدالرحمان بن عوف کا شمار مدینہ کے متمول ترین تاجروں میں ہونے لگا۔ وہ بڑے مخیّر اور غریب پرور تھے، اور اسلام کی سربلندی کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔

مکیوں کا ردِ عمل

۱۴۳۔ کفارِ مکہ نے رسولِ خداؐ کے یوں بچ کر مدینہ چلے جانے کا بہت برا منایا۔ انھوں نے ایک وفد مدینہ بھیجا اور مطالبہ کیا کہ رسولِ خداؐ کو مدینہ سے نکال دیا جائے یا ان کے سپرد کیا جائے۔ انھوں نے دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مدینہ والوں کو سنگین نتائج بھگتنا ہوں گے۔ کفارِ مکہ کا یہ وفد بے نیلِ مرام واپس گیا مگر ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ اب کچھ ہو کر رہے گا اور ہمیں اپنے دفاع اور سلامتی کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہییں۔ اس واقعہ کے دو اہم اور دور رس نتائج نکلے: مدنی ریاست کا آئین مرتب ہوا اور مدینہ کے

---

[1] تاریخِ اسلام میں اس واقعہ کو "مواخات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

اردگرد ایک بفرسٹیٹ کا قیام عمل میں آیا۔

مدنی ریاست رسولِ خدا نے مدینہ کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک عام اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس آنحضورؐ کے ذاتی ملازم اُنس کے والد کے گھر پر ہوا۔ امام بخاری کے مطابق رسولؐ اللہ نے اس اجلاس میں تجویز پیش کی کہ مدینہ کے لوگوں میں باہمی تنازعات کے خاتمہ اور کسی بیرونی حملہ آور کی حوصلہ شکنی کے لیے مدینہ کی ایک ریاست قائم کی جائے۔ یہ ریاست ایک کنفیڈریشن ہو جس کے تمام یُونٹوں کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہو۔ کسی جُرم کے بارے میں سزا کے خلاف ریاست کے سربراہ سے اپیل کی جا سکے گی۔ سربراہِ مملکت کو جنگ یا امن کے دنوں میں کسی مہم کے لیے افراد کے قطعی انتخاب کا اختیار ہوگا۔ سماجی تحفظ کے لیے بھی ایک مضبوط نظام قائم کیا گیا۔ خون بہا کی صورت میں بھاری رقم متعین کی گئی جو اس صورت میں ادا کرنا ضروری تھی جب قتل کے مجرم کو سزائے موت نہ دی جائے۔ دشمن سے جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

معاہدے کی تمام دفعات پر اتفاق رائے کے بعد انھیں ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ یہ معاہدہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہے جو کسی سربراہِ مملکت نے جاری اور نافذ کیا ہے۔ اس تاریخی دستاویز کی تفصیل درج ذیل ہے جو "میثاق النبی" کے عنوان سے معروف ہے:

میثاق النبیؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

یہ تحریری معاہدہ[1] مدینہ کے مندرجہ ذیل طبقوں کے درمیان ہے:

ا۔ محمد نبی رسول اللہ

ب۔ مسلمان قریشِ مکہ از ساکنین شہر مدینہ

ج۔ مدینہ کے مسلمان

د۔ مدینہ کے یہودی

ہ۔ مدینہ کے نصرانی

و۔ مدینہ کے غیر مسلم۔

---

[1] دنیا کے پہلے تحریری دستور یا آئین کی حیثیت سے یہ معاہدہ جسے "میثاق النبی" بھی کہا جاتا ہے بے حد اہم دستاویز ہے جو ہم تک لفظ بلفظ پہنچی ہے۔ اس معاہدہ کا متن اسی مصنف (علامہ محمد حمید اللہ، پیرس) کی عربی کتاب "مجموعہ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ راشدہ" جس کا اردو ترجمہ "سیاسی وثیقہ جات از عہدِ نبوی تا بہ خلافتِ راشدہ" کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیا ہے، بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

دفعہ اول ——— متذکرۃ الصدور ہر شش گروہ سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دفعہ دوم ——— ان میں سے ہر ایک گروہ فرداً فرداً مندرجہ ذیل امور کا ذمہ دار ہے اور اس دفعہ میں مدینہ کے مندرجہ ذیل گروہ بھی شامل ہیں:

۱۔ بنو عوف	۲۔ بنو حارث از قبیلہ خزرج
۳۔ بنو ساعدہ	۴۔ بنو جشم
۵۔ بنو نجار	۶۔ بنو عمرو بن عوف
۷۔ بنو نبیت	۸۔ بنی اوس

دفعہ سوم ——— ۱۔ کوئی گروہ دیت کی مقررہ حدوں میں تخفیف کی راہ پیدا نہ کرے۔

۲۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے مظلوم حلیف (موالی) کے مقابلے میں اپنے حلیف (موالی) کی ناحق حمایت نہ کرے۔

۳۔ جو شخص باہم ادائے دیت میں سفارش کی راہ پیدا کرنے کی سعی کرے اس شخص کے خلاف دوسرے مسلمانوں کو ورثائے قتیل کی مناسب طرفداری کرنا ہوگی۔

۴۔ جو مسلمان خود یا اس کا بیٹا جماعت میں فساد اور تفرقہ پیدا کرنے میں ساعی ہو، اس کے خلاف تمام مسلمانوں کو یک جا ہو کر یہ فتنہ فرو کرنا ہوگا۔

۵۔ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کافر مارا جائے تو دوسرے مسلمان کا کافر کی حمایت میں مسلمان پر جور و تعدی کرنا خلافِ معاہدہ ہوگا۔

۶۔ اگر کافر مسلمان کے درپے ہو تو کسی مسلمان کو ایسے کافر کی حمایت نہ کرنا ہوگی۔

۷۔ مسلمانوں کا ہر فرد یکساں طور پر خدا کی پناہ میں ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوستدار ہیں۔

دفعہ چہارم ——— ۱۔ مسلمان کے لیے کسی یہودی کے ایسے معاملہ میں مدد کرنے کا کوئی حرج نہیں جس سے وہ یہودی مسلمان کے انصاف پر اطمینان حاصل کر سکے۔

۲۔ مسلمان کے لڑائی میں شہید ہونے کے بعد کسی دوسرے مسلمان پر اُس کی ذمہ داری عاید نہ کی جائے گی۔

۳۔ تمام مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

۴۔ کوئی مسلمان کسی مشرک کو مسلمان کے خلاف پناہ نہ دے گا، نہ کسی ایسے مال کا ضامن ہوگا جو مشرک نے ناجائز طور سے مسلمان کے مال سے حاصل کیا ہو، اور نہ کوئی مسلمان مشرک کی حمایت میں مسلمان کے درپے ہوگا۔

۵۔ مومن کے قتل ناحق پر اگر ورثائے قتیل رضامندی سے دیت لینے پر مائل نہ ہوں تو قاتل کو جلاد کے حوالے کیا جائے گا۔

۶۔ جو مسلمان اس معاہدہ میں شامل ہے، اگر وہ دل سے خدا تعالیٰ اور روزِ محشر پر ایمان لا چکا ہے تو اسے کسی مفسد کی

حمایت نہ کرنا ہوگی۔ مفسد کو پناہ دینا بھی اس کی حمایت میں شامل ہے۔ ایسے بے انصاف مسلمان پر دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی لعنت اور عذاب ہے، جس عذاب کے بدلے میں اس سے کوئی بدل قبول نہ کیا جائے گا۔

ذیلی دفعہ (نمبر ۷) بلا استثنا تمام مسلمانوں پر لاگو ہے۔

۷۔ مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں خدا اور محمد (رسول اللہ) کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں گے۔

یہود شہر کا ئے معاہدہ کے لیے ۱۔ مسلمانوں کی جنگوں میں ان کی مالی اعانت کرنا ہر یہودی پر واجب ہوگا۔

۲۔ قبیلہ عوف کے تمام یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق کی حیثیت سے مل کر رہنا ہوگا۔ مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔

۳۔ یہ ذمہ داری بنو عوف کے غلاموں پر بھی ان کے آقاؤں کی مانند عاید ہوگی اور عدم پابندی کی صورت میں ان کے آقا ان کی طرف سے جواب دہ ہوں گے۔ سرکشی کی صورت میں نہ صرف بنو عوف کے مرد بلکہ ان کے بال بچوں پر بھی مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ اس دفعہ میں مدینہ کے مندرجہ ذیل یہود بھی شامل ہیں:

۱۔ بنو نجار — ۲۔ بنو حارث

۳۔ بنو ساعدہ — ۴۔ بنو ثعلبہ اور ان کے حلیف

۵۔ بنو جشم — ۶۔ جُفنہ جو بنو ثعلبہ کی شاخ ہے

۷۔ بنو شطبیہ

الغرض یہ دفعہ ہر یہودی قبیلہ کے حلیفوں پر لاگو ہے۔

۵۔ ان میں سے کوئی فرد یا شاخ یا قبیلہ اس دفعہ سے محمد (صلعم) کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ قرار نہیں پا سکتا۔

۶۔ نہ ان میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی کو مجروح کرنے پر مواخذہ سے بری الذمہ قرار پا سکتا ہے۔

۷۔ ان میں جو فرد یا جماعت قتلِ ناحق کا ارتکاب کرے اس کا وبال اس کی ذات اور اہل و عیال سب پر آسکتا ہے۔

۸۔ اِن (یہود) میں سے کسی پر ناحق ایسی تہمت پر اس کا ناصر اور حامی خدا ہے۔

۹۔ مسلمان اور یہود دونوں اپنے مصارفِ زندگی کے خود کفیل ہوں گے۔

۱۰۔ دونوں میں سے جو فرد اس قرارداد سے منحرف ہوگا دُوسرا فریق اس باغی پر قابُو حاصل کرنے میں پہلے فریق کا معاون ہوگا۔

۱۱۔ یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے گروہ اور فرد کے ساتھ صلح اور نصیحت پر عامل رہیں گے اور صلح و نصیحت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی درمیان نہ آنے دیں گے۔

۱۲۔ فریقین میں سے کوئی فرد یا جماعت دوسرے فریق کی حق تلفی گوارا نہ کرے گی البتہ ایک دوسرے گروہ کے مظلوم کی حمایت کرنا اس کا فرض ہوگا۔

۱۳۔ مسلمان جب تک اپنے دشمنوں سے مصروف پیکار رہیں یہود ان کی مالی اعانت کرتے رہیں گے۔
۱۴۔ شہر مدینہ میں ایک دُوسرے فریق کے ساتھ جنگ کرنا حرام ہے۔
۱۵۔ ہر فرد اپنے ہمسائے کی طرفداری اپنے نفس کی مانند کرتا رہے گا۔
۱۶۔ اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ باہمی اختلاف اور تنازعہ کا مقدمہ خدا اور اس کے رسول محمد (صلعم) کے سامنے پیش کریں گے۔
۱۷۔ شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریشِ مکہ کو اپنے ہاں پناہ نہ دے گی اور نہ قریشِ مکہ کے کسی حلیف کی حمایت کرے گی۔
۱۸۔ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریق کی حمایتی ہو گی۔
۱۹۔ شرکائے قرارداد کسی جماعت کی طرف سے دشمن کے ساتھ مصالحت میں دوسرے گروہ میں شریک نہ ہوں گے۔
۲۰۔ دشمن سے صلح کی صورت میں اگر کسی نوع کی منفعت ہو گی تو مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکائے قرارداد بھی اس سے نفع اندوز ہوں گے۔
۲۱۔ البتہ جو شخص اپنے دین سے منحرف ہو جائے اس کے لیے یہ دروازہ بند رہے گا۔
۲۲۔ جنگی حالت میں فریقِ معاہدہ کے ہر فرد کو مالی اعانت میں اپنا حصہ ادا کرنا ہو گا۔
۲۳۔ قبیلہ اوس کے یہود اور ان (یہود) کے موالی (حلیف) بھی اس قرارداد کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح وہ قبائل جن کا نام بنام ذکر اوپر آچکا ہے۔

حرفِ آخر ۱۔ اس معاہدہ کی خلاف ورزی ظالم اور مفسد کے سوا اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔
۲۔ جو شخص مدینہ میں خلوص اور امن کے ساتھ سکونت رکھے اور وُہ شخص جو مدینہ سے خلوص اور امن کے ساتھ کسی اور جگہ نقلِ مکانی کرنا چاہے ان دونوں پر کوئی مواخذہ نہیں لیکن فساد اور شرارت کرنے کے لیے قیامِ مدینہ اور یہاں سے ترکِ اقامت دونوں پر گرفت ہے۔
۳۔ جو شخص دوسروں کے ساتھ بھلائی کا طلب گار رہے خدا تعالیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے خیر اندیش ہیں۔

دفاعی معاہدے

۱۴۵۔ داخلی امن مستحکم ہو جانے کے بعد رسولِ خدا نے مدینہ سے باہر آباد قبائل سے رابطہ پیدا کیا۔ پیغمبر نے ان قبائل سے خاص طور پر تعلق پیدا کیا جن کے علاقوں میں سے قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے گزر کر عراق، شام یا مصر کی طرف آتے جاتے تھے۔ رسولِ خدا ان قبائل کے ساتھ بیرونی حملہ کے خلاف باہم فوجی امداد کی بنیاد پر دفاعی معاہدے کرنے میں کامیاب رہے۔ معاہدہ کے مطابق مسلمانوں کے فوجی دستے ان قبائل کے علاقوں میں گشت کرنے کے مجاز تھے مگر کافروں کو ایسا کرنے کی اجازت نہ تھی۔

۱۴۶ ۔ جن قبائل کے ساتھ رسولِ خدا نے معاہدے کیے ان میں ضمرہ، جہینہ اور مزینہ نامی قبائل شامل تھے۔ یہ قبائل علی الترتیب مدینہ کے جنوب، شمال اور مغرب میں آباد تھے۔ بڑے شہر عموماً آس پاس آباد خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کی مصنوعات اور پیداوار کی منڈیاں ہوتے ہیں۔ مدینہ کے اردگرد رہنے والے ان قبائل کی معیشت کا انحصار بھی مدینہ کی منڈی پر تھا اور ان کے سامنے اس کا کوئی تبادل بھی نہ تھا۔ ممکن ہے زمانہ قبل از اسلام کے دوران اہلِ مدینہ اور بعض نواحی قبائل کے درمیان بھی معاہدے موجود رہے ہوں، جیسا کہ قبیلہ جُہینہ کے سردار کے ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے: مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ اس کے علاقہ میں گیا تاکہ قریشِ مکّہ کے ایک تجارتی قافلے کی راہ روک سکے، مگر علاقہ کے قبائلی سردار مجدی ابن عمرو نے جو دونوں فریقوں کا دفاعی حلیف تھا مداخلت کی اور مسلمانوں کا فوجی دستہ کارروائی کے بغیر ہی واپس مدینہ آگیا۔

۱۴۷ ۔ بنوضمرہ ابوذر غفاریؓ کا قبیلہ تھا جو ظہورِ اسلام کے شروع میں ہی ایمان لائے تھے۔ بنوضمرہ سے مسلمانوں کا جو دفاعی معاہدہ ہوا ممکن ہے اس میں ابوذر غفاریؓ کا اثر و رسوخ بھی کارفرما رہا ہو۔ اس معاہدہ میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ اگر مذہب کی بنیاد پر جنگ شروع ہو جائے تو بنوضمرہ اس میں شریک نہ ہوں گے گو بنوضمرہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے، مگر انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بنوضمرہ، بنوغفار، بنو رُبعہ اور بنو زُرعہ جو قبیلہ جہینہ کی شاخیں ہیں، سے کیے جانے والے معاہدات کے متن ہم تک پہنچے ہیں مگر مزید جنوب میں آباد بنومدلجی کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کا متن معلوم نہیں ہو سکا تاہم اس معاہدہ کی دفعات یقیناً دیگر معاہدوں کے مطابق ہی ہوں گی۔ بنو مدلجی کے سراقہ کا رویہ ـــــــ جس نے سفرِ ہجرت کے وقت رسولِ خدا اور ان کے رفقا کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی ـــــــ نہایت ہمدردانہ تھا۔ اور جب رسولِ خدا کفارِ مکّہ کے ایک تجارتی قافلہ کے خلاف کارروائی کے لیے العشیرہ گئے تو سراقہ نے پورے فوجی دستہ کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف دعوت دی، اس دعوت کی وجہ سے مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ہو گیا اور دشمن کے تجارتی کاروان سے ان کی مُڈبھیڑ نہ ہو سکی۔

۱۴۸ ۔ ایسے دفاعی معاہدوں کے ذریعے رسولِ خدا نے "اسلامی ریاست" کی سلامتی اور دفاع کو روز افزوں مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ معاہدوں کی وجہ سے پُرامن طور پر کام کرنے کی راہ ہموار ہو گئی اور دینِ اسلام ان قبائل میں سرایت کرنے لگا جن سے رسول اللہؐ نے دفاعی معاہدے کیے تھے۔ جلد ہی بنوضمرہ میں سے اسلام کو بہترین سفیر میسر آیا۔ یہ عمرو بن امیہ الضمری تھے۔ وہ رسولِ خدا کے اس قدر وفادار تھے کہ ابھی انھوں نے اسلام بھی قبول نہیں کیا تھا جب رسول اللہ نے جنگِ بدر کے بعد انھیں اپنا سفیر بنا کر حبشہ کے شاہِ نجاشی کے دربار میں بھیجا تاکہ وہاں اسلام کے خلاف کفارِ مکّہ جو سازشیں کر رہے ہیں ان کا توڑ کیا جائے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۴۹ ۔ جب مدینہ کے آس پاس کے قبائل سے دفاعی اور دوستانہ معاہدے مکمل ہو گئے تو رسولِ خدا نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کفارِ مکہ پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ قریشِ مکّہ کے تجارتی قافلے شمال کی طرف سفر کرتے وقت انہی علاقوں سے گزرتے تھے جن علاقوں کے قبائل سے مسلمانوں نے معاہدے کر رکھے تھے۔ رسولِ خدا کا یہ اقدام اخلاقی اعتبار سے بالکل درست تھا۔ کفارِ مکّہ نے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کی املاک ضبط کر لی تھیں۔ فریقین حالتِ جنگ میں تھے دُنیا بھر

میں یہی دستور ہے کہ دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کیا جائے، قتل کیا جائے اور دشمن کی املاک لوٹ لی جائیں۔ کفارِ مکہ اپنی تجارت سے حاصل ہونے والے منافع کو مدینہ کے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں صرف کر رہے تھے۔ رسولِ خداؐ نے تو کفارِ مکہ سے صرف یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسلامیانِ مکہ کے زیرِ اثر علاقوں میں سے آمد و رفت بند کر دیں۔ ان کے تجارتی قافلوں پر چھاپے تو محض ایک سزا تھی، کفار نہ اسلامی علاقے میں سے گزرتے اور نہ ہی ان کے کاروان خطرے میں پڑتے۔

باب ۶

مکّہ سے تعلقات

۱۵۰۔ مکّہ بنجر علاقہ ہے، نہ وہاں زراعت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی صنعت کا وجود ہے۔ لوگوں کا واحد ذریعۂ روزگار تجارت ہے۔ اُن دنوں یمن کی یورپ سے تجارت شام کے ذریعے ہوتی تھی اور تجارتی قافلے مکّہ سے ہوکر گزرتے تھے۔ مکّہ والوں کے تجارتی قافلے سردیوں اور گرمیوں میں (القرآن ۱۰۶/۲) ان کے لیے خوشحالی اور آسودگی کا پیام لاتے تجارت کی غرض سے محض یمن تک جانا بے سُود تھا جب تک شام تک کا سفر اختیار نہ کیا جائے اور وہاں یمنی مصنوعات کا لین دین نہ کیا جائے۔ اگر ان تجارتی قافلوں کا مدینہ کا راستہ بند کر دیا جاتا تو ان کے مفادات پر سخت زد پڑتی۔ چنانچہ مکّی بزورِ شمشیر مدینہ کا راستہ کھولنا چاہتے تھے۔ یہ بات ہی مسلمانوں کے ساتھ کفارِ مکّہ کے مسلح تصادم کا باعث بنی۔ پہلی جنگ بدر میں ہُوئی اور اس کے بعد دو جنگیں (جنگِ اُحد اور جنگِ خندق) مدینہ میں لڑی گئیں۔ آخری جنگ مکّہ میں ہُوئی جو مسلمانوں کے لیے فتح کی خوشخبری کی پیغامبر ثابت ہُوئی۔

۱۵۱۔ محض یہ پابندی کہ کفارِ مکّہ کے قافلے اسلامی سرزمین میں سے نہ گزریں' کافی نہ تھی۔ چنانچہ جونہی مدینہ کے آس پاس آباد قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدے مکمل ہوگئے، رسولِ خدا نے مسلم فوج کے دستے ان علاقوں میں بھیجنے شروع کیے تاکہ کفارِ مکّہ کے ایسے قافلوں کو ہراساں کیا جا سکے جو مسلمانوں کی عاید کردہ پابندی کا احترام نہ کریں اور مسلمانوں کی علاقائی حدود کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں۔ کھلے صحرا میں یہاں آبادی کم ہوتی ہے، کسی علاقے میں مداخلت آسان ہوتی ہے خصوصاً مکّی قافلوں کے لیے یہ کام اور بھی آسان تھا کیونکہ وہ شب میں سفر کرتے تھے۔ علاقہ میں چھوٹے چھوٹے پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے تجارتی راستوں پر کنٹرول اور بھی مشکل تھا۔ چنانچہ دس میں سے ایک مسلم گشتی دستہ کافروں کے کسی تجارتی قافلہ سے رابطہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا۔ قافلوں پر چھاپہ مارنے کے لیے ان کی نقل و حرکت کی بالکل صحیح اطلاع ناگزیز ہوتی ہے۔ شروع شروع میں مسلمانوں کو پوری اطلاعات نہیں مل رہی تھیں۔ جب اسلامی علاقہ میں توسیع ہُوئی اور مسلمانوں کا اثر و نفوذ بڑھا تو دشمن کے قافلے ایک ہی رات میں اسلامی علاقہ سے گزر نہیں سکتے تھے جس کے باعث تجارتی راستوں پر مسلمانوں کا کنٹرول موثر ہوگیا۔ مگر یہ سب کچھ تحمل اور مسلسل نگرانی سے ممکن ہو سکا۔

۱۵۲۔ فطری طور پر کفارِ مکّہ آسانی سے شکست تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جب انھیں اطلاع ملی کہ ان کے ایک بڑے تجارتی قافلہ کا بدر کی گھاٹی میں تعاقب کیا جا رہا ہے تو انھوں نے ایک بڑی فوج جمع کی تاکہ مسلمانوں کو سبق سکھایا جا سکے لیکن وُہ بُری طرح ناکام رہے۔ (جنگِ بدر میں) مسلمانوں نے رسولِ خدا کی قیادت میں دشمن کو جو تعداد میں ان سے تین گنا تھا تہس نہس کر دیا۔ ستر کافر کھیت رہے اور تقریباً اتنے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں جنگی قیدی بن گئے۔ بعد میں انھیں فدیہ لے کر

رہا کر دیا گیا۔ مگر رسولِ خدا کی طرف سے اس نرم رویّہ کا کوئی مفید اثر نہ ہوا، کافروں کے دل نہ بدلے بلکہ وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنے حلیفوں سے فوجی امداد حاصل کی اور کرائے کے سپاہی بھرتی کیے۔ انھوں نے شاہ نجاشی کے دربار میں ایک اور وفد بھیجا تاکہ اسے اہلِ اسلام کے خلاف بھڑکا کر ان مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوایا جائے جو وہاں پناہ گزیں تھے۔ حضور پاکؐ کو بھی ——— غالباً مکّہ میں اپنے وفادار ایجنٹوں کے توسط سے ——— اس کی اطلاع مل گئی، چنانچہ اُنھوں نے اپنا ایک خصوصی سفیر عمرو بن اُمیہ الضمری جو بنوضمر کا سردار تھا، شاہِ حبشہ کے دربار میں بھیجا اور اس طرح کفارِ مکہ کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ شاہِ نجاشی کو ایک بار ملک میں بغاوت اور خانہ جنگی کی وجہ سے ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا تھا اور اس نے جلاوطنی کا یہ عرصہ بنوضمر کے پاس گزارا تھا (السہیلی) ممکن ہے اُسی وقت سے عمرو ابن امیہ الضمری کے شاہ نجاشی سے دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

۱۵۳ – اسی اثنا میں مشرکینِ مکّہ نے مدینہ پر فوج کشی کر دی، چنانچہ مسلمانوں اور کافروں میں کوہِ اُحد کی وادی میں جنگ ہُوئی۔ دشمن فوج کی تعداد مُسلم فوج سے چار گنا تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی پہنچایا مگر جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ ایک ہی جھڑپ کے بعد دشمن پسپا ہوگیا اور مکہ لوٹ گیا، تاہم کفار کے تجارتی راستے بدستور مسدود رہے۔ مکّی تجّار نے راستہ میں تبدیلی کی اور صحرائے نجد میں سے گزر کر عراق پہنچنے کی کوشش کی مگر مسلم فوج کے ایک دستے کے بہادرانہ حملہ کے بعد جس میں کفّار کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، مکّی تاجروں کو اس راستے پر دوبارہ سفر کی جُرأت نہ ہوئی۔ اس طرح دشمنانِ اسلام کی تجارت بند ہو کر رہ گئی۔ دشمن کا مستقبل تاریک ہوگیا انھیں روز افزوں مایوسی نے گھیر رکھا تھا کہ اچانک انھیں امید کی کرن نظر آئی اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک اور کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ مدینہ کے یہودی قبیلہ بنونضیر کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا کیونکہ انھوں نے ایک مسلم خاتون کی بے حُرمتی کی تھی اور جب ایک مسلمان اس خاتون کی مدد کو آیا تو بنو نضیر نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مسلم حکومت نے جب مجرموں کے خلاف کارروائی کرنا چاہی تو بنونضیر نے ہتھیار سنبھال لیے اور مزاحمت کی۔ مدینہ سے نکلنے کے بعد بنو نضیر نے خیبر کو اپنا مسکن بنایا اور مسلمانوں کے خلاف ایک وسیع سازش میں مصروف ہوگئے۔ انھوں نے مکّہ سے دفاعی معاہدہ کیا اور بنوغطفان اور بنوسلیم سے کرایہ کے فوجیوں کی خدمات حاصل کیں تاکہ مسلمانوں پر بیک وقت حملہ کیا جا سکے۔ کفّارِ مکّہ نے بھی اپنے حلیفوں اور دوستوں سے کمک طلب کی۔ کفّار کی فوج مدینہ کے محاصرہ کے لیے آئی، اس کی تعداد مسلمانوں سے آٹھ گنا سے بھی زیادہ تھی۔ اب وہ محض ایک آدھ جھڑپ پر اکتفا کرنے کو تیار نہ تھے پیغمبرِ اسلام کو کفّارِ مکہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع کافی عرصہ پہلے مل چکی تھی اور وہ شہر کے دفاع کے لیے موثر انتظامات کر چکے تھے۔ رسول اللہ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی۔ خواتین اور بچّوں کو ان قلعہ بندیوں میں منتقل کر دیا جو شہر کے اندر کافی تعداد میں موجود تھیں، یہ قلعہ بندیاں اتنی بڑی تھیں کہ ان میں بھیڑوں کے ریوڑ بھی رکھے جا سکتے تھے۔ جنگ شروع ہوگئی، دشمن نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا مگر کئی ہفتے گزرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، فوج کفار کے رسد کے ذخائر اور گھوڑوں کے لیے چارہ ختم ہوگیا۔ پھر حج کا زمانہ آگیا جس کے بعد عاشورہ محرم تھا جس کے دوران جنگ ممنوع تھی۔ مکّی بھی ان دنوں خونریزی سے

گریز کرتے تھے۔ پھر وہ حجِ کعبہ کے لیے مکہ آنے والوں سے جو کمائی کرتے تھے وہ اس سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ ان دنوں جنوری کا سرد موسم تھا۔ ان تمام عوامل نے مل کر اہلِ مکّہ کو مدینہ کا محاصرہ ختم کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ گھروں کو لوٹ گئے۔

۱۵۴۔ کفارِ مکّہ کے لیے یہ صورتِ حال انتہائی مایوس کن تھی۔ انھیں نوشتۂ دیوار صاف نظر آ رہا تھا۔ انھی دنوں مکّہ میں قحط رُونما ہوا کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی۔ پیغمبرِ اسلام نے قحط زدہ افراد کی امداد کے لیے پانچ سو اشرفیاں مکہ بھجوائیں۔ انھوں نے مکّہ کے سردار ابوسفیان کو کھجوروں کی بھاری مقدار بھی بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ ان کھجوروں کے بدلے کھالیں بھجوا دے جو وہ تجارتی راستے بند ہونے کی وجہ سے برآمد نہیں کر سکا تھا۔ یہ باور کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ رسولِ خدا نے ابُوسفیان کو یقین دلایا تھا کہ اس کے تجارتی قافلوں کو بلا روک ٹوک اسلامی سلطنت کے راستوں سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ درحقیقت چند ہفتے بعد جب رسولِ خدا حُدیبیہ کی مہم پر گئے جو مکّہ کے نواح میں ہے، تو ابوسفیان مکّہ میں موجود نہ تھا بلکہ وُہ شام میں تھا جہاں اس نے بیت المقدس میں رومی بادشاہ ہرقل سے ملاقات کی۔ ہرقل ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد اظہارِ تشکر کے لیے بیت المقدس آیا تھا۔ انھی دنوں رسول اللہؐ نے ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہؓ سے نکاح بھی کیا۔ وُہ اسلام قبول کر چکی تھیں اور حبشہ میں پناہ گزیں تھیں۔ ان کا شوہر جو شرابی کبابی انسان تھا حبشہ جا کر عیسائی ہو گیا۔ ام حبیبہ نے اپنے شوہر کی طرف سے ہر قسم کے دباؤ کے باوجود عیسائیت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسلام پر استقامت سے قائم رہیں۔ ام حبیبہؓ کا شوہر نشہ کی حالت میں ڈوب کر مر گیا۔ اسلام سے اُمِ حبیبہؓ کی محبت اور اللہ کی راہ میں استقامت سے متاثر ہو کر ہی رسولِ خدا نے ان سے شادی کی پیش کش کی انھوں نے نبی کی ازواج میں شامل ہونے کا شرف بخوشی قبول کر لیا اور یُوں وہ اہلِ اسلام کی ماں قرار پائیں۔ اب محمد صلعم کے داماد تھے کوئی اجنبی نہ تھے اس کے دل میں اسلام سے نفرت اور دشمنی میں کمی واقع ہوئی۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآن پاک کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

> "شاید کہ اللہ تم میں اور ان میں کہ جن سے تمھیں دشمنی ہے دوستی قایم کر دے۔ اور اللہ قادر ہے اور اللہ بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔"

۱۵۵۔ ان تمام واقعات کے اثرات بالآخر اسلام کے حق میں نکلے رسولِ خدا نے اس طرح راہ ہموار کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وُہ حجِ بیت اللہ کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ کیا کفارِ مکّہ کے لیے یہ فخر و مباہات کا مقام نہ تھا کہ ان کا "بت خانہ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگاہوں میں بھی مقدس ہے، جبکہ رسول اللہؐ ان کے بتوں کے اولیں دشمن تھے۔ اور کیا اس سے کفارِ مکہ کے دلوں میں اسلام کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا ہو گا؟ رسول اللہؐ حدیبیہ پہنچے جو مکہ کے نواح میں ہے انھوں نے قریشِ مکّہ کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر چند روز کے لیے مکہ میں پُرامن داخلہ کی اجازت طلب کی تاکہ وُہ حج کا فریضہ ادا کر سکیں۔ اس پر مکّہ والوں نے بات چیت کے لیے ایک وفد رسولِ خدا کی خدمت میں بھیجا۔ معاہدۂ امن کوئی مشکل امر نہیں تھا کیونکہ رسولِ خدا قریشِ مکّہ کی انا کی خاطر ان کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

رسولِ خدا اس سے دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے ؛

اوّل امن، اور دوم قریشِ مکہ سے یہ وعدہ کہ مسلمانوں اور کسی تیسری طاقت کے درمیان جنگ کی صورت میں وہ غیر جانبدار رہیں گے۔

گو مکّی جانتے تھے کہ مسلمان ان سے جس غیر جانبداری کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا تعلق خیبر کے یہود سے ہے لیکن علاقائی امن اور تجارتی راہداری کی بحالی کا لالچ اتنا بڑا تھا کہ مکّی معاہدہ پر رضامند ہو گئے۔

معاہدہ میں کہا گیا تھا :

الف۔ رسولِ خدا اس سال حج نہیں کریں گے بلکہ ایک سال بعد آئیں گے اور مکّہ میں صرف تین روز قیام کریں گے۔

ب۔ افراد کی واپسی کا یک طرفہ نظام ہوگا : اگر کوئی مکّی مدینہ جاکر رسولِ خدا کے پاس پناہ حاصل کرے تو رسولِ خدا اسے مکہ والوں کو لوٹا دیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام ترک کر کے مدینہ سے مکہ میں پناہ گزین ہو جائے تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے۔

ج۔ فریقین میں دس سال کے لیے جنگ ممنوع ہوگی مگر مسلمانوں کو مکہ اور طائف جانے کی آزادی ہوگی۔ اسی طرح مکی تجار کے قافلے اسلامی مملکت کی حدود سے گزر کر شام جا سکیں گے۔

د۔ فریقین، معاہدہ کے ایک فریق کی کسی تیسری طاقت کے ساتھ جنگ کی صورت میں غیر جانبدار رہیں گے۔

ھ۔ دوسرے قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور وہ جس فریق کے ساتھ چاہیں شامل ہو سکیں گے۔

(چنانچہ بنوخزاعہ نے رسول اللہ کے ساتھ اور بنو بکر (احابیش) نے قریشِ مکہ کے ساتھ اس معاہدہ میں شمولیت اختیار کرلی)

۱۵۶۔ اس معاہدہ کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے :

(أ) مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان خفتہ رابطے بیدار ہو گئے اور فریقین کے درمیان بات چیت کو فروغ ملا۔ اس ضمن میں حضرت خالدؓ ابن ولید اور حضرت عمروؓ ابن العاص کی مثال بہترین ہے جنھوں نے اس واقعہ کے بعد اسلام کا دامن تھاما۔

(أأ) مکّہ میں بیسیوں مسلمان جنھیں ان کے والدین یا سرپرستوں نے نظر بند کر رکھا تھا یا زبردستی روک رکھا تھا معاہدہ حدیبیہ کی دفعہ ۳ کے باوجود بھاگ کر مدینہ پہنچنے لگے۔ معاہدہ کی اس دفعہ پر عمل درآمد کی بعض تفصیلات کا بیان محلِ نظر ہوگا۔ مقامِ حدیبیہ پہ رسولِ خدا کے کیمپ میں ایک مکی ابوجندل ابن سہیل بن عمرو آیا اور سیاسی پناہ طلب کی لیکن اس کے والد کے مطالبہ پر اسے مکہ واپس بھیج دیا گیا۔ رسولِ خدا نے اس سلسلے میں صرف یہ کیا کہ ابوجندل کے والد سے یہ عہد لے لیا کہ اسلام قبول کرنے کی پاداش میں وہ اپنے بیٹے پر تشدد نہیں کرے گا۔ رسول اللہ جب واپس مدینہ جا رہے تھے

تو ایک اور مکی مسلمان ابوبصیر انھیں راستے میں ملا۔ وہ مکہ سے بھاگ کر رسولِ خداؐ کی پناہ میں آیا تھا۔ ابوبصیر کے خاندان کے دو افراد بھی اس کے فوراً بعد رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رسولِ خداؐ نے ابوبصیر کو ان کے سپرد کر دیا۔ اثنائے راہ میں ابوبصیر نے اپنے ایک محافظ کو قتل کر دیا اور واپس اسلامی فوج میں آ گیا۔ دُوسرا مکی بھی واپس آیا اور رسول اللہؐ کو تمام واقعہ بتایا۔ حضورؐ کے تیور پہچان کر ابوبصیر کھسک گیا اور غائب ہو گیا جس کے بعد ابوبصیر کو واپس لے جانے کے لیے مکہ سے آنے والے محافظ کو خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔ صلح حدیبیہ کے بعد مکی تاجروں کے قافلے شام کو آنے جانے لگے تھے۔ ابوبصیر اسلامی فوج سے نکل کر بدر کی ایک گھاٹی[۱] میں جاگزین ہو گیا۔ وہ جب بھی کسی مکی کافر کو ادھر سے گزرتے دیکھتا تو اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے اسے ختم کر دیتا۔ ابوبصیر کی کامیابیوں کا سُن کر مکہ سے متعدد مسلمان فرار ہو کر بدر کی گھاٹیوں میں پہنچ گئے۔ اب ابوبصیر کے پاس ایک مضبوط فوجی دستہ[۲] جمع ہو گیا اور وہ کفارِ مکہ کے تجارتی قافلوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا جو یہاں سے گزر کر شام جاتے تھے۔ اس میں رسولِ خداؐ کا کوئی قصور نہ تھا۔ چنانچہ قریش جب ابوبصیر اور اس کے رفقا کی تاخت کی تاب نہ لا سکے تو انھوں نے رسولِ خداؐ کی خدمت میں عریضہ پیش کیا کہ وہ معاہدہ کی دفعہ "۴" سے دستبردار ہوتے ہیں اور اس کے عوض رسول اللہؐ ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو مدینہ بلا لیں۔ چنانچہ رسولِ خداؐ نے بخوشی اس دفعہ کی تنسیخ کی منظوری دے دی۔ معاہدہ میں اس ترمیم سے قبل مکہ سے دو خواتین بھی رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اسلام میں کتنی کشش تھی ان خواتین میں سے ایک عقبہ ابن ابومعیط کی بیٹی تھی جو مکہ میں پیغمبر کا جانی دشمن تھا اور بدر میں گرفتاری کے بعد اس کا سر قلم کیا جا چکا تھا۔ اسی عقبہ کی نوجوان تاکتخدا بیٹی نے چپکے سے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ پہنچ گئی۔ اس کے دو بھائی بھی مدینہ آئے اور اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پر رسولِ خداؐ نے جواب دیا:

"اس دفعہ کا تعلق مردوں سے ہے خواتین سے نہیں۔" چنانچہ انھوں نے اپنی بہن کی واپسی پر اصرار نہ کیا۔ ایک اور خاتون جو دراصل مدینہ کی رہنے والی تھی مگر اس کی شادی مکہ میں ہوئی تھی، اپنے خاندان کو چھوڑ کر مدینہ آ گئی۔ اس ضمن میں رسولِ خداؐ نے اس کے حق مہر کی رقم اس کے خاوند کو ادا کرا دی۔ اسلام میں کسی مسلمان خاتون کی شادی غیر مسلم سے نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی کوئی مسلم خاتون غیر مسلم شوہر سے ازدواجی تعلقات برقرار رکھ سکتی ہے۔ مسلمان مردوں کو بھی اہلِ کتاب کے سوا کسی غیر مسلم عورت سے شادی کی ممانعت ہے۔

(iii) صلح حدیبیہ کے بعد خیبر کے یہودی مکی حلیفوں کی امداد سے محروم ہو گئے، جلد ہی انھوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی جس کے بعد تیما، وادی القرا اور فدک وغیرہ کے علاقے اسلامی مملکت میں شامل کر لیے گئے۔

(iv) رسولِ خداؐ نے غیر ملکی فرمانرواؤں کو خطوط لکھے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ یہ خطوط ہرقل، کسریٰ

---

[۱] جس جگہ ابوبصیر جاگزین ہوئے وہ مقام عیص کہلاتا ہے۔ عیص کے قریب ہی وہ شاہراہ تھی جس سے گزر کر کفارِ مکہ کے قافلے شام کو جاتے تھے۔ (مترجم)

[۲] معتبر روایات کے مطابق ایسے مسلمانوں کی تعداد ستر تھی۔

اور شاہِ نجاشی کے علاوہ متعدد دوسرے حکمرانوں کو بھیجے گئے۔ اسلام کو محض جزیرہ نما عرب تک محدود تو نہیں رہنا تھا! یہ ایک المناک واقعہ ہے کہ رسولِ خدا کے ایک سفیر[1] کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا۔ اور بازنطینی فرمانروا ہرقل نے اس جرم کے مرتکب شہزادہ کو سزا دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی سلطنت اللہ کی سزا کی حقدار ہو چکی تھی۔ افسوسناک بات تو یہ تھی کہ عیسائی قبل ازیں اسلام کے اتنے مخالف نہ تھے۔ اپنی دانش، سائنسی ترقی اور علم و فہم کے باوجود وہ اسلام کے بارے میں انتہائی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کن تصورات رکھتے تھے۔

(۷) اہلِ مکہ اور رسولِ خدا کے حلیفوں کے درمیان خونریز معرکہ ہوا۔ یہ دونوں قبیلے بعد میں معاہدہ حدیبیہ میں شامل ہوئے تھے۔ بعض احمق مکیوں نے خفیہ طور پر اپنے حلیف قبیلہ کو افرادی قوت اور اسلحہ کی امداد فراہم کی تاکہ وہ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ کو ختم کر سکے۔ اس قبیلے کے بیشتر افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ مکیوں کی طرف سے یہ صلح نامہ کی کھلی خلاف ورزی تھی جو خاموشی سے برداشت نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مکہ پر مسلمانوں کا قبضہ اور مکیوں کے اذہان میں نفسیاتی تبدیلی قابلِ غور ہے۔

۱۵۷ ۔ مسلمانوں کے حلیف قبیلہ پر کفارِ مکہ کے حلیف قبیلہ کے حملہ کی خبر جب رسولِ خدا کو ملی تو انھوں نے مدینہ کی سرحدیں بند کر دیں اور حکم دیا کہ کوئی شخص مدینہ سے باہر نہیں جائے گا۔ اس سے مدینہ کے اندر رونما ہونے والے حالات کی خبر شہر کی حدود سے باہر نہ نکل سکی۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ایک بہت بڑی فوجی مہم کی تیاری کا حکم دیا مگر یہ نہ بتایا کہ اسلامی فوج کا ہدف کیا ہوگا۔ پھر انھوں نے مدینہ کے آس پاس کے مسلم قبائل کو اسلامی فوج میں شمولیت کے لیے ہر طرح تیار رہنے کا حکم بھیجا تاہم انھیں بھی منزل سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اسلامی فوج جس کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی رسول اللہؐ کی سرکردگی میں مدینہ سے نکلی، رسولِ خدا ادھر ادھر سے ہوتے ہوئے چل رہے تھے تاکہ مختلف قبائل کے فوجی دستوں کو جن کی تیاری کا وہ حکم دے چکے تھے اسلامی فوج میں شریک کرتے جائیں۔ پوری فوج میں کسی کو علم نہ تھا کہ وہ شمال کو جا رہے ہیں یا جنوب کو یا ان کے سفر کی سمت مشرق ہے۔ قبائل کے فوجی دستوں کی شمولیت سے اسلامی فوج کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ چلتے چلتے بالآخر حضورِ اکرمؐ نے مکہ کے نواح میں پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ فوجی دستور کے مطابق بہت سے سپاہی مل کر تمام فوج کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں۔ مگر رسولِ خدا نے حکم دیا کہ اس رات ہر سپاہی الگ آگ جلائے اور اپنا کھانا خود تیار کرے۔ مکہ کی پہاڑیوں پر آباد خاندانوں نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں دس ہزار کے لگ بھگ مقامات پر آگ جل رہی ہے۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ مسلمانوں نے پچاس ہزار سپاہ پر مشتمل فوج سے مکہ پر حملہ کر دیا ہے۔ سردارِ مکہ ابو سفیان جاسوسی کی غرض سے خود دامنِ کوہ میں اُترا، مگر مسلمانوں کے ایک گشتی دستے نے اسے گرفتار کر لیا جس کے بعد مکہ میں دفاعی اقدامات میں رابطہ پیدا کرنے والا کوئی نہ رہا۔

اگلی صبح رسول اللہؐ نے اپنی فوج کو متعدد یونٹوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ ہر یونٹ الگ راستے سے مکہ میں داخل ہو۔ اس طرح

---

[1] اسلام کے اس شہید سفیر کو عیسائی سردار شرحبیل نے موتہ (شام) کے قریب شہید کیا تھا۔ سفیر کا نام حارث بن عمیرؓ تھا۔ (مترجم)

مکیوں کے فرار کے تمام راستے بھی مسدود کر دیے گئے۔ رسولِ خدا نے تمام کمانڈروں کو سختی سے حکم دیا کہ وہ صرف اس وقت اپنے دفاع میں ہتھیار استعمال کریں جب ان پر حملہ کیا جائے۔ جب اسلامی فوج کی پیش قدمی شروع ہوگئی تو رسولِ خدا نے ابو سفیان کو رہا کر دیا جو ازحد حیران و پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسلامی فوج کے نقیب شہر بھر میں یہ منادی کرتے پھر رہے تھے کہ جو شخص اپنے گھر میں ہی رہے گا اسے امان ہے، جو شخص کعبہ کے صحن میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے بھی امان ہے، جو شخص اپنے ہتھیار مسلم فوج کے حوالے کر دے گا یا ابو سفیان کے گھر میں پناہ حاصل کر لے گا اس کے لیے بھی امان ہے۔ (اس آخری رعایت سے نہ صرف ابو سفیان بلکہ کفارِ مکہ بھی ہکا بکا رہ گئے) اسلامی فوج مکہ میں پھیل گئی اور خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر شہر پر قبضہ کر لیا۔ ظاہر ہے مکہ کی آبادی پر اداسی طاری تھی۔ جلد ہی رسول اللہؐ کی طرف سے شہر بھر میں اعلان کیا گیا کہ لوگ کعبۃ اللہ میں جمع ہو جائیں جہاں محمدؐ رسول اللہ ان سے خطاب کریں گے۔ لوگ خوف و ہراس اور تجسس کے ملے جلے جذبات لیے کعبہ میں جمع ہو گئے، رسولِ خداؐ اپنی فوج کے جلو میں آئے، وہ سراپا انکسار تھے اور اپنی اونٹنی کی پشت پر ہی اللہ کے حضور سجدہ میں گرے ہوئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔ پھر وہ کعبۃ اللہ کی عمارت میں داخل ہوئے، انھوں نے دیواروں پر بنی ہوئی تمام تصاویر کو مٹانے کا حکم دیا۔ ایک معروف روایت کے مطابق حضورؐ نے فرمایا: "تمام (تصاویر) دھو ڈالو سوائے اس کے" یہ کہتے ہوئے انھوں نے حضرت مریم اور ان کے بچے کی تصویر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ کعبہ سے باہر آئے اور اپنے موذن بلالؓ حبشی کو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا حکم دیا۔ کفارانِ مکہ کے ایک سردار عتاب بن اسید نے جو اس موقع پر موجود تھا اپنے قریب کھڑے ایک اور کافر سے کہا "خدا کا شکر ہے میرا باپ مر چکا ہے ورنہ یہ کالا گدھا (اس کا اشارہ حضرت بلالؓ کی طرف تھا) کعبہ کی چھت پر کھڑا ہو کر جو آوازیں نکال رہا ہے وہ اسے کبھی برداشت نہ کرتا۔" رسولِ پاک نے کعبہ میں مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔ پھر وہ کفارِ مکہ سے مخاطب ہوئے۔ رسول اللہؐ نے انھیں اس سلوک کی یاد دہانی کرائی جو کفارِ مکہ نے اکیس سال کے دوران پیغمبرِ خدا سے روا رکھا تھا۔ پھر رسول اللہؐ نے سوال کیا "اب تم مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو؟" فطری طور پر ان کے سر شرم سے جھک گئے۔ رسولِ خداؐ مشرکین مکہ کے قتلِ عام، انھیں غلام بنانے یا کم از کم ان کی املاک ضبط کرنے کا حکم دے سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ نہایت حلیمی سے بولے "آج کے دن تم پر کوئی جبر نہیں، جاؤ تم آزاد ہو"۔ رسول پاکؐ کے اس فیصلے کا مشرکین مکہ پر زبردست اثر ہوا اور عتاب بن اسید آگے بڑھ کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "اے محمد (صلعم)! میں عتاب بن اسید ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔" رسولِ خداؐ نے بھی ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہا۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمھیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں۔" جلد ہی رسولِ خداؐ واپس روانہ ہو گئے اور انھوں نے اپنا ایک سپاہی تک مکہ میں نہ چھوڑا۔ اپنے اس فیصلہ پر حضورؐ کو کبھی پشیمان نہیں ہونا پڑا۔

۱۵۸۔ مزید آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے اس رویہ پر بھی غور کیا جائے۔ مکہ کو جس بات کی سزا دی گئی، اس میں مکہ کی تمام آبادی کا قصور نہیں تھا۔ کم از کم اخلاقی طور پر مکہ کو یوں فتح کرنا زیبا نہ تھا۔ رسولِ خداؐ صرف یہ چاہتے تھے کہ مکہ کا نظام بدل جائے اور ایسے لوگوں کو عنانِ حکومت سونپی جائے جو غیر جانبداری اور سنجیدگی سے

اسے سنبھال سکیں۔ چنانچہ انھوں نے عتاب بن اَسید کو مکہ کا گورنر مقرر کر دیا اور خود مدینہ لوٹ گئے۔ انھوں نے مکہ والوں میں ذہنی تبدیلی کے لیے حسبِ استطاعت سب کچھ کیا۔ ایک فاتح کی حیثیت سے پیغمبر کا رویّہ اتنا فراخدلانہ تھا کہ مکیوں کا تعصب اس کی لہر میں بہہ گیا۔ مکہ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور از خود اسلامی مملکت کا ایک حصہ بن گیا۔ مکہ کو کسی مفتوحہ شہر کی طرح زبردستی فاتح مملکت میں ضم نہیں کیا گیا۔

۱۵۹۔ صرف عتاب بن اَسید ہی حضورؐ کے رویہ سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام نہیں ہوا، ایک اور سردار صفوان رسولِ خدا کے پاس آیا اور بولا "میں اسلام قبول کرنا نہیں چاہتا، مجھے غور و فکر اور فیصلہ کے لیے دو ماہ کی مہلت درکار ہے"۔ رسولِ خدا نے فرمایا "میں تمھیں چار مہینے دیتا ہوں"۔ بہت سے دوسرے مکی مثلاً عکرمہ ابن ابوجہل مکہ سے فرار ہو گئے، انھیں بجا طور پر اپنی بداعمالیوں کی سزا ملنے کا خطرہ تھا۔ رسولِ خدا نے ان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ بعض لوگوں کو رسولِ خدا نے قیمتی تحائف دیے۔ ظاہر ہے ایسے سلوک کے بعد ان کے دلوں میں اسلام کے لیے اندھی نفرت کا قایم رہنا ممکن نہ تھا۔

۱۶۰۔ رسولِ خدا کی مختصر تقریر نفسیاتی طور پر انتہائی مؤثر ثابت ہوئی۔ پورا شہر صرف ایک رات میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ مکی اسلام کے نہایت وفادار پیرو کار ثابت ہوئے۔ کوئی دو سال بعد جب رسول اللہؐ کا وصال ہوا اور متعدد علاقوں کے لوگ اور کئی قبیلے مُرتد ہو گئے۔ مکہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ثابت ہوا اور پورے عرب کے لیے تالیفِ قلب کا باعث بنا رہا۔

۱۶۱۔ مکہ کے مملکتِ اسلامیہ میں شامل ہونے کے صرف ایک ہفتہ بعد رسولِ خدا کو طائف سے شورش کی اطلاع ملی جو مکہ کے مشرق میں ہے۔ وہ اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری طور پر نکل کھڑے ہوئے اور مکہ سے دو دن کی مسافت پر جنگِ حُنین لڑی گئی۔ دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں نے علی الصبح ملگجے اندھیرے میں اچانک مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ جدھر مُنہ تھا ادھر بھاگ نکلے۔ اس سنگین صورتِ حال کو پیغمبرِ خدا کی ذاتی جرأت، بہادری اور ٹھنڈے دل و دماغ کی وجہ سے سنبھالا جا سکا۔ رسول اللہؐ کے ساتھ ایک درجن کے لگ بھگ جاں نثار تھے جنھوں نے پیغمبر کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ان میں ایک دلیر خاتون اُمِ عمارہ بھی شامل تھی جو امید سے تھی۔ ان جاں نثاروں کی جرأت اور مردانگی کی وجہ سے میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ صورتِ حال کچھ سنبھلی تو فرار ہونے والے مسلمان بھی واپس آ گئے۔ دشمن کو پسپا ہونا پڑا۔ اور اس کی چھاؤنی، خاندان، بیویاں اور بچے، مویشیوں کے گلّے اور دوسری املاک ——— جنھیں وہ احمق میدانِ جنگ میں اپنے ساتھ لائے ہوئے تھے ——— مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئیں۔ فتح کے بعد ام عمارہ بڑے فخر کے ساتھ رسولِ خدا کے حضور پیش ہوئی اور بولی "اے رسولِ خدا! یہ مرد تو ناپسندیدہ نکلے۔ وہ بزدلی سے میدانِ جہاد سے فرار ہوئے ان سب کو موت کی سزا دی جانی چاہیے"۔ رسولِ اکرمؐ مسکرائے اور ام عمارہ کی بہادری کی تعریف کی اور اس کے لیے دُعا کی۔ اس پر ام عمارہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ (کہا جاتا ہے کہ لڑائی کے آغاز پر ام عمارہ کے پاس صرف ایک خنجر تھا۔ اس نے اپنے خنجر سے دشمن کے ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتارا، اس سے تلوار چھینی اور پھر اس تلوار سے کافروں کے ساتھ جنگ کرتی رہی)

۱۶۲۔ جنگ کے بعد رسولِ خدا نے بنی ہوازن (جنھوں نے شورش بپا کی تھی)، کا طائف تک پیچھا کیا۔ وہ چند

روز طائف میں مقیم بھی رہے تاہم بعد میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ محاصرے کے بجائے امن کا حربہ استعمال کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ مکہ لوٹ آئے جہاں سے وہ مدینہ چلے گئے۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ زیادہ مفید ثابت ہوا۔

۱۶۳۔ اس کے کوئی دو ماہ بعد ایامِ حج میں یہ عجیب و غریب بات سامنے آئی کہ مسلمان تو کعبۃ اللہ کو دین اسلام کے مرکز کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور عرب کے کونے کونے سے آنے والے کفار خانہ خدا میں بت پرستی کی رسوم بھی ادا کر رہے ہیں۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مکہ کو جبراً اسلامی مملکت میں ضم نہیں کیا گیا تھا بلکہ رسولِ خداؐ نے شہر کی حکومت تبدیل کرنے پر اکتفا کی تھی۔ عتّاب بہترین گورنر ثابت ہوا۔ مسلمان اور مشرکین دونوں ہی اس کے معترف تھے۔ تاہم جلد ہی جب مکہ میں تمام لوگ دینِ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو صورت حال بالکل بدل گئی۔

۱۶۴۔ ایک سال بعد رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ایامِ حج کے دوران اپنی نیابت کے لیے مکہ بھیجا۔ اس موقع پر انھوں نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ کوئی کافر بُت پرستی کی غرض سے کعبۃ اللہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ حجاج مکیوں کے لیے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھے جیسا کہ زمانہ حال میں سیّاح مختلف ممالک کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم (۹/۲۸) نے اہلِ مکہ کو یقین دلایا کہ وہ حجاج کی تعداد میں متوقع کمی کے متعلق تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے بعد مسلم حجاج کی تعداد میں اتنا اضافہ ہُوا کہ اس سے قبل کعبہ کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد کے سال میں تو عرب کے لوگ قرآن کے الفاظ کے مطابق (۱۱۰/۱-۳) گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

مالیاتی اصلاحات

۱۶۵۔ اسی سال (۹ ہجری) کے دوران رسولِ خداؐ نے اسلامی ریاست کے شعبۂ مالیات میں انقلابی اصلاحات نافذ کیں۔ اُس وقت تک مملکتِ اسلامیہ کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتی تھی بلکہ عوام کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے ہم مذہبوں سے احسان کریں اور اللہ کی راہ میں اپنا مال صرف کریں۔ چنانچہ لوگ اپنے مال کا ایک حصہ راہِ خدا میں صرف کرنے کے لیے رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کرتے تھے جسے حضورؐ اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتے تھے۔ مملکت کے بعض غیر مسلم علاقے خراج ادا کرتے تھے۔ مگر ان وسائل سے کسی بحران کے وقت اُمت کی ضروریات پُورا کرنا ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، مسلمانوں کے ایک سفیر کو بازنطینی سلطنت کے علاقہ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ سفیر کے قتل کا انتقام لینے کے لیے رسول اللہؐ نے تین ہزار سپاہ پر مشتمل ایک مہم روانہ کی۔ دشمن سے موتہ کے مقام پر جنگ ہوئی، دشمن کی فوج اسلامی فوج سے ۳۳ گنا زیادہ تھی۔ اسلامی فوج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ اسلامی فوج کی واپسی کے بعد رسولِ خداؐ نے جنگِ تبوک کی تیاری شروع کی۔ اس جنگ کے لیے تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تیار کی گئی۔ اتنی بڑی مہم کے لیے بھاری مقدار میں روپے پیسے کی ضرورت تھی۔ محض رضا کارانہ امداد سے اتنی بڑی مہم کے اخراجات پُورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی طرف سے دی جانے والی خیرات کو باقاعدہ شکل دی گئی۔ چنانچہ مختلف اشیا پر کم از کم ٹیکس عاید کیا گیا؛ فصلوں، تجارتی سرمایہ، درآمد و برآمد، مویشیوں کے گلوں اور کانوں وغیرہ پر فیصد کے حساب سے ٹیکس (زکوٰۃ) عاید کیا گیا۔ ٹیکس کی ادائیگی کے لیے سال میں ایک مہینہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ

منکرین زکوٰۃ سے زکوٰۃ بذریعہ طاقت وصول کی جائے گی۔ دینی نقطۂ نظر سے زکوٰۃ ایک دینی فریضہ اور نیک کام تھا تاہم اسے سرکاری ٹیکس کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس ٹیکس کے لیے قدیم نام زکوٰۃ (صدقہ بھی) برقرار رکھا گیا تاہم صاحبِ استطاعت اصحاب پر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض قرار دی گئی۔

۱۶۶۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ قرآن حکیم ایسی اشیا جن پر زکوٰۃ واجب ہے اور زکوٰۃ کی شرح کے بارے خاموش ہے لیکن قرآن حکیم اسلامی حکومت کے اخراجات کے اصولوں اور سرکاری آمدنی سے متمتع ہونے والوں کی ٹھیک ٹھاک تفصیل بیان کرتا ہے۔ غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ ٹیکس عاید کرنے کا اختیار عوام کے نمائندوں کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنے دور اور اس دور کی ضروریات کے مطابق ٹیکس عاید کرنے کا فیصلہ کرسکیں۔ سرکاری آمدنی کے خرچ کی مدّات سے تعلق رکھنے والی قرآنی آیت میں کہا گیا ہے:

”زکوٰۃ مفلسوں کے لیے ہے اور محتاجوں (غیر مسلموں میں) کے لیے۔ اور ان کے لیے جو اس (کی وصولی) کا کام کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ اور اسیروں اور غلاموں کی گردن چھڑانے (آزاد کرانے) کے لیے، اور قرضداروں کے قرض ادا کرنے کے لیے، اور اللہ کی راہ میں (صرف کرنے کے لیے) اور مسافروں کے لیے یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا (فرض) ہے، اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔“ (توبہ ۶۰)

۱۶۷۔ صرف زکوٰۃ کے لیے یہ آٹھ مدات نہایت جامع ہیں اور فلاحی ریاست کی بنیاد ہیں۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ ”فقرا“ سے مراد مسلمانوں میں غریب لوگ اور مساکین سے مراد ملک کے غیر مسلم باشندوں میں نادار لوگ ہیں۔

۱۶۸۔ وہ جو ”ٹیکس کے لیے کام“ کرتے ہیں، ان میں ٹیکس اکٹھا کرنے والے، آڈٹ کرنے والے، اسے مقررہ انداز میں تقسیم کرنے والے اور اس تمام کام کی نگرانی کرنے والے شامل ہیں۔ درحقیقت اس سے مراد مملکت کی پوری مشینری ——— سول اور فوجی ——— ہے۔

۱۶۹۔ ”تالیف القلوب“ سے مراد مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہیں۔ درحقیقت اس کا اشارہ سیاسی مقاصد کے لیے مملکت کی خفیہ سروس اور نومسلموں کی طرف ہے۔

۱۷۰۔ ان دنوں ملک سے مسلم یا غیر مسلم شہریوں کو، جنھیں دشمن نے قید کرلیا ہو، فدیہ دے کر چھڑانا نہایت ہی اہم تھا۔ پھر اس آیت میں یہ دلچسپ فرض بھی مملکت کو سونپا گیا ہے کہ وہ معاوضہ دے کر غلاموں کو آزاد کرائے۔ یہ کام عام لوگوں کی طرف سے راہِ خدا میں مال صرف کرکے غلاموں کو آزاد کرانے کے علاوہ ہے۔

۱۷۱۔ جن قرضداروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ غریب لوگ نہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ بلکہ ان سے مراد ایسے افراد ہیں جو اچانک کسی وجہ سے قرضے کے بوجھ تلے دب گئے ہوں۔ خلیفہ عمرؓ نے اس مقصد کے حصول کے لیے بلا سُود

قرضوں کا اہتمام کیا تھا۔

۱۷۲۔ "اللہ کی راہ میں اخراجات" سے مراد سب سے پہلے مملکت کے دفاعی اخراجات ہے۔ اس کے بعد رفاہی کام جیسے مساجد کی تعمیر اور سکولوں کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔

۱۷۳۔ "مسافروں" یا سیاحوں کے لیے سڑکوں، پلوں، پولیس، صحت و صفائی کے نظام اور میزبانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کا سفر آسان ہو سکے۔

تکمیل دین

۱۷۴۔ ۱۰ھ کے آخر تک پورا جزیرہ نمائے عرب اسلام قبول کر چکا تھا۔ کہیں کہیں یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کی چھوٹی موٹی آبادیاں اپنے اپنے مذہب پر قایم تھیں۔ لیکن وُہ اسلامی مملکت کی بالادستی تسلیم کرتے تھے جو رواداری اور ان کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی پر گامزن تھی وہ حکومت کی اس پالیسی کا دل خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ حکومت ان کے ضمیر کی آواز کو کچلنے کے حق میں نہیں تھی۔ ہر فرقہ اسلامی حکومت کے تحفظ میں اپنے معتقدات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا ——— اس سے قبل ان فرقوں کو ملک کے حکمرانوں کے دین پر چلنا پڑتا تھا خواہ وُہ ایران میں ہوں یا بازنطینی سلطنت میں ——— پھر وسیع اسلامی مملکت ان کی زرعی پیداوار اور مصنوعات کے لیے ایک کھلی منڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت یمن سے عراق کے انتہائی جنوبی صوبوں تک اور فلسطین پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔

۱۷۵۔ یہ تھے وُہ حالات جن میں رسول اللہ نے خرابیٔ صحت کے باوجود حج بیت اللہ پر جانے کا قصد کیا۔ پیغمبرِ خدا کے حج پر آنے کا سُن کر بھاری تعداد میں اہلِ اسلام مکہ پہنچ گئے اور یوں اہلِ مکہ کا یہ وسوسہ غلط ثابت ہُوا کہ کعبہ میں غیر مسلموں کے داخلہ پر پابندی کے باعث حجاج کی تعداد میں کمی ہو جائے گی (اور ان کی آمدنی متاثر ہو گی) حج کے موقع پر رسولِ خدا نے میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار حجاج کے روبرو خطبہ دیا۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں۔ (اگر ان مسلمانوں کو بھی ملا لیا جائے جو اس سال حج کے لیے مکہ نہ پہنچ سکے تو اندازہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد پانچ سے دس لاکھ تک تھی)

نبی کریمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو ارکان ادا کیے وہ مسلمانوں کے لیے قواعدِ حج قرار پائے، اور صدیاں گزرنے کے باوجود ان میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ حجاج میدانِ عرفات میں جمع ہوئے جہاں جبلِ رحمت سے نبی پاکؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا ——— اس کا ذکر بعد میں آئے گا ——— پھر رسولِ خداؐ مزدلفہ میں رات گزارنے کے بعد منٰی میں آئے۔ یہاں اُنھوں نے جمرات کو کنکر مارے اور قربانی دی۔ پھر وہ مکہ آئے، اللہ کے گھر کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ پھر وہ دوبارہ منٰی میں گئے۔ تین دن کے بعد وہ دوبارہ مکہ آئے اور طواف وداع کیا۔ اس کے بعد وُہ مدینہ لوٹ گئے جہاں صرف تین ماہ بعد ان کا وصال ہو گیا۔

خطبہ حجۃ الوداع

۱۷۶۔ رسول پاکؐ نے جبلِ رحمت پر سے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ درحقیقت اسلامی تعلیمات کا

لُبِ لباب ہے اور انسانیت کے لیے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ خطبہ من و عن پیش کیا جائے :

"سب تعریف اللہ کے لیے ہے، ہم اسی کی ثنا کرتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں، اسی سے بخشش کی استدعا کرتے ہیں اور اسی سے عفو کے طالب ہیں۔ ہم اپنی رُوح کی بُرائیوں اور اپنی بد اعمالیوں کے خلاف اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ ضلالت میں مبتلا کر دے اسے کوئی سیدھی راہ نہیں دکھا سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ واحد ہے، وہ لاشریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

اے اللہ کے بندو! میں تمہیں حکم دیتا ہُوں کہ اللہ سے ڈرو اور میں تمہیں تلقین کرتا ہوں کہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اور میں شروع کرتا ہوں ساتھ بھلائی کے۔

اما بعد! لوگو، سُنو میری بات تاکہ میں تمام معاملات تم پر واضح کر سکوں۔ کیونکہ میں نہیں جانتا شاید میں آپ کو آئندہ سال اس جگہ دوبارہ نہ مل سکوں۔

لوگو! تمھارے خون، مال اور تمھاری عزتیں ایک دُوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں ——— اس وقت تک جب تک تم اپنے خدا سے نہیں ملتے ——— جیسا کہ تمھارے لیے آج کا دن، یہ شہر اور یہ مہینہ حرمت والا ہے۔ کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے اللہ! گواہ رہنا۔

جس کسی کے پاس کوئی امانت ہے وہ اسے اس کے مالک کو لوٹا دے۔

جاہلیت کے زمانہ کا سُود (قرضوں پر) ختم کر دیا گیا۔ مگر تمھیں اپنے سرمایہ پر حق حاصل ہے نہ تم ظلم کرو گے اور نہ ظلم برداشت کرو گے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ سُود ختم ہونا چاہیے۔ پہلا سُود اپنے خاندان کا میں مٹاتا ہوں یہ سُود میرے چچا عباس ابن عبد المطلب کا ہے۔

میں ایامِ جاہلیت سے قتل کے تمام جھگڑے ملیا میٹ کرتا ہُوں۔ پہلا خون (جو میں معاف کرتا ہُوں میرے بھتیجے) عامر ابن ربیعہ ابن الحارث ابن عبد المطلب کا ہے۔

میں ایامِ جاہلیت کی تمام رسوم کو ختم کرتا ہوں ماسوائے تولیت کعبہ کے اور (حجاج کو) پینے کا پانی فراہم کرنے کے۔

قتل عمد کا قصاص لیا جائے گا۔ قتل غیر عمد وہ ہے جس میں کوئی لاٹھی یا پتھر لگنے سے ہلاک ہو جائے۔ اس صورت میں ایک سو اُونٹ دیت مقرر ہے جو اس سے زیادہ طلب کرے گا وہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں میں سے ہوگا۔ لوگو! سنتے ہو کیا میں نے تم تک (اللہ کا حکم) پہنچا دیا ہے؟ یا اللہ گواہ رہنا۔

اما بعد، لوگو! شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ تمھاری سرزمین پر اس کی

پُوجا کی جائے گی۔ مگر وہ اس پر بھی مطمئن ہوگا کہ یہاں کے سوا (باقی دنیا میں) اس کی پُوجا کی جائے اور ایسے امور میں اس کی تابعداری کی جائے جن سے تم نفرت کرتے ہو۔ چنانچہ اپنے دین کے معاملات میں شیطان سے ہشیار رہو۔

لوگو! ماہ کبیسہ کفر پر مستزاد ہے۔ اور جو کفر کا ارتکاب کرتے ہیں، گمراہ کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ایک سال تو (کسی مہینہ کو) غیر متبرک قرار دیتے ہیں مگر ایک سال اسے متبرک تسلیم کرتے ہیں تاکہ وہ (مہینوں کی) تعداد پوری کرلیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور اسے باحرمت قرار دے سکیں جسے (مہینہ کو) خدا نے غیر متبرک کہا ہے۔ دراصل وقت (کی گردش) اسی صورت حال پر ہے جو اس روز تھی جب خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ خدا کے نزدیک اُس تجویز کے مطابق صرف بارہ مہینے ہیں جس روز اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان میں سے چار مہینے مقدس ہیں، ان میں سے تین ایک ساتھ آتے ہیں، اور چوتھا الگ ہے۔ مثلاً ذیقعد، ذوالحجہ اور محرم۔ اور ماہِ رجب جو قبیلۂ مُضر کا ہے جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان پڑتا ہے۔ کیا میں نے (تم تک) اللہ کا حکم پہنچا دیا ہے۔ اے اللہ گواہ رہنا۔

امّا بعد، لوگو! تمھاری بیویوں کا تم پر حق ہے، اور ان پر تمھارا حق ہے۔ بیویوں پر تمھارا حق اتنا ہے کہ وہ تمھارے بستر کو کسی غیر مرد سے آلودہ نہ کریں (ناجائز جنسی تعلقات کو نرم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے) اور ایسے (لوگوں کو) تمھارے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں جنھیں تم ناپسند کرتے ہو، اِلّا تمھاری اجازت ہو۔ انھیں (عورتوں کو) کوئی معیوب کام نہیں کرنا چاہیے اگر وہ ایسا کریں تو خدا نے تمھیں یہ اختیار دیا ہے کہ تم انھیں سرزنش کرو۔ ان سے بستر میں علٰحدگی اختیار کرو، اور (اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں) انھیں ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو۔ اگر وہ باز آجائیں تو تم پر واجب ہے کہ انھیں اچھا کھلاؤ اور رواج کے مطابق اچھا پہناؤ۔ عورتوں کے معاملہ میں فراخ دلی سے کام لو کیونکہ درحقیقت وہ تمھاری قیدیوں کی طرح ہیں، ان کی کوئی املاک نہیں اور تم نے انھیں خدا کی امانت کے طور پر قبول کیا ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی اُن (عورتوں) کے وجود سے حظ اٹھاتے ہو، سو خواتین کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو، اور ان سے نیک سلوک کرو۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے خدا گواہ رہنا!

لوگو! تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور کسی شخص کے لیے دوسرے بھائی کی اجازت اور مرضی کے بغیر اس کی جائداد پر قبضہ کرنا خلافِ قانون ہے۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟ اے خدا گواہ رہنا!

پس میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ میں تم میں وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے: وہ چیز ہے اللہ کی کتاب (قرآن) اور

اس کے رسولؐ کی سنت ۔ لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) پہنچا دیا ہے؟ اے خدا! گواہ رہنا۔

لوگو! تمھارا خدا ایک ہے اور تمھارا جد بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہُوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ شخص ہے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے۔ کسی عرب کو عجمی (غیر عرب) پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ——— اگر ہے تو محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ سے کتنا ڈرتا ہے ——— اے لوگو! کیا میں نے (اللہ کا حکم) تم تک پہنچا دیا ہے؟

اس پر لوگوں نے جواب دیا: "ہاں یا رسول اللہ"۔ تو حضورؐ نے خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"جو لوگ یہاں ہیں وہ یہ تمام باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں"۔

اے لوگو! خدا نے ہر وارث کا حصہ وراثت متعین کر دیا ہے۔ کسی ایک وارث کے لیے وصیت کرنا خلافِ قانون ہے۔ ورثا کے سوا کسی کے حق میں جائداد کی ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنا قانون کے منافی ہے۔ بچے بستر کے مالک (شوہر) کی ملکیت ہیں۔ اور زانی کے لیے صرف سنگساری کی سزا ہے۔ جو کوئی اپنے والد کے سوا کسی اور سے نسب ظاہر کرتا ہے یا اپنے سرپرست کے سوا کسی اور سے اظہارِ تعلق کرتا ہے اس پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی۔ اس سے نہ تو معاوضہ طلب کیا جائے گا نہ اس سے اخراجات قبول کیے جائیں گے۔

اَلسَّلامُ علیکُم (تم پر اللہ کی رحمت ہو)"۔

۱۷۷۔ ابنِ سعد کے مطابق حضورؐ کے خطبہ میں یہ دو جملے بھی شامل تھے:

"لوگو! سُنو اور عمل کرو، اگر تمھارا کمانڈر کسی پھٹی ہوئی ناک والے حبشی کو بھی مقرر کر دیا جائے، اور صرف اس وقت تک جب تک وہ تم پر اللہ کی کتاب کے مطابق احکام نافذ کرے"۔

اور:

"تمھارے غلام، تمھارے غلام، انھیں وہی کھانے کو دو جو تم خود کھاتے ہو، انھیں ویسا ہی لباس فراہم کرو جیسا تم خود پہنتے ہو، اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے جسے تم معاف کرنا نہ چاہو تو انھیں فروخت کر دو مگر ان پر تشدد نہ کرو"۔

۱۷۸۔ اپنے خطبہ میں رسولِ خدا نے جن نکات پر بحث کی ہے ان میں دو ——— سُود (ربٰو) اور قمری کیلنڈر ——— کو اکثر غلط طور پر سمجھا گیا ہے۔

۱۷۹۔ اسلام اپنے قوانین کو اخلاقی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور باہمی اشتراک و امداد سے اس پر عمل کرانا چاہتا ہے رسولِ خدا کی طرف سے امتناعِ سُود کے چودہ سو سال بعد اب جدید سائنس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ سُود تمام اقتصادی برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے معاشرہ کا اقتصادی توازن درہم برہم رہتا ہے۔ ربٰو کی بدولت چند لوگ لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور بعض

کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کیمونزم بھی سُود کی اس بُرائی کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ روس میں بالشویکی انقلاب کے بعد کام کی ابتدا سود پر پابندی سے ہوئی تھی۔ لیکن جلد ہی انقلابیوں کو قرضے جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چونکہ انھوں نے سود پر پابندی کی ضرورت سے لوگوں کو پوری طرح آگاہ نہیں کیا تھا اس لیے کوئی بھی شخص قرضے دینے کو تیار نہ ہوا، چنانچہ بالشویکیوں کی یہ اہم اقتصادی اصلاح اسی طرح ناکام ہوئی جس طرح امریکہ میں امتناعِ شراب کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ امریکی حکومت نے شراب پر پابندی عائد کی مگر دو سال سے زاید اس پر عمل درآمد نہ کرا سکی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے (دیکھیے پیرا ۱۷۱) مالیاتی اصلاحات کے تحت بنکوں کو قومی تحویل میں لینا ضروری ہے اور کسی بنک کو خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، سُودی کاروبار کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ سرکاری تحویل میں لیے گئے بنک بلا سُود قرضے جاری کریں۔ تجارتی اداروں میں بنکوں کو حصہ دار بنایا جانا چاہیے، اور وُہ ان اداروں کے نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ یہی خلیفہ عمرؓ نے کیا تھا۔ وہ تاجروں کو بھی اسی طرح قرضے دیتے تھے جس طرح عام شہریوں کو غیر پیداواری ضروریات کے لیے قرض مہیا کرتے تھے۔

۱۸۰۔ جہاں تک کیلنڈر (تقویم) کا معاملہ ہے اہلِ مکہ قمری اور شمسی دونوں کیلنڈر استعمال کرتے تھے۔ مہینہ نئے چاند کے طلوع سے شروع ہوتا تھا مگر قمری سال میں ایک ماہ کا اضافہ کر کے شمسی سال سے مطابقت پیدا کر لی جاتی تھی۔ رسولِ خدا نے قمری سال میں ایک ماہ کا اضافہ بند کر دیا اور خالصتاً قمری تقویم کو رواج دیا۔ زرعی فصلوں پر جو ٹیکس موسم کے اعتبار سے عاید کیا جاتا تھا اسے نہیں چھیڑا گیا، اور یہ ٹیکس فصل کی برداشت پر وصول کیا جاتا رہا۔ مگر دوسرے تمام ٹیکس قمری سال کے مطابق ادا کیے جاتے تھے۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہُوا کہ حکومت ۳۳ شمسی سالوں میں ۳۴ بار سالانہ ٹیکس وصول کرتی تھی۔ بھلا وہ کون سا وزیرِ خزانہ ہے جو ایسا کرنے سے احتراز کرے گا؟ اس طرح سرکاری ملازموں کو ۳۳ شمسی سالوں میں ۳۴ بار سالانہ تنخواہ ادا کرنے کے باوجود سرکاری خزانہ کو معقول بچت ہو گی (شمسی زراعت کے لیے) اور قمری سال کے اعتبار سے ٹیکسوں کے نفاذ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سال کے اختتام پر سرکاری خزانہ کبھی خالی نہیں رہتا تھا کیونکہ دونوں اقسام کے ٹیکسوں کی وصولی کا موسم مختلف ہوتا تھا۔

حج کے معانی

۱۸۱۔ رسولِ خدا نے آخری خطبۂ حج ۹ ذوالحجہ ۱۰ ہجری (۶ مارچ ۶۳۲ء) کو ارشاد فرمایا تھا۔ اسی روز قرآن حکیم کی یہ عظیم الشان آیہ مبارکہ نازل ہوئی (القرآن ۵/۳):

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنا احسان پُورا کر دیا اور میں نے تمھارے واسطے اسلام ہی کو (بطور) دین پسند کیا ہے۔"

اگر یہ بات تاریخی لحاظ سے درست ہے کہ اسلام کے چار ارکان ـــــــ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں سے "حج" سب سے آخر میں آتا ہے تو حج کا روحانی مرتبہ کیونکر متعین ہوگا۔

۱۸۲۔ خانۂ خدا کی زیارت ادیان کی تاریخ میں نادر ترین عمل ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں "حج" کا تصور

ملتا ہے مگر اسلام کے سوا ہر مذہب میں اس کی حیثیت فرض کی نہیں محض نیک عمل کی ہے۔ صرف اسلام میں ہر مسلمان کے لیے ——— خواہ وہ مرد ہو یا عورت ——— زندگی میں ایک بار حج بیت اللہ (بشرطِ استطاعت) فرض ہے۔ پھر دوسرے مذاہب میں "حج" کی جگہ یا تو کسی برگزیدہ ہستی کا مقبرہ ہے، یا فطرت کا کوئی مظہر، مثلاً کسی بڑے دریا کا منبع، دریاؤں کا سنگم وغیرہ جسے دیکھ کر خوف یا توصیف کے جذبات پیدا ہوں، اور جو روحانی تسکین کے بجائے محض سیاحت کے لیے زیادہ کشش کا موجب ہو۔ اسلام میں حج کے لیے خدائے واحد کے گھر کی زیارت کو جاتے ہیں جو صرف مکّہ میں واقع ہے۔ (رسولِ خدا کا روضہ مبارک مدینہ میں ہے مگر روضہ کی زیارت کا ارکانِ حج سے کوئی تعلق نہیں)

۱۸۳۔ لفظِ "کعبہ" کے لغوی معنی چوکور اور مدوّر کے ہیں۔ درحقیقت کعبہ چوکور بھی ہے اور مدوّر بھی ( ) اور مجموعی طور پر کعبہ کی شکل انسانی دل سے مشابہ ہے۔ ایک معروف حدیث قدسی ہے:

"میری زمین اور میرے آسمان کی وسعتوں میں میرا سمانا ممکن نہیں، میرا مکان اگر ہوسکتا ہے تو وہ قلبِ مومن ہے"۔

تو اللہ کے گھر کی شکل دل کی شکل سے بہتر نہیں ہوسکتی تھی۔

۱۸۴۔ بہشت سے نکالے جانے کے بعد بابا آدم (علیہ السلام) مائی حوّا کو کھو بیٹھے۔ طویل تلاش اور اللہ کے فضل وکرم سے ان کی ملاقات میدانِ عرفات میں ہوئی، جہاں انھوں نے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور دوبارہ مل جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ آدم اور حوّا کی اولاد ہونے کے ناطے بھی ہمارے لیے میدانِ عرفات برکتوں کا مقام ہے۔ ہم بھی جب میدانِ عرفات میں (دورانِ حج) پہنچتے ہیں، تو اپنے گناہوں کو یاد کرکے ربّ العزّت سے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں۔

۱۸۵۔ ہمارے روحانی اسلاف میں سے ایک اور حضرت ابراہیمؑ نے بھی دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہر چیز سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی آزمایش کے لیے خدا نے انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیلؑ کو جو ان کے بڑھاپے کی اولاد تھا، قربان کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے بلا تامل بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ بیٹے کو لے کر گھر سے دور جارہے تھے تو شیطان بھیس بدل کر ان کے پاس آیا اور انھیں اپنے ارادے سے باز رہنے کی ترغیب دی۔ حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو پہچان لیا۔ انھوں نے شیطان کا پیچھا کیا اور اس پر پتھر برسائے۔ چند قدم جانے کے بعد شیطان کسی اور بھیس میں آگیا، حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ماجدہ کو بہکانے کی کوشش کی۔ انھوں نے بھی شیطان کو بھگانے کے لیے پتھر مارے۔ بالآخر وہ حضرت اسماعیلؑ کے سامنے آیا اور انھیں ورغلانے کی کوشش کی۔ حضرت اسماعیلؑ نے بھی شیطان کی پتھروں سے تواضع کی، جس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربان کرنے کے لیے چھری اس کی گردن پر رکھ دی۔ انھوں نے چھری چلائی مگر بیٹے کی جگہ ایک دُنبہ قربان ہوگیا اور ان کا بیٹا صحیح وسالم پاس کھڑا تھا۔ خدا نے جبرائیلؑ کو یہ معجزہ دکھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ابراہیمؑ کو خلیل اللہ (اللہ کا دوست) کا خطاب ملا۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے بچّے کے عوض بھیڑوں کی قربانی دیں۔ ابراہیمؑ اور ان کے اخلاف قربانی کی سنّت پر عمل کرتے رہے اور چار ہزار سال گزر جانے کے باوجود اہل اسلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنّت کی یاد میں شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہیں اور مِنیٰ میں جانوروں کی قربانی دیتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے

خدا سے محبّت کا ثبوت پیش کر دیا تھا جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک اور فرزند سے نوازا، جس کا نام اسحاق تھا۔

۱۸۶۔ قبل ازیں ابراہیمؑ اپنے خالق سے وفاداری کا ایک اور ثبوت پیش کر چکے تھے۔ وہ اپنے پہلوٹھی کے بیٹے اور اس کی ماں حاجرہ کو فلسطین سے مکہ کے صحرا میں لائے اور انھیں خدا کے سپرد کر کے اس جگہ چھوڑ دیا۔ جلد ہی ان کا کھانے پینے کا سامان ختم ہوگیا اور بچّے نے مارے پیاس کے چلانا شروع کر دیا۔ ماں نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ شفقتِ مادری میں وہ مایوس نہیں ہوئیں۔ چنانچہ خدا نے چشمہ زم زم جاری فرمایا اور یوں صحرا میں زندگی کے تحفظ کا سامان کر دیا۔ چنانچہ دورانِ حج صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی (ادھر سے اُدھر بھاگتے ہوئے آنا جانا) حضرت حاجرہ کی یاد میں کی جاتی ہے، اور یُوں ایک ماں کی بیٹے کے لیے بے پایاں محبت کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے، جو مخلوق کے لیے خالقِ حقیقی کی محبت کا مظہر ہے۔

۱۸۷۔ طوافِ کعبہ اور حج کے دیگر ارکان غور کرنے والوں کے لیے روحانی بالیدگی کا بہت بڑا سرچشمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بندہ جتنے بھی ناموں سے یاد کرے "بادشاہ" سے بہتر کوئی خطاب اللہ اور بندے کے رشتے کو بیان نہیں کرتا۔ یعنی خدا بادشاہ اور بندہ اس کا غلام ہے۔ (انسانی زبان و بیان اور انسانی تصور میں اس سے بہتر لفظ آ ہی نہیں سکتا) اگر خدا ہمارا بادشاہ ہے (دیکھیے قرآن ۶۲/۱) تو پھر اس کے پاس نہ صرف خزانے ہوں گے (قرآن ۶۳/۷) اس کا تخت بھی ہوگا (۹/۱۲۹) اور فوج ہوگی (۴۸/۴) بلکہ اس کی ایک وسیع مملکت بھی ہوگی (۲/۱۰۷) اور اس وسیع سلطنت میں ایک بین الاقوامی شہر بھی ضرور ہوگا۔ اور ایک شہر جس کا نام مکّہ ہے قرآن نے اسے اُمّ القریٰ (شہروں کی ماں) قرار دیا ہے (۶/۹۲) اس اُم البلاد میں ایک شاہی محل بھی ہوگا (۵/۹۷ الکعبۃ البیت الحرام) جدید انسانی معاشرہ فرمانروا کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ذاتی طور پر اظہارِ وفاداری و اطاعت کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے رُوبرو اظہارِ اطاعت و وفاداری کے لیے کعبۃ اللہ میں جاتا ہے۔ حدیثِ رسولؐ ہے کہ:

"حجرِ اسود دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔"

مسلمان اپنے دونوں ہاتھ "اللہ کے دائیں ہاتھ" کے سامنے پیش کرتا ہے اور پھر خدا کے گھر کی حفاظت اور ہر دشمن سے اس کی مدافعت کے عزم کے اظہار کے طور پر بیت اللہ کا طواف شروع کرتا ہے۔ وہ سات مرتبہ طواف کرتا ہے۔ سات کا عدد غیر محدود وقت کی علامت ہے (وقت ہفتہ کے سات دنوں کی مدد سے شمار کیا جاتا ہے جو ازل سے بار بار خود کو دُہرا رہے ہیں)

۱۸۸۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اگر نماز بندے کی خدا کے حضورِ اقدس میں مانند حاضری کے ہے۔ اور خدا کے گھر کا حج اطاعت و فرمانبرداری کی معراج ہے۔

باب ۷

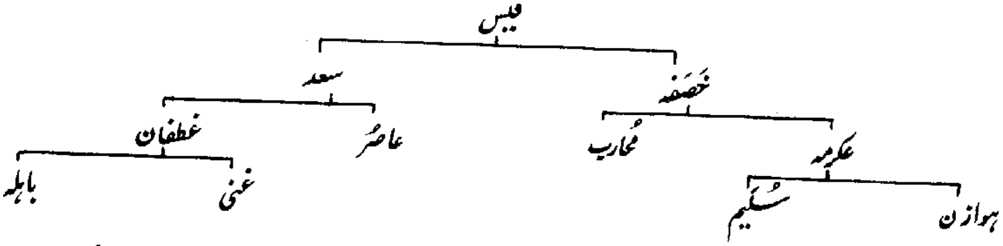
عرب قبائل سے تعلقات

۱۸۹۔ کفارِ مکہ اسلام کے بدترین دشمن تھے، اُنھی سے اپنے دفاع کے لیے رسولِ خدا نے مدینہ کے اردگرد کئی لفری ریاستیں قایم کی تھیں —— ہر قبیلہ ایک آزاد ریاست کی مانند تھا —— یوں اُنھوں نے آہستہ آہستہ مکہ کے گرد بھی گھیرا ڈال لیا اور اہلِ مکہ کو نہایت شرافت سے مسلم حکومت کی رضا کارانہ اطاعت پر مجبور کر دیا۔ مدینہ کے اردگرد دوست قبائل کا سلسلہ قایم کیا گیا مگر یہ سلسلہ ہر طرح سے مکمل نہ تھا کیونکہ تھوڑے فاصلے پر ہی آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ عرب میں اور بھی قبائل آباد تھے جو قریش مکہ سے کم طاقت ور نہ تھے۔ یہ تمام قبائل بت پرست تھے لیکن یہ امر ناقابلِ تشریح ہے کہ ان قبائل نے مسلمانوں کی مزاحمت کیوں نہ کی۔ فتح مکہ کے لیے اکیس سال کا عرصہ صرف ہوا اور دس ہزار سپاہ پر مشتمل فوج کی ضرورت پیش آئی مگر دوسرے قبائل کے خلاف جو مہمیں روانہ کی گئیں ان میں زیادہ سے زیادہ چند سو فوجی شامل ہوتے تھے۔ بیشتر قبائل نے فوراً ہی مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ یہاں تک کہ نہایت ترقی یافتہ علاقے مثلاً یمن، بحران (بحرین)، عُمان اور دُومۃ الجندل وغیرہ نے جتنی آسانی اور تیزی سے اسلام قبول کیا مورخ بھی اس پر حیران و ششدر رہیں۔ جہاں تک ساحلی علاقوں کا تعلق ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ علاقے غیر ملکی قبضے اور نوآبادیاتی نظام کے جوئے تلے پس رہے تھے اور اسلام ان کے لیے آزادی کا پیغام لایا تھا۔ اسلام نے انھیں حکمرانی دی، خود مختاری سے نوازا اور اس کے عوض ان سے ماسوائے اس کے کچھ طلب نہ کیا کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے بتوں کی پُوجا کی احمقانہ رسم ترک کر دیں۔ دوسرے علاقوں کے قبائل میں غالباً اتحاد اور یک جہتی مفقود تھی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے مناسب قوت مجتمع نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے ان علاقوں کے بُت خانے تباہ کر دیے اور بتوں کو پاش پاش کیا لیکن بُت شکنوں پر "خدا کا غضب" نازل نہ ہوا، جو ان بتوں کی بے مائگی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔

۱۹۰۔ قبائل کو مشرف بہ اسلام کرنے کی مہموں میں ہلاک ہونے والوں کے اعداد و شمار کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مہموں میں اسلحہ کا استعمال اور خونریزی برائے نام ہی ہوئی تھی۔ رسولِ خدا نے مدینہ میں آمد کے بعد ہی دشمنوں کے خلاف جنگ کی پالیسی پر عمل شروع کیا تھا۔ اس کے دس سال بعد ان کا وصال ہو گیا۔ اس دہائی میں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ تیس لاکھ مربع کلومیٹر تک پھیل گیا۔ گویا مسلمانوں نے دس سال تک اوسطاً نوسو مربع کلومیٹر علاقہ روزانہ فتح کیا۔ ان جنگوں میں ہر ماہ دشمن کے دو افراد بھی ہلاک نہیں ہوئے۔ مسلمانوں کا جانی نقصان تو اس سے بھی کم تھا۔ تیس لاکھ مربع کلومیٹر پر فتح حاصل کرنے کے دوران دو تین سو افراد کا میدان میں کام آنا تاریخ عالم کے لیے نا آشنا اور غیر معمولی واقعہ ہے۔ انسانی خون کی حرمت کا یہ تصور جو رسولِ خدا کی حیاتِ طیبہ کے دوران موجود تھا، ان کے خلفا کی حکومتوں کے دوران بھی جاری و ساری رہا۔

۱۹۱۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسولِ خداؐ نے کس طرح مدینہ کو کفارِ مکہ کے حملوں سے محفوظ بنانے کے لیے شہر کے اردگرد بفر ریاستوں کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ مسلمانوں کے ان حلیف قبیلوں کی ریاستوں سے پرے کئی اور قبائل آباد تھے۔ ان میں بعض قبائل بلا وجہ اسلام سے عناد رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ جو جنگیں ہوئیں، ان میں کوئی زیادہ خون نہیں بہایا گیا۔ اب ہم ان کا مختصر حال بیان کریں گے۔

۱۹۲۔ مدینہ کے شمال مشرق میں بنو غطفان اور بنو فزارہ، مشرق میں بنو سُلیم اور جنوب مشرق میں بنو ہوازن آباد تھے۔ یہ سب قبائل ایک ہی مورثِ اعلیٰ قیس کی اولاد تھے اور عم زاد قبائل تھے۔



قدیم مورخوں مثلاً ابنِ حبیب کے نزدیک تین قبائل (۱) سُلیم — ہوازن، (۲) غطفان اور (۳) عاصُر — محارب کو ایک ہی نام — اثافی[1] — سے پکارا جاتا تھا۔ ان کا یہ نام حالات کے مطابق بلا جواز نہیں تھا۔ یہ قبائل مدینہ کی مسلم مملکت کے قریب ترین ہمسائے تھے۔ جو قبائل دور انتہائی شمال، انتہائی جنوب یا جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی مشرق میں آباد تھے ان سے مسلم ریاست کا رابطہ دُوسرے مرحلہ میں ہی ہو سکتا تھا۔ اور اس رابطہ کا مطلب بازنطین اور ایران کی بیرونی سلطنتوں سے چھیڑ چھاڑ تھی کیونکہ ان ملکوں نے عرب میں نوآبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ آیئے ہم پہلے گروپ سے ابتدا کریں۔

بنو سُلَیم

۱۹۳۔ بنو سُلیم کے مکہ سے انتہائی قدیم اور قریبی تعلقات تھے۔ رسولِ خداؐ کے اسلاف کی تیسری سے چھٹی نسل تک حضورؐ کی تین دادیاں جن کا ایک ہی نام — عاتکہ — تھا، بنو سُلیم سے تعلق رکھتی تھیں، تاہم اس سے پیغمبر (صلعم) کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ غالباً رسولِ خداؐ کے بنو سُلیم سے تعلقات ظہورِ اسلام سے قبل ہی بگڑ چکے تھے۔ اہلِ مکہ اور بنو قیس کے قبیلوں کے درمیان جنگ الفجار لڑی گئی تھی۔ یہ طویل جنگ کئی لڑائیوں پر مشتمل تھی۔ رسولِ خداؐ نے بھی عالمِ نوجوانی میں ایک یا دو معرکوں میں بنو قیس کے خلاف حصہ لیا تھا۔ روایت ہے (دیکھیے علامہ الحازمی کی الاماکن فصل بُرزا) کہ بنو سُلیم نے مالک ابنِ خالد ابن صخر ابن الشارد کو تاج پہنایا اور اسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس کا عرف ذو التاج تھا۔ مگر وہ ایک قبائلی جنگ یوم بُرزا میں مارا گیا۔ جب رسول اللہؐ نے جو مکی تھے نبوت کا دعویٰ کیا تو غالباً بنو قیس نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ مکی اس نبی کی بدولت اُن پر بالادستی قایم کرلیں گے اور پھر عرب میں بنو قیس کی حکومت کبھی قائم نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ انھی تصورات اور حسد کی بنا پر

---

[1] عربی میں اثافی ان پتھروں کو کہتے ہیں جو چُولھا تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ (مترجم)

وہ مسلمانوں کے مقابلے پر آ گئے ۔ فریقین کے درمیان کشیدگی نبیؐ کی ہجرت سے قبل ہی شروع ہو گئی ۔ مشہور بت العزّٰی بنو سُلیم کا بت تصور ہوتا تھا ۔ بنو غطفان بھی اس بت کی پوجا کرتے تھے ۔ یہ نخلہ کے بُت خانہ میں رکھا ہوا تھا ۔ اس بُت خانہ کا متولی افلح السُّلَیمی بسترِ مرگ پر تھا کہ ابولہب اس کی بیمار پرسی کے لیے گیا ۔ افلح نے ابولہب کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا ۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد عُزّٰی کو نقصان پہنچے گا" افلح نے کہا ۔ مگر ابولہب نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف عزّٰی کی مدافعت کرے گا ۔

۱۹۴ ۔ بنو سُلیم کے خود غرض عناصر کو اس وقت مزید نقصان اٹھانا پڑا ۔ جب رسول اللہؐ نے ہجرت کے بعد ایک گشتی دستہ بھیجا جس سے بنو سُلیم بھڑک اُٹھے ۔ اسلامی فوج کے گشتی دستے نے اہلِ مکہ کے ایک تجارتی قافلے کو جو واپس مکہ جا رہا تھا ، نخلہ کے مقام پر روک کر لوٹ لیا اور اہلِ قافلہ کو قیدی بنا لیا ۔ رسولِ خداؐ نے فوجی دستے کے کمانڈر کی اس کارروائی پر اظہارِ ناپسندیدگی نہ کیا مگر بنو سُلیم کی خوشنودی کے لیے بھی کچھ نہ کیا ۔ دو ماہ بعد جب جنگِ بدر پیش آئی تو رسولِ خداؐ کو بنو سلیم کی مخاصمت کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد پیغمبرؐ قرقرۃ الکدر گئے تاکہ بنو سُلیم کے ایک ذیلی قبیلہ کو سزا دے سکیں ۔ اسلامی فوج نے ان کے پانچسو اونٹوں پر قبضہ کر لیا اس سے بنو سلیم اور مسلمانوں کے تعلقات مزید بگڑ گئے ۔ بنو سُلیم اور بنو غطفان دونوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے دفاعی اقدام کے طور پر ذُوامر اور بحران[1] (بحرین) کو دو مہمیں بھیجیں جن میں علی الترتیب ۴۵۰ اور ۳۰۰ رضاکار شامل تھے ۔ بحران کی مہم کے دوران رسولِ خداؐ خود دو ماہ تک موقع پر موجود رہے اور مصالحت کی کوشش کرتے رہے بنو سُلیم کے معمر اور دانشمند افرادِ صلح کے حق میں تھے جبکہ نوجوان طبقہ اس کے خلاف تھا اور بالآخر نوجوانوں کی بات ہی مانی گئی اور رسولِ خدا مصالحت میں ناکام رہنے کے بعد واپس آ گئے تاہم رسول اللہؐ نے مصالحانہ کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر وہ بنو سُلیم کے عم زاد قبیلہ بنو کلاب سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور رئیس قبیلہ نے سنہ ۴ ہجری میں اپنی ذاتی حفاظت کے تحت اسلام کے مبلغین طلب کیے ۔ مسلمان مبلغوں کا چالیس سے ستر افراد پر مشتمل وفد وہاں گیا مگر اس پر دھوکہ سے بئرِ معونہ کے قریب حملہ کر دیا گیا ۔ پورا وفد شہید کر دیا گیا ۔ رسولِ خداؐ کو اس واقعہ سے بڑا دکھ ہوا مگر ان دنوں مکہ اور خیبر کی صورتِ حال خراب تھی اور نبیِؐ خدا کی ساری توجہ اس پر مرکوز تھی ۔ لہٰذا مبلّغینِ اسلام کا خون بہانے والوں سے بازپرس نہ کی جا سکی ۔ بنو سُلیم کے سرداروں کی ہٹ دھرمی کے باوجود قبیلہ کے افراد اسلام قبول کرتے رہے اور رسول اللہؐ کی طرف سے اعزاز بھی حاصل کرتے رہے ۔ حضورؐ نے انھیں تحفہ میں اراضی بھی دی ۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ابوالعوجاءؓ السلمی کو سنہ ۷ ہجری میں مبلّغوں کے وفد کے ساتھ بنو سُلیم کے علاقہ میں بھیجا گیا مگر یہ مبلّغ بھی قتل کر دیے گئے ۔ اس کے باوجود ایک سال بعد مسلمانوں کی جس فوج نے فتح مکّہ میں حصّہ لیا اس میں بنو سلیم کے بہادروں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بھی شامل تھا ۔ خصوصاً

---

[1] یہ سعودی عرب کا ہی ایک علاقہ ہے جسے ماضی میں بحران یا بحرین کہا جاتا تھا ۔ اس کا موجودہ بحرین سے کوئی تعلق نہیں ۔
(مترجم)

بنو سُلیم کے گھڑسواروں کا دستہ رسولِ خدا کے ہم رکاب تھا۔ مورخ بنو سُلیم کے بڑی تعداد میں اسلام لانے کا سبب دریافت نہیں کر سکے، البتہ امکان ہے کہ مادی فوائد کی کشش انھیں دائرۂ اسلام میں لے آئی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ شروع شروع میں اسلام کے زیادہ وفادار نہ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب رسولِ خدا بنو ہوازن (جو بنو سُلیم کا عم زاد قبیلہ تھا) سے جنگ کے لیے نکلے تو بنو سُلیم کے دستے اسلامی فوج سے فرار ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے نہ صرف شکست خوردہ بنو ہوازن کا تعاقب کرنے سے انکار کر دیا بلکہ دُوسرے مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ تاہم رسول اللہ ان سے مایوس نہ تھے۔ اُنھوں نے مالِ غنیمت سے بنو سُلیم کے دستوں کو وافر حصہ دیا۔ آہستہ آہستہ پرانی عداوت فراموش کر دی گئی۔

بنو ہوازن

۱۹۵۔ نبیِ خدا کی رضاعی والدہ بی بی حلیمہ کا تعلق بنو ہوازن سے تھا۔ فتح مکہ کے بعد بنو ہوازن مسلمانوں سے سخت خوفزدہ ہو گئے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمان اب ان کے شہر طائف پر بھی فوج کشی کریں گے۔ طائف بت شکن مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے گا جس کے بعد طائف کے عظیم بُت لات کا بھی وہی حشر ہو گا جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں کعبہ میں بتوں کا ہو چکا تھا۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا اور بنو ہوازن اسلامی فوج کی پیش قدمی روکنے کی قوت سے عاری تھے۔ جنگِ حنین میں شکست کے بعد بنو ہوازن نے طائف کے محاصرے میں مسلمانوں کی شدید مزاحمت کی۔ لیکن طائف والے مکہ کی منڈی اور اپنے دوستوں سے کٹ چکے تھے۔ ایک سال بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تاہم انھوں نے بعض دینی معاملات میں (رسولِ خدا سے) کچھ مراعات حاصل کر لیں۔ اسلام کے طریقۂ تبلیغ کے نقطۂ نظر سے مراعات کے حصول کا یہ واقعہ بیحد اہم ہے، اس لیے اس کی کچھ تفصیل بیان کرنا نامناسب نہ ہو گا۔

۱۹۶۔ بنو ہوازن کے اشراف کا ایک وفد مدینہ آیا اور درخواست کی کہ ان کے بُت لات کو نہ چھیڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اللہ کی وحدانیت اور محمد (صلعم) کی نبوت پر ایمان لانے کو تیار ہیں لیکن انھیں نماز کی ادائیگی، زکوٰۃ اور جہاد کے فرائض سے سبکدوش سمجھا جائے۔ مزید برآں انھیں حُرمت شراب، امتناعِ زنا اور سُود کی ممانعت سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ طائف شہر کو حرام علاقہ قرار دیا جائے جہاں جنگلی جانوروں کا شکار اور جنگلی درختوں کی کٹائی ممنوع ہو۔

۱۹۷۔ رسولِ خدا بنو ہوازن کو زکوٰۃ، جہاد کے لیے رضاکاروں کی فراہمی اور طائف شہر کو حرام علاقہ قرار دینے پر رضامند ہو گئے (ہم اس کا ذکر آگے کریں گے) نماز کی معافی کے بارے میں رسول اللہ نے فرمایا: وہ مذہب تو مذہب کہلانے کا مستحق ہی نہیں جس میں بندے کے خالق کی عبادت کا تصور ہی نہ ہو۔ جنسی اختلاط کی بے محابا آزادی کے بارے میں نبیِ خدا نے ان سے سوال کیا: "کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کی بیوی، ماں، بہن یا اس کی بیٹی کی عصمت کوئی اجنبی لُوٹ لے؛ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو جس عورت کے ساتھ تم کُھل کھیلو گے وہ بھی تو کسی کی بیوی، بہن یا بیٹی ہو گی، اور وہ اس صورتِ حال کو کیسے برداشت کرے گا!" اس پر وفد کے ارکان اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو گئے۔ سُود کے سلسلے میں نبی نے انھیں چند ماہ کی مہلت دے دی تاکہ وُہ اپنے پُرانے قرضے سُودی نظام کے مطابق نمٹا سکیں۔ لیکن رسول نے واضح کر دیا کہ جو نئے قرضے دیے جائیں گے ان پر سُود وصول کرنا حرام ہو گا۔ بنو ہوازن کے بُت لات کے بارے میں رسولِ خدا نے بڑے

سکون سے فرمایا: "تمھیں لات یا اس کے بُت خانہ کو خود توڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے اپنے آدمی بھجوائیں گے جو لات کو پاش پاش کر دیں گے اور یُوں بت کا غضب ان لوگوں پر ہی نازل ہوگا۔" رسول اللہؐ نے امتناعِ شراب کے سلسلے میں بھی کوئی رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ اس ضمن میں نبیؐ نے جو جواب دیا اس کی تفصیل میسر نہیں ہے، لہذا سوچا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ کہا ہوگا کہ شراب کا نشہ انسان کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیتا ہے۔

۱۹۸۔ جب بنو ہوازن کا وفد واپس چلا گیا تو اہلِ مدینہ نے جو اہلِ طائف کو یُوں مراعات دینے پر برافروختہ تھے، رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا زکوٰۃ اور جہاد کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ رسولِ خداؐ نے جواب دیا: "نہیں، مگر جب ان لوگوں کے دلوں میں اسلام راسخ ہو جائے گا تو وہ خود ہی ان مراعات سے اظہارِ برأت کر دیں گے۔" رسولِ خداؐ کا فرمانا صحیح تھا۔ یہ مراعات حاصل کرنے کے بعد دوسرے لوگ طائف والوں کو دوسرے درجے کا مسلمان کہہ کر ان کا تمسخر اڑاتے تھے تاہم دو سال بعد رسول اللہؐ کے وصال سے قبل ہی طائف کے لوگوں نے دُوسرے مسلمانوں کی طرح اسلامی حکومت کو زکوٰۃ کی ادائیگی شروع کر دی۔ رسولِ خداؐ کی وفات پر انھوں نے اپنے مسلح دستے مدینہ بھیجے تاکہ علاقہ کے بعض حصّوں میں مرتدوں کی شورش کو کچلنے میں اسلامی حکومت کی مدد کر سکیں۔

۲۰۰۔ لات کی تباہی ایک قابلِ دید منظر تھا۔ رسولِ خداؐ نے طائف کے ایک مسلمان المغیرہؓ ابنِ شُعبہ کی قیادت میں ایک دستہ طائف بھیجا، اس میں ابوسفیانؓ بھی شامل تھے۔ المغیرہ نے اہلِ طائف کو جمع کیا تاکہ وہ بُت کی تباہی کا تماشا کر سکیں۔ پھر اس نے بُت پر پہلی ضرب لگائی اور یُوں ظاہر کیا جیسے اسے کچھ ہو گیا ہے، یہ چیخ ماری اور "بے ہوش" ہو کر زمین پر گر گیا۔ المغیرہ کی یہ "گت بنتے" دیکھ کر ناپختہ ایمان افراد بڑے خوش ہوئے، اچانک المغیرہ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر چند زوردار ضربیں لگا کر بُت کو پاش پاش کر دیا۔ اس سے ان لوگوں کے ایمان میں بھی پختگی آ گئی جو ابھی تک ڈھلمل یقین تھے۔

بنو غطفان

۲۰۱۔ بنو غطفان کُلی طور پر خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ کسی شہر میں ان کی کوئی آبادی نہ تھی۔ وُہ اپنی اقتصادی ضروریات کے سلسلے میں کسی اور شہر یا علاقہ کے بجائے خیبر پر ہی انحصار کرتے تھے۔ مسلمانوں اور بنو سُلیم (جو غطفان کا عم زاد قبیلہ تھا) کے درمیان کشیدگی نے بنو غطفان کو مسلمانوں کے خلاف اُکسایا اور اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف قزاقی، لُوٹ مار اور چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں۔ مگر پیغمبرِ اسلام نے وسیع القلبی کی پالیسی اختیار کی جس نے سادہ دل بدوّوں کو اسلام کی کسی فلسفیانہ یا عالمانہ تشریح سے زیادہ متاثر کیا۔ مثال کے طور پر اسلامی فوج کی ایک تعزیری مہم ذوامر بھیجی گئی مگر دشمن نے راہِ فرار اختیار کی اور وہاں مسلمانوں سے لڑنے والا کوئی نہ تھا۔ اسی اثنا میں بارش آ گئی۔ رسولِ خداؐ نے بارش بند ہونے کے بعد اپنا لباس اتارا اور سُوکھنے کے لیے ایک درخت سے لٹکا دیا۔ وُہ خود ساتے میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ ان کے صحابہ نے بھی ایسا ہی کیا اور صحرا میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ پیغمبرِ خدا کو اکیلے دیکھ کر دشمن کا ایک سردار جس نے قریبی پہاڑی کی چوٹی پر پناہ لے رکھی تھی، چپکے سے نیچے اترا اور رسولِ خدا کی تلوار پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ چلّا کر بولا: "اب تجھے کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟" رسول اللہؐ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے

اور جواب دیا "میرا خدا"۔ رسولؐ خدا کے اعتماد نے سادہ دل بدوی کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کانپنے لگا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب رسول اللہؐ نے شمشیر سنبھالی اور بدوی سے پُوچھا "اب تمھیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" بدوی سردار ذُوالثور نے جواب دیا: "کوئی نہیں"۔ مگر نبیؐ نے اسے معاف کر دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی، وہ رسول اللہؐ کی رحم دلی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے نہ صرف فوری طور پر اسلام قبول کر لیا بلکہ اپنے قبیلہ میں اسلام کا سرگرم مبلّغ بھی بن گیا۔

۲۰۲۔ بنو غطفان کی بعض اور شاخیں ——— اشجاع اور عامر ابن عکرمہ ——— مدینہ کے نواح میں آباد تھیں۔ ان کی روزی کا دار و مدار علاقہ سے گزرنے والے کاروانوں پر تھا۔ وہ ہجرت کے فوراً بعد ہی ایمان لے آئے اور مسلمانوں کے نہایت سُود مند حلیف ثابت ہوئے۔

۲۰۳۔ جب تک اہلِ مکّہ اور اہلِ خیبر مسلمانوں کے دشمن تھے۔ بنو غطفان کا سردار عُیینہ بن حسن الفزاری بھی مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف رہا۔ مگر اس کے بعد اسے بھی عقل آگئی اور اس نے مسلمانوں سے صلح کر لی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بنو غطفان کے علاقہ میں بھی اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ نبیؐ کے وصال کے بعد عُیینہ مرتد ہو گیا مگر جلد ہی اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے معذرت کی تو خلیفہ ابوبکرؓ نے اسے معاف کر دیا۔ اس غیر متوقع رہائی سے اکھڑ بدو پکّا مسلمان بن گیا۔

باب ۸

یہود سے تعلقات

۲۰۴۔ اُن دنوں یہود کی بستیاں شام سے یمن اور عُمان تک پھیلی ہوئی تھیں مگر ان کا گڑھ خیبر کا علاقہ ہی تھا۔ مدینہ میں وہ مجبوراً قیام پذیر تھے کیونکہ رسول اللہ نے اسلامی مملکت مدینہ کے لیے جو آئین نافذ کیا تھا اس میں یہودیوں کا ایک الگ قبیلہ یا کنفیڈریشن کے خود مختار یونٹ کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہ دو عرب قبائل اوس یا خزرج کے حلیف کے طور پر تسلیم کیے گئے تھے۔ یہودیوں کا تعلق تین بڑے قبائل بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے تھا۔ چونکہ ان تینوں یہودی قبائل میں باہمی مناقشت تھی اس لیے ان کے حلیف بھی جُدا جُدا تھے۔ بعض نے خود کو بنو اوس سے اور دوسروں نے بنو اوس کے دشمنوں سے خود کو وابستہ کر رکھا تھا۔

۲۰۵۔ بنو قینقاع کے زرگر نہایت پست اخلاق تھے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے ایک مسلمان خاتون کو محض شرارت سے ننگا کر دیا۔ اس پر یہودیوں اور مسلمانوں میں فساد ہو گیا۔ چنانچہ نبیؐ نے پُورے بنو قینقاع کو تو نہیں بلکہ قصوروار خاندانوں کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا اور وہ مدینہ سے نکل کر شام چلے گئے۔

۲۰۶۔ کہا جاتا ہے کہ بنو نضیر نے اس وقت رسول اللہ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی جب اللہ کے نبی انتظامی امور کے سلسلے میں ان یہودیوں کی بستی کا معاینہ کرنے گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور انھیں بھی مدینہ سے اخراج کا حکم دیا گیا۔ تاہم انھیں اپنی تمام املاک ساتھ لے جانے اور شہر میں دیے گئے قرضے وصول کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ انھوں نے اخراج کے حکم پر بدنیتی سے عمل کیا اور رسولِ خدا کی نرمی اور تحمل کو ان کی کمزوری پر محمول کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اہلِ مکہ، بنو سُلیم، بنو غطفان اور دیگر قبائل کے کرائے کے فوجیوں کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی سازش کی جس کے نتیجے میں جنگِ خندق رونما ہوئی۔ بنو قریظہ کے یہودی ابھی تک مدینہ میں مقیم تھے، رسولِ خدا نے ان پر بڑے احسانات کیے تھے اور ان کی حالت سدھارنے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مدینہ کے دوسرے یہودی بنو قریظہ کو خود سے کمتر تسلیم کرتے تھے یہاں تک کہ اگر کوئی یہودی بنو قریظہ کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو اس کا خون بہا مقررہ رقم کا نصف ادا کیا جاتا تھا۔ یہ رسولِ خدا ہی تھے جنھوں نے بنو قریظہ کی عزت اور انسانی حرمت بحال کی اور انھیں دوسروں کے مساوی قرار دیا۔ لیکن ان تمام احسانات کے باوجود جب بنو نضیر کے ایجنٹوں نے انھیں ورغلایا تو وہ غداری کر کے حملہ آوروں سے مل گئے اور اہلِ اسلام کے دفاعی منصوبوں کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بچا لیا۔ جنگِ خندق کے خاتمہ پر مسلمانوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب انھیں زیر کر لیا گیا تو رسولِ خدا نے پھر بھی نرمی کا سلوک کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اپنے جرم کی سزا کے تعین کے لیے خود ہی کسی حکم کا انتخاب کر لیں[1]۔ ایک سال بعد اہلِ مکہ سے مسلمانوں کی صلح (صلح حدیبیہ) ہو گئی۔ اہلِ مکہ

[1] بنو قریظہ نے ایک یہودی سعد بن معوذ کو حکم مقرر کیا جس کے فیصلہ کے مطابق تین چار سو یہودیوں کو موت کی سزا دی گئی۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو نیلام کر دیا گیا اور ان کے مال و اموال پر مسلم فوج نے قبضہ کر لیا بعد میں وہ شام چلے گئے۔ (مترجم)

قرضوں پر مسلمانوں کے لیے تو سود لینا حرام تھا مگر غیر مسلم سودی کاروبار کرسکتے تھے۔ لیکن غیر مسلموں کو مسلمانوں کی نسبت درآمدی ڈیوٹی (کسٹمز) دوگنا ادا کرنا پڑتی تھی۔ زرعی زمین پر ٹیکس کی صورت میں مسلمان فصل کا دسواں حصّہ ادا کرتے تھے جبکہ غیر مسلم معاہدہ کے مطابق یا پھر نقد ادائیگی کرتے تھے، تاہم زرعی ٹیکس کے ضمن میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔

قرضوں پر مسلمانوں کے لیے تو سود لینا حرام تھا مگر غیر مسلم سودی کاروبار کر سکتے تھے۔ لیکن غیر مسلموں کو مسلمانوں کی نسبت درآمدی ڈیوٹی (کسٹمز تہ) دوگنا ادا کرنا پڑتی تھی۔ زرعی زمین پر ٹیکس کی صورت میں مسلمان فصل کا دسواں حصہ ادا کرتے تھے جبکہ غیر مسلم معاہدہ کے مطابق یا پھر نقد ادائیگی کرتے تھے، تاہم زرعی ٹیکس کے ضمن میں مسلموں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔

باب ۹

خارجہ تعلقات

بازنطین ۲۰۹۔ پیغمبرِؐ اسلام نے صرف دفاع کی خاطر اور وُہ بھی بڑے تامّل کے ساتھ ہتھیار اٹھائے تھے۔ جب اسلام کے پُرانے دشمنوں کی احمقانہ معاندت ختم ہوگئی تو ان کا صرف ایک ہی کام اور ایک ہی مقصد رہ گیا کہ عرب اور دیگر ممالک میں پُرامن طور پر اسلام کی تبلیغ کی جائے۔

۲۱۰۔ الحدیبیہ سے واپسی کے بعد جہاں وہ اہلِ مکّہ سے پُرامن بقائے باہمی پر مفاہمت میں کامیاب رہے اور خیبر فتح کیے بغیر ——— فتح مکہ کا تو ذکر ہی کیا ——— پیغمبرِ اسلام نے بیرونی ممالک میں قاصد روانہ کرنا شروع کر دیے۔ ۷ھ ہجری میں انھوں نے بازنطینی فرمانروا، والیٔ مصر، شاہِ حبشہ اور شاہِ ایران کے نام مراسلے ارسال کیے جن میں ان فرمانرواؤں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان ممالک کو بھیجنے کے لیے نبیؐ نے ایسے افراد کا انتخاب کیا جو پہلے ہی ان ممالک کا دورہ کر چکے تھے اور وہاں کی زبان کسی حد تک سمجھ سکتے تھے۔

۲۱۰۔ا۔ رسولِ خدا نے جن فرمانرواؤں کو خطوط ارسال کیے ان میں ہرقل معمولی گھرانے کا فرد تھا جو قسطنطنیہ میں ایک فوجی انقلاب کے نتیجہ میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس نے انھی دنوں ایرانیوں پر زبردست فتح حاصل کی تھی اور انھیں اپنی مملکت کے ان حصوں سے مار بھگایا تھا جن پر انھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ فطری طور پر شہنشاہ ہرقل حقیر عرب کے کسی باشندے کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہوسکتا تھا جبکہ عرب کا ایک حصہ خود اس کی سلطنت کی ایک نوآبادی تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے ہرقل نے اپنے ایک سردار کو محض اس لیے پھانسی دے دی تھی کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس نے مسلم سفیر کو قتل کرنے والے گورنر کو پناہ دی جس نے بین الاقوامی قوانین اور اصول و قواعد کی صریح خلاف ورزی کی تھی۔ جب پیغمبرؐ نے سفیر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے فوجی مہم موتہ بھیجی تو ہرقل نے ایک زبردست فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اس کا رویہ ایک بے اصول ظالم اور جابر بادشاہ کا تھا۔ مسلمان مورخوں کے مطابق ایک بڑے پادری نے اسلام سے رغبت کا اظہار کیا تو لوگوں نے اس کی تکا بوٹی کر دی۔ ممکن ہے اس واقعہ کے باعث ہی ہرقل نے اسلام کے متعلق بے توجہی برتی ہو، حالانکہ انھی دنوں اس توہم پرست بادشاہ نے بعض ڈراؤنے خواب دیکھے تھے اور اس نے علمِ نجوم کی بعض کتابوں میں جو اس کے کتب خانہ میں موجود تھیں اور جن کا وہ اکثر مطالعہ کرتا تھا، رسولِ پاکؐ کے بارے میں بعض پیشگوئیوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ پیغمبرؐ نے ہرقل کو جو خط لکھا اس کا اصل مسودہ کئی صدیاں سپین میں رہا۔ اب یہ خط دوبارہ نمودار ہوا ہے مگر یہ دیکھنا باقی ہے کہ جو خط اب منظرِ عام پر لایا گیا ہے وہ جعلی تو نہیں۔

۲۱۱۔ رسولِ خدا کے خطوں کے جواب کم و بیش نرم زبان میں انکار کے مترادف تھے۔ انسانی معاشرہ میں مذہب

اور ماورائے طبیعیات اعتقادات کے بارے میں سب سے زیادہ قدامت پرستی اور تعصب کارفرما رہتا ہے۔ لیکن ایسا داعی جسے اپنے دعوے پر مکمل یقین ہو کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اگر شروع میں اسے کامیابی نہ بھی ہو تو وہ براہِ راست یا بالواسطہ ذرائع سے بار بار اپنی کوشش بروئے کار لاتا ہے۔ ایرانیوں اور بازنطینیوں دونوں نے عرب کے اندر اور گرد و نواح میں اپنی نوآبادیاں قایم کر رکھی تھیں۔ انھوں نے عربوں کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا اور وہ ان سے دوسرے درجے کے شہریوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ وہ عربوں کو کمتر نسل تصور کرتے تھے۔ رسولؐ خدا نے براہِ راست یونانیوں (رومیوں) سے رابطہ پیدا کرنے سے قبل ان سے رابطہ کا فیصلہ کیا۔

۲۱۲۔ سینٹ پال کے دور میں عرب نہ صرف دور دور تک آباد تھے بلکہ انھوں نے دمشق کے شمالی علاقہ میں چھوٹی موٹی سرداریاں بھی قایم کر رکھی تھیں۔ اس وقت اس علاقے کا حکمران حارث (ارٹیس) نامی ایک شخص تھا۔ رسولؐ اللہ کے دور میں اس علاقے میں عرب قبیلہ غسان آباد تھا جس نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ رسولؐ اللہ نے اس قبیلہ کے مختلف سرداروں کے نام بھی خط بھجوائے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی:

۲۱۳۔ نبیؐ نے پہلا خط حارث ابن شمیر کو لکھا۔ مگر اس نے رسولؐ خدا کی دعوت مسترد کر دی۔ جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔ پھر اس کے جانشین جبلہ الایہم کو بھی اسی طرح کا نامہ بھیجا گیا۔ اس کے قبولِ اسلام کے بارے میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ رسولِ خدا نے حاکمِ بصرہ کے نام بھی اسلام کا دعوت نامہ ارسال کیا۔ یہ خط حارث ابن عمیر الازدی لے کر گئے مگر عیسائی سردار شرحبیل ابن عمرو الغسانی نے رسولِ خدا کے سفیر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ عیسائی سردار کا یہ فعل تمام بین الاقوامی اصول و قواعد کی کھلی خلاف ورزی تھا۔ رسولؐ خدا نے سفیر کے قتل کا تاوان طلب کیا اور مطالبہ کیا کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ لیکن شہنشاہ ہرقل نے مسلمانوں کی چھوٹی سی مہم کے مقابلہ میں ایک لاکھ سپاہ پر مشتمل وہ فوج روانہ کر دی جو اس نے ایران کی مہم کے لیے بھرتی کی تھی اور ابھی اسے فارغ نہیں کیا گیا تھا۔ رسولِ خدا نے اس مہم کے لیے تین ہزار افراد پر مشتمل فوج خشکی کے راستے اور کچھ کمک سمندر کے راستے بھجوائی تھی، مسلم فوج کا ہرقل کی فوج سے موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا، مسلمان دشمن کی تعداد سے خائف نہیں تھے، جنگ شروع ہوئی مسلمانوں کے دو سینئر جرنیل، کمانڈر انچیف، زید بن حارثہ (رسولِ خدا کا لے پالک بیٹا) اور ان کا نائب جعفر الطیار ابن ابوطالب (رسول پاکؐ کا عم زاد) شہید ہو گئے۔ اس کے بعد فوج نے خالد ابن ولید کو سپہ سالار منتخب کیا۔ انھوں نے دشمن کو بھاری جانی نقصان پہنچایا اور اسلامی فوج کو بتدریج پیچھے ہٹا لائے۔ دشمن کو مسلم فوج کا تعاقب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسلامی فوج مدینہ میں وارد ہوئی جس کے بعد رسول پاکؐ نے جنگِ تبوک کی تیاری شروع کر دی۔ ۹ سنہ ہجری میں رسولِ خدا خود تیس ہزار افراد پر مشتمل فوج لے کر نکلے۔ راستے میں اسلامی فوج جس جگہ پڑاؤ ڈالتی وہاں ایک مسجد تعمیر کر دی جاتی۔ انھوں نے پورے شمالی عرب اور جنوبی فلسطین پر مسلمانوں کی بالادستی قایم کر لی۔ اسلامی فوج نے دومتہ الجندل، مقنہ، ایلہ، جربا اور اذرح پر قبضہ کر لیا۔ یہ تمام شہر بازنطینیوں نے خالی کر دیے تھے۔ ان میں ایلہ کی بندرگاہ نو بردست اہمیت کی حامل تھی۔ علاقہ کی عرب آبادی نے جو عیسائیت تو قبول کر چکی تھی، ظالم بازنطینیوں کے

خلاف بغاوت کر دی تھی، وُہ روا دار اور اصول پرست مسلمانوں کے سائے میں زندگی بسر کرنے پر خوش تھے ۔ ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا اور اب رومی شہنشاہ ان میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا تاہم ابھی اسلامی مملکت کی سرحدوں کی صورت حال مستحکم نہ تھی چنانچہ ڈیڑھ سال بعد ایک اور فوجی مہم روانہ کی گئی ۔ یہ فوج عین اس روز روانہ ہوئی جس روز رسولِ خداؐ کا وصال ہوا ، اس فوج کو بھیجنے کا فیصلہ رسول اللہؐ نے کیا تھا ۔ چنانچہ خلیفہ ابو بکرؓ نے پیغمبرؐ کا فیصلہ برقرار رکھا ۔ فوج کا کمانڈر اُسامہؓ ابن زید کو مقرر کیا گیا ۔ زید جنگِ موتہ میں اسلامی فوج کی کمان کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے ۔ اس فوج نے اسلامی مملکت کی حدود کو مزید شمال میں وسعت دی اور جلد ہی فلسطین مسلمانوں کے زیرِ نگیں آ گیا ۔

۲۱۴ ۔ معان کے عرب گورنر کو بھی رسولِ خداؐ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور اس نے اسلام قبول کر لیا مگر ہرقل کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا ۔

مصر

۲۱۵ ۔ مصر سلطنت بازنطین کا ایک حصّہ تھا جب ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا ۔ انھوں نے قبطیوں سے فیاضانہ سلوک کیا جو بازنطینی حکومت کے "مذہبی مظالم" سے تنگ آ چکے تھے ۔ ایرانیوں نے قبطیوں میں سے ایک شخص کو ان کا حکمران بنا دیا جسے مقوقس کا خطاب دیا گیا ——— مقوقس کا لفظ ایرانی الخرج معلوم ہوتا ہے ——— ایرانیوں کو جب نینوا کے مقام پر ہرقل کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ مصر بھی خالی کرنے پر مجبور ہو گئے ۔ غالباً یہی دَور تھا جب رسولِ خداؐ نے قبطیوں کے سردار کو خط لکھا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ۔ قبطی سردار نے رسول اللہؐ کے خط کا نہایت مودبانہ جواب دیا ، تاہم مقوقس کے قبولِ اسلام کا مقصد حاصل نہ ہو سکا ۔ مقوقس نے اسلامی سفیر کو متعدد تحائف دیئے جو وہ اپنے ساتھ مدینہ لے آیا ان میں دو سے چار کنیزیں بھی شامل تھیں ۔ ان میں سے ایک جس کا نام ماریہ تھا رسولِ خداؐ کے بیٹے ابراہیم کی ماں بنی ۔ ماریہ کی بہن کا نام شیریں بتایا گیا ہے جو خالص ایرانی نام ہے ۔ ممکن ہے یہ دونوں بہنیں ایرانی النسل ہوں ۔ ماریہ نے عیسائیت قبول کر لی تھی ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا والد ایرانی اور ماں قبطی ہو ۔ ہمیں زیادہ تفصیل اس کے سوا ، معلوم نہیں کہ ماریہ نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا تھا جس کی بنا پر رسولِ خداؐ نے اسے اپنی زوجہ ہونے کا اعزاز بخشا ۔

۲۱۶ ۔ رسول اللہؐ نے مقوقس کو جو خط لکھا تھا اس کا اصل مسوّدہ اب تک محفوظ ہے اور ان دنوں استنبول (ترکی) کے مشہور کتب خانہ توپ کاپی میں موجود ہے ۔

حبشہ

۲۱۷ ۔ حبشہ کا علاقہ یمن کے قریب تھا اور باب المندب کی تنگ کھاڑی اسے یمن سے جُدا کرتی تھی ۔ ظہورِ اسلام سے بہت پہلے مکہ سے حبشہ کے نہایت قریبی اقتصادی تعلقات قائم تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہودی حکمران ذُو نواس نے عیسائیوں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر اتنے مظالم کیے کہ حبشہ کے عیسائیوں نے یمن پر حملہ کر دیا اور اس پر قبضہ کر لیا ۔ لیکن فاتح عیسائیوں کے جرنیلوں کے درمیان حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے ۔ اس خونریزی اور جنگ و جدل کے بعد ابرہہ حبشہ کے بادشاہ کی طرف سے یمن کا گورنر بن گیا ۔ وہ مذہب کے معاملے میں بڑا اکھڑ اور ہٹ دھرم تھا ۔ یہ وہی ابرہہ ہے جس نے کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے لیے مکہ پہ

حملہ کیا تھا کیونکہ وہ کعبہ کو عرب میں عیسائیت کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ اس کی فوج میں ایک ہاتھی تھا جو اس نے مکہ پر حملہ میں استعمال کیا۔ وہ فوج لے کر طائف سے گزرا مگر اس نے لات کے بت خانہ کو نہیں چھیڑا کیونکہ اہل طائف نے مکہ کی راہ بتانے کے لیے اسے رہنما فراہم کیے تھے۔ قرآن پاک کی سورہ الفیل (۱۰۵) اس وقت نازل ہوئی تھی جب ان لوگوں میں سے بہت سے بقیدِ حیات تھے جنھوں نے مکہ پر ابرہہ کا حملہ بچشم خود دیکھا تھا۔ گو یہ لوگ اسلام کے مخالف تھے مگر انھیں سورہ فیل کے نفسِ مضمون کی تردید کی جرأت نہیں ہوئی۔ سورۂ فیل میں بتایا گیا ہے کہ "اصحابِ فیل کو جانوروں (ابابیل) کے جھنڈ نے مکمل تباہی سے ہمکنار کیا جنھوں نے ان پر کنکریاں برسائیں"۔ یہ واقعہ اسی سال رونما ہوا تھا جس سال رسولِ خدا تولد ہوئے تھے۔

۲۱۸۔ اس کے بعد جلد ہی ایرانیوں نے یمن پر فوج کشی کی اور حبشہ کی حکومت کے مخالف یمنیوں کی مدد سے حکمرانوں کو مار بھگایا۔

۲۱۹۔ حضورِ اکرمؐ نے جن مختلف حکمرانوں کو خطوط لکھے ان میں حبشہ کا شاہ نجاشی بھی شامل تھا۔ مسلمانوں سے نجاشی کے تعلقات اس خط سے بہت پہلے سے قایم تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ حضورؐ کے اعلانِ نبوت سے کوئی پانچ سال بعد مکہ میں چند اہلِ اسلام پر اتنے مظالم ڈھائے گئے کہ انھوں نے مادرِ وطن سے ہجرت کر کے سمندر پار کے ملک حبشہ میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ایک خط کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو غالباً رسولِ خدا نے اپنے عم زاد جعفر ابن ابو طالب کو دیا تھا۔ یہ خط شاہِ حبشہ کے نام ایک طرح کا تعارفی رُقعہ تھا۔ اگلے سال اہلِ مکہ نے دو سفارتیں حبشہ بھیجیں تاکہ مسلمانوں کو حبشہ سے نکال کر اہلِ مکہ کے حوالے کیا جائے۔ مگر دونوں سفارتیں ناکام رہیں۔ جب مکہ والوں کا دوسرا وفد حبشہ گیا تو رسولِ خدا نے بھی اپنا ایک سفیر حبشہ بھیجا تاکہ اہلِ مکہ کی سازش کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس دور کی حبشہ کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، جس کے باعث یہ قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ حبشہ کے جس شاہ نجاشی نے مکی مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور دس سال بعد جس نجاشی نے اہلِ مکہ کے دوسرے وفد سے ملاقات کی تھی وہ ایک شخصیت تھی یا دو مختلف افراد تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت تھی اور پیغمبرِ اسلام سے اس کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہؐ نے اسے خط لکھا تھا جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ (نبیؐ کے اس خط کا اصل مسودہ ہم تک پہنچا ہے اور اس وقت دمشق میں موجود ہے) کہا جاتا ہے کہ شاہ نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم وہ اپنی رعایا کو قبولِ اسلام کی ترغیب نہیں دے سکا تھا۔ نجاشی کا قبولِ اسلام اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کے مطابق نجاشی کی وفات کی خبر ملنے پر رسولِ خدا نے مدینہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا تھا۔ رسولِ خدا نے شاہ نجاشی کے جانشین کو بھی خط لکھا تاہم اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ مگر حبشہ کے بہت سے شہری مشرف بہ اسلام ہوئے جن میں شاہ نجاشی کا ایک بیٹا بھی شامل تھا۔ وہ بعد میں مدینہ آگیا اور رسولِ خدا کے خاندان کے زیرِ کفالت فرد کی حیثیت سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

۲۲۰۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حبشہ کو بازنطینی سلطنت کی نوآبادی نہیں بلکہ دوست ملک اور حلیف ظاہر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہم مذہبیت کی بنا پر کیا گیا ہو کیونکہ دونوں ملک عیسائیت کے پیروکار تھے۔

۲۲۱۔ عرب میں حبشہ کے کئی شہری بھی ملتے ہیں۔ موذّنِ رسولؐ حضرت بلالؓ کو حبشی اسی بنا پر کہا جاتا تھا کہ وہ حبشہ کے رہنے والے تھے۔ ایک اور شخص یاسر تھا جس کا تعلق نوبیا سے تھا۔ رسولِ خداؐ نے اسے آزاد کر دیا تھا جس کے بعد وہ نبیؐ کا خادم بن کر مدینہ میں جاگزین رہا۔ مگر یہ افراد عرب میں کیسے اور کہاں سے آئے، اس کا علم نہیں ہو سکا۔ کیا انھیں حبشہ سے اغوا کر کے عرب میں بطور غلام فروخت کیا گیا تھا یا کوئی اور ماجرا تھا۔ اب ہمارے لیے اس ضمن میں کچھ کہنا محال ہے۔

ایران

۲۲۲۔ بازنطینی سلطنت کی طرح ایران نے بھی عرب میں نوآبادیاں قایم کر رکھی تھیں۔ گو عربوں کے درمیان باہمی اختلافات تھے، وہ ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے مگر ان میں انا اور عزتِ نفس کا احساس بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین وفادار حلیف ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ بنو غسان بازنطینیوں کے نہایت وفادار حلیف تھے۔ اسی طرح حیرہ (موجودہ کوفہ) کے لوگوں کے ایران سے تعلقات تھے اور وہ ایران کے حلیف تھے۔ ایک وقت تھا کہ حیرہ کے حکمرانوں نے اپنے وتیرہ سے ایران کے شاہی خاندان میں اتنا اعتماد پیدا کر لیا کہ ولی عہد شہزادہ بہرام گور کو بچپن میں مدائن کے شاہی محل میں رکھنے کے بجائے حیرہ بھیج دیا گیا تاکہ یہاں اس کی پرورش اور تربیت کی جا سکے۔ لیکن بعد کی نسلوں کے زمانے میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ ایک شہنشاہ ایران نے خواہش ظاہر کی کہ والیِ حیرہ کی بیٹی شاہی حرم میں بھیجی جائے۔ مگر حیرہ کے گورنر نے انکار کر دیا۔ چنانچہ شہنشاہ نے گورنر کو مدائن طلب کیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔ اس پر عربوں نے حکومت ایران کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ شہنشاہِ ایران نے عربوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور حیرہ پر فوج کشی کر دی۔ عربوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور شاہی فوج کو جنوبی عراق میں ذوقار کے مقام پر تہس نہس کر دیا۔ یہ واقعہ انھی دنوں رونما ہوا۔ جب کفارِ مکّہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگِ بدر لڑی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ذوقار کی جنگ کے دوران عربوں نے "یا محمد" کے نعرے بلند کیے۔ جب جنگِ ذوقار کی خبر مدینہ پہنچی تو رسولِ خداؐ نے پکار کر کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ عربوں نے ایرانیوں سے انتقام لیا ہے۔ اور انھیں میری وجہ سے یہ فتح نصیب ہوئی ہے۔" رسولِ خدا ایران کے آں جہانی شہنشاہ نوشیرواں کی عادلانہ حکومت کے معترف تھے۔ لیکن وہ ایرانیوں کی آتش پرستی اور زرتشت کی طرف سے مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی بدعتوں کے سخت خلاف تھے۔ ہمیں اس کی صدائے بازگشت قرآن حکیم (۳۰/۲-۴) میں بھی سنائی دیتی ہے۔ پیغمبر کی مدینہ کو ہجرت سے قبل ایرانیوں نے بازنطینی سلطنت پر حملہ کر کے شام، فلسطین، اور مصر پر قبضہ کر لیا تھا قرآن میں کہا گیا ہے، رومی (بازنطینی) ہمسایہ ممالک میں شکست سے دوچار ہوئے ہیں مگر چند سالوں کے اندر وہی فاتح ہوں گے۔" عیسائیوں کو نسبتاً مسلمانوں کے قریب تصور کیا جاتا تھا اور زرتشتی (ایرانی) کفارِ مکّہ کے ہم مشرب تصور ہوتے تھے۔ غالباً اسی لیے یہ ردِّ عمل ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۲۳۔ ۶ھ ہجری میں جب پیغمبرِ خدا نے خسرو پرویز کو اسلام کی دعوت دی اور اسے خط لکھا ——— اس خط کا اصل مسودہ ہم تک پہنچا ہے ——— یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا رسولِ اسلام کا یہ خط خسرو پرویز نے وصول کیا تھا، یا اس کے کسی جانشین کو ملا تھا۔ کیونکہ بالکل انھی دنوں ایرانیوں کو نینوا کے مقام پر مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شہنشاہِ ایران کو خود اس کے بیٹے نے قتل کر دیا تھا اور پایۂ تخت مدائن (تیسفون) میں وارثانِ تخت جلد جلد بدل رہے تھے۔ بہر حال اسلامی سفیر سے

نہایت توہین آمیز سلوک کیا گیا اور اسے بے عزتی کر کے ایرانی دربار سے نکال دیا گیا۔ ترمذی کی ایک حدیث کے مطابق ایران کی ایک ملکہ نے مدینہ میں ایک سفارت بھیجی۔ ایرانی سفیر تحفے لے کر رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا جس کا مقصد سابق شہنشاہ کی طرف سے مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی اذیت کا مداوا کرنا تھا۔ ایران کی یہ ملکہ غالباً پوران دُخت تھی جو مختصر عرصہ کے لیے تختِ ایران پر جلوہ گر رہی، وہ اس بات سے خوفزدہ تھی کہ عرب میں ایرانی نوآبادیات تختِ ایران کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے ہوئے ہیں۔

۲۲۴۔ دراصل شہنشاہ ایران سے مایوس ہو کر رسولِ خدا نے اپنی تمام تر توجہ عرب میں ایرانی مقبوضات پر مرکوز کر دی تھی ـــــ جیسا کہ انھوں نے بازنطینی سلطنت کے ضمن میں کیا تھا ـــــ کیونکہ ان ایرانی مقبوضات کی نہ صرف رعایا بلکہ حکمران طبقہ کا بڑا حصہ بھی عرب تھا۔ یمن، عمان، بحران[ل] (یہ موجودہ بحرین نہیں ہے بلکہ یہ وہ علاقہ ہے جو سعودی عرب کے مشرقی سرحدی صوبہ الحسا پر مشتمل ہے) اور جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی شمال مشرقی علاقے ایرانی مقبوضات پر مشتمل تھے۔

یمن

۲۲۵۔ یمن میں صورتِ حال خاص طور پر بڑی سنگین تھی۔ یمن ثقافتی اعتبار سے نہایت ترقی یافتہ علاقہ تھا اور انتہائی شاندار ماضی کا حامل تھا۔ یمن میں روم اور ایتھنز سے بھی پہلے مہذب حکومتیں قایم تھیں۔ رسولِ خدا کے ظہور سے صرف ایک نسل قبل یمن میں عظیم الشان سلطنت قایم تھی جس کی حدود میں نہ صرف پورا جزیرہ نما عرب بلکہ وہ وسیع علاقے بھی شامل تھے جو بعد میں بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کا حصہ بنے۔ اب یہی یمن ایرانیوں کی غلامی کے خلاف نبرد آزما تھا۔ یمنی ایرانیوں کی غلامیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یمن میں آباد تمام ایرانیوں، ایرانی النسل حکام اور فوجیوں کو قتل کرنے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ اس موقع پر رسولِ خدا کی طرف سے اہلِ یمن کو قبولِ اسلام کی دعوت کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ پہلے خالدؓ ابن ولید اور پھر حضرت علیؓ کو اس علاقے میں بھیجا گیا۔ چنانچہ جہاں یمن کے بہت سے قبائل آسانی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، وہاں نجران کے عیسائیوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر کے امن سے رہنے کو ترجیح دی۔ یمن کا دانشمند ایرانی گورنر باذان بھی آتش پرستی سے توبہ کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ رسولِ خدا نے باذان کو گورنر کے عہدے پر برقرار رکھا اور کچھ عرصہ بعد جب وہ وفات پا گیا تو رسول اللہؐ نے اس کے بیٹے شہر کو گورنر مقرر کر دیا۔ رسولِ خدا کے اس اقدام سے یمن میں مقیم بہت سے ایرانیوں کو تحفظ کا احساس نصیب ہوا ہوگا۔ رسولِ خدا نے یمن کی انتظامیہ کے لیے مدینہ سے بہت سے لوگوں کو بھیجا۔ یہ سب لوگ نہایت پرہیزگار اور صالح مسلمان شمار ہوتے تھے اور ان میں سے بعض مثلاً ابو موسیٰ الاشعری، یمنی النسل تھے۔ انھوں نے یمن میں بطور جج، اُستاد، ٹیکس کلکٹر اور عام انتظامی افسروں کی حیثیت میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ معاذ ابن جبل جن کی مسجد آج بھی قصبہ جند میں موجود ہے، انسپکٹر جنرل تعلیم کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ انھوں نے یمن کے ایک ایک علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ دینی تعلیم کے انتظامات کیے۔ رسولِ خدا نے چند فوجی دستے یمن کے اس بُت خانہ کو مسمار کرنے کے لیے بھی بھیجے

ل بحران کو بیشتر کتب میں بحرین ہی لکھا گیا ہے۔ مگر قدیم عربی کتب اور حوالے کی کتابوں کے مطابق قدیم عرب اس علاقے کو "بحران" کہتے تھے۔ (مترجم)

جسے کعبہ کا ہمسر تصوّر کیا جاتا تھا۔ جب اس بُت خانے کو گرایا گیا اور بُت شکنوں پر بُتوں کا کوئی غضب نازل نہ ہوا، تو یمن کے سادہ لوح عوام کے دلوں میں موجود موہوم خدشات بھی دُور ہو گئے۔ جلد ہی عملی طور پر پُورا یمن اسلام لے آیا، صرف نجران کا عیسائی قبیلہ اور اِکا دُکا یہودی خاندان باقی رہ گئے جو اپنے اپنے مذہب پر قائم تھے۔

۲۲۶۔ نجران کے عیسائی مذہبی معاملات میں بے حد منظم تھے۔ ظہورِ اسلام سے قبل وہاں غیر ملکی مسیحی مبلّغ تک آتے تھے ایسا ہی ایک مبلّغ اٹلی کا گرگینتس تھا جس نے بنو نجران میں مسیحیت کو راسخ کیا۔ یہودی بادشاہ ذونواسؒ نے مذہبی اختلاف کی بنا پر بنو نجران پر جو مظالم توڑے ان کی بنا پر اپنے مذہب پر ان کا اعتقاد اور بھی راسخ ہو گیا۔ انھوں نے اپنا ایک وفد بھی مدینہ بھیجا جس کی قیادت ان کا بشپ اور اس کا نائب کر رہے تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجران میں کلیسا کی مضبوط تنظیم قائم تھی۔ وہ مدینہ اس امید پر گئے تھے کہ پیغمبر کو تثلیث و صلیب کے عقیدہ کا قائل کر لیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مدینہ میں عقاید پر بحث و مباحثہ بھی کیا۔ رسولِ خدا سے مذاکرات کے دوران ان کی اجتماعی عبادت کا وقت ہو گیا۔ مذاکرات مسجد نبوی میں ہو رہے تھے۔ چنانچہ عیسائی وفد عبادت کے لیے واپس اپنے کیمپ میں جانا چاہتا تھا مگر رسولِ خدا نے مہمان نوازی کے ارفع جذبہ کے تحت کہا: اگر آپ لوگ پسند کریں تو آپ مسجد میں ہی عبادت کر سکتے ہیں۔" مورخوں کا بیان ہے کہ عیسائی وفد نے مشرق کا رُخ کر کے عبادت کی۔ غالباً انھوں نے اس مقصد کے لیے صلیبیں بھی نکال لیں (جو وہ لباس کے اندر گلے میں پہنے ہوئے تھے) مسلمان تجسس کے گہرے جذبات کے ساتھ انھیں عبادت کرتے دیکھتے رہے۔ عبادت کے بعد عیسائی وفد نے پھر مذاکرات شروع کر دیے۔ رسول اللہؐ نے ان کے سوالوں کے مسکت جواب دیے اور مزید کہا "اگر تمھارا اطمینان نہ ہوا ہو تو آئیے ہم خدا سے رجوع کرتے ہیں۔ آئیے ہم دونوں (فریق) اللہ سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور ہم دونوں میں سے جو جھُوٹا ہو اس پر، اس کے خاندان اور بال بچوں پر اپنا غضب نازل کرے"۔ (دیکھیے قرآن ۳/۶۱) اس پر عیسائی وفد نے غور کرنے کی مہلت مانگی، انھوں نے تنہائی میں باہم مشورہ کیا۔ انھوں نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے سوچا: اگر محمد (صلعم) واقعی اللہ کے رسولؐ ہیں تو ان کی بددعا ہمیں دونوں جہانوں میں تباہ کر کے رکھ دے گی۔ بہتر ہے کہ ان سے معاہدہ صلح کر لیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے رضاکارانہ طور پر مسلم حکومت کی بالادستی تسلیم کر لی اور رسولِ خدا سے تحریری معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کے تحت نجران کے عیسائیوں کو انتظامی اور مذہبی معاملات میں مکمل آزادی دی گئی۔ انھیں اختیار تھا کہ وہ جسے چاہیں بشپ وغیرہ منتخب کر لیں اور اس انتخاب کی توثیق اسلامی حکومت سے کرانا لازم نہ تھا۔ رسولِ خدا نے حکم دیا کہ نجران کے عیسائی قرضوں پر سُود ادا نہ کریں بلکہ صرف اصل زر ہی ادا کریں۔ فطری طور پر رسولِ خدا نے انھیں یہ بھی کہا کہ وہ بھی مستقبل میں قرضوں پر سُود وصول نہ کریں۔ یہ تحریری معاہدہ بھی ہم تک پہنچا ہے۔

۲۲۷۔ یمن کے متعدد دوسرے قبائل نے بھی اپنے وفود مدینہ بھیجے اور اسلام قبول کیا۔ یمن کا وسیع و عریض علاقہ تین سال کے اندر کسی جنگ کے بغیر اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں آ گیا۔

لہ قرآن پاک میں اَصحَابُ الاُخدُود (۸۵/۴) کا اشارہ اسی طرف ہے۔ (مترجم)

عُمان ۲۲۸۔ عمان عرب کے جنوب مشرق میں ایک ریاست تھی جہاں جلندی کے دو بیٹے جیفر اور عبد مشترکہ طور پر حکومت کرتے تھے۔ رسولِ خدا کی دعوت پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اپنے وعدہ کے مطابق دونوں کو عمان کی حکومت پر برقرار رکھا۔ اس طرح پیغمبر نے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ اسلام میں مشترکہ حکومت روا ہے، تاہم رسولِ خدا نے عمان میں اپنا ایک نمائندہ مقرر کر دیا جو مسلمانوں کی تعلیم وغیرہ کی نگرانی کرتا تھا۔

۲۲۹۔ عمان کا علاقہ اقتصادی اعتبار سے بڑا اہم تھا اس کی بین الاقوامی بندرگاہیں اور وہاں کے تجارتی میلے اسلامی مملکت کے لیے وقار اور قوت کا باعث بنے۔

۲۳۰۔ عبد القیس کا قبیلہ جیفر کی حکومت کے تحت نہ تھا بلکہ آزاد تھا کیونکہ انھوں نے اپنا وفد الگ سے رسول اللہؐ کی خدمت میں روانہ کیا جس نے مدینہ میں پیغمبر سے براہِ راست مذاکرات کیے۔ وفد کے ارکان یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ رسولِ خدا ان کے ملک کا وسیع دورہ کر چکے ہیں اور (ظہورِ اسلام سے قبل) کافی عرصہ عمان میں گزار چکے ہیں۔ رسولِ خدا عمان کے بہت سے لوگوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے انھوں نے اہلِ وفد سے عمان کی تازہ خبریں بھی دریافت کیں۔ بات چیت نہایت خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔ امام بخاریؒ کے مطابق مسجد نبوی کے بعد جس مسجد میں پہلی بار نماز جمعہ ادا کی گئی وہ عبد القیس کے علاقہ کی مسجد جواثا تھی۔

۲۳۱۔ یہ علاقہ زبردست اقتصادی اہمیت کا حامل تھا۔ دبا اور مقشر کے مقامات پر سالانہ تجارتی میلے منعقد ہوتے تھے، جن میں کئی ممالک کے تجار شریک ہوتے۔ دبا عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی۔ اس کے تجارتی میلہ میں عرب کے کونے کونے سے ہی نہیں بلکہ" چینی، ہندی، سندھی اور مشرق و مغرب سے تاجر اپنا مالِ تجارت لے کر شریک ہوتے تھے۔" چینی تاجر بڑی بڑی کشتیوں میں اپنے ملک سے سیدھے دبا آتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاندار مصنوعات کی وجہ سے یہاں ایسا تاثر قائم کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے۔"

جب یہ علاقہ غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو گیا تو رسولِ خدا نے دبا کا الگ گورنر مقرر کیا۔ یہ گورنر دبا کا رہنے والا ایک مسلمان تھا۔ اس کے فرائض میں دبا کی بندرگاہ، شہر اور منڈی کی دیکھ بھال شامل تھی۔

بُحران ۲۳۲۔ موجودہ بحرین جو خلیج عرب و فارس میں جزیرہ نما عرب کے مشرق میں واقع ہے ان دنوں اُوال کہلاتا تھا۔ ان دنوں جس علاقے کو بحرین[1] (بحران) کہتے تھے (بحرین کا لغوی ترجمہ "دو سمندر" ہے) وہ سعودی عرب کا موجودہ ضلع الحسا ہے جو سعودی عرب کا ایک حصہ ہے۔ غالباً ظہورِ اسلام کے وقت اس علاقے میں موجودہ قطر بھی شامل تھا۔ قطر خلیج کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور یوں دو سمندروں کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال اس علاقے (بحران یا بحرین) کے

---

[1] بیشتر عربی کتب میں اس علاقہ کو بُحران لکھا گیا ہے تاہم اسے بحرین بھی کہا اور لکھا جاتا تھا۔ (مترجم)

عرب گورنر المنذر ابن ساوہ نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ اسلامی حکومت کا نہایت پُرجوش منتظم ثابت ہوا۔ تاریخ میں رسولِ خدا کے نام اس کے نصف درجن سے زاید خطوط کا ذکر آتا ہے ان میں سے ایک خط کا اصل ہم تک پہنچا ہے۔ یہ خط پہلی بار برلن کے ایک پبلشر ZDMG نے شایع کیا تھا۔

سماوہ

۲۳۳۔ شمال مشرقی عرب کے قبیلہ بنو تمیم نے نہایت آسانی سے اسلام قبول کر لیا تھا اس کے مزید شمال میں جنوبی عراق کا علاقہ بھی عربوں کا گہوارہ تھا۔ اس علاقے میں حیرہ (موجودہ کوفہ) کی ریاست سمیت عرب قبائل آباد تھے۔ ایرانی حکومت کی جنوبی اور مشرقی عرب میں جو نو آبادیات تھیں ان پر دارالحکومت مدائن کے قرب و جوار کی آبادیوں کی نسبت حکومت کی گرفت کمزور تھی تاہم حیرہ کے حکمران قبیلہ بنو لخم کے متعدد ذیلی قبائل نے اسلام قبول کر لیا۔ رسولِ خدا کی طرف سے انھیں جو اسناد فراہم کی گئیں تاریخ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

۲۳۴۔ حیرہ (کوفہ) کے جنوب مشرق میں سماوہ کا علاقہ ہے۔ رسول اللہ کے ایک خط کا ذکر ملتا ہے جو حضورؐ نے سماوہ کے فرمانروا نُفاثہ الدیالی کے نام لکھا تھا تاہم اس خط کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ یہ بادشاہ بھی عربی النسل تھا اور اس امر کے قوی امکانات ہیں کہ اس نے ایرانیوں کی باجگزاری سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کر لیا ہو تاہم اس سلسلے میں کوئی یقینی بات کہنا ممکن نہیں۔

ہندوستان

۲۳۵۔ کیا رسولِ اسلام کے ہندوستان سے کوئی تعلقات تھے؟ اس ضمن میں کچھ یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اسے ناممکن بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ عرب تجار ظہورِ اسلام سے قبل ہی سندھ اور مالابار کی بندرگاہوں پر بکثرت آتے جاتے تھے۔ ہندی تاجر بھی جنوب مشرقی عرب کی بین الاقوامی بندرگاہ دبا کے تجارتی میلے میں شرکت کرتے تھے (دیکھیے ابن حبیب کی المحبر، صفحہ ۲۶۵) اس امر کا بھی قوی امکان ہے کہ ہندی تاجر یمن بھی جاتے تھے (دیکھیے ابنِ ہشام صفحہ ۲۶۵) کیونکہ یمن کے حکمران سیف ابن ذی یزن نے ایک بار ایرانی شہنشاہ کو اطلاع دی کہ اس کے ملک پر "کوّوں" نے قبضہ جما لیا ہے اور اس کی امداد کی جائے۔ "کون سے کوّے؟" کسریٰ نے وضاحت طلب کی "یہ ہندی کوّے ہیں یا حبشہ سے آئے ہیں؟" شہنشاہِ ایران کے ذہن میں یہ سوال آ ہی نہیں سکتا تھا اگر یمن اور ہند کے درمیان مستحکم تعلقات نہ ہوتے۔ جہاں تک دبا کا تعلق ہے رسولؐ پاک خود وہاں جا چکے تھے (دیکھیے ابنِ حنبلؒ جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ "میں نے تمھارے ملک کا وسیع دورہ کیا ہے" مصنف رسول اللہ کی وہ احادیث کا تذکرہ کرتا ہے جن کے مطابق رسول اللہ نے مشقّر اور بعض دُوسرے علاقوں کا نام لیا جہاں کا وہ سفر کر چکے تھے) چنانچہ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ جب یمن کے قبیلہ بل حارث کا وفد مدینہ گیا تو رسول اللہ نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں جو ہندی معلوم ہوتے ہیں" (دیکھیے ابن ہشام صفحہ ۹۶۰ - ابنِ سعد ۱/۲ صفحہ ۷۲ - نسائی ۲۵/۴۱) ابنِ حنبلؒ (۲ - ۲۲۹) کے مطابق ابو ہریرہؓ جو یمنی الاصل تھے اکثر کہا کرتے تھے "رسولِ خدا نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان کی طرف ایک مہم بھیجی جائے گی اگر میں وہاں (ہند میں) ہلاک ہو جاؤں تو میں بہترین شہدا میں سے ہوں گا اور اگر میں صحیح و سالم واپس آ جاؤں تو میں وہی آزاد شدہ

غلام ابوہریرہ رہوں گا"۔ رسول پاکؐ سے ایک اور حدیث بھی منسوب کی جاتی ہے، فرمایا: "مجھے ہندوستان کی طرف سے تازہ ہوا آتی ہے۔"

۲۳۶۔ رسولِ خدا کی زندگی میں صرف ہندی لوگوں کا ہی نہیں ان کے مذہب کا بھی ذکر آیا تھا۔ قدیم مسلم مورخ عبدالکریم الجیلی اور دورِ حاضر کے پروفیسر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۲۳۷۔ چنانچہ پیغمبر ذوالکفل (جو کفل سے آیا ہو) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کفل دراصل کپل وستو کی عربی شکل ہے، وہ ریاست جس میں گوتم بدھ پیدا ہوا تھا۔ ایک اور توضیح اس طرح ہے کہ "کفل" کے لفظی معنی "خوراک" کے ہیں۔ اور گوتم بدھ کے والد کے نام سدودھن کے معنی بھی "خوراک" کے ہی ہیں۔ قرآن حکیم کی سورہ التین میں ہے:

"انجیر اور زیتون کی قسم اور طور سینا کی اور اس شہر (مکہ) کی جو امن والا ہے۔۔۔۔۔۔"

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ اس آیۂ مبارکہ میں شہر سے مراد مکہ ہے۔ کوہ سینا سے مراد موسیٰؑ کا سینائی پہاڑ ہے اور زیتون حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جہاں تک انجیر کے درخت کا تعلق ہے اس کا اشارہ بڑ کے درخت کی طرف ہے جو جنگلی انجیر ہے۔ بدھ کو بڑ کے درخت کے نیچے ہی نروان حاصل ہوا تھا کسی اور پیغمبر کی زندگی میں بڑ کے درخت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی۔

۲۳۸۔ برہمنیت کا جہاں تک تعلق ہے قرآن میں (۲۰/ ۸۵-۹۷) ایک زرگر سامری کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں اچھوت (لامساس) کی طرف واضح اشارہ ہے۔ راجہ سامری (جسے یورپ والے زمورین (ZAMORIN) لکھتے ہیں) کالی کٹ اور مالابار کے علاقوں میں آج بھی معروف ہے جہاں اس کا خاندان برطانوی راج کے دوران حکمرانی کرتا تھا۔ اس سامری کا انجیل کے سامری سے کوئی تعلق نہیں جو موسیٰؑ کے بعد کے دور میں ہوا ہے، جبکہ سامری سُنار یہودیوں کا حلیف تھا اور وہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ کے عہد میں موجود تھا۔

۲۳۹۔ میں اس تعارف کو متبحر عالم مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کی دو تصانیف اوّل ان کی سوانحی لُغت "سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان" کا مقدمہ اور دوسری "شمامۃ العنبر فی ماورد عن الہند عن سید البشر" کے ذکر پر ختم کرتا ہوں۔

۲۴۰۔ ہندوستان کے جنوب مغربی ساحلی علاقہ مالابار میں یہ روایت مشہور ہے کہ اس علاقہ کے ایک بادشاہ چکرورتی فرماس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔ یہ رسول اللہؐ کا معجزہ تھا جو مکہ مکرمہ میں ظہور پذیر ہوا۔ بادشاہ چکرورتی فرماس نے اس سلسلے میں جب تحقیقات کیں تو اسے علم ہوا کہ عرب میں ایک پیغمبر کے ظہور کی پیشگوئیاں موجود ہیں اور شق القمر کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ خدا ظاہر ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود رسول اللہؐ سے ملاقات کے لیے عرب روانہ ہو گیا۔ اس نے رسول اللہؐ کے رُوبرو اسلام قبول کیا اور پھر ان کے حکم پر واپس ہند روانہ ہو گیا۔ راستے میں یمن کی بندرگاہ ظفار میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہاں آج بھی "ہندی بادشاہ" کا

مزار مرجع خاص و عام ہے۔ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ایک پرانا مسودہ (نمبر عربی ۲۸۰۷ ص ۱۵۲-۱۷۳) ہے جس میں اس کی تفصیل درج ہے۔ زین الدین المعبری کی تصنیف "تحفۃ المجاہدین فی بعد اخبار البرتگالین" میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے (اس کتاب کا پرتگیزی ترجمہ انگریزی سے کہیں بہتر ہے مگر اس کا اردو ترجمہ نامکمل ہے)۔

۲۴۱ - ہم رتن ہندی (دیکھیے ابن حجر، اصابہ ۲۷۵۹) اور سرباتک ہندی کا جو علی الترتیب چوتھی اور آٹھویں صدی ہجری میں گزرے ہیں زیادہ تذکرہ نہیں کریں گے۔ ان دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ رسولِ اسلام کے صحابی ہیں اور انھوں نے کئی سو سال عمر پائی ہے مگر ان کے معاصرین ان کے اس دعوے کو محض فراڈ قرار دیتے ہیں۔

ترکستان

۲۴۲ - ترکی کے لوگوں کے بارے میں تو بہت ہی کم مواد موجود ہے۔ علاّمہ بلاذری اپنی کتاب انساب الاشراف (۱-۴۸۵) میں روایت کرتے ہیں کہ اسلام کی پہلی شہید خاتون سمیّہ عمار ابن یاسر کی والدہ تھیں۔ انھیں ابوجہل نے شہید کیا تھا۔ ان کا اصل نام پامیخ تھا اور ان کا تعلق ایران کے علاقہ کسگر سے تھا۔ پامیخ کو جدید ترکی میں "پاموک" کہتے ہیں جس کے لغوی معنی کپاس کے ہیں۔ اور یہ کسی ترک خاتون کا نام ہی ہو سکتا ہے۔ خدا اس خاتون کے درجات بلند کرے۔ ہندوستان کی طرح ترکی میں بھی ایک شخص مقلاب ابن ملکان الخوارزمی گزرا ہے جس نے یکے از صحابہؓ رسول ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ (دیکھیے ابن حجر، اصابہ - ۲۱۲۶)

چین

۲۴۳ - چین کے بارے میں حضورِ اکرم کی ایک معروف حدیث ہے: "علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے"۔ یہ یقین کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ رسول اللہؐ کی چینیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ حضورِ اکرمؐ نہ صرف ان کی استقامت سے متاثر ہوئے کہ وہ کئی ماہ تک سمندر میں سفر کرکے آئے تھے بلکہ ان کی مصنوعات کی عمدگی نے بھی رسولِ خدا کو متاثر کیا تھا۔ ایک طرف تو مسعودی لکھتے ہیں (دیکھیے علاّمہ مسعودی کی "مروج الذہب" ۱-۳۰۸) کہ چینی ظہورِ اسلام سے قبل بڑی بڑی کشتیوں میں بحران (بحرین) اور عمان آتے تھے اور دوسری طرف ابنِ حبیب دبا کے تجارتی میلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ (دبا) عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی اور اس کے سالانہ تجارتی میلے میں ہند، سندھ، چین اور مشرق و مغرب سے تجار آتے تھے . . . . ."

۲۴۴ - چینی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ رسولِ خدا نے شاہِ چین کے دربار میں سفیر بھیجا تھا اور اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس سفیر کا نام ابو عبیدہؓ تھا۔ وہ بعد میں دوبارہ چین گئے اور اسی جگہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا مقبرہ سنگان فو میں ہے۔ (ان کے مقبرے میں تحریروں کے سلسلے میں ملاحظہ کیجیے وین لینگ وو کی "مذہبی کتبات" پیکنگ، ۱۹۵۷ء اور بروم ہال مارشل کی "چین میں اسلام" ص ۶۶، ۸۳-۹۰)

باب ۱۰

اسلامی معاشرہ کی تنظیم

۲۴۵۔ رسولِ خداؐ کی جائے پیدائش مکہ ظہورِ اسلام سے قبل ہر طرح سے منظم شہری ریاست تھی۔ مکہ میں حکمران کونسل (پارلیمنٹ) قائم تھی جس میں دس "وزرا" تھے۔ یہ وزرا ریاست کے دس بااثر اور طاقتور قبیلوں سے موروثی طور پر لیے جاتے تھے۔ یہ وزرا شہر کے اندرونی نظم ونسق کے ذمہ دار تھے۔ چند وزرا نامزد کیے جاتے تھے جن کے سپرد بین الاقوامی اور خصوصاً حج کے انتظامات ہوتے تھے جو خالصتاً مقامی مسئلہ نہیں تھا۔

۲۴۶۔ ظہورِ اسلام سے قبل شہر کی مقامی انتظامیہ کی صورت حال یہ تھی:

۱۔ بنو ہاشم کے العباس (رسول اللہؐ کے چچا) چاہ زمزم کے نگران تھے اور ایام حج میں لوگوں کو پانی کی فراہمی ان کے ذمہ تھی وہ حرم کعبہ میں نظم وضبط کے بھی ذمہ دار تھے تاکہ کعبۃ اللہ کے احاطہ میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو اللہ کے گھر کے شایانِ شان نہ ہو۔

۲۔ بنو تیم کے ابوبکر (صدیقؓ) اشناق کے سربراہ تھے، ان کا کام دیوانی اور فوجداری معاملات میں ہرجانہ کا تعین تھا جو مظلوم کو ادا کیا جاتا تھا۔

۳۔ بنو عدی کے عمرؓ بن خطاب "سفارہ ـ منافرہ" کے انچارج تھے۔ یہ ایک طرح کا سفارتی عہدہ تھا جس کا مقصد امورِ خارجہ میں مملکت کی نمائندگی اور متنازعہ معاملات میں دوسرے ممالک سے بات چیت کی ذمہ داری شامل تھی۔ یُوں کہیے کہ حضرت عمرؓ ایک طرح کے وزیر خارجہ تھے۔ کہ جب کسی ملک کو سفارت بھیجنے کا فیصلہ کرتے تو عمرؓ بن خطاب بھیجے جاتے، اور جب کسی بیرونی معاملہ میں اہلِ مکہ کی اولیت کو چیلنج درپیش ہوتا تو مذاکرات کے لیے عمرؓ کا انتخاب کیا جاتا۔

۴۔ بنو امیہ کا ابوسفیان مملکت کے فوجی پرچم "عُقاب" کا نگران تھا۔ جنگ کے موقع پر وہ مملکت کا پرچم تھا متا جب تک کسی کو متفقہ طور پر سپہ سالار منتخب نہ کر لیا جاتا۔ عموماً ایسا اس وقت ہوتا جب اہلِ مکہ کی فوج کسی حلیف سے مل کر جنگ میں شامل ہوتی۔

۵۔ بنو عبدالدار کے عثمان ابنِ طلحہ قبائلی پرچم "لوا" کے نگران اور محافظ تھے۔ ("عقاب" اور "لوا" کے درمیان فرق یہ ہے کہ عقاب بڑی جنگوں کے موقع پر اور لوا عام معمولی معرکوں کے موقع پر لہرایا جاتا تھا) عثمانؓ دارالندوہ (پارلیمنٹ ہاؤس) کے بھی انچارج تھے جہاں ریاست کے تمام معمر اور تجربہ کار افراد کو کسی بھی معاملے پر صلاح مشورہ کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس مشاورت میں چالیس سال یا اس سے زاید عمر کے شہری ہی شریک ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار خصوصی طور پر کسی نوجوان کو بھی مدعو کر لیا جاتا تھا۔ یہ مجلسِ مشاورت ایک طرح سے پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں تھا۔

۶ - بنواسد کے یزید ابن زمعہ (جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے والد تھے) مشورہ کے انچارج تھے۔ یہ پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا تھا۔ کیونکہ جب کوئی قرارداد منظور کی جاتی تھی وہ اس عہدہ دار کو توثیق کے لیے پیش کی جاتی تھی۔

۷ - بنو مخزوم کے خالد ابن ولید قبہ کے انچارج تھے (یہ ایک قسم کا سائبان تھا، جب بڑے بُت لات وغیرہ کا جلوس نکالا جاتا تھا تو یہ سائبان بُت پر تانا جاتا تھا وہ عینہ کے بھی ذمہ دار تھے اور اس حیثیت میں بُت کے جلوس کے وقت اس گھوڑے کی لگام تھامتے تھے جس پر بُت رکھا جاتا تھا۔ وُہ جنگ کے دَوران گھڑ سوار دستوں کی قیادت بھی کرتے تھے۔ ان کا ایک نائب بھی ہوتا تھا وہ دونوں گھڑ سوار دستوں کی اس طرح قیادت کرتے تھے کہ ایک میمنہ میں اور دوسرا میسرہ میں ہوتا تھا۔

۸ - بنو نوفل کے الحارث ابن عامر رفادہ (عطیات اور ٹیکس) کے شعبہ کے سربراہ تھے۔ وُہ ایک طرح کے وزیر خزانہ اور خزانچی تھے جو لوگوں سے عطیات جمع کرتے اور اس رقم کو ایامِ حج میں ایسے زائرین پر صرف کرتے جو کسی وجہ سے مشکل میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

۹ - بنو جُمح کا صفوان ابن اُمیہ ازلام (فال کے طور پر استعمال ہونے والے تیر) کا انچارج تھا۔ جب کوئی شخص کسی مشکل معاملہ میں خود فیصلہ نہ کر پاتا تو وہ یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتا۔ اس کے بعد تیروں سے فال نکالی جاتی۔ چنانچہ "ہاں" یا "نہ" جیسا بھی تیر آتا اس کے مطابق عمل کیا جاتا۔ فال نکلوانے کے لیے فیس ادا کرنا پڑتی تھی۔

۱۰ - بنو سہم کا الحارث ابن قیس ثالثی اور کعبہ میں پیش کی جانے والی نذروں کا انچارج تھا۔ وُہ دیوانی مقدمات میں گویا جج کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ مقدمات ان فوجداری وغیرہ مقدمات سے الگ ہوتے تھے جن کا ذکر اوپر (نمبر ۲) آیا ہے۔

۲۴۷ - نامزد وزیروں میں سے ایک انجنیئر اور ماہرِ تعمیرات ایک شخص حالہ ابن عوف ابن عامر کی اولاد میں سے ہوتا تھا جس کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ اَزدِ شنوءہ سے تھا۔ مگر یہ شخص مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔

۲۴۸ - ایک اور نامزد وزیر کیلنڈر (تقویم) کا انچارج تھا اور وہ اس بات کا تعین کرتا تھا کہ کون سے قمری سال پر تیرھواں مہینہ ایزاد کیا جائے تاکہ شمسی سال سے مطابقت پیدا کی جا سکے، اور مختلف موسم ایک ہی قمری مہینے میں آئیں۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایامِ حج ایک ہی موسم میں آئیں (یعنی موسمِ بہار کے ابتدا میں) رسول پاکؐ کے دور میں یہ کام مالک ابن کنعان کے سپرد کیا گیا تھا (اور اس عہدیدار کو قلمّس کہا جاتا تھا)

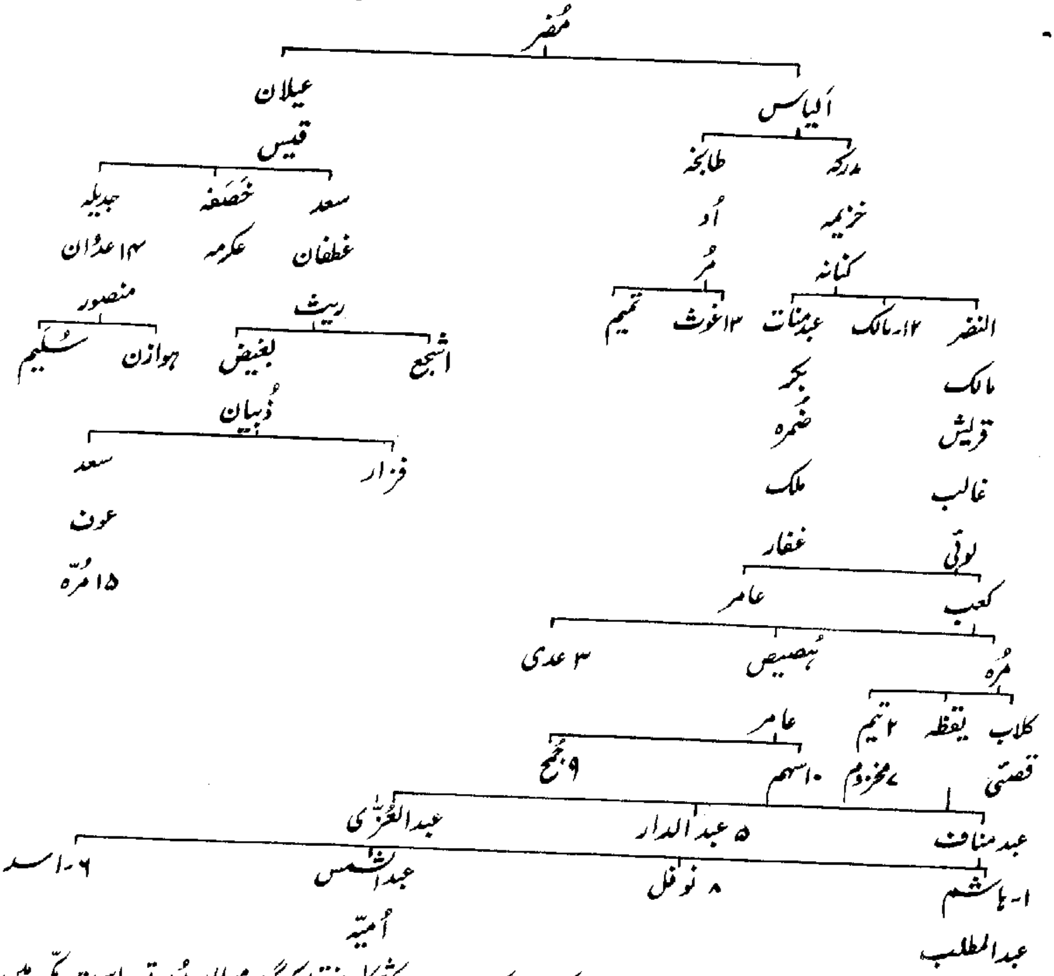
۲۴۹ - ایک اور وزیر کے ذمہ عرفات میں لوگوں کی رہنمائی کرنا تھا۔ یہ عہدہ بھی موروثی تھا اور اس پر ہمیشہ بنو غوث ابن مُر کا رکن ہی فائز ہوتا تھا۔

۲۵۰ - مزدلفہ میں حجاج کے نظم و ضبط اور وہاں سے منیٰ تک ان کی رہنمائی ایک اور شخص کی ذمہ داری تھی جو بنو عدوان ابن جندیلہ سے ہوتا تھا۔

۲۵۱ - بنو مُرابن عوف کا ایک فرد بھی وزارت کے منصب پر فائز ہوتا تھا مگر مورخوں نے اس کے فرائض کی صراحت نہیں کی۔

۲۵۲- ذیل میں ایک شجرہ نسب دیا جا رہا ہے جو مختلف قبائل کے ایک دوسرے سے رشتہ داری کو سمجھنے میں ممد ہوگا۔ (صرف ماہر تعمیرات وزیر کے خاندان کا اس شجرہ میں ذکر نہیں کیونکہ اس کا تعلق جنوبی عرب سے تھا)

ارکانِ حکومت کا شجرۂ نسب



۲۵۳- جب اسلام کا ظہور ہوا تو یہ ریاست کے اندر ایک ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ مسلمان یوں تو ریاست مکہ میں رہتے تھے مگر وہ اپنے تمام امور میں صرف پیغمبرِ اسلام سے رہنمائی حاصل کرتے تھے جو حاکم وقت تو تھے البتہ ان کے زیر نگیں ابھی کوئی علاقہ نہ تھا۔

۲۵۴- جب رسول اللہؐ نے ۶۲۲ء میں مدینہ کو ہجرت کی تو مٹھی بھر افراد اُنھیں خدا کا رسول تسلیم کرتے تھے۔ ان میں بھی کچھ مکی تھے اور باقی کا تعلق مدینہ سے تھا۔ اس وقت نہ تو یہ سارا علاقہ مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور نہ ہی پیغمبر کو کوئی سیاسی قوت

حاصل تھی۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ اس پُورے علاقہ میں نہ تو واحد ریاست تھی اور نہ ہی وہاں کوئی مؤثر حکومت قائم تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ مدینہ میں بھی ہر قبیلہ آزاد و خود مختار رہتا تھا۔ پھر ان قبائل میں باہمی رقابتیں اور دشمنی تھی۔ مدینہ کا علاقہ زرخیز تھا۔ اس کا زیرِ زمین پانی میٹھا تھا جو زراعت اور باغات کے لیے نہایت مفید تھا۔ جب رسولِ خدا مدینہ کے قبائل کو منظم کر کے شہری ریاست کا رنگ دینے میں کامیاب ہو گئے، تو مدینہ مکہ سے بھی زیادہ طاقت ور ہو گیا کیونکہ یہ علاقہ مکہ کی نسبت زیادہ خود کفیل تھا۔ اگرچہ صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر قرائن سے ظاہر ہے کہ سنِ ہجری کے آغاز پر مدینہ کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی ان میں عرب اور ان کے یہودی حلیف بھی شامل تھے۔ ہجرت کے فوراً بعد رسولِ خدا نے حکم دیا کہ مدینہ کے تمام مسلمانوں، خواتین سمیت کی فہرست تیار کی جائے اور انھیں پیش کی جائے۔ امام بخاریؒ کے مطابق مسلمانوں کی اس مردم شماری سے جو فہرست مرتب ہوئی اس میں ڈیڑھ ہزار نام شامل تھے۔ فتح مکہ تک جو ۸ ہجری میں ہوئی، رسولِ خدا کی پالیسی یہ تھی کہ وہ عام مسلمانوں کو فرداً فرداً اور گروہوں کی صورت میں بھی مدینہ کو ہجرت کی تلقین کرتے تھے تاکہ وُہ کفار سے محفوظ رہ سکیں۔ ۶۳۲ء میں جب پیغمبر کا وصال ہُوا یہودیوں کی اکثریت مدینہ کا علاقہ خالی کر چکی تھی اور نئے مہاجر مدینہ آتے رہتے تھے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت مدینہ کی آبادی پندرہ سے بیس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

۲۵۵۔ اس دوران، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، رسولِ خدا مدینہ میں ایک ایسی شہری ریاست کی مضبوط بنیادیں قایم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جو جلد ہی ایک مملکت بلکہ وسیع سلطنت میں تبدیل ہو گئی جس کی سرحدیں پُورے عرب، عراق اور فلسطین سمیت جنوبی علاقوں تک پھیل چکی تھیں۔ چونکہ قبل ازیں علاقہ میں کوئی مملکت قایم نہ تھی لہٰذا ضرورت کے مطابق ہر انتظامی شعبہ قایم کرنا پڑا۔ اور پھر تجربات کی روشنی میں اسے بہتر بنایا گیا۔ مدینہ شہر کی انتظامیہ اس وسیع سلطنت کی مرکزی حکومت تھی اور ہر قبیلہ اسلام قبول کرنے کے ساتھ اپنے علاقہ میں اس سلطنت کا صوبہ بن جاتا تھا۔ حضور اکرمؐ کی پالیسی یہ تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہر قبیلہ میں کسی مقامی شخص کو حکومت کا سربراہ مقرر کر دیتے، اگر قبیلے کا رئیس بھی مسلمان ہو جاتا تو اسے ہی حکومت کا سربراہ مقرر کیا جاتا اور اس کی امداد کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کونسل تشکیل دی جاتی۔ یہ انتظام مرکز سے تنخواہ دار گورنر اور دُوسرے عُمّال بھیجنے کی نسبت زیادہ سستا پڑتا۔ پھر نفسیاتی طور پر بھی یہ انتظام بہتر رہتا کیونکہ اس طرح لوگوں میں یہ تصور پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ان پر کوئی غیر ملکی حکومت کر رہا ہے۔ قبائل کے سربراہوں کے لیے باقاعدہ فرمان جاری کیے جاتے جن میں انھیں ان کی سابق جاگیر ——— زمین اور پانی وغیرہ ——— پر برقرار رکھا جاتا یا علاقہ میں انھیں نئی جاگیر عطا کی جاتی۔ گو یہ نظام جاگیردارانہ سا محسوس ہوتا ہے مگر بالواسطہ حکومت ناگزیر تھی کیونکہ علاقہ کے لوگ خانہ بدوش فطرت کے مالک تھے۔ لیکن عرب کے زیادہ آباد اور زرخیز علاقوں کے علاوہ یمن، بحران (بحرین) اور عمان وغیرہ کو جہاں پہلے ہی حقیقی ملکیتیں قایم تھیں، رسولِ خدا نے جُوں کا تُوں قایم رکھا۔ رسولِ خدا کے تحت جہاں قبائل کے سردار تھے وہاں بادشاہ بھی ان کے باجگزار تھے جو رسولِ اسلام کو خراج ادا کر کے آزادی، امن اور چین سے حکومت کر رہے تھے۔

۲۵۶۔ رسولِ خدا کی مملکت جس کے سربراہ تھے اپنی ہیئت کے اعتبار سے بڑی پیچیدہ تھی اور اس کے مختلف علاقوں میں کہیں براہِ راست اور کہیں بالواسطہ حکومت کا نظام رائج تھا۔ اس مملکت کے نظام کو وحدانی قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ اسے وفاقی یا نیم وفاقی (کنفیڈریشن) کہا جا سکتا ہے۔ مملکت کی مرکزی حکومت گو فی الواقع کی حکومت تھی تاہم اسے مطلق العنانی سے

کوئی واسطہ نہ تھا۔ مسلسل اور بار بار مشاورت کا طریقہ رائج تھا، گر انتخابات کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا مگر قبائل کے سردار اپنے اپنے عوام کے فطری نمائندہ تھے۔ مشاورت عام کے دوران عوام بھی موجود ہوتے تھے کیونکہ عموماً رسولِ خدا نماز کے بعد مسجد میں موجود حاضرین کے سامنے ہی مسئلہ پیش کر دیتے تھے۔ اس پر قبائل کے سردار ہی نہیں عام لوگ بھی رائے دے سکتے تھے۔ خفیہ مشاورت نہ ہونے کے برابر تھی، البتہ جنگ یا جنگ کے خطرہ کے پیشِ نظر خفیہ صلاح مشورہ کیا جاتا تھا البتہ کسی مسئلہ پر رائے شماری کا موقع تو شاید ہی آتا تھا۔ ایک مرتبہ رسول اللہؐ اس بات پر رائے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آیا مالِ غنیمت ——— دشمن کے وُہ افراد جو غلام بنا لیے گئے تھے ——— جو تقسیم ہو چکا تھا اس کی تقسیم منسوخ کر کے اسے اصل مالکان کو واپس کر دیا جائے یا نہیں، کیونکہ جس قبیلہ سے جنگ ہوئی تھی اس نے اپنے فعل پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ رائے عامہ منقسم معلوم ہوتی تھی، چنانچہ رسولِ خدا نے چند افراد کو یہ فرض سونپا کہ وُہ باہم مشورہ اور سوچ و بچار کے بعد اس مسئلہ پر فوج کے ہر سپاہی کی رائے کے بارے میں رپورٹ پیش کریں۔ بھاری اکثریت کی رائے غلاموں کو آزاد کرنے کے حق میں تھی مگر چند افراد نے مالِ غنیمت واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسولِ خدا نے حکم دیا کہ تمام مالِ غنیمت واپس کر دیا جائے تاہم جن سپاہیوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا انھیں بیت المال سے نقد معاوضہ ادا کیا گیا اور وُہ بھی دشمن کے غلام بنائے گئے افراد کو واپس کرنے پر رضامند ہو گئے۔ یہ حقیقت کہ رسولِ خدا کسی قبیلہ، کسی ریاست یا علاقہ کا حکمران نامزد کرتے تھے یا اسے تسلیم کرتے تھے، اس امر کی غماز ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت کسی بھی حکمران کو معزول کر سکتے تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر عمل میں لا سکتے تھے۔ اس طرح گو ملک کے مختلف حصے متضاد عناصر کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان میں ذاتی نوعیت کا گہرا اتحاد موجود تھا۔

۲۵۷۔ ہم دورِ خلافت کی مسلم مملکت کا تذکرہ نہیں کر رہے بلکہ یہ پیغمبرِ اسلام کے دَور کی اسلامی مملکت ہے جو ہمارے زیرِ بحث ہے۔ رسولِ خدا کی ذات والا صفات بے مثال تھی۔ ہر مسلمان کا ایمان تھا کہ حضورؐ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ جب رسولِ خدا فرماتے تھے کہ یہ خدا کا حکم ہے تو اس حکم کے خلاف کوئی اپیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ نتیجتاً زندگی کے تمام شعبوں دین، سیاست، اخلاق، سماجی اقدار اور دیگر امور میں پیغمبر کو قطعی اختیار حاصل تھا۔

۲۵۸۔ رسولِ خدا نے جب مدینہ کی شہری ریاست کی بنیاد رکھی تو وہ اسے بظاہر مکہ کی جلاوطن حکومت تصور کرتے تھے وُہ جب فوج لے کر نکلتے تو اپنا لِوآ (پرچم) بنو عبدالدار کے کسی مسلمان کے سپرد کرتے، جب اہلِ مکہ سے مذاکرات کا مرحلہ درپیش ہوتا تو حضرت عمرؓ کو طلب کیا جاتا، اور جب خالدؓ ابنِ ولید اسلام لے آئے تو انھیں اسلامی فوج کے گھڑسوار دستوں کا سالار مقرر کیا گیا۔ چاہ زمزم کی نگہبانی کا فرض بدستور حضرت عباسؓ (رسولؐ کے چچا) کے سپرد رہا۔ یہ سب لوگ مکہ میں موروثی طور پر انہی امور کے وزیر تھے، حضورؐ کے ان اقدامات کی اس کے سوا اور کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ وہ مدینہ کی حکومت کو مکہ کی جلاوطن حکومت تصور کرتے تھے۔

۲۵۹۔ جُوں جُوں اسلامی مملکت کی سرحدوں میں وسعت ہُوئی اور قبائل کی بڑی تعداد کے ساتھ اسلامی مملکت کے تعلقات قائم ہوئے، انتظامی کام میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ کام نمٹانے کے لیے باقاعدہ تنخواہ دار سیکرٹری مقرر کیے گئے۔

۲۶۰ - مدینہ میں مسجد نبوی مرکزی مسجد تھی جس میں اقامتی یونیورسٹی صُفّہ بھی قائم تھی۔ رسولِ خدا کے علاوہ متعدد دیگر اصحاب بھی مبتدیوں اور اعلیٰ درجوں کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ مسجد نبوی میں ایک سے زاید موذن بھی تھے جن کے ذمّے رات کے وقت مسجد میں لیمپ روشن کرنا اور مسجد کی صفائی وغیرہ کا کام بھی تھا۔ مسجد نبوی مدینہ کی واحد مسجد نہ تھی۔ رسولؐ اللہ کی زندگی میں ہی مدینہ میں نو مزید مساجد تعمیر ہو چکی تھیں۔ رسولؐ اللہ کی اس حدیث کہ:

"ہمسایوں سے علم حاصل کیجئے"

سے ظاہر ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی مساجد میں مکتب بھی قایم تھے۔

۲۶۱ - ابتدا میں جب رسولِ خدا کو مسلمانوں کی طرف سے تحائف یا صدقات موصول ہوتے تو وہ انھیں فوراً ہی لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ بعد میں ایک سٹور قائم کیا گیا جہاں یہ صدقات وغیرہ جمع کیے جاتے۔ اس سٹور کے محافظ اور نگران بلالؓ حبشی تھے جو رسولؐ کی منشا کے مطابق صدقات وغیرہ صرف کرتے تھے۔ یہی سٹور آگے چل کر بیت المال کی شکل اختیار کر گیا۔ جب زکوٰۃ فرض کی گئی اور باقاعدگی سے اس کی وصولی ہونے لگی تو بیت المال میں نہ صرف نقد رقوم بلکہ اُونٹ اور بھیڑ بکریاں، کھجوریں اور دُوسری زرعی اجناس بھی موصول ہونے لگیں۔ چنانچہ بیت المال کے ملازموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہُوا۔ نہ صرف یہ کہ چرواہے ملازم رکھے گئے بلکہ آمد اور خرچ کا حساب کتاب رکھنے کے لیے کلرک بھی بھرتی کیے گئے۔ جنگِ تبوک کی تیاری کے اخراجات کے لیے رسولِ خدا نے مسلمانوں کو زکوٰۃ پیشگی ادا کرنے کا بھی حکم دیا۔

۲۶۲ - مملکت کی بڑھتی ہُوئی دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر مسلمانوں پر جہاد فرض کیا گیا (فرض کفایہ) مگر کسی مہم کے لیے اگر زیادہ تعداد میں فوج درکار ہوتی تو رضاکاروں کے لیے اپیل کی جاتی۔ اس طرح فوج کی مطلوبہ تعداد پُورا ہونے تک انتظار کرنا پڑتا۔ یُوں نہ صرف کافی وقت گزر جاتا بلکہ زحمت بھی اٹھانا پڑتی۔ چنانچہ رسولِ خدا کے زمانے میں ہی مستقل فوج کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ امام محمد الشیبانی نے اپنی تفسیر "السیر الکبیر" میں لکھا ہے:

"۔ ۔ ۔ ۔ رسولؐ اللہ کی زندگی میں ہی زکوٰۃ کی آمدنی الگ رکھی جاتی تھی۔ اس شعبہ کے ملازم بھی الگ تھے اور مالِ غنیمت کا حساب کتاب رکھنے کے لیے علیٰحدہ لوگ متعین تھے۔ رسولِ خدا زکوٰۃ فنڈ میں سے یتیموں، معمر افراد اور نادار خاندانوں کی امداد کرتے تھے۔ جب کوئی یتیم سنِّ بلوغ کو پہنچ جاتا اور اس پر جہاد واجب ہو جاتا تو اسے زکوٰۃ فنڈ کے بجائے مالِ غنیمت سے امداد ملنا شروع ہو جاتی۔ اگر یہ نوجوان فوجی فرائض ادا کرنا پسند نہ کرتا تو پھر اسے زکوٰۃ فنڈ سے کوئی امداد نہ دی جاتی اور اسے حکم دیا جاتا کہ وُہ اپنی روزی خود کمائے۔"

۲۶۳ - مدینہ کی آبادی میں اضافہ کی وجہ سے شہر میں نہ صرف نئی منڈیوں کا قیام ناگزیر ہو گیا بلکہ منڈیوں کی نگرانی اور معاینہ کا مستقل انتظام بھی ضروری تصوّر کیا جانے لگا۔ چنانچہ ایک پڑھی لکھی خاتون شفاء بنت عبداللہ (عمرؓ کے والد) کو منڈیوں کے ضمن میں بعض فرائض سونپے گئے۔ چونکہ ان کے عہدے کا ٹھیک ٹھیک تعیّن نہیں ہو سکا۔ لہٰذا قیاس

کیا جاتا ہے کہ انھیں یا تو منڈیوں کی انسپکٹر جنرل یا تاجروں پر کسٹمز ڈیوٹی کی کلکٹر یا کم از کم خاتون تاجروں کے لیے انسپکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ تاجروں پر درآمدی ڈیوٹی میں بعدازاں اصلاحات کی گئیں جیسا کہ وینس میں بھی بہت بعد میں کیا گیا، تاجروں کے زمرہ کے مطابق درآمدی ڈیوٹی کی شرح مختلف تھی۔ مقامی تاجروں، غیر ملکیوں جو مملکت میں رہائش پذیر ہوں اور غیر ملکوں سے جو آتے جاتے رہتے ہوں علی الترتیب ۲½، ۵ اور ۱۰ فیصد کے حساب سے کسٹمز ڈیوٹی وصول کی جاتی تھی۔

۲۶۴۔ ابتدا میں اسلامی حکومت کا کوئی مستقل سیکرٹریٹ نہ تھا تاہم بعد میں خطوط اور فرمانوں پر ثبت کرنے کے لیے رسول اللہ کی مُہر بنوائی گئی۔ غیر ملکی زبانوں کے ماہر افراد کو بطور مترجم اور سیکرٹری متعین کیا گیا۔ قرآن پاک کی ترتیب و تدوین، رسول اللہ (صلعم) کے لیے خطوط نویسی، حکومت کی آمدنی اور اخراجات کے حسابات رکھنے اور فوجی نظم و نسق وغیرہ کے لیے الگ الگ شعبے قائم کیے گئے اور ان میں مطلوبہ اہلیت کے افراد ملازم رکھے گئے۔

۲۶۵۔ فوجی تربیت کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ رسولِ خدا بہ نفس نفیس گھڑ دوڑ کے میدان میں جاتے اور جیتنے والوں میں انعامات تقسیم فرماتے۔ تیر اندازوں کو نشانہ بازی کی مشق کرائی جاتی۔ پتھر پھینکنے کی تربیت دی جاتی اور اسی طرح کے دوسرے فنونِ حرب میں نوجوانوں کو مہارت دلائی جاتی۔ رسولِ خدا ایسے مواقع پر اکثر موجود ہوتے جس سے نوجوانوں کی زبردست حوصلہ افزائی ہوتی۔

۲۶۶۔ اسلامی مملکت کے شعبہ اطلاعات کو خاص طور پر فروغ دیا گیا۔ ملک کے اندر اور باہر نامہ نگار مقرر کیے گئے جو مکہ، نجد، طائف اور متعدد دوسرے مقامات کے اسلام کے زیرِ نگیں آنے سے قبل بھی رسولِ خدا کو پل پل کی خبریں ارسال کرتے رہتے تھے۔

۲۶۷۔ مملکت کی مرکزی اور صوبائی انتظامیہ ضرورت اور تجربہ کے تحت قائم کی گئیں اور ان میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح ہوتی چلی گئی۔ دونوں حکومتیں نہ صرف پرسکون طور پر کام کرتی رہیں بلکہ روز بروز مکمل تر ہوتی چلی گئیں۔ انسانی کمزوریاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ ظالم و جابر فرمانرواؤں کے لیے روپیہ پیسہ ہی سب سے بڑی کمزوری ہوتا ہے۔ اور اُن دنوں زکوٰۃ کی آمدنی حکومت کا سب سے بڑا وسیلہ تھی۔ رسولِ خدا کی یہ حدیث کتنی رُوح پرور ہے کہ:

"زکوٰۃ کا مال مجھ پر اور میرے خاندان پر حرام ہے۔"

اگر کسی حکومت کا سربراہ دیانت دار ہو تو بھلا اس کے عُمال کیسے غبن اور بددیانتی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ رسول اللہ ترغیب و تحریص اور بوالہوسی کی حوصلہ شکنی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک تحصیلدار (ٹیکس کلکٹر) ایک صوبہ سے واپس آیا اور بتایا کہ "یہ تو حکومت کے محاصل کی آمدنی ہے اور یہ مجھے لوگوں نے بطور تحفہ پیش کیا ہے۔" رسولِ خدا نے مسجد نبوی میں ایک اجلاس عام طلب کیا اور لوگوں سے خطاب کیا، رسولِ خدا نے فرمایا: کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ "یہ وہ چیزیں ہیں جو لوگوں نے مجھے ذاتی طور پر تحفہ دی ہیں۔" انھیں اپنی ماں کے گھر میں بٹھا دیجئے پھر دیکھیے کہ لوگ انھیں تحائف دینے آتے ہیں! ایک اور موقع پر رسول اللہ نے فرمایا: اگر تم کوئی ملازمت کرو ہر شخص یہ توقع کرے گا کہ تم اپنے فرائض ٹھیک ٹھیک ادا کرو، اور تم کسی بھی معمولی سی کوتاہی کے لیے ذمہ دار بھی ٹھہرائے جاؤ گے۔ اس کے برعکس اگر دوسرے تم پر دباؤ ڈالیں کہ تم فلاں کام کرو اور تمھارے مسلسل انکار کے باوجود کام تمھارے سپرد کر دیا جائے تو وہ سب اس کام کی تکمیل میں تمھارے معاون بھی ہوں گے اور اس کام میں اگر کوئی سقم رہ جائے تو بھی ان کی ہمدردیاں تمھارے

ساتھ ہوں گی۔ رسولِ خدا بعض افراد کو ان کی نااہلیت یا اہلیت کی بنا پر کسی خاص کام کی تکمیل پر مامور کرنے یا کوئی خاص کام ان کے سپرد نہ کرنے کے احکام بھی بلا تامل جاری کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے چچا العباسؓ کے بارے میں حکم دیا کہ انھیں ٹیکس جمع کرنے کا فرض نہ سونپا جائے۔ ابوذرؓ کے متعلق آپ نے یہ پابندی عاید کی کہ اسے یتیموں کی املاک کا منصرم مقرر نہ کیا جائے۔ وہ لوگوں کی صلاحیتوں کو سراہتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ رسولِ خدا تعلیم کے فروغ کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے بعض جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ منسوخ کر دیا اور ان سے کہا کہ وہ زرِ فدیہ کے بجائے مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، تاہم ناخواندگی کسی کی ترقی میں سدِّ راہ نہ تھی۔ ابوموسیٰؓ اشعری کو جج بنا کر یمن بھیجا گیا حالانکہ وہ ان پڑھ تھے۔ انھوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد لکھنا اور پڑھنا سیکھا (ابنِ سعد ۴/۱ ص ۸۳)۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ عمرؓ نے ابوموسیٰؓ اشعری سے کہا تھا کہ وہ کسی عیسائی کو اپنا سیکرٹری مقرر نہ کریں۔

۲۶۸۔ رسول اللہ کی زندگی کے مطالعہ کے دوران ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اوّل و آخر اللہ کے رسولؐ تھے انھوں نے پوری زندگی اس مشن کی تکمیل میں صرف کی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں سونپا تھا۔ وہ ایک خاص نظریہ کے علمبردار تھے۔ حکومت اور مملکت بھی اسی نظریہ کے فروغ کے لیے وقف تھی جس کا ماحصل یہ ہے کہ خدا ہی اصل حاکم و مالک ہے۔ انسان کو اس کے ماتحت (نائب) کا رویہ اپنانا چاہیے اور اس کے احکام بجا لانے چاہئیں۔ چونکہ خدا انسانی محسوسات سے ماورا ہے لہٰذا بندہ کو اس کے منتخب انسان ——— رسولؐ ——— پر نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اسلام کا اقرار "لا الٰہ الّا اللہ محمّد رسول اللہ" اسی نظریہ کا ہی مظہر ہے۔ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر اور قادرِ مطلق ہے اس کے بندوں ——— انسانوں ——— کو اس کے رسول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ خدا کے اور بھی رسول مثلاً حضرت عیسیٰؑ ——— ہو سکتے ہیں جنھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق نہیں ہے بلکہ صرف چند گوشوں سے ہے۔ لیکن رسولِ اسلام نے "دنیا اور آخرت میں نیکی" کا ارفع تصوّر پیش کیا۔ چنانچہ انفرادی یا معاشرتی زندگی کا کوئی پہلو ان کے احکام کے دائرہ سے باہر نہیں۔

۲۶۹۔ رسول اللہؐ کی تعلیمات کے مطالعہ سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رسولؐ کی تعلیمات گردشِ زمانہ سے محفوظ کیسے رہیں اور پھر ہم تک کیسے پہنچیں۔

رسولؐ اللہ کی تعلیمات کا تحفّظ

۲۷۰۔ کسی بھی نبی کی تعلیمات ان کے اقوال (احادیث) ان کے اعمال اور ان کے امتیوں کے وہ اعمال ہوتے ہیں جن کی نبی نے واضح طور پر توثیق کی ہو۔

۲۷۱۔ محمد (صلعم) نے اپنی احادیث (اقوال) کے مختلف زمرے متعین کیے ہیں۔ بعض اقوال کے بارے میں انھوں نے کہا: "یہ خدا کا پیغام ہے، اسے لکھ لیجئے، حفظ کیجئے اور نماز میں اسے پڑھیے۔" یہ قرآن ہے۔ دیگر اقوال میں سے

بعض کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے مگر انھوں نے یہ حکم نہیں دیا کہ اس قول یا اقوال کو قرآن میں شامل کیا جائے ۔ یہ حدیث قدسی ہے ۔ رسول اللہؐ کے اعمال یا ان کے پیروکاروں کے وہ اعمال جن کی رسولؐ نے توثیق کی اصحاب رسول کے توسط سے ہی ہم تک پہنچ سکے تھے ۔ یہ سُنّت ہے ۔ آئیے دیکھیں کہ یہ مختلف عناصر ہم تک کیسے پہنچے ؛

قرآن حکیم

۲۷۲ ۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے ۔ خدا زبان و بیان سے ماورٰی ہے ۔ ہم اسے ایک تشبیہ کی مدد سے سمجھ سکتے ہیں ۔ خدا کا کلام بجلی کی رَو کے مانند ہے جو بے رنگ ہے اور اسے دیکھنا بھی ممکن نہیں ۔ رسولِ خدا مانند بلب کے ہیں جو اس تار کے ساتھ منسلک ہیں جس میں بجلی کی رَو دوڑتی ہے ۔ یہ بلب اسی رَو کی وجہ سے روشن ہوتے ہیں ۔ بلب کا رنگ پیغمبر کی مادری زبان ہے ۔ بجلی کی رَو جو اللہ کا کلام ہے' اسی رنگ کی روشنی بکھیرتی ہے جس رنگ کا بلب ہو ۔ یہ خواہ سفید ہو، سرخ ہو، زرد ہو یا سبز وغیرہ ، بجلی کی رَو کا خود کوئی رنگ نہیں ہوتا ۔ پھر روشنی کی کمی بیشی بلب کی قوت پر منحصر ہوتی ہے یُوں اللہ کا کلام جو زبان و صدا سے ماورٰی ہے ہم تک بلب ———— رسولِ خدا ———— کی زبان اور آواز میں پہنچتا ہے جس پر اس کا نزول ہوتا ہے ۔

۲۷۳ ۔ قرآن حکیم کا عام نسخہ پانچ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے ۔ یہ زبور[1] اور انجیل کے عہد نامہ جدید دونوں سے زیادہ ضخیم ہے ۔ تاریخی اعتبار سے قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہوا بلکہ اس کا نزول ۶۰۹ سے ۶۳۲ ء تک ۲۳ سال میں مکمل ہوا ہے ابتدا میں جب رسول اللہؐ پر ایمان لانے والا کوئی نہ تھا تو جو آیات بھی نازل ہوتیں انھیں لکھے بغیر رسولِ خدا اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے ۔ درحقیقت ابتدائی آیات نہ تو طویل تھیں اور نہ ہی ان کی تعداد کچھ زیادہ تھی ۔ ان کے ضائع ہونے کا بھی خطرہ نہ تھا کیونکہ رسولِ خدا نزولِ وحی کے بارے میں لوگوں سے بات چیت کرتے وقت روزانہ ان آیات کو دُہراتے تھے غالباً وہ عبادت کے وقت بھی انھی آیات کی تلاوت کرتے ۔ وہ صبح و شام دو بار نماز ادا کیا کرتے تھے (پانچ نمازوں کی ادائیگی تو کافی عرصہ بعد شروع ہوئی تھی)

۲۷۴ ۔ جلد ہی جب حضورؐ پر ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھی اور آیاتِ قرآنی کے نزول میں بھی اضافہ ہوگیا تو اللہ کے کلام کو تمام مسلمانوں تک پہنچانا ضروری تھا ۔ ابنِ اسحاق نے رسولِ خدا کی جو سوانح سپردِ قلم کی ہے ۔ اس کے کچھ حصے ہم تک پہنچے ہیں ۔ ایک مسودے میں جو ان دنوں رباط (مراکش) میں ہے یہ اہم روایت بیان کی گئی ہے کہ" جب کبھی قرآن کی کسی آیت کا نزول ہوتا تو رسول اللہؐ پہلے مردوں کے اجتماع میں اور پھر مسلم خواتین کے اجتماع میں اسے پڑھ کر سناتے ۔" (حضورؐ کو خواتین کی تعلیم سے بھی گہری دلچسپی تھی) چونکہ ہر شخص کی یادداشت کم و بیش ہوتی ہے چنانچہ یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے کہ بعض صحابہؓ آیات لکھ لیا کرتے تھے تاکہ فارغ اوقات میں اسے بار بار دُہرا کر حفظ کر سکیں ۔ قرآنی آیات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا کام کب شروع ہوا ، ہمیں قطعیت کے ساتھ اس کا علم نہیں ۔ لیکن ہم جانتے ہیں (دیکھیے اسی کتاب کا پیراگراف ۱۰۵) کہ جب حضرت عمرؓ ایمان لائے قرآن کے پاروں کی تحریری نقول موجود تھیں ۔ عمرؓ رسول اللہؐ کے دعوٰی نبوت کے پانچویں

---

[1] زبور کی پانچ کتابیں جن کا تعلق حضرت موسٰی سے بیان کیا جاتا ہے ۔ (مترجم)

سال اور تبلیغِ رسالت کے دوسرے سال دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے جو ہجرت سے کوئی آٹھ سال پہلے کا وقت بنتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے دو سورتوں ۱۸ ویں اور ۲۰ ویں کا مطالعہ کیا تھا جو نزول کے اعتبار سے ۷ ویں اور ۴۵ ویں سورتیں ہیں۔ اس اطلاع کی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ ہجرت سے قبل نازل ہونے والی متعدد سورتوں میں قرآن پاک کی تحریری نقول کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ سورت ۲۵ (جو نزول کے اعتبار سے ۴۲ ویں ہے) کی آیت ۵ اور سورۃ ۵۶ (جو نزول کے اعتبار سے ۴۶ ویں ہے) کی آیت ۹، اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ قرآن حکیم میں خود قرآن کے لیے لفظ "کتاب" کئی بار استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب تحریری دستاویز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت (۹۶/۱) میں حکم دیا جاتا ہے: "پڑھو"۔ اس حکم سے بھی قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۲۷۵۔ رسول اللہ نے فیصلہ کیا کہ قرآن کریم کی مختلف سورتوں کو ان کی ترتیب نزول کے مطابق مشیتی انداز میں مدون نہیں کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن پاک کی تمام سورتوں کو خود ترتیب دیا (سب سے پہلے جو سورت نازل ہوئی جس میں قلم کی تعریف کی گئی ہے اور اسے انسانی علم کا نگران قرار دیا گیا ہے اب قرآن حکیم کی ۱۱۴ سورتوں میں ۹۶ ویں نمبر پر ہے) ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ قرآن پاک کی کوئی بھی سورت ایک ساتھ نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں۔ مورخوں کے مطابق بسا اوقات متعدد سورتوں کی آیات بیک وقت بھی نازل ہوتی تھیں۔ جب کبھی کوئی نئی آیت نازل ہوتی تو رسولِ خدا بتا دیتے تھے کہ اسے متعلقہ سورت میں کس مقام پر رکھا جائے۔ انھوں نے نہ صرف آیات کی ترتیب بتائی بلکہ قرآن پاک میں مختلف سورتوں کی ترتیب بھی متعین کی۔ یوں سورتوں اور آیات کی ترتیب و تدوین مسلسل نظرِ ثانی اور سخت نگرانی کی متقاضی تھی۔ چنانچہ ہر سال ماہِ صیام میں اُس وقت تک نازل ہونے والا پورا قرآن عام لوگوں کے سامنے تلاوت کیا جاتا تھا۔ اصحابِ رسولؐ اپنے قرآن پاک کے نسخے بھی لے آتے تھے اور وہ رسولؐ پاک کی تلاوت سے موازنہ کرنے کے بعد ان نسخوں میں غلطیاں وغیرہ (اگر کوئی ہو) درست کر لیتے تھے۔ اپنی دنیاوی زندگی کے آخری سال میں حضورؐ نے قرآن پاک کا دو بار دَور کیا۔ یہ موازنہ اور عام لوگوں کے درمیان قرآن حکیم کی تلاوت "عَرض" کہلاتی تھی۔ اور عَرَضَ الآخر تو قرآن حکیم کی تاریخ میں ایک یادگار ہے۔

۲۷۶۔ رسولِ کریمؐ نے قرآن کی صحت کے سلسلے میں دو اور موثر اقدام کیے۔ اُنھوں نے حکم دیا کہ روزانہ نماز کے دوران قرآن حکیم کی تلاوت کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو قرآن کی آیات حفظ کرنا پڑیں اور یوں قرآن پاک پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری قائم نہ ہو سکی۔ رسولِ خدا نے یہ حکم بھی دیا کہ مسلمان اوّل تو رسولؐ اللہ سے یا پھر اُن اصحابؓ سے جنھیں حضورؐ نے خود اس کام پر مامور کیا تھا قرآن حکیم کا درس لیں۔ قرآن حکیم کی صحت کے سلسلے میں یہ جو تہرا طریقہ ——— قرآن کو ضبطِ تحریر میں لانا، حفظ کرنا اور کسی سند یافتہ استاد سے درسِ قرآن لینا ——— رسولؐ اللہ نے نافذ کیا تھا آج تک مسلمان اس پر ہی عمل پیرا ہیں۔

۲۷۷۔ چونکہ رسولِ خدا پر زندگی کے آخری وقت تک نزولِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا، لہٰذا ان کے دَورِ حیات میں قرآن پاک کا کوئی سرکاری ایڈیشن شائع نہ کیا جا سکا۔ پیغمبر کے وصال کے بعد جب نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور

قرآن میں کسی اضافہ یا تنسیخ کا کوئی امکان نہ رہا تو خلیفہ ابوبکرؓ نے ایک کمیٹی قایم کی جس کے سربراہ رسول اللہ کے چیف سیکرٹری زیدؓ ابن ثابت تھے۔ اس کمیٹی کو قرآن پاک کا ایک کتاب کی شکل میں قطعی مسودہ تیار کرنے کا فرض سونپا گیا۔ زید خود حافظِ قرآن تھے لیکن مزید احتیاط کی غرض سے خلیفہ نے انھیں حکم دیا کہ وُہ جو آیت بھی ضبطِ تحریر میں لائیں انھیں دو گواہوں سے اس کی توثیق کرانی چاہیے اور پھر قرآن پاک کے دو ایسے مسودوں سے اس کی تصدیق کر لینی چاہیے جن کا موازنہ خود رسول اللہ کی تلاوت (عَرَض) کے دوران کیا جا چکا ہو۔ خلیفہ نے عام لوگوں کو بھی حکم دیا کہ وُہ اپنے اپنے مسودے مسجد نبوی میں لا کر زید اور ان کے رفقا کو دکھائیں۔ جب کام ختم ہو گیا اور قرآن حکیم کا مکمل مسودہ تیار کر لیا گیا تو زید نے خود دو بار اس کی تلاوت کی اور (کتابت میں) جو کمی رہ گئی تھی اسے پُورا کیا۔ اس طرح جو قطعی مسودہ تیار ہوا وہ خلیفہ ابوبکرؓ کے سپرد کر دیا گیا۔ ان کے بعد یہ مسودہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ مسودہ حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ کے پاس آ گیا جو رسولؐ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں۔ کچھ مدت کے بعد جب حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم مقرر ہوئے تو اُنھوں نے یہ نسخہ حاصل کر کے ایک اور کمیشن کے سپرد کیا جس کے سربراہ زیدؓ بن ثابت ہی تھے۔ انھوں نے کمیشن کو ہدایت کی کہ وہ قرآن حکیم کی آیات کے ہجے اُس زمانے کے مطابق کر کے سات نسخے تیار کریں۔ یہ نسخے جب تیار ہو گئے تو مسجد نبوی میں عام لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت کی گئی۔ جب سب لوگوں نے اظہارِ اطمینان کیا تو ایک ایک نسخہ وسیع اسلامی سلطنت کے صوبائی مراکز کو بھیج دیا گیا۔ ان دنوں (۲۶ ہجری) اسلامی سلطنت مدینہ سے مغرب میں اُندلس (جنوبی سپین) اور مشرق میں ماوراالنہر (چین میں دریائے جیحوں کے دوسری طرف) تک پھیل چکی تھی۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ آئندہ صرف ان قطعی نسخوں کے مطابق مزید قرآن حکیم کتابت کرائے جائیں اور جو نسخے ان قطعی نسخوں سے ذرا بھی مختلف ہوں انھیں تلف کر دیا جائے۔

۲۷۸۔ دَورِ عثمانؓ میں تیار کیے جانے والے قرآن حکیم کے ان قطعی نسخوں میں سے دو اب بھی موجود ہیں، ایک ترکی کے میوزیم توپ کاپی (استنبول) میں اور دُوسرا تاشقند کی لائبریری میں ہے۔ اس کے بعد کی صدیوں اور مختلف مسلم ممالک میں قرآن حکیم کے جو نسخے بعد ازاں تیار ہوتے وہ بھی ہم تک پہنچے ہیں۔ جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ برائے قرآن" نے دنیا بھر سے قرآن پاک کے ۴۲ ہزار مکمل اور نامکمل نسخے جمع کیے، ان پر کوئی پچاس سال تک تحقیق کے بعد اعلان کیا گیا کہ ان میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف موجود نہیں۔ اور اگر کوئی غلطی ملی ہے تو وہ کتابت کی غلطی نکلی۔ یہ عظیم ادارہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران امریکی بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔

۲۷۹۔ یہ تو ہے اُمت تک قرآن حکیم کی ترسیل کی حکایت۔ اب قرآنی مندرجات کے بارے میں چند الفاظ:
قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا، احکام، امتناع، وعدے، وعید، قصص اور تاریخی روایات ہیں۔ اللہ تعالیٰ بسا اوقات صیغۂ متکلم ——— مَیں یا ہم ——— میں کلام کرتا ہے اور بعض اوقات اپنے لیے صیغہ واحد غائب ——— وہ ——— کا استعمال کرتا ہے۔ قرآن پاک کا اوّلیں مخاطب نبی یعنی خدا کا پیغمبر ہے۔ کلام اللہ میں بعض جگہ تلمیح اور استعارے سے کام لیا گیا ہے جو اللہ کا رسولؐ، اللہ کا مقرب ترین خادم ہی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا اسے ہی لوگوں تک کلام اللہ کی

ترسیل کا فرض سونپا گیا ہے۔ اور غالباً یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بادشاہ کا طرزِ تکلم عام لوگوں کی طرح نہیں ہوتا۔ بادشاہ دورانِ کلام میں کہتا ہوں، ما بدولت فرماتے ہیں، شاہ کہتا ہے، تمہارا مالک فرماتا ہے، وغیرہ جملے بدل بدل کر استعمال کرتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن کا طرزِ تکلم دلربا اور پرشکوہ ہے۔ اس سے کسی کو حتیٰ کہ رسولؐ کے دشمنوں کو بھی مجالِ انکار نہیں۔ قرآن نثر میں ہے مگر اس میں شاعری کی تمام رعنائیاں حتیٰ کہ ردیف قافیہ وغیرہ تک موجود ہیں یہاں تک کہ اگر کسی آیت کے کسی لفظ سے ایک حرف تک ساقط ہو تو اس کی موسیقیت درہم برہم ہو جاتی ہے اور فوراً غلطی کا پتہ چل جاتا ہے۔ مسلمانوں نے تجویدِ قرآن کا فن ایجاد کیا جو موسیقی کی ایک شاخ ہے، اور دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ فن آج بھی زندہ ہے اور اسے ہر طرح سے سراہا جاتا ہے۔

۲۸۰۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں کی کتاب مقدس عہد نامہ قدیم بلکہ اس کا اہم ترین حصہ زبُور بھی ایک نسل کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں کہیں کہیں اللہ کے احکام بھی دیے گئے ہیں۔ دوسرے انبیا کی کتابوں میں بھی یہودیوں کی عصری تاریخ ہی بیان کی گئی ہے۔ انجیل (عہد نامہ جدید) حضرت عیسیٰؑ کی سوانح پر مشتمل ہے جو ان کے حواریوں اور ان کے پیروکاروں نے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد محض اپنی یادداشت کے سہارے تیار کی ہے۔ لیکن قرآن کا معاملہ اس طرح نہیں بلکہ قرآن خود رسول اللہؐ نے جو دین متین کے بانی ہیں، نزول کے ساتھ ہی اپنے سیکرٹریوں کو لکھوایا اور اس کی صحت اور بصحت ترسیل کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ ہم تک یہ بالکل اصلی شکل میں پہنچا ہے۔ گذشتہ چودہ سو سالوں میں اس کے الفاظ اور گرامر تو کیا اس کا ایک حرف بھی بدلا نہیں جا سکا۔ اس کا یہ خوشگوار نتیجہ ہے کہ جو لوگ آج عربی کے اخبارات پڑھ سکتے ہیں وہ قرآن پاک کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ترکی میں پانچ لاکھ حافظِ قرآن مرد اور خواتین موجود ہیں۔ موریطانیہ کی اسّی فیصد مسلمان آبادی حافظِ قرآن ہے اور دُنیا بھر میں کروڑوں حفاظ موجود ہیں۔

حدیث اور سُنّہ

۲۸۱۔ رسولِ خدا کے اقوال جو انھوں نے خود قرآن میں شامل نہیں کرائے 'حدیث' کہلاتے ہیں۔ اگر رسول اللہؐ نے یہ کہا ہو کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" تو اسے 'حدیث قدسی' کہیں گے۔ قولِ رسولؐ کو صرف حدیث کہا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کے افعال و اطوار سنّت کی بنیاد ہیں لیکن بسا اوقات حدیثِ رسولؐ اور سُنّہ باہم یُوں مل جاتے ہیں کہ انسان 'حدیث' اور 'سُنّہ' کو ہم معنی تصور کرنے لگتا ہے۔ حدیث رسول اللہ کے افعال و اقوال دونوں پر محیط ہے۔ اسی طرح سنّتِ رسولؐ بھی آپ کے افعال و اقوال کا احاطہ کرتی ہے۔ حضورؐ کے افعال سے مراد وہ کام ہیں جو نبیؐ نے خود کیے۔ صحابہؓ کے ایسے افعال بھی جو رسول اللہؐ کے علم میں آئے اور حضورؐ نے ان کی توثیق کی، سُنّتِ نبوی میں شامل تصوّر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبیؐ کے صحابہ کرامؓ میں جو امور مروّج تھے وُہ بھی سنّت سے کم نہیں، جیسا کہ ایک قانونی مقولہ ہے: "جب بات ناگزیر ہو، اور اگر کوئی خاموش رہے تو اس کی خاموشی کو رضا تصوّر کیا جانا چاہیے۔"

۲۸۲۔ رسولؐ کی احادیث اور سنّت کی ترتیب و تدوین ایک الگ باب ہے۔ احادیث کا ایک حصہ تو خود حضور اکرمؐ کے حکم سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ ان میں رسولِ خدا کے خط، معاہدے، مدینہ سے دُور موجود عمّال کے لیے ہدایات اور رسولِ خدا کی جاری کردہ اسناد وغیرہ شامل ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہیں، اور ان میں رسولؐ کے ذاتی ملازم حضرت انسؓ کی مثال واضح ترین ہے کہ لوگوں نے حضورؐ کی احادیث ضبطِ تحریر میں لا کر رسولِ خدا کو پیش کیں اور حضورؐ نے خود ان کے مندرجات کی تصحیح فرمائی۔ تقریباً ایک

درجن صحابہ کرامؓ ایسے ہیں جنھوں نے نبیؐ کی زندگی میں ہی اُن پر اپنی یادداشتیں مرتب کیں۔ اس سے بھی زیادہ ——— کم از کم پچاس ——— اصحابؓ ایسے ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کے وصال کے فوراً بعد وہ سب کچھ تحریر کیا جو رسولؐ اللہ کے بارے میں ان کے علم میں تھا۔ ایسے لوگ تو بے شمار ہیں جنھوں نے رسول اللہؐ کی زیارت نہیں کی تھی مگر انھیں اصحابِؓ رسولؐ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے صحابہؓ سے رسول اللہؐ کے متعلق سوالات دریافت کیے اور ان کے جوابات کو ضبطِ تحریر میں لا کر اس عظیم علمی خزانہ کو مدون کیا۔ حدیث پاک کے ایک مسلمہ ماہر بیان کرتے ہیں کہ ایسے صحابہؓ کی تعداد جنھوں نے کم از کم ایک حدیثِ رسولؐ بیان کی ہے، ایک لاکھ سے زاید ہے۔ اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ رسولِ خداؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدانِ عرفات میں ایک لاکھ چالیس ہزار فرزندانِ توحید کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

۲۸۳۔ پہلی نسل میں تو صرف اصحابِؓ رسولؐ کی یادداشتیں ہی سامنے آ سکتی تھیں۔ البتہ دوسری نسل میں اگر کسی طالب علم نے ایک سے زاید صحابہ کرام سے تحصیلِ علم کی ہو تو وہ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ علم کو زیادہ جامع انداز میں مرتب کر سکتا تھا۔ تیسری نسل میں تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کو یکجا کیا جا سکتا تھا اور حدیث و سنّت کی تدوین و ترتیب میں بالکل یہی ہوا ہے۔

۲۸۴۔ چونکہ قرآنِ حکیم کی طرح احادیثِ نبویؐ کی ترتیب و تدوین پر موثر کنٹرول ممکن نہیں تھا لہٰذا غلط فہمی، اغلاط بلکہ اس سے بھی بدتر امکانات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ان امکانات کے پیشِ نظر ہی مسلمانوں نے احادیث کی انفرادی روایت کے نقد و جرح کے لیے سائنسی انداز ایجاد کیا جس کی ابتدا اصحابِ رسولؐ کے زمانہ میں ہی ہو چکی تھی۔ احادیث کے راویوں کی سوانح بڑی محنت سے تیار کی گئیں جن میں راوی کی شہرت، دیانت یا ضعیف ہونے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے اساتذہ اور شاگردوں کی مکمل تفصیل اور دوسری معلومات فراہم کی گئیں ——— تیسری اور بعد میں آنے والی نسلوں کا تو ذکر ہی کیا ——— صرف دوسری نسل میں بھی محض یہ کہنا کافی نہ تھا کہ "رسولِ خداؐ نے فرمایا ہے" بلکہ راوی کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ "میں نے اپنے فلاں استاد سے جو اصحابِؓ رسولؐ میں سے ہیں سُنا ہے کہ . . . . . ." تیسری نسل میں یہی بات یوں کہنا پڑی "میں نے اپنے فلاں استاد سے سنا ہے جس نے اپنے فلاں استاد کو جو صحابیؓ تھے کہتے ہوئے سُنا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا . . . . ." فطری طور پر کسی بھی روایت کے لیے راویوں کی فہرست نسلاً بعد نسلٍ طویل تر ہوتی چلی گئی۔

۲۸۵۔ حدیث کی صحت پر کنٹرول کا ایک اور طریقہ بھی تھا: اگر کوئی حدیث رسولِ پاکؐ کے ایک سے زاید صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور سبھی نے ایک ہی بات کہی ہے، تو ایسی حدیث کسی ایک صحابی کی روایت کردہ حدیث کے مقابلے میں زیادہ معتبر تصور کی جائے۔

۲۸۶۔ تدوین کے دوسرے طریقوں کے علاوہ احادیث کو راویوں یا پھر موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا جا سکتا تھا لیکن ہر صورت میں ایک ایک حدیث کے ذرائع کا تفصیلی ذکر ناگزیر تھا۔

۲۸۷۔ مختلف راویوں سے مروی احادیث میں تضاد بھی ممکن تھا۔ یہ تضاد مختلف نسلوں کے راویوں کے سہو سے

رونما ہو سکتا تھا یا پھر رسول اللہؐ نے کسی امر پر اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہو اور اپنا سابق حکم کالعدم قرار دے دیا ہو ایسے اور اسی نوع کے دیگر امور سے "علم الحدیث" کی کتب میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ رسولِ خداؐ کی احادیث و سنّت کے بارے میں جتنی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں تاریخِ عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سیرتِ رسولؐ

۲۸۸ ۔ رسولِ خداؐ پر کتابوں کی تیسری قسم اُن کی سوانح پر مشتمل ہے جو ان کے بعد تحریر کی گئیں۔ اس زمرہ کی اوّلین کتب آنحضورؐ کے صحابہؓ کے بیٹوں نے لکھی ہیں، ان میں عُروہ ابن الزبیر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے بعض حصّے ہی ہم تک پہنچے ہیں جن کا ذکر بعد کی نسلوں کے مصنّفوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ رسولِ خداؐ کی قدیم ترین سوانح جس کے قلمی نسخے کے بعض حصّے ہم تک پہنچے ہیں ایک تابعی (جس نے صحابۂ رسولؐ اور ان کے پیروکاروں کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی ہے) کی تحریر کردہ ہے۔ یہ مصنّف ابنِ اسحاق ہے جس کا انتقال ۷۶۸ء (۱۵۱ھ) میں ہوا تھا۔ ایسی کتب کو "سیرت" کہا جاتا ہے۔ وہ ان کتابوں سے ملتی جلتی ہیں جن میں حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کے حالات ان کے حواریوں نے بیان کیے ہیں۔ چونکہ پیغمبرؐ کے ان سوانح نگاروں نے اپنے ماخذ تفصیل سے بیان کیے ہیں، لہٰذا ان کی صحت اور ان کتب میں مذکور حقائق کی صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

وثیقہ جات نبویؐ

۲۸۹ ۔ وثیقہ جاتِ دورِ نبویؐ دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم کتبوں پر مشتمل ہے، خصوصاً جو مدینہ، مکہ اور طائف وغیرہ میں دستیاب ہوئے ہیں، بعض ایسے کتبوں پر تاریخیں بھی ملی ہیں۔ مثلاً طائف کے نزدیک ایک بند ہے جس پر حضرت معاویہؓ جو خود ایک صحابی تھے کے گورنر کا نام معہ سَن کے کندہ ہے۔ کئی کتبے خصوصاً جو ابتدائی دَور کے ہیں تاریخ سے محروم ہیں۔ ان میں سے بعض تو رسولِ خداؐ کے دَور کے ہیں۔ (میں نے ایسے بعض کتبوں کے عکس شائع کئے ہیں اور بعض کا مطالعہ کیا ہے جو میرے خیال کے مطابق ۵ ہجری میں جنگِ خندق کے وقت کے ہیں۔ مصنّف)

۲۹۰ - وثیقہ جاتِ نبویؐ کی دُوسری قسم خطوط پر مبنی ہے۔ پانچ ایسے خطوط کے جو نبیؐ سے منسوب کیے جاتے ہیں، اصل مسودے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سے ایک خط جو مقوقس[1] کے نام ہے استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں موجود ہے۔ مصر کے قدیم مخطوطوں میں خلیفہ عمرؓ کے دور کے متعدد خطوط ملے ہیں، جو ۲۲ھ اور اس کے بعد لکھے گئے تھے۔ چونکہ ان پر تاریخیں درج ہیں لہٰذا ان میں جعل سازی کا امکان معلوم نہیں ہوتا۔

۲۹۱ ۔ رسولِ خداؐ کی بعض ذاتی استعمال کی اشیا بھی ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کے مُوئے مبارک تو متعدد ممالک میں موجود ہیں استنبول، ہندوستان اور بعض دیگر ممالک میں رسولِ خداؐ کا جُبّہ یا دُوسرے لباس موجود ہیں، تاہم ان اشیا کے حقیقی ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ رسولِ خداؐ کی تلوار ——— ذوالفقار ——— اسلام کے اوائل میں ہی ٹوٹ گئی تھی مگر استنبول کے توپ کاپی میوزیم میں یہی ذوالفقار بالکل درست حالت میں موجود ہے۔ رسولِ پاکؐ سے

---

[1] مقوقس مصر میں قبطیوں کا سردار تھا اور رسولِ خداؐ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ (مترجم)

منسوب یہ اشیا اگر واقعی اصلی ہوں تو ان سے اس دور کی صنعتی تاریخ پر کسی حد تک روشنی پڑ سکتی ہے۔ مگر جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے یہ کچھ زیادہ وقعت کی حامل نہیں۔

عقل اور فوق الفطرت

۲۹۲۔ انسانی تاریخ میں برگزیدہ انسانوں کی، خواہ وہ نبی ہوں یا ولی یا کسی مذہب کے بانی ہوں، زندگی مافوق الفطرت باتوں سے خالی نہیں ہوتی۔ ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، زرتشت اور بُدھ وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ رسولِ اسلام کی زندگی بھی مافوق الفطرت واقعات سے خالی نہیں۔ رسول اللہ کے بعض عظیم معجزے بیان کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مُردے کو زندہ کیا۔ انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو کر پھر جُڑ گیا۔ خوراک کی معمولی سی مقدار لاتعداد لوگوں کے لیے کافی نکلی۔ انھیں حظیرۃ القدس کے بلند ترین مقام پر لے جایا گیا اور وہ خدا کے حضور جا کر واپس زمین پر تشریف لائے۔ اسی طرح کے کئی اور معجزوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اہلِ ایمان نبیؐ کے ان معجزات پر بجا طور پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

۲۹۳۔ تاہم چند باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ قرآن کے مطابق معجزہ پیغمبر نہیں خدا دکھاتا ہے۔ رسولِ خدا ہمیشہ کہا کرتے تھے: میں خود کچھ نہیں کر سکتا، اللہ کے لیے جو اس کائنات کا خالق ہے، کوئی بات بھی معجزہ نہیں، وہ کہتا ہے کُن (ہو جا) فیکون (پس وہ ہو جاتا ہے)۔ اللہ کے لیے علت اور معلول کا کوئی سوال نہیں، نہ ہی کسی مثال کی حاجت ہے۔ وہ جب چاہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے بعض نبیوں نے حیرت انگیز کام کیے ہیں، اور بعض نبیوں کو ان کے رفقا نے ہی قتل کر ڈالا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی بھی نہیں بچائی

۲۹۴۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ معجزوں کی اصل افادیت ہمیشہ اضافی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا اس بات پہ ہمیشہ اتفاق رہا ہے کہ کسی رسولِ خدا کے لیے معجزے ناگزیر نہیں ہیں۔ پھر معجزات سے ہر کسی کو قائل نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے

ل واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے جہاں رسولِ اکرمؐ اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے۔ (مترجم)

ل معجزہ کسی مافوق الفطرت چیز کے معنوں میں کسی دعوے یا اصول کی صداقت کا مسلّمہ ثبوت قرار نہیں پا سکتا۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص کہتا ہے: "دو اور دو پانچ ہوتے ہیں کیونکہ میں ننگے پاؤں آگ پر یا پھر پانی پر چل سکتا ہوں"۔ ان دونوں باتوں میں کوئی معقولیت نہیں۔ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں پانچ نہیں۔ یہ بات ریاضی کے اصولوں سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ آگ پر ننگے پاؤں چلنا یا ڈوبے بغیر پانی پر چل کر دکھانا، اگر کبھی ایسا ہو ہی جائے، قانونِ فطرت میں اس کا ضرور کوئی سبب اور وجہ ہو گی کیونکہ ہماری یہ دنیا علت و معلول سے عبارت ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار آتا ہے کہ (۱۷/۷۷، ۳۳/۶۲، ۳۵/۴۳، ۴۸/۲۳) اللہ قانونِ فطرت کو تبدیل نہیں کرتا (گو وہ پسند کرے تو ایسا کرنے پر بالکل قادر ہے) اگر کسی مافوق الفطرت واقعہ کی ... کسی توضیح ... نہیں ہو سکتی تو وہ اسے معجزہ قرار دیتا ہے خواہ یہ واقعہ کسی رسول ... یا کسی شیطانی ذہن کے حامل انسان سے ہی کیوں نہ سرزد ہوا ہو۔ کوئی سوچ و سمجھ سے عاری ذہن ہی ایسے کسی واقعہ کو (باقی بر صفحہ آئندہ)

کسی معجزہ کے بغیر اسلام قبول کر لیا مگر ابو جہل جیسے تو معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ بعض افراد خارق عادات واقعات کو دیکھ کر اچھل پڑتے ہیں اور وہ معجزہ دکھانے والے کی ہر بات فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔

۲۹۵۔ مزید برآں یہ ممکن ہے کہ کوئی عجیب و غریب فطری واقعہ محض تجسس اور تعریف کے معمولی جذبات پیدا کرنے کے سوا کسی غیر معمولی توجہ کا مستحق نہ ٹھہرے مگر یہی واقعہ اس وقت زبردست اہمیت اختیار کر سکتا ہے جب کسی کو اس کی "ضرورت" ہو۔ فرض کیجئے کہ چاند کے مادوں میں اندرونی احتراق کی وجہ سے دھماکہ ہوتا ہے اور چاند دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے مگر اس کی کشش ثقل کی وجہ سے دونوں ٹکڑے دوبارہ باہم مل جاتے ہیں، تو ہم کہیں گے کہ یہ ایک عجیب مگر فطری واقعہ ہے لیکن اگر یہی واقعہ اس وقت رونما ہو جب ایک پیغمبر کے دشمن اسے کہہ رہے ہوں کہ "اگر صرف ایک خدا ہے اور وہ ہر شے پر قادر بھی ہے تو اسے کہو کہ وہ چاند کے دو ٹکڑے کرے۔" اور پھر یہ واقعہ رونما ہوتا ہے تو ہم اسے معجزہ ہی کہیں گے۔ معجزہ محض عجیب و غریب واقعہ نہیں بلکہ یہ کفار کے مطالبہ پر رونما ہوا ہے ورنہ خدا کے لاشریک ہونے اور چاند کے دو ٹکڑے ہونے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایک سے زاید "خدا" ہوتے اور چاند کا "خدا" اسے سزا دینا چاہتا تو بھی چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔

۲۹۶۔ ایک اور نکتہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ غیر معمولی واقعات محض نبیوں تک محدود نہیں ہیں۔ اگر ایسا واقعہ کسی نبی کے ہاتھوں رونما ہو تو ہم اسے معجزہ قرار دیتے ہیں (معجزہ کے لغوی معنی ایسے واقعہ کے ہیں جس کے سامنے دوسرے عاجز ہوں یعنی وہ اس نوع کا کام نہ کر سکیں) اگر ایسا کسی ولی سے رُونما ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔ شر پسندوں کو بھی خلافِ عادت واقعات کی قوت سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اگر کسی "شیطان" سے ایسا واقعہ منسوب ہو تو اسے استدراج (دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے خفیہ طریقہ سے کوئی کام کرنا) کہا جائے گا۔ تو پھر کسی سچے نبی اور جھوٹے مدعی کے درمیان نشانِ امتیاز کیا چیز ہوئی؟

۲۹۷۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا خیال ہے کہ قرآن کبھی رسولِ اسلام کے معجزات پر اصرار نہیں کرتا بلکہ بار بار اہلِ ایمان کو غور و فکر، تدبّر، تعقّل، دلیل اور استنباط کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کے مطابق ایمان تصدیقٌ بالقلب کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دو اور دو پانچ کے اصول کی تصدیق تسلیم کرے گا۔ دو اور دو کو چار ثابت کرنے کے لیے کسی معجزے کی ضرورت نہیں بلکہ ریاضی کے ذرا سے فہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح دعوئ نبوت، خدا کی توحید، موت کے بعد زندگی اور یوم حساب وغیرہ پر ایمان لانے کے لیے معمولی فہم و دانش کے حامل انسان کے لیے بھی کسی معجزے کی ضرورت نہیں۔ نبیوں کے معجزے تاریخی حقائق ہیں مگر میرے ناقص فہم کے مطابق یہ معجزے ان نبیوں کی تعلیمات کی صداقت کا کوئی منطقی ثبوت نہیں ہیں، یہ تعلیمات ان معجزوں کے بغیر بھی سچی اور برحق ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ اس طرح کے معاملات میں قرآن نے لفظ "معجزہ" استعمال نہیں کیا بلکہ اسے "آیات" (نشانیاں، عظیم واقعات) قرار دیا ہے۔ (مصنف)

نام ہے محض جذباتیت نہیں کیونکہ قرآن ترقی یافتہ انسانیت کے لیے ہے۔ قدیم وحشی اور غیر مہذب انسانوں کے لیے نہیں جن کی عقل و دانش ابھی ابتدائی مراحل میں تھی اور وہ فطرت کے ان عظیم قوانین کو دریافت نہیں کر پائے تھے جو بعد میں روبہ عمل آئے، وہ تو صرف خواب میں ہی چاند پر جانے کا تصور کر سکتے تھے۔

۲۹۸۔ چنانچہ رسولؐ اللہ سے منسوب معجزے ان کی کتاب زندگی کے حاشیہ میں درج واقعات ہیں، ان کی زندگی کا نچوڑ تو ان کی تعلیمات ہیں۔

باب ۱۱

رسولِ اسلامؐ کی تعلیمات

۲۹۹ - ہندوستان کے ایک برہمن ماہر الٰہیات کے مطابق "معاشرے کا رسم و رواج بہترین قانون ثابت ہوتا ہے" چنانچہ مذہبی احکام میں کوئی تبدیلی جو عوام کے لیے قابلِ قبول ہو، خواہ یہ کسی ایک علاقے تک ہی محدود کیوں نہ ہو، مذہبی قانون کی خلاف ورزی متصور نہیں ہوگی۔ یہودیوں میں ربی (یہودی عالم) کی رائے کو زبور کے قوانین و احکام کے الفاظ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عیسائی تو اس سے بھی آگے چلے گئے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ پادریوں کا اجلاس روح القدس کے سائے میں منعقد ہوتا ہے۔ قبل ازیں منحرفین کو پادریوں کی کونسل سے نکال دیا جاتا تھا مگر اب (کسی معاملہ پر) محض کثرت رائے کو ہی کافی تصور کیا جاتا ہے اور پوری کونسل کا اتفاق رائے بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور یوں کسی بھی عقیدہ یا رواج کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

۳۰۰ - صرف اسلام ہی دین کی حرمت کو زبردست اہمیت دیتا ہے۔ دوسرے ادیان کے برعکس اسلام وہ واحد دین ہے جو بڑے فخر سے اعلان کر سکتا ہے کہ اس کے عقاید اور طریق عبادت کے ضمن میں دینی قوانین آج بھی وہی ہیں جو رسول اللہ کے زمانے میں تھے۔ انفرادی بھول چوک ممکن ہے مگر ایسا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا عمل عین اسلام ہے۔ اسلام میں بعض ایسے فرقے یقیناً موجود ہیں جنھوں نے ابھی تک زمانہ جاہلیت کے بعض رواج، خصوصاً وراثت کے بارے میں، سینے سے لگا رکھے ہیں تاہم وُہ رضاکارانہ طور پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا رواج اسلام کے مطابق نہیں ہے۔

۳۰۱ - ہم نے اُوپر دیکھا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی بنیادی دستاویزات خصوصاً قرآن نہایت قابلِ اعتماد ذرائع سے اپنی اصلی زبان اور اصلی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ جاننا نہایت سہل ہے کہ رسولِ اسلام نے کیا تعلیم دی ہے۔ اسلام کی ان تعلیمات کو کوئی شخص قبول یا مسترد تو کر سکتا ہے مگر وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات وہی ہیں جو محمد (صلعم) نے ودیعت کی ہیں۔

۳۰۲ - کسی علاقائی یا قومی مذہب اور آفاقی دین میں بڑا فرق ہے۔ پھر عارضی اور دائمی مذہب پر بُعد المشرقین ہوتا ہے۔ قرآن اور حدیث میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ محمد (صلعم) اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

۳۰۳ - مذہبی عقاید پر ایمان اور قوانین کی پابندی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ایک روح اور دوسرا جسم کے لیے ہے۔ قرآن اور حدیث نے ناگزیر اصول و قواعد بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جبکہ باقی انسان کی صوابدید اور استطاعت پر چھوڑ دیا ہے۔ اللہ پر ایمان ناگزیر ہے مگر ایک عام آدمی اور ایک فلاسفر کے ذہن میں خدا کا یکساں تصوّر ممکن

نہیں۔ خوش قسمتی سے خدا ہم پر ہماری استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جیسا کہ قرآن حکیم (۲/۲۸۶) میں آیا ہے۔

۳۰۴۔ ایک روز رسولِ خدا نے خود ہی اپنی تعلیمات کا خلاصہ بیان فرمایا۔ اس ضمن میں جو حدیث ہم تک پہنچی ہے وہ احادیث کی معتبر ترین کتب بخاری اور مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ اس حدیث کا ایک ایک لفظ قرآن پاک پر (۲/۲۸۵، ۴/۱۳۶) مبنی ہے۔ حدیثِ رسولؐ یہ ہے:

ایک روز ایک اعرابی نے رسولؐ اللہ سے دریافت کیا: "ایمان کیا ہے؟" رسولؐ نے جواب دیا: ایک اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یومِ حشر اور اس حقیقت پر ایمان کہ اچھائی یا برائی سب اللہ کی طرف سے ہے۔

پھر اس اجنبی نے پوچھا: "اسلام کیا ہے؟" رسولؐ اللہ نے جواب دیا: نماز قایم کرنا، رمضان میں روزے رکھنا، بشرطِ استطاعت حج کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔

اجنبی نے پھر سوال کیا: "احسان (ان سب عقاید کی زینت) کیا ہے؟ جواب ملا: تم اس طرح نماز ادا کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو خیر اتنا تو خیال رکھو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

جب یہ اجنبی چلا گیا تو رسولؐ اللہ نے حاضرین سے فرمایا: "دیکھو وہ کون ہے؟" مگر اجنبی تو غائب ہو چکا تھا۔ اس پر پیغمبرؐ نے کہا: وہ جبرائیل تھا جو تمھیں اسلام سکھانے آیا تھا۔

یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان عمارت کی مانند ہے جس کی چھت ہمارا ایمان ہے۔ یہ چھت چار ستونوں —— نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ —— پر قایم ہے۔ اس عمارت کی تزئین و آرائش اسلام کے عقاید اور طریقِ عبادت پر دل و جان سے عمل پیرا ہونا ہے۔

۳۰۵۔ حضورِ اکرمؐ کی تعلیمات کا دلفریب، قابلِ فہم اور منطقی خلاصہ یہ ہے: انسان کو اپنے خالق خدائے واحد پر ایمان رکھنا چاہیے اور اس کے احکامات کی پابندی کرنی چاہیے۔ وہ اعلیٰ و برتر اور ماورائے ادراک ہے۔ اس کے احکام ہم تک ایک فرشتہ اور پھر نبی کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ پھر یومِ قیامت ہے جو یومِ حساب بھی ہے۔ کوئی چیز بالذات اچھی یا بُری نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہے جو کسی چیز کو بُری اور کسی کو بھلی ٹھہراتا ہے۔

۳۰۶۔ اسلام کے نہایت سادہ عقیدے میں جو چیز دل کو لگتی ہے اور روحانی تحریک کا باعث بنتی ہے وہ اس دین کی آفاقیت اور تسلسل ہے جس میں تحمل اور رواداری رچی بسی ہے۔ اِسلام کا خدا اِس یا اُس خاندان کا "خدا" نہیں بلکہ وہ پوری دُنیا کا، پوری کائنات کا خدا ہے۔ مسلمان کے لیے تمام الہامی کتب پر ایمان ناگزیر ہے صرف ایک کتاب یعنی قرآن پر نہیں۔ اسے تمام رسولوں پر بھی ایمان کا اعلان کرنا پڑتا ہے محض محمدؐ رسول اللہ پر نہیں۔ حالانکہ اگر اسلام محض قرآن اور رسولؐ اللہ پر ایمان تک بھی محدود ہوتا تو اس کی معقولیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ لیکن نہیں! اسلام میں وسیع القلبی اور عالی ظرفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے جس کی ادیانِ عالم کی تاریخ میں

کوئی مثال نہیں ملتی۔ آدمؑ سے محمدؐ تک تمام انبیا جو کسی بھی زمانہ میں کسی بھی قوم یا نسل کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں اور تمام کتابیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی زبان میں کسی بھی پیغمبر پر نازل کی ہیں، سب اسلام کے انبیا اور اسلام کی کتابیں ہیں۔ قرآن بار بار فرماتا ہے کہ اللہ نے ہر دور میں تمام قوموں کے لیے انبیا مبعوث کیے ہیں۔ قرآن میں متعدد انبیا کے نام بھی آئے ہیں اور غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی پیغمبر بھیجے گئے ہیں۔

۳۰۷۔ یہ کہنے کی غالباً کوئی ضرورت نہیں کہ جب کوئی ایک قانون ساز ایک ہی موضوع پر بار بار قوانین کا نفاذ کرتا ہے تو سب سے آخر میں نافذ کیا جانے والا قانون ہی مؤثر تصور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سابق قانون سے ہی چمٹا رہے اور رائج الوقت قانون سے پہلوتہی کرے تو اسے قانون کا پابند شہری قرار نہیں دیا جا سکتا اگرچہ تمام قوانین ایک ہی قانون ساز نافذ کرتا ہے مگر ایک قانون دوسرے کی جگہ لیتا ہے اور بعد میں نافذ شدہ قانون ماقبل کو منسوخ کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مسلمان تمام الہامی کتب اور اللہ کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر وہ اللہ کی جدید ترین الہامی کتاب (قرآن) پر عمل کرتے ہیں۔

۳۰۸۔ عام لوگوں کی اطلاع اور موازنہ کے لیے مسیحی عقیدہ کا متن یہاں درج کرنا غالباً بے جا نہ ہوگا جو یہ ہے:

"میں[1] اعتقاد رکھتا ہوں قادرِ مطلق باپ پر جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور اس کے اکلوتے بیٹے ہمارے خداوند یسوع مسیح پر کہ وہ رُوح القدس سے مجسم ہو کر کنواری مریم سے پیدا ہوا۔ پُنطُس پلاطُس کی حکومت میں دُکھ اُٹھایا، صلیب پہ کھینچا گیا، مر گیا اور دفن ہوا۔ تیسرے دن مُردوں میں سے جی اُٹھا، آسمان پر چڑھ گیا اور خدا باپ قادرِ مطلق کے داہنے ہاتھ بیٹھا ہے، جہاں سے وہ زندوں اور مُردوں کے انصاف کرنے کو آئے گا۔ میں اعتقاد رکھتا ہوں رُوح القدس پر، پاک کلیسیائے عام پر، مقدسوں کی رفاقت، گناہوں کی معافی جسم کے جی اُٹھنے اور ہمیشہ کی زندگی پر۔ آمین"

۳۰۹۔ ہمارے دَور کے ان دو بڑے مذاہب کی دُعا کا معلوماتی موازنہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

رسولِ خدا نے فرمایا: سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بغیر کوئی نماز روا نہیں۔	پہاڑ پر اپنے وعظ میں حضرت عیسیٰؑ نے کہا: اور دعا کرتے وقت غیر قوموں (کفار) کے لوگوں کی طرح بک بک نہ کرو..... کیونکہ تمھارا باپ تمھارے مانگنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ تم کن کن چیزوں کے محتاج ہو پس تم اس طرح دعا کیا کرو، "اے ہمارے باپ تُو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے، تیری
سورہ فاتحہ یہ ہے:	
اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔	
سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا	

[1] مسیحی عقیدہ کے متن کا یہ اُردو ترجمہ پادری فلپ جان ایکٹن ڈائرکٹر لٹریچر متحدہ میتھوڈسٹ کلیسیائے پاکستان کی مرتب کردہ "عبادت کی کتاب" مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان' نہایت رحم والا ہے۔ یوم جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا، نہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے۔ آمین (القرآن ۱/۱-۷)

بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو بھی ہمارے قرض معاف کر' اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا کیونکہ بادشاہی، قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہیں۔ (متی ۶/۷-۱۳)

۰ ۳۱۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق "نیکی اور بدی کے تعین" پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔ کیا اس فارمولا کا تعلق قضا و قدر سے ہے؟ یہ یقینی نہیں۔ نیکی اور بدی کا تعین خدا کا معاملہ ہے۔ یہی اس کے لغوی معنی ہیں۔ اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ ایک ہی بات کسی کے لیے بُری اور کسی کے لیے اچھی ہو سکتی ہے۔ بھیڑیا خرگوش کو ہضم کر لیتا ہے، یہ ایک کے لیے غذا (لہٰذا بھلائی) ہے اور دوسرے کے لیے موت (برائی) ہے۔ کسی فیصلہ کن جنگ کا نتیجہ فاتح کے حق میں اچھا ہوتا ہے مگر شکست خوردہ فریق کے لیے تباہ کن (بُرائی) ثابت ہوتا ہے۔ قتل تک بھی ہمیشہ بُرائی نہیں ہوتا۔ کوئی ننھا بچہ کسی پر فائر کر دے، پاگل کسی کو گولی مار دے، کوئی شکاری پرندے پر فائر کرتے وقت کسی انسان کی جان لے لے، سرکاری جلاد مجرم کو گولی کا نشانہ بنا دے' کوئی سپاہی دورانِ جنگ دشمن کے سپاہی کا صفایا کر دے ——— ان مختلف افراد کی طرف سے کسی کی جان لینے میں کتنا فرق ہے! کس کے لیے کوئی کام اچھا ہے اور کس کے لیے وہی کام بُرا، عام سادہ معاملات میں تو عقل سلیم اور ضمیر کی رہنمائی کافی ہونی چاہیے مگر پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے معاملات میں' انسان کو یہ بات اللہ پر چھوڑ دینی چاہیے۔ کیا "نیکی اور بدی کا تعین خدا کا کام ہے" کے فارمولا کی رُوح یہی ہے؟ میں اس کی تصدیق کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آئیے ہر قاری کو خود ہی اس کا تعین کرنے دیں۔

۳۱۱۔ مگر میں "فعل مختاری" اور قضا و قدر کے مسئلہ پر چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔ ہر شخص پُوچھنا چاہتا ہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے ہر بات کا پہلے سے تعین کر رکھا ہے تو پھر مجھے سزا کس بات کی دی جائے گی؟" لیکن کوئی یہ پُوچھنے پر آمادہ نہیں کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے (قضا و قدر کے تحت) ہر بات کا تعین پہلے سے کر دیا ہے تو پھر مجھے نیکی کی جزا کیوں دی جائے گی"۔ دونوں صورتوں میں ہمارا عمل میکانکی ہوگا۔ رسولِ اسلام نے اس بحث کو سختی سے منع فرمایا ہے اور اس کی معقول وجوہ ہیں۔ درحقیقت یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ اگر ہم کہیں انسان فعل مختار ہے اور اپنے افعال کا ذمہ دار ہے تو اس سے یہ ملحدانہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت کامل نہیں، حالانکہ اس کی مرضی کے بغیر درخت کا پتہ تک نہیں ہلتا بھلا ہم اللہ کی مرضی اور رضا کے بغیر کوئی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اگر ہم کہیں کہ خدا قادرِ مطلق ہے اور ہم تمام کام اس کے پہلے سے متعین پروگرام کے مطابق کرتے ہیں تو انسانی منطق پہلو بدل کر سوال کرتی ہے: تو پھر مجھے کسی فعل کے لیے ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یا تو خدا قادرِ مطلق ہے یا پھر انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ تو نہیں ہو سکتیں۔ یہ وہ پیچیدہ صورتِ حال ہے۔

۳۱۲۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اسی ذہنی انتشار اور الجھاؤ سے بچنے کے لیے ہی رسولِ خدا نے جبر و قدر کے

مسئلہ پر بحث سختی سے منع کی ہے۔ آئیے ہم ایک بنیادی نکتہ پر غور کریں: خدا کا قادرِ مطلق ہونا ایک ملکوتی معاملہ ہے جبکہ انسان کا فعل مختار ہونا دنیاوی اور انسانی مسئلہ ہے۔ دونوں ایک ہی سطح پر نہیں، اس لیے ان میں تصادم کا بھی کوئی امکان نہیں، جس طرح زمین سورج کا تصادم خارج از امکان ہے حالانکہ دونوں ہی خلا میں محوِ سفر ہیں مگر ان کا مدار جُدا جدا ہے۔ کسی کو اس عقیدہ پر ذرا سا شبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارا خالق و مالک قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہمارے افعال کا پہلے سے تعین کرنے پر قادر رہے، اس کے باوجود ہم اپنے افعال کے لیے خود ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نے یومِ ازل کو یہ ذمہ داری رضاکارانہ طور پر قبول کی تھی۔ اُس روز اللہ تعالیٰ نے پیشکش کی مگر انسان کے سوا کسی نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا، جیسا کہ قرآن میں آتا ہے:

"ہم نے زمینوں اور آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے امانت پیش کی پھر انھوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے اٹھا لیا بیشک وہ بڑا بھول نے والا اور بڑا نادان تھا۔"
(۳۳/۷۲)

یہ کون سی امانت تھی انسان نے جس کا بار اٹھانا قبول کیا ماسوائے اس رضامندی کے کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری تقدیر میں لکھ دینا چاہیئے جو وہ پسند کرتا ہے اور جو اس کی رضا ہے۔ ہمیں اس کی رضا کو بلا چُون وچرا قبول کر لینا چاہیے اور وہ جو کچھ ہمیں دینا چاہتا ہے بخوشی قبول کرنا چاہیے۔ شکایت کا تو ذکر ہی کیا، کوئی وفادار غلام یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ آقا نے دُوسرے غلام کو کیا دیا ہے؟ اسے یہ کیوں دیا ہے؟ مجھے کیوں نہیں عطا کیا؟ اگر کوئی مصوّر کوئی تصویر بناتا ہے اور پھر اس میں ترامیم کر دیتا ہے یا اسے بالکل مٹا کر کوئی نئی چیز بنا دیتا ہے۔ کیا یہ ڈیزائن یا تصویر وغیرہ شکایت کا ذرا سا بھی حق رکھتے ہیں؟ کیا خدا کے سامنے ہم کسی فن کار کی تصویر سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں

۲۱۳۔ جبرائیل کی آمد کے ضمن میں حدیث کا دُوسرا حصہ عبادت کے بارے میں ہے۔ ہم نے رسولِ خدا کی سوانح کے بیان کے سلسلے میں کافی بحث کی ہے۔ اب اس بحث کو دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ تاہم آئیے ہم ایک عام غلط فہمی کو دور کریں۔ "احسان" جس کا ذکر رسول اللہ نے کیا ہے کہ یہ اسلام کی عظیم عمارت کی زینت ہے، یہ احسان عقیدہ کے سلسلے میں ہو یا عبادت کے سلسلے میں، اسے بسا اوقات تصوّف، سلوک اور طریقہ بھی کہتے ہیں۔ سائنس تو ایک علم ہے۔ اگر کسی کو پُورا علم نہ ہو مگر وہ سائنس دان ہونے کا دعویٰ کرے یا کسی کو سائنس پر عبور تو ہو مگر وہ اس کا بے جا اور غلط استعمال کرے، دونوں صورتوں میں سائنس (علم) کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ رسولِ پاک نے اسے نہایت مختصراً یُوں بیان فرمایا ہے: "خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا تصوّر راسخ کیجیے۔" خدا ہر جگہ موجود ہے، اگر کوئی اسے محسوس کر لے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ کے امین (پیغمبر) کو جھٹلانے کی جرأت کرے۔ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کے تصوّر کو راسخ کرنے کے بعض اصول اور طریقے ہیں۔ اللہ کی یاد میں محو ہونے کے علاوہ ایک بنیادی ضرورت سچ بولنا اور حلال کھانا بھی ہے جسے صوفیہ کی زبان میں "صادق المقال و اکل الحلال" کہا جاتا ہے۔ جہاں تک طریقوں کا تعلق ہے وہ ہر فرد کے لیے جُدا جُدا ہیں۔ احسان پر خانقاہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ احسان کسی خدا ترس بادشاہ کے تختِ شاہی پر بھی پایا جا سکتا ہے۔ بھلا خانقاہ کا باسی کون سا صوفی عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ پرہیزگار ہو سکتا ہے (جو اندلس سے چین تک

وسیع اسلامی سلطنت کے حکمران تھے) ہم خلفائے راشدین کا ذکر نہیں کرتے جنھوں نے نبیؐ کی نگرانی میں تربیت حاصل کی تھی۔ ایک دلچسپ مگر بامقصد کہانی ہے:

ایک روز کسی خانقاہ میں ایک درویش نے اپنے شیخ سے کہا،"کیا آپ سے بہتر کوئی ہستی ہے جس کی میں زیارت کرسکوں؟" شیخ نے اثبات میں جواب دیا اور درویش کو اُس ہستی کی طرف تعارفی خط دے کر بھیجا۔ جب درویش خط پر لکھے گئے پتہ پر پہنچا تو اس کی حیرت کی حد نہ رہی۔ شیخ کا مکتوب الیہ ایک بادشاہ تھا۔ درویش نے بادشاہ کو اپنے شیخ کا خط دیا۔ بادشاہ درویش کی الجھن کو پا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ دودھ کا ایک کٹورہ لایا جائے جو لبالب بھرا ہوا ہو۔ پھر اس نے یہ کٹورہ درویش کو تھماتے ہوئے کہا" لو اور اسے ہاتھ میں لے کر پُورے شہر کا چکّر لگاؤ مگر احتیاط رکھنا دُودھ کی ایک بُوند بھی گرنے نہ پائے۔" بادشاہ نے ایک سپاہی کو درویش کے ساتھ کر دیا اور اسے حکم دیا" اگر دُودھ کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرے تو فی الفور اس درویش کی گردن مار دینا۔" تھوڑی دیر بعد درویش دوبارہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے دریافت کیا:" کیا آپ نے ہمارے خوب صورت دارالحکومت کی سیر کی اور ان دنوں جو تقریبات اور میلے ٹھیلے منعقد ہو رہے ہیں ان سے حظ اٹھایا؟" درویش نے جواب دیا:" میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ سکا کیونکہ میری ساری توجہ دُودھ کے کٹورے پر مرکوز تھی۔" بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا" میرے لیے بادشاہت دودھ کا کٹورہ ہے۔ میں خوفِ خدا کی وجہ سے ایک لمحہ بھی اس کا لطف نہیں اٹھا سکتا۔"

اسلامی قوانین

۳۱۴۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایمان، عبادت اور احسان (تصوّف) اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہیں لیکن یہ دُنیاوی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے۔ چنانچہ دنیاوی زندگی کے مختلف پہلو اسلامی قوانین کے دائرہ میں آتے ہیں جسے ہم" فقہ" کہتے ہیں۔ فقہ نہ صرف عبادت کی تفصیل بیان کرتی ہے بلکہ اس میں باہم لین دین، جُرم وسزا، آئین ودستور، بین الاقوامی قوانین واصول، پرسنل لاز اور حقِ وراثت وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مسلم قانون میں مستور حکومت قابلِ غور ہے کیونکہ اسلامی قانون کی یہی حکمت ہے جس میں اس کے فروغ کے امکانات مضمر ہیں۔ قرآن نے قانون کو دو حصوں معروف (نیکی) اور مُنکر (برائی) میں تقسیم کیا ہے۔ نیکی ہر مسلمان پر فرض اور واجب ہے۔ جبکہ بدی سے مکمل پرہیز کا حکم دیا گیا ہے اور اسے قرآن کی زبان میں" حرام" قرار دیا گیا ہے۔ جن معاملات میں نیکی اور بدی کو ایک دوسرے سے جُدا کرنا ممکن نہ ہو، ان میں اگر نیکی غالب ہو تو ان پر عمل کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے، واجب نہیں ٹھہرایا گیا۔ اور اگر ایسے کاموں میں بدی غالب ہو تو اس سے گریز کی تلقین کی گئی ہے اور اسے مکروہ قرار دیا گیا ہے، حرام نہیں کہا گیا۔ اس کے علاوہ جو معاملات فرد کی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور انھیں مباح قرار دیا گیا ہے (یعنی فرد چاہے تو ایسے معاملات میں عمل کر سکتا ہے اور چاہے تو گریز اختیار کرسکتا ہے) قطب نما کی طرح اس میں بھی درمیانی درجے مقرر ہیں (جس طرح قطب نما میں چار سمتوں کے علاوہ شمال مشرق، شمال مغرب وغیرہ بھی ظاہر کیے جاتے ہیں) مثال کے طور پر مکروہ کے دو درجے مکروہ تنزیہی اور مکروہ تحریمی مقرر کیے گئے ہیں۔ (ان کی تفصیل ہمیں ہمارے اصل موضوع سے دُور لے جائے گی)

۳۱۵ - ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں فرائض کی تعداد محدود ہے۔ البتہ مستحب اور مکروہ نسبتاً زیادہ تعداد میں ہیں۔ تاہم یہ بھی لاتعداد نہیں ہیں۔ تمام معاملات میں ضمیر کو بہترین رہنما تصور کیا جاتا ہے ("خواہ ماہرِ قانون آپ کو (کسی کام کا) اختیار بھی دے، اپنے ضمیر سے ضرور مشورہ کیجئے" یہ رسولؐ اللہ کا فرمان ہے) ایک اور معروف حدیث میں ہم اسلامی قانون کے فروغ کی نہایت ابتدا دیکھتے ہیں، معاذؓ ابن جبل کو جب گورنر کے عہدے پر فائز کیا گیا تو وہ روانگی سے قبل رسولؐ اللہ سے الوداعی ملاقات کے لیے آئے۔ اس موقع پر اُن کے اور نبیؐ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

"معاذ! جب کوئی مسئلہ تمھارے پیش ہوگا تو تم اس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟"

"یا رسول اللہ! میں اللہ کی کتاب (قرآن) کو سامنے رکھوں گا۔"

"اور اگر کتاب اللہ میں اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہ دیا گیا ہو تو؟" حضورؐ نے پھر پوچھا

"تو پھر میں اللہ کے نبیؐ کی سنّت سے رجوع کروں گا۔" معاذؓ نے جواب دیا

"لیکن اگر سنّت بھی اس معاملے میں خاموش ہو تو؟"

"تو پھر میں اپنی رائے دُوں گا۔" معاذؓ بن جبل نے ادب سے کہا

"تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے پیغمبرؐ کے ایلچی کو اس امر کی طرف ہدایت فرمائی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔" رسولؐ اللہ نے بے ساختہ کہا

ظاہر ہے اس صورتِ حال میں اسلامی قوانین نہ صرف بنیادی طور پر مستحکم ثابت ہوں گے بلکہ ان میں مطابقت پذیری کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہوگی۔

۳۱۶ - کسی فرد کی رائے کو کسی دُوسرے فرد کی بہتر رائے سے بدلا جا سکتا ہے، مگر قوم (یا کسی گروہ) کی متفقہ رائے فرد کی رائے سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ تاہم انسانوں کی متفقہ رائے کو بھی خطا سے پاک اور دائمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ماہرینِ فقہ تسلیم کرتے ہیں ایک اجماع (متفقہ رائے) دوسرے اجماع کے ذریعے منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی اصول کارفرما ہے کہ جو مجاز اتھارٹی کوئی قاعدہ نافذ کرتی ہے وہ یا اس سے بالائی مجاز اتھارٹی اس قاعدے پر خطِ تنسیخ بھی پھیر سکتی ہے۔ اس طرح قرآن پاک کے الفاظ ایک اور وحی کے ذریعے تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص قرآن میں تنسیخ و ترمیم کا ہرگز مجاز نہیں۔ اسی طرح حدیث (رسولؐ کا کلام) میں صرف رسولؐ یا اللہ تعالیٰ کے احکام سے ردّ و بدل ممکن ہے، علما کی رائے سے قرآن یا حدیث میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ البتہ ایک عالم کی رائے (فتویٰ) دوسرے عالم کی رائے کی جگہ لے سکتی ہے، کیونکہ تمام مسلمان مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ تاہم اس حقیقت کی نفی ممکن نہیں کہ عوام کی نظروں میں علما کے بھی درجے ہوتے ہیں، کیونکہ تمام افراد کو اللہ تعالیٰ نے یکساں صلاحیتوں سے نہیں نوازا۔

۳۱۷ - عامتہ المسلمین کے زیادہ فائدہ کی خاطر مماثلات سے استنباط وغیرہ ایسے طریقے ہیں جن سے رسولؐ اللہ کے بعد نہ صرف اسلامی قانون کو فروغ نصیب ہوا ہے بلکہ اس کی یہ لچک بھی قائم رہی ہے کہ: قانون انسان کے لیے ہے؛

انسان قانون کے لیے نہیں۔

نکتہ چینی ۳۱۸۔ ہمارے اور رسولِ خدا کے دور میں چودہ سو سال کا فصل ہے۔ موجودہ دور میں زندگی یکسر بدل چکی ہے۔ کیا چودہ سو سال پُرانے قوانین وضوابط اب بھی بنی نوع انسان کی رہنمائی کے قابل ہیں؟ اس ضمن میں امریکہ کے ایک مشنری کی کتاب ("اسلام فہمی کی طرف" از ایچ۔ جی۔ ڈورمن) کو ایک غیر جانبدارانہ رائے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

اسلامی ضابطہ اخلاق میں طلاق اور تعدّدِ ازدواج کے سوا کوئی بات قابلِ گرفت معلوم نہیں ہوتی (میں نکتہ چینیوں کی خاطر اس میں تصوّرِ جہاد اور چوری کی سزا (قطعِ ید) کو بھی شامل کر لیتا ہوں)۔

چونکہ ایک غیر مسلم کو بھی اسلامی اخلاقیات میں کوئی دُوسری قابلِ گرفت بات نظر نہیں آتی۔ آیئے ہم ان اصولوں (جو قابلِ گرفت گردانے گئے ہیں) پر غور کریں:

اگر دوسری شادی ممنوع قرار دے دی جائے اور طلاق کا امکان نہ ہو تو بسا اوقات گھر جہنّم کا نمونہ بن سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت عیسٰی مسیحؑ کی طرف سے انجیل میں طلاق کی قطعی ممانعت کے باوجود پوری مسیحی دنیا میں پارلیمانی قوانین کے تحت طلاق کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اسلام نے اس سماجی ضرورت کو روزِ اوّل سے ہی محسوس کر لیا تھا مگر عیسائیت کو اسے سمجھنے میں پورے دو ہزار سال لگ گئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسلام میں طلاق "اللہ کی نظر میں مباح چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔" جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ پھر طلاق کی اجازت کے باوجود مسلمانوں میں طلاق کے واقعات کوئی زیادہ نہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ مہر بھی ہے جو شادی کے وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بغیر شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ مہر بیوی کی ملکیت ہوتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی صورت میں شوہر مہر ادا کرنے کا پابند ہے۔

۳۱۹۔ اب تعدّدِ ازدواج کو لیجئے۔ دُنیا کے کسی مذہب حتّٰی کہ عیسائیت میں بھی تعدّدِ ازدواج کی ممانعت نہیں کی گئی۔ انجیل مقدس کے مطابق حضرت سلیمانؑ کی ایک ہزار بیویاں (۷۰۰ بیویاں اور ۳۰۰ کنیزیں) تھیں۔ حضرت داؤدؑ ایک سو بیویوں کے شوہر تھے۔ ابراہیمؑ، موسٰیؑ اور انسانی تاریخ کے دوسرے تمام برگزیدہ افراد ایک سے زیادہ بیویوں کے شوہر تھے۔ اسلام درحقیقت وہ پہلا دین ہے جس نے:

۱۔ تعدّدِ ازدواج کی تحدید کی ہے (جو چار ہے)

۲۔ خُلع کا حق تسلیم کیا ہے۔

اسلام کے مطابق شادی زندگی میں کیے جانے والے دوسرے معاہدوں کی مانند ایک معاہدہ ہے اور اس کے جاری رہنے کا انحصار فریقین کی رضامندی پر ہے۔ اس معاہدہ میں حق مہر ہی نہیں بلکہ عائلی زندگی کے دُوسرے پہلو بھی شامل ہیں۔ چنانچہ یک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی) کی شرط شادی کی شرائط میں عین قانون کے مطابق ہے: کوئی خاتون شادی کے وقت یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ شادی کے بندھن کے دوران دوسری شادی نہیں کرے گا۔

اگر دُولھا یہ شرط قبول کرلے تو پھر اسے اپنے وعدے پر پورا اترنا ہوگا لیکن اگر دُولھا یہ شرط قبول نہ کرے اور دُولھن اسی پر مُصر ہو تو ان کی شادی جائز نہیں۔ اس سلسلے میں خاندانِ عباسیہ کے خلیفہ المنصور کا قصہ تاریخ میں بے حد مشہور ہے۔ خلیفہ المنصور نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شادی کے وقت دوسری شادی نہ کرنے کی شرط منظور کی تھی۔ چنانچہ اس کے دور کا کوئی فقیہ اس شرط کو غیر قانونی یا غیر اسلامی قرار دینے کا فتوٰی جاری نہ کر سکا۔

۳۲۰۔ اسلام میں جہاد کے تصور کو دشمنانِ اسلام نے توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔"

ہم کسی کو اسلام قبول کرنے پر بذریعہ طاقت مجبور نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی کسی ملک کے خلاف صرف اس لیے اعلانِ جنگ کیا جا سکتا ہے کہ اسے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآنی احکام واضح اور غیر مبہم ہیں۔ (۲/۱۹۰-۱)

"اور اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ اور انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے ۔۔۔۔"

گویا جہاد کے لیے دو پیشگی شرائط عاید کی گئی ہیں۔ جہاد صرف اللہ کی راہ میں کیا جانا چاہیے ۔۔۔۔ اور یہ ان کے خلاف ہونا چاہیے جو (مسلمانوں پر) حملہ کریں۔ گویا مسلمانوں کے لیے دوسروں کے خلاف جنگ محض دفاعی کارروائی ہو سکتی ہے۔ پیغمبرِ خدا کی زندگی میں دفاع کے سوا کسی دوسری نوع کی جنگ کا وجود نہیں ملتا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ رسولِ خدا نے جو لڑائیاں لڑیں وہ خونریزی سے کیسے پاک اور انسانی ہمدردی کے مظاہرہ سے پُر تھیں۔ تیس لاکھ مربع کلومیٹر علاقہ کی فتح کے دوران دشمنوں کے تین سو سے بھی کم افراد ہلاک کیے گئے۔ خلفائے راشدین نے بھی تین براعظموں کو اسلامی مملکت کے دائرہ میں شامل کیا اور وُہ بھی رسولِ خدا کے نقشِ قدم پر ہی چلتے رہے۔

۳۲۱۔ جہاں تک اسلام کے تعزیری قوانین کا تعلق ہے میں شراب کی خرابیوں کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن کوڑوں کی سزا کے آغاز کے ساتھ ہی اس بُرائی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ قتلِ عمد کے لیے موت کی سزا دی گئی ہے مگر اس پر عمل کرنا فرض نہیں۔ ملزم کو یہ سہولت حاصل ہے کہ اگر مقتول کے وارث مان جائیں تو وہ دیت ادا کر کے سزا سے بچ سکتا ہے۔ زانی کی سزا سنگساری ہے مگر اس سزا پر عمل صرف ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ چار چشم دید گواہ موجود ہوں جنھوں نے ملزم کو یہ فعل بد کرتے دیکھا ہو۔ اگر عینی شاہد موجود نہ ہوں عدالت ملزم کو سزا دے ہی نہیں سکتی۔ (انجیل کے عہد نامہ قدیم میں بھی اسی نوع کی سزا مقرر کی گئی ہے) رہ گئی چوری جس کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکوں نے حجاز خالی کر دیا تو شریف حسین کی بادشاہت کے دوران کوئی حاجی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس گھر جا سکے گا۔ بعض عربوں نے جنھوں نے ترکوں اور پھر شریف حسین کا دور دیکھا ہے مجھے بتایا کہ شریف حسین تو ڈاکوؤں سے لوٹ مار کے مال کا حصہ وصول کرنے سے بھی نہیں چُوکتا تھا۔ جب ابنِ سعود نے شریف حسین کی فاسد حکومت کا خاتمہ کیا تو اس نے اسلام کے تعزیری قوانین نافذ کر دیے۔ میں نے مکّہ کے اخبارات و رسائل میں پڑھا ہے کہ چند افراد کو قطعِ ید کی سزا ملنے کے بعد پُوری سلطنت سعودی میں کئی کئی ماہ تک چوری کی کوئی واردات

نہیں ہوتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں خود میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ میں اونٹوں کے ایک قافلہ کی معیت میں مکّہ سے مدینہ جا رہا تھا، ایک پڑاؤ پر پہنچ کر قافلے میں شامل ایک خاتون نے شکایت کی کہ اس کا سُوٹ کیس کھو گیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ درج کرلیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس کی پُوری پوری تفتیش کریں گے۔ تین ہفتے بعد ہم مدینہ سے واپس مکّہ جاتے ہُوئے جب اُسی جگہ سے گزرے تو پولیس افسر نے پُوچھا سُوٹ کیس میں موجود اشیا کی مالیت کیا تھی؟ ہم چور پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکے آپ اپنے سامان کی قیمت وصول کرلیں۔ یہ رقم حکومت نے آپ کے نقصان کے عوض دی ہے۔ اس بات پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے کہ آیا کوئی سخت قانون جس کے نفاذ کی ضرورت شاذ ہی پیش آتے اس نرم قانون سے بہتر ہے یا نہیں جو برائی (جرم) کے استیصال میں ناکام رہے۔ یہ نہیں بھُولنا چاہیے کہ اسلام میں سزا کے دو مواقع ہیں۔ اگر کوئی مُجرم عدمِ شہادت کی بنا پر دنیاوی حکومت کے ہاتھوں سزا سے بچ بھی جائے تو روزِ حشر اپنے کیے کی سزا بھگتنا ہوگی، اور عام حالات میں آخرت میں سزا کا تصوّر نہایت موثر ثابت ہوتا ہے۔ حکومتوں کو اُخروی سزا کا خوف لوگوں کو دلانا چاہیے جو پولیس اور تعزیراتی قوانین سے بہرحال زیادہ موثر تحذیر ہے۔

باب ۱۲

رسولؐ کی عائلی زندگی

۳۲۲ - ہم نے محمد (صلعم) کو عوامی زندگی میں اللہ کے ایک رسولؐ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح انھوں نے ایک دین کی بنیاد رکھی تاکہ اللہ نے انھیں جو فرض سونپا ہے اسے پورا کر سکیں اور اللہ کا پیغام جو ان پر نازل ہوا ہے لوگوں تک موثر طور پر پہنچا سکیں - ہم نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ رسولِ خدا نے کس طرح ایک ریاست (مملکت) کی بنیاد رکھی جو ان کی منزل یا مقصد نہ تھی بلکہ وہ ان کے الُوہی مشن کی تکمیل اور ان کی قایم کردہ تنظیم (دین اسلام) کی بقا و فروغ کا ایک ذریعہ تھی - اب ہم رسولِ خدا کی نجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں - وہ کس طرح عبادت کرتے تھے، روزے کیسے رکھتے تھے، اہلِ بیت اور اپنے بچوں سے کس طرح پیش آتے تھے، اپنے مہمانوں، ملازموں اور غلاموں سے ان کا سلوک کیسا تھا اور وہ اپنے گھر میں کیسے رہتے تھے -

اللہ سے معاملہ

۳۲۳ - اُمت کے سربراہ ہونے کے ناطے یہ ان کا قطعی اختیار اور حق تھا کہ وہ امامت کے فرائض انجام دیں اور نماز باجماعت ادا کرائیں - اگر وہ دوسروں کو دن میں پانچ وقت نماز ادا کرنے کا حکم دیتے تھے تو انھوں نے کئی سنّت اور نفل نمازیں خود پر واجب کر رکھی تھیں جو وہ اپنے گھر میں ہی ادا کرتے تھے - ان کی اس عادت کا بھی سبب تھا - پیغمبر کا عمل مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے اور رسولِ خدا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے اُمتیوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالیں - اگر وہ نوافل بھی مسجد میں ادا کرتے تو مسلمان سمجھتے کہ یہ نوافل بھی نماز کا ناگزیر حصّہ ہیں - اس سے دین پر عمل مشکل ہو جاتا اور اُمّت کی مادی زندگی کو نقصان پہنچتا - مزید برآں گھر میں نوافل کی ادائیگی نمود و نمائش سے بھی مبرا تھی، گویا یہ صرف خدا اور اس کے بندے کا معاملہ تھا جو ان دونوں کے درمیان ہی رہا - جیسا کہ قرآن پاک میں آیا ہے - تہجّد رسولؐ کی ذات پر فرض ہے - اور اس فرض کا اطلاق دوسرے مسلمانوں پر نہیں ہوتا - نمازِ عشا کے بعد رسولؐ اللہ کچھ آرام فرماتے اور پھر تہجد کے لیے اُٹھ جاتے بسا اوقات وہ نوافل میں اتنی دیر اقامت کرتے کہ اُن کی ٹانگیں متورم ہو جاتیں - وہ عام سربراہانِ مملکت کی طرح عیش و آرام سے بہت دُور رہتے تھے بلکہ وہ صحیح معنوں میں نفس کشی اور ترکِ دُنیا کا نمونہ تھے - وہ اپنے اہلِ بیت کے تمام حقوق پورے کرتے تھے مگر کسی بھی اور نفس سے زیادہ ان کی لَو اللہ سے لگی ہوئی تھی وہ صحیح معنوں میں اللہ کے بندے تھے -

۳۲۴ - رسولِ خدا نے اپنے اُمتیوں کو ہر سال رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھنے کا حکم دیا - مگر وہ خود رمضان کے دنوں کے علاوہ بھی اکثر روزے سے ہوتے تھے - وہ ہر پیر اور جمعرات کے علاوہ ہر قمری مہینہ کی ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کو بھی روزہ رکھتے تھے (غیر مسلموں میں روزہ کا صحیح تصوّر نہیں پایا جاتا - عام آدمی ہی نہیں عیسائی پادری اور راہبوں کو بھی پوپ نے بتایا ہے کہ روزہ محض خیالی عمل ہے اور ترکِ خوراک سے اس کا کوئی تعلق نہیں - حال ہی میں ہمبرگ کے ایک پادری نے میرے سوال پر

مجھے بتایا کہ مسیحی روزہ کا مطلب ہلکا سا ناشتا، پیٹ بھر کر ظہرانہ اور ہلکا سا عشائیہ ہے۔ مگر مسلمانوں کے نزدیک روزہ کا مطلب ہے صبح صادق سے شام تک کھانے پینے، تمباکو نوشی اور متعدد دوسری باتوں سے مکمل پرہیز۔ خواہ شدید گرمی ہو یا شدید سردی، اس عمل میں کوئی کمی بیشی ممکن نہیں۔ معترضین کہہ سکتے ہیں کہ روزہ مضرِ صحت ہے۔ درخت سردیوں میں روزہ رکھتے ہیں، انھیں پانی نہیں دیا جاتا اور ان کے پتے گر جاتے ہیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو وہ پتوں، پھولوں اور پھلوں سے لد جاتے ہیں۔ جنگلی پرندے اور درندے بھی سخت سردی میں روزہ (سوئے رہتے ہیں) رکھتے ہیں، وہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور جب بہار کا گجر بجتا ہے تو وہ نئے دلکش پروں اور نئی جلد کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ نئی قوت سے دوبارہ زندگی شروع کرتے ہیں اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ جو روزہ نہیں رکھتے ان کی صحت عموماً کچھ اچھی نہیں ہوتی۔ نپولین بڑی حسرت سے کہا کرتا تھا: اگر میری فوج میں تُرک (مسلمان) ہوتے تو میں چٹکی بجاتے پوری دنیا فتح کر لیتا کیونکہ تُرک کھانا پینا ترک بھی کر دیتے ہیں مگر ان کی جنگی صلاحیت متاثر نہیں ہوتی) رسولِ خدا سال کے متعدد دوسرے دنوں میں بھی روزہ رکھتے تھے۔ مگر ہمیشہ ایک ہی دن کا انتخاب نہیں کرتے تھے۔

۳۲۵۔ رسول اللہؐ اپنے پیرو کاروں کو اپنی بچت اور بے کار پڑی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ مگر وہ خود اتنے سخی تھے کہ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔ جب آنحضرتؐ کا وصال ہوا ان کے گھر میں کوئی درہم و دینار نہ تھا۔

ملازم اور غلام

۳۲۶۔ اسلام نے (شروع میں) انجیل کی طرح غلامی کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن انجیل میں تو غلاموں کو آزاد کرنے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں جبکہ اسلام نے عملی طور پر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب ہم اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ اس وقت جبکہ دنیا بھر میں غلامی کا رواج تھا دشمن مسلمانوں کو بھی غلام بنا کر فروخت کر سکتے تھے۔ غلامی کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ نبیؐ نے حکم دیا: دشمن کا کوئی بھی غلام جو مسلمانوں سے پناہ طلب کرے اور مسلمانوں کی پناہ میں آجائے خود بخود آزاد تصور ہوگا۔ جس لونڈی کے بطن سے کوئی بچہ پیدا ہو، اس کے مالک کی وفات پر وہ لونڈی از خود آزاد ہو جائے گی تاآنکہ لونڈی کا مالک اس سے قبل ہی اسے آزاد نہ کر چکا ہو۔ قرآن کریم میں (۹۰/ ۱۱) آیا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنا بہترین خیرات ہے۔ پھر مختلف گناہوں کے لیے مثلاً اتفاقی قتل (۴/۹۲) مجبوراً حلف شکنی (۵/ ۸۹) اور طلاق جس میں شوہر نے بیوی کو اپنی ماں کے برابر قرار دے دیا ہو (۵۸/ ۳) غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا گیا ہے۔ مزید برآں اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ (۹/ ۶۰) اپنے سالانہ بجٹ میں معقول رقم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کے لیے مختص کرے۔ اسلام میں غلام کے لیے یہ سہولت (۲۴/ ۳۳) بھی رکھی گئی ہے کہ وہ خود مالک کو اپنی قیمت ادا کر کے آزادی حاصل کر سکے۔ وہ رقم کے حصول کے لیے کسی جگہ ملازمت کر سکتا ہے اور ملازمت کے اوقات میں مالک کے لیے کام کرنا اس پر فرض نہیں۔ قرآن حکیم کے مطابق (۴۷/ ۴) جنگی قیدی ——— جو نئے غلاموں کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تھا ——— فدیہ لے کر یا صلہ رحمی کے طور پر رہا کرنا ضروری ہیں[1]۔ امام سرخسی نے ایک حدیث نقل کی ہے:

[1] بظاہر متعلقہ پیراگراف کا یہی مطلب ہے۔ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد ۱، ۳۵۱ (تدوین مصطفےٰ البابی قاہرہ) (باقی برصفحہ آیندہ)

"عرب غلام کے بغیر عرب نہیں ہوتا"۔[1]

کوئی غلام اسلام قبول کر سکتا ہے اور کسی آزاد مسلمان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا خواہ اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار ہی کیوں نہ کر لیا جائے۔ (اسلام کا یہ قانون انجیل کے قانون کے بالکل برعکس ہے، انجیل کے مطابق ایک یہودی دوسرے یہودی کو غلام بنا سکتا ہے)

۳۲۷۔ غلامی کا فائدہ صرف یہ تھا کہ جنگوں میں گرفتار ہونے والے جو افراد بے یار و مددگار رہ جاتے تھے، انھیں رہنے کا ٹھکانہ میسر آجاتا تھا۔ انھیں اچھا ماحول میسر آتا وہ دوسری قوم کی ثقافت سے بہرہ ور ہوتے اور بہتر انسان بن کر معاشرے کا مفید تر رکن ثابت ہو سکتے تھے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں آزاد شدہ غلام اور پیدائشی آزاد شہری میں کوئی تفریق نہیں تاریخ اسلام میں آزاد شدہ غلام فرمانروا گزرے ہیں اور انھوں نے شاہی خاندانوں کی بنیاد رکھی ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں مملوکوں اور ہندوستان میں خاندان غلاماں کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔

۳۲۸۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اسلام کے قانون کے پیشِ نظر رسولِ خدا کے پاس جب بھی کوئی غلام ——— بطور تحفہ یا بطور مالِ غنیمت ——— آتا، وہ اس وقت اسے آزاد کر دیتے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اگر کسی لونڈی کے ہاں اس کے مالک کے نطفے سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ مالک کی وفات پر خود بخود آزاد تصور ہو گی۔ پھر مالک کو صاحبِ اولاد لونڈی کو فروخت کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے اور لونڈی کو مالک کے گھر اس کی منکوحہ بیوی کی طرح کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں لکھا ہے کہ صحابۂ رسولؐ کے درمیان اسی بات پر اتفاق رائے تھا کہ جنگی قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جانا چاہیے۔ گو اس سے قبل نازل ہونے والی ایک آیت ۳۳/۵۰ میں جنگ کے دوران قیدی بنائے جانے والی عورتوں کو لونڈی بنانے کی اجازت دی گئی ہے۔ ان دونوں آیات میں مطابقت کے لیے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ آیت ۴۷/۴ میں جو ہدایت فرمائی گئی ہے وہ "متبادل" ہے، خصوصی نہیں یا دوسری آیت کے حکم کی تنسیخ نہیں کرتی۔ چونکہ خود رسولِ خدا نے بھی ۵ھ میں بنو المصطلق کے لوگوں کو غلام بنایا تھا (دیکھیے ابنِ ہشام ص ۷۲۹) بلکہ ۸ھ میں بنو ہوازن (ابن ہشام ص ۸۷۷) اور ۹ھ کے اواخر میں بنو العنبر کے لوگوں کو غلام بنایا گیا تھا (ابن ہشام ص ۹۸۳) تاہم بعد میں یہ تمام غلام آزاد کر دیے گئے تھے۔

[1] مبسوط × ۴۰ اور ۱۱۸۔ شرح السیر الکبیر II ۲۶۵، ۲۶۹ (طبع حیدر آباد) اوپر بنو ہوازن کے لوگوں کو غلام بنائے جانے کے بارے میں حوالہ جنگِ حُنین کے سلسلے میں ہے۔ یہ جنگ ۸ھ میں طائف کے علاقہ میں ہوئی تھی۔ یہاں رسولِ خدا نے غیر مبہم الفاظ میں حکم دیا تھا کہ دشمن قبیلے کی چھاؤنی میں موجود عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور انھیں اسلامی فوج میں بطور مالِ غنیمت تقسیم کر دیا جائے۔ تاہم جب بنو ہوازن کے شکست خوردہ قبیلے کے معززین کا ایک وفد آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اپنے فعل پر اظہارِ ندامت کیا اور اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہؐ کی سفارش پر غلام بنائے جانے والے تمام افراد کو رہا کر دیا گیا تھا۔ اس سے نومسلم بنو ہوازن کا ایمان مستحکم کرنے میں بڑی مدد ملی۔

البتہ وہ مالک کے ترکہ میں حصہ دار نہ ہوگی۔ ان احکام کو عملی طور پر مستحکم کرنے کے لیے رسولِ خدا نے مصری سردار مقوقس کی طرف سے بطور تحفہ بھیجی جانے والی لونڈی ماریہ کو گھر میں ہی رکھا اور بعد میں وہ پیغمبر کے بیٹے ابراہیم کی ماں بنی جو دو سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے امام الزہری کے مطابق رسول اللہ نے نہ صرف یہ کہ ماریہ کی آزادی کا حکم دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ "اگر ابراہیم زندہ رہتے تو میں تمام قبطی عیسائیوں کو جزیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیتا۔"

ازواجِ مطہرات

۳۲۹۔ قرآن حکیم (۶/۳۳ اور ۵۳) نے نبی کی ازواجِ مطہرات کو اُمّ المومنین قرار دیا ہے نبی کے بعد کوئی مسلمان ان سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ تو اس کی مائیں ہیں۔ کسی مسلم خاتون کی کیا شان ہے، وہ نبی کی زوجہ ہو تو تمام مسلمانوں کی ماں ہوتی ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ خواتین رسولِ خدا کے عقد میں آنے کی خواہشمند رہتی تھیں۔ میں نے یورپ کی متعدد فیشن ایبل مگر مذہبی خیالات کی حامل عیسائی دوشیزاؤں سے دریافت کیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ مسیح دوبارہ دنیا میں آجائیں اور وہ ایک سے زاید بیویوں کی موجودگی میں تم سے نکاح کرنا چاہیں تو کیا تم انکار کر دو گی؟ ایک بھی مسیحی دوشیزہ نے اس کا نفی میں جواب نہیں دیا۔

۳۳۰۔ رسولِ خدا نے متعدد مواقع پر فرمایا: مجھے بیوی کی ضرورت نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے عائلی زندگی کا بار اٹھا کر بڑی قربانی دی ہے۔ لیکن انھیں تو اُمت کے لیے ایک سے زاید بیویوں سے نکاح کی صورت میں مثالی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا تھا۔ ایک بیوی کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر غیر معمولی حالات میں بھی تعددِ ازواج کو برداشت کیا گیا ہے تو اس سے رسولِ خدا عملی طور پر بتانا چاہتے تھے کہ ایک سے زاید بیویوں سے کس طرح سلوک کیا جانا چاہیے۔ وہ خواتین کو بھی یہ سکھانا چاہتے تھے کہ تعددِ ازواج کی صورت میں شوہر سے اور ایک دوسری سے ان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

۳۳۱۔ قرونِ اول میں بھی کسی پیغمبر نے تعددِ ازواج کی ممانعت نہیں کی اور نہ ہی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد مقرر کی ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں بھی یہی رواج تھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے قرآن آیات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نازل ہوا ہے اور بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی حد کے بارے میں قرآنی حکم اس وقت آیا تھا جب رسولِ خدا نے آخری بار شادی کی ہے۔ عام طور پر قانون موثر بہ ماضی نہیں ہوتے۔ مگر جونہی یہ حکم آیا رسولِ خدا نے ایسے مسلمانوں کو جن کی چار سے زاید بیویاں تھیں حکم دیا کہ وہ زاید بیویوں کو طلاق دے دیں۔ اس وقت رسولِ خدا کی نو بیویاں تھیں۔ مگر انھوں نے اس قانون پر خود کیوں عمل نہ کیا؟ بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے: رسولِ خدا نے درج ذیل انداز میں اس حکم پر عمل کیا تھا۔

۳۳۲۔ رسولِ خدا نے اپنی تمام بیویوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں تعددِ ازواج کے سلسلے میں قرآن کے نئے حکم سے آگاہ کیا۔ رسولِ خدا نے اپنی تمام ازواج سے کہا: مجھے تم میں سے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا تم سب کا کام ہے کہ تم میں سے کون طلاق حاصل کرنا پسند کرتی ہے اور کون میری اہلیہ کے طور پر زندگی بسر کرنا

چاہتی ہے۔ بھلا کونسی مُسلم خاتون نبی کی زوجہ ہونے کے شرف کو کھونا چاہتی فطری طور پر کوئی بھی طلاق حاصل کرنا اور مطلقہ کی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ احکامِ خداوندی کی بنیاد پر رسولؐ اللہ نے انھیں بتایا : میں تم سب کو اپنی بیوی کی طرح رکھنے کو تیار ہوں مگر ایک شرط پر کہ میں ازدواجی تعلقات صرف چار سے رکھوں گا۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ رسولؐ خدا نے آیت کے الفاظ کی تعبیر اس طرح کی جیسا کہ قرآن بتاتا ہے (۵۱/۳۳) کہ "ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمزدہ نہ ہوں"۔ دراصل نبیؐ جن چار بیویوں سے ازدواجی تعلقات رکھتے تھے ان میں وہ ردّ و بدل کرتے رہتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پہلی چار کی جگہ دُوسری چار لے لیتی تھیں۔ لیکن قرآنی آیات کی یہ تفسیر و تعبیر اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی۔ چنانچہ اللہ کی طرف سے اگلی آیت نازل ہُوئی (۵۲/۳۳) کہ" اس کے بعد آپ کے لیے عورتیں حلال نہیں، اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور عورتیں تبدیل کریں، اگرچہ آپ کو ان کا حُسن پسند آئے اِلّا جو آپ کی مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے"۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود رسولؐ کی ذات شادی کے معاملہ میں بھی قانون سے بالاتر نہیں۔

۴۳۳۔ کئی باتیں ایسی ہیں جو کوئی خاتون مارے شرم کے کسی مرد سے پُوچھ نہیں سکتی۔ وہ کسی دوسری عورت سے وہی سوال آسانی سے کرسکتی ہے۔ چنانچہ مسلم معاشرہ میں پڑھی لکھی خاتون کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ بھلا رسولِ خُدا کی ازواجِ مطہرات سے زیادہ عالِم کون سی خاتون ہوسکتی تھی جو ہر وقت اللہ کے نبی کے ساتھ رہتی تھیں اور انہی سے (اسلام کے اصول و قوانین) سیکھتی تھیں۔ اگر رسولؐ کی صرف ایک زوجہ مطہرہ ہوتیں تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ طویل عمر پاتیں۔ کسی شخص کی جتنی زیادہ بیویاں ہوں گی اتنا ہی یہ امکان بھی زیادہ ہوگا کہ ان بیویوں میں سے بعض زیادہ عرصہ زندہ رہیں گی۔ رسولؐ کی جتنی احادیث پیغمبر کی ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں، اور جتنے فتوے اُنھوں نے دیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات کتنی ذہین اور عقل سلیم کی مالک تھیں۔ پھر اُنھوں نے پاکیزہ اور انسانی ہمدردی سے پُر زندگی کی عملی مثالیں پیش کی ہیں۔

۴۳۴۔ رسولؐ اللہ کی ایک اور ضرورت اسلام کا استحکام اور اہم افراد سے پائیدار دوستی تھی۔ کسی طاقتور قبیلہ کے سردار کی بیٹی سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے والا یقیناً نفع میں رہتا ہے اور رسولِ خدا کے معاملہ میں ایسی شادی کا مقصد ذاتی جاہ و اقتدار نہیں تھا بلکہ اللہ کی خاطر اور اسلام کا مفاد مقصود تھا۔

۴۳۵۔ بعض اور مفاد بھی تھے جن کا ذکر ہم ازواجِ مطہرات کے مختصر سوانح میں کریں گے۔

۱۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

۴۳۶۔ رسولِ خدا کی پہلی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ تھیں جن سے حضورؐ نے ظہورِ اسلام سے کافی عرصہ پہلے نکاح کیا تھا۔ وہ مکہ کی رہنے والی تھیں اور ایک متمول قبیلہ اسد کی اہم فرد تھیں۔ وہ بیوہ تھیں، یکے بعد دیگرے اُن کے دو شوہر وفات پا چکے تھے۔ وہ نہایت دانشمند اور عقل سلیم کی مالک تھیں۔ انھیں ورثہ میں جو کچھ ملا اسے ضائع کرنے کے بجائے انھوں نے تجارت میں سرمایہ کاری کی اور اپنے سرمایہ کو خوب فروغ دیا۔ وہ نوجوان خاتون تھیں چنانچہ وہ تجارتی کاروانوں کے ساتھ سفر نہیں کرسکتی تھیں۔ لہٰذا وہ

یوں جو منافع ہوتا مورخوں
اپنا مالِ تجارت مکہ کے دیندار تاجروں کے سپرد کر دیتیں جو بیرونی ممالک میں خرید و فروخت کے لیے جاتے تھے۔
محمدؐ بھی تجارت کے سلسلے میں ہی پہلی بار
کے مطابق اس میں مالِ تجارت کی مالکہ اور فروخت کنندہ (ایجنٹ) کا نصف نصف حصّہ ہوتا۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کرنے لگیں بتدریج یہ احترام
خدیجہؓ سے ملے تھے۔ حضرت خدیجہ ان کی دیانت اور امانت سے بے حد متاثر ہوئیں، وہ
بڑھ کر پسند اور پھر محبت میں تبدیل ہو گیا اور بالآخر دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس وقت نبیؐ کی عمر صرف ۲۵ سال تھی جبکہ حضرت خدیجہ ۲۸ سال
(بلکہ معروف روایات کے مطابق ۴۰ سال) کی تھیں۔ ان کے بطن سے کوئی نصف درجن بچے تولد ہوئے جن میں سے صرف چار بیٹیاں
بقیدِ حیات رہیں۔ جب ان بیٹیوں کی شادی ہوئی تو پیغمبرِ خدا کی خواہش تھی کہ ان کے داماد ایک ہی بیوی پر قناعت کریں (اس سے
ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ عام حالات میں کس طرح کی عائلی زندگی پسند فرماتے تھے) حضرت خدیجہؓ بڑی فیاض، مخیر اور کریم النفس خاتون تھیں
وہ آنحضورؐ کی رضاعی ماں (حلیمہ) سے نہایت حُسنِ سلوک روا رکھتیں جو اکثر اپنے پیارے رضاعی بیٹے سے ملنے مکہ آتی تھیں، حضرت
خدیجہؓ یتیموں، بیواؤں، شہر کے نادار افراد، غیر ملکی مسافر حاجت مندوں جو مکہ سے گزرتے تھے اور دوسرے مستحق افراد سے بھی
مہربانی کا سلوک کرتیں۔ حضرت خدیجہؓ کا دو منزلہ خوب صورت مکان تھا۔ چنانچہ مورخوں کا بیان ہے: جب نبیؐ فلسطین سے واپس
آئے خدیجہ نے اپنے گھر کی دوسری منزل سے ان کے کاروان کو مکہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ جس جگہ حضرت خدیجہ کا مکان تھا مکہ میں وہ
جگہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ اُنھوں نے بُرے اور بھلے وقت میں اپنے شوہر کا ساتھ دیا۔ وہ سب سے پہلے اسلام سے مشرف
ہوئیں اور اپنے شوہر کی نبوت کا اقرار کیا۔ نبوت کے ابتدائی دور میں جب حضورؐ کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ انھیں واقعی اللہ کا رسول
منتخب کیا گیا ہے اور وہ سخت غمگین رہتے تھے حضرت خدیجہؓ ان کا حوصلہ بڑھاتیں۔ مورخوں نے ایک دلچسپ واقعہ سپردِ قلم کیا ہے:
نبوت کے ابتدائی دنوں میں ایک روز حضرت خدیجہؓ نے نبیؐ کو بتایا "کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ جبرائیل کب آپ کے پاس آتا ہے؟"
رسولِ خدا نے اثبات میں جواب دیا۔ ایک روز رسول اللہ نے حضرت خدیجہؓ سے کہا: "لو جبرائیل آگیا"۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے اپنے
شوہر کو اپنی دائیں طرف کر لیا اور پوچھا: "کیا آپؐ کو اب بھی فرشتہ نظر آرہا ہے؟" رسولِ خدا نے کہا: "ہاں"۔ پھر حضرت
خدیجہؓ نے کہا کہ آپ اپنی جگہ بدل لیں، پھر انھوں نے رسولِ پاک کو اپنے بائیں، سامنے اور عقب میں کھڑا کر کے پوچھا "کیا وہ اب
بھی نظر آرہا ہے؟" ہر بار رسولِ خدا کا جواب اثبات میں تھا۔ پھر انھوں نے اپنے شوہر کو بازوؤں میں بھر لیا تو رسولِ خدا نے
فوراً کہا: "اب وہ غائب ہو گیا ہے"۔ اس پر حضرت خدیجہؓ بولیں: "یقیناً یہ خدا کا فرشتہ ہی تھا۔ کیونکہ اگر وہ شیطان ہوتا تو یوں
بے تکلف پا کر بھی وہ ہمیں گھورنے سے باز نہ آتا"۔ رسولِ خدا کے قبیلے کو کفارِ مکہ کی طرف سے تین سال تک خوفناک بائیکاٹ کا سامنا
رہا۔ حضرت خدیجہؓ ابتلا کے اس دور میں اپنے شوہر کے ساتھ تھیں۔ اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ عسرت نے ان کی صحت
میں سپردِ خاک کیا گیا اور ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔
تباہ کر دی تھی۔ انھیں مکہ قبرستان المعلاۃ

پہلے ان کی
۳۳۷۔ سودہؓ بنت زمعہ مکہ کی رہنے والی تھیں۔ ان کا تعلق بنو عامر ابن لوئی سے تھا۔

۲۔ حضرت سَودہؓ

شادی ایک شخص السکران ابن عَمرو سے ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔
اور وہی اپنے شوہر کے اسلام لانے کا سبب بنی تھیں۔ دونوں پر مکہ میں اہلِ کفار نے مظالم توڑے جس کے بعد وہ دونوں حبشہ کو

ہجرت کر گئے۔ اس کے بعد متضاد روایات سامنے آتی ہیں؛ کہا جاتا ہے حبشہ پہنچ کر سکران مرتد ہو گیا اور اس نے عیسائیت قبول کر لی مگر بعض روایات اول الذکر کی نفی کرتی ہیں۔ جو راوی سکران کے قبول عیسائیت کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ نہیں بتاتے کہ اس نے کیوں اور کیسے اسلام سے روگردانی کر کے مسیحی مذہب قبول کیا۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سکران کی موت کے بعد سودہؓ مکہ واپس آگئیں۔ ان کی عمر کافی ہو چکی تھی۔ رسولِ خدا کے متعدد بچے تھے اور کم از کم ان کی دو بیٹیوں کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی چنانچہ انھوں نے کسی نوجوان خاتون پر معمر عورت سے شادی کو ترجیح دی، غالباً اسی لیے کہ نوجوان خاتون غالباً سن بلوغ کو پہنچنے والے بچوں سے زیادہ عزت نہ کرا سکتی۔ وہ مورخ جو سکران کے قبولِ عیسائیت کی نفی کرتے ہیں اس کے قبیلہ کی شہرت کو داغدار کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس کا پورا قبیلہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو سودہؓ سے رسولِ خدا کی شادی کا مقصد بھی مشکل حالات میں اسلام پر استقامت کے لیے انھیں اعزاز بخشنا تھا۔ مورخوں کے مطابق حضرت سودہؓ رسولِ خدا کے بچوں سے بیحد محبت کرتی تھیں۔ انھوں نے بچوں کو حقیقی ماں کا پیار دیا۔ معمر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ سماعت کمزور ہو گئی اور بالآخر وہ بالکل بہری ہو گئیں۔ رسولِ خدا نے ان کے معاملہ میں ہی طلاق رجعی کی ذاتی مثال پیش کی۔ مگر انھوں نے رسول اللہ سے کہا: "میرے لیے متاہلانہ زندگی میں کوئی کشش نہیں، میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں یوم نشور میں آپ کی زوجہ کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں۔ چنانچہ رسول اللہ انھیں فوراً گھر لے آئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال خلیفہ عمرؓ کے زمانہ میں ۱۹ھ میں ہوا۔ انھیں مدینہ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ

۲۳۸۔ عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں اور ان کا تعلق مکہ کے قبیلہ بنو تیم سے تھا۔ رسولِ خدا کے تعددِ ازواج میں وہ پہلی بیوی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کے دور میں آنحضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ حضرت سودہؓ سے انھوں نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ کی شادی ہجرت سے دو سال قبل مکہ میں ہوئی۔ اس وقت وہ ابھی نابالغ تھیں۔ مگر ان کی رخصتی کئی سال بعد ان کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد مدینہ میں عمل میں آئی۔ آخر رسولِ خدا نے حضرت عائشہؓ کا رشتہ کیوں طلب کیا؟

۲۳۹۔ ظاہر ہے اس میں کوئی نفسانی خواہش کارفرما نہیں تھی کیونکہ مستقبل قریب میں حضرت عائشہ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ کے لیے یہ بڑی مشکلات اور مصائب کا دور تھا۔ جناب ابو طالب انتقال کر چکے تھے اور قبیلہ کی سرداری ابولہب کو مل گئی تھی جو آنحضورؐ کا جانی دشمن تھا۔ اس نے نبیؐ کو قبیلہ کا "باغی" قرار دے دیا تھا۔ رسول اللہ کی طرف سے طائف میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اور ان دنوں رسولِ خدا مکہ کے ایک غیر مسلم کی پناہ میں دن گزار رہے تھے۔ اس شادی کی وجہ کسی طاقتور حلیف سے ربط بھی نہیں تھی کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ بنو تیم مکہ کے قبائل میں کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے، بلکہ ایک شاعر نے تو یہ کہہ کر بنو تیم کا مذاق اڑایا تھا کہ "مکہ میں اہم فیصلہ کرتے وقت بنو تیم کو مشاورت میں بھی شریک نہیں کیا جاتا۔"

۲۴۰۔ ابوبکرؓ ظہورِ اسلام سے قبل بھی رسولِ خدا کے گہرے دوست تھے اور دونوں کا ایک دوسرے کے

گھروں میں آنا جانا تھا۔ یوں رسولِ خدا حضرت عائشہؓ کو ان کی پیدائش کے وقت سے ہی جانتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ عائشہؓ کتنی ذہانت اور فطانت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ وہ اس عظیم دور کے ان بچوں میں سے تھیں جو مسلمان والدین کے گھر تولد ہوئے تھے۔ گویا وہ پیدائشی مسلمان تھیں۔ ان سے شادی کر کے رسولِ خدا حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اپنے تعلقات مستحکم تر کرنا چاہتے تھے، پھر وہ نو عمر عائشہ کو اسلامیات اور فقہ کی عظیم عالم بنانے کے خواہاں تھے۔ چونکہ ان کی عمر ابھی بہت کم تھی اس لیے یہ باور کرنے کی خاص وجوہ تھیں کہ وہ رسولِ خدا کے بعد کافی دیر زندہ رہیں گی (اُن کا انتقال رسولؐ پاک کے وصال کے ۴۸ سال بعد ہوا) چنانچہ ان سے وابستہ تمام اُمیدیں بر آئیں۔ وہ نہایت متقی خاتون تھیں جن کے شب و روز نوافل اور روزے میں گزرتے تھے۔ وہ اتنی فیاض تھیں کہ جب انھیں دربارِ خلافت سے شاہی پنشن موصول ہوتی وہ اسی روز تمام رقم ناداروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتیں۔ ان کی ایک خادمہ سے روایت ہے: ایک روز انھیں پنشن موصول ہوئی جو خلیفہ عمرؓ نے بھجوائی تھی۔ انھوں نے مجھے ہدایت کی کہ اُس میں سے فلاں فلاں کو اتنی اتنی رقم دے دی جائے۔ چنانچہ اسی طرح ساری پنشن ختم ہوگئی۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ محترمہ آپ آج روزہ سے ہیں اور شام کو افطاری کے لیے گھر میں کچھ نہیں، تو انھوں نے جواب دیا: تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، خیر کوئی بات نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے۔

۳۴۱۔ جہاں تک ان کے علم و فضل کا تعلق ہے انھیں اپنے دور میں اسلامی قانون ———— جو ان کا خاص میدان تھا ———— عربی شاعری، زمانہ قبل از اسلام کی تاریخ عرب، ریاضی، علم الادویات اور متعدد دیگر علوم کی ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُس دور کے عظیم ترین مسلم ماہرین قانون کو جب کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ حضرت عائشہؓ سے رجوع کرتے اور عموماً ان کے جواب سے مطمئن ہو جاتے۔ روایات میں آیا ہے کہ بسا اوقات جب کسی مسئلہ پر ماہرینِ قانون کی رائے ان کے سامنے پیش کی جاتی تو وہ سنتے ہی اس کے نقائص بیان کر دیتیں جو یہ ماہرینِ قانون بھی تسلیم کر لیتے۔ بلا شُبہ وہ رسولؐ اللہ کی حدیث اور سنّت کی ایک بہترین عالم تھیں اور انھیں اس دور کا عظیم محدث تصوّر کیا جاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نہایت ذہین اور سکالر خاتون تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسلمان خواتین کے لیے پردہ کا حکم ابھی نہیں آیا تھا۔ ایک روز ایک عرب سردار عُیینہ بن الحسن الفزاری رسولؐ اللہ سے ملاقات کے لیے آیا۔ رسولؐ پاک اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تھے۔ چنانچہ مہمان کو اسی گھر میں بُلایا گیا جس نے حضرت عائشہ کی بے حد تعریف کی۔

۳۴۲۔ حضرت عائشہؓ نہایت دُبلی پتلی خاتون تھیں، ان کے دُبلا پتلا اور کمزور سا ہونے کے باعث ایک مرتبہ نہایت سنگین اُلجھن پیدا ہوگئی۔ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے، وہ بنو المصطلق کے خلاف فوجی مہم میں نبی کے ہم رکاب تھیں۔ جب مہم سے لشکرِ اسلام واپس آرہا تھا ایک روز علی الصبح وہ حوائجِ ضروریہ کے لیے پڑاؤ سے دُور چلی گئیں، وہ جب واپس آئیں تو دیکھا کہ اسلامی فوج کوچ کر چکی ہے۔ جس ملازم کو حضرت عائشہؓ کے اُونٹ پر محمل رکھنے کا فرض سونپا گیا تھا اس نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ ام المومنین محمل میں نہیں ہیں کیونکہ وہ بہت ہی دُبلی پتلی تو تھیں۔ لشکرِ اسلام کو نہ پاکر حضرت عائشہ بے حد گھبرائیں اور مایوسی کے عالم میں انھوں نے اپنے سراپا پر چادر لپیٹ لی اور زمین پر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک مسلمان سپاہی جو اتفاق سے پیچھے

رہ گیا تھا ادھر سے گزرا، اس نے حضرت عائشہؓ کو پہچان لیا۔ انھیں یوں لیٹا دیکھ کر اسے سخت صدمہ ہوا اور وہ ڈر گیا کہ ام المومنینؓ کے ساتھ یقیناً کوئی سنگین حادثہ رونما ہوا ہے۔ اس نے حضرت عائشہ کو آواز دی جب اسے ام المومنینؓ کے اتفاقاً پیچھے رہ جانے کا علم ہوا تو اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھا دیا۔ پھر وہ اونٹ سے کچھ پرے چلا گیا تاکہ ام المومنینؓ آزادی سے اونٹ پر سوار ہو سکیں۔ جب آپؓ سوار ہو گئیں تو اس نے مہار پکڑ لی اور اونٹ کے آگے آگے پیدل روانہ ہو گیا۔ جلد ہی وہ اسلامی لشکر سے جا ملا۔ اس وقت لشکرِ اسلام یا تو راستے میں تھا یا دوپہر سے قبل اگلے پڑاؤ پر پہنچ کر لشکری اونٹوں پر سے اپنا سامان اتار رہے تھے۔ فطری طور پر ام المومنین کے پیچھے رہ جانے کی اطلاع پڑاؤ میں پھیل گئی تاہم کسی کو اس میں کوئی مشکوک بات نظر نہ آئی۔ ہمیں ابن اُبَیّ تو یاد ہو گا جو مدینہ کا بادشاہ مقرر کیا جانے والا تھا مگر یہ منصوبہ اس وقت تبدیل کر دیا گیا جب مدینہ کے لوگوں نے رسولؐ خدا کی صورت میں بہتر تبادل پا لیا۔ ظاہر ہے ابن اُبَیّ اس واقعہ کو نہیں بھولا تھا۔ اس نے نبیؐ کو کبھی معاف نہ کیا اور پوری زندگی ان کے لیے مسائل و مشکلات کھڑی کرتا رہا۔ اسی ابن اُبَیّ کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے میں فضول بکواس شروع کر دی، اس پر بعض دوسرے لوگ بھی باتیں بنانے لگے۔ بالآخر ان افواہوں کے بارے میں مدینہ میں رسولؐ خدا کو رپورٹ پیش کی گئی۔ نبیؐ نے اپنی زوجہ سے تو کچھ نہ کہا مگر حضرت عائشہؓ نے رسولِ خدا کے رویّہ میں سرد مہری کو محسوس کر لیا جس نے محبت کی نرمی کی جگہ لے لی تھی۔ ام المومنینؓ کے لیے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے رسولؐ اللہ سے اپنے میکے جانے کی اجازت طلب کی تاکہ چند روز اپنے والدین کے ساتھ گزار سکیں۔ رسولِ خدا نے اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کی۔ حضرت عائشہؓ کی خادمہ اور بعض دوسرے افراد سے بھی سوالات کیے گئے مگر کسی نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی تھی جس کے لیے حضرت عائشہؓ کو ہدفِ ملامت بنایا جا سکے۔ رسولؐ اللہ نے دیکھا کہ واقعات کے اصل حقائق معلوم کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی لوگوں کی زبان تھامنا ممکن ہے تو وہ برہم ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے گھر گئے تاکہ عائشہؓ اور ان کے والدین سے بات کر سکیں۔ وہاں اُنھوں نے حضرت عائشہ کے والدین کی موجودگی میں اپنی زوجہ سے کہا: اگر تم نے کوئی غلطی کی ہے تو بہتر ہے اس کے لیے خدا سے معافی طلب کرو۔ خدا سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں، پھر روزِ حشر کے بجائے اس دُنیا میں معافی طلب کرنا بہتر ہے۔ حضرت عائشہ اپنے شوہر محترم کی باتیں سُن کر جذباتی ہو گئیں، اُنھوں نے والدین سے کہا: "انھیں جواب دیجیے"۔ مگر انھوں نے کہا "ہماری عزیز از جان بیٹی! بھلا ہم ایسے معاملہ میں کیا جواب دیں جس کا ہمیں کوئی علم نہیں"۔ حضرت عائشہؓ جذباتی صدمہ سے سنبھل گئیں، خود پر قابو پایا اور نہایت مختصر مگر انتہائی پُر اثر بات کی۔ انھوں نے رسولِ خدا کو بتایا کہ وہ معصوم ہیں اور اپنی معصومیت کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتیں، بلکہ انھوں نے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے جو حاضر و ناظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے، اور وہ اس ضمن میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتیں۔ اچانک سب لوگوں نے دیکھا کہ رسولؐ اللہ پر وہ مخصوص حالت طاری ہو گئی جو نزولِ وحی کے وقت ہوا کرتی تھی۔ جلد ہی یہ حالت ختم ہو گئی تو رسولؐ اللہ نے حضرت عائشہؓ کو مبارکباد دی اور کہا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی پاک دامنی کی تصدیق کی ہے (قرآن ۲۴/ ۱۔ ۲۰) اس پر حضرت عائشہؓ واپس رسولؐ اللہ کے گھر میں آ گئیں اور انھیں حسبِ سابق نبیؐ کی شفقت اور محبت حاصل ہو گئی۔

۳۴۳ - ہم آگے چل کر دوبارہ حضرت عائشہؓ کا ذکر کریں گے اور دیکھیں گے کہ ام المومنینؓ کو عدل و انصاف سے کتنا گہرا لگاؤ تھا - زندگی کے اولیں دور میں وہ کھیل کود کو پسند کرتی تھیں - اور روایت ہے کہ ایک بار انھوں نے رسول اللہ کے ساتھ دوڑنے کا مقابلہ بھی کیا تھا اور وہ نبیؐ سے تیز دوڑنے والی ثابت ہوئیں - اس کے کئی سال بعد بھی حضرت عائشہؓ نے ایک بار پھر رسولِ پاک کے ساتھ دوڑ لگائی مگر عمر کے ساتھ اب وہ نسبتاً فربہ ہو گئی تھیں - لہٰذا وہ ہار گئیں رسولؐ پاک نے پیار سے کہا: "یہ اُس وقت کا بدلہ ہے۔"

۴ - حضرت حفصہؓ

۳۴۴ - حضرت حفصہؓ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں - وہ مکی تھیں اور ان کا تعلق بنو عدی سے تھا - ان کی شادی ایک پرہیزگار مسلمان سے ہوئی تھی جو جنگِ اُحد میں شہید ہو گئے - ابھی وہ جوان ہی تھیں لہٰذا ان کے والد ان کے نکاح ثانی کے لیے اچھے سے بر کی تلاش میں تھے - اُنھوں نے سب سے پہلے اپنے گہرے دوست ابوبکرؓ سے نکاح کے لیے کہا مگر وہ خاموش رہے - پھر انھوں نے حضرت عثمانؓ کو پیشکش کی جو رسول پاک کے داماد تھے مگر حال ہی میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا - انھوں نے بھی معذرت کر لی کیونکہ وہ رسول اللہ کی دوسری بیٹی سے شادی کی توقع لیے بیٹھے تھے - اس پر حضرت عمرؓ کے جذبات مجروح ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ سے شکایت بھی کہ ان کے بہترین دوستوں نے ان کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ وہ بڑی خوبیوں کی مالک ہے - رسولِ خدا عمرؓ کی باتوں سے متاثر ہوئے اور بولے: "پروا نہ کرو، میں عثمانؓ کے لیے تمھاری بیٹی سے بہتر بیوی کا انتظام کروں گا اور تمھاری بیٹی کو عثمانؓ سے بہتر شوہر ملے گا۔" رسولؐ خدا عثمانؓ کے عقد میں اپنی دوسری بیٹی دے کر انھیں اعزاز بخشنا چاہتے تھے اور حضرت عمرؓ کی بیوہ بیٹی سے خود شادی کر کے عمرؓ کے وقار میں اضافہ کے خواہشمند تھے - اس فیصلہ پر ہر شخص نے اظہارِ مسرت کیا - بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ کو اپنی خاموشی کی وجہ بتا دی - انھوں نے کہا: میرا خیال تھا کہ رسولؐ خدا آپ کی صاحبزادی سے عقد کرنا چاہتے ہیں مگر میں قبل از وقت اس کا انکشاف نہیں کرنا چاہتا تھا - حضرت عمرؓ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے اور دونوں میں پرانی دوستی از سرِ نو زندہ ہو گئی - نبیؐ سے نکاح کے وقت حضرت حفصہؓ کی عمر ۲۲ سال تھی - وہ عقل و دانش میں کسی سے کم نہ تھیں - وہ عرب کی ان معدودے چند خواتین میں سے تھیں جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں - اُنھوں نے بلا کا حافظہ پایا تھا - ان سے حضورؐ کی متعدد احادیث مروی ہیں - رسولِ پاک کے بعد خلیفہ عمرؓ ان سے قانون سازی، خصوصاً خواتین کے متعلق امور میں مشورہ لیا کرتے تھے -

۵ - حضرت زینبؓ اُم المساکین

۳۴۵ - زینب بنت خُزیمہ کا تعلق نجد کے بہت بڑے قبیلہ عامر ابن صعصعہ سے تھا - ان کی شادی مکہ میں رسول اللہ کے خاندان میں ہوئی تھی - ۲ھ میں ان کے شوہر عبید اللہ ابن الحارث ابن المطلب نے جنگِ بدر میں جامِ شہادت نوش کیا - چنانچہ حضرت زینبؓ نے مدینہ میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا - وہ مسلمان تھیں اور نجد میں اپنے قبیلہ میں جانا نہیں چاہتی تھیں جو اسلام نہیں لایا تھا - ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس وقت مسلمانوں اور نجد کے اس طاقت ور قبیلہ کے درمیان تعلقات کس حد تک بگڑ چکے تھے - اس قبیلہ کے

لوگوں نے دھوکے سے بئرِ معونہ کے مقام پر مسلمان مبلغوں کے ایک وفد کو شہید کر دیا تھا۔ بعد میں اس قبیلہ کے دو مسلمان افراد کو بئرِ معونہ کے قتلِ عام میں زندہ بچ جانے والے ایک مسلمان نے قتل کر دیا تھا —— یہ مسلمان اس قتلِ عام کے وقت موقع پر موجود نہیں تھا بلکہ وہ اپنے رفقا کے اونٹ چرانے کے لیے چراگاہ میں گیا ہوا تھا —— اس نے جن دو مسلمانوں کو قتل کیا ان کے قبولِ اسلام کا بھی اسے علم نہیں تھا۔ ان حالات کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ضروری تھا۔ پیغمبرؐ نے خیال کیا کہ اگر وہ زینبؓ سے نکاح کر لیں تو ہو سکتا ہے اسلام کے متعلق اس قبیلے کی معاندانہ روش میں نرمی پیدا ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے قبیلہ میں زینب کی بڑی عزت کی جاتی تھی، وہ اتنی فیاض تھیں کہ قبولِ اسلام سے قبل ہی انھیں "اُمّ المساکین" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا تاہم ان کی صحت ٹھیک نہ تھی اور شادی کے صرف تین ماہ بعد مدینہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال تھی۔ حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینبؓ کی وفات کے بعد اب رسولؐ خدا کی صرف تین بیویاں سودہؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ رہ گئیں۔

۶۔ اُمِّ سلمہ ہند

۳۴۶۔ اُمِّ سلمہ بنت ابو اُمیہ مکّی تھیں۔ ان کا تعلق اہم قبیلہ بنو مخزوم سے تھا اور وہ خالد ابن ولید کی قریبی عزیزہ تھیں۔ حضرت اُمِّ سلمہ اور ان کے شوہر ظہورِ اسلام کے ابتدائی دور میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور انھوں نے اسلام کے لیے بیحد کام کیا۔ اپنے خاندان کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کے لیے دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، وہاں سے واپسی پر وہ مدینہ جانا چاہتے تھے کہ ام سلمہ کے والدین نے اسے زبردستی روک لیا، تاہم ان کے شوہر ابو سلمہ مدینہ چلے گئے۔ ام سلمہ کے والدین نے ان کے بچّے کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی مگر ام سلمہ کو بچّے کی جُدائی گوارا نہ تھی، بچّے کے لیے والدین سے ام سلمہ کی جدوجہد کے دوران بچّے کا ایک بازو اکھڑ گیا اور عمر بھر کے لیے بیکار ہو گیا۔ ام سلمہ کے والدین اسے مدینہ جانے سے روک سکتے تھے مگر وہ اسے زبان بند رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ام سلمہ روزانہ کعبۃ اللہ میں جا کر اپنے خاندان کے لیے بلند آواز سے بددعا کرتیں:

"خدا کرے گدھ آسمانوں سے اُتریں اور پُورے خاندان کو ہضم کر جائیں۔"

ان کے اہلِ خاندان تنگ آ گئے اور بالآخر اُنھوں نے کہا: "جاؤ، جہاں چاہو چلی جاؤ۔" اور ام سلمہ اکیلی مدینہ روانہ ہو گئیں اور اپنے خاوند سے جا ملیں۔ مگر ابھی ان کے مصائب کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ جلد ہی جنگِ اُحد (۳ ہجری) میں ان کے شوہر نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بدقسمت خاتون کے پاس آہوں اور نوحوں کے سوا کچھ نہ رہا۔ گو ان کی عمر کافی ہو چکی تھی اور ان کے متعدد بچّے بھی تھے تاہم رسولِ خدا نے جو بنو خزیمہ کی بڑی عزّت کرتے تھے، ام سلمہ سے نکاح کرنے اور ان کے زخمی دل پر پھایا رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اُمِّ سلمہ کے لیے یہ غیر متوقع اعزاز تھا، گو وہ اپنے مرحوم شوہر سے بے حد محبت کرتی تھیں مگر وہ رسولِ خدا کی پیشکش کو مسترد نہ کر سکیں۔ خالد ابنِ ولید اُس وقت اسلام کے بدترین دشمن تھے۔ مگر جب رسولِ خدا نے ام سلمہؓ سے نکاح کر لیا اور یُوں خالد کے قریبی رشتہ دار بن گئے تو

ان کی دشمنی میں ٹھہراؤ آگیا۔ کوئی دو سال بعد وہ بھی مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ ام سلمٰہ بھی عرب کی ان چند خواتین سے تھیں جو پڑھنا جانتی تھیں۔ انھوں نے طویل عمر پائی، ان کا سنِ انتقال ۶۱ ہجری ہے۔ وہ رسولِ خدا کے وصال سے پچاس سال بعد تک زندہ رہیں۔ وہ عمدہ شاعرہ تھیں۔ انھوں نے حضورؐ کی بہت سی احادیث و روایات آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑی ہیں۔ ان کے پہلے شوہر سے ایک بیٹی زینب تھیں جو آگے چل کر اسلام کی نامور ماہر فقہ قرار پائیں۔ زینب حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں اس لیے حبشہ کی زبان بھی جانتی تھیں۔ ام سلمہ نے حبشہ کے متعدد گرجا گھروں کا مطالعہ کیا تھا اور وہ بتایا کرتی تھیں کہ کس طرح ان گرجا گھروں کو عیسائی شخصیات کی تصاویر سے مزین کیا گیا تھا۔

۷۔ زینب بنت جحش ۴۷۳۔ رسولؐ کی یہ زینب نام کی دوسری زوجہ مطہرہ تھیں۔ ان کے والد شمالی عرب کے رہنے والے تھے جو بعض ذاتی وجوہ کی بنا پر مکہ میں بس گئے تھے۔ انھوں نے رسولِ خدا کی ایک پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب سے شادی کی تھی۔ جحش کا پُورا خاندان ابتدا ہی میں اسلام قبول کرچکا تھا اور پُورا خاندان ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ آگیا تھا۔ ان کی عمر ۳۶ سال تھی مگر یہ واضح نہیں ہوسکا کہ آیا وہ کنواری تھیں، بیوہ تھیں یا مطلقہ تھیں۔ رسولِ خدا اسلامی معاشرہ میں، جو وجود میں آرہا تھا، غلاموں کی حیثیت بہتر بنانا چاہتے تھے اور ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ کر دینا چاہتے تھے کہ آزاد پیدا ہونے والے شہری اور کسی غلام کے درمیان اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تعصبات کے خاتمہ کے لیے ضرب کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نبیؐ نے اپنی پھوپھی زاد زینب سے کہا کہ وہ زید بن حارثہ سے شادی کرلیں۔ زید رسولؐ پاک کا غلام تھا جسے حضورؐ نے آزاد کر کے متبنّٰی بنالیا تھا۔ زینب خود رسولؐ سے شادی کی خواہش رکھتی تھیں اور اُنھوں نے منت مان رکھی تھی کہ اگر ان کا یہ ارمان پُورا ہوجائے تو وہ چھ ماہ تک روزے رکھیں گی۔ فطری طور پر وہ کسی سے اپنی خواہش یا منت بیان نہیں کرسکتی تھیں۔ ان حالات میں وہ زید ابن حارثہ سے شادی کی تجویز پر خوش نہیں تھیں لیکن پارسا مسلمان ہونے کی حیثیت میں زینب اور ان کے والدین نے رسولِ خدا کی تجویز قبول کرلی۔ مورخوں کے مطابق زینب کا تعلق ایک متمول خاندان سے تھا اور وہ زبان کی بھی ذرا تیز تھیں۔ چنانچہ زید سے ان کا ساتھ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان اکثر ناگوار حالات پیدا ہوجاتے اور رسولِ خدا ہمیشہ مداخلت کر کے ان میں مفاہمت کراتے۔ وہ فریقین کو اعتدال کی تلقین بھی کرتے۔ زید نے ایک حبشی خاتون ام ایمن سے بھی شادی کر رکھی تھی جو رسولؐ پاک کی والدہ محترمہ کی خادمہ تھیں۔ ان کے بطن سے زید کا ایک بیٹا اسامہ بھی تھا جس سے رسولِ خدا بڑی محبت کرتے تھے اور جو آگے چل کر اسلامی افواج کا سپہ سالار بھی بنا۔ رسول اللہؐ ایک روز حسبِ معمول زید بن حارثہ کے گھر گئے۔ میاں بیوی میں پھر جھگڑا ہوا تھا جس پر زید نے نہ صرف زینب کے رویہ کی شکایت کی تھی بلکہ یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ وہ زینب کو طلاق دے دیں گے۔ رسول اللہ نے زید کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر میاں بیوی کے درمیان مفاہمت کرانے کی خاطر ان کے مکان پر گئے۔ اس وقت زید گھر پر نہ تھے۔ زینب نے جب گھر کے دروازے پر نبیؐ کو بتایا کہ زید گھر پر نہیں ہیں تو وہ یہ کہتے ہوئے دروازہ پر سے ہی لوٹ آئے "اللہ اکبر وہی دلوں کو پھیرنے والا ہے"۔ مورخوں کا بیان ہے کہ گو زینب کی عمر ۳۶ برس ہو چکی تھی، وہ نہایت خوش رُو تھیں اور زرد رنگ کے لباس میں بہت خوبصورت

دکھائی دیتی تھیں۔ اُنھوں نے بھی دروازہ کے اندر رسولؐ پاک کے مُنہ سے نکلنے والا کلمہ سُن لیا۔ زید گھر آئے تو زینب نے اپنے شوہر سے رسولؐ اللہ کی آمد اور ان کے جملہ کا تذکرہ کیا۔ زید نے رسولؐ اللہ کی بات کا مطلب غلط سمجھا۔ دراصل رسولِ خدا کا مطلب یہ تھا کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ زید اپنی بُوڑھی حبشی بیوی کے ساتھ تو خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہے مگر اس خوبصورت خاتون سے اس کی بَن نہیں آتی۔ زید تیر کی طرح رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور بولے "اگر آپ پسند کریں تو میں زینب کو طلاق دیئے دیتا ہُوں"۔ رسولِ خدا نے زید کو پھر ٹھنڈا کیا اور اسے اعتدال کی تلقین کی۔ کچھ عرصہ بعد جب زید کے لیے زینب کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہ رہا تو انھوں نے زینب کو طلاق دے دی۔ رسولِ خدا کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ انھیں اس بات کا بیحد افسوس تھا کہ اُنھوں نے زینب کو زید سے شادی پر مجبور کیا تھا۔ اب وہ اس کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ عدّت کی میعاد ختم ہونے کے بعد رسولِ خدا نے حضرت زینبؓ سے شادی کی پیشکش کی۔ زینبؓ کو اتنی والہانہ خوشی ہوئی کہ اُنھوں نے رسولؐ کا پیام لے کر آنے والے کو چند منٹ انتظار کرنے کے لیے کہا اور اندر جا کر نوافلِ شکرانہ ادا کیے۔ پھر رسولؐ پاک کی تجویز پر اثبات میں جواب دیا۔ ان کی زندگی بھر کی خواہش پُوری ہوگئی تھی۔ انھوں نے پیام بر کو قیمتی تحفوں سے بھی نوازا۔ رسولِ خدا کے اس اقدام سے کافروں کے اس قدیم عقیدہ پر کاری ضرب لگی کہ لے پالک بیٹا (متبنّیٰ) حقیقی بیٹے کی مانند ہوتا ہے اور اس کی مطلقہ سے باپ کی شادی روا نہیں۔ اگرچہ قرآن نے کفّار کے اس رواج کو ختم کر دیا تھا بلکہ اسے ابدی نیند سُلانے کے لیے کسی ذی وقار مثال کی ضرورت تھی۔ یہ مثال خود رسولؐ اللہ نے پیش کر دی۔ اگرچہ زید ابن حارثہ سے زینب کی شادی تھوڑا عرصہ قایم رہی لیکن اس کے اسلامی معاشرے پر دُور رس اثرات مرتّب ہوئے کہ اس کے بعد معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو کسی تعصب کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انھیں اسلامی معاشرہ میں اتنا بلند مقام حاصل ہوا کہ تاریخ میں شاہی خاندانوں کی بنیاد رکھی۔ حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ ہجری میں ہوا۔

۸۔ حضرت جویریہؓ

۳۴۸۔ جویریہ بنت الحارث کا تعلق بنو المصطلق سے تھا۔ یہ قبیلہ اسلام کی دشمنی میں پیش پیش تھا۔ جب بنو نضیر کے یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا تو بنو المصطلق ان کے حامی بن گئے اور ان کی کرایہ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ وہ جنگِ خندق کے دوران مدینہ کے محاصرہ میں بھی شامل ہونا چاہتے تھے۔ رسولؐ اللہ مدینہ کے شمال کی طرف دُومۃ الجندل کے باسیوں کی سرکوبی کے لیے گئے ہوئے تھے جو مدینہ کی طرف آنے والے رسد کے قافلوں کو خیبر کے یہود کے ایما پر ہراساں کرتے تھے۔ دراصل دشمنوں کی چال یہ تھی کہ جب رسولِ خدا مُٹھی بھر مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے دور انتہائی شمال میں چلے جائیں تو مدینہ پر اجتماعی حملہ کر دیا جائے۔ اس سازش میں بنو غطفان، اہلِ مکہ، بنو سُلیم اور دوسرے دشمنانِ اسلام شامل تھے۔ ان کے منصوبے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مدینہ پر حملہ کے ساتھ رسولِ خدا کو بھی شمال میں ہی گھیر لیا جائے، اس وقت وہ اپنے ہیڈ کوارٹر سے بھی دُور ہوں گے۔ لیکن رسولؐ اللہ کو اس ناپاک منصوبے کا علم اس وقت ہو گیا جب وہ بنو غطفان کے علاقہ میں تھے۔ چنانچہ وہ تیزی سے پلٹے اور مدینہ پہنچ کر شہر کے گرد خندق کی کھدائی اور دوسرے دفاعی انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ دفاعی اقدام کے طور پر اسی دوران میں انھوں نے اسلامی فوج کا ایک دستہ لے کر بنو المصطلق پر چھاپہ مارا جو مدینہ پر

حملہ کے لیے لشکر اکٹھا کر رہے تھے ۔ بنو المصطلق مسلمانوں کی طرف سے اچانک حملہ پر گھبرا گئے ۔ انھیں رسول اللہؐ سے ایسے اقدام کی توقع نہیں تھی ، ان کے قدم نہ جم سکے اور قبیلہ کے مرد افراتفری کے عالم میں فرار ہو گئے ۔ اسلامی فوج نے ان کی عورتوں ، بچوں ، گھوڑوں اور دوسرے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا ۔ رسولِ پاکؐ اس قبیلہ کے ساتھ دشمنی میں اضافہ نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ بنو المصطلق کے دل جیتنا چاہتے تھے ۔ قبیلہ کے جنگی قیدیوں کو اسلامی لشکر میں بطور مالِ غنیمت تقسیم کر دیا گیا ۔ مگر رسولِ خداؐ چاہتے تھے کہ اسلامی فوج کے ارکان از خود یہ مالِ غنیمت اس کے اصل وارثوں کو لوٹا دیں ۔ اس مقصد کے لیے محض سفارش کے بجائے کسی بڑے اقدام کی ضرورت تھی ۔ چنانچہ رسولؐ نے قبیلہ کے سردار کی نوجوان بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ۔ اس طرح اُس کے تمام رشتہ دار پیغمبر کے رشتہ دار بن گئے ۔ اس کے فوراً بعد اسلامی لشکر نے سارا مالِ غنیمت واپس کر دیا ۔ چنانچہ جب بنو المصطلق کی عورتیں اور بچے رہا ہو کر واپس پہنچے تو اُنھوں نے نبیؐ کی رحم دلی کی داستان مردوں کو سنائی ۔ چنانچہ بنو المصطلق کے مرد مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اس کے بعد یہ قبیلہ اسلام کا زبردست حلیف ثابت ہوا ۔ حضرت جویریہؓ نہایت متقی خاتون تھیں وہ رات نوافل میں اور دن روزے سے گزارتیں ۔ انھوں نے طویل عمر پائی ۔ ان کا انتقال ۵۷ھ میں ہوا ۔ ان سے بھی متعدد احادیث مروی ہیں ۔

۹ ۔ حضرت اُمِّ حبیبہؓ ۳۴۹ ۔ وہ مکی تھیں ، ان کا تعلق قبیلہ بنو اُمیّہ سے تھا ، وہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں (ان کا ایک بھائی معاویہ آگے چل کر خلیفہ بنا) اُمِّ حبیبہ اور ان کے شوہر نے اوائل میں ہی اسلام قبول کیا تھا وہ ان مسلمانوں میں شامل تھے جنھوں نے حبشہ کو ہجرت کی تھی ۔ ان کا شوہر شراب کا رسیا تھا ——— ان دنوں ابھی اسلام میں شراب پر پابندی نافذ نہیں ہوئی تھی ——— حبشہ جانے کے بعد ان کا شوہر عیسائیت کی طرف مائل ہو گیا ۔ اس نے اپنی رفیقہ حیات کو بھی اپنے نقشِ قدم پر چلنے پر مجبور کیا مگر اُمِّ حبیبہؓ نے مزاحمت کی اور اسلام کا دامن استقامت سے تھامے رکھا ۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ، اُمِّ حبیبہ کا شرابی شوہر حبشہ میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا ۔ چنانچہ رسولِ خداؐ اُمِّ حبیبہؓ کو اسلام پر استقامت کا صلہ دینا چاہتے تھے اور اُنھوں نے شادی کی تجویز پیش کر دی ۔ اس وقت اُمِّ حبیبہ حبشہ میں تھیں ۔ چنانچہ شاہِ نجاشی نے وہاں شادی کی تقریب منائی اور پھر دُلھن کو تحائف دے کر اسلامی سفیر کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا ۔ وہ رسول اللہؐ کے ساتھ اپنی شادی سے اس قدر خوش تھیں کہ جب نجاشی کی ایک کنیز نے اُنھیں یہ خوشخبری سنائی تو انھوں نے اپنے کنگن اور دُوسرے تمام زیورات جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھیں اتار کر کنیز کو بطور تحفہ دے دیئے ۔ یہ شادی ۶ ہجری میں ہوئی ، اس کے فوراً بعد ہی صلح حدیبیہ کا معاہدہ عمل میں آیا جس کی اہلِ مکہ نے خلاف ورزی کی ۔ ان دنوں ابوسفیان مکہ میں نہیں تھے بلکہ تجارتی قافلہ لے کر شام گئے ہوئے تھے ۔ جب وہ مکہ لوٹے اور انھیں معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کے بارے میں اہلِ مکہ کی حماقت کا علم ہُوا تو وہ فوراً مدینہ پہنچے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی رسول اللہؐ سے بات کرے اور نبیؐ کو اہلِ مکہ کے حق میں ہموار کرے تاکہ معاہدہ کو نئی زندگی مل سکے ۔ مگر حضرت اُمِّ حبیبہؓ اسلام کی اس قدر شیدائی تھیں کہ ان کی نظر میں خاندانی تعلقات ہیچ تھے ۔ یہاں تک کہ جب ابوسفیان ان سے ملنے گئے تو اُنھوں نے اپنے باپ کو اس

بوریے پر بیٹھنے کی اجازت نہ دی جس پر رسولؐ اللہ بیٹھا کرتے تھے۔ اُنھوں نے کفارِ مکّہ کے لیے کچھ بھی کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آخری فیصلہ صرف رسولؐ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب ابُوسفیان نے نبیؐ سے بات کی تو وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ ابوسفیان یہ جانے بغیر واپس چلا گیا کہ مسلمان اب اہلِ مکّہ سے جنگ کریں گے یا صلح پر قایم رہیں گے (ہم اُوپر بتا چکے ہیں کہ مکہ پر رسولِ خدا نے کس طرح قبضہ کیا تھا) اُمِّ حبیبہ کی زندگی زُہد و تقوٰی سے عبارت تھی۔ اُنھوں نے بھی طویل عمر پائی، ان کا انتقال ۵۹ ہجری میں ہُوا۔ اُنھوں نے احادیث اور سنّتِ رسولؐ کے بارے میں نہایت قابلِ قدر روایات کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔

۱۰۔ صفیہ بنت حیی

۳۵۰۔ ان کا تعلق یہود سے تھا۔ ۷ھ ہجری میں جب رسولِ خدا نے خیبر فتح کیا تو وہ مالِ غنیمت میں لشکرِ اسلام کے ہاتھ لگیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ رسولِ خدا نے ان سے شادی کر لی تھی۔ وہ خود بھی رسولِ خدا سے شادی کی خواہشمند تھیں کیونکہ انھوں نے خواب میں ایسا ہوتے دیکھا تھا ——— اور اس سے خیبر فتح کرنے والی مُسلم فوج کی مشکلات میں بے حد کمی ہوگئی ——— رسولؐ اللہ نے صفیہ کو بتایا کہ انھیں خیبر کے یہودیوں پر حملے کا افسوس ہے، مسلمان جنگ نہیں چاہتے۔ انھوں نے وضاحت سے بتایا کہ مسلمان اسلامی مملکت اور اسلام کے دفاع کے لیے خیبر کے خلاف فوج کشی پر مجبور ہوئے ہیں۔ رسولؐ خدا کی دُوسری ازواجِ مطہرات نے تصدیق کی ہے کہ حضرت صفیہ نہایت متقی اور پارسا مسلمان تھیں۔ رسولِ خدا کے خاندان میں حضرت صفیہؓ کے دسترخوان کی بڑی شہرت تھی۔ وہ فیاض مگر مُسرف نہ تھیں۔ وہ ۵۰ھ ہجری تک زندہ رہیں۔ انھوں نے خاصی دولت پس انداز کی تھی۔ ان کا ایک بھتیجا تھا جو یہودیت سے چمٹا رہا۔ اسلام نے والدین سے ——— خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں ——— حُسنِ سلوک کی جو تلقین کی ہے، اور اس رعایت سے کہ ترکہ میں حصہ دار افراد کے سوا دُوسروں کے حق میں وصیّت کی جا سکتی ہے، فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت صفیہ نے اپنی جائداد کا تیسرا حصّہ اسی بھتیجے کے نام ہبہ کر دیا۔ اس پر بعض مسلمانوں نے شدید اعتراض کیا مگر حضرت عائشہ آڑے آئیں اور انھوں نے اصرار کیا کہ صفیہ کی وصیت پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت عائشہؓ کا یہ اقدام ان کی انصاف پسندی پر دال ہے حالانکہ رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران حضرت عائشہؓ اور حضرت صفیہؓ کے درمیان کئی بار تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ ایک روز حضرت عائشہؓ نے کسی کام سے حضرت صفیہ کو آواز دی: "او یہودن کی بیٹی! ذرا سُننا" اس پر حضرت صفیہؓ کو سخت رنج ہوا اور اُنھوں نے رسولؐ اللہ سے شکایت کی۔ رسولؐ پاک نے انھیں مستقبل میں (حضرت عائشہؓ کو) یہ جواب دینے کے لیے کہا: "میرا باپ اللہ کا رسول ہارون ہے، میرا چچا پیغمبر مُوسٰی اور میرا شوہر محمدؐ رسول اللہ ہے، بھلا تم میں کون ایسی جامع صفات ہے۔" مگر حضرت عائشہؓ کو بھی خاموش کرنا آسان نہ تھا۔ انھوں نے فوراً کہا: "او یہودن کی بیٹی! یہ جواب تیرے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔" تاہم بعد میں وہ دونوں پکّی سہیلیاں بن گئیں۔ جب حضرت صفیہؓ بسترِ مرگ پر تھیں تو حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا اگر میری کسی بات سے تمھیں کبھی دُکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کر دو۔ حضرت صفیہؓ نے بھی موت سے قبل رسولؐ اللہ کی ان ازواجِ مطہرات سے جو اُس وقت بقیدِ حیات تھیں اپنے کہے سُنے کی معافی طلب کی۔ صفیہؓ بھی متعدد احادیث کی راوی ہیں۔ ان کا انتقال ۵۰ ہجری میں ہوا۔

۱۱۔ حضرت میمونہؓ

۳۵۱۔ میمونہؓ بنت الحارث کا تعلق نجد کے قبیلہ امیر ابن صعصعہ سے تھا۔ وہ حضرت زینبؓ ام المساکین کی سوتیلی بہن تھیں۔ وہ نو بہنیں تھیں اور سبھی کی شادی مختلف قبائل کے سرداروں سے ہوئی تھی۔ حضرت میمونہؓ بیوہ تھیں اور مکہ میں تھیں۔ جب رسولؐ اللہ، ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے وہاں گئے۔ ان دنوں حضرت زینبؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ممکن ہے رسولؐ اللہ قبیلہ امیر ابن صعصعہ اور ان تمام قبائل سے قریبی تعلقات قایم کرنا چاہتے ہوں جن کے سرداروں سے حضرت میمونہؓ کی بہنیں بیاہی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے ان دنوں اہلِ مکہ سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ صلح نامہ کے مطابق رسولؐ اللہ کو مکہ میں صرف تین دن قیام کرنا تھا۔ چنانچہ مقررہ مدت ختم ہونے کے بعد کفارِ مکہ کا ایک وفد رسولؐ اللہ کے پاس آیا اور مطالبہ کیا کہ رسولِ خدا مکہ سے چلے جائیں۔ رسولؐ اللہ نے اہلِ مکہ سے کہا "اگر میں کچھ دیر اور قیام کروں تو تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ میں نے ابھی شادی کی ہے اور میں پورے شہر کو دعوتِ ولیمہ میں مدعو کرنا چاہتا ہوں۔" مگر کفارِ مکہ نے کہا کہ وہ ضیافت کھانا نہیں چاہتے، رسولؐ اللہ نے اپنی سی کوشش کی مگر وہ کفارِ مکہ کو قائل نہ کر سکے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسولِ خدا پندرہ سو مسلح سپاہیوں پر مشتمل فوج کے ساتھ مکہ پر قابض تھے اور اہلِ مکہ اپنے گھر چھوڑ کر شہر سے باہر نواحی پہاڑیوں اور وادیوں میں جا چکے تھے۔ کوئی اور جرنیل ہوتا تو شہر پر مستقل قبضہ جما لیتا اور شہر کے سابق باسیوں کو واپس اپنے گھروں میں آنے کی اجازت نہ دیتا۔ لیکن وہ اللہ کے رسولؐ تھے جنھیں قرآن نے رحمۃٌ للعالمین کا لقب عطا کیا ہے، وہ بنی نوعِ انسان کے لیے کوئی معمولی مثال قایم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضرت میمونہؓ کا انتقال ۵۱ ہجری میں ہوا، وہ بھی متعدد احادیث کی راوی ہیں۔

۳۵۲۔ یہ رسولؐ پاک کی گیارہ ازواج مطہرات تھیں۔ وہ کا قبل ازیں انتقال ہو چکا تھا تاہم ایک وقت میں نبیؐ کی ازواج کی تعداد نو سے زیادہ نہیں رہی۔

رسولِ خدا کی عادات

۳۵۳۔ مختلف روایات متفق ہیں کہ رسولِ خدا جسم اور لباس کی طہارت و صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی، کبھی کبھار وہ بال بھی بڑھا لیتے تھے مگر وہ بالوں کو نہایت صاف ستھرا اور کنگھی سے سنوار کر رکھتے تھے۔

۳۵۴۔ وہ تیز تیز چلتے تھے حتّٰی کہ ان کے صحابہ کو ان کے ساتھ قدم ملانے میں وقت پیش آتی تھی۔ مگر وہ گفتگو نہایت آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ ایک راوی کے مطابق "نبیؐ اتنا ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے کہ ان کے ہر لفظ کا ایک ایک حرف بآسانی گنا جا سکتا تھا۔" چونکہ رسولؐ کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ قانون تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ کہیں، سننے والے اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ وہ سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے تھے، خواہ وہ کسی فرد سے گفتگو کر رہے ہوں یا مسلمانوں کے اجتماع سے خطاب کر رہے ہوں، ان کا طرزِ تکلم ہر طرح کے تصنّع سے پاک ہوتا تھا۔

۳۵۵۔ حضورؐ نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے جوتوں کی خود مرمت کرتے، اپنی بکریوں کا دودھ

دو ہتے اور اس کام کے لیے اپنے خادم کو تکلیف دینا بھی گوارا نہ کرتے۔ ان کے ذاتی خادم حضرت انسؓ کا کہنا ہے: "میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت اقدس میں گزارے، انھوں نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا یا کیوں کیا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے نہایت شفقت فرماتے تھے۔"

۳۵۶۔ رسول اللہؐ ننھے مُنّے بچوں سے بڑا پیار کرتے تھے اور جہاں کہیں بچوں کو دیکھتے خوش ہو جاتے اور بچوں کو ہنسانے کے لیے ان سے مذاق بھی کرتے۔ فطری طور پر وہ اپنے نواسوں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بھی بیحد محبت کرتے۔ بسا اوقات وہ نماز کے دوران بھی ان میں سے ایک کو بازوؤں میں اٹھا لیتے۔ جب وہ سجدہ میں جاتے تو نواسے کو پاس کھڑا کر لیتے اور سجدہ سے اُٹھ کر اسے پھر گود میں لے لیتے۔ جب دونوں بچے ذرا سیانے ہوئے تو وہ مسجد نبوی میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے، نماز باجماعت کے دوران کبھی کبھار وہ رسول اللہؐ کی ٹانگوں میں سے گزر جاتے، رسولِ خدا انھیں کچھ نہ کہتے۔

۳۵۷۔ اللہ کے رسولؐ ہر ایک سے مشفقانہ برتاؤ کرتے، حتیٰ کہ معمر خواتین ان سے لمبی لمبی بے سروپا باتیں بھی کرتیں مگر رسولِ خدا کوئی اکتاہٹ محسوس نہ کرتے۔ یہ خواتین اُنھیں بازو سے پکڑ کر ٹھہراتیں اور رسولِ خدا نہایت شفقت سے ان کی باتیں سنتے اور اپنا بازو بھی نہ چھڑاتے۔

۳۵۸۔ سفر کے دوران وہ قافلہ کے ہر فرد کے ساتھ رابطہ رکھتے اور بار بار لوگوں کے پاس جاتے تاکہ وہ خوش رہیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر وہ اپنے پرانے دوست حضرت جابرؓ کے پاس گئے جو اپنے بوڑھے اونٹ پر سوار جا رہے تھے۔ حضورؐ نے خود پر اس طرح سنجیدگی طاری کر لی کہ کوئی بھی دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا کہ نبیؐ مذاق فرما رہے ہیں ——— پھر انھوں نے جابرؓ سے پُوچھا "کیا تم اپنا اونٹ میرے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، مگر ایک شرط پر کہ میں اُونٹ مدینہ واپس جا کر آپ کے سپرد کروں گا۔" جابرؓ نے جواب دیا

"پر لوگے کیا؟"

"آپ بتائیے۔"

"ایک درہم میں بیچ گے؟" رسولِ خدا نے کہا

"اسے اللہ کے نبی! آپ مجھے لُوٹنا چاہتے ہیں۔" جابرؓ پکارا

"تو چلو دو درہم لے لو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تو تین، چار، پانچ۔" رسول اللہؐ نے قیمت بڑھائی اور بالآخر چالیس درہم تک پہنچ گئے اور حضرت جابرؓ رضا مند ہو گئے۔ پھر رسولِ خدا نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور قافلے میں کسی اور شخص سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔ مدینہ واپس پہنچ کر جابرؓ نے اپنی زوجہ سے تمام ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ کس طرح دورانِ سفر رسولِ خدا سے خوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نیک بخت کچھ زیادہ ہی محتاط تھی اور اس نے حضرت جابرؓ سے اصرار کیا کہ وہ رسول اللہؐ کی بات کو مذاق تصور نہ کریں بلکہ

اونٹ رسول اللہ کے گھر لے جائیں۔ جب رسول اللہ کو اطلاع ملی تو وہ مسکرائے اور انھوں نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ جابر کو چالیس درہم ادا کر دیے جائیں۔ رسول اللہ نے وہ اونٹ بھی بطور تحفہ دوبارہ جابر کے حوالے کر دیا۔ یہ اونٹ اس کے بعد بھی کئی سال تک حضرت جابرؓ کے پاس رہا۔ جب بھی جابر کو اس واقعہ کی یاد آتی اور وہ رسول پاک کے اس یادگار تحفے کو دیکھتے تو نبیؐ کی یاد میں کھو جاتے۔

۳۵۹۔ اللہ کے نبی جانوروں پر بھی بڑی شفقت فرماتے۔ ایک روز حضورؐ فوجی دستے کی معیت میں جا رہے تھے کہ ایک صحابی حضورؐ کے پاس کسی پرندے کے چند چھوٹے چھوٹے بچوں کو لایا، ان کی ماں بھی ساتھ تھی، رسولِ خدا نے اس سے پوچھا تو صحابی نے بتایا "میں نے ان بچوں کو ایک گھونسلے میں دیکھا، جونہی میں ان کے قریب گیا ان کی ماں پرواز کر گئی، میں نے تمام بچوں کو اپنے رومال میں لپیٹ لیا، جب میں چلا تو ان کی ماں بھی میرے سر پر منڈلانے لگی۔ میں نے رومال کو زمین پر کھول کر رکھ دیا تو ماں بھی بچوں کے پاس آ گئی اور میں نے اسے بھی بچوں کے ساتھ رومال میں لپیٹ لیا۔ اب یہ سب آپ کے سامنے ہیں۔" رسولِ خدا نے صحابی کو حکم دیا کہ وہ فی الفور واپس جائے اور بچوں کو ان کی ماں سمیت ان کے گھونسلے میں چھوڑ کر آئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ رسولؐ پاک نے فوج کے ہمراہ جاتے ہوئے ایک کُتیا کو دیکھا جس کے بچے ماں کا دودھ پی رہے تھے حضورؐ نے ایک سپاہی کو کُتیا کے پاس کھڑا کر دیا، اسے حکم دیا گیا کہ وہ ساری فوج گزرنے تک کُتیا کے پاس کھڑا رہے اور کسی کو اسے پریشان نہ کرنے دے۔

ایک روز مدینہ میں ایک اُونٹ بھاگتا ہوا آیا اور رسولؐ اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی چند افراد بھی وہاں پہنچ گئے جو اُونٹ کو پکڑنا چاہتے تھے۔ رسولِ خدا نے ان سے ماجرا پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ "اُونٹ بہت بوڑھا ہو گیا ہے اور اب وہ کنوئیں سے پانی کھینچنے کا کام نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہم اسے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔" رسولؐ اللہ کو اُونٹ پر رحم آ گیا۔ انھوں نے کہا "اسے چراگاہ میں چھوڑ دو، اس نے تمھاری طویل عرصہ تک خدمت کی ہے، اسے اب "پنشن" پر جانے کا حق ملنا چاہیے۔" اُونٹ کے مالک رسولؐ اللہ کی بات سے متفق ہو گئے اور اونٹ کو واپس لے گئے۔

۳۶۰۔ ایک اور سفر کے دوران حضورؐ چند دوستوں کی معیت میں تھے۔ اُنھوں نے صحرا میں ملنے والے ایک گڈریے سے بھیڑ خریدی۔ حضورؐ کے ایک رفیقِ سفر نے کہا "میں بھیڑ کو ذبح کر لیتا ہوں۔" تو میں اس کی کھال اتار دوں گا"۔ دوسرے صحابی نے ذمہ داری لی۔ تیسرے صحابی نے گوشت پکانے اور کھانا تیار کرنے کی ہامی بھر لی۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ کام اپنے ذمے لے لیا۔ تو رسولِ خدا نے کہا "میں جا کر خشک لکڑیاں اکٹھی کرتا ہوں۔" تمام صحابہؓ نے جو موجود تھے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! یہ کام بھی ہم سب کیے لیتے ہیں مگر رسولِ پاک نے فرمایا: "میں لکڑیاں ضرور لاؤں گا، یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ آپ سب لوگ تو کام کریں اور میں کوئی مدد نہ کروں۔"

۳۶۱۔ رسولؐ اللہ صحابہؓ سے مذاق بھی فرمایا کرتے تھے اور صحابہ اس سے لُطف اٹھاتے۔ حضورؐ کا ایک سادہ لوح سا صحابی تھا جو کوئی زیادہ خوش رُو نہ تھا۔ ایک دن رسولؐ اللہ نے اسے مدینہ کے بازار میں جاتے دیکھا حضورؐ دبے پاؤں پیچھے سے اس کے پاس گئے، اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور بولے: "کیا کوئی یہ غلام خریدنا چاہتا ہے۔" صحابی نے گردن موڑ کر دیکھا کہ اسے

کس نے بازوؤں میں لے رکھا ہے۔ رسولؐ اللہ کو دیکھ کر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے اپنی پشت حضورؐ کے سینے کے ساتھ زور سے لگاتے ہوئے کہا "یارسولؐ اللہ! اس غلام کی فروخت سے آپ کو کچھ زیادہ رقم نہیں ملے گی۔" رسولؐ اللہ نے اسے چھوڑ دیا اور بولے "مگر خدا کی نظروں میں تمھاری قدر وقیمت بہت زیادہ ہے۔"

۳۶۲ - ایک روز ایک اجنبی رسولؐ اللہ کے پاس آیا۔ رسولِ خدا نے اسے کھلایا پلایا اور رات گزارنے کے لیے بستر بھی دیا۔ وہ کوئی نادان دشمن تھا، اس نے بستر خراب کر دیا اور علی الصبح چلا گیا۔ یُوں وہ اللہ کے رسولؐ سے اپنی تصوراتی دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ کچھ دُور جا کر اسے احساس ہوا کہ وُہ اپنی تلوار تو رسولؐ اللہ کے گھر میں ہی چھوڑ آیا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آیا اس نے دیکھا کہ اللہ کا رسولؐ اسی بستر کو اپنے دستِ مبارک سے دھو رہا ہے۔ جب رسولِ پاک نے "مہمان" کو دیکھا تو انھوں نے اس کی تلوار اٹھا کر اس کے حوالے کر دی، انھوں نے اجنبی کو ملامت تک نہ کی۔ اگرچہ بدو پر حضورؐ کے اس اخلاق کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے رسولؐ اللہ سے معافی طلب کی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

۳۶۳ - ایک روز مسجد میں رسولِ خدا نے ایک شخص کو دیکھا جس کی ڈاڑھی اُلجھی ہوئی تھی اور سر کے بالوں میں کنگھی تک نہیں کی گئی تھی۔ رسولؐ اللہ نے اسے مسجد سے باہر جا کر ہاتھ مُنہ دھونے اور بالوں میں کنگھی وغیرہ کرنے کو کہا۔ جلد ہی وہ حجام کی دکان سے واپس آیا تو رسولؐ پاک نے کہا "کسی خوفناک شیطان کی مانند نظر آنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے؟" ایک اور موقع پر رسولؐ پاک نے ایک مسلمان کو نہایت خستہ حالت میں دیکھا۔ اس کے کپڑے پھٹے ہُوئے تھے اور بدن پر جھول رہے تھے۔ جب رسولؐ اللہ نے اس سے ایسی حالت کا سبب پُوچھا تو اس نے بتایا "یارسولؐ اللہ! میں کوئی غریب شخص نہیں اللہ نے مجھے کافی دولت دی ہے مگر میں سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہُوں اور خود جھُوٹے مُوٹے پر اکتفا کرتا ہُوں۔" اس پر رسولؐ اللہ نے کہا "یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو جن نعمتوں سے نوازا ہے وہ بندے کو ان نعمتوں سے مستفید ہوتے دیکھنا بھی پسند کرتا ہے۔"

۳۶۴ - رسولؐ پاک کی ایسی بامعنی اور روحانی اصلاح کرنے والی باتوں پر دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر اوپر جو بیان ہوا ہے اس سے رسولِ خدا کی بہترین انسانی صفات اور ان کے مثالی معاشرتی رویہ کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

باب ۱۳

دورِ نبویؐ کا معاشرہ

۳۶۵ - آج کی اقوام درحقیقت ماضی کے قبائل ہیں۔ رسولِ خدا کے دور میں قبیلہ ہی معاشرہ کا فیصلہ کُن عنصر تھا جسب نسب انسان کی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ پاسپورٹ اور قانونِ وقت تھا۔ ہر جگہ، ہر محفل میں قبیلہ ہی تسلیم شدہ حقیقت تھی اور فرد اپنے رہائشی علاقہ کے بجائے قبیلہ کے حوالے سے ہی پہچانا جاتا تھا۔ ان کی سوچ بالکل منطقی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ زمین انسان کے لیے ہے، انسان زمین کے لیے تخلیق نہیں کیا گیا۔

۳۶۶ - قبائل دو قسم کے تھے: ایک وہ جو مختلف علاقوں میں آباد تھے اور دُوسرے وہ جو خانہ بدوش تھے۔ آباد قبائل تہذیب یافتہ تھے جبکہ خانہ بدوش ابھی تہذیب کی روشنی سے آشنا نہیں تھے۔ شروع میں تو تمام قبائل خانہ بدوش ہی رہے ہوں گے تاہم جن قبائل کو ایسے خطے میسر آ گئے جہاں وافر مقدار میں پانی اور سدا بہار چراگاہیں موجود تھیں، تو انھیں مزید صحرا نوردی کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ یہی دُو چیزیں ——— پانی اور چراگاہ ——— ان کی بنیادی ضرورت تھیں۔ انہی پر ان کی زندگی کا انحصار تھا، وہ خانہ بدوش اسی لیے تھے کہ جب ایک جگہ سے پانی یا چراگاہ ختم ہو جاتی تو وہ قُوتِ لایموت کی تلاش میں چل نکلتے۔ جن قبائل کو صحرائے عرب میں پانی اور مستقل چراگاہ نصیب نہ ہوئی، وہ صحرا نوردی پر مجبور رہتے۔ سرسبز وادیوں میں آباد اور صحراؤں کی خاک چھاننے والے دونوں قسم کے قبائل کے پاس مویشیوں کے گلّے تھے، ان میں بالعموم اونٹ اور بھیڑ بکریاں شامل ہوتی تھیں۔ مگر وادیوں میں آباد قبائل نسبتاً زیادہ خوشحال تھے۔ وہ پانی کی بدولت کھیتی باڑی کرتے، اناج اگاتے اور کھجوروں کے درخت بھی لگاتے تھے۔

۳۶۷ - یہ ضروری نہیں کہ ایک قبیلہ ہی کسی جگہ آباد ہو یا سارا قبیلہ ہی خانہ بدوش اور صحرا نورد ہو بلکہ ایک ہی قبیلہ کے بعض خاندان تو آباد تھے اور بعض صحرا نوردی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ میں خود ۱۹۴۶ء میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دورِ نبویؐ کا مشہور قبیلہ قریش (جو مکّہ میں آباد تھا) آج بھی مکّہ کے گرد و نواح میں موجود ہے اور ابھی تک خانہ بدوش اور بدوی زندگی گزار رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ممتاز مورخ علامہ البلاذری (صاحب انساب الاشراف) نے اپنی کتاب میں بنو قریش کی جو دو اقسام قریش البطا (وہ قریشی جو نخلستانوں میں آباد ہو گئے تھے) اور قریش الظواہر (خانہ بدوش) بیان کی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔

۳۶۸ - کسی بھی قبیلہ میں خواہ وہ آباد ہو یا خانہ بدوش، تمام افراد ایک ہی جد امجد کی اولاد نہیں ہوتے تھے۔ ان میں غلام اور لونڈیاں اور دیگر قبائل سے بیاہ کر لائی جانے والی لڑکیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ ان "فطری بیگانوں" کے علاوہ قبائل میں کچھ اور لوگ بھی آ شامل ہوتے تھے، عرب فطرةً بڑے مہمان نواز ہیں۔ چنانچہ کوئی عرب اپنے مہمان کو یا کسی ایسے شخص کو

جو اس کی پناہ میں آ جائے اُس (پناہ گزین) کے دشمنوں کے سپرد کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کی انا یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی پناہ میں آنے والوں کو نکال باہر کرے۔ چنانچہ "سیاسی پناہ" صحرائے عرب میں ایک مقدس اقدام تھا جسے واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اور عرب اپنی پناہ میں آنے والوں پر جان قربان کرنا فخر تصور کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے "غیر قبائلی" بھی اپنے دشمنوں سے بچنے کے لیے کسی قبیلہ میں سیاسی پناہ حاصل کر لیتے تھے اور پھر اُسی قبیلے کے ہو جاتے تھے۔ یہ سیاسی پناہ گزین (حلیف یا قبیلہ کی پناہ میں آنے والے دوسرے لوگ ہر قبیلہ میں ——— خواہ وہ خانہ بدوش تھا یا آباد ——— پائے جاتے تھے۔ وہ اپنے میزبان قبیلے میں شادی بھی رچا سکتے تھے اور یوں بتدریج اسی قبیلہ کا حصہ بن جاتے تھے۔ مکہ اور طائف میں ایسے پناہ گزینوں کی تعداد کافی تھی مگر مدینہ بھی اس شعبہ میں دوسرے شہروں سے پیچھے نہ تھا۔

۳۶۹۔ یہ عجیب بات ہے کہ مدینہ صحرائے عرب کے شمال میں واقع ہے مگر مدینہ کے باسیوں کی اکثریت کا تعلق جنوبی عرب سے تھا اور وہ یمن سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے جبکہ مکہ اور طائف میں آباد قبائل اپنے اسلاف کو شمالی عرب کا باسی بیان کرتے تھے۔ اگرچہ شمالی اور جنوبی عرب کے ان باشندوں کے درمیان اختلافات اور قبائلی تعصبات موجود تھے مگر وہ سب ایک ہی زبان ——— عربی ——— بولتے تھے۔ پھر دونوں فریقوں میں باہم شادی بیاہ اور رشتے ناطے عام تھے جن کی وجہ سے قبائلی رقابتوں میں کمی ہو رہی تھی۔

۳۷۰۔ صحرائے عرب میں مقامی بولیاں بھی تھیں مگر ان کا تعلق الفاظ کے تلفظ سے تھا۔ چونکہ عام عرب اَن پڑھ اور جاہل تھے لہذا ظہورِ اسلام سے قبل کے دور میں دستاویزات ناپید ہیں۔ البتہ اس دور کی بعض پتھروں پر کھُدی ہوئی عبارتیں ملتی ہیں۔ ظہورِ اسلام کے بعد کے مورخوں نے قبل از اسلام کی بعض نادر تحریریں فراہم کی ہیں جو اگرچہ تقریباً مبہم اور ناقابلِ فہم ہیں میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں: عظیم شاعر امراۃ القیس جس نے بازنطینی شہنشاہ جسٹنین کے پاس پناہ حاصل کر رکھی تھی اور جس کا انتقال[1] انقرہ میں ہوا تھا، اس زبان سے نابلد تھا جو سبعہ معلقات[2] کعبہ میں استعمال کی گئی ہے۔ امراۃ القیس یمن کے علاقہ کندہ کے حکمران کا بیٹا تھا۔ کندہ پر جب حبشہ والوں نے فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا تو امراۃ القیس فرار ہو کر انقرہ پہنچ گیا۔ یمن کے گورنر ابرہہ نے جو شاہِ حبشہ کا ماتحت تھا، مارب کے بند پر ایک تحریر چھوڑی ہے جو یمنی زبان میں ہے حبشہ کی زبان میں نہیں۔ اب یہ شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ تحریر اس عربی میں ہرگز نہیں جو عربی سبعہ معلقات میں استعمال کی گئی ہے جو امراۃ القیس کے قصائد تصور ہوتے ہیں۔

---

[1] ایک معروف روایت کے مطابق امراۃ القیس کو انقرہ میں قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ شہنشاہ جسٹنین کی لڑکی اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ شاہ اس بات کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے عظیم شاعر کو قتل کرا دیا۔

[2] "سبعہ معلقات" سات قصیدے تھے جو انتہائی فصیح عربی میں لکھے گئے تھے۔ روایت ہے کہ یہ قصیدے امراۃ القیس نے لکھے تھے۔ انھیں کعبہ میں لٹکایا گیا تھا تاکہ کوئی اور ان کا جواب پیش کر سکے۔ (مترجم)

۳۷۱ - عربوں میں ثقافت کے تمام فطری آثار موجود تھے، وہ شاعری سے آشنا تھے - ضرب الامثال ان میں عام تھیں، لوک کہانیاں، مقامی تاریخ کے واقعات جو زبانی بیان کیے جاتے اور ایسی ہی دیگر چیزیں ان میں موجود تھیں - تحیّر خیز بات یہ ہے کہ ظہورِ اسلام سے قبل ہی گرامر اور شعروں میں ردیف و قافیہ مکمل طور پر ترقی یافتہ شکل میں موجود تھے اور گزشتہ چودہ سو سال میں ان میں عملی طور پر کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوئی - قرآن حکیم نے عربی زبان، گرامر، ہجوں اور تلفظ کو ایک معیار بخشا - قرآن کی زبان بالکل ویسی ہے جیسی زبان ہم عربی اخبارات و جرائد میں پڑھتے ہیں یا عالمِ عرب کے ریڈیو کی نشریات میں سنتے ہیں - یہ بات اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ عربی جاننے والا ہر شخص قرآن حکیم کی زبان سمجھ سکتا ہے اور دوسری قدیم یا جدید زبانوں یونانی، عبرانی، سنسکرت اور انگریزی وغیرہ کی کتابوں کی طرح قرآن پاک کے معانی کو سمجھنے کے لیے دُور از کار مفروضوں یا قیاس آرائیوں پر انحصار کی ضرورت نہیں - ظاہر ہے ایک ابدی دین اور ایک ایسے رسولؐ کی تعلیمات کے لیے جس کے بعد کوئی اور نبی پیدا نہیں ہوگا، ایسی ہی ابدی اور مستقل زبان کی ضرورت تھی -

معاشرتی آداب

۳۷۲ - اُس وقت کوئی تربیتی سکول تو تھے نہیں، چنانچہ خاندان کی بڑی بوڑھیاں ہی بوقتِ ضرورت دایہ کا کام انجام دیتی تھیں اور یہ فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتیں - جونہی بچہ تولد ہوتا گھر کا کوئی مرد ——— بسا اوقات خود رسولِ خدا ——— اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہتا (ان دونوں میں توحید و رسالت کے اعلان کے ساتھ دونوں جہانوں میں فلاح کے لیے اللہ کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے) اس طرح جو پہلی آواز نومولود کے کان میں پڑتی ہے، ایک اچھا مشورہ ہوتا ہے - ممکن ہے یہ رسم زمانہ جاہلیت کی کسی اسی نوع کی رسم کی برگزیدہ شکل ہو تاہم اس سلسلے میں کوئی روایت نہیں ملتی -

۳۷۳ - مدینہ میں نومولود کو ماں کے دودھ سے قبل کھجور چبا کر بھی دی جاتی تھی اور کبھی شہد چٹایا جاتا تھا -

۳۷۴ - بچّے کا نام رکھنے کے ضمن میں بھی ایک مختصر سی تقریب منعقد ہوتی - گو اس موقع پر رکھا گیا نام بعد میں تبدیل کیا جا سکتا تھا یا اس کے آگے پیچھے اضافہ کیا جا سکتا تھا - بالعموم ہر عرب بچے یا بچی کو اس کے باپ کے نام پر پکارا جاتا تھا، مثلاً اے فلاں کے بیٹے، یا او فلاں کی بیٹی - بچّے کا اصل نام شاذ ہی استعمال کیا جاتا تھا - پھر عربوں میں کنیت کا رواج تھا، مثلاً اے فلاں کے والد، یا اے فلاں کی ماں - ضروری نہیں تھا کہ شادی کے بعد یا اولاد ہونے کے بعد ہی کسی کو فلاں کے باپ یا فلاں کی ماں کہہ کر پکارا جائے، بلکہ اوائل عمر میں بچّوں کو بھی اسی طرح پکارا جاتا تھا - عموماً کنیت پہلے بیٹے کے نام سے رواج پاتی تھی - لڑکی کے نام پر کنیت خال خال تھی - مثال کے طور پر حضرت عمرؓ کو ابو حفصہؓ کہہ کر پکارا جاتا تھا (حفصہؓ ان کی بیٹی تھیں جو رسول اللہ سے بیاہی ہوئی تھیں) گو حضرت عمرؓ کے لڑکے بھی تھے مگر ان کی کنیت ان کی ذی قدر بیٹی کے نام پر رواج پائی - بعض فرضی کنیتیں بھی موجود تھیں، مثلاً حضرت علیؓ کو بوتراب (مٹی کا باپ) کی کنیت خود حضورؐ پاک کی طرف سے ودیعت ہوئی - رسول اللہؐ نے ایک روز حضرت علیؓ کو زمین پر سوتے دیکھا - ان کا بدن مٹی سے لتھڑا ہوا تھا - اس پر رسولؐ نے انھیں "بوتراب" کہہ کر پکارا تھا - اسی طرح رسولؐ اللہ کے ایک صحابی کو ابوہریرہؓ

(بلّی کا باپ) کہا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ ابوہریرہ ایک روز جنگل سے ننھی مُنّی سی بلّی پکڑ لائے اور اسے پالنے لگے۔ ان کے اہلِ خاندان، دوستوں یاروں اور ملنے والوں نے انھیں ابوہریرہ کہنا شروع کر دیا۔ یہ کنیت اتنی مقبول ہوئی کہ بالآخر خود ابوہریرہ بھی اپنا اصلی نامؐ ترک کر کے خود کو ابوہریرہ ہی کہنے لگے۔ اگر کسی کو کسی دوسرے شخص کے باپ کا نام معلوم نہ ہوتا تو اسے بلانے کے لیے وہ اس کے قبیلہ کا نام استعمال کرتا، مثلاً "اے قریش کے بیٹے" یا "اے قریش کی بیٹی" کبھی کبھار "اے قریش کے بھائی" یا "اے قریش کی بہن" کو کر بھی پکارا جاتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ مخاطب کسی قبیلہ کے جدامجد کا کوئی حقیقی بھائی یا بہن ہے۔ قرآن پاک میں کنواری مریم کو "عمران کی بیٹی" اور "ہارون کی بہن" کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ ہارون عمران کا بیٹا تھا اور وہ حضرت مریم کا بھائی نہیں بلکہ ان کے اسلاف میں سے تھا۔

۳۷۵۔ عرب میں بچّوں کے نام محض خیالی یا مادی اجسام کے نام پر بھی رکھے جاتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی گو اس دستور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تاہم دینی وجوہ کی بنا پر بعض نام متروک قرار پائے۔ ظاہر ہے اسلام میں عبدالشمس (سورج کا پجاری) عبدالکعبہ (کعبہ کا پجاری) عبدالجن (جن کا پُوجنے والا) جیسے نام برداشت نہیں کیے جا سکتے تھے حتیٰ کہ عبدالمحمد جیسا نام بھی رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ رسول اللہؐ نے ناموں میں معاشرتی اور جمالیاتی حس کی بنا پر تبدیلی کی سفارش کی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں میں ظالم، غاوی، کلب (کُتّا) وغیرہ نام جو ان دنوں عام تھے، رکھنے کی سختی سے ممانعت کر دی (نبی خدا نے اسی بنا پر بعض علاقوں کے نام بھی تبدیل کر دیے تھے) درختوں، پتھروں اور جنگلی جانوروں کے نام پر رکھے جانے والے نام مباح قرار پائے، جو زمانہ قبل از اسلام میں بھی مروّج تھے۔ ان ناموں میں طلحہ، سمورہ، عوسجہ، ثمامہ اور ہرملہ مختلف درختوں اور پودوں کے نام ہیں۔ اسد، بکر، ثعلبہ اور ارقم جانوروں کے نام ہیں۔ اور حجر کے معنی پتھر ہیں۔

عقیقہ

۳۷۶۔ بچّہ تولّد ہونے کے چند روز یا چند ہفتے بعد اس کا سر پہلی بار منڈوایا جاتا۔ اس موقع پر خاندان والوں کی دعوت بھی کی جاتی تھی۔ ایک بھیڑ ذبح کی جاتی اس کا کچھ گوشت تو مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا اور باقیماندہ دعوت کے لیے استعمال ہوتا۔ بچّے کے بالوں کے برابر چاندی (بعض صورتوں میں سونا) خیرات کی جاتی۔ ظہورِ اسلام سے قبل اس موقع پر ذبح کیے جانے والے جانور کا خون بچّے کے سر پر ڈالا جاتا مگر اسلام میں اس کی ممانعت کر دی گئی، تاہم اس کی جگہ بچّے کے سر پر کوئی خوشبو خصوصاً زعفران مل دی جاتی۔ (دیکھیے ابوداؤد اور مالک)

۳۷۷۔ بچّوں کی ایک اور رسم جو صرف لڑکوں کے لیے ہے ختنہ ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں تاہم یہ رسم اوائل عمر میں ہی ادا کی جاتی ہے جب بچّے کو ابھی برہنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ انجیل کے مطابق یہ رسم حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی اطاعت و رضا کے معاہدہ کی علامت کے طور پر جاری کی تھی۔ مگر اسلام تو کیا ظہورِ اسلام سے ماقبل کی

لہ حضرت ابوہریرہ کا اصل نام عبداللہ اور کنیت ابوعمر تھی۔ مگر ان کا لقب ابوہریرہ اس قدر مشہور ہوا کہ ان کا نام اور کنیت اس کی شہرت کی گرد میں دب گئے اور ابوہریرہ ہی ان کی کنیت ٹھہری۔ (مترجم)

عربی لوک کہانیوں میں بھی اس کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اسے صحت و صفائی کے ضمن میں ایک اقدام تصور کیا جاتا ہے۔

۲۷۸۔ دورِ اسلامی میں بعض دوسری رسوم بھی موجود تھیں۔ مثلاً جب بچہ لکھنا پڑھنا شروع کرتا یا پہلی بار قرآن پاک ختم کرتا یا بچہ پہلی بار روزہ رکھتا اور دیگر ایسے ہی مواقع پر خاندان میں تقریبِ مسرت منعقد کی جاتی (فطری طور پر ختمِ قرآن وغیرہ کی تقریب رسولِ خدا کی حیاتِ طیبہ کے بعد ہی شروع ہوئی ہو گی کیونکہ رسول اللہؐ کے دور میں تو قرآن پاک کا نزول تقریباً آخر وقت تک جاری رہا ہے)۔

۲۷۹۔ شادی نہ صرف متعلقہ خاندان بلکہ معاشرہ کے لیے سب سے اہم تقریب ہوتی ہے۔ زمانہ ماقبل اسلام کے عرب میں بھی شادی کی پُر مسرت تقریب منائی جاتی تھی۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی یہ تقریب بدوؤں اور شہری خاندانوں میں بدستور رائج رہی۔ اس ضمن میں خود رسولِ خدا کی زندگی کے بعض واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں: ایک روز طائف سے ہجرت کر کے آنے والے ایک مسلمان المغیرہ ابن شعبہ نے رسول اللہؐ کو بتایا کہ اس نے مدینہ کی ایک لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ رسول اللہؐ نے مغیرہ سے پوچھا "کیا تم نے لڑکی کو دیکھ رکھا ہے؟" مغیرہ نے نفی میں جواب دیا تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا "شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لو کیونکہ بعد میں پچھتانے کی نسبت یہ (لڑکی کو دیکھنا) کہیں بہتر ہے۔" رسولؐ کے ایک صحابی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے اس صحابی نے ایک لڑکی کو چوری چھپے دیکھ لیا تھا مگر لڑکی کو اس کا علم نہ تھا اور بعد میں صحابی نے اس لڑکی سے شادی کی تجویز پیش کی۔

۲۸۰۔ مدینہ میں پیشہ ور گانے والی لڑکیاں (غالباً لونڈیاں) موجود تھیں جو دف اور جھانجھ بھی بجاتی تھیں۔ ایک روز ایک گانے والی لڑکی نے رسول اللہؐ کو آتے دیکھ لیا تو اس نے وہ نظم جو وہ گا رہی تھی ——— یہ نظم کسی جنگ کے سورماؤں کے بارے میں تھی ——— چھوڑ دی اور بولی "اور ہم میں ایک پیغمبر موجود ہے جو بتا سکتا ہے کہ کل کیا ہو گا۔" اس پر رسول اللہؐ نے لڑکی سے کہا "یہ نہیں وہی گاؤ جو تم پہلے گا رہی تھیں۔" روایت ہے کہ دُلہن کے دُولہا کے گھر جاتے وقت رات کو مشعل بردار جلوس نکالا جاتا تھا۔ ایک روز رسولِ خدا نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت عائشہؓ کو بتایا "میں تمہارے عم زاد کی شادی میں شریک تھا مگر وہاں موسیقی نہ تھی، کیا بات ہے؟ مدینہ کے باسی تو موسیقی کو پسند کرتے ہیں۔"

۲۸۱۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دُلہنوں کا میک اپ کیا جاتا تھا، اُن کے ہاتھ پاؤں پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے اور انھیں خوشبو میں بسایا جاتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دارم کا پودا رسول اللہؐ کے دور میں مکہ یا مدینہ میں متعارف ہو چکا تھا یا نہیں۔ ماہر نباتیات الدینوری کے زمانے میں خواتین اپنے ہونٹوں کو سُرخ کرنے کے لیے دارم کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مسواک استعمال کرتی تھیں۔ چنانچہ متعدد عشقیہ نظموں میں دارم سے سُرخ کیے گئے لبوں کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں۔ دُلہنوں کی طرح دُولہوں کو بھی سنوارا اور سجایا جاتا تھا اور انھیں بھڑکیلے رنگوں کا لباس پہنایا جاتا تھا۔ بہت سے لوگ، رشتہ دار، دوست اور احباب شادی میں شریک ہوتے اور دعوتِ ولیمہ میں شرکت کرتے جو شادی کے بعد ہوتی۔ شادی عموماً دُلہن کے گھر میں ہوتی

اس تقریب کے ضمن میں مسجد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ گو دُلہن شادی کے وقت سامنے نہیں آتی تھی مگر اس کے قریبی رشتے دار باپ، چچا، ماموں یا بھائی اس کی رضامندی حاصل کرتے تھے۔ اس موقع پر نکاح خواں خطبہ پڑھتا۔ وہ دُلہن اور اس کے اہل خاندان کی رضامندی بھی حاصل کرتا۔ وہ دُولہا کی رضامندی (ایجاب و قبول) بھی حاصل کرتا۔ اس موقع پر کم از کم دو گواہوں کی موجودگی ناگزیر تصور کی جاتی۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ اُن دنوں مدینہ میں شادی کی کوئی تحریری دستاویز تیار کی جاتی تھی۔ رسولِ خدا نے مسلمانوں کی شادی کے لیے مہر ضروری قرار دے دیا تھا جو صرف اور صرف دُلہن کا حق ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام میں بیوی کی جائداد علیحدہ رہتی ہے اور شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ لہٰذا مہر کسی حد تک بلا جواز طلاق کی راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ نکاح خواں کی طرف سے نکاح کے خاتمہ اور نئے جوڑے کے لیے دعائے خیر کے بعد یہ رسم تھی کہ دُولہا کے اُوپر سے اور آس پاس چھوہارے، مصری کی ڈلیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں پھینکی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسولؐ خدا کی موجودگی میں جب چھوہارے وغیرہ پھینکے گئے تو بعض لوگوں نے اُنھیں "لُوٹنے" میں حصہ نہ لیا۔ چنانچہ رسولؐ اللہ نے خود بڑھ کر چھوہارے "لُوٹے" اور یوں ذاتی مثال پیش کر کے اس پُرمسرت تقریب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ رسولِ خدا نے شادی کے بعد دُولہا کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کی پُرزور سفارش کی ہے۔ ولیمہ عموماً دُلہن کے شوہر کے گھر پہنچنے کے بعد اگلی صبح کو منعقد ہوتا ہے۔

۳۸۲۔ فطری طور پر بچّے کی پیدائش بھی پُرمسرت تقریب کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس موقع پر بچّے کے لیے اس کی جنس کی مناسبت سے کھلونے بطور تحفہ دیے جاتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی جب شادی ہوئی اور وہ رسولؐ اللہ کے گھر آئیں تو اپنے کھلونے بھی ساتھ لائیں۔ ان میں پروں والے گھوڑے بھی تھے۔ جب کبھی لڑکیاں حضرت عائشہؓ سے ملنے آتیں تو وہ یہ گھوڑے ان کو دکھایا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ رسولِ پاک نے حضرت عائشہؓ کو یہ گھوڑے لڑکیوں کو دکھاتے ہوئے دیکھ لیا اور پوچھا "کون سے گھوڑوں کے پر ہوتے ہیں؟" حضرت عائشہؓ نے فوراً جواب دیا "آپ تو رسولؐ ہیں، آپ کو علم نہیں کہ سلیمان کے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے۔" ——— غالباً مٹّی سے اشیا بنانے کی صنعت اس دَور سے پہلے بھی موجود تھی ——— لڑکوں کو تحفے میں چھوٹی چھوٹی کمانیں اور تیر دیے جاتے تھے۔ مدینہ میں کرک ——— ایک قسم کا گیند جو کپڑے وغیرہ سے بنایا جاتا تھا ——— کا ذکر ملتا ہے۔ اس دور کا ایک مقبول کھیل درکالہ (نیزہ بازی) تھا۔ کشتی، پیراکی، مردوں کی دوڑ، گھڑ دوڑ، اونٹوں اور غالباً گدھوں کی دوڑ بھی اُس دَور کے مقبول کھیل تھے۔ عیدین کے موقع پر حبشی لڑکوں کا ناچ جو وہ نیزے پکڑ کر کرتے تھے، اتنا مقبول تھا کہ خود ازواجِ مطہراتؓ بھی یہ ناچ دیکھا کرتی تھیں۔

۳۸۳۔ حضورؐ انور اپنی خوراک میں ثرید (ایک طرح کا حلیم) بیحد پسند فرماتے تھے۔ وہ بُھنا ہوا گوشت بھی رغبت سے کھاتے۔ اُس دور کے کھانوں میں شتر مُرغ کے انڈوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو جنگل میں ملتے تھے۔ ساحلِ سمندر پر آباد افراد مچھلی بھی کھاتے تھے مگر خشک مچھلی کے سوا مدینہ جیسی اندرونِ ملک آبادی میں تازہ مچھلی کا ذکر نہیں ملتا۔ خشک گوشت بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ قربانی کے موقع پر اگر پُورا گوشت استعمال میں نہ آتا تو باقی ماندہ گوشت دُھوپ میں خشک کر لیا جاتا۔ اور یوں یہ کافی عرصہ تک استعمال کے قابل بن جاتا۔ نبیؐ سرکہ بھی پسند فرماتے تھے۔ رسولؐ اللہ کی زندگی میں زیتون اور پنیر کے استعمال کا

ذکر بھی کیا گیا ہے۔

۳۸۴۔ معمر افراد کے بالوں کو رنگنا ظہورِ اسلام سے قبل ہی عربوں میں رائج تھا۔ یمن کی زرخیز سرزمین ایک طرح کا سیاہ رنگ پیدا کرتی تھی جو رسول اللہؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کی زندگی میں زیرِ استعمال تھا۔ ایک پودے کُتم کے پتوں سے سُرخ رنگ پیدا ہوتا تھا۔ ان پتوں سے بال رنگے جا سکتے تھے۔ خواتین حنا سے اپنے ہاتھوں پر نقش و نگار بناتی تھیں۔ انگوٹھیاں، بازوبند، نکلس (ہار)، بُندے اور متعدد دوسرے زیورات خواتین میں مستعمل تھے۔

۳۸۵۔ مدینہ میں ایک ریس کورس تھا جہاں عام طور پر بیرونجات سے آنے والے قافلے قیام کرتے تھے۔ جس مقام پر بیٹھ کر رسولِ خدا یہاں گھڑ دوڑ دیکھا کرتے تھے اس جگہ اب مسجد السباق موجود ہے۔

۳۸۶۔ عرب میں جو سالانہ میلے ہوتے تھے وہ محض تجارتی منڈیاں نہ تھے بلکہ ان میں عوامی دلچسپی کے متعدد پہلو بھی تھے۔ مکہ کے قریب عُکاظ میں جو سالانہ میلہ لگتا تھا وہ خاص طور پر پورے عرب میں مشہور تھا۔ اس میلہ میں بڑے بڑے شعرا شریک ہوتے تھے جو اپنی برجستہ اور فی البدیہہ نظموں سے سامعین کو مسحور کرتے۔ شعلہ بیان مقرر لوگوں کو اپنی شعلہ نوائی سے محظوظ کرتے اور زبان دانی کے جوہر دکھاتے۔ اس میلہ میں اُس دَور کی بین الاقوامی عدالت کا اجلاس بھی ہوتا جس میں دُور دراز علاقوں سے آنے والے لوگ اپنے مقدمات پیش کرتے تاکہ ان کا غیر جانبدارانہ فیصلہ ہو سکے۔ کاہن اور نجومی لوگوں کی قسمت کا حال بتا کر اپنی روزی کماتے۔ وہ دوسروں کے مستقبل کا حال بیان کرتے، گو انھیں اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کے بارے میں خاک علم نہ ہوتا۔

۳۸۷۔ موت کے موقع پر بھی بعض رسوم منائی جاتیں۔ اس روز لوگ ہمیشہ کے لیے جُدا ہونے والے عزیز یا دوست کو آخری خراجِ عقیدت پیش کرتے۔ میّت کو کئی بار نہایت احتیاط سے غسل دیا جاتا۔ کپڑے کے متعدد ٹکڑوں پر مشتمل کفن پہنایا جاتا اور نمازِ جنازہ ادا کی جاتی۔ اگر مرنے والا قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوتا اور اس کا ترکہ اتنا نہ ہوتا کہ اس سے قرض بے باق ہو سکے تو رسولِ خدا ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیتے۔ وہ ہر مسلمان کی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، نمازِ جنازہ خود پڑھایا کرتے تھے۔ نمازِ جنازہ کے بعد میّت زمین میں دفن کی جاتی۔ تدفین کے بعد قبر پر دعا مانگی جاتی جس میں مرنے والے کو تلقین کی جاتی کہ اسے دُوسری دنیا میں نئی زندگی کا کیسے سامنا کرنا ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جونہی کسی مسلمان کو مرنے کے بعد قبر میں دفن کیا جاتا ہے دو فرشتے (مُنکر نکیر) قبر میں آتے ہیں اور مرنے والے سے مذہب اور یومِ قیامت کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ چنانچہ مرنے والے کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ان فرشتوں کو بتائے کہ خدائے واحد اس کا معبود ہے، محمدؐ اس کا رسول ہے، قرآن اس کی کتاب ہے، کعبہ اس کی سمتِ نماز ہے، وہ یومِ حشر پر یقین رکھتا ہے اُس کا یومِ قیامت، دوزخ اور جنت پر بھی ایمان ہے۔

۳۸۸۔ مکہ اور مدینہ میں چند سال بعد قبریں ہموار کر دی جاتی ہیں اور پھر اسی جگہ از سرِ نو تدفین عمل میں لائی جاتی ہے۔ چنانچہ قبرستان زیادہ پھیلنے نہیں پاتے۔ گزشتہ چودہ صدیوں سے ان دونوں مقدس شہروں میں ایک ایک قبرستان ہی چلا آ رہا ہے۔ جب سے کعبۃ اللہ کو مسلمانوں کے لیے نماز کی سمت قرار دیا گیا ہے، دنیا بھر میں مسلمان مُردوں کو دفن کرتے وقت بائیں شانے کی طرف سے ذرا بلند کر کے لحد میں رکھتے ہیں تاکہ مرنے والا قبلہ رُو رہے۔ چنانچہ مختلف ممالک میں قبروں کے لیے

رخ سمت مختلف ہے۔ مدینہ کے قبرستان میں قبر مشرق سے مغرب کو کھودی جاتی ہے کیونکہ یہاں سے کعبۃ اللہ جنوب میں ہے۔ لیکن اس قبرستان میں پہلی صدی ہجری کے اوّلیں دنوں کی چند قبریں موجود ہیں، جب کعبہ کو ابھی نماز کی سمت متعین نہیں کیا گیا تھا جو شمالاً جنوباً ہیں (تاکہ مرنے والے کا رُخ مشرق میں چڑھتے سورج کی طرف رہے؟)

۳۸۹۔ رسول اللہ کی تجویز کے مطابق ہی جس خاندان کا کوئی فرد فوت ہو جائے اسے ایک یا دو روز تک کھانا ہمسائے (عزیز و اقارب) فراہم کرتے ہیں۔ اُس دور میں مرنے والے پر رونے کے لیے پیشہ ور ماتمی مل جاتے تھے جو عام طور پر خواتین ہوتی تھیں۔ رسولِ خدا ان پیشہ ور ماتم کرنے والیوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ شکنی کرتے تھے۔

معاشرے کی خصوصیات

۲۹۰۔ ظہورِ اسلام کے وقت اور اس کے بعد کا معاشرہ عام انسانی معاشرہ تھا، جس میں اچھے اور بُرے ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ حقیقت کہ اُس دَور میں بھی جرائم ——— خواہ ان کی تعداد کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو ——— قتل، قانون کی خلاف ورزی، اور چوری وغیرہ کا ارتکاب کیا جاتا تھا، اس امر کی غماز ہے کہ وہ معاشرہ عام انسانوں سے عبارت تھا اور اس میں صرف فرشتے یا صرف شیطان نہیں بستے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر شخص کے ذہن پر یہ نقش تھا کہ وہ نیکی کو نیکی اور بُرائی کو برائی سمجھے۔ کوئی شخص اپنے جرائم پر فخر نہیں کرتا تھا۔ معاشرہ اور رائے عامہ کا دباؤ ہر شخص کو حسنِ عمل کی توقیر پر مجبور کرتا تھا۔ پولیس کا کوئی وجود نہ تھا مگر لوگ از خود پیش ہو کر ایسے جرائم کا بھی اقبال کر لیتے تھے جن کی سزا موت تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں جُرم کی تعزیر برداشت کرنا آخرت میں سزا سے بہتر ہے۔

۳۹۱۔ شراب مکمل طور پر ممنوع تھی اور اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ لوگوں کے گھروں اور بازاروں میں امن کا راج تھا انسان جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور نشے میں جنگلی درندوں کی سطح تک کبھی نہیں گرتا تھا۔ سُور کا گوشت نہیں کھایا جاتا تھا چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ بے حیائی بھی معاشرہ میں موجود نہ تھی۔

۳۹۲۔ جوا نہیں کھیلا جاتا تھا اور نہ ہی سُود کی لعنت معاشرے پر مسلط تھی۔ سُود لینا اور دینا دونوں حرام تھے۔ بلا سُود قرض حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم سُود خوروں کو سود کی ادائیگی بھی ممنوع تھی۔ چنانچہ مسلمان قرضے لینے سے باز رہتے تھے اور اپنے اخراجات پر کنٹرول رکھتے تھے۔ حُرمتِ سود کے دانشمندانہ قانون نے سب سے پہلے ان مٹھی بھر انسانی جونکوں کا خاتمہ کر دیا جو سُود کے ذریعے لوگوں کا خون چوس رہی تھیں اور یُوں بد دیانتی کی کمائی پر پل رہی تھیں۔ بلاشبہ جوئے اور سُود کے ذریعے لوگ بڑی تیزی سے دولت کماتے تھے۔ مسلمانوں کو اس "امکان" سے تو محروم کر دیا گیا تھا مگر اس سے مسلمانوں کے قرضوں میں جکڑے جانے کی رفتار بھی تو انتہائی سُست ہو گئی تھی۔ چنانچہ مسلمان اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے زندگی گزارنے کی عادت اختیار کر رہے تھے۔ اس طرح سرکاری افسروں اور عمال کو بدعنوان بنانے والی قوتیں مفلوج ہو گئیں اور یُوں انتظامیہ کو صاف ستھرا رکھنے میں زبردست مدد ملی۔

۳۹۳۔ ایسی ہی اصلاحات کی بدولت معاشرہ میں پولیس فورس کی ضرورت باقی نہ رہی۔ ان اصلاحات کی ضرورت کے لوگ قائل تھے اور یہ ان کے ذہنوں میں نقش ہو چکی تھیں۔

باب ۱۴

رسولؐ اللہ کے کام پر ایک نظر

۲۹۴ ۔ دُنیا میں لاتعداد مذاہب ہیں۔ ان میں کئی توحید پرستی پر مبنی ہیں۔ متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ اسلام ان تمام مذاہب میں سب سے کم عمر ہے۔ ممکن ہے اسلام اپنے پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا مذہب نہ ہو مگر یہ ایک زندہ اور فروغ پذیر مذہب ہے۔ دُنیا کے تمام مذاہب اور لادینی عناصر اس کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ کیونکہ یہ ایک آفاقی دین ہے اور کسی خطّے یا نسل تک محدود نہیں۔ اسلام میں کسی بھی قومیت میں سرایت کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ تاہم ہمارا موضوع اسلام نہیں بلکہ اس عظیم دین کا بانیؑ ہے۔

۲۹۵ ۔ ادیان کی تاریخ عالم میں یہ کلیہ ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کے بانی کی زندگی اور جدّوجہد کے بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کو اپنی دنیاوی زندگی کے دوران زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، ان کے لائے ہوئے دین کو ان کی موت کے بعد ہی وسعت ملی اور ترقی حاصل ہوئی۔ ادیان کے ان بانی حضرات کی تعلیمات اپنی اصل شکل میں نہیں بلکہ جستہ جستہ ہم تک پہنچی ہیں۔ ان مذاہب کے پیروکاروں نے تاریخ کے عمل کے دوران اپنے ادیان کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے زعم میں ان کے اصولوں اور عملی پہلوؤں میں کئی تبدیلیاں کر دیں۔

۲۹۶ ۔ محمد (صلعم) اس قاعدہ کے تمام اصول وضوابط میں ایک استثنا ہیں۔ ان کی زندگی کے بارے میں آنکھوں دیکھے احوال پر جلدوں کی جلدیں موجود ہیں جن میں ان کی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے کی تفصیل درج ہے۔ ان کے ذاتی اعمال، ان کے دور اور معاشرہ کی ذرا ذراسی تفصیل بھی بیان کر دی گئی ہے۔ رسولِ اسلامؐ اپنی زندگی میں ہی عظیم ترین کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ جب حجۃ الوداع کے موقع پر انھوں نے ایک لاکھ چالیس ہزار سے زاید مسلمانوں کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا جو مختلف علاقوں سے حج کا فریضہ ادا کرنے مکہ معظمہ آئے تھے ان سے کئی گنا مسلمان اپنے گھروں میں موجود تھے کیونکہ مسلمانوں پر ہر سال حج کرنا فرض نہیں۔ نہ ہی ان پر یہ فرض تھا کہ وہ کسی خاص سال کے موقع پر ضرور ہی حجِ کعبہ کو جائیں۔ بلاشبہ رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد بھی اسلام کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی مگر اسلام کے بانیؑ کی زندگی میں ان کی تعلیمات کو جو کامیابی حاصل ہُوئی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں تک رسولِ اسلامؐ کی تعلیمات کا تعلق ہے قرآنِ حکیم لفظ بلفظ ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی زبان وہی ہے جس میں وہ نازل ہوا تھا اور یہ جس انداز میں ہم تک آیا ہے وہ قابلِ اعتماد ہے۔ چودہ صدیاں گزر گئیں، اس دوران رسولؐ اللہ کی جائے پیدائش یا دنیا میں کسی اور جگہ قرآن میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی۔ ہم جانتے ہیں کہ محمدؐ کس طرح نماز ادا

کرتے تھے، روزہ کیسے رکھتے تھے، اور اُنھوں نے حج کس انداز میں کیا تھا۔ چنانچہ تمام مسلمان آج بھی ان روحانی فرائض کو عین اسی طرح انجام دیتے ہیں جس طرح رسولِؐ اسلام نے انجام دیے تھے۔ دوسرے متعدد مذاہب کے پیروکاروں کی طرح ایسے مسلمانوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے دین پر عمل نہیں کرتے بلکہ بعض تو محض نام کے مسلمان ہیں۔ اس کے باوجود کسی مسلمان نے خواہ وہ محض نام کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو دینِ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے اس میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خود ہمارے دور میں تمام مذاہب میں اصلاح کی تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے مذاہب کو تو جدید دَور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانے کے لیے ان میں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے مگر مسلم مصلحین بیک زبان محمدؐ کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کی تلقین کر رہے ہیں۔ کسی مذہب کے بانی کو اس سے بڑا خراجِ عقیدت بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیمات آج بھی زندہ و متحرک ہیں اور ان میں ذرہ برابر تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی۔

۳۹۷۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں بانیٔ اسلام کی سوانح پر ہزاروں کُتب موجود ہیں۔ ان کے مصنفوں میں اسلام کے دوست اور دشمن سبھی شامل ہیں۔ تمام مصنف خواہ وہ رسولِؐ اسلام کو پسند کریں یا محض اس بات پر ناپسند کریں کہ ان مصنفوں کا تعلق اسلام کے مخالف مذاہب سے ہے، اِس بات پر متفق ہیں کہ محمدؐ ایک عظیم انسان تھے۔ جن مصنفوں نے جان بُوجھ کر رسولِؐ اسلام کی زندگی اور تعلیمات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے ——— اور ایسے مصنفوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے ——— دراصل وہ بھی انھیں بالواسطہ طور پر خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ وہ رسولِؐ اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ اگر انھوں نے اسلام کی صحیح تصویر پیش کر دی تو ان کے ہم مذہب "گمراہ" ہو جائیں گے جنھیں وہ قبولِ اسلام سے روکنے کے لیے بانیٔؐ اسلام کے متعلق بے سروپا کہانیاں گھڑ گھڑ کر سناتے رہتے ہیں اس طرح کی ذہنی بددیانتی آج بھی جاری ہے۔ یہ بات تحیّر خیز ہے کہ جدید مغرب کے زبردست مادی اور دُوسرے وسائل کے باوجود حضرت محمد رسولؐ اللہ کی ذات کے خلاف پراپیگنڈہ کوئی نتائج پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن کی توقع اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کی اشاعت، ریڈیو، ٹی وی نشریات اور فلموں کی نمائش کے بعد کی جا سکتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جتنے وسائل عیسائی مشنریوں اور کمیونسٹوں کو حاصل ہیں، اگر اسلام اتنے ہی وسائل سے بہرہ ور ہوتا تو دُنیا کا رُخ کیا ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک عیاں حقیقت ہے کہ مسیحی اور کمیونسٹ مغرب دونوں میں اسلام نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے بعد تیس سال کے دوران انگلستان میں کوئی ایک سو سے زاید مساجد تعمیر ہوئی ہیں۔ جرمنی اور فرانس بھی اس میدان میں انگلستان سے پیچھے نہیں۔ امریکی سفید فاموں میں بھی قبولِ اسلام کے واقعات کی کمی نہیں۔ چنانچہ اسلام کو گلے لگانے والوں میں سفرا، پروفیسر اور دیگر معزز پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ ہر سال سیکڑوں سیاح استنبول میں مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں جہاں اناطولیہ کی نسبت مذہبی جوش و خروش زیادہ نہیں ہے۔

رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قایم ہے۔

۳۹۸۔ محمد (صلعم) کی تعلیمات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا رشتہ زندگی کے ہر شعبہ سے قایم ہے۔ وہ محض مافوق الطبیعیات عقاید تک محدود نہیں۔ وہ انسان کی روحانی زندگی کے ساتھ ساتھ دُنیوی زندگی کے لیے بھی اصول و قواعد بیان کرتے ہیں، حتیٰ کہ سیاسیات بھی ان کی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام انسان کی پُوری زندگی کی تعمیر میں مدد دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح محض روحانی پہلو پر نظر نہیں رکھتا اور نہ ہی سیاست کو محض حکمرانوں کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہے۔

۳۹۹۔ ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے پیروکاروں کی زندگی اور ذاتی رویہ پر دینِ اسلام کے اثرات دوسرے مذاہب کی نسبت نہایت گہرے ہیں۔ یہ مذاہب آفاقیت کے دعویدار تو ہیں مگر وہ اپنے پیروکاروں میں نسل اور رنگ کا تعصب ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں انگلستان کی ایک مسجد میں ایک انگریز مؤذن دیکھا۔ اس نے بڑے فخر سے اپنا نام بلال رکھا ہوا تھا جو رسولِ اسلام کے حبشی نژاد مؤذن کا نام بھی تھا۔ یہ کتنی نرالی بات ہے کہ فن لینڈ کے ایک شخص عقیل نے جو سویڈن میں آباد ہے محض مطالعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا حالانکہ قبل ازیں کسی مسلمان سے اس کا تعارف تک نہ تھا۔ پھر فرانسیسی نژاد گینن کو بھی اس نے مشرف بہ اسلام کیا۔ گینن کے پیروکار فرانس، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور سیکڑوں افراد کو حلقۂ اسلام میں داخل کر چکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مغرب والوں کو صرف فخر الدین رازی ہی نہیں محی الدین ابن عربی نے بھی زبردست متاثر کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کافر ہلاکو خاں نے عالمِ اسلام کو فتح کر لیا اور عباسیوں کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مگر چند درویشوں نے اُس کے پوتے غزن خاں کو مشرف بہ اسلام کیا اور عالمِ اسلام کو تباہ و برباد کرنے والوں کو اسلام کا عظیم علمبردار بنا کر رکھ دیا۔

۴۰۰۔ اگر دیگر مذاہب کے بانیوں نے ایک دوسرے پر بعض انسانی خوبیوں میں سبقت حاصل کی ہے تو بانیِ اسلام نے اتنے شعبوں میں فضیلت حاصل کی ہے کہ طالبِ علم حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وہ ایک عظیم اور جامع صفات قانون ساز تھے جنھوں نے تمام قانونی سوالات کے جواب میں قواعد مرتب کیے ہیں۔ وہ بہت بڑے منتظم تھے جنھوں نے مُشتِ خاک سے ایک عظیم مملکت قایم کی۔ وہ خود اس کے منتظمِ اعلیٰ تھے۔ انھوں نے فوجوں کی کمان کی اور بسا اوقات اپنی رضاکار فوج سے تین سے پندرہ گنا بڑی فوج تک کو شکست فاش دی۔ اُن کی اخلاقی تعلیمات پُرمغز ہیں اور ان تعلیمات کو محض مثالی مگر ناقابلِ عمل بنانے کے لیے کسی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر کوئی تمھارے دائیں گال پر چپت رسید کرے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو۔ بلکہ وہ کہتے ہیں "اگر تم ادلے کا بدلہ لو تو یہ بالکل درست اور جائز ہے لیکن اگر تم معاف کر دو تو یہ اللہ کے نزدیک مستحسن ہے"۔ یُوں ان کی تعلیمات عام آدمی کے لیے بھی اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح کسی ولی، رشی یا مُنی کے لیے۔ یہ تعلیمات عام آدمی کو ارتکابِ گناہ سے روکتی ہیں اور اسے معقول حدود کے اندر رکھتی ہیں۔ ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق "بندہ خدا کا اور خدا بندے کا ہے"۔ یُوں اُنھوں نے خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست رابطہ قایم کرا دیا ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی یہ کسی کی اجارہ داری ہے۔ محمدؐ کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت، اس کی لاتعداد صفات،

اپنی مخلوق کے لیے اس کی محبت اور رحم کا کوئی اور مذہب ثانی پیش نہیں کر سکتا۔ اسلام میں خدا "رب العالمین" ہے۔ وہ ودود (محبت) ہے، رحیم (رحم کرنے والا) اور غفور (عفو کرنے والا) ہے۔ وہ قیامت کو سزا دینے میں حق بجانب ہے مگر اس کی رحمت اس کے غضب سے سوا ہے (سبقت رحمتی علیٰ غضبی ——— حدیثِ رسولؐ)

۴۱۔ محمدؐ نے نسلِ انسانی کو تمام اخلاق سکھایا اور جب وہ مطمئن ہو گئے کہ انھوں نے اپنا مشکل ترین مشن بحسن و خوبی تمام کر دیا ہے تو انھوں نے اس کی بلند رفاقت کو ترجیح دی (مع الرفیق الاعلیٰ)۔

اللھم صل علیٰ سیّدنا محمد و علیٰ اٰل سیدنا محمد و اصحاب سیدنا محمد و بارک وسلم وصل علیہ۔

باب ۱۵

رسولِ خدا کا وصال

۴۰۲ - اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے سپرد جو کام کرتا ہے وہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ محمد (صلعم) کا مشن اس لحاظ سے اور بھی محال تھا کہ اس میں انسان کی پوری شخصیت کو "نشانہ" بنایا گیا تھا۔ اُس کے پُرانے معتقدات، طریقِ عبادت، خاندانی زندگی، اخلاقی اصول، معاشرتی آداب، سیاست، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا تھا۔ گویا اس مشن کا مقصد مکمل تبدیلی اور انقلاب تھا۔ خوش قسمتی سے اعلانِ نبوت کے بعد رسولِ اسلام کافی دیر بقیدِ حیات رہے، اگرچہ انھوں نے اپنے مشن کا آغاز چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد کیا تاہم ان کے پاس ۲۳ پُر جوش سال موجود تھے جن کے دوران اُنھوں نے پُوری توجہ اپنے مشن پر مرکوز رکھی۔ نبی مرتے نہیں وہ دنیاوی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایسے لوگوں کے ذریعے جو ان کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں، معاشرہ میں اپنا اثر و نفوذ برقرار رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی موت کسی دوسرے نبی کی بعثت پر ہی واقع ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت نوحؑ کا مشن ختم کیا، حضرت موسیٰؑ حضرت ابراہیمؑ کے اور حضرت عیسیٰؑ حضرت موسیٰؑ کے مشن کے خاتمے کا سبب بنے۔ اور بالآخر حضرت محمد صلعم کی بعثت پر دینِ عیسوی بھی تمام ہوا، محمدؐ اللہ کے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی نہیں۔ تاریخی اعتبار سے بھی دین اسلام کے بعد کوئی شخص پیدا نہیں ہوا جس نے اسلام سے بہتر عقاید پیش کیے ہوں اور رسولؐ اللہ کی تعلیمات سے کوئی بہتر تعلیم دی ہو۔

۴۰۳ - رسولؐ اللہ کی عمر ۶۳ سال ہوگئی۔ تبلیغِ اسلام کے لیے ۲۳ سال کی زبردست جدوجہد میں وہ تھک گئے تھے۔ زندگی کی حرارت کے آخری شرارہ کے بل پر اُنھوں نے مکہ کا طویل سفر اختیار کیا ———— اُونٹ کی پشت پر بارہ دن مکہ جانے میں اور اتنی ہی مدت واپسی میں صَرف ہوتی تھی ———— تاکہ حجِ بیت اللہ کا فریضہ ادا کرسکیں۔ دورانِ حج رسولؐ اللہ کی مسرت کی انتہا نہ رہی جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ان پر نازل کی:

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا۔ میں نے تم پر اپنی نعمتوں (احسان) کی بھی تکمیل کر دی اور میں نے تمھارے واسطے اسلام ہی کو دین پسند کیا ہے۔" (۵/۳)

یہ نبیؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان تھا جو نبیؐ کے لیے باعثِ مسرت و اطمینان تھا۔ وہ اس مادی دنیا کو چھوڑنے پر خوش تھے، انھیں کوئی ملال نہ تھا۔ اسی وقت ان پر یہ آیات بھی نازل ہوئیں: (۱۱۰/۱-۳):

"جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھا، تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے، اس سے عفو طلب کیجئے، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

کیا ہی معقول تعلیم ہے ؛ خود رسولِ خدا کو بھی اللہ سے مغفرت اور عفو طلب کرنا چاہیے۔ محمدؐ اللہ کا بندہ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ انھوں نے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

۴۰۴۔ اس فاتحانہ حج کے بعد جب نبیؐ مدینہ پہنچے تو جلد ہی انھیں مرض الموت نے آلیا۔ مرض کا آغاز سر میں درد سے ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے کیسے کیا ہے۔ چنانچہ ایک رات شدید علالت کے باوجود وہ گھر سے نکلے اور قریبی قبرستان میں پہنچے جسے جنت البقیع کے خوب صورت نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے ان صحابہؓ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کی جن کی مدد اور تعاون سے انھوں نے بنی نوع انسان کو ایک نئی منزل اور زندگی کو ایک نئی جہت سے رُوشناس کرایا تھا۔ نبیؐ کی علالت میں شدت آگئی اور جلد ہی وہ اس قابل نہ رہے کہ نماز باجماعت کی امامت کا فریضہ ادا کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے حکم دیا کہ ان کے وفادار اور قریبی دوست ابوبکرؓ نماز باجماعت میں امامت کے فرائض سنبھالیں۔ پھر ایک روز نبیؐ کی طبیعت سنبھل گئی، وُہ اپنے حجرہ سے باہر تشریف لائے اور نماز کی امامت کی تاہم انھوں نے نماز بیٹھ کر ادا کی۔ پھر ان کے مرض میں شدّت عُود کر آئی۔

۴۰۵۔ انہی دنوں رسولؐ اللہ نے ایک مقامی کہاوت کے مطابق اپنا علاج بھی کیا۔ اُنھوں نے سات مختلف کنوؤں کا پانی منگوایا اور اس سے غسل کیا۔ اس سے انھیں کافی افاقہ محسوس ہُوا۔ چنانچہ وہ دو افراد کی مدد سے مسجد نبویؐ میں تشریف لائے اور منبر سے پُراثر خطبہ دیا جسے سُن کر صحابہؓ گریہ زاری کرنے لگے۔ اُنھوں نے جنگِ اُحد کے شہدا کے لیے اللہ کی رحمت کی دعا کی اور یُوں دین پر ان کی استقامت اور اللہ کے دین کے لیے جدوجہد میں شرکت پر ان کے لیے اظہارِ تشکر کیا۔ پھر انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس دنیاوی زندگی سے کنارہ کشی کرنے والے ہیں۔ اُنھوں نے کہا :

"اللہ کا ایک بندہ تھا جسے اللہ نے انتخاب کا اختیار دیا اور اس نے "مع رفیق الاعلیٰ" کا انتخاب کرلیا۔"

پھر اُنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کی شاندار الفاظ میں تعریف کی۔ اُنھوں نے ابوبکر صدیقؓ کی خدمات اور اسلام کے لیے نبیؐ سے تعاون کا تفصیلی تذکرہ کیا، انھوں نے ابوبکرؓ کو اپنا بھائی اور قابلِ ترجیح دوست قرار دیا (یہ رسولؐ اللہ کی طرف سے اشارہ تھا۔ وہ یہ حکم نہیں دے سکتے تھے کہ ان کے بعد ابوبکرؓ کو ان کا جانشین منتخب کیا جائے تاکہ وہ نبیؐ کے کام کو جاری رکھ سکیں) پھر رسولؐ اللہ مکّی مسلمانوں سے مخاطب ہُوئے اور ان پر مدنی مسلمانوں کے فضائل واضح کیے جن کی میزبانی اور امداد و تعاون کے بغیر اسلام یُوں تیزی سے ترقی نہیں کرسکتا تھا۔ رسولِ خدا نے باصرار کہا کہ اسلام کے لیے مدنی مسلمانوں کی خدمات کو فراموش نہ کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے ایک مثال قایم کی۔ انھوں نے ہر شخص کو جو موقع پر موجود تھا یا نہیں، اجازت دی کہ اگر کسی کا ان پر حق ہے تو وہ بیان کرے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ اگر میں نے کسی کو رنج پہنچایا ہو تو میں اس سے معافی کا طلبگار ہوں۔ اُنھوں نے اپنی ان باتوں پر اس قدر اصرار کیا کہ ایک دو افراد کھڑے ہوئے، ایک نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ نے اس سے تین درہم قرض لیے تھے مگر وہ واپس کرنا بھول گئے۔ فوراً ہی اس شخص کی تسلّی کر دی گئی۔ رسولِ خدا نے پھر اپنی بات پر اصرار کیا اور کہا کہ کسی کا جان و مال اور عزت کے ضمن میں مجھ پر کوئی حق ہو تو بلا تامل طلب کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ کسی بھی شخص، حکومت

یا مملکت پر کسی کا کوئی حق ہو جو اسے نہ ملا ہو وہ بھی پیش کیا جائے۔ پھر اُنھوں نے قبروں کو پُوجنے کی سختی سے ممانعت کی اور بولے:

"جو لوگ پیغمبروں کی قبروں کو پُوجتے ہیں ان پر خدا کی مار ہے۔ میرے بعد میری قبر کو بُت میں تبدیل نہ کر دینا جس کی لوگ پرستش کریں۔"

انہی دنوں اسلامی فوج کی ایک مہم اسامہؓ بن زیدؓ بن حارثہ کی قیادت میں روانہ ہونے والی تھی۔ رسولؐ اللہ نے کہا:

"میری موت کی صورت میں بھی یہ مہم ملتوی نہ کی جائے۔"

(اس فوجی مہم میں بعض جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ بعض لوگوں نے تجویز پیش کی کہ اس مہم کی قیادت اسامہ کو نہ سونپی جائے مگر رسولؐ اللہ نے یہ تجویز سختی سے مسترد کر دی)

۴۰۶۔ نبیؐ واپس اپنے بستر پر چلے گئے، وہ تھک گئے تھے، ایک دن اور ان کی طبیعت بہتر محسوس ہوئی، وہ پھر بستر سے اُٹھے اور حجرہ سے باہر گئے۔ یہ نماز کا وقت تھا۔ وہ یہ دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے کہ مسجد نمازیوں سے بھری ہوتی ہے اور وہ خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں ——— مسلمان بھی اپنے پیارے رسولؐ کی علالت میں افاقہ دیکھ کر خوشی سے جھُوم اُٹھے۔ مگر انھوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جو خدا کی عبادت (نماز) کے وقار کے منافی ہو ——— مگر رسولؐ اللہ آگے نہ جا سکے وہ مسکرائے اور پلٹ کر اپنے بستر پر چلے گئے۔ لوگ دھوکا کھا گئے۔ ابوبکرؓ رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور اپنے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ کئی روز سے اپنے اہلِ خانہ میں نہیں گئے تھے۔ چنانچہ وہ مدینہ کے نواحی علاقہ میں چلے گئے۔ کچھ اور صحابی بھی رسولؐ اللہ سے ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں کسی نے رسولِ خدا سے کہا کہ وہ اپنی وصیّت تحریر کرا دیں، چنانچہ رسولؐ اللہ نے کاغذ اور قلم لانے کا حکم دیا۔ پھر صحابہ میں بحث چھڑ گئی کہ آیا رسولِ پاک کو وصیت تحریر کرانے کی زحمت دی جائے یا نہیں جبکہ وہ پہلے ہی ہر بات اُمت کو بتا چکے ہیں۔ (درحقیقت صحابہ کو جنگِ اُحد کے واقعات یاد تھے جب اُنھوں نے رسولِ خدا کو برہم کر دیا تھا اور انھیں وہ کام کرنے کو کہا تھا جو رسولؐ اللہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ جنگ میں ہزیمت کی شکل میں برآمد ہوا تھا۔ حضورؐ نے مسجد نبویؐ میں اپنی تقریر کے دوران جنگِ اُحد کا تفصیلی تذکرہ کیا تھا) جب رسولِ خدا نے صحابہؓ میں بحث ہوتے سُنی تو اُنھوں نے سب کو چلے جانے کا حکم دے دیا۔

۴۰۷۔ چند گھنٹے بعد بیماری زور پکڑ گئی۔ رسولِ خدا بیہوش ہو گئے مگر جلد ہی ہوش میں آ گئے۔ اب وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایک صحابی کے ہاتھ میں مسواک دیکھی۔ انھوں نے مسواک کی طرف اس طرح دیکھا کہ لوگ سمجھ گئے کہ نبیؐ دانت صاف کرنے کی خواہش کر رہے ہیں۔ چنانچہ رسولؐ اللہ کے دانت صاف کرائے گئے جس کے بعد ان کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ ذرا توقف کے بعد اُنھوں نے تین بار کلمہ پڑھا اور کہا: "موت کتنی اذیت ناک ہے" ان کی زبان سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

"نہیں لیکن مع الرفیق الاعلیٰ"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسولِ خدا کو انتخاب کرنے کو کہا گیا تھا۔ ان کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ جن کی آغوش میں حضور صلعم کا

سرمبارک تھا، سے مروی ہے: "یہ حضورؐ کا آخری لمحہ تھا، مگر میں بہت چھوٹی تھی اور مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ جب دوسرے گریہ زاری کرنے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ کیا گزر گئی ہے۔ میں نے ان کا سر آہستہ سے تکیے پر رکھ دیا اور خود بھی گریہ زاری کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔"

۴۰۸۔ رسولؐ اللہ کی پشت پر (دونوں شانوں کے درمیان) ایک نشان تھا جسے رسولؐ اللہ مُہرِ نبوت تصور کرتے تھے۔ سوانح نگاروں کے مطابق رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد کسی نے دیکھا یہ نشان غائب ہو چکا تھا۔

باب ۱۶

تدفین اور جانشینی

۴۰۹ - اللہ کا پیغمبر، اسلامی ریاست اور دین اسلام کی رفیع الشان عمارت کا معمارِ اعظم، کیا اس کا سچ مچ انتقال ہو چکا تھا؟ کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ ناقابلِ تصور اور ناقابلِ یقین بات تھی۔ ہر مسلمان رنج و الم میں ڈوبا ہُوا تھا۔ اور ایک نے تو تلوار میان سے نکالی اور اعلان کیا "نہیں اللہ کا رسولؐ مرا نہیں، زندہ ہے، اسے موت نہیں آ سکتی، اگر کسی نے کہا کہ نبیؐ مر گیا ہے تو میں اس کی گردن اُڑا دوں گا۔" نبیؐ خدا کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح مسلم ریاست کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ معتبر ترین روایات کے مطابق اس روز پیر تھا، ربیع الاول کی ۲ تاریخ اور ۱۱ سن ہجری (۲۵ مئی ۶۳۲ عیسوی) رسولؐ اللہ کا وصال دن کے وقت ہوا (تاہم ۱۲ ربیع الاوّل حضورؐ کے یومِ وصال کے طور پر زیادہ مشہور ہے)

۴۱۰ - ابوبکرؓ کو بھی رسولؐ اللہ کے وصال کی اطلاع ملی اور وہ فوراً ہی آستانۂ نبوت پر پہنچ گئے۔ وہ تیزی سے رسولؐ اللہ کے گھر میں داخل ہُوئے، ان کی لختِ جگر عائشہ صدیقہؓ نے جو رسولِ پاک کی زوجہ مطہرہ تھیں وہ کپڑا اٹھا دیا جس سے نبیؐ کا جسدِ مبارک ڈھانپا گیا تھا۔ ابوبکرؓ نے فرطِ عقیدت سے رسولؐ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر کپڑا حضورؐ کے جسدِ مبارک پر ڈال دیا۔ پھر وہ سیدھے مسجدِ نبویؐ میں آئے۔ جونہی وہ منبرِ رسولؐ پر بیٹھے مسجد میں خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص کے کان ابوبکرؓ کی آواز سننے کے لیے بے چین تھے۔ اُنھوں نے اپنی تقریر کا آغاز قرآن حکیم کی اس آیت سے کیا:

> "اور محمدؐ تو رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول گزرے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائے یا مارا جائے تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اُلٹے پاؤں پھر جائے گا تو (وہ) اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ شکرگزاروں کو ثواب (اجر) دے گا۔" (۳/۱۴۴)

پھر انھوں نے کہا:

> "جو کوئی محمدؐ کی پُوجا کرتا تھا تو اسے کہنے دو کہ محمدؐ چل بسے ہیں مگر جو خدا کی پرستش کرتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔"

اُنھوں نے اپنی تقریر اس تجویز پر ختم کی کہ اُمّت کے اولوالامر کی جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے اور مسلمانوں کو رسولؐ اللہ کے جانشین کا فوراً انتخاب کر لینا چاہیے۔

۴۱۱ - ہر شخص نے ابوبکرؓ کی تجویز پر صاد کیا اور بولے: ہم اس پر کل (رسولِ خدا کے جسد کی تدفین کے بعد) بات کریں گے۔ اس کے بعد غم و اندوہ میں ڈوبے ہُوئے لوگ ادھر ادھر چلے گئے۔ اب کوئی دھوکا نہ تھا، کوئی پردہ نہ تھا،

یہ سانحہ عظیم تھا جو اُمت پر گزر گیا۔ مگر صدیق اکبرؓ کی طاقت ور شخصیت نے ہر فرد کو سہارا دیا اور لوگ بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اُن سے ہی ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے لگے۔ اُمت کو ڈھیروں مسائل کا سامنا تھا۔

۴۱۲۔ اوّلین مسئلہ جو درپیش تھا وُہ یہ تھا کہ رسولِ خدا کی تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے یہ مسئلہ نہایت آسانی سے حل کر دیا۔ انھوں نے بتایا کہ" ایک روز رسول اللہ نے کہا تھا" اللہ کے پیغمبر اسی جگہ مدفون ہوتے ہیں جہاں وہ آخری سانس لیتے ہیں۔" تو پیغمبر کی قبر کس طرح کی ہو گی؟ یہ دُوسرا مسئلہ تھا۔ مکّہ میں قبر کھودنے کا طریقہ اور تھا جبکہ مدینہ میں یہی کام کسی اور انداز سے کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: "مکّی طرز کی اور مدنی طرز کی قبریں کھودنے والے دو افراد بلا لو اور معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، ان دونوں میں سے جو بھی پہلے موقع پر پہنچے اسے اپنے مخصوص انداز میں قبر کھودنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ اس کے بعد خواتین کو ایک طرف کر دیا گیا اور رسولِ خدا کے عم زادوں نے حضورؐ کی میّت کو غسل دیا۔ دورانِ غسل بھی حضور صلعم کا جسد مبارک ڈھانپ کر ہی رکھا گیا۔

۴۱۳۔ اس دوران ایک نہایت سنگین واقعہ رُونما ہوا جس نے اسلام کی بڑی بڑی شخصیتوں کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔

۴۱۴۔ رسول اللہ کی بیماری کے آخری دنوں میں رسولؐ کے چچا العباسؓ ایک روز اپنے بھتیجے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کے پاس آئے اور بولے، "رسولِ خدا کی صحت یابی کی کوئی زیادہ امید نہیں، مگر اُنھوں نے ابھی تک اپنے جانشین کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہی، آؤ ہم رسول اللہ سے پُوچھ لیں اگر ان کے خاندان میں سے کسی کو جانشینی کا اعزاز ملنا ہے تو ہمیں اس کا علم ہو جائے گا، اور اگر نہیں تو ہم دونوں رسول اللہ کی خواہش کے شاہد ہوں گے۔" اس پر حضرت علیؓ نے کہا: "نہیں میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا، کیونکہ اگر رسول اللہ نے اس وقت ہمیں اپنی سیاسی جانشینی کے لیے منتخب نہ کیا تو ان کے بعد کوئی ہمیں رسول اللہ کا جانشین تسلیم کرنے پر تیار نہ ہو گا۔" جب رسولِ خدا کا وصال ہُوا تو حضرت عباسؓ پھر حضرت علیؓ کے پاس گئے اور بولے: "ہم رسول اللہ کے سب سے قریبی عزیز ہیں (میں اُن کا چچا اور پہلا وارث اور تم عم زاد ہو) میری مدد کرو میں تمھیں رسولِ خدا کے جانشین کے طور پر پیش کروں گا اور تمھاری بیعت کر لوں گا۔ دُوسرے لوگ میری تقلید کریں گے اور کسی کو اعتراض کا یارا نہ ہو گا، اگر تم نے انکار کیا تو یہ موقع ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔" مگر حضرت علیؓ نظم و ضبط کے اتنے پکّے اور با اصول تھے کہ وُہ دوسروں کے سامنے کسی بھی بات کو طے شدہ امر کے طور پر پیش کرنا پسند نہیں کر سکتے تھے، اُنھوں نے کہا: "نہیں، ایسا نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ عام مشاورت کے دوران کوئی بھی ہمارے حق جانشینی سے انکار نہیں کرے گا۔"

۴۱۵۔ رسول اللہ کے وصال کے اگلے روز مدینہ کے بنوخزرج نے اپنی مجلسِ مشاورت طلب کی۔ یہ ایک طرح کا خفیہ اجلاس تھا اور خاص طور پر کسی مکّی کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اغلباً وہ کوئی فیصلہ کرنے کے خواہشمند نہ تھے بلکہ وہ باہم مشاورت کے دوران اپنا لائحہ عمل تیار کرنا چاہتے تھے۔ بنوخزرج کی مجلسِ مشاورت میں اس رائے کا

اظہار کیا گیا کہ چونکہ مدینہ میں ان کی بھاری اکثریت ہے اس لیے نبیؐ کا جانشین ان کا کوئی نمائندہ ہونا چاہیے۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ مدینہ کا دُوسرا قبیلہ اوس بنوخزرج سے تعداد میں صرف ایک تہائی تھا) ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بنوخزرج کی مشاورت میں شامل ہر شخص کا اس بات پر اتفاق تھا کہ بنوخزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو رسولِ خداؐ کا جانشین مقرر کیا جانا چاہیے۔

۴۱۶۔ بنواوس کے کسی آدمی کو بنوخزرج کی اس خفیہ مشاورت کی بھنک پڑی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اوس کو یاد دلانا چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے باہم جو فیصلہ کیا تھا اُن کی یہ خفیہ مشاورت اس فیصلے کے منافی تھی اور یہ کہ دوسروں کی عدم موجودگی میں اس طرح مجلسِ مشاورت منعقد کرنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ پھر اُنھیں یہ خوف بھی دامنگیر ہوا کہ اگر انھوں نے کوئی اقدام نہ کیا اور کوئی فیصلہ کر لیا گیا تو پھر اس فیصلے کو کالعدم کرنا ممکن نہ ہوگا۔ چنانچہ وُہ اپنے دو رفقا حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ (دونوں مکّی تھے) کے ساتھ بنوساعدہ کے ڈیرے (ثقیفہ) پر پہنچے جہاں یہ خفیہ مجلسِ مشاورت منعقد ہو رہی تھی۔ انھوں نے آوازِ بلند السلام علیکم کہا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ کسی نے مجلسِ مشاورت میں ان کی شرکت پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کے بعد کچھ اور مکّی صحابہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔

۴۱۷۔ ان کی آمد کے فوراً بعد بنوخزرج کے ثابت ابن قیس کھڑے ہُوئے اور اُنھوں نے انصارِ مدینہ کی خُوبیاں اور اسلام کے لیے ان کی خدمات بیان کیں۔ اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ ان خدمات کے پیشِ نظر رسول اللہؐ کی سیاسی قوّت و سیادت کا جانشین انصار میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔ پھر اُنھوں نے اہلِ مکّہ (مہاجرین) سے مخاطب ہو کر اپنی تجویز پر ان کا ردِّ عمل دریافت کیا۔ رسولؐ کے سیاسی جانشین کے سوال پر غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا اور اب اس معاملہ سے پہلو تہی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ابوبکرؓ اُٹھے اور بولے: "میری رائے میں کوئی مکّی ہی پُورے عرب کے لیے واجب احترام ثابت ہو سکتا ہے۔" اُنھوں نے حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہ (ابن جراح) کی خوبیوں اور عظیم صلاحیتوں کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے حاضرینِ مجلس کو تجویز پیش کی کہ ان دونوں اصحاب میں کسی کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے امیدوار بننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس معاملہ پر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ مجلسِ مشاورت کی فضا جذبات سے مملو ہو گئی۔ اس موقع پر بنوخزرج کے الحباب ابن المنذر اُٹھے اور انھوں نے تجویز پیش کی کہ آئیے دو امرا کا انتخاب کر لیں، ایک مکّی اور دُوسرا مدنی۔

۴۱۸۔ مندرجہ ذیل تفصیلات اس وقت کی اُلجھی ہُوئی صورتِ حال پر کچھ روشنی ڈالتی ہیں:

ابنِ سعد (۱/۱۱۱ ص ۱۵۱) کے مطابق اس ضمن میں جو تجویز پیش کی گئی تھی اس کے الفاظ یہ تھے: "رسولِ خداؐ نے جب کبھی تم (مکّی) میں سے کسی کو گورنر (عامل) مقرر کیا تو انھوں نے ہم (مدنی) میں سے بھی کسی کو ضرور اس کے ساتھ کر دیا۔ چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ اب مسلمانوں کی اَمارت بھی دو افراد کے سپرد ہی کی جانی چاہیے جن میں سے ایک تم میں سے اور ایک ہم میں سے ہو۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز پر یہ کہا گیا تھا کہ اگر دو امیر مقرر کر دیے جائیں اور کسی معاملہ میں ان کے درمیان اتفاقِ رائے پیدا نہ ہو سکے تو اُمّت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

الدیار بکری (۱۱/۱۶۸ - ۹) کی روایت دُوسری اور ترمیم شدہ تجویز معلوم ہوتی ہے۔ اس روایت کے مطابق

انصار نے کہا" اگر آج تم (مکّی) اپنے میں سے کسی کو امیر نامزد کرتے ہو تو اس کی وفات پر ہم (مدنی) انصار میں سے کسی کو امیر مقرر کریں گے اور جب یہ امیر چل بسے تو پھر مہاجرین میں سے امیر کا انتخاب کیا جائے۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک مسلم مملکت قائم رہے۔" امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق (باب ۶۲، حصہ ۵، حدیث نمبر ۹) ابوبکرؓ نے یہ تجاویز مسترد کر دیں اور جوابی تجویز پیش کی "نہیں امیر ہم میں سے ہوگا اور وزیر تم میں سے لیے جائیں گے۔" ابنِ حنبل (۱، ۵ نمبر ۱۸) کی روایت کے مطابق ابوبکرؓ نے خاص طور پر بنو خزرج کے امیدوار سعد بن عبادہ سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا تمھیں یاد نہیں سعد! کہ ایک روز جب تم بھی رسول اللہ کی مجلس میں بیٹھے تھے، نبیؐ نے کہا تھا "سیادت کے سزاوار قریش (مکّی) ہی ہیں اور عوام میں اچھے لوگ قریش کے اچھے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور عوام میں سے برے لوگ قریش میں سے بُروں کا ساتھ دیتے ہیں۔" سعد نے ابوبکرؓ کی بات کو تسلیم کیا اور کہا: "یا ابوبکر! تم نے سچ کہا" ہم وزیر ہوں گے اور تم امیر ہو گے۔"

۴۱۹۔ ابھی خلافت کے لیے کسی فرد کا انتخاب نہیں ہُوا تھا، لوگ خاموش خاموش تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ اُٹھے اور معاملہ نمٹا دیا۔ اُنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر فضا میں بلند کیا اور بولے: "ابوبکرؓ سے بہتر کوئی امیر نہیں ہو سکتا۔" وہ حضرت ابوبکرؓ سے رسمی طور پر بیعت کرنے والے تھے کہ بنو خزرج کا بشیر ابنِ سعد اُٹھا ـــــ جو واقدی کے مطابق بنو خزرج کے ان افراد میں شامل تھا جنھوں نے اپنے عم زاد الحباب کی دو امیروں کے تقرر کی تجویز کی مخالفت کی تھی ـــــ اور بولا "ٹھہرو، ہم ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق ہیں مگر مجھ سے پہلے کسی کو ان کی بیعت نہیں کرنی چاہیے۔ (یہ اللہ کا نیک بندہ چاہتا تھا کہ ایک مکّی کے خلیفہ منتخب ہونے پر اہلِ مدینہ قلق محسوس نہ کریں۔ چنانچہ اس نے اہلِ مدینہ کی طرف سے بیعت کرنے میں پہل کی۔ یہ اسلام سے لگن اور بے لوثی کی ایک شاندار مثال ہے) چنانچہ بشیر ابن سعد نے سب سے پہلے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے بعد دوسرے صحابہ بڑھ بڑھ کر بیعت کرنے لگے۔ اور یوں مقررہ وقت سے پہلے ہی جو عام مشاورت کے لیے متعین کیا گیا تھا یہ اہم معاملہ نمٹ گیا۔

۴۲۰۔ چونکہ یہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا تھا ـــــ گو اس کا انجام نہایت حُسن وخوبی اور پرسکون انداز میں ہوا ـــــ اس لیے رسول اللہ کے دیگر جلیل القدر صحابہ اور حضورؐ کے اہلِ خاندان کو جو تدفین کے انتظامات میں مصروف تھے مجلسِ مشاورت میں شریک نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ ابوبکرؓ اس فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے تھے اور وہ اس سلسلے میں مزید مشاورت کے خواہاں تھے۔ بہرحال بنو ساعدہ کے ڈیرے (ثقیفہ) سے لوگ رسول اللہ کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ جس حُجرے میں رسول اللہ نے آخری سانس لیے تھے وہیں ان کا جسدِ مبارک قبر کے قریب رکھا تھا جو اسی اثنا میں تیار کر لی گئی تھی۔ اس حُجرے میں اتنی گنجایش نہیں تھی کہ تمام مسلمان ایک ساتھ نمازِ جنازہ ادا کر سکیں، اور رسول اللہ کے جسدِ مبارک کو کُھلی جگہ لے جانے کا حوصلہ کسی میں نہ تھا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں حُجرے میں داخل ہوں اور انفرادی طور پر دعا کریں۔ چنانچہ اس طرح کافی دیر لگ گئی اور پُوری رات گزر گئی۔ جب آخری مسلمان بھی حُجرے میں سے ہو کر باہر آ گیا تو تدفین عمل میں آئی۔

۴۲۱۔ پھر ابوبکرؓ نے لوگوں کو جمع ہونے کے لیے کہا۔ اُنھوں نے اجلاسِ عام میں بتایا کہ وہ ثقیفہ کے فیصلہ کو قطعی تصور نہیں کرتے اور اب ہر شخص خلافت کے مسئلہ پر رائے دینے میں آزاد ہے، وہ جسے چاہیں خلافت کے لیے منتخب کر لیں

مگر کسی نے ثقیفہ کے فیصلے کی مخالفت نہیں کی اور حاضرین نے متفقہ طور پر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کا اقرار کیا۔ اس موقع پر ابوبکرؓ نے ایک مختصر مگر نہایت پُر مغز تقریر کی :

" لوگو ! میں تمھارا سردار منتخب کیا گیا ہُوں گو میں تم سے افضل نہیں ہوں، اس لیے اگر میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں غلط چلوں تو مجھے درست کر دو، صداقت (درست مشورہ) سربراہ مملکت سے وفاداری کا اظہار ہوگا اور سچ کو چھپانا غداری کے مترادف ہوگا۔ آپ میں سے کمزور (مظلوم) میری نظر میں اس وقت تک طاقت ور ہوگا جب تک میں اُس کا حق نہ دلا دوں اور طاقتور (ظالم) میری نظر میں اس وقت تک کمزور ہوگا جب تک میں اس سے دوسروں کا حق چھین نہ لُوں، یہ سب کچھ اللہ کے حکم کے مطابق ہوگا۔ سُنو ! ایسی کوئی قوم نہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد سے احتراز کرے اور ذلیل نہ ہوئی ہو۔ کسی قوم میں جب بداخلاقی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر قہر نازل کرتا ہے۔ اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے (بتائے ہوئے) راستے پر گامزن رہوں، جُونہی میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے راستے سے بھٹک جاؤں تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ آؤ اب نماز ادا کریں۔ اللہ تم سب پر رحمت کا نزول کرے۔"

نماز کے بعد لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

وحی

مولانا محمود حسن

وحی لغتِ عرب میں اشارہ ، کتابت ، مکتوب ، رسالت ، الہام ، القا کو کہتے ہیں اور اصطلاح اور عُرف میں اُس کلام اور پیام کا نام ہے جو حضرت رب العزت کی طرف سے انبیا علیہم السلام پر نازل ہو ۔ ہر چند واسطہ بلا واسطہ کے تفاوت اور وسائط کے اختلاف سے اُس کی متعدد اقسام ہوں مگر کلامِ الٰہی ہونے میں سب شریک ہیں۔ زید کا کلام بلاواسطہ سُنو یا بواسطہ ہیلو گراف یا کتابت یا پیغام زبانی ہر حال میں اُس کو کلام زید کا کہنا درست ہو گا گلستان کوئی پڑھے کوئی لکھے کلامِ شیخ ہی سمجھا جائے گا بلکہ صرف مضمون جس کا ہوتا ہے اسی کا کلام شمار کیا جاتا ہے الفاظ خواہ دوسرے کے ہوں اگر ہم کوئی مضمون کسی کو بتلادیں اور وہ اس کو زبانی اپنے الفاظ میں یا تحریراً اپنی عبارت میں بیان کرے اور دُوسرے کو پہنچا دے تو وہ ہمارا کلام اور ہمارا پیام ضرور سمجھا جائے گا گو دوسری وجہ سے اس کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا بھی غلط نہ ہو ۔ خلاصہ یہ کہ اصل کلام مضمون و معنی ہیں الفاظ و حروف اس کے لیے عنوان اور اس پر دال ہیں۔ اب ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بات بھی بسہولت سمجھ میں آجائے گی کہ قرآن شریف اور احادیثِ قدسیہ اور دیگر احادیث و اقوال نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم سب کلامِ الٰہی اور وحی من اللہ ہیں عوارض خاصہ اور بعض احکام میں گو اُن میں باہم امتیاز ہو اور ضرور ہونا چاہیے ، مگر کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی خفا نہیں ۔ چنانچہ جملہ اکابر کے نزدیک بھی مسلّم ہے کہ احادیثِ رسول علیہ السلام حتیٰ کہ ان کا خواب بھی وحی ہی سمجھا جاتا ہے ۔

جب وحی کا مفہوم اور اُس کا مصداق اور اُس کے اقسام معلوم اور معین ہو چکے تو اب اُس کی عظمت اور صداقت میں کون کلام کرسکتا ہے جو دلیل کی حاجت ہو جب کسی کو حاکم یا سُلطان مان لیا جاوے تو گنوار سے گنوار بھی اُس کا یہی مطلب سمجھتا ہے کہ اُس کے احکام واجب التسلیم ہیں ہاں اگر کوئی سلطان اور حاکم کے معنی ہی نہ سمجھے یہ دوسری بات ہے یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ کوئی خدا کا تو قائل ہو اور اُس کے احکام کو واجب التسلیم نہ سمجھے اور بالفرض کوئی ایسا ہو تو اس کو ایمان کے ساتھ آدمیت سے بھی نکالنا پڑے گا بلکہ نکالنے سے پہلے خود نکل جائے گا کہ وہ حقیقت میں خدا ہی کا منکر ہے اس کے بعد یہ التماس ہے کہ وحی کے واجب التسلیم ہونے کے ساتھ یہ امر بھی ضروری اور بدیہی ہے کہ جملہ ذرائعِ علم میں وحی کے برابر کوئی نہیں جہل و خطا و نسیان کا اُس میں شائبہ تک نہیں ۔ اُس کے مقابلہ میں افلاطون و بقراط کے کلام کو کسی جاہل کودن طفل مکتب کے کلام پر ہرگز فوقیت نہیں کون نہیں جانتا کہ کلام کی عظمت اور اُس کی متابعت فصاحت و بلاغت واقعیت و صداقت تطابق حکمت و مصلحت کا مدار اُس کے متکلم پر ہوتا ہے جس درجہ کا متکلم ہو اُس درجہ کا کلام و قدر الشہادۃ قدر الشہود چنانچہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی کو تمام مخلوقات کے کلام پر وہی فضیلت حاصل ہے جو حق جل و علا شانہٗ کی ذات پاک کو تمام مخلوقات پر کلام الملوک ملوک الکلام کے

قاعدے سے تو کلام الالٰہ الٰہ الکلام کہنا ضرور ہوگا پھر کلامِ الٰہی کے برابر یا اس سے زاید مخلوقات کا کلام کیسے ہو سکتا ہے بلکہ جیسے اس کے مقابلہ میں کسی کی کچھ حقیقت نہیں ایسے ہی اس کے کلام کے مقابلہ میں کسی کے کلام کی کچھ حقیقت نہ ہوگی سقراط اور ارسطو کے کلام کے روبرو کسی پاگل دیوانہ کے کلام کی جتنی وقعت ہو سکتی ہے رب العزت کے کلام مقدس کے روبرو تمام مخلوقات کے کلام کی اتنی وقعت بھی نہیں ہو سکتی بالجملہ یہ امر بدیہی ہے کہ کلامِ الٰہی کے برابر ہرگز ہرگز کسی کا کلام قابلِ تسلیم اور واجب التعمیل نہیں ہو سکتا اور اس پر کوئی حجتی بہت سے بہت کہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم کو وحی الٰہی بلا واسطہ تو پہنچتی نہیں بیچ میں وسائط ضرور ہیں تاوقتیکہ اُن وسائط کی طرف سے اطمینان تام نہ ہو کلامِ الٰہی ہونے پر کیسے وثوق ہو سکتا ہے صرف قائل کی صداقت کافی نہیں ہو سکتی اس کے ساتھ ناقل کا صادق ہونا بھی ضرور ہے تو وسائط کل دو ہیں ایک وحی لانے والا یعنی فرشتہ ۔ دوسرے جس پر وحی لے کر آیا، یعنی نبی اور رسول ۔ سو ان دونوں فریق کی صداقت اور عصمت باتفاق اہلِ عقل و نقل ایسی ظاہر و مسلّم ہے کہ اصلاً حاجت بیان نہیں کون نہیں جانتا کہ ملائکۃ الرحمٰن اور انبیائے کرام مقربین بارگاہِ الٰہی سے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں مقرب اور خواص بننے کے لیے سراپا اطاعت ہونا ضرور ہے اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے اور مسندِ قرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ وہ مقرب جن پر اپنے اسرار اور مافی الضمیر آشکارا کیے جاویں اور منصبِ سفارت پر مقرر فرمائے جائیں اور سلسلہ ہدایت عالم ان کے ساتھ وابستہ کیا جاوے اور لا یعصون اللہ ما امرھم اور ما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا فرما کر حق تعالیٰ نے اس کی صداقت کی کفالت فرمائی ہو معصوم اور ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار ضرور ہوں گے سو اب ملائکہ اور حضرات انبیا کی شان میں کوئی بیہودہ خیال کرنا ہرگز انھیں تک نہ رہے گا بلکہ اُس کی نوبت دوزخ تک پہنچے گی۔ علاوہ ازیں حضرات ملائکہ کی طرف سے سوءظنی تو اتنا بعید امر ہے کہ عاقل سے متوقع نہیں جو اُن کی اصلیت اور اُن کی حالت سے مطلع ہوگا جان لے گا کہ اُن میں رذائل کا مادہ ہی نہیں اُن کی طرف کذب کا خیال ایسا ہی ہے جیسا کوئی ناواقف اُن کی طرف اکل و شرب و توالد و تناسل کا خیال خام پکانے لگے البتہ حضرات انبیاؑ کے بشر ہونے کی وجہ سے شاید ان کی نسبت کسی کو یہ خیال ستائے تو اس ضرورت سے جواب اول کے علاوہ دوسرا امر قابلِ التماس یہ ہے کہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کو اور تم کو جو کسی کے بہادر یا سخی یا باحیا یا عقلمند یا راستباز یا امانتدار وغیرہ ہونے کا بسا اوقات یقین ہوتا ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اُس کے تجربہ اور مشاہدہ احوال و اقوال سے ہم کو بسا اوقات ایسا یقین ہو جاتا ہے کہ جانب مخالف کا خیال بھی نہیں رہتا تو اب حضرات انبیا کے بارہ میں یہ قاعدہ مسلمہ کہاں جاتا رہا اور حضرات علیہم السلام کو رہنے دیجیے۔ حضرت رسولِ عربی اُمّی سیّد الانبیاؑ والمرسلین کے احوال و افعال و اقوال کو ملاحظہ فرمالیجیے کہ موافق و مخالف جو ان کی حالت نقل کرتے ہیں برُوئے انصاف اُس سے کیا نکلتا ہے کوئی دلیل جس سے اُن کی عقل و فہم و فراست و صداقت و دیانت و امانت سخاوت و شجاعت حیا و متانت وغیرہ میں کمی بھی معلوم ہوتی ہو، اگر ہو تو پیش کیجیے گا یا ہم آپ کو یہ دکھلاتے ہیں کہ ان کے مخالف اور دشمن ان کے کمالات کے کس قدر مداح ہیں یقیناً آپ کا کمالات حسنہ میں کامل ہونا اُس سے زیادہ قابلِ تسلیم ہے جیسے کہ رستم کی شجاعت و حاتم کی سخاوت مسلّم ہو رہی ہے مگر تعصب و عناد کے علاج سے سب مجبور ہیں کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ ایسا شخص جو صداقت و دیانت جملہ کمالات میں نظیر نہ رکھتا ہو وہ وحی خداوندی میں ایسا کرے اور جس نے مدت العمر کسی کے ساتھ کذب کا

استعمال نہ کیا ہو وہ نعوذ باللہ خداوند عالم پر جھوٹ لگائے اسی کے ساتھ بشرطِ فہم یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی کیا صورت ہوئی اور کیا کیا اسباب اور اہتمام اُس کے متعلق پیش آئے تاکہ اس پر غور کرنے سے اہلِ فہم کو بالبداہت یہ معلوم ہو جائے کہ وحی الٰہی میں کسی قسم کے خلجان کی گنجائش نہیں اور وحی من اللہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ نہایت اعلیٰ اور عظیم الشان امر ہے جس کے قابل کوئی ہی نکلتا ہے اور پھر اس پر نزول کی بھی خاص ہی شان ہوتی ہے اور پھر فرقِ مراتب کی وجہ سے ہر ایک وحی کا اہتمام اُسی کی شان کے موافق کیا جاتا ہے دیکھیے حضرت رسولِ اکرم نبی الانبیاء والامم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی جس کو اعلیٰ درجہ وحی کا کہنا چاہیے اُس کے حالات اور کیفیات کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر جس کا جی چاہے انصاف سے کہہ دے کہ اس میں کسی کوتاہی یا نقصان کی گنجائش ہو سکتی ہے ہرگز نہیں اس کی تفصیل کے لیے جو امام المحدثین امیر المومنین فی الحدیث نے صحیح بخاری میں بواسطہ احادیث بیان فرمایا ہے اس کو بہت کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت امام بخاری نے یہ کیا کہ اپنی کتاب میں سب سے اوّل باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منعقد فرمایا جس سے معلوم ہو گیا جملہ اصول و فروع حتیٰ کہ ایمان اور علم سب کا ماخذ و منشا وحی الٰہی ہے اور تمام اصول و فروع وہی معتبر ہو سکتے ہیں جن کا ماخذ وحی ہو اور اس کتاب میں جو مذکور ہو گا اصول ہوں یا فروع عبادات ہوں یا معاملات اُس کا ماخذ وحی ہوگی۔ اور اس کی کیفیات اور اُس کے حالات بیان فرمانے سے حضرت امام رضی اللہ عنہ و ارضاہ کی یہ بھی غرض معلوم ہوتی ہے کہ اُن کو سمجھ کر ہر کوئی سمجھ جاوے کہ بیشک وحی ہی اصل اصول ہے اور اُس کے روبرو کوئی مستحکم سے مستحکم دلیل بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ترجمہ بیان کر کے اس کے بعد چند آیات و احادیث امام رحمہ اللہ نے بیان فرمائیں جس سے کیفیات بدءِ وحی کی توضیح ہو جائے اور اُس کی عظمت اور مفترض الطاعت ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہے مگر صرف دو باتوں کا خیال ضرور رہے۔ اوّل یہ کہ لفظ وحی میں جملہ اقسام مذکورہ بالا داخل ہیں وحی متلو یعنی قرآن شریف ہی مقصود نہیں۔ دوسرے یہ کہ ابتدا سے کوئی خاص ابتدا منظور نہیں بلکہ عام ہے خواہ بلحاظِ زمانہ ہو یا مکان یا باعتبار احوال خاصہ ہو یا اوصاف ترجمہ کے متصل ہی یہ آیۂ کریمہ انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ بیان کی جس سے معلوم ہوا کہ مبدء وحی یعنی جہاں سے یہ کلام صادر ہو وہ حق جل وعلیٰ شانہٗ ہے اور اسی طرح پر انبیائے سابقین پر وحی آئی جس سے معلوم ہو گیا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کو اس کا ماننا ایسا ہی پڑے گا جیسے اپنے انبیا کی وحی کو تسلیم کرتے ہیں اس کا انکار گویا سب کا انکار ہے اور جن کو علم و عقل عنایت ہوا ہے وہ اس پر قناعت نہ فرمائیں بلکہ اس رکوع کو صراطاً مستقیماً تک غور سے ملاحظہ کریں کہ وحی کی عظمت اور اس کی تاکید کس کس طرح سے کی گئی ہے۔ شاید کسی دوسرے موقع پر اتنی تاکیدات نہ ملیں جس سے امام بخاری رحمہ اللہ کی فہم و تتبع کا پورا پورا پتا لگتا ہے۔ اس کے بعد چند روایات اور آیات کو بیان فرمایا جن کی تفصیل سے اس وقت بالکل قاصر ہوں۔

ہاں بالاجمال یہ عرض ہے کہ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت اعلیٰ اور خالص ہو نسب بہت اعلیٰ اور اخلاق و اعمال کامل ہوں نقضِ عہد اور کذب سے مبرا ہو مخالفین تک اُس کی صدق و دیانت و عمدگی اخلاق و افعال کو تسلیم کرتے ہوں اور خاص جناب سید المرسلین کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ آپ کو ابتدا سے وحی نہیں عنایت ہوئی بلکہ بڑے ہو جانے اور کامل العقل ہونے کے بعد یعنی چالیس سال کے بعد آپ کو وحی عطا ہوئی اور فرشتوں میں بھی خاص حضرت جبرائیل علیہ السلام جو

افضل الملائکہ ہیں اس خدمت پر مامور ہوئے اور بہت سے مجاہدات و خلوات اور کثرت عبادات کے بعد اور ابتدا میں یہ حالت ہوئی کہ کلمات عربی جو آپ کی زبان تھی اس کو نہ کہہ سکے مکرر سہ کرر جدوجہد کے بعد اُن چند کلمات کو کہہ تو لیا مگر نہ دل قابو میں نہ ہاتھ پیر۔ اُس کی عظمت و ہیبت سے آپ کو یہاں تک اندیشہ ہوا کہ شاید مر جاؤں اور یہ نوبت بھی اول نہیں بلکہ کچھ عرصہ تک خواب میں اوّل آپ کو یہ حالاتِ صادقہ پیش آچکے تھے اور یہ حالت تو آپ کی اخیر تک رہی کہ نزولِ وحی کے وقت شدتِ سرما میں پسینہ بہنے لگتا تھا سوار ہوتے تھے تو سواری بیٹھ جاتی تھی، کسی کے گھٹنے پر آپ کا گھٹنا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتا کہ شاید میری ہڈی چُورچُور ہو جائے گی۔ انھیں روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غارِ حرا جو آپ کی عبادت گاہ اور اعتکاف کی جگہ تھی وہاں اوّل وحی آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام مہینوں میں رمضان شریف کے مہینہ کو وحی سے زیادہ اختصاص ہے۔ اور انھیں روایات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ چالیس برس کے بعد اور خوابوں کے بعد جب فرشتہ وحی لانے لگا تو پھر بھی متصلاً نہیں آئی بلکہ آکر ایک عرصہ تک آنا بند رہا پھر جو آئی تو علی الاتصال آتی رہی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وحی کے محفوظ رہنے اور بجنسہٖ اُس کے لوگوں تک پہنچا دینے کی حق تعالیٰ نے کفالت اور ذمہ داری فرمائی اور صاحبِ فہم کو اور امور بھی اُن روایات سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جن سے عظمتِ وحی ہویدا ہے اور ان کے سوا دیگر روایات سے ایسے حالات بکثرت اہلِ فہم کو معلوم ہوتے ہیں جن سے دو باتیں ضرور سمجھ میں آتی ہیں اوّل تو وحی کی عظمت، دوسرے یہ کہ اس میں کسی طرف سے اندیشہ سہو و خطا وغیرہ نہیں ہو سکتا لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کے اس طرز سے ہمارا مدعا ایک قسم کی وضاحت کے ساتھ ثابت ہو گیا کہ وحی جو بواسطہ رسول ہم کو پہنچتی ہے متلو ہو یا غیر متلو، وہ ہمارے لیے ایسی کافی حجت ہے کہ اس کے ہوتے دوسری طرف نظر ڈالنی اور وہ بھی کیف ما اتفق بیشک خدا کی بندگی سے نکال کر شیطان کی بندگی میں داخل کر دیتی ہے اور آپ کا ارشاد نہ فقط اہلِ اسلام پر بلکہ تمام اہلِ زمین پر بروئے انصاف ایسی حجت ہے کہ اس کا ماننا ہر متنفس کو ضروری ہے اور اس کے مقابلہ میں اِدھر اُدھر جانا بالکل خام خیالی ہے اور مسلمانوں میں گو اس کو سب مانتے ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے زور میں آکر ذرا اِدھر اُدھر ہو کر بہت دُور نکل جاتے ہیں الحذر الحذر اگر مقدر ہے تو شاید کسی وقت کچھ تفصیل کی بھی نوبت آجائے ؎

یکے از عقل می لافد یکے طامات می بافد
بیا کیں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ؎

صحرائے مغیلاں ہوس طے شدنی نیست — دردامنِ تجرید شکستیم قدم را
شادم کہ قضا ساختہ محرابِ جبینم — درگاہ شہنشاہ عرب را و عجم را
آں شمعِ رسالت کہ کند نور جبینش — ہم منصب پروانہ براہین حکم را

پیشتر یہ مضمون کچھ بسط سے معلوم ہو چکا ہے کہ مدار جملہ احکام وحیِ خداوندی پر ہے کسی کی بات کو بمقابلہ وحی قابلِ قبول سمجھنا خالق و حاکم پر مخلوق و محکوم کی فوقیت و برتری کا اقرار کر لینا ہے جس کے ابطال کے لیے نام کی عقل بھی کافی ہے۔ علم و ایمان کی بھی چنداں احتیاج نہیں یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو ایمان و علم کے بدلے میں بھی عقل ہی مل گئی تھی وہ بھی وحی کے تکیہ گاہ بے حجت

ہونے کو بلا حجت مان گئے۔

شکل انسانی میں ایسے افراد تو کچھ نہ کچھ ضرور پائے گئے کہ سرے سے وجود باری کے ہی منکر ہو گئے اور وجود مخلوقات کے لیے وجود خالق کی ضرورت اُن کی عقل میں نہ آئی۔ مگر ایسا ایک شخص بھی نہ ہوا ہوگا کہ وجود خالق کائنات اور اس کی صنعت کما ینبغی کا قائل ہو کر اس کے احکام کو واجب التسلیم نہ سمجھے یا کسی دُوسرے کے حکم کو اس کے احکام پر ترجیح دینے کی جرأت کرے۔

ایسا تو ہو جاتا ہے کہ سلطان وقت یا حاکم با اختیار کی حکومت کو کوئی سینہ زوری یا حماقت سے تسلیم نہ کرے اور بغاوت پر کمر بستہ ہو جائے۔ مگر ایسا دیکھا تو کیا سُنا بھی نہ ہوگا کہ کسی کی سلطنت اور حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر اس کے احکام کے واجب الاتباع ہونے کا انکار کرے یا رعایا میں سے کسی کے احکام کو اُس کے احکام کے مقابلہ میں واجب التسلیم خیال کرے اور بالفرض کوئی ایسا کرے تو اُس کو آدمیوں میں شمار کرنا آدمی کا تو کام نہیں یہ تو صریح اجتماع ضدین ہے جس سے بڑھ کر غلط اور باطل کوئی امر نہیں ہو سکتا۔

بالجملہ وحی یعنی کلامِ الٰہی اور کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ وُہ بھی حسب بیان سابق حقیقۃً میں کلامِ الٰہی ہے ایسی مستحکم اور قوی حجت ہے جیسی خدا کی خدائی۔ اس کے مقابلہ میں کسی دلیل کی اتنی بھی وقعت نہیں ہو سکتی جیسے آفتاب کے مقابل ذرّہ اور دریا کے سامنے قطرہ۔ اور ایسا عام حکم ہے کہ عرب، عجم، مسلم، غیر مسلم، عالم، جاہل، جملہ بنی آدم پر اُس کی متابعت بلا تخصیص و استثنائ یکساں فرض ہے اُس کے کسی حکم سے انکار اور سرتابی کرنے والا انھیں خطابات کا مستحق ہے جو ابلیس کو ہمیشہ کے لیے دیے گئے۔

اُس کے واجب التعمیل ہونے میں کسی کو اتنی بھی گنجایش نہیں کہ تسلیم عقل کی انتظاری کی جاوے یا اس کے لِم اور اغراض و مصالح کے معلوم ہونے کی یا کسی خدشہ کے رفع کرنے کی راہ دیکھی جائے۔

اس مضمون مسلم و بدیہی کے بعد ہر کوئی یقین کر سکتا ہے کہ اگر فہم و حق پرستی، انصاف و ایمان سے کام لیا جاتا تو وحی الٰہی کے ہوتے مذاہب مختلفہ کی نوبت آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ جب سلطانِ وقت تمام رعایا کے لیے ایک عام قانون تجویز اور معین فرما دے اور اسی کے مطابق تمام معاملات و نزاعات فیصل کیے جاویں تو پھر اختلافات کے چلنے اور بڑھنے کی صورت کیا ہے۔

اب اس پر یہ اختلاف مذاہب اور تعارض عقاید و خیالات جو بحر مواج کی صورت میں نظر آتا ہے کس چیز کا ثمرہ ہے، اور اس اختلاف کے اسباب کیا ہیں؟

ظاہر ہے کہ علیٰ سبیل منع الخلو[1] اس اختلاف کا باعث کل دو امر ہیں۔ جہل و بدفہمی یا ناحق پرستی اور بے انصافی۔ کیونکہ اس خرابی کا منشا یا نقصان علم ہوگا یا نقصان عمل سو اوّل اوّل ہے اور ثانی ثانی۔ آگے جو کچھ اسباب اختلاف نظر

[1] یعنی دونوں سببوں میں سے ایک تو ضرور ہوتا ہے اور اگر دونوں سبب موجود ہوں تب بھی مضائقہ نہیں ۱۲

آویں گے جیسے خود رائی، خود پسندی اپنے سلف جاہلین کا اتباع، اپنی رسوم اور اغراض و مصالح کی پابندی، اپنے خیال میں تشدد و تعصب سہل انگاری و تساہل عناد و دشمنی، توسع اور مطلق العنانی، بیباکی و آزادی وغیرہ وہ سب انھیں دو کے شعبے ہیں۔

انصاف سے دیکھ لیجئے کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین چونکہ علوم شرعیہ میں کامل اور حق پرستی میں طاق تھے یعنی اُن کے علم و عمل دونوں جزو نقصان مذکورہ سے پاک و صاف تھے اس لیے ان میں وہی ایک مذہب حق جو حضرت سیدالعرب والعجم کے زمانہ مسعود میں موجود تھا اُسی ہیئت و صورت پر قایم رہا۔ کسی دُوسرے طریقہ کو اتنی بھی گنجایش نہیں ملی کہ ان نفوس مقدسہ میں سے ایک فرد پر بھی اپنا ادنیٰ اثر پہنچا سکے اور یہ اختلاف مذموم اُن کاملین فی العلم والعمل میں سے کسی ایک کو بھی اپنا منہ دکھلا سکے۔ اللہ اکبر۔

البتہ ان کے بعد اور طبقات میں جب جہل و ناحق پرستی کا اثر رفتہ رفتہ آنا شروع ہوا تو اسی کے ساتھ ساتھ اختلاف منحوس کو بھی اسلام میں قدم بڑھانے کی گنجایش ملی۔

اور آج غلبہ جہل و ناحق پرستی کے باعث اُس اختلاف کی یہ نوبت ہے کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف بھی گرد نظر آتا ہے۔ بنی اسرائیل وغیرہ اُمم سابقہ کو جو جو موجبات اختلاف پیش آئے تھے جن کے باعث اُن کے مذہب اصلی کا پتا لگانا عنقا کی سراغ رسانی سے کم دشوار نہیں وُہ جملہ اسباب زور شور کے ساتھ آج مدعیانِ اسلام میں موجود ہیں جن کی اصل وہی دو مرض ہیں جو ہم ابھی عرض کر چکے ہیں۔

اگر ارشادِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام لا تزال طائفۃ من امتی علی الحق ظاھرین لا یضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ[1] کی جلوہ افروزی اور فرمان لن تجتمع امتی علی الضلالۃ[2] کی کارسازی نہ ہوتی تو آج اس افضل الادیان کی بالیقین وہی حالت ہوتی جو ادیان سابقہ کی یا اُس سے بھی بدتر اور خیرالکتب یعنی قرآن پاک کی وُہ گت ہوتی جو کتب سماویہ تورات و انجیل وغیرہ کی یا اُس سے بھی ابتر۔ نعوذ باللہ والحمد للہ۔

بالجملہ احکام وحی تو فی نفسہٖ ایسی حجت قطعی اور فرمان عام ہیں کہ ہرقل و کسریٰ و نجاشی سے لے کر شاہانِ یورپ تک اور سُلتانِ حرمین سے لے کر جرمن و لندن و فرانس تک کسی کا کوئی عذر، حیلہ، دلیل بروئے فہم و انصاف اس کے مقابلہ میں قابلِ التفات نہیں ہوسکتا۔ تمام عالم پر اُس کی اطاعت فرض ہے۔ مگر صرف اُن بے اصل خیالات کے باعث جو جہل و ناحق پرستی پر مبنی ہیں یہاں تک نوبت آئی کہ مدعیانِ اسلام بھی بکثرت اُن احکام کی پابندی سے آزاد و سبکدوش ہو بیٹھے دُوسروں کا تو ذکر کیا ہے۔

---

[1] یعنی میری امت میں سے قیامت تک ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی جو دُوسروں پر غالب ہوگی اور مخالفین کی مخالفت اُس کو کچھ ضرر نہ دے گی۔

[2] میری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہوگی ۱۲

صرف اتنا فرق ہے کہ دیگر اقوام تو اُسی جہل و تعصب کے باعث آپ کی رسالت، مذہبِ اسلام کی حقیقت، قرآن وحدیث کے وحیِ الٰہی ہونے کا سرے سے انکار کر کے اپنے نزدیک فارغ البال ہو بیٹھے۔ بہت ہُوا تو اصول و فروعِ اسلام پر کچھ اعتراض بھی کر دیا اور مدعیان و محبانِ اسلام اتنی جرأت تو کیسے کر سکتے تھے انھوں نے یہ کیا کہ اپنی رائے کو بزور دخل دے کر خیالی گھوڑے دوڑانے شروع کیے اور اپنی فہم اور اغراض و اوہام کو اصل قرار دے کر کلامِ الٰہی اور کلام جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچ کھینچ کر اُس پر منطبق کرنا شروع کر دیا اور خودرائی کے جوش میں سلف صالحین حتیٰ کہ اصحابِ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے خلاف کی بھی کچھ پروانہ کی فضلّوا و اضلّوا[1] حالانکہ اہلِ علم و ایمان خوب جانتے ہیں کہ حضرات صحابہ کی کیا شان ہے اور قرآن مجید اور حدیث شریف میں اُن کے کمالات اور مناقب کیا کچھ مذکور ہیں اور اُمتِ مرحومہ کو ان کی تعظیم اور متابعت کی بابت کیا کیا وصیتیں ہیں۔ خیر یہ قصہ تو لمبا چوڑا ہے جس کی تفصیل سے اس موقع پر ہم معذور رہیں۔

اہلِ فہم ہمارے بیان سے اتنا ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ جس جماعت نے وحی کو اپنا قبلہ اور حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اپنا امام بنایا وہ نہ تو اُس طریقہ کے مخالف ہوئے جو اوّل سے چلا آتا تھا اور نہ اُن میں باہم اس اختلاف مضر کی نوبت آئی جس کے بانی جاہل ہوا پرست ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب سب کا مقصود ایک ہے خود رائی اور خود غرضی کا لگاؤ نہیں علم کامل ہے پھر اس اختلاف فاحش کے پیش آنے کے کیا معنی۔

بس اسی ایک فرقہ کو اہلِ حق اور اہلِ سنّت کا خطاب ملا اور ارشاد ما انا علیہ و اصحابی[2] کا یہی مصداق ہوا۔

البتہ جن صاحبوں نے بوجہ نقصانِ فہم یا غلبۂ اغراض و ہوا اپنی رائے اور توہمات کو امام بنایا اور احکامِ وحی کو اُس کے موافق کرنے میں سعی کی وہ لوگ طریقِ حق سے بھی اپنے اپنے جہل اور اوہام کے مطابق دُور ہوتے گئے اور حسبِ ارشاد رسول علیہ السلام اختلاف مذموم اور تعددِ مذاہب کو بھی اُن میں پُورا دخل ملا۔

کون نہیں جانتا کہ عقل عقلا خود از حد متفاوت ہے۔ پھر بیوقوفوں کی سمجھ اور اُن کے اوہام و اغراض کا تو پوچھنا کیا ہے اُن کی بدولت تو جس قدر اختلاف اور تعددِ مذاہب پیش آوے وہ تھوڑا ہے۔

یہ تمام فرقے اہلِ اہوا کہلائے۔

ادیانِ سابقہ میں جو کچھ خلل آیا اس کی بڑی وجہ یہی ہوئی کہ جب کسی نبی کا زمانہ ختم ہُوا تو اُن کے خلفا و اصحاب نے دین کو سنبھالا اور اُن کی ہدایت کے موافق خلق اللہ کی اصلاح میں کوشش کی مگر رفتہ رفتہ کہیں جلد کہیں دیر میں یہ ہوا کہ ناقص الفہم خود رائے، مختلف الخیال مداہن، ہوا پرست لوگوں نے آ کر حدودِ شرعیہ کو ضائع اور احکام دین میں تحریف و تغیّر کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دین اصلی مخالفوں سے تو کیا خود اہلِ ملت سے ایسا رُوپوش ہو گیا کہ قیامت تک اُس کی صورت سے محرومی اور اس کے

---

[1] خود بھی گمراہ ہوئے اور دُوسروں کو بھی گمراہ کیا ۱۲

[2] جس طریقہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ ۱۲

دیدار سے یاس کلّی ہو چکی۔

ملتِ ابراہیمی اور ملتِ موسوی اور ملتِ عیسوی وغیرہ سب میں یہی مرض مہلک اپنا پورا اثر دکھلا چکا ہے اور حسبِ ارشادِ فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام مفاسد و اختلافات آج مذہب اسلام میں نہایت شدّت وکثرت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔

وحی الٰہی یعنی قرآن وحدیث کہ جن کے ساتھ دین اسلام کا وجود و عدم وابستہ ہے دانا دشمن اور نادان دوستوں نے یا یوں کہو کہ دشمنان اعیانی اور پنہانی نے طرح طرح سے اُس کے ساتھ وہ سفا کانہ اور بیبا کانہ کارروائی کی ہے کہ جس پر اسلام کا اصلی صورت پر باقی رہنا ایک حیرت ناک قصہ ضرور ہے۔

انصاف سے ایک تحریف معنوی ہی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمایئے جو اس وقت میں وبا کی طرح پھیل رہی ہے کہ اُس کے مقابلہ میں یہود کی وہ تحریف کہ جس کی بُرائی کلامِ الٰہی میں جگہ جگہ مذکور ہے کم نظر آتی ہے۔

تورات میں جو تحریف کرتے تھے وہ کسی وجہ سے عالمِ تورات تو سمجھے جاتے تھے۔ الفاظ تورات کی تلاوت سے متنفر اور اُس کی عبارت کے ترجمہ لفظی سے تو بےخبر نہ تھے یہ تو نہ تھا کہ محض بضرورتِ تحریف ہی تورات کو دیکھتے ہوں۔ اب تو یہاں تک نوبت آ گئی کہ کتبِ تاریخ دیکھ لو اور کلامِ الٰہی اور کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف شروع کر دو، یا جغرافیہ پڑھ لو اور تحریف کرنے لگو، یا زبان انگریزی یا ڈاکٹری یا ریاضی وہیئت یا کوئی معزز عہدہ یا وکالت یا مختار کاری وغیرہ کا پاس حاصل کر لو اور وحی الٰہی میں تحریف خودرائی کی سند دبا بیٹھو۔ قرآن وحدیث کو کبھی نہ دیکھو بلکہ دُوسروں کو بھی تضیع اوقات کا فتویٰ سُنا دو اور جب کوئی ضرورت یا جدید خیال پیش آئے تو نہایت آزادانہ رائے زنی کرو خالق ومخلوق کسی کی موافقت کا انتظار اور مخالفت کی پروا نہ کرو۔ زبان عربی سے ناواقفیت ہو تو ترجمہ دیکھ لو یا کسی سے پُوچھ لو ؎

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علاوہ ازیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے تو اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں انھیں مواقع میں تحریف کی نجاست میں ملوث ہوتے تھے جہاں اپنی اغراض فاسدہ کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نظر آتی تھی جیسے زنا کی سزا رجم، اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور اُن کے اتباع کا حکم۔

اور اب ہم اہلِ اسلام کے اندر یہ مرض مہلک ایک دریائے شور کی طرح ایسا پھیلا ہوا ہے کہ عقاید سے لے کر اعمال تک اور اوضاع سے لے کر عادات تک کوئی اس کی تلخی سے بدشواری خالی رہ سکے گا گویا وحیِ الٰہی میں اُسی آزادگی کے ساتھ رائے زنی کرنا مدار لیاقت اور معیارِ عقل وکمال ٹھہر گیا ہے ضرورت کی بھی ضرورت نہیں ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اور اسی پر بس نہیں بلکہ مقامِ ترقی میں احادیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات پر ایک طرف سے غیر معتبر ہونے کا فتویٰ

لگایا جاتا ہے اور پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ ارشاد انتم اعلم بامور دنیاکم[1] کی وجہ سے تمام احکام متعلقہ معاملات کو امورِ دنیا میں شمار کرکے ہر ایک خود رائے ہوا پرست، خاتم المرسلین اور قائل اوتیت علم الاولین والآخرین[2] کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اعلم کہنے کو تیار ہے۔

حضرات صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین اور جملہ صلحا وصدیقین کی تو اب حقیقت ہی کیا رہ گئی۔ افسوس ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

اب انصاف وفہم سے کام لیجئے تو اسلام کی ضرر رسانی میں دونوں فریق مذکور برابر ہیں۔

فریق اوّل نے جو وحی الٰہی کی صاف صاف تکذیب کی اور فریق دوم نے جو اپنی ہوشیاری اور دینداری سے تاویلات و تحریفات کرکے نصوص کا وہ مطلب نکالا جو اغراض شارع کے بالکل خلاف ہے۔ یہ دونوں امر اسلام اصلی کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک دوسرے کی نظیر ہیں ؎

تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

بلکہ چشمِ بصیرت ہو تو دوستوں کی یہ عنایات دشمنوں کے ستم سے بدرجہا زاید ہیں اور گوش حقیقت نیوش ہو تو اسلام زبانِ حال سے بآوازِ بلند کہہ رہا ہے ؎

من از بیگانگاں ہرگز نمی نالم کہ بر جانم
بلا ہائے کہ شد نازل ز دستِ دوستاں آمد

منصف فہیم بالبداہت سمجھتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تعلیم زبان ولغات کے لیے تشریف نہیں لائے بلکہ اقلیموں کو اُنھیں کے محاورات میں ہدایت اور تعلیم احکام فرماتے ہیں جو زبان اُن کے اندر پہلے سے شائع ہوتی ہے اور سیدھے سادے طرز میں جو کہ معمیات اور تکلفات کے اسلوب سے بمراحل دور ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ خود ارشاد صریح موجود ہے۔ اور قرآن شریف کو مواقع کثیرہ میں "مبین" فرمایا ہے تو اب قرآن مجید کے معنی خلاف لغت واستعمال عرب لینے یا خلاف صحابہ وتابعین اور دیگر عرب العرباء کے اُس کے مطلب کو چیستان بنانا بیشک اُسی نظر سے دیکھا جائے گا جیسے کوئی ہندی، یورپی، کابلی صرف ونحو کے دو چار رسالے

---

[1] تم اپنے دُنیا کے کاموں سے خوب واقف ہو ۱۲

[2] مجھ کو اوّلین و آخرین کا علم عطا کیا گیا ہے ۱۲

دیکھ کر امراءُ القیس[1] اور لبید کو اصلاح دینے کے لیے بیٹھ جائے بلکہ اُس سے بھی کمتر۔

اہلِ اہوا کو اس خطاب کا مستحق صرف اتنی ہی بات نے بنایا ہے کہ انھوں نے اپنی رائے کو امام بنا کر اور اپنی اغراض کو نصب العین رکھ کر احکامِ وحی کو اُس کے ساتھ کھینچنا چاہا اور کسی کے وفاق و خلاف کی پروا نہ کی اور نقل و عقل میں جب کشمکش پیدا ہوئی تو انھوں نے بزورِ عقل اپنی ناقص عقل کو سب پر ڈور رکھا اور نصوصِ یقینیہ میں تاویلات ناروا اور طرح طرح کی حیلہ سازی سے کام لیا۔

مثال مطلوب ہے تو سُنیے انھیں حضرات نے مخالفت نصوص کے طعن سے بچنے کے لیے ایک قاعدہ عامۃ الورود اور ایک چلتی ہوئی تدبیر جگہ جگہ یہ پیش کی کہ خدائے برتر اور رسولِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی جملہ کوئی کلام ہرگز ہرگز خلافِ حقیقت خلافِ واقع خلافِ عقل نہیں ہو سکتا۔ یہ قاعدہ فی حد ذاتہ ضرور قابلِ تسلیم ہے۔ مگر انھوں نے اس سے یہ کام لینا شروع کیا کہ جب کوئی حکم وحی اُن کے نام کی عقل بلکہ اُن کے وہم کے بھی خلاف نظر آیا اور جس حکمِ الٰہی سے اُن کو جان بچانی منظور رہوئی وہاں اپنے توہمات سے خلاف واقع اور خلافِ عقل کا فتویٰ دے کر اُس حکم سے سبکدوش ہو بیٹھے اور نہایت بے فکری بلکہ سرکشی کے ساتھ انکار محض یا تحریف و تاویل جس سے چاہا کام لیا۔

چنانچہ رویۃ جناب باری، ثبوت تقدیر، تعذیب قبر، وزن اعمال، پلصراط، دوزخ جنت کا بالفعل موجود ہونا اور دیگر جزئیاتِ کثیرہ قطعیہ کا خون اسی شمشیر کے بھروسے اپنی گردن پر لینا بڑے اطمینان کے ساتھ منظور کیا گیا۔

افسوس اُن مدعیانِ عقل و اسلام کو اتنا بھی نہ سُوجھا کہ کلامِ خداوندی اور کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مخالف حقیقت اور مخالف واقع نہیں ہو سکتے ایسی ہی واقع کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جاوے جو کوئی طریقہ دربارہ اخبار واقع مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہوگا تو کلام اللہ اور احادیث کے ذریعہ سے اُس کی تغلیط کر سکیں گے یہ کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اس طریقہ کے بھروسا ہرگز نہیں کر سکتے۔

الغرض عقل کی بات تو یہ تھی کہ کلام اللہ اور احادیث صحیحہ نمونۂ صحت و سقم و دلائل عقلیہ سمجھی جاتیں نہ برعکس۔

علیٰ ہٰذا القیاس کلام اللہ اور حدیث کے مضمون متبادر و مطابق محاورۂ عرب کو جو باعتبار قواعد صرف و نحو بدلالت مطابقی سمجھ میں آتا ہوا اُس کو اصل قرار دے کر دلائل عقلیہ کو اُس پر منطبق کرنا چاہیے اگر کھینچ کھینچا کر بھی مطابق آجاوے تو فبہا ورنہ کالائے زبون بریش خاوندیہ اُن کی عقل کا قصور سمجھا جاوے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ اپنے توہمات و معقولات کو اصل سمجھ کر

---

[1] امراء القیس عرب کا مشہور فصیح و بلیغ شاعر اسلام سے چالیس سال پہلے گزرا ہے اور لبید بھی جاہلیت کا مشہور شاعر ہے جس کی نسبت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اُس کا یہ قول نہایت ہی سچا ہے: ع

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ

(یعنی خوب سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کے سوا تمام چیزیں باطل ہیں) ۱۲

کلامِ الٰہی اور احادیثِ صحیحہ کو ترک کیا جاوے یا ان کو کھینچ تان کر اپنی عقل کا تابع بنایا جاوے۔

اگر آج کوئی جنگلی، دیہاتی، وحشی، بے عقل، بے خبر ریل اور تار وغیرہ صنائع عجیبہ کے افسانے سُن کر ان کو دُور از عقل بتائے اور ان کی تغلیط پر زور دے تو کیا اُس کا یہ انکار اہلِ عقل کے نزدیک قابلِ تسلیم ہو سکتا ہے یا اس کا قصورِ عقل سمجھا جاوے گا۔

انصاف کیجیے تو خداوند عالم کے علم کے سامنے تمام حکماء و عقلا کی عقل و فہم کی حقیقت اُس وحشی بیوقوف کی عقل کے برابر بھی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔

پھر اس کے کلام کے مقابلہ میں ایسی جرأت معلوم نہیں کس چیز کا نشہ ہے ؎

آنانکہ زروئے تو بجائے نگرانند
کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظر انند

اس تمام خامہ فرسائی سے ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ وحی الٰہی کے واجب التسلیم ہونے پر ہر چند کہ تمام اہلِ ادیان متفق ہیں اور اس وجہ سے تمام اہلِ عالم پر قرآن و حدیث کا ماننا ضروری اور اُن کے احکام کا اتباع واجب ہے۔ مگر مخالفین تو اس کے کلامِ الٰہی اور احکامِ خداوندی ہونے کے منکر ہو کر بے فکر ہو گئے۔

حالانکہ اُن کا یہ انکار محض ہٹ دھرمی ہے۔ چنانچہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے آیات قرآنی اور روایات حدیث سے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جو وحی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ ہر پہلو سے قابلِ اطمینان اور واجب الاتباع ہے کسی طرح سے اُس میں تردد اور انکار کی گنجایش نہیں۔ اس سے قبل کسی قدر تفصیل سے اس کو عرض کر دیا گیا ہے جس طریقہ سے حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کسی کو مسلّم ہے اُسی طریقہ سے آپ کی رسالت کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ پھر کوئی یہودی یا نصرانی یا کسی ملّت کا تابع یا کسی رسول کا اُمتی اُس کا انکار کیونکر کر سکتا ہے اور اُس کا انکار بروئے انصاف کیونکر مسموع اور مقبول ہو سکتا ہے۔

اور سوائے اہلِ حق اور اہلِ سنّت کے جتنے فرقے مدعیانِ اسلام ہیں ان سب نے یہ کیا کہ خیالات و اغراض مذکورۂ بالا کی وجہ سے تاویل و تحریف انکار و تغلیط طرح طرح کے حیلوں سے کام لیا اور احکامِ وحی کو بزورِ عقل جس سانچے میں چاہا ڈھال لیا جس کی وجہ سے وہ قصرِ دین کہ جس کی تکمیل تام آپ کے مبارک ہاتھوں سے ہو چکی تھی اور جس کی حفاظت ہم پر فرض تھی آج اُس کی چار دیواری اور اُس کے دروازے کا پتا لگانا ہر ایک کا کام نہیں۔

اور وہ شاہراہ شریعت جس کی بابت ملّتِ بیضا اور جس کی توصیف میں لیلھا و نہارھا سواء ارشاد ہو چکا تھا اس میں سے چاروں طرف قدم قدم پر اتنی سڑکیں نکالی گئیں کہ اُس شریعت بیضا کی برابر تمام عالم میں کوئی بھول بھلیاں نظر نہ آئیں گی ؎

گو تیا باور نمیدارند روز داورے   کایں ہمہ قلب و دغل در کار داور میکنند

جب دوستوں کی طرف سے یہ حُسنِ سلوک ہے تو پھر دُوسروں کی شکایت کیا۔

لیکن اہلِ فہم پر روشن ہو چکا ہے کہ اس تمام اختلال وخرابی کی جڑ اور ان تمام مقاصد کا تخم وہی خود رائی ہے جس نے ادیان سابقہ کو اپنے دست بُرد سے تہ و بالا کر کے صفحۂ ہستی سے اُن کا نام ونشان مٹا چھوڑا۔

یہی وجہ ہے کہ اِس خانہ برانداز خود رائی کو کلامِ الٰہی اور احادیث اور اقوال علماؑ و اولیاؑ میں نہایت شد و مد سے روکا گیا ہے۔

کلامِ الٰہی میں ارشاد ہے:

اِنِ الحکم الاّ للّٰہ۔[1]

دوسرے موقع پر اللہ اکبر خاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے:

ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین فما منکم من احد عنہ حاجزین۔[2]

اور موقع پر حضرات صحابہ کو خطاب ہے:

واعلموا ان فیکم رسول اللّٰہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم۔[3]

اور لیجئے جملہ اہلِ ایمان کی نسبت حکم ہے:

فلا وربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔[4]

دُوسری جگہ دھمکایا جاتا ہے:

یٰایها الذین اٰمنوا لا تقدموا بین یدی اللّٰه ورسوله واتقوا اللّٰه ان اللّٰه سمیع علیم۔[5]

---

[1] خدا تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم معتبر نہیں ۱۲

[2] اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف سے کچھ باتیں گھڑ کر بیان کرتے تو ہم ان کا دایاں ہاتھ پکڑ کر گردن اُڑا دیتے اور تم میں سے کوئی ان کو بچا نہ سکتا۔

[3] اے مسلمانو! خوب سمجھ لو کہ تم لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اگر وہ اکثر باتوں میں تمہاری اطاعت کرتے رہتے تو تم لوگ مشقت میں پڑ جاتے ۱۲

[4] یعنی خدا کی قسم ہے کہ وہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے جھگڑے میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور آپ کے فیصلہ سے دل میں ذرا بھی دلتنگی نہ لاویں اور پوری طرح تسلیم نہ کر لیں ۱۲

[5] یعنی اے ایمان والو! خدا اور رسول سے پیش قدمی نہ کرو اور خدا سے ڈرتے رہو وہ تمہارے سب اقوال کو سنتا ہے اور تمہاری سب باتوں کو جانتا ہے ۱۲

ان آیات واضحہ کو تدبر و انصاف سے ملاحظہ فرما لیجئے کہ صاف یہ حکم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو منصب حکم نہیں اُس کے سوا حقیقت میں کوئی حاکم نہیں اور فخر الانبیاء علیہ السلام کو بھی یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے حکم دے سکیں اور اللہ کے ذمہ اپنی طرف سے کوئی بات لگاویں اوروں کی تو حقیقت کیا ہے۔

افضل و اعلم اُمت یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو ارشاد ہے کہ تم میں رسول اللہ موجود ہیں اُن سے اپنی رائے کی متابعت کی کوئی توقع نہ رکھیے بالفرض ایسا ہو تو تم ہلاک ہو جاؤ۔

تم مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ جب تک ارشادات و احکام رسول کو خوشدلی اور اطمینان سے تسلیم نہ کرو گے ایمان نصیب نہ ہوگا اور تم کو یہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول کے حکم معلوم ہونے سے پہلے ہی اپنی رائے سے حکم لگانے بیٹھ جاؤ

اس کے سوا آیات و احادیث و اقوال اکابر اس بارہ میں اس کثرت سے ہیں کہ ہم کو تو سب کا جمع کرنا بھی محال نظر آتا ہے اور نہ اُس کے جمع کرنے کی حاجت۔

جب یہ امر محقق و مسلم ہے کہ احکام الٰہی ہر امر میں واجب التعمیل ہیں تو اوّل کلام الٰہی سے اسی بات کو طے کر لینا چاہیے کہ دوسروں کو بالخصوص ہم جیسوں کو اُن احکام میں رائے زنی اور خود رائی کی کہاں تک اجازت ہے۔

اور احکام مذکورہ میں کسی حد تک کسی کو اگر رائے زنی کا منصب بھی ہو تو اس کے لیے کسی نصاب کسی سند کسی لیاقت کی ضرورت ہے یا صرف اپنی خوشی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے اُس مجلس شوریٰ کا رکن بن جائے اور خدا اور رسول کو مشورہ دینے کو تیار ہو جائے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ جو اپنی معمولی جزئیات میں دوسروں کی رائے کے محتاج ہیں وہ بھی احکام خداوندی کی ترمیم و اصلاح کرنے کو بلکہ احکام قطعیہ منصوصہ کو نظر بر مصالح و اسباب اس زمانہ میں واجب الترک کہنے کو نہایت استقلال اور اطمینان کے ساتھ کمر بستہ ہو جاویں۔

اگر یہ دریافت کیا جاوے گا کہ حکم خداوندی کے مقابلہ میں اوّل کس نے خود رائی کر کے خطاب رجیم اڑایا تو اس کا جواب شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ ہر کوئی اس کا جواب جانتا ہے خواہ اُس خود رائی کے وجود کو بھی مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔

اگر ہم خدا کے قائل ہیں اور وہ حاکم بلکہ احکم الحاکمین اور ہم محکوم محض ہیں اگر ہمارا وجود و عدم اور جملہ منافع اور مضار اُس کے قبضہ میں ہیں اگر اس کا کوئی خاص سفیر اور رسول ہم کو اس کے قوانین و احکام بغرض تعلیم پہنچا چکا ہے بلکہ کر کے دکھلا گیا ہے اگر ہم کو اس کے ساتھ کسی تعلق کے قایم رکھنے کی حاجت ہے۔ اگر ہم سے کسی وقت ہمارے خیالات اور معاملات کی باز پرس فرمانے کا اُس کو استحقاق حاصل ہے تو پھر بروئے انصاف ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے موجودہ اقوال و افعال کہاں تک ان امور کے موافق یا مخالف ہیں۔

اور اس پُر اختلاف وقت میں ہم کو منجملہ فرقہائے مذکورہ بالا کس فریق کا اتباع اور کس جماعت میں داخل ہونا چاہیے

یا سب سے یکسو ہو کر اپنا آئین و دین مقرر کرنا چاہیے۔

جس کے دل میں کچھ خیر اور دماغ میں کچھ عقل اور عقل میں کچھ انصاف ہوگا وہ تو واللہ یہی کہے گا کہ بندہ کو خدا اور اس کے رسول کے سامنے کالمیت فی ید الغسال[1] ہونا ضروری ہے۔

ہاں جن کو اپنی عقل و کمالات پر ناز اور اپنے نفس کی تابعداری ضروری ہے وہ بے شک اپنے آپ کو مثلِ جمادات سمجھ لینا ہرگز گوارا نہ کریں گے۔

لیکن وہ تعلق قوی جو خالق و معبود اور اس کی مخلوق و عبد میں محقق ہے اور وہ ربط مستحکم جو علت تامہ اور اس کے معلول تام میں ثابت ہے اُس پر جس کی نظر ہو گی اُس کو تو اپنے کسی کمال کا خیال اس موقع میں ہرگز ہرگز سدِّ راہ نہیں ہو سکتا مگر ہم اس نزاع کو فضول سمجھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اچھا صاحب یہ نہ سہی مگر اُس کو حاکم مطلق اور اپنے آپ کو اس کا محکوم محض سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں اور جو کوئی حاکم ہو گا وہ تو ظاہری اور عارضی ہو گا اور اُس کی حکومت بھی محدود ہو گی حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین اس کی حکومت اصلی اور حقیقی اور غیر محدود۔

تو اب کسی کو اس کی گنجائش ہے کہ اُس کے احکام کا خلاف کر سکے یا اپنی رائے سے دُوسرا قانون اُس کے قانون کے خلاف مقرر کرے یا اُس کے قانون مقررہ کو اُس کے خلاف منشأ اپنی طرف سے متغیر و محرف کر کے اُس کی ہی مملکت میں پھیلا کر اس کی رعایا کو باغی بنانے لگے۔

اور کوئی ایسا کرے تو بروئے انصاف وہ کس خطاب کے لایق اور کس سزا کا مستحق ہے واللہ الہادی وھو الموفق۔

کیا اچھا ہو جو ہم راستبازی کے ساتھ وحی کی متابعت کریں اور اپنے توہمات و خیالات کو اُس میں دخل نہ دیں اور عقاید و اقوال میں تو اُس کے پُورے مقید رہیں ایک اعمال ہی میں نقصان رہے تو رہے باقی اپنی رائے زنی اور آزاد خیالی کے لیے بہت میدان وسیع آنکھوں کے سامنے ہے اور اس میں جولانی سے کون روکتا ہے ؎

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور و لے
رسول کے رہے قدموں پہ سر خدا کے لئے

اپنی پریشانی تقریر سے معذرت کے بعد دو امر قابلِ عرض ہیں، ایک تو یہ کہ ہم نے جو کچھ وحی الٰہی کے متعلق عرض کیا اُس کے باعث دو امر ہیں اوّل یہ کہ اسلامی عقاید، اعمال، اخلاق، اوضاع، عبادات، معاملات، سب کا منشأ اور سب کے لیے قانون صرف وحی الٰہی ہے جملہ امور میں اُس کی متابعت اور اُس کی مخالفت سے اجتناب ضروری ہے حتیٰ کہ توحید جو اصل الاعمال اور راس الطاعات ہے اُس کا بھی وحیِ الٰہی کے مطابق ہونا ضروری ہے جو توحید ارشاد وحی کے خلاف ہے وہ وسوسہ نفسانی سے زیادہ اعتبار نہیں رکھتی۔

---

[1] جیسے غسل دینے والے کے ہاتھ میں مُردہ ۱۲

دیکھیے فلاسفہ، معتزلہ، یہود، نصاریٰ سب ہی موحد ہونے کے مدعی ہیں مگر بذریعہ وحیِ الٰہی جو توحید ہم کو بتلائی گئی چونکہ ان فرقوں کی توحید اس کے خلاف ہے اس لیے ہم نے توحید بیان فرمودہ وحی قبول کر کے اُن سب کی توحید کو غلط اور باطل سمجھا۔

پچھلے دو فرقوں نے تو اتنا توسع کیا کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر دیا جو صریح کفر ہے اور اوّل دو فرقوں نے توحید میں اتنی تنگی کی کہ کمالاتِ خداوندی اور اس کی صفاتِ ذاتیہ کا بھی انکار کر بیٹھے ہم نے وحی کے مقابلہ میں کسی کی نہ مانی اور افراط و تفریط مذکورہ چھوڑ کر توحید فرمودہ وحی کو اپنا ایمان بنایا۔

جب ایمان و توحید جس کو اصل الاصول کہنا چاہیے اُس کا مدار وحی پر ہے تو اور اعمال و فروعات کا تابع وحی ہونا تو بدیہی ہے اس کے سوا اسلام کی مخالفت اور مذاہب اسلامیہ کی کثرت جو وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے اُس کا بڑا منشا یہی ہے کہ پابندی احکام وحی میں طرح طرح سے غلط اندازی اور تساہل سے کام لیا جاتا ہے اس جڑ کے درست ہو جانے سے بہت سے اختلافات تو خود بخود ان شاء اللہ ایسے ختم ہو جائیں گے کہ مشعل لے کر بھی نظر نہ آویں گے اور یہی وجہ ہے جو حضرت امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب میں ایمان سے بھی مقدم وحی کا باب منعقد فرمایا۔

دُوسرے اس کا التزام کیا گیا ہے کہ ان شاء اللہ حتی المقدور ہر کلی جزوی امر میں مطابقت احکام شرعیہ یعنی وحی الٰہی کی متابعت کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

ان دُو ضرورتوں سے مناسب معلوم ہوا کہ اوّل وحی الٰہی کے متعلق بطور تنبیہ عرض کر دیا جائے بلکہ علم وحی کے علاوہ جو دیگر فنون، فصاحت، بلاغت، تاریخ، کلام وغیرہ کے متعلق مضمون شائع ہوں گے اُن میں بھی اُس فن کے ائمہ اور محققین کے حُسنِ اتباع اور اُن کی عظمت کو ملحوظ رکھ کر تحقیق سے کام لیا جاوے گا ان شاء اللہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ بلا وجہ وجیہ اور بلا تحقیق کسی فن کے ائمہ اور محققین کو مطعون بنا کر اپنی سُرخروئی اور کمالِ علمی کو دُوسروں کی نظر میں موجہ اور مدلل کرنے کی طمع کی جاوے۔

دُوسری بات قابلِ عرض یہ ہے کہ حاشا وکلا جو ہم کو اس تحریر سے کسی پر طعن یا کسی کی توہین مدِ نظر ہو محض اہلِ اسلام کہ جن میں یہ ننگ اسلام بھی شمار ہوتا ہے اُن کی اصلاح و تنبیہ کی غرض سے اس عرض کی نوبت آئی۔

ہم اپنی سادہ معمولی تحریر کی حقیقت اور ابنائے زمانہ کے مذاق کی کیفیت سے کچھ واقف ضرور ہیں اثنائے تحریر میں بار بار خیال آتا تھا ؂

کس زبانِ مرا نمی فہمد
بعزیزاں چہ التماس کنم

مگر شفیق خیر اندیش کو مریض کی رغبت اور لذّت کا اتنا خیال نہ ہونا چاہیے جس قدر اس کی صحت و راحت کا اور مریض انجام بین کو بھی اُبالی کھچڑی کی وہ قدر و منزلت کرنی چاہیے جو بریانی اور تنجن کی بھی نہ ہو صرف اسی قسم کے خیالات اس غرض کے باعث ہوئے۔

؂ گو نالہ نارسا نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(۲)

لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ

پہلے یہ مضمون توضیح اور تفصیل کے ساتھ معروض ہو چکا ہے کہ عقاید و اعمال عبادات و معاملات اخلاق و اوضاع کی برائی بھلائی صحت و سقم کا دارومدار وحی الٰہی ہی ہے بدون اتباع وحی ایمان اور دیگر اعمال حسنہ حقہ کا میسر آنا ایسا ہے جیسے بدون قوت باصرہ دیکھنے کی اور بغیر قوت سامعہ کوئی سننے کی توقع رکھے۔ اب یہ عنوان جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے یعنی لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ جو بعینہ ارشاد رسول یعنی وحی الٰہی ہے اس کو دیکھ کر شاید یہ خدشہ ہو کہ وحی الٰہی پر تو ایمان کا موقوف ہونا سمجھ میں آتا تھا لیکن امانت پر ایمان کا موقوف ہونا اور امانت کے موجود اور معدوم ہونے پر ایمان کے وجود اور عدم کا متفرع ہونا کیسے قابل تسلیم ہو سکتا ہے اس لیے اول تو یہ عرض ہے کہ تمام اہل عقل بالبداہت جانتے ہیں کہ ہر چیز اپنے وجود میں جیسے علۃ فاعلہ کی محتاج ہے ایسے ہی علۃ قابلہ کی دست نگر ہے دیکھیے وجود زراعت جیسے تخم ریزی پر موقوف ہے ایسے ہی زمین کی جو قابل زراعت ہو محتاج ہے ورنہ پتھر لوہے آگ پانی وغیرہ سب پر زراعت کر لیا کرتے تعلیم میں جیسی فاعل یعنی معلم کی ضرورت ہے ایسی ہی جس کو تعلیم دی جائے اس کا قابل العمل ہونا لابدی ہے ورنہ جمادات و نباتات وجملہ حیوانات کو بھی مثل انسان تعلیم دینا ممکن ہوتا۔ جب یہ مضمون دلنشین ہو گیا کہ ہر امر ممکن کا موجود ہونا جیسا کہ وجود فاعل اور مؤثر پر موقوف اور اس کا محتاج ہے ایسا ہی اس امر کو اپنے تحقق میں قابل اور متاثر کی بھی احتیاج ہے اور جب تک یہ دونوں موقوف علیہ یعنی فاعل اور قابل متحقق نہ ہوں گے اس وقت تک کوئی امر ممکن الوجود موجود نہ ہو سکے گا تو اب یہ سمجھ لینا بھی کوئی دشوار نہیں کہ ایک چیز کے لیے اگرچہ قابل ہوں تو ان میں باہم فرق مدارج قابلیت بھی ہوا کرتا ہے دیکھ لیجیے تمام قطعات زمین قابلیت زراعت میں اور تمام افراد انسانی قابل العلم ہونے میں ہرگز ہرگز یکساں نہیں بلکہ ازحد مختلف ہیں۔ اب اس کے بعد یہ التماس ہے کہ اگر ایمان کے لیے وحی الٰہی کو بمنزلہ علۃ فاعلہ مانا جائے اور امانت کو اس کے لیے بمنزلہ علۃ قابلہ کہا جائے تو اس کا واجب التسلیم ہونا ایسا ہی بدیہی ہوگا جیسا کہ زراعت کے لیے تخم ریزی کو علۃ فاعلہ اور زمین کو علۃ قابلہ کہنا یا تعلیم کے لیے معلم کو علۃ فاعلہ اور فہم متعلم کو علۃ قابلہ کہنا بدیہی امر تھا اس کے بعد عاقل منصف اگر کہہ سکتا ہے تو صرف اسی قدر کہہ سکتا ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ ایمان کے لیے بھی علۃ فاعلہ اور علۃ قابلہ دونوں کا ہونا ضروری امر ہے۔ اور ایمان کے لیے وحی الٰہی کا بمنزلہ علۃ فاعلہ ہونا بھی درست ہے جیسا کہ پہلے ثابت ہو چکا ہے لیکن امانت کو ایمان کے لیے علۃ قابلہ کہنا اس کی وجہ کوئی معلوم نہیں ہوتی تو صرف اتنے خدشہ کا ازالہ بہت آسان ہے۔ امانت کے معنی اور مراد سمجھ لینے کے بعد ان شاء اللہ یہ خلجان پیش ہی نہ آئے گا بلکہ امانت کا ایمان کے لیے علۃ قابلہ اور موقوف علیہ ہونا ضروری التسلیم سمجھا جائے گا جو حدیث مذکورۂ بالا کا عین مطلب ہے۔

سو سنیے کہ لغت عربی میں امانت ضد خیانت کا نام ہے اور خیانت اس کو کہتے ہیں کہ کسی شخص کو کسی امر میں کسی وجہ سے ہم تو قابل اطمینان سمجھیں اور اس سے خیر خواہی اور راستبازی کی توقع کریں مگر وہ ہم سے بدخواہی اور دھوکہ بازی اور بدعہدی

اور بدمعاملگی کر جائے کچھ مال کی ہی تخصیص نہیں مال ہو خواہ عہد و پیمان ہو خواہ کوئی معاملہ یا راز یا کوئی مشورہ وغیرہ ہو جب خلاف اطمینان و توقع کسی بات میں بدخواہی اور بدمعاملگی کی جا دے گی وہی خیانت ہو گی تو اب بالضرور " امانت کے یہ معنی ہوں گے کہ فعل یا قول یا عہد و پیمان یا روپیہ پیسہ وغیرہ میں کوئی امر خلاف خیر خواہی اور راستبازی نہ ہو جو کچھ ہو عین سلوک عین ایمانداری اور حق پسندی کے ساتھ ہو۔ جب امانت کے معنی معلوم ہو گئے تو اب سنیے کلام اللہ میں مذکور ہے کہ جب حق تعالیٰ نے مضمون امانت کو مخلوقات میں سے کسی کے ذمہ لگانے کی تجویز ظاہر فرمائی تو آسمان و زمین و پہاڑ سب اس بارگراں کے تحمل سے گھبرا گئے اور کانوں پر ہاتھ دھر گئے مگر انسان گٹھڑی کے پورے مت کے ہیٹے نے اپنے سر لے لیا جس کا نتیجہ اہل ایمان کے لیے نہایت مفید اور دوسروں کے حق میں نہایت مضر ہونے والا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے وہ آیہ کریمہ یہ ہے :

انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً جہولاً لیعذب اللہ المنٰفقین والمنٰفقٰت والمشرکین والمشرکات ویتوب اللہ علی المؤمنین والمومنات وکان اللہ غفوراً رحیماً۔

اہل علم واقف ہیں کہ لیعذب میں جو لام ہے یہ لام تعلیلیہ ہے اور لام عاقبة کہلاتا ہے۔ یعنی انسان کے حق میں تحمل بار امانت کا انجام اور نتیجہ یہ ہوا کہ اہل ایمان کو مستحق تنعیم اور دوسرے لوگ مستوجب تعذیب ہو گئے جیسے ضربتہ تادیباً میں تادیب ضرب کی علة غائی اور اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور یہی لعینہ انسان کے مکلف ہونے کا مطلب ہے سب جانتے ہیں کہ انسان کے مکلف ہونے کا ماحصل صرف یہی تو ہے کہ احکام خداوندی بجا لانے میں مستحق ثواب اور خلاف کرنے میں مورد عقاب ہو گا۔ تو جب تحمل بار امانت انسان کے حق میں موجب تعذیب و تنعیم ہوا تو صاف معلوم ہو گیا کہ مدار تکلیف اور اس کا منشا صرف امانت ہے جس میں صفت امانت اور ملکہ امانت محقق ہو گا وہی تعمیل احکام خداوندی کا مکلف ہو گا اور جس میں یہ ملکہ اور استعداد نہ ہو گی وہ بیشک غیر مکلف ہو گا۔

حضرت امام غزالی اور قاضی بیضاوی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمة اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ امانت سے یہی مراد ہے کہ تکلیف احکام خداوندی کو اپنے ذمے لے لینا اور اپنے آپ کو طاعت کی صورت میں مستحق ثواب اور در صورت معصیت مستحق عذاب تسلیم کر لینا۔

اس تقریر سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ جیسا دیکھنا بصارت پر اور سننا سماعت پر موقوف ہے اسی طرح انسان کا ایمان اور جملہ احکام متعلقہ ایمان کا مکلف ہونا صفت امانت پر متفرع ہے اور صفت امانت ان جملہ تکلیفات شرعیہ کے لیے منشا اور موقوف علیہ ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ امانت ایمان کے لیے موقوف علیہ اور ضروری ہے بدون تحقق امانت تحقق ایمان ممکن نہیں اگر ممکن ہو تو پھر امانت کا ایمان کے لیے موقوف علیہ ہونا بھی غلط ہو جائے گا اور جمادات وحیوانات کو بھی مثل انسان مکلف احکام شرعیہ کہنا پڑے گا کہ کچھ فرق ہی نہ رہے گا وہو باطل"۔

اگر توضیح و تفصیل مطلوب ہے تو سنیے حسب ارشادات نقلیہ و دلائل عقلیہ و محسوسات بدیہیہ جن کی تفصیل میں تطویل ہے

جاننے والوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان سب سے اشرف اور افضل ہے خصوصاً جمادات و نباتات و حیوانات وغیرہ اشیائے معلومہ محسوسہ پر تو اُس کی افضلیت اسی طرح روشن ہے جیسے خوبصورتوں کا بدصورتوں پر صورت میں افضل ہونا اور خوش فہموں کا بدفہموں سے افضل ہونا ظاہر و باہر ہے اور اسی وجہ سے منصب خلافت احکم الحاکمین بھی اسی نے اڑایا اور بار امانت جس کے اٹھانے سے آسمان زمین پہاڑ سب عاجز ہوگئے وہ بھی اسی ظلوم جہول کو اٹھانا پڑا، حافظ شیرازؒ اسی مضمون کی طرف اشارہ فرماتے ہیں : ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اب جیسا انسان کا اشرف المخلوقات اور افضل الموجوات کہنا عقلاً اور نقلاً ضروری ہے۔ ایسا ہی دو امر اور بھی ضروری التسلیم مجمع علیہ عقلا ہیں :

اوّل یہ کہ خداوند عالم علیم وحکیم نے اپنی مخلوقات میں جس کو جیسا بنایا اور جو مرتبہ ادنیٰ یا اعلیٰ اس کو عنایت فرمایا وہ سراسر حکمت کے مطابق ہے اور ایسا ہی ہونا مناسب تھا اگر کسی موقع خاص میں کسی کو کوئی خلجان پیش آ دے یا حکمت کے خلاف نظر آئے تو یہ بالیقین اس کے فہم کا قصور ہوگا حکم خداوندی کے مطابق حکمت ہونے میں اس سے اصلا اشتباہ نہ ہوسکے گا۔ جب ملائکہ مقربین کے اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء و نحن نسبح بحمدك ونقدس لك عرض کرنے کا قال انی اعلم مالا تعلمون جواب کافی ہوگیا جس پر ملائکۃ الرحمٰن کو بھی بجز سکوت کوئی گنجایش باقی نہیں رہی اور بالآخر سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم ؂ عرض کر کے اپنے قصور سے معترف ہوئے تو آج وہ کون ہے کہ اُس کے قوی سے قوی خدشہ اور اعتراض کے مقابلہ میں ہم اس کو یہی جواب دیں اور کافی نہ سمجھا جاوے۔ پہلے ہم صاف عرض کر چکے ہیں کہ تمام حکمائ وعقلاء بلکہ جملہ عالم کے عقل وعلم کی حق تعالیٰ کے علم کے سامنے ہرگز ہرگز اتنی بھی وقعت نہیں ہوسکتی جیسے جملہ حکماء کی عقل کے سامنے کسی جاہل گنوار کی عقل کی حقیقت۔

دُوسرے یہ کہ مثل دیگر صفات کمالیہ حق تعالیٰ کی رحمت بھی غیر متناہی اور تمام مخلوقات کو حاوی ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ خود اس کا ارشاد صریح موجود ہے۔

دُوسرے موقع پر کلامِ الٰہی میں مذکور ہے :

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔

یعنی خالق عالم خبیر و حکیم رحیم وکریم نے جملہ مخلوقات کو اُن کے مناسب شان ومطابق حال اوّل تو صورت وشکل و دیگر اوصاف قوٰی عنایت فرمائے اُس کے بعد ہر ایک مخلوق کو ان اوصاف وقوٰی سے جو کہ خالق حکیم نے ان میں ودیعت رکھ دیے تھے کام لینے اور نفع اٹھانے کے طریقے سمجھا دیے (فسبحانہ جل جلالہٗ ما اعظم رحمتہ و نوالہ) و ما احسن ما قال العارف ؎

جلوہ کرد رخش روزِ ازل زیرِ نقاب　　　عکسے از پرتوِ آں بر رُخِ افہام افتاد

ایں ہمہ عکس مے و نقش مخالف کہ نمود　　یک فروغ رُخِ ساقیست کہ در جام افتاد

پاک بیں از نظرِ پاک بمقصود رسید　　احول از چشم دو بیں در طمع خام افتاد

جب حکمت و رحمتِ الٰہی دونوں کا عموم و شمول بہ نسبت جملہ مخلوقات معلوم ہو چکا تو ہر ایک سلیم الطبع خود معلوم کر لے گا کہ انسان جس کا کہ اشرف المخلوقات ہونا مسلّم ہو چکا ہے اس کے برابر نہ کوئی مظہر حکمت ہو سکتا ہے نہ مظہر رحمت، اور یہ بات یوں بھی تو ظاہر اور بدیہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بادشاہِ وقت کو کوئی مہم یا بھاری کام پیش آتا ہے مثلاً کسی ولایت کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے یا کسی ملک کو کسی مخالف سرکش کی دست بُرد سے بچانا چاہتا ہے یا اہلِ ظلم و اہلِ فساد و اہلِ بغاوت کے اثر سے ملک کو پاک کرنا اور پاک رکھنا مطلوب ہے اور اس مہم عظیم کا کام لینا اپنے خلیفہ اور نائب سے مقتضائے مصلحت ہوتا ہے تو اوّل تو بادشاہ بیدار مغز اپنے مقربین اور خواص اور خواص میں سے اُس کو اس مہم کی انجام دہی کے لیے منتخب اور مقرر کرتا ہے جو ہر طرح سے لائق اور قابلِ اطمینان اور جماعت مقربین میں سب پر افضل و ممتاز سمجھا جائے۔ دُوسرے اس مہم عظیم کی انجام دہی کے لیے جس قدر لشکر اور سامان اور نقد و جنس وغیرہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے بے تامل خزائن شاہی سے وہ چیزیں امیر مذکور کو عطا فرمائی جاتی ہیں اور جملہ لشکر اور تمام انتظامات پر اُس کو اختیارات کُلی دے کر اور سب کو اُس کا محکوم اور ماتحت بنا کر بعد عطائے سند و خطاب مہم عظیم کی انجام دہی کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

جب خالق علیم حاکم علی الاطلاق نے حضرت آدم کو اپنا خلیفہ اور نائب مقرر فرما کر عالمِ دنیا کی اصلاح اور درستی کے لیے اور اُس میں احکام و قوانین احکم الحاکمین اور سلسلۂ ہدایت جاری کرنے اور پھیلانے کے لیے اس عالم میں بھیجا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اُس خلیفہ خاص کے حق میں ہر دو امر مذکورۂ بالا کی رعایت نہ کی گئی ہو۔

سلطانِ وقت بوجہ اقتدار کلی گو اپنے ماتحتوں اور غلاموں میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کو بھی منصبِ نیابت دے سکتا ہے مگر اپنی عقل اور بیدار مغزی کی وجہ سے ہرگز کسی نالائق اور ناقابل کو یہ اعلیٰ منصب عطا نہ کرے گا۔

اسی طرح پر خالق قدیر اپنی قدرت سے جس کو چاہے منصب خلافت عطا کر سکتا ہے کون دم مار سکتا ہے مگر چونکہ جیسی اُس کی قدرت غیر متناہی ہے ایسی ہی اس کی حکمت بھی بے حد و بے پایاں ہے اس لیے ضروری ہے کہ جس کو اس نے تمام عالم پر اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر ایک امر عظیم کی انجام دہی کے لیے مقرر فرمایا اُس میں اوّل تو امتیاز و افضلیت اور ہر طرح کی لیاقت کی رعایت کُلی کی گئی ہے۔ دوسری کار خلافت میں جن کمالوں اور سامانوں کی حاجت تھی وہ تمام مہا اس خلیفہ خاص کو ضرور خدا کے غیر متناہی خزانہ سے حسب حاجت عطا فرمائی گئی ہیں جس کی تفصیل کی اس موقع پر حاجت نہیں معلوم ہوتی صرف ارشاد خلق اللّٰہ اٰدم علیٰ صُوْرَتِہٖ۔ اللہ اکبر ایک اتنی بڑی بات ہے جو اہلِ علم کے سمجھنے کے لیے قدر کفایت سے بھی بدرجہا زائد ہے۔

جب یہ بات خُوب دلنشیں ہو چکی تو اب سُنیئے کہ جس قدر کمالات خلیفہ موصوف کو عنایت فرمائے گئے ان سب میں اول و افضل و ضروری کمال علمی ہے اور سب کمالات اس کے بعد ہیں حق سبحانہ تعالیٰ کی جملہ صفات کمالیہ جن کو مخلوقات سے کوئی تعلق ہے جیسے قدرۃ۔ ارادہ۔ کلام وغیرہ ان میں بھی سب سے اقدم اور افضل صفۃ علم ہی شمار ہوتی ہے ادھر دیکھیے کہ جب ملائکہ علیہم الصلوٰۃ

والتسلیم کو حضرت آدم کی خلافت میں خلجان پیش آیا جس کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے تو حضرت آدم اور ملائکہ علیہم السلام کا امتحان علم ہی میں تو لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرات ملائکہ علیہم السلام پر کمال علمی میں ایسے فائق رہے کہ ملائکہ بھی ان کی افضلیت اور مستحق خلافت ہونے کے معترف ہو گئے آیہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے لے کر تین چار آیتیں پڑھ جائیے۔ یہ مضمون بوضاحت مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ علم افضل الصفات ہے اور مدار خلافت الٰہی اس پر ہے اور حضرت آدم اس کمال میں سب سے فائق اور ممتاز ہیں۔ علاوہ ازیں عالم سے جاہل تک سب کو معلوم ہے کہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہمارا کوئی فعل اختیاری بدون علم ہم سے صادر نہیں ہوتا ہر فعل اختیاری کرنے کے لیے ضرور ہے کہ پہلے اس کا علم حاصل ہو تو پھر فعل مذکور کی نوبت آ دے تو اب انصاف فرمائیے کہ خلافت خداوندی جیسی عظیم الشان خدمت بدون کمال علمی کیونکر انجام پذیر ہو سکتی ہے۔

الحاصل خلیفہ مذکور کے لیے علم اور علم کا بھی کامل ہونا ضروری ہے بدون اس کمال کے کہ جس کو اصل الکمالات کہنا چاہیے کار خلافت پورا تو کیا ادھورا بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف کمال علمی سے خدمت خلافت کیونکر انجام پذیر ہو سکتی ہے۔ علم کے ساتھ ایسی قدرت وقوت کی بھی ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے امور ضروریہ متعلقہ خلافت کی خود بھی تعمیل کر سکے اور دوسروں سے بھی تعمیل کرا سکے۔ بدون ان دونوں کمالوں کے کار خلافت انجام دینا ممکن نہیں۔

دیکھیے اگر علم بھی نہ ہو تو پھر کرنا تو در کنار کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اگر صرف علم ہو اور قدرت نہ ہو تو ہر چند عمل کا ارادہ تو کر سکتا ہے مگر عمل کیونکر کر سکتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ قوت علمیہ اور قوت عملیہ کے بدون کار خلافت کی انجام دہی ممکن نہیں۔ اس لیے بمقتضائے رحمت وحکمت اور حسب ارشاد اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدی اور نیز بباعث اشرفیت وافضلیت انسان ضرور ہوا کہ انسان ضعیف البنیان کو کمال علمی میں سب سے فائق وبرتر بنا کر اس قدر قدرت عطا فرمائی جائے کہ کار خلافت کو بسہولت انجام دے سکے اور سلسلۂ ہدایت کو عالم میں پھیلا سکے اور انتظام عالم کو پورا کر سکے جو کہ اس کی آفرینش سے مقصود ہے۔

اب ان ہر دو کمال کے بعد بظاہر کار خلافت کی انجام دہی میں کوئی حالت منتظرہ معلوم نہیں ہوتی کیونکہ علم سمجھنے کے لیے اور قدرت عمل کے لیے کافی ہیں اور واقع میں بھی یہی بات ہے۔

مگر غور سے کام لیجئے تو علم وقدرت کے بیچ میں ایک چیز کہ جس کو اقتضائے نفس وفطرت یا رغبت ونفرت طبعی سے تعبیر کیجئے ایسی حائل وحاجب ہے کہ باوجود علم یقینی قدرت کو بسا اوقات علم کے موافق کام کرنے سے روک دیتی ہے بلکہ یہی اقتضائے نفسانی علم یقینی کے بالکل خلاف قدرت سے کام لے لیتا ہے۔

چور، رہزن، باغی، قاتل وغیرہ جملہ بدمعاشوں کو دیکھ لیجئے کہ بسا اوقات اُن کو اس بات کا علم اور ظن غالب ہوتا ہے کہ اس کام کا انجام جیل خانہ، عبور دریائے شور، جلا وطنی، پھانسی اور طرح طرح کی مصیبت اور روسیاہی وذلت ہے مگر وہی مقتضائے نفسانی وطبعی ان کے علم کو بالکل معطل وبیکار بنا کر ان کی قوت وقدرت سے بڑے بڑے سنگین کام لے لیتا ہے اور علم وقدرت طبیعت کے سامنے مغلوب ومجبور ہو کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔

ہم کو احکامِ خداوندی پر ایمان و یقین ضرور ہے حساب کتاب ثواب عقاب سب چیزوں کو دل سے مانے ہوئے ہیں ۔ مگر طبیعت کی وہی بیہودہ رغبت و نفرت اکثر اوقات ہم کو احکم الحاکمین کے اوامر کی تعمیل سے مانع اور اس کے نواہی پر مستعد اور دلیر بنا دیتی ہے اور ہم ہیں کہ اپنے علم و قدرت سب کو بالائے طاق رکھ کر اقتضائے طبیعت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا ۔

اور اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ خالقِ کائنات اور حکیم علی الاطلاق نے اپنی قدرت قاہرہ اور حکمت باہرہ سے انسان کے اندر قوۃ ملکیہ اور قوۃ بہیمیہ دونوں رکھ دی ہیں اور ان دونوں متضاد قوتوں میں برابر باہمی تخالف اور تزاحم رہتا ہے انسان کو اوّل قوت خیر کی طرف کھینچتی ہے تو دُوسری قوت طرح طرح کی خرابیوں اور فسادات میں مبتلا ہونے پر اس کو مجبور کرتی ہے اسی وجہ سے کوئی اعلیٰ علیین تک پہنچ جاتا ہے تو کوئی اسفل السافلین میں جا پڑتا ہے ۔ اہلِ عقل و انصاف کو اس سے زاید بیان کی حاجت نہیں معلوم ہوتی ۔

سو جب انسان پابند ہوا و ہوس کا یہ حال ہے کہ رغبت و نفرت طبعی کے مقابلہ میں علم و قدرت جیسے کمالات کو خاک میں ملا دیتا ہے اور جس علم و قدرت کی اعانت و مدد سے اُس رغبت مذمومہ اور نفرت قبیحہ سے اپنا بچاؤ کر سکتا تھا اسی علم و قدرت کو اُس رغبت و نفرت کی تحصیل میں صرف کرنے سے اصلا باک نہیں کرتا تو اس لیے احکم الحاکمین ارحم الراحمین نے جہاں اپنے خزانہ خاص سے اور کمالات انسان کو عطا فرمائے تھے ان کمالات کی اعانت اور تکمیل اور تقویت کے لیے محض اپنے فضل سے انسان کی اصلی خلقت اور فطرت اور طبیعت میں ایک ملکہ اور ایک خاص صفت ایسی بھی رکھ دی جو انسان کو اپنے مالک کی محبت و اطاعت اور عدل و ہدایت اور راستبازی و حق پسندی اور جملہ امور خیر کی طرف رغبت دلائے اور بُری خصلتوں اور بُرے کاموں سے اس کو نفرت دلانے میں سعی کرے ۔

سو اسی ملکہ اور اسی قوت کا نام حقیقت میں امانت ہے اور یہی فطرت اسلامی ہے جو کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یھوّدانہ او ینصرانہ او یمجّسانہ الخ اور متعدد آیات و احادیث میں مذکور ہے ۔

سو اب یہ دونوں کمال یعنی علم اور امانت ہر انسان کے لیے خاص اور تمام افراد انسانی کے لیے ایسی طرح عام ہیں کہ جس سے کوئی فرد انسان خالی نہیں ہو سکتا ۔

صانع رحیم و حکیم نے حسبِ بیان سابق ہر چیز کو جیسا اس کے مناسب حالات و صفات مختلفہ عطا فرمائیں اسی طرح پر انسان اشرف المخلوقات کو جہاں اور کمالات لائقہ اور فائقہ دیے گئے تھے وہیں لیاقت علم و امانت خصوصیت کے ساتھ ذات انسانی کو لازم کر دیے گئے تاکہ اپنا فرض منصبی یعنی کارِ خلافت بخوبی انجام دے سکے اور حسبِ متابعت ہدایاتِ خداوندی اور مطابقت احکام ایزدی تمام مفاسد اور نقصانات و مظالم کا دفعیہ کر کے جملہ عالم کی اصلاح اور درستی میں کوشش کر سکے ۔

لیکن یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ زراعت میں گو اصل الاصول تو یہی ہے کہ دانہ کو زمین کے اندر رکھ دیا جائے مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ جن چیزوں کو نشو و نما میں دخل ہے جیسے پانی ہوا وغیرہ وہ چیزیں دانہ کو پہنچائی جائیں اور جو چیزیں نشو و نما کو مضر ہوں اُن سب کے اثر سے دانہ مذکورہ کو بچایا جائے ۔ مثلاً پانی کی کثرت یا برف باری کی شدت ۔

دیکھیے اگر زمین شور میں دانہ بو دیں یا کھیت کو بو کر حوض کی طرح اس کو پانی سے بھر دیں یا ہزاروں من مٹی دانہ پر ڈال دیں یا تیز آگ پھیلا دیں تو پھر تو زراعت کیسی خود تخم ہی گل سڑ کر پیوند زمین ہو جائے گا یا جل بھن کر رہ جائے گا۔

اب اسی طرح پر خیال فرمایئے کہ حسب بیان سابق یہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے ہر ایک آدمی کے اندر جوہر علم اور جوہر امانت دونوں جوہر پیدا فرما دیے ہیں مگر صرف اتنی ہی بات سے ہم عالم بن جائیں اور صاحب امانت کہلائیں ایسا خیال کرنا خود اس بات پر دال ہے کہ ابھی عالم ہونے میں بہت دیر ہے۔

بلکہ جیسا دانہ کی نشوونما اور پھولنے پھلنے کے لیے اس کی مؤیدات کا پہنچانا اور مضرات سے اس کو بچانا ضروری ہے ایسے ہی ملکہ علم و امانت کے مثمر و منتج و مفید و کار آمد ہونے میں اس کی ضرورت ہے کہ علم و امانت کے مؤیدات اور متممات و مکملات کے حصول میں کوشش کی جائے اور جملہ مضرات و مفسدات سے احتراز و اجتناب رکھا جائے۔

ورنہ مثل دانہ مذکورہ قوت علم اور قوت امانت سے فائدہ تو درکنار خود علم و امانت ہی خراب و فاسد ہو کر نقصان وہ اور مضرت بخش ہو جائیں گے۔

جب یہ بات ضروری ٹھہری کہ کوئی فرد انسانی صفت علم و صفت امانت سے خالی نہیں ہو سکتی اگر خالی ہو سکی تو ضرور ہے کہ مثل دیگر مخلوقات غیر مکلف ہوگی حالانکہ تمام افراد انسانی کا مکلف اور مخاطب احکام الٰہی ہونا ضروری امر ہے۔

اور اسی کے ساتھ یہ امر بھی قرار پا چکا کہ جو صفت علم اور استعداد امانت کہ خالق کائنات نے آدمی میں ایسی طرح رکھ دی ہے جیسے قوت بصارت و سماعت و رفتار و گفتار وغیرہ اُسی صفت علم و امانت کا بذریعہ مؤیدات و اسباب ظاہری بڑھانا اور اُن کے مضرات و مفسدات سے پرہیز کرنا ہر انسان کے ذمہ لازم اور ضروری ہے ورنہ بدون اس تائید و تقویت کے ان کمالات کے وسیلہ سے ہم نفع نہیں اُٹھا سکتے۔

اور جو ایسا نہ کرے گا وہ اپنے مقصود اصلی یعنی اطاعت خداوندی اور اپنے کار منصبی یعنی انجام دہی خدمت خلافت سے محروم رہ کر اولٰئک کالانعام بل ھم اضل اولٰئک ھم الغافلون کا پورا منظر اور ارشاد لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کا ایک کامل مظہر بن جائے گا (ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا)

الحاصل اس مضمون کو خوب دلنشین کر لینا چاہیے کہ حق جل و علیٰ شانہ نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے بیشک انسان کو عجیب عجیب ملکات اور کمالات کا مخزن و مظہر بنایا مگر ان کمالات کے لیے استعداد اصلی اور استعداد کسبی دو درجے مقرر فرما دیے۔

استعداد اصلی انسان کی حد قدرت و اختیار سے بالکل اوپر اور باہر ہے اور اُس میں کمی و بیشی کی بھی گنجائش نہیں۔

لیکن استعداد کسبی میں انسان کے کسب و اختیار کو پورا دخل ہے اور ہمارے کسب و اختیار ہی پر اس کی ترقی و تنزل موقوف ہے۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ حواس ظاہرہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ بصارت و سماعت وغیرہ کی استعداد اصلی اور قوت جو ہم میں اوّل سے موجود ہے کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف اس میں تو ہمارے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں بلکہ اندھا مادرزاد جیسا

اپنے اختیار سے اندھا نہیں ہو گیا بعینہٖ ایسے ہی آنکھوں والا اپنے اختیار سے بصیر نہیں ہوا۔

البتہ ان قویٰ سے جو الوان و اشکال مختلفہ اور اصوات متباینہ اور ملموسات متفاوتہ اور مشمومات متمیزہ کو ادراک کرتی ہیں اُس میں ہمارے قصد و اختیار کو بیشک دخل ہے۔

اور مدرکات مذکورہ کی مشق و مہارت کے بعد ہم اتنی ترقی کر لیتے ہیں کہ اُن مدرکات کے ایسے باریک و دقیق فرقوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دُوسرا آدمی جس نے یہ مشق و ترقی نہ کی ہو اُس فرق کے دریافت کرنے سے ایسا عاجز ہوتا ہے کہ بسا اوقات بتلانے کے بعد بھی دریافت نہیں کر سکتا۔ گو اصلی استعداد میں وہ ہم سے بڑھا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

دیکھیے اگر کسی شخص کی قوتِ شامہ اصل سے بہت قوی ہو مگر اُس کو عطریات کے تجربے اور استعمال کی نوبت نہ آئی ہو تو وہ شخص عطریات کے باریک فرق تو درکنار موٹے موٹے فرق کے احساس سے بھی بے خبر ہوتا ہے اور دُوسرا شخص کہ جس کی قوت شامہ پہلے کی برابر یا اس سے کچھ کم ہی کیوں نہ ہو مگر عطریات کا تجربہ اور مہارت تامہ رکھتا ہو تو وہ بے تکلف ایسے ایسے باریک فرق بتلا دیتا ہے کہ ناواقفوں کو سُن کر بھی تعجب ہوتا ہے۔

تو اب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ علم و امانت کی استعداد اصلی جو حکیم علی الاطلاق نے ہر ایک انسان میں رکھ دی ہے کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف۔ اس سے تو کوئی شخص خالی اور بے بہرہ نہیں ہو سکتا اور وہ استعداد ہر ایک میں بالفعل موجود ہے آدمی کے کسب و قصد کو اُس میں اصلاً دخل نہیں۔ آیہ کریمہ انا عرضنا الامانۃ الخ اور حدیث شریف کل مولود یولد علی الفطرۃ الخ جن کا ذکر آ چکا ہے ان میں امانۃ و فطرۃ سے سب جانتے ہیں کہ ان کی استعداد اصلی ہی تو مراد ہے بلکہ اس بارے میں ہمارے مدعائے سابق کے لیے دلیل قطعی ہیں۔

ایسے ہی بعض آیات و احادیث میں استعداد کسبی مراد ہے جس کو جاننے والے بالبداہۃ جانتے ہیں۔ بالجملہ علم و امانت کی استعداد کسبی کو سمجھ لینے کے بعد اب ان شاء اللہ ہر ایک صاحبِ فہم بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ جیسا آیہ و علم آدم الاسماء کلھا الخ میں علم کی استعداد اصلی کی طرف اور آیہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون میں علم کی استعداد کسبی کی طرف اشارہ ہے۔ بعینہٖ اسی طرح پر آیۃ انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال الخ مرقومہ بالا میں تو امانت کی استعداد اصلی کی جانب اور حدیث شریف مندرجہ عنوان لا ایمان لمن لا امانۃ لہ میں امانت کی استعداد کسبی کی جانب ایما ہے۔

کیونکہ ابھی گزر چکا ہے کہ علم و امانت کی استعداد اصلی سے تو کوئی فرد بشر خالی ہی نہیں اور نہ اُس کے ہم مکلف ہیں سب کو معلوم ہے کہ تکلیف اُن امور کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور استعداد اصلی میں بندہ مجبور محض ہے۔

تو اب یہ مضمون خوب ہی واضح ہو گیا کہ علم کی استعداد اصلی کے لحاظ سے تو ارشاد لا یعلمون مندرجہ آیت مذکورہ بالا کا مصداق قیامت تک نہیں مل سکتا۔

اور علیٰ ہذا القیاس امانت کی استعداد اصلی کے لحاظ سے فرمان لا امانۃ لہ مندرجہ حدیث کا مصداق بھی نوع انسانی

میں ہاتھ نہیں آسکتا۔

ہاں علم اور امانت کی استعداد کسبی کے اعتبار سے اور وہ بھی زمانہ موجود میں ارشاد لا یعلمون اور لا امانۃ لہ کی افراد اوّل نظر میں اتنی نظر آئیں گی کہ ارشاد یعلمون کے مصداق اور متصفین بالامانۃ کی افراد سعی اور تلاش کے بعد ہزاروں میں ایک کے ملنے کی بھی وہی توقع کر سکتا ہے کہ جس کو علم و امانت کی اتنی بھی خبر نہ ہو کہ کس چیز کا نام ہے ؎

گوی توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند　　کس بمیداں رو نمی آرد سواراں راچہ شد
حافظا اسرار الٰہی کس نمی داند خموش　　از کہ می پرسی کہ دورِ روزگاراں راچہ شد

ان جملہ مضامین کے ضبط کر لینے کے بعد ان شاء اللہ بخوبی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ نعمتِ ایمان حاصل ہونے کے لیے بیشک ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر دو کمال خداداد یعنی علم اور امانت کی استعداد اصلی جو رحیم و حکیم نے زبردستی محض اپنے لطف و کرم سے مثل قوۃ باصرہ اور قوۃ سامعہ وغیرہ ہماری ذات میں پیدا فرما دی ہیں اُن کے وسیلہ سے اب ہم علم اور امانت کی استعداد کسبی حاصل کرنے میں جدّ و جہد سے کام لیں۔

اور تا وقتیکہ ہم ایسا نہ کریں گے ہرگز ہرگز اس ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہو سکیں گے جس کو تمام مخلوقات سے آگے بڑھ کر ہم نے اپنے ذمہ لیا تھا۔

اور آیۃ مذکورہ سابقہ میں جو لیعذب اللہ اور یتوب اللہ دو صورتیں مذکور ہیں ان میں سے اوّل صورت میں رستگاری اور دوسری صورت میں شراکت کا کوئی طریقہ بجز اس کے نہیں کہ علم و امانت کی استعداد کسبی مذکورۂ بالا کی تحصیل اور تکمیل اور اس کی تعمیل میں پوری چستی اور مستعدی کی جائے۔

کوئی شخص فرض کر لیجئے کہ تمام فنون کا ماہر بلکہ موجد اور عاقل اور ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو مگر علم و امانت مذکورۂ بالا کی استعداد کسبی سے اگر بالکل بے خبر اور بے بہرہ ہے تو وہ اپنے مقصود اصلی اور کار منصبی سے اتنا دُور پڑا ہوا ہے کہ جس کا تدارک وہ کسی طرح نہیں کر سکتا اور ارشاد مذکورۂ عنوان لا ایمان لمن لا امانۃ لہ کا پورا مصداق ہے واللہ یؤید بنصرہٖ من یشاء۔

ہماری معروضات سے خُوب واضح ہو گیا کہ ایمان جو کہ ہر فرد انسان کے حق میں تمام ضروریات سے ضرورتر اور تمام کمالات انسانیہ کی جڑ ہے اور اس کے بدون انسان بالکل ایسا ہے جیسا کوئی گھوڑا قوی ہیکل خوبصورت تیز رفتار ہو کر ایسا سرکش ہو جائے کہ کسی طرح سواری نہ دے بلکہ دیوانے کُتّے اور بھیڑیئے کی طرح مردم دری کرنے لگے۔

اس جوہر ایمان کا حصول دو چیزوں پر موقوف ہے :

اوّل احکامِ الٰہی یعنی وحی جس کو حسب معروضہ سابق ایمان کے لیے بمنزلہ علّتِ فاعلہ کہنا چاہیے۔

دوسری صفت امانت جس کو ایمان کے حق میں بمنزلہ علت قابلہ سمجھنا چاہیے تا وقتیکہ یہ دونوں کمال نصیب نہ ہوں گے حصول ایمان ایسا ہی محال ہوگا جیسے بغیر تخم ریزی یا بدون زمین قابل زراعت کوئی نادان حصول زراعت کی توقع کرے۔

جس سے ارشاد لا ایمان لمن لا امانۃ لہ مرقومۂ عنوان کی حقیقت اور حقیت میں کسی قسم کا خلجان نہ رہا اور جو مضمون ضروری ہم کو عرض کرنا تھا بحمداللہ اس سے فراغت ہو چکی۔

مگر اس کے بعد بغرض توضیح و تنبیہ یہ بتلا دینا بھی مناسب ہے کہ صفت امانت کی اصلاح اور اس میں ترقی کرنے کی صورت کیا ہے اور صفت امانت یعنی کسی کی رغبت و نفرت پر معتبر یا غیر معتبر ہونے کا حکم لگانے کی سبیل کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حسب ارشادات سابقہ جب علم اور امانت پر ایمان کا دارومدار ٹھہرا اور ان دونوں کمالوں کی تحصیل ہم پر ضروری ہوئی تو اب علم وحی اور احکامِ خداوندی کے حاصل کرنے کا طریقہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ بذریعہ تعلیم و تعلم جیسے ہر ایک علم و فن کو ہم حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح پر بذریعہ تعلیم و تعلم علم وحی کو بھی اگر کوئی حاصل کرنا چاہے تو بے تکلف اپنی لیاقت کے موافق حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن صفت امانت جو ایک کیفیت قلبی ہے اس کو دل میں پیدا کرنے کی کیا صورت ہے اور اس میں کمال اور ترقی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں جب یہ امر مسلم ہے کہ مضمون امانت اور اس کی استعداد اصلی ہر ایک فرد انسانی میں موجود ہے اور ادھر یہ بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ ہر ایک طبیعت کے ساتھ اس کی مقتضیات مختلفہ یعنی کسی امر کا شوق و رغبت اور کسی امر سے اجتناب و نفرت بھی ضروری لگی ہوئی ہیں اور پھر وہ مقتضیات باہم از حد مختلف ہیں۔

دیکھیے ایک طبیعت شرک و بت پرستی اور خمر و خنزیر کی طرف اس قدر راغب ہے کہ ان اشیائے سے کسی حالت میں رک ہی نہیں سکتی اور ان کے بدون اس کو چین ہی نہیں آ سکتا۔

اور دوسری طبیعت اشیائے مذکورہ سے اس قدر متنفر ہے کہ ان کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور کسی طرح ان چیزوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔

علیٰ ہذا القیاس جہاں تک نظر جاتی ہے مرغوبات طبائع میں اس قدر تخالف اور تباین نظر آتا ہے کہ خدا کی پناہ جس کے روبرو آسمان و زمین کا فرق بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا ؎

ویختلف الرزقان والشیٔ واحد
الی ان یری احسان ھذا لذا ذنبا

تو اس حالت میں ہم کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ فلاں طبیعت کی رغبت معتبر اور فلاں طبیعت کی غیر معتبر ہے اور ہمارے پاس کون سا معیار ہے کہ جس کے ذریعہ سے ہم صفت امانت کی نسبت جو کہ بھلی بری کی شناخت کے لیے ہر انسان کے اندر موجود ہے صحت و فساد کا حکم لگا سکیں۔

سو امر اول کا جواب بقدر کفایت تو یہی ہے کہ امانت جیسے ایک کیفیت قلبی کا نام ہے ایسے ہی علم بھی تو ایک کیفیت قلبی ہی کا نام ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ اعضائے جسمانی کو تو علم ہوتا ہی نہیں علم تو صرف دل کے ساتھ مخصوص ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے ؎

از خواندن علم ہرگز عالم نشوی
شیریں نشود دہاں ز نام شکر

توپھر بذریعہ تعلیم و تعلم جو اعضائے جسمانی زبان آنکھ کان کا کام ہے علم کو جو کہ امر قلبی ہے کیونکر ہم حاصل کر لیتے ہیں۔ بس اسی طرح
اعضائے جسمانی مذکورۂ بالا کے وسیلہ سے صفت امانت کو بھی ہم ضرور حاصل کر سکیں گے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ کان سے کسی مضمون کا سننا یا آنکھ سے کسی کتاب کو دیکھنا یا زبان سے پڑھنا ہرگز علم میں شمار نہیں
ہوسکتا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو تعلق خاص حکیم علی الاطلاق نے انسان کے حواس ظاہرہ اور اس کے قلب میں رکھ دیا ہے
اُس تعلق لطیف کی وجہ سے بذریعہ حواس انسان کو بالبداہتہ علم حاصل ہوجاتا ہے۔
خلاصہ یہ ہوا کہ حواس کو ہرچند علم تو حاصل نہیں ہوتا مگر حصول علم کے لیے حواس ظاہرہ واسطہ بیشک ہوتے ہیں اور یہ امر
ایسا بدیہی ہے کہ جس کی تسلیم میں کسی صاحب فہم کو عذر نہیں ہوسکتا۔
بعینہٖ اسی طرح صفت امانت کو خیال فرمالیجئے کہ اسی تعلق لطیف کی وجہ سے جو کہ انسان کے قوی ظاہرہ اور قوی باطنہ میں
موجود ہے اگر ہم چاہیں تو بلا تامل امور ظاہرہ کے ذریعہ سے کیفیت امانت کی تحصیل و تکمیل میں کوشش کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔
باقی رہا امر ثانی کہ کس کی رغبت طبعی اور میلان کو صحیح و معتبر سمجھیں اور کس پر غلط اور غیر معتبر ہونے کا حکم لگائیں۔ سو ہرچند
اس کا جواب مختصر اور عقل کے مطابق صرف یہ ہے کہ جو طبیعت صحیح اور امراض مفسدۂ فطرت سے پاک ہوگی اس کا اعتبار ہوگا اور جس
طبیعت کو امراض نے خراب اور فاسد کر کے اس کی مرغوبات کو کچھ کا کچھ کر دیا ہو اور امور حقہ واقعیہ سے متنفر اور غلط اور بیہودہ امور کی
طرف راغب اور مائل بنادیا ہو ایسی بیہودہ نکمی طبیعت کی رغبت و نفرت کا اعتبار وہی کرسکتا ہے کہ جس کی طبیعت اور عقل دونوں مسخ
ہوچکی ہوں۔
معقولات اور محسوسات انسانی دونوں کو ملاحظہ فرمالیجئے کہ ہر ایک میں کس قدر اختلاف شدید موجود ہے۔
امور عقلیہ کے اختلافات کا تو ذکر بھی فضول ہے اور اُن سب کا شمار کرنا بھی ہماری قدرت کے احاطہ سے باہر ہے محسوسات کہ
جن سے زیادہ کوئی چیز ظاہر اور بدیہی نظر نہیں آتی اُن کو ملاحظہ فرمالیجئے۔
ایک صحیح النظر کسی چیز کو ایک کہتا ہے تو احول اسی چیز کو دو دیکھ رہا ہے۔ ایک صحیح المزاج کو ایک کپڑا سفید نظر آتا ہے وہی
کپڑا مریض یرقان کو صاف زرد نظر آرہا ہے۔
ایک شخص کو مصری شیریں اور لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے کو غلبہ صفرا میں ایلوہ سے کم محسوس نہیں ہوتی۔ ہم کو نیم کی پتی سخت
تلخ معلوم ہورہی ہیں۔ مار گزیدہ کو اُن میں قند و شکر کا مزہ آرہا ہے۔ عطر و گلاب کے سونگھنے سے ایک لطیف الدماغ کے گئے ہوئے
ہوش لوٹ آتے ہیں۔ گندہ دماغ کے آئے ہوئے ہوش ان کی بُو سے اڑے جاتے ہیں۔
جس لالٹین میں مختلف الالوان آئینے ہوں اُس میں شمع کسی کو سُرخ کسی کو سبز کسی کو زرد محسوس ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ سب کو

معلوم ہے کہ بسا اوقات شدتِ خوف کی حالت میں آدمی کو آنکھوں سے صاف طور پر وہ اشکال نظر آتی ہیں جن کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا اور ایسی آوازیں مسموع ہوتی ہیں کہ جن کا وجود بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔

مگر ان بدیہی اختلافات کے دفع کرنے میں کسی عاقل کو دشواری نہیں ہوتی بلکہ ہر کوئی یہ کہے گا کہ جمیع امثلہ مذکورہ میں اعتبار اسی کی بات کا ہوگا جس کا حاسہ صحیح ہو اور کسی امر عارضی اور مرض خارجی نے اس کے احساس کو خراب اور غلط نہ کر دیا ہو۔ گو ایسا شخص ایک ہی کیوں نہ ہو اور جس کے احساس میں کسی مرض کے باعث فتور موجود ہے اس کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا گو ایسے مریض ہزار دو ہزار یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں بلکہ خود وہ مریض بھی بشرطیکہ عقل کو جواب نہ دے بیٹھا ہو اپنے احساس کو غلط اور صحیح المزاج اور صحیح الادراک کے احساس کو درست اور واقع کے مطابق کہے گا۔

اب مقتضیات طبائع میں اختلاف شدید دیکھ کر ہم کو ہرگز پریشان نہ ہونا چاہیے بلکہ ہم پر لازم ہے کہ اول عقل خداداد اور غور و انصاف اور قرائن و دلائل اکابر اور تجربہ وغیرہ سے طبیعت سلیم اور مریض میں تمیز کریں کہ کون سی طبیعت صحیح اور کون سی بیمار ہے اس کے بعد حسب قاعدۂ مسلمۂ سابقہ بے تکلف طبیعت سلیمہ کی مقتضا کی تصدیق اور مریضہ کی تکذیب اور تغلیط کریں اور کسی سے نہ ڈریں۔

اور کم سے کم یہ بات تو ہم پر فرض ہے کہ جب تک ہم کو کسی کی نسبت دلائل سے یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ اس کی طبیعت جملہ اُن امراض اور نقصانات سے پاک ہے کہ جن کی وجہ سے طبیعت کی مقتضیات میں خلل اور فساد آسکتا ہے اُس وقت تک ہم اُس شخص کی رغبت و نفرت کو ہرگز قابلِ اعتماد نہ سمجھیں گو وُہ اپنے وقت کا افلاطون اور ارسطو ہی کیوں نہ ہو اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر اگر کوئی عاقل ہم کو جاہل کا خطاب دے تو بمقتضائے انصاف ہم کو بُرا ماننا نہ چاہیے۔

مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ جدت پسند طبائع کیا عجب ہے جو صرف اتنی بات فرما کر ہماری تمام جانفشانی کو خاک میں ملا دینے کو موجود ہو جاویں کہ ہم کو تو اپنی عقل و انصاف سے فلاں منشی یا فلاں مولوی یا فلاں فلاسفر یا فلاں ڈاکٹر یا فلاں مسٹر یا فلاں پنڈت کی طبیعت و فطرت سلیم و صحیح اور قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہے تو ہر چند اہلِ عقل و انصاف کے نزدیک یہ کہنا اس سے بھی بدتر ہے کہ کوئی عقل کا دشمن طبیعت کا ہٹی شرم و انصاف کو بغل میں مار کر احول کی نظر اور مریض صفرا کے ذائقہ اور چارو خاکروب کی قوتِ شامہ کو قابلِ اعتماد اور لائقِ اعتبار قرار دے کر صحیح النظر اور صحیح المزاج اور لطیف الدماغ کے احساس کی تغلیط پر کمربستہ ہو جائے۔

تاہم یہ عرض ہے کہ ایسی جرأت کرنا واقف سلیم الطبع سے تو قیامت تک ممکن نہیں اور ناواقف فاسد الطبع کا اس اہم معاملہ میں کسی درجہ میں اعتبار کرنا اُسی کا کام ہے جو خود فاسد الطبیعت اور ناقابلِ اعتبار ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام تو اُس شخص کا ہے کہ پہلے خود سلیم الفطرت ہو اور اس کی طبیعت جملہ امراض اور ان کے علل و اسباب سے محفوظ ہو بلکہ امراضِ فطرت کے معالجات سے بھی واقف ہو کیف ما اتفق کسی فن خاص کا ماہر یا کوئی رند بازاری اس منصب اعلیٰ کے لائق کب ہو سکتا ہے ؎

شہپر زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست
کایں کرامت درخور شہباز و شاہین کردہ اند

اور ہم سے پُوچھیے تو وہ حقیقۃً میں کسی کا بھی پیرو نہیں صرف اپنی رغبات فاسدہ اور خیالات بیہودہ کا تابع ہے اور

کسی فلاسفر یا مولوی یا جاہل کا نام لے دینا ایسا ہی ہے جیسا ڈوبتا ہُوا تنکے کے سہارے کو منظور کرنے پر مجبور رہتا ہے۔

لیکن ہم اگر اس وقت اُن امراض اور اُن کے معالجات کے متعلق بحث کرتے ہیں تو اوّل تو ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ اپنے مختصر سیدھے مطلب سے کہ کس قدر دُور جا پڑیں گے اس کے علاوہ جو مطلب ضروری ہم کو یہاں عرض کرنا منظور ہے اس کے لیے اس تفصیل اور تطویل کی حاجت بھی نہیں۔

ان تمام باتوں کے سوا ہم کو اس موقع پر یہ بتلا دینا بھی بہت ضروری ہے کہ کسی شخص کی صفت امانت اور کمال علم و فطرت میں فائق اور معتبر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کارِ خلافت اور منصبِ ہدایت جو کہ خاص انسان کو عطا ہوا ہے اس کی انجام دہی کے لیے اُس شخص کا علم اور امانت و فطرت کافی ہے اور اُس کو کسی تعلیم و تعلّم کی حاجت نہیں اگر کسی کی نسبت کوئی ایسا خیال کرے تو۔ ع

بالکل غلط غلط غلط اور کس قدر غلط

تمام اہلِ عقل کو معلوم ہے کہ کارخانۂ ہدایت اور منصب خلافت کا انجام دینا تو حق جل جلالہ کے اوامر و نواہی یعنی اُس کی مرضیات و غیر مرضیات کے جاننے اور اُس کی موافقت و متابعت پر موقوف ہے اور اُن سب کا علم بدون کسی کے بتلائے یا تو اُس کو ہو سکتا ہے کہ جس کا علم و عقل نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے علم کے برابر ہو اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کے قائل کو احمق کہنا بھی ایسا عزت کا خطاب ہے کہ جس کا مستحق وہ قیامت تک بھی نہیں ہو سکتا اور یا اُس شخص کو اُن امور پر اطلاع ممکن ہے کہ فرض کیجیے اُس کا احساس و انکشاف اس قدر قوی ہو کہ مکنونات علم جناب باری تک اُس کی رسائی ہو مگر ہم بالبداہتہ دیکھتے ہیں کہ انسان سرتا پا کثافت کے مافی الضمیر تک تو ہمارا احساس پہنچنے سے عاجز ہے اگر کسی کا سینہ بلکہ دل بھی چیر کر دیکھیں تو اُس کے مافی الضمیر کا نام و نشان بھی معلوم نہیں ہو سکتا پھر حق تعالیٰ شانہ لطیف و خبیر وراء الوراء ثم وراء الوراء کی مکنونات علمیہ کی نسبت اگر کوئی بے عقل بیباک ایسی بات زبان سے نکالے تو اس کی زبان پر اگر دسترس مشکل ہوگی تو اپنے کانوں کے بند کرنے میں تو کسی کو بھی تامّل نہ ہوگا۔ جس کا خلاصہ یہ ہُوا کہ خدا تعالیٰ کے بدون بتلائے اور اس کے بغیر ظاہر فرمائے کسی کو اُس کی مرضیات و غیر مرضیات کا علم ممکن نہیں۔

انصاف تو کیجیے کہ اگر انسان کی فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ اس بارہ میں کافی ہوتی تو حکیم علی الاطلاق مثل دیگر فنون و علوم ضرور اس بار کو بھی ہمارے ذمہ رکھ دیتا۔ اس علم خاص کے لیے انبیا علیہم السلام کے بھیجنے اور پھر بذریعہ وحی اپنی مرضیات و غیر مرضیات پر اُن کو اطلاع دینے کی حاجت کیا تھی۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ افضل البشر اور اکمل البشر اور اعلم البشر یعنی انبیائے کرام علیہم الصلٰوۃ والسلام بھی مرضیات و غیر مرضیات جناب باری عزّ اسمہٗ کی جاننے اور دریافت کرنے میں تعلیم خداوندی اور وحی الٰہی کے محتاج ہیں تو اس پر بھی اگر کوئی زید و عمر کی عقل یا اُن کی رغبت و نفرت طبعی کو اس بارہ میں کافی سمجھے یا علمِ الٰہی جو بذریعۂ وحی ہم تک پہنچا ہے اُس کے مقابلہ میں اُس کا اعتبار کرے تو اس پر فرض ہے کہ جان دے کر بھی اگر کہیں سے تھوڑی عقل و امانت مل سکے تو ہرگز تامل نہ کرے اور بدقسمتی سے اگر عقل و امانت اس طرح پر بھی میسر نہ ہو تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسی فضول جان کو کیا کرے، ہاں ایک مردہ زندہ دل کی یہ

دعا ضرور یاد آتی ہے ؎

خوشش بہ تیغ حسرت یا رب حلال بادا
صیدے کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد

الحاصل جب یہ امر معلوم ہو چکا کہ صفت امانت اور سلامتی فطرت کے خراب کرنے والے امراض اور ان کے علل و اسباب کے بیان میں کچھ طول بھی ہے اور ہمارے مدعٰی کی تحقیق میں اُن کی حاجت بھی نہیں اور ادھر صرف فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ سے بغیر اتباع وحی الٰہی ہمارا کام بھی نہیں چل سکتا تو ان وجوہ سے اُن کی تفصیل سے قلم کو روک کر بالاجماع اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ فطرت سلیمہ انسانی کو جس قدر امور فاسد و بیمار و مسخ کر دینے والے ہیں ان سب کے اصول کل تین ہیں :

اوّل نقصان و خرابی علم و معرفت۔

دوسرے خواہشات طبعی و نفسانی کی مشغولی اور ان میں انہماک۔

تیسرے پابندیِ رسوم یعنی تحصیلِ کمال و عزت و جاہ و اوضاع و احوال میں طالبانِ دُنیا کی موافقت کو پسند کرنا اور اُن کی متابعت کو عقل و نقل پر ترجیح دینا۔

اور ان امراض کی تفصیل اور ان کے معالجات کو اہل علم و فہم کے حوالہ کرکے وُہ بات عرض کیے دیتے ہیں جس سے بسہولت یہ بات معلوم ہو جائے کہ کونسی فطرت و امانت کو صحیح و سالم قابلِ اعتبار کہنا چاہیے اور کس کو بیمار ناقص اور بیہودہ سمجھنا چاہیے مگر توضیع مطلب سے پہلے ایک قاعدہ بدیہی جس کی تسلیم میں کسی عاقل کو تامل نہیں ہو سکتا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ یہ ہے کہ خالق کائنات حکیم علی الاطلاق نے جس قدر کمالات ظاہری و باطنی انسان اشرف المخلوقات کو عطا فرمائے ہیں اُن میں ہر ایک کمال سے کوئی نفع خاص مقصود ہے کہ جس کی وجہ سے وہ کمال آدمی کو عطا ہُوا ہے اور ہر کمال کے ساتھ حق سبحانہٗ نے اپنی حکمت و قدرت سے ایسی قیود اور حدود بھی ضرور لگا دی ہیں کہ ہر کمال اپنی تحصیل غرض میں اُن قیود کا محتاج اور اُن حدود کا پابند ہے کوئی کمال انسانی اپنے احاطہ مقررہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اگر رکھے گا تو وہ کمال مبدل بہ نقصان اور باطل اور غیر مفید ہو جائے گا۔ اور جس قدر فائدہ مند تھا اُسی قدر ضرر رساں سمجھا جائے گا۔ اس لیے ہر کمال سے نفع اُٹھانے کے لیے اُن قیود و حدود کا پُورا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

مثلاً آنکھ جو عطا ہوئی ہے ہر چند اُس کو ہمارے جمال میں بھی پُورا دخل ہے مگر سب جانتے ہیں کہ غرض اصلی آنکھ سے مبصرات کا دیکھنا اور بھلے بُرے کی تمیز ہے اور اِسی کے ساتھ آنکھ سے دیکھنے کے لیے متعدد شرائط اور قیود بھی ہیں جن کے بدون آنکھ اپنا کام کرنے سے عاجز و مجبور ہے اگر اپنے اُس احاطہ سے کہ جو قدرت و حکمتِ الٰہی نے اُس کے واسطے مقرر فرمایا ہے ایک قدم بھی باہر رکھیں گے تو آنکھ کا وجود اُس کے عدم سے زیادہ مفید نہ ہو گا۔

دیکھئے آنکھ اُسی چیز کو دیکھ سکتی ہے جو موجود بھی ہو اور مثل اجسام محسوسہ و اشکال والوان مختلفہ وُہ چیز کثیف بھی ہو۔ ہوا اور نار کی طرح لطیف نہ ہو اور وُہ چیز آنکھ کے سامنے ایک خاص دوری پر بھی ہو آنکھ کے متصل یا بہت بعید نہ ہو اور وہاں روشنی

بھی ہو، تو اب کسی شخص کو اختلال دماغ و حواس کی حالت میں اگر وہ چیزیں نظر آنے لگیں جن کا وجود ہی نہیں تو اس پر سب خلل دماغ کا حکم لگائیں گے اس کی رویت کو ہرگز معتبر نہ سمجھیں گے یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مجھ کو ہوا بھی نظر آتی ہے یا میں ہندوستان میں بیٹھے ہوئے تمام یورپ کی سیر کر لیتا ہوں تو کوئی عقل کا اندھا بھی یہ نہ کہے گا کہ اس کی نظر بہت تیز اور قوی ہے کہ اس قدر اشیائے لطیفہ اور بعیدہ کو دیکھ رہا ہے بلکہ ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ اس کے دماغ و حواس میں خلل ہے یا دیدہ و دانستہ دروغ بے فروغ حماقت سے بک رہا ہے اسی طرح پر جملہ حواس کا حال خیال فرما لیجئے۔

جب یہ قاعدہ واضح ہو چکا تو اب سنیے کہ صفحات گزشتہ میں مذکور ہو چکا ہے کہ انسان افضل الممکنات کو جو اول درجہ کا کمال عطا ہوا ہے وہ علم ہے جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت اور حکمت کی شناخت اور بالخصوص حق سبحانہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات کے دریافت کرنے کے لیے عطا ہوا ہے اور اس کمال کا افضل الکمالات ہونا ایسا ہی مسلّم ہے جیسا انسان کا افضل المخلوقات ہونا قابلِ قبول ہے۔

اور اس کمال میں صانع حکیم و رحیم نے اس قدر وسعت عطا فرمائی ہے کہ حواس میں کسی کو نصیب نہیں آنکھ کی طرح نہ روشنی کا محتاج ہے اور نہ رُوبرو ہونے کی ضرورت نہ قربِ مکانی کی پابندی نہ اتحادِ زمانی کی حاجت۔

دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے قریب بعید حاضر غائب سب طرف اُس کی رسائی یکساں ہے بلکہ معدومات اور ممتنعات تک اُس کی دسترس نظر آتی ہے۔

وسعتِ علم کے مقابلہ میں آسمان و زمین کی وسعت بھی ہیچ نظر آتی ہے امور موجودہ اور گزشتہ و آئندہ سب اُس کے جولانگاہ ہیں۔

مگر باوجود اس قدر پھیلاؤ اور وسعت کے جو کسی احساس و ادراک کو نصیب نہیں سب کو معلوم ہے کہ علم بھی ایک احاطہ میں مقید ہے اور اُس کی رسائی کے لیے بھی ایک شاہراہ مقرر ہے جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ علم انسانی نہ جملہ معلومات کو دریافت کر سکتا ہے اور نہ یہ کر سکتا ہے کہ جس طریقہ سے چاہے کیف ما اتفق کسی امر کو معلوم کر لیا کرے بلکہ بعض معلومات تو ایسی ہیں کہ علم بشری وہاں تک پہنچنے ہی میں عاجز و قاصر ہے اور جن امور تک اس کی رسائی ممکن ہے اُن کے دریافت کرنے میں وسائط مخصوصہ اور اسباب منفردہ کا محتاج ہے کہ بدون اُن وسائل کے علم کا حاصل ہونا ممکن نہیں دیکھیے دخان کے ذریعہ سے تو بیشک ہماری عقل آگ تک رسائی ہو سکتی ہے مگر گرد و غبار کے ذریعہ سے آگ کا علم ہرگز علم نہ ہوگا بلکہ جہل مرکب ہوگا الحاصل جن وسائط اور وسائل سے ہم کسی امر کو دریافت کرنا چاہیں گے تا وقتیکہ وہ وسائل حقیقۃً میں وسائل اور واقع میں معتبر نہ ہوں گے۔ ان سے جو علم حاصل ہوگا وہ سراسر جہل ہوگا کیونکہ واقع علم کا تابع نہیں ہوتا بلکہ علم واقع کا تابع ہوا کرتا ہے چنانچہ علم کا تابع معلوم ہونا اہلِ علم میں مشہور اور بدیہی مسئلہ ہے۔

اگر تمام ماہرانِ ہیئت و ریاضی اپنے معتبر نقشوں اور گھڑی گھنٹوں کے حساب سے اس بات پر متفق ہو جائیں کہ آفتاب اس وقت بالکل ڈوب ہو چکا ہے اور فرض کیجیے آفتاب کا کنارہ کسی قدر باقی ہے تو یہ ہرگز نہ ہوگا کہ اُن ماہرانِ ہیئت اور ان کے

نفثجات و آلات کے اتفاق کے باعث آفتاب واقع میں غروب ہو جائے گا بلکہ واقع میں اُن کا قول غلط اور ان کا علم سراسر جہل شمار ہو گا۔
اسی طرح پر اگر نفس الامر میں عالم کے لیے کوئی صانع اور خالق ہے یا خالق کائنات کے لیے توحید اور اس کا ایک ہونا ضروری ہے یا یہ صحیح ہے کہ جس قدر امور چھوٹے بڑے ہیں وہ سب اس کے علم میں مقدر اور مقرر ہو چکے ہیں یا عالم کا حادث ہونا واقعی بات ہے تو پھر اگر تمام مدعیان عقل و علم بھی بالفرض وجود صانع کا انکار کریں یا دو تین خدا کے قائل ہو جائیں یا تقدیر کا انکار کرنے لگیں یا عالم کے قدیم ہونے کے معتقد ہو جائیں تو اس اتفاق سے ہرگز ہرگز یہ نہ ہوگا کہ وجود صانع میں ادنیٰ سا ضعف بھی آسکے یا اس کی توحید میں خلل آجاوے یا تقدیر کا مسئلہ غلط ہو جائے یا عالم قدیم بن جائے بلکہ اُن تمام مدعیان عقل کا قول محض غلط سفید جھوٹ اور ان کا علم سراسر جہل ہوگا یہ نہ ہوگا کہ اُن کے سمجھنے یا کہنے سے جو امر واقعی ہے وہ بدل کر ان کے علم کے موافق اور اس کا تابع ہو جائے اور یہ بات ایسی بدیہی ہے جس کی تسلیم میں کوئی فہیم متامل نہیں ہو سکتا۔

جب یہ قاعدہ ذہن نشین ہو چکا کہ انسان کے ہر ایک کمال ہر ایک ادراک کے لیے ضرور ہے کہ کوئی امر خاص اور منفعت مخصوص اُس سے مطلوب ہو کہ بہ پابندی قیود معتبرہ و حدود مقررہ وہ غرض اس کمال سے حاصل کی جا سکے۔

تو اب صفت امانت کہ جس کی صحت و فساد کا قاعدہ معلوم کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود ہے اُس کو بھی ہم اگر اس قاعدہ کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں تو الحمد للہ کہ کوئی خلجان اور دشواری نظر نہیں آتی بلکہ جیسا تمام حواس ظاہرہ اور عقل و علم کی صحت و سقم میں اس مختصر قاعدہ سے ہم تمیز کر سکتے ہیں اُسی طرح صفت امانت کی صحت و سقم کو بے تکلف قاعدہ مذکورہ کے ذریعہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں۔

اوراق گزشتہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے کہ جو ہر عقل و علم جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت شناسی اور مرتبہ دانی کے لیے عطا ہوا تھا اُس کی تائید و تکمیل کے لیے ہم کو قدرت و اختیار عنایت ہوا تھا تاکہ حسب ہدایت علم اپنے قویٰ و اعضا سے اعمال حسنہ بھی کر سکیں لیکن قوت بہیمیہ جو انسان کی عقل و علم پر غالب آکر اُس قدرت سے بسا اوقات خلاف عقل و علم کام لینے لگتی ہے تو خالق حکیم نے انسان کو اس مضرت سے محفوظ رکھنے کے لیے عقل و علم کو ایک مددگار خاص مرحمت فرمایا کہ قوت بہیمیہ کے تغلب سے ہم کو بچائے اور ہماری قدرت و اختیار کو عقل و علم کی نافرمانی سے روکے اور اُسی کا نام فطرت اور امانت ہے۔ انتہیٰ

اب اس مضمون مذکورۂ اوراق بالا سے صفت امانت کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے یعنی یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ صفت امانت سے مقصود اصلی کیا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صفت امانت کی کارپردازی کے لیے کون سا احاطہ محدود ہے۔

دیکھو۔ لیجیے غرض اصلی صفت امانت کی تو یہ ہوئی کہ ہم کو قوت بہیمیہ کی مضرت سے بچائے اور بُری باتوں سے روکے اور بھلی باتوں پر چلائے اور ان کی طرف کھینچے۔

اور حد اور احاطہ کی بابت یہ بات تو واضح ہوگئی کہ یہ امر ضروری ہے کہ صفت امانت متابعت علم اور اعانت عقل سے سرِ مُو متجاوز نہ ہو اس کے سوا اگر اور حد و قیود بھی اس کے لیے ہوں تو ان سے ہم کو انکار نہیں ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ اگر صفت امانت متابعت عقل و علم سے ذرا بھی متجاوز ہوگی تو وہ امانت صحیح نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جیسا علم اپنے احاطہ سے نکل کر علم نہیں رہتا ضد علم یعنی جہل ہو جاتا ہے بعینہٖ اسی طرح امانت اپنی حد سے اِدھر اُدھر ہو کر حقیقت میں امانت نہ رہے گی بلکہ ضد

امانت ہو جائے گی جس کو حقائق شناس فتنہ کہتے ہیں۔

کیونکہ جیسا امانت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو امورِ حقہ واقعیہ کی طرف راغب بنائے اور غلط اور باطل باتوں سے نفرت دلائے ایسا ہی فتنہ درحقیقت اُس حالت اور کیفیت کا نام ہے جو ہماری نظروں میں سچی باتوں کو غلط اور غلط باتوں کو سچا کر دکھائے اور مرغوبات اصلیہ کو مکروہ اور مکروہات اصلیہ کو مرغوب بنا دے جو سخت مہلک مرض ہے۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظھر منہا وما بطن۔[1]

اب ان شاء اللہ ہر ایک عاقل منصف بے سمجھائے سمجھ سکتا ہے کہ فطرت سلیمہ اور امانت صحیحہ کی پوری اور بے تکلف یہ شناخت ہے کہ عقل وعلم کی تابع ہو بالخصوص علمِ وحی کہ جس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان بھی نہیں اور اُس کا مطابق واقع یعنی اُس کا علم ہونا قطعی اور یقینی ہے اُس کی پیروی اور موافقت تو امانت صحیحہ کے لیے اور اُس کی مخالفت امانت فاسدہ کے لیے اوّل اور قوی تر شناخت ہے اور جیسا کسی کا علم واقع اور علم و احکام خداوندی کے مخالف ہو کر علم نہیں ہو سکتا بلکہ جہل مرکب بن جاتا ہے اسی طرح یہ وہ فطرت و امانت جو علم اور عقل اور واقع کے خلاف ہو ہرگز امانت ہی نہیں ہو سکتی حقیقت شناس بے تامل اُس کو فتنہ کہیں گے والفتنۃ اشد من القتل۔ (اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے)

ہم کو اُمید ہوتی ہے کہ ہماری تمام معروضات کو سمجھ کر انشاء اللہ اہلِ فہم و انصاف کو حدیث شریف مرقومہ عنوان کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ خلجان میں نہ ڈالے گا اور ایمان کے لیے وحی کو بمنزلہ علۃ فاعلہ اور صفت امانت کو بمنزلۂ علۃ قابلہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا تردد پیش نہ آئے گا اور خوب سمجھ لے گا کہ ایمان کا حاصل ہونا علم وحی اور صفت امانت دونوں پر موقوف ہے جس کو ان دونوں کمالوں سے جتنا حصہ ملے گا اُسی درجہ کا اُس کا ایمان سمجھا جائے گا اور ان ہر دو کمال میں سے اگر ایک کمال سے بھی کوئی محروم ہوگا تو پھر حصول ایمان کی توقع ایں خیال ست و محال ست و جنوں کا مصداق ہے تمام جہان کے کمالات بھی اگر کسی میں تجویز کر لیے جاویں تو ان ہر دو کمال میں سے کسی ایک کمال کی بھی مکافات نہیں کر سکتے۔

عاقل، عالم، حکیم، موجد، علامہ، وحید دہر، مصلح قوم، وسیع الحوصلہ، اولوا العزم، دُور اندیش، محقق، ماہر وغیرہ وغیرہ جس قدر خطابات چاہیے کسی کو دیئے جائیے مگر مومن ہونے کا استحقاق کسی کو جب ہی نصیب ہو سکتا ہے کہ ہر دو کمال مذکورہ بالا سے کافی اور ضروری حصہ حاصل کر لے۔

بلکہ حسب ارشاد سید المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم یقال ما اظرفہ وما اجلدہ وما فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان او کما قال (یعنی قربِ قیامت میں یہ حالت ہوگی کہ بعض لوگوں کی نسبت لوگ کہیں گے کہ نہایت ہی عاقل نہایت ہی ظریف نہایت ہی جری آدمی ہے حالانکہ اس کے دل میں ذرہ بھر ایمان بھی نہیں ہوگا) بغیر حصول دولت ایمان کوئی کمال اور کوئی خوبی مستحق تحسین اور قابل اعتبار ہی نہیں ہو سکتی یعنی غیر مومن کی سچی تعریف بھی ناپسند ہے۔

---

[1] ہم خدا تعالیٰ سے ظاہری و باطنی فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دائرۂ ایمانی سے باہر اور احاطۂ احکام خداوندی سے آزاد رہ کر جملہ کمالات انسانی بھی بالفرض حاصل کرلے اور عالم کے تمام علوم و فنون پر حاوی ہو جائے تو نظر حقیقت شناس اُس کو ایسا سمجھے گی جیسے عمدہ کپڑا بنایا تو گیا تھا پہننے کے لیے مگر کسی کوزہ نظر حریص نے اُس کو جلا کر چائے پکالی یا حقہ بھر لیا نعوذ باللہ من الجھل والغباوۃ[1] اِس پر بھی اگر کوئی علم وحی اور صفتِ امانت کو تمام علوم سے افضل و ضروری اور جملہ کمالات انسانی سے برتر اور لابد نہ سمجھے تو اُس سے زیادہ جاہل امانت سے محروم فتنہ میں مبتلا اور کون ہوگا۔

الحمد للہ ہماری معروضات سابقہ و لاحقہ سے یہ بات تو خوب محقق ہوگئی کہ ایمان یعنی اطاعتِ خداوندی جو کہ ہماری بلکہ تمام دنیا کی آفرینش سے مقصود ہے وہ علم وحی اور ملکۂ امانت پر موقوف ہے اور اس موقع پر ہمارا مطلب ضروری بھی اتنی بات کا عرض کر دینا تھا جس سے فراغت ہو چکی۔

اس کے بعد یہ امر بھی ضرور لحاظ و فکر کے قابل ہے کہ حق سبحانہ کی مرضیات و غیر مرضیات تک رسائی کہ جس پر ایمان و عبودیت و انجام وہی کار خلافت و ہدایت کا مدار ہے بالخصوص ہم جیسوں کو یقیناً محال اور اس شعر کا مصداق ہے۔ ؎

وہی آئے نہ آئے آپ ہم تک
نہ یاں طالع رسا، نے جذبِ کامل

ادھر امانت کی پابندی یعنی اسیرانِ ہوا و ہوس کا تمام مفاسد و مظالم اور جملہ خیانات اور بیجا خواہشوں سے پیچھا چھڑا کر جادۂ عدل و اعتدال اور صراطِ مستقیم پر قایم رہنا طاقت بشری سے اتنی دُور نظر آتا ہے کہ بجز مایوسی کچھ نظر نہیں آتا، اور بے اختیار یہی کہنے کو دل چاہتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ اند
باز میگوئید دامن تر مکن ہشیار باش

اب ادھر تو یہ دونوں امر اس قدر ضروری کہ اُن کے بدون انسان گدھے اور کُتّے سے بدتر اور اولٰئک کالانعام بل ھم اضل کے لقب کے شایاں اُدھر ان ہر دو کمال تلک رسائی۔ ان سے منتفع ہونا ہماری ہمت سے باہر اور طاقت سے دُور پھر کام چلے تو کیونکر چلے۔

اس عقدۂ لاینحل کے حل کرنے کے لیے اور بندگان اسیران جہل و ہوس پر ان تمام مشکلات کی سہولت کی غرض سے حکیم علی الاطلاق جل جلالہٗ و عم نوالہٗ نے اپنے کمال قدرت اور وفور رحمت سے یہ کیا کہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی اور ینابیع فیوض غیر متناہی مہبط انوار غیبی مخزن اسرار لاریبی یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو تمام کمالات علمی و عملی میں ممتاز اور تمام ملکات و اخلاق حسنہ سے سرفراز اور اپنے تمام بندوں کی محبت و شفقت سے اُن کے قلوب مطہرہ کو مالا مال فرما کر گویا اپنی تمام مرضیات و غیر مرضیات کا اُن کو

---

[1] جہل و غباوۃ سے خدا کی پناہ۔

نمونہ اور نقشہ بنا کر حسب مقتضائے حکمت و ضرورت وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کی طرف بھیجا اور کیا عرض کروں کہ کس کس طرح سے ہر دو کمال مذکورہ علم و امانت اور دیگر امور مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل و تکمیل کو اپنے بندوں پر سہل فرما دیا جس کو دیکھ کر مایوسان کم ہمت بھی "نصیبے برم" کہنے کو تیار ہیں فللہ الحمد والثنا ولہ الشکر والفضل والثنا ۔

اس کی توضیح اپنی لیاقت کے موافق اور اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ بارگاہ احکم الحاکمین میں جو قرب و امتیاز محبوبیت و اعزاز مقبولیت و وجاہت کرامت و سیادت حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل ہے کسی فرد بشر کو نصیب نہیں اور جو کمال علمی و عملی اُن کو عطا ہوا ہے کسی کو میسر ہونا محال، تمام حکماء و عقلا کے اخلاق و عقل کو اُن اورنگ نشینان محفل کمال کی عقل و اخلاق کے ساتھ وہی نسبت ہے جو دھوپ کو آفتاب سے اور پانی کی حرارت کو آگ سے ۔ بارگاہ رب الارباب میں اُن کا وہی درجہ ہے جو بارگاہ سلطانی میں مقربان شاہی کا ہونا چاہیے کہ حکام ماتحت اور عام رعایا ملک جو احکام و انعامات سلطانی بھیجتے ہیں اُنھیں کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں رعایا کی عرضداشت وہی مسموع ہو سکتی ہے جو ان کے وسیلہ سے پیش ہو ان کی اطاعت بعینہ اطاعت سلطانی اور اُن سے سرکشی و تمرد بغاوت بادشاہی شمار ہوتی ہے خلیفہ کامل اور نائب بلا واسطہ ہیں تو وہی ہیں باقی تمام عالم کو (کسے باشد) بعض کو بمنزلہ حکام ماتحت اور بعض کو بمنزلہ رعایائے سلطانی سمجھنا چاہیے ۔

بالجملہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دربارہ فیوضات غیبی اور برکات روحانی اور تحصیل سعادت و ہدایت اور تسہیل حصول جملہ کمالات بشریت حق سبحانہ اور اس کے بندوں کے مابین ایسے ہی واسطہ ہیں جیسے وہ اشیاء کہ آفتاب کے اور ان کے درمیان کوئی چیز حاجب ہو اور اُن تک نور آفتاب پہنچانے کے لیے آئینہ مصفّٰی و مجلّٰی واسطہ ہو جاتا ہے ۔

اور بعثت انبیاءؑ سے غرض اصلی یہی ہے کہ بندگان جاہل و گمراہ علماً و عملاً اپنے اصول و فروع ایمانی یعنی علوم و اعتقادات، اخلاق و حالات، اقوال و افعال، عادات و عبادات، رسوم و معاملات میں ایسے مہذب ہو جاویں کہ دنیا میں انتظام معاش اور آخرت میں فلاح معاد بخوبی و سہولت حاصل کر سکیں جس سے اہل انصاف کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اتباع انبیاءؑ کو صرف عبادات کے ساتھ مخصوص سمجھنا اُنہیں صاحبوں کا کام ہے جو بے علمی اور کوتہ نظری کے ساتھ صفت امانت کو خراب و فاسد کر کے من حیث لا یحتسب فتنہ میں مبتلا ہو چکے ہیں اگر وجوب اتباع انبیاءؑ مسئلہ شرعی اور امر دینی ہے تو پھر ارشاد انتم اعلم بامور دنیاکم کے بھروسے متابعت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صرف عبادات میں منحصر کرنا کس قدر سینہ زوری ہے اور اطاعت رسول کو امور دنیوی میں داخل کرنا تو اُسی کا کام ہے جو احاطۂ آدمیت سے بھی خارج ہو چکا ہو ۔

سب جانتے ہیں کہ ایک تو امر اور حکم ہوتا ہے اور ایک صلاح و مشورہ ۔ سو امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خواہ کسی چیز کے متعلق ہو ہم بیشک اس کے مامور ہیں ۔ اور مشورہ آپ کا ہو یا کسی اور کا ہم اس کے مامور ہرگز نہیں ۔ یہ امر دیگر ہے کہ بمقتضائے حسن ادب جو بوجہ کمال عقل و مقبولیت انبیاءؑ علیہم السلام کے ساتھ ہونا چاہیے اُن کے مشورہ کا اتباع بھی مستحب اور اُن کا مشورہ بھی اوروں کے مشورے سے مقدم ہے مگر یہ استحباب خارجی اور عرضی ہے اس اتباع کی نسبت امر شرعی ہم کو نہیں ہوا جو اس کو امر شرعی کہا جائے ادھر یہ بات ہے کہ مشورہ مذکورہ کی گنجائش ہے تو منافع و مضار دنیوی میں ہے دربارۂ منافع و مضار اُخروی انبیاءؑ کو

مشیر سمجھنا نبوت کا مدعی بننا یا انبیا کو عوام میں داخل کرنا ہے اور یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیے کہ تحصیل منافع دنیا کے بعض طرق فلاح آخرت کے معارض ہوتے ہیں اور بعض موافق اور بعض نہ معارض نہ موافق پہلے دو طریقوں میں حکمِ نبوی اور امر شرعی کا اتباع کرنا پڑے گا البتہ تیسرا طریقہ یعنی جو فلاح آخرت کے نہ مخالف ہے نہ موافق صرف اُس میں ہم کو توسع اور اختیار ہے کہ اُس کے ذریعہ سے ہم منفعت دنیوی حاصل کر سکتے ہیں اُس میں فقط یہ ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ کسی نہج سے فلاح آخرت کے معارض نہ ہو جاوے۔ باقی جس طرح چاہیں طریقۂ مذکورہ سے منفعت حاصل کریں چنانچہ بیوع و اجارات فاسدہ وغیرہ کی ممانعت اسی پر مبنی ہے۔

تو اب جو کوئی اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ کے ارشاد سے (جو آپ نے تابیر نخل کی نسبت فرمایا تھا) خود مختار بننا چاہے اول اس پر یہ لازم ہے کہ یہ سمجھ لے کہ آپ نے تابیر نخل سے جو روکا تھا یہ حکم اور امر تھا یا بتقاضائے خیر خواہی بطور مشورہ منع کیا تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھ لے کہ اقسام ثلثہ مذکورہ میں سے تابیر نخل کس قسم میں داخل ہے۔ جس قسم میں داخل ہے صرف اُسی میں مختار بنے جملہ اقسام میں خود مختاری اس سے حاصل کرنا بالکل یہ کہہ رہا ہے کہ حدیث مذکور کے مورد اور اس کے مطلب سمجھنے کا قصد بھی نہیں کیا۔

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ درستیِ آخرت چونکہ مقصود بالذات ہے اور انتظام معاش دنیوی بالتبع مطلوب ہے تو اس لیے اگر کوئی چیز معاش دنیوی کے لیے مفید و نافع اور معاد و آخرت کے لیے مضر و نقصان دہ ہوگی تو وہ چیز ضرور قابلِ ممانعت اور واجب الاجتناب ہوگی اور اس کا عکس قابلِ قبول اور واجب العمل ہوگا۔

اِس مختصر قاعدہ کے سمجھ لینے کے بعد ان شاء اللہ جملہ اُن امور سے نجات مل سکتی ہے کہ جن سے وحیِ الٰہی تو روکتی ہے اور ہم کو اپنی عقل سے بڑے بڑے نفع ان میں نظر آتے ہیں یا وحی الٰہی تو اس کی طرف شوق و رغبت دلاتی ہے اور ہمارا نفس اس سے ڈراتا ہے۔ چنانچہ فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے کے بارہ میں خود کلام الٰہی میں ارشاد ہے :

الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشآء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا واللہ واسعٌ علیم۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ جب ہماری عقل و خواہش حکمِ الٰہی کے ناموافق ہوں تو ہم کو امرِ خداوندی کی متابعت چاہیے اور یہی ہمارے لیے موجب فلاحِ دارین ہے مگر اسی آیۃ کے متصل یؤتی الحکمۃ من یشآء ارشاد فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ اس کو تسلیم کرنا اُنہیں کا کام ہے جو علم و عمل میں پختہ ہیں جاہل ہوا پرست سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جو نادان اپنی یا کسی دوسرے کی عقل کے بھروسا کہ جس کو حسب الحکم آیۃ سابقہ حقیقت میں اغوائے شیطانی کہنا چاہیے احکام وحی کی مزاحمت اور اُن میں تصرفات کرنے پر آمادہ ہو اُس نادان کو عظمتِ وحی تو درکنار خود اپنی بھی خبر نہیں وہ بیچارہ علم و امانت سے اس قدر اجنبی اور بے نصیب ہے کہ صاحبِ علم و امانت کو اُس کی نسبت "نیستند آدم غلاف آدم اند" کہہ کر بھی صبر نہ آئے گا۔

ارشادِ خداوند فاضلہ اللہ علی علم اور ارشادِ نبوی اتخذوا رؤسا جھالا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا کے پوری مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ والعیاذ باللہ ؎

اے جذبہ ہمتے کہ دریں دشت پُر فریب گم کردہ ایم قافلہ سالار خویش را

جب یہ مضمون محقق ہوگیا کہ تمام عالم کے لیے سرمنشأ ہدایت اور سرچشمۂ جملہ کمالات بنی آدم اگر ہیں تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ کو جو احکامات و انعامات خداوندی پہنچتے ہیں اُنھیں کی وساطت سے پہنچتے ہیں تو اب کیسے ہوسکتا ہے کہ علم و امانت جن کو انعاماتِ خداوندی میں اعلیٰ اور کمالات انسانی میں تمام کمالوں کے لیے سرمنشأ کہنا چاہیے وہ انبیاء کے ذریعہ سے ہم کو نہ پہنچائے جائیں بلکہ ضرور ہے کہ ان دونوں کمالوں کی ہم کو جس قدر احتیاج ہے اُسی قدر بذریعہ انبیاء ہم تک پہنچانے میں اہتمام زیادہ فرمایا گیا ہو اور جس قدر ان کی تحصیل میں دشواری تھی اُسی قدر بذریعہ انبیاء ہم پر ان کی تحصیل کو سہل و آسان کر دیا گیا ہو۔

سو الحمدللہ علم و امانت میں بھی قصہ ہے دیکھ لیجیے اول تو انسان کو جوہر عقل اور علم عطا فرمایا پھر اس کی تائید کے لیے حواس ظاہرہ و باطنہ کس قدر عنایت کیے پھر تعلیم و تعلم کے ایسے طریقے بتلا دئے کہ انسان ظلوم وجہول سہولت کے ساتھ تحصیل و تکمیل علم کر سکے بلکہ مختلف علوم وفنون صنائع بدائع اپنی سمجھ اور تجربہ وغیرہ سے ایجاد کر سکے چنانچہ آج جس قدر علوم وفنون ہماری نظر کے سامنے ہیں وہ سب ایسے ہی ہیں صرف ایک علم جس کو علم مرضیات الٰہی اور علم احکامِ الٰہی اور علم وحی کہتے ہیں اور اس کا جاننا مقصود اصلی ہے البتہ اس تک رسائی ہماری طاقت سے باہر تھی اور باوجود کمالات مذکورہ انسان کو اس علم کا حاصل کرنا محال تھا سو اس کا تکفل و اہتمام حق سبحانہٗ نے خود ایسا فرمایا اور انبیاء کرام کے وسیلہ سے ہم پر اس قدر سہل کر دیا کہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اللہ کے فضل سے علم وحی کی تحصیل میں وہ سہولتیں نظر آتی ہیں جو بہت سے علوم ایجاد کردۂ بنی آدم میں بھی نہیں دیکھتے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ سفراء معصومین اعنی ملائکہ مقربین کی وساطت سے احکامِ الٰہی اور کلام خداوندی انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرمائے جاتے ہیں اور کلام الٰہی کا مطلب اصلی اور منشأ واقعی اُن کے قلوب میں خوب راسخ فرما کر تبلیغ و ہدایت خلق اللہ کا عظیم الشان کام ان کے سپرد کیا جاتا ہے اور انبیاء کرام کے وہ کمالاتِ جلیلہ شریفہ جن کو بالاجمال ابھی عرض کر چکا ہوں ان کمالات پر بھی بس نہیں کی جاتی بلکہ طرح طرح سے احکامِ خداوندی کی تبلیغ اور اُن کی محافظت کا عظیم الشان اہتمام کیا جاتا ہے جس کی کیفیت بخوبی اس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے:

عالم الغیب فلا یظہر علٰی غیبہٖ احداً الّا من ارتضٰی من رسول فانہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہٖ رصداً لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم واحصٰی کل شئ عددا۔

خلاصۂ مضمون آیۃ یہ ہے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب اپنے بھید کی باتیں پیغمبروں کے سوا کسی پر ظاہر نہیں فرماتا اور اپنے رسول کی حفاظت وحمایت سب طرف سے کرتا ہے تاکہ رسولوں کا احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرنا محقق ہوجائے اور کوئی فتور و قصور تبلیغ وحی میں نہ آنے اور اللہ کا علم و قدرت رسولوں کے احوال اور تمام اشیاء کو محیط ہے کوئی امر اس کے علم و قدرت سے خارج نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ احکام بذریعہ وحی خاص انبیاء پر نازل ہوتے ہیں اور لفظ ارتضٰی سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ حضرات انبیاء کرام کے تمام ملکات و علم و اعمال و اخلاق و احوال پسندیدۂ جناب باری و اکمل و اعلیٰ ہوتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ وحی الٰہی اور اس کی تبلیغ کا ہر طرح سے ایسا انتظام و محافظت تام منجانب اللہ ہوتا ہے کہ کسی نقصان و

خلل کا اُس میں امکان محال ہے نہ یہ ہوسکتا ہے کہ شیطان کے کسی قسم کے دخل کو وہاں تک رسائی ہو نہ یہ ممکن ہے کہ حضرات انبیاءؑ سے اُس کے فہم مطلب میں غلطی اور اُس کی تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی یا بھول چوک ہو جائے۔

اسی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ منجملۂ کمالات گوناگوں عبودیت و عصمت دو کمال عظیم الشان انبیاءؑ علیہم السلام کو خاص طور سے عطا ہوتے ہیں۔

عبودیت کا خلاصہ تو یہ ہے کہ اپنے تمام کمالات کو محض انعام و عطائے خداوندی اور اپنے آپ کو تمام کمالات وغیرہ میں اُسی کا محتاج اور دستِ نگر سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے اتباع احکام الٰہی میں ایسی چُستی اور اُس کی رضا جوئی میں اس قدر محو اور چالاک کہ ہر ایک امر خداوندی کے بجالانے کو جان و دل سے تیار اور ہر ایک مخالف مرضی سے متنفر اور بیزار بجز اطاعت و فرمانبرداری نہ راحت کا خیال نہ تکلیفات شاقہ کا فکر و ملال نہ عزت سے سروکار نہ کسی کی ایذارسانی کا دل پر بار۔

اور عصمت کا ماحصل یہ ہے کہ انبیاءؑ علیہم السلام کے اقوال و افعال عبادات و معاملات حالات و عادات اخلاق و ملکات جو سرتاپا پسندیدہ اور برگزیدہ اور حق سبحانہٗ کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں بعنایت و حمایت الٰہی وہ سب دخل شیطانی اور عوارض نفسانی سے معصوم و محفوظ رکھے جاتے ہیں اُن کے کسی قول و فعل وغیرہ میں دُوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہوسکتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاءؑ کی تعلیم قولی و فعلی وغیرہ سب قابلِ قبول اور واجب الانقیاد ہیں اور اُن کے کسی قول یا فعل یا عادت یا معاملہ سے انحراف موجب خسران دارین ہے۔

پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ کمال علم و عبودیت کے ساتھ حضرات انبیاءؑ علیہم السلام کے مقدس قلوب میں تمام امت تمام قوم تمام بنی نوع کی محبّت اور سچّی خیر خواہی اور ہمدردی اور اُن پر رحمت و شفقت اس قدر القاء فرمائی جاتی ہے کہ اُن کی راحت کو اپنی راحت سے اور اُن کی تکلیف و مضرت کو اپنی تکلیف اور مضرت سے کم نہیں سمجھتے مثل پدر شفیق ان کی تادیب و تعلیم میں جان و مال کسی چیز سے دریغ نہیں فرماتے اُن کی آوارگی اور گمراہی دیکھ کر نہایت بے چین و بیقرار ہوتے ہیں لیکن ان کی ہمت میں فتور اور ان کی سعی میں قصور نہیں آتا نااہلوں کے پتھر اور گالیاں کھا کر بھی اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون ہی ان کی زبان پر آتا ہے اور ارشادِ حق عزّ و جل لعلّك باخع نفسك ان لا یکونوا مومنین سُن کر بھی ان کی ہمدردی اور دل سوزی کا جوش فرو نہیں ہوتا۔

اس پر زُہد و قناعت، استغنا اور استقامت، ہمّت و شجاعت، فہم و فراست، فصاحت و بلاغت، فیضِ صحبت وغیرہ اوصاف میں ایسے کامل کہ ہدایت و حق گوئی میں تنِ تنہا تمام عالم سے نہ جھجکیں اور کسی طمع اور کسی حاجت کے باعث ہرگز ہرگز کسی سے نہ لچیں امرِ حق میں سب سے بیگانہ خلق اللہ کی مصلحت بینی اور نفع رسانی میں فرد و یگانہ دوستوں پر عاشق دشمنوں کے سچے بھی خواہ اور طالب صادق تعلیم و تفہیم میں وہ کمال کہ مضمون دقیق و طویل کو سہل اور مختصر فقروں میں اُمّی صحرانشین کے دل میں ایسا بٹھلا دیں کہ قیامت تک نکالا نہ نکلے اور جاہل سنگدل ایسا متاثر اور خود رفتہ ہو جائے کہ سنبھالا نہ سنبھلے۔

اب اہلِ فہم ان جملہ امور مذکورۂ بالا کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھ لیں کہ جب علم مرضیات الٰہی بندوں تک پہنچانے میں

اس قدر اہتمام و احتیاط ہر ہر طرف سے فرمائی گئی ہے کہ حفاظت وحمایت الٰہی کا یہ حال ہے اور اس کے لانے والے ایسے مقرب اور معتمد علیہ ہیں اور حضرات انبیا علیہم السلام کا علم و دیانت، راستی و صداقت، عبودیت و عصمت، اخلاق فاضلہ اور شفقت کاملہ تعلیم و تفہیم عباد میں یہ کمال ہے جو معروض ہو چکا تو اب ان جملہ انتظامات کاملہ کے بعد فرمائیے کہ علم مرضیات الٰہی کی تحصیل و تسہیل میں کون سی دقت اور اس کے معتبر اور ہر طرح سے قابلِ وثوق ہونے میں کون سی کسر باقی رہ گئی۔

کلامِ الٰہی جو فی نفسہٖ ارشاد انا سنلقی علیک قولاً ثقیلا کا مصداق ہے اُس کی نسبت اُن سہولتوں کے بعد جو مذکور ہوئیں صاف صاف اور بار بار ولقد یسرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر فرما دینا ہمارے مدعی کی ایسی دلیل ہے کہ پھر کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

ہمارے بیانات سے جیسا یہ ثابت ہُوا کہ تحصیل علم وحی بذریعۂ انبیاء کرام ہم پر سہل بلکہ اسہل فرما دی گئی جس کا بیان کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود تھا ایسا ہی یہ امر بھی خوب محقق ہو گیا کہ وحی الٰہی کے نزول اور اُس کی تبلیغ و حفاظت میں اس قدر اہتمام ہر طرف سے فرمایا گیا ہے کہ تمام جن و انس مل کر بھی اس میں ادنیٰ سا خلل ہرگز نہیں ڈال سکتے۔ چنانچہ اس حفاظت وحمایت کو ادنیٰ اعلیٰ سب پہ واضح کر دینے کی غرض سے حق سبحانہ، نے تاکیدی الفاظ میں یہ وعدہ فرما دیا، انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحافظون۔

اب اہلِ عقل و انصاف اوّل تو نزولِ وحی کے ارکان ضروریہ یعنی وحی نازل فرمانے والے اور وحی کے لانے والے اور جس پہ وحی نازل ہوئی ان تینوں کی جلالت و عظمت و رفعت کو حسب بیانات سابقہ ملاحظہ فرمائیں۔ ان سب کے بعد حق تعالیٰ کے اس وعدۂ مستحکم کو دیکھیں پھر فرمائیں کہ اس سنگین بلکہ آہنی قلعہ میں کون خلل ڈال سکتا ہے اور فلسفۂ قدیم کے پٹاخے اور فلسفۂ جدید کی مہتابیاں اس مستحکم قلعہ پر کیا اثر پہنچا سکتی ہیں اور اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لجھلاً کے علماء اور بعضُ العقلِ عقالٌ کے عقلاء اپنی ٹکروں سے اُس کی بنیادوں کو کہاں تک متزلزل کر سکتے ہیں۔ واللہ اتنا بھی اثر نہیں پہنچا سکتے کہ جتنا پیلِ مست کو مچھر کی لات اور رعد کی آواز کو مکھی کی بھنبھناہٹ۔

جب علمِ وحی کا بذریعہ انبیائے کرام ہم پر طرح طرح سے سہل ہو جانا بالتفصیل معلوم ہو چکا تو اب صفت امانت کو بھی اُس پر قیاس فرمایئے کہ اوّل تو ملکۂ امانت ہمارے قلوب میں مثل دیگر ملکات خلقۃً اور فطرۃً رکھ دیا گیا اُس کے بعد علم و عقل و جملہ ملکات حسنہ اور اخلاق فاضلہ حلم و حیا صدق و صفا سخاوت و شجاعت عفت و دیانت انصاف و مروت وغیرہ کے ذریعہ سے ملکۂ امانت کے کسب و ترقی میں آسانی اور سہولت کر دی گئی کہ ان کی اعانت سے صفتِ امانت کو تقویت پہنچے اور انسان مغلوب ہوا و ہوس جملہ خیانتوں سے اور بیجا خواہشوں سے محفوظ رہ کر صراطِ مستقیم پر بسہولت قائم رہ سکے۔

ان سب سے قوی اور سہل تر ذریعہ امانت کی درستی اور ترقی اور جانچ کے لیے اتباع و فہم علم وحی ہے۔

ان تائیدات کے بعد اب کسی دُوسری تائید کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی مگر مضمون امانت حسب بیان سابق چونکہ امرطبعی ہے اور رغبت ونفرت کا اُس پر مدار ہے اور سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات امور طبعیہ کے مقابلہ میں اور طبیعت کی رغبت نفرت کے سامنے عقل وعلم، انصاف وحیا، مروّت و دیانت سب مغلوب ہوجاتے ہیں اور آدمی مرغوب طبعی کے پیچھے کبھی ایسا بیخود ہوکر دوڑتا ہے کہ عقل وعلم کی آواز بھی اُس کے کان تک نہیں پہنچتی اور دیانت وحیا پر نظر ڈالنے کی مُہلت بھی اُس کو نہیں ملتی۔

بالکل ایسا قصّہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ بلّی دربار شاہی میں مشعل مُنہ میں لیے کھڑی تھی چُوہا سامنے سے گزرا تو مشعل کو فرش پر ڈال چُوہے کی طرف بے اختیار دوڑی جس سے قریب تھا کہ تمام مکان میں آگ لگ جاوے۔

اگر تھوڑا سا غور و انصاف کریں تو بلّی کے قصّہ سے بدرجہا زاید تعجب خیز اور حیرت انگیز مثالیں اپنے احوال اور افعال میں ہم بے تکلف مشاہدہ کرسکتے ہیں۔

اس لیے حق سُبحانہٗ جل سلطانہٗ نے اپنے لطف و رحمت سے ایسی دولت و نعمت ہم کو عطا فرمائی کہ اس دشواری خاص میں ہم کو اُس سے کامل مدد مل سکے اور اِس دشواری میں خاص سہولت پیدا ہوجائے۔

اور وہ انعام یہی ہے کہ حسبِ معروضۂ سابق حضرات انبیاؑ کے واسطے سے جیسے علم مرضیاتِ الٰہی کہ جس تک ہم کو رسائی غیرممکن تھی ہم پر سہل فرمادیا گیا بعینہٖ اِسی طرح پر انبیائے کرام کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے محض اپنی قدرت و رحمت سے صفت امانت کو قلوب بنی آدم میں ایسا قایم اور قوی کردیا کہ خواہشاتِ نفسانی اور مقتضیات طبعی کی دستبرد سے ہم کو نجات مل سکے اور اُن کی غارت گری سے دولتِ ایمان محفوظ رہ سکے ؎

فشکراً لہ وابتہاجا بہ

وان قصر الفعل عما وجب

شرح اِس معما کی یہ ہے کہ حضرات انبیاؑ صلوات اللہ علیہم و سلامہ کے وجود سراپا جود کی مثال ایسی سمجھیے جیسے آفتاب عالمتاب کہ جب آفتاب اپنے مطلع کے قریب آتا ہے اُسی وقت سے رات کی تاریکی دُور ہونے لگتی ہے اور جب اُس کا نور عالم میں پھیل جاتا ہے تو ظلمتِ شب بالکل کافور اور محض معدوم ہوجاتی ہے اور ہر ہر جگہ آفتاب کا نور ایسا سرایت کرتا ہے کہ کوئی موقع اس کے فیض سے محروم نہیں رہتا اور تاریکی شب اپنی حالت پر کہیں بھی قایم نہیں رہنے پاتی مکانوں کے اندر ہرچند نور آفتاب نہیں پہنچتا لیکن تاریکی شب وہاں بھی نہیں رہ سکتی البتہ اگر کوئی مکان ایسا ہو کہ اُس میں کوئی دروازہ یا روشندان یا کسی قسم کا سوراخ ہی نہ ہو تو بے شک اُس کو آفتاب سے محرومی ضروری بات ہے اِسی طرح پر یہ مقبولان بارگاہِ الٰہی اور چشم ہائے فیوض غیبی جب عالم نورانی سے اس جہان ظلمانی کی طرف بامر ارحم الراحمین گمراہوں کی ہدایت کے لیے نزول فرماتے ہیں تو ایک خاص برکت اور نور ہدایت بھی ان برگزیدگان عالم القدس والجبروت کے ساتھ ساتھ ضرور اس عالم میں آتا ہے اور اپنی اپنی قابلیت کے موافق تمام قلوب بنی آدم میں اس کا اثر پہنچتا ہے اور کوئی اس سے

محروم نہیں رہتا اور خود بخود سب کے دلوں میں طلبِ حق کا جوش اور سب کی زبانوں پر کلمۃ الحق کا خروش ظاہر ہونے لگتا ہے ہر کوئی خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے نقائص علمی اور مفاسد عملی پر خود بخود متنبہ اور خبردار ہو جاتا ہے۔ طلب حق قلوب میں ایسی موجزن ہوتی ہے کہ کسی قسم کی تکلیف و مشقت اور رنج و مصیبت ان کو قبول امورِ حقہ سے مانع نہیں ہوسکتی اطاعت احکم الحاکمین میں ایسے چست ہو جاتے ہیں کہ نفس امارہ کی مرغوبات اور دنیا کی محبت و حب جاہ و مال کو یک لخت پس پشت ڈال کر اور نام و نشان کو خاک میں ملا کر ہر ایک حکمِ الٰہی کی تعمیل کو اپنا منتہائے مطلوب اور غایت مقصود خیال کرتے ہیں ہاں جو کوئی شقی ازلی اور محروم حقیقی ہوتا ہے وہ اِس سعادت و برکت سے بالکل بے بہرہ اور اِس نعمت و دولت سے البتہ بے نصیب رہتا ہے اور اسی برکت اور نورِ ہدایت کو امانت بھی کہتے ہیں جس کا بیان ہم کو مقصود ہے۔

اب اہلِ فہم انصاف کریں کہ وہ صفت امانت جس کی تحصیل و تکمیل میں ہم کو سخت دشواری بلکہ ایک طرح کی معذوری و مجبوری نظر آتی تھی اُس کو حق سبحانہ، نے انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ سے ہم پر کس قدر سہل و آسان فرما دیا جس کی کیفیت دیکھ کر اب تو نہایت مسرت کے ساتھ ہم یہ شعر پڑھنے کو مستعد ہیں ؎

آفتاب اندرون خانۂ ما
در بدر میردیم ذرہ مثال

چنانچہ حدیثِ نبوی میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انّ الامانۃ نزلت فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القرآن ثم علموا من السنۃ۔[1]

اہلِ فہم انصاف فرمائیں کہ اِس ارشاد سے ہمارا مضمون مذکورۂ سابق جیسا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے ایسا ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آدمیوں کے قلوب میں اوّل مضمون امانت جاگزین ہوتا ہے اُس کے بعد علمِ قرآن و علمِ حدیث سے ہدایت نصیب ہوتی ہے اور اسی امانت کو آیۂ انّما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن[2] اور ارشاد سیذکر من یخشی[3] میں لفظ خشیۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ھُدًی للمتقین وغیرہ آیات میں لفظ تقوٰی سے مذکور فرمایا ہے جن کے ملاحظہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بدون خشیت اور بلا تقوٰی یعنی بغیر حصول امانت آدمی کو اتباع احکامِ الٰہی اور ہدایت حاصل نہیں ہوتی بلکہ قرآن و حدیث اُسی کو نافع ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اوّل برکت مذکورہ یعنی امانت موجود ہو۔

اب ہماری اِس تمام تقریر پریشان سے صفت امانت کی حقیقت اور کیفیت بھی پوری واضح ہو گئی اور حدیث شریف

---

[1] لوگوں کے قلوب میں پہلے امانت نازل ہوئی پھر اُنھوں نے قرآن و سنّت سیکھا ۱۲

[2] آپ اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور خدا سے ڈرے ۱۲

[3] نصیحت وہی قبول کرے گا جس میں خشیہ ہو ۱۲

مذکورۂ عنوان لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَہٗ کی تحقیق بھی خوب واضح ہوگئی اور صفت امانت کی تحصیل میں جو دشواری اور دقت نظر آتی تھی اُس کی سہولت اور آسانی کی تفصیل بھی مشرح معروض ہو چکی و الحمد للہ و ما توفیقی اِلّا باللہ ۔

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی خوب واضح ہو گیا کہ تمام خوبیوں کی جڑ اگر ہے تو صفت امانت ہے اس کے بدون نہ ایمان حاصل ہو سکے نہ خوف و محبت الٰہی نہ تقویٰ نہ طہارت نہ ہدایت نہ سعادت حتیٰ کہ قرآن و حدیث یعنی علم وحی سے منتفع ہونا جو کہ تمام عقائد و اعمال اصول و فروع اسلامیہ کی اصل ہے وہ بھی بحکم حدیث مذکور صفت امانت پر ہی موقوف ہے۔

مگر جب یہ ہے تو پھر یہ بھی ضرور کہنا پڑے گا کہ قوی ضعیف جس درجہ کی کسی کی صفت امانت تسلیم کی جائے گی اُسی درجہ کا اُس کا ایمان بھی مانا جائے گا۔ بلکہ جملہ امور ہدایت عقاید ہوں یا اعمال عبادات ہوں یا معاملات اخلاق حسنہ ہوں یا احوال اُسی درجہ کے سمجھے جائیں گے کہ جس درجہ کی صفت امانت ہوگی اور اسی کے ساتھ ساتھ اگر کسی کی صفت امانت میں کسی قسم کی کوتاہی یا کسی طرح کا نقصان یا کسی نوع کا خلل مانا جائے گا تو اُسی کے موافق اُس کے ایمان اور تمام اصول و فروع ہدایت میں بھی اس کا تسلیم کرنا ضرور ہو گا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ تمام خوبیوں کی اصل صفت امانت اور تمام خرابیوں کی جڑ فسادِ امانت ہے جس کو فتنہ کہتے ہیں۔ کسی صاحبِ امانت نے کیا خوب فرمایا ہے:

۵

گر امانت بسلامت ببرم باکے نیست
بیدلی سہل بود گر نبود بیدینی

اس کے بعد اہلِ عقل کو اس امر کو تسلیم کر لینے میں بھی کسی دلیل کی احتیاج نہ ہوگی کہ وصفِ امانت میں جملہ افراد انسانی مساوی نہیں ہو سکتے بلکہ جیسا علم و ایمان وغیرہ امور میں افراد انسانی از حد مختلف ہیں ایسا ہی صفت امانت میں باہم فرق ضروری ہے اور جیسا نورِ آفتاب کو آئینہ اور دیگر اجسامِ لطیفہ و کثیفہ اپنی اپنی قابلیت کے موافق قبول کرنے میں مختلف ہیں اِسی طرح پر قلوب بنی آدم امانت و برکت مذکورۂ بالا کے قبول کرنے میں از حد متفاوت ہیں اور اِسی تفاوت کی وجہ سے مراتب ایمانی میں جملہ مومنین کو متمایز سمجھنا ضروری ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا جملہ اُمتِ مرحومہ سے افضل ہونا جو علماءؒ میں ایک مہتم بالشان مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بجز اکابر اہلِ سنّت دیگر فرقوں کو اُس کا سمجھنا دشوار رہا ہے اُس کا بڑا منشأ یہی برکت اور یہی امانت ہے یعنی جناب سید المرسلین و خاتم النبیین جب اُس پُر آشوب وقت میں ہدایت خلق اللہ کے بھیجے گئے کہ جس کی نظیر شرک و جہالت میں زمانۂ سابق میں بھی کبھی نہ گزری تھی تو حسبِ قاعدۂ مذکورہ بالا آپ کے ساتھ بھی مثل جملہ انبیأ علیہم السلام اُسی فیض و برکت و امانت مذکورہ کا پورا نزول ہوا مگر یہ فیض و برکت دیگر انبیا کرام کی برکات و فیوض سے دو وجہ سے بہت فائق اور برتر تھے۔ بڑی وجہ تو یہی ہے کہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم افضل الرسل اور تمام انبیأ کے کمالات کے مرجع ہیں کیونکہ آپ کے کمالات اور

دیگر انبیاء کے کمالات میں وہی نسبت ہے جو نورِ شمس اور نورِ قمر میں تعلق ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں چونکہ جہل و شرک کو وہ قوت تھی کہ کسی زمانہ میں نہ ہوئی تھی۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ایسے ہی اعلیٰ ہادی اور سامان قویہ ہدایت کی ضرورت تھی کہ اس جہل و شرک کو جو کہ تمام عالم میں وبائے عام کی طرح پھیل کر قلوب بنی آدم میں اپنا سکہ جما چکا تھا اس کو نیست و نابود کر کے نورِ ہدایت شرقاً و غرباً پھیلا دے۔ شاہانِ دُنیا کو بھی جب کوئی بغاوت چھوٹی یا بڑی پیش آتی ہے تو اس کی مدافعت کے لیے اُسی سردار اور سپہ سالار کو مامور کرتے ہیں جو اُس کے مناسب حال ہو اور اُس کی مدافعت کے لیے کافی سمجھا جائے بغاوت عظیم کے انسداد کے لیے کم درجہ کے افسروں کو کوئی نہیں بھیجتا یہاں تک کہ اگر بغاوت عام تمام مملکت سلطانی میں پھیل جانے کی نوبت آتی ہے تو ایسے خاص معتمد جلیل القدر سردار کو اپنا قایم مقام بنا کر بھیجنا پڑتا ہے کہ جو تمام خواص سلطانی میں ممتاز اور ہر طرح سے لائق و فائق سمجھا جاوے۔

الحاصل حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اِس برکت و فیض خاص میں جملہ انبیاء علیہم السّلام پر فائق و ممتاز ہونا مثل دیگر کمالات ضروری التسلیم ہے۔

آپ بحکم رب العالمین تمام عالم کی اصلاح و ہدایت کے لیے اس عالم میں بھیجے گئے اور اعلیٰ درجہ کا فیض امانت اور نورِ ہدایت آپ کے ساتھ ساتھ ایسا ہی تھا جیسا آفتاب کے ساتھ نور۔ تو اِس نورِ ہدایت اور اِس برکت و امانت سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وہی حصّہ ملا جو نورِ آفتاب سے کواکب اور آئینۂ مجلاّ و مصفّٰی کو ملتا ہے حضرات صحابہ میں باہم فرق مراتب ہو مگر اور کوئی اِس کمال میں اُن کا ہم پلّہ نہیں جن لوگوں کی نظر صرف ریاضات و مجاہدات و اعمال صالحہ پر قاصر رہی اُن کو بالبداہتہ ایسے شکوک پیش آئے کہ جن سے افضلیت صحابہ کو کما حقہٗ تسلیم نہ کر سکے اور جن کی نظر غائر ان تمام کمالات کے اصل یعنی ملکۂ امانت تک پہنچی اُن کو افضلیت صحابہ کی تسلیم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور جب حضرات صحابہ کو صفت امانت میں سب اُمت سے افضل مانا جائے گا تو حسب معروضۂ سابق اُن کے ایمان کو بھی تمام مومنین کے ایمان سے اعلیٰ اور اکمل کہنا ہوگا ہاں اگر کوئی شخص ریاضات شاقہ یا عبادات بدنی و مالی یا علم جزئیات شرعیہ میں کسی صحابی سے بڑھ جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل اور دشواری نہیں۔

مگر یہ فوقیت حضرات صحابہؓ کے کمال کے مقابلہ میں ایسی ہے کہ کسی قوی البصر گوشہ نشین کو تو مشاہدہ جزئیات مختلفہ کی نوبت کم آئے اور ضعیف البصر سیاح دائر سائر کو جزئیات مختلفہ کثیرہ کا مشاہدہ میسر ہو تو ادنیٰ صاحبِ عقل بھی مشاہدہ جزئیات کثیرہ کی وجہ سے اس ضعیف البصر کو ہرگز قوتِ بصر میں اُس قوی البصر پر ترجیح نہ دے گا بلکہ قوۃ بصر میں باوجود قلت مبصرات شخص اوّل ہی کو فائق و افضل سمجھے گا۔

جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ ایمان اور تمام اعمال صالحہ کا وجود و عدم اور کمال و نقصان ملکۂ امانت کے وجود و عدم اور کمال و نقصان کے ساتھ وابستہ ہے تو اربابِ فہم بلا تامل تسلیم کر لیں گے کہ کفر اور تمام اعمال بد کا وجود و عدم ضد امانت یعنی فتنہ کے وجود و عدم پر اِسی طرح موقوف سمجھا جائے گا جیسے ہدایت کے وجود و عدم کو علم کے وجود و عدم پر موقوف کہنے سے ضلالت کے وجود و عدم کو جہل کے وجود و عدم پر موقوف کہا جاتا ہے۔

اور اسی پر کیا موقوف ہے جن کو عقل سے کچھ بھی لگاؤ ہے وہ ایک ضد کی حالت سمجھ لینے سے بے تکلف دوسری ضد کا حال معلوم کر لیا کرتے ہیں۔

تو اب کوئی صاحبِ فہم و انصاف حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے افضل الامۃ ہونے میں ان شاء اللہ متأمل نہ ہوگا کیونکہ صفت امانت اور برکات نبوت ہیں جو کہ جملہ امور ایمانی کی اصل ہے حسب معروضہ سابقہ حضرات صحابہ کا نمبر سب سے اوّل اور افضل ہے۔ اور جب حضرات صحابہ کے افضل الامت ہونے کی لِم اور علت معلوم ہوگئی۔ تو اب یہ بھی واجب التسلیم ہوگا کہ جس کی صفت امانت فاسد و خراب ہوگی اُس سے زیادہ ایمان سے محروم اور بدنصیب کوئی نہ ہوگا بلکہ اُس کا ناقص الایمان اور بدترین خلائق ہونا ایسا ہی مسلم ہوگا جیسا حضرات صحابہ کا افضل الامۃ اور اکمل المومنین ہونا واجب التسلیم ہے گو وہ کیسا ہی صاحبِ کمال و عقل سمجھا جائے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ امانت سے ضروری اور بہتر اور فتنہ سے زیادہ مضر اور بدتر ہمارے حق میں دُوسری چیز نہیں ہو سکتی اور جس زمانہ میں امانت کا غلبہ ہوگا وہ زمانہ خیر القرون اور جس زمانہ میں فتنہ کا غلبہ ہوگا وہ زمانہ شر القرون کے خطاب کا مستحق ہوگا یہی وجہ ہے کہ ہمارے مربّی اوّل رؤف و رحیم، بشیر و نذیر نے جیسا ہدایت کے دونوں ارکان یعنی علم و امانت کی حقیقت اور ان کی ضرورت و منفعت پر ہم کو طرح طرح سے مطلع فرمایا ایسا ہی ان دونوں ارکان کی ضد یعنی جہل و فتنہ کی اصلیت اور ان کی خرابی و مضرت سے ہم کو آگاہ فرمانے میں ہر قسم کی تاکید اور تنبیہ سے کام لیا۔ جو حضرات کتب علم وحی کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں اُن کو میری تصدیق میں تأمل نہ ہوگا اُن ارشادات کے ملاحظہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اُس جہالت و ضلالت کے زمانہ میں کہ جو جہالت و ضلالت میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا اپنی رحمت سے قلوب بنی آدم میں مضمون امانت کا القا فرمایا اور اپنے بندۂ خاص سرآمد جملہ خواص کو بھیج کر اُس کے فیض و برکت سے مضمون امانت کو وہ ترقی عطا فرمائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہوگیا اور زنگ خوردہ قلوب کو ایسا مجلّٰی اور مصفّٰی کر دیا کہ بھلے بُرے کی تمیز گویا آنکھوں سے سب کو محسوس ہونے لگی اور قلوب انسانی کو ہر طرح سے قابلِ قبول ہدایت بنا کر علم وحی یعنی قرآن و حدیث سے مالا مال کرنا شروع کر دیا جس کے فیض سے وہی افراد کہ جن کو جاہل، کافر، مشرک، گمراہ کہا جاتا تھا چند روز میں رئیس الموحدین اور راس المتقین اور امام الاصفیاءٗ والصالحین نظر آنے لگے اور جن کی وجہ سے شرک و ضلالت میں وُہ زمانہ بے نظیر شمار ہوتا تھا آج ہم اُنھیں کے طفیل سے ہدایت و سعادت میں کسی زمانہ کو اُس کا ہم پلّہ نہیں کہہ سکتے بلکہ آئندہ کو بھی امید نہیں کر سکتے۔ اس کی مثال بالکل ایسی سمجھنی چاہیے جیسے اوّل زمین کو قابلِ زراعت بنایا جاتا ہے پھر اُس میں تخم ریزی کرتے ہیں جس قدر زمین قابل اور تخم ریزی کامل ہوگی اُسی قدر زراعت اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور ان دونوں جزو میں جتنی خرابی اور کمی ہوگی اُسی قدر زراعت میں خرابی و نقصان ظاہر ہوگا ایسے ہی جس زمانہ جس گروہ میں علم و امانت جس قدر کامل ہوں گے اُسی قدر ہدایت و خیریت اُن میں کامل ہوگی اور جس ملک اور جس زمانہ اور جس قوم میں جس قدر علم و امانت میں نقصان ہوگا اُسی قدر اُن میں خرابی اور بُرائی اور گمراہی کا ظہور ہوگا۔

اِسی کے ساتھ اُس بشیر و نذیر عالم علوم اوّلین و آخرین نے خوب سمجھا دیا کہ یہ خیریت جو میرے زمانہ میں ہے

ہمیشہ قایم نہ رہے گی بلکہ کچھ عرصہ کے بعد علم و امانت میں خلل آنا شروع ہوجائے گا اور رفتہ رفتہ جہل کا غلبہ اور فتنہ کا تسلط قلوبِ بنی آدم پر پورا پورا ہوجائے گا اور علم و امانت کے خراب ہوجانے کے بعد تمام خرابیں میری اُمت میں عام اور شائع ہوجاویں گی اور تحریفِ کتاب اللہ اور تغییرِ احکامِ خداوندی اور ہر قسم کی بداعمالی اور فسق و فجور میں یہود و نصاریٰ سے کم نہ رہیں گی اور تمام گمراہی اور بداعمالی کی اصل اصول یعنی فتنہ کی تشریح خوب واضح فرما دی اور فتنہ کے جملہ اقسام ظاہری و باطنی خاصہ اور عامہ متعلقہ تلک و ملت سب کو ایسا ظاہر فرما دیا کہ آج ہم کو اپنی حالت دریافت کرنے کے لیے اپنے گریبان کی طرف سر جھکانے کی بھی حاجت نہیں اور ابنائے زمانہ کی بڑی بڑی تحقیقات اور سلف صالحین اور علمائے راسخین پر اُن کے کڑے کڑے اعتراضات اور احکام شرعیہ سے اُن کے بڑے بڑے اختلافات اور اس پر اُن کے مداحین کے عظیم الشان عطا کردہ خطابات سب کو دیکھ کر اور سُن کر بجز اس کے کہ ارشاداتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق آنکھوں سے اور کانوں سے محسوس ہونے لگی بحمداللہ اور کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔

اہلِ علم و فہم کو معلوم ہے کہ جہل مرکب اور علم میں اور امانت و فتنہ میں باہم امتیاز کرنا دشوار ہے جو ہر ایک کا کام نہیں مگر حسب معروضات سابقہ پیروانِ قرآن و حدیث اور متبعانِ احکام خدا و رسول کو اس میں اس قدر سہولت ہے کہ کوئی دقت ہی نظر نہیں آتی۔ ہمارے اعمال کیسے ہی بُرے ہوں مگر قرآن و حدیث کے ہوتے ہم کو دربارۂ علم و امانت کسی مغلطہ میں مبتلا ہونے کی بحمداللہ کوئی وجہ نہیں۔

مثلاً ہم جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی مدعی عقل و علم قرآن و حدیث کا کسی امر میں دیدہ و دانستہ خلاف کر رہا ہے یا کوئی ناواقف اپنی خود رائی اور عقل کے زور سے احکام شرعیہ میں دخل دیتا ہے تو ارشادِ رسول علیہ السلام :

ان من العلم لجهلا۔ — بعض علم تو سراسر جہل ہوتا ہے۔

اور :

اتخذ الناس رؤساجهالاً فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔ — لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے پھر اُن سے مسئلے پُوچھے جاویں گے تو وہ بلا علم کے فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دیکھ کر ہم بلا تردیہ اُس کو جاہل اور ضال و مضل سمجھنے اور کہنے پر مامور اور مستعد ہوں گے اور اس کے فتوے کو واجب الرد اعتقاد کریں گے۔

اور جب کوئی ہم کو قرآن و حدیث کے متعلق ایسے مضامین سمجھائے گا کہ نہ ہم نے کبھی سُنے نہ ہمارے اکابر نے تو حسب ارشادِ رسول کریم :

یکون فی آخر الزمان دجّالون کذابون۔ — آخر زمانہ میں بہت سے جھوٹے دجّال نکلیں گے۔

یا تونکم من الاحادیث بما لم تسمعوا انتم ولا اٰباءکم فایاکم وایاھم لا یضلونکم ولا یفتنونکم۔

جو تم کو ایسی باتیں سنائیں گے کہ نہ تم نے کبھی سنی ہوں گی نہ تمھارے باپ دادا نے۔ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا کہیں تم کو گمراہ نہ کر دیں اور فتنہ میں نہ مبتلا کر دیں۔

ہم بے شک اُس کے اقوال سے اجتناب اور نفرت کریں گے اور اُس کو گمراہ کرنے والا اور فتنہ میں ڈالنے والا بالیقین خیال کریں گے اور اُس کو صاحبِ علم و صاحبِ امانت تو وہی کہہ سکتا ہے جو خود پُورا جاہل اور پُورا مفتون ہو۔

اور اگر ہم کسی کُرسی نشین کو دیکھیں کہ وہ اپنے عقلی خیالات سے ہم کو متابعت حدیث سے روکتا ہے اور احادیث کو غیر معتبر بتا کر ہم کو صرف کتاب اللہ کی متابعت کی رائے دیتا ہے تو حسبِ ارشاد مخبر صادق:

اَلا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھٰذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ۔

آگاہ ہو جاؤ کہ مجھ کو قرآن مجید عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور۔ دیکھنا ایک بہت پیٹ بھرا ہوا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لے لو (اور حدیث وغیرہ کو چھوڑ دو) جو کچھ اس میں حلال پاؤ اُس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ اس کو حرام سمجھو حالانکہ خدا کے رسولؐ نے جس چیز کو حرام بتلایا ہے وُہ بھی ایسا ہی حرام ہے جیسا خدا تعالیٰ کا (قرآن میں) حرام بتلایا ہوا۔

ہم پر فرض ہوگا کہ ہم اُس مالدار مسند نشین کے کلام کو لغو اور باطل سمجھیں اور ہرگز ہرگز سوائے تردید و ابطال کے اُس کی طرف توجہ بھی نہ کریں۔

الغرض اِس پُر آشوب وقت میں جس قدر فتنہ ظاہری و باطنی خاصّہ و عامہ بڑے چھوٹے عالمگیر نظر آ رہے ہیں ان شاء اللہ ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس کی حقیقت اور حالت مخبر صادق جامع علوم اوّلین و آخرین کی احادیث صادقہ میں موجود نہ ہو۔ احادیث رسولِ امینؐ کو سرسری نظر سے دیکھ کر بھی ہم کو علم و جہل اور امانت و فتنہ میں کوئی التباس کوئی خلجان نہیں پیش آ سکتا بلکہ سہولت سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ امر فتنہ کی کس قسم میں داخل ہے اور وُہ امر کس قسم میں ہاں جس بدقسمت کو احادیث ہی سے استنکاف اور بے خبری ہو وُہ ضرور وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ کا مصداق ہوگا حتّٰی کہ جہل کو علم اور فتنہ کو امانت سمجھے گا۔ سو ایسے لوگ جو چاہیں کریں وہ جانیں ہم کو تو صرف یہ بتلا دینا منظور رہے کہ جس قدر امانت ضروری اور مفید امر ہے اُسی قدر فتنہ ہمارے حق میں مضر اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور حسبِ ارشاد رسولِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم سلف کا زمانہ جیسا امانت و ایمان و علم و

صدق و ہدایت و خیریت کا زمانہ تھا ویسا ہی حسبِ ارشاد مخبر صادق علیہ الصّلوٰۃ و السلام یہ زمانہ ہجوم فتنہ اور فسادِ امانت اور جہل و ضلالت کا زمانہ ہے اور ارشاد حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم :

انی لاری الفتن تقع خلال بیوتکم کوقع المطر۔	میں تمہارے گھروں میں فتنوں کو گرتے ہُوئے ایسا دیکھ رہا ہُوں جیسے بارش گرا کرتی ہے ۔

اور :

یقبض العلم و تظھر الفتن ۔	علم ضبط کر لیا جائے گا اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوں گے ۔

اور :

ان من اشراط الساعۃ ان یرفع العلم و یکثر الجھل ۔	قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اٹھا لیا جائے اور جہل کی کثرت ہو

اور :

اذا ضُیّعت الامانۃ فانتظر الساعۃ ۔	جب دلوں سے امانت کھودی جائے تو قیامت کے منتظر ہو بیٹھو ۔

اور :

تعرض الفتن علی القلوب کالحصیر عودًا عودًا الخ ۔	جیسے چٹائی میں ایک ایک تیلی لگاتے ہیں اسی طرح یکے بعد دیگرے فتنے دلوں پر پیش ہوں گے ۔

وغیرہ ارشادات کا پُورا مصداق ہے حتیٰ کہ حضرت سرورِ کائنات علیہ الصّلوٰۃ والتسلیمات نے فرمایا ہے :

لا یعرف معروفا و لا ینکر منکرًا الا ما اشرب من ھواہ ۔

یعنی بعض قلوب میں فتنہ اس قدر راسخ ہو جائے گا اور مضمون امانت سے اتنی دُور جا پڑیں گے کہ شریعت و علم و عقل سب سے آزاد ہو کر اپنی خواہشات بیہودہ کے ساتھ جس چیز کو موافق دیکھیں گے اُس کو معروف اور اچھا سمجھیں گے اور جو چیز اُن کی خواہشات کے خلاف ہو گی اُس کو منکر اور بُرا کہیں گے یعنی عقل و نقل و اقوال اکابر سب کو پس پشت ڈال کر صرف اپنی ہوا و ہوس کے مقلد اور تابع ہوں گے اور اُسی کو مفید اور حق سمجھیں گے سو میرے نزدیک اگر چند لمحہ کے لیے ہم گریبان کی طرف سر جھکا کر غور کریں گے تو موجودہ زمانہ میں اس اخبث المراتب کے نظائر ملنے میں بھی غالباً ہم کو دشواری نہ ہو گی والعیاذ باللہ الرحیم ۔

ہمارے مقدس اکابر اسی بدترین حالت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ بعض افرادِ انسانی اپنی اصل طبیعت سے ملحد مزاج اور ایسی زندیق فطرت ہوتے ہیں کہ ظاہر میں گو کلمۂ اسلام زبان سے کہتے ہیں لیکن خدا اور رسول ، دین و مذہب ، حساب و کتاب ، عذاب و ثواب ، دوزخ و جنّت وغیرہ امور کا اُن کے دل میں یقین اور ان امور پر اُن کو وثوق و اعتماد نہیں ہوتا صرف نشیب و فراز

دنیوی ہی میں سعادت وشقاوت کو منحصر سمجھتے ہیں اور حصولِ جاہ اور تحصیل مال کو اصلی کمال اور منتہائے پرواز جانتے ہیں وہ عاقل وفہیم اُسی کو سمجھتے ہیں جو تحصیل جاہ و مال میں مشغول ہو اور حکیم و مصلح قوم حقّی کہ ہادی و مقتدا اُسی کو کہتے ہیں جن کو نشیب و فراز دنیوی میں مہارت اور مصروفیت ہو اور جس کو اِن امور سے مجتنب اور یکسو پاتے ہیں اُس کو جاہل اور غبی اور بیوقوف اور نکما خیال کرتے ہیں جو سعی و جانفشانی تحصیل دنیا کا باعث نہ ہو اُس کو بیہودہ اور جو محنت ومشقت وسیلہ حصول اغراض دنیوی نہ ہو اُس کو بے سُود تصوّر کرتے ہیں جو لوگ اتّباع انبیاؑ اور ہادیان دین میں سرگرم ہیں ان کو بے عقل اور احمق کہتے ہیں اور اقوال و افعال ومعاملات وعادات میں مذہب کی رعایت اور پابندی کو حماقت اور سفاہت بتلاتے ہیں۔ طاعت و عبادت میں جانکاہی اور مشقت کو نادانی اور صبر و قناعت اور زہد و توکّل کو دلیل کمزوری اور ناتوانی سمجھتے ہیں احکاماتِ شرعیہ کو رسوم بے اصل سے زیادہ نہیں مانتے اور طرح طرح سے طعن و تشنیع اُس پر کرتے رہتے ہیں۔ مضامین شاعرانہ اور دلائل فلسفیانہ وملحدانہ احکام ربانی کے مقابلہ اور معارضہ میں پیش کر کے ہر طرح سے اُن احکام حقّہ کی توہین اور اُن پر طعن اور تشنیع کرکے عوام کی نظروں میں اُن کی وقعت و اعتبار گھٹانے کی سعی کرتے رہتے ہیں اُن کی تحریر و تقریر میں چرب زبانی اور شوخ قلمی کے ساتھ امورِ شرعیہ اور پابندانِ شرع پر طرح طرح سے طنز و رمز، طعن و تشنیع، استہزا و تلبیس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوتا اور اپنے مخترعات و ایجادات کو احکامِ حقّہ شرعیہ پر ترجیح دینے میں مطلق العنانی و بے باکی و چالاکی سے پُورا کام لیتے ہیں دنیا کے جزوی اور احتمالی منافع کی اس قدر رعایت و اہتمام کرتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے احکام مصرحہ قطعیہ شرعیہ کے انکار و تحریف و تاویل کی کچھ بھی پروا نہیں کی جاتی اور خم ٹھوک کر فخر و مباہات کے ساتھ احکام حقہ کی تکذیب و تردید کی جاتی ہے۔

سو اب یہ تو کیا عرض کروں کہ ایسے لوگوں کے حق میں شریعت کیا حکم دیتی ہے اور ہمارے مقدس اکابر نے کیا فرمایا ہے جو طالبِ حق ہو تحقیق کرلے ہم کو تو اس موقع پر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ ہمارے مربّی اوّل اور اُن کے سچے جانشینوں نے یہ تمام فتنے اور ان کے تفصیلی حالات و احکام مشرح بیان فرماکر ہم کو ایسا بے نیاز فرما دیا تھا کہ آج ہم کو اپنے یا کسی دُوسرے کی وسعت خیالی اور اختراع عقلی اور رطب اللسانی اور خوش بیانی اور کمال علمی اور دُور اندیشی اور دلائل فلسفی اور شواہد ہیئت و طبعی اور طمع مفاد دنیوی وغیرہ دیکھ کر یا سُن کر سوا اس کے کہ اپنے مقدس ہادی کے ارشادات صادقہ کی تصدیق اور زیادہ ہوتی بشرط فہم و انصاف ان باتوں کا دُوسرا کوئی اثر ہم پر نہ ہو سکتا۔

اِس سے زیادہ تعجب خیز کون سا امر ہوگا کہ مربّی صادق نے جن باتوں کو تفصیلی و تحقیقی طور سے ہم کو بتلا دیا تھا اور اُن کے حالات و احکام پوست کندہ سمجھا دیے تھے کہ زمانہ غلبہ جہل و فتنہ میں ایسا ایسا ہوگا جب آج جو وُہ ناپاک امور ہوبہو ہمارے سامنے پیش آئے تو بجائے تصدیق ہم نے یہ کیا کہ جہل کو علم اور فتنہ کو امانت یقین کرکے ارشادات صادقہ مربّی شفیق و رحیم کے مقابلہ کے لیے بڑی چستی کے ساتھ کمر باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

فنعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و فساد علمنا و امانتنا۔

ہم خدا تعالیٰ سے اپنے نفسوں کی شرارت اور علم امانت کے فاسد ہونے سے پناہ مانگتے ہیں۔

اور اُس غلبۂ جہل وفتنہ نے ہم کو ایسا مسخ کر دیا کہ جملہ احکام و معاملات و رسوم و عادات وغیرہ شرعیہ کو طے کر کے نماز و روزہ ؍ حج وزکوٰۃ جیسی عبادات محضہ اور ارکان اسلامیہ میں بھی صرف ترک ہی پر ہم کو قناعت نہ ہوئی بلکہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنے علم وعقل کے زور سے ارکان مذکورہ میں بھی کاٹ تراش کرنا اور اُن کی ضرورت اور لزوم میں رخنہ اندازی کرنا شروع کر دیا ؎

نخوت نگر کہ مخلد اندر دلش ز رشک

حرفے کہ در پرستش معبود میرود

جو حضرات مدعیانِ اسلام خدانخواستہ اِس حد تک پہنچ چکے ہوں کہ جن کی کیفیت بذریعہ حدیث شریف اور ارشاد اکابر ابھی عرض کر چکا ہوں اُن کی خدمت میں تو ناصحانہ ہماری صرف یہ عرض ہے: ؎

ببال و پر مرو از رہ کہ تیر پرتابی

ہوا گرفت زمانے ولے بخاک نشست

اور جو حضرات بحمد اللہ اِس حد تک نہیں پہنچے بلکہ اُن کے دل میں اسلام کی صداقت اور محبت اور خیر خواہی باقی ہے مگر سلام کی صداقت کے ساتھ اپنے علم وعقل ہمت و تدبیر پر بھی پُورا اعتماد ہے اور اِس وجہ سے اپنی عقل وفہم کے موافق اسلام کی اصلاح ور مسلمانوں کی درستی کرنا چاہتے ہیں اُن کی خدمت میں خیر خواہانہ یہ عرض ہے: ؎

چہ مردِ دیں نہ بانفس کافر بر نے آئی

سکندر نیستی اندیشہ از نیروی دارا کن

ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ احکامِ الٰہی میں کسی کی عقل کافی تو کیا دخل دینے کی بھی لیاقت اور منصب نہیں رکھتی۔

اس وقت تک جو جو ستم و جفا مدعیانِ اسلام کے ہاتھ سے دین اسلام پر ہو چکا ہے سچّے اسلام کی نیست و نابود ہو جانے کے لیے کافی سے بھی زائد ہے چنانچہ ادیان صادقہ گزشتہ مردہ سب اس کی زندہ نظیر ہیں۔ مگر اُسی مربّی شفیق اور مخبر صادق نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہر چند اسلام کے اندر اخیر زمانہ میں سب ادیان سابقہ سے زائد اختلافات وفتنے ظہور پذیر ہوں گے مگر حق تعالیٰ کی رحمت سے یہ ہوگا کہ ایک جماعت ہر قرن میں ایسی بھی موجود رہے گی کہ اسلام کی حمایت اور اس کے احکام کی حفاظت سچے ذریعہ سے کرتی رہے گی اور دربارۂ دین اسلام وہ جملہ اہلِ باطل پر غالب رہے گی اُن کی وجہ سے احکامِ الٰہی اور دین اسلام اہلِ باطل اور اہلِ فتنہ کے تصرفات سے محفوظ رہیں گے جو جو اختراعات اور غلط باتیں اربابِ جہالت وفتنہ دین میں وقتاً فوقتاً ملاتے رہیں گے۔ اُن کو وہی جماعت قلیل اپنے اپنے زمانہ میں دین حق سے ایسے نکالتے رہیں گے جیسے دُودھ سے مکھی یا خمیر سے بال۔ اور اہلِ فتنہ اور اہلِ ضلالت کا اثر اُن کے متبعین ہی تک محدود رہے گا اسلام کے خط وخال پر اُس کا اثر نہ آنے پائے گا اور اُسی غریب جماعت کی حمایت سے باذن اللہ دین اسلام اخیر تک اپنی اصلی حالت پر محفوظ رہے گا سو یہ محض حق تعالیٰ کا فضل وانعام ہے جس کا مشاہدہ برابر ہو رہا ہے اور کسی دین کو نصیب نہیں ہُوا اگر گوش حقیقت نیوش ہو تو غریب اسلام آج اپنے دانا دشمن اور نادان دوست کو (یعنی اُنھیں دونوں قسم کی جماعتوں کو جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے) خطاب کر کے بآوازِ بلند کہہ رہا ہے: ؎

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود
ورنہ ہیچ از دل بیرحم تو تقصیر نبود

اس پر طرہ یہ ہے کہ اُس غریب باخیر جماعت سے جیسے احکام شرعیہ اور علوم مذہبی اسلامی کی حفاظت اور حمایت کرائی جاتی ہے ویسے ہی اُس جماعت کو اُس فیض و برکت میں سے اپنے اپنے درجہ کے موافق حصہ عنایت کیا جاتا ہے جو حسب معروضات سابقہ ہمارے مربّی مقدس اور ہادی اوّل کے ہمراہ تھا اور جس فیض و برکت کا اثر قلوب بنی آدم میں پہنچ کر موجب ہدایتِ عامہ خلق اللہ ہوا تھا۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ہدایت کے وہی دو رکن اعظم کہ جن کا نام علم وحی اور صفت امانت تھا اُن دونوں میں سے ہر زمانہ میں اُس جماعت موصوف کو درجہ بدرجہ حصہ عنایت ہوتا ہے اور اُن سے نیابت رسول اور ہدایت مخلوق کا کام لیا جاتا ہے اور جیسے وہ حضرات علم وحی کے عالم ہوتے ہیں ویسے ہی اُن کی مجالست اُن کے قرب اُن کے تعلق اُن کی محبت سے کیفیت امانت دلوں میں ظاہر اور ترقی پذیر ہوتی ہے اور یہی حضرات رسول کے سچے نائب اور علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل کے واقعی مصداق ہوتے ہیں انھیں نفوس قدسیہ کی ہمت و برکت سے بقائے دین و ایمان اور انھیں کی فیض و حمایت سے جہل و فتنہ کی روک تھام ہوتی رہتی ہے اور یہ حق سبحانہ کا اتنا بڑا انعام ہے جس کی قدر وہی جان سکتا ہے جس کو مرتبۂ نبوت کی عظمت اور انبیاءِ کرام کے کمالات کی حقیقت کما حقہ معلوم ہو ورنہ جن افرادِ زمانہ کے قلوب میں خود انبیاء کرام ہی کی کل حقیقت یہ ہے کہ نبی مصلح قوم کا نام ہے تو اُن کی آنکھوں میں بیچارے غریب نائبوں کی کیا وقعت ہوسکتی ہے فالی اللہ المشتکی من جور الفتنۃ والھوی۔

الحاصل وہ علم وحی اور امانت کہ جو ایمان اور اُس کی تمام اصول و فروع کے لیے مبنی اور موقوف علیہ تھی اُس کی تعلیم و تحصیل میں حسب بیاناتِ سابقہ پوری وسعت اور سہولت فرمائی گئی اور حسبِ ارشادات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام تابقیامت اُس کا ایسا انتظام فرمادیا گیا کہ باوجود غلبہ جہل و ضلالت اور باوجود کثرت فتنہ اور عدم امانت ان ہر دو کمال کا سلسلہ کسی حالت اور کسی وقت میں منقطع نہ ہونے پاوے فالحمد للہ کما ینبغی لجلال وجھہ ولعظم سلطانہ۔

مگر اسی کے ساتھ اہلِ اذہان صافیہ اس کو بھی تسلیم کرلیں گے کہ جیسا ان نائبانِ رسول کے ذریعہ سے اہلِ عالم کو اپنے اپنے تعلق اور مناسبت کے باعث علمِ وحی اور فیضِ امانت پہنچتا ہے اسی طرح پر اُن لوگوں کی وجہ سے کہ جن کے وقتاً فوقتاً آنے کی آپ نے خبر دی ہے اور اُن کو امام فتنہ اور دجال اور کذاب فرمایا ہے اُن کی مجالست اُن کی محبت اور مناسبت سے ضرور بہت سے افراد کے قلوب میں اپنی اپنی لیاقت کے موافق جہل و فتنہ اور شر و ضلالت کا اثر ظاہر اور ترقی پذیر ہوگا۔ یضل من یشآء ویھدی من یشآء۔

چنانچہ یہ دونوں اثر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں جن کی تصدیق میں کوئی صاحبِ فہم و انصاف متامل نہ ہوگا۔

ہم اپنی غفلت اور ہوا و ہوس کے نشہ سے متنبہ ہو کر انصاف سے دیکھ لیں کہ اہلِ علم و امانت اور اربابِ فتنہ و ضلالت کے بارہ میں جو حضرت نبی کریم اور مربی رحیم نے ہم کو باتیں بتلائی ہیں وُہ آج صاف صاف اپنے اندر اور دیگر حضرات کے اندر آنکھوں سے کھُلے طور پر ہم کو نظر آتی ہیں یا نہیں جس کے ملاحظہ کے بعد ہم کو ایمان و کفر، علم و جہل، امانت و فتنہ کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہاں ہم دیکھنا ہی نہ چاہیں یا دیکھ کر بھی اپنی سینہ زوری کیے جاویں تو اس کا علاج کوئی نہیں کر سکتا لیکن حق تعالیٰ کے یہاں سب کا علاج ہے اور سب کو معلوم ہے جو اُس کا یقین اب نہیں کرتا عنقریب مجبوراً کرنا پڑے گا۔

حضرت فخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کسی نے ایمان کی علامت پُوچھی یعنی ایمان ظاہری کی نہیں بلکہ ایمان اصلی حقیقی کی جو کہ قلب کے متعلق ہے تو آپ نے جواب میں فرمایا:

اذا سرّتك حسنتك وساءتك سيّئتك فانت مومن۔

یعنی نیک کام کر کے تیرے دل میں مسرت ہو اور بُرا کام کر کے دل بُرا ہو تو تُو مومن ہے۔

اب ہم کم سے کم اپنے ایمان قلبی کو کہ جس کا معلوم کرنا جاننے والے جانتے ہیں کہ کس قدر دشوار ہے اسی کسوٹی پر کھینچ کر دیکھ لیں کہ کھرا ہے یا کھوٹا اور کسی امر میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور اُس کی عبادت کرنے سے ہم کو مسرت ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو کس قدر، علیٰ ہٰذا القیاس گناہ کر کے ہمارا دل بُرا ہوا یا نہیں اور ہوا تو کس قدر، جس کے ذریعہ سے ہم اپنے ایمان کی قوت و ضعف وجود و عدم کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور اِسی ارشاد سے ہماری سمجھ میں بخوبی یہ بھی آگیا کہ اگر کوئی ایسا ہو کہ عبادت اور نیک کام کر کے بجائے مسرت اُس کے دل میں تنگی اور کدورت اور بُرائی پیدا ہو اور بُرا کام کر کے دل میں انشراح اور مسرت و خوشی پیدا ہو یا کوئی شخص ایسا ہو کہ کسی عبادت خاص مثل صوم و صلوٰۃ و حج و زکوٰۃ سے اُس کے دل میں نعوذ باللہ اس قدر تنفر اور وحشت ہے کہ کسی حال اُس کے کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اُس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تو ایسے شخصوں کو کیا سمجھنا چاہیے اور ہم کیا ہر منصف فہیم بذریعہ ارشاد مذکور اُس کا حکم سمجھ سکتا ہے۔

اور اِس ارشاد مذکورہ کی حقیقت سمجھنا چاہو تو وہی ہے جو بالتفصیل معلوم ہو چکی۔ یعنی جو شخص نیک کام کر کے مسرور اور بُرا کام کر کے مکدّر و مغموم ہوتا ہے اُس شخص کی رغبت و میلان فطرتی یعنی صفت امانت معلوم ہو گیا کہ صحیح ہے جس پر ایمان کا مدار ہے اور جو شخص طاعت سے مکدّر اور معصیت سے مسرور ہوتا ہے معلوم ہو گیا کہ اُس کی رغبت اور میلان قلبی یعنی امانت فاسد ہو چکی ہے اور لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ کا مصداق بن چکا ہے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

یہاں سے بشرطِ تدبر و انصاف ہم کو یہ بات خوب دل نشین ہو گئی کہ بہت سے وہ احکام جزوی جو لباس و طعام، رفتار و گفتار، عادات و اوضاع، نشست و برخاست کے متعلق ہیں اور اہلِ اسلام بکثرت اُن امور کو ایک حقیر بات سمجھ کر اُن میں خلاف حکم شریعت کے اصلا پروا نہیں کرتے اُن میں دو امر قابلِ لحاظ ہیں:

ایک تو خلاف حکم شریعت کرنا یہ جس درجہ کا گناہ ہو۔

دوسرے امر مخالف شرع کا استحسان اور اُس پر مسرت۔ یہ نہایت سنگین جُرم ہے جس کا ذکر ابھی گزرا۔ مثلاً ٹخنے

سے نیچے پاجامہ پہننا یا داڑھی منڈوانا یہ ایک گناہ ہے مگر ان امور کو کر کے دل میں مسرت ہونی اور ان کے خلاف یعنی شریعت کی موافقت کو کراہیت اور ناگواری کی نظر سے دیکھنا یہ نہایت خوفناک امر ہے جو فساد رغبت یعنی نقصان امانت کی دلیل ہے جس سے اجتناب کلی سب پر لازم اور ضروری ہے یا فرض کیجئے کہ کسی کے دل میں نماز یا حج یا کسی اور امر شرعی کے کرنے کا کوئی تقاضا اور اہتمام نہیں اور نہ حکم و تاکید خداوندی کا خیال ہے مگر دبے دبائے شرما شرمائے یا اپنی کسی نفسانی منفعت یا کسی دنیاوی مصلحت کی وجہ سے اُس کام کو اپنے ارادہ سے ادا کر لیا تو اب غور کرنا چاہیے کہ اُس طاعت مفروضہ کو ادا کر کے اُس کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہوئی اگر خدانخواستہ کسی قسم کی کراہیت و نفرت یا انقباض و کدورت پیدا ہوئی تو یہ اس قدر ردی علامت اور سخت امر ہے کہ حقیقت میں اُس فرض کے ترک کرنے کا جُرم بھی بہت گھٹا ہُوا ہے اور اگر اُس فعل کو ادا کر کے مسرت اور استحسان دل میں آیا تو ارشاد فرمودہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوگیا کہ اُس شخص کے دل میں بحمداللہ مضمون ایمان اب تلک موجود ہے۔ گو ایک عظیم معصیت یعنی ترک فرض خداوندی میں مبتلا ہے یعنی فاسق ہے کافر نہیں فاعتبروا یا اولی الابصار، والحذر الحذر۔

الغرض ہم پر اوّل فرض یہی ہے کہ علمِ وحی اور صفتِ امانت کو اُن طریقوں سے کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے حاصل کریں اور اُس کی ترقی میں کوشش کرنے سے نہ رُکیں اور اپنی تمام عبادات و معاملات کی باگ اُن کے ہاتھ میں دے دیں اور تا وقتیکہ ہمارے یہ دونوں جُزو پُورے نہ ہوں گے ہم کو اپنی درستی مذہب اور اصلاحِ دین و ایمان کی توقع ایک خیال خام سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی دنیاوی ثروت و وجاہت حکومت و عزت کسی قسم کا کمال با دولت ان امور سے ہرگز تحصیل ایمان اور ترقی اسلام ممکن نہیں سے

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بترکستان ست

ہرچند زمانہ غلبہ جہل وضلالت کا ہے اور فتنہ اپنا سکہ اکثر قلوب پر ایسا جما چکا ہے کہ کوئی خوش قسمت ہی اس موجِ طوفان خیز سے نکل سکے تو نکل سکے مگر حق تعالےٰ کا فضل و رحمت نہ کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے نہ کسی مکان کے ساتھ نہ کسی جماعت خاص میں منحصر ہے نہ کسی ملک میں۔ اُس کا دروازۂ رحمت ہر وقت اور ہر کسی کے لیے رات دن کھلا ہوا ہے اور بآوازِ بلند یہ کہا جا رہا ہے:

سے

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و رند و بت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ کا اعلان چار سو عام جو اِس کا مصداق بن سکے سُبْحَانَ اللہ توبہ سے کوئی مانع کوئی اُس سے خارج نہیں کسی قسم کی تنگی نہیں ادھر اسباب علم و امانت برابر موجود ہیں پھر دیر کیا ہے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔ وَاللہ ولی التوفیق وما تشاءون الا ان یشاء اللہ۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ؎

خطبہ حجۃ الوداع

ترجمہ : حکیم محمد نعیم الدین زبیری

عربی

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْحَجِّ أَتَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَفَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتَّى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهُ فَأَتَى بَطْنَ الْوَادِي فَخَطَبَ النَّاسَ خُطْبَتَهُ الَّتِي بَيَّنَ فِيهَا مَا بَيَّنَ

فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ قَائِلًا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ

أَيُّهَا النَّاسُ ! اِسْمَعُوا قَوْلِي فَإِنِّي لَا أَرَانِي وَإِيَّاكُمْ أَنْ نَجْتَمِعَ فِي هٰذَا الْمَجْلِسِ أَبَدًا بَعْدَ عَامِي هٰذَا

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللهَ يَقُولُ " يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ " فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَبْيَضَ وَلَا لِأَبْيَضَ عَلَى أَسْوَدَ فَضْلٌ إِلَّا بِالتَّقْوَى

اُردو

حج کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرفہ تشریف لائے اور آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصواءؔ (اپنی اونٹنی) کو لانے کا حکم فرمایا۔ اونٹنی تیار کرکے حاضر کی گئی، تو آپؐ (اس پر سوار ہوکر) بطنِ وادی میں تشریف فرما ہوئے اور اپنا وہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں دین کے اہم امور بیان فرمائے۔

آپ نے خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے خطبے کی یوں ابتداء فرمائی : خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے کوئی اس کا ساجھی نہیں، خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس نے اپنے بندے (رسول) کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔

لوگو! میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں یکجا ہو سکیں گے (اور غالباً اس سال کے بعد میں حج نہ کرسکوں گا)

لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے"۔ چناں چہ اس آیت کی روشنی میں نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی

معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ اَلَا كُلُّ مَأْثُرَةٍ اَوْدَمٍ اَوْمَالٍ يُدَّعٰى بِهٖ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سَدَانَةُ الْبَيْتِ وَسِقَايَةُ الْحَاجِّ ثُمَّ قَالَ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا تَجِيْئُوْا بِالدُّنْيَا تَحْمِلُوْنَهَا عَلٰى رِقَابِكُمْ وَيَجِيْئُ النَّاسُ بِالْاٰخِرَةِ فَلَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا

انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علیٰ حالہٖ باقی رہیں گی۔
پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمھاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں، اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمھارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔"

مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ دِمَائَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ اِلٰى اَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَكَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا۔ وَاِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْئَلُكُمْ عَنْ اَعْمَالِكُمْ۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمھاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا۔ اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمھارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی اہمیت ایسی ہی ہے جیسی تمھارے اس دن کی اور اس ماہِ مبارک (ذی الحجہ) کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بازپرس فرمائے گا۔

اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ ضُلَّالًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔

دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں کشت و خون کرنے لگو۔

فَمَنْ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَانَةٌ فَلْيُؤَدِّهَا اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَهٗ عَلَيْهَا۔

اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے۔

اَيُّهَا النَّاسُ! كُلُّ مُسْلِمٍ اَخُو الْمُسْلِمِ وَاِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ اَرِقَّاءَكُمْ اَرِقَّاءَكُمْ اَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو، انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ

دورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں سے روندیا۔

مَوْضُوْعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَاِنَّ اَوَّلَ دَمٍ اَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ الرَّبِيْعَةِ ابْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضَعًا فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ فَقَتَلَهُ هُذَيْلٌ۔ وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهُ مَوْضُوْعٌ كُلُّهُ

زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے دُودھ پیتے بیٹے کا خُون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔ دورِ جاہلیت کا سُود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سُود جسے میں چھوڑتا ہُوں، عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سُود ہے، اب یہ ختم ہو گیا۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیّت نہ کرے۔

اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

بچّہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا پتھر ہے، حساب و کتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

مَنِ ادَّعٰى اِلٰى غَيْرِ اَبِيْهِ اَوْ تَوَلّٰى اِلٰى غَيْرِ مَوَالِيْهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت۔

اَلدَّيْنُ مَقْضِيٌّ وَالْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُوْدَةٌ وَالزَّعِيْمُ غَارِمٌ

قرض قابلِ ادائی ہے۔ عاریتاً لی ہُوئی چیز واپس کرنی چاہیے تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔

وَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِّنْ اَخِيْهِ اِلَّا مَا اَعْطَاهُ عَنْ طِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ اَنْفُسَكُمْ

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وُہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے، خود پر اور ایک دُوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

اَلَا يَحِلُّ لِامْرَاَةٍ اَنْ تُعْطِيَ مِنْ مَالِ زَوْجِهَا شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِهِ

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی بغیر اجازت کسی کو دے۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ اَلَّا يُوْطِئْنَ فُرُشَكُمْ اَحَدًا تَكْرَهُوْنَهُ وَعَلَيْهِنَّ اَنْ لَّا يَاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ فَاِنْ فَعَلْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذِنَ لَكُمْ اَنْ تَهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاَنْ تَضْرِبُوْا ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَاِنِ

دیکھو! تمھارے اوپر تمھاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح اُن پر تمھارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وُہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وُہ کوئی خیانت نہ کریں، کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے

اِنْتَهَيْنَ فَلَهُنَّ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

کرتم انھیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آجائیں تو انھیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔

وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ عَوَانٍ لَكُمْ لَا يَمْلِكْنَ لِاَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِى النِّسَآءِ فَاِنَّكُمْ اَخَذْتُمُوْهُنَّ بِاَمَانِ اللّٰهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوْجَهُنَّ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ

عورتوں سے بہتر سلوک کرو، کیونکہ وہ تو تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ چناں چہ ان کے بارے میں خدا کا لحاظ رکھو کہ تم نے انھیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو، میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا۔

وَاِنِّىْ قَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَّا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابَ اللّٰهِ وَاِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِى الدِّيْنِ فَاِنَّمَا اَهْلَكَ مَنْ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِى الدِّيْنِ

میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے اگر اس پر قائم رہے، اور وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور ہاں دیکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انھی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

وَاِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ مِنْ اَنْ يُّعْبَدَ فِىْ اَرْضِكُمْ هٰذِهٖ اَبَدًا وَّلٰكِنْ سَتَكُوْنُ لَهٗ طَاعَةٌ فِيْمَا تُحَقِّرُوْنَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ فَيَرْضٰى بِهٖ فَاحْذَرُوْهُ عَلٰى دِيْنِكُمْ

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی، لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنھیں تم کم اہمیت دیتے ہو اس کی بات مان لی جائے۔ اور وہ اسی پر راضی ہے، اسی لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔

اَلَا فَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَصَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَاَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا اَنْفُسُكُمْ وَتَحُجُّوْا بَيْتَ رَبِّكُمْ وَاَطِيْعُوْا وُلَاةَ اَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ مہینے بھر کے روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوشدلی کے ساتھ دیتے رہو۔ اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہلِ امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اَلَا لَا يَجْنِىْ جَانٍ اِلَّا عَلٰى نَفْسِهٖ اَلَا لَا يَجْنِىْ جَانٍ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ

اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمے دار ہوگا اور اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا، نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ

سنو، جو لوگ یہاں موجود ہیں انھیں چاہیے کہ یہ احکام اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

وَاَنْتُمْ تُسْاَلُوْنَ عَنِّىْ فَمَاذَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ

اور لوگو! تم سے میرے بارے میں (خدا کے ہاں

سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ قَدْ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحْتَ

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپ نے امانت (دین) پہنچا دی اور آپ نے حقِ رسالت ادا فرمادیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَآءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اُٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا، "خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا!"

قصیدہ بردہ شریف

حضرت شیخ امام محمد شرف الدین البُوصیریؒ

فارسی ترجمہ : حضرت مُلا محمد عبدالرحمٰن جامی
اُردو ترجمہ : محمد فیاض الدین نظامی بہزاد دکن

۱ أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمِ
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرٰى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ

اے زیادِ صحبتِ یارانِ اندر ذی سلم
اشکِ چشمم آمیختی با خُوں رواں گشتہ بہم

کیا تمھیں یاد آگئے ہمسایگانِ ذی سلم
خُون کے آنسو جو آنکھوں سے رواں ہیں دمبدم

۲ أَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ
أَوْ أَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ إِضَمِ

یا مگر از کاظمہ بادے وزید از کوئے دوست
یا مگر در نیم شب برقے جہیدہ از اضم

یا صبا لائی ہے سمتِ کاظمہ سے اک پیام
یا ہُوا بجلی سے روشن رات میں کوہِ اضم

۳ فَمَا لِعَيْنَيْكَ إِنْ قُلْتَ اكْفُفَا هَمَتَا
وَمَا لِقَلْبِكَ إِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ

چیست چشمت را چہ گوئی خشک شو گریاں شود
چیست دل گوئی بہوش آشفتہ گردد ز غم

کیا ہوا آنکھوں کو تیری رو رہی ہیں زار زار
کیا ہوا دل کو ترے کیوں اس قدر کھاتا ہے غم

۴ أَيَحْسَبُ الصَّبُّ أَنَّ الْحُبَّ مُنْكَتِمٌ
مَا بَيْنَ مُنْسَجِمٍ مِنْهُ وَمُضْطَرِمِ

اے تو پنداری کہ عشقِ عاشقاں پنہاں شود
با وجودِ آتشِ دل سوز و آبِ چشمِ نم

ہے عبث تیرا گماں چھپتا نہیں ہے رازِ عشق
اس کو افشا کر رہے ہیں سوزِ دل اور چشمِ نم

۵ لَوْلَا الْهَوٰى لَمْ تُرِقْ دَمْعًا عَلٰى طَلَلٍ
وَلَا أَرِقْتَ لِذِكْرِ الْبَانِ وَالْعَلَمِ

گر نہ بودے عشق اشکت بر طلل کے ریختی
کے بدے بے خواب چشمت از غمِ بان و علم

یُوں نہ ویرانوں پہ روتا گر نہ ہوتا سوزِ عشق
مضطرب کرتے نہ تجھ کو قصّۂ بان و علم

۶ فَكَيْفَ تُنْكِرُ حُبًّا بَعْدَ مَا شَهِدَتْ
بِهِ عَلَيْكَ عُدُولُ الدَّمْعِ وَالسَّقَمِ

چوں کنی انکارِ عشقش چوں گواہی میدہند
بر تو اشکِ چشم دیگر زردیِ رُوئے سقم

عشق سے انکار کرنا تیرا ممکن ہی نہیں
ہیں گواہِ معتبر صورت تری اور چشمِ نم

۷ وَ اَثْبَتَ الْوَجْدُ خَطَّیْ عَبْرَةٍ وَّضَنًی
مِثْلَ الْبَهَارِ عَلٰی خَدَّیْكَ وَ الْعَنَمِ

عشق ثابت کرد بر رو خطِ اشک ولاغری
چوں بہار روئے یار سرخیِ شاخِ عنم

خطِ عشق اور لاغری نے عشق ثابت کر دیا
زرد رخساروں پہ گویا سرخیِ شاخِ عنم

۸ نَعَمْ سَرٰی طَیْفُ مَنْ اَهْوٰی فَاَرَّقَنِیْ
وَ الْحُبُّ یَعْتَرِضُ اللَّذَّاتِ بِالْاَلَمِ

چوں خیالِ دلبرم آمد مرا بے خواب کرد
عشق آرد درمیانِ خرمی رنج والم

ہاں خیالِ یار نے مجھ کو جگایا رات بھر
لذتوں کو کر دیا ہے عشق نے رنج والم

۹ یَا لَائِمِیْ فِی الْهَوَی الْعُذْرِیِّ مَعْذِرَةً
مِنِّیْ اِلَیْكَ وَ لَوْ اَنْصَفْتَ لَمْ تَلُمِ

اے کہ در عشقم ملامت میکنی معذور دار
گر ترا انصاف باشد عذر آری از کرم

ناصحا تو عشق میں کر معذرت میری قبول
ہے اگر انصاف تجھ میں کر نہ مجھ پر یہ ستم

۱۰ عَدَتْكَ حَالِیْ لَا سِرِّیْ بِمُسْتَتِرٍ
عَنِ الْوُشَاةِ وَ لَا دَائِیْ بِمُنْحَسِمِ

حالِ من وز تو گزشتہ سرِ من از دشمناں
نیست پنہاں در دِمن زائل نگشتہ از دلم

اب تو واقف ہو چکے اغیار بھی تیرے سوا
درد میرا ہو نہیں سکتا کسی صورت سے کم

۱۱ مَحَّضْتَنِی النُّصْحَ لٰكِنْ لَّسْتُ اَسْمَعُهٗ
اِنَّ الْمُحِبَّ عَنِ الْعُذَّالِ فِیْ صَمَمِ

تو نصیحت میکنی نیکو و من می نشنوم
عاشقاں باشند دایم از ملامت در صمم

تھی نصیحت خوب لیکن اس کو سنتا کس طرح
ناصحا عاشق کے حق میں ہے سماعت کالعدم

۱۲ اِنِّی اتَّهَمْتُ نَصِیْحَ الشَّیْبِ فِیْ عَذَلٍ
وَ الشَّیْبُ اَبْعَدُ فِیْ نُصْحٍ عَنِ التُّهَمِ

شیب پندم داد و من بردم گمان بد برد
گرچہ شیب اندر نصیحت دور باشد از تہم

تھی ضعیفی کی نصیحت پھر بھی دل بدظن ہوا
گو نصیحت میں ضعیفی ہے بہت دور از تہم

۱۳ فَاِنَّ اَمَّارَتِیْ بِالسُّوْٓءِ مَا اتَّعَظَتْ
مِنْ جَهْلِهَا بِنَذِیْرِ الشَّیْبِ وَ الْهَرَمِ

نفس فرماں دہ بہ بدہا میکند دیم خراب
وز جہالت پند نہ پذیرد ز پیری وھرم

نفسِ امّارہ نے نادانی سے کچھ پروا نہ کی
یوں تو پیری کی نصیحت تھی نہایت محترم

۱۴ وَ لَا اَعَدَّتْ مِنَ الْفِعْلِ الْجَمِیْلِ قِرٰی
ضَیْفٍ اَلَمَّ بِرَاْسِیْ غَیْرَ مُحْتَشِمِ

ہم نہ کرد او کارِ نیکو بہرِ مہمانیِ او
بر سرم آمد فرود از من نگشتہ محتشم

نیکیوں سے میں نے اس مہماں کی خاطر نہ کی
آن پہنچی جب ضعیفی سر پہ میرے ایک دم

۱۵ لَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنِّيْ مَا أُوَقِّرُهُ
كَتَمْتُ سِرًّا بَدَا لِيْ مِنْهُ بِالْكَتَمِ

گر بدانستم کہ مہماں را نمیدارم عزیز
کردمی تغییر اسفیدی مویم از کتم

کاش میں پہچانتا توقیر اس مہمان کی
پس چھپا لیتا سفیدی سر کی از رنگ کتم

۱۶ مَنْ لِيْ بِرَدِّ جِمَاحٍ مِنْ غَوَايَتِهَا
كَمَا يُرَدُّ جِمَاحُ الْخَيْلِ بِاللُّجُمِ

نفسِ سرکش را ز بے راہی کہ می آرد براہ
چوں لگامے اسپ سرکش آورد از راہ ہم

کون ہے جو نفسِ سرکش کو مرے یوں پھیر دے
روکتے ہیں جیسے گھوڑوں کو لگاموں سے بہم

۱۷ فَلَا تَرُمْ بِالْمَعَاصِيْ كَسْرَ شَهْوَتِهَا
إِنَّ الطَّعَامَ يُقَوِّيْ شَهْوَةَ النَّهِمِ

پس مجو بر فعلِ عصیاں کسرِ شہوتہائے نفس
زانکہ قوت میدہد شہوت طعام اندر شکم

نفس کی خواہش گناہوں سے نہیں ہوتی ہے دُور
جس طرح جُوع البقر میں پُر نہیں ہوتا شکم

۱۸ وَالنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلَىٰ
حُبِّ الرَّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

نفس چوں طفل است گر شیرش دہی دم خورد
مدتہ شیرش باز داری او نہ خواہد ہیچ دم

نفس کی ہیں عادتیں مانندِ طفلِ شیر خوار
دُودھ پیتا جائے گا جب تک چھڑائیں گے نہ ہم

۱۹ فَاصْرِفْ هَوَاهَا وَحَاذِرْ أَنْ تُوَلِّيَهُ
إِنَّ الْهَوَىٰ مَا تَوَلَّىٰ يُصْمِ أَوْ يَصِمِ

باز گیرش از ہوا بر خود ہوا حاکم مکن
چوں ہوا حاکم شود و بینت بشد یا گشت کم

خواہشوں کو روک ہرگز نفس کا تابع نہ ہو
تا نہ کر دے ختم یا پھر عیب والا کم سے کم

۲۰ وَرَاعِهَا وَهِيَ فِي الْأَعْمَالِ سَائِمَةٌ
وَإِنْ هِيَ اسْتَحْلَتِ الْمَرْعَىٰ فَلَا تُسِمِ

نفس را مقہور کن چوں در عمل جولاں کنی
ور بچیزے انس گیرد باز دارش از ستم

باز رکھ حُسنِ عمل کو لذتِ تشہیر سے
اِس چراگاہِ ہوس سے دُور رکھ اپنا قدم

۲۱ كَمْ حَسَّنَتْ لَذَّةً لِلْمَرْءِ قَاتِلَةً
مِنْ حَيْثُ لَمْ يَدْرِ أَنَّ السَّمَّ فِي الدَّسَمِ

لذتے کاں با مضرت باشد آراید بخلق
آں چناں کو در نیابد ایں کہ زہر اندر دسم

لذتیں چکنی غذا کی زہرِ قاتل تھیں مگر
کھانے والے نے نہ جانا اس میں پوشیدہ ہے سم

۲۲ وَاخْشَ الدَّسَائِسَ مِنْ جُوْعٍ وَمِنْ شِبَعٍ
فَرُبَّ مَخْمَصَةٍ شَرٌّ مِنَ التُّخَمِ

تو بترس از حیلہ ہائے نفس چوں جوع و شبع
گاہ باشد گشنگی بدتر ز سیری و تخم

مکر سے کر خوف اُن کے شکم سیری ہو کہ بھوک
آفتیں خالی شکم کی کچھ نہیں سیری سے کم

۲۳ وَاسْتَفْرِغِ الدَّمْعَ مِنْ عَيْنٍ قَدِ امْتَلَأَتْ
مِنَ الْمَحَارِمِ وَالْزَمْ حِمْيَةَ النَّدَمِ
پس ببار از دیدگاں اشکے کہ چشمت پُر شدہ
از محارم پس ملازم شو بدرگاہِ ندم
ان گناہوں کو جو آنکھوں میں بسے ہیں دُور کر
ہو پشیماں اور بہا اشکِ ندامت دمبدم

۲۴ وَخَالِفِ النَّفْسَ وَالشَّيْطَانَ وَاعْصِهِمَا
وَإِنْ هُمَا مَحَّضَاكَ النُّصْحَ فَاتَّهِمِ
برخلافِ نفس و شیطاں باش فرمانش مبر
ور نصیحت میکنندت قولِ شاں داں متہم
نفس و شیطاں کا مخالف بن نہ مان ان کا کہا
اُن کی اچھی بھی نصیحت جھوٹ سے کیا کچھ ہے کم

۲۵ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمَا خَصْمًا وَلَا حَكَمًا
فَأَنْتَ تَعْرِفُ كَيْدَ الْخَصْمِ وَالْحَكَمِ
ترک کن فرمانِ ایشاں خصم باشد یا حکم
زاں کہ میدانی تو مکرِ خصم و ہم مکرِ حکم
تو نہ کر اُن کی اطاعت ہوں یہ حاکم یا عدو
جانتا ہے خوب تو مکرِ عدو و مکرِ حکم

۲۶ أَسْتَغْفِرُ اللهَ مِنْ قَوْلٍ بِلَا عَمَلٍ
لَقَدْ نَسَبْتُ بِهِ نَسْلًا لِذِي عُقُمِ
میکنم استغفر اللہ از کلامِ بے عمل
بچہ میخواہم ازاں زن گو بود صاحب عقم
مجھ کو قولِ بے عمل سے توبہ کرنی چاہیے
گویا بانجھ عورت سے امیدِ نسل رکھتے ہیں ہم

۲۷ أَمَرْتُكَ الْخَيْرَ لٰكِنْ مَا ائْتَمَرْتُ بِهِ
وَمَا اسْتَقَمْتُ فَمَا قَوْلِي لَكَ اسْتَقِمِ
امر کردم من بخیرت خود نہ کردم ہیچ خیر
راستی در دیں نہ کردم پس چہ سود از گفتنم
کی نصیحت دوسروں کو اور رہیں خود بے عمل
ہو نصیحت کا اثر کیا بے عمل جب خود ہیں ہم

۲۸ وَلَا تَزَوَّدْتُ قَبْلَ الْمَوْتِ نَافِلَةً
وَلَمْ أُصَلِّ سِوَى فَرْضٍ وَلَمْ أَصُمِ
توشۂ ہرگز نہ کردم بہرِ زادِ آخرت
وز نماز و روزہ جز فرضے نیامد در تنم
زادِ راہِ آخرت اک نفل کا بھی تو نہیں
جُز نماز فرض و روزہ کچھ نہیں رکھتے ہیں ہم

۲۹ ظَلَمْتُ سُنَّةَ مَنْ أَحْيَا الظَّلَامَ إِلَى
أَنِ اشْتَكَتْ قَدَمَاهُ الضُّرَّ مِنْ وَرَمِ
من ستم کردم بسے بر سنتِ خیر الرسل
آں کہ از احیائے شبہا پائے وے کردے ورم
سنتِ بیداریِ شب پر کیا میں نے ستم
طاعتِ شب کے سبب تھا جن کے قدموں پر ورم

۳۰ وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ أَحْشَاءَهُ وَطَوَى
تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحًا مُتْرَفَ الْأَدَمِ
سنگ بستے بر شکم آں نازنیں از گشنگی
صرف کردے در رہِ حق جملہ دینار و درم
بھوک کی شدت کے باعث اور فاقوں کے سبب
آپ نے پتھر سے باندھا نازپروردہ شکم

۳۱ وَرَاوَدَتْهُ الْجِبَالُ الشُّمُّ مِنْ ذَهَبٍ
عَنْ نَفْسِهٖ فَاَرَاهَا اَيَّمَا شَمَمٖ

کوہ از زر کرد خود را عرض تا گردد قبول
رُو نے گردانید از آں زر مصطفےٰ خیر الشیم

زر کے بن کر جب پہاڑ آئے کہ مائل ہوں حضورؐ
کچھ توجہ تک نہ کی تھے آپؐ وہ عالی ھمم

۳۲ وَاَكَّدَتْ زُهْدَهٗ فِيْهَا ضَرُوْرَتُهٗ
اِنَّ الضَّرُوْرَةَ لَا تَعْدُوْ عَلَى الْعِصَمِ

با ضرورت ہا کہ بودش میل بر دنیا نہ کرد
از ضرورت خستہ نہ بود آنکہ دور است از حرم

ایسی حاجت پر بھی تقویٰ کو کیا مضبوط تر
سچ ہے حاجت غالب آ سکتی نہیں جب ہو عصم

۳۳ وَكَيْفَ تَدْعُوْ اِلَى الدُّنْيَا ضَرُوْرَةُ مَنْ
لَوْلَاهُ لَمْ تَخْرُجِ الدُّنْيَا مِنَ الْعَدَمِ

چوں تواند خواند بر دنیا ضرورت زاں کہ گر
نامدے دنیا گہے بیروں نگشتے از عدم

کیا کرے مائل ضرورت ان کو دنیا کی طرف
گر نہ ہوتے آپؐ تو دنیا بھی ہوتی کالعدم

۳۴ مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْكَوْنَيْنِ وَالثَّقَلَيْنِ
وَالْفَرِيْقَيْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

آں محمدؐ سید کونین فخر انس و جاں
بہتر اہل دو عالم مہتر عرب و عجم

ہیں محمدؐ سید کونین شاہ جن و انس
اور شہنشاہ دو عالم مالک عرب و عجم

۳۵ نَبِيُّنَا الْاٰمِرُ النَّاهِيْ فَلَا اَحَدٌ
اَبَرَّ فِيْ قَوْلِ لَا مِنْهُ وَلَا نَعَمِ

آمر و ناہی پیمبر آں رسولؐ راست گو
راست گو تر زو نہ بد در قول لا و در نعم

امر و ناہی کے پیمبر ہیں نہیں ان کا جواب
ہیں نہایت صاف گو وہ قول لا ہو یا نعم

۳۶ هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِيْ تُرْجٰى شَفَاعَتُهٗ
لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحِمِ

آں حبیبؐ کو بود امید گاہ مردماں
در شفاعت نزد سختیہائے پیچیدہ بہم

وہ حبیبؐ ایسے ہیں جن سے ہے شفاعت کی امید
ہوں گی نازل آفتیں پیش آئیں گے جب رنج و غم

۳۷ دَعَا اِلَى اللّٰهِ فَالْمُسْتَمْسِكُوْنَ بِهٖ
مُسْتَمْسِكُوْنَ بِحَبْلٍ غَيْرِ مُنْفَصِمِ

مردم را خواند بحق و ہر کہ رو دست زد
دست زد در حبل محکم کاں بریدہ نشندم

دعوت حق آپ نے دی اور کیا جس نے قبول
اس نے ایسی ڈور تھامی جو نہ ہو گی منفصم

۳۸ فَاقَ النَّبِيِّيْنَ فِيْ خَلْقٍ وَّفِيْ خُلُقٍ
وَّلَمْ يُدَانُوْهُ فِيْ عِلْمٍ وَّلَا كَرَمِ

بہتر پیغمبراں در خَلق و در خُلق آمدہ
کس چو او نامد نہ در علم و نہ در وصف کرم

سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے خَلق میں اور خُلق میں
انبیاء میں سب سے اکمل آپؐ کا علم و کرم

۳۹ وَكُلُّهُمْ مِنْ رَسُولِ اللهِ مُلْتَمِسٌ
غَرْفًا مِنَ الْبَحْرِ أَوْ رَشْفًا مِنَ الدِّيَمِ
ملتمس از وے ہمہ از انبیاء و از رسل
یک کف از دریائے علم و شربتے ز ابر کرم
انبیا سب ملتمس ہیں تاکہ مل جائے انھیں
ایک جُرعہ بحر سے یا قطرہ از ابر کرم

۴۰ وَوَاقِفُونَ لَدَيْهِ عِنْدَ حَدِّهِمِ
مِنْ نُقْطَةِ الْعِلْمِ أَوْ مِنْ شَكْلَةِ الْحِكَمِ
نزدِ او استادہ جملہ ہر یکے در حدِ خویش
نقطۂ از علم دارد یا نصیبے از حکم
اپنے حدِ مرتبہ پر سب کھڑے ہیں رُو برو
جیسے نقطہ لفظ میں اعراب لفظوں میں بہم

۴۱ فَهُوَ الَّذِي تَمَّ مَعْنَاهُ وَصُورَتُهُ
ثُمَّ اصْطَفَاهُ حَبِيبًا بَارِئُ النَّسَمِ
از خلائق او بود در صورت و معنی تمام
برگزیدش در محبت خالق روح و نسم
صورت و سیرت میں ہیں سرکارِ عالی مرتبت
اس لیے اُن کو کیا حق نے حبیبِ محترم

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِيكٍ فِي مَحَاسِنِهِ
۴۲ فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِيهِ غَيْرُ مُنْقَسِمِ
او منزہ از شریک اندر محاسن آمدہ
جوہرِ حسنِ محمد پارہ ناید در قسم
کوئی عالم میں نہیں ان کا محاسن میں شریک
حسن میں جوہر ہے یکتا جو نہ ہوگا منقسم

۴۳ دَعْ مَا ادَّعَتْهُ النَّصَارَى فِي نَبِيِّهِمِ
وَاحْكُمْ بِمَا شِئْتَ مَدْحًا فِيهِ وَاحْتَكِمِ
آنچہ ترسایان بگفتند در حقِ عیسےٰ مگو
پس بگو در حقِ سید آنچہ خواہی در حکم
جو نصارٰی نے کہا عیسٰی کے حق میں تو نہ کہہ
جس قدر ممکن ہو کر مدحِ نبیِ محترم

۴۴ وَانْسُبْ إِلَى ذَاتِهِ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ
وَانْسُبْ إِلَى قَدْرِهِ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمِ
نسبت اندر ذاتِ او کن ہرچہ خواہی از شرف
نسبت اندر قدرِ او کن ہرچہ خواہی از عظم
جو شرف ہو ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کر
جتنی عظمت چاہیے کر شانِ والا میں رقم

۴۵ فَإِنَّ فَضْلَ رَسُولِ اللهِ لَيْسَ لَهُ
حَدٌّ فَيُعْرِبَ عَنْهُ نَاطِقٌ بِفَمِ
فضل و جاہِ مصطفیٰ حدے ندارد در کمال
تا تواند کرد شخصے روشن آں را بیش و کم
حد نہیں ہے کوئی حضرت کے کمال و فضل کی
ہو بیاں کس مُنہ سے توصیفِ شہِ خیر الامم

۴۶ لَوْ نَاسَبَتْ قَدْرَهُ آيَاتُهُ عِظَمًا
أَحْيَى اسْمُهُ حِينَ يُدْعَى دَارِسَ الرِّمَمِ
در خورِ قدرِ بزرگش گر نمودے معجزاست
یادِ نامش زندہ کردے استخوانہائے رمم
اُن کی عظمت کے برابر معجزے ہوتے اگر
ہوتے زندہ نام سے سب استخواں ہائے رمم

۴۷ لَمْ يَمْتَحِنَّا بِمَا تَعْيَى الْعُقُوْلُ بِهٖ
حِرْصًا عَلَيْنَا فَلَمْ نَرْتَبْ وَلَمْ نَهِمِ

انچه او فرمود عقل از فهم آن عاجز نه شد
بر صلاحِ ما حریص است بے گمان و بے نہم
باز رکھا امتحاں سے جس سے عاجز ہو سمجھ
مہربانی کی نہ بچتے یوں گماں و شک سے ہم

۴۸ اَعْيَى الْوَرٰى فَهْمُ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرٰى
لِلْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمِ

عاقلاں از فہمِ معنیِ محمد عاجز اند
اہلِ عالم جملہ در وصفش کشیدستند دم
سرِّ باطن کی حقیقت نے کیا خلقت کو دنگ
دور سے نزدیک سے بس فہم بھی ہے منفحم

۴۹ كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ
صَغِيْرَةً وَّتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اَمَمِ

مثلِ خورشید است شانش گر بود کوچک دور
در برابر چشم ہاے مردم انداز دہم
وہ ہیں مثلِ شمس جو ظاہر ہو چھوٹا دور سے
اور آنکھیں قرب سے ہوتی ہیں خیرہ ایک دم

۵۰ وَكَيْفَ يُدْرِكُ فِي الدُّنْيَا حَقِيْقَتَهٗ
قَوْمٌ نِّيَامٌ تَسَلَّوْا عَنْهُ بِالْحُلُمِ

چوں بداندش حقیقت اہلِ عالم چوں بود
مست خواب و دیدنش در خواب داند مغتنم
اہلِ دنیا کس طرح ان کی حقیقت پا سکے
خوابِ غفلت میں ہیں گویا قوم خوابیدہ ہیں ہم

۵۱ فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِيْهِ اَنَّهٗ بَشَرٌ
وَّاَنَّهٗ خَيْرُ خَلْقِ اللّٰهِ كُلِّهِمِ

مبلغِ معلومِ مردم آنکہ سید آدمی ست
بہترینِ مردماں باشد رسولِ محتشم
انتہائے علم کہتی ہے وہ ہیں خیر البشر
جملہ مخلوقات میں رکھتے ہیں وہ شانِ اتم

۵۲ وَكُلُّ اٰيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا
فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُّوْرِهٖ بِهِمِ

ہر چہ آوردند مجموعِ رسل از معجزات
آں ز نورِ مصطفےٰ آمد بایشاں لاجرم
جو رسولانِ جلیل القدر کے تھے معجزے
آپ ہی کے نور سے پایا تھا سب نے یہ کرم

۵۳ فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا
يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

او بود خورشیدِ فضل و دیگراں سیارگاں
روشنیِ سیارگاں ظاہر کنند اندر ظلم
آفتابِ فضل ہیں وہ سب ستارے انبیا
کرتے ہیں ظلمت میں ظاہر سب پہ انوارِ کرم

۵۴ حَتّٰى اِذَا طَلَعَتْ فِي الْكَوْنِ عَمَّ هُدَا
هَا الْعٰلَمِيْنَ وَاَحْيَتْ سَائِرَ الْاُمَمِ

پیشوائے خلقِ عالم شد چوں آمد در وجود
چوں عدم پوشیدہ شد از نورِ او جملہ امم
ہو گیا خورشید طالع اور ہوا روشن جہاں
آپ کے نورِ ہدایت سے ہوئیں زندہ امم

۵۵ أَكْرِمْ بِخَلْقِ نَبِيٍّ زَانَهُ خُلُقٌ
بِالْحُسْنِ مُشْتَمِلٍ بِالْبِشْرِ مُتَّسِمِ

خلقِ پیغمبر نکو بر خلق خوش آراستہ
مشتمل بر حُسن باشد بر بشارت متسم
کیا عظیم الخلق صورت ہے مزیّن خلق سے
حُسنِ صورت مشتمل ہے خندہ روئی سے بہم

۵۶ كَالزَّهْرِ فِي تَرَفٍ وَالْبَدْرِ فِي شَرَفٍ
وَالْبَحْرِ فِي كَرَمٍ وَالدَّهْرِ فِي هِمَمِ

چوں بہار از تازگی بدہم چوں بدر اندر شرف
ہمچوں دریا در کرم چوں روزگار اندر ہمم
تازگی میں ہیں وہ غنچہ اور شرف میں مثلِ بدر
دہر ہیں ہمت میں اور بخشش میں دریائے کرم

۵۷ كَأَنَّهُ وَهُوَ فَرْدٌ مِنْ جَلَالَتِهِ
فِي عَسْكَرٍ حِينَ تَلْقَاهُ وَفِي حَشَمِ

گر کسے دیدیش تنہا خود ہمی پنداشتے
کز بزرگی اوست اندر لشکر و خیل و حشم
ہیں جلال و رعب میں سرکارِ عالی بے نظیر
جیسے گرد و پیش رکھتا ہے کوئی فوج و حشم

۵۸ كَأَنَّمَا اللُّؤْلُؤُ الْمَكْنُونُ فِي صَدَفٍ
مِنْ مَعْدِنَيْ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَمُبْتَسَمِ

دُرِّ مکنوں در صدف دندانِ او بد گوئیا
واں دہن گویا کہ می افشاند مروارید ہم
ہیں وہ دندانِ مبارک مثلِ موتی سیپ میں
معدنِ نطق و تبسم ہے وہ دہن محترم

۵۹ لَا طِيبَ يَعْدِلُ تُرْبًا ضَمَّ أَعْظُمَهُ
طُوبَى لِمُنْتَشِقٍ مِنْهُ وَمُلْتَثِمِ

ہیچ بوئے خوش چو بوئے خوابگاہِ او نہ بود
نیک بخت آنکس کہ بوئیدست و بوسیدست ہم
ہے وہ خوش قسمت جو سونگھے اور بوسہ دے اسے
اے خوشا خوشبوئے خاکِ تربتِ شاہِ اُمم

۶۰ أَبَانَ مَوْلِدُهُ عَنْ طِيبِ عُنْصُرِهِ
يَا طِيبَ مُبْتَدَإٍ مِنْهُ وَمُخْتَتَمِ

وقتِ زادن پاکیِ ذاتِ شریفش شد پدید
پاک بودش مبتدا و پاک بودش مختتم
اُن کی پیدائش سے ساری خوبیاں ظاہر ہوئیں
پاک اُن کی ابتدا اور پاک اُن کا مختتم

۶۱ يَوْمٌ تَفَرَّسَ فِيهِ الْفُرْسُ أَنَّهُمُ
قَدْ أُنْذِرُوا بِحُلُولِ الْبُؤْسِ وَالنِّقَمِ

اہلِ فرس آں روز دانستند کایشاں را نمود
بعد ازیں درد و بلا و خواری و رنج و نقم
اہلِ فارس کو ولادت کی خبر جب مل گئی
ہو گئے دہشت زدہ اور چھا گیا رنج و الم

۶۲ وَبَاتَ إِيوَانُ كِسْرَى وَهْوَ مُنْصَدِعٌ
كَشَمْلِ أَصْحَابِ كِسْرَى غَيْرَ مُلْتَئِمِ

طاقِ کسریٰ شد خراب و کنگرِ کسریٰ شکست
در شکست احوالِ کفار و دگر نامد بہم
قصرِ کسریٰ گر پڑا اور پارہ پارہ ہو گیا
اور پراگندہ ہوئے کسریٰ کے ساتھی ایک دم

۶۳ وَالنَّارُ خَامِدَةُ الْاَنْفَاسِ مِنْ اَسَفٍ
عَلَيْهِ وَالنَّهْرُ سَاهِي الْعَيْنِ مِنْ سَدَمِ

آتشِ گبراں بمرد از حزن و اندوہ و ملال
چشمۂ آبِ رواں شد خشک در جوئے سدم
آتشِ فارس نے ٹھنڈی سانس لی افسوس سے
نہر بھی چشموں کو بھولی از رہِ اندوہ و غم

۶۴ وَسَآءَ سَاوَةَ اَنْ غَاضَتْ بُحَيْرَتُهَا
وَرُدَّ وَارِدُهَا بِالْغَيْظِ حِيْنَ ظَمِيْ

ساوہ غمگیں شد چو گشتش آبِ دریاچہ خشک
تشنگاں زو باز گشتند جملگی در درد و غم
اہلِ ساوہ تھے پریشاں خشک چشمے دیکھ کر
لوٹتے تھے گھاٹ سے غصّے میں پیاسے پُر الم

۶۵ كَاَنَّ بِالنَّارِ مَا بِالْمَاءِ مِنْ بَلَلٍ
حُزْنًا وَّبِالْمَآءِ مَا بِالنَّارِ مِنْ ضَرَمِ

گوئیا بر جائے آتش آب بودے سرد و تر
از غم و بر جائے آب آتش بُدے سوزان و گرم
پانی سی ہو گئی تھی آگ مارے رنج کے
اور پانی ہو گیا تھا آتشیں از سوز و غم

۶۶ وَالْجِنُّ تَهْتِفُ وَالْاَنْوَارُ سَاطِعَةٌ
وَالْحَقُّ يَظْهَرُ مِنْ مَّعْنًى وَّمِنْ كَلِمِ

لشکرِ شیطاں فغاں کردہ ز اندوہِ تمام
نورِ حق تاباں ز معنیٰ و کلم شد و مبدم
کی فغاں جنّات نے انوار بھی چمکے ادھر
نورِ حق روشن ہوا الفاظ و معنیٰ سے بہم

۶۷ عَمُوْا وَصَمُّوْا فَاِعْلَانُ الْبَشَآئِرِ لَمْ
تُسْمَعْ وَبَارِقَةُ الْاِنْذَارِ لَمْ تُشَمِ

کور و کر گشتند نشنیدند بشارت از خدا
ہم ندیدند برقِ بیم از غایتِ رنج و الم
اندھے اور بہرے تھے سنتے کس طرح خوشخبریاں
بلکہ خوفِ برق بھی ان کو نہ تھا از رنج و غم

۶۸ مِنْ بَعْدِ مَا اَخْبَرَ الْاَقْوَامَ كَاهِنُهُمْ
بِاَنَّ دِيْنَهُمُ الْمُعْوَجَّ لَمْ يَقُمِ

پس ازاں کاخبار ایشاں کردہ بودند کاہناں
آنکہ دینِ شاں کژست و نیست خواہد گشت ہم
دی خبر اقوام کے سب کاہنوں نے بعد ازاں
دین اُن کے ہو گئے باطل ہوئے سب کالعدم

۶۹ وَبَعْدَ مَا عَايَنُوْا فِي الْاُفُقِ مِنْ شُهُبٍ
مُنْقَضَّةٍ وَّفْقَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ صَنَمِ

دیدہ بودند ز آسماں آتش بزیر افتادہ بود
در زمیں ہم سرنگوں از خواری افتادہ صنم
بعد ازاں یوں ٹوٹتے تاروں کو دیکھا چرخ نے
اور منہ کے بل گرے سب سرنگوں ہو کر صنم

۷۰ حَتّٰى غَدَا عَنْ طَرِيْقِ الْوَحْيِ مُنْهَزِمٌ
مِّنَ الشَّيَاطِيْنِ يَقْفُوْا اِثْرَ مُنْهَزِمِ

از طریقِ وحی دیواں جملہ آوارہ شدند
دل شکستہ از پئے ہم میرسیدند از ہزم
بھاگتے تھے راستے سے وحی کے شیطان یوں
ایک پیچھے دوسرے کے سر پہ رکھ اپنا قدم

۷۱ كَأَنَّهُمْ هَرَبًا أَبْطَالُ أَبْرَهَةٍ
أَوْ عَسْكَرٌ بِالْحَصَى مِنْ رَاحَتَيْهِ رُمِي

چوں دلیرانِ یمن بودند گویا در گریز
یا چوں آں لشکر کہ از خاکِ کفش گشتند گم

تھا وہ لشکر ابرہہ کا یا پراگندہ سی فوج
سنگریزے جن پہ پھینکے تھے بدستِ شاہِ اُمم

۷۲ نَبْذًا بِهِ بَعْدَ تَسْبِيحٍ بِبَطْنِهِمَا
نَبْذَ الْمُسَبِّحِ مِنْ أَحْشَاءِ مُلْتَقِمِ

اوفگندہ از پئے تسبیح در دستِ رسول
مثلِ تسبیحے کہ یونسؑ را بیفگند از شکم

لے کے نام اللہ کا پھینکا جو کنکر آپؐ نے
حضرتِ یونسؑ کو اگلا جیسے ماہی کا شکم

۷۳ جَاءَتْ لِدَعْوَتِهِ الْأَشْجَارُ سَاجِدَةً
تَمْشِي إِلَيْهِ عَلَى سَاقٍ بِلَا قَدَمِ

ہم درخت آمد بفرمانش بہ نزد و سجدہ کرد
می دویدے سوئے او دائم بساقِ بے قدم

ہو کے مسجود آپؐ کی دعوت پہ اشجار آ گئے
پیڑ سے چلتے ہوئے رکھتے نہ تھے گو وہ قدم

۷۴ كَأَنَّمَا سَطَرَتْ سَطْرًا لِمَا كَتَبَتْ
فُرُوعُهَا مِنْ بَدِيعِ الْخَطِّ فِي اللَّقَمِ

گوئیا خطے کہ کردند شاخہا بر ہر درخت
می نوشتندے خطِ نیکو عجب اندر رقم

ان درختوں نے لکیریں خوب کھینچیں اور لکھا
ڈالیوں سے اپنی وسطِ راہ میں با پیچ و خم

۷۵ مِثْلَ الْغَمَامَةِ أَنَّى سَارَ سَائِرَةً
تَقِيهِ حَرَّ وَطِيسٍ لِلْهَجِيرِ حَمِي

ابر بودے بر سرش تا او برفتے ہر کجا
تا نگاہش داشت از گرمائے تابستان گرم

ابر کے مانند وہ سایہ فگن تھے آپؐ پر
تا بچائے گرم موسم کی حرارت سے بہم

۷۶ أَقْسَمْتُ بِالْقَمَرِ الْمُنْشَقِّ إِنَّ لَهُ
مِنْ قَلْبِهِ نِسْبَةً مَبْرُورَةَ الْقَسَمِ

میخورم سوگند بہر ماہے کہ منشق شد از و
نسبتے دارد ز قلبش زاں درست آمد قسم

قلبِ پاکِ مصطفےٰ سے چاند کو نسبت ہے خاص
ماہِ منشق کی قسم کھاتا ہوں ہیں سچی قسم

۷۷ وَمَا حَوَى الْغَارُ مِنْ خَيْرٍ وَمِنْ كَرَمٍ
وَكُلُّ طَرْفٍ مِنَ الْكُفَّارِ عَنْهُ عَمِي

جمع کردہ غار خیرات و کرامت ہا بسے
با محمدؐ چشم کافر گشت زیں شاں کور ہم

کیا نظر آتا انھیں کفار تھے سب کور چشم
غار میں جو ہو گئے تھے جمع با خیر و کرم

۷۸ فَالصِّدْقُ فِي الْغَارِ وَالصِّدِّيقُ لَمْ يَرِمَا
وَهُمْ يَقُولُونَ مَا بِالْغَارِ مِنْ أَرِمِ

صدق و صدیق اند در غار و کس ایشاں را ندید
کافراں گفتند کس اینجا نہ باشد منکتم

صدق اور صدیقِ اکبر غار ہی میں تھے چھپے
غار میں کوئی نہیں کفار کہتے تھے بہم

۷۹ ظَنُّوا الْحَمَامَ وَظَنُّوا الْعَنْكَبُوْتَ عَلٰى
خَيْرِ الْبَرِيَّةِ لَمْ تَنْسُجْ وَلَمْ تَحُمِ

تخم بنہادہ کبوتر بُد بہ بفتِ عنکبوت
کافراں را شد گماں کانجا نیا سُودہ نسم
دیکھ کر انڈے کبوتر کے اُدھر مکڑی کا جال
تھا گماں کفّار کو اس میں نہیں شاہِ امم

۸۰ وِقَايَةُ اللّٰهِ أَغْنَتْ عَنْ مُّضَاعَفَةٍ
مِّنَ الدُّرُوْعِ وَعَنْ عَالٍ مِّنَ الْأُطُمِ

چُوں خدا اورا ز مکرِ دشمناں محفوظ داشت
بر زرہ حاجت نبودش و بحصن و قلعہ ہم
کی حفاظت آپؐ کی ایسی خدائے پاک نے
زرہ اور قلعوں سے مستغنی ہوئے شاہِ امم

۸۱ مَا سَامَنِي الدَّهْرُ ضَيْمًا وَّاسْتَجَرْتُ بِهٖ
إِلَّا وَنِلْتُ جِوَارًا مِّنْهُ لَمْ يُضَمِ

رنج اگر دیدم ز دہر و خواستم از وے اماں
در جوارِ او خلوص از ہر بلائے یافتم
جب زمانے نے ستایا میں نے لی اُن کی پناہ
جب ملی اُن کی مدد بس دُور تھا سب رنج و غم

۸۲ وَلَا الْتَمَسْتُ غِنَى الدَّارَيْنِ مِنْ يَّدِهٖ
إِلَّا اسْتَلَمْتُ النَّدٰى مِنْ خَيْرِ مُسْتَلَمِ

ہر چہ کردم التماس از نعمتِ ہر دو سرا
یافتم بر وجہ بہتر آنچہ از وے خواستم
دستِ اقدس سے طلب کی دین و دنیا جب کبھی
سرفرازی ہو گئی جب مل گیا دستِ کرم

۸۳ لَا تُنْكِرِ الْوَحْيَ مِنْ رُّؤْيَاهُ إِنَّ لَهٗ
قَلْبًا إِذَا نَامَتِ الْعَيْنَانِ لَمْ يَنَمِ

پس مکن انکار وحی از خوابِ پیغمبرؐ از انک
چشمش ار در خواب رفتی دل بُدش بیدار ہم
اس وحی کا تو نہ منکر ہو جو آئے خواب میں
آنکھیں سوتی تھیں مگر رہتا تھا دل بیدار ہم

۸۴ فَذَاكَ حِيْنَ بُلُوْغٍ مِّنْ نُّبُوَّتِهٖ
فَلَيْسَ يُنْكَرُ فِيْهِ حَالُ مُحْتَلِمِ

وحی در خواب اولِ پیغمبری بودی ورا
خوابِ او منکر مشو تو مثلِ خوابِ محتلم
تھا وہ معراجِ نبوّت کا زمانہ آپ کے
پس نہ کر انکار ہرگز مثلِ خوابِ محتلم

۸۵ تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْيٌ بِمُكْتَسَبٍ
وَّلَا نَبِيٌّ عَلٰى غَيْبٍ بِمُتَّهَمِ

پس بزرگ است آں خدا وحیِ او کسبے نہ بود
ہم رسولِ او نہ بُد بر علمِ غیبش متہم
بارک اللّٰہ سعی سے حاصل نہیں ہوتی وحی
اور نہ علمِ غیب پر کوئی نبی رہے متہم

۸۶ كَمْ أَبْرَأَتْ وَصِبًا بِاللَّمْسِ رَاحَتُهٗ
وَأَطْلَقَتْ أَرِبًا مِّنْ رِّبْقَةِ اللَّمَمِ

بس کساں را او شفا داد وے بمالیدن بدست
وارہانیدے بسے دیوانگاں را از لمم
جب چھُوا دستِ مبارک ہو گئی کامل شفا
اور رہا پائی جنوں سے اکثروں نے از کرم

۸۷ وَاَحْیَتِ السَّنَۃَ الشَّھْبَآءَ دَعْوَتُہٗ
حَتّٰی حَکَتْ غُرَّۃً فِی الْاَعْصُرِ الدُّھُمِ

دعوتِ او قحط و تنگی از جہاں بر داشتہ
تا چو روا سپید بودی در سیاہی و نسم

خشک سالی کی سفیدی ہوگئی کافور سب
اک دعا نے آپؐ کی برسا دیا ابرِ کرم

۸۸ بِعَارِضٍ جَادَ اَوْخِلْتَ الْبِطَاحَ بِھَا
سَیْبًا مِّنَ الْیَمِّ اَوْسَیْلًا مِّنَ الْعَرِمِ

بر دعایش آمدے باراں وادی پر شدے
گوئیا دریا بُدے یا گوئیا سیلِ عرم

ہوگئی کثرت سے بارش ندیاں بہنے لگیں
موج دریا کی نظر آتی تھی سیلابِ عرم

۸۹ دَعْنِیْ وَوَصْفِیْ اٰیَاتٍ لَّہٗ ظَھَرَتْ
ظُھُوْرَ نَارِ الْقِرٰی لَیْلًا عَلٰی عَلَمِ

گوش کن تا معجزش گویم کہ آں روشن بود
ہمچوں آتش در شبِ تاریک بر فرقِ علم

چھوڑ دے مجھ کو بیاں کرنے نبیؐ کے معجزات
جو ہے شب میں مثلِ مہمانی کی آگ اوپر علم

۹۰ فَالدُّرُّ یَزْدَادُ حُسْنًا وَّھُوَ مُنْتَظِمٌ
وَلَیْسَ یَنْقُصُ قَدْرًا غَیْرَ مُنْتَظِمِ

دُر اگر در رشتہ باشد حُسنِ او زاید بود
ورنہ در رشتہ بود قدرش نہ گردد ہیچ کم

حُسن ہوتا ہے دو بالا موتیوں کا ہار میں
یا لڑی سے بھی جدا کر دو نہ ہو گی قدر کم

۹۱ فَمَا تَطَاوَلَ اٰمَالُ الْمَدِیْحِ اِلٰی
مَا فِیْہِ مِنْ کَرَمِ الْاَخْلَاقِ وَالشِّیَمِ

ہر چہ کاں گوید مدیحِ مصطفےٰؐ بسیار نیست
کو مزین بد بہ خُلقِ نیک و احسان و شیم

اس لیے مدّاح ہیں توصیف میں عاجز تمام
فہمِ انساں سے ہیں بالا ان کے اخلاق و شیم

۹۲ اٰیَاتُ حَقٍّ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثَۃٌ
قَدِیْمَۃٌ صِفَۃُ الْمَوْصُوْفِ بِالْقِدَمِ

آیہ ہائے حق کہ از رحمٰن فرود آمد بہ تو
آں قدیم است و بود وصفش بموصوفِ قدم

مصحفِ رحمٰن کی سب آیتیں ہیں لاجواب
ہے صفت اس کی قدیم اور ہے وہ موصوفِ قدم

۹۳ لَمْ تَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَّھِیَ تُخْبِرُنَا
عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَّعَنْ اِرَمِ

مقترن نامد بوقتے دائماً ثابت بداں
او خبر داد از معاد و حشر و زعاد و ارم

ہر زمانہ سے بری ہیں اور سناتی ہیں ہمیں
عاقبت کا حال بھی اور قصۂ عاد و ارم

۹۴ دَامَتْ لَدَیْنَا فَفَاقَتْ کُلَّ مُعْجِزَۃٍ
مِنَ النَّبِیِّیْنَ اِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

نزد ما باقی بماند بہتر از ہر معجزات
معجزِ پیغمبراں باقی نہ ماندہ در امم

معجزہ قرآن کا برقرار رہے گا تا ابد
اس کے آگے معجزاتِ انبیاءؑ ہیں کالعدم

۹۵ مُحَكَّمَاتٌ فَمَا يُبْقِينَ مِنْ شُبَهٍ
لِذِي شِقَاقٍ وَلَا يَبْغِينَ مِنْ حَكَمِ

محکم است آیاتِ قرآں شبہ کس را نماند
وز ہمہ الفاظ از و تاباں بود نورِ حکم

ہیں وہ مستحکم مخالف کو نہیں اس میں جگہ
شبہ و شک کی اس لیے ہیں وہ بجائے خود حکم

۹۶ مَا حُورِبَتْ قَطُّ إِلَّا عَادَ مِنْ حَرَبٍ
أَعْدَى الْأَعَادِي إِلَيْهَا مُلْقِيَ السَّلَمِ

ہر کہ با قرآں بہ جنگ آمد بآخر باز گشت
آں کہ دشمن تر بدے نزدش بیفگندے سلم

جو لڑا قرآن سے آخر وہ عاجز آگیا
کر دیا دشمن نے بھی اپنا سرِ تسلیم خم

۹۷ رَدَّتْ بَلَاغَتُهَا دَعْوَى مُعَارِضِهَا
رَدَّ الْغَيُورِ يَدَ الْجَانِي عَنِ الْحُرَمِ

از بلاغت دعوئے جملہ معارض کرد رد
چوں غیورے کو کند رد دست جانے از حرم

اس نے سب اپنی بلاغت سے کیا دعووں کو ختم
جیسے ہوں محفوظ غیرت مند کے اہلِ حرم

۹۸ لَهَا مَعَانٍ كَمَوْجِ الْبَحْرِ فِي مَدَدٍ
وَفَوْقَ جَوْهَرِهِ فِي الْحُسْنِ وَالْقِيَمِ

معنیِ بسیار ہمچوں موجِ دریا دارد آں
بہتر است از دُرِّ دریا جملہ در حُسن و قیم

ہے معانی آیتوں کے مثلِ دریا موجزن
گوہرِ دریا سے بہتر ان کا ہے حسنِ قیم

۹۹ فَمَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصَى عَجَائِبُهَا
وَلَا تُسَامُ عَلَى الْإِكْثَارِ بِالسَّأَمِ

پس عجائب اندراں و کس نہ بتواند شمرد
وز چہ بسیاری بخواند کس نہ بیند شوق کم

جو عجائب ان میں پوشیدہ ہیں ان کا کیا شمار
خواہ کثرت سے پڑھو ہوگا نہ اس کا شوق کم

۱۰۰ قَرَّتْ بِهَا عَيْنُ قَارِيهَا فَقُلْتُ لَهُ
لَقَدْ ظَفِرْتَ بِحَبْلِ اللهِ فَاعْتَصِمِ

چشمِ خوانندہ بداں روشن شود من گفتمش
یافتی حبلِ خدا محکم بگیر اے معتصم

ہوگئیں آنکھیں جو ٹھنڈی میں نے قاری سے کہا
تھام حبل اللہ کو ہے فتح تیری معتصم

۱۰۱ إِنْ تَتْلُهَا خِيفَةً مِنْ حَرِّ نَارِ لَظَى
أَطْفَأْتَ حَرَّ لَظَى مِنْ وِرْدِهَا الشَّبِمِ

گر بخوانیش زترسِ آتشِ دوزخ کنی
سرد بر خود گرمیِ آتش بداں من ضامنم

آتشِ دوزخ کے ڈر سے تو اگر ان کو پڑھے
شعلۂ نارِ جہنم اس سے ہو جائے گا کم

۱۰۲ كَأَنَّهَا الْحَوْضُ تَبْيَضُّ الْوُجُوهُ بِهِ
مِنَ الْعُصَاةِ وَقَدْ جَاءُوهُ كَالْحُمَمِ

آں چو حوضے واں کہ دارد روئے خوانندہ سفید
گرچہ عاصی آمدست و رو سیہ ہمچوں حمم

ہیں وہ مثلِ حوضِ کوثر جس سے ہوتی ہیں سفید
عاصیوں کی صورتیں جو تھیں سیاہ مثلِ حمم

۱۰۳ وَكَالصِّرَاطِ وَكَالْمِيزَانِ مَعْدِلَةً
فَالْقِسْطُ مِنْ غَيْرِهَا فِي النَّاسِ لَمْ يَقُمِ

چوں صراط است آں و چوں میزاں بود در راستی
راستی از غیر آنہا کس ندیدہ بیش و کم
ہیں ترازو عدل کی اور راستی کے ہیں صراط
ہے بغیر ان کے قیام انصاف کا بس کالعدم

۱۰۴ لَا تَعْجَبَنْ لِحَسُودٍ رَاحَ يُنْكِرُهَا
تَجَاهُلًا وَهُوَ عَيْنُ الْحَاذِقِ الْفَهِمِ

گر حسود انکار آں کردہ مدار آں را عجب
کو تجاہل کردہ ورنہ نیک کرد است آں فہم
مت تعجب کر تو حاسد پر جسے انکار ہے
ہے تجاہل اس کا گرچہ ہے وہ پکا ذی فہم

۱۰۵ قَدْ تُنْكِرُ الْعَيْنُ ضَوْءَ الشَّمْسِ مِنْ رَمَدٍ
وَيُنْكِرُ الْفَمُ طَعْمَ الْمَاءِ مِنْ سَقَمِ

گہ گہے چشم از رمد منکر شود خورشید را
ہم دہن منکر شود طعم خوش آب از سقم
روشنی سورج کی کیونکہ دیکھتی بیمار آنکھ
ذائقہ کیا آب شیریں کا ملے جب ہو سقم

۱۰۶ يَا خَيْرَ مَنْ يَمَّمَ الْعَافُونَ سَاحَتَهُ
سَعْيًا وَفَوْقَ مُتُونِ الْأَيْنُقِ الرُّسُمِ

اے مہین آں کہ مردم قصد درگاہش کنند
یا پیادہ یا بہ پشتِ اشتراں بادو دم
اے شہ والا ترے دربار میں آتے ہیں سب
یا پیادہ اور سوار اشترانِ تازہ دم

۱۰۷ وَمَنْ هُوَ الْآيَةُ الْكُبْرَى لِمُعْتَبِرٍ
وَمَنْ هُوَ النِّعْمَةُ الْعُظْمَى لِمُغْتَنِمِ

اے کہ ہستی آیت کبریٰ کہ باشد معتبر
اے کہ ہستی نعمت عظمیٰ کہ باشد مغتنم
ہیں وہ برتر اور ذی شاں معتبر کے واسطے
اور وہ ہیں نعمت عظمیٰ برائے مغتنم

۱۰۸ سَرَيْتَ مِنْ حَرَمٍ لَيْلًا إِلَى حَرَمٍ
كَمَا سَرَى الْبَدْرُ فِي دَاجٍ مِنَ الظُّلَمِ

در شبے رفتی ز مکہ تا باقصیٰ شریف
چوں کہ ماہ چاردہ گردد رواں اندر ظلم
بدر کامل جس طرح سے رات میں کرتا ہے سیر
مکہ سے اقصیٰ گئے معراج میں شاہِ امم

۱۰۹ وَبِتَّ تَرْقَى إِلَى أَنْ نِلْتَ مَنْزِلَةً
مِنْ قَابِ قَوْسَيْنِ لَمْ تُدْرَكْ وَلَمْ تُرَمِ

بر شدی بالا و گشتہ قاب قوسینت مقام
واں نہ دیدست و نہ بیند ہیچ کس در ہیچ دم
طے کیے سارے مدارج اور ملا ایسا مقام
ہے پرے ادراک کے در قاب قوسین سے نہ کم

۱۱۰ وَقَدَّمَتْكَ جَمِيعُ الْأَنْبِيَاءِ بِهَا
وَالرُّسُلِ تَقْدِيمَ مَخْدُومٍ عَلَى خَدَمِ

انبیاء و مرسلینت پیشوا کردند دراں
ہمچوں مخدومے کہ گردد پیشوا اندر خدم
مسجد اقصیٰ میں بن کر انبیاءؑ کے پیشوا
آپ تھے مخدوم باقی انبیاءؑ سب تھے خدم

۱۱۱ وَاَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ
فِیْ مَوْکِبٍ کُنْتَ فِیْهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ
زآسماں ہا برگذشتی بر جمیعِ انبیاءؑ
در گروہ کاندر ایشاں تو بدی صاحب عَلَم
طے کیا سات آسمانوں کا سفر با انبیاؑ
ساتھ افواجِ ملائک کے تھے با شان و حشم

۱۱۲ حَتّٰی اِذَا لَمْ تَدَعْ شَاْوًا لِمُسْتَبِقٍ
مِنَ الدُّنُوِّ وَلَا مَرْقًی لِمُسْتَنِمِ
زینتے از قرب بہر ہیچ کس نگذاشتے
جائے بالاتر نہ ہشتی دیگراں را در رقم
مرتبہ باقی نہ رکھا بڑھنے والوں کے لیے
ہر بلند و پست پر تھا آپؐ کا فیض قدم

۱۱۳ خَفَضْتَ کُلَّ مَقَامٍ بِالْاِضَافَةِ اِذْ
نُوْدِیْتَ بِالرَّفْعِ مِثْلَ الْمُفْرَدِ الْعَلَمِ
پست کردی پیشِ قربت ہر مقامِ دیگراں
چوں ترا بُردند بالا و ندراں گشتی عَلَم
کر دیے پست آپؐ نے سب کے مدارج اور مقام
جب ہوئے مدعو بلندی پر یگانہ با حشم

۱۱۴ کَیْمَا تَفُوْزَ بِوَصْلٍ اَیِّ مُسْتَتِرٍ
عَنِ الْعُیُوْنِ وَسِرٍّ اَیِّ مُکْتَتَمِ
تا مقامِ وصل پنہاں یافتی از چشمِ خلق
سِرِّ پنہانی بدانستے ز اوصافِ قدم
تاکہ ہوں اسرارِ پوشیدہ سے واقف بعدِ وصل
حق نے ظاہر کر دیے سب راز از فضل و کرم

۱۱۵ فَحُزْتَ کُلَّ فَخَارٍ غَیْرَ مُشْتَرَكٍ
وَجُزْتَ کُلَّ مَقَامٍ غَیْرَ مُزْدَحَمِ
جمع کردی ہر بزرگی کاں نبودہ مشترک
بر شدی از ہر مقامے کاں نبودی مزدحم
ہر بزرگی غیر شرکت جمع کر لی آپؐ نے
طے کیے سب مرتبوں کو آپؐ غیر مزدحم

۱۱۶ وَجَلَّ مِقْدَارُ مَا وُلِّیْتَ مِنْ رُتَبٍ
وَعَزَّ اِدْرَاكُ مَا اُوْلِیْتَ مِنْ نِّعَمِ
بس بزرگ است آنچہ داوندت ز فضل مرتبت
بس عزیز است آنچہ بخشیدت خداوند از نعم
ہیں عظیم الشان رُتبے جو ملے سرکار کو
ہیں پرے ادراک کے جو کچھ ہوئے حاصل نعم

۱۱۷ بُشْرٰی لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اِنَّ لَنَا
مِنَ الْعِنَایَةِ رُکْنًا غَیْرَ مُنْهَدِمِ
مژدگانی باد مارا اے مسلماناں کہ ماں
از عنایت ہست رکنے کاں بود دور از ہدم
اے مسلمانو! یہ خوشخبری ہے اپنے واسطے
اک ستوں ایسا ملا مضبوط از فضل و کرم

۱۱۸ لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِیْنَا لِطَاعَتِهٖ
بِاَکْرَمِ الرُّسُلِ کُنَّا اَکْرَمَ الْاُمَمِ
چوں خدا مارا بطاعت خواند بفرستاد داد
بہتر پیغمبراں گشتیم ما خیر الامم
جبکہ ان کو حق نے خود خیر الرسل فرما دیا
طاعتِ حق کے سبب ہم ہو گئے خیر الامم

۱۱۹ راعت قلوب العدى أنباء بعثته
كنبأة أجفلت غفلا من الغنم

دشمناں را دل بترسانید اخبار رسول
ہمچو آوازے کہ ناگہ برجہانید ے غنم

سن کے بعثت کی خبر تھرا گئے اعدا کے دل
شیر کی آوازے جیسے ڈرے غافل غنم

۱۲۰ ما زال يلقاهم في كل معترك
حتى حكوا بالقنا لحما على وضم

چوں بہ جنگِ دشمناں رفتے بدے در جنگ گاہ
آں بدنہا بر سرِ نیزہ چو لحم اندر وضم

جنگ کے میدان میں کفار کی حالت نہ پوچھ
جسم تھے نیزوں پہ ان کے جیسے کندوں پر لحم

۱۲۱ ودوا الفرار فكادوا يغبطون به
أشلاء شالت مع العقبان والرخم

آرزو شاں بگریز و غبطہ بردندے براں
عضو ہائے شاں پریدے با عقاب و با رخم

جنگ کی وحشت سے ان کو بھاگنا منظور تھا
آرزو رکھتے تھے کھالیں چیل و گدھ ان کا لحم

۱۲۲ تمضي الليالي ولا يدرون عدتها
ما لم تكن من ليالي الأشهر الحرم

پس شبے بگذشت و آں را کس نہ دانستے عدو
در غزا ہا چوں نہ بودے از شبِ ماہِ حرم

ڈر کے مارے یوں گزر جاتی تھیں راتیں بیشمار
ہاں سوا راتوں کے جن کے ہیں مہینے محترم

۱۲۳ كأنما الدين ضيف حل ساحتهم
بكل قرم إلى لحم العدى قرم

گوئیا دیں بود مہمانی کہ او آمد فرود
بر سرائے آں کہ بد مشتاقِ لحمِ دشمنم

لشکرِ اسلام تھا مہمان اُن کے صحن میں
چاہتا تھا ہر نفس مل جائے دشمن کا لحم

۱۲۴ يجر بحر خميس فوق سابحة
يرمي بموج من الأبطال ملتطم

میکشیدے بحرِ لشکر حملہ بر اسپاں سوار
موج میزد از دلیرانے کہ رفتندے بہم

تیز رو گھوڑوں پہ تھا وہ لشکرِ دریا مثال
جنگ کے میدان میں موجیں لگاتا دمبدم

۱۲۵ من كل منتدب لله محتسب
يسطو بمستأصل للكفر مصطلم

جملہ از بہرِ خدا در کار بودند و غزا
بیخِ کفر از بن بکندند نیست کردند آں شیم

اجر کی امید والے دعوتِ حق کے مرید
کفر کی بنیاد کو کرتے تھے بالکل کالعدم

۱۲۶ حتى غدت ملة الإسلام وهي بهم
من بعد غربتها موصولة الرحم

تا قوی شد ملتِ اسلام از سعیِ ہمہ
دیں در اول بد غریب و شد در آخر محترم

دینِ حق یوں ان کے دم سے آخرش ظاہر ہوا
مل گئے بچھڑے ہوئے اور ہو گئی غربت بھی کم

۱۲۷ مَکْفُوْلَۃً اَبَدًا مِنْھُمْ بِخَیْرِ اَبٍ
وَخَیْرِ بَعْلٍ فَلَمْ تَیْتَمْ وَلَمْ تَئِمِ

دیں از ایشاں یافت بہتر شوہر و بہتر پدر
زاں نشد در بیوگی و ہم نماند اندر یتیم
جیسے مل جائے کسی کو نیک شوہر اور پدر
بیوگی کا اور یتیمی کا اسے پھر کیا ہو غم

۱۲۸ ھُمُ الْجِبَالُ فَسَلْ عَنْھُمْ مُصَادِمَھُمْ
مَاذَا رَاٰی مِنْھُمْ فِیْ کُلِّ مُصْطَدَمِ

کوہ ہا بودند زاں کو در نبرد آمد بپرس
تا بگویند آنچہ دیدستند از ایشاں در صدم
تھے وہ مثلِ کوہ پوچھو دشمنوں سے اُن کا حال
کچھ اگر دیکھا ہے اُن کو شاملِ جنگ و صدم

۱۲۹ فَسَلْ حُنَیْنًا وَّسَلْ بَدْرًا وَّسَلْ اُحُدًا
فُصُوْلَ حَتْفٍ لَّھُمْ اَدْھٰی مِنَ الْوَخَمِ

از حنین و بدر دیگر از اُحد میکن سوال
تا بخوانند فصلہائے مرگ ادہیٰ از وخم
پوچھ لو بدر و حنین و اُحد سے بھی ان کا حال
موت کے اقسام ہرگز تھے وبا سے کچھ نہ کم

۱۳۰ اَلْمُصْدِرِی الْبِیْضِ حُمْرًا بَعْدَ مَا وَرَدَتْ
مِنَ الْعِدٰی کُلَّ مُسْوَدٍّ مِّنَ اللِّمَمِ

سرخ کردندے بخونِ دشمناں شمشیر را
چوں فرو شد در سیاہی ہر سر مو از لمم
یوں سپیدی سرخ روئی سے بدل جاتی تھی تب
زخم کھا کر جب ہوا کرتے تھے ان کے سر قلم

۱۳۱ وَالْکَاتِبِیْنَ بِسُمْرِ الْخَطِّ مَا تَرَکَتْ
اَقْلَامُھُمْ حَرْفَ جِسْمٍ غَیْرَ مُنْعَجِمِ

می نوشتندے بہ نیزہ خطِ سرخی بر بدن
حرف جسمے بے نقط نہ نوشتہ بوئے از قلم
دشمنوں کے جسم کو بے زخم چھوڑا ہی نہیں
کارفرما اس طرح تھے ان کے نیزوں کے قلم

۱۳۲ شَاکِی السِّلَاحِ لَھُمْ سِیْمَا تُمَیِّزُھُمْ
وَالْوَرْدُ یَمْتَازُ بِالسِّیْمَا مِنَ السَّلَمِ

آں کماں سنجاں کہ سیماشاں بریں ممتاز بود
گل برنگ و بوئے خود ممتاز گردد از سلم
گو مسلح تھے مگر رکھتے تھے سجدے کے نشاں
تھے صحابہؓ مثلِ گل کفار مانندِ سلم

۱۳۳ تُھْدِیْ اِلَیْکَ رِیَاحُ النَّصْرِ نَشْرَھُمْ
فَتَحْسَبُ الزَّھْرَ فِی الْاَکْمَامِ کُلَّ کَمِیْ

میرساند باد نصرت بر تو بوئے سعی شاں
چوں بہار اندر سر غنچہ بود ثابت قدم
بوئے نصرت جب صبا لائے تو یہ سمجھے گا تو
مثلِ غنچوں کے غلافوں میں تھے وہ عالی ہمم

۱۳۴ کَاَنَّھُمْ فِیْ ظُھُوْرِ الْخَیْلِ نَبْتُ رُبًا
مِنْ شِدَّۃِ الْحَزْمِ لَا مِنْ شِدَّۃِ الْحُزُمِ

گوئیا بر پشتِ اسپاں چوں درختِ پشتہ کوہ
ز استواری بود در دین نہ ز کثرت در نسم
تھے وہ گھوڑوں پر سوار ایسے کہ ٹیلوں پر درخت
زین کی پروا نہ تھی اُن شہسواروں کو بہم

۱۳۵ طَارَتْ قُلُوْبُ الْعِدٰی مِنْ بَاْسِهِمْ فَرَقًا
فَمَا تُفَرِّقُ بَیْنَ الْبَهْمِ وَ الْبُهَمِ

لرزه بر دلہائے کفّار او فتاد از ترس شاں
چار پائے و آدمی نشناختند از ترس و غم

ہوش غائب تھے عدو کے سختیوں سے جنگ کی
فرق کر سکتے نہیں تھے سُورما ہے یا غنم

۱۳۶ وَمَنْ تَكُنْ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ نُصْرَتُهٗ
اِنْ تَلْقَهُ الْاُسْدُ فِیْ اٰجَامِهَا تَجِمِ

ہر کہ او را از رسولؐ اللہ نصرت آمدہ
شیر اگر پیشِ رسد از ترسِ او آید بہم

ہو مدد جس کو رسولؐ سیّدِ لولاک کی
شیر بھی ان کو ملے جنگل میں گر مارے نہ دم

۱۳۷ وَلَنْ تَرٰی مِنْ وَّلِیٍّ غَیْرَ مُنْتَصِرٍ
بِهٖ وَلَا مِنْ عَدُوٍّ غَیْرَ مُنْقَصِمِ

دوستانش را نہ بینی غیر منصور و عزیز
ہم نہ بینی دشمنش جز خار بگسستہ بہم

دوست اُن کا ہو نہیں سکتا ہے محرومِ مدد
اور ذلیل و خوار ہو گا دشمنِ شاہِ امم

۱۳۸ اَحَلَّ اُمَّتَهٗ فِیْ حِرْزِ مِلَّتِهٖ
كَاللَّیْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِیْ اَجَمِ

اُمّتِ خود را نشاندہ در حصارِ ملتش
ہمچوں شیرے کو بُود با بچگاں اندر اَجم

اپنی ملّت سے کیا محفوظ اُمّت کو تمام
جس طرح جنگل میں رکھے شیر بچّوں کو بہم

۱۳۹ كَمْ جَدَّلَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ مِنْ جَدِلٍ
فِیْهِ وَكَمْ خَصَمَ الْبُرْهَانُ مِنْ خَصِمِ

ہر کہ با قرآں بہ جنگ آمد بیفگندش بخاک
گفتگوئے منکر از برہانِ او گشتست کم

بارہا قرآن نے دشمن کو نیچا کر دیا
اور دلیلوں نے بھی سر کو کر دیا دشمن کے خم

۱۴۰ كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِی الْاُمِّیِّ مُعْجِزَةً
فِی الْجَاهِلِیَّةِ وَالتَّادِیْبِ فِی الْیُتُمِ

ایں قدر از معجزه کافی کہ پیش از وحیِ او
اُمّی پُر علم بود و پُر ہنر اندر یتم

ہو کے اُمّی تھے وہ عالم ہے یہ کافی معجزہ
جاہلیت اور یتیمی میں ادیبِ ذی حکم

۱۴۱ خَدَمْتُهٗ بِمَدِیْحٍ اَسْتَقِیْلُ بِهٖ
ذُنُوْبَ عُمْرٍ مَّضٰی فِی الشِّعْرِ وَالْخِدَمِ

خدمتش کردم بمدحے تا نہ بخشندم گناہ
زاں کہ عمرم صرف شد در گفتنِ شعر و خدم

نعت گوئی کی کہ اپنا خاتمہ بالخیر ہو
یُوں تو ساری عمر دنیا کی خوشامد کی نہ کم

۱۴۲ اِذْ قَلَّدَانِیَ مَا تُخْشٰی عَوَاقِبُهٗ
كَاَنَّنِیْ بِهِمَا هَدْیٌ مِّنَ النَّعَمِ

کردہ غل در گردنم عصیان و می ترسم ازاں
گوئیا با شعر و خدمت مثلِ ہدیم از نعم

ہے یہ ڈر دونوں نے ڈالا طوق گردن میں مری
ہوں میں گویا اونٹ قربانی کا از قسمِ نعم

۱۴۳ أَطَعْتُ غَيَّ الصِّبَا فِي الْحَالَتَيْنِ وَمَا
حَصَّلْتُ إِلَّا عَلَى الْآثَامِ وَالنَّدَمِ

بُردہ ام فرمان غیّ کودکی در ہر دو حال
ہیچ ازاں حاصل نہ دارم جز گناہان و ندم
ہر دو حالت میں شکارِ گمرہِ طفلی ہوا
کچھ نہ حاصل ہو سکا مجھ کو بجز جُرم و ندم

۱۴۴ فَيَا خَسَارَةَ نَفْسٍ فِي تِجَارَتِهَا
لَمْ تَشْتَرِ الدِّينَ بِالدُّنْيَا وَلَمْ تَسُمِ

پس زیاں ہائے کہ نفس اندر تجارت یافتہ
کاں بہ دنیا دیں نہ بخرید و نگفتہ میخرم
حیف میرے نفس نے سودا کیا نقصان سے
یعنے دنیا کو خریدا کر کے عقبیٰ کالعدم

۱۴۵ وَمَنْ يَبِعْ آجِلًا مِنْهُ بِعَاجِلِهِ
يَبِنْ لَهُ الْغَبْنُ فِي بَيْعٍ وَفِي سَلَمِ

ہر کہ عقبیٰ را بہ دُنیا می فروشد خاسر است
غبنِ او روشن شود البتہ در بیع و سلم
آخرت کو جس نے بیچا صرف دنیا کے لیے
ہے بڑا نقصان اس کے حق میں یہ بیع و سلم

۱۴۶ إِنْ آتِ ذَنْبًا فَمَا عَهْدِي بِمُنْتَقِضٍ
مِنَ النَّبِيِّ وَلَا حَبْلِي بِمُنْصَرِمِ

گر گنہ کردم بسے من عہد را نشکستہ ام
با نبی ہم حبلِ دینِ مصطفیٰ نبریدہ ام
ہوں تو عاصی پر نہیں ٹوٹا ہے پیماں آپ سے
دین کی رسّی نہ ہوگی منقطع شاہِ امم

۱۴۷ فَإِنَّ لِي ذِمَّةً مِنْهُ بِتَسْمِيَتِي
مُحَمَّدًا وَهُوَ أَوْفَى الْخَلْقِ بِالذِّمَمِ

عہدِ او دارم کہ نامِ من محمد کردہ اند
کس وفا چوں او نہ کردہ در ہمہ عہد و ذمم
ہے شفاعت کی مجھے امید میرے نام سے
ہے محمدؐ اس میں اور ہیں آپ مشفق محترم

۱۴۸ إِنْ لَمْ يَكُنْ فِي مَعَادِي آخِذًا بِيَدِي
فَضْلًا وَإِلَّا فَقُلْ يَا زَلَّةَ الْقَدَمِ

گر ز فضلم در قیامت دستگیرد خرمم
ورنہ گیر وائے بر من چوں بلغزانم قدم
حشر میں گر دستگیری کی نہ میری آپ نے
پھر تو میری شومیِ تقدیر سے پھسلے قدم

۱۴۹ حَاشَاهُ أَنْ يُحْرَمَ الرَّاجِي مَكَارِمَهُ
أَوْ يَرْجِعَ الْجَارُ مِنْهُ غَيْرَ مُحْتَرَمِ

دُور باد اگر کند نومید ہر امیدوار
یا کہ از وے باز گردد جار غیرِ محترم
ہے بعید از شان گر محروم مجھ کو کر دیا
اور لوٹوں آپؐ کی شفقت سے غیرِ محترم

۱۵۰ وَمُنْذُ أَلْزَمْتُ أَفْكَارِي مَدَائِحَهُ
وَجَدْتُهُ لِخَلَاصِي خَيْرَ مُلْتَزِمِ

زاں کہ من مشغول کردم فکرِ خود در مدحِ او
بر خلاصِ خود ورا خوش یافتم من ملتزم
وقف جب سے ہو گیا ہوں مدح میں سرکار کی
پا لیا اپنی رہائی کا مددگارِ نعم

۱۵۱ وَلَنْ يَّفُوْتَ الْغِنٰى مِنْهُ يَدًا تَرِبَتْ
اِنَّ الْحَيَا يُنْبِتُ الْاَزْهَارَ فِي الْاَكَمِ

دستِ درویش از عطا ہا نعمتش خالی نشد
زاں کہ از باراں بروید گل ببالائے اکم

آپ کی بخشش نہ چھوڑے گی کسی محتاج کو
جس طرح گلزار ٹیلوں کو کرے ابرِ کرم

۱۵۲ وَلَمْ اُرِدْ زَهْرَةَ الدُّنْيَا الَّتِي اقْتَطَفَتْ
يَدَا زُهَيْرٍ بِمَا اَثْنٰى عَلٰى هَرِمِ

من نمی خواہم متاعِ مال و دنیا چوں زہیر
کو نہ چیدہ دستِ او چوں گفت او مدحِ ہرم

مجھ کو دولت کی نہیں خواہش کبھی مثلِ زہیر
جس نے حاصل کی تھی دولت بن کے مداحِ ہرم

۱۵۳ يَا اَكْرَمَ الْخَلْقِ مَا لِيْ مَنْ اَلُوْذُ بِهٖ
سِوَاكَ عِنْدَ حُلُوْلِ الْحَادِثِ الْعَمَمِ

اے گرامی تر ز خلقاں من نہ دارم ملجاء
جز تو چوں آید قیامت یا بود مرگِ تنم

اے مکرم تر جہاں سے جز ترے میرا ہے کون
حادثاتِ عام میں جب گھیر لیں رنج و الم

۱۵۴ وَلَنْ يَّضِيْقَ رَسُوْلَ اللّٰهِ جَاهُكَ بِيْ
اِذَا الْكَرِيْمُ تَجَلّٰى بِاسْمِ مُنْتَقِمِ

یا رسول اللہ! جاہت تنگ می ناید بہ من
چوں کریم انتقام آرد بہ اربابِ نقم

کم نہ ہوگا آپ کا رتبہ شفاعت سے مری
جلوہ گر جب ہو بہ اسمِ منتقم وہ ذی کرم

۱۵۵ فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَضَرَّتَهَا
وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

شمۂ از جودِ تو دنیا بود با آخرت
وز علومت در دو عالم علم لوح است و قلم

کیوں کہ دنیا اور عقبیٰ آپ کی بخشش سے ہیں
اور علومِ باطنی سے آپ کے لوح و قلم

۱۵۶ يَا نَفْسُ لَا تَقْنَطِيْ مِنْ زَلَّةٍ عَظُمَتْ
اِنَّ الْكَبَائِرَ فِي الْغُفْرَانِ كَاللَّمَمِ

اے دل از رحمت مشو نومید با جرمِ بزرگ
چوں کبائر نزدِ غفرانِ خدا شد چوں لمم

یوں تو عصیاں ہیں بہت اے نفس مت مایوس ہو
سامنے بخشش کے بیشک ہیں یہ ادنیٰ اور کم

۱۵۷ لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّيْ حِيْنَ يَقْسِمُهَا
تَاْتِيْ عَلٰى حَسَبِ الْعِصْيَانِ فِي الْقِسَمِ

رحمتِ رحمٰن مگر آں دم کہ قسمت میکنند
بر من آید درخورِ جرم و گناہ اندر رقسم

رحمتِ حق ہو گی جب تقسیم مجھ کو ہے امید
میرے عصیاں سے سوا ہوگا مرے رب کا کرم

۱۵۸ يَا رَبِّ فَاجْعَلْ رَجَائِيْ غَيْرَ مُنْعَكِسٍ
لَدَيْكَ وَاجْعَلْ حِسَابِيْ غَيْرَ مُنْخَرِمِ

یا رب امیدم برآور زاں مگرداں باژگوں
در قیامت نزدِ تو آں کہ حساب آساں کنم

میرے رب امید کو میری نہ رد فرمائیے
تیری رحمت پر بھروسا ہے نہ کر تو کالعدم

۱۵۹ وَالْطُفْ بِعَبْدِكَ فِي الدَّارَيْنِ اِنَّ لَهُ
صَبْرًا مَتٰى تَدْعُهُ الْاَهْوَالُ يَنْهَزِمِ

لطف کن با بندۂ خود ہم بہ دنیا ہم بہ دیں
زاں کہ صبرش نزدِ سختی ہا گریزد از سام

لطف فرما دو جہاں میں اپنے بندہ پر کریم
سختیوں میں ہے بہت بے صبر با رنج و الم

۱۶۰ وَائْذَنْ لِسُحْبِ صَلٰوةٍ مِّنْكَ دَائِمَةٍ
عَلَى النَّبِيِّ بِمُنْهَلٍّ وَّ مُنْسَجِمِ

پس درودِ بے کراں بارانِ ابرِ رحمتت
تا شود ریزان و پاشاں از نعیم و از نعم

ابرِ رحمت کو ترے دے حکم تا برسائے وہ
تا ابد اپنے نبیؐ پر رحمت و فضل و کرم

۱۶۱ وَالْاٰلِ وَالصَّحْبِ ثُمَّ التَّابِعِيْنَ لَهُمْ
اَهْلِ التُّقٰى وَالنُّقٰى وَالْحِلْمِ وَالْكَرَمِ

بعد ازاں بر آلؓ و اصحابؓ کرام و تابعین
اہلِ علم و حلم و عقل و فضل و تقویٰ و کرم

آلؓ پر اصحابؓ پر اور تابعینِ پاک پر
صاحبِ تقویٰ پہ اور جو ہیں حلیم و ذی کرم

۱۶۲ ثُمَّ الرِّضَا عَنْ اَبِيْ بَكْرٍؓ وَّ عَنْ عُمَرٍؓ
وَعَنْ عُثْمَانَؓ وَعَنْ عَلِيٍّؓ ذَوِي الْكَرَمِ

یا خدا راضی شو از بوبکرؓ و عثمانِ غنیؓ
از عمرؓ فاروقِ اعظم و ز علیؓ محتشم

اے خدا راضی ہو بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ سے
اور علیؓ مرتضےٰ سے تھے جو اصحابِ کرم

۱۶۳ مَا رَنَّحَتْ عَذَبَاتِ الْبَانِ رِيْحُ صَبًا
وَاَطْرَبَ الْعِيْسَ حَادِي الْعِيْسِ بِالنَّغَمِ

تا بہ جنباند صبا اندر چمن شاخِ درخت
و براند اشتراں را بندگانش در نغم

جب تلک بادِ صبا چلتی رہے گلزار میں
اور اونٹوں کو طرب میں ساربانِ پُر نغم

۱۶۴ فَاغْفِرْ لِنَاشِدِهَا وَاغْفِرْ لِقَارِئِهَا
سَاَلْتُكَ الْخَيْرَ يَا ذَا الْجُوْدِ وَالْكَرَمِ

مغفرت خواہم و بخشش از خداوندِ کریم
از برائے قاریان و از مصنف پاک ہم

مغفرت قاری کی ہو بخشش مصنف کی بھی ہو
بس یہی ہے التجا تجھ سے مرے ربِّ کرم

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسولؐ نمبر

جلد سوم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۳ء

مدیر:
محمد طفیل

ادارۂ فروغ اردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن : ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

طلوع ۵

عالمِ بشریت، اسلام سے پہلے

۱۔ انسانیت، اسلام سے پہلے ۷
۲۔ دنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر ۲۱
۳۔ اسلام سے پہلے عرب تصورات ۴۱
۴۔ عہدِ جاہلیت میں عربوں کے معتقدات ۵۶
۵۔ تجارت العرب قبل الاسلام ۶۶
۶۔ اسلامی انقلاب کا اثر جاہلی معاشرے پر ۸۶
۷۔ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے ۹۳
۸۔ ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقا ۱۲۸
۹۔ اسلام میں اخلاقی فکر کی ابتدا ۱۵۳

۲۔ رحمۃ للعالمینؐ، بہ حیثیت انسان کامل

۱۔ اسم پاک محمدؐ ۱۶۷
۲۔ رحمۃ للعالمینؐ ۱۷۶
۳۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۱۷۲
۴۔ ذکر الحبیبؐ ۱۸۲
۵۔ نبیِ رحمتؐ ۱۹۱
۶۔ محمد رسول اللہؐ ۲۰۴
۷۔ رحمۃ للعالمینؐ بحیثیت انسانِ کامل ۲۱۸
۸۔ محمدؐ عبدہٗ و رسولہٗ ۲۲۴
۹۔ انسانِ کاملؐ ۲۲۸

۱۰۔ پیغمبرِ اسلامؐ ۲۴۷
۱۱۔ سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں ۲۶۱
۱۲۔ رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کے سترہ نکات ۲۷۰

۳۔ اصلاحِ معاشرہ

۱۔ کارنامۂ سیرت، بے رحم تاریخ کی کسوٹی پر ۲۸۹
۲۔ پیغامِ محمدؐ ۳۰۶
۳۔ نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں ۳۳۸
۴۔ سیرتِ نبوی کا پیغام عہدِ حاضر کے نام ۳۶۶
۵۔ نبوت کا عطیہ ۳۷۵
۶۔ نبی کریمؐ اپنے گھر میں ۳۸۵
۷۔ نبی کریمؐ بحیثیت داعی الی الحق ۳۹۶
۸۔ عطیاتِ محمدیؐ ۴۰۳
۹۔ سرورِ کونینؐ اور سماجی انصاف ۴۰۵
۱۰۔ نبی کریمؐ اور اصلاحِ معاشرہ ۴۰۹
۱۱۔ حضورِ اکرمؐ اور تبلیغ ۴۱۴
۱۲۔ رسول اللہؐ اور طرزِ معاشرت ۴۱۸

۴۔ عظمتِ انسانی کا نقیبِ اوّل، ہمارے رسولؐ

۱۔ سرورِ کائناتؐ کے حقوق اُمت پر ۴۲۷
۲۔ حضورِ انورؐ کی امتیازی خصوصیات ۴۳۵
۳۔ رحمت و رافت کی رُوحِ رواں ۴۴۲
۴۔ حضورؐ نے انسانی معاشرت کو کیا دیا ۴۴۹
۵۔ نبی کریمؐ کے بنیادی عناصر ۴۵۵
۶۔ پیغمبرِ اسلامؐ کا پیغامِ امن و سلام ۴۶۰
۷۔ آزادی کا علمبردار نبیؐ ۴۷۱
۸۔ اسلامی معاشرہ اور نابینا افراد ۴۷۶

۹۔ اسلام اور جنسی مساوات ۴۹۹
۱۰۔ رسول اللہؐ اور طبقۂ نسواں ۵۰۷
۱۱۔ سرورِ کائنات کا رویّہ منافقوں سے ۵۱۸

۵۔ سیاسی نظام پر اثرات

۱۔ رسول اللہؐ کی بین الاقوامیت ۵۲۵
۲۔ عہدِ نبویؐ کی سیاست خارجہ کا شاہکار ۵۵۵
۳۔ عالم عربی کی قیادت ۵۶۲
۴۔ سیاست نبویؐ کا ایک اہم پہلو ۵۷۳
۵۔ آنحضرتؐ کی پہلی سیاسی فتح ۵۷۶
۶۔ اسلام کا سیاسی و معاشی تصوّر ۵۹۷
۷۔ سرورِ کائنات کی حکومت ۶۰۷
۸۔ نبی بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست ۶۲۳
۹۔ سرورِ کائنات کا دربار ۶۲۹
۱۰۔ عہدِ نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات ۶۳۴
۱۱۔ عہدِ نبویؐ کے اصول سیاسیات ۶۴۴
۱۲۔ رسول اللہؐ کے عہد میں نظامِ عدل ۶۵۲
۱۳۔ اسلام اور مذہبی رواداری ۶۶۶
۱۴۔ دعوتِ نبویؐ کے اصول و مقاصد ۶۷۴

۶۔ فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام

۱۔ رحمتِ عالمؐ کا پیش کردہ نظامِ حیات ۶۸۷
۲۔ عہدِ جدید کے مسائل اور آنحضرتؐ کا پیغام ۶۰۸
۳۔ اسلام کا بنیادی فلسفہ ۷۱۲
۴۔ رسول اکرمؐ کا معاشی نظام ۷۲۲
۵۔ نقشِ پیمبرؐ، سماجی انصاف ۷۲۹
۶۔ عہدِ نبوّت کے عمرانی اور تمدنی مسائل ۷۳۴

(محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا)

طلوع

مجھے سیر و تفریح کا قطعاً شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایک شہر سے دُوسرے شہر جاتے ہوئے خاصا پریشان ہونا پڑتا ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیر تو دُور کی بات ہے۔

مگر اب کے مَیں سعودی عرب گیا۔ بڑے شوق سے گیا۔ کیونکہ یہ ملک میرے محبوب کا ملک ہے۔ جہاں کہ وُہ پلے بڑھے تھے، جہاں کہ اُنھوں نے اپنے پیغام سے دنیا کو متوجہ کیا تھا۔

پہلے مَیں جدّہ گیا۔ اس کے بعد مکّہ گیا۔ خانۂ خدا کو دیکھا۔ حجرِ اسود کو دیکھا کہ جسے رسولؐ اللہ نے خانۂ کعبہ میں رکھا تھا۔ پھر مَیں مکّہ کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا، یہ جان کر کہ شاید ادھر سے میرے رسولؐ گزرے ہوں!

اس کے بعد مدینہ گیا۔ روضۂ اقدس کو دیکھا۔ منبر کی جگہ کو دیکھا کہ جہاں رسولؐ اللہ کھڑے ہو کر خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا کرتے تھے۔ منبر کے سامنے کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، یہ سوچ کر کہ شاید یہیں حضورؐ کھڑے ہو کر خدا کی بارگاہ میں سجدے کرتے ہوں!

پھر مسجد قبا گیا جو رسولِ حقؐ نے بنائی تھی۔ جو دُنیا کی پہلی مسجد تھی۔ اُس جگہ کو بھی دیکھا کہ جہاں سرورِ دوعالمؐ کھڑے ہو کر، خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا کرتے تھے۔

خواہش صرف اتنی تھی کہ اُس جگہ آنکھیں بچھاؤں، جہاں کہ رسولِ اکرمؐ نے قدم رکھا ہو۔ اُس جگہ سجدہ کروں کہ جہاں حضورؐ نے سجدہ کیا ہو۔

بالآخر مَیں نے روضہ کے سامنے بیٹھ کر، دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ دل پر جو کچھ اُترا، وہی حاصلِ زندگی:

مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!
مجھے کچھ اور نہیں چاہیے!

○

محمد طفیل

اس شمارے میں

جلد اوّل، جلد دوم میں سیرت کے بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، وُہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ!

جلد سوم کا انداز ہی اور ہے۔ اس میں قبل از بعثت سے لے کر آخری دنوں تک کے حالات، محققانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ جتنے موضوعات کا احاطہ موجودہ جلدوں میں کیا جا سکا، وہ حاضر کیے جا رہے ہیں۔

اس نمبر میں لکھنے والوں کی اہمیت سے زیادہ موضوع کو اہمیت دے کر مضامین کو ترتیب دیا گیا ہے۔ وہ جُرأت بھی اس خیال سے کی کہ بارگاہِ رسولؐ میں، کسی کا بھی نام بڑا نہیں۔ بڑائی کام کی ہے جو اپنی اہمیت ہر جگہ منوائے گی۔ دُوسرے ایسا اس لیے بھی کیا گیا کہ مضامین کی ترتیب کا تقاضا یہی تھا، یا میرا خیال ایسا تھا۔

اس نمبر میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کرکے، ان کے تحت متعدد مضامین پیش کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے "قبیلہ" میں رہیں اور قاری کو بھی کھچڑی ترتیب سے بچایا جا سکے۔ بڑے عنوانات یہ ہیں:

۱ — عالمِ بشریت، اسلام سے پہلے
۲ — رحمۃ للعالمینؐ، بحیثیت انسانِ کامل
۳ — اصلاحِ معاشرہ
۴ — عظمتِ انسانی کا نقیب اوّل، ہمارے رسولؐ
۵ — سیاسی نظام پر اثرات
۶ — فلاحی معاشرہ اور اقتصادی نظام

ان چھ موضوعات کے تحت ۴۶ مضامین چھاپے گئے ہیں، باقی موضوعات پر مضامین آیندہ جلدوں میں پیش کیے جائیں گے۔

اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ ہر جلد اپنی جگہ مکمل ہو!

[محمد نقوش]

كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

تم لوگ ایک آگ کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے تھے،

(آل عمران: ۱۰۳)



عالمِ بشریت اسلام سے پہلے

انسانیت اسلام سے پہلے

محمد مظہرالدین صدیقی

بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا کی سیاسی اور اقتصادی حالت

اسلامی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور تمدنی ماحول کو مدِنظر رکھیں، جس کے اندر اسلامی تحریک رونما ہوئی۔ جہاں تک اس زمانہ کی سیاسی حالت کا تعلق ہے، اس وقت عرب کے آس پاس دو بڑی زبردست سلطنتیں قایم تھیں۔ یعنی روم اور ایران۔ لیکن ان دونوں پر سیاسی اور اخلاقی زوال طاری تھا۔ ان کی باہمی جنگوں سے مہذب انسانیت کا ایک بڑا حصہ پامال اور عوام الناس کا امن و چین رخصت ہو چکا تھا۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ صاحب نے اس زمانہ کے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ اتنا صحیح اور حقیقت پسندانہ ہے کہ ہم ان کی عبارت کو ہو بہو نقل کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

(ترجمہ) "جب ایرانیوں اور رومیوں کو مختلف اقوام پر حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور انھوں نے دنیوی زندگی ہی کو اپنا مقصد بنا لیا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھے اور شیطنت ان پر غالب آ گئی، تو ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ عیش کے دن گزاریں۔ چنانچہ ان میں سے ہر شخص دادِ عیش دینے لگا۔ ان کے اس طرزِ زندگی کو دیکھ کر دنیا کے ہر گوشہ سے علماء اور سائنسدان ان کے گرد جمع ہونے لگے، جو ان کے لیے سامانِ عیش مہیا کرنے کی غرض سے عجیب عجیب دقیقہ سنجیاں اور نکتہ آفرینیاں کرنے لگے اور نئے نئے اسبابِ زینت کی ایجاد و اختراع میں مصروف ہو گئے۔ سرمایہ پرست امراء کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جس کسی کے پاس ایک لاکھ درہم سے کم مالیت کا پٹکا یا کلاہ ہوتا تھا، اسے بخیلی کا طعنہ دیا جاتا تھا۔

ایسے ہی انھوں نے عالیشان سر بفلک محل، اعلیٰ درجہ کے آبزن، نفیس حمام، نظر افروز پائیں باغ، سواری کے نمایشی جانور، خدمت کے لیے خوب صورت غلام اور حسین باندیاں، اپنی زندگی کے لوازم بنا لیے اور مقصدِ حیات صرف یہ سمجھ لیا کہ صبح و شام عیش و نشاط کی محفلیں ہوں، جن میں طرح طرح کے کھانے وسیع دسترخوانوں پر چُنے ہوں اور لباسِ فاخرہ پہنے اُن پر بیٹھے ہوں۔ بغرض ان ملوک ایران و روم کی داستان پاستان کہاں تک بیان کی جائے، تم اپنے زمانے کے پادشاہِ دہلی کی جو حالت دیکھتے ہو، وہی ان ملوکِ ایران و روم کی حالت کا قیاس کرنے کے لیے کافی ہے۔

بادشاہوں اور امیروں کی اس عیاشانہ زندگی سے بہت سے خطرناک معاشی اور معاشرتی امراض پیدا ہو گئے، جو حیات معاشری کے ہر شعبہ میں داخل ہو گئے۔ ان سے نہ شہری محفوظ رہا، نہ دیہاتی، نہ امیر اور

نہ غریب۔ اس ہمہ گیر مصیبت کا سبب یہ تھا کہ یہ سامانِ تعیش کثیر زر و مال صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مالِ کثیر کاشتکاروں اور تاجروں وغیرہ پر نئے ٹیکس لگانے اور پہلے کے لگے ہوئے ٹیکسوں میں اضافہ کیے بغیر حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ گراں بار ٹیکس لوگوں کو طرح طرح سے تنگ کر کے وصول کیے جاتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کرتے تھے، تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کی جاتی تھی ......

اس اقتصادی بدحالی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹیکس ادا کرنے اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے سوا لوگ اور کسی امر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ سعادتِ اُخروی کے متعلق سوچ کر سکیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سارے ملک میں ایک شخص بھی نہیں رہتا، جو حصولِ معاش کی کشمکش یا عیش و عشرت کی دلفریبیوں سے نکل کر کائنات کی حقیقت اور اخلاقی سعادت کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔"

آخر میں شاہ ولی اللہؒ صاحب لکھتے ہیں:

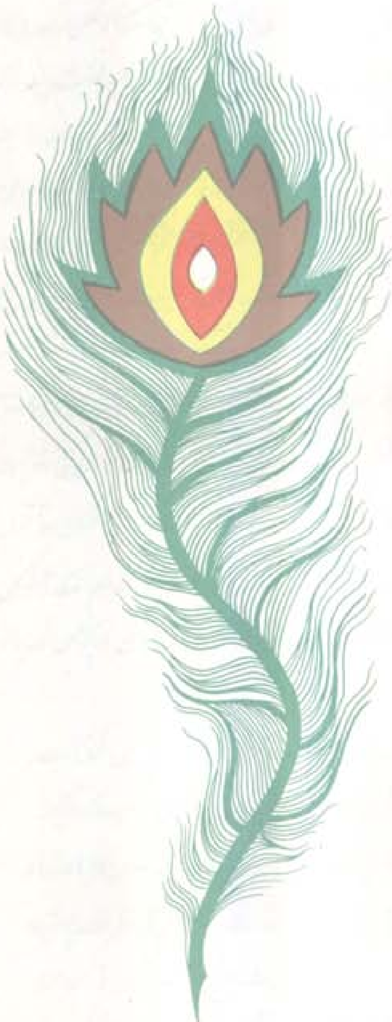
فلما عظمت ھٰذہ المصیبة واشتد ھٰذا المرض سخط علیھم اللہ والملٰئکة المقربون و کان رضاہ تعالیٰ فی معالجة ھٰذا المرض بقطع مادتہ فبعث نبیًّا امیًّا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم لم یخالط العجم والروم ولم یترسم برسومھم وجعلہ میزانًا یعرف بہ الھدی الصالح المرضی اللہ من غیر المرضی وانطقہ بذم عادات الاعاجم وقبح الاستغراق فی الحیاة الدنیا والاطمئنان بھا ونفث فی قلبہ ان یحرم علیھم رؤس ما اعتادہ الاعاجم وتباھوا بھا کلبس الحریر والقسی والارجوان والاستعمال اوانی الذھب والفضة وحلی الذھب غیر المقطع والثیاب المصنوعة فیھا والصور وتزویق البیوت وغیر ذٰلک۔ وقضیٰ بزوال دولتھم بدولتہ وریاستھم بریاستہ وبان ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ وھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ۔ (حجة اللہ البالغہ۔ جلد ا۔ ص ۱۰۶)

(ترجمہ) جب یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور مرض نے شدت اختیار کر لی، تو خدا تعالیٰ اور اس کے مقرب فرشتے ناراض ہوئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ اس مرض کا مادہ ہی کاٹ کر پھینک دیا جائے کیونکہ مرض لاعلاج حد تک بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے خدا تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جو بالکل ان پڑھ تھے اور جنھوں نے کبھی ایرانی اور رومی لوگوں سے میل جول نہ رکھا تھا اور نہ ان کی رسم و رواج اور طرزِ معاشرت اختیار کی تھی۔ انھیں رسومِ صالح اور غیر صالح کے درمیان تمیز کرنے کا معیار قرار دیا اور ان کی زبانِ فیض ترجمان سے عجمیوں کی رسموں کی مذمت کروائی۔ اور دنیاوی زندگی میں انہماک اور اس پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کی خرابی ظاہر کی۔ ان کے دل میں ڈالا کہ جن اخلاقِ فاسدہ اور رسومِ ردّیہ کے عجمی

كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

تم لوگ ایک آگ کے گڑھے کے دہانے پر کھڑے تھے،

(آل عمران: ۱۰۳)



عالمِ بشریت اسلام سے پہلے

عادی ہیں اور جن پر وہ فخر و مباہات کرتے ہیں، وُہ حرام ہیں۔ مثلاً ریشمی لباس، ارغوانی کپڑے، سنہرے اور روپہلے برتن، سنہری زیور اور ایسے کپڑے جن پر تصویریں بنی ہوں، مکانوں پر نقش و نگار۔ خداوند تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس نبی کی حکومت کے ذریعے سے قیصر و کسریٰ کی حکومت کو برباد کر دے اور اس کی لیڈر شپ کے ذریعے ان کی لیڈر شپ کو ختم کر دے۔ چنانچہ اس کے وجود سے کسریٰ ہلاک ہو گیا اور پھر کوئی کسریٰ نہ ہو گا اور قیصر کی قیصریت ختم ہو گئی اور پھر اس کا کوئی جانشین نہ ہو سکے گا۔

ساسانی حکمرانوں کے تحت زردشتی مذہب اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ گیا۔ لیکن اس کی اخلاقیات کو گھُن لگ چکا تھا۔ ایران کے مذہبی آتشکدے آباد تھے۔ لیکن دلوں کے آتش کدے بجھ چکے تھے۔ اردشیر اور اس کے جانشین مذہبی یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے زردشتیوں کے سوا سارے مذاہب کی بیخ کنی کے درپے تھے، لیکن ان کا مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ زمانہ مابعد کے ساسانیوں کے تحت ایرانی سلطنت فرقہ وارانہ نزاعات کی گرم بازاری، حکمرانوں کی عیاشی، امراء کے ظلم و ستم اور مذہبی طبقات کے غرور و تکبّر میں بازنطینی سلطنت سے کسی طرح پیچھے نہ تھی۔ اس کے فرمانرواؤں کو الوہیت کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اپنی رعایا کے جان و مال اور عزّت و آبرو پر پورا پورا اختیار رکھتے تھے۔ عوام بالکل بے زبان اور تمام حقوق سے محروم تھے۔ ان کی حیثیت بالکل غلاموں کی تھی۔

یورپ میں سپین کی حالت بالخصوص نہایت ابتر تھی۔ امراء جنھیں رومی شہنشاہوں کے تحت تمام اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل تھے، ہر قسم کے محصول سے بری قرار دیے گئے۔ یہ لوگ نہایت شاندار محلات میں رہتے اور غلاموں اور کنیزوں کا ایک جمِ غفیر ان کی مشایعت کیا کرتا تھا۔ ان کا زیادہ وقت حماموں میں گزرتا، جو بداخلاقیوں کے اڈّے بن گئے تھے۔ ان کی دولت و ثروت اور اعلیٰ معیارِ زندگی کے مقابلہ میں عوام الناس کی حالت نہایت شکستہ اور قابلِ رحم تھی۔ متوسط طبقے اور شہروں اور دیہاتوں کی آزاد آبادی رومیوں کے ظلم و ستم سے تنگ تھی۔ غلاموں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ وحشی اقوام کے حملوں نے ملک میں اور زیادہ ابتری پھیلا دی۔ انہوں نے ہر طرف قتلِ عام اور تباہی کا بازار گرم کر دیا اور ہزاروں عورتوں، بچّوں اور پادریوں کو غلام بنا لیا۔

رومی سلطنت کی کیفیت اس سے بدتر تھی۔ جان بی فرتھا سکو اپنی کتاب "قسطنطین اعظم" میں لکھتا ہے:

"یہ تو ہم پڑھ چکے ہیں کہ فرمانروائے سلطنت کی حیثیت بہ نسبت سابق کے اب بہت بدل گئی تھی۔ اب وُہ ایک رومانی امپراطور یعنی مالک جنگ و پیکار یا سلطنت کا سب سے اعلیٰ مبارز نہیں رہا تھا بلکہ محلوں کا بادشاہ ہو گیا تھا۔ ایک مشرقی تخت نشین حکومت کے تکلّفات اس میں پیدا ہو گئے تھے، عوام کی نظر سے پوشیدہ رہتا تھا۔ سونے اور جواہرات سے مرصّع لباس پہنتا تھا اور ہر چہار طرف جاہ و حشم کے سامان موجود رہتے تھے۔ رعایا کو تعلیم ہوتی تھی کہ شہنشاہ کا خیال جب دل میں یا ذکر زبان پر آئے، تو اس کو انسان سے بڑھ کر معظّم و محترم سمجھیں اور جب لوگ اس کے حضور میں حاضر ہوں تو نہایت ادب سے گھٹنے ٹیکتے ہُوئے آگے بڑھیں۔"

ہر زوال پذیر سلطنت کی مانند رومی سلطنت میں دفتریت کا پھیلاؤ بھی بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ وہی مصنف، جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں، لکھتا ہے:

"ہر ایک ایسے حاکم کے نیچے اہلکاروں کا ایک انبوہ کثیر ہوتا تھا اور یہ ہی انتظام درجہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کے سررشتوں اور محکموں میں جاری تھا۔ خود مختار بادشاہوں کو مجبوری ہوتی ہے کہ ماتحتوں کی ایک بااختیار اور تربیت یافتہ جماعت (بیوروکریسی) کے ذریعہ ملک پر حکومت کریں اور یہ سلسلہ حکام با اختیار کا ایک ایسے پھیلاؤ کا بھاری چٹان ہوتا ہے، جس کے بوجھ میں محصول دینے والی رعایا دبی مرتی ہے۔ کیونکہ اس عظیم الشان انتظام کی عمارت کو سنبھالے رکھنا ان ہی غریبوں کا کام ہوتا ہے"۔

رومی بازنطینی سلطنت کے نظامِ محصول بندی کا ذکر بھی مصنف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"خلاصہ یہ کہ اس سخت محصول بندی سے صوبجات کے زمیندار اور چھوٹے کاشتکار بالکل ہی فنا ہو گئے .... قسطنطین کے زمانے میں بالخصوص اس کے آخری دورِ حکومت میں اس بات کی شہادت بکثرت موجود ہے کہ صوبجات کے گورنر جس طرح چاہتے تھے، رعایا کو لوٹتے تھے۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اجازت تھی کہ جس طرح چاہیں، رعایا پر جبر کریں ...... ظاہر ہے کہ اس سخت محصول نے رعایا پر بڑی سختیاں کی تھیں۔ ہر ایک علاقے میں جس قدر سرمایہ پس انداز لوگوں کے پاس تھا، وہ سب ختم ہو گیا۔ اور کاشت کار بالکل تباہ ہو چلے ......"

غرض کہ ملکی واصلات اور خرچ کا جو طریقہ جاری تھا اور جہاں تک اس کا تعلق اراضی کی بابت مالگزاری سے تھا، اس کے وضع کیے جانے کی غرض صرف یہ معلوم ہوتی تھی کہ ہر ایک علاقے کی دولت بالکل کھینچ لی جائے۔ اس سختی کی وجہ سے رعایا میں حدّ بندی کا طریقہ نکل آیا اور اس طریقہ کی سختیاں خزانہ شاہی کی ضروریات کے مطابق بڑھتی گئیں اور آزاد کاشتکار، جو پہلے کسی کے غلام نہ تھے نہ نوکر، بالکل ہی بگڑنے لگے۔ جب مفلسی بڑھی تو امیروں کے غلام نہیں تو ادنیٰ رعیت بن کر کاشتکاری کرنے لگے اور یہ ادنیٰ پیشہ ان کی جات ہو گئی، یہ کاشت کار گو غلام نہ تھے، لیکن اپنی نقل وحرکت پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ جس وقت ان غریبوں کا حقِ ملکیت زمین سے اُٹھ گیا، تو پھر وہ دوسروں کے نوکر اور بندے ہو گئے۔ اس حال میں جو کچھ زمین سے پیدا کرتے تھے اس کا ایک مقررہ حصہ مالک کو دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں مالک کی سکونت ہوتی، وہاں جا کر چند مقررہ ایام تک بیگار میں کام کرتے تھے بغرض ان کاشتکاروں کی حالت جن کو کولونس کہتے تھے، رفتہ رفتہ ایسے غلاموں کی ہو گئی، جن کو پوری آزادی نہ ملی ہو، بلکہ غلامی اور آزادی کی درمیانی حالت میں ہوں۔ دُوسرے لفظوں میں یہ سمجھیے کہ اب وہ محض سرف (SERF) رہ گئے تھے۔ یعنی ایسے کاشت کار ہو گئے تھے، جن کا تعلق کسی طرح زمین سے، جس پر وہ کاشت کرتے تھے، جُدا نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا زمین کے ساتھ اشیاے غیر منقولہ میں ان کا بھی شمار تھا۔ ان کاشتکاروں کی نسبت لکھا جاتا تھا کہ "وہ زمین کے ساتھ شامل ہیں"۔ ان غریبوں کو اپنی حالت بہتر کرنے یا اپنی اولاد کی مدد کرنے کا مطلق موقعہ حاصل نہ رہا تھا۔ صرف ایک صورت اس حالت سے

نجات کی تھی اور وہ یہ تھی کہ کہیں فوج میں بھرتی ہو جائیں۔

طبقہ واریت

ہندوستان میں جب آریہ حملہ آور پنجاب سے آگے بڑھے، تو ان کے مذہبی طبقات نے مفتوحہ آبادی کو الگ تھلگ رکھنے کے لیے نہایت سخت قواعد وضع کیے۔ اگر مفتوحہ آبادی کا کوئی فرد فاتح طبقہ کے کسی شخص کو چھو لیتا، تو اس کو مذہبًا ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ ذاتوں کے مذہبی رسوم و شعائر شودروں کے لیے بالکل ممنوع تھے۔ شودروں کو یہ اجازت تو ضرور تھی کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی یاد میں قربانیاں کریں، لیکن ان مراسم میں کوئی برہمن حصہ نہیں لے سکتا تھا اور اگر لیتا تو اسے سخت سزاؤں کا مستوجب قرار دیا جاتا۔ اگر کوئی شودر کسی برہمن کو وید پڑھتے سُن لیتا، تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی برہمن کی نشست پر بیٹھ جاتا، تو اسے گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ کوئی شودر اونچی ذات والوں میں شادی بیاہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ طبقۂ اعلیٰ کے کسی فرد کو یہ اجازت تھی کہ وہ شودروں میں شادی بیاہ کرے۔

ایران میں مسلمانوں کے داخلہ سے قبل محصولات کا جو نظام رائج تھا، اس سے ایرانیوں کی طبقہ وارانہ ذہنیت صاف عیاں ہوتی ہے۔ خسرو نوشیرواں کی اصلاحات کے مطابق ایران میں عام آبادی کو دو محصول ادا کرنے پڑتے تھے: ایک خراج یعنی محصول زمین، دُوسرے گزیت یعنی جزیہ۔ لیکن ایران کے سات بڑے خاندان، جن میں شاہی خاندان بھی شامل تھا، ان محصولوں سے مستثنیٰ تھے۔ اسی طرح اُمرائے عظام جنھیں العظما، کہا جاتا تھا۔ انھیں بھی دونوں محصولوں سے بری کر دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ تمام فوجی سپاہی، سرکاری عہدہ دار، آتشکدوں کے نگران کار، مذہب کے نمایندے اور وُہ اشخاص جو شہنشاہِ ایران کے شخصی ملازم تھے، ان محصولوں کی ادائیگی پر مجبور نہ تھے۔ اس طرح حقوق یافتہ طبقات اور عوام الناس کے مابین ایک گہری خلیج حائل تھی یہ حقوق یافتہ طبقات حکمرانوں، امیروں، مذہبی پیشواؤں اور نظم و نسق کے کارکنوں پر مشتمل تھے۔

زن و مرد کی عدم مساوات

عرب میں اسلام سے قبل عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا، اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن دنیا کے دوسرے حصوں کی کیا حالت تھی۔ دُختر کشی کی رسم صرف عرب تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان میں بھی اس کا خاصا رواج تھا (امیر علی۔ اسپرٹ آف اسلام۔ مقدمہ ص ۲۸) یہ امر صحیح طور پر معلوم نہیں کہ بیواؤں کو زندہ جلا دینے کی رسم ہندوستان میں کب سے شروع ہُوئی۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں اس کا رواج عام تھا۔ عورتوں کو وید پڑھنے کی ممانعت تھی اور اسی طرح وہ دیوتاؤں کی قربانیوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ عورت کا مقصدِ زندگی صرف یہ تھا کہ وہ عمر بھر شوہر کی چاکری کرتی رہے۔ ہندوستان میں مردوں کی طرح عورتوں کی بھی بہت سی مذہبی برادریاں قایم تھیں۔ یہ غیر شادی شدہ عورتیں آزادی کے ساتھ خانقاہوں میں داخل ہو سکتی تھیں۔ جہاں انھیں باقاعدہ رکن کی حیثیت دی جاتی تھی۔ غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فضا بالکل ناپاک ہو چکی تھی اور زناکاری عام تھی۔

ایران میں عورتوں کی حالت کچھ اس سے بہتر نہ تھی۔ ہندوستان میں تو منو کے قوانین کے باعث مردوں اور عورتوں پر کچھ اخلاقی پابندیاں عاید تھیں۔ لیکن ایران میں مرد ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی گرفت سے بالکل آزاد تھا۔ اس کی مرضی اپنا آپ قانون تھی۔ وہ خون کے قریب ترین رشتوں میں شادی کر سکتا تھا اور جتنی بیویوں کو چاہتا طلاق دے سکتا تھا۔ عورتوں کو مردوں سے علیحدہ رکھنے کی رسم صرف ایرانیوں تک محدود نہ تھی، آیونی یونانیوں میں عورتوں کو گھروں میں بالکل مقفل رکھا جاتا تھا اور انھیں

کسی حالت میں باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایران میں زمانہ قدیم سے یہ دستور تھا کہ عورتوں کی حفاظت کے لیے مردوں کو ملازم رکھا جاتا تھا۔ نیز یونان کی طرح یہاں بھی خواصوں اور داشتہ عورتوں کو رکھنے کا طریقہ عام تھا۔ اسے نہ صرف مذہباً جائز قرار دیا گیا تھا بلکہ یہ ایرانیوں کی سماجی زندگی کا لازمی خاصہ بن گیا تھا۔

مذہبی عدم رواداری اور فرقہ واریت کا زور عیسائیوں کے باہمی مذہبی اختلافات کا پہلا مظاہرہ مجلس نیقیہ میں ہو چکا تھا اس مجلس نے آریوسی عقیدہ کو مردود قرار دیا تھا۔ حالانکہ آریوس کو مسیح کی الوہیت سے انکار نہ تھا۔ اس کا عقیدہ صرف یہ تھا کہ ایک وقت ایسا تھا جب باپ تھا اور بیٹا نہ تھا۔ یعنی حضرت مسیح ابدیت میں خدا سے ایک درجہ کم ہیں۔ اس جرم میں آریوسی عقاید کے پیروؤں کے خلاف کفر کا فتوٰی دیا گیا اور آریوس، یوسی بیوس اور تھیوگ نس کو سلطنت سے جلاوطن کر دیا گیا۔ اسی زمانہ میں نسطور کی تکفیر کا واقعہ پیش آیا، جس کے متعلق ڈریپر اپنی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" میں لکھتا ہے:

"عیسوی مذہب میں بت پرستی کے عنصر کی آمیزش کا عمل تو بہر طرف جاری ہی تھا۔ اب ہر بطریق کو ہر دلعزیز بننے یا اپنا اثر و رسوخ برقرار رکھنے کے لیے اس بات کی فکر پڑ گئی کہ جس طرح بن پڑے، اپنے معتقدیوں کے عقاید کو، قطع نظر اس سے کہ ان عقاید کا زمانہ قبل ظہور مسیحیت ہو یا بعد ظہور مسیحیت مذہب میں داخل کر لیا جائے۔ مصریوں نے اسی طرح مسئلہ تثلیث کے متعلق اپنے خاص قسم کے عقاید کو عیسائیت میں زبردستی داخل کر لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ مریم عذرا کی پرستش کے بہانے سے آئی سس کی قدیم پرستش کو از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ انھیں دنوں میں قیصر تھیوڈوسیس نے نسطور کو جو فلسفہ میں تھیوڈور کا ہم مسلک تھا، قسطنطنیہ کا بطریق اعظم مقرر کیا (۴۲۷ء) ان ذلیل تجسیمیہ عقاید سے جو عوام میں پھیلے ہوئے تھے، نسطور کو انکار تھا اور اس کا یہ خیال تھا کہ خدائے ذوالجلال و قیوم کو جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ساری و دائر ہے ذات یا صفات میں انسان کے مشابہ یا مماثل قرار دینا کفر ہے۔ نسطور پر ارسطو کے فلسفہ نے گہرا اثر ڈالا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ عقاید مشائیہ کو خالص مسیحی عقاید کے ساتھ تطبیق دی جائے۔ اس بنا پر اس میں اور اسکندریہ کے بطریق سائرل میں جھگڑا ہو گیا۔ سائرل کا تعلق کلیسا کی اس جماعت سے تھا، جو بت پرستی کی حامی تھی اور نسطور اس گروہ کا سرگروہ تھا، جو مذہب کو مطابق عقل ثابت کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ سائرل وہی ہے، جس نے ہائی پیشیا کو قتل کیا تھا۔ سائرل نے عزم بالجزم کر لیا تھا کہ حضرت مریم کی پرستش خدا کی ماں ہونے کی حیثیت سے ارکان کلیسا میں داخل ہو جائے اور نسطور کا مصمم قصد تھا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے صدر گرجا میں نسطور نے ایک خطبہ پڑھا جس میں خدائے قیوم کی صفات کو شرک سے مبرا قرار دیتے ہوئے اس نے ازراہِ استعجاب یہ سوال کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے خدا کی ماں ہو؟ ......

اسکندریہ کے ادنیٰ درجہ کے پادریوں کی شہ پا کر قسطنطنیہ کے پادریوں نے "خدا کی ماں" کی حمایت کا

بڑا اٹھایا اور نسطور کی مخالفت شروع کی۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ شہنشاہ کو مجبوراً حکم دینا پڑا کہ افیسس میں کونسل منعقد ہو۔ سائرل نے اس اثناء میں دربار شاہی کے صدر خواجہ سرا کو کئی سو مثقال سونے کی رشوت دے کر شہنشاہ کی بہن تک رسائی حاصل کر لی۔ اس طور پر سائرل نے ایک دن میں میدان مار لیا، اور اپنے حریف کو شکست فاش دے کر خوش خوش گھر پہنچا۔ نسطور نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے کہ اس کے عذرات تو سن لیے جائیں اور جو دلائل وہ پیش کرنا چاہتا تھا ان کو ایک نظر تو دیکھ لیا جائے۔ لیکن اس کی ایک پیش نہ گئی۔ بجائے اس کے کہ اس کو صفائی کا موقع دیا جاتا اُس پر فوراً فردِ جرم لگا دی گئی۔۔۔۔ نسطور موردِ عتاب ہوا اور جلاوطن کر کے مصر کے ایک ریگستان میں بھیج دیا گیا۔ اس کے دشمن عمر بھر اس کو ایذائیں دیتے رہے۔

دو سال کے بعد نسطور کے پیروؤں نے اپنا ایک علیحدہ کلیسا قائم کر لیا اور افیسس کی مجلسوں کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ لیکن سرکاری کلیسا کو دنیوی اقتدار حاصل تھا اور نسطوریوں کو شدت سے سزائیں دی گئیں۔ انطاکیہ اور یونانی بولنے والے شامی علاقہ میں ظلم و ستم نے اپنا پورا کام کیا اور نسطوری مصر میں ایک مغرور فرقہ کی حیثیت میں آ گئے۔

۴۸۹ء میں شہنشاہ زینو نے اڈیسہ کے مدرسے کو اس بنا پر بند کر دیا کہ اس کے ارکان نسطوری میلانات رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڈیسہ کے نسطوری اساتذہ اور اہلِ علم بارسوما کی قیادت میں ایرانی سرحد کے پار نقل مکانی کر گئے۔ بارسوما نے ایرانی بادشاہ فیروز کو سمجھایا کہ راسخ العقیدہ یعنی سرکاری کلیسا یونانیوں کا موید ہے لیکن نسطوری بازنطینی سلطنت کے مظالم کی بنا پر اس سے بالکل الگ ہو گئے ہیں۔ اس طور پر نسطوریوں کو ایران میں پناہ مل گئی۔

یہ تو تھا عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں باہمی رواداری کا حال۔ اب یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ عیسائیوں کے اقتدار کے تحت یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قسطنطین پہلا بازنطینی رومی فرمانروا تھا، جس نے عیسائیت کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس بادشاہ نے یہودیوں کے متعلق یہ قانون وضع کیا کہ اگر کوئی یہودی کسی ایسے شخص کو پتھر سے مارے یا اس کی زندگی خطرہ میں ڈالے، جس نے یہودی مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول کی ہو، تو ان تمام لوگوں کو زندہ جلا دیا جا سکتا ہے، جو ایسی کارروائی میں شریک ہوں۔ اس کے بعد ایک قانون یہ وضع کیا گیا کہ کوئی عیسائی یہودی مذہب نہیں اختیار کر سکتا۔ مرنے سے چھ ماہ پہلے قسطنطین نے ایک اور قانون کے ذریعہ یہودیوں کو ممانعت کر دی کہ وہ کسی عیسائی کو غلام نہ رکھیں۔"

ڈین ملمین اپنی کتاب "یہودیوں کی تاریخ" میں صفحہ ۱۹۱ پر لکھتا ہے:

"قسطنطین کے جانشین نے یہودیوں کے بارے میں جو سخت تر قواعد وضع کیے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین عداوت کے جذبات کتنے شدید تھے۔ بدقسمتی سے یہودیوں نے اپنے

رویہ سے حکومت کو اشتعال دلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہودیوں کے جوشیلے نوجوانوں نے آریوسی اور اثاتانیوسی فرقوں کے جھگڑوں میں شریک ہو کر ان مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات کو اور زیادہ ہوا دی، جن سے اسکندریہ کی فضا مکدر تھی۔ انھوں نے بُت پرستوں کی طرح آریوسی فرقہ کی طرفداری میں بڑی سنگدلی اور غارتگری کا مظاہرہ کیا۔ کئی گرجاؤں کو جلا دیا اور بہت سی دوشیزاؤں کی آبروریزی کی۔ جنھوں نے کلیسا کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ اسی زمانہ میں جوڑیا میں یہودیوں نے پھر بغاوت کی۔ جس نے عیسائیوں کے ظلم وستم کے لیے ایک اور بہانہ فراہم کر دیا۔ یہودیوں پر محاصل کا شدید ترین بوجھ ڈال دیا گیا۔ انھیں منع کر دیا گیا کہ وہ کوئی عیسائی غلام اپنے پاس نہ رکھیں، ورنہ انھیں موت کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح عیسائی عورتوں سے بھی شادی کی ممانعت کی گئی۔ شہنشاہ ہیڈریان کے زمانہ کا ایک قانون دوبارہ نافذ کر دیا گیا، جس کی رُو سے بیت المقدس میں ان کا داخلہ روک دیا گیا۔

جولین کی تخت نشینی سے یہودیوں کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ یہ شہنشاہ بُت پرست تھا اور عیسائیوں کا سخت مخالف۔ لیکن جولین کے جانشینوں نے پھر قدیم عیسائی حکمتِ عملی کا احیاء کر کے یہودیوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ چنانچہ تھیوڈوسیس نے ایک قانون کے ذریعہ فلسطین سے باہر بسنے والے یہودیوں کو حکم دیا، کہ وہ فلسطین کے یہودی بطریق کو سالانہ خراج کی رقم ادا کرنا بند کر دیں۔ اس حکم کی وجہ سے فلسطین میں یہودیوں کی مذہبی سیادت اور مرکزیت کو سخت صدمہ پہنچا۔"

ترکِ دُنیا اور رہبانیت کا زور

اسلام سے پہلے جو تمدن کش رجحانات کارفرما تھے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں تصوّر یہ تھا کہ دنیوی زندگی ایک لعنت ہے۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنا انسانی نجات کے لیے ضروری ہے۔ بُدھ مت نے ہندوستان میں اس رجحان کو اور زیادہ تقویت دی۔ اس نے مذہب کا ترکِ خواہشات پر دارومدار رکھا اور نروان یا فنائے کامل کو مقصودِ حیات قرار دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک نہایت وسیع اور منظم خانقاہی نظام کی تخلیق کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں لاکھوں انسان جو اپنی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کو قوت سے فعل میں لا کر تمدن کی ترقی اور انسانیت کی خوشحالی میں اضافہ کر سکتے تھے۔ دنیا اور علائقِ دنیا سے الگ ہو کر خانقاہوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت اور نفس کشی کے دن گزارنے لگے۔ ان کے نزدیک انسان خدمتِ خلق کے لیے نہیں بلکہ مراقبہ اور ذکر و فکر کے لیے پیدا ہوا تھا اور روحانی تسکین و نجات کے حصول کا طریقہ یہ نہ تھا کہ انسانیت کو اس کی پست سطح سے بلند کیا جائے۔ تمدن کے وسائل کو ترقی دی جائے اور انسانی تعلقات کے نظام کو بہتر اصولوں پر قائم کیا جائے بلکہ رُوح اور نجات کی تسکین کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ آدمی کسی گوشہ میں بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہے اور زبان، آنکھ، کان اور دل و دماغ کے تمام دریچے بند کر کے صرف مراقبہ اور فکر میں دن گزارے۔ عیسائیت نے زندگی کو لعنت تو نہیں قرار دیا، لیکن اس نے انسان کی پیدائشی گناہگاری کے تصور سے ایک ہمت شکن اور تمدن کُش طرزِ فکر پیدا کر دیا۔ بُدھ مت کی طرح عیسائیت بھی خانقاہی زندگی کی حامل بن گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں مردوں اور عورتوں نے زندگی کے اعلیٰ مشاغل ترک کر دیے اور اپنی قوتوں کو

انسانیت کے فائدہ کی خاطر استعمال کرنے کی بجائے انھیں بالکل مجہول کر دیا۔ اس ضمن میں ہم قسطنطین اعظم کے مصنف جی۔ بی۔ فرتھ اسکوائر کا حسب ذیل بیان پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ مذہبی عبادات و ریاضات کا یہ غلو دنیا کو کس طرف لیے جا رہا تھا:

"کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ رومانی سلطنت میں خاص کر اس کے مشرقی حصہ میں لوگوں کے اطوار بگڑ کر کس درجہ طبیعتیں مسخ ہو گئی تھیں اور کیسی بے شرمی اور بدکاری عموماً پھیل گئی تھی۔ اگر قوم کا بحیثیت مجموعی کوئی ایمان تھا تو اس کی قوتِ احساس بالکل زائل ہو چکی تھی۔ اب اس کے لبوں پر مہر سکوت تھی۔ کوئی نیک ہدایت اس سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ نیک بخت اور پاکیزہ طبیعتیں نازک مزاج بن کر الگ ہو بیٹھی تھیں۔ تمام خرابیوں کو گوارا کر کے مطلق ہاتھ پاؤں نہ ہلاتی تھیں۔ پس اشد ضرورت تھی کہ کوئی تحریک ان خرابیوں کے رفع کرنے کے لیے ظاہر ہو۔ آخر کار وہ تحریک ظاہر ہوئی۔ لیکن اس دین کے ماننے والوں میں بہت لوگ ایسے تھے، کہ جن گناہوں میں دنیا مبتلا تھی، ان کو جتا کر خود دنیا چھوڑ بیٹھے تھے اور گوشہ نشین ہو کر رہبانیت اختیار کر لی تھی۔ رہبانیت بھی ایسی سخت جس میں انسان کی فطری کمزوریوں کا لحاظ کرنا تو چیز دیگر تھا، قدرتی ضرورتوں کو بھی، جو انسان کے ساتھ لگی ہیں قطعی ترک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان لوگوں میں جن کے مزاج میں سختی بڑھی ہوئی تھی، اتنا تو ضرور مانا جاتا تھا کہ ازدواج ایک قابلِ عزت چیز ہے۔ لیکن تجرد کی خوبیوں کو بیان کرنے میں بحدِ غایت مبالغہ کرتے تھے اور گو خود اس پر عمل نہ ہو، لیکن دوسروں کو سمجھانے میں جس قدر بلاغت و فصاحت میں کمال پیدا کیا تھا، وہ سب اسی مضمون پر صرف کیا جاتا تھا۔ کوئی شخص بلا افسوس اس تکلیف و اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا، جو صدہا بلکہ ہزارہا مردوں اور عورتوں کو اس رہبانیت کی وجہ سے اٹھانی پڑیں، جو اگر بالکل نئی نہ تھی، تو کم از کم سختی میں پہلے سے بڑھی ہوئی تھی۔ سلطنت کو اور ملکوں کو ان مردوں اور عورتوں کی خدمات کی واقعی ضرورت تھی اور بہت خوب ہوتا کہ ملک ان کی خدمتوں سے مستفید ہوتا۔ لیکن ان لوگوں نے دنیا کے تعلقات سے کنارہ کیا اور تنہائی کے گوشوں میں جا بیٹھے۔ جہاں انھوں نے یہ نہیں سیکھا کہ اپنے بھائی انسان کی مدد کس طرح کرتے ہیں، بلکہ اس خود غرضانہ حیرانی اور پریشانی میں کہ کسی طرح خود عذابِ آخرت سے بچ جائیں، اپنا خاتمہ کر دیا۔ ان کو سوائے اپنی روحانی نجات کے اور کسی چیز سے بحث نہیں رہی تھی۔"

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:

"اس کے ساتھ اس کا خیال بھی رہنا چاہیے کہ ازدواج سے پرہیز کرنا اور اس کی ذمہ داریوں سے بچنا رومانی سلطنت میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ صدہا برس سے سلطنت کو خوف تھا کہ بڑے طبقوں میں بالخصوص یہ خیال قوت پکڑتا جاتا ہے کہ شادی کر کے اہل و عیال کا بوجھ اپنی گردن پر لینا درست نہیں۔ چنانچہ رعایا کے اسی میلانِ طبیعت کو بدلنے کے لیے سلطنت کی جانب سے خاص خاص انعام اور محصولات سے معافیوں کے وعدے ہوئے تاکہ لوگ صاحبِ اولاد ہونے سے پرہیز نہ کریں...... اس قسم کے احکام اس اصول پر مبنی تھے کہ انسانی

معاشرت کا یہ ایک لازمی فرض ہے کہ انسان شادی کر کے ملک کی خدمت کے لیے اولاد پیدا کرے۔ چنانچہ دربار کے ایک خوش بیان شاعر نے لکھا تھا: "قوم کی اولاد سلطنت کی بیج ہے۔ یہی وُہ کیاری ہے، جہاں سے نئے پودے تیار ہو کر دُور دُور کے باغوں میں لگائے جاتے ہیں۔ یہی وہ باغ جوانی ہے، جہاں سے افواج رومانی کے لیے شجاعت و مردانگی کے چشمے جاری ہوتے ہیں"۔ لیکن لوگوں کو لاولد رہنے میں ایسی آسایش معلوم ہوتی تھی کہ گو شہنشاہ جولیان نے اس مضمون کے متعلق بہت سے فرامین جاری کیے، مگر کسی نے کچھ پروا نہ کی۔ ٹاسی ٹیوس ان فرامین کی نسبت لکھتا ہے کہ ان میں مرض کا علاج مرض سے بھی بدتر بتایا گیا ہے۔ جس نیت سے ایک دنیا سے متنفر آدمی یا زناکار بت پرست بدنی پاکیزگی حاصل رکھنی چاہتا تھا، وہ ایک عیسائی کی نیت سے مختلف ہوتی تھی مگر حیرت کا مقام ہے کہ اس بدنی طہارت کو حاصل رکھنے کے لیے طریقہ دونوں نے ایک ہی سا اختیار کیا تھا۔ یعنی شادی کرنے سے بیزاری ظاہر کرتے تھے"۔

انسانی فکر و نظر کا انحطاط

اب تک ہم نے اسلام سے پہلے کے تمدنی اور مذہبی خیالات کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری مہذب دنیا کا سیاسی، معاشی اور تمدنی نظام ابتر ہو چکا تھا۔ ایک طرف تو دنیا اور مشاغل دنیا میں محویت کی یہ حالت تھی کہ عیش و عشرت ایک فنِ لطیف بن گیا تھا اور مالدار طبقوں کو زندگی کی دلفریبیوں میں نہ خدا یاد رہا تھا اور نہ روحانی فلاح و سعادت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں باقی رہ گیا تھا۔

دوسری طرف غریب، مفلوک الحال طبقوں کو زندگی میں جن مصائب اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کا ذہنی ردِ عمل ان پر یہ ہُوا کہ وُہ دنیا کو ایک لعنت سمجھنے لگے۔ زندگی اور تمدن کو نفرت اور کراہیت کی نظروں سے دیکھنے لگے اور روز بروز ترکِ دُنیا اور لاطائل ریاضات و مجاہدات کی طرف مائل ہوتے گئے۔ لیکن یہ ساری خرابیاں اس فکری زوال کی پیداوار تھیں، جو اس زمانہ میں انسانیت پر طاری تھا۔ اس فکری انحطاط میں افلاطونی فلسفہ اور بعض مشرقی مذاہب مثلاً ہندومت اور بدھ مت کے نظریات کا بڑا حصہ تھا۔ ان اثرات نے مل جل کر نوفلاطونی نظامِ فکر کو جنم دیا، جو اس دور میں انسانی ذہن پر اتنا حاوی ہو گیا کہ مذہب عیسوی کی پُوری تعلیمات اس کے رنگ میں رنگ گئیں۔ یہ تمدن کش راہبانہ فلسفہ دنیا اور انسان کی حقیقت کا منکر تھا۔ مراقبہ اور کشف کو ادراکِ حقیقت کا واحد ذریعہ قرار دیتا تھا۔ وجدان کو حواس پر اور کشف و الہام کو عقل پر ترجیح دیتا تھا۔ اس نے خدا کے ساتھ اتصال اور فنا فی اللہ کا ایک ایسا مہمل نظریہ پیش کیا جس نے بڑے بڑے علماء، عقلاء اور اعلیٰ صلاحیت کے آدمیوں کو زندگی کی کشمکش اور تمدن کی خدمت سے ہٹا کر تزکیہ نفس میں لگا دیا۔ اس فلسفہ نے نہ صرف مسیحیت کو مسخ کیا بلکہ زمانہ مابعد میں اسلامی تہذیب و تمدن کو بھی زندگی کی حرارت اور تعمیر کے ولولے سے خالی کر دیا۔ اس کی ابتدا کیونکر ہُوئی۔ اس کی توضیح کے لیے ہم "فلسفہ ابن رشد" سے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں (ملاحظہ ہو ابنِ رشد، مصنفہ محمد یونس صاحب فرنگی محلی، صفحات ۲۰۷ اور ۲۴۷):

"بطلیموسی خاندان کے فرمانروا مرکزِ علم ایتھنز سے اسکندریہ کو منتقل کر چکے تھے۔ روم بھی مرکز تھا، مگر اس کو زیادہ شہرت

رہتی۔ اسکندریہ میں مختلف عقاید کے لوگ آباد کیے گئے تھے۔ اس بنا پر اسکندریہ مذہب کا سنگم قرار پایا۔ یعنی سامی اور مشرقی مذاہب وخیالات سے پہلے پہل مغربی فلسفہ کی تنشا سائی ہوئی۔ قیصر کالیگولا کے عہد میں فیلو نامی ایک یہودی اسکندریہ میں درس دیتا تھا۔ اس نے پہلے پہل فلسفہ میں مشرقی مذاہب کے عناصر شامل کیے۔ اس کے فلسفہ کا ماحصل یہ تھا کہ عالم خدا کی ہستی کا ایک جزو ہے اور مقدس لفظ کن سے اس کی پیدایش ہوئی۔ یہ لفظ خدا اور عالم کے مابین واسطہ ہے۔ فیلو کے بعد اپالونیس پلوٹارک وغیرہم ہوئے، جو سب کے سب گو افلاطون کے مذہب کے پیرو تھے، مگر مشرقی خیالات کا ان پر اثر غالب تھا۔ سب کے بعد تیسری صدی عیسوی میں امونیس سیکاس ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے خیالات تمام تر عیسائیت سے اثر پذیر تھے۔ اس نے کشف ومراقبہ کے عنصر کو فلسفہ میں شامل کیا، یعنی اپنے فلسفہ کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ علم و ادراک بیکار چیزیں ہیں۔ حقایق عالم کا ادراک محض کشف و مراقبہ سے ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی مسند پر پلاٹینس بیٹھا، جو ۲۰۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے فنا وجذب کے مسائل فلسفہ میں شامل کیے۔ یہ سلسلہ افلاطونی فرقہ کے پیرؤوں کا تھا اور افلاطونیہ جدیدہ کے نام سے موسوم تھا۔"

"یونانی فلسفہ میں تصوف کی آمیزش پہلے پہل فرقہ افلاطونیہ جدیدہ کی بنیاد پڑنے سے ہوئی۔ اس فرقہ کا بانی ایک مرتد عیسائی امونیس سیکاس نامی تھا۔ یہ اسکندریہ میں تیسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد اس مسئلہ پر رکھی کہ علم انسان کو اُسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب تزکیہ باطن کے ذریعہ انسان بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہوجاتے کہ عالم ومعلوم متحد ہوجائیں۔ اس کا خیال تھا کہ عالم میں تین قوتیں جوہر مطلق، عقل فعال اور قوتِ مطلق کارفرما ہیں۔ انسان کی سعادت یہ ہے کہ مکاشفہ کے ذریعہ اپنے باطن کا تزکیہ کرے کہ عقل فعال سے اس کا اتصال ہوجائے۔ امونیس سیکاس کے بعد اس کا شاگرد پلاٹینس، جو ۲۰۳ء میں پیدا ہوا، اپنے استاد کی مسند پر بیٹھا۔ یہ اکثر روزہ دار رہتا اور عزلت میں بسر کرتا۔ اس کا خیال تھا، اس کو اپنی زندگی میں متعدد مرتبہ رویت باری کا شرف حاصل ہوا ہے اور چھ مرتبہ اس کا جسم جسمِ خداوندی سے مماس ہوا۔ اس کے نزدیک دنیا محض خواب وخیال ہے۔ خدا سے اتصال کامل انسان کی حقیقی سعادت ہے۔ اتصال بھی اتنا کامل کہ انسان بیرونی اثرات سے پاک ہوکر خدا کے تصور میں اپنے تئیں فنا کردے۔ لیکن یہ حالت محض کشف ومراقبہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب انسان خودی کو فنا کرکے بے خود ہوجاتا ہے اور شخصیت کو کلیت میں فنا کرکے فنا فی الکل کے مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس بیخودی اور فنا فی اللہی کی حالت میں اصلی حقیقت کے راز اس پر کھل جاتے ہیں اور انسان اس چیز سے متحد ہوجاتا ہے، جس میں وہ اپنے تئیں فنا کر رہا ہے۔ یعنی فنا کے رتبہ سے بقا تک اور شخصیت سے کلیت تک اس کو صعود ہوجاتا ہے۔ یہی اس کی حیاتِ جاودانی اور

حقیقی سعادت ہے۔"

افلاطونیہ جدیدہ کے یہ تمام رہبانی اور تمدن کُش خیالات درحقیقت افلاطون کے نظریہ اعیان سے ماخوذ تھے۔ افلاطون نے تجربہ اور احساسات کی دنیا کو غیر حقیقی قرار دیا تھا۔ اس کی نظر میں حقیقی عالم فوق الحسّی ہے، جس میں نہ احساس کا گزر ہے، نہ تجربہ کا۔ یہی دنیا ہے، جس کو وہ عالمِ اعیان یا کلی تصورات کی دنیا کہتا ہے۔ ہماری روزمرہ کی حسّی اور تجربی زندگی میں جو اشیاء نظر آتی ہیں، ان کی نسبت نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہیں اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ وجود اور عدم کی درمیانی حالت میں ہیں۔ مثلاً کسی حسین شے کو لیجئے، جس کا ہم اپنے احساسات کے ذریعہ تجربہ کرتے ہیں۔ اس میں حسن کامل نہیں پایا جائے گا بلکہ کوئی نہ کوئی پہلو ضرور لگا ہوا ہو گا۔ ایسی چیزیں صحیح علم موضوع نہیں بن سکتیں۔ لیکن مجرد حسن اور مجرد نیکی ایسے ابدی حقایق ہیں، جن میں ان کی ضد کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ ان کا کمال ہر نقص سے مبرا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کلی تصورات یا اعیان تجربہ کے عالم سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس لیے معلوم ہُوا کہ ایک اور فوق التجربہ عالم ہے، جس کو افلاطون عالمِ اعیان کہتا ہے۔ یہی عالم حقیقی اور علم کا اصلی موضوع ہے۔ افلاطون اپنے اس نظریہ کا اطلاق صرف اخلاقی تصورات جیسے حسن اور نیکی وغیرہ پر ہی نہیں کرتا بلکہ مادی اشیاء پر بھی۔ مثلاً کسی مادی شے کو لیجیے۔ جیسے بلی، کُتا، آدمی، میز۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم جس بلّی کو دیکھتے اور چھُوتے ہیں، وُہ ایک مخصوص اور منفرد ہستی ہے۔ لیکن جب ہم بلّی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اُس سے کوئی مخصوص بلی مراد نہیں ہوتی۔ یہ ایک عمومی تصور ہے، جس کا ہمیں کبھی کوئی حقیقی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم جو بلّی بھی پائیں گے، وہ ایک مخصوص بلّی ہوگی۔ نہ کہ بلی کا عمومی اور مجرد تصور۔ پس معلوم ہوا کہ یہ مخصوص اور منفرد ہستیاں مثلاً بلّی، کتا، آدمی اور میز وغیرہ اس عمومی اور مجرد تصور بلّی، کتے، آدمی اور میز کی ٹھوس اشکال ہیں۔ پھر چونکہ ہم اس مجرد اور کلّی تصور کا کوئی مشاہدہ اور تجربہ نہیں کر سکتے، اس لیے معلوم ہُوا کہ اس کا تعلق عالم مادی اور حسی سے نہیں بلکہ عالم اعیان یا کلّی تصورات کے عالم سے ہے، جو فوق التجربہ ہے اور یہی عالم اصلی اور حقیقی ہے۔ باقی رہا مادی اور حسی عالم، تو وہ اس عالم کا پرتو ہے جس طرح کوئی بلّی، کتّا، آدمی وغیرہ جو ہمارے ادراک میں آتا ہے، اس عینی بلّی، کتّے اور آدمی کی ایک مثال ہے، جو عالمِ اعیان میں موجود ہے۔ لہٰذا تجربہ اور احساسات کے مقابلہ میں عقل، جزئیات کے مقابلہ میں کلّیات اور عالمِ مادی کے مقابلہ میں عالمِ اعیان زیادہ حقیقی اور پائدار ہے۔ مادی عالم تو آنی و فانی ہے۔ لیکن ابدی حقائق کا عالم لازوال ہے۔

بظاہر یہ فلسفہ بڑا معصوم اور ٹھوس معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے عملی نتائج زمانہ ما قبل اسلام میں بڑے خطرناک ثابت ہُوئے۔ پہلے تو اس نے ایک ثنویت پیدا کر کے حقیقت کو دو جداگانہ اور مستقل خانوں میں تقسیم کر دیا، جن میں سے ہر ایک قایم بالذات اور دُوسرے سے غیر متعلق ہے۔ پھر اس نے علم کے لیے حسی تجربہ کو غیر ضروری ٹھہرایا، جس کے نتیجہ میں علم وجدانی کا تصور پیدا ہُوا۔ اس علم کے لیے کسی دلیل و برہان اور تجربہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی وہ تفریق عمل میں آئی، جو بالآخر رہبانیت اور ترکِ دنیا کی طرف لے گئی۔ بلکہ اس نے علم ظاہر اور علم باطن کی بھی تفریق پیدا کی۔ شریعت اور طریقت کے جو جھگڑے زمانہ مابعد میں مسلمانوں میں پیدا ہُوئے، وُہ اسی فلسفہ کی پیداوار تھے کیونکہ

طریقت کے پیرو ایک ایسے باطنی علم و وجدان اور کشف و الہام کے مدعی تھے، جس کو عقل و دلیل سے ثابت کرنا ضروری نہ تھا۔ ہر شخص یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ فلاں فلاں حقیقت اس نے اپنے باطنی علم اور وجدان کے ذریعہ معلوم کی ہے۔ اس طرح تمام ذاتی توہمات اور شخصی آراء کو مذہب اور عقل کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ افلاطونی فلسفہ نے نہ صرف دنیاداروں اور دینداروں کی تقسیم کا آغاز بلکہ خود دینداروں کے دو حصے کر دیے۔ ایک حصہ علم ظاہر کا پیرو تھا اور ایک علم باطن کا۔ چنانچہ مانی کے مذہبی نظام میں بھی ایک طبقہ خواص کا تھا اور دوسرا سامعین کا۔ خواص کو گوشت سے پرہیز کرنا پڑتا تھا اور ازدواج سے توبہ کرنی پڑتی تھی اور تمام احساسات و خواہشات کو کچل دینے کا حکم تھا۔ سامعین پر اس کے مقابلہ میں بہت کم پابندیاں تھیں۔ یہ دو درجہ بندیاں بہت سے مشرقی مذاہب میں داخل ہو گئیں اور زمانہ مابعد میں اسلام کے مذہبی نظام پر بھی ان کا اثر پڑا۔ حالانکہ اسلام کے احکام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

علمی حیثیت سے یہ فلسفہ اس لیے تباہ کن ثابت ہوا کہ اس نے تجربہ کی ناقدری کر کے انسان کو مجرد تصورات کا خوگر بنا دیا۔ اس طرح انسان جزئیات تجربہ سے کلیات تک پہنچنے کے بجائے اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ ایک جست میں کل حقیقت معلوم کرے۔ تجربہ اور آزمائش کی صبر آزما منزلوں سے گزر کر حقیقت مجردہ اور تصورات تک پہنچنے کے بجائے وہ من مانے حقائق اور عینی صورتوں کے پیچھے پڑ گیا۔ جن کی صحت و صداقت اس کے نزدیک اتنی بدیہی تھی کہ انھیں زندگی کی تجربہ گاہ میں آزمانا اس کو بلا ضرورت معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ کوئی مجرد حقیقت اس وقت تک صداقت کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتی، جب تک وہ زندگی کے عملی تجربات میں انسانیت کے لیے مفید مطلب نہ ہو۔ جس چیز کو انسان کی مادی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے معیارات پر نہ جانچا جا سکے۔ اس کی صداقت یا عدم صداقت کا حال کس طرح معلوم ہو سکتا ہے اور وہ عملی زندگی میں انسان کی کس طرح رہنمائی کر سکتی ہے۔ افلاطون کے نظریہ اعیان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت اور صداقت کا رشتہ زندگی سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ زندگی تو جزئیات اور احساسات و تجربات کا نام ہے اور افلاطون کے نزدیک حقیقت و صداقت اور علم کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں۔ صداقت و حقیقت اور علم کی دنیا اس دنیا سے مافوق اور بالکل الگ تھلگ ہے۔

اخلاقی زندگی کے لیے افلاطونی نظریات اس لیے تباہ کن ثابت ہوئے کہ اخلاقیات کا تمام تر تعلق ہماری مادی حسی اور معاشرتی زندگی سے ہے۔ جس اخلاق سے انسان کے معاشرتی تعلقات میں کوئی اصلاح نہ پیدا ہو۔ جس سے اس کے معاشی نظام کی اونچ نیچ اور نا انصافیاں دور نہ ہوں۔ جس سے بین الاقوامی تعلقات اور طبقاتی امتیازات میں کوئی ہمواری اور عدل نہ پیدا ہو۔ آخر اس اخلاق کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ تمام اخلاقی تصورات مثلاً حسن، نیکی، عدل وغیرہ کا اس عالم سے کوئی علاقہ نہیں۔ ان کی دنیا تو بالکل الگ تھلگ ہے۔ حالانکہ جو حسن انسانی روابط و تعلقات میں ظہور پذیر نہ ہو، جو نیکی پریشان حال اور مصیبت زدہ انسانوں کی چارہ سازی کرنے سے قاصر ہو اور جس عدل کا مظاہرہ طبقاتی اور بین الاقوامی تعلقات میں نہ ہو سکے، اس حسن، نیکی اور عدل کی حقیقت بہت مشتبہ ہے۔ اخلاقی زندگی کا انسانی تجربات اور جذبات و احساسات سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک بے جذبہ ہستی پر ہم اخلاقی اقدار کا اطلاق نہیں کر سکتے۔ ایک بے حس وجود کی روحانیت کیا معنے رکھتی ہے۔

اسی طرح جس چیز کو عقل و وجدان اور کشف و الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ بھی تجربات و احساسات اور جزئی تصورات کی

جڑوں میں پیوست ہے۔ عقل جزئیات تجربہ سے بالاتر کوئی مستقل بالذات قوت نہیں۔ وُہ انھیں جزئی تجربات کے صحیح تجزیہ اور ترکیب کا نام ہے۔ کشف و الہام اور وجدان بھی انسان کے حسی تجربات کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ جو انسان دنیا ترک کر کے غاروں اور جنگلوں میں زندگی گزارتا پھرے، جو ترک علائق کے چکر میں پھنسا ہُوا ہو، جس نے انسانوں کے باہمی ظلم و ستم اور معاشرہ کی ناانصافیوں کا کوئی تجربہ نہ کیا ہو، اس کا کشف و الہام صرف اس کے جسمانی عوارض کی پیداوار ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کون سی وحی، کون سا الہام اور کون سا کشف ہے جو صرف اس دعویٰ پر مشتمل ہو کہ یہ میرا ذاتی تجربہ اور ذاتی کشف و الہام ہے۔ میں اس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو بلادلیل میرے دعووں کو ماننا پڑے گا۔ قرآن بھی وحی و الہام ہے مگر وہ دلائل پیش کرتا ہے۔ اور نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ طلب کرتا ہے:

ھاتوا برھانکم (دکھاؤ کہ اپنی دلیل لا) مگر یہ دلائل و براہین ایک ایسی دنیا سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں، جو تمام انسانوں کے تجربہ میں مشترک ہو، جس کو سب افراد بلا استثنا محسوس کر سکیں۔ اگر یہ ایک مشترک حسی اور تجربی عالم سے متعلق نہ ہو، تو ایک آدمی کی دلیل کو دُوسرا آدمی کیا سمجھ سکے گا۔ لیکن افلاطون کہتا ہے کہ وجدانی علم اور کلّی تصورات و اعیان کا علم ایک ایسے عالم سے متعلق ہے جو مافوق الحس اور مافوق التجربہ ہے۔

غرضیکہ اسلام سے پہلے زمانہ میں عیسویت کی جتنی اخلاقی، علمی اور مذہبی خرابیاں تھیں، جن کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سب کا ماخذ اور منبع افلاطونی فلسفہ اور نو افلاطونی تصوف ہیں۔

دُنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر

سید امیر علی

ترجمہ : محمد ہادی حسن

نوعِ انسانی کی ذہنی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے، وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیطِ کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکنے پھرنے کی جو زحمتیں، کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ ان کے ذہنوں پر ایک ایسی روحِ مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا، جو تمام موجودات میں جاری و ساری اور نظامِ فطرت کو قاعدہ و قانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہیں، یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جس عمل کے ذریعے نوعِ انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادتِ الٰہی تک پہنچی ہے، وہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہراہِ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کے غولِ راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہدِ طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے، جو محض ان کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے۔ لیکن خدا کی آواز، چاہے کوئی اسے سنتا یا نہ سنتا، ہمیشہ دعوتِ حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگانِ خاص نے اٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگانِ خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے۔ جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو روحِ انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور ابھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدن کی تعلیم دینے کیلئے آئے جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالمگیر پیغام لے کر آئے۔ ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا بلکہ ساری نوعِ بشر کیلئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار موخر الذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کیلئے نہ تھا۔ آپؐ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ سارے بنی آدم کے لئے، اس دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگانِ خدا ہیں ان سب کے لیے۔ اس معلمِ اعظمؐ کا ظہور، جس کے سوانحِ حیات اس کی بعثت کے لمحے سے لے کر آخر تک مصدقہ طور پر قلمبند ہو چکے ہیں، محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخِ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبانِ حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں، ساری کائنات میں جاری و ساری ایک قدرتِ مطلقہ پر یقینِ محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے، جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں عیسیٰ کے روپ میں ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے، جس کی زندگی ایک المیہ تھی۔ وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے اور اب کی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا، اس میں جو مظاہر رونما ہوئے، وہ ویسے ہی تھے، جیسے ثبتِ ایمان و ایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بننے میں تاکہ وہ سرگرم ان قوتوں کو مذہبی ارتقاء کے اس ناگزیر راستے پر لایا جائے، جس کی منزلِ مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر [illegible]

اس کے بعد جس شاخ نے اُمّ البلاد سے کوچ کیا، وہ سامی (SEMICTIC) نسل تھی۔ سامی بھی تورانیوں کے نقش قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (MESOPATOMIA) کے ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انہوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کا سکّہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (ASOYRIANS) نے جو دارالحکومت بنایا، اس میں جو مذہب رائج تھا، وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصورِ توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے یہاں جو سماوی سلسلہ مراتب تھا، اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

ادھر ڈیلٹے کے شمالی حصے میں سامی نو آبادوں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ادھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (UR) کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ جو کلدانی سلطنت کے زیرِ نگین تھا۔ اس قبیلے کا شیخ جس کی خود اختیاری جلاوطنی اور بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصوں کا مضمون بن گئی ہے، مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جدِ امجد بنا[1][2]

معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصل وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی تنے سے جدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں، اسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشوونما پا رہی تھی لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہو گئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے یکے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ نہ جانے اس فطری بے چینی کے باعث، جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی یا اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین ان کے راعیانہ مشاغل کے لئے ناکافی ہو گئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے، ان میں پلیسجین (THE PELASGIANS) اور کلٹ (THE CELTS) تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوس رحلت بجایا یہاں تک کہ بالآخر صرف خاص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ان کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا۔ اور دوسرا بلخ کے نزدیک، جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور ان کے جنگ و جدل اور نقل و حرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بود و باش کرتے رہے۔ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے، وہ زمین کے ان قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے، جس میں اُن کے بہت سے قبیلے اس سطح مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالمگیر مجرّد ذات کا مبہم سا احساس اُن کے ذہنوں میں تشکل پذیر ہو رہا ہے اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطری کی پرستش کرتے رہے تھے، ان کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں بعض قبیلوں کے یہاں مجرّد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے، یعنی نور اور ظلمت۔ زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک واحد

---

[1] RAWLINSON ANCIENT MONARCHIES

[2] عربی روایتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر بیان کیا گیا ہے، جو صریحاً اشور کی ایک دوسری صورت ہے۔ آزر کے بنائے ہوئے خوبصورت بتوں کا ذکر اسلامی ادب میں اکثر آتا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اشوری النسل تھے۔

خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے، جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے لیکن آخرالامر اپنے مخالف اصول یعنی ظلمت اور شر پر غالب آ جائے گی۔ دوسرے قبیلوں کے یہاں یہ صورتِ حال ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں، وہ خیالی ہستیاں ایک دوسری میں مدغم ہو رہی ہیں۔ کبھی تو وہ جُدا جُدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یکجا ہو کر نوعی حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھند کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب و قبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے۔ دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل و اعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر بزور داخل ہو رہا ہے۔ کیومرس، ہوشنگ اور دوسرے شاہانِ پاستان، جن کے گیت ایک حیرت انگیز نادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں، ایک رو بہ ترقی تہذیب کے اولین نشان بردار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے یہاں بادشاہی کا آغاز ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازعہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرزبوم سے جلاوطن ہو گئی۔ مغربی آریوں میں ایک معلّم نے، جو اپنے مذہب کی کتابوں میں نشانہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کشمکش پیدا کی، اس کے نشان اُن تبرّوں میں ملتے ہیں، جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن "جرو شتی" پر بھیجے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا، وہ ناموں کے غیر معمولی توارد سے کہیں بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علٰحدہ ہو جانے کا فوری اور بلاواسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی، مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (DUALIST) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو جن کا مذہب تعدد ارباب (POLYTHEISM) اور وحدۃ الوجود (PANTHEISM) کی ایک معجون مرکب تھا (PARODAMISADAC) کی سرحدوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے۔ یہاں انہوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا، یا قتل کر دیا، یا غلام بنا لیا اور انھیں ہمیشہ اپنے سے کمتر ہستیاں، یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہرحال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا، وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کی بجائے اُن کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا، اس نے انھیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا اہورا کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور "جرو شتی" پر دل کھول کر سب و شتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا۔ یہ پردۂ لاعلمی میں مستور رہے۔ بہرحال داریوش ہستاسپ کے عہد میں اس نام کا ایک اور معلّم گزرا، جس نے پُرانی تعلیمات کی تجدید، تدوین اور توسیع کی۔

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں، تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے، زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا، یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطرت کی پرستش۔ پنجاب میں رُوحانی تصور نے مزید نشوونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے، تاہم گو ہم اُپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اُپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں، جو ایک ایسا تصور ہے، جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی، بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے ہیں کہ رُوحِ مطلق پرم آتما تمام موجودات

کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخرالامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے، جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے، تو انسانی روح پر کالبد خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں، وہ اُن سب کا شعور کھو دیتی ہے۔ لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلاشک و شبہ روحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے، جنھوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رُخ پلٹا دیا۔ چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُرانوں نے حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنتروں کا طریق پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دُہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اسی سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا۔ جس طرح مغربی غیر الہامی کتاب کا فلسفہ کائنات نفس عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے، جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور اُن کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو۔ اسی طرح اُپنشدوں کے موحدانہ ولولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔

چنانچہ انہوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیرو ڈھونڈھ نکالا جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہٖ برہما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنے حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی، وہ نہ صرف اس امر کی پُرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا۔ بلکہ اس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے، جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا[1] کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنی اور عوام کے جذبات و خیالات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے، جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے، ان آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے، یا اُن کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کئے تھے، جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں نے اپنے طول طویل فاتحانہ کوچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و منقاد بنایا تھا، ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی ان کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اُونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں، وہ ان کے لئے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آیائی ہندو فکر میں جو مدو جزر آئے ہیں ان سب کے دوران ارواح اسلاف کی پرستش مذہبی و معاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے۔ یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤاجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں لیکن اگر کوئی برہمن اُن کی پوجا میں شریک ہوتا، تو اسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سن پاتا، تو اس کے لئے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تین اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بے رحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں لیکن کسی قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے

---

[1] زمانہ حال کا ایک مصنف کہتا ہے کہ بھگوت گیتا میں بے شک وحدانیت کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن وہ غیر موحدانہ عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔

سے نہ روک سکیں ۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں داخل ہو گئے ۔ اور اُن کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی ریتوں میں شامل ہو گئی ۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظامِ خیال کے ارتقا میں مصروف تھے، اس میں ابتذال آ گیا ۔

جب تک تابعینِ اسلام نے وہ پردہ نہ اٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پُر اسرار زندگی بسر کر رہا تھا ۔ اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی ۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ واسودیو کرشن[1] کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی ۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں، جو سیدے سردیا اور لچر معلوم ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں پروہتوں نے گھڑیں، جو دیوتاؤں سے اونچے نہیں، تو اُن کے ہمسر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں یہ تھا کہ عوام کے دلوں کو لبھائے اور چھائے رکھیں ۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیومالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی، جو بھکتی سے تعلق رکھتا ہے، مرکزی شخصیت ہے ۔ وہ بدیہی طور پر ایک جامع شخصیات دیوتا ہے ۔ اس کی ایک شخصیت وہ نٹ کھٹ دیوتا، وہ رنگیلا کنھیا ہے، جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور برندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا ۔

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مکتی یعنی نجات کی کنجی ہے ۔ جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا، اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے، اُسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا ۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسومات اور عقائد کو جنم دیا، جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں ۔ چونکہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں بسا لیا جائے اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگا لی جائے، اس لیے عام لوگ بیراگ اور سنیاس کو مہاپن تصور کرنے لگے ۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سالہا سال تک جنگل میں بیٹھے رہنا، برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا، بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر اُدھر گھسٹے پھرنا، یہ سب ایسے کام تھے، جو سب پاپ دھو ڈالتے تھے ۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منت ماننا منظور ہوتا، تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے

بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری بُرائیاں دوش اور پاپ دُھل جاتے تھے ۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر جو سکہ جما رکھا ہے، وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا ۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعال تخلیقی پہلو ہے ۔ شیو جی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے، جو پاربتی، بھوانی، کالی، مہاکالی، دُرگا، چنڈا اور

---

[1] سری کرشن کو عموماً گوپال کرشن (یعنی کرشن گوالا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اُن کی ہمجولیوں کو گوپیوں (یعنی گوالنیں) کہا جاتا ہے ۔ اہیروں، یعنی شمالی ہند کے گوالوں کے اس سورما دیوتا کے بارے میں بہت سی پُر لطف کہانیاں مشہور ہیں ۔ بعض لوگوں نے اسے ہندوؤں کے اپالو (APALLO) کا لقب دیا ہے، لیکن یہ لقب کچھ پھبتا نہیں ۔

دوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اس دیوی کی پُوجا، جیسے کہ وہ مبھوا بھوُتی کے ڈرامے میں، جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، بیان کی گئی ہے، انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پُوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے، اس میں عیسائی مذہب کی "مادرِ غمخوار" (MATER DOLOROSA) کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اسکندریہ کے پُجاری آئی سس (ISIS) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے، اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوفناک دیوی میں موجود نہیں۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور، جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیداوار ہے، صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہلِ کتاب مذاہب میں نہیں ملتی اور تو اور سبلی (CYBELE) یعنی اہلِ روما کی مادرِ کبریٰ (MGNA MAT-ER) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی جتنی تباہی کے دیوتا شیو کی شکتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا تنتروں کی رسومات کے مطابق کی جاتی ہے، جو گویا شکتی دھرم کی بائیبل ہیں۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھکتی اور سادھنا سے بھرے ہوئے ہیں اور دیوی سے جو پرارتھنائیں کی گئی ہیں، ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں، عام لوگ ان کی بتائی ہوئی پُوجا پر لغواً عمل کرتے ہیں[1]۔

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے، جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجہ راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتا چل جاتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقا یافتہ معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے ظہور سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیزگاری نہیں بلکہ برہمنوں (جن کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ گوتم بدھ اور مہابیر نے جو بغاوت کی، وہ خود غرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اُٹھنے والی ایک آواز تھی۔

---

[1] تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں۔ دکھنا چاری اور بام چاری، یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی ریتوں پر عمل کرنے والے۔ دکھنا چاریوں کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں مثلاً وشنو دیوتا کی شکتی لکشمی یا مہالکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ بام چاری کی پوجا میں، جسے خاص طور پر تنتر کہا جاتا ہے، کالی دیوی بلا شرکتِ غیرے معبود ہوتی ہے۔ یہ پُوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں۔ سارے ہندوستان میں بام چاری پنتھ کے پیرو کار بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ درگا پوجا میں، جو عموماً اگست کے مہینے میں منائی جاتی ہے، درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیہ رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے۔ اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سروں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا سر پیچھے کو مڑا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ انسان کی بجائے اُسے بکری بھینٹ چڑھائی گئی، تو اس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا۔

دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقلِ کل حکمران ہے، جو اس کا نظام چلا رہی ہے لیکن دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندو مت سے وابستہ رہا ہے اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے، لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو مکتی کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی کے عمر بھر عمل کے میدان میں جدوجہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے میں بدھ مت کا جو تصوّر تھا، وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا اور اس کا سری تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اسے جو سنگین سزائیں دیں، ان کی رُوداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیرؤوں کے دل موہ لئے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی جزائیں اور سزائیں آئندہ زندگی میں راحت و سعادت کے وعدے، اس زندگی میں فرائض ادا نہ کرنے کے نتیجے، سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لئے ضروری ہو گیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کر دے، یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اس نے کوشش کی تھی، اس سے سمجھوتہ کرے۔ چنانچہ اسے اپنے پیرؤوں کو یہ اجازت دینی پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں گم جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تنترک رسومات اختیار کریں۔ اسے اپنے اصلی وطن میں نہایت ناموافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی، اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کر سکے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوستان سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا۔ اس زمانے میں برہمن دھرم نے جو بُرے دن دیکھے تھے، اُن سے اُس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اس کے روحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بے جان رسم پرستی، جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی، آگے سے بھی زیادہ استوار بنیادوں پر از سرِ نو قائم ہو گئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگیوں پر ایک ایسے مذہب کا آگے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا، جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا۔ البتہ وہ ان کے حواس اور غالباً اُن کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بیہودہ رسموں کا ایک روزانہ چکر بن گئی۔ ان کے معبود پروہت تھے، اگلوں کی روحیں تھیں اور محض ظاہرداری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بُت پرستی ہندوؤں نے سیکھی تھی، اسے نہ ان کا فلسفہ، نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کر لیا۔ درخت، پتھر، دوسری اشیائے فطری اور بُت جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پُرانے دیوتاؤں کی علامتی مورتیاں تھے، عام لوگوں کے معبود بن گئے۔ منو کا دھرم شاستر جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا، ایک ایسی مملکت کا ضابطہ آئینی ہے جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقے کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجا بھی دیوتا

بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں، اگرچہ منوسمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی جگہ دھیان گرو بجنولکیہ نے لے لی۔ اس کے نزدیک ذات پات کا فرق اتنا ہی پتھر کی لکیر تھا، جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شودر اتنے ہی ملیچھ تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی جتنی دورِ جہالت کے عربوں میں تھی۔ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی۔ لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہرحال بیوائیں یقیناً جیتے جی چتا میں جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی۔ کیونکہ اگر ان کے اولاد نہ ہوتی، تو ان کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں یا اگلوں کی روحوں کو جو بھوگ دیے جاتے تھے، ان کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں، اُن کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی سیوا کرے اور اس کا جگ جگ کا سکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا۔ جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی، اسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے۔ بلکہ اکثر اسے دیوی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے۔

اگرچہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی اُن رکیک رسموں میں کوئی گہرے معانی نظر نہ آتے تھے اور ان کی روحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں پرواز کرتی تھیں، لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بے بس اور عموماً نوعمر بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔

بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آ گئی تھیں۔ جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاکبازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں، جو مختلف دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ان کے اراکین ہمیشہ دھرم سالوں میں جمع ہوتے تھے، جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سنیاسیوں کی ان منڈلیوں میں، جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آئیں، کنوارپن کا بچپن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا۔ جوگیوں کے جتھے مندروں اور متھوں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطیٰ کے بھک منگے راہبوں کی طرح یا قلیمولیس (FLAYIGS) کے عہد کے تارک الدنیا کلبیوں (CYNICS) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں اُن کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟ اُن کے گندھے ہوئے لمبے لمبے بال، الجھی ہوئی گھنی داڑھی، گیروے رنگ کا کرتا، بھبوت ملا ہوا بدن، کشکول اور ڈنڈا۔

چونکہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں آتی تھیں، جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں، ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (TERTULLIAN) کے تعصب انگیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے: "عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں۔ وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انہیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔"

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا، اس نے تقریباً (PANDECTS) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انھیں غلام پیدا کیا ہے اور

اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چونکہ غلامی اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اسے کون اس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات اس وقت، جب پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنا پیغام دنیا کو دیا۔

آئیے! اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ اسلام کے مرزبوم سے آتنا قرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اس نے نہ صرف دینِ موسوی اور دینِ عیسوی کے مزاج پر بلکہ تفکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر اور روحانی نشوونما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور ان علاقوں میں جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں، پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کوشتی (KUSHITE) نسلوں کے جو باشندے تھے، انھوں نے ان کو مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے جہاں وہ حامیوں اور کوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے۔ جو ماد اور سوسیانہ (SUSIANA) میں آباد تھے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بنائے وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقہ بگوش ہو گئے، جو یا کوشی تھا یا اشوری (اغلب ہے اشوری تھا) اور بڑی مدت تک اس کے زیرِ فرمان رہے[1]۔ ان غیر ملکی فاتحین کے نکال دیئے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی، جس میں کبھی ایک فریق غالب آ جاتا تھا اور کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی[2]۔ افراسیاب اور کیکاؤس کے پیرؤوں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے بسا اوقات جو سابقہ پڑا۔ اس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت ان کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کیے بغیر نہ رہی! ایرانیوں نے ماد کے قدیم آبادکاروں پر غلبہ تو پا لیا، لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش اُن کے مذہب میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ایران میں صرف ہرمزد کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا، وہاں ماد میں خیر و شر کے ان دونوں نمائندوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمزد پر ترجیح دیتے تھے۔

مادیوں اور بابلیوں کا ایک تعاونی معاہدے کی بدولت۔ جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے، اشوری سلطنت کا تختہ الٹ گیا۔ لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریوں نے فتح کئے، اتنی مدت تک مسلط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک قدسی سلسلہ مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا، اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمزد کی ایک اشوری ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی اور ایرانیوں نے روشنی کے خدا سے مہربان کو مجسم کرنے

---

[1] ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سے زیادہ سالوں تک ایران پر حکومت کی۔ بہت سے محققوں نے اشوریوں کے اقتدار کی بھی یہی مدت بتائی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو فریدون کا خروج اور نینوا کا سقوط دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے۔

[2] LERMONT, ANCIENT HISTORY OF THE CAST, P. 54

کے لئے جو علامتی نشان منتخب کیا، وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا، جو ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور ایک کمان تھامے سنار چکر میں محصور کھڑا تھا۔ ان کے یہاں جو جھاڑ نشو ونما کی علامت تھا، پہلے اس کی اوپر کو اٹھتی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں، اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں۔ اس سے قبل کہ کسریٰ نے آکر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سالمیت بخشی ابتدائی مہاجروں اور آباد کاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی، وہ عوام کے یہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

آشور کا شہر، جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنۂ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی، طاقتور سارگون اور عظیم سنخریب (SANNACHERIB) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اسے اقوامِ عالم میں سر اٹھانا نصیب نہ ہوا۔ بابل جو شروع شروع میں نینوا کا حریف رہ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا، پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس نے ان تمام علوم و فنون کو، جو ایک ہزار سالوں کی نشو ونما کا ماحصل اور "قوموں، مذہبوں، مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے"۔ اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانۂ سلف کے بے جان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف ان کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ ان کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل، جس کی عظیم زرنشان و شوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا، ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا، جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا۔ بخت نصر (بخت نصر) کے عہدِ حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوجِ اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلمرو میں آ گیا اور اس کے چیدہ و برگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیئے گئے "تاکہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہودہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقتور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس نے صوریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں۔ اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں، تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہ کیں، جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں، جو ان سے کیا گیا۔ جب تک نجات دہندہ (یعنی حضرت موسیٰ) نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی، اس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی۔ لیکن جب انہیں رہائی مل گئی، تو انہوں نے سب و شتم، بددعاؤں اور ملامت و نفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا، جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا۔ "بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کر کے روئے۔ اے دخترِ بابل! خوش نصیب ہو گا وہ شخص، جو تو نو زائیدہ بچوں کو پتھروں پر پٹک دے گا"[1] بخت نصر کے عہدِ حکومت میں بابل بلا شک و شبہ اس دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اس کے پروہتوں کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا، وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہو گیا۔ یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی موبدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری، بعض عبرانیوں کو شاہِ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا، ان سب نے یکجا ہو کر فرزندانِ اخریٰ کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے، تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت

---

[1] PS · CXXXVII

کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے، تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے، جو نظریات و عقاید میں ترقی یافتہ، بڑھتے ہوئے حوصلوں سے مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔

فتح بابل سے مذہب کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہب ثنویت کی حکومت قائم ہوگئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی، اس کے صلے میں انہوں نے قدرتی طور پر اسے "مسیحا"، "نجات دہندہ" اور "شفیع عالم" کے القاب دیئے۔ عبرانی قبیلوں کی اسیری، ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب ان کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت ان کا ایرانیوں سے اختلاط، یہ چیزیں غالباً زرتشتیوں کی اس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں، جو داریوش ہشاسپ کے تحت ظہور میں آئی فعل و انفعال کا دو طرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیطِ کُل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے ایرانیوں سے ایک سماوی سلسلہ مراتب اور خیر و شر کی تخلیق کے اصول دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی رُوح داخل کر دیتا ہے اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی و اخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہدِ حکومت ملک گیری کا دور تھا، تنظیم کا دور نہ تھا۔ داریوش کا عہدِ حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہُرمزد کا پکّا پرستار تھا اور اپنی ساری فتوحات کو اس کا احسان کہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے، مادیوں کی مجوسیّت کا قلعہ مسمار کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنائے۔ لیکن انحطاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا، وہ کسی کے روکے رک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں، جن کا اس نے اپنے عہدِ طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بُت پرستوں کے لئے عذاب کے فرشتے تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انہوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (APIS) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، انہوں نے بہت جلد ہُرمزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پُرانی مجوسی عناصر پرستی از سرِ نو تازہ ہوگئی اور داریوش کے ایک قریبی جانشین اردشیر نیمون (ARTOXERXCES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پُوجا رائج کرائی۔ یہ کلدانی دیوتا بِلتا یا انائی تیس کا مُتنبّے تھا اور اس کے ساتھ لِنگ پُوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پوجا کا نشوونما پا کر خوبصورت سورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہو جانا تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سورج، پہاڑوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا، بیل کو باڑے میں سے جا کر ہلاک کرتا ہوا اور اس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہوا، یہ ایک ایسا تصور ہے، جو دنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ متھرا کی پُوجا کو رُومی لشکری وادیِ فرات سے یورپ کے دُور ترین گوشوں میں لے گئے اور قیصر ڈائیو کلیشین (DIOCLATIAN) کے زمانے میں وہ روما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے حالات تھے، اس سے بدتر اور کبھی نہ ہوئے تھے وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت قاعدہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا، اس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا۔ لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملے میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہ تھے۔ وہ اپنی قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا

(IONIA) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (GYNAIKONITIS) میں بند رہتی تھیں۔ جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے۔ اور انھیں سرِعام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہرحال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس نہ کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لئے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آرہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا۔ اور معاشرے کی رگ و پے میں ساری تھا۔ بہرحال ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہوتے دیا۔ ان کے یہاں کوئی ایفروڈائٹی پینڈیموس (APHRODITE PANDEMOS) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اس اخلاقی وبا میں مبتلا نہ تھا، جو تمام بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور یونان میں عام تھی۔ اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کر سکی[1]

جب ہخامنشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشت دنیا کی ترقی میں ایک قوتِ محرکہ نہ رہی۔ فاتحوں کے ان ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے، معاشرتی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندر مقدونی کا ظفرمندانہ حملہ بھانت بھانت کے جتھے، جو اس کے جلو میں آئے، ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ سیلیشی، صُوری، مِفیلی، فریجی اور لاتعداد دوسری قوموں کے لوگ، نیم یونانی، نیم ایشیائی، جوار کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آکر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج، ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ نرمی زندگی کے نمائندے مرد فاتح کی چیرہ دستیوں کے تختۂ مشق بنے کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہابِ ثاقب کی طرح تھی۔ قصے کہانیوں کا جو تانا بانا اس کی شخصیت کے گرد بُنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے، اُسے ہٹا بھی دیا جائے، تو اس صورت میں بھی وہ مہتم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعلیٰ درجے کی اولوالعزمی تھی، ایک ایسی زبردست فطانت تھی، جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آجاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی، جس کی بدولت وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایک اجتماعِ ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد، جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے اور خود ساری دنیا سے خراجِ عبودیت وصول کرے اور دوسرے وہ فلاسفہ و حکما کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز زیادتیوں سے مملو تھی۔ اس کا ایک مداح ذیل کے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے:۔

> "صُور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوقِ غلامی پہنانا، ہندوستان اور باختر میں اس نے جو ہنگامۂ قتال برپا کیا، کلائٹس کا قتل، فلوٹس اور وفادار پارمینیو کی موت کے جو فرمان اس نے جاری کیے، طوائفوں کے کہنے پر تختِ جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا، یہ سب ایسے کام تھے، جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکی۔"

---

۱ DOLLINGER. THE GENTILE AND THE JAW, VOL. ii, P. 239

سکندر کی فتح یابی اور ہخامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایات نے لے لی۔ اساطیر الصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی جو محبت اور اسے ایک نئی، قوی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی، اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب، عقاید اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا، جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سلیوکی حکمرانوں کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل ثابت قدمی سے جاری رہا۔ انیٹیوکس ایپی فینیز کو، جس نے یہودہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے، یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسر اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سرعت آ گئی۔ سلیوکی فرمانروا دجلہ اور اورونٹیز کے کناروں پر حکمران تھے۔ پارتھیوں نے ہخامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قایم کی۔ یونانی باختری خاندان مشرقی علاقوں یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذاہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلا وطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ پارتھیوں کے تحت مزدکیت اگرچہ بالکل ختم نہ ہوگئی، پھر بھی حکمرانوں کی نظر بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی۔ جن علاقوں میں امن دامان تھا، وہاں زرتشتیت بابلیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہوگئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی، جو ملک کے دور دراز حصوں میں روپوش تھے لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے جبری تن۔ی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔ چنانچہ مجوسی زرتشتیت نے از سر نو مذاہب عالم کی صف میں سر اٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے موبدوں کو اعیان مملکت کے منصب عطا کئے۔ ایک قریب مرگ مذہب کے یہ آخری نمائندے ان تمام امیدوں کا مرجع تھے، جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیر سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزمانہ امنگیں کہاں تک پوری ہوئیں، یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی، یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہوگئی، لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیا حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں، لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رستم کی طرح مردہ ہو چکی تھیں۔

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے۔ بارہا انہوں نے روما کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کے شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قیصروں کو قیدی بنایا اور اس کی رعایا کی دولت لوٹی۔ لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتشکدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی، لیکن لوگوں کے دلوں میں بجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی۔ اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذاہب کو دبانے کی کوشش کی، اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا، اس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے، اس کے اشراف و اعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اس کے موبد اور کشیش جس کبر کا شکار تھے، ان سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کیے جاتے تھے وہ رعایا کی جان و مال پر کلی اختیار رکھتے تھے اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اس اشتراکیت کا پرچار کیا، جس سے یورپ حال ہی میں آشنا ہوا ہے اور لوگوں کو یہ تعلیم دی

کہ وہ آگ، پانی اور گھاس کی طرح دولت اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں، نجی املاک کو ختم کر دیں اور دنیا کی اچھی اور بُری چیزوں میں برابر کے شریک ہوں[1]۔" مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور خون کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی جائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چنانچہ مزدک، جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا، قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں۔ اس فالِ بد کو کسریٰ نوشیرواں کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روکے رکھا لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہرحال ایک معلمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جیسے دنیا کے جسدِ مُردہ میں نئی روح پھونکنی تھی۔

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور ان کے حالات میں بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جو قیامتیں ملّتِ موسوی پر یکے بعد دیگرے ٹوٹیں، ان میں قیامتِ کبریٰ قیصران ٹائی ٹس اور ہیڈریَن کی جنگیں تھیں۔ روم نے ان کے ہیکل کو مسمار کر دیا تھا اور تیغ و آتش سے ان کا بحیثیتِ ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے ان کو مظالم کا نشانہ بنایا۔ لیکن انہوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انہوں نے تنگی القلب جابروں کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھائی تھیں، اُن سے انہوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر، قبرص اور سیرینی کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بود و باش کر رہے تھے، انہوں نے جو انسانیت سوز مظالم کیے، وہ ان کی حالتِ زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قومِ اسرائیل کا گھر اُجڑ گیا، اس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور انھیں کہیں دیر تک امان نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی شقاوتِ قلب جس کی مذمت ان کے انبیاء یکے بعد دیگرے کر چکے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں انھیں پناہ ملی، انہوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم اُمیدوں پر زندہ تھی۔ لیکن امیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ آ کر جا چکے تھے۔ لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے، حضرت عیسیٰؑ نے ان کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اس معلم کے دل پر، جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا، کتابِ دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا۔ جو قوم کے سیاہ ترین ایام میں لکھی گئی تھی اور جو اس کی آرزوؤں کا اظہار اور اس کے لیے امید کا ایک پیغام تھی۔ پہاڑوں میں پناہ گزین ربیوں کا شدید تعصب، صدوقیوں کی بے جان رسم پرستی، فریسیوں کی ظاہر دارانہ آزاد منشی، اسینیوں کا ایک ہاتھ اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلائے امیدوں بھرے خواب دیکھنا، اس درویش پُر خروش کا ملامت آمیز وعظ، جس کی زندگی ہیرودیس کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی، ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰؑ کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عقاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور روما کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ

---

[1] "دبستانِ مذاہب" از محسن فانی۔ شیخ محمد اقبال کی کتاب (DEVELOPMENT IN PERSIA) بھی ملاحظہ کیجیے۔

راست خدا کے ہاتھوں قائم کی جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُرآزادخواب انہوں نے دیکھا، دونوں ان کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ کسی سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالمگیر اخوت اور محبت کے پیغامبر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھری قوم میں رہ کر انہوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مودت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیروؤں کی بہبودی کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقتور، دولت مند حکمران طبقوں کے سینوں میں انہوں نے صرف نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کئے تھے لیکن غریبوں، جاہلوں، ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انہوں نے شکرگزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ دل میں یہ امید لئے کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے، اس میں انھیں کامیابی حاصل ہونے ہی والی تھی، یہودی تعصب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ رو نہ ہفتے ہی گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور زندگی پر افسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے، اس کو ہٹایا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اور ان کا پیغام بھی غریبوں ہی کے لیے تھا۔ وہ ربانوی علوم میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں کے لئے وقف رہی۔ ان کے حواری بھی غریب اور اَن پڑھ لوگ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ زود اعتقاد تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ کے پُراسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انھیں حیرت میں ڈال دیا۔ پھر بھی ان لوگوں نے انھیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ اُن کے مجسم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصور تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مورخ موشیم کہتا ہے کہ اگرچہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا تاہم "یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو، جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علماٗ اور غیر اہل کتاب فلاسفہ کا مقابلہ خود ان کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے خود ایک آواز غیبی کی ہدایت پر ایک پڑھے لکھے شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا، جس کا نام سال تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی"[1]

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بدھ مت کے پیرو ایک مجسم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے، جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا۔ اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک "نیم خدا" کا نظریہ ایجاد کیا اور سیارس کی پیدائش، موت اور دوسری زندگی کے بڑی تصورات آئی سس سرپز کا تصور، یعنی اس کنواری ماں کا تصور، جو نوزائیدہ سورج دیوتا ہورس کو گود میں لیے ہوئے ہے۔ یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں بھی عام تھے۔ پال جو ایک صاحب علم فریسی تھا، ان نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹر اس کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں بھی

---

[1] MOSHIM, ECCLESIASTICAL HISTORY, VOL. II, 63

[2] ملاحظہ کیجیے مسٹر ارنسٹ ڈی بنسن (MR. ERNEST DE BUNSUN) کا مضمون بعنوان "محمدؐ کا مقام کلیسا میں" (ASIATIC QUARTERLY REVIEW, APRIL, 1889.)

مبتلا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اسے حضرت عیسیٰ سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسیٰ کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دیے، یا انھیں ایک مجسم فرشتہ کہے۔ اس نے حضرت عیسیٰ کی سیدھی سادی تعلیمات میں نیشا غورثیت جدیدہ کے پُراسرار نظریے داخل کر دیے، جن میں مشرق بعید سے مستعار لیے ہوئے عقول سماویہ اور تین واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے۔

ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی، اس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسیٰ کے دو شاگردوں پطرس اور پال کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا[1]۔ ابیونی غالباً یسوع ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے نمائندے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کو "عقلی اور روحانی زندگی" کے تمام اعمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا انہوں نے حضرت عیسیٰ کو بچپن، نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کا حضرت عیسیٰ کے بارے میں جو عقیدہ تھا، وہ ان کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا، جس کی قابل ذکر کڑیاں دوسیتی[2]، مارشونی، پیٹری پاسی اور ان سب سے آخر میں نیس کی کونسل ہے، جو ۳۲۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذات باری کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے، بالخصوص انہوں نے جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا نہ تھا، ان کی انسانی شخصیت سے آشنا نہ ہوئے تھے اور ان کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ نہ کی تھی۔ اُن کی الوہیت کا نظریہ قیل و قال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسیٰ نے تبلیغ شروع کی، اس وقت روما کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اس کے زیر نگیں تھا۔ تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پرو کیادی اور مخالف فرقوں کا میدانِ کارزار بن گئی۔

فریزیوں کی دیوی سبلی[3] کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیشتر بطلیموس سوتر، جو اسکندریہ کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دُور اندیش جرنیلوں میں تھا، مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریق عبادت ایجاد کرے، جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں۔ یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبر اعظم کو سوجھا تھا۔ لیکن جہاں اکبر ناکام رہا، وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی، کیونکہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی، زیوس، دمیتر اور اپالو یا ڈایونیشیس کی پوجا کرتے تھے۔ مصری، اوسائرس، آئی سس اور ہورس کی۔ عقیدۂ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اوسائرس

---

[1] MILNER, HISTORY OF THE CHURCH OF CHRIST, VOL. I-H. 26-27

[2] دوسیتی حضرت عیسیٰ کو خالص خدا سمجھتے تھے۔ مارسیونیوں کا عقیدہ تھا کہ "وہ سب سے زیادہ خدا کے مشابہ ہے۔ اس کا بیٹا یسوع مسیح ہے اور جسم کی ایک سایہ نما سی شباہت کا جامہ پہنے ہوئے ہے تاکہ انسانی آنکھیں اسے دیکھ سکیں۔" پیٹری پاسی اس کے قائل ہیں کہ آسمانی باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ صلیب پر اذیت سہی۔ (موشیم اور گبن مزید ملاحظہ کیجیے نسینڈر)

[3] سبلی کی پوجا ہندوؤں کے مشہور دیوی درگا یا کالی کی پوجا سے قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔

اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور رستخیز تھی۔ یونانی مذہب کا مدار ڈائیونیشیس کی اذیت کشی اور رستخیز۔ یونان کے شہر ایلیوس میں بھی پرستش کے پُراسرار طریقے رائج تھے، جن میں نوواردوں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مصری سرشیش بھی آئی سس کی پُراسرار پرستش کی پیشوائی بھی اسی قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ کوئی مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی، یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں، ان کے نام کیا تھے۔ انھیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا۔ ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس نے یونانیوں کے یہاں زیوس کی اور مصریوں کے یہاں اوسائی رس کی جگہ لے لی۔ آئی سس نے اسکندریہ کے مسلک کی "مادرِ غمخوار" بن کر دیمیتر کو برطرف کر دیا اور ڈائیونیشیس کو اب تک جو خراجِ عبودیت پیش کیا جاتا تھا، وہ اب ہورس ہیپوکریٹس کو پیش کیا جانے لگا بہرحال ڈائیونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا۔ چنانچہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس، جس کی شان و شوکت اپنے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے اسی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی۔ اس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات، اس کے سرمنڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پروہت، اس کے سفید پوش نوعمر ادنیٰ پروہت جو مشعلیں اٹھائے چلتے تھے، اس کے باوقار جلوس، جن میں اوسائی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم واندوہ کے پُرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے صوفیانہ معانی سے مملو پُراسرار عبادات اور سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارت، میں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چُپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی، بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں، کہ آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا[۱]

اگرچہ "دکھیاروں پر ایک ماں کی مامتا نچھاور کرنے والی" آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلط رہی لیکن سورج دیوتا مترا کے نسبتاً زیادہ مردانہ وار مسلک نے، جس میں پُراسرار رسومات کے ساتھ ساتھ کفارہ گناہ کا نظریا اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہِ راست تعلق پر اصرار بھی تھا۔ رومی لشکریوں میں خاص ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ مترا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آئے۔

عیسائیت کا جو دعویٰ ہے کہ اسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوع انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرمانروائی کرے۔ اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ان اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے، جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوشخبری نے کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی، جس میں غریبوں کو

---

[۱] DILLS ROMAN SOCIETY FROM NERO TO MARCUS AVRELIVS. CHAP. V. LEGGES FORCRAMER AND RIYALS OF CHRISFIANITS VOL II. P87

سرفرازی حاصل ہوگی اور دولت مند طبقہ کی جگہ غریب جنت کی نعمتوں کا لطف اٹھائے گا، ادنیٰ طبقوں کے دلوں میں امیدوں کی ایک ہل چل برپا کردی۔ حضرت عیسٰی کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کے وہ دل سے بھری ہوئی اُمیدوں نے اُس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پُرجوش عقیدہ دُور دراز علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدم مساوات زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا، عوام میں فوراً ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسٰی کے دوبارہ آتے ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی، لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس عہد کا ایفا جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جائے گا، مستقبل کی دھندلی دُوریوں میں آنکھوں سے ہٹتا چلا گیا۔ تاہم جن توقعات اور اُمیدوں کو اس نے جنم دیا تھا، ان کا زور اس وقت تک کم نہ ہوا۔ جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دور تھی، دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے، جو عیسائیت کے اس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے، جو اس نے حضرت عیسٰی کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدہ کے مطابق ان کے پردۂ غیب میں چھپ جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک، شام اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکز بنائے ہوئے خدا اور ایک تثلیثِ قدسیہ کا تصور عام تھا مصریوں کے سرا ایسی مذہب کا یہ ایک لازمی رکن تھا لیکن آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عیسٰی کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقاید کی صورت اختیار کرلی، ان کے ماننے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رکاوٹ تھی۔

ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی۔ اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقاید سے واقف ہوئے بغیر انھوں نے فطرت الٰہی اور حیات بعد الموت کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں، ان کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے اسرار اور پُرانے مسلکوں کی رسومات و عبادات پر بہت سے صاحبِ فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا۔ لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے ان کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت اَن پڑھ اور غیر متمول طبقوں تک محدود رہی۔ جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے ایمانیاتی مسائل اور ان کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ادارے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عبادتی نظام میں داخل نہ کیے، اس وقت تک اسے اصحابِ فرہنگ و ثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے کر آئے، جنھوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی [1]۔ بہر حال دینِ عیسوی کی نشو و نما کے ابتدائی دَور میں اس بے پناہ جبر و تشدد نے

---

[1] DILLS ROMAN SOCIETY FROM NERO TO MARCUS AURELIUS CHAP. V

جو صدیوں تک جاری رہا، عقاید و نظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ مصری دیوی کی جگہ "امن کا ملجا" اور "رحم کا ماویٰ" بن گئیں۔ اب ان کی پرستش "خدا کی ماں" کے طور پر ہونے لگی۔ جیسی کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترک دنیا فدایان اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثاغورث اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے اور انہوں نے اسے گنگا کے ڈیلٹے کے پروہتوں سے، جن کے یہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے اسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنا کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی۔ آئی سس پوجا کے زیر اثر وہ ایک پر تکلف اور پراسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکت اعشائے ربانی کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ اور تو اور، آئی سس کی سری عبادات سے جو یہ عقیدہ متعلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سر منڈے صفاچٹ واڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش خادموں کو، رسومات کی شان و شوکت کو، عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں، ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ بین عینک لگا کر دیکھیے، تو وہ قدیم تر مذہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی، اپنے سارے طمطراق اور دھوم دھڑکے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں، جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی غیر اہل کتاب دنیا کی "مادر مخوار") کے حضور گایا کرتے تھے اور سینٹ پیٹر یا سینٹ پال کے گرجا سے سراپیوم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اسلام سے پہلے عرب کے تصوّرات

عبد اللہ قدسی

عرب قدیم کی کوئی تاریخ مدّون نہیں ہوسکی۔ سب سے بڑا ماخذ ادب ہے اور پھر پتھر کے نقوش ونشانات اور دوسرے ملکوں کی قدیم تاریخوں کے کچھ حوالے ہیں۔ زمانہ جاہلیت قبل اسلام کے ادب کو لوگوں نے ایک سو سال میں منحصر کر دیا ہے[2] بعض لوگوں نے دورِ جاہلیت سے نوحؑ و ادریس کا درمیانی زمانہ مراد لیا ہے، قرآن شریف میں ہے۔

وقرن فی بیوتکن ولاتبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ

کلبی لکھتا ہے حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا درمیانی زمانہ مراد[3] ہے۔ اور بعض نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا درمیانی زمانہ شمار کیا ہے اور بعض نے حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کا درمیانی زمانہ مراد لیا ہے۔ لیکن عام طور پر اس سے اسلام سے پہلے کفر کا زمانہ مراد ہوتا[4] ہے۔

جاہلیت عرب کے دورِ اول کا ادب قدیم تو ضائع ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ فن کتابت سے ناواقف تھے لیکن دورِ ثانی یعنی اسلام سے پہلے کی جاہلیت کا ادب مدّون ہے جس کا کچھ حوالہ قرآن شریف میں آیا ہے اور باقی تمام شعرا ئے جاہلیت کے اشعار میں موجود ہے۔ اس کا ماخذ سیرت ابن ہشام، اخبار عبید بن شریہ، الاکلیل، حیات الحیوان الدمیری اور بعد کی کتب جیسے الاغانی، مروج الذہب ارزقی، بلجنی القزوینی، الثعالبی، الالوسی وغیرہ ہیں۔

عربی، فینیقی، اشوری اور بابلی ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ اسی لیے ان کے جسم اور ان کی عادتیں ملتی جلتی ہیں۔ پھر عرب اپنے بھائیوں سے جدا ہو گئے۔ یہ سامی کہلائے اور عرب خالص "سادی بدوی" ہوئے اور باقی قبیلے بابل و مصر میں رہے۔ بہر کیف دونوں تہذیبیں ایک ہی جگہ سے نکلی ہیں، لیکن ان کی جدائی کا زمانہ معلوم نہیں ہو سکا۔

اکثر بڑے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ سامی قومیں حقیقت میں عرب سے آئی ہیں[5] بہر کیف یہ قومیں عرب سے باہر گئی ہوں یا عرب ان سے جدا ہو کر آئے ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ عرب ہیئت اجتماعی اور ہیئت اقتصادی میں سامیوں سے مختلف ہیں۔ البتہ عادات اور عقائد میں کچھ قریب ہیں[6]۔

---

[1] LITERARY HISTORY OF THE ARABS BY NICHOLSON, B. XXII

[2] تاریخ الطبری ج ۱ ص ۳۸ [3] بلوغ الارب ج ۱ ص ۱۷، [4] بلوغ الارب ج ۱ ص ۱۸

[5] DIEALTE GEOGRAPHIE ARABIENS, P. 293, BERNE 1875

[6] فجر الاسلام ج ۱ ص ۱۳۰ (طبع ثانی)

چنانچہ ایک محقق کوک صاحب نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے[1] کہ یہ بات بالکل مبہم ہے کہ سامی عالم آخرت کے معتقد تھے۔

"THERE IS CERTAIN GLOOM, MORBIDITY AND ABSENCE OF OTHER-WORLDLINESS AMONG SEMITES..."

ہرودوط بیان کرتا ہے کہ جس زمانہ میں فینیقیہ اور فلسطین سے بیش قرار خراج ایران کے بادشاہوں کو جایا کرتا تھا۔ اس وقت عرب ہی ایسے تھے جو خراج سے مستثنےٰ تھے[2]۔

عرب باتشنا سے سرحدات شمالی عربستان غیر اقوام کی فتوحات سے بالکل محفوظ رہا۔ مصری، یونانی، رومی اور ایرانی وغیرہ ملک گیر جنہوں نے تمام دنیا کو تہ وبالا کر ڈالا، عربستان کا کچھ نہ کر سکے۔ اگر عرب میں بیرونی آبادکار آئے بھی، تو تاریخ میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ ہمیں کسی ایسے حملہ آور کا بھی علم نہیں، جو ان ریگستانی دیواروں کو چیرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ اور اس سرزمین میں حکومت قائم کر چکا ہو[3]۔

البتہ یمن پر ۵۲۵ء میں حبشیوں نے چڑھائی کر کے حکومت قائم کی اور کچھ لوگوں کو عیسائی بنا لیا۔ لیکن ۵۹۷ء میں ایرانیوں کی مدد سے انہیں نکال دیا گیا اور حجاز تک اس کا بھی اثر کبھی نہیں پہنچ سکا۔

خود یمن کی ترقی رومیوں سے بالکل علیحدہ تھی اور یہاں خالصتاً عربی تمدن تھا۔ اسی وجہ سے عربوں کے پرانے تمدن کا پتا یمن میں مل سکتا ہے[4]۔

تاریخ سے یہ بالکل واضح ہوتا ہے کہ عرب ہمیشہ آزاد رہا اور اس پر دوسروں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس لیے عرب اپنی خصوصیات دوسرے ممالک سے بالکل علیحدہ رکھتا ہے اس کا تمدن، اس کا مذہب اس کی زبان اور اس کا ذہن سب علیحدہ خصوصیات کے حامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں اس کی ملکی خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان کی خاص خصوصیات یہ ہیں وہ تیز نظر، ذہین، بے دین، بت پرست، حریت پسند اور خوش بیان ہے اس کی حریت پسندی اس کے تمام نظریات پر حاوی ہے۔

روئے زمین پر کوئی ملک نہیں ہے، جس کی خاص آب و ہوا کا اور مٹی کا ایسا بین اور صریح اثر اس ملک کے باشندوں پر ہوا ہے، جیسا عربستان کی مٹی اور آب و ہوا کا اثر عربستان کے باشندوں پر ہوا ہے[5]۔

عربوں کی جبلت اور ان کے خصائص روحانی کے مطالعہ سے ان کی سرگزشت اور ان کے اسباب ترقی و تنزل کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اس قوم کی خصائص اخلاقی اور ارادہ کی مضبوطی اور التزام کے ساتھ سالہا ئے دراز تک قوم کی اولاد و احفاد میں قائم

---

[1] RELIGION OF PALESTINE, P. 36

[2] HERODOTUS, BOOK III, CHAP. 8

[3] HISTORY OF THE ARABS BY P.K. HITTI, P. 8

[4] تمدن عرب ص ۸۷ ۔ [5] تمدن عرب ص ۸۰

رہی ہے، جس طرح خصائص جسمانی ارثاً اولاد میں ظاہر ہوتی ہیں۔

مذاہب عرب

۱۔ بعض عرب تو ایسے تھے، جو خالق کو مانتے ہی نہ تھے اور نہ قیامت کو کچھ سمجھتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے طبیعت عناصر خالق ہے اور دہر فنا کرنے والا ہے۔

۲۔ بعض خالق کو مانتے تھے، مگر قیامت کے منکر تھے۔

۳۔ اکثر تعداد بت پرستوں کی تھی،

۴۔ ایک فرقہ ستارہ پرست تھا لیکن یہ بھی ستاروں کے بت پوجتے تھے اور ان کی نظر بھی مادہ سے بلند نہیں تھی۔

۵۔ مجوسی فرقہ بھی تھا لیکن یہ بھی حقیقت میں بت پرست ہی تھے۔

۶۔ کچھ یہودی اور عیسائی تھے، لیکن ان پر بھی بت پرستی غالب تھی۔ اور ایک خدا کا تصور مبہم تھا۔

وسط عرب کے باشندے عام طور پر خالق کے تصور سے خالی تھے اور اگر بت پرستی یا مظاہر پرستی کا وجود تھا، تو اس پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ یہ بدوی فطرت ان لوگوں پر بھی غالب تھی، جو شہر میں آباد تھے۔ اس لیے کہ وہ بھی اسی کلچر پر فخر کرتے تھے اور اسی سے رشتہ جوڑتے تھے۔ بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ عرب عام طور پر مذہب سے ناآشنا تھے اور بتوں کی بھی ان کے دل میں خاص عزت نہ تھی[1]

رہائش اور ہیئت اجتماعی میں ان کی فطرت یہ تھی کہ وہ صحرا اور ریتلے میدان اور بے آب و گیاہ زمین کے رہنے والے تھے، جہاں درخت ناپید تھے، چشمے اتفاق سے ملتے تھے ایسے لوگ سورج کی تیزی سے بچنے کے لیے رات کو نیلے آسمان کے نیچے سفر کرتے ہیں اور ستاروں سے رستہ تلاش کرتے ہیں۔

ان کی اجتماعی زندگی عارضی ہوتی ہے پہاڑوں کے غاروں کی طرح خیمے بنا لیتے ہیں، فصل میں قیام کیا، خزاں آتے ہی چل پڑے۔ ان کے پاس نہ زراعت کے آلات ہوتے ہیں، نہ ایسی صنعتیں، جو سکون و اطمینان چاہتی ہیں یہ اپنی روزی کے لیے قدرت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ کل پر بھروسہ نہیں کرتے اور نیچر کے علاوہ اور کسی بات پر غور نہیں کرتے، بلکہ قریب نظر رکھتے ہیں۔ ان کی فکر بالکل صاف اور سادہ ہوتی ہے، جیسا ریتلا میدان۔ ان کی باتیں سلجھی ہوئی اور ان کا بیان واضح ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرتے ہیں اور صاف دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظر تیز اور ان کی یاد قوی ہوتی ہے وہ نظر آنے والی چیزوں کے اوصاف میں دقیق باتیں بیان کرتے ہیں ضرورتیں پوری کرنے میں عجلت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ صحرا والے خانہ بدوش بالکل مادی زندگی رکھتے ہیں اور قوتِ مشاہدہ میں آریوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ نزار کا قصہ ان کی فطرت سمجھنے کے لیے مناسب ہے:

جب نزار کی موت کا وقت آیا، تو اس نے اپنے چاروں بیٹوں، ایاد، ربیعہ، انمار اور مضر کو جمع کر کے وصیت کی کہ میری وفات کے بعد تم لوگ اسقف نجران کے پاس جانا وہ عرب کا حکیم اور قاضی ہے۔ چنانچہ جب نزار مر گیا، تو یہ لوگ اس کے پاس روانہ ہوئے راہ میں انہوں نے اونٹ کے نشانات دیکھے۔ ایاد نے کہا، یہ اونٹ بھینگا ہے، مضر نے کہا، وہ دم

---

[1] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, VOL. I, P. 999

کٹا اونٹ ہے، ربیعہ نے کہا ترچھا چلنے والا بھی ہے، انمار بولا اور بھگوڑا بھی ہے اس کے بعد انہیں اونٹ کا مالک ملا اس نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے میرا اونٹ دیکھا ہے؟ ایاد نے اس سے پوچھا، کیا وہ بھینگا ہے؟ جواب ملا جی ہاں۔ مضر نے کہا، کیا وہ دم کٹا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ غرض سب نے جیسا پوچھا، ویسا ہی نکلا۔ آخر اونٹ والے نے کہا، وہ کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا، ہم نے تو نہیں دیکھا۔ اونٹ والا ساتھ ہو گیا اور اسقف نجران سے شکایت کی۔ ان لوگوں نے جواب دیا ہم نے اونٹ کے نشانات دیکھے اور ان سے اونٹ کی صفات پہچان لیں۔

اسقف نے پوچھا، تم نے کیا صفات بیان کیں؟ چاروں نے اپنے اپنے نشانات بنا دیئے اسقف نجران نے ایاد سے پوچھا۔ اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ بھینگا ہے؟ کہا، میں نے دیکھا کہ وہ اپنی داہنی آنکھ کی طرف چلتا ہے اور اس پر چارا لدا ہوا ہے مضر سے پوچھا، تمہاری کیا دلیل ہے کہ وہ دم کٹا ہے؟ جواب دیا کہ اس کی مینگنیاں ایک جگہ جمع تھیں، اگر دم ہوتی تو اس سے پھیلا دیتا۔ ربیعہ سے پوچھا، تم نے کیسے جانا، وہ ترچھا چلتا ہے؟ کہا اس کے پاؤں ایک دوسرے پر پڑتے ہیں اور کبھی دونوں مخالف پڑتے ہیں، میں نے سمجھ لیا وہ ترچھا چلتا ہے۔ انمار سے پوچھا، تمہیں اس کے بھگوڑے ہونے کا کیسے علم ہوا؟ جواب دیا، کہ اس کے پاؤں کے نشانات عموماً راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ اگر کوئی سامنے سے آئے، تو رستے سے ہٹ جاتا ہے۔ اگر بھگوڑا نہ ہوتا، تو ہم سب اس کی جگہ پر پہنچ جاتے۔[1]

اپنی قوت مشاہدہ اور تجربات کی بنا پر یہ لوگ عرافہ اور قیافہ میں ماہر تھے، لیکن عرافہ کا تعلق کہانت سے قطعی نہیں ہے عرب کا عرافہ یہودی کی کہانت سے بالکل مختلف ہے ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ کہانت اور رہبانیت خالص روحانی نظریئے ہیں۔ اور عرافہ مادی نظریہ ہے، جو محسوسات اور علامات سے مستنبط ہوتا ہے۔

عربی طبیعت مادیت اور دہریت کی طرف مائل ہے، لیکن اطراف عرب سے مختلف ادیان بھی داخل ہوئے اور اس طرح ان کی خالص طبیعت کے خیال کو دوسرے خیالات کی آمیزش نے مبہم کر دیا، لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کو بدلا نہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "ادب الجاہلی" میں اپنی پوری تحقیق و تنقید کا یہ خلاصہ پیش کیا ہے کہ سبعہ معلقہ کے تمام مشہور شاعروں کی وہی اصلی شاعری ہے، جس میں ملکۂ تخیل شاعری کے مادی احساس سے مکمل طریقہ سے وابستہ ہو اور اس حس سے الگ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ کوئی کام اکیلے نہ کر سکے۔ جاہلی شاعر کی طرف حواس کے ذریعہ جو صورتیں منتقل ہوتی تھیں، ان کو وہ مجرد کر کے اور ان کی تنقیح و تصفیے کے بعد انہیں دوبارہ مرکب نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس تالیف و ترکیب میں حواس ہی کو وسیلہ بناتا تھا۔ اس لیے اس کی شاعری میں وصف (حالات کا بیان) حسی اور بلوی ہوتا تھا۔[2]

عرب میں صابئین کی کواکب پرستی اور یہود و نصاریٰ کے عقائد آئے۔ مجوسیت کا اثر بھی پہنچ گیا۔ لیکن یہ نظریات بھی ان میں فلسفیانہ فکر پیدا نہ کر سکے۔ اس کا اندازہ ان کی معاشرت کے اسلوب سے ہوتا ہے وہ اگرچہ حج اور عمرہ کرتے تھے بت پرستی اور کواکب پرستی کرتے تھے، لیکن ان کی طبیعت انہیں آبائی دین کی طرف کھینچ لے جاتی تھی، چنانچہ وہ یہود و نصاریٰ کے خداؤں

---

[1] کتاب التیجان ص ۲۱۴ و ۲۱۵ [2] ادب الجاہلی پانچواں باب

کی صفات اپنے اولین اسلاف کی بیان کی ہوئی صفات کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ وہ کبھی یہود و نصاریٰ کے خداؤں کی پرستش کرتے اور کبھی ان کا مذاق اڑاتے اس لیے کہ یہ لوگ دہری مزاج تھے۔ اساطیر ان کا دین تھا اور دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک خرافات اور بیہودہ بات تھی[1]۔ جیسا کہ عبداللہ ابن الزبعری نے کہا تھا[2]

حیات ثم موت ثم نشر
حدیث خرافہ یا ام عمر

(زندگی، پھر موت، پھر زندہ ہونا، اے ام عمر، یہ سب باتیں خرافات ہیں)

اہل عرب سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ دنیا کہاں سے پیدا ہوگئی اور کدھر جا رہی ہے جیسا کہ اس وقت دوسری قومیں سوچتی تھیں کہ ہوائیں کہاں سے چلتی ہیں۔ زمین و آسمان کی ابتدا اور انتہا کیا ہے۔ اہل عرب عالم کو غیر متغیر، لازوال اور حوادثات پر مؤثر خیال کرتے تھے سجاح بن سباع الضبی نے لکھا ہے[3]

لقد طوفت فی الآفاق حتی
بلیت وقد أنی لی لو ابید

(میں نے آفاق میں گشت کیا، یہاں تک کہ مصیبت میں پڑ گیا اور قریب ہوا کہ ہلاک ہو جاؤں)

وشهر مستهل بعد شهر
وحول بعده حول جدید

(مہینے کے بعد مہینہ شروع ہو جاتا ہے اور سال کے بعد نیا سال شروع ہو جاتا ہے)

ومفقود عزیز الفقد تاتی
منیة و ماموول ولید

(اور گم گشتہ نہیں لوٹتا، موت آتی ہے اور جوان پر امید ہوتا ہے)

اکثر قبائل کا یہی عقیدہ تھا۔ ان میں اہل قریش پیش پیش تھے اور یہ ظاہر ہے کہ قبیلہ قریش کا تمام عرب میں کس قدر اثر تھا۔ یہ لوگ معطلین تھے۔ ان کے عقیدہ میں زمانہ ازلی ہے، نظام عالم کا مدبر ہے، انسان کی تنگی اور فراخی زمانہ پر منحصر ہے، انسان کی عمر پر زمانہ کو قدرت ہے۔ وہی تمنائیں پوری کرتا ہے، وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی سعادت اور شقاوت زمانہ کے ہاتھ میں ہے۔ شعراء زمانہ کے اعمال کا تذکرہ کرتے، تو اس کی یہ صفات بیان کرتے تھے۔ زمانہ ان کے نزدیک ایسا تیر انداز ہے، جس کا تیر خطا نہیں ہوتا اور یہی موت کا پیالہ پلاتا ہے۔ ان کے اس عقیدہ کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] اساطیر العربیہ قبل الاسلام صفحہ ۲۱ [2] الملل والنحل للشہرستانی ج ۳ ص ۲۶۲ [3] دیوان حماسہ ج ۱ ص ۴۲۴ مطبعہ محمد علی مصر۔

وقالوا ما هی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما یهلکنا الا الدهر[1]

(ان لوگوں نے کہا اور کچھ نہیں ہے، مگر یہی دنیا کی زندگی، مرتے ہیں اور جیتے ہیں، ہمیں کوئی نہیں مارتا سوائے زمانے کے)

چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں علامہ المسعودی نے تحریر کیا ہے۔

"ان کا عقیدہ تھا کہ مرورِ ایام ہلاکت کا سبب ہے۔ یہ لوگ حوادثات کی نسبت دہر اور زمانے کی طرف کرتے تھے اللہ کے حکم سے روح کے قبض ہونے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زمانہ کو بُرا نہ کہو، اللہ ہی زمانہ ہے۔ یعنی حوادثات کی نسبت اللہ کی طرف ہے، نہ کہ زمانہ کی طرف۔"[2]

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس سے بھی زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے۔

"اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ لیل ونہار اور سن وسال ہلاکت کا سبب ہیں۔ اس عالم میں دوسرا کوئی موثر نہیں۔ زمانہ کے ہاتھ میں موت وحیات ہے، جیسا کہ قطرب نے کہا ہے۔"

وما یهلکنا الا الموت

(ہمیں صرف موت ہلاک کرتی ہے)

اور ابی ذویئب نے یہ شعر کہا ہے۔

امن المنون وریبها تتوجع
والدهر لیس بمعتب من یجزع

(زمانہ کی مصیبتوں نے مجھے لے لیا اور اس کے مصائب تکلیف دہ ہیں۔ زمانہ گھبرانے والے کو خوش کرنے والا نہیں ہے)

حضرت ابوہریرہ نے روایت بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کان اهل الجاهلیة یقولون ما یهلکنا الا اللیل والنهار وهو الذی یهلکنا، یمیتنا فیسبون الدهر، قال الله تعالیٰ۔ یوذینی ابن آدم یسب الدهر وانا الدهر بیدی الامر اقلب اللیل والنهار

(ترجمہ:۔ اہلِ جاہلیت کہتے تھے کہ ہمیں کوئی نہیں مارتا مگر رات اور دن اور وہی ہمیں ہلاک کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور جلاتے ہیں۔ اس لیے زمانہ کو برا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے ابن آدم نے ایذا دی زمانہ کو برا کہتا ہے اور میں زمانہ ہوں۔ میرے ہاتھ میں حکم ہے میں رات اور دن کو تبدیل کرتا ہوں۔

یہ بخاری کی حدیث ہے، مسلم اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ اس قسم کی حدیث موطا میں بھی ہے۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ زمانہ غافل ہے۔ لہٰذا جب مصیبت پڑتی یا اور کوئی خرابی آتی، تو اسے دہر کی طرف منسوب کرتے اور زمانہ کو برا کہتے۔ اس لیے ان سے کہا گیا، زمانہ کو بُرا نہ کہو"[3]

---

[1] قرآن! پارہ ۲۵ سورۃ الجاثیہ رکوع ۱۹۔ [2] تفسیر ابی السعود ج ۵ ص ۶۰) [3] تفسیر القرطبی ج ۱۶ ص ۱۷۱

عرب دیکھتے تھے، سب کو فنا ہے، لیکن شمس و قمر اور رات دن باقی ہیں، تو انہوں نے قیاس استقرائی سے کام لے کر نتیجہ نکالا کہ یہ رات دن ہی موت و حیات پر قادر ہیں اور انہیں کا نام دہر ہے۔

الم تر ان الدھر یوم ولیلۃ
وان الفتی یسعی لعاریۃ دائباً[1]

کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ دہر رات دن ہیں اور جوان پیٹ کے لیے کرتا ہے۔

اقول وفاضت بعینی عبرۃ
ارا الدھر یبقی والاخلاء تذھب

(میں کہتا ہوں اور میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ میں دیکھتا ہوں، زمانہ کو بقا ہے اور دوست گزر رہے ہیں)

اخلای لو غیر الحمام اصابکم
عتبت ولکن ما علی الدھر معتب[2]

(اے میرے دوستو! اگر موت کے علاوہ تکلیف پہنچتی تو میں غصہ ہوتا۔ لیکن زمانہ پر تو عتاب نہیں ہو سکتا۔)

رائیت المنایا خبط عشواء من تصب
تمتہ ومن تخطی یعمر فیھرم[3]

(میں موت کو اندھی اونٹنی کی طرح دیکھتا ہوں، جو ملا اسے مار ڈالا اور جو بچا وہ بوڑھا ہو کر ہلاک ہوا۔)

اس سے بالکل ثابت ہوتا ہے کہ عرب کی عقل خیال اختراعی سے خالی تھی۔ یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان کے ادب میں وصف، تشبیہہ، مجاز وغیرہ کا بہت کافی استعمال ہے، جس میں قوت خیال صرف ہوتی ہے لیکن یہ واضح رہے کہ اہل عرب کی شاعری میں جس کی تقسیم خیال تصوری اور خیال اختراعی[4] میں سے صرف خیال تصوری کا استعمال ہوا ہے۔ عرب خیال تصوری میں ماہر ہیں اس میں اشیاء کا تصور سابقہ تجربات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اہل عرب کچھ مرئیات میں سے لیتے ہیں اور کچھ محسوسات میں سے اور ان دونوں سے مرکب بنا لیتے ہیں، جس میں کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے اپنی کتاب "من حدیث الشعر والنثر" میں لکھا ہے کہ اہل عرب جاہلیت کی تشبیہات منظر میں اچھی اور صورت میں حسین ہوتی ہیں، لیکن تخیل کی ندرت نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کی عقلیت مشاہدات اور محسوسات میں محصور رہی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی عادتوں اور محسوسات میں کوئی مثل اعلیٰ نہیں ہے زندگی میں عرب کی خاص نظر تھی زندگی کا مقصد تمام عرب کے نزدیک مشترک تھا اور امت کے تمام افراد میں جاری تھا۔ اگر حیات و خلود مقصد نہ ہوتا، تو امرالقیس

---

[1] الدرۃ الفاخرہ لحمزۃ الاصفہانی نقل من الخزانۃ التیموریہ دار الکتب المصریہ۔ نسخہ قلمی استاذ عبدالعزیز المیمنی [2] لسان (عتب)

[3] سبعہ معلقہ زہیر [4] PRINCIPLE OF PSYCHOLOGY BY WILLIAM JAMES, P44

یہ کیوں کہتا۔

فلو انما اسعی لادنی معیشت
کفانی ولم یطلب قیلا من المال

(اگر میں معمولی زندگی کے لیے کوشش کرتا، تو مجھے کافی ہوتا اور میں تھوڑے مال کو طلب نہ کرتا)

ولکنما اسعی لمجد موثل
وقد یدرک المجد الموثل امثالی[۱]

(لیکن میں مثالی بزرگی کے لیے کوشاں ہوں اور مثالی بزرگی مجھ جیسے حاصل کر لیتے ہیں)

یہ بات کہ غایت حیات یا مثل اعلیٰ اہلِ عرب کے نزدیک "خلود" ہے اور مادی بقا اور مادی دوام ہی ان کی طلب ہے، اس کے لیے اساطیر میں ہزاروں شہادتیں ملتی ہیں۔

بادشاہ ذوالقرنین کو آبِ حیات کی طلب ہوئی۔ یہ بھی اسی کی دلیل ہے[۲]۔ عرب کے تصور میں حیات طبیعت سے خارج نہیں تھی اس لیے کہ طبیعت اور مادہ سے باہر ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اس لیے روح کو وہ خون خیال کرتے تھے اور یہی بنی اسرائیل کا بھی تصور تھا[۳]۔

مسعودی نے لکھا ہے، بعض لوگ حیات کو خون سمجھتے تھے اور روح کو ہوا، جو جسم کے اندر ہے بعض کہتے تھے، نفس ایک پرندہ ہے، جو جسم انسانی میں موجود ہے۔ جب انسان مرجاتا ہے، تو وہ پرندہ اس کی قبر کا طواف کرتا ہے[۴]۔

سیرت ابن ہشام کی روایت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ انبیاء کے ذریعہ روح کی تعریف سے واقف تھے۔ لیکن عرب اس سے بالکل نابلد تھے[۵]۔

بلوغ الارب میں بھی اسی قسم کی روایتیں اور اشعار درج ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جن، بھوت، چڑیل وغیرہ حیوانات ہیں۔ بھوت ایک حیوان نادر ہے[۶]۔ چنانچہ عرب بعض افراد اور قبائل کو جن کی نسل سے سمجھتے تھے[۷]۔

عرب نے اپنی مادہ پرست طبیعت اور دہری عقیدہ کی تسکین کے لیے دہر کے بت بھی بنا لیے تھے۔ منات اور عوض دہر ہی کے صنم تھے۔

ولولا نبل عوض فی
خطبای واوصالی

---

[۱] عمدۃ الادب ج ۱ ص ۵۹۔ طبع دمشق [۲] کتاب التیجان ص ۹۱

[۳] RELIGION OF THE SEMITES, P.40 [۴] مروج الذہب ص ۳۱۰

[۵] سیرت ابن ہشام ص ۱۰۲ [۶] عجائب المخلوقات ص ۲۰۴

[۷] بلوغ الارب ج ۲ ص ۳۴۹

(اگر عوض کا تیر میرے دونوں جوڑ اور گھٹنوں میں نہ ہوتا۔)

لطاعنت صدور الخیل
طعناً لیس با لالٰی [1]

(تو میں شہسواروں کے سینوں میں ایسا نیزہ مارتا جس میں ذرا سستی نہ ہوتی)

کلبی نے روایت کی ہے کہ بکر ابن وائل قبیلہ کا صنم عوض تھا[2] اور بعد بھی دہر کا صنم تھا۔

منات اہل لغت اس کے معنی قدر اور قوت کے لکھتے ہیں اور قدر بھی افکار عرب کا مرکز تھا۔ تصور جاہلیہ اسی محور کے گرد چکر لگاتے رہے ہیں شعراء نے اسے مختلف لقبوں سے پکارا۔ جیسے منون منیہ وغیرہ۔ منات قدید میں ایک صنم ہے اور قدید مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے[3]۔

اوس و خزرج کے قبیلے منات کی پرستش کرتے ہیں اور ذبیحہ کرتے ہیں، اس کی منتیں مانتے ہیں اور اس پر تحفے چڑھاتے ہیں[4]۔

منات قدیم صنم ہے۔ اس کی عبادت حجاز میں ہوتی تھی۔ لیکن یہ وہیں کا صنم نہیں تھا بلکہ بابلی ادب سے پتا چلتا ہے کہ وہاں بھی یہ صنم تھا۔ یہ ان کا موت و حیات کا خدا تھا اور اس کا نام مامناتو (MAMNATN) تھا[5]۔

اسی طرح قدیم نبطی نقوش میں مناوات آیا ہے[6]۔

اس سے ثابت ہوا کہ عرب کا منات، بابل کا مامناتو اور نبطی نقوش کا مناوات ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بابل میں یہ صنم (مرد) مذکر اور عرب میں (عورت) مونث ہے۔

اہل بابل اسے موت و قدر کا خدا مانتے تھے۔

OMAM-MITU THOU GOD OF FATE AND DEATH
THOU SPIRIT OF FIERCE HATE AND PARTING BREATH [7]

شہرستانی نے دہریوں پر جامع انداز میں لکھا ہے اور تمام بحث کو مدون کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، کہ یہ فرقہ معطلہ کہلاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں تھیں۔ ایک گروہ وہ تھا، جس نے خالق کا انکار کیا۔ اسے دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت سے انکار تھا۔ زندگی اور موت کو ترکیب و تحلیل پر موقوف سمجھتے تھے، چنانچہ طبیعت پیدا کرنے والی اور لیل و نہار ہلاکت کے

---

[1] حماسہ ج ۱ ص ۲۱۴
[2] ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS (ARABS)
[3] کتاب الاصنام ص ۱۴
[4] سیرت ابن ہشام ص ۲۷۲
[5] BABYLONIAN LITERATURE, P. 93
[6] ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS (ARABS)
[7] BABYLONIAN LITERATURE, P. 110

باعث ہیں[1]۔ انہیں کے عقیدہ کو قرآن شریف میں بیان کیا گیا ہے۔ وقالوا ما ھی الاحیاتنا.... الخ اور دوسری آیت بھی انہیں کے متعلق ہے۔ ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما ائنا لمبعوثون او آباؤنا الاولون[2]

(جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں میں تبدیل ہو جائیں گے، تو کیا ہم پھر زندہ ہوں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی؟)

یہ تو واضح ہو گیا، کہ عرب بالطبع دہری تھے۔ عام طور پر بت پرست تھے اور اللہ کے توحیدی تصور سے خالی تھے۔ اگر اللہ کا تصور تھا، تو وہ بہت مبہم تھا۔ زائد سے زائد یہ تھا کہ اللہ کو ان ہیں، سب سے بڑا خدا تسلیم کر لیتے تھے۔ اوس بن حجر نے کہا ہے۔

وبا للات والعزی ومن دان دینھا وبا اللہ ان اللہ منھن اکبر[3]

(میں لات، اور عزیٰ کی قسم کھاتا ہوں اور اس کی جو اس کے دین پر چلا اور اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ بے شک اللہ ان میں سب سے بڑا ہے)

اور اس لیے جب اسلام نے ایک خدا کا تصور پیش کیا، تو وہ حیران رہ گئے اور سخت تعجب ہوا۔

اجعل الالھۃ الھا واحدا ان ھذا لشئ عجاب[4]۔

(کیا اس نے بہت خداؤں کو ایک خدا کر دیا، بے شک، یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے)

بت پرستی یہ تو ظاہر ہے کہ عرب اللہ کے علاوہ دوسرے معبود مانتے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بت مختلف قسم کے تھے درخت، چشمے اور پتھر سب ان میں شامل ہیں۔ ان بتوں کے نام، ان کی تفصیل اور رسوم و رواج کا ذکر کلبی کی کتاب الاصنام میں درج ہے اور قرآن شریف سے بھی اس پر واضح روشنی پڑتی ہے لیکن یونان میں جس طرح دیوتاؤں کے اعمال اور ان کی فطرت کی تفصیل ملتی ہے، عرب میں ایسا کوئی سراغ میں ملتا۔ جو کچھ تفصیل ملتی ہے، وہ شاعری اور ضرب المثلوں میں ملتی ہے[5]۔

عرب ان بتوں کو وسیلہ مانتے تھے اور کہتے تھے یہ ہماری سنتے ہیں، ہماری گواہی دیتے ہیں۔ وہ بتوں کی قسم کھاتے تھے۔ ان کے سامنے حلف اٹھاتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے انہیں ہدیے دیتے تھے۔ عرب میں ہر قبیلہ کا الٰہ مخصوص تھا۔ جیسے رب قریش، رب ربیعہ، اور ان الٰہ میں حاکم و محکوم کا رشتہ بھی نہیں تھا بلکہ عرب کے تمام قبائل بلا امتیاز ان اصنام کو مانتے تھے[6]۔ ان کے

---

[1] الملل والنحل لاشہرستانی ج ۲ ص ۲۵۷

[2] حاشیہ الملل والنحل لاشہرستانی ج ۲ ص ۲۵۷ (الصٰفٰت آیت ۱۶)

[3] کتاب الاصنام ص ۱۷

[4] قرآن پارہ ۲۳، رکوع ۱۰

[5] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, VOL. I, P. 660

[6] کتاب الاصنام ص ۴۳۔

نام پر جانور آزاد کرتے تھے اور ان پر قربانی کرتے تھے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جب کوئی جانور بوڑھا ہو جاتا تو وہ بت کے نام پر چھوڑ دیتے تھے چنانچہ بُت کے نام پر چھوڑے ہوئے بوڑھے اونٹ کو حام اور بت کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی کو بحیرہ کہتے تھے۔

ان بُت پرستوں کی کوئی مذہبی شریعت یا احکامات نہیں تھے، جو فرد کو سوسائٹی سے وابستہ کرتے ہوں یا فرد پر کچھ فرائض اور حقوق عائد کرتے ہوں۔ بلکہ افراد بتوں کو اپنی ضروریات کے لیے استعمال کرتے تھے[1]۔

عرب فطرتاً قدامت پرست تھے اور باپ دادا کے رسم و رواج پر بغیر سوچے عمل کرتے تھے۔ جیساکہ قرآن میں ان کا مقولہ نقل ہوا ہے۔ اناوجدنا آبائنا علیٰ ھٰؤلاء[2] (ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے)

ان عربوں میں بدوی عرب اور بھی زیادہ سخت منکرِ خدا تھے۔ الاعراب اشد کفرا و نفاقا[3]۔

(عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں)

ان عربوں کے دل میں بتوں کی عزت بھی زیادہ نہیں تھی۔ بلکہ وہ ان کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور ان سے انکار بھی کر دیتے تھے۔ اس کا اندازہ اس قصے سے ہو گا، جسے حتی (HITTI) نے بھی نقل کیا ہے۔

امرؤالقیس باپ کا انتقام لینے کے لیے روانہ ہوا، تو ذوالخلصہ کے مندر میں ٹھہرا تاکہ ازلام سے فال نکلوائے تینوں دفعہ فال نکلی کہ ارادہ چھوڑ دو۔ تو اس نے ٹوٹے ہوئے تیر دیوتا پر کھینچ مارے اور چلایا۔ ملعون اگر تیرا باپ مارا گیا ہوتا، تو پھر تو مجھے انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا[4]۔

اس کا سراغ لگانا بہت مشکل ہے، کہ عرب میں کب سے بت پرستی جاری تھی، لیکن اس کی قدامت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی بت پرستی بہت قدیم ہے۔ جب اسلام آیا، تو اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ ہر قبیلہ کا علٰحدہ بت تھا لیکن عرب تو بتوں کیلئے لڑتے تھے نہ بتوں کے سلسلہ میں اختلافات کا کہیں سراغ ملتا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو مشرکانہ عقاید ایک مدت سے رائج تھے، وہ اب ایسے فرسودہ ہو چکے تھے کہ لوگوں کے مذہبی تقاضوں کی سیری نہیں ہوتی تھی، بلکہ موسیو ریبان کا یہ نتیجہ بالکل درست ہے کہ جس طرح سے رومی شہنشاہوں کے وقت میں قدیم دیوتاؤں سے نفرت پیدا ہو چلی تھی، اسی طرح عربستان میں بھی اس قسم کی نفرت ظاہر ہو چکی تھی۔ پرانے اعتقادات کی عزت اور پرانے بتوں کی عزت جا چکی تھی۔ یہ پرانے اعتقادات بہت پرانے ہو چکے تھے اور دیوتاؤں میں کچھ دم نہیں رہا تھا[5]۔

توحید بے شک عرب میں دو چار آدمی موحد بھی گذرے ہیں، جیسے ورقہ ابن نوفل، عثمان بن حویرث، عبداللہ بن جحش

---

[1] THE HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL. VII P. 292

[2] قرآن شریف

[3] قرآن شریف (التوبہ۔ ۹۷

[4] آغانی ج ۸ ص ۷۰

[5] تمدن عرب ص ۹۰

وغیرہ، لیکن یہ اس قسم کے موحد تھے جنہوں نے بتوں کے آگے نہیں جھکایا اور ان کی عقل سلیم نے خالق حقیقی کو تلاش کرنا چاہا مگر وہ اس کی معرفت اور اس کی صفات کا ادراک نہ کر سکے۔ پھر یہ کہ ایسے لوگوں کا وجود شاذ و نادر تھا اور الشاذ کالمعدوم (نادر نایاب کے برابر ہے۔ ایک موحد زید بن عمرو بن نفیل نے کہا ہے۔

أربًّا واحداً او الف رب
أدين اذا تقسمت الامور[1]

(کیا ایک رب ہے یا ہزار رب۔ میں اس وقت مانوں جب کاموں کی تقسیم ہونے لگے)

ڈاکٹر طہٰ حسین کی تحقیق یہ ہے کہ ان لوگوں کے نام پر جو شعر اور روایتیں منسوب ہیں، حقیقت میں وہ مسلمانوں نے بعد میں گھڑے ہیں، محض اس لیے کہ عربی ممالک میں اسلام کی سابقیت اور فوقیت ثابت کی جائے اور انگریز مستشرقین اس لیے ان کو مان لیتے ہیں، تاکہ عربی ماخذوں سے یہ ثابت کیا جائے کہ قرآن ایک طرف یہودیت اور دوسری طرف عیسائیت سے نیز ان دیگر درمیانی مذاہب سے جو عربی ممالک یا اس کے قرب و جوار میں پھیلے ہوئے تھے، متاثر ہوا ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی تحقیق سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار گھڑے ہوئے ہیں[2]

عرب میں یہودیت و نصرانیت

عرب میں کچھ یہودی اور نصرانی بھی موجود تھے، جنہیں عربوں نے ہمیشہ اپنا غیر سمجھا۔ عرب کے یہود و نصاریٰ میں حلول، تثلیث اور نسلی خدا کی صفات تھیں ان بھٹکے ہوئے یہود و نصاریٰ کی بات پرتی کو عربوں نے تسلیم کیا، لیکن اگر ان میں توحید کا کچھ اثر تھا بھی، تو اسے عربوں نے نہیں سمجھا، نہ اس سے اثر لیا۔

اکثر یورپین مورخین بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عرب میں یا اس سے متصل جو یہودی اور نصاریٰ اس وقت آباد تھے، ان کی دینی حالت بالکل تباہ تھی اور ان کے پاس خود شریعت کا کوئی علم نہیں رہا تھا۔ اس وقت کے عرب تمام بت پرست تھے اور ان پر مذاہب کا کچھ اثر نہیں تھا[3]

عیسائی، ربیع غسان اور حیرہ میں آباد تھے۔ انہوں نے وہ عقائد اختیار کیے تھے جو مقامی حلولی اعتقاد فرقہ مونو فیری (MONOPHYSITE) سے مطابقت رکھتے تھے[4]

حیرہ (عراق) ایرانی عرب کا صدر مقام تھا۔ کوفہ سے تقریباً تین میل دور یہاں کچھ نسطوری فرقہ کے عیسائی تھے جنہیں عباد یعنی حضرت مسیحؑ کی پرستش کرنے والا کہتے تھے[5]

---

[1] آغانی ج ۳ ص ۱۲۵

[2] الادب الجاہلی باب المذہب والالحاق

[3] THE HISTORIANS' HISTORY OF THE WORLD, VOL. VIII, P. 10

[4] THE HISTORY OF THE ARABS BY HITTI, P. 78

[5] طبری ج ۱ ص ۷۷۰

یہودی بنو نضیر اور بنو قضاعہ مدینہ کے دو قبیلے تھے، جن کا پیشہ زراعت، تجارت اور سود پر روپیہ دینا تھا۔ عرب انہیں غیر شمار کرتے تھے۔ ان سے ان کی رشتہ داریاں نہیں تھیں۔ یہ قبیلے آپس میں حلیف ہو کر رہتے تھے۔ اسی لیے عربوں میں ان کے نسب کا سلسلہ موجود نہیں ہے۔

بہرکیف اس زمانے کے یہود و نصارٰی خاص طور پر عرب کے اہل کتاب بھی بت پرستوں سے کم نہیں تھے اللہ کا نام تو ضرور لیتے تھے، لیکن کہیں اللہ نسلی تھا اور کہیں انسانی شکل میں، جیسا کہ ان کے لیے قرآن مجید میں مذکور ہے۔

وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری المسیح ابن اللہ۔ (التوبہ۔ ۳۰)

(یہود نے کہا عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصارٰی نے کہا مسیح خدا کا بیٹا ہے)

ذالك قولهم بافواههم يضاهئون قول الذين كفروا من قبل[1]

(یہ ان کے صرف زبانی دعوے تھے۔ یہ اگلے کافروں کی بات کی نقل اتارتے ہیں)

موسیو یبان نے لکھا ہے کہ روم، یونان اور ایشیا کی حالت اسلام سے پہلے ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا متخیلہ سو چکا تھا، قومی دیوتاؤں کی پرستش کا کوئی اثر باقی نہیں رہا تھا۔ ایک خالص اور محض نفسی خود غرضی رہ گئی تھی۔[2]

عرب کا قانون

عرب میں چونکہ کوئی ریاست یا بادشاہت نہیں تھی، نہ کوئی باقاعدہ حکومت قائم تھی، اس لیے وہاں کوئی قانون بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی افسر، نہ ماتحت، نہ کوئی بالادست طاقت تھی۔ قبیلہ کا سردار طاقتور خاندان والا شخص ہوتا تھا۔ لیکن وہ بھی طاقت کے بل پر اپنی بات منوا سکتا تھا، ورنہ قبیلہ سردار کا ماتحت نہیں ہوتا تھا۔ قبیلہ کا ہر خاندان اپنی جگہ آزاد تھا اور خاندان کا ہر فرد اپنی جگہ خود مختار تھا۔

فرد کو دوسرے فرد سے خون کے رشتے کے علاوہ کوئی چیز وابستہ نہیں کرتی تھی۔ البتہ ضرورت پر کام آنے کے لیے معاہدے اور حلف ہوتے تھے اور پڑوس کا حق اور بھائی چارہ بھی ہوتا تھا جس کے ذریعے فرد قوت بڑھاتا تھا اور اس طرح خاندان بھی طاقت بڑھاتا تھا۔ گویا سیاسی تعلقات اخلاق پر مبنی تھے اور اخلاق قبیلہ سے وابستہ تھے۔

ان کے ہاں سب سے بڑی چیز خون کا بدلہ تھا۔ خون کا بدلہ خون سے لیتے تھے۔ لیکن اگر بدلہ لینے کے قابل نہ رہتے اور کمزور ہو جاتے، تو خون بہا لیتے۔ لیکن یہ خاندان کے افراد لیتے تھے۔ فرد کا فرد سے تعلق تھا۔ دوسرے مذاہب مثلاً یہودی اس کو خدا کا گناہ مانتے تھے۔ لہٰذا یہ مذہبی فریضہ تھا۔ اس قسم کا کوئی تصور عرب میں نہیں تھا۔[3]

---

[1] قرآن :- پارہ ۱۰، رکوع ۱۱

[2] تمدن عرب ۱۲۹

[3] THE HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD VOL. VIII CHAP. XI.

فرد، اس کا خاندان اور قبیلہ علی الترتیب خون کا بدلہ لینے میں وابستہ تھے دوسرے جرائم میں وہ مال قبول کر لیتے تھے۔ یہ بدلہ بھیڑ، بکری، اونٹ کی صورت میں ہوتا تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد بیٹا سوتیلی ماں کو ورثہ میں پاتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ چوری، ڈکیتی اور قتل کرکے مال لوٹنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

عرب میں مساوات تھی۔ ایک معمولی فرد قبیلہ کے شیخ سے مساویانہ گفتگو کرتا تھا ان میں کبھی ملک کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ان کی اس مساوات نے حضرت عمرؓ کے الفاظ میں اسلام کے لیے کچا مسالہ فراہم کیا۔[1]

عرب کا فلسفۂ اخلاق

جب عرب میں کوئی مذہب اور قانون نہیں تھا، تو وہ کون سا اصول تھا جس کی روشنی میں وہ زندگی بسر کرتے تھے اور جس کے لیے ان کا مرنا اور جینا تھا اور جس اصول کے گرد ان کے قبیلہ، خاندان اور فرد کی زندگی گردش کرتی تھی؟ یہ اصول عرض (بہ کسر عین) یا عزت ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلامؐ کے سپلیمنٹ میں بھی عرض پر جو بحث ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عرض کی تقسیم تین حصوں میں کی جا سکتی ہے —— قبیلہ، خاندان اور فرد —— قبیلہ میں شاعر، خطیب، اور کمزور، خاندان اور فرد میں جوانی، بغاوت، شجاعت، حریت، بیوی کی عفت، آزادی، وعدے کا لحاظ کرنا، آزاد عورت کی آزادی، حسب کی حفاظت، مہمان نوازی شامل ہے۔ لیکن یہ تمام صفات کبھی قبیلہ اور فرد سے اور کبھی خاندان اور فرد سے اور کبھی قبیلہ، خاندان اور فرد سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قبیلہ یا خاندان کی عزت فرد کی عزت ہو جاتی ہے۔ یا فرد کی عزت قبیلہ یا خاندان کی عزت ہو جاتی ہے۔

طاقت اور قوت سے جو صفات وابستہ ہیں، وہ عرض ہیں۔ ان پر فخر کیا جاتا ہے اور کمزوری سے جو صفات متعلق ہیں وہ ذلت ہیں۔ ان سے منافرت اور دوری ہوتی ہے۔

عرض سماجی اور جماعتی کام ہے۔ قدیم عرب میں مذہب کمزور تھا بلکہ مذہب تو تھا ہی نہیں۔ نہ اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس کی جگہ عرض نے لے لی تھی۔ عرض کا اصول ان پر چھایا ہوا تھا اور یہ فوری اثر کرنے والا اور جذبات ابھارنے والا تھا۔ ان کی زندگی کے لیے یہی شمع ہدایت تھی۔ اور یہی نصب العین تھا۔ ان کے کردار اور اعمال اسی سے وابستہ تھے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرض نے عرب میں دین کی جگہ لے لی تھی۔[2]

عرض پر فخر کرنے کے لیے مقابلے ہوتے تھے اور اس کے جوش اور معاشرت میں اسے زندہ رکھنے کے لیے میلوں میں جلسے ہوتے تھے اور اس پر فخر کیا جاتا تھا۔ عرض کا عرب میں سب سے اونچا مقام تھا اور اس کی حفاظت کے لیے وہ ہتھیار اٹھاتے تھے۔ اس کی مثال کے لیے تاریخ عرب کا سب سے مشہور واقعہ کافی ہے، جسے ہر مورخ نے نقل کیا ہے۔

---

[1] طبقات الکبیر ابن سعد، ج ۳ ح ۱ ص ۲۴۶ لیدن ۱۹۰۴ء

[2] ENCYCLOPEDIA OF ISLAM, SUPPLEMENT, P. 96.

لخمی خاندان کے مشہور بادشاہ مندر سوم کے بعد اس کا بیٹا عمر (ابن ہند) تخت پر بیٹھا تو اس کے دربار میں عرب کے سات مشہور ترین شاعروں میں سے تین موجود تھے، طرفہ، عمر ابن کلثوم اور حارث ابن ہند نے لوگوں سے دریافت کیا، مجھ سے، بڑا عزت والا بھی کوئی موجود ہے؟ لوگوں نے کہا، عمر ابن کلثوم ہے۔ قبیلہ کی مفاخرت میں لمبی نظم کہی، جو سبعہ معلقہ (SEVEN GOLDEN ODES) میں ہے اور بادشاہ کو قتل کر دیا۔[1]

اس غرض میں حسب کی حفاظت شامل ہے اور اس کی وجہ سے عرب میں علم نسب نے اتنی ترقی کی کہ اس کے ذریعہ ہم تک عرب کی مختصر انسائیکلوپیڈیا پہنچ گئی۔ بقول ابن خلدون، خاندان کے حالات حسب و نسب کا سلسلہ، نسلی تاریخ زبانی یاد رکھنے اور شاعری میں استعمال کرنے کا طریقہ صرف عرب ہی میں تھا۔ چنانچہ شعرائے عرب نے اس حصہ کو مرتب کرنے کے لیے زبردست مواد بہم پہنچایا ہے۔

مشہور شاعر جریر قریش اور بنو تمیم کی تعریف میں کہتا ہے۔

فما ولد یا کرم من قریش
ولا خال باکرم من تمیم

(کوئی فرزند دنیا میں قریش سے بڑھ کر نہیں ہے اور نہ کوئی ماموں تمیم سے زیادہ عزت دار ہے)

اس علم کے ذریعہ ہم تک عرب کے بڑے حاکموں، حکموں، عقلاء، شعراء، مشاہیر مرد اور عورتوں کا حال اور نام پہنچ گئے ہیں۔

ابو المنذر ہشام ابن عمر کلبی کی کتاب "جمہرۃ" علم نسب کی بہترین کتاب ہے۔

---

[1] طبری ج ۲ ص ۱۸۸۲۔ یاقوت ج ۳ ص ۴۰۹۔

عہدِ جاہلیت میں عربوں کے مذہبی معتقدات

عبد الحمید صدیقی

دنیا کا کوئی نظامِ حیات نہ خلا میں پیدا ہوتا ہے اور نہ خلا میں پروان چڑھتا ہے بلکہ ہر نظام ایک خاص ماحول میں جنم لیتا ہے اور رائج الوقت نظام سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ہر نئے نظام کی رُوح، اس کے اساسی تصورات اور اس کے عملی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس میں وُہ نظامِ حیات معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہی فطری اصول ہمیں اسلام کے معاملے میں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ اگر قرآن مجید کی تصریحات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلاب انگیز تعلیمات کے مضمرات کو پوری طرح جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے اس پس منظر کو ذہن نشین کریں، جس میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس مضمون میں ہم عربوں کے صرف مذہبی معتقدات پر بحث کریں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مثبت طور پر جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وُہ توحید ہے اور جس باطل خیال کا پوری شدت کے ساتھ ابطال کیا ہے وہ شرک ہے۔ عربوں کے اندر یوں تو شرک کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو مگر اس میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت بُت پرستی کو حاصل تھی۔ اس لیے ہم سب سے پہلے قدیم عربوں کی بت پرستی کا ہی جائزہ لیتے ہیں۔

عرب میں بُت پرستی کا آغاز

عرب میں بت پرستی[1] کا آغاز خانہ کعبہ کی عقیدت کے پاکیزہ جذبہ سے شروع ہُوا۔ جو شخص بھی مکہ سے عارضی یا مستقل طور پر جُدا ہوتا، وہ حرم کے مقدس پتھروں میں سے ایک آدھ پتھر عقیدت کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتا۔ منزلِ مقصود پر پہنچ کر وُہ اسے ایک خاص مقام پر نصب کر لیتا اور اس کے گرد اسی طرح طواف کرتا، جس طرح کہ قیامِ مکہ کے دنوں میں وہ خانہ کعبہ کے گرد طواف کیا کرتا تھا۔ وہ اس پتھر سے حرم کے تعلق کی بنا پر خیر و برکت کا طالب ہوتا اور اس کے ساتھ اسی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتا، جو ایک نیک اور خدا ترس انسان اللہ کے مقدس گھر سے کرتا ہے۔

سب سے پہلے جس شخص نے عرب میں دینِ ابراہیمؑ کو مسخ کر کے بت پرستی کا آغاز کیا، وہ قبیلہ خزاعہ کا سردار عمرو بن ربیعہ لحی بن حارثہ بن عمرو بن عامر الازدی تھا۔ کعبہ کی تولیت پہلے الحارث کے سپرد تھی مگر جب عمرو بن لحی مکہ میں قیام پذیر ہوا تو اس نے حارث کے حقِ تولیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی اولاد کی مدد سے حارث اور اس کے خاندان کو اس قابلِ رشک عہدہ سے محروم کر کے خود اس پر قابض ہو گیا[2]۔

---

[1] اس موضوع کے لیے ہم نے زیادہ تر مواد ابی المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی کی شہرہ آفاق تصنیف "کتاب الاصنام" سے لیا ہے۔

[2] کتاب الاصنام ص

اس انقلاب کے بعد عمرو بن لحی پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا اور اس بیماری نے بڑی سرعت کے ساتھ شدت اختیار کی۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں کسی حکیم و دانا نے اسے بتایا کہ شام میں البلقا کے مقام پر گرم پانی کا ایک چشمہ موجود ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر اس کے پانی سے غسل کرے، تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس نے اس مشورے کو پوری خوشدلی سے قبول کیا اور البلقا کے لیے رختِ سفر باندھا قدرت کو اس کی صحت منظور تھی۔ چنانچہ اس نے جب اس چشمے کے پانی سے غسل کیا تو جلد شفا یاب ہو گیا۔

صحت بحال ہو جانے کے بعد اس نے کچھ دنوں کے لیے وہاں مزید قیام کیا تاکہ اس کی قوت و توانائی معمول پر آجائے اور وہ آسانی کے ساتھ سفر کے مصائب اور صعوبتوں کو برداشت کر سکے۔ اس عرصۂ قیام میں اس نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کے حضور سرِ نیاز خم کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات و سکنات سے وہ پہلے قطعاً ناآشنا تھا۔ اس کے دل میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان کے بارے میں اُن سے استفسار کرے۔ جستجو کرنے پر اسے بتایا گیا کہ یہ ان کے معبود ہیں، جن کی طرف وہ بارش اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ عمرو بن لحی نے ان سے درخواست کی کہ پتھر کے کچھ معبود اسے بھی دے دیے جائیں۔ چنانچہ بلقا کے باشندوں نے اس کے اس مطالبہ کے احترام میں چند بت اس کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیے۔ یہ شخص پتھر کی ان مورتیوں کو لے کر مکہ واپس چلا آیا اور انھیں خانہ کعبہ کے ارد گرد رکھ دیا۔ [1]

اسی سلسلہ میں ابن عباس سے جو روایت منقول ہے، وہ یہ ہے کہ قبیلۂ جُرہم سے تعلق رکھنے والے ایک شخص اساف اور ایک عورت نائلہ کے درمیان سرزمینِ یمن میں معاشقہ شروع ہوا۔ حج کے موسم میں یہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ روانہ ہوئے جب وہ اللہ کے مقدس گھر میں داخل ہوئے تو اتفاق سے اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے منہ کالا کیا۔ اس ذلیل اور مذموم حرکت کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑی اور وہ بے جان پتھروں میں تبدیل کر دیے گئے۔ لیکن عربوں کی "ذہانت" کی داد دیجئے کہ انہوں نے ان سے عبرت پکڑنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی۔ خزاعہ اور قریش کے قبائل اس معاملے میں پیش پیش تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اولادِ اسمٰعیلؑ میں سے پہلا شخص جس نے بت پرستی کی رسم کو رواج دیا اور لوگوں کو اپنی اولاد کے نام بتوں کے ناموں پر رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوا۔ وہ ہُذیل بن مُدرکہ تھا۔

عرب کے مشہور بُت اور بُت کدے

ذیل میں ہم عرب کے مشہور بُتوں اور بت کدوں کے نام اور ان کے مختصر حالات درج کرتے ہیں:

قبیلہ ہُذیل سُواع کا پرستار تھا اور اس بت کو اہلِ قبیلہ نے مدینہ کے ایک گاؤں ینبع کے نزدیک "رہاط" کے مقام پر نصب کر رکھا تھا۔ اس صنم خانہ کی تولیت بنولحیان کے سپرد تھی۔

قبیلۂ کلب کے لوگ وَدّ کے سامنے اظہارِ عبودیت کرتے تھے۔

---

[1] کتاب الاصنام ص ۸

اسی طرح عرب کے دو مشہور قبائل مَذحج اور اہلِ جُرَش یغوث سے وابستہ تھے۔ ان بتوں سے ان قبائل کی عقیدت کا اظہار بعض اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

حَیَّاكَ وَدٌّ فَاِنَّا لَا یَحِلُّ لَنَا

لهو النسا و ان الدین قد عزمنا

"اے وَدّ! تمہیں حیاتِ جاوداں نصیب ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم عورتوں کے ساتھ دل بہلائیں۔ ہمارا دین پختہ اور مضبوط ہے۔"

قبیلہ خیوان کے لوگ یعوق کے حضور میں سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ ابن کلبی کے قول کے مطابق اسے کسی ایسے قبیلے کا ذکر نہیں ملتا، جس کے افراد نے اپنے نام اس بُت کے نام پر رکھے ہوں۔ اسی طرح اس بُت کا تذکرہ شعراء کے کلام میں بھی ناپید ہے۔ اس کی وجہ ابن کلبی کے نزدیک یہ ہے کہ خیوان، ہمدان اور اسی طرح کے دوسرے قبائل چونکہ صنعاء کے نزدیک آباد تھے اور حمیر سے اختلاط کی وجہ سے انہوں نے یا تو یہودیت کو قبول کر لیا تھا یا اس سے کافی متاثر تھے۔ اس لیے انہیں اس بت سے کوئی گہری وابستگی باقی نہ رہی تھی۔ یہ سرد مہری ہمیں قبیلہ حمیر کے افراد میں ان کے بت "نسر" کے بارے میں بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ قبیلہ تُبّع کے عہدِ حکومت میں بت پرستی کو ترک کر کے دینِ موسوی میں داخل ہو گیا تھا۔

دینِ موسوی میں داخلے سے قبل حمیر نے صنعاء کے مقام پر ایک صنم کدہ تعمیر کر رکھا تھا جو ریام کے نام سے اہلِ عرب میں مشہور تھا۔ لوگ اس کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے۔ یہاں آکر نذرانے چڑھاتے اور بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دیتے تھے۔

یہ صنم کدہ مکر و فریب کی آماجگاہ تھا، جس میں سادہ لوح عوام کو ان کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا کر مختلف قسم کے فریب دیے جاتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب تبع عراق کی مہم میں کامیاب ہو کر اپنے مستقر پر واپس آیا، تو اس نے دو مذہبی رہنماؤں کی مدد سے اس بُت خانہ کو نیست و نابود کروا دیا۔ اس لیے قدیم عرب شاعری میں ریام اور نسر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔

یہ پانچ بُت یعنی وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے، قومِ نوح کے نہایت معظم و محترم اصنام تھے۔ ان سے اسے گہری وابستگی تھی اور وُہ اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے زیادہ تر انہی کی طرف رجوع کرتی تھی قرآن مجید میں ان بتوں کی پرستش کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَ اتَّبَعُوْا	نوح نے کہا اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے
ـــــــــــــــــــ	میری نافرمانی کی اور ان کی پیروی کی، جن کے مال
ـــــــــــــــــــ	اور اولاد نے انہیں سوائے نقصان کے اور کچھ نہ دیا
ـــــــــــــــــــ	اور جنھوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنھوں نے
ـــــــــــــــــــ	کہا کہ تم اپنے معبودوں یعنی وَدّ، سُواع، یغوث،

— — — — — — — — — — یعوق اور نسر سے کبھی منہ نہ موڑنا ۔ ان لوگوں نے
— — — — — — — — — — بہتوں کو گمراہ کر دیا ۔

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۔ (نوح ۔ ۲/۱ ۔ ۲۴)

یہ پانچوں بُت یعنی ودّ، سواع، لیغوث، یعوق اور نسر عمرو بن لحی کی وساطت سے عربوں میں مقبول ہُوئے ۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ یہ اصنام غیر ملکی تھے جنھیں باہر سے پرستش کے لیے درآمد کیا گیا تھا ۔

عربوں کی قومی بت پرستی

عربوں کے قومی بتوں میں مناۃ کی شہرت بہت زیادہ ہے ۔ وہ نہ صرف اس بُت کی پُورے جذبۂ عبودیت کے ساتھ پرستش کرتے بلکہ عقیدت اور احترام کی وجہ سے اپنی اولاد کو ایسے ناموں سے پکارتے، جو ہر لحاظ سے ان کی اس بت کے ساتھ گہری وابستگی کے آئینہ دار ہوتے تھے ۔ عربی ادب میں ہمیں اس قسم کے کئی نام ملتے ہیں، جن میں عبد مناۃ اور زید مناۃ خاص طور پر مشہور و معروف ہیں ۔ یہ بُت مکہ اور مدینہ کے درمیان مشلّل کے قریب قُدَید کے مقام پر رکھا ہوا تھا ۔

اس بُت کی تقریباً قریب سارے عرب قبائل میں پرستش ہوتی تھی اور اس کی خوشنودی کے حصول اور اس کی ناراضگی سے بچنے کے لیے عرب جانوروں کی قربانیاں دیا کرتے تھے ۔ مگر اس معاملے میں اوس اور خزرج سب پر سبقت لے گئے تھے ۔ ابن کلبی، عمار بن یاسر کا، جو اوس اور خزرج کے حالات کے متعلق سب سے زیادہ اور مستند معلومات رکھتے تھے، ایک قول نقل کرتے ہیں، جس سے ان قبائل کی مناۃ کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا پتا چلتا ہے :

> " یہ لوگ جب حج کی غرض سے دُوسرے حجّاج کے ساتھ روانہ ہوتے تو وہ تمام ان مقامات پر ٹھہرتے، جن پر کہ عرب عام طور پر قیام کیا کرتے تھے اور وہ ساری رسوم ادا کرتے، جو اس وقت رائج تھیں، لیکن وُہ اپنے سروں کو منڈانے سے اجتناب کرتے ۔ واپسی پر جب وہ اس مقام پر پہنچتے، جہاں مناۃ کا بُت نصب تھا، تو وہاں کچھ وقفہ کے لیے قیام بھی کرتے اور اپنے سر بھی منڈاتے، کیونکہ ان کے نزدیک مناۃ کی زیارت بھی حج کا ایک نہایت ضروری حصّہ تھا، اور جب تک اس رکن کو پوری طرح ادا نہ کیا جائے، اس وقت تک ان کی نظر میں حج کی تکمیل نہ ہوتی تھی ۔ "

اس بُت اور اس سے عربوں کی غیر معمولی عقیدت اور وابستگی کا ذکر قرآن مجید میں یُوں آتا ہے :

اَفَرَاَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَ مَنٰوةَ	کیا تم نے لات اور عزّٰی اور تیسرے منات کے حال
الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اَلَكُمُ الذَّكَرُ	میں غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں
وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۔	اور خدا کے لیے بیٹیاں ۔ اس اعتبار سے تو یہ بڑی
(النجم ۔ رکوع ۱)	بے ڈھنگی تقسیم ہے ۔

عربوں کے ہاں منات کی عرصہ دراز تک تعظیم و تکریم ہوتی رہی یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ آٹھ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ اسے یکسر مسمار کروا دیا اس مہم میں مسلمانوں کو کافی مال و اسباب ملا، جس میں وہ دو تلواریں بھی شامل تھیں جو شاہ غسان حارث بن ابی شمر نے مناۃ کے حضور میں بطور نذرانہ پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک تلوار کا نام "مخذم" اور دوسری کا "رسوب" تھا۔ ان تلواروں کا ذکر علقمہ نے ایک شعر میں اس انداز میں کیا ہے: ؎

مظاهر سر بالی حديد عليهما

عقيلاً سيوفٍ: مخذمٌ و رسوب

"زرہ بکتر پہننے کے ساتھ ساتھ اس نے دو مرصع تلواریں بھی یعنی مخذم اور رسوب بھی سجا رکھی تھیں۔"

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں تلواریں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمائیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ انہی میں سے ایک تلوار کو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالفقار کے نام سے موسوم فرمایا تھا۔

لیکن اسی سلسلہ میں ایک دُوسرا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب حضورؐ نے "فلس" کی مہم پر روانہ کیا تو اس وقت طئی کے صنم کدے سے یہ تلواریں امیر المومنین کے ہاتھ آئیں۔

مناۃ کے علاوہ عربوں کا دوسرا واجب التعظیم بت اللات تھا، جس نے طائف کی سرزمین میں کفر و شرک کی ظلمتیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس صنم کدے کی تولیت ثقیف والوں کے سپرد تھی جن میں عتاب بن مالک کا خاندان سب سے نمایاں تھا۔ لات کا بُت بھی منات کی طرح عرب کے سارے قبائل میں معظم اور مکرم تھا اور لوگ خیر و برکت کے حصول اور آسمانی اور ارضی آفات سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کے نام اس بُت کے نام پر رکھتے تھے۔ اسلام سے قبل کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ "زید اللات" اور "تیم اللات" زبان زد عام تھے۔

طائف کے میدان میں جو مسجد آج موجود ہے، اس کے بائیں مینار کے بالکل ساتھ ہی یہ بت کبھی نصب تھا۔

عرب کی جاہلی شاعری میں ہمیں بے شمار مقامات پر اس بت اور اس سے لوگوں کی عقیدت و محبت کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً عمرو بن الجُعید نے اپنے ایک شعر میں لات کا ذکر یُوں کیا ہے:

فَاِنِّیْ و تَرْکِی وَصْلَ کَاْسٍ لکالّذی

تبرّأ من لاتٍ و کان يدينها

"میرا ترکِ شراب بلاشُبہ اس شخص کی مانند ہے، جو لات سے بیزاری کا اظہار کرے، درآنحالیکہ وہ اسے اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔"

لات کا بُت ایک مدت دراز تک عربوں خصوصاً اہلِ طائف کی عقیدت کا مرکز و محور رہا۔ پھر جب ۹ ہجری میں بنو ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو اس صنم کدے کے انہدام کے لیے بھیجا، چنانچہ انھوں نے اسے منہدم کر دیا۔

جس وقت شرک اور بُت پرستی کے اس مرکز کا استیصال کیا جا رہا تھا، اُس وقت شدّاد بن عارض الجشمی نے ثقیف والوں کو مخاطب کرکے بآوازِ بلند فرمایا : ؎

لا تنصروا اللات ان اللّٰہ مھلکہا
وکیف نصرکم من لیس ینتصر
ان التی حُرّقت بالنار فاشتعلت
ولم تقاتل لدی احجارھا ، ھدر
ان الرسول متٰی ینزل بساحتکم
یظعن ولیس بہا من اھلہا بشر

"لات کی مدد نہ کرنا، کیونکہ لات کو برباد کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے جس کی قسمت میں کامیابی نہ ہو، تمہاری مدد سے کیا ہوگا۔ جو چیز آگ میں بھسم ہو کر راکھ ہوگئی اور اپنی کوئی مدافعت نہ کرسکی، وُہ یقیناً ناکارہ شے ہے جب حضور سرورِ عالم آپ کی سرزمین میں اپنے مبارک قدم رکھیں گے اور پھر یہاں سے واپس تشریف لے جائیں گے تو ایک متنفس بھی لات کا حامی نہ ہوگا"

اہلِ عرب کی تیسری مشہور دیوی[1] کا نام عزّٰی تھا۔ اس کی پرستش لات و منات کے بعد شروع ہُوئی۔ جاہلی عرب کی تاریخ اس حقیقت کی واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے کہ اس دیوی کے نام پر عربوں نے اپنی اولاد کے نام بہت بعد میں رکھنے شروع کیے تھے۔ چنانچہ عبدالعزّٰی جیسا مرکب اسم پہلے دور میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا تذکرہ عام طور پر ان شعراء کے کلام میں ملتا ہے' جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ذرا پہلے پیدا ہُوئے۔

عزّٰی کی پرستش کا آغاز ظالم بن اسعد کے ہاتھوں ہُوا۔ مکہ سے جو راستہ عراق کی طرف جاتا ہے، اُس پر بُستان سے نو میل کے فاصلہ پر سڑک کے دائیں جانب اس دیوی کا بت نخلۃ الشامیہ کے مقام پر جسے حراض بھی کہتے ہیں، نصب تھا۔ اس بُت کے اردگرد ایک وسیع عمارت تعمیر کی گئی تھی، جسے بُس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس عمارت میں اس دیوی کے حضور میں نذرانے پیش کیے جاتے، اس کی پرستش ہوتی اور غیب سے پُراسرار آوازیں سنانے کے عجیب و غریب انتظام کیے جاتے تھے۔

اس دیوی کا وقار اور احترام مسلسل بڑھتا رہا۔ لوگوں نے دوسرے ناموں کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ اپنی اولاد کے نام اسی دیوی کے نام پر رکھنے شروع کیے۔ چنانچہ ایک ایسا وقت بھی آیا، جب سب سے زیادہ مقدس نام عبدالعزّٰی خیال کیا جانے لگا۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا، جس نے اس بُت کی بندگی پر فخر نہ کیا ہو۔ لیکن اس معاملہ میں جتنی فدائیت اور جاں نثاری

---

[1] حقیقت میں لات و منات بھی ان کی دیویاں ہی تھیں۔

قریش کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے، اس کی نظیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔

عرب کے اس سب سے زیادہ طاقت ور اور با اثر قبیلے کے افراد کعبہ کے گرد طواف کرتے وقت اس بُت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کرتے:

واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری فانھن الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ۔

"قسم ہے لات و عزّیٰ کی اور ان دو کے علاوہ تیسرے منات کی۔ یہی حسین و جمیل رفیع الشان لڑکیاں ہیں، انہی سے شفاعت کے لیے التجا کی جاتی ہے۔"

ان تینوں بُتوں یعنی لات، منات اور عزّیٰ کو اہلِ عرب خدا کی بیٹیاں تصوّر کرتے تھے اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ ان کی شفاعت کے بغیر وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید نے بڑے زور دار الفاظ میں ان کے اس باطل عقیدہ کی تردید کی ہے:

اَفَرَاَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی — تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی۔ (النجم رکوع ۱-۲)	کیا تم نے لات، عزّیٰ اور تیسرے منات کے حال پر غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے، یہ نرے نام ہی نام ہیں، جنھیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرا لیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تو کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ یہ لوگ بے بنیاد خیالات اور اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا انسان کی ہر خواہش اور تمنّا پوری ہو جاتی ہے۔ سو اللہ ہی کے اختیار میں ہے دنیا اور آخرت اور بہت سے فرشتے جو آسمانوں میں موجود ہیں۔ ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر اللہ تعالیٰ جس کے معاملہ میں چاہیں اور جس سے راضی ہوں، اجازت فرما دیں اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔

قریش نے حُریض کے قریب ایک پوری وادی جسے سُقام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے عزّٰی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس وادی کو یہ لوگ بڑی عزت و توقیر سے دیکھتے اور اسے خانہ کعبہ کا ہی ایک حصہ خیال کرتے تھے۔ چنانچہ عزّٰی کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس "وقف" کا ذکر بھی عربی اشعار میں کئی جگہ ملتا ہے۔ ابوجندب الہذلی اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتے ہُوئے عزّٰی اور سقام دونوں کی طرف اپنے ایک شعر میں یُوں اشارہ کرتا ہے: ؎

لَقَدْ حَلَفَتْ جهـدًا يمينًا غليظـةً

بفرع الـتی احمت فـروع سُقَامِ

"اس نے اس ذات کی پختہ اور سچّی قسم کھائی، جس کے لیے سُقام کی وادی وقف کی گئی تھی۔"

اسی طرح درہم بن زید الاوسی نے ایک شعر میں کہا ہے: ؎

انی و رب العـزی السعيـده

و الله الـذی دون بيته سَرِف

"خوش بخت عزّٰی کے رب کی قسم، اس اللہ کی قسم جس کے گھر (اور سقام) کے درمیان سَرِف موجود ہے۔"

عزّٰی کے صنم کدے میں ایک قربان گاہ بھی تھی جسے غبغب کہا جاتا تھا اور جہاں زائرین ہدیے کے جانور لاکر ذبح کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے: ؎

لَقَدْ اُنكِحَتْ اَسْمَاءُ لَحْیَ بُقَـيْرَةٍ

من الْاَدْمِ اهـداها امرؤٌ من بنی غـنم

رأی قذعًا فی عَينها اِذ يَسُو قُـهـا

اِلیٰ غَبْغَبِ الْعُزّٰی وضّـع فی الْقَسَمِ

"اسماء کا نکاح اس بچھڑی کے جبڑے سے کر دیا گیا جسے بنی غنم کے کسی شخص نے چڑھاوا دیا تھا اور جب وہ اسے غبغب عزّٰی کی جانب لے جا رہا تھا اور اسے تقسیم کے لیے کاٹا، تو اس وقت اسے اس کی آنکھ میں عیب نظر آیا۔"

عزّٰی کا صنم کدہ عربوں کے ہاں کتنا مشہور و مقبول اور کس قدر واجب التعظیم تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ قیس بن الحدادیۃ الخزاعی کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے: ؎

تَلَيْنَا بِبَيْتِ اللهِ اَوّل حَلْفَـةٍ

وَ اِلَّا فَاَنْصَابٍ يَسُرْنَ بِغَبْغَبٍ

"ہم سب سے پہلے قسم اللہ کے گھر کی کھاتے ہیں۔ لیکن اگر وُہ مؤثر نہ ہو تو پھر ان مقدس پتھروں کی، جو غبغب کے مقام پر نصب ہیں۔"

اس امر کا فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ لات، منات اور عزّٰی میں عربوں کے نزدیک کونسی دیوی سب سے زیادہ قابلِ تکریم تھی۔ لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قریش کو عزّٰی سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا اور وہ اس کی عزت و تکریم کو اپنا جزوِ ایمان سمجھتے تھے۔

زید بن عمرو بن نُفَیل کا شمار ان سعید روحوں میں ہوتا ہے، جن کی فطرتِ سلیم نے انھیں بُت پرستی سے اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہی بیزار کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بُت پرستی کی پُرزور مذمت کی ہے اور اس سے برأت کا کھلے بندوں اظہار کیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات بڑی آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عربوں کی عقیدت کے کون کون سے مرکز و محور تھے اور وہ کن آستانوں پر اپنی جبینِ نیاز جھکا کر اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں زید بن عمرو بن نُفَیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

ترکت اللات و العزّٰی جمیعاً
کذالك یَفعلُ الجلدُ الصبورُ
فلا العزّٰی اُدین و لا ابنتیھا
ولا صنمی بنی غنم اَزُوْرُ
ولا ھُبَلاً اَزُوْرُ وکان ربّاً
لنا فی الدّھر اذ حلمی صغیر

"میں نے لات اور عزّٰی دونوں کی پرستش سے منہ موڑ لیا ہے اور جری اور بہادر آدمی اسی طرح کرتا ہے۔ میں اب نہ تو عزّٰی کا پرستار ہوں اور نہ ہی اس کی دونوں بیٹیوں کا۔ میں بنی غنم کے دونوں بُتوں کی بھی زیارت نہیں کرتا۔ میں ہُبل کی زیارت اور اس کی پرستش کے لیے بھی نہیں جاتا حالانکہ جب میں سنِ بلوغ کو نہ پہنچا تھا اُس وقت ہم اسے اس دنیا میں اپنا رب تصور کیا کرتے تھے۔"

عزّٰی کے صنم کدہ کی تولیت عرصہ دراز تک مجموعی طور پر بنی سُلَیم کے پاس رہی لیکن اس بُت خانہ کی حفاظت اور دربانی میں بنو شیبان پیش پیش تھے اور اس کام کو اپنے لیے ایک غیر معمولی اعزاز سمجھ کر اسے بڑے خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ اس کی پرستش بھی دوسرے بتوں کی طرح حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بربادی کا حکم صادر فرما دیا۔ اس دیوی کے بارے میں عربوں کے جذبات کتنے نازک تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ اس کا اندازہ اُس صدمے سے لگایا جا سکتا ہے، جو اُنھیں اُس کی مذمت سے پہنچا۔ سورہ النجم کی مشہور آیت اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی جب نازل ہُوئی تو اس سے کفّار کو شدید اذیت ہُوئی اور اس کے نتیجہ میں ابو اُحیحہ (عبد مناف کا پڑپوتا) سخت بیمار پڑ گیا۔ یہی بیماری بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہُوئی۔ اسی دوران میں ابولہب اس کی عیادت کے لیے اس کی خدمت میں پہنچا تو اس نے اسے آہ و فغاں کرتے ہُوئے دیکھا۔ ابولہب نے ابو اُحیحہ سے

کہا، "کیا تو موت سے خوفزدہ ہو کر آنسو بہا رہا ہے حالانکہ اس سے کوئی مفر نہیں"۔ اس پر ابواحیحہ نے جواب دیا: "نہیں مجھے موت کا قطعاً کوئی خوف نہیں اور اس کی وجہ سے میں بالکل پریشان نہیں۔ البتہ مجھے صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد عزیٰ کی پرستش ختم ہو جائے گی"۔ ابولہب نے اسے تسلی دی اور کہا: "یہ محض تمہاری خام خیالی ہے کہ عزیٰ کی تعظیم و تکریم یا اس کی پرستش تمہاری ذات سے وابستہ ہے اور اس بنا پر یہ صرف تمہاری زندگی تک محدود رہے گی اور تمہارے چلے جانے کے بعد لوگ اس دیوی سے منہ موڑ لیں گے"۔

ابواحیحہ نے جب یہ الفاظ سُنے تو اسے بڑی مسرت ہوئی کہ عزیٰ سے عربوں کو خاص طور پر ابولہب کو غیر معمولی عقیدت اور وابستگی ہے۔

تجارت العرب قبل الاسلام

سید شمس اللہ قادری

تجارتِ عرب کی قدامت

نہایت ہی قدیم زمانے میں جن اقوام نے ایک ملک کی پیداوار کو دوسرے ملک کی پیداوار سے پہلے پہل بدل کیا ہے، ان میں خصوصیت کے ساتھ عربوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اہلِ عرب حضرت مسیح علیہ السلام سے صدیوں پیشتر تجارت میں مشغول تھے۔ تورات اور نیز یونان کے نہایت قدیم تصنیفات میں عربوں کی تجارت کے بے شمار حالات موجود ہیں، جس سے ان کے اس پیشہ کی قدامت بہت ہی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔

ایک نہایت ہی قدیم روایت[1] ہے کہ جن لوگوں نے حضرت یُوسف علیہ السلام کو ان کے نامہربان اور سنگدل بھائیوں سے خرید کر مصر کے رئیس فوطیفار کے ہاتھ بیچا تھا، وہ عرب کے قبائل اسماعیل اور مدیان کے تاجر تھے۔

تجارتِ عرب کی وسعت

عربوں کی تجارت جیسی کہ قدیم تھی، ویسی ہی وسیع اور عالمگیر تھی، جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان نے لکھا ہے کہ "اس کی انتہا رُبع مسکون تک پہنچ گئی تھی"۔ چین کے مشرقی سواحل اور مجمع الجزائر سے لے کر جبل الطارق تک عربی تجار کے جہازات کا بیڑا الغرض تجارت پھرا کرتا تھا۔ افریقہ، ایران، ہندوستان، خطا، ترکستان، روس، ایشیائے کوچک وغیرہ کی سرزمین ان کے قافلوں کی جولان گاہ تھی۔

غرض اقصائے عالم کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی اور دو ہزار برس تک ملک عرب تمام عالم کا مرکز تجارت بنا رہا تھا۔[2] اور اسی وجہ سے سکندرِ اعظم نے ارادہ کیا تھا کہ اپنے ملک کا مستقر اور حدود وسط عرب کو بنائے[3] بقول ڈاکٹر لی بان کے زمانہ قدیم

---

[1] تمام علمائے یورپ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت مسیحؑ سے سترہ سو سال پیشتر کا ہے۔

[2] ڈاکٹر لیبان کی فرانسیسی کتاب ص ۶۸

[3] صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب مطبوعہ بیروت ص ۲۹۶

میں عرب نے تمام دنیا میں وہی کام کیا، جو یورپ میں وینس نے نشأۃ الثانیہ کے زمانہ میں کیا تھا۔[1]

دنیا کے وہ ممالک جہاں عرب تجارت کیا کرتے تھے

عربوں کو نہایت قدیم زمانہ سے مصر، ہندوستان، ایران، چین، روم، یونان، افریقہ بابل، فینیکینیا، شام وغیرہ ممالک سے تجارتی تعلق تھا۔ عرب ان ممالک میں بحر و بر دونوں راہوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ بری تجارت کاروانوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ بحری تجارت کے لیے دور دراز مقامات پر جہازات کے ذریعہ سے آیا جایا کرتے تھے اور قرب و جوار میں کشتیوں سے کام لیتے۔ عربوں کی بحری تجارت بری تجارت سے بڑھی ہوئی تھی۔

مصریوں کے عربوں سے تجارتی تعلقات

عصر قدیم میں مصریوں کی تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ نیز عربوں کا تجارتی تعلق بہ نسبت دیگر ممالک کے مصریوں سے نہایت قدیم ہے۔ عنطف[2] رابع نے اپنے زمانہ میں بحر احمر کے سواحل پر ایک تجارتی مشن روانہ کیا تھا، جس کے ساتھ بیش قیمت اشیا، جواہرات، نادر حیوانات تھے۔ اسی طرح مصر کی ملکہ ہتشو نے بھی جہازوں کا ایک بیڑا اس ملک میں بغرضِ تجارت بھیجا تھا۔[3]

عربوں کی تجارت ملکہ ہتشو[4] کے زمانہ میں اور نیز اس کے جانشینوں کے ایامِ حکومت میں نہایت چمکی ہوئی تھی۔ عرب اکثر بحر احمر سے مصر میں جایا کرتے تھے۔ نیز خلیج سوئس سے رودِ نیل تک بھی انھوں نے ایک گزرگاہ بنا لی تھی۔ اہلِ یمن کی تجارت مصر میں انیسویں[5] خاندان کے خاتمہ تک باقی رہی۔ پھر مصریوں نے اپنے ملک میں تاجروں کے لیے بازار بنا لیے۔[6]

---

[1] ڈاکٹر لی بان کی فرانسیسی کتاب کا صفحہ ۹۸ دیکھیے۔

[2] عنطف رابع مصر کا بادشاہ تھا جو عہد بینا رین کے بعد گزرا ہے۔ اور یہ مصر کے گیارھویں شاہی خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں نو فرمانروا گزرے ہیں، جن میں پہلے (۶) کا لقب عنطف تھا اور آخر (۳) کا منطوہوتپ۔ یہ خاندان بقول پیٹری ۳۰۰۵ء سے ۲۷۷۸ء قبل مسیح تک فرمانروائی کرتا رہا۔

[3] تاریخ القدیم مطبوعہ بیروت ص ۱۹۶

[4] ملکہ ہتشو جس کا پورا نام ہتشت ہے، مصر کے اٹھارھویں شاہی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ آمس اول ہے جس نے ۱۵۸۶ء سے ۱۵۶۲ء تک محکم حکومت کی۔ اس کے بعد امینوس تھوتمس اول و دوم حکمران ہوئے جن میں تھوتمس دوم کی حکمرانی چند ہی یوم کی تھی تھوتمس دوم کے بعد ملکہ ہتشو کی حکومت کا زمانہ آتا ہے۔

[5] مصر کے انیسویں شاہی خاندان کا آغاز ۱۳۷۵ء ق م سے اور خاتمہ ۱۲۰۰ء ق م میں ہوا ہے۔ اسی خاندان کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

مصری ہندوستانیوں سے براہِ راست تجارت نہیں کرتے تھے، بلکہ ہند کا مال واسباب عربوں سے خرید کرتے تھے۔ عرب مصر سے غلوں کے دانے، مویشی، برتن، شیشہ وغیرہ ہندوستان میں لایا کرتے تھے اور ہند سے خوشبو، پنبہ، یاقوت وغیرہ اشیا مصری چیزوں کے تبادلہ میں لیا کرتے تھے[۱]

صورئین اور عربوں کے تجارتی تعلقات

صور[۲] کے باشندوں اور عربوں کے درمیان بھی قدیم الایام سے تجارتی تعلقات ہیں۔ اس ملک میں عرب خشکی اور تری کے دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ اہلِ یمن کی تجارت عرب والوں کے ساتھ کئی راستوں سے تھی۔ خشکی کے راستہ سے حجاز سے ہوتے ہوئے قافلوں کے ذریعہ اپنے مال واسباب لے جایا کرتے تھے اور ان کا بحری راستہ خلیج عقبہ سے تھا۔ کبھی کبھی صور وصیدا کے راستوں سے بھی جایا کرتے تھے۔ صورئین اگرچہ فنِ جہازرانی کے خوب ماہر تھے تاہم بحر احمر اور بحر ہند کے خطرات سے خائف تھے۔ اس وجہ سے ان ممالک کی پیداوار عربستان بالخصوص جنوبی عرب (یمن) کے باشندوں سے لے جایا کرتے تھے[۳]

یمن اور عدن والے صور میں جن اشیا کی تجارت کرتے تھے وُہ ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور طرح طرح کے قیمتی پتھر، کمخواب، سونا، چوغے ارغوانی، منقش پوشاکیں اور سب طرح کے بُوٹی دار کپڑے تھے[۴] اہلِ حجاز کی تجارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایامِ حکومت میں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لے گئے۔ بیسویں خاندان کے زمانہ حکومت میں سے جس کی مدتِ حکومت ۱۲۰۰ ق م سے ۱۰۹۰ ق م تک ہے۔ مصریوں کی تجارت اہلِ فینیکیہ کے ہاتھوں میں تھی اور یہ لوگ مصر کے تاجروں کو دور دراز ممالک سے اشیا لا کر دیا کرتے تھے فینیکیہ کی تباہی کے بعد سے پھر عرب تاجروں کو مصر میں عروج ہوا۔ ۵ تاریخ القدیم مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۹۶

[۱] سیاحۃ المعارف مطبوعہ بیروت کا صفحہ ۵۔

[۲] صور، ساحل شام پہ کوہ البنان اور بحرالابیض کے درمیان واقع ہے۔ اس کا طول ایک سو پچاس میل اور عرض چوبیس میل ہے اس ملک کے بیت السلطنت کا نام صور تھا۔ اسی مناسبت سے تمام ملک کو عبرانی اور عربی صور کہتے ہیں۔ یونانی اس کو فینیکیہ کہتے ہیں اسی لفظ سے انگریزی کا لفظ فونیشیا نکلا ہے اور صورئیین قدیم الایام سے معاملات وادوستد میں مشغول پائے جاتے ہیں (یعنی بیت السلطنت) جو لبِ دریا تھا۔ اپنی تجارت اور رونق کے لحاظ سے ملک صور کے تمام شہروں سے نامور اور مشہور تھا۔ حضرت حزقیلؑ نے جو مسیح سے چھ سو برس قبل گزرے ہیں، صور کی تجارت اور اس کی رونق وخوبصورتی کا نہایت دلچسپ اور حیرت انگیز تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اقصائے عالم کے تجار بغرض لین دین کے آیا کرتے تھے (صحیفہ حزقیل کا باب ۲۷ ملاحظہ کیجیے)۔ صور حضرت مسیحؑ سے چھ سو برس قبل تباہ ہوگیا۔

[۳] تاریخ القدیم ص ۱۹۶ [۴] کتاب مقدس میں حزقیلؑ کی کتاب کا باب ۲۷ آیۃ ۲۲ سے ۲۴ تک۔

بھیڑ، مینڈھے، بکریوں کی تھی[۱] گوہر، شب چراغ، ارغوانی اور زردوزی کتان مرجان وغیرہ کو ادوم[۲] کے باشندے صور کے بازاروں میں لایا کرتے تھے[۳]

بنی اسرائیل[۴] سے عربوں کے تعلقات

بنی اسرائیل کے دُور دراز ممالک سے تجارتی تعلقات نہیں تھے وہ صرف اپنے ہمسایہ ممالک سے لین دین کیا کرتے تھے۔ رومانی یونانی اشیا کی خرید کے لیے فینیکیا تھا۔ ایرانی اسباب خالدیا سے لیا کرتے تھے اور عربی پیداوار ہند اور چین کے سامان عربوں سے لیتے تھے۔

بنی اسرائیل اور عربوں کے مابین جو تجارت ہوتی تھی اس کا ذکر تورات میں کئی مقام پر آیا ہے۔ منجملہ ان کے ایک نہایت مشہور واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا حیرام کی شرکت سے براہ سمندر ادفیر[۵] سے سونا منگوانا ہے[۶]

بابل[۷] والوں سے عربوں کے تعلقات

بابل کو اہلِ عرب کاروانوں کے طریقہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ ان کے کاروان عرصہ دراز تک مقیم رہا کرتے تھے[۸]

---

[۱] حزقیل کی کتاب باب ۲۷ آیۃ ۲۱ ۔

[۲] ادوم کو، جسے دومہ بھی کہتے ہیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے چھٹے فرزند دوماہ نے آباد کیا تھا۔ عرب اس کو دومۃ الجندل کہتے ہیں اور یہ نجد میں واقع ہے۔

[۳] صحیفہ حزقیل باب ۲۷ آیت ۱۶۔

[۴] بنی اسرائیل کا ملک وہ ہے جس کو عرب کنعان اور یہودی خنعن اور یونانی فلسطین اور فلسطیا کہتے ہیں۔ یہ ملک ان کے جنوب، بیرشبع کے شمال، بحرالابیض کے مشرق، صحرائے آرام کے جنوب میں واقع ہے۔

[۵] ادفیر کے جائے وقوع میں اکثر علما اختلاف کرتے ہیں لیکن عام طور پر یہ شہر حضر موت میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

[۶] دوم تواریخ باب ہشتم آیۃ ۱۷ سے ۱۹ تک۔

[۷] بابل، جس کو ایرانی کسدیم اور یونانی خالدیا اور اسوریا کہتے ہیں، وہ ملک ہے جو سواحلِ فرات اور دجلہ پر واقع ہے۔ بابل والوں کے تجارتی تعلقات، جو ہندوستانیوں اور ایرانیوں سے تھے وہ قابلِ بیان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے شمالی ممالک سے براہ بحر و بر تجارت کیا کرتے تھے۔ بحری راستہ خلیج فارس سے تھا، جس کے درمیان شیراز پڑتا تھا۔ اس راہ سے سندھ، ملتان، گجرات وغیرہ ممالک میں آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بری راستہ ایران اور افغانستان سے ہوتا ہوا جاتا ہے۔

[۸] یشعیا علیہ السلام کی کتاب۔ باب ۱۳۔ آیت ۲۰۔

خالدین عربوں سے عرب کی پیداوار، جنوبی ہندوستان، چین، افریقہ وغیرہ ممالک کی اشیا خرید کیا کرتے تھے[1] اور عرب ان سے شمالی ہند، ایران، ترکستان وغیرہ ممالک کی پیداوار تبادلہ میں لیا کرتے تھے۔ عربوں کی تجارت خالدین سے تباہی بابل تک نہایت عروج پر تھی۔

ایرانیوں سے عربوں کے تجارتی تعلقات

قدیم زمانہ میں اہلِ عرب جنوب کے ایرانیوں سے براہ بحرین شہر گیرا سے تجارت کیا کرتے تھے[2] تباہی بابل کے بعد شمالی ایران میں عربوں کی آمد و رفت کو ترقی ہوئی ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں[3]، جب کہ عراق عرب دولت عجم کے ماتحت ہو گیا تھا، عربوں کو ایرانی تجارت میں نہایت عروج حاصل تھا۔ چنانچہ ان ایام میں شہر مداین[4]، جو عراق عرب میں ہے ایران کی تجارت کا مرکز تھا۔

چین سے عربوں کے تجارتی تعلقات

اہلِ عرب چین[5] کو بحری اور برّی دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بحری راستہ سواحل عرب یا

---

[1] تاریخ قدیم ص ۸۰۔

[2] مورّخ استرابو کی یونانی زبان کی تاریخ ص ۱۱۰۔

[3] زمانہ وسطیٰ سے حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسیح علیہ السلام کے مابین کا زمانہ اور بالخصوص چوتھی اور چھٹی صدی مسیحی کا درمیانی زمانہ مراد ہے۔

[4] مداین بغداد سے ایک منزل کے فاصلہ پر جانب جنوب آباد تھا۔ زمانہ قدیم میں اس کو طیسیفون کہتے تھے۔ نوشیروان نے اس کو اپنا مستقر قرار دیا تھا۔ اسی شہر میں ایوانِ کسریٰ کے کھنڈرات تھے۔ صناجۃ الطرب والا لکھتا ہے کہ اس کے ایک ستون سے دوسرے ستون تک ۹۵ ہاتھ کا فاصلہ تھا اور اس کی بلندی ۸۰ ہاتھ تھی۔

[5] مورخ رشید الدین لکھتا ہے کہ ملک چین کے دو حصے تھے۔ خطا و صین الصین' دریائے ہوانگ ہو کے شمال میں، جو ایک ملک ہے وہ خطا کہلاتا تھا اور اس کا بیت السلطنت خان بالغ تھا۔ ہوانگ ہو کے جنوبی ملک کو صین الصین کہتے تھے اور اس کا دار السلطنت خنسا تھا۔ خنسا میں جو عرب آیا کرتے تھے وہ زیادہ تر ایران، ترکستان، منگولیا وغیرہ ہوتے ہوئے خشکی کے راستہ آتے تھے۔ خان بالغ، ابنِ بطوطہ وغیرہ اور صاحبِ تقویم البلدان (کے مولف) نے اس مقام کا نام خانفو بھی لکھا ہے۔ حال کے جغرافیہ میں اس کو پیکن کہتے ہیں۔ صین الصین، اس کو عرب صین الکبیر بھی کہتے ہیں۔ مارکو پولو نے اس کا نام ماچین لکھا ہے۔ حال کے جغرافیہ میں اس کا نام کینٹن لکھتے ہیں۔ خنسا جس کو اس وقت ہوانگ چو کہتے ہیں چین کا بہت بڑا اور بارونق شہر ہے۔ پہلی صدی میں جو عربی تاجروں کے جہازات چین میں آتے تھے ان کے قیام کی جگہ یہی شہر تھا۔

خلیج فارس کے سواحل سے شروع اور براہِ راست چین تک منتہی ہوتا تھا، جس کے اثنا ے راہ میں سواحل ہند، سیلان، سیام، مجمع الجزائر وغیرہ پڑتے تھے۔ بری راستہ ایران، دشت قفچاق، ترکستان، بکتریا وغیرہ ممالک سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔[1]

عرب مسیحؑ سے صدیوں پیشتر چین میں بغرضِ تجارت آیا جایا کرتے تھے۔ مسٹر آرنولڈ لکھتا ہے کہ عربوں کی تجارت کو مسیحؑ سے ایک صدی پیشتر چین میں کمال عروج تھا۔

عربوں کی تجارت چین کے اور شہروں کی بہ نسبت زیادہ تر صین الصین میں تھی۔ اس شہر میں اس وقت بھی قدیم عربوں کے بلیے ایک آثار موجود ہیں، جن کے منجملہ ایک حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا مرقد مبارک ہے۔[2]

چین[3] میں عربوں کی تجارت جواہرات، مرجان، فرش اور سُوتی کپڑے کی تھی اور ان اشیا کے تبادلہ میں وہاں سے اطلس، کمخواب، ظروفِ چینی، چائے، ادویہ وغیرہ لیتے تھے اور صین الصین سے چائے، افیون، سیماب، شورہ، ٹین، جواہرات لیا کرتے تھے۔[4]

ہندوستان اور سیلان سے عربوں کے تجارتی تعلقات

عرب ہندوستان کو بری اور بحری دونوں راستوں سے آیا جایا کرتے تھے۔ بری راستہ ایران، سمرقند، کشمیر سے ہوتا ہوا ہند کو جاتا تھا۔ بحری راستہ سراف اور عدن سے تھا۔[5]

خشکی کے راستہ سے ان لوگوں کی تجارت، کشمیر، قنوج وغیرہ ممالک میں ہوتی تھی۔ بحری راستہ سے سندھ، ملیبار[6]

---

[1] یہ راستہ ڈاکٹر لی بان کی کتاب لا سویلزیشن اور نخبۃ الدہر فی عجائب البر والبحر مطبوعہ پیٹرس برگ سے اخذ کیا گیا ہے۔

[2] ملاحظہ کیجیے ٹائمز آف انڈیا مطبوعہ ۱۲ ستمبر ۱۸۹۵ء میں عماد نواز جنگ بہادر کی بیوی جمیلہ بیگم صاحبہ کا مضمون "ایک ترکی سلطانہ کی ملاقات"۔ بیگم صاحبہ نے اس قبر کو بچشم خود دیکھا ہے۔ نیز اس شہر کے متعلق یہ بھی لکھتی ہیں کہ یہاں سات لاکھ مسلمان آباد ہیں اور نیز چار نہایت قدیم مسجدیں ہیں، جن کو یہاں کے مسلمان کعبۂ شرقی خیال کرتے ہیں۔

[3] ڈاکٹر لی بان کی کتاب لا سویلزیشن دس عربس ص ۶۰۳۔

[4] تاریخ چین ص ۱۴۔

[5] لا سویلزیشن دس عربس ص ۶۰۲۔

[6] لفظ "ملیبار" کے معنی "پہاڑی ملک" ہیں۔ اس کو قدیم زمانہ میں "کرالہ" کہتے تھے۔ راس کماری سے گوا تک کا مشرقی ساحل ملیبار کہلاتا ہے۔

سیلان[1] وغیرہ ملکوں میں تجارت کیا کرتے تھے۔ عرب شمالی ہند اور کشمیر وغیرہ سے بارود، پنبہ، افیون، اون، حریر، مُشک، ریوند چینی اور پشمینہ وغیرہ خرید کرتے تھے[2] اور جن چیزوں کو ملیبار اور سیلان سے خرید کرتے تھے، وہ طرح طرح کے گرم مصالحے، لونگ، الائچی، مرچ، زیرہ، عطریات، دارچینی، جواہرات، نیز دیگر معدنیات، حیوانات اور ناریل وغیرہ اشیا تھیں[3]

عربوں کا تجارتی تعلق ہندوستان سے نہایت قدیم ہے۔ بقول ڈاکٹر گستاولی بان کے جس کا آغاز ابتدا زمانہ تاریخی سے ہوتا ہے[4]، عرب ہندوستان کے جن شہروں میں سب سے پہلے تجارت کی غرض سے آئے وہ سندھ، ملیبار، سیلان تھے اور یہ ہی مقامات ان کی خاص تجارت گاہیں تھیں۔

افریقہ اور عربوں کے تجارتی تعلقات

عرب قدیم الایام سے سواحلِ افریقہ پر تجارت کیا کرتے تھے۔ یہاں حبشہ[5] اور کارتھج[6] ان کی تجارت کے مشہور مقامات تھے[7]۔ اہلِ یمن حبشہ کو عدن سے اور اہلِ حجاز جدّہ سے آیا جایا کرتے تھے۔ کارتھج کا بحری راستہ بحر الروم سے تھا[8]۔ مورخ استرابو

---

[1] سیلان ہندوستان کے جنوب میں ایک جزیرہ ہے۔ اس کے اور ہندوستان کے درمیان چالیس میل کا فاصلہ ہے۔ رامچندر جی کی بیوی سیتا کو، جو راون چرا کر لے گیا تھا، وہ اسی جزیرہ کا بادشاہ تھا۔ ہندو لوگ اس کو لنکا کہتے ہیں۔ سراندیپ بھی اسی کا نام ہے۔

[2] سیاحۃ المعارف ص ۱۰۰

[3] تحفۃ المجاہدین

[4] لاسویلزیشن دس عربس ص ۵۰۶

[5] عرب جس کو حبشہ کہتے ہیں، وہ ملک اس وقت ابی سینا اور نوبیہ کہلاتا ہے۔ یونانیوں نے اس کا نام ایتھوپیا رکھا ہے۔ ایتھوپیا دو لفظوں سے مرکب ہے جس کے معنی ہیں "جلا ہوا چہرہ"۔ یہ نام انھوں نے اس کو اس وجہ سے دیا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے چہرے تمازتِ آفتاب کی وجہ سے سیاہ ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ حبشی اور سیاہ فام مخلوق قدیم زمانہ میں مہذب تھی اور ہندوستان اور عرب سے اس کی بہت بڑی تجارت تھی۔ زمانہ وسطیٰ میں عربوں کو حبشیوں سے خاص تعلق تھا کیونکہ ان لوگوں کی یمن میں عرصہ تک حکومت رہی تھی۔

[6] کارتھج ایک قدیم شہر ہے جو افریقہ کے شمال میں واقع تھا، جہاں اب ٹیونس آباد ہے۔ صورئین نے ۸۵۳ قبل مسیح اس کی بنا ڈالی تھی۔ ۱۴۶ء میں رومیوں نے اس کو برباد کیا۔ وہ عربی تجار، جو یونان کو آیا جایا کرتے تھے، یہاں بھی جاتے تھے۔

[7] تاریخ الاسلام ص ۶، مطبوعہ گورکھپور

[8] استرابو یونان کا مشہور جغرافیہ دان ہے۔ ۵۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا ۲۴ء میں مرا۔

نے کہا ہے کہ افریقہ میں عربوں کی آمد و رفت جیرہ[۱] کی طرف سے ہوتی تھی[۲]

عربوں اور یونانیوں کے تجارتی تعلقات

عربوں اور یونانیوں[۳] کے مابین جو تجارتی تعلق تھا، نہایت قدیم تھا۔ مورخ ہیرو دوٹس[۴] کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے زمانہ میں یونان میں عربوں کی تجارت عروج پر تھی۔

یونانیوں کے ہاتھ عرب قسم قسم کے مصالحے، خوشبودار اشیا، ملبوسات، جواہرات وغیرہ فروخت کیا کرتے تھے۔ جن کو وہ لوگ ہندوستان، چین اور اپنے ملک سے لاتے تھے[۵] مورخ ہیرودوٹس لکھتا ہے کہ ایلوا اور لوبان کی تجارت یونانیوں سے صرف عرب ہی کرتے تھے اور یہ اشیا ان کو عربوں کے سوا کسی اور سے نہیں ملتی تھیں[۶]

استرابو نے بھی یونانیوں اور عربوں کے تجارتی تعلقات کا ذکر کیا ہے اور ان تمام اشیا کو جن کی تجارت اہلِ عرب یونان میں کیا کرتے تھے، عربستان کی پیداوار بتلاتا ہے۔

عربستان کی تجارت گاہیں

عربستان کے کئی شہر تجارت کی منڈیاں تھے، جہاں اقصائے عالم سے مال و اسباب آیا جایا کرتا تھا۔

ملک یمن: عرب میں یمن کی تجارت نہایت قدیم ہے[۷] نیز یہاں کے سوداگر جیسے اعلیٰ درجے کی اشیا فروخت کرتے تھے ویسے

---

[۱] استرابو نے اس کا تلفظ گیرا لکھا ہے۔ جرمنی کے ضمیمہ مراصد الاطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عربی تلفظ جیرہ ہے اور یہ شہر بحرین میں خلیج فارس کے کنارے واقع تھا۔

[۲] دیکھیے استرابو کی یونانی زبان کی تاریخ کا صفحہ ۱۱۱۰۔

[۳] یونانی اپنے ملک کو جسے انگریز گریک بولتے ہیں، ہیلاس کہتے تھے (دیکھیے یونانی اور فارسی زبانوں میں اعمال الرسل باب ۲۰ آیۃ ۲) اور خود کو ہیلانسس کہا کرتے تھے۔ اور یونان ان نو آبادیوں کا نام رکھا تھا، جن کو انھوں نے بحر الاسود اور بحر الروم کے مابین آباد کیا تھا۔ اس کو وہی لوگ ہی منکر آسیا بھی کہتے تھے۔ عرب اس کو جزآسیا، الصفراے کہتے ہیں۔ وہ لعینہٖ منکر آسیا کا ترجمہ ہے۔ عرب ہیلاس کو یونان کہتے ہیں لیکن ہمارے اس مضمون میں یونان سے ہیلاس اور ایطالیہ دونوں ملک مراد ہیں۔

[۴] ہیرو دوٹس یونان کا مشہور مورخ ہے جس کو ابو المورخین کہتے ہیں۔ ۴۸۴ ق م میں فوت ہوا۔

[۵] لا سویلزلیشن دس عربس۔

[۶] تاریخ ہیرودوٹس کا فرنچ ترجمہ صفحہ ۲۰۰۰۔

[۷] لا سویلزلیشن دس عربس۔

اقصائے عالم کے تمام سوداگروں سے بھی میسر نہیں آتی تھیں [1]

عدن : عدن یمن کی مشہور تجارت گاہ ہے۔ ڈاکٹر گستاولی بان ادریسی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ عدن میں سندھ، ہندوستان اور چین سے طرح طرح کے بیش قیمت اسباب آیا کرتے تھے۔ جوہردار تلواروں کے پھل، رنگا اور پکایا ہوا چمڑا، زرہ، مشک، زین، فلفل سیاہ، ناریل، پوست، الائچی، دارچینی، گلنگہ، جوزی، ہڑ، آبنوس، سنگ پشت کی ہڈی، کافور، جائفل، لونگ، کباب چینی اور انواع واقسام کے نباتات کے ریشوں کا بنا ہوا کپڑا، اعلیٰ درجے کا مخمل، عاج رانگا، بید، مختلف اقسام کے گیا اور ایلوا۔

جیرہ : یہ شہر بحرین میں تھا اور بہت بڑی تجارت گاہ تھا۔ یہاں ایران، شیراز، سندھ، ہندوستان، افریقہ سے سامان آیا جایا کرتا تھا۔

فجا [2] : یہ شہر قہوہ کی مشہور تجارتی منڈی تھا اور یہاں سے اقصائے عالم میں قہوہ جایا کرتا تھا۔

صنعا [3] : یہ شہر عرب کے مشہور بلاد سے ہے قدیم زمانہ میں شاہان یمن کا بیت السلطنت ہونے کی وجہ سے بہت بڑی تجارت [4] گاہ تھا۔

احسا [5] : اس شہر میں خرموں کی تجارت ہوتی تھی۔

قطیب [6] وکاظمہ : ان دونوں شہروں میں موتی کی تجارت ہوتی تھی۔

ظفار [7] : یہ شہر بھی مشہور تجارتی مقام ہے۔ اہل یمن یہاں سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے [8] اسی وجہ سے اس علاقہ میں ہندوستان کے اکثر درخت مثل ناریل، پان وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

ملک حجاز : حجاز میں دو شہر تجارت کے لیے نہایت مشہور تھے : مکہ، جدہ۔

مکہ : شہر مکہ حجاز میں بہت بڑی تجارت گاہ تھا۔ یہاں قریش کے بڑے بڑے تجار رہتے تھے اور نیز یمن، شام، عراق، مصر وغیرہ ممالک سے تجارتی کارواں آیا جایا کرتے تھے۔

جدہ : اس شہر سے اہل حجاز بحری تجارت کیا کرتے تھے اور یہیں سے ان لوگوں کی تجارت حبشہ، مصر، صور، افریقہ وغیرہ ممالک سے ہوتی تھی۔

---

[1] دوم سفر الایام۔ باب ۹ ۔ آیۃ ۹ ۔

[2] لا سویلزیشن دس عربس ص ۲۱ ، اور صناجۃ الطرب ص ۱۲

[3] صناجۃ الطرب ص ۱۱

[4] ایضاً ص ۱۲

[5] ایضاً

[6] یہ شہر حضرموت میں بحرِ ہند پہ واقع ہے۔

[7] صناجۃ الطرب ص ۱۳

خیبر[1] : خیبر میں خرموں کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ یہاں خرمے اس کثرت سے ہوتے تھے کہ ان کی کثرت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ ایک شاعر کہتا ہے : ؎

فانك واستبضاعك الشعر نحوا
لمستبضع تمرالی ارض خیبرا

عراق عرب : عراق عرب کے بھی کئی ایک شہر بڑے بڑے تجارت گاہ تھے۔ حیرہ، ابلہ وغیرہ۔

حیرہ[2] : عراق میں تجارت کے لیے یہ شہر سب سے زیادہ مشہور مقام تھا۔ یہاں ہندوستان، چین، ایران وغیرہ ممالک کے مال و اسباب آیا کرتے تھے[3]۔

ابلہ[4] : یہ شہر فرات اور دجلہ میں چلنے والے جہازوں کا لنگر گاہ تھا۔ یہاں بھی سندھ، ہندوستان، شیراز سے مال و اسباب آیا کرتا تھا[5]۔

مدائن : یہ شہر خاص کر ایرانی اشیا کی تجارت کے لیے نہایت مشہور تھا۔

ارض شام : زمانہ قدیم میں شام کی تجارت گاہ تدمور، بعلبک، دمشق وغیرہ تھا۔

تدمور[6] و بعلبک[7] : یہ دونوں شہر شام کے نہایت مشہور تجارت گاہ ہیں۔ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔

ڈاکٹر لی بان[8] لکھتا ہے کہ خالدین کا ہندوستان سے خشکی کی راہ نیز خلیج فارس کی طرف سے تجارتی تعلق تھا۔ یہ لوگ وہاں سے

---

[1] خیبر نہایت قدیم شہر ہے۔ اس کو عمالقہ نے آباد کیا تھا۔ ایام وسطی میں یہاں یہودی بستی تھی۔

[2] حیرہ سواد عراق کے کنارے آباد تھا، جس کو تُبّع نے، جو یمن میں عمالقہ کے بعد بادشاہ ہوا ہے، بخت نصر کے زمانہ میں آباد کیا تھا۔ نُعمان بن مُنذر کی اولاد سے جتنے بادشاہ لخمئین گزرے ہیں، ان کا پایۂ تخت رہا ہے۔ یہاں کے بادشاہ اردشیر بابکان کے وقت سے دولتِ عجم کے ماتحت ہو گئے تھے۔

[3] دیکھیے سید علی صاحب بلگرامی کا مضمون عربوں کی تجارت پر۔

[4] ابلہ دریائے فرات اور دجلہ کے مقام اتصال پر واقع ہے۔

[5] دیکھیے سید علی صاحب کا مضمون عربوں کی تجارت۔

[6] تدمور عبرانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھجور۔ یونانی اس شہر کو پالمیرا کہتے ہیں۔ یونانیوں نے گویا تدمور کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیونکہ پالمیرا کے معنی مدینۃ النخل ہیں۔ تدمور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملکہ زنوبیا کے عہد تک یعنی تیسری صدی عیسوی تک آباد تھا۔ پھر ویران ہو گیا ہے۔

[7] اس کا قدیم نام بعلت ہے۔ یونانی اس کو ہیلیو پوس کہتے ہیں۔ یہ شہر ویران ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے آثار موجود ہیں۔

[8] دوم کتاب ایام باب ہشتم ص ۴ - ۶

جو مال و اسباب لاتے تھے شام میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اور یہ کارواں قدیم بعلبک تدمور نیرویا کے تجارت گاہوں میں آیا کرتا تھا۔[1]

تدمور کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس غرض سے تعمیر کیا کہ تجارت گاہ کا کام دے۔ جہاں آرام، فرات کے سوداگر مصری تاجروں کے ساتھ اپنے تجارتی مال و اسباب بدلا کریں۔ رومیوں کے زمانہ میں ہندوستان کی پیداوار بھی اسی شہر سے روم میں جایا کرتی تھی۔[2]

عربستان: عربستان کے بازار عرب میں کئی ایک بازار بھی تھے۔ ان میں اگرچہ باہمی تفاخرہ اور شعرخوانی وغیرہ کا بھی بازار گرم رہا کرتا تھا، لیکن ان کے کھولنے کی اصلی غرض سلسلہ خرید و فروخت تھی۔

سوقِ دومۃ الجندل: یہ بازار ماہ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو دومۃ الجندل میں لگا کرتا تھا۔

سوقِ ہجر: یہ بازار ارض حمیر میں ۹ ربیع الثانی میں کھولا جاتا تھا۔

سوقِ عمان: یہ بازار جمادی الاوّل کے آخر ایام میں ارض حمیر میں کھولا جاتا تھا۔

سوقِ مشقر: یہ بازار قلعہ مشقر[3] میں بماہ جمادی الاخریٰ میں ہوتا تھا۔

سوقِ صحار: صحار[4] میں ماہ رجب میں کھولا جاتا تھا اور ۵ ایوم تک رہتا تھا۔

سوقِ عدن: یہ بازار اوائل رمضان میں کھلتا تھا۔

سوقِ صنعا: یہ بازار اواخر رمضان میں ہوتا تھا۔

سوقِ حضرموت: یہ بازار ذیقعد میں لگتا تھا۔ یعقوبی نے اس کا نام الرابیۃ لکھا ہے۔[5]

سوقِ حباشہ: یہ بازار دیار بارق[6] میں سال میں دو مرتبہ: ایک موسم حج میں اور دوسرا رجب میں ہوتا تھا۔

سوقِ عکاظ: یہ بازار عرب کے تمام بازاروں سے بڑا اور مشہور تھا۔ اس کا افتتاح طائف میں[7] ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے ہوتا تھا اور کامل ایک ماہ بیس روز تک کھلا رہتا تھا، جس میں عرب کے تمام قبیلے جمع ہوا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے ہفتہ میں ایک دفعہ یک شنبہ کے روز بھی کھلتا تھا جس میں قریب قریب کے لوگ آتے جاتے تھے۔ عکاظ میں سوداگروں سے

---

[1] لا سویلزیشن دس عربس۔

[2] دیکھیے بلانیکس بائبل ہسٹری کا باب نہم فصل چہارم فقرہ ۶۔

[3] یہ قلعہ ملک بحرین کا ایک مشہور قلعہ ہے۔

[4] صحار شہر عمان کا قصبہ ہے اور بحرین میں واقع ہے۔ (تقویم البلدان مطبوعہ یورپ کا صفحہ ۸۴ دیکھیے)

[5] تاریخ یعقوبی مطبوعہ یورپ صفحہ ۳۱۲ جلد اوّل۔

[6] دیار بارق قنونا میں واقع ہے اور قنونا مکہ سے یمن کی طرف ہے۔

[7] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت صفحہ ۲۹۹

ایک قسم کا ٹیکس بھی لیا جاتا تھا جس کو عرب مکس کہتے تھے۔

علاوہ ان بازاروں کے اور دو بازار ہیں: ایک سوق مجنۃ۔ دوسرا سوق الشحر[1]۔ ان کی تاریخِ افتتاح وغیرہ معلوم نہیں۔ لیکن بلوغ الارب سے اتنا معلوم ہوتا ہے پہلا بازار قصبہ مجنۃ میں، جو مکّہ کے قریب ہے لگتا تھا۔ اور سوق الشحر کے دو مقام تھے، ایک ملبع جو بحرین میں ہے، دوسرا حصات۔[2]

عربوں کے تجارت پیشہ قبائل

عربوں کی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ تجارت تھا۔ اس لیے کم و بیش تمام عرب تجارت پیشہ پائے جاتے تھے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ حجاز، یمن، عمان، بحرین کے باشندوں کی تجارت بہت بڑھی ہوئی تھی۔[3]

عرب بائدہ: ہم نہیں بتلا سکتے کہ عرب بائدہ کی کون کون سی قومیں تجارت پیشہ تھیں کیونکہ ان کا زمانہ ہم سے نہایت دور ہو گیا ہے جس سے ان کا کوئی حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عمالقہ، عاد، ثمود، حمیر وغیرہ، جو عرب بائدہ کے مشہور متمدن اقوام ہیں، ضرور تجارت کرتے ہوں گے۔

بنی قحطان: بنی قحطان (یہ لوگ تورات میں یقطان کہلاتے ہیں) جو عرب بائدہ کے بعد آ کر نواحی یمن میں آباد ہوئے۔ ان کے بیشتر قبائل تجارت و زراعت پیشہ تھے۔ ان لوگوں کی تجارت نہایت وسیع تھی اور ایسی اعلیٰ اشیا کی تجارت کیا کرتے تھے، جو اقصائے عالم میں کمیاب ہوتی تھیں۔[4]

بنی اسمٰعیل: بنی اسمٰعیل بھی تجارت پیشہ تھے۔ یہ لوگ مسیح سے سترہ سو سال قبل ایک ملک کی پیداوار کو دوسرے ملک کی پیداوار سے تبادلہ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں چنانچہ ایک قدیم روایت کے مطابق، جس قافلہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سنگدل بھائیوں سے خرید کر مصر میں فروخت کیا تھا وہ اسماعیلیوں ہی کا قافلہ تھا جو جلعاد سے گرم مصالحے، روغن بلسان لے کر مصر جا رہا تھا۔[5] بنی اسمٰعیل اپنی تجارت کی بدولت اس قدر مالدار تھے کہ ان کی دولت و حشمت ضرب المثل ہو گئی تھی۔[6]

---

[1] طائف نامی مکّہ سے ۴۰ میل پر ایک پُرفضا قصبہ ہے۔

[2] بلوغ الارب فی احوال العرب مطبوعہ بغداد جلد اوّل صفحہ ۳۸۳، ۳۸۴۔

[3] ایضاً جلد ثالث ص ۴۰۵

[4] سفر الایام باب ۹ آیۃ ۹

[5] سفر تکوین باب ۳۷

[6] سفر یشعیاہؑ۔ باب ۲۱ - آیۃ ۱۶

بنی اَدُوم : بنی اُدوم بھی عرب کے مشہور سوداگر تھے۔ چنانچہ ان کا شہر دومتہ، جس کو دُومتہ الجندل بھی کہتے ہیں، زمانۂ قدیم سے شمال اور جنوب کے درمیان یعنی ایک سمت آرام اور بابل اور دُوسری طرف ہند اور مصر کے سلسلہ تجارت کو جاری رکھنے کے لیے شاہراہ کا کام دیتا رہا۔[1]

قبیلہ قریش : ایام وسطی میں تمام عرب میں اسمٰعیلیوں کے قبیلہ قریش کی تجارت نہایت وسیع تھی جس کی وجہ سے یہ قبیلہ تمام عرب میں نہایت دولت مند اور صاحب ثروت مانا جاتا تھا۔

اس قبیلہ کا لقب قریش اس کے تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مورخ ابن خلدون قریش کی وجہ تسمیہ میں لکھتا ہے کہ قرش کے لغوی معنی کسب اور جمع کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ تجارت اور کسب کیا کرتے تھے اس وجہ سے ان کا نام قریش ہوا۔[2]

قریشیوں کی تجارت کے مرکز شام، یمن، حبشہ، فارس، مصر وغیرہ ممالک تھے۔ قریش شام کو موسم گرما میں جایا کرتے تھے۔ کیونکہ گرمی کا زمانہ شام میں کسی قدر آرام سے گزرتا تھا۔ اور وہاں اس فصل میں آب و ہوا اچھی ہوتی تھی۔ اور موسم سرما میں یمن کا سفر کرتے تھے کیونکہ عرب کی بہ نسبت یمن کا ملک گرم ہے اور اسی وجہ سے گرمیوں میں وہاں کا رہنا دشوار سمجھا جاتا تھا۔[3]

مورخ ابن ہشام لکھتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہاشم بن عبدالمناف نے پہلے پہل یمن و شام کے سفر مقرر کیے تھے۔[4] لیکن ابن خلدون اس قول کی تکذیب کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ رسم عرب میں ابتدائے زمانہ آبادی سے چلی آتی ہے۔[5]

قبیلہ قریش کے چند مشہور تجار

چھٹی صدی مسیحی کے وسطی ایام میں یا ظہور اسلام سے تھوڑا عرصہ پیشتر قبیلہ قریش کے جو بڑے بڑے تجار تھے ان کے نام یہ ہیں :

ہاشم بن عبدالمناف : ان کی تجارت کا مرکز ملک شام تھا۔

عبدالشمس : ان کی تجارت کا مرکز حبشہ تھا۔

عبدالمطلب : ان کی تجارت کا مرکز یمن تھا۔

نوفل : ان کی تجارت کا مرکز فارس تھا۔[6]

---

[1] ملاحظہ کیجیے پلکیس بائبل ہسٹری۔ باب چہارم فصل دوم فقرہ چہارم

[2] ابن خلدون۔ جلد ثانی ص ۳۲۴

[3] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت ص ۲۹۸

[4] سیرت ابن ہشام ج ۱ مطبوعہ یورپ ص ۸۷

[5] ابن خلدون ج ۱ مطبوعہ مصر

[6] بلوغ الارب جلد ثالث مطبوعہ بغداد

قبولِ اسلام سے پیشتر قریش کا مشہور سپہ سالار ابُوسفیان ملک شام میں اور مصر کا نامور فاتح عمرو بن عاص مصر کو بغرضِ تجارت جایا کرتے تھے۔[۱] حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی تجارت کی بدولت بعثت سے پیشتر دو مرتبہ ملک شام کے سفر کا اتفاق ہوا ہے۔[۲]

حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی بچپن سے تجارت کا پیشہ کرتے تھے۔ آپ کی تجارت ایک طرف یمن اور دوسری طرف شام تک پھیلی ہوئی تھی۔[۳] حضرت عمرؓ بن الخطاب کا ذریعہ معاش بھی تجارت کا پیشہ تھا اور آپ نے قبول اسلام سے پیشتر تجارت کی غرض سے دور دراز ممالک کے سفر بھی کیے تھے۔ مسعودی لکھتا ہے کہ آپ نے جاہلیت کے زمانہ میں عراق اور شام کے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے عرب وعجم کے بادشاہوں سے بھی ملے تھے۔[۴]

علاوہ ازیں اور کئی ایک صحابہ کرام بھی ایامِ جاہلیت و زمانہ اسلام میں تجارت پیشہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ بزازی کی دُوکان کرتے تھے۔ سعدؓ بن ابی وقاص تیر بنا کر بیچا کرتے تھے۔ زبیر بن عوامؓ لحم فروش تھے۔[۵]

وہ اشیا جن کی تجارت اہلِ عرب کیا کرتے تھے

عربوں کی تجارت محض عرب کی پیداوار تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ ان اجناس کی بھی تجارت کیا کرتے تھے جو افریقہ، ہندوستان، چین وغیرہ ممالک سے پیدا ہوتے تھے اور ان کی تجارت میں اکثر وہ اشیا ہوا کرتی تھیں جو سامانِ عیش و عشرت سے متعلق ہیں۔ عاج، مصالحہ جات، خوشبویات، عطریات، جواہرات، سونا، لونڈی، غلام وغیرہ۔

عربوں کی تجارتی اشیا کی مفصل فہرست بیان کرنا محالات سے ہے۔ تاہم جن اشیا کا ذکر اکثر کتب تواریخ میں آیا ہے، وہ یہ ہیں:

دارچینی، فلفل، ناریل، گوگل، عنبر، لونگ، جوز، جوتری، الائچی، لوبان، کافور، عود، بید، ریشم، ظروف چینی، عاج، اون صوف، بانس، تمر ہندی، گھوڑے، گدھے، اونٹ، اعلیٰ درجے کے قیمتی کپڑے اور پوشاکیں، معدنیات یعنی ٹین، سیماب، سونا، چاندی، قہوہ، بخُور، مُشک وغیرہ وغیرہ۔

توراۃ میں بھی عربوں کی تجارتی اشیا کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں عرب کے مختلف حصّوں کے

---

۱ سید علی صاحب کا مضمون "عربوں کی تجارت"

۲ سیرۃ ابن ہشام جلد اول، مطبوعہ یورپ، ص ۱۱۵ و ۱۱۹

۳ الصدیق، مطبوعہ امرتسر ص۶

۴ الفاروق مصنفہ شبلی نعمانی ج ۱، ص ۳۰

۵ فلاحِ دارین مصنفہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب۔

باشندے مختلف اشیا کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ادومیوں کی تجارتی اشیا گوہر شب چراغ قرمزی اور زردوزی کتان موتی اور لعل تھے[۱]
بنو اسمٰعیل روغن بلسان، گرم مصالحے، مربی[۲]، بکروں اور مینڈھوں کی تجارت کیا کرتے تھے[۳]۔
یمن کے سوداگروں کے جو تجارتی اجناس تھے وُہ یہ ہیں:
کخواب[۴]، چوغے، ارغوانی اور منقش پوشاکیں، بُوٹی دار نفیس کپڑے، نفیس اور خوشبودار مصالحے، جواہرات، سونا[۵]،
چاندی[۶]، چندن کے درخت کی لکڑی[۷]

عربوں کی وہ تجارتی اجناس جو خاص خاص ممالک کی پیداوار ہیں

عربوں کے تجارتی اجناس سے بعض ایسے تھے، جیسے جواہرات اور کپڑے وغیرہ اور بعض اشیا کی پیداوار اور ساخت مختلف ممالک سے مخصوص تھی۔

دارچینی: اس کو عربی میں قرفہ کہتے ہیں۔ فقط ملیبار اور سیلان میں پیدا ہوتی ہے۔ قدیم الایام میں جبشہ میں بھی پیدا ہوتی تھی مگر اب نہیں۔

فلفل: اس کو مرچ کہتے ہیں۔ بلادِ ہند، بنگالہ، دکن میں پیدا ہوتی ہے۔ ہند کے دیگر شہروں کے بہ نسبت ملیبار میں اس کی پیدائش بہت ہی زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے عرب اس کو دار الفلفل[۸] کہتے ہیں۔ مارکوپولو، جو تیرھویں صدی مسیحی کا مشہور سیاح ہے، لکھتا ہے کہ چین میں بہت ہی بڑی گول سفید مرچ پیدا ہوتی ہے[۹]۔

ناریل: ناریل صرف ملیبار اور سیلان میں پیدا ہوتا ہے۔ گوگل (مقل عربی، بوے جھوواں فارسی) صرف جنوبی ہند میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو کو یہودی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ رسم ان میں قدیم الایام سے ہے۔ اس کی وجہ سے ایرانی اس کو بوئے جھوواں کہتے ہیں۔ اہلِ عرب اس کو یہودیوں کے لیے مخصوص لے جایا کرتے تھے[۱۰]۔

---

[۱] صحیفہ حزقئیل ۲۷ باب ۱۶ آیۃ
[۲] سفر تکوین ۲ باب ۲۵ آیت
[۳] صحیفہ حزقئیل ۲۷ باب ۲۱ آیت
[۴] اصل عبرانی زبان کی کتاب میں کخواب کے لیے گلیم ہے جس کا مادہ گلم ہے اور جس کے معنی ہیں لپیٹنا۔ چونکہ جمع کا صیغہ ہے، اس لیے اس کے معنی ہیں لپیٹنے کی اشیا۔ سُریانی زبان میں اس کا ترجمہ کملات ہے اور یونانی زبان کے ترجمہ سپٹواجنٹ میں جس کو مسیح سے تین سو برس قبل یہودیوں کے ستّر علما نے اسکندریہ میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ترجمہ ماخالیم کیا گیا ہے جس کے معنی کخواب ہیں۔
[۵] صحیفۂ حزقئیل ۲۷ باب ۲۲ سے ۲۴ تک
[۶] دوم کتاب تواریخ ۹ باب ۱۳ آیت
[۷] دوم سفر الملوک ۱۰ باب ۱۱ آیت
[۸] تقویم البلدان مطبوعہ پیرس ص ۳۵۴۔ مصنف ابوالفدا
[۹] مارکوپولو کا سفرنامہ۔ مطبوعہ لاہور
[۱۰] مخزن الادویہ

لوبان : لوبان کی پیدائش بھی ہندوستان جنوبی سے مخصوص ہے۔ لوبان ایک قسم کا خوشبودار گوند ہے۔ آگ پر رکھنے سے کافور کی طرح اڑجاتا ہے۔ ابو الفضل لکھتا ہے کہ لوبان یمن میں بھی پیدا ہوتا ہے، جو کندر کہلاتا ہے۔ لیکن اس میں خوشبو نہیں ہوتی ہے[۱]

عنبر : جزائر الہند اور میدغاشفار (میڈگاسکر) میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یمن میں بھی اس کی پیدائش ہے لیکن بہت ہی کم۔ عنبر کی ماہیت میں اختلاف ہے۔ بوعلی سینا لکھتا ہے کہ سمندر کی تہ میں پتھر کی تہ سے کوئی چیز مومیائی یا قر کی طرح اُبل کر نکلتی ہے اور تلاطم امواج مدوجزر کے باعث سے اُوپر آجاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دریا میں ایک گائے ہوتی ہے اس کے گوبر کو عنبر کہتے ہیں۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے : ؎

گر بے ہنر بہ مال کند کبر بر حکیم
کون خرش شمار وگر گاؤ عنبر است

لونگ، جوز، جوتری، الائچی : ملیبار میں ہوتی ہیں۔

کافور : کافور جزائر الہند اور صین الصین میں ہوتا ہے۔

عود : عود کی پیدائش ہندوستان جنوبی اور سیام سے مخصوص ہے۔ چونکہ عرب اس کو ہند سے لیتے تھے، اس وجہ سے اس کا نام ہی انھوں نے عود ہندی رکھ دیا تھا۔

ریشم : ریشم چین میں ہوتا ہے۔ یہ چین کی قدیم اور وطنی پیداوار ہے۔ مسیح سے اڑھائی ہزار برس قبل بھی چین میں اس کا رواج پایا گیا ہے[۲]۔ قدیم زمانہ میں ریشمی کپڑے صرف چین ہی میں بنتے تھے۔

عاج : عاج صرف سیلان، جنوبی ہند، افریقہ میں ہوتا ہے۔

اون : اون ترکستان، تبت، مغربی چین میں ہوتا ہے۔

تمر ہندی : اس کی پیدائش جنوبی ہند سے مخصوص ہے۔

ٹین[۳] : ٹین کی کانیں قدیم زمانہ میں مشرقی چین، ہندوستان میں تھیں۔

سیماب : سیماب چین میں ہوتا ہے۔

چینی کے برتن : چینی کے برتنوں کی ساخت قدیم الایام سے چین سے مخصوص چلی آتی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ صین الصین میں چینی کے کاریگر قدیم زمانہ سے ہیں اور یہیں ظروف چینی بنتے ہیں۔

---

[۱] آئین اکبری

[۲] سفر نامہ ابن بطوطہ مطبوعہ لاہور

[۳] ٹین کو عربی میں اُسرب تنک اور سنسکرت میں رانگ کہتے ہیں۔ یہ ایک سفید اور نرم دھات ہے۔

عربستان کی پیداوار

قدیم زمانہ میں شیشہ و آلات یونان و روم میں بنتے تھے[1] عرب کا بیشتر حصہ پتھریلا اور ریتلا ہے۔ جنوبی اور مغربی کناروں پر کوہستان کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جس میں کہیں کہیں سرسبز نخلستان بھی ہیں۔ جو حصے قدرتی زرخیز ہیں وہ زیادہ وسط اور جنوب میں واقع ہیں۔ عرب میں زیادہ تر قطعات ہیں جو کثیر النمو نباتات کی بہتات کی وجہ سے بار آور اور سرسبز ہیں اور یہاں انسان و حیوان کی نسل بھی ترقی پذیر ہے۔

قہوہ، خرما، بخور، بلسان: عرب کی مخصوص پیداوار ہیں۔ علاوہ ان کے مختلف قسم کے درخت خوشبودار بوٹیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ نیز قیمتی معدنیات کی کانیں بھی اس سرزمین میں پائی جاتی ہیں۔

سونا وغیرہ: تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں جو سونا، خوشبودار اشیا، جواہرات پیدا ہوتے تھے۔ نہایت عمدہ اور نایاب ہوتے تھے۔ ان کی مثل عمدہ اشیا اقصائے عالم میں نہیں ملتی تھیں[2]۔

نباتات: مصنف صناجۃ الطرب نے عرب کے نباتاتی پیداوار کی جو فہرست دی ہے، وہ یہ ہے:

طرفا، صفصاف، جھاؤ، بید، دوم، حنا، گوگل، مہندی، زنجبیل، فل، نخل، حنظ، فوہ، تبغ، فلفل، صبر، جوز، مشمش، سفرجل، تین، شقائق، نیلہ، بنفسج، قثا، موز، طلع، لبان، سونٹھ، نیلوفر، خرما، گیہوں، مجیٹھ، تمباکو، مرچ، ایلوا، بادام، زردآلو، بہی، انجیر، لالہ، بنفشہ، کریلہ، کیلہ، کھجور کی گدر پھلیاں، لوبان، یاسمین، تمر ہندی، قصب، شعیر، بن، عفص، بادنجان، رمان، ملتی، تفاح، لیموں، ورد، حزام، نرجس، خروع، بطیخ، منقی، نارجیل، عدس، چنبیلی، املی، بانس، جو، قہوہ، ڈبی (مازو)، بینگن، انار، پستہ، سیب، گلاب، نرگس، سن یا خوشبودار گھاس، ارنڈ، خربزہ، مشہور، ناریل، مسور۔

بلسان: بلسان ایک درخت ہوتا ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلسان صرف جلعاد[3] میں پیدا ہوتا ہے۔ بلسان سے

---

[1] صناجۃ الطرب فی تقدمات العرب

[2] یہ مضمون تورات کے صحیفہ وبری یا یوسیم کی دوسری جلد کے نویں پسرق سے لیا گیا۔ اس کی اصل عبارت عبرانی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

ملکہ سبا نے ایک سو بیس قنطار سونا اور بہت سے خوشبویات، قیمتی جواہرات اپنے ملک کے سلیمان بادشاہ کو دیے۔ اور پھر ایسی عمدہ خوشبویات، جواہرات وغیرہ سلیمان کو کہیں سے میسر نہ ہوئیں جیسے ملکہ سبا نے دی تھیں۔

[3] جلعاد (گلعاد) کا وہ ملک کہلاتا ہے، جو شمال عرب میں ہے۔ اس کے مشرق میں حجاز ہے۔ مغرب میں دریائے یرون، شمال میں باشان، جنوب میں سرزمین بنی عمون۔ یہ ملک صحرائی اور کوہستانی ہے۔ اس میں وادیاں اور نخلستان بہت ہیں۔ بلسان اسی میں پیدا ہوتا ہے۔

(ملخص از بائیبل گزیٹیئر مطبوعہ یورپ)

جو روغن بنایا جاتا ہے، اس کا ذکر تورات میں بار بار آتا ہے اور ہر کہیں بھی وہ جلعاد کا روغن بلسان کہلاتا ہے۔ روغن بلسان قدیم زمانہ میں بطور دوا کے استعمال کیا جاتا تھا اور اکثر زخموں پر اس کو لگاتے تھے۔[۱]

خرما: عرب میں عام طور پر ہوتا ہے اور اس کے نخلستان تمام عربستان میں ہیں۔

قہوہ: قہوہ صرف یمن میں ہوتا ہے۔ قدیم الایام سے دنیا میں یہیں سے جاتا ہے۔ یمن کا بندر مخا قہوہ کا مشہور تجارت گاہ تھا اگرچہ قہوہ کی زراعت فرانس، فلنک، انگلینڈ وغیرہ میں شروع ہوگئی ہے۔ لیکن یمنی قہوہ اور یورپی قہوہ میں بڑا فرق ہے۔[۲]

بخور:[۳] بخور بھی عرب کی مخصوص پیداوار ہے۔ اس کی تجارت دنیا میں سوائے عربوں کے کوئی نہیں کرتا تھا۔ ہیرو ووطس لکھتا ہے کہ یونانیین کو بخور سوائے عربوں کے کسی اور کے یہاں سے نہیں ملتا تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے بخور وہی ہے جس سے یونانی لوگ اپنے مکانوں اور معابد میں اور ربانی اپنے کاہنوں کی قبروں پر دھونی دیتے تھے۔ مصر کے بطلیموسی اور رومی بادشاہوں کے عہد میں مصر کے باشندے اس کو عرب کے تجار سے، جو بحر احمر کی راہ سے آیا کرتے تھے، خریدتے تھے اور عرب اس کے معاوضہ میں جواہرات اور عمدہ عمدہ قسم کے معدنیات لیتے تھے، جس سے اپنے شہروں اور معابد کی عمارتوں کو آراستہ کرتے تھے۔[۴]

عرب میں کئی ایک ایسے اجناس بھی ہوتے ہیں جو مختلف ممالک کی مخصوص پیداوار ہیں۔ مثلاً مرچ، ناریل وغیرہ۔ مگر ان کی پیدائش عام طور سے نہیں ہے، بلکہ صرف یمن کے بعض شہروں میں، جو مثل ظفار وغیرہ کے تھے، پیدا ہوتے تھے۔[۵]

ان اجناس کو سوداگروں نے مختلف ملکوں سے، جہاں ان کی پیدائش مخصوص تھی، لاکر رواج دیا ہے۔

حیوانات: عرب کے حیوانات سے گھوڑا، اونٹ، بھیڑ، بکرے، بینڈھے، ہرن، گدھے مشہور ہیں۔ حکمائے علم حیوانات کی رائے میں عرب گھوڑے کی اصلی اور حقیقی جائے پیدائش ہے۔ عربی گھوڑوں میں تیزی، چالاکی، وفاداری، جاں نثاری فطرتاً ودیعت ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان گھوڑوں کی شہرت تمام عالم میں ہے اور ہر ایک ان کا خواہاں ہوتا ہے۔ عرب کا گدھا مشہور ہے۔ یہ قوت میں قریباً خچر کے برابر ہوتا ہے۔ حاجیوں کا جو قافلہ مکہ معظمہ کو جاتا ہے وہ انھیں گدھوں پر جاتا ہے۔ تخمینہ کیا گیا، تو معلوم ہوا ہے کہ عربی گدھا ایک گھڑی میں ڈیڑھ ہزار قدم چلتا ہے۔[۶] عرب کے گھوڑے اور گدھے قدیم زمانہ میں ممالک غیر میں بہت جاتے تھے اور عربوں کو ان سے بڑی بڑی قیمتیں ملتی تھیں۔ اب بھی عرب میں گھوڑوں اور گدھوں کی تجارت بہت ہوتی ہے۔[۷]

---

[۱] صحیفہ یرمیاہ علیہ السلام
[۲] صناجۃ الطرب
[۳] بخور ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے اس کو ایرانی چنگ مریم اور پنجہ مریم کہتے ہیں (منتخب اللغات) یہ گھاس زیادہ تر حجاز میں ہوتی ہے۔
[۴] صناجۃ الطرب
[۵] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت صفحہ ۲۸۲
[۶] صناجۃ الطرب مطبوعہ بیروت ص ۲۸۳
[۷] انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں دیکھو "عربیا"

اونٹ عربوں کی تجارت کا بہت بڑا جزو ہے۔ یہ لوگ اس پر اپنے تجارتی اجناس کو لاد کر ریگستانی دشوار گزار راستوں کو طے کرتے اور غیر ممالک میں آیا جایا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ ان میں قدیم الایام سے مروّج ہے[1]۔

معدنیات وجواہرات

قدیم الایام میں عرب میں قیمتی معدنیات کی بے شمار کانیں تھیں۔ بلاد یمن سونے چاندی کی ہمہ تن کان تھی[2]۔ زمانہ قدیم میں اوفیر کا سونا نہایت مشہور تھا۔ حضرت یشعیاہ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اوفیر کے سونے کے مثل سونا دُوسرے ملکوں میں کمیاب ہے[3]۔

عرب کے جواہرات میں زبرجد، زمرد، حدید نہایت مشہور ہیں۔ جزع، عقیق صرف یمن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے جزع یمانی اور عقیق یمنی مشہور ہیں۔

موتی: موتی خلیج فارس سے عمان اور بحرین کے شہروں میں نکلتا ہے۔ جزائر بحرین قدیم زمانہ میں اپنے نایاب موتیوں کے باعث نہایت مشہور تھے۔ اب بھی ان سے ایسے ایسے موتی نکلتے ہیں جن کی نظیر عالم میں نہیں ملتی[4]۔

صنعت وحرفت

قدیم زمانہ میں اہلِ یمن کو صنعت وحرفت میں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ شداد کا عدیم المثال باغ، جو باغِ ارم یا بہشتِ شدّاد کہلاتا ہے اور جس کا مثل ونظیر اب تک نہیں دکھلا سکا اور جس کی نسبت صانع ہستی ارشاد فرماتا ہے:

لم یخلق مثلها فی البلاد۔

انہی لوگوں کی صنعت کا نمونہ تھا۔

مورخین نے عربوں کی صنعت وحرفت کا بہت ہی کم ذکر کیا ہے۔ ایک مسیحی مصنف لکھتا ہے کہ یمن میں قدیم زمانہ میں کپڑے بننے کے کارخانے، شیشہ بنانے اور آلات کے کارخانے تھے اور یہاں کے لوگ سونے چاندی کے ظروف اور زیور بھی بناتے تھے، جو نہایت خوب صُورت اور قابلِ قدر ہوتے تھے۔ آلاتِ موسیقی سے طنبور اور ستار نہایت خوبصورت بناتے تھے اور زنبیل انھیں کی صنعتوں سے ہے[5]۔

قدیم عربوں کو کپڑا بننے میں بھی کمال حاصل تھا۔ وشی، قصب، حریر، قالین نہایت عمدگی سے بناتے تھے[6]۔ سامانِ چوبی مثل کرسی وغیرہ بھی نہایت خوبی سے تیار کرتے تھے۔ صاحبِ بلوغ الارب نے ان کے آلات نجاری کی جو

---

[1] سفر تکوین باب ۳۷۔ آیت ۲۵

[2] صناجۃ الطرب۔ مطبوعہ بیروت

[3] صحیفہ حضرت یشعیاہ، باب ۱۳۔ آیت ۱۲

[4] صناجۃ الطرب ص ۱۲

[5] صناجۃ الطرب ص ۳۰۱

[6] بلوغ الارب ج ۳

طول وطویل فہرست بیان کی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فنِ نجاری میں یدِ طُولیٰ حاصل تھا۔[1]
عربوں اور بالخصوص اہلِ حجاز کو بہادری میں بہت کچھ حصہ ملا تھا اور ان میں ہمیشہ میدان کا رزار گرم رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے ان کو آلاتِ حرب کی ساخت میں بھی خاص ملکہ تھا۔[2] چنانچہ سلوق (یہ شہر یمن میں ہے) کی زرہ اور کٹنان اور خط (یہ شہر بحرین میں ہے) کے نیزے، حجاز کے تیر، عرب کی شمشیر مشہور ہے۔

---

[1] بلوغ الارب مطبوعہ بغداد

[2] صناجۃ الطرب

اسلامی انقلاب کا اثر جاہلی معاشرے پر

حبیب احمد

کتنا عظیم الشان تھا وہ انقلاب، جو فتح مکہ کے بعد —— پندرہ برس کے اندر اندر —— تمام جزیرۃ العرب میں برپا ہو گیا۔ اس کی عظمت کو دیکھتے ہُوئے اگر آپ یہ کہیں کہ اسے انقلاب سے بڑھ کے کوئی نام دینا چاہیے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ ایک نئی تہذیب تھی، جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس مختصر زمانے میں عرب بت پرستی سے نکل کر اسلام کی طرف آئے اور ان کی قبائلی نا انصافی اور قومی نفرت ایک ایسی وحدت میں بدل گئی، جو ہمہ گیر سیاست اور مشترک غرض کے بل پر قائم تھی۔ اس سے پہلے وُہ جزیرہ نمائے عرب کی حدود میں سمٹے ہُوئے تھے اور اس کے بعد یہ ایک ایسی وسیع سلطنت کے مالک بن گئے، جس میں رومی اور ایرانی دونوں سلطنتیں تحلیل ہو گئی تھیں۔ پہلے ان کی اکثر آبادیوں پر بدویت کی سختی و تنگ دستی چھائی ہُوئی تھی اور اب وُہ ایک ایسی آسُودگی و خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے، جو اس سے پہلے ان کے لیے اجنبی تھی۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں، اگر ان کی اجتماعی زندگی ان برق رفتاریوں سے متاثر ہو جاتی اور زندگی اور مطالبِ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل جاتا۔

اور ہوا بھی یہی —— وُہ تمام محرکات جنھوں نے عربوں میں اس نئی تہذیب کو جنم دیا، ان کی انفرادی اور جماعتی دونوں زندگیوں پر اپنا اپنا اثر پہلے سے کسی حد تک رکھتے تھے۔ مذہبی محرک کا اپنا اثر، سیاسی محرک کا اپنا اثر اور اقتصادی محرک کا اپنا اثر۔ یہ اثرات بعض اوقات متناقض ہوتے تھے، لیکن وہ ایک دُوسرے پر اثر انداز ہو کر آپس میں گھل مِل گئے اور انہوں نے اجتماعی زندگی میں کچھ ایسی تبدیلی پیدا کر دی کہ اس کا جو اثر بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی زندگی پر مترتب ہُوا، وُہ نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتا اور دماغ کو اپنے متعلق سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس انقلاب کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہم عربوں کی اسلام سے پہلے کی اجتماعی زندگی پر نظر ڈالیں۔ عربوں کی اکثریت صحرا میں زندگی بسر کرتی تھی۔ شہری آبادی بہت کم تھی، جس کا سبب یہ تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں باقاعدہ بہنے والی نہریں نہ تھیں اور نہ وہاں سال بسال وہ موسمی بارشیں ہوتی تھیں، جو زمین کو سرسبز و زرخیز بناتی ہیں۔ چند علاقوں کو چھوڑ کے پورے جزیرۃ العرب میں کھیتی باڑی کا کوئی نظام نہ تھا۔ پھر شہر اور بستیاں ان مقامات پر آباد تھیں، جہاں چشموں کی بہتات ہوتی تھی۔ باقی جو کچھ تھا، ریگستان ہی ریگستان تھا۔ جہاں بارشیں ہوتیں، سبزہ اُگ آتا ورنہ زمین بے آب و گیاہ رہتی۔ اس لیے یمن کے ریگزار بھی دُوسرے ریگزاروں کی طرح اہلِ یمن کے ایک بڑے حصے کو شامل تھے۔ البتہ نجد، حجاز اور عرب کے دُوسرے تمام علاقوں میں شہری اور صحرائی آبادی کا جو تناسب تھا، اسی کے لحاظ سے یمن کی شہری آبادی اس کی صحرائی آبادی سے زیادہ تھی۔

ریگستان میں اجتماعی زندگی کی اساس قبیلہ تھا۔ قبیلہ خاندانوں سے ترکیب پاتا تھا اور خاندان افراد کے نسبی اور قرابتی تعلقات سے وجود میں آتے تھے۔ خاندان کا ہر گھر نمدے کے خیمے میں رہتا تھا تاکہ جب کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کے لیے چراگاہ اور اپنے

بال بچوں کے لیے رزق کی تلاش میں کوچ کرنا چاہے تو اسے اٹھا کر لے جانے میں سہولت رہے قبیلے اکثر گرمی اور بہار کے موسم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے۔ جب ریگستان کے چھوٹے چھوٹے چشموں کے گرد گھاس کثرت سے اُگ آتی تھی لیکن موسم سرما کی آمد پر چراگاہیں خشک ہو جاتی تھیں، تو یہ لوگ شہروں کا رُخ کرتے تھے اور ان کے قریب ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ پیٹ بھر روٹی حاصل کرنے کے لیے وُہ اہلِ شہر کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے، یا ان پر چھاپے مارتے تھے اس لیے کہ ان کی کفیل وہ آزادی تھی، جو انہیں اچھے سے اچھے کھانے اور بہتر سے بہتر کپڑے سے زیادہ عزیز تھی۔

یہ ہے بدوی زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کا مختصر سا خاکہ، جس میں بحیثیت مجموعی عرب کی شہری زندگی کے خاندانی اور گھریلو نظام کی تصویر بھی شامل ہے۔ اس لیے کہ شہروں کے رہنے والے بھی بدویوں کی طرح قبیلوں ہی میں منقسم تھے اور ان میں سے اکثر بدوی الاصل تھے جن کے دلوں میں شہری زندگی کا شوق پیدا ہُوا اور وُہ شہروں میں آکے رہ بس گئے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد شاید آپ آج بھی ان بدویوں میں جنہیں ہنوز تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی، اس نظام کے بچے کھچے آثار کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اسلام نے بہت کچھ اسے مٹا دیا تھا۔

عرب کے بدویوں اور شہریوں کا خاندانی اور گھریلو نظام آپس میں ملتا جلتا تھا لیکن زندگی کے سرو سامان اور اس چیز میں، جسے آج ہم "اقتصادی نظام" سے موسوم کرتے ہیں، وُہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ اہلِ شہر اپنی زندگی تجارت اور اپنے ان باغوں، تاکستانوں اور کھیتوں کی پیداوار کے سہارے بسر کرتے تھے، جن میں بونے، جوتنے اور دیکھ بھال کے کام وہ کرایہ کے آدمیوں سے لیتے تھے اور اپنی اس تجارت و زراعت سے انھیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر اپنا روپیہ سُود پر چلاتے تھے اور جو لوگ کاروبار وغیرہ کرنا چاہتے تھے، انھیں بھاری منافع پر قرض دے کر اپنی رقم تھوڑی سی مدت میں دُگنی کر لیتے تھے۔ یہ سب لوگ زندگی کی ان راحتوں اور آسائشوں میں کھیلتے تھے، جن سے اہلِ بادیہ واقف بھی نہ تھے۔ شراب، موسیقی اور جُوا، ان کے لیے دن رات کا مشغلہ تھا اور خواہشوں کی شکم سیری نے زندگی کو ان کی نظر میں محبوب اور اطمینان افزا بنا دیا تھا۔ تجارت اور سُود سے جو بے شمار نفع انھیں ہوتا تھا اس کی وجہ سے وہ لذتوں میں ڈوب گئے تھے اور بلند اخلاقی کی بہت سی خوبیاں ان کی کتابِ زیست سے محو ہو گئی تھیں۔

لیکن خانہ بدوشی کی زندگی چراگاہوں کی تلاش اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے ترکیب پاتی تھی۔ ایک بدوی کی ملکیت نمدے کا ایک خیمہ ہوتا تھا جس میں وُہ اپنی زندگی بسر کرتا تھا یا وُہ غلّہ اور پھل جو اپنے گردوپیش کی زمین میں وُہ بوتا تھا۔ کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ کھیت اس کا ہے جو اس کو بوئے۔ لیکن یہ ملکیت برائے نام ہوتی تھی۔ اس لیے کہ بدوی زراعت کو پسند نہ کرتے تھے اور کھیتی باڑی کو اپنے مرتبے سے کم تر سمجھتے تھے۔ لیکن قبیلے کی آبادی کے اردگرد جو چراگاہ ہوتی تھی، وہ قبیلے کی مشترکہ ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال اس گھاس کا تھا، جو ریگستانی آبادی کی ان محفوظ چراگاہوں میں پیدا ہوتی تھی اور ہمسایہ قبائل کو یہ حق حاصل تھا کہ باہمی مفاد کے پیشِ نظر ایک قبیلہ اپنی زمین کا تبادلہ دُوسرے قبیلے کی زمین سے کرے۔

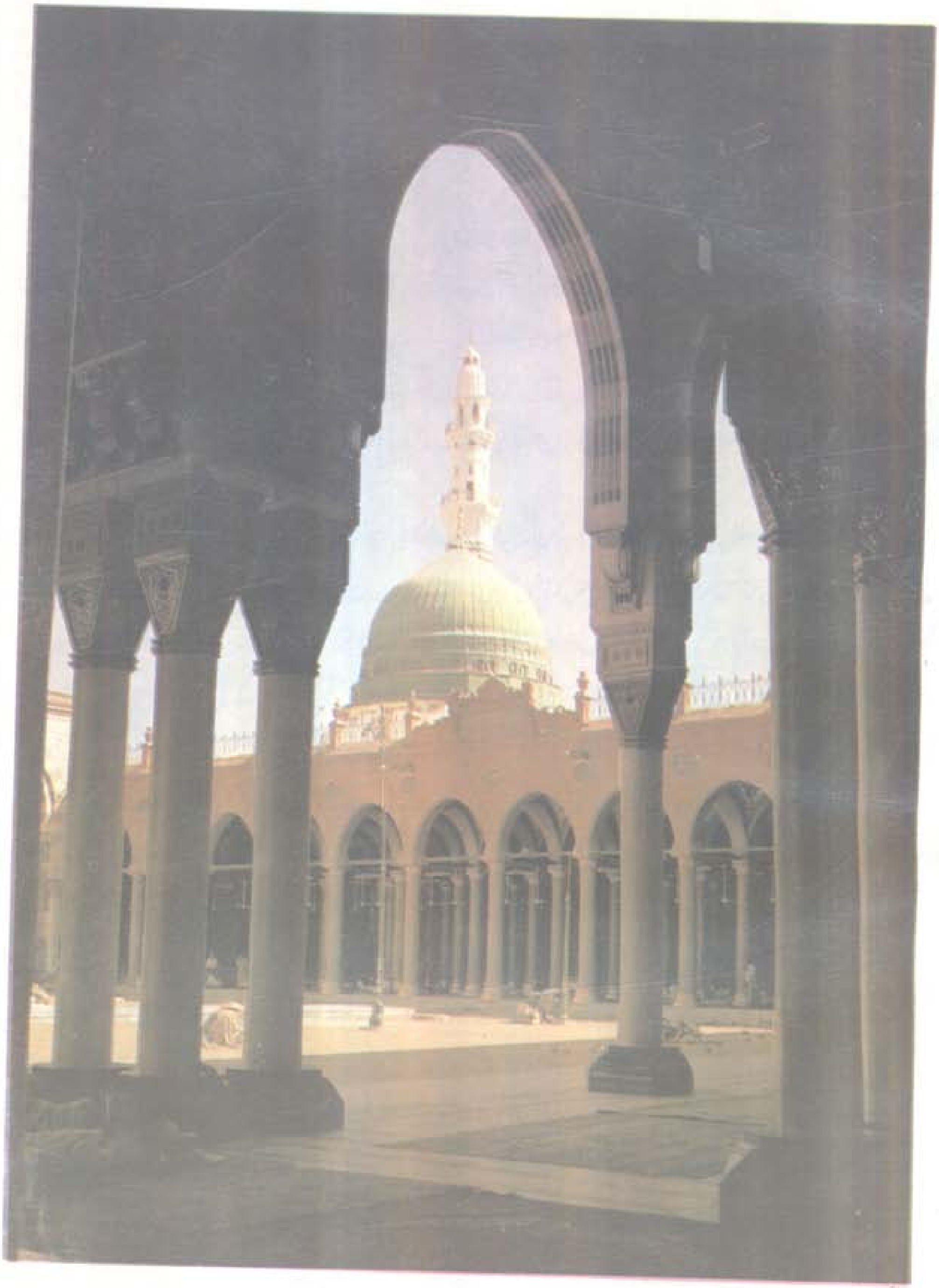
قبائلی بستیوں کی حد بندی آپس کے اتفاق اور رواجی یکسانی سے ہوتی تھی اور جب کوئی قبیلہ چراگاہ کی تلاش میں نکلتا تھا، تو کسی دُوسرے قبیلے کے لیے جائز نہ تھا کہ اس کی جگہ آباد ہو جائے یا اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سے خُون خرابہ کرے۔ لیکن

اس قسم کی دراز دستیاں عام تھیں اور ان کے نتیجے میں قبائل کی باہمی پیکار کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس لیے ایک بدوی پیدائشی طور پر شمشیر آزما اور قبائل کی زندگی اکثر اوقات مار دھاڑ اور چھینا جھپٹی کی زندگی ہوتی تھی۔

حملہ اور انتقام کے خوف کا یہ فطری اثر تھا کہ وہ قبیلے کی یک جہتی میں اضافہ کر دیتا اور اس یک جہتی کی مزید تقویت کے لیے اس قبیلے کے افراد کو ماضی کی یادوں اور اپنے اسلاف کے جرأت آموز اور شجاعت انگیز کارناموں کے طلسم زار میں پہنچا دیتا اور یہی راز تھا عربوں کی اپنے نسب سے غیر معمولی دلچسپی کا کہ اس کے ذریعے وہ دُوسروں پر اپنی بڑائی جتائیں۔ اپنی یک جہتی کو تقویت دیں اور اپنے اسلاف کی بلندیوں تک پہنچیں جو شجاعت، سخاوت، پناہ گیری کی حمایت اور اسی قسم کی ان دوسری خوبیوں کے لیے مشہور تھے، جن کا بیج بدوی زندگی نے ان کی فطرت میں بویا تھا اور جو ان کی سیرت و کردار کا ایک مستقل جزو تھیں اور اخلاف کا یہ فرض تھا کہ ان خوبیوں سے اپنے اسلاف کی تقلید کریں کہ انہی خوبیوں کے سہارے وہ بدوی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ ایک بدوی ہمیشہ دوسروں کے حملے کی زد میں رہتا تھا اور بدویانہ زندگی عسرت و تنگ دستی کی زندگی تھی، جو کبھی کبھی فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ بادیہ شریف و سخی نہ ہوتے، مہمانوں کی مدارات اور پڑوسیوں کی حمایت نہ کر سکتے، تو ان میں سے اکثر ہلاک ہو جاتے۔ پھر صحرا کی زندگی خطرات پر غالب آنے اور حملہ آوروں کو شمشیر بشمشیر جواب دینے کی زندگی تھی۔ اس لیے اگر اہلِ صحرا بہادر، زیرک اور توانا نہ ہوتے، تو زندگی کا بوجھ انھیں کچل ڈالتا اور اگر ان میں مدافعت کی وہ صلاحیت نہ ہوتی، جو دوسروں کو ان سے خوفزدہ کر دیتی تو انھیں شر و فساد میں مبتلا ہو جانا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بیشتر حصہ فخر و شجاعت اور سخاوت و مکارم کے ذکر پر مشتمل ہے اور ان میں مختلف فضیلتوں کا بیان پایا جاتا ہے، جو خانہ بدوشی کی زندگی کا لازمہ تھیں اور جو اہلِ صحرا کو اپنے اعادہ و تکرار پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ صرف انہی لوگوں کے خلاف نہیں بھڑکتے تھے، جو ان کی بستیوں پر حملہ آور ہوں بلکہ جان و مال، عزت و ناموس غرض یہ کہ ہر قدر کو ٹھیس لگنے پر بھڑک اٹھنا ان کا عام دستور تھا۔ قبیلہ اپنے ہر فرد کا انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ جو لڑائیاں عزت اور ناموس کے انتقام میں شروع ہوئیں، ان کی آگ برسوں تک سُلگتی رہتی۔ اگر کوئی قبیلہ بطور خود انتقام لینے کے قابل نہ ہوتا تو وُہ اپنے حلیف یا ہمسایہ قبائل سے درخواست کرتا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس قسم کے معاہدے عرب میں عام تھے اور ان معاہدوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ حلیف قبیلے مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اس وقت تک تلوار نیام میں نہ رکھیں گے جب تک مظلوم اپنا حق نہ پا لے۔

ان کے ہر قبیلے بلکہ ہر گھر کا ایک الگ بت تھا، جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن بتوں کو پوجتے وقت وُہ اللہ کے وجود سے انکار نہ کرتے تھے بلکہ انھیں اللہ کے ساتھ شریک کرتے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ حجِ کعبہ کے وقت لبیک کہتے ہُوئے اللہ کا نام لیتے اور ان بتوں کا اس کے شریک کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے۔ بعض قبائل کہتے: "حاضر ہوں یا اللہ! میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس کے جو تیرا شریک ہے۔ تو اس کا اور دوسری چیزوں کا مالک ہے۔" قریش کعبہ کا طواف کرتے اور کہتے: "قسم ہے لات و عزّیٰ اور تیسرے منات کی۔ یہ اعلیٰ غرانیق ہیں اور ان کی شفاعت قابلِ اعتماد ہے۔" قرآن کہتا ہے: "وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔

یہ ہے اسلام سے پہلے عربوں کی اجتماعی زندگی کے عقاید و عادات کی اجمالی تصویر، جسے دیکھ کر آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ



گنبد خضرٰی

اسلام نے ان میں سے کن کن چیزوں کو مٹایا۔ فطری طور پر شرک ہی تھا، جس کا اثر سب سے پہلے عربی ذہن سے محو ہوا، عربوں نے شرک کے متعلق وہ آیات سنیں، جنھوں نے قبولِ اسلام کے بعد انھیں شرک کا سب سے بڑا دشمن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت جن لوگوں نے راہِ ارتداد اختیار کی یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انھوں نے بھی اللہ کا کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا بلکہ ہر جھوٹے نبی نے یہی اعلان کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے نبی تھے اور وُہ اپنی قوم کا نبی ہے اور جب ارتداد کا خاتمہ ہو گیا تو سارا عرب لا الٰہ الا اللّٰہ و انّ محمّد رسول اللّٰہ پر ایمان لے آیا۔

شرک کے اس خاتمے کا عربوں کے ذہن اور ان کی اجتماعی زندگی پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اب مسلمانوں کا خدا کے سوا کوئی آقا نہ تھا، بلکہ ان کی تمام تر عقیدت صرف اللہ جل شانہٗ کے لیے مخصوص ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان اپنی زندگی کے مسائل میں غیر خدا سے مدد کا طالب نہ ہوتا تھا۔ اب وُہ خدا سے لَو لگاتے تھے، اسی پر بھروسہ کرتے تھے اور اسی سے مدد چاہتے تھے۔ اس سے عربی عقل اور عربی ضمیر پر بت پرستی کی جو بیڑیاں تھیں، وُہ کٹ گئیں اور یہ دونوں انسان کے لیے ترک و اختیار کی کسوٹی بن سکے اس کے اور خدا کے درمیان تنہا وسیلہ ہو گئے۔

عربی عقل بت پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اللہ پر ایمان لے آئی، جو ہر چیز کا خالق ہے اور اسے وہم کی غلامی اور ان رسوم کی بندگی سے نجات مل گئی جو اس پر جاہلیت نے فرض کر رکھی تھیں۔ اللہ کی طرف سے آیا ہوا پیغام اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا، اور وہ اسے اپنانے کے لیے آمادہ تھی۔ عقل کی اس آزادی کا مذہبی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی پر بھی بہت گہرا اثر پڑا۔

آبائی رسم و رواج کے خلاف یہ بغاوت واقعی اپنے اندر اتنی جان رکھتی تھی کہ عربی زندگی میں اساسی طور پر ایک ایسا اجتماعی انقلاب برپا کر دیتی، جو بدویّت اور مدنیت دونوں کو شامل ہوتا۔ یہ بغاوت وحی کے ذریعہ آئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اللہ کا ایک حکم تھی، جس سے بچنے کا کوئی رستہ نہ تھا اور جس کی تعمیل بہر صورت ہوتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربی ذہن پر اس بغاوت کا اثر اس فعلی بغاوت کے اثر سے زیادہ شدید تھا، جس نے بتوں کو ڈھا کر اور شرک سے انکار کر کے اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا جب کبھی عقل و دل غلامی کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہُوئے ہیں، آزادی کے نور سے ضیا اندوز ہونے کے لیے اسی کی طرف دوڑے ہیں۔ یہی حال ہماری فکر اور ہمارے ذاتی عقاید کا ہے۔ لیکن جہاں زندگی پر ہمارے اختیارات اور دوسروں سے ہمارے تعلقات کا سوال آتا ہے، اطاعت و تسلیم کی ڈوری میں تردّد اور ہچکچاہٹ کی گرہیں پڑنے لگتی ہیں اور عقل کی سرافرازی کے باوجود چاہتے ہم یہی ہیں کہ ہمارا اقتدار بہر صورت قایم رہے اور جو کچھ اس میں کمی آ گئی ہے، وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہو جائے اس لیے کہ ہماری خواہشوں کا مقتضا یہی ہے عقل جتنی چاہے خواہشوں سے بلند ہو جائے اور آزادیِ فکر جتنا چاہے بلند معانی پر عبور حاصل کر لے۔ انسان پر حکومت وہی جبلت کرتی ہے جو تمام خواہشوں کا مدار ہے۔

آجکل کی اصطلاح میں جسے "اکتسابی حقوق" سے موسوم کیا جاتا ہے، وُہ دراصل مادی منفعتیں ہیں، انسانی فطرت مادی منفعتوں سے غیر معمولی تعلق رکھتی ہے اور باقی تمام چیزوں سے زیادہ ان سے چمٹی رہتی ہے۔

قرآن جو اقتصادی انقلاب لے کر آیا تھا، اس کا اثر اجتماعی انقلاب سے کم نہ تھا دولت مند تاجر اور سردار وغیرہ جنھیں

زمانۂ جاہلیت میں امتیازی مقام حاصل تھا، محتاجوں اور مزدوروں سے غرور و تبختر کے ساتھ پیش آتے تھے اگرچہ یہ غرور و تبختر ان کی آزادی و خودداری کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا اس لیے مالدار لوگ جب کسی محتاج کو کچھ دیتے تھے، ترس کھا کے دیتے تھے اور پھر احسان جتا جتا کے اپنی عطا و بخشش کو مرتبے کی بلندی کا ذریعہ بناتے تھے۔

اسلام نے نزولِ وحی کے آغاز ہی میں انانیت کے اس جذبے کا مقابلہ کیا۔ لوگوں میں اخوت و مساوات کی بنیاد رکھی مال داروں کو اس خیرات پر سرزنش کی، جس کے نتیجے میں وہ احسان جتا جتا کے کچھ دیتے تھے اور محتاجوں کے لیے مالداروں پر زکوٰۃ فرض کی:

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ (۲ : ۲۶۳-۲۶۴)	ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔ اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر خاک میں نہ ملاؤ۔

اور فرمایا:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔	اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

صدقہ مالداروں کا فقیر پر احسان نہیں بلکہ فقیر کا مالدار کی دولت میں حق ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا — وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (۹ : ۶۰)	یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہیں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلوب مطلوب ہو۔ نیز گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔

اور فقیر کا یہ حق مساوی ہے والدین کے اس حق کے، جو ضرورت کے وقت انہیں اپنے بیٹے کے مال میں حاصل ہوتا ہے:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ	لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو

خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ (۲: ۲۱۵)

مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر، اپنے رشتہ داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

یہ ایک نئی تعبیر ہے، جس کی اساس پر آپ بآسانی اسلامی نظمِ معیشت کی مکمل عمارت کھڑی کر سکتے ہیں، پھر یہ ایک ایسی تعبیر ہے کہ اس قسم کی قوت سے عرب پہلے ناآشنا تھے ہر زمانے میں لوگ احسان وعطا کے متعلق یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ دینے والے کا کرم ہے، لینے والے کا حق نہیں۔ لیکن قرآن احسان وعطا کو حق سمجھتا ہے اور صرف یہ حق ہی ہے جو مالداروں کی دولت کو گناہ کی آمیزش سے پاک کرتا ہے۔ اسی لیے شروع شروع اس نغمے کے جاندار اثر نے اسلام کی اشاعت میں کام کیا اور بعد کو اسلامی جماعت میں وہ برق رفتار تبدیلیاں پیدا کیں، جو اسی نظمِ معیشت کا لازمی ثمرہ تھیں۔

سُود کے خلاف اسلام نے نہایت شدید جنگ کی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ۔ (۲: ۲۷۶)

اللہ تعالیٰ سُود کو ہلاک کرتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

اور ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ (۲: ۲۷۵)

وہ لوگ جو سُود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔

بلکہ قرآن نے سُود کو لوگوں کے مال ناجائز طریقوں پر کھانے سے تعبیر کیا:

وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (۴: ۱۶۱)

اور وہ سُود لیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں، ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں سُود کا جو رواج تھا، اللہ نے اسے حرام قرار دے دیا اور تاکید فرما دی کہ جو شرائط پہلے طے پائی تھیں، ان کے مطابق کوئی شخص ایک حبہ بھی وصول نہ کرے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سُود لوگوں پر باقی ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم

02063

لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲: ۲۷۸-۲۷۹)

ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اب بھی توبہ کرلو اور سود چھوڑ دو تو اصل لینے کے تم حقدار ہو نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

اس اقتصادی و معاشی تنظیم کا اجتماعی زندگی پر اس قدر قوی اور گہرا اثر پڑا کہ سُود خواری جاہلی معاشرے سے کلیۃً مٹ گئی، جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی پُرجوش تائید نے اپنے معاشرے میں کہیں بھی اور کسی زمانے میں بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آخری زمانے تک مسلمان اپنی پوری قوتوں کے ساتھ اس معاشی مفسدے سے نفرت کرتے چلے آئے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی نظیر اس قدر عظیم، مستحکم، ہمہ گیر اور پائندہ انقلاب کی نہیں ہے۔

بعثتِ محمدیؐ سے پہلے

سیّد ابوالحسن علی ندوی

چھٹی صدی مسیحی کی دُنیا

چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دَور تھا، صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جا رہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہونچ گئی تھی، روئے زمین پر اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں اس کو گرنے سے روک سکے، نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی، انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا، پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے وہ ہواؤں کے طوفان میں یا تو بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند خدا شناس دل روشن تھے، جو شہروں کو چھوڑ کر چند پورے پورے گھروں میں بھی اُجالا نہیں کر سکتے تھے۔ دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دَیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے اور زندگی کی کش مکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائضِ قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے انھوں نے بادشاہوں اور اہلِ دنیا سے ساز باز کر لی تھی اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظامِ سلطنت و معیشت میں ان کے دستِ راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔ وہ دنیا کے لیے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمّہ دار تھے، مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں، ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے، بادشاہ اور حکام خوابِ غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے۔ کام و دہن کی لذّت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی مشغلہ نہ تھا، زندگی کی ہوس اور لذّت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ متوسط طبقہ کے لوگ (ہر زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور

اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے، باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بارے میں ایسے دبے ہوئے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپایوں سے ذرا مختلف نہ تھی، دوسروں کی راحت کے لیے محنت کرنے اور دوسروں کے عیش و عشرت کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جُتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصّہ نہ تھا، کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس کے یکساں چکّر سے اُکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دنیا کے مختلف حصّوں اور ملکوں میں ایسی ذہنی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رُونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دُوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دُوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اقوام و مذاہب پر ایک نظر

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے، ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھیں کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دُنیا میں آکر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔

تہذیب و تمدّن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا، نظامِ حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکّام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی، درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا، ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لیے مستحکم و معقول اصول۔

مسیحیت چھٹی صدی عیسوی میں

مسیحی مذہب میں کبھی بھی اس درجہ تفصیل و وضاحت نہ تھی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں یا اس کی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے، یا اس کے زیرِ ہدایت کوئی سلطنت چل سکے۔ جو کچھ تھا وہ صرف حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا ایک ہلکا سا خاکہ تھا جس پر توحید کے سادہ عقیدہ کا کچھ پر تو تھا۔ مسیحیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک قائم رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دست برد سے بچا رہا، اس نے تو آکر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی کیونکہ جس بُت پرستانہ ماحول میں

اس کی پرورش ہوئی تھی اور جن جاہلی خرافات سے وُہ نکل کر آیا تھا، اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی۔ اس کے بعد قسطنطین کا زمانہ آیا جس نے اپنے دورِ حکومت میں رہی سہی اصلیت بھی کھو دی۔ غرض یہ کہ چوتھی صدی ہی میں مسیحیت ایک معجون مرکب بن کر رہ گئی تھی، جس میں یونانی خرافات، رومی بت پرستی، مصری افلاطونیت (NEO- PLATIONISM; M) اور رہبانیت کے اجزا شامل تھے۔ حضرت مسیحؑ کی سادہ تعلیمات کا عنصر اس مجموعہ میں اس طرح گم ہو کر رہ گیا تھا جیسے کہ ایک قطرہ کا وجود سمندر میں گم ہو جاتا ہے۔ بالآخر مسیحیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا جو نہ روح میں گداز پیدا کر سکتے تھے نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے، نہ جذبات کو حرکت میں لا سکتے تھے اور نہ ان میں اس کی صلاحیت تھی کہ زندگی کے اہم مسائل میں انسانی قافلہ کی رہبری کر سکیں۔ اس پر تحریف و تاویل کی مصیبت مستزاد تھی، جس کا انجام یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ نصرانیت علم و فکر کے دروازے کھولتی، وہ خود علم و فکر کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئی اور صدیوں کے مسلسل انحطاط کے باعث محض ایک بُت پرستی کا مذہب بن کر رہ گئی۔ سیل (SALE) جس نے انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، چھٹی صدی عیسوی کے عیسائیوں کے بارے میں کہتا ہے:

"مسیحیوں نے بزرگوں اور حضرت مسیحؑ کے مجسموں کی پرستش میں اس درجہ غلو کیا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک بھی اس حد کو نہیں پہنچے۔"[1]

رومی سلطنت میں مذہبی خانہ جنگی

پھر نفس مذہب سے متعلق کلامی مباحث اُبھر آئے اور بے نتیجہ اختلافات کی شورش نے قوم کو اُلجھا دیا جس میں ان کی ذہانتیں ضائع ہوئیں اور قوائے عملیہ شل ہو گئے۔ بیشتر ان خانہ جنگیوں نے بڑے پیمانہ پر خونی معرکہ کی شکل اختیار کر لی۔ مدارس کلیسا اور لوگوں کے مکانات حریف کیمپ بن گئے تھے اور پورے کا پورا ملک خانہ جنگی (CIVIL WAR) کا شکار تھا۔ بحث یہ تھی کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت کیا ہے اور اس میں الٰہی اور بشری جزو کس تناسب سے ہیں! روم و شام کے ملکانی (MALKITE) عیسائیوں کا مذہب یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت مرکب ہے، اس میں ایک جزوِ الٰہی ہے اور ایک بشری۔ لیکن مصر کے منوفیشی (MONOPHYSITES) عیسائیوں کا اصرار تھا کہ حضرت مسیحؑ کی فطرت خالص الٰہی ہے اس میں ان کی فطرت بشری اس طرح فنا ہو گئی ہے جیسے سرکہ کا ایک قطرہ سمندر میں پڑ کر اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے۔ پہلا مسلک گویا حکومت کا سرکاری مسلک تھا، بازنطینی سلاطین و اہلِ حکومت نے اس کو عام کرنے اور پوری مملکت کا واحد مذہب بنانے میں پوری قوت صرف کی اور مخالفینِ مذہب (مبتدعین) کو سخت ترین سزائیں دیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اختلاف اور مذہبی کشاکش بڑھتی ہی رہی، دونوں فریق ایک دوسرے کو ایسا ہی خارج از مذہب اور بد دین سمجھتے تھے۔ جیسے دو

---

[1] S/ SALE'S TRANSLATION. P.62 (1896)

متضاد مذہب کے پیرو، قیرس (CYRUS) کی نیابت مصر کے دس سال (۶۳۱ء تا ۶۴۱ء) کی تاریخ وحشیانہ سزاؤں اور لرزہ خیز مظالم کی داستانوں سے لبریز ہے۔[۱]

اجتماعی بدنظمی اور معاشی بے چینی

روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہونچ گئی تھی باوجود اس کے کہ عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دوگنے چوگنے بڑھ گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدلیسی حکومتوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اجارہ داریاں (MONOPOLIS) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانہ پر فسادات اور بغاوتیں رُونما ہوئیں۔ چنانچہ ۵۳۲ء کے فساد میں تیس ہزار افراد دارالسلطنت میں ہلاک ہوئے[۲] اور ہرچند کہ وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہوسکتی ہے اس حد تک پہونچ چکے تھے، صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہیے اور اس کو فیشن پرستی، عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے۔ انسانیت و شرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب و اخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے تاکہ آزادی سے انھیں کھل کھیلنے کا موقع ملے۔[۳] انصاف کا حال یہ تھا کہ بقول سیل (SALE) جس طرح اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور ان کے دام ٹھیرائے جاتے ہیں اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت و خیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی۔[۵] گبن کہتا ہے:

"چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اس کی پستی انتہا پر تھی۔ اس کی مثال اس بڑے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سائے میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو جو روز بروز سوکھتا جارہا ہو۔"[۶]

---

[۱] ALFRED J BUTLER' ARABS CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION P. 23–30.

[۲] P. 183 – 189.

[۳] ENCYCLOPAEDIA BRITANICA CHAP JUSTIN.

[۴] THE HISTORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE V. 3 P. 327.

[۵] SALE'S TRANSLATION P. 72.

[۶] GIBBON V. V P. 31.

"تاریخِ عالم برائے مورخین" کے مصنفین لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمتِ رفتہ کو پھر زندہ کر سکیں وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانہ میں انتہائی انحطاط و تنزل کے عالم میں تھی اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا۔"[1]

یورپ کی شمالی و مغربی قومیں

وُہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں۔ جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں۔ وہ جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اسلامی وعربی اندلس (SPAIN) اس وقت تک منصۂ شہود پر نہیں آیا تھا کہ علم و تمدن سے روشناس کرائے۔ نیز مصائب و حوادث نے بھی ان کی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ غرض ہر طرح یہ قومیں تمدنِ انسانی کے قافلہ کی شاہراہ سے الگ تھلگ تھیں، بہت حد تک یہ دنیا سے بے خبر تھیں اور دنیا ان سے تقریباً ناآشنا تھی۔ مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آرہے تھے۔ ان سے ان قوموں کو دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ عقاید کے لحاظ سے یہ قومیں نوخیز مسیحیت اور فرسودہ بت پرستی کے درمیان میں تھیں۔ نہ دین سے متعلق ان کے پاس کوئی پیغام تھا اور نہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی مقام تھا۔ ایچ جی ویلز (H.G. WELLS) کا بیان ہے:

"اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یک جہتی اور نظام کے کوئی آثار نہ تھے۔"[2]

رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے:

"پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گھری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی چڑھی تھی۔ کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو سڑ گئی ہو۔ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مُہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہونچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس۔ وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔"[3]

---

[1] HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD. V. VII. P. 175.

[2] A SHORT HISTORY OF THE WORLD.

[3] THE MAKING OF HUMANITY V. P. 164.

یہود

یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی یہود نام کی قوم دنیا کی تمام قوموں میں اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ اس کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور اس میں دینی تعبیرات و اصطلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی، لیکن یہ یہودی مذہب تمدن یا سیاست میں وُہ مقام نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں بلکہ اُن کے لیے مقدر ہو چکا تھا کہ ہمیشہ ان پر دوسرے لوگ حکومت کریں اور ہمیشہ ظلم و استبداد، سزا و جلاوطنی اور مصائب و مشقت کے ہدف بنے رہیں، عرصہ دراز تک غلام رہنے اور انواع و اقسام کی سختیاں اور سزائیں جھیلنے کے سبب ان کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا، قومی غرور، نسبی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہُوئی طمع، مسلسل سود کے لین دین سے ان میں مخصوص ذہنیت و سیرت اور قومی خصائل و عادات پیدا ہو گئے تھے جن میں وُہ ہمیشہ منفرد رہے۔ کمزور یا مغلوب ہونے کے وقت ذلت و خوشامد، اور غالب ہونے کی صورت میں انتہائی بے رحمی اور بد معاملگی اور عام حالات میں دغابازی اور نفاق، سنگدلی و خود غرضی، مفت خوری و حرام خواری، راہِ حق سے لوگوں کو روکنا ان کا قومی کردار تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس صورت حال کا جو چھٹی اور ساتویں صدی میں تھی بہت واضح اور مکمل نقشہ کھینچا ہے اور بتلایا ہے کہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں وہ کس منزل میں تھے اور کیا اسباب تھے جن کی بنا پر وُہ ہمیشہ کے لیے عالم کی قیادت اور اقوام کی امامت سے معزول کر دیے گئے۔

چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت و منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ان میں سے کوئی دوسرے فریق کو ذلیل کرنے اور اس سے اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا۔ سنہ ۶۱۰ء میں یہودیوں نے انطاکیہ میں عیسائیوں کے خلاف بلوہ کیا۔ شہنشاہ فوقا (PHOCAS) نے ان کی سرکوبی کے لیے مشہور فوجی افسر ابنوسوس (BONOSUS) کو بھیجا۔ اس نے پُوری یہودی آبادی کا اس طرح خاتمہ کیا کہ ہزاروں کو تلوار سے، سیکڑوں کو دریا میں غرق کر کے، آگ میں جلا کر اور درندوں کے سامنے ڈال کر ہلاک کر دیا۔ سنہ ۶۱۵ء میں جب ایرانیوں نے شام کو فتح کیا تو یہودہی کے مشورہ و ترغیب سے خسرو نے عیسائیوں پر وحشیانہ مظالم کیے اور بیشتر عیسائیوں کو تہِ تیغ کیا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد ہرقل (HERACLIUS) نے زخم خوردہ عیسائیوں کے مشورہ سے سنہ ۶۳۰ء میں یہودیوں سے سخت انتقام لیا اور ان کا اس طرح قتل عام کیا کہ رومی مملکت میں صرف وہ یہود ہی بچ سکے جو ملک چھوڑ کر چلے گئے یا کہیں چھپے رہے۔[1]

اس سفاکی و بربریت اور اس خُون آشام ذہنیت کے ساتھ جس کا مظاہرہ ساتویں صدی کے ان دو عظیم ترین مذاہب

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخطط المقریزیہ ج ۴ ص ۳۹۲، اور THE ARAB'S CONQUEST OF EGYPT P. 133-134. HISTORIAN'S HISTORY OF THE WORLD V.8 - P.84.

نے کیا۔ اس کی کیا توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے دورِ حکومت میں انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے۔ حق و انصاف اور امن و صلح کا پیغام دُنیا کو سنائیں گے۔

ایران اور وہاں کی تخریبی تحریکات

متمدن دُنیا کی تولیت و انتظام میں ایران روم کا شریک نہیں تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ دشمن انسانیت افراد کی سرگرمیوں کا پرانا مرکز تھا وہاں کی اخلاقی بنیادیں زمانۂ دراز سے متزلزل چلی آ رہی تھیں، جن رشتوں سے ازدواجی تعلقات دنیا کے متمدن معتدل علاقوں کے باشندے ہمیشہ ناجائز اور غیر قانونی سمجھتے رہے ہیں اور فطری طور پر اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ایرانیوں کو ان کی حرمت و کراہت تسلیم نہیں تھی۔ یزدگرد دوم جس نے پانچویں صدی کے وسط میں حکومت کی ہے۔ اس نے اپنی لڑکی کو زوجیت میں رکھا پھر قتل کر دیا[1]۔ بہرام چوبیں جو چھٹی صدی عیسوی میں حکمران تھا اس نے اپنی بہن سے اپنا ازدواجی تعلق رکھا[2]۔ پروفیسر ار تھر کرسٹن کے مطابق اس قسم کا رشتہ ایران میں کوئی ناجائز فعل تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک عبادت اور کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔ مشہور چینی سیاح (ہون سیانگ) کا بیان ہے کہ ایرانی قانون و معاشرت میں ازدواجی تعلقات کے لیے کسی رشتہ کا بھی استثنا نہ تھا[3]۔

تیسری صدی عیسوی میں مانی دنیا کے سامنے آیا۔ اس کی تحریک در اصل ملک کے بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کا ایک غیر فطری اور سخت ردِ عمل اور نور و ظلمت کی مفروضہ کش مکش کا (جو ایران کا قدیمی فلسفہ ہے) نتیجہ تھا۔ چنانچہ اس نے تجرد کی زندگی اختیار کرنے کی دعوت دی تاکہ دُنیا سے شر و فساد کے جراثیم ناپید ہو جائیں۔ اس نے اعلان کیا کہ نور و ظلمت کا امتزاج ہی شر کا باعث ہے اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس بنا پر اس نے نکاح کو حرام قرار دیا کہ انسان جلد سے جلد فنا ہو جائے اور نسلِ انسانی منقطع ہو کر نور و ظلمت پر دائمی فتح حاصل ہو۔ بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ یہ شخص دُنیا کی تباہی کی دعوت دیتا ہے اس لیے قبل اس کے کہ دنیا ختم ہو اور اس کا مقصد پورا ہو اس کو خود ہلاک ہونا چاہیے۔ لیکن مانی مذہب کے قتل کے باوجود اس کی تعلیمات عرصہ تک زندہ رہیں اور اسلامی فتح کے بعد تک ان کے اثرات باقی رہے۔

ایران کی افتادِ طبع نے پھر ایک مرتبہ مانی کی دشمن فطرت تعلیمات کے خلاف بغاوت کی۔ یہ بغاوت مزدک (پیدائش ۴۸۷ء) کی دعوت کی شکل میں سامنے آئی۔ اس نے اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر پیدا ہوئے ہیں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ لہٰذا ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق حاصل ہیں اور چونکہ مال اور عورت ہی وہ ایسے عنصر ہیں جن کی حفاظت و نگرانی کا انسان اہتمام کرتا ہے لہذا انھیں میں مساوات و اشتراک کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ شہرستانی کا

---

[1] و [2] تاریخ طبری، ج ۳، ص ۱۳۸

[3] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۳۰

بیان ہے :

"مزدک نے تمام عورتوں کو سب کے لیے حلال قرار دے دیا اور مال و زن کو مثل آگ، پانی اور چارہ کے مشترک اور عام کر دیا۔" [1]

نوجوانوں اور عیش پسندوں کی مراد بر آئی اور انھوں نے اس تحریک کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ طرفہ تماشہ یہ ہُوا کہ شاہِ ایران قباذ نے اس کی سرپرستی قبول کی اور اس کی اشاعت و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ تحریک آگ کی طرح ملک میں پھیل گئی۔ پُورے کا پُورا ایران جنسی انارکی اور شہوانی بحران میں ڈوب گیا۔ طبرانی کا بیان ہے کہ :

"اوباش اور آوارہ مزاج لوگوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مزدک اور مزدکیوں کے پُرجوش ساتھی اور دست و بازو بن گئے۔ عام شہری اس بلائے ناگہانی کا شکار تھے۔ اس تحریک کا اتنا زور ہُوا کہ جو چاہتا جس کے گھر میں جا گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا اور صاحبِ مکان کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ان مزدکیوں نے قباذ کو اُبھارا اور اسے معزولی کی دھمکی دے کر تیار کر لیا کہ وہ بھی اس دعوت کو اپنا لے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ عالم ہو گیا کہ نہ باپ اپنے لڑکوں کو پہچان سکتا تھا اور نہ لڑکا اپنے باپ کو۔ کسی کا بھی اپنی کسی ملکیت پر اختیار اور قبضہ نہیں تھا۔" [2]

طبری کا بیان ہے کہ :

"اس تحریک سے پہلے قباذ ایران کے اچھے فرمانرواؤں میں تھا۔ لیکن مزدک کی پیروی کی وجہ سے حدودِ مملکت اور سرحدوں میں پراگندگی اور ابتری پھیل گئی۔" [3]

ایران کی شاہ پرستی

ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ (خسرو) ہُوا کرتا تھا اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے۔ اہلِ ایران بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان سلاطین کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے، ان کی اُلوہیت کے ترانے گاتے اور انھیں قانون سے، تنقید سے بلکہ بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔ فرطِ ادب سے ان سلاطین کے نام بھی اپنی زبان پر نہ لاتے اور نہ کوئی شخص ان کی مجلس میں بیٹھنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ اہلِ ایران کا عقیدہ تھا کہ ان سلاطین کا ہر انسان پر پیدائشی حق ہے، اور کسی انسان کا ان سلاطین پر حق نہیں۔ شاہِ ایران اپنی دولت میں سے جو تھوڑا بہت کسی کو دے دے یا اپنے دسترخوان سے کوئی ٹکڑا

---

[1] الملل و النحل للشہرستانی ص ۸۶

[2] و [3] تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۸

اٹھا کر کسی کو عطا کر دے وہ اس کا احسان و صدقہ ہے، کسی کا استحقاق نہیں، لوگوں کو سوائے احکام کی بجا آوری کے کسی امر میں دخل نہ دینا چاہیے۔ ملک و قوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانہ (کیانی خاندان) متعین تھا۔ اہلِ ایران سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں اور یہ حق وراثتاً بیٹے کو باپ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہے گا۔ اس حق میں کسی کو دست درازی کی مجال نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بادشاہِ وقت پر ایمان رکھتے تھے کہ حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے کہ جس میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ نہ ملتا تو بچہ ہی کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیتے۔ اور اگر کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شہنشاہی پہناتے۔ چنانچہ شیرویہ کے بعد اس کے ہفت سالہ بچہ اردشیر کو شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور خسرو پرویز کے بیٹے فرخ زاد خسرو کو طفلی کی حالت میں لوگوں نے بادشاہ بنایا اور کسریٰ کی لڑکی بوران بھی تخت نشین ہوئی اور دوسری بیٹی جس کا نام آزرمی دخت تھا وہ بھی حکومت کر چکی ہے[۱] کسی کو اس کا تصور بھی نہیں آیا کہ کسی سپہ سالار یا بڑے سردار یا کسی دوسرے لائق اور آزمودہ کار شخص کو (جیسے رستم و جابان تھے) انتظامِ سلطنت سپرد کر دیں چونکہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مذہبی گھرانوں اور سرداروں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ لوگ عام انسانی سطح سے بلند ہیں اور ان کی شخصیتیں اور ان کے دل و دماغ دوسرے انسانوں سے الگ ہیں۔ ان اشخاص کو اہلِ ایران نے غیر محدود اختیارات دے رکھے تھے اونچ نیچ کا فرق، طبقوں کا تفاوت اور پیشوں کی تقسیم ایرانی سوسائٹی اور نظامِ زندگی کا اٹل قانون تھا جس میں ردّ و بدل ممکن نہ تھا، پروفیسر ارتھر کرسٹن سین کا بیان ہے:

"سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ تھا[۲] حکومت کی طرف سے عوام الناس کو ممانعت تھی کہ وہ طبقۂ امرا میں سے کسی کی جائداد کو خرید سکیں[۳]۔ سیاست ساسانی کا یہ محکم اصول تھا کہ ہرگز کوئی شخص اپنے اس رتبہ سے بلند تر رتبہ کا خواہاں نہ ہو جو اس کو پیدائشی طور پر یعنی از روئے نسب حاصل ہے[۴] کوئی شخص مجاز نہ تھا کہ سوائے اس پیشہ کے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے کوئی دوسرا پیشہ اختیار کر سکے[۵] شاہانِ ایران حکومت کا کوئی کام کسی نیچ ذات کے آدمی کے سپرد نہیں کرتے تھے[۶] عوام الناس کی مختلف جماعتوں میں نہایت صریح امتیاز تھا، سوسائٹی میں ہر شخص کی ایک معین جگہ تھی"[۷]

ایرانیوں کی قوم پرستی

اہلِ ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت و تقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا کی

---

[۱] تاریخ طبری ج ۲ و تاریخ ایران از مکاریوس ایرانی

[۲] ایران بعہد ساسانیاں ص ۹۰ د [۳] ص ۳۴۲ [۴] ص ۴۱۸ [۵] ص ۴۲۳ [۶] ص ۴۲۲ [۷] ص ۴۲۱

ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت و نسل کو فضیلت و برتری حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ خصوصی صلاحیتیں اور فطری قابلیتیں بخشی ہیں جن میں ان کا کوئی شریک و ہمسر نہیں۔ یہ لوگ اپنے گرد و پیش کی قوموں کو بڑی حقارت و ذلت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان کے لیے ایسے ایسے نام تجویز کرتے تھے جن میں توہین یا تمسخر پایا جاتا۔

آتش پرستی اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات

چونکہ آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے اور اپنا پیغام پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ اس میں یہ قدرت ہے کہ اپنے پجاریوں کے مسائلِ زندگی کو حل کر سکے، ان میں دخل دے اور مجرموں، گنہگاروں اور مفسدوں کا ہاتھ پکڑ سکے، اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجوسیوں کا مذہب چند مراسم و روایات کا نام رہ گیا تھا جنھیں مخصوص اوقات اور خاص خاص مقامات پر ادا کر لیا کرتے تھے، رہا عبادت گاہوں سے باہر اپنے گھروں اور بازاروں، دائرۂ اثر اور سیاسی و اجتماعی امور میں، تو اس میں یہ بالکل آزاد تھے، اپنی من مانی کرتے، ان کے خیالات جس رُخ پر چاہتے انھیں موڑتے رہتے یا پھر جو مصلحت اور وقت کا تقاضا ہوتا اس پر کاربند ہوتے، جیسا کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں عام طور پر مشرکوں کا حال رہا ہے۔

غرض اہلِ ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے جو اُن کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا، نفسیاتی خواہشات کو دبانے اور نیک خواہشات کو اُبھارنے کی اس میں طاقت ہوتی، وُہ خاندان کا نظامِ زندگی ملک کا دستورِ حکومت ہوتا، جو سلاطین کی چیرہ دستیوں اور حکام کی زیادتیوں کی روک تھام کر سکتا، ظالم کا ہاتھ پکڑ سکتا اور مظلوم کے حق میں انصاف کرا سکتا، لیکن جیسا کہ اوپر گزر چکا آتش پرست ایرانیوں کو ایسا دین نصیب نہ تھا۔ اور اس طرح ایران کے مجوسیوں اور دُنیا کے دُوسرے لامذہب و لاقانون افراد میں اخلاق و اعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہ تھا۔

بودھ مت اور اس کے تغیرات

بودھ مت اپنی سادگی اور اپنی انفرادیت عرصہ ہوا کھو چکا تھا، بودھ مذہب نے ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے میں شامل کر کے اور اس کے اوتاروں اور دیوتاؤں کو اختیار کر کے (جیسا کہ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدنِ ہند کا رجحان معلوم ہوتا ہے) اپنی ہستی کو گم کر دیا تھا برہمنیت نے (جو عرصہ سے خار کھائے بیٹھی تھی) اس کو ہضم اور اپنے میں ضم کر لیا تھا۔ بہر حال یہ دونوں مذاہب جو عرصہ سے ایک دوسرے کے حریف چلے آ رہے تھے باہم شیر و شکر ہو چکے تھے اور بدھ مت اب عرصہ سے بت پرستی کا ایک مذہب تھا، جن ممالک میں بھی اس مذہب کے پیرو گئے بُت ان کے ساتھ رہے۔ یہ لوگ جہاں جاتے اور جس ملک میں پہنچتے گوتم کے مجسمے نصب کرتے اور اس کی شبیہیں تیار کرتے۔ ان کی مذہبی اور تمدنی زندگی ان مجسموں سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہے[1]۔ یہ مجسمے زیادہ تر بودھ مت کے دورِ ترقی میں تیار ہُوئے تھے۔ پروفیسر ایشورا ٹوپا اپنی کتاب

[1] ٹکسلا (قدیم بدھ دار السلطنت) کے عجائب خانہ کی سیر کرنے والا ان مجسموں اور مورتوں کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

"ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں :

"بدھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قایم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرمار اور مورت پرستی کا دَور دَورہ دکھلائی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی۔ اس میں بدعتیں اور جدتیں یکے بعد دیگرے نظر آ رہی تھیں"۔[۱]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاشِ ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بدھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کے متعلق لکھتے ہیں :

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنادیا، بُدھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دولت مند ہو گئے اور ایک خاص جماعت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا۔ عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تنزل شروع ہوگیا۔ اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی مسز رائس ڈیوڈس (RHYSE DAVIDS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے :

"ان مریضانہ تخیلات کے گہرے سائے میں آکر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہوگئی۔ ایک نظریہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دُوسرے نے لے لی، اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضا ذہن کی اُن پر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانیِ مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الٰہیاتی مُوشگافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔[۲]

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں ہی میں گراوٹ پیدا ہوگئی اور ان میں اکثر مبتذل رسوم داخل ہوگئیں دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا، بدھ مت برہمنیت میں گھل مل گیا"۔[۳]

خلاصہ یہ کہ چین اور ان تمام ممالک کے پاس (جو بودھ مت کے پیرو تھے) دنیا کے لیے کوئی پیغام نہیں تھا جس کی روشنی میں دنیا اپنے مسائل کا حل تلاش کرسکتی اور خدا کا سیدھا راستہ پاتی۔ اہلِ چین متمدن دنیا کے بالکل مشرقی کنارہ پر اپنی علمی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو بدھ مذہب کے مِٹے ہوئے شہروں کی کھدائی کے بعد نکلے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اور اس کا تمدن خالص بُت پرستانہ مذہب و تمدن بن گیا تھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان نے بھی ہندوستان میں بدھ عمارتوں اور یادگاروں کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالا ہے۔ وہ "تمدنِ ہند" میں لکھتا ہے :

"اصلی بدھ مذہب کو سمجھنے اور جاننے کے لیے اس مذہب کی یادگاروں کا مطالعہ کرنا چاہیے نہ کہ کتابوں کا۔ جو سبق ہمیں ان یادگاروں سے ملتا ہے وہ ان کتابی مسائل سے جن کی تعلیم یورپی مصنفین کرتے ہیں بالکل علحدہ ہے۔ یہ یادگاریں ثابت کرتی ہیں کہ جس مذہب کو یورپی علماً الحادی مذہب بتاتے ہیں وہ فی الواقع بت پرست اور کثیر الالٰہ مذاہب کا سرتاج ہے"۔ (تمدنِ ہند ص ۲۴۵)

[۱] ہندوستانی تمدن (اردو) ایشوراٹوپا [۲] تلاشِ ہند ص ۲۰۱ - ۲۰۳ [۳] ایضاً

مذہبی میراث کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے، جس میں نہ خود وہ کسی اضافہ کے خواہشمند تھے اور نہ دُوسروں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے اہل تھے۔

وسطِ ایشیا کی قومیں

مشرق اور وسط ایشیا کی دُوسری قومیں (مغل، ترک، جاپانی) وغیرہ بگڑے ہُوئے بودھ مت اور وحشیانہ بت پرستی کے درمیان تھیں، نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی اور نہ سیاست کا کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے یہاں تھا، دراصل یہ قومیں اپنے عبوری دور میں تھیں، جاہلانہ بُت پرستی سے نکل کر تمدّن کی طرف آ رہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دورِ طفولیت تھا۔

ہندوستان، مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے

ہندوستان کے مورخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا (جو کسی زمانہ میں علم و تمدّن اور اخلاقی تحریکات کا مرکز رہا ہے) پست ترین دَور تھا۔ ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات تھیں جن میں اس ملک کو شانِ یکتائی حاصل تھی۔ ان خصوصیات کو تین عنوانات کے ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ معبودوں کی حد سے بڑھی ہوئی کثرت

۲۔ جنسی خواہشات کی ہیجانی کیفیت

۳۔ طبقاتی تقسیم اور معاشرتی امتیازات

نِت نئے دیوتا

چھٹی صدی عیسوی میں بُت پرستی پُورے عروج پر تھی۔ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی۔ اس صدی میں تینتیس کروڑ ہوگئی۔ اس عہد میں ہر پسندیدہ شے، ہر کشش رکھنے والی اور زندگی کی کوئی ضرورت پُوری کرنے والی چیز دیوتا بن گئی تھی جس کی پُوجا کی جاتی تھی۔ اس طرح بتوں اور مجسموں، دیوتاؤں اور دیویوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ان دیوتاؤں اور قابلِ پرستش اشیا میں معدنیات و جمادات، اشجار و نباتات، پہاڑ اور دریا، حیوانات حتّٰی کہ آلاتِ تناسل سب ہی شامل تھے۔ اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقاید و عبادات کا ایک دیومالا بن کر رہ گیا۔ ڈاکٹر گستاولی بان "تمدّنِ ہند" میں لکھتا ہے:

"دنیا کی تمام اقوام میں ہندو کے لیے پرستش میں ظاہری صورت کا ہونا لازمی ہے، اگرچہ مختلف ازمنہ

میں مذہبی اصلاح کرنے والوں نے ہندو مذہب میں توحید کو ثابت کرنا چاہا ہے۔ لیکن یہ کوشش بالکل بے فائدہ ہے۔ ہندو کے نزدیک کیا ویدی زمانہ میں اور کیا اس وقت ہر چیز خدا ہے جو کوئی چیز اس کی سمجھ میں نہ آئے یا جس سے وہ مقابلہ نہ کر سکے اس کے نزدیک پرستش کے لائق ہے۔ برہمنوں اور فلسفیوں کی نہ صرف کل کوششیں جو انھوں نے توحید قائم کرنے کے لیے کیں بلکہ کل وہ کوششیں بھی جو وہ دیوتاؤں کی تعداد گھٹا کر تین پر لانے کے لیے عمل میں لائے، محض بیکار اور رائیگاں گئیں۔ عوام الناس نے ان کی تعلیم کو سنا اور قبول کیا۔ لیکن عملاً یہ تین خدا تعداد میں بڑھتے گئے اور ہر ایک چیز میں، ہر ایک رنگ و بو میں اُن کے اوتار نظر آنے لگے۔"[1]

چھٹی ساتویں صدی میں بُت سازی کے فن نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد میں یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا تھا سارے ملک میں بت پرستی کا دور دورہ تھا، حتیٰ کہ بودھ مت اور جینی مذہب کو بھی مذاق عام کا ساتھ دینا پڑا اور اپنی زندگی اور مقبولیت کو قائم رکھنے کے لیے اسی روش کو اختیار کرنا پڑا۔ بُت پرستی کے اس عروج اور مورتیوں اور مجسموں کی کثرت کا اندازہ چینی سیاح ہوئن سیانگ (جس نے ۶۳۰ء اور ۶۴۴ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی ہے) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے راجہ ہرش (۶۰۶ - ۶۴۷ء) کے جشن کی کیفیت سنائی ہے۔

ہوئن سیانگ لکھتا ہے:

"راجہ ہرش نے قنوج میں علمائے مذہب کا مجمع کرایا، کوئی پچاس ہاتھ اونچے مینار پر گوتم بدھ کی طلائی مورت نصب کی گئی تھی۔ اس کی دوسری چھوٹی مورت کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا جس میں ہرش نے سکر دیوتا کے لباس میں چتر برداری کی اور اس کے حلیف راجہ دائی کامروپ نے مگس رانی کی۔"[2]

ہوئن سیانگ نے ہرش کے خاندان یا درباریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کوئی تو شیو کا پرستار تھا اور کوئی بودھ مت کا پیرو ہو گیا تھا۔ بعض لوگ سورج کی پُوجا کرتے تھے بعض وشنو کی۔ ہر شخص آزاد تھا کہ جس دیوی دیوتا کو چاہے اپنی پرستش کے لیے مخصوص کرے اور چاہے تو سب کی پُوجا کرے۔[3]

جنسی بحران

شہوانی جذبات اور جنسی (SEXUL) میلان کو اُبھارنے والے عناصر مذہبی صورت میں جس قدر ہندوستان کے

---

[1] تمدنِ ہند ص ۴۴۰ - ۴۴۱

[2] ہوئن سیانگ کا سفر نامہ" نوکوٹی کی" (مغربی سلطنت) [3] ایضاً

قدیم مذہب و تمدن میں ہیں کسی دوسرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔ ملک کی مقدس کتابوں اور مذہبی حلقوں نے اہم واقعات حوادث کے وقوع اور موجودات کے وجود کی توجیہ کے سلسلہ میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہم اختلاط اور بعض اونچے گھرانوں پر ان کی توجہات کے بعض ایسے واقعات اور روایتیں بیان کی ہیں جن کو سن کر آنکھیں نیچی اور پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ ان حکایتوں کا سادہ لوح اہلِ مذہب پر جو بڑے اخلاص اور جوشِ ایمانی کے ساتھ ان کہانیوں کو دہراتے ہیں جو کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا قیاس کرنا کچھ مشکل نہیں ظاہر ہے کہ ان کے اعصاب اور جذبات پر یہ روایتیں غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوں گی۔ اس کے علاوہ بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پوجا ہوتی تھی اور بچے، جوان، مرد، عورت، سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر گستاولی بان اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ اہلِ ہند کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا اُنس ہے۔ اُن کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ نہایت اہتمام سے بجالاتے ہیں ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں، جن سے مراد مادہ خلقت کے دونوں جزو ہیں، اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں۔"[1]

بعض مورخین کا بیان ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے۔[2] مندروں کے محافظ و منتظم بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے اور بہت سی عبادت گاہیں اخلاقی جرائم (CORRUPTION) کا مرکز تھیں۔ راجاؤں کے محل اور بادشاہوں کے درباروں میں بے تکلف شراب کا دور چلتا اور سرمستی میں اخلاقی حدود برقرار نہ رہتے۔

اس تن پروری و نفس پرستی کے بالکل متوازی نفس کشی، ریاضت و مجاہدہ (یوگ اور تپسیا) کا سلسلہ بھی جاری تھا جس میں حد درجہ غلو اور انتہا پسندی سے کام لیا جاتا تھا۔ ملک ان دونوں سروں کے درمیان اعتدال و توازن سے محروم تھا چند افراد نفس کشی اور روحانی ترقی میں مصروف تھے اور عام آبادی شہوانیت اور نفس پرستی کے دھارے میں بہی چلی جا رہی تھی۔

طبقہ واریت

کسی قوم کی تاریخ میں اس قدر بین طبقہ واری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی انمٹ اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی و معاشرتی قانون میں ہے۔ ذات پات کی تفریق اور پیشہ کی جکڑ بندیوں کی ابتداء وید کے آخری زمانہ سے شروع ہو جاتی ہے۔ آریوں نے اپنی نسل اور اس کی خصوصیات کو محفوظ

---

[1] تمدنِ ہند ص ۴۴۷

[2] ستیارتھ پرکاش (دیانند سرسوتی) ص ۳۴۴

رکھنے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت قائم رکھنے اور اپنا تفوق و برتری برقرار رکھنے کے لیے اس طبقہ واری تقسیم اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے :

"ویدی زمانہ کے آخر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مختلف پیشے کم و بیش آبائی ہوتے جا رہے تھے اور ذات کی تقسیم شروع ہو چکی تھی اگرچہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ ویدی آریوں کو یہ خیال پیدا ہو چکا تھا کہ وہ اپنی پرانی نسل کو اقوامِ مفتوحہ کے میل جول سے محفوظ رکھیں، اور جس وقت یہ قلیل التعداد فاتحین مشرق کی طرف بڑھے اور انھوں نے دیسی اقوام کے ایک بہت بڑے گروہ کو فتح کر لیا تو یہ ضرورت اور بھی زیادہ ہو گئی اور مقننوں کو اس کا لحاظ کرنا لازمی ہو گیا۔ نسل کے مسائل کو آریہ سمجھ چکے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کوئی قلیل التعداد فاتح قوم اپنی پوری حفاظت نہ کرے تو وہ بہت جلد مفتوح اقوام میں کھپ جاتی ہے اور اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔" [۱]

لیکن اس کو ایک مرتب و مفصل قانون کی شکل دینے کا سہرا منوجی کے سر ہے۔ منوجی نے پیدائشِ مسیح سے تین سو برس پہلے (جب ہندوستان میں برہمنی تہذیب عروج پر تھی) ہندوستانی سماج کے لیے اس قانون کو مرتب کیا اور تمام اہلِ ملک نے اس کو بالاتفاق قبول کیا اور اس نے بہت جلد ملکی قانون اور ایک مذہبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ وہی قانون ہے جس کو ہم آج "منوشاستر" کے نام سے جانتے ہیں۔

منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں :

۱۔ برہمن یعنی مذہبی پیشوا

۲۔ چھتری لڑنے والے

۳۔ ویش زراعت و تجارت پیشہ ، اور

۴۔ شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔

منوشاستر میں ہے :

"قادرِ مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لیے اپنے منھ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر کو پیدا کیا۔ [۲]

اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لیے علٰحدہ علٰحدہ فرائض قرار دیے۔" [۳]

برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کے چڑھاوے دینا اور دان دینے کا فرض قرار دیا۔ [۴]

---

[۱] تمدنِ ہند ص۱۱۲ [۲] منوشاستر باب اوّل ص۱۳ [۳] باب اوّل ص۱۳ [۴] باب اول ص ۸۸

چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور خواہشاتِ نفسانی میں نہ پڑے۔[1]

ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے، تجارت، لین دین زراعت کرے۔[2]

شودر کے لیے قادرِ مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔"[3]

اس قانون نے برہمنوں کو دوسری ذاتوں کے مقابلہ میں اتنا امتیاز اور تفوق و تقدس عطا کیا تھا کہ وہ دیوتاؤں کے ہمسر بن گئے۔ منوشاستر میں ہے:

"جب کوئی برہمن پیدا ہوتا ہے تو وہ دنیا میں سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ وہ بادشاہ ہے کل مخلوقات کا اور اس کا کام ہے شاستر کی حفاظت[4]

جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے، کل چیزیں اسی کی ہیں[5]

برہمن کو ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا، کیونکہ غلام صاحبِ جائداد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کل املاک مالک کا مال ہے[6]

جس برہمن کو رگ وید یاد ہے وہ بالکل گناہ سے پاک ہے اگرچہ وہ تینوں عالم کو ناس کیوں نہ کر دے یا کسی کا بھی کھانا کیوں نہ کھائے[7]

بادشاہ کو کیسی ہی سخت ضرورت ہو اور وہ مرتا بھی ہو تو بھی اسے برہمنوں سے محصول نہ لینا چاہیے اور نہ اپنے ملک کے کسی برہمن کو بھوک سے مرنے دینا چاہیے[8]

سزائے موت کے عوض میں برہمن کا صرف سر مونڈا جائے گا لیکن اور ذات کے لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی[9]

اس قانون میں چھتری اگرچہ ویش اور شودر کے مقابلہ میں بلند ہیں لیکن برہمنوں کے مقابلہ میں وہ بھی ہیچ ہیں۔ منو لکھتے ہیں:

"دس سال کی عمر کا برہمن اور سو سال کی عمر کا چھتری گویا آپس میں باپ بیٹے کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں برہمن باپ ہے۔"[10]

---

[1] منوشاستر باب اول ۸۹ [2] باب اول ۹۰ [3] باب اول ۹۱ [4] باب اول ۹۹ [5] باب اول ۱۰۰
[6] باب ہشتم ۴۱۷ [7] باب نہم ۲۶۲ [8] باب ہفتم ۱۳۳ [9] باب ہشتم ۳۷۹
[10] باب دوم ۱۳۵

بدقسمت شودر

باقی رہے اچھوت شودر، تو وہ ہندوستانی سماج میں اس شہری و مذہبی قانون کی رُو سے جانوروں سے پست درجہ کے، اور کُتوں سے زیادہ ذلیل تھے۔ منوشاستر میں ہے:

"برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابلِ تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔[1]

شودر کو اگر موقع ملے تو اُسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے۔ کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔[2]

اگر شودر دُوجوں پر ہاتھ یا لکڑی اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے گا۔ اور اگر وہ غصے میں لات مارے تو اس کا پیر کاٹ ڈالا جائے گا۔[3]

اگر کوئی شودر کسی دوج کے ساتھ ایک ہی جگہ بیٹھنا چاہے تو بادشاہ کو چاہیے کہ اس کے سُرین کو دغوا دے اور اسے ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کو زخمی کرا دے۔[4]

اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے۔[5]

کُتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوّے، اُلّو اور شودر کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔"[6]

ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت

برہمنی زمانہ اور تہذیب میں عورت کا وہ درجہ نہیں رہا تھا جو ویدی زمانہ میں تھا۔ منو کے قانون میں (بقول ڈاکٹر لی بان) عورت ہمیشہ کمزور اور بے وفا سمجھی گئی ہے اور اس کا ذکر ہمیشہ حقارت کے ساتھ آیا ہے۔[7]

شوہر مرجاتا تو عورت گویا جیتے جی مرجاتی اور زندہ درگور ہوجاتی۔ وہ کبھی دُوسری شادی نہ کر سکتی تھی۔ اس کی قسمت میں طعن و تشنیع اور ذلت و تحقیر کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ بیوہ ہونے کے بعد اپنے متوفی شوہر کے گھر کی لونڈی اور دیوروں کی خادمہ بن کر رہنا پڑتا۔ اکثر بیوائیں اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہوجاتیں۔ ڈاکٹر لی بان لکھتا ہے:

"بیواؤں کو اپنے شوہروں کی لاش کے ساتھ جلانے کا ذکر منوشاستر میں نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] باب دہم ۱۲۹ [2] باب دہم ۱۲۹ [3] باب ہشتم ۲۸۰ [4] باب ہشتم ۲۸۱ [5] R.C. DUTT P. 342-343.
[6] منوشاستر [7] تمدنِ ہند ۲۳۶

یہ رسم ہندوستان میں عام ہو چلی تھی، کیونکہ یونانی مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔"[1]

غرض یہ سرسبز و شاداب ملک جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا، سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے عرصے محروم ہونے اور مذہب کے مستند ماخذوں کے گم ہو جانے کی وجہ سے قیاسات و تحریفات کا شکار اور رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا، اور اس وقت کی دنیا میں جہالت و توہم پرستی، پست درجہ کی بُت پرستی، نفسانی خواہشات اور طبقہ داری ناانصافی میں پیش پیش تھا اور دُنیا کی اخلاقی و روحانی رہبری کے بجائے خود اندرونی انتشار اور اخلاقی بدنظمی میں مبتلا تھا۔

عرب

دورِ جاہلیت میں عرب اپنی فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے۔ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے، عقیدہ کے پرجوش، صاف گو اور جری، حافظہ کے قوی، مساوات، بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی، ارادہ کے پکے، زبان کے سچے، وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیا اور اُن کی تعلیمات سے بُعد، ایک جزیرہ نما میں صدیوں کے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی و اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے۔ چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے، کھلی ہوئی بُت پرستی میں مبتلا، اور اس میں دنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھُن کی طرح کھا رہے تھے، غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور معائب میں مبتلا تھے۔

دَورِ جاہلیت کے بُت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بُتوں اور مُورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکزِ توجہ بنانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا[2]) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دُوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ، قربانی، حلف، دعا و استعانت) انھیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور ملک میں کھلی بت پرستی، خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا

---

[1] تمدنِ ہند ص ۲۳۸ [2] ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ

دَورِ دورہ تھا[1]

عرب میں ہر ہر قبیلہ، ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بُت تھا، بلکہ ہر گھر کا بُت جُدا تھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بُت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے۔ جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بُت کو حصولِ برکت کے لیے چھُوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بُت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا[2]۔ بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا۔ کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بُت تیار کر لیا تھا جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے[3] خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا) اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بُت تھے[4]۔ بتوں اور دیوتاؤں کی پُوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پُوجتے۔

بخاری میں ابو رجاؔ العطاردی سے روایت ہے کہ "ہم لوگ پتھر کو پُوجتے تھے اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے۔"[5]

کلبی کا بیان ہے کہ "کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اُترتا تو چار پتھر لے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔"[6]

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا۔ ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے۔ فرشتوں کے بارہ میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لیے ان سے

---

[1] عرب جاہلیت کے عقائد کی حقیقت اور مشرکانہ عقیدہ کے تدریجی ارتقا کو معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو شامی فاضل محمد عزت دروزہ کی کتاب بیئة النبی صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن اور ماحول قرآن کی روشنی میں)

[2] کتاب الاصنام ص ۳۳ [3] ایضاً

[4] صحیح بخاری کتاب المغازی باب فتح مکہ۔ [5] ایضاً باب وفد بنی حنیفہ

[6] کتاب الاصنام

شفاعت کے طلبگار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے، ان کی قدرت اور اثراندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے ۔[1]

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کو پوجتی تھی ۔[2]

صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا، کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا، بنو تمیم وبران کی، لخم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعری اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا ۔[3]

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کیے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اس کی مقبولیت و عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔[4] شراب کی دکانیں برسرِ راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا۔[5] جُوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی ۔[6]

تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا۔ پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا۔ اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی ۔[7]

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے ۔[8] زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنانِ بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا ۔[9]

---

[1] کتاب الاصنام ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۳۴ [3] طبقات الامم (صاعد اندلسی) ص ۴۳۰

[4] ملاحظہ ہو کتاب المخصص (ابن سیدہ) الخمر ج ۱۱ ص ۷۲، ۸۲ [5] سبع معلقات معلقہ شعر قدبت سامرھا الخ

[6] دیوان الحماسہ قصیدۂ حجر بن خالد شعر و اذا ھلکت فلا تریدی عاجز الخ

[7] ملاحظہ ہو تفسیر طبری تفسیر آیت انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء

[8] تفسیر طبری ج ۳ ص ۵۹-۶۹

[9] ملاحظہ ہو العقد الفرید کتاب اخبار زیاد (ابن عبد ربہ)

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے[1]۔ دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی[2]۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں[3]۔

لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انھیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ ہیثم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک کہ اسلام نہیں آیا[4]۔ بعض ننگ و عار کی بنا پر، بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفا و رؤسا ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور اُن کی جان بچاتے[5]۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا[6]۔ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی جاہلی باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے اندوہ ناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں[7]۔

قبائلی و خاندانی عصبیت و امتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی رُوح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے:

انصر اخاك ظالماً او مظلوماً۔

یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا۔ بعض خاندان دُوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۲۳۲ [2] سورۃ النسا، آیت ۱۹ [3] سورۃ الانعام، آیت ۱۴۰ [4] میدانی [5] ملاحظہ ہو بلوغ الارب فی احوال العرب۔ آلوسی [6] کتاب الاغانی [7] ملاحظہ ہو سنن الدارمی ۱۷ باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجہل والضلالۃ۔ ص ۳

نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے۔ وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے۔ آنے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے[1]۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا۔ کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا، جنگ ان کے لیے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل لبستگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا، ایک شاعر فخریہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر و حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں[2]۔ ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ:

"میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار کے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔"[3]

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لیے معمولی کام تھا۔ جنگ کو بھڑکانے کے لیے معمولی واقعات کافی تھے۔ وائل کی اولاد، بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا۔ ایک سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ دونوں خاندان مٹ گئے۔ ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی۔ بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے، لاشیں دفن نہیں کی جاتیں[4]۔ پورا جزیرۂ عرب گویا شکاری کا جال تھا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکہ سے قتل کر دیا جائے گا، لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اُچک لیے جاتے تھے، یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے چوکی پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی[5]۔

دنیا کا عمومی جائزہ

ایک انگریز سیرت نگار آر، وی، سی، بوڈلے (R.V.C. BODLEY) اپنی کتاب "پیغامبر" (THE MESSENGER) میں زمانۂ بعثت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک و

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۱۹۹ [2] و احیانا علی بکر اخینا اذا ما لم نجد الا اخانا (حماسہ) [3] اذا المهرة الشقراء ادرك ظهرها + فشبّ الاله الحرب بين القبائل (حماسہ) [4] ملاحظہ ہو کتاب ایام العرب

[5] ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۳۳

اقوام کا تذکرہ کرتا ہے:

"قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اوّل ہی تباہ ہو چکی تھی یا اپنے شاہی دَور کے اختتام پر تھیں۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت، ایران کی عظمت اور روما کی شوکت وجلال سے متحیّر تھی اور کوئی ایسی ایک شے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

یہودی تمام دُنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے ان کو کوئی مرکزی رہنمائی حاصل نہ تھی۔ حالات کے مطابق یا تو ان کو محض برداشت کیا جاتا یا اذیتیں دی جاتیں، کوئی ملک اُن کا اپنا ذاتی نہ تھا اور ان کا مستقبل اسی قدر غیر یقینی تھا جس طرح کہ آج ہے۔

پوپ گریگری اعظم (GRIGORY THE GREAT) کے حلقۂ اثر سے باہر مسیحی اپنے سہل عقائد کے ہر قسم کے پیچیدہ معانی ایجاد کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں ایک دُوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف تھے۔

ایران میں تعمیرِ سلطنت کی صرف ایک کرن رہ گئی تھی۔ خسرو ثانی اپنی سلطنت کی توسیع میں مصروف تھا اس نے روما کو شکست دے کر کیپدوشیا (CAPPADOCIA) مصر و شام پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے ۶۲۰ء میں (جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رہنما ظاہر ہونے والے تھے) بیت المقدس کو تاراج کر کے مقدس صلیب کو چُرا لیا تھا اور دارائے اوّل کی زبردست عظمت و شوکت کو دوبارہ قائم کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مشرقِ وسطیٰ کی عظمت کو زندگی کی ایک نئی قسط مل گئی ہے۔ لیکن یہی نہ تھا بازنطینی رومی اب بھی اپنی گزری ہوئی چستی رکھتے تھے جب خسرو اپنی فوج کو قسطنطنیہ کی فصیلوں پر لایا تو انھوں نے ایک آخری کوشش کر دکھائی۔

مشرقِ بعید میں حالات کوئی نمایاں اثرات نہیں چھوڑ رہے تھے، ہندوستان اب بھی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اور حربی حیثیت سے ایک دُوسرے پر فوقیت کے لیے جد وجہد میں مصروف تھیں۔

چینی ہمیشہ کی طرح آپس میں نبرد آزما تھے۔ خاندان سوئی آیا اور گیا اور اس کی جگہ ٹینگ نے لے لی جو تین صدیوں تک حکمران رہا۔

جاپان میں پہلی مرتبہ ایک عورت تخت نشین ہُوئی۔ بدھ مت جڑ پکڑنے لگا تھا اور جاپانی تصورات اور مقاصد پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

اسپین اور انگلستان غیر اہم چھوٹے چھوٹے ملک تھے۔ اسپین وسی گوتھوں (VISI GOTHS) کے زیرِ اثر تھا جو کچھ عرصہ پہلے ہی فرانس سے جس پر انھوں نے لوائر (LOIRE) تک قبضہ کر رکھا تھا نکالے گئے تھے وہ ان یہودیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے جن کو اس مسلم حملہ کے لیے جو ابھی سو برس بعد ہونے والا تھا آسانیاں پیدا کرتی تھیں۔

جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا۔ ڈیڑھ سو[۱۵۰] سال رومیوں کو روانہ ہوئے ہو چکے تھے جن کی جگہ نارڈک لوگوں کی آمد نے لی تھی، خود انگلستان سات مختلف بادشاہتوں پر مشتمل تھا۔[۱]

زمانہ جاہلیت کا سیاسی و معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لی جائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہے اور وہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم و فعال عنصر (FACTOR) ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانہ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قایم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا۔ وہاں آلِ ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر اُن کا موروثی حق ہے اور انھیں تائیدِ الٰہی حاصل ہے۔ عام رعایا کو بھی پوری کوشش کر کے اس کا یقین دلایا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور حکومت کے بارہ میں ان کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قایم ہوتی تھی۔ اہلِ چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان "نر" ہے اور زمین "مادہ"، اور کائنات کو انھیں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختا اوّل زمین و آسمان کے جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے[۲]۔ اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا، اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں"۔ شہنشاہ لی یان یا تائی تسنگ جب مرا ہے تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا کسی نے سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے۔ کسی نے جنازہ سے اپنے کان مار مار کر زخمی کر لیے۔

---

[۱] ۱۸۔۱۹ (باختصار) ترجمہ سید قاسم حسنی [۲] تاریخ چین از جیمس کارکرن

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ مملکتِ روما میں اعتقاد تھا وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔ ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہونچتا ہے۔ سلطنت روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی۔ وہ ہر ظلم و ستم کو جائز سمجھتی تھی۔ رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا۔ کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی جس پر بوقتِ ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اس کو چارہ دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے۔ رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) رومی سلطنت کے بارہ میں لکھتا ہے:

"رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھتی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی بُرائی اور بنیادی خرابی فساد و شر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشوونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی۔ یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں۔ اور چونکہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لیے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہونچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت و قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی۔ لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔"[1]

مصر و شام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر (ALFRED BUTLER) رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے:

"مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح

---

[1] ROBET BRIFFAULT. THE MAKING OF HUMANITY. P.159.

ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہونچایا جائے۔ رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی، مصر پر ان کی حکومت ان پر دیسی ہی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسا کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی ہے[1]

ایک عرب شامی مورخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں کہتا ہے:

"ابتدا میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا۔ اگرچہ ان کی سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار رہتا لیکن جب ان کی حکومت بُوڑھی ہوگئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا، روم نے براہِ راست شام کا بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق نہیں حاصل ہوئے، نہ ان کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا۔ شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے، اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوئے، مظالم کی زیادتی تھی، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا، اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں"[2]

رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی۔ ان کے آتے ہی ملک میں اختلافات، خود سری اور جبر کی بنیاد پڑ گئی تھی اور قتل کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، یونانیوں نے شام پر ۳۶۹ سال حکومت کی اس پُورے عہدِ حکومت میں بڑی سخت جنگیں ہوئیں، رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پُوری کیفیت کھل کر ظاہر ہوگئی شامی قوم پر ان کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی[3]

خلاصہ یہ کہ بدلیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے اور سیاسی، مالی، اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دار السلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا انتظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم، بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا۔

---

[1] ARAB'S CONQUEST OF EGYPT AND THE LAST THIRTY YEARS OF THE ROMAN DOMINION. P. 42.

[2] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۱ ص ۱۰۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۰۲

خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملہ کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مولف لکھتا ہے:

"خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے، چونکہ مالیات کی رقم سال بسال مختلف ہوتی رہتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہوسکے۔ علاوہ اس کے ان چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا، بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ادھر تو جنگ چھڑ گئی ادھر روپیہ ندارد۔ ایسی حالت میں پھر غیر معمولی ٹیکس کا لگانا ضروری ہوجاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اس کی زد مغرب کے مالدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی۔"[1]

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لیے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے خرچ ہوتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ شاہانِ ایران کے یہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیا جمع کرتے[2] خسرو دوم نے ۶۰۷ - ۶۰۸ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا۔ یعنی تقریباً سینتیس کروڑ پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار ارب اڑسٹھ کروڑ روپے)۔ حکومت کے تیرھویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا[3] خسرو دوم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا[4]

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت و خوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی، معدودے چند اشخاص نہایت دولتمند تھے باقی نہایت تنگدست اور پریشان حال۔ ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کا زمانہ حسنِ انتظام اور عدل گستری کے لیے ضرب المثل ہے۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۶۳ [2] ایضاً ص ۱۶۲ [3] ایضاً ص ۶۱۱

[4] ایضاً ص ۶۲۷ تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا، اور زمرد، یاقوت اور موتیوں سے مرقع تھا بادشاہ کے سر کے اوپر چھت سے ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آکر نہ دیکھا جائے نظر نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اس کو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا وزن ۹۱½ کیلو تھا (تقریباً ۲½ من ہوا)

ایران بعہد ساسانیاں ص ۵۱۳

"خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بیشک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا، عوام الناس اسی طرح جہالت وعسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے جیسا کہ زمانہ سابق میں بازنطینی فلسفی جو شہنشاہ کے یہاں آکر پناہ گزیں ہوگئے تھے ایران سے جلد برداشتہ خاطر ہوگئے۔ یہ سچ ہے کہ وُہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک غیر قوم کی عادات ورسوم کو غیر جانبداری کی نظر سے دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفی بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے وہ ان کو نظر نہ آئیں، اور چونکہ علم الاقوام کے مطالعہ کا انھیں ذوق نہ تھا اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو اس علم کے جاننے والے کی ہوتی ہے لہٰذا ایرانیوں کی بعض رسموں مثلاً ترویج محرمات کی رسم یا لاشوں کو زخمیوں پر کھلا چھوڑ دینے کی مذہبی رسم نے ان کو برہم کیا، لیکن محض یہ رسمیں نہ تھیں جن کی وجہ سے ان کو ایران میں رہنا ناگوار ہوا بلکہ ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ اور خستہ حالی جس میں نچلے طبقہ کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے۔ طاقت ور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔"[1]

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اس کی معاصر وحریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا۔ رابرٹ بریفالٹ (ROBERT BRIFFAULT) لکھتا ہے:

"یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقا کو روک دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے، اسی لیے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا۔ سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے۔ ہر لڑکے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے۔"[2]

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے، بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لیے مخصوص تھے جو جاہ وحشم رکھتے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی، بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی، ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس سے انھیں دلی لگاؤ نہ تھا، انھوں نے عبادت گاہوں

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں بحوالہ اگاتھیاس ۳۷-۳۰

[2] THE MAKING OF HUMANITY. P. 160.

اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی ، نہ ان کو اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لیے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہو گیا۔[3] "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف ایران کے کاشتکار طبقہ کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، لکھتا ہے :

"کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی وُہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ مورخ امیاں مارسلینوس لکھتا ہے کہ" ان بچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے ، گویا کہ ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اُجرت سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی[1] کسانوں کا تعلق زمینداروں کے ساتھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔" [2]

حکّام کا رویّہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہل ملک ان سے عاجز تھے ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کی جان و مال کی پڑا تھی' نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس' لوگ شکایتیں کرتے ، لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جُوں نہ رینگتی ، یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پُرعشرت زندگی

رومؔ و ایرانؔ دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا مصنوعی تہذیب اور پُر فریب زندگی کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا جس میں وُہ سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ سلاطینِ روم اور شاہانِ ایران اور ان کے امرا و رؤسا خواب غفلت میں پڑے تھے ، لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا ، تکلفاتِ زندگی ، تعیشات اور سامانِ آرائش کی وُہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے[3]۔ پارسی مورخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق "کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں ، پچاس ہزار اصیل گھوڑے ، اس قدر سامانِ تعیش ، محلات ، نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے اس کا

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں ص ۴۲۴ [2] ایضاً

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیاں" کا باب نہم "آخری شاندار عہد"۔

محل اپنی شان وشکوہ اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا[۱] مکاریوس لکھتا ہے کہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہانِ ایران کی طرح دادِ عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرقِ اقصیٰ کے درمیان واقع تھے[۲]۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان چھوڑے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے، طلائی ظروف، سنگار کا سامان، عطریات وغیرہ تھے۔" طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا، کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں[۳]۔ مورخین نے فرشِ بہار کی (جس پر بیٹھ کر امراءِ ایران موسمِ خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ ساٹھ گز مربع تھا، تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جا بجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی، چمن تھے جن میں پھولدار اور پھل دار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی، پتے حریر کے، کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے، گرد ہیرے کی جدول تھی، درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسمِ خزاں میں تاجدارانِ لِ ساسان اس گلشنِ بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔"[۴]

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ دونوں حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ شہنشاہانِ روم ان کے شامی رؤسا و حکام نے کھل کر دادِ عیش دی۔ ان کے عالی شان محل اور دیوان خانے اور ناؤ نوش کی مجلسیں عیش کے ساز و سامان اور دولت و فراغت کے اسباب سے لبریز تھیں۔ تاریخ و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ (جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امراءِ شام کی مجلسوں میں شرکت کی تھی) جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ رومی تھیں جو بربط پر گا رہی تھیں اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے دھن میں گا رہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفۃً بھیجا تھا، اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں، جبلہ جب شراب نوشی کے لیے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر

---

[۱] تاریخ ایران (شاہین مکاریوس) طبع مصر ۱۸۹۰ء ص ۹۰ [۲] ایضاً ص ۲۱۱ [۳] تاریخ طبری
[۴] تاریخ اسلام از مولوی عبدالحلیم شرر، ج ۱، ص ۳۵۴ ماخوذ از تاریخ طبری وغیرہ

قسم قسم کے پھول چمیلی، جوہی وغیرہ بچھا دیے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مُشک وعنبر لگائے جاتے، چاندی کی طشتریوں میں مُشک خالص لایا جاتا، اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا، اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی، اور اس کے ہمنشینوں کے لیے گرمیوں کا لباس آتا جس کو وہ اپنے اوپر ڈال لیتا، جاڑوں میں سمور، قیمتی کھالیں اور دُوسرے گرم لباس حاضر کیے جاتے۔"[1]

والیانِ ریاست، شاہزادے، امرا، اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلنے اور کھانے پینے، پوشاک اور طرزِ رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے عادات و اطوار اختیار کرتے معیارِ زندگی بہت ہی زیادہ بلند ہوگیا تھا اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی۔ ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پُوری ایک بستی کی پرورش ہوسکے یا جو پُورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور ستر پوشی کے مصارف کے لیے کافی ہو، ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لیے ناگزیر تھا کیونکہ اگر وُہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا، یہاں تک کہ یہ بھی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک قانون بن گیا' جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔

شعبی کہتے ہیں کہ اہلِ ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انھیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی۔ چنانچہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت و عزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی۔ ہرمز کا شمار انھیں افراد میں تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔[2] شرافت و وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو۔ ازاد بہ (زادویہ) شہر حیرہ کا کسریٰ کے عہد میں حاکم تھا۔ وہ سیادت میں دُوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی۔[3] رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔[4]

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم وضروریات کے اس طرح عادی ہوگئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئے تھے اور ان سے علٰحدہ ہونا ان کے لیے ناممکن سا ہوگیا تھا۔ نازک سے نازک وقت میں اور مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اُتر آنا ان کےلیے دشوار تھا۔

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہِ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، مگر اس عجلت و پریشانی میں وُہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے اس سے اس ذہنیت اور معیارِ تمدن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مصنف لکھتا ہے:

"یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویّے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار بازدار،

---

[1] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۷۰ [2] ایضاً ص ۶ [3] ایضاً ص ۱۱ [4] ایضاً ص ۱۳۴

اور بہت سے دُوسرے لوگ لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔" [۱]

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ چاہے مَیں پیاسا مر جاؤں مگر اس بھدّے پیالے میں پانی پینا میرے لیے ممکن نہیں۔ چنانچہ اس کے لیے تلاش کر کے دُوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس کو وُہ پی سکا۔[۲]

ان دو واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس قدر دور ہو چکے تھے۔

حکومت کی دولت ستانی

اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں۔ جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں اور اہلِ حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جا سکے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل گئی۔ "ایران بعہد ساسانیاں" کا مولف لکھتا ہے:

"باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جس کو آئین کہتے تھے۔ اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کیے جاتے تھے۔ خزانہ شاہی کے ذرائع آمدنی میں سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیر ہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے جو بادشاہ کے لیے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگیوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی۔" [۳]

مورخ شام رومی حکومت کے طرزِ عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے:

"شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس داخل کرے، فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دُوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے۔ مثلاً چنگی، کانیں، محاصل، اس کے علاوہ جو قطعات گندم کی کاشت کے قابل ہوتے، اور چراگاہیں ٹھیکہ پر اٹھا دی جاتیں ان ٹھیکہ داروں کو "عشارین" کہتے تھے۔ یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیارات خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے۔ ہر صوبہ میں ان ٹھیکیداروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل

---

[۱] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۸ [۲] تاریخ طبری ج ۴ ص ۱۶۱ [۳] ایران بعہد ساسانیاں ص ۱۶۱

ملازم تھے جو اپنے افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر ان کو لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے، وہ لوگوں کو فراغت و راحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر ان کو غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے۔" [۱]

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے:

"اچھا گلہ بان وُہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اُون کاٹ لیتا ہے نوچتا نہیں۔" واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہانِ روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اُون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے۔" [۲]

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونوں مملکتوں میں اہلِ ملک دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بیّن فرق تھا، ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہلِ دربار، اُن کے خاندانوں، عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولت مندوں کا تھا۔ یہ لوگ سدا بہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دُودھ اور گلاب میں نہاتے یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور در و دیوار کو بھی ریشم و کمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ کاشتکاروں، کاریگروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا، جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی۔ یہ زندگی کے بوجھ ٹیکسوں اور نذرانوں کے بارسے کچلے جا رہے تھے ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا۔ وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس جاتا۔ اس کٹھن اور پُر مصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وُہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے، ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں ان کو وہ وقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں ان کو پیش آتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی، ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور ان کو حقیقی سکون اور اطمینانِ قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولتمند اور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خدا فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دو انتہائی سروں کے درمیان

---

[۱] خطط الشام (محمد کرد علی) ج ۵ ص ۴۷ [۲] ایضاً

انبیا علیہم السّلام کی دعوت و تعلیم کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی، اخلاق عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدن دنیا میں متروک و ناقابلِ عمل سمجھ لیے گئے تھے۔ دولت مندوں کو اپنے تفریحی مشاغل اور تعیشات سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارہ میں کچھ سوچیں۔ کاشت کاروں اور محنت کش کو اس کے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات اس کی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روز کی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے۔ غرض یہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو اُلجھا رکھا تھا اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا۔ زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں اور انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف (حجۃ اللہ البالغہ) میں ما قبل اسلام کی اس صورتِ حال کی پوری تصویر کھینچی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دُنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پُورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامانِ آرائش میں بڑی مُوشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہلِ ہُنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے جو اس سامانِ آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراشِ خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امرا میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے۔ کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمّل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو[1]، یہ تمام تکلفات اُن کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے، اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ ایک مصیبتِ عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط

---

[1] شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشتکاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے ملک میں ایک فردِ بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی ہے"[1]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب اقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم۔

ابتدائے اسلام میں اخلاقی فکر کا ارتقاء

ڈاکٹر محمد عبد الحق انصاری

ابتدائے اسلام میں اخلاق بحیثیت ایک علم کے وجود میں نہیں آیا تھا مگر بعض اخلاقی مسائل پر مختلف حلقوں میں غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اخلاقی آئیڈیل کی تشکیل کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کی ابتدا میں اخلاقی نظریات بہت حد تک واضح اور مرتب ہو چکے تھے مگر اخلاقیات کو ابھی سیاسیات ہی کا جز سمجھا جا رہا تھا۔ بحیثیت ایک مستقل علم کے اخلاقیات کا آغاز اسلام میں سب سے پہلے مسکویہ (م ۴۲۱ھ) سے ہوتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اخلاقی نظریات اور آئیڈیل کے نشوو ارتقاء پر دوسرے افکار و رجحانات، مذاہب اور قوموں نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن اخلاقی زندگی کی تعبیر اور اخلاقی قدروں کی تشکیل میں جو مقام قرآن وسنت کا ہے، وُہ کسی دُوسرے عامل کا نہیں ہے۔ اخلاقی فکر میں نئے مسائل کی آمد، پرانے تصورات کی نئی تشکیل اور اخلاقی آئیڈیل کی نئی تعبیر اس وقت تک بخوبی سمجھی نہیں جا سکتی، جب تک کہ قرآن وسنت کی اخلاقی تعلیمات پیشِ نظر نہ ہوں۔ بالخصوص جب تک کہ خدا، آخرت اور رسالت کے بارے میں اسلامی عقاید سامنے نہ ہوں، جو اخلاقی زندگی کی تعبیر اور اخلاقی قدروں کی اضافی قدر و قیمت کے تعین میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

قرآن وسنت کے اخلاق کا بیان مختلف کتابوں میں ملتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اکثر قرآن مجید کی ایسی آیات اور ایسی حدیثیں جمع کر دی جاتی ہیں، جن میں کوئی اخلاقی حکم ہوتا ہے۔ اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مختلف اخلاقی مسائل پر قرآن وسنت کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے اور یہ تو بہت کم ہوتا ہے کہ اسلامی عقاید، اخلاقی فکر اور اخلاقی زندگی کو جس طرح متاثر کرتے ہیں ان کی وضاحت کی جائے۔ عام طور پر قرآن وسنت کے اخلاق کے ذیل میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں ان سے صدر اسلام کی اخلاقی زندگی کا ایک نقشا سامنے ضرور آجاتا ہے۔ مگر یہ نقشا بھی نامکمل اور غیر متوازن ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں اخلاقی زندگی کا ہر پہلو اپنی اضافی اہمیت کے ساتھ اُبھر نہیں آتا۔ بسا اوقات ان پہلوؤں کو اجاگر کر کے پیش کیا جاتا ہے، جو جاہلیت یا مغرب کی اخلاقی زندگی سے نمایاں طور پر مختلف ہوتے ہیں۔

علم کلام کا اوّلین مقصد اسلامی عقاید کی توجیہہ و تفہیم تھی۔ لیکن عقاید کے ضمن میں بعض اخلاقی مسائل پر بھی اچھی بحثیں کلام کی کتابوں میں ملتی ہیں۔ اسلامی اخلاق کے مطالعہ میں عموماً اخلاقی فکر کا یہ پہلو نظر سے اوجھل رہا ہے۔ اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس گوشے کا مطالعہ مسلمانوں کے اخلاقی فکر پر قرآن وسنت کے اثرات دریافت کرنے کے سلسلے میں بے حد اہم ہے۔ اس پہلو سے غفلت کی وجہ سے عموماً یہ سوچا جانے لگا ہے کہ اسلامی آئیڈیل اور قدروں کے مطالعہ کے لیے طالب علم کو یا تو فلسفہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے یا تصوّف کی طرف۔

ذیل کے صفحات میں اسلام کے ابتدائی ساڑھے تین سو سال کے اخلاقی فکر کا ایک مربوط مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ وُہ

دور ہے، جب تک علم اخلاقیات بحیثیت ایک مستقل علم کے وجود میں نہیں آیا تھا۔ صفحات ذیل میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ تفصیل سے باتیں کی جائیں۔ ہم صرف اختصار کے ساتھ بعض اہم تصورات اور رجحانات کی وضاحت پر اکتفا کریں گے۔

قرآن وسنت میں اخلاق

قرآن وسنت کی نظر میں زندگی دو مرحلوں میں منقسم ہے مگر دونوں مرحلے ایک دُوسرے کے ساتھ بے حد مربُوط ہیں۔ ایک موت سے پہلے کا مرحلہ، دوسرا موت کے بعد کا۔ بلاشبہ موت ایک عظیم تغیر ہے لیکن زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی۔ دوسری زندگی ایک نئی زندگی ہوتی ہے، لیکن پہلی زندگی کے منافی ہوتی ہے اور نہ اس سے یکسر مختلف۔ دراصل زندگی ایک وحدت اور ایک تسلسل ہے، اس وحدت و تسلسل کا تقاضا ہے کہ زندگی کا خیر اعظم نہ صرف اس دنیا سے متعلق ہو اور نہ محض اُس دنیا سے، بلکہ دونوں کی بھلائی پر حاوی ہو۔ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو جو تعلیم دی ہے، وُہ یہ ہے:

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاٰخرة حسنة وقنا عذاب النار۔	اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمایئے اور آخرت میں بھی۔ اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔
(۲: ۲)	

اس تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کا محض ذریعہ قرار نہ دیا جائے بلکہ اس کو بذاتِ خود مقصود سمجھا جائے۔ اسلام نے خیر کا جو تصور پیش کیا ہے، دنیا کی فلاح اس کا جزو لاینفک ہے۔ قرآن وسنت میں زندگی کے مختلف پہلوؤں (سماجی، معاشی اور سیاسی) کی تعمیر و اصلاح کا جو اہتمام ملتا ہے، وہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اسلامی آئیڈیل کسی ایسے فرد کا آئیڈیل نہیں ہے، جو سماج سے الگ رہتا ہو بلکہ ایسے فرد کا ہے جو سماج کا فعال اور سرگرم کارکن ہے۔ انسان کی ذاتی زندگی اور سماجی زندگی دونوں کو قرآن وسنت میں ایک کل سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت کا تصورِ فلاح انفرادی ہی نہیں بلکہ سماجی بھی ہے۔ حیاتِ دنیا میں سماج کی جو اہمیت ہے، وُہ تو ہے ہی۔ آخرت کی زندگی کا نقشا بھی جو قرآن وسنت میں ملتا ہے، وُہ بالکل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سماجی زندگی ہے[1]۔ اسلام میں جو اہمیت سماجی تعلقات، جماعتی فرائض اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام کا خیر کا تصور اجتماعی ہے۔ سماج سے گریز یا اجتماعی فلاح سے بے تعلقی ایک جُرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کی اجازت صرف ان انتہائی حالات میں دی گئی ہے جن میں دینی فرائض و ارکان کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی ہے، مگر ایسے حالات میں بھی ظلم و فساد کے خلاف جہاد کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیشہ عزیمت ہی قرار دیا ہے[2]۔

---

[1] قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ ایک خاندان کے افراد آباء، ابناء اور ازواج جنت میں ایک ساتھ رکھے جائیں گے بشرطیکہ وہ صالح ہوں (۱۳: ۲۳؛ ۴۰: ۸؛ ۵۲: ۲۱)۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ رفقاء اور اصحاب اجتماعی طور پر رہیں گے، ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کوئی بغض نہ ہوگا۔ ایک دوسرے کو تحیات پیش کریں گے (۱۵: ۴۵-۴۸) ان کا معاشرہ برائیوں سے پاک اور باہمی الفت اور محبت سے سرشار ہوگا (۷۸: ۳۵؛ ۵۶: ۲۵-۲۶؛ ۱۰: ۱۰) چونکہ جنت کی زندگی مثالی زندگی ہوگی۔ لازم ہے کہ اس میں انسان کے سماجی جذبات کی تسکین کا موقع ہو۔ [2] اس مفہوم کی حدیثیں بہت ہیں۔ یہاں صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے۔ رسول اللہ سے سوال کیا گیا (باقی برصفحہ آیندہ)

اگرچہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی فی نفسہٖ مقصود ہے، لیکن دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فلاحِ دنیا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں چند روزہ ہے۔ مزید یہ کہ دنیا کی زندگی دو اعتبار سے محدود ہے: ایک یہ کہ اس میں دین کے بہت سے حقایق کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں اعمال کے پورے نتائج برآمد نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اس دوگونہ حقیقت کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی ایک آزمایش ہے چونکہ انسان کی آزمایش اس میں ہے کہ وہ زمین پر خدا کی خلافت کے فرائض انجام دے۔ اس لیے دنیا کی بھلائی آخرت کی بھلائی کے لیے شرطِ لازم بن جاتی ہے۔ دنیا کی بھلائی سے بے اعتنائی آخرت کی فلاح کے امکانات ختم کر سکتی ہے۔

قرآن و سنت کے خیر میں جسم و روح دونوں کی رعایت ہے۔ بعد کے فکر نے جسم و روح اور مادی و روحانی خیر میں جو تضاد نمایاں کیا ہے، اس کی تائید قرآن مجید سے نہیں ہوتی۔ حسی لذات اور روحانی مسرتیں دونوں ہی خیر کا جز ہیں۔ جسمانی لذتوں میں فی الحقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔ دنیا فی نفسہٖ نہ بھلی ہے اور نہ بُری۔ اس کی برائی اور بھلائی اس طریقۂ زندگی پر منحصر ہے جسے انسان اختیار کرتا ہے۔ مسیحیت کا یہ تصور کہ زمین پر انسان کا ورود سقوط کے ہم معنی ہے اور گناہ اوّل کی سزا ہے۔ اسلامی عقیدے کے منافی ہے۔ قرآن مجید حیاتِ دنیا کی تعمیر و اصلاح کو سعادت کا لازمی جز قرار دیتا ہے۔ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی کوئی گنجایش ہے اور نہ ہی دنیا کی لذتوں سے بالکلیہ دست کش ہونا جائز۔ قرآن مجید نے رہبانیت کو بدعت قرار دیا ہے[1] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام سے خارج قرار دیا ہے: "لا رھبانیۃ فی الاسلام"۔[2]

قرآن و سنت نے جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں انسانی شخصیت کے کسی جز کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ عقل و وجدان، ذوق و تخیل، جذبہ و احساس، سب کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا ہے۔ اگرچہ افراد کی زندگیوں میں ان عناصر کی اضافی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، لیکن انفرادی حالات و صلاحیتوں کی رعایت کے باوجود اسلام نے یہ کبھی نہیں پسند کیا کہ ایک جز کو دوسرے جز پر قربان کر دیا جائے یا زندگی کے ایک پہلو کو اس قدر ابھارا جائے کہ دُوسرا پہلو کچل کے رہ جائے۔ خدا کے رسول نے اس امر کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ہے کہ آپ کے اصحاب زندگی کے کسی پہلو کو ایک خاص حد سے زیادہ نہ دبائیں۔[3] اسلامی آئیڈیل میں جذبہ اور عمل، فکر اور احساس، رُوح اور جسم کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر محبت کو لیجیے۔ اسلامی آئیڈیل میں حبِ الٰہی کو جو بلند مقام حاصل ہے، وُہ ظاہر ہے مگر جس محبت کی تعریف قرآن و سنت میں آئی ہے، وہ نرا جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ وُہ قوت ہے، جو ان گوناگوں اعمال کی محرک ہوتی ہے، جو اسلام کو پسند اور مطلوب ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کون لوگ سب سے بہتر ہیں؟ فرمایا: وہ جو خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ پھر سوال کیا گیا: ان کے بعد کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا: وہ لوگ جو تنہا پہاڑوں پر رہتے ہیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں دُوسری روایت میں ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ امام نووی: ریاض الصالحین، باب استحباب العزلۃ عند فساد الناس والازمان، بحوالہ بخاری و مسلم۔

[1] قرآن مجید (۵۷ : ۲۷) [2] مسند دارمی: باب النکاح

[3] امام نووی نے اعتدال و توسط کے ذیل میں بہت سی حدیثیں پیش کی ہیں۔ ریاض الصالحین: باب الاقتصاد فی الطاعۃ۔

قرآن و سنت نے ہمہ جہتی شخصیت کا جو آئیڈیل پیش کیا ہے، اس میں اور مخصوص انفرادی صلاحیتوں اور رجحانات کی تکمیل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام میں شخصیت کا ایسا بے لچک تصور نہیں ہے، جس کی ہو بہو نقل ہر شخص سے مطلوب ہو۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ، ابوہریرہؓ و ابوذرؓ، خالدؓ اور علیؓ، عثمانؓ بن عفان اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ، عائشہؓ اور حفصہؓ کی شخصیتوں میں اگرچہ بنیادی یکسانیت ہے لیکن اس کے باوجود ہر ایک کی قوتیں اور صلاحیتیں، مشاغل و رجحانات، اطوار و عادات مختلف ہیں بلکہ بسا اوقات ایک دوسرے سے متضاد ہیں[1]۔ خدا کے رسول کو انفرادی قوٰی اور رجحانات کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر آپ نے یہ فرمایا: اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم[2] (میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی روش تم اختیار کرو گے، راہِ راست پر رہو گے) افراد کو فرداً فرداً اس ارشاد کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی سماج بحیثیت مجموعی کسی ایک صحابی یا ایک جماعت صحابہ کو اپنا آئیڈیل بنا لے اور دوسروں سے صرف نظر کر لے تو وہ راہِ راست سے ہٹ جائے گا، کیونکہ خدا کے رسول کے علاوہ کسی کی زندگی ہر نوع جامع نہیں ہے۔ سماج کو تو پوری جماعت صحابہ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مسلمان کی زندگی ذمہ داری اور جواب دہی کے ایک گہرے احساس سے سرشار رہتی ہے۔ یہ عقیدہ کہ ہر فرد کو جسم و دماغ کے ہر فعل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ اس کے شعور پر حاوی رہتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی خواہ وُہ ذاتی ہو یا سماجی، ایک فریضہ بن جاتی ہے مگر مسلمان اس فریضہ کو خارج سے ڈالا ہوا ایک بار نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو اس کے داخلی احساس ذمہ داری کی ترقی یافتہ اور فعال صورت ہے، جو انسان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے، ناممکن ہے کہ ذمہ داری اور جواب دہی کا یہ گہرا شعور اسلام کے تصورِ خیر کو متاثر نہ کرے۔

خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اگرچہ بہت وسیع ہے، لیکن اس تعلق کا ایک مخصوص پہلو بھی ہے، جس میں نماز اور دُعا، ذکر و فکر وغیرہ اعمال شامل ہیں۔ زندگی کے آئیڈیل میں عام انسانی اخلاق کے علاوہ تعلق باللہ کا یہ مخصوص پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انسان ابتدا میں تعلق باللہ کے مختلف طریقے اخلاقاً واجب سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ مگر روحانی ترقی کی بلند منزلوں میں یہ طریقے اور اعمال تقاضائے طبیعت بن جاتے ہیں اور جواب دہی اور خوف کی جگہ ارادت و محبت لے لیتے ہیں۔

قرآن و سنت کے اخلاق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں جہاں اخلاق کے متعین اصول و ضوابط ملتے ہیں۔ انسان سے یہ مطلوب ہوتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی پابندی کرے۔ بظاہر اسے اخلاق کا فقہی تصور کہا جا سکتا ہے، لیکن اسلامی اخلاق اس تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی اخلاق میں فرد کا محض یہ کام نہیں ہے کہ وُہ قرآن و سنت کے اخلاقی احکامات حفظ کر لے اور بغیر غور و فکر کیے انھیں

---

[1] حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بڑے صائب الرائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف دینی، سیاسی اور سماجی مسائل میں ان سے مشورے کرتے تھے حضرت ابوہریرہؓ اور ابوذرؓ اپنے زہد و فقر کے لیے مشہور تھے۔ حضرت علیؓ اور خالدؓ اسلام کے بہترین قائدین جیش تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ ابن عوف اپنی ثروت اور خدمتِ اسلام میں فائق تھے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس علم و تفقہ میں ممتاز تھے۔ حضرت عائشہؓ و حفصہؓ بھی دین علم و بصیرت میں مشہور تھیں۔

[2] مشکوٰۃ، باب مناقب الصحابہ

جوں کا توں اپنے حالات پر منطبق کر دے۔ قرآن وسنت میں عموماً جو اخلاقی اصول وضوابط ملتے ہیں، وہ بہت عام ہیں۔ مثال کے طور پر:

ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان وایتآء ذی القربٰی وینھٰی عن الفحشآء والمنکر والبغی۔ (۱۶ : ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحش، منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اس ہدایت پر عمل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کو مثلاً یہ معلوم ہو کہ عدل کے کیا معنی ہیں۔ اگرچہ انسان کو عدل کے مفہوم کے تعین میں قرآن وسنت سے بیش قیمت ہدایت ملے گی لیکن بدلتے ہوئے حالات میں عدل کے تقاضے معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ غور وفکر کی ضرورت پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت زندگی کے ارتقاء اور نئے نئے حالات کے ظہور سے بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لیے عموماً کسی ایک اصول سے منطقی استنباط کرنے کا مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ مختلف اصولوں کے تقاضوں کو تولنا اور ان کے نتائج کو پرکھنا اور جانچنا پڑتا ہے۔

کسی موقع پر صحیح طرز عمل متعین کرنے کے لیے نتائج اور عواقب کو ملحوظ رکھنا قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت مثلاً اس اصول کی نشان دہی کرتی ہے:

ولا تجعل یدك مغلولة الٰی عنقك ولا تبسطھا كل البسط فتقعد ملومًا محسورًا۔ (۱۷ : ۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے تاکہ پچھتانے اور تہی دست ہونے کی نوبت نہ آئے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ متوقع نتائج کی سنگینیت حرام کے ارتکاب کو جائز قرار دے دیتی ہے۔ جیسا کہ بعض شدید حالات میں لحم خنزیر یا شراب کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے یا جیسا کہ قتل ناحق کو روکنے کے لیے غلط بیانی کی یا دوسروں کو شر سے محفوظ رکھنے کے لیے غیبت کی یا روایات کی صحت معلوم کرنے کے لیے تجسس کی یا باہمی تعلقات کی اصلاح کے لیے کذب کی اجازت دی گئی ہے۔[۱]

قرآن وسنت کی نظر میں وہ عمل صائب نہیں ہے، جو اس کی ہدایت کے بظاہر مطابق ہو بلکہ اس عمل کا محرک بھی صحیح ہونا ضروری ہے: "انما الاعمال بالنیات" مشہور حدیث ہے، وہی اعمال حقیقت میں صائب اور حسن ہیں، جو خدا کی رضا کے لیے کیے جائیں۔ لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر نیت درست ہو تو اعمال بھی لازماً صحیح ہوں گے۔ نیت کی صحت کے ساتھ عمل کا اخلاقی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس دوسری شرط کی ایک شق یہ بھی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عمل اپنے نتائج اور عواقب کے اعتبار سے صائب اور حسن ہو۔

---

[۱] اضطرار کی حالت میں لحم خنزیر کے استعمال کی اجازت قرآن مجید میں ہے (۶ : ۱۴۹؛ ۵ : ۳؛ ۲ : ۱۷۳) شراب کے استعمال کی اجازت فقہ کا مشہور مسئلہ ہے۔ ناحق قتل سے بچانے کے لیے جھوٹ بولنے کی اجازت کے لیے ملاحظہ ہو امام غزالی: احیاء العلوم، دار الکتب العربیۃ الکبریٰ، مصر ۳: ۱۱۹-۱۲۱ اور امام نووی: ریاض الصالحین، باب بیان ما یجوز من الکذب۔ غیبت کے جائز مواقع کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ریاض الصالحین: باب بیان ما یباح من الغیبۃ۔

رضائے الٰہی کے صحیح معنی اور عام اخلاقی محرکات سے اس کا تعلق وغیرہ ایسے سوالات ہیں، جو اگرچہ قرآن وسنّت کے اخلاقی نظریہ کے فہم کامل کے لیے نہایت ضروری ہیں مگر ان پر گفتگو کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اعمال کی ذمہ داری کے بارے میں قرآن مجید کا نظریہ قابلِ تحقیق ہے۔ اشاعرہ کسی فعل حسن کے سلسلے میں انسان کو اس لیے ذمہ دار سمجھتے ہیں کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ معتزلہ انسان کو اس لیے ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ یہ عقل کا حکم ہے۔ دونوں گروہوں کے نظریات ان کے مابعد الطبیعاتی اور دینی تصورات سے اس قدر مربوط ہیں کہ آزادانہ طریقہ سے اس سوال پر قرآن وسنّت کا موقف متعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بظاہر قرآن مجید کی آیات دونوں ہی خیالات کی تائید کرتی ہیں اور غالباً صحیح نظریہ ان دونوں نظریات کا امتزاج ہوگا۔ ایسی آیات تو بے شمار ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں اور فلاں عمل کو واجب قرار دیا ہے اور فلاں فلاں عمل یا شئے کو حرام کر دیا ہے۔ دُوسرے نظریہ کی تائید میں یہ آیت بہت واضح ہے "ولا اقسم بالنفس اللوامۃ" (۷۵ : ۲) نفس لوامہ یا ضمیر کے وجود کی تائید سے یہ بات لازم آتی ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ہے، جو نہ صرف شر کے ارتکاب پر ملامت کرتی ہے بلکہ خیر کا حکم بھی دیتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے چند آیات کے بعد ہی یہ آیت ملتی ہے: "بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ" (انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بُوجھ رکھتا ہے، اگرچہ وُہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے)

خیر و شر صائب وغیر صائب کے علم کے بارے میں بھی قرآن مجید کا نقطۂ نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے نظریات کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ حسن و قبح کے علم کا انحصار نہ تو محض شرع پر ہے اور نہ عقل ہی ان کے ادراک کے لیے کافی ہے۔ قرآن وسنّت کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید کی ضرورت نہیں ہے کہ بعض حسن و قبح کا علم شرع سے ہوتا ہے مگر معتزلہ کی اس رائے کے حق میں کہ بعض حسن و قبح کا علم عقل سے ہوتا ہے، صرف ایک آیت پیش کی جا رہی ہے:

ونفس وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔	قسم ہے (انسان کے) نفس کی کہ اسے درست بنایا اور اس کو اس کی نیکی اور بدی الہام کر دی۔

ایک حدیث بھی اس نظریہ کی تائید میں بہت واضح ہے:

یا وابصۃ استفت قلبک واستفت نفسک البر ما اطمان الیہ القلب واطمأنت الیہ النفس والاثم ماحاک فی صدرک وتردد فی النفس وان افتاک الناس۔ (مسند احمد ابن حنبل ۴ : ۲۲۸)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اور اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وُہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وُہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑبن میں ڈال دے۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

ان دونوں نظریات کی تطبیق کے لیے یہ حدیث قابلِ غور ہے۔

ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی: ایک راستہ سیدھا ہے اور اس کے

دونوں طرف دیواریں ہیں اور دیواروں میں کھلے ہُوئے دروازے ہیں اور دروازوں پر پردے پڑے ہُوئے ہیں اور راستہ کے سرے پر ایک داعی کھڑا ہُوا ہے، جو پکار کر کہہ رہا ہے، سیدھے راستہ پر چلے جاؤ، اِدھر اُدھر منہ نہ کرو اور اس داعی کے علاوہ ایک اور داعی ہے۔ جب کوئی بندہ ان دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولنا چاہتا ہے، تو دوسرا داعی پکار کر کہتا ہے کہ افسوس ہے تجھ پر، اس کو نہ کھول۔ اگر تو اس کو کھولے گا، اس کے اندر داخل ہو جائے گا۔ یہ مثال بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر اس طرح فرمائی: سیدھا راستہ تو اسلام ہے اور دیواروں کے دروازوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جنھیں خدا نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے پردوں سے مراد اللہ کی حدود ہیں اور وہ داعی جو راستے کے سرے پر کھڑا ہے، قرآن ہے اور وہ دوسرا داعی اللہ کا واعظ ہے، جو ہر مومن کے دل میں موجود ہے (مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد، ترمذی اور بیہقی)

انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت مختلف آیات میں کی گئی ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ (۷۴: ۳۸)	ہر شخص اپنے اعمال کے بارے میں ماخوذ ہوگا۔
الیوم تجزی کل نفس بما کسبت لا ظلم الیوم ان اللہ سریع الحساب۔ (۴۰: ۱۷)	آج ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔ آج (کسی پر) کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

انسانی ذمہ داری کے اس نظریے کے خلاف بعض گروہوں نے قرآن مجید کی وہ آیات نقل کی ہیں، جن میں خدا کی غیر محدود قدرت کا ذکر آیا ہے۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت والی آیات انسانی ذمہ داری کی تائید کرنے والی آیات سے متضارب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک استخراجی نتیجہ ہے۔ قرآن مجید نے اعمال انسانی کی ذمہ داری کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کی ہے۔ دُوسری بات یہ کہ جب کبھی انسانوں نے اپنے اعمالِ بد کی ذمہ داری خدا پر ڈالی ہے اور اس کے لیے خدا کے غیر محدود علم و قدرت کا سہارا لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو ظن و تخمین اور افترا ہی قرار دیا ہے:

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا و لا آباؤنا و لا حرمنا من شئ کذلک کذب الذین من قبلھم حتی ذاقوا بأسنا قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ (۶: ۱۴۹)	جن لوگوں نے شرک کا ڈھنگ اختیار کیا ہے، وُہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو (اپنی رائے سے) حرام ٹھہراتے سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سچائی کو) جھٹلایا تھا، جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا (اے پیغمبر!) تم کہو کہ کیا تمہارے پاس علم کی روشنی ہے، جسے ہمارے سامنے پیش کرسکتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر وہم

اور اٹکل کی اور تم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو کہ
بے سمجھے بوجھے باتیں بنانے والے ہو۔

قرآن و سنت کے اخلاق کے یہ چند بنیادی نکات ہیں۔ رسولِ خدا کی زندگی اس آئیڈیل کی کامل تصویر تھی۔ آپ نے قرآن مجید کے اخلاقی اصولوں کو زندگی کے سارے شعبوں میں نافذ فرمایا۔ ذاتی زندگی ہو یا سماجی، قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی آپ نے ان اصولوں پر ان کی نئی تشکیل کی۔ وُہ افراد جو آپ کی رہنمائی اور تربیت میں اس عظیم اخلاقی تجربے سے گزرے۔ ان کے اندر ایک تیز اخلاقی بصیرت پیدا ہو گئی۔ جس کو اگرچہ اپنے نظریاتی مفروضات اور مضمرات کا بخوبی شعور نہ تھا لیکن وہ ایک طویل عرصہ تک زندگی کی اسلامی تشکیل کے لیے کافی ثابت ہُوئی۔

اسلام جس تیزی کے ساتھ پھیلا، اسی تیزی کے ساتھ مسلم معاشرے کو نئے نئے مسائل پیش آئے۔ جو اس کی اخلاقی بصیرت کے لیے چیلنج تھے۔ دوسری اور تیسری صدی کے فقہا نے ان مسائل کو بڑے کامیاب طریقے پر حل کیا۔ اس عمل میں اصحابِ فقہ دھیرے دھیرے ان نظریاتی مفروضات سے واقف ہونے لگے۔ جو ان کی اخلاقی بصیرت کی بنیاد میں تھے۔ ان نظریاتی مسائل کے شعوری فہم کی ضرورت بعض دوسرے عوامل کے نتیجہ میں بڑھتی گئی۔ جو لوگ نئے نئے اسلام لائے تھے، وہ ان مسائل کو فراموش نہ کر سکتے تھے۔ جنہوں نے صدیوں پریشان رکھا تھا، وہ ان مسائل کا حل اسلام سے چاہتے تھے۔ نئے دین و عقیدہ سے گہری اور مخلصانہ وابستگی کے لیے اس کی قدروں اور اس کے آئیڈیل کا بہتر فہم ضروری تھا۔ پھر دُوسرے مذاہب کے جو لوگ اسلام نہیں لائے تھے، یا اس کے مخالف تھے، وُہ اپنے آبائی دین پر قائم رہنے کے لیے اور اپنی مدافعت کے لیے اسلامی عقاید پر اعتراض کر رہے تھے۔ اسلام کی اشاعت اور اس کے خلاف اعتراض کے جواب کے لیے بھی ضروری تھا کہ اسلامی فکر کے دُوسرے گوشوں کی طرح اس کے اخلاقی اصول و نظریات کو بھی مدلّل طریقہ پر پیش کیا جائے۔ مگر سب سے زیادہ اہم عامل یونانی علوم و فنون کی اشاعت ثابت ہُوئی جس کے اثر سے عقلیت پسندی کا رجحان ترقی پا گیا اور اخلاقی مسائل کی قابلِ فہم توجیہہ کی ضرورت شدید ہو گئی۔

مگر اخلاقی فکر کی تحریک جس فوری سبب سے ہُوئی، وہ سیاسی تھا۔ بنواُمیہ نے اپنی حکومت کی توسیع اور استحکام کے لیے ظالمانہ طریقے اختیار کیے۔ دشمنانِ عوام اور غالباً اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے مظالم کو خدا کی مشیت اور اپنے کارناموں کو تقدیرِ ازلی قرار دیا[1]۔ اس نظریہ کی مخالفت ہُوئی۔ ایک گروہ نے انسانی ذمہ داری اور آزادیِ ارادہ کا نظریہ پیش کیا اور اس کی اشاعت شروع کر دی مگر دونوں گروہوں کو اپنے فکر کی تنظیم میں کوئی نہ کوئی زحمت پیش آئی۔ اگر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، تو اس کا ارادہ آزاد ہونا چاہیے۔ مگر کیا اس صورت میں خدا کی غیر محدود قدرت محدود نہیں ہو جاتی؟ یہ تھا وُہ سوال جو آزادیِ ارادہ کے قائلین کو پیش آیا۔ لیکن اگر خدا کی قدرت ساری چیزوں پر حاوی ہے اور سب کچھ اس کے ارادہ اور قدرت سے ہوتا ہے، تو انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار کیوں گردانا جائے؟ کیا اس سے عدلِ الٰہی کی نفی نہیں ہوتی؟ یہ تھا وُہ سوال جسے ان لوگوں کو حل کرنا تھا، جو خدا کی قدرت کو غیر محدود

---

[1] DONALDSON, STUDIES IN MUSLIM ETHICS, (LONDON, 1953), P. 98 — 100

اور مطلق قرار دیتے تھے۔

آزادی ارادہ کے نظریہ کی تائید معتزلہ نے کی اور خدا کی قدرت کو برملا محدود قرار دیا۔ انہوں نے اپنے خیالات جس زبان اور انداز میں بیان کیے، وہ عامۃ المسلمین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئے۔

ابوالحسن اشعری پہلے اعتزال کے پرجوش مبلغ تھے۔ بعد میں ان کو اس سے بے اطمینانی پیدا ہوئی، جو اس حد تک بڑھی کہ ۳۰۰ھ میں انہوں نے برسرعام اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور اپنے نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ مگر اشعری نے جن مسائل میں دلچسپی لی وہ عقاید سے متعلق تھے۔ اخلاقی مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اخلاقی مسائل کی تنقیح کی اور اشعری اصولوں پر ان کا حل پیش کیا۔ بعد کو دوسرے ائمہ اشاعرہ نے ان مسائل پر فکر کو آگے بڑھایا۔ ان میں امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) اور امام غزالی نمایاں ہیں۔ جن اخلاقی مسائل سے متکلمین نے بحث کی، وہ دو تھے؛ ایک یہ کہ اخلاقی اصولوں کے علم کا ذریعہ کیا ہے؛ شرع یا عقل۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی اصولوں کے علم کی پابندی کی بنیاد کیا ہے؛ مثال کے طور پر اگر ہمیں سچ بولنا چاہیے، تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے یا یہ ہے کہ سچ بولنا عقل کا فیصلہ اور حکم ہے؛ خیر اور اخلاقی آئیڈیل سے متعلق متکلمین کے یہاں کوئی بحث نہیں ملتی۔ اگرچہ ان کی کتابوں میں رویت باری کے مسئلہ پر طویل بحثیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن یہ بحثیں اس نکتہ پر مرکوز تھیں کہ رویت باری کا امکان ہے یا نہیں؛ ان بحثوں کا تعلق اس بات سے کچھ نہ تھا کہ رویت باری اور سعادت انسانی میں کیا تعلق ہے۔

اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کے مطالعہ کے لیے ہمیں تصوف اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نئے حالات کے اندر ایک نیا آئیڈیل وجود میں آ رہا تھا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کا نقشہ پہلے پیش کیا گیا ہے[1]، ان حالات نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کو بہت متاثر کیا۔ قرآن مجید نے زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا، وہ بڑا متوازن تھا۔ اس میں ہر چیز کو مناسب مقام حاصل تھا، مگر ان بدلے ہوئے حالات میں یہ توازن باقی نہیں رہا۔ بعض پہلو زیادہ اُبھر آئے اور بعض دب گئے۔ سماج سے گریز اور کنارہ کشی کو اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔ زہد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ توکل علی اللہ کے غلط تصور نے بے عملی اور جمود کو تقویت دی اور حقیقت کی فکری جستجو اور مطالعہ و تفکر کو عمل و تجربہ کے مقابلہ میں برتر سمجھا گیا۔ عشق الٰہی کا نظریہ اسی دور میں پیدا ہوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ خدا کا ذکر اس کثرت سے کیا جائے کہ انسان اس کی یاد میں گم ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وجدانی ادراک ما سوا کا احساس ہی مٹا دے۔ دینی جذبے کی تسکین کے لیے عزلت کے گوشے تلاش کیے گئے۔ شر و فساد کے خلاف جہاد اس جذبہ کی تسکین کا اب ذریعہ نہیں رہا۔ دوسرا اہم عامل جس نے اس رجحان کو تقویت دی اور جس نے اس کے اظہار اور اشاعت میں بڑی خدمت انجام دی، وہ یونانی فلسفہ تھا۔ یونانی فلسفہ کی بیشتر کتابیں سریانی سے عربی میں منتقل ہوئیں۔ عیسائی مترجمین اور مستفین نے جو ترجمے کے کام میں پیش پیش تھے، اس آئیڈیل کے ارتقاء میں اہم پارٹ ادا کیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو: "چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالت" مجلہ علوم اسلامیہ (۱۰۲/۳)، علی گڑھ، جون ۱۹۶۲ء

اور مطلق قرار دیتے تھے۔

آزادیٔ ارادہ کے نظریہ کی تائید معتزلہ نے کی اور خدا کی قدرت کو برملا محدود قرار دیا۔ انہوں نے اپنے خیالات جس زبان اور انداز میں بیان کیے، وہ عامۃ المسلمین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہُوئے۔

ابوالحسن اشعری پہلے اعتزال کے پُرجوش مبلغ تھے۔ بعد میں ان کو اس سے بے اطمینانی پیدا ہُوئی، جو اس حد تک بڑھی کہ ۳۰۰ھ میں انہوں نے برسرِ عام اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور اپنے نئے خیالات کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ مگر اشعری نے جن مسائل میں دلچسپی لی وُہ عقاید سے متعلق تھے۔ اخلاقی مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ) وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اخلاقی مسائل کی تنقیح کی اور اشعری اصولوں پر ان کا حل پیش کیا۔ بعد کو دُوسرے ائمہ اشاعرہ نے ان مسائل پر فکر کو آگے بڑھایا۔ ان میں امام الحرمین جوینی (م ۴۷۸ھ) اور امام غزالی نمایاں ہیں۔ جن اخلاقی مسائل سے متکلمین نے بحث کی، وُہ دو تھے؛ ایک یہ کہ اخلاقی اصولوں کے علم کا ذریعہ کیا ہے؛ شرع یا عقل۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی اصولوں کے علم کی پابندی کی بنیاد کیا ہے؛ مثال کے طور پر اگر ہمیں سچ بولنا چاہیے، تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے یا یہ ہے کہ سچ بولنا عقل کا فیصلہ اور حکم ہے؛ خیرِ اور اخلاقی آئیڈیل سے متعلق متکلمین کے یہاں کوئی بحث نہیں ملتی۔ اگرچہ ان کی کتابوں میں رویتِ باری کے مسئلہ پر طویل بحثیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن یہ بحثیں اس نکتہ پر مرکوز تھیں کہ رویتِ باری کا امکان ہے یا نہیں؛ ان بحثوں کا تعلق اس بات سے کچھ نہ تھا کہ رویتِ باری اور سعادتِ انسانی میں کیا تعلق ہے۔

اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کے مطالعہ کے لیے ہمیں تصوف اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ نئے حالات کے اندر ایک نیا آئیڈیل وجود میں آ رہا تھا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کا نقشا پہلے پیش کیا گیا ہے[1]، ان حالات نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقا کو بیحد متاثر کیا۔ قرآن مجید نے زندگی کا جو آئیڈیل پیش کیا، وہ بڑا متوازن تھا۔ اس میں ہر چیز کو مناسب مقام حاصل تھا۔ مگر ان بدلے ہُوئے حالات میں یہ توازن باقی نہیں رہا۔ بعض پہلو زیادہ اُبھر آئے اور بعض دب گئے۔ سماج سے گریز اور کنارہ کشی کو اس کے مسائل میں دلچسپی لینے کے مقابلے میں ترجیح دی گئی۔ زہد کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ توکل علی اللہ کے غلط تصور نے بے عملی اور جمود کو تقویت دی اور حقیقت کی فکری جستجو اور مطالعہ و تفکر کو عمل و تجربہ کے مقابلہ میں برتر سمجھا گیا۔ عشقِ الٰہی کا نظریہ اسی دور میں پیدا ہُوا، جس کا حاصل یہ تھا کہ خدا کا ذکر اس کثرت سے کیا جائے کہ انسان اس کی یاد میں گم ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وجدانی ادراک ما سوا کا احساس ہی مٹا دے۔ دینی جذبے کی تسکین کے لیے عزلت کے گوشے تلاش کیے گئے۔ شر و فساد کے خلاف جہاد اس جذبہ کی تسکین کا اب ذریعہ نہیں رہا۔ دوسرا اہم عامل جس نے اس رجحان کو تقویت دی اور جس نے اس کے اظہار اور اشاعت میں بڑی خدمت انجام دی، وُہ یونانی فلسفہ تھا۔ یونانی فلسفہ کی بیشتر کتابیں سریانی سے عربی میں منتقل ہُوئیں۔ عیسائی مترجمین اور مستفین نے جو ترجمے کے کام میں پیش پیش تھے، اس آئیڈیل کے ارتقاء میں اہم پارٹ ادا کیا۔

---

[1] ملاحظہ ہو: "چوتھی صدی ہجری میں عراق اور مغربی ایران کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالت" مجلہ علوم اسلامیہ (۱۱۳) علی گڑھ، جون ۱۹۶۲ء

یونانی فلسفہ کے ان چند اہم نظریات پر ایک نظر ڈال لیجئے، جنھوں نے اخلاقی آئیڈیل کے ارتقاء پر گہرا اثر ڈالا۔ خدا کی حیثیت یونانی فلسفہ میں ایک مابعد الطبیعاتی تصور کی تھی۔ جسے یا تو علت اوّل سمجھا گیا، جو کائنات کی حرکت کو آغاز میں لانے کے لیے ضروری تھا یا مصدر اوّل قرار دیا گیا، جس سے سارا نظام وجود درجہ بدرجہ صادر ہوا۔ نو فلاطونی فلسفہ میں، جو مسلمانوں پر صدیوں غالب رہا، خدا عقل کی رسائی سے بلند، صفات سے عاری اور فوق العقلی وجدان کا موضوع تھا۔ انسان کی رُوح جو ذات واحد سے صادر ہوتی تھی موت کے بعد جسم سے علیحدہ ہوکر پھر اپنے مصدر کو لوٹ جاتی تھی۔ رُوح کا اپنے مصدر کی طرف رجوع اور اس سے اتصال آخری مقصد تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے انسان کو اپنے نفس کی تطہیر کرنی چاہیے تھی۔ مادی آلایشوں سے پاکی اور خدا کی ذات میں تفکر اس کے لیے ضروری تھا۔ یونانی فلسفہ میں خدا کی ذات قانون کا مصدر نہ تھی اور نہ ہی عبادات کا موضوع خدا، وحی و ہدایت سے بلند تھا۔ وہ نہ مختسب تھا اور نہ مجازی۔ رُوح کا تصور یونانی فلسفہ میں یہ تھا کہ رُوح ایک غیر مادی جوہر ہے، جو جسم سے نہ صرف بالکل مختلف ہے بلکہ اس سے متضاد اور متضارب بھی ہے۔ بعد میں جسم اور رُوح کا تضاد نمایاں اور وسیع ہوتا چلا گیا بالآخر جسم کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا ہوگئی فرفوریوس کو اپنے جسم سے اس قدر نفرت تھی کہ اس نے خودکشی کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اس کا استاد افلاطین (PLOTINUS) مانع آیا۔ اس نے اسے یہ سمجھایا کہ جسم رُوح کے لیے ایک تربیت گاہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے جس سے گزرے بغیر وہ ترقی و کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ جسم فی الحقیقت ایک ناگزیر شر ہے۔[۱]

افلاطون اور ارسطو سماج کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے فکر میں انسان کی سماجی زندگی اس کی ذاتی زندگی کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھی۔ سماج کی یہ اہمیت بعد کے رواقی اور لذتی فکر میں قائم رہی مگر نو فلاطونی فلسفہ میں سماج کی اہمیت گھٹتی چلی گئی بالآخر نوبت سماج سے بے تعلقی اور بیزاری تک پہنچی۔

سقراط نے علم کو عقل اور فضیلت کو علم کا شعبہ قرار دیا۔ یہ دونوں بنیادی نظریات قدرے ترمیم کے ساتھ یونانی فلسفہ کی پوری تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ سقراط نے حواس کی اہمیت جس طرح گرائی، اس کی تلافی پھر نہیں ہوئی۔ افلاطون نے فلسفہ کا آئیڈیل پیش کیا کہ انسان اپنے غیر عقلی وجود کو فنا کر دے۔ نو فلاطونی فلسفہ میں عقل کی جگہ وجدان نے لے لی جس کے نتیجے میں فلسفہ تصوّف کی ایک قسم بن گیا اور حقیقت کی عقلی جستجو کی جگہ "ذات واحد" کا وجدانی عرفان مقصد قرار پایا۔

یونانی اخلاقیات کا مرکزی تصور خیر کا تصور تھا۔ فرض کا تصور اس میں سرے سے موجود نہیں تھا۔ اس میں نہ تو کوئی الہامی ضابطۂ اخلاق تھا اور نہ ہی خدا کے سامنے جواب دہی کا کوئی خیال۔ فضیلت خیر اعلیٰ یا سعادت کے حصول کا ذریعہ تھی۔ ابتداء میں سعادت انسان کی ہمہ جہتی ترقی و تکمیل کے ہم معنی تھی لیکن فلاسفہ کے نزدیک سعادت عقل کی تکمیل قرار پائی کیونکہ عقل ہی انسان کا مابہ الامتیاز تھی اور حقیقی انسانیت اسی سے عبارت تھی، عقل کے دو پہلو تھے؛ نظری اور عملی۔ لیکن نظری عقل کو عملی عقل پر فوقیت حاصل تھی۔ عملی زندگی حقائق عقلی کی تحصیل کا ذریعہ تھی۔ مابعد الطبیعیات علم کی منتہا تھی اور اس کی تحصیل زندگی کی آخری غایت۔

---

[۱] ALICE ZIMMERU : THE LETTER OF PROPHYRY TO MARCELLA, (LONDON, 1696), P. 27, 35.

فضیلت کے درجات تھے، جن میں فضائل عقلی کو بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ نوفلاطونی اخلاقیات میں فضائل کی صعودی ترتیب یہ تھی، سیاسی، تطہیری CARTHARIC، عقلی اور PARADIGMATIC یعنی ذات واحد میں فکری محویت اور استغراق[1]
یونانی فلسفے کے یہ دُو اہم نظریات ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے اخلاقی فکر کو بیحد متاثر کیا۔ تیسری اور چوتھی صدی کے حالات میں جن کا ذکر پہلے آیا ہے اس فلسفے کی اثر انگیزی کی توجیہہ کی ضرورت نہیں۔ ایک طرف اخلاقی آئیڈیل کی تشکیل کے لیے حالات بڑے سازگار تھے۔ دُوسری طرف اس تشکیل کے لیے جن تصورات اور فکری آلات کی ضرورت تھی، انھیں یونانی فلسفے نے مہیا کردی۔

متکلمین کے اخلاقی تصوّرات

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ اخلاقی فکر کا آغاز انسانی ذمہ داری کے سوال سے ہوا۔ آزادی ارادہ کے اوّلین علمبردار وُہ تھے، جنھیں قدریہ کہا گیا۔ ان کے فکر کی اشاعت بعد میں معتزلہ نے کی۔ معتزلہ نے آزادی ارادہ کے مضمرات واضح کرنے میں جرأت دکھائی، اگر انسان اپنے ارادہ کا مالک ہے اور اپنے اعمال کی حقیقی علّت وہی ہے۔ ان کے الفاظ میں وہی ان کا خالق ہے[2] تو ظاہر ہے کہ خدا کی قدرت غیر محدود نہیں رہ جاتی۔ معتزلہ کا خیال تھا کہ خدا کی قدرت کو محدود کیے بغیر نہ تو انسانی ذمہ داری اور مسئولیت کو بچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی خدا کے عدل وانصاف کو[3] قدریہ کے مخالفین کو "جبریہ" کہا گیا۔ یہ لوگ خدا کی غیر محدود قدرت کو محدود کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور آزادی ارادہ کے منکر تھے۔ مگر اعمال کی ذمہ داری اور خدا کے عدل کے مسئلہ کا کوئی حل انہوں نے پیش نہیں کیا۔[4]

اشاعرہ نے کسب کا نظریہ پیش کیا، جس سے ان کا مقصد ایک طرف خدا کی غیر محدود قدرت اور عدل کو محفوظ کرنا تھا اور دُوسری طرف آزادی ارادہ اور انسانی ذمہ داری کو باقی رکھنا تھا۔ ان کے خیال میں انسان اپنے اعمال کا خالق نہیں تھا، اسے اختیار و ارادہ کی آزادی ضرور حاصل تھی لیکن اختیار و ارادہ کی قوت بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ تھی۔ انسان ان کا خود خالق نہیں تھا۔ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اس لیے تھا کہ وُہ ارادہ اور اختیار کا مالک تھا۔ اس نظریہ کی بنا پر خدا کا عدل بھی مجروح نہیں ہوتا تھا اور چونکہ ہر چیز اور ہر فعل کا خالق خدا ہے، اس لیے اس کی قدرت محدود بھی نہ ہوتی تھی۔[5]

---

[1] THOMAS WHITTAKER, THE NEO- PLATONISTS, (CAMBRIDGE, 1928) P. 91-49

[2] شہرستانی: کتاب الملل والنحل ص ۶۲، شائع کردہ محمد بن فتح اللہ، الازہر مصر، ۱۹۴۷ء؛ زہدی حسن جار اللہ: المعتزلہ: ۹۲، ۹۷، ۹۹، قاہرہ ۱۹۴۷ء۔

[3] شہرستانی: الملل والنحل، ص: ۶۲، واتفقوعلی ان العبد قادر خالق لافعاله خیرها وشرها مستحق علی مایفعله ثوابا وعقابا فی الدار الآخرة والرب تعالیٰ متنزه ان یضاف الیه شر وظلم وفعل هوکفر ومعصیة لانه لوخلق الظلم کان ظالما کما لوخلق العدل کان عادلا۔ [4] ایضاً: ۱۳۳، الاشعری: مقالات الاسلامیین، استانبول، ۱۹۲۹ء، (۱: ۲۷۹)

[5] ایضاً: ۱۵۶؛ شہرستانی: نہایۃ الاقوام، آکسفورڈ، ۶۷: ۸۰؛ الغزالی: الاقتصاد فی الاعتقاد، مصر ۱۳۲۷ھ، ۳۷-۴۰

عدل الٰہی اور قدرت الٰہی میں توافق کا مسئلہ شر کے وجود کے ضمن میں بھی اٹھتا ہے۔ معتزلہ اوّل تو اس کے انکاری تھے کہ خدا شر کا خالق ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی معصوم کو مبتلائے عذاب کرتا ہے۔ اشاعرہ خدا ہی کو خیر و شر کا خالق سمجھتے تھے۔ وہ مثال کے طور پر معصوم انسانوں کی مصیبت کو اسی کی طرف سے سمجھتے تھے۔ معتزلہ شر اور تعذیب معصوم کو خدا کی طرف منسوب کرنے سے اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ بات ان کے خیال میں خدا کی معقولیت اور عدل کے منافی تھی۔ اگر بالفرض کوئی معصوم مبتلائے تکلیف ہو بھی تو ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ پر اس کی تلافی دوسری دنیا میں لازم ہے[1] اشاعرہ ہر طرح کے شر کو من اللہ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے عدل کے تصور ہی کو چیلنج کیا۔ ان کے خیال میں عدل وہ نہیں ہے، جو ہماری عقل بتائے بلکہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کرے[2] معتزلہ عدل کو ایک عقلی تصور سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں خدا کی طرف عدل کی نسبت اسی معنی میں ہوتی ہے، جس معنی میں وہ انسان کی طرف ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ خدا کے اعمال عقل انسانی کے مطابق ہوتے ہیں بلکہ انھیں لازماً مطابق ہونا چاہیئے خدا عقل کے اصولوں کا ویسا ہی پابند ہے جیسا کہ کوئی دوسرا صاحب عقل۔

اس اختلاف سے دو اہم اخلاقی مسائل پیدا ہوئے: ایک یہ کہ اخلاقی معلومات کا ذریعہ کیا ہے، عقل یا شرع؟ اور دوسرا سوال یہ کہ اخلاقی ذمہ داری (OBLIGATION) کی بنیاد کیا ہے؟ ان سوالات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی کیونکہ ان کے ساتھ بعض دوسرے اہم مسائل وابستہ تھے جن میں سے ایک مسئلہ نبوت کی ضرورت اور جواز کا تھا۔ اگر عقل خیر و شر کے ادراک کے لیے بالکل کافی ہو، تو وحی کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔

معتزلہ کے پاس ان دونوں سوالات کا جواب ایک تھا عقل حسن ان کی تنقیح کے مطابق تین معنوں میں بولا جاتا تھا: ایک وہ جس میں نماز، روزہ اور دوسرے دینی فرائض حسن کہے جاتے تھے۔ دوسرا وہ جس میں حسن سے مفید اور مسرت بخش امور مراد لیتے تھے اور تیسرا وہ جس میں عدل، شکر اور سخاوت کو حسن کہا جاتا تھا معتزلہ کو تسلیم تھا کہ پہلے معنی میں حسن کے علم کے لیے شرع ضروری ہے[3] حسن بھی دوم و سوم کے علم کے لیے جس میں اخلاقی حسن بھی آتا ہے عقل بالکل کافی ہے ——————— ان کا خیال تھا کہ عقل ہمیں بتاتی ہے کہ شکر اور سچائی وغیرہ حسن ہیں اور ناشکری اور جھوٹ وغیرہ قبیح ہیں۔ ان کے حسن کا علم شرع سے نہیں ہوتا۔ شرع صرف اس علم کی تصدیق کرتی ہے، جو عقل سے حاصل ہوتا ہے۔ معتزلہ اس خیال کو اس طرح ادا کرتے تھے۔

اشیاء اور افعال فی نفسہٖ حسن یا قبیح ہوتے ہیں اور ان کے حسن و قبح کا ادراک عقل کرتی ہے[4] اس قول کے یہ معنی تھے کہ خیر و شر کلیتہً عقلی (RATIONAL) ہیں۔ لیکن یہ سوال کہ خیر و شر کے کیا معنی ہوتے ہیں، یا اخلاقی طور پر حسن ہونے کا مفہوم کیا ہے؟

اس دور میں جس کے اخلاقی فکر کا جائزہ ہمارے پیش نظر ہے اب تک پیدا نہیں ہوا تھا، غزالی سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے

---

[1] الاشعری؛ مقالات اسلامیین (۱: ۲۵۳-۲۵۴)

[2] شہرستانی: الملل والنحل (۶۷، ۵۸)

[3] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶) المطبعۃ الامیریہ، بولاق ۱۳۲۲ھ

[4] ایضاً (۱: ۵۵)؛ الاشعری؛ مقالات الاسلامیین (۲: ۳۵۶)؛ شہرستانی: نہایۃ الاقدام، ص ۳۷۱

یہ سوال اٹھایا[1] مگر وہ پانچویں صدی کے ہیں۔ معتزلہ کا یہ بھی خیال تھا کہ عقل ہی اخلاقی ذمہ داری کا مصدر ہے۔ یعنی یہ کہ عقل حسن و قبح کا علم ہی نہیں دیتی بلکہ حسن کے انجام دینے اور قبح سے اجتناب کرنے کا حکم بھی دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اخلاقی ذمہ داری (وجوب) عقلی ہے اور عقل کے احکامات ہر ذی عقل ذات پر واجب ہیں۔ معتزلہ کے اس نظریہ کا ایک لازمہ یہ تھا کہ شرع کے پہنچنے سے پہلے انسان اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہوتا ہے[2]۔

معتزلہ نے اخلاقی مسائل میں عقل کے کافی ہونے کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں: اخلاقی فضائل مثلاً شکر کا حسن ہونا ہم ضرورۃً جانتے ہیں۔ انسان خواہ وہ وحی و الہام سے آشنا ہوں یا نہ ہوں، اس میں یقین رکھتے ہوں یا اس کے منکر ہوں بالعموم ان فضائل کے حسن ہونے کے قائل ہیں۔ جب بھی کوئی مقصد صائب اور غیر صائب دونوں طریقوں سے یکساں حاصل ہو سکتا ہے تو انسان نمایاں طور پر محسوس کرتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ صائب طریقہ ہی کو اختیار کرے۔ اگر اعمال کا حسن عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تو ایک سچے نبی اور ایک جھوٹے متنبی میں فرق کرنا ناممکن ہوتا۔ اس آخری استدلال کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شرع کی اتباع اور اطاعت کی ذمہ داری بھی بالآخر عقلی ہے[3]۔

اشاعرہ کو یہ تسلیم تھا کہ حسن بمعنی دوم عقلی ہے[4] مگر حسن بھی اول و سوم (دینی اور اخلاقی) کے علم کو وہ عقلی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت وہ ان دونوں معنی میں کوئی امتیاز ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں افعال اور اشیاء کا حسن و قبح ذاتی نہیں ہوتا۔ کوئی چیز حسن ہے تو اس لیے ہے کہ شرع نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ بالفاظِ دیگر شرع حسن و قبح کی اطلاع دینے والی نہیں بلکہ خالق ہے۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ اخلاقی ذمہ داری عقلی نہیں ہو سکتی کیونکہ جب تک کہ شرع کا حکم کسی کو نہ پہنچے، اس وقت تک وہ نہ صرف ذمہ دار نہیں ہوتا، بلکہ کسی چیز کے حسن و قبح کا علم بھی اس کو نہیں ہوتا۔

باقلانی (۴۰۳ھ) نے معتزلہ کے دلائل کی تردید میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: حسن و قبح کا علم بدیہی نہیں ہے۔ ورنہ اختلاف نہ ہوتا، عمومی بھی نہیں ہے کیونکہ خیر و شر کے بارے میں انسانوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اور بسا اوقات متضاد خیالات ملتے ہیں۔ حسن و قبح کا علم عقلاً ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ ضروری ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ جن مقدمات سے یہ علم مستخرج ہو، وہ بدیہی ہوں اور ایسا ہے نہیں۔ یہ بات کہ جب حسن اور غیر قبیح دونوں ہی اعمال سے مقصد یکساں طور پر حاصل ہوتا ہے تو انسان حسن کو ترجیح دیتا ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ انسان قبیح کا ارتکاب کر کے سماج کی ملامت مول نہیں لینا چاہتا، یا حسن کو انجام دینے سے اس کا مقصد تعریف حاصل کرنا ہوتا ہے، یا وہ اس لیے کارِ حسن کرتا ہے کہ کسی وحی میں یقین رکھتا ہے یا اس کے زیر اثر ہوتا ہے۔ باقلانی کے خیال میں کوئی اور صورت اس حقیقت کی توجیہ کی نہیں ہے۔ معتزلہ کی آخری دلیل کے جواب میں باقلانی کا خیال ہے کہ نبی کی پہچان کی حقیقی دلیل اس کے معجزات ہوتے ہیں[5]۔

---

[1] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶)
[2] شہرستانی: الملل والنحل: ۴۷، ۴۸، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۲۰
[3] باقلانی: التمہید، ص ۱۰۰ شائع کردہ محمد الکدی اور محمد عبدالہادی ابوریدہ، قاہرہ، ۱۹۴۷ء
[4] الغزالی: المستصفیٰ (۱: ۵۶-۵۷)
[5] باقلانی: التمہید، ص ۱۱۴، شہرستانی: الملل وا[illegible] ۱۶۸

اشاعرہ اور معتزلہ کے انتہا پسند خیالات کے برخلاف ایک درمیانی مکتب فکر ابوحنیفہ اور ان کے شارح اور مفسر ابومنصور ماتریدی کا ہے۔ یہ مکتب فکر اخلاقی اصولوں کے علم کے مسئلہ میں معتزلہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اخلاقی وجوب کے مسئلہ میں اشاعرہ کا ہم نوا ہے[۱]۔ اس کے خیال میں، دونوں سوالات ایک دوسرے پر منحصر نہیں ہیں۔

فلسفیانہ اخلاقیات جب ہم کلامی اخلاقیات سے فلسفیانہ اخلاقیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو نہ صرف اخلاقی مسائل ہی بدلے نظر آتے ہیں بلکہ اصطلاحات بھی نئی ہوتی ہیں۔ متکلمین حسن کو خیر اور صائب کے معنی میں استعمال کرتے تھے، جن کے درمیان وہ کوئی تمیز نہیں کرتے تھے اور قبیح کو شر اور غیر صائب کے معنی میں استعمال کرتے تھے اور وجوب کا لفظ اخلاقی ذمہ داری کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولتے تھے۔ فلسفیانہ اخلاقیات میں ان الفاظ کی جگہ خیر، فضیلت اور سعادت اور ان کے مخالف الفاظ مروج ملتے ہیں۔ فلسفیانہ اخلاق کا مرکزی مسئلہ خیر کا مسئلہ تھا۔ عموماً بحث خلق کے تصور کی وضاحت سے شروع ہوتی ہے، جو اخلاقی تصورات کا موضوع ہے۔ خلق کی دو قسمیں کی جاتی ہیں، ایک خیر، دوسرے شر۔ خلق کا خیر یا شر ہونا نفس کے قوی کے باہمی تعامل کی نوعیت پر منحصر ہوتا تھا۔ فضیلت اچھے خلق سے عبارت تھی لیکن فضیلت کا تصور خلق تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ عقل کے کمال پر بھی صادق آتا تھا، بشرطیکہ وہ مستقل ہو۔ سعادت فاضلانہ افعال پر مشتمل ہوتی تھی اور ہر طرح کے خیر کا جامع تھی لیکن سعادت کی آخری قسم وُہ تھی جو فلسفی کو حاصل ہوتی تھی، یعنی جو عقل اور بالخصوص عقل نظری کی تکمیل سے عبارت تھی۔ مسلمانوں کے فلسفیانہ اخلاقیات کا یہی عام نقشا تھا۔

فلسفیانہ اخلاقیات کے مطالعے کے لیے ہمیں کندی (م ۲۶۰ ھ) سے ابتدا کرنی چاہیے۔ کندی ابتداء میں اعتزال کا حامل تھا بعد میں کلام سے فلسفہ کی طرف رُخ کیا اور یونانی علوم کی کتابوں کے مطالعہ، ترجمہ اور تشریح میں مصروف ہوگیا۔ فلسفہ میں مابعد الطبیعیات اور نفسیات اس کے اہم موضوعات تھے۔ اخلاق میں کندی نے ایک رسالہ "دفع الاحزان" کے نام سے لکھا ہے، جس میں حزن و غم کے وجوہ اور ان کے دُور کرنے کے عملی طریقوں کی نشان دہی کی ہے۔ کندی نے نفس کا جو نظریہ پیش کیا وہ اخلاقیات کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا نظریہ نفس بعد کے نفسیاتی اور اخلاقی فکر دونوں کے لیے اہم بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو مختصراً یہ ہے:

نفس ایک بسیط روحانی جوہر ہے۔ اس کی حقیقت ربانی ہے۔ خدا سے اس کا صدور اس طرح ہُوا ہے، جس طرح کہ سورج سے روشنی نکلتی ہے[۲]۔ نفس مادی جسم سے نہ صرف کلیتہً مختلف ہے بلکہ متضاد بھی ہے۔ اس کی ایک نمایاں وجہ یہ ہے کہ نفس جسم کی خواہشات پر پابندی اور قیود عائد کرتا ہے[۳]۔ اس تاریک دنیا میں نفس جب جسم سے متصل ہوتا ہے تو جسم کی ضروریات اور خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس تاثر کے نتیجہ میں عقل کے علاوہ شہوت اور غضب کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل، شہوت اور غضب کو بادشاہ، خنزیر اور کتے سے بالترتیب تشبیہ دی جا سکتی ہے[۴]۔ انسان فضیلت کی تحصیل اس وقت کرتا ہے جب کہ عقل کی حکمرانی بقیہ دونوں قوتوں پر مکمل ہوتی ہے۔

---

[۱] ابوعلی محمد بن نظام الدین انصاری؛ فواتح الرحموت برحاشیہ المستصفیٰ (۲۵-۲۶) ابوعذبہ: الروضۃ البہیۃ (۳۴-۳۹) حیدر آباد

[۲] رسائل الکندی الفلسفیہ (۱۹۵۰) (۱: ۲۷۴) شائع کردہ ابوریدہ مطبعۃ الاعتماد، مصر

[۳] ایضاً: ۲۷۳ [۴] ایضاً: ۲۷۴

انسان کا آخری کمال تفکر میں ہے، جس کا موضوع اعلیٰ خدا کی ذات ہے۔ خدا کا حقیقی علم صرف اس نفس کو حاصل ہو سکتا ہے، جو آلائشوں سے پاک ہو۔[1] اخلاقی فلسفیانہ کمال کے لیے ناگزیر شرط اور ذریعہ ہے۔ کمال کا انتہائی درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب کہ رُوح جسم سے الگ ہو کر عالمِ روحانی میں داخل ہو جائے گی، جہاں اسے خدا کا دیدار ہوگا۔[2] یہ کمال انسانی کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان پر سارے حقایق اس طرح منکشف ہوں گے، جیسے کہ وُہ علم الٰہی میں ہیں۔[3] حقایق روحانیہ کا یہ انکشاف انتہائی مسرت انگیز ہوگا۔[4]

"دفع الاحزان" میں کندی نے حزن وغم کے اصل سبب کی نشان دہی کی ہے۔ انسان کو رنج والم اس لیے ہوتا ہے کہ وہ مادی چیزوں سے محبت کرتا ہے اور ان کے حصول میں پریشان رہتا ہے۔ لیکن مادی چیزیں فاسد ہونے والی ہیں۔ ان کے بجائے اگر انسان ہمیشہ رہنے والی روحانی چیزوں کی خواہش کرے اور انھیں محبوب رکھے، تو وہ کبھی حزن و یاس سے دوچار نہیں ہوگا۔[5] روحانی حقایق کے حصول ہی میں انسان کی حقیقی سعادت ہے۔ موت کا خیال بھی اکثر آدمیوں کے لیے پریشانی اور غم کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ موت کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ اگر انسان یہ جان لے کہ موت سعادت ابدی کے لیے فتح باب کا حکم رکھتی ہے، تو انسان اس کے خیال سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہوگا۔[6]

فارابی (م ۳۳۹ ھ) کی دلچسپی کے اہم ترین موضوعات منطق، مابعد الطبیعیات اور سیاسیات تھے۔ فارابی نے ارسطو کی NICOMACHEAN ETHICS شرح لکھی تھی۔ مگر اخلاق کے موضوع پر اس کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ اس کے اخلاقی نظریات اس کی سیاسی کتابوں سے مستخرج کیے جا سکتے ہیں، جن میں "آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ"، "السیاسۃ المدنیۃ"، "تحصیل السعادۃ" اہم ہیں۔ اس کی "التنبیہ علیٰ سبیل السعادۃ" بھی اس سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ "تحصیل السعادۃ" اور "التنبیہ علیٰ سبیل السعادۃ" دونوں کا موضوع سعادت کی تحصیل ہے، لیکن دونوں میں ایک فرق نمایاں ہے۔ "تحصیل" میں ریاست اور معاشرہ کی سعادت زیرِ بحث ہے۔ "التنبیہ" میں فرد کی سعادت پیشِ نظر ہے۔

کندی کا نظریہ رُوح یکسر نوفلاطونی ہے۔ فارابی، نوفلاطونی اور مشائی نظریات کو ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ فارابی اس مشائی نظریہ سے ابتدا کرتا ہے کہ جسم اور نفس میں مادہ اور صورت کا تعلق ہے۔[7] پھر وہ نفس اور عقل کے تعلق کو بھی مادہ اور صورت کا تعلق قرار دیتا ہے۔ نفس رُوح کی تکمیل ہے اور عقل نفس کا کمال۔ مگر یہاں ایک فرق ملحوظ رہنا چاہیے۔ نفس جسم کی ترقی سے وجود میں آتا ہے مگر عقل، عقل فعال سے صادر ہو کر نفس سے متصل ہوتی ہے۔[8] بعد کی کتابوں میں فارابی نفس کو مادہ سے الگ ایک روحانی جوہر قرار دیتا ہے۔[9] مگر اس نظریہ میں نفس کو

---

[1] رسائل الکندی الفلسفیہ (۱۹۵۰) (۱ : ۲۷۳) شائع کردہ ابوریدہ مطبعۃ الاعتماد، مصر، ص ۲۷۶، ۲۷۸

[2] ایضاً : ۲۷۴، ۲۷۶ — [3] ایضاً : ۲۷۵، ۲۷۶ — [4] ایضاً : ۲۷۷

[5] ایضاً : ۲۱ — [6] ایضاً : ۲۲ - ۲۳

[7] آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، ص ۲۵، ۲۸، ۳۹

[8] السیاسیات المدنیۃ، ص ۴۳، حیدر آباد

[9] اثبات المفارقات، ص ۷، حیدر آباد، التعلیقات، ص ۱۲ حیدر آباد

عقل سے ممتاز کرنا دشوار ہے۔ بہرحال نفس اور جسم کا جو بھی تعلق ہو، اتنا طے ہے کہ موت کے بعد جو نفس کے عمل کے انقطاع سے عبارت ہے۔ عقل جہاں سے آئی تھی، وہاں لوٹ جاتی ہے، موت کے بعد عقل کا فعل کس طرح باقی رہتا ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہوتی مگر یہ کہ ایسا ہوتا ہے اور عقل فعال میں ضم نہیں ہو جاتی۔ فارابی کے فکر میں اس مسئلہ پر کوئی ابہام نہیں ہے۔

کندی اور فارابی میں ایک اور فرق ہے۔ کندی افلاطون کی پیروی میں روح کی تین قوتیں بتاتا ہے، شہویہ، غضبیہ اور ناطقہ۔ لیکن فارابی ارسطو کی اتباع کرتا ہے۔ فارابی نے مختلف کتابوں میں نفس کی جو قوتیں گنائی ہیں، ان میں کسی قدر اختلاف ہے۔ عام طور پر پانچ قوتیں بیان کی ہیں: غذائیہ، حاسہ، متخیلہ، ناطقہ اور نزوعیہ[1] نزوعیہ ہر خیر و شر کا ارادہ کرتی ہے، خواہ اس فعل کا تعلق حس سے ہو یا تخیل سے یا عقل سے[2] ان ساری قوتوں میں وہی تعلق ہے جو مادہ اور صورت میں ہوتا ہے، غذائیہ اولین مادہ ہے اور عقل آخری صورت۔ مگر نزوعیہ دوسری قوتوں کے اندر اس طرح جاری و ساری ہے، جیسے گرمی آگ میں[3] نفس کی قوتوں میں درجہ بندی ہے۔ عقل ان میں سب سے بلند اور سب کی حاکم ہے اور وہی ساری قوتوں کی علت غائی ہے۔ وہی ان کی وہ انتہائی صورت ہے جس میں ان کی تکمیل ہوتی ہے اور عقل ہی وہ مقصود ہے، جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے[4] انسان کا خیرِ اعلیٰ یا سعادت قصوی عقل ہی کی تکمیل میں ہے۔

عقل دو طرح کی ہوتی ہے، ایک نظری اور دوسری عملی۔ عقل نظری کی تکمیل موجودات کے علم سے ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ عقل کی تکمیل کے لیے سارے علوم صحیحہ کا اکتساب لازمی ہے۔ علم کی غایت خدا کی معرفت ہے[5] یعنی یہ کہ وہ واحد، غیر متحرک اور ساری چیزوں کی علت ازلی ہے۔ سارا نظام کائنات اس کی رحمت، حکمت اور عدل سے قایم ہے[6] مابعد الطبعیات اور دینیات (THEOLOGY) منتہائے علم ہیں۔ عقل عملی کی تکمیل صائب اور غیر صائب میں تمیز، فضائل کی تحصیل، حسن و قبح کے علم و اختیار اور تعمیر و تخلیق سے ہوتی ہے۔ مگر عقل عملی کی تکمیل فی نفسہٖ مطلوب نہیں ہے۔ عقل عملی، عقل نظری کی خادم اور علم حقیقی کی تحصیل کا ذریعہ ہے[7]

فارابی لکھتا ہے، حقیقی سعادت، نفس کی وہ حالت ہے، جس میں وہ ہر طرح کے مادی علایق سے پاک ہو کر ان روحانی جواہر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو مادہ کے ادنیٰ شائبہ سے بھی بلند ہوتے ہیں[8] خدا جو صورۃ الصور ہے فلسفہ کا آخری موضوع ہے۔ اعمال میں خدا کی مشابہت اختیار کرنا فلسفہ کی منزل ہے۔ تشبہ باللہ ہی انسان کا آخری کمال اور حقیقی سعادت ہے[9]

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے نفس کا تزکیہ اور فضائل کا اکتساب ضروری ہے۔ فضیلت عقل کی رہنمائی میں نفس کی قوتوں کے صحیح تعامل سے عبارت ہے۔ فارابی نے قوی نفس کے صحیح تعامل کا قیاس جسمانی صحت پر کیا ہے۔ جسم اسی وقت صحت مند ہوتا ہے، جب

---

[1] المدینۃ الفاضلۃ، ۴۷ - ۴۹ مطبعۃ النیل، مصر　　[2] ایضاً: ص ۵۰

[3] ایضاً: ص ۵۲　　[4] تحصیل السعادۃ، ص ۳۲، حیدر آباد: المدینۃ الفاضلۃ: ص ۶۷

[5] رسالہ فی ماینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ، ص ۵۳ (یہ رسالہ الثمرات المرضیہ فی لبعض الرسالات الفارابیہ، لائڈن، ۱۸۹۰ء میں شامل ہے)

[6] المدینۃ الفاضلہ: ۱۰ - ۱۷　　[7] ایضاً: ص ۶۷

[8] ایضاً: ص ۶۶　　[9] رسالہ فی ماینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ: ص ۵۳

اس کے اعضاء کا تعامل صحیح ہوتا ہے۔ اسی طرح نفس اسی وقت صحت مند ہوتا ہے، جب اس کی قوتیں صحیح طریقے پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں[1] اعتدال اور توسط فضیلت کا لازمی جزء ہے۔ کسبِ فضیلت کے لیے انسان کو اپنے اعمال میں درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ مگر توسط کا جو تصور فارابی نے پیش کیا، وہ ریاضیانی نہیں ہے بلکہ زمان و مکان، حالات و ظروف اور فرد و معاشرہ کی ضروریات کے لحاظ سے اضافی ہے[2]

فضائل کی تفصیلی بحث میں فارابی نے ارسطو کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ افلاطون کی طرح فضائل کو نفس کے قوی ثلاثہ سے مستنبط نہیں کرتا بلکہ ہر فضیلت کو علیحدہ لیتا ہے اور اس کا نفسیاتی اور اخلاقی تجزیہ کرتا ہے[3]

تزکیۂ نفس اور کسبِ فضائل کے بعد فارابی انسان کو عقلِ فطری کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کے لیے وہ سب سے پہلے علم البرہان کی تحصیل ضروری قرار دیتا ہے تاکہ انسان استدلال کی غلطیوں اور بھول بھلیوں سے محفوظ رہ سکے۔ علم البرہان کے دو حصے ہیں: ایک ریاضی اور دوسرا منطق۔ انسان کو ریاضی سے ابتدا کرنی چاہیے، پھر منطق سیکھنی چاہیے۔ اس کے بعد مختلف علوم کی تحصیل کرنی چاہیے اور آخر میں دینیات کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے، جو تاج العلوم ہے[4]

فارابی کا یہ پختہ یقین ہے کہ سعادت تنہا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ایسا معاشرہ اور ریاست ناگزیر ہے، جس کے افراد کے درمیان تعاون ہو[5] فارابی کی مثالی ریاست وہ ریاست ہے جس کے شہری ان ذرائع اور وسائل کی تحصیل میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں، جن سے سعادت حاصل ہوتی ہے[6] تعاون بین الناس کا نظریہ فارابی کے خیال میں دو بنیادوں پر قائم ہے: ایک بقائے حیات کی ضروریات کی فراہمی، دوسرے افراد کی صلاحیتوں میں بے حد تفاوت۔ انسانوں کی کثیر جماعت اس لائق نہیں ہوتی کہ حقیقی سعادت کو پہچان سکے، کجا کہ تن تنہا اسے حاصل کرلے[7] حقیقت یہ ہے کہ ریاست کا وہ طبقہ جسے ذی عقل کہا جاتا ہے، وہ بھی مل کر اس لائق نہیں ہوتا کہ عوام کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ اس کام کے لیے تو ایک عظیم ہوشمند اور ذی علم حاکم کی ضرورت ہے[8] کوئی پیغمبر، فلسفی یا امام ہی اس کارِ عظیم کو انجام دے سکتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اور رئیس اول ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اگر رئیس اول موجود نہ ہو تو پھر اس کے قانون اور سنت کی اتباع کرنی چاہیے۔ فارابی نے جس حکومت کا تصور پیش کیا ہے، وہ دینی جماعت بھی ہے۔

اس کا رئیس اول بیک وقت دینی پیشوا اور دنیاوی بادشاہ ہوتا ہے۔ ریاست شہریوں کی دنیاوی حالت ہی متعین نہیں کرتی، ان کی آخرت کا فیصلہ بھی کرتی ہے[9]

---

[1] التنبیہ علی سبیل السعادۃ: ص ۱، حیدرآباد [2] ایضاً: ص ۱۰ - ۱۱ [3] ایضاً: ص ۱۱ - ۱۲

[4] رسالہ ما ینبغی ان یقدم قبل تعلم الفلسفہ: ص ۵۲ - ۵۳؛ فصول المدنی: ص ۷۰، انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کردہ D.M. DUNLOP کیمبرج، ۱۹۶۱ء [5] تحصیل السعادۃ: ص ۱۰۵ - ۱۴ [6] المدینۃ الفاضلہ: ص ۸۰

[7] ایضاً: ص ۷۷، السیاسات المدنیہ: ص ۴۷، ۴۸ [8] السیاسات المدنیہ: ص ۴۸ - ۴۹

[9] ROSENTHAL, THE POLITICAL THOUGHT IN MEDIEVAL ISLAM, P. 131.

اخوان الصفاء بظاہر اخوان الصفاء کے پیش نظر شریعت کی تطہیر تھی۔ ان کے خیال میں شریعت حقہ میں جاہلی توہمات داخل ہوگئے تھے۔ ان مفسدات سے شریعت کو پاک کرنے کے لیے وہ فلسفہ یونانی کی روشنی میں شریعت کی تعبیر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اسی شریعت اور یونانی فلسفہ کے امتزاج ہی میں وہ کمال کا امکان دیکھتے تھے[1] مگر ان کے رسالوں کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، ان کا یہ اظہار و اعلان ان کے دوسرے پنہاں مقاصد کے لیے نقاب تھا۔ وہ نہ کسی مذہب پر ایمان رکھتے تھے اور نہ ہی کسی نظام فکر میں یقین۔ ہر فکر اور ہر مذہب سے کچھ تصورات و خیالات منتخب کر کے انھوں نے اپنا ایک نیا نظام فکر و عمل تیار کر لیا تھا، جس کے اجزا میں توافق کا ہونا لازمی نہ تھا[2]

مختلف اطراف سے خوشہ چینی اخوان الصفا کے اخلاقی فکر میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں اخلاق دو طرح کے ہوتے ہیں: برے اور بھلے۔ دونوں طرح کے اخلاق میں انسانوں کے اندر بعید تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس تفاوت کی وجہ ان کے نزدیک جسمانی حالات، آب و ہوا، مقام رہائش اور تعلیم و تربیت کا اختلاف ہے۔ لیکن تفاوت اخلاق کا سب سے زیادہ موثر سبب ستاروں کا عمل ہے اور سارے دوسرے عوامل ستاروں کے عمل پر منحصر اور ان کے تابع ہیں[3]۔ ستاروں کی تاثیر کا عنصر اخوان الصفاء کا اضافہ ہے اور غالباً ایرانی ماحول اور روایات کی وجہ سے ہے۔

خلق طبعی بھی ہوتا ہے اور کسبی بھی۔ اکثریت طبعاً بری ہوتی ہے، جس کی اصلاح کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، ایک قلیل تعداد طبعاً بھلی ہوتی ہے، مگر یہ نظریہ اخوان الصفاء کے اس نظریہ سے متضارب ہوتا ہے، کہ سارے انسان فی الحقیقت بھلے ہوتے ہیں[4]۔

خلق کو اخوان نفس کی ایک مستقل کیفیت بتاتے ہیں اور اس کی پانچ قسمیں کرتے ہیں: نفس نباتیہ شہوانیہ، نفس حیوانیہ غضبیہ، نفس انسانیہ ناطقہ، نفس عاقلہ حکمیہ، نفس ناموسیہ ملکیہ[5]۔ نفس کی یہ تقسیم مشائی اور فلاطونی نظریات کے امتزاج سے عمل میں آئی ہے۔ مگر آخر کے دونوں نفوس کا اضافہ اخوان کا اپنا ہے اور یہ ان کے اس نظریہ سے ماخوذ ہے کہ انسان عالم اصغر ہے۔ اس لیے اس میں عالم (انسان اکبر) کی ساری قوتیں چھوٹے پیمانہ پر موجود ہوتی ہیں[6]۔ ان نفوس میں درجہ بندی ہے، جس کے اعتبار سے عقل عام کو جسمانی قوتوں پر فوقیت حاصل ہے اور فلسفیانہ عقل کو عقل عامہ پر اور سب کے اوپر ناموس کی حکمرانی ہے۔ نفس کی ہر قوت اس وقت تک صحیح کام کرتی رہتی ہے، جب تک کہ وہ اوپر کی قوت کی اطاعت کرتی ہے۔ بظاہر اس سکیم سے اشاعرہ کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ خیر و شر شرعی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اخوان الصفاء کا خیال تھا کہ اگرچہ ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ خیر و شر میں تمیز کر سکے لیکن چند لوگ ایسے ضرور

---

[1] DE BOER, HISTORY OF PHILOSOPHY IN ISLAM, ENG. TR. P. 123.

[2] احمد امین، ظہر الاسلام (۲: ۱۵۱)

[3] رسائل اخوان الصفا: (۱: ۳۹-۴۰) بمبئی ۱۹۰۵ء

[4] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۱۴۴، بیروت ۱۹۵۳ء

[5] رسائل ۴۸-۴۹ بمبئی

[6] ایضاً: ص ۲، رسالہ (۱۲: ۳) : رسالہ ۳

ہوتے ہیں، جنھیں خیر و شر اور فرائض و واجبات کا صحیح ادراک ہوتا ہے[1]

خیر اعلیٰ یا سعادت حقیقی فضیلت سے عبارت ہے اور فضیلت قویٰ نفس کے صحیح تعامل کے مرادف ہے، جس کے لیے اعتدال اور توسط لازمی شرط ہے۔ سعادت درحقیقت اللہ کا کرم ہے اور اس کے فیضان نور کا مرہون منت ہے، جو نو فلاطونی حقایق ابدیہ، عقل کل اور نفس عالم کے ذریعہ سے انسان تک پہنچتا ہے[2] افراد کے نفوس نفس عالم کے اجزاء ہیں اور نفس عالم کی طرح مادی جسم میں رہتے ہیں، جو حقیقت میں شر ہے۔ رُوح جب جسم میں داخل ہوتی ہے، تو سکون وچین کو خیر باد کہہ دیتی ہے[3] مگر جسم میں نفس کے داخل ہونے کی غایت یہ ہے کہ نفس اس مسکن میں رہ کر سعادت ابدی کی تیاری کرے۔ جسم نفس کی تربیت گاہ ہے۔ جس طرح کہ مادی عالم نفس عالم کا مکتب ہے[4] نفس کو جسم میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وُہ اپنی کوشش سے اپنی پنہاں قوتوں کو عمل میں لائے اور علم وفن، خلق و فضیلت کی جو صلاحیتیں اس میں بالقوہ موجود ہیں، انہیں بالفعل کرے[5] نفس کی تکمیل اخلاقی فضائل اور صحیح عقاید کی تحصیل حق و صداقت کے علم اور حکومت اور ریاست کے فہم سے ہوتی ہے[6]

اخوان الصفا نے جس مثالی انسان کا تصور پیش کیا ہے، وُہ ان کے الفاظ میں اپنی نسبت میں ایرانی، دین میں عربی، مذہب میں حنفی، آداب و اطوار میں عراقی، ذکاوت میں عبرانی، رہایش میں عیسائی، زہد میں شامی، علم میں یونانی، بصیرت میں ہندوستانی، سیرت میں صوفی، اخلاق میں فرشتہ اور فکر وخیال میں ربانی ہے[7] وہ سقراط کے علم، مسیح کے زہد وتصوف اور مسلمانوں کی دینی عقیدت کا جامع ہے[8] مگر دین سے عقیدت کا مفہوم اخوان کے نزدیک یہ نہیں ہے کہ اس کے قوانین و شرائع کی پابندی کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کے مغز و جوہر کو حاصل کیا جائے، جو ان کے خیال میں مخلصانہ دوستی، اخلاق حسنہ، تحصیل علوم، تزکیۂ نفس اور حقایق روحانیہ کے عرفان سے عبارت ہے[9] عبادت کے طریقے اور مراسم مقصود بالذات نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ظواہر باطنی حقایق کے اشارات ہیں۔ آخرت کی نجات کا انحصار عبادت اور کسبِ فضائل پر نہیں ہے بلکہ علم و صداقت کے حصول پر ہے[10] اخوان الصفا اپنے قریبی کارکنوں کو جس ضابطے کی پابندی کا حکم دیتے ہیں۔ اس میں دینی فرائض کا کوئی مقام نہیں ہے، انھیں فی الحقیقت مذہب سے یک گونہ نفرت ہے۔ مذہب پر فلسفہ کو ترجیح دینا ان کا طے شدہ مسلک ہے[11] المقدسی کا قول ہے: "شریعت بیماروں کے لیے دوا ہے اور فلسفہ صحت مندوں کے لیے قوت ہے۔"[12]

---

[1] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۱۳۷

[2] ایضاً: ص ۱۳۹

[3] رسائل (۲: ۳۴۲)

[4] ایضاً: (۲: ۳۴۳)

[5] ایضاً ۲: ۳۴۶

[6] ایضاً ۲: ۳۴۶

[7] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۳۷

[8] رسائل ۲: ۳۱۵

[9] عمر فروخ: اخوان الصفاء، ص ۲۰

[10] ایضاً ۲۰

[11] ایضاً ۲۷

[12] احمد امین: ظہر الاسلام ۲: ۱۵۵

انسان کی اعلیٰ ترین زندگی وُہ ہے، جو ہر طرح کے مادی علایق سے پاک ہو۔ مگر دوسری دنیا سے پہلے اس پاک زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ موت کے بعد فلسفی کی زندگی کامل ہوتی ہے۔ اس زندگی میں فلسفی کو پاک روحوں کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس عالمِ روحانی میں وُہ خدا اور عقل کے تفکر میں غرق ہو جاتا ہے اور سعادتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوتا ہے[1]۔ اخوان حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے بارے میں معروف عقیدہ کو جہالت قرار دیتے ہیں[2]۔

اخوان کے سامنے ایک روحانی معاشرہ کی تشکیل کا نصب العین تھا، جسے وہ اخلاص و محبت اور کامل تعاون و ہمدردی کے اصولوں پر قایم کرنا چاہتے تھے۔ وہ اس معاشرے کے ضوابط کو عام نہیں کرتے تھے۔ ان کا علم صرف قریبی کارکنوں کو ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ہم مخلصانہ اخوت کے تصور پر اتفاق کر چکے تو ہمیں اپنی ساری قوتوں اور صلاحیتوں کو اپنے نصب العین کے لیے لگا دینا چاہیے اور متحد اور یک جان ہو کر اپنے مثالی روحانی معاشرہ کی تشکیل کرنی چاہیے[3]۔

تصوّف کا اخلاقی آیڈیل

چوتھی صدی ہجری میں تصوّف اپنی تاریخ کے تیسرے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ تیسرا مرحلہ تنظیم و تعمیر افکار کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ تیسری صدی میں تصوّف نے ایسے بلند افراد جنم دیے، جو جدتِ فکر اور قوتِ عمل میں ممتاز تھے۔ انھیں کے افکار و اعمال پر تصوّف کی بنیاد قایم ہے۔ مگر ان اکابر نے تصوّف کو منظم نہیں کیا۔ ان کے افکار کی تنظیم، ان کے نظریات کی تفصیل، ان کے اشارات کی توضیح اور ان کے اقوال کو اسلامی مآخذ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش چوتھی صدی کے افراد نے انجام دی۔ اس اہم کام کے علاوہ چوتھی صدی کے صوفیہ نے اپنے شیوخ کی تعلیمات کو جمع کیا اور ان کے حالاتِ زندگی قلمبند کیے۔

۳۰۹ھ میں منصور بن حلاّج کو دار پر چڑھایا گیا۔ اس واقعے کے بعد تصوف کو قرآن و سنّت سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی تعلیمات اور اسلامی عقاید میں توافق پیدا کرنے کی ضرورت شدید تر ہو گئی۔ صوفیہ نے یہ ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھیں کہ وہ اصول دین میں عام متکلمین اسلام کے نظریات سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے۔ مثلاً یہ کہ معتزلہ کے اس نظریہ کی انہوں نے اشاعرہ کی طرح تردید کی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بندوں کے بہتر سے بہتر مصالح پیشِ نظر رکھنا لازم ہے[4]۔ اشاعرہ ہی کی طرح انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کے افعال کو ہر علت و غایت سے بلند رکھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے افعال لازماً انسانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے ہوں، بلکہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ وُہ چاہے تو نیکوں کو سزا اور بُروں کو انعام دے سکتا ہے۔ اس کے افعال میں مقصد اور علت کی تلاش ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں صوفیہ نے اشاعرہ کی طرح قرآن مجید کی یہ آیات پیش کیں[5]:

ولقد ذرأنا لجہنم کثیرا من الجن   اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں، جنھیں ہم نے

---

[1] رسائل ۲: ۳۳۹-۳۴۰   [2] ایضاً ۳: رسالہ ۷، ۲: رسالہ ۱۶

[3] کمال الیازجی وانطون غطاس کرم: اعلام الفلسفۃ العربیہ، ص ۴۸۳

[4] کلاباذی: کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف، ص ۳۵ انگریزی ترجمہ اے۔ جے۔ آربری، کیمبرج، ۱۹۳۵ء

[5] ایضاً: ص ۳۵-۳۶

والانس - (۷: ۱۷۹) — جہنم کے لیے پیدا کیا۔

لاملئن جہنم من الجنۃ والناس اجمعین - (۱۱: ۱۱۹) — یعنی جہنم کو کیا جن اور کیا انسان سب سے بھر دوں گا۔

کلاباذیؒ[1] (م ۳۸۰ھ) ان باتوں میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھتے جسے ظلم کہا جائے۔ کیونکہ جور کسی ایسے فعل کے ارتکاب سے عبارت ہے جس کی ممانعت کی گئی ہو اور ظلم کے معنی اس راہ راست سے انحراف کے ہیں، جسے اس ہستی نے تجویز کیا ہو، جو سب کے اوپر حکمران ہے اور سب جس کے محکوم ہیں۔ خدا نہ کسی ہستی کے زیر اثر ہے اور نہ کسی کا محکوم۔ اس لیے وُہ جو کچھ بھی کرے، اس کے لیے ظلم کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وُہ جو فیصلہ کرتا ہے، وہی صحیح ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی حسن ہے۔ بری وُہ شے ہے جسے اس نے برا بنایا اور بھلی وُہ ہے جسے اس نے بھلا بنایا[2]۔

حسن و قبح کا یہ صوفیانہ نظریہ مقبول عام کلامی نظریہ کے مطابق تھا۔ مگر کلاباذی نے حسن و قبح کی ایک اور تعریف نقل کی ہے، جو مذکورہ بالا عبارت کے فوراً بعد پیش کی گئی ہے اس تعریف سے صوفیہ کے اصل طرزِ فکر اور رجحان کا پتا چلتا ہے۔ مشہور صوفی محمد بن موسیٰ کے الفاظ ہیں:

"جو چیزیں حسن ہوتی ہیں وہ خدا کی تجلی کے اظہار سے حسن ہوتی ہیں اور جو چیزیں قبیح ہوتی ہیں، وہ خدا کی تجلی کے اخفا سے قبیح ہوتی ہیں یہ دونوں صفات ازلی اور ابدی ہیں۔"

کلاباذی اس عبارت کی تشریح کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز تمہیں خدا سے دور اور اشیاء سے قریب کرے وہ قبیح ہے اور حسن و قبح کی یہ صفت اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں تخلیق کر دی تھی[3]۔ خدا سے قلبی تعلق اور اس کے اندر محویت اور فنائیت وہ آئیڈیل ہے جسے صوفیہ نے اپنے سامنے رکھا اور اسے خیر اعلیٰ اور سعادت سمجھا اور یہی ان کے لیے ہر چیز کی بھلائی اور بُرائی جانچنے کا معیار قرار پایا۔

اس دور کے صوفیہ نے جن کا مطالعہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اپنے آئیڈیل کی باقاعدہ تشریح نہیں کی۔ ان کے آئیڈیل کے اہم نکات ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں اور فلاسفہ کے آئیڈیل سے اس کا مقابلہ بھی کیا جاتا ہے۔

صوفیہ کے خیال میں انسان کی رُوح خدا کا فیضان ہے جیسا کہ کندی اور فارابی کے نوفلاطونی فلسفہ میں ہے۔ لیکن نوفلاطونی فلسفہ

۱؎ ابوبکر ابن ابی اسحاق محمد بن ابراہیم بن یعقوب کلاباذی — کلاباذ (بخارا) کے رہنے والے تھے۔ صوفیاء ان کی کتاب "التعرف لمذہب اہل التصوف" کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سہروردی مقتول (م ۱۱۹۱ء) نے اس کتاب کے بارے میں کہا ہے: اگر یہ نہ ہوتی تو ہم تصوف کو نہ جان سکتے۔ جن صوفیہ نے اس پر شرحیں لکھی ہیں، ان میں عبداللہ بن محمد الانصاری الہروی (م ۱۰۰۸ء) علاء الدین علی بن اسمٰعیل القناوی (م ۱۳۲۹ء) اور اسمٰعیل بن محمد بن عبداللہ المستملی جیسے افراد ہیں۔

۲؎ التعرف لمذہب اہل التصوف، انگریزی ترجمہ آربری، ص ۳۶

۳؎ ایضاً: ص ۳۶

میں خدا اور روح انسانی کے درمیان جن تنزلات کا سلسلہ ہے، صوفیہ ان کی جگہ دوسرا سلسلہ پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے خدا اور روح انسانی کا تعلق زیادہ قریبی اور گہرا ہوجاتا ہے۔ ارسطو نے عقل (NOUS) کو جو مقام دیا تھا، اس کی جگہ نوفلاطونی فلاسفہ نے وجدان کو فائز کیا، جس کے نتیجے میں عرفان کی بلند ترین صورت عقل کے بجائے وجدانی قرار پائی۔ مسلم فلسفیوں میں کہیں عقل کو بلند کیا گیا ہے اور کہیں وجدان کو۔ متکلمین اسلام کے اس نظریہ کا حاصل کہ افعال خداوندی عقل معروف کے مطابق نہیں ہوتے، یہ تھا کہ خدا عقل کے ذریعہ جانا نہیں جا سکتا۔ ان ساری باتوں نے مل کر صوفیہ کے تصور وجدان و انکشاف کے لیے راہ ہموار کر دی۔ چنانچہ انہوں نے حتمی طور پر یہ بات رکھی کہ عقل روحانی اور الٰہی معاملات میں ناکافی بلکہ گمراہ کن ہے۔ "عقل مخلوقات کا طواف تو کر لیتی ہے، لیکن جب وہ خالق کا ارادہ کرتی ہے تو خود تحلیل ہو جاتی ہے۔"[1] کلامی نظریہ منفی تھا کیونکہ اس کا حاصل یہ تھا کہ افعال الٰہی کی کنہ و حقیقت عقل سے ماوراء ہے۔ صوفیہ اس منفی مقام پر کب ٹھہر سکتے تھے۔ انہوں نے اثبات میں یہ کہا کہ خدا کے علم و عرفان کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ عشق و وجدان کا راستہ ہے۔ صوفیہ نے عشق پر زور دیا ہے۔ اس سے دینی زندگی میں نئی جان پڑ گئی۔ اتباع شریعت میں وہ جوش و گرمی آ گئی جس کی بجد ضرورت تھی۔ یہی سوز عشق، یہی والہیت اور تفویض اور یہی سرگرمی اور بے تابی صوفی آئیڈیل کا وہ اہم عنصر ہے، جو اسے فلاسفہ کے ٹھنڈے عقلی آئیڈیل سے ممتاز کرتا ہے۔ فلاسفہ کی عقل اگرچہ ان قیدوں سے باہر نکل چکی تھی جنہیں ارسطو نے عقل پر عاید کر دی تھیں، لیکن جذب و شوق کی بلندیوں سے وہ ابھی تک نا آشنا تھی۔

صوفیہ نے خیر اعلیٰ یا سعادت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ فلاسفہ کے تصور سے بہت مختلف نہ تھا۔ پانچویں صدی میں غزالی نے اس کی جو تشریح کی، اس کے مطابق سعادت تکمیل نفس کا نام تھی۔[2] افلاطون کے نظریہ وظیفہ (FUNCTION) کو غزالی بنیاد بنا کر لکھتے ہیں کہ نفس کا کمال اس میں ہے کہ وہ معقولات کو سمجھے، حقایق روحانیہ میں تفکر کرے اور انہیں اپنے اندر ایسا جذب کرے کہ ان سے کامل ہم آہنگ ہو جائے۔[3] اس آئیڈیل کے حصول کے لیے علم و عمل دونوں ضروری ہیں۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، غزالی کہتے ہیں کہ صوفیہ اور فلاسفہ متفق ہیں کہ عمل سے مقصد نفس کو صفات خبیثہ اور عادات رذیلہ سے پاک کرنا ہے۔[4] دوسرے الفاظ میں اخلاق کی غایت تزکیہ نفس ہے۔ غزالی مزید لکھتے ہیں کہ فلاسفہ اور صوفیہ دونوں علم کو انسان کی غایت قرار دیتے ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو وہ علم کی نوعیت میں ہے۔[5]

صوفیہ کو علوم و فنون کی تحصیل سے دلچسپی نہیں ہے اور نہ ہی حقیقت کی عقلی جستجو سے کوئی تعلق۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ برائیوں کا ازالہ کیا جائے، تعلقات کم رکھے جائیں اور ساری قوت خدا کی تجلی کی انتظار میں لگا دی جائے، جس کے ظہور سے سارے حقایق روشن ہو جاتے ہیں۔[6] غزالی لکھتے ہیں، صوفیہ کے علم کا حاصل نفس کی رکاوٹوں کو دور کرنا اور مذموم اخلاق اور بری صفات سے پاک کرنا ہے "تاکہ قلب غیر اللہ سے خالی

---

[1] التعرف لمذہب اہل التصوف، انگریزی ترجمہ آربری: ۴۷

[2] الغزالی: میزان العمل ص ۱۵، الطبعۃ المصریہ، ۱۳۴۲ھ

[3] ایضاً: ۱۵، ۳۲، ۳۳ "فقد عرفت ان سعادۃ النفس وکمالہا ان تنتقش بحقایق الامور الالٰہیۃ وتتحد بہا کانہا ھی"

[4] ایضاً: ۳۴، ۳۰-۳۲ "اعلم ان جانب العمل متفق علیہ وانہ مقصود لمحو صفات الردیہ وتطہیر النفوس من الاخلاق السیئۃ ولکن جانب العلم مختلف فیہ" [5] ایضاً: ۳۴ [6] ایضاً: ۳۴

ہوجائے اور اللہ کے ذکر سے لبریز ہو جائے۔[1]

صوفیہ اپنے قلب کو آئینے کی طرح پاک اور روشن بنا کر حقائق روحانیہ کے انکشاف کے لیے ہمہ تن شوق و انتظار بنے رہتے ہیں جب خدا کا نور ظاہر ہوتا ہے، تو ان کے قلب کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور حقایق و اسرار بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ فلاسفہ کی عملی کاوش اور ادبی سرگرمی کے بجائے صوفیہ ترک دنیا، زہد و ورع اور ذکر الٰہی پر زور دیتے ہیں۔

اگرچہ عمل اور فضیلت کی غایت کے بارے میں صوفیہ اور فلاسفہ میں اتفاق تھا لیکن عمل کی تفصیلات میں ان دونوں گروہوں میں خاصا اختلاف تھا۔ فلاسفہ اجتماعی عمل میں یقین رکھتے تھے زندگی سے کنارہ کشی اور گوشہ گیری کا ان کے یہاں کوئی تصوّر نہیں تھا۔ ان کے خیال میں فضیلت کی تکمیل فرد کے تزکیہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خاندان اور معاشرہ کی اصلاح و تعمیر بھی فضیلت کا لازمی جز تھی۔ فلاسفہ سعادت کو اجتماعی فعل قرار دیتے تھے، جس میں سب کا تعاون ضروری تھا۔ صوفیہ اس کے برعکس انفرادیت اور گوشہ نشینی کے علمبردار تھے۔ معاشرے کے مسائل میں دلچسپی اور اس کی اصلاح کی کوشش سے دُور رہتے تھے۔ ان کا خیر اعلیٰ انفرادی تھا اور اجتماعی زندگی سے علیحدگی کو وہ اپنے خیر اعلیٰ کے حصول کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔

فلاسفہ عقلی محاسن کو اخلاقی فضائل پر ترجیح دیتے تھے۔ صوفیہ کے نزدیک عقلی محاسن کی کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ انھیں علمی اور فلسفیانہ کاوشوں سے یک گونہ نفرت تھی۔ فلاسفہ کے نظام فضائل کی جگہ صوفیہ ایک دوسرا نظام فضائل رکھتے تھے، جن میں سے بیشتر اسلامی عقاید سے ماخوذ تھے۔ مثلاً اخلاص، یقین، خوف و رجا، توکل اور محبت وغیرہ[2] یہ فضائل جن کی صوفیہ کے یہاں بڑی اہمیت تھی، فلاسفہ کے فکر و تخیل سے نہ صرف دُور تھے بلکہ ان سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

تصوّف نے بہت سے عام اخلاقی فضائل کو نئی شکل دی۔ صوفی کی داخلی زندگی فلسفی کی داخلی زندگی سے بہت مختلف ہوتی تھی۔ صوفی کے نفسیاتی ماحول میں سب سے زیادہ موثر اور ہمہ وقت موجود ذات خدا کی ہوتی تھی۔ خدا کے حضور میں حاضر ہونے کا گہرا شعور اس کے سوچنے کے طریقوں، اس کی دلچسپیوں، اس کے نظام فضائل اور اس کے پسند و اختیار کے معیار کو بیحد متاثر کرتا تھا۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ حیا کی تعریف کرتے ہیں: حیا وہ جذبہ ہے جو دو احساسات سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ احساس کہ انسان پر خدا کے بے شمار احسانات ہیں اور دوسری طرف یہ احساس کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی سے قاصر ہے۔[3]

---

[1] المنقذ من الضلال ص ۲۸، المطبعۃ الامیریہ، قاہرہ، ۱۳۰۳ھ

[2] اخلاص، یقین، خوف، محبت، توکل وغیرہ کو فضائل کہا جا سکتا ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ یہ نفس کے مستقل حالات ہیں اور ان سے ایک مخصوص طرز عمل کا ظہور ہوتا ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ نفس کی یہ صفات کسبی ہوتی ہیں اور فضیلت کے لیے یہی دونوں باتیں شرط ہیں۔ عام اخلاقی فضائل سے ممتاز کرنے کے لیے انہیں دینی فضائل کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا مرکز و محور خدا کی ذات ہے ان صفات کو فضائل کہنے سے صوفیہ کے اس تصوّر کی نفی یا مخالفت نہیں ہوتی کہ یہ مقامات و احوال ہیں۔

[3] القشیری: الرسالہ فی التصوف ص ۱۰۹ (مصر ۱۹۵۹ء)

فضائل کے اکتساب کے باب میں فلاسفہ اور صوفیہ کا اختلاف اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ صوفیہ کے تزکیہ نفس کی کوشش میں ذمہ داری کا گہرا احساس، رضائے الٰہی کی بے تاب جستجو، ارتکاب گناہ کا شدید خوف اور ذات الٰہی کی بے پناہ محبت وہ عناصر تھے، جو فلاسفہ کے کسب فضائل میں بالکل نہیں تھے۔ فلاسفہ کا ذات حق کا شعور بہت دھندلا ہوتا تھا اور صرف عقلی اور اک تک محدود رہتا تھا۔ وہ جذبات کو متاثر نہیں کرتا۔ فلسفی فضیلت کو بالذات مقصود قرار دیتا تھا اور خدا کے گہرے شعور کے بغیر اس کا حصول ممکن سمجھتا تھا۔ مگر صوفی کے لیے فضائل بے انتہا اہمیت کے حامل تھے۔ چونکہ وہ عقلی محاسن اور علم وفن کی تحصیل کی کوششوں سے منہ موڑ کر نفس کے تزکیہ ہی کو اپنی سعادت کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا، اس لیے فضائل اس کی زندگی میں بےحد اہمیت اختیار کر لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ لٹریچر میں فضائل اور رذائل کی جو تفصیلی بحثیں اور دقیق تجزیے ملتے ہیں، فلسفیانہ اخلاق کی کتابوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ حارث بن اسد محاسبی کی "الرعایہ لحقوق اللہ"، ابوطالب مکی کی "قوت القلوب" اور پانچویں صدی میں غزالی کی "احیاء العلوم" اس حقیقت پر شاہد ہیں۔

اگرچہ تصوف کی بنیاد قرآن وسنت پر ہے لیکن تفصیلات میں تصوف کا آئیڈیل قرآن وسنت کے آئیڈیل سے کسی قدر مختلف ہے۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ تصوف کے آئیڈیل میں اسلامی آئیڈیل کے بعض پہلو دب گئے ہیں اور بعض زیادہ ابھر آئے ہیں۔ بعض رجحانات کو تیز اور شدید اور بعض کو کمزور اور کم کر دیا گیا ہے۔ بعض تصورات نے نئے معنی اختیار کر لیے ہیں اور بعض کے مفہوم میں جزوی تبدیلی ہوگئی ہے اور بعض پہلوؤں کو تصوف نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے اور بعض نئے اجزا شامل کر لیے ہیں۔ اس مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان اشاروں کی وضاحت کی جائے، لیکن انہیں ذہن سے قریب کرنے کے لیے بعض مثالیں دی جاتی ہیں۔

ابتدائے اسلام میں عمل کا دائرہ بہت وسیع تھا مگر تصوف میں تنگ ہوگیا۔ مثال کے طور پر اجتماعی مسائل صوفی کی دلچسپی کے دائرے سے خارج ہو گئے۔ اسلام کے ابتدائی آئیڈیل میں فکر، جذبہ اور عمل کے درمیان ایک توازن تھا۔ لیکن صوفیہ نے جذبات وکیفیات پر اس قدر زور دیا کہ عمل اور بالخصوص فکر کی اہمیت کم ہوگئی۔ خدا کی محبت مذہب کی روح رہی ہے۔ لیکن ابتدائے اسلام میں محبت کو عمل سے الگ کسی جذبہ کی پرورش نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس کی حیثیت اس روح کی تھی، جو ان سارے اعمال حسنہ میں یکساں جاری وساری تھی۔ جو انسان کو زمین میں خدا کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انجام دینے تھے۔ صوفیہ کے آئیڈیل میں عمل کا دائرہ نہ صرف تنگ ہوگیا، بلکہ محبت کا عمل سے تعلق بھی کمزور ہوگیا۔ چنانچہ جذبہ محبت کی تحریک اور تقویت کے لیے صوفیہ نے مختلف طریقے (مثلاً سماع) اختیار کیے، جن سے وہ اعمال سرزد نہیں ہوتے تھے، جن کے ساتھ ابتدائے اسلام میں محبت کا جذبہ وابستہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت کے رجحان کو روکا اور کم کیا لیکن تصوف نے اس رجحان کو تقویت دی۔ اکابر صوفیہ میں جسم کی لذتوں اور اجتماعی تعلقات کے بارے میں ایک شدید منفی رجحان پایا جاتا ہے، جو ابتدا میں نہیں تھا۔ قرآن وسنت میں ذکر الٰہی کو تزکیہ نفس میں ایک خاص مقام حاصل تھا مگر ذکر الٰہی کے ساتھ دوسرے طریقے اور ذرائع بھی تھے۔ مثال کے طور پر جہاد[1]۔ مگر صوفیہ نے

---

[1] تزکیہ نفس اور صبر وتوکل، تسلیم ورضا جیسے عظیم فضائل کے اکتساب اور دنیا کی محبت کم کرنے کے سلسلے میں جہاد کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ ظاہر ہے۔ قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جہاد کے اس وظیفے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ۳: ۱۴۰-۱۴۱ اور ۳۳: ۲۲ وغیرہ۔

ساری قوت ذکر الٰہی میں صرف کر دی اور اسی کو تزکیہ کا واحد موثر ذریعہ قرار دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ذکر کے آداب اور طریقوں میں نئی نئی اختراعات ہوئیں۔

صوفیانہ تصور مجاہدہ نفس کی خواہشات کے خلاف جنگ سے عبارت تھا۔ خدا کے دشمنوں کے خلاف جنگ سے اس مجاہدہ کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ جنگوں میں استقامت اور پامردی کا وہ عنصر جو قرآن کے تصور صبر میں نمایاں ہے، صوفیہ کے صبر میں تقریباً ناپید ہے۔ یہی حال توکل اور دوسرے دینی فضائل کا ہے۔

زندگی کے آئیڈیل میں یہ تبدیلی جو تصوف نے پیدا کی، اس کا جواز کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا تعلق اس جائزہ سے نہیں ہے جو ہمارے پیش نظر ہے مگر یہ مسئلہ جس قدر اہم ہے، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔ حلاج کی سُولی کے بعد اس مسئلہ کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ صوفیہ نے اس سلسلہ میں جو کوشش کی اور اپنے موقف کی وضاحت اور مدافعت میں جو کارنامے انجام دیے ان کی اسلامی فکر کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ ہم اس کوشش کے ایک پہلو کی طرف نشان دہی کرنا چاہتے ہیں، جو مذکورہ بالا مشاہدات کی تائید کرتا ہے۔

صوفیہ نے اپنے عمل کے جواز میں انتخاب و اختیار کا طریقہ اپنایا۔ مثلاً، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب میں ان بزرگوں کو انہوں نے اپنا آئیڈیل بنایا، جو ان کی زندگی سے زیادہ قریب تھے، جیسے اصحاب صُفّہ اور دُوسرے اصحاب کی زندگی کے ان گوشوں کو نمایاں کیا اور پیش نظر رکھا، جو ان کے رجحانات کی تائید کرتے تھے۔ حضرت جنید سے پُوچھا گیا کہ تصوف کیا ہے؟ فرمایا، تصوف کی بنیاد آٹھ چیزوں پر ہے، جو آٹھ پیغمبروں کی زندگی میں نمایاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی سخاوت، حضرت اسمٰعیلؑ کی رضا و تسلیم، حضرت یعقوبؑ کا صبر، حضرت زکریاؑ کی اشارت، حضرت یحییٰؑ کی اجنبیت، حضرت عیسیٰؑ کی مسافرت، حضرت موسیٰؑ کی صوف پوشی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر۔

کلاباذی صوفیہ کا پیشوا اور امام اصحاب صفہ کو قرار دیتے ہیں اور علی ہجویری بھی "کشف المحجوب" میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ خلفاء اربعہ کی زندگی کے اس پہلو کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جو ان کے زہد، ایثار، سخاوت اور ریاضت سے متعلق ہے لیکن ان اکابر کے ان مجاہدانہ کارناموں کو بھول جاتے ہیں، جو انھوں نے معاشرہ کی تعمیر، ریاست کی تشکیل، حدود الٰہی کے نفاذ اور دشمنان خدا کے خلاف جنگ وغیرہ معاملات میں انجام دیئے۔

۱؎ قرآن مجید کے تصور صبر کے ان عناصر کے لیے ملاحظہ ہو: ۸ : ۴۶، ۶۶؛ ۱۳ : ۲۴؛ ۲۴ : ۱۴؛ ۱۲ : ۱۶؛ ۲۲ : ۴۲؛ ۱۱۰ : ۱۲۶؛ ۴۷ : ۳۱؛ ۳۰ : ۶۰؛ ۳۱ : ۱۷ وغیرہ۔

۲؎ خطرات اور آزمائشوں اور خوفناک جنگوں میں توکل کرنے کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں ذکر ہے مثلاً ۸ : ۲، ۴۹، ۶۱-۶۳؛ ۹ : ۵۱؛ ۱۰ : ۸۳-۸۶، ۷۱؛ ۱۱ : ۵۴-۵۶، ۸۸؛ ۱۲ : ۱۴؛ ۱۶ : ۴۲؛ ۱۷ : ۱۳-۱۶؛ ۲۲ : ۱۱، ۱۵-۱۶ وغیرہ۔

۳؎ علی ہجویری: کشف المحجوب ص ۳۹-۴۰، انگریزی ترجمہ لندن ۱۹۳۶ء

۴؎ کلاباذی: کتاب التعرف، انگریزی ترجمہ، ص ۲

۵؎ کشف المحجوب ص ۷۰-۷۴، انگریزی ترجمہ

اسلام میں اخلاقی فکر کی ابتدا

پروفیسر عمر الدین

اسلام کی عمارت اخلاقی اصولوں پر قایم ہے اور اخلاقی روح اسلامی نظام حیات کے ہر شعبہ میں جاری وساری ہے۔ اسلامی فقہ زندگی کے ہر پہلو پر حاوی اور اخلاقی قدروں کی حامل ہے۔ اسلام حقیقت میں ایک اخلاقی دین ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن وسنت نے اخلاقی فلسفہ بھی دیا ہے۔ اخلاقی بصیرت اور عملی اخلاق اور شے ہے اور اخلاقی فلسفہ سے دیگر اسلامی تاریخ میں اخلاقی فکر کی ابتدا شروع کی چند صدیوں کے گزر جانے پر ہوتی ہے اور ایک ساتھ سارے ہی بنیادی اور اہم مسائلِ اخلاقیات زیر بحث نہیں آتے بلکہ آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن پر مفکرین اور فلاسفہ اسلام نے غور و فکر کیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک اسلامی اخلاقیات کے تینوں مکاتب 'کلامی' فلسفیانہ اور صوفیانہ اخلاق کے بنیادی تصورات مرتب ہو چکے تھے۔ بعد کے آنے والوں نے ان بنیادوں پر اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کی ہیں۔ ذیل میں اسلامی اخلاقیات کا جو جائزہ پیش کیا جا رہا ہے وہ انھیں ابتدائی صدیوں تک محدود ہے۔

اخلاق قبل اسلام

اسلامی اخلاقیات کی ابتدا دوسرے علوم اسلامیہ کی طرح قرآن وسنت سے ہوتی ہے۔ اہلِ عرب، جن میں قرآن مجید اوّل اوّل نازل ہوا تھا، تہذیب وتمدن کے ابتدائی مراحل میں تھے جن کے اخلاقی فضائل و مکارم کا تذکرہ یا تو ان کے اشعار میں ملتا ہے، یا ان کے حکما کے مختصر اور جامع کلمات ہیں۔ ان فضائل کے تحفظ و اشاعت اور ان مکارم کی تعلیم و ترویج کا کام یا تو شاعر و خطیب انجام دیتے یا سردارِ قبیلہ اور بزرگِ خاندان۔ اور یہ کام عرب معاشرہ میں کچھ اس طرح ہو رہا تھا کہ ہر نو وارد فرد ان قدروں کا انتہائی معتقد، عاشق اور علمبردار بن جاتا۔ کسی کو ان پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی اور نہ اس کے لیے فضا ہی سازگار تھی۔ قبائلی عصبیت کی عظیم قوت ہر خیر و شر اور ہر صحیح و غلط کی یکساں حمایت کرتی تھی۔ ایک سادہ اور تمدن کے بُرے اثرات سے محفوظ قوم اپنے اخلاقی اقدار پر عمل کرنا جانتی تھی۔ ان کی بنیادوں پر سوچنا، ان کے لوازمات اور مضمرات پر غور کرنا اور اپنے پیمانوں کی صحت اور عدم صحت پر تدبر کرنا اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا۔

قرآن مجید کا اخلاق

یوں تو قرآن مجید کے نزول سے کچھ پہلے ان قدروں کی طرف سے چند سنجیدہ افراد میں ایک بے اطمینانی پیدا

ہو رہی تھی۔ لیکن ان کا کوئی اثر معاشرہ پر مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ قرآن مجید نے پہلی بار اس پرسکوں سمندر میں تموّج پیدا کیا۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کا جائزہ لیا اور ایک نئے فکر کی روشنی میں ان پر تنقید کی۔ عرب کے مجموعہ اخلاق میں جو بات درست تھی اس کی تائید اور تاکید کی اور جو غلط نظر آئی اس کی تردید فرمائی اور اس سے احتراز کو لازم قرار دیا اور جن باتوں کی کمی تھی، ان کا اضافہ کیا اور انھیں واجب ٹھہرایا۔ پروفیسر مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ قرآن مجید نے مسلمانوں میں دو خوبیوں کو پروان چڑھایا ہے: ایک شجاعت اور دوسرے نظم ا ڈسپلن۔ اسی طرح میئرز (MAYERS) نے اسلامی اخلاق کو فوجی اخلاق قرار دیا ہے مگر ان باتوں میں صداقت کا صرف ایک جُز ہے۔ ان حضرات نے حقیقت کے ایک ہی پہلو کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس تصور کے بالکل برعکس گرونوبایم (GRUNEBAUM) نے اسلام کے انسانی آئیڈیل اور اس کے اخلاقی مکارم و فضائل کو شہری (CIVILIAN) تسلیم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اخلاقی نظام پر گہرے، وسیع اور دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اخلاق کو قبائلی پابندیوں سے آزاد کر کے صحیح معنٰی میں عالمی اور آفاقی بنایا اور یہ کام خیال و تصور کی دنیا میں نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں انجام پایا۔ عرب کی اخلاقی قدروں کے پیچھے یا معاشرتی تحسین و تقبیح کی قوت کارفرما تھی یا ضمیر کی آواز۔ اسلام نے ان قوتوں سے بلند تر ایک نئے احساس ذمہ داری، ایک جاندار خوفِ آخرت اور ایک قومی جذبۂ محبتِ الٰہی کو اُبھارا۔ اس نے اخلاقی زندگی کو تعلق باللہ کے ساتھ ایسا وابستہ کیا کہ ساری زندگی عبادت بن گئی۔ اخلاق و مذہب ایک دُوسرے کے معاون اور شریک ہو گئے۔ توحید اور آخرت کے تصور نے نگاہ کو خوردبینی کی وہ صلاحیت بخشی، جو نفس کی تاویلات کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی۔ اسلام نے اخلاق کو پُوری زندگی پر وسیع کر دیا۔ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ رہا، خواہ وُہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ملکی ہو یا بین الاقوامی جس میں اس کی اخلاقی اسپرٹ یکساں طور پر جاری و ساری نہ ہو گئی ہو۔ قرآن مجید اور بالخصوص سنّت نے احسان کے مدارج کو ایسا بلند کیا اور مکارم و فضائل کی سطح کو اتنا اونچا اٹھایا جو علم انسانی اخلاق کے تصور میں بھی بمشکل آ سکتا۔ خیر و شر کا ایک ایسا متوازن تصور پیش کیا، جس میں احساس، ہر جذبہ اور ہر خواہش کی یکساں رعایت تھی۔ لذّت و مسرّت کے ساتھ فضائل و مکارم کی فی نفسہ مطلوبیت اور توقیر و احترام کا شدید احساس بھی اس میں داخل تھا اور جذبہ کمال کی تسکین کے ساتھ فرض و ذمہ داری کا گہرا شعور بھی شامل تھا۔ اس میں آخرت کی سعادت کے ساتھ دنیا کی کامیابی اور تعمیر بھی مضمر تھی۔

قرآن مجید نے جو اخلاقی نظام دیا ہے، اس کی مکمل تشریح تو یہاں ممکن نہیں، البتہ اس کے اخلاقی اصولوں میں سے چند مثال کے لیے بیان کیے جاتے ہیں:

——— والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آؤ اور اعزّہ و اقارب، یتیم و محتاج، پڑوسی اور رفیقِ سفر، مسافر اور غلام کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

——— اہلِ ایمان کی صفت یہ ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔

—— اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ اعزہ اور اقارب پر خرچ کرنے کی تاکید فرماتا ہے اور فحش، منکر اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔

—— جو لوگ خوشحالی اور تنگی دونوں میں انفاق کرتے ہیں، غصّہ کو ضبط کرتے ہیں، عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔

—— ایمان لانے والوں کو حکم دو کہ وُہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور عفت اختیار کریں۔

—— کسی قوم سے عناد تمھیں عدل کی راہ سے نہ بھٹکا دے۔

—— قسط و عدل پر قایم رہو۔

—— سارے مسلمان بھائی ہیں، اس لیے ان میں صلح و آشتی پیدا کرو اور اگر کوئی دو گروہ آپس میں جھگڑا کرلیں تو ان میں صلح کرادو۔

—— تم میں سے خدا کی نگاہ میں افضل وُہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

پورا قرآن مجید ایسی ہی بلند اخلاقی تعلیمات سے پُر ہے۔

سنّت کا اخلاق

قرآن مجید نے اخلاق کے جو تصورات دیے ان کی تفصیل حدیث نے پیش کی۔ سنّت نے قرآن مجید کے اشاروں کی وضاحت، اس کے کلیات کی تصریح، اس کے اصولوں کا عملی انطباق اور اس کے احکامات کی تشریح کی خدمت انجام دی۔ محمد رسول اللہ (اللہ کی رحمت ہو اس مبارک ذات پر) کی ذات ان تصورات کی واضح مثال اور ان مکارم و فضائل کی زندہ مجسمہ تھی۔ جس نے آپ کی صحبت سے فیض اٹھایا وہ انھیں اقدار کے رنگ میں رنگ گیا۔ مزدور اور کسان سے لے کر پولیس اور فوج، قاضی اور امیر سبھی ان فضائل کے علمبردار بن گئے۔

اس انسان عظیم کی زندگی کی ایک اچھی تصویر امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں کھینچی ہے۔ یہ وہ آئیڈیل ہے جس کی قرآن مجید نے ان الفاظ میں تصدیق کی ہے:

"بیشک تم عظیم اخلاق کے مالک ہو"

خدا کے رسولؐ گہرے احساس بندگی اور بڑے ہی عجز و انکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عظیم دربار میں مکارم و فضائل کی دعا کیا کرتے تھے۔ وُہ بڑے ہی نرم دل، خاشع اور متواضع تھے۔ اس کے باوجود شیر کی طرح دلیر اور بلند حوصلہ تھے۔ فرمایا کرتے کہ:

"میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں"

اور آپؐ کی پوری زندگی اس دعوے کی تصدیق تھی۔ خود انتہائی خدا ترس اور انصاف پسند تھے اور اپنے پیروؤں کو خوفِ خدا،

بنی نوع انسان کی خیر خواہی، ہمدردی و محبت، صدق و امانت، ایفائے عہد و تکمیل پیمان کی تلقین کرتے اور آخرت سے ڈراتے، اعمال کے احتساب پر ابھارتے، ذمہ داری کے احساس کو بیدار کرتے، پڑوسیوں کے حق کی ادائیگی، یتیموں سے محبت، کمزوروں کی امداد، مظلوموں کی دادرسی، فقیروں کے اطعام پر ترغیب اور خوشی اور غم، رضا اور ناراضی میں انصاف پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کرتے۔ اسلام کی تعلیمات کو دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی ہدایت فرماتے اور خود ہر کام میں اپنی مثال پہلے پیش کرتے۔

آپ کی زندگی سادہ تھی۔ بڑے قانع اور غنی القلب تھے۔ غذا معمولی ہوتی، جَو کی روٹی، کدو کا سالن یا چھوہارے مگر اچھے کھانوں سے پرہیز نہ تھا۔ کسی چیز کو جسے کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہو، اسے ترک نہ کرتے اور نہ حرام ٹھہراتے۔ ٹھنڈے پانی کو اللہ کی نعمت سمجھتے۔ عطر و خوشبو کا بھی اکثر استعمال کرتے۔ اپنے جوتے اپنے ہاتھوں گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں پیوند خود لگاتے۔

ہر شخص سے مساوات کا سلوک کرتے، کسی کو حقارت سے نہ دیکھتے۔ آزاد ہو یا غلام ہر ایک سے یکساں محبت سے پیش آتے، سلام کرتے، تحفہ دیتے اور ربط پیدا کرنے میں دوسروں سے سبقت کرتے۔ ہر امیر و غریب کی دعوت یکساں قبول کرتے۔ ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ تکبّر اور خود بینی کا آپ کی سیرت میں شائبہ تک نہ تھا۔ لوگوں کی زیادتیاں انگیز کرتے۔ مگر کسی سے ذاتی معاملہ میں کبھی انتقام نہ لیتے۔ انتہائی عالی ظرف تھے۔ ظلم کا بدلہ عفو سے اور زیادتی کی جزا احسان سے دیتے۔ پس ماندوں کی امداد کرتے، بیواؤں کی خدمت کرتے اور ضرورت کا سامان بازار سے لا دیتے۔ مہمانوں کی ضیافت اور مریضوں کی عیادت کرتے اور ہر شخص کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ انسان کی خیر خواہی کو دین قرار دیتے۔ فرمایا کہ:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک سچا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

یہ اصول اسلامی اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے۔

خدا کی نصرت میں کامل یقین رکھتے، ہر آزمائش میں صابر اور ثابت قدم رہتے۔ اپنے اصولوں کی صداقت پر ایسا اذعان تھا کہ کسی بھی سمجھوتے کے لیے تیار نہ ہوئے اگرچہ بارہا اس کی نوبت آئی۔ باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ظلم کے مقابلہ میں کبھی ہمت نہ ہاری۔ مظلوم کی حمایت اپنا فرض اور ظالم سے انصاف طلبی اپنا شعار سمجھتے۔

آپ بیک وقت ایک شفیق باپ، ایک محب خاوند، ایک بہترین معلّم، ایک بصیرت مند عربی، ایک پُر جوش داعی، ایک عظیم قائد، ایک پُر ہیبت امیر، ایک ماہر سیاستدان، ایک تجربہ کار سپہ سالار، ایک بلند حوصلہ فاتح، ایک انصاف پسند قاضی، ایک دیانت دار مفتی، ایک فصیح و بلیغ خطیب، ایک بصیر و متبصر حکیم، ایک فقیر بے نوا اور ایک شاہ پر جلال تھے غرضکہ آپ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے۔

اسلام نے جو آئیڈیل پیش کیا، یہ بیان اس کی ایک غیر مکمل تصویر ہے۔ آپؐ کی ذات بہت بلند اور بڑی مثالی تھی

اس نمونہ اور اس مثال کے علاوہ قرآن وسنّت نے دوؔ چیزیں اور دیں :
ایک اخلاق کا ایک مکمل ضابطہ جو آیات قرآنی یا احادیث نبویؐ کی شکل میں مکتوب یا غیر مکتوب تھا۔
دوسری چیز وہ اخلاقی بصیرت تھی جو رسول اللہؐ کی نگرانی اور قرآن مجید کی تیئیس سالہ تربیت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھی۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ اخلاقی ضوابط کا وہ جُزء جو غیر مکتوب تھا قلمبند ہو رہا تھا اور اخلاقی بصیرت صحابہ کے زیرِ تربیت افراد اور جماعتوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ انھیں دونوں چیزوں سے کام لے کر بعد میں جتنے مسائل مسلمانوں کو پیش آئے، ان کا حل انھوں نے تلاش کیا۔ ابتدائی دوؔ صدیوں کے فقہا نے انھیں دونوں چیزوں کی مدد سے اسلامی معاشرہ اور افراد کے لیے زندگی کے مختلف مسائل میں بروقت رہنمائی کی۔

قرآن وسنّت نے ایک ضابطۂ اخلاق دیا، لیکن کوئی فلسفۂ اخلاق نہیں دیا، مگر فلسفہ اخلاق کی بنیادیں قرآن وسنّت میں ملتی ہیں۔ ان بنیادوں پر اخلاق کی تعمیر کا کام زمانہ کی ضروریات کے تحت ہوتا رہا لیکن موجودہ دور میں چند صدیوں سے ان بنیادوں اور اصولوں کو دورِ حاضر کی اصطلاحات اور تصوّرات کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کا کام نہیں ہوا ہے۔

اخلاقی فکر کا پس منظر

صحابہ کے دور میں جب اسلام عرب سے نکل کر ایران، عراق، شام اور مصر میں پہنچا تو مختلف اسباب نے اخلاقی فکر کو حرکت دی۔ جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہو رہے تھے، وہ ان اخلاقی سوالات کا اسلام میں جواب تلاش کرنا چاہتے تھے، جنھوں نے صدیوں ان کے اور ان کے آبا کے ذہنوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ پھر اپنے دین میں خلوص اور اپنے عقاید میں یقین پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ یہ نئے افراد دین کو اور اس کے اخلاقی ضوابط اور ہدایات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو مذاہب اسلامی آبادی میں مامون تھے وہ اپنا تشخص برقرار رکھنے کے لیے مدافعتی جد وجہد کر رہے تھے اور اس کوشش میں اسلام کی اخلاقی ہدایات کے بارے میں سوالات اور شبہات پیدا کر رہے تھے۔ بنی امیّہ کے دَور کے اختتام اور عباسی دور کے شروع میں یونانی فلسفہ اور علوم کی جو اشاعت ہُوئی، اس نے اخلاقی مسائل بھی اٹھائے اور ان پر سوچنے کی تحریک بھی کی۔ مگر فوری طور پر جن حالات نے ایک اخلاقی مسئلہ پیدا کر دیا اور سارے سوچنے والے ذہنوں کو متوجہ کر لیا، وہ سیاسی تھے۔ بنی امیّہ نے اپنا اقتدار مستحکم کرنے، بغاوتوں کو سختی سے فرو کرنے اور مخالفت کا خاتمہ کرنے کے لیے جس ظلم وسفاکی کا ثبوت دیا، اس نے دلوں کو لرزا دیا اور نفرت وندامت کے جذبات بھڑکا دیے۔ بنی اُمیہ نے ان اعمال کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے اور غالباً اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لیے جبریت کا عقیدہ عام کرنا شروع کیا۔ یعنی یہ خیال پھیلانا شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شے، ہر فعل وعمل پر حاوی ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے برا ہو یا بھلا، وہ سب اسی کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان اس کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے۔ اعمال کی ذمہ داری اس پر

عائد نہیں ہوتی۔

یہ خیال جب بصرہ میں پہنچا اور لوگوں نے حضرت حسن بصریؒ سے اس کے بارے میں سوال کیا، تو انھوں نے جواب میں کہا: "ظلم و تشدد خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ منکرات و خواہش کا حکم نہیں دیتا۔ اس کی ذات ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ خطا کاری کی ذمہ داری انسان کی اپنی ذات پر ہے۔" قدرت کے اس تصور کو عام کرنے کا کام معبد الجہنی اور اس کے شاگردوں نے انجام دیا اور بنی امیہ کے عتاب کے شکار ہوئے۔

جبریت اور قدریت کے دونوں داعی اپنے خیال کی تائید کے لیے قرآن و حدیث پیش کرتے۔ اگرچہ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہ تھا، لیکن حالات نے اسے از سرِ نو زندہ کیا اور اس کو اہم بنا دیا۔ خود قرآن مجید نے مشرکین کا وہ استدلال نقل کیا ہے جو وہ اپنے شرک پر ثابت قدم رہنے اور تحلیل و تحریم کے آبائی ضابطہ کی پابندی کے لیے بطور جواز پیش کرتے، وہ کہا کرتے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ہی ٹھہراتے۔ مگر قرآن مجید نے خدا کی مشیت اور قدرت مطلقہ سے یہ استدلال صحیح قرار دیا اور جواب میں فرمایا کہ "ایسی ہی باتیں بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ تم تو محض گمان پر چلتے اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو۔" (سورہ انعام)

قدر و جبر کے دونوں ہی فریقوں کو اس مسئلہ کے حل میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، تو اسے اپنے اعمال کے ارادہ اور کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن کیا پھر اس سے قدرت خداوندی کی تحدید لازم نہیں آتی؟ اور اگر قدرت خداوندی کو محدود نہ کیا جائے اور سارے افعال، خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی طرف منسوب کر دیا جائے، تو کیا اس صورت میں انسان کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی؟ اور کیا اعمال پر آخرت کی باز پرس خلافِ عدل نہیں قرار پاتا؟ درانحالیکہ اللہ تعالیٰ کوئی کام عدل کے خلاف نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کو اس کے عدل و انصاف سے ہم آہنگ کرنے کا سوال ایک اور مسئلہ میں پیدا ہوا۔ ایک فریق نے کہا کہ اللہ تعالیٰ معصوموں کو عذاب نہیں دیتا، اس لیے کہ وہ عادل ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ یہ بات کہ بہت سے معصوم مختلف مصائب اور آلام کے شکار ہوتے ہیں، مشاہدے کی چیز ہے اور یہ آلام خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ کے تحت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ معصوموں کو بھی عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف نہیں؟ اس گروہ نے جواب دیا کہ نہیں۔ یہ ظلم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے، سراسر عدل ہوتا ہے بلکہ عدل اس کا نام ہے جو وہ کرتا ہے یا کہتا ہے۔ پہلا گروہ اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا اشاعرہ کے نام سے۔ معتزلہ جو پہلے مسئلے میں قدر کے قائل تھے، انھوں نے یہ کہا کہ عدل و انصاف تو وہ ہے جو عقل بتاتی ہے اور اللہ تعالیٰ عقل کے فیصلوں کا پابند ہے۔ اس کے افعال کو عقل کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح دو نئے سوالات پیدا ہوئے: ایک یہ کہ خیر و شر اور صحیح و غلط کو جاننے کا ذریعہ کیا ہے، عقل یا شرع؟

اس کے ساتھ یہ بات بھی متعلق تھی کہ صحیح و غلط کو پرکھنے کا معیار کیا ہے ؟ جس طرح سے یہ سوال اٹھایا گیا، اس میں ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے سے ممیّز نہیں کیا گیا۔ دُوسرا سوال یہ تھا کہ اخلاقی وجوب عقلی ہے یا شرعی ؟ یعنی یہ کہ اگر معلوم بھی ہوجائے کہ سچ بولنا (مثال کے طور پر) صحیح ہے تو یہ بات کہ سچ بولنا لازمی اور واجب ہے کہاں سے آئی ؟ کیا عقل نے واجب قرار دیا یا شرع نے ؟

کلامی اخلاقیات

اخلاقی اقدار کے علم اور وجوب کے یہ دو مسائل ایسے تھے جن پر متکلمین اسلام نے نہایت نفیس بحثیں کی ہیں خصوصیت سے وجوب کا مسئلہ تو ایسا ہے، جو اخلاقی فکر کی تاریخ میں نیا مسئلہ تھا۔ اسلام میں یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ اسلام نے اخلاق کا ایک ضابطہ دیا اور اس کو خدا کا فرمان بتایا اور اسی کی اتھارٹی کو ان ضوابط کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس کے سامنے ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اسی اتھارٹی سے پیدا ہوتا ہے، جو لوگ اخلاقی وجوب کو شرعی قرار دے رہے تھے انھیں اسی اتھارٹی اور اسی جواب دہی کا تحفظ مدّنظر تھا اور یہ بات صرف اخلاقی ضوابط تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا تعلق سارے ضابطہ تحلیل و تحریم اور پورے اسلامی قانون سے تھا اور جو گروہ اسے عقلی قرار دے رہا تھا، وہ ہر ضابطہ اور قانون کو عقل کے ماتحت کرنا چاہتا تھا اور جو بات بھی اس کے تصورِ عقلی کے مطابق صحیح نہیں اُترتی اسے وہ بغیر نتائج و عواقب کا لحاظ کیے ردّ کر دینے کے لیے تیار تھا۔ اس گروہ کی زحمت یہ تھی کہ اسے اپنی عقل کے حدود کی خبر نہ تھی۔ اس کا بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ عقل حقیقت اور صداقت کے ہر پہلو کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

پہلا سوال کہ کیا انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور کیا خدا کی قدرت مطلقہ کے تصور کے ساتھ انسان کے آزادی ارادہ و عمل کو ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے ؟ دراصل اخلاقیات کا براہِ راست سوال نہیں بلکہ اس کا تعلق اخلاقی مابعدالطبیعیات سے ہے۔ لیکن خیر و شر کے علم اور اخلاقی وجوب کے دوسرے اور تیسرے سوالات حقیقی معنی میں اخلاقیات کے مسائل ہیں۔

معتزلہ

پہلے سوال سے متعلق معتزلہ کا خیال یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے اور ان کا خالق بھی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی صُورت میں وہ خدا کے عدل و انصاف کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس تصور کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو محدود کرنے کے لیے تیار تھے، قدرتِ خداوندی ان کے نزدیک غیر محدود اور مطلق نہ تھی۔ خیر و شر کے علم کے بارے میں ان کی زیادہ سوچی اور سمجھی رائے یہ تھی کہ حسن اور قبح (جو متکلمین کی بول چال میں خیر و شر کے لیے مستعمل ہوتے ہیں) تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک مفید اور مضر کے معنی میں، دوسرے قابل اجر اور تعذیب کے

وہ حسن اور قبیح کو شرعی مانتے لیکن بقیہ دونوں معنی میں عقل کو علم کا کافی
معنی میں اور تیسرے عام اخلاقی خیر و شر کے معنی میں۔ اس بات کو وہ اس طرح
ذریعہ سمجھتے۔ اخلاقی حسن اور قبیح کا علم عقل سے ہوتا ہے اور شرع صرف اس علم کی تصدیق کرتی ہے۔ شرع کسی چیز میں حسن یا قبیح
پیش کرتے کہ حُسن اور قبیح اشیا کے ذاتی صفات ہیں اور عقل ان صفات ذاتیہ کا ادراک کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل ہی فعل حسن کے
پیدا نہیں کرتی۔ تیسرے سوال یعنی اخلاقی وجوب کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بھی عقلی ہے۔ عقل ہی حاکم اور موجب ہے۔
کرنے اور فعل قبیح سے بچنے کا حکم دیتی ہے۔ مثلاً یہ بات کہ شکر حسن ہے،
دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں ان کی دلیل یہ تھی کہ عام اخلاق کا علم ہر انسان کو ہوتا ہے۔ اس کے حسن ہونے کو جانتا ہے۔
ہم کو عقل سے ضرورۃً معلوم ہوتی ہے۔ ہر انسان خواہ وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو یا نہ ہو، اگر اخلاقی
ایسے مواقع پر جب کہ سچ اور جھوٹ دونوں سے یکساں طور پر مقصد حاصل ہو، انسان سچ بولنا ضروری سمجھتا ہے۔
فضائل و رذائل کا علم عقل سے نہ ہوتا تو انسان نبی اور متنبی میں فرق نہ کر پاتے۔ حقیقت میں شرعی ذمہ داری بھی آخری طور
پر عقلی ذمہ داری ہے۔

اشاعرہ

پہلے سوال کے سلسلے میں اشاعرہ نے کسب کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق انسان اپنے اعمال کا
خالق نہیں کاسب ہے۔ خلق تو تنہا اللہ کا کام ہے۔ انسان صرف کسب کرتا ہے۔ یہ تصور قرآن مجید کی اس طرح کی آیات
سے لیا گیا تھا:

لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت۔

اشاعرہ کے خیال میں اسی کسب کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ کسب انسان کے ارادہ کرنے میں
ہوتا ہے۔ وہ صرف ارادہ کا مالک ہے۔ فعل انجام دینے کی جو قدرت وُہ رکھتا ہے، وُہ اللہ کا عطیہ ہے۔ حقیقی فاعل
اللہ تعالیٰ ہے، انسان محض کاسب ارادہ ہے۔
دوسرے سوال سے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ افعال اور اشیا بجائے خود حسن اور قبیح نہیں ہوتے۔ حسن اور
قبیح ان کی ذاتی صفات نہیں ہیں۔ شرع جن چیزوں کو حسن قرار دیتی ہے، وہ حسن ہیں اور جنھیں قبیح ٹھہراتی ہے، وہ قبیح ہیں۔
وہ اس کی اطلاع سے پہلے نہ حسن تھے اور نہ قبیح۔ دُوسرے الفاظ میں شرع افعال اور اشیاء کو حسن اور قبیح بناتی ہے۔
اخلاق وجوب کے بارے میں ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بھی شرعی ہے۔ مثلاً سچ بولنا شرع ہی واجب قرار دیتی ہے اور
جھوٹ بولنا حرام بتاتی ہے۔
ابوبکر باقلانی (م ۴۰۳ھ / ۱۰۱۲ء) نے معتزلہ کے مذکورہ بالا رسائل کی تردید اس طرح سے کی ہے "حسن اور قبیح
کا علم نہ تو ضروری ہے اور نہ بدیہی۔ بدیہی اس لیے نہیں کہ ہزاروں انسان اختلاف رکھتے ہیں۔ جس کو ایک حسن قرار دیتا ہے"

دُوسرا اسے قبیح سمجھتا ہے اور ضروری اس لیے نہیں کہ حسن و قبح کا علم مبادی اولیہ سے مستنبط نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت انسان اگر سچ بولنا ضروری سمجھتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل کا فیصلہ ہے۔ بلکہ وہ ایسا یا تو معاشرہ کی زجر و توبیخ سے بچنے کے لیے کرتے ہیں یا اس کی تحسین و تعریف کی خاطر۔ یا اس کے زیر اثر ان تصورات کو اپنا لیتے ہیں۔ معتزلہ کی آخری دلیل کے بارے میں باقلانی کا خیال یہ ہے کہ پیغمبر کی پہچان معجزہ سے ہوتی ہے۔

ماتریدیہ

معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان کلام کا وہ مکتبِ فکر ہے، جو امام ابوحنیفہ اور ان کے شارع ابومنصور ماتریدی کی طرف منسوب ہے۔ اخلاقی فضائل و رذائل، حسن اور قبیح کے علم میں تو وہ معتزلہ کے ساتھ ہیں، یعنی یہ کہ حسن و قبح عقلی ہیں۔ اشاعرہ کے ناقدین میں امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید امام ابن قیم بھی ہیں اور اس مسئلہ میں ان کی رائے معتزلہ اور ماتریدیہ کے ساتھ ہے۔ لیکن اخلاقی وجوب کے تصوّر میں ماتریدیہ مکتب فکر کی رائے اشاعرہ کے ساتھ ہے، یعنی یہ کہ اخلاقی شرعی ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں ان دونوں مسائل کو الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کو عقلی ماننے سے دوسرے کا عقلی ماننا لازم نہیں آتا۔

فلسفہ اخلاقیات

جب ہم کلام سے فلسفہ کا رُخ کرتے ہیں، تو وہاں نہ صرف سوالات بدلے ہوئے ملتے ہیں بلکہ اصطلاحات بھی تبدیل ہوجاتی ہیں۔ کلامی حلقہ میں حسن و قبح اور وجوب کے الفاظ مستعمل تھے مگر فلسفیانہ بحثوں میں خیر و شر، سعادت و فضیلت جیسی اصطلاحات ملتی ہیں۔ فلاسفہ کے نزدیک انسانی ارادہ کی آزادی اور انسانی اعمال کی ذمہ داری ایک بنیادی مفروضہ ہے جس کے قدرتِ الٰہی کے تصوّر سے ہم آہنگ ہونے کے مسئلہ میں وہ پڑنا نہیں چاہتے۔ اسی طرح ان کے یہاں یہ بات بھی مسلّمات میں تھی کہ عقل خیر و شر اور فضیلت و سعادت کا علم حاصل کر سکتی ہے اور اس کام میں وحی سے بے نیاز ہے۔ جہاں تک اخلاقی وجوب کا سوال ہے، تو یہ بات ان کے یہاں سرے سے زیرِ بحث ہی نہیں آتی۔

کندی (ف ۲۵۹ھ/ ۸۷۳ء)

اسلام میں فلسفہ کا بانی ابو اسحٰق کندی ہے۔ اس کی توجہ زیادہ تر مابعد الطبیعیات اور نفسیات پر مرکوز رہی۔ علمی اخلاقیات میں اس نے ایک مختصر سی کتاب "دفع الاحزان" کے نام سے لکھی ہے۔ مگر کندی نے نظری اخلاقیات پر کوئی رسالہ تحریر نہیں کیا۔ البتہ اس نے نفس یا روح کا جو تصور پیش کیا، وہ بعد میں فلسفیانہ اخلاق کا جز بن گیا۔ کندی نے نفس کے اس تصور پر فضیلت و سعادت کے بارے میں نتائج نکالے ہیں۔ اس کے خیال میں

انسانی روح کے دو ماخذ ہیں، اسی کا ایک جز جسم کے ساتھ ارتقا پاتا ہے اور دوسرا جز خدا کی ذات سے آتا ہے۔ چونکہ انسانی رُوح کا تعلق بدن سے بہت گہرا ہے اس لیے جب تک اس کا قیام بدن میں رہتا ہے، اس وقت تک رُوح علت و اسباب کے سلسلے سے آزاد نہیں ہوسکتی۔ لیکن دوسری طرف چونکہ انسانی روح عالمِ روحانی سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس اعتبار سے اسے آزادی اور بقائے سرمدی حاصل ہے۔ انسان تقویٰ و پرہیزگاری اور علم و حکمت کی تحصیل سے ہی مادّی قیود سے بلند ہوسکتا ہے لیکن مادی قیود سے مکمل آزادی بعد موت ہی نصیب ہوسکتی ہے۔ کندی کے نزدیک سعادت قصوی کے لیے اخلاق کے ساتھ ساتھ علم و دانش ناگزیر ہیں بلکہ اخلاق علم و حکمت کے حصول کے لیے ابتدائی مرحلہ ہے۔

فارابی (ف ۳۳۹ھ / ۹۵۰ء)

کندی کے بعد فارابی نے فلسفہ اخلاق کو آگے بڑھایا لیکن اس نے فلسفۂ اخلاق کو سماجی اور سیاسی فلسفے سے الگ کر کے نہیں دیکھا۔ افلاطون اور ارسطو کی طرح اخلاق فارابی کے نزدیک بھی سیاست کا ایک جز رہا۔

فارابی کے خیال میں صرف فلاسفہ کو نظمِ حکومت چلانے اور لوگوں کی زندگیوں کی تشکیل و تعمیر کا حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ حقیقت کا علم انھیں کو حاصل ہوتا ہے اور وہی انسانوں کو حیاتِ دنیا کی کشمکش میں مبداء اوّل کی طرف رجوع کی صحیح راہ کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔ پوری کائنات ایک وحدت ہے اور خدا اس کا حاکم ہے۔ اسی طرح انسانی جسم بھی ایک اکائی ہے، جس کی حکومت دل کے سپرد ہے۔ پھر اسی طرح ریاست بھی ایک عضویاتی وحدت ہے، جس کا حاکم ایک ایسے شخص کو ہونا چاہیے، جو ذہن و دل کی ساری خوبیوں کا مالک ہو، جس کے عزائم بلند، جس کی فکر رسا، جس کا قلب حقیقت آشنا، جس کی سیرت مکارم و فضائل سے آراستہ اور جس کا ذہن حکمت و دانش کے نور سے منور ہو۔ فارابی نے اپنی مثالی ریاست کی تشریح اپنی ایک مشہور کتاب میں کی ہے۔

انسان دو طرح کی قوتوں کا مجموعہ ہے: حیوانی اور عقلی۔ عقل ہی صحیح کو غلط سے اور خیر کو شر سے ممتاز کرتی ہے اور اس سے حقیقت کے اسرارِ پنہاں سے آگاہی ہوتی ہے۔ حقیقت کی معرفت ہی انسان کا اصل کمال ہے اور ساری چیزیں اسی ایک مقصد کی خادم اور تابع ہیں۔ انسان میں صرف اس غایت کی معرفت کی صلاحیت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک جذبہ بھی ہے جو اسے ہمیشہ برتر اور بہتر کی طرف سرگرمِ عمل رکھتا ہے۔ کمال کے حصول کا یہ جذبہ ہی ساری سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو کامل آزادی اور مکمل سعادت اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ وہ مادی علائق سے نجات نہیں پا لیتا۔ فارابی کی مثالی ریاست کا حاکم فلسفی ہے، جس کی خصوصیات کی تشریح فارابی نے اس طرح کی ہے جس سے اس کے فکر و کردار کی معصومیت کا تصور پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ فارابی کا مثالی انسان ہے، جو افلاطون کی حکمت اور غالباً حضرت علیؓ کی سیاست اور اخلاق کا پیکر ہے۔ ریاست عام انسانوں کے لیے اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ اخلاق کی تربیت، تشکیل و ترقی ریاست سے باہر انجام نہیں پاسکتی۔

ابن سینا (ف ۴۲۸ھ / ۱۰۳۶ء)

ابن سینا کی توجہات کا مرکز بھی مابعد الطبیعیات اور طبیعیات ہی کے مسائل رہے۔ اخلاقیات میں اس نے زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے اخلاقی نظریات اس کی دو کتابوں سے ملتے ہیں: ایک "کتاب السیاستہ" اور دوسرے "کتاب البر و الاثم"۔

ابن سینا کا خیال تھا کہ انسان خیر و شر اور صحیح و غلط میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اخلاقی اصولوں اور فضائل پر ابن سینا نے کوئی تفصیلی بحث نہیں کی۔ عام انسانوں کے لیے وہ اس نظام اخلاق کی پابندی کی ہدایت کرتا ہے، جو ان کے معاشرہ میں مقبول و رائج ہوں۔ لیکن جو لوگ اونچی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے مالک ہوں اور بہتر سیرت و کردار رکھتے ہوں، ان کے لیے ابن سینا نے دوسرا آئیڈیل تجویز کیا ہے اور یہ آئیڈیل اس کے فلسفہ مابعد الطبیعیات سے ماخوذ ہے۔ ساری کائنات عشق کی قوت کی محکوم ہے۔ عشق پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ وہی ارتقا اور ہر تغیر کا سبب اور زندگی کی اصل روح ہے۔ اس عشق کا مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جو اس دنیا کا خالق ہے اور جو کمال حسن اور غایت اولیٰ ہے، اسی حسن ازلی کی محبت انسان اور ساری کائنات کی زندگی کا راز ہے اور اس کی طرف رجوع اور اسی سے اتحاد و قرب انسان کی غایت کمال اور سعادت تامہ ہے۔ مگر جب تک انسان ان مادی علائق میں رہتا ہے، اس وقت تک مقصود ازلی کا کما حقہ حصول نہیں ہو سکتا۔ فلسفی اور حکیم ہی اس غایت قصوی تک پہنچ سکتے ہیں، یا نبی اور اولیا۔ عام انسانوں کو حرمان و ناکامی کے علاوہ کچھ اور نہیں حاصل ہوتا۔

اخوان الصفاء

اخوان الصفا ایک جماعت تھی جو چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں بغداد میں ظہور میں آئی، جس کا مقصد شریعت اسلامیہ کو فلسفہ کے ذریعہ پاک کرنا تھا۔ مگر اس زمانہ کے حالات اور ان کے رسائل کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق کا یہ دعویٰ ایک مدافعتی تدبیر تھی۔ اخوان الصفا نے باطنی طرز کی تاویلات سے کام لے کر نماز، روزہ اور دوسری عبادات، آخرت، رسالت اور دوسرے ایمانیات کی ایسی توجیہات پیش کیں، جن سے دین بالکل مسخ ہو کر رہ گیا۔ وہ حقیقت میں جیسا کہ انھوں نے اپنے رسائل میں ایک جگہ پر خود لکھا ہے، نہ کسی مذہب کے وفادار تھے اور نہ کسی فلسفہ کے پابند۔ ان کے فلسفہ میں ہر طرح کے عناصر اسلامی اور غیر اسلامی، یونانی اور ایرانی، یہودی اور نصرانی، شیعی اور سنّی اور بُت پرستوں اور مجوسیوں کی مختلف باتیں شامل تھیں مگر ان کا غالب رجحان شیعیت کی طرف تھا۔

ان کا زیادہ زور اخلاق پر تھا اور انھوں نے اپنی ایک خفیہ جماعت بھی منظم کی تھی جس میں کئی مدارج تھے۔ ایک نووارد کو ان مدارج سے گزرے بغیر اس جماعت کے اصل اسرار و رموز سے واقفیت نہیں ہوتی تھی۔ جو رسائل انھوں نے

ترتیب دیے، وہ اپنے فکر کو عام ممبروں تک پہنچانے اور ان کے ذہن میں اپنے خیالات اتارنے کے لیے لکھے گئے تھے اور اسی سبب سے ان کے بیانات میں بسا اوقات تضاد ملتا ہے۔

ان کا فلسفہ اخلاق ان کے عام فلسفہ کی طرح مختلف نظریات کا مجموعہ تھا، جو مختلف فرقوں اور مکاتب فکر سے ماخوذ تھے۔ انسانی روح اصلاً خدا کی ذات سے صادر ہوئی۔ اگرچہ یہ صدور درمیان کے کئی واسطوں سے ہوا۔ روح کا تعلق مادہ کے ساتھ عارضی ہے۔ علم و دانش اور ایمان و یقین، اخلاق و کردار کے ذریعہ انسانی روح اس مادی تعلق سے اپنے کو آزاد کرنے کی سعی کرتی ہے۔ انسانی زندگی کی غایت اسی مادی چکر سے نجات حاصل کرنا اور مبداء اول میں جذب ہو جانا ہے۔ ان کا اخلاقی ضابطہ زُہد و ورع کی تعلیم دیتا ہے اور ایک روحانی نظام ہے۔ انسان کا فعل قابلِ تحسین اس وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ اپنی فطرت کے قانون کی پابندی کرتا ہے۔ یہ قانون فطرت عقل کی ارتقاء اور اس کی حکمرانی کا قانون ہے۔ عقل کی نشو و نما علوم و حقایق کے حصول میں ہے اور روح کے دوسرے اجزا پر اس کی حکمرانی سے آداب و فضائل اور مکارم کا وجود ہوتا ہے۔

انسان کو خدا سے ایک فطری محبت ہے۔ اس لیے جذبۂ فطرت کو ابھارنا، ترقی دینا اور تکمیل تک پہنچانا انسان پر فرض ہے۔ سب سے اعلیٰ اخلاق محبت اور عشق ہے، اس لیے کہ عشق و محبت ہی سے انسان کو مبداء اوّل سے وابستگی کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔

اخلاق کی تکمیل معاشرہ میں ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ فارابی کی ریاست نہیں بلکہ ایک روحانی معاشرہ ہے، جو جماعت اخوان کے ہم معنی ہے۔ بغیر اس تنظیم میں منسلک ہوئے اور بغیر اس روحانی ریاست میں داخل ہوئے انسان سعادت تامہ سے محروم ہی رہے گا۔

کندی سے لے کر اخوان الصفاء تک میں اخلاقیات کو عام فلسفہ سے الگ ایک مضمون کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، فلاسفہ نے نظری اخلاقیات پر جو کچھ لکھا، وہ نفسیاتی مباحث کے تکملہ کے طور پر یا سیاسی نظریات کے جزء اور ضمیمہ کی حیثیت سے لکھا۔ کلامی حلقوں میں بھی اخلاقی نظریات کی حیثیت ثانوی تھی۔ یہ مسائل عقائد اور ایمانیات کی بحثوں میں ضمناً آجاتے تھے۔

مسکویہ (ف ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء)

وہ پہلا فلسفی ہے، جس نے اخلاقیات کو اپنے فکر کا مرکز بنایا اور اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی، جو "تہذیب الاخلاق" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور مانع ہے۔ اس کا اسلوب سلیس اور بیان واضح ہے اور طریقہ بحث منظم و مربوط اور فلسفیانہ ہے۔

مسکویہ بحث کا آغاز نفس کی روحانی حقیقت کے اثبات سے کرتا ہے۔ مختلف دلائل کی روشنی میں اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ نفس انسانی بسیط، باشعور، ایک روحانی وجود ہے جو اپنے مبداء و منتہا سے آشنا ہے۔ اخلاق نام ہے نفس کی

اس حالت کا جس کی وجہ سے اعمال وافعال بغیر فکر و تدبیر کے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ خلق بار بار کی مشق و تربیت کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے بچوں میں خلق کی تشکیل غیر شعوری ہوتی ہے۔ لیکن بڑے ہو کر انسان کا ارادہ اور اس کا فکر خود خلق کی تشکیل کرتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر ہی عادات و اطوار پر خلق کے لفظ کا صحیح اطلاق ہوتا ہے۔

مگر خلق کی تشکیل خلاً میں نہیں ہوتی بلکہ فطرت میں جو صلاحیتیں ہوتی ہیں، انھیں کو مشق و تربیت اور فکر و ارادہ کی قوت ایک خاص ڈھنگ پر ڈال دیتی ہے اور اسی کا نام خلق ہے۔ خلق نہ تو خلاف فطرت ہوتا ہے اور نہ فطرت سے بنا بنایا ہی ملتا ہے۔ انسان کی فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ اسی لیے لوگوں کے اخلاق مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کو زیادہ اور بہتر صلاحیتیں ملتی ہیں اور کسی کو کم اور گھٹیا۔ مگر اس کے باوجود اخلاق میں تغیر ہوتا ہے اور تبدیلی ممکن ہے۔ اخلاق چونکہ انسان ماں کے پیٹ سے لے کر نہیں آتا بلکہ معاشرہ اور فرد کی کوششوں سے بنتا ہے، اس لیے متغیر ہو سکتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم، اساتذہ و والدین کی تربیت، سزا اور جزا کا قانون، ترغیب اور ترہیب کے ذرائع، یہ سب چیزیں عبث قرار پاتیں اگر اخلاق اٹل اور فطری ہوتے اور ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہوتی۔

خلق دو طرح کے ہوتے ہیں: اچھے اور بُرے۔ اچھے اخلاق فضائل کہلاتے ہیں اور بُرے رذائل۔ اچھے اور بُرے کا معیار کیا ہے۔ اس کے لیے نفس انسانی کے نفسیاتی مطالعہ کی ضرورت ہے۔ انسانی نفس کے تین اجزا یا اس کی تین قوتیں ہوتی ہیں:

عقل، غضب اور شہوت۔

غضبی اور شہوانی نفس جب عقل کی حکمرانی قبول کر لیتے ہیں اور ان کا ہر فعل عقل کے فیصلوں کے مطابق ہوتا ہے، تو ان سے فضائل پیدا ہوتے ہیں۔ نفس غضبیہ کی فضیلت شجاعت اور نفس شہوانیہ کی عفت ہے اور عقل جب اپنی روشنی میں ترقی کرتی جاتی ہے اور افعال کی تنظیم اور قوتوں پر حکمرانی میں کامیاب ہوتی جاتی ہے، تو ایک تیسری فضیلت پیدا ہوتی ہے، جسے حکمت کہتے ہیں۔ یہ عقل کی فضیلت ہے۔ دراصل یہی حکمت وہ اصل فضیلت ہے جس کی وجہ سے شجاعت شجاعت ہے اور عفت عفت۔ مگر شجاعت، عفت اور حکمت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتے جب تک کہ ان میں باہمی ہم آہنگی نہ ہو۔ اور سب کا فعل توازن سے انجام نہ پائے۔ یہ توازن اور اعتدال راس الفضیلت ہے اور یہ ان ساری قوتوں کے باہمی تعامل اور توافق سے وجود میں آتی ہے۔ اس فضیلت کو عدالت کہتے ہیں۔

غرضکہ روح انسانی کے نفسیاتی مطالعہ سے چار فضائل کا اثبات ہوا۔ لیکن اگر نفوس ثلاثہ کا فعل مخالف سمت میں ہو اور عقل کی حکمرانی نہ ہو تو پھر رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ نفوس ثلاثہ کی یہ مخالفت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک افراط اور دوسرے تفریط کی جانب۔ اس طرح چار امہات فضائل کے مقابلہ میں آٹھ بنیادی رذائل وجود میں آتے ہیں۔ مسکویہ نے بڑی تفصیل سے ہر ہر فضیلت اور اس کے مخالف رذائل کا ذکر کیا ہے۔

انسان کی سعادت جو فی نفسہٖ خیر ہے، انھیں فضائل کے حصول میں مضمر ہے۔ سعادت کوئی خارجی شے نہیں بلکہ عقل کی روشنی میں ارتقا و تکمیل کا دوسرا نام ہے۔ اسی سعادت میں انسان کی بہترین مسرت پنہاں ہے۔

یہ سارے فضائل عقل عملی کے مظاہر اور پیداوار ہیں۔ لیکن انسان کی عقل کا ایک جز نظری بھی ہے اس کا مقصد حقیقت کی معرفت اور علوم کا حصول ہے اور اسی میں نظری عقل کا کمال اور سعادت مضمر ہے۔ انسانی سعادت دونوں عقلوں نظری اور عملی کی تکمیل کا نام ہے۔ لیکن عقل نظری کو عقل عملی پر ترجیح حاصل ہے۔ اس لیے سعادت علمی و نظری سعادت عملی کے مقابلہ میں برتر اور بلند تر ہے بلکہ سعادت علمی سعادت عملی کی غایت اور مقصود ہے۔ اخلاق فلسفہ و حکمت کا خادم ہے۔

یہ سعادت ظاہر ہے کہ چند انسانوں کے نصیب میں آسکتی ہے مگر عام انسان باہمی تعاون اور مشارکت سے اس سعادت میں ایک حد تک حصہ لے سکتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو مکمل کر سکتے ہیں۔ معاشرہ انسانی کی بنیاد انسانی محبت اور ہمدردی پر قایم ہے۔ انسان، انس (یعنی محبت) سے مشتق ہے۔ یہ انس اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لیے مواخات اور ہمدردی دوستی اور خیر خواہی ذاتی اغراض کی تکمیل کے ذرائع نہیں بلکہ فطرت انسانی کی پکار، اس کے داعیہ کی تکمیل کا نام ہیں۔ معاشرہ اسی جذبہ انس کو ترقی دیتا اور منظم کرتا ہے۔ ریاست اس کی مکمل ترین شکل ہے اور فرد کی طرح معاشرہ اور ریاست کا مقصد بھی سعادت کا حصول ہے۔ معاشرتی اور ریاستی زندگی ہر انسان کے لیے ضروری ہے۔ عزلت و گوشہ نشینی نفس کی قوتوں کا اہمال اور جذبہ انس کا قتل اور اجتماعی ذمہ داری سے فرار کا دوسرا نام ہے۔ معاشرہ اور ریاست کو شریعت اور قانون الٰہی کا پابند ہونا چاہیے۔ بغیر اس کے نہ خواص سعادت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ عوام۔

صوفیانہ اخلاق

مسکویہ کی اخلاقیات کے ساتھ فلسفیانہ اخلاق کا پہلا دور ختم ہوجاتا ہے۔ کندی، فارابی، ابن سینا اور مسکویہ کے دور میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف کا ارتقا بھی ہو رہا تھا۔ ابتدائی دور کے صوفیہ میں خوف و خشیت کا غلبہ تھا اور اس کے بعد کے صوفیہ میں محبت و عشق کا بلکہ حقیقی معنی میں تصوف اسی محبت و عشق والے دور سے شروع ہوتا ہے، شروع شروع میں صوفیہ نے اخلاق کی جو تعلیم دی اور ان کی زندگیوں نے جس کی ترجمانی کی اس میں زہد، دنیا سے کنارہ کشی، صبر و توکل، تسلیم رضا، محبت الٰہی اور رویت باری کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ بعد کے آنے والوں نے انھیں کی تعلیمات کو منظم کیا اور ان کو ترقی دی۔ چنانچہ ابوطالب مکی نے ایک مشہور کتاب "قوت القلوب" کے نام سے لکھی جس میں تعلق باللہ کے ان مدارج کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ تصوف کے نظریات پر سب سے اچھی کتاب کلاباذی کی "التعرف لمذہب التصوف" ہے۔ کلامی اخلاقیات میں جن جن مسائل کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، ان مسائل کے بارے میں صوفیہ نے انھیں خیالات کو اپنایا ہے جنھیں اشاعرہ نے پیش کیا ہے۔ صوفیانہ اخلاق اعمال کے باطن کی اہمیت، نیت کے اخلاص اور داخل کی صفائی اور قلب کی تطہیر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کا مقصد خدا کی ہمہ وقتی یاد، اس کے ساتھ قلبی وابستگی و محبت اور اس کی ذات میں فنا ہوجانا ہے۔ مگر اس فنائیت میں فرد کی شخصیت کی علٰحدہ حیثیت ختم نہیں ہوتی، باقی رہتی ہے۔

اسلام کے ابتدائی چار صدیوں میں اخلاقی فکر کا یہ ایک ہلکا سا جائزہ ہے۔ اس دور میں تینوں مکاتب الگ الگ ترقی پا رہے تھے۔ ان کو ملا کر ایک جامع نظام اخلاق کی شکل دینا امام غزالی کا کام تھا اور ان کی ذات سے اخلاقی فکر کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے ۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

اور ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لیے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے

(الانبیاء: ۱۰۷)



رحمۃ للعالمین

اسمِ پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا عبد الرحمٰن ندوی

حضورؐ کا نام نامی آپؐ کے دادا "عبدالمطلب" نے رکھا تھا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رجاء ان یحمد عبدالمطلب نے آثارِ نیک دیکھ کر محمدؐ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولود سعید آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم مجموعۂ محامد اور مرجع خلائق بنے۔ ارباب تصوف موشگافی کی انتہا کر دیتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ "محمد" خدا کے نام "احد" سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے، لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّٰی کی صفات، خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہیے۔ افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے، لیکن عموماً انواع و اجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً انسان، مسلم، قوم۔ شاذونادر طریقہ پر افراد و اشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کر لیا جاتا ہے جیسے "مسیح" اور "بدھ" یہ دونوں نام اپنے مسمّٰی کے اوصاف اور خواص کو بتاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپ سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتا نہیں چلتا۔ مورخین اکثر لکھتے ہیں۔ ولم یکن شائعاً بین العرب ھٰذا الاسم اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے "نام مبارک" کا "عبدالمطلب" کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجود گرامی سے مشرف کر چکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی۔" اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس جامعیتِ کبریٰ، برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح و ستائش ہیں اس لیے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تفحص کو اور زیادہ وسعت دیں۔ صاحب مفردات "محمدؐ" کے معنی لکھتے ہیں الذی اجمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ "محمدؐ" کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں۔

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کارسازِ قدرت کی وسعت لامحدود اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے وا ہے۔

غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے۔ مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجہ کمال ہے کہ جس کے آگے اس کا قدم نہیں بڑھتا۔ "حیوانات"، "نباتات" اور "جمادات" تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں۔ صورتیں ایک ہیں، شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں، لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے، جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہوتے ہیں، ہم مقصود فطرت اور نقطہ تخلیق کہہ سکتے ہیں۔ اس نقطہ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ یہ بات تھوڑے سے غور اور مشورے سے بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ تفحص اور تفتیش کے بعد تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجہ اعلیٰ پاتے ہیں۔ کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔ دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوعِ مستقل ہے۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و شباہت، اس کے اعضاء و جوارح، اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے، سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال ان سے جدا گانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اب اگر انسان کی اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ادوار، زبانوں کی تاریخ میں ارتقاء دماغی کی آخری ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہو سکتی ہے، تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ لغات قاموس نے لفظ "حمد" کے ایک معنی قضاء الحق کے بھی بتلائے ہیں۔ پس لفظ "محمد" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو۔ یعنی قدرت کی جانب سے نوع انسان کو جس سرحد کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق تخلیق مقرر تھا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا۔ علم و عمل، خَلق و خُلق، دماغ و کیرکٹر ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لب لباب ہیں۔ اول ثانی کے لیے بنیاد ہے عمل علم پر کیرکٹر دماغ پر، خُلق خَلق پہ قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہو گی، اسی قدر اس کی خلقی کیفیت راسخ و مستحکم ہو گی۔ ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک نے پیش کیا، عالم انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے۔ حتیٰ کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو فرمایا گیا انک لعلی خلق عظیم

محاورات عرب سے حمد کے یہ بھی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا حماسیات میں نیزہ کے بھرپور پڑنے کے وقت حمدتُ بلاءہٗ (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیش نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالات نبوت و معجزات رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضورؐ اقدس کا نامِ نامی بھی ہے یہ زندہ جاوید معجزہ بعثت کے وقت سے تاہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو، تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے، محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتہً رسالتماب روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کما... سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ علماء و فضلاء یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے ماتحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے، دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بیقراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت ان کے نزدیک جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ بادلِ ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبان اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ بے شبہ پیغمبرؐ عرب کے قانون دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالم انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے، اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔" یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتا دے رہا ہے۔ مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا۔ اس حیثیت سے نام مبارک کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے، عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے، شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ دار اور اس کے شعبہائے حیات کی تفصیل ہو۔ مگر نامِ نامی آقائے نامدارؐ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق ضرور عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن، خلق و خُلق ہر حیثیت سے حضور کی زندگی قابلِ تعریف تھی اور اسی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نام مبارک حضورؐ کے نہ صرف نبی بلکہ خاتم النبین ہونے کی دلیل بھی ہے کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا۔ لیکن حضورؐ کی جامعیت آپؐ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ لفظ "محمد" کے معنی "مجموعۂ خوبی" اور "مخلوق کامل" کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پہ کمال کلی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت، نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔ مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے، وہ باوجود ہزار سعی

تنقیص اعتراف کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سر ولیم میور اور مارگو لیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم انتہائی سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ عہد نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آ چکے ہیں۔ کہ بعض سخت ترین منکر ایک توجہ نظر اقدس کی تاب نہ لا سکے۔ عبد اللہ بن سلام، جو نامور علماء یہود میں سے تھے، وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے۔ بعثت کے حالات، سیرت طیبہ، تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس خاصیت اور بے اختیار کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا۔ لفظ "محمدؐ" عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے، جو باب تفصیل کا مصدر ہے اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لیے مجبور کیا۔ جیسے صَرَّف (پھیر دیا) یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا۔ اسی طرح "محمدؐ" کے معنی ہیں، وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنی سے اسی قوت جاذبہ اور کشش اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبد اللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرۂ اقدس کو دیکھتے ہی پکار اٹھے ھٰذا لیس بوجہ کذاب یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین پیرایوں میں دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خداترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ کی جا رہی ہیں، انہوں نے تجربہ کرا دیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے، تو انہوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا کعبہ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصاء کیے ہوئے ہے۔ کوئی جزء اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے قَتَّلَہ تَقْتِیْلاً یعنی خوب خوب قتل کیا۔ اس خاصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ "محمدؐ" یعنی جس کا جزء جزء قابل تعریف ہے "اصلاح نفس"، تدبیر منزل اور تدبیر مدن کی وہ کون سی شاخ ہے، جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا۔ یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد و نہایت کو پہنچا، ضرورت ہوئی کہ عالمِ انسان کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جائے، جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو، جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ مستی، مسیحانہ اخلاق، ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آ جائے اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی کا جامع اور برزخ کامل ذات پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی لیے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ "احمد" فرمایا۔ یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہو گا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشو و نما جب ہی پائی ہے، جب وہ معرفت و روحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں۔ مسیحی مذہب کی ترقی رومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالمگیر مذہب بھی اسی وقت بنی

تکمیل کر سکا، جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آ گیا۔ لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے۔ وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جماعتوں میں پھیلا، اخلاق و روحانیت سے گیا۔ غریب تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کر دیا گیا۔ فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی، لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقت معین پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ "محمدؐ" کے ایک یہ بھی معنی قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی۔ آپؐ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا، جس کی سرعت اور بغیر جدوجہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع، بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے۔ ایک طرف وہ اپنے مسمیٰ کے کام اور کام کے انجام کی پیش گوئی ہے۔ دوسری طرف اس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لب لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔ والحمد للہ رب العالمین۔

لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مالک سرام

قرآن میں جن وانس کی تخلیق کی غرض وغایت اور ان کا مقصدِ حیات یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نیک اور عبادت گزار بندے بنیں:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (۵۱ : ۵۶)

جب تخلیق کی علت غائی یہ ٹھہری تو یہ کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ خداوند کریم نے بندوں کے لیے ایک منزل تو مقرر کر دی، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے کوئی رستہ نہیں بتایا اور کوئی اس رستے کا بتانے والا پیدا نہیں کیا۔ انھی دونوں شکوک کا ازالہ یوں کیا کہ فرمایا:

انّ الدین عند اللہ الاسلام (۳ : ۱۹)

کہ ہم تک پہنچنے کا راستہ اسلام کہلاتا ہے اور مسلمان کون ہے:

الذین یؤمنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و ممّا رزقنٰھم ینفقون و الذین یؤمنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک و بالاٰخرۃ ھم یوقنون۔ (۲ : ۳-۴)

مسلمان وہ ہیں، جو ان دیکھے خدا پر ایمان لاتے ہیں اور اسی کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اپنی مادی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی، غرض ان تمام صلاحیتوں کو، جو خدا نے ان میں ودیعت فرمائی ہیں، اس کی اور اس کے بندوں کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں، ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے مخلوق کی ہدایت کے لیے نبی بھیجے اور ان پر اپنی وحی نازل کی۔ اس لیے وہ تمام گزشتہ نبیوں اور اُن کی وحی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر انھیں اس کا بھی یقین ہے، کہ ہم اس زندگی میں جن اعمالِ نیک و بد کے مرتکب ہو رہے ہیں، ایک نہ ایک دن ان کی جزا و سزا بھی ضرور ملے گی۔ یہی تعلیم ازل سے بنی نوع انسان کی طرف آتی رہی اور یہی وہ رستہ ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔

پھر صرف رستے ہی کی نشان دہی نہیں کی، بلکہ ایسے لوگ بھی پیدا کیے، جو اس راہ کے ہر پیچ وخم سے واقف تھے، جو جانتے تھے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے کہاں کہاں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان سے بچاؤ کی صورت کیا ہے۔ راہِ راست پر چلانے والے یہ ہادی ہر قوم میں پیدا ہوئے:

لکلّ قومٍ ھادٍ۔ (۱۳ : ۷)

انھوں نے لوگوں کو تعلیم و تلقین کی اور انھیں بتایا کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؛ نیکی پر عمل اور بدی سے اجتناب کی ہدایت کی۔ یہی لوگ خدا کے نبی اور رسول تھے، جو خدا کی وحی والہام کی روشنی میں مختلف قوموں کی رہنمائی کرتے رہے۔

ہر ایک نبی اپنی قوم میں سب سے پہلے اپنی نبوت کی صداقت اور خدا کی ہدایت کی حقیقت پر ایمان لاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وُہ اوّل المسلمین ہوتا ہے۔ وہ گویا نمونہ ہے اسلام اور اسلامی تعلیم اور اعمال کا۔ دوسرے لوگ اس کا تتبع کرتے ہیں۔ یہی گروہ اس کے پیرو اور اس کی امت کہلاتے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اسلام، مسلم، نبی، رسول، وحی، الہام وغیرہ ذالک، یہ سب الفاظ عربی زبان کے ہیں اور تمام ملکوں میں یہ اصطلاحیں جاری نہیں رہی ہوں گی۔ خواہ عربی ام الالسنہ ہی کیوں نہ ہو۔ کسی نہ کسی مرحلے پر دنیا میں مختلف زبانیں رائج ہوگئیں اور پھر جس ملک، یا قوم میں کوئی نبی آیا، اس کی وحی بھی اس قوم کی زبان ہی میں رہی ہوگی، تاکہ وہ لوگوں کو راہِ ہدایت دکھا سکے:

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہٖ لیبیّن لھم۔ (۱۴ : ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وحی صرف عربی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے تو اس کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا، کیونکہ اس کی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ اگر طالب عالم استاد کی گفتگو سمجھ ہی نہ سکے، تو وہ تعلیم کیا حاصل کرے گا۔ حاصل کلام یہ کہ اگرچہ نبی مختلف اقوام میں آئے اور ان کی وحی کی زبان بھی الگ تھی، لیکن اس کا مفاد اور مقصد یکساں تھا۔

غرض اللہ تعالیٰ کی ہدایت تمام قوموں کی طرف آئی اور اس کا ذریعہ انبیاء ربانی تھے۔ جب منبع ہدایت ایک تھا اور ذریعہ ہدایت ایک، تو یہ لازمی بات ہے کہ اس کے نتیجے میں ہدایت یا دین بھی ایک ہی ہوتا اور دنیا کبھی گمراہ نہ ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود قومیں راہِ راست سے بھٹک گئیں۔ انھوں نے طرح طرح کے معبود گھڑ لیے اور ان کی پُوجا کرنے لگیں۔ ان معبودوں نے مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کیں۔ مثلاً ہندوستان اور عراق قدیم (بابل) میں یہ اجرام فلکی، سورج، چاند، ستارے تھے۔ بلکہ ان سے بھی گزر کر ہر قسم کے دیوی دیوتا بنا لیے گئے۔ زمین، پانی، آگ، بارش، بجلی، رعد، غرض ہر ایک چیز کی دیوی تھی یا دیوتا۔ ان کی مورتیاں بنائی گئیں۔ اور ان کے لیے خاص مندر تعمیر ہُوئے، جہاں اُن کی پُوجا ہوتی تھی اور ان کو خوش رکھنے کو چڑھاوے چڑھائے جاتے۔ چین اور جاپان میں متوفی بزرگوں کی پرستش بھی ہوتی تھی وعلیٰ ذالک، ہر جگہ کا یہی حال تھا۔

لیکن اس راہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ متعدد قوموں نے ان انبیاء اللہ ہی کو معبود کا درجہ دے دیا۔ جو مخلوقِ خدا کو اپنے خالق اور رب کی طرف بلانے کے لیے آئے تھے۔ اپنے منصب کی رعایت سے ان کی مثالی زندگی میں تو شبہ ہو نہیں سکتا۔ تائیدِ ایزدی سے وُہ گناہ سے بھی معصوم تھے۔ بس یہی بات ان کے پیروؤں کی سمجھ میں نہ آئی۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہماری طرح کے گوشت پوست کے معمولی انسان نہیں ہو سکتے۔ ورنہ ان میں بھی وہی کمزوریاں ہوتیں، جن میں ہم سب مبتلا ہیں۔

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور عبادت کا نتیجہ ہونا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے، انسان اپنے آپ کو صفاتِ الٰہی کا مظہر بنائے۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے ماحول میں رہنے پر مجبور ہے اور مختلف اوقات میں اس ماحول کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے۔ جو شخص کسی خاص حالت میں بطور ردِ عمل کسی صفت الٰہیہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتا ہے، وہ اتنا ہی اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب گردانا جائے گا:

و من احسن من اللہ صبغۃ۔ (۲ : ۱۳۸)

انبیاء الٰہی سے زیادہ اور کون مویدمن اللہ اور ان سے زیادہ اپنے قول و فعل پر کون قادر ہوگا پس جب انھوں نے ہر ایک موقع پر عام انسانی سطح سے بلند ہو کر کلام کیا اور اس پر عمل کر کے دکھا دیا، تو ظاہر بین نظروں نے یہ تو نہ دیکھا کہ یہ غیر معمولی عمل تائید خداوندی کا نشان ہے، بلکہ اس سے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ یہ شخص ہماری نوع کا نہیں۔ انسانی بھیس میں خود خدا نے جنم لے لیا ہے۔ بعضوں نے اسے ابن اللہ (یا بنت اللہ) بنا دیا۔ یہ چلن کسی ایک ملک یا قوم تک محدود نہیں رہا، الا ماشاء اللہ دنیا کی اکثر قومیں اس گمراہی کا شکار ہو گئیں کہ انھوں نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنے انبیاء کو ان کے اصل مقام سے زیادہ دے دیا اور انھیں خدائی صفات میں برابر کا شریک اور ند و مثل بنا دیا۔ ہندوستان کے اوتار اور دیوتا بھی اسی قبیل سے ہیں۔ عیسائیوں نے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ہی بنا دیا اور وہ بھی اکلوتا۔

مراد یہ ہے کہ ایسی صورت حال اتنی مرتبہ پیش آچکی تھی کہ آیندہ بھی اس کے اعادے کا یقین کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اس امکان کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے کلمے میں اسی کا سدباب کیا ہے۔

مخالف اعتراض کرتا ہے کہ خود اسلامی کلمے میں شرک ہے۔ مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں:

"جب حضرت محمدؐ صاحب دنیا میں تھے تو ان کی تعظیم و تکریم ہمارا عین فرض تھا لیکن آج مسلمانوں نے اپنے کلمے کے اندر محمدؐ صاحب کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں، تو اللہ حاضر و ناظر ہے، وہ ہماری بات سنتا ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ محمدؐ صاحب ہمارے رسول ہیں اور اس جملے کو اللہ کے کلمہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں، تو حضرت محمدؐ صاحب ہماری بات سنتے نہیں۔ اللہ کے تصور کے ساتھ محمدؐ صاحب کا بھی تصور اسی وقت ہمارے دل کے سامنے آجاتا ہے پھر توحید کہاں رہی؟" ("مصابیح الاسلام"۔ گنگا پرشاد اوپادھیائے ص۲۷)

یہ اعتراض بہت لوگوں نے کیا ہے۔ الفاظ بدلتے رہے ہیں، لیکن مفاد سب کا یہی ہے کہ کلمے میں رسول کے نام کی شمولیت توحید کے منافی اور ایک نوع کا شرک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنیاد ہی غلط ہے اور یہ قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ کلمہ خدا یا اس کے رسول کو سنانے کے لیے نہیں پڑھا جاتا بلکہ یہ تو اپنے ایمان کا اعلان ہے۔ کلمہ جزو عبادت نہیں، بلکہ یہ صرف پڑھنے والے کی اعتقادی کیفیت اور جماعتی تعلق کی شہادت ہے۔ جب کوئی آدمی "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کہتا ہے، تو وہ اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ میں آج سے خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں کروں گا، یہاں تک کہ محمدؐ کی بھی نہیں، کیونکہ وہ بھی صرف اس کے رسول ہیں، نہ کہ معبود۔

یہ تو عین توحید پر ایمان اور ایقان کا اعلان ہے، اس میں شرک کہاں سے آگیا اور اس کی ضرورت جیسا کہ بیان ہو چکا، اس لیے پیش آئی کہ ماضی میں بارہا یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا کہ امتوں نے مرور زمانہ کے ساتھ اپنے نبیوں ہی کو معبود بنا لیا تھا۔ حالانکہ نبی یہ کہتے ہی رہے کہ عبادت کے لایق صرف خدائے واحد کی ذات ہے، ہم بھی تمھاری ہی طرح کے انسان ہیں، تمھاری ہی طرح سے ماں، باپ سے پیدا ہوئے اور تمھاری ہی طرح کھاتے پیتے، گلی کوچوں میں چلتے اور پھرتے، کاروبار کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں خداوند تعالیٰ نے اپنی وحی سے نوازا ہے، ورنہ ہم بھی معمولی بشر ہیں۔

(انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد۔ (۱۸ : ۱۱۰)

پس اسلامی کلمے کا مقصد یہ تھا اور ہے کہ کہیں مسلمان بھی اُممِ سابقہ کی طرح اپنے نبی کو معبود نہ بنالیں۔ معاذ اللہ یہ گویا توحیدِ خالص کا اعلان ہے۔ اس کا پڑھنے والا عہد کرتا ہے کہ آج سے میں کسی غیر اللہ کی عبادت نہیں کروں گا۔ وہ علی الاعلان شہادت دیتا ہے کہ خدا کے علاوہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی لائقِ عبادت نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔

وماعلینا الا البلاغ۔

رحمۃ للعالمین ﷺ

قائدِ اعظم محمد علی جناح

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سب سے بڑے صاحبزادہ حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ تھے۔ بائبل اور تورات کے بیان کے مطابق پھر ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ جن میں سے ایک کا نام قیدار تھا۔ جن کی اولاد عرب کے صوبہ حجاز میں آباد ہوئی۔ اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں۔ تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ حضور آقائے عرب وعجم کا سلسلہ نسب عدنان سے ملتا ہے، جو چالیسویں پشت میں حضرت اسماعیلؑ سے جا کر ملتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا کہ حضورؐ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی نویں پشت میں نضر بن کنانہ کا نام ملتا ہے جو قریش مکہ کے مورث اعلیٰ تھے۔ گویا شرافت اور وجاہت کے اعتبار سے بھی حضورؐ کا خاندان معزز اور باوقار تھا۔ جغرافیہ کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ جزیرۃ العرب برِ اعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے جہاں تین برِ اعظم ایشیا، یورپ اور افریقہ آپس میں ملتے ہیں۔ آفتابِ اسلام کی ضیاباریوں سے پیشتر دنیا جہالت اور خودناشناسی کی تاریکیوں میں روپوش تھی۔ اور عرب کی حالت کا تو پوچھنا ہی کیا، وہاں پر لوگوں کا جُدا جُدا اور مختلف مذاہب پر اعتقاد تھا لیکن بُت پرستی سب میں مشترکہ چیز تھی حتیٰ کہ کعبہ مقدس میں بھی ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، عیسیٰؑ اور مریمؑ صدیقہ کے بتوں کی بے محابہ پرستش ہوتی تھی۔

عہدِ جاہلیت

عرب لوگوں کی زندگی کا دارومدار تیغ آزمائی پر تھا۔ اور چونکہ وہ ایسی ہی فضا میں پلتے تھے۔ اس لیے خونخواری اور سفاکی ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ ان کے دن رات کے چوبیس گھنٹے باہمی جنگ وقتال میں صرف ہوتے تھے اور ذراسی بات پر تلوار میان سے تڑپ کر نکلتی تھی اور دم بھر میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے تھے۔ ان حالات میں انسانی خون کی پاکیزگی کا کسے خیال آسکتا تھا۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینا۔ شراب اور عیاشی کی گود میں زندگی بسر کرنا ایسے واقعات ہیں جن پر تاریخِ عالم کے اوراق گواہ ہیں۔ مولانا حالی علیہ الرحمہ نے اس صورتِ حالات کا نقشہ کن موثر الفاظ میں کھینچا ہے: ؎

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی — شراب اُن کی گھُٹی میں گویا پڑی تھی

تعیّش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی — غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

ولادتِ قدسی لیکن یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب موسم خزاں میں درختوں کے پتے خشک ہو کر جھڑ جاتے ہیں تو بہار کی دلفریب ہوائیں بھی بہت دور پیچھے نہیں ہوتیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ مُردہ درختوں کے جسم سے لہلہاتی ہوئی

کونپلیں پھوٹتی ہیں اور قدرت پھر ایک دفعہ دلفریب دُلہن کی طرح حسن کی آرائشوں سے مالا مال ہوجاتی ہے۔

طلوعِ اسلام اسی طرح جب عرب گمراہی کی ضلالتوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل نے ایک ایسے سورج کا طلوع کیا جس کی درخشانی اور تابانی نے تاریک ترین راہگزروں کو بھی بقعۂ نور بنادیا۔ یعنی ۲۲۔اپریل ۵۷۱ء کو مکہ میں آفتابِ رسالت کا طلوع ہُوا۔ آپؐ کے والد محترم عبداللہ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی اس جہان سے رخصت ہوچکے تھے اور آپ ابھی چھ سال کے ہی تھے کہ آپ ماں کی شفقت سے بھی محروم ہوگئے۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ کا سن شریف آٹھ سال کا تھا، آپ کے دادا عبدالمطلب نے بھی سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اور آپؐ کی پرورش کا تمام بوجھ آپؐ کے چچا ابُوطالب کو برداشت کرنا پڑا۔ اس دوران میں اور جوانی کے آغاز تک آپ گلہ بانی کا کام کیا کرتے تھے۔ گویا اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آپ جس طرح بھیڑوں اور بکریوں کو درندوں اور خونخوار جانوروں سے محفوظ رکھتے ہیں اسی طرح آپؐ انسانیت کے گلّہ کے بھی راعی ہیں۔ ۱۳ سال کی عمر میں آپؐ ایک تجارتی قافلہ کے ہمراہ شام کو بغرضِ تجارت تشریف لے گئے اور اس کے چند سال بعد سرزمین عرب میں قریش اور بنی قیس میں خوفناک جنگ شروع ہوگئی۔ حضورؐ فخرِ دوعالم نے اس خونریزی کو دیکھا اور آپؐ کے حسّاس دل پر گہرا اثر ہوا۔ اور آپؐ نے حق وصداقت کو بلند رکھنے اور امنِ عامہ کی حفاظت کا تہیّہ کرلیا اور بالآخر آپؐ فریقین میں صلح وصفائی کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ تاریخ میں اس صلح کو "حلف الفضول" کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کی رو سے کمزوروں اور مظلوموں کی امداد اور حفاظت کا عہد کیا گیا۔

آپؐ جس وقت سن بلوغت کو پہنچے تو آپؐ نے اپنے آباؤ اجداد کی اقتدا میں تجارت شروع کر دی۔ آپؐ کی دیانت، صداقت، خلوص اور ایمانداری سے حضرت خدیجہؓ اس قدر متاثر ہُوئیں کہ اُنھوں نے آپؐ کو معمول سے دُگنا حصّہ دینے پر اصرار کیا۔

اصحابِ فیل کا واقعہ

یہاں پر تفصیل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے تمام واقعات کو رقم کرنے کی گنجائش نہیں لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپؐ کی ولادت کے سال میں یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے اپنے دارالخلافہ میں ایک عظیم الشان گرجا اس ارادہ سے تعمیر کیا کہ خلقِ خدا کا اژدہام کعبہ کی بجائے اس گرجا میں ہو تاکہ کعبہ کی روحانی اور دنیاوی عظمت کا قصرِ رفیع زمین پر آرہے۔ در اصل اس عزمِ مشومہ کی تہہ میں تثلیث کو کامرانی اور کامیابی سے ہمکنار دیکھنا مقصود تھا۔ چنانچہ اس ناپاک مقصد کی تکمیل کے ارادے سے کعبہ پر ایک جرار فوج کے ساتھ حملہ آور ہُوا۔ وُہ مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ٹھہر گیا اور اہلِ مکّہ کو اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لیے ایلچی روانہ کر دیا۔ اسی اثناء میں ابرہہ کے سپاہیوں نے عبدالمطلب کے بہت سے اونٹوں کو قبضہ میں لے لیا۔ حضرت عبدالمطلب اس سلسلہ میں اس کے پاس چل کر آئے۔ ابرہہ ان کی عظمت وجلالت کو دیکھ کر سخت متحیر ہُوا۔ اور ان کی تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ عبدالمطلب الحاح وزاری سے کعبہ کے استحفاظ کی درخواست کریں گے۔ لیکن اس کی امیدوں کے برعکس عبدالمطلب نے اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پر ابرہہ نے متعجب ہو کر پُوچھا کہ "آپ کو اپنے اونٹوں کی تو بڑی فکر ہے مگر کعبہ کے متعلق جس کو میں گرانے آیا ہُوں، آپ کو کوئی فکر ہی نہیں۔" عبدالمطلب نے

بلاجھجک جواب دیا کہ "میں اونٹوں کا مالک ہوں۔ مجھے ان کی حفاظت مطلوب ہے، کعبہ کا مالک خود اپنے گھر کی حفاظت پر قادر ہے۔ اور وہی اس کا بندوبست کرے گا۔" ازبسکہ قریش ابرہہ کے فشون قاہرہ کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ اس لیے وہ گرد و نواح کی پہاڑیوں میں روپوش ہو گئے۔ عبدالمطلب کعبہ کو چھوڑنے سے پہلے کعبہ میں گئے اور اس کی چادر کو تھام کر یوں دعا کی: "اے اللہ! یہ تیرا گھر ہے، ہم اس کی حفاظت سے عاجز ہیں تُو اپنے گھر کا آپ نگہبان ہو۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اور مورخین کا اتفاق ہے کہ ابرہہ کی فوج پر اتنی زبردست تباہی آئی کہ اس کے لشکر کا کثیر حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ باقی ماندہ بے سروسامانی میں تتر بتر ہو گیا۔ قرآن حکیم میں بھی مندرجہ ذیل آیات بیّنات میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل۔ الم یجعل کیدھم فی تضلیلٍ وارسل علیھم طیراً ابابیل ترمیھم بحجارۃٍ من سجیلٍ فجعلھم کعصفٍ ماکول۔

صحرائی تربیت

عرب شرفا میں دستور تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو چھاتیوں سے دودھ پلانے کی بجائے انھیں دیہات کی تندرست عورتوں کے سپرد کر دیتی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے چند دن بعد تک آپؐ کی والدہ محترمہ نے آپؐ کو دودھ پلایا اور اس کے بعد چند دن ثوبیہ نے جو ابولہب کی لونڈی تھیں، آپؐ کو دودھ پلایا۔ زاں بعد آپؐ حلیمہ سعدیہؓ کی تحویل میں دے دیے گئے دو سال بعد آپؐ پھر اپنی والدہ مکرمہ کے پاس تشریف لے آئے۔ لیکن فوراً ہی پھر دیہات میں بھیج دیے گئے۔ کیونکہ مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ آپؐ چھ سال تک دائی حلیمہ کے گہوارہ میں پرورش پاتے رہے اور اس کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس دوران میں آپؐ کی والدہ محترمہ مدینہ کی طرف اپنے خاوند کی قبر کی زیارت کے لیے سفر کر رہی تھیں کہ راستہ میں ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی خبرگیری کا بار آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے ذمے لے لیا۔ بچپن سے ہی آنحضرتؐ میں محبت، امانت اور صداقت کے جوہر نمایاں تھے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی امانت اور دیانت سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے خود آپ کے حبالۂ عقد میں آنے کی خواہش ظاہر کی، حالانکہ اس سے پیشتر عرب کے بڑے بڑے سردار حضرت خدیجہؓ سے نکاح کی خواہش ظاہر کر چکے تھے جسے آپ نے رد کر دیا تھا۔

حضرت خدیجہؓ

شادی کے وقت آپ کی عمر پچیس سال کی تھی اور حضرت خدیجہؓ آپؐ سے پندرہ سال بڑی، یعنی چالیس سال کی تھیں۔ لیکن عمر میں اس تفاوت کے باوصف ان کی آپس میں بیحد محبت تھی، حالانکہ اس وقت ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جتنی عورتوں سے چاہے شادی کر لے۔ حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کی۔ وہ لوگ جو کو رباطنی سے حضور صلعم کی شادیوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ وہ خدارا بتلائیں کہ ایک شخص جو عین شباب کے عالم میں ایک چالیس سالہ

بیوہ سے شادی کرتا ہے اور اس کی زندگی میں دُوسرے نکاح کا دل میں خیال تک نہیں لاتا۔ کیا اس کے متعلق بدباطن سے بدباطن شخص بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کی بعد کی شادیوں میں دنیاوی دلچسپیوں کو دخل حاصل تھا شادی کے پندرہ سال بعد آپ کو منصبِ نبوت عطا ہوا۔

حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کوئی اور شخص آنحضرتؐ کے قلبِ مبارک کی عمیق ترین گہرائیوں سے واقف نہیں تھا۔ انھوںؓ نے آنحضرتؐ کی زندگی کے ہر ایک پہلو کو خلوتوں میں باریک نگاہوں سے دیکھا تھا اور جس وقت آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہؓ سے اپنے منصبِ نبوت کا ذکر کیا۔ وہ آپ کی دیانت کو جانتی ہُوئی فوراً آپ پر ایمان لے آئیں۔

صلح و امن کا داعی

شادی کے کچھ عرصہ بعد مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے لوگوں پر آپؐ کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس زمانہ میں قریش کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اور جس وقت سنگِ اسود کو اس کی اصلی جگہ رکھنے کا سوال درپیش ہُوا تو ہر ایک قبیلہ اپنا حق مقدم سمجھتا تھا کہ وہ سنگِ اسود کو اس کی جگہ نصب کرے۔ اس قبائلی نزاع کے نتائج سخت خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ بالآخر یہ طے ہُوا کہ جو شخص علی الصبح سب سے پہلے کعبہ کی چار دیواری میں داخل ہو وہ اس جھگڑے کو جس طرح چاہے چکادے۔ خوبیِ قسمت سے سب سے پہلے جو شخص کعبہ کی چار دیواری میں داخل ہُوا، وُہ حضرت محمدؐ تھے۔ اس سے سب بہت خوش ہُوئے۔ اگر آپؐ چاہتے تو خود سنگِ اسود کو اٹھا کر اُس کی جگہ نصب کر دیتے۔ مگر آپؐ کی طبیعت میں خود غرضی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اپنی چادر مونڈھوں سے اتار کر زمین پر بچھا دی اس میں سنگِ اسود رکھا اور تمام قبیلوں کو چادر کے کونے پکڑنے کو کہا۔ اور خود بعد میں اُسے اٹھا کر اپنی جگہ نصب کر دیا۔ اور اس طرح ملک عرب کو ایک بہت بڑی خانہ جنگی سے نجات مل گئی۔ اس واقعہ سے آنحضرت کی معاملہ فہمی، وسعتِ خیال اور بے مثل رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔

سیرت اور اخلاق کا معجزہ

حضورؐ کی زندگی کے دو پہلو بہت زیادہ جاذبِ نظر ہیں۔ پہلے تو یہ کہ آپؐ اُمّی شخص تھے۔ لیکن خدا کی قدرت ہے کہ اسی اُمّی نے علم و حکمت، تمدّن و معاشرت کا وُہ عظیم الشان مینار تعمیر کیا جس کی روشنی نے جہالتوں اور تاریکیوں کے تمام پردے چاک چاک کر دیے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال ایسے ماحول میں بسر کیے جس میں شراب خوری، بُت پرستی اور عیاشی کا دور دورہ تھا لیکن آپؐ کا دامن ان آلائشوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ آپ کے بدترین دشمن کو کبھی آپ کی اخلاقی زندگی میں عیب جوئی کا حوصلہ نہیں ہُوا۔ منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پیشتر آپ کی زندگی سراسر معجزہ تھی۔ اور ہر وُہ شخص جس نے حضورؐ کی زندگی کا بہ نظر تعمق مطالعہ کیا ہے۔ ابو طالب کی طرح یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گا۔

"میں نے محمدؐ کو کبھی جھُوٹی بات کہتے نہیں سُنا۔ اُس کے لب کبھی غیر مہذب اور ناپسندیدہ الفاظ سے آشنا

نہیں ہوئے۔ اور وہ آج تک کسی غیر پسندیدہ مجلس میں نہیں بیٹھا۔"

حضرت محمدؐ کی زندگی ضبطِ نفس، پاکیزگی اور صداقت کا نمونہ تھی۔ آپ نے اپنی ضروریات کو اپنے خاندان کی ضروریات پر کبھی بھی مقدم نہ جانا۔ آپؐ کا خاندان تمام عرب بھر میں موقر اور معزز تھا۔ جب کبھی قریش آپ پر معترض ہوتے اور مخالفت کرتے تھے تو آپؐ انھیں برملا کہا کرتے تھے:

"اے قریش! میری زندگی کا ایک ایک لمحہ تمہارے سامنے بسر ہوا ہے، مجھے بتاؤ تو سہی کہ کیا تم نے اس عرصہ میں مجھ میں کوئی بھی نقص دیکھا۔"

یہ چیلنج آج بھی اسی طرح مشرق و مغرب میں گونج رہا ہے۔ اور حضورؐ کے بدترین دشمن کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ آپؐ کی زندگی کے کسی ایک واقعہ پر بھی حرف گیری کر سکے۔

بچپن میں ہی لوگ حضور صلعم کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ وہ آپ کو "الامین" کے معزز خطاب سے مخاطب کیا کرتے تھے۔" الامین" کا مفہوم محض روپیہ پیسہ میں امانت تک ہی محدود نہیں بلکہ صداقت کے ہمہ گیر مفہوم کے مترادف ہے۔

اولاد

حضرت خدیجہؓ کے بطن سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ آپؐ کے سب سے بڑے صاحبزادہ کا نام قاسمؓ تھا جن کی نسبت سے حضورؐ کو ابو القاسمؐ بھی کہا جاتا ہے۔ قاسمؓ دو سال کی عمر میں ہی آپؐ کو داغِ مفارقت دے گئے آپؐ کی سب سے بڑی صاحبزادی زینبؓ ابوالعاص کے حبالۂ عقد میں تھیں۔ رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے ہوئی۔ لیکن آپؓ جنگِ بدر کی فتح کے موقع پر انتقال فرما گئیں اور بعد ازاں اُمِ کلثومؓ حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئیں۔ آپؐ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الکبریٰؓ تھیں، جن کی اولاد تاریخ اسلام میں سید کہلاتی ہے۔ آپؓ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عقد میں تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی اولاد میں سے صرف حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہی زندہ رہیں۔ ایک دوسری بیوی سے حضورؐ کے ہاں ایک صاحبزادہ پیدا ہوئے جن کا نام ابراہیمؓ تھا۔ لیکن وہ بھی عالمِ طفولیت میں ہی انتقال فرما گئے۔ حضورؐ کو خدیجہؓ سے بے حد الفت تھی اور ان کی وفات کے بعد بھی وہ انھیں محبت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

انقلابِ عظیم

اسلام کے فاتحانہ سیلاب میں دنیا کی توہم پرستیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں۔ اور جس جگہ بُت پرستی اور شرک و طغیان کی خار دار جھاڑیاں تھیں، وہاں گلشنِ توحید لہلہانے لگا۔ اسلام دنیا میں ایک پاکیزہ تہذیب کا درخشاں باب ہے۔ ایک یتیم جس کی مخالفت میں طاغوتی طاقتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جس کو گھر سے بے وطن کیا گیا اور جسے طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ بالآخر عزم الامور کے طفیل ایک وحشی قوم کو فتح و نصرت کی بلندیوں تک پہنچانے میں بے مثل طور پر کامیاب ہوا اور

جو لوگ سیاسی، معاشی، عمرانی تاریکیوں کے گڑھوں میں گرے ہوئے تھے۔ وہی پاکیزگی، توحید، حریت، صداقت اور شجاعت میں ضرب المثل ہو گئے۔ ایک ربع صدی میں ایسے زبردست انقلاب کو پیدا کرنا تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ آنحضرتؐ ایک ہی وقت میں مصلح اعظم، کمانڈر انچیف، حاکم، مجسٹریٹ، اور قوموں کی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والے تھے۔

ازبسکہ انسانیت جہاں تک بنیادی اصولوں کا تعلق ہے اس چرخ نیلوفری کے نیچے ہر ایک جگہ ایک جیسی ہے۔ اس لیے زندگی کے تمام مسائل کم و بیش ہر ایک جگہ یکساں ہوتے ہیں جس طرح آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر چند الٰہی قوانین کی تاثیر نے عربوں کی مردہ قوم کو از سر نو زندگی کے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح آج ان قوانین کی برکت سے غلام ہندوستان[1] کی قسمت بدلی جا سکتی ہے۔ اسلامی قوانین آج بھی ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی بین الاقوامی مصائب کو حل کر سکتے ہیں۔

حضور نبی کریمؐ کی تعلیم نے ایک ایسے سیاسی مذہب کی بنیاد رکھی جس نے دہلی سے غرناطہ تک زندگی کے ہر شعبہ میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا اور روحانی، دماغی، سوشل، سیاسی اور اقتصادی پستیوں کو چشم زدن میں رفعت سے آشنا کر دیا۔ آج بھی ہمیں حضور رحمۃ للعالمینؐ کی تعلیم پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ کاشکے ہم اس آواز کو سن سکیں۔

حضورؐ کی بعثت سے قبل دنیا کے مختلف حصوں اور مختلف وقتوں کے لئے انبیائے کرامؑ تشریف لاتے رہے۔ ان کی تعلیم عالمگیر نہ تھی، اور عالمگیر ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں ابھی بہت وقت درکار تھا۔ بالآخر ہمارے ہادی عالم صلعم کا ورود مقدس اس وقت ہوا جب دنیا ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے وہ حقائق و معارف کے تمام امور کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسی لیے ہمارے پیغمبر آخر الزمانؐ کو "**رحمۃ للعالمین**" کے معزز لقب سے خالق اکبر نے سرفراز فرمایا۔

---

[1] بحمد اللہ ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو پاکستان عالم وجود میں آگیا۔ (ادارہ)

ذکر الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم

محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وردِ زباں جناب محمد کا نام ہے
قابل درود پڑھنے کے اپنا کلام ہے

اللہ اللہ کیا شرافت ہے اُس محفل ہمایوں کی جس میں جناب محبوب کبریا سرورِ اصفیا سید المرسلین خاتم النبیین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ افضل الصلوٰۃ والثناء کا ذکرِ خیر ہو اور سبحان اللہ کیا سعادت ہے اُن اہل ایمان کی جو اس مجلس مبارک میں حُسنِ عقیدت اور خلوصِ نیت سے حاضر ہوں۔ یہ وہ بزمِ باصفا ہے جس میں انوارِ عالمِ قدس سے نازل ہوتے ہیں اور یہ وہ بیان روح افزا ہے جسکے سننے کو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ میں بارھویں ربیع الاول کو اُس مجلس پاک میں حاضر ہوا جو مکہ معظمہ میں خاص مکانِ ولادت شریف میں منعقد تھی اور اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تولد کا مذکور تھا۔ دفعتاً کچھ انوار وہاں بلند ہوئے۔ میں نے جو بہ نظرِ تامل دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ انوار تھے اُن ملائکہ کے جو ایسی متبرک محفلوں میں حاضر ہوا کرتے ہیں اور وہ انوار تھے رحمتِ الٰہی کے۔ پس اے مسلمانو! تم کو چاہیے کہ اس انجمن عالی میں بصد ادب بیٹھو اور خوب ذوق وشوق سے احوال خیر اشتمال سنو اور حاضرین پر یہ بھی واجب ہے کہ درود شریف کی کثرت رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرتؐ پر درود پڑھنے کا امر فرمایا ہے اور حضرت سرورِ کائناتؐ نے فرمایا ہے کہ جو میرے ذکر کو سُن کر درود نہ بھیجے وہ بخیل ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ حدیث میں آیا ہے کہ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِيْ یعنی سب مخلوق سے پہلے خدا نے میرے نور کو پیدا کیا۔ روایت ہے کہ وہ نور عالمِ وجود میں آکر ستر ہزار برس تسبیح میں مصروف رہا اور پھر اس سے ملائکہ عرش وکرسی لوح وقلم آسمان وزمین جنّ وانس غرض جملہ عالم کا ظہور ہوا۔ ازاں بعد حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی اُس نور سے نورانی فرمائی گئی۔ اُسی نور کی تعظیم منظور تھی جو ربّ العرش نے فرشتوں کو حضرت آدمؑ کے سجدے کا حکم دیا اور یہی وہ گرانبہا امانت تھی جس کے تحمل سے پہاڑ اور زمین وآسمان عاجز ہوگئے اور انسان کے حوصلۂ بلند نے بسر وچشم کہہ کر اُٹھا لیا۔ ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

یہ نورِ رحمت ظہورِ پُشت ہائے پاک سے ارحامِ طیبہ میں نقل کرتا رہا یہاں تک کہ عرب کی عزت افزائی منظور ہوئی اور یہ ودیعت بدیع حضرت اسماعیلؑ سے بنی اسمٰعیلؑ کو اور بنی اسمٰعیل میں قریش کو اور قریش میں بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں عبد المطلب کو نصیب ہوئی۔

آنحضرتؐ کے والدِ ماجد عبداللہ عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ چاہِ زمزم حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی ایڑیوں سے کھد گیا تھا ایک مدت تو وہ کنواں بدستور رہا لیکن پھر اَٹ گیا اور اُس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ عبدالمطلب نے اُس کنوئیں کی جگہ خواب میں دیکھی اور ارادہ کیا کہ اُس کو پھر کھدوائیں۔ قریش سدِّ راہ ہوئے اور لڑائی کی نوبت پہنچی۔ بمصداق چاہ کن را چاہ درپیش۔ قریش اُس معرکہ میں مغلوب ہوئے اور عبدالمطلب غالب۔ عبدالمطلب کے اُس وقت ایک ہی بیٹا تھا اُنھوں نے نذر کی کہ اگر پروردگار مجھ کو دس بیٹے عطا فرمائے اور چاہِ زمزم بھی بن جائے تو میں اپنا ایک بیٹا قربانی کردوں۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے فضل سے عبدالمطلب کا مطلب پُورا کردیا۔ دس بیٹے بھی ہوئے اور چاہِ زمزم بھی درست ہوگیا۔ اب اُنھوں نے ارادہ کیا کہ نذر پوری کریں، قرعہ جو ڈالا تو عبداللہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب اُن کو ذبح کرنے لے چلے۔ چونکہ اُن کے چہرہ میں نورِ احمدیؐ کی درخشانی تھی اس لیے سب کو اُن کا ذبح ہونا ناپسند تھا آخر سو اُونٹ اُن کے سر پر سے قربان کر کے قربانی کر دی۔ عبداللہ کی شادی بی بی آمنہ سے ہُوئی جو وہب ابن عبدالمناف کی بیٹی تھیں جس سال نورِ محمدیؐ صلبِ پدر سے منتقل ہو کر بطنِ مادر میں آیا قریش صدمۂ قحط سے سینہ ریش تھے آپ کے قدم میمنت لزوم کی برکت سے مینہ خوب برسا اور ساری سرزمینِ عرب سرسبز اور سیراب ہوگئی حتیٰ کہ اس برس کا نام قریش نے سنۃ الفتح والابتہاج رکھا یعنی فتح اور خوشی کا سال۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ کو خواب میں آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت کی بشارت ہُوئی اور بشارت دینے والے نے آپؐ کے واسطے نامِ محمدؐ بتایا۔ بارھویں ربیع الاوّل کو پیر کے دن صبح صادق کے وقت حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات نے اس عالمِ خاک کو اپنے وجودِ باجود سے رشکِ افلاک بنایا۔

شعر

یکایک ہُوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بُوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاک بطحانے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہُوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا — دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوٰے — یتیموں کا والی غلاموں کا مولا
خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کا شیر و شکر کرنے والا

اشعار

تو محبوب جانی و جانِ جہانی — فدائے تو صد عمر و صد زندگانی

به نورِ ہدایت چراغِ زمینی — برفعت فزوں تر ز ہفت آسمانی
علیہ صلواتی علیہ سلامی — امینِ زمینی امانِ زمانی
تو سلطانِ جودی و شاہِ وجودی — بنورِ جبیں رہبرِ کامرانی
چو شوقِ تو دیدم فراموش کردم — جمالِ جوانی سماعِ اغانی
تو ساقیِ حقی و جانِ جہاں را — ز فیضِ تو باشد شرابِ مغانی
امانِ دیاری شریعت دثاری — طریقت تو داری حقیقت تو دانی
شریعت چہ گوید حقیقت چہ جوید — معانِ المبادی مبادِ المعانی
ز سیرِ سلوک تو جبریلؑ وا ماند — کہ با تو نیارد کسے ہمعنانی

جمیلی کریمی جزیلی کفیلی
ترا قاسمی بندۂ جاودانی

خالقِ اکبر جلّ جلالہٗ نے اس لیے کہ غافل ہوشیار و خبردار ہو جائیں آنحضرتؐ کے تولّد کے وقت بہت سے امورِ عجیبہ ظاہر فرمائے۔ اُمِّ عثمان بن ابی العاص سے روایت ہے کہ جب حضرت پیدا ہُوئے تو تارے جُھک کر زمین سے ایسے قریب ہو گئے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ گر پڑیں گے۔ اس میں یہ ایما تھا کہ حضرت سرورِ کائنات کُل انوار کے مرکز ہیں اور ہر شے اپنے مرکز کی طرف مائل ہوا کرتی ہے۔ ملک فارس کے آتشکدوں کی آگ جو ہزار برس سے دہک رہی تھی بُجھ گئی اس میں یہ رمز تھی کہ دینِ حق کے جلوہ سے آتش پرستی کی گرم بازاری نہ رہے گی۔ دریائے ساوا سُوکھ گیا اس میں یہ اشارہ تھا کہ اب آب پرستی اور پرستشِ دریا پر پانی پھر جائے گا۔ تمام رُوئے زمین کے بُت اوندھے گر پڑے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ کی رسالت سے بُت پرستی کا مُنہ کالا ہوگا۔ نوشیرواں بادشاہِ ایران کے محل میں زلزلہ پیدا ہُوا اور اُس کے چودہ کنگورے ٹُوٹ گئے۔ ؎

لرز کر گر پڑے چودہ کنگورے قصرِ کسریٰ کے
اُٹھا جب شور عالم میں نبی کی آمد آمد کا

چنانچہ آج تک وہ محل جس کا نام طاقِ کسرا ہے بغداد کے قریب شہر مداین کے ویرانہ میں پھٹا کھڑا ہے۔ سیاح وہاں جا کر اب تک اس معجزے کو دیکھتے ہیں اس میں یہ راز تھا کہ آپؐ کی برکت سے شجاعانِ عرب کے قدم تختِ جم پر جم گئے اور شاہانِ عجم کی حکومت کی بنیاد ہل گئی۔ چودہ کنگورے گرنے میں یہ سِرّ تھا کہ اس کے بعد چودہ بادشاہ اس خاندان نوشیروانی میں اور فرمانروائی کریں گے پھر قصرِ ابیض کا خزانہ غازیانِ عرب کا مال ہوگا۔ آپ کے والد ماجد تولّد شریف سے پہلے وفات پا گئے تھے چھ برس کی عمر تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ نے رحلت کی اور جدِّ امجد عبدالمطلب پرورشِ ظاہری کے متکفل ہُوئے۔ جب سِنِ اقدس آٹھ پر پہنچا وہ بھی دنیا سے اُٹھ گئے پھر آپ کے عمِ بزرگوار ابوطالب نے سرپرستی اپنے ذمہ لی۔ بارہ برس کی عمر میں ابوطالب کے ساتھ آپ ملکِ شام کو تشریف لے گئے۔ راستہ میں ایک نصرانی عابد نے جس کا نام بحیرا تھا اُن علامتوں سے جو اُس نے اپنی کتابوں میں دیکھی تھیں آپ کو

پہچانا اور دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا کہ یہ بے شک رسولِ ربّ العالمین ہیں۔ آپ کے ہمراہیوں نے پُوچھا: تم نے کیسے جانا تو اس نے جواب دیا کہ جس وقت تم یہاں آئے میں نے دیکھا کہ شجر و حجر نے آپ کو سجدہ کیا۔ ۲۵ برس کی عمر میں آنحضرتؐ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے شادی کی۔ اکتالیسویں سال حضرت جبریلؑ وحی لے کر آپ کی خدمت میں آئے اور سورۂ اقرأ نازل ہُوئی جب سن شریف پچاس کا ہوا، معراج واقع ہُوئی۔ نزولِ وحی کے بعد تیرہ برس مکہ معظمہ میں قیام فرمایا پھر ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے اور دس برس مدینہ منورہ آپ کے جمال باکمال سے منور و مشرف رہا۔ ۲۷ غزووں میں بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے اور نو لڑائیوں میں تلوار چلائی۔ تین حج ادا فرمائے، دو حج کے فرض ہونے سے پہلے اور ایک اس کے بعد۔ یہ اخیر حج حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے خالق اکبر عزّ نوالہٗ نے آپ کو جمال ظاہری بھی کامل عطا فرمایا تھا ؎

وہ نبیوں میں ہُوئے ایسے کہ ختم الانبیاء ٹھہرے
حسینوں میں ہوئے ایسے کہ محبوبِ خدا ٹھہرے

حلیہ اشرف یہ ہے: قدِ اقدس میانہ، رنگ ہمایوں سُرخ و سفید بانمکینی و ملاحت، سر بزرگ بڑا، موئے شریف سیاہ و نرم اور کسی قدر گھونگر والے کبھی گردن تک اور کبھی کان کی لو تک، بالوں میں مانگ نکلی رہتی اور تیسرے روز تیل پڑتا۔ گوشِ حق نیوش متوسط، پیشانی نورانی کشادہ و تاباں، ابروئے مبارک باریک وخمیدہ اور کسی قدر ایک دوسرے سے جدا دونوں ابرؤوں کے بیچ میں رگ ہاشمی تھی جو غصہ کے وقت اُبھر آتی تھی، چشم خدا بیں بڑی پتلیاں خوب سیاہ اور سپیدی میں سُرخی کے ڈورے، مژگاں شریف بڑی، رُخسارِ معلّٰی نرم اور پُرگوشت لیکن نہ پھولے ہُوئے، بینی پاک بلند اور روشن، دہنِ مقدس بڑا مگر نہ ایسا فراخ جو بدنما ہو، دنداں مبارک تابدار اور کچھ کچھ جدا، وقتِ تکلم یہ معلوم ہوتا تھا کہ دانتوں میں سے نور نکلتا ہے اور ہنگام تبسم بجلی کی سی جلا محسوس ہوتی، چہرہ نہ لانبا نہ بالکل گول۔ ریش احسن خُوب بھری ہُوئی اور اس کے گھنے بال سینہ کو پُر کرتے۔ گردنِ نور معدن صاف وشفاف گویا سانچے میں ڈھلی۔ دوشِ اقدس پُر گوشت باہم پیوستہ نہ تھے اُن کے بیچ میں مہر نبوت، دست حق پرست لانبے، انگلیاں لمبی اور خوشنما، تمام بدن کے جوڑ خوب قوی اور مضبوط، کفِ دست کشادہ اور نہایت نرم، بغلیں سپید خوشبو جن میں بالوں کا نام نہیں، سینہ صفا گنجینہ چوڑا، پنڈلیاں گول ہموار اور صاف اور فی الجملہ باریک۔ کفِ پا (خاکش آبروئے سرم) پُرگوشت اور بیچ میں خالی، پاؤں کی انگلیاں مضبوط انگوٹھے کے پاس کی انگلی انگوٹھے سے بڑی، جن خوش قسمت بزرگوں نے وہ جمال جہاں آرا دیکھا اُن سب کی رائے اس پر متفق ہے کہ ایسی پاکیزہ شکل نہ آپ سے پہلے دیکھی نہ آپ کے بعد، مزاج عالی میں نفاست بہت تھی ہمیشہ صاف سُتھرے رہنے کو پسند فرماتے اور میلے کچیلے آدمی سے ناخوش ہوتے۔ جسم اطہر سے بُوئے جان پرور آتی جس راہ سے آپؐ تشریف لے جاتے خوشبو سے مہک جاتی اور جو وہاں سے گزرتا اُس کو معلوم ہوجاتا کہ حضور اس طرف سے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کا سایہ نہ تھا۔ سایہ تو اجسام کثیف کا ہوتا ہے، آپؐ تو سراپا نور تھے پھر سایہ کس کا ہوتا ؎

یہ تھی رمز جو اُس کا سایا نہ تھا
کہ رنگِ دوئی واں سمایا نہ تھا

آنحضرتؐ کو جو دفعتاً دیکھتا جلال نبوت سے اُس پر ہیبت طاری ہوجاتی مگر جب حضور میں رہتا اور لطف و مدارا دیکھتا اُس کا قلب آپ کی محبت سے مالا مال ہوجاتا۔ معجزات آپ کی ذات بابرکات سے بہت صادر ہُوئے چند یہاں تحریر ہوتے ہیں۔

جب آپ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی حضرت ابوبکر صدیقؓ ہمرکاب تھے۔ راستہ میں سراقہ ابن مالک کا فروں کے بھیجے ہوئے سوار نے آ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دیکھ کر کہا کہ یارسول اللہؐ! کافر آن پہنچے۔ آپ نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا اے ابوبکر! کچھ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے۔ پھر آپ نے بددُعا فرمائی فوراً اُس سوار کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ وُہ فریاد کرنے لگا کہ مجھ کو اس بلا سے نجات دیجیے جو کافر راہ میں ملے گا اُس کو لوٹاے جاؤں گا۔ آپ نے دعا کی اُس کا گھوڑا نکل آیا اور اُس راستہ میں جو کافر اس کو ملا یہ کہہ کر لوٹا تا گیا کہ میں دیکھ کر آیا ہُوں اِدھر کوئی نہیں گیا۔

دوسرا معجزہ: غزوۂ حُدیبیہ میں پانی نبٹ گیا اور پیاس کی شدت ہُوئی۔ آنحضرتؐ کے پاس ایک لوٹے میں پانی تھا، جس سے آپ نے وضو فرمایا اہلِ لشکر حاضرِ خدمت ہُوئے اور عرض کیا کہ سوائے اس لوٹے کے پانی کے فوج میں پانی بالکل نہیں نہ پینے کو اور نہ وضو کرنے کو۔ آپ نے دستِ مبارک اُس لوٹے میں رکھ دیا اور آپ کی اُنگلیوں سے پانی چشمہ کی طرح اُبلنے لگا۔ سب نے خوب پیا اور وضو کیا۔ حضرت جابرؓ سے جو اس حدیث کے راوی ہیں لوگوں نے پُوچھا کہ اس روز سب کتنے آدمی وہاں تھے؟ انھوں نے کہا کہ اگر لاکھ آدمی ہوتے تو بھی سیراب ہوجاتے، ہم سب پندرہ سو آدمی تھے۔

تیسرا معجزہ: حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ ایک مرتبہ چلے، اک کھلے میدان میں منزل ہُوئی، آپؐ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے گئے، اتفاقاً وہاں کچھ آڑ نہ تھی میدان کے کنارے پر دُور دُور البتہ دو درخت تھے آپؐ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور ایک درخت کی شاخ پکڑ کر فرمایا: اِنْقَادِیْ عَلَیَّ بِاِذْنِ اللّٰہِ یعنی خدا کے حکم سے میرے ساتھ چلا آ۔ وُہ درخت اس طرح آپ کے ساتھ ہولیا جیسے کوئی اُونٹ کی نکیل پکڑے لاتا ہے۔ پھر آپ نے دُوسرے درخت کی طرف قدم رنجہ فرمایا اور اُس کو بھی وہی ارشاد کیا، وہ بھی ہمراہ ہولیا۔ جب بیچ میدان میں آئے آپ نے حکم دیا کہ خدا کے حکم سے دونوں مل جاؤ۔ دونوں مل گئے۔ اُن کی آڑ میں بیٹھ کر آپ نے فراغت حاصل کی۔ پھر وہ دونوں الگ الگ ہو گئے۔

چوتھا معجزہ: حضرت سلمہ بن اکوع کے پاؤں میں زخم کا نشان تھا۔ کسی نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ خیبر کی لڑائی میں میرے زخم لگا تھا اُسے دیکھ کر ساتھ والوں نے کہا کہ اب سلمہؓ نہ بچیں گے۔ میں حضورِ نبوی میں حاضر ہُوا اور آپؐ نے تین بار لعابِ دہن اُس میں ڈال دیا اور سب شکایت جاتی رہی۔

پانچواں معجزہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میری والدہ مشرکہ تھیں اور میں ہمیشہ اسلام لانے کے واسطے اُن سے کہا کرتا تھا، ایک دن میں نے انکو دعوت اسلام کی اُنھوں نے آں حضرتؐ کی شان میں کچھ کلماتِ مکروہ استعمال کیے۔ مَیں روتا ہُوا درِ اقدس پر حاضر ہوا اور گزارش کی کہ یارسول اللہؐ! میری ماں کے لیے دعائے ہدایت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا: اللّٰھُمَّ اھْدِ اُمَّ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ۔ یعنی اے اللہ! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت دے۔ میں آپؐ کی دعا سے خوش ہو کر چلا آیا۔ گھر کے دروازہ پر جو پہنچا تو دروازہ بند۔ میری والدہ نے میرے پاؤں کی آہٹ سُن کر کہا کہ اے ابوہریرہؓ! وہیں کھڑے رہو۔

میں کھڑا ہوگیا اور پانی کے گرنے کی آواز سُنی۔ والدہ نہا کر اور کپڑے پہن کر کواڑ کھولنے آئیں اور ایسے جلد کہ دوپٹا بھی نہ اوڑھا دروازہ کھولا اور مجھ کو مخاطب کر کے کہنے لگیں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ میں دیکھ کر آپؐ کو خوشخبری سُنانے دوڑا اور جوشِ خوشی سے میرے آنسو جاری تھے۔ آپؐ نے سُن کر شکر ادا کیا اور کلمات خیر فرمائے۔

چھٹا معجزہ: ایک شخص آپ کا منشی تھا۔ شامت اعمال سے مرتد ہوگیا اور مشرکوں میں جا ملا۔ آپ نے سُن کر فرمایا: زمین اُس کو نہ لے گی۔ حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ اتفاقاً میرا گزر اُس سرزمین پہ ہوا جہاں وُہ مرا تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ اُس کی لاش باہر پڑی ہے۔ میں نے پوچھا، لوگوں نے کہا کہ ہم نے بہت دفعہ دفن کیا، زمین اُس کو قبول نہیں کرتی۔

ساتواں معجزہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ خطبہ فرمانے کے وقت ایک چوبی ستون سے تکیہ لگا کر کھڑے ہوا کرتے تھے۔ جب منبر تیار ہُوا اور آپ نے اس پر استادہ ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا تو وہ لکڑی کا ستون اس طرح چیخنے لگا کہ گمان ہوتا تھا شق ہو جائے گا۔ آپؐ منبر سے اُترے اور اُس کو پکڑ کر چپٹا لیا، تب وہ چُپ ہوا اور ایسی سسکیاں بھرنے لگا جیسے کسی بچے کو رونے سے چُپ کراتے ہیں اور وُہ سسکتا ہے۔ حضرت جابرؓ نے کہا ہے کہ وُہ اُس بیان کے شوق میں رویا جو آپ سے سُنا کرتا تھا۔

آٹھواں معجزہ: حضرت ابوبکرؓ سے روایت آئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کے لوگ ایک وسیع زمین پر آباد ہوں گے جس کا نام بصرہ ہے۔ اُس دریا کے کنارے پر جس کا نام دجلہ ہے دریا پر پُل ہوگا وہاں آبادی بہ کثرت ہوگی اور وُہ شہر منجملہ اُن شہروں کے ہوگا جو مسلمان آباد کریں گے۔ آخر زمانے میں قنطوراء نام کی ایک قوم کی اولاد جن کے مُنہ چوڑے اور آنکھیں چھوٹی ہوں گی، حملہ کرے گی اور لبِ دریا اُترے گی۔ اہلِ شہر کے تین حصّے ہو جائیں گے۔ ایک حصّہ جان بچانے کو بھاگے گا اور جنگل میں ہلاک ہوگا۔ دُوسرا فرقہ امان لے گا وہ بھی قتل ہوگا۔ تیسرے فریق کے آدمی اپنے اہل وعیال کی حفاظت کے لیے لڑیں گے وہ شہید ہیں۔ سُبحان اللہ! یہ پیش گوئی ہمارے ختم المرسلین کی کیسی سچّی ہُوئی۔ دجلہ کے کنارے پر خلفائے عباسیہ نے متصل بصرہ شہر بغداد آباد کیا اُس کی رونق اور آبادی عروجِ کمال پر پہنچی۔ آپؐ کی وفات کے چھ سَو چالیس برس بعد تاتاری ترکوں نے ہلاکو خاں کی ماتحتی میں بغداد پر حملہ کیا۔ بڑے بڑے علماء اور خلیفہ مستعصم باللہ امان لے کر باہر نکلے تاتاریوں نے سب کو ذبح کر ڈالا۔ ہزاروں مسلمان لڑ کر شہید ہُوئے۔ بہت سے بیچارے جان بچا کر بھاگے۔ خدا جانے غربت اور پریشانی میں کس مصیبت میں بیچارے مرے۔

حضرت کی ذات بابرکات جامع جمیع صفات وکمالات تھی۔ خالق عالم جلّ جلالہٗ اپنے کلامِ پاک میں فرماتا ہے: انك لعلی خلق عظیم۔ اے محمدؐ! تمھارا اخلاق بہت بڑا ہے۔ آپ کے حلم اور عفو کا یہ عالم تھا کہ جب جنگِ اُحد میں مشرکین سے لڑائی ہُوئی تو آپ کا نیچے کا ایک دانت پتھر کے صدمہ سے شہید ہوگیا۔ سر گنجینۂ اسرار میں ایک زخم لگا اور چہرۂ مبارک پر خون بہنے لگا اصحابؓ نے جو یہ رنگ دیکھا اُن کو بہت شاق ہوا اور عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہؐ! ان کافروں کے حق میں دعاءِ بد فرمائیے۔ آپ نے جواب دیا کہ میں بد دعا کرنے کے واسطے نہیں بھیجا گیا ہُوں خدا نے مجھ کو اپنی مخلوق کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے پھر اُن کافروں کے

حق میں یہ دُعا زبانِ حق ترجمان پر جاری ہوئی اللھم اھد قومی فھم لا یعلمون۔ یعنی اے خدا! میری قوم کو ہدایت دے وُہ جانتے نہیں ہیں۔ اللہ اللہ یہ بلندیِ حوصلہ کفار کی وہ شقاوت اور آپ کی یہ شفقت، انھوں نے زحمت پہنچائی آپ نے دُعائے خیر سے اُن کو یاد کیا اور پھر اس لُطف سے کہ قومی کہہ کر اور بارگاہِ الٰہی میں اُن کی طرف سے عذر خواہی بھی کر دی کہ وہ یہ جہالت اس لیے کرتے ہیں کہ میرا مرتبہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ؎

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جُود و سخاوت کا یہ حال کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے کبھی سوال کے جواب میں "لا" نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ نوّے ہزار درہم آپ کے پاس آئے اُن کو آپ نے بانٹنا شروع کیا جو سامنے آیا اُسی کو عطا فرماتے گئے۔ یہانتک کہ سب اُسی وقت بانٹ دیئے۔ ؎

بر روئے زدہ کفِ خجالت

با جود کفِ تو بحرِ موّاج

شجاعت اور بہادری کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت علی شیرِ خداؓ فرماتے ہیں کہ جب لڑائی کا معرکہ گرم ہوتا تھا تو آں حضرتؐ سب سے آگے ہوتے تھے۔ ایک شب مدینہ والوں کو کچھ خوف پیدا ہُوا اور آدمی باہر دوڑے کہ دیکھیں کیا ہے وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ آپ سب سے پہلے مقامِ خطرناک پر اس شان سے پہنچ گئے تھے کہ ابو طلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور تلوار شانہ سے آویزاں تھی۔ ان لوگوں کو آپ یہ فرما کر تسلّی دینے لگے لم تراعوا مت گھبراؤ مت گھبراؤ۔ ؎

در صفِ ہیجا بوقت صولتِ اعدا

کوہ خجل ماند از ثباتِ محمدؐ

حیا کا یہ نقشہ کہ اگر کوئی شخص بُرا کام کرتا اور آپؐ اُس کو سُنتے تو نصیحت فرمانے کے وقت اُس آدمی کا نام نہ لیتے بلکہ یُوں فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو ایسے بُرے کام کرتے ہیں۔ خلقِ خدا پر عنایت و شفقت کا یہ حال تھا کہ آپ کی رافت و مہربانی اپنے بندوں کے حال پر ملاحظہ فرما کر خود خدا تعالیٰ نے اپنے دو نام نامی آپ کو بطور خطاب عطا فرمائے یعنی وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ، دوسری جگہ فرمایا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اُس رحمت پر روح فدا ہو جس کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے کافروں پر بھی اگلی امتوں کے گنہگاروں کی طرح عذاب نازل نہیں فرمایا اور منافق بدسرشت آفت قہر سے بچے رہے۔ آپ کے پاس بیٹھنے والے سب یہی خیال کرتے کہ سب سے زیادہ نظرِ عنایت مجھی پر ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ میں آٹھ برس کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک آپ کی خدمت کرتا رہا کبھی آپ نے ہوں نہیں کہا۔ اگر میں نے کوئی کام کیا تو یہ نہ فرمایا کہ کیوں کیا اور نہ کیا تو یہ نہ پوچھا کہ کیوں یہ کام نہیں کیا۔ اگر نماز میں کسی بچّے کے رونے کی آواز گوشِ مبارک میں چلی جاتی تو غایتِ لطف سے آپ نماز جلد ختم فرما دیتے تاکہ اُس بچّے کے مربی اُس کی تسکین و تشفی کر سکیں۔ بلّی پیاسی آتی تو آپ پانی کا برتن اُس کی طرف جھکا دیتے اور جب تک

وہ خوب سیر ہو لیتی آپ برتن جھکائے رکھتے۔ عہد کی استواری اور وفاداری اس قدر تھی کہ ایک یہودی کا قرض آپ کے ذمّہ تھا ایک دن اُس نے تقاضا کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے اُس نے کہا کہ اے محمدؐ! میں تم کو یہاں سے بے لیے نہ جانے دُوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا میں تمھارے پاس بیٹھا جاتا ہوں یہ کہہ کر آپ وہاں بیٹھ گئے اور پانچوں وقت کی نمازوں میں آپ نے پڑھی۔ صحابی اس یہودی کو ڈراتے اور دھمکاتے تھے۔ آخر آپ سے عرض کرنے لگے کہ یا رسول اللہؐ! ایک یہودی آپ کو روکے بیٹھا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو عہد شکنی سے منع فرمایا ہے۔ جب دن چڑھا تو وہ یہودی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ گستاخی میں نے اس واسطے کی کہ دیکھوں تورات میں جو صفت نبی آخر الزماں کی ہے آپ میں پائی جاتی ہے یا نہیں اب مجھ کو معلوم ہو گیا کہ بیشک آپ سچے نبیؐ ہیں۔ وُہ یہودی بڑا مالدار تھا اپنا سب مال لاکر آپ کی خدمت میں پیش کیا کہ اس کو راہِ خدا میں صرف کر دیجیے۔ آپ کو حضرت حلیمہ نے دُودھ پلایا تھا جب کبھی وُہ آتیں تو آپ اپنی چادر بچھا دیتے کہ وُہ اس پر بیٹھ جائیں۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی بیوی تھیں، اگرچہ ان کا انتقال ہو گیا لیکن جب آپ کے پاس ہدیہ آتا تو آپ فرما دیتے یہ فلاں عورت کے گھر دے آؤ خدیجہؓ کو اس سے محبت تھی۔ جب حضرت خدیجہؓ کی کوئی ملنے والی دولت خانہ پر آنکلتی تو آپ بڑی نوازش و نرمی سے اُس کا حال پُوچھتے۔

تمکین و وقار ایسا کہ آپ کبھی قہقہہ نہ مارتے، صرف تبسم فرماتے، اکثر سکوت میں رہتے اور بے ضرورت کلام نہ فرماتے مجلس ہمایوں میں بآواز بلند کوئی بات نہ کرتا حاضرین اس طرح ساکت بیٹھتے جیسے اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔

آپ کے زہد کی یہ کیفیت تھی کہ اگرچہ اخیر زمانے میں آپ حجاز، یمن و دیگر ممالک عرب اور عراق و شام کے سرحدی ملکوں کے بادشاہ تھے لیکن حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کبھی دو دن برابر جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ دنیا سے رحلت کر گئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ایک ایک مہینے گھر میں چُولھے میں آگ نہ جلتی اور مع اہل وعیال کے صرف سُوکھی کھجوروں پر قناعت فرماتے۔ آپ اپنا جُوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، اپنی بکریوں کا دُودھ خود دوہ لیتے، پھٹے پُرانے کپڑے سی لیتے۔ غرض اپنا اکثر کام خود اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے اور فرماتے تھے کہ اپنا کام اپنے آپ کرنا چاہیے۔ کسی دُوسرے کی مدد کا محتاج اتنا بھی نہ رہے کہ مسواک کے ٹکڑے کی برابر اُس سے مدد مانگے۔ ایک دفعہ سفر میں آپ نے بکری ذبح ہونے کا حکم دیا۔ ایک نے کہا ذبح میں کرونگا دُوسرا بولا کھال مَیں اتاروں گا۔ تیسرے نے کہا میں پکاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ لکڑیاں میں لاؤں گا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ کی طرف سے ہم لے آئیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: یہ سچ ہے لیکن میں نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو سب یاروں سے ممتاز بنالوں۔ خدا اس بات کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ کہہ کر آپ لکڑیاں لینے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ابتدائے عہد میں ہم نے فقر و فاقہ کی شکایت کی اور اپنے پیٹ کھول کر دکھائے کہ ایک ایک پتھر ہم سب کے پیٹ سے بندھا ہُوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اپنا شکم مبارک دکھایا تو اُس پر دو پتھر بندھے ہُوئے تھے۔ روحی فداک یا رسول اللہ۔

تواضع اور انکسار آپ کے مزاج میں ایسا تھا کہ مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ اہل محفل کے زانو سے اپنا زانو آگے نہ بڑھاتے۔ اگر صحابہؓ آپ کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تو آپ ان کو منع فرما دیتے کوئی مسکین بیمار ہوتا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی غلام بھی دعوت کرتا تو آپ قبول فرما لیتے۔ آپ کی شان جلال دیکھ کر اکثر آدمی خائف ہو جاتے، تو آپ انکی

یُوں تسکین فرماتے کہ میں کوئی بادشاہ قہار نہیں ہُوں۔ قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہُوں تم مطمئن رہو۔

امانت آپ میں ایسی تھی کہ خدا تعالیٰ قرآن پاک میں آپ کی امانت کی مدح فرماتا ہے۔ مُطاع ثم امین۔ اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ کفارِ مکہ ہر چند آپ کے سخت دشمن تھے مگر جب کوئی اُن سے آپ کی نسبت سوال کرتا تو یہی کہتے کہ چاہے کچھ ہو آپؐ امین اور سچے تو ضرور ہیں۔ جب آپ کا فرمان ہرقل بادشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا تو اس نے اہلِ دربار کو حکم دیا کہ دیکھو آجکل ہمارے شہر میں عرب بھی ہیں یا نہیں اگر ہوں تو میرے سامنے لاؤ تاکہ اُن سے آپ کے حالات دریافت کروں۔ اتفاقاً قریش کا ایک کارواں وہاں گیا ہوا تھا۔ ابوسفیانؓ قافلہ سالار تھے۔ بادشاہ نے اُن سے پُوچھا کہ یہ نبی کبھی جھُوٹ بھی بولتے ہیں، تو ابوسفیانؓ نے باوجود کافر ہونے کے کہا کہ نہیں آپؐ نے آج تک کبھی خیانت نہیں کی اور نہ کبھی جھُوٹ بولتے ہیں۔ ؎

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است (غالبؔ)

اپنے رب کا خوف اس قدر تھا کہ شب کو نماز میں یہاں تک قیام فرماتے کہ پائے مبارک وَرم کر جاتے۔ آپ کی یہ جفاکشی دیکھ کر صحابیوںؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے عفو فرما دیے پھر کیوں اس قدر تکلیف اور زحمت آپ اٹھاتے ہیں، آپؐ نے جواب میں فرمایا: افلا اکون عبداً شکوراً یعنی جب خدا نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں تو کیا میں شکر بھی نہ ادا کروں۔

روایت ہے کہ آپ ایک ایک دن میں ستّر ستّر دفعہ استغفار فرماتے۔ نماز میں خشوعِ قلب کا یہ عالم تھا کہ فرطِ جوش سے سینۂ انوار خزینہ سے ایسی آواز نکلتی جیسے دیگچی جوش کھا رہی ہو۔ ؎

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا محمد اشرف

نبوت سراسر رحمت ہے، ہر نبی رحمت بن کر آیا، چنانچہ آیت :-

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ط (البقرہ) — اور اللہ تعالیٰ خاص کرتا ہے اپنی رحمت (نبوت) سے جس کو چاہتا ہے۔

کا یہی مراد ہے، لیکن وہ ذاتِ پاک جسے اللہ تعالیٰ نے "رحمۃ للعٰلمین" کے نام سے نوازا، وہ صرف ہمارے آقا و مولا حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، قولِ خداوندی ہے :

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ — ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپؐ کی رحمت زمان و مکان کی وسعتوں پر چھائی ہوئی اور ازل و ابد پر محیط ہے۔ آپؐ کا ہر قول و فعل، ہر ارادہ و عمل، ہر حرکت و سکون، ہر تکلّم و سکوت، ہر نظریہ و فکر، غرض زندگی کا ہر جزو کل رحمت ہی رحمت ہے، نہ صرف آپؐ کی ذات بابرکات ہی سراپا رحمت ہے بلکہ آپؐ کا دیا ہوا صحیفۂ الٰہی، آپؐ کا پہنچایا ہوا دین، آپؐ کی لائی ہوئی عبادات، آپؐ کی شریعت اور اس کا ایک ایک حکم، آپؐ کا پیش کردہ طرزِ ماندوبود، نظامہائے معیشت و معاشیات، واقتصاد و سیاسیات، عدل و معاشرت اور انسان کے جملہ طبقات اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ہدایات سب نری رحمت ہی ہیں صحیفۂ اسلام کے بارے میں قرآن خود گویا ہے :-

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - (سورۂ بنی اسرائیل ۸۲) — اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں شفا اور رحمت ہیں۔ (بیان القرآن)

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ - (النحل) — اور ہم نے آپؐ پر قرآن اُتارا ہے کہ تمام (دین کی) باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور بڑی خوشخبری سنانے والا ہے۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام کے پیام میں سب سے پہلی بات جس کی طرف دعوت دی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہوتی ہیں، اس لیے تصوّرِ الٰہی اور صفاتِ خداوندی، مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت ہی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں مصرِ قدیم نے خدا کی

ذات کو نو کروڑ خداؤں میں تقسیم کر دیا۔ ہندوؤں نے خدا کی صفات کو لاکھوں دیوتاؤں میں بانٹ دیا۔ یونان قدیم مختلف پہاڑوں پر اپنے مختلف دیوتاؤں اور خداؤں کی جلوہ سامانیاں دیکھتا رہا۔ بدھ کی تعلیمات خدا کے ذکر سے ساکت ہیں۔ زردشت کو آگ میں یزداں کا جلوہ دکھائی دیا اور سلبی صفات اہرمن کے حوالے کر دی گئیں۔ یہودی صحیفے اور موجودہ تورات عموماً اللہ تعالیٰ کی صفات کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ یہود کے ہاں اللہ کا خصوصی نام "یہواہ" اور عام نام "الوہیم" ہے۔ لیکن صفات میں اگر کسی صفت کا ذکر ہوتا ہے تو وہ جلال کا مظہر "ذوجوں والا خداوند" ہے۔ موجودہ عیسائیت خدائی صفات کو "اقانیم ثلاثہ" کے فلسفہ کے عقدۂ لاینحل میں گم کر بیٹھی، خدا کو "باپ" کا نام لے کر مادی صفات سے تنزیہ خداوندی کو آلودہ کر دیا گیا۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہاڑی وعظ بے شک محبت و پیار کا پیام ہے۔ لیکن اس وعظ کو اگر عیسیٰ علیہ السلام کے قول پر پرکھا جائے کہ "جیسے درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان عمل سے پہچانا جاتا ہے"، عیسائیوں کا عمل ثابت کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی وہ تعلیم کوہ زیتون کی فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

اب آیئے اس پیغمبر (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آخری وصیت اور تورات کے آخری کلمات اور پیشگوئی کے مطابق کوہ فاران پر دس ہزار قدسیوں[1] کے ساتھ آیا اور جس کے منہ میں خداوند نے اپنا کلام ڈالا اور جو کچھ خدا نے اس سے کہا وہ سب اس نے لوگوں سے کہا۔[2] اور وہ رسولؐ جس کا وعدہ عیسیٰ علیہ السلام کر گئے تھے، کہ وہ سچائی کی روح آئے گی، اور وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو کچھ وہ سنے گی، سو کہے گی۔" (انجیل یوحنا باب ۱۶ - ۷)

وہ بشارت عیسوی کے مطابق اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد و ثنا کرنے والا احمد (فارقلیط) آیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمانیت و رحیمی، ربوبیت و کریمی، ستاری و غفاری کے نغموں کے ساتھ آیا اور اللہ تعالیٰ کے جود و سخا، بخشش و عطا، غفران نعما سے عالم پرشور تھا، اس کا پیام سراپا محبت، شفقت اور رحمت تھا، آپؐ نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ستائش، تنزیہہ

---

[1] عہدنامہ قدیم استثنا ۳۳ - ۱، ۲، ۳ میں ہے: "یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خدا سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی، ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں، اور تیری باتوں کو مانیں گے۔" اس پیش گوئی کا تذکرہ قرآنِ کریم کی آیت میں یوں ہے:-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ...... ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ

[2] "میں ان کے لیے اُن کے بھائیوں میں تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ سب اُن سے کہے گا۔" (استثناء ۱۸/۱۹)

تقدیس، جمال و نوال، جمال و کمال و صفات و شئون کی رنگا رنگی اور بے چونی و بے چگونی کی تعلیمات سے معرفت ربانی و عرفان الٰہی کے تو بر تو پردوں کو یکسر چاک کر دیا اور باری تعالیٰ کی صفات عالیہ اپنی پوری جلوہ سامانیوں، جمال آرائیوں، حسن و جمال کی تابانیوں اور محبت و لطف، عطا و بخشش کی ارزانیوں کے ساتھ مخلوق سے روشناس کرا دیا، جس کا عشر عشیر تو کیا اقل قلیل بھی دوسرے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں نہیں ملتا، رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کی جو پردہ کشائی اور مستور از ل کی جو رہنمائی فرمائی۔ اس میں خالق کائنات کی ذات عالی کسی ظالم و جابر، حاکم و مالک کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ حسن و جمال، جود و نوال، لطف و عطا، عفو و درگذر، رحم و کرم کا سراپا، اپنی عزت و اجلال کبریائی و کمال کے ہالہ میں پرتو فگن ہے، جس کا مقصد ہی نوازش و بخشش ہے اور جو پیہم پکار رہا ہے۔ ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

چنانچہ گو اللہ کے لیے جملہ اچھے نام و صفات ہیں، لیکن عَلَم کے طور پر جو نام اسلام نے چُنے وہ "اللّٰہ" اس کے بعد "رحمٰن" کا نام ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (بنی اسرائیل - ۱۲)

آپ فرما دیجئے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو جس نام سے بھی پکارو گے، پس اُسی کے واسطے بہت اچھے نام ہیں۔

اللہ کا معنیٰ عربی لغت کے لحاظ سے دلوں کے اس محبوب اور پیارے کے ہیں جو قلوب کو موہ لے اور جس کی محبت میں لوگ حیران و سرگرداں ہوں۔ گویا "اسلام کا خدا" نرا محبت ہی محبت اور پیار ہی پیار ہے۔ قرآن کریم میں اللہ کا لفظ ۲۶۹۷ مقامات پر آیا ہے، گویا رحمت و پیار کے اس جامع و مانع لفظ سے قرآن کا صفحہ صفحہ روشن ہے۔ الرحمٰن دوسرا اسم عَلَم ہے۔ جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ۱۱۴ بار و لیسے ۵۵ بار قرآن کریم کی زینت بنا ہے۔ الرحمٰن کا معنی نہایت مہر و رحمت اور رحم کرنے والے کے ہیں۔ اس سے ملتا جلتا دوسرا نام الرحیم ہے، جس کا معنی بار بار اور بہت ہی رحم کرنے والے کے ہیں۔ تسمیہ کے علاوہ یہ نام قرآن کریم میں ۹۳ بار آیا ہے۔ خیال رہے کہ محققین کے نزدیک "رحمٰن و رحیم" دونوں الفاظ رحمت سے مشتق ہیں، اور رحمت اس جذبہ و نرمی کو کہتے ہیں، جس سے کسی دوسری ہستی کے ساتھ محبت و شفقت، لطف و احسان اور فضل و کرم کرنے کا داعیہ غالب آ جائے۔ مشہور عالم و بزرگ ابن مبارک کا قول ہے کہ "رحمان وہ ذات ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو عطا فرمائے اور رحیم وہ ذات ہے کہ اس سے مانگا نہ جائے، تو غضب میں آ جائے"۔

چوتھا نام جس سے صحیفۂ الٰہیہ سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ الناس تک منوّر ہے، الرّب ہے، جو مختلف اضافتوں کے ساتھ قرآن کریم میں ۹۰۲ بار آیا ہے۔ الرّب پرورش کرنے والی وہ ذات ہے جو عدم سے وجود میں لا کر ہستی کے جملہ مراحل اور ابد الآباد تک موجودات کے وجود و پرورش کی ذمہ دار ہو۔ عیسائیت رب کو اب جیسا مادی نام دے کر فخر کرتی ہے لیکن اب (باپ) کا تعلق اولاد سے ایک حادثہ کا نتیجہ ہے، "باپ" پیدائش و پرورش کے تمام مراحل میں مجبور و معذور رہے، لیکن رب کا تعلق

چلنے والے کے ساتھ عدم و عالم ارواح سے لے کر پیدائش اور موت اور ابد الآباد تک محیط ہے، اور وہ اس پرورش پر مجبور نہیں بلکہ اپنے لطف و رحمت اور شانِ ربوبیت کی وجہ سے پالتا ہے، یہ تعلق ہمہ گیر، ازلی و ابدی ہے۔

نبی الرحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ آسمانی اسی طرح اللہ تعالےٰ کے رحمت و شفقت، محبت و احسان سے بھرپور ناموں سے منوّر ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ رحمت مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو کھولا وہ اکثر "رحمت و محبت، شفقت و کرم ہی سے عبارت ہیں، اور جہاں "تدبیر و انتظام" اور "جلال و کمال" کی حکمت کی وجہ سے سزا اور وعید کا تذکرہ آیا ہے وہ بھی رأفت و رحمت و عطا و بخشش وغیرہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام لیتا ہے۔ لیکن عذاب و انتقام کے لیے اکثر اضافت کے ساتھ اپنی نسبت کرتا ہے، مثلاً:

اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ط وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ط (الاعراف آیت ۱۶۷)

بلاشبہ آپ کا رب واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے اور بلاشبہ وہ غفور (بڑی مغفرت والا) اور رحیم (بڑی رحمت والا) ہے، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ط۔ (الانعام ۱۶۶)

بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے اور بالیقین وہ واقعی غفور بڑی مغفرت کرنے والا رحیم، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ط۔ (المائدۃ آیت ۹۸)

تم یقین جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والے ہیں، اور اللہ تعالےٰ (غفور) بڑے مغفرت والے اور (رحیم) بڑی رحمت والے بھی ہیں۔

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ۔ (الحجر ۴۹ - ۵۰)

اے محمدؐ! آپ میرے بندوں کو اطلاع دے دیجئے کہ میں بڑا مغفرت (غفور) اور رحمت والا (رحیم) بھی ہوں اور (نیز) یہ کہ میری سزا دردناک سزا ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ (المائدہ ۹۵)

اور اللہ تعالےٰ عزیز یعنی زبردست ہیں، انتقام لے سکتے ہیں۔

غرض نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کا پروردگار رحمت ہی رحمت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بارے میں بار بار آتا ہے:۔

کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ (الانعام: ۵۴)

تمہارے رب نے رحمت فرمانا اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے۔

وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ ط (الانعام ۱۳۴)

اور آپ کا رب بالکل غنی ہے، رحمت والا ہے۔

فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْرَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۔ (الانعام ۱۴۵)
تو آپؐ فرما دیجئے کہ تمھارا رَبّ بڑی وسیع رحمت والا ہے ۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوالرَّحْمَةِ ۔ ط (الکہف آیت ۵۸)
اور آپؐ کا رَبّ بڑا مغفرت کرنے والا (اور) بڑا رحمت والا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہر چیز سے وسیع ہے ۔ ارشادِ ربّانی ہے :۔

رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ۔ (الاعراف ۱۵۶)
اور میری رحمت تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے ۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا ۔ (المومن ۸۰)
اے ہمارے پروردگار! آپ کی رحمت (عامہ) اور علم ہر چیز کو شامل ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فیضان کو کوئی روک نہیں سکتا ۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ط ۔ (فاطر ۲)
اللہ تعالےٰ جو رحمت لوگوں کے لیے کھول دے ، سو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا گمراہی اور کفر ہے ۔

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۔ (الحجر ۵۶)
ابراہیمؑ نے فرمایا کہ بھلا اپنے رَبّ کی رحمت سے کون ناامید ہوتا ہے بجز گمراہ لوگوں کے ۔

اللہ تعالےٰ کی رحمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے ؟ حضرت محمدّ صلے اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا صحیفۂ آسمانی میں اللہ تعالیٰ اپنے گنہگار بندوں کو محبت و پیار سے اپنا بندہ کہہ کر پکارتا ہے اور کیا نوید جانفزا سناتا ہے ۔!

قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ (الزمر ۵۳)
آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو ! جنھوں نے (کفر و شرک کرکے) اپنے اُوپر زیادتیاں کی ہیں ، کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو ، بالیقین خدا تعالےٰ تمام (گزشتہ) گناہوں کو معاف کر دے گا ۔ واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے ۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی جو طبرانی نے نقل کیا ہے ، رحمت مجسم حضرت محمدّ صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و رأفت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت اور گنہگاروں کی رعایت و ناز برداری کا اچھوتا نمونہ ہے ۔

بدر کے ہیرو ، عمِّ رسولؐ سیدالشہداء حمزہ رضی اللہ عنہٗ کے قاتل وحشی ابن حرب تھے جنھوں نے چھپ کر وار کرکے اللہ کے اس شیر کو شہید کر دیا تھا ، اور پھر جس بے دردی سے ان کے ناک کان کاٹے گئے اور دل کو نکال کر چبایا گیا ، تاریخ کا ایک رُوح فرسا واقعہ ہے ، جس کا اثر آخر تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر رہا ، لیکن یہ جذبۂ دعوت و شفقت تھا ، وحشی کو اسلام کا

پیغام دے کر بھیجتے ہیں، وہ قرآن کریم کی آیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواباً کہلواتے ہیں:۔

یا محمد کیف تدعونی وانت تزعم ان من قتل او اشرک اوزنی یلق اثاما، یضاعف له العذاب یوم القیامة ویخلد فیه مهانا، وانا صنعت ذلک فهل تجد لی من رخصة۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مجھے اسلام کی دعوت کیسے دیتے ہیں، اور آپ کا دعویٰ ہے کہ جس نے قتل کیا یا شرک کیا یا زنا کیا، وہ گناہ میں جا پڑا، اور قیامت میں اُسے دونا عذاب ہوگا، اور اس میں خوار پڑا رہے گا، اور میں نے یہ تمام کام کئے ہیں، پس کیا میرے لیے کوئی چھٹکارا کی صورت آپ پیدا کر سکتے ہیں۔

وحشی کے اس پیام پر رحمتِ حق جوش میں آتی ہے اور کیا عجیب استثناء کی آیت نازل ہوتی ہے:

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۔ (الفرقان)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک عمل کئے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا، اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

وحشی رضی اللہ عنہ کہنے لگا، اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم یہ توبہ، ایمان اور عمل صالح کی شرط سخت ہے، شاید میں یہ پوری نہ کرسکوں، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ۔ (النساء ۴۸)

بے شک اللہ تعالےٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے، اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہو گا، وہ گناہ بخش دیں گے۔

وحشی نے اب اور بات نکالی اور کہا:

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس بات میں بھی مجھے مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع دکھائی دیتی ہے، پس میں نہیں جانتا کہ مجھے بھی بخشے گا یا نہیں، پس اس کے علاوہ کوئی بات ہوسکتی ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نے یہ آیت نازل فرمائی:۔

يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ (الزمر)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنھوں نے (کفر، شرک کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو، بالیقین خدا تعالےٰ تمام (گزشتہ) گناہوں کو معاف فرما دے گا، واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت والا ہے۔

وحشی نے کہا اب بات درست ہوئی اور اسلام لے آئے۔ بعض لوگوں نے پوچھا، ہم بھی وحشی کی طرح ان باتوں کے مرتکب

ہو چکے ہیں، آپؐ نے فرمایا، یہ بشارت اور حکم عام ہے۔

(مجمع الزوائد صنا جلد ۷، بخاری میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ ص ج ۲ بروایت ابن عباس)

کیا رحمت کا ٹھکانہ ہے؟ ایک گنہگار کے کیا کیا ناز اٹھائے جاتے ہیں! اور رحمت نہ صرف گناہوں کو معاف کرنے کی بشارت دیتی ہے، بلکہ گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کرنے کا بھی اعلانِ عام دیتی ہے۔ کیا اس عفو عام اور رحمتِ بے پایاں کی نظیر کسی اور جگہ مل سکتی ہے؟ ابوسعید ابوالخیر نے اس پیام کو کیا خوب الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

بخاری وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا کیا تو خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عاید کر لی۔ اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پاک سے گنہگاروں اور سیہ کاروں کو بخشش و رحمت کا مژدہ، عفو عام کا اعلان بار بار سنوایا گیا تفصیلات کا وقت نہیں، ایک حدیث پر اکتفا کرتا ہوں کہ:-

"اے آدمؑ کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے، میں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیوب کیوں نہ ہوں۔ مجھے پروا نہیں۔ اے آدمؑ کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کر دوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدمؑ کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ۔ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا۔"

(جامع ترمذی ابواب الدعوات، جمع الفوائد ص جلد ۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنی اس رحمت بے پایاں کو صرف اپنی ذات تک محدود ہی نہیں رکھا، بلکہ اپنے بندوں اور خواص پر اس کا پرتو ڈال کر انھیں بھی بحد بشری اور حسب استعداد و ظرف اپنی رحمت کا مظہر بنایا، جس کا سب سے بڑا حصہ اس شاہکارِ خلق، زبدۂ نبوت، فخر کون و مکان، مقصود آفرینش، خاتم الرسل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا، جنھیں خداوند قدوس نے خود تمام جہانوں کے لیے رحمت یعنی رحمۃ للعالمین کہہ کر پکارا اور اپنے اسماء خاصہ میں سے رأفت و رحمت سے بھرپور دو ناموں سے اس کی ذاتِ عالی کو نواز دیا، اور ارشاد فرمایا:-

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ ۱۲۸)	(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف اُن کو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں، اور مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

کیا احسان الٰہی ہے، اس کی ذات بھی رؤف و رحیم اور اس کا بندۂ خاص بھی اس کا مظہر اتم بن کر رؤف رحیم ؎

تو کریمی و رسولؐ تو کریم — صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

یہ نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور دنیا کو ایسا دین دے گئے، جو ہر رنگ و صورت میں رحمت و رأفت کا شاہکار تھا، اپنے

رسم ورواج کے نیچے دبی ہوئی دنیا کو ان نامناسب بوجھوں سے نجات دلائی۔ مذہب کے نام پر تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ، رہبانیت، ترک دنیا، نفس کشی اور ایذا رسانی جسم کی جو صورتیں رائج تھیں، ان کو ایک ایک کرکے توڑا، اور سہولت و راحت، نرمی و اعتدال، دین و دنیا کی وحدت والا ایک ایسا روشن دین پیش کیا جس پر ہر طبقہ اور ہر قوم، ہر فرد خواہ عورت ہو یا مرد، ہر حال میں اور ہر وقت میں عمل پیرا ہو سکے، رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کارنامہ کو قرآن نے ان الفاظ میں پیش فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(الاعراف آیت ۱۵۷)

جو لوگ کہ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ ہے) وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بُری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں، اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں، سو جو لوگ اس نبی (موصوف) پر ایمان لاتے ہیں اور اُن کی حمایت کرتے ہیں، اور اُن کی مدد کرتے ہیں اور اس نُور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اسلام آسان ہے، اس میں کسی قسم کی تنگی و سختی اور تکلیف، لایطاق نہیں، ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے بقدر اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ دین ہر ایک کے بس کی بات ہے، اپاہج و بیمار، غنی و نادار، حاکم و محکوم، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان، عورت و مرد، بوڑھا و بچہ، ہر طبقہ و ہر فرد، ہر حال و وقت اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے کہ دین کے احکام ہر شخص کی گنجائش و وسعت کے مطابق ہی آئے ہیں، یہی وہ رحمت ہے جس کا نام و نشان شاید ہی کسی دوسرے مذہب میں ملتا ہو۔ قرآن کریم نے نبی الرحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتے ہوئے دین کی سہولتوں کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے، نمونتاً چند پیش کرتا ہوں:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ آیت ۲۸۶)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا۔ (الطلاق ۷)

خدا تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ (البقرۃ ۱۸۵)

اور تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج ۷۸)

اور تمہارے لیے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

ان ھذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ ۔ — یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

(جمع الفوائد ص ۳۴ ج ۱ بحوالہ بخاری)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا :

ایھا الناس خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللہ لا یمل حتی تملوا وان احب الاعمال الی اللہ ما دام وان قل ۔ — اے لوگو اتنا ہی عمل کرو جتنا برداشت کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا ۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی عمل ہے، جو دائمی ہو گو تھوڑا ہو۔

(جمع الفوائد ص ۳۴ ج ۱ بحوالہ بخاری ونسائی وترمذی وابن ماجہ)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا :

لا تشددوا علی انفسکم فانما ھلک من کان قبلکم بتشدید ھم علی انفسھم — اپنے نفسوں پر (دین کے بارے میں) سختی نہ کرو کہ تم سے پہلے لوگ اپنے اپنے نفسوں پر سختی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

(جمع الفوائد ص ۳۵ ج ۱)

ایک جگہ ارشاد ہے :۔

انما بعثت بالملۃ السمحۃ او السھلۃ الحنیفۃ البیضاء ۔ (مسند ابن حنبل ص ۲۶۶ ج ۵) — میں تو سہل اور آسان روشن حنفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

دین کی یہ سہولت اور درمیانہ روی جملہ عبادات ومعاملات، اخلاق ومعاشرت، انفرادی واجتماعی اعمال میں ساری وطاری ہے ۔ جس کی تفصیل کی قلتِ وقت کی وجہ سے گنجائش نہیں۔

"رحمت محمدیہ" کا پرتو اس نظام اقتصاد ومعاشیات میں بھی نمایاں ہے جو آپؐ نے پیش فرمایا ۔ جس میں سرمایہ دارانہ ظلم نہیں، مالی رقابت کی بنا پر طبقاتی کشمکش وگروہی کشاکش نہیں، بلکہ ہر طبقۂ انسانی دوسرے طبقہ کا ہمدرد وغمگسار، معاون ومددگار، خیر خواہ وخدمت گار اور بھائی بھائی بن کر زندگی گذارنے والا ہے ۔ اسی طرح جو قانون اور نظام عدل دیا گیا، وہ ساری انسانیت کے لیے رحمت وفلاح وبہبود کا الٰہی دستور ہے ۔ جس میں کسی خاص طبقے، گروہ، جماعت یا فرد کے لیے ظالمانہ مراعات وتحفظات کا کوئی چور دروازہ نہیں بلکہ اس میں ہر ایک کے حقوق کی حفاظت، اس کی دارین کی ترقی کا انتظام ہے جس میں نہ کسی پر ظلم ہے اور نہ کسی کو ظلم کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ — اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو

مُحرّما فلا تظالموا۔ تمھارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔

(صحیح مسلم)

عدل میں اپنے پرائے، دوست و دشمن، شاہ و گدا کا امتیاز روا نہیں رکھا گیا، بلکہ ہر ایک کے لیے عدل کا ترازو برابر ہے، قرآن بار بار گویا ہے :۔

وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ (الشوریٰ) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان عدل کروں

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۔ (المائدہ ۸) اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو، کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (الانعام ۱۵) اور جب بات کہو پس انصاف کرو، گو وہ شخص قرابت دار ہی ہو۔

رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت پر ایک بڑا اکرم یہ کیا کہ ملکوں، قوموں اور قبائل میں بٹی ہوئی انسانیت کو "وحدت آدمیت" کا سبق دیا، اور رنگ و نسل، وطن و قوم، امیر و غریب، سرمایہ دار و مزدور، زمیندار و کسان اور دیگر انسانی عصبیتوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی انسانیت کو اخوّت کا ایسا پیغام دیا کہ جس کے اپنا لینے کے بعد دُنیا امن و چین، محبّت و اُلفت، مواسات و ہمدردی کا گہوارہ بن جاتی ہے اور علاقائی اور ملکی یا عالمگیری جنگیں ہوں یا طبقاتی جھگڑے، سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی اقوام متحدہ قوموں کے اتحاد کا نشان ہے، لیکن وحدتِ انسانی کا نظریّہ، رحمت محمّدیّہ کا وہ عطیہ ہے، جس سے پوری نسل انسانی جسد واحد بن جاتی ہے اور حسد و منافست، تنافر و غضب کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۔ (الحجرات، ۱۳) اے انسانو! تحقیق ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو (مختلف) قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

دوسری جگہ فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۔ (النساء) اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (آدمؑ) سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ (یعنی نسل انسانی اسی ایک جوڑے سے وجود میں آئی)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِي الْمُتَّقُوْنَ مَنْ كَانُوْا وَحَيْثُ كَانُوْا ۔ (کنز العمال)

مجھ سے قریب وہ لوگ ہیں، جو متقی ہوں، جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں (یعنی جنس و وطن و مقام کی قید نہیں)

حجۃ الوداع میں اعلان فرمایا :۔

ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد، الا لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لاحمر على اسود ولا لاسود على احمر الا بالتقوى۔ (مسند احمد)

لوگو! ہاں بیشک تمھارا رب ایک ہے اور بے شک تمھارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اخوّت عامہ کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد الله اخوانا۔ (بخاری و جمع الفوائد ص۳۹۵ ج ۲، بحوالہ صحاح)

آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو۔ اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

یگانگت و بھائی چارے کا یہ پیام صرف رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے ادا ہُوا جن کا کام ہی یہ تھا۔ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ایک ابرِ رحمت تھا، جو پیہم موسلا دھار بارش کی طرح برستا رہا، گلزار و خار زار، دوست و دشمن اس افادۂ رحمت میں برابر کے شریک تھے۔ آپؐ ہدایاتِ ربّانی کے سب سے بڑے مبلّغ اور توحیدِ الٰہی کے داعی اکبر ہیں، سب جانتے ہیں کہ تبلیغ پھولوں کی سیج نہیں اور کسی آبلہ پا کا اس سے سلامت گذر جانا آسان نہیں، لیکن رحمت للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم باوجود ہر قسم کی اذیت و تکلیف سہنے کے سراپا لطف و رحمت، نرمی و ملاطفت و عفو و درگذر رہتے، قرآنِ کریم نے گواہی دی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (آل عمران ۱۵۹)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپؐ ان کے واسطے نرم ہوئے، اور آپؐ اگر تُندخُو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے؛

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ (بخاری کتاب الآداب)

یہی سبب ہے کہ زہرِ ہلاہل کھلا دینے والی یہودیہ کو درگذر فرما دیا، قریش مکّہ نے وہ کونسا ظلم، کونسی تکلیف تھی جو نہ پہنچائی ہو؟ کون سی اذیت تھی جس سے دریغ کیا ہو؟

مکہ کی زندگی میں شعب ابی طالب کی المناک محصوری، پتھروں کی بارش، کانٹوں کا بچھایا جانا، فرق اقدس پر (العیاذ باللہ) خاک گندگی تک ڈال دینا، سجدہ کی حالت میں اُونٹ کی بچہ دانی اور اوجھ کو سر پہ ڈال دینا، ہر قسم کی ملاحیاں، غرض وہ کیا ستم ہیں تھا جو یہ ظالم ایجاد نہ کرتے ہوں، اپنا مولد و منشأ اور اللہ تعالیٰ کا محبوب گھر ان کی وجہ سے چھوڑنا پڑا، اور ہجرت کے بعد بھی ایک دن چین کا سانس نہ لینے دیا گیا، لیکن واہ ری رأفت و رحمت جب کوکبۂ نبوت اپنے پورے جلال و عظمت کے ساتھ فتح مکہ کے دن حرم میں داخل ہوتا ہے تو خون کے پیاسوں کو یہ کہہ کر درگذر کر دیا جاتا ہے :۔

لا تثریب علیکم الیوم، یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین (الکنز ص۲۹۲، ج ۲)	آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا قصور معاف فرمائے۔ وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔
اذھبوا انتم الطلقاء (حیاۃ الصحابہ ص۱۵۴، ج ۱)	جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔

سفر طائف کا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا شدائد کے لحاظ سے سخت ترین دن تھا، غیرت حق جوش میں آکر اہلِ طائف کو ان کی گستاخی پر پہاڑوں کی چکی میں پیس دینا چاہتی تھی، لیکن رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تکلیف کو بھول جاتے ہیں، اہلِ طائف کو ہلاکت سے یہ کہہ کر بچا دیتے ہیں کہ :۔

بل ارجو ان یخرج اللہ عزوجل من اصلابھم من یعبد اللہ عزوجل وحدہ لا یشرک بہ شیئا۔ (بخاری ص۴۵۸، ج ۱ و مسلم وغیرہ)	(میں ان کی ہلاکت نہیں چاہتا) بلکہ اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمائے جو ایک اللہ عزوجل کی عبادت کرنے والے ہوں اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں۔

اُحد میں خون میں نہا کر دانت شہید، زبان مبارک سے صرف یہی کلمات نکلے :۔

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔	"اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں"۔

ایک دفعہ چند لوگوں نے کفار کے ظلم سے تنگ آکر درخواست کی کہ ان کے حق میں بددعا فرما دیجیے، جواباً فرمایا۔ میں دنیا کے لیے لعنت نہیں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، (مشکوٰۃ کتاب الاخلاص)

غرض ہر حال میں رأفت و رحمت کا دریا بہتا رہا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا، اُمت کی ہدایت کے لیے فرطِ شفقت و رحمت میں گھلتے رہے، دائم الاحزان ہونا آپؐ کی صفت بن گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کو کہ جس نے مبعوث فرمایا تھا، بار بار اس اندوہ وغم سے چھٹکارا دلانے کے لیے کہنا پڑا،

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ ط (الکہف ۶)	سو شاید آپؐ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس بات (قرآن) پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے (یعنی اتنا غم نہ کریں کہ آپؐ کی جان پر بن جائے۔)
لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ط (الشعراء ۳)	شاید آپؐ ان کے ایمان نہ لانے پر (رنج کرتے کرتے) اپنی جان دے دیں گے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (النحل ۱۶ - ۱۲۷) ان پر غم نہ کیجئے۔

یہ غم آپؐ کا کفار کے لیے تھا، پھر مسلمانوں پر شفقت کا کیا عالم ہوگا! اُمّت کے غم میں راتوں کو روتے روتے ہچکی بندھ جاتی، اُبلتی ہوئی ہنڈیا کی طرح بلکنے کی آواز آتی۔

ایک یہودی کا بچّہ مسلمان ہوا، خوشی سے بے اختیار پکار اُٹھے :-

الحمد للّٰہ الذی انقذنی بنسمۃ من النار۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے میرے ذریعے ایک جان کو جہنّم کی آگ سے آزادی دی۔

ایک چور کا ہاتھ کٹتا ہے۔ رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔

(مستدرک حاکم ص ۳۸۳ - ج ۴)

(بعض کا قول ہے رو پڑتے ہیں) قربان جائیے رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے!

رحمت للعٰلمین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا تذکرہ و احاطہ کسی شخص کی بساط نہیں، چند باتیں نمونتہً اس تھوڑے وقت میں پیش کر دی گئیں۔ سلام ہو اس رحمت مجسّم پر اور درود ہو اس آیۂ رأفت و شفقت پر جو آیا، اور اپنی رحمت سے کو نین کو پر بہار بنا گیا۔ اپنی بات کو اقبال سہیل کے چند اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

خلق خدا کا داعیٔ آخر، دینِ ہدیٰ کا داعیٔ آخر — جس کی دعوت اَسلِم تَسلَم صلی اللہ علیہ وسلّم
ارض و سما میں آیۂ رحمت، روزِ جزا میں سایۂ رحمت — اس کی لولئے حمد کا پرچم، صلی اللہ علیہ وسلّم
راہ میں کانٹے جس نے بچھائے، گالی دی پتھّر برسائے — اس پر چھڑکی پیار کی شبنم، صلی اللہ علیہ وسلّم

سَم کے عوض دارو ئے شفا دی، طعن سُنے اور نیک دُعا دی
زخم سہے اور بخشا مرہم، صلی اللہ علیہ وسلّم

اللّٰھم صلّ وسلّم وبارک علی سیّدنا ومولانا محمّد امام الخیر وقائد الخیر ورسول الرحمۃ
واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ عبداللہ یوسف علی

شخصیت اور کامیابی

دنیا میں تمام بلند انسانوں کی کامیابی اور شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی وہ خود کیا ہے اور اس کے کام کی نوعیت کیا ہے۔ بعض اوقات ایک آدمی اپنے ملک اور دنیا کی تمام تاریخ بدل دیتا ہے۔ اور اس کے کارناموں سے فضائے بسیط گونج اٹھتی ہے۔ مگر اس کے باوصف اس کی شخصیت اس کے کام کی نسبت زیادہ دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ کیونکہ شخصیت ہی وہ بیج ہے جس سے کامیابی کا پودا پھوٹتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے بلند انسان یا تو اپنے وقت سے آگے ہوتے ہیں یا پیچھے۔ کیونکہ لیبا اوقات ایسے انسانوں کے خیالات اور اثرات بیرونی حالات کی وجہ سے توقع کے مطابق پھل پھول نہیں لاتے۔ لیکن اگر وہ کارزارِ حیات میں جی توڑ کر لڑے ہوں اور انہوں نے نامساعد حالات کے علی الرغم جادہ مستقیم پر غیر متزلزل رہنا سیکھ لیا ہو تو بھی ان کے متبعین کے لیے ان کی ناکامیوں اور ہزیمتوں میں عبرت اور موعظت کے بے شمار دفتر پنہاں ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ صفحۂ تاریخ پر سنہری حروف میں لکھے جانے والے کارنامے باعثِ اختلاف ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایسے کارنامے اگر ایک طبقہ کی نظر میں قابل تحسین و ستائش ہوں تو دوسرے گروہ کی نگاہ میں ان کے تخریبی پہلو نمایاں ہوں۔ لیکن ایک دلربا سیرت ایسی سیرت جو خاکساری، بلند فہمی، پاکیزگی اور انصاف کی مظہر ہو ہر ایک انسان کے لیے نیکی اور پاکیزگی کی محرک ہو سکتی ہے۔ اور ایسے انسان مصیبت، رنج اور ناکامی میں پرکھے جاتے ہیں۔ کامیابی اور فتح میں ان کی رحم دلی اور خدا ترسی کی آزمائش ہوتی ہے۔ آپ حقانیت، انصاف، صبر اور استقلال کی محک پر معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا وہ آدمی روحانی پاکیزگی کا مظہر ہے اور اس کی زندگی الٰہی ہدایت کی تجلیوں کا مرقع ہے یا اس کی زندگی صفحۂ ارض پر ایک عام نقش کی مانند ہے۔ جو لحظہ کے لیے ہویدا ہوتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے میں جو کچھ کہوں گا آپ کو اس سے گونا دلچسپی ہوگی اور آپ اس بلند ترین شخصیت کی دلربا جھلک محسوس کرنے کے قابل ہو سکیں گے، جس کی چوکھٹ پر ہم جبینِ عشق و نیاز رگڑنا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔

غیر مسلموں سے استدعا

اس وقت میرا روئے سخن صرف ان کی طرف ہی نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ دیارِ ہندوستان میں ایسے ہندو

موجود ہیں جو یہاں کی دو بڑی قوموں کے درمیان اتحاد قایم کرنے کے لیے خیالات اور سوشل زندگی کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایسے مخلص لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہمارا یہ اوّلین فرض ہونا چاہیے کہ ہم بھی اپنے خیالات اور احساسات کی اس طرح ترجمانی کرسکیں کہ باہمی افہام وتفہیم کی زنجیریں اور مضبوط ہوسکیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے مذاہب موجود ہیں جو روحانی وحدت اور ہم آہنگی کے پاکیزہ عزائم رکھتے ہیں۔ میرے دل میں ایسے عیسائی بھائیوں کا تصوّر موجود ہے جن کی نگاہ میں اسلام کی حقیقت مذہب کی دنیا میں ایک دُور افتادہ لستان سے زیادہ نہیں جو دنیا کی نئی تحریکوں سے کوئی خاص مناسبت نہیں رکھتا۔ اس وقت میں آپ کے سامنے چند حقایق پیش کرنا چاہتا ہُوں جن کی روشنی میں آپ محسوس کرسکیں گے کہ جس شخصیت کے متعلق میں آپ کے سامنے کچھ کہنے والا ہُوں، اس کی زندگی پاکیزگی اور بلند نگاہی کا مظہر تھی۔ اور آج دنیا جن مسائل سے دوچار ہے ان کی عقدہ کشائی میں اس کی زندگی کو بہت دخل ہے۔

مناظر قدرت کا اثر

اس مقدس موقع پر میری طرف سے یہ حقیر پیش کش ہے۔ اس وقت جبکہ شمالی آب دہوا میں موسم بہار کی مسرت بخش ہواؤں نے بُوٹے بُوٹے اور پتّہ پتّہ پر جوبن اور نکھار پیدا کر دیا ہے۔ ہماری خوشی میں اس احساس سے دوگونہ اضافہ ہوجاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود مناظرِ قدرت کی دلبستگیوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اور وُہ اپنی روحانی اور اخلاقی تعلیم میں لوگوں کی توجہ قدرت کے مناظر کی طرف مبذول کروایا کرتے تھے اور قدرت کی دلفریب تبدیلیوں سے وُہ خدا کی عظمت وجلالت محسوس کرنے کے عادی تھے۔ ہم بھی آج اس نیلگوں آسمان کی چھت کے نیچے اور اس ہری بھری مخملی گھاس پر بیٹھ کر جادوانی لذت محسوس کرتے ہیں۔

خاندانی وجاہت

ہمارے بعض دوست جنھیں اسلامی تہذیب اور اسلامی آئین سے گونا دلبستگی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی نہیں۔ جس کی وُہ مستحق ہے۔ مجھے ایسے لوگوں کی خبر ہے جو نہایت نیک نیتی اور عزّت و احترام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساربان اور ان کی تہذیب کو "صحرائی تہذیب" سے موسوم کرنے کے عادی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان تمام عرب بھر میں بہت جاہ وجلال کا خاندان مانا جاتا تھا، اور کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے وُہ مذہبی اور سوشل معاملات میں قائد کی حیثیت سے مانے جاتے تھے۔ محمد صلعم کے والد ان کی پیدائش سے پہلے ہی دارالبقا کو سدھار چکے تھے اس لیے عبدالمطلب آپ کے دادا جو تمام قبیلوں میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے لیے بمنزلہ والد کے تھے۔ قبیلہ کا ہر ایک فرد اپنے آپ کو ایک دُوسرے کے برابر سمجھتا تھا، تاہم ان میں امارت کا احساس بہت زیادہ تھا۔ افراد کی طرح قبیلوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور قریش تمام قبیلوں میں ممتاز تصوّر کیے جاتے تھے۔

اگرچہ پیغمبر علیہ الصّلوٰۃ والسلام اپنی سیرت کی پاکیزگی اور سادگی کی وجہ سے کوئی کام کرنا عار نہیں سمجھتے تھے حتیٰ کہ آپ بھیڑ بکریوں

کی رکھوالی کرتے تھے، اُونٹ چرایا کرتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے اور اپنے قبیلہ کی عورتوں کے کام میں ان کا ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے۔" تاہم ان تمام باتوں سے اگر آپ ان کے عالیشان گھرانہ کو نظر انداز کردیں گے تو ان کے عظیم الشان کام کو جانچتے ہوئے سخت غلط فہمی کا احتمال ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غریبوں کے دُکھ درد میں اُن کے ساجھی ہوتے تھے۔ اور عربی مقولہ کے مطابق اگر امرا ان کے دست نگر تھے تو وُہ غربا کی دلجوئی سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے جس وقت ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس عریاں حقیقت کو لاتے ہیں کہ محمد صلعم کا لائحۂ عمل اپنے معزز قبیلہ کی دیرینہ روایات کو جو کعبہ کے متولی ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں ملیامیٹ کرنے میں مضمر تھا تو ان کے عظیم الشان کام کی اہمیت اور عظمت بہت بڑھ جاتی ہے جس وقت سے انہوں نے طول وعرض عرب میں صورِ حق پھونکا۔ لوگوں نے ان الفاظ میں اس کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا:" تو کیا تو ہمارے باپ دادا سے زیادہ عقلمند ہے کہ تو انہیں بُرا بھلا کہتا ہے اور ہمارے بتوں کی بھی تضحیک کرتا ہے۔ یاد رکھ کہ عبدالمطلب نے تیری پرورش کی ہے اور تو اسی دیوار کو ڈھا رہا ہے جس کو وہ مقدس سمجھتا تھا، اور یہ بات ہرگز تیرے شایان شان نہیں۔"

صحرائی تہذیب

دُوسرا اہم پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وُہ یہ ہے کہ نہ تو جس تہذیب کو پیغمبر علیہ السلام نے مٹایا صحرائی تہذیب تھی۔ اور نہ ہی کسی ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جسے ہم صحرائی تہذیب سے تعبیر کرسکیں۔ ارباب خبر کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی کہ مکہ اور مدینہ عرب کے وسطی صحرائی جغرافیائی حدود سے باہر ہیں اور آجکل کی طرح اس وقت بھی یہ دونوں شہر عظمت و شہرت کے مالک تھے۔ اگر ہم ان میں طائف کو بھی جو مکہ سے مشرق کی جانب ساٹھ میل کے فاصلہ پر پُر فضا نخلستان ہے، اور جو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی مبارک کے سلسلہ میں کافی اہمیت رکھتا ہے، تو ہم تین شہروں کے نام لے سکتے ہیں، جو عربی ثقافت کے مرکز تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی جگہ تہذیب و تمدن کا نام و نشان نہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کا عرب زرا پڑا وحشی تھا۔ اس کی شاعری تشدد اور دختر کشی کے جذبات سے مملو تھی۔ فریب کاری، تفاخر، بدکاری اور خانہ جنگی اس کا امتیازی نشان تھے۔ آج بھی ہم اگر زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا بنظرِ امعان مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا معیارِ ثقافت ایسا نہ تھا جو کسی دوسری قوم کے نزدیک قابل قبول ہوتا۔ اس کے علاوہ دُوسرا نظام جو مکہ، مدینہ اور طائف میں مروج تھا۔ متذکرہ بالا حالات سے بدتر تھا۔ توہمات، بھوت پریتوں کے قصّے، اخلاقی پستی اور خود غرضانہ روایتیں اور انسانوں اور قبیلوں کی باہمی رقابتیں اس سلسلہ نظام کی مختلف کڑیاں تھیں۔ جن کا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک جھٹکے سے ٹوٹنا مقدر ہو چکا تھا اور دنیا کی حیرت یافتہ آنکھوں نے سچ مچ دیکھ لیا کہ محمد صلعم نے نہ صرف ان طاغوتی طاقتوں کے نقوش کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا بلکہ ایک ایسا پاکیزہ نظام قایم کیا، جس کی روشنی سے چار دانگ عالم جگمگا اُٹھا۔ میں یہاں غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نیا نظام درون عرب کا اس قدر رہین منت نہیں۔ جس قدر کہ بیرون عرب کا ہے۔ اس کی اخلاقی اپیل بہت بلند معیار کے لیے تھی۔ آج بھی اگرچہ بدو لوگ برائے نام مسلمان ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کے افعال و اعمال پر اسی جہالت و بربریت کے پردے

پڑے ہُوئے ہیں، جن کو آقائے نامدار نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل چاک کیا تھا۔

والدین

جیسا کہ میں کہہ چکا ہُوں سات سال تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی پر عبدالمطلب کا گہرا اثر رہا۔ آپ کے والد عبداللہ آپ کی پیدائش سے قبل ہی رحلت فرما چکے تھے۔ آپ کی والدہ محترمہ کی شخصیت بھی تاریخ کی روشنی میں دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہے اسلام میں دو تین بہت بڑی اور کامل عورتیں ہُوئی ہیں۔ لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مہر مادری اور شفقت پدری دونوں سے ہی محروم تھے آپ کی والدہ ماجدہ چھ سال کی عمر میں انتقال فرما گئی تھیں۔ عرب کے رواج کے مطابق آپ نے اس چھ سال کے عرصہ میں اپنی والدہ کو بہت کم دیکھا تھا۔ اور یہ اس طرح ہُوا کہ مکہ کے جلیل القدر قبیلے موسم گرما میں اپنے بچّوں کو سخت گرمی سے بچانے کے لیے اندرونِ ملک میں جہاں نسبتاً کم گرمی ہوتی ہے، بھیج دیا کرتے تھے۔ اس لیے جونہی بچّے توتلی زبان سے باتیں کرنے کے قابل ہوتے اس وقت سے الھڑپن تک دُودائیوں کی گود میں ہی پلتے تھے۔ اسی رواج کے مطابق رضاعت کے فرائض کا زیادہ حصہ بی بی حلیمہؓ نے جو محمد صلعم کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہیں سرانجام دیا۔ بی بی حلیمہؓ کا خاندان غربت اور بے کسی سے دوچار تھا۔ آپ کے قبیلہ کی دُوسری عورتیں امیر گھرانوں کے بچّوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی تھیں۔ مگر حلیمہؓ کی بلند نصیبی دیکھیے کہ اُسے دُودھ پلانے کو ایک یتیم بچّہ ملا، جس کے سر سے ماں کا سایہ بھی بہت جلد اُٹھنے والا تھا۔ عبدالمطلب کے سولہ بچّے تھے اور عبداللہ ان کے آٹھویں لڑکے تھے، اس لیے وہ کوئی بہت امیر نہ تھے اور ان کی بیوہ حلیمہؓ کو بہت زیادہ معاوضہ دینے کے قابل نہ تھیں۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اس خوش بخت دُودھ پلانے والی نے اس بچّہ کو اٹھایا جس کی آنکھوں سے روشنی اور پاکیزگی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ اس پاکیزہ جوہر کو اس طرح اٹھا کر وہ شاداں و فرحاں اپنے قبیلے میں واپس چلی آئی اور دو سال تک تن دہی سے رضاعت کے فرائض سرانجام دیے۔ رواج کے مطابق اب اُسے بچہ کو واپس کرنا تھا بادلِ ناخواستہ وہ اسے واپس لے کر آئی، لیکن فراق کے خیال سے اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ بالآخر اس نے آنسو بھری آنکھ اور لجاجت بھرے دل سے درخواست کر دی کہ مجھے ایک دو سال کے لیے اور اس بچّہ کو دُودھ پلانے کی اجازت دی جائے کیونکہ "یہ پیارا بچّہ ہمک کر جب میری چھاتی سے چمٹ جاتا ہے تو میری رگوں میں اطمینان و سرور کی مقدس لہریں دوڑ جاتی ہیں۔" اس کی اس بے تابانہ درخواست کو ٹھکرایا نہیں گیا اور وہ خوشی خوشی بچّہ کو واپس لے آئی۔ لیکن آخر کار وُہ وقت آ گیا کہ وُہ اس کو اور زیادہ اپنے پاس نہ ٹھہرا سکتی تھی۔ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار سال کے قریب تھی۔

بی بی حلیمہؓ

انسانی تاریخ میں اس پیارے بچّہ اور دائی حلیمہؓ کے درمیان بے حد محبت تھی۔ بی بی حلیمہؓ کے دو لڑکے بھی تھے۔ اور یہ رضاعی بھائی محمد صلعم کو بہت پیار کرتے تھے۔ محمد صلعم ان کے ساتھ باہر جایا کرتے تھے۔ ایک دن حلیمہؓ کے دونوں لڑکے اپنی بھیڑیں چرانے باہر لے گئے تھے۔ آپ نے حلیمہؓ سے پوچھا: "اماں! میرے بھائی کہاں ہیں؟" حلیمہؓ نے محبت بھری نظر سے

دیکھ کر جواب دیا: "میرے لال! مجھے پتا ہے تجھے ان سے بھائیوں کی طرح محبت ہے۔ کیا تو بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا ہے؟" محمد صلعم نے بھولے انداز سے کہا: "ہاں"۔ اس کے بعد جیسا کہ روایت میں بیان کیا جاتا ہے حلیمہؓ نے نہایت محبت سے اس بھولے بھالے معصوم بچّہ کو اُجلے کپڑے پہنائے۔ اور اس خیال سے کہ مبادا کوئی بدرُوح اسے تکلیف پہنچائے آپ کے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا اور آپ کی آنکھیں اور پیشانی چُومتے ہُوئے کہا "جا میرے لال۔ اپنے بھائیوں سے جا کر کھیل۔ اللہ تیرا نگہبان ہو"۔ محمد صلعم نے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بھولے انداز سے پُوچھا: "اماں! یہ کیا ہے؟" حلیمہؓ نے کہا: "لال! یہ تعویذ ہے تاکہ بدرُوحیں تجھے تکلیف نہ پہنچا سکیں"۔ یہ بات سُن کر ننھے محمد صلعم نے تعویذ اتار کر پھاڑ پھینکا اور عجب شانِ دلربائی سے کہا: "مجھے ایسی چیزوں کی حفاظت پسند نہیں، خدا خود میری حفاظت کرے گا"۔ مدتوں بعد محمد صلعم نے دعوتِ حق بلند کی۔ تو حلیمہؓ نے شہادت دی کہ چھوٹی سی عمر میں بھی ننھے محمد صلعم نے جہالت کی قبا چاک کر ڈالی تھی اور اُس وقت بھی اُسے خدا پر کامل یقین تھا۔

قلب میں انوارِ تجلیات

اس کے علاوہ ایک اور کہانی بھی بیان کی جاتی ہے جس کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ تمثیل ہے یا امر واقعہ ہے وھو ھذا۔ جس وقت حضورؐ کی عمر تین سال کی تھی اور آپ اپنے رضاعی بھائیوں سے کھیل رہے تھے آپ یکایک غائب ہوگئے دوسرے لڑکے سخت متعجب ہُوئے، ان میں سے ایک ہانپتا کانپتا حلیمہؓ کے پاس آیا اور کہا: "اماں! کچھ خبر بھی ہے محمدؐ کو کیا ہوگیا ہے، جلدی آ، دیکھ، تجھے تو بہت دیر ہوگئی ہے"۔ حلیمہؓ بھاگتی بھاگتی آئی اور تلاش کے بعد محمدؐ کو ایک درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا، ان کو حیران و پریشان دیکھ کر اُس نے معصومانہ انداز سے پوچھا: "آپ حیران کیوں ہیں؟" انہوں نے مسرت آمیز تعجب سے کہا: "واہ! ہم حیران کیوں نہ ہوں۔ تُو تو غائب ہوگیا تھا"۔ حلیمہؓ نے پیار سے پُوچھا: "تُو یہاں کیا کر رہا تھا؛ اور تیرے ساتھ کیا ہُوا؟" محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: "میں نے دو آدمی فرشتوں کی مانند دیکھے جنہوں نے مجھے اُٹھا لیا اور پھر میرا دل چیر کر اسے برف سے دھو ڈالا۔ اور اس میں پاکیزہ خوشبُو بھر دی"۔

ان واقعات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچپن سے ہی آنحضرتؐ میں خیالات، حسیات اور مناظرِ قدرت سے لگاؤ کی جھلک نظر آتی تھی اور خدا کی قدرتِ کاملہ جو مردوں، عورتوں، بچّوں، پرندوں غرض ہر ایک حقیر جاندار کی خبرگیری کرتی ہے۔ اور جو ہمیں پاکیزگی اور روشنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے ہم پر بالکل روشن ہو جاتی ہے۔

ابُو طالب

جسمانی ترقی کے ساتھ ساتھ محمد صلعم کی انسانی محبت اور رحم دلی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور لوگ اُسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتے تھے کہ "یہ کس قدر پیارا اور رحم دل بچّہ ہے!" پانچ سال کی عمر میں آپؐ کی والدہ کا انتقال ہُوا۔ لیکن آپؐ کے دادا تمام خاندان سے آپؐ کو زیادہ پیار کرتے تھے۔ اور جب ان کے ملنے جلنے والے ملاقات کی غرض سے آتے تو عبدالمطلب محمد صلعم کو

نہایت شفقت سے "میرے بیٹے" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے مفسرین یہ لکھا دیکھ کر متعجب ہُوا کرتے ہیں کہ محمد صلعم عبدالمطلب کے پوتے نہ تھے بلکہ بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور آپؐ کی پرورش کا ذمّہ ابو طالب نے لیا جو آپ کے حقیقی چچا تھے۔ اور اگرچہ ابو طالب نے آباو اجداد کے مذہب کو نہ چھوڑا، تاہم آپ نے اپنے عظیم الشان بھتیجے کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن سعی کی۔ جس وقت ابو طالب کا انتقال ہُوا، اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سن شریف پچاس سال تھا۔ ابو طالب کے اور بھی لڑکے بالے تھے۔ لیکن ان میں کبھی رقابت کا جذبہ پیدا نہیں ہُوا کیونکہ محمد صلعم بہت زیادہ پیارے تھے اور ان کے چچازاد بھائی ان کو عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ ابو طالب کے لختِ جگر علیؓ تو جو حضرت محمد صلعم سے بیس سال چھوٹے تھے اپنے چچازاد بھائی پر پروانہ وار نثار تھے۔

تجارتی مراکز کا سفر

محمد صلعم کسی منزل میں اپنے خیالات اور دلچسپیوں کو وسیع کرنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ابو طالب تجارت کی غرض سے مصر اور شام کو جایا کرتے تھے۔ جس وقت آنحضرتؐ کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی آپؐ نے بھی ساتھ جانے کا شوق ظاہر کیا۔

ہم قوتِ تخیل کے ذریعہ چچا اور بھتیجے کی گفتگو کا تصور کرسکتے ہیں۔ ابو طالب کہتا ہوگا "لیکن تُو تو ابھی چھوٹی عمر کا بچّہ ہے۔" محمد صلعم جو اپنی عمر کے لحاظ سے بہت زیادہ عقلمند اور دھن کے پکّے تھے جواب میں کہتے ہوں گے: "یہ ٹھیک ہے کہ میں عمر کے لحاظ سے بہت کم سن ہُوں لیکن خدا کی وسیع و عریض دنیا جس طرح بڑوں، بوڑھوں اور مردوں عورتوں کے آگے پھیلی ہُوئی ہے۔ اسی طرح کم سن بچّوں کے آگے بھی کتابِ عالم کھلی ہُوئی ہے۔ میں دنیا کے آدمیوں اور عورتوں کو دیکھنا چاہتا ہُوں کہ وہ کس طرح کاروبار اور تجارت میں مصروف ہیں۔ میں ان کے طور طریقوں اور ان کے دلوں سے واقف ہونا چاہتا ہُوں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ وہ کس طرح خدا کی طرف جھکتے ہیں۔" کہا جاتا ہے کہ تیرہ سال سے پچیس سال کی عمر تک محمد صلعم مصر، شام اور یمن کے سفروں کے درمیان جو اس وقت عرب کے گردو نواح میں تہذیبی مراکز تھے۔ عیسائی رہبانوں اور یہودی علماء سے عموماً ملا کرتے تھے۔ وہ ان کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے نہیں بلکہ نہایت محبت اور شریفانہ طریقہ سے گفتگو کرنے کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کے دلوں پر اپنی نیک نیتی اور شرافت کا غیر فانی نقش چھوڑ آیا کرتے تھے۔ شیکسپیئر میں ایک ناقابلِ فراموش محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"ہماری خامیوں کی تلافی اپنے تخیل کی مدد سے کرلو۔"

محمد صلعم ایک ایسے انسان تھے جنھوں نے اپنی قسمت اور حالات کی خامیوں کی تلافی اپنی بے مثل شخصیت سے کی۔ اگرچہ بچپن میں ہی شفقتِ پدری اور مہرِ مادری سے محروم ہوگئے تھے تاہم انہیں دو ماؤں کی محبت نصیب تھی، اور انھوں نے انسانوں کے لیے ان غیر فانی الفاظ میں ماں کی عظمت و رفعت کا سبق چھوڑا ہے "زیرِ قدمِ والدہ فردوس بریں ہے۔" وہ مصائب و نوائب کے بے پناہ سختیوں سے واقف ہونے کے باوصف بھی بچّوں اور بیکسوں پر معصوم تبسم کے پھول نثار کیا کرتے تھے۔ "الفقر فخری"

ان کی کتاب زندگی کا سنہری باب تھا۔ تنہائی ان کی زندگی کا جزو تھی۔ مگر لوگوں کی مجلسوں میں وُہ اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کرتے تھے وہ لوگوں سے مل کر عقل و فراست کے موتی حاصل کرتے تھے۔ وُہ کم گو تھے۔ مگر ان کے الفاظ موزونیت اور فصاحت و بلاغت کا مرقع ہوتے تھے۔ اگرچہ وُہ اُمّی محض تھے۔ مگر عام اشیاء کی حقیقت اور لوگوں کے دل کی عمیق گہرائیوں سے واقف تھے۔ وہ وسیع القلب تھے جو ہر وقت جاگتا رہتا تھا۔ انہوں نے فرمایا ہے:

"میری آنکھیں سو جاتی ہیں مگر میرا دل ہر وقت بیدار رہتا ہے۔"

دیانت و امانت

آپ ان حالات میں جوان ہونے گئے۔ اور اسی عمر میں آپ کی صداقت و حقانیت، عزم و ارادہ کی پختگی اور بے مثل امانت کا شہرہ تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے: "ان میں صداقت کی جھلک نظر آتی ہے۔" جس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ مکہ کی ایک امیر عورت نے جس کے تجارتی قافلے شام اور مصر کو جایا کرتے تھے اپنے دل میں کہا کہ "اگر میں اس دیانتدار اور باوفا شخص کو اپنی تجارت میں شامل کر سکوں تو میرے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ میں نے اس کی دیانت اور امانت کا بہت شُہرہ سنا ہے۔ اچھا میں اُسے پیغام بھیجوں گی۔" چنانچہ اس خاتون نے لرزتے ہوئے پیغام بھیجا کہ وہ اس کے تجارتی قافلہ کی سرداری قبول کر لیں۔ انہوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس خاتون نے اس قافلہ میں بہت سا مال لگا دیا۔ اور جب محمد صلعم سفر سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے کوڑی کوڑی کا حساب دیا۔ یہ سفر تجارتی نقطۂ نگاہ سے بہت کامیاب رہا۔ اور وُہ خاتون محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ قدردان ہوگئیں۔

حضرت خدیجہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ

حضرت خدیجہؓ بہت امیر اور با اثر خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حُسنِ سیرت کی طرح حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا۔ آپ اکثر محمد صلعم سے تجارتی امور کے علاوہ دُوسری باتوں کے متعلق گفتگو فرمایا کرتی تھیں۔ اور محمد صلعم ان حیرت انگیز باتوں کے متعلق انہیں آگاہ کرتے جو انہوں نے چشمِ بصیرت سے دیکھی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کو محمد صلعم کی مذہبی شیفتگی کا علم تھا اس لیے وُہ نہایت احترام سے ان مذہبی معارف کو سنا کرتی تھیں، جن کے متعلق وُہ عیسائی رہبانوں اور یہودی علماء اور عرب کے سرداروں سے باتیں کیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں محمد صلعم نے اپنے خواب بھی ان سے بیان کیے اور غارِ حرا میں شب بیداری اور ستاروں کے نکلنے اور چھپنے کے دل آویز اثرات بھی سنایا کرتے تھے۔ محمد صلعم کا مذہبی رجحان دیکھ کر حضرت خدیجہؓ کو آپ سے بہت محبت ہوگئی اور وُہ آپ کے عقدِ مبارک میں آگئیں۔ آپ نے ان کی زندگی بھر ایک باوفا شوہر کی مانند ان کے ساتھ زندگی بسر کی۔ حضرت خدیجہؓ بے حد نیک اور پاکیزہ بیوی تھیں، جو اپنے شوہر کی فطرت سے آگاہ اور ان کی اخلاقی اور روحانی تکلیفوں کو سمجھتی تھیں۔ جس وقت تمام دنیا نے انہیں ماننے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت خدیجہؓ نے انہیں نبی تسلیم کیا۔ انھوں نے کبھی ایک بار بھی اپنے پاکیزہ شوہر

کے کام میں بارج ہونے کے خیال سے اور ان کے لائحۂ عمل میں رکاوٹ پیدا کرنے کے اندیشہ سے اپنی شخصیت کو ان کی شخصیت پر فنا نہ کیا۔ پچیس سال سے چالیس سال کی عمر تک محمد صلعم تمام بیرونی تفکرات سے بہت حد تک آزاد ہو کر روحانی ارتقاء کی منازل طے کرتے رہے، تاکہ وُہ اپنے عظیم الشان فرض سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکیں۔

حضرت خدیجہؓ اسلامی تاریخ میں چار مکمل پاکیزہ عورتوں میں سے تسلیم کی جاتی ہیں۔ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ بھی آپ کے پایہ کی تھیں جو بعد میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے حبالہ عقد میں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ مکمل باپ اور پاکیزہ ترین ماں کی پاکیزہ بیٹی تھیں۔

جس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور اس پر تمام عرب ان کی مخالفت پر کمر باندھ کر کھڑا ہو گیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر سات آٹھ سال کے قریب تھی۔ وہ اپنے والد محترم کے ساتھیوں کو استبداد کی چکی میں پِستا دیکھتی تھیں اور آنسو پی کر چُپ ہو رہتی تھیں۔ مگر ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے والد کے دعویٰ کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے تیار نہ تھیں۔

جنگِ اُحد کے بعد جب حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی عمر اکیس سال تھی تو انہوں نے میدانِ جنگ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ و السلام کے زخم دھو کر پٹی باندھنے میں بہت بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ آپ محبت اور شفقت کا سرچشمہ اور پاکیزگی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھیں۔

جس وقت آنحضرت کا سن شریف ۳۵ سال تھا، اس وقت ایک معاملہ پیش آیا، جس سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی دیانت و امانت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ اور اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ برائے نام مذہبی اور دنیاوی عقل کی خشک اور سخت روایتوں سے بالاتر ہو کر انسانی دل کی گہرائیوں سے واقف ہو سکتے تھے۔

اس وقت کعبہ کی دوبارہ تعمیر ہو رہی تھی اور تمام قبیلوں میں حجرِ اسود کو نصب کرنے پر سخت جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ہر ایک قبیلہ یہی سمجھتا تھا کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا ہمارا مقدم حق ہے۔ قریش کے مختلف قبیلوں میں اس پر فساد کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں اور قریب تھا کہ تلواریں تڑپ کر میانوں سے نکلتیں اور دم بھر میں کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ اسی اثناء میں محمد صلعم جنہیں "الامین" کے معزز لقب سے پکارا جاتا تھا، ادھر آ نکلے۔ وہ بنی نوع انسان کی ہر مصیبت کے وقت اپنے سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے سے گریز نہ کرنے والے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی انہوں نے اس تشویشناک نزع کو نہایت احسن طریقہ سے نپٹا دیا۔

اگرچہ قریش کے تمام قبیلوں نے انہیں ثالث مقرر کر دیا تھا، مگر محمد صلعم نے کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جس سے کسی قبیلہ کی طرفداری کا شبہ ہو سکے یا ان کی اندرونی رقابت کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔

چنانچہ آپ نے اپنی چادر زمین پر بچھا دی۔ اور اس پر حجرِ اسود رکھ کر لوگوں سے کہا: "ہر ایک قبیلہ اپنا ایک ایک نمائندہ بھیج دے۔" جب تمام قبیلوں کے نمائندے آ گئے تو آپ نے ان کو چادر کے کونے پکڑا دیے اور اس طرح خود حجرِ اسود اٹھا کر اس کی جگہ نصب کر دیا اور عربوں کو ہولناک خونریزی سے بچا لیا۔ یہ تو ایک معمولی واقعہ تھا، مگر اس کے بعد ان سے ایسے امور سرزد

ہونے والے تھے جن نے تمام دنیا کو غرقِ ورطۂ حیرت کر دیا۔

نبوّت کا اعلان

جس وقت آپ کی عمر چالیس سال کی تھی تو آپ نے نبوّت کا اعلان کیا۔ یہ بہت نازک وقت تھا۔ تشکک وشبہات کی تاریک بجلیاں گھر رہی تھیں، مصائب ونوائب کے جھکڑ چل رہے تھے مگر ان سب کے باوصف آفتابِ نبوت چمکا اور اس طرح کہ تمام دنیا کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ آپ غارِ حرا میں (جو مکہ کے نزدیک ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی) اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے وہاں آپ متعدد راتیں عبادت اور تفکر میں گزارتے تھے۔ اور اکثر اس بات پر غور کرتے کہ میں اپنی قوم کو ان کی ہلاکتوں سے کیسے آگاہ کروں۔ ایک رات تجلیات سے ان کا سینہ مطلع انوار ہوگیا اور وہ قریب قریب بے ہوش ہو گئے۔ انہوں نے ایک فرشتہ دیکھا جو انہیں "اقرأ" یعنی "پڑھ" کہہ رہا ہے۔

محمد صلعم نے کہا: "میں کیسے پڑھوں، مجھے پڑھنا نہیں آتا۔"

لیکن پھر وہی "اقرا" کی آواز ان کے کان میں گونجنے لگی اور انہوں نے سنا "اٹھ اور لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا، خدا جو خالق ہے جس نے آدمی کو لکھنا پڑھنا سکھایا اور اس کو نیا علم سکھایا۔"

اس پیغام کو سُن کر آپ اپنی بیوی خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور اُن سے کہا:

"مجھ پر اس قدر بوجھ آپڑا کہ مجھے کچھ خبر نہ رہی، یہ مجھ پر کیا آیا تھا؟ یہ مجھ پر کیا بوجھ آپڑا ہے؟ کیا میں اس کو سہار سکوں گا؟ کیا یہ کوئی خبیث رُوح تو نہیں؟"

خدیجہؓ نے انہیں اطمینان دلایا اور کہا:

"آپ صادق ہیں، دنیا آپ کو ایماندار اور صادق کی حیثیت سے جانتی ہے، اور آج تک آپ کے لبوں سے کوئی جھوٹا لفظ نہیں نکلا۔ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت ہے کہ آپ دنیا کو اس کا پیغام پہنچائیں۔"

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ پر ایمان لے آئیں، وُہ اپنے چچا زاد بھائی ورقہ کے پاس بھی گئیں اور انہیں تمام سرگزشت سے مطلع کیا۔ اس وقت دنیا "مسیح" کے انتظار میں کروٹیں بدل رہی تھی اور ان میں بہت سے لوگوں نے کہا کہ "آپ درحقیقت خدا کے پیغمبر ہیں"۔ یہ آپ پر پہلی وحی ہوئی تھی اور اس کے بعد مایوسی اور تکلیف، خطرہ اور مصیبت کے لمحوں میں خدائے واحد پر آپ کامل ایمان رکھتے تھے، اور آپ پر الہام ہوتا تھا جو قرآن شریف کی شکل میں محفوظ ہے۔

صبر واستقلال کی مستحکم چٹان

اس واقعہ کے بعد مخالف طاقتیں آنکھیں مل مل کر بیدار ہونی شروع ہوگئیں اور وُہ لوگ جو آپ کو محبت کرتے تھے اور آپ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ آپ کے مخالف ہوگئے۔ آپ کے رشتہ دار بھی آپ کی مخالفت پر کمربستہ

ہو گئے "یہ مجنون ہے، یہ ہمارے بتوں پر سب و شتم کیوں کرتا ہے؟"

عربوں کا دستور تھا کہ وُہ ناپاک اور غیر صالح اعمال میں اپنے بتوں کو پشت و پناہ بنایا کرتے۔ لیکن محمد صلعم نے ببانگِ دہل کہا:

"کہ یہ سب تمہارے ذاتی تصرفات ہیں۔ خدا تو صرف ایک ہے جو اسود و احمر، آقا اور غلام، مرد اور عورت، بچّہ اور بوڑھے میں فرق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک عربی اور عجمی، قریش اور غیر قریش ایک کانٹے میں تُلتے ہیں۔"

یہ انقلابی پیغام ان کے نزدیک آسانی سے قابل قبول نہ تھا۔ جب تک ان لوگوں کے سیم و زر کو کوئی خطرہ نہ تھا محمد صلعم کے پیغام کو مجذوب کی بڑ سمجھتے رہے۔ لیکن جب بہت سے لوگوں نے اسلام کا جُوا اپنی گردن میں ڈال لیا اور ان کے ذرائع آمدنی میں خطرہ پیدا ہُوا تو ان کی آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے برسنے لگے۔ از بسکہ کعبہ کے متولی چڑھاوا اور نذر و نیاز کی فراوانیوں سے محروم ہو رہے تھے اس لیے وہ اور بھی برافروختہ ہو گئے۔ محمد صلعم کی تعلیم انقلاب انگیز تھی کیونکہ وُہ انسانوں میں تفریق مٹانے آئے تھے۔

انہوں نے بلال حبشیؓ اور خبابؓ کو عربوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا تھا جس پر عربوں نے بیک آواز کہا کہ: "یہ آدمی تو ہمارے آباؤ اجداد کی ریت مٹانے آیا ہے۔ اس کے خاندان کے لوگ بھی کیسے ہیں کہ اس کا دماغ بھی درست نہیں کر سکتے"۔ انہوں نے حیلہ و حوائج اور لالچ و فریب سے انہیں جادۂ مستقیم سے متزلزل کرنا چاہا۔ مگر خدا کے مامور کی نگاہ میں سونے چاندی کے انبار اینٹوں سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ جب کفارِ عرب نے دیکھا کہ وُہ کسی طرح سے بھی ڈھب پر نہیں آتے۔ تو انہوں نے ان کے عزیز و اقربا پر ستم توڑنے شروع کیے۔ مگر جو شخص دنیا میں خدا کا نام بلند کرنے نکلا ہو۔ اُسے کون ڈھیل دے سکتا ہے۔

دنیا نے پیغامِ حق کیسے سُنا

محمد صلعم نے جو بیج بویا تھا آخر بار آور ہونا شروع ہُوا۔ اور تمام قبیلوں کے لوگ ان پر ایمان لانے لگے۔ ابوبکرؓ نے جو عرب میں بااثر تھے، علی الاعلان کہہ دیا:

"یہ شخص اپنے دعوٰی میں بالکل سچّا ہے اور میں اس پر ایمان لاتا ہُوں"۔

ابوطالب جو محمد صلعم کے انقلاب آفریں پیغام کا مفہوم نہ سمجھتا تھا اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قایم تھا، تا دمِ آخر اپنے بھتیجے کی امداد پر کمر بستہ رہا۔ محمد صلعم نے عورتوں کو جو عربوں کی مخصوص ذہنیت کی وجہ سے ذلت و نکبت کے تاریک گڑھوں میں گری ہوئی تھیں۔ از سرِ نو انسانیت کے زمرہ میں شریک کرنے کے لیے سعی مشکور کی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بہت سی عورتوں نے آپ کی صدا پر لبیک کہی جن میں حضرت خدیجہؓ آپ کی زوجہ محترمہ ہی سب سے پیش پیش تھیں۔ ان کے علاوہ ایک اور خاتون بھی تھیں جن کا میں ابھی ذکر کروں گا اور جنہوں نے اسلام کی گراں بہا خدمات سر انجام دیں۔ امیر و غریب آدمی اور عورت، بچّے اور بوڑھے اسلام کے جھنڈے تلے اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ وہ لوگ جن کے حقوق کچلے جاتے تھے اور جن کے سروں پر ظلم و ستم کے آرے چلتے تھے بیک آواز پکار اُٹھے "یہ انسان تو ہمارے لیے رحمت کا سرچشمہ ہے۔ دُوسرے لوگ کبر و نخوت میں ہماری

ہستی سے ہی انکار کرتے ہیں۔ سخت گیر آقاؤں کے ستائے ہوئے غلام ان کے پاس آتے اور آقا بن کر واپس جاتے۔ سرزمین مکہ میں زید بن حارث ایک غلام تھا، جسے بعد میں آزاد کر دیا گیا تھا۔ اس کا باپ اس کو لینے کے لیے آیا لیکن اس غلام نے جس کی آنکھیں آفتاب نبوت سے مستفید ہو چکی تھیں، کہا: "اگرچہ میں آزاد ہوں اور میں آپ کو اپنے والد کی طرح محبت کرتا ہوں۔ مگر میرا ایک رُوحانی باپ بھی ہے جس کی محبت میرے جسم کے رونئیں رونئیں میں بسی ہوئی ہے۔"

زید نے اپنے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور آستانۂ نبوت پر قرب حقیقی کے لطف اٹھاتا رہا۔ زید تمام عمر آقائے نامدار رحمت عالمیان فخر عالم محمد صلعم کے ساتھ رہا۔ اور بعض اوقات اسے زید بن محمد بھی کہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت ہی غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالی گئی تھیں نہ کہ بارہ سو سال بعد۔

عمرؓ بن الخطاب

اب میں عمرؓ بن الخطاب کے اسلام لانے کے واقعہ پر ایک چھچلتی ہوئی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ آغاز اسلام میں عمرؓ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے محمد صلعم کے آوازۂ حق کو دبانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے تپتی ہوئی چٹانوں پر ننگا بدن لٹا دیتے تھے تاکہ موسم گرما کے گرم سورج کی حدت ان کے دلوں سے اسلام کا جذبہ مٹا دے۔ مگر اسلام وہ نشہ ہے جسے سختی کی کوئی ترشی اتار نہیں سکتی۔ اسلام کی پہلی جانباز شہید ایک خاتون تھیں جن کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر نیزے سے دو نیم کر دیا گیا اور ان کے خاوند کو بھی شہید کر دیا گیا۔

ایک دفعہ کسی شخص نے عمرؓ سے کہا کہ "خیر آپ اسلام کو تو خوب مٹا رہے ہیں مگر پہلے ذرا اپنے گھر کی خبر تو لیں، آپ کی بہن تو مسلمان ہو چکی ہیں۔"

یہ سُن کر عمر کا پارہ غیظ و غضب کھولاؤ کے درجہ پر پہنچ گیا اور کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بہن اس مجنون پر ایمان لے آئے۔" اور سخت جوش میں بھرے ہوئے اپنی بہن کے گھر گئے یہاں وہ، ان کا خاوند اور ایک اور آدمی موجود تھے۔ عمرؓ کو دیکھ کر وہ بہت متردد ہوئے۔ عمرؓ نے غصہ میں بھری ہوئی آواز میں کہا:

"کیا تم اس سڑی پر ایمان لے آئے ہو، کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے، تم اس جادوگر کے سحر سے آزاد ہو۔"

اگرچہ وہ دونوں عمرؓ کے رعب سے خوفزدہ تھے لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ:

"ہم تو محمد صلعم پر ایمان لے آئے ہیں اور اب خواہ ہمارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں ہم ابدًا اس سے مُنہ نہیں موڑ سکتے۔"

عمرؓ اپنے بہنوئی پر ٹوٹ پڑے اور جب ان کی بہن نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا تو اس کے گال پر ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ خون جاری ہو گیا۔ ان سب باتوں کے باوصف وہ اپنے ایمان میں غیر متزلزل رہے۔ اس پر معاً عمرؓ کے دل میں خیال پیدا ہوا آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے ان کے دلوں میں استقامت اور فروتنی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہے اور اس نے اپنی بہن کو قرآن کا وہ صفحہ دکھانے کو کہا جو وہ تلاوت

کررہی تھیں۔ ان کی بہن نے کہا: "بھائی! اس پاکیزہ چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے تُو پاک ہو لے۔" اس کے بعد جب انہوں نے قرآن سُنا تو ان پر عجیب اثر ہُوا، اور وہ ایمان لے آئے۔ اور ان کے شاندار کارناموں سے تاریخ اسلام کے زرّیں باب روشن ہیں۔

ظلم وستم کا دور

جُوں جُوں اسلام لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کفارِ عرب بھی زیادہ سے زیادہ ظلم کرنے لگے۔ ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بہت سے مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ کچھ حبش میں چلے گئے جہاں عیسائی بادشاہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۵۲ سال تھی مدینہ منوّرہ کے گرد و نواح میں اسلام پھیلنا شروع ہوگیا۔ مدینہ میں اسلام لانے کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ وُہ قبیلے جو پہلے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے تھے شیر و شکر ہوگئے اور ان کی اخلاقی حالت بہت بلند ہوگئی۔ بہت سے مسلمان مکّہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے۔ اس پر سردارانِ مکہ اور بھی برافروختہ ہوگئے اور انہوں نے یہ سازش کی کہ جس طرح بھی محمدؐ کو قتل کردیا جائے۔ مدینہ والے محمد صلعم کو دعوت دے چکے تھے کہ وُہ مکّہ چھوڑ کر ان کے ہاں تشریف لے آئیں۔ چنانچہ آپ نے ان کی دعوت قبول فرمالی اور اپنے متبعین کو پہلے مدینہ بھیجنا شروع کردیا۔ اس طرح دو دو اور تین تین کی پارٹیوں میں مسلمان مدینہ شریف کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ جس رات کفار آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھ چکے تھے، حضرت علیؓ نے آپ سے کہا: "میں آج رات آپ کے بستر پر سوؤں گا، میں نوجوان ہوں، اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔ اس کے بعد میں آپ سے جلدی آملوں گا۔" جیسا کہ کہا جاتا ہے محمد صلعم حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں مدینہ شریف کو ہجرت فرما گئے اور ان کے بستر میں شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سو گئے۔ جس وقت کفار آئے اور انہوں نے محمد صلعم کی جگہ علیؓ کو دیکھا تو پیچ و تاب کھا کر واپس چلے گئے۔

مدینہ شریف کو ہجرت

مدنی زندگی گیارہ سال تھی۔ اور ان گیارہ سالوں میں عرب کی تمام تاریخ بدل گئی۔

اہلِ مدینہ نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں اور تمام عرب ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے شروع ہوگئے۔ قریش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے اور چاہتے تھے کہ مدینہ کو فتح کرکے محمد صلعم کو اس جسارت کا مزا چکھائیں۔ ان کے یہ مذموم عزائم معلوم کرکے حضورؐ نے دفاعی تدابیر شروع کردیں اور دنیا کو بتلا دیا کہ محمدؐ صرف رسول ہی نہیں، جس کا کام صرف دعوتِ حق ہی ہو بلکہ وُہ ایک شجاع سپاہی، ایک زبردست منتظم، پاکباز تاجر، صالح سیاست دان، بلند نگاہ مفکر اور حق پسند ثالث بھی تھے۔ اور ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان تمام حیثیتوں سے محمد صلعم نے ایک نئی رُوح اور ایک نیا جذبہ پیدا کرکے دنیا کا زاویۂ نگاہ بہت بلند کردیا۔ میں ان کی تفصیلات کے بحرِ بیکراں میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ سیرت کی بہت سی کتابوں میں ان کے متعلق تفاصیل کے دفتر موجود ہیں۔

رحم

دس سال تک قریش نے پے بہ پے کوششیں کیں کہ محمد صلعم کی طاقتوں کا تیا پانچا کرکے انہیں ایسا مزا چکھایا جائے کہ چھٹی کا

دُودھ یاد آجائے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جو محمد صلعم اور ان کے پاکباز ساتھیوں کو گھائل کرنے کے دن رات منصوبے سوچتے رہتے تھے ان کے جگر میں ایسا تیر پیوست ہونے والا تھا کہ ان کے لیے ہائے ہائے کرکے بیٹھ جانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

قریش کی دست درازیوں کے دن بیت گئے اور عرب میں ایک نئے سلسلے کا آغاز ہُوا۔ یعنی محمد صلعم مظلومی اور مجبوری کی زنجیروں کو توڑ کر مکّہ کی طرف ایک جرّار لشکر کے ساتھ بڑھے اور بغیر خونریزی کے اُسی سرزمین میں

"قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا"

کہتے ہُوئے داخل ہُوئے، جہاں سے دس سال پہلے رات کی سیاہ ظلمت میں مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے پر مجبور ہُوئے تھے۔ وہ لوگ جن کے دن اور راتیں حضور اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے منصوبوں پر بسر ہوتی تھیں ان کے سامنے بیکسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا "بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" شرم و حیا سے ان کی آنکھیں زمین پر گڑی ہُوئی تھیں اور وہ زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ تیرے جیسے بے مثل انسان کے لیے انتقام روا نہیں تُو ہمارے ساتھ وہی سلوک کر جو یُوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ محمد صلعم کا دل انسانی ہمدردی سے اُمنڈ آیا اور ان سب کو معاف کر دیا۔ آپ کی درخشاں شخصیت کی روشنی سے جہالت اور گمراہی کی تاریکیاں کافور ہوگئیں، اور جہاں باہمی رقابت، کینہ اور انتقام کے بوجھ سے زمین کی کمر ٹیڑھی ہو رہی تھی، وہاں اخوت و محبت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ تمام عربوں نے پیغمبرِ اسلام کی قیادت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ لیکن یہ صرف اس سلسلہ کی پہلی ہی کڑی تھی، جس کا مقصد انسانیت کو اخوت کی سنہری زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

غزوات

اب میں غزوات کے متعلق چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہُوں۔ غزوات سے مراد ایسی لڑائی نہیں جس کا مقصد مالِ غنیمت کا اکٹھا کرنا یا ملک غصب کرنا ہو، بلکہ محمد صلعم نے اعمال اور افعال سے ثابت کر دیا کہ انسانی کاروبار میں ہم بے حد صبر و سکون اور بے حد استقلال برت سکتے ہیں اور انہوں نے اصلاح میں بے حد استقامت کا ثبوت دیا۔ کون نہیں جانتا کہ لوگوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے۔ ان پر کوڑا کرکٹ پھینکا گیا اور ان کو گالیاں دی گئیں اور ان پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ تو وہ ان کی تنظیم میں مصروف ہوگئے۔ بزدلی ان کو چھُو بھی نہ گئی تھی مدافعت کے لیے انہوں نے دشمن کے چیلنج کو قبول بھی کیا۔ اور اس سلسلہ میں سعی و کاوش اور جنگ و جدل بھی کی۔

جس وقت مکّہ فتح ہوگیا، اس وقت انہوں نے قتل و غارت سے نہ صرف پرہیز ہی کیا بلکہ ان کی جان و مال کی حفاظت بھی اپنے ذمہ لی۔ آج تخفیف اسلحہ کی کانفرنسوں میں جنگ کے بدنتائج کو دُور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ایسی کوششیں ناکامی پر ہی ختم ہوتی ہیں۔

عالمگیر اخوت

حضرت ختم الانبیاء ۶۳ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ انھیں اپنے انتقال کی پہلے ہی سے خبر تھی۔ اور وُہ جانتے تھے کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہُوں۔ آپ نے آخری حج کے موقع پر جو رُوح پرور خطبہ دیا تھا اس میں عالمگیر اخوت، انسانی خون کی پاکیزگی، عورتوں اور

غلاموں کے حقوق کے متعلق بہت زور دیا۔ غلاموں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ:

"جو خود کھاتے ہو، وہی انہیں کھلاؤ۔ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔"

اور آپ نے تاکید فرمائی کہ اس اعلان کو دوسرے لوگوں تک پہنچا دیا جائے شاید ان پر زیادہ اثر ہو۔

موجودہ زمانہ کا پیغام

آنحضرتؐ کے انتقال کو آج تیرہ سو سال بیت چکے ہیں۔ جو آخری پیغام انہوں نے حج کے موقع پر دیا تھا اس کے ہم وارث ہیں اگرچہ ہم نے ان پاک الفاظ کو ان کی پاک زبان سے خود نہیں سنا۔ لیکن وُہ آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ شاید آنے والی نسلیں میرے پیغام کو کماحقہٗ سمجھ سکیں۔ دراصل محمدؐ کا پیغام تمام نوعِ انسان کے لیے ہے آپؐ کے پیغام نے "آزادی اور دلیل" کی تنگ وادیوں کو بے پایاں وسعتوں سے بدل دیا تھا۔ اور آج جبکہ ہماری "آزادی" اور "دلیل" کا مفہوم سمٹ سمٹا کر بہت محدود ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی پیغام کو پھر گوشِ ہوش سے سُنا جائے۔

آہ! آج ہم اس کے متبعین اس کی صداقت اور اس کی روحانی عظمتوں سے بہت دُور جا پڑے ہیں۔ کاش! ہم آپ کے عظیم الشان بلند ترین اور پاکیزہ پیغام کو سُنیں اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو حرزِ جاں بنائیں تاکہ دُوسرے لوگوں سے ہمارا سلوک نیک ہو۔ اور ہم اپنے عظیم الشان پیغمبر (بابائنا واُمہاتنا) کی طرح جس کی عالمگیر رحمت اور نورِ ہدایت سے تمام نسلِ انسانی فیضیاب ہو رہی ہے۔ اپنے دشمنوں سے بھی حُسنِ سلوک روا رکھیں ورنہ اس پاک انسان کی عالمگیر تعلیم کے بنیادی اصول، ابوّتِ الٰہی اور اخوّتِ انسانی سے ہم ابداً آشنا نہیں ہو سکتے۔ صلّوا علیہ و آلہٖ۔

رحمۃ للعلمین بحیثیت انسانِ کامل

خلیفہ عبدالحکیم

اس اہم اور مقدس مضمون پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ازرہِ تمہید انسان اور کمال کے تصوّرات کی نسبت مختصراً کچھ عرض کیا جائے۔ اس کائنات میں مخلوقات کے جو لاتعناہی اقسام ہیں ان میں سب سے زیادہ عسیر الفہم ہستی انسان ہے۔ انسان نے خاک و باد و آب و آتش اور مظاہرِ فطرت کی نسبت بہت کچھ یقینی علم حاصل کرلیا ہے اور اس یقینی علم کی بدولت انسان خارجی فطرت کا مسخّر بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن خود اپنی نسبت اس کا علم ابھی ابجد سے آگے نہیں بڑھا۔ اپنی نسبت اس کا علم ابھی تک ظنی ہے۔ مگر جنون کی طرح ظنون کے بھی بے شمار اقسام ہیں۔ انسان نے اپنی نسبت متضاد تصورات قائم کر رکھے ہیں اور اس تضاد کو رفع کرنا مقصودِ عقل و حکمت اور غایتِ اخلاق و ایمان ہے۔ مگر یہ کام نہایت درجہ دشوار اور محال معلوم ہوتا ہے۔ طبیعی حکمائے مادیین نے انسان کو لامحدود مادی کائنات کا ایک اتفاقی مظہر اور آنی جانی کیفیت قرار دیا۔ ہستئ بے مقصود کے بحرِ متلاطم میں چند لمحوں کے لیے اُبھرنے اور جلد بے پروا موجوں سے دوبارہ ہمکنار ہونے والا حباب ناپائدار، زمان و مکان کی آفاقیت کا ایک تغیر پذیر اور بے ثبات شائبہ۔ دُوسری طرف آئیڈیالسٹوں نے اس کو مصدر و محورِ ہستی بنا دیا۔ بقول عارفِ رومی؛

قالب از ما ہست شد نے ما ازو

بادہ از ما مست شد نے ما ازو

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ یہ جہانِ بے پایاں بظاہر یم ایام میں غرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ زمان و مکانِ لامحدود سب کا سب اس ایک جام میں غرق ہے، جو انسان کا نفس یا دل ہے۔ مذاہب حکماء ہوں یا ادیان عالیہ، سب کے سب انسان کی متضاد فطرت کو علی الاعلان پیش کرتے ہیں۔ انسان ایک طرف مسجودِ ملائک ہے، تو دُوسری طرف مردودِ خلائق۔ یہ احسن تقویم والی مخلوق گرتی ہے، تو اسفل السافلین کی تاریک گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے اور اوپر اُٹھتی ہے تو اس کے ڈانڈے الوہیت سے جا ملتے ہیں اور تخلقوا باخلاق اللہ کا کٹھن راستہ طے کرنے کے بعد مجاہدہ اور معرفت اس کو حقیقتِ ازلی کا اس درجہ ہم صفت بنا دیتے ہیں کہ آگ میں پڑے ہُوئے لوہے کی طرح بشریت اور الوہیت کا امتیاز دشوار ہوجاتا ہے۔ ایک طرف وہ اس امانت کا امین ہے، جس کو قبول کرنے میں ارض و سما لرز گئے۔ لیکن یہ اہم امانت قبول کرنے والا ظلوماً جہولا اور دیوانہ بھی ہے۔ بقول غالبؔ؛

بُرد آدم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت

ریخت می برخاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یا بقول حافظؔ:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

کسی نے اس کو مجبورِ محض قرار دیا اور کسی نے اس کو اپنی تقدیر کا معمار تصور کیا۔

میر تقی کہتا ہے: ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

آزاد کا یہ فتویٰ ہے: ؎

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

اس جبر کے مقابلے میں علامہ اقبال کی تلقینِ خودی ہے: ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

منطق خواہ کچھ ہی کہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ اختیار کے بغیر چارہ اور نہ صبر سے گریز۔ انسان کی نسبت جتنی باہم متضاد باتیں کی گئی ہیں، ان سب میں ہر ایک جزئی صداقت کی حامل ہے۔ انسان عقل کے جوہر سے مشرف ہے، لیکن اس عقل کو عنان گسیختہ جذبات کا غلام بھی انسان ہی بناتا ہے۔ انسان فطرت کا عظیم الشان شاہکار بھی ہے اور فطرت کی سب سے خطرناک لغزش بھی۔ قرآن کریم کو اس نظر سے پڑھیے تو اس مخلوق کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے، از رُوئے قرآن یہ بھی درست ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت کے مطابق بنایا۔ فطرۃ اللہ الّتی فطر النّاس علیھا۔ لیکن یہ انسان ناشکرا لربّہٖ لکنود بھی ہے۔ خلق من عجل جلد باز بھی ہے۔ کبدیا درد و کرب بھی اس کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ انسان کی زندگی کا سودا زیادہ تر گھاٹے ہی کا سودا ہے۔ ان الانسان لفی خسر۔ انسان آزادی کا خواہاں ہے اور دین بھی حریت کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن وُہ خود اپنے آپ کو توہمات اور حرص و ہوس کی زنجیروں میں جکڑتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ انسان عقل و ایمان اور جذباتِ شہوانیہ کی مخالف لہروں میں پڑتا ہُوا ایک بھنور رہ جاتا ہے۔

اسلام اور اس کی کتابِ حکیم نے انسان کی یہ تمام کیفیتیں بیان کی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ تلقین کی ہے کہ انسان کا وظیفہ زندگی اور مقصودِ حیات یہی ہے کہ وہ زندگی کے تضاد کو رفع کرتا ہُوا مسلسل اس وحدت کی طرف قدم بڑھائے، جو مصدرِ حیات و کائنات ہے۔ اس لحاظ سے دین اور حکمتِ عقلی میں کوئی تضاد نہیں۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے کہ تمام ہستی اپنی کثرت و تنوع کے باوجود ایک وحدت سے سرزد ہُوئی ہے، جو کثرتِ موجودات اور ظاہری تنوع کی شیرازہ بند ہے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون کا یہی گہرا مفہوم ہے کہ ہمارا ماخذ ایک وحدت خلاق ہے اور مقصودِ حیات پھر اسی کی طرف عود کرنا ہے، کلّ شئ

یرجع الی اصلہ :

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

عقل و حکمت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ مظاہر فطرت خارجی ہوں یا مظاہر نفسِ انسانی، غرضیکہ ہر جگہ انفس و آفاق میں ان قوانین کی جستجو کرے، جن کی نسبت قرآن حکیم نے لا تبدیل لخلق اللہ کہا اور اسی کو دین قیم قرار دے کر دین اور حکمت کو ہم آغوش کر دیا ہے۔ دین ہو یا علم یا اخلاق سب رفع اضداد کی مختلف کوششیں ہیں۔

آئیے اس لحاظ سے اسلام اور اس کے پیش کرنے والے رحیم و حکیم نبی کی تعلیم اور زندگی پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

بہت سے فلسفے اور کئی ادیان زندگی کے ظاہری اور باطنی اضداد سے گھبرا گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ متغیر عالم غیر حقیقی اور فریب ادراک یا مایا ہے۔ اور گیان کے ذریعے سے اس فریب سے نجات حاصل کرنا زندگی کی غایت ہونی چاہیے۔ کسی نے آرزوؤں کی اطمینان ناپذیر کشاکش سے بیزار ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے، اس لیے اچھی اور بری تمام آرزوؤں کی بیخ کنی ہی سے نروان حاصل ہو سکتا ہے۔ یونانیوں نے کہا کہ عالم حقیقی اعیانِ ثابتہ کا عالم عقلی ہے اور متغیر مظاہر کا عالم بے حقیقت اور بے ثبات ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں۔ کسی نے ایک عالم کی بجائے خیر و شر کے آفریدہ دو عالم بنا دیے۔ ان میں سے ایک آفریدۂ یزداں اور دوسرا آفریدۂ اہرمن۔ اسلام نے سورۂ فاتحہ کی پہلی ہی سطر میں ان تمام باطل نظریات کی تنسیخ کر دی۔ خالق کائنات کو رب یا پروردگار قرار دیتے ہوئے یہ بتا دیا کہ یہ رب کسی ایک عالم کا رب نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ تمام عوالم ایک ہی خالق کے آفریدہ اور ایک ہی پروردگار کے پروردہ ہیں۔ عالم جماد، عالم نبات، عالم حیوان، عالم انسان، عالم افلاک، عالم ملائکہ ایک ہی ہستی کے آفریدہ ہیں، جو رحمان و رحیم ہے۔ رحمانیت میں رحمت کا جو مظہر ہے، اس کا تعلق آفرینش سے ہے۔ جس کی نعمتیں اور برکتیں مخلوقات کے اعمالِ حسنہ کا اجر نہیں بلکہ رحمت خلاقی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد شانِ رحیمی ہے جس کا ظہور انسانوں کی غلط روی کے بعد ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی ہر لغزش پر گرفت اور عذاب ہوتا تو زندگی محال ہو جاتی۔ خدا کے ہاں عدل بھی ہے، لیکن اس کی رحمت اس کے عدل کو بھی محیط ہے۔ اسی لیے رب العالمین کو رحمٰن و رحیم کے بعد مالکِ یوم الدین کہا گیا تاکہ رحمت کی سبقت انسان پر واضح ہو جائے۔ جس طرح اسلام کا پیش کردہ خدا رحمۃ للعالمین ہے، اسی طرح اس کا نبی کامل بھی رحمت کل کا مظہر ہے۔ کئی مذاہب و ادیان نے اس کائنات ہی کو ملعون قرار دیا تھا۔ نبی حکیم نے کہا کہ یہ کائنات نہ غیر اصلی ہے اور نہ باطل و مردود۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ خدا کی رحمت کل کائنات میں جاری و ساری ہے، وہ کسی ایک عالم تک محدود نہیں۔ حقیقی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عالم کو خدا کا ایک مظہر سمجھا جائے اور ہر مظہر میں خدا کی حکمتیں اور نعمتیں تلاش کی جائیں۔ رہبانیت کے مذاہب عالم مادی و جسمانی کو ملعون سمجھ کر فکر و عمل میں اس سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں تھے اور روحانیت کی تکمیل کے لیے دنیا سے روگردانی اور بدن آزاری کو لازم گردانتے تھے۔ نبی حکیم و رحیم نے یہ اعلان کر دیا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام کوئی انسان دنیا کو رد کر کے نہ روحانیت میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ خدا تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ انسان کے مقاصد اور جذبات میں بے شبہ تضاد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا علاج

جذبات کشی سے نہیں بلکہ حدود و عمل سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے، تاکہ جذبات کی قوتیں نہ باہم برسرِپیکار ہوں اور نہ عقل و ایمان سے دست و گریباں ہوں۔ قرآن و حدیث میں کئی جگہ نفسِ امارہ اور جذبات کی سرکشی کے لیے شیطان کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ سننے والے صحابی نے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی ہے۔ اس کا جو بصیرت افروز جواب دیا، اسلام کی تمام امتیازی شان اس کے اندر موجود ہے۔ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے، لیکن میں نے اس کو مسلمان بنا کر اس کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ازروئے اسلام دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں، جسے شرِ مطلق کہہ سکیں۔ زندگی کی اکثر قوتیں خواہ وہ مادی و طبعی ہوں یا نفسی، بجلی کی طرح بے طرف قوتیں ہیں۔ خیر و شر کا مدار ان کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ دیکھیے رسولِ کریمؐ کی رحمتِ کلی کی تعلیم جس میں جذبات و شہوات کی شیطنت بھی زاویۂ فکر و عمل کی تبدیلی سے معاونِ حیات اور ذریعہ ارتقاء بن سکتی ہے۔

کمالِ صفات کا تصور خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کی ذاتِ کاملہ کا فہم انسان کے لیے ممکن نہیں۔ خدا علیم ہے لیکن اس کا علم انسانی قسم کا علم نہیں ہو سکتا، جو مشاہدہ اور استقراء و استخراج اور علت و معلول کے روابط سے آشنا ہونے کا نام ہے وہ سمیع ہے لیکن اس کا سننا اس قسم کی شنوائی نہیں ہو سکتا، جو ہمارے آلۂ سماعت کی پیداوار ہے۔ وُہ بصیر ہے، لیکن اس کی بصارت ہماری آنکھوں کی بصارت کے انداز کی نہیں ہو سکتی۔ وُہ رحیم ہے، لیکن اس کے رحم میں وہ انفعالی کیفیت نہیں ہو سکتی جو انسان کے جذبۂ رحم میں پائی جاتی ہے۔ سہ

ہیچ ماہیاتِ اوصافِ کمال
کس نداند جُز بآثار و مثال

ان صفات کا کمال صرف خدا ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہت سے ادیان اس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ پیشوایانِ دین کو کامل ثابت کرنے کے لیے ان کو خدا کے صفاتِ کاملہ سے متصف کر دیا اور ان کو خدا کا اوتار بنا دیا۔ اس غلط انگاری سے نبوت الوہیت بن گئی۔ ان مذاہب نے یہ نہ سوچا کہ جب خود خدا ہی انسان کا رُوپ اختیار کر کے دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہو گیا، تو انسانوں کے لیے وُہ کس طرح نمونہ اور حسنہ بن سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لیے تو انسان ہی کی اعلیٰ مثال کام آ سکتی ہے۔ ان ادیان کے مقابلے میں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کمال انسانیت کا کمال ہے۔ یہ ایسے انسان کا کمال ہے جو انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو بندۂ خدا کے طور پر پیش کرتا ہے اور خود معبود بننے کا خیالِ باطل اس کے واہمہ میں بھی نہیں گزر سکتا۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں عرصۂ دراز تک طالبِ حق اور سوچنے والا انسان تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ وُہ ہدایت یافتہ ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کا پیغام رساں کہتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہونے کا مدعی نہیں۔ وہ راست بازی سے کہتا ہے کہ مجھے غیب کا بس اتنا ہی علم ہے، جتنا کہ خدا مجھے بخش دے۔ وُہ خدا کی معرفتِ کلی کا دعویٰ بھی نہیں کرتا۔ باقی انسانوں کے مقابلے میں بیحد حصولِ بصیرت و معرفت کے بعد بھی ما عرفناك حق معرفتك پکارتا ہے۔ اے خدا تیری ذاتِ مطلقہ کو کما حقہٗ جاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے، وُہ اپنے پیرؤوں سے کہتا ہے کہ امورِ دنیا کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ بشریت کے تقاضے سے مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان اعترافات سے

کسی مخلص اور راستباز انسان کے کمال میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ درحقیقت کسی انسان کے لیے دعویٰ کمال خود نقص کی علامت ہے۔ رسولِ کریمؐ کا کمال بشریت اور عبودیت کا کمال ہے۔ رسولِ کریم خدا کے کامل نہیں بلکہ انسان کامل ہیں۔ اس برگزیدہ ہستی کا کمالِ صفات کی ہمہ گیری اور عمل کی جامعیت ہے۔ جو خدا ان کو تمام عالم کے لیے ہمیشہ کے لیے اُسوۂ حسنہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی مشیت نے ان کو زندگی کے تمام مراحل میں سے گزارا اور ہر شعبۂ حیات اور ہر مرحلے میں ان کے فکر و عمل کا انداز اس شعبے میں انسانوں کے لیے شمعِ ہدایت بن گیا۔ بیکسی اور یتیمی سے لے کر سلطانی تک انسانی زندگی کے تمام مراحل طے کر ڈالے۔ وُہ ایک مزدور کی زندگی بھی بسر کر چکے تھے۔ اس لیے مزدور کے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ تھے۔ مزدوروں کو دنیا حقیر سمجھتی تھی لیکن سب سے پہلے اس نبیؐ نے اعلان کیا کہ الکاسب حبیب اللہ، جائز پیشہ اور مزدوری سے روزی پیدا کرنے والا خدا کا حبیب ہے۔ خدا کا حبیب ہونے سے اونچا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کے مصائب اور مخالفت کے مقابلے میں اٹل صبر و استقلال، ناکامیوں میں کبھی مایوس نہ ہونا اور کامیابی میں نخوت و غرور کو نفس کے قریب بھٹکنے نہ دینا، دیانت داری اور حکمتِ عملی سے ایک کامیاب تاجر کے لیے مثال بننا۔ ایک معمر بیوہ سے شادی کر کے آخر دم تک محبت و وفا کی مثال پیش کرنا، کامیاب فاتح بن کر اذیت کیش سنگدل مجرموں کو لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دینا۔ صلح و امن کو اپنی مساعی کی غایت بناتے ہُوئے اگر جنگ کی ضرورت پیش آ جائے، تو شجاعت کی داد دیتے ہُوئے بھی انسانیت کے اقدار کو نظرانداز نہ کرنا۔ ع

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ایک مقنن کی حیثیت سے ایسے عادلانہ قوانین پیش کرنا، جن کی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس کی نسبت بنیادی ہدایت اس اسوۂ حسنہ میں نہ مل سکے۔ یار و اغیار کے ساتھ خوبی کا برتاؤ۔ اختلافِ مسلک کے باوجود دوسری ملتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید، تمام افراد و اقوام کے لیے مذہب و ضمیر کی آزادی، لا اکراہ فی الدّین کا اعلانِ عام۔ سوا ان امور کے جن میں خود فطرت نے تفاوت پیدا کر دیا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض میں عام مساوات، حصولِ علم کی فضیلت اور اس کی ترغیب، افزونی علم کی مسلسل کوشش اور دعا، ارتقاے حیات کا یہ تصور کہ جس شخص کے دو دن ایک جیسے رہے اور اس نے کسی اچھے پہلو میں ترقی نہیں کی، تو وہ گھاٹے میں رہا۔ من استوا یوماہ فھو مغبونٌ۔ روحانیت، حکمت اور اخلاق کی اچھی باتیں ان سے پہلے بھی انبیاء، اولیاء، صلحا، حکماء کہتے چلے آئے تھے لیکن ایمان و حکمت و عمل کی یہ جامعیت کہیں نہیں ملتی ؎

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

نبوت ایسے ہی شخص پر ختم ہو سکتی تھی، جس کی زندگی کسی پہلو میں تشنہ نظر نہ آتے۔ جو مزدور و کسان کے لیے بھی نمونہ ہو اور حاکم و حکیم کے لیے بھی۔ جو پیکارِ حیات اور اضداد اور افکار و جذبات میں صلح جوئی اور وحدت آفرین کے ڈھب صرف نظری طور پر نہ بتائے بلکہ نصب العین کو عملی جامہ پہنا کر افراد و اقوام کے لیے بلند ترین نمونہ پیش کرے۔ اس جامعیت کا انسان نہ تاریخِ عالم نے بعثتِ محمدیؐ سے پہلے پیش کیا اور نہ آیندہ اس کا امکان ہے۔ محض افکار عالیہ کے مقابلے میں زندہ عملی مثال کہیں زیادہ موثر ہوتی ہے،

انسانوں کے اخلاق اچھے نمونوں سے متاثر ہو کر عمدہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اچھے نمونے محمد رسول اللہ ہی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کو انسانِ کامل کہہ سکتے ہیں۔ جس کا کمال ہر شعبۂ زندگی میں نظر افروز اور ہمت افزا ہو اور جس کی جامعیت سے انسانیت کا کوئی شعبہ خارج نہ ہو۔

محمد عبدہٗ و رسولہٗ

ماہر القادری

آسمان و زمین میں کسی مخلوق کی اتنی توصیف و ستائش نہیں کی گئی جتنی محمد عربی ﷺ کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ "محمد" مشتق ہی حمد سے ہے جس کے معنی تعریف کے ہیں! محمدؐ وہ عبد کامل اور انسانیت کا محسنِ اعظم ہے جس کی تعریف ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی! عبدالمطلب کو جب یہ خوشخبری ملی کہ اُن کے پوتا پیدا ہوا ہے تو اُن کو القا کیا گیا کہ نومولود کا نام "محمد" رکھنا، عرب میں اس سے پہلے کسی بچہ کا نام محمد نہیں رکھا گیا، تمام مخلوقات میں جو اپنی ذات سے بے مثال و یکتا تھا اس کے نام میں بھی انفرادیت اور شانِ یکتائی پائی جانی چاہیے تھی۔

اس نام کی تقدیس کا کیا پوچھنا — یہ نام اذان و تکبیر میں شامل ہے، دن رات میں پانچ وقت لاکھوں مسجدوں سے

"اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

کی ایمان افروز اور دلنواز صدا بلند ہوتی ہے اور اس آواز سے فضا میں ایسی حرکت پیدا ہو جاتی ہے جس پر قلب و ضمیر جھومتے اور ذوق و وجدان وجد کرتے ہیں اس نام میں جو نغمگی ملتی ہے اُس کی کوئی حد و نہایت نہیں! "محمدؐ" کے "میم" کی تشدید کا جو لہجہ ہے اُس کے زیر و بم سے محو فردوسِ گوش ہیں پھر اس نام کی شیرینی کا یہ عالم کہ "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہوئے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور لبوں کا ایک دوسرے سے پیوست ہونا اور چپک جانا انتہائے حلاوت کی دلیل ہے!

نبیؐ کے نام کی لذت یہ ہو درود و سلام
زباں کو لطفِ شرابِ طہور ملتا ہے

محمدؐ وہ نام ہے جو شیریں بھی ہے مترنم بھی ہے اور مقدس بھی ہے۔ یہ نام ہی خود بتا رہا ہے کہ میں اُس عظیم ترین انسان کا نام ہوں جس کی نسبت ستائش اور توصیف ارض و سما پر واجب قرار دی گئی ہے!

حضورؐ دعائے خلیلؑ بھی ہیں اور نویدِ مسیحا بھی ہیں! انجیل میں جس نبیؐ آخر کے ظہور کی خوشخبری دی گئی ہے اس کا نام "فارقلیط" بتایا گیا ہے، "فارقلیط کے معنی ہیں "محمد اور احمد" یونانی میں یہ لفظ (فارقلیط) "پیریکلوطاس" بن گیا: علم السنہ (فلالوجی) اس کی گواہی دیتا ہے کہ آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں اس قسم کے تغیر ہوتے رہتے ہیں شلاً لاہور کو قدیم نظموں میں "لہاور" اور ملتان کو "موتان" باندھا گیا ہے! اسپین کے مشہور شہر "MADRID" کو عربی میں مجریط کہتے ہیں۔

توریت کے باب استثنار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ آخری کلام درج ہے۔

"خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا
دس ہزار مقدسوں کے ساتھ"

سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو دس ہزار جاں نثار صحابہؓ حضورؐ کے جلو میں تھے۔ کوہِ "فاران" مکہ کی

پہاڑیوں کو کہتے ہیں۔

حبقوق ؑ نبی نے بھی اس بشارت کو دہرایا — "خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا" اس کی شوکت سے زمین آسمان چھپ گئے اور اُس حمد سے زمین معمور ہو گئی "

تاریخ بتاتی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ جس کی حمد کی گئی ہے اُس کا نام محمدؐ ہے اور محمدؐ ہی کی حمد سے زمین معمور ہو گئی (صلی اللہ علیہ وسلم)

انبیاء کرام کی پیشن گوئیوں میں جو نام ملتا ہے وہ حمد (PRAiSE) سے مشتق ہے اور یہ ذات گرامی احمد مجتبےٰ اور محمد مصطفےٰ (روحی لہ الفدا) کی ہے۔ سامنے کی بات یہ ہے کسی انسان پر اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی کتابیں سیدنا محمد عربی نبی آخر صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی گئی ہیں اور ان کتابوں میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حضورؐ کے ذکر اور تعریف و ستائش نے شعر و ادب کو زندگی بخشی ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ دو شعر نام محمدؐ ہی کی عظمت و تقدیس کے ترجمان ہیں ؎

وضمّ الاِلٰہ اسم النبی الی اسمہٖ ۔۔۔ اِذ قال فی الخمس المؤذن اشھد

(اللہ نے اپنے نام کے ساتھ اُن کے نام کو جوڑ دیا ہے ۔۔۔ جب کہ پانچ وقت مؤذن اشہد کہتا ہے)

وشقّ لہٗ من اسمہٖ لیجلہٗ ۔۔۔ فذوالعرش محمودٌ وھذا محمدٌ

(اللہ نے اُن کا نام اُن کے اجلال کے لئے اپنے نام سے مشتق کیا ہے جو صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد ہیں)

جب سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین کو اسلام کی دعوت دی ہے اور اُن کو خطوط بھیجے ہیں تو قیصر کو بھی نامہ مبارک ملا، قیصر نے حکم صادر کیا کہ عرب کا کوئی رہنے والا مل جائے تو اُسے میرے دربار میں حاضر کرو، میں اُس سے کچھ پوچھنا اور معلوم کرنا چاہتا ہوں، اتفاق کی بات کہ اُن دنوں عرب کے تاجر غزہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ابوسفیان جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، اُن تاجروں میں شامل تھے، قیصر کے ملازمین اور پیادے ابوسفیان کو اپنے ہمراہ لے کر دربار میں پہونچے قیصر نے دربار کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ آراستہ کیا تھا، قیصر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوسفیان سے متعدد سوالات پوچھے جن میں سے دو سوال یہ تھے۔

قیصر :— کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہوا ہے۔

ابوسفیان — نہیں۔

قیصر — وہ کبھی عہد و پیمان کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے۔

ابوسفیان — ابھی تک تو ایسی کوئی بات اُس نے نہیں کی لیکن اب جو نیا نیا صلح کا معاہدہ ہوا ہے، اس میں دیکھیں وہ اپنے عہد پر قائم رہتا ہے؟

قیصر کے دربار میں ابوسفیان کی زبان سے یہ درحقیقت محمدؐ عربی کی تعریف تھی جو بیساختہ ابوسفیان کی زبان سے نکلی اور تمام درباری کہنے والے کا منہ تکنے لگے۔ ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن تھا، ایمان و اسلام کی دولت ابھی اُسے نصیب نہیں ہوئی تھی وہ قیصر کے سامنے جھوٹ بھی بول سکتا تھا مگر محمدؐ کے نام کی عظمت و تقدیس نے اُس کو سچ بولنے پر مجبور کر دیا۔ ابوجہل جیسا شدید دشمن کہا کرتا تھا کہ

"محمد! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا مگر تم جو کلام سناتے ہو اُس کو دُرست نہیں سمجھتا"

حق اور صداقت کی یہ خوبی ہے کہ دشمن بھی اُس کی گواہی دیتے ہیں۔ اور اس گواہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قریش حضورؐ کی دیانت و امانت کا تجربہ کرنے کے بعد آپ کو "الامین" کہتے تھے اور حضورؐ کے اعلانِ نبوت کرنے کے بعد قریش نے دشمنی، عداوت اور ایذا رسانی کی حد کر دی تھی اُس وقت بھی وہ اپنی امانتیں محمدؐ عربی "الامین" ہی کے پاس رکھتے تھے۔ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہدایت فرمائی تھی کہ تم قریش کی امانتیں واپس کرنے کے بعد مدینہ کا رُخ کرنا۔

۱۲ سنہ نبوی کا واقعہ ہے جب عقبہ ثانیہ میں مدینہ کے انصار حضورؐ سے بیعت کر رہے تھے، اس موقع پر حضرت سعدؓ بن زرارہ کھڑے ہو گئے اور اپنے ساتھیوں سے بولے:۔

"یا ایہا الاخوان! تمھیں کچھ پتہ بھی ہے؟ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ تو عرب و عجم سے اعلانِ جنگ ہے۔"

یہ بھی محمدؐ کی شانِ اقدس میں منثور قصیدہ تھا۔ سعدؓ بن زرارہ نے انصار کو بتایا کہ یہ اُس کی بیعت ہے جو دُنیا کے عظیم ترین اور آخری انقلاب کا داعی اور نقیب ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ پہونچے ہیں پورا مدینہ حضورؐ کے استقبال کے لئے اُمڈ آیا تھا اور انصار نے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے تھے۔ خیر مقدم کے اس موقع پر مخدرات یعنی پردہ نشین خاتونیں مکانوں کی چھتوں پر یہ اشعار ترنم سے پڑھ رہی تھیں۔

طلع البدر علینا	ہم پر چودھویں رات کا چاند طلوع ہوا ہے
مِن ثنیات الوداع	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجب الشکر علینا	ہم پر شکر واجب ہے
ما دعیٰ للہ داع	جبتک اللہ سے دعا مانگنے والے دعا مانگیں

اور بنو نجار کی معصوم لڑکیاں دف پر گا رہی تھیں:

نحن جوار مِن بنی النجار	ہم خانوادۂ نجار کی لڑکیاں ہیں
یا حبّذا محمداً مِن جار	محمدؐ کتنے اچھے ہمسائے ہیں

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی پیش گوئی کو صحیح ثابت کر دکھایا اور "محمدؐ کی توصیف و ثنا سے زمین معمور ہو گئی!

عبداللہ بن سلام یہودیوں کے بہت بڑے عالم تھے اور یہودی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے، انھوں نے پہلی بار حضرت سیدنا محمدؐ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا، تو بے اختیار پکار اُٹھے:

"خدا کی قسم جھوٹے کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔"

حضرت انسؓ نے حضورؐ کی سخاوت، سیر چشمی اور ایثار کی کتنی جامع تعریف کی ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لا یدخر لغدٍ ——— رسول اللہ کل کے لئے کوئی چیز اٹھا کر نہیں رکھتے تھے۔

حضرت عدی بن حاتم نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا لوگوں کی زبانی اُن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات پہنچے تو وہ اس تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ حضورؐ بادشاہ ہیں یا پیغمبر ہیں، ایک بار ایسا ہوا کہ وہ اپنے قبیلہ کے وفد کے ترجمان کی حیثیت سے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ ایک مسکین صورت عورت وہاں آئی۔ اس کے آنے کا مقصد حضورؐ کی خدمت میں کچھ عرض معروض کرنا تھا حضور نے گلی میں کھڑے ہو کر اُس کی عرضداشت کو سنا اور اُس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک وہ عورت خود نہیں چلی گئی عدی بن حاتم کا یہ منظر دیکھ کر وہ تذبذب اور شک دور ہو گیا اُن کا ضمیر پکار اٹھا کہ حضور پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں ہیں۔

قرآن نے حضرت محمد بن عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کی ان لفظوں میں تعریف کی:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ اے محمد! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک شخص کے دریافت کرنے پر جواب دیا:

اِنَّ خلق رسول الله كانَ خلقه القرآن

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق سراپا قرآن تھا)

حضرت عائشہؓ نے اس طرح قرآن کی تصدیق بھی کر دی اور اپنے عملی تجربہ کا خلاصہ اور لب لباب بھی بیان کر دیا۔

اب سے کوئی چالیس برس پہلے کی بات ہے شہر مدراس میں سیرت النبیؐ کے ایک بڑے اجتماع میں ایک اونچے درجہ کے ہندو لیڈر اور دانشور نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ہماری پوری قوم برس ہا برس سے مورتی کھنڈت کی کوشش کر رہی ہے مگر اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندو مورتیوں کی پوجا آج بھی کر رہے ہیں اس کے برخلاف عرب میں تنہا ایک شخص اٹھتا ہے اور بت پرستی کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، اس کی آواز اتنی اثر انگیز اور انقلاب آفریں ثابت ہوتی ہے کہ ملک عرب کے ہر گوشہ سے بت پرستی کا وجود ہی سرے سے مٹ جاتا ہے۔ بت پرست، بت شکن بن جاتے ہیں۔ دُنیا کے پردے پر جہاں جہاں مسجدیں پائی جاتی ہیں اُن میں بت تو ایک طرف رہے کسی جاندار کی تصویر تک دکھائی نہیں دیتی۔ تو ایسے شخص کو میں نبی نہیں خدا کہوں گا۔

مگر ہم حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی حضورؐ کے معجزات، کارناموں اور فضائل و کمالات کو واقعہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے — اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ — ہی کہتے ہیں! حضورؐ کمال عبدیت کے اس مقام پر فائز ہیں جس سے بلند تر کوئی مقام نہیں اور جو انسانیت کی معراج ہے۔

انسانِ کامل

خواجہ غلام السیدین

جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وُہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وُہ اپنے بندوں کی طرف سے غافل نہیں بلکہ اس نے ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے شروع ہی سے وقتاً فوقتاً اپنے خاص اور نیک بندوں کو بھیجا تاکہ وہ انھیں نیکی کی طرف بُلائیں اور بدی کے راستے پر چلنے سے منع کریں۔ جو اس کو قادرِ مطلق سمجھتے ہیں اُنھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر اس کی مشیّت ہوتی وہ انسان کی فطرت میں بدی کا مادہ ہی نہ رکھتا۔ بلکہ فرشتوں کی طرح وہ بھی ہر وقت عبادتِ الٰہی میں سرگرم رہتا۔ لیکن پھر انسانوں کی ضرورت ہی کیا رہتی، فرشتوں کی مخلوق ہی کافی ہوتی۔

انسان کا امتیاز اور امتحان تو یہی ہے کہ اس کو آزادی اور اختیار کا عطیہ دیا گیا ہے، اس کو نیکی اور بدی کی پہچان ہے اور وہ ان میں سے جس کو چاہے اپنا سکتا ہے۔ ہم نے اس کو (صحیح) راستہ دکھایا، اب اس کا کام ہے کہ خواہ وہ شکر اختیار کرے یا ارادۂ کفر۔ یہی اس کا کمال ہے۔

شکر کا راستہ اس کو اخلاق کی انتہائی معراج تک پہنچا دیتا ہے۔ کفر کا راستہ اختیار کرکے وہ "اسفل السافلین" کی پستی میں جا گرتا ہے۔ خدا نے اس کو ارادہ اور فکر و عمل کی یہ آزادی تو ضرور بخشی ہے لیکن وہ اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہوا۔ اس کی طرف سے اپنے ہاتھ نہیں دھوئے۔ اس کو بالکل اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ نظامِ کائنات کی تخلیق کچھ اس اصول پر کی ہے کہ یہ انسان تسلیم و رضا اور انکار و بغاوت کی کش مکش میں حصہ لے، حق و باطل کی مسلسل نہ ختم ہونے والی جنگ میں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف شریک ہو اور رفتہ رفتہ اپنے علم اور وجدان اور اخلاقی شعور میں ترقی کرے۔ اور بحیثیت مجموعی باوجود شکستوں اور ناکامیوں اور نافرمانیوں کے خدا کے بڑھتے ہوئے مقصد کی تحصیل کا ذریعہ بن جائے۔ اس غرض سے خدا کے نبیوں، پیغمبروں اور اوتاروں کا ایک سلسلہ اس کو برابر صراطِ مستقیم کی طرف بلاتا رہا ہے۔ انسان کی بے بصری اور عجلت پسندی کو اکثر یہ گہری مصلحت نظر نہیں آتی اور بعض دفعہ اس کے بہترین افراد بھی دنیا میں ظلم و جور کی کثرت دیکھ کر، طاقت کو حق کے مقابلے میں کامیاب پا کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہاں نہ کوئی نظم و تربیت ہے نہ زندگی کی اخلاقی اہمیت ہے، نہ حق کا بول بالا ہونا قرینِ قیاس ہے۔ وہ اس ذہنی اور جذباتی کیفیت میں گرفتار ہو کر یا تو امید کا دامن ہاتھ سے بالکل چھوڑ دیتے ہیں یا دنیا کی طرف سے مایوس ہو کر محض اپنی روحانی عفت کو بچانے کی فکر کرتے ہیں اور اس غرض سے کوئی گوشۂ عافیت تلاش کرکے ریاضت یا عبادت، گیان و دھیان میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن ایک حساس دل و دماغ کے لیے یہ راہ فرار ہے، اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اندھیرے کا مقابلہ آنکھیں بند

کر لینے سے نہیں ہو سکتا، اس کے لیے چراغ جلانے کی ضرورت ہے اور چراغ کی یہ صفت ہے کہ خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہو ساری دُنیا کا اندھیرا ابھی اسے بجھا نہیں سکتا۔ بیشک ایک چھوٹے چراغ کی روشنی تھوڑی دُور تک پہنچے گی۔ ایک بڑا چراغ زیادہ دُور تک روشنی پہنچائے گا اور آفتاب عالم تاب کی زد میں سارا جہاں ہے۔ لیکن چراغ بہرحال انسان کی ضرورت ہے، جس کو وہ ترک نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ وہ اپنے بنیادی انسانی شرف کو تج دینے پر تیار ہو۔

۲

آج سے کوئی چودہ سو برس پہلے عرب کی سرزمین پر قریش کے ایک معزز خاندان میں ایک ایسا انسان کامل پیدا ہوا جس کی تعلیم اور مثال اس طویل مدّت میں کروڑوں انسانوں کو صراطِ مستقیم دکھاتی ہے۔ اور ان کو حیات کے ایک بہتر تصوّر سے آشنا کیا ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے اس چراغ کی جوت بھی قائم رہے گی۔

اس بچے کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ کس کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کا نام اس قدر احترام اور عقیدت کے ساتھ لیا جائے گا اور بے شمار انسان اس کے نام کا کلمہ پڑھیں گے۔ اس کی ابتدائی زندگی کا پس منظر غور کے قابل ہے۔ اس میں ایسے ظاہری اسباب اور حالات نہیں ملتے جو ابتدائی تربیت میں معیّن ہوتے ہیں۔

بچہ کی پیدائش سے چند ماہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے اور ابھی اس کی عمر چھ سال کی بھی نہیں کہ شفیق ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اب اس یتیم کی نگرانی اس کے دادا کے حصّہ میں آتی ہے۔ لیکن اس نئی ولایت کو دو سال بھی نہیں گزرے کہ یہ سایہ بھی سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ جیسے قدرت کو یہ دکھانا مقصود ہو کہ اس کے پالنے والے اس کی نگرانی کرنے والے اس کے عزیز نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی ہے جو کسی خاص مقصد کے لیے اس کی تربیت کر رہی ہے!

ابھی ایک چچا کا دم باقی تھا اور انھوں نے ہی بھتیجے کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمّہ لیا اور وہ تجارت کے سلسلے میں شام وغیرہ کا سفر کیا کرتے تھے۔ اس میں انھوں نے اس عزیز اور ہونہار بھتیجے کو اپنے ساتھ لیا اور اس طرح اسے اپنے گرد و پیش کی دُنیا کو دیکھنے اور اس کی مادی، سماجی، اخلاقی اور روحانی حالت کا مطالعہ کرنے کا موقعہ بھی ملا۔

دل کی آنکھیں تو قدرت نے ابتدا سے روشن کر رکھی تھیں اب باہر کی آنکھوں نے بھی انسان کی گمراہی اور زوال کے منظر دیکھے جس سے دل پر چوٹ پڑی اور وہ سوچ بیدار ہوئی جو معلمینِ اخلاق اور انسان کے ہادیوں کے حصّہ میں آئی ہے یعنی انسان کی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جائے۔ ان کے کردار میں کس طرح پاکیزگی اور شرافت پیدا ہو۔

لیکن یہ زمانہ تیاری کا تھا، سیرت کے نقوش کو تربیت دینے اور اُجاگر کرنے کا تھا، دنیا کو دیکھنے اور انسانوں کے برتنے کا، ابھی اعلان کا پیغام پہنچانے کا دَور نہیں آیا تھا اس لیے انھوں نے تجارت کا شغل اختیار کیا جس میں مفید مطلب تجربے حاصل ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس دولت نہ تھی۔ لیکن نوجوانی ہی میں ان کی ذہانت، امانت اور سمجھداری کا شہرہ پھیل چکا تھا۔ اس شہرت سے متاثر ہو کر عرب کی ایک شریف اور بیوہ خاتون نے اپنی تجارت کا انتظام ان کے سپرد کر دیا

اور اس فرض کو انھوں نے ایسی ایمانداری، سلیقے اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا کہ اس محترم خاتون بی بی خدیجہؓ نے اپنی طرف سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہ مبارک رشتہ آیندہ پچیس برس یعنی ان کے انتقال تک قائم رہا۔ اس طرح انھیں خاندانی زندگی کے آداب اور شرافتوں کو برتنے اور دنیا کے سامنے ان کی عملی مثال پیش کرنے کا موقعہ حاصل ہوا۔

اس وقت ان کی کیا پوزیشن تھی؟ انھوں نے دنیاوی زندگی کے مختلف پہلو دیکھ لیے تھے۔ کاروبار کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ اپنی شرافت، دیانت، مروت، انسان دوستی، ہمدردی کی بدولت لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ ان کی ساری زندگی ان کی نظروں کے سامنے گزری تھی اور انھوں نے اس میں کوئی کمزوری، کوئی جھول نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے دوستوں اور دشمنوں مخالفوں سب نے انھیں اتفاق رائے کے ساتھ صادق اور امین کا خطاب دیا تھا۔ وہ ان کی سچائی کے قائل تھے اور ان کی سیرت و کردار کی بلندی کے گواہ۔ اہلِ وطن کو اس نوجوان سے بہت سی امیدیں تھیں وہ اسے اپنا قائد اور لیڈر ماننے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے پاس اس وقت کیا کچھ نہ تھا! عزت، نیک نامی، دولت، خاندانی زندگی کی آسائشیں اور آرام کی زندگی گزارنے کی توقع، بیشک یہ سب چیزیں تھیں، ایک معنی میں آرام بھی نصیب تھا، لیکن اطمینان نہ تھا۔

اطمینان تو دل کی تسکین اور روح کی مسرت سے حاصل ہوتا ہے۔ جس کا سرچشمہ ذاتی فراغت نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی اور خدمتِ خلق ہے۔ اس قلبِ صافی کو حق کی تلاش تھی اور معرفتِ الٰہی کی لگن، ساتھ ہی انھیں فکر تھی کہ یہ دنیا جس میں بےشمار مرد اور عورتیں زندگی کے اعلیٰ تقاضوں اور قدروں سے ناآشنا، جانوروں کی سی بلکہ بعض لحاظ سے اس سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے تھے۔ کس طرح خالقِ کائنات کی مشیت کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس گھُپ اندھیرے میں کہ چاروں طرف چھایا ہوا تھا، اپنی کٹیا میں چراغ جلانے سے اس جذبہء خدمت کی تشفی کس طرح ہو سکتی ہے، جو ان کو بےچین رکھتا ہے، ان کو ہر وقت دُھن تھی کہ کسی طرح اپنے ہم جنسوں کو اس سیدھے اور سچے راستے پر لگائیں جس سے وہ بھٹک گئے تھے۔

۳

مکہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک سنسان علاقہ میں ایک غار ہے جو تاریخ میں غارِ حرا کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کا دستور تھا کہ وہ بعض اوقات کئی کئی دن تک اس غار میں مقیم رہتے۔ خدا سے لو لگا کر اس کی عبادت اور حمد و ثنا کرتے۔ اور اپنے نفس کی گہرائیوں میں اس روشنی کی تلاش کرتے جس کے بغیر دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھانا ممکن نہیں۔ اس طرح کی تخلیقی تنہائی کا لطف جس میں بندہ اپنے معبود کے ساتھ براہِ راست رشتہ قائم کرتا ہے اور جزوی اور غیر ضروری باتوں کو بھلا کر حقیقت کا چہرہ بے نقاب دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں تمام خاصانِ خدا نے اٹھایا ہے۔

ایک روز کوئی چالیس سال کی عمر میں جب وہ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے نورِ حقیقت نے قلبِ صافی پر جلوہ کیا اور انھیں بشارت ہوئی کہ خدا نے انھیں اپنا رسول بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تاکہ بھٹکتے ہوئے انسانوں کو اس کا ابدی پیغام دوبارہ یاد دلائیں، ان کو نیکی کی تعلیم دیں، بدی سے روکیں اور خدا کے سچے اور سیدھے راستہ کی طرف ان کی رہبری کریں۔

"(اے رسول!) پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے ساری کائنات بنائی ہے، جس نے انسان کو خون کی ایک جمی ہوئی بُوند سے بنایا، پڑھو، اور تمھارا پروردگار بڑا صاحبِ کرامت ہے، اسی نے قلم کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا۔ وہ سب کچھ سکھایا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ تھی پہلی وحی یا فرمانِ الٰہی جو ان پر نازل ہوا اور جس میں سب سے پہلے انسان کو علم حاصل کرنے یعنی دماغ کی کھڑکیاں کھولنے کی، زبان اور قلم کے ذریعہ ملکِ معنی کی تسخیر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ وہ زندگی جہالت کی تاریکی میں یا باپ دادا کے بنائے ہوئے طریقوں پر بسر نہ کریں جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے بلکہ غور و فکر یا تدبّر اور تفکّر کے ذریعہ زندگی کے معنی اور مقصد کو سمجھیں اور اس کو حاصل کرنے کے لیے صحیح ذریعہ اختیار کریں۔ انسان اس منزل پر پہنچ گیا تھا جب وہ عقلِ خداداد کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر سکتا تھا۔

خدا کے رسول کا پہلا کلام یہ تھا کہ وُہ انسان کے سامنے اس چیلنج کو پیش کرے کہ علم و حکمت تمھاری کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں کہیں ملے اس کو اپناؤ اور جس کو حکمت مل گئی اس کو ہر طرح کی خوبیاں اور بھلائیاں مل گئیں۔ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمھیں چین ہی جانا پڑے۔ یعنی دماغ کو قفل نہ لگاؤ اس کو زندگی کے مسئلوں کو حل کرنے کی کنجی سمجھو۔

یہ بڑا سخت وقت تھا خدا کے رسول پر، بشارت اپنے جلو میں آزمائش لے کر آئی تھی۔ چالیس سال تک انھوں نے اپنی قوم کے سامنے ایک بے داغ اور بے لوث زندگی گزاری تھی اور اس میں مقبولیت حاصل کی تھی۔ اب انھیں ان کی گمراہی پر تنبیہ کرنی تھی۔ گمراہی جس کی جڑیں ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہت گہری چلی گئی تھیں۔ سچائی کی خاطر عمر بھر کی ہر دلعزیزی کو قربان کر کے ہر قسم کی مخالفتوں اور بدگمانیوں کو جھیلنا اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا لیکن جب خدا کے کسی منتخب بندے کو یہ بشارت ملتی ہے تو اس کے لیے کوئی دُوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ وہ بہت خوشی اور آمادگی کے ساتھ تمام آزمائشوں اور مصیبتوں کو خاطر نشان کرتا ہے اور خدا کے پیغام کو اس کے بندے کے سامنے جرأت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس مردِ مجاہد کو اندازہ تھا کہ اب اس کے سامنے کس قسم کا خارزار ہے لیکن ان کی ہمت کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انھوںؐ نے اپنی بیوی سے اس بشارت کا ذکر کیا اور کہا کہ میرے دل پر خدا کا خوف اور رعب طاری ہے کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔

وُہ ان کو اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ایک معمر اور صاحبِ بصیرت عیسائی عالم تھے۔ انھوں نے اس عجیب واقعہ کو سُنا۔ حضرت محمدؐ کے رُخِ زیبا پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

"بے شک یہ خدا کا پیغام ہے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ یہ وہی پیغام ہے جو آپؐ سے پہلے دوسرے بہت سے نبیوں پر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہو چکا ہے۔ میری نظریں اس مستقبل کو دیکھ رہی ہیں جو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی اور اس وقت آپ کی کچھ خدمت کر سکتا۔"

پوچھا: "کیا قوم مجھے مکّہ سے نکال دے گی؟"

جواب ملا: "ہاں اس دنیا میں جس کسی نے ایسی انقلابی تعلیم پیش کی ہے اس کو یہی صورتِ حال پیش آئی ہے اور ہر قسم کی مخالفتیں جھیلنی پڑی ہیں۔"

دل نے کہا یہ سب منظور ہے اب کہ دل کی کشتی اس طوفان میں ڈال دی ہے تو فکر کیا ہے۔ اس کا کھویا وہی پروردگار ہے جس نے مجھے اس کام کے لیے چھانٹا ہے۔

دل افگندیم بسم اللہِ مجرٖیہا و مرسٰہا

۴

جب اُنھوں نے خدا کا یہ پیغام، جس کو پہنچانے والے آفرینش عالم سے مختلف لفظوں اور صورتوں میں پہنچانے آئے تھے پھیلانے کا بیڑا اٹھایا تو عرب اور اس کے گرد و پیش کی دنیا کی کیا حالت تھی؟ پرانے پیغام کتابوں میں محفوظ تھے۔ لیکن اس کی رُوح غائب ہو چکی تھی۔

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی

اور جاننے والے جانتے ہیں کہ لفظی پابندی (مذہب کی) موت ہے، اس کی روح ہے جو زندہ رکھتی ہے۔ اس زمانہ میں کہ عرب کی تاریخ میں جاہلیت کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ہر طرف بُت پرستی کا دَور دورہ تھا۔ ایک خدا کو بھول کر لوگوں نے اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ یورپ میں علم و فضل کے جو چراغ یُونانی تہذیب نے جلائے تھے وہ جہالت اور توہمات کی آندھی نے گُل کر دیے تھے۔ تباہی، تعصب اپنے پُورے شباب پر تھا اور پیغمبرِ امن، مسیح کے پیرو مذہب میں نہ صرف ہر قسم کا جبر و اکراہ بلکہ ظلم و ستم کو روا سمجھتے تھے جس کی وجہ سے مذہبی عدالت کی ستم آرائیاں انسانی تہذیب کی پیشانی پر ایک داغ بن گئی تھیں۔ ہندوستان، چین، مصر جہاں ایک زمانہ میں مذہب اور فلسفہ کا بہت چرچا رہ چکا تھا اب محض علمی مُوشگافیوں کا مرکز تھا۔ مذہب کی حقیقی شرافتوں اور رواداریوں کو بھلا کر ان کے عالم ایک دوسرے کی تکفیر اور مخالفت میں لگے ہوئے تھے اور بجائے تلاشِ حقیقت میں تعاون کرنے کے ایک دوسرے کی راہ کاٹنے کی فکر میں تھے۔

خود عرب میں اس وقت نہ کوئی منظم حکومت تھی نہ قانون کی کارفرمائی، نہ سماج میں انصاف اور مساوات کا احترام۔ شاید وہاں فنِ خطابت، آدابِ شجاعت اور مہمان نوازی کے سوا تہذیب کے کوئی دُوسرے دلپذیر عناصر باقی نہ رہے تھے۔ جہالت عام تھی، لوگ بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن کے الگ الگ "خدا" تھے جو ان سے قربانیوں کے طالب تھے اور دُوسرے خداؤں سے برسرِ پیکار۔ ان قبیلوں کے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں لڑائی آگ کی طرح بھڑک اُٹھتی اور جائداد کی طرح یہ نفرت اور مخالفت ایک نسل سے دُوسری نسل کو منتقل ہوتی اور کشت و خون کا بازار گرم رہتا۔

خانہ کعبہ جس کو حضرت ابراہیمؑ نے "خدا کا گھر" بنایا تھا۔ یعنی اس کی عبادت کے لیے مخصوص کیا تھا اب کئی سو بُتوں کا مسکن تھا۔ اس طرح توحیدِ الٰہی اور انسانی وحدت دونوں کا تصور پاش پاش ہو چکا تھا۔ باہمی مروّت اور سماجی وضع داریاں ختم ہو چکی تھیں۔

عورت کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی، گھوڑوں اور اُونٹوں سے تو یقیناً بدتر، جن کی عرب عام طور پر بہت قدر کرتے تھے۔ اس کی نہ کوئی سماجی پوزیشن تھی نہ اقتصادی، اس کو اس درجہ ذلیل سمجھا جاتا تھا کہ اگر کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ اس کو ایک شرمناک بات سمجھ کر پوشیدہ رکھتا۔ اور بعض سنگدل تو اس معصوم کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے۔

شراب خوری، قمار بازی، بے شرمی کے بہت سے اور مظاہر ان کی زندگی کا جزُ بن گئے تھے اور ہر اعتبار سے تہذیب و تمدن کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔

یہ تھی وہ دنیا اور وہ ملک جس میں مشیت الٰہی نے اس بندۂ خدا کو بھیجا۔ انھیں پُوری طرح اندازہ تھا کہ سچ کی حمایت کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور اس راستہ میں کس قدر کٹھنائیاں پیش آتی ہیں۔ ایک جابر مطلق العنان حاکم اپنی مرضی زبردستی لوگوں پر عائد کر سکتا ہے، لیکن یہاں تو دِلوں اور دماغوں کو بدلنے یعنی ایک زیادہ بنیادی انقلاب لانے کا سوال تھا کیوں کہ خدا کسی قوم کی (خارجی) حالت نہیں بدلتا جب تک وُہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ کرے۔

ایک مصلح کو یہ کام محبت، ہمدردی، دل سوزی، صبر اور نفسیاتی سُوجھ بُوجھ کے ذریعہ کرنا پڑتا ہے۔ اور کام کیا تھا، ابدی صداقتوں کے حسین چہروں پر سے اس دُھول کو صاف کرنا جو صدیوں کی بُھول اور گمراہی نے اس پر جما رکھی تھی۔ یہ سماج کی پُوری طاقت کے خلاف ایک تنہا اور نہتے مردِ مجاہد کا جہاد تھا۔ بہت ہمت شکن تھا یہ مرحلہ لیکن جب عشقِ الٰہی کی آگ کسی دِل میں روشن ہو جاتی ہے اور بندوں کی خدمت اور اصلاح کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے تو کوئی خوف اس آگ کو بجھا نہیں سکتا۔ کوئی مصلحت اندیشی اس جذبہ کو سُلا نہیں سکتی۔

چنانچہ اُنھوں نے بہت مضبوطی، لیکن ملائمت کے ساتھ اپنی اس نئی تعلیم کو ان کے سامنے رکھا جو ان کی پُرانی روایتوں اور عقیدوں کو چیلنج کرتی تھی اور اس کا ردِعمل وہی ہوا جو تاریخ میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ یعنی یہ ہمارے باپ دادا کے طور طریقوں کی مخالفت ہے جس کو ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ اگر سچ کی آواز مصلحت اندیشی کے واسطوں اور دنیادی لالچوں کی تحریص سے خاموش نہیں ہوگی تو اس کو اکثریت کی مخالفت سے دبایا جائے گا۔

مطلب یہ ہُوا کہ اس نئی تعلیم کے ماننے والوں کو یہ آزادی نہیں دی جائے گی کہ وہ اس پر عمل کریں یا اس کی تبلیغ کریں۔ وہی آزادیِ ضمیر کا مطالبہ اور مفادِ مخصوصہ کی پُرانی ضد کہ اس کی اجازت نہیں ملے گی۔

لیکن اس تحریک کو کون سی طاقت کچل سکتی تھی، جب خلوص اور ایمان کی بے پناہ قوّت اس کی پشت پر ہو۔ انھوں نے گلی گلی کُوچہ کُوچہ اس پیغام کو سنایا۔ میلوں اور منڈیوں میں اس کی اشاعت کی۔ زبان سے اس کا اقرار کیا۔ دل سے اس کی تصدیق کی، عمل سے اس کا اظہار کیا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ جن لوگوں نے انھیں صادق اور امین کا خطاب دیا تھا، جو ان کی دیانت کی قسم کھاتے تھے انھوں نے ہی شروع میں ان کا مذاق اڑایا اور بعد میں ان کو ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائیں اور ان کی تعلیم کو

خطرناک قرار دیا اور کیوں نہ دیتے!

وہ زندگی کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد کر کے عیش و عشرت اور نفس پرستی میں گزارنا چاہتے تھے اور یہ شخص ایسے دین کو لے کر آیا تھا جس میں سارا زور اعتدالِ اخلاق اور شرافت پر تھا۔ ان کی وفاداری قبیلوں کی چار دیواری کے اندر محصور تھی اور وُہ ایک خدا اور انسانیت کے عالمگیر تصور کا قائل تھا۔ وہ لوگوں کو بتاتا تھا کہ زندگی ایک امانت ہے جس کے لیے اس دُنیا میں بھی جواب دہی ہے اور آخرت میں بھی۔ اور ان لوگوں میں سرے سے نہ احساس فرض کا تصور تھا اور نہ جواب دہی کا۔

وہ اخوت، امن اور مساوات کا پیغامبر تھا، اور یہاں چھوٹے چھوٹے نسلی امتیازات اور جھُوٹے بزرگوں کے بُت دلوں میں بیٹھے ہُوئے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ انسانوں میں افضلیت کا معیار تقویٰ اور پرہیز گاری پر ہے اور ایک حبشی غلام جو یہ صفات رکھتا ہے ایک قریشی سیّد سے کہیں بہتر ہے جو ان صفات سے محروم ہو۔ لیکن عرب کے سردار جو احساسِ برتری کا شکار تھے "گھٹیا" لوگوں کو اپنا ہم پلہ ماننے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ بات ان کے سارے نظامِ فکر کے خلاف تھی۔ لہٰذا یہ زندگی کے دو متضاد تصوروں کی ٹکر تھی جن میں کسی سمجھوتہ کا امکان نہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ ایک طرف قدامت کا استحکام اور جمود کی طاقت تھی اور دُوسری طرف صرف حق پرستی کا صلہ۔

لیکن نہ معلوم اس شخص کی زبان میں کیسا جادو اور سیرت میں کیا کشش تھی کہ باوجود "خواص" کی مخالفت اور ایذا رسانی کے بہت سے عام لوگ اور خود ان کے خاندان اور قبیلے کے افراد ان کی طرف جھکنے لگے۔ ان کی صداقت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس تعلیم کا خیر مقدم ان لوگوں نے کیا جو ان سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ یعنی ان کی بیوی حضرت خدیجہؓ، ان کے نوعمر چچا زاد بھائی علیؓ، ان کے دوست حضرت ابوبکرؓ، ان کے متبنیٰ زیدؓ بن حارث اور ایک سیاہ رنگ روشن قلب حبشی غلام بلالؓ جو اسلام کے پہلے موذن بنے۔

اب مدینہ کے ارباب کو پریشانی ہُوئی اور یہ فکر کہ یہ فتنہ محض ہنسی اڑانے یا جبر کرنے سے نہیں رکے گا۔ لہٰذا پہلا مدافعانہ حربہ یہ اختیار کیا گیا کہ ان کو لالچ دے کر اس خطرناک تعلیم کی اشاعت سے باز رکھا جائے۔ چنانچہ قریش کے ایک با اثر اور دولتمند سردار عقبہ نے پوری آبادی کی نمائندگی کرتے ہوئے ان سے کہا:

> "اے میرے عزیز! تم کیوں یہ سب حرکتیں کر رہے ہو؟ کیوں ہمارے معبودوں کو نہیں مانتے اور ان کی بجائے ایک اَن دیکھے، اَن جانے خدا کے وکیل بنے ہو؟ کیوں ہمارے پرانے طور طریقوں کو رد کرتے ہو؟ اگر ان تمام باتوں سے تمہارا مقصد مال اور دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں تمہاری خواہش سے زیادہ مالا مال کر دیں گے۔ اگر عزت چاہتے ہو تو اپنا رئیس اور سردار مان لیں گے۔ اگر حکومت کی آرزو ہے تو تمہیں عرب کا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔ اگر تمہارا یہ سب دھندا خللِ دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم تمہارے علاج کا بہترین انتظام کرا دیں گے۔"

مگر اس ایلچی کو کیا خبر تھی کہ عشقِ الٰہی کا یہ "نشہ" یا "جنون" ایسا نہیں جو کسی دوا یا علاج سے دور ہو سکے۔

بڑی نرمی لیکن یقین کے ساتھ جواب ملا:

"آپ کا خیال صحیح نہیں۔ مجھے نہ مال و دولت چاہیے نہ دنیاوی عزّت و حکومت، نہ میرے دماغ میں کوئی خلل ہے۔ میں تو خدا کا ایک سیدھا سادا اور سچا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اس میں بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس کے فرمان کو مانیں اور تنبیہ ان کے لیے جو اس سے انکار کریں۔

میں بھی آپ سب کی طرح اس کا ایک معمولی بندہ ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ مجھ پر اس نے اپنی رحمت سے وحی کے ذریعہ سچائی کو واضح کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمام انسانوں کا معبود ایک خدا ہے اسی سے لو لگانی چاہیے، اسی سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا چاہیے۔ جو لوگ شرک کرتے ہیں، خیرات نہیں دیتے، آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ بہت گھاٹے میں ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے۔"

کچھ ایسا اثر تھا اس بیان کے خلوص اور یقین میں کہ عقبہ پر ایک محویت کا عالم طاری ہوگیا اور اس نے جاکر لوگوں سے کہا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے باتیں کیں اور اس کا کلام سُنا، اس میں نہ کہانت ہے نہ شعر ہے نہ جادو، نہ منتر، بلکہ محض عقیدے اور دل کی بات کا اظہار ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تم انھیں اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کی مخالفت نہ کرو۔

چنانچہ ترکش کا یہ تیر بیکار گیا۔ اب لالچ کے بعد خوف کا حربہ استعمال کرنے کی منزل آئی۔ انھوں نے رسولؐ کے عم محترم حضرت ابو طالب کو پیغام بھیجا کہ ہم آپ کی بزرگی کے خیال سے اب تک چپ ہیں، اپنے بھتیجے کو سمجھا لیجیے کہ وہ اس کام سے باز آئے ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے۔

"ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے!"

یہ وہ دھمکی ہے جو قوّت نے حق کے خلاف ہمیشہ استعمال کی ہے۔ سچ کے پرستاروں کے سامنے موت کبھی زہر کا پیالہ بن کر آئی، کبھی اس نے صلیب کی شکل اختیار کی، کبھی آگ بن کر جلایا، کبھی آری اور خنجر بن کر سر کو تن سے جُدا کیا۔ لیکن اس نے کبھی ان عاشقانِ صادق پر فتح نہیں پائی، ان کے دل کی پکار ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یا تو اپنے مقصودِ حقیقی کو حاصل کریں یا اس کشمکش میں جانِ جاں آفریں کے سپرد کر دیں۔ یہی محمدؐ عربی کے دل کی پکار تھی۔ جب ان کے سامنے خوف اور لالچ کے سارے واسطے رکھ دیے گئے اور محبت کرنے والے چچا نے بھی کہا کہ جو کچھ کر رہے ہو اس کے سارے نتیجہ کو سوچ لو۔ تو انھوں نے جواب دیا، اور یہ جواب انسانی فضیلت کی تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے:

"اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لاکر رکھ دیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، تب بھی میں اپنے کام سے نہیں ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں ایک حرف کی کمی بیشی نہیں کروں گا خواہ اس کوشش میں میری جان ہی جاتی رہے۔"

پھر انھوں نے مطالبہ کیا کہ اگر تم خدا کے رسول ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ پہاڑوں کو سامنے سے ہٹا دو ، ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دکھاؤ۔ سونے چاندی کے خزانے ، محل اور باغ بنا کر دکھاؤ۔

لیکن انھوں نے جواب دیا کہ :

"میں شعبدہ دکھلانے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ سچائی خود اپنی شہادت ہے اس کے لیے معجزوں اور خلافِ فطرت مظاہروں کی ضرورت نہیں۔ اگر تم میری تعلیم قبول کرو گے تو یہ تمھارے لیے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ثابت ہوگی۔ اگر رد کرو گے تو انتظار کرو اس فیصلے کا جو خدا میرے اور تمھارے درمیان کرے گا۔"

اب سمجھوتہ کی کوئی صُورت باقی نہ رہی تھی لیکن ایذا رسانی کے ہاتھ کون باندھ سکتا ہے۔ لوگ فرداً فرداً اور ٹولیاں بنا کر ان پر کیچڑ پھینکتے ، پتھر مارتے ، راستے میں کانٹے بچھاتے ، کھانا پانی بند کر دیتے۔ وعظ کے دوران انؐ کی زبان بندی کی کوشش کرتے ، لعن وطعن کرتے ، ان کو دیوانہ مشہور کرتے۔ انؐ کے قتل کے منصوبے بناتے۔ لیکن انؐ کی زبان سے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی کوئی سخت کلمہ نہ نکلا ، جب کہا یہی کہا :

"یا اللہ ! ان لوگوں کو معاف کر دے ، یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔"

ایک دفعہ لڑائی میں اُن کے جسم پر بہت سخت زخم لگے اور انؐ کے احباب نے کہا کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے بددعا کیوں نہیں کرتے ، تو جواب ملا :

"میں لعنت کرنے کے لیے نبی نہیں بنایا گیا ، مجھے تو خدا کی طرف بلانے والا سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اے خدا ! میری اس گمراہ قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ جاہل اور بے خبر ہیں۔"

یہ وہی پیغمبرانہ جذبہ ہے جس کا اظہار مسیحؑ نے اپنی زندگی میں بار بار کیا تھا۔ چنانچہ کفار اپنی ان حرکتوں میں لگے رہے اور خدا کا رسول ذاتی خطروں اور تکلیفوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہا اور کام بھی انھیں کی خدمت اور ہدایت ، جنھوں نے اسؐ پر عرصۂ حیات کو تنگ کر دیا تھا۔ یہ تھی اس کی اخلاقی عظمت اور کردار کی بلندی۔

۵

ایک مختصر سے مضمون میں اس عظیم المرتبت انسان کی اخلاقی اور روحانی خوبیوں کا کس طرح احاطہ ہو سکتا ہے ! دریا کو کوزے میں کس طرح بند کیا جا سکتا ہے ! انسان کی حیثیت سے انھوں نے ایک مثال دنیا کے سامنے پیش کی جو ہر شخص کو اس کی تقلید کا حوصلہ ہو سکتا ہے حالانکہ اس کمال تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ان کی شخصیت اور زندگی رعب وجلال کی کیفیت سے زیادہ محبت اور یگانگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا :

"مجھ سے نہ ڈرو میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں ، قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سُوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

انؐ کی روزمرّہ کی زندگی خوبیوں اور مسکینوں کی سی تھی اور انھی کے ساتھ ان کو خاص طور پر محبّت اور یک جہتی کا احساس تھا۔ ہر قسم کا ہاتھ کا کام خود کر لیتے تھے۔ اس میں کسی طرح کی عار نہ تھی۔ گھر کی صفائی کرتے، مویشیوں کو چارہ ڈالتے، بازار سے سامان خریدتے، پھٹے کپڑوں کو پیوند لگاتے، ٹوٹے جوتے کو گانٹھتے، نوکروں کے ساتھ بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھاتے۔ اور اگر بعض دفعہ کچھ بھی کھانے کو میسر نہ ہوتا تو خدا کا شکر کرتے اور بھوکے ہی سو جاتے۔ کبھی کئی کئی ہفتے چولھے میں آگ نہ جلتی اور پانی اور کھجوروں پر گزارا ہوتا۔

یہ حالت تھی اس زمانہ میں بھی جب اس سرزمینِ عرب میں انؐ کو دنیاوی حیثیت سے بھی ایک بادشاہ کا مقام حاصل تھا لیکن خود اپنی دولت اور جو دولت بیت المال میں آتی، سب ضرورت مندوں اور غریبوں کی نذر تھی اپنی ذات کے لیے صَرف نہ ہوتی تھی۔ ایسا شخص کس طرح عرب کے مغرور اور امتیاز پسند سرداروں کو گوارا ہو سکتا تھا۔

کوئی غریب انؐ کے دربار میں چھوٹا نہ تھا، نہ کوئی دولت مند اور ذی وجاہت شخص امتیازی سلوک کا مستحق۔ سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے تھے اور بچّوں سے ہمیشہ شفقت، اور عورتوں سے عزّت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ انھوںؐ نے کبھی کسی انسان کی دل شکنی نہیں کی، کسی کو ذلیل نہیں کیا۔ ہر کسی کو اونچا اٹھانے کی کوشش کی۔ شیریں کلامی کے ساتھ بات کرتے، رحم دلی کا سلوک کرتے۔ جو لوگ ان کے ساتھ بدی کا سلوک کرتے اس کا جواب نیکی سے دیتے۔ اگر بھولے سے بھی کسی کو ان کی وجہ سے تکلیف پہنچتی تو اس کی معافی مانگنے میں اتنی ہی عجلت کرتے جس قدر دُوسروں کی زیادتیوں کو معاف کرنے میں۔ انتقام کا جذبہ کبھی اس قلبِ پاک میں پیدا نہیں ہُوا۔ مخالفوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے کئی سال تک اپنے وطن سے باہر رہے۔ اور جب ایک کامیاب فاتح کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوئے تو وہاں کے شریر اور مفسد لوگوں کو، جنھوں نے انھیںؐ اور انؐ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی تھیں، اندیشہ تھا کہ انھیں اپنی بداعمالیوں کی سزا ملے گی۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی حالانکہ انھیں حیرت نہ ہونی چاہیے تھی جب اُنھوں نے دیکھا کہ اُنؐ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت ہے:

"آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں (جو ہونا تھا وہ ہو چکا) اللہ تمھارا قصور بخش دے۔ وہ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

یہی رحم دلی، ہمدردی، محنت، امن پسندی اس پیغمبرِؐ امن کی سیرت کی مرکزی صفات تھیں۔ لیکن کسی شخص کے کردار کا پورا اندازہ اس کے کارناموں سے نہیں ہوتا یہ بھی دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کا اثر اس کے عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں بلکہ مخالفوں کی زندگی پر کیا ہوا۔

اس اعتبار سے محمد عربیؐ کا اثر معجزے کا حکم رکھتا ہے۔ جو لوگ ایک دفعہ انؐ کی صحبت کا پورا فیض پاتے، ہمیشہ کے لیے ان کے اثر میں آجاتے اور ان کی دنیا ہی بدل جاتی، زندگی کا تصوّر بدل جاتا، اس کی قدریں بدل جاتیں، کامرانی اور ناکامی کے اندازے بدل جاتے۔ گویا خرد کا نام جنون ہو جاتا ہے اور جنون کا خرد!

عقل، جس نے اب تک عیش و عشرت کی جستجو کو مقصودِ حیات سمجھا تھا اب خدا کی رضا اور رسول کے عشق

میں خوشی اور اطمینان کو تلاش کرتی اور راستہ کے کانٹوں کو پھول سمجھ کر چن لیتی ۔

بلال (رضی اللہ عنہ) ایک حبشی غلام تھا، نور کی چنگاری اس کے دل میں چمکی اور وہ مسلمان ہوگیا ۔ اس جرم کی پاداش میں کیا کیا "سلوک" ان کے ساتھ نہیں ہوئے ۔ گردن میں رسّی ڈال کر انھیں مدینہ کی گلیوں میں کھینچتے ہوئے تپتی ہوئی ریت پر بٹھاتے اور گرم گرم پتھر کی سلیں چھاتی پر رکھتے ۔ ان کا کھانا پانی بند کیا جاتا اور لکڑیوں سے پیٹا جاتا ۔ لیکن ان کے ایمان میں خلل نہ آیا، اور زبان سے خدا کے نام کے سوا کچھ نہ نکلا ۔

جنگِ اُحد کے دوران ایک مسلمان عورت کو خبر ملتی ہے کہ اس کا بھائی شہید ہوگیا ہے ۔ اس نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ راہِ خدا میں کام آیا ۔ پھر باپ کی شہادت کی خبر ملی ۔ اس نے دوبارہ خدا کا شکر ادا کیا ۔ پھر شوہر کی سنائی ملی ۔ اس نے کمال صبر کے ساتھ اِنّا للہ و انّا الیہِ راجعون کہا اور اشتیاق کے ساتھ پوچھا کہ خدا کا رسولؐ بھی زندہ ہے؟ جب انؐ کی خیریت کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو کہا : " الحمد للہ ! اب ہر مصیبت برداشت کر سکتی ہوں "

ایک صحابی تھے حضرت خبیبؓ ۔ ان کے جگر کو نیزہ سے چھید کر کافروں نے پوچھا کہ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمھیں چھوڑ دیا جائے اور محمدؐ تمہاری جگہ لے لیں ۔ جواب ملا : خدا واقف ہے کہ میں اس بات کے لیے بھی تیار نہیں ہوں کہ میری جان بچ جائے اور اس کے بدلے رسولؐ کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چُبھ جائے ۔

اور جب خبیبؓ کو پھانسی دی جا رہی تھی تو ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے :

" یہ لوگ کہتے ہیں کہ کفر اختیار کرو تو آزادی مل سکتی ہے مگر میرے لیے اس کے مقابلہ میں موت زیادہ آسان اور قابلِ قبول ہے ۔ میں نہ ان کے سامنے عاجزی کروں گا نہ گریہ زاری ۔ کیوں کہ میں تو اپنے خدا کے پاس جا رہا ہوں (میرے لیے یہ باعثِ فخر ہے کہ) عرش عظیم کے مالک نے مجھ سے کوئی خدمت لی ۔ اور مجھے اس حالت میں صبر کی توفیق دے ۔ "

یاد رہے کہ یہ ذکر صرف رسولؐ کے جلیل القدر صحابیوں کا نہیں جن کے کارنامے تاریخ میں موجود ہیں اور جن کے فضائل سے دنیائے اسلام واقف ہے ان میں ان کے معمولی عقیدت مند بھی شامل ہیں جن کے دل میں ایک بجلی چمکتی تھی اور ان کی دنیا بدل جاتی تھی ۔

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظرِ شمع و چراغیم

مسیحؑ کو عمر بھر کی ریاضت اور تلقین کے بعد بارہ[۱] حواری ملے تھے ۔ اور ان میں سے ایک یہودہ تھا جس نے آخری وقت میں رہبر کے ساتھ دغا کی ۔ ایک مبصّر نے لکھا ہے کہ تعجب تعداد کی کمی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ مسیحؑ کو اتنے وفادار اور مخلص بھی مل گئے لیکن رسولِ عربیؐ کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کو سیکڑوں ایسے ساتھی ملے جنھوں نے اپنی جان و مال، اولاد، عزّت، عیش و عشرت ہر چیز کو رسولؐ کی خوشنودی پر قربان کر دیا ۔ تاریخ ایک بھی ایسے شخص کا نام نہیں بتاتی جس نے

انعام کے لالچ میں یا مصیبتوں کے خوف سے اپنے راستہ کو چھوڑا یا صداقت سے منہ موڑا ہو۔ بقول مولانا آزاد کے انھوں نے اپنے پچھلے سارے رشتے بھلا دیے تھے اور صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی۔ یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور اس کے حُسنِ جہاں آرا پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے والے تھے۔

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

۶

آپ نے دیکھیں اس برگزیدہ رسول اور احباب کی سیرت کی چند جھلکیاں۔ ان کی تعلیم کے چند انقلابی پہلو بھی دیکھ لیجیے جو ایک لحاظ سے آج بھی اتنے ہی انوکھے ہیں جس قدر چودہ سو برس پہلے تھے انہیں مخالفوں کی سرکشی اور حق ناشناسی کی وجہ سے کئی مرتبہ لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن کسی موقعہ پر انھوں نے عدل اور رحم و شرافت کے ان آداب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جو اُنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں برتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں تہذیب کے اس دَور میں جب انسان کو علم اور اس کی قدر کمال کو پہنچ گئی ہے اور مذہب، فلسفہ اور اخلاق کی تمام نسلی دولت اس کا سرمایہ ہے جنگ کے سلسلہ میں کیا کیا بربریت روا نہیں رکھی گئی اور انسان نے انسان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جس کی وجہ سے ہمارا سر خونخوار درندوں کے سامنے شرم سے جھک جاتا ہے۔

عرب کے اس نبیِ رحمت نے اپنے ساتھیوں کو ایسے آدابِ جنگ کی تعلیم دی جنھوں نے جنگ کو بھی گویا ایک تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ جنگ میں جو قیدی ہاتھ آتے ان کی خبر گیری مہمانوں کی طرح کی جاتی اور ان کی خوراک اور لباس کا مناسب انتظام کیا جاتا۔ جس وقت رسولِ خدا فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہُوئے تو فوج کو مندرجہ ذیل احکام دیے گئے ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل ہر شخص کی جان بخشی کا اعلان ہوتا۔

۱۔ جو شخص ہتھیار پھینک دے اس کو قتل نہ کیا جائے۔
۲۔ جو شخص خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے اس کو قتل نہ کیا جائے۔
۳۔ جو شخص ایک مقامی باشندے حکیم بن حزام کے گھر میں پناہ لے اس کو قتل نہ کیا جائے۔
۴۔ زخمی کو قتل نہ کیا جائے۔
۵۔ اسیر کو قتل نہ کیا جائے۔
۶۔ بھاگ جانے والے کا پیچھا نہ کیا جائے۔

قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی وہ مثال قائم کی کہ جس قدر لوگ حنین میں گرفتار ہوئے تھے ان میں سے جتنے اپنے یا حضرت مُطلب کے خاندان والوں کے حصہ میں آئے تھے ان سب کو علی الاعلان بلا کسی معاوضہ کے آزاد کر دیا۔ چنانچہ انصار اور مہاجرین کو

بھی ان کی پیروی میں ایسا ہی کرنا پڑا۔ چند لوگ ایسے بھی تھے جو اس بات پر آمادہ نہ ہوئے ان کے حصے کے قیدیوں کو رسولؐ خدا نے خود چھ اونٹ فی نفر کے حساب سے خرید کر آزاد کر دیا۔ یاد رہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ وُہ تھے جو انھیں ایذا پہنچانے اور ان پر پتھر برسانے میں پیش پیش رہے تھے۔

جب اسلام کے دورِ اوّل میں مسلمان مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ یا حبش چلے گئے تو ان کی غیر حاضری میں ان کے مکانوں اور جائدادوں پر اہلِ مکّہ نے قبضہ کر لیا۔ مدینہ میں فاتح کی حیثیت سے واپس آکر اُنھوں نے رسولِ خدا سے درخواست کی کہ ہماری جائدادیں واپس دلائی جائیں۔ جواب ملا:

"جن چیزوں کو تم راہِ خدا میں چھوڑ چکے ہو ان کی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو۔"

اور ان کی درخواست منظور نہیں ہُوئی۔ کس قدر مختلف ہے یہ اندازِ نظر اس رویّے سے جو اس دورِ تمدن میں رائج ہے۔

بہت سے مواقع ایسے پیش آئے جب انھوں نے اپنے عقیدت مندوں کو اپنے خطبوں میں نہ صرف اسلام کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دی بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے ان کو جینے کا سلیقہ سکھایا، ایک دوسرے سے اور تمام انسانوں سے میل جول کی شرافتیں سکھائیں۔ جس طرح اشوکِ اعظم کے فرمودات لوہے اور پتھروں کے میناروں پر کندہ ہیں اسی طرح ان کے فرامین ثقہ راویوں کے ذریعہ صحت کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں۔ کتابوں اور لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ مکّے سے ہجرت کا پہلا سال تھا مہاجرین نے ایک چھوٹی سی مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ پہلے تاریخی خطبہ کے موقعہ پر کئی سَو مسلمان وہاں جمع تھے اور خدا کا یہ رسولؐ اپنے خطاب کے دوران زندگی کے بھید ان پر کھول رہا ہے:

میں شہادت دیتا ہُوں کہ خدا کے سوا کوئی دُوسرا عبادت کے لائق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے جس کو اس نے ہدایت، نور اور نصیحت دے کر بھیجا ہے ایک ایسے زمانے میں جب کہ مدّت سے کوئی رسول نہیں آیا۔ علم گھٹ گیا اور پھر انسانوں کی گمراہی بڑھ گئی تھی۔ جو شخص خدا اور رسول کی تائید کرتا ہے یعنی نیکی کے راستہ پر چلتا ہے وہ ہدایت پاتا ہے اور جو ان کا حکم نہیں مانتا وہ راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اے مسلمانو! خدا کی نعمتوں سے لطف اٹھاؤ لیکن اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو۔ اس نے تمہارے لیے ایک کتاب بھیجی ہے اور تمھیں اپنا سیدھا راستہ دکھایا ہے تاکہ راست بازوں اور باطل پرستوں میں تمیز ہو سکے۔ اے لوگو! خدا کو یاد کرو اور آیندہ زندگی کو پیشِ نظر رکھ کر (نیک) کام کرو۔ کیونکہ جو شخص اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست کر لیتا ہے اللہ اس کے اور دوسرے لوگوں کے باہمی معاملات کو بھی درست کر دیتا ہے۔"

اس مختصر سے آخری جملے میں اُنھوں نے اس گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دین اور دُنیا میں اور روحانی اور مادی قدروں میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جو شخص دین کے معاملہ میں شرافت کے اصول کا پابند رہے گا اور مسجد اور منڈی کے لیے دو مختلف طریقِ فکر و عمل اختیار نہیں کرے گا اس کے دل کی پکار یہی ہوگی کہ "اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا کی نیکیاں اور

بھلائیاں بھی دے اور آخرت کی بھی، کیوں کہ یہ دنیا ہی زندگی آخرت کی کھیتی ہے۔ جیسا ہم بوئیں گے ویسا وہاں کاٹیں گے۔"
دنیا کے معاملات میں بھی ان ہی اصولوں کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔

آپؐ کی نظرِ حقیقت شناس نے انسانی فطرت کی چھپی ہوئی کمزوریوں کو تلاش کیا۔ بڑی دل سوزی اور وضاحتِ خیال کے ساتھ ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کا علاج تجویز کیا ایک خطبہ میں جو خطبۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے زندگی کے لیے ہدایتیں موتیوں کی لڑی کی طرح پروئی ہیں اور ان میں ایک ایسا اعجازِ بلاغت شامل ہے جو عربی زبان کا مخصوص حصّہ ہے۔ ان میں نمونہ کے طور پر چند کے تیور ملاحظہ ہوں:

○ سب باتوں سے بڑھ کر بھروسا کی بات تقوٰی ہے۔ اور سب باتوں پر اللہ کے ذکر کو شرف حاصل ہے۔ تمام اعمال میں افضل عمل وُہ ہے جس سے دُوسروں کو فائدہ پہنچے۔

○ دل کا اندھا ہونا سب سے بڑی کور ہے۔

○ سب سے بڑی دولت دل کی دولت ہے۔ دولت زرومال کی کثرت نہیں۔ غنی وہ ہے جس کا دل غنی ہے۔

○ بلند ہاتھ (یعنی دینے والا) پست ہاتھ (یعنی لینے والا) سے بہتر ہے۔

○ دانائی کا سرچشمہ دل میں خوفِ خدا کا ہونا ہے۔

○ جو دوسروں کے عیب چھپاتا ہے خدا اس کے عیب ڈھانپتا ہے۔

○ جو شخص چغلی پھیلاتا ہے خدا اس کی رسوائی عام کرتا ہے۔

○ قابلِ رشک ہے وہ مالدار جس کو دولت کے صحیح مصرف کی توفیق ہو۔

○ قابلِ رشک ہے وہ شخص جس کو خدا نے حکمت دی ہو، اس پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔

○ پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھا لادنا بھیک مانگنے سے بہتر ہے۔ محنت کر کے کمانے والا خدا کا دوست ہے۔

یہ ہیں وہ اصول جو فرد کی سیرت کو سنوارتے ہیں اور اُنھیں کا پرتو فرد اور جماعت کے تعلقات کی تفسیر میں بھی نظر آتا ہے۔ عرب کے اس رسولِ اُمّی کی حدیثیں (جس نے کسی مدرسہ میں یا کسی استاد سے باضابطہ تعلیم نہیں پائی) اس پر ہر پہلو سے کیسی دل نشین روشنی ڈالتی ہیں:

○ مسلمان وُہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔

○ تم میں سے کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

یاد رہے کہ اس تصورِ حیات میں ہر انسان دوسرے تمام انسانوں کا بھائی ہے کہ سب ایک خدا کے

بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں)

- خبردار! بدگمانی کو اپنی عادت نہ بناؤ کہ وہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ بے بنیاد باتوں پر کان نہ لگاؤ۔ اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔
- دوسروں کے عیب تلاش نہ کرو، آپس میں بُغض اور نفرت نہ رکھو، کسی انسان سے منہ نہ موڑو۔
- جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کو ایذا نہ پہنچائے (اور آج کی دنیا میں کون کس کا ہمسایہ نہیں ہے) ، اپنے مہمان کی عزّت کرے ، بات کہے تو اچھی کہے ورنہ خاموش رہے۔ (آدابِ کلام کا اس سے بہتر گُر اور کیا ہوسکتا ہے)
- قوّت کا ثبوت یہ نہیں کہ دُوسروں کو زیر کرے بلکہ غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ نیکی اس میں ہے کہ اسیروں کو رہائی دلاؤ ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ اور بیماروں کی خبرگیری کرو۔
- قیامت کے دن خدا کا سایہ ہوگا اس شخص پر جو چھپ کے خیرات کرتا ہے اس شان سے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔
- عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر ، کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی افضلیت نہیں کیونکہ فضیلت کا معیار تقویٰ یعنی خدا ترسی ہے۔
- اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم معاہد (رعایا) کو قتل کرے گا وہ بہشت کی خوشبو بھی نہ سُونگھ پائے گا۔ حالانکہ یہ خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے آنے لگتی ہے۔

یہ ہیں وہ قدریں جو ذاتی اور اجتماعی زندگی کی صالح تشکیل کے لیے ضروری ہیں ، جو دیکھنے میں بالکل واضح اور بدیہی معلوم ہوتی ہیں لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کو توفیقِ الٰہی اور ضمیر کی دولت حاصل ہے کس قدر دور ہیں یہ عام لوگوں کی زندگی اور عمل سے ! جب تک یہ ہمارے فکر و نظر میں ، ہمارے قول و فعل میں رچ نہ جائیں ہم زندگی کا کوئی بڑا یا چھوٹا مسئلہ خوش اسلوبی اور سلامتی سے طے نہیں کر سکتے۔ جب کبھی دنیا کی تاریخ میں یہ چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں ان کی حفاظت کے لیے ایسے ہی روحانی سرچشموں سے ہدایت حاصل کرنی پڑتی ہے۔

۷

ایک اور مخصوص پہلو اس رسولِ اکرمؐ کی تعلیم کا یہ ہے کہ جیسا میں نے اس باب کے شروع میں ذکر کیا کہ انھوں نے دنیا کے سامنے ادب کا ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا یعنی مختلف مذہب خدا کے بھیجے ہوئے نیک بندے مختلف زمانوں میں لائے وہ ایک دوسرے کے نقیض یا رقیب نہیں بلکہ ایک زرّیں سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کا پیغام بر نہ آیا ہو کہ لوگوں کو بداعمالیوں کے نتیجے سے خبردار کرے اور ان کو راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دے۔

ان سب کی تعلیم بنیادی اعتبار سے یکساں ہے۔ ان کے اصول ابدی اور مستقل ہیں۔ گو ان کی تفسیر اور تعبیر میں ان کی فروع شاخوں میں زمانہ کے حالات اور ضرورتوں اور نفس انسانی کی تربیت اور ترقی کے مطابق تبدیل ہوتی رہی ہے اس لیے لازم آتا ہے کہ ہم سب مذہبوں کے بانیوں اور خدا کے پیغامبروں کا دل سے احترام کریں اور ان کی تعلیم کا ادب سے مطالعہ کریں۔

یہ در اصل ایسا اصول ہے جو رواداری کو مصلحت پسندی سے بلند کر کے ایک قدر مستقل بنا دیتا ہے اور نام نہاد مذہبی لڑائیوں اور فسادوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ محمد عربی کی دینی دعوت کے تصور پر جبر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی بلکہ انھوں نے ہر موقع پر بار بار بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ ہر قوم کی اپنی شریعت اور زندگی ہے جس پر قائم رہنے کا اسے حق ہے اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے ترک کر کے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے۔ سچائی اسی وقت سچائی ہے جب ہم دل کی گہرائیوں سے اس پر ایمان لائیں ورنہ کسی لالچ یا دباؤ سے اس کا زبانی اقرار کرنا بالکل بے معنی ہے۔

اختلاف تو انسانی فطرت کا جزو ہے اس کو کیسے دُور کیا جا سکتا ہے! سچائی کی تلاش میں تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے اور دل کو تعصب، تنگ نظری اور قدامت پرستی کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی۔ اس کے بعد عقلِ خداداد خود اپنا راستہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا کا رسول راستہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ ٹھیکہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ زبردستی سب کو ایک ڈگر پر چلائے۔

اگر تیرا پروردگار چاہتا تو دنیا کے تمام بسنے والے ایمان لے آتے (لیکن اس نے ایسا نہیں کیا) پس اے رسول! تم ان لوگوں پر جبر کر سکتے ہو کہ وہ ایمان لائیں؟ (ہرگز نہیں)۔

تمھارا فرض تو ذکرِ الٰہی کرنا اور خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور شیریں کلامی کے ساتھ بلانا ہے اور بس۔ اگر کوئی مشرک بھی تمھارے پاس آکر پناہ مانگے تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ تم اس کو پناہ دو پھر اس کو کلام الٰہی سناؤ۔ اس کے بعد اسے (احتیاط کے ساتھ) اس کے مسکن پر پہنچاؤ۔ یعنی علم و اخلاق کی جو روشنی خدا کی رحمت سے تمھارے نصیب میں آئی ہے اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا تمھارا کام ہے لیکن تم اسے زبردستی کسی پر عائد نہیں کر سکتے۔ پھر خدا سمجھے ان انصاف شناسوں کو جو ان صریح حکموں کی موجودگی میں یہ ثابت کرنے کی فکر کرتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے اس تعلیم کے بنیادی اصول اور عقائد جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ دراصل انسان کے اخلاقی اور روحانی شعور کی تفسیر ہیں۔ اس میں پہلا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ایک قادرِ مطلق خدا کے وجود کا اعتراف کیا جائے جو ہر جگہ موجود ہے، جس کی ہر جگہ حکمرانی ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہر انسان کا فرض ہے جو خدائے رحمت و محبت، خدائے غضب و انتقام نہیں۔ جس نے انسان کو عقل اور ضمیر کی دولت دی تاکہ وہ خیر اور شر میں تمیز کر سکے۔

دوسرا عقیدہ عقیدۂ عدل ہے۔ یعنی خدا ظالم نہیں بلکہ صاحبِ انصاف ہے اور جس طرح اس کے ہاں ہر معاملہ میں انصاف کی کارفرمائی ہے (خواہ ظاہر بیں نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں) اس طرح انسانی رشتوں اور تعلقات میں انصاف برتنا انسان کا فرض ہے۔ اسلام نے حُسن، خیر اور حق کی قدروں کے ساتھ جو قدیم یونانی تہذیب کا امتیاز ہیں، عدل کو ایک بلند مقام بخشا ہے۔

تیسرا عقیدہ جس کی طرف اُوپر اشارہ ہو چکا ہے خدا کے رسولوں پر ایمان ہے جو ابتدائے آفرینش عالم سے انسان کی ہدایت کے لیے آتے رہے ہیں اور جن کی عزت صرف حق کا احترام ہے۔ اور دوسری طرف مذہبی رواداری کی بنیاد۔ مسلمانوں کے آخری نبی محمدؐ عربی ہیں جن کے پیام اور کلام کو ان کے بعد اماموں اور خدا کے نیک بندوں نے دنیا میں قائم کیا اور پھیلایا ہے۔ اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ زمانہ آج بھی صداقت پرستوں سے مختلف شکلوں میں قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔

پھر قیامت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے یعنی انسان کی زندگی تاریکی کے سمندر میں شرارے کی سی عارضی چمک نہیں کہ ایک لمحہ کے لیے روشن ہوئی اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی بلکہ اس کے لیے مکافاتِ عمل کا قانون ہے، کام اور خیال اور نیت کے نتیجوں کی جواب دہی ہے اس دنیا میں بھی اور دُوسری دنیا میں بھی۔ یہ ہی ذمہ داری کاموں کے تول، نیکی اور بدی کی پرکھ اور ان کا مناسب بدلہ زندگی کا تانا بانا ہے۔

جو شخص ایک رائی کے دانے کے برابر نیکی کرے گا وہ دیکھی جائے گی اور جو ایک رائی کے دانے کے برابر بدی کرے گا وہ بھی دیکھی جائے گی۔ یہ کھاتہ بند نہیں ہوتا کبھی گم نہیں ہوتا۔ قیامت ایک روزِ موعود تک محدود نہیں بلکہ ہماری زندگی کے ایک ایک قدم پر اس کا سایہ ہے۔ ہمارے علم اور اخلاق پر ہماری دینی اور دُنیوی کاروبار پر، ہماری ذاتی اور اجتماعی زندگی پر اور ہماری عقل خود پسند پر جس کا غرور اکثر خدا کو بھی بھلا دیتا ہے۔

گمان میر کہ خرد را حسابؔ میزان نیست

نگاہ بندۂ مومن قیامت خرد است

اسی تعلیم کا فیض تھا کہ عرب میں اور اس کے بعد دُوسرے ملکوں میں جہاں جہاں اس برگزیدہ بندۂ خدا کی آواز پہنچی اور اس کی چوٹ حساس دلوں پر پڑی ان کی زندگی اور زندگی کے تعلقات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا خصوصاً ان طبقوں کی آزادی اور انسانی حقوق کا ایک نیا چارٹر مل گیا جن کو سماج کے ظلم اور بے حسی نے جانوروں کی حیثیت دے رکھی تھی۔ تاریخ میں مدت تک یہ بحث چلتی رہی کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی روح ہے یا نہیں!

مگر انھوں نے عورتوں کو مردوں کا ہم دوش قرار دیا۔ تعلیم کے دروازے ان پر کھولے۔ ماں باپ کی جائداد میں ان کا حصہ تسلیم کیا۔ شوہروں کی طرف سے مہر کا ادارہ قائم کیا۔ خلافِ مرضی شادی کو ممنوع کیا۔ طلاق اور خلع کے ذریعہ صحبت ناجنس کے عذاب کو دُور کرنے کا بھی راستہ نکلا۔ بیواؤں کی شادی کو کہ سماج کی نظر میں مردود تھی جائز قرار دیا۔

غرض ہر حیثیت سے ان کے جائز حقوق ان کو دلانے کی کوشش کی۔ اسی طرح غلاموں کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ انھوں نے نہ صرف غلامی کے تصور کو خلافِ انسانیت قرار دے کر اسے مسترد کیا بلکہ اس پر ایسی پابندیاں لگائیں اور حسنِ سلوک کے ایسے نمونے اور اصول قائم کیے کہ یہ دستور رفتہ رفتہ ناپید ہوتا گیا اور جہاں کہیں غلام باقی رہے وہ بھی گویا خاندان کا جزو بن گئے اور ان پر سے ایک مستقل کمتری اور ذلت کا کلنک دُور ہو گیا۔ خادموں کے ساتھ سلوک اور احسان اور انصاف کی ایسی سنت قائم کی کہ رسولؐ کے گھر میں آقا اور غلام کی تمیز بالکل اُٹھ گئی۔ رسولؐ کی چہیتی بیٹی فاطمہ زہراؓ نے ساری عمر اپنے

گھر میں محنت مزدوری کی، ہاتھ سے سب کام کیے، کھانا پکایا۔ جھاڑو دی، کپڑے سیے۔ اور جب ایک خادمہ "فضہ" ہاتھ بٹانے کے لیے میسر ہوئیں تو بندھا ہوا معمول یہ تھا کہ ایک دن سارا کام خود کرتیں اور دوسرے دن فضہ کی باری آتی۔ رشتہ مساوات کا تھا آقائی نہ تھا۔ لیکن اسی کا فیض تھا کہ فضہ نے اپنی محبت، جاں نثاری اور وفاداری کے ذریعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اپنے لیے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا کہ فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نام بھی عزت اور عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ یہی صورت اسلام کے مؤذن اول بلالؓ کی تھی جو ابتداء میں ایک حبشی غلام تھے۔ لیکن ان کا نام آج تک منارہ عظمت کی زینت ہے۔

اس تعلیم کا شاید سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے نسل و رنگ، دولت اور ذات پات کے چھوٹے امتیازوں کو دور کر کے اخوت اور مساوات کو اجتماعی زندگی کا بنیادی اصول قرار دیا۔ اس کے اثر سے ایک حد تک مختلف نسلوں، قبیلوں اور مذہبوں کے لوگ جو ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے محبت کے ایک سلسلہ میں گندھ گئے ایک خدا کی عظمت اور کبریائی کا نقش انسان کے دل پر بٹھایا اور دوسری طرف انسان کو اس کا صحیح مقام دکھایا جو نیابتِ الٰہی کا مقام ہے جہاں انسان اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعہ دنیا میں مشیّتِ الٰہی کی تکمیل کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے اس نے خیر و شر کا ایک عالم گیر تصور انسان کے سامنے پیش کیا جس نے جغرافیائی حدبندیوں کو نظرانداز کر کے انسان کو شرافت اور امن دوستی کی بنیادوں اور قدروں پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے وہی اتحاد اور محبت کا راستہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے آخری باب میں اس سورت کی "تعلیمی روح" بیان کی ہے جو در اصل اسلام کی تعلیمی روح ہے۔ پیغمبرِ اسلام کے عالمگیر تصورِ انسانیت کی تفسیر پہلے اس سورہ کا ترجمہ پیش کرتا ہوں اور پھر مولانا کی تفسیر کے چند جملے جو محمدؐ عربی کی تعلیم اور ہر شریف انسان اور سچے مسلمان کے دل اور دماغ کی بہت موثر تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس سے بہتر خاتمہ اس مضمون کے لیے میرے ذہن میں نہیں آسکتا۔

ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے، جو رحمت والا ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالامال کر رہی ہے، جو اس دن کا مالک ہے جس دن (اپنے) کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصہ میں آئے گا (خدایا!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے اپنی ساری احتیاجوں میں مدد مانگتے ہیں (خدایا!) ہم پر (سعادت کی) سیدھی راہ کھول دے، وہ راہ جو ان قوموں کی راہ ہے جن پر تو نے انعام کیا۔ اُن کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

آخری تین آیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے یہی ایک مدعا ہے جس سے زبانِ احتیاج آشنا ہوتی ہے۔ لیکن کون سی سیدھی راہ؟ کسی خاص نسل کی سیدھی راہ، کسی خاص قوم کی سیدھی راہ، کسی خاص مذہبی طبقہ کی سیدھی راہ؟ نہیں، وہ راہ جو تمام رہنماؤں اور تمام راست باز انسانوں کی متفقہ راہ ہے خواہ کسی عہد یا کسی قوم میں ہوئے ہوں اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے۔ لیکن یہاں بھی کسی خاص نسل یا قوم یا کسی مذہبی گروہ کا ذکر نہیں کرتا

بلکہ ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں۔

گویا جس بات کا طلب گار ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے وہ بھی نوعِ انسان کی عالمگیر بُرائی ہے۔ نسل، قوم، ملک یا مذہبی گروہ بندی، تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی۔

غور کرو مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن اور عواطف کے لیے کس طرح کا سانچہ مہیا کرتی ہے۔ جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا۔

کم از کم دو باتوں سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ ایک کہ اس کی خدا پرستی۔ خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی۔ دُوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہیں ہوگا۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا۔ اور دعوتِ قرآن کی اصل رُوح یہی ہے۔

جانتا ہُوں کہ اس رُوح کو مسلمانوں اور دوسرے انسانوں نے بڑی حد تک بُھلا رکھا ہے۔ لیکن کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں جہاں بعض مرتبہ تہذیب اور بربریت کی حدوں میں امتیاز ناممکن ہو جاتا ہے دنیا کو اس پیغامِ محبت اور تصورِ انسانیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا عبد الستار خاں

نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَمَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (السباء)

تمہید

اس مقالے کا موضوع ہے پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور سرورِ دو جہاں، فخرِ موجودات، خلاصۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ جہاں ہر مسلمان وسیلۂ نجات سمجھتا ہے وہاں میرے جیسا ایک عامی اس تقریب پر لب کشائی کی ذمہ داری کے احساس سے بھی لرزتا ہے ؎

ادب گاہ ایست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی حقیقت کا بیان کچھ انھیں لوگوں کو زیب دیتا ہے جو اس تذکرے میں الفاظ کے گورکھ دھندے سے آزاد ہو کر ایمان کی آنکھ سے واقعات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ شہبازانِ معرفت نعت کے میدان میں سبقت رکھتے ہیں تو از روئے شریعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو پہچاننے کی کوشش کرنا عُلماء کرام کا حق ہے۔ میں مشائخ عظام اور عُلماء کرام کا خادم ہونے کی حیثیت میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ معرفت کی چاشنی یا شریعت کی روشنی سے پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں کچھ کہنے کی جرأت کر سکوں۔ روحانیت اور الٰہیات کے زاویۂ نگاہ سے میں اپنے عجز کا اقرار ہی باعثِ سعادت تصور کرتا ہوں ؎

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ حلقہ بگوش غلام غلاماں کی حیثیت سے آج اپنی معروضات کو صرف اس دائرے تک محدود رکھوں گا کہ اپنی عقلِ ناقص سے جب عہدِ حاضر کی انسانی معاشرت پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو موجودہ دنیا کے تمام مسائل کا حل مجھے کس طرح زندگی کے ہر پہلو میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو حتمی، قطعی اور آخری حجت تسلیم کر لینا نظر آتا ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر باؤ نہ رسیدی تمام بولہبی است

آغازِ کلام

عہدِ حاضر کا انسان جب مسائل کو اپنی عقل سے جانچنے کا زعم لے کر نکلتا ہے تو اس عقل کی حدودِ اربعہ کیا ہیں؟ آج کل کے سائنسدانوں کو زعم ہے کہ ہم آباؤ اجداد کی طرح صرف آنکھ کی طاقت سے نہیں بلکہ دوربین اور خوردبین لگا کر حقائقِ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماضی کا انسان صرف کان سے سنتا تھا، ہمارے گوشِ ہوش کی سماعت ریڈیائی لہروں پر حاوی ہے۔ گذشتہ تہذیبیں صرف قدم قدم چلتی تھیں۔ ہم سپٹنک سرپٹ دوڑاتے ہیں۔ اس کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ سات ہزار سال کی مستند تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بشری کمالات نے بعض جزئیات میں ضرور ایک حد تک ترقی کر لی ہے لیکن اس ترقی سے آفرینشِ کائنات اور غایتِ موجودات کا تو کیا ذکر انسان ابھی تک غیب اور آخرت کی کُنہ تک بھی نہیں پہنچ سکا۔ بیشک انسان کو اب معلوم ہو گیا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا، زمین نظامِ شمسی میں گردش کرتی ہے۔ لیکن یہ تو اب بھی پتہ نہ چلا کہ افلاک کے ماورا کیا ہے خلا کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے نظامِ شمسی کی حرکات کا حاصل کیا ہے اور انسان جس پر یہ تمام اسرارِ کائنات منکشف ہو رہے ہیں اس کی منزل کیا ہے اور اس کے ترددات کی غایتِ اُولیٰ کیا ہے؟

فقط یہی نہیں کہ انسان جب اپنے نفس سے باہر جھانکتا ہے تو اُسے اُفق کے کناروں سے پرے غیب کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک قلزمِ ظلمات دکھائی دیتا ہے، جس کا اور چھور اس کی عقل کو معلوم نہیں بلکہ وہ اپنے نفس کے اندر بھی جھانکتا ہے تو اسے آغاز و انجام ایک پہیلی کی طرح نظر آتا ہے جس کی آخری حقیقت اس کی ظاہر بیں عقل سے پوشیدہ ہے نہ صرف انسان کا عقلی علم، لاعلمی سے شروع ہو کر لاعلمی پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ انسانی عزائم کی ابتدا و انتہا بھی بے خبری سے شروع ہو کر بے خبری پر ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا تھا:

عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ

ترجمہ: انسانی ارادوں کے ٹوٹ جانے سے مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس کائنات پر اصل حکمرانی انسان سے ایک بالا ترہستی اور طاقت کی ہے۔

نہ صرف یہ عقلِ ناقص اپنی ابتدا و انتہا کے لحاظ سے ناقص ہے بلکہ اس علمِ ناقص کا نشۂ پندار بھی تا عرصہ نفس پر حاوی رہتا ہے تب بھی اس سے سوائے تصادم، تضاد اور سعیٔ لاحاصل کے کچھ نہیں نکلتا۔ آسمان پر سپٹنک (SPUTNIK) سے ایکسپلورر (EXPLORER) لڑ رہا ہے۔ زمین پر سٹالن کو خروشچیف مُوردِ الزام قرار دے رہا ہے۔ ایک معاشرتی طبقہ دوسرے معاشرتی طبقے سے برسرِپیکار ہے۔ وطن سے وطن کی ٹکر ہو رہی ہے۔ جمہوریت سے جمہوریتیں بیزار ہیں۔ غرض دو بادشاہوں کا ایک تخت پر بیٹھنا قرونِ مظلمہ (DARK AGES) میں ایسا ناممکن نہ تھا۔ جتنا فی زمانہ عقل کی عقل سے صلح ہو جانا محال دکھائی دیتا ہے۔ کیا خوب کہا تھا اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ؎

عوض لٹھ کے چلتے ہیں آپس میں دوٹ

اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ کے طومار سے سرگرداں ہو کر اس نتیجے پر پہنچے تھے۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے دل خرد سے

نیز فرمایا تھا کہ ؎ حکمت و فلسفہ کرد است گراں خیز مرا خضر من از سرم ایں بارِ گراں پاک انداز

عقل کی حد کا تقاضا عقل کرتی ہے

غرض عقل کے حدود و اربعہ کا اگر عقل سے جائزہ لیا جائے تو اس کی سرحدات سے پرے ماورائے عقل کی مملکت صاف دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ اس کے نقوش دھندلے ہیں۔ عقل کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ عقل کی اس حد پر پہنچ کر اقلیم عقل کے سیاحوں نے تین راہیں اختیار کی ہیں۔ (۱) ایک قافلہ تو وہ تھا جنھوں نے غیب اور آخرت کی دھندلاہٹ سے جھنجھلا کر عقل کی محدود روشنی سے بھی انکار کر دیا اور لا ادریت کی تاریکی میں کھو گئے۔ انھوں نے کہا کہ کائنات نقطہ ہے اور یہ کائنات فقط مایا کا جال ہے۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

قرآن مجید کی تاریخی اصطلاح میں ایسے حقیقت کو جھٹلانے والوں کا نام منکرین ہے۔ چاہے متشککین ہوں یا خیالیین SKEPTICS ہوں یا IDEALISTS۔

(۲) دوسرے گروہ نے کہا کہ عقل سے پرے جب کچھ صاف دکھائی نہیں دیتا تو عقل پر کیوں نہ اکتفا کریں۔ قرآنی اصطلاح میں ہر زمانے اور ساری کائنات پر حاوی عقل کی بجائے مختلف زمانوں اور مختلف قسموں کی چھوٹی چھوٹی اور عارضی عقول کو اس طرح برحق مان لینے والوں کا نام مشرکین ہے۔ چاہے وہ MATERIALISTS ہوں یا PRAGMATIC یعنی مادیت پرست ہوں یا افادیت پرست (انھیں مصیبت یہ پیش آئی کہ جب عقل پر توجہ مرکوز کی جائے تو اس کی وسعتیں ناگہاں پھیلنے لگتی ہیں، جو کل عقل تھی وہ آج بے عقلی دکھائی دیتی ہے اور پرسوں حماقت سے بھی زیادہ ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ماورائے عقل کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے عقل کی آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں تو ماورائے عقل کی جانب پیٹھ موڑنے سے بھی عقل کے پاؤں تلے کی زمین مسلسل سرکتی جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں عقل سے روگردانی کرنے والے اور سراسر عقل پر انحصار کرنے والے دونوں قافلے مسافتِ ہستی میں سرگرداں اور گمراہ ہو گئے (قرآنی اصطلاح میں انکارِ حقیقت یا شرک کا ارتکاب کر کے زندگی کی اصلیت سے یوں روگرداں رہنے والوں کا نام کفار ہے) وہاں تیسری جماعت ان لوگوں کی تھی، جن پر انسانیت کے ارتقاء کا ہمیشہ سے انحصار رہا ہے اور ہمیشہ انحصار رہے گا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے عقل کا اقرار کرتے ہوئے بھی غیب اور آخرت کا انکار نہ کیا۔ قرآنی اصطلاح میں یہ جماعتِ مومنین ہے جن کا نعرہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ ؎

عقل است چراغِ تو در رہگذارے نہ
عشق است ایاغِ تو با بندۂ محرم زن

اور

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من عقل است غلامِ من

اس جماعت کی رہنمائی ہر خطۂ زمین اور ہر عہدِ تاریخ میں ان برگزیدہ شخصیتوں نے کی جو عقل اور ماورائے عقل کی سرحد پر روشنی کے مینار کی طرح سر بلند اور منور کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وہ شخصیتیں ہیں جو اپنے دَور میں عقل کے بشری تقاضے پُورے کرتے ہوئے غیب اور آخرت سے ہدایت کی وحی کا مہبط قرار پاتی رہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا تاریخی اور عقلی منصب

موجودہ زمانے کا انسان نبی کے مفہوم کو سمجھنے میں بسا اوقات یوں ٹھوکر کھاتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے کی اس بنیادی اصطلاح کو بیان کرنے کے لیے رائج الوقت غیر مسلموں کی زبانوں سے ایسے الفاظ مستعار لئے جاچکے ہیں جن کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کے متعلق غیر مسلموں کے تعصبات اور توہمات کا ایک عنصر بھی ان الفاظ کے معنوں میں شامل ہو گیا ہے۔ یورپین زبانوں کا لفظ پرافٹ (PROPHET) اس یونانی مصدر سے مشتق ہے جو غالباً یہود کے دورِ زوال میں سُریانی زبان سے مستعار لیا گیا تھا اور جس کا بنیادی تصوّر اس مفہوم کے گرد گھومتا ہے کہ پیغمبر کبھی کبھی آنے والے زمانے کی باتیں بھی قبل از وقت بتا دینا اپنے حقیقی مشن کی تکمیل کے لئے مناسب سمجھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ عہدِ جاہلیت میں عرب کے اندر بھی کاہن کی اصطلاح کے ماتحت اس قسم کا ایک مفہوم موجود تھا جس کا تصور پیشین گوئی اور دانشمندانہ اقوال تک محدود تھا۔ قرآن مجید نے وضاحت سے اس غلط توقع کی تردید کر دی ہے:-

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ: اور یہ (منکرینِ حق) یوں کہتے ہیں کہ اس پر اپنے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں۔ (اے پیغمبر اسلامؐ) تم فرماؤ کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور میں تو یہی صاف ڈر سُنانے والا ہوں۔

پیغمبر کا منصب یہ نہیں کہ وہ جوتشیوں کی مانند مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی بابت ٹپے (GUESSES) لگاتا رہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الحاقہ)

ترجمہ: تو مجھے قسم ہے ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنہیں تم نہیں دیکھتے بے شک یہ قرآن ایک کرم والے رسول سے باتیں

ہیں اور وہ کسی شاعر کی بات نہیں۔ کتنا کم یقین رکھتے ہو۔ اور نہ کسی کاہن کی بات۔ کتنا کم دھیان کرتے ہو۔ اس نے اُتارا ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔

عربی لفظ نبی جو مذکورہ بالا قدیم سریانی مصدر سے ہی مشتق ہے لغت کے اعتبار سے خبر دینے والے کا تصور پیش کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے یہ خبر دینے والا کس چیز کی خبر دیتا ہے یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اس کی چنونی (انبأ) خوشخبری پر بھی دلالت کرتی ہے اور ڈرائی بھی ہوتی ہے لیکن امید و بیم تو اس پیغام کے اثر سے تعلق رکھتے ہیں۔ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا بنیادی مفہوم کیا ہے۔ اس پیغام کا بنیادی مقصد ہوتی اور دان ہوتی، بُرے اور بھلے، حرام اور حلال کی تمیز سکھانا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف)

ترجمہ: وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں۔ اس رسول کی جو نبی اُمّی ہے اور جسے اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں وہ انھیں نیک کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے منع کرتا ہے، وہ حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے اُن پر ناپاک چیزیں اور اُتارتا ہے ان سے بوجھ ان کے اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور اس کی مدد کی اور اتباع کی اس نور کی جو اس کے ساتھ اترا ایسی وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اللہ کے پیغمبر ہر زمانے میں انسان کو یہ سکھاتے ہیں کہ غیب اور آخرت کی وہ کونسی حدود ہیں جن کے اندر انسان اپنے شعور اور عقل کے استعمال سے مفید نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ عقل کا موضوع تو شاید اس کائنات میں انسان کے بغیر بھی قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن خود عقل اپنے وجود کے لئے انسانی ذہن کی محتاج ہے۔ انسانی ذہن کی نشو و نما اور بلوغت اسی صورت میں ممکن ہے جب انسانی معاشرہ ایک صحت مندانہ نہج پر موجود ہو۔ انسان حیوانِ مدنی الطبع ہے۔ بغیر دوسرے کے نہ وہ اپنی فطری حالت میں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ جس طرح معاشرے کو جنم دینے اور قائم رکھنے کے لیے اقل قلیل مادی ضروریات لابدی ہیں، اسی طرح افراد کی شخصیتوں میں بعض تعمیری عناصر کے بغیر سوسائٹی قائم نہیں رہ سکتی۔ ممکن ہے سورج کی کھولتی ہوئی حرارت میں کسی اور نوع کی مخلوق زندہ رہ سکتی ہو۔ لیکن وہاں انسانی جامے میں انسان آباد نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جن انسانوں کے ذہن سے تعمیری میلانات اور فطری احساسات بالکل مٹ جائیں ان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح افراد میں دیوانگی کا غلبہ ایک حد سے بڑھ جائے تو ان کی موت واقع ہو جاتی ہے اور جس طرح خاندان میں مُروّت باہمی نہ رہے تو خاندان بکھر جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرے کے اندر بُرے اور بھلے کی تمیز بالکل ختم ہو جائے تو قومیں منتشر ہو جاتی ہیں اور امتیں مٹ جاتی ہیں۔

نبی اپنی اُمت کی مساعی کا میدان ظاہر اور غیب اور موجود و آخرت کی حدود کے اندر مُعین کرتا ہے۔ تاریخ کی ابتدا میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ جبکہ مصر میں صنائع اور حرفت کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جس نے آگے جا کر یونانی حکمت اور یونانی علوم و فنون کی بنیادیں رکھی تھیں اور دوسری جانب مشرقِ وسطیٰ میں وہ بلدیاتی ریاستیں (CITY STATES) قائم ہو چکی تھیں جنھوں نے یونان

کی سٹی سٹیٹس (CITY STATES) کے لئے نمونہ بنا تھا۔ تو اس وقت انسان کے ذہن میں یہ خلجان پیدا ہو رہا تھا کہ کیا شجر و حجر اور شمس و قمر خود انسان کی طرح ایک ایسی شخصیت رکھتے ہیں جس کے ساتھ شعوری ربط پیدا کر کے اسے راضی کیا جا سکتا ہے یا یہ وہ ادنیٰ طاقتیں ہیں جنھیں اشرف المخلوقات نے اظہارِ عبودیت و جستجوئے رضامندی کے بجائے اپنی استعداد اور قوت سے مسخر کرنا ہے۔ قرآن مجید شاہد ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی کہ ستارے، چاند یا سورج انسان کی تقدیر کے مالک نہیں۔

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ .... اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

فطری قوتوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھ کر انسان نے ان کے جو مجسمے بُت یا نقشے ڈھال لئے ہیں وہ اس پر حاکم نہیں۔ سلطنتوں کے وہ بادشاہ جو نمرود و شداد کی طرح حکم چلاتے ہیں یہ بھی عام انسانوں سے بالاتر نہیں۔ بلکہ کائنات کا رب تو وہ اَن دیکھی ہستی اور طاقت ہے جو کائنات اور کائنات کی ہر شے کو اپنی اَن دیکھی قوتوں اور غیبی ترکیبوں سے وجود میں لاتا ہے۔ انسان کی جبینِ عبودیت صرف اسی کی بارگاہ میں جھکنی چاہیے۔ اس ایک سجدے سے وہ قبلہ تعمیر ہو گیا، جس نے سابقہ شعوبی عصبیتوں کو مٹا کر ایک نئی ملت پیدا کر دی ؎

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ | رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ!
یہی دینِ محکم یہی فتح باب | کہ دُنیا میں توحید ہو بے حجاب

اکثر مؤرخ بھول جاتے ہیں کہ صدیوں بعد یونان میں جو حریت، حکمت، سیاست اور فنون کے نمونے پیدا ہوئے، اگر انہوں نے مصر کے سائنس (سائنٹفک علوم) اور صنعت سے ورثہ حاصل کیا اور مشرقِ وسطیٰ کی بلدیاتی ریاستوں کے نمونے کو سامنے رکھا۔ تو ان سب سے زیادہ ملتِ ابراہیمی کی روشنی تھی جس نے ظلمت کدۂ یونان میں سحر کی ابتدا کی۔

قریباً ایک ہزار سال بعد جب فرعون کی سیاسی قوت اور قارون کی اقتصادی طاقت نے انسانیت کے متمدن گوشے کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے احکامِ عشرہ کی تختیاں ہیکل بیت المقدس میں سجا کر اپنی اُمت کو یہ پیغام دیا کہ قانون خالی جبر یا دولت سے استخراج نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی معاشرے کی ہدایت ہے۔ لکھے ہوئے قانون اور معاشرتی فلاح کا نمونہ یہی تھا جس کا چربہ صدیوں بعد رومن لاء کی تختیوں پر اُتارا گیا۔

جب انسان قانون کی شوکت کو فانی حاکموں کی غیر فطری بالادستی کی آڑ بنانے لگا اور عسکری قوت لے کر معاشرے کی حفاظت کے بجائے رعایا سے استحصال کا برتاؤ کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کو یہ تعلیم دی کہ انسان صرف موجودہ قوت یا اجتماعی شوکت کے بل پر صحت مند معاشرہ قائم نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے سامنے موجودہ سے بہتر ایک مستقبل کا نصب العین بھی ہونا چاہیے۔ آسمانی بادشاہت کا یہی آئیڈیل تھا۔ جس نے کئی صدیوں تک زمین کی سلطنت کو بھی تہذیب کی نعمتوں، تمدن کی ترقیوں اور ثقافت کی برکتوں سے مالامال کیا۔

غرض عقلِ انسانی نے جب کبھی اپنی جلوہ آرائی کا سامان پیدا کیا تو اس کے مظاہرے کے لیے میدان قبل ازیں پیغمبرانہ تعلیمات سے مہیا ہو چکا تھا۔ عقل کی کشتی اپنی سُبک روی کا تماشا تبھی دکھا سکتی ہے، جب معاشرہ غیبی طاقتوں کے ساتھ سازگاری پیدا کر کے وہ ہموار سطح فراہم کر دیتا ہے جس پر اس کشتی کو چلنا ہے اور آخرت کی منزل کی جستجو اس کشتی کے لیے ایک روشنی کا مینار تعمیر کر چکی ہے ۔ ورنہ ممکنات کے انتھاہ

سمندر کی حد بندی اگر شریعت کے ساحل سے نہ ہو چکی ہو اور آخرت کا کوئی نقشہ کسی منزل کا تعین نہ کر چکا ہو، تو عقل بے چاری اس استدلال کی طرح "نا تک ٹوئیاں مارتی اور حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ جس کا کبریٰ مجہول ہو، صغریٰ نامعلوم ہو اور نتیجہ ظاہر ہے کہ سوائے لاطائل ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مؤرخین نے عقل کی حدود اربعہ کے قیام کے لئے اقوام کے ارتقاء اور تہذیبوں کے نشو و نما کا سہارا بھی لیا ہے لیکن وہ یہ واضح نہیں کر سکتے کہ قوم کو کیا چیز قوم بناتی ہے اور تہذیب کو کونسی قوت تہذیب کے درجے تک پہنچاتی ہے، قوم اور تہذیب دونوں کا تصور معاشرے کے تصور کے بغیر محال ہے اور معاشرہ صرف اسی اُمت کے اندر ممکن ہے جو غیب اور موجود اور حاضر و آخرت کی حدود کا تعین کر چکی ہو۔ جو انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ جو کچھ نہیں جانتا اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے جو کچھ کہ وہ جانتا ہے اور جسے یہ معلوم نہیں کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کا مصرف مطلب اور غایت کیا ہے۔ ایسا انسان حیوانیت کی اس سطح پر جس کے ربوڑ دوسری طاقتیں ہانکتی ہیں۔ نہ صرف غیب اور آخرت کے تصورات کا مجرد تعین معاشرے کے قیام کی پہلی شرط ہے، بلکہ تصورات جو کچھ بھی ہوں تمام معاشرے میں ان کی یکسانیت بھی شرط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسی یکسانیت کا پیغام ہمیشہ کوئی پیغمبر ہی لایا کرتا ہے۔ چاہے اس پیغام کی یاد اس پیغامبر کی اُمت کی آئندہ پشتیں فراموش ہی کیوں نہ کر چکی ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین اور عمرانی محققین نے معاشرے کی تشکیل کے اجزاء کو غیب و آخرت اور حرام و حلال کی اصطلاحات میں بیان کرنے کے بجائے نظریۂ ارتقاء (EVOLUTION THEORY) کا سہارا بھی لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح موسم برسات میں زمین سے گھاس اُگتی ہے اور فصل پک جانے پر پھل بلوغت کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور جس طرح موسم بہار میں پرندے خود بخود چہچہانے لگتے ہیں اسی طرح معاشرہ بھی بغیر احساس خود شعوری کے پروان چڑھ جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ جمادات کا ارتقاء نباتات میں دیکھنے والے اور نباتات کا ارتقاء حیوانات میں تلاش کرنے والے جب انسان کو تختہ مشق بناتے ہیں تو اس کی ترقی کمالات و مقامات کی منزلیں آخرت میں تلاش کرنے کے بجائے اسے تنزل و انحطاط کی راہ دکھا کر اس کے ارتقاء کو تسفل کے مدارج میں ڈھونڈتے ہیں۔ مان لیا کہ برسات میں خود رَو گھاس اُگ آتی ہے، لیکن کیاریوں کی چمن بندی تو دستِ مشاطہ کی محتاج رہتی ہے۔ یقیناً پرندے موسم بہار میں خود بخود چہچہانے لگتے ہیں، لیکن طوطی و مینا کو طرزِ تکلم سکھانے کے لیے تو کسی متکلم کی حاجت باقی رہتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسانی تمدن کا کھوج، ہم بن مانسوں اور بندروں کے جبلی میلانات اور وحشیوں کی شہوات میں تلاش کریں اور ملائکہ کی وساطت سے نازل ہونے والی وحی سے غفلت کی آنکھ بند کر لیں۔

اُصول سے قطع نظر تفصیل میں دیکھئے تو مذہب سے ہٹ کر تمدن کی اساس سوائے نسل یا وطن کے اور کہیں متعین نہیں کی جا سکتی۔ آج رُوئے زمین پر تمام نسلی ریاستیں مٹ چکی ہیں اور جو ایک نسلی ریاست فنا نہیں ہوئی، اس کی نسل کی بنیاد دین نے محفوظ کر رکھی ہے۔ اگرچہ اس دین کو مسخ کر دیا گیا ہے۔ وطنی ریاستوں کی تاریخ شاہد ہے کہ اوطان کی حفاظت کے لیے اقوام کو وطن پرستی کی عصبیتیں ترک کر کے بین الاقوامی جگھٹوں کی تلاش ہے۔ یہ بین الاقوامی ٹولیاں جب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے مفاخرے کی زبان کھولتی ہیں تو اپنی وطن پرستی کو گناہ کی طرح چھپا کر اس پر انسان دوستی کا ملمع چڑھاتی ہیں۔ اس انسان دوستی کے پیچھے انسان کا تصور تلاش کیا جائے، تو پھر

الہامی کتابوں سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، حتیٰ کہ مسٹر خروشچیف نے بھی ایک حالیہ تقریر میں انجیل کے حوالے پیش کئے کہ یہ سرمایہ دارانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فقر کی نسبت قارون کی زرپرستی سے مشابہ ہیں۔

موضوع یہ تھا کہ انسانی کمالات کا جوہر پیغمبرانہ تعلیمات کے دائرے کے اندر محدود ہو کر ہی کھلتا ہے چاہے جوہر دکھانے والے زبان سے اُن تعلیمات کا جزوی انکار ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ رسالت کا یہ مفہوم تعین کرنے کے بعد ہمارے لئے آسان ہو گیا ہے کہ ہم عہدِ حاضر کے انسان کی مشکلات کا حل پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے نسبت قائم کرنے میں تلاش کریں۔

پیغمبروں کے مابین تفریق نہیں لیکن فضیلت ہے

انسان کے عہدِ طفولیت میں مختلف انسانی معاشروں کو اسی طرح قدم قدم پر فطرت کے سہارے اور امداد کی ضرورت تھی جس طرح ایک طفلِ شیرخوار ماں اور انا کا محتاج ہوتا ہے، جب گھٹنوں کے بل چلنے والا بچہ قدم قدم چلنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ بلوغت کی عمر کو پہنچ گیا تو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل وہ وقت بھی آ گیا، جب کائنات کی ترقی اُمتوں کے بجائے ایک اُمت اور اجتماعی کوششوں کے ساتھ انفرادی فضیلتوں کے سپرد کر دی جائے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جہاں دوسری ملتوں پر بنی اسرائیل کے یہودا (JAHOVA) کی فضیلت کے بجائے اللہ کی توحید نے تمام باطل معبودوں کو اس طرح ملیامیٹ کر دیا کہ اب روئے زمین پر الفاظ تو شاید مختلف باقی ہوں، لیکن خدا کے اقرار سے کسی کو مفر نہیں۔ تمام قدیم شریعتیں منسوخ کر کے ایک شریعت نے دین کی تکمیل کر دی:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

اور

وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

میں قرآن کریم نے اس جانب واضح اشارے فرمائے ہیں۔

حیات بعد ممات کے مختلف اور اُلجھے ہوئے تصورات کے بجائے معاد اور آخرت کا ایک ایسا تصور سامنے آ گیا جس نے زندگی اور موت کو ایک ہی تسلسل کی لڑی میں پرو دیا۔

اِنَّ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَان اور خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ سے واضح ہے اور اس میں اس حقیقت کو نہایت ہی دل نشیں پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ پس یوں اُخروی فضیلتیں دنیاوی برکتوں کے حصول کا وسیلہ بن گئیں۔ تب بنی نوعِ انسان کو پہلی مرتبہ " یٰاَیُّھَا النَّاسُ " کے خطاب سے نوازا گیا اور " اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی نعمت تمام کر کے ربّ العٰلمین کی جانب سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کُل کائنات کی رہنمائی کا منصب عطا ہوا۔

قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ؕ

ترجمہ: تمام نوعِ انسانی کو کہہ دو کہ میں سب کی طرف رسول ہوں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ؕ

ترجمہ: اور آپ کو ہم نے تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔

يَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَى هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ؕ

ترجمہ: جس دن ہم ہر اُمّت میں سے ان کے اندر ہی سے گواہ کھڑے کریں گے اور تمھیں اے رسول ان تمام اقوام و امم اور ان کے شاہدین پر گواہ کھڑا کریں گے، اس لیے کہ ہم نے تم پر وہ کتاب اُتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے اور ان پر جو اس کتاب (احکامِ الٰہی) کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں ان کے لئے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔"

پہلی مرتبہ حکومت کا ایک ایسا نظریہ پیش ہوا جس میں ابیض و اسود اور احمر و اصفر سب کے لیے اہل الرائے کا منصب حاصل کرنے کا معیار تقویٰ طے پا گیا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۝ اور خطبۂ حجۃ الوداع میں مزید وضاحت فرماتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا:

یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی العجمی ولا لعجمی علی العربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالدین والتقویٰ ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم! چمن زادیم و از یک شاخساریم!

تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم!

وحی کی راہ آئندہ کے لئے مسدود کر کے علم اور تحقیق کی ایسی شاہراہیں کھول دی گئیں جن پر چل کر ظاہر اور غیب، موجود اور مقصود، حاضر اور آخرت کے سنگھم کو پُل صراط کی طرح عبور کرنا ہر طالب کے لیے طریقۂ سلوک کی مانند ممکن ہو گیا۔

پیغمبر کی سُنّت سے اجماعِ اُمّت کا رشتہ

عقل اور ماورائے عقل کے مابین جو حجاب حائل تھا وہ معراج والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث "اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ" سے دُور ہو گیا، لیکن عقل پر ماورائے عقل ۔ تمام راستے کھل جانے کے ساتھ یہ شرط عائد رہی کہ تمام راستے ایک دروازے سے ہو کر گزریں گے جس کا نام توحید ہے۔ علم جو کچھ جاننا چاہے جان سکتا ہے، فن جو کچھ بنانا چاہے اور جو کچھ حاصل کرنا چاہے حاصل کر سکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جان پہچان میں یہ امر ملحوظ رہے کہ سب جانچ پڑتال کی اصلیت ایک رَب کی محتاج ہے۔ اگر علم نے یکسانیت اور یک جہتی کا اسلوب ترک کر دیا تو ایسا علم متضاد اور منتشر ہو کر باطل ہو جائے گا۔ اگر کسی فرد نے اپنی مختلف معلومات کو ایک توحید پر مرتکز نہ کیا تو اس کی شخصیت کے پُرزے پُرزے ہو کر اس کے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے۔ جہاں علم کے لیے تمام راستے کھول کر ان کو توحید کے دروازے سے گزرنا لازمی قرار پایا۔ وہاں اس دروازے کی کلید اقرارِ رسالتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم قرار پائی۔ انسان ضعیف البنیان کو کائنات کے تمام اسرار و رموز سے دوچار ہونے کی اجازت اس شرط پر ملی ہے کہ ظاہر پر غیب کے دریچے کھول دینے والے پیغمبرؐ کی سنت کا دامن کسی حالت میں ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر اُمّت نے اس سُنّت کا دامن تھام لیا تو پھر اس سُنّت کا اجماع، سُنّتِ سلف صالحین کا منصب حاصل کرے گا اور اگر فرد کے اجتہاد نے اتباعِ سلف صالحین، اجماعِ اُمّت اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی میں کامیابی حاصل کر لی تو اس انفرادی اجتہاد کے لیے اہل الرائے

کے اجماع کے مقام سے گزر کر خود اجماعِ اُمّت کا مقام حاصل کر لینے کی راہ بھی کھلی ہے ؎

وہ دانائے سُبل، ختم الرسلؐ مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اور عقیدۂ ختمیّت کے صدقے اُمّت کو مقامِ خویش سے یوں آگاہ کر دیا گیا ہے ؎

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد ۔۔۔ بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایّام را ۔۔۔ او رُسُل را ختم و ما اقوام را

عالمی مسائل اور پیغمبرِ عالم

آج رُوئے زمین کی انسانی آبادیوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو تین بنیادی مسائل نے ہر جگہ انسان کو لاچار، مضمحل، پریشان اور دُکھی بنا رکھا ہے۔

پہلا مسئلہ اخوتِ انسانی کا ہے۔ آج انسان کی ترقی کا راستہ بُتوں، چڑیلوں، بدرُوحوں، درندوں اور بلاؤں نے نہیں روک رکھا۔ بلکہ آج انسان کی ترقی اور حُریت کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ وہ پلید انسان ہیں، جنہوں نے ان تمام بد اَرواح اور خبیث قوتوں کی خصلتیں اپنا لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انسان کا سہارا انسان بنتا، انسان کی رہنمائی انسان کرتا، انسان کا ہاتھ انسان بٹاتا اور انسان کی مشکلات کو انسان حل کرتا۔ لیکن آج انسان کو سب سے بڑی فکر ہے تو انسان پر ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، زہریلی گیس اور زہریلے جراثیم برسانے کی۔ اگر انسان قمر و مریخ کا عزم کرتا ہے تو افلاک سے رحمتیں حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان پر جنگ کے مکروہ دیوتا کے ساتھ سازش کر کے ہلاکت و مُصیبت اور آگ برسانے کی خاطر۔ یہ صورتِ حال ان منافقین کی مساعی سے کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوگی، جو جمعیت اقوام بناتے ہیں تو کمزور کا گھر لُوٹ لیتے ہیں طاقتور کی خونخواری کی تسکین کی غرض سے اور تو یُو۔این۔او (U.N.O) بناتے ہیں تو کشمیر اور فلسطین کی قسمت سے کھیلنے کے واسطے، جو جنیوا میں اکٹھے ہوتے ہیں تو مشرقِ وسطیٰ کی بندر بانٹ کی نیت سے اور جو دول کبیر کی مجلس کا اہتمام کرتے ہیں تو ملل صغیر کو اپنا نخچیر بنائے رکھنے کی خاطر ؎

در جنیوا چیست غیر از مکر و فن
صیدِ تو این میش و آن نخچیرِ من!

اور

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ۔۔۔ کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے ۔۔۔ اور قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

انسانی اخوّت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تمام انسانوں کے مابین کوئی بنیادی قدرِ مشترک دریافت نہ کر لی جائے انسانی معاشرے کے مابین کوئی بنیادی قدرِ مشترک اس وقت تک دریافت نہیں ہو سکتی جب تک انسان ایک پیدا کرنے والے ایک پالنے والے اور ایک جان قبض

کرنے والے کی توحید پر متفق نہیں ہو جاتے۔ نظریاتی توحید اس وقت تک قانون اور شریعت کی توحید پر منتج نہیں ہو سکتی جب تک کہ توحید کا سبق آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل نہ کر لیا جائے ؎

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم

اخوتِ انسانی کے بعد آج انسانیت کو جو دوسری حاجت لاحق ہے، وہ جابرانہ اور مستبدانہ حکومت کی اصلاح ہے۔ انسانوں نے اپنی اپنی کمائی حسبِ توفیق ٹیکس ادا کر کے حکومت کا خزانہ اس لئے بنایا تھا کہ محتاجوں کی حاجت روائی ہو سکے اور اجتماعی ضروریات کی کفالت مشترکہ جدوجہد سے ہو جائے۔ انسان نے اپنی حریت سے جگر کی بوٹیاں نوچ کر حکومت کو اس لیے اقتدار سونپا تھا کہ فرد کے ناموس اور وقار کا قرار واقعی تحفظ ہو سکے۔ لیکن آج امریکہ ہو یا روس، جاپان ہو یا چین حکومتیں انسان کے سر پر سندباد جہازی کے پیرِ تسمہ پا کی مانند اس طرح مسلط ہوئی ہیں کہ غریب کو دوڑا دوڑا کر ہلکان کر دیا ہے۔ خود کردہ اقتدار سے پی پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ غریب سندباد کو لقمۂ حلال بھی حلق سے اتارنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اس مرض کا تدارک بھی کسی ایک پیرِ اقتدار کی گدی پر کسی دوسرے پیرِ اقتدار کو بٹھا کر ممکن نہیں بلکہ اس کا ایک ہی اصولی حل ہے کہ اقتدار کے بتوں کو ان کے سنگھاسن سے اتار کر چکنا چور کر دیا جائے۔ انسان پر کسی انسان کو اپنی رائے سے حکم چلانے کا حق نہیں۔ حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آذری

اللہ کے اختیارات کی تعمیل آخری رسولؐ کو سونپی گئی تھی۔ اب انسان کے لئے سوائے رسولؐ کا نائب بن کر کچہری یا دربار میں احکام جاری کرنے کی کوئی وجہِ جواز نہیں ؎

خلافت بر مقامِ گواہی است | حرام است آنکہ برما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ | خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

انسانیت کا تیسرا اہم مسئلہ آج کل یہ ہے کہ حریتِ فکر کی تحریک اس لئے چلائی گئی تھی تاکہ انسانوں کو جھوٹے آقاؤں اور ظالم فرماں رواؤں کی اطاعت سے نجات ملے۔ ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ جو چاہے اور جس طرح سے چاہے سوچے، یقین کرے اور عمل کرے۔ لیکن مصیبت یہ لاحق ہو گئی ہے کہ پابندیٔ افکار سے نجات دلانے کے لئے حریتِ افکار کا جو داعی اٹھتا ہے۔ نمرود، شداد، ہامان و فرعون بن کر بنی نوع انسان پر اپنے ذاتی، طبقاتی، نسلی اور خیالی اوہام و تعصبات مسلط کرنے کے درپے ہو جاتا ہے ؎

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جب لینن اور سٹالن کروڑوں انسانوں کو فنا کے گھاٹ اتار چکے، جب انقلاب کے نامور ترین علمبردار عمرِ یں تعذیب تعزیر اور زنداں و سلاسل میں گزار چکے تو اب کمیونسٹ لیڈروں پر یہ راز کھلا کہ مارکس کی تعلیمات کا نفاذ متشددانہ انقلاب اور قتل و غارت کے بغیر جمہوری طریقوں

سے بھی ہو سکتا ہے۔ امریکی سفاک جب ریڈ انڈین (RED INDIANS) کی نسلوں کا صفایا کر چکے اور حبشی غلاموں کی کثیر آبادی کو زیر دست بنا چکے تو انھیں غلاموں کو آزاد کرانے، نو آبادیات کو ڈومینین سٹیٹس (DOMINION STATUS) دلانے اور حریت و جمہوریت کے متعلق وعظ کرنے میں بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ حریت فلسطین میں امریکہ کے متبنّٰی (اسرائیل) کو ضرر نہ پہنچائے اور الجزائر میں غلاموں کو جب آزادی عطا کی جائے تو وہ رضامندانہ طور پر اپنے آقاؤں کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے پر آمادہ رہیں ورنہ جمہوریت کا غلط استعمال کرنے والوں کے علاج کے لئے کنٹرولڈ اور گائیڈڈ ڈیماکریسی (CONTROLLED AND GUIDED DEMOCRACY) کا پورا "عطار خانہ" موجود ہے ؎

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال غارتگری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برّۂ معصوم کی تلاش

تحریک حریت فکر کی اس بے راہ روی کا علاج فقط یہ ہے کہ انسان پر کسی دوسرے انسان کے افکار کی پیروی کی پابندی نہیں۔ البتہ تمام امتی انسانِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار کے مطیع رہنے کے پابند ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر دوسرے انسانوں کی حریتِ فکر قائم نہیں رہ سکتی

ع دل بحق بر بند و راہِ مصطفٰے رَو!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ط (الانفال-ع)

ترجمہ: اے پیروانِ دعوت ایمانی! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے۔ تاکہ تمہیں موت کی حالت سے نکال کر زندہ کر دے ؎

محمد کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

انسانیت کی نجات رحمۃ للعلمین کی پیروی میں ہے

مجمل طور پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کے علم کا آغاز ایسے حالات و کوائف کے ماتحت ہوتا ہے جن کی تحقیق و تفتیش وہ ایک حد سے آگے نہیں کر سکتا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ انسان کا علم ایک ایسی حد پر ختم ہو جاتا ہے جس سے آگے کے مسائل فقط انسانی جستجو سے حل نہیں ہو سکتے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آغاز و انتہا کی ان دو لاعلمیوں کے مابین انسانی علم کی جو مختصر سی زندگی ہے اس کے دوران میں بھی علم کی بقا انسانی معاشرے کی بقا کی محتاج ہے یعنی علم سے علم ٹکراتا ہے، جب پیچیدہ معاشرتی مسائل کا حل معلومات سے فراہم نہیں ہوتا تو اس وقت انسان کو کائنات کی اس فطری ہدایت کی جانب سے راہنمائی کی حاجت ہوتی ہے جس کا پیغام صرف نبی بتا سکتے ہیں۔ جہاں علم کی حد ختم ہوتی ہے وہاں سے نبوت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ لیکن ابتدائے آفرینش سے علم کی سرحد آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ حقائق کائنات کو ایک حد تک پہنچ کر نبوت کی مرحلہ ختم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ محمد کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ اقدس میں کائنات کے لئے ایک ایسا اسوۂ کاملہ وجود میں آ گیا جس کی کامل رہنمائی سے زندگی کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر لحاظ سے رضائے الٰہی کے حصول کا مکمل نمونہ پیش کیا۔ بحیثیت ایک جج، بحیثیت ایک کمانڈر ان چیف، بحیثیت ایک معلم اخلاق، بحیثیت ایک مصلح معاشرہ، بحیثیت ایک قانون ساز، بحیثیت ایک ماہر معاشیات و اقتصادیات،

غرضیکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قائدانہ صلاحیتیں اس مقام پر ہیں کہ انسانیت اپنی تکمیل کے لیے ہر وقت انھیں ذروۂ کمال پر دیکھے گی۔ بلکہ مقامِ نبوت کی وسعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانی ترقی کے لیے دامن کھلا رکھیں گی ؎

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو آنکه از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفےٰ اُو را بہاست یا هنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است
خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است رحمۃ للعلمینی انتہا است

آج امکانی لحاظ سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر علم کے تمام دروازے اس طرح سے کھلے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل جن مسائل کو وحی سے حل کرنے کے محتاج تھے وہ آج علمائے اُمتِ محمدی اتباعِ سُنّتِ محمدی کے ذریعے حل کر سکتے ہیں لیکن حصولِ کمالات و ترقی مقامات کے ان لامحدود امکانات میں اپنی ہستی گم نہ کر بیٹھنے اور ہدایت کے بجائے گمراہی سے بچنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبے میں ہر پہلو سے آخری حُجت تسلیم کیا جائے۔ ایسا نہ کیا گیا تو خود علم علم سے ٹکرا جائے گا۔ ایک معاشرتی طبقے سے دوسرے معاشرتی طبقے کا فساد ہو جائے گا۔ ملل عالم اخوت و مساواتِ محمدی سے بہرہ مند ہونے کے بجائے اس قسم کی ہلاکت آفرین جنگوں، اقتصادی رقابتوں اور معاشرتی تسفّل میں گرفتار ہو جائیں گی۔ جن کا مشاہدہ ہم دو عالمگیر جنگوں کے زمانے میں خود اپنی آنکھوں سے کر چکے ہیں اور تیسری عالمگیر جنگ کی تیاریاں ہر لحظہ ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ رحمۃ للعالمین کی غلامی سے انکار کرنے والی قومیں اسی طرح ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر کھا جائیں گی جس طرح بچھو کے بچے خود ماں کے پیٹ کو نوچ کر پیدا ہوتے ہیں اور ان کی اولاد خود ان کے لئے فرشتۂ اجل کا حکم رکھتی ہے۔

یہی احساس تھا جس نے حضرت سید جمال الدین افغانی علیہ الرحمۃ کو اتحادِ عالمِ اسلامی کی مساعی میں عمر صرف کر دینے پر مجبور کیا۔ یہی وہ احساس تھا جس کے ماتحت برصغیر کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت، تحریکِ شہید گنج اور بالآخر تحریکِ پاکستان میں ہر قسم کی قربانیاں دیں، یہی وہ احساس تھا جس نے بالآخر مجسّم ہو کر آج سے تیئیس[۲۳] سال قبل دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی۔

سرورِ کونین رحمۃ للعالمین اور عالمِ غیب و شہود کے لئے یکساں پیغمبری کا پیغام لانے والے نبی کے اس مختصر تذکرے میں نامناسب نہ ہوگا۔ اگر میں اختتام علمی مسائل کے تذکرے کے بعد ان کے عملی پہلوؤں کی مقتضیات پر کروں۔ قیامِ پاکستان کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ مسلمان بجز خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی، اپنی قومیت اور اپنی سیاست اپنے وطن اور ترقی کے لیے کسی اور معیار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، آج تک پاکستان میں جو خلل پیدا ہوا اس کی کوئی بنیادی وجہ سوائے اس کے نہ تھی کہ ہم نے اپنے ہر مسئلے میں ہر پہلو سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کچھ کوتاہی کی۔ پاکستان میں کوئی موجودہ خلل اس وقت تک دُور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم اس کو دُور کرنے کے لئے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی جانب رجوع نہیں کرتے۔ آئندہ بھی پاکستان کو سوائے اس کے کسی خلل کا اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں خدانخواستہ کسی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔

ایک وقت تھا جب دُنیا میں اسلامی مبلّغین کے لیے سب سے اہم مسئلہ توحید کی تبلیغ تھی۔ ایک وقت تھا جب نظریۂ توحید اقطاعِ عالم میں تعلیم کر لیا گیا۔ تب مسلمانوں نے توحید کی تبلیغ کے لئے متکلمین پیدا کرنے کے بجائے اِن اولیاء اللہ اور عارفین کی تربیت کی حاجت زیادہ محسوس کی جو تالیفِ قلوب کے ذریعے مجوس و ہنود کے موحدین کو اسلامی تربیت کے زیور سے آراستہ کرتے رہے۔ پھر ایک ایسا دَور بھی تھا جب توحید

تبلیغ یا شریعت کے نفاذ کے مقابلہ میں مسلمانوں کو جہاد بالسیف، کشور کشائی اور جدال و قتال کی جانب زیادہ توجہ دینی پڑی ۔ ایک اور دور بھی تھا جب مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی لیکن شعائر و عبادات اسلامی کی پابندی میں کوتاہی کی جاتی تھی۔ لہٰذا معلمین اسلام کو عقائد و اعمال کی نسبت عبادات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج انسانیت اس مرحلے پر پہنچ چکی ہے کہ اسلامی تعلیمات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا کوئی متمدن معاشرہ اصولی انکار کر سکے۔ آج عالمگیر غلبۂ اسلام اور تسخیرِ کائنات میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آخری نبی کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر یا مسخ کر کے بعض متنبیین (کذابین) اُمتِ محمدیہ کے قلب سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو زائل نہ بھی کر سکیں تو تضعیف یا مجوب کرنا چاہتے ہیں۔

ختمِ نبوّت

اس لیے چودھویں صدی میں تمام عالمِ اسلام کے اندر ہر محبِ اسلام کا یہ فرض ہے کہ ختم نبوّت کے مسئلہ کو تمام دوسرے مسائل پر ترجیح دے اگر ہم ناموسِ ختمِ نبوت کو محفوظ رکھنے کے ذریعے اپنی بقا کا اہتمام کر لیتے ہیں تو توحید، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قرآن شریف، شریعت کسی اصول دین کو ضعف نہیں پہنچ سکتا، لیکن خدانخواستہ مستشرقین یا منافقین اس تعریف کو ہماری لوحِ قلب سے ذرا بھی اوجھل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اسلام محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو کچھ نازل ہوا اس کی غیر مشروط اتباع کا نام ہے تو پھر نہ ہمیں ناموسِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہمارا ایمان برقرار رکھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ نہ ولائے اہلِ بیت ہماری نجات کے لیے کافی ہو سکتی ہے، نہ ہی قرآن کے اوراق میں ہمارے لئے ہدایت باقی رہ جاتی ہے، نہ ہی مساجد کے محراب و منبر میں کوئی تقدیس باقی رہ جاتی ہے اور نہ ہی اولیاء اللہ اور مشائخ عظام کی نسبتیں جاری رہ جاتی ہیں، نہ ہی علمائے کرام کی تدریس و وعظ میں اثر باقی رہ جاتا ہے، نہیں نہیں صرف یہی نہیں خاکم بدہن اُمتِ محمدیہ کے تسمیہ اور وجود دونوں پر زد پڑتی ہے اُمّتِ محمدیہ ملل میں تقسیم ہو جاتی ہے، ملتیں حکومتوں میں بٹ جاتی ہیں اور حکومتیں گروہوں کی سازشوں کا شکار ہو جاتی ہیں، فقط اتنا ہی نہیں خاندان ملت سے خارج ہو جاتے ہیں، خود خاندان کے اندر صلہ رحمی قطع رحمی سے مبدّل ہو جاتی ہے۔ اس لئے اگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہیں تو پھر شریعت ایک نہیں، جب شریعت ایک نہیں تو حرام و حلال بھی ایک نہیں، جب حرام و حلال میں یکسانیت نہیں تو باپ بیٹے، ماں بہن، خاوند اور بیوی غرض دُنیا کے سب رشتے اپنی تقدیس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ختمِ نبوت کا انکار آسمان پر فرشتوں کا انکار ہے، زمین پر قبلہ اور حج کا انکار ہے، سیاست میں مسلمانوں کے غلبے اور خدا کا نہ وجود کا انکار ہے۔ غرض ختمِ نبوّت سے انکار خود مسلمان کے مسلمان ہونے سے انکار ہے، یہاں پہنچ کر زبان گنگ ہو جاتی ہے، قلم ٹوٹ جاتا ہے اور الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے ؎

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر

ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما اُبھار کر اکبرؔ اسی کا ورد تو صدق سے بیشمار کر

صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں سچی باتیں

مولانا عبدالماجد دریابادی

بابرکت نکاح حدیث نبویؐ کی معتبر کتاب مشکوٰۃ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ روایت محدث بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے نقل ہوئی ہے:

قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃً۔ (کتاب النکاح باب اوّل فصل ۳)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ برکت والا نکاح وُہ ہے جو محنت کے لحاظ سے آسان ترین ہو۔

سُن لیا آپ نے کہ سرور دو سردار کا ارشاد کیا ہو رہا ہے؛ نکاح بہترین وُہ نہیں جو خوب دُھوم دھام سے کیا جائے، جس میں دل کے حوصلے جی بھر کر نکالے جائیں، جس میں روشنی ہو، آتش بازی ہو۔ نام و نمود کی نمایش مسرفانہ غیر اسلامی رسموں پر ہزاروں لاکھوں لٹا دیے جائیں۔ ناچ رنگ کی محفلیں جمیں یا کم سے کم فلمی یا غیر فلمی، نیم فحش و عریاں گانوں کے ریکارڈوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا جائے؛ بہترین تقریب عقد وُہ ہے جو بالکل سادہ طریقہ سے انجام دی جائے۔ بغیر مشقت میں ڈالنے والے جھمیلوں اور مسرفانہ و مشرکانہ رسوم کی منزلوں سے گزرنے کے اس ایک چھوٹی سی اور آسان حدیث پر اُمت کا اگر آج عمل ہو جائے تو اپنے ہاتھوں کی لائی ہُوئی کتنی عصبیتوں اور زحمتوں سے نجات ہو جائے۔ محفل آرائی کے لیے سامان دوسروں کے ہاں سے مانگ کر لانے کی ذلت، قرضہ داری کا چکر، تقریب کے دنوں میں شدید جسمانی محنت اور تکان۔ آپس کی رنجشیں اور بدمزگیاں۔ غرض دنیا اور آخرت کے کتنے ہی مخمصے اور مواخذے بس ایک دم سے ختم ہو جائیں! کیا زمانہ کا انقلاب ہے۔ شرافت اور بڑائی کا معیار اب اُمت کا حدیثِ رسول پر عمل کرنا نہیں بلکہ ٹھیک اس کے برعکس طرزِ عمل اختیار کر لینا یعنی اس کی مخالفت کرنا ہی اپنے لیے ٹھہرا لیا ہے۔

دورِ جاہلیت کی واپسی سیرت رسولؐ میں سیرت ابن ہشام ایک قدیم و مستند ماخذ ہے۔ غزوۂ احد کے مشہور معرکہ کے سلسلہ میں اس کا بیان ہے کہ:

> "جب قریش اپنے حلیفوں اور مددگاروں کے ساتھ چلے تو ان کے ہمراہ عورتیں بھی سوار ہو کر چلیں تاکہ ان کے جوش کو بڑھاتی رہیں اور بھاگ نکلنے سے انہیں روکے رہیں۔"

پھر جب صفیں مقابل ہُوئیں تو ان کی سردارنی ہند بنت عتبہ اپنی زنانی ٹولی کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور ہاتھوں میں ڈفلیاں لے لے کر ان سب نے مردوں کے پیچھے بجانا اور انھیں جوش دلانا شروع کیا اور ہند یہ ترانہ گاتی جاتی تھی:

"اے قبیلۂ عبدالدار کے فرزندو! آگے بڑھو، ہمارے عقب کے محافظو! آگے بڑھو۔ تیز نیزوں کے خوب وار کرو۔"

اور یہ گیت بھی گایا:

"اگر آگے بڑھو گے تو ہماری ہم آغوشی نصیب ہوگی اور ہم تمہارے لیے نرم قالینوں کا بستر بنا کر دیں گے۔ اگر تم پیچھے ہٹے تو ہم تم سے جدا ہو جائیں گے اور جدائی بھی ایسی جس میں محبت کا کوئی شائبہ نہ ہوگا۔"

دوسری مستند تاریخ عہد نبوت طبقات الکبیر ابن سعد میں اسی موقع پر ہے کہ:

"مشرک عورتوں نے ڈھول تاشے اور ڈفلے بجانے شروع کیے۔ وہ انھیں ابھار رہی تھیں اور انھیں بدر کے مقتولین کی یاد دلا رہی تھیں اور یہ گاتی جاتی تھیں۔"

آگے وہی شعر اوپر والے نقل ہیں ——— کتنی آزاد، کتنی روشن خیال اور کیسی جوانمرد تھیں یہ قریش کی خاتونیں! نہ علانیہ گانے بجانے میں انھیں عار!! نہ فوجیوں کے دوش بدوش، صف بصف رجز پڑھنے میں انھیں کوئی تکلف یا جھجک!!! بیسویں صدی عیسوی کے نقش ثانی کا نقش اول ساڑھے تیرہ سو سال قبل! ——— لیکن اس پر حیرت کیوں کیجئے، مرد وزن میں آزادانہ میل جول، بے محابا اختلاط۔ کہنا چاہیے کہ نئی ہوں یا پرانی، ساری ہی جاہلی تہذیبوں میں جزو مشترک رہا ہے۔ یہ تو اسلام ہی کی کرامت تھی کہ اس نے دونوں جنسوں کی مادی، ذہنی، اخلاقی ساخت و ترکیب کے عین مطابق پابندیاں عاید کیں اور قیدیں لگائیں ——— جاہلیت کے قدردانوں اور پرستاروں کو مبارک ہو کہ ان کی تہذیب نے پھر نیا جنم لینا شروع کر دیا ہے۔ ع

ہاں خدایانِ کہن وقت است وقت

نیت عمل کا فرق

جنگِ اُحد شدید ترین جنگوں میں سے تھی۔ ابن ہشام میں ابن اسحاق کی روایت ہے کہ:

"لوگ خوب خوب لڑے اور جنگ نے شدت اختیار کر لی۔"

دونوں فریق پوری دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کے لشکر میں ایک اجنبی شخص آملا تھا۔ اس کا نام قزمان تھا۔ حضور کے سامنے جب اس کا ذکر آتا تو آپ فرماتے کہ وہ اہل جہنم میں سے ہے لیکن

"جب احد کا معرکہ ہوا، تو یہ شخص بڑی شجاعت سے لڑا، یہاں تک کہ اس نے اکیلے ہی سات آٹھ مشرکوں کو قتل کر دیا۔" (ابنِ ہشام)

قدرتاً سب نے اس کے جوش غزا کی داد دی اور جب وہ آخر زخمی ہو کر گرا اور موت کے قریب پہنچا تو مسلمان اس کے گرد جمع ہو کر اسے جنت کی بشارت دینے لگے، تو وہ بدنصیب بولا کہ

"بشارت کیسی؟ میں تو محض اپنی قوم کی عصبیت میں لڑا ہوں۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ جنگ کرتا۔"

زخموں کی تکلیف بڑھی، تو اس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اس سے خودکشی کر لی اور رسولؐ کا کشفی نظارہ ایک حقیقت بن کر رہا۔

اسی جنگ کا ایک اور منظر۔ بنی عبدالاشہل کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ لیکن اصیرم نامی ایک شخص اسی قبیلہ کے تھے، جنھوں نے اپنے ہم قوموں کے باوجود اسلام لانے سے انکار کر دیا تھا لیکن عین معرکۂ اُحد کے دن یہ اسلام لے آئے۔ پھر تلوار سلے معرکہ میں گھس پڑے۔ یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔

قبیلہ کے لوگ اپنے مقتولوں کو ڈھونڈھتے ہُوئے آئے تو ان کو بھی ڈھیر میں پڑا ہوا پایا اور ابھی جان باقی تھی۔ حیرت سے ان لوگوں نے پوچھا کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟ اپنی قوم کی حمیت میں یا اسلام کی کشش میں؟ بولے: اسلام ہی کی کشش سے! توحید و رسالت کی تصدیق کی اور معاً روح پرواز کر گئی۔

رسولؐ کے گوشِ مبارک تک خبر پہنچی تو ارشاد ہوا کہ "وہ جنتی ہے"۔

دیکھئے صورتِ عمل دونوں مثالوں میں بالکل ایک تھی، یعنی کمال شجاعت و جانبازی۔ لیکن نیتِ عمل کے فرق نے ایک کو جہنم پہنچایا اور ایک کو جنت! ایک کے پیشِ نظر محض قوم و وطن کی محبت رہی اور دوسرے کا مقصود رضائے الٰہی۔

مثالی ایفائے عہد سیرۃ نبویؐ کے معمولی طالب علم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ حدیبیہ کے واقعہ سے ضرور واقف ہوں گے آنحضورؐ کی جو مصالحانہ روش شروع سے رہی، اس میں کیسے کیسے پیچیدہ مرحلوں اور منزلوں سے گزرنے کے باوجود آخر تک بھی فرق نہ آنے پایا۔ قریش کی اشتعال انگیزیوں کی حد ہی نہ تھی۔ قدم قدم پر وہ رو بہ رکھا کر سالار اسلام کو غصہ آ کر رہے۔ تفصیل بیان ہو تو ایک مستقل مقالہ بن جائے۔ نظر میں صرف آخری مرحلہ کو لائیے ——— عین جس وقت صلح نامہ کی تحریر ہو رہی تھی، مسلمانوں کے جذبات کے خلاف، محض رسولؐ کے حکم سے یہ لکھا جا رہا تھا کہ مسلمان اس وقت واپس جائیں اور آئندہ دس سال تک ایک دُوسرے سے رُکے رہیں۔ اس درمیان میں قریش کا کوئی شخص اگر اُدھر آ جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا اور اگر اِدھر کا کوئی شخص قریش کے پاس پہنچ جائے تو وہ اسے واپس نہ کریں گے ——— تو عین اس وقت ایک نومسلم ابوجندل زنجیروں سے بندھے ہُوئے رسولؐ کی خدمت میں آئے، اور مسلمانوں کے جذبات میں اس وقت جو شدید تلاطم تھا ظاہر ہی ہے۔ مورخ ابن ہشام کے الفاظ ہیں قریب تھا کہ مسلمان رنج و افسردگی سے ہلاکت کو پہنچ جائیں۔

اس وقت نومسلم پناہ طلب کرنے والے کا مشرک باپ سہیل بن عمرو بھی موجود تھا۔ اس نے سب کے سامنے لڑکے کے منہ پر طمانچہ مار کر رسولِ خدا سے کہا کہ یہ تو ابھی ابھی طے ہو چکا ہے۔ میں ابوجندل کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دینے کا۔ آپ نے فرمایا: تو نے سچ کہا۔ (اس جواب سے شیر ہو کر) سہیل نے ابوجندل کو پیچھے کھینچنا شروع کیا کہ اسے قریش سے ملا دے۔ اب اس پر قدرۃً ابوجندل نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا کہ اے مسلمانو! کیا میں مشرکین کی طرف واپس کر دیا جاؤں گا؟ کہ وہ مجھے میرے دین کی خاطر جی بھر کر تکلیفیں پہنچائیں؟ راوی کہتا ہے کہ مسلمانوں کا دل غم و غصہ سے لبریز تو پہلے سے تھا۔ اب اس میں اور اضافہ ہُوا۔ لیکن رسول اللہؐ نے ابوجندل ہی کو سمجھایا اور تسکین دی کہ اللہ عنقریب ہم لوگوں کے لیے کشایش کی راہ پیدا کر دے گا لیکن

"اس وقت تو ان لوگوں سے عہد کر چکا ہُوں اور صلح نامہ پر اللہ کو گواہ کر چکا ہُوں اور عہد کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔"

دنیا کی تاریخ کے ورق اُلٹ ڈالیے۔ اتنے شدید صبر آزما موقع پر اس حلم کی، اس ظرف کی، اس ایفائے عہد کی، اللہ پر اس توکل و اعتماد کی نظیر کسی سردارِ فوج، کسی بادشاہ کے ہاں ملے گی ——— صبر و ظرف کے یہ معجزے، کسی بڑے سے بڑے مادی معجزے سے کچھ کم ہیں؟

حبِ دنیا حدیث کی کتابوں میں، اخیر زمانے کے متعلق ایک پیش خبری حضرت ثوبان صحابی کے واسطے سے حضورؐ کی زبان سے ملتی ہے کہ "اُس وقت قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے کے حریص کھانے کے بڑے سے بڑے برتن پر آ گرتے ہیں"۔ کسی صحابی نے عرض کیا کہ کیا ہم اس وقت بہت قلیل تعداد میں ہوں گے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ "نہیں، تعداد میں تم کثیر ہو گے لیکن اُس جھاگ کی طرح جو سیلاب میں پانی کے اُوپر آجاتی ہے (یعنی اتنے کمزور و بے بساط) اور بڑی بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور تمہارا رعب نکال دے گا اور خود تمہارے دلوں میں "وھن" ڈال دے گا"۔ پوچھنے والے نے پُوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ "وھن" (کمزوری) کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا "دنیا سے محبت اور موت سے کراہت"۔

سُن لیا آپ نے اپنے رسول کریمؐ کی زبانی ملّت کے اجتماعی زوال و پستی کا اصل راز؛ چھوٹے بڑے اور بھی اسباب یقیناً بہت ہوں گے، لیکن اصلی اور حقیقی سبب بس یہی ہے۔ دنیوی زندگی کی حرص اور شوق۔ آخرت کے بجائے اس سے گریز و بیزاری۔ حضرات صحابہ میں اور کیا بات تھی؛ جنگی ساز و سامان، آلات حرب، تعداد لشکر وغیرہ کے لحاظ سے تو وہ معاصر سلطنتوں سے کہیں پیچھے تھے بس اسی یقین آخرت میں سب سے آگے تھے۔ آخرت ان کے لیے کوئی دور دراز کا مفروضہ، نظریہ نہیں، ایک زندہ حقیقت تھی اور یہی موت سے بے خوفی ہی تھی جس نے بے جگری کے ساتھ انھیں روم و ایران کے سے زبردست حریفوں سے جا بھڑایا تھا۔ اور اسی نے مصر، عراق، شام، فلسطین، فارس سب کہیں کی دولتیں ان کے قدموں میں لا ڈالی تھیں ——— آج جب ہم عملاً دوسری بے یقین اور آخرت فراموش قوموں کے ہم سطح ہو چکے ہیں، تو تکوینی قانون فطرت ہماری کسی طرح کی مروّت و رعایت کیوں کرنے لگا؛ اب تو ہر معرکہ میں لازماً فتح اس فریق کو نصیب ہو گی جو عقل و تدبیر اور مادی لحاظ سے قوی تر ہو گا۔ اس سارے نظام کو شکست دینے کا اگر داعیہ ہے تو لازمی ہے کہ اسی جذبۂ یقین آخرت اور بے خوفیِ موت کو از سرِ نو اور پُوری قوت کے ساتھ بیدار کیجئے۔

پابندیِ عہد سیرت نبویؐ کے سلسلہ میں ایک مشہور واقعہ کا ذکر حلف الفضول کے نام سے آتا ہے۔ بعثتِ نبویؐ ابھی ہُوئی نہ تھی مگر ہونے ہی کو تھی کہ قریش کے قبیلوں نے مظلوموں کی امداد و فریاد رسی کی غرض سے ایک دوسرے کو حلف اٹھانے کے لیے طلب کیا۔ مجمع عبداللہ بن جدعان کے گھر پر ہوا، جو قبیلہ بنی تمیم کے ایک معمر سردار تھے۔ بنی ہاشم، بنی مطلب وغیرہ جمع ہُوئے اور سب نے مل کر قسمیں کھائیں اور معاہدہ کیا کہ مکّہ میں وُہ جس مظلوم کو بھی پائیں گے اس کی مدد پر کھڑے ہو جائیں گے خواہ وہ مظلوم مکہ کا رہنے والا ہو یا دُوسرے لوگوں میں سے وہاں آیا ہو اور جس نے ظلم کیا اس کا مقابلہ کریں گے، یہاں تک کہ وہ مظلوم کو اس کا حق پھیر دے۔"

(سیرت ابن ہشام)

محمد بن عبداللہ بھی اس مجمع اور حلف میں شریک تھے اور بعد بعثت رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا بیان کرنا اسی کو مقصود ہے:

عبداللہ بن جدعان کے گھر حلف کے وقت میں موجود تھا۔ اس کے بدلے میں بہت سے سُرخ اُونٹوں کے ملنے کو بھی پسند نہ کروں گا (یعنی بڑی سے بڑی دولت بھی اُس کا معاوضہ نہیں ہو سکتی) اس معاہدہ کی رُو سے کوئی اسلام میں بھی دعویٰ ہو تو ضرور اس کو قبول کر لُوں گا"۔

ارشاد یہ نہیں ہُوا کہ کافروں، مشرکوں، بے دینوں کے کسی حلف، کسی معاہدہ کا اعتبار ہی کیا۔ زمانۂ جاہلیت کے ساتھ

اس کا وہ معاہدہ بھی گیا۔ ارشاد بجائے اس کے یہ ہو رہا ہے کہ (وہ معاہدہ آج بھی وہی قیمت) وہی اہمیت رکھتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں اس کی تھی، اور میں آج بھی اس کے پُورے نفاذ پر تیار ہوں ——— اتنا ہی نہیں، بلکہ اسی کتاب میں اس ذکر سے معاً پہلے ارشادِ نبویؐ ایک عمومی صورت میں ہر معاہدہ سے متعلق ملتا ہے کہ:

"جاہلیت میں جو کچھ معاہدہ تھا، اسلام نے اس کی قوت و استحکام کو بڑھا ہی دیا ہے۔"

کتنی جچی تلی تعلیم اس کو مل رہی ہے کہ نیکی ہر حال میں قابلِ قدر اور عہد ہر صورت میں قابلِ احترام ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ ان کے عامل کن عقیدوں اور کس کیش و مذہب کے ہیں ——— مسلمان اگر اس حقیقت کو دل میں اتار لیں تو غیر مسلموں کے ساتھ نیکی، بھلائی، خوش چلنی اور رفاہ عام کے کاموں میں تعاون کی راہ کتنی آسان ہوتی جاتی ہے۔

مقصودِ زندگی حدیث نبویؐ میں جو اہم دعائیں آئی ہیں ان میں سے ایک لمبی دُعا کا ایک آخری ٹکڑا یہ ہے:

ولا تجعل الدنیا اکبر همنا ولا مبلغ علماء و لا غایة رغبتنا۔ (ترمذی و نسائی عن ابن عمرؓ)

اے اللہ! دنیا کو نہ ہمارا مقصودِ اعظم بنا دینا اور نہ ہمارے معلومات کی انتہا اور نہ ہمارے شوق، خواہش کی منزلِ مقصود۔

اسے پڑھنے کے بعد سوچیے کہ ہمارا آپ کا عمل کسی درجہ بھی اس کے مطابق و مماثلت ہے؟ جس دن سے بھی ہمارے اولاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہماری بڑی سے بڑی کوشش اور خواہش کیا رہنے لگتی ہے؟ یہی نہ کہ یہ اونچی سے اونچی ڈگری حاصل کرے۔ اونچے سے اونچے امتحان مقابلہ میں کامیاب ہو اور اونچی سے اونچی ملازمت، فلاں سررشتہ یا پیشے میں حاصل کرے۔ نمبر اول نہ سہی، دوسرے تیسرے درجہ کسی نمبر پر بھی کوئی خیال اس کا آتا ہے کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی "ترقی" کی آخری منزل آخر کیا ہونا ہے؟

یہ ہر قسم کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو اندھا دھند جھونکتے رہنا اور ترقی اور اُونچی تنخواہ کے ہر راستہ پر آنکھ بند کر کے اپنی اولاد کو ڈال دینا کس ذہنیت کی علامت ہے؟ مآل اندیشی اور عافیت بینی کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتا ہے؟ ہر مومن اور مومن زادہ اور مومن زادی کی جو شعوری اور مقصدی زندگی ہونا چاہیے۔ اس سے کسی طرح بھی ہماری بے شعوری اور بھیڑ چال میل کھاتی ہے؟ نسلوں پر نسلیں گزر گئیں، حکومتیں بدلیں۔ انقلابات آئے۔ لیکن دنیا کی اس ناز برداری اور اس کے ساتھ اس مستقل نیاز مندی کی روش میں ہم نے اپنی روش میں کوئی فرق آنے دیا؛ بلکہ دنیا پرستی کے اس انہماک میں نئی نسل تو اپنے سے پرانی پر اور سبقت لیے ہی جاتی ہے؟ ——— جس قوم کو دیدۂ بینا دے کر بتایا گیا تھا کہ سفرِ ہستی نہایت طویل ہے اور یہ عالمِ ناسُوت اس کا ایک بہت ہی محدود، مختصر اور صرف ابتدائی حصہ ہے۔ محرومی اور کور بختی کی انتہا ہے کہ اسی نے اپنی آنکھیں پھوڑ کر اندھی قوموں کی تقلید میں اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ رکھنے پر قناعت کر لی ہے اور اپنی اس "روشن خیالی" پر اسے فخر و اطمینان ہے۔

جذبۂ حبِ زر سیرت کی روایتوں میں بعض الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ بیان یہ ملتا ہے کہ "رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے

بعد ترکہ میں نہ کوئی بکری چھوڑی، نہ کوئی اُونٹ، نہ کوئی درہم، نہ کوئی دینار، نہ کوئی کنیز، نہ کوئی غلام!" —— اور جس وقت آپ نے وفات فرمائی ہے آپ کی حیثیت دنیوی اعتبار سے ایک بڑے رئیس بلکہ پورے بادشاہ کی تھی۔ حجاز پورا قبضہ میں آچکا تھا۔ نجد، یمن، عمان وغیرہ اطراف کی ساری ریاستیں زیرنگیں آچکی تھیں۔ شام تک کا جنوبی علاقہ پرچم اسلام کے تحت آچکا تھا اور کئی لاکھ مربع میل پر اب حکومت اسلام کا سکہ رواں تھا —— یہ رقبہ تو پھر بڑا ہوا۔ دنیا کے معمولی اور چھوٹے رئیس بھی کیا اس طرح خالی ہاتھ دنیا سے روانہ ہوتے ہیں؟ پرانے شہنشاہوں، کجکلاہوں، سلطانوں، قیصروں کو چھوڑیے، آج کے بڑے بڑے جمہوریت پسند، جمہوریت دوست، سرمایہ بیزار و اشتراکیت نواز سرداروں، روس، امریکہ، برطانیہ کے والیان ملک بلکہ ان کے نائبوں اور نائب در نائب سرداروں کی دولت و جائداد کے کیا اندازے ہیں؟ ان کے زر و جواہر کے خزانوں کے کیا تخمینے ہیں۔ ان میں سے کوئی ادنیٰ نسبت بھی اس بندۂ غنی سے رکھتا ہے؟

غیروں کو چھوڑیے، وہ اپنے فعل کے مختار ہیں۔ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ ہم کوئی مناسبت ترک دولت میں اپنے آقا و سردار سے رکھتے ہیں —— جب حب مال کا جذبہ ہمارے اندر جوش زن ہوتا ہے، جب تصور امارت و ثروت کے خیالی محل تیار کرنے لگتا ہے یا واقع میں ہم زر و جواہر کے مالک ہو کر مسرت کی مستی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تو اس وقت بس اتنی سی بات سوچ لیا کریں کہ اس حالت میں مشابہت کس سے پیدا ہو رہی ہے! قیصر و کسریٰ سے، راتشچائلڈ اور فورڈ سے، فلاں کروڑپتی اور ارب پتی سے یا اپنے اس آقا و سردار سے، جس کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں اور جس کے قدموں کے طفیل آسمانی بادشاہت میں داخلہ کی تمنا اور حوصلہ رکھتے ہیں؟ ایک یہی مراقبہ ان شاء اللہ حب زر، حب مال، حرص و طمع کا کافی علاج ثابت ہو جائے گا۔

سہل الحصول نسخہ رسول انامؐ کی مشہور دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے جو صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے:

اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً و احشرنی فی زمرۃ المساکین۔

اے اللہ! مجھے زندگی میں مسکین رکھیو اور مسکینی ہی میں میری موت لائیو! اور حشر میں مجھے مسکینوں ہی کے گروہ میں اٹھائیو۔

"مجھے زندگی میں مسکین رکھیو" تاکہ مالی ذمہ داریاں مجھ پر کم سے کم عاید ہو سکیں۔ مالی ذمہ داریوں کا بوجھ تو مال و دولت کے جلو میں چلتا ہے۔ زکوٰۃ دینا واجب اور نفل صدقوں کی فکر میں لگے رہنا۔ عزیزوں، قریبیوں، محلہ والوں، بستی والوں، ملت والوں سب کے مالی حقوق درجہ بدرجہ ادا کرتے رہنا۔ ان سے بچے رہنے میں زندگی کیسی ہلکی پھلکی گزر جائے گی۔ راحت و سکون قلب کے اسباب کتنے زاید فراہم رہیں گے۔ لوگوں کے رشک و حسد سے کس درجہ نجات رہے گی۔

"مسکینی میں میری موت لائیو!" اور زندگی کی یہ مسکینی عارضی اور وقتی نہ ہو، اخیر وقت تک یہی حالت قایم رہے تاکہ جب موت اسی حالت میں آئے تو زر و مال کی ذمہ داریوں کی گرانباری سے امن رہے اور ان سوالوں کی نوبت ہی نہ آئے جو امراء و اغنیاء سے ہوتے ہیں۔

"اور میرا حشر مسکینوں کے گروہ میں کیجیو!" کہ یہی گروہ تو حشر میں رحمت خصوصی اور مکرمت امتیازی کا حقدار رہے گا۔ بڑے لوگوں کو تو خدا جانے کن کن مرحلوں سے گزرنا اور کیسی کیسی گھاٹیوں کو طے کرنا ہوگا جب کہیں جا کر نجات نصیب میں آئے گی۔ یہ غریب غربا بے کھٹکے

ان وادیوں سے دامن جھٹکتے گزر جائیں گے۔

امت کے لیے کتنا آسان، کتنا سہل الحصول نسخہ رسول انامؐ نے پیش فرما دیا ہے۔ کتنے جھگڑوں، مخمصوں سے نجات دلا دینے والا! کیسے کیسے پتھروں، چٹانوں کو پانی کرنے والا ——— اللہ عمل کی توفیق ہم کو، آپ کو سب کو دے۔ آمین

جشنِ ولادت

ربیع الاول کا مہینہ ختم ہُوا اور اس ماہ مبارک میں مسلمانوں نے پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اپنے ہادیٔ اعظمؐ اور سرورِ عالمؐ کا جشنِ ولادت خوب جی کھول کر منا لیا! نمازیں پڑھ کر نہیں، روزے رکھ کر نہیں، توبہ و استغفار کر کے نہیں، دلوں میں جہاد کا ولولہ و داعیہ پیدا کر کے نہیں، کبائر و صغائر سے بچنے کا عہد کر کے نہیں۔ شراب نوشی، حرام کاری، سود خواری کا بائیکاٹ کر کے نہیں ——— بلکہ جلوس پر جلوس نکال کر گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں سے رات کو دن بنا کر اور خوب گا بجا کر! ڈنکے کی چوٹ پر نہیں، ہارمونیم کی الاپ اور ڈھولک کی تھاپ پر! اکیلے شہر لاہور سے متعلق اخباری تخمینہ ہے کہ ۱۲ لاکھ روپیہ (۶۲ء۱۹ میں) اٹھا۔ اس کو پیمانہ قرار دے کر اب کس کی ہمت ہے کہ ہند و پاکستان کے سارے شہروں کی اولوالعزمیوں کی میزان لگائے؟

یہ کوئی قدیم اور فرسودہ قسم کی "بارہ وفات" تھوڑے ہی تھی کہ مولویوں کے فتوے کام دیتے اور میلاد و قیام کے جواز و عدمِ جواز پر موشگافیاں ہوتیں۔ یہ ماڈرن "یوم النبی" تھا۔ اس کے رعب و جلال کے سامنے اچھے اچھوں کے قدم اکھڑ گئے اور بڑے بڑے مانعین خود آکر واعظانِ شیوا بیان اسٹیج کی زینت بن گئے۔ لاہور کے زندہ دلوں نے اپنی کمال جدت سے شب برات اور محرم والوں کو مات دے دی اور ایک نقلی روضۃ النبی مع زندہ پتلوں کے تیار کر دکھایا۔ یہ کوئی ضریح یا شبیہ نہ تھی جس کے بدعت ہونے کا سوال پیدا ہوتا۔ یہ تو ماڈل تھا ماڈل! اور ماڈل کو روک کر کون اپنے کو کٹھ ملا کہلانا گوارا کرتا!!

اکبرؔ تو بزرگوں اور اللہ والوں ہی کی تقدیس کو دیکھ کر کہہ گئے تھے: ع

یاروں نے بت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا

آج سید الانبیاءؐ کی اس انوکھی تعظیم و تکریم پر کیسے کیسے خون کے آنسو بہاتے۔

اللہ کے بندو! ذرا سوچو تو سہی کہ جس رسولؐ کی زندگی کا سب سے بڑا عملی سبق سادگی تھا۔ اس سے کوئی نسبت اس پُر تکلف اور جگمگاتی ہوئی مسرفانہ، رئیسانہ بلکہ شاہانہ تقریب کو باقی رہی ہے؟ اور کبھی حساب لگا کر دیکھو کہ ان تکلفات کی مدیں خرچ کی میزان لکھوکھا تک پہنچ جاتی ہے یا نہیں؟ اس سارے دھوم دھڑکے سے چلن سادگی کا بڑھا، یا اس کے برعکس بے تحاشا اسراف کا۔ اور طبیعتیں جو راتیں سینما قسم کی لذتوں میں گزارنے کی حریص اور مریض تھیں۔ ان او نگھنتوں کے ٹھیلتوں کو ایک "مقدس" بہانہ ہاتھ آگیا یا نہیں؟ ——— ان ہجوموں، مجمعوں، جمگھٹوں میں کتنوں کو نظمیں پڑھنے یا تلاوتِ قرآن کی توفیق ہُوئی؟ بلکہ کتنوں کو نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کے فرض بھی نصیب ہوئے۔ یہ جشن یوم النبی اس صورت میں منانے کا طریقہ آخر صحابہ میں، تابعین میں، کس کا تھا۔ یہ تمام تر فتنے بھلا بدعت کی "سنت" پر ہے یا نہیں؟

جنتی بیوی

ایک حدیث نبوی، جسے محدث جلیل، امام فقہ، احمد بن حنبل اپنی مسند میں لائے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"جب عورت پانچوں نمازوں کو ادا کرتی رہے اور ماہِ رمضان کے روزے رکھتی رہے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرتی رہے اور اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرتی رہے تو اس سے (قیامت میں) کہا جائے گا کہ جنت کے

جس دروازے سے چاہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

جنتی بیوی کی نشانیاں آپ نے قول رسولؐ کی روشنی میں معلوم کر لیں؛

کتنی صاف ستھری، سادہ، آسان اور مطابق فطرت زندگی جنتی بیوی کی ہوتی ہے۔ وہ نمونہ جس پر شروع سے اب تک بے شمار جنتی بیویوں نے چل کر دکھا دیا۔ کوئی محض خیالی اور فرضی نقشۂ زندگی نہیں، اپنی عزت و آبرو کا لحاظ رکھا، شوہر کی خدمت کی، فرض عبادتیں پابندی سے ادا کیں۔ چلیے بس جنت پر استحقاق قائم ہو گیا۔

کوئی وقت ایسی بیویوں کے روزانہ پروگرام میں "میک اپ" کرتے رہنے، ہونٹوں پر لالی تھوپنے، خوب بن ٹھن کر باہر نکلنے، سینما جانے، گندے ناول پڑھنے، گندی سے گندی تصویریں دیکھنے، کلب میں جا کر شبانی میں شریک ہونے، مردوں سے بے تکلف اور بے محابا ہنسنے بولنے، زیادہ سے زیادہ چُست و عُریاں لباس پہن کر غیروں کے سامنے چمکنے مٹکنے اور ان کے ساتھ ڈانس کرنے کا نکلتا ہے؟ اس "ماڈرن" اور "اپ ٹو ڈیٹ" نقشۂ زندگی کی کوئی مناسبت اس جنتی نقشۂ زندگی سے ہے؟

حقیقتِ دُنیا

جامع ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اگر تم لپک کر مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو تم کو دنیا اس مقدار میں کافی ہو جانا چاہیے جیسے سوار کا ناشتہ! اور مالداروں کے پاس بیٹھنے اُٹھنے سے بہت بچو!! اور دوسرا کپڑا نہ بدلو جب تک کہ اس میں پیوند نہ لگا لو یعنی جب تک بھی وہ چل سکے، اسی کو چلاؤ۔"

سُن لیا آپ نے، یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہمارے آپ کے عقیدہ میں دین و دنیا کے بادشاہ) اپنی محبوب ترین رفیقۂ حیات حضرت عائشہؓ سے ——— دنیا اور سامانِ دنیوی سے اپنا تعلق بس محض بقدرِ ضرورت رکھو اور اہلِ ثروت سے انتہائی کنارہ کشی رکھو کہ حرص اور محرکاتِ حرص بھی نہ پیدا ہونے پائیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جوڑا روز بدلنا اور جلد جلد بدلنا کیا معنی۔ کپڑا اس وقت تک چلاؤ جب تک وہ کچھ بھی قابلِ استعمال رہے اور پھٹ پھٹا کر اس میں نوبت پیوند لگانے کی نہ آجائے۔

اس ارشاد پر اس محبوبۂ سیّدِ عالمؐ نے عمل بھی یوں کیا کہ بقول ایک دوسرے محدث کے:

عُروہ روایت کرتے ہیں کہ بس حضرت عائشہؓ جب تک کپڑے کو پیوند نہ لگا لیتیں اور اسے اٹا کر کے نہ پہن لیتیں نیا کپڑا نہ بدلتیں۔"

حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ عورت کو زیور اور خوش لباسی سے کس درجہ محبت ہوتی ہے! ایک اور روایت میں انھیں حضرت عائشہؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑے کبھی اتنے ہوئے ہی نہیں کہ انھیں کہیں رکھنے کی ضرورت پڑے، نہ کپڑوں کی الماریاں، نہ کپڑوں کے صندوق، نہ کپڑوں کے لیے کھونٹیاں۔

اب اگر آپ کو اپنے کپڑوں کے ذخیرہ پر، اپنی پوشاک کی نفاست پر، بیش قیمتی پر، باوضعی (فیشن نوازی) فخر ہے تو خود ذرا سوچ لیجیے کہ اپنے سردار و پیشوا سے کوئی بھی مناسبت آپ کو باقی رہی ہے؟ ——— اور پاکستان کی ذی شان "مسلمان" بیگمات عالیہ کی نظر سے کبھی یہ تاریخی تحقیقیں گزری ہیں۔

رنگ ونسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبۂ حج اپنی اہمیت کے لحاظ سے کہنا چاہیے کہ پیغمبر کا وصیت نامہ ہے، جس میں اہم ترین وصیتیں آپ نے اُمت کو فرمادی ہیں۔ اس کے بعض لفظ آج پھر دُہرا لیجیے:

لا فضل لعربي على عجمي۔ — آج کے دن سے کوئی بڑائی کسی عرب کو غیر عرب کے مقابلہ میں نہیں۔

جاہل دنیا اس وقت آج ہی کی طرح قومی مفاخرت کے نشہ میں سرشار تھی۔ روم والوں کو یہ غرہ تھا کہ ایران والوں کی کیا ہستی ہے، اور ایران والے اس پندار میں مست تھے کہ یونان ہمارے سامنے کیا مال ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہر قوم فخر بس اپنے ہی خطۂ زمین پر کرتی ہے اور بغیر کسی تائید و دلیل عقلی کے محض اس بنا پر کہ انگریز اتفاق سے سرزمین انگلستان پر پیدا ہو گیا ہے۔ اپنی قوم کو جرمن اور فرنچ، ہندوستانی اور افغانی، چینی اور جاپانی ساری ہی قوموں سے افضل و اشرف سمجھتا ہے۔ اور یہی حال ہر دُوسری قوم کا ہے ہر ملک والا محض دُوسری زبان یا دوسرے خطۂ زمین کی بنا پر اپنے دل میں برتری کا تصور قایم کیے ہُوئے ہے۔ نسل پرستی، لسان پرستی، ملک پرستی کا نام فخر کے ساتھ وطنیت (نیشنلزم) رکھ لیا ہے اور ہر ملک والا اپنے کو اس کا حقدار سمجھتا ہے کہ جتنا چاہے، دوسرے کا ملک دبا لے' اس کی زمین کا حصہ کاٹ لے اور آج قوموں کے "ہیرو" وہی بنے ہُوئے ہیں، جن کے کارنامے بس دُوسروں پر دست درازی ہی کے ہیں۔

اسلام نے اس وطن پرستی ہی کی جڑ نہیں کاٹی بلکہ شارع اسلام کی زبان سے اسی خطبہ میں یہ فقرہ بھی ادا کر دیا ہے:

لا لاسود على احمر۔ — اور نہ آج سے کسی سیاہ رنگ والے کو کوئی فضیلت کسی سُرخ رنگ پر ہے۔

خوب غور کر کے دیکھ لیجئے کہ دنیا پر آج جو دوسرا بڑا فتنہ مسلط ہے وہ نسل پرستی اور قوم پرستی کے ساتھ رنگ پرستی کا ہے۔ گوروں کی بستی کالوں سے الگ آباد ہے اور پیلے رنگ والوں کا اگر ایک گروہ ہے تو کالے رنگ والے (نیگرو) کا دُوسرا۔ اور سفید فام (whites) کا تیسرا۔ سب آپس میں ایک دُوسرے سے ٹکرانے والے اور دُوسرے کو بدگمانی اور حقارت سے دیکھنے والے ——— اسلام ہی نے آکر بتایا کہ غیر اختیاری چیزیں جتنی بھی ہیں چاہے وہ رنگ ہو یا نسل، زبان ہو یا ملک، ان میں سے کوئی چیز افضلیت کا معیار یا پیمانۂ فساد نہیں بن سکتی۔ بزرگی کا معیار تو صرف اختیاری و ارادی چیز یعنی ایمان و عمل صالح ہے:

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ — اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ پسندیدہ وُہ ہے جو سب سے زیادہ صاحبِ کردار ہو۔

اگر آج دنیا اس معیار کو قبول کر لے تو دنیا میں کہیں بھی قومی، نسلی اور فرقہ وارانہ ہنگامے اور فساد باقی رہ سکتے ہیں؟ بلکہ خود شخصی، انفرادی جھگڑوں اور قضیوں کا بھی وجود کہیں قایم رہے گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے سترہ نکات

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ایم اے ڈی لٹ

ربِ علیم و حکیم نے چودہ صدیاں پہلے اپنے آخری نبی و رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق فرمایا تھا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔

(الاحزاب ۳۳: ۲۱)

بلاشبہ تمھارے لیے (محمد) رسول اللہ (کی سیرت) میں (فکر و عمل کے لیے) حسین نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے ملنے اور آخرت کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔

غور کریں تو اس ارشادِ قرآنی میں زندگی کی دُنیوی و اُخروی کامیابی کا اصل الاصول اس اعجازِ بلاغت سے بیان کیا گیا ہے کہ بیچ پر بیچ دریائے معانی کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اصل الاصول یہ ہے کہ زندگی کی حقیقی کامیابی (دُنیوی و اُخروی) اُنھیں حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی فکری و عملی زندگی اس طرح بسر کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے معاشرے میں بسر کی تھی۔ وجہ یہ ہے کہ حسین و مطمئن اور سچی زندگی گزارنے اور اپنی حقیقی منزلِ مقصود پر پہنچنے کی ایک ہی راہ مستقیم ہے جو آپؐ کی راہِ فکر و عمل تھی۔ یہاں اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ انسان کی حقیقی منزلِ مقصود جنّت ہے، جو اس کا حُسن المآب بھی ہے اور اپنے الٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کے قُرب و حضوری اور احسان و رضوان کا حُسن المقام بھی ہے۔ اس ارشادِ قرآنی میں آرزوئے حُسن و حق رکھنے والوں کے لیے نویدِ جانفزا بھی ہے اور اہلِ تکفیر و تکذیب کے لیے تنذیر اور چیلنج بھی ہے۔ نیز اس میں پیش گوئی بھی ہے جس کی تصدیق تاریخ نے ہر زمان و مکان میں کی ہے۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ سے متعلق تاریخ کا یہ فیصلہ قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم دُنیا کے عظیم ترین انسان تھے اور ہیں، نیز آپ امام الصالحین بھی تھے اور امام النبیین والمرسلین بھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یتیم، گمنام اور اُمّی چرواہے سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن آپؐ میں آرزوئے حُسن و حق اس قدر شدید و حرکی تھی کہ آپؐ نے ایسی پاکیزہ، سچّی اور حسین زندگی بسر کی کہ افرادِ معاشرہ آپؐ کو صادق و امین سمجھنے اور کہنے لگے۔ لیکن ربِّ علیم و خبیر نے آپؐ سے فرمایا کہ آپؐ بلاشبہ صادق و امین ہیں، لیکن آپؐ کی شخصیت جملہ مکارمِ اخلاق اور صفاتِ حسنہ کی مظہر ہے۔ چنانچہ ایک تو آپ صاحبِ خُلقِ عظیم ہیں۔

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (القلم ۶۸ : ۴) بے شک آپ اخلاق کے عظیم مرتبے پر ہیں۔

اور دُوسرے آپؐ کی زندگی تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمتِ محض بنا کر بھیجا ہے۔

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ربِّ ذوالجلال والاکرام کے ان دو ارشادات پر غور کرنا چاہیے کہ جس خُلق کو ربِ اکبرو اعظم "عظیم" کہے وہ اہلِ دنیا کے حوالے سے کتنا عظیم ہوگا۔ عقلِ انسانی تو اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی۔ اسی طرح ربِ رحمٰن ورحیم اپنے جس بندے اور رسول سے یہ فرمائے :

"آپ جملہ جہانوں کے لیے رحمتِ محض ہیں۔"

اس برگزیدہ ہستی کی رحمت کے بے پایاں و لاتمنا ہی ہونے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔

کتبِ سیرت و تاریخ اِس حقیقت کی شاہد ہیں کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق آپ کے اہلِ وطن کا متفقہ طور سے یہ فتویٰ تھا کہ :

"آپؐ صادق و امین ہیں۔"

اگرچہ معاشرہ آپؐ کے دیگر اوصاف کا بھی معترف تھا، لیکن صداقت و امانت ایسی دو امتیازی اخلاقی خصوصیات تھیں جو انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھیں کہ ایک شخص جو اُن میں پیدا ہوا، اُن میں اس نے بچپن، لڑکپن اور شباب گزارا، اور اس حسین و پاکیزہ طریقے سے گزارا کہ کسی نے کبھی اُس پر انگشت نمائی نہیں کی۔ سب نے "محمّد" کو اسم بامسمّٰی تسلیم کیا۔ چالیس برس کی عمر تک آپؐ نے کبھی کسی معاملے میں نہ جھوٹ بولا اور نہ امانت میں خیانت کی۔ ایسا بلند کردار، محسن و مخلص اور صادق و امین انسان کیسے یکایک دین کے معاملے میں جھوٹ بول سکتا ہے! وہ کیسے جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں اللہ تعالیٰ کا نبی و رسول ہوں اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے"۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپؐ کے دعوائے نبوت کے بعد جب اہلِ عرب آپؐ کے جانی دشمن بن گئے، پھر بھی وہ آپؐ کے خُلقِ عظیم اور رحمۃٌ للعالمینی کی صفات کے معترف و قائل تھے۔ چنانچہ قرآن مجید نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ آپؐ نے اپنی ان صفاتِ حسنہ ہی کی بدولت اہلِ عرب کے دلوں کو مسخّر کر کے انھیں اپنے رنگِ الٰہی میں رنگ دیا' اور اس طرح اُنھیں ایک عظیم و مثالی قوم بنا دیا، جس نے دنیا کو توحید و محبت، اخوت و مساوات اور آزادی کا درس دیا۔ اور اس کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اسلام در اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی، اور جو شخص ایمان لا کر اُس میں کُلّیۃً داخل ہو جاتا، وہ انسانوں، حیوانوں اور دیگر مخلوقات کے لیے رحمت بن جاتا۔ اس میں آرزوئے حسن زندہ و فعّال ہو جاتی، وہ خود بھی صاحبِ حُسن و سرور بننے کی کوشش کرتا اور دُوسروں کو بھی ایسا بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی کوششِ جمیلہ کا دُوسرا نام "جہاد" ہے اور اسی کوشش میں جان دینے کے لیے شہادت کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ یہ آرزوئے

حُسن تھی جس نے مسلمانوں میں ذوقِ وشوقِ جہاد و شہادت پیدا کیا اور اس کی بدولت اُنھوں نے وہ عظیم الشان اور حیرت انگیز سیاسی و عسکری اور ثقافتی و دینی فتوحات حاصل کیں، جن کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید ایسا حسین و انقلاب آفرین کلامِ الٰہی ہے، جس کے بنیادی مقاصد میں ایک تو انسان میں آرزوئے حُسن کو زندہ و فعال کرنا، دُوسرے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا اور انسان کو صاحبِ حُسنِ کردار بنانا، نیز اس کے قلب کو نورِ علم و حکمت سے منوّر کرنا اور اس میں مضمر شرارِ محبتِ الٰہی کو شعلہ فگن کر کے شمعِ رحمت بنانا ہے تاکہ اس کے نور و فیضان سے بنی نوع انسان بالخصوص اور دیگر مخلوقات بالعموم مستفیض ہوں۔ اگر یہ کہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اسی کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی زندہ حقیقت کا اظہار ہوگا جس کا اعتراف تاریخ مسلسل کرتی رہتی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ:

عورت اپنے مرد کے اخلاق کی سب سے زیادہ محرم ہوتی ہے اور اس کی رائے اس معاملے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ ایک دن چند صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پُوچھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا خُلق کیسا تھا؟"

اُمّ المومنین نے، جو نہ صرف آپ کی رفیقۂ حیات اور مزاج دان و محرمِ راز تھیں، فراست و حکمت میں عبقری اور روحِ قرآن کی شناسا بھی تھیں، جواباً پُوچھا:

"کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا: "ہاں"۔

اس پر مزاج دانِ رسالت و قرآن نے برجستہ فرمایا:

انّ خُلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کان القرآن۔ (ابو داؤد۔ باب الصّلوٰۃ)	بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

قرآن حکیم بلاشبہ ربّ الحیّ والقیوم کا زندہ و ناطق کلام ہے اور اس کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک از بس فکر انگیز و بصیرت افروز خوبی یہ ہے کہ اس کا موضوع "انسان" ہے، جس کی طرف خود اس نے مندرجہ ذیل آیت میں انسان کی توجّہ مبذول کرائی ہے تاکہ وہ اس پر غور و فکر کرے۔ موضوع کے اعتبار سے اسے ہم "کتاب الانسان" کہہ سکتے ہیں جس طرح موضوع کے لحاظ سے "کتاب الحیوان" کہنے کا دستور ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ بنی نوع انسان سے خطاب کر کے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانبیآء ۲۱ : ۱۰)	ہم نے یقیناً یہ کتاب تمھاری طرف نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر ہے، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے؟

حُسن تھی جس نے مسلمانوں میں ذوق و شوقِ جہاد و شہادت پیدا کیا اور اس کی بدولت اُنھوں نے وہ عظیم الشان اور حیرت انگیز سیاسی و عسکری اور ثقافتی و دینی فتوحات حاصل کیں، جن کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔

قرآن مجید ایسا حسین و انقلاب آفرین کلامِ الٰہی ہے، جس کے بنیادی مقاصد میں ایک تو انسان میں آرزوئے حُسن کو زندہ و فعّال کرنا، دُوسرے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا اور انسان کو صاحبِ حُسنِ کردار بنانا، نیز اس کے قلب کو نورِ علم و حکمت سے منوّر کرنا اور اس میں مضمر شرارِ محبتِ الٰہی کو شعلہ فگن کر کے شمعِ رحمت بنانا ہے تاکہ اس کے نور و فیضان سے بنی نوع انسان بالخصوص اور دیگر مخلوقات بالعموم مستفیض ہوں۔ اگر یہ کہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ اسی کلامِ الٰہی کی عملی تفسیر ہے تو یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایسی زندہ حقیقت کا اظہار ہوگا جس کا اعتراف تاریخ مسلسل کرتی رہتی ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ:

عورت اپنے مرد کے اخلاق کی سب سے زیادہ محرم ہوتی ہے اور اس کی رائے اس معاملے میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ ایک دن چند صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پُوچھا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا خُلق کیسا تھا؟"

اُمّ المومنین نے، جو نہ صرف آپ کی رفیقۂ حیات اور مزاج دان و محرمِ راز تھیں، فراست و حکمت میں عبقری اور روحِ قرآن کی شناسا بھی تھیں، جواباً پُوچھا:

"کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا: "ہاں"۔

اس پر مزاج دانِ رسالت و قرآن نے برجستہ فرمایا:

انّ خُلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کان القرآن۔ (ابُو داؤد۔ باب الصّلوٰۃ)	بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

قرآنِ حکیم بلاشُبہ ربّ الحیّ والقیوم کا زندہ و ناطق کلام ہے اور اس کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک ازبس فکر انگیز و بصیرت افروز خوبی یہ ہے کہ اس کا موضوع "انسان" ہے، جس کی طرف خود اس نے مندرجہ ذیل آیت میں انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے تاکہ وہ اس پر غور و فکر کرے۔ موضوع کے اعتبار سے اسے ہم "کتاب الانسان" کہہ سکتے ہیں جس طرح موضوع کے لحاظ سے "کتاب الحیوان" کہنے کا دستور ہے۔ اللہ تعالیٰ جملہ بنی نوع انسان سے خطاب کر کے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانبیآ ۲۱ : ۱۰)	ہم نے یقیناً یہ کتاب تمھاری طرف نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر ہے، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے؟

بلاشبہ قرآن حکیم میں انسان کا اپنا ذکر ہے۔ یہ ذکر کیا ہے؟ نور و ہدایت اور شفا ہے؛ نیز حسین و کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کا دستور ہے۔ یہ افراد و اقوام کے عروج و زوال کی ایک عبرت انگیز و سبق آموز تاریخی داستان ہے۔ چنانچہ رب ذوالجلال والاکرام نے اس کے ذریعے انسان کو اس اصل الاصول سے آگاہ کیا ہے کہ ہر زمان و مکان میں اللہ تعالیٰ کے انبیا و رسل علیہم السلام ہی اس کے انعام یافتہ، ہدایت یافتہ، کامیاب، عظیم اور مثالی انسان ہوئے ہیں اور ان کی سیرت حسنہ ہی میں انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ تھا، اور اب اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے حسین و کامیاب زندگی گزارنے کا اُسوۂ حسنہ یا حسین نمونہ ہے۔ قرآن مجید کے اس دعوے کا ثبوت خود قرآن مجید بھی ہے، آپ کی سیرت طیبہ اور تاریخ کی کتب میں بھی ہے۔

ان تینوں کتب کے آئینے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور اکتسابِ علم و ہنر نہ کیا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ پیدائشی نبی و رسول اور معلّم و مزکیِ نوعِ انسانی تھے، لہٰذا ربِ جلیل کو گوارا نہ ہُوا کہ اُس کے حبیب و پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کسی شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں اور اُسے اپنا استاد و معلّم بنائیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے آپ عُمر بھر اُمّی رہے۔ یہ اور بات ہے کہ خود ربِ علیم و حکیم نے آپ کا شق الصدر بھی کیا اور شرح الصدر بھی، اور بذریعہ وحی آپ کے سینہ مبارک کو علم و حکمت کے نور سے معمور و منیر کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ آپ نے منصبِ نبوت و رسالت پر متمکن ہو کر اولادِ آدمؑ کو علم و حکمت سکھانا، اُن کا تزکیہ کرنا اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنا تھی۔ بالفاظِ دیگر آپ چونکہ خاتم النبیین تھے، اس لیے آپ نے قیامت تک کے لیے اقوامِ عالم اور افرادِ نسلِ انسانی کا معلّم و مزکّی اور ہادی و مربّی بننا تھا۔ آپ نے پہلے اپنا تزکیۂ نفس کیا اور اپنے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کی؛ نیز اپنی آرزوئے حسن و حق اور نورِ باطنی کی تکمیل کی اور صاحبِ جمال و جلال بن گئے۔ آپ کی خودی کی تحسین و تکمیل ہو گئی اور وہ محکم و ناقابلِ تسخیر بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسمی طور پر خلعتِ نبوت و رسالت سے مزیّن کر دیا۔ اُس وقت آپ کا سنِ رشید چالیس برس کا تھا اور آپ کا پیشہ سوداگری تھا۔

جن معاشرے میں آپ نے مہد سے کہولت تک عمر گزاری تھی اور جس کے افراد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک چرواہا اور سوداگر، ایک اُمّی و بے ہنر شخص کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ کر سکتا ہے، اس معاشرے میں آپ نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا نعرہ مار کر اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا تو اس میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ نعرۂ توحید جس پر اسلام کی بنیاد استوار ہے اور جو تحریکِ اسلام کی رُوحِ رواں ہے، اہلِ قریش کے دلوں پر برق بن کر گرا اور ان کے صبر و شکیب کو خاکستر کر گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نعرے کو کوئی سمجھا تو وہ قریش تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب شرک و بت پرستی اور فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و آزریت کی ہر شکل و صورت کا استیصال ہے، اور ایک اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و معبودیت کا اقرار و اثبات ہے۔ یہ نعرہ ان کے لیے ایسا چیلنج تھا جسے وہ نہ قبول کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کیا۔ یہ نعرۂ توحید در اصل ہر زمان و مکان کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں کے لیے چیلنج تھا اور ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس نعرے

حق و باطل، حُسن و قبح، ایمان و کفر اور توحید و شرک میں ٹھن گئی اور سرد جنگ کا آغاز ہوگیا۔ چند اہلِ صدق و صفاؓ نے پہلی ہی دعوتِ اسلام پر لبیک کہا اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔ تقریباً بارہ برس تک آپؐ مکہ مکرمہ میں "لا الٰہ الا اللّٰہ" کا نعرہ لگاتے رہے؛ اس کی صدا اہلِ مکہ کے کانوں میں گونجتی اور ان کے دلوں میں آتشِ انتقام بھڑکاتی رہی۔ مخالفت کے طوفان چلتے رہے؛ آپؐ اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ صبر آزما امتحانوں سے گزرتے رہے، ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، لیکن آپؐ تحریکِ اسلام چلاتے رہے، رضا کاروں کا تزکیہ کرتے، ان کو علم و حکمت سکھاتے اور ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کرتے رہے؛ نیز ان کی آرزوئے حسن و حق کو فعال و حرکی بناتے اور ان کے نورِ باطنی کی تکمیل کرتے رہے۔ تحریکِ اسلام کا پہلا مرحلہ ختم ہوا تو آپؐ نے تحریک کے نشو و ارتقا کے لیے یثرب کی آزاد سرزمین منتخب کی۔ آپ وہاں کے چند جویانِ حق کو تحریکِ اسلام میں شامل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے ساتھ وہاں تحریکِ اسلام چلانے کے لیے زمین ہموار اور فضا کو سازگار بنانے کا کام شروع ہوگیا۔ یہ بھی بڑا کٹھن مرحلہ تھا، لیکن فرزندانِ توحید کی مساعیِ جمیلہ اور تائیدِ ایزدی سے یہ مرحلہ بھی کامیابی سے طے ہوگیا۔

آپؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کر کے وہاں تحریکِ اسلام چلانے کا حکم دیا؛ امتثالِ امر میں مسلمانوں کی اکثریت ہجرت کر گئی لیکن جو مجبور و معذور تھے، وہ قریش کے مظالم سہتے رہے۔ آخر کار آپ کو بھی اللّٰہ تعالیٰ کا اذنِ ہجرت ملا۔ ہجرت کی شب قریش نے آپؐ کو شہید کرنے کی غرض سے قاتل مقرر کیے جنھوں نے آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن آپؐ صاف بچ کر نکل گئے اور سفرِ ہجرت کے اوّلیں مقام پر پہنچ گئے، جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ کا گھر تھا۔ ہجرت میں ہمسفری اور مصاحبت کا شرف بھی اسی پیکرِ صدق و صفا کو ملا، جو حضورِ اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے عزیز ترین و وفا شعار دوست، معتمد و مقرب اور ہمراز مشیر تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایک عشرہ بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ نے تاریخ کا رُخ صحیح سمت موڑ دیا؛ باطل قوّتوں کو شکستِ فاش دی؛ تمام جزیرہ نماعرب کو فتح ہی نہیں کیا بلکہ اُن کے باشندوں کے دلوں کو بھی مسخّر کر لیا اور وہ جوق در جوق تحریکِ اسلام میں شامل ہونے لگے۔ اس طرح آپؐ نے عرب کو متحد کر کے ایک ناقابلِ تسخیر قوّت بنا دیا، اور اسلامی حکومت کی قوّت سے قیصر و کسریٰ کی ایسی عظیم سلطنتیں بھی خوف کھانے لگیں۔

میرے نزدیک آپؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے عرب کے وحشی و خونخوار بدوؤں کو مہذب و متمدن انسان بنایا؛ مشرکوں اور بُت پرستوں کو مومن موحّد بنایا؛ نجس و ناپاک لوگوں کو مطہر و پاکباز بنایا، عباد الشیطان کو عباد الرحمان بنایا؛ ظالموں، جاہلوں اور ناخواندہ لوگوں کو علم و حکمت سکھائی، ان کو متقی و سعید بنایا؛ اُن کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی، ان میں شوقِ جہاد و شہادت پیدا کیا؛ ان کے دلوں میں اللّٰہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کی محبت کی شمع روشن کی اور انھیں اقوامِ عالم کے لیے باعثِ رحمت بنا دیا؛ انھیں رموزِ خلافت و جہانبانی سے آگاہ کیا؛ ان کے دلوں میں اطاعت و اتحاد اور تنظیم کی اہمیت کا حق الیقین پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہائی قلیل مدت میں اُن میں ایسے ایسے عالم و حکیم اور فقیہ و مجتہد پیدا ہوئے، جن کے علمی و تحقیقی کارناموں پر آج بھی علمی دُنیا فخر کرتی ہے اور اُن کے علم و حکمت کے

چراغوں کی روشنی سے آج بھی طالبانِ علم اکتساب فیض کرتے ہیں۔ ان میں ایسے ایسے سپہ سالار و فاتح پیدا ہوئے جو تاریخ ساز و عہد آفرین ثابت ہوئے۔ علاوہ بریں، ان میں ایسے ایسے عظیم الشان منتظم پیدا ہوئے جن کے حسنِ انتظام کی تعریف میں تاریخ رطب اللسان ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ان اور دیگر عظیم و بے مثال کارناموں کی بدولت تاریخ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بجا طور سے ہر زمان و مکان کا عظیم ترین مثالی انسان تسلیم کیا اور ربِ علیم و حکیم نے آپؐ کی شخصیت و سیرت کو بنی نوعِ انسان کے لیے حسین نمونہ قرار دیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے یہ عظیم و بے مثال اور عہد آفرین و تاریخ ساز کارنامے کیسے سرانجام دیے؟ بالفاظِ دیگر آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کیا ہے؟ اس کا جواب آپؐ ہی کی زبانِ مبارک میں پیش کیا جاتا ہے جو ایجاز بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپؐ کی سنّت یا طریقۂ زندگی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

۱ــــ المعرفۃ راس المالی۔ (معرفت و عرفان میرا اس المال یا سرمایۂ حیات ہے)

۲ــــ والعقل اصل دینی۔ (عقل میرے دین کی اصل ہے)

۳ــــ والحبُّ اساسی۔ (محبّت میری (زندگی کی) اساس یا بنیاد ہے)

۴ــــ والشوق مرکبی۔ (شوق میرا راہوار یا سواری ہے)

۵ــــ و ذکر اللہ انیسی۔ (ذکرِ الٰہی میرا مونس ہے)

۶ــــ والثقۃ کنزی۔ (اعتماد میرا خزانہ ہے)

۷ــــ والحزن رفیقی۔ (غمِ (عشقِ الٰہی) میرا رفیق ہے)

۸ــــ والعلم سلاحی۔ (علم میرا ہتھیار ہے)

۹ــــ والصبر ردائی۔ (صبر میرا لباس ہے)

۱۰ــــ والرضا غنیمتی۔ (رضا میرا مالِ غنیمت ہے)

۱۱ــــ والعجز فخری۔ (تواضع و انکساری میرا فخر ہے)

۱۲ــــ والزھد حرفتی۔ (زُہد میرا پیشہ ہے)

۱۳ــــ والیقین قوّتی۔ (یقین میری طاقت و توانائی ہے)

۱۴ــــ والصّدق شفیعی۔ (صدق میرا حامی و شفیع ہے)

۱۵ــــ والطّاعۃ حسبی۔ (طاعتِ (الٰہی) میری کفایت کرنے والی ہے)

۱۶ ـــ والجهاد خُلقي ۔ (جہاد میرا خُلق ہے)
۱۷ ـــ و قُرّۃُ عینی فی الصلوٰۃ ۔ (نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے) [بحوالہ قاضی عیاض، کتاب الشفا]

دیکھنے میں یہ سترہ انتہائی مختصر جملے ہیں، لیکن یہ کتابِ حیات کے جملہ سترہ ابواب ہیں اور ہر باب اپنے موضوع کا آئینہ ہے۔ اب آپؐ کے ان ارشاداتِ عالیہ کو واضح طور سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے:

۱۔ معرفت میرا راس المال ہے:

معرفت کے معنیٰ ہیں: پہچاننا۔ معرفت دو قسم کی ہے:
معرفتِ نفس اور معرفتِ الٰہی۔

(ا) معرفتِ نفس کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں: ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

معرفت کا سرچشمہ غور و فکر ہے۔ انسان خلوصِ نیت کے ساتھ پہلے سوچے سمجھے نظریات و معتقدات، علمی و مذہبی تعصبات وغیرہ سے دل کو صاف کر کے اپنی ہستی پر غور و فکر کرے تو اسے اپنی ذات میں مضمر صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے، اس پر اس کا مقصدِ حیات منکشف ہوتا ہے۔ اسے کائنات اور اپنے الٰہ و رب کے رشتے کی نوعیت کا علم ہوتا ہے۔ اس طرح معرفتِ نفس سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ صوفیہ کے مندرجہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ جس کسی نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

معرفتِ نفس سے انسان میں اپنی حیثیتِ عبدیت اور اللہ تعالیٰ کے مقامِ الوہیت کا ایقان و اذعان پیدا ہوتا ہے۔ اس سے نہ تو اس میں فرعونیت، ہامانیت اور قارُونیت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کبھی اور کو اپنا الٰہ ہی بناتا یا سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ اپنی ذات میں مضمر صلاحیتوں کو دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں ان کو کام میں لانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور وہ انھیں قوت سے فعل میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش اس کی عظمت و کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے۔

(ب) معرفتِ الٰہی سے انسان مُوحّد بنتا ہے۔ شرک و بُت پرستی سے اسے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ جمیل و جلیل ہے۔ اس کے جمال و جلال کے مشاہدے سے اس پر نہ صرف حقیقتِ حُسن آشکارا ہوتی ہے بلکہ اس میں جمالیاتی ذوق بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ایک تو حُسن سے محبت ہو جاتی ہے، لہٰذا وہ قُبح سے نفرت کرنے لگتا ہے اور دوسرے اس میں حُسن و قبح اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی حِس بیدار ہو جاتی ہے۔ عارف میں جوں جوں صفاتِ الٰہی

کی پہچان بڑھتی جاتی ہے، اس میں ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر لینے کا شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس شوق کی بدولت ہی عارف صفاتِ الٰہی سے اپنی شخصیت کو متصف کر لیتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں وُہ اپنی زندگی کو رنگِ الٰہی (صبغۃ اللہ) میں رنگ لیتا ہے۔ یہی دین کی غایت، رُوحِ انسانی کی آرزو اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے۔ اس لحاظ سے معرفت حیاتِ انسانی کا حقیقی سرمایہ ہے، جس کی بدولت وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما سکتا ہے۔ راس المال اس مال و دولت کو کہتے ہیں جو صنعت و حرفت اور تجارت میں سرمائے کے طور پر لگایا جاتا ہے۔

۲۔ عقل میرے دین کی اصل ہے:

اصل کے معنی "جڑ" ہیں۔ پودا یا درخت اصل ہی پر قائم ہوتا ہے اور اسی پر اس کی نشوونما اور بقا کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس منطقی قیاس کی بنا پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ دین اسلام کی بقا اور نشوو ارتقا کا دارو مدار عقل پر ہے۔ بالفاظِ دیگر عقل کے بغیر دین بے اصل ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ بے عقل لوگوں کا دین بے اصل ہوتا ہے، لہٰذا جو قوم عقل سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے، اس کے دین کا شجر برگ و بار لانا چھوڑ دیتا ہے اور وہ صرف بے ثمر ہی نہیں ہوجاتا بلکہ بے بنیاد بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بے عقل فرد کی طرح بے عقل قوم کی زندگی بھی بے مقصد ہوتی ہے اور اس کے فکر و عمل کی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ جہت۔ وُہ اپنی خواہشوں کو اپنا الٰہ بنا لیتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وُہ اپنے نفسِ امارہ کی محکوم و مطیع بن جاتی ہے۔ اس کا ضمیر کمزور بلکہ مُردہ ہوجاتا ہے۔ بے عقل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر نجاست ڈالتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے دُوسرے مقام پر اس نفسیاتی حقیقت کی صراحت کر دی ہے کہ عقل سے کام نہ لینا دراصل بیماریٔ دل کی وجہ سے ہوتا ہے، اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے ان کے دل و دماغ بلکہ ساری زندگی ناپاک و پلید ہوتی ہے اور ان کی موت کفر پر ہوتی ہے، اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وُہ کفر کی حالت ہی میں مر گئے۔

عقل اس لیے بھی دین کی اساس ہے کہ قرآن مجید کو عقل ہی کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پاک سے ثابت ہُوا کہ عقل اور دین لازم و ملزوم ہیں۔ عقل ہی کے ذریعے انسان دین کے اغراض و مقاصد، قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ کے معارف، اسرار و رموز اور علوم وغیرہ سے آگاہی حاصل کر سکتا، حکمت سیکھ سکتا اور اس کا اظہار و ابلاغ کر سکتا ہے۔ یعنی تبلیغ کا فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے عبادُالرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ایک پہچان یہ بتائی ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ عقل و ہوش سے ان پر غور و فکر کرتے ہیں۔ عقل ہی وہ غوّاص ہے جو آیاتِ الٰہی کے بحرِ زخّار میں سے گوہرِ معانی کو نکالتی ہے۔ لہٰذا جو

لوگ فہمِ قرآن میں عقل سے کام نہیں لیتے اور آیاتِ الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ فرد ہو یا قوم، جو بھی اللہ تعالیٰ کی جس نعمت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے، قدرت اس سے وہ نعمت چھین لیتی ہے۔ زوالِ اُمت کے بعد اس کا سب سے بڑا زیاں یہ ہوا ہے کہ اس سے عقل چھین لی گئی ہے، اور وہ اُس کے دین کی اساس نہیں رہی۔ حاصلِ کلام یہ کہ ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے علوم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے عقل کو اپنے دین کی اساس نہیں بناتی۔

۳۔ محبّت میری بنیاد ہے :

اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ محبّتِ الٰہی انسان کو طبعاً و دلیعت کی گئی ہے، اور اسے اس حقیقت کا فطری اذعان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا یہ اقتضا بھی ہے اور خاصّہ بھی، کہ اس کی مخلوقات خصوصاً بنی نوع انسان سے محبت کی جائے۔ محبّتِ انسانی کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان سے ہمدردی غمگساری اور عدل و احسان کیا جائے اور ان کی خاطر ایثار و قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ محبّت جب حیاتِ انسانی کی اساس بن جاتی ہے تو وہ اپنی ذات، نیز اپنوں اور بیگانوں سب کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔ چونکہ محبّت (اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی) آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی بنیاد تھی، اس لیے آپؐ نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ تمام عالموں کے لیے بھی رحمت تھے اور ہیں۔

تقویٰ یا خشیّتِ الٰہی محبّت ہی کی پیداوار ہے، اور تقویٰ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کے شعور پر اور دُوسری جانب انسان کے اپنی ذات سے سچی محبّت پر دلالت کرتا ہے، جس کی بدولت ایک تو وہ اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال کو آتشِ خوف و حُزن سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور دُوسرے اپنے اِلٰہ کے قرب و رضوان کی خاطر اسے اپنی حقیقی راہ و منزل کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔

حُسن چونکہ معروضِ محبّت ہے اس لیے حُسن و محبّت لازم و ملزوم ہوئے۔ اس سے یہ کُلیہ مستخرج ہُوا کہ جس دل میں جس قدر حُسن ہوگا، اسی قدر اس میں محبّت ہوگی اور یہی مثل معاشرے پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کا نقیض یہ ہُوا کہ جس دل یا معاشرے میں محبّت نہیں ہوگی وہ حسین بھی نہیں ہوگا۔ چونکہ آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی اساس محبّت تھی، اس لیے آپ پیکرِ حُسن و محبّت تھے۔ محبّت جب حُسنِ عمل یا انسان کے ذریعے قوّت سے فعل میں آتی ہے تو رحمت بن جاتی ہے۔ لہٰذا آپؐ کے رحمۃٌ للعالمین ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذاتِ اقدس حُسن و محبت کا جہانِ بیکراں تھی۔

۴۔ شوق میرا مرکب (سواری) ہے :

شوق سے آپؐ کی مُراد طلب و جستجو یا آرزو ہے، جس سے زندگی میں حرکی فعالیت پیدا ہوتی ہے۔ "شوق میرا مرکب" کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی تمام انقلابی و تعمیری سرگرمیوں کا محرک حقیقی شوق یا سوزِ آرزو تھا۔ آپؐ کی بعثت کا

جو مقصد تھا یا بالفاظِ دیگر قدرت کی طرف سے آپؐ کو جو مشن تفویض کیا گیا تھا، اس سے آپؐ کو عشق بھی تھا اور اُسے پُورا کرنے کی طلب و جستجو تھی۔ چنانچہ یہ عشق و آرزو ہی آپؐ کے عظیم الشان مشن میں کامیابی کے بنیادی عوامل تھے۔

آرزو و جستجو کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے فقدان سے حیاتِ انسانی میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منفی عمل اس کے انحطاط و اضمحلال اور ضُعف و زوال پر منتج ہوتا ہے۔ کسی فرد یا قوم کی یہ حالت ہو تو اُسے مجازاً مُردہ کہتے ہیں۔ یہیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی قوم فقدانِ آرزو کے باعث مُردہ ہو جاتی ہے تو سوزِ آرزو ہی کے ذریعے وہ دوبارہ زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزو حیاتِ انسانی کے ارتقاء کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے یا بالفاظِ دیگر سوزِ آرزو اور ارتقائے حیات لازم و ملزوم ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اپنے نصب العین یا مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے اندر آرزو کو زندہ و بیدار کرنا اور پھر سوزِ آرزو سے اپنی ذات کو زندہ رکھنا ناگزیر بھی ہے اور آپؐ کی سنّتِ حسنہ بھی۔

۵۔ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے:

اصل جُملہ جتنا مختصر ہے، معانی و مطالب اتنے ہی وسیع و بلیغ ہیں۔ انیس کے معانی ہیں اُنس رکھنے اور محبت کرنے والا۔ یہ مقولہ بھی جتنا مشہور ہے اتنا سچا ہے کہ:

"دل را بدل رہیست"۔ یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

چنانچہ جب ایک دوست دُوسرے دوست کو یاد کرتا ہے تو اُس کے دل میں بھی اپنے دوست کی یاد آتی ہے۔ یہ تو انسانی دل کا حال ہے۔ لیکن جب ایک بندہ اپنے اللہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کو یاد کرتا ہے جو دلوں کا حال جانتا ہے، تو وہ اپنے بندے کو کتنا یاد کرتا ہو گا۔ اس کا اندازہ اس کی رحمتِ بے پایاں سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کس پیار سے اپنے بندے سے کہتا ہے:

"مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا۔"

ظاہر ہے جس بندے کو اُس کا اللہ یاد کرے، جو خدائے متعال و ربِّ جلیل ہے، اس سے بڑھ کر بندے کی اور خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے!

دوست وجہِ طمانیت و مسرت ہوتا ہے اور ذکرِ الٰہی بھی وجہِ طمانیت ہے۔ لہٰذا وہ بھی انسان کا دوست ہوا۔

آپؐ کے زیرِ نظر جُملے میں یہ بھی ایک بلیغ و بصیرت افروز نکتہ ہے کہ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہُوں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے۔ اور اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کا ذکر مجھے محبوب و مرغوب ہے، دُوسرے اس سے مجھے اُس کا پیار ملتا ہے جو سامانِ طمانیتِ دل ہے۔ تیسرے محبوب کو دل ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے، کیونکہ اُس کی یاد تو تیرِ نیم کش کی طرح دل میں پیوست ہوتی ہے۔ صوفیہ کا یہ قول کہ "جو دم غافل سو دم کافر" اسی حقیقت کا

غماز ہے۔

۶۔ اعتماد میرا خزانہ ہے:

اصل میں ہے: الثقۃُ کنزی۔

یہ دو لفظی جُملہ معانی کا گنجینہ ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے لحاظ سے آپؐ کے اعتماد کی نوعیت سہ گونہ تھی۔ آپؐ کو ایک تو ذاتِ الٰہی پر، دُوسرے اپنی ذات پر اور تیسرے اپنے صحابہؓ یعنی اسلام کی تحریکِ انقلاب کے رُفقا پر اعتماد تھا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد عبارت ہے توکّلِ الٰہی سے۔ توکّلِ الٰہی عبارت ہے انسان کے اس ایقان و اُمید سے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں، اور وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا ہے۔ جدّو جہد اور مساعیِ جمیلہ کے بعد نُصرتِ الٰہی کی امید رکھنا توکّل سے عبارت ہے۔ توکّلِ الٰہی تین چیزوں پر دلالت کرتا ہے:

ایمان باللہ، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات، مثلاً قدرت، علم، رحمت وغیرہ پر،

دوم قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل پر،

اور تیسرے انسان کی رجائیت پسندی پر۔

ان تینوں چیزوں میں ایسی قوت مضمر ہے جو انسان کی شخصیت کو عظیم و ناقابلِ تسخیر بناتی ہے۔

خود اعتمادی کامیابی کی ایک پیش شرط ہے۔ انقلابی عمل جو آپؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد تھا اور جس کے ذریعے آپؐ ایک عظیم و ہمہ گیر جمالیاتی معاشرتی انقلاب لانے میں کامیاب ہُوئے، اس کی اساس خود اعتمادی پر ہے۔ خود اعتمادی کے بغیر شخصیتِ انسانی کٹے پتنگ کی طرح ہوتی ہے، لہٰذا اس میں بادِ مخالف کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ زمانے کی حریف قوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے، کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینے اور زندگی کے تجربات سے گزرنے کے لیے خود اعتمادی ناگزیر ہے۔

رفقا پر اعتماد کا مطلب سہ گونہ ہے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا اور انھیں اپنا معتمد اور قابلِ اعتبار بنانا۔ ظاہر ہے اس اعتماد کے بغیر نہ تو کوئی قائد اپنے مشن میں کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ کوئی سپہ سالار کامیابی سے جنگیں لڑ سکتا ہے۔ سیاسی اور عسکری میدان میں رفقا پر اعتماد کامیابی کی ایک لازمی پیش شرط ہے۔

مختصر یہ کہ اعتماد اپنی کُلّی حیثیت میں قوت کا خزینہ ہے اور یہ قوت شخصیتِ انسانی کو ناقابلِ تسخیر بناتی ہے، نیز اس کی عظمت و کامیابی کی ایک پیش شرط اور قیادت کی ایک لازمی صفت ہے۔

۷۔ غم میرا رفیق ہے:

غم دُو قسم کا ہوتا ہے: ایک غمِ ذات اور دُوسرا غمِ انسانیت، جسے غمِ روزگار اور غمِ عشق بھی کہتے ہیں۔ اپنی ذات کا

غم شخصیت کو مضمحل و ناتواں اور محدود و سوگوار بنا تا ہے اور اگر یہ بہت بڑھ جائے تو زندگی کا بارِ گراں بن جاتا ہے۔ اس غم سے دل کو آتش خاموش لگ جاتی ہے اور وہ اذیت ناک عذاب بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس غمِ انسانیت میں ایک تو ذاتی و دُنیوی تمام غموں کو مٹا ڈالنے اور دوسرے شخصیت کو بے کراں بنانے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس غم کی بدولت انسان میں بڑے سے بڑے امتحان سے بے خطر گزر جانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

قرآن مجید، احادیثِ طیبہ اور کتبِ سیرت سے ثابت ہے کہ آپؐ کو اپنی ذات کا نہیں، انسانیت کا غم تھا اور اس غمِ انسانیت کی نوعیت محض مادی یا دُنیوی نہیں تھی بلکہ مادی، روحانی یا دُنیوی، اُخروی تھی۔ آپؐ ایک تو بنی نوعِ انسان کو ہر قسم کی استحصالی و طاغوتی (مثلاً فرعونی، ہامانی اور قارونی) قوتوں سے، نیز شرک و بُت پرستی کے عقاید و عبادات سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ اور دُوسرے ان کے لیے اخوت و محبت اور آزادی و مساوات کی بنیادوں پر ایک حسین و مثالی معاشرہ تشکیل و تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کا یہ مشن تھا اور اس کی تکمیل کا آپؐ کو غم تھا۔ اس غم کی شمع ہر وقت آپؐ کے قلبِ مبارک میں فروزاں رہتی تھی جس کی روشنی میں حُسن کی تابانی اور سوز میں آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ آپؐ کا غم آپؐ کی رحمت کی طرح عالمِ انسانی کو ہی نہیں تمام عالموں کو محیط تھا۔ اس سے آپؐ کی شخصیت کی عظمت و بے کرانی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۸۔ علم میرا ہتھیار ہے:

اسلام میں علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل امور سے لگایا جا سکتا ہے:

اوّل، نبی کی حیثیت سے آپؐ کا اہم ترین فریضہ بنی نوعِ انسان کو علم و حکمت سکھانا تھا۔

دوم، قرآن مجید، جو علم و حکمت کا سرچشمہ اور مرشد و ہادی ہے، اس سے متقی لوگ ہی ہدایت و روشنی حاصل کرتے ہیں اور اہلِ علم ہی میں خشیتِ الٰہی یا تقویٰ ہوتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تقویٰ، ایمان اور علم ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔

سوم، علم میں قوتِ تسخیر پائی جاتی ہے جس کے سامنے ملائکہ سربسجود ہیں اور اس کو تسلیم نہ کرنا شیطنت کا خاصہ ہے۔

علم تین قسم کا ہے:

موضوعی، معروضی اور ماورائی۔

موضوعی علم سے مراد معرفتِ نفس ہے۔ اس سے انسان کو اپنے اندر مضمر قوتوں کے خزینوں کا پتا چلتا ہے، جن کو فعل میں لا کر وہ عظیم و کامیاب بن سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی ان قوتوں سے بے خبر رہے تو ظاہر ہے وہ ان سے کام نہیں لے گا اور وہ ضائع ہو جائیں گی، جسے کفرانِ نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اسے "خسران" یا نقصان پذیری بھی کہتا ہے۔

معروضی علم کا مطلب حقائقِ اشیأ کو جاننا ہے ۔ اس علم سے انسان میں تخلیق و تعمیر، ایجاد و اختراع اور زمان و مکان کو تسخیر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے ۔ علاوہ بریں معروضی علم سے انسانوں اور قوموں کے نفسیاتی حقائق، دشمنوں کے منصوبوں اور ان کی مادی و اخلاقی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلومات فتح و کامرانی کی پیشں شرائط ہیں ۔

ماورائی علم سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات و آیات کی معرفت ہے ۔ اس کے من جملہ دیگر فوائد کے ایک یہ ہے کہ اس سے فکر و نظر میں تاریخ کے تیور پہچاننے کی صلاحیت اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراٗ جانے کی قوت پیدا ہوتی ہے، جسے اصطلاح قرآنی میں "سلطان" سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس علم سے انسان میں مستقبل بینی کی صلاحیت کے علاوہ قدرت کے قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے ۔ حکمت، جسے قرآن حکیم نے خیرِ کثیر کہا ہے، اس کی ناگزیر پیش شرط علم ہے ۔ لہٰذا علم و قوت اور حکمت و خیرِ کثیر ایک ہی سلسلے کی مربُوط و لاینفک کڑیاں ہیں ۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے علمبردار تھے، اور اس انقلابی عمل میں آپؐ کو کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی اجتماعی قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا ۔ اور یہ مقابلہ آپؐ نے علم کی قوت سے کیا تھا ۔ جیسا کہ آپؐ کے ارشاد اَلْعِلْمُ سِلَاحِی (علم میرا ہتھیار ہے) سے ثابت ہے ۔ آپؐ کے اس ارشاد میں یہ ازبس اہم نکتہ بھی مضمر ہے کہ آپؐ نے تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ علم کی قوت سے اسلام دشمن قوتوں پر کامیابی حاصل کی اور ان کے دلوں کو مسخّر کرکے انھیں اپنی تحریکِ اسلام میں شامل کیا ۔ اس سے صلیبی و صیہونی مستشرقین کے اس غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے کی تردید ہوجاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے ۔

۹۔ صبر میرا لباس ہے :

لباس عریانی اور جسمانی معائب کی پردہ پوشی کرتا، شدائدِ موسم سے بچاتا، نیز آراستگی و تزئین کے کام بھی آتا ہے ۔ لہٰذا صبر بھی انسان کی کئی قسم کی نفسیاتی و مادّی کمزوریوں اور عیوب کی پردہ پوشی کرتا، اسے خوف و غم کی اذیتوں، اغیار کی شماتت و تشنیع اور طنز و استہزا سے بچاتا اور عزتِ نفس کی حفاظت کرتا ہے ۔ نیز وہ انسان کا بھرم قایم رکھتا اور اس کی ہوا اُکھڑنے نہیں دیتا ۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے قائد تھے اور اس راہ میں آپؐ کو قدم قدم پر خطرناک اور شکیب ربا دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا ۔ لیکن آپؐ نے نہ تو کبھی کسی قسم کی کمزوری، بزدلی اور خوف و خطر کا مظاہرہ کیا، نہ آپؐ کے پائے عزم و ثبات میں لغزش آئی اور نہ کبھی راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش ہی کی، بلکہ شجاعت و مردانگی سے ان کا مقابلہ کیا اور تیروں اور تلواروں کے سائے میں بھی آپؐ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے ۔ نتیجۃً نصرتِ الٰہی ہمیشہ ہی آپؐ کے شاملِ حال رہی ۔

قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت بے نقاب کی ہے کہ نصرتِ الٰہی صبر کرنے والوں کے شاملِ حال ہوتی ہے ۔ صبر

ان چار چیزوں میں سے ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تاریخ کی حریف قوتوں کی مضرتوں، معاشرتی و نفسیاتی اور اخلاقی و روحانی بیماریوں اور زندگی کے جمود و تعطل کے نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔ صبر کو لباس بنانے میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کو حسین انداز میں صبر کرنا چاہیے یا دُوسرے لفظوں میں اس کو صبرِ جمیل کرنا چاہیے۔

۱۰۔ رضا میرا مالِ غنیمت ہے:

رضا سے مراد رضائے الٰہی ہے، اور جنگ میں دشمن کا جو سازوسامان اور مال و دولت ہاتھ لگے، اسے مالِ غنیمت کہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فوجی سپاہیوں کو مالِ غنیمت کا لالچ تھا اور یہ لالچ جنگ و جدال کا ایک زبردست محرک تھا۔ اسلام نے ایسی جنگوں کے خاتمے اور پائدار بین الاقوامی امن کی خاطر مالِ غنیمت کے لالچ کو بڑے حکیمانہ طریق سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے اہلِ ایمان میں اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کیا کہ جنگ فقط اللہ تعالیٰ کی راہ اور رضا کے لیے ہونی چاہیے جسے جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نیز مالِ غنیمت کے لالچ میں لڑنے والوں کو کوئی اجر نہیں ملتا، چاہے وہ جان ہی کیوں نہ دے ڈالیں۔ اسلام کے نزدیک مجاہد وُہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال کرتا ہے اور اگر اس میں ہلاک ہوجاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے اور شہادت کا اجر جنّت کی حیاتِ ابدی ہے۔

"رضائے الٰہی میرا مالِ غنیمت ہے۔"

آپؐ کے اس ارشاد سے مستشرقین اور دیگر اعدائے اسلام کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا بُطلان ہو جاتا ہے کہ آپؐ مالِ غنیمت اور کشور کشائی کے لیے جنگیں لڑتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جنگوں میں مالِ غنیمت بھی ہاتھ لگا، لیکن آپؐ نے ہمیشہ اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔ کتبِ حدیث و سیرت شاہد ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے اہل و عیال نے عمر بھر فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی۔ آپؐ کی انقلابی اور تعمیری سرگرمیوں کی غایتِ حقیقی فقط رضائے الٰہی تھی۔ صحابہ کرامؓ جو آپؐ کی سنّتِ طیبہ کی بڑی سختی سے پیروی کرنے والے تھے اُن کی زندگی کا مقصودِ حقیقی بھی رضائے الٰہی تھا۔

۱۱۔ عجز میرا فخر ہے:

انسان خِلقی طور پر کمزور، اللہ تعالیٰ کا محتاج اور اس کا بندہ ہے، اس لیے بندۂ محتاج کو عجز و تواضع ہی سزاوار ہے۔ کبریائی کا سزاوار فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کا حقیقی مقام عبدیت ہے اور یہ مقام حاصل کرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور عظمت کی دلیل بھی۔ اِنسان جب اس مقام پر متمکن ہوجاتا ہے تو اس کا دل غرور و تکبّر سے پاک صاف اور عجز و انکسار سے معمور ہوجاتا ہے، اور یہ متاعِ عجز و انکسار ہی اس کا سرمایۂ عزت و افتخار ہے۔

تقویٰ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں اور تقویٰ یا خشیتِ الٰہی کا خاصّہ عجز و انکسار ہے، لہٰذا مومن کے کردار، گفتار میں عجز و انکسار ہوتا ہے جو ایمان کا خاصّہ بھی ہے اور اس کی شناخت بھی۔ اور مومن اسے حُسنِ خلق اور سرمایۂ افتخار

سمجھتا ہے ۔ چونکہ آپؐ تقویٰ اور ایمان میں سب افرادِ نسلِ انسانی سے افضل تھے، اس لیے عجز و انکسار میں بھی آپؐ سب پر افضلیت و فوقیت رکھتے تھے حالانکہ آپؐ بیک وقت پیغمبرِ اعظم و آخر بھی تھے اور حکمران بھی، ہادی و مُرشد بھی تھے اور معلّم و سپہ سالار بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان آپؐ کے ایک اشارے پر مال وجان اور اہل وعیال قربان کر دینے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

عظمتِ انسانی کے بلند ترین مقامِ محمود پر متمکن پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کا اپنے عجز و انکسار کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنا، ہمیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ بندے کو عجز ہی سزاوار ہے اور اسی کو اپنے لیے وجۂ افتخار سمجھنا چاہیے۔

۱۲ - زُہد میرا پیشہ ہے :

زُہد کی حقیقت آپؐ کی سیرت کے حوالے سے مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہوجاتی ہے:

"جب تم فراغت پاؤ تو عبادت میں لگ جاؤ اور اپنے رب ہی کی طرف راغب رہو۔"

چنانچہ آپؐ کا عمر بھر یہ شعار رہا کہ آپؐ تحریکِ اسلام و تبلیغ کے امور سے فارغ ہوتے تو اپنے الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کی رضا و دید کے لیے اس کی بارگاہِ حسن میں پہنچ جاتے۔ اس کی یادِ تیرِ نیم کش کی طرح آپؐ کے قلبِ مبارک میں پیوست تھی، اس لیے کہ دوست کے بغیر کسی کروٹ آپؐ کو قرار نہ تھا۔ لہذا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر "بارگاہِ دوست" میں حاضر ہونا، اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہنا، کبھی عجز و نیاز سے رکوع و سجود کرنا اور کبھی آہ و فغاں اور گریہ و زاری سے دردِ محبت کا اظہار کرنا آپؐ کا دستورِ زندگی تھا۔

۱۳ - یقین میری قوّت ہے :

یقین کی تین قسمیں ہیں :

علم الیقین ، عینُ الیقین اور حق الیقین۔

اور یہی اس کے ارتقائی مدارج ہیں۔ علم الیقین عقل سے، عین الیقین مشاہدے سے اور حق الیقین تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دُھواں نظر آئے تو عقل آگ پر قیاس کرتی ہے اور اسے علم الیقین کہتے ہیں، لیکن آگ نظر آئے تو اسے عین الیقین اور جب آگ کے لمس سے اس کی حدّت و سوزش محسوس ہو تو اسے حق الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یقین چونکہ عقل، مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے اس میں علم، واقعیت اور صداقت کی قوّت ہوتی ہے۔ اس قوّت سے دل میں صدق و طمانیت، عزم و ہمّت اور صبر و استقامت ایسے خصائص پیدا ہوتے ہیں جن کی بدولت انسان بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور بڑے سے بڑے امتحان و تجربے سے گزر جاتا ہے۔ یقین کی قوّت ہی سے عقاید میں جلالت و حرکت پیدا ہوتی ہے، اور عقاید جلیلہ و محرّکہ ہی فرد و قوم کی قوّت و عظمت اور

ترقی و کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ یقین کی قوت کے بغیر عقاید و ایمانیات بے جان ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت نظریات و خیالات کی سی ہو جاتی ہے۔ مُردہ عقاید کی نوعیت "مردہ بدستِ زندہ" کی سی ہوتی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ مُردہ قومیں کیوں زندہ اقوام کی تقلید کرتی ہیں۔ قوتِ یقین سے محروم ہونے کے باعث جب کسی قوم کے عقاید مُردہ یا بے جان ہو جاتے ہیں تو اسے "مُردہ قوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قوتِ یقین کی بدولت جس قوم کے عقاید زندہ، جلیل اور حرکی ہوتے ہیں، وہ زندہ کہلاتی ہے، اور زندہ قومیں ہی قوت و سطوت کی مالک، ترقی کی راہ پر گامزن، زمانے کی راکب اور مُردہ قوموں کی قائد ہوتی ہیں۔

بحیثیت پیغمبرِ اعظم و آخرؐ اور رحمۃ للعالمینؐ کے آپؐ کا مشن ہمہ گیر و عالمگیر تھا اور آپؐ کو اس کی صداقت و اہمیت کا حق الیقین تھا، اس لیے آپؐ کا یقین اور اس کی قوت بھی اسی نسبت سے غیر محدود تھی۔ اس یقین نے بلاشبہ آپؐ کی عظیم و بے مثال کامیابیوں میں ازبس اہم کردار ادا کیا تھا۔

۱۴۔ صدق میرا حامی و سفارشی ہے :

امام راغب اصفہانیؒ کے نزدیک الصّدق کے معنی ہیں : دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر دونوں میں کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو طبعاً سچا ہو اور سچ بولنا اس کی عادت ہو۔ اصل یہ ہے کہ قلب اپنی فطری یعنی خالص و حسین حالت پر ہو تو اس میں صدق ہوتا ہے۔ یہ موضوعی صدق ہے جو معرضِ اظہار میں آئے تو معتبر بنتا ہے۔

انسان طبعاً سچ کو پسند کرتا اور اس سے مثبت طور پر متاثر ہوتا ہے، کیونکہ سچ میں حُسن کی تاثیر ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات اور کام میں صدق ہو، اُس میں قوتِ اثر و نفوذ ہوتی ہے، جو اس کے فاعل یا کرنے والے کی حامی و ناصر (شفیع) بن جاتی ہے۔ یہ مقولہ کہ "سچ کو آنچ نہیں" اسی حقیقت کا غماز ہے۔

جس طرح صِدّیق قرآن مجید کی رُو سے صالح و شہید بھی ہوتا ہے، اسی طرح نبی کا صِدّیق ہونا بھی ناگزیر ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السّلام انسان کے معلّم و ہادی اور مرشد و مربّی بن کر مبعوث ہوتے تھے، لہٰذا قدرت ان کے قلوب کی حفاظت کرتی اور انھیں ان کی فطری یعنی حُسن و صدق کی حالت پر رکھتی تھی۔ چنانچہ آپؐ بعثت سے پہلے بھی صِدّیق تھے اور "صادق و امین" کے لقب سے معروف تھے۔ آپؐ چونکہ اسلام کی انقلابی تحریک کے بانی و علمبردار تھے، جو دنیا کے تمام معاشروں کے لیے ایک چیلنج تھی، اس لیے آپؐ کو اپنے زمانے کی طاغوتی و فرعونی اور ہامانی و قارونی قوتوں کی زبردست مزاحمت و مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، اور ازبس خطرناک امتحانوں اور تجربوں میں سے گزرنا پڑا تھا، اور جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے، آپؐ کا یہ صدق تھا جس نے قدم قدم پر آپؐ کی حمایت و تائید کی اور لوگوں کے دلوں کو مرعوب و مسخر کرنے اور رام کرنے میں ازبس اہم کردار ادا کیا۔

۱۵- طاعت میری کفایت کرنے والی ہے :

طاعت سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے اور اس کے معنٰی ہیں : فرماں برداری، نظم و ضبط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام (اوامر و نواہی) کی تعمیل اور عبادت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا مطلب اس کا بندہ بن جانا ہے، اور بندگی سے خدا ملتا ہے، اور جسے خدا مل جائے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور اسے دنیا سے مستغنی کر دیتا ہے۔ اسے تصوّف میں فقر و غنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ میرے لیے کافی ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی طاعت میرے لیے کافی ہے۔ اس میں دو لطیف نکات مضمر ہیں :

ایک یہ کہ آپؐ کے اس ارشاد میں عجز و انکسار پایا جاتا ہے، جو آپؐ کا حُسنِ شعار تھا۔

اور دوسرا یہ کہ طاعت سے خدا ملتا ہے۔

بہرحال آپؐ کی ساری زندگی طاعتِ الٰہی میں گزری اور آپؐ کی سیرتِ طیّبہ طاعتِ الٰہی کا حسین نمونہ ہے، اسی لیے طاعتِ الٰہی کے ساتھ آپؐ کی اطاعت کو بھی مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا۔

۱۶- جہاد میرا خُلق ہے :

جہاد مقدور بھر جدّ و جہد اور مساعیِ جمیلہ سے عبارت ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں : الجھادُ والمُجاھدۃ کے معنی دشمن کے مقابلے میں پُوری طاقت صرف کرنے کے ہیں۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں :

۱۔ کفار سے ۲۔ شیطان سے اور ۳۔ اپنے نفس سے۔

اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جدّ و جہد کرنا، جس میں جنگ و قتال بھی شامل ہے۔

خَلق اور خُلق اصل میں دونوں ایک ہی ہیں، جیسے شَرب و شُرب۔ مگر ان میں فرق یہ ہے کہ خَلق بمعنی خلقت یعنی ہیئت اور شکل و صورت پر بولا جاتا ہے جس کا تعلق اور ادراک بصر سے ہوتا ہے۔ خُلق کا لفظ عادت اور خصلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کا تعلق بصیرت سے ہوتا ہے۔ آپؐ کی سیرتِ طیّبہ شاہد ہے کہ آپؐ کی ساری عمر مسلسل جدّ و جہد، مقدور بھر محنت و مشقت اور مساعیِ جمیلہ میں گزری۔ بعثت سے پہلے آپؐ کا جہاد نفس و شیطان کے خلاف تھا اور بعثت کے بعد اس میں کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کا بھی اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا آپؐ کی عظیم و کامیاب اور بے نظیر و مثالی زندگی ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ عظمت و کامیابی کی راہ مسلسل جدّ و جہد، مقدور بھر محنت و مشقت اور مساعیِ جمیلہ کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاد کو اسلام میں از بس اہمیت حاصل ہے۔

۱۷۔ نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے :

اصل میں ہے : قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ قرّۃ کے لغوی معنی ہیں ٹھنڈک، جو طمانیت و مسرّت کا حاصل ہے۔ الصّلٰوۃ کے معنی نماز ہیں، لیکن جس نماز سے دل کو طمانیت و مسرت کی ٹھنڈک پہنچتی ہے اسے حدیثِ طیبہ میں "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ احسان مقامِ شہود ہے۔ آپؐ نے اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ عبادت کے وقت انسان یہ محسوس کرے کہ گویا وہ اپنے اِلٰہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو وہ یہ محسوس کرے گویا اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حُسنِ حقیقی ہے اور بنی نوعِ انسان کا اِلٰہ اور ربِ رحیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جذبۂ محبت کی تشفّی اپنے حقیقی اِلٰہ کے قُرب و حضوری اور دید و لقا سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا ایک بہترین ذریعہ نماز ہے۔ نیز اس جذبۂ محبت کی تشفّی سے انسان کو ایسی طمانیت و مسرّت ملتی ہے جس کا حاصل ٹھنڈک ہوتا ہے آپ چونکہ مستقلاً احسان یعنی مقامِ شاہدیت پر متمکن تھے جسے "مقامِ محمود" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے آپؐ کو نماز میں ہمیشہ ہی "دیدِ اِلٰہ" میسر آتی تھی، اور اس کی بدولت آپؐ کا قلبِ مبارک کیف و سرور سے معمور ہو جاتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ نماز اصل میں وُہ ہے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنانا آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے، اور زندگی کا مقصود اور عبادات کا حاصل ہے۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں : ؎

آدمی دید است باقی پوست است ۔۔۔ دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

جُملہ تن را در گداز اندر بصر ۔۔۔ در نظر رو، در نظر رو، در نظر

یعنی انسان حقیقت میں شہود یا دید ہے۔ دید کا مطلب رُوبیتِ الٰہی ہے یعنی اپنے اِلٰہ کا دیدار۔ لہٰذا اپنے اندر دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کی خاطر ریاضت و مشقّت کے ذریعے اپنے وجود کو شمع کی طرح گھلا ڈالو (اور پھر مقامِ شاہدیت پر متمکن ہو کر) ہمیشہ اسے دیکھتے رہو۔

حاصلِ کلام یہ کہ آپؐ کے محوّلۂ بالا اخلاقِ حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرنا اور انھیں معرضِ اظہار میں لانا، نیز آپؐ کی سیرتِ طیّبہ کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہی اصل میں سُنّتِ حسنہ کی پیروی کرنا ہے اور یہی آرزوئے اسلام، غایتِ زندگی، مشیّتِ ایزدی اور فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح ہی انسان عظیم و کامیاب اور صاحبِ حُسن و سرور بن سکتا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ

محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں

"آیتِ بالا میں نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا نام بھی ہے اور حضورؐ کا منصب بھی بتایا گیا ہے، ہر دو اعتبار سے آیتِ بالا خصوصیّاتِ نبویّہ کی مظہر ہے۔"

واضح ہو کہ انبیائے کرام علیہم السّلام میں سے کسی نبی کا نام بھی ایسا نہیں پایا جاتا کہ وُہ نام ہی اپنے مسمّٰی کے کمالاتِ نبوّت کا شاہدِ عدل ہو، بہ طور نمونہ چند اسمأ کا ذکر کیا جاتا ہے:

آدمؑ : کے معنی گندم گوں ہیں، ابوالبشر کا یہ نام اُن کے جسمانی رنگ کو ظاھر کرتا ہے۔

نوحؑ : کے معنی آرام ہیں، باپ نے ان کو آرام وراحت کا موجب قرار دیا۔

اسحٰقؑ : کے معنی ضاحک، یعنی ہنسنے والا ہیں، ہشاش بشاش چہرہ والے تھے۔

یعقوبؑ : پیچھے آنے والا، یہ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ توام پیدا ہوئے تھے۔

موسیٰؑ : پانی سے نکالا ہُوا، جب ان کا صندوق پانی میں سے نکالا گیا، تب یہ نام رکھا گیا۔

یحیٰیؑ : عمر دراز، بُڈھے ماں باپ کی بہترین آرزوؤں کا ترجمان ہے۔

عیسیٰؑ : سُرخ رنگ، چہرہ گلگوں کی وجہ سے یہ نام تجویز ہُوا۔

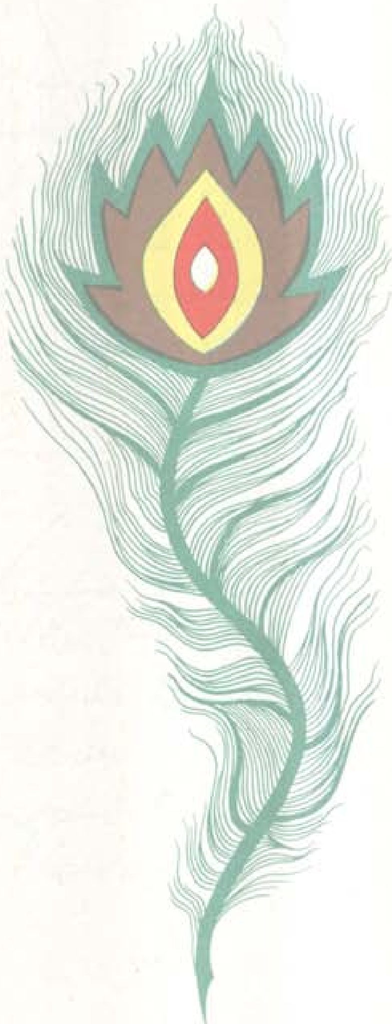
اسمأ بالا کو دیکھو اور ان کے معانی پہ غور کرو کہ وہ کسی طرح مسمّٰی کی عظمتِ رُوحانی یا نبوّت کی طرف ذرا سی بھی اشارت نہیں رکھتے۔

مگر اسمِ محمدؐ کی شان خاص ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

تم ہیں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا ہے۔ جس کو تمہارا
دکھی ہونا بہت شاق ہے اور جو تمہارا سکھ چاہتا ہے

(التوبة: ۱۲۹)



اصلاحِ معاشرہ

کارنامۂ سیرت، بے رحم تاریخ کی کسوٹی پر

مولانا ابوالکلام آزاد

وجودِ مقدس کی لاانتہائیت

آپ کو معلوم ہے کہ اس موضوع کی اہمیت ۔ اہمیت کا لفظ کافی نہیں، لاانتہائیت کا کیا حال ہے؟ جس وجودِ مقدس کے تذکار کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں، تاریخِ انسانیت کی کامل تیرہ[13] صدیاں اس پر گزر چکی ہیں اور شاید کوئی انسانی ہستی اس ذاتِ گرامی کے سوا ایسی نہیں گزری، جس کے تمام گوشہ ہائے زندگی کا عقلِ انسانی نے اس قدر سراغ لگایا ہو، جس قدر اس مقدس و عظیم الشان ہستی کے لیے لگایا جا رہا ہے مگر داستانِ حیات اس ذاتِ گرامی کی ہنوز نامکمل ہے۔ وجودِ مقدس کی حقیقت کا پتا لگانے کے لیے سمندر کی موجوں کو ایک کوزہ میں اور دریاؤں کی روانی کو اگر قطرے میں بند کیا جا سکتا ہے تو شاید ہی کوئی اس کا کھوج لگا سکے۔ میں کوشش کروں گا کہ اسی ایک قطرے کے حسن و وصف کے تذکارِ اقدس میں یہ وقت گزارا جائے۔

مطالعۂ سیرت کے طریقے

میں آپ کو جس رُخ پر لے جانا چاہتا ہوں وہ رُخ کون سا ہے؟ سیرت پاک پر نظر ڈالنے کے لیے ایک نہیں، بیشمار دروازے ہیں، جن کے ذریعے سے اس کی کبریائی کی سراغ رسانی کی جا سکتی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ کم سے کم اور قریب ترین راستے سے اس کی عظمتوں کا مطالعہ کرا سکوں۔ میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ وہ تمام اوصاف و واقعات جو سیکڑوں بار دہرائے جا چکے ہیں اور جن کو صدہا بار آپ کے کانوں نے سنا ہوگا انھیں نظر انداز کر دوں۔ میں کوشش کروں گا کہ کوئی ایسا نقطۂ نگاہ آپ کے سامنے پیش کروں کہ اس کے اعمالِ عظیمہ کو یقینی معیار پر رکھ کر آسانی سے جانچ سکے۔ ایسا معیار ہم اپنی طرف سے بنانا نہیں چاہتے، ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآنِ حکیم نے کیا کوئی ایسا معیار بیان کیا ہے، اگر بیان کیا ہے تو اس کے ماتحت اس کے اعمالِ حسنہ کا کیا حال ہے!

قرآنی معیار

جب ہم قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس وجودِ گرامی اور زندگیِ مقدس کے لیے بے شمار معیار ملتے ہیں، جس کو

خود آپ نے بھی بارہا سُنا ہوگا۔ ہاں! سنا ہوگا، لیکن اس کی گہرائیوں تک غور نہ کیا ہوگا۔

اچھا سُنو، ان میں سے ایک معیار وہ ہے جو سورۂ انبیاؑ میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝

(۲۱ — ۷ — ۱۰۵)

اور (دیکھو) ہم نے زبور میں تذکیر و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کی وراثت انھی بندوں کے حصے میں آئے گی جو نیک ہوں گے۔ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو عبادت گزار ہیں، یہ ایک بڑا ہی پیام ہے۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لیے کہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہو۔

اس آیت میں ایک معیار بتایا گیا ہے ہر معتقد کے لیے جو دیکھ لینا چاہے اور ہر منکر کے لیے جو پرکھنا چاہے۔

رحمۃ للعالمین

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وجودِ گرامی کا ظہور کس ماحول میں ہوا اور اس نے کیا نتائج نکالے! میں ابھی آپ کے سامنے چند کارنامے اس وجودِ مقدس کے پیش کروں گا فیصلہ خود آپ کے سامنے آجائے گا۔ "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ" اس کا ظہور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ رحمۃ للعالمین تمام نوعِ انسانی کے لیے رحمت۔ کسی ایک ٹکڑے، کسی ایک گوشے کے لیے نہیں تمام نوعِ انسانی کے لیے، مشرق و مغرب کے لیے، اسود و احمر کے لیے۔ کسی ایک خاص قوم کے لیے نہیں، اقوامِ عالم کے لیے اللہ کا یہ اعلان حق ہے۔ قرآن کے اس اعلانِ حق سے آج تک کوئی منکر بھی انکار نہیں کر سکا، بلکہ تاریخ کے جتنے ابواب و اوراق اُلٹے گئے اس اعلان کی صداقت و حقانیت واضح بلکہ واضح تر ہوتی گئی اور اس وجودِ گرامی کا رحمۃ للعالمین ہونا ہر اعتبار سے اور ہر نوعیت سے ثابت و درست ہوتا گیا۔ کسی محقق کی بھی خواہ وہ کتنا ہی مخالف ہو یہ مجال نہیں ہوئی کہ قرآن کریم کے اس معیار کو غلط ثابت کر سکے اور اس وجودِ اقدس کے اعمالِ حسنہ پر حرف رکھ سکے، اس کا ہر عمل بجائے خود دلیل بن کر پکارا کہ ہاں میں رحمت ہوں۔

اگر کسی نوعیت سے یہ رحمت نہ ہو تو پھر رحمت ہوتا کون اور ہے کیا؟ تاریخ کو کون جھٹلا سکتا ہے، کوئی بھی تاریخ اٹھاؤ تم دیکھو گے کہ ہر امتیاز، ہر پرکھ ایک اُبھری ہوئی نشانی ہے۔ ہر عمل عملِ خیر اور معیارِ رحمت ہے، ایسا کہ ہر نظر، ہر نگاہ، ہر دل، ہر دماغ اعتراف و تسلیم کرے گا کہ بلا شک و شبہ یہی وجودِ گرامی رحمتِ الٰہی ہے۔

بے کس اور مجبور انسان

دوسرا معیار، اس ذاتِ اقدس کے رحمۃ للعالمین ہونے کا قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت سے ثابت ہے جو سورہ

اعراف میں ملتی ہے۔ وہاں فرمایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ [1]

اس آیت کا مقصد و نتیجہ کیا ہے؟ پہلے تم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ "اصر" کے معنی کیا ہیں۔ عربی میں "اصر" کے معنی بوجھ کے ہیں۔ معمولی قسم کا بوجھ نہیں بلکہ ایسا ناقابلِ برداشت بارِ شدید جو کسی کو تہہ کر دے۔ اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی شخص سر پر بوجھ اٹھائے چلا جا رہا ہے لیکن شدتِ بار سے اس کی کمر جھکی چلی جا رہی ہے، خم ہوئی جاتی ہے۔ پھر اس طرح کی حالت کو عربی زبان میں اِصر کہتے ہیں۔

"اغلال"، اغلال کے معنی ہیں محنت و مشقت میں مبتلا، مفہومِ عام میں جکڑ بند رہنا، طرح طرح کے شدائد اور سختیوں میں، مصائب و آلام میں محصور اور قسم قسم کے دام، بیڑیاں، پھندے، جن میں انسان قید و بند میں مبتلا رہے۔

غور کرو! قبل ظہورِ اسلام کیا اقوامِ عالم کی بالکل یہی حالت نہ تھی؟ تاریخ کے اوراق سے پوچھو کیا وہ انھی آلام و مصائب کا علی الاعلان ثبوت پیش نہیں کر رہے؟ قبلِ بعثت کیا انسانی گردنوں میں طرح طرح کے پھندے، ان کے پاؤں میں قسم قسم کی بیڑیاں نہیں پڑی ہوئی تھیں؟ نسلِ انسانی کیا رنگ رنگ کی جکڑ بندیوں میں جکڑی ہوئی نہ تھی، ایسی کہ ان کی کمریں دوتہہ ہوئی جاتی تھیں اور اس وقت انسانی کاندھوں پر جو بوجھ لدے ہوئے تھے کیا اُنھوں نے ان کی زندگی کو تلخ نہیں بنا ڈالا تھا؛ قانون کے جو پھندے ان کی گردنوں میں، مذہبی آستانوں کے جو حلقے ان کے جسموں میں لپٹے ہوئے تھے، کیا ان سے ان کی جسمانی و روحانی تسکین پامال نہیں ہو رہی تھی؛ ہاں ایسا ہی تھا اس وقت کی صدہا اقسام کی مذہبی و قانونی جکڑ بندیاں ایک لعنت بن کر نسلِ انسانی و نوعِ بشری کے ساتھ چپک گئی تھیں اور انسانوں کے ساتھ انسانیت کا بھی خون ہو رہا تھا اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا، مستشرقینِ یورپ کی تحقیقی رپورٹ اور تاریخ کے اوراق بھی یہی کہتے ہیں۔

ظہورِ نبویؐ اور نویدِ امن

عین اسی عالمِ یاس میں ۵۷۰ء میں سرزمینِ مکہ سے ایک آواز بلند ہوتی ہے جو طالبانِ نجات کے لیے وجہِ نجات ثابت ہوتی ہے۔ یہ اعلان کوئی معمولی اعلان نہیں تھا۔ کیا اعلان؟ اعلان کہ ایک ہستی آئی ہے، کیوں آئی ہے؟ کرۂ ارضی پر بسنے والی نوعِ انسانی کے لیے پیامِ رحمت لے کر، زمین کی پیٹھ پر، اس طبقہ انسانی کے لیے، جس کی گردنوں میں ظالمانہ قانون کے پھندے اور پاؤں میں بے رحمانہ احکام کی بیڑیاں، کندھوں پر مصائب و آلام کے اور مشقت و مصیبت کے

---

[1] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ جس کا ترجمہ یہ ہے: جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے، وہ انھیں نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جس میں وہ گرفتار ہوں گے۔

ناقابلِ برداشت بوجھ لدے ہوئے ہیں، پیغامِ آزادی لے کر ہر اس کمر کے لیے جو بوجھ سے دوتہہ اور ہر اس گردن کے لیے جو طرح طرح کی ظالمانہ جکڑ بندیوں میں جکڑی ہوئی ہے، نویدِ امن لے کر آئی ہے۔

تاریخ کی شہادت

یہ دو معیارِ تفتیش ہیں جن کو لے کر میں بحث و نظر کے میدان میں آتا ہوں، حُسن و اعتقاد کے ساتھ نہیں، تحقیق و تدقیق کے اصول پر، اپنا نظریہ نہیں' تاریخ کا بے رحمانہ فیصلہ' بے لاگ فیصلہ، وہ تاریخ جو کبھی کسی کے سامنے نہ جھک سکے، جس کو دنیا کی کوئی قوت متاثر نہ کر سکے، جس کو دنیا کی کوئی دولت خرید نہ سکے، جس کو دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہ سکے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تاریخ کا فیصلہ کیا ہے ؟ وہ فیصلہ جو حقیقت و تفصیل کی بنیاد پر ہو، وہ فیصلہ نہیں جو اعتقاد و تاویل کی بنا پر ہو۔ پس اس سلسلے میں تمھارے سامنے دو معیاری چیزیں آئیں :

۱۔ ایک تمام کُرۂ ارض کے لیے رحمت

۲۔ دُوسرے وہ تمام بوجھ جن سے نوعِ انسانی کو جکڑ بند کر دیا گیا تھا اس سے نجات۔

یہ دو بنیادیں' یا قرآن کی بولی میں دو معیار ہاتھ آ گئے، دو کسوٹیاں مل گئیں، ہم دیکھیں گے کہ بے رحم تاریخ کا اسی معیار و کسوٹی کے مطابق فیصلہ کیا ہے ؟

سیلابِ ہستی میں چند حبابوں سے زیادہ حقیقت نہیں اگر ہم اپنے جذبات، اعتبار، پرستش و اعتقاد کو کام میں لائیں، بلکہ ہمیں حقیقت اور صرف حقیقت کی رُو سے معاملے کی چھان بین کرنی ہے۔ تاریخ کا یہ ایک کھلا ہوا باب اور عریاں حقیقت ہے کہ قرآن حکیم نے چند لفظوں میں جو نقشہ کھینچ دیا ہے، ساتویں صدی عیسوی میں نسلِ انسانی کا ہُوبہو وہی نقشہ، وہی فوٹو اور وہی حالتِ زار تھی۔ شاہانہ اقتدار بے جا اور قانونِ وقت نے نوعِ انسانی کو بے طرح جکڑ بند کر دیا تھا، میں تمھیں بتانا چاہتا ہُوں کہ اس کے ثبوت کے لیے تمھیں بہت دُور اور تاویلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف تاریخ کے چند اوراق کی ورق گردانی کے بعد ہی تمھارے سامنے اس وقت کا پُورا نقشہ آ جائے گا۔ اور ان جگر خراش واقعات کی صورت پر بھروسا کرتے ہوئے حیاتِ جنابِ محمد رسول اللہؐ کے ساتھ اس کا مقابلہ کرو تو تمہارے سامنے امن و راحت کی جو تصویر آئے گی کیا اس پر رحمت کے سوا کسی دوسری چیز کا اطلاق ہو سکتا ہے ؟ نوعِ انسانی کی دونوں حالتیں جب موازنے کے لیے ترازو کے دو پلڑوں میں رکھی جائیں، پھر ہم تاریخ کا دروازہ کھٹکھٹائیں، اس سے پوچھیں حقیقت کیا ہے ؟ انصاف کیا کہتا ہے ؟ اس وقت اقوامِ عالم کا کیا حال تھا ؟ ظہورِ اسلام کے بعد صورتِ معاملہ کیا ہے ؟

دورِ شہنشاہیت

تاریخ کا ناطق فیصلہ خود حقیقت بتلا دے گا۔ یہ کوئی پیچیدہ راز نہیں، اُبھری ہُوئی خصوصیت ہے۔ جب

دعوتِ اسلام کا نمود ہوا، اس وقت اُمم عالم کا کیا حال تھا؟ انھوں نے تمدن کی جو بنیاد رکھی تھی، کیا رکھی تھی، کس نے رکھی تھی؟ جواب صاف ہے کہ وُہ لاطینی قوم تھی، اسی کا تمدن اقوامِ عالم پر چھایا ہُوا تھا۔ روما تمدن ترقی پر تھا، قدیم یونانی ضوابط و قوانین، رسم و رواج، تمدن و معاشرت کا دور دورہ تھا اور ان تمام اقوام کا یہ حال تھا کہ آسمانی حکومت کا خاکہ تک برباد کر رہا تھا۔ نام نہاد قیصر تو تھا مگر حقیقت میں قیصر کا سایہ تک نہ تھا، مسیحی مذہب انتہائی عروج تک پہنچ چکا تھا، بجائے اس کے کہ غریبوں کی حکومت حق و صداقت کی سلطنت ہوتی، شہنشاہی مذہب ہو چکا تھا، ساتویں صدی عیسوی میں جب کہ عیسوی مصلحین کا ظہور ہوا تھا، اخوت، ایثارِ نفس، ہمدردی کے بجائے تمام و کمال جابرانہ نظام نافذ تھا، عقل و فہم اور ادراک کا نام لینا ان کی مجلسِ ملّی کے سامنے کفر تھا بلکہ صرف مختلف آسیب زدہ روحوں کی شہادت پر تمام معاملاتِ ملّی و مذہبی کا فیصلہ کیا جاتا اور جب یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ سچائی کیا ہے، تو تمام تحقیقات کا دار و مدار آسیب زدہ انسان کی شہادت پر تھا۔ وُہ اعلان کرتا تھا کہ فلاں گروہ کے ساتھ سچائی ہے، بس وہی فیصلہ، فیصلۂ ناطق تھا جو ان کی مجلسِ ملّی کے اعلان کی صورت میں نافذ ہو جاتا تھا۔

پاپائیت اور عقلِ انسانی کی مجبوری

پھر جب قیصریت کا مزیہ پوپ کو حاصل ہوا تو اس وقت سچائی کی شناخت کا معیار کیا قرار پایا؟ مختلف قسم کی جسمانی سزائیں، عقوبتیں اور اذیتیں، اگر کسی فرد یا جماعت نے سچائی کا دعویٰ کیا، پارلیمنٹ نے آزمائش کا معیار کیا منتخب کیا؟ کبھی لوہے کو آگ میں تپایا گیا اور ان کے جسم داغے گئے اس شدید عذابِ اذیت سے اکثر جان بحق ہو گئے۔ اگر کوئی بچ رہا تو قید کی کڑیاں جھیلنے کو، جیلوں کی کوٹھریاں آباد کرنے کو، مسیحی معیار اور کیا تھا؟ دریا میں ڈبویا جاتا تھا، ہاتھ پاؤں باندھ کر کبھی بند بکسوں میں اور بوریوں میں تنہا، کبھی وزن کے لیے پتھروں کے ساتھ، یہ اور اسی قسم کے اور صدہا اور ہزارہا ظالمانہ طریقے تھے ان کے معیارِ شناخت کے۔ بہرحال جس نے اقانیم ثلاثہ سے انکار کیا یا توحید کی دعوت دی، فیصلہ ہوا کہ سچائی کے دعوے کو جانچا جائے اور کس طرح جانچا اور پرکھا جائے؟ آگ اور پانی کے ذریعے، نہ عقل، نہ فہم، نہ ادراک، نہ بصیرت، بس آگ اور پانی۔ یہ تھے آسیب زدہ انسان کے فیصلے کے مطابق سچائی کے معیار، ان میں سے جو نہ جلتا یا کم جلتا یا نہ ڈوبتا یا ڈوب کر اُبھر آتا اس کے حق پر ہونے کی مُہر لگ جاتی۔ عقلِ انسانی کسی گوشے میں بھی کارگر نہ تھی۔

سرچشمۂ ضلالت

پس بتاؤ کیا خدا کی مخلوق اسی شدائد و مصائب کے لیے پیدا ہوئی تھی، کیا کوئی عقل ایک لمحے کے لیے تسلیم کر سکتی ہے کہ کسی مذہب اور توحید کی سچائی کی جانچ کے لیے یہ معیار صحیح ہے؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر کیا قرآن کی بولی میں یہ عذابِ الیم اور محن و مصائب، زنجیریں اور بوجھ نہ تھے، جو مسیحی نظامِ حکومت نے نوعِ انسانی کے پاؤں میں اور گردنوں پر ڈال رکھے تھے؟ تاریخ کے اوراق پہ ایک اچٹتی ہُوئی نظر ڈالو، ساتویں صدی عیسوی کے مسیحی نظامِ سلطنت کو پڑھ جاؤ،

تمھیں ان کے مذہبی اعمال وعقاید کی کیفیت، ان کے اوہام وظنون کی داستان، ان کی وحشت و بربریت، درشتگی و درندگی کا حال معلوم ہو جائے گا۔ میں نے تو صرف ایک اشارہ کر دیا ہے کتاب اللہ، اناجیل جس کی بنیاد وحیِ الٰہی پر تھی، باقی نہ رکھی گئی بلکہ چند انسانوں کے ہاتھ کی ایک تصنیف و تالیف ہو کر رہ گئی جو ہر وقت و ہر لمحہ ذاتی و نفسانی ضروریات کے لیے تبدیل و تحریف کی جا سکتی تھی۔ پوپ جو پطرس کا جانشین تسلیم کر لیا گیا تھا، چرچ اور تختِ روما کا مالک تھا اور اناجیلِ مقدس کی کتر بیونت کا بااختیار حاکم۔

ضلالتِ عیسائیت کا سرچشمہ کون تھا، کیا کتاب اللہ؟ نہیں۔ کیا عقل وفہم؟ نہیں۔ پھر کیا تھا؟ چند انسانوں کا غلط فیصلہ۔ وہ فیصلہ جو نفس وجنون کے زیرِ اثر نافذ ہوتا تھا۔ دلیل و اجتہاد سے معرّا فیصلہ۔ یہ بات سننے میں اتنی ہلکی معلوم ہوتی ہے اور آپ کے چہروں کے مشاہدے سے میں اس نتیجے پر پہنچ رہا ہوں کہ آپ نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ غور کرو! میں نے کتنی عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

وہ انسان جن کی عقل کے دروازے پر قفل لگ گیا اور جن کی قوتِ ادراک نابود ہو گئی طرح طرح کے توہماتِ نفسانی کا شکار ہو گئے۔ آسیب زدگی ان کے ہر ہر قدم، ہر ہر فعل وقول سے واضح ہے۔ کیا وہ اس قابل ہیں کہ عقولِ انسانی ان کے سامنے جھک جائیں؟ اور اگر عقلیں ان کے سامنے جھک جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ عقولِ انسانی ایک لمحے کے لیے ترقی و نشوونما پا سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہی حال تھا جب کہ قوانینِ الٰہی و شریعتِ نبوی مٹا ڈالی گئی تھی، اغراض و ہوائے نفس کا دور دورہ تھا۔ پس غور کرو جب عقل بالکل بیکار کر دی جاتے، جب کتاب اللہ میں تحریف کر کے انصاف کے دروازے بند کر دیئے جائیں، جب معیارِ حق وصداقت، چند آسیب زدہ انسانوں کے نفس پرورانہ احکام، فیصلے ہوں، تو نتیجہ کیا ہو گا؟ یہی حقیقت تھی چرچِ روما کی، ایک آسیب زدہ انسان کے ہاتھ میں سررشتۂ حکم آ گیا تھا اور نظامِ سلطنت فطری آزادیوں پر نہیں، ظالمانہ قوانین پر تھا۔ جب تم نے یہ اصل تسلیم کر لی تو نتیجہ نکال لو گے کہ ہر قسم کے ذہنی ارتقاء، عقلی نشوونما، یکسر یک قلم رُک گئی تھی۔ یقیناً افرادِ انسان کی ترقی رک گئی تھی، کیوں؟ تمام دینی و دنیوی معاملات کا دارومدار چند انسانوں اور پوپ ماؤف الدماغ پوپ پر تھا۔ یہود و نصاریٰ سب کے سب یکساں گمراہی میں مبتلا تھے۔ یہ تھا مسیحی نظامِ مذہب کا حال، جس نے نسلِ انسانی کی عقلی ترقی، رشد وہدایت کو یکسر روک دیا تھا، ضروری نہ رہا تھا کہ یہ دیکھا جائے کہ انجیل کا کیا مطلب ہے۔ اس کے سمجھنے اور اس کے فیصلے کا اختیار پوپ یا اس کی مجلس کو تھا۔ اپنی عقل کو تج کر، کتاب اللہ سے منہ موڑ کر! انسان، چند انسانوں کے ہاتھ میں جکڑ بند ہو گیا تھا۔ پوپ کی طرف سے احکام نافذ ہوا کرتے تھے کہ ہر انسان بطورِ خود معاملاتِ شرع میں غور وفکر کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ کام چرچ کا ہے، عوام کو اسی کے تابع رہنا چاہیے۔ اور یہی ہے وہ حقیقت جو آج بھی یورپ میں بطورِ اصل کام کر رہی ہے، عقولِ انسانی کو معطّل کر کے اس کا فرمان یہ تھا کہ جس کو میں حلال کروں وہ حلال اور جس کو میں حرام کروں وہ حرام۔ یہی تھی اور ہے وہ بنیادی خرابی جو نسلِ انسانی کی ترقیاتِ ذہن وعقل کو کھائے جا رہی تھی، اور ان کے نشوونما ارتقا کی جڑوں کو کھوکھلی کر چکی تھی اور اس کی طرف قرآنِ حکیم نے

"اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ" والی آیت میں اشارہ کیا ہے۔ یہ اعجاز و بلاغتِ قرآن ہے کہ بڑے بڑے اہم واقعات و حالات کو مختصر و جامع الفاظ میں بیان کر کے وقت کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

مسیحی دنیا کے نام اسلام کا پیام

کوئی غیر طرفدار مورخ ہو' آئے اور جانچے، کیا سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو اس وقت کی حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے" وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ[2]" کی صداقت سے انکار کر سکے گا؟ اسی قدر نہیں قرآن نے جابجا اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یمن کے بشپ و بطریق کی معرفت مسیحی دنیا کو جو پیغام دیا تھا، کیا تھا؟ تم نے اگر کبھی قرآن کھول کر پڑھا ہوگا اور ساتھ ہی غور کرنے کی تکلیف بھی کی ہوگی تو سورۂ آلِ عمران میں اس پیام کو پایا ہوگا:

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

(۶۴ : ۳)

(اے پیغمبرؐ! تم یہود اور نصاریٰ سے کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو اور) اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے یکساں طور پر مسلّم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنا لیا ہے۔

یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں سے خطاب ہے، طلب کسی اور چیز کی نہیں ہے، دنیا کی امداد، نہ ذات کے لیے فائدہ کی، بلکہ مطالبہ ہے۔

اشتراکِ عقیدہ کے لیے، توحید پر اتفاق کے لیے، یعنی اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہ، خدا کی چوکھٹ کے سوا کسی انسانی بارگاہ پر خواہ وہ ظاہری ٹھاٹھ میں کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو' عبادت کی پیشانی نہ جھکائیں۔

دوسرے "لَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا" عقیدتاً بھی، باطن میں بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ گویا ظاہر ہو

---

[1] سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۱ کا ابتدائی حصہ۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: "ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے علما و مشایخ کو پروردگار بنا لیا۔"

[2] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷، جس کا ترجمہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے۔

تب ، باطن ہو تب ، دونوں حالتوں میں اسی کی عظمت ، اسی کی کبریائی ، اسی کی الوہیت کے سامنے ، نیاز کا سر یا اعتراف کا قلب جھکے ، اور تمام باطل وخود ساختہ معبودوں اور مدعیانِ جبروت طاقتوں کو ٹھکرا دیا جائے ، خواہ یہ آواز چرچوں سے بلند کی جائے یا تخت ہائے شہنشاہی سے ۔ اور یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود نہ بنائیں" وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ "

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی تفسیر

قرآن کی بولی میں رب بنا لینے کا کیا مطلب ہے ؟ میں خود نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ نے اس کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اور اس سے جو مراد لی ہے میں وہی تمھیں بتاؤں گا ۔

عدیؓ بن حاتم کی روایت ہے جو پہلے عیسائی تھے ، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ میں بھی حاضرِ خدمت ہوا ۔ حضورؐ کے اعتراض پر میں نے عرض کیا کہ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے کہ ہم پادریوں اور راہبوں کو رب بنا لیتے ہیں ۔ فرمایا : کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جس چیز کو اللہ نے تم پر حلال کیا تھا ، تمھارے احبار و رہبان نے اپنے نفس کی خاطر اس کو حرام کر دیا ہے اور جس چیز کو اللہ نے تم پر حرام ٹھہرایا تھا ، انھوں نے اپنی لذتِ چشم وجسم کے لیے اسے حلال کر لیا ہے اور اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قانونِ حلال وحرام کو بالکل بدل ڈالا ہے ؟ عدی نے کہا : ہاں یہ تو ٹھیک ہے ۔ فرمایا : بس یہی مطلب رب بنا لینے کا ہے ۔ ناقص کو کامل سمجھ کر اختیار کر لیا ہے اور یہ اس لیے کہ جو اوصاف ہمیں اللہ کے لیے خاص رکھنے چاہییں تھے ۔ انسانی عقل کے ہاتھ میں تسلیم کر لیے گئے ۔ ذرا غور تو کرو کیا یہ چیز خود نیچر کے بھی صاف وصریح خلاف نہیں ہے ؟ اچھا یہ تمام تصرفات جو تم نے دینِ الٰہی میں کر لیے ہیں ، کیا اس کی دلیل بھی تمھارے پاس ہے ؟ اللہ کے کسی کلام میں ، کسی نوشتۂ وحی میں کسی پیغمبر کی تعلیم میں ، رسولوں کی کسی تبلیغ میں ، کہیں سے بھی کوئی دلیل ہمیں دکھاؤ کہ چرچ کے اربابِ اختیار نے احکامِ الٰہی کو نہیں بدلا ، اور وہ اس کی بے چون وچرا تعمیل کر رہے ہیں ۔ مگر تم نہیں دکھا سکتے ، بلکہ اس کے برخلاف ہزارہا سند و دلیل بتائی جا سکتی ہیں کہ پوپ اور دوسرے احبار و رہبان ارباباً من دون اللہ کے زعمِ باطل میں نت نیا قانون فطرت ونیچر وحکمِ الٰہی کے خلاف وضع کرتے اور اُمّت پر مسلط کرتے رہے ہیں ۔ مگر سرِ دست میں ان گوشوں میں نہ جاؤں گا ۔

یورپ کا دورِ نشاۃِ ثانیہ

بہرحال ، چند قدم اور آگے بڑھیے ، نتیجہ بہت جلد سامنے آجائے گا ۔ مورخینِ ازمنۂ وسطیٰ کہتے ہیں کہ سولھویں صدی عیسوی ، اصلاحاتِ چرچ کا اور امنِ عالم وتغیرِ معتقدات کا زمانہ ہے ، جس میں پوپ ، شاہ اور عوام کے لیے قوانین نافذ ہوئے اور اس دور کو نشاۃِ ثانیہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں ، اسے موجودہ دور سے بہتر کہتے ہیں ۔ لیکن یہ تاریخ کی دُہرائی ہوئی اور پامال حقیقت ہے اور جسے میں واقعات وتفاصیل کے ساتھ دُہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا ،

تم کالج کے طالب علم ہو تمھارے سامنے لائبریری کی کتابیں موجود رہتی ہیں کسی ایک تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لو اس میں مندرج واقعات و حقایق اس کی تائید کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ خونریزی کے حوادث، ظلم کی کہانیوں اور ستم رانیوں کے احوال سے ہر تاریخ بھری پڑی ہے پوپ اور چرچ نے جتنے ستم یہودیوں اور عام باشندگانِ ملک پر اس وقت توڑے شاید ہی کسی زمانے میں ایسا ظلم و ستم ہوا ہو، اور یہ سب مذہب و اصلاحِ عقیدہ کے نام پر ہوا، اور میں بے سند و بے دلیل نہیں کہتا، بلکہ یہ مورخینِ یورپ کے قلم کے بکھرے ہوئے حقایق ہیں۔

کلیسا کا مصلح

غور کرو، سب سے پہلی دستک کون سی تھی جو یورپ کے سامنے علم و عقل نے اصلاحِ کلیسا یا چرچ ریفارم کے نام سے دی؛ سولھویں صدی عیسوی میں، اس بارے میں لوتھر کی پہلی آواز تھی جو اس راہ میں اُٹھی۔ تمام مورخ متفق ہیں کہ عمل و علم کی راہ میں لوتھر کی آواز پہلی روشنی تھی جو کلیسا کی سیہ کاریوں، ستم رانیوں کے بالمقابل عوام کے سامنے آئی، لیکن دیکھو کہ اس تعلیم کا ماحصل کیا ہے؛ لوتھر نے للکارا، دین کی تعلیم کے بارے میں چرچ کا رویّہ غلط ہے۔ اس کو خلش پیدا ہوئی کہ حق کا معیار اور سچائی کا راستہ کون سا ہو سکتا ہے، کتاب اللہ یا پوپ کی ذاتی رائے اور اس کے احکام؛

دراصل اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ پوپ نے مغفرت کے پروانے دینے شروع کیے، یعنی جتنی معصیت کریں، کوئی فکر نہیں، جتنا بھی کوئی فسق و فجور، عیش پرستی، نفس پروری کرنا چاہے کرے، پوپ سے مغفرت کے پروانے نقد قیمت دے کر خرید لے اور فکرِ عقبیٰ سے آزاد ہو جائے۔ مغفرت کی یہ نقد تجارت اتنی بُری اور بڑھی ہوئی تھی اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں بلکہ امرِ واقع ہے کہ تمام گوشہ ہائے ملک میں باقاعدہ ایجنٹ پوپ کے پھیل گئے تھے اور انھیں پوپ کے پروانے کے ماتحت ہر قسم کے سفید و سیاہ کا اختیار تھا۔

نظامِ عالم یکسر درہم برہم ہو گیا تھا احکام و قوانینِ الٰہی پس پشت ڈال دیئے گئے تھے، کلیسا کے اربابِ حل و عقد، بست و کشاد اپنی من مانی کارروائیوں کا ایک جال تمام ملک میں بچھائے ہوئے تھے اور دادِ عیش دے رہے تھے۔ ان کے خود ساختہ قوانین نے ایک اصولی شکل اختیار کر لی تھی جس کی پابندی ہر متنفس کے لیے لازمی تھی۔ لوتھر نے اسی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، بحث و مناظرہ کی نوبت پہنچی، اربابِ کلیسا کے شکنجے میں تنگ آئے ہوئے لوگوں نے جن کی تعداد قلیل تھی، لوتھر کا ساتھ دیا مگر اس طرح کہ خوف و ہراس سے ان کا بُرا حال تھا۔ خوف بھی ان کا جو زمین پر مظہرِ خدا ہونے کے مدعی تھے، اختیارِ مکمل کے مالک تھے۔ پھر ان کے کارپردازوں کا، پھر ان کے متبعین کا، بدقسمتی سے جن کی تعداد شمار سے خارج تھی۔

بہرحال بحث یہ تھی کہ احکام کس کے قابلِ قبول ہیں؛ چرچ کے یا انجیل کے؛ لوتھر نے کہا نہیں ہم اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسولؐ کے فرمان کی فرمانبرداری کے مکلف ہیں۔ ایمان یہی ہے خدا اور اس کے رسول کے مان لینے کے معنی یہی ہیں، کسی انسانی رائے کو، خواہ وُہ انسان کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو، اگر صاحبِ وحی نہیں ہے تو اس کا کوئی درجہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ ہمارا اعتقاد اللہ اور اللہ کی کتاب پر ہے، اور عقلاً ہونا بھی چاہیے۔ کلیسا اور کلیسا پرستوں میں ایک

جلسۂ عام کے اندر لوتھر کی یہ تقریر آگ کا کام کر گئی۔ طے کر لیا گیا کہ اس نئی دعوت و اصلاح کو پامال کرنا چاہیے، خون بہا اور بے شمار کلیسائی تلواریں کھنچ گئیں اور ادنیٰ اشتباہ پر لوگوں کی زندگی موت سے تبدیل ہو گئی۔ سر قلم ہوئے، گھر کے گھر برباد کر دیے گئے، بستیاں کی بستیاں ویران کر دی گئیں تاہم تاریخ کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اربابِ کلیسا کے ظلم و جبر کے باوجود مُصلح لوتھر کی دعوت پامال نہ کی جا سکی، مخالفت و شرارت کے باوجود یہ صدا اٹھی، بلند ہوئی اور پھیلی تا آنکہ تقریباً نصف مسیحی دنیا پر چھا گئی۔

ساتویں صدی عیسوی کا عہدِ سعادت

لیکن سوال سولھویں صدی عیسوی کا نہیں ساتویں صدی عیسوی[1] کا ہے جبکہ یہ اصلاح و دعوت ہی فنا ہو گئی تھی، شہنشاہ لوئی اور ایڈرین (ADRIAN) نے کلیسا کے اختیار میں سب کچھ دے دیا تھا اور ہر طرف پوپ و چرچ کا دور دورہ تھا۔ ظلم و شرارت، طغیانی و سرکشی اپنی ہولناکیوں اور ہوسناکیوں کے ساتھ پھیل پڑی تھی کہ ناگاہ صحرائے عرب کے دامن سے ایک مصلح کی آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ پکار محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدا تھی:

"یٰاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ"

دراصل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صدا جو اللہ تعالیٰ کی آواز اس کی تائید و نصرت کے ساتھ بلند ہوئی تھی، رافتِ نبویؐ اور رحمتِ الٰہی کا ایک عام اعلان تھا بے چین و مضطر دنیا کے لیے ایک پیامِ امن تھا، اشرار کے لیے ایک طبلِ جنگ تھا۔ مسیحی دنیا میں ایک برگزیدہ کی دُعا اور دُوسرے مقرب کی بشارت کے ظہور کی نشانی تھی۔ قبولِ عام بڑھ بڑھ کر قدم لیتی ہے، حقانیت و سچائی کے متلاشی جوق در جوق آتے ہیں، تسکین و تشفی ہوتی ہے۔ خیالات میں، اعتقادات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ سعید ارواح پرچمِ نبویؐ کے نیچے جمع ہوتی چلی جاتی ہیں یدخلون فی دین اللہ افواجًا کی شان متشکل ہوتی ہے۔ ذاتِ نبویؐ کا ظہور، قرآن کا نزول اپنے جلوؤں کی تابانی سے مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب، کوہ و صحرا، دشت و جبل منور ہو رہے ہیں عجیب ساعت ہے عجیب عہدِ سعادت ہے، عجیب خیر و برکت اور امن و امان کا دور دورہ ہے۔ جان محفوظ، مال محفوظ، عزت محفوظ، آبرو محفوظ۔

تاریخِ عالم کی مسلّمہ حقیقت

خونخوار و باطل پرست سایۂ رحمت میں آ گئے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ امن و آسائش کی بسائی ہوئی یہ نئی دنیا جس ذات کی رہینِ منت ہے اس کا نام محمد رسول اللہ ہے۔ اور تنہا میں نہیں کہتا، اپنی طرف سے

---

[1] ساتویں صدی عیسوی بعثتِ نبویؐ کے لحاظ سے ہوئی ورنہ ولادت باسعادت تو چھٹی صدی عیسوی (یعنی ۵۷۱ء) کا عظیم الشان واقعہ ہے۔

نہیں کہتا۔ تاریخ عالم کی اور بے مہر تاریخِ عالم کی مسلّمہ و مصدّقہ حقیقت بیان کرتا ہوں جس کو بے گانوں اور اغیار نے بھی مانا اور تسلیم کیا ہے۔

ایک گروہ اس سلسلہ میں تاریخ کا اور آپ کے سامنے بے نقاب کر دوں کہ موجودہ مسیحی دنیا انجیل کو، اور موسائی تورات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سبب ہے نوعِ انسانی کے تہذیب و تمدن اور امن و امان سے آشنا بنانے کا، حالانکہ ان کے اپنوں تک کی تاریخ ان کے اس قول کی تصدیق نہیں کرتی، جس کا ایک نمونہ میں اوپر بیان کر آیا ہوں، مزید توضیح کا نہ جلسہ حامل ہے نہ وقت مقتضی، نہ میری صحت کی اجازت۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اُفق پر بجز دستِ محمدیؐ کے کوئی دوسرا ہاتھ نہیں۔

قدیم ہندوستان

جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے ہندوستان ایک قدیم تمدّن کا گہوارہ ملک ہے۔ اس کی تمدن و تہذیب کی اولیت و عروج تاریخِ عالم کے نزدیک، تمام ممالکِ آباد و سطحِ ارضی سے ممتاز اور سابقون الاوّلون میں شمار ہوتا ہے۔ تاریخ نے اس کے حالات کو جب سے احاطہ کیا ہے، اس کے دورِ اوّل پر جو روشنی پڑتی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمنی رسم و رواج وہ طریقِ حکمرانی تھا کہ جس کا نظم و نسق اور عزل و نسخ برہمن مدبرین اور پیشواؤں کے ہاتھوں رہا۔ اس تہذیب و تمدن کے آثار اب بھی بعض مقامات سے ظاہر ہیں۔ بعض کتابوں میں درج ہیں اور متعدد زبانوں پر جاری، برہمنی تہذیب کو جب زوال آیا تو گوتم بدھ کی تعلیمات اور اس کا مذہب ملک و مذہب پر غالب آیا اور تمام ہندوستان میں پھیل گیا۔ ابھی یہ تہذیب و تعلیم اپنے پاؤں مضبوط نہ کر سکی تھی کہ پھر انقلاب ہُوا، کشت و خون کا بازار گرم، اور دار و گیر، رسن و زنجیر کی ہنگامہ آرائی مدت تک رہی، بالآخر یہ بلوہ ایک نئے مذہب و نئی تہذیب کے جنم پر منتج ہوا جو برہمنی دور کی ایک ترقی یافتہ تحریک و تعلیم تھی۔ یہ تحریک شنکراچاریہ کی تحریک تھی اور اس کا ظہور دکن میں ساتویں صدی عیسوی میں ٹھیک اس وقت ہوا جو اسلام کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس تعلیم نے بھی برہمنی قوانین کے مطابق تقسیمِ ذات کو تسلیم کر لیا۔ نوعِ انسانی کی اس تقسیم پر، جو بالکل غیر فطری و غیر قدرتی تقسیم تھی۔ اقوام و افراد میں برتری و تفوق کا مُردہ تخیل پھر عود کر آیا، نسلی امتیاز اصلی اور عملی اعزاز بے اصل و بے قدر ہو گیا حالانکہ شرف و خصوصیت عمل پر موقوف ہے، نسل و غرورِ نسل کوئی چیز نہیں، بخلاف اس کے اسلام نے اعلان کیا ہے کہ جسمانی و روحانی اوج و عروج عمل پر منحصر ہے نسل کی کوئی گنتی نہیں۔ عمل میں جو شخص یا جماعت جتنی پاکباز ہے اس کا درجہ بھی اتنا ہی بلند و بالا ہے اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ۔۔۔[1] میں اس کی طرف اشارہ ہے اور "اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" اس پر ایک مہرِ تصدیق۔

---

[1] آیت اور اس کا ترجمہ یہ ہے: اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۳۴-۱۳) اے آلِ داؤد! شکر گزاری کے کام کرو اور میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہیں۔

بہرحال فطری حقیقت کے خلاف اس تعلیم نے ذات پات (CAST SYSTEM) کو اپنے یہاں جائز تسلیم کیا، اور بنیادی عقیدہ کے طور پر اسے داخلِ مذہب کیا۔ تفریقِ نسل و تقسیمِ ذات کے اس منظر کو سامنے لاؤ اور اس کا خلاصہ نکالو۔ خلاصہ یہ نکلا کہ تقسیم ذات جس نے اب غلو کر کے عصبیت کا درجہ لے لیا ہے۔ غرورِ نسل کے نتیجہ، افتراق و انشقاق پر منتج ہوئی ہے۔ وہ ابتداءً پیشوں کی تقسیم اور عمل کی بنا پر ممکن ہے کہ پیدا ہوئی ہو۔ ایک عمل لڑائی کا، ایک عمل تجارت کا، ایک عمل نچلے کاموں کا، یہ تقسیم گویا ایک بہت زیادہ گہری اعتقادی نیت پر تھی حالانکہ دنیا نے کہیں اپنے اصول' دنیاوی امور کے لیے بھی نہیں وضع کیے، مذہب تو ایک بالاتر اعتقادی اور روحانی چیز تھی۔ پھر ان کی ایک ایسی بھی جماعت پیدا ہوئی جس نے معاشرتی و دینی اصلاح کے سلسلے میں تناسخ کا عقیدہ قایم کیا۔

عقیدۂ تناسخ

تناسخ کیا ہے؟ بار بار آنے کا عقیدہ، کیوں اور کس طرح؟ اپنے کرم کے اعتبار سے عذاب کے طور پر انسان مختلف جسموں میں، جن میں حیوانات اور نجس و ناپاک جانور بھی شامل ہیں، مرنے کے بعد اس کی روح جنم لیتی رہے۔ عذاب و ثواب کے بارے میں یہ ان کی بنیادی اینٹ تھی۔ کرم اچھے ہوتے ہیں تو کسی اچھے جنم کے لیے اچھا جانور منتخب ہوتا ہے، بلحاظ عہدہ جو خاندان اونچا ہے اس میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ راجہ ہو سکتا ہے، برہمن ہو جا سکتا ہے' یہ اس کی معراج اور حدِ کمال ہے، اگر اس کی ساری عمر پاپوں میں بسر ہوئی ہے تو اسے شودر اور نیچی قوم میں جنم ملے گا۔ اور اگر معصیت اس سے زیادہ ہے تو نجس جانوروں تک میں اس کو داخل ہونا پڑے گا۔ ان کا یہ اعتقادی اصول اور جزا و سزا کا تصور کسی بہت ہی گہرے لیکن گمراہ و خود غرض نے ایجاد کیا۔ مزید جسارت بھی اس درجہ کی کہ کہہ دیا کہ یہ خدائی اصول ہیں اور فطرت نے اُن پر مُہر لگا دی ہے۔

یہی وہ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم اصول و ضوابطِ مذہب تھے جن کے خلاف حال میں ڈاکٹر امبیدکار نے آواز بلند کی ہے۔ ڈاکٹر امبید ایک تعلیم یافتہ اور روشن دماغ مدبّر و مفکر ہے اس نے سمجھ لیا کہ جو اصول اور اصول بھی وہ جو مذہب کے نام پر وضع کیے گئے ہوں، ہرگز مذہبی بنیادی اصول ہو ہی نہیں سکتے، نہ فطرت کی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے، نہ فطرت کا یہی نشا ہے یہ یقیناً انسانی تقسیم ہے اور خود غرض انسانوں کا وضع کردہ غلط در غلط ضابطۂ تفوق پسندی و قانونِ حکمرانی، ڈاکٹر امبیدکار کے اس اعلانِ عام نے ہندو دنیا میں جو کرب و اضطراب پیدا کر دیا ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں اور نفس و غرض کے بندوں کو اس اعلان پر حواس باختہ ہونا بھی چاہیے۔ مدتِ مدید سے جس قوم نے ایک طبقۂ انسانی کو غلام اور بندۂ بے اختیار بنا رکھا ہو ان میں بیداری پیدا کر کے ان میں اپنی قیمت و قدر کا احساس پیدا کرنا' جرم ہی ایسا ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بحیثیت قائدِ قوم و پست اقوام کے نمائندے کے ڈاکٹر امبیدکار کا یہ اعلان رنگ لائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں تاریخِ انسانیت کا یہ انقلاب یقیناً اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم انقلاب ہوگا۔ اگر ڈاکٹر امبیدکار کے استقلال نے

نوعِ انسانی کے پاؤں سے غلامی و پستی کی ان بوجھل زنجیروں کو کاٹ ڈالا۔

بیسویں صدی کا یہ اعلان کہ ہر انسان ' انسان ہے اور خدا نے ترقی کا دروازہ ہر شخص پر برابر کھول دیا ہے ، تقریباً نصف صدی یعنی گزشتہ پچاس برس سے یہ آواز جو مختلف گوشوں ، مختلف پلیٹ فارموں سے وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہے ، بلاشبہ اصلاحِ عقیدہ میں یہ کوشش نہایت قیمتی ہے لیکن شودر کے لیے عام مجرمانہ خاموشی بدستور قایم ہے ، پس اس لحاظ سے یہ کوشش بھی بے سُود ہے ، اس سے کیا ہوتا ہے ؛ بنیاد پر جو مُہر ہو چکی ہے اس کو کوئی مٹائے۔

ہندوستان کا عہد سعادت

ہندوستان کا یہ اعتقاد کہ ہمارے مذہبی اصول پر فطری مُہر لگ چکی ہے اصل زمانہ اس کی نشو و نما کا گیا ہے ؛ ٹھیک وہی جو ظہورِ اسلام کا زمانہ ہے ۔ پیروانِ بُدھ بھی تناسخ کے قائل ہیں۔ پس مسئلۂ تناسخ جب تک بال برابر موجود ہے وہ نہیں مٹ سکتی۔ نہ ان کی اصلاحی کوئی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے تا آنکہ انسان کا درجہ بحیثیت ایک انسان کے آزاد اور برابر کا نہ تسلیم کر لیا جائے اور نوعِ انسانی میں پستی و بلندی ، اونچ نیچ کی تقسیم کو اٹھا نہ دیا جائے اور ترقی کی راہوں کو ہر شخص پر کھلی ہوئی تسلیم نہ کر لیا جائے۔ پس گویا اسلام کی نمود کے وقت ہندوستان بھی گوناگوں سختیوں اور جکڑ بندیوں میں مبتلا تھا اپنی ساری سختیوں کے ساتھ ہندوستان میں تاریخ کی اُبھری ہُوئی حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں ۔ ظلم و تعصب، تنگدلی و مذہبی گمراہی کی وجہ سے نوعِ انسانی پر سب سے گہری ضرب کون سی لگائی گئی ؟ تاریخ انسانیت پر زبردست انقلابی و اصلاحی کیفیت کب ثبت ہُوئی ؟ ایک انسان کا درجہ بحیثیت انسان کے دوسرے انسان کے برابر تسلیم کیا گیا ؟ تب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا :

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔ (۴۹ : ۱۳)

اے لوگو ! ہم نے دنیا میں تمھاری خلقت کا وسیلہ مرد اور عورت کا اتحاد رکھا اور نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا اس لیے کہ باہم پہچانے جاؤ (ورنہ دراصل یہ تفریق و انشعاب کوئی ذریعۂ امتیاز نہیں) اور امتیاز و شرف اس لیے ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ متقی ہے بلاشبہ اللہ علیم و خبیر ہے۔

اپنی پیدائش و خلقت کے اعتبار سے نسلِ انسانی ایک ہے ، کسی کو کسی قسم کی ترجیح نہیں۔ البتہ شعوب و قبائل میں تقسیم اس لیے کر دیے گئے ہو کہ تمھاری شناخت ہو سکے ۔ کیسی شناخت ، صرف یہ کہ یہ شخص ہندی ہے ، یہ مصری ہے ، یہ یورپین ہے ۔ باقی رہا یہ کہ کسی انسان کو اپنی نسل پر دوسرے انسانوں کے مقابلے میں فخر و غرور ہو تو یہ منشائے فطرت نہیں ،

گمراہی ہے، ضلالت ہے، اس کی تردید بھی فرمادی۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ ذاتی وجاہت و نسلی غرور کوئی چیز نہیں تم میں سب سے زیادہ معزز و مکرم وہ ہے جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ راست باز و پاکباز ہے۔ کوئی قید نہیں، کوئی تخصیص نہیں کہ کون خصوصیت کے ساتھ اعزاز و اکرام کا مستحق ہوگا، مگر وہ جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ راستباز، اور اپنے عمل میں پاکباز ہے۔

پس جتھوں اور گروہوں کی تقسیم اس بنا پر ہے، لتعارفوا۔ کس ملک و خطہ کا باشندہ ہے! اس لیے نہیں کہ شودر و برہمن کا امتیاز ہو، اس پہچان کے واسطے کہ اس کی نسل فلاں ہے اس کی نسل فلاں، پس ذاتی امتیاز کیوں ہو۔ کیا اس امتیاز کی بنا پر کسی کو حقیقت مل جاتی ہے؛ نہیں، ایک منٹ کے لیے نہیں۔ بزرگی اور امتیاز کس انسان کے حصہ میں آیا؛ ایک اور صرف ایک اس انسان کے حصے میں جو "عند اللہ اتقاکم" کے ماتحت آگیا ہو۔

عرب کا عہدِ جاہلیت

اب ہمیں وہ گہرائیاں دیکھنی چاہئیں جو اس حکم و حقیقی فطری تقسیم میں مضمر ہیں، خود عرب کا ظہورِ اسلام کے وقت کیا حال تھا؛ عرب کی سرزمین، عرب جاہلیت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ ایک ایک بچے کو دعوائے فضیلت و تمکنتِ خاندان تھا کہ ہم شرافت و بسالت کے پیکر اور اصیل ترین نسل و خاندان کے افراد ہیں، انھیں غرورِ نسلی میں اس طرح غلو تھا کہ اظہارِ حال و بیانِ حقیقت کے لیے گڑے ہوئے مُردے قبروں سے اکھاڑ کر فخریہ بوسیدہ ہڈیوں کی نمود و تشہیر سے بھی باز نہ رہتے تھے۔ اسی قسم کی اور صدہا نسلی غرور کی مثالیں مستند تواریخ کے اوراق میں آج بھی موجود و محفوظ ہیں۔ وقت نہیں ہے ورنہ میں ان پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالتا۔ عقلی و نسلی فخر و غرور کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی بات پر پچیس برس تک خونریزی و خونخواری کا میدان گرم رہا۔ مرتے وقت لوگ اس بارے میں وصیت تک کر جاتے۔

قرآن کے اس اعلان پر ان کی ذہنیت، ان کے نسلی غرور، ان کے طبعی نقائص اور وحشت و درندگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ان کی تمدنی، معاشرتی و مذہبی ہر قسم کی زندگی بآسانی سمجھ لی جا سکتی ہے جب ان کے اعمال کے پیشِ نظر وحیِ الٰہی نے کہا:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا (۳ : ۱۰۳)

اللہ نے تمھیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو، تمھارا حال یہ تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے (دشمنی کی وجہ سے تمھارا حال یہ تھا کہ آگ سے بھری ہوئی خندق ہے اور اس کے کنارے کھڑے ہو (ذرا پاؤں پھسلا اور شعلوں میں جا گرے) لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھیں ان حالات سے نکال لیا۔

قرآن تاریخ یا قصّہ کی کتاب نہیں، وہ واقعہ بیان کرتا ہے مگر اشارۃً۔ اس لیے بھی کہ عرب کا ہر فرد تاریخ عرب کی ایک مجلد کتاب تھا۔ ذرا سا اشارہ انھیں حالات و معاملات معلوم کرانے کے لیے کافی تھا۔ جنھیں فہمِ قرآن بخشا گیا ہے ان کے لیے بھی اتنا اشارہ عرب کی پُوری تاریخ پیش کر دیتی ہے۔

عرب کا عظیم الشان انقلاب

لیکن بعثتِ محمد رسول اللہ و نزولِ قرآن کے بعد انہی اہلِ عرب کا کیا حال تھا ؟ قلب بدل گئے تھے، ماہیت بدل گئی تھی، ذہنیت بدل گئی تھی، یکسر انقلاب ہو گیا تھا، یکسر انسان بن گئے تھے اور اس تبدیلی و انقلاب کے بارے میں اکابرِ عرب کے اقوال مختلف تاریخی کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں، دیکھے جاتے ہیں اور دیکھے جا سکتے ہیں، غصب و قزاقی کے خوگر عرب انقلاب کے بعد ایسے انسان و نمونۂ انسانیت بن گئے تھے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات ہیں، غلاموں اور غلام زادوں کے نام اپنے ترکے کی وصیت کرتے تھے، یا اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ترکے میں حصّہ دیتے تھے۔

ابوبکر صدیقؓ، ان کی شرافت و نجابت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اشرافِ عرب، اصیل قریش، نسلی غرور کر سکتے تھے، ایک منٹ کے لیے بھی یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ یہ کس کی رکاب پکڑ کر چلنے والے لوگ ہیں مگر یہ تاریخ کی ایک دُہرائی ہوئی حقیقت ہے اور تہذیب جدید بھی جس سے انکار نہ کر سکی کہ حضرت اسامہؓ[1] سالارِ لشکر بن کر جب احاطۂ شہر سے نکلتے ہیں تو دُور تک آپ ان کے گھوڑے کی رکاب تھامے ہوئے انھیں سمجھاتے چلے گئے اور وہ بار بار معذرت کرتے رہے، لیکن آپ کا ضمیر اور حقیقی صحبتِ نبویؐ سے مجلّیٰ قلب آمادہ نہ ہو سکا کہ ان کی معذرت کو قبول کیا جائے۔

سلمانؓ بن اسلامؓ[2] کی کیفیت مورخین نے جو کچھ تاریخ میں قلم بند کر کے خلف کے لیے چھوڑی ہے دیدۂ عبرت کے لیے

---

[1] اسامہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت زیدؓ کے صاحبزادے تھے۔ حضرت زیدؓ کو حضورؐ نے آزاد فرما دیا تھا اور انھیں اپنے عزیزوں کے ساتھ گھر چلے جانے کی اجازت عطا فرما دی تھی لیکن انھوں نے حضورؐ کے قدموں سے جدائی گوارا نہ فرمائی۔ حضرت اسامہؓ کی والدہ اُمّ ایمن برکۃ تھیں جو حضور کے والد ماجد حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب کی لونڈی تھیں۔ گویا اسامہؓ والد اور والدہ دونوں کی جانب سے غلام زادے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی اور بعض صحابہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں اس کی سفارش کرنی چاہی تو انھوں نے حضرت اسامہؓ کو سفارشی بنایا تھا۔ حضورؐ کے وصال کے بعد وادی القریٰ میں رہنے لگے تھے۔ ابن عبد اللہ کی رائے کے مطابق ۵۴ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی ہے۔

[2] حضرت سلمانؓ اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ سلمان فارسی کے نام سے مشہور ہوئے۔ تلاشِ حق میں گھر بار چھوڑا، عیسائی مذہب اختیار کیا لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ بالآخر نصیبے کی یاوری نے حضورؐ کی خدمت میں پہنچا یا اور (باقی بر صفحۂ آئندہ)

ہمیشہ سبق آموز رہے گی۔ بلال حبشیؓ سے اکنافِ عالم میں بسنے والوں سے کون واقف نہیں، کیا ان کا حال و مقام ہمارے درسِ عبرت کے لیے کافی نہیں؟ ایک حبشی اسود، سیاہ فام لیکن مقام کیا تھا! صحابہ کرام خوشامد کے ساتھ ان سے عرض کرتے تھے کہ اذان دے کر ہمارے دلوں کو خوش کرو۔

حضرت عمرؓ جیسا جلالی خلیفہ، اور محترم ترین صحابی رسول اللہ، جن کے عدل، دانش اور تدبّر نے اقوامِ عالم سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ ان کی ذات پر فخر کرتے تھے اور انھیں "سیّدنا" کے لقب سے یاد کرکے خوش ہوتے اور فخر کرتے تھے۔ حضرت صہیبؓ رومی کا حال کس نے نہیں سنا!

بہرحال، ہر ولایت و ملک کے لوگ جو معلمِ اخلاق و انسانیت کے دربار میں پہنچے، انسان بن گئے۔ ہے کوئی انسان تاریخِ انسانیت میں موجود؟ جس کو مثال کے طور پر بھی اس انسانیتِ کبریٰ کے مقام پر فائز انسانِ کامل کے سامنے لایا جا سکے؟ تاریخ اس کے جواب و مثال سے آج تک قاصر ہے اور قاصر رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ نے ہیبت و دبدبہ، رعب و جلال والی سیکڑوں ہستیاں اور ان کے کارنامے اپنے صفحات میں محفوظ رکھے ہیں، مگر انسانِ کامل، جو ایک طرف شہنشاہ تو دوسری طرف بوریہ نشین مسکین، ایک طرف فوجی جرنل و قائد تو دوسری طرف داعیِ امن و سلامتی انسان، صفحۂ ہستی پر ہویدا نہیں کیا، نہ زمانے نے پیدا کیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) جمالِ جہاں فدا دیکھتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ عربوں نے انھیں پکڑ کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور تقریباً دس بار خرید و فروخت کا عمل دُہرایا گیا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ و امداد سے غلامی سے نجات پائی۔ حضورؐ سے ان کی تعریف میں متعدد حدیثیں مروی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ سلمان ہمارے اہلِ بیت سے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس کی عمر پائی۔ ۳۵ ہجری میں مدائن میں انتقال فرمایا۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ ان سے روایت کرتے ہیں۔

لے بلال بن رباح جو بلالِ حبشیؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن کی حیثیت سے مشہور ہوئے امیہ بن خلف جمحی کے غلام تھے۔ یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مکہ میں اپنے اسلام کو ظاہر کیا۔ قریش نے ان پر سخت ستم توڑے۔ خود ان کے مالک نے طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی آپ پر بہت شاق تھی۔ آپ کے وصال کے بعد مدینہ چھوڑ کر شام چلے گئے تھے۔ ۲۰ ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے ان سے روایت کی۔

لے صہیبؓ کے والد کا نام سنان تھا، آبائی وطن موصل تھا، رومیوں نے ان کی آبادی پر حملہ کیا، یہ بھی قیدی بنا لیے گئے۔ یہ اس وقت بچے تھے۔ نشو و نما روم میں ہوئی اس لیے صہیب رومی کے نام سے مشہور رہیں۔ ان کے مالک نے مکہ کے ایک بدار کلب کے ہاتھ فروخت کر دیا، کلب نے عبداللہ بن جدعان تیمی کے ہاتھ بیچ ڈالا، انھوں نے آزاد کر دیا۔ مکہ میں شروع دور میں اسلام قبول کیا۔ کفارِ مکہ کے ہاتھوں سخت تکالیف برداشت کیں۔ قرآن کی آیت "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" (۲ : ۲۰۷) (کچھ آدمی ایسے ہیں جو اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی جانیں تک بیچ ڈالتے ہیں) انھیں کے بارے میں ہے۔ ۳۸ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔

نسلی عصبیت کا پیکرِ خاکی دُوسروں کے جان و مال، عزت و آبرو کا پاسبان بن جاتے، وہ یا ظلم و استبداد سے اقوام کے گلے میں غلامی کا طوق اور ان کی پیٹھ پر پابندیوں کا بوجھ ڈال کر سرِغرور فخر سے بلند کرنے والا، دونوں میں کون افضل ہے؟ تاریخ کا فیصلہ موجود ہے میرے کہنے کی ضرورت نہیں، جس قوم کا وطیرہ قتل و غارت ہو، فخر و غرور ہو اس میں یہ انقلاب ایام ہو جائے کہ قریشی ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑا ہو، اور غلام قوم کا ایک فرد ان کا امام ہو۔ اُمّ المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے اگر زید زندہ ہوتے تو خلافت میرے باپ کی بجائے انھیں ملتی۔ مسلم کی حدیث میں محمد رسول اللہ کی ایک دُعا ضبطِ تحریر میں آئی ہے آپؐ کی زبانِ مبارک پر جورات کو پچھلے پہر اکثر جاری رہتی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ[1] الخ

نہ تفرقہ ہے نہ پارٹی اور جتھہ بندی ہے، نہ گروہ پسندی۔ بس اسلام ملّت ہے، اللہ کی بندگی ہے اور رسول کی اطاعت۔ ہر مسلمان بلکہ ہر انسان بھائی بھائی ہے ان العباد کلھم اخوان۔ کوئی انسان بحیثیت انسان کے اچھوت نہیں ہے، اعمال کیسے ہوں، عقیدے کیسے ہوں، بحث یہ ہے ناپاکی جسم میں نہیں ہے عقیدے میں ہوتی ہے جسم ہر انسان کا پاک ہے۔

"تاریخ و اقوامِ عالم کی اجمالی کیفیت اور ساتویں صدی تک کے وہ تمام بوجھ جو نوعِ انسانی کی پیٹھ پر ڈال دیے گئے تھے اور ظہورِ اسلام کے بعد کی دنیا کا حال مختصراً آپ نے سُن لیا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ آپؐ رحمت تھے، نشانِ رحمتِ الٰہی اور سببِ رحمتِ ایزدی تھے۔

ساتویں صدی میں نوعِ انسانی کی حالت آپ سُن چکے، تہذیب و سلطنت کا حال معلوم کر چکے، کلیسائی احکام، پاپائی نظام، رومہ کی سعادت، ہندی احکام و قوانین، رسم و رواج، پابندی و جکڑبندی دیکھ لی۔ فیصلہ یہ ہوگا کہ نسلِ انسانی یکسر گرفتارِ بلا و معذب تھی عقل گرفتار، جسم گرفتار، غاصبانہ ذہنیت، غلامانہ عقیدت، جسم پر ظالمانہ شرارت، رُوح میں بزدلانہ خباثت، بادشاہتوں اور مذہبی مسندوں نے طرح طرح کی عقوبتیں ڈال رکھی تھیں۔ بس بحالات ایں، تاریخ کا بے لاگ، اٹل، بے پناہ فیصلہ یہی ہوگا اور ہے کہ نوعِ انسان عذاب و ذلّت کے عذاب میں گرفتار تھی۔

غیرتِ خداوندی جوش میں آتی ہے آیۂ رحمت بن کر محمدؐ رسول اللہ کا ظہور ہوتا ہے۔ عیسائی و موسائی سب کو پیامِ رحمت ملتا ہے، انقلاب ہوتا ہے، دنیا بدلتی ہے۔ کل جو سورج نسلِ انسانی پر ایک نئے ظلم کی خبر لاتا تھا آج اس کی ہر شعاع دامنِ انسان کو امن و راحت، رافت و رحمت سے مالا مال کر رہی ہے، غلامی کی بیڑیاں کٹ جاتی ہیں، پیٹھ کا بوجھ گر جاتا ہے، ذہنی بندشیں اور فکری بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ نسلِ انسانی ہر قسم کے ظلم و عذاب سے نجات پاتی ہے اور ہر قسم کی جتھہ بندی، نسلی غرور و ذاتی وجاہت کی جکڑ بندیوں سے نجات پا کر بھائی بھائی بن جاتی ہے، مشرق و مغرب میں بجز اس نعرہ کے اور کچھ نہیں سنا جاتا کہ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین ط عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف رحیم ط فبشر عبادی الذین یستمعون القول و یتبعون ما احسنہ ط

[1] مسلم میں متعدد دعائیں مروی ہیں۔ میں نے سرسری طور پر نظر ڈالی لیکن دماغ فیصلہ نہیں کر سکا کہ مولانا کا اشارہ کس حدیث کی طرف ہے خصوصاً ایسی جس کے ابتدائی الفاظ اللھم انا نسئلك ہوں۔

پیغامِ محمدؐ

ابوالکلام آزاد

(۱)

عالمگیر دعوت

پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کسی خاص قوم اور ملک کے لیے نہیں، تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے (سورۂ اعراف) کی آیت (۱۵۷)[1] جوامع آیات میں سے ہے، جس نے دعوتِ اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی:

۱۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔
۲۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
۳۔ ایمان باللہ وکلماتہ اس کا شعار ہے، یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلماتِ وحی پر ایمان۔

فرمایا: خدا نے مجھے تم سب کی طرف بھیجا ہے۔ وہ خدا کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے۔ یعنی جب تمام کائناتِ ہستی میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی ہے تو ضروری ہُوا کہ اس کا پیغامِ ہدایت بھی ایک ہی ہو اور سب کے لیے ہو۔

پیامِ زندگی

پیغمبرِ اسلام (صلعم) کی دعوت اس لیے ہے کہ تمھیں زندہ کر دے[2]۔ یعنی وہ انسانیتِ اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی

---

[1] سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ ہے:

قل یٰایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً الذی لہٗ ملک السمٰوٰت والارض، لا الٰہ الا ھو یحیٖ و یمیت فاٰمنوا باللہ و رسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلمتہٖ واتبعوہ لعلکم تھتدون۔

(اے پیغمبر!) کہو اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، کوئی معبود نہیں مگر اسی کی ایک ذات، وہی جِلاتا ہے، وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی امّی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر) ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

[2] اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت ۲۴ کی طرف۔ یعنی:

(باقی برصفحہ آئندہ)

دعوت ہے۔ غور کرو اس دعوت نے وقت کی تمام مُردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا تھا۔ اس سے بڑھ کر مُردوں کو جلانا کیا ہوگا کہ عرب کے ساربانوں میں ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، خالد، ابن ابی وقاصؓ ابن العاص (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر پیدا ہوگئے اور پچاس برس کے اندر عرب کے وحشی کرۂ ارضی کی سب سے بڑی اور مہذب قوم تھے۔

توحید

خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مالک الملک ہے، حی و قیوم ہے، اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔ اس کے علم سے کوئی شے مخفی اور اوجھل نہیں۔ وہ غفلت سے منزّہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ہستی کی ایسی صفتیں ہوں اس کے سامنے کسی کی سعی و سفارش کی کیا گنجایش ہے! اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ میں کون ہے جو دخل دینے کی جُرأت کر سکتا ہو؟

بعض ضروری نکتے

قرآن مجید میں توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات بھی کمال پر پہنچا دی گئی۔ انسان کے لیے دینی عقاید و اعمال کا جو تصوّر قایم کیا، اس کی بنیاد تمام تر رحمت و محبت پر رکھی۔ سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کی صفتوں کے بعد "مالك یوم الدین" (جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا) کہہ کر صفت عدالت کا ذکر کیا اور تمام صفات جلال کو عدالت ہی کے تابع رکھا۔

۱۔ فطرت کائنات میں ربوبیت و رحمت کے ساتھ مجازات بھی ہیں۔ انسان نے مجازات کو قہر و غضب پر محمول کر لیا۔ اس طرح خدا کی صفات میں خوف و دہشت کا تصوّر پیدا ہوگیا حالانکہ جن مظاہر کو قہر و غضب پر محمول کیا گیا وہ عین مقتضائے رحمت ہیں۔ تعمیر کی تحسین و تکمیل کے لیے تخریب نہ ہوتی تو میزانِ عدل قایم نہ رہتی اور نظام ہستی درہم برہم ہو جاتا۔

۲۔ صفاتِ الٰہی میں قہر و غضب کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ عدالت ضرور ہے اور صفاتِ قہریہ جس قدر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یٰایها الذین اٰمنوا استجیبوا لله و للرسول اذا دعاکم لما یحییکم۔

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں (روحانی موت کی حالت سے نکال کر) زندہ کردے۔

بیان کی گئی ہیں در اصل اسی (عدالت ہی) کے مظاہر ہیں۔

(توحید فی الصفات میں صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی تمام راہیں بند کر دیں)

(ا) عبادت اور نیاز کی مستحق صرف خدا کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکایا تو توحیدِ الٰہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔

(ب) صرف خدا ہی کی ذات انسانوں کی پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر تم نے دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا تم نے اسے خدا کی خدائی میں شریک کر لیا۔

(ج) اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی ہستی کا تصوّر پیدا کرتا ہے وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کر لیا تو توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔

(د) یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں "ایاك نعبد و ایاك نستعین" میں اوّل عبادت کے ساتھ استعانت کا ذکر بھی کیا گیا۔ پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا، جو مفید حصر ہے یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں۔

(ہ) سب سے زیادہ اہم مسئلہ شخص نبوّت کی حد بندی کا تھا۔ پیغمبرِ اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا اور اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ یہ قرار دیا: اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده و رسوله۔ یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد (صلعم) خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا اسی طرح پیغمبرِ اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اعتراف ہے (اور بندگی کا اقرار رسالت کے اقرار پر مقدم ہے)

نبوّت کی روشن ترین دلیل

سورۂ یونس میں ہے:

قل لو شاء الله ما تلوته عليكم ولا ادراكم به فقد لبثت فيكم عمراً من قبله افلا تعقلون۔ (آیت ۱۶)

تم کہو اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمھیں سناتا ہی نہیں اور تمھیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمھیں اقوامِ عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملے سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟

صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں، جس کے فضائل و حالات کی تمھیں خبر نہ ہو۔ تمھیں میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس سال کی مدت تک کہ عمر انسانی کی پختگی کی خاص مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمھاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصے میں کوئی ایک بھی بات تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملے میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے طیار[1] ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں، مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے۔ کیا اتنی موٹی سی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و فضائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچا اس عرصے میں بن گیا وہ بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ (یونس : ۱۷)

بتلاؤ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے جی سے جھوٹ بنا کر اللہ پر افترا کرے اور اس آدمی سے جو اللہ کی سچی آیتیں جھٹلائے؟ یقیناً جُرم کرنے والے کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے، جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں۔ جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر ہے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا۔ اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ جو صادق تھا اس کا کلمۂ صدق آج تک قایم ہے اور قایم رہے گا۔

پیغمبرؐ اسلام کی صداقت

پیغمبرِ اسلام کی صداقت کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی؛ چونکہ اعترافِ حقیقت کے لیے طیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اسے جادو سے تعبیر کریں۔

"الانبیا" کی آیت ۳[2] میں فرمایا: وہ پیغمبرِ اسلام کے پاس جانے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ان کے

[1] مولانا کا املا "تیار" کے متعلق یہی تھا۔

[2] سورہ انبیا کی آیت ۳ یہ ہے:

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَی ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ

دل ہیں کہ یک قلم غافل اور (دیکھو) ظلم کرنے والوں نے چپکے

(باقی برصفحہ آیندہ)

پاس گئے اور جادو میں پھنسے۔ یہ ہماری طرح ایک آدمی ہے، پس جو کچھ اس کا اثر و نفوذ ہے وہ جادو ہی کی وجہ سے ہے۔

سچائی کی سب سے بڑی شناخت یہ ہے کہ اسے سچائی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اگر اور کچھ کہنا چاہو گے تو کتنا ہی زور لگاؤ، بات بنے گی نہیں۔ بنے گی اسی وقت جب سر جھکا دوگے کہ ہاں یہ سچائی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نفس انسانی کی گمراہی و سرکشی پر حقیقت کا اعتراف ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ وہ بغیر لڑے کبھی ہتھیار نہیں رکھے گی وہ مانے گی (کیونکہ سچائی منوائے بغیر رہ نہیں سکتی) مگر اس وقت جب ماننے پر مجبور ہو جائے گی۔

پیغمبر اسلام نے جب کلام حق کی منادی شروع کی تو قریش مکہ کا یہی حال ہوا۔ وہ سچائی دیکھ رہے تھے، مگر اسے سچائی سمجھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ کبھی کہتے یہ مجنون ہوگیا ہے، خواب و خیال کو وحی و نبوت سمجھتا ہے۔ پھر تاثیر و نفوذ دیکھتے تو کہتے جادوگر ہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور یہ ساری باتیں آپس میں کہیں۔

(ابن ہشام)

دین میں جبر نہیں

اس اصل عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملے میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد دعوت و موعظت سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ جبر و اکراہ سے۔

قریش مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ کہ ظلم و تشدد سے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا، پس جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا، خود اسی بات کا منکر کیونکر ہو سکتا ہے؟

دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہے، جدل و خصومت کی راہ نہیں۔ داعی حق کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اس کا ناطقہ بند کر دے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔

خدا پرستی اور نیک عملی

خدا پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، خدا کے تمام رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا سچا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ۔

سرگوشیاں کیں۔ یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک آدمی ہے، پھر کیا تم جان بوجھ کر ایسی جگہ آتے ہو جہاں جادو کے سوا اور کچھ نہیں؟

کامل ایمان ہے۔ خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اور آخرت دین کے بنیادی حقایق ہیں۔

خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں روزی دیتے ہیں انھیں بھی دیں گے۔ بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ کسی جان کو قتل نہ کرو، جسے خدا نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ یتیموں کے مال کی طرف نہ بڑھو۔ جب کبھی کوئی بات کہو انصاف کی کہو، اگرچہ معاملہ اپنے قرابت دار ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اسے پورا کرو۔

خدا پرستی اور نیک عملی کی یہی راہ میری (خدا کی) ٹھہرائی ہوئی سیدھی راہ ہے۔ اسی پر چلو، اور راہوں پر نہ چلو کہ خدا کی راہ سے بھٹکا کر تمھیں تتر بتر کر دیں۔

جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لائے گا تو اس کے لیے اس نیک عمل سے دس گنا زیادہ ثواب ہوگا۔ اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کے بدلے اتنی ہی سزا پائے گا۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، وہی درست اور صحیح دین ہے، ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک خدا کے لیے ہو جانا۔ میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا صرف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں پہلا فرمانبردار (یعنی مسلم) ہوں۔

اوامر و نواہی

۱۔ توحید فی العبادت کی تلقین۔ کیونکہ نفس توحید کا اعتقاد تو تمام پیروانِ مذاہب میں موجود تھا، لیکن توحید فی العبادت کی حقیقت مفقود ہو گئی تھی۔

۲۔ پھر والدین کے حقوق پر توجہ دلائی گئی۔ انسان کے لیے والدین کی ربوبیت، ربوبیت الٰہی کا پرتو ہے۔ والدین کی خدمت و اطاعت کی آزمایش کا اصلی وقت ان کے بڑھاپے میں آتا ہے، جب کمزوریاں انھیں دوسروں کی خدمت کا محتاج بنا دیتی ہیں۔

انسان کی احتیاج کے دو ہی وقت ہیں: طفولیت اور بڑھاپا۔ طفولیت میں ماں باپ نے خدمت کی تھی، بڑھاپے میں اولاد کو خدمت کرنی چاہیے۔

۳۔ ماں باپ کے بعد ان سب قرابت داروں کے حقوق ہیں جو ہماری خبر گیریوں کے محتاج ہوں۔ ساتھ ہی "تبذیر" یعنی بے محل خرچ کرنے سے روکا۔ فرمایا: مال و دولت بے محل خرچ نہ کرو۔ خرچ کرنے کا صحیح محل ارباب حقوق ہیں۔

۴۔ مال و دولت خرچ کرنے میں اور ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ کسی ایک طرف نہ جھک پڑو کہ خرچ کرنے پہ آئے تو سب کچھ اڑا دیا۔ احتیاط کرنی چاہی تو کنجوسی پر اتر آئے۔

۵۔ اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہلاک نہ کرو، ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی۔

۶۔ زنا سے دُور رہو یہ بڑی بے حیائی کی بات اور بڑی بُرائی کا چلن ہے۔

۷۔ کسی جان کو ناحق قتل نہ کرو، جسے قتل نہ کرنا اللہ نے حرام ٹھہرا دیا ہے۔ ہم نے مقتول کے وارث (یا وارثوں) کو مطالبۂ قصاص کا اختیار دے دیا ہے۔ پس چاہیے کہ خونریزی میں زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ یتیموں کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ (یعنی اسے خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو) مگر ایسے طریقے پر جو ان کے لیے بہتر ہو۔ جب یتیم جوان ہو جائیں تو امانت ان کے حوالے کر دو۔

۹۔ عہد پورا کرو اس کے بارے میں تم سے باز پرس کی جائے گی۔

۱۰۔ جب کوئی چیز ناپو تو پیمانہ بھرپور رکھا کرو۔ تو لو تو صحیح ترازو سے۔ (یعنی نہ ماپ میں کمی کرو اور نہ تول میں ڈنڈی دباؤ)

فرمانبرداروں کے نشان

ان لوگوں کے اعمال و اوصاف (کی مجمل سی کیفیت) جنھوں نے احکامِ حق قبول کیے اور دنیا کے لیے نافع بن گئے:

ا۔ اللہ کی بندگی کا عہد پورا کرتے ہیں اور اپنی عبودیت میں سچے اور کامل ہیں۔

ب۔ اللہ نے جو رشتے جوڑ دیے انھیں ظلم و ناانصافی سے توڑتے نہیں، بلکہ ہر رشتے کا پاس کرتے اور ہر علاقے کا حق ادا کرتے ہیں۔ اس عمل میں تمام حقوق العباد آ گئے جس طرح "ا" میں حقوق اللہ آ گئے۔

ج۔ آخرت کی فکر سے بے پروا نہیں ہوتے۔ جو کچھ کرتے ہیں اس میں خوفِ آخرت کی کھٹک موجود ہوتی ہے۔ یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز کسی کے آگے پیش ہونا ہے اور حساب کی سختی سے بچنا ممکن نہیں۔

د۔ اللہ کی محبت میں ہر طرح کی ناخوشگوار حالتیں صبر و ثبات کے ساتھ جھیل لیتے ہیں۔ شدتوں اور محنتوں سے منہ نہیں موڑتے، آزمائشوں کو پیٹھ نہیں دکھاتے۔

ہ۔ نماز اس کی ساری شرطوں کے ساتھ قایم کرتے ہیں۔

و۔ جو کچھ کماتے ہیں اسے صرف اپنے ہی نفس پر خرچ نہیں کرتے، دوسروں پر بھی خرچ کرتے ہیں اور ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، کھلے طور پر بھی اور پوشیدہ طور پر بھی۔

ز۔ بدی کے بدلے بدی کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ کوئی ان کے ساتھ کتنی ہی برائی کرے وہ بھلائی ہی سے پیش آئیں گے۔

ایمان والوں کے پانچ وصف

مومنوں کے پانچ وصف خصوصیت سے بیان کیے گئے۔ گویا قرآن کے نزدیک ایمان و عمل کے مرقع میں سب سے



مسجد نبوی کا بیرونی منظر

زیادہ نمایاں خط و خال یہی ہیں جس زندگی میں یہ خصائص نہ ہوں وہ مومن کی زندگی نہیں ہو سکتی :

ا ۔ نماز کی محافظت اور اس کا خضوع و خشوع سے ادا کرنا۔ کسی باہیبت و جلال مقام پر کھڑے ہو جاؤ، تمھارے ذہن و جسم پر کیسی حالت طاری ہو جائے گی؟ ایسی ہی حالت کو عربی میں "خشوع" کہتے ہیں۔

ب ۔ ہر اس بات سے مجتنب رہنا جو نکمی ہو۔ صرف انھی باتوں کا اشتغال رکھنا جو دین و دنیا میں نافع ہوں۔

ج ۔ کمائی میں سے اپنے محتاج بھائیوں کے لیے خرچ کرنا۔

د ۔ زنا سے کبھی آلودہ نہ ہونا۔

ہ ۔ امانت دار ہونا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنا۔

راہِ حق کے پیشرو

راہِ حق میں سب سے آگے نکل جانے والے وہ ہیں :

ا ۔ جو اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

ب ۔ جو پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

ج ۔ جو اس کی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں، بلا تامل دے دیتے ہیں۔ ان کے دل ترساں رہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور انھیں لوٹنا ہے۔

طریق خیر و سعادت

ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو خواہ اجنبی، ہر حال میں اچھے برتاؤ کا مستحق ہے۔ اسی طرح جو لوگ تمھارے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے ہوں نیز لونڈی، غلام جو تمھارے قبضے میں ہیں ان سب کے بھی تم پر حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت اور احسان سے پیش آؤ۔

بخل نہ کرو، خدا نے جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں خرچ کرو۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا ہاتھ انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) سے کبھی رک نہیں سکتا۔ البتہ جو کچھ خرچ کرو اللہ کے لیے کرو نام و نمود کے لیے نہ کرو۔

نظم و فلاح میں اصل اصول

اجتماعی زندگی میں نظم و فلاح کے لیے اصل اصول یہ ہے کہ جو جس بات کا حقدار ہو، اس کے حق کا اعتراف کرو

اور جو چیز جسے ملنی چاہیے وہ اس کے حوالے کردو، وارث کا حق ہو، یتیم کا مال ہو، قرضدار کا قرض ہو، امانت رکھنے والے کی امانت ہو، اہلیت رکھنے والے کے لیے منصب اور عہدہ ہو، جو جس کا حق ہو اور جو جس کا اہل ہو اُسے ملنا چاہیے۔

جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو صرف عدل و انصاف پیشِ نظر ہو، کسی حالت اور کسی صورت میں بھی یہ جائز نہیں کہ فیصلہ انصاف کے خلاف کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے اصل دین

مسلمانوں کے لیے اصل دین یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کریں، اللہ کے رسول کی اطاعت کریں اور جو لوگ ان میں سے صاحبِ حکم و اختیار ہوں ان کی اطاعت کریں (بشرطیکہ اصحابِ حکم و اختیار کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش نہ ہو جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے خلاف ہو) بصورتِ نزاع اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی طرف رجوع کیا جائے اور جو فیصلہ ملے، اس کے آگے سب سرِ تسلیم خم کر دیں۔

قوّامونَ بالقسط

مسلمانوں کو چاہیے کہ "قوّامون بالقسط" ہوں۔ یعنی حق و راستی پر اس مضبوطی سے قایم رہنے (اور جم جانے والے) کہ کوئی بات بھی انھیں جگہ سے ہلا نہ سکے۔ چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں۔ دُنیا کی کوئی چیز انھیں سچ کہنے سے روک نہ سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور اعزہ و اقربا کے خلاف ہو جب بھی انھیں سچی ہی بات کہنی چاہیے، وہ صرف سچائی ہی کے لیے دل و زبان رکھتے ہیں۔[1]

بنیادی دستورالعمل

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے شعائر کی بے حُرمتی روا نہ رکھیں۔ دوسروں کے معاملے میں ان کا دستورالعمل

---

[1] سورۂ مائدہ میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ:

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (آیت ۸)

ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لیے ابھار دے کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔

یہ ہونا چاہیے کہ نیکی کے کاموں میں سب کی مدد کریں۔ بُرائی کے کاموں میں کسی کی بھی مدد نہ کریں۔ کوئی ظلم کرے تو یہ برائی ہے اس سے بچیں۔ کوئی حج و زیارت کو جائے تو یہ بھلائی ہے اس کے معاون بنیں۔ (گویا نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں تعاون، گناہ اور ظلم کی ہر بات میں لاتعاون ہر مسلمان کے لیے بنیادی اصل کار ہے)

دین کی تکمیل اور نعمت کا اتمام چاہتا ہے کہ ہم اپنی سیرت میں سرتاسر حق و صداقت کے پیکر بن جائیں۔

(۲)

انسانی مساوات

نسل انسانی کی مساوات کا اعلان اور نسل و شرف کے تمام امتیازات سے انکار جو لوگوں نے بنا رکھے تھے اور جن کی وجہ سے انسانی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ آزاد ہو یا غلام، مرد ہو یا عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، وضیع ہو یا شریف انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں قریش کو خطاب کرتے ہوئے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا فرما دی تھی۔ فرمایا:

"اے جماعتِ قریش! خدا نے تمھاری جاہلانہ نخوت اور آباؤ اجداد پر اترانے کا غرور آج توڑ دیا (سچ تو یہ ہے) سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا تھا۔ خدا فرماتا ہے: لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے۔ گوت قبیلے سب پہچان کے لیے بنا دیے ہیں اور خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت، جس میں تقویٰ زیادہ ہے"[1]

جب تمام انسان ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) کی اولاد ہیں تو انسان ہونے میں امتیازات کی کون سی وجہ ہے؟ پھر خدا کے ہاں عزت کا جو معیار قرار پایا یعنی تقویٰ، وہ ایسا ہے کہ اس میں انسانوں کے درمیان حسد و رقابت ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ منافیِ تقویٰ ہوگی۔ باقی ہر معیار یعنی دولت، عہدہ، رنگ وغیرہ میں حسد و رقابت کے سوا اور کسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا]

دین کی اصلِ عظیم

دین کی اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ سچی خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔

[1] رحمۃ للعلمین ج ۱ ص ۱۵۶۔ جس آیت کا ترجمہ دیا گیا ہے وہ سورۂ حجرات کی تیرھویں آیت ہے۔ یعنی: یٰاَیُّھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

اصل شے دل کی پاکی اور عمل کی نیکی ہے۔ شریعت کے ظاہری احکام و رسوم بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصود حاصل ہو۔

نزولِ قرآن کے وقت دنیا کی ایک عالمگیر مذہبی گمراہی یہ تھی کہ لوگ سمجھتے تھے دین سے مقصود محض شریعت کے ظواہر و رسوم ہیں اور انھیں کے کرنے نہ کرنے پر نجات و سعادت موقوف ہے۔ پس جہاں تک دین کا تعلق ہے، ساری طلب مقاصد کی ہونی چاہیے نہ کہ وسائل کی۔

ابراہیمؑ کی راہ

دین کی جو راہ حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کی تھی، وہ کیا تھی؛ ان کے بعد ان کی اولاد جس طریقے پر چلتی رہی، وہ کون سا طریقہ تھا؛ خود حضرت یعقوبؑ نے بسترِ مرگ پر جس دین کی وصیت کی تھی وہ کون سا دین تھا؛ یقیناً وہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی نہ تھی (اس وقت تک یہودیت اور مسیحیت کا تو وجود بھی نہ تھا) وہ صرف خدا پر ایمان لانے اور اس کے قانونِ سعادت کی فرمانبرداری کرنے کی فطری اور عالمگیر سچائی تھی۔ اسی کی دعوت قرآن نے دی۔

دینِ الٰہی کو "الاسلام"[1] کے کلمہ سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں یعنی ہر طرح کی نسبتوں اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر صرف اطاعتِ حق کی طرف انسانوں کو دعوت دی جائے۔

عمل کی کمائی

قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد کو وہی پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے اور نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔

انسان کے لیے قدامت پسندی کا پھندا بڑا ہی سخت ہے، اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا۔ ہندو ہزاروں برس سے مہابھارت اور پرانوں کے افسانوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے دُو فرقے آج تک اس نزاع سے فارغ نہیں ہوئے کہ تیرہ سو برس پہلے سقیفۂ (بنو ساعدہ) میں خلافت کا جو انتخاب ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؛ قرآن کہتا ہے:

"تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم۔" (پ ۱، س البقرہ ۱۴۱)

اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمھیں کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا، تم اپنی خبر لو۔ ان کے اعمال ان کے لیے تھے اور تمھارے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے: ان الدین عند اللہ الاسلام (بلاشبہ اصل دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) (آل عمران: ۱۹) ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منه (جو کوئی الاسلام کے سوا کسی دُوسرے دین کا خواہشمند ہو گا تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا) (آل عمران: ۸۵) ورضیت لکم الاسلام دینا (تمھارے لیے پسند کر لیا کہ دین الاسلام ہو) (مائدہ: ۲)

تمھارے لیے ہیں۔

دنیا پرستی کا غرور

دین حق دنیا کا نہیں، دنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دنیا پرستی کا غرور انسان کو خدا پرستی اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت اور حکومت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو دنیا میں انسان کا ظلم و فساد کر سکتا ہے۔ جو لوگ سچے خدا پرست ہیں وہ دنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں، مگر ان کے پیشِ نظر نفس پرستی نہیں صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

آخرت کی نجات

آخرت کی نجات کا دارو مدار تمام تر ایمان و عمل ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی اور آشنائی کام دے سکتی ہے، نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔ کسی نیک اور بزرگ ہستی سے حسن عمل کا سبق لیا جا سکتا ہے، اس کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اہلِ علم سے مسائل پوچھے جا سکتے ہیں لیکن نجات کا انحصار اپنے ہی ایمان و عمل پر یا اللہ کی رحمت پر ہے۔ کسی کی سعی و سفارش کچھ اعانت نہیں کر سکتی۔ ایسا تصور ہی سراسر غیر اسلامی ہے۔

حق و باطل کا معیار

حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں۔ گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات بھی آ جاتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دورِ نزولِ قرآن کے وقت بھی دنیا پر چھایا ہوا تھا۔ گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو۔ یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی؟ حق کی راہ یقین و بصیرت ہی کی راہ ہے نہ کہ جہل و گمان کی۔ اگرچہ بہت تھوڑے آدمی اس راہ پر کاربند ہوں آج دنیا کی آبادی میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی۔ پھر کیا اس بنا پر اکثریت کے مطابق حق کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے؟ ابتدائی دور میں مسلمان بہ مشکل چند لاکھ ہوں گے لیکن انھوں نے حیرت انگیز سعی و ہمت اور نادیدہ جوشِ فداکاری سے چند سال کے اندر روئے زمین کے گوشے گوشے میں نورِ حق کا اجالا کر دیا۔ آج ان کی بھیڑ ساٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو باطل کی ظلمت کاریوں سے محفوظ رکھنے میں بے بس نظر آتے ہیں بلکہ وہ گروہ در گروہ ایسے طور طریقے اختیار کیے بیٹھے ہیں جنھیں حق نہیں، باطل کے شاخسانے ہی کہا جا سکتا ہے۔

منکرینِ آخرت

جو لوگ منکرینِ آخرت ہیں یعنی محاسبۂ اعمال پر اعتقاد نہیں رکھتے، ان کی ذہنیت چار حال سے خالی نہیں:

ا۔ انھیں خدا سے ملنے کی توقع نہیں۔

ب۔ وہ صرف دنیوی زندگی میں خوشنود ہوتے ہیں۔

ج۔ اس حالت کے خلاف ان کے اندر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔ اسی پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔

د۔ ان کے ذہن و ادراک میں اس درجہ تعطل پیدا ہو گیا ہے کہ قدرت کی تمام نشانیاں جو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، انھیں بیدار نہیں کر سکتیں۔

ان میں سے ہر بات نہ صرف بیانِ حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے۔ اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

مشکلیں اور آزمائشیں

کتاب و حکمت کی تعلیم، شخصِ نبوت کی پیغمبرانہ تربیت (تزکیہ)، مرکزِ ہدایت کا قیام (کعبہ مکرمہ) اور بہترین امت (خیر امۃ اخرجت للناس) ہونے کا نصب العین، یہی وُہ بنیادی عناصر تھے جو موعودہ امت کی نشو و نما کے لیے ضروری تھے۔

یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو پیروانِ دعوتِ قرآنی کو سرگرمِ عمل ہو جانے کا حکم مل گیا۔

سرگرمِ عمل ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مشکلیں اور آزمائشیں پیش آئیں، اس لیے صبر و استقامت اور جاں فروشی کی بھی دعوت دی گئی۔

صبر و ثبات

فرمایا:

ا۔ صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لو۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات کو مصائب کو جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا کی جائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے روح کو تقویت ملتی ہے۔ جس جماعت میں یہ دُو قوتیں (صبر اور نماز) پیدا ہو جائیں گی، وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔

ب۔ جو جماعت موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ راہِ حق میں موت، موت نہیں سرتاسر زندگی ہے۔

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اور کتنی ہی بڑی جماعتیں ہیں جو چھوٹی جماعتوں سے شکست کھا جاتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت و کثرت پر نہیں، دلوں کی قوت پر ہے۔ اللہ کی مدد انھیں لوگوں کا

ساتھ دیتی ہے جو صابر اور ثابت قدم ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کا نصب العین

مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقت ور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت و برتری میں جماعتی گھمنڈ اور قومی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوّت کے منافی تھی۔ پس صرف "خیر" اور "بہتر" ہونے پر زور دیا گیا (کنتم خیر امة اخرجت للناس) جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے۔ جس جماعت کا نصب العین یہ ہوگا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو، وہ طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی (اور حق یہ ہے کہ خیر و سعادت میں سب سے بڑھ کر ہونے کے بعد کسی جماعت کی معنوی قوت میں کون سی چیز کی کمی رہ سکتی ہے اور معنوی قوت سے بڑھ کر کون سی قوت ہے جو امن و سلام کی ضامن ہو؟)

وحدت دعوت

قرآن مجید نے دین حق کی اس اصل عظیم کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ تمام نبی صرف ایک ہی دین کے داعی تھے۔ جب اللہ کا دین ایک ہے تو تمام رہنما ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جو ان میں تفریق کرتا ہے وہ پورے سلسلۂ ہدایت ہی کا منکر ہے۔ اللہ کا دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانینِ فطرت کی اطاعت کی جائے اور آسمان و زمین میں جس قدر مخلوق ہے سب قوانینِ الٰہی کی اطاعت کر رہی ہے۔ پھر اگر تمھیں اللہ کے قوانینِ فطرت سے انکار ہے تو اللہ کے قانون کے سوا کائناتِ ہستی میں اور کون سا قانون ہو سکتا ہے؟

ایمان اور محبّت

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے، جیسی چاہت سے ماننا صرف اللہ کے لیے ہے تو یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا اور توحیدِ الٰہی کا اعتقاد درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔ (والذین اٰمنوا اشد حبًّا للّٰہ) جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے اسے چاہیے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعوٰے اور اس کی راہ بتلانے والے کی پیروی سے انکار ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے (رسول صلعم کی پیروی کرنے والوں سے اللہ بھی محبت کرنے لگے گا اور ان کی خطائیں بخش دے گا)

قرآن مجید کے چار وصف

سُورۂ یونس میں ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔ (آیت ۵۷)

لوگو! تمھارے پاس پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے، جو موعظت ہے۔ دل کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔

اس میں قرآن کے چار وصف بیان کیے:

ا۔ "موعظت" ہے یعنی دل میں اتر جانے کی دلیلوں اور رُوح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے، جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت نہیں بلکہ ایسی نصیحت ہے جو موثر دلائل اور دل نشیں دلیلوں سے کی جائے۔

ب۔ "شفآءٌ لما فی الصدور" دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخۂ شفا ہے، جو فرد یا گروہ اس نسخے پر عمل کرے گا، اس کے قلوب ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائیں گے۔ یاد رہے عربی میں قلب، فواد اور صدر کے الفاظ جب کبھی ایسے موقع پر بولے جائیں، جیسا یہ موقع ہے تو ان سے مقصود انسان کی معنوی حالت ہوتی ہے۔ یعنی ذہن و فکر کی قوّت، عقلی ادراک، جذبات و عواطف، اخلاق و عادات، اندرونی حسیات۔ وہ عضو مقصود نہیں ہوتا، جو فنِ تشریح کا دل اور سینہ ہے۔

ج۔ "ھُدًی" یعنی یقین کرنے والوں کے لیے ایک ہدایت۔

د۔ "رحمة للمؤمنین" یقین کرنے والوں کے لیے پیامِ رحمت ہے، یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے دُنیا کو نجات دلاتا ہے۔ رحم و محبّت اور امن و سلامتی کی رُوح سے معمور کرتا ہے۔

اعلان ہی نہیں دلیل بھی

یہ محض قرآن کے اوصاف کا مدعیانہ اعلان ہی نہ تھا، بلکہ اس کی صداقت کی سب سے زیادہ موثر دلیل بھی تھا۔ اگر ایک شخص دعوٰی کرے کہ وہ طبیب ہے تو اس کے دعوے کی جانچ کا سب سے زیادہ سہل اور قطعی طریقہ یہ ہوگا کہ دیکھا جائے کہ اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں؛ قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے۔ اس نے کہا، میں نسخۂ شفا ہوں۔ ثبوت میں مومنوں اور متقیوں کی جماعت پیش کر دی، جو اس کے دار الشفا

میں طیار ہوئی تھی۔ آج بھی اس کی یہ دلیل اسی طرح قاطع ہے جس طرح عہدِ نزول میں تھی۔ اگر اس نے عرب جاہلیت کے مریضان روح و دل میں سے ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، خالدؓ، سلمانؓ، ابوذرؓ وغیرہ جیسی تندرست رُوحیں پیدا کر دی تھیں تو کیا اس کے نسخۂ شفا میں شک کیا جا سکتا ہے؟

صراطِ مستقیم اور دینِ قیّم

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا:

ان ھٰذا القراٰن یھدی للتی ھی اقوم۔ (۹)

بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں، ان میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی سے سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ وخم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہو سکتی۔ یہی حقیقت دوسری جگہ "صراط مستقیم" اور "الدین القیم" سے تعبیر کی گئی۔

(۲)

دین حق کے تین بنیادی اصول

سورۃ اعراف میں ہے:

قل امر ربی بالقسط واقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین لہ الدین۔ (آیت ۲۹)

تم کہو میرے پروردگار نے جو حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر بات میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ درست رکھو اور دین کو اسی کے لیے خالص کر کے اسے پکارو۔

اس آیت میں دین حق کے تین بنیادی اصول واضح کر دیے: عملؔ میں اعتدال، عبادتؔ میں توجہ اور خداؔپرستی میں اخلاص۔

یہ آیت باب توحید میں اصل اصول ہے۔ دین کو خدا کے لیے خالص کر کے پکارو، یعنی دین کی جتنی باتیں ہیں وہ صرف خدا ہی کے لیے مخصوص کر دو۔

"خلق" اور "امر" دونوں اللہ ہی کی ذات سے ہیں۔ یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور اسی کے حکم و قدرت سے اس کا انتظام ہو رہا ہے۔

دکھاوے کی خیرات

دکھاوے کی خیرات اکارت جاتی ہے۔ جو شخص نیکی کے لیے نہیں، نام و نمود کے لیے خیرات کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔ ایسی خیرات سے روکا گیا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک پوری چھپے خیرات نہ کر سکو خیرات کرو ہی نہیں یا پوشیدگی کا تعلق بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے (چھپائے رکھنا ممکن ہو تو نہ چھپانا رفتہ رفتہ ریا و نمائش کا باعث بن سکتا ہے۔ نیت پاک ہو اور خدا کی رضا کے سوا کچھ منظور نہ ہو تو کسی کے سامنے بھی خیرات کر دینا نامناسب نہیں بلکہ بعض اوقات کھلم کھلا خیرات دوسروں کے لیے وسیلۂ ترغیب بن جاتی ہے۔ مقصود حقیقی یہ ہے کہ نمود و نمائش سے نیت کا آئینہ آلودہ نہ ہونے پائے)

نکمی اور بیکار چیزیں خیرات کے نام سے محتاجوں کو نہ دو۔ سوچو کہ اگر تمھیں کوئی ایسی چیز دے تو لینا پسند کرو گے؟

محبت و ہمدردی کے تقاضے

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشوونما نہیں پا سکتی تھی۔ اگر اس کو حکم دیتے ہوئے ایسی باتوں سے روک نہ دیا جاتا جو ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہیں۔ پس انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا) کے ساتھ ساتھ سُود کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

دینِ حق انسانوں میں محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے خیرات کا حکم دیا کہ ہر انسان دُوسرے کی احتیاج اپنی احتیاج سمجھے۔ سُود خوار کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے۔ وُہ چاہتا ہے دُوسرے کی احتیاج سے خود انتہائی فائدہ اٹھائے اور محتاج کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنائے (گویا سُود خوار کے دل میں ہم جنسوں کے لیے محبت و ہمدردی کا کوئی احساس باقی ہی نہیں رہتا)

مومن اور امید و یقین

قرآن نے ہر جگہ یہ حقیقت واضح کی کہ ایمان امید اور یقین ہے، کفر شک اور مایوسی ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ مایوس نہ ہو۔ امید کا چراغ روشن رکھو، ہر حال میں امیدوارِ فضل و سعادت رہو۔ یہی مقتضائے ایمان ہے۔ یہی سرچشمۂ زندگی ہے۔ اسی سے تمام دنیوی اور اُخروی کامرانیوں کی دولت حاصل ہو سکتی ہے۔

جس انسان نے امید و یقین کی جگہ شک و مایوسی کی راہ اختیار کی، خواہ دنیا کی زندگی کے لیے ہو، خواہ آخرت کے لیے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ایسے آدمی کے لیے صرف یہی چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ گلے میں پھندا ڈالے اور زندگی ختم کر دے۔

ایمان نام ہی امید کا ہے اور مومن وہ ہے جو مایوسی سے کبھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذہنی مزاج کسی چیز سے اتنا بیگانہ نہیں جس قدر مایوسی سے۔ زندگی کی مشکلیں اسے کتنا ہی ناکام کریں لیکن وہ پھر سعی کرے گا۔ لغزشوں اور گناہوں کا ہجوم اسے کتنا ہی گھیر لے لیکن وہ پھر توبہ کرے گا۔ نہ تو دنیا کی کامیابی سے وہ مایوس ہو سکتا ہے نہ آخرت کی نجات سے۔ وُہ جانتا ہے کہ دنیا کی مایوسی موت ہے اور آخرت کی مایوسی شقاوت۔ وہ دونوں جگہ رحمتِ الٰہی کو دیکھتا اور اس کی بخششوں پر یقین رکھتا ہے کہ لاتقنطوا من رحمة الله، إن الله يغفر الذنوب جميعا، إنه هو الغفور الرحيم (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ سبھی گناہ بخش دیتا ہے، ہاں وُہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔(سورہ زمر: ۵۳)

قبولِ حق کی استعداد

بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سر سبز نہ ہوگی۔ اسی طرح قرآن کی ہدایت سے بھی وہی روحیں شاداب ہوں گی جن میں قبولیتِ حق کی استعداد ہے۔ جنھوں نے استعداد کھو دی ان کے حصّے میں محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید، گھڑی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتدا میں جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ ایک مدّت تک لوگ اسے مانتے رہتے ہیں۔ جب ایک عرصے کے اعتقاد سے اس میں شانِ تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و بصیرت کی کوئی بھی دلیل اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن اسی کو "اسماء سميتموها انتم وآباؤكم" (نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے گھڑ لیے ہیں) سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ بنائے ہوئے ناموں کے سوا وہ کوئی حقیقت اور معقولیت پیش نہیں کر سکتے۔

دعوتِ اسلام کی تین خصوصیتیں

سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷[1] میں پیغمبرِ اسلام کی دعوت کی تین خصوصیتیں بیان کیں:

---

[1] اس آیت کا متعلقہ حصّہ یہ ہے:

يامرهم بالمعروف وينههم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبآئث ويضع عنهم اصرهم والاغلل التي كانت عليهم۔

(پیغمبرِ اسلام، جس کی صفات تورات و انجیل میں یوں مکتوب تھیں کہ) وہ نیکی کا حکم دے گا، برائی سے روکے گا، پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا، گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے۔

۱۔ نیکی کا حکم دیتا ہے، بُرائی سے روکتا ہے۔

۲۔ پسندیدہ چیزوں کا استعمال جائز ٹھہراتا ہے، ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال کو روکتا ہے۔ قرآن نے اس معنی میں "طیبات" اور "خبائث" کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۳۔ جو بوجھ اہلِ کتاب پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، ان سے نجات دلاتا ہے۔

یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے جن سے قرآن نے نجات دلائی؛ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے: مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں۔ پیغمبرِ اسلام کی دعوت نے ان سب سے نجات دلا دی۔ سچائی کی ایسی سہل و آسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ اور عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔

درخشاں حقائق

چند حقایق ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ قرآن کے نزدیک کسی جماعت کے مسلمان ہونے کی عملی شناخت دو باتیں ہیں: نماز کا اہتمام اور زکوٰۃ کا نظام۔ جو جماعت یہ دو عمل ترک کر دے گی وہ (عملاً) مسلمان متصور نہ ہو گی۔ زکوٰۃ کے نظام سے مراد ہے کہ حکومت یہ انتظام نہ کر سکے یا کسی جگہ مسلمان خدانخواستہ محکوم ہو جائیں تو وہ خود زکوٰۃ کا نظام سنبھالیں۔

۲۔ شرف و بزرگی کے رسمی مناصب کوئی چیز نہیں، بزرگی اسی کے لیے ہے جو عمل و ایمان کی بزرگی رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن کے نزدیک سب سے بڑا درجہ ان انسانوں کا ہے جو ایمان و حق پرستی کی راہ میں قربانیاں کرنے والے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو رواجی نیکیوں اور رسمی نمائشوں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

۴۔ مومن وہ ہے جس کی حُبِّ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت غالب نہ آ سکے۔

۵۔ جماعت کی زندگی اور فتح و کامرانی کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں کہ مذبذب اور دو دِلے آدمی اس میں موجود ہوں۔

۶۔ کاروبارِ حق میں دارومدار شخصیتوں پر نہیں۔ شخصیت اس لیے ہے کہ بیج بو دے۔ باقی رہے برگ و بار، تو ہو سکتا ہے اس کی زندگی میں ہی سب نمودار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کچھ زندگی میں، کچھ اس کے بعد ہوں۔ اس تاخیر سے کاروبارِ حق پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

۷۔ حلت و حرمتِ اشیاء میں قرآن کے اصول اربعہ:

الف۔ اصل اباحت ہے نہ کہ حرمت، اِلّا یہ کہ وحیِ الٰہی نے کسی چیز کو حرام ٹھہرا دیا ہو۔

ب۔ کسی چیز کو حرام ٹھہرا دینے کا حق خدا کی شریعت کو ہے۔

ج ۔ محض اپنی رائے اور قیاس سے کوئی چیز حرام ٹھہرانا افترا علی اللہ یعنی خدا پر بہتان باندھنا ہے ۔

د ۔ انسان کے عقاید و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے ، نہ کہ وہم و گمان پر ۔

تذکیر و توکیل

پیغمبر کا کام "تذکیر" و "تبلیغ" ہے "تبشیر" و "تنذیر" ہے ۔ وہ داعی اور مذکر ہے ۔ "وکیل" یعنی نگہبان نہیں جو زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جائے ، پھر اس سے نکلنے نہ دے ۔ سورۂ یونس میں ہے :

وما انا علیکم بوکیل ۔ (میں تم پر نگہبان نہیں ۔ یونس : ۱۰۷)

دوسری جگہ پیغمبرِ اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے یہی مطلب یُوں ادا کیا :

وما انت علیھم بجبار (تو ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں کہ جبراً و قہراً بات منوا دے ۔ ق : ۴۵)

نیز فرمایا :

لست علیھم بمصیطر (تجھے ان پر دارغہ بنا کر نہیں بٹھا دیا ہے کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن تو انھیں راہِ حق پر چلا دینے کا ذمہ دار ہو ۔ غاشیہ : ۲۲)

پھر فرمایا :

فانما علیک البلغ وعلینا الحساب (جو کچھ تیرے ذمے ہے یہی ہے کہ پیغام پہنچا دیا جائے ۔ ان سے ان کے کاموں کا حساب لینا ہمارا کام ہے ۔ رعد : ۴۹)

قرآن صاف صاف کہتا ہے کہ خدا کے رسولوں کا منصب "تذکیر و تبلیغ" کے اندر محدود تھا حالانکہ وہ خدا کی طرف سے مامور تھے ۔ پھر ظاہر ہے کہ کسی دُوسرے شخص کے لیے وہ کب گوارا کر سکتا ہے کہ وکیل ، مصیطر اور جبّار بن جائے !

تذکیر و تبلیغ اور پسند و قبول

دراصل اعمال انسانی کے تمام گوشوں میں اصل سوال حدود ہی کا ہے اور ہر جگہ انسان نے اسی میں ٹھوکر کھائی ہے ، یعنی ہر بات کی جو حد ہے اس کے اندر نہیں رہنا چاہتا ۔ دو حق ہیں ۔ دونوں کو اپنی اپنی حدود کے اندر رہنا چاہیے ۔ ایک حق ہے تذکیر و تبلیغ کا ، ایک پسند و قبولیت کا ۔ ہر انسان کو اس کا حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے لیکن اس کا حق نہیں کہ دُوسروں کے حق سے انکار کر دے ، یعنی یہ بات بُھلا دے کہ جس طرح اسے ایک بات کے ماننے نہ ماننے کا حق ہے ، ویسا ہی دوسرے کو بھی ماننے نہ ماننے کا حق ہے اور ایک فرد دوسرے کے لیے ذمہ دار نہیں ۔

تاریخ کو بارہ صدیوں تک اس بات کا انتظار کرنا پڑا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محض اختلافِ عقاید کی بنا پر

ذبح نہ کرے۔ اتنی بات سمجھ لے کہ "تذکیر" و "توکیل" میں فرق ہے۔ اب ڈیڑھ سو برس سے یہ بات دُنیا کے عقلی مسلمات میں سے سمجھی جاتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس کے اعلان کی تاریخ امریکہ اور فرانس کے "اعلان حقوق انسانی" سے شروع نہیں ہوئی۔ اس سے بارہ سو برس پہلے (نزولِ قرآن کے ساتھ) شروع ہو چکی تھی۔

خوف و حُزن

قرآن نے اہلِ ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بھی بات اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ "لاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون" (اور یہ قرآن میں کئی مقامات پر ارشاد ہوا ہے) یعنی وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت انھی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے: خوف اور دُکھ۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آ گئیں۔ زندگی کے جتنے کانٹے بھی ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو، خواہ جسم میں چُبھے ہوں، خواہ دماغ میں۔ خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں، خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے۔ جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

عقل اور ماورائے عقل

قرآن اس بات کی بھی مذمت کرتا ہے کہ علم و بصیرت کے بغیر کوئی بات مان لی جائے اور اسی کی بنی پر محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی بات ہے۔ یا تو وہ عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بُوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کیے چلتا رہتا ہے، یا پھر سمجھ بوجھ کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی، جھٹلا دی۔ اس طرح حقیقت کے اثبات و وجود کا مدار صرف ایک خاص فرد کی سمجھ پر رہ گیا۔

صورتیں دو ہیں اور دونوں کا حکم ایک نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو۔ ایک یہ کہ تمھاری عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں، جن کا احاطہ تمھاری سمجھ نہیں کر سکتی، لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلافِ عقل ہیں۔ اولاً افراد کی عقلی قوت یکساں نہیں۔ ثانیاً عقل انسانی برابر نشو و ارتقا کی حالت میں ہے۔ ایک عہد کی عقل جن باتوں کا اثبات نہیں کر سکتی دوسرے عہد کے لیے وہ عقلی مسلّمات بن جاتی ہیں۔ ثالثاً انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی۔

مرد عورت کی اخلاقی مساوات

قرآن نے مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے وہ دونوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں کرتا۔ سورۂ نسا میں جہاں ازدواجی زندگی کے احکام کی تشریح ہے وہاں صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ فضائل و محاسن کے لحاظ سے دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی راہیں رکھتے ہیں اور دونوں کے لیے ایک ہی طرح پر فضیلتوں کا دروازہ کھول دیا گیا ہے[1]۔ چنانچہ جس طرح وہ نیک مردوں کے فضائل و مدارج بتلاتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کے بھی بتلاتا ہے یعنی جس طرح مردوں میں مسلم و مومن ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی قانت عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں صادق مرد ہیں اسی طرح عورتوں میں بھی صادقہ عورتیں ہیں۔ جس طرح مردوں میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بہ کثرت اس کا ذکر کرنے والے ہیں، اسی طرح عورتوں میں بھی اللہ کا خوف رکھنے والیاں اور بہ کثرت ذکر کرنے والیاں ہیں۔

قرآن کریم کی شہادت

مردوں کے لیے فرمایا:

التائبون العابدون الحامدون السآئحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر و الحافظون لحدود اللہ۔

(سورۃ توبہ: ۱۱۲)

(اپنی لغزشوں اور خطاؤں سے) توبہ کرنے والے، عبادت میں سرگرم رہنے والے، اللہ کی حمد و ثنا کرنے والے، سیر و سیاحت کرنے والے، رکوع و سجود میں جھکنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حد بندیوں کی حفاظت کرنے والے۔

عورتوں کے لیے بھی فرمایا:

مُسلماتٌ، مؤمناتٌ، قانتاتٌ، تائباتٌ، عابداتٌ، سائحاتٌ۔

(سورہ تحریم: ۵)

مسلم عورتیں، مومن عورتیں، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، سیر و سیاحت کرنے والیاں۔

---

[1] اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

للرجال نصیبٌ مما اکتسبوا وللنسآء نصیبٌ مما اکتسبن۔

مردوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے اپنے عمل سے جو کچھ حاصل کیا اس کے مطابق (ثمرات و نتائج میں) ان کا حصہ ہے۔

منافقوں کا ذکر کیا تو دو جنسوں کا کیا :

المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض یأمرون بالمنکر و ینهون عن المعروف۔ (سورۃ توبہ : ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں، سب ایک دوسرے کے ہم جنس برائی کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔

پھر فرمایا :

ان المسلمین والمسلمٰت والمؤمنین والمؤمنٰت والقٰنتین والقٰنتٰت والصٰدقین والصٰدقٰت والصٰبرین والصٰبرٰت والخٰشعین والخٰشعٰت والمتصدّقین والمتصدّقٰت والصّآئمین والصّٰئمٰت والحافظین فروجهم والحٰفظٰت والذّٰکرین الله کثیراً والذّٰکرٰت اعدّ الله لهم مغفرۃً و اجراً عظیماً۔

(سورۃ احزاب : ۳۵)

مسلم مرد اور مسلم عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور صدق پر کاربند مرد اور صدق پر کاربند عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی حفاظت کرنے والے پاکباز مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی پاکباز عورتیں اور اللہ کا بہت ذکر کرنے والے مرد اور بہت ذکر کرنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ کے ہاں مغفرت اور بہت بڑا درجہ ہے۔

غور کرو کسی وصف میں تفریق نہیں، کسی فضیلت میں امتیاز نہیں، کسی بڑائی میں عدمِ مساوات نہیں۔ پھر کیا ممکن ہے کہ جس قرآن نے مردوں اور عورتوں کی اخلاقی مساوات اس درجہ ملحوظ رکھی ہو اسی قرآن کا یہ فیصلہ ہو کہ عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ بد اخلاق ہے؟

صبر اور شکر

"صبر" کے معنی ہیں مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں جمے رہنا۔ "شکر" کے معنی ہیں اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں (اور نعمتوں) کی قدر کرنا اور انھیں ٹھیک ٹھیک کام میں لانا۔ خدا کا یہ مقررہ قانون ہے کہ جو قوم (مشکلوں اور مصیبتوں کے مقابلے میں ثبات و استقامت پر استوار رہتی ہے اور) خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر بجا لاتی ہے اور ان سے ٹھیک طور پر کام لیتی ہے۔ خدا اسے اور نعمتیں عطا فرماتا ہے، لیکن جو کفرانِ نعمت کرتی ہے یعنی قدر شناسی نہیں کرتی، محرومی و نامرادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور یہ اللہ کا سخت عذاب ہے، جو کسی انسانی گروہ کے حصے میں آتا ہے۔

غور کرو یہ حقیقتِ حال کی سچی تعبیر ہے۔ جو فرد یا گروہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر کرتا ہے۔ مثلاً خدا نے اسے فتحمندی و کامرانی عطا فرمائی ہے وہ اس نعمت کو پہچانتا، اسے ٹھیک طور پر کام میں لاتا اور اس کی حفاظت سے غافل

نہیں ہوتا۔ وہ اور زیادہ نعمتوں کے حصول کا مستحق ہوجاتا ہے یا نہیں؛ جو ایسا نہیں کرتا، اس کی نامرادی و تباہی میں کوئی شک ہوسکتا ہے؛

اکتسابِ مال اور انفاقِ مال

ہر انسان کی ذہنی وجسمانی استعداد یکساں نہیں ہوتی، اس لیے وسائل معیشت کے حصول کے اعتبار سے بھی سب کی حالت یکساں نہ ہوئی۔ کسی کو کمانے کے زیادہ مواقع حاصل ہوگئے، کسی کو تھوڑے۔ پہلے قوت میں مقابلہ ہوا۔ طاقتور نے کمزور کو مغلوب کرلیا۔ پھر ذہن وجسم کا مقابلہ شروع ہوا اور ذہنی قوت نے جسمانی قوت کو مقہور کرلیا۔

قرآن اس صورت حال سے تو تعرض نہیں کرتا کہ حیثیت کے اعتبار سے تمام انسانوں کی حالت یکساں نہیں، لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ حصولِ رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حالت یکساں نہ ہو۔ کسی کو ملے کسی کو نہ ملے۔ وہ کہتا ہے ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا، دنیا کے سامان رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے۔

دراصل قرآن کی اس تہ میں یہ بنیادی اصل کام کررہی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے مختلف افراد اور جماعتوں کو ایک دوسرے سے الگ اور منقسم تسلیم نہیں کرتا، بلکہ سب کو ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد قرار دیتا ہے۔ ایسے افراد جو آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے شریک حال ہیں۔

(قرآن) کہتا ہے کمائی کے حق کا دامن انفاق کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ تم انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے۔ یہاں کمائی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ تم جس قدر کما سکتے ہو کماؤ، بلکہ چاہیے زیادہ سے زیادہ کماؤ، لیکن یہ نہ بھولو کہ زیادہ سے زیادہ کمانا، زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے افراد کے ہاتھ کمائی کے لیے ہیں، لیکن جماعت کا حق خرچ کرانے کا ہے۔

غرض جہاں تک نظامِ معیشت کا تعلق ہے، قرآن نے اکتسابِ مال کا معاملہ انفاقِ مال کے ساتھ وابستہ کردیا ہے کوئی کمائی جائز نہیں تسلیم کی جاسکتی، اگر انفاق سے انکار کرتی ہو۔ ہر وہ کمائی جو محض اکتناز کے لیے ہو اور انفاق کے لیے دروازہ کھلا نہ رکھے قرآن کے نزدیک ناجائز، ناپاک اور مستحق عقوبت ہے۔

بدعملی کا بڑا مرکز

انفرادی زندگی میں بدعملی کا بڑا مرکز دنیوی خوشحالی کی زندگی ہے۔ خوشحالی وثروت کی حالت ایک ایسی حالت ہے کہ اگر کسی جماعت میں پھیلی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی برکت نہیں اور اگر صرف چند افراد میں سمٹی ہوئی ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں، کیونکہ جب دولت صرف چند افراد کے قبضے میں آگئی، باقی افرادِ جماعت محروم رہ گئے تو قدرتی طور پر ہر طرح کا غلبہ وتسلط چند افراد کے ہاتھ میں آجائے گا اور ایسے غلبہ وتسلط کا نتیجہ غرور باطل اور استکبار عن الحق ہے (اس

صورت حال کی الم انگیز مثالیں ہر طرف موجود ہیں)

یہی وجہ ہے کہ قرآن جس جماعتی خوشحالی کو اللہ کا سب سے بڑا فضل قرار دیتا ہے، اسی کو انفرادی حالت میں "فتنہ" اور "متاع غرور" بھی کہتا ہے۔

آج تمام دنیا میں شور مچ رہا ہے کہ انفرادی سرمایہ داری دنیا کے لیے مصیبت ہے، لیکن قرآن چودہ سو برس پہلے اسے "فتنہ" قرار دے چکا اور اس کے لیے اکتناز کا لفظ بول چکا ہے۔

والذین یکنزون الذھب و الفضة و لا ینفقونھا۔ (سورۃ توبہ: ۳۴)

اور جو لوگ چاندی اور سونا اپنے ذخیروں میں جمع کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے۔

مشکل یہ ہے کہ جب تک قرآن کی صدا ہے تمھاری نظروں میں جچتی نہیں۔ جب وہی بات وقت کے ذہن و فکر سے اُٹھنے لگتی ہے تو فوراً اس کی پرستش شروع کر دیتے ہو۔

(۴)

فضیلت و کامرانی کے طریقے

۴۴

سورۂ اعراف میں ہے:

و ان تدعوھم الی الھدی لا یسمعوا و تراھم ینظرون الیك وھم لا یبصرون خذ العفو و امر بالمعروف و اعرض عن الجاھلین۔ (۱۹۸ - ۱۹۹)

(اے پیغمبر!) اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو ہرگز تمھاری پکار نہ سنیں۔ تمھیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمھاری طرف تک رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں (بہرحال) نرمی و درگزر سے کام لو، نیکی کا حکم دو، جاہلوں کی طرف متوجہ نہ ہو۔

(دیکھیے) چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دیے۔ "اخذ بالعفو"، "امر بالمعروف" اور "اعراض عن الجاھلین"۔ یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینا، نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا اور جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا۔ سرسری نظر میں پتا نہیں لگے گا، اچھی طرح اور بار بار غور کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی ساری عملی مشکلات ان تین اصولوں سے حل نہیں ہو جاتیں؟

آیت ۱۹۸ میں فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تجھے دیکھتے نہیں کیونکہ اگر دیکھتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔ سو ایک دیکھنا سلمان فارسی کا تھا، جو پہلی ہی نگاہ میں پکار اُٹھا:

واللہ ماھذا الوجه کذاب (خدا کی قسم یہ صورت جھوٹے آدمی کی ہو نہیں سکتی)

اور ایک دیکھنا ابوجہل کا تھا کہ مالھذا الرسول یاکل الطعام و یمشی فی الاسواق (یہ کیسا نبی ہے کہ آدمیوں کی طرح

غذا کا محتاج ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے ؛ (الفرقان : ۷)

ذات وصفات

خدا کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے۔ اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا (جب تک ایجابی صفتوں کے تشخص کا کوئی نہ کوئی نقاب چہرے پر نہ ڈال دے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے (صفاتِ باری تعالیٰ میں) جو راہ اختیار کی وہ ایک طرف تو تنزیہ[1] کو اس کے کمال کے درجے پر پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف "تعطیل"[2] سے بھی تصور کو بچا لیتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کرتا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آ سکتی ہیں، متصف ہے۔ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، رحمت والا ہے۔ لیکن اسی طرح صاف صاف اور بے لچک کہہ دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں، جو تمہارے تصور میں آ سکتی۔ وہ عدیم المثال ہے۔

درماندگیوں کا ایک ہی حل

غرض قرآن کے تصورِ الٰہی کا یہ پہلو فی الحقیقت اس راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے اور ساری سرگردانیوں کے بعد بالآخر اسی منزل پر پہنچ کر دم لینا پڑتا ہے۔ یہاں ایک طرف بامِ حقیقت کی بلندی اور فکر کوتاہ کی نارسائیاں ہوئیں، دوسری طرف ہماری فطرت کا اضطرابِ طلب اور ہمارے دل کا تقاضائے دید ہوا۔ بام اتنا بلند کہ نگاہِ تصور تھک تھک کے رہ جاتی ہے۔ تقاضائے دید اتنا سخت کہ بغیر کسی کا جلوہ سامنے لائے چین نہیں پا سکتا۔ اگر "تنزیہ" کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو "تعطیل" میں جا گرتے ہیں اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو "تشبیہ" اور "تجسیم" میں کھوئے جاتے ہیں۔ پس نجات کی راہ صرف یہی ہوئی کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رہیں۔ "اثبات" کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے، "تنزیہ" کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنی پائے۔

---

[1] "تنزیہ" سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے، صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک و بلند رکھا جائے۔

[2] "تعطیل" کے معنی یہ ہیں کہ "تنزیہ" کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکر انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے قرآن کا تصور صفات تنزیہ کی تکمیل ہے، تعطیل کا آغاز نہیں۔ اسی طرح قرآن نے تشبیہ و تمثیل و تجسیم کا بھی خاتمہ کر دیا۔

محکمات و متشابہات

قرآن نے مطالب کی دو بنیادی قسمیں قرار دیں۔ ایک کو " محکمات " سے تعبیر کیا دوسری کو " متشابہات " سے۔ محکمات سے وہ باتیں مقصود ہیں، جو صاف صاف انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں اور اس کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے ایک سے زیادہ معانی کا دل میں احتمال نہیں۔ متشابہات وہ ہیں جن کی حقیقت وہ پا نہیں سکتا اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک خاص حد تک جا کر رک جائے اور بے نتیجہ باریک بینیاں نہ کرے۔

هو الذی انزل علیك الكتاب فیه آیاتٌ محكماتٌ هنّ امّ الكتاب واخر متشٰبهٰت فامّا الذین فی قلوبهم زیغٌ فیتّبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله وما یعلم تاویله الّا الله والرّٰسخون فی العلم یقولون اٰمنّا به كلٌّ من عند ربّنا وما یذّكّر الّا اولوا الالباب۔

(آل عمران : ۳)

(اے پیغمبر!) وہی (حیّ و قیوم) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے (یعنی ایسی آیتوں کی جو اپنے ایک ہی معنی میں اٹل اور ظاہر ہیں) اور وہ کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم متشابہات کی ہے (یعنی ان کا مطلب کھلا اور قطعی نہیں) تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ (محکم آیتیں چھوڑ کر) ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو کتاب اللہ میں متشابہ ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت معلوم کر لیں حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر جو لوگ علم میں پکے ہیں کہتے ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور مصیبت یہ ہے کہ (تعلیم حق سے) دانائی حاصل نہیں کرتے مگر وہی جو عقل و بصیرت رکھنے والے ہیں۔

متشابہات کی حقیقت کا ادراک عقل انسانی کی پہنچ سے باہر ہے۔ وہ خلافِ عقل نہیں (بلکہ) ماوراے عقل ہیں۔ انسان ان پر یقین کر سکتا ہے، مگر ان کی حقیقت نہیں پا سکتا۔

وفائے عہد اور قرآن

عہدِ جاہلیت کے عرب وفائے عہد کی اخلاقی قدر و قیمت سے بے خبر نہ تھے، ان میں ایسے لوگ بھی تھے، جو اپنے اور اپنے قبیلے کے مفاخر میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ وفائے عہد کو دیتے تھے، لیکن جہاں تک جماعتی معاہدوں کا تعلق ہے وفائے عہد کا عقیدہ کوئی عملی قدر و قیمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک قبیلہ ایک قبیلے سے معاہدہ کرتا تھا، کل دیکھتا تھا کہ اس کے

مخالف زیادہ طاقت ور ہو گئے ہیں تو بے دریغ ان سے جا ملتا تھا اور معاہد و حلیف پر حملہ کر دیتا تھا۔ اگر کسی دشمن فریق سے (عہد جاہلیت کے عرب) امن کا معاہدہ کرتے، پھر دیکھتے کہ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع پیدا ہو گیا ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی معاہدے کا احترام انھیں حملہ کر دینے سے نہیں روکتا تھا اور بے خبر دشمن پر جا گرتے تھے۔

قرآن راستبازی کی جو رُوح پیدا کرنا چاہتا تھا وہ ایک لمحے کے لیے بھی ایسی بد اخلاقی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام پیمان کا جو معیار قایم کیا ہے وہ اس درجہ بلند، قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی بھی گوشہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ فرد ہو یا جماعت، ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہوں یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہوں یا غیر ہم قوم و مذہب، دوست ہوں یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، لیکن کسی بھی حال میں عہد شکنی جائز نہیں، وہ ہر حال میں جُرم ہے، معصیت ہے، اللہ کے ساتھ ایک بات کر کے اسے توڑ دینا ہے۔ عذابِ عظیم کا اپنے کو مستحق ثابت کرنا ہے۔

قرآنی ارشادات

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا وفائے عہد پر زور دیا ہے اور جہاں کہیں مومنوں کے ایمانی فضائل کی تصویر کھینچی ہے یہ وصف سب سے زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے:

۱۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا۔ (البقرہ: ۱۷۷)
اور جب قول و قرار کر لیتے ہیں تو اس کا پاس کرتے ہیں۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (المومنون: ۸)
نیز جن کی حالت یہ ہے کہ اپنی امانتوں اور عہدوں کا پاس رکھتے ہیں۔

احادیث میں منافق کی یہ پہچان بتلائی گئی ہے:

اذا وعد اخلف۔
جب وعدہ کرے گا پُورا نہ کرے گا۔

(سورۃ نحل آیت: ۹۲ میں فرمایا):

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ

تم آپس کے معاملے میں اپنی قسموں کو مکر و فساد کا ذریعہ بناتے ہو اس لیے کہ ایک گروہ کسی دوسرے گروہ سے (طاقت میں) بڑھ چڑھ گیا ہے (یاد رکھو) اس معاملے میں اللہ تمھاری (راست بازی اور استقامت) کی آزمایش کرتا ہے۔

پھر اس طرح کی بدعہدی کی مثال کیا ہے؛ فرمایا: کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انكاثا۔ النحل (اس عورت کی سی ہے جس نے بڑی جانفشانی سے سُوت کاتا، پھر خود ہی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے برباد کر دیا) یعنی جب ایک

شخص یا ایک گروہ کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کی پختگی کے لیے بڑی باتیں کرتا ہے۔ ہر طرح دوسرے فریق کو یقین دلاتا ہے۔ پھر اگر ایک بات اتنی کوشش کے بعد پختہ کی گئی ہے تو کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ جس نے کل پختہ کی تھی وہی آج اسے اپنے ہاتھوں سے توڑ کر رکھ دے۔

رسولِ اکرم صلعم کی شانِ رافت و رحمت

سُورۃ توبہ کی آخری دو آیتوں[1] میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا: اللہ کا رسول تم میں آگیا۔ اس نے اپنا فرضِ رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آنکلا تھا۔ سنّت الٰہی کے مطابق خود تمھیں میں پیدا ہوا، اور چونکہ تمھیں میں سے ہے اس لیے اوّل سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمھاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں اس کا لڑکپن بھی تم میں گزرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس نے تم سے کہیں چھُپ کر زندگی بسر نہیں کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گزرنا تھا، گزرا تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سُن لیے۔ فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزما نہ لی ہو۔

پھر (رسول صلعم کے) ایک ایسے وصف پر زور دیا، جو منصبِ رسالت کے لیے اور ہر اُس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو، سب سے زیادہ ضروری ہے، یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا: اس سے زیادہ کوئی بات تمھارے لیے یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمھارا دُکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمھاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو خواہ روح کے لیے، اس کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے۔ وہ اس کے لیے ایسا مضطرب قلب رکھتا ہے کہ اگر اس کی بن پڑتی تو ہدایت و سعادت کی ساری پیالیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتا۔ پھر اس کی یہ شفقت و محبت تمھارے ہی لیے نہیں وہ تو تمام مومنوں کے لیے خواہ عرب کے

---

[1] لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔ (۱۲۸ - ۱۲۹)

تمھارے پاس اللہ کا رسول آگیا ہے جو تم ہی میں سے ہے۔ تمھارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ وہ مومنوں کے لیے شفقت اور رحمت رکھنے والا ہے۔ اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو "میرے لیے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا وہ تمام عالم ہستی کی جانداری کے عرشِ عظیم کا خداوند ہے۔

ہوں یا عجم کے "رَءُوفٌ رَّحِیمٌ" ہے۔

"رؤف" "رافت" سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری اور مصیبت پر جوش میں آئے۔ پس رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثیر کے ساتھ واضح ہوگیا۔

خدا نے یہ دونوں وصف جا بجا اپنے لیے فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسولؐ کے لیے بھی فرمائے۔

پیامِ موعظت کی ضرورت

اس کے بعد مجمع مخاطبین یہ سب کچھ دیکھ لینے اور تجربہ کر لینے کے بعد بھی اوا ئے فرض سے اعراض کرے تو اے پیغمبر! تم آخری اعلان کر دو کہ میرے لیے اللہ بس کرتا تھا اور اب بھی بس کرتا ہے۔ وہ اپنے کلمۂ حق کا محافظ ہے اور اس کی مشیّت نے جو فیصلہ کر دیا ہے بہر حال ہو کر رہنے والا ہے۔ اس کا قیام و عروج کسی خاص ملک اور قوم کی پشت پناہی پر موقوف نہیں۔ میرا بھروسا اللہ ہی پر تھا، اسی پر ہے، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔

یہ پیامِ موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا؟ اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں۔ سُورت (یعنی سورۃ توبہ) کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب۔ یہ سُورت اس وقت نازل ہُوئی جب تمام عرب میں کلمۂ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن کی عالمگیر فیروزمندیوں کی خبر دے دی تھی، تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بیکسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں بعض سے جو تساہل ہوا، اس کی تہ میں بھی اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صورت میں اس تفصیل اور شدّت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسری صورت میں نہیں ملتی۔

تاریخ انسانیت کے نوادر

کوئی شخص کتنے ہی مخالفانہ ارادے سے مطالعہ کرے، لیکن تاریخ اسلام کے چند واقعات اس درجہ واضح اور قطعی ہیں کہ ممکن نہیں ان سے انکار کیا جا سکے۔ از اں جملہ یہ کہ جو جماعتیں پیغمبر اسلام صلعم کی مخالف تھیں، ان کے تمام کام اوّل سے آخر تک ظلم و تشدد، دغا و فریب اور وحشت و تشدّد پر مبنی رہے اور پیغمبر اسلام صلعم اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک ایک فعل، صبر و تحمل، راستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا:

۱۔ مظلومی میں صبر،

۲۔ مقابلے میں عزم،

۳۔ معاملے میں راستبازی،

۴۔ طاقت و اختیار میں درگزر۔

تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہیں ہوئے (جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے اندر جمع ہوئے اور پورا عہد مبارکۂ نبوت ان نوادر کی درخشانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ گویا سیرۃ طیبہ کا نچوڑ یہی ہے جو حقیقت میں انسانیت عالیہ وعظمیٰ کا سدرۃ المنتہیٰ ہے)

"نذیر" و "بشیر"

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت و بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں، لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام صلعم کی حیثیت صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس گمراہی کا ازالہ ہو گیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے۔

جو دنیا پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہشمند تھی، اسلام کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کر لو۔ زیادہ سے زیادہ اپنی نسبت جو بات سنائی، یہ تھی کہ میں انکار و بدعملی کے نتائج سے خبر کر دینے والا ("نذیر") اور ایمان و نیک عملی کی برکتوں کی بشارت دینے والا ("بشیر") ایک بندہ ہوں، اگر غیب داں ہوتا تو زندگی کا کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔

کیا ایسے انسان کی زبان سے سچائی کے سوا کوئی بات نکل سکتی ہے؟

چہ عظمت دادہ ای یارب بخلق آں عظیم الشان
کہ "انّی عبدہٗ" گوید بجائے قول "سبحانی"

سورۃ فاتحہ کی تعلیمی روح

سورۃ فاتحہ "ام القرآن" ہے "الکافیہ" ہے "اساس القرآن" ہے "السبع المثانی" ہے۔ قرآن کی تمام سورتوں میں دین حق کے جو مقاصد بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں انھی کا بہ شکل اجمال بیان موجود ہے۔ اس کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت (نماز پنجگانہ) کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ ذرا اس کی تعلیمی روح کا اندازہ فرمایئے:

۱۔ وہ خدا کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج ہے، لیکن اس خدا کی حمد میں نہیں جو نسلوں، قوموں اور مذہبوں کی گروہ بندیوں کا خدا ہے بلکہ "رب العلمین" کی حمد میں جو کائنات خلقت کا پروردگار ہے اور تمام نوع انسانی کے لیے یکساں طور پہ پروردگاری و رحمت رکھتا ہے۔

۲۔ پھر وہ اسے (خدا کو) اس کی صفتوں کے ساتھ پکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف "رحمت" و

"عدالت" ہی کی صفتیں اسے (حمد و ثنا کرنے والے کو) یاد آتی ہیں ۔ گویا خدا کی ہستی کی نمود اس کے لیے سرتا سر رحمت و عدالت کی نمود ہے ۔

۳ ۔ وہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے ۔ کہتا ہے صرف تیری ہی ایک ذات ہے جس کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے اور صرف تو ہی ہے جو ہماری ساری درماندگیوں اور احتیاجوں میں مددگاری کا سہارا ہے وہ اپنی عبادت اور استعانت دونوں کو صرف ایک ہی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے ۔ دُنیا کی ساری قوتوں اور ہر طرح انسانی فرمانروائیوں سے بے پروا ہو جاتا ہے ۔

۴ ۔ پھر وہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق طلب کرتا ہے ۔ یہی ایک مدعا ہے جس سے زبان احتیاج آشنا ہوتی ہے لیکن کون سی سیدھی راہ ؟ کسی خاص نسل، خاص قوم یا خاص مذہبی حلقے کی سیدھی راہ ؟ نہیں وہ راہ جو دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں اور تمام راستباز انسانوں کی متفقہ راہ ہے ۔

۵ ۔ اسی طرح وہ محرومی اور گمراہی کی راہوں سے پناہ مانگتا ہے ۔ یہاں بھی ان راہوں سے بچنا چاہتا ہے جو دنیا کے تمام محروم اور گمراہ انسانوں کی راہیں رہ چکی ہیں ۔

۶ ۔ گویا جس بات کا طلبگار ہے وہ بھی نوعِ انسانی کی عالمگیر اچھائی ہے اور جس بات سے پناہ مانگتا ہے ، وُہ بھی نوع انسانی کی عالمگیر برائی ہے ۔ نسل ، قوم ، ملک یا مذہبی گروہ بندی کے تفرقہ و امتیاز کی کوئی پرچھائیں اس کے دل و دماغ پر نظر نہیں آتی ۔

۷ ۔ غور کرو مذہبی تصور کی یہ نوعیت انسان کے ذہن و عواطف کے لیے کس طرح کا سانچا مہیا کرتی ہے ! جس انسان کا دل و دماغ ایسے سانچے میں ڈھل کر نکلے گا وہ کس قسم کا انسان ہوگا ! کم از کم دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے :

اوّل اس کی خدا پرستی خدا کی عالمگیر رحمت و جمال کے تصور کی خدا پرستی ہوگی ۔

دُوسری یہ کہ کسی معنی میں بھی وہ نسل ، قوم یا گروہ بندیوں کا انسان نہ ہوگا ۔ عالمگیر انسانیت کا انسان ہوگا ۔ دعوت قرآنی کی اصل رُوح یہی ہے ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

ربیع الاوّل کے مہینہ میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت ہوئی تھی، لہٰذا اس مہینہ میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً حضورؐ کی سیرتِ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں، حضورؐ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت و عقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے اور ہم یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم نے بحیثیت اُمتی اپنی ذمہ داری پُوری کر دی اور حضورؐ کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیے۔ یہ جھُوٹا اطمینان عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں کرتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ازروئے قرآنِ حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ ہم سے خدا کے ہاں آنحضورؐ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہو گا؟ کس چیز کی پُوچھ گچھ ہو گی؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضورؐ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار اور قائم کریں۔ جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کو پُورا کرنے اور دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کا ارادہ لے کر ہم کسی سیرت کی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر اُس مجلس سے اُٹھیں تو یقیناً وہ فائدہ کی بات ہے، نفع بخش کام ہے، آخرت میں کام آنے والا عمل ہے۔

آج کی صحبت میں اسی موضوع پر قدرے تفصیل سے میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہُوں کہ ازرُوئے قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ اس بات ہی کے سلسلے میں سورۂ اعراف کی ۱۵۷ویں آیت کا ایک جزو تلاوت کرتا ہُوں۔ یہ پُوری آیت نہیں بلکہ آیت کا آخری جزو ہے۔ فرمایا کہ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؁

ترجمہ یہ ہے کہ "پس جو لوگ ایمان لاتے ان (نبی اکرمؐ) پر اور جنھوں نے اُنؐ (نبی اکرمؐ) کی تعظیم و توقیر کی، اور جذبۂ احترام کے ساتھ جنھوں نے ان (نبی اکرمؐ) کی مدد اور حمایت کی، اُنؐ کے کام اور انؐ کے مشن میں انؐ کے دست و بازو بنے، اور انؐ کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا، اور جنھوں نے اُس نور اور روشنی کا اتباع کیا، پیروی کی جو اُن کے ساتھ نازل

کی گئی ہے۔ تو یہی ہیں وُہ لوگ جو خدا کے ہاں فلاح پانے والے، کامیاب ہونے والے اور کامران و شاد کام ہونے والے قرار پائیں گے۔"

جس آیت کریمہ کے آخری جزو کو میں نے پیش کیا ہے، وہ پُوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ اس میں اصل تخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصارٰی سے ہے اور ان کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:

"یہی وہ الرسول النبی الاُمّی ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں، جن کی خوش خبریاں انبیاء سابقین دیتے چلے آرہے ہیں، ہمارے یہ رسولؐ تمہارے پاس آگئے ہیں، یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے تم کو روکتے ہیں اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بوجھ لاد رکھے ہیں اور بیڑیاں پہن رکھی ہیں، ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں۔ تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام فرما رہے ہیں۔"

اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی کہ:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

برادرانِ دین! آیت کریمہ کے اس حصّہ پر غور کرنے سے بہ ادنٰی تامّل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کی جو چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں، وُہ یہ ہیں:

—— پہلی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جائے، اُنؐ کی تصدیق کی جائے۔

—— دُوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر و تعظیم کی جائے۔

—— تیسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و حمایت کی جائے۔ اور

—— چوتھی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس کا اتباع اور پیروی کی جائے اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لیے اس روشنی کے مینار سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ وضاحتیں کافی تفصیل چاہتی ہیں لیکن میں وقت کی کمی کے باعث کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کروں جو آپ کے لیے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

ایمان

اس آیت کے حوالہ سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وُہ یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی اوّلین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم انؐ پر ایمان لاتے ہیں اور انؐ کی تصدیق کرتے ہیں نیز

اُن کو اللہ کا نبیؐ، اللہ کا رسولؐ، اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اِس اقرار و یقین کا نام ہے "ایمان"۔ یہاں سے ہمارے اور حضورؐ کے مابین ایک تعلق اور ایک رشتہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے بہت سوں کا آں حضورؐ سے کوئی نسلی تعلق نہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے یہاں سادات اور ہاشمی بھی موجود ہوں، لیکن عظیم اکثریت یقیناً اُن لوگوں کی ہوگی جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہے، بایں ہمہ ایک تعلق ہے، سب سے اہم، سب سے مضبوط تعلق ہے اور وہ تعلق ہے ایمان کا، اس یقین کا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول، نبی، پیغمبر ہیں جو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہادی بناکر مبعوث کیے گئے اور جو بنی نوع آدم کے لیے بشیر و نذیر بناکر بھیجے گئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ط

حضراتِ گرامی! مجھے یقین ہے کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ آپ میں سے اکثر حضرات کو ایمان مجمل کے الفاظ یاد ہوں گے[1] اس میں دو اصطلاحیں آئی ہیں، ایک اقرار باللسان اور دوسری تصدیق بالقلب۔ زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں، اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقین کامل رکھنا۔ انکو آپ ایمان کے دو درجے کہہ لیجئے، دو مراتب کہہ لیجئے، دو پہلو کہہ لیجئے، جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے، تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہوگا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے اور دل سے یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضورؐ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے، بلکہ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، زکوٰۃ ادا کرتے تھے، لیکن دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ دل والا ایمان ان کو حاصل نہ تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنّم قرار پایا اور جہنّم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضورؐ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو، لیکن زبان سے اقرار نہ کر رہا ہو تو شریعت کے قاعدہ کی رُو سے وہ شخص کافر قرار پائے گا۔ زبان سے اقرار لازم ہے دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے اقرار کرے اور کلمۂ شہادت ادا کرے کہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ط اور آخرت میں وہی شخص مومن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو، جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں، اور اُنؐ پر اللہ کا آخری کلام، اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابدالآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

توقیر و تعظیم

اب یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ آجائے گی کہ جب ایمان یقین قلبی کے درجہ تک پہنچتا ہے تو اس سے چند

---

[1] اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌۢ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌۢ بِالْقَلْبِ۔

لازمی مقتضیات عائد ہوتے ہیں جن کے نتیجہ میں چند مضمرات اُبھرتے اور کچھ لازمی اثرات پیدا ہونے چاہئیں۔ اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد آیا ہے فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ "پس وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور جنھوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی" گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب حضورؐ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ آپؐ ہمارے خالق، ہمارے مالک، ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں، اس کے پیغامبر ہیں، اس کے رسول ہیں، ہماری ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اور حضورؐ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے، جو تعلیم دی ہے، جو احکام دیے ہیں، جو خبریں دی ہیں، جو اوامر و نواہی بتائے ہیں، حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں ان میں سے کوئی بات بھی اُنھوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے، جیسا کہ سورہ النجم میں فرمایا کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

"اور یہ رسول اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے ان کا ارشاد صرف وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ حضورؐ کی توقیر، تعظیم، احترام اور ادب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں سورۂ حجرات میں اس احترام، ادب، توقیر اور تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور جو مطلوب ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ط

"اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ اُن سے گفتگو میں اپنی آواز کو اس طرح نمایاں کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے بلند آوازی اختیار کرتے ہو مبادا تمھارے سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں، ساری نیکیاں اکارت ہو جائیں، اب تک کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے اور تمھیں شعور اور احساس تک نہ ہو۔"

شعور و احساس جب ہوتا ہے، جب انسان یہ سمجھے کہ وہ حضورؐ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجیے کہ یہاں نافرمانی اور معصیتِ رسولؐ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوءِ ادب کی وجہ سے سارے اعمال کے حبط ہونے کی وعید سُنائی جا رہی ہے "لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ" حضورؐ کی نافرمانی، حکم عدولی، حضورؐ کی رائے کو پسِ پشت ڈال دینا، یہ تو بڑی دُور کی بات ہے۔ اس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ سوءِ ادب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز کو محض بلند کر دیا جائے تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے، کیسی زبردست تنبیہ کی گئی ہے کہ صرف اِس سوءِ ادب اور بے احتیاطی کے سبب سے تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا، سب اعمال اکارت، سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی، اور تمھیں معلوم تک نہ ہو گا کہ تم نے اس بے احتیاطی سے کیا کچھ

کھو دیا۔ تم کیسے عظیم نقصان اور خسارہ سے دوچار ہوگئے۔ اس لیے کہ تم اس مغالطہ میں رہو گے کہ میں نے کوئی حکم عدولی تو نہیں کی کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو مجھ سے نہیں ہوا۔ میں نے اختصار کے ساتھ حضورؐ کی عزت، توقیر اور تعظیم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے سورۂ حجرات کی یہ آیت آپ کو سنائی جس سے اُمید ہے کہ یہ بات واضح طور پر آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ایمان بالقلب کا پہلا لازمی نتیجہ ہے حضورؐ کا ادب، توقیر اور تعظیم۔ اب اسی ایمان کے دو مضمرات ہیں جو میں دو مشہور احادیث کے حوالہ سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسولؐ اور دُوسرا ہے محبتِ رسولؐ۔

اطاعت

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

"لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔"

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اُس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو مَیں لایا ہوں۔"

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ احکام، وہ اوامر و نواہی، وہ شریعت، وہ قوانین و تعزیرات، وہ حدود و قیود اور خدا کے وہ فیصلے جو بذریعہ کتاب (قرآن مجید) اور بذریعہ سنّت (احادیث) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائے ہیں۔ جب تک ان کے لیے کامل اطاعت کا جذبہ اور سرِتسلیم خم کرنے کی کیفیت قلب میں پیدا نہیں ہوتی اور عمل کی تحریک بیدار نہیں ہوتی، اور نفس کی خواہشات کو کچل دینے کا ولولہ نہیں ابھرتا، تب تک ایمان کا تقاضا پُورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ اس ایمان بالقلب کی شرط لازم ہے، اطاعت اور سرِتسلیم خم کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول کی اطاعت کا بھی ساتھ ساتھ ہی حکم موجود ہوگا۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو خدا کا رسول، اس کا نمایندہ، اس کا فرستادہ مان لیا ہے اور تسلیم کر لیا ہے تو اب تمہارے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ اُنؐ کا ہر حکم تم کو ماننا پڑے گا۔ ہر حکم کے آگے سرِتسلیم خم کرنا لازم ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ جو رسول بھی بھیجتا ہے' اِس مقصد کے لیے اور اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

"اور ہم نے تمام رسولوں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔"

اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

"جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔"

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اپنا حکم دینے کے لیے خود نہیں آتا۔ اُس نے اپنے حکم کو پہنچانے کے لیے نبی اور رسول کو وسیلہ، ذریعہ اور واسطہ بنایا ہے، لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسول کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو حضورؐ نے اس طرح فرمایا کہ:

"جس نے میری اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے خدا کی نافرمانی کی۔" (حدیث)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لزوم کے لیے سورۂ نساء کی ایک آیت کا حوالہ مزید دوں گا۔ فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

"پس نہیں، تیرے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں تم ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں، دل کی پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ اس فیصلہ کو قبول نہ کر لیں۔"

یہ آیت مبارکہ حضورؐ کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے نصِّ قطعی ہے۔ رسول محض مان لینے کے لیے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ اس لیے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے، اس کے تمام فیصلے تسلیم کیے جائیں۔ اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے، اس کی سنّت کی پیروی کی جائے، اس کے نقشِ قدم کو رہنما بنایا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں بلکہ آپ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ایمان اور توقیر و تعظیم کا لازمی عملی نتیجہ نکلتا ہے۔ اس اطاعتِ کُلی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا، لیکن حقیقی ایمان کے اعتبار سے خُدا کے ہاں معتبر نہیں ہو گا۔ جیسا کہ اس حدیث شریف میں حضورؐ نے واضح طور پر فرما دیا جو میں نے اس پہلو پر گفتگو کے آغاز میں آپ کو سنائی تھی کہ:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کی تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

محبّت

اسی ایمان اور توقیر کا دُوسرا لازمی نتیجہ محبت ہے۔ صرف مارے باندھے کی اطاعت، مجبوری کی اطاعت، زبردستی کی اطاعت کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جا سکتی ہے بلکہ کی جاتی ہے، لیکن جب یہ اطاعت رسولؐ کے لیے مطلوب ہو تو وہ مارے باندھے کی اطاعت، مجبوری اور زبردستی کی اطاعت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ

وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو دل کی انتہائی گہری محبت کے ساتھ ہو، دل کی پوری آمادگی کے ساتھ ہو، پورے انبساطِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ ہو۔ یہ مطلوبہ محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ میں نے اس موضوع پر گفتگو کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اطاعت اور محبت کے مضمرات کے بیان کے لیے میں دو مشہور احادیث کے حوالے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ اطاعت والی حدیث آپ سُن چکے ہیں، اب محبت والی حدیث پیش کرتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک میں اُسے محبوب تر نہ ہو جاؤں، اُس کے اپنے بیٹے سے، اس کے اپنے باپ سے، اور تمام انسانوں سے۔"

یعنی اگر ایک مومن کے دل میں حضورؐ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوتی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مومن نہیں۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بات واضح نہ ہو، بلکہ صاف صاف اور دو ٹوک انداز میں ارشاد ہوا کہ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ اگر رسول کی محبت ان تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس معنی پر ایمان مطلوب ہے وہ ایمانِ حقیقی ابھی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ اسی موقع پر دل چاہتا ہے کہ وہ واقعہ بھی سُنا دوں جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا، ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے سوال کیا "عمر! تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟" ذرا اندازہ لگائیے کہ اس طرح کی بھی گفتگو ہوتی تھی، کتنی اپنائیت کا احساس اس گفتگو سے اُبھرتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ حضورِ اقدسؐ اور عمر فاروقؓ کے مابین کس قدر قربِ قلبی اور ذہنی موجود تھا، حضورؐ حضرت عمرؓ سے دریافت فرماتے ہیں کہ "عمرؓ! تمھیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اُسی ہستی سے کیا جا سکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلّم ہو۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ:

"حضورؐ! آپ مجھے دُنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں۔"

حضورؐ نے پھر دریافت فرمایا کہ:

"اور خود اپنی جان سے؟"

اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: "الآن۔ ہاں حضورؐ! اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔"

سوچ سمجھ کر جواب دیا، اپنا جائزہ لے کر کہا، دل کے اندر جھانک کر کہا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں

کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعویٰ محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جائیں۔ اِلاّ ماشاء اللہ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ " ہاں اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو، اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔"

حضراتِ گرامی! اب تک کی میری اس گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے از روئے قرآن مجید ہمارے تعلق کی پہلی اساس اور بنیاد ہے " ایمان "۔ اقرارٌ باللسان بھی اور تصدیقٌ بالقلب بھی۔ دوسری بنیاد ہے " توقیر و تعظیم "۔ اور ان دو بنیادوں کے لوازم میں سے دو اہم لوازم ہمارے سامنے آئے: ایک اطاعتِ کُلّی اور دوسرے محبتِ قلبی۔ اب اگر موخرالذکر دونوں چیزوں کا اجتماع ہو جائے تو ایک نیا لازمہ بن جاتا ہے اور اس کے لیے قرآنِ کریم کی اصطلاح ہے اتباع۔

اتباع

قلبی یقین، دل کی حقیقی محبت اور طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو۔ بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لیے سعادت سمجھے گا، اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہے گا۔ وہ یہ دیکھے گا کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے، ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے، وہ چلتے کس طرح ہیں، وہ لباس کون سا پہنتے ہیں، انھیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے، چاہے ان کے بارے میں کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو، لیکن جس کے دل میں حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے گی جو والہ و شیفتہ ہو جائے گا اس کے لیے وہ احکام جو الفاظ میں دیے گئے ہوں، زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں، یا وہ کام جن کو کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو، وہ تو بہت دُور کی بات ہے وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل۔ اس کے لیے تو چشم و آبرو کا اشارہ بھی حکمِ قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ہر ہر ادا کی نقالی، اس کے ہر ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام ہے " اتباع " جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بہت سے واقعات سیر کی کتب میں مرقوم ہیں۔ وہؓ ایک سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھے، اتفاق سے حضورؐ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا ہے، لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لیے لازم کر لیا کہ جب کبھی اُس راستہ سے گزرنا ہُوا تو وہ اس درخت کے نیچے سے ہو کر نکلے ہیں۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر میں حضورؐ نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا، جہاں جہاں استراحت فرمائی، حوائجِ ضروریہ سے

فراغت پائی۔ حضرت ابن عمرؓ نے سفرِ حج میں وہاں وہاں پڑاؤ، استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا اگرچہ کوئی حکم نہیں۔ شریعت کے لحاظ سے یہ عمل سنّت میں شامل نہیں، بلکہ خالص عقلیت پسند (RATIONALIST) لوگ تو شاید اس کو جنون کہیں، ممکن ہے کہ وہ اس کو خواہ مخواہ کا (FANATICISM) کہیں۔ لیکن یہ معاملہ محبت کا معاملہ ہے، عشق کا معاملہ ہے جس میں محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت میں شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنا فی حُبّ رسولؐ ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویّہ یہی ہونا چاہیے۔ یہ دل کا معاملہ ہے اور اس کی قدر دانی بھی وہی ہستی فرمائے گی جس کے حکم کے مطابق یہ اتباع لازم کیا جا رہا ہو۔ اسی طرح سیرِ صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے، وہ کہیں دُور دراز علاقہ سے آئے ہیں، حضورؐ کے ہاتھ پر مشرف بالاسلام ہوتے ہیں۔ حضورؐ کو ایک ہی موقع پر دیکھا ہے اور اتفاق سے اس وقت حضورؐ کا گریبان کھلا تھا۔ ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے، اس لیے کہ اُنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حال میں دیکھا تھا، حالانکہ کوئی حکم نہیں، شریعت کا کوئی امر نہیں، کوئی فرض نہیں، واجب نہیں۔ کسی ادنیٰ درجہ میں بھی حضورؐ کا اشارہ موجود نہیں، لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کی ہر ہر چیز کی پابندی، ہر ہر نقشِ قدم کی پیروی اور ہر ہر ادا کی نقالی اپنے اُوپر لازم کر لی جائے، اس طرزِ عمل کا قرآن مجید کی اصطلاح میں نام ہے "اتباع"۔

حضرات! اس اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے اس کو بھی دیکھ لیجئے۔ سورۂ آل عمران کی ۳۱ ویں آیت میں صاف صاف کھول کر کہہ دیا گیا کہ:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

"اے نبی! آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، تمہاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔"

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں اُن کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

برادرانِ دین! میں چاہتا ہوں کہ اس مقام تک کی گفتگو کا ایک خلاصہ آپ کے سامنے پھر پیش کر دوں۔ اور آپ سے درخواست کروں کہ آپ اس بات کو الجبرا کی (EQUATION) کی طرح اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ ایمان اور توقیر و تعظیم کے دو اور ناگزیر لوازم ہیں، ایک اطاعتِ کلّی اور دوسرے محبت، جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور

جب یہ دونوں جمع ہوں گی یعنی اطاعتِ کُلّی اور محبّتِ قلبی، تو اس کا نام ہے "اتباع"۔ اور خدا کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ اس اتباع کا وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ جس کا سورۂ آلِ عمران کی ۳۱ ویں آیت میں ذکر کیا گیا جو ابھی میں نے آپ کو سنائی اور جس کا مفاد یہ ہے کہ "اگر تم خدا سے محبّت کرتے ہو تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اپنے اوپر لازم کر لو اللہ تم سے محبت کرے گا، تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے۔"

حضرات! اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان دونوں ناگزیر لوازم اور اساسات میں اگر ایک بھی غائب اور ساقط ہو تو اس ادھورے طرزِ عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایمان کا دعوٰی ہے۔ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے، لیکن محبّت نہیں ہے، دل کی آمادگی نہیں ہے، یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ط کی کیفیت نہیں ہے، دل میں تنگی ہے، اُپراہٹ ہے، تو اس طرزِ عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور ایک مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمان لانے کے وہ بھی مدعی تھے، اطاعت وہ بھی کرتے تھے، مجبوراً کرتے تھے، اس لیے کہ اس کے بغیر وہ مسلم معاشرہ کے فرد کی حیثیت اختیار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعت تو درکنار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا استہزاء کریں۔ جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں، ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں، سنّتِ رسولؐ کے التزام سے انکار کریں۔ اسلام کے نظامِ زندگی کو ناقابلِ عمل اور اساطیر الاوّلین قرار دیں، لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اُس معاشرہ کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا، خود کو مسلمان کہلانا تھا، اُس پر لازم تھا کہ اطاعت کرے، اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی، نمازیں پڑھے، شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائضِ دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے عمل کرتے تھے بلکہ قسمیں کھا کھا کر اپنے صادق و مخلص ہونے کا حضورؐ کو یقین دلاتے تھے لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی، وہ تھی یقینِ قلبی اور حقیقی و واقعی محبّت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون میں فیصلہ فرما دیا کہ:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ط وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○

"اے نبیؐ! جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ درحقیقت آپ اللہ کے رسول ہیں (کیونکہ اُسی اللہ ہی نے تو آپ کو مبعوث فرمایا ہے) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشُبہ اپنے قول میں جھوٹے ہیں۔"

یعنی اُن کی یہ بات تو اپنی جگہ سچّی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن چونکہ یہ منافق لوگ دل سے آپ کی رسالت کے قائل نہیں، ان کے دلوں میں آپ کی حقیقی محبّت موجود نہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں، ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور۔ اس لیے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ محبّت

اور یقین قلبی کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہے تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر محبتِ رسولؐ کے دعوے ہیں، لیکن اطاعت نہیں۔ فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر و نواہی کی پروا نہیں۔ احکام کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں۔ تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت ہے، فسق ہے، فجور ہے۔ یہ دعویٰ محبت خدا کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں ایسا دعویٰ قبول نہیں ہو سکتا، مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ والد کی محبت کا دعویٰ ہو، لیکن ان کا کہنا نہ مانا جا رہا ہو بلکہ ہر عمل اور ہر فعل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیا جا رہا ہو، تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعویٰ محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ عشقِ رسولؐ اور محبتِ رسول کے بلند بانگ دعاوی اور بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام اور بڑے ہی عمدہ اور شاندار طریقہ سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالس سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی ہیں، پیرویِ سنّت کے جذبہ سے عاری ہیں تو سراپا ڈھونگ ہے، فریبِ نفس ہے۔ اُن کا کوئی وزن نہیں، اُن کی کوئی حقیقت نہیں۔ خدا کے ہاں ان کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، بلکہ یہ سب قابلِ مواخذہ ہیں۔ دو چیزیں' اطاعت اور محبت دونوں یکساں مطلوب۔ دونوں جمع ہو گئیں تو اتباع۔ اطاعت ہے، محبت نہیں تو مشابہت منافقین کے ساتھ۔ محبت کا دعویٰ ہے، لیکن اطاعت نہیں ہے تو دعویٰ ناقابلِ قبول، مسترد اور خارج۔ خدا کے ہاں اس کی کوئی قدر اور وقعت نہیں اور میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ پس حضرات! فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دو بنیادیں واضح ہوئیں۔ اب تیسری بنیاد کو لیجئے جو وَنَصَرُوْهُ کی اصطلاح میں بیان ہوئی یعنی "جن لوگوں نے حضورؐ کی مدد اور حمایت کی"۔

نُصرتِ رسُولؐ

برادرانِ دین! اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات طے کیجیے کہ رسول کی نصرت و حمایت اور رسول کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ رسالت و نبوت ایک فریضۂ منصبی ہے جو خدا کی طرف سے رسولؐ نبی کو تفویض کیا جاتا ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ سوجھانا، نیند کے ماتوں کو جگانا، شرک کی اندھیاریوں میں سے انسان کو نکال کر توحید کی روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا، اعمالِ صالح اور مکارمِ اخلاق کا انسان کو خوگر بنانا، انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا، معاشرہ میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا، انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک و آقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لیے کھڑا ہونا ہوگا يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط اور يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ط وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝ جس روز لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے اور جس روز کسی کا کوئی بھلا نہیں کر سکے گا، کوئی کسی کے کام نہیں آ سکے گا

اور جس دن تکوینی حاکمیت کے ساتھ تشریعی حکومت بھی اللہ اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔

جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی و جہد کا نتیجہ اُس کے سامنے ہوگا بُرے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں جہنم اس کے سامنے پیش ہوگی اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیش نظر اپنے نفس کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہوگا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا :

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ○ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ○ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○

(النّٰزِعٰت)

جس روز انسان اپنا سب کیا دھرایا د کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگا اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا تو جنت اُس کا ٹھکانا ہوگی!

تبلیغ کا بارِ گراں

تبلیغ کا یہ بارِ گراں، دعوت کا یہ کٹھن کام، شرک کے اندھیروں کو دُور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری، بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام، طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور بول بالے کے جان جوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا۔ یہ تھا وہ بارِ گراں جو رسالت و نبوت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پہ آیا تھا۔ یہ تھے وہ فرائضِ منصبی جو آنحضورؐ کے سپرد ہونے تھے۔ چنانچہ ابتدا ہی میں حضورِ اکرمؐ کو خبر دے دی گئی تھی اور سورۂ مزمّل میں کہہ دیا گیا تھا کہ :

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○

"ہم عنقریب تم پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے۔"

اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند دنوں بعد ہی حضورؐ کے شانوں پر رکھ دیا گیا۔ چنانچہ سورۂ مدثّر میں حکم آ گیا :

يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○

"اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو، ان کو خبردار اور چوکنا کرو، ان کو ہوشیار کرو، ان کو غلط عقیدہ اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ، اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو، نہ صرف اعلان کرو بلکہ اپنے رب کی کبریائی کا عملاً نفاذ کرو۔"

تکبیر کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم و برپا کر دینا ہے ، جس میں تشریعی حیثیت سے بھی خدا ہی مقتدرِ اعلیٰ ہو وہی سپریم (SUPREME) تسلیم کیا جائے اُسی کا حکم حرفِ آخر ہو ۔ اُسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اُسی طرح زمین پر بھی پوری ہو ۔ اُسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلند تر ہو جائے تاکہ اُسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط یہ ہے تکبیرِ رب کا اصل اور حقیقی مفہوم ۔ اور یہ ہے وہ قولِ ثقیل ، وہ بھاری بوجھ جس کی سورۂ مزمل میں خبر دی گئی تھی ۔ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○

برادرانِ دین ! جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تکبیر کے معنی صرف زبان سے اللہ کی بڑائی بیان کرنا نہیں بلکہ اس کے مفہوم میں اپنے رب کی کبریائی کا اعلان اور اس کا عملاً نفاذ بھی شامل ہے ۔ کبریائی تو واقعتہً وہ کبریائی ہے جو عملاً نافذ ہو ۔ محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں ۔ محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی بلکہ کبریائی اور بڑائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی مانا گیا ہو تسلیم کیا گیا ہو جس کے احکام جس کی ہدایات اور جس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو ، جس کا آئین اور جس کا قانون عملاً نافذ ہو ، جو حقیقی طور پر سپریم تسلیم کیا گیا ہو ۔ یہ ہے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کا حقیقی مفہوم ۔ مدنی دور میں اسی بات کو مزید کھول دیا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم المرسلین والنبیین ہیں لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ہی اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے اور آپؐ کی بعثت کی غایتِ اُولیٰ ہے ۔ چونکہ تا قیامِ قیامت کوئی اور رسول اور نبی آنے والا نہیں لہٰذا بنی نوعِ انسان پر اتمامِ حجت کے لیے جہاں اللہ نے اپنی آخری کتاب ، مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا[1] وہاں ضروری ہوا کہ دینِ حق بتمام و کمال قائم و نافذ بھی ہو تاکہ انسان کے لیے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے اور اتمامِ حجت ہو جائے ۔ یہ مضمون مدنی دور کی تین سورتوں سورۂ توبہ ، سورۂ فتح اور سورۂ صف میں وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط

وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ (رسول) اس ہدایت اور دینِ حق کو ہر جنس دین (یا کُل ادیان ، نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے ۔"

یہ ہے وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ آپ پورے عالمِ انسانی میں اس وقت اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل تنہا اور اکیلے تھے ۔ دنیا کے بتکدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا ، تکبیرِ رب کا نعرہ لگانا ، خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ، اظہار و غلبۂ دین کے لیے کشمکش کرنا ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا ۔ اعمالِ صالح اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا عَلم بلند کرنا ۔ ظلم و جور ، تعدی و

---

[1] اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○

ستم اور استبداد واستحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا؛ چنانچہ اسی لیے اسے " قول ثقیل" بھاری بوجھ سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیر رب کے لیے کھڑے ہونے کا مطلب تھا پورے معاشرہ سے جنگ۔ اور حضورؐ کو حکم تھا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝

اور فرمایا گیا کہ :

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ط وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ط

" اور چاہے مشرکوں کو اور کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"

وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی تھی۔ وہ کتنا ہی راستہ روکیں، مزاحمت کریں۔ وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرہ میں پڑ گئی ہوں، وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں، کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں۔ ظلم و تشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں، جور و تعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں۔ ان تمام مخالفتوں، مظالم اور استبداد کے علی الرغم' ان تمام موانع کے باوجود اور ان شدائد و مصائب کے باوصف نبی اکرم، سرورِ عالم، محبوبِ خدا، رحمۃٌ للعالمین، خاتم المرسلین والنبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ رب کا جھنڈا بلند کریں۔ طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں۔ باطل کی قوتوں سے نبرد آزما ہوں۔ استہزاء اور طعن و تشنیع کے وار سہیں۔ حکم تھا اللہ کی کبریائی کے بالفعل نفاذ اور دینِ حق کے اظہار[1] کے لیے جد وجہد کرو، کشمکش کرو، اور ہر نوع کے استہزاء، طنز و تعریض اور شدائد و مصائب کو انگیز کرو۔ یہ بھاری بوجھ تھا اور یہ بھاری ذمہ داری تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر رکھی گئی تھی۔

حضراتِ گرامی! اب آپ خود غور کیجئے، دو اور دو چار کی طرح اس حقیقت کا ادراک فرمائیے کہ جو شخص حضورؐ پر ایمان لائے اور اقرار و تصدیق کرے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس کے لیے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی میں، تکبیرِ خداوندی کی کٹھن مہم میں، اظہارِ دینِ حق کے جان جوکھوں کے کام میں، دعوت و تبلیغ کے راہِ خارزار میں حق و باطل کے معرکۂ کارزار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ جنگ و جدال میں وہ حضورؐ کا دست و بازو بنے' سہارا بنے، رفیق و ناصر بنے، حامی کار و مددگار بنے، جہاں حضورؐ کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کو اپنے لیے باعثِ فوز و سعادت سمجھے۔ حضورؐ کے مشن کی تکمیل کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کا ایقان رکھے، اس کا جینا اور مرنا حضورؐ کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہو، اس کا مال، اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لیے وقف ہوں جو خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔ اگر حضورؐ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط نہ ہو تو اس کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت غیر معتبر ہے'

---

[1] عربی میں اظہار کا مفہوم غلبہ و فوقیت ہے۔ (مرتب)

جھوٹ ہے، مغالطہ اور فریبِ نفس ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ہے۔ لفظِ نصرت سے مبادا آپ کو یہ خیال ہو کہ نبی اور رسول کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت! نبی کا مقام اور اس کا مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود ان کا ولی، مولا اور ناصر ہے۔ نبی کی پشت پناہ ملائکۃ اللہ ہیں وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ط نبی کو تو رُوح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا نبی کو اہلِ ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت! پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس عالمِ اسباب میں اور عالمِ تشریعی میں دینِ حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے شرف سے نوازا گیا ہے۔ الھدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ اللہ اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق و انفس میں اللہ کی آیات نبی کی دعوت قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ نبی اور رسول کی صداقت کے ثبوت کے لیے انزالِ کتب ہوتا ہے، جس کی ایک ایک آیت فرقانِ مبین اور برہانِ قاطع ہوتی ہے۔ وہ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات سے بھی نوازتا اور سرفراز فرماتا ہے، لیکن قبولِ حق اور انکار کا فیصلہ کرنے کے لیے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ط اقامتِ دین، شہادتِ حق، دعوت و تبلیغ کی جدوجہد بہرحال انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے اور نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعیِ اوّل ہوتا ہے اور سب سے پہلے رسول ہی دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ احزاب میں فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ	اے نبی! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر
مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر،
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝	اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت
(احزاب)	دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔

پھر جو لوگ نبی کی دعوت قبول کریں، ان پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ عزّ و جلّ اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچتا ہے ان کا امتحان لیتا ہے، اِس عالمِ علّت و معلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر، رسول پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مومنین صادقین کی جانفشانیوں اور سرفروشیوں کے ایثار و قربانی اور جدوجہد سے پھیلے گا، دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہو گی تو ان ہی کی کشمکش، محنت اور جدّوجہد اور جہاد و قتال سے قائم ہو گی۔ وہ خاک و خون میں لوٹیں گے۔ راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید و نصرت سے اللہ کا دین غالب اور قائم ہو گا۔ یہی سنّتِ اللہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (الصف)

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی ابتلا اور کشمکش میں مومنین صادقین کی آزمایش ہے، امتحان ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے۔ جدّوجہد اور جہاد و قتال میں، حضور کے مشن کی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ نصرت سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ہی وہ کسوٹی ہے جس پر اس عالمِ رنگ و بُو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں۔ جیساکہ سورۂ عنکبوت میں فرمایا:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○

"یقیناً اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مومن بنے پھرتے ہیں جو حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے حقیقتاً منافق ہیں۔"

ایمان و نفاق کا اس دُنیا میں انھی آزمائشوں سے، ان ہی سرفروشیوں سے اور ان ہی جاںفشانیوں سے فیصلہ ہوتا ہے رسولؐ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا۔ رسول کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا۔ محمد رسول اللہ کے منصبِ رسالت کی تکمیل میں کھپے یا نہیں کھپے۔ دعوتِ الی اللہ کے مراحل میں صبر واستقامت دکھائی یا نہیں دکھائی۔ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں پھر تو رسول پر ایمان کا دعویٰ ناقابلِ قبول، رسول سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد، رسول اللہ کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا، محض دکھاوا، اس لیے کہ آپ خود سوچیے اور ذرا چشمِ تصوّر میں لائیے کہ محبوبِ خدا، سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے میدان میں جان کی بازی لگا رہے ہیں، اس کشمکش میں رحمۃٌ للعالمین زخمی ہوگئے ہیں، خَود کی کڑیاں سرِ مبارک میں گھُس گئی ہیں، رُخسارِ مبارک بھی مجروح ہوگیا ہے، دندانِ مبارک بھی شہید ہوچکے ہیں، مقدس خون راہِ حق میں بہہ رہا ہے اور عین اُس وقت کوئی مدعیِ عشقِ رسولؐ مدینہ میں کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیحیں پڑھ رہا ہو، حضورؐ پر سلام پڑھ رہا ہو، حضورؐ کی شان میں نعتیں پڑھ رہا ہو، تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی۔ کوئی تعلق اور کوئی نسبت ہے اس طرزِ عمل کی، اس دعوئے ایمان بالرسول اور دعویٰ محبتِ رسولؐ کے ساتھ۔ آپ درود کی تسبیح پر تسبیح پڑھے جا رہے ہوں سلام پہ سلام بھیجے جا رہے ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کارزارِ اُحد میں، خاک و خُون کے میدان میں، اس وادیِ پُرخطر میں جہاں پہ ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو، اپنے جاں نثاروں کے ساتھ خونیں کشمکش اور جدوجہد فرما رہے ہوں، زندگی اور موت کا درس دے رہے ہوں۔ اللہ کے جھنڈے کو تھامنے کے لیے، اس کو سربلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسول کہیں کسی گوشہ میں بیٹھا درود وسلام پڑھ رہا ہو۔ جتنی عجیب بات یہ اُس وقت ہوتی اُتنی ہی عجیب بات یہ آج بھی اور اس وقت بھی ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حضورؐ کا مشن مُردہ نہیں ہوا، زندہ ہے، تابندہ ہے اور تا قیامِ قیامت زندہ رہے گا۔ حضورؐ کی بعثتِ رسالت تا قیامِ قیامت ہے۔ بنی نوعِ انسان آج بھی ہدایتِ ربّانی کے محتاج ہیں۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے اور یہ فرض اُمتِ مسلمہ کو بحیثیت اُمت ادا کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی خود کو مسلمان سمجھتا ہے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوعِ انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ حضورؐ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لیے نہ تھی بلکہ پوری بنی نوعِ انسان کے لیے ہے۔ حضورؐ کی

بعثت ایک مخصوص زمانہ اور وقت کے لیے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لیے ہے ۔ توحید کی دعوت دینا ، شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب ، قائم اور نافذ کرنا محمد رسول اللہ کا مقصدِ بعثت تھا' جیسا کہ فرمایا :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس آیت کی کامل شان کا ظہور باقی ہے اس کا ظہور اس وقت تک نہ ہوگا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اسی طرح خدا کے دین کا جھنڈا نہیں لہراتا اور ادیانِ باطل کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے ۔ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں شدائد و مصائب ، استہزاء و طنز و تعریض ، شعبِ ابی طالب ، سفرِ طائف ، ہجرت ، بدر و اُحد ، احزاب و حنین اور تبوک کے مراحل سے گزر کر جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا ۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے نبی اکرمؐ کا مقصدِ رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اب کارِ رسالت کی انجام دہی کی ذمہ داری اُمتِ مُسلمہ پر ہے ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

پس اب اُس مدعیِ ایمان ، اس عاشقِ رسول اور اس محبِ رسول کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہیے جسے حضورؐ کے اس مشن ، اس مقصدِ بعثت سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اُسے فیصلہ کرنا چاہیے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے ۔ آج عملاً یہ صورتِ حال رونما ہو چکی ہے کہ : ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وُہ آج غریب الغربا ہے

یہی وُہ صورتِ حال ہے جس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی ، صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

بَدَءَ الاسلامُ غریبًا وسیعود کما بدء فطوبی للغرباء ۔	اسلام کی ابتدا غربت کی حالت میں ہوئی اور غربت کی یہ حالت پھر اسلام پر طاری ہو گی تو مبارکبادی ہے "غربا" کے لیے ۔

غریب کے صرف اردو معنی مفلس و نادار کے نہ سمجھیے بلکہ اس کے مفہوم کو لغتِ حدیث سے معلوم کیجئے ۔ جہاں اس کی تشریح اس طرح ملتی ہے کہ " اسلام غربت سے شروع ہُوا جیسے غریب مسافر اپنے اہل و عیال سے دُور اور اپنے وطن سے دُور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے ، اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں غریب اور تنہا تھا ، کوئی غم خوار نہ تھا یعنی مسلمان بہت کم تھے ۔ ایک زمانہ میں وہ پھر " غریب " ہو جائے گا ۔ کفار ، ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہو گی ۔ نام کے

مسلمان کثیر التعداد ہوں گے۔ سچے، موحد، دیندار، متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان کم اور قلیل "غرباء" کے لیے طوبیٰ ہے، یعنی مبارکباد اور بہشت۔"

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْغُرَبَآءُ الَّذِیْنَ یُحْیُوْنَ سُنَّتِیْ وَیُعَلِّمُوْنَھَا النَّاسَ۔ — غرباء وہ ہیں جو میری سنّت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔

اور حضورؐ کی سب سے بڑی، سب سے اہم سنّت سُنّتِ دعوت و تبلیغ ہے جس پر میں ان شاءاللہ آگے روشنی ڈالوں گا۔

ایک اور روایت میں حضورؐ نے خبر دی کہ:

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ۔ — اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسلام کہیں زمین پر فی الواقع قائم و نافذ نظر نہیں آئے گا۔ کردار اور شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کارفرما اور موجود دیکھنے کے لیے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمیں جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ تلاوت صرف رسمًا اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے باقی رہ جائے گی۔

برادرانِ دین! یہ صورتِ حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیث میں دی گئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھنے کے لوازم میں سے ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر حضورؐ سے محبت ہے، اگر حضورؐ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر حضورؐ کے ساتھ ہمارا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو وہ ہی ہمارا مقصدِ زندگی، مقصودِ حیات اور نصب العین ہے یا نہیں کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت تھا، یعنی لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا ط اور اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلِّہٖ، تکبیرِ رب اور اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم اگر ہم میں سے کسی کے مقاصدِ زندگی میں شامل نہیں، اگر وہ حضورؐ کے مشن کی تکمیل میں حضورؐ کا دست و بازو نہیں بن رہا، حضورؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا حضورؐ سے تعلق درست نہیں جس کی اُسے فکر کرنی چاہیے۔ یہ ہے حضورؐ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو وہ نَصَرُوْہُ کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

اتباع کا اقتضا

اسی نصرتِ رسول کے مسئلہ کو میں "اتباعِ رسول" کے حوالہ سے مزید واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اتباع کے

معنی ہیں حضورؐ کے نقشِ قدم کی پیروی، جو حضورؐ نے کیا وہ ہم کریں۔ یہ ہے اتباع، یہ ہے سنّت پر عمل۔ اب ذرا غور کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے، پیہم و مسلسل ہوا ہے، جو پورے تیئیس۲۳ برس ہوا ہے، شب و روز ہوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں؟ کب چار بنیں؟ کب روزوں کی فرضیت ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کب نازل ہوئی؟ ان سب کے لیے احادیث اور تاریخ و سیرت سے اوقات اور زمان متعین کیے جا سکیں گے۔ ان میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، کسی قیل و قال کا موقع نہیں، اور وہ بات یہ ہے کہ

> اوّل یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو عمل پیہم کیا ہے، مسلسل کیا ہے، متواتر کیا ہے، شب و رُوز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے وہ عملِ دعوت ہے۔ وہ عملِ تبلیغ ہے، وہ تکبیرِ رب کی سعی و جہد ہے، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد ہے، وہ دینِ حق کے سر بلند کرنے کی تگ و دَو ہے، وہ اظہار و اقامتِ دین کے لیے مجاہدہ، کشمکش اور تصادم ہے۔

اس سعی و جہد اور مجاہدہ کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں، کہیں وہ مکّی دَور میں دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی۔

مکّہ کی اور طائف کی گلیوں کُوچوں میں پتھر کھانے اور استہزاء کے تیر انگیز کرنے کے مرحلہ میں تھی۔ کہیں وہ مدنی دَور میں ایک مسلّح تصادم، بدر و اُحد اور خندق کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی۔ کہیں قبائلِ عرب اور قُرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صُلح حدیبیہ اور فتح مکّہ نیز غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن جو عمل تیئیس۲۳ سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جاتا رہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبع رسول ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنّتِ رسول لازم ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر، متفق علیہ اور ثابت شدہ سنّت کس حال میں ہے؟ دعوت و تبلیغ کی اس کے اندر کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ کتنا رجحان ہے اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے؟ کتنا مال لگا رہا ہے۔

متفقہ سنّتِ رسولؐ

میری اس گفتگو سے مجھے اُمید ہے کہ یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ وُہ سنّت جس کے بارے میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں اور نہ اختلاف کی کوئی گنجائش ہے وہ سنت سنّتِ دعوت و تبلیغ ہے، وہ مجاہدہ فی سبیل اللہ ہے،

وہ تکبیرِ رب کی عملی جدوجہد ہے۔ وہ غلبۂ دین کی سعی و کوشش ہے۔ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سرفروشی اور جاں نثاری ہے۔ اسی سنت میں جان و مال کھپانا ہے، صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرنی ہیں۔ اسی کو مقصدِ حیات قرار دینا ہے۔ اگر یہ نہیں تو اطاعت، محبت اور اتباع کے تمام دعاوی غلط ثابت ہوں گے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اور اسی بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ حضورؐ کا مشن زندہ ہے، حضورؐ کا مقصدِ بعثت تابندہ ہے، لیکن اُسے شرمندۂ تکمیل کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ یہ مرحلہ طے کرنا، اس کے لیے جدوجہد کرنا، محنتیں کرنا، ہر اس شخص پر لازم ہے بلکہ فرض ہے جو حضورؐ کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتا ہو۔ یہ کام ہم کو، آپ کو، سارے مسلمانوں کو کرنا ہوگا۔ اسی مقصد کو اپنا نصب العین اور مقصودِ اوّلین سمجھنا اور بنانا ہوگا۔ اسی کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں، توانائیوں کو وقف کرنا ہوگا۔ اسی طرح وہ تقاضا پورا ہوگا جو وَنَصَرُوْہُ کے حوالے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔

نُصرت کا قرآن میں مقام

اسی نُصرت کو قرآن مجید کے ایک اور حوالہ سے بھی سمجھ لیجیے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؑ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا:

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔

"خدا کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟"

تکبیرِ رب، دعوتِ توحید، ہدایت کی توسیع، نورِ خداوندی سے دُنیا کو منوّر کرنے کا کام میرے سپرد ہوا ہے۔ اس مشن کے لیے میں نے جدوجہد کرنی ہے۔ اب کون ہے جو اس راہ میں میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو میرا دست و بازو بنے؟ حواریین کے جواب کو قرآن مجید یُوں نقل فرماتا ہے:

قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔

"حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے انصار اللہ کے مددگار۔"

جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ۔ جواب میں کہلوایا گیا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت ہے۔ رسول کی نُصرت خدا ہی کی نصرت ہے۔ اس کو یُوں سمجھیے کہ غلبۂ دین جو مقصودِ حقیقی ہے، اس کو غالب کرنے کی کوشش کرنا رسول کا بحیثیت رسول فرضِ منصبی ہے۔ اب اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسول کا حامی، مددگار اور دست و بازو بنتا ہے، اپنے آپ کو کھپاتا ہے، جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ اللہ کے رسول کی نصرت بھی کر رہا ہے اور خدا کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ پس اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کو اللہ اپنی اور اپنے رسول دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔ یہاں وَنَصَرُوْہُ کا بیان ختم ہُوا۔ اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی چوتھی صحیح بنیاد کا ذکر شروع ہوتا ہے اور وہ ہے نورِ قرآن مجید کو

حرزِ جان بنانا، رہنما قرار دینا اور اُس نُور کا اتباع کرنا۔

اتباعِ قرآن مجید

فرمایا:

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۔

"اور اتباع کیا اُس نُور کا جو اُن (نبی اکرمؐ) کے ساتھ یا اُن پر نازل کیا گیا"۔

یہ نورِ قرآن یہ نورِ کتاب، یہ نورِ ہدایت جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا، اس کا اتّباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں۔ یعنی اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ ۔ تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اُس کا مزید اضافہ کس مقصد کے لیے کیا جا رہا ہے کہ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ نبی اکرمؐ بہرحال اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک مدتِ معیّنہ ہی تھی جس میں صحابہ کرام رضؓ کو حضورؐ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی،

آنحضورؐ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابد الآباد تک کے لیے جس چیز کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین اور قائم مقام بننا ہے وہ ہے قرآن مجید، فرقانِ حمید، کتابِ مبین، نورِ خداوندی، اللہ کا کلام۔ یہ وہ نُور ہے جو دائم و قائم ہے اور جو محمد رسول اللہ کے ساتھ اُترا۔

چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضورؐ نے جو آخری بات فرمائی ہے وہ اسی قرآن مجید کے متعلق ہے مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجۃ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں:

وَقَدْ تَرَكْتُ فِیْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا ۔ كِتَابُ اللّٰهِ ۔

اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تا ابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے، وہ چیز ہے کتابُ اللہ۔

اس سے قبل کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشادِ گرامی کے بارے میں کچھ عرض کروں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اس ارشادِ گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی حجۃ الوداع کے موقع پر حضورِ اکرمؐ نے یہ محسوس فرما لیا تھا کہ آپ کشمکشِ حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پُورے خطبہ میں موجود ہے، بلکہ خطبہ کا آغاز ہی آپؐ نے ان الفاظ سے فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ فَاِنِّیْ لَا — لوگو! میری بات غور سے سُنو، کیونکہ شاید اس

آدری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا | سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے پھر نہ
بھذا الموقف ابدا۔ | مل سکوں۔

چنانچہ اس خطبہ میں حضورؐ کے ارشادات کا انداز وصیّت کا سا ہے یعنی ان امور کی تاکید جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ اسی خطبہ میں حضورؐ نے آخر میں تاکید فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا، اسے حرزِ جان بنانا، اس سے چمٹنا، میں تم کو بے یارو مددگار چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ میں تمہاری ہدایت اور تمہاری رہنمائی کے لیے اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جا رہا ہوں، جو تمھیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی صراطِ مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حَبۡلُ اللهِ

یہی اللہ کی کتاب ہے جس کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حَبۡلُ اللہ قرار دیا۔ قرآن مجید میں سورۂ حج کے آخر میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللهِ۔

"خدا کے ساتھ چمٹ جاؤ، خدا کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ۔"

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خدا سے کیسے چمٹیں، خدا کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؛ سورۂ آل عمران میں اس کو مزید کھولا گیا:

وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللهِ۔

"اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامو۔ اللہ کی رسّی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔"

پھر ایک اشکال رہ گیا کہ حبل اللہ سے کیا مراد ہے، کیسے تھامیں؛ کس سے جڑیں؛ اس کی شرح و توضیح نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں اور وحیِ غیر متلو کے ذریعہ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسّی ہے جس سے اعتصام کا، چمٹ جانے کا، جُڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے متعلق حضورؐ نے فرمایا:

هُوَ حَبۡلُ اللهِ الۡمَتِيۡنُ۔

یہ ایک بڑی مفصل اور مشہور حدیث کا ایک جزو ہے جس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت، اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی اہمیت کا بیان ہوا ہے، اسی طویل حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی مذکور ہے کہ:

"قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے، یعنی اس کتاب پر کبھی

باسی پن طاری نہیں ہوگا۔ نہ کثرت اور تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات ختم ہوں گے۔"

یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ۔

اسی حدیث میں قرآن مجید کے متعلق حضورؐ فرماتے ہیں کہ: هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ۔

اور اسی کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرما رہا ہے: وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تا ابد گمراہ نہیں ہو گے۔ جیسا کہ میں ابھی آپ کو خطبہ کا آخری حصہ مسلم شریف کے حوالہ سے سُنا چکا ہُوں۔ بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے جب مضبوطی سے حبل اللہ کو تھامنے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت تھی تو لازماً اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی ہونا چاہیے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیے۔ آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اسی کو اپنا ہادی و رہنما حقیقی معنوں میں سمجھا، اُسی پر اپنے سارے عمل، اخلاق اور معاملات کا انحصار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا، دُنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے، اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا، لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا ہوتے چلے گئے اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے نیاز ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال آتا چلا گیا۔ وہ فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے مغلوب مقہور ہو گئے۔ اُن کے عقائد خراب ہُوئے، اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو قبضہ جمانے کا موقعہ مل گیا۔ ان کا اتحاد پارا پارا ہوا اور وہ بنیانِ مرصوص کے بجائے فرقوں میں، گروہوں میں، قومی و نسلی اور لسانی و جغرافیائی تفریقوں میں تقسیم ہو گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہیے، وہ ترک ہو چکا۔ اب ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہم اسے حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں، ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں تو سمجھنے اور اخذِ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ حصولِ ثواب کے لیے بلکہ میں تو کہا کرتا ہُوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا۔ اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لیے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ اپنے لیے بھی اب ہم قرآن کے ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے۔ اب تو قرآن مجید گویا صرف مُردوں کو ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

> بآیاتش تُرا کارے جُز ایں نیست
> کہ از یٰسین اُو آساں بمیری

سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الرَّسُولُ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُورًا ۝	اور کہا رسول نے اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا، نظرانداز کر دیا تھا۔

علامہ اقبال مرحوم نے اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے : ؎

خوار از مہجوریِ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چو شبنم بر زمیں اُفتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

اگرچہ اس آیت کے سیاق و سباق کے لحاظ سے اس میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز ہی نہیں تھی اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیِ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے؛ تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ و التفات کی روش اختیار کریں اور اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل نہ بنائیں۔ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ اس حصہ میں " اتباع " کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا ، ہر حکم ، ہر ہدایت ، ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن کے ساتھ یہ تعلق ہوگا تو ہم گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ جیسا کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع میں فرمایا : اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا۔

حضرات! کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا۔ اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی ، حکم اور رہنما قرار دینا ، اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ، اس کی صبح و شام تلاوت کرنا ، اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا ، اس کو ترجمان بنانا ، اس کا اتباع کرنا۔ یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے از روئے قرآن مجید ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمدؐ سے جڑ گئے ، اور اس سے کٹے تو محمدؐ سے کٹ گئے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن مجید کی اہمیت کے بارے میں ایک حدیث شریف مزید سناتا ہوں جو حضرت عبیدہ مُلیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

یَااَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَ اَفْشُوْہُ وَتَغَنَّوْہُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔	اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بناؤ بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو ، جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگِ عالم میں) پھیلاؤ اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو اور اس میں تدبر ، غور و فکر کیا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس حدیث مبارک میں مسلمانوں کو حضورؐ نے خطاب دیا ہے : " یَا اَھْلَ الْقُرْاٰن " ۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے " یَا اَھْلَ الْکِتَاب " ۔ الکتاب کا آخری ، مکمل اور جامع ایڈیشن ہے " القرآن " جس کی حامل اُمتِ مسلمہ ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ہمیں خطاب دیا " یَا اَھْلَ الْقُرْاٰن " ۔ سبحان اللہ کتنا پیارا خطاب ہے جو اس امت کو ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی تقریر میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اعادہ کرتا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے یہ نام " اَھْلُ الْقُرْاٰن " اختیار کیا۔ ہم

نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ نام انھوں نے اپنے انکارِ حدیث پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ اُن کا اصل نام ہونا چاہیے تھا "منکرینِ سنّت" "منکرینِ حدیث"۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا، حالانکہ اہلِ قرآن وہ نہیں، ہم ہیں۔

اس حدیث کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے، کتنے جامع ہیں یہ الفاظ، جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔ فرمایا:

"یَااَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُ واالْقُرْاٰنَ۔"

"اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا"۔

تکیہ کمر کے پیچھے رہتا ہے لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہُوا کہ اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈال دینا۔ دُوسرا مفہوم یہ ہے کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنا لینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول رکھا ہے۔ اچھے سے اچھے جُزدان میں اونچے طاق پر رکھ چھوڑا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ نیز اس سے عملی تعلق بس اتنا باقی رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑی، چاہے وہ جھُوٹی قسم ہو تو اس کتاب اللہ کی آڑ میں کھائی جائے گی۔ جھُوٹی شہادتوں کے لیے اس کی آڑ لی جائے گی۔ میں نے اشارتًا ایک لفظ کی کچھ شرح کی ہے۔ آپ اس حدیث کے ایک ایک لفظ پر خود غور کیجئے گا معارف کا ایک سمندر ہے جو ہر لفظ میں آپ کو موجزن نظر آئے گا۔

حضرات! اللہ کے اس نور کا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ہم کو ملا تھا (اُنْزِلَ مَعَہٗ) ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس کا اس دنیا میں یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم دنیا میں رُسوائی کا ایک عبرتناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذابِ اُخروی، تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم، اُس کی رحمت دستگیری فرمائے تو دُوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسی صادق آتی ہے ہمارے حال پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ جس کو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَاالْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ ۝ "اللہ تعالیٰ اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزّت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتابِ ہدایت کو چھوڑنے کے باعث) ذلّت و نکبت سے دوچار فرمائے گا۔

؎ وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور "ہم" خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ۔ آیت کے اس حصہ پر غور کیجئے، آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس میں ایمان بالرسالت، توقیر و تعظیم رسول اور نصرتِ رسول کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پُوری طرح احاطہ کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہوئیں اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے آخر میں فرمایا: وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح وصلاح اور

نجات، نبیِ اکرمؐ سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستی پر موقوف ہے۔

حضرات! اس موضوع پر گفتگو ختم کرنے سے قبل میں آپ سے یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی، اُن کا زوال اور اُن کی رُسوائی در اصل قرآن مجید سے بُعد کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام اپنی تقریر و تحریر میں کہتے چلے آئے ہیں، جن میں سے ایک بزرگ ہستی کا حوالہ میں اس وقت پیش کروں گا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں اور وہ ماضی بعید کی شخصیت نہیں بلکہ ماضی قریب کی ایک مسلّمہ محترم شخصیت ہیں اور وُہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی "تالیف" "وحدتِ اُمّت" میں لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیو بند کے اکابر اور علماء کو شیخ الہندؒ نے جمع کیا اور فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پُوری دُنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک اُن کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلاف اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہُوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچّوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قایم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے رُوشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

حضرات! میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزو مند ہیں ان کی تمام تر توجّہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرتکز ہو جانی چاہیے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے، سمجھنے اور سمجھانے، اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لیے اپنی بہترین عملی جدّ و جہد اور قوتوں کو صرف کرنا ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرہ میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہوگا، عقاید اسی سے درست ہوں گے، جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہوگا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیا پاشی سے دُور ہوں گے، عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہوگی۔ معاملات سنوریں گے تو اسی کتابِ مبین کی رُشد و ہدایت سے سنوریں گے۔

ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبل اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسّک کے نتیجہ میں قائم و نافذ ہوگا۔

اس کے سوا اصلاح اور تبدیلی کی کوئی صورت میرے نزدیک ممکن نہیں۔ اس کام کو شریعت میں کیا مقام حاصل ہے؟ اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین احادیث سے سمجھیے۔ پہلی کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔

"تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں"

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیرؓ ابن مطعم سے مروی ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَيْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَآءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟ قُلْنَا: بَلٰى۔ قَالَ: فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اس کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟ ہم نے عرض کیا 'یقیناً'۔ تب آپ نے فرمایا 'پس تم خوشیاں مناؤ، اس لیے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے نہ کبھی گمراہ۔

تیسری حدیث کے راوی ہیں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے

حرفِ آخر

برادرانِ دین! اب اختتام پر آج کی ساری گفتگو کا اعادہ کر لیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی اوّلین بنیاد "ایمان" ہے۔ ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر دُوسری بنیاد توقیر و تعظیم ہے۔ اسی دُوسری بنیاد کے مقتضیات "اطاعت و محبت" ہیں۔ اور ان دونوں کے اجتماع کا نام "اتباعِ رسولؐ" ہے جو اصل مطلوب ہے۔ حضور سے صحیح تعلق کی

تیسری بنیاد "نصرتِ رسول" ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ حضورؐ کے مقصدِ بعثت کی حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں تکمیل ایک درجہ میں ہوئی یعنی جزیرہ عرب کی حد تک۔ اس کا علی الاطلاق اور وسیع تر سطح پر، آفاقی سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض اُمت کے ذمہ ہے۔ یہ بوجھ اُمّت کے کاندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہر اس شخص کی طرف منتقل ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دامن سے وابستہ ہے، حضورؐ کا نام لیوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗ ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لیے اس طریقِ کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے، جس پر کاربند ہو کر دعوتِ الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر اس کا داعی، علمبردار اور پیغامبر بن کر ہم کو دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کی تکمیل کے لیے جدّوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دُنیوی و اُخروی فلاح و فوز مضمر ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَآئِرِ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

(تقریر)

سیرتِ نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام

ڈاکٹر سیّد محمد عبد اللہ

حمدِ رب العالمین کے بعد ہزاراں ہزار صلوٰۃ وسلام حضور کے لیے کہ مدعائے سخن وہی ہیں ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک وگلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

وہی حضورؐ جن کے حق میں وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ کی آیت نازل فرما کر خود اللہ تعالیٰ نے گویا سب سے پہلی نعت ارشاد فرمائی۔ جب حالت یہ ہے تو یہ خاکسار بے مقدار حقِ درود وسلام کا کیا ادا کر سکے گا۔ اس لیے اسد اللہ خاں غالب کا ہمنوا ہو کر معاملہ اسی پر چھوڑتا ہوں کہ: ؎

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

موضوع ہے "سیرتِ نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام"۔ یہ پیغام وہی ہے جو اسلام کا پیغام ہے اور یہ صرف عصرِ حاضر کے لیے نہیں بلکہ آنے والے ہر عصر اور ہر دور کے لئے ہے، جو رب المشارق والمغارب نے اپنے آخری نبیؐ کے ذریعے بھیجا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف جامع ترین شخصیت کے مالک تھے ذہم تو خاکِ پاک کے بھی عاشق ہیں۔ ا بعض غیر مسلم مفکرین نے بھی یہی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً جیسا کہ دوسروں کے علاوہ پروفیسر آر، ڈبلیو، جے، آسٹنؒ نے اپنے ایک مضمون میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

"..... HE IS THE ARCHETYPE OR NORM OF HUMANITY PAR EXCELLENCE IN WHOM ALL ASPECTS OF BEING UNIQUE (UNITE) AT THE CENTRE ARE IN PERFECT HARMONY AND BALANCE."

(P.68, 'The Prophet of Islam' IN THE BOOK THE CHALLENGE OF ISLAM ED. BY ALTAF GOHAR, 1978.)

بلکہ آپ کو خاتم النبیینؐ ہونے کے لحاظ سے جملہ علوم نبوت بدرجہ اتم حاصل تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیق وتشریح کے

لہ فاضل مضمون نگار یونیورسٹی آف ڈرہم (یو، کے) میں تقابلِ مذاہب اور تصوّف کے استاد ہیں۔

مطابق جملہ علومِ نبوت یا کمالاتِ نبوت آپ کو عطا ہوئے۔ یہ کمالات ہیں رشد و ہدایت، علم و حکمت اور تدبیر و سیاست و ملکداری۔ اور یہ وہ کمالات ہیں جو عطیۂ ایزدی ہیں اکتسابی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشیالوجی کے جدید نامور ماہرین ان کمالات کو 'CHARISMA' کا نام دے کر اسے محیّر العقول سمجھتے ہیں۔ دراصل ان علوم کی دریافت کے لیے وہ آنکھ اور دل مطلوب ہیں جو علمِ ظاہری سے نہیں نورِ ایمان سے منوّر ہوں۔

آج حضورِ پُرنورؐ کا یومِ ولادت باسعادت ہے۔ اس کا تقاضا ہے نیز اس فضا کا بھی ہے جو مملکتِ خداداد پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے۔ تقاضا ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات کو داخلی اور خارجی طور سے سارے عالم میں پھیلایا جائے۔ اگرچہ چودہ صدیاں گزر کر اب اسلام پندرھویں صدی میں داخل ہو چکا ہے، لیکن دنیا کو (اور خود عالمِ اسلام کو) علومِ نبوت یعنی نبوی رشد و ہدایت، علم و حکمت، "تدبیرِ ملکداری اور نظامِ معاشرت و سیاست کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح ظہورِ قدسی کے وقت تھی کیونکہ آپ تا قیامت بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی۔ چونکہ حضورؐ کی نظر میں دین خیر خواہی کا نام ہے۔ (چنانچہ فرمایا: اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃٌ) اس لیے اس خیر خواہی کے ساتھ یہ امر لازم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ سعادتوں کو تمام عالم میں پھیلا دیا جائے جو حضورؐ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ اور تعلیم میں ہیں تاکہ دنیا راحت و اطمینان اور فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔

یاد رہے کہ عصرِ حاضر کی ترکیب میں مغربی تہذیبی دنیا بھی شامل ہے اور سارا مشرق اور عالمِ اسلام بھی۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو دو آیتوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ اور باقی عالم (عامۃ الناس) کے لیے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ جہاں تک خاص مسلمانانِ عالم کا تعلق ہے ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک بنیادی پیغام دو نکتوں میں جمع کیا جا سکتا ہے:

پہلا نکتہ یہ ہوگا کہ اے مسلمانانِ عالم متفق و متحد ہو جاؤ، تفریق و انتشار سے بچو۔ آیت وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا۔

بقول اقبالؒ: ؎

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اس وقت عالمِ اسلام کی جو حالت ہے وہ یقیناً تشویشناک ہے۔ مسلم اقوام اپنی داخلی کوتاہیوں اور زیادہ تر درآمدی اجنبی تصورات سے مغلوب ہو کر شقاق و افتراق کی بری حالت میں ہیں جو اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کی روح کے منافی روبہ ہے۔ اس وقت مسلم ممالک نے جن بنیادوں پر خود کو تقسیم کیا ہوا ہے وہ سراسر غیر مناسب ہیں۔ چنانچہ افغانستان سے لے کر عرب اور افریقہ تک عام طور پر باہمی بے تعلقی کا عالم ہے، لہٰذا قدرتی طور سے حضورؐ اپنی امت کو آج بھی وہی فرمائیں گے جو عربوں سے فرمایا تھا اور اتحاد کی نعمت کی بشارت دے کر افتراق سے بچنے کی تلقین کریں گے۔ اور یہ حسنِ اتفاق ہے کہ حال ہی میں صدرِ مملکت، جنھیں قدرت نے بہت سی جگہ اپنے دین کی پاسبانی اور ترجمانی کا شرف بخشا ہے

بتقاضائے آیہ کریمہ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ایران اور عراق کے مابین مصالحت کروانے کے لیے ایک اور خیر سگالی مشن انجام دے کر واپس آئے ہیں ۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے ۔ جس طرح حضورؐ کے زمانے میں اتحاد واقعی ایک نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوا تھا اور آپؐ کی اُمت دیکھتے دیکھتے ساری دنیا پر چھا گئی تھی ۔ آج بھی نعمتِ اتحاد و اتفاق اپنے اندر ویسے ہی روشن امکانات رکھتی ہے ۔ بلاشبہ چودھویں صدی میں زوال کے سائے گہرے رہے ۔ مگر پندرھویں صدی جملہ قرائن کی رُو سے امید افزا صدی ہے ۔ یہ اس شرط سے ہے کہ مسلمان اپنے روحانی رشتوں کو اپنے اتحاد کی اساس قرار دے لیں ۔ اور ان رشتوں کے تابع وسائل مادی کی عقلی تنظیم کر کے خود کو ایک بنیانٌ مّرصوص بنا لیں ۔

دُوسرا نکتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پیغام کا یہ ہوگا کہ اے مسلمانانِ عالم ! اپنے اصلی نصب العین یعنی دعوتِ حق کو فراموش نہ کرو اور موعظہ حسنہ اسلام کو آج کے دَور میں آج کی زبان اور آج کے محاورے میں پیش کرو اور حکمتِ تسخیرِ کائنات سے بہرہ مند ہو جاؤ ، دُوسروں کی ٹکنالوجی سے مرعوب ہو کر نہیں بلکہ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ کے علاوہ ایمان و یقین ، اعمالِ صالحہ اور یومِ آخرت کے ایقان سے مستحکم ہو کر ، اس اصول پر آگے بڑھو جس کا درس سیرتِ نبویؐ میں ملتا ہے وہ درسِ خدا کے ارشاد وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا میں ہے ۔

یہ تو رہا سادہ سا پیغام حضورِ انورؐ کی طرف سے مسلمانانِ عالم کے نام ، جس کی تفصیلات قرآن مجید میں الگ الگ بھی ہیں اور یکجا بھی ، جنھیں مصری فاضل محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب "حیاتِ محمدؐ" میں یکجا جمع کر دیا ہے (دیکھیے مذکورہ کتاب کا صفحہ ۵۲۴-۵۲۵)

یہ گویا ایک منشورِ انسانیت ہے جو مسلمانوں کے علاوہ سارے عالم کے لیے بھی ہے ۔ اس میں سب نیکیاں جمع ہیں اور اسلام عبارت اسی عمل بالمعروف اور اجتناب عن المنکر سے ہے ۔ اس میں حقوق اللہ ، حقوق العباد اور دیگر اکثر معاشرتی تلقینات موجود ہیں جو زندگی میں پاکیزگی ، توسط ، حسنِ معاملہ اور ثروت القلوب پیدا کرتی ہیں اور معاشرے کو اس بے آہنگی سے بچاتی ہیں جو مغربی دنیا میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے مگر اس کا ذکر آگے آئے گا (حضورؐ کے دوسرے معاشرتی و اخلاقی احکام کے لیے یکجا دیکھیے مولانا بدر عالم کی کتاب ترجمان السنۃ جلد دوم و سوم)

حضرات ! ہمارے موضوع کا عنوان تقاضا کرتا ہے کہ حضورؐ کی سیرتِ پاک کے حوالے سے عصرِ حاضر (یعنی مغرب کے فکری و معاشرتی احوال پر بھی کچھ گفتگو کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ حضورؐ کی تعلیمات سے مغرب کس طرح مستفید ہو سکتا ہے !

یہ امر واقعہ ہے کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی تک پہنچ چکا ہے لیکن ان عظیم الشان ترقیات کے باوجود جیسا کہ ان کے ادب اور فکری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے وہاں کے افراد سخت بے اطمینانی میں مبتلا ہیں ، ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے بنیادی تصورات کسی خاص قسم کے عدمِ توازن کا شکار ہو چکے ہیں اور انھیں واقعی کسی ایسے پیغام کی ضرورت ہے جس سے ان کے معاشرے کا توازن بحال ہو جائے ۔ اور ہمارا الیقین یہ ہے کہ وہ پیغامِ رحمت حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تعلیمات (قرآن مجید اور سیرت نبویہؐ) میں موجود ہے ۔ رحمت سے مراد کیا ہے ؟ اس لفظ کا مادہ رحم (ر ح م) ہے ، اور رحیم ، رحمان بھی مفسرین اور علماءِ عرب زبان شناسوں کے نزدیک اسی مادے سے ہیں ۔

"رحمِ مادر" کی ترکیب کے حوالے سے اس کے مفہوم میں بہت سے جذباتِ محبت و تربیت آ گئے ہیں۔ اس کے معنی محبت، شفقت، نرمی اور عفو و درگزر ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اس کے محدود معنی ہیں۔ رحمت بہت وسیع لفظ ہے جو خداوند تعالیٰ نے اپنے لیے بھی اور حضورؐ کے لیے بھی ارشاد فرمایا ہے۔ غور و تدبّر سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ اس لفظ میں جملہ پدرانہ اور مادرانہ، معلّمانہ اور مربیانہ محبتیں اور شفقتیں جمع ہیں جن کا مکمل احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مختصراً رحمت، شواہد ربوبیت کا مظہر اور سرمایۂ بہجت و سعادت بھی ہے اور فرد اور معاشرہ کے جملہ دکھوں کی دوا بھی، اس میں تسلّی اور مداوائے غم بھی ہے مگر مربیانہ تربیت اور معلّمانہ بشارت کے ساتھ انذار بغرضِ اصلاح بھی ہے بہرحال رحمت کا غالب عنصر وہ سلوک ہے جس سے قلبِ انسانی دُکھ سے نجات پاکر اطمینان حاصل کر سکے بلکہ اس سے بڑھ کر قلوب میں شادابی کی کیفیت پیدا ہو جائے، جو یک گونہ توانائی اور نشو و نما کی صلاحیت کی بھی ضامن ہو۔ لہٰذا حضورؐ کے پیغام میں یہ سب باتیں موجود ہیں جن کا ذکر ہوا۔

"رحمۃٌ للعالمین" کے مصنف قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب کی جلد سوم (صفحہ ۹۲ و بعد) میں حضورؐ کی سیرت طیبہ سے حضورؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے ۴۶ سوانحی نمایاں شواہد پیش کیے ہیں جن میں آپؐ نے ان سب غیر معمولی شفقتوں اور بے نظیر مہربانیوں کا تذکرہ کیا ہے جو خدائے تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے کیں۔ اور ان سے ان سب کمالاتِ نبوت (رُشد و ہدایت اور خیر خواہی عام) کا ثبوت ملتا ہے جن کا اس سے قبل ذکر آ چکا ہے۔ چند مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ آپؐ وہی تھے کہ آپ نے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ پر عمل کیا اور کرایا۔ آپؐ نے وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا پر عمل کیا اور کرایا۔ آپؐ نے فتح مکّہ کے بعد فرمایا:

فَاذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔

ان مثالوں کے علاوہ حضورؐ کی جملہ تعلیمات میں تسلّی، آسودگی، عدل اور رواداری جیسے شواہد رحمت پائے جاتے ہیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ناقابلِ یقین کمال تک پہنچ چکا ہے تو اس صورت میں مغرب کو کسی بیرونی پیغام کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ دعویٰ مغرب کے اکثر مفکر کرتے بھی ہیں لیکن خود مغربی ادب یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان سب مذکورہ ترقیات کے باوجود مغرب قلبی اطمینان سے محروم ہے اور امریکہ و یورپ کے معاشروں میں کجروی اور بے یقینی کے بحران بھی پیدا ہو گئے ہیں جو پریشانیوں کا موجب ہیں اس لیے پیغام اور رہنمائی کی ضرورت واضح ہے۔

اگر مجھ سے پُوچھا جائے کہ مغرب کی یہ پریشانیاں کیا ہیں (جن سے ان کے اپنے مصنفوں کے بیان کے مطابق بھی انکار نہیں کیا جا سکتا) تو میں عرض کروں گا کہ اس وقت مغرب کی بڑی اور مرکزی پریشانیاں دو ہیں، جو باقی سب پر محیط ہیں:

اوّل خوف یعنی کسی خوفناک عالمگیر جنگ کا مسلسل خوف اور اس کے ہمراہ وسائلِ زندگی کا تدریجی طور پر کم ہو کر ختم ہو جانے کا اندیشہ۔

دوم قحطِ الفت و رفاقت و محبّت جو کربِ تنہائی اور خود بیزاری (ALIENATION) پر منتج

ہو رہا ہے اور بقول غالب: ؎

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

اب ان دونوں خوفوں کے اسباب کیا ہیں؟
ٹوائن بی نے مغربی انتشارِ قلبی کی صرف دو علامتوں کا ذکر کرکے بات ختم کر دی ہے کہ مغرب کی صرف دو بڑی کمزوریاں ہیں:
ایک RACIAL DISCRIMINATION
اور دوسری ALCOHOLISM -
اور شپنگلر نے تو اپنی دَوری (CYCLIC) فلسفۂ اقوام سے زوالِ مغرب کی اصل بیماری کا ذکر گول ہی کر دیا ہے -
لیکن بات اتنی ہی نہیں یہ کہانی طویل ہے۔ علامہ اقبال کہہ گئے ہیں: ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب آنست کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دراصل مغربی بیماری کا آغاز اس تصورِ زندگی سے ہوا کہ دین اور دُنیا دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ رفتہ رفتہ مادّی فلسفوں کی بدولت ماورائی روحانی سب سلسلوں کا انکار ہوتا گیا۔ دیکارت نے ہر وسیلۂ علم و زندگی کو مسترد کر کے جزا و سزا اور عقبیٰ اور رحمت کے چھپے ہُوئے جملہ وسائل سے انسان کو مایوس و محروم کر دیا۔
اور اب آخری نقطۂ نظر ہے AUTONOMY OF MAN اور خواہشاتِ نفس کی بے روک تسکین۔ یہ دراصل انسان کا غرورِ نفس ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ -

قدرت نے مغرب کو ایک نعمت سے نوازا تھا جس کا نام سائنس ہے۔ لیکن اس نے سائنس کو بے محور فلسفہ بنا کر اپنی خدائی کے دعوے شروع کر دیے اور کہا کہ مذہب اور دین کی ضرورت نہیں کیونکہ سائنس ہر شے کے لیے کافی ہے۔ (فاضل محمد قطب نے اسے یُوں ادا کیا ہے کہ خرابی کی انتہا یُوں ہُوئی کہ مغرب کے فلسفیوں نے سائنس کو MYTH بنا دیا (دیکھیے ان کا مضمون در کتاب THE CHALLENGE OF ISLAM مرتبہ الطاف گوہر صفحہ ۳۱۴، جہاں ڈارون، فرائیڈ اور مارکس کے خیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے)
بہرحال جب تجربے سے ثابت ہوا کہ سائنس برحق تو ہے لیکن صرف جزوی حقیقتوں کا ادراک کر سکتی ہے یعنی کُلی حقیقت کا نہیں (جس کا احاطہ مذہب ہی کر سکتا ہے) تو اس تجربے سے آہستہ آہستہ ضمیر دار اہلِ فکر کو محسوس ہوا کہ انسان ایک نہایت ہی وسیع دنیا ہے۔ اس کے داخلی قلبی دکھوں کا علاج سائنس کے پاس نہیں تو مایوسی پھیلنے لگی۔ جان و تن کی تفریق بڑھتی گئی اور دل پژمُردہ ہوتے گئے۔ اب قریب ہو کر آپ دلوں کو ٹٹولیں گے تو اکثر مغربی لوگ اندر سے دُکھی نظر آئیں گے (چنانچہ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۸۰ء

کا مغربی ادب اسی کرب و اضطراب کا آئینہ دار ہے) معاشرتی اور تخلیقی ادب کے آئینے میں یہ تصویر دیکھنی ہو تو ہارورڈ کے پروفیسر T.W. BELL کی کتاب CULTURAL CONTRADICTIONS OF CAPITALISM، تھیابالڈ کی کتاب BEYOND DESPAIR اور MAGEE کی کتاب RELIGION AND THE MODERN MIND کے اوراق پر نظر ڈالیے اور خود دیکھ لیجئے کہ پریشانی، کجروی اور تجزیہ احساس کس خطرناک حد تک بڑھ چکا ہے۔

غرض مغرب یا عصرِ حاضر کے دو بڑے بحران یہی ہیں اوّل خوفِ جنگ اور اندیشۂ قحطِ وسائل۔ دوم کربِ تنہائی اور خاتمۂ محبت و رفاقت۔ یہ سب مادی فلسفوں کے نتائج ہیں جن میں خدا کا سہارا ختم کر دیا گیا اور تن کی خواہشات کی تسکین اور عیشِ امروز ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا۔ ایمان باللہ اور ایمانیات سے انکار، دین اور دنیا کی جدائی مغرب کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بنیادی پیغام مغرب (عصرِ حاضر) کے نام عَوْد الی الایمان (RETURN OF FAITH) ہے۔

ایمان (FAITH) کی اس ضرورت کا احساس دوسری جنگِ عظیم کے فوراً بعد کی مغربی شعوریات میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتا گیا تھا جس کا ظہور کئی شکلوں میں ہوا ہے۔ اس کے علمبردار پال ٹلش (PAUL TILLICH) جیسے مغربی مفکر بھی ہیں اور داخلیت کے فلسفی بیوبر (BUBER) جیسے بھی ہیں۔ ایک مذہبی مفکر J.B. MAGEE نے ایک مبسوط کتاب RELIGION AND THE MODERN MIND میں جدید ذہن کا شرح و بسط سے تجزیہ کر کے FAITH کو مغرب کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا ہے۔ اور ایک اور مصنف نے اپنے ایک مضمون IT IS TIME TO REMIND WEST کے عنوان سے یورپ کو تنبیہ کی ہے کہ تباہی سے بچنا ہے تو خدا سے تعلق پیدا کرو۔ غرض ایمانیات کے حق میں آمادگی پائی جاتی ہے اور حضورؐ کے پیغام کے لیے یہ وقت ہر طرح موزوں معلوم ہوتا ہے کاش عصرِ حاضر دینِ اسلام اور سیرتِ رسولؐ پاک پر ٹھنڈے دل اور بے تعصبی سے نظر ڈال سکے۔

حضورؐ کی تعلیم و تلقین کلیت (TOTALIZY) (دین اور دنیا، تن اور روح کی جامعیت) کی طرف رجعت کی دعوت بن رہی ہے تاکہ مغرب نے سخت محنت کے بعد جو مادی ترقی کی ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔

میں نے اوپر جس تفریق کا ذکر کیا ہے وہ صرف نظری معاملہ نہیں بلکہ اس کے عملی نتائج و ثمرات نے ساری دنیا کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اسی تفریق کے تصور سے قومیت (NATIONALISM) کا تصور پیدا ہوا ہے جس نے نسلِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اب ہر قومیت دوسری قومیت سے گرم یا سرد جنگ میں مبتلا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکی استبداد بھی اسی کے نتیجے ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیمات میں شعوب و قبائل کی عصبیت اور ان کی باہمی جنگ کو (جن کی بنیاد پر آج قومیتیں اُبھر رہی ہیں) "آگ" قرار دیا گیا ہے اور الفت و رفاقت باہمی کو (بر بنائے وحدت انسانی) نعمت قرار دیا گیا ہے۔ آج بھی دنیا حضورؐ کی دی ہوئی اس نعمت کی بڑی شدت سے ضرورت مند ہے۔ آیتِ قرآنی یہ ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط (آل عمران ۱۰۳)

(ترجمہ:) اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر خدا نے اپنی مہربانی سے تم کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور پھر تم جہنم کے کنارے پر پہنچ چکے تھے پھر خدا نے تم کو اس سے نجات بخشی۔

اس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ یہ کہ صرف تن اور حواس کی زندگی پر زور دینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاقیات میں ABSOLUTES کا انکار کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اخلاقی اقدار ختم ہو گئی ہیں۔ لہٰذا جبلتوں اور نفسانی خواہشات پر کوئی کنٹرول نہیں رہا اسی سے وہ معاشرتی اور انفرادی انارکی (ANARCHY) نمودار ہوئی ہے جو مغرب میں عریانی، جنس پرستی اور "اینگری بوائے" اور "باربیرک ڈراما" جیسی کجروی کو جنم دے رہی ہے۔ اب زندگی چونکہ تعیش کا دوسرا نام ہے اس لیے دولت پرستی اور زراندوزی (سرمایہ داری یا "تکاثر") واحد مقصدِ حیات بن گیا ہے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں استعمار و استحصال عام ہو کر اب دنیا رقابتوں کا مرکز ہے اور دنیا دو مستقل بلاکوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔

قرآن مجید نے تکاثر، اسراف و ترف کی سخت مذمت کی ہے اور اب بھی دُنیا کو معاشرتی امن کی ضرورت ہو گی تو اسے تن پرستی اور تکاثر سے اجتناب کر کے توسط کی زندگی کو اپنانا ہو گا۔ اور اقتصاد کو جس کے معنیٰ ہی میانہ روی ہیں اقوامِ عالم کا ضروری معاشرتی معاشی رویّہ بنانا پڑے گا۔

مقصد یہ کہ حضورؐ کی تعلیمات کی رُو سے ایک متوسط معاشی نظام ہی دُنیا کے معاشی و معاشرتی مصائب کا علاج ہے اسلام کے نزدیک مال و دولت یا مناسب سرمایہ کا حصول بُری چیز نہیں لیکن سرمایہ داری فی الحقیقت بری ہے۔ اسی طرح انسان کی آزادیِ معاش کو سلب کر لینا بھی مذموم ہے۔ حضورؐ کی معاشی تعلیم میانہ روی کی دعوت دیتی ہے اور مغرب کے ان دونوں دبستانوں کو حضورؐ کی دعوت پر غور کرنا چاہیے۔

لہٰذا اسلام اور حضورؐ کی تعلیم اقتصادیات کی طرف بلاتی ہے جس میں سرمایہ داری کے وہ ہولناک مظاہر بھی نہ ہوں جو یورپ اور امریکہ میں نمودار ہوئے ہیں اور اجتماعی پیداوار کے نام سے فرد کی آزادی اور اس کی محنت کا جس طرح استحصال کیا جا رہا ہے وہ بھی نہ ہو۔

اس کے لیے حضورؐ کے قائم کردہ نظام کو کیوں نہ دیکھ لیا جائے، اس پر یقیناً ایک عادلانہ عالمگیر معاشی نظام تیار کیا جا سکتا ہے جس میں ہر کوئی خوش دلی سے کمائے اور بانٹ کر کھائے۔

میرا خیال ہے کہ مغربی مفکرین نے اسلام کے خاندانی نظام کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ محبت و تعاون کے علاوہ معاشی کفالت عمومی کی ایک عملی صورت ہے۔ اس کے علاوہ مغرب اگر اسلامی شورائی اصول کی روشنی میں اپنی جمہوریت کا بھی تجزیہ کرے تو وہ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اقتدار کی پسند یا تقویٰ پر یا عقل پر ہونی چاہیے۔ اکثریت کا اصول طفل تسلی سے کم نہیں۔ اس معاملے میں اسلام کا مطالعہ یقیناً زیادہ عملی اور منصفانہ نتائج پیدا کرے گا۔

اسلام کا ایک اہم عقیدہ وحدتِ نسلِ انسانی ہے۔ آیت:

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔ (۴ النساء ۱)

حضورؐ کی تعلیم اسی عظیم تصور پر زور دیتی ہے اور اس معاشرتی اشتراک کی قائل ہے جس میں کوئی غیر مسلم معاشرہ بھی مشترک اصولوں پر مسلمانوں سے تعاون کرنے پر قبول کیا جا سکتا ہے۔

اس کا ثبوت میثاقِ مدینہ ہے (جس کے ذریعے آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ شہریت میں اشتراک کیا) اس کے علاوہ آپ نے معاصر سلاطین کے نام جو مکاتیب لکھے ان میں کَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کے اصول کو دُہرایا۔

آپؐ نے قرآن مجید کی مشہور آیت کریمہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ کے مضمون کے مطابق انسان کی اکرمیت کی بنیاد تقوٰی اور شرافت کو بنایا اور خطبۂ حجۃ الوداع میں تو صاف اعلان کیا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی احمر کو اسود پر ترجیح حاصل نہیں صرف تقوٰی کی بنیاد پر ہر کوئی شخص افضلیت حاصل کر سکتا ہے۔ محض رنگ و نسل وغیرہ کافی نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ہندوستان اور مصر کے غلام بھی سلاطین بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اسی قرآنی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

آج کے دور میں کبھی کھلا اور کبھی کنایۃً سفید فام اقوام اپنے رنگ اور دوسرے اوصاف کو وجہِ تفاخر بناتی ہیں لیکن حضورؐ کی تعلیم اس کے خلاف ہے اور آپؐ نے اپنی زندگی میں اس کے عملی ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ اسی اصول یا عقیدے کی بنیاد پر اسلام کو PLURALISM جیسی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ امریکہ چاہے تو نسلی مسئلے کا حل اسلام کی تعلیم کے ذریعے کر سکتا ہے۔

وحدتِ نسلِ انسانی کے تصور کے اندر سے مغرب کے بعض مفکر تمام عالم کی واحد ریاست کا تخیل پیش کرنے کے مدعی ہیں اور حقوقِ عامہ کے معاملے میں سبقت کا دعوٰی بھی کرتے ہیں اور کنگ جان کے میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کو اولین دستاویز حقوق اور بعد کی متعدد وحدت آفریں تجویزوں مثلاً پین یورپا لیگ آف نیشنز اور موجودہ یونائیٹڈ نیشنز وغیرہ کا بطور مثال تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ واحد عالمی ریاست کے نصب العین کا سنگِ بنیاد حضورؐ نے میثاقِ مدینہ کے علاوہ خصوصی طور سے خطبہ حجۃ الوداع میں رکھا تھا۔ جن مثالوں کا ذکر اُوپر آیا ہے وہ یا تو محدود تھیں یا ناقابلِ عمل تھیں کیونکہ ان کی بنیاد صرف مادّی تھی اور وہ اس روحانی کشش سے خالی تھیں جو قلوب میں پائیدار الفت پیدا کر سکتی ہوں۔

(کتاب UNIFICATION OF MANKIND کے آخری باب کے دلائل اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں)

بالیقین حضورؐ کی دعوت اور سیرت ہی ایک پائیدار دستور العمل ہے جو کسی واحد عالمی ریاست کے خواب کی عملی تشکیل کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ رب العالمین اور جمیع الناس کے اصول پر مبنی ہے۔

جس دن مغرب ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرلے گا اس کے جملہ اقتصادی، معاشرتی، معاشی اور تعزیراتی نظام خود بخود خدا ترسی، انصاف، عدل، رفاقت، مساوات اور توسّط کے اصولوں پر چلنے لگیں گے۔ گو یا زمین پر اللہ کی

حاکمیت ہوجائے گی۔

اس خاکسار بے مقدار نے ڈرتے ڈرتے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میں برابر سوچتا رہا کہ اگر نوکِ سوزن کے برابر بھی بے اعتدالی ہوگئی تو دنیا و آخرت کا خسارہ یقینی۔ آج کا دن ۱۲ ربیع الاول ـــــ حضورؐ کے پاسِ ادب کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ قلم پر جو عمر بھر ایک مدرس و معلم کا قلم رہا ہے آج اسے بڑی مشکل سے گزرنا پڑا۔ پلکوں سے سوئیاں چننی پڑیں۔

بہرحال معذرت ہے حضرت رسالتمآبؐ سے کہ میں ذرا بھی حق ادا نہ کر سکا ؎

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حُسن تو بسیار

گل چینِ بہارِ تو ز دامانِ گلہ دار

اور آخر میں پھر حمدِ پروردگار ہے اور اس کے بعد صلوٰۃ و سلام حضورِ پُرنور پر۔ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمْ۔

نبوت کا عطیہ

سید ابو الحسن علی ندوی

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے افراد اور جماعتیں گزری ہیں جنھوں نے انسانیت کی خدمت کی ہے اور دنیا کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ اس موقعہ پر وہ سب تاریخ کی سطح سے اُبھر آتے ہیں اور اپنے کو انسانیت کا معمار و خدمت گزار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور وہ امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو بھی اس معیار سے جانچا اور پرکھا جائے گا، یہ ٹھیک ہے ان کو بھی موقع دینا چاہیے اور ان کی خدمات و احسانات کا موازنہ کرنا چاہیے پھر فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون اس معیار پر پُورا اترتا ہے۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک سنجیدہ اور باوقار گروہ آتا ہے، یہ حکماء و فلاسفہ کی جماعت ہے، ان میں یونان کے بڑے بڑے فلسفی بھی ہیں اور ہندوستان کے بلند پایہ حکیم بھی۔ ہمارا ذہن حکمت و فلسفہ سے شروع سے مرعوب رہا ہے، ہم ان کو دیکھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ انھوں نے انسانیت کا سر اونچا کیا ہے اور اس کا دامن حکمت کے موتیوں سے بھر دیا ہے لیکن تعصبات اور عقیدت مندی سے ذرا آزاد ہو کر غور کیجیے کہ کیا ان کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور کیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ انسانیت کے حق میں رحمت ثابت ہوئے ہیں؛ میں پُوچھتا ہُوں کہ انسانیت نے ان سے کیا پایا، اس کی کون سی پیاس بجھی، انھوں نے اس کے کس درد کا مداوا کیا؛ غور کرنے پر ہم کو مایوسی ہوتی ہے! ذرا آپ فلسفہ کا مطالعہ کیجیے اور فلاسفہ کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ صاف معلوم ہوگا کہ فلسفہ زندگی کے سمندر میں ایک مختصر سا جزیرہ تھا، ایک محفوظ جگہ تھی، ایک محدود دائرہ تھا۔ یہ حکماء و فلاسفہ اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، خدا کی دی ہوئی طاقتیں اس محدود دائرے کے اندر صرف کر رہے تھے۔ انسانیت کے وہ مسائل جن کو ذرا دیر کے لیے بھی ٹالا نہیں جاسکتا اور جو فوری حل کے محتاج ہیں، جن کے بغیر انسانیت کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی، ان حکماء نے نہ ان مسائل کو چھیڑا نہ ان سے بحث کی اور نہ ان مسائل میں انسانیت کی کوئی مدد کی، وہ اپنے اس علمی جزیرے کے اندر عافیت کی زندگی گزارتے رہے، لیکن انسانیت تو ان چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بند نہیں تھی، یونان جہاں فلاسفہ بہت گزرے ہیں، اس یونان میں بھی سارے کے سارے فلسفی ہی تو نہیں تھے۔ ان فلسفیوں نے کواکب و سیارات سے تو بحث کی اور فلکیات پر مُوشگافیاں کیں، مگر زندگی کے لیے کیا ہدایات دیں اور علمی طبقہ کو چھوڑ کر دوسرے طبقات کی کیا رہنمائی کی؛ انھوں نے بھٹکتی ہوئی انسانیت اور سسکتی ہُوئی زندگی کے لیے کیا کیا؛ اور زندگی میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے بے تعلق تھے۔ انھوں نے اپنے گرد علم و حکمت کا ایک حصار کھینچ لیا تھا اور صرف چند علمی مسائل سے تعلق رکھا تھا۔

یہ ایک سیاسی دور ہے اور ہمارا ملک اب آزاد ہے، شاید آپ اس مثال سے فلاسفہ کی صحیح پوزیشن سمجھ سکیں۔ دیکھیے آپ کے ملک میں مختلف بیرونی ممالک کے سفارت خانے ہیں۔ کوئی امریکی سفارت خانہ ہے، کوئی روسی سفارت خانہ ہے،

کوئی مصر کا ہے، کوئی ایران کا۔ ان سفارت خانوں کے اندر بھی زندگی اور حرکت ہے، ان کے اندر بھی بہت سے لوگ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں، بڑے بڑے فاضل اور سیاسی مبصر بھی ہیں لیکن ان کو ہمارے ملک کے اندرونی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں، ہمارے آپس کے تعلقات اور باہمی کشاکش سے کوئی واسطہ نہیں، یہاں کی غریبی، امیری، اخلاقی ترقی و انحطاط سے ان کو بحث نہیں، ان کا ایک محدود و مخصوص کام ہے اور وہ صرف وہی کام انجام دیتے ہیں، اس لیے وہ یہاں ہو کر بھی ایسے ہیں گویا وُہ یہاں نہیں ہیں۔ بس اسی طرح حکمت و فلسفہ ایک غیر ملکی سفارت خانہ کی طرح قائم تھا اور یہ حکمأ و فلاسفہ ان سفارت خانوں کی چار دیواری کے اندر علم و حکمت کی نمائندگی کر رہے تھے اور زندگی کے مسائل سے بے تعلق تھے۔

دوسری جماعت جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ ادبأ و شعرا کی جماعت ہے ہم کو اور آپ کو ادب و شاعری کا ذوق ہے اور ہم ادب و شعر کی تحقیر نہیں کرتے، لیکن بے ادبی معاف! کہ ادبأ و شعرأ نے بھی انسانیت کے دُکھ کا علاج نہیں کیا۔ انھوں نے ہمارے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچایا، ہمارے ادب و زبان کو مالا مال کیا۔ لیکن انسانیت کی اصلاح کا دردِ سر مول نہیں لیا اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی، زندگی بنتی اور بگڑتی رہی، انسانیت گرتی اور سنبھلتی رہی اور یہ اپنے میٹھے میٹھے بول سناتے رہے، اس کی مثال یُوں سمجھیے کہ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں میں مبتلا ہوں، کہیں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہو، کہیں زندگی کے مسائل درپیش ہوں اور کوئی بانسری بجانے والا بڑی سُریلی آواز میں بانسری بجاتا گزر جائے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس کا لطف لے سکتے ہیں، آپ اس کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں، مگر اس ترنم سے آپ زندگی کے مسائل تو حل نہیں کر سکتے اور نہ اس سے کوئی پیغام حاصل کر سکتے ہیں، شعر و ادب ہماری زندگی کے لیے کتنا ہی ضروری سہی اور اس سے ہماری رُوح کی بالیدگی اور اس سے ہمارے دماغ کو کیسی ہی تازگی حاصل ہو، لیکن یہ ہمارے مسائل کا حل اور ہمارے درد کی دوا تو نہیں۔ پھر ان ادبأ و شعراء کو کسی چیز پر اصرار بھی نہیں تھا۔ وہ کسی مقصد کے لیے جدوجہد بھی نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے لیے قربانیاں کرنا ان کے بس کی بات تھی اور اصلاح و انقلاب اس کے بغیر ہُوا نہیں کرتا۔

تیسرا گروہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ فاتحین کا ہے جنھوں نے ملکوں کو فتح کیا اور اپنے زورِ شمشیر سے قوموں کو تسخیر کیا اس گروہ سے بھی ہم اچھے خاصے مرعوب ہیں، ان کی تلواروں کی جھنکار ابھی تک ہمارے کانوں میں آ رہی ہے، بظاہر ان کے شور سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کی بڑی خدمت کی مگر ان کے نام کے ساتھ کون سی تاریخ وابستہ ہے؛ کیا عدل و انصاف کی یا درندگی و سفاکی کی؛ سکندر کا نام آتا ہے تو اس کے مظالم کی داستان تازہ ہو جاتی ہے، کیا وہ انسانیت کا محسن تھا، اس نے یونان سے ہندوستان تک تمام ملکوں کو زیر و زبر کر دیا، ملک کے ملک اس کی وجہ سے امن و امان اور زندگی کے لطف سے محروم ہو گئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی سیکڑوں برس تک یہ ملک سنبھل نہ سکے۔ یہی حال سیزر، چنگیز خاں اور دوسرے بڑے بڑے فاتحین کا ہے، فاتح چاہے اپنے ملک کا محسن ہو یا اپنی قوم کے لیے رحمت ہو مگر دوسری قوموں کے لیے عذاب اور مصیبت ہے۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا آتا ہے جو ملک کے آزاد کرانے والے ہیں اور قومی لیڈر رہیں۔ اس گروہ کا جب نام آتا ہے

تو احترام سے ہماری گردنیں جھک جاتی ہیں۔ حقیقتاً انھوں نے اپنے ملک کے لیے بڑا کام کیا مگر اس ملک کے باہر بسنے والے انسانوں کے لیے کیا کیا آپ ابراہیم لنکن کے نام سے واقف ہوں گے وہ جدید امریکا کا معمار ہے، مگر بتائیے کہ ہندوستان، مصر و عراق اور ان جیسے اور ملکوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا؟ نتائج پر نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک امپیریلسٹ طاقت پیدا کر دی اور دُنیا کی غلامی کی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ کر دیا۔ سعد زاغلول کون تھا؟ مصر کا محسن اور وہاں کی تحریکِ آزادی کا سب سے مشہور رہنما، مگر مصر سے باہر اس نے کیا کیا اور اس کا ہم پر کیا احسان ہے؟ یہ قوم پرستی تو در اصل دوسرے ملکوں اور قوموں کے لیے مصیبت ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی اپنی قوم کی برتری اور دوسری قوموں کی تحقیر پر ہے اور اکثر اس کو اپنی قوم کا پایہ بلند کرنے کے لیے دوسری قوموں کو غلام بنانا پڑتا ہے۔

پانچواں گروہ وہ ہے جو سائنٹسٹ کہلاتا ہے جس نے نئی نئی ایجادیں کیں اور بہت سی کارآمد چیزیں بنائیں۔ بلا شبہ اس گروہ نے انسانوں کی بڑی خدمت کی۔ یہ تمام ایجادیں جو ہمارے کام آتی ہیں جیسے بجلی، ہوائی جہاز، ریل اور ریڈیو، انھیں سائنٹسٹ حضرات کی مرہونِ منت ہے، اس کے لیے انھوں نے بڑی محنتیں کیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ انسانوں کے بڑے کام آ رہی ہیں۔ مگر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایجادیں تنہا کافی نہیں، ان ایجادوں کے ساتھ اگر نیک ارادے نہ ہوں، صبر و ضبط نہ ہو، خدمتِ خلق کا جذبہ نہ ہو، اس سے اگر انسانیت کے ضروری مسائل حل نہ ہوں تو بتائیے کہ یہ ایجادیں انسان کے لیے رحمت ہیں یا زحمت؟ انھوں نے یہ ایجادیں تو انسان کو دے دیں مگر ان کے استعمال کا صحیح جذبہ نہیں دیا، وہ ذہن و ضمیر نہیں پیدا کیا جو ان سے فائدہ اٹھاتے اور ان کو ٹھکانے لگائے اور ان سے غلط کام لینے سے پرہیز کرے۔ گزشتہ دو جنگوں کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور خدا ترسی کے بغیر یہ ایجادیں اور یہ وسائل انسانیت کے حق میں قہر و عذاب ہیں، رحمت و راحت نہیں۔ میں ان سائنس دانوں کی تحقیر نہیں کرتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ایجاد کا کارنامہ نیک مقاصد، اخلاقی طاقت اور دماغی توازن کے بغیر مکمل نہیں ادھورا ہے، جب تک انسان کے دل میں نیک خواہش نہ ہو اور خود اس کے اندر نیک کام کرنے کی تحریک اور تقاضا نہ پیدا ہو اس کو وسائل و آلات، مواقع و امکانات اور سہولتیں اور آسانیاں نیک نہیں بنا سکتیں، فرض کیجیے میرے پاس دینے کو روپیہ بھی ہے لینے کو بہت سے محتاج بھی ہیں، میرا کوئی ہاتھ نہیں پکڑتا، مگر میرے اندر فیاضی کا جذبہ اور مدد کرنے کی خواہش نہیں تو مجھے کون دینے پر آمادہ کر سکتا ہے؟

اب ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ پیغمبروں کا گروہ ہے۔ یہ گروہ ایجادات و اکتشافات کا دعویٰ نہیں کرتا نہ وہ علوم میں مہارت کا مدعی ہے، نہ اس کو ادب و شاعری پر ناز ہے۔ وُہ اپنے متعلق نہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے نہ بے ضرورت خاکساری سے، وُہ بڑی صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں کہ دُنیا کو وہ تین چیزیں عطا کرتے ہیں؛

۱۔ صحیح علم

۲۔ اس علم پر یقین

۳۔ اس علم پر عمل کرنے اور اس یقین کے مطابق زندگی گزارنے کا جذبہ اور خواہش۔

یہ ہے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تعلیم کا نچوڑ۔

اب میں بتاتا ہوں کہ وُہ صحیح علم کیا ہے جو پیغمبر انسانوں کو دیتے ہیں، وہ علم اس کا کہ دنیا کو کس نے بنایا؟ پیغمبر کہتے ہیں کہ سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کو کس نے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ اس کے معلوم کیے بغیر ہمارا ہر قدم غلط ہے۔ ہم کو اس دنیا کی کسی چیز سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں، اس لیے کہ اس زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے؛ چلنا پھرنا، کھانا پینا وہ سب اس عظیم کُل کا ایک حقیر جُز ہے، جب تک کہ ہم کو اس کائنات کا مرکز معلوم نہیں اور ہم اس کے مقصدِ کلی سے اتفاق نہیں رکھتے کہ ہم کو اس کے اجزا سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ اس کے بغیر تو روٹی کا ایک ٹکڑا توڑنا حرام ہے، ہم بھی اس کائنات کا ایک حقیر جُز ہیں اور غلّہ کا جو دانہ ہم استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس مجموعہ کی ایک بہت حقیر کسر اور ایک ادنیٰ ذرّہ ہے۔ بلکہ ہم جس سیارہ (زمین) پر بس رہے ہیں وہ بھی اس کائنات کا حقیر ذرّہ ہے۔ ہماری اس زمین کی اس نظامِ فلکی میں کیا حیثیت ہے؛ اگر آپ کو وہ نسبت معلوم ہو جائے جو آپ کی اس سرزمین اور سورج کے درمیان ہے یا دوسرے سیاروں اور ثوابت سے ہے تو آپ کو اپنے وجود سے بھی شرم آنے لگے گی اور اپنے عظیم الشان وطن سے بھی۔ آپ کے اور اس کائنات کے دوسرے اجزا کے درمیان کس نے ربط پیدا کیا؟ اسی خالقِ کائنات نے اور اسی مقصدِ کلّی نے! اگر آپ اس خالقِ کائنات کو نہیں جانتے یا نہیں مانتے اور اس مقصدِ کُل سے آپ کو اتفاق نہیں ہے تو آپ کو اس کائنات کے کسی ذرّے یا دوسرے جز سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ میں پُوچھتا ہُوں کہ اگر روٹی کا وہ ٹکڑا جو آپ کے ہاتھ میں ہے آپ سے سوال کرے کہ میں نے تو اپنے خالق کو پہچان لیا اور اس کے حکم کے مطابق میں نے اپنے مخدوم (انسان) کے لیے اپنے وجود کو قربان کر دیا لیکن اے انسان! تُو نے نہ اپنے خالق کو جانا نہ اس کی بندگی کی، تجھے مجھ سے فائدہ اٹھانے کا کیا حق ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ اسی طرح اس دنیا کی کسی چیز کا استعمال غلط ہے جب تک یہ جان نہ لیا جائے کہ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے! مگر یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ آج دنیا میں تمام کام ہو رہے ہیں، بازار میں چہل پہل ہے، تعلقات قائم ہو رہے ہیں، سواریاں چل رہی ہیں، بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں کہ جس دنیا میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ جب پیغمبر دنیا میں تشریف لاتے انسانیت کی گاڑی بے مقصد جا رہی تھی۔ فلاسفہ، علماء، ادباء، شعراء، فاتحین، حکمرانوں، کاشتکاروں اور تاجروں کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی، حاکم بھی تھے اور محکوم بھی تھے، ظالم بھی تھے اور مظلوم بھی تھے۔ مگر سب اصل مقصد سے غافل اور اپنے پیدا کرنے والے سے ناواقف، ان چھوٹے چھوٹے بالشتیوں جیسے انسانوں میں ایک بلند قامت انسان آتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں انسانیت کی باگ ڈور تھی، ان سے سوال کرتا ہے کہ جواب دو کہ تم نے انسانوں پر یہ کیا ظلم کیا ہے کہ ان کو اپنے مالک اور اس دُنیا کے بادشاہ سے ہٹا کر اپنا غلام بنا لیا ہے؟ تم کو کیا حق تھا کہ نابالغ انسانیت کا ہاتھ پکڑ کر تم نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے؟ اے ظالم ڈرائیور! تو نے مسافروں سے پوچھے بغیر زندگی کی گاڑی کس طرف چلانی شروع کر دی؟ وہ زندگی کے قلب و ضمیر میں کھڑے ہو کر انسانیت کو خطاب کرتا ہے

اور اس کو پکارتا ہے، اس کے سوال کو ٹالا نہیں جا سکتا، اس کی دعوت اور اس کی پکار پر دو گروہ ہو جاتے ہیں:

ایک اس کی بات مانتا ہے۔

ایک انکار کرتا ہے۔

دنیا کو ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

پیغمبر کبھی نہیں کہتے کہ ہم قدرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرنے آئے ہیں، ہم طبعی طاقتوں کو مسخر کرنے آئے ہیں، ہم کچھ نئی ایجادیں کریں گے، وہ جغرافیہ و معدنیات میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے بنانے والے اور اس کی ذات و صفات کا صحیح علم عطا کرتے ہیں جو ہم کو اس دنیا کے مالک نے اور انسان کے خالق نے عطا کیا ہے اور اب ہمارے ہی ذریعہ سے وہ دوسروں کو مل سکتا ہے۔

وہ بتاتے ہیں کہ اس دنیا کا بنانے والا ایک ہے اور اسی کی مرضی و حکمت سے یہ دُنیا چل رہی ہے، وہ بلا شرکتِ غیرے اس کو چلا رہا ہے۔ یہ دُنیا بے مقصد نہیں پیدا کی گئی اور نہ بے مقصد چل رہی ہے۔ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہوگی جس میں اس پہلی زندگی کا حساب دینا ہوگا، وہاں اچھے اعمال کا انعام ملے گا، بُرے اعمال کی سزا ملے گی، قانون لانے والے اور خدا کا منشا بتلانے والے پیغمبر ہیں جو ہر ملک اور ہر قوم میں آئے اور خدا کا پیغام لائے، خدا کا راستہ ان کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر تمام پیغمبر متفق ہیں ان میں کسی کا اختلاف نہیں، فلاسفہ و حکماً میں سخت اختلاف ہے ان میں سے دو بھی کسی ایک بات پر متفق نہیں لیکن یہاں کسی ایک بات پر بھی دو پیغمبروں میں اختلاف نہیں۔

لیکن تنہا علم کے لیے یقین ضروری نہیں، آج ہمارے معلومات کتنے زیادہ ہیں مگر ہمارا یقین کتنا کم ہے، علم ہمیشہ یقین پیدا نہیں کرتا، قدیم زمانہ کے فلاسفہ میں سے بہت سے یقین سے محروم تھے اور شک کے مریض۔ آج بھی ان کا علم یقین پیدا کرنے کے بجائے اُلٹا شک پیدا کرتا ہے۔ آج بھی بڑے بڑے صاحبِ علم یقین کو ترستے ہیں۔ انبیاؑ علیہم السلام تنہا صحیح علم نہیں دیتے تھے اس پر یقین بھی عطا کرتے تھے۔ علم بڑی دولت ہے مگر اس پر یقین اس سے بڑی دولت ہے۔ علم بغیر یقین کے زبان کی ورزش ہے، دماغ کا تعیّش اور دل کا نفاق۔ پیغمبروں نے اپنے ماننے والوں کو صحیح علم عطا کیا اور مضبوط یقین، انھوں نے جو کچھ جانا اس کو مانا، پھر اپنے کو اس پر قربان کر دیا۔ ان کے دماغ اس علم سے روشن ہوئے اور ان کے دل اس یقین سے طاقتور۔ ان کے یقین کے قصّے تاریخ میں پڑھیے، ان کے یقین کے نتائج اپنی گرد و پیش کی دنیا میں دیکھیے۔

آج اگر یقین ہوتا تو بد اخلاقی کیوں ہوتی؟ ظلم کیوں پھیلتا؟ رشوت کا بازار کیوں گرم ہوتا؟ کیا یہ تمام خرابیاں اس لیے ہیں کہ علم نہیں، لوگوں کو معلوم نہیں کہ چوری جُرم ہے، رشوت حرام ہے، اگر کوئی بد اخلاقی ہے؟ یہ کون کہہ سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاں علم زیادہ ہے وہاں خرابیاں بھی زیادہ ہیں، جو لوگ رشوت کی بُرائی پر کتاب لکھ سکتے ہیں اور اس کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں، وہ زیادہ رشوت لیتے ہیں، جو چوری کی خرابی سے اور اس کے انجام سے زیادہ واقف ہیں

وہ چوری زیادہ کرتے ہیں۔ گرہ کٹوں کو دیکھیے ان میں سے بہت سے ایسے ملیں گے جو گرہ کٹی کے الزام میں کئی کئی با سزا بھگتے ہوئے ہوتے ہیں، کیا ان سے زیادہ کوئی گرہ کٹی کے انجام اور سزا سے واقف ہوگا۔ اگر صرف علم کافی ہوتا تو چوری کی سزا کے بعد چوری چھٹ جاتی اور ایک بار جرم کرنے اور سزا بھگتنے کے بعد کوئی جرم نہ کرتا لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا علم تنہا کافی نہیں۔

پھر علم ضروری اور یقین ضروری۔ مگر اس کی کیا ضمانت کہ اس پر عمل کا تقاضا بھی پیدا ہوگا۔ بہت سے لوگ جانتے بھی ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں کہ شراب بُری چیز ہے، اس کے نقصانات کا تجربہ بھی ہے، یقین بھی، مگر پیتے ہیں۔ آپ کے شہر میں بہت سے ڈاکٹر حکیم ہوں گے جو بدپرہیزی کرتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ بدپرہیزی خطرناک ہے مگر وہ بدپرہیزی کر گزرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عمل کا تقاضا نہیں ہوتا اور ان کے اندر پرہیز کی خواہش اور بدپرہیزی سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ بدپرہیزی کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اس خواہش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

انبیاء کرام علم و یقین کے ساتھ یہ تیسری طاقت بھی عطا کرتے ہیں، یعنی اپنے علم و یقین پر عمل کرنے کی رغبت اور اپنی غلط خواہشات کا مقابلہ کرنے کی طاقت۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم و یقین سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، ان کا ضمیر ان کی نگرانی کرتا ہے اور غلط کام کرنے کے وقت ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

ہر پیغمبر نے یہ تینوں دولتیں اپنے اپنے زمانہ والوں اور اپنی اپنی اُمتوں کو عطا کیں اور ان کی بدولت لاکھوں انسانوں کی زندگی بن گئی اور زندگی کی چول اپنی جگہ پر آگئی۔ انسانیت پر حقیقی احسان انھیں پیغمبروں کا ہے، اللہ کا درود و سلام ہو ان پر کہ انھوں نے انسانیت کی دستگیری کی اور اس کو عین وقت پر ہلاکت سے بچا لیا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ دولتیں دنیا سے ناپید ہونے لگیں۔ علم صحیح گم ہوگیا، یقین کا چراغ بجھ گیا، نیک عمل کی خواہش مُردہ ہوگئی۔ چھٹی صدی مسیحی آئی تو یہ تینوں دولتیں اتنی نایاب ہو چکی تھیں کہ ان کا سراغ لگانا مشکل تھا، پورے پورے ملک اور پورے پورے بر اعظم میں بھی ڈھونڈے سے ایک اللہ کا بندہ نہ ملتا جو علم صحیح اور ایمان قوی کی دولت سے مالا مال ہو، انبیاء کا لایا ہوا دین اور پھیلایا ہوا یقین سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ بن گیا تھا۔ شک و بے عملی کی ظلمتوں میں علم و یقین کا یہ نور اس طرح کہیں کہیں چمکتا تھا جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں، اہل یقین کا ایسا قحط تھا کہ ایران کا ایک نوجوان سلمان فارسی یقین اور حُسنِ عمل کی تلاش میں نکلتا ہے تو ایران سے شام اور وہاں سے حجاز پہونچ جاتا ہے اور ان تین ملکوں میں اس کو صرف چار صاحبِ یقین ملتے ہیں۔

اس گھٹاٹوپ اندھیرے اور اس عالمگیر ظلمت میں خدا کا آخری پیغمبر آتا ہے وہ ان تینوں دولتوں کو اتنا عام کر دیتا ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی عام نہیں ہوئی تھیں۔ جو دولت کسی کسی سینہ اور کسی کسی سفینہ میں تھی جو گھروں سے نکل کر محلوں میں بھی اور محلوں سے نکل کر شہروں میں بھی نہیں پھیلی تھی وہ گھر گھر عام ہو جاتی ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتی ہے:

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

وہ ان تینوں حقیقتوں کی تلقین ہی نہیں کرتا، ان کا صور پھونک دیتا ہے، دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی کان والا ایسا نہیں جو کہہ سکے کہ اس نے اس صور کی آواز نہیں سنی اور جس نے نہیں سُنی اس کے کان کا قصور ہے، اس کے اعلان کا قصور نہیں۔ آج دنیا کا کون سا گوشہ ہے جہاں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ اور اشھد ان محمد رسول اللّٰہ کا ترانہ سُننے میں نہیں آتا، جب دُنیا کی تمام آوازیں تھک کر سو جاتی ہیں، جب جیتے جاگتے شہر پر موت کی سی نیند طاری ہو جاتی ہے جب زبانوں پر قفل پڑ جاتے ہیں اس وقت بھی کانوں میں یہی صدا آتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں۔

آج ریڈیو کے ذریعہ دنیا کے کونہ کونہ میں آواز پہونچتی ہے اور گھر گھر پیغام پہونچ جاتا ہے۔ لیکن کیا کسی ریڈیو نے، خواہ وہ امریکہ کا ہو یا برطانیہ عظمیٰ کا، کسی حقیقت کو کسی علم کو اس طرح دنیا میں عام کیا ہے جس طرح یہ علم عام ہوا ہے جس کی صدا نبیِ امّی نے کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر لگائی تھی!

انسان کبھی ترنگ میں آتا ہے اور طفلانہ معصومیت کے ساتھ کچھ کہنے لگتا ہے۔ ایسی ہی ترنگ میں اقبال نے انسانوں کی طرف سے اپنے مالک کی بارگاہ میں عرض کیا تھا:

ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اگر آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ غلام عرض کرے تو کیا بے جا ہے کہ خدایا تیری خدائی برحق، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالق اور اس ساری دنیا کا خالق و مالک اور ہر شے پر قادر ہے، لیکن کیا تیرے بندوں اور تیری مخلوقات میں سے کسی نے تیرا نام اس طرح پھیلایا اور دنیا کے کونہ کونہ میں پہنچایا جس طرح تیرے بندے اور پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے؟ یہ کوئی بے ادبی اور سرکشی نہیں، اس میں بھی تعریف اسی خدا کی ہے جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پیغمبر بھیجا اور ان کو اپنا نام پھیلانے اور اپنا دین چمکانے کی یہ طاقت اور توفیق عطا فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے میدان میں جب اپنی چودہ پندرہ سال کی کمائی اللہ کے دین کی مدد کے لیے سامنے رکھ دی اور ۳۱۳ کو ایک ہزار کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا تو زمین پر سر رکھ کر اپنے مالک سے یہی کہا تھا کہ "اے اللہ! اگر تو اس مٹھی بھر جماعت کو آج ہلاک کر دینے کا فیصلہ فرماتا ہے تو قیامت تک تیری عبادت نہ ہو سکے گی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی جو صدا لگائی تھی اس سے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفہ اور کوئی دماغ غیر متاثر نہیں رہا۔ جب سے دنیا نے سُنا کہ انسان کے لیے خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا ذلت اور عار ہے۔ خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے اس لیے جھکایا تاکہ سب سجدے اس کی اولاد پر حرام ہو جائیں، وہ سمجھ لے کہ جب اس کارخانۂ قدرت کے کارندے ہمارے سامنے جھکا دیے گئے تو ہم کو اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے جھکنا کب زیب دیتا ہے، جب سے دنیا نے توحید کی حقیقت اور انسان نے اپنی یہ حیثیت سُنی اس وقت سے شرک خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا۔ اس کو احساسِ کمتری نے گھیر لیا۔ آپ کو بعثتِ محمدی کے بعد اس کے لب و لہجہ میں فرق محسوس ہوگا۔ اب وہ

اپنے عمل پر نازاں نہیں، وہ اس کی تاویل اور فلسفیانہ تعبیر کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید کی آواز نے دل میں گھر کر لیا ہے۔

پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم و یقین کے ساتھ وہ طاقت بھی پیدا کر کے دکھا دی جس میں ہزار پولیس، سیکڑوں عدالتوں اور بیسیوں حکومتوں سے زیادہ طاقت ہے۔ یعنی ضمیر کی طاقت، نیکی کی رغبت، گناہ سے نفرت اور نفس کا خود احتساب۔

یہ اسی طاقت کا کرشمہ تھا کہ ایک صحابی جن سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے وہ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ ضمیر چٹکیاں لینے لگتا ہے اور وہ حضورؐ کی خدمت میں آتے ہیں اور عرض کرتے ہیں: حضور! مجھ کو پاک کر دیجیے، آپ رُخ انور پھیر لیتے ہیں وہ اسی طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ دُوسری طرف رُخ کر لیتے ہیں، وُہ اس طرف آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، آپ تحقیق کرواتے ہیں کہ ان کی دماغی حالت خراب تو نہیں، جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح الدماغ آدمی ہیں تو آپ ان کو سزا دلواتے ہیں۔ کس چیز نے ان کو سزا پر آمادہ کیا اور کون سی چیز ان کو کھینچ کر لائی؟

آگے چلیے غامدیہ ایک ان پڑھ عورت تھیں کسی گاؤں کی رہنے والی، وہ ایک بار بڑے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہیں، نہ کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا۔ مگر ان کے دل میں ایک پھانس تھی جو ان کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ ان کو کھانے پینے میں مزا نہ آتا تھا۔ وہ کھانا کھاتیں تو ان کا دل کہتا کہ تم ناپاک ہو، ناپاک کا کیا کھانا پینا، تمھیں پہلے پاک ہونا چاہیے، اس گناہ کی پاکی سزا کے بغیر ممکن نہیں، وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور تقاضا کرتی ہیں کہ ان کو پاک کر دیا جائے۔ اور اس پر اصرار کرتی ہیں، یہ معلوم کر کے کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس بچہ کا کیا قصور، اس کی جان تمہارے ساتھ کیوں جائے، جب یہ ہو جائے تب آنا، خیال کیجیے ان کو ضرور اس میں کچھ عرصہ لگا ہوگا، کیا اُنھوں نے کھایا پیا نہ ہوگا، کیا زندگی نے خود ان سے تقاضا نہ کیا ہوگا، کیا خود کھانے پینے کی لذّت نے زندگی کی رغبت نہ پیدا کی ہوگی اور ان کو یہ نہ سمجھایا ہوگا کہ اب وہ حضورؐ کے پاس جانے کا ارادہ فسخ کر دیں مگر وُہ اللہ کی بندی پکی رہی اور کچھ عرصہ کے بعد بچہ کو لے کر آئی اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں اس سے فارغ ہوگئی، اب میری طہارت میں کیوں دیر ہو؟ فرمایا، نہیں نہیں، ابھی اس کو دودھ پلاؤ۔ جب دُودھ چھوٹے تب آنا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کو دو برس تو ضرور لگے ہوں گے، یہ دو برس کیسی آزمائش کے تھے، نہ پولیس تھی نہ نگرانی، نہ مچلکہ نہ ضمانت، کتنے خیال اس کو آئے ہوں گے۔ بچہ کی معصوم صُورت اس کو جینے کی دعوت دیتی ہوگی، اس کی مسکراہٹ زندگی کی خواہش پیدا کرتی ہوگی، اور بچہ اپنی زبان بے زبانی سے کہتا ہوگا کہ اماں! میں تو تیری ہی گود میں پلوں گا اور تیری انگلی پکڑ کر چلوں گا۔ مگر اس کا ضمیر کہتا تھا: نہیں، تیری ماں ناپاک ہے، اس کو سب سے پہلے پاک ہونا ہے، دل کا یقین کہتا تھا کہ احکم الحاکمین کے یہاں جانا ہے، وہاں کی سزا سخت ہے، وُہ پھر حاضر ہوئی۔ روٹی کا ٹکڑا بچے کے منہ میں ہے اور کہتی ہے: یا رسول اللہ! دیکھیے اس بچہ کا دودھ بھی چھوٹ گیا اور وہ روٹی کھانے کے قابل ہو گیا ہے۔ اب میری پاکی میں کیا دیر ہے؟ آخر

خدا کی اس سچی اور پکی بندی کو سزا دی جاتی ہے اور حضورؐ خوشنودی کا پروانہ عطا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس نے ایسی سچی توبہ کی ہے کہ اس اکیلی توبہ کی اگر سارے مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ارضاہا۔

میں پوچھتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جو بغیر ہتکڑی بیڑی کے، بغیر مچلکہ وضمانت کے، بغیر پولیس کے اس کو کھینچ کر لاتی ہے اور سزا کے لیے اصرار کرواتی ہے؟ آج ہزارہا پڑھے لکھے، قابل، فاضل مرد اور عورتیں ہیں جن کا علم اور نقصانات کا یقین ان کو غلط کام سے باز نہیں رکھ سکتا اور اچھے کام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو یہی تینوں انمول موتی عطا کیے۔ علمِ صحیح، یقینِ کامل اور نیکی کا تقاضائے قلبی، دنیا کو نہ اس سے زیادہ قیمتی سرمایہ ملا، نہ کسی نے اس پر آپ سے بڑھ کر احسان کیا۔

دنیا کے ہر انسان کو فخر کرنا چاہیے کہ ہماری نوعِ انسانی میں ایک ایسا انسان پیدا ہوا جس سے انسانیت کا سر اونچا اور نام روشن ہوا، اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا نقشہ کیا ہوتا اور ہم انسانیت کی شرافت وعظمت کے لیے کس کو پیش کرتے؟ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر انسان کے ہیں۔ محمد رسول اللہ سے اس دنیا کی رونق اور نوعِ انسانی کی عظمت ہے، وہ کسی قوم کی ملک نہیں، ان پر کسی ملک کا اجارہ نہیں، وہ پوری انسانیت کا سرمایۂ فخر ہیں، کیوں آج کسی ملک کا انسان فخر ومسرت کے ساتھ یہ نہیں کہتا کہ میرا اس نوع سے تعلق ہے جس میں محمد رسولؐ جیسا انسان کامل پیدا ہوا؟

آج انسانوں کا کون سا طبقہ ہے جس پر آپ کا براہِ راست یا بالواسطہ احسان نہیں، کیا مردوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیت کی تعلیم دی؟ کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق بتلائے اور ان کے لیے ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: "جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے"؟ کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کی حمایت کی اور فرمایا کہ "مظلوم کی بددعا سے ڈرو کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں" کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق وفرائض بھی بتلائے اور حدود بھی بتلائے اور انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنا دی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سایہ میں ہوگا، کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشے کی شرافت بتلائی اور خود تجارت کر کے اس گروہ کی عزت بڑھائی۔ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اور راست گفتار اور دیانتدار تاجر جنت میں قریب ہوں گے، کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔ کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے اور جس میں احساس و زندگی ہے اس کو آرام پہونچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے" فی کل ذات کبد حری صدقۃ"۔ کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا! تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں" انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ"۔ کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں کہ سب سے پہلے

دنیا نے آپ ہی کی زبان سے سُنا کہ خدا کسی قوم، نسل و برادری کا نہیں سارے جہانوں اور دنیا کے سب انسانوں کا ہے جس دُنیا میں آریوں کا خدا، یہودیوں کا خدا، مصریوں کا خدا، ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا وہاں "الحمد للہ رب العالمین" کی حقیقت کا اعلان ہُوا اور اس کو نماز کا جُز بنا دیا گیا۔

ہماری آپ کی دنیا میں حکماُ و فلاسفہ بھی آئے، ادبا و شعراُ بھی، فاتح و کشور کشا بھی، سیاسی قائد اور قومی رہنما بھی، موجدین و مکتشفین (سائنٹسٹ) بھی، مگر کس کے آنے سے دنیا میں وہ بہار آئی جو پیغمبروں کے آنے سے؛ پھر سب سے آخر سب سے بڑے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے آئی، کون اپنے ساتھ وہ شادابی، وہ برکتیں، وہ رحمتیں نوعِ انسانی کے لیے وہ دولتیں اور انسانیت کے لیے وہ نعمتیں لے کر آیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے؛ تیرہ سو برس کی انسانی تاریخ پُورے وثوق کے ساتھ آپ کو خطاب کر کے کہتی ہے: سہ

سرسبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

نبیؐ اپنے گھر میں

امین احسن اصلاحی

ایک شخص کے گھر کی زندگی اس کے سیرت و کردار کا حقیقی آئینہ ہوتی ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی باہر کی زندگی میں ظاہرداری کی چادر اوڑھ کر نکلتا ہو اور جو کچھ وہ ہے اس سے بالکل مختلف شکل و صورت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہو ، لیکن گھر کی زندگی میں وہ اپنے اوپر اس قسم کا پردہ ڈالے رکھنے میں زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں ہوسکتا ۔ اوّل تو کوئی شخص اس قسم کی کوشش کرتا ہی نہیں، اور اگر وہ کرے تو اس میں کامیاب نہیں بھی ہوسکتا ۔ اس وجہ سے کسی شخص کو جانچنے کے لیے بہترین کسوٹی اس کے گھر کی زندگی ہے ۔ وہاں اس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کی سیرت کیا ہے ؛ جس خداترسی اور تقویٰ کا درس وہ باہر دے رہا ہے، اس پر وہ اپنے گھر کے اندر کتنا عامل ہے ؛ جس اتباعِ کتاب و سنّت کا وعظ وہ دوسروں کو سنا رہا ہے ، اس پر وہ خود کس قدر عمل کرتا ہے ؛ اور اپنے بیوی بچّوں سے کس قدر ان پر عمل کراتا ہے ؛ جس دین کی اقامت کے لیے وہ خدائی فوجدار بنا ہوا سارے جہان سے لڑ رہا ہے ، اس دین کو وہ اپنے گھر کے اندر کس حد تک قایم کرنے میں کامیاب ہوسکا ہے ؛ جس سادگی ، جس ایثار ، جس قناعت ، جس صبر اور اخلاص و دیانت کا وہ دوسروں سے مطالبہ کر رہا ہے ، اس کا جمال خود اس کی گھریلو زندگی میں کتنا جھلک رہا ہے ؛ اگر فی الواقع کوئی شخص اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے ، تو بلاشبہ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے ، جس پر پُورے اُترنے والے کی اخلاقی عظمت کا اور اس کی سچائی کا انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ ایک ایسے شخص کے اصولوں اور نظریات سے تو آپ اختلاف کرسکتے ہیں ، لیکن آپ اس کو محض ایک مصنوعی یا ایک بے کردار آدمی قرار نہیں دے سکتے ۔

آئیے اس کسوٹی پر ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں اور یہ دیکھیں کہ آپؐ کی باہر کی دعوت اور گھر کی زندگی میں کس حد تک مطابقت ہے ۔ خوش قسمتی سے صرف آپؐ ہی کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کا ہر حصّہ دنیا کے سامنے ہے ۔ ہم نہایت مستند معلومات کی بنا پر جس طرح یہ جانتے ہیں کہ آپؐ مسجد نبوی کے اندر صحابہؓ کی موجودگی میں کیا کچھ فرماتے تھے اور کیا کچھ کرتے تھے ، اسی طرح ہم نہایت مستند معلومات کی روشنی میں یہ بھی جانتے ہیں کہ آپؐ بیوی بچّوں کے اندر کس طرح رہتے سہتے تھے ۔

آپؐ نے اپنی زندگی پرائیویٹ اور پبلک کے دو حصّوں میں تقسیم نہیں کی تھی بلکہ آپؐ کی زندگی کا ہر حصّہ پبلک کے لیے کُھلا ہوا تھا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے رہنمائی حاصل کریں ۔ آپؐ نے لوگوں سے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ لوگ صرف آپؐ کی پبلک زندگی ہی کو دیکھیں ، آپؐ کی نجی زندگی کا تجسّس نہ کریں بلکہ آپؐ نے اپنی پبلک اور اپنی نجی زندگیاں ایک کُھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف اپنے دوستوں کے سامنے بلکہ اپنے دشمنوں کے سامنے بھی رکھ دیں کہ لوگ چاہیں تو ان کو اسوۂ حسنہ

بنائیں اور چاہیں تو بے خوف وخطران پر حرف گیری کریں، اگر حرف گیری کی گنجائش پائیں۔

دُنیا میں دُوسروں کی بیویاں ان کی گھریلو زندگی کے رازوں کی امین ہوتی ہیں، لیکن صرف حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پبلک کے نمایندہ کی حیثیت سے آپؐ کی گھریلو زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھتی تھیں اور پُوری دیانت و امانت کے ساتھ اس کو پبلک تک پہنچاتی تھیں۔ ایک ایسی زندگی جس کی جلوت وخلوت سب کچھ ہمارے سامنے ہے، بہترین چیز اس مقصد کے لیے ہو سکتی ہے کہ ہم اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں میں کس حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔

اس مقصد کو سامنے رکھ کر میں یہ سطریں لکھ رہا ہُوں اور میری کوشش یہ ہوگی کہ میں جس پہلو کو بھی نمایاں کروں، اس کے لیے موادِ استدلال اصلاً قرآن مجید سے اخذ کروں تاکہ آپؐ کی سیرت طیّبہ کا مستند ترین حصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے، اس کا ایک پہلو آپ کے سامنے آئے اور اگر کہیں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو حدیث اور سیرت کے بیان کردہ واقعات سے بھی مدد لوں گا۔

اہلِ بیت کا مشغلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی گھریلو زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ کے اہلِ بیت کا رات دن کا مشغلہ بھی وہی تھا، جو خود حضورؐ کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ یہ صورت نہیں تھی کہ آپؐ خود تو لوگوں کو بندگیِ رب اور اطاعتِ الٰہی کا وعظ سناتے رہیں اور آپؐ کے اہلِ بیت دنیا کی دلچسپیوں اور مادی زندگی کی لذّتوں میں منہمک ہوں یا آپؐ باہر تو لوگوں کو زُہد وقناعت کی تعلیم دیں اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جہاد کی تلقین فرماتے ہوں اور گھر میں آکر اس تلقین کو بھُول کر گھر کی دلچسپیوں اور راحتوں میں کھو جاتے ہوں۔ بلکہ آپؐ کا جو مشن باہر ہوتا تھا، آپؐ اسی مشن کو لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے اور جس مبارک شغل میں خود اپنا وقت صرف فرماتے تھے، اسی مبارک شغل میں آپؐ کے گھر والے بھی اپنا وقت بسر کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک مشن سورۂ جمعہ میں یہ بیان ہوا ہے:

ھو الذی بعث فی الامیّین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیاتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ ۔ (آیت ۲)	وہی ہے جس نے بھیجا اُمیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اللہ کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت۔

بعینہٖ اس مشن کی یاد دہانی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اس وقت فرمائی ہے جب کہ منافقین اور منافقات اس غرض کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے تھے کہ کسی طرح آپؐ کی ازواجِ مطہرات کو اس اعلیٰ نصب العین سے ہٹا کر دُنیوی اور مادی زندگی کی لذتوں کی طرف مائل کریں۔ چنانچہ منافقوں کی بیویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے کانوں میں یہ پھُونکنا شروع کیا کہ آپ معزز اور امیر گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگوں کی پرورش سردار گھرانوں میں عیش و

آرام کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ لیکن اس شخص نے آپ کو غربت اور فلاکت کی زندگی میں لاکر ڈال دیا ہے۔ اگر آپ ان کی قید سے آزاد ہوتیں تو بڑے بڑے سرداران قبائل آپ کو نکاح کے پیغام دیتے اور آپ کی زندگیاں بڑے عیش و آرام سے گزرتیں۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اس سے بالاتر تھیں کہ اس قسم کے شیطانی پروپیگنڈے سے متاثر ہوں، تاہم طبائع انسانی کی عام کمزوری کو سامنے رکھ کر اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم منصب پر سرفراز ہیں۔ اسی منصب کی ذمہ داریوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا ہے اور اس دنیا کی کوئی عزت و شوکت بھی اس منصب کی عزت و شوکت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ چنانچہ فرمایا:

یٰنساء النبی لستن کاحدٍ من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولاً معروفاً وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولیٰ واقمن الصلوٰۃ واٰتین الزکوٰۃ واطعن اللہ ورسولہٗ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ واذکرن ما یتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ ان اللہ کان لطیفاً خبیراً۔

(احزاب ۳۲ - ۳۴)

اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ پس تم اپنے لہجہ میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو اور نماز قایم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتی رہو۔ اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم سے دنیا کی آلائشیں دُور رکھے۔ اے نبی کے گھروالو! اور تم کو اچھی طرح پاک کرے اور تمھارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کا چرچا کرو۔ اللہ تعالےٰ لطیف و خبیر ہے۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سنوارنے اور سدھارنے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا اُسی طرح آپؐ کے گھر والوں کو بھی اسی لیے چنا تھا کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں آپؐ کا ہاتھ بٹائیں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے اونچا بنایا تاکہ سب لوگ ہادی و مرشد اور پیغمبر و امام کی حیثیت سے آپؐ کی پیروی کریں، اسی طرح آپؐ کی ازواج کا درجہ بھی تمام اُمت کے مردوں اور عورتوں کے لیے امہات کا رکھا تاکہ سب لوگ ان کو اپنے لیے نمونہ مان کر ان سے زندگی کے وُہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئے ہیں۔

جس طرح ان تعلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرماتے تھے، جو آپ دُوسروں کو دیتے تھے،

اسی طرح ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیتِ نبوت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وُہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمۂ نور سے خود پہلے اچھی طرح منور ہوں۔ پھر اس روشنی سے دوسروں کو منور کریں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ دنیا کے زخارف ان کو اپنی طرف متوجہ کریں، اسی طرح آپؐ کے اہلِ بیت کے لیے بھی یہ بات پسند نہیں کی گئی کہ آلایش دنیا کی چھینٹوں سے ان کے دامن آلودہ ہوں۔ اندر اور باہر دونوں جگہ کامل یکسانی اور کامل مشابہت تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے حضورؐ نے اپنے دن رات ایک کر رکھے تھے اس اعلیٰ مقصد میں آپؐ کی ازواج بھی دل وجان سے منہمک تھیں۔

شریر اور دنیا پرست لوگ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یکسوئی کو درہم برہم کرنے کے لیے طرح طرح کے فتنے اٹھاتے رہتے تھے، لیکن اللہ کی تائید اور رہنمائی سے آپؐ ہمیشہ ان فتنوں سے محفوظ رہ کر اپنے کام میں لگے رہے۔ اسی طرح منافقین اور منافقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی یکسوئی میں بھی خلل انداز ہونے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھا اور دنیا کی دلفریبیاں ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آزادانہ انتخاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات نے دنیا طلبی کی تمام رغبتوں اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر محض اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت، اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور کتاب و سنّت کی تعلیم و دعوت کے لیے اپنے آپ کو جو وقف کر دیا تھا، تو یہ کوئی مجبوری کا سودا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے مقدس شوہر چونکہ ایک خاص طرح کی زندگی اور ایک خاص قسم کے مشن پر مامور کر دیے گئے تھے، اس وجہ سے ان کے لیے اب اس کے سوا کوئی راہ باقی ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چار و ناچار اسی کام میں اپنے آپ کو بھی لگائیں اور طوعاً و کرہاً دنیا کی لذتوں اور راحتوں کے ارمانوں سے اپنے دل خالی کریں، بلکہ یہ پاکیزہ زندگی اُنھوں نے آزادانہ انتخاب سے اختیار کی تھی۔ ان کے سامنے دُنیا پیش کی گئی، لیکن انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں پوری آزادی دی کہ وہ اپنے لیے جو زندگی پسند کریں، اس کا انتخاب کر لیں۔ اُنھوں نے ہر قیمت پر آپؐ کی رفاقت کو منتخب کیا۔

شریروں اور منافقوں نے ان کو طرح طرح سے غیر مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کے اس اطمینان اور اس سکونِ خاطر میں، جو نبی کی محبت میں حاصل تھا کوئی فرق نہ آیا۔ جس زمانہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں ازواجِ مطہرات کو غیر مطمئن کرنے کے لیے غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ آپ نے حجت تمام کرنے کے لیے اپنی ازواج کو اس بات کا پورا پورا اختیار دے دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور زخارفِ دنیا میں سے کسی ایک چیز کا پوری یکسوئی اور دلجمعی سے انتخاب کر لیں۔ اگر انھیں دنیا اور دنیا کی راحتوں اور لذتوں کی خواہش ہے تو اللہ کا رسولؐ اس بات کے لیے تیار ہے کہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ ان کو ان کے حقوق دے دلا کر رخصت کر دے اور اگر وہ دنیا پر لات مار کر رسولؐ کی محبت و معیت اور اقامتِ دین کے اس جہاد کے لیے اپنے آپ کو وقف کرتی ہیں، تو پھر اس زہد و قناعت کی زندگی پر

ان کو قانع ہونا پڑے گا، جو وہ گزار رہی ہیں۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَھَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ (۳۳ : ۳۰)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ تمھیں تمھارے حقوق دے دلاؤں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی طلب کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو یہ اختیار دے کر ایک طرف تو ان کے لیے اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اگر اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اس جہاد اور زہد و نفس کشی کی اس ریاضت میں آپ کی شریکِ سفر رہنا چاہتی ہیں تو اپنے آپ آزادانہ انتخاب و اختیار سے رہیں تاکہ اس جہاد و ریاضت کا جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملنے والا ہے اس میں پوری پوری حصہ دار بن سکیں۔

دوسری طرف آپ نے ان منافقین کے لیے بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ دیکھ لینے کا ایک موقعہ بہم پہنچایا، جو ایک عرصہ سے اس مہم میں لگے ہوئے تھے کہ آپ کی گھریلو زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور انتشار پیدا کرکے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے بعد قدرتی طور پر ان کو دلی خوشی ہوئی ہو گی کہ ایک لمبے عرصے تک فساد کی جو فصل بوتے اور سینچتے رہے ہیں اب اس کے بارآور ہونے کا وقت آیا ہے۔ وہ متوقع ہوئے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کو اُکسانے اور ان کی موجودہ زندگی سے ان کو بیزار کرنے کی جو جدّوجہد کرتے رہے ہیں اب اس کے نتائج کچھ نہ کچھ ضرور نکلیں گے۔ آپ کی ازواج میں سے سب نہیں تو بعض ضرور ہی اس اختیار کے بعد آپ کی رفاقت سے انکار کر دیں گی اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور آپ کو ایذا پہنچانے کا نیا مواد ان کو ہاتھ آئے گا۔ لیکن ان کے چھکے چھوٹ گئے ہوں گے جب اُنھوں نے دیکھا ہو گا کہ اس اختیار کے پانے کے بعد آپ کی ازواج کا جذبۂ اطاعت اور جوشِ محبت و وفاداری اور بڑھ گیا اور ان میں سے ایک ایک نے صاف صاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ:

"آپ کی غلامی کے آگے تمام دنیا کی سلطنت اور سارے کون و مکان کی سروری و سرداری بھی ہیچ ہے۔"

اس طرح یہ حقیقت مخالفین اور موافقین دونوں پر واضح ہو گئی کہ حضورؐ کی ازواج کی زندگیاں اس مقدس مشن کے ساتھ صرف اس لیے نہیں بندھی تھیں کہ وہ حضورؐ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں، بلکہ ان میں سے خود ہر ایک کا مطلوبِ حقیقی بھی یہی مشن بن گیا تھا۔

بخاری میں ابوسلمہ بن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا کہ جب مذکورہ آیت تخییر اُتری تو حضورؐ نے اپنی ازواج میں سے ایک ایک کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہہ رہا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں کہ تم اس کے جواب کے لیے جلدی کرو، اس کا جواب تم اپنے والدین سے مشورہ کے بعد مجھے دو۔ اس کے بعد آپؐ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں ایسی کیا بات ہے جس کے بارے میں مجھے اپنے والدین سے مشورہ کی ضرورت ہو، میں دُنیا اور اس کی زینتوں کے مقابل میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی زندگی کو اختیار کرتی ہوں :

بولائے تو کہ اگر بندہ خویشم خوانی
از سرِ خواجگی کون و مکاں برخیزم

پھر یہی سوال حضورؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی تمام ازواج کے سامنے رکھا اور سب کا جواب وہی تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ کا تھا اور اس کے سوا جواب اور ہو بھی کیا سکتا تھا! سن و سال کے لحاظ سے اگر دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کا ارمان ہو سکتا تھا تو حضرت عائشہؓ کے دل میں ہو سکتا تھا، لیکن جب عشقِ حق نے ان کو اس قدر دنیا سے بے نیاز اور آخرت کا طالب بنا دیا تھا کہ اللہ کی محبت اور رسول کی اطاعت پر سب کچھ قربان کر دینے میں زندگی کی حقیقی لذت محسوس کر رہی تھیں تو دوسروں کا جواب ان کے جواب سے کس طرح مختلف ہو سکتا تھا۔

بعض مستشرقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت پر "حرم" کی پھبتی چست کرتے ہیں۔ بعض آپؐ کی ازواجِ مطہرات کو قیدیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ "گرفتارانِ بلا" تھیں، جو صرف اس لیے آپؐ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں کہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن کیا پوری تاریخِ انسانی میں ایک مثال بھی اس امر کی پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی نے اپنے قیدیوں کے سامنے آزادی کا اختیار نامہ رکھا ہو، جو حضورؐ نے رکھا، لیکن قیدیوں نے اس آزادی پر اس کی غلامی ہی کو ترجیح دی ہو؟

محبت، اعتماد اور خودداری کی فضا

لیکن کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہلِ بیت نے دُنیا کی جگہ آخرت، ثروت و امارت کی جگہ فقر اور خدمتِ نفس کی جگہ خدمتِ انسانیت کے اس نصب العین کو اپنے لیے پسند فرمایا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی گھریلو زندگی میں کوئی لذت و کیفیت، کوئی چہل پہل، سرگرمی اور اتار چڑھاؤ کی کوئی نرمی و گرمی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہموار زندگی تھی، ہر قسم کے نشیب و فراز سے خالی ایک پرسکون ماحول تھا۔ ہر قسم کے جذبات کی مداخلت سے پاک اور محفوظ، ایک بہتا ہوا دریا تھا، ہر قسم کے تلاطم اور تموج سے یکسر نا آشنا، حضورؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق جن لوگوں کا تصور یہ ہے، ان کا تصور نہایت غلط ہے۔ آپؐ کی باہر کی زندگی کی طرح آپؐ کی گھر کی زندگی بھی ان تمام کیفیات سے معمور اور پُر رونق تھی، جس سے

انسانی زندگی کو معمور اور پُررونق ہونا چاہیے۔ البتہ ان میں افراط و تفریط کی بے اعتدالیاں یا عیش دنیا کی خود فراموشیاں نہیں تھیں۔ آپؐ سوتے بھی تھے، جاگتے بھی تھے۔ آپؐ کھاتے بھی تھے اور بھوکے بھی رہتے تھے۔ آپؐ خوش بھی رہتے تھے اور ناخوش بھی ہوتے تھے۔ آپؐ پیار بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی فرماتے تھے۔ غرض زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں، آپؐ کی گھریلو زندگی میں بھی وہ سارے پہلو پائے جاتے تھے۔ بس دُوسروں کی زندگی سے اگر کوئی فرق تھا، تو جیسا کہ عرض کیا گیا یہ فرق تھا کہ زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ اس وجہ سے اس میں کوئی شے نہ اپنے فطری حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اگر کوئی چیز ذرا بھی آگے پیچھے ہٹتی تو ہمیشہ عالم الغیب کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی۔

آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپؐ ان کی دلداری کے خیال سے کوئی ایسی چیز کھانی چھوڑ دیتے جو خود آپؐ کو مرغوب ہوتی۔ لیکن آپؐ کی ازواج میں سے کسی کے مذاق کے خلاف ہوتی۔ آپؐ کی یہ شفقت و دلداری اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے آگاہ فرمایا کہ یہ چیز اس حد تک نہیں بڑھنی چاہیے کہ اس کے سبب سے کوئی جائز چیز ناجائز بن جائے۔ آپؐ اپنی ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے تھے۔ اس لیے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر بیویوں کی طرف سے ان رازوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی ہوتی، تو اس پر آپؐ ان کو سرزنش بھی فرماتے۔ کیونکہ جس طرح شوہر کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اعتماد کرے، اسی طرح بیوی کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امین بنے اور اس میں کوئی خیانت نہ کرے۔

آپؐ اپنے بیوی بچوں کو سرزنش بھی فرماتے تھے لیکن سرزنش کرنے کے معاملہ میں بھی حضورؐ کا ایک خاص انداز تھا۔ آپؐ اگر کسی بات پر سرزنش فرماتے تو اس طرح نہیں کہ جس کو سرزنش کی، اس کے لتے لے ڈالے، بلکہ اس طرح کہ مخاطب بات سمجھ بھی جائے اور اس پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ آپؐ کی ازواج کے باہمی تعلقات (معمولی فطری نسوانی جذبات کے وقتی اظہار کے سوا) نہایت خوشگوار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے راز کی باتیں بھی ایک دوسرے پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں۔ اس چیز پر بھی حضورؐ نگاہ رکھتے تھے کہ نہ تو غیر معمولی اعتماد کسی بے راہ روی میں مبتلا کرے اور نہ بلاوجہ سے بے اعتمادی کسی خرابی کا باعث بنے۔ حضورؐ کی ازواج کبھی کبھی خود حضورؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور حضورؐ اس کو بھی پسند فرماتے تھے، بشرطیکہ یہ اپنی جائز حدود سے آگے نہ بڑھے۔

زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز، جو حضورؐ کی گھریلو زندگی میں موجود تھے، ایک ایسی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں، جس کو انسانی زندگی کا بہترین مظہر کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں قرآن مجید کی کچھ آیتیں نقل کرتے ہیں، جن میں آپؐ کی گھریلو زندگی کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ اگر آپ ان کی تہ میں اتر کر غور کریں گے، تو وہ ساری جھلکیاں آپ خود دیکھ لیں گے، جو اُوپر کی سطروں میں نمایاں ہوئی ہیں:

یٰایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللہ غفورٌ	اے نبی! جو چیز اللہ نے تمھارے لیے جائز ٹھہرائی ہے، اس کو اپنی بیویوں کی دلداری کے

رحیم - قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم واللہ مولیٰکم وھو العلیم الحکیم و اذا اسرّ النّبی الیٰ بعض ازواجہ حدیثاً فلمّا نبّات بہٖ واظھرہُ اللہ علیہ عرف بعضہٗ و اعرض عن بعضٍ فلما نبّاھا بہٖ قالت من انباك ھٰذا قال نبانی العلیم الخبیر - ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما و ان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولٰہ وجبریل وصالح المؤمنین والملٰئکۃ بعد ذٰلك ظھیرٌ۔

(تحریم ۱-۴)

خیال سے اپنے لیے حرام کیوں ٹھہراتے ہو؟ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ نے تمھارے لیے تمھاری خلاف شرع قسموں کا توڑنا فرض ٹھہرایا ہے اور اللہ ہی تمھارا آقا و مولا ہے اور وہ علم و حکمت والا ہے اور جبکہ پیغمبر نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کہی تو جب اس بیوی نے وہ بات دوسری بیوی کو بتا دی اور اللہ نے اس امر سے آپؐ کو آگاہ کر دیا، تو کچھ حصّہ کا آپ نے ذکر کیا اور کچھ حصہ کو حذف کر دیا توجب آپ نے ان بیویوں پر ظاہر کیا تو وہ بولیں کہ آپ کو اس چیز سے کس نے آگاہ کیا؟ آپ نے کہا کہ مجھے خدائے علیم و بصیر نے آگاہ کیا۔ اگر تم دونوں بیویاں اللہ کی طرف رجوع کرو، تو یہی تمھارے شایانِ شان ہے کیونکہ تمھارے دل پہلے ہی سے اللہ کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم پیغمبر کے خلاف ایکا کرو گی تو اللہ اس کا مالک ہے اور جبریل اور تمام مسلمان اور ملائکہ اس کے ساتھی ہیں۔

ان آیات میں جس چیز کی تحریم کا ذکر کیا ہے یا جس راز کی طرف اشارہ ہے ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے راز رکھیں ان کی کھوج کرید کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج کے درمیان کے کسی راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا تو ہمارے لیے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ان آیات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے جو پہلو بالکل نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آرہے ہیں، انھیں ہمیں ضرور سمجھنا چاہیے۔ ان سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کوئی بے رنگ، سپاٹ اور بے نشیب و فراز زندگی نہیں تھی بلکہ انسانی فطرت جن پاکیزہ تقاضوں اور جن خوب صورت داعیات سے مرکب ہے ان کی دھوپ چھاؤں یہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً ان آیات کے عمق میں اتر کر غور کیجئے تو مندرجہ ذیل باتیں نہایت واضح طور پر آپ کے سامنے آئیں گی:

ایک یہ کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم جائز حدود کے اندر اپنی ازواج کی دلداری فرماتے تھے۔ ان کے مذاق کا لحاظ رکھتے تھے اور ان کے جو شوق بے ضرر ہوتے تھے حتی الامکان وہ پُورے کر دیتے۔

دوسری یہ کہ آپؐ کی بیویاں آپؐ کی شریکِ رنج و راحت تھیں۔ آپؐ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ ان کو اپنے رازوں کا امین بھی بناتے تھے۔

تیسری یہ کہ آپؐ کی بیویوں کے آپس کے تعلقات نہایت محبت اور اخلاص کے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی بتقاضائے فطرتِ انسانی ان میں سوکنوں کے سے جذبات بھی ابھر آتے تھے، لیکن یہ عام حالت نہیں تھی۔ عام حالت اس قدر اعتماد و محبت کی تھی کہ ایک دوسرے کو شوہر کے راز سے بھی آگاہ کر دیتی تھیں، حالانکہ سوکنوں میں یہ اخلاق بہت کم پایا جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ آپؐ کی ازواج کو اپنے گھروں میں جائز حد تک اپنی خودداری کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل تھا، یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا بھی کر لیتی تھیں، چونکہ یہ چیز محض بربنائے محبت و اعتماد ہوتی تھی، اس وجہ سے اس کو ہمیشہ حضورؐ نے گوارا فرمایا۔ صرف اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا جب یہ اپنی فطری حدود سے بڑھتی نظر آئیں۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کی یہ جھلکیاں ہمیں قرآن مجید میں نظر آتی ہیں۔ اگر اس کو ہم سیرت کی کتابوں میں دیکھیں تو وہاں ہر پہلو سے متعلق ہمیں پوری تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کے لیے اس مضمون میں گنجایش نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم 'زاد المعاد' کی مندرجہ ذیل سطروں پر قناعت کرتے ہیں۔ علامہ ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ نہایت محبت اور حُسنِ سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپؐ انؓ کی خواہش پوری کر دیتے۔ وہؓ جس برتن سے پانی پیتیں آپؐ بھی اس برتن سے اُن کے منہ لگانے کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں اُس ہڈی کو آپؐ بھی لے کر چُوستے۔ ایک مرتبہ اہلِ حبشہ مسجدِ نبویؐ میں اپنے کرتب دکھا رہے تھے آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے لیے اس کا موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپؐ کے کندھے کی اوٹ سے ان کے کرتب دیکھ لیں۔ دوؔ مرتبہ آپؐ سفر کے موقع پر ان کے ساتھ دوڑے بھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وُہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔ نمازِ عصر پڑھ کر آپؐ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ تمام ازواج کے ہاں تشریف لے جاتے اور ان کی خیر خیریت دریافت فرماتے۔ پھر شب میں جس کی باری ہوتی ان کے یہاں قیام فرماتے۔"

(زاد المعاد، ج ۱، ص ۳۸)

محاسبہ

لیکن اس تمام اعتماد و محبت کے باوجود حضورؐ اپنے اہلِ بیت کے محاسبہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف

شفقت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال مسلسل خدمت کی۔ دُوسری روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں۔ لیکن حضورؐ نے میری کسی بات پر اُف تک نہیں کیا۔ لیکن دوسری طرف محاسبہ کا یہ اہتمام تھا کہ دینی معاملات میں اگر ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے صادر ہوتی، تو ناممکن تھا کہ وہ آپؐ کی گرفت سے بچ سکے۔ اُمہات المومنینؓ کی یہ شہادت ہے کہ حضورؐ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے باز پرس نہیں فرماتے تھے۔ لیکن خدا اور دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی پر ضرور باز پرس فرماتے اور اس احتساب سے کوئی محبوب سے محبوب شخصیت بھی نہیں بچ سکتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے زیادہ آپؐ کو اور کون محبوب ہو سکتا تھا؟ ایک مرتبہ ان کی زبان سے حضرت صفیہؓ کے بارے میں یہ الفاظ نکل گئے کہ:

حسبك من صفيه كذا كذا ۔

(صفیہؓ میں یہ عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے)

یہ بات ان کی زبان سے نکلنی تھی کہ آپؐ نے فوراً ان کو تنبیہ فرمائی، اور جن الفاظ میں فرمائی، ذرا ان کے تیور ملاحظہ ہوں:

"عائشہ! تم نے ایسی بات زبان سے نکال دی ہے کہ اگر وہ سمندر میں بھی ملا دی جائے تو اس کی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھ دے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ محاسبہ بھی درحقیقت آپؐ کی محبت ہی کا ایک پہلو تھا۔ جو لوگ اپنے گھر والوں سے محض مادی قسم کی محبت رکھتے ہیں، وہ اپنے ذاتی عیش و آرام سے تعلق رکھنے والی باتوں پر تو بڑے سخت گیر اور تنک مزاج ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے سرزد ہو جائے اور وہ اس کو نظر انداز کر جائیں۔ لیکن خدا اور شریعت کے معاملات میں وُہ بڑے روادار اور فیاض ہوتے ہیں۔ بیوی بچوں میں سے جس کا جی چاہے، اپنی آخرت کی بربادی کے لیے جو چاہے کر گزرے، انھیں کبھی ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ حالانکہ حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو تو نظر انداز کریں جو ان کی اپنی ذات کے معاملہ میں ہوں اور ان باتوں پر گرفت کریں، جن کا تعلق خود ان کی اپنی آخرت سے ہو۔ حضورؐ کا طریقہ یہی تھا۔ آپؐ اپنے ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لیے فکر مند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا اُسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بھاری تھیں۔ دوسروں کے مقابل میں ان کا اجر بھی دُگنا تھا اور اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی سزا بھی دُگنی تھی:

يٰنسآء النبي من يأت منكن بفاحشة	اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی
مبينة يضاعف لها العذاب ضعفين	برائی کی مرتکب ہوگی، تو اس کو دوہری سزا
وكان ذالك على الله يسيرا - ومن	سنا دی جائے گی اور یہ اللہ کے لیے سہل بات ہے
يقنت منكن لله ورسوله وتعمل صالحاً	اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
نؤتها اجرها مرتين واعتدنا لها	کرتی رہیں گی اور بھلے کام کرتی رہیں گی، ہم ان کو

رزقاً کریما۔ (احزاب ۳۰-۳۱) ان کا اجر بھی دوہرا دیں گے اور ان کے لیے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے۔

حضورؐ اپنے اہلِ بیت کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گرانبار رہتے تھے اور ہر وقت ان کو دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابیوں کے لیے اُبھارتے رہتے۔ آپؐ جب شب کی نمازوں کے لیے اُٹھتے تو آپؐ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپؐ کی بیویاں بھی اس سعادت میں حصہ لیں ——— اور بتاتے کہ اپنی آخرت کے لیے جو کچھ کر سکتی ہو، کر لو۔ میں وہاں تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔

نبی اکرمؐ بحیثیت داعی الی الحق

پروفیسر خورشید احمد

انسان بنیادی طور پر دو ایسی ضروریات کا محتاج ہے، جن سے وُہ ایک لمحہ کے لیے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ایک طرف اسے ان اشیاء و وسائل کی ضرورت درپیش ہے، جو اس کی مادی احتیاجات کو پُورا کریں، جن کے ذریعے وُہ اپنے جسم اور رُوح کے رشتے کو قایم و استوار کرے اور بقاے حیات کے مادی تقاضوں کو پُورا کرے۔ دُوسری طرف وہ اس ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے، جس کی روشنی میں وہ اپنی اخلاقی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کی تشکیل صحت مند بنیادوں پر کر سکے اور اس طرح انسانیت کے حقیقی مقاصد کی بوجہ احسن تکمیل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا تقاضا ہے کہ وُہ انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو پُورا کرے۔ پہلی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے اس نے زمین و آسمان میں وسائلِ معیشت کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ودیعت کر دیا ہے اور انسان ان کے وسائل کے ذریعے اپنی مادی ضرورتوں کو پُورا کر سکتا ہے۔ پوری کائنات انسان کے لیے اپنا دامن پھیلائے ہُوئے ہے اور اپنے سینے سے وہ وسائل اگل رہی ہے جو انسانیت کی بے شمار اور ہر آن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو بحسن وخوبی پُورا کر رہے ہیں:

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

انسان کی دُوسری بنیادی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور اپنے نبی مبعوث فرمائے تاکہ وہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کرائیں۔ انھیں زندگی کے معنی اور اس کے مقاصد سے آشنا کریں۔ انھیں جینے کے طریقے سکھائیں اور ان اصول تمدن کی تعلیم دیں، جو زندگی کو اس کے اصل مقاصد سے ہمکنار کر دیں اور خدا کی زمین پر ایک صحت مند نظام قایم کریں، جس میں زمین اپنی نعمتیں اگل دے اور آسمان اپنی برکتیں نازل کرنے لگے۔

انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وُہ خدا اور بندے کے تعلق کو توحید، رسالت اور آخرت کے عقاید کی بنیادوں پر استوار کرائیں اور دعوتِ دین اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے تاریخ کی رَو کو موڑ دیں اور الہامی ہدایت کی روشنی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔ سورہ الحدید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (حدید۔ ۲۵)	ہم نے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ قرآن (یعنی قانونِ حیات) اور میزانِ عدل اتاری تاکہ انسانوں پر انصاف قایم کریں۔

سورہ الصف میں رب السموات والارض کا ارشاد ہے:

هو الذی ارسل رسولهٗ بالهدٰی و دین الحق لیظهرهٗ علی الدین کلّهٖ۔ (صف - ۹)

وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔

یہ ہے انبیاء کا مشن اور یہی وجہ ہے کہ نبی کی جو حیثیت اس کی تمام حیثیتوں سے نمایاں و ممتاز ہے، وہ داعی الی الحق کی حیثیت ہے۔ اسلام کا اصل مقصد انسانی زندگی کو ایک خاص نہج پر چلانا ہے۔ اسلام کوئی پوجا پاٹ کا جامد نظام نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک تحریکِ فکر و عمل ہے۔ جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہدایت الٰہی کا پابند بناتی ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے، جو انسانوں کو خدا کے دین کی طرف بلاتی اور ان کی زندگیوں کو نورِ الٰہی سے منور کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی تمام وسعتوں پر حاکمیتِ الٰہی قایم کرنے کا دعویدار ہے۔ انبیاء وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں، جو اس دعوت کے داعی اور اس تحریک کے قائدین ہیں اور جن کی رہنمائی میں یہ اصلاحی جدوجہد برپا ہوئی۔ اور جس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

قرآن پاک آپؐ کی بعثت کا مقصد اس چیز کو قرار دیتا ہے:

هو الذی بعث فی الامّیّٖن رسولاً منهم یتلوا علیهم اٰیاتهٖ و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة و ان کانوا من قبل لفی ضللٍ مُّبین۔ (جمعہ - ۲)

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے (یعنی حضرت محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے، ان کا تزکیہ کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ صریح گمراہی میں تھے۔

یٰاَیها الرسول بلّغ ما اُنزل الیك من ربك۔ (مائدہ - ۶۷)

اے رسولؐ! جو جو کچھ تم پر تمھارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے، اس کی تبلیغ کرو۔

فلذلك فادعُ و استقم کما اُمرت۔ (شوریٰ - ۱۴)

پس اسی راہ کی دعوت دو اور اس پر استقامت کے ساتھ جمے رہو جس طرح کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

ان آیات ربانی سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی حیثیت داعی کی حیثیت ہے۔ آپؐ کا اصل مشن یہ تھا کہ خدا کی ہدایت لوگوں تک پہنچا دیں، انھیں خدا کی کتاب اور حکمت و دانش کی تعلیم دیں اور انھیں دعوت دیں کہ وہ دین کو اپنی پوری زندگی پر غالب کر دیں۔ پھر جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہیں، انھیں ایک تحریک اور ایک اُمت میں منظم کریں، ان کے اخلاق کا تزکیہ کریں، ان میں کردار کے جوہر پیدا کریں اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعے اپنی قیادت و رہنمائی میں وہ تہذیب و تمدن قایم کریں، جو اسلام قایم کرنا چاہتا ہے۔

اسلام فکر و نظر اور علم و عمل میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا داعی ہے۔ وہ انسان کو غیر اللہ کی ہر غلامی سے نجات دلا کر اس کی زندگی کو خدا کے لیے خاص کرنا چاہتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی، قومی ہو یا بین الاقوامی، خدا کی حاکمیت قایم کرو۔ ہر اطاعت پر خدا کی اطاعت اور ہر قانون پر خدا کا قانون مقدم ہے: سے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حاکمیتِ الٰہی کی دعوت تھی اور آپ کی سیرتِ پاک کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے دعوتِ اسلامی کے کام کو باقی تمام کاموں پر مقدم رکھا اور ہر دور اور ہر حالت میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہے۔ آپ اوّل بھی داعی تھے اور آخر بھی داعی اور صرف داعی الی اللہ۔

آئیے آپ کی دعوتی زندگی کے چند اہم پہلوؤں کا مطالعہ کریں تاکہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو آپ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ادا کرنے کی کوشش کر سکیں۔ اس لیے کہ داعی الی الحق کی جو ذمہ داری آپ کے مبارک شانوں پر تھی، اب وہ پوری اُمتِ مسلمہ کے کندھوں پر ہے:

لیکون الرسول شہیدًا علیکم و تکونوا شہداء علی الناس۔ (الحج - ۷۸)	تاکہ پیغمبر تمھارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔

یعنی جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی شہادت اور گواہی دی، اب اسی طرح پوری اُمت کو تمام انسانیت کے سامنے اس حق کی شہادت دینا ہے:

۱۔ آپ کی دعوتی زندگی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جو تعلیم آپ نے دنیا کو دی، اس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ خود تھے۔

اٰمن الرسول بما اُنزل الیہ من ربہ والمؤمنون۔ (بقرہ - ۲۸۵)	رسول اس پر ایمان لائے، جو رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا اور تمام مومن بھی۔

آپ اس ہدایت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اپنی زندگی کو سب سے پہلے اس کے تابع کرنے والے تھے۔

انا اوّل المؤمنین، میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ انا اوّل المسلمین، میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

جو دعوت آپ نے دی، آپ کی پوری زندگی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ بقول حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی زندگی سراپا قرآن تھی۔

دنیا میں بے شمار مُصلح اور فلسفی آئے، جو گفتار کے غازی تو ضرور تھے مگر کردار کے غازی نہ تھے۔ جو تعلیم انھوں نے دی، وہ خود اس پر عامل نہ تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنی دعوت کے ہر پہلو پر خود عمل کر کے دکھا دیا اور انسانیت کے لیے بہترین نمونہ پیش فرمایا تاکہ لوگ صرف آپ کے ارشادات ہی سے ہدایت حاصل نہ کریں بلکہ آپ کے افعال و اعمال کی بھی پیروی

کریں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا باقی نہ رہے ، جس پر آپؐ کے سیرت و کردار کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ (احزاب - ۲۱)

۲۔ دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ آپؐ نے جزوی اصلاح کے مقابلے میں کلی انقلاب کی جدوجہد کی۔ آپ کا مقصد چند جزئیات میں تبدیلی پیدا نہ کرنا تھا بلکہ پوری زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق استوار کرنا تھا۔ آپ نے لوگوں کے خیالات اور نظریات کی اصلاح کی اور انھیں ایک ایمان اور جوش زندگی بخشا۔ آپؐ نے ان کے اخلاق و کردار کو سنوارا اور ایک نیا انسان پیدا کیا۔ آپؐ نے تمدن و معاشرت کی اصلاح فرمائی اور ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر کی۔ آپؐ نے طاغوت کو زندگی کے ہر میدان میں شکستِ فاش دی اور پھر وہاں حاکمیتِ الٰہی کے تحت بچھائے۔ یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا اور انسانی تاریخ کا وہ واحد انقلاب ہے جس نے انسانیت کی پوری زندگی کی اصلاح و تعمیر کی۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضور سرورِ کائناتؐ کو دین کی فتح و کامرانی اور اس کی سربلندی پر ہمیشہ گہرا اور غیر متزلزل یقین رہا۔ عین اُن پُرآشوب حالات میں جب مسلمانوں کی کشتی مخالفتوں کے طوفان میں گھری ہوئی تھی اور دور دور ساحل کا کہیں نام و نشان نہ ملتا تھا اور روشنی کی کوئی رمق موجود نہ تھی، اس وقت بھی قطعاً مایوس نہ ہُوئے۔

مکی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ مسلمان قریش کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہُوئے تھے، ہر مسلمان کی جان خطرہ میں تھی۔ صبح ہوتی تھی، شام کا بھروسا نہ تھا اور شام ہوتی تھی تو صبح کا یقین نہ تھا۔ بظاہر اسلام کا کوئی مستقبل نظر نہ آ رہا تھا اور جو دن گزرتا تھا، غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ایک مظلوم مسلمان حضرت خبابؓ آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ حضرت خبابؓ نے کہا، یا رسول اللہؐ! اب تو پانی سر سے گزرا جا رہا ہے، آپ ہمارے لیے دعا کیجیے۔

آنحضرتؐ کا چہرہ سُرخ ہو گیا، آپؐ نے فرمایا: بس خبابؓ! گھبرا گئے۔ پہلی اُمتوں میں تو یہ ہُوا کہ مومن کو گڑھا کھود کر گاڑ دیا گیا اور سر پر آرہ چلایا گیا، یہاں تک کہ اس کے بدن کے دو ٹکڑے ہو کر گر گئے اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں سے جُدا کیا گیا مگر اس کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ خدا کی قسم، اللہ اپنے دین کو مکمل کرے گا۔ یہاں تک کہ (اس دین کی عمومیت اور غلبہ) کا یہ حال ہو گا کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتا چلا جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا کھٹکا نہ ہو گا، سوائے اس کے کہ اس کو بھیڑیے سے خطرہ ہو کہ وہ اس کی بکریوں پر حملہ کرے۔ لیکن تم جلدی بہت کرتے ہو۔

یہ واقعہ کئی حیثیت سے بڑا اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو اپنی دعوت پر کتنا اعتماد ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل اور آزمایش کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی عمومیت اور غلبہ کا مطلب اپنے تمام تضمنات کے ساتھ اس کے سامنے اس وقت بھی تھا، جب غلبہ و حکمرانی بظاہر ناممکن نظر آتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی استقامت کے اس مقام پر ہوتا ہے، جہاں سے کوئی چیز اس کے ارادہ کو متزلزل نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری چیز ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ آپ نے بعثت سے لے کر اپنے آخری سانس تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش اس انہماک اور تندہی سے کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپؐ کا ہر لمحہ اسی فکر میں بسر ہوتا تھا کہ کسی طرح خدا کا یہ پیغام خدا کے بندوں تک پہنچائیں اور ان کو جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچائیں۔ یہ فکر آپ کو اس درجہ دامنگیر رہتی تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ

دن بھر کی تبلیغی جد وجہد اور دشمنوں کی اذیت رسانی سے چُور ہو کر رات کو تھکے ہارے گھر واپس آئے۔ بدن بخار سے تپ رہا تھا اور آپؐ چند منٹ کے لیے لیٹ گئے۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ مکّہ سے چند میل ایک پہاڑی کے نیچے ایک قافلہ آکر رُکا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان تک خدا کا پیغام پہنچائیں۔ لوگوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، قافلہ والوں سے کل صبح مل لیں۔" آپؐ نے فرمایا: "کیا معلوم صبح تک مجھے موت آجائے یا وہ قافلہ راتوں رات کہیں اور چلا جائے اور اس صورت میں میرا فرض نامکمل رہ جائے۔" دیکھیے دعوتِ اسلامی کے کام کو حضورؐ کتنی اہمیت دیتے ہیں اور فرض کی بجا آوری کو کیا مقام آپ نے دیا۔ فرض شناسی کی یہ مثال ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔

۴۔ پھر آپؐ کی دعوتی زندگی کا یہ بھی ایک نمایاں پہلو ہے کہ آپ نے ہر مرحلے اور ہر دور کے حالات کے مطابق دعوتِ دین کی راہیں نکالیں اور ہر زمانہ میں نہایت حکمت و دانشمندی کے ساتھ کلمۂ حق کا اظہار کیا اور بالآخر دینِ حق کو قایم کیا۔ بعثت کے فوراً بعد خاموشی کے ساتھ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کر دیا اور قریبی حلقوں میں دین کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ بعثت کے تیسرے سال جب دعوت کی عام اجازت ملی، تو آپ نے تمام قریش کو فاران پر جمع کیا اور اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی۔ پھر معززینِ قبیلہ کو خصوصی دعوت دی اور کھانے پر بلا کر ان کو خدا کے کلام سے آگاہ کیا۔ آپؐ ایک ایک قبیلہ، ایک ایک خاندان، ایک ایک گروہ اور ایک ایک فرد تک پہنچے اور ان کو اسلام سے روشناس کرایا۔ نجی گفتگوئیں، مکالمات و مذاکرات، تقریر و وعظ الغرض ہر ممکن طریق سے اسلامی تعلیمات ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اور جب تک دعوت کی راہیں کھلی رہیں، آپؐ برابر حق کی طرف بلا بلاتے رہے اور جب کھلے بندوں تبلیغ کا امکان نہ رہا تو خاموشی سے نجی ملاقاتوں کے ذریعے اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔

جب آپؐ کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا، تو آپؐ خاموشی کے ساتھ جن جن مقامات پر جا سکتے تھے، اس زمانہ میں بھی ان مقامات پر دعوت پہنچانے سے آپؐ نہ رُکے۔ پھر جب مکّہ میں دعوت کے مزید پھیلانے کا امکان نہ رہا، تو آپ نے مکّہ سے باہر جا کر دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا۔ میلوں اور جلسوں کے موقعوں پر باہر کے قبائل سے ملے۔ طائف کا سفر کیا اور دُوسرے بیرونی قبائل کو اپنی دعوت کی طرف بلایا، حتیٰ کہ بیرونی قبائل میں اس کوشش ہی کے نتیجہ میں اسلامی دعوت کا نیا مرکز مل گیا اور اہلِ مکّہ کی سختی اور ان کا تشدد ذریعہ بنے دینِ حق کے نئے مرکز — مدینۃ الرسول — کے قیام اور اس کے ذریعے بالآخر دعوتِ اسلامی کے غلبہ کا!

پھر مدینہ میں جب قوت و اقتدار اسلام کو حاصل ہو گیا، تو آپ نے ریاست کی تمام طاقتیں دعوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔ ایک طرف مدینہ میں اسلامی ریاست قایم کی اور دُوسری طرف اس ریاست کے ذریعے تمام عرب اور بالآخر پُوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی۔

۵۔ پھر آپؐ کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر کونے اور ہر جہت سے اس کی مخالفت کی جائے اور مخالفت کی نت نئی صورتیں نکالی جائیں۔ آپ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو سبّ و شتم کا نشانہ بنایا گیا۔ آپؐ کے متعلق افواہیں پھیلائی گئیں، آپؐ پر پتھر پھینکے گئے۔ آپؐ کو زدوکوب کیا گیا۔ آپؐ کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا گیا۔ عین عالمِ سجدہ میں آپؐ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی تک رکھ دی گئی۔ آپؐ کے ساتھیوں کو آگ پر لٹایا گیا، تپتی ریت

پر گھسیٹا گیا، پتھر کی سلوں کے نیچے دبایا گیا اور اتنا مارا گیا کہ وُہ شہید ہو گئے۔ لیکن ہر حال میں آپ ثابت قدم رہے۔ آپ نے دعوتِ اسلامی کا کام جاری رکھا اور راہ کی کوئی مشکل اور مصیبتوں کا کوئی طوفان آپ کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ اسی طرح کوئی لالچ اور کوئی ترغیب ، خواہ وُہ دولت کی ہو یا سرداری کی یا بادشاہت کی، آپ کو اپنے مشن سے ہٹا نہ سکی اور ہر حالت میں آپ نے کہا، تو یہی کہا:

"خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سُورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں تبلیغ دین کا کام ترک کر دوں، تو مجھے منظور نہیں۔ اگر اس راہ میں مجھے ہلاکت نظر آئے تب بھی میں پیچھے نہ ہٹوں گا۔ حتی کہ یہ مشن کامیاب ہو یا میں اس میں کام آجاؤں۔"

یہ تھا داعی کا عزم! اور سچ ہے کہ داعی اگر اپنے مشن میں سچا اور اپنی دُھن کا پکا ہو، تو انھیں مشکلات سے کامیابی کی راہیں پھوٹیں گی اور دینِ حق فاتح و کامران ہو گا۔ جس طرح کلی کی موت کے بعد ہی پھول خندہ زن ہو سکتا ہے اور جس طرح آگ کے جلے بغیر روشنی اور حرارت ممکن نہیں، اسی طرح آزمائش اور ابتلاء کے بغیر دعوتِ حق کی کامیابی کا امکان نہیں۔ فتح مکہ کی منزل، شعب ابی طالب کی گرفتاری، طائف کی ہزیمت اور بدر و اُحد کی خوں پاشی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہی فطرت کا قانون ہے، و لن تجد لسنت اللہ تبدیلًا اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

عطیاتِ محمدیؐ

سیّد ہاشمی فرید آبادی

تاریخ مذہب کا مطالعہ کرنے والے یہ مشاہدہ کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ پیغمبر اسلام (علیہ التحیاۃ والسلام) نے تمام انبیائے سلف کی تصدیق و تعظیم کو شرطِ ایمان قرار دیا۔ خاص طور پر حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کی بڑی ستائش فرمائی۔ قرآن مجید میں حضرت ممدوح کی خرقِ عادت ، ولادت ، پیدا ہوتے ہی کلام کرنا ، پھر مُردوں کو جِلا دینے تک کے متعدد معجزات بہ تکرار گنائے گئے (آل عمران ، ع ۵ ۔ سورۂ مریم ، ع ۲) اور قیامت کے ایک منظر میں بھی ان کا عقیدۂ تثلیث سے تبرّی کرنا ، رحمتِ الٰہی سے اپنی امت کو بخشوانے کی التجا نہایت پُراثر الفاظ میں بیان کی (المائدہ ، ع ۱۶) حضرت مریمؑ کو نہ صرف ہر قسم کی تہمت سے پاک ثابت کیا ، بلکہ تمام دُنیا کی عورتوں (نساء العالمین) میں برگزیدہ ٹھہرایا (آل عمران ، ع ۵) ۔ اس درجہ واضح اور موثر حمایت کے باوجود عیسائی دنیا ہی پیغمبر اسلام (علیہ التحیاۃ والسلام) سے نہ صرف ناراض بلکہ سخت عداوت میں سرگرم پائی جاتی ہے اور آج تک گھرے تعصب و عناد کا اظہار کر رہی ہے۔ زیادہ حیرت انگیز اور اب ان کے جانشین ، ولایت ہائے متحدہ امریکہ والوں پر ہوتی ہے جن کو مسلمانوں سے کوئی آزار یا قومی نقصان کبھی نہیں پہنچا ، مگر پھر بھی وہ دوسری عیسائی قوموں سے کچھ زیادہ ہی اسلام دشمنی کے مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

ان تعصبات کے بعض تاریخی اور نفسی اسباب سے اہلِ علم آگہی رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کی تصریح کا موقع نہیں۔ البتہ یہ اور جتا دینا مناسب ہوگا کہ گزشتہ دو صدیوں میں بہت سے الزام جو پادریوں نے اسلام پر لگائے اور عیسائی یورپ میں پھیلائے تھے ، سراسر جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب قرآن مجید اب قطعی صحت کے ساتھ دنیا کے سامنے کھلی ہوئی موجود ہے۔ اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے اور خود مغربی مستشرقین میں اس کے عربی متن کی نسبت کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہی ۔

یہ اس عجیب دعویٰ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون کی روشن تصدیق ہے ، جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ایسے ملک اور زمانے میں کیا گیا تھا ، جہاں لکھنے کا سامان میسّر نہ تھا اور لکھنے والے بھی معدودے چند ہی تھے ۔ پھر یہ واقعہ کہ ہر دور میں ایسی قوموں کے ہزاروں افراد عربی جیسی سخت نحوی زبان سے مطلق ناواقف ایک غیر منظوم ، خاصی بڑی کتاب کو زیر زبر میں کامل صحت کے ساتھ حفظ کرتے رہے ۔ قرآن کا محض معجزہ ہی نہیں بلکہ صریحی دلیل بھی ہے کہ یہ اسی مصنّف کا کلام ہو سکتا ہے ، جس نے انسان کے حافظہ اور نطق کو اس کلام کے مناسب و مطابق تخلیق کیا ۔

کہتے ہیں کہ صرف محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم کا انگریزی ترجمہ قرآن لاکھوں کی تعداد میں مسیحی دنیا میں نشر ہو رہا ہے ۔ غرض یہ کہ عقاید ، عبادات ، اخلاق وغیرہ کی اصل قرآنی تعلیم آج اس طرح محفوظ و مبرہن ہمارے سامنے ہے کہ اور کسی بڑے مذہب کی اصل

تعلیم اس طرح صحیح سلامت نہیں رہی۔ یہی دعویٰ بانیِ مذہب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ شریف کی صادق اور "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" کی بدیہی تفسیر ہے۔ البتہ اس کتاب و سنت کے معارف و معانی جاننے کے لیے ہمیں عربی زبان کے اساتذہ اور مستند علمائے دین کی طرف ہی رجوع کرنا ہوگا۔

قرآن کا سب سے نمایاں اور تاکیدی پیام توحیدِ الٰہی ہے۔ اس کی قطعیت اور تواتر کی خصوصیت کا غیر مسلم بھی اعتراف کرتے ہیں یہ تعلیم سب وسائل و وسائط کو چھوڑ کر براہِ راست انسان کو خدائے کائنات سے تعلق پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن کی یہ پُرہیبت و جلالت آواز اس وقت بلند ہوئی، جب کہ دنیائے معلوم عموماً تثلیث، ثنویت، شرک و بُت پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہی اہلِ عرب کا مذہب تھا۔ وُہ خالقِ کُل کے وجود سے انکار نہیں کرتے تھے، مگر بہت سی غیبی طاقتوں کو بھی انسانی یا دنیاوی معاملات میں کارساز حقیقی مانتے تھے۔ ایک حیّ و قیّوم، حاضر و ناظر، خالق و پروردگار کا تصور جس قوت اور وضاحت سے اسلام نے دنیا کو دیا، کسی انسانی یا الہامی کتاب میں اس کی مثال نہ پہلے تھی، نہ آج تک دیکھی جا سکتی ہے۔

ب۔ محمدیؐ تعلیم کی دُوسری خصوصیت مساواتِ انسانی کا وُہ عجیب عقیدہ ہے، جس نے ملک و وطن، رنگ و نسب، نسل و قوم، دولت و افلاس کی ساری تفریقوں کو یک قلم کالعدم کر دیا۔ تمام نوعِ بشر کو ایک باپ کی اولاد اور ایک ہی کنبے کے افراد قرار دیا۔ صرف اصولی اور اعتقادی طور پر نہیں، بلکہ فی الواقع عملاً حبشی غلاموں کو اشرافِ قریش پر فضیلت کا حقدار بنا دیا۔ (زیدؓ، بلالؓ، طیب المطیب، عمارؓ وغیرہم کی طرف دیکھیے) فلپ حتی اپنی تاریخ عرب (ص ۱۹۲) میں لکھتا ہے کہ بازنطی والیِ مصر (کاٹرس یعنی مقوقس) یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ شرائطِ صلح کے لیے مسلمانوں کا جو وفد آیا، اس کا رئیس ایک حبشی تھا۔ مملوک اور غلاموں کی بادشاہیاں اسلامی تاریخ کے مشہور ابواب ہیں، جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔

ج۔ غالباً اس قرآنی حکم کو، کہ یتامیٰ کی املاک کی حفاظت کا بندوبست قوم کا ذمہ ہے (النساء، ع ۱۔ بنی اسرائیل، ع ۴) ہم اسے انسانی برادری کے تصور پر مبنی کر سکتے ہیں۔ کسی دوسری قوم یا معاشرہ میں ایسا قانون ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لاوارث یا مجہول النسب بچّوں کی پرورش گاہیں، جو عالمی جنگوں کے بعد یورپ میں بنیں، دوسری نوعیت رکھتی ہیں اور عام شہریوں کے یتیم بچّوں کے لیے نہیں ہیں۔

انسانی برادری کا بھی بنیادی تصور اسلامی شریعت میں سود (ربا) کی قطعی حرمت کا باعث ہوا اور اس کے لیے ایسے تہدیدی الفاظ میں ممانعت کی گئی کہ پڑھ کر دل کانپنے لگتا ہے بایں ہمہ مغربی استیلا (اور بظاہر یہودی ساہوکاروں کے اثر) سے مسلمان بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے اور مغتنم مستثنیات کو چھوڑ کر، ہم میں سے اکثر دانستہ یا نادانستہ اس کے چکّر میں گھرے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ اسلامی حکومتیں بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ مسلمان تاجر، کارخانہ دار اور اہلِ ثروت (الا ماشاء اللہ) سب ہی سُودی کاروبار میں کسی نہ کسی عنوان سہیم و شریک ہیں اور یہ دیکھ کر تو بہت ہی افسوس ہوتا ہے کہ وہ صاحبانِ شریعت، جو پہلے اس کے سخت مخالف تھے، سرمایہ دار بننے کے بعد اس کے مؤید ہو گئے ہیں اور "تجارتی منافع" اور "فے" وغیرہ کے شرعی حیلوں سے جواز پیدا کر رہے ہیں۔

سرمایہ اندوزی کی جڑ سُود ہے۔ میرے علم کے مطابق اشتراکی نظام میں سُودی سرمایہ کاری کی اس جڑ پر بھی ضرب لگائی گئی ہے

کوئی تعجب نہیں کہ لادین اشتراکیت میں حرمتِ ربا کے قرآنی اصول پر عمل کیا جا رہا ہو۔ ہر قسم کے سُودی کاروبار میں، بینک کے سُود میت، قباحت ہی قباحت ہے اور اس کے اقتصادی نقصانات کو تو اب بعض مغربی ماہرینِ مالیات بھی تسلیم کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ تہذیب حاضر کے تار و پود میں یہ چیز اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ بغیر کسی عظیم مالی انقلاب کے نوعِ انسانی کو اس تسمہ پا سے نجات نہیں مل سکتی۔

د۔ اسلام کے دو اور قانون قمار و مسکرات کی ممانعت ہیں، جن کے نقصانات علم اور تجربے سے برابر آشکارا ہو رہے ہیں۔ لیکن نفس پروری کے دور میں انسانی معاشرہ ان کے سدباب پر تیار نہیں ہوتا۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ اخلاقی مرض اندر ہی اندر اور بتدریج افراد یا اقوام کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

مغربی اہلِ قلم کو محمدی تعلیمات میں دو باتیں بہت قابلِ اعتراض معلوم ہوتی رہیں۔ یعنی مذہبی جہاد اور دوسری تعداد ازدواج۔ مگر یورپ کی دیوانہ وار گھاریں جو محاربات صلیبی کہلاتی ہیں، ان کی گونج گلیڈاسٹن اور رالیس کوتھ کی تقریروں تک میں سُنی گئی۔ ادھر عمرانیات کے بعض مشہور اساتذہ نے جنگ کو "صالح" زندگی کا لازمہ ثابت کیا۔ گزشتہ خوفناک خونریزی اور نسل کشی کی شیطانی تدابیر نے بالواسطہ دکھا دیا کہ وُہ جہاد، جو فی الواقع خدا پرستی اور انسانی حقوق کی حفاظت کے لیے کیا جائے۔ سیلیٔ استاد کی طرح انسان کے حق میں رحمت اور انتہائی قربانی کی تعلیم ہے۔

تعداد ازدواج کی طبعی اور طبی ضرورت سے اب کوئی سائنسدان بھی انکار نہیں کر سکتا۔ دینِ فطرت نے اسے جائز قرار دیا اور انیسویں صدی کے یورپ کے جاہل نقالوں کے سوا آج کوئی بھی اس فطری قانون کی تکذیب نہیں کرتا۔ لیکن سب سے عجیب تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عورت کو انسانیت کے حقوق دیے۔ بے شبہ وہ اس کی "نسائیت" کو حجاب و عفت کے ذریعے محفوظ رکھنے میں متشدد ہے اور بقول اقبال زن کو "نازن" بنانے کا روادار نہیں۔ لیکن دو سو برس پہلے 'تک' دنیا کا کونسا مذہب فلسفہ یا قانون ہے جس نے عورتوں کو وراثت اور حصولِ علم و دولت کے وہ باقاعدہ شہری حقوق عطا کیے ہوں، جن کی قرآن مجید میں بہ تاکید صراحت فرمائی گئی ہے۔

سرورِ کونینؐ اور سماجی انصاف

کیپٹن محمد جمعہ ماڑگانی

ترجمہ: وحید عثمانی

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بنی نوع انسان سمیت ارض وسما میں شامل تمام چیز پیدا کی اور اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور اسے روحانی بصیرت عطا فرمائی تاکہ قدرت اور فطرت کے مظاہر کو سمجھ سکے اور ان کا ادراک حاصل کر سکے۔ اس سلسلہ میں انسان کے سمجھنے کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خداوند نے حضرت آدم علیہ اسلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم سمیت لاتعداد پیغمبر بھیجے جو آتے اور جاتے رہے ان پیغمبروں کے یکے بعد دیگرے بھیجنے میں خداوند تعالیٰ کا ایک مقصد مسلسل کارفرما رہا اور وہ مقصد یہ تھا کہ بعد میں آنے والا ہر پیغمبر اس کام کو جاری رکھے جو اس کے پیشرو پیغمبر کو خدا کی طرف سے سونپا گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سرورِ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور اگرچہ تمام انسانوں نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں کو قبول نہیں کیا مگر اس کے باوجود مبعوث ہونے والے ہر پیغمبر نے خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کا کام برابر جاری رکھا اور جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے زمانوں کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجا گیا۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد وہی کام خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یتیم اور مفلس پیدا ہوئے تھے اور امّی تھے مگر آپ کو سارے زمانوں کے سارے انسانوں کے لئے نبی مبعوث کیا گیا آپ نہ تو خدا کا بیٹا تھے اور نہ فرشتے بلکہ ہماری طرح بشری روپ میں تھے۔ آپ انتہائی دیانتدار اور امین تھے۔ آپ ہر قسم کے دنیوی لالچ اور حرص سے بے نیاز تھے۔

آپ کو نہ دولت کی خواہش تھی نہ اقتدار کی ہوس۔ آپ کو اللہ نے اپنے لوگوں کا ہادی اور رہنما بنا کر بھیجا تھا۔ آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنے پوتے کا نام محمدؐ رکھتے ہوئے اپنے مہمانوں سے کہا تھا: "میں نے اس بچے کا نام محمدؐ اس لیے رکھا کہ مجھے توقع ہے کہ ایک دن بہت بڑا ثابت ہوگا۔" اپنے اس پوتے کی پیدائش کے وقت عبدالمطلب کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان کے دوستوں نے انھیں اس سے زیادہ خوش پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ عبدالمطلب کے دوستوں نے ان سے پوچھا کہ اس بچے کا نام محمد ہی کیوں رکھا گیا اس کا نام عبدالمطلب کے گھرانے کے دوسرے ناموں کی طرح پر کیوں نہیں رکھا گیا۔ اس پر عبدالمطلب نے کہا کہ "یہ نام میں نے نہیں رکھا۔ یہ نام خدا نے رکھا ہے اور وہی اس نام کا دنیا میں بول بولا کرے گا کہ خدا ہی سب کچھ جاننے والا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے۔"

پھر ماہ وسال گزرتے گئے۔ آپ اب مائی حلیمہ سعدیہؓ کی نگرانی اور رضاعت میں تھے مگر آپ رضاعت کے لئے مائی حلیمہؓ کے پاس آنے والے دوسرے تمام بچوں سے بہت مختلف تھے۔ پھر یہ بچہ کلی کی طرح بڑھ کر پھول بنا۔ بچپن لڑکپن میں ڈھلنے لگا۔ دادا عبدالمطلب بوڑھے ہوتے گئے اور آخر کار اپنی عمر کے ۸۲ ویں سال انتقال کر گئے دادا کے انتقال کے بعد چچا ابوطالب یتیم بھتیجے کے سرپرست ہوئے اب آپ کا عنفوان

شباب تھا آپ نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اپنے ماحول کو لڑائی جھگڑے اور فتنہ و فساد سے معمور پایا۔ یہ جھگڑے قبائل کے اندرونی تنازعات اور قبائلی عصبیتیں تھیں اور وہ ملک جس سے آپؐ کو پیار تھا جہالت اور توہمات کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا اور آپ کے ہم وطن عرب جن میں اگرچہ شجاعت اور بہادری اور جنگجوئی کی خوبیاں تھیں قانون شکن ظالم اور بے رحم تھے اس طرح حضرت محمدؐ کو نبوت سے پہلے زندگی کا جو ماحول ملا وہ سماجی اعتبار سے زمانہ ماقبل تہذیب جیسا تھا بلکہ اکثر صورتوں میں اس سے بھی بدتر۔ ان حالات میں رہتے ہوئے اکثر آپ کو یہ خیال گزرتا تھا کہ میں اس دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں لے کر آیا۔ میں اگر کچھ کر سکتا ہوں تو صرف یہی کہ اپنے معاشرے اور ماحول میں پھیلے ہوئے انتشار کو کم کروں اور پچھلے گزرے ہوئے پیغمبروں کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کردوں اور نبوت سے پہلے اس کا ثبوت کہ آپؐ ہی پیغمبر اسلام ہوں گے اور سماجی انصاف قائم کریں گے اس واقعہ سے ملتا ہے جب خانہ کعبہ کو منہدم کر کے اس کی دوبارہ تعمیر کا مرحلہ پیش آیا سنگ اسود کو جو اکھاڑا جا چکا تھا خانہ کعبہ کی دیوار میں اپنی اصل جگہ رکھنے کے سوال پر مکہ کے عرب قبائل میں جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر کار فیصلہ اس پر ہوا کہ جو شخص سب سے پہلے خانہ کعبہ جو اس وقت بہت بڑا بُت کدہ تھا، میں داخل ہو گا وہی اس تنازعہ کو حل کرے گا اور پھر یوں ہوا کہ خانہ کعبہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے حضرت محمدؐ تھے۔ چنانچہ آپ ہی کو ثالث بننا پڑا۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ اس مقدس پتھر کو ایک دری یا بڑی چادر پر رکھا جائے اور ہر قبیلے کا ایک ایک شخص دری یا چادر کے کنارے کو تھام کر اسے اوپر لے جائے۔ اس طرح سنگ اسود دیوار کعبہ میں اس کے اصلی مقام پر نصب کر دیا گیا اور تمام قبائل کے نمائندے آپ کے فیصلے اور حسن تدبر پر مطمئن ہو گئے یہ واقعہ بعثت سے پہلے کا ہے۔

مکہ والوں کا ظالمانہ رویّہ

بعثت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہمارے سامنے ہے اس دور کے پندرہ برسوں کے دوران آپ نے ہمیشہ توحید خداوندی کی اشاعت کی اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سارا وقت توصیف خداوندی کرتے ہوئے گزارا حالانکہ آپ اسلام اور خود اپنی ذات کے خلاف قریش کی سازشوں سے پوری طرح باخبر تھے اور یہ جانتے تھے کہ اہل قریش آپ کو قتل کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں اس دور میں آپ کی تعلیمات پر کان دھرنے والے صرف یثرب کے وہ لوگ تھے جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے تھے۔

ہجرت نبوی

اس زمانے کا ذکر ہے۔ یہ ماہ جولائی کی ایک گرم رات تھی اور مکہ کے ایک مقام (دارالندوہ) میں اہل قریش کے نمائندوں کے ایک بڑے اجتماع میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کی سازش طے پائی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپؐ کو دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کر دیا اور آپؐ کو مکہ سے نکل جانے کی تاکید کی گئی اس رات آپؐ کا جس مکان میں قیام تھا اسے ابوجہل کے آدمی اپنے گھیرے میں لے چکے تھے مگر آپ دشمنوں کے ہاتھ نہ آئے جس پر انھیں سخت غصہ آیا۔ آپ مکہ سے ہجرت فرما چکے اور قبا میں تشریف لا چکے تھے اور دشمنوں کے ہاتھوں ستائے جانے کا دور گزر چکا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے نکل جانے کی خبر سارے صحرائے عرب میں پھیل چکی تھی۔ یثرب جس کو ہجرت کے بعد شہر نبیؐ ہونے کا اعزاز ملا۔

مدینے میں ورودِ مسعود

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری مدینے میں داخل ہوئی تو گلی کوچوں، سڑکوں بازاروں اور محلوں میں عید کا سماں تھا۔ مدینہ کا ہر شخص معزز مہمان کے استقبال کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ اسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے کی توفیق ملے اور یہ سب کچھ جس محبوب شخصیت کے لیے ہو رہا تھا اس کے ذہن میں صرف ایک ہی دھن تھی اور یہ دھن اسلام کی اشاعت کی تھی۔

آپ کی مدنی زندگی کا اصل اور منتہائے مقصود صرف اسلام کی سربلندی اور کامرانی تھی۔ اس پورے عرصے میں آپ تن من دھن سے بکھرے ہوئے لوگوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے، پرانی رقابتوں اور عصبیتوں کو مٹانے سب لوگوں بن سگے بھائیوں جیسی اخوت پیدا کرنے والوں کی نفرتیں اور کدورتیں دور کر کے انسان کے ساتھ پیار کے جذبے کو بیدار کرنے اور جہالت کے زمانے کی تمام سماجی برائیوں کو ختم کرنے اور بت پرستی کے ہر نقش باطل کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کی کوششوں میں لگ گئے۔ آپ کی ساری مدنی زندگی اسی مقصدِ عظیم کے حصول میں گزری۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اس کے اختیار اور ذرائع اور وسائل مل چکے تھے کہ آپ اپنی سوچوں، خیالوں، جذبوں اور خواہشوں کو عملی اور قانونی صورت دے سکیں اور اسلام کے نظری اصولوں کو روزمرہ زندگی کے معمولات کا حصہ بنا دیں اس غرض کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیرونی ملکوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لئے سفیر اور ایلچی بھیجے اور غیر ملکوں کے نامور بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت تحریری صورت میں دی۔

ان میں سے کچھ بادشاہوں نے مکتوباتِ رسالتؐ کے جوابات بھی دیئے جبکہ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے رسید تک نہ دی پھر آپ نے ان لوگوں کے خلاف عملی مزاحمت بھی کی جنھوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مخالفین اسلام کے خلاف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر فوجی مہم کامیاب اور اسلامی فوج ہر ایسے معرکہ میں فاتح رہی۔

اور آخر میں وہ مسعود و مبارک گھڑی آئی جب دس ہزار مسلمانوں کا لشکر پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں کسی مزاحمت کے بغیر مکہ میں داخل ہوا اور ہمارے پیارے نبیؐ نے عفو و درگزر کی منفرد اور عملی شان قائم کرتے ہوئے مکہ کے ہر شخص کو معاف کر دیا خواہ اس کی خطائیں کیسی ہی سنگین کیوں نہ تھیں۔ معافی پانے والوں میں وہ بھی تھے جو ساری زندگی آپ کے خون کے پیاسے رہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے رسولِ خداؐ سے پوچھا بھی کہ مکہ والوں سے اس قدر فراخ دلانہ سلوک کیوں؟ اس کے جواب میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان میں سے کسی کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا"

اس حسنِ سلوک کا نتیجہ ملاحظہ ہو۔ اسلام کے کٹر دشمنوں کی آل اولاد میں سے کوئی فرد و بشر ایسا نہیں رہا جو حلقہ بگوشِ اسلام ہونے پر فخر نہ کرتا ہو۔

یہ ہے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا عملی نمونہ۔ اور اس سے یہ ملا اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی انصاف صرف اپنے ہم وطن عربوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ یہ ساری دنیا کے لئے تھا، ہے اور رہے گا۔

اسوۂ رسولؐ پر عمل کی اہمیت

آپ کے اوصافِ حسنہ میں سب سے نمایاں خوبی یہ تھی کہ آپ اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے

کرتے۔ آپ نے مسجد تعمیر کی تو خود اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے پتھر، مٹی اور گارا ڈھویا۔ جبکہ آپ کے شرف یہ تھے کہ دنیا کے سب سے بڑے مقنن اور قانون ساز آپ تھے۔ سب سے بڑے منتظم اور انتہائی زیرک سیاست دان، مدبر آپ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ایک ہنرمند کاریگر اور صناع بھی تھے۔ آپ نے ساری زندگی لوگوں کو نیکی کرنے، خیرات دینے دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کرنے اور نیک اور اچھے کام کرنے کی تعلیم دی اور یہی اعمالِ حسنہ آپ کی تعلیمات کی اصل روح ہیں۔

چنانچہ آج ہماری موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری تعلیمات پر عمل کریں مثلاً آپ کے بتائے ہوئے جنگوں کے اصولوں اور اسلحہ کے استعمال کے طریقوں پر عمل کریں اور یہ دیکھیں کہ آپ نے حالت جنگ میں آزادیِ قوت کا صحیح استعمال کرنے اور ضروری سامان رسد کی فراہمی جاری رکھنے کے لئے خود کیا کیا اقدامات کئے تھے۔ پھر یہ دیکھیں کہ اپنی حکومت کے قانون بناتے ہوئے آپ نے کیا اصول اپنے سامنے رکھے تھے اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور فلاح کے لئے کیسی اصلاحات نافذ کیں تھیں اور ایسا کرتے ہوئے وقت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنے کو کتنی زیادہ اہمیت دی تھی اور آپ کے نزدیک انسانی توانائی اور اس کی حرکت اور عمل کی صلاحیتوں کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔

نبی کریمؐ اور اصلاح معاشرہ

محمد حسام الدین شریفی

آج سے چودہ سو سینتیس برس پہلے ۹ ربیع الاوّل کو اس ذات قدسی صفات نے اس دنیا میں ظہور کیا جسے کائنات کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا اور جس نے اپنی اسی رحمت سے کام لیتے ہوئے کائنات کی ساری تاریکیوں اور ظلمتوں کو روشنی سے بدل دیا اور انسانی معاشرے کی تمام خرابیوں کو دُور کر دیا۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ظہور سے پہلے کی دنیا کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ کوئی خرابی ایسی نہ تھی جو دنیا میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی، جس میں اہلِ عرب مبتلا نہ ہوں بغرض سارا معاشرہ بگڑ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس نے معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے اپنے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جنھوں نے بہت قلیل عرصے میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح نہایت عمدہ اور احسن طریقے سے فرمائی۔

رسولِ معظم نبی آخر علیہ السلام نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح فرمائی اور معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہ رہا، جس تک آپ کی نگاہ نہ پہنچی ہو۔ اگرچہ معاشرے کی اصلاح کی خاطر نبی اکرم کو ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن تمام مصیبتیں سہنے کے باوجود بھی آپ نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کا کام جاری رکھا اور عمر مبارک کے کسی لمحے میں بھی یہ مقصد آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا اور آپ کی جدوجہد مسلسل اور سعی پیہم کے نتیجے میں تئیس سال کی مختصر سی مدت میں وہ مثالی معاشرہ وجود میں آ گیا، جس کی نظیر دنیا آج تک پیش نہ کر سکی۔

کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنے کو لوگ کتنا حقیر کیوں نہ سمجھتے ہوں، لیکن بظاہر اس معمولی سی چیز سے معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور گھر کے گھر جس طرح تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس لیے ایک دُوسرے کے دلوں میں کدورت، نفرت اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہی چیز معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہے، اسی وجہ سے اس کو روکا گیا اور ارشاد فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص کسی کی غیبت نہ کرے۔" (القرآن)

اور غیبت کیا ہے؟

ذکر اخاك بما یکرہ قیل: افرأیت	اپنے مسلمان بھائی کا ذکر ان الفاظ میں کرنا کہ اگر وُہ
ان کان فی اخی ما اقول؟ قال	ان الفاظ کو سن لے، تو ناپسند کرے۔ پُوچھا گیا:
ان کان فیہ ما تقول فقد	اگر وُہ برائی جو بیان کی جا رہی ہے، اس میں موجود ہو،

اغتبتہ و ان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہ ۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)	تب بھی؟ فرمایا : اگر وُہ عیب جو تم نے بیان کیا ہے، اس شخص میں موجود ہے تو غیبت ہے اور اگر تمہارا بیان کردہ عیب اس میں نہیں پایا جاتا، تو یہ بہتان ہے (جو غیبت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے)

رشوت معاشرے کا ایک رستا ہوا ناسُور ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی مذمت کی جاتی رہی ہے۔ حضورؐ نے اس کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی :

الراشی و المرتشی فی النار۔ (الحدیث)	رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے کا ٹھکانا جہنم ہے۔

بلکہ اس کی جڑ بھی اکھاڑ کے رکھ دی :

عن ابی عمر فھینا من التکلف۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل فرماتے ہیں کہ ہمیں تکلف سے روکا گیا اور یہ تکلف اور نمود و نمایش ہی رشوت لینے کا سبب بنتے ہیں اور جب کوئی معاشرہ تکلف کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اور لوگ جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بجائے طبقہ اعلیٰ میں شامل ہونے کی خواہش ان میں پیدا ہو جائے، تو پھر ان تکلفات میں ان کی آمدنی ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے اور لا محالہ انھیں " دستِ غیب" کی ضرورت پڑتی ہے اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے رشوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی امت کو تکلفات میں پڑنے سے روک دیا۔

سُود کے ذریعہ جس طرح غریبوں کی دولت کو ان سے چھینا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں انھیں نانِ شبینہ تک سے محروم کر دیا جاتا ہے، اسے کسی طرح بھی درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر اس سے وُہ لوگ جن کے پاس کچھ رقم ہوتی ہے، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور بغیر محنت و کوشش کے اپنے سرمائے میں اضافہ پر اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں، جس سے وُہ لوگ کاہل اور معاشرہ کے لیے ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ لوگ صرف اپنا بھلا چاہتے ہیں، دوسروں کی بھلائی اور نفع سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں سے معاشرے کی کسی قسم کی بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی اور اسی وجہ سے اسلامی معاشرے میں سُود کے لیے کوئی گنجایش نہیں۔

جناب عبداللہ بن مسعودؓ نقل فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُودی کاروبار کرنے والے (سُود لینے اور سُود ادا کرنے والے)، سودی کاروبار کے متعلق گواہی دینے والے اور سودی کاروبار کی خط و کتابت کرنے پر لعنت فرمائی ہے۔

(ریاض الصالحین ص ۶۱۶)

جب کسی قوم اور کسی ملک کے لوگوں میں امارت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اور ہر آدمی امیر قوم، امیر صوبہ اور ہر راہ نما امیر ملک بننے کا خواہاں ہو اور اس مقصد کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کرنا شروع کر دے، تو سمجھنا چاہیے کہ اس معاشرے میں

بگاڑ کی ابتداء ہو چکی ہے۔ کیونکہ ایسے موقع پر ہر شخص اپنے مقابل کی پگڑی اُچھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی معمولی سے معمولی غلطی اور بُرائی کو بڑھا چڑھا کر دُوسروں کے سامنے پیش کرنے میں نظر آتا ہے:

وعین السخط تبدی المساویا

اسی لیے جناب نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم ارشاد فرماتے ہیں:

"تم لوگ امارت کے خواہشمند ہو گے، حالانکہ یہی چیز قیامت کے دن تمہارے لیے ندامت کا باعث ہو گی۔"
(بخاری عن ابی ہریرہؓ)

اور اُمت کی رہنمائی کرتے ہُوئے اس سلسلے میں بہ وضاحت بھی فرما دی کہ تمہیں اپنے لیے امیر منتخب کرتے وقت کن امور کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور کس قسم کے لوگوں کو اپنا حاکم بنانا چاہیے:

"تمہارے بہترین حاکم اور امراء وُہ ہیں، جن سے تم محبت رکھتے ہو، اور وہ تم سے محبت رکھتے ہیں۔ تم اُن کے لیے دعائیں مانگتے ہو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اور تمہارے بدترین حاکم وُہ ہیں جن سے تم نفرت کرتے ہو اور وُہ تم سے عداوت رکھتے ہیں اور تم اُن پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ایسے حاکموں کی اطاعت کرنے سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہ کرلیں؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قایم رکھتے ہیں۔" (مسلم عن عوف بن مالک)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں بہترین حاکم وہ لوگ کہلانے کے مستحق ہیں، جو عوام سے قریب ہوں۔ ان سے اپنا رابطہ قایم رکھتے ہوں اور ہمہ وقت ان کی بھلائی میں مصروف رہتے ہوں۔ عوام ان کی حکومت کی سلامتی اور ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعاگو ہوں، اور جن لوگوں نے عوام سے دُوری کو اپنا شیوہ قرار دے رکھا ہو اور ان کی بھلائی سے انھیں کوئی غرض نہ ہو بلکہ ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے رہنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہو۔ ان کی زبان پر، ان کے قلم پر اور ان کی آواز پر پابندی لگا دینے کو اپنی کامیابی سمجھ رکھا ہو، ان کا شمار ناپسندیدہ حاکموں میں ہوتا ہے۔

دُوسری روایت میں اطاعتِ امیر کے متعلق مزید وضاحت فرمائی کہ ان کی اطاعت اسی وقت کے لیے ہے، جب تک ان کے احکام اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے مابین ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر اس کے برعکس صورت پیدا ہو جائے تو پھر ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وُہ ان کی بات بھی سُننا گوارا نہ کرے۔

"اگر اس کی جانب سے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے، تو ایسی صورت میں اس کی بات بھی سننا گوارا نہ کرو اور نہ اس کی اطاعت کرو۔" (بخاری و مسلم عن ابن عمرؓ)

معاشی اور دوسری مختلف پریشانیوں کی بناء پر جب معاشرے سے ذہنی سکون و اطمینان رخصت ہو جائے اور ہر طرف بے اطمینانی کا دور دورہ ہو جائے، تو اس معاشرہ میں معمولی معمولی باتوں پر دُوسروں کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو ختم کرنے کی وارداتیں عام ہونے لگتی ہیں۔ ضبطِ تولید کا پرچار کیا جانے لگتا ہے۔ مثبت اقدام اختیار کرنے کے بجائے منفی قدم اٹھائے جانے لگتے ہیں۔ مگر

اسلامی معاشرے میں ان میں سے کسی بھی چیز کو درست نہیں سمجھا گیا۔

اسلام اور پیغمبرِ اسلام نے ضبطِ تولید کو کسی طور پر مستحسن قرار نہیں دیا، کہ اس کے ذریعے عصمت و عفت کے ختم ہوجانے کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین ہے اور یہ چیز زنا کے پھیلنے میں ممد ثابت ہوتی ہے اور حالات وواقعات اس پر شاہد ہیں۔ تو کیا محض ایک موہوم امید کے سہارے اتنے عظیم نقصان کو برداشت کرنا عقلمندی اور دانائی کہلا سکتا ہے؟

معاشرے سے اس برائی کو ختم کرنے کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔ — اور بھوک سے ڈر کر اپنی اولاد کو ختم نہ کرو۔

(القرآن)

اور جناب نبی کریمؐ نے معاشرے کی اس گندگی کو دور کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا تم میں سے خدا کے ساتھ شریک ٹھیرانا ہے اور والدین کی نافرمانی کرنا اور قتلِ نفس اور جھوٹی قسم کھانا یہ تمام افعال کبائر میں سے ہیں" (بخاری عن عبداللہ بن عمرو بن العاص)

رسولِ معظمؐ نے ان چار باتوں کی نشان دہی کرکے ان سے بچنے کا حکم دیا اور ایک دوسری حدیث میں تنگیٔ رزق کا سبب بتلا دیا کہ جب کسی قوم میں زنا کی کثرت ہوجاتی ہے اور وہ لوگ ناپ تول میں کمی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے رزق میں کمی کردی جاتی ہے اور غلہ کم پیدا ہونے لگتا ہے اور پھر وہ لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ غلہ کم اور کھانے والے زیادہ ہیں۔ لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ اپنے معاشرے سے زنا کو ختم کردیں اور ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو سختی سے اس حرکت سے منع کریں اور اس طریقے سے معاشرے کو فساد سے بچایا جاسکتا ہے۔

معاشرے میں فتنہ و فساد اور خرابی پیدا کرنے میں مرد و زن کا آزادانہ اختلاط بھی نمایاں کردار ادا کرتا ہے اس سلسلے میں مغربی ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہاں مرد و زن کے آزادانہ اختلاط سے معاشرہ جس تیزی سے تباہی و بربادی کے گڑھے کی طرف جارہا ہے، اہلِ مغرب خود اس سے نالاں ہیں اور ہمارے ہاں کے اہلِ عقل و دانش ان حالات سے بخوبی آگاہ ہیں۔

اسلامی معاشرے میں اس اختلاط کو روکنے کے لیے پردے کو لازمی قرار دیا گیا ہے اور اپنے خاص رشتہ داروں کے علاوہ کسی بھی مرد کے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حد یہ ہے کہ امہات المومنین رضوان اللہ علیہن اجمعین کو سب سے پہلے پردے کا پابند کیا گیا اور اپنے رشتہ داروں کے سوا سارے مسلمانوں سے پردہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس معاملے میں ان کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہیں برتی گئی؛

وقرن فی بیوتکن۔ (القرآن) وہ سب اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں۔

"ام المومنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ (پردے کا حکم نازل ہوجانے کے بعد ایک مرتبہ) میں اور میمونہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ آگئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو پردہ کرلینے کا حکم دیا کہ تم دونوں پردے میں چلی جاؤ۔ ہم نے کہا: یارسول اللہؐ! کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟

نہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ ہمیں پہچانتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں اندھی ہو؟ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ یعنی وہ تو دیکھنے سے معذور ہیں، لیکن تم جوان کو دیکھ رہی ہو اور پردہ دونوں ہی طرف سے ہے۔"

مرد و عورت کے دائرۂ کار بالکل الگ الگ ہیں اور اسلامی معاشرے کی جانب سے ان دونوں کی حدود متعین ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں عورت کو سونپی گئی ہیں اور بیرونی معاملات مرد کے سپرد کیے گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے جو فریق بھی اپنے حدود سے تجاوز کر کے دوسرے کے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کرتا ہے، معاشرے میں فتنہ و فساد اور بگاڑ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

معاشرے کے بگاڑ میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے اور اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری انہی لوگوں پر ہے، جو ذہنی غلامی میں مبتلا اور احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور جو صرف دوسروں کی نقالی کرنا جانتے ہیں، خواہ یہ نقالی زبان کی حد تک ہو یا لباس، رہن سہن اور کھانے پینے کے طریقوں تک پھیل چکی ہو اور مرد زنانہ قسم کے لباس پہننا اور بال بنانا پسند کرتے ہوں یا عورتیں بالوں میں اور لباس میں مردوں کی نقالی شروع کر دیں۔ یہ تمام باتیں کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دی جا سکتیں اور اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ان تمام قسموں کی نقالی سے روکا ہے۔

"آدمی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جن سے اسے محبت اور تعلق ہو (اور جن کے راستے پر چلنا اسے پسند ہو)۔

جناب عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی اور اُن مردوں پر، جو عورتوں کے ساتھ مشابہت پیدا کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے سر کے بال منڈانے سے روکا ہے۔"

اور حلق راس میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں، جن کا آجکل عام طور پر رواج ہے کہ چٹیا کٹا کر مردوں کی طرح بال بنا لیے جاتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بگڑے ہوئے معاشرے کی مکمل اصلاح و تطہیر فرمائی، اس کی بنیاد خوفِ خدا پر رکھی۔ جس معاشرے کی بنیاد خوفِ خدا کے علاوہ کسی اور چیز پر ہوگی، وہ معاشرہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس معاشرے کا درست ہونا اور اس کی اصلاح ہونا قطعی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے خوفِ خدا کو اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے بنیادی ستون قرار دیا ہے۔

حضورؐ نے معاشرے کے جن جن پہلوؤں کی اصلاح فرمائی، ان میں سے چند پہلو آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں۔

آج معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، وُہ اسی طرح دور ہو سکتی ہیں کہ ان معاملات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا جائے اور ان ہدایات سے سرِ مُو انحراف نہ کیا جائے۔ بصورتِ دیگر معاشرے کے بگاڑ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور آخر ایک دن وُہ آئے گا، جب اس کی اصلاح ناممکن ہو کر رہ جائے گی۔ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں معاشرے کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

حضورِ اکرمؐ اور تبلیغ

محمد جعفر شاہ پھلواروی

تبلیغ، ابلاغ اور بلاغ سب کے معنی ایک ہیں، یعنی پہنچانا۔ پہنچانے کا مفہوم خود لفظ "رسول" کے اندر بھی موجود ہے۔ رسول کے معنی ہیں بھیجا ہوا اور پیغام لے جانے والا۔ کوئی پیغام دے کر کسی کو بھیجا جائے، تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے پہنچا دے۔ ان تمام باتوں کو قرآن کی ایک آیت ہی بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

یا یہا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته۔	اے پیغمبر! تمہارے رب کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغامبری کا حق ہی ادا نہ کیا۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسالت کے معنی ہی پیغام کے ہیں اور رسول وہی ہوتا ہے جو پیغام لائے اور اس کا اصلی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچا دے، اسی پہنچا دینے کا نام ہے تبلیغ یا ابلاغ۔ رسول تو پیغام لانے والا ہے اور وہ پیغام قرآن مجید ہے جسے ھذا بلاغ للناس کہا گیا ہے۔ یعنی یہی کتاب پیغامِ خداوندی ہے اور اس کو پہنچانے والا رسول ہے۔ قرآن کریم نے رسول کے فریضۂ تبلیغ کے متعلق واضح لفظوں میں یہ بھی فرما دیا کہ:

وما علی الرسول الا البلاغ المبین۔	رسول کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وضاحت کے ساتھ پہنچا دے۔

اس آیت سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ رسول کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا پیغام سنا دے اور اس کے بعد آرام سے گھر پر آکر سو رہے۔ گویا نعوذ باللہ وہ صرف ایک چٹھی رساں کی طرح آکر خط دے جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے نہ خط بھیجنے والے سے کوئی مطلب ہوتا ہے، نہ خط وصول کرنے والے سے کوئی غرض۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کے ذمے جو تبلیغ کی گئی تھی وہ محض لغوی حیثیت کا پہنچانا نہیں بلکہ وہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جو اپنے بیسیوں لوازم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسا فریضہ ہے، جس میں سردھڑ کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ پوری کائنات خم ٹھونک کر مقابلے پر آجاتی ہے۔ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہوجاتی ہے، قدم قدم پر شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک ایک ایک لمحے کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دینا پڑتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے دو قسم کی تبلیغیں تھیں: ایک اہلِ کفر کو اسلام کی تبلیغ اور دوسرے اسلام لانے والوں کو سنبھالے رہنے کے لیے ہر ممکن تبلیغ۔ ان دونوں قسموں کی تبلیغ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضورؐ کی پوری زندگی ہی تبلیغ تھی اور زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس کی ایک ایک ادا ہمہ تن تبلیغ تھی۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں

سننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ تبلیغ کے ضروری لوازم کیا ہیں - جو فریضۂ تبلیغ کو جان جوکھوں کا کام بنا دیتے ہیں -

تبلیغی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مبلّغ کو اپنے مشن سے ایسی لگن اور ایسا عشق ہو کہ وُہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے اور اس کے لیے ہر متاعِ عزیز کی قربانی کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھے - یہ دُھن، یہ ایمان اور یہ اذعان و ایقان نہ ہو، تو مبلّغ کے لیے تبلیغی کامیابی تو الگ رہی، وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے گا -

دُوسری ہے استقامت - یعنی ارادہ و عزم میں کسی وقت بھی تزلزل نہ آئے - اگر اندر سے یقین کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو تو وُہ دُھن اور وہ لگن ہی کمزور ہو جاتی ہے، جو تبلیغی سرگرمی کی جان ہے - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم "فاستقم کما امرت" کا حکم دیتا ہے، یعنی اے رسول احکمِ الٰہی کے مطابق جمے رہو -

تیسری شرط ہے بے غرضی و بے لوثی - اس کے بغیر بھی کوئی تبلیغ کامیاب نہیں ہو سکتی - خود غرض انسان کے پیچھے کوئی نہیں چلتا - یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اس کی وضاحت کر دی کہ:

لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی اللہ - میں تم سے اپنی تبلیغ کے عوض کسی قسم کا کوئی اجر نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو بس اللہ کے ذمّے ہے -

چوتھی شرط ہے حُسنِ افہام یعنی اپنا پیغام اتنی صفائی، خوبصورتی اور وضاحت سے پیش کرے کہ سُننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہے - گفتگو اتنی مختصر نہ ہو کہ مضمون تشنہ رہ جائے اور اتنی طویل بھی نہ ہو کہ سامع اکتا جائے - انداز مناسب اور موثر ہو، دلائل ناقابلِ تردید ہوں - مخاطب کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہوں وغیرہ وغیرہ - اسی کو قرآن کہتا ہے کہ:

وقل لھم فی انفسھم قولا بلیغا - ایسی بات کہو، جو ان کے دل میں اُتر جائے -

پانچویں شرط ہے انسانی خیر خواہی - اگر زندگی کے ہر ہر مرحلے پر مبلّغ عملاً یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ بنی نوع انسان کا بھی خواہ اور خیر طلب ہے، تو اس کے متعلق کیسے یقین آئے گا کہ یہ بھی ہمارے ہی دینی و دنیوی فائدے کے لیے ہے؟ خیر خواہی تبلیغ کے لیے ایسی ضروری شرط ہے کہ پیغمبروں نے تبلیغ کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے - مثلاً حضرت ہودؑ فرماتے ہیں کہ:

ابلغکم رسٰلٰت ربی و انا لکم ناصح امین - میں نے تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں تم سب کا امانت دار خیر خواہ ہوں -

یہی مضمون حضرت نوحؑ، صالحؑ اور شعیبؑ کی زبان سے بھی قرآن میں ادا ہوا ہے -

چھٹی شرط ہے خود مبلّغ کا سراپا نمونۂ عمل بننا - یہ ایسی ضروری شرط ہے کہ اس کے بغیر کسی کامیاب تبلیغ کا تصوّر بھی مشکل ہے - کون ایسے شخص کی بات مان سکتا ہے، جس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو؟ مبلّغ کے لیے صرف اسی قدر کافی نہیں کہ اس کی زندگی اس کے پیغام کے مطابق ہو بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وُہ جتنا بھی دُوسروں سے چاہتا ہے، اس سے بے شمار گنا زیادہ خود کر کے دکھائے - اگر وُہ دوسروں سے مال کا چالیسواں حصّہ طلب کرتا ہو، تو خود اپنی ساری پُونجی پیش کر دے - اگر دُوسروں کے ترکے کو قانونِ وراثت سے رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہے، تو اپنے ترکے میں ایک درہم بھی نہ چھوڑے بلکہ اس کے پاس جو کچھ ہو، وہ سب کا سب

قوم کی ملکیت ہو۔ غرض اس کی زندگی ایک اعلیٰ نمونۂ عمل ہو۔ جیسے قرآن کہتا ہے :

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ تمھارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔

ایک ساتویں ضروری شرط جسے ان تمام شرائط کا مجموعہ کہنا چاہیے ، یہ ہے کہ مبلّغ کا اخلاقی کردار اتنا بلند ہو کہ بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کو کسی جہت سے بھی اس پر نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ قرآن کریم اسی حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے کہ :

انک لعلیٰ خلق عظیم۔ آپ بہت اعلیٰ کردار پر قائم ہیں۔

یہ ہیں وُہ چند شرائط جو ایک مبلّغ کے لیے ضروری ہیں ، اور جن کے بغیر بلند سے بلند افکار کی تبلیغ بھی کامیابی سے ہم آغوش نہیں ہوتی ، پھر اگر پیغام ایسا انوکھا ہو ، جو سننے والی قوم کے افکار ، عادات اور روایات سب کے خلاف ہو اور ہر متاعِ عزیز کی قربانی چاہتا ہو ، تو کون ایسے مبلّغ کی بات قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے ، جب تک اس میں یہ تمام شرائطِ تبلیغ بہ تمام و کمال نہ پائی جائیں۔
اب اس مبلّغِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا تبلیغی کارنامہ ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے پہلے کون ایمان لایا ؟ وہ جن کے لیے بظاہر سب سے آخر میں بھی ایمان لانا دشوار تھا ، یہ ایمان لانے والے حضورؐ کی رفیقۂ زندگی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ کسی انسان کی سیرت و کردار کی واقفیت بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتی۔ انسان کی اصلیت گھر کی دن رات کی خلوتی زندگی میں بے نقاب ہو جاتی ہے جلوت کی زندگی میں تقدس قایم کر لینا دشوار نہیں۔ حقیقتِ حال کا پتا تو گھریلو زندگی سے چلتا ہے۔ ایک بیوی شوہر کی زندگی کے متعلق سب کچھ جانتی ہے اور اس پر کسی شوہر کا جھوٹا جادو نہیں چل سکتا۔ ذرا سوچیے ، حضورؐ کا کردار کتنا بلند ہوگا کہ ان کا پیغام سُنتے ہی سب سے پہلے ان کی رازدار ، واقفِ حال ، تجربہ کار اور ہوشمند بیوی ہی ایمان لاتی ہیں اور یہ سمجھ کر ایمان لاتی ہیں کہ اب آخر دم تک ہر سرد و گرم کو جھیلنا پڑے گا۔ کیا ایک مبلّغ کا اس سے بڑا بھی کوئی کارنامہ ہو سکتا ہے ؟

اس کے بعد کون اس پیغام کو قبول کرتا ہے ؟ ایک رفیق جو بچپنے سے ساتھ کھیلا ہُوا ہے ، اور اس سے مبلّغ اعظم کا کوئی راز پوشیدہ نہیں ، اگر مبلّغ کی سیرت و کردار پر اس کی امانت و صداقت پر سو فیصد اعتماد نہ ہو ، تو کون ہم عصر دوست ہے ، جو ایک خشک و بے مزہ پیغام کو قبول کر کے زمین و آسمان کو دشمن بن جانے کی دعوت دے ؟ یہ تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ جن کی زیرکی و فراست اور ایثار و صداقت پر کوئی دشمن بھی حرف نہ لا سکا۔ کیا ایک مبلّغ کا اس سے بھی کوئی بڑا کارنامہ تصوّر میں آ سکتا ہے ؟

پھر کون ایمان لایا ؟ ایک منہ بولا فرزند زید بن حارثہؓ ، جو دن رات اس مبلّغ کے ساتھ رہتا ہے ، گھر کے اندر بے تکلّف آتا جاتا ہے۔ ہر آن اس مبلغ کی صداقت و کردار کا بچشمِ خود مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ کمال اعتماد و اعتقاد نہ ہو تو کون ایسے خطرناک پیغام پر لبیک کہنے کی جرأت کرے ؟ کیا تبلیغ کی یہ کامیابی بجائے خود ایک عظیم الشان کارنامہ نہیں۔

یہ تو ذرا عمر رسیدہ لوگ تھے۔ جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد ایک نوخیز ۱۰ سالہ صاحبزادے کا ایمان لانا بھی کچھ معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ ہیں حضرت علی مرتضیٰؓ ، جو ابھی جوان بھی نہیں ہُوئے ہیں مگر اپنی عقل و فرزانگی میں ہزاروں بڑوں سے آگے ہیں۔ رسولؐ کی گود میں پرورش پائی ہے اور ان کی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ کمال عزم و استقامت کے ساتھ یہ بھی ایمان لے آتے ہیں۔ یہ

تمام لوگ ایک ہی دن آگے پیچھے ایمان لاتے اور آخری دم تک ہر ایثار و قربانی کو برداشت کرتے رہے۔

یہ وُہ تبلیغ تھی جس سے متاثر ہونے والے لوگ پہلے ہی سے حضورؐ کے کردار سے متاثر تھے اور اس تبلیغ کے قبول کرنے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جس پر حضورؐ کی دشمنی کا کوئی دور گزرا ہو۔ لیکن آگے چل کر کمال درجے کا تبلیغی کارنامہ وُہ ہے، جب کہ پیغامِ اسلام سُن کر لوگ خون کے پیاسے اور جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں اس کی بھی سُن لیجئے:

سیدنا عمرؓ اس مبلغِ اعظمؐ کا سر قلم کرنے کے ارادہ سے شمشیر برہنہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ اپنی بہن اور بہنوئی کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں خوب مارتے ہیں۔ اس کے بعد ہی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت بن جاتے ہیں۔ ضمادِ ازدی حضورؐ کو دیوانہ سمجھ کر جھاڑ پھونک کرنے آتے ہیں اور خود اسلام کے دیوانے بن جاتے ہیں۔ طفیل دوسی اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر آتے ہیں کہ محمدؐ کی کوئی آواز ان کے کانوں میں نہ پڑے۔ مگر پھر ہمیشہ کے لیے اپنی غفلت کی ڈاٹ نکال دیتے ہیں۔ بریدہ اسلمی ستر آدمیوں کے ساتھ حضورؐ کو گرفتار کرنے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور راستے میں حضورؐ سے مل کر سب کے سب گرفتارانِ اسلام ہو جاتے ہیں۔ ابوسفیان حضورؐ کے خلاف ہر تحریک کے پیرو بن جاتے ہیں لیکن آخر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ عمیر بن وہب زہر میں خنجر بجھا کر حضورؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے مدینے پہنچتے ہیں اور خود قتیلِ خنجرِ ایمان ہو جاتے ہیں۔ ثمامہ بن اثال جیسے پیشہ ور ڈاکو گرفتار ہو کر آتے ہیں اور بغیر کسی تعزیر کے رہا کر دیے جاتے ہیں، پھر کشاں کشاں خود آ کر اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ مثالیں بے شمار ہیں۔ سارا عرب و عجم ہی دشمن تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بے شمار انسان اپنے کفر سے تائب ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ تبلیغ کا یہ عظیم الشان کارنامہ اور کس مبلغ کے ہاتھوں ظہور میں آیا ہے؟

پھر اس کے بعد ایک تیسرا دورِ تبلیغ آتا ہے جو ۶ھ ہجری میں شروع ہوتا ہے۔ یہ وُہ دور ہے جب سلاطین کو تبلیغ نامے بھیجے گئے۔ نجاشی حبشہ اصحمہ بن ابجر کو، شاہِ بحرین منذر بن ساوہ کو، شام کے گورنر فروہ بن عمرو خزاعی کو، دُومۃ الجندل کے حکمران اکیدر کو، اضلاعِ یمن وطائف کے حکمران ذوالکلاع حمیری کو، شاہِ عمان جیفر کو اسلام کے پیغام بھیجے اور یہ سب کے سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

جو فرمانروا ایمان نہ لائے، ان میں ہوذہ بن علی حاکمِ یمامہ، جریج بن متی شاہِ مصر ملقب بہ مقوقس، خسرو پرویز شاہِ ایران اور نیز شاہِ قسطنطنیہ ہرقل وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ و برباد ہو گئے۔

حضورؐ کی تبلیغی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پُوری زندگی خصوصاً مکی زندگی میں حضورؐ کو اور حضورؐ کے تمام ساتھیوں کو ہر ممکن ایذا پہنچائی گئی، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، گلا گھونٹا گیا، بائیکاٹ کیا گیا، گالیوں اور تالیوں سے استقبال کیا گیا، قتل کی سازشیں کی گئیں، جنگ پر مجبور کیا گیا، وطن سے نکالا گیا۔ کیا کچھ نہ کیا گیا؟ لیکن استقامت، خیر خواہی، بے لوثی، ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت وغیرہ میں کبھی فرق نہ آیا۔ یہی وُہ تبلیغی کردار کے اعلیٰ نمونے تھے، جنھوں نے حضورؐ کو دُنیا کا سب سے زیادہ کامیاب مبلغ بنا دیا۔

رسولُ اللہ اور طرزِ معاشرت

سید رشید احمد ارشد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ تمام عالم کے لئے قابلِ تقلید ہے آپ کی حیاتِ مبارکہ از ابتدا تا انتہا ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ جس کا ہر کوئی مطالعہ کر سکتا ہے اور رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ آپ کی زندگی کے کسی دور کا حال پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی سیرت مبارکہ کا معمولی سے معمولی واقعہ بھی مستند ذرائع اور عینی شاہدوں کے ذریعے تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہ واقعات ہر طبقے کے انسان کے لئے اس کی زندگی کے ہر شعبے میں مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔

آپ کی سیرت مبارکہ کی یہ خصوصیت بھی قابلِ غور ہے کہ آپ نے اپنی تعلیمات پیش کرنے سے پہلے خود اُن پر عمل کیا چنانچہ آپ کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ آپ کی عملی زندگی کا ہر گوشہ نمایاں ہے۔ بلکہ آپ کی تعلیمات کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے۔ کہ جب آپ کی عملی زندگی سے اس کا ثبوت ملتا ہے، جسے شرعی اصطلاح میں سنتِ نبوی کہا جاتا ہے اور چوں کہ شریعت میں سنتِ نبوی کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے ہر عمل اور ہر فعل کو مکمل تحقیق کے بعد کتب احادیث میں محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ اہلِ اسلام بالخصوص اور اہلِ عالم بالعموم آپ کی عملی زندگی کو سرچشمۂ ہدایت بنا سکیں۔

کتبِ احادیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی زندہ جاوید کتاب قرآن کریم سے بھی آپ کے اخلاق و عادات واضح ہیں۔ جیسا کہ آپ کی زوجہ محترمہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے:۔

”آپ کے اخلاق (کا حال معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ) قرآنِ کریم ہے۔“

سیرتِ نبوی ﷺ کی اہمیت

سیرتِ نبوی کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ عموماً ایک عظیم شخصیت بیرونی دنیا کو باعظمت نظر آتی ہے۔ مگر اس کے گھر والے، جو اس کی اندرونی کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے ہیں بلکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے، کہ جس قدر کوئی شخص مشہور تر اور عظیم تر ہوگا۔ اسی قدر اس کے اندرونی حالات ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ کردار کے دوست دشمن سبھی مداح رہے ہیں۔ اسی طرح آپ کے گھر والے عزیز اور رشتے دار آپ کی مدح و ثنا میں رطب اللسان ہیں۔ کیونکہ آپ کی خانگی اور نجی زندگی بھی اسی طرح بے داغ و پاک و صاف ہے۔ جس طرح بیرونی دنیا کے سامنے آپ کا کردار عظیم اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔

ہمارے دعوے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ جب آپ کو نبوت عطا ہوئی، تو آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں آپ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ، آپ کے پروردہ چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، آپ کے متبنیٰ غلام حضرت زید بن حارثہ اور آپ کے مخلص ترین اور قریبی دوست ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ کی سیرت مبارکہ اس قدر اعلیٰ و ارفع تھی کہ جو شخص جس قدر آپ کے قریب ہوتا تھا۔ اسی قدر وہ آپؐ کی عظیم ترین شخصیت سے زیادہ واقف ہو کر آپ پر جلد ایمان لاتا تھا کیونکہ وہ آپ کی پاکیزہ شخصیت سے بیحد متاثر ہوتا تھا۔

بیوی سے بڑھ کر کوئی فرد اپنے شوہر کی اندرونی کمزوریوں سے واقف نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ کے کردار میں ذرا بھی کوئی بات ہوتی تو آپ کی ازواجِ مطہرات میں سے کوئی اس کا تذکرہ کرتیں۔ اس کے علاوہ قبیلہ قریش اور کفارِ مکہ آپ کے جانی دشمن تھے اور ساری عمر وہ آپؐ سے برسرپیکار رہے۔ وہ بھی آپ کی اخلاقی کمزوری کا کھوج لگاتے اور دنیا کے سامنے اپنی دشمنی کا انتقام لینے کے لئے نمایاں کرتے۔ مگر کسی تاریخی روایت سے ایسا کوئی واقعہ مذکور نہیں ہے۔ اس کے برعکس ازواجِ مطہرات نے آپ کے گھریلو واقعات بیان کئے ہیں ان سے آپؐ کی عظمتِ کردار اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ نیز آپ کے دشمن ابوسفیان نے ہرقل کے سامنے آپؐ کے بارے میں جو گفتگو کی تھی اس سے بھی آپ کے اعلیٰ کردار کا ثبوت ملتا ہے۔

کامل شخصیّت

عالمِ انسانیت کے لئے سیرت نبویؐ کا مطالعہ اس لئے اہم ہے کہ آپ کی عظیم ترین شخصیت جامع الکمالات تھی۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر دور، ہر عمر اور ہر طبقے کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ بچے جوان بوڑھے مرد و زن سبھی اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے بچپن کا ابتدائی دور ہمارے بچے اور نوعمروں کے لئے سبق آموز ہے۔ آپ کے ابتدائی دور سے یہ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں کہ ناسازگار ماحول کے باوجود ایک صداقت شعار بچہ اپنے عزم و استقلال کی بدولت اپنے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اصول کو برقرار رکھ سکتا ہے اور ہر حالت میں وہ دیانت داری، حق و صداقت اور شرافت کے اصول کے مطابق اپنی زندگی گزار سکتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دشمن اور مخالف افراد بھی اسے صادق اور امین کا لقب دے کر اسے خراجِ تحسین پیش کر سکتے ہیں۔

آگے چل کر بعثت سے پہلے آپ نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے تجارتی مال کی فروخت میں محنت اور دیانتداری سے کام لیا۔ آپ کی اس محنت اور دیانتداری کی بدولت آپ کو اس تجارتی کاروبار میں بہت نفع حاصل ہوا۔ آپؐ کا یہ طرزِ عمل ہمارے ان تاجروں کے لئے سبق آموز ہے۔ جو محنت کے بغیر بددیانتی کے ذریعے جلد مالدار بننا چاہتے ہیں اور جنہوں نے گراں فروشی اور نفع خوری کو کامیابی کا واحد ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔

عزم و استقلال

جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی تو آپؐ نے بت پرستوں کے مخالفانہ ماحول میں نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ توحید و رسالت کی تعلیمات کو پیش کیا اور کفارِ مکہ کی انتہائی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود حق و صداقت سے ذرا برابر بھی پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ نیک مقصد کی خاطر آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ یہ واقعات ایسے ہیں جو ہمارے مبلغین معلمین اخلاق اور سماجی کارکنوں کے لئے قابلِ عمل نمونہ بن سکتے ہیں۔

نظامِ حکمرانی مدنی زندگی میں آپ نے اسلامی حکومت کی بنیاد قائم کی اور اسلامی نظم و نسق کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ اس دور میں آپ نے مدینے کے یہودیوں کے ساتھ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق صلح و امن کے ساتھ باہمی زندگی گزارنے کا ایک معاہدہ کیا۔ اس کے بعد جب یہودی اپنے معاہدے پر قائم نہیں رہے اور وہ آپ کے دشمنوں سے مل گئے۔ تو آپ نے صلح و جنگ کے اعلیٰ اصول قائم کئے اور اس کے مطابق عمل کیا۔ یہ تعلیمات اور اصول ایسے ہیں جو آج بھی موجودہ قوموں کی مشکلات کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔ بلکہ آپ جس سیاست اور حکمت عملی پر کاربند رہے۔ اس کے بنیادی اصول آج بھی اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح وہ دورِ نبوی اور مسلمانوں کے ابتدائی دور میں عملی طور پر کامیاب ثابت ہوئے تھے۔

اس مختصر مقالے میں سیرتِ نبوی کے ہر گوشے کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ آپ کی سیرت کے ہر گوشے کو بیان کرنے کیلئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اسی لیے ہم موجودہ حالات میں آپ کے نظامِ حکمرانی کے چند واقعات اور چند اصولوں کو تحریر کرتے ہیں۔

حکّام کا تقرر جب اسلامی حکومت مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کے علاقے تک محدود تھی اور اسوقت تمام انتظامی امور کے نگران آپ تھے۔ فتح مکہ کے بعد تمام اہلِ عرب مسلمان ہوگئے تھے۔ اس وقت ان کی ضروریات کی وجہ سے آپ نے حکام کا تقرر کیا۔ اور دور دراز کے علاقوں کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ حاکم مقرر کئے چنانچہ اسلامی تاریخوں میں مکہ معظمہ، عمان، بحرین، تیما اور یمن کے مختلف حصوں کے لئے جداگانہ حکام کے نام مذکور ہیں۔

اس زمانے میں یمن جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ آباد اور وسیع علاقہ تھا۔ اس کا قدیم تہذیب و تمدن مشہور تھا۔ تجارتی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے اس کا تجارتی کاروبار ترقی پذیر تھا۔ زراعت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت تھی۔ لہٰذا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے علاقے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر ایک حصہ کے لئے جداگانہ امیر (حاکم) مقرر کیا۔

تقرر کا معیار حکام کے تقرر کے سلسلے میں آپ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ یا تو اس علاقے کا سابق حاکم ہو۔ یا وہاں کا باشندہ ہو، وہ اسلامی اصولوں کے مطابق مکمل دیانت دار ہو اور خوش اخلاق بھی ہو۔ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتظامی امور کی صلاحیت رکھتا ہو۔

آپؐ حکام کے تقرر کے لئے مذکورہ بالا صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ حاکم کا خالص عربی النسل کا ہونا آپ کے نزدیک ضروری نہیں تھا اور اس سلسلے میں آپ عرب یا عجم کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے شاہانِ عجم میں سے بہرام گور کے خاندان کے ایک شخص باذان بن ساسان کو مسلمان ہونے کے بعد یمن جیسے اہم علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے یمن کے حکمران رہ چکے تھے۔ اس لئے انھیں وہاں کے انتظامی امور کا تجربہ حاصل تھا۔ اسی انتظامی صلاحیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے باذان کی وفات کے بعد آپ نے ان کے فرزند شہر بن باذان کو یمن کے علاقے صنعاء کا حاکم مقرر کیا۔

حکام کے فرائض آپ کا ایک خاص اصول یہ بھی تھا کہ آپ جب کسی مہاجر مسلمان کو کسی علاقے کا حاکم مقرر کرتے تھے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے۔ یہ مسلم حکام ملک کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور خراج بھی وصول کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان حکام کا سب سے مقدم فریضہ

اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور اسلامی احکام کی تعلیم و تدریس بھی تھا۔ چنانچہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کے ایک حصے کا قاضی بنا کر بھیجا تو جس طرح آپ نے ملکی مصالح کے بارے میں ان کو بیش قیمت ہدایات دیں، اسی طرح انھیں یہ حکم بھی دیا کہ وہ قرآن کریم اور اسلامی قوانین کی تعلیم دیں۔

ان کے ذمے یہ فرض بھی عاید تھا کہ وہ یمن میں صدقات کے محصلین سے صدقات وصول کریں اور انھیں جمع کر کے مرکز کو روانہ کریں۔

آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو یہ ہدایات بھی ارشاد فرمائیں!

"تم انھیں سمجھاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ جو ان کے امرأ سے وصول کر کے ان کے غربأ پر تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو (اس صدقے کے مال کو وصول کرنے میں) ان کا بہترین مال حاصل کرنے سے پرہیز کرو۔ (اس معاملے میں) مظلوم کی بددعا سے بچتے رہو، کیونکہ اس کی (بددُعا) اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔"

چونکہ حضرت معاذ بن جبل کو ایک مہذب و متمدن علاقے میں قاضی بنا کر بھیجا گیا تھا، اس لئے وہاں کی مقامی ضروریات اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آپ نے انھیں اجتہاد کرنے کے اختیارات بھی دیئے تھے۔ چنانچہ سنن ترمذی میں یہ حدیث مذکور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب (حضرت) معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے فرمایا:

"تم کس (بنیاد) پر (مقدمات) کا فیصلہ کرو گے؟"

"انہوں نے کہا" کتاب اللہ (قرآن مجید) سے۔"

آپ نے فرمایا" اگر تم کو وہ فیصلہ اس میں نہ ملے؟"

انہوں نے کہا" سنت رسول سے!"

آپ نے فرمایا" اگر (سنت رسول اور احادیث سے) یہ ہدایت نہ ملے؟"

اس پر انہوں نے کہا" اس وقت میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔"

اس پر آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس نے اپنے رسول کے قاصد کو وہ توفیق دی ہے۔ جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔

خوش اخلاقی کی ہدایت

آپ اپنے حکام کو خوش اخلاقی اور نرمی کی ہدایت فرماتے تھے اور انھیں رعایا پر تشدد اور ظلم کرنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو سب سے پہلے ان دونوں کو یہ نصیحت فرمائی:۔

"تم دونوں (لوگوں کے لئے) سہولت فراہم کرو۔ اور مشکلات نہ پیدا کرو۔ (لوگوں کو اچھے کاموں کی) بشارت دو۔ (ان کو) وحشت زدہ نہ کرو۔ اتفاق باہمی سے رہو۔ اختلافات پیدا نہ کرو۔" (صحیح مسلم ج ۲ ص ۶۳ کتاب الایمان)

اس کے بعد جب حضرت معاذ بن جبل رکاب میں پاؤں ڈال چکے اور گھوڑے پر سوار ہو گئے تو چلتے وقت آپ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی :۔

"لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیے۔"

تشدّد کی ممانعت آپ اپنے حکام اور عام مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ کہ وہ اپنے ماتحت ملازموں اور رعایا پر سختی نہ کیا کریں۔ بلکہ حکومت کے ٹیکس اور واجبات کو بھی تشدّد کے ذریعے وصول نہ کریں۔ اور جیسا کہ مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہے، آپ انھیں ہر حالت میں نرمی، خوش اخلاقی اور سہولت کا رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ تشدد اور مظالم سے روکتے تھے۔

آپ کا یہ قطعی حکم تھا کہ غیر مسلم رعایا سے بھی جزیہ وصول کرنے میں تشدد نہ کیا جائے۔ بلکہ انھیں بھی جزیہ کی رقم اور دیگر واجبات کے ادا کرنے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں ہشام بن حکیم حزام کی ایک روایت مذکور ہے۔ جس میں فرماتے ہیں :۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے :۔

" اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا۔ جو دنیا میں (لوگوں) کو عذاب دیتے ہیں۔

محصّلین اور عمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام حکومت زیادہ وسیع نہیں تھا۔ کیونکہ اسلامی مملکت کی حدود صرف آپ کے آخری زمانے میں کسی قدر وسیع ہوئی تھیں۔ دیگر ممالک کی فتوحات آپ کے بعد ہوئیں۔ تاہم آخر زمانے میں آپ نے مسلم اور غیر مسلم رعایا کی سہولت کے لئے جو عمدہ انتظامات کئے تھے وہ بعد کے مسلم خلفاء کے لئے مشعل ہدایت بنے۔

دیگر انتظامات کے ساتھ ساتھ آپؐ نے یکم محرم ۹ھ سے صدقہ، زکوٰۃ، جزیہ اور خراج وصول کرنے کے لئے ہر قبیلے کے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے، جو مختلف قبائل میں گشت کر کے صدقات و خراج جمع کرتے تھے۔ وصول کرنے کے بعد وہ تمام رقم آپ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھی، بالعموم قبیلوں کے سردار اپنے قبیلوں کے محصّل ہوتے تھے اور ان کا تقرر عارضی طور پر ہوتا تھا۔

محصّلین کو ہدایت زکوٰۃ اور خراج وصول کرنے کے سلسلے میں محصّلین آپ کی ہدایات کے مطابق وہ رقوم وصول کرتے تھے۔ آپؐ نے پہلے ہی سے زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار اور ان کے شرائط کا باضابطہ تعین کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ ان احکام و قوانین پر عمل کرتے تھے۔

آپ نے مویشی پر بھی زکوٰۃ مقرر کی تھی اور محصلین لوگوں کے گھروں پر جا کر مویشیوں کی زکوٰۃ مویشی کی جنس میں لیتے تھے اس لئے انھیں آپ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ وہ مویشیوں یا دوسری اجناس میں سے سرکاری زکوٰۃ چھانٹ کر وصول نہ کریں۔ اور ایسا عمدہ مال لینے کی کوشش نہ کریں۔ جس سے عوام کو نقصان یا تکلیف پہنچے۔ بلکہ اوسط درجے کا مال وصول کریں۔

ان محصلین کے لئے یہ قطعی ممانعت تھی کہ وہ رعایا سے اپنے سرکاری فرائض انجام دینے کے زمانے میں کسی شکل میں لوگوں سے تحفہ یا نذرانہ وصول کریں۔ اس معاملے میں سختی کے ساتھ ان سے باز پرس ہوتی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان سے محاسبہ فرماتے تھے۔

نذرانے کی ممانعت ایک بار آپ نے ابن اللتیبہ نامی ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب وہ واپس آئے۔ اور آپ نے ان سے محاسبہ کیا تو انہوں نے کہا۔

"یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے تحفے میں ملا ہے"۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا۔" اگر یہ بات ہے تو تم کو گھر بیٹھے یہ تحفہ کیوں نہیں ملا"۔

آپ کا اس ارشاد سے یہ منشا تھا کہ جس کسی عامل کو سرکاری حیثیت سے کوئی ہدیہ یا نذرانہ دیا جائے۔ تو وہ بھی ایک قسم کی رشوت ہے۔ اس لئے سرکاری عہدے پر رہتے ہوئے اس قسم کا تحفہ یا ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہیے۔

یہ معاملہ آپ کے نزدیک اس قدر اہم تھا کہ آپ نے فوراً مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب کیا اور لوگوں کو اس قسم کا رویہ اختیار کرنے سے منع کیا۔

خویش پروری کا خاتمہ آپ نے اقربا پروری کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے خاندان اور خاندان بنو ہاشم پر صدقہ لینا حرام کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف صدقے کی کوئی چیز نہیں کھا سکتے تھے۔ بلکہ آپ انھیں صدقہ اور خیرات کے عامل اور محصل کی حیثیت سے بھی مقرر نہیں فرماتے تھے۔ کیونکہ صدقے کی تنخواہ اسی مد سے ادا ہوتی تھی۔ اس لئے ان کا تقرر ممکن نہیں تھا۔

آپ نے یہ اصول اس لئے مقرر فرمایا تھا کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ خاندان نبوت کے افراد اپنے اس تعلق سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور ان میں مذہبی تقدس قائم کرکے مفت خوری کی عادت نہ پیدا ہو۔ اس طرح دیگر مسلم حکام اور خلفا کو بھی یہ نصیحت حاصل ہو کہ وہ بھی اپنے رشتہ داروں کو ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دیں۔

درخواست کی ممانعت حکام کے تقرر اور انتخاب میں آپ کا یہ اصول بھی مقرر تھا کہ جو لوگ سرکاری خدمت کے لئے خود درخواست پیش کرتے تھے۔ انھیں حکومت کے کسی عہدے پر آپ مقرر نہ فرماتے تھے۔
اس قسم کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے عامل بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کر دی اور فرمایا۔

"جو لوگ خود (کسی سرکاری عہدہ کی) خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے ہیں"۔

اس وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری نے اس قسم کی کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ اس لئے آپ نے انھیں بلا درخواست یمن کا حاکم مقرر کرکے وہاں روانہ کیا۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۹)

سرکاری ملازموں کو بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا۔ آپ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص مقررہ تنخواہ سے زیادہ رقم لے گا۔ وہ مالی خیانت کا مجرم ہوگا۔ (سنن ابی داؤد ج ۲ باب ارزاق العمال)

مزدوروں سے حسنِ سلوک

ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم حکام کو یہ ہدائت دے رکھی تھی۔ کہ وہ اپنے ماتحتوں اور غریب رعایا کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی کا سلوک کریں۔ اس سلسلے میں آپ نے مزدوروں اور محنت کشوں کے بارے میں خاص ہدایات دی تھیں۔ جن کا ذکر کتبِ احادیث میں مذکور ہے! ان میں سے آپ کے چند ارشادات کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ تم مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو۔

۲۔ اس شخص پر خدا کی لعنت ہو جو مزدور کا حق غصب کرے۔

۳۔ کسی شخص کو ایسا سخت کام کرنے کا حکم نہ دو۔ جسے تم خود نہ کر سکو اگر کوئی ایسا کام ہو۔ تو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔ اور اس سے نرمی کا سلوک کرو۔

۴۔ تم مزدور کو اپنے جیسا انسان سمجھو، اس پر اس کی طاقت سے زیادہ کام کا بوجھ نہ ڈالو۔ اس کی عزت اور عافیت کا خیال رکھو۔

۵۔ غریبوں کے حق کو پہچانو، کیونکہ یہ تمہارا ہی کام کرتے ہیں۔ خدا اس بندے کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ جس نے کسی مزدور کا حق مار لیا ہو۔

محنت کی فضیلت

۱۔ مومن کی نشانی یہ ہے کہ مرتے وقت بھی اس کی پیشانی محنت کے پسینے سے تر ہو۔

۲۔ اس بندے پر خدا کی رحمت ہو۔ جو اپنی محنت سے اپنی روزی کماتا ہے

جس طرح آپ نے مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح مزدوروں کو ان کے فرائض بھی یاد دلائے ہیں کہ وہ فرض شناسی، دیانت داری اور محنت سے کام کریں۔

خطابت و کلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا زیادہ وقت خاموش رہ کر گزارتے تھے۔ آپ اسی وقت گفتگو فرماتے تھے جب بولنے کی ضرورت ہوتی تھی، آپ کی آواز بلند تھی اور اچھی طرح سنی جا سکتی تھی۔ آپ کی گفتگو شیریں اور دل کش ہوتی تھی، آپ گفتگو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر فرماتے تھے کہ ہر جملہ دوسرے جملہ سے علیحدہ ہوتا تھا تاکہ سننے والے اسے سمجھ سکیں اور آسانی کے ساتھ یاد رکھ سکیں۔ آپ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے اسے دہراتے تھے۔ نہ تو آپ ضرورت سے زیادہ طویل گفتگو فرماتے تھے اور نہ اتنی مختصر کہ پوری طرح سمجھ میں نہ آسکے۔ آپ کی گفتگو بالکل جچی تلی اور متوازن ہوتی تھی۔ آپ کسی کی بات بیچ میں سے نہ کاٹتے تھے۔ اگر کسی کی کوئی بات دین کے خلاف ہوتی تو آپ اسے یا تو روک دیتے یا پھر وہاں سے اٹھ جاتے۔ آپ کی زبان سے کوئی بے معنی اور غیر متعلق بات نہ نکلتی تھی۔ اگر خطبہ دیتے وقت سامعین کی کثرت ہوتی تو آپ کسی ایک سمت یا ایک آدمی

کی طرف مخاطب نہ ہوتے تھے بلکہ آپ باری باری سے ہر طرف رخِ مبارک کو گھماتے تھے۔ آپ کو چلانے اور شور کرنے کی عادت نہ تھی۔ آپ کی گفتگو ہمیشہ افادیت سے بھرپور ہوتی تھی۔

راست گفتاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر راست گفتار تھے کہ مزاح کے وقت بھی آپ کے الفاظ سچے ہوتے تھے، اور آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی غلط بات نہ نکلتی تھی۔ آپ کے دشمنوں اور مخالفوں نے آپ کو "شاعر" "دیوانہ" اور "سحر زدہ" تک کہا مگر ان میں سے کسی کو آپ پر جھوٹ کی تہمت لگانے کی جرأت نہیں ہوئی، ابوجہل آپ کا بہت بڑا دشمن تھا۔ وہ کہا کرتا تھا:۔

"محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا۔ ہاں! تم جو باتیں بیان کرتے ہو ان کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔"

ایک موقع پر بہت سے لوگوں نے متفقہ طور پر اعتراف کیا:۔

"اے محمدؐ! آپ جو کچھ بھی کہیں گے۔ ہم اس پر یقین لے آئیں گے، اس لئے کہ ہم نے آپ کی زبان سے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں سنی۔"

غیرت و حیا آپ کنواری لڑکیوں سے زیادہ شرمیلے تھے۔ جب آپؐ بازاروں سے گزرتے تھے تو خاموشی اور وقار کے ساتھ گزرتے تھے۔ آپ کے لبوں پر اکثر تبسم رہتا تھا۔ مگر آپؐ نے کبھی زور سے قہقہہ نہیں لگایا۔

صفائی اور پاکیزگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفائی، ستھرائی اور پاکیزگی کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ ایک شخص میلے کپڑے پہن کر آپ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا:۔

"کیا یہ آدمی اپنے کپڑے دھونے کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا؟"

ایک خوش حال شخص آپ کی خدمت میں گھٹیا درجہ کے کپڑے پہن کر حاضر ہوا۔ آپ نے اس پر ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تم کو مال و دولت دی ہے۔ اس کا اظہار تمہاری ظاہری حالت سے بھی ہونا چاہیے۔"

اگر آپ مسجد کی دیواروں پر تھوک وغیرہ کا نشان دیکھتے تو اسے خود چھڑی سے کھرچ دیتے۔ کبھی کبھی آپ صحابہ کرام کو نصیحت کرتے کہ خوشبو کے لئے لوبان اور کافور سلگایا کرو۔ اکثر موقعوں پر آپ خود بھی مشک لگایا کرتے تھے۔ آپ لوگوں کو محض کاہلی کی وجہ سے برتن میں پیشاب کرنے سے منع فرماتے تھے۔

سادگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی سادہ زندگی گزارتے تھے اور اپنے گھر والوں کے لئے بھی سادہ زندگی پسند فرماتے تھے۔ آپؐ فطرتاً تواضع سے سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ آپ موٹا جھوٹا لباس زیب تن فرماتے تھے۔ آپ نے جب وصال فرمایا ہے تو آپ کے بدن پر بھیڑ کے بالوں کا بنا ہوا لباس تھا۔ اس وقت جب کہ یمن سے لے کر شام تک اسلام کی سیادت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ پیغمبرِ اسلام کے گھر میں صرف ایک معمولی سا پلنگ اور چمڑے کی ایک چھاگل تھی، آپ کی وفات کے وقت آپ کے گھر میں تھوڑے سے جَو کے علاوہ کھانے پینے کی کوئی اور چیز نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کا زیادہ تر کاروبار خود اپنے ہاتھ سے کر لیا کرتے تھے۔ اپنی بکریوں کو آپ خود دوہتے تھے۔

کبھی کبھی اپنے کپڑے بھی دھو لیتے تھے، آپ گھر کے کام کاج میں ازواجِ مطہرات کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھتے، اونٹ خود ہی باندھتے اور اپنے ہاتھ سے اس کے آگے چارہ ڈالتے۔

جود و عطا سخاوت اور داد و دہش آپ کا پیدائشی وصف تھا، آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں کسی حاجت مند کے مانگنے پر "نہیں" کہا ہی نہیں۔ آپ کے پاس جو چیز بھی ہوتی سائل کو دے دیتے یا نرمی کے ساتھ غمخواری کے لہجہ میں اس کی تسلی کر دیتے۔ یا پھر اس سے وعدہ فرما دیتے کہ آئندہ کسی موقع پر آنا۔ آپ تنہاخوری کے عادی نہ تھے۔ جب کوئی چیز کھاتے پیتے تھے تو دوسروں کو بھی اس میں شریک فرما لیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوہِ اُحد میری خاطر سونے کا ہو جائے تو بھی میں یہ پسند نہ کروں گا کہ تین رات گزر نے تک میرے پاس ایک دینار بھی بچ رہے۔ جب تک گھر میں رکھی ہوئی رقم پوری کی پوری خیرات نہ فرما دیتے۔ آپ کو چین نہ آتا تھا۔

خدمتِ خلق حضرت خباب رضی اللہ عنہ ایک جنگی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتیں دودھ دینے والے جانوروں کو دوہنا نہیں جانتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ خبابؓ کے گھر جا کر جانوروں کو دوہتے تھے۔ آپ بیواؤں اور اپاہجوں کی مدد کرنے میں نہ تو عار محسوس فرماتے تھے اور نہ اس کو زحمت سمجھتے تھے۔ ایک بار ایک پاگل لڑکی آپ کے پاس آگئی اور حضور کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ نے اس سے فرمایا:۔

"بی بی! تم مدینہ کی جس گلی میں چاہو جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارا کام ضرور کر دوں گا۔"

چنانچہ آپؐ نے اس کے بتائے ہوئے کام کو پورا کر دیا۔ ایک دن آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی حالت میں ایک بدوی نے آکر آپ کے دامن کو تھام لیا اور کہنے لگا:۔

"میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، پہلے تم اُسے پورا کر دو اس لئے کہ کہیں تم بھول نہ جاؤ۔" آپ بدوی کے ساتھ مسجد نبوی سے باہر نکلے اور اس کا کام کرنے کے بعد نماز کو پورا کیا۔

سرورِ کائنات ﷺ کے حقوق اُمّت پر

مولانا اشرف علی تھانوی

جاننا چاہیئے کہ کسی سے محبت ہونا اور اس محبت کا متقاضیٔ متابعت ہونا تین سبب سے ہے۔

ایک محبوب کا کمال جیسے عالم سے محبت ہوتی ہے، شجاع سے محبت ہوتی ہے،

دوسرا جمال، جیسے کسی حسین سے محبت ہوتی ہے،

تیسرا نوال، یعنی عطا و احسان، جیسے اپنے مربی اور منعم سے محبت ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ میں تینوں وصف علی سبیل الکمال مجتمع ہیں، جب تینوں وصف، جو علتِ محبت ہیں، آپ میں جمع ہیں، تو خود اس کا طبعی مقتضا ہے کہ آپ کے ساتھ امت کو اعلیٰ درجہ کی محبت ہونی چاہیئے۔ اگر نصِ شرعی[1] بھی نہ ہوتی اور جب کہ نصوص شرعیہ بھی اس کے ایجاب میں موجود ہیں، تو داعیٔ عقل و طبع کے ساتھ داعیٔ شرع بھی مل کر آپ کے وجوبِ محبت کو مؤکد کرتا ہے اور درحقیقت اعظم غایت اس مضمون کی اس امر کی طرف اہلِ ایمان کو متوجہ کرنا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ان اسباب و دواعی کے ہوتے ہوئے محبت[2] سے اتباع کا انفکاک عادتاً محال ہے جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا اتباع ہوگا اور ظاہر ہے کہ محبت علی سبیل الکمال واجب ہے۔ پس متابعت بھی علی سبیل الکمال واجب ہوگی، اور اس میں گو کسی کو بھی کلام نہیں ہوسکتا، تاہم محض تجدید استحضار کے لیے مختصر طور پر تنبیہہ کر دی گئی اور اسی کی تقویت کے لیے چند روایات بھی ذکر کی جاتی ہیں۔

پہلی روایت حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ تم میں کوئی شخص مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد اور اولاد اور تمام آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے کذا فی المشکوٰۃ۔)

ف: یعنی اگر میری مرضیات[3] اور دوسروں کی مرضیات میں تزاحم ہو، تو جس کو ترجیح دی جائے اسی کی محبوب تر

---

[1] یعنی اگر حضورؐ سے محبت کرنے کی کوئی شرعی دلیل نہ بھی ہوتی، تو تب بھی آپ کے اندر محبت کے وہ تمام اسباب موجود ہیں جنکی وجہ سے کسی سے محبت کی جاتی ہے اور اب جب کہ شرعی دلائل بھی موجود ہیں تو عقلی دلائل کے ساتھ شرعی دلائل مل کر آپ سے محبت کرنے کو اور بھی زیادہ ضروری بنا دیتے ہیں۔

[2] محبت سے حضورؐ کی پیروی کو جدا کرنا ناممکن ہے۔

[3] میری پسندیدہ اور دوسروں کی پسندیدہ باتوں میں ٹکراؤ اور مقابلہ ہو جائے۔

ہونے کی یہ علامت ہوگی۔

دوسری روایت امام بخاری نے ایمان و نذور کے باب میں حضرت عبداللہ بن ہشام سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ میرے نزدیک ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میرے نفس کے جو میرے پہلو میں ہے (یعنی وہ تو مجھے بہت ہی محبوب ہے) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک عمر اس کے نفس سے بھی زیادہ میں اس کو محبوب نہ ہو جاؤں حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ آپ میرے نزدیک اس نفس سے بھی زیادہ محبوب ہیں جو میرے پہلو میں ہے اس پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس اب بات ٹھیک ہوئی۔

(کذا فی المواہب)

ف:۔ حضرت عمرؓ نے اول محبت بلا اسباب کو محبت بالاسباب سے اقوی سمجھ کر نفس کو مستثنےٰ[1] کیا۔ پھر آپؐ کے اس ارشاد سے کہ اپنے نفس سے بھی زیادہ محبوب رکھنا ضروری ہے، یہ سمجھ گئے کہ اقوی ہونے کا مدار کوئی ایسا امر ہے کہ اس کے اعتبار سے کوئی چیز نفس سے بھی زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ کی خوشی کو نفس کی خوشی پر طبعاً مقدم اور راجح پایا۔ سو اس حقیقت کے انکشاف کے بعد آپ کی احبیت من النفس (نفس سے بھی زیادہ محبوب ہونے کا) مشاہدہ کیا اور خبر دی مواہب کے مقصد سابع میں دوسرے صحابہؓ کی محبت کی عجیب و غریب حکایتیں ذکر کی ہیں۔

تیسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت جنت میں داخل ہوگی مگر جس نے میرا کہنا قبول نہ کیا، عرض کیا گیا کہ حضورؐ قبول کس نے نہیں کیا؟ فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے قبول نہیں کیا۔

(روایت کیا اس کو بخاری نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف:۔ صحابہؓ کے اس سوال سے معلوم ہوا کہ اباء[1] مخصوص بہ کفر نہیں ہیں، ورنہ اس میں کونسا خفا تھا پس آپ کے اتباع نہ کرنے کو اباء سے تعبیر فرمایا گیا۔ اس سے متابعت کا وجوب ثابت ہوا۔

چوتھی روایت حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔ وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔ (روایت کیا اس کو ترمذی نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف:۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کی محبت کی علامت آپؐ کی سنت سے محبت کرنا ہے اور آپ کی محبت کی فضیلت بھی ثابت ہوئی۔ کہ مفتاح[2] جنت ہے اور علاوہ جنت کے حضورؐ کی معیت کا بھی موجب ہے۔

---

[1] قبول کرنا۔
[2] جنت کی کنجی ۱۲

پانچویں روایت حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے کے جرم میں سزا دی۔ پھر دوبارہ وہ اس جرم میں حاضر کیا گیا۔ آپؐ نے پھر سزا کا حکم دیا۔ ایک شخص نے مجمع میں سے کہا کہ اے اللہ! اس پر لعنت کر کس قدر کثرت سے اس کو (مقدمہ میں) لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس پر لعنت نہ کرو واللہ میرے علم میں یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔ (اس کو بخاری نے روایت کیا ہے)

ف: اس حدیث سے چند امور ثابت ہوئے۔ ایک بشارت زبان کرکے ان سے اللہ اور رسولؐ کی محبت کی نفی نہیں کی گئی، دوسری ذ نبیں کو تنبیہ کہ خالی اور صرف محبت سزا سے بچنے میں کام نہ آئی تو کوئی شخص اس ناز میں نہ رہے کہ خالی محبت ہی بغیر اطاعت و اعمال خیر کے سزائے جہنم سے بچالے گی۔ البتہ بعد بعید من الرحمت (خدا کی رحمت سے بہت دور ہو جائے) سے بچا سکتی ہے۔ جیسا کہ نہی عن اللعنت (لعنت کرنے سے منع فرمانے) سے معلوم ہوا۔ پس جو سزا آخرت اس ملعونیت پر مرتب ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہنا اس سے یہ محبت قلبی بچالے گی اور سزا بھگتنے کے بعد مغفرت ہو جائے گی تیسری بات محبت کی فضیلت معلوم ہوئی، جیسا کہ ظاہر ہے، چوتھی بات محبت کے مراتب کا فرق ظاہر ہوا کہ باوجود ایک گناہ کے اثبات محبت کا حکم فرمایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ متابعت کامل نہ ہونے سے گو کمال محبت کا حکم نہ ہوگا، مگر نفس متابعت سے جس کا ادنیٰ درجہ قبول اسلام ہے، کوئی نہ کوئی درجہ محبت ثابت کیا جائے گا۔ پانچویں بات یہ معلوم ہوئی کہ مومن خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو، مگر اس پر لعنت نہ کرنی چاہیئے۔ اس سے اللہ و رسولؐ کی محبت کی عظمت معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ محبت ایک شمہ برابر ہو اور وہ بھی گناہوں میں ملوث ہو، لیکن ایسی محبت بھی لعنت کرنے سے مانع ہے، تو سوچیئے کہ محبت کا کامل اور خالص درجہ کتنا کچھ مفید اور موثر ہے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

حضور محترم جناب رسول اکرمؐ کی توقیر احترام اور ادب کا واجب ہونا یہ مضمون بھی مضمون بالا کے ساتھ ملحق ہے کیونکہ یہ بھی منجملہ آپؐ کے حقوق عظمت کے ہے۔ اس مضمون کے متعلق چند آیات اور روایات کا نقل کرنا کافی ہے۔

آیتہ اول:

ما کان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہٖ (نور)

آیتہ دوم:

انما المومنون الذین اٰمنوا باللہ ورسولہٖ واذا کانوا معہٗ علیٰ امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ

ان الذین یستاذنونک اولئک الذین یومنون باللہ ورسولہ فاذا استاذنوک لبعض شانھم فاذن لمن شئت منھم واستغفر لھم اللہ ان اللہ غفور رحیم ہ لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا ط (نور)

آیت سوم :۔

وما کان لکم ان توذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ان ذالکم کان عند اللہ عظیماً الی قولہ ان الذین یوذون اللہ ورسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ واعد لھم عذاباً مھینا (احزاب)

آیت چہارم :۔

انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا لتومنوا باللہ وتعزروہ وتوقروہ وتسبحوہ بکرۃ واصیلا (فتح)

آیت پنجم :۔

یاایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم ط الی قولہ ولو انھم صبروا حتی تخرج الیھم لکان خیرا لھم ط واللہ غفور رحیم ہ

حاصل ان آیات کا یہ ہے:

۱۔ مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گرد و پیش میں رہتے ہیں، یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دیں۔ اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو ان کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں۔

۲۔ پس مسلمان تو وہی ہیں، جو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پہ ایمان رکھتے ہیں اور صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کسی ایسے کام کے لیے ہوتے ہیں جس کے لیے جمع کیا گیا ہے اور (اتفاقاً) وہاں سے جانے کی ضرورت پڑتی ہے، تو جب تک آپ سے اجازت نہ لیں اور آپ اس کی اجازت دیں مجلس سے اٹھ کر نہیں جاتے۔ اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے ایسے مواقع پر اجازت لیتے ہیں بس وہی اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ تو جب یہ اہل ایمان لوگ ایسے مواقع پر اپنے کسی ضروری کام کے لیے آپ سے اپنے جانے کی اجازت طلب کریں، تو ان میں سے آپؐ جس کے لیے چاہیں مناسب سمجھ کر اجازت دینا چاہیں، اجازت دے دیا کریں اور اجازت دے کر بھی آپ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کیا کیجیے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے کو جب وہ کسی ضرورت اسلامیہ کے لیے تم کو جمع کریں، ایسا معمولی بلانا مت سمجھو، جیسا کہ تم میں ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے کہ چاہے آیا یا نہ آیا۔ پھر آ کر بھی جب تک چاہا بیٹھا اور جب چاہا اٹھ کر بے اجازت لیے چل دیا۔

۳۔ اور (حرمت ایذاء نبویؐ صرف قبول جم کر بیٹھ جانے ہی کی صورت میں نہیں بلکہ علی الاطلاق حکم ہے کہ تم کو کسی امر میں) جائز نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کلفت پہنچاؤ۔ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپؐ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو۔ یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری معصیت کی بات ہے (اور جس طرح یہ نکاح کرنا ناجائز ہے، ایسے ہی اس

کا) زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا یہ سب گناہ ہے ۔ سو گر تم اس کے متعلق کسی چیز کو زبان سے ظاہر کرو گے یا اس کے ارادہ کو دل میں پوشیدہ رکھو گے، تو اللہ تعالیٰ (کو دونوں کی خبر ہوگی کیونکہ وہ) ہر ایک چیز کو خوب جانتے ہیں (پس تم کو اس پر سزا دیں گے اور ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے، اس سے بعض مستثنے بھی ہیں، جس کا بیان یہ ہے کہ) پیغمبر کی بیویوں پر اپنے باپوں کے سامنے آنے میں کوئی گناہ نہیں، اور نہ اپنے بیٹوں کے، یعنی جس کے بیٹا ہو اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ بھانجوں کے اور اپنی شریکِ دین عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور اے پیغمبر کی بیبیو! (ان احکام مذکورہ کے امتثال میں) خدا سے ڈرتی رہو ۔ (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پائے) بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ۔ ان پیغمبر پر، اے ایمان والو! تم بھی ان پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ کا حق عظمت جو تمہارے ذمہ ہے ادا ہو) بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قصداً ایذا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۔

۴ ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو امت پر گواہی دینے والا، قیامت کے عموماً اور دنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لیے بشارت دینے والا اور کافروں کے لیے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اے مسلمانو! ہم نے ان کو رسولؐ بنا کر اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے دین کی مدد کرو ۔ اور اس کی تعظیم کرو (عقیدتاً بھی کہ اللہ تعالیٰ کو موصوف بالکمالات[1] اور منزہ عن النقائص سمجھو اور عملاً کہ اطاعت کرو) اور صبح و شام اس کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہو ۔

۵ ۔ اے ایمان والو! اللہ اور رسولؐ کی اجازت سے پہلے تم کسی قول یا فعل میں سبقت نہ کیا کرو ۔ (یعنی جب تک قرائن قویہ[2] یا تصریح سے گفتگو کی اجازت نہ ہو، گفتگو نہ کرو) اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو سننے والا تمہارے افعال کو) جاننے والا ہے اور اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو، جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو ۔ (یعنی آپ کے سامنے اگرچہ آپس میں گفتگو کرو، لیکن بلند آواز سے نہ بولو اور جب خود حضورؐ سے بات کرو، تو برابر کی آواز سے بھی نہ بولو) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رفع صوت[3] کو صورتاً بے باکی ہے اور جہر کما بینکم[4] طبعاً گستاخی ہے ناگوار اور موجب تاذی[5] ہو سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاذی موجب حبطِ (بربادی) اعمال ہے، گو اور دوسرے معاصی موجبِ حبط

---

[1] تمام تر کمالات سے موصوف اور تمام تر عیوب سے پاک ۔

[2] جب تک ایسے قوی قرینے نہ ہوں جن سے گفتگو کا یقین ہو یا صاف طور پر بات کی اجازت مل جائے ۔

[3] آواز بلند کرنا ظاہری طور پر گستاخی ہے،

[4] آپس میں بلند آواز سے بولنے کی طرح حضورؐ کے دربار میں بولنا ۔

[5] ایذا پہنچانا،

نہیں ہوتے لیکن یہ اس عام میں مخصوص ہے۔ البتہ بعض اوقات جب کہ طبیعت زیادہ منبسط[1] ہو، یہ امور ناگوار نہیں ہوتے اس وقت ایذا دہی ثابت نہ ہونے کی وجہ سے رفع صوت موجب[2] حبط نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ بعض اوقات متکلم کو سامع کی اذیت کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے ممکن ہے کہ تاذی ہو جائے اور اس سے حبط ہو جائے اور متکلم اس گمان میں رہے کہ تاذی نہیں ہوئی، پس حبط کی بھی خبر نہ ہو۔ لا تشعرون کے یہی معنی ہیں اور اسی وجہ سے مطلق رفع صوت اور جہر بالقول کو منہی[3] عنہ ٹھہرایا گو اس کے بعض افراد موجب تاذی نہ ہوں گے، لیکن اس کی تعیین کیسے ہو گی؛ لہٰذا مطلقاً تمام اجزا و افراد کو ترک کر دینا چاہیے یہ تو رفع صوت پر ترہیب[4] تھی۔ آگے خفض صوت[5] پر ترغیب ہے کہ بے شک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست رکھتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے خالص کر دیا ہے (یعنی ان کے قلوب میں غیر تقویٰ نہیں ہے) مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس باب خاص میں، وہ کمال تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ کمال تقویٰ یہ ہے جسب حدیث مرفوع ترمذی: لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا باس به حذرا لما به باس[6] اور رفع صوت کا ایک فرد فی نفسہٖ غیر ذی باس ہے (یعنی اس میں بالذات کوئی نقصان نہیں) جس میں تاذی نہ ہو اور فرد ذی باس ہے (نقصان دہ) جس میں تاذی ہو۔ جب انہوں نے مطلقاً رفع صوت کو ترک کر دیا۔ پس کمال تقویٰ متحقق ہو گیا اور فی نفسہٖ کی قید اس لیے لگائی کہ ممانعت کے بعد تو دونوں ہی فرد ذی باس ہو گئیں آگے ان پر عمل کرنے کا اخروی ثمرہ مذکور ہے کہ ان لوگوں کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے اور جو لوگ حجروں کے باہر سے آپؐ کو پکارتے ہیں، ان میں سے اکثروں کو عقل نہیں ہے، ورنہ آپؐ کا ادب کرتے اور ایسی جرأت نہ کرتے اور اگر یہ لوگ ذرا صبر و انتظار کرتے، یہاں تک کہ آپؐ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر یہ لوگ اب بھی توبہ کر لیں تو معاف ہو جائے کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

حضور پاکؐ کی عظمت اور احترام کے متعلق چند روایات درج ذیل ہیں۔

پہلی روایت سنن ابوداؤد کتاب الحدود میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا کی ام ولد تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیہودہ اور گستاخانہ باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ نابینا منع کیا کرتے، وہ باز نہ آتی۔ وہ اس کو ڈانٹتے، مگر وہ نہ مانتی۔ ایک شب اسی طرح اس نے کچھ بکواس شروع کی۔ نابینا نے چھرا لے کر اس کے پیٹ پر رکھ کر بوجھ دے دیا اور ام ولد کو ہلاک کر ڈالا۔ صبح کو اس کی تحقیقات ہوئی۔ نابینا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے فعل کا اقرار کیا اور پورا واقعہ بیان کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا، سب گواہ رہو کہ ام ولد کا خون رائیگاں ہے یعنی قصاص وغیرہ نہیں لیا جائے گا۔

---

[1] خوش [2] اعمال ضائع ہونے کا سبب نہیں ہوتے [3] ممنوع و ناجائز، [4] ڈرانا [5] آواز پست کرنا۔
[6] اس وقت تک متقی نہیں بنتا، جب تک ناجائز کے خوف سے جائز کو بھی نہ چھوڑ دے۔

ف :۔ اس واقعہ سے اس نابینا صحابیؓ کا حضورؐ کے ساتھ کس قدر جوشِ محبت اور پاسِ ادب ثابت ہوتا ہے، یہ قتل سیاستاً اور زجراً ہے کہ علانیہ ایسے کلمات کا کہنا کہ اس کا فر کے مذہب میں بھی داخل نہیں، پھر بار بار جو دلیل ہے۔ تمرّد اور اسلام کے استخفاف کی بلاشبہ موجب زجر بالقتل ہے۔

دوسری روایت امام بخاری نے کتاب الشروط میں قصہ حدیبیہ کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ عمرو بن مسعود رئیس مکہ نے آپ کی مجلس شریف سے مکہ واپس جاکر لوگوں سے بیان کیا کہ اے میری قوم! واللہ میں بادشاہوں اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں گیا ہوں۔ واللہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے مصاحب اس کی اس قدر تعظیم کرتے ہوں جس قدر صحابہؓ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعظیم کرتے ہیں واللہ وہ جب کھنکار پھینکتے ہیں، تو وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور وہ اس کو اپنے چہرہ و بدن پر مل لیتا ہے اور جب آپ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں، تو وہ تعمیل حکم کے لیے دوڑتے ہیں۔ اور جب آپؐ وضو کرتے ہیں، تو ان لوگوں کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ وضو کا گرتا ہوا پانی لینے کے لیے گویا اب لڑ پڑیں گے اور جب آپ کلام فرماتے ہیں، تو وہ لوگ اپنی آوازوں کو آپ کے سامنے پست کر لیتے ہیں اور وہ لوگ آپ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھتے تک نہیں۔ (الحدیث)

ف :۔ اس سے صحابہؓ کے جو کچھ آداب ثابت ہوتے ہیں، ظاہر ہے۔

تیسری روایت مشکوٰۃ میں بروایت امام احمد براء ابن عازب سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری کے جنازہ میں گئے اور قبر تک پہنچے۔ ابھی میت کو لحد میں نہیں رکھا تھا (کچھ دیر ہوگئی) آپؐ بیٹھ گئے اور ہم آپ کے گرد اگرد اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے تھے (یعنی نہایت سکون اور سکوت کے ساتھ)

ف :۔ صحابہؓ کا حضور کی خدمت میں اس طرح بیٹھنے کا معمول تھا۔ اس سے غایت ادب ثابت ہوتا ہے اور اس قسم کی بے شمار روایات وارد ہیں۔ علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ یہ آداب بعد وفات بھی باقی ہیں چنانچہ مواہب میں ہے کہ جب آپؐ کی صوت[1] پر صوت بلند کرنا اعمال کے حبط ہونے کا موجب ہے، تو اپنی آراء اور ہواء[2] کو آپؐ کی سنت اور حکم پر بڑھانے کی نسبت کیا گمان رکھتے ہو، اور جب آپ کی مجلس سے بغیر اجازت جانا جائز نہیں تو آپؐ کی تفاصیل دین سے دوسری طرف جانا کیسے جائز ہوگا اور دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جس طرح حضورؐ کے سامنے رفع صوت جائز نہیں تھا، اس طرح آپ کے ارشادات کے درس اور احکام کی نقل کے وقت بھی رفع صوت حاضرین و سامعین کے لیے خلاف ادب ہے اور اسی طرح محل جسد شریف کے قریب بھی رفع صوت ناجائز ہے۔ مواہب میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ خلیفہ منصور ابو جعفر نے امام مالک سے کسی مسئلے میں مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر گفتگو کی، تو

---

[1] آواز [2] خواہشات

امام مالکؒ نے فرمایا کہ امیر المومنین تم کو کیا ہوا؟ اس مسجد میں آواز بلند کرو۔ کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وفات کے بعد وہی ہے جو حالت حیات میں تھا۔ سو ابو جعفر دب گیا۔ اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ نے اہل طائف کے دو شخصوں سے فرمایا تھا کہ کیا تم مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی آواز کو بلند کرتے ہو؟ (روایت کیا اس کو بخاری نے وکذا فی المشکوٰۃ باب المساجد)

پس آپؐ کے نام کی، قرب مقام کی، کلام کی اور احکام کی، سب کی تعظیم واجب ہے اور منجملہ اسی تعظیم احکام کے یہ ہے کہ تعظیم ظاہری میں حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو یعنی مثلاً کسی اور نبی کی یا حضرت تعالیٰ جل مجدہٗ کی بے ادبی نہ ہونے لگے چنانچہ چوتھی اور پانچویں درج ذیل روایات سے ظاہر ہے۔

چوتھی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک مسلمان اور یہودی کے جھگڑے کے قصے میں روایت ہے کہ مسلمان نے اپنی قسم میں کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم پر برگزیدہ بنایا۔ یہودی نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام عالم پر برگزیدہ بنایا۔ مسلمان نے اس وقت ایک طمانچہ یہودی کے منہ پر مارا۔ یہودی نے جاکر حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ نے مسلمان سے تحقیق فرمائی۔ اس نے پورا قصہ عرض کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا، تم مجھ کو موسیٰ علیہ السلام پر (ایسی) فضیلت مت دو (جس میں) ان کی بے ادبی کا شائبہ بھی ہو۔ جیسا کہ تفاضل میں لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ جانے سے اس کا شبہ واقع ہو سکتا ہے۔ (روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے کذا فی المشکوٰۃ)

پانچویں روایت حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، جانیں مصیبت میں آگئیں اور بال بچے بھوکے مرنے لگے اور اموال تباہ ہونے لگے (یعنی قحط کے سبب) سو آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے بارش کی دعا کیجیے۔ سو ہم آپ کو خدا کے نزدیک شفیع لاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو آپؐ کے نزدیک شفیع لاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اس کلمے سے نہایت مضطرب ہوئے اور) سبحان اللہ سبحان اللہ فرمانے لگے اور اس قدر مکرر سہ کرر تسبیح فرمائی کہ اس کا اثر صحابہؓ کے چہروں میں دیکھا گیا۔ پھر فرمایا، کم بختی مارے خدا تعالیٰ کو کسی کے نزدیک شفیع نہیں لایا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت زیادہ عظیم ہے (الحدیث) (روایت کیا اس کو ابو داؤد نے کذا فی المشکوٰۃ)

ف:۔ گو شفیع کا بے عظیم بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے آپنے دوبارہ مغیث فرمایا کہ میں حکم نہیں کرتا، شفاعت کرتا ہوں لیکن لوازم شفاعت سے یہ ہے کہ شفیع اس حاجت کو پورا کرنے سے خود عاجز اور جس سے شفاعت کرتا ہے، اس کا محتاج ہوتا ہے اور عجز و احتیاج کا تو احتمال بھی خدا تعالیٰ کی ذات میں محال ہے پس چونکہ اس عنوان میں اگرچہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، مگر حق جل شانہٗ میں سوء ادب ہونے کی وجہ سے آپؐ پر کس قدر گراں گزرا اور آپ نے کس اہتمام سے اس سے رد کیا۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

۱۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کو قرآن پاک میں اجمالاً اس طرح بیان فرمایا گیا ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(آل عمران ۱۶۴ ۔ دیکھیں البقرہ ۱۵۱ ۔ الجمعۃ ۲)

یعنی اللہ پاک کی آیات کی تلاوت، لوگوں کا تزکیۂ نفس، قرآن پاک کا علم اور حکمت، یہ چار خصوصیات ایسی ہیں جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ ہیں۔

۲۔ خود حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پانچ خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ صحیحین میں جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلَا تَحِلُّ لِاَحَدٍ مِنْ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً ۔

مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں :
۱۔ ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رُعب طاری ہو جاتا ہے
۲۔ ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی ہے جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ۳۔ غنیمت کا مال میرے لئے حلال کر دیا گیا ہے جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا ۴۔ مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے
۵۔ پہلے کے نبی اپنی قوم کے لیے خاص ہُوا کرتے تھے مگر میں ساری دنیا کے لیے نبی ہو کر آیا ہوں ۔

۳۔ قرآن پاک میں آتا ہے :۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء ۱۰۷) =
اور آپ کو جو ہم نے بھیجا تو سارے جہانوں کے واسطے رحمت بنا کر۔

رب العلمین نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا ––

۴۔ قرآن میں ہے کہ :۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۲۸) =
اور آپ کو جو ہم نے بھیجا، تو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو

۵۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں ۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ

خاتم النبیّٖنؕ و کان اللّٰہُ بکلِ شیءٍ علیماً ہ (الاحزاب-۴۰)

= محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں پر مہر ہیں اور اللہ پاک سب چیزوں کو جانتا ہے۔

مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اسی لیے اُن کے صاحبزادے مرد ہونے سے پہلے فوت ہو گئے۔ وہ رسول ہیں اور نبیوں پہ مہر ہیں یعنی نبیوں کے سلسلے پر مہر ثبت کرنے والے ہیں اور جب وہ رسول ہی ہیں (وما محمّد الّا رسول) تو پھر اُن کی جائداد میں اولادِ صلبی کا حق نہیں تھا۔

۶۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے ہاتھوں دین کو مکمل کیا گیا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ (المائدہ-۳)

= آج میں پورا دے چکا تم کو دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین اسلام۔

۷۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو بے مثل بنایا۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ہ (البقرہ-۲۳)

= اور اگر تم ہو شک میں اس کلام سے جو اُتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورت اس قسم کی اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔

۸۔ حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹)

= ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت (قرآن) اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ تقریباً چودہ سو سال ہو چکے ہیں کہ قرآن قطعاً محفوظ ہے اور ہر سال تراویح میں حفّاظ کا امتحان بھی لیا جاتا ہے تاکہ کسی طرح کی کوئی تحریف کا شائبہ بھی باقی نہ رہے۔

۹۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن کو مُطہّر لوگ ہی (دل سے) چھو سکتے ہیں — لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ہ (الواقعہ-۷۹)

= اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنے ہیں۔

مُطَهَّر، اسم مفعول ہے جس کا فاعل اللہ پاک ہے۔ چنانچہ اس لفظ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو صحیح عقیدہ بخشا گیا ہے وہی اس قرآن کو دل سے چھو سکتے ہیں۔ یعنی بدعقیدہ لوگ اس کے حافظ نہیں ہو سکتے۔

۱۰۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی معراج پر بلایا گیا۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَاؕ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ
(بنی اسرائیل۔۱)

= پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصا تک جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں کہ دکھائیں اُس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے۔ وہی ہے سنتا دیکھتا۔

پھر سورۃ النجم کی ابتدائی اٹھارہ آیتوں میں اس معراج کی تفصیل ہے۔ کچھ آیتیں یہ ہیں:۔
فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی = پھر رہ گیا فرق دو کمانوں کا بلکہ اس سے بھی نزدیک۔
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی = بہکی نہیں نگاہ اور حد سے نہیں بڑھی۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک تجلی دیکھی تھی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور وہ بیہوش ہو گئے تھے (الاعراف ۱۴۳)

۱۱۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو وحی فرمایا گیا ہے۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ (النجم ۳۔۴)

= اور نہیں بولتا اپنی چاؤ سے۔ یہ تو وحی ہے جو پہنچی ہے۔

" تجلی ربانی کا یہ استیلا سے تام ہوا کہ جو کچھ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ وحی الٰہی ہوتی ہے" (روح البیان)

۱۲۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی کوثر دیا گیا۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (الکوثر۔۱)
= بے شک ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔
یعنی آخرت میں جس کو چاہیں گے کہ حوضِ کوثر سے پلائیں گے۔ کوثر کے معنی بے شمار خوبیاں بھی ہیں۔ بہر حال کوثر عطا کیا گیا ہے اور عطا کی ہوئی چیز واپس نہیں لی جاتی۔

بخاری اور مسلم میں بھی ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بخشی ہوئی چیز کو واپس لینے سے منع فرمایا ہے۔
(منقول از ریاض الصالحین نوویؒ مترجم صفحہ ۳۲۴)

۱۳۔ صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کو اللہ پاک نے سب سے زیادہ بلند کیا۔ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الانشراح۔۴)

لہ اس خصوصی معراج میں آٹھ انبیاء علیہم السلام سے بھی ملاقات ہوئی۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم سے، دوسرے آسمان پر یحییٰ اور عیسیٰ سے، تیسرے آسمان پر یوسف سے۔ چوتھے آسمان پر ادریس سے۔ پانچویں پر ہارون سے۔ چھٹے پر موسیٰ سے اور ساتویں پر ابراہیم (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے۔

= اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔

حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے اس آیت کو دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ کے ذکر کی بلندی یہ ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے تو میرے ساتھ آپ کا بھی ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "اذان میں، تکبیر میں، تشہد میں، منبروں پر، خطبوں میں"۔ پس اسی طرح درود و سلام میں، نیز بے شمار درس و تدریس اور گفتگو کے مواقع میں اللہ پاک کے بعد سب سے زیادہ ذکر آپ ہی کا آتا ہے۔

۱۴۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتیوں کے دل میں آپ کے لئے جو محبت پیدا کی گئی ہے وہ کسی دوسرے نبی کے لیے اُن کے اُمتیوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزر چکنے کے باوجود ایک بے عمل اور گناہ گار اُمتی بھی آپ کے نام پر مر مٹنے کو تیار ہے اور آپ کی شان میں ذراسی گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک حدیث ہے کہ:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○

تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری محبت اُس کو اُس کے والدین اور اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ نہ ہو۔

آج کا بے عمل مسلمان بھی ایسی محبت کا احساس اپنے دل میں رکھتا ہے۔ الحمدللہ علیٰ احسانہٖ

۱۵۔ جتنی بُرائی ہو اُتنی ہی سزا دی جائے تو یہ عدل ہے اور اگر ایک نیکی کا دس نیکیوں کے برابر اجر دیا جائے تو یہ رحمت ہے اور یہ خصوصیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو حاصل ہے۔ سورۃ الانعام (۱۶۱) میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰىٓ اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ = جو کوئی لایا نیکی اُس کو ہے اُس کے دس برابر اور جو لایا بُرائی تو سزا پائے گا اُتنی ہی اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

۱۶۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ اُن کے بیس اُمتی، دو سو پر غالب ہوئے اور اُن کے سو اُمتی، ایک ہزار پر غالب ہوئے۔ سورۃ الانفال (۶۵) میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

اے غیب کی خبریں بتانے والے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دو۔ اگر تم میں سے بیس صبر والے ہوں گے دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے سو ہوں گے تو کافروں کے ہزار پر غالب آئیں گے، اس لیے کہ وہ سمجھ نہیں رکھتے

اس کے بعد کی آیت میں مسلمانوں کی کمزوری کے باوجود اُن کو اپنے سے دو گنے پر غالب ہونے کی بہر حال بشارت دی گئی ہے۔

۱۷۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی ہر مسلمان کو محبوبیت کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ سورۃ آل عمران (۳۱) میں ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

آپ فرما دیں کہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥

کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

۱۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کامل و مکمل ہے اور ایسی بے داغ ہے کہ کسی موقع پر اور کسی زمانے میں اُسے بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا ہے کہ "جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اُس کو جلوت میں برملا بیان کرو، جو حجرہ میں کہتے سنو اُس کو چھتوں پر چڑھ کر پکار دو ——

اَلا فلیبلّغ الشاھد الغائب ۔

اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو اللہ پاک نے دنیا کے سامنے بطورِ چیلنج کے پیش کر دیا ہے کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ٥ (الاحزاب - ۲۱)

بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے، اُس کے لیے کہ جو اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے ۔

یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی، ایمان والے کے لیے ہر طرح بہتر ہے اور اُن کی حیاتِ طیبہ ایسی مثالی ہے کہ اسی کی پیروی سے ہر خیر و فلاح کے دروازے کھل سکتے ہیں ؛

۱۹۔ توبہ کرنے والے کے لئے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہی قابلِ قبول ہے بغیر اس شفاعت کے محض توبہ کافی نہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ٥ (النسآء ۶۴)

اور جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں (نافرمانی کریں) تو اے محبوب وہ تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول اُن کی شفاعت فرمائے تو ضرور وہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں ——

اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اُن کے اُمتیوں کے لیے ضرور کارگر ہوگی ۔

۲۰۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی قیامت میں ہر اُمت کے گواہ اور نگہبان بنائے جائیں گے ۔ سورۃ النسآء (۴۱) میں ہے :-

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ ۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ٥

تو کیسا ہوگا جب ہم ہر اُمت سے ایک گواہ لائیں (جو اُمت کے تمام اعمال پر گواہ ہوگا) اور اے میرے محبوب، تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہبان بنا کر لائیں گے ۔

اسی طرح سورۃ النحل (۸۹) میں بھی ہے اور سورۃ البقرہ (۱۴۳) میں بھی ہے :-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ٥

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب اُمتوں میں افضل کہ تم، لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان اور گواہ ہیں ۔

اس دوسری آیت کے سلسلے میں بخاری (کتاب التفسیر، جلد دوم ص۱۲۱) میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ پاک نوح علیہ السلام کو بلائے گا۔ وہ آئیں گے اور عرض کریں گے کہ اے رب میں حاضر ہوں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے ہمارے احکامات کو لوگوں تک پہنچادیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ جی ہاں، اس کے بعد اُن کی اُمت سے دریافت کیا جائے گا کہ تمھارے پاس خدا کے احکامات لے کر کوئی رسول آیا تھا یا نہیں؟ وہ اُمت کہے گی کہ نہیں آیا۔۔۔۔۔ اُس وقت میری (حضورؐ کی) اُمت گواہی دے گی کہ بے شک نوح علیہ السلام نے احکامِ الٰہی کی تبلیغ کی تھی اور میں کہوں گا کہ یہ لوگ سچ کہہ رہے ہیں"۔

عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر ضرور کھڑا کرے گا۔

(بنی اسرائیل ۷۹)

مقامِ محمود ہی مقامِ شفاعت ہے کہ جب حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کھڑے ہوں گے تو جملہ اولین و آخرین حضور کی حمد کریں گے (تفسیر خازن)۔
اس آیت کی تفسیر میں صحیحین میں وہ حدیث موجود ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سب کی شفاعت فرمائیں گے۔

(۲۱) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت نمایاں خصوصیت تکمیلِ مکارمِ اخلاق ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم۔۴) اور بے شک آپ کو خلقِ عظیم پر پیدا کیا ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی فرمایا ہے کہ:-

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَ مَحَاسِنَ الْاَعْمَالِ ۔ میں بزرگ ترین اخلاق اور نیکو ترین اعمال کی تکمیل کے لیے نبی بنایا گیا ہوں ——

(۲۲) اللہ پاک نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝ (الاحزاب ۴۶)

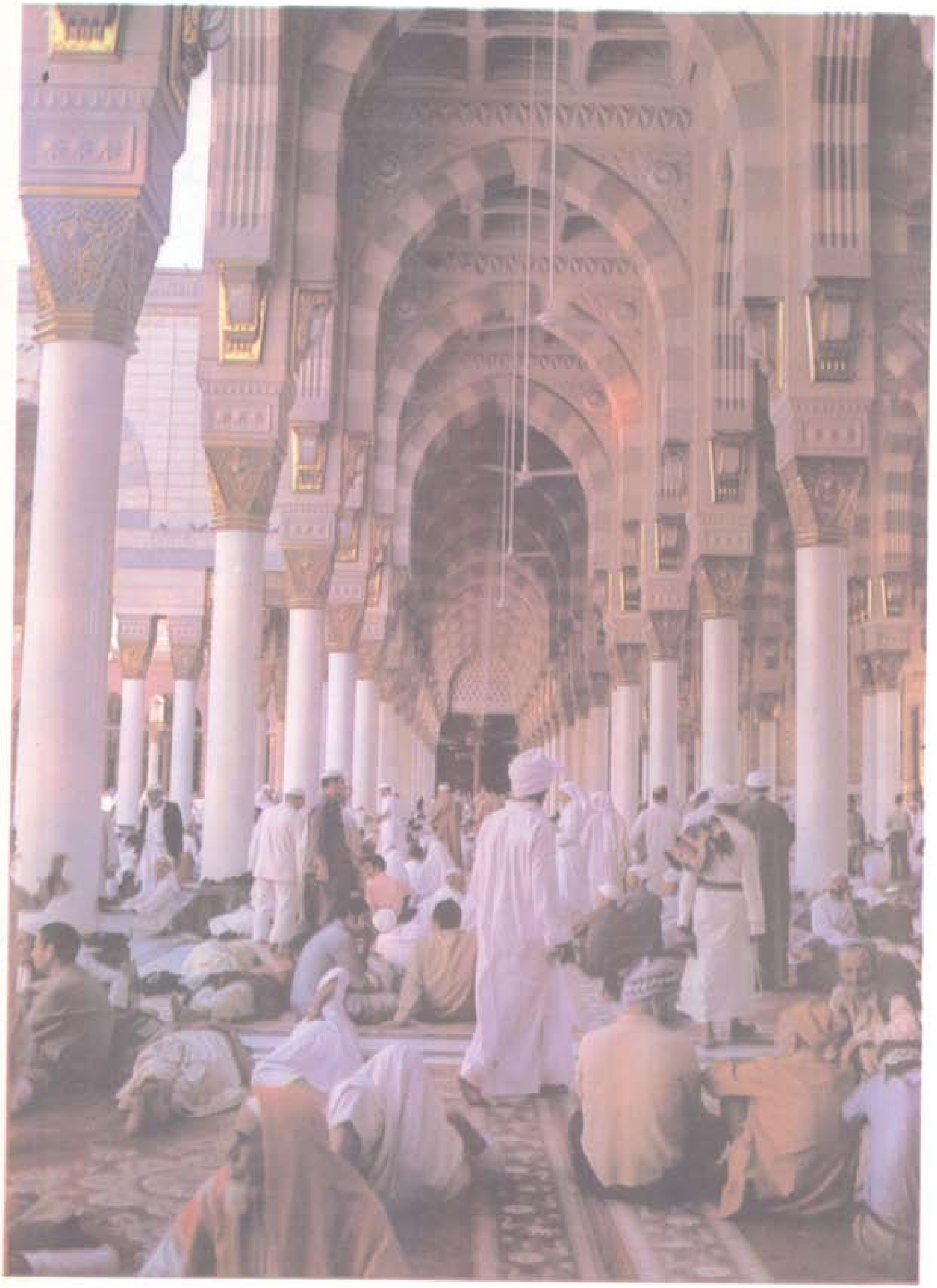
اس آیت میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد، مُبشر، نذیر، اللہ کی طرف اُس کے اذن سے داعی اور سراجِ منیر کہا ہے محققین کا خیال ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کو سراجِ منیر نہیں کہا گیا۔

(۲۳) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم "سراجِ منیر" ہیں تو اُن کے صحابہ نجوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے کہ:-

اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمْ اِقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ۔ میرے صحابہ مانند نجوم کے ہیں، ان میں سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

کہا جاتا ہے کہ ۲۳ سال کی نبوی زندگی میں قریب ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ مستفیض ہوئے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں وہ کامل ہدایت کے اہل قرار دیے گئے۔ پوری کائنات میں کبھی ایسی جماعت تیار نہیں ہو سکی —— یہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔

(۲۴) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو کائنات پیدا نہ کی جاتی۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ اِن الفاظ میں تمام و کمال حقیقت کی قوت پوشیدہ ہے۔



مسجدِ نبوی کا اندرونی منظر

(۲۵) صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے ہمیشہ پیار کے ناموں سے یاد کیا ہے ۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یا آدم یا نوح یا ابراہیم ۔ یا موسیٰ ۔ یا عیسیٰ کہہ کر خطاب کیا ہے لیکن حضورؐ کو کبھی یا محمد کہہ کر خطاب نہیں کیا ۔ بلکہ یا مُزمّل (اے کملی والے) یا مُدثّر (اے لحاف والے) ۔ یٰسٓ (اے سیّد) جیسے القاب سے یاد کیا ہے اور خود اپنے توصیفی ناموں میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شریک کیا ہے ۔ مثلاً اللہ پاک رؤف بھی ہے رحیم بھی ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی رؤف اور رحیم کہا ہے :

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ۔ ۱۲۸) وہ مومنوں سے بہت پیار کرنے والے اور اُن پر ہمیشہ رحم کرنے والے ہیں ۔

ان کے علاوہ نور ۔ متین ۔ عزیز ۔ بَرّ ۔ رشید بھی اللہ پاک کے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی توصیفی نام ہیں ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ چند امتیازی خصوصیات ہیں ورنہ آپ کی حیاتِ طیّبہ کا ہر واقعہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور جامی نے ہرگز مبالغہ نہیں کیا جبکہ انہوں نے یہ کہا کہ :۔ ؎

ہمہ قرآں در شانِ محمدؐ

رحمت و رافت کی روحِ رواں

عبد الرحمٰن عزام بک

تاریخ عرب بلکہ تاریخ عالم میں بہت سی اولوالعزم ہستیاں پائی جاتی ہیں، جن کے کارنامے اور تذکرے ہمیشہ انسانوں کے کانوں میں گونجتے رہیں گے۔ ان کے اندر ایسی صفات تھیں، جن کے ذریعہ فلاح و کامیابی نے ان کے قدم چومے، یہی لوگ بہادر کہلاتے ہیں۔

ہم نے اسلام کے بطلِ اعظم کے بعض کارناموں اور صفات کو بیان کیا ہے، جن میں ہم نے ظاہر کردیا، کہ کس طرح آپ ان تمام صفات کے حامل تھے، اب ہم آپ کی اس رحمت و رافت کو قلم بند کرتے ہیں، جس کے ادنیٰ درجہ کو بھی کوئی شخص نہ پاسکا۔ آپ تنگ دستی و فراخ دستی، قوت و ضعف، فقر و غنا غرض کہ ہر حال میں رحمت و رافت کا مجسمہ اور شفقت و محبت کی جیتی جاگتی تصویر تھے، احسان اور بھلائی ہمیشہ آپ کی کنیز تھی اور رحمت آپ کے سامنے دست بستہ ہر وقت کھڑی رہتی تھی، آپ فرماتے ہیں: "احسان اور بھلائی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، خدا تم پر رحم فرمائے گا۔ جو شخص لوگوں پر مہربان نہیں، خدا بھی اپنی رحمت سے اس کو نہیں نوازتا، رحم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتا ہے، بدکار کے دل سے رحمت و شفقت چھین لی جاتی ہے،" قرآن مجید میں آپ کی صفت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

لقد جآءكم رسولٌ من انفسكم	تمہیں میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے، جس پر
عزيزٌ عليه ما عنتم حريصٌ عليكم وبالمؤمنين	تمہاری تکلیف بہت شاق ہے، وہ تمہارا دلدادہ ہے
رءوفٌ رحيمٌ۔	اور مومنوں پر مہربان اور شفیق ہے۔

آپ کی رحمت پوری دنیا کے لیے عام تھی، آپ مسلمانوں اور مشرکوں پر احسان اور بھلائی کیا کرتے تھے۔ فقیروں، مسکینوں اور کمزوروں کے ساتھ آپ کو بے حد محبت تھی، فقراء کے ساتھ تو آپ کی محبت کا یہ عالم تھا، کہ آپ نے خدا سے دعا مانگی تھی، کہ زندگی اور موت کے بعد انہیں میں آپ کو باقی رکھے، حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے تھے، "اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کی جماعت کے ساتھ اٹھا،" حضرت عائشہ رضؓ نے دریافت کیا۔ ایسا کس لیے ہے، یا رسول اللہؐ؟ آپ نے فرمایا کیوں کہ یہ لوگ مال داروں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوجائیں گے، اے عائشہ رضؓ مسکین کو خالی ہاتھ مت لوٹانا، کھجور کا ایک ٹکڑا ہی سہی انہیں دے دینا، اے عائشہ رضؓ مسکینوں سے محبت رکھ، اور ان کی قربت میں رہ، خدائے تعالیٰ بھی قیامت کے دن تجھے اپنے قریب کرے گا۔"

الحاصل آپ کی زندگی فقیروں کے ساتھ بسر ہوتی تھی، جو کچھ آپ کے گھر میں موجود ہوتا، آپ انہیں خیرات کردیتے تھے، آپ اُن پر اس قدر مہربان تھے کہ ایک آدمی آپ کے سامنے سے گزرا، آپ نے اپنے پاس کے ایک شخص سے دریافت فرمایا، اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا، یہ شریف آدمیوں میں سے ہے، یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی سے منگنی کرے، تو بیاہ دیا جائے اور اگر کسی کی سفارش

کرے، تو اس کی سفارش قبول کرلی جائے، پھر دوسرا شخص گزرا۔ آپ نے فرمایا اس کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ یہ فقیر آدمی ہے۔ یہ اس لائق ہے کہ اگر وہ منگنی کرنا چاہے، تو رد کر دیا جائے۔ اگر سفارش کرے تو نامنظور کر دی جائے، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کو نہ سنا جائے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا: "یہ شخص روئے زمین کے تمام آدمیوں میں بہتر ہے۔"

الغرض آنحضور اکرم ؐ اپنی رحمت و شفقت اور تائید ایزدی کے ذریعہ، جو آپ کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی، فقراء و مساکین کی شان و عظمت اور ان کی توقیر و منزلت کو دوبالا کیا کرتے تھے۔ کمزوروں کی دستگیری اور یتیموں اور بیواؤں کی غمگساری اور ہمدردی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، نیز آپ نے ان تمام کمزور طبقات پر وہ احسان کیا کہ تھوڑی مدت میں سوسائٹی کے نظام میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا، انہی بے چارے فقیروں اور مسکینوں میں وہ روح پھونکی کہ آخر کار انہوں نے مشرق و مغرب کو اپنا تابع فرمان بنا لیا۔ آنحضرت ؐ فرمایا کرتے تھے: "تم اپنے مسکین اور کمزور آدمیوں کو میرے روبرو پیش کرو، کیونکہ انہی لوگوں سے تم فتح و غلبہ حاصل کرو گے۔" آپ ان کی جماعت میں بیٹھنے کو بہت مرغوب سمجھتے تھے، ایک مرتبہ آپ اپنی قوم کے بعض مالدار اشخاص سے گفتگو میں ایسے محو ہو گئے کہ ایک اندھے شخص کی طرف توجہ نہ فرما سکے اس وقت بطور عتاب و تنبیہ کے آپ پر وحی نازل ہوتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَن جَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔

یہ پیغمبر چیں بجبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے۔ اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا، یا نصیحت قبول کرتا۔ پس اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا، تو جو شخص بے پروائی کرتا ہے، آپ اس کی تو فکر میں پڑے رہتے ہیں۔

قریش یہ دیکھ کر، کہ آپ مسکینوں کی صحبت میں رہتے اور ان کے ساتھ کعبۃ اللہ جاتے ہیں، آپ کا مذاق اڑاتے اور کہتے:

اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْ بَیْنِنَا "کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان احسان کیا ہے۔"

مگر آنحضرت ؐ مساکین کے ساتھ بہت ہی مہربان اور شفیق تھے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور فقراء کے ساتھ بیٹھے اور ان کو جنت کی خوشخبری سنائی، تو ان کے چہروں پر مسرت اور خوشخبری کے آثار نمایاں ہونے لگے، میں چونکہ ان کے گروہ سے نہیں تھا، اس لیے غم زدہ سا ہو گیا۔"

آپ نے سعد بن ابی وقاص کو مسکینوں پر اپنی بزرگی اور بڑائی جتاتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا: "اس کو جو کچھ بھی بھلائی اور فتح و نصرت نصیب ہوگی، وہ انہی مسکینوں اور فقیروں کی صحبت کا فیض ہوگا۔" چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی اس وقت پوری ہوئی۔ جب کہ حضرت سعد رضؓ نے جنگ قادسیہ کے موقعہ پر مسکینوں کی قیادت فرمائی اور رستم کو شکست فاش دے کر کسریٰ کی سلطنت کو پامال کر دیا۔

مسکینوں کی وفات کے بعد بھی آپ کی رحمت اور آپ کا احسان ان پر برابر جاری رہتا۔ صحیح بخاری میں وارد ہے کہ آنحضرت ؐ نے ایک دن ایک حبشی کو یاد فرمایا اور پوچھا کہ وہ کہاں ہے، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو فوت ہو چکا۔ آپ نے فرمایا تم نے کیوں

نہیں اس سے پہلے اس کی اطلاع دی؟ لوگوں نے کہا وہ ایسا ایسا تھا، گویا انھوں نے اس کی تحقیر و مذمت کی، آپ نے فرمایا اس کی قبر کہاں ہے؟ مجھے نشان دہی کرو، چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لائے اور نماز پڑھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں کی آزادی اور ان کی شان و منزلت کو بلند کرنے میں بہت ہی جد و جہد فرماتے تھے۔ ان کی راہ میں مال، دولت، حشمت غرض کہ ساری چیزیں قربان کر دیتے تھے، آپ ان پر بہت مہربان اور شفیق تھے۔ سب سے مشہور قصہ آپ کے غلام زید بن حارثہ کا ہے، آپ نے ان کو اپنے مالک (خود آنحضورؐ) اور ان کے والد کے درمیان اختیار دے دیا کہ جس کو چاہیں پسند کر لیں، لیکن انھوں نے آپ کو ایسے زمانے میں اپنے والد پر ترجیح دی، جب کہ آپ کے پاس نہ دولت و قوت تھی اور نہ مدافعت کا سامان، اس وقت آپ قریش کی مصیبتوں اور اذیتوں کا شکار بنے ہوئے تھے، ایک وہ دور بھی آیا جس میں آنحضرتؐ نے زید بن حارثہ کو غزوۂ روم کو لشکر روانہ کرتے وقت مہاجرین اور انصار کا قائد اعظم بنایا، جب موتہ کی لڑائی میں یہ شہید ہو جاتے ہیں، اس وقت آپ کی عمر صرف بیس سال کی تھی، تو قریش کے بڑے بڑے لوگ، صحابہؓ اور آنحضرتؐ آپ کے جنازے کے ساتھ تھے۔

اُوپر کے واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ غلاموں کی شان و عظمت کو دوبالا کرنے کے لیے اُن کے ساتھ کس قسم کا حسن سلوک کرتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے: "غلاموں کے ساتھ بدسلوکی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ بھی آپ کا ارشاد ہے: اچھی لونڈی باعث یمن و برکت اور بُری لونڈی موجب شر ہے:"

خدمت گزاروں اور مزدوروں کے ساتھ آپ نہایت اچھا برتاؤ کرتے تھے، ابُو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا "جب کوئی تمہارا خادم کھانا لائے، اگر وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے، تو اس کو ایک دو لقمے دے دو" معاویہ بن سوید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہمارے پاس صرف ایک خادم تھا، ہم میں سے کسی نے اس کے ایک طمانچہ لگایا، آنحضرت کو جب اس کی خبر پہنچی، تو آپ نے فرمایا: "اس کو آزاد کر دو" آپ سے کہا گیا کہ ان کے پاس سوائے اس کے کوئی اور خادم نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا، اس سے خدمت لیتے رہو، جب کوئی دوسرا مہیا ہو جائے، تو اس کو آزاد کر دو" ابُو مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک غلام کو کوڑے سے مارا، مَیں نے اپنے پیچھے آواز سُنی مڑ کر دیکھا تو آنحضرتؐ یہ فرما رہے تھے: "اے ابُو مسعُود! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ خدائے تعالیٰ اس غلام سے زیادہ تجھ پر قدرت رکھتا ہے"

آپ کی رحمت و شفقت کا یہ عالم تھا، کہ آپ کسی سے یہ سُننا بھی گوارا نہ فرماتے تھے کہ وہ اپنے غلام کو "اے میرے غلام یا میری لونڈی" کہہ کر پکارے، آپ مسلمانوں کو اس قسم کے القاب سے پکارنے کو باز رکھتے تھے۔ آپ کی یہ تعلیم و تربیت، غلاموں کو آزاد کرنے، ان کے اور آقا کے درمیان مساوات قائم کرنے، نخوت و غرور اور عصبیت جاہلیت کے فاسد و ردی تخیلات کو دُور کر کے ان کے اندر اخوت کی روح پھونکنے کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔

معرور بن سویدؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے ابُو ذر کے جسم پر ایک چادر دیکھی، اسی قسم کی چادر ان کے غلام کے جسم پر بھی تھی، مَیں نے اس کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے کہا کہ آنحضرتؐ کو مَیں نے یہ کہتے ہُوئے سُنا ہے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، خدا نے ان کو تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ جس کسی کے ماتحت اس کا بھائی ہو تو اس کو چاہیے کہ یہ جو کچھ کھائے اور اوڑھے اس کو بھی وہی کھلائے اور پہنائے، تم

ان کی طاقت اور برداشت سے زیادہ کوئی تکلیف نہ دو، اگر کوئی مشکل کام ان کے سپرد کرو، تو تم بھی اس میں ان کی اعانت کرو اور ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال خدمت کی، آپ نے مجھے کبھی اُف تک نہیں کہا، آنحضرت مسکینوں، خدمت گزاروں اور غلاموں سے میل جول رکھتے تھے، ان سے خندہ پیشانی سے گفتگو فرماتے، ان کی دعوت قبول کرتے، اُن کے بیماروں کی عیادت پرُسی کے لیے تشریف لے جاتے، اُن کے جنازوں میں شریک ہوتے اور ان کے موتی پر نماز پڑھتے تھے۔

شریعت محمدیہ نے بیت المال میں سے غلاموں کی آزادی کا بھی حصہ مقرر فرمایا ہے، آنحضرت غلام کو آزاد کرنے کے بعد اس کو کچھ دے دیا کرتے تھے، تاکہ وہ کوئی معاملہ کرے یا کسب معاش کا ذریعہ ڈھونڈھے۔

آپ کی رحمت و شفقت اور احسان اور بھلائی نہ صرف انسانوں تک ہی محدود تھی، بلکہ آپ جانوروں پر بھی نرمی اور رحم فرماتے تھے۔ عربوں میں جانوروں اور انسانوں سے متعلق بے شمار ذلیل عادات اور انسانیت سوز حرکات پائی جاتی تھیں، آپ نے ان تمام کا سدباب کیا اور نفرت و بے رحمی کے جذبات کو ان سے دور کر دیا، وہ لوگ زندہ حیوانات کے بدن سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر بھون لیا کرتے اور ان کو کھاتے تھے، چنانچہ آپ نے اس بے رحمانہ فعل کو حرام قرار دیا۔ آجکل بھی صحرائے کبریٰ میں ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جن میں اس دردانگیز فعل کی خوبو پائی جاتی ہے، جب وہ کسی جنگ کے لیے نکلتے ہیں اور ان کو دور دراز ملک کا سفر کرنا پڑتا ہے، تو اونٹ کے پچھنے لگا کر اس کا خون چوستے پھر اس کا گوشت پکا کر کھاتے ہیں، یا اس کی کوہان چیر کر اس کی چربی نکال کر کھا لیتے ہیں اور کوہان کو سی دیتے ہیں، چنانچہ آپ نے اس ایذا رساں فعل سے منع فرمایا، عرب اپنے جانوروں پر تیر آزمائی کرتے اور گھوڑوں کی دُمیں کاٹ دیتے تھے۔ آپ نے ان تمام حرکات سے روکا، ایک مرتبہ آپ نے ایک اونٹنی کو بھوکی پیاسی بندھی ہوئی پایا، تو آپ نے اس کی رسی کھول دی اور اس کو چھوڑ دیا اور لوگوں کو نصیحت کی کہ جانوروں کے معاملہ میں حذر کرتے رہیں۔

آنحضرت نے اس معاملہ میں بے شمار مثالیں بیان فرمائی ہیں، آپ نے فرمایا کہ ایک آدمی سفر کر رہا تھا کہ اثنائے راہ میں اس کو سخت پیاس محسوس ہوئی، اس نے ایک کنواں دیکھا، اس میں اتر کر پانی پیا، باہر نکلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے بہت بیتاب ہے، زبان باہر نکالے ہوئے مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے جیسی پیاس لگی تھی، ویسی ہی اس کتے کو بھی لگی ہے وہ کنوئیں میں اترا اور موزہ میں پانی بھر کر کتے کے مُنہ میں ڈالا، کتا سیراب ہو گیا۔ اس شخص نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے گناہ معاف ہو گئے۔

لوگوں نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں بھی ہمیں ثواب ملے گا، آپ نے فرمایا: ہر زندہ شئی میں ثواب ہے۔ آپ نے فرمایا ایک عورت بلی باندھے رکھنے کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہو گئی۔ نہ اس نے اس کو کچھ کھلایا اور نہ ہی اسے کھلا چھوڑا تاکہ وہ زمین کے کیڑے کوڑے کھا کر اپنی بھوک رفع کرتی۔

یہ تمام تمثیلات آنحضرت نے ان لوگوں کے روبرو پیش کیں جن کو گمان تھا کہ حیوانوں کے ساتھ سلوک کرنے میں ثواب نہیں ملتا۔ مسلمانوں کے نفوس میں ان صفات کی وجہ سے نرمی اور رحم دلی کے جذبات پیدا ہو گئے، اور مشرق و مغرب میں، جو لوگ ان کے اثرات

تعلیمات سے فیض یاب ہوئے، ان میں ایک نمایاں اثر اور حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہوگئی۔ جاہلیت میں یہ بھی طریقہ رائج تھا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر بنالیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جانور اس لیے مسخر کیے ہیں کہ تم ایک شہر سے دوسرے شہر کو پہنچ سکو، اس نے تمہاری حاجتوں کو بر لانے کے لیے زمین بنائی ہے، تم اس میں اپنی ضرورتوں کی تکمیل کرو۔

آپ کی رحمت و شفقت کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ چھوٹے پرندوں تک کو کوئی گزند پہنچانا گوارہ نہ فرماتے تھے عبدالرحمن بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے، ہم نے ایک سرخ پرندہ کو دیکھا، جس کے ساتھ اس کے دو چھوٹے بچے بھی تھے، ہم نے ان کو پکڑ لیا۔ ان کی ماں پھڑ پھڑاتے ہوئے آئی۔ آنحضرتؐ جب تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کس نے ان کی ماں کو صدمہ پہنچایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔

آنحضرتؐ نے حضرت عائشہ رضؓ کو دیکھا کہ آپ اُونٹ پر بیٹھی ہوئی اس پر سختی کا برتاؤ کر رہی تھیں آپ نے فرمایا: جو نرمی نہیں کرے گا وہ اپنے اوپر اپنی بھلائی حرام کرے گا۔

انسانوں اور جانوروں کے ساتھ آپ کی رحمت و اُنس کا یہ تقاضا تھا کہ جب آپ کسی بچے کو دیکھتے یا اس سے ملتے تو محبت اور خوشی کے آثار آپ کے چہرے سے نمایاں ہونے لگتے تھے۔ کبھی کبھی آپ اپنے صحابہؓ کے بچوں کو اُٹھا کر کھلایا کرتے تھے۔ جب لڑکوں پر سے گزرتے تو ان پر سلام کرتے تھے۔ جابر بن سمرہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے لڑکوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، تو آپ بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگے۔ جب کبھی کوئی لڑکا آپ کو راستہ میں مل جاتا، تو آپ اس کو خوش کرنے کے لیے اپنی اونٹنی پر بٹھا لیتے تھے، بچے والدین سے بڑھ کر آپ سے پیار کرتے تھے۔

حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ یہ نہیں پتہ چل سکا کہ آنحضرتؐ سے بڑھ کر اپنے اہل و عیال کو چاہنے والا کوئی ہوا ہو۔ اُسامہ بن زید کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا، تو رسول اللہؐ مجھے اٹھا لیتے اور اپنے ایک زانوئے مبارک پر بٹھاتے اور حسن رضؓ کو اپنے دوسرے زانو پر پھر ہم دونوں کو بھینچ کر فرماتے "اے اللہ ان دونوں پر رحم فرما کیوں کہ میں ان پر رحم کھاتا ہوں اور اُن سے پیار کرتا ہوں" بیان کیا جاتا ہے کہ بعض اعراب نے آنحضرتؐ کو خود اپنے اور اپنے صحابہ رضؓ کے بچوں کو محبت اور پیار کرتے ہوئے دیکھا، تو بہت تعجب کیا۔ ایک مرتبہ اقرع بن حابس نے آپ کو دیکھا، کہ آپ حسین رضؓ کو بوسہ دے رہے ہیں، تو کہا یا رسول اللہؐ! میرے دس بچے ہیں۔ آج تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔ اس قسم کے سوالات بعض لوگ آپ کی غیر معمولی شفقت و محبت پر کرتے رہتے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بے رحمی، سنگ دلی اور قساوتِ قلب سے منع فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا کیا آپ لوگ بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ مگر ہم تو اُن سے کبھی پیار نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: "جب خدا نے تیرے دل سے شفقت و رحمت چھین لی ہے، تو میں تھوڑے ہی اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہوں۔"

آپ کے جذبۂ رحمت کا یہ اثر تھا کہ آپ پر جس طرح مسرت و خوشی کے آثار و جذبات ظاہر ہوتے، اس طرح آپ کا دل حزن و ملال کی کیفیات و تاثرات میں ڈوب جاتا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ سنگ دل و ستمگار لوگ آپ کی رقتِ قلب اور فراوانی شفقت پر تعجب کرنے لگتے۔ آپ ان کو ظاہر کرتے کہ یہ بھی رحمت کی ایک قسم ہے، جس میں کوئی عیب و نقص نہیں۔

آپ کی ایک صاحبزادی کی وفات ہوگئی، تو آپ کا دل پگھل رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو رہے تھے۔ سعد بن عبادہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں پیدا کی ہے، خدا اپنے رحم دل اور شفیق بندوں پر رحم کرتا ہے۔"

سعد رضؓ جب بیمار پڑ گئے، تو آنحضرتؐ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا کہ یہ اپنی بیوی کی آغوش میں پڑے ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا کیا وفات پا گیا؟ لوگوں نے کہا نہیں یا رسول اللہ! آپ رو دئے اور فرمایا سنو! اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آنسو جاری ہونے اور دل فگار غمزدہ ہونے کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا، بلکہ۔ اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے۔"

یہ رحمت نہ صرف چھوٹوں بڑوں اور مومنوں کے ساتھ مختص تھی، بلکہ دیگر ادیان و ملل کے دشمنوں، مشرکوں اور مخالفوں پر بھی شامل تھی کسی جنگ میں ایک بچہ قتل کر دیا گیا، آپ کو سن کر بہت ہی صدمہ ہوا، بعضوں نے آپؐ سے کہا یا رسولؐ اللہ! آپ کیوں اس قدر غم زدہ ہیں، وہ تو مشرکین کا بچہ تھا، آپ برا فروختہ ہو گئے اور فرمایا تم کیا کہتے ہو، کیا تم ان سے بہتر ہو گئے۔ وہ تو اپنی فطرت پر ہیں، تم بچوں کو قتل کرنے سے پرہیز کرو، تمہیں بچوں کو قتل نہ کرنا چاہیے۔"

امام بخاریؒ نے جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ ہمارے سامنے ایک جنازہ گزرا، آنحضرتؐ اُٹھ کھڑے ہوئے، آپ کے ساتھ ہم بھی اُٹھ گئے۔ ہم نے کہا یا رسولؐ اللہ! وہ تو یہودی کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا کیا وہ انسان نہ تھا؟ جب کوئی جنازہ تمہارے روبرو سے گزرے، تو تم اس کے لیے اٹھ جاؤ، جب نجاشی نے وفات پائی، تو آپ نے اپنے اصحاب کو اس کی خبر مرگ سنائی، پھر آگے بڑھے، لوگوں نے آپ کے پیچھے صف باندھی، آپ نے نجاشی کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی۔"

آپ کی یہ وہ رحمت شاملہ ہے، جو کسی وطن یا دین یا ملت و گروہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کی نظر میں انسان و حیوان کے ساتھ سلوک اور حسن معاملہ کرنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔

بعض لوگوں نے آپ سے کہا کہ اپنے دشمنوں پر ملامت اور لعنت بھیجیں، آپؐ نے فرمایا، میں لعنت بھیجنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ سراپا رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، جب عبداللہ بن ابی بن سلول کی وفات ہوئی جو مدینہ میں منافقوں کا سردار تھا، جس نے جنگ احد میں اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹا لیا اور آنحضرتؐ کو ایذائیں پہنچانے اور آپؐ کو رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، تو اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے آنحضرتؐ سے آپ کی قمیص اس کی تجہیز و تکفین کے لیے طلب کی، آپؐ نے منافقین کے سرغنہ کیلئے اپنی قمیص مبارک اتار کر دے دی، کیا اس قسم کا سلوک و احسان آج تک کسی نے اپنے دشمن جانی کے لیے کیا ہے؟ یہی نہیں بلکہ آنحضرتؐ اس کی قبر پر نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے، عمرؓ بن خطاب لپک کر آپؐ کے روبرو آئے اور کہا کیا آپ ابن اُبی پر نماز پڑھنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس نے ایک دن آپ کی شان میں ایسا اور ایسا کہا تھا، یہ الفاظ حضرت عمرؓ بار بار دہرا رہے تھے، آنحضرتؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا اے عمرؓ خاموش رہ! حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنے جملہ کو آپ کے روبرو بار بار لوٹانا شروع کیا، تو آپ نے فرمایا مجھے اس امر میں اختیار دیا گیا ہے، لہٰذا میں نے اس کو اختیار کیا، اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ اس کی مغفرت کی دعا کروں، تو اس سے بھی زیادہ مغفرت کی دعا کرتا، پھر آپ وہاں سے لوٹ گئے۔

استغفار اور عدم استغفار کے بارے میں منافقین کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

استغفر لھم اولا تستغفر لھم، ان تستغفر لھم سبعین مرۃً فلن یغفر اللہ لھم۔ | خواہ تو اُن کی مغفرت طلب کرے یا نہ طلب کرے، اگر ستر بار بھی اُن کے لیے مغفرت چاہے تب بھی ہرگز اللہ تعالیٰ ان کو نہیں بخشے گا۔

جب آپ کو اس معاملہ میں اختیار دیا گیا، تو آپ کی رحم پرور طبیعت میں اپنے دشمنوں کے استغفار کے لیے ایک ولولہ سا پیدا ہوا، یہاں تک آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ان کی مغفرت کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں، تب بھی اس سے زیادہ کے لیے میں تیار ہو جاتا۔"

یہ وہ رحم دلی اور شفقت کا جذبہ ہے، جو اپنے دشمنوں، دوستوں اور تمام لوگوں کے لیے وسیع و عام تھا۔

آپ نے ایک مرتبہ ایک اعرابی کو، جو آپ کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، یہ کہتے ہوئے سنا کہ "اے اللہ مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہمارے سوا کسی پر رحم نہ کر۔" جب آپ سلام پھیر کر فارغ ہوئے، تو فرمایا: "تو نے رحمت کے وسیع دائرہ کو تنگ کر دیا۔"

یہ اور اسی قسم کی مذکورۂ بالا مثالوں سے، جن کو آنحضرتؐ کی رحمت و شفقت کے بارے میں ہم نے پیش کیا ہے، واضح ہوتا ہے کہ آپ کی رحمت و شفقت، رقت و رافت نہ صرف اپنے گھر اور خاندان والوں کے ساتھ مخصوص تھی، بلکہ تمام دُنیا کو گھیرے ہوئے تھی، یہی وہ وسیع و غیر محدود رحمت ہے، جس کی وجہ سے آپ اپنے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر کرتے ہیں، حالانکہ جنگِ اُحد میں آپ سخت زخمی کیے گئے تھے صحابہؓ نے آپ کو اپنے دشمنوں پر بددعا کرنے کے لیے زور دیا تھا، یہ وہ عالم تھا، کہ آپ کے چچا حمزہ کے ساتھ انسانیت سوز حرکات روا رکھی گئی تھیں، ان کے ہاتھ پیر اور کان کاٹ دیے گئے تھے، آپ کے انصار میں سے بعض مقتول اور بعض زخمی ہو گئے تھے۔ یہی وہ رحمتِ کاملہ ہے، جس نے ثقیف والوں کے لیے طائف میں دعا کرنے پر آمادہ کیا۔ حالانکہ انھوں نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا تھا، اور آپ کو سخت ایذائیں پہنچائی تھیں، اسی شفقت و محبت کا تقاضا تھا کہ جس نے قریش کی تجارت اور آمد و رفت کے لیے یمامہ و شام کے راستے بے خوف و خطر کھول دیے تھے، جب کہ انھوں نے آپ سے صلہ رحمی کی بھیک مانگی اور اپنے اہل و عیال کے فقر و فاقہ کی بے تابیوں کی شکایت کی تھی، اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے آپ کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا اور مدینہ میں آپ کا محاصرہ کر لیا تھا۔

آنحضرت کی رحمت و شفقت اور آپ کے احسان و کرم سے دوست و دشمن، قوی و کمزور، آزاد و غلام اور جانور تک فیض یاب ہوئے، آپ کا دل اسی رحمت کے جذبہ سے معمور تھا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے چہرہ پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں۔ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لہریں بھی جاری ہو جاتی تھیں، آپ کے ہاتھوں میں جود و کرم کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ یہی وسیع ترین رحمت آنحضرتؐ کے ظاہر و روشن صفات میں سے ہے، جو اپنی جانب تمام مشاہیر اور بہادروں کو کھینچتی رہے گی، اور یہ بہادر جذبۂ رحمت میں آپ سے سبقت لے جانا چاہیں گے لیکن ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکیں گے، اور آنحضرتؐ اس صفت میں تنہا تمام کے پیشوا اور قائدِ اعظم تسلیم کیے جائیں گے۔

حضورؐ نے انسانی معاشرت کو کیا دیا

ڈاکٹر فواد فخرالدین (انڈونیشیا)   ترجمہ: خلیل حامدی

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس روز دینِ حق کا پیغام لے کر دنیا میں تشریف لائے ہیں، وہ روز دنیا کے اندر نئی روشنی کے ظہور کا روز تھا۔ اسی نئی روشنی کی برکت تھی کہ اس نے انسان کو وہ عقیدہ اور تصور دیا، جو سراسر مکارمِ اخلاق اور فضائل و محاسن کا مجموعہ تھا اور تسامح، رواداری اور رذائل سے اجتناب کی دعوت تھی۔ اس عطیہ نے انسانیت کے وجود کو افراط و تفریط کے گرداب سے نکال کر اعتدال پر فائز کیا۔ عورت کو، جو انسانی معاشرہ میں انتہائی پستی کے مقام پر گر چکی تھی، عزت و تکریم کے اعلیٰ مراتب سے ہمکنار کیا۔ جمہوریت کو رواج دے کر حقوقِ انسانی کی حدبندی کر دی۔ جو اس سنہری اصول پر قایم تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اولادِ آدم باہم دندانہ ہائے شانہ کی طرح ہیں۔

اسلام کے ظہور نے دنیا کے تختہ پر ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ دنیا کا فرسودہ نظام بدل کر رکھ دیا۔ دنیا کے اندر بہ اندازِ نو نظم و نسق قایم کیا، دستورِ زندگی کی طرح ڈالی۔ انسانوں کے اندر ایک ایسی رُوح پھونک دی جس نے فرد اور جماعت کے درمیان الفت و محبت، اخوت و تعاون کے جذبِ مقناطیسی کو نشو و نما بخشی۔ شوریٰ فی الامر پر مملکت کی بنیادیں استوار کیں اور دین میں اکراہ و اجبار کی کوئی گنجایش نہ رکھی۔ "تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین" کہہ کر گویا اس بات کا اعلان کر دیا کہ اسلام کی اطاعت کا قلاوہ گلے میں ڈالنے کے لیے ہر انسان کو اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ کسی شخص کو اس لیے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ وہ کافر ہے، بلکہ اہلِ کتاب کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ الغرض اس طرح کے دوسرے اصول اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اسلام روادارانہ نظریات کا حامل ہے اور ایک ایسے جہانِ نو کی ایجاد اس کے پیشِ نظر ہے، جو بغض و عداوت کی آلودگیوں سے مُبرّا اور تعصب و تنگ نظری کے جذبات سے پاک ہو اور نوعِ انسان کے لیے امن و سلامتی کا گہوارہ ثابت ہو سکے۔

اس مبارک گھڑی میں جس چیز کا بار بار جائزہ لینے کی ضرورت ہے، وہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپؐ کے محامد و فضائل ہیں۔ یہ معلوم کیا جائے کہ دعوتِ دین کو پھیلانے میں آپؐ نے کس طرح انتھک کوششیں کیں۔ گھر بار کو خیرباد کہہ کر کس طرح سفر و غربت کی صعوبتوں سے دوچار رہے۔ دشمن جنگ و جدال پر اتر آئے، تو ان کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور بہت سے معرکے سر کیے، قوم کی طرف سے ایذائیں دی گئیں، تو صبر و شکیب کے ساتھ انہیں سہا۔ یہ تمام واقعات آپؐ کے فضائلِ حسنہ اور اعلیٰ کردار کی شہادت دیتے ہیں۔ خود ذاتِ خداوندی نے آپؐ کی تعریف میں فرمایا ہے:

فبما رحمة من الله لنت	اے پیغمبر! یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں
لهم و لو كنت فظاً غليظ القلب لا	کے لیے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے۔ ورنہ اگر

انفضوا من حولك ـ (آل عمران ـ ۱۵۹) کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔

انك لعلیٰ خلق عظیم ـ (القلم ـ ۴) بیشک آپ انسانی اخلاق کے بلند مدارج پر" فائز" ہیں۔

اسلام دنیا کے سامنے بے شمار مفید اور گرانقدر اصول لے کر آیا ہے۔ اس نے انسانوں کا ایک گروہ تیار کر دیا جس کی اساس اعلیٰ انسانی اخلاقیات پر قایم تھی اور اس عقیدے پر قایم تھی، جو کائنات کے فرمانروا نے اپنی بشری مخلوق کے لیے انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام بنا کر بھیجا ہے اور اس میں ہر اس چیز کی وضاحت کر دی، جس کی انسانوں کو اس جہانِ بے ثبات میں ضرورت لاحق ہو سکتی ہے اور ان تمام اعمال کا نقشہ پیش کر دیا ہے، جو آخرت کی زندگی میں سلامتی و نجات کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس یادگارِ دوام آثار میں ہمارے لیے جو منفعت بخش پہلو ہیں، وہ آپ کا عمل اور آپؐ کا اُسوۂ ہیں، جو آپ کی ذاتی زندگی سے لے کر خاندانی اور قومی زندگی تک پھیلا ہُوا ہے۔ آپؐ کا یہی اُسوہ ہماری عزت و سُرخروئی کے لیے دنیا میں ہماری قوت کی بقا کے لیے بہت بڑا بیش قیمت اور نایاب سرمایۂ وراثت ہے۔ آپؐ کے اُسوۂ حسنہ اور آپؐ کی تعلیم کا خلاصہ چند نکات میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہُوں:

۱۔ دعوتِ حق کو خلقِ خدا تک پہنچانے میں آپ نے کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نہایت صبر اور بردباری کے ساتھ اس پیغام کو پہنچایا۔ یہ جد وجہد کسی دُنیوی غرض اور ذاتی مفاد کی خاطر نہ تھی بلکہ خالص خدا کے لیے تھی۔ اسی بات کی تشریح کرتے ہُوئے آپؐ نے فرمایا تھا:

واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترك ھذا الامر ما ترکته حتی یظھرہ اللہ او اھلك دونه۔

بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج لا رکھیں اور بائیں ہاتھ پر چاند کہ میں اس کام سے باز آجاؤں، تو میں کبھی نہیں باز آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا میری جان جاتی رہے۔

دنیوی مال و متاع سے ہمیشہ آپ نے بے اعتنائی اختیار فرمائی۔ جب آپؐ کے سامنے سونے کے پہاڑ بھی پیش کیے گئے، تو آپ نے لینے سے انکار کر دیا اور شرف و کرامت کی زندگی بسر کرنے کے لیے معمولی کفاف پر اکتفا کی۔

۲۔ تواضع اور رواداری آپؐ کی پُوری زندگی میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپ نے کبھی اپنے آپ کو دُوسروں سے برتر رکھنے کی کوشش کی ہو بلکہ آپؐ کی مجلس غرباء و مساکین اور معمولی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی اور جس طرح رؤسا اور سرداروں کے ساتھ آپؐ کا سلوک تھا، اسی طرح نچلے درجہ کے لوگوں کے ساتھ آپ کا مساویانہ طرزِ عمل تھا۔ آپؐ کی روادارانہ تعلیم کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وہ قریش جو ہمیشہ آپ کے جانی دشمن رہے، آپؐ کو ایذائیں دیتے رہے، آپؐ کے رفقاء اور ساتھیوں کو آپؐ سے توڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔

یہاں تک کہ ترکِ وطن پر انہوں نے آپؐ کو مجبور کر دیا۔ ان تمام سختیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود وہی قریش فتح مکّہ کے دن جب گرفتار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آتے ہیں، تو آپؐ کی زبان مبارک سے ان کے حق میں یہ کلمات جاری ہوتے ہیں:

اذهبوا فانتم الطلقاء لا تثريب عليكم اليوم يغفر الله لكم وهو ارحم الراحمين۔	جاؤ تم آزاد ہو۔ آج تم پر کوئی گرفت نہیں اللہ تمہیں معاف کرے گا۔ اور وُہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

۳۔ عام مساوات آپؐ نے جس باہمی مساوات اور طبقاتی کشمکش کے استیصال کا درس دیا، اس کی عملداری اس قدر ہمہ گیر تھی کہ آپؐ کا گھر اور اپنا خاندان بھی اس میں شامل تھا۔ آپؐ کے قبیلہ کے کسی فرد کو دوسروں پر کسی درجہ کوئی فضیلت و برتری حاصل نہ تھی۔ اس سلسلہ میں آپؐ کا وہ ارشاد مبارک بہت مشہور رہے، جو آپؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو خطاب کرتے ہُوئے فرمایا تھا:

يا فاطمه بنت محمد، اعملى فانى لا اغنى عنك من الله شيئًا۔	اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! اپنے لیے نیک عمل کر لو۔ میں اللہ کی گرفت سے تمہیں ذرہ بھر نہیں بچا سکتا۔

اسی طرح دوسرے افرادِ خاندان کو مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا تھا:

يا آل محمد لا ياتيني الناس باعمالهم وتاتون بانسابكم اعملوا فانى لا اغنى عنكم من الله شيئًا۔	اے محمدؐ کی آل! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب و نسب لے کر۔ عمل کرو میں اللہ کی گرفت سے تمھیں بالکل نہیں بچا سکتا۔

عام انسانی مساوات کی تشریح کرتے ہُوئے فرمایا:

اجعلوا الناس فى الحق سواءً قريبهم كبعيدهم و بعيدهم كقريبهم۔	حقوق میں تمام انسانوں کو برابر رکھو۔ اس طرح کہ اپنے بیگانوں کی طرح اور بیگانے اپنوں کی طرح ہوں۔

۴۔ اسلامی اور انسانی اخوّت یہ وہ تعلیم تھی جس نے قوم کی منتشر صفوں میں اتحاد و الفت کے رُوح پرور گلشن کھلا دیے اور مدّت سے بچھڑے ہوُوں کو گلے ملا دیا۔ اخوت اسلامی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہے:

انما المومنون اخوة فاصلحوا بين اخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون۔	تمام مومن بھائی بھائی، پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح رکھو اور اللہ سے ڈرو تاکہ وہ تم پر رحم کرے۔

اسی نعمت کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا:

واذكروا نعمة الله عليكم اذ كنتم اعداءً	اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو، جو اس نے تم پر کیا ہے

فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔

تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔

اسی نازک آبگینہ کی حفاظت کے اصول و قواعد بیان کرتے ہُوئے آنحضرتؐ نے فرمایا:

ا۔ ولا تحاسدوا و لا تناجشوا و لا تباغضوا و لا تدابروا و لا یبیع بعضکم علیٰ بعض و کونوا عباد اللہ اخوانا۔

آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ آپس میں کسی کو دوسرے کے خلاف بھڑکاؤ اور نہ آپس میں بغض رکھو اور نہ آپس میں کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع کرے اور تم اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔

ب۔ المسلم اخو المسلم لا یظلمه و لا یخذله و لا یکذبه و لا یحقره التقویٰ ھٰھنا و یشیر الیٰ صدره ثلاث مرّاتٍ بحسب امرئٍ من الشر ان یحقر اخاه المسلم۔

مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (آپ اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے تین بار فرماتے ہیں) تقویٰ یہاں ہے۔ انسان کو شر سے یہ بات کافی ہے کہ وُہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔

ج۔ کل المسلم علی المسلم حرامٌ دمه و ماله و عرضه۔

"ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، مال، آبرو حرام ہے۔"

عالمگیر انسانی برادری کے قیام کی دعوت دیتے ہُوئے قرآن نے بیان کیا ہے:

یٰٓایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدةٍ و خلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیرًا و نسآء و اتقوا اللہ الذی تسآءلون به و الارحام۔

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے، اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔

۵۔ اعتماد علی النفس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ آپؐ قوم کے اندر اعتماد علی النفس اور خودداری کی اعلیٰ صفات کو اجاگر کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک طرف ہر ہر فرد بذاتِ خود قوت کی چٹان بن جائے اور دُوسری طرف پُوری اُمت قوت و طاقت کا ایک ایسا ہمالہ بن جائے، جو حوادث کے ہجوم اور جنگجوؤں کی شعلہ باری کے موقع پر دوسروں کے سامنے تعاون اور امداد کی جھولی پھیلانے کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کرنے والی اور اپنی مدد آپ کرنے والی ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله و عدوكم۔	جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے (دشمن کے) مقابلے کے لیے مہیا رکھو، تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کرو۔

یہ ہے مختصر اور سرسری خلاصہ، جو پیغمبرِؐ انسانیت کی تعلیم میں ہمیں ملتا ہے اور پیغمبرِؐ انسانیت کے یومِ ولادت پر اس کے اعادہ و تکرار کی ہمیں ضرورت ہے۔ یہ وہ انمٹ آثار ہیں جو اُمتوں اور قوموں کو زندگی کے میدانِ عمل میں فلاح و بہبودی سے متمتع کرتے ہیں۔ اسلام نے اس ربانی تعلیم اور صحیح فکر کی طرف تمام دنیا کو دعوت دی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی بہتری اور سلامتی بھی اسی میں ہے کہ زمامِ حیات اسی صالح قائد کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ جس قوم نے اپنی زندگی کی گاڑی اس فکر و عقیدے کے خطوط پر چلائی ہے اور اسلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے، وہ عزت و شوکت اور تہذیب و تمدن کے بالاترین مدارج پر جاگزین ہُوئی ہے۔

ان تمام گزارشات کے بعد ہم ملّتِ اسلامیہ کو خواہ وہ مسلمان ممالک کی ہو یا غیر مسلم ممالک کی، دعوت دیتے ہیں کہ تعلیمِ نبویؐ کی روشنی میں وہ اپنے موجودہ نظامِ حیات اور طرزِ عمل پر غور و فکر کرے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ امت اپنے اعمال میں اور زندگی کے معاملات میں عملی ربط و اتصال سے دامن کش ہے اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور ابھی تک گوشہ ہائے خلوت کی زینت ہے اور مضبوط محاذ بنانے کے لیے اور مسلم قوم کے اندر عملی تعاون (CO-OPERATION) کی روح پھونکنے کے لیے ان میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ حالانکہ مسلم معاشرہ گروہ بندی اور جماعت پرستی کا شکار ہو چکا ہے اور ہر گروہ کا عقیدہ مختلف اور مسلک جداگانہ ہے۔ نہ افکار و نظریات میں اتحاد پایا جاتا ہے اور نہ اصول و مبادی میں ہم آہنگی نظر آتی ہے اور سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ اپنی اس زبوں حالی کے باوجود مسلمان بڑے تساہل پسند ہو چکے ہیں۔ مستقبل بینی اور دُور اندیشی ان کے پاس نہیں پھٹکتی اور اپنی مدد آپ کرنے کا اصول ان کے نزدیک مضحکہ خیز بات ہے۔ عمل و کردار کے لحاظ سے اس قدر کھوکھلے ہیں کہ موجودہ خطرناک حالات (جن میں سب مسلمان ممالک گھرے ہُوئے ہیں) کی ایک ٹھوکر کی تاب نہیں رکھتے۔

آخر میں ہم یہ گزارش کریں گے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں پر، مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے، یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور کام کا ایسا پروگرام بنائیں، جو ملّت کے لیے مفید اور نتیجہ بخش ہو، اور اس سکیم کو بروئے کار

لانے کے لیے اجتماعی عمل کے لیے فضا ہموار کریں۔ اجتماعی تعاون پیدا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ چند دھواں دھار کانفرنسیں منعقد کر دی جائیں اور ان میں فصیح و بلیغ لیکچر دیے جائیں اور گھڑی دو گھڑی باغوں کی سیر کرا دی جائے۔ بلکہ اس ورطۂ مذلت سے نکلنے کے لیے ٹھوس طریقے عمل میں لائے جائیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس امر کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسا فنڈ جاری کیا جائے جس کے ذریعہ اسلامی علاقوں میں، جہاں دینی تحریکیں ہیں، ان کی عام اشاعت و پبلسٹی کی جائے۔

نبی کریمؐ کے بنیادی عناصر

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی امتیازی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ بعثت محمدیؐ سے قبل لاتعداد انبیاء، مصلحین و حکماء گزر چکے تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان سب کی صداقت کا اقرار جزوِ ایمان ہے۔ لیکن مرور ایام سے ہر جگہ حق و باطل کی آمیزش ہو گئی ہے اور ہر جگہ ادیان میں غلو پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ وضاحت کے ساتھ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے۔ اور اس کے علاوہ ان تمام اساسی حقائق کو ایک تنظیم میں یکجا کیا جائے، جو مختلف زمانوں اور مختلف ملتوں میں منتشر ہیں۔ تعلیم محمدیؐ کی اساس توحید ہے۔ اگر خدا کی ذات اور اس کے صفات کے متعلق انسان کا عقیدہ منزّہ اور خالص ہو جائے تو باقی تمام صداقتیں لازمی نتائج کے طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ گویا توحید ایک لبریز حیات تخم ہے اور اگر قلب انسانی اس کی آبیاری کرے، تو حیات و کائنات کے تمام حقائق شاخ و شگوفہ و برگ و ثمر کی طرح اس کے اندر سے پھوٹنے لگیں گے اور زندگی پھلنے پھولنے اور پھیلنے لگے گی۔ توحید ہی کے صحیح تصور سے یہ کائنات بھی قابل فہم ہو جاتی ہے اور زندگی کا مقصود بھی متعین ہو جاتا ہے۔ حکمت یا سائنس کا کام کائنات کی کثرت اور گوناگونی میں وحدتوں کی تلاش ہے۔ جسے حکمت کی زبان میں قوانین فطرت کہتے ہیں۔ بتدریج ان وحدتوں یا قوانین کو انجام کار ایک بنیادی وحدت میں منسلک کرنا حکمت کا نصب العین ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نصب العین خدا ہے۔ والی ربك المنتھی۔ یہ منتہا مبدا بھی ہے۔ جس طرح کہ ایک ثمر کا بیج درخت کی ابتدا ہے اور انجام ارتقا میں ثمر کی صورت میں اس کی انتہا بھی۔ توحید کے تصورات اسلام سے قبل انبیاء نے بھی پیش کیے اور حکماء نے بھی۔ لیکن انسانوں کی پستیِ فکر نے ہمیشہ ان میں شرک کی آمیزش کر دی یا بعض حکماء کی طرح ان میں اس قدر منطقی تنزیہہ پیدا کی کہ خدا بے صفات ہو کر ایک مجرد تصور رہ گیا جس سے نہ عقل بہرہ اندوز ہو سکے اور نہ وہ عملی زندگی میں کام آسکے۔ قرآنی اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اس تصور کو خالص کرنا تھا۔ آئیں اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں کہ ادیانِ عالیہ اور فلسفوں میں خدا کا تصور کس کس طرح مسخ ہو چکا تھا ہندوؤں کے بلند مذہبی فلسفوں میں خدا کی ذات واجب الوجود کائنات سے اس قدر ماوراء ہو گئی تھی کہ شنکر اچاریہ کی ویدانت میں خدا نرگن یعنی صفات سے معرّا ہو گیا تھا۔ وہ کائنات کا خالق نہ تھا کیونکہ ذات مطلق حقیقی تھی اور کائنات وہمی مایا یا فریبِ ادراک۔ انسانوں کا جسم و نفس بھی کائنات کے ساتھ بے حقیقت ہو گیا تھا۔ خیر و شر کی پیکار بھی وہمی تھی۔ اعمال اور ان کے نتائج بھی غیر حقیقی مظاہر کا تار و پود تھے۔ مہاتما بدھ نے برہمنیت میں بہت کچھ اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بھی نہ خدا نظر آتا ہے اور نہ نفس انسانی کوئی حقیقی جوہر رہتا ہے سب اعراض ہی اعراض ہیں، جن کی تہ میں کوئی جوہر نہیں اور زندگی کا مقصود ان تمام دھوکوں سے نجات پانا ہے اور یہ نجات تب تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام آرزوؤں، یہاں تک کہ تمنائے حیات کو بھی بیخ و بن سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ برہمنیت اور بدھ مت نے زندگی سے گریز کی تعلیم دی تاکہ انسان اعمال اور ان کے تکراری چکر میں سے نکل جائے۔ ان مذاہب میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ خدا کبھی کبھی انسان کی

صورت میں بغرضِ اصلاح دنیا میں اُترآتا ہے بھگوت گیتا میں اس عقیدے کی نسبت ایک اشلوک ہے جس کا فیضی نے یہ ترجمہ کیا ہے: سہ

چوں بنیادِ دیں سُست گردد بسے
برآریم خود را بشکل کسے

عیسائیت میں بھی یہی اوتار کا تصور تمام دین کا محور بن گیا اور مسیح علیہ السلام کو عیسائیوں نے عین خدا بنا دیا۔ جو دنیا میں انسان کی صورت میں اس لیے آیا کہ انسانوں کے ناقابل معافی گناہوں کا، جو اسے ہبوط آدم سے ورثے میں ملے ہیں، کفارہ بن جائے۔ جن فلسفوں میں خدا کا تصور ملتا ہے، وہاں بھی اس سے نہ کائنات وحیات کی توجیہہ ہوسکتی ہے اور نہ وہ انسانی زندگی میں کسی کام آ سکتا ہے۔ افلاطون کے ہاں خدا ناظم و صناع ہے لیکن اس صفت کا خام مواد اس کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت اعیان ثابتہ کی ہے۔ خدا ان کے مقابلے میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ارسطو کے ہاں خدا عقلِ خالص یا فکرِ محض ہے۔ اس فکر ازلی کا موضوع و معروض وہ خود ہی ہے۔ موجودات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کلیات کا ایک منطقی نظام ہے جو زندگی کے جزئیات سے بے تعلق ہے۔ وہ نہ کائنات کا خالق ہے اور نہ اس کا رب اور ناظم۔ انسان کا انفرادی نفس ایک حادث مظہر ہے، جو خدا کے ساتھ دعا یا عبادت کا کوئی رابطہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اس نفس کو بقا بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ یونانی فلسفے کی آخری صورت فلاطینوس اسکندری کا فلسفیانہ تصوّف ہے جس کے نمایاں نقوش عیسوی اور اسلامی متصوفانہ افکار میں ملتے ہیں۔ اس جدید افلاطونیت میں بھی خدا نہ خالق ہے اور نہ رب۔ وہ ذی ارادہ اور صاحبِ اختیار ہستی بھی نہیں۔ موجودات اس سے اس طرح سرزد ہوتے ہیں، جس طرح سُورج سے شعاعیں نکلتی ہے۔ وہ اپنی ذاتِ بحت میں تمام صفات سے معرا یعنی ویدانت کے عقیدے کے مطابق نرگن ہے۔ اس اشعاعِ نور میں جو ہستیاں اس سے جتنی قریب ہیں، اتنی ہی منور ہیں۔ دوری کے ساتھ نور میں کمی اور ظلمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جسے ہم مادی کائنات کہتے ہیں۔ وہ ظلمت کدہ ہے۔ انسان کا جسم بھی اس ظلمت کا ایک پیوند ہے۔ ذاتِ مطلق احدیتِ مطلقہ ہے جس میں نہ ارادہ ہے نہ شعور۔ سب کچھ اسی سے بہ تنزل سرزد ہوتا ہے۔ وہ خود نہ سمیع ہے، نہ علیم نہ بصیر۔

اب اس مختصر تمہید کے بعد ذرا اس کا جائزہ لیجیے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بذریعہ وحی قرآن اور بوسیلۂ بصیرت ایمانی انسانوں کے سامنے خدا کا کیا تصور پیش کیا۔ اسلام کا خدا ایک ذی شعور اور ذی ارادہ خالق ہے۔ اس نے کائنات کو مقصد اور ارادے سے پیدا کیا۔ وہ خلاق ہے۔ اس کی صفت خلاقی ازلی و ابدی ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کرتا رہتا ہے اس کے ہاں حیات و وجود کے خزانے لامحدود ہیں۔ لیکن وہ ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق ہونے کے علاوہ ناظم بھی ہے۔ اس کے ارادوں میں تلوّن نہیں ہوتا۔ اس کی خلاقی اس کی حکمت سے بھی ہم آغوش ہے اور اس کی رحمتِ عامہ سے بھی ہم کنار ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ کائنات اور موجودات سے ماورا بھی ہے اور اپنی قدرت مشیت اور حکمت سے ذرّے ذرّے میں جاری و ساری بھی ہے۔ اس کی سنّت یا عادت فطرت کے اندر آئین آفرین ہے:

لن تجد لسنة الله تبديلا۔ اس کے آئین تبدیل و تحویل سے بری ہیں۔

فطرت انسانی کو اس نے اپنی فطرت کے مطابق وضع کیا ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کے بنیادی حقایق بھی حقایق الٰہیہ ہیں۔

انہی حقایق کا ادراک اور ان کے مطابق زندگی کو ڈھالنا دین کہلاتا ہے :

فطرة اللہ التی فطر الناس علیہا۔ — اللہ کی اس فطرت پر غور کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔

ذٰلك الدین القیم۔ — یہی دین قیم ہے۔

لا تبدیل لخلق اللہ۔ — اللہ کے قانون خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس کائنات میں انسان خدا کا شاہکار ہے۔ قرآن کا آدم مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات ہے۔ اس سے کوئی ایک فرد مراد نہیں بلکہ یہ انسانیت کا نصب العین ہے۔ خدا کا عابد اور ساجد ہونے سے وُہ فطرت کی تمام قوتوں کا مسجود ہو جاتا ہے۔ خدا کا محکوم ہو کر وہ کائنات پر حکمران بن جاتا ہے۔ اخلاقِ الٰہیہ کے تخلّق سے وہ خلافت کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ انسان کے ممکنات کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ زندگی کا ارتقاء کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اسلام نے خدا کے تصوّر کے ساتھ ساتھ کائنات اور انسانیت کے تصوّر کو بھی درست کر دیا۔ اس نے کہا کہ خدا خلاقِ حقیقت ہے، وہ باطل آفرینی نہیں کر سکتا۔ حیات و کائنات محض کھیل تماشہ نہیں مقاصدِ وجود نہایت سنجیدہ و پائیدار ہیں :

ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔ — اے ہمارے رب! تُو نے اسے بے حقیقت نہیں پیدا کیا ہے۔

اسلام حریت و اخوت و مساوات کی تعلیم ہے۔ حریت یعنی آزادی آدمیت کے جوہر میں فطری طور پر موجود ہے۔ آدم نے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے آزادی کا ثبوت دیا۔ آزادی کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ لیکن خلاف ورزی کے احساس کے بعد تائب ہونا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آدم کے قصّے کو بیان کر کے قرآن نے گناہ کا تصوّر بھی بدل دیا۔ عیسائیت نے آدم کی لغزش کو ناقابلِ معافی قرار دیا اور اس کے گناہ کو آیندہ آنے والی لامتناہی نسلوں کے لیے متوارث بنا دیا۔ نبی کریمؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو اس غیر منصفانہ تصوّر سے نجات ملی۔ قرآن نے کہا کہ ایک فرد کا گناہ اس کی انفرادی لغزش ہے اور تائب ہونے سے انسان اس کے خراب نتائج سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نیکیاں بدیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں :

ان الحسنات یذھبن السیئات۔ — نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں۔

ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ رُوحانی حیثیت میں کسی انسان کا بوجھ دُوسرے انسان پر نہیں ڈالا جاتا :

لا تزر وازرة وزر اُخرٰی۔ — کوئی شخص دُوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

چونکہ خدا انسان کو اپنی فطرت پر ڈھالنا چاہتا ہے، اس لیے وُہ اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا، وہ ہدایت اور گمراہی کی راہوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کرے یا وُہ۔ جو راستہ بھی اختیار کرے گا، اس کے نتائج سے وُہ گریز نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو بالجبر مومن بنا دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا کرنا نہیں چاہا۔ اس لیے کہ جبر اور ایمان باہم منافی چیزیں ہیں۔ مجبور کے لیے نہ نیکی نیکی ہے نہ بدی بدی۔ اور جبر کے بعد ثواب و عذاب کے بھی کچھ معنی نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآن کریم نے علی الاعلان کہہ دیا کہ دین کے معاملے میں جبر ناروا ہے :

لا اکراہ فی الدین ۔ دین میں کوئی جبر نہیں۔

جب خدا، جو قادرِ مطلق ہے، انسان پر جبر روا نہیں رکھتا، تو کسی انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو مجبورِ محض یا غلام بنا لے۔ اگر مسلمان قرآن کریم کی اس حکیمانہ تعلیم کے نتائج اخذ کر کے ان کا اطلاق پوری طرح معاشرت پر کرتے، تو بیک قلم دنیا سے غلامی کا صفایا ہو سکتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں ڈھیل برتی۔ غلاموں کے ساتھ سلوک دیگر اقوام کے مقابلے میں تو بہتر ہو گیا لیکن یہ انسانیت کُش رسم باقی رہی۔ دین کے معاملے میں رواداری کی تلقین اسلامی تعلیم کا سب سے زیادہ قابلِ فخر پہلو تھا لیکن رُوحِ اسلام سے بیگانہ مدعیانِ دین نے غیر اسلامی تنگ نظری اور تعصب سے کام لے کر خود مسلمانوں کے اندر جبر و تعدی اور تکفیر کا بازار گرم کر دیا۔

قرآن نے نجات کو کسی ملت کا اجارہ قرار نہیں دیا اور جو لوگ شریعتِ محمدیؐ کے دائرے میں داخل نہ ہو سکے، ان کے ساتھ بھی کمال درجے کی رواداری برتی۔ جس وقت یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے اس وقت بھی انصاف سے کام لے کر یہ کہا کہ دیکھو سب کے سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہلِ کتاب میں بھی بڑے بڑے خدا ترس اور خدا پرست موجود ہیں اور بعض دوسری ملتوں کا نام لے لے کر وضاحت سے کہا کہ ان میں کا جو فرد بھی خدا پرست، آخرت کا قائل اور انسانوں کا محسن ہے، وہ نجات یافتہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دُوسری ملتوں میں بھی ہوں تو وہ اولیاء اللہ اور خوف و حزن سے بالاتر ہیں:

لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون ۔ نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محض اتفاق سے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے مردم شماری کے مسلمان اسلام یا نجات کے ٹھیکیدار نہیں اسلام کی تعلیم کا جتنا حصہ جو فرد یا ملت اپناتی ہے، اتنی وہ اسلام سے بہرہ اندوز اور صلاح و فلاح کے قریب ہے۔ نبی کریمؐ نے اعلان کیا کہ اسلام نے بادشاہی اور شہنشاہی کو منسوخ کر دیا ہے:

لا قیصر و لا کسریٰ۔

لیکن مسلمانوں میں یہ ملعون چیز جلد واپس آ گئی اور رُوحِ اسلام سے بیگانہ شعراء و شیوخ نے ان مصادرِ ضلالت کو ظل اللہ قرار دے کر مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی حریت کو مسخ کر دیا۔ اسلام نے زر و زمین کی سرمایہ اندوزی کے راستے بند کیے تھے مگر تھوڑے ہی عرصے میں یہ مخرّبِ انسانیت راہیں پھر کشادہ ہو گئیں اور ہمارے علمائے سُو ان کے جواز میں قرآن و حدیث کی تاویلیں کرنے لگے۔ اسلامی حریت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان زندگی کے حقائق پر آزادی سے غور و خوض کریں اور تغیرِ احوال کے ساتھ ساتھ اسلام کے ازلی اصول سے ہنگامی طور پر فروع کو اخذ کریں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کے جامد ہونے کے بعد یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد قیامت تک کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے فقط لکیر کا فقیر ہونا اور روایت پرستی باقی رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا، جو لازمی ہونا چاہیے تھا۔ بقول اقبالؒ یہ اُمت روایات میں کھو گئی اور زندگی کی تخلیقی قوتیں جنھیں اقبالؒ عشق کہتا ہے، ٹھٹھر کر رہ گئیں: ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

لیکن مسلمان کے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہے اور رسولؐ کے اُسوۂ حسنہ پر نظر رکھنے ڈالا اب بھی تمام برکات سے فیضیاب ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے بنیادی حقایق اور اصول عمل دوسروں سے اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا ہے تو اس کا تصور اسلام سے خالص تر کہیں نہیں مل سکتا۔ سچی آزادی اور عدل و رحم کی تعلیم حقیقی اسلام سے بڑھ کر کہیں نہ ملے گی۔ حصولِ علم کی ترغیب قرآن سے زیادہ کسی مذہبی صحیفے میں نہ پاؤ گے۔ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ اسی زندگی میں جمال و کمال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو یہاں کور باطن ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ زندگی کی کسی جائز لذت کو اسلام نے حرام نہیں کیا۔ قرآن پوچھتا ہے کہ بتاؤ کون ہے جس نے اللہ کی زینتوں کو حرام کیا ہے۔ رہبانیت کو اسلام نے ممنوع قرار دیا تاکہ زندگی کی پیکار سے فرار ممکن ہو جائے۔ حدود اللہ کو مدِ نظر رکھ کر زندگی بسر کرنے سے انسان پر عرصۂ حیات تنگ نہیں ہو جاتا بلکہ خدائے لامحدود سے رابطہ پیدا کر کے زندگی لا محدود بن سکتی ہے۔

رسول کریمؐ کی ہمہ گیر اور محیط کل حیاتِ طیبہ سے بہتر نمونہ تاریخ انسانی میں مفقود ہے۔ افلاس میں زندگی کس طرح بسر کی جاتے۔ مال کے حصول کے بعد زندگی کا کیا ڈھب ہو، ایمان داری سے تجارت کس طرح کی جائے۔ زراعت میں نفع اندوزی سے کس طرح پرہیز کیا جاتے۔ ضرورت سے زیادہ مال کا کیا مصرف ہے۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں کس قدر مساوات ہے صلح و جنگ کے آئین کیا ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ عدل و رواداری کا سلوک۔ جمہوری نظام مملکت، جس کا نظم و نسق اہل الرائے کے مشورے سے قایم کیا جائے۔ اقتصادی نظام جس میں دولت چند ہاتھوں میں متمرکز نہ ہونے پائے بلکہ خون کی طرح تمام جسمِ ملت میں رواں دواں ہو اور چند معین حدود کے علاوہ زندگی کے تمام متغیر شعبوں میں مسلسل اجتہاد۔ یہ تھا اصل اسلام جس پر عمل کر کے رسول کریمؐ اور صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے عملاً ایک نصب العین پیش کیا۔ مسلمان اگر خودداری کے ساتھ مہذب اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن اور اُسوۂ رسولؐ کی طرف عود کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر دیگر اقوام نے اسلام کے بعض اہم پہلوؤں کو اپنا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صلاح و فلاح پیدا کی ہے، تو مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم ہے کہ وہ دوسروں سے پیچھے رہ کر ان کی تقلید پر مجبور ہو جائیں۔ اصلِ اسلام اور اُسوۂ رسولؐ کی طرف عود کر کے ملتِ اسلامیہ دوسروں سے بہتر نمونے پیش کر سکتی ہے۔ اس کا رسولؐ کوئی ماضی کی شخصیت نہیں۔ وہ انسانیت کے حال اور مستقبل میں ہر قدم پر رہنمائی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ جامد مسلمان رسولؐ کی رسالت کو بھی جامد نہ بنا دیں۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ یہ نبوت اب ہمیشہ تک اقوام کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

پیغمبرِ اسلامؐ کا پیغامِ امن وسلام

زین العابدین سجاد میرٹھی

فتنہ وفساد کی ان اندھیری گھٹاؤں میں، جب کہ افق پہ کوئی ستارۂ امید نظر نہیں آتا، ظلم وطغیان کی ان ہولناک موجوں میں جب کہ کشتیِ مراد پاش پاش ہوکر آخری جھکولے کھارہی ہے، نومیدی ویاس کے ان جھکڑوں میں جب کہ گلشنِ آرزو کی آخری کلیاں بھی بکھر گئی ہیں آپ کو زمانۂ جاہلیت کا صحیح تصوّر کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہ آئے گی۔ آیئے "تاریخ کی سُوئی کو چودہ سو سال پیچھے گزر چکے ہیں۔

دنیائے جاہلیت

یہ ایران ہے۔ یہاں فحاشی وزناکاری جزو دین بنا دی گئی ہے۔ "دینِ مزدکی" نے عصمت وعفت کی چادر انسانیت کے چہرہ سے اتار پھینکی ہے۔ عوام کی بہو بیٹیوں کی عزت امراء کی شہوت پرستی کے ہاتھوں کا کھلونا بن رہی ہے۔

یہ یونان ہے۔ یہاں غلاموں کو انسانیت کے ابتدائی "حقِ زندگی" سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ آقاؤں کی پیشانی پہ ہر شکن ان کے لیے زنجیرِ پا بن سکتی ہے۔ ذرا ذرا سے قصوروں پر بھپرے ہوئے شیروں کے سامنے ڈال دینا اور غلاموں کی ہڈیوں کے گوشت سے جُدا ہونے کا منظر دیکھنا ارکانِ حکومت کا ایک دلچسپ تماشا ہے، کمزور بچوں کو بھی یہاں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے غار کی گہرائی تک ان کی منزلِ زندگی کو مختصر کر دیا گیا ہے۔

یہ ہندوستان ہے۔ یہاں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کر کے حقوقِ انسانیت کو صرف تین ذاتوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے بیچارہ اچھوت مذہبی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتا اور عبادت گاہوں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔

یہ ارضِ فلسطین ہے۔ یہاں یہودیوں نے نحن ابناء اللہ واحباءہٗ کا نعرہ لگایا ہے۔ بنی اسرائیل ہی ان کے زعم میں خدا کے لاڈلے بیٹے ہیں اور کسی کو اس کے فضل وکرم کے سفرۂ عام سے ایک ریزہ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں۔

پھر اصولِ انسانیت کی اس تحقیر اور اخلاق ومدنیت کی اس تذلیل ہی پر بس نہیں بلکہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے وجود ہی کو ختم کر دیا جائے۔

ارضِ فلسطین یہودیوں اور عیسائیوں کے خون سے لالہ زار ہو رہی ہے۔ نصرانی حکومت یہودیوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔ یہودیوں کا ملی وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے شعائرِ مذہبی کو آزادانہ انجام دے سکیں۔ یہودیوں نے شہر "صور" کا محاصرہ کر کے ہزاروں عیسائیوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ "جنگِ روم وایران" میں ایرانیوں کے ہاتھوں قید ہونے والے اسّی ہزار عیسائی قیدیوں کو خرید کر ان کے خون سے اپنی آتشِ انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو سرد کر دیا ہے (محمد المثل الکامل جاد مولیٰ بک المصری)

مدائن سے قسطنطنیہ تک کی سرزمین وقت کی دو سب سے بڑی شہنشاہتوں کی جوع الارض کا لقمہ بنی ہوئی ہے۔ تہذیب پامال

ہورہی ہے۔ شرافت سرپیٹ رہی ہے۔ انسانیت خون کے آنسو رو رہی ہے مگر شہنشاہیت کا سر غرور سے اونچا ہو رہا ہے، اور وہ ان بربادیوں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آبادیاں اُجڑ رہی ہیں۔ گھر لُٹ رہے ہیں۔ کھیتیاں پامال ہو رہی ہیں مگر انسانوں کی کھوپڑیوں پر قصرِ قیصری و ایوانِ کسروی کی شاندار بنیادیں اٹھائی جا رہی ہیں۔

"عرب" سرزمین حرم کا حال نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں بلکہ سب سے بدتر ہے۔ ایام العرب کا ایک سلسلہ ہے، جو خون کی موجوں کی طرح سارے جزیرہ میں پھیلا ہوا ہے۔ جنگ وجدال، قتل وخون، سلب ونہب مائیِ فخر و ناز ہے۔ امن و اطمینان، آرام و سکون باعثِ شرم و عار۔ قماربازی فخر کی بات ہے۔ شراب نوشی عزتِ نفس کی دلیل ہے۔ زناکاری قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔ معصوم بچیوں کو زندہ درگور کر دینا عظمت و شرافت کا ثبوت ہے۔

ادب جاہلی کی شہادت اگر یہ صحیح ہے کہ ہر زمانہ کا لٹریچر، اس زمانہ کی تہذیب و اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے، تو سُنیے! بنی قیس بن ثعلبہ کا ایک شاعر کہتا ہے: ؎

انا محیوك یا سلمیٰ فحیینا

وان سقیت کرام الناس فاسقینا

(اے سلمیٰ (معشوقہ شاعر) ہم تجھے سلام کرتے ہیں، تو بھی ہمیں سلام کر اور اگر تو سرارانِ قوم کی تواضع شراب سے کرتی ہے، تو ہمیں بھی شراب پلا)

ایک دُوسرا شاعر جھوم کر کہتا ہے: ؎

الا ھبی بصحنك فاصبحینا

و لا تبقی خمود الاندرینا

(ہاں اپنا شراب کا پیالہ لے کر اُٹھ اے محبوبہ اور ہمیں صبوحی پلا اور دیکھ اندرین کی شرابوں میں سے کوئی باقی نہ رکھ)

ایک اور شاعر ابوکبیر ہذلی فخریہ بیان کرتا ہے:

ممن حملن بہ وھن عواقد

حبك النطاق فشب غیر مھبل

(میں ان جوانوں میں سے ہوں، جن کی ماؤں سے زبردستی ہم بستری کی گئی۔ لہٰذا وُہ جوان ہُوئے۔ اس حال میں کہ چھریرے بدن کے ہیں)

اور رئیس الشعراء امراء القیس نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

و مثلك حبلیٰ قد طرقت ومرضع

فالھیتھا عن ذی تمائم محول

(اور تجھ جیسی بہت سی حاملہ اور دُودھ پلانے والی عورتیں ہیں، جن کے پاس میں رات کے آخری حصّے میں پہنچا اور

انھیں اپنے شیر خوار بچوں سے غافل کر دیا)

وداک بنی یشل مازنی اپنی ہوسِ جنگ کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے : ؎

اذا استنجدوا لم یسالو من دعاهم
لایة حرب ام بای مکان

(میں ان بہادروں میں سے ہوں، جب کوئی ان سے مدد مانگتا ہے، تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کس جنگ کے لیے اور کہاں)

حصین بن ہمام مری کہتا ہے : ؎

نفلق هاما من رجال اعزة
علینا وان کانوا اعق و اظلما

(ہم ذی عزت لوگوں کے سروں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ بڑے ظالم و جابر ہوں)

بنی عقیل کا ایک شاعر اپنے عزیزوں کو خطاب کرکے کہتا ہے : ؎

و نبکی حین نقتلکم علیکم
و نقتلکم کانا لا نبالی

(ہم تمھیں قتل کر دینے کے بعد تم پر روتے ہیں مگر جب قتل کرتے ہیں، تو کوئی پروا نہیں کرتے)

سوار بنی مضرب سعدی کہتا ہے :

وانی لا ازال اخا حرب
اذا لم اجن کنت مجن جان

(میں ہمیشہ لڑائیوں میں گھرا رہتا ہوں۔ اگر خود ظلم نہیں کرتا، تو ظالموں کی سپر بن جاتا ہوں)

ندائے صفا ظلم و ستم، جور و جفا، قتل و غارت، سلب و نہب، عیاشی و فحاشی، عشرت پسندی و شہوت پرستی کی اس دنیا میں یکایک ایک صدائے حق بلند ہوتی ہے۔ خداوند قدوس کا ایک مقدس بندہ "حرا" کی خلوت راز سے باہر آتا ہے اور صفا کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر اعلان کرتا ہے :

یاایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها و بث منهما رجالاً کثیراً و نسآء۔

اے افرادِ نسلِ انسانی، تم (اخوت و محبت کے رشتہ کو توڑتے ہو) اپنے اس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ پھر ان دونوں کی نسل سے گروہ در گروہ مرد اور عورتیں پیدا کیں (جو سطح ارضی کے مختلف حصوں میں پھیل گئی۔

جب تمہارا پیدا کرنے والا ایک ہے، تمہاری اصل و نسل ایک ہے، تمہاری حقیقت و ماہیت ایک ہے، تو پھر ملک و وطن کی حد بندی سے، رنگ و روپ کے فرق سے، غربت و امارت کے امتیاز سے یہ تزاحم و تصادم کیوں؟

اس آیت کے ذیل میں صاحب رُوح البیان لکھتے ہیں:

تقویٰ کے حکم کو جو اس واقعہ پر مرتب کیا گیا، تو اس واسطے کہ یہاں انسانوں کو اپنے اہل خاندان اور اپنے ابنائے جنس کے حقوق کی حفاظت کے بارہ میں خداوند جل و علیٰ سے ڈرنے کا حکم دینا تھا اور اس واقعہ کو اس کی تمہید بنانا تھا۔ گویا کہ یہ فرمایا گیا:

"اے انسانو! جس پروردگار نے تم سب کو ایک سلسلہ میں جکڑ دیا ہے اور ایک جڑ کی مختلف شاخیں بنا دیا ہے، اس پروردگار سے تعلقات باہمی کے حقوق کی ذمہ داری کے بارہ میں ڈرو۔ ان حقوق کا پُورا پورا خیال رکھو اور ان سے غافل نہ ہو۔" (رُوح البیان دوم ص ۱۵۹)

پھر چونکہ خطاب تمام کائنات انسانیت سے کرنا تھا اور سب کو ایک اخوت انسانیہ کے رشتہ میں جکڑنا تھا۔ لہٰذا قرآن کریم نے "نفس واحدۃ" فرمایا، آدم نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ مختلف اقوام و ملل کے درمیان انسانی گھرانے کے جدِ اعلیٰ کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ یہود اور جمہور اہل اسلام نسل انسانی کی ابتداء آدم (علیہ السلام) سے مانتے ہیں۔ بعض دُوسری قومیں دوسری شخصیتوں کا نام لیتی ہیں۔ مثلاً اہلِ ہند برہما کو زنجیر انسانیت کی پہلی کڑی بتاتے ہیں۔ حکماء مغرب چند اصولوں کو خاندانِ انسانیت کا مبداء قرار دیتے ہیں۔ (تفسیر المنار سورۃ النساء)

بہرحال اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ "حقیقت انسانیت" تمام انسانوں کے درمیان مشترک ہے۔ لہٰذا قرآن کریم اس وحدت حقیقت ہی کی طرف متوجہ کر کے ان سے باہمی الفت و محبت کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی شخصیت کی تعیین کر کے دعوت اخوۃ کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔

پھر اس نے بتایا کہ تم معرفت و شناخت کی آسانی کے لیے خاندانوں اور کنبوں کی حد بندیاں قایم رکھ سکتے ہو، مگر انھیں کسی طرح عزت و ذلت، برتری و کمتری کا معیار نہیں بنا سکتے۔ عزت و ذلت اور برتری و کمتری کا معیار تو صرف ایک ہے اور وہ ہے تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی اور بس!

وجعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔	تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وُہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس نے اعلان کر دیا کہ اگر حقیقی بلندی و برتری کی تمنا ہے، تو اس کا طریقہ صرف ایک ہے اپنے معبود حقیقی کے سامنے نیازمندانہ جھک جاؤ۔ اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں، انھیں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرو۔ اس کے کمزور اور ستم رسیدہ بندوں کی مدد کرو اور برائی کو بھلائی کے ساتھ دفع کرو۔

والذین صبروا ابتغاء وجه ربھم و اقاموا الصلوٰۃ و انفقوا مما رزقنٰھم سرًّا و علانیۃً وّ یدرؤن بالحسنۃ السیئۃ اولٰئك لھم عقبی الدار۔

اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ہر تکلیف پر صبر کیا، نمازوں کو ان کے آداب کے ساتھ ادا کرتے رہے اور جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا اس میں سے کچھ پوشیدہ وعلانیہ ہماری راہ میں خرچ کرتے رہے اور برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے رہے تو یاد رکھو یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کا بہتر ٹھکانہ ہے۔

اس نے دشمنوں کے ساتھ بھی محبت کا سلوک کرنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اگر کوئی ایسا کر سکے تو یہ نیکی و سعادت مندی کا اونچا مقام ہے:

و لا تستوی الحسنۃ و لا السیئۃ ادفع بالّتی ھی احسن فاذا الّذی بینك و بینهٗ عداوۃ کانّهٗ ولیّ حمیم و ما یلقّٰھا الّا الذین صبروا و ما یلقّٰھا الّا ذو حظٍّ عظیم۔

نیکی اور بدی کا درجہ برابر نہیں ہو سکتا۔ برائی کا جواب اچھائی کے ساتھ دو۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو تم دیکھو گے کہ اچانک تمھارا دشمن تمہارا دلی دوست بن گیا ہے۔ البتہ انسانیت کے اس بلند مقام پر وہی پہنچ سکتا ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے اور جس کی قسمت میں نیکی و سعادت کا حظِ عظیم ہو۔

اس نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ظلم و شقاوت کی دنیا کو امن و سعادت کا گہوارہ بنانے کے لیے دنیا میں بد امنی و خونریزی کے جو اسباب ہو سکتے ہیں، ایک ایک کرکے ان کو ختم کیا۔

شہنشاہیت دنیا میں فتنہ و فساد کا بڑا سرچشمہ "شہنشاہیت" رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قصرِ شاہی کی آبادی و رونق کے لیے رعیت کی جھونپڑیاں ہمیشہ اجڑتی رہی ہیں۔ خدا کی زمین اس کے بندوں کے خون سے اس لیے سیراب ہوتی رہی ہے تاکہ پادشاہوں کا نخلِ آرزو برگ و بار لائے۔ پیغمبرِ اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے سب سے پہلے فتنہ کی اس جڑ کو صاف کیا۔

و لا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللّٰہ۔

اور خدا کو چھوڑ کر، ایک انسان دُوسرے انسان کو اپنا پروردگار قرار نہ دے۔ دنیا خدا کا ملک ہے اور حکم بھی یہاں خدا ہی کا جاری ہوگا۔

لم یکن له شریك فی الملك ان الحکم الّا للّٰہ۔

اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں۔ حکم صرف خدا ہی کا چل سکتا ہے۔

یہاں تک کہ جب وفد بنی عامر نے آپ سے کہا انت سیّدنا، آپ ہمارے سردار ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا: السیّد

اللہ تبارک و تعالیٰ سردار تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔
اس پر ان لوگوں نے عرض کیا: بہرحال شرف و عزت میں تو آپ ہم سے بلند و برتر ہیں ہی، تو آپ نے جواب دیا: ہاں یہ تم کہہ سکتے ہو۔

اسی لیے اس وقت کی شہنشاہیت کے مظہر اتم اور آمرانہ حکومت کے مجسمہ کامل "کسریٰ" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:

اذا مات کسریٰ لا کسریٰ بعده۔	اس خاندان کسروی کے بعد اب اور کسریٰ نہ ہوگا

سرمایہ داری سرمایہ داری بھی امن عالم کے لیے بڑا فتنہ رہی ہے۔ ساہوکاروں کی مجلس نشاط کا ساغر احمری ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کے خون سے تیار ہوتا رہا ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے زبان وحی ترجمان سے انسانی سوسائٹی کا ایسا نقشہ کھینچا جس میں ہر انسان کو خدا کے پیدا کیے ہوئے وسائل معیشت سے استفادہ کا موقع دیا گیا اور جدوجہد کے بعد جو کچھ حاصل ہوا، اس میں اس کا حق ملکیت و انفاق بھی تسلیم کیا گیا مگر طرق و اکتساب و انفاق پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جس سے دولت چند افراد کا سرمایہ بن کر نہ رہ جائے:

کی لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم۔	یہ اس لیے کیا گیا تاکہ دولت تمہارے سرمایہ داروں میں ہی گردش کرتی نہ رہ جائے۔

جو لوگ اسلام کے اس عادلانہ نظام معیشت سے بغاوت کریں، اس کے ممنوعہ طریقوں سے دولت جمع کریں، ذاتی تعیش و تنعم پر اسے خرچ کریں اور سوسائٹی کے محتاج و ضرورت مند طبقہ کو اس سے محروم رکھیں، ان کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا اور ان کو عذاب الیم کی بشارت دی گئی:

والذین یکنزون الذھب و الفضۃ و لا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔	جو لوگ چاندی سونے کے ذخیرے جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں عذاب الیم کی بشارت دے دیجیے۔
ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔	بے محل دولت کا استعمال کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

سرمایہ داری کے دو بڑے مظاہر ساہوکاری اور جاگیرداری ہیں۔ اسلام نے احتکار، اکتناز اور اس کے وسائل سود، قمار وغیرہ کو ممنوع قرار دے کر اور وراثت، زکوٰۃ، عشر وغیرہ تقسیم دولت کی صورتوں کو لازمی قرار دے کر ان دونوں کے پنپنے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

وطنیت وطنیت بھی ہمیشہ سے ایک ایسا بت رہی ہے جس پر ہزارہا انسانوں کے سروں کے چڑھاوے چڑھتے رہے ہیں۔ "جرمنی" جرمنوں کے لیے ہے، انگلستان انگریزوں کے لیے ہے، ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے۔ یہ ایسے نعرے ہیں کہ آج بھی جن سے دنیا کی فضا گونج رہی ہے۔ اگر ان نعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی طاقتور قوموں کو یہ

حق نہیں کہ وہ کمزور قوموں کے اسباب حصول دولت پر اپنی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہو جائیں تو یہ نعرے درست ہیں۔ لیکن اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ ملک اور وطن کے نام پر خدا کی مخلوق میں منافرت پیدا کی جائے اور خدا کے بندوں کو اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے کسی حصہ سے جائز طریقوں سے فائدہ اٹھانے سے روکا جائے، تو اس سلسلہ میں پیغمبر اسلامؐ کا اعلان یہ ہے :

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود کلکم من آدم و آدم من تراب۔	عربی النسل کو عجمی النسل پر اور سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدمؑ کا مایۂ خمیر مٹی ہے۔
لیدعن رجال فخرھم باقوام انما ھم فحم من فحم جھنم۔	لوگ اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دیں۔ ایسا کرنے والے جہنم کا کوئلہ بنیں گے۔
لیس منا من دعا الی عصبیۃ ان الارض للہ۔	وہ ہم میں سے نہیں، جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا۔ زمین اللہ ہی کی ہے۔
وجعلنا لکم فیھا معایش۔	ہم نے تم سب کے لیے زمین میں سامانِ معیشت پیدا کر دیئے ہیں۔

مذہبی منافرت مذہب کے نام پر بھی، جو دنیا میں امن و صلح کا پیغام ہونا چاہیے، جنگ و جدل کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقت بھی فضا ان نعروں سے گونج رہی تھی۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی:

"ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر خدا کی آواز کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔ ان کے نزدیک پرمیشر صرف پاک آریہ ورت کے باشندوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ خدا کی رہنمائی کا عطیہ صرف اسی ملک اور یہیں کے بعض خاندانوں کے لیے محفوظ تھا۔ زردشت خاک ایران کی پاک نژاد کے سوا اور کہیں خدا کی آواز نہیں سنتا تھا۔ بنی اسرائیل اپنے خاندانوں سے باہر کسی رسول اور نبی کی بعثت اور ظہور کا حق نہیں سمجھتے تھے۔ یہ پیغام محمدیؐ ہی ہے، جس نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر طرف خدا کی آواز سنی اور بتایا کہ خدا کی رہنمائی کے لیے ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں۔ اس کی نگاہ میں فلسطین، ایران، ہندوستان اور عرب سب برابر ہے۔ ہر جگہ اس کے پیغام کی بانسری اور ہر طرف اس کی رہنمائی کا نور چمکا۔"

قرآن کریم نے اس زمانہ کے ارباب مذہب کے لیسع وعرب کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا :

وقالت الیھود لیست النصرٰی علٰی شئٍ وقالت النصرٰی لیست الیھود علٰی شئٍ و ھم یتلون الکتٰب کذٰلك قال الذین لا یعلمون مثل قولھم۔	یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین بے بنیاد ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا دین بے اصل ہے حالانکہ دونوں کے پاس اللہ کی کتاب ہے اور وہ اسے پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی بات ان نے بھی کہی جو مقدس

کتابوں کا علم نہیں رکھتے۔

پھر ان مذہبی گروہوں کے ان غلط خیالات کی تردید اس طرح فرمائی :

وان من اُمّة الّا خلا فیها نذیر ۵ و لقد بعثنا فی کلّ امة رسولاً ان اعبدوا اللّٰہ و اجتنبوا الطاغوت۔

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خدا کے عذاب سے ڈرانے والا نہ آیا ہو اور بلاشبہ ہم نے دنیا کی ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث کیا جس کا پیغام یہ تھا کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے رہو اور شیطان سے بچتے رہو۔

پھر حکم دیا گیا کہ پیغامِ محمدیؐ کے قبول کرنے والے کے لیے تمام پچھلے پیغمبروں اور ان کے صحیفوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس اقرار کے بغیر کوئی شخص مسلم نہیں تسلیم کیا جا سکتا :

الذین یؤمنون بما انزل الیك و ما انزل من قبلك۔

پرہیزگار وہ ہیں جو قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہیں اور ان تمام کتابوں پر، جو اس سے پہلے اُتریں۔

پھر خدا کے ان مقدس بندوں میں نبی ہونے کے لحاظ سے، کسی قسم کا فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی :

کلّ اٰمن باللّٰہ و ملٰئکتہٖ و کتبہٖ و رُسلہٖ لا نفرق بین احد من رسلہٖ۔

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے) سب ایمان لاتے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اقرار کیا کہ ہم اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

قرآن کریم نے اعلان کر دیا کہ شمعِ نبوت کی یہ روشنی، جو آج عرب کے ذرّوں کو جگمگا رہی ہے، کوئی نئی روشنی نہیں بلکہ مختلف عہدوں میں یہی روشنی زیتون کے مرغزاروں کو اور ہمالیہ کے کہساروں کو بھی روشن کر چکی ہے اور اب "پیغامِ محمدیؐ" کے نظر افروز فانوس میں ساری دنیا کو دعوتِ تماشا دے رہی ہے اور جمالِ حقیقت اور چشمِ شوق کے درمیان کوئی پردہ باقی نہیں چھوڑ رہی۔ بے شک آفتابِ نبوت اپنی عالم افروز اور جہاں تاب کرنوں کو دنیا کے چپّہ چپّہ میں بکھیرتا ہوا طلوع ہو چکا ہے۔ اس لیے ڈوبے ہوئے چاند اور تاروں سے رہنمائی کی جستجو بیکار ہے :

ان الدین عند اللّٰہ الاسلام۔

درحقیقت دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

؎ آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

تاہم آفتاب کا کام یہ ہے کہ وہ اندھیرے کو دُور کر دے اور دنیا کو روشنی سے معمور کر دے۔ لیکن اگر کوئی چادر میں منہ

چھپا کر بیٹھ جاتے اور روشنی سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کرے، تو اس کی چادر کو کھینچ کر اتار پھینکنا آفتاب کا کام نہیں۔
نور اسلام نے اپنی ظلمت پاش شعاعوں سے حق و باطل، معروف و منکر، طاقت و معصیت، عدل و ظلم میں امتیاز پیدا کر دیا۔ ہر شخص کے لیے، جس کو دیدۂ بصیرت حاصل ہے اب یہ ممکن ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کی شاہراہ پر چل کر منزلِ حقیقت کا سراغ پالے لیکن اگر کوئی عقل کا اندھا کفر و طغیان کی گھاٹیوں میں ہی ٹاک ٹوئیاں مارنا پسند کرے، تو اس پر کوئی جبر نہیں:

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔

دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں۔ کیونکہ حق اور باطل میں کھلا امتیاز قایم ہو چکا ہے۔

انا انزلنا علیک الکتاب للناس بالحق فمن اھتدٰی فلنفسہٖ و من ضل فانما یضل علیھا و ما انت علیھم بوکیل۔

ہم نے یہ کتاب لوگوں کی ہدایت کے لیے آپ پر سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ سو جس کسی نے راہِ ہدایت قبول کی، تو اپنے فائدے کے لیے اور جس کسی نے گمراہی اختیار کی، تو اپنے نقصان کے لیے اور اے پیغمبر! آپ ان کے ذمہ دار نہیں۔

ایک اور جگہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوشِ دعوت کی مزاحمت کی جاتی ہے:

ولو شآء ربک لاٰمن من فی الارض کلھم جمیعا ط افانت تکرہ الناس حتّٰی یکونوا مؤمنین۔

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین پر سب بسنے والے ایمان لے آتے (لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں) تو پھر کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔

ہاں البتہ اگر کوئی فرد یا گروہ صداقت کی اس روشنی ہی کو گل کر دینا چاہے، یا دوسروں کو اس سے جبراً استفادہ نہ کرنے دے، تو بے شک اس کی مزاحمت کی جائے گی۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی آنکھیں بند کر لے اور ٹھوکر کھا کر گر پڑے مگر دوسروں کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کا حق کسی کو نہیں۔

یُریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہٖ ولو کرہ الکٰفرون۔

کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو منہ سے پھونکیں مار مار کر بجھا دیں مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر اسے پسند نہ کریں۔

انتقام در انتقام

انتقام در انتقام کا چکر بھی ہمیشہ دنیا میں خون کے طوفان برپا کرتا رہا ہے۔ خود جزیرۃ العرب بعثت محمدی سے پہلے اس طوفان کی موجوں میں گھرا ہوا تھا۔ چراگاہوں میں، میلوں میں یا شاعروں کی مجلس میں کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی تھی تو سیکڑوں تلواریں نیام سے تڑپ کر نکل آتی تھیں اور پھر برسوں اور قرنوں تک ان کی برق افشانی جاری رہتی تھی۔ انتقام کے اس مجنونانہ جذبے میں مجرم و غیر مجرم اور حق و ناحق کا کوئی فرق باقی نہ رہتا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ خدا کی مخلوق کے درمیان پیدا ہونیوالے جھگڑوں کا فیصلہ خدا ہی کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حکومت کے

ذریعہ ہونا چاہیے، جو اس قانون کے نفاذ کے لیے قایم ہوتی ہو:

ان الحکم الا للّٰہ۔ حکومت اور فیصلہ کا حق صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔

ایسی حکومت کے ارباب بست وکشاد کے یہ اوصاف بیان فرمائے گئے:

الذین ان مکّنٰھم فی الارض اقاموا الصّلٰوۃ و اٰتوا الزّکٰوۃ و امروا بالمعروف و نھوا عن المنکر۔ (۲۲ : ۴۱)

یہ وہ جماعت ہے کہ اگر ہم انھیں زمین پر صاحبِ اقتدار بنا دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قایم کریں۔ بھلائی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں۔

قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کا کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی حق نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جب اسلام کے نامور خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کو ابولؤلؤ نامی ایک غلام نے جفینہ نصرانی اور ہرمزان پارسی کی سازش سے شہید کر دیا اور جوشِ غضب میں وارفتہ ہو کر عبید اللہ بن عمرؓ نے اپنے باپ کے انتقام میں ہرمزان کو تہ تیغ کر دیا، تو قایم مقام خلیفہ حضرت صہیب کے حکم سے انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور جب تک ان کی طرف سے دیت ادا نہ کر دی گئی، رہائی نہ ہو سکی۔

پھر ایک عام حکم دیا گیا کہ دشمن ہوں یا دوست، اپنے ہوں یا غیر، مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی سے بھی برتاؤ کرتے وقت عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دیں:

و لا یجرمنکم شنأن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔

کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس سے بے انصافی پر آمادہ نہ کر دے۔ عدل کو ہاتھ سے نہ دو کہ وہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص قانون کے دائرہ میں رہ کر قانون کے ذریعہ جو زیادتی اس پر کی گئی ہے، اس کا بدلہ لے سکتا ہے:

فمن اعتدٰی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدٰی علیکم۔

جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر کی ہے۔

پھر بھی عفو و درگزر اور مرحمت و مغفرت کا درجہ بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے:

و لمن صبر و غفر ان ذٰلک لمن عزم الامور۔

اور درحقیقت جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو بے شبہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

فمن عفا و اصلح فاجرہ علی اللّٰہ۔ (۴۲ : ۴۰)

اور جس نے معاف کیا اور صلح کی راہ اختیار کی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمّہ ہے۔

خود جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اس آیت مبارکہ کی عملی تفسیر ہے۔ دشمنوں نے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو گالیاں دیں، آپ کو دیوانہ و مجنوں کہا، آپ کا مذاق اڑایا، آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے،

آپ کے جسمِ اطہر پر نجاست پھینکی، آپ کی پیشانی انور کو زخمی کیا، آپ کے قتل کی سازش کی اور آخر کار محض اس جرم میں کہ آپ خدا کے گھر میں خدا کا نام کیوں لیتے ہیں، آپ کو راتوں رات مکہ سے نکل کر مدینہ جانے پر مجبور کر دیا اور پھر وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ بار بار قتل کی سازشیں کی گئیں، عہد نامے توڑے گئے، بدر، اُحد اور خندق کے معرکے برپا کیے گئے لیکن جب قدرت کے امتحان کی مدت ختم ہُوئی اور رب العزت کے دستِ انتقام کو جنبش ہُوئی، یہی مجبور و مقہور، ستم دیدہ و جفا کشیدہ "مہاجر" اسی کعبہ میں جہاں سے انھیں رب کعبہ کا نام لینے اور اس کی بارگاہِ نیاز میں سر جھکانے کی بھی اجازت نہ تھی، اس شان سے مجلس آرا ہُوا کہ ہزار ہا گردنیں اس کے سامنے عاجزانہ جھکی ہُوئی تھیں، ہزار ہا زبانیں اس کی عظمت و سطوت کا اعتراف کر رہی تھیں اور ہزار ہا کان اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے اس کی جنبشِ لب پر لگے ہُوئے تھے، تو تمھیں معلوم ہے اس نے اپنے جان و مال، عزت و آبرو، دین و ایمان کے دشمنوں کے متعلق کس فیصلہ کا اعلان کیا؟ اس نے اعلان کیا:

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔

آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو، جو چاہو، کرو۔

استیلاء کامل کے بعد یہ پہلا پیغام امن و سلام تھا۔ پھر حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں جو اُمت کے نام آپؐ کا آخری پیغام تھا، آپ نے جنگ کے دیوتا اور انتقام کے بھوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پا بہ زنجیر کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

الا ان کل شئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع و دماء الجاھلیۃ موضوعۃ و اول دم اضعہ من دماء فدم ابن ربیعہ۔

سُنو، میں جاہلیت کی تمام رسمیں اپنے پاؤں تلے کچل دیتا ہُوں اور انتقامِ خون کی رسم بھی اپنے پاؤں تلے کچلتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے بھائی ربیعہ ہی کے خون کے مطالبہ کو ختم کرتا ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خلقِ عظیم اور ذکرِ جمیل آج تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی دنیا کی امن پسند اور صلح جُو قوموں کے لیے ایک منارۂ روشنی ہے۔ ہر قوم و ملت کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا آدمی اس روشنی میں اخلاق و انسانیت اور صلح و امن کی گم شدہ منزل کا سراغ پا سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ہر امن پسند اور صلح جُو کے لیے فمن عفی واصلح فاجرہ علی اللہ۔ (جس کسی نے عفو و صلح کی راہ اختیار کی، تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے) کی بشارت سنائی گئی تو آپ کو وان لک لاجرا غیر ممنون وانک لعلیٰ خلق عظیم (آپ کے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ منقطع ہونے والا نہیں، کیونکہ آپ کا اخلاق نہایت بلند ہے) کی کرامت عطا فرمائی گئی۔ اس لیے کہ:

من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجر من عمل بہا۔

جس کسی نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا، اسے ان سب لوگوں کے برابر ثواب ملے گا جو اس طریقہ کو اختیار کریں گے۔

فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ بخلقہ محمد و بارک وسلم۔

آزادی کا علمبردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

اسلام کا ایک بنیادی نظریہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا، لیکن اس نے یا خود ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہن لیں یا ظالمانہ روایات اور جابر انسانوں نے اپنے ہم جنسوں کو پابہ زنجیر کر دیا۔ کسی انقلاب کو حقیقی مصلحانہ انقلاب نہیں کہہ سکتے، جب تک اس انقلاب سے انسان کا قدم غلامی سے آزادی کی طرف نہ بڑھے۔ مولانا رومؒ نے بھی نبوت کی یہی حقیقت اس مصرع میں بیان کی ہے کہ: ؎

خلق را از انبیاء آزادی است

اور اسی خیال کو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں ادا کیا ہے: ؎

جس کے ڈر سے دہر کا قصرِ کہن آئین گرا
گردنِ انساں سے طوقِ راہبِ خود بیں گرا

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اس وقت تمام دنیا کے انسان گوناگوں غلامیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ظالم حکمرانوں نے رعایا کو غلام بنا رکھا تھا۔ بعض انسانوں نے بعض انسانوں کو حیوان یا مالِ تجارت قرار دے کر ان سے نفع اندوزی کا طریقہ رائج کر رکھا تھا۔ مذہبی پیشواؤں احبار و رہبان نے لوگوں کے دل و دماغ کو توہمات کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور فطرت کے گلے میں بھاری طوق ڈال رکھے تھے مردوں نے عورتوں کو بے طرح محکوم کر رکھا تھا اور ربے در رسرمایہ داروں نے معاشی استبداد روا رکھا تھا۔ مصلحین عالم میں فقط ایک مصلح ایسا نظر آتا ہے، جس کی اصلاح میں ہمہ گیری ہے۔ استبداد کا کوئی ظاہری یا خفیہ پہلو اس کی نظر سے اوجھل نہیں۔ وہ ایک ایک کر کے ہر زنجیر اور ہر زنجیر کی ہر کڑی کو توڑتا ہے اور انسان کو آزاد کر کے خدائے مطلق کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے تاکہ وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے ساتھ ایک کرے۔ انسان خدا تو نہیں بن سکتا، لیکن خدا کا ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور خدا کے ساتھ ہم آہنگی ہی اصلی آزادی ہے۔

آئیے ہم طلوعِ اسلام کی معاصرانہ زندگی پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انسان جس کو اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ علی الارض بنانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا، وہ کس قدر ذلیل و خوار ہو چکا تھا۔ مسجودِ ساکنانِ فلک سنگ و حجر اور اپنے وہم سے تراشیدہ معبودوں کا ساجد بن چکا تھا۔ وہی انسان جس میں مسخرِ کائنات بننے کی صلاحیت ودیعت کی گئی تھی، وہ خود خارج کی ہر قوت سے مسخر ہو چکا تھا۔ یونانی حکیم اپیکیورس جو لذتیت کے فلسفے کا امام شمار ہوتا ہے، اس کی تعلیم کا ایک جزوِ اعظم یہ تھا کہ انسانوں کے دلوں میں دیوتاؤں کا خوف جب تک زائل نہ ہو جائے، تب تک وہ حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتے اور جب تک بے بنیاد خوفوں سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، تب تک مسرت و سعادت اور سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتے۔

اپیکیورس دیوتاؤں کے وجود کا منکر نہ تھا، لیکن فقط یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ دیوتا انسانوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم توحیدِ حقیقی کے علم بردار تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ان دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ معبود انسان کی اپنی ادنیٰ خواہشوں کے مجسمے ہیں۔ ایک صوفی شاعر کا کیا عمدہ شعر ہے۔ ایک معبودِ بُت زبانِ حال سے پجاری کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے :

مرا بر صورتِ خویش آفریدی
بروں از خویشتن آخر نہ دیدی

(تم نے مجھے اپنی ہی صورت پر بنایا ہے ، میں تمھاری ہی خواہشات کا آئینہ ہوں ، میرے اندر تم اپنے آپ کو ہی دیکھ رہے ہو ، اس کے سوا مجھ میں کیا رکھا ہے)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اصل دین توحید ہے۔ جس قدر یہ عقیدہ کسی میں راسخ ہوتا جائے گا ، اسی قدر وُہ شخص آزاد ہوتا جائے گا ، جو موحّد ہے وہ فطرتِ خارجہ کی قوتوں سے ڈرے گا اور بے جا خوف ہر قسم کی پست ہمتی اور پست اخلاقی کی جڑ ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم جب نجات یافتہ انسان کا ذکر کرتا تو کہتا ہے :

فلا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔

انسان کا کمال یہی ہے کہ وُہ ہر قسم کے وہمی اور غیر اصلی خوف سے آزاد ہو جائے ۔ اس پر کوئی شخص معترض ہو سکتا ہے کہ خدا کا ڈر تو باقی رہتا ہے ۔ لیکن خدا کا ڈر تمام قسم کے خوفوں سے الگ نوعیت کا خوف ہے۔ یہ اپنی فطرت کے قانون کی خلاف ورزی کا ڈر ہے یہ ڈر اسی قسم کا ہے جس طرح صاف آدمی گندگی سے ڈرتا ہے ، نیک سیرت آدمی بد اخلاقی سے ڈرتا ہے اور محبت کرنے والے انسان ایک دُوسرے کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں۔ خدا کے ڈر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس سے ڈرے کہ وہ انسانیت کے مرتبے سے نہ گر جائے۔

توحید میں کائنات کے اندر صرف ایک ہی حقیقی عامل و موثر قوت باقی رہ جاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الاّ باللہ لا غالب الاّ اللہ لا موثر فی الوجود الاّ اللہ۔ جس شخص نے اپنی مرضی کو اس مشیّتِ ظلی کے ساتھ وابستہ کر دیا ، اس کو کسی کا ڈر باقی نہ رہا اور وُہ خلافتِ الٰہی کا حقدار ہو گیا۔ تمام قسم کے صحیح نظریاتِ حیات فقط عقیدہ توحید ہی سے سرزد ہو سکتے ہیں۔

توحیدِ کائنات جس پر تمام سائنس کی بنیاد ہے ، وہ بھی اسی توحیدِ الٰہی کا ایک پہلو ہے۔ توحیدِ حیات اور توحیدِ انسانیت بھی اسی نخلِ توحید کی شاخیں ہیں۔ حضورؐ نبی یہ چاہتا تھا کہ تمام انسان حقیقتاً آزاد ہو جائیں ، اسی نے سب سے زیادہ توحید کی حقیقت کو واضح کیا۔ اور کہا کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے ، جو کسی طرح معاف نہیں ہو سکتا۔

مذہب نے تمام دنیا میں یہ صورت اختیار کر رکھی تھی کہ ہر مذہبی گروہ نجات کا اجارہ دار بن گیا تھا ، اور قوموں کے اندر مذہبی پیشواؤں کے طبقے تفوّق حاصل کرکے انسانوں اور خیالی معبدوں کے درمیان دلاّل بن گئے تھے۔ اسلام نے انسانوں کو اس مذہبی استبداد اور اجارہ داری سے نجات دلائی اور یہ تعلیم دی کہ ہر انسان کا تعلق براہِ راست خدا سے ہونا چاہیے۔ درمیان میں کسی کمیشن ایجنٹ کی ضرورت نہیں۔ اس طبقے کی نسبت قرآن کریم میں ہے کہ یہ دھوکہ دے کر لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور لوگوں کو خدا تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اسلام کے انحطاط کے زمانے میں کچھ افراد اسی قسم کے اجارہ دار بن بیٹھے لیکن یہ طبقہ کبھی ملّتِ اسلامیہ پر منظم ڈاکہ نہ ڈال سکا۔

انسان نے انسانوں کو جو براہِ راست غلام بنا رکھا تھا، اس کا انسداد بھی اُسوۂ نبیؐ کی تعلیم میں اس انداز کا ملتا ہے، جس کی مثال قدیم دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تمام تہذیبوں میں یہ خیال چلا آتا تھا کہ غلامی ایک فطری چیز ہے۔ ارسطو جیسا حکیم بھی کہتا تھا کہ غلامی ایک فطری چیز ہے اور بعض لوگ غلام ہی بننے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے بڑے بڑے کارنامے غلاموں ہی کے رہین منّت ہیں۔ اسلام نے دیکھا کہ دنیا کا تمام معاشی نظام اس لعنت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ایسا ہمہ گیر تھا کہ بیک قلم اس کا منسوخ کرنا محال تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور اپنے عمل سے اس کی تنسیخ کا ایسا پروگرام بنایا کہ اگر مسلمان نیک نیتی سے اس پر چلتے، تو غلامی چند سال کے اندر داستانِ پارینہ بن کر رہ جاتی۔

غلاموں کو آزاد کرنا ایک بڑے ثواب کا کام قرار دیا۔ اس کو خیرات کا بہترین مصرف بنا دیا۔ یہ قانون بنا دیا کہ غلام کو کوئی شخص بالجبر غلام نہیں بنا سکتا۔ مالک کی شدید بدسلوکی کی وجہ سے غلام کو عدالت آزاد کر سکتی ہے۔ یہ بھی شرط لگا دی کہ غلام اس شرط پر رکھ سکتے ہو کہ جو تم کھاؤ، وہ اس کو کھلاؤ اور جو پہنو، اس کو پہناؤ۔ مقصد یہی تھا کہ اس شرط پر بھلا کون کسی کو نوکر رکھنا چاہے گا۔ مسلمان غلامی کو صفحۂ ہستی سے تو نہ مٹا سکے لیکن اسلام کی تعلیم کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ غلامی کی وہ بھیانک صورت نہ رہی، جو دیگر اقوام میں پائی جاتی تھی۔ غلام رکن خاندان بن گئے، مذہبی پیشوا اور عالم دین بن گئے، امیر و وزیر بن گئے، فوجوں کے سپہ سالار اور بادشاہوں کے محبوب بن گئے۔ رسولؐ خدا کے بعد حضرت عمرؓ نے غلامی کو منسوخ کرنے کے لیے ایک بڑا قدم اٹھایا کہ کوئی عرب غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے بعد کے فرمانروا اگر اس راستے پر دو چار قدم اور چلتے تو اسلامی ممالک میں غلامی کا قلع قمع ہو جاتا۔

اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنا بہت سے گناہوں کا کفّارہ قرار دیا۔ اسلام سے پہلے اور اس کی معاصر دنیا میں غلامی کے بارے میں اس کے مماثل کوئی تعلیم نہیں ملتی۔ یونان کی جمہوری شہری مملکتوں میں ایک آزاد شہری کے مقابلے میں تین غلام ہوتے تھے اور یونان و روما کے قوانین میں ان کے حقوق نہ تھے۔ ان کا جو مالک تھا، وہ کلیتہً ان کے جان و مال اور آبرو کا مالک تھا۔

بعض مذاہب کی کتابوں میں ہے: غلامی کی ایک اور قسم یہ تھی کہ مردوں نے عورتوں کو غلام بنا رکھا تھا کہ عورت ماتحت رہنے کے لیے پیدا ہوئی ہے، وہ اپنی جائیداد نہیں رکھ سکتی۔ باپ کے گھر میں وہ باپ کی محکوم ہے، شادی کے بعد شوہر کی محکوم اور بیوہ ہو جانے کی صورت میں اپنی اولادِ نرینہ کی محکوم۔

سب سے پہلے انسانوں کے آزاد کرنے والے نبیؐ نے عورتوں کو ایک مستقل حیثیت عطا کی اور کہا کہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں۔ نکاح کو ایک آزادانہ معاہدہ قرار دیا، جو ہر قسم کی جائز شرائط پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ خاص نامساعد حالات پیدا ہو جانے سے مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی کا حق رکھتے ہیں۔ عورت خود اپنے سرمایہ اور جائیداد کی بے شرکتِ شوہر مالک ہو سکتی ہے۔ خود مسلمانوں نے انحطاط کے دور میں ان کے بہت سے حقوق سلب کر لیے۔ لیکن اصل اسلام میں ان کے حقوق کی مساوات موجود ہے۔ مغرب میں عورتیں اپنے قانونی حقوق کے لیے کم و بیش ایک سو سال سے جدوجہد کر رہی ہیں۔ اس پر بھی انھیں کچھ حاصل ہوا اور کچھ نہیں۔ جو کچھ وہ جائز طور پر طلب کرتی ہیں، وہ اسلام کی تعلیم میں پہلے سے موجود ہے۔ آج عورتیں نکاح و طلاق، وراثت و ملکیت کے وہی حقوق طلب کرتی ہیں، جو اسلام میں مسلمان عورتوں کو حاصل ہیں۔ لیکن

اعلیٰ تہذیب کی مدعی قومیں ابھی تک ان کی مزاحم ہیں۔

غلامی کی دو اور بڑی قسمیں ہیں، ایک سیاسی غلامی، دُوسری معاشی غلامی۔ سیاسی غلامی کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ ہے کہ کوئی حکمران فرد یا حکمران طبقہ تمام رعایا کی جان و مال کا مالک بن جائے۔ ایک ملوکیت ہے اور دُوسری آمریت شاہی کا خاتمہ کرنا اسلام کا ایک اساسی اصول تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قسم کا اقتدار حاصل ہُوا، اس قسم کے صاحبِ اقتدار قدیم دنیا میں بادشاہ بن جاتے تھے۔ نہ رسول کریمؐ سے پہلے کی تاریخ میں اور نہ آپؐ کے بعد کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود ہے کہ کسی شخص نے اس قسم کے اقتدار کو بادشاہت میں تبدیل نہ کر دیا ہو۔ اس قسم کے لوگ پہلے بادشاہ بن جاتے تھے۔ اب اصطلاح بدل گئی ہے اور وُہ ڈکٹیٹر کہلاتے ہیں۔ ہے وہی دیو استبداد جس کا نام دُوسرا رکھ دیا جاتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عین عروج کے زمانے میں ایک اعرابی نے کہا: "اَنْتَ مَلِکُنَا" (تُو ہمارا بادشاہ ہے)، رسول کریمؐ نے فرمایا: نہیں، میں بادشاہ نہیں، خدا بادشاہ ہے۔ سوا سادہ سے سادہ غذا اور لباس کے اپنے لیے کچھ روا نہ رکھا۔ یہی حال خلفائے راشدین کا تھا، جو خالص اسلامی طرزِ حکومت کے حکمران تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کوئی قوم یا قبیلہ یا طبقہ حکمران نہ بن بیٹھے۔ قبائل کی باہمی فضیلت و تفوق کو منسوخ کر دیا، اور جب عربوں کو پورا غلبہ حاصل ہوگیا، تو یہ اعلان کیا کہ عرب کو عجم پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ سب فوقیت انفرادی ہے، جس کا مدار سیرت و تقوٰی پر ہے۔ قانونِ وراثت کو جاری کر کے جاگیرداری کی جڑ کاٹ دی۔ اس لیے اب جاگیرداروں کا بھی حکمران طبقہ بن نہ سکتا تھا جو کاشتکاروں کو موروثی غلام سمجھتے تھے۔

زکوٰۃ کو لازمی اور سُود کو حرام قرار دیا کہ سرمایہ داروں کا طبقہ رفتہ رفتہ غریبوں اور ناداروں کو غلام بنا لیتا ہے۔ نہ صرف قدیم زمانے ہی میں بلکہ زمانۂ حال تک یہ دیکھا جاتا تھا کہ سود خوار کے مقروض تب تک سُود خوار کی غلامی قبول کر لیتے تھے، جب تک کہ اصل مع سُود ادا نہ ہو جائے۔ لیکن سُود در سُود کی اتنی رقم جمع ہو جاتی تھی کہ مقروض کبھی اس دلدل میں سے نکل نہ سکتا تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری سے جتنی غلامی پیدا ہوتی ہے، انسانوں کے آزاد کرانے والے نے ان لعنتوں سے بھی ان کی گردنوں کو چھڑانے کی ایک بلیغ کوشش کی۔

غلامی اور آزادی کے مسئلے میں ایک اور طرف بھی نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ اسلام سے قبل نہ صرف انسانوں کے اعمال پر بیجا پابندیاں تھیں بلکہ خود علم بھی آزاد نہ تھا۔ ہر جگہ علم مذہبی طبقے میں محدود تھا اور علم کی بھی اجارہ داری قائم تھی۔

قرآن کریم نے علم و حکمت کو خدا کی نعمتِ عظیم قرار دیا اور اس کو انسانیت کا جوہر ٹھہرایا۔ اس کی بدولت آدم مسجودِ ملائک ہُوا۔ علم کا حصول ہر مرد و عورت کے لیے فریضہ قرار دیا اور قوانینِ فطرت پر غور و خوض کو ایمان کا سرچشمہ ٹھہرایا۔ مورخوں کو حیرت ہوتی ہے کہ صحرا سے نکلنے والے دین نے اس قوم کو جو شروع میں اُمّی تھی اور جس کا نبیؐ بھی اُمّی تھا، کس طرح چند سال میں دنیا کے علوم و فنون کا مالک اور اقوام کا علمی رہبر بنا دیا، اس تاریخی اعجاز کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ علم پہلے آزاد نہ تھا۔ اسلام نے اس کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ جس قوم میں علم آزاد ہو اور اس کا حاصل کرنا ایک مذہبی فرض ہو، اس کی لامحدود ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

آخر میں مَیں اس غلامی کا ذکر کرتا ہوں، جو شدید ترین ہے۔ وُہ خواہشاتِ نفس کی غلامی ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم نے یہ بتایا کہ تمھارے اندر جو جبلّتیں ہیں، وہ فطری اغراض کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ ایمان اور عمل صالح سے ان سے بہت اچھے کام لیے جا سکتے ہیں۔ یہی جبلّتیں اگر بے عنان ہو جائیں، تو انسان اپنے باطنی شیاطین کا غلام بن جاتا ہے، جو اس کی گردن میں رسّی ڈالے ہُوئے، جدھر چاہیں، اس کو گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ نفسِ انسانی کو ان پر حکمران ہونا چاہیے، ان کا محکوم نہیں بننا چاہیے۔ خواہشات کا غلام بدترین غلام ہے، خواہ وُہ بظاہر بادشاہ و امیر ہی نظر آئے۔

اگر ہر انقلابی تحریک کسی نہ کسی لحاظ سے کسی استبداد کے خلاف جہاد ہی کا نام ہے تو دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑا مصلح، مجاہد اور انقلابی رہنما محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے جس نے ہر استبداد کے خلاف جہاد کیا، خواہ معاشی اور خواہ دینی ہو، خواہ علمی۔

حقیقت میں آزادی کی علمبردار وہی اُمت ہو سکتی ہے جو اس قسم کا ہمہ گیر جہاد کرے جس کا اسوہ حسنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔

اسلامی معاشرہ اور نابینا افراد

محمد اسمٰعیل آزاد

انقلاب فرانس جس نے موجودہ جمہوریت کو جنم دیا، اس کے بعض کارکنوں نے انسانی مساوات اور حریت کے سلسلے میں نابینا افراد کو معاشرے کے لیے مفید بنانے کا کام شروع کیا۔ اور اس وقت کے گرجوں میں رکھے جانے والے نابینا افراد کو مخیر لوگوں کی خیرات پر گزارہ کرنے کے بجائے پڑھنا لکھنا اور مفید دستکاریاں سکھانے کا بطور تجربہ آغاز کیا۔ یہ طریقہ کار بتدریج یورپ اور یورپین قوموں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں پھیلا۔

فرنگی اقتدار کے بل بوتے پر عیسائی مبلغین جس طرح عیسائیت کو فروغ دیتے رہے، یہ ایک تلخ کہانی ہے۔ اس کہانی کا ایک پہلو اندھے اور اپاہج لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام تھا، جو عیسائی مشنریوں نے مختلف ملکوں میں شروع کیا۔

پہلی جنگِ عظیم میں ہزارہا افراد جنگ کے نتیجہ میں بینائی سے محروم ہوئے، اس لیے حکومتوں نے ان نابینا فوجی افراد کی پیشہ ورانہ تربیت اور آبادکاری کے لیے کثیر رقمیں خرچ کیں اور یہ کام ایک باقاعدہ فن بن گیا۔

دوسری جنگ عالمگیر کے موقع پر مزدوروں کی کمی کے وقت ایسے نابینا افراد کو کارخانوں میں بعض کاموں پہ لگایا گیا' اور یوں یورپ اور امریکہ کو ان کی ضرورت نے اس سلسلہ میں فلاح نابینا کا کام ایجاد کروایا۔ چنانچہ اب ہر ملک اس تجربہ سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور دنیا بھر میں ہزاروں نابینا افراد کو تربیت اور تعلیم دی جا رہی ہے اور اس خاص سلسلے کا لٹریچر مختلف اداروں کی طرف سے پھیلتا جا رہا ہے۔

نابینا افراد کی تعلیم و تربیت کے عملی پہلو سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، لیکن اس کے علمی پہلو میں ایک بہت بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ اس سلسلے کا لٹریچر فلاح نابینا کے سلسلے میں ابتدا اور کامیابی کا سہرا صرف عیسائیت کے سر رکھتا ہے۔
(دیکھو - THE BLIND IN ASIA)

دوسرے اس قسم کے مصنفین کو جاپان کے قدیم زمانے کے بدھ مذہب کے نابینا علما تو نظر آتے ہیں، لیکن ممالک مشرق وسطیٰ میں اسلام کے دورِ اول سے لے کر آج تک جتنے نابینا علماء، ادباء، شعراء ہو گزرے ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت دوسرے آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ہوتی رہی ہے۔ یا تو ان مصنفین کو ان کا علم نہیں ہے، یا وہ جان بوجھ کر چھپاتے ہیں اور اس طرح ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جسے علومِ دین سے واجبی سی واقفیت ہوتی ہے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ معذور افراد کی فلاح و بہبود کا کام صرف مغربی تہذیب کی ایجاد بندہ ہے۔

ظاہر ہے اس غلط فہمی کو جس قدر جلد ہو سکے، دور کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں مصر کے ایک عالم صلاح الدین الصفدی

نے کتاب نکت الہمیان لکھ کر اس میں تاریخ اسلام کے تقریباً تین سو ایسے نابینا افراد کا تذکرہ لکھا جو علم و ادب، شاعری، علمِ دین وغیرہ میں اپنے دور کے مسلّم علما تھے اور جن کی تعلیم و تربیت آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ہوئی تھی۔ غالباً کسی اسلامی ملک کی طرف سے یہ پہلی کتاب تھی۔

غیر منقسم ہند میں مولانا اسلم جے راجپوری نے "نوادرات" کی بنیاد غالباً اسی کتاب نکت الہمیان پر رکھی اور بہرحال اردو زبان میں پہلی مرتبہ نابینا علماء و شعرا کا تذکرہ لکھا۔

ان تذکروں میں چونکہ نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے، دوسرے نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے موجودہ نکتۂ نگاہ سے ان میں کام نہیں لیا گیا، اس لیے راقم الحروف کو خیال ہوا کہ جدید نکتہ نگاہ سے اسلام میں نابینا افراد کے حقوق و فرائض اور دورِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے اصول اجاگر کیے جائیں۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دورِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل ریکارڈ جس طرح ہمارے فنِ حدیث اور رجال میں موجود ہے، ایسا کسی مذہب کے دورِ اوّل کا مکمل ریکارڈ اس وقت دنیا کے پاس نہیں ہے اس لحاظ سے دورِ رسالت کے نابینا افراد، ان کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری بہرحال مستند ریکارڈ کا درجہ رکھتی ہیں، جبکہ بعض مذاہب عالم میں نابینا افراد کے تذکرے افسانوی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ تاریخِ انسانیت میں اس نے پہلی مرتبہ نابینا افراد کو معاشرے میں دوسرے صحیح سالم افراد کے مساوی حقوق عطا فرمائے اور اس طرح انھیں معاشرے میں دوسرے طور پر جذب کر لیا جو آج بھی ترقی یافتہ ممالک کے لیے صرف ایک نصب العین ہے، جسے وہ باوجود اتنی ترقیوں کے حاصل نہ کر سکے۔

اخیر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اسلام کی امتیازیت کو نابینا افراد کو معاشرے میں جذب کرنے کے بارے میں ثابت کر دینا ہی سب کچھ نہیں بلکہ عملاً اس کو کر دکھانا اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر واجب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ سطور میں جو کچھ دورِ رسالت کے طریقہ کار کے بارے میں مستند کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے، نابینا افراد ان کی فلاح و بہبود کا کام کرنے والے افراد اور ادارے ملک کے تعلیم یافتہ افراد، سماجی کارکن، حکومت کے کارندے اور اسلام پسند حضرات اسے پڑھ کر رسالت کے طریقہ کار کو نابینا افراد کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنائیں گے۔

نابینا افراد کے مسائل قرآن و سنّت کی روشنی میں

قرآن کریم میں لفظ اعمیٰ یعنی نابینا اپنے لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور اصطلاحی معنی میں بھی۔ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی "تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، اس لیے کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا"۔ یہاں یہ لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ اَمْ هَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ۔

(کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں اور کیا اندھیرا اور اجالا برابر ہو سکتے ہیں)

یہاں یہ لفظ اپنے وسیع اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے اور مقصود نابینا کی ذلّت نہیں ہے بلکہ اسلام اور کفر کے فرق کو ہدایت اور گمراہی، نور و ظلمت، بینا اور نابینا کے ظاہری فرق سے مثال دے کر سمجھایا گیا ہے اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (۲۲: ۴۶)

(اسلام کے مخالفین بظاہر آنکھوں سے نابینا نہیں ہیں، لیکن ان کے قلوب کی آنکھیں اندھی ہیں، وہ بصیرت سے محروم ہیں)

ومن کان فی ھٰذِہٖ اعمٰی فھو فی الاٰخرۃ اعمٰی و اضل سبیلا۔

(یہاں کا اندھا جو دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لایا وہ آخرت میں بھی محروم رہے گا)

اس آیت میں لفظ اعمٰی اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

الغرض قرآن کریم نے ان لوگوں کو نابینا کہا ہے، جو آنکھ رکھتے ہُوئے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سے محروم رہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"بلکہ نظر باطن کا نقصان بہ نسبت آنکھ کے نقصان کے زیادہ اور بڑا ہے، اس لیے کہ نفس مثل سوار کے ہے اور بدن مثل گھوڑے کے۔ اور ظاہر ہے کہ سوار کا اندھا ہونا بہ نسبت گھوڑے کے اندھے ہونے کے زیادہ مضر ہے اور باطن کی بصیرت کو ظاہری بصارت سے مشابہت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ما کذب الفؤاد ما رأی۔

جھوٹ نہ دیکھا دل نے جو دیکھا۔

اور فرمایا:

وکذٰلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض۔

اور اسی طرح ہم دکھلانے لگے ابراہیمؑ کو سلطنتِ آسمان اور زمین۔

اور اس کی ضد کو نابینائی فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوئیں پر اندھے ہوتے ہیں دل، جو سینوں میں ہیں۔"

(مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد اول باب علم فصل ہفتم)

اسی طرح سورہ فاطر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وما یستوی الاعمٰی والبصیر ولا الظلمٰت ولا النور ولا الظل ولا الحرور وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔

نابینا اور آنکھ والے، اندھیرا اور اجالا، سایہ اور دھوپ، زندہ اور مردہ برابر نہیں ہوسکتے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نابینا افراد کو آنکھ والے افراد کے مقابلے میں نعوذ باللہ حقیر سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ امام رازیؒ نے ان آیات پر تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ اس آیت میں افراد کے بجائے اوصاف کا مقابلہ کیا گیا ہے پھر کفار کے طریقہ ضلالت و گمراہی کو نابینا اور دین اسلام کے ماننے والے کو بینا سے تشبیہ دی ہے۔ بس مومن بصیر (دیکھنے والا) ہے اور کافر اعمٰی (نابینا)۔ (خلاصہ از تفسیر کبیر امام رازیؒ ج ۲۶ سورۂ فاطر)

الغرض اس آیت میں لفظ اعمٰی اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور اس طرح اسلام سے انکار کرنے والے کو نابینا، اندھیرا اور مُردہ فرمایا ہے۔

دُوسری طرف جیسا کہ آگے مناسب موقع پہ آئے گا، قرآن کریم نے بصیرت قلبی رکھنے والے نابینا افراد کو آنکھ والے بے بصیرت پر ترجیح دی ہے اور یہ واقعہ انسانی تاریخ کے محفوظ ترین ریکارڈ قرآن کریم میں محفوظ ہے اور افضل ترین انسان حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے یہ واقعہ مذکور ہوا ہے۔

نابینائی اور مذاہب عالم

خدائے بزرگ و برتر نے محض اپنے فضل و کرم سے انسان کو زندگی جیسی نعمتِ بے بہا بخشی اور پھر اس سے محفوظ ہونے کے لیے انسان کو حواسِ خمسہ عنایت فرمائے اور عقل جیسی دولت عنایت فرمائی، جس کے ذریعہ انسان زندگی کے راستے میں حوادث روزگار کی پیدا کردہ مشکلات اور رکاوٹوں پر عبور حاصل کرتا ہے۔

زوالِ بصارت بھی زندگی کی راہ میں اگرچہ بڑی رکاوٹ ہے لیکن ناقابلِ عبور نہیں۔ زندگی اپنی ہر کمی کو خود ہی پُورا کر لیتی ہے اور اس طرح خود کو حالات سے ہم آہنگ بنا لیتی ہے۔ مثلاً کسی چوپائے کی ایک ٹانگ ضائع ہونے سے اس کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ چوپایہ اپنی باقی ماندہ تین ٹانگوں سے پھر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کسی خارجی مدد کے بغیر خود کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔ زندہ رہنے کی یہ امنگ ہی زندگی کا اصلی جوہر ہے۔

زوالِ بصارت بھی اسی طرح کا جسمانی نقص ہے۔ جب دُوسرے جسمانی نقائص گونگا پن، بہرہ پن، لنگڑا پن، لولا پن وغیرہ زندگی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے اور جب زبان کے قائم مقام گونگے کے لیے اشارے بن جاتے ہیں، جس کی مدد سے اس کی روزمرہ کی گزر بآسانی ہو جاتی ہے، تو گویا گونگے بہرے فرد کے لیے بینائی زبان اور آواز کی قایم مقام بن جاتی ہے۔ اسی طرح نابینا فرد کے لیے اس کی قوتِ سامعہ اور لامسہ بینائی کا قایم مقام بن جاتی ہیں۔ بہرحال اس جسمانی نقص سے ایسے فرد کی انسانیت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں نے اس سانحہ کی اپنے اپنے عقائد کے مطابق توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عقیدۂ تناسخ رکھنے والی قوموں کے نزدیک یہ سانحہ بھی دوسرے سانحوں کی طرح گزشتہ زندگی کے کسی جرم کی سزا کے طور پہ واقع ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد نابینا فرد سے ہمدردی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ ایسا کرنا قانونِ آسمانی کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے۔ نتیجے میں ایسے معاشرہ میں نابینا افراد دُوسروں کی خیرات ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ اس طرح مخیّر

لوگ نروات (نجات) حاصل کریں۔

یہ جبری عقیدہ خود نابینا افراد میں اپنی اس رکاوٹ پر قابو پانے کے سلسلے میں کوئی حوصلہ پیدا نہیں کرتا بلکہ حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

بعض معجزہ پرست اقوام میں ان کے بانی مذہب کے ایسے معجزے گنائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے ہزار ہا نابینا افراد کو بینائی نصیب ہوئی تھی۔ لیکن اس بانیِ مذہب کے بعد نابینا افراد کو پھر ایسی معجزہ نما شخصیت کی تلاش میں سرگرداں رہنا ہی پڑتا ہے، جس کا معجزہ انھیں بینائی کی دولت سے مالا مال کر دے حالانکہ ان اقوام کے عقاید کی رُو سے اب ایسی شخصیت کا ملنا محال ہے۔ نتیجہ پھر وہی نکلتا ہے کہ نابینا افراد رضا بہ قضا خود کو مخیر حضرات کے رحم و کرم کے حوالے کر دیں۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائی گرجوں اور خانقاہوں میں معذور افراد کا پناہ گزیں ہونا اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ بہرحال اس عقیدے سے بھی نابینا افراد کو اپنی اس رکاوٹ پر عبور حاصل کرنے کے سلسلے میں کوئی حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔

دین اسلام انسانیت کی دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ اس دین کا طرۂ امتیاز انسانی مساوات کا قیام ہے۔ یہ اسلامی مساوات رنگ و نسل، قوم و زبان بلکہ صحیح سالم افراد اور جسمانی نقص رکھنے والے افراد کے درمیان کسی فرق کو گوارا نہیں کرتی۔ ایک فرد انسانی کے سارے اعضاء و حواس صحیح سالم ہیں۔ دوسرے کے کسی عضو میں کوئی نقص نہیں ہے، لیکن جسمانی نقص کی وجہ سے وہ کسی کمتر سلوک کا مستحق نہیں، بلکہ اسلام ایسے افراد کو بھی صحیح سالم افراد کی طرح فرائض کی ادائیگی کے نتیجے میں وہی حقوق عطا فرماتا ہے، اسلام نے ایسے افراد میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کی اور انھیں اپنے ماحول میں دلچسپی لینا اور خود کے لیے اور معاشرہ کے لیے مفید بننا سکھایا اور اس سلسلے میں انسانیت کی رہنمائی کی۔

نابینائی دربارِ رسالتؐ میں ایک دن حرمِ کعبہ میں سردارانِ قریش جمع تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کے بارے میں سمجھا رہے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا ایک قائد (آنکھ والا رہبر) کے ساتھ ادھر آنکلے اور درمیان گفتگو میں پوچھا کہ جو کچھ آپ کو خدا نے سکھایا ہے، مجھے بھی سکھائیے۔ آپ نے اشارے سے قائد کو سمجھایا۔ قائد کی بات ابن ام مکتوم نے نہ مانی اور گفتگو میں پھر دخل انداز ہوئے۔ حضورؐ نے منہ پھیر لیا اور دوسرے لوگوں کی طرف توجہ فرمائی۔ یہ واقعہ سورہ عبس کا شانِ نزول بنا اور وحی نازل ہوئی:

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ اَنْ جَاۗءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَاۗءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا اور کس چیز نے معلوم کروایا تجھ کو، شاید کہ وہ پاک ہوجاتا یا نصیحت سُنتا۔ پس فائدہ دیتی اس کو نصیحت پر جو شخص کہ بے پروائی کرتا ہے پس تو واسطے اس کے تقید کرتا ہے اور کیا ملامت ہے اوپر تیرے یہ کہ ناپاک ہووے وہ۔ اور جو کوئی آیا تیرے پاس

دوڑتا ہوا اور وہ ڈرتا ہے پس تو اس سے تغافل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات اور ان کی شانِ نزول سے مندرجہ ذیل باتیں ظاہر ہوتی ہیں:

۱۔ عبداللہ ابن امِ مکتوم مسلمان تھے اور جو مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کو تبلیغ فرما رہے تھے، یہ انھیں مکرر پوچھ کر سمجھنا چاہتے تھے۔

۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ یہ دخل اندازی نہ کریں، تاکہ آپ ان سردارانِ قریش کو اسلام سمجھا سکیں۔

۳۔ آپ کا خیال تھا کہ شاید ان میں سے کوئی مسلمان ہو جائے اور اس ابتدائی دور میں کسی سردارِ قبیلہ کا مسلمان ہو جانا اسلام کی تقویت کا باعث ہوتا جب کہ ابن امِ مکتوم مسلمان تھے اور یہی مسائل انھیں کسی دوسرے وقت سمجھائے جا سکتے تھے اس لیے ان کی دخل اندازی آپ کو ناگوارِ خاطر ہوئی۔

۴۔ نابینا سائل کو آپ نے نہ تو جھڑکا اور نہ بالراست خاموش ہونے کو فرمایا بلکہ اس کے ساتھی کو اشارہ فرمایا تاکہ نابینا کی دل شکنی نہ ہو کیونکہ اس کا ارادہ نہایت پاک تھا اور آپ دوسرے آدمیوں سے مصروفِ گفتگو ہو گئے۔

۵۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے پر ان کے قائد نے انھیں ٹوکا تو انھوں نے نہ مانا کیونکہ وہ اسے قائد کی بات سمجھے۔

۶۔ نابینا ہونے کی وجہ سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کو بھانپ نہ سکے۔

۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرح دوسری طرف مصروفِ گفتگو ہونے پر ابن امِ مکتوم اگرچہ خاموش رہے، لیکن ان کے دل پر یہ بات شاق گزری اور جیسا کہ ایسے موقع پر نابینا افراد محسوس کرتے ہیں، انھیں یہ خیال ہوا ہوگا کہ نابینا ہونے کی وجہ سے انھیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہی احساسِ پستی نابینا کو خود سے اور معاشرے سے متنفر کر دیتا ہے۔ بہرحال ان کی اس ذہنی خلش کی اطلاع خدائے بزرگ و برتر نے اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی دی۔

۸۔ چونکہ اسلام سے قبل اہلِ عرب نابینا افراد کو معاشرہ کا ناکارہ فرد سمجھتے اور ان کے ساتھ مل کر کھانے پینے کو باعثِ ننگ سمجھتے تھے، اس لیے اس کا امکان تھا کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کر لیتے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی نابینا افراد کے بارے میں انھیں کے ہم خیال ہیں۔ نعوذ باللہ منہا

۹۔ نابینا انسان جو راہِ راست پر ہو وہ آنکھ والے بے راہ انسانوں سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے اور اس کی نابینائی سے اس کی انسانیت میں کمی واقع نہیں ہوتی اور وہ صحیح سالم افراد کی طرح زندگی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

۱۰۔ یہ واقعہ قرآن کریم کو خدا کا کلام ثابت کرنے میں زبردست دلیل ہے جس میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک طرزِ عمل پر نکتہ چینی فرمائی گئی ہے اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہ رسول امین ہیں جو خود کے بارے میں ایسی وحی کو پوری امانت کے ساتھ قوم کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

عہدِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت

ابن اُمِ مکتوم ام المومنین خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی رشتہ داری تھی۔ قدیم الاسلام تھے اور ان سابقون الاوّلون میں سے تھے جنھیں ابتدائی مکّی دور میں حضورؐ کی مصاحبت اور آپؐ سے دین سیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، پیدائشی نابینا تھے۔ بقول زرقانی:

"وزعم بعضهم انه ولد اعمٰی فکنت امه به لاکتتام نور بصره"

یہ نابینا پیدا ہوئے اس لیے ان کی والدہ محترمہ نے ان کی کنیت ابن ام مکتوم مقرر کی۔ لیکن دوسری روایت حسب ذیل ہے:

وقد روی ابن سعد والبیهقی من انس ان جبرئیل اتی النبی صلی الله علیه وسلم وعنده ابن ام مکتوم فقال متی ذهب بصرك قال ولها غلام ولفظ البیهقی وانا صغیر۔

ابن سعدؒ اور بیہقیؒ نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ جبرئیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور ان کے پاس ابن ام مکتوم تھے۔ انھوں نے پوچھا: تمھاری بصارت کب گئی؟ کہا: جب میں ابھی بچّہ تھا۔ بیہقی کے الفاظ میں چھوٹا تھا۔ (زرقانی ج ۳ ص ۲۷۰)

تجسّس علم حاصل کرنے کے لیے بڑا ضروری عنصر ہے۔ آنکھ والے افراد اپنے گرد وپیش کو بیک نظر دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں نابینا افراد ایسا نہیں کر سکتے، اس لیے اپنے گرد وپیش سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یا تو لمس یا آوازوں کو سُن کر ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر انھیں پوچھنا پڑتا ہے۔ ابن ام مکتومؓ میں تجسّس کا کتنا مادہ تھا، یہ تو اس واقعہ ہی سے معلوم ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کی آواز سنتے ہی آپ کی خدمت میں دوڑے ہوئے آئے۔

واما من جاءك یسعٰی۔

اور جو تمھارے پاس دوڑتا ہوا آتے۔

یہ تجسّس تحصیلِ علم کے شوق میں تبدیل ہو گیا۔ زرقانی کی مذکورہ بالا روایت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ اکثر و بیشتر حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے۔

نزولِ سورۂ عبس کے بعد تو جب بھی یہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے، تو آپؐ فرماتے:

مرحبا بمن عاتبنی فیه ربی ولیبسط رداءه۔

اس کو خوش آمدید جس کے معاملے میں میرے رب نے مجھ پر عتاب فرمایا اور آپ ان کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔

اور ابن جریر نے روایت کی ہے کہ آپ اس کے ساتھ ہی ان کی ضروریات بھی پوچھ لیتے۔

دورِ رسالت میں عملی طور پر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ نازل شدہ وحی کو حفظ کروانا، اس کے معانی و مطالب، روزمرہ پیش آنے والے مسائل اور ان کا حل، ارکانِ اسلام کی عملی تعلیم وغیرہ۔ اس تعلیم میں ابن ام مکتومؓ دوسرے آنکھ والے صحابہ کرامؓ کے دوش بدوش شریک رہتے۔ آنکھ والے افراد سے الگ رہ کر نابینا فرد خود میں کمی محسوس کرتا ہے، اس لیے وہ خود کو زندگی کی دوڑ میں آنکھ والوں کے برابر کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ طریقہ رسالت صلعم میں اس کی گنجائش نہیں، بلکہ آپ کے طرزِ عمل سے آپ نے مساواتِ انسانی کا وہ سبق دیا جس سے واضح ہو گیا کہ جسمانی نقص رکھنے والے افراد خود کو صحیح سالم افراد سے کمتر نہ سمجھیں۔ اس کے نتیجے میں ابن ام مکتومؓ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی جو نابینا فرد کی تعلیم و تربیت کا پہلا قدم ہے۔

اس خود اعتمادی کی وجہ سے ابن ام مکتومؓ نابینائی کی وجہ سے پیدا ہونے والے احساسِ پستی کا شکار نہ ہو سکے اور دوسرے صحیح سالم افراد کی طرح زندگی اور اپنے ماحول میں دلچسپی لینے لگے۔

چنانچہ جب آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین و المجاہدین ۔ ۔ ۔ الخ نازل ہوئی، جس میں ارشادِ خداوندی تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے والے مومن اس میں شرکت نہ کرنے والے مومنوں سے زیادہ مراتب پائیں گے۔ علم دین کے شائق ابن ام مکتومؓ اپنے عذر نابینائی کے تعلق سے اس ارشادِ خداوندی کو سمجھنا چاہتے تھے۔ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا عذر پیش کیا۔ اس پر آیت غیر اولی الضرر نازل ہوئی یعنی معذور افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (دیکھو صحیح مسلم باب سقوط فرض الجہاد عن المعذورین)

اگر ان میں خود اعتمادی حضورؐ کے فیضِ صحبت سے نہ پیدا ہو جاتی تو اس آیت کے نتیجے میں بہرحال احساسِ کمتری کا شکار رہتے۔ لیکن آگے بڑھ کر پوچھ لینے سے استثنا کی اجازت مل گئی اور اس طرح دوسرے سب معذور افراد کی نمایندگی بھی ہو گئی، کیونکہ:

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا۔

خدا کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اس طرح نماز باجماعت کی تاکید کے موقع پر ابن ام مکتومؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ کیونکہ وہ مسجد نبویؐ سے کافی فاصلے پر رہتے ہیں، راستے میں جھاڑیاں وغیرہ ہیں اور ہر وقت کسی قائد کا ملنا بھی مشکل ہے، اس لیے نماز باجماعت سے انھیں مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیا تمھارے گھر تک اذان کی آواز سنائی دیتی ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: تم پر نماز باجماعت ضروری ہے۔ (المستدرک للحاکم، کتاب معرفۃ الصحابہ، تذکرہ ابن ام مکتومؓ)

مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نابینا فرد کے ساتھ حد سے زیادہ رعایت نہ برتی جاتی تھی۔ ورنہ ایسا کرنے سے نابینا فرد سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتا۔ اپنی جائے رہائش اور اس کے اطراف و اکناف میں اس کا چل پھر لینا خود اس کے اندر زندگی کی امنگ کو باقی رکھ سکتا ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ابن ام مکتوم کو نماز باجماعت سے مستثنیٰ نہیں فرمایا اور یہ ثابت فرما دیا کہ جو حرکت اور کام نابینا افراد خود کر سکیں اس کے لیے ان کی مدد نہ کرنی چاہیے، تاکہ ان میں خود اعتمادی

پیدا ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مدینہ ہجرت کرنے والوں میں ابو احمد بن جحش کا نام لیا جا سکتا ہے جو نابینا تھے اور مکّہ میں نشیبی اور بالائی علاقوں میں بغیر قائد کے پھرتے تھے (تاریخ الطبری ج ۲ ص ۹۷)

بہر حال اسلام کے دورِ اوّل میں نابینا افراد کو محض ناکارہ نہ سمجھا جاتا تھا اور وہ دوسرے افراد کی طرح روزمرہ کی زندگی میں اپنا کردار ادا کرتے تھے اور قومی و مذہبی اجتماعی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ اسی سلسلے میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن ابی هريرة قال طاف رسول الله صلى الله عليه وسلم فى حجته على ناقته الجدعاء وعبد الله ابن ام مكتوم اخذ بخطامها يرتجز۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر اپنی اونٹنی جدعا پر سوار ہو کر طواف فرمایا اور ابن ام مکتوم اس کی نکیل تھامے رجز پڑھتے جاتے تھے۔ (المستدرک للحاکم کتاب معرفۃ الصحابہ۔ تذکرہ ابن ام مکتومؓ)

نابینا افراد کی تربیت فردِ واحد کا کام نہیں ہے بلکہ سارے معاشرے کا رویہ نابینا افراد کے بارے میں ایسا ہو کہ وہ خود کو "تنہا" محسوس نہ کریں۔ انھیں یہ محسوس ہو کہ معاشرہ ان میں دلچسپی رکھتا ہے۔ نتیجے میں وہ خود بھی اپنے معاشرے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل عملی نمونہ قایم فرمایا ہے:

عن جابر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انطلقوا بنا الى البصير الذى فى بنى واقف نعوده وكان رجل اعمٰى۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے ساتھ چلو، بنی واقف کے ایک بصیر کی عیادت کریں اور وہ نابینا شخص تھا۔ (السنن للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰۰)

دوسری روایت میں ہے:

عن محمد بن جبير بن مطعم بن ابيه قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يقول لاصحابه اذهبوا بنا الى بنى واقف نزور البصير قال سفيان وهم حى من الانصار وكان محجوب البصر۔

محمد بن جبیر بن مطعمؓ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے ہمارے ساتھ بنی واقف کی طرف چلو، ہم ایک بصیر سے ملاقات کریں گے۔ سفیان نے کہا بنی واقف انصار کا ایک قبیلہ ہے اور وہ شخص نابینا تھا۔ (السنن للبیہقی ج ۱۰ ص ۲۰۰)

پہلی روایت میں نابینا مریض کی عیادت کے لیے اور دوسری روایت میں ملاقات کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانا اور اس پر اپنے ساتھیوں کو شوق دلانا ثابت ہے۔ اس کے نتیجے میں نابینا فرد خود کو تنہا نہیں پاتا اور محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی زندگی سے معاشرہ کو دلچسپی ہے اور زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کے سلسلے میں معاشرہ کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ دوسری بات جو ہر دو روایت میں مذکور ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا فرد کے بارے میں بصیر (دیکھنے والا

یا بصیرت رکھنے والا) فرمایا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نابینائی ایک جسمانی نقص ہے، عیب نہیں، اور عام طور پر ایسے افراد کے سامنے یہ لفظ بطور عیب کے کہا جاتا ہے، جس سے ان کا ذہن فوراً اس کمی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جس کا پورا ہونا بعض صورتوں میں ناممکن ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جب تک بینائی نہ ہو معاشرہ کے دوسرے افراد انھیں کمتر سمجھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ عمل سے نابینا فرد کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ وہ بینائی نہ رکھتے ہُوئے بھی دوسرے صحیح سالم افراد کی طرح اپنے ساتھ برتاؤ ہوتا محسوس کرکے عزتِ نفسی جیسی کیفیت اس میں پیدا ہوتی ہے۔

نابینا افراد کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں معاشرہ کا ان کے ساتھ برتاؤ ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات ابن ام مکتومؓ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رویے سے ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

عن ام سلمة انها كانت هي وميمونه عند النبي صلى الله عليه وسلم فدخل ابن ام مكتوم فقال النبي صلى الله عليه وسلم احتجبا منه فقالتا انه اعمٰى لا يبصرنا قال النبي صلى الله عليه وسلم افعميا وان انتما فليس تبصرانه۔

ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ اور میمونہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں کہ اتنے میں ابن ام مکتوم داخل ہُوئے۔ آپ نے فرمایا کہ پردہ کر لو۔ دونوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو نابینا ہیں، ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم دونوں بھی نابینا ہو اور انھیں نہیں دیکھ سکتی ہو؟

اس حدیث اور دُوسری روایات سے دُو باتیں ظاہر ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ ابن ام مکتومؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے رہتے تھے اور دین کا علم حاصل کرتے رہتے تھے۔ دُوسرے یہ کہ نابینا فرد سے پردہ اسی طرح آپؐ نے کروایا جیسا کہ آنکھ والے افراد سے کیونکہ اسلام میں غضِ بصر کا حکم مومن عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے یکساں ہے اور نابینا فرد سے پردہ کرکے اسے دوسرے مردوں کی طرح سمجھا جا رہا ہے اور اس سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جا رہا ہے اور نابینا افراد سے معاشرہ کا امتیازی سلوک ہی نابینا افراد کی تربیت اور آبادکاری میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد کی کارگزاریاں

سورۂ عبس میں مذکور واقعے کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ابن ام مکتومؓ کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں ان کی تعلیم و تربیت ہوتی رہی ہے۔ آخری مکی دور میں بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر انصارِ مدینہ کی خواہش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ اور مصعب بن عمیرؓ کو مدینے میں اسلام کی تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ ابنِ قیم فرماتے ہیں:

وبعث معهم رسول الله صلى الله عليه وسلم عمرو ابن ام مكتوم ومصعب بن عمير يعلمان من اسلم منهم القرآن ويدعوان الى الله عزّ وجلّ فنزل على ابى امامه اسعد بن

بن زرارۃ وکان مصعب ابن عمیر یومھم لما بلغوا اربعین فاسلم علی ایدیھما بشر کثیر منھم اسید بن الحضیر و سعد ابن معاذ واسلم باسلامھا یومئذ جمیع بنی عبد الاشھل الرجال والنساء۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کے ساتھ ابن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر کو روانہ فرمایا۔ یہ حضرات نومسلموں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے اور غیر مسلموں کو اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ یہ دونوں ابو امامہ اسعد بن زرارہ کے پاس اُترے۔ مسلمانوں کی امامت مصعب بن عمیر کرتے تھے اور جب چالیس افراد موجود ہوتے، تو جمعہ پڑھاتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے ہاتھ پہ کثیر تعداد میں لوگ ایمان لائے جن میں اسید بن الحضیر اور سعد بن معاذ بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے اسلام لانے سے قبیلہ بنو عبد الاشھل کے سارے مرد اور عورتیں اسلام لے آئے۔" (زاد المعاد ۔ ج ۲ ۔ ص ۷۱)

ابن ام مکتومؓ کے بحیثیت مبلّغ مدینہ میں مصعب بن عمیر کے ساتھ بھیجے جانے کا ذکر علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب "جوامع السیرۃ" ص ۷۲ اور ابن خلدون نے جلد دوم ص ۸۳ ۱ میں، اور سیرۃ حلبی کے مصنف علامہ علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی نے سیرۃ حلبی ص ۴۰۵ میں کیا ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

اب ظاہر ہے کہ مکّہ کے باہر علی الاعلان تبلیغ کا یہ پہلا موقع تھا اور اس موقع کے لیے آزمودہ کار مبلّغین ہی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ انتخاب ان دونوں حضرات پر پڑی اور یہ دونوں اس امتحان میں پُورے کامیاب ثابت ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی خود مکّہ معظمہ میں ان کی تبلیغی کوششوں کو ظاہر کرتی ہے، جن کوششوں نے انھیں تجربہ کار مبلّغ بنایا اور انھیں کارگزاریوں کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں یہ اس کام کے لیے موزوں معلوم ہُوئے۔ پھر تبلیغ کے دونوں پہلوؤں پر کاربند رہے۔ یعنی کفار کو اسلام سمجھانا اور مسلمانوں کو قرآن اور شریعت کی تعلیم دینا۔ اس سے ابن ام مکتومؓ کی اسلام کے بارے میں کماحقہٗ واقفیت و مہارت ثابت ہوتی ہے۔ بہرحال ابن ام مکتوم ہجرت سے پہلے مدینہ میں اسلام پھیلا کر ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فضا سازگار بنانے کا شرف حاصل کرنے والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو تربیت یافتہ صحابہؓ میں سے ایک ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ تشریف لائے۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ فرائض و احکام نازل ہوتے رہے اور اسلام کا قانون مکمل ہوگیا۔ اس دَور میں قرآن کریم و حدیث میں ابن ام مکتومؓ کے تذکرے ملتے ہیں، جس سے ان کی کارگزاریوں پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

عن ابن عمر قال کان لرسول اللہ موذنان بلال وابن ام مکتوم الاعمٰی۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو موذن تھے، بلالؓ اور ابن ام مکتومؓ نابینا۔

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

کان ابن ام مکتوم یوذنون لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو اعمٰی۔

ابن ام مکتوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان کہتے تھے اور وہ نابینا تھے۔ (صحیح مسلم باب استحباب اتخاذ المؤذنین للمسجد الواحد)

رمضان کے زمانے میں ابن ام مکتومؓ کی اذان سحر کے وقت کے ختم ہونے کا اعلان تھی۔ حدیث میں آتا ہے:

عن ابی عمر قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان بلالاً یوذن بلیل فکلوا واشربوا حتی سمعوا اذان ابن ام مکتوم۔

ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سُنا کہ بلالؓ کچھ رات رہے اذان دیتے ہیں اس لیے تم کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتومؓ کی اذان سُن لو۔ (صحیح مسلم باب ان الدخول فی الصوم یحصل بطلوع الفجر)

امام نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

"بلالؓ اپنے وقت اذان کہہ کر اپنے اوراد و اذکار میں مصروف ہوجاتے تھے۔ طلوعِ صبح صادق پر لوگ ابن اُمِ مکتومؓ کو کہتے اور وہ اذان دیتے۔ یہی اذان سحر کے وقت کے ختم ہونے کا اعلان تھی۔"

بہرحال مدنی زندگی میں ابن ام مکتوم کی کارگزاریوں کا آغاز اسی دینی خدمت سے ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی آپ کی مصروف ترین زندگی ہے، تربیت صحابہ، تعلیم دین، معاملات کے فیصلے، نفاذ احکام اسلامی اور تنظیم مسلمین مقابلہ کفار وغیرہ۔ ایسے کئی مواقع آئے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ سے باہر تشریف لے جانا پڑا اور مدینہ میں کسی کو اپنا نائب مقرر فرمانا پڑا۔ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ:

"ابن عبد اللہ نے علماء نسب اور سیرت کی ایک جماعت کے حوالے سے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ کو ۱۳ مرتبہ شرفِ نیابت بخشا، حجۃ الوداع اور بدر کے موقع پر بھی۔ بدر کے وقت ابو لبابہ بھی آپ کے ساتھ شریک تھے۔" (الاصابہ فی تمییز الصحابہ)

اسی طرح سیرتِ حلبی میں لکھا ہے:

قال شعبی غزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث عشر غزوۃ ما من غزوۃ الا واستخلف ابن ام مکتوم علی المدینۃ وکان یصلی بھم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۳ غزوات کیے اور کوئی غزوہ ایسا نہیں ہے، جس میں آپ نے ابن ام مکتومؓ کو اپنا نائب بنا کر مدینہ میں نہ چھوڑا ہو۔ وہ لوگوں کو نماز باجماعت پڑھاتے تھے۔ (سیرت حلبی ص ۳۰۴)

حدیث میں آتا ہے:

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم استخلف ابن ام مکتوم یوم الناس وھو اعمٰی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ کو، جو نابینا تھے، مدینہ میں اپنا جانشین بنایا اور وہ لوگوں کی نماز میں امامت کرتے تھے۔ (ابو داؤد)

اسی طرح اور کتب الرجال میں بھی اسی قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان روایات سے ظاہر ہے کہ غزوات اور حج کے زمانے میں مدینے کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی تھی۔ جہاد چونکہ فریضہ تھا، اس لیے فوجی خدمات کے قابل افراد آپ کے ساتھ ہوتے۔ اب مدینہ میں ایسے لوگ باقی رہ جاتے، جو کسی نہ کسی عذر کی بنا پر شریک جہاد نہ ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے ضرورت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی نہ کوئی نائب موجود ہوتا۔ چنانچہ آپ نے اس طرح کے موقعوں پر ابولبابہ، ابوذر غفاری وغیرہ دوسرے اصحاب کو بھی مقرر فرمایا۔ لیکن سیرت حلبی کی روایت صاف بتاتی ہے کہ ہر موقع پر فریضۂ امامت ابن ام مکتومؓ ہی ادا کرتے رہے۔

نماز جمعہ کی امامت اور خطابت کے سلسلے میں روایت ہے:

حدثنی عبید اللہ بن نوح عن محمد بن سھیل بن ابی حثمہ قال استخلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم علی المدینۃ فکان یجمع بھم و یخطب الی جنب المنبر یجعلہ علی یسارہ۔

واقدی نے روایت کی ہے کہ ان سے عبید اللہ بن نوح اور ان سے محمد بن سہیل بن ابی حثمہ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ام مکتوم کو مدینہ پر اپنا نائب بنایا۔ وہ جمعہ پڑھاتے اور منبر کے بازو کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، اس طرح کہ منبر ان کی بائیں جانب ہوتا۔ (سیر اعلام النبلاء للذہبی ج ۷ ص ۲۶۰)

الغرض روایات سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں بحیثیت نائب رسول آپ پوری ذمہ داریاں ادا کرتے تھے۔ حضورؐ کی غیر موجودگی میں دشمنوں سے مسلمانوں کے گھروں اور اہل و عیال کی حفاظت اور خبر گیری، معاملات کے تصفیہ وغیرہ بھی غالباً اسی ذمہ داری میں شامل تھے، اور ابن ام مکتوم نابینا ہونے کے باوجود تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے، جس کی کسی عہدہ دار کے لیے سخت ضرورت ہے۔ یہ نتیجہ تھا آں حضرت صلی اللہ علیہ السلام کے فیض صحبت کا۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ معذور افراد کس طرح ابن ام مکتوم کے سوال پر فرضیت جہاد سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابن قتیبہ فرماتے ہیں:

وفیہ وجہ آخر وھو ان القرآن کان ینزل شیئًا بعد شیئٍ و آیۃ حتی لربما نزل الحرفان او الثلاثہ قال زید بن ثابت کنت اکتب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاھدین فی سبیل اللہ فجاء ابن ام مکتوم فقال یا رسول اللہ

انی احب الجهاد فی سبیل اللہ و اکن بی عن الضرر ما تری قال زید فثقلت فخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی فخذی حتی خشیت ان ترضها ثم قال اکتب لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاهدین فی سبیل اللہ ۔

اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہے اور وُہ یہ کہ قرآن کریم تھوڑا تھوڑا ایک آیت کے بعد دوسری آیت، یہاں تک کہ دو یا تین حروف، بھی نازل ہوتا تھا ۔ چنانچہ زید بن ثابتؓ نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھ رہا تھا لا یستوی القاعدون کہ جہاد میں شریک نہ ہونے والے ، اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے اتنے میں ابن ام مکتومؓ آئے اور کہا : یا رسول اللہؐ ! میں جہاد سے محبت کرتا ہوں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں نابینا ہوں ۔ زید نے کہا کہ اتنے میں حضورؐ کا پاؤں جو میرے پاؤں پر تھا ، ناقابلِ برداشت حد تک بوجھل ہوگیا (نزولِ وحی کی کیفیت تھی ۔ جب وحی نازل ہوگئی تو) حضورؐ نے مجھ سے فرمایا : لکھو لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاهدین فی سبیل اللہ جہاد میں شریک نہ ہونے والے سوائے اس کے کہ معذور ہوں، مجاہدین کے برابر نہیں ہو سکتے ۔ (تاویل مشکل القرآن ابن قتیبہ ص ۱۸۴)

بہرحال غیر اولی الضرر میں نابینا ، لنگڑے اور مریض افراد شامل ہیں (دیکھو ترمذی) حدیث میں آیا ہے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند دخوله المدينة بعد غزوة تبوك ان فی المدينة لا قواماً ما سرتم من مسير ولا قطعتم من وادٍ الا كانوا معكم فيه ۔ قالوا یا رسول اللہ وهم بالمدينة ۔ قال نعم بالمدينة حبسهم العذر ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر مدینے میں داخل ہوتے وقت فرمایا : مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ نہ تم پھرے اور نہ تم نے کسی وادی کو قطع کیا مگر وہ تمہارے ساتھ ہیں ۔ صحابہؓ نے پوچھا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اور وہ مدینہ میں ہیں ؟ فرمایا : ہاں، وہ مدینہ میں ہیں، ان کو ان کے عذر نے روکا ہے ۔ (التفسیر الواضح ص ۴۸)

معذور افراد جذبۂ جہاد رکھتے ہُوئے بھی اپنے عذر کی بنا پر شریک نہ ہو سکے ۔ لیکن ان کے خلوصِ نیت کی بنا پر انھیں مجاہدین کے برابر اجر ہے ۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر ابن ام مکتومؓ مطمئن نہیں ہوئے ۔ کیونکہ وُہ رخصت اور عزیمت کے فرق کو جانتے تھے ۔ بہرحال شوقِ جہاد ان میں بڑھتا گیا اور بالآخر وہ شریکِ جہاد بھی ہوئے ۔ چنانچہ روایت ہے :

ثابت البنانی عن ابی لیلی ان ابن ام مکتوم قال ای رب انزل عذری فانزلت غیر اولی الضرر فکان بعد یغزو ویقول ادفعوا الی اللواء فانی اعمٰی لا استطیع ان افر واقیمونی بین الصفین ۔

ثابت البنانی نے ابو لیلیٰ سے روایت کی ہے کہ ابن ام مکتوم نے آیت لا یستوی القاعدون کے نزول پر کہا : اے میرے رب ! میرے عذر نابینائی کے بارے میں بھی نازل فرما ۔ پس آیت غیر اولی الضرر نازل ہوئی ۔ اس کے بعد وہ بھی شریک جہاد ہوتے اور کہتے کہ مجھے جھنڈا دے کر دونوں صفوں کے درمیان کھڑا کر دو، میں نابینا ہوں، بھاگ نہیں سکتا ۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۲، ص ۲۶)

کتنا لطیف طنز ہے کہ آنکھ والا اپنے لشکر کو پسپا ہوتا دیکھ کر بھاگ سکتا ہے ۔ لیکن نابینا چونکہ دیکھتا نہیں، اس لیے میدان میں جما رہتا ہے اور اپنے عَلَم کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا ۔

الغرض اسی جذبۂ جہاد نے انھیں جنگِ قادسیہ میں اسلامی لشکر کے عَلَم بردار کی حیثیت سے شریک کیا ۔ چنانچہ ابن جریر طبری نے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ انھوں نے جنگِ قادسیہ میں ابن ام مکتوم کو دیکھا کہ جسم پہ زرہ ہے اور ہاتھوں میں عَلَم تھامے ہوئے ہیں اور اسی میں یہ شہید ہوئے ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد کے ساتھ ان کے اہلِ خاندان کا رویّہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسلام نابینا افراد کو بالغی انسانیت سے الگ کوئی گروہ نہیں سمجھتا اور دوسرے آنکھ والے افراد کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کی ہمت افزائی کرتا ہے ۔ نابینا افراد جس گھر اور خاندان کے اراکین ہیں، انھیں اسی ماحول میں جذب کرنا اسلامی نکتۂ نگاہ سے ضروری ہے، بصورتِ دیگر نابینا فرد کو گھریلو ماحول سے نکال کر دوسرے کسی ماحول میں تعلیمی مقاصد کے لیے جذب کیا جائے تو نتیجے میں اس کا اپنا گھریلو ماحول اس کے لیے بیگانہ ہو جاتا ہے ۔ اسی لیے صلہ رحمی جو اسلام میں ایک خوبی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ نابینا افراد کے قریبی رشتہ دار ایسے افراد کی زندگی کو کامیاب بنانے میں ان کا ہاتھ بٹائیں اور یہ معاشرہ کی ابتدائی اکائی یعنی خاندان مل کر ایک فرد کی حالت کو سنواریں ۔ اس طرح ایک نابینا فرد کی آبادکاری ایک خاندان کا اپنا مسئلہ بن جاتا ہے ۔

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

لیس علی الاعمٰی حرج ولا علی الاعرج حرج ولا علی المریض حرج ولا علی انفسکم ان تاکلوا من بیوتکم او بیوت اٰبآئکم او بیوت امھٰتکم او بیوت اخوانکم او بیوت اخواتکم او بیوت اعمامکم او بیوت عمّٰتکم او بیوت اخوالکم او بیوت خٰلٰتکم او ما ملکتم مفاتحہٗ او صدیقکم ۔ (۶۱ : ۲۴)

نابینا پر اور لنگڑے پر اور مریض پر اور خود تم پر کوئی تنگی نہیں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے والد کے یا ماؤں، بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں، خالاؤں یا جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھروں سے ۔

اس آیت پاک کی تفسیر اور شانِ نزول میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ عطا خراسانی اور عبدالرحمن نے یہ معنی لیے ہیں کہ نابینا، لنگڑے اور مریض کے لیے جہاد کو چھوڑنے میں کوئی گناہ نہیں۔ ان کی ناتوانی اور عذر کے سبب سے آیت کا منطوق یہاں جہاد ہے ہی نہیں۔ دوسرے معذور افراد کو شرکت جہاد سے دوسری آیت لایستوی القاعدون...... الخ میں مستثنیٰ کیا جا چکا ہے۔

سعید بن جبیرؓ اور مقسم نے کہا ہے کہ لوگ نابینا، لنگڑے اور مریض افراد کے ساتھ مل کر کھانے کو بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ نابینا کھانے کو دیکھ نہیں سکتا اور ہوسکتا ہے کہ وہ عمدہ کھانا' جو اس کی دسترس میں ہو، کھا جائے، جب کہ دستر خوان پر دوسروں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ لنگڑا صحیح طور پر بیٹھ نہیں سکتا۔ اس لیے دوسرے آدمی کو سبقت کرنی پڑتی ہے اور بیمار آدمی تندرست کی طرح کھا نہیں سکتا۔ بہرحال یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ نابینا، لنگڑے اور مریض افراد کے ساتھ مل کر کھانے میں کوئی حرج نہیں حالانکہ آیت کے اسلوبِ بیان میں صحیح سالم افراد کے بجائے معذور افراد کو بتایا جا رہا ہے کہ انھیں اپنے رشتہ داروں کے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں۔

اس آیت کے شانِ نزول میں ملا جیون فرماتے ہیں :

واحسن من کل ذلک فی المدارک حیث قال۔ قال سعید بن المسیب کان المسلمون اذا خرجوا الی الغزو مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وضعوا مفاتیح بیوتھم عند الاعمٰی والمریض والاعرج وعند اقاربھم ویاذنوا بھم ان یاکلوا من بیوتھم وکانوا یتحرجون من ذلک ویقولون نخشٰی ان لا تکون انفسھم بذلک طیبۃ فنزلت الایۃ رخصۃ لھم۔

اور ان سب سے بہتر مدارک التنزیل میں ہے، جیسا کہا سعید بن المسیب نے کہ مسلمان جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے لیے نکلتے تو اپنے مکانوں کی کنجیاں نابینا، لنگڑے، مریض اور رشتہ داروں کو دیتے اور انھیں اپنے ان گھروں میں سے کھانے کی اجازت دیتے، لیکن یہ معذور افراد اور رشتہ دار اس میں حرج سمجھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ شاید ان کے لیے یہ کھانا پاکیزہ نہ ہو۔ اس لیے انھیں رخصت کے طور پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (التفسیر الاحمدیہ ملا احمد جیون ص ۷۷ ۳ و نیز مدارک التنزیل سورہ نور)

معذور افراد اور مجاہدین کے رشتہ داران مجاہدین کے مکانات کی حفاظت کرتے ہوئے بھی وہاں سے کھانے کو اس لیے بُرا جانتے تھے کہ فرمانِ خدا تھا:

یٰاَیُّھا الذین اٰمنوا لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔

اور ان کا خیال تھا کہ جہاد پر جانے والوں کے گھروں کی حفاظت کرتے ہوئے وہاں سے کھانا اس آیت کے مطابق اکل بالباطل ہوگا، اس لیے احتراز کرتے تھے۔ اس لیے رخصت کے طور پر یہ آیت لیس علی الاعمٰی حرج نازل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ معذور افراد جہاد سے مستثنیٰ کیے گئے تھے اور دوسرے مسلمان، جو فوجی خدمات کے لیے جاتے تھے ان کے گھروں کی دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔ پس معذور افراد سے اس سلسلے میں کام لیا گیا اور یہ کام کرتے ہوئے ان لوگوں نے ان مکانوں میں سے کھانا اپنے تقویٰ کے خلاف جانا۔ اس طرح ان کے لیے رخصت ایک ہنگامی صورتِ حال کو ظاہر کرتی ہے لیکن قرآن پاک کا اسلوبِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ رخصت اتفاقی یا ہنگامی نہیں بلکہ عام حالات میں بھی اگر معذور افراد کو ان کے وہ رشتہ دار اور احباب، جن کا ذکر اس آیت میں ہے، سہارا دینا چاہیں، تو معذور افراد کو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھنا چاہیے۔

پھر آیت کا شانِ نزول صاف بتا رہا ہے کہ مجاہدین ان معذور افراد کو بخوشی اپنے گھروں میں سے کھانے کی اجازت دیتے تھے۔ ان کے احتراز پر خدائے پاک نے خصوصی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر گیارہ رشتوں کا تذکرہ فرما دیا کہ معذور افراد ان کی طرف سے دستِ تعاون کو حرج نہ سمجھیں۔

اگر رخصت کی جگہ ان رشتہ داروں کو معذور افراد کی امداد کا حکم دیا جاتا تو یہ بات خود معذور افراد کو کاہل بنا سکتی تھی۔ قرآن پاک میں رخصت کے طور پر جو بات ارشاد فرمائی گئی اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل میں معذور افراد بھی غایت درجہ کی خود داری اور عزتِ نفس کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اور یہ بات ان کی جبلّیات کے جذبہ کے مطابق بھی ہے، پس اپنی جد و جہد کے ساتھ ساتھ اگر اہلِ خاندان کا تعاون حاصل ہو تو اس کی اجازت بھی ہے اور یہ معذور افراد کی اپنے گھریلو ماحول میں آباد کاری کی ایک بیّن دلیل بھی ہے۔ اس سے نابینا اور معذور افراد کسی نئے ماحول میں جا کر نئی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوئے بغیر اپنی زندگی کو اپنے گھریلو ماحول میں رہ کر کامیاب بنا سکتے ہیں۔

الغرض اس آیت پاک کا اطلاق خاندانی ماحول پر کرتے ہوئے اہلِ خاندان اپنے کسی نابینا فرد کو یا کسی اور معذور فرد کو مناسب کام پر لگا کر اس طرح ایک فرد خاندان کی حالت کو سنوار سکتے ہیں اور یہی اس آیت کا مقصود بھی ہے اور شانِ نزول کی روایت جو سعید بن المسیّب سے ہے، قدرت تائید کر رہی ہے۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد اور ان کی ازدواجی زندگی

جنسی میلان ایک فطری داعیہ ہے۔ اس کی تکمیل کے بغیر جیسے آنکھ والے افراد میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح نابینا افراد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام میں اس داعیہ کی تکمیل کے لیے نکاح کا قانون موجود ہے۔ اور جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں اسلام میں اس معاملے میں بھی نابینا اور آنکھ والے افراد کے لیے یکساں ہدایت کی ہے اور جنسی داعیہ کی جائز تکمیل میں نابینا افراد بھی آنکھ والے افراد کی طرح کامیاب ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل واقعات سے دورِ رسالت میں نابینا افراد کی متاہلانہ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

اوس بن الصامت (نابینا) نے کسی معاملے میں غضب ناک ہو کر اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کو کہہ دیا کہ:

انت علی کظھر امی وکان ذٰلک فی زمن الجاھلیۃ طلاقا۔

تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ یعنی حرام ہے۔ اور یہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کا طریقہ تھا۔
اس کے بعد انھوں نے مراجعت چاہی تو خولہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ وہ پوچھے مراجعت جائز ہے یا نہیں ؛ چونکہ اس وقت تک ظہار کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

"خدا نے اس معاملہ میں کوئی حکم نازل نہیں فرمایا اور میری رائے میں تو اس کے لیے حرام ہے۔"

خولہ نے کہا : "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! جس خدا نے آپ پر کتاب نازل فرمائی اس نے طلاق کا ذکر نہیں کیا ؛ اور وہ (اوس بن الصامت) میرے بچوں کا باپ ہے، یعنی میرا شوہر ہے، میں اسے چاہتی ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا : "میری رائے میں طلاق ہو گئی ہے مراجعت ناممکن ہے۔" خولہ نے کہا "میں خدا سے فریاد کرتی ہوں اپنی بیکسی اور تنہائی کی اور اپنے بچوں کی، طلاق کی صورت میں اگر میں ان بچوں کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیتی ہوں تو وہ تباہ ہو جائیں گے (اس لیے کہ شفقتِ مادری اور ماں کی تعلیم و تربیت سے محروم ہو جائیں گے یا یہ کہ شوہر نابینا ہونے کی وجہ سے بچوں کی دیکھ بھال شاید نہ کر سکے گا) اور خود اپنے ساتھ رکھتی ہوں تو بھوکوں مریں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ آسمان کی طرف منہ اٹھاتی رہی۔ حضرت عائشہؓ جو اس وقت موجود تھیں فرماتی ہیں کہ وہ روتی رہی اور اس وقت جو لوگ موجود تھے وہ بھی اس سے متاثر ہو کر روتے رہے۔ اس کے بعد ہی وحی نازل ہوئی۔

(خلاصہ از شذرات الذہب ابن العماد، ج ۱ ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ۔ واللہ یسمع تحاورکما۔ ان اللہ سمیعٌ بصیر ○ والذین یظھرون منکم من نساء ھم ما ھن امھتھم ط ان امھتھم الا الّٰئی ولدنھم ط وانھم لیقولون منکراً من القول وزورا ط وان اللہ لعفو غفور ○ ...

.... عذاب الیم ○

واقعی اللہ نے اس عورت کی بات سن لی، جو اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑتی تھی اور اللہ کی طرف شکایت کرتی تھی اور اللہ تمھارے سوال وجواب سنتا تھا۔ واقعی اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ ان کی مائیں وہ ہیں جنھوں نے انھیں جنا ہے اور یقیناً وہ بُری بات کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں اور پھر اس سے لوٹ جانا چاہتے ہیں پس وہ ایک غلام آزاد کریں، قبل اس سے کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں۔ تمہیں اس کی نصیحت کی جاتی ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔ اور جو کوئی غلام آزاد نہ کر سکے وہ دو ماہ کے پے بہ پے روزے رکھے قبل اس سے کہ ایک دوسرے کو چھوئیں اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لیے ہے کہ تم ایمان لاؤ خدا اور اس کے رسول پر، اور یہ اللہ کے حدود ہیں، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (خلاصہ از شذرات الذہب، ابن العماد

ج ۱ - ص ۱۷، ۱۸، ۱۹)

اسلام میں طلاق جاہلیت کو منسوخ کرنے والی اس آیت کا سببِ نزول ایک نابینا اوس بن الصامت کا اپنی بیوی کو ظہار کرنا یعنی طریق جاہلیت سے طلاق دینا ہے۔ طلاق کے بعد جدائی اور بچوں کا مستقبل دونوں کے سامنے آیا تو مراجعت چاہی۔ پھر خولہ نے خدا کے رسولؐ سے بحث وجدل کر کے خدا سے شکایت کی اور نتیجے میں کفارہ ادا کرنے کا حکم اور مراجعت کی اجازت ملی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اوس بن الصامت نابینا کی وفادار بیوی صحیح معنی میں ان کی رفیقہ حیات تھیں اور اپنے نابینا شوہر کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہی تھیں۔

یہ وہی خولہ ہیں جو حضرت عمرؓ کو ان کی خلافت کے زمانے میں راہ میں ملیں اور حضرت عمرؓ ان سے بڑی دیر تک دھوپ میں کھڑے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد اپنے ساتھی کے سوال، پر آپ نے فرمایا: یہ وہ عورت ہے جس کی باتیں خدا نے سُنیں۔ (الدر المنثور تفسیر سورہ المجادلہ)

ابواحمد بن جحش جحبن کے بارے میں پچھلے صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ نابینا ہونے کے باوجود مکّے کے نشیبی اور بالائی علاقوں میں بغیر کسی قائد کے پھرتے تھے، یہ بھی ازدواجی زندگی میں منسلک تھے، اولاد کوئی نہ تھی۔

دورِ رسالت میں نابینا افراد برسرِ روزگار

کاروبار تمدنی ضروریات کی فراہمی کے لیے ضروری ہے۔ عرب کے سادہ تمدن کی وجہ سے ظاہر ہے کہ کاروبار کے ذرائع کم ہی ہوں گے تاہم زراعت، نجاری، لوہاری، اُونی کپڑا بننا، ہتھیار بنانا، بیوپار وغیرہ ایسے پیشے ہیں، جن کا تذکرہ احادیث و سیَر کی کتب میں ملتا ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ان ذرائع روزگار کی مدد سے کسبِ حلال کے پابند تھے۔

اسلام نے چونکہ نابینا افراد کو از کار رفتہ تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ باعزت روزی کمانے میں ان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اس لیے نابینا افراد بھی دوسرے صحابہ کی طرح باعزت روزی کماتے تھے۔ تفصیلات حسب ذیل ہیں:

حضرت ابن ام مکتومؓ کے بارے میں ہم لکھ آئے ہیں کہ قرآن کی تعلیم دینا، اذان کہنا، بوقتِ ضرورت نماز باجماعت پڑھانا، اس طرح یہ دینی خدمت سے وابستہ ہو گئے تھے تعلیم دین کے سلسلے میں یاد رہے کہ مسجد نبویؐ کے ایک چبوترے پر کم از کم چالیس ایسے مجرد افراد رہتے تھے جن کا کام صرف وحیِ الٰہی کو حفظ کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم حاصل کرنا ہوتا تھا، انھیں اصحابِ صُفّہ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابن ام مکتومؓ، صہیبؓ، سلمانؓ انھیں اصحابِ صُفّہ میں شامل تھے۔ آگے چل کر ان میں سے اکثر نے شادی کر کے الگ اقامت اختیار کر لی تھی۔

یہ حضرات دین کی تعلیم حاصل کرنے اور پھر اسے دُوسروں تک پہنچانے کے لیے وقف تھے، لیکن ان کے اس طرح وقف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ دوسروں پر بارِ دوش بنتے۔ چنانچہ یہ حضرات تعلیم و درس سے فارغ ہوتے ہی

ان میں سے بعض جہاد میں شریک ہو گئے، بعض نے زراعت اختیار کی، بعض نے تعلیمی لائن اختیار کی، بعض نے قرأت، اور بعض نے عبادتِ الٰہی کے لیے زندگی وقف کر دی۔ (التربیت الاداریہ ج ۱ ص ۴۷۷)

اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے فرماتے اور صحابہؓ اصحابِ صفہ میں سے ایک ایک یا چند افراد کو اپنے ساتھ کھانا کھلانے گھر لے جاتے"۔ تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ایسی صورتِ حال ہے، جب اصحابِ صفہ میں سے کسی فرد کو کچھ روزگار نہ مل سکا ہو اور اپنی محنت سے کما کر اپنی ضروریات پوری کر لینا، یہی وہ جذبہ تھا جو نابینا افراد کو مجاہدین کے گھروں کی حفاظت کرتے ہوئے بھی وہاں سے کھا لینا حرج معلوم ہوتا تھا جس کو وحیِ الٰہی نے رفع کر دیا۔ یہ خودداری نابینا افراد میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ باعزت ذریعۂ روزگار کے پابند ہوں۔

غزوۂ اُحد کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے روانہ ہوئے، تو اپنی روانگی کو مخفی رکھنے کی غرض سے آپ نے عام راستہ سے ہٹ کر راستہ اختیار فرمایا اور بنی حارثہ کے محلہ میں سے ہو کر گزرے اور المربع بن قیظی کی زمین میں سے گزرے۔ یہ شخص نابینا تھا اور منافقین میں شامل تھا۔ اس نے آواز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا اور احاطہ میں سے آپ کے گزرنے پر آپ سے نعوذ باللہ گستاخانہ گفتگو کی۔ صحابہؓ نے اسے سزا دینی چاہی لیکن آپ نے انھیں روک دیا اور فرمایا:

هذا اعمی البصر اعمی القلب۔

یہ آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۹۳)

یہ نابینا منافق اپنے مال کی خود ہی نگہداشت کرتا تھا اور اسی حالت میں اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتے ہوئے پہچان لیا تھا۔ اس طرح یہ نابینا فرد گلہ بانی کو ذریعۂ روزگار بنائے ہوئے تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نابینا افراد اپنے جس گرد و پیش سے واقف تھے اور جہاں وہ بآسانی چل پھر لیتے تھے، وہیں کچھ ذرائع روزگار اختیار کر لیتے تھے اور معاشرہ ان سے تعاون کرتا تھا۔ اور یہی سب سے مناسب طریقہ نابینا افراد کی آبادکاری کا آج بھی ہے۔ نابینا افراد کے لیے تجارت ایک بہترین ذریعہ معاش ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے اسلام نے واضح طور پر نابینا کی بیع و شریٰ خرید و فروخت کو جائز قرار دیا ہے۔ خیارِ رویت کی شرط کو نابینا افراد میں ٹھوس چیزوں میں بذریعہ لمس، بو والی چیزوں میں سونگھنے کے ذریعہ اور ذائقہ دار چیزوں میں چکھنے کے ذریعہ آنکھ والے افراد کے برابر تسلیم کیا ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری۔ ج ۳۔ کتاب البیوع ثالث)

اور فقہائے اسلام کے فتاویٰ کی بنیاد در اصل قرآن پاک اور سنتِ نبویؐ ہے۔

امامت ایک دینی خدمت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نابینا افراد اسے انجام دیتے رہے ہیں، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں فقہائے جو نابینا کی امامت کو مکروہ قرار دیا ہے اس کی وجہ ملاحظہ ہو:

نابینا نجاست سے بچ نہیں سکتا۔ دوسرے ہو سکتا ہے کہ وہ مقتدیوں میں سب سے افضل نہ ہو۔ اگر افضل ہو تو بہتر ہے۔ ابن ام مکتومؓ کی امامتِ نماز کو اسی پر قیاس کیا گیا ہے کہ اس وقت مدینہ میں ان سے افضل لوگ نہیں رہ گئے تھے۔ عتبان بن

مالک (آخیر عمر میں نابینا ہوئے) اپنی قوم میں افضل تھے۔ (بحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ا ص ۲۴۱)

اس سلسلے میں اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ تربیت یافتہ اور تعلیم یافتہ نابینا افراد نجاست سے ایسے ہی بچ سکتا ہے جیسے آنکھ والا فرد۔ علم دین اور دوسری شرائط میں بھی نابینا دوسرے مقتدیوں سے افضل ہو سکتا ہے۔ اس لیے فتویٰ محدثین ہے کہ نابینا کی امامت بلا کراہت جائز ہے۔ رہ گیا عوام کی رغبت کا سوال، تو اصل کام نابینا فرد کے بارے میں عوام ہی کے رویّے کو تبدیل کرنا ہے، جس کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ اس طرح "موذن" ہونا نابینا فرد کے لیے ایک اچھا ذریعۂ معاش ہے اس سلسلے میں فقہا کا قول ہے کہ "اوقاتِ نماز کی حفاظت کرنے والا اگر دوسرا آنکھ والا فرد نابینا کے ساتھ ہو تو نابینا اور آنکھ والا اذان کہنے میں برابر ہیں۔" (بحر الرائق ج ا ص ۲۶۵)

ظاہر ہے کہ اب جب نابینا فرد ابھرے ہوئے ڈائل والی گھڑی کی مدد سے وقت معلوم کر سکتے ہیں، یا دُوسری صورت میں کسی آنکھ والے فرد سے وقت معلوم کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ خدمت نابینا فرد کے لیے مناسب ذریعہ معاش ہے۔ چنانچہ دورِ رسالت میں ابن ام مکتومؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے ایک موذّن تھے۔ اور صبح کی اذان کا وقت لوگ انھیں بتا دیا کرتے تھے۔

اسی طرح عمیر بن عدی الخطمی نابینا تھے۔ بنو خطیمہ میں یہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ ان کے قبیلے کے ایک شخص یزید الخطمی انصاری کی بیوی عصما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہا کرتی تھی۔ اس سے اہلِ ایمان کو تکلیف ہوتی تھی بالآخر عمیر نے ایک دن موقع پا کر اس شاعرہ کو قتل کر دیا اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مِن وعَن سب بیان کر دیا۔

عمیر بن عدی الخطمی اپنی قوم کے امام اور قاری تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بصیر فرمایا کرتے تھے۔ غالباً اسی بصیر سے ملاقات کرنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے جایا کرتے تھے۔ واللہ اعلم (وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ ج ا ص ۱۹۷)

الغرض اسلام نے دینی خدمت جیسے مقدس ذریعہ روزگار پر نابینا تربیت یافتہ افراد کے تقرر سے ثابت کر دیا کہ یہ مقدس ترین خدمت کا شرف نابینا افراد کو بھی نصیب ہوا ہے۔ مذاہبِ عالم میں اس کی مثال اس طرح کے تاریخی مستند حوالوں سے ملنی ناممکن ہے۔

اسلام میں نابینا افراد کے حقوق

اسلام میں نابینائی کو ناقابلِ عبور رکاوٹ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لیے نابینا افراد کو زندہ رہنے اور دوسروں کے لیے مفید ثابت ہونے کے سلسلے میں خاص حقوق عطا فرمائے گئے ہیں:

۱۔ نابینائی نکاح میں عیب نہیں ہے۔ جانبین میں کسی میں اس کا پایا جانا عیب نہیں۔ اس طرح نابینا کو ازدواجی

زندگی حاصل کرنے کا حق ہے۔

۲۔ نابینا کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اس طرح اسے کاروبار کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

۳۔ تعلیم و تربیت سے مزین ہونے کے بعد معلم اور امام کی حیثیت سے روزگار حاصل کرنے کا اسے حق ہے۔

۴۔ شہادت جس طرح ایک معزز شہری کا حق ہے، اسی طرح نابینا افراد کی شہادت جائز ہے۔

(دیکھو المحلّٰی لابن حزم ج ۹ ص ۴۳۲)

۵۔ اپنی تمام تر کوششوں کے بعد بھی اگر ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے محروم رہے یا پیرانہ سالی کی وجہ سے محروم المعیشت ہو، تو اسلامی حکومت پر اس کا یہ حق واجب ہے کہ وہ اس کو زکوٰۃ و صدقات کی مد سے وظیفہ دے۔

۶۔ اپنے آباو اجداد اور دوسرے ذی محرم سے ورثہ پانے کا حق ہے۔ محض نابینائی کی وجہ سے ورثہ یا نفقہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۲۱۹)

۷۔ جن کاموں کے لیے نظر ضروری ہے، ایسے دینی فرائض مثلاً جہاد فی سبیل اللہ سے نابینا افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور اس استثنا سے ان کی اہانت مقصود نہیں ہے۔

۸۔ اسلامی معاشرہ میں نابینا فرد بالکل صحیح سالم افراد کی طرح پورے شہری حقوق سے متمتع ہو سکتا ہے، اور باعزت زندگی گزار سکتا ہے۔

خلاصہ: دورِ رسالت میں نابینا افراد کی تعلیم و تربیت اور آبادکاری کے اصولوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ معاشرہ کا نابینا افراد کے ساتھ مساویانہ بیناؤں پر برتاؤ تاکہ ان میں احساس کمتری نہ پیدا ہو۔

۲۔ نابینا افراد کو الگ گروہ میں رکھ کر تعلیم دینے کے بجائے دوسرے صحیح سالم افراد کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت۔ اس طرح اپنے ماحول سے ان کی یگانگت باقی رہتی ہے۔

۳۔ نابینا فرد کو ناکارہ سمجھ کر کونے میں بٹھائے رکھنے کے بجائے اسے ضروری اور مناسب کاموں میں مشغول رکھا جائے اور اسے ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ بیکاری جس طرح صحیح سالم افراد کے دل و دماغ ماؤف اور قوائے عمل کو مفلوج کر دیتی ہے اسی طرح نابینا افراد بھی اس سے ایسے ہی متاثر ہوتے ہیں۔

۴۔ اہلِ خاندان اپنے خاندان کے نابینا فرد کی آبادکاری میں تعاون کریں۔

۵۔ یہ تعاون کوئی احسان نہیں ہے بلکہ اس طرح معاشرہ خود اپنے آپ کی مدد کرتا ہے۔

۶۔ ذی حیثیت افراد نابینا فرد سے ملتے جلتے رہیں، اس سے اس میں احساسِ تنہائی باقی نہ رہے گا۔ دوسری طرف معاشرہ کو ایسے افراد اور ان کی ضروریات کے متعلق معلومات فراہم ہوں گی جنھیں آباد کیا جانا ہے اور آبادکاری کے بعد کی ملاقاتیں آبادکاری کی رفتار اور نتائج سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

۷۔ بغیر کسی کے سہارے چلنے پھرنے سے نابینا فرد کی جسمانی نشوونما ٹھیک طور پر ہو سکے گی جو ذہنی نشوونما

کے لیے ضروری ہے۔

۸۔ ذی استطاعت افراد نابینا افراد سے مل کر ان کی ضروریاتِ زندگی معلوم کرنے اور فراہم کرنے میں پہل کریں۔ اس طرح نابینا افراد گداگری کی ذلّت کو مجبوری کی حالت میں بھی قبول نہیں کریں گے۔

۹۔ تعلیم و تربیت کے بعد نظم و نسق کی ذمہ داریاں بھی نابینا افراد کو سونپی جا سکتی ہیں اور اس طرح نابینا افراد معاشرہ کے تعاون سے اپنے لیے اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۰۔ جو کام نابینا فرد کسی قدر کوشش سے کر سکتا ہو، اس میں اسے رعایت یا سہارے کی ضرورت نہیں ہے تاکہ وہ آرام طلب نہ ہو جائے اور اس کی خود اعتمادی زائل نہ ہو۔

اسلام اور جنسی مساوات

محمد مظہر الدین صدیقی

مساوات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی صحیح طور پر تعریف کرنا بہت دشوار ہے۔ ایک معنی کر کے تمام انسان ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ لیکن جب ہم عملی زندگی کے واقعات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دو آدمی بھی ایسے نہیں، جو ہر اعتبار سے باہم مساوی ہوں۔ ہر انسان کا اپنا ایک خاص مذاق ہوتا ہے۔ وہ ایک جداگانہ طبیعت لے کر عالم وجود میں آتا ہے۔ اس کے قوائے جسمانی اور دماغی اور اس کی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں دوسروں سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اختلافات بالکلیہ ماحول اور تربیت کے پیدا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی حقوق اور ذمہ داریوں اور معاشرہ میں انسان کا انفرادی رتبہ متعین کرنے میں پیدائشی اختلافات کو بڑا دخل ہے۔ انسان کی بنیادی وحدت و مساوات کو اصولی حیثیت سے تسلیم کرنے کے باوجود یہ امر عملاً ناممکن ہے کہ افراد کے باہمی فروق و اختلافات کو بالکل مٹا دیا جائے۔ اور ان فروق و اختلافات سے جو عدم مساوات پیدا ہوتی ہے اسے یکسر محو کر دیا جائے۔ عدم مساوات کی وجہ سے جو مظالم اور ناانصافیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وُہ اسی وقت وجود میں آتی ہیں جب انسانوں کی فطری اور پیدائشی عدم مساوات میں معاشرہ اپنی طرف سے مصنوعی عدم مساوات کا اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ مصنوعی عدم مساوات جو بالآخر ظلم اور اتلاف حقوق کی جانب لے جاتی ہے۔ غیر فطری رسم و رواج اور پارینہ روایات کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ جب یہ غیر فطری بندشیں اور مصنوعی پابندیاں کسی معاشرہ میں جڑ پکڑ لیتی ہیں، تو اس کے تمام افراد خواہ مرد ہوں یا عورتیں، اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو نشوونما دینے میں رکاوٹیں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہنی اور روحانی ارتقا مسدود ہو جاتا ہے۔ ان کے بلند تر عزائم اور اعلیٰ حوصلے ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہ کام مذہب، حکومت اور قانون کا ہے کہ وہ انفرادی نشوونما کی راہ سے ایسی تمام رکاوٹوں کو دُور کریں اور ایک ایسا ماحول پیدا کریں جس میں صرف انسان کی پیدائشی صلاحیتوں کا فرق و اختلاف معاشرہ میں ان کا رتبہ متعین کرے۔

جنسی مساوات کے مسئلہ پر بھی اسی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔ اگر جنسی مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہماری سوسائٹی کی دقیانوسی روایات مصنوعی رسوم اور ایسے تمام قوانین جن کی اسلام میں کوئی حقیقی سند موجود نہیں اور جو غیر مسلموں کے میل جول یا مخصوص قومی اور ملکی حالات کی پیداوار ہیں، ہمارے معاشرہ سے خارج کر دیئے جائیں تاکہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ موقع حاصل ہو کہ وہ اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں اور مسلمان سوسائٹی کی ترقی میں اپنا جائز حصّہ لے سکیں۔ تو بجز چند قدامت پرستوں کے اور کسی سمجھدار شخص کو اس قسم کی مساوات سے انکار نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر جنسی مساوات کے معنے بدلے جائیں کہ صنفِ نازک کے جسمانی خصوصیات، نفسیاتی میلانات اور ذہنی صلاحیتیں بعینہٖ اور ہوبہو مردوں کی مانند ہیں یا مرد اور عورت ایک دوسری کی تکمیل نہیں کرتے بلکہ ایک مشترک میدانِ عمل میں باہم حریفانہ حیثیت رکھتے ہیں اور ہر وہ کام جو مردوں کے کرنے کا ہے، عورتیں بھی اسی حسن و خوبی سے انجام دے سکتی ہیں، یا مرد بھی عورتوں کے وظائف انجام دے سکتے ہیں، تو اس قسم کی جنسی مساوات بالکل غیر حقیقی اور ناقابلِ عمل ہے۔

جہاں تک مرد و عورت کی بنیادی مساوات کا تعلق ہے، قرآن حکیم نے ایک جامع آیت میں اس کا اثبات کر دیا ہے:

یٰایھا النّاس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا و بث منھما رجالا کثیرا و نساء۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا۔ پھر اسی نفسِ واحد سے انسان کا جوڑا پیدا کیا یعنی صنفِ نازک کی تخلیق بھی اسی نفسِ واحد سے عمل میں آئی جس سے مرد کو پیدا کیا گیا۔ یہاں نہ صرف مردوں اور عورتوں کی اصولی مساوات کا اعلان کیا گیا ہے بلکہ سارے انسانوں کو بلا امتیازِ نسل و خون اور قومیت مساوی قرار دیا گیا۔ کیونکہ سب کے سب بالآخر اسی نفسِ واحد کی پیداوار ہیں۔ اس جامع قرآنی آیت کے بعد جس میں مردوں اور عورتوں کی مساوات کا صاف لفظوں میں اثبات کیا گیا ہے۔ اگر کوئی حدیث یا روایت ہمیں ایسی ملتی ہے جس سے قرآن کے اس اعلان کی براہِ راست یا بالواسطہ تکذیب ہوتی ہے، تو ایسی حدیث یا روایت لائقِ استناد نہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ اسی طرح ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی چیز میں منحوسیت ہو سکتی ہے تو گھوڑے، عورت اور مکان میں۔ یہ دونوں حدیثیں قرآن کے اعلان مساوات کی صریحاً تکذیب کرتی ہیں اور اس لیے انھیں حضور رسالتمآبؐ کی جانب منسوب کرنا منصبِ نبوت کی تذلیل و اہانت ہے۔

عربوں کی تاریخ کے جس عہد میں اسلام منظرِ وجود پر نمودار ہوا، اس میں عورتوں کی حیثیت بہت پست اور حقیر تھی انھیں نہ صرف مردوں سے کم مرتبہ قرار دیا گیا تھا بلکہ ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ جب کسی مرد کا انتقال ہو جاتا، تو اس کی بیویاں اس کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتی تھیں۔ گویا کہ وہ بھی کوئی جائداد منقولہ ہیں۔ لڑکیوں کا پیدا ہونا اہلِ خاندان کے لیے باعثِ ننگ سمجھا جاتا تھا اور بہت سے لوگ اس ذلت کی شرمندگی کو چھپانے کے لیے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات نے اس غلط تصور کو مٹا دیا کہ لڑکیاں لڑکوں سے کم حیثیت اور کم رتبہ ہیں یا لڑکے سلوک اور برتاؤ میں کسی ترجیح کے مستحق ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے عورتوں اور مردوں کے رتبہ کو مساوی قرار دیتے ہوئے کہا:

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الیٰ نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ (سورۂ بقر)	رمضان کی شب میں تمہارے لیے بیویوں سے ہمبستری حلال ہے، کیونکہ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لیے۔

چونکہ لباس سے انسان کے بعض عیوب پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور لباس سردی اور گرمی میں انسان کو بیرونی فضا کے

اثرات سے محفوظ رکھتا ہے ، اس لیے یہاں عورتوں کو مردوں کا لباس قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح مرد عورتوں کو برائیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور ان صفات کی تکمیل کرتے ہیں جو عورتوں میں نہیں پائی جاتیں ، اسی طرح عورتیں بھی مردوں کو فواحش سے روکنے کی موجب ہیں اور مردوں میں جن صفات کی کمی ہے ، انھیں پورا کرتی ہیں ۔ یا اگر لباس سے آرائش و زینت مراد لی جائے ، تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس طرح مرد کا وجود عورتوں کو زیب و زینت بخشتا ہے اسی طرح عورتیں مردوں کے لیے باعثِ زینت ہیں ۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اللہ کی نظر میں مرد اور عورت بلحاظ مرتبہ مساوی ہیں ۔ عربوں کی جیسی سوسائٹی میں، جہاں عورت کو اتنا ذلیل سمجھا جاتا ہے ، قرآن کا یہ اعلان انتہائی انقلاب انگیز تھا اور نہ صرف عربوں میں بلکہ یورپ کے ممالک میں ابھی سو دو سو سال ہوئے ، عورتوں کو جو حیثیت دی گئی تھی اس کے لحاظ سے قرآن کا اعلانِ مساوات مہذب دنیا کے معیارات سے بہت اونچا تھا ۔ اسی طرح عربوں میں لڑکیوں کو جس ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ، قرآن اس کی صاف الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے ان لوگوں کو نہایت کمینہ اور دنی الطبع قرار دیتا ہے ، جو لڑکی کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اور اس کے وجود کو اپنے خاندان کے لیے ایک بارگراں سمجھتے تھے :

و اذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھه مسودا وھو کظیم ۔ یتوارٰی من القوم من سوٓء مابشربه ۔ ایمسکه علیٰ ھون ام یدسه فی التراب ۔ الا سآء ما یحکمون ۔ (سورہ نحل ۵۹)	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے ۔ وہ اس خبر کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی جاتی ہے ، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلت کے لیے رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے ۔ سنو بہت برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں ۔

اسی طرح اس خیال کی بھی قرآن ہی نے تردید کی کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہے ، بلکہ مرد آزاد ہے کہ ان کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے ۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے :

و لھن مثل الذی علیھن بالمعروف ۔ (سورہ بقر)	اور عورتوں کے لیے بھی پسندیدہ طور پر ویسے ہی حقوق ہیں ۔

اسی اصول مساوات کی تعلیم دینے کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی کہ لڑکیوں کے ساتھ انھیں بالکل وہی برتاؤ کرنا چاہیے جو لڑکوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔ اسلام سے قبل لڑکیوں کو ایک بار سمجھا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ خاندان میں اولاد ذکور کی جو عزت تھی، لڑکیاں اس سے بالکل محروم تھیں بلکہ آج تک مسلمانوں میں اس عدم مساوات کے پیچھے کچھ اثرات پائے جاتے ہیں اور بہت سے لوگ لڑکوں کو اس لیے عزت و احترام اور شفقت و محبت کا مستحق سمجھتے ہیں کہ آگے چل کر ان سے خاندان کی معاشی سود و بہبود میں اضافہ ہوگا ۔ چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر

له ستراً من النار۔
(مسلم کتاب البر والصلۃ)

میں ڈالا جائے، وہ ان میں پورا اترے اور اچھی طرح ان کی تربیت کرے، میں آتش جہنم سے اس کی آڑ بن جاؤں گا۔

مساوات جنسی کے قیام کے لیے اسلام نے بار بار اس پر زور دیا کہ اولاد کے لیے ماں اور باپ دونوں کا مرتبہ برابر ہے۔ اگر عورت اور مرد کو خدا نے مساوی رتبہ نہ دیا ہوتا' تو ان کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا مطالبہ اس زور و شدت سے نہ کیا جاتا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث میں ماں کی عزت اور افضلیت پر بطور خاص توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ووصّینا الانسان بوالدیه احسانا حملته امه کرها و وضعته کرها۔

ہم نے انسان کو تعلیم دی کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اس کی والدہ نے حمل کے زمانے میں بھی اس کو تکلیف سے اٹھایا اور اس کو پیدا کرنے میں بھی تکلیف اٹھائی۔

یہاں اگرچہ ماں اور باپ دونوں کے ساتھ نیکی اور حُسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن ماں کی قربانیوں کا بطور خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے:

عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الجنة تحت اقدام الامهات۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح حضرت فاطمہؓ سے مروی ہے:

عن فاطمة قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الزم رجلها فان الجنة تحت اقدامها۔

حضرت فاطمہؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کے قدموں سے چمٹ جاؤ کیونکہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

اسی طرح اسلام نے عورتوں کو عزت و مساوات کا وہ مقام عطا کیا' جہاں اس سے پہلے وہ کبھی نہیں پہنچی تھی۔ اسلام کو عورتوں کے حقوق اور ان کے مساوی رتبہ کا کتنا خیال تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے نہ صرف آزاد عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی بلکہ باندیوں اور لونڈیوں کو بھی شرف و عزت کا مقام عطا کیا۔ چنانچہ بخاری (کتاب النکاح) کی روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے قبضہ میں کوئی لونڈی یا باندی ہو اور وہ اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے نیز اسے تہذیب و شائستگی اور فنون و آداب سے آراستہ کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

جہاں تک مردوں اور عورتوں کے روحانی ارتقا اور اخلاقی نشوونما کا تعلق ہے' قرآن نے واضح الفاظ میں یہ بتادیا ہے کہ اس میدان میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کامل مساوات ہے اور مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنی جدّ و جہد، کوشش

اور اطاعت گزاری سے روحانی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنسآء نصیب مما اکتسبن۔

مرد جو کچھ (اپنی جدوجہد سے) حاصل کریں گے اس سے بہرہ ور ہوں گے اور عورتیں جو کچھ (اپنی کوشش سے) حاصل کریں گی، اس سے مستفید ہوں گی۔

یہ آیت معاشی اور روحانی زندگی دونوں پر یکساں حاوی ہے۔ یعنی خواہ مال و دولت اور رزق کے حصول میں ہو یا روحانی اور اخلاقی ترقی کی دوڑ میں، ہر صنف کے لیے یکساں اور مساوی راہیں کھلی ہیں۔ مرد کی طرح عورت بھی معاشی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے کر مال و دولت کما سکتی ہے یا اخلاقی جدوجہد کے ذریعہ روحانی بلندیاں حاصل کر سکتی ہے۔ یہی بات ایک اور جگہ اس طرح بیان کی گئی ہے:

و من یعمل من الصّٰلحٰت من ذکر او انثیٰ و ھو مومن فاولٰئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیراً۔

جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ بھر بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔

مذہبی فرائض اور اخلاقی حدود کے دائرہ میں قرآن نے مردوں اور عورتوں کے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں دونوں یکساں اور مساوی طور سے شریک ہیں۔ اس لیے خدا کی نگاہ میں ان کا مرتبہ اور مقام بالکل مساوی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیآء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولٰئک سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ومسٰکن طیبۃ فی جنّٰت عدن ورضوان من اللہ اکبر ذالک ھو الفوز العظیم۔

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں، نمازیں قایم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان پر اللہ رحم کرے گا، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے اور مکان ستھرے رہنے کے باغوں میں اور رضامندی اللہ کی سب سے بڑی یہی ہے بڑی مراد ملنی۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے ارشاد کی رُو سے مردوں اور عورتوں پر نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی، حق و صداقت کی

تبلیغ اور باطل کی روک تھام یکساں طور سے فرض کی گئی ہے ، تو انھیں تعلیم کے دائرہ میں بھی یکساں حقوق اور مساوی مواقع حاصل ہونے چاہئیں کیونکہ سچائی کی تبلیغ اور برائیوں سے روکنے کا کام صرف گھریلو زندگی کی چہار دیواری سے متعلق نہیں۔ قرآن نے ایسی کوئی تہدید نہیں کی جس سے یہ ثابت ہو کہ معاشی امور، سیاسی معاملات اور تعلیمی مسائل میں عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ حکومت یا معاشرہ کی صحیح رہنمائی کریں اور اسے غلط تدابیر اختیار کرنے سے روکیں۔ پھر اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سیاسی زندگی، معاشی امور اور تعلیمی مسائل پر بھی حاوی ہے، تو وہ عورتیں جنھیں تعلیم و تربیت کے مواقع سے محروم کر کے ملکی سیاسیات، تمدنی مسائل، تعلیمی مشاغل یا صنعتی اور معاشی امور سے بالکل الگ کر دیا گیا ہو معاشرہ اور حکومت کو بُری راہوں پر چلنے سے کیسے روک سکتی ہیں۔ جو عورتیں سیاسی فہم سے عاری ہوں، جنھیں یہ خبر نہ ہو کہ ان کا معاشی نظام کن بنیادوں پر قایم ہے، جنھیں تعلیمی مسائل کی نوعیت اور پیچیدگیوں کا کوئی اندازہ نہ ہو، وہ ان امور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔ اس لیے قرآن کی مندرجہ بالا آیات سے لازمی طور پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ عورتیں اور مرد نہ صرف خانگی زندگی میں یکساں اور مساوی حقوق رکھتے ہیں، بلکہ سیاسیات، معاشیات اور تعلیم کے دائرہ میں بھی انھیں مساوی درجہ حاصل ہے اور اگر عورتیں اپنے ان خصوصی فرائض اور ذمہ داریوں سے پہلوتہی نہ کریں، جو خاندانی زندگی کے دائرے میں ان کے تفویض ہیں، تو ان کے لیے عام ملکی اور سیاسی زندگی میں حصہ لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا ہے۔

رسولؐ اللہ اور طبقہ نسواں

بیگم خدیجۃ النساء ایم سراج۔ سنگاپور

کسی قوم کی تہذیب و تمدن اور ترقی کا حال معلوم کرنا ہو تو یہ دیکھو کہ اس کے معاشرے میں عورت کا درجہ کیا ہے۔ بہترین معیار یہی ہے، جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خداوند تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے۔ عورت ساری دنیا میں محکوم تھی اور کمتر سمجھی جاتی تھی، وُہ بہت سے قانونی حقوق سے محروم تھی۔ بہت وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اُس وقت جن مذاہب و قوانین کا دور دورہ تھا اُن کی رُو سے عورت مردوں کی اس قدر محکوم تھی کہ مذہبی امور تک میں حصّہ لینا اس کے لیے ممنوع تھا۔ عورت ان کے نزدیک سرچشمۂ گناہ تھی۔ عرب کی عورتوں کا حال بھی دوسرے ملکوں کی عورتوں سے کچھ بہتر نہ تھا بلکہ مقابلۃً بدتر ہی تھا۔ اُس کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھی کہ وہ مردوں کی تسکین ہوس کا ایک ذریعہ تھی، اس کا کام صرف یہ تھا کہ قبیلے کی عزت کو محفوظ رکھنے کے لیے جفاکش سپاہی پیدا کرتی رہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج بھی مفاخرت کے اسی جھُوٹے تصور کا پیدا کردہ تھا۔ زناکاری پر بے حیائی کے ساتھ عمل تھا۔ ان گنت بیویاں رکھنا بھی عام تھا۔ اور اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عورت کو حقوق مطلقاً حاصل نہ تھے۔ وہ کسی جائیداد کی وارث تک نہ ہو سکتی تھی، بلکہ وُہ خود بھی جائداد کا ایک حصّہ تھی کہ جب اُس کا شوہر مر جاتا تو وہ شوہر کے بیٹے اور جانشین کے حصّہ میں جائداد کی طرح منتقل ہو جاتی، اور وُہ اُس کی مرضی کے خلاف اپنی بیوی بنا لینے کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ جو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آپؐ نے انسانیت کو پہنچائیں۔ ان تمام باتوں کا یکسر خاتمہ کر دیا اور اس طرح سے بد قماشی اور ناپاکی کا خاتمہ ہوا۔ قرآن حکیم نے واضح طور سے اعلان کیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں "نفس واحدہ" سے پیدا کیے گئے ہیں۔

> اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور قرابت سے بھی ڈرو بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔ (آل عمران ۴)

اور اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں اور پھر ان بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو اپنی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں، کیا پھر بھی بے بنیاد چیز پر ایمان رکھو گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہو گے۔ (النحل ۷۲)

خداوند تعالیٰ کی نظر میں عورت اور مرد قطعی مساوی سطح پر ہیں، نیکوکاری کے معاملے میں بھی اور اس کی جزا اور انعام کے معاملہ میں بھی قرآن حکیم میں اس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو ہم اس شخص کو (دنیا میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔ (النحل ۹۷)

(جہاں جزا کا یہ قانون ہے) کہ جو شخص گناہ کرتا ہے اس کو تو برابر سرابر ہی ملتا ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے (اور) وہاں بے حساب ان کو لطف ملے گا۔ (المومن ۴۰)

اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء ۱۲۴)

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ (احزاب ۳۵)

سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو اُن کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دُوسرے کے جزو ہو۔ سو جن لوگوں نے ترکِ وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دی گئیں میری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا۔ اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ عوض ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔ (آل عمران ۱۹۵)

اسلام کے مذہبی فرائض عورتوں اور مردوں دونوں پر یکساں عائد ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے تو احکام میں عورتوں کو رعایت بھی دی ہے اور بعض ایسے فرائض سے ان کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جن کی بجا آوری مردوں پر لازمی ہے۔ مسلمان عورت "ایام" کے زمانے میں نماز اور روزے سے مستثنیٰ ہے۔ عیدگاہ جانا یا جمعہ کی نماز کے لیے مسجدوں میں پہنچنا بھی اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اور اگر جانا چاہے تو ممانعت بھی نہیں۔

ہمیں قرآن حکیم نے یہ تعلیم دی ہے کہ جنت سے ہبوطِ آدم کی ذمہ دار تنہا حوّا نہیں تھیں بلکہ آدم اور حوّا دونوں شیطان کے فریب میں یکساں آ گئے تھے اس لیے مورد الزام بھی دونوں یکساں ٹھہرے۔

> اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! رہا کر تو اور تمہاری بیوی بہشت میں، پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے ورنہ تم بھی انھیں میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ پھر لغزش دے دی آدم اور حوّا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے سو بر طرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اُترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر چندے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک۔ (البقرہ ۳۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ عورت شیطان کا آلۂ کار نہیں برعکس شیطان (کی یورش) کے خلاف وہ ایک مضبوط قلعہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر تو عورت کو انتہائی اعزاز کا مرتبہ عطا کیا کہ "جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

روایت ہے کہ جب ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے زیادہ واجب الاحترام اور حقدار کون ہے جس کی خدمت نیکی اور حصولِ ثواب کی نیت سے کی جائے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہاری ماں"۔ صحابی نے پوچھا: "ماں کے بعد؟" رسول اللہؐ نے پھر یہی فرمایا کہ "تمہاری ماں" حتیٰ کہ تیسری مرتبہ کے بعد۔ چوتھی بار جب صحابی نے یہی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہارا باپ"۔ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماں کی حیثیت بیٹوں اور بیٹیوں کی نظر میں باپ سے تین گنی زیادہ ہونی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا معیار بھی بلند کر دیا اور اپنے پیروؤں کو اس کی تاکید کی، فرمایا کہ "نکاح میری سنت ہے۔ جو شخص میری سنت سے منحرف ہو وہ مجھ سے نہیں ہے (یعنی میرا پیرو نہیں ہے)" اور پھر یہ بھی فرمایا کہ "جس نے نکاح کر لیا اس نے نصف مذہب کی تکمیل کر لی۔"

نکاح کی مثالی غایت کو اور بیوی کے مرتبے کو رفعت بخشی گئی۔ قرآن حکیم فرماتا ہے،

> "اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔" (الروم ۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کی محبت اور احترام کی بار بار تاکید کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

"تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔"

اور فرمایا:

"ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔"

پھر یہ بھی فرمایا کہ:

"کسی مسلمان کو اپنی بیوی سے نفرت ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے یادگار خطبۂ حجۃ الوداع میں بڑی تفصیل سے عورتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور خاص طور پر یہ کہا کہ:

"اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے، ان کے معاملے میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔"

لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا وہ رواج جو اسلام سے پہلے تھا اس کی سخت مذمت کی گئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ چاہیں۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

"قیامت کے دن وہ لڑکیاں جن کو زندہ دفن کیا گیا تھا اپنے قاتلوں کے خلاف گواہی دیں گی۔ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ یہ کس جرم میں قتل کی گئی تھیں۔" (التکویر ۸، ۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو۔ کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی، بیشک ان کا قتل کرنا بھاری گناہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۳۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ:

"جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔"

یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"جس کے کوئی لڑکی ہے اور اس نے زندہ دفن اس کو نہیں کیا، نہ غیر منصفانہ سلوک اس کے ساتھ کیا، نہ لڑکوں کو اس پر ترجیح دی، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔"

ظہورِ اسلام سے پہلے قانون نے مرد سے علٰحدہ عورت کو آزاد حیثیت کوئی نہ دی تھی مگر اسلام نے اس کو مردوں کی طرح قانون اور معاملات میں مساوی حقوق عطا کیے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض تک، اور ان عورتوں کو یہ بات

حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہو (حمل یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں۔ اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یومِ قیامت پر یقین رکھتی ہیں اور ان عورتوں کے شوہر ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں۔ اس عدت کے اندر بشرطیکہ اصلاح کا قصد رکھتے ہوں اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں اور حکیم ہیں۔ (البقرہ ۲۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی کہ:

"طلبِ علم ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے۔"

مغربی قوانین نے شادی شدہ عورت کو ذاتی املاک خریدنے اور بیچنے کا حق جو اب دیا ہے، اسلام نے یہ آزاد حیثیت بہت پہلے عطا کی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

اور تم کسی ایسے امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ مردوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لیے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ (النساء ۳۲)

"پیرے کرا بائٹس" نے جو مصر کی مخلوط ٹریبونل کا سابق امریکی جج تھا اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ہے "محمدؐ نے عورت کے لیے کیا کیا" یہ اعتراف کیا ہے کہ حقوقِ نسواں کے سلسلہ میں محمدؐ کا شاندار کارنامہ وہ حقِ ملکیت ہے جو انھوں نے اپنی امت کی بیویوں کو عطا کیا۔ قانونی درجہ عورت کا بالکل وہی ہے جو اس کے شوہر کا ہے۔ جہاں تک ایک مسلمان بیوی کے حقِ ملکیت کا تعلق ہے، اس کو وہی آزادی حاصل ہے جو کسی پرندے کو پرواز کی حاصل ہے۔ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی رائے لیے بغیر اپنے مال و متاع کو جس طرح چاہے صرف کرے یا ٹھکانے لگا دے۔

قرآن حکیم کی بعض آیات اور احادیثِ نبویؐ کی تعبیر بعض اوقات اس طرح بھی کی گئی ہے جس سے مساوات کا انکار ہوتا ہے اور مردوں کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن گہرا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو گا کہ بظاہر کتنی ہی غیر مساوی صورت نظر آئے۔ درحقیقت اسلام نے عورت کے مکمل حقوق کی ضمانت دی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

..... اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو عورتوں پر ہیں قاعدہ (شرعی) کے موافق اور مردوں کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے۔ (البقرہ ۲۲۸)

یہ فرق جو دونوں صنفوں میں ہے، وہ ان کے حقوق کے بنیادی اختلافات کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ تو اس فرق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو معاشی مرتبے میں ان کے درمیان تھا۔ عملی طور پر عورت کو وہ سماجی مواقع حاصل نہیں جو مردوں کو تجربات، اختراعات اور معلومات عامہ کے سلسلے میں حاصل ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی طور پر عورتوں کا انحصار مردوں پر ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو مردوں کو ایک طرح کی برتری اور ذمہ داری عطا کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ:

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر فضیلت دی ہے اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہیں اطاعت کرتی ہیں۔ مردوں کی عدم موجودگی میں بحفاظت اپنی نگہداشت کرتی ہیں، اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو، اور ان کو مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر بہانہ مت ڈھونڈو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے رفعت اور عظمت والے ہیں۔
(النساء ۳۴)

اس آیت میں جو لفظ "قوّامون" ہے۔ اس سے مراد سرپرستی، نگہداشت اور اعانت و کفالت کا فریضہ ہے۔ یہ آیت اس شخص کا تذکرہ کر رہی ہے جو کسی دوسرے مشغلے میں پوری طرح لگا ہوا ہو، اپنے مفادات کا تحفّظ کر رہا ہو، اور اپنے معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو۔ یہی لفظ دوسری جگہ قرآن حکیم میں یوں استعمال ہوا ہے کہ:

اے ایمان والو! انصاف پر خوب قایم رہنے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے، سو تم خواہشِ نفس کا اتباع مت کرو، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ (النساء ۱۳۵)

چنانچہ قرآن حکیم کی ان آیتوں میں مردوں کو عورتوں کے حقوق پامال کرنے کے بجائے ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ایک فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق کے محافظ رہیں، حتیٰ کہ مردوں کے مفادات کے خلاف بھی، تاکہ عورتوں کے لیے مراعات اور انصاف کی ضمانت ہو۔ یہ ہے قوّامون کا مفہوم۔

وراثت کے سلسلہ میں اسلامی شریعت کا یہ قانون ہے کہ عورتوں کا حصّہ مردوں کے مقابلہ میں نصف ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کی یہ آیت دیکھیے:

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے باب میں لڑکے کا حصّہ دو لڑکیوں کے حصّے کے برابر، اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ مرا ہے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔ اور ماں باپ کے لیے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لیے میّت کے ترکے میں سے چھٹا چھٹا حصّہ ہے اگر میّت کے کچھ اولاد ہو، اور اگر اس میّت کے کچھ اولاد نہ ہو تو اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے۔ اور اگر میّت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصّہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا) وصیّت نکال لینے کے بعد کہ میّت اس کی وصیّت کر جاوے یا دَین کے بعد تمہارے اصول و فروع جو ہیں

تم پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے کہ ان میں سے کون سا شخص تم کو نفع پہنچانے میں نزدیک تر ہے۔ یہ حکم منجانب اللہ مقرر کر دیا گیا۔ بالیقین اللہ تعالیٰ بڑے علم اور حکمت والے ہیں۔ (النساء ۱۱)

عورتوں کی اس قانونی حصہ داری میں بظاہر جو عدم مساوات سی نظر آتی ہے اس کی تشریح علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے یوں کی ہے:

لڑکی کا یہ حصہ اس کی کسی فطری کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے معاشی مواقع کے پیش نظر ہے۔ اور اس مقام کی وجہ سے ہے جو اپنے معاشرے کے نظام میں اس کو حاصل ہے "محمڈن لا" کے مطابق لڑکی اس جائداد کی پوری طرح مالک تصور کی گئی ہے جو اس کو شادی کے وقت باپ کی طرف سے بھی ملتی ہے اور شوہر کی طرف سے بھی، مزید برآں مہر بھی کلیتہً اسی کی ملکیت ہوتا ہے جو خود اس کی مرضی کے مطابق معجّل ہو یا موجّل، اتنا ہی نہیں بلکہ مہر کی ادائیگی تک وہ اپنے شوہر کی ساری جائداد اپنے قبضے میں رکھ سکتی ہے ساری عمر کی کفالت کی ذمہ داری بھی (شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد) شوہر پر ہے۔ اگر آپ اس زاویۂ نظر سے قانونِ وراثت کے عمل کو دیکھیں تو آپ کو بیٹے اور بیٹیوں کے معاشی مرتبے میں کوئی مادی تفاوت نظر نہیں آئے گا بلکہ حق تو یہ ہے کہ وراثت کی حصہ داری میں بظاہر غیر مساوی نظر آنے والی یہ صورت ہی اصل میں قانونی مساوات مہیا کرتی ہے۔ (اسلام کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید ص ۱۹۲، ۱۶۱)

اسلام نے مرنے والے مسلمان کی جائداد میں اس کی بیوی اور بیٹیوں کا متعین حصہ رکھا ہے اور یہ انتظام کیا ہے کہ اگر جائداد میں کسی قسم کا تصرف بھی ہو تو یہ اپنے قانونی حصوں سے محروم نہ ہونے پائیں۔ قرآن حکیم میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں سے جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جاویں خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر ہو، حصہ قطعی (النساء ۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق نکاح دراصل ویسا ہی "معاہدہ" ہے جیسے دوسرے معاہدات دو افراد میں ہوتے ہیں۔ جہاں تک معاہدہ کی شرائط کا تعلق ہے عورت مرد دونوں شرکا ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں اور ہر شریک کے فرائض ہیں اور حقوق بھی۔ اسلام ہر معاہدے میں عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔ معاہدۂ نکاح میں بھی عدل و انصاف پیش نظر ہونا ضروری ہے۔

امام بخاری کے نزدیک ایک باپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں دے دے خواہ وہ دوشیزہ ہو یا ثیبہ۔ ایک روایت کے بموجب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ:

"کسی ثیبہ کو خود اس کے حکم کے بغیر کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جا سکتا اور کسی دوشیزہ کو بھی اس وقت تک

کسی کے حبالۂ عقد میں نہیں دیا جا سکتا جب تک پہلے اس کی مرضی نہ معلوم کر لی جائے۔"

یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض گزار ہوئی کہ "میرے باپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے نکاح میں دے دیا ہے جو مجھے پسند نہیں ہے۔" اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ اس کی پسند پر چھوڑ دیا۔

طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ابغض المباحات ہے (جس کی اجازت بحالت مجبوری دی گئی ہے) چونکہ شوہر ہی کفالت کا ذمہ دار اور گھر کا نگران ہوتا ہے اس لیے اس کو یہ حق دیا گیا ہے کہ مجبوری یا ضرورت ہو تو معاہدۂ نکاح کو فسخ کر سکتا ہے، لیکن اس کی اجازت بھی اسی وقت ہے جب وہ بیوی اور بچوں کا انتظام کر دے۔ مہر اور اخراجات کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائے۔ اس کو اپنا یہ حق طلاق استعمال کر کے بیوی کو جراحت یا نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اس سلسلہ میں نہ تو کوئی نقصان پہنچایا جائے نہ باہم نقصان پہنچانے کی کوئی نیت ہو۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ طلاق صرف بوقت ضرورت دی جاتی ہے۔ بیوی کو بھی طلاق حاصل کرنے کا حق حاصل ہے وہ خلع حاصل کر سکتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ:

وہ طلاق دو مرتبہ کی ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ اور تمہارے لیے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (ہی) جو تم نے ان کو مہر میں دیا تھا مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قایم نہ رکھ سکیں گے۔ سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قایم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے۔ یہ خدائی ضابطے ہیں سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے سو ایسے لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔ (البقرہ ۲۲۹)

حدیث میں بھی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ جو ثابت بن قیس کی بیوی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا: یا رسول اللہؐ! جہاں تک ثابت بن قیس کا تعلق ہے میں ان کے کردار اور تقوٰی پر کوئی الزام نہیں دھر سکتی لیکن میں اسلام میں احسان فراموشی کو پسند نہیں کرتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم وہ باغ واپس کرنے پر آمادہ ہو جو ثابت نے تمہیں دیا ہے؟ جمیلہ نے کہا: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس سے فرمایا کہ باغ لے لو اور ان کو ایک طلاق دے دو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدد ازواج کو نہ تو نافذ کیا نہ اس عمل کی تاکید کی۔ تعدد ازواج قبل اسلام سے رائج تھا اور اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحدید نافذ کی اور کئی بیویوں کی اجازت اس وجہ سے دی کہ ان عورتوں کی کفالت ہو سکے جن کے باپ یا شوہر جنگوں میں کام آ گئے ہوں۔ قرآن حکیم نے بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے اور تاکید کی ہے کہ سب کے ساتھ مساوی

اور عادلانہ سلوک کیا جائے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو اور عورتوں سے جو تم کو پسند ہوں نکاح کر لو دو دو عورتوں سے اور تین تین عورتوں اور چار چار عورتوں سے۔ پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو یا جو تمہاری ملک میں ہو وہی سہی اس امر مذکور میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے۔ (النساء ۳)

معاہدۂ نکاح کے شرائط، شرکاء معاہدہ کے طے کرنے کے ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق۔ اگر شوہروں کو اجازت ہے کہ مجبوری کے وقت وہ اپنا حقِ طلاق استعمال کریں تو بیویاں بھی حقدار ہیں کہ اپنے مہر اور نفقے کا اپنی پسند کے مطابق تعین کریں، نیز اپنے شوہروں سے علیحدہ ہو جانے کا اختیار طلب کریں کہ جب ضرورت پڑے تو اس اختیار کو استعمال کر سکیں۔ اگر شادی کے وقت تمام امور کا پوری طرح لحاظ کر کے معاہدہ عمل میں آئے اور جانبین عملی طور پر ایک ہی سطح پر ہوں تو عورت کے لیے نقصان اٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے کہ:

اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نگاہیں نیچی کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں۔ مگر جو اس (موقع زینت) میں سے (غالباً) کھلا رہتا ہے، جس کے ہر وقت چھپانے میں ہرج ہے) اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں اور اپنی زینت (کے مواقع مذکورہ) کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے (محارم پر یعنی) باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر یا اپنے (حقیقی، علاتی یا اخیافی) بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی (حقیقی، علاتی اور اخیافی) بہنوں کے بیٹوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی لونڈیوں پر یا ان مردوں پر جو طفیلی (طور پر رہتے) ہوں اور ان کو ذرا توجہ نہ ہو، یا ایسے لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں (مراد غیر مراہق ہیں) اور اپنے پاؤں زور سے نہ رکھیں کہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔ اور مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (النور ۳۱)

اگر اس آیت سے عورت کا اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر عزلت گزیں رہنا درست کہا جائے کہ وہ اپنے جائز امور کو سرانجام دینے کے لیے بھی گھر سے باہر قدم نہ رکھنے پائے تو پھر یہی پابندی مردوں پر بھی عائد ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (النور ۳۰)

پھر دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیویوں سے بھی کہہ دیجئے

کہ (سرسے) نیچے کر لیا کریں اپنی ٹھوڑی سے اپنی چادریں، اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کرے گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (احزاب ۵۹)

اس حکم کا مقصد عورت کی آزادی پر پابندی عائد کرنا نہیں تھا بلکہ اُس وقت مدینہ میں جو حالات تھے ان کے پیشِ نظر عورتوں کو چھیڑ چھاڑ اور دوسرے نقصانات سے بچانا مقصود تھا۔ زمانۂ قدیم میں ایک خاص قسم کا لباس تھا جو عورت اور مرد دونوں کے لیے نشانِ عزت و امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً "آشورین" کے قدیم قانون نے شادی شدہ عورت کے لیے نقاب ضروری قرار دیا تھا اور لونڈیوں کو یا بدنام عورتوں کو نقاب کی ممانعت تھی۔

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ سودہؓ بنت زمعہ باہر گئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا اور کہا کہ خدا کی قسم، سودہؓ! تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ لہٰذا وہ واپس چلی آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کو اجازت ہے کہ اپنی ضرورتوں کے لیے باہر جاؤ۔ اگر یہ سچ ہے کہ عہدِ رسالت کے سماجی حالات کے مطابق عموماً عورتیں زیادہ تر گھریلو معاملات میں اپنے شوہروں اور بچّوں کی نگہداشت میں غرق رہتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ مصروفیات ملی سرگرمیوں میں حصّہ لینے میں کبھی مانع نہ تھیں۔ گھر کے کام کاج نے ان کو نہ تو مسجد جانے سے روکا، نہ عید کی نمازوں سے روکا، نہ میدانِ جنگ میں جانے اور شریکِ جہاد ہونے سے روکا اور نہ دوسرے بے شمار فرائض کی ادائیگی سے روکا۔ مثلاً وہ رسد کی فراہمی کا انتظام کرتیں، بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کرتیں، میدانِ جنگ سے زخمیوں اور شہیدوں کو اٹھاتیں حتّٰی کہ ضرورت آ پڑتی تو باقاعدہ لڑائی میں بھی حصّہ لیتیں۔ رسول اللہ صلعم کی ایک زوجۂ مطہرہ زینبؓ چمڑا تیار کرتی تھیں۔ یہ ان کا کاروبار تھا اور اس کاروبار کی آمدنی رفاہ عامہ پر صَرف کرتیں۔ عورتیں کھیتی کے کاموں میں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹاتیں، دعوتوں کے موقعوں پر مہمانوں (مردوں) کی تواضع کرتیں۔ اس کے علاوہ تجارت بھی کرتیں، وہ مردوں سے چیزیں خریدتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا مرتبہ بہت بلند کر دیا ہے اور قانونی طور پر عورت کو مردوں کے برابر حقوق عطا کیے ہیں۔ عدل کی تاکید کی ہے۔ خصوصی مراعات کی ہدایت کی ہے اور ان کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری مرد کے سر عائد کی ہے۔ مگر آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا نہ صرف غلط استعمال ہوتا رہا بلکہ بعض اوقات تو سرے سے ان کو نظر انداز کیا گیا۔ مرد عورتوں کے محافظ بنائے گئے تھے مگر اس کے عوض وہی ان کے حق میں ظالم و جابر ہو گئے۔ آج بھی بہت سے ممالک میں "مسلم لا" پر عمل درآمد اس انداز سے ہو رہا ہے کہ حقوقِ نسواں کے معاملے میں مخالفانہ امتیاز نمایاں ہے۔ لیکن ان تمام باتوں پر موردِ الزام مسلمان ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور دین و شریعت اس سے بری ہیں۔ شیخ محمد عبدہٗ نے لکھا ہے کہ جو شخص اس سے واقف ہے کہ اسلام سے پہلے کی تمام قوموں نے کس طرح مردوں کو ترجیح دی اور عورتوں کو جانور بنائے رکھا، اور وہ مردوں کا محض کھلونا سمجھی گئیں۔ اور کس طرح بعض مذاہب نے بھی مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے فوقیت دی اور عورت کو عورت ہونے کی وجہ سے کمتر سمجھا اور کہیں بعض قوموں نے عورت کو مذہبی ذمہ داری تک انجام دینے کے قابل نہ سمجھا، حتّٰی کہ یہ

تصوّر کیا کہ وہ روح کی بھی حامل نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے آگاہ ہونے کے بعد ہی وہ ان اصلاحات کی حقیقی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتا ہے جو عورتوں کے معاملے میں اسلام نے کی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی عیاں ہو جائے گی کہ اہلِ یورپ کا یہ دعویٰ کتنا بڑا فریب ہے کہ عورتوں کو اعزاز و اکرام اور مساوات سب سے پہلے انھوں نے عطا کیا۔ یہ اوّلیت تو اسلام کو حاصل ہے، اسی نے عورتوں کو اعزاز و اکرام اور مساوات سے نوازا۔ اور اہلِ یورپ کے قوانین اور احکام مذہبی میں تو آج تک مرد کی برتری بدستور قایم ہے۔

یقین کیجئے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے حقوق سے آشنا کرنے میں ساری کوتاہی مسلمانوں کی ہے اسلام کی نہیں، اور ہم تو یہاں تک تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے مذہب کی ہدایات کو پُورا کرنے سے اس قدر قاصر رہے ہیں کہ اب وہی اس کے خلاف ایک ثبوت بن کر رہ گئے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ مسلمان اسے محسوس کریں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت تک سرسبز نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو محکومی سے نجات نہیں ملتی اور وہ امتیاز ختم نہیں ہوتا جو بیچ میں حائل ہے اور معاشرے میں اسے پُوری طرح احکام قرآنی کے مطابق حصّہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

”عورتیں ریاست کا ستون ہیں، اگر وہ اچھی ہیں تو ریاست بھی اچھی ہے۔ اگر وہ خراب ہیں تو ریاست بھی خراب ہوگی۔“

سرورِ کائناتؐ کا رویّہ منافقوں سے

رئیس احمد جعفری

کھلے ہوئے دوست اور کھلے ہوئے دشمن کے ساتھ طرزِ عمل متعین کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آتی۔ یہ دوست ہے وہ دشمن ہے۔ دوست اس لیے ہے کہ موردِ لطف وکرم بنے اور دشمن اس لیے ہے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیا جاتے۔ لیکن دشمن کی ایک قسم اور ہوتی ہے؛ یہ قسم ہے منافقوں کی۔ یہ اپنے تئیں دوست ظاہر کرتے ہیں، دوستی کا عوامی دعویٰ کرتے ہیں۔ پیمانِ رفاقت بڑے زور شور سے استوار کرتے ہیں، لیکن درپردہ دشمن ہوتے ہیں، دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں، ہر وقت تخریب کے درپے رہتے ہیں، سازش کرتے ہیں نقصان پہنچاتے ہیں، تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ یہ دشمن کی سب سے بدترین خطرناک اور ناقابلِ برداشت قسم ہے۔ ایسے لوگ جب برافگندہ نقاب ہو جائیں، تو انھیں معاف نہیں کیا جا سکتا، ان پر لطف وکرم کی بارش نہیں کی جا سکتی۔ انھیں موردِ مہر وکرم نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ صرف اس قابل ہوتے ہیں کہ جہاں ملیں کچل دیے جائیں۔ جہاں ان کا سراغ لگے، پامال کر دیے جائیں۔ جب یہ ہاتھ آئیں، ان کے جسم وجان کا رشتہ بے تامل منقطع کر دیا جائے۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی یہی ہوتا تھا، دورِ تاریخ کے آغاز میں بھی ایسا ہی ہوا اور اب کہ دُنیا عمرانیت اور حضارت کے اوجِ کمال پر ہے، یہی اصول کارفرما ہے، سچ تو یہ ہے کہ بغیر اس تطہیر کے کام بھی نہیں چل سکتا، نہ نظم قایم ہو سکتا ہے، نہ امن بحال ہو سکتا ہے، نہ دوستوں کی شناخت ہو سکتی ہے، نہ دشمنوں سے نجات مل سکتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آقائے دوجہاںؐ نے منافقوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ ان کا کس طرح قلع قمع کیا؟ ان سے کیونکر نجات حاصل کی؟ انھیں

کیسی عبرت انگیز اور لرزہ خیز سزائیں دیں؟

اس سلسلہ میں چند واقعات خاص طور پر اس قابل ہیں کہ پیشِ نظر رہیں تاکہ عہدِ رسالت کی صحیح تصویر آپ کے سامنے آجائے اور رسالتمآبؐ کے کردار و اخلاق اور صفات و سیرت کا واضح خاکہ متعین ہو جائے۔

منافق کا وار

غزوہ اُحد تاریخِ اسلام میں اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی فیصلہ کن جنگ ہے۔ کفارِ قریش نے اس لڑائی کا بڑی تیاریوں کے ساتھ انتظام کیا۔ بدر میں انھیں جو شکست فاش ہُوئی تھی، اس کا بدلہ لینے کے لیے وُہ بے چین تھے۔ سردارانِ قریش، جو اس جنگ میں ہلاک ہُوئے تھے، ان کے متعلقین ایک خوفناک جنگ کے لیے سربکف ہو چکے تھے۔ قریش کے کاروانِ تجارت کا جو نفع جمع ہو رہا تھا طے ہُوا کہ اسے جنگی تیاریوں پر صرف کر دیا جائے اور یہ تجویز بڑی گرم جوشی اور مسرت کے ساتھ منظور کر لی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے جنگ کی ابتداء نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اگر جنگ مسلّط کر دی جائے، تو پھر میدانِ جنگ آپ کا مرغوب ترین مقام بن جاتا تھا۔ جب آپ کو قریش کی تیاریوں کا علم ہُوا، تو آپ نے بھی جتنی اور جیسی کچھ تیاریاں ممکن تھیں، شروع

کر دیں۔ لیکن یہ تیاریاں ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں، کہ یک بیک قریش کا لشکر نمودار ہو گیا۔ مدینہ کے قریب پہنچ کر اُس نے اُحد پر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ تعدادِ لشکر کے بارے میں آپ نے تحقیق کی، تو معلوم ہوا بہت زیادہ ہے۔ یہ اندیشہ تھا کہیں قریش کا لشکر بڑھ کر مدینہ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ چنانچہ ہر طرف چوکی پہرے کا انتظام کیا۔ مسجد نبوی کے دروازے پر دو صحابی رات بھر مسلح کھڑے پہرہ دیتے رہے۔ دُوسرے دن صبح مشورہ ہُوا۔ کچھ لوگوں نے یہ رائے دی کہ شہر میں قلعہ بند ہو کر لڑا جائے۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ پہلی رائے دینے والوں میں عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ یہ بہت بڑا منافق تھا اور منافقوں کا سردار بھی۔ بحث و مباحثہ کے بعد آنحضرتؐ نے دوسری رائے قبول فرمائی اور بعد نماز جمعہ ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ بارادہ جنگ شہر سے باہر نکلے۔ ان ایک ہزار لوگوں میں تین سو عبداللہ کے آدمی تھے۔ وُہ تھوڑی دُور ساتھ چلنے کے بعد اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس نے کہا:

حب محمدؐ نے میری رائے نہ مانی، تو میں ان کا ساتھ کیوں دُوں۔

غور کیجیے یہ کتنا بر وقت نفسیاتی وار تھا، جو اس منافق نے لشکرِ اسلام پر کیا تھا۔ مسلمان ایک ہزار سے سات سو رہ گئے۔ ان باقی ماندہ سات سو نفوس پر تین سو کے یک بیک الگ ہو جانے کا کیا اثر پڑنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ کو خدا پر بھروسہ تھا۔ آپ نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ یہی سات سو جاں نثار لے کر ایک بڑے لشکر کے مقابلہ کو نکلے اور بالآخر خدا نے فتح عطا فرمائی۔ عبداللہ کو اس حرکت کی سزا یہ سات سو آدمی وہیں "قضیہ زمین برسر زمین" کے مطابق دے سکتے تھے اور جنگِ اُحد کے خاتمہ کے بعد تو بڑی آسانی سے ایک نازک وقت میں دھوکہ دے کر الگ ہو جانے والے تین سو آدمیوں کو نہیں، تو اُن کے سردار کو ضرور موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ کچھ نہ ہُوا۔ نہ منافقین کو کوئی سزا دی گئی، نہ ان کے سردار عبداللہ کے ساتھ کسی طرح کا منتقمانہ رویہ اختیار کیا گیا۔

منافق کی سازش

یہودیوں کا اسلام اور داعی اسلام کے ساتھ جو مفسدانہ، باغیانہ اور سرکشانہ رویہ تھا، اسے تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے۔ وُہ صلح و اسلام کے ہر عہد نامے کو ردّی کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ کسی موقع پر لچک اور نرمی کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ یہودیوں کے ایک قبیلہ بنو نضیر کی سرکشی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی جہاں ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعوں میں پناہ گزیں تھے، وہاں ایک دُوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مدینہ کے منافق ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے جب ان سے معاہدہ صلح کر لینے کی خواہش فرمائی تو وُہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس موقعہ پر بھی عبداللہ بن ابی نے حسبِ معمول انھیں شہ دی اور اطمینان دلایا کہ جب تم لڑنے نکلو گے تو دو ہزار آدمیوں کے ساتھ میں بھی تمہاری مدد کو آ دُں گا (ابو داؤد) عبداللہ کی اس حرکت کی اطلاع وحی الٰہی نے آپؐ کو دے دی کہ یہ منافقین کا فروں (یہودیوں) سے کہہ رہے ہیں:

وان قوتلتم لننصرنکم۔ — اگر تم مقاتلہ کے لیے نکلے، تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

کیا اس سے بڑا جُرم بھی کوئی ہو سکتا ہے، جس کا ان منافقوں نے ارتکاب کیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کسی طرح کی کوئی بازپرس نہ فرمائی، اپنی تیاریوں میں لگے رہے۔ نہ منافقین کی پروا کی، نہ یہودیوں کی طاقت سے مرعوب ہُوئے۔

منافق ساتھی

انصار اور مہاجرین میں رسول اللہؐ نے وُہ اخوت پیدا کر دی تھی کہ اس بھائی چارہ کے آگے صلب اور رحم کے

رشتے بیچ تھے۔ کوئی انصاری اگر مرتا تھا تو مہاجر بھائی اس کی وراثت میں حصہ پاتا تھا۔ ایسی مواخات دنیا میں پہلی بار قایم ہوئی تھی و پھر اس کے بعد دنیا یہ دل آویز منظر نہ دیکھ سکی۔

منافقین اس کوشش میں رہتے تھے کہ مہاجرین اور انصار میں غلط فہمی پیدا کرکے جنگ و پیکار کرا دیں تاکہ یہ عجیب و غریب بھائی چارہ بھی ختم ہو، اور ان دونوں کے اتحاد نے کفار و مشرکین کے لیے جو ایک خطرہ پیدا کر دیا ہے، وُہ بھی دُور ہو جائے مگر ان کی کوششیں کبھی بار آور نہیں ہُوئیں بلکہ ایک مرتبہ قریب تھا کہ یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔ ایک مہاجر اور ایک انصاری کے ذاتی جھگڑے کو عبداللہ نے قومی اور طبقاتی جھگڑا بنا دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ دونوں نے اپنے اپنے طبقہ (مہاجرین اور انصار) کو مدد کے لیے پکارا۔ تلواریں کھنچ گئیں اور لڑائی کا میدان تیار ہوگیا۔ لیکن چند معاملہ فہم لوگوں نے مداخلت کی۔ بات بڑھنے نہ پائی۔ بغیر کسی خُونریزی کے وہیں کی وہیں ختم ہوگئی۔

ایسا زریں موقعہ جب ہاتھ سے نکلتا دیکھا، تو عبداللہ تلملا اُٹھا۔ اس نے انصار سے مخاطب ہو کر کہا:

تم نے خود ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔ مہاجرین کو تم نے اتنا بڑھایا کہ اب وُہ برابری کا دعویٰ کرکے تمہارے منہ آنے لگے ہیں۔ اب بھی موقع ہے، اپنا دستِ اعانت کھینچ لو، تو یہ (مہاجرین) فوراً (بے یار و مددگار ہونے کے باعث) بھاگ کھڑے ہوں گے۔

عبداللہ کی یہ باتیں ایسی نہ تھیں، جو نظرانداز کر دی جاتیں۔ معاملہ دربارِ رسالت میں پہنچا، حضرت عمرؓ بھی موجود تھے انہوں نے سرورِ کائناتؐ سے عرض کیا:

"کسی کو حکم دیجئے وہ اس منافق کی گردن اُڑا دے!"

اور کون کہہ سکتا ہے، حضرت عمرؓ کی یہ رائے قرینِ صواب نہ تھی؛ لیکن کیا رسول اللہؐ نے حضرت عمرؓ کے اس مشورہ کو قبول کر لیا؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

"کیا تم اسے پسند کروگے کہ لوگ کہیں محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ کچھ جواب نہ دے سکے اور رحمتِ عالمؐ کے عفوِ تام نے ایک بہت بڑے منافق کی جان بچا لی۔

یہی نہیں، اس رئیس المنافقین کے ساتھ ایک اس سے بھی بڑا اور حیرت انگیز واقعہ پیش آتا ہے۔

منافق باپ کا مومن بیٹا جب عبداللہ بن ابی کی منافقانہ سرگرمیاں حد سے بڑھ گئیں، ان میں کسی طرح کی کمی واقع نہ ہُوئی، بلکہ اضافہ ہی ہوتے لگا، تو مسلمانوں میں اس کے قتل کا چرچا ہونے لگا۔ یہ افواہ پھیلنے لگی اب وُہ بچ نہیں سکتا۔ ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قتل کا حکم امروز فردا میں صادر فرما دیں گے۔

بات قرینِ قیاس تھی۔ شدہ شدہ عبداللہ بن اُبی منافقِ اعظم کے بیٹے عبداللہ کو یہ خبر پہنچی۔ یہ عبداللہ بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ اسلام کے شیفتہ، رسولؐ کے جاں نثار اور باپ کے خدمت گزار، یہ خبر سُن کر سیدھے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا:

"جو کچھ میں نے سُنا ہے (عبداللہ بن اُبی کے حکمِ قتل کے متعلق) اگر وُہ صحیح ہے، تو صرف اتنی استدعا کرنا

چاہتا ہوں، مجھے حکم دیا جائے، میں اپنے باپ کا سر ابھی کاٹ کر قدموں پر لا کر پھینک دوں گا۔"
آپ نے یہ سنا اور جاں نثار ہوکیا جواب دیا:
"نہیں! ہم اس کے قتل کا حکم نہیں دیں گے، اس سے لطف و کرم کا برتاؤ کریں گے۔"
عبد اللہ باپ کی جاں بخشی کی نوید سن کر چلے گئے۔ باپ بھی اپنی جان کے بچ جانے پر خوش ہُوا لیکن اُس کی منافقانہ سرشت جُوں کی توں قایم رہی، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

منافقوں کا عذر لنگ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لڑائی پر صلح کو ترجیح دیتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں اور مشرکوں سے معاہدے کیے اور ان پر سختی سے عمل کیا۔ لیکن مشرکین اور یہود کے معاہدے صرف اس لیے تھے کہ جب مناسب سمجھیں، انھیں چاک کر دیں۔ جنگ خندق (۵ھ) انھی عہد شکن یہودیوں اور قریش نے بغیر کسی وجہ کے برپا کی تھی۔ بنو نضیر تو خیر عہد شکنی میں ممتاز تھے ہی، بنو قریظہ بھی، جو ابھی تک پاسِ عہد کرتے چلے آ رہے تھے، بنو نضیر کے بہکاوے میں آ گئے اور معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان کے ساتھی بن گئے۔ آپ نے معاہدے کی یاد دہانی اور اتمامِ حجت کے لیے دو صحابیوں کو ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا:
"نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ محمدؐ کون ہے؟ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ معاہدہ کیا ہوتا ہے؟"
یُوں بھی کفار و مشرکین کا لشکر بہت بڑا تھا۔ اب بنو قریظہ نے اس کی تعداد دس ہزار تک پہنچا دی[1] اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس توکل اور نصرت الٰہی پر بھروسہ کے سوا کیا تھا۔ کفار و مشرکین کی اس متحدہ یلغار کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت پارہ پارہ کر دی جائے۔ تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکیں۔
ایک یہودی سردار حی بن اخطب نے اپنے خیال میں سچ ہی کہا تھا: "اب اسلام کا خاتمہ ہے۔"
اس دس ہزار کے لشکر جرار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی، پھر بے مائیگی مستزاد۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے یہ طے ہوا کہ خندق کھود کر جنگ لڑی جائے۔ خندق کھودنے میں آپ نے برابر کا حصہ لیا۔ کفّار و مشرکین نے تین طرف سے محاصرہ کر لیا تھا، حالات سخت نازک تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی، وسائل بھی ناپید تھے، روپیہ اور اناج بھی نہیں تھا۔ لیکن کفر و شرک کی یورش سے گھبرانا اور پیٹھ پھیرنا مسلمان کا شعار نہیں۔ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد اور نازک ہوں، مسلمان کلمۂ الٰہی کی سربلندی کے لیے جان کا قربان کر دینا ایک کھیل سمجھتا ہے۔ ہاں تو تاریخ کا یہ عجیب و غریب کھیل جاری تھا۔ ایسا کھیل جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔
ایک مہینا تک یہ محاصرہ قایم رہا۔ اس محاصرہ نے مسلمانوں کی حالت اور زیادہ زار و زبوں کر دی۔ بار بار فاقے کرنا پڑے ایک مرتبہ صحابہ پر مسلسل تین فاقے گزر گئے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے سامنے پیٹ پر پتھر باندھے ہُوئے دکھائے (عربوں کا

---

[1] فتح الباری

معمول تھا کہ شدت گرسنگی کے عالم میں پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے تاکہ کمر سیدھی رہے) یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے بھی اخفاء حال مناسب نہ سمجھا، شکم مبارک کھولا، تو دو پتھر بندھے ہُوئے تھے۔

مسلمانوں کے اس چھوٹے سے لشکر میں منافقین کی خاصی تعداد تھی۔ شروع شروع میں تو اپنے نفاق کو چھپاتے رہے۔ لیکن جب شدائد کا دور سخت ہُوا تو نفاق چھپاتے نہ چھپ سکا۔ عذر ہاتے لنگ پیش کر کرکے واپس جانے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ قرآن مجید میں جنگِ خندق (جسے جنگِ احزاب بھی کہتے ہیں، کیونکہ بہت سی جماعتوں نے متحدہ یلغار کی تھی) کے متعلق جو سورہ (احزاب) ہے، اس میں ان کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے عذرات کا مقصد راہِ فرار تلاش کرنا ہے:

ان یریدون الاّ فراراً۔ ان لوگوں (منافقوں) کا ارادہ صرف یہ ہے کہ بھاگ کھڑے ہوں۔

لیکن راہِ فرار تلاش کرنے والے ان منافقوں کے ساتھ نہ صرف وہ رویّہ اختیار نہیں کیا گیا، جو میدانِ جنگ سے بھاگنے والے سپاہی کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ انھیں کسی طرح کی سزا نہیں دی۔ ایک طرف ان کا یہ حال تھا، دوسری طرف کھرے اور سچے مسلمان تھے، جو اس جنگ کی ہر حالت میں ہر سختی اور ہر مصیبت کے موقع پر جان ہتھیلی پر لیے قربان ہونے کو تیار رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے، جان خدا کی دی ہُوئی ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کا مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ خدا کی راہ میں کام آجائے:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

منافق کو شبہ کا فائدہ مدینہ سے یہودیوں کی جلاوطنی کے بعد خیبر ان کا مستحکم ترین اور ناقابلِ تسخیر قلعہ بن گیا تھا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر وہ اسلام اور داعی اسلام اور مسلمانوں کے تخریب کی تدبیریں سوچا کرتے۔ سازشیں کیا کرتے اور جنگی منصوبے بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگِ خیبر سے کچھ قبل یہودیوں نے بنو غطفان کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی طرح ڈالنا چاہی۔ مدینہ کے منافقین برابر یہودیوں کو خبریں پہنچا رہے تھے اور شہ دے رہے تھے۔ آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ جنگ نہ ہو بلکہ معاہدۂ صلح ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ نے ایک صحابی کو بھی بھیجا، لیکن وُہ جنگ فتح کر لینے کے نشہ میں تھے، صلح کی باتیں کیا سُنتے؛ پھر جب کہ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے انھیں یقین دلا رکھا تھا۔

محمدؐ کچھ نہیں کرسکتے، مٹھی بھر آدمیوں کے سوا ان کے پاس ہتھیار تک نہیں، وُہ کیا لڑیں گے؟ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غطفان، جو اب تک شرکت یہود کے بارے میں تذبذب میں تھے، ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔

منافقین کی یہ دراندازیاں اس لیے تھیں کہ وُہ جانتے تھے، انھیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔ انھیں جماعت سے خارج نہیں کیا جائے گا۔ ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا، ان کا اسلام زیر بحث نہیں لایا جائے گا، اس لیے اسلام کا یہ اصول ہے کہ کسی ایسے شخص کی جان نہیں لیتا، جو اسلام کا مدعی ہو۔ اگرچہ وُہ جھوٹ ہی کیوں نہ بول رہا ہو۔

مسجد ضرار اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ منافقین کی سب سے بڑی اور دیرینہ تمنا یہ تھی کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو۔ وُہ ایک دوسرے سے اُلجھ پڑیں، ان میں جو اخوت، محبّت، ہمدردی اور ملاطفت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، وُہ سرد پڑ جائے تاکہ اسلام پنپ نہ سکے اور یہ ملّت خود آپس کے نزاع میں مبتلا ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

چنانچہ مسجد قبا کے توڑ پر انہوں نے ایک جدا گانہ مسجد بنائی تاکہ مسلمانوں میں آسانی سے تفرقہ پیدا کیا جا سکے۔ وجہ یہ بتائی کہ معذور اور اپاہج لوگ، جو مسجد قبا میں نہیں جا سکتے، وُہ یہاں آکر نماز پڑھ لیا کریں۔

آنحضرتؐ کو وحیِ الٰہی نے بتا دیا کہ دراصل مقصد کیا ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے:

والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً وتفریقا بین المومنین۔ اور ان لوگوں نے مسجد ضرار کفر کے لیے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسجد میں آگ لگوا دی اور اسے مسجد کے طور پر نہیں استعمال ہونے دیا۔ لیکن منافقوں کو ہر سزا سے محفوظ رکھا۔

منافقوں کی فتنہ انگیزی فتح مکہ سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے کہ آنحضرتؐ کو اطلاع ملی۔ رومیوں کا ایک لشکر گراں مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ سُن کر آپ نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ اگرچہ موسم نہایت گرم تھا (گرمی اور وُہ بھی عرب کی) اور قحط کی شدّت نے حالات کو حد درجہ نامساعد بنا دیا تھا۔ لیکن آپ کی تیاریاں جاری تھیں اور جو مخلص مسلمان تھے، وہ ان شدائد کے باوجود راہِ خدا میں اپنی جان قربان کر دینے کو تیار اور آمادہ تھے۔ لیکن منافقین، نہ صرف یہ کہ بہانہ بازی اور عذر تراشی کر کے وہ ان کی سرگرمیوں سے الگ رہے، بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو بھی بھڑکانا شروع کیا کہ اُس قحط اور اس گرمی میں وُہ کیوں گھر کی عافیت چھوڑ کر جنگ کی صعوبتیں برداشت کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں:

لا تنفروا فی الحر۔ اُس گرم موسم میں باہر نہ نکلو۔

یہ تھا دعوتِ رسالت کے جواب میں ان کا وُہ خفیہ پیغام، جو مسلمانوں کے کانوں تک صرف اس لیے پہنچایا جا رہا تھا کہ وہ ایک بڑی سعادت سے محروم رہ جائیں۔

ان فتنہ طرازیوں کے باوجود ان کی جان کو کوئی گزند پہنچا، نہ مال کو۔

منافق کی سپر ایک بدری صحابی نے ایک مرتبہ آنحضرتؐ کو اپنے گھر بلایا، وہاں تشریف لے گئے، تو کھانے کے لیے اصرار رہوا، آپؐ راضی ہو گئے۔ محلہ کے تمام لوگ اس موقع پر موجود تھے۔ کسی نے کہا:

"آج مالک بن دخیش نظر نہیں آتے۔"

ایک شخص نے یہ سن کر کہا: "وہ منافق ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ نہ کہو، وہ لآ الٰہ الاّ اللہ کہتے ہیں۔"

سب خاموش ہوگئے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان سے لاَ اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کہہ دینا ایک منافق کے لیے بھی سپر بن جاتا ہے۔

منافق کا اقرار سے انکار

واقعہ افک یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی تھی، وہ ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ حضرت عائشہؓ کی طہارت و تقدیس کی خود قرآن مجید نے توثیق فرمائی۔ لیکن یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اُم المومنینؓ کی ذات گرامی پر ایسا رکیک اتہام۔ قدرتاً اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کو بھی حد درجہ صدمہ ہوا اور خود حضرت عائشہؓ کے قلب و دماغ پر جو کچھ گزری، اس کا اندازہ ہر حساس شخص بآسانی کر سکتا ہے لیکن اتنے بڑے واقعہ کے سلسلے میں ہوا کیا؟ اس سلسلہ میں تین خاص اہم شخصیتوں کا ذکر لازمی ہے۔ تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی یعنی دِرّے لگائے گئے۔ ان سزا یافتگان میں حضرت حسان بن ثابتؓ بھی تھے، جو صحابیِ رسولؐ اور شاعرِ رسولؐ تھے۔ لیکن منافقین کے بہکاوے میں آگئے اور تہمت لگانے والوں میں شریک ہوگئے۔

ایک دُوسرے صاحب مسطح بن اثاثہ تھے۔ یہ بھی تہمت لگانے والوں میں (منافقین کے بہکاوے میں آکر) شریک تھے۔ انھیں بھی شرعی سزا ملی لیکن مزید سزا یہ ملی کہ حضرت ابوبکرؓ نے، جو ان کے کفیل معاش تھے، اپنی مالی امداد بند کر دی اور قسم کھالی کہ ایسے شخص کی مدد اب کبھی نہیں کریں گے۔ یہ بات خدا کو بُری لگی اور آنحضرتؐ پر یہ آیت نازل ہوئی:

و لیعفوا و لیصفحوا لا تحبون ان یغفر اللہ لکم و اللہ غفور رحیم۔ (سورہ نور۔ ۲۲)	تمھیں عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہاری مغفرت فرمائے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

لیکن اس واقعہ کا اصل ہیرو منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا اور آپ اس حقیقت سے خوب واقف تھے کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا ہوا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں، راسخ العقیدہ اور صالح مسلمانوں کو حد شرعی برداشت کرنا پڑی۔ اس لیے کہ اُن پر جرم ثابت تھا اور عبداللہ بن اُبی صاف بچ گیا۔ اس لیے کہ اسے خود اقرار نہیں تھا کہ اس نے تہمت لگائی اور شواہد و قرائن خواہ کتنے ہی قوی موجود ہوں لیکن کوئی ایسی شرعی شہادت موجود نہیں تھی جس کی بنا پر اسے سزا دی جاسکتی۔ کیا یہ معمولی واقعہ ہے؟ کیا اس عفو و درگزر اور لطف و مرحمت اور احسان و نعمت کی کوئی حد مقرر کی جاسکتی ہے؟

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو، اور جو تم میں سے حاکم ہو، اس کی اطاعت کرو

(النسآء: ۵۹)



سیاسی نظام پر اثرات

رسولؐ اللہ کی بین الاقوامیّت

اقبال احمد نوری

یوں تو ہر نبی اور رسول کے وجود کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر تاریکی کو چھانٹ کر نور میں تبدیل کر دے، ہر شرک و بدعت کی جڑ کاٹ کر توحید و سنت کی تخم ریزی فرمائے، باطل کے ہر اضطراری پہلو کو حق کے دائمی دامن میں سمیٹ لے، لیکن اسی کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ نبی یا رسول کسی خصوصی خطۂ ارض، کسی خصوصی طبقہ اور کسی خصوصی قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے اور یوں بھی ہوا ہے کہ یہ حضرات کبھی کبھی کئی کئی کی تعداد میں بیک وقت روئے زمین پر رونما ہوئے۔ اگر کسی نے خطۂ مصر میں اشاعتِ توحید کی تو کوئی فلسطین میں حق و صداقت کا درس دیتا رہا۔ غرض زمین کی پھیلی ہوئی کشادہ چادر کے طول و عرض میں ہر طرف انبیاء و رسل بھی جلوہ افروز رہے، لیکن ابھی تک ایسے پیغمبر آخر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جس کی تجلیات سے بین الاقوامی تاریکی پاش پاش ہو جائے اور تمام دنیا کے حق کوش و حق بیں ایک ہی مرکز پر سمٹ کر آجائیں۔ مذہبی اعتبار سے، ذہنی اعتبار سے، وضع قطع و لباس کے اعتبار سے غرضیکہ ہر اعتبار سے۔ اس سلسلے میں یہ بھی واضح رہے کہ یہ کام جب ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ جب کہ ایسے جلیل القدر نبی کی پیدائش مرکزی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ سرزمین عرب کو بلاشبہ دائرۃ العرض میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور ہے۔ اور وہیں پر اس نبی آخر نے قدم رنجہ فرمایا جس کی طرف زمانے بھر کے صلحاء و علماء کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور اسی کے ساتھ یہ کمال بھی ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک حیات ظاہری ہی میں عرب اور خصوصیت سے حجاز کو وہ مرکزی حیثیت حاصل ہوئی کہ اگر حبش سے بلالؓ یہاں آنے کو بے چین ہیں، تو فارس سے حضرت سلمانؓ اگر ایک طرف ہرقل کے پاس اسلام کی دعوت بھیجی جارہی ہے، تو دوسری سمت والیٔ ایران کے پاس غرضکہ حضور رسالت مآب کی بعثت کا منشا ہی بین الاقوامی لادینی و الحاد کو نیست و نابود کرنا اور بین الاقوامی مذہب کی اشاعت و تبلیغ فرمانا تھا۔

عرب تین برِ اعظم، یورپ، ایشیا، افریقہ کے درمیان واقع ہے۔ ملک عرب کو جزیرہ عرب بھی کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں بحر احمر یعنی بحیرۂ قلزم، جنوب میں بحر ہند، مشرق میں خلیج عمان اور خلیج فارس ہیں شمال میں دریائے فرات جس نے عرب کو ایک جزیرہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

عرب کی وجہ تسمیہ اہلِ لغت عرب کو بمعنی فصاحت و بلاغت اور اہلِ زبان ہونے کو اعراب کہتے ہیں اور عرب کے بالمقابل دنیا کے دوسرے ملکوں کو عجم یعنی گونگے کہا جاتا ہے۔

مختلف تفصیلات ملک عرب کا طول تقریباً پندرہ سو اور عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ مربع میل ہے ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے بقیہ زمین میں پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے سب سے بڑا

پہاڑی سلسلہ جبل السراۃ کے نام سے مشہور ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں ملک شام تک چلا گیا ہے اس کی سب سے بلند چوٹی آٹھ ہزار فٹ ہے۔ بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔ چاندی اور سونے کی کانیں بکثرت ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے اہلِ عرب ہی نے تمدن کی طرف قدم بڑھایا۔ گلہ بانی اور تجارت کے ذریعہ ادنیٰ حالت سے رفتہ رفتہ ترقی کرنے لگے۔ بھیڑوں کی اون سے موٹا ٹاٹ بنایا اور خیموں کی طرح نصب کر کے اس میں رہنے لگے۔ ان کا لباس صرف ایک لمبی بغیر سلی چادر، جس کو بطور تہبند کے اپنی کمر سے باندھتے، یا بطور احرام کے اپنی کمر سے لپیٹ لیتے تھے۔ ان کی خوراک ادھ پکا گوشت، اونٹ کا دودھ اور کھجوریں تھیں۔ ان کی تمام ملکیت اور جائیداد میں صرف مویشی اور گھوڑے، اونٹ، لونڈی اور غلام ہوتے تھے یہی ان کا بیش قیمت سرمایہ تھا۔

عرب کا تہذیب و اخلاق اور معاشرتی حالت

ننگے ہو کر ناچنا، عورتوں کو برہنہ نچانا، شراب خود بنانا اور پینا، جوئے میں عورتوں کو ہار جانا، لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا، لاتعداد بیویاں رکھنا اور باپ کے مرنے کے بعد دیگر مال کے ساتھ ماؤں کو آپس میں بانٹ لینا اور بیوی بنا کر رکھنا یا فروخت کر دینا، چوری لوٹ مار، قتل و غارت گری بعض قبیلوں کا پیشہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات سے اچھے یا بد شگون لیا کرتے تھے۔ اگر پرند بائیں طرف سے دائیں طرف راستہ کاٹ گیا، تو نیک شگون لیتے تھے۔ اور اس کو سانح کہتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی پرند دائیں سے بائیں طرف راستہ کاٹ گیا تو بد شگون لیتے اور اس کو طیرہ کہتے تھے۔ پھر اس کام کو نہ کرتے اور لوٹ آتے اگر کوئی مر جاتا، تو اس کا اونٹ اس کی قبر پہ باندھ دیتے، یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مر جاتا اور اس مرنے والے کا سوگ ایک سال تک منایا جاتا۔ جو عورت بیوہ ہو جاتی اسے ایک سال کی عدت گزارنا ہوتی اور اسے نہایت منحوس سمجھا جاتا۔ ایک سال تک غسل اور منہ ہاتھ دھونے کو اسے پانی نہ دیا جاتا نہ کپڑے دیئے جاتے۔ یہاں تک کہ اس کے جسم میں سمیت پیدا ہو جاتی۔ جب عدت پوری ہو جاتی۔ اس کی جھولی میں اونٹ کی مینگنیاں بھر کر شہر میں گشت کرایا جاتا اور جہاں کچھ مرد عورتیں نظر آتیں، یہ عورت ان پہ مینگنیاں مٹھی بھر بھر کر مارتی تاکہ لوگ جان لیں کہ آج اس کی عدت پوری ہوئی ہے۔ جہاں اہل عرب میں عدت کا اتنا سخت اور ظالمانہ رواج تھا، وہاں یہ بھی تھا کہ حسین عورتوں کو اس کی حاجت ہی نہ پڑتی۔ مرنے والے کا ترکہ بانٹنے والے اس کو بھی مال متروکہ سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ بسا اوقات اس کے حصول کی خاطر تلواریں چلا کرتیں اور خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے۔ جب بارش نہ ہوتی اور اس کی سخت ضرورت ہوتی تو یہ ظالم ایک گائے کی دم میں سوکھی گھاس کا گٹھا باندھ کر آگ لگا کر جنگل میں چھوڑ دیتے۔ وہ بیچاری آگ سے بچنے کے لیے جتنا بھاگتی، ہوا سے آگ اور بھڑکتی، تو وہ ربِ کریم اپنی رحمت کی بارش سے اس کی آگ بجھا دیتا۔

حشرات الارض، یعنی سانپ، بچھو، چھچھوندر، چوہے، چھپکلی اور کھنکھجورا وغیرہ تک کھا جاتے۔ یتیموں کا مال کھانا غریبوں اور کمزوروں کو ستانا وغیرہ وغیرہ۔ جہاں اہلِ عرب میں یہ خامیاں تھیں، وہاں بعض خوبیوں کے بھی مالک تھے یعنی وعدہ کے پکے اور عہد پہ اٹل، مر جاتے مگر بات میں فرق نہ آنے دیتے۔ اہل عرب کی سی مہمان نوازی اگرچہ دشمن ہی

کیوں نہ ہو، تاریخ دنیا میں نہیں ملتی، اہلِ عرب کسی بنا پر گاہک کو قرض دینے سے انکار کر دیتے۔ مگر جب یہ معلوم ہو جاتا کہ اس کے یہاں کوئی مہمان آیا ہے، تو فوراً دے دیتے۔ چاہے اس قرض کے ملنے کی امید ہو یا نہ ہو۔

اہلِ عرب کی خوبیوں اور اچھائیوں کو ان کی بدکرداری، غلو و عیاشی نے اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ بے شمار برائیوں میں یہ چند خوبیاں کچھ اس طرح روپوش ہو گئی تھیں، کہ کوئی ان خوبیوں کو خوبیاں نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ دوسرے ان خوبیوں کو تسلیم کرتے، بلکہ اہلِ عرب بھی ان خوبیوں کو نیکی اور اچھا کام سمجھ کر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اچھائی اور برائی میں فرق نہ تھا۔ وہ ہر فعل عادتاً کرتے تھے یہی حال دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم و ملت کا تھا۔ عیسائی حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم کو فراموش کر چکے تھے اور بجائے نبی و رسول ماننے کے عیسٰی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے۔ جب ان کے مذہب کا یہ حال تھا تو ان کی تہذیب اور ان کے معاشرے میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم کا کون سا جز باقی رہ گیا تھا۔

ایسی حالت میں جب کہ دنیا گناہوں کی تاریکی میں روپوش ہو چکی تھی، وہ قومیں جو اپنے آپ کو ایک روشنی کا منارہ تصور کرتیں اور ہدایت کی شمعیں روشن کرنے کی مدعی تھیں، وہ سب کفر و شرک و گناہ کی تاریکیوں کا ایک جزبن رہ گئی تھیں ضروری تھا کہ دنیا کی اصلاح کرنے کے لیے کوئی معلم، کوئی بین الاقوامی ریفارمر پیدا ہو۔ اس لیے خالقِ کائنات نے ایک ایسا عظیم مصلح جو کائنات عالم کو ایک ہی وقت میں ہدایت کر سکے، دنیا کے مرکزی مقام عرب میں پیدا فرمایا اس آفتاب ہدایت کا اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ آفتاب ہدایت فاران کی چوٹیوں سے چمکا اور دنیا کے ہر حصہ کو اپنی نورانی شعاعوں سے منور کرنے لگا۔

بین الاقوامی رسول جب کسی کو بین الاقوامی ریفارمر یا رسول یا مصلح کہا جائے گا، تو یہ بھی دیکھنا ضروری ہو گا کہ اس ذات میں وہ تمام صفات، جو ایک مصلح کے لیے ضروری ہیں، موجود ہیں یا نہیں اس کے اخلاق بین الاقوامی ہیں یا نہیں۔ اس کی معاشرت ہمہ گیر ہے یا نہیں۔ اس کی خاندانی شرافت اس کی زندگی اس کا عمل، اس کا ہر قول و فعل، اس کی ہر خو و خصلت، اس کا کردار، اس کا کیرکٹر بین الاقوامی تسخیر و کشش رکھتا ہے یا نہیں۔

سوانح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سلسلہ نسب بین الاقوامی شخصیت خصوصاً جو رہبر عالم ہونے کا مدعی ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عالی خاندان ہو، شرافت نسبی اس کے خون میں شامل ہو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ یہ ہے

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

یہ سلسلہ عدنان کی ۴۰ پشتوں کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جا کر ملتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی شرافت نسبی تمام اقوام و مذاہب میں مسلم ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد در اولاد، جن کا سلسلہ حضور سے آکر ملتا ہے، سب خدا پرست گزرے۔ رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباؤ اجداد میں سے کسی کا دامن شرک سے ملوث نہ ہوا اور تمام اقوام میں ممتاز رہے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے کنانہ کو برگزیدہ فرمایا۔ اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم سے مجھ کو برگزیدہ بنایا۔ اسی طرح ترمذی شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلقت کو پیدا کیا، تو مجھ کو ان کے سب سے اچھے گروہ میں بنایا۔ پھر قبیلوں کو چنا، تو مجھ کو سب سے اچھے قبیلے میں بنایا۔ پھر گھروں کو چنا تو مجھ کو ان کے سب سے اچھے گھر میں بنایا۔ پس میں روح و ذات و اصل کے لحاظ سے ان سب سے اچھا ہوں۔ قصی کے چار لڑکے تھے، عبدالدار، عبد مناف، عبد بن قصی، عبدالعزیٰ قصی نے مرتے وقت حرم محترم اور اس کا انتظام عبدالدار کے سپرد کیا۔

حضرت ہاشم کی تولیت کعبہ لیکن ہاشم نے جب یہ دیکھا کہ خاندان عبدالدار کعبہ کا احترام و انتظام صحیح نہیں کرتے تو ان سے کعبہ کی تولیت چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا اور خود اس منصب پر فائض ہوئے کعبہ معظمہ کی زیارت کے لیے اس وقت بھی بڑی دور دور سے لوگ آتے تھے۔ اگرچہ کعبہ شریف میں بھی کچھ عرصہ سے بت پرستی شروع ہو گئی تھی اور اس کا بانی بنی خزاعہ کا ایک فرد ربیعہ بن حارث تھا۔ یہ ملک شام گیا اور وہاں لوگوں کو بت کی پرستش کرتے دیکھا تو یہ بھی چند بت خرید لایا اور کعبہ شریف کے آس پاس نصب کر دیئے۔ جو لوگ کعبہ کے عقیدت مند تھے انہوں نے بتوں کی بھی پرستش شروع کر دی۔ ورنہ اس سے پہلے عرب بھر میں بت پرستی کا رواج نہ تھا ——— صرف حضرت ہاشم نے کبھی بتوں کی طرف توجہ نہ کی مگر کعبہ اور اس کے زائرین کی آپ کے دل میں عقیدت تھی۔ لہٰذا ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کی صبح کو ہاشم نے کعبہ سے پشت لگا کر قریش سے یوں خطاب کیا۔

"اے قریش کے گروہ! تم خدا کے گھر کے پڑوسی ہو۔ خدا نے بنی اسمٰعیل میں سے تم کو اس کی تولیت کا شرف بخشا ہے اور تم کو اس کے پڑوس کے لیے خاص کیا ہے خدا کے زائرین تمہارے پاس آرہے ہیں، جو اس کے گھر کی تعظیم کرتے ہیں۔ پس وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدا کے مہمانوں کی میزبانی کا حق سب سے زیادہ تم پر ہے۔ اس لیے تم خدا کے مہمانوں اور اس کے گھر کے زائرین کا اکرام کرو۔"

غرض ہاشم نے اپنے فرائض کو نہایت خوبی سے انجام دیا۔ زائرین کعبہ کو نہایت فراخ دلی سے کھلاتے تھے پانی کی قلت تھی، زمزم شریف کو بھی بنی جرہم نے بند کر دیا تھا۔ اس کا اب کچھ نشان بھی باقی نہ رہا تھا (جس کا ذکر آئے گا) ہاشم

نے چمڑے کے حوض بنا کر ان میں پانی بھر کر منیٰ اور زمزم شریف کے قریب پانی کی سبیلیں لگوا دیں، عرب کے راستے بڑے مخدوش تھے، دن میں قافلے لوٹ لیے جاتے تھے۔ ہاشم نے قریش کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے قیصر روم اور شاہ حبش سے خط و کتابت کر کے فرمان حاصل کیے اور مال تجارت کا ٹیکس معاف کرایا اور راستہ کے قبائل میں دورہ کر کے ان سے معاہدہ کیا۔ اب ان کا قافلہ تجارت بلا خوف و خطر جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک جاتا اور بڑا فائدہ حاصل کرتا۔

عبدالمطلب حضرت ہاشم ایک بار تجارت کی غرض سے ملک شام گئے۔ راستہ میں مدینہ میں قیام کیا وہاں خاندان بنی نجار کی ایک شریف النسب لڑکی سلمیٰ سے نکاح کیا اور کچھ روز کے بعد شام کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں علیل ہو گئے اور غزہ کے قریب انتقال ہو گیا۔ سلمیٰ حاملہ تھیں، ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا، ان کا نام سلمیٰ نے شیبہ رکھا۔ شیبہ نے آٹھ سال تک مدینہ میں پرورش پائی۔ جب ہاشم کے بھائی مطلب کو معلوم ہوا، تو مدینہ گئے۔ بھاوج اور بھتیجہ کو مکہ چلنے کے لیے کہا، سلمیٰ تیار نہ ہوئیں، مگر بھتیجہ کو ساتھ کر دیا۔ مکہ والے حضرت شیبہ کو عبدالمطلب کہنے لگے اور آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے۔

چاہ زمزم کی دوبارہ کھدائی ہاشم کے انتقال کے بعد باتفاق رائے مکہ کی سرداری اور کعبہ کی تولیت عبدالمطلب کو ملی۔ آپ نے خواب میں زمزم شریف کا صحیح مقام دیکھا اور اپنے بیٹے حارث کو لے کر کھودنا شروع کر دیا۔ اس وقت آپ کو معاونین کی قلت کا بہت احساس ہوا۔ آپ نے اپنی اولاد میں برکت کی دعا کی اور عہد کیا کہ اگر میرے سب بیٹے میرے سامنے جوان ہو گئے، تو ان میں سے ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دوں گا۔

ذبیح اللہ حضرت عبداللہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی۔ ادھر تو زمزم شریف کی کھدائی مکمل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے دس بیٹے عطا فرمائے اور سب کے سب آپ کے سامنے جوان ہو گئے۔ تو آپ سب کو لے کر کعبہ میں حاضر ہوئے اور سب کے نام پر قرعہ ڈالا۔ خدا کی قدرت کہ قرعہ حضرت عبداللہ کے نام کا نکلا۔ عبدالمطلب حضرت عبداللہ کو لے کر قربان گاہ کی طرف چلے۔ حضرت عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں۔ رونے لگیں اور حضرت عبداللہ کو چھوڑ دینے کی التجا کرنے لگیں، عبدالمطلب نے مجبور ہو کر یہ کیا کہ دس اونٹوں پر حضرت عبداللہ کے نام کا قرعہ ڈالا۔ اس میں بھی حضرت عبداللہ کا نام نکلا۔ پھر دس اونٹوں کا اور اضافہ کیا۔ اس بار بھی حضرت عبداللہ کا نام نکلا۔ اس طرح سو اونٹ ہو گئے۔ تب اونٹوں پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کیے۔ اس لیے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے انا ابن الذبیحین (میں دو ذبیحوں کا بیٹا ہوں) یعنی حضرت اسمٰعیل اور حضرت عبداللہ۔

حضرت عبداللہ کی شادی جب عبدالمطلب اس قربانی سے فارغ ہوئے، تو حضرت عبداللہ کے نکاح کی فکر ہوئی حضرت عبداللہ کے حسن و جمال کا شہرہ عرب میں پہلے ہی سے تھا۔ اس واقعہ نے آپ کو اور بھی مشہور کر دیا۔ عرب کی عورتیں اور مرد آپ کے حسن و جمال کے دیدار سے اپنے چشم و دل کو مسرور اور غم کو دور کرتے بہت سی عورتیں آپ سے عقد کی خواہش مند تھیں، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ کو پردہ عفت و عصمت میں محفوظ رکھا۔ قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی لخت جگر حضرت آمنہ خاتون سے آپ کا عقد ہوا۔ عرب کے دستور کے

مطابق حضرت عبداللہ تین دن اپنے سسرال میں رہے۔ اس کے بعد اپنے گھر چلے آئے۔

حضرت عبداللہ کا انتقال کچھ عرصے کے بعد حضرت عبداللہ ملک شام کی طرف تجارت کے لیے گئے واپسی میں مدینہ منورہ میں اپنی ننھیال میں قیام فرمایا۔ وہیں بیمار ہو گئے۔ عبدالمطلب نے علالت کی خبر سن کر حارث کو بھیجا کہ عبداللہ کو مکے لے آئیں۔ حارث کو وہاں پہنچ کر انتقال کی خبر ملی۔ واپس آئے۔ یہ خبر وحشت اثر سب کو سنائی۔ تمام اہلِ مکہ کو اس خبر سے رنج و ملال ہوا۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا اس وقت حاملہ تھیں۔ حضرت عبداللہ نے ترکہ میں صرف پانچ اونٹ، چند بکریاں اور ایک کنیز ام ایمن کو چھوڑا۔

ولادت رسول عالم چرخِ کہن نے چمنستانِ عالم میں ہزاروں پھول کھلتے دیکھے، ہزاروں کلیوں کو مسکراتے دیکھا کبھی خزاں کے تند و تیز جھونکوں سے تر و تازہ اشجار کو جڑ سے اکھڑتے دیکھا۔ کبھی موسم بہار کی آمد آمد کے ڈنکے بجتے سُنے کبھی بادِ صرصر کی صدائیں گونجیں، تو کبھی بادِ نسیم کی سحر کاریاں دیکھیں۔ جب کبھی تاریکی نے آنکھیں دکھائیں، ایک نور چمکا اور ان تاریکیوں کو روپوش ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ جب کفر و شرک کی گھنگھور گھٹائیں فضائے عالم پر مسلط ہوئیں، کوئی رسول نورِ ہدایت کا منارا بن کر آیا۔ حسبِ ضرورت قوم و ملت کوئی صاحب خلق اور معلم اخلاق بن کر آیا۔ تو کوئی رعب و ہیبتِ حق سے متصف ہو کر جلوہ افروز ہوا۔ کوئی میدانِ شجاعت میں سربلند، تو کوئی صبر و توکل کا درس دینے والا۔ کوئی تختِ شاہی پر تاج و قار سجائے نظر آیا تو کوئی زہد و قناعت کے فرش پر جلوہ گر دیکھا گیا۔ کسی کے حسن و جمال کا شہرہ ہوا تو کسی کی خوش کلامی اور فصاحت و بلاغت کے خطبے پڑھے گئے۔ مگر چرخِ کہن کی آنکھیں مضطرب، شمس و قمر، رات دن گردش میں مصروف کسی اور ہی نبیٔ باکمال کی منتظر تھیں۔ جس میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم و اکمل و اعلیٰ موجود ہوں اور کوئی ایسی صفت باقی نہ رہ جائے جو انبیاء و مرسلین میں اس سے پیشتر پائی گئی ہو۔ جب یہ گردش کرتے کرتے تھکنے ہی والے تھے، کہ ان کی مراد بر آنے کا وقت آ گیا

ازل کے روز جس کی دھوم تھی، وہ آج کی شب تھی
جو قسمت کے لیے مقسوم تھی، وہ آج کی شب تھی

ادھر سطحِ فلک پر نیلگوں چادر جس میں ہزاروں روشن ستارے ٹانکے گئے ہیں، ان آبدار موتیوں کی جھالر شامیانۂ آسمان میں بڑی دلکش معلوم ہو رہی ہے۔ ادھر فرشِ زمین جس پر چاند کی چاندنی بڑی صفائی سے بچھائی گئی ہے۔ دریاؤں کی روانی، نسیم صبح مست و سہانی کچھ عجیب سماں پیدا کر رہی ہے۔

نہاکے نہروں نے وہ جھمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے
پہاڑیوں کا وہ حسن تزئین، وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکین
صبا سے سبزے میں لہریں آتیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

غرض آسمان و زمین کو دلکش آرائشوں سے سجایا گیا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر کائنات کو دلہن بنایا گیا ہے۔

ادھر سطحِ فلک پر چاند تارے رقص کرتے تھے
ادھر روئے زمیں پر نقش بنتے تھے سنورتے تھے
سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے
جبل لعل و جواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے
زمرد وادیوں میں سبزہ بن کر ہر طرف بکھرا
ہوئی بارانِ رحمت ہر شجر کا رنگِ رُخ نکھرا
ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں
کوئی مژدہ تھا جو ہر گوشِ گل میں کہہ سناتی تھیں

نسیم بہار چلی، شاخ شاخ سے گلے ملی۔ گل فرط مسرت سے پھولے نہ سمائے۔ کلیوں کی چٹک سے صلوٰۃ اللہ وسلام علیک کی آواز آئی۔ فاختہ صدائے کوکو چھوڑ کر منتظر تھا۔ بلبل ناشاد کے دن پھرے جب آسمان اور اس کے بسنے والے زمین اور اس میں رہنے والے، آسمان کے چاند ستارے چمنستان ارض کے سب نظارے رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبالی پروگرام کے تحت بن سنور گئے، تو:

بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پرکیف شہنائی
ہوئی فوجِ ملائک جمع زیرِ چرخِ مینائی
ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے
نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے

سردار ملائک سدرہ سے چلے، ابلیس لعین کے فتنے ٹلے۔ قدوسیوں نے مبارک باد دی، ابلیسوں نے فریاد و بکا کی۔ روح الامین نے بامِ کعبہ پر ایک علم سبز نصب کیا۔ حوران بہشت نے حضرت آمنہؓ کو اپنی آغوش میں لیا۔ اور ایک جامِ سرد و شیریں پینے کو دیا اور بصد ادب یوں عرض کیا۔

اظہر یا سید المرسلین	اے انبیاء کے سردار تشریف لائیے
اظہر یا رحمۃ للعلمین	اے عالمین کے لیے رحمت جلوہ فرمائیے
اظہر یا خاتم النبیین	اے انبیا کے ختم فرمانے والے بے نقاب ہو جائیے۔
اظہر یا رسول رب العلمین	اے رسول رب العلمین تشریف لائیے۔

فظھر محمد رسول اللہ کا لبدر المنیر

پس بصد ہزار عز و شان ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوئے۔ جبل و اشجار نے کھڑے ہو کر تعظیم دی محراب کعبہ نے سر جھکا کر تسلیم کی۔ حطیم نے

بڑھ کر اپنی آغوش میں لیا۔ ابر رحمت نے سایہ کیا۔ بوندیاں شوق دیدار میں درود پڑھتی اتریں۔ بجلیوں نے سورہ نور وردِ زبان کی۔ وحوش و طیور نے ایک دوسرے کو بشارت دی۔ ملائکہ نے اہل زمین کو مبارکباد پیش کی۔ گھر گھر شادی کی رسوم ہر طرف مبارکباد کی دھوم، درودیوار سے صلاۃ وسلام کی صدائیں بلند ہوئیں۔

اے مدینے کے تاجدار سلام — اے غریبوں کے غمگسار سلام

تیری اک اک ادا پہ اے پیارے — سو درودیں فدا ہزار سلام

رب سلم کے کہنے والے پہ — جان کے ساتھ ہوں نثار سلام

میری بگڑی بنانے والے پر — بھیج اے میرے کردگار سلام

اس جواب سلام کے صدقے — تا قیامت ہوں بیشمار سلام

عرض کرتا ہے یہ حسنؔ تیرا
تجھ پہ اے خلد کی بہار سلام

ولادت اور چند خصوصیات

وقت ولادت حضرت آمنہؓ اپنے شوہر مرحوم حضرت عبداللہ کے مکان پر رونق افروز تھیں۔

۱۔ حمل کا اظہار کسی پر نہ ہوا۔ غیر تو غیر خود حضرت آمنہ خاتونؓ کو بھی محسوس نہ ہوا۔ آپ نے بشارت جلیلہ سے جانا کہ میں حاملہ ہوں (سیرت جلیلہ) اس طرح ان کے رب نے حیا والے رسولؐ کی والدہ ماجدہ کی پردۂ رحمت سے پردہ پوشی فرمائی۔

۲۔ آپ وقت ولادت بالکل تنہا تھیں۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ آپ کی خواہش تھی کہ اس وقت عبد مناف کی بیٹیاں ہوتیں تو اچھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد کے لیے اہل جنت اور حوران بہشت کو بھیجا (جلال الدین جوزی بیان میلاد نبوی) اس رب کریم نے اپنے محبوب کی والدہ ماجدہ کو کسی عورت کے سامنے بھی بے ستر نہ ہونے دیا۔

۳۔ حضورؐ ناف بریدہ اور ختنہ شدہ اور معطر و مطہر پیدا ہوئے۔ (سیرت جلیلہ) یہ اس لیے کہ حیا والے رسولؐ کو کوئی بے ستر نہ دیکھے۔

۴۔ بعد ولادت ایک فرشتہ آیا اور آب رحمت ساتھ لایا پھر تین بار غسل دیا اور پارہ حریر سے ایک مہر کہ شکل میں مثل بیضہ کے چمک میں مانند زہرہ کے تھی، نکال کر دونوں شانوں کے درمیان ثبت کی (دلائل النبوۃ ابو نعیم) اگر دایہ غسل دیتیں، تو حضور کا بے ستر ہونا یقینی تھا۔ اس لیے فرشتہ نے غسل کرایا۔

۵۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب حضور پیدا ہوئے میں نے دیکھا حضورؐ سجدے میں ہیں۔ پھر ایک سفید ابر نے آکر حضورؐ کو ڈھانپ لیا۔ جب پردہ ہٹا تو میں نے دیکھا کہ حضور ایک سفید اونی کپڑے میں لپٹے ہوئے ہیں اور سبز ریشمیں بچھونا بچھا ہے اور گوہر شاداب کی تین کنجیاں حضورؐ کی مٹھی میں ہیں اور ایک کہنے والا کہہ رہا ہے کہ نصرت کی کنجیاں، نبوت کی کنجیاں فتح کی کنجیاں سب پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ فرمالیا۔

حضورؐ کے اسماءِ مبارک حضرت آمنہؓ نے فرشتوں سے سن کر حضورؐ کا اسم مبارک احمد رکھا اور کتب سابقہ میں بھی احمد ہی لکھا ہے۔ مگر حضرت عبدالمطلب نے حضورؐ کی ولادت کے تیسرے دن خوشی میں قریش کی دعوت کی اور سب کو حضورؐ کا دیدار کرایا۔ بعدہٗ عرب کی رسم کے مطابق اسی مجلس میں حضور کا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا قرآن مجید میں بھی حضورؐ کا ذاتی اسم گرامی محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ علاوہ ان ذاتی اسما کے صفاتی نام بکثرت ہیں۔ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ علامہ احمد خطیب قسطلانی ؒ نے پانچسو نام جمع فرمائے۔ سیرت شامی میں تین سو اور اضافہ کیے اور میں (اعلیٰ حضرت) نے چھ سو اور ملائے۔ کل چودہ سو ہوئے (الملفوظ اول)

کثرتِ اسماء کا سبب یہ ہے کہ حضور کے اسمائے گرامی ہر طبقہ میں مختلف ہیں اور ہر جنس میں جدا گانہ ہیں۔ آسمانوں میں اور نام ہیں اور زمین میں اور نام۔ ملائکہ میں اور ہیں، جنات میں اور، بہشتیوں میں اور نام ہیں، انسانوں میں اور، دریاؤں میں اور نام ہیں، پہاڑوں میں اور۔

ایامِ رضاعت حضرت آمنہؓ نے دو یا تین دن اپنا دودھ پلایا۔ اس کے بعد ثوبیہ، جو ابولہب کی کنیز تھیں، اس دولت سے مشرف ہوئیں۔ ابولہب حضورؐ کا سوتیلا چچا تھا۔ ثوبیہ نے جاکر ابولہب سے کہا کہ تجھے مبارک ہو کہ تیرے بھتیجے محمدؐ پیدا ہوئے (صلی اللہ علیہ وسلم) ابولہب خوش ہوا اور انگلی سے اشارہ کر کے کہا: اے لونڈی! میں تجھے اس خوشی میں آزاد کرتا ہوں۔ جا تو اس مولود کو دودھ پلا۔ ثوبیہ حضرت آمنہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہے مبارک ہو سیدہ زہرہؓ کہ محمدؐ کے قدم بابرکت ہیں۔ ان کے دنیا میں آتے ہی غلام اور کنیزیں آزاد ہونے لگیں۔

میلاد کی خوشی منانے والا ابولہب جب حضور نے اعلانِ نبوت فرمایا اور دنیا کو بھلائی کی طرف بلایا، تو ابولہب حضورؐ کا جانی دشمن بن گیا۔ یہ اور اس کی بیوی نے حضورؐ کو بہت دکھ پہنچائے۔ اس کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک سورۃ نازل ہوئی۔ (سورۃ لہب پ۳۰) ابولہب کی موت کے ایک سال بعد حضرت عباس نے اس کو خواب میں دیکھا، تو پوچھا: اے دشمن رسول! تیرا کیا حال ہے اس نے جواب دیا لم الق بعدکم غیر انی سقیت فی ھذہ بعتاقتی ثویبہ۔ تمہارے بعد مجھے کچھ بھی آرام نہ ملا، سوائے اس کے کہ ثوبیہ کو آزاد کرنے کے سبب سے بمقدار اس کے نیچ کی انگلی اور کلمہ کی انگلی کے درمیان گھائی ہے سے پانی مل جاتا ہے، جسے میں پی لیتا ہوں اور سکون پاتا ہوں۔

یہ حدیث عروہ بن زبیر سے مرقوم ہے۔ مقام غیرت ہے کہ ایک کافر اکفر، منکر توحید و رسالت حبیب پیدائش محبوب کی خوشی میں جس انگشت سے اشارہ کر کے ایک لونڈی کو آزاد کر دے، تو ہر روز دو شنبہ کو اسی انگشت سے پانی جاری ہو۔ جس کو پی کر ابولہب اس دن آرام و سکون سے رہے اور عذاب قبر سے محفوظ رہے، تو جو صاحب ایمان و الیقان اس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد مبارک کی خوشی ہر سال منائے، تو کیا اس پر سے عذاب حشر و قبر نہ اٹھ جائے گا اور جو اس خوشی کو مناتا ہوا دنیا سے جائے گا تو اس کے رونگٹے رونگٹے سے رحمت کے فوارے نہ پھوٹ نکلیں گے۔

وباللہ التوفیق وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

حضورؐ کی ولادت کا ماہ مُبارک ربیع الاول تھا، خدا کی قدرت کہ یہ موسم بھی ربیع (یعنی بہار) کا تھا قریش
حلیمہ سعدیہؓ کا دستور تھا کہ وہ اپنے بچے کسی بدوی خاندان میں ایام رضاعت گزارنے بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کے خیال
میں جو بچے اس طرح پرورش پاتے تھے، تو وہ جوان ہو کر شجاعت و بہادری میں یکتا ہوتے۔ اور عربی زبان، عربی لہجہ اور فصاحت
و بلاغت میں بھی ماہر ہوتے تھے۔ یہ رسم قریش میں ایسی رائج ہوئی کہ اب ہر سال موسم ربیع میں طائف کی دایہ عورتیں خود
آتیں اور شیرخوار بچوں کو اپنے ساتھ لے جا کر پرورش کرتیں، چنانچہ اس سال بھی قبیلہ بنی سعد سے دس عورتوں پر مشتمل ایک قافلہ
طائف سے چلا۔ حلیمہ سعدیہ بھی اپنی لاغر اونٹنی پر خالقِ کائنات کے سہارے قافلے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئیں۔ بادِ خزاں کے تیز جھونکے
درختوں کی پتی پتی کو مرجھا کر گرا سکتے تھے۔ مگر حلیمہ کی خوش آئند زندگی اور شاندار مستقبل پر اثر انداز ہونا ان کے بس کی بات نہ تھی۔
مایوس و بیمار حلیمہ چلی جا رہی تھیں۔ مگر قسمت نازاں تھی کہ حلیمہ اس گوہر بیش بہا کو حاصل کرنے جا رہی ہے، جو آگے جانے والوں
کو نہیں مل سکتا۔ وادی مکہ میں قافلہ اترا دایہ عورتیں اپنے نونہالوں کو شوہروں کی آغوش میں دے کر زرداروں کی تجوریوں کی طرف
لپکیں اور امیروں کے بچوں کو حاصل کر لیا۔ مگر حلیمہ شہنشاہِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہوئی اور سنگ اسود کو بوسہ دے کر عرض کی۔ اے
خالق و مالک! سب اپنی آرزوئیں لے کر امیر دولت مندوں کے دربار میں گئیں اور اپنی آرزوؤں کے پھل حاصل کر لائیں اور میں تیرے حضور حاضر ہوئی
ہوں۔ بلکہ اپنی خواہش کو تیرے حضور لائی ہوں تو دانائے غیوب ہے رحیم و کریم ہے تو اپنی رحمت سے میرے دامنِ مراد کو بھر دے۔
ادھر عرض کی ادھر قبول ہوئی۔ حضرت عبدالمطلب آتے ہیں اور حلیمہ سے فرماتے ہیں۔ اے حلیمہ! تیرا گوہر مراد میرے
پاس ہے۔ حلیمہ خوشی سے جامہ میں پھولی نہیں سمائی۔ جب دولت کدہ آمنہؓ پر پہنچی، تو حضرت آمنہؓ نے اس درِ یتیم کو جس کے
حضور قبولیت خود مرادیں مانگنے آئے، حلیمہ کی آغوش میں دے دیا۔ حلیمہ نے رُخِ انور سے چلمن ہٹائی، سرکار نے مسکرا کر چشم حق بیں
کھولیں۔ ایک نور آسمان کی جانب بلند ہوتا نظر آیا۔ حلیمہ کی نظر جب اس منبعِ نور پر پڑتی ہے، ساری کلفتیں راحت سے بدل
جاتی ہیں۔

جس کے جلوے سے مرجھائی کلیاں کھلیں
اس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

حلیمہ اپنی متاعِ جاں نچھاور کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ نصیبہ جاگ اٹھتا ہے۔ قسمت رقص کرتی ہے۔ خشک چھاتیاں
دودھ کی نہریں بن کر بہہ نکلتی ہیں۔ آپ پہلے سیدھی چھاتی سے دودھ پلاتی ہیں سرکار شرفِ قبولیت سے نوازتے ہیں جب
بائیں چھاتی منہ میں دیتی ہیں، سرکار بنظرِ انصاف منہ پھیر لیتے ہیں۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو حلیمہ حیران و پریشان ہوئیں کہ سب
بچے دونوں چھاتیوں سے دودھ پیتے ہیں۔ یہ دوسری کو منہ کیوں نہیں لگاتے۔ غیب سے ندا آتی ہے کہ اے حلیمہ! پریشان
نہ ہو۔ ہمارے محبوب منصف مزاج ہیں۔ داہنا اپنے لیے پسند فرمایا اور بایاں تمہارے لڑکے کے لیے چھوڑ دیا ہے
یہ بشارت سن کر حلیمہ بڑی مسرور و شاداں ہوئیں۔

بھائیوں کے لیے ترکِ پستاں کریں
دودھ پیتوں کی نصفت پہ لاکھوں سلام

پھر باجازت اس سرمایۂ خیر و برکت کو لے کر قافلہ کی طرف چلیں۔ اس وقت حلیمہ کی قسمت حالت وجد میں اس طرح پکار اٹھتی ہے

رہے محروم اس دولت سے ڈھونڈنے والے
سبھی کچھ پا گئے دامانِ رحمت ڈھونڈنے والے!!

حلیمہ کے شوہر کبھی یاس بھری نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ اور کبھی مایوس نگاہوں سے راہ مکہ کو تکتے تھے کہ حلیمہ رحمتِ عالم کو آغوش میں لیے جا پہنچیں اور کتاب نور کی زیارت کرائی۔ دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ گویا چشم تمنا گویا تھی کہ

اتنی مدت تک ہو دید مصحفِ عارض نصیب
حفظ کر لوں ناظرہ پڑھ پڑھ کے قرآن جمال

واپسی کے روز ہدیہ تشکر پیش کرنے درگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر طواف کعبہ کر کے قافلہ کے ساتھ چل دیتی ہیں۔ حلیمہ کی وہ کمزور ولاغر اونٹنی ہے جس سے کل شام تک قدم اٹھانا دشوار تھا۔ آج وہ کچھ ایسی سبک رفتار ہو گئی ہے کہ خود حلیمہ حیران ہے حلیمہ کے شوہر جو اونٹنی کے لاغری کے خیال سے پاپیادہ چل رہے تھے، اسے تازہ دم اور تندرست و توانا دیکھ کر خود بھی اس پر سوار ہو گئے۔ ایک سراپا معجزہ ذات شریف کی سواری میں آنے کے بعد یہ اونٹنی سراپا کرامت بن گئی تھی۔ جس مقام پر اس کا قدم پڑتا، اس جگہ ہری ہری گھاس اگ آتی۔ کچھ ہی دیر میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری سارے قافلے کے آگے نظر آنے لگی، جس کے برابر سے گزرتی۔ قافلہ والے حیرت سے حلیمہ کو مخاطب کرتے کہ اے حلیمہ! ذرا لگام تھام۔ یہ صبا رفتار اونٹنی تجھے کہاں سے ہاتھ لگی؟ کل تک تو تجھے رستہ چلنا دشوار تھا، آج یہ کیا ماجرا ہے۔ حلیمہ بھلا کیا جواب دیتیں۔ انہیں کیا خبر کہ آج کون ذات شریف ان کی آغوش میں ہیں۔ اس اونٹنی نے بزبان فصیح کہا۔ اے بنی سعد کی عورتو! تمہیں خبر نہیں کہ آج مجھ پر وہ شخص سوار ہے، جو خدا کا پیارا اور پیغمبروں کا سردار ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ راہ میں بکریاں چرتی تھیں۔ بولیں اے حلیمہ! تو اس کو جانتی ہے، یہ مالک زمین و آسمان کا پیغمبر اور اولادِ آدم کا سردار اور سب جن وانس سے بہتر ہے صلی اللہ علیہ وسلم (سرور القلوب)

ابھی قافلہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ شوق زیارت میں سورج نکل آیا۔ جیسے ہی سورج کی کرنیں اس قافلہ کی طرف متوجہ ہوئیں، ایک ابر کا ٹکڑا دوڑ کر آیا اور سرکار کے ساتھ حضرت حلیمہ اور ان کے شوہر کو بھی اپنے سائے میں لے کر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب سورج نصف النہار پر آیا، ایک پڑاؤ پہ قافلہ ٹھہر گیا۔ حلیمہ نے کچھ ستو اور کچھ کھجوریں نکالیں اس کے بعد اونٹنی کا دودھ دوہنے بیٹھیں، تو حیران رہ گئیں اور شوہر کو مخاطب کر کے بولیں آج سے پہلے کبھی اس اونٹنی نے نصف برتن سے زیادہ دودھ نہ دیا تھا آج پورا برتن بھر گیا۔ لانا دوسرا برتن تو دینا۔ قدرت خدا کہ دوسرا برتن

بھی بھر گیا، مگر اونٹنی کے تھن اسی طرح بھرے ہوئے نظر آرہے تھے، تو سخی حلیمہ نے قافلہ میں گشت کیا اور جسے حاجت مند دیکھا، اس کا برتن لے آتیں۔ دودھ بھر کر دے آتیں۔ قافلہ کے بیشتر افراد کا صرف حلیمہ کی اونٹنی کے دودھ پر وقت گزرنے لگا۔

مکہ کا چاند اور حلیمہ کا گھر یہ مبارک قافلہ پڑاؤ سے چلا۔ راہ میں طرح طرح کے عجائبات و غرائبات ظاہر ہوتے جدھر سے گزر ہوتا سنگ و شجر سلام علیک کرتے۔ جو بکریوں کا گلہ ادھر سے گزرتا، حضورؐ کو سجدہ کرتا اور سلام علیک کرتا۔ یہاں تک کہ یہ قافلہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ شب کا وقت تھا۔ حلیمہ نے چاہا کہ چراغ روشن کریں مگر گھر میں اس وقت تیل نہ نکلا۔ غریب حلیمہ خود تو اندھیرے کی عادی تھیں مگر فکر تو حضورؐ کی تھی خیال گزرا کہ کہیں تاریکی سے ڈر نہ جائیں۔ حلیمہ نے بستر کیا اور حضورؐ کو لے کر لیٹ گئیں، جیسے ہی چہرہ مبارک سے کپڑا ہٹا، سارا گھر نور سے معمور ہو گیا۔ پھر تو حلیمہ کو اپنے گھر چراغ روشن کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔ جب آفتاب آسمانی اپنا منہ چھپاتا، ماہ مدینہ اپنے نور سے سارے گھر کو منور کر دیتا۔ ایک ہمسایہ نے دریافت کیا۔ اے حلیمہ! کیا تیرے گھر رات بھر آگ جلتی ہے یا چراغ۔ جب میری آنکھ کھلتی ہے تیرے گھر کو روشن پاتی ہوں۔ آپ نے جواب دیا کہ تو نے آگ اور چراغ میں ایسی روشنی دیکھی ہے، جیسی میرے گھر میں ہوتی ہے۔ خدا کی قسم یہ پیاری روشنی آمنہ کے لال کے چاند سے چہرے کی ہے جس سے میرا گھر بقعہ نور بنا رہتا ہے۔ جب صبح ہوتی حلیمہ اور ان کے بچے حضورؐ کے جاگنے کے منتظر رہتے حضورؐ کبھی نہ سوتے، صرف آنکھ سوتی تھی۔ واللہ اگر حضورؐ سو جاتے، تو کائناتِ عالم سو جاتی پھر کبھی اس کی صبح نہ ہوتی۔ حلیمہ کی عادت تھی کہ جب تک حضورؐ جاگ نہ جاتے اور اپنی مسکراہٹ سے اجازت نہ دیتے وہ کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتیں۔ کبھی دیر تک حضورؐ آرام فرماتے، تو حلیمہ جگانے کی کوشش نہ کرتیں۔ خود جاگ جانے کی منتظر رہتیں اور جب ان چشمانِ حق بیں کی کیفیات اور دلنواز مسکراہٹوں سے محظوظ ہونا چاہتیں، تو اس طرح گنگنایا کرتیں۔

مرے لاڈلے دلربا جاگو جاگو ۔۔۔ محمدؐ رسولِ خدا جاگو جاگو
ذرا آنکھ کھولو تو لے لوں بلائیں ۔۔۔ کروں جان تم پر فدا جاگو جاگو
سُنا میں نے مرغ سحر کی اذاں سے ۔۔۔ نکلتا ہے صلِ علیٰ جاگو جاگو
بکھیرے ہیں سبزے نے شبنم کے موتی ۔۔۔ ہے اٹھکیلیوں پر صبا جاگو جاگو
کیا کرتے ہو خواب میں کس سے باتیں ۔۔۔ مخاطب ہے کیا کبریا جاگو جاگو
نکل آیا شوقِ زیارت میں سورج ۔۔۔ ہوئی صبح اے مصطفےٰ جاگو جاگو
پیو دودھ دایہ کی گودی میں بیٹھو ۔۔۔ اٹھو میرے مشکل کشا جاگو جاگو
ہٹا ہے جو یہ رُخِ روشن سے پردہ ۔۔۔ چمکتا ہے نورِ خدا جاگو جاگو

حلیمہ کے گھر خیر و برکت کی بارش حضورؐ چشمانِ حق بیں کھول دیتے ہیں اور دلنواز مسکراہٹ سے حلیمہ کا دل موہ

لیتے ہیں۔ حلیمہ کی بیٹیاں، انیسہ، حذیفہ، شیما، جو حضورؐ کے جاگنے کی منتظر تھیں، بلائیں لینے لگتی ہیں۔

جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آگیا
اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

حلیمہ نے حضور کا چہرہ انور اور دست و پا دھوئے۔ مگر پانی کو زمین پر نہیں گرنے دیا بلکہ وہ پانی ایک برتن میں محفوظ کر کے اپنی بکریوں کو پلا دیا۔ حلیمہ کی بکریاں قحط سالی کی وجہ سے نہایت لاغر و کمزور تھیں، مگر وہ پانی پی کر تندرست ہو گئیں اب تو ان کا یہ حال ہوا کہ جہاں قدم رکھتیں، ہری ہری گھاس اگ آتی۔ اسے کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتیں۔ جن سے بیٹھ کر اٹھا نہیں جاتا تھا، جن کے تھن سوکھے پڑے تھے، ان کے دودھ میں وہ برکت ہوئی، کہ ایک دن کا دودھ سات دن کفایت کرتا یا تو حلیمہ فاقہ کرتی تھیں یا رحمت عالم کے قدوم مبارک کی برکت کہ اب ان کے دروازے پر اکثر فقیر پڑے رہتے اور ان کی بکریوں کے دودھ سے سیراب ہوتے۔ مواہب لدنیہ اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ قبیلہ کی عورتیں اپنے مردوں سے کہتیں کہ تم اپنی بکریاں اسی جنگل میں کیوں نہیں چراتے، جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں۔ دیکھو تو اس کی بکریاں کیسی شیر دار اور طاقت ور ہو رہی ہیں اور ہماری بکریاں سوکھتی چلی جا رہی ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ حلیمہ پر اس دُرِ یتیم کے قدوم کی برکت ہے، اس کی بکریاں بھی اسی جگہ چرتی ہیں، جہاں ہماری۔ سارے جنگل خشک سالی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں مگر اس کی بکریاں جہاں قدم رکھتی ہیں، گھاس اگ آتی ہے (سرور العباد)

ایک دن تمام قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر حاضر ہوئیں۔ حضورؐ کی پیشانی اور قدوم مبارک کو بوسہ دے کر بولیں۔ اے حلیمہ! ہم بد قسمت تھے، جو تجھ سے پہلے مکہ پہنچے اور اس دولت عظیمہ سے محروم رہے۔ خدا نے اس بابرکت ذات شریف کی خدمت تیرے ذمہ رکھی تھی۔ اے حلیمہ! اگرچہ یہ ہماری آغوش میں نہیں مگر ہمارے قبیلہ میں تو ہیں۔ ان کی رحمت سے یہ تو بعید ہے کہ ایک گھر کو مستفیض فرمائیں، باقی محروم رہیں۔ اے حلیمہ! ان گھنگھریالے گیسوؤں کا صدقہ ہمیں بھی عطا ہو۔ ان نیم وا چشم رحمت کی بھیک ہم بھی چاہتے ہیں۔ ان کے دست و پا کا غسالہ ہمیں بھی مل جائے۔ حلیمہ نے اجازت طلب نظروں سے حضورؐ کے رُخ انور کی طرف دیکھا۔ حضورؐ مسکرا دیئے۔ یہ گویا اجازت تھی۔ فوراً دست و پا دھو کر تھوڑا تھوڑا پانی بطور تبرک سب کو دے دیا۔ وہ پانی جو بیمار پیتا شفا پاتا، اور جو جانور پیتے تندرست اور شیر دار ہو جاتے، حلیمہ کی بکریاں کچھ عرصہ میں سات سے سات سو ہو گئیں اور ایک دن کا دودھ ۴ دن تک کفایت کرتا۔

(سرور القلوب)

مُفت کا دار الشفا حلیمہ کا گھر شفاخانہ بنا ہوا تھا۔ بستی اور قبیلہ میں جو بیمار ہوتا، حضورؐ کے قدموں پر ڈالتے ہی شفایاب ہوتا۔ جو جوان اور بوڑھے بیمار پڑتے، حلیمہ کی منت و سماجت کرتے۔ حضرت حلیمہ حضورؐ کا دستِ شفا ان کے سر پہ رکھ دیتیں، فوراً اچھے ہو جاتے۔ جس کی وجہ سے دور دور تک شہرت ہو گئی کہ حلیمہ کے

یہاں قریش کا ایک ایسا بچہ آیا ہے، جو بچپن ہی میں منصف مزاج ہے جس نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ کی حق تلفی نہیں کی بلکہ دائی کی چھاتی اپنے لیے اور بائیں برادر رضاعی کے لیے چھوڑ دی جس کے دست و پا کا غسالہ شفا بخش اور باعث خیر و برکت ہے وہ جس پہ دست کرم رکھ دیتا ہے، وہ مہلک امراض سے شفا پاتا ہے۔

دُرِ یتیم گہوارے میں جھولا، پالنا، ہنڈولا، جسے عربی میں مہد اور فارسی میں گہوارہ کہتے ہیں، رحمت عالم کے لیے بھی حلیمہ نے پالنا بنایا جس میں حضورؐ آرام فرماتے۔ حلیمہ فرماتی ہیں کہ میں جب حضورؐ کو گہوارے میں لٹا دیتی، تو مجھے ہلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ کسی کے ہلانے کا محتاج نہ تھا۔ تاریخ الخمیس میں ہے کہ فرشتے حضورؐ کا جھولا ہلاتے رہتے تھے۔

نورِ خدا کا نوری کھلونا فطرتاً بچوں کو کھلونوں سے لگاؤ ہوتا ہے۔ شفقتِ مادری، پدری بہتر سے بہتر کھلونے لانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد ولادت سے پہلے اس دار فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ دادا جان کی محبت اور والدہ ماجدہ کی قربت سے دور کاشانہ حلیمہ میں رونق افروز ہیں غریب حلیمہ کسی لائق نہیں، جو شایانِ شان کھلونے حاصل کر سکیں۔ ان کا طالب، ان کا محب، ان کے خالق و مالک نے ہی خود اپنے محبوب و مطلوب کے لیے ان کی شایانِ شان کھلونا مہیا فرما دیا۔ جس کو عربی میں قمر اور فارسی میں ماہ، اردو میں چاند، ہندی میں چندرماں کہتے ہیں۔ اس نورِ لم یزل کے نورانی کھلونے تو دیکھیے۔ آپؐ مہد میں آرام فرما ہیں۔ قمر آسمانی دنیا پر جلوہ افگن ہے۔ آپؐ جدھر انگشت مبارک سے اشارہ فرماتے ہیں، اسی طرف جھک جاتا ہے۔ آپؐ اس سے باتیں کرتے ہیں، وہ آپؐ سے باتیں کرتا ہے۔

عبداللہ ابن عباسؓ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ اعلان نبوت فرما چکے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ اے میرے چچا کے بیٹے، مسلمان ہو جاؤ۔ عرض کی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اے سرکار، یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں آج مسلمان ہوا ہوں، بلکہ میں نے اسی وقت آپؐ کو نبی تسلیم کر لیا تھا، جب آپ مہد میں جھولا کرتے اور چاند سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ آپؐ کے اشارے پر چلا کرتا تھا۔

قوتِ گویائی حضرت عیسٰی علیہ السلام نے گہوارے میں اپنی امی جان کی طہارت و پاکی پہ گواہی دی۔ حضور نے پیدا ہوتے ہی اپنے رب کو سجدہ کیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اول کلمہ جو زبانِ مبارک سے نکلا، یہ تھا۔ اللہ اکبر کبیراً والحمد للہ کثیراً۔ فسبحان اللہ بکرۃ واصیلاً۔ قسطلانی اور ابونعیم روایت کرتے ہیں کہ بعد ولادت آپ نے خدا کو سجدہ کیا اور انگشت مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا۔ لا الٰہ الا اللہ انی رسول اللہ بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد فرمایا۔ ربّ ھب لی امتی (خدایا میری امت مجھے بخش دے) (سرور القلوب)

پہلے سجدے پہ روزِ ازل سے درود
یادگاریِ اُمّت پہ لاکھوں سلام

اب رسول اکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پوچھنا کہ آپؐ کس عمر میں گفتگو فرمانے لگے تھے، درست نہیں۔ جب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اسی دن یا چند روز بعد کلام فرما سکتے ہیں، تو حضورؐ تو سرورِ انبیاء ہیں ان کی فصاحت و بلاغت ان کی قوتِ گویائی کا کیا پوچھنا، پیدا ہوتے ہی اپنے رب کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی گواہی دی۔ پھر اس کے بعد کسی سے کلام فرمانے کے متعلق تحقیق نہیں۔ اگر حضور چاہتے تو پیدا ہوتے ہی ہر ایک سے گفتگو فرماتے مگر یہ شاید اس لیے نہیں ہوا کہ اس وقت لوگ بت پرستی کا شکار تھے، حضورؐ پر کسی دیوی یا دیوتا کا اثر سمجھنے لگتے۔ پھر بھی آپؐ چھ مہینے کی عمر میں بڑی فصاحت و بلاغت سے کلام فرمانے لگے تھے۔ ایک دن حضرت حلیمہ نے حضورؐ کا ہاتھ منہ دھلا کر سرمہ لگایا اور بڑے پیار سے اس چاند سی صورت کو دیکھا، ناگاہ خیال ہوا کہ کہیں میرے لال کو نظر نہ ہو جائے۔

اللہ اللہ وہ بچپنے کی پھبن
اس خدا بھاتی صورت پہ لاکھوں سلام

فوراً بکس میں سے ایک ہار مہرِ یمانی کا نکال کر لائیں اور حضور کو پہنا دیا۔ آپؐ نے پوچھا امی جان یہ کیا ہے۔ فرمایا یہ ہار نظرِ بد سے محفوظ رکھتا ہے۔ آپؐ مسکرائے اور فرمایا۔ امی جان میرا محافظ و نگہبان میرے ساتھ ہے، اسے بکس میں رکھ دیجئے۔

سات ماہ کی عمر میں چلنا

دو ماہ کی عمر میں بلا تکلف بغیر سہارے بیٹھنے اور سات ماہ کی عمر شریف میں خوب دوڑ کر چلنے لگے تھے۔ سات ماہ میں دوڑ کر چلنا خصوصیاتِ نبوت سے نہیں ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مرغی کا بچہ تو پہلے ہی دن کھڑا ہو جاتا ہے اور چلنے لگتا ہے۔ پھر سات ماہ میں حضورؐ کا چلنا کیا تعجب کی بات ہے۔

بالفرض یہ خصوصیت نبوی سے نہ بھی سہی مگر یہ ماننا پڑے گا کہ جس طرح اور بچے کھڑے ہوتے اور گر پڑتے ہیں، ایک بار نہیں صدہا بار گرتے ہیں، تب کہیں چلنا سیکھتے ہیں۔ مگر یہ آپؐ کی خصوصیت تھی کہ کبھی آپ گرے نہیں۔ اور بھلا حضورؐ کیا گرتے، جو گرتوں کو اٹھانے کے لیے آئے تھے۔ ایک سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری میں چلنے کی کوشش کرنا کیوں تھا۔ اس کے متعلق مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے کہ وقت کم اور کام بہت، ساری شریعتوں کا منسوخ کرنا اور اگلی شریعت کی مشکلوں کو کھولنا کروڑہا گنہگاروں کو بخشوانا، سارے جہان میں اسلام پہنچانا۔ تھوڑے وقت میں کام بہت کرنا، چونکہ حضرت دور سے آئے تھے، اس لیے دیر میں آئے۔ ساتویں مہینے بہت دوڑ کر چلنا اس لیے تھا کہ دوزخ کے ساتوں دروازے (اپنی امت پر) بند کرنے تھے۔ (محفل میلاد صـ۵۲)

بچپن کے کھیل

بچے فطرتاً کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ چاند جو ایک نورانی کھلونا قدرت نے مہیا فرما دیا تھا۔ (مگر وہ تو بچپن کا کھلونا تھا) اس کھیلنے کا وقت گزر چکا تھا، جیسے جیسے عمر و عقل میں پختگی آتی جاتی ہے، کھیلوں کا معیار بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اب آپؐ گھر کے باہر آنے جانے لگے تھے۔ اپنے ہم عمر بچوں کو کھیلتا دیکھتے، مگر ان کے کھیل

میں شریک نہ ہوتے، کیونکہ وہ آپ کے معیار کے لائق نہ ہوتے۔ ابتدا میں آپ کے رضاعی بھائی عبداللہ بن حارث حسب عادت حضورؐ کو بھی کھیل میں شرکت کی دعوت دیتے۔ آپؐ ان کے ساتھ کھیل میں شریک نہ ہوتے بلکہ انہیں بھی نامناسب کھیل کھیلنے سے روکتے۔ البتہ ایک کھیل، جو بچپن ہی سے مرغوب تھا اور آخر عمر تک کبھی اس کھیل سے غافل نہ رہے، وہ تھا بتوں کو توڑنا جیسا کہ حضرت مولانا بیدلؒ فرماتے ہیں۔

نہ لڑکوں میں خیر الوریٰ کھیلتے تھے
وہ کچھ کھیل اپنا جدا کھیلتے تھے

نہ رکھتے تھے کچھ پاس دیتے تھے سب — یہ بازی وہ راہ خدا کھیلتے تھے
بتوں کے کئے ٹکڑے بتخانے توڑے — یہ کھیل اشرف الانبیاء کھیلتے تھے
روایت ہے چاند آپؐ سے کرتا باتیں — ہنڈولے میں جب مہ لقا کھیلتے تھے

تھے قدرت کے کھیل ان کے سب کھیل بیدل
وہ کھیل ایسے معجز نما کھیلتے تھے

جب حضورؐ دو برس کے ہوئے تو آپ کا دودھ چھڑا دیا گیا اور حلیمہؓ حضورؐ کو لے کر حضرت آمنہ خاتونؓ کی خدمت میں مکہ حاضر ہوئیں، عرض کی آپ کی امانت حاضر ہے، مگر میری خواہش ہے کہ ابھی میں ان کی قربت و خدمت سے اور شرفیاب ہوں۔ ان دنوں مکے کی ہوا کافی گرم تھی۔ اس لیے حضرت عبدالمطلب اور حضرت آمنہؓ دونوں نے اجازت دے دی اور حضرت حلیمہؓ گوہر مراد کو اپنے ہمراہ پھر لے آئیں۔

بکریاں چرانا حضورؐ اکثر اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے کے لیے جانے کا ارادہ فرماتے مگر حلیمہ شفقت سے منع فرما دیتیں۔ ایک دن آپؐ چھپ کر شیما کے ساتھ جنگل چلے گئے۔ حلیمہ کو جب وہ چاند سا چہرہ کچھ دیر نظر نہ آیا، تو جان بہار کی مسکراہٹ سے قلب کو مطمئن کرنے کے لیے بے چین ہو کر دروازہ پر آئیں۔ آپ کو جب باہر نہ پایا، تو بچوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ حضورؐ جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔ آپ تڑپ اٹھیں۔ اپنے شوہر حارث کو آواز دی اور جنگل کی طرف دوڑیں۔ دیکھا کہ آپؐ شیما کے ساتھ ہیں۔ حلیمہ شیما پر ناراض ہوئیں کہ اس تیز دھوپ میں میرے جگر پارے کو کہاں لے آئی۔ تو شیما نے کہا اماں جان بھائی پر اس تیز دھوپ کی تپش کا کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ ایک بادل کا ٹکڑا آپ کے سر پر سایہ کئے ہوئے تھا۔ جب آپؐ چلتے وہ بھی چلتا۔ جب ٹھہر جاتے وہ بھی ٹھہر جاتا۔ یہی حال راستے بھر رہا۔ یہاں تک کہ ہم یہاں آ پہنچے (سیرت رسول عربیؐ)

اس واقعہ سے حلیمہ کچھ مطمئن ہو گئی تھیں۔ ادھر حضور کو بکریاں چرانے کی رغبت جس نے حلیمہ کو مجبور کر دیا اور حضورؐ کو عبداللہ کے ساتھ بھیج دیا۔ واپس آکر عبداللہ نے بیان کیا۔ اے ماں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان عجیب۔ جس جنگل میں جاتے ہیں، ہرا ہو جاتا ہے اور دھوپ میں ابر سایہ کرتا ہے۔ جنگل کے جانور آپ کے قدم چومتے ہیں۔ حلیمہ نے کہا اے فرزند! اپنے بھائی کا یہ حال کسی سے نہ کہنا۔ (سرور القلوب)

اب حضور روزانہ بکریاں چرانے عبداللہ کے ساتھ جنگل جانے لگے۔

نکتہ پروردگار عالم نے بکریاں چرانے کی رغبت بچپن سے اس رحمت عالمؐ کے دل میں پیدا فرمائی کہ یہ کام سیاست و شفقت بر ضعفائے امت اور صبر بر مصیبت وغیرہا امور سے کہ لوازم نبوت سے ہیں۔ نہایت مناسبت رکھتا اور تواضع و فروتنی سکھاتا ہے۔ علاوہ بریں جب مرد احسان شناس ایسے حقیر کام سے کسی منصب عمدہ اور عہدۂ جلیلہ پر سرفرازی ہوتا ہے تو اس نعمتِ غیر مترقبہ کو محض فضل اپنے مولا کا سمجھتا ہے اور اس کا شکر بجالاتا ہے۔ (سرور القلوب)

بے مثل بشر کا شق صدر چار سال کی عمر شریف تھی حسب دستور ایک دن سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں بکریاں چرانے میں مشغول تھے کہ دو فرشتے سفید پوش آئے اور حضور کو ایک صاف ستھری جگہ پر لٹایا اور سینہ اقدس چاک کیا پھر قلب منور کا آپریشن کر کے ایک سیاہ نقطہ خون آلود نکال کر پھینک دیا اور کہا ھٰذا حَظُّ الشیطٰن منک یا حبیب اللہ (اے پیارے! یہ جو پھینکا گیا ہے، شیطان کا حصہ تھا۔ اب وہ آپ کی طرف کبھی دست درازی نہ کر سکے گا۔)

اور ایک نعمت، جو ازل سے حضورؐ کے لیے خاص تھی، رکھ کر سی دیا۔ یہ ہے بے مثل بشر کی بے مثلی کہ دنیا میں کوئی بھی ایسی مثال ملنا محال ہے کہ کسی کے قلب کا آپریشن ہو اور وہ زندہ رہ سکے۔ ادھر حلیمہ کے بیٹے نے جونہی حضورؐ کو لٹاتے اور سینہ چاک کرتے ہوئے دیکھا، روتا پیٹتا گھر آیا اور ماں کو خبر دی۔ پھر تو حلیمہ پر جو گزری، کس کی زبان میں طاقت کہ بیان کر سکے۔ نہ سر کے دوپٹے کا ہوش، نہ پاؤں کے جوتے کا خیال۔ وارفتگی کے عالم میں روتی جاتیں اور کہتی جاتیں ہائے محمدؐ کے خدا! اے کعبہ کے مالک! میں نے یہ کیا وحشت انگیز خبر سنی اے خدا اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا منہ لے کر مکہ جاؤں گی۔ اور کس منہ سے یہ خبر سناؤں گی۔ اے خدا تیرے محبوب کی آئی مجھے آئے میرے بچوں کو آئے مگر حضرت عبدالمطلب کی امانت بخیر و عافیت مل جائے۔ یہ فریاد و بکا کرتی جنگل کی طرف دوڑیں۔ قبیلے والوں میں جو بھی سنتا، وہ بھی دوڑتا چلا آتا، کچھ دور چلی تھیں کہ حضور کو مسکراتے ہوئے آتے دیکھا۔ دوڑ کر حلیمہ نے سینے سے چمٹا لیا۔ حضور نے فرمایا: اماں! میں تو اچھا ہوں، آپ پریشان کیوں ہیں۔ وہ تو اللہ کے فرشتے تھے جنہوں نے میرا سینہ چاک کیا تھا۔

مکہ میں واپسی حارث نے کہا: اے حلیمہ! بہتر یہ ہے، اسے مکہ میں چھوڑ آؤ۔ نہ معلوم یہ کیا اسرار ہیں۔ حلیمہ کس دل سے حضورؐ کی جدائی گوارا کرتیں۔

آرزو یہ تھی کہ نکلے دم تمہارے سامنے
ہم تمہارے سامنے ہوں، تم ہمارے سامنے

مگر مرضیٔ خدا کہ

طائف سے چلے نگارِ کعبہ
کعبہ میں رہے بہارِ کعبہ

مجبور ولاچار حلیمہ، اپنے پیارے رسیع ہم گنہگاروں کے شفیع کو بادل بریاں و دیدۂ گریاں لے کر چلیں، عبد اللہ اپنے بھائی رضاعی کو گلے لگا کر رخصت کر رہے ہیں شیما پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ کبھی گود میں لے کر پیار کرتی اور اس طرح کہتی اے بھائی ابتاؤ تو اب اس گھر میں مجھے سکون کس طرح آئے گا، تم اس گھر کو اندھیرا کر چلے۔ یہ تمہاری لونڈی شیما کس کو لوریاں دے کر سلائے گی اور کس کے جاگنے کے انتظار میں صبح تک تارے گنے گی۔ اب نسیم سحر کس کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے طائف کے چکر لگائے گی۔ اب طائف کے پیر و جوان کس کے دستِ شفاء کی طلب میں بیمار رہنے کی التجائیں کریں گے۔ بنی سعد کے بیمار بچے کس کے قدم پر لوٹیں گے۔ اب طائف کے یتیموں پر دست شفقت کون رکھے گا۔ اے ماں سے زیادہ شفیق اور باپ سے بڑھ کر مہربان بتائیے تو ہمیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہیں۔ نہ صرف قبیلہ بنی سعد کے بچے بوڑھے مرد و عورتیں تحفۂ اشک رواں کی صورت میں پیش کر رہے ہیں، بلکہ بنی ہوازن کے جانور بھی قدوم مبارک پر سر رکھ کر جان بہار کو رخصتی سلام کر رہے ہیں۔ ہاں حلیمہ کا قلب کچھ مطمئن ہے کہ مجھے ابھی چند دن خدمت و قرب کا موقع حاصل ہے۔ اس امانت عبد المطلب کو لے کر مکہ کی طرف چلیں ہر مقام پر قیام، ہر منزل پر مقام کرتی وادی بطحا تک آئیں۔ یہاں غیب سے ایک آواز سنی۔ کوئی کہنے والا کہتا ہے۔ اب خیر و برکت بنی سعد سے جاتی ہے اور اسے وادیِ بطحا مبارک ہو کہ تجھ میں خوشی و زینت دوبارہ آتی ہے۔ اے حطیم مبارک ہو کہ آج آفتاب جود و سخا تجھ میں تشریف لاتا ہے۔ حلیمہ حضورؐ کو حطیم میں بٹھا کر گوبیدہ کی تلاش میں نکلیں مگر کہنے والے کا دور تک پتا نہ چلا۔ واپس آئیں تو حضورؐ حطیم میں نہ پایا۔ اس وقت حلیمہ کی جو حالت ہوئی، کس کی زبان میں یارا ہے جو اس کا عشر عشیر بھی بیان کر سکے رنگ زرد، لب پہ آہِ سرد، دل سے دفورِ بے تابی پیدا، چہرے سے پریشانی ہویدا، افتاں و خیزاں ہر طرف جاتیں اور کہیں اس یوسفِ مصر نبوت کا پتہ نہ پاتی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک بوڑھا ملا۔ اس نے حلیمہ کا حال پُر ملال سنا، تو کہا اس کی کچھ نشانیاں بتاؤ، تو تلاش کیا جائے۔ آپ نے بتایا اے بزرگ صورت میں اس کی کیا نشانی بتاؤں میں نے اس کی سی آنکھ کسی کی نہ دیکھی، میں نے اس کی سی بینی (ناک) کسی کی نہ پائی، اس کا سا چہرہ آج تک دیکھا نہ سنا۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ سورج اس کے جمال کو کبھی نہ دیکھ سکا۔ جب سورج نکلا ابر نے اس پر سایہ کر لیا۔ چاند اس کے تلووں کے مقابل شرما جاتا۔ اس بوڑھے نے کہا۔ اے حلیمہ چل، میں تجھے ہبل کے پاس لے چلتا ہوں۔ وہ بت غیب کی خبریں دیتا ہے حلیمہ اس کے ساتھ ہو لیں۔ انہیں کیا خبر کہ جس صاحب دولت کا پتہ لگانے ہبل کے پاس جا رہی ہوں، وہ بت شکنی کے لیے رونق افروز ہوئے ہیں۔ اس پیر مرد نے بت کو سجدہ کیا اور کہا۔ اے خداوند عرب! یہ حلیمہ مسافرہ تیری پناہ میں آئی ہے۔ اس کا بیٹا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے ملک میں گم ہو گیا۔ یہ سن کر ہبل اور تمام بت سرنگوں گر پڑے اور ان سے آواز آئی کہ اے شخص کس کا نام لیتا ہے۔ کیوں ہمارے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے جس کا نام سنتے ہی ہمارے چیلے اور فتنے خاک میں مل گئے پیر مرد نے یہ واقعہ عجیب و غریب دیکھ کر کہا۔ مبارک ہو وہ لڑکا ہرگز ہرگز گم نہ ہو گا۔ بلکہ گمراہوں کو راہ دکھائے گا۔

جب وہاں بھی دُرِ مقصود کا پتہ نہ چلا تو ناچار عبد المطلب کی خدمت میں پہنچیں، عبد المطلب کی نظر جیسے ہی حلیمہ پر پڑی اور اس کی گود گلِ مراد سے خالی دیکھی، بے چین ہو گئے۔ حال دریافت کیا، حلیمہ نے کلیجہ تھام کر حال پُر ملال سنایا

کہ اے سرداروں میں تمہارے فرزند ارجمند کو وادی بطحا تک بخیر و سلامت لائی۔ یہاں اس نامراد کے ہاتھ سے وہ دامنِ دولت چھوٹ گیا۔ حلیمہ ناشاد کا خرمنِ صبر و قرار لٹ گیا۔ عبدالمطلب نے قریش کو حضورؐ کی تلاش میں روانہ کیا اور خود جانب حرم چلے اور اس کی بارگاہ بیکس پناہ میں رو رو کر عرض کرتے لگے۔ الٰہا بادشاہا! اگرچہ میں اس قابل نہیں کہ میری بات تیرے آستانے پر سنی جائے، مگر اس طفلِ ذی شان میں تیری رحمت کے آثار پاتا ہوں اس لیے اسی کو تیری جناب میں شفیع لاتا ہوں کہ اس جان جہاں آرام جاں کو مجھ سے ملا دے۔ عبدالمطلب گریہ وزاری کر رہے تھے کہ ناگاہ ملہمِ غیب نے ندا دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک خدا ہے جو انہیں ضائع نہ چھوڑے گا۔ عبدالمطلب نے عرض کی۔ اے ندا کرنے والے، یہ بتا کہ وہ ہیں کہاں؟ ندا آئی وہ سردار وادی تہامہ میں ایک درخت کے نیچے جلوہ فرما ہیں۔ یہ نوید جانفزا سن کر مجمع قریش جانب تہامہ روانہ ہوا۔ تلاش کیا تو دیکھا کہ ایک ماہ رخسار جن کے چہرے سے جمال ہاشمی کے انوار نمودار ہیں اور سر نیاز جھکائے مراقبہ میں جلوہ آرا ہیں۔ عبدالمطلب نے قریب آکر فرط ادب سے نام نامی پوچھا۔ ارشاد ہوا۔ محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب۔ حضرت عبدالمطلب نے عرض کی میری جان تیرے قربان، میں ہوں تیرا دادا عبدالمطلب۔ پھر اس درِ مقصودؐ کو صدفِ آغوش میں لے کر جانب آمنہؓ چلے اور اس مایۂ قرار کے دیدار سے مادرِ غمگین کے دل کو تسکین دی۔

کنول پھولے دلوں کے کھل گئے اُمید کے غنچے
تیرا آنا بہارِ جاں فزا ہے باغِ عالم کو

پھر عبدالمطلب نے حلیمہ کو باخلعت و لباس کچھ زر و مال دے کر رخصت کیا۔

والدہ ماجدہ کی آغوشِ شفقت سے جُدائی

دنوں کو گزرتے دیر نہیں لگتی حلیمہ کے یہاں سے آئے دو برس ہو چکے ہیں۔ حضورؐ چھوٹے بچوں اور ہم عمر لڑکوں کو درس راست گوئی، دیانتداری، خوش خلقی دیتے اور بری عادتوں اور بری باتوں سے روکتے۔ نہ صرف بچے بلکہ آپ کی پرلطف اور نیک باتوں سے بڑے بھی اثر لیتے۔ مکہ میں مشہور ہو گیا کہ عبداللہ کا یتیم فرزند بغیر کسی تعلیم و تربیت کے کتنا اچھے اٹھان اٹھ رہا ہے۔ آپ جب اپنے والد بزرگوار کا نام سنتے، آنکھیں نم ہو جاتیں۔ ایک دن امی جان کے گلے میں باہیں ڈال کر فرمایا۔ امی ہم نے سنا ہے، ہمارے والد مدینہ گئے، تو واپس نہیں آئے۔ چلیئے ہم آپ ہی چل کر مل آئیں۔ یہ سن کر حضرت آمنہؓ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، مگر ننھے دل کا خیال فرما کر پونچھ ڈالے اور فرمایا، بیٹا اپنے دادا سے اجازت لے لو۔ حضورؐ نے عبدالمطلب سے اجازت لے لی۔ حضرت آمنہؓ، ام ایمن حضورؐ کو لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ حضرت خوشی سے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ بڑی دل کش اداؤں کے ساتھ مدینہ کا سفر طے فرما رہے ہیں مگر ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آج جس باپ کی زیارت کی خاطر اپنی مادرِ مشفقہ کے ساتھ مکہ سے مدینہ کا سفر فرما رہے ہیں، واپسی میں یہ آغوشِ مادر بھی ساتھ نہ ہو گی۔ آج تو والد ماجد کی سرپرستی سے محروم ہیں، کل ماں کی آغوش بھی جدا ہو جائے گی۔ مکہ میں سب ان کو عبداللہ کا یتیم فرزند کہتے ہیں اور مدینہ والے دُرِّ یتیم کہا کریں گے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ حضورؐ مستقبل کے ان مراحل سے ناواقف تھے، ہاں دنیا تو یہی کہے گی۔

مرغ عقل تو عمر کے تقاضے اور صغر سنی کے لحاظ سے اپنی پرواز کو موقوف کر دے گا کہ چھ برس کی عمر میں مستقبل کی فکر کسے ہوتی ہے چہ جائیکہ مستقبل کے مراحل سے باخبر ہونا۔ مگر ایمان و ایقان و عقیدت کی پرواز عقل و دانش ہی کے بل پہ نہیں بلکہ خالقِ کائنات کی قدرت و طاقت کے بھروسہ پہ ہے اس لیے ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضورؐ کو مستقبل کے تمام مراحل کی خبر تھی۔ آپؐ خدا کے عطا کردہ علم سے سب کچھ جانتے تھے کہ ایک دن وہ آنے والا ہے کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ بسانا ہے۔ یثرب کو مدینہ اور وہاں کی بادِ سموم کو بادِ بہار اور وادیٔ یثرب کو گلشنِ طیبہ بنانا ہے۔ والد ماجد تو اسی سرزمین کو ہمیشہ کا مسکن بنا چکے، امی جان بھی اس خطہ میں بس جائیں گی، جو ہمارا دائمی ابدی وطن بننے والا ہے اور خالق کی مرضی بھی ہے۔ اسی لیے باسرار مادر مشفقہ کو جانب مدینہ لے چلے۔ غرض مدینہ پہنچ کر اپنی ننھیال میں قیام کیا اور والد ماجد کی قبر پہ والدہ کے ہمراہ گئے۔ بڑی دیر تک خمیدہ سر چشم بند استادہ رہے۔ ایک دن حضورؐ کچھ بچوں کے ہمراہ قریب کے تالاب جس کو چاہ بنی عدی کہتے ہیں تشریف لے گئے اور اس میں غسل فرمایا اور تیرنے کی مشق فرمانے لگے۔ کہ کچھ یہودی اس طرف سے گزرے۔ اس وقت دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوت مثلِ آفتاب روشن تھی۔ ایک نے اپنے ہمراہیوں سے کہا، یہ نبی آخر الزماں ہونے کی نشانی ہے (معارج و مدارج)۔ ام ایمن ساتھ تھیں۔ انہوں نے یہ واقعہ حضورؐ کی والدہ کو سنایا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد یہ تین نفوس پر مشتمل مبارک قافلہ مدینے سے مکہ معظمہ کی طرف چلا۔ واپسی میں جب مقام ابوا میں قیام فرمایا، تو جو مرضی رب تھی، پوری ہوئی اور خوش خصلت حضرت آمنہؓ نے اپنے جگر پارے کو ام ایمن کے سپرد کر کے داعی اجل کو لبیک کہا اور یتیمانِ امت کی ڈھارس بندھانے کے لیے اپنے فرزند ارجمند کو دُرِ یتیم کا خطاب دے کر ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہوئیں۔ کوئی اس وقت حضور کے دل سے پوچھے کہ والد کی قبر شریف کی زیارت کو تشریف لائے تھے اور اب والدہ ماجدہ کو دفن فرما کر لوٹ رہے ہیں چھ سال کی عمر ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے حاصل کی جا سکتی ہے، مگر آغوش مادر اور شفقتِ پدری اٹھ جانے کے بعد کسی قیمت پہ واپس نہیں مل سکتی۔ جو ذات دوسرے کی تکلیف نہ دیکھ سکے، اگر کسی کے کانٹا چبھے، تو وہ بے چین ہو جائے اگر کسی کا سر دکھے، تو ان کا دل دکھ جائے، کسی کو اذیت پہنچے تو یہ تڑپ اٹھیں، مگر آج اس غریب الوطنی کے عالم میں کوئی ڈھارس بندھانے والا نہیں۔ نہ عبدالمطلب ہیں، جو سر پہ ہاتھ رکھ سکیں۔ نہ رضاعی باپ حارث ہیں، جو تسکین قلب فرما سکیں۔ نہ حلیمہ موجود ہیں کہ کلیجہ سے چمٹا کر تسلی دیں۔ نہ شیما سے قربت ہے، جو اپنے آنچل سے آپ کے آنسو خشک کر سکے صرف ام ایمن والدین کی کنیز تجہیز و تکفین میں مشغول ہے اور کبھی حسرت بھری نظروں سے اس معصوم کو دیکھتی اور آنسو بہاتی ہے شاید کوتاہ بین ان حادثات کو قدرت کی ستم ظریفی پر محمول کریں، مگر حقیقت میں یہاں معاملہ ہی برعکس ہے یہ رحمت عالم ہیں رحمت کا یہی تقاضا تھا جو ہو رہا تھا۔ شاید روزِ ازل ہی سے محب و محبوب، طالب و مطلوب میں عہد و پیمان ہو چکا تھا کہ اے محبوب ہم تمہیں یتیم ہی نہیں بلکہ دُرِ یتیم بنا کر مبعوث فرمائیں گے۔ تاکہ تمہاری ذات یتیموں کے لیے باعث تسکین اور مصیبت زدوں کی تشفی کا موجب ہو اور اے محبوب ہم تمہیں بین الاقوامی حیثیت سے سرفراز فرمائیں گے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں آپؐ کو تعلیم و تربیت دینے والا کوئی نہ ہو اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم ہمارے سوا کسی اور کی تعظیم کرو۔ بس دنیا

تمہاری تعظیم کرے اور تم کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہ کرو۔

عبدالمطلب کی کفالت

زندگی تکلیف و راحت میں با عیش و آرام میں ہر طرح بسر ہو ہی جاتی ہے مگر اس عمر میں والدین کی مفارقت بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے، ہر ہر قدم پر یہ احساس قلب کو مجروح کرتا رہتا ہے کہ اس قدر والد حیات ہوتے تو یہ دشواریاں آسانی سے بدل جاتیں۔ اگر والدہ حیات ہوتیں تو میلے کپڑے دھو کر یا پھٹے کو سی کر پہنا دیتیں اگر ماں ہوتیں تو اپنے امکان بھر بھوکا نہ سونے دیتیں مجبوری تسلی و تشفی دے کر ماں کی آغوش میں سکون سے سلا دیتیں۔ دنیا جس طرح یتیموں کو حقیر نظر سے دیکھتی ہے اور عرب کی تہذیب، جس میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل تفریح میں داخل تھی۔ بھلا حضور کے قلب پر کیا گزرتی ہوگی، مگر رحمت عالم ہو کر آنے والی ذات کے لیے ضروری تھا کہ یہ سب تکلیفیں اٹھائے اور ہنسی خوشی برداشت کرے تاکہ جب کوئی بشر ان مراحل سے دوچار ہو، تو اس کے لیے ان کے حالاتِ زندگی باعثِ تسکین ہوں۔ کہ مدنی تاجدار، سرکار ابد قرار رحمۃ للعلمین نے بھی یہ مصیبتیں برداشت کی ہیں۔ اور تکلیفات اٹھائی ہیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو دوسرے کی تکلیف و مصیبت اس کے لیے سکون قلب کا سبب بن جاتی ہے کہ فلاں پر بھی ایسا وقت گزر چکا ہے اور اس نے ہنسی خوشی وہ وقت گزار دیا تھا۔ اللہ اکبر! حضور کے والد ماجد ولادت سے پہلے ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔ ولادت کے چند روز بعد ہی والدہ کی آغوش سے دور غریب الوطنی کی حالت میں حلیمہ کے ہاں چار سال گزارتے ہیں۔ اگر اس دوران والدہ مشفقہ دنیا سے رخصت ہو جاتیں تو اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا۔ مگر قدرت چار سال کی عمر میں ماں کی آغوش پھر عطا فرماتی ہے۔ جب آپ رضاعی ماں کی آغوش سے مادرِ حقیقی کی آغوش کا لطف پا کر رضاعت و حقیقت کے فرق سے روشناس ہو جاتے اور مانوس ہو جاتے ہیں تو دو سال بعد اسے بھی چھین لیا جاتا ہے، وہ بھی غریب الوطنی کی حالت میں۔ ہم جب ان مراحل پر نظر ڈالتے ہیں، دل ابل آتا ہے، چشم پرنم ہو جاتی ہے، جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے مگر قدرت مسکراتی ہے اور غیب سے ندا آتی ہے۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ اے محبوب! تم کیوں رنجیدہ ہوتے ہو، نہ تمہارے چاہنے والے دل ملول ہوں۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس میں کیا راز ہے۔ ہم بتاتے ہیں کہ تمہاری ہر آنے والی ساعت پچھلی ساعت سے بہتر و افضل و اعلیٰ ہے اس کا اظہار عبدالمطلب کی محبت و شفقت سے ہوا۔ ام ایمن کو تاکید شدید تھی کہ میرے درِ یتیم کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے تمہاری شفقت ماں کی آغوش کو بھلا دے۔ اگرچہ عبدالمطلب خود بھی حضور کی دلجوئی اور دلنوازی کا خیال رکھتے۔ اکثر خواہشات مرغوبات کے متعلق دریافت فرماتے رہتے۔ پھر بھی مکہ کی سرداری جس کی وجہ سے ساری قوم کی ذمہ داریاں آپ ہی کے سر تھیں، ہمہ وقت حضور کی پرورش پر صرف نہ کر سکتے تھے۔ تاہم حضور کو سکون حاصل تھا کوئی حضور کی طرف غلط نظر سے نہ دیکھ سکتا تھا نہ زبانِ طعن دراز کر سکتا تھا۔

عبدالمطلب بھی رخصت ہوتے ہیں

ابھی دو ہی سال گزرے تھے، ابھی والدہ ماجدہ کی جدائی کا غم نہ بھولا تھا کہ عبدالمطلب کی سرپرستی سے بھی جدائی کا سامان مہیا ہو گیا۔ عبدالمطلب مرض الموت میں بستر علالت

پرورانڈ ہیں۔ جب زندگی سے مایوس ہو گئے تو ایک دن اپنے تمام بیٹوں کو بلا کر فرمایا۔ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا۔ حضورؐ کے سراقدس پر اپنا دست شفقت رکھ کر کہا۔ مجھے ان آخری لمحات میں ان کے سوا کسی کی نہ فکر ہے نہ غم۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد اس بے مادر و پدر پر کیا گزرے نہ اس کا کوئی محافظ و نگہبان ہے، نہ مربی و کفیل۔ میں اس دریتیم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ امکان بھر آرام دیتا، دلجوئی کرتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے کوئی اس دریتیم کی پرورش کا عہد کرے اور اس کی کفالت اپنے ذمے لے تاکہ میں باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہوں۔ یہ سن کر ابولہب کھڑا ہوا اور کہا کہ اے رئیس عرب! آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہم سب ان کی خدمت کے واسطے موجود ہیں اور اگر آپ چاہیں تو مجھے دے دیں۔ میں ان کی پرورش دل وجان سے کروں گا۔

عبدالمطلب نے فرمایا اگرچہ تو مالدار ہے، تو پرورش کر سکتا ہے مگر تو بہت سفاک و بے رحم ہے یتیم خستہ دل ہوتے ہیں۔ ان کے قلب ادنیٰ دل آزاری کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ سن کر امیر حمزہؓ اٹھے اور حضور کو اپنی کفالت میں لینے کی درخواست کی۔

عبدالمطلب نے جواب دیا، تم بے اولاد ہو اور بے اولاد دوسرے کی اولاد کی تربیت کی قابلیت نہیں رکھتا دوسرے تم شکار کے عادی اور سیاحانہ زندگی بسر کرتے ہو۔ اس لیے تمہاری غفلت قابل گرفت نہ ہوگی مگر میرے جگر پارے کو تمہاری غفلت سے جو تکلیف ہوگی، وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

اب حضرت عباسؓ نے گزارش کی کہ میں آپ کے منظور نظر کو سر آنکھوں پر رکھوں گا اور کبھی غفلت نہ برتوں گا۔

عبدالمطلب نے کہا اے عباسؓ! میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، وہ پورا کرو گے۔ مگر تم کثیر العیال ہو اور غریب ہو۔ کس طرح ان کی خواہشات کا احترام کر سکو گے۔

اب ابوطالب کھڑے ہوئے اور عرض کی میں ان کی خدمت سے شرفیاب ہونے کی آرزو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مگر بہ سبب ادب پہلے عرض نہ کر سکا۔ اگرچہ میں مالدار تو نہیں مگر یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ان کی دلجوئی و دل نوازی میں کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ پہلے انہیں کھلاؤں گا، پہلے انہیں پہناؤں گا، پھر اپنے بچوں کو۔ ہر وقت ساتھ رکھوں گا۔ ان کی خدمت سے کبھی غافل نہیں ہوں گا۔

عبدالمطلب کچھ دیر خاموش رہے اور فرمایا تمہاری ہر ہر بات سے صداقت ٹپک رہی ہے اور میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے جگر پارے کی طرف سے محبت کے چشمے چھلکتے دیکھے ہیں مجھے یقین ہے کہ تم اپنا عہد پورا کرو گے مگر میں اس کا فیصلہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے سپرد کرتا ہوں۔ اے بیٹا! میں چاہتا ہوں، یہ تمہارے چاروں چچا اس وقت موجود ہیں تم جس کو پسند کرتے ہو، اس سے آگاہ کر دو۔ تمہاری مرضی پر میرا فیصلہ ہوگا۔ حضورؐ اٹھے اور ابوطالب کی گود میں جا بیٹھے۔ عبدالمطلب نے کہا، جسے میں چاہتا تھا، تم نے بھی اسی کو پسند کیا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔

ابوطالب کی سرپرستی

آٹھ سال کی عمر شریف میں غموں کا انبوہ اور دوسری میت کی تجہیز و تکفین۔ جنازے کے ہمراہ جاتے ہیں اور فرط محبت سے اشک بہاتے ہیں۔ دیکھنے والوں کے دل رو رہے ہیں۔ ہر زبان پر عبداللہ کے یتیم فرزند کا چرچا ہے۔ مگر قدرت مسکرا کر وَلَلْآخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی کا پرکیف نغمہ سناتی ہے اور مستقبل کی ہر آن، اس وجد آفریں ترانہ کو سن کر جھوم جاتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ابوطالب نے جو عہد کیا تھا، بحسن و خوبی انجام دیا اور زندگی بھر اپنے اہل و عیال اور جان و مال سے زیادہ عزیز رکھا۔ قدرت کو جو منظور ہوتا ہے، وہی ہو کر رہتا ہے۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد مکے کی سرداری پھر بنو امیہ کے خاندان کی طرف منتقل ہو گئی اور دنیوی اقتدار خاندان بنو ہاشم سے چھن گیا۔ صرف منصب سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا حضرت عباسؓ کے ہاتھ رہا۔ خاندان بنی ہاشم سے دنیاوی اقتدار چھن جانے سے ان کی معاشی حالت پر بھی کافی اثر پڑا۔ ابوطالب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اب صرف تجارت ہی ذریعہ معاش تھا۔ ابوطالب نے تجارت کی طرف توجہ دی مگر حسب وعدہ حضور کی طرف سے غافل نہ ہوئے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے، ساتھ کھلاتے، پاس سلاتے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے مقابل اپنے بچوں تک کی پروا نہیں کرتے۔ حضورؐ بھی کافی مانوس ہو گئے مگر کمال استغنیٰ کہ کبھی بچوں کا سا نہ ضدیں اور فرمائشیں نہ کیں۔ معمولی کپڑے کو بھی اس طرح خوشی خوشی قبول فرماتے، جیسے دلی تمنا پوری ہو گئی ہو۔ غیر مرغوب غذا ایسے تناول فرماتے، گویا سب سے زیادہ یہی مرغوب ہے۔ ابوطالب کے قلب میں حضورؐ کی ان اداؤں نے عشق پیدا کر دیا تھا۔ حضورؐ نے محسوس فرمایا کہ ہمارے چچا معاشی مشکلات سے دوچار ہیں تو آپ نے بغیر کسی کے کہے بکریاں چرانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ابوطالب نے ہر چند منع کیا مگر آپ نے فرمایا بکریاں چرانے سے میرے ذوق کو تسکین ہوتی ہے اور پھر بکریاں بھی اپنی ہی ہیں۔ اس لیے شرم و عار کا کوئی سوال نہیں۔ غالباً اس وقت دس سال کی عمر شریف ہو گی۔ یہی وہ وقت ہے، جب دوبارہ شق صدر ہوا۔

حضورؐ کے اشارے پر پانی برسنا

ابن عساکر جہلمہ بن عرفطہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ اہل مکہ سخت قحط میں مبتلا تھے میں وہاں موجود تھا۔ لوگوں کو فکر و تشویش ہوئی۔ ایک نے مشورہ دیا کہ لات و عزیٰ کے پاس چلو۔ دوسرا بولا منات کے پاس چلو۔ غرض سب کے سب اس کام کے لیے تین سو ساٹھ خداؤں میں ایک کا انتخاب کرنے لگے اور ہر شخص اپنے قبیلہ کے خدا کا نام لیتا۔ مگر ایک خوبرو صائب الرائے بوڑھے نے کہا کہاں الٹے جا رہے ہو، جب کہ ہم میں اولاد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ موجود ہے۔ غرض سب لوگ ابوطالب کے پاس آئے اور پانی برسانے کے لیے دعا کے طالب ہوئے۔ ابوطالب کے ساتھ حضورؐ بھی تھے۔ کعبہ میں پہنچ کر حضورؐ کو گود میں لیا، کعبہ سے پشت لگائی اور حضورؐ کے چاند سے رخساروں کے وسیلے سے دعا کی۔ حضور نے ابوطالب کو دیکھا۔ پھر اپنی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت آسمان پہ بادل کا کوئی ٹکڑا نہ تھا مگر اشارہ کرنا تھا کہ چاروں طرف سے بادل آنے لگے۔ پانی برسا اور خوب برسا۔

بعثت کے بعد جب کفار نے حضور کو ایذائیں دینا شروع کیں، تب ابوطالب نے ایک قصیدہ لکھا، جو سیرت ابن ہشام میں نقل ہے۔ اس میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ
ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

(ا ورگورے رنگ والے جن کے وسیلے سے نزولِ باراں طلب کیا جاتا ہے، یتیموں کے ملجا، بیواؤں اور درویشوں کے نگہبان ۔)

پہلا ملک شام کا سفر ۱۲ سال کی عمر میں حضور نے ابوطالب کے ساتھ ملک شام کا سفر کیا۔ بضرورت شدید ابوطالب نے تجارت کے قافلہ کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔ تکلیفاتِ سفر کی وجہ سے حضورؐ کو ساتھ لے جانا مناسب نہ جانا مگر آپ نے اصرار کیا اور ابوطالب نے دل شکنی گوارا نہ کی، ساتھ لے لیا۔ حضورؐ جس کام سے دنیا میں تشریف لائے تھے، وہ بین الاقوامی تھا، اس لیے دور دراز ممالک کا سفر اور وہاں کی معاشرتی، اخلاقی، مذہبی حالات کا خود جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ اس کے لیے تجارت ہی بہتر اور آسان ذریعہ ہو سکتا تھا۔ جب یہ قافلہ بصریٰ میں پہنچا، تو ایک عیسائی راہب بحیرا نامی نے حضورؐ کو پہچان لیا اور قوم کو بتایا کہ اس قافلہ میں نبی آخر الزماں بھی ہیں۔ یہ خبر قریش تک پہنچی، وہ بحیرا کے پاس گئے اور نشانیاں دریافت کیں۔ اس نے کہا کیا تم میں محمدؐ نامی کوئی بچہ تو نہیں۔ انہوں نے کہا ہے اس نے کہا، کیا ان کے دونوں شانوں کے درمیان سیب کے مانند ابھرا ہوا گوشت نہیں، جو مثل چاند کے چمکتا ہے انہوں نے کہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہی نشانی ہے میں نے تم لوگوں کو گھاٹی سے اترتے دیکھا۔ تو تمام درخت سجدہ کر رہے تھے۔ درخت سوائے نبی کے کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے (ترمذی) اس روایت میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک شام کے دوسرے سفر میں یہ واقعہ پیش آیا۔

حرب فجار میں شرکت ایامِ جہالت کی جنگ خاندان کو تباہ کر دیتی تھی اور سات سات پشت تک چلا کرتی تھی۔ حرب فجار ایامِ جہالت کی آخری جنگ تھی۔ یہ لڑائی خاندان قریش اور قبیلہ قیس میں ہوئی تھی، جس میں قریش کے سب خاندان شریک تھے۔ خاندان بنی ہاشم کا علَم زبیر بن عبد المطلب کے ہاتھ میں تھا اور قریش حق پر تھے۔ اس لیے حضور کو شریک ہونا پڑا۔ اس وقت حضورؐ کی عمر شریف ۱۴ سال کی تھی سخت خونریزی کے بعد قریش غالب آئے۔ بالآخر حضورؐ کے طفیل صلح پر خاتمہ ہوا۔ مگر حضور نے تلوار ہاتھ میں لینے سے یہ کہہ کر انکار فرما دیا تھا کہ یہ ماہِ حرام ہے۔ اس ماہ قتل و خونریزی منع ہے اور اس چیز نے اہلِ مکہ کو صلح پر آمادہ کیا۔ کیونکہ ایامِ جہالت میں اہلِ عرب ماہ حرام میں جنگ کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔

مبارک عہد اس جنگ نے بعض طبیعتوں کو اصلاح کی طرف راغب کر دیا تھا۔ چنانچہ جنگ فجار کے فوراً بعد زبیر بن عبد المطلب نے یہ تجویز پیش کی کہ مکہ کے تمام باشندے ایک معاہدہ کریں کہ ہم میں کا ہر شخص مظلوم کی حمایت

کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ اگرچہ اس قسم کا معاہدہ حضورؐ کی ولادت سے قبل بھی مکہ میں ہوا تھا جس کو حلف الفضول کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اب یہ معاہدہ رحمۃ للعالمینؐ کے زیر سایہ ہوا تھا، اس لیے کامیاب ہوا۔ حضور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ اس معاہدے میں میں شریک تھا کہ جس کی شرکت سے روکنے کے لیے سرخ اونٹ بھی دیئے جاتے تو قبول نہ کرتا اور آج بھی کوئی مظلوم اس قسم کے عہد کے لیے پکارے، تو میں حاضر ہوں۔

شادی کے سلسلہ میں عرب دو راستوں پر گامزن تھا۔ اولاً تو یہ کہ شادی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ اکثر باپ کے ترکہ میں مال و دولت بیویاں بھی مل جاتیں اور ماؤں کو بیوی بنا لیتے یا جب کسی ایسے شخص کا انتقال ہوتا جس کا کوئی لڑکا نہ ہوتا، تو قریبی رشتہ داروں میں سے جو بھی جس عورت پر پہلے قبضہ جما لیتا، وہ اس کی ہو جاتی۔ لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی دفن کر دی جاتیں، مگر جو کسی وجہ سے بچ جاتیں اور جوان ہو جاتیں، تو ان کا بھی باپ کے مرنے کے بعد یہی حال ہوتا۔ دوسری صورت میں اگر شادی کرنا پڑتی تو اتنی رقم خرچ ہوتی کہ بڑے بڑے مالدار بھی برداشت نہ کر پاتے تھے۔

قافلہ تجارت کے ساتھ ملک شام کا دوسرا سفر

جب حضورؐ کی عمر شریف تقریباً ۲۴ سال کی ہوگی کہ ایک دن آپؐ کے چچا نے حضورؐ کے سر مبارک پر دست شفقت رکھ کر فرمایا۔ بیٹا! میں سمجھتا ہوں کہ تم برابر میرا ہر کام میں ہاتھ بٹا رہے ہو۔ جب کوئی کام نہیں ہوتا ہے، تو بکریاں چراتے ہو اور خالی نہیں بیٹھتے۔ پھر بھی آج یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اب بحمداللہ تم جوان ہو۔ گو عرب میں شادیاں بہت عمر میں ہوتی ہیں، مگر میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی جلد کر دوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ شادی میں کتنی رقم کی ضرورت ہوگی اور میں بالکل مفلس ہوں بلکہ کافی قرض دار ہوں۔ قحط کی تیز دھوپ نے امیدوں کے درختوں کو جلا دیا ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا۔ اے چچا جان! آپ ہراساں نہ ہوں۔ میرے لیے جو حکم ہو، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ابو طالب نے کہا۔ آج کل خدیجہ کا کاروبار عروج پر ہے اور اس وقت اسے ایک دیانتدار اجیر کی ضرورت ہے۔ اگر تم چلے جاؤ تو دوسروں کے مقابل وہ تمہیں ترجیح دے گی۔ حضورؐ نے فرمایا اے چچا جان، مجھے اس کام میں کوئی عذر نہیں۔ مگر میں خود جا کر خدیجہ سے درخواست کروں، یہ میری خاندانی وجاہت کے خلاف ہے۔ بات معقول تھی ابو طالب خاموش ہو گئے، قدرت کا منشا ہی کچھ اور تھا۔ اس گفتگو کو کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن حضرت عاتکہ تشریف لائیں اور ابو طالب سے فرمایا کہ ہمارے بھائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بفضلِ خدا اب جوان ہیں۔ کہیں شادی کی فکر کیوں نہیں کرتے؟ ابو طالب نے کہا مجھے بھی فکر ہے مگر قحط کی تیز دھوپ نے امیدوں کے درختوں کو جلا دیا ہے اور اس وقت میں کافی مقروض بھی ہوں۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا اس وقت بی بی خدیجہ کا کاروبار بڑے زوروں پر ہے اور اسے ایک شخص کی ضرورت بھی ہے اگر آپ کہیں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے اس سے کہوں۔ ابو طالب نے کہا میں خود یہی چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھیج دیا۔ حضرت عاتکہ فوراً بی بی خدیجہ کے دولت کدہ کی طرف چل دیتی ہیں۔

حضرت بی بی خدیجہؓ کے مختصر حالات زندگی

خویلد عرب بھر میں بڑے مالدار ملک التجار تھے حضرت خدیجہؓ

ان کی اکلوتی بیٹی تھیں، آپ کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے آپ کی ماں کا نام فاطمہ بن زائدہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عرب بھر کا حسن حضرت خدیجہؓ کی ایک ذات میں جمع فرما دیا تھا علم و ہنر نے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ ایسی پاک طینت اور پاکدامنہ تھیں کہ لوگ ایام جہالت میں بھی آپ کو سیدہ طاہرہ کے خطاب سے پکارتے تھے۔ اور آپ کی پاکدامنی اور حیا کی مثال پیش کرتے تھے۔ آپ کی پہلی شادی بناش ابن زرارہ تمیمی کے ساتھ ہوئی اور اس سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہندا اور دوسرے کا ہالہ تھا۔ اس لیے بناش کا خطاب ابوہالہ ہو گیا۔ ہالہ کا انتقال ایام جہالت میں ہو گیا۔ اور ہندا حضورؐ پر ایمان لائے اور صحابہ میں داخل ہوئے، حضورؐ کا حلیہ مبارک انہیں سے منقول ہے۔ نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔

ابوہالہ بناش کے انتقال کے بعد آپ کا دوسرا نکاح عتیق ابن عابد مخزومی کے ساتھ ہوا اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام ہند تھا۔ یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ مگر ان سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ کچھ دنوں بعد عتیق کا بھی انتقال ہوا۔ دوسرے شوہر سے حضرت خدیجہؓ کو بہت محبت تھی اس کے انتقال پر حضرت خدیجہؓ کو عظیم صدمہ پہنچا۔ آپ کے لیے اب دنیا میں کوئی کشش باقی نہ تھی۔ لہٰذا آپ دنیا سے بیزار ہو کر خانہ کعبہ میں اپنی زندگی گزارنے لگیں، وہ عرب جہاں بیوگی موت سے بدتر ثابت ہوئی ہے، یا تو وہ بیوہ مال غنیمت کی طرح دوسرے کی ملکیت میں چلی جائے اور زرخرید کنیزوں سے بھی زیادہ حقیر رہ کر زندگی گزارتی یا پورے ایک سال کی عدت اس طرح پوری کرتی کہ پیاس بھر سے زائد پانی نہ ملتا، غسل تو غسل ہاتھ منہ دھونے اور استنجا پاک کرنے تک کو پانی نہ دیا جاتا، جو کپڑے جسم پر ہوتے ان کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ دیا جاتا، غرض وہ جب عدت کی موت سے بچ جاتی، تو کہیں دوسرے سے شادی کرنے کے لائق ہوتی۔ مگر اب دوسری شادی ہونا اس سے زیادہ اہم کام ہوگا۔ بخلاف اس کے حضرت خدیجہ اپنی عدت کے دن کعبہ معظمہ کے طواف اور عبادت خدا میں گزارتیں۔ آپ کو دوسری شادی کرنے کا خیال نہیں تھا۔ اس لیے کسی قانون کی پابندی ضروری نہ سمجھی۔ عدت کے دن گزرتے اور بڑے بڑے مالدار نوجوانوں کے پیغامات آنا شروع ہو جاتے۔ یہی دوسرے شوہر کے انتقال پر بھی ہوا، مگر اب آپ نے صاف صاف انکار کر دیا اور باقی زندگی کاہنہ اور عبادت گزار عورتوں کی صحبت میں گزار دینے کا عزم صمیم کر لیا۔ اکثر ان کاہنہ عورتوں سے آنے والے حالات پر گفتگو کرتی رہتیں جس سے آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ عرب میں ایک ذات ایسی بھی ہوگی، جو نبوت کا اعلان کرے گی اور ان کا دین تمام ادیان سابقہ پر غالب آئے گا۔

ایک دن خویلد نے حضرت خدیجہ کو بلا کر کہا۔ اے بیٹی! اب میں بوڑھا ہو چکا، تجارت کا بار اب مجھ سے نہیں اٹھتا کوئی بیٹا نہیں جس کے سپرد یہ کام کیا جائے۔ لے دے کر صرف تم ہو۔ تو تم نے بھی دنیا سے بیزاری کا اظہار کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے، بتاؤ میں کیا کروں؟

بی بی خدیجہؓ نے جواب دیا۔ اے والد بزرگوار آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کام کو میں اپنے ذمہ لیتی ہوں۔ آپ نے اپنے حسن انتظام سے تجارتی مرکز کو اپنے قبضہ میں لیا اور چند ہی روز میں کئی گنا ترقی پر پہنچا دیا۔ آپ کا قافلہ تجارت مصر عراق، شام تک جاتا جس کا سردار آپ کا غلام میسرہ ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ہوشیار تاجر تھا مگر بی بی خدیجہؓ کو یہ فکر تھی کہ میسرہ ایک غلام ہے۔ قافلہ کے لوگ اس کی سرداری مجبوراً تسلیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی شریف النسب، دیانتدار ہوشیار آدمی مل جائے تو کام اور بڑھ سکتا ہے۔ اس ضرورت کا اعلان کر دیا گیا۔

ایک حسین خواب

جس دن حضرت عاتکہ بی بی خدیجہ کے یہاں پہنچیں، اسی رات بی بی خدیجہ نے ایک حسین خواب دیکھا کہ چاند میری گود میں اتر آیا ہے اور میں نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا ہے۔ صبح کو یہ خواب لکھ کر ایک راہب کے پاس بھیجا۔ اس نے تعبیر میں کہلا بھیجا کہ نبی آخرالزماں جو کہ پیدا ہو چکے ہیں وہ تمہیں اپنے نکاح میں لائیں گے۔ اس دن خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی اور یہ خیال کر رہی تھیں کہ نہ معلوم وہ ذات گرامی کون ہے کہ حضرت عاتکہ پہنچیں۔ بی بی خدیجہ اور تمام خدمت گار تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نہایت ادب سے مسند پر بٹھایا اور دریافت کیا کہ اے سیدہ عرب! آج یہاں آنے کی تکلیف کیونکر گوارا فرمائی۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا۔ اے ملکہ عرب! میں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو ایک آدمی کی ضرورت ہے اور جن خصوصیات کا حامل انسان آپ کو درکار ہے، وہ سب فضائل ایک ذات میں ملنا دشوار ہیں۔ مگر آپ چاہیں تو میں ایک ایسا آدمی آپ کو بتا سکتی ہوں جو آپ کے قافلہ کے ساتھ جانے کو بھی تیار ہے۔

بی بی خدیجہؓ نے بے چینی سے دریافت کیا، وہ کون ہے؟

حضورؐ کی بی بی خدیجہؓ کے قافلے میں شمولیت

آپ نے فرمایا، میرے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ سنتے ہی بی بی خدیجہؓ کی رگوں میں خون جوش مارنے لگا اور آپ کو اپنے خواب کی صداقت کا گمان یقین میں تبدیل ہو گیا اور فرمایا مجھے منظور ہے۔ جو معاوضہ دوسرے کو دیتی ہوں، اس سے دوگنا دوں گی۔ کیا آپ انہیں یہاں بلا سکتی ہیں۔ امور تجارت کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ حضرت عاتکہ نے فرمایا، میں ابھی انہیں اپنے ہمراہ لے کر آتی ہوں۔ یہ کہہ کر آپ چلی آئیں۔

حضرت بی بی خدیجہؓ نے اپنے خدمت گاروں کو بلا کر اپنی نشست گاہ کی صفائی اور سجاوٹ کا حکم دیا۔ اپنی نشستین پر ایک باریک پردہ ڈالا اور ادب سے بیٹھ کر حضورؐ کی تشریف آوری کا انتظار کرنے لگیں۔ ادھر حضرت عاتکہ نے ابوطالب کو خوشخبری سنائی اور حضورؐ کو لے کر دولت کدہ بی بی خدیجہ پر پہنچیں۔ بی بی خدیجہ نے پس پردہ کھڑے ہو کر استقبال کیا مگر حضورؐ کا رعب حسن ان پر ایسا غالب ہوا کہ ایک نظر بھی نہ دیکھ سکیں، گفتگو کرنا تو بڑی بات تھی۔ کچھ دیر بعد حضرت عاتکہ سے فرمایا، میں جو کچھ سمجھانا اور بتانا چاہتی تھی، آپؐ اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ کو لباس سفر پہنا کر جلد بھیج دیجیے، میرا قافلہ تیار ہے۔ ادھر بی بی خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو بلا کر فرمایا۔ اے میسرہ دیکھو! اس سفر میں میر قافلہ بن کر محمد صلی اللہ

علیہ وسلم) جارہے ہیں، تو ان کی اطاعت و فرماں برداری اس طرح کرنا جس طرح میری کرتا ہے۔ اور ایک قصبی خلعت دے کر فرمایا، دیکھ جب یہاں سے قافلہ چلے تو سب سے اگلے سجے ہوئے اونٹ کی مہاران کے دست مبارک میں دے دینا۔ شہر کے آخری پڑاؤ تک وہ اسی طرح جائیں گے۔ اور جب اس پڑاؤ سے قافلہ آگے بڑھے تو یہ خلعت انہیں پہنا کر اسی اونٹ پر بٹھا دینا اور اس کی مہار ساربانوں کی طرح تو خود پکڑ کر ساتھ ساتھ چلنا۔

مکہ سے روانگی میسرہ نے وعدہ کیا اور چلا گیا۔ حضورؐ بھی قافلہ میں پہنچ چکے تھے۔ میسرہ نے سب سے آگے والے اونٹ کی مہار حضورؐ کے دست مبارک میں دے کر آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

شہر کے بہت لوگ اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو رخصت کرنے پڑاؤ پر آئے ہوئے تھے۔ انہیں میں حضرت عاتکہ اور ابو طالب بھی تھے۔ ابو طالب نے حضورؐ کو اونٹ کی مہار پکڑے پیادہ پا دیکھا تو کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ آنکھوں سے اشکوں کا مینہ برسنے لگا۔ اور حضور کو اس مقام پر پہنچانے کا مجرم اپنے آپ کو سمجھنے لگے۔ حضرت عاتکہ سے برداشت نہ ہو سکا اور اس طرح پکار اٹھیں، اے عبدالمطلب ذرا خاک لحد سے سر نکالو اور دیکھو کہ جسے آپ نے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا، زمانہ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے اے آمنہؓ لحد سے باہر آؤ اور دیکھو تمہارا لاڈلا آج کس حال میں ہے۔ وہ جو حلیمہ کی بکریاں لے کر جنگل کو جائے تو فرشتے آ کر جنگل کو صاف کریں، ابر جس کے سر پہ سایہ کرے، وہ جسے چرند پرند سجدے کریں۔ مگر آج وہ پیادہ پا، بطور اجیر ملک شام کا طویل و کٹھن سفر کرنے جا رہا ہے۔

وہ اونٹوں کو مکہ سے لے جانے والا ـــــ پیادہ درِ شہر تک جانے والا
خدیجہ کو جلووں سے تڑپانے والا ـــــ وہ بے باپ، بے ماں گزر کرنے والا

امیں اور امانات عرشی کا حامل
متیں اور حفظ شرافت میں کامل

مہار اونٹ کی ہاتھ میں اپنے لے کر ـــــ چلا جانب شام محبوب داور
فرشتوں نے کی عرض اے رب اکبر ـــــ یہ کس حال میں ہیں جناب پیغمبر

ہوا حکم یہ گر ہے پیغمبری کا
یہ آغاز ہے شیوۂ رہبری کا

محمدؐ ہے انسان و حیواں کا رہبر ـــــ محمدؐ ہے ہر قوم عریاں کا رہبر
محمدؐ ہے گرد بیاباں کا رہبر ـــــ زمانے کا ہادی ہے دوراں کا رہبر

نبوت جلو میں کھڑی کہہ رہی ہے
مہار اس کے ہاتھوں میں کونین کی ہے

دوست دشمن غرض یہ قافلہ شہر سے باہر ایک پڑاؤ پر مقیم ہوا۔ اس قافلہ میں ازلی دوست دشمن سب ہی تھے۔ ندو دستوں

کو یہ خبر تھی کہ کل اس بارگاہِ بیکس پناہ سے کیا اعزاز انہیں ملنے والا ہے، نہ دشمنوں کو اس کا علم تھا ہمیں ان کی بارگاہ سے کیا ذلت وخواری نصیب ہوگی، مگر ازلی عداوت اور ازلی محبت دونوں کارفرما تھیں۔ جب اس پڑاؤ سے قافلہ روانہ ہوا تو میسرہ نے حضرت خدیجہؓ کے حکم کے مطابق وہ قیمتی خلعت حضورؐ کو پہنایا اور اس زر وجواہرات سے سجا ہوا امیر قافلہ اونٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اور اس اونٹ کی مہار ساربانوں کی طرح اپنے کاندھے پر ڈال لی۔ ابوجہل بھی اسی قافلہ میں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر جل گیا دوڑا ہوا آیا اور میسرہ سے کہا۔ اے میسرہ یہ تونے کیا کیا۔ یہ ابھی کم عمر ہیں۔ شاید عمر کا دوسرا سفر ہے انہیں تو موٹے کپڑے پہننے کو دے اور محنت ومشقت سے کام لے، تاکہ تکالیف سفر کا تجربہ ہو۔ میسرہ نے کہا، میں تیرا غلام نہیں، جو تیرے حکم پر عمل کروں مجھے جو میری ملکہ کا حکم ملا ہے، اس کے موافق کر رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

دو تھکے اونٹوں کا دستِ شفا سے کھڑا ہو جانا قافلہ کو ٹھہرے کافی دیر ہو چکی تھی کہ حضورؐ نے میسرہ سے دریافت کیا۔ اے میسرہ! یہ قافلہ کیوں رکا ہوا ہے۔ میسرہ نے جواب دیا کہ درمیان کے دو اونٹ نہ معلوم بیمار ہیں یا تھکے ہوئے ہیں کہ اٹھتے ہی نہیں۔

حضورؐ یہ سن کر اپنے اونٹ سے نیچے تشریف لائے اور ان تھکے ہوئے اونٹوں کے پاس تشریف لے گئے یکے بعد دیگرے دونوں کی پشت پر اپنا دست مبارک پھیر دیا۔ وہ دونوں فوراً کھڑے ہوگئے اور چلنے لگے۔ اب تک میسرہ بی بی خدیجہ کے حکم سے حضورؐ کی خدمت کر رہا تھا، مگر یہ کرشمہ دیکھ کر اس کے قلب میں حضورؐ کی سچی محبت وعظمت پیدا ہو گئی اور اب اس نے دل سے حضورؐ کی خدمت کرنا شروع کر دی۔

نسطورا راہب غرض یہ قافلہ منزل در منزل قیام کرتا بُصریٰ کے پڑاؤ پر اترا۔ بُصریٰ چونکہ پہلا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں زیادہ دنوں قیام کرنا تھا۔ اس لیے قافلہ والوں نے اپنے اونٹوں سے کود کود کر جلدی جلدی درختوں کے سایہ کو گھیرنا شروع کر دیا اور اپنے اپنے بستر لگا کر سامان اتارنے کی فکر میں لگ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے اطمینان سے نیچے تشریف لائے اور دیکھا کہ تمام درختوں کے سائے گھر چکے ہیں۔ صرف ایک طرف ایک خشک درخت کھڑا ہے جس میں ایک پتہ بھی نہیں۔ آپ بلا تکلف اسی طرف چلے اور اس درخت کے نیچے چادر مبارک بچھا کر بیٹھ گئے۔ آپ کا بیٹھنا تھا کہ وہ درخت سرسبز وشاداب ہو کر سایہ کر لیتا ہے۔ اس منظر کو نسطورا راہب جس کی خانقاہ قریب ہی تھی۔ بالاخانے پر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گھر میں گیا اور ایک کتاب لے کر دوڑا ہوا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سامنے کھڑا ہو گیا کبھی اپنی کتاب کی ورق گردانی کرتا اور کبھی کتاب نورؐ پر نظر ڈالتا۔ آخر کار بلند آواز سے پکار اٹھا۔ اے قافلے والو! آنکھوں کے اندھو! تمہیں خبر ہے کہ یہ ذات شریف کون ہیں خدا کی قسم میری کتاب میں صاف لکھا ہے کہ اس درخت کے نیچے کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔ مگر نبی۔ میری کتاب میں جو نشانیاں اس نبی کی لکھی ہیں، وہ سب ان میں موجود ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہ نبی آخرالزماں ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ میں انہیں کے شوق زیارت میں ایک مدت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ الحمد للہ

کہ آج کامیاب ہوا۔ کاش میری عمر عہد نبوت تک وفا کرتی کہ میں بھی آپ کا دین متین اختیار کرتا۔

میسرہ نے شور سن کر نظر اٹھائی تو حضورؐ کے قریب نسطورا راہب کو کھڑا دیکھا۔ گمان ہوا کہ یہ حضور پر کچھ ناراض ہو رہا ہے، میسرہ نے تلوار کھینچی اور خزیمہ کو، جو بی بی خدیجہؓ کے بھانجے تھے، انہیں پیچھے آنے کا اشارا کرکے آگے بڑھ گیا۔ خزیمہ کو بھی یہی گمان ہوا، جو میسرہ کو ہوا تھا۔ انہوں نے بھی تلوار ہاتھ میں لے لی۔ حضورؐ نے جب ان دونوں کو غصہ میں آتے دیکھا تو اشارے سے ضبط کی تلقین فرمائی۔ ان دونوں نے تلواریں نیام میں ڈال لیں اور کان اس کی گفتگو پر لگائے۔ جب بات سمجھ میں آئی کہ یہ تو حضور کی تعریف کر رہا ہے، تو ادب سے دست بستہ ہو کر سننے لگے اس طرف نسطورا کی پشت تھی، جب اس نے اپنا کلام ختم کیا، تو ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ تم دونوں کا ان ذات شریف سے کیا تعلق ہے۔ ان دونوں نے بیک زبان کہا، ہم دونوں حضورؐ کے غلام ہیں۔ نسطورا نے کہا تمہارا قافلہ ملک شام جا رہا ہے۔ وہاں یہودی زیادہ ہیں۔ ان کو بھی نبی آخر الزماں کی ولادت کی خبر مل چکی ہے۔ ان کی کتابوں میں ان کا حلیہ بھی لکھا ہوا ہے۔ جس طرح میں نے انہیں پہچان لیا، اسی طرح وہ بھی پہچان لیں گے۔ یہودیوں کو ان کے عالموں نے یہ بتا کر کہ یہ نبی ہیں، یہودیوں کو فنا کر دینے والے ہیں۔ ان کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ اگر تم میرا کہا مانو، تو ملک شام نہ جاؤ یا انہیں اپنے ہمراہ نہ لے جاؤ۔

بصریٰ کا بازار

میسرہ نے خزیمہ کی طرف اور خزیمہ نے میسرہ کی طرف دیکھا۔ کیونکہ یہ مرحلہ ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے طے ہو سکے۔ اصل مرکز تجارت شام ہی تھا، بغیر وہاں جائے کامیابی ناممکن تھی مگر خزیمہ نے کہا اے میسرہ! سوچتے ہو کیا ہو۔ بی بی خدیجہ راضی ہوں یا ناراض، تم آگے جانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دو۔ میں دیکھ لوں گا۔ یہ سن کر میسرہ نے کہا، اے سردار! ایسا ہی ہو گا، کیونکہ اب میں حضور کو ساتھ لے کر نہ ملک شام جا سکتا ہوں، نہ تنہا چھوڑ سکتا ہوں، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

قدوم مبارک کی برکت

دوسرے دن بصرے کے بازار میں سارے قافلے نے اپنا مال لگایا۔ خدا کی قدرت اور حضور کے قدوم مبارک کی برکت کہ ہر ایک کا مال اسی بازار میں فروخت ہو گیا اور مال بھی زیادہ نفع سے فروخت ہوا۔ اور بی بی خدیجہؓ کے مال میں تو ہر سال گزشتہ سے دس گنا منافع ہوا۔ جب قافلہ کا کل مال فروخت ہو گیا، تو بصریٰ کے بازار سے ان لوگوں نے اناج وغیرہ وہ چیزیں خریدیں، جو مکہ میں لا کر فروخت کی جائیں۔

عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہد آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئیں تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں۔ لیکن بحرِ متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے "وسط الارض" (میدی ترانین) تھا۔ یونان اس سمندر پر آباد ہے، تو روم بھی، مصر و شام بھی اس کے ساحل پر ہیں، تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدودِ مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی مدت کے لیے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ نافِ زمین پر آباد ہے اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکز مشکل سے پا سکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقہ کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو عطا ہوا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطۂ نظر سے بھی اس سے محفوظ مقام کم مل سکتے ہیں۔ ۱۳ ق ھ ۶۱۰ء میں پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاحِ دین کی کوشش شروع فرمائی، اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہلِ ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کٹھن سالوں کے اختتام پر ۱ھ ۶۲۲ء میں آپؐ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینہ منورہ جا رہنا پڑا۔ جیسا کہ معلوم ہے، نراج میں آپ نے ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی، جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے[1]۔ مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپ آس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے۔ چنانچہ مدینے سے ینبع تک جو علاقہ ہے، وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ مُدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے، تو مسلمان ان کو مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے[2]۔ یہ وہی علاقہ ہے، جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش

---

[1] اس پر میرا مضمون "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور" مجلہ طیلسانین حیدر آباد دکن جولائی ۱۹۳۹ء ملاحظہ ہو۔
[2] ان کے متن کے لیے دیکھیے میری عربی تالیف الوثائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انہیں اتنا بے بس نہ کر سکی۔ ۳ھ میں احد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلائیے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گو تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافاتِ مدینہ سے جلاوطنی پر مجبور ہوئے، تو انہوں نے مدینہ کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش و غطفان وغیرہ قبائل کو ورغلانا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنکشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا[۱] جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہو اور انہیں یہودیوں کی کوشش سے غطفان و فزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینے کا محاصرہ کیا اور انتظام کر لیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینے کے اندر کے باقی یہودی یعنی بنی قریظہ بھی غداری کریں جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑی، تو خیبر و تیماء اور وادی القریٰ و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جدوجہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ و غطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے بنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا، یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے[۲] جنوب میں مکہ تھا جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم و غصہ سے بیقرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ ناکامیوں کی خلش الگ تھی۔ آثار یہ نظر آ رہے تھے کہ خیبر میں جا بسے ہوئے (جلاوطنانِ مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہودی غطفان اور قریش سہ گانہ قوت مدینے پر ہلہ بول دے گی۔ جس کی مدافعت آسان نہ تھی، معرکہ خندق میں دس ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینے کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس الائمہ سرخسی نے کتاب المبسوط[۳] میں نہایت بالغ نظری اور تہ بینی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں، تو خیبر و غطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے مواشی

۱۔ التنبیہ والاشراف للمسعودی ص ۲۴۸

۲۔ عُیَینہ بن حصن الفزاری کی تاخت مدینہ کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ جلد ۱۰ ص ۹۶۔

وموال کے ساتھ آکر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بیچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناطرفدار بنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی، تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور اسے پھر سر زوری کی جرأت نہ ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ صلح مکے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شایق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے، جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلاوطنی اور جائیداد کے لٹنے کا داغ تھا۔ جو جائداد کی واپسی کے بغیر مٹ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی "سرمایہ الاحتفاظ" ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جا سکتا تھا شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتاً غیر جنگ جو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مالِ غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت سی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب مکی ہی تھے اور اہلِ مکہ ان کے رشتہ دار۔ کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزلِ مقصود تھا۔ اہلِ مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے اور ان کی صلاحیتیں تمام عرب میں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے پکے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے۔ طبیعت مہمات پسند تھی، ادبی ذوق اور انتظامِ ملک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا اور شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف لاج رکھنے کے لیے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا۔ اور مکے والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی[1]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بندش کا اثر محسوس کرا دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا[2] کر نیز مکے والوں میں سے غربا و فقرا کی امداد کے لیے سرمایہ قحط میں اس زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے[3] وہاں کے عوام کے دل موہ لیے تھے اور مکے کے سب سے بڑے اور باا ثر سردار ابو سفیان کی لڑکی بی بی اُمِ حبیبہؓ سے جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اس زمانے میں عقد غائبانہ کر لیا تھا نیز مختلف سامانِ ضرورت (کھجور وغیرہ) ابو سفیان کو "ہدیہ" بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں[4]۔ غرض باوجود حالتِ جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آ گیا تھا جس میں وہ مسلسل

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صـ ۹۹۷ تا ۹۹۸ ۔ استیعاب ابن عبد البر، سوانح عمری صـ ۲۷۵ ۔

[2] ایضاً ۔

[3] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صـ ۹۱ تا ۹۲ ۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ صـ ۶۹ ۔

[4] مبسوط سرخسی جلد ۱۰ صـ ۹۲ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ صـ ۷۰ ۔

تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابلِ قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں انہیں ملتا تو اس پہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جزو بنا لیا تھا جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی وغیرہ کے لیے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں، تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں اور اتفاق سے اسی زمانے میں نینوا کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر منتج ہوئی تھی[1] اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو "لاوارث" ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین اور عمان تھے، ان کے متعلق حسبِ دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورتِ حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آگیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوا میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابلِ کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے اور ساتھ قربانی کے جانور ہیں اور ارادہ محض سالانہ ہے اس لیے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں۔ (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگا لیا جاتا ہے[2]۔ جو ساتھ تو رہتا ہے مگر بند حالت میں) مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے۔ اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطہ نظر سے حدیبیہ کے درّے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لیے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ میں آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہو گئی۔ قریش کے نمائندے اور کارندے آ آ کر مقصد معلوم کرنے لگے آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختارِ کل کی حیثیت سے گفت و شنید کر سکیں مگر عجیب بدنظمی تھی اور کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انہیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انہوں نے مرتے مارنے کا اقرار

---

[1] دیکھیے گرلانڈ کی جرمن کتاب "قیصر ہرقل کی جنگی مہمیں"۔

[2] تاریخ طبری ص ۱۵۳۱۔

کیا جس کا "اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ" کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انہوں نے سُہیل بن عمر کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلح نامہ طے ہو گیا قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:-

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں،

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو، تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آجائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسالمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کے خالص اسلامی فارمولے کے قریش نا رمولا "باسمك اللّٰھم" لکھا جانا اور "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کی جگہ "مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ" لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انہیں و بنا پڑا اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدبر بھی اپنی بے چینی کو چھپا نہ سکے لیکن مسلمانوں میں نظم و ضبط اتنا کچھ آ چکا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

حدیبیہ کی اس صلح ریا بقول قریش "شکست") کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یہ برعکس نہند نام زنگی کافور" کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے کو تیار تھی۔ صرف خیبر میں جنگ سے ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ "باسمك اللّٰھم" کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز "محمد بن عبداللہ" کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور "من استطاع الیہ سبیلا" کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ یک طرف تحویل ملزمین کی توجیہہ خود جناب رسالتؐ مآب یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہم وطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری کے باہر نومسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کر دیا کہ خود قریش نے جناب رسالتؐ مآب التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نومسلموں کو مدینہ بلالیں اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کریں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتح مبین" "نصر عزیز"

تھی، جس کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انہوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر دی، جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی اور جو اس سے ٹکرایا، پاش پاش ہو کر رہ گیا اور جس نے سر تسلیم خم کر دیا، وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالا قومیت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے، جسے عہدِ نبوی کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہیئے! اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے، جس کی تفصیل میں نے الوثائق السیاسیہ (مطبوعہ مصر ۱۳۶۱ھ) میں دستاویز نمبر ۱۱ کے تحت دی ہے، یہاں اس کا ترجمہ کافی ہو گا۔

معاہدہ حدیبیہ

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے، جو محمدؐ بن عبداللہ اور سُہیل بن عمرو میں طے ہوا،

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے، جس دوران میں لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکہ آئے، تو اس کی جان و مال کا امان ہو گا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایت ابو عبیدہ عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے، تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہو گا[1]

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو آپؐ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا، وہ اسے آپؐ کے سپرد نہیں کریں گے،

۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلافِ عہد دغا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا۔ (اس پر قبائل خزاعہ نے اُٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔)

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکے میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے تیرے ساتھ سوار کا

[1] یہ دفعہ ابن اسحٰق اور ابن ہشام میں نہیں ہے۔ نہ ہی تاریخ طبری میں ہے۔ لیکن تفسیر طبری، ابو عبید، کی کتاب الاموال، فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے، جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا۔ اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

(غالباً) مہر نبویؐ

(غالباً) مہر سہیل بن عمرو

گواہانِ اسلام:۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن وقاص، محمود بن مسلمہ، ابوعبیدہ بن الجراح وغیرہ

گواہان قریش:۔ مکرز بن حفص، وغیرہ۔

کاتب:۔ علیؓ بن ابی طالب

ماخذ ہائے متن تفسیر طبری ص۲۶ ص۶۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص۷۴۷ تا ۷۴۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحٰق ورق ۱۷۰/ب (مخطوطہ پاریس) مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۰ الف۔ طبقات ابن سعد ج حصہ ۲ ص۷۴ نیز ج ۲ حصہ ۱ ص۷۰ تا ۷۱، تاریخ طبری ص۱۵۴۶ تا ۱۵۴۷، سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیا صوفیا) فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص۱۶۸ تا ۱۶۹۔ تاریخ الخمیس للدیار بکری ج ۲ ص۲۳۔ تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص۱۵۶ سیرۃ حلبی ج ۳ ص۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن کتاب الاموال لابی عبیدؒ ص۱۴۴ تا ۱۴۴۴ صحیح البخاری ۶۴/۴۳، ۶۴/(۳۵/۲۹)، ۵۴/(۶، ۷)، ۵۴/۱ وغیرہ۔ عن کتب سید المرسلین لابن طولون ۲۶۔ فتوح بلاذری ص۳۶۔ تاریخ الیعقوبی ج ۲ ص۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ کائتانی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ۶ھ ص ۳۴۔ ہیفننگ کی جرمن کتاب "اسلام کا قانون خارجہ" ضمیمہ دوم۔

اشپرنگر کی جرمن "سوانح و تعلیمات محمدیؐ" ص۳ ص۲۴۶ جہاں تمیمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے۔ نقل نہیں۔

مجید خدوری کی انگریزی کتاب "اسلام کا قانون جنگ و امن" ص۸۹۔

مزید حوالے ونسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

عالمِ عربی کی قیادت

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

عالمِ عربی کی اہمیت

دنیا کے سیاسی نقشہ میں عالمِ عربی بہت اہمیت رکھتا ہے، وہ ان قوموں کا گہوارہ ہے جنھوں نے انسانی تاریخ میں سب سے اہم پارٹ ادا کیا۔ اس کے سینہ میں دولت و طاقت کے عظیم الشان خزانے محفوظ ہیں۔ اس کے پاس پٹرول ہے جو آج جنگی اور صنعتی جسم کے لیے خون کا درجہ رکھتا ہے اور یورپ و امریکہ اور مشرق بعید کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

وہ عالمِ اسلامی کا دھڑکتا ہوا دل ہے جس کی طرف روحانی اور دینی طور پر پورے عالم اسلامی کا رُخ ہے جو ہر وقت اس کا دم بھرتا ہے اور اس کی محبت و وفاداری میں سرشار رہتا ہے۔

اس کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کا امکان ہے کہ خدانخواستہ اس کو تیسری جنگ کا میدان بننا پڑے۔ وہاں طاقت ور بازو ہیں، سوچنے سمجھنے والی عقلیں ہیں اور جنگجو جسم ہیں، وہاں بڑی بڑی تجارتی منڈیاں ہیں اور قابلِ کاشت زمینیں ہیں۔

مصر وہیں واقع ہے جو اپنی پیداوار، آمدنی، زرخیزی و شادابی، دولت و ترقی، تہذیب و تمدن میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ جس کی گود میں دریائے نیل رواں دواں ہے۔ یہاں فلسطین ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک ہیں جو اپنی آب و ہوا کی لطافت و حسن و خوب صورتی اور فوجی اہمیت میں ممتاز ہیں۔

اس کے پاس عراق کا ملک ہے جو اپنی بہادری، سخت جانی، شجاعت، عزم اور پٹرول کے ذخیروں کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہاں جزیرۂ عرب ہے جو اپنے روحانی مرکز، دینی اثر میں سب سے منفرد ہے جس کے حج کے سالانہ اجتماع کی نظیر دنیا میں نہیں، جہاں تیل کے چشمے سب سے زیادہ تیل پیدا کرتے ہیں۔

یہ سب چیزیں ہیں جنھوں نے عالمِ عربی کو اہلِ مغرب کی نظر کا مرکز، ان کی خواہشات کی آماجگاہ اور قیادت و لیڈرشپ کے لیے مقابلہ کا میدان بنا دیا اور جس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ ان ملکوں میں عربی قومیت اور وطن پرستی کا شدید احساس پیدا ہو گیا ہے۔

محمد رسول اللہ عالمِ عربی کی روح ہیں

ایک مسلمان، عالمِ عربی کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس میں اور ایک یورپین کی نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے، بلکہ

خود ایک وطن پرست عرب، عالم عربی کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

مسلمان عالم عربی کو اس حیثیت سے دیکھتا ہے کہ وہ اسلام کا گہوارہ ہے، انسانیت کی پناہ گاہ ہے، عالمی قیادت کا مرکز ہے، روشنی کا مینار رہا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم عالم عربی کی جان، اس کے عزت و افتخار کا عنوان اور اس کا سنگِ بنیاد ہیں۔ اگر اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جُدا کر دیا جائے تو اپنے تمام قوت کے ذخیروں اور دولت کے چشموں کے باوجود اس کی حیثیت ایک بے جان لاشہ اور ایک نقشِ بے رنگ سے زیادہ نہ ہوگی۔ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کی ذات ہے جن کی وجہ سے عالمِ عربی عالمِ وجود میں آیا۔ اس سے پہلے یہ دنیا منقسم اور منتشر اکائیوں، باہمی دست و گریباں قبیلوں، غلام قوموں اور بے مصرف صلاحیتوں کا دوسرا نام تھی، اس پر جہل و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے، عرب رومی شہنشاہی سے جنگ مول لینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کا تصور کرنا بھی ان کے لیے مشکل تھا، شام جو بعد میں عالمِ عربی کا بہت اہم حصہ قرار پایا ایک رومی نوآبادی تھی جو مطلق العنان حکومت اور سخت ترین ڈکٹیٹر شپ کے رحم و کرم پر تھی، اس نے ابھی تک آزادی و انصاف کا مفہوم ہی نہیں سمجھا تھا۔

عراق کیانی حکومت کی اغراض و خواہشات کا شکار رہتا۔ نئے نئے محاصل اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے اس کی کمر جھک گئی تھی، رومی مصر کے ساتھ ایک گائے کا سا برتاؤ کرتے تھے جس کو دوہنے اور فائدہ اٹھانے میں وہ کمی نہ کرتے۔ لیکن چارہ دیتے وقت حق تلفی اور بخل سے کام لیتے۔ پھر وہاں سیاسی استبداد کے ساتھ مذہبی استبداد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ دفعتاً اس متفرق، منتشر، مظلوم دنیا پر اسلام کی بادِ بہاری کا ایک جھونکا چلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اس وقت یہ عربی دنیا ہلاکت کے قریب تک پہونچ گئی تھی، آپ نے اس کی دستگیری فرمائی، اس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں آپ نے اس کو زندگی بخشی، نئی روشنی عطا کی، کتاب و حکمت کی تعلیم دی، تزکیہ کا سبق پڑھایا، آپ کی بعثت کے بعد اس دنیا کی نوعیت بدل گئی، اب وہ اسلام کی سفیر تھی، امن و سلامتی کی پیامبر تھی، تہذیب و تمدن کی علمبردار تھی، قوموں کے لیے رحمت کا پیغام تھی۔ اب ہم شام کا بھی نام لے سکتے ہیں، عراق کا بھی ذکر کر سکتے ہیں، ہم مصر پہ بھی فخر کر سکتے ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت نہ ہوتی تو آج نہ شام کا کہیں پتہ ہوتا نہ عراق کا کہیں ذکر ملتا نہ مصر کا وجود ہوتا اور عالم عربی' عالم عربی ہی نہ ہوتا، اور یہیں تک نہیں، دُنیا بھی تمدن و شائستگی، علم و فن، تہذیب و ترقی کی اس سطح پر نہ ہوتی۔ اب اگر عرب قوموں اور حکومتوں میں کوئی دینِ اسلام سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور اپنا رُخ مغرب کی طرف پھیرتا ہے یا عرب کے عہدِ قدیم کی طرف حریصانہ نظر ڈالتا ہے یا اپنے نظامِ زندگی اور سیاست و حکومت میں مغربی دستور اور مغربی قوانین کی پیروی کرتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنا قائد، امام، رہبر اور اُسوہ و معیار نہیں سمجھتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی ہوئی نعمت کو فوراً واپس کر دے اور اپنے پہلے دورِ جاہلیت کی طرف واپس چلا جائے، جہاں رومیوں اور ایرانیوں کا سکہ چلتا تھا، جہاں ظلم و استبداد کا بازار گرم تھا، جہاں سامراج کی فرمانروائی تھی، جہاں جہل و گمراہی تھی، جہاں غفلت اور ریکاری تھی، جہاں دنیا سے الگ تھلگ گمنامی کے گوشہ میں ایک

مجموعی زندگی گزاری جا رہی تھی، اس لیے کہ یہ شاندار اور روشن تاریخ، یہ تابناک تہذیب، یہ بازارِ ادب، یہ عرب سلطنتیں اور حکومتیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بعثت کا فیض اور آپ کی آمد کا نتیجہ ہیں۔

ایمان، عالم عربی کی طاقت ہے

اسلام عالم عربی کی قومیت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے امام اور قائد ہیں، ایمان اس کی قوت کا خزانہ ہے جس کے بھروسا پر اس نے دوسری قوموں کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہُوا، اس کی طاقت کا راز اور اس کا کارگر ہتھیار جو کل تھا وہی آج ہے جس کے ساتھ وہ دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، اپنی ہستی کی حفاظت کر سکتا ہے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے۔

عالم عربی کو اگر کمیونزم یا یہودیت سے جنگ کرنا ہے یا کسی دُوسرے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تو اس دولت کے بل بوتے پر جنگ نہیں کر سکتا جو برطانیہ اس کو عطا کرتا ہے یا امریکہ اس کو خیرات دیتا ہے، یا پٹرول کی قیمت کے طور پر اس کو حاصل ہوتی ہے، وُہ اپنے دشمن کا مقابلہ صرف اس ایمان، معنوی قوت، اس رُوح اور اسپرٹ کے ساتھ کر سکتا ہے جس اسپرٹ کے ساتھ کبھی اس نے بیک وقت رومی و ایرانی حکومتوں کو جنگ کی دعوت دی تھی اور فتح حاصل کی تھی، وہ اس دل کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا جس کو زندگی سے عشق اور موت سے نفرت ہو، اس جسم سے مقابلہ نہیں کر سکتا جو عیش و عشرت کا دلدادہ ہو اس عقل کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا جس کو شک و شبہ کا گھُن لگ چکا ہو، اور افکار و خواہشات باہم دست و گریبان ہوں، اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ ضعیف الایمان اور متشکک قلب اور میدان میں ساتھ چھوڑ دینے والی قوت کے ساتھ میدانِ جنگ کبھی نہیں جیتا جا سکتا، عرب کے قائدین اور عرب لیگ کے ذمہ داروں کے لیے سب سے اہم کام یہ ہے کہ وہ عربی فوج، کسانوں، تاجروں اور جمہور کے ہر طبقہ میں ایمان کی تخم ریزی کریں۔ ان میں جہاد کا جذبہ، جنت کا شوق اور ظاہری آرائشوں کی تحقیر و اہانت کا احساس پیدا کریں، ان کو خواہشاتِ نفس اور زندگی کی مرغوبات پر قابو حاصل کرنے، خدا کے راستہ میں مصائب اور تکلیفیں برداشت کرنے، مسکراتے چہروں کے ساتھ موت کے استقبال اور اس پر پروانوں کی طرح گرنے کا سبق دیں۔

شہسواری اور فوجی زندگی کی اہمیّت

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ عربی اقوام نے اپنی بہت سی فوجی خصوصیات کو ضائع کر دیا، خاص طور پر شہسواری ان کی زندگی سے بالکل خارج ہو گئی، جو ایک بہت بڑا نقصان اور میدانِ جنگ میں ہزیمت اور کمزوری کا بہت اہم سبب ہے، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان قوموں کی فوجی اسپرٹ جو ان کا طغرائے امتیاز تھی ختم ہو گئی، جسم کمزور ہو گئے، لوگ ناز و نعم میں زندگی گزارنے لگے، موٹروں نے گھوڑوں کی جگہ لے لی اور قریب ہے کہ عربی گھوڑے جن کی دُنیا میں دھوم ہے

جزیرہ عرب سے نیست ونابود ہوجائیں ، لوگوں نے کشتی، شہسواری، جنگی مشقوں اور دوسری جسمانی ورزشوں کو فراموش کردیا اور ان کھیلوں کو اختیار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے تعلیم وتربیت کے رہنماؤں کے لیے ضروری ہے کہ عرب نوجوانوں میں شہسواری، فوجی زندگی، سادگی، استقلال، عزیمت اور مصائب پر صبر واستقامت کی اہلیت پیدا کریں۔ امیرالمومنین عمرؓ بن الخطاب عجمی ممالک میں اپنے عرب عمّال کو لکھتے ہیں:

ایاکم والتنعم وزی العجم وعلیکم بالشمس فانها حمام العرب وتمعددوا واخشو شنوا واخلولقوا واعطوا الراکب استنها وانزوا نزواً وارموا الاغراض[1]

تن آسانی وراحت طلبی کی زندگی اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دُور دُور رہنا، دُھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں کا حمام ہے، جفاکشی، سادہ زندگی، صبر وتحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے عادی رہو۔ گھوڑے پر جست لگا کر بے تکلف بیٹھنے کی مشق رہنی چاہیے، نشانے درست ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ارموا بنی اسماعیل فان اباکم کان رامیا[2]

اے اہلِ عرب! تیراندازی کی مشق رکھو اس لیے کہ تمھارے جدِّ امجد (حضرت) اسماعیل (علیہ السلام) تیرانداز تھے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

الا ان القوۃ الرمی، الا ان القوۃ الرمی[3]

یاد رکھو جس قوت کے تیار رکھنے کی قرآن مجید میں تاکید ہے وہ تیراندازی ہے، وہ تیراندازی ہے۔

تعلیم وتربیت کے ذمہ داروں کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کا مقابلہ کریں جو مردانگی وشجاعت کی روح کو کمزور کر رہی ہو اور عجز وتخنث پیدا کرتی ہو، عریاں صحافت نگاری، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں، جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق وفجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کر رہا ہو، ان پیشہ وروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوجی کیمپ میں نہ داخل ہونے دیں جو نسل اسلامی کے قلب واخلاق میں فساد برپا کرنا چاہتے اور فسق ومعصیت اور فحش پسندی کو چند حقیر پیسوں کے لیے خوب صورت اور مزین بنا کر پیش کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں مردانگی اور غیرت انسانی کو زوال ہوا۔ عورتوں نے اپنی نسائیت اور

---

[1] بغوی [2] بخاری [3] مسلم

فطرت مادری کے خلاف بغاوت کی اور آزادی و بے حجابی کی راہ اختیار کی۔ ہر چیز میں مردوں کی مسابقت کی کوشش کی، خانگی زندگی سے نفرت و غفلت بڑھی اور ضبطِ تولید کی رغبت پیدا ہوئی۔ اس کا ستارۂ اقبال غروب ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے نشانات بھی مٹ گئے۔ یونانی، رومی اور ایرانی اقوام کا انجام بھی ہوا اور یورپ بھی آج اسی راہ پر گامزن ہے جو اس انجام تک لے جاتی ہے۔ عالم عربی کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کا انجام بھی ایسا نہ ہو۔

طبقاتی تفاوت اور اسراف کا مقابلہ

عربوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے اور بہت سے دُوسرے اسباب کی بنا پر عیش و عشرت، غیر ضروری لوازم زندگی کے شدید اہتمام، اشراف، لذت و خواہش اور فخر و آرائش کے لیے فضول خرچی کی عادت پڑ چکی ہے۔ اس عیش و تنعم اور بیدردی کے ساتھ خرچ کے پہلو بہ پہلو فقر و فاقہ اور عریانی بھی موجود ہے، جب ایک شخص بڑے بڑے عرب شہروں پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک طرف وہ آدمی ہے جس کو اپنی ضرورت سے زاید غذا، لباس کا مصرف نظر نہیں آتا، دوسری طرف اس کی نگاہ ایسے بدوی پر پڑتی ہے جس کو ایک روز کا کھانا اور ستر پوشی کے لیے کپڑا بھی نصیب نہیں۔ جب عرب کے امراد اصحابِ ثروت ہوا سے باتیں کرنے والی موٹروں پر سرگرم سفر ہوتے ہیں، اُسی وقت چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے بچوں اور بچیوں کی ایک فوج سامنے آتی ہے جن کا لباس تار تار ہوتا ہے جو ایک پیسہ کے لیے ان کی موٹروں کے ساتھ دوڑنے لگتی ہے۔

جب تک عرب ملکوں میں فلک بوس محلوں، بہترین کاروں کے ساتھ ساتھ حقیر جھونپڑیاں اور تنگ و تاریک مکانات نظر آئیں گے، جب تک تخمہ و فاقہ ایک شہر میں شباب پر ہوگا اس وقت تک کمیونزم کے لیے دروازے کھلے ہوئے ہیں، ہنگامے، جھگڑے ہونا لازمی ہیں، کوئی پروپیگنڈا اور طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ وہاں اگر اسلامی نظام اپنے جمال و اعتدال کے ساتھ قائم نہیں ہوگا تو تعزیرِ خداوندی کے طور پر اور ردِّ عمل کے طریقہ پر اس کی جگہ ایک ظالم و جابر نظام کا قائم ہونا ضروری ہے۔

تجارت اور مالی نظام میں خود مختاری

عالم اسلامی کی طرح عالم عربی کے لیے ضروری ہے کہ وُہ اپنی تجارت، مالیات، صنعت و حرفت اور تعلیم میں پورے طور پر آزاد اور خود کفیل ہو، وہاں کے رہنے والے انھیں چیزوں کا استعمال کریں جو ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی صنعت محنت کا نتیجہ ہوں، زندگی کے ہر شعبہ میں وہ مغرب سے مستغنی ہوں اپنی تمام ضروریات، مصنوعات، غذا، لباس، ہتھیار، مشینیں، آلاتِ حرب کسی چیز میں وہ غیر کے دستِ نگر اور مغرب کے پروردۂ رحمت اور نمک خوار نہ ہوں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ عالم عربی اگر بعض ناگزیر حالات کی بنا پر مغرب سے جنگ کرنا چاہے تو وہ اس لیے

جنگ نہیں کرسکتا کہ وہ اس کا مقروض اور اس کی امداد کا محتاج ہے۔ جس قلم سے وہ مغرب کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کرتا ہے وہ قلم بھی مغرب ہی کا بنا ہوا ہے، اگر وہ مقابلہ کرتا ہے تو میدانِ جنگ میں اسی گولی کو استعمال کرتا ہے جو مغرب کے کارخانہ کی تیارشدہ ہے۔ عالم عربی کے لیے یہ ایک بڑی ٹریجیڈی ہے کہ وہ اپنے دولت کے ذخیروں اور قوت کے سرچشموں سے خود فائدہ نہ اٹھاسکے، زندگی کا خون اس کو فائدہ پہونچانے کے بجائے اسی کی رگوں سے دوسروں کے جسم میں پہونچتا ہو، اس کی فوجوں کی ٹریننگ مغرب کے ایجنٹوں اور فوجی افسران کے ہاتھ میں ہو اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی انھیں کے سپرد ہوں۔ عالمِ عربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کا خود کفیل ہو، تجارت و مالیات کی تنظیم، درآمد برآمد، قومی صنعت، فوج کی ٹریننگ اور مشینوں اور آلاتِ حرب کی تیاری پر اس کا مکمل قبضہ ہو، ایسے اشخاص کی تربیت کی جائے، جو حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں اور سرکاری فرائض پوری واقفیت، فنی مہارت، دیانت اور خیر خواہی کے ساتھ انجام دیں۔

انسانیت کی سعادت کے لیے عربوں کی ذاتی قربانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس وقت ہوئی جبکہ انسانیت کی شقاوت و بدبختی انتہائی حد کو پہونچ چکی تھی۔ اس وقت انسانیت کی اصلاح کا مسئلہ ان افراد کی دسترس سے باہر تھا جن کی زندگی ناز و نعمت میں بسر ہو رہی تھی اور جو محنت و مشقت کے برداشت کرنے اور مالی و جانی نقصانات کو جھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور جن کے لیے ہر وقت عیش و نشاط کا سامان موجود تھا، اس وقت انسانیت کو ایسے افراد درکار تھے جو انسانیت کی خدمت میں اپنے مستقبل کو قربان کرسکتے تھے اور منافع سے دست بردار ہو کر اپنے جان و مال، عیش و آرام اور اپنے تمام دنیاوی مفاد کو خطرات و مشکلات کے مقابلہ میں پیش کرسکتے تھے، ان کو اپنے پیشہ و تجارت کی کساد بازاری اور کسی طرح کے مالی نقصان و خطرات کی پروا نہ تھی، جن کو اپنے آباؤ اجداد، اپنے دوستوں اور قرابت مندوں کی قائم کی ہوئی اُمیدوں پر پانی پھیر دینے میں تامل نہ تھا۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے جو کچھ ان سے کہا تھا وہی ان تعلق والوں کی زبان پر بھی جاری ہوجاتا:

قالوا یٰصٰلح قد کنت فینا مرجوًّا قبل هذا۔ — اے صالح! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

جب تک دُنیا میں ایسے مجاہد تیار نہ ہوں اس وقت تک انسانیت کا بقا، استحکام اور کسی اہم دعوت کا کامیاب ہونا ناممکن ہے۔ یہ کردار رکھنے والے گنتی کے چند افراد جو دنیا کی اصلاح میں محروم اور کوتاہ قسمت سمجھے جاتے ہیں انھیں کی بلند ہمتی اور جذبۂ قربانی پر انسانیت کی فلاح و کامرانی اور عیش و شادمانی کا دارومدار ہے، وہ چند افراد جو اپنی جان کو مصائب میں ڈال کر ہزاروں بندگانِ خدا کے ابدی مصائب سے بچنے کا سبب بنتے ہیں اور دنیا کے ایک بڑے گروہ کو شر سے خیر کی طرف لاتے ہیں۔ اگر چند افراد کی محرومی و ہلاکت ایک پوری ملت کے لیے خوشحالی اور سرفرازی کا باعث ہو اور اگر کچھ مال و زر اور تجارت و حرفت کے نقصان اور گھاٹے سے بے شمار اور لاتعداد انسانوں کے لیے دینی و

دُنیوی فلاح کا دروازہ کھلتا ہو تو یہ سودا ہر طرح سستا ہے۔

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ جانتا تھا کہ روم و فارس اور دنیا کی متمدن قومیں جن کے ہاتھ میں اس وقت عالم کی باگ ڈور ہے ہرگز اپنے عیش و نشاط کو نہیں چھوڑ سکتیں، وہ اپنی ناز پروردہ زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتیں، وہ بے یارومددگار انسانیت کی خدمت، دعوت و جہاد کے لیے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتیں۔ان کے اندر اتنی استطاعت ہرگز نہیں کہ اپنی پُرتکلف زندگی اور زیب و زینت کا ایک معمولی سا جز بھی قربان کریں، ان میں ایسے لوگ بالکل مفقود تھے جو اپنی خواہشات پر قابو رکھتے ہوں، اپنی حرص و طمع کو روک سکیں، اور جو تمدن کے لوازم اور فیشن کی پابندی سے بے نیاز ہو کر واجبی گزران پر اکتفا کر سکیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے پیغام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے ایسی قوم کا انتخاب فرمایا جو دعوت و جہاد کے بوجھ کو اٹھا سکتی تھی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے بھرپور تھی۔ یہ وہی عربی قوم تھی جو طاقت ور، سادہ منش اور جفاکش تھی، جس پر مصنوعی تمدن کا کوئی وار کارگر نہ ہوا اور دنیا کی رنگینیوں کا کوئی جادو نہ چل سکا۔یہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کے غنی، علم سے بھرپور اور تکلفات سے کوسوں دُور تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عظیم الشان دعوت کو لے کر اُٹھے اور آپ نے جدوجہد و جانفشانی کا حق پُوری طرح ادا کر دیا، اس دعوت کو ہر اس چیز پر ترجیح دی جو آپ کے لیے رکاوٹ کا سبب بن سکتی تھی۔آپ خواہشات سے بالکل کنارہ کش تھے۔دُنیا کی دلفریبیوں کا آپ پر کوئی جادو نہ چل سکا۔یہی وہ چیز تھی جو دنیا کے لیے اُسوۂ حسنہ اور رہنما بنی۔ جب قریش کے وفد نے آپ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور آپ کے لیے وہ تمام چیزیں پیش کیں جو ایک نوجوان کے دل کو فریفتہ اور نفسیات رکھنے والے انسان کو خوش کر سکتی تھیں، مثلاً حکومت و ریاست، عیش و عشرت، دولت و ثروت، تو آپ نے ان تمام چیزوں کو بے تامل ٹھکرا دیا۔ اسی طرح جب آپ کے چچا نے گفتگو کی اور چاہا کہ آپ کو اس دعوت کے پھیلانے اور اس میں حصہ لینے سے روک دیں تو آپ نے صاف صاف فرما دیا کہ" اے چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور میرے بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں جب بھی میں اس کام سے باز نہیں آسکتا۔ اور اس وقت تک کوشش کرتا رہوں گا جب تک اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غالب نہ کر دے یا میں خود اس سلسلہ میں کام نہ آجاؤں۔" یہی جدوجہد اور قربانی، دنیا کی نفع اندوز ذہنیت سے بے تعلقی اور پُرمسرت زندگی کے مقابلہ میں تکلیف و مشقت کی زندگی کی ترجیح، اہلِ دعوت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک نمونہ اور اُسوہ بن گیا۔آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اوپر تمام عیش و آرام اور راحت و آسائش کے دروازے بند کر لیے، خود اپنے ہی اوپر نہیں بلکہ اپنے پُورے خاندان، اہلبیت اور تمام عزیزوں کو بھی عیش و عشرت کے مواقع سے مستفید ہونے کا موقعہ نہیں دیا، وہی لوگ جو آپ سے زیادہ قریب و عزیز تھے زندگی کے عیش و راحت میں اُنھیں کا حصہ سب سے کم تھا اور جہاد و قربانی میں وہ سب سے آگے رکھے گئے تھے۔جب آپ کسی چیز کی حرمت کا ارادہ کرتے تو اس کی ابتدا اپنے قبیلہ اور اپنے ہی لوگوں سے

کرتے اور جب کسی حق کی باری آتی یا کوئی نفع پہنچانا ہوتا تو دُور کے لوگوں سے شروع کرتے۔ اور بسا اوقات آپ کے قرابت دار اور قبیلہ والے اس سے محروم ہی رہ جاتے۔ آپ نے جب سُودی کاروبار ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کے کاروبار کو مٹایا اور ان کے تمام سُودی منافع کو ختم کر دیا۔ اسی طرح جاہلیت کے انتقامات و مطالبات کو باطل کرنے اٹھے تو ربیعہ بن حارث ابن عبد المطلب کے خون کو پہلے باطل کیا، اور جب آپ نے زکوٰۃ کا قانون جاری فرمایا (جو درحقیقت ایک بہت بڑی مالی منفعت ہے اور تا قیامت باقی رہنے والی چیز ہے) تو آپ نے اپنے قبیلہ بنی ہاشم کے لیے اس کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا۔ فتح مکّہ کے دن جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ سے بنی ہاشم کے لیے سقایت زمزم کے ساتھ ساتھ خانہ کعبہ کی کلید برداری کا مطالبہ کیا تو آپ نے شدّت سے انکار فرما دیا اور عثمان بن طلحہؓ کو بلا کر خانہ کعبہ کی کنجی ان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اے عثمان! دیکھو یہ تمھاری کنجی ہے تم اس کو لے لو، آج احسان اور وفا کا دن ہے اور اب یہ تمھارے خاندان میں ہمیشہ رہے گی کوئی اس کو تم سے نہیں لے سکتا، الّا یہ کہ کوئی ظالم اس کی جرأت کرے۔ آپ نے ازواجِ مطہرات کو زہد و قناعت اور رُوکھی پھیکی زندگی گزارنے کی ترغیب دی اور صاف صاف فرمایا کہ اگر تم فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے لیے آمادہ ہو تو میری رفاقت اختیار کر سکتی ہو ورنہ ناز و نعمت و راحت کے ساتھ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھ کر سُنایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ فَإِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَٰتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (احزاب - ۲۹)	اے نبی! آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجیے کہ تم اگر دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ متاع دے دوں اور تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور اس کے رسول کو اور عالم آخرت کو تو تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرِ عظیم مہیّا کر رکھا ہے۔

لیکن اس انتخاب میں آپ کے گھر والوں نے اللہ اور رسول ہی کو اختیار کیا۔ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب سُنا کہ آپ کے پاس کچھ غلام و خادم آئے ہیں اور جبکہ ان کے ہاتھوں میں چکّی چلانے سے گٹّے پڑ گئے تھے۔ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی ایک خادم عنایت فرما دیجیے تاکہ میں کچھ آرام حاصل کر سکوں تو آپ نے ان کو تسبیح و تحمید کی وصیّت فرمائی اور کہا کہ تمھارے لیے یہ چیز خادم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ یہی معاملہ آپ کا اپنے تمام قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے ساتھ تھا اور جو جتنا ہی قریب ہوتا جاتا اسی قدر اس کی ذمہ داری بڑھتی جاتی۔

مکّہ کے لوگ جب ایمان لائے تو ان کی اقتصادی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا، ان کی تجارت کساد بازاری کا

شکار ہوگئی اور بعض اپنے راس المال سے بھی محروم ہو گئے تھے جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں جمع کیا تھا، ان میں ایسے بھی ایمان لانے والے تھے جو راحت و آرام کے سامان اور آرائش و زینت کے اسباب بھی ختم کر چکے تھے حالانکہ پہلے ان کی امتیازی شان یہی تھی کہ وہ زینت و آرائش کے دلدادہ تھے، اسی طرح اس دعوت کے پھیلانے اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں بہتوں کی تجارت برباد ہوگئی اور کتنے اپنے آبائی دولت کے حصوں سے محروم ہو گئے۔

اسی طرح جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ کا ساتھ دیا تو اس کا اثر ان کے کھیتوں، ان کے باغات پر پڑا مگر باایں ہمہ جب انھوں نے اپنا کچھ تھوڑا سا وقت ان کی نگہداشت کے لیے چاہا تو ان کی اجازت نہیں ملی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو متنبہ کیا گیا، ارشاد ہوا:

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہی حال عرب اور ان تمام لوگوں کا ہوا جو اس دعوت سے متاثر اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ چناں چہ جہاد کی مشقت اور جان و مال کے خسارہ میں ان کا اتنا بڑا حصہ تھا جو دنیا کی کسی قوم کے حصہ میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۠ (التوبہ۔ ۲۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جس کو تم پسند کرتے ہو، تم کو اللہ اور اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

دوسری جگہ فرمایا:

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ۔ (التوبہ۔ ع ۱۵)

مدینہ کے باشندوں کو اور ان اعرابیوں کو جو اس کے اطراف میں بستے ہیں لائق نہ تھا کہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دیں اور پیچھے رہ جائیں اور نہ یہ بات لائق تھی کہ اس کی جان کی پروا نہ کر کے محض اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں۔

اس لیے کہ انسانی سعادت کی عمارت انہیں لوگوں کی قربانیوں کے ستونوں پر قائم ہونے والی تھی اور حالات کی تبدیلی میں صرف اسی بات کا انتظار تھا کہ یہ مہاجرین و انصار اپنے کو مٹا کر انسانیت کی سرسبزی اور قوموں کی ہدایت و فلاح کا فیصلہ حاصل کرلیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ (البقرہ ۱۵۵)	ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے کچھ نہ کچھ خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور پھلوں کی کمی اور نقصان کے ساتھ۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝	کیا لوگ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی۔

اگر عرب اس سرفرازی کو قبول کرنے سے ہچکچاتے اور انسانیت کی اس عظیم خدمت میں تردّد سے کام لیتے تو بدبختی اور عالم کے فساد کی مدت اور بڑھ جاتی اور جاہلیت کی تاریکی بدستور دنیا پر چھائی رہتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔ (الانفال - ع ۱۰)	اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی ہی خرابی پھیلے گی۔

چھٹی صدی عیسوی میں دنیا ایک دوراہے پر کھڑی تھی، اس وقت دو ہی راستے تھے، یا تو عرب کے لوگ اپنے جان و مال، آل اولاد اور تمام محبوب چیزوں کو خطرہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے اور دنیا کی ترغیبات سے کنارہ کش ہو کر اجتماعی مصلحت کی راہ میں اپنا سارا سرمایہ قربان کر دیتے جب دنیا کو سعادت نصیب ہوتی اور انسانیت کی قسمت بدلتی، جنّت کا شوق اُبھرتا اور ایمان کی ہوائیں چلتیں۔ یا پھر وہ اپنی خواہشات و مرغوبات اور اپنی انفرادی لذت و عیش کو انسانیت کی سعادت و فلاح پر ترجیح دیتے تو ایسی صورت میں دنیا گمراہی و بدبختی کے دلدل میں پھنسی رہ جاتی اور غفلت و مدہوشی کے عالم میں پڑی رہتی، لیکن اللہ تعالیٰ کو انسانیت کی بھلائی منظور تھی اس لیے عربوں میں اس نے ولولہ پیدا کیا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اندر ایمان و ایثار کی روح پھونک دی اور ان کو آخرت اور اس کے بے پایاں ثواب کی ترغیب دی، تو اُنھوں نے اپنے آپ کو انسانیت پر قربان کرنے کے لیے پیش کر دیا اور اللہ کے ثواب اور نوعِ انسانی کی سعادت کی اُمید میں اُنھوں نے دُنیا کے تمام عیش و آرام سے آنکھیں بند کر کے اپنے جان و مال کو اللہ کے راستے میں جھونک دیا اور ان تمام چیزوں کو تج دیا جن پر لوگ حریصانہ نظریں اٹھاتے ہیں، انھوں نے پُورے خلوص اور صداقت کے ساتھ راہِ خدا میں جانیں دیں اور محنتیں کیں، تو اللہ نے ان کو دنیا اور آخرت کے بہتر اجر سے نوازا۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے)

آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی۔ یہ عالم پھر اسی دوراہے پر نظر آرہا ہے جس دوراہے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھا، آج اس کی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دُنیا کی قسمت بدلنے کے لیے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش وثروت، دُنیا کی نعمتوں، ترقی وخوشحالی کے امکانات اور اپنے سامانِ راحت کو خطرہ میں ڈال دے تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عرب بدستور اپنے حقیر اغراض اور ذاتی سربلندی وترقی، عہدہ ومنصب، تنخواہوں کی بیشی، آمدنی کے اضافہ اور کاروبار کی ترقی کی فکر میں رہیں اور سامانِ عیش اور اسبابِ راحت کی فراہمی میں مشغول رہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دُنیا اسی زہریلے "تالاب میں غوطہ زن رہے گی جس میں وہ صدیوں سے ہلاک ہو رہی ہے، اگر اچھے اچھے ذہین عرب نوجوان بڑے بڑے شہروں میں خواہشات کے غلام بن کر بیٹھے رہیں اور اگر ان کی زندگی کا محور صرف مادہ اور معدہ ہو اس کے علاوہ ان کی کوئی اور فکر نہ ہو اور ان کی تمام جدوجہد صرف اپنی ذاتی زندگی اور اپنی مرفّہ الحالی کے گرد چکّر لگا رہی ہو، تو ایسی صورت حال میں انسانی سعادت کا تصور بھی مشکل ہے، بعض جاہلی قوموں کے نوجوان ان سے زیادہ حوصلہ مند تھے اور ان کا ذہن ان سے کہیں زیادہ بلند تھا جبکہ انھوں نے اپنے پسندیدہ مقاصد کی راہ میں اپنی تمام راحت وآرام اور اپنے مستقبل تک کو قربان کر دیا۔ جاہلی شاعر امراء القیس ان سے کہیں زیادہ باہمت تھا کہ کہتا ہے: ؎

ولو اننی اسعی لادنی معیشۃ — کفانی ولم اطلب قلیلاً من المال

ولکنما اسعی لمجد مؤثل — وقد یدرك المجد المؤثل امثالی

(اگر میں کسی ادنیٰ درجہ کی زندگی کے لیے کوشش کرتا ہوتا تو مجھے تھوڑا سا مال بھی کافی ہوتا اور اس کے لیے ایسی جدوجہد کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن میں تو ایسی عظمت کا طالب ہوں جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور مجھ جیسے آدمی ہی ایسی عظمت کو حاصل کر لیتے ہیں)

دنیا کی سعادت وکامرانی کی منزل تک پہونچنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی قربانیوں سے ایک پل تعمیر کریں، اس پل پر سے گزر کر دُنیا بہتر زندگی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے۔ زمین کھاد کی محتاج ہوتی ہے، لیکن انسانیت کی زمین کی کھاد جس سے اسلام کی کھیتی برگ وبار لاتی ہے، وہ وہی انفرادی خواہش وہوس ہے جس کو مسلم نوجوان اسلام کا بول بالا کرنے اور اللہ کی زمین میں امن وسلامتی پھیلانے کے لیے قربان کریں۔ آج انسانیت کی افتادہ زمین کھاد مانگتی ہے یہ کھاد راحت وآرام کے مواقع، انفرادی ترقی کے امکانات اور عیش کے اسباب ہیں جن کو مسلمان بالخصوص عرب اقوام قربان کر دینے کا ارادہ کر لیں۔ چند انسانی جانوں کی جدوجہد اور ان کی قربانیوں سے اگر انسانی گلہ آگ کی راہ سے نکل کر جنّت کی راہ پر لگ جاتا ہے تو یہ بڑا سستا سودا ہے، اس لیے کہ جو نعمت حاصل ہوگی وہ بہت ہی جنس گراں مایہ ہے اور اس کے لیے جو کچھ قربان کرنا پڑے وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہی معمولی اور ارزاں ہے ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں — اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

سیاستِ نبویؐ کا ایک اہم پہلو

خالد مسعود

رمضان ۹ھ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آ چکے تھے۔ تبوک کا غزوہ وہ تھا، جس میں مسلمان روم کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے اور یہ سفر اس زمانہ میں پیش آیا، جب گرمی زوروں پر تھی اور ملک میں فصل کا زمانہ ہونے کی وجہ سے پھل پک چکے تھے۔ یوں تو حضور کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ دشمن کو زک پہنچانے اور لڑائی کی مہم کو کامیاب بنانے کے نقطۂ نظر سے اس کی سمت اور اس کے علاقہ کو مخفی رکھنے کے لیے آپؐ غزوات کے ارادہ کو راز میں رکھتے، لیکن اس غزوہ کے موقع پر آپ نے تبوک جانے کا اعلان فرما دیا۔ اس کے بارے میں ابن ہشام لکھتا ہے:

"سوائے غزوۂ تبوک کے کہ اس میں آپؐ نے طویل مسافت، موسم کی شدت اور مقابل دشمن کی کثرت کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں میں اس کا عام اعلان فرما دیا تاکہ لوگ اس کے لیے ضروری سامان ساتھ لے لیں۔ پھر آپؐ نے تیاری کا حکم دیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ آپؐ روم کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فاتح لشکر کے ساتھ واپس آئے، جسے اللہ تعالیٰ کی شدید آزمائش نے ہلاکر رکھ دیا تھا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے اندر کے منافقوں اور کمزور ایمان والوں کو چھانٹ دیا تھا۔ سورہ توبہ کی مندرجہ ذیل آیات ان لوگوں کے نفاق، تردد اور کمزوری ایمان کا ایک ابدی نشان بن گئی ہیں:

لا یستاذنك الذین یؤمنون باللہ و الیوم الاخر ان یجاھدوا باموالھم و انفسھم و اللہ علیم بالمتقین انما یستاذنك الذین لا یؤمنون باللہ و الیوم الاخر و ارتابت قلوبھم فھم فی ریبھم یترددون و لو ارادوا الخروج لاعدوا لہ عدۃ و لکن کرہ اللہ انبعاثھم فثبطھم و قیل اقعدوا مع القاعدین لو خرجوا فیکم ما زادوکم الا خبالا و لا اوضعوا خلالکم یبغونکم الفتنۃ و فیکم سمعون لھم و اللہ	نہیں رخصت چاہتے تجھ سے وہ لوگ جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کی اور اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے تجھ سے رخصت تو وہی لوگ چاہتے ہیں، جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک میں ڈھلمل یقین ہو رہے ہیں۔ اگر وہ واقعی نکلنا چاہتے تو اس کی تیاری کرتے۔ مگر خدا نے انھیں اٹھانا پسند نہیں کیا۔ پس اس نے انھیں روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو اور اگر وہ نکلتے تو تمھارے اندر فساد بڑھاتے اور تمھارے درمیان

علیمٌ بالظّٰلمین۔ (توبہ ۴۴-۴۷) — فتنہ پھیلانے کی کوشش کرنے اور تمہارے اندران کے جاسوس بھی ہیں اور اللہ ظالموں کو خُوب جانتا ہے۔

جب حضورؐ ذی اوان میں تھے، تو آپؐ کو خبر پہنچی کہ منافقین کے ایک گروہ نے مومنین کی جماعت میں تفریق ڈالنے کی غرض سے ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ یہ وہ مسجد تھی، جس میں حضورؐ کی تبوک کو روانگی سے قبل منافقوں نے حضورؐ سے نماز ادا کرنے کی درخواست کی تھی اور تعمیر مسجد کا مقصد یہ بتایا تھا کہ "ہم نے اسے مریضوں، حاجت مندوں اور سردی کی بارانی راتوں کے نمازیوں کی خاطر تعمیر کیا ہے۔" اس وقت حضورؐ نے اپنا جواب غزوہ تبوک سے واپسی تک ملتوی فرما دیا تھا۔

جب آپؐ کو ذی اوان میں یہ خبر معلوم ہُوئی، تو آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو بلا کر حکم دیا کہ ظالموں کی اس مسجد کو جا کر گرا دو اور اسے آگ لگا دو۔ وُہ دونوں جلدی سے گئے اور مسجد کو گرا کر آگ لگا دی۔ اس مسجد اور اس کے تعمیر کنندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہُوا:

والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً وتفریقاً بین المؤمنین و ارصاداً لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل ولیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ و اللہ یشھد انھم لکٰذبون ۔ (توبہ - ۱۰۷)	اور جنھوں نے مسجد بنائی ضرر پہنچانے کے لیے اور کفر کے لیے اور مومنین کے درمیان تفریق ڈالنے کے لیے اور اس شخص کو گھات مہیا کرنے کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑا اور یہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وُہ جھوٹے ہیں۔

اس طریقے سے نبی قائد نے وحدت جماعت کے لیے خطرہ بنے ہُوئے نفاق کی سرزنش کے لیے مضبوط قدم اٹھانے کا حکم دیا اور اسے مسلمانوں کے لیے عبرت کا نمونہ قرار دے کر یہ سبق دیا کہ مومنین کے دشمنوں کا مسجدیں بنانا اور مظاہر اسلام کو اختیار کرنا نبیؐ کی نظر میں کوئی وقعت نہیں پا سکا۔ بلکہ اس کا غضب ان کے مظاہر اسلام کے اختیار کرنے کی نسبت ہی سے زیادہ ہُوا اور نبیؐ نے ان مظاہر کی بیخ کنی میں بھی پُوری درشتی سے کام لیا۔ قرآن کریم نے بھی منافقین کی قسموں کو جھٹلا کر ان کی خباثت کو نمایاں کیا ہے۔ فرمایا:

ولیحلفن ان اردنا الا الحسنیٰ و اللہ یشھد انھم لکٰذبون ۔ (توبہ - ۱۰۷)	اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ بجز بھلائی کے ہمارا کوئی ارادہ نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وُہ جھوٹے ہیں۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد قبائل طائف کا نمایندہ وفدِ ثقیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعت اور قبول اسلام کی غرض سے آیا۔ ان کی شرط یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالبات منظور فرمائیں اور ان کی قوم، ان کے علاقوں اور اموال کے بارے میں انھیں خصوصی پروانہ لکھ کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ملاقات کی اور ان کی شرائط سُنیں۔ ان میں ایک شرط ابن ہشام کی روایت کے مطابق یہ تھی کہ "ان کے قبیلہ کے بُت 'لات' کو ان کے لیے باقی رہنے دیا جائے اور تین سال کی مدت تک اسے نہ گرایا جائے"۔ وفدِ ثقیف کی دلیل یہ تھی کہ جب تک ان کی قوم اسلام نہیں لے آتی، وہ اس کے بُت کو توڑ کر اسے دہشت میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ اس مدت کو سالوں سے گھٹاتے گھٹاتے ایک ماہ تک لے آئے۔

لیکن حضورؐ نے دو ٹوک فرما دیا کہ آپ ہدم لات کے لیے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کو تیار نہیں خواہ یہ مدت ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد وفد ثقیف نے درخواست کی کہ انھیں نماز معاف کر دی جائے اور ان پر یہ پابندی نہ لگائی جائے کہ وہ اپنے بُتوں کو اپنے ہی ہاتھوں توڑیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

"جہاں تک اپنے ہاتھوں بُت توڑنے کا تعلق ہے، ہم تمھیں اس کی معافی دیں گے لیکن جہاں تک نماز کی معافی کا تعلق ہے یاد رکھو کہ جس دین میں نماز نہیں، اس دین میں کوئی خیر نہیں۔"

پھر آپؐ نے حضرت ابوسفیانؓ بن حرب اور مغیرہ بن شعبہؓ کو طائف روانہ کیا۔ انھوں نے وہاں جا کر لات کو توڑا۔ پھر حضورؐ نے حضرت عثمانؓ بن ابوالعاص کو ان کی صغر سنی کے باوجود صرف اس لیے ثقیف کا امیر مقرر کر دیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے متعلق یہ رائے دی تھی کہ "یا رسول اللہؐ! میں نے ان لوگوں میں سے اس لڑکے کو اسلام کے سمجھنے اور قرآن سیکھنے میں سب سے زیادہ حریص پایا ہے۔"

اس واقعہ میں ہم دُوسری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست میں مضبوط فیصلہ کی کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ ایک معبودِ من دون اللہ کی بیخ کنی میں تاخیر کی اجازت نہ دے کر، دوسرے فرض نماز کا حکم دینے میں۔ پھر عثمان بن ابوالعاصؓ کو ان کی صغر سنی کے باوجود محض ان کے تعلیم قرآن اور تفقہ فی الاسلام کے شوق کے پیشِ نظر ثقیف کا امیر مقرر کر دینے میں بھی ہمیں حضورؐ کا حتمی فیصلہ نظر آتا ہے، جو آپؐ نے ایک نبی کے مخصوص معیارِ انتخاب پر انھیں جانچ کر کیا۔

ہمارے اہلِ سیاست جب سیرت النبیؐ کے اس پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں، تو انھیں خیال ہوتا ہے کہ ہدم لات میں ذرا سی تاخیر گوارا کر لینے میں آخر کیا ہرج تھا۔ جب کہ ایک نہ ایک دن اسے منہدم ہونا ہی تھا؛ اگر یہ تاخیر گوارا کر لی جاتی تو اہلِ طائف کے جذبات اور زیادہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے۔ اسی طرح اگر کچھ عرصہ کے لیے نماز معاف کر دی جاتی، تو اس سے کیا نقصان ہوتا، جب کہ ان لوگوں میں اسلام ابھی نیا نیا داخل ہو رہا تھا؛ امیر کے تقرر میں بھی ہمارے ان اہلِ سیاست کو ایک چیلنج نظر آتا ہے، جو وفد ثقیف کے مسلّم معیارِ سیادت کو دیا گیا۔

لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبیؐ کی سیاست اس طرح کی حکمت عملیوں پر مبنی نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسے زندہ اور واضح عقیدہ سے پھُوٹتی ہے، جو حق کے معاملہ میں نمائشی رواداری سے کام نہیں لیتا۔ یہ اس واضح اور کامل پیغام پر مبنی ہوتی ہے، جس کے اٹھانے کے اہل صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دلوں میں اس کی جڑیں اچھی طرح راسخ ہو چکی ہوں اور وُہ اس کے معاملہ میں کبھی متزلزل نہ ہوں۔ جب معاملہ عقیدۂ توحید کا ہوتا ہے اور یہ حقیقت پیشِ نظر ہوتی ہے کہ یہ عقیدہ خدا کے ساتھ کسی بُت کی پرستش اور کسی طاغوت کے خوف سے کوئی جوڑ نہیں رکھتا، تو آپ کو نبیؐ کی سیاست میں بناوٹ اور رواداری کی تعبیروں کا سراغ نہیں ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے داعی کسی نرمی یا رخصت پر کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم نے اسی واقعہ میں دیکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف کو اتنی رعایت دی کہ خود ان کے اپنے ہاتھوں بُت کو نہیں تڑوایا۔ ان کو نرمی سے حقیقت سمجھائی حتیٰ کہ انھوں نے حضورؐ کی بات مان لی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح رہے کہ اگرچہ حضورؐ نے ان کے ساتھ نرمی بھی کی اور انھیں رعایت بھی دی، لیکن جہاں تک بُتوں کے توڑنے اور اس میں تاخیر نہ کرنے کا تعلق ہے، آپؐ اپنے عزم پر قائم رہے اور اس کو قربان نہیں ہونے دیا۔ (المسلمون) ٭

آنحضرتؐ کی پہلی سیاسی فتح (ہجرتِ حبشہ)

سید مرتضیٰ حسین فاضل

بسم اللہ ولہ الحمد وصلی اللہ علی رسولہ محمد وآلہ الامجاد۔

بصیرت نبوت کا اعجاز

ہادی دوعالم، رسولِ اعظم، نبی خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات با برکات جس قدر متنوع فتوحات ومعجزات کی حامل ہے کما حقہ اس کی عظمت وافادیت کا ادراک دشوار ہے۔ ولادت باسعادت ظہور قدسی سے بعثت اور اعلانِ رسالت سے ہجرت تک حضورؐ کی سیرت وکردار کے بے شمار پہلوسب کے سامنے آئے، دشمنوں نے انھیں دشمنی کی بنا پر چھپایا اور ان کا تذکرہ نہ کیا یا پھر ان کی ذہنی افتاد ان حقائق کو دریافت ہی نہ کرسکی جن سے راستے منور ہوتے، بہت سے چھوٹے بڑے مشاہدات دوستوں کے تھے مگر وہ لوگ "عیاں راچہ بیاں" سمجھ کر روایت نہ کرسکے، راویانِ اخبار سیرت نگار حضرات اپنے اپنے رجحان کے مطابق بات کرتے اور واقعات لکھتے رہے، مگر جسے وہ ضروری سمجھے اس کا تذکرہ کیا، جسے بڑا واقعہ جانا اُس کا خلاصہ اور جس کی اہمیت نہ سمجھ سکے اس پر اشارہ ہی کافی جانا۔ اجمال وتفصیل کا یہ دفتر ہر دور میں نکتہ رس آدمی کے لیے فکر وتردد کا باعث رہا۔ وہ جس نکتے کو تلاش کرنا چاہتا ہے اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ اس کے باوجود تاریخ وحدیث وتفسیر، جغرافیہ، سیاست وثقافت کے وسیع مطالعے کے سہارے معاصر حالت وصورت کا ایک خاکہ ضرور مل سکتا ہے، بشرطیکہ واقعات وحقائق کی راہوں سے باحتیاط گذر کر منزل کی بڑی شاہراہ دریافت کرلے۔

اس وقت میرے سامنے "ہجرتِ حبشہ" کا مسئلہ ہے میں سوچتا ہوں کہ ہجرت اولیٰ کا پس منظر کیا تھا؟ یہ ہجرت حبشہ ہی میں کیوں ہوئی؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کیوں نہ فرمائی؟ ہجرت کی تیاری، سمندر اور ساحل کا سفر، راستے اور منزلیں، احوال وواقعات کے کلیات وجزئیات کیا تھے؟ ان نکات وسوالات پر مواد کی کمی جوابات کی مکمل تفصیل مہیا نہیں کرتی۔

چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے حجاز اور اس علاقے کے کسی واقعے پر لکھتے پڑھتے وقت وہاں کی ثقافت وسیاست پر بہت سے محققین کی نظر ہے لیکن مذاہب وعقائد اور ان کے حلقوں کا پھیلاؤ، ان کی باہمی کشمکش پر کم، پھر ان باتوں کے سیاسی زاویے سے معاملات کی صورتِ حال پر بہت کم توجہ کی گئی ہے، تجارتی معاملات وجزئیات پر مترتب ہونے والے اثرات تو سب سے کم زیرِ بحث آئے۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمہ جہت حالات و مسائل سے فائدے اٹھائے اور تبلیغ دین کے لیے کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ دعوت وارشاد، تعلیم وپیام رسانی میں کوئی گوشہ خالی نہ چھوڑا، ہجرت حبشہ بھی انھیں میں سے ایک اہم ترین واقعہ ہے۔

بازنطینی و ایرانی، حکومتوں کی باہمی طاقت آزمائی، یمن پر ایران و روم و حبش کی سعی حصولِ اقتدار کی جدوجہد، پھر عیسائی فرقوں کی باہمی چپقلش۔ حبشے کی جغرافیائی، سیاسی اور مذہبی حیثیت پر غور کیجئے تو ظہورِ اسلام سے لے کر ہجرت حبشہ تک ایک کڑی نظر آئے گی۔ یمن سے مکہ، شام سے مکہ، سندھ و ہند سے مکہ — اور حبشہ سے مکہ تک ایک ربط ملے گا۔

مکہ حجاز و عرب کا مقدس شہر تھا۔ کعبے کی تولیت عرب زعامت کی اساس تھی۔ بیہقی نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے — "كان هذا الامر في حمير فنزعه الله منهم وجعله في قريش" — عرب کی زعامت پہلے یمن کے حمیری خاندان میں تھی، اللہ نے یہ زعامت ان سے لے کر قریش کو عطا کر دی۔ قریش خانہ کعبہ کے متولی اور حجاج کی مہمانداری کے سربراہ بنے۔ قصی نے اہلِ مکہ کی اصلاح و تنظیم کا اہتمام کیا، تجارت کے منصوبے بنائے — قرآن مجید میں قریش کی تجارتی مہم میں ایک اصول کا تذکرہ ہے۔ یہ لوگ سردی میں اور گرمی میں الگ الگ سمتوں کا رخ کرتے تھے۔ موسم کے مطابق سامانِ سفر اور مالِ تجارت لے کر آتے جاتے تھے، اس طرح انھیں قریب و بعید، آسان و دشوار راستوں، تجارتی منفعتوں کے علاوہ اقتصادی و سیاسی و ثقافتی تعلقات کے امکانات بھی معلوم ہو گئے تھے۔ اچھے تاجر ہمیشہ صلح کے پیامی اور امن کے قاصد ہوتے تھے، تمام تاجروں میں قریش کا اعزاز مسلّم تھا۔ یہ لوگ معاملات میں دوسرے قبائل سے ممتاز مانے گئے — قریش کے مراکزِ تجارت شام، عراق اور ایران، مصر اور حبشہ میں تھے۔

خانہ کعبہ میں پورے سال زائر آتے رہتے تھے، لیکن موسمی اجتماع میں خاص کر دُور دُور سے لوگ آتے تھے، منڈیاں لگتی تھیں، کاروباری قافلے میدانوں اور پہاڑوں پر ڈیرے لگاتے، معزز لوگ اپنے دوستوں کے گھروں میں قیام کرتے تھے۔ یمن، شام، حبشہ و مصر، عراق و ایران، سندھ و ہند کے نامور تاجر، امراء مکہ کے خصوصی مہمان ہوتے تھے، ان میں خبروں کا تبادلہ ہوتا، ملک ملک کے احوال معلوم ہوتے، باہمی معاہدات کی بات چیت ہوتی تھی، یہ لوگ اپنے وطن جا کر مکے والوں کے بارے میں اپنے ملک کے تاجروں اور رہنماؤں کو باخبر کرتے، سربرآوردہ اشخاص و افراد اور عوام کے کردار سے مطلع کرتے اور خاص خاص دوستوں کا تعارف کراتے تھے۔

اہلِ مکہ بھی اپنے سفر میں سابقہ تعارف رکھنے والوں اور جہاں جاتے وہاں کے ہم آہنگ افراد سے ملتے اور اُن کی بستیوں میں اُترتے۔ اُن کی منڈیوں میں مال بیچتے اور پھر نئے دوست بناتے۔ ان سے میل جول بڑھا کر نئے روابط پھیلاتے رہتے تھے۔

حبشے کے ضمن میں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہاشم ایک مرتبہ وہاں گئے تھے اور وہاں کے حاکم نجاشی سے ملے تھے۔ اس ملاقات میں انھوں نے قریش کو کچھ تجارتی مراعات بھی دلائے تھے۔ ان کے تجارتی سامان پر ٹیکس بھی معاف کرایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاشم اور اُن کی اولاد کو سرکار دربار تک رسائی حاصل تھی اور بازار کے بڑے بڑے بیوپاری انھیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت حضرت ابوطالب کے وہ خط ہیں جو انھوں نے شاہ حبشہ کو لکھے تھے۔ حبشے والے عیسائی مذہب کے پرستار تھے۔

یمن میں حمیری خاندان یہودی و یہود نواز تھا رومیوں نے حبشہ کی مدد کر کے ایک مرتبہ یمن پر حملہ کروایا اور ۵۲۵ء کے لگ بھگ حبشیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں اُن کا آدمی حاکم ہو گیا تھا۔ ابرہہ نے یمن پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہی فسادی یہودیوں کی اچھی طرح خبر لینے کے بعد عیسائی مذہب کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی۔ یہ لوگ خانۂ کعبہ کی مرکزیت سے خائف تھے۔ اس سے ان کو معاشی، سیاسی اور مذہبی بالادستی حاصل ہونے کی اُمید نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ جب تک کعبہ موجود ہے مکّے پر ان کا قبضہ نہ ہو سکے گا اور اس مرکزی شہر تجارت میں ان کے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔ حبشہ و روم کے سربراہ بھی اپنے اقتدار کی فکر میں تھے۔ وہ یمن کی قربت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان سب حقائق کے پس منظر میں عیسائیوں نے فیصلہ کیا اور صنعاء و نجران میں بڑے بڑے مرکزی گرجے بنانے پر متفق ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح لوگ خانۂ کعبہ کے بجائے ان کے تو تعمیر عبادت خانوں میں آئیں گے۔ مگر یہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا۔ کعبہ کی مرکزیت میں کوئی فرق نہ پڑا۔ آخر ابرہہ نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی ٹھانی۔

ابرہہ کا کعبہ پر حملہ سنہ پانچ سو ستر یا اکہتر عیسوی میں یمن کا حاکم ابرھہ ہاتھی کے ساتھ بھاری فوج لے کر مکہ مکرمہ کی طرف بڑھا، کم و بیش ساٹھ ہزار سپاہی اور قلعہ شکن ٹینک یعنی ہاتھی، خوفناک تیاری تھی، یمن سے طائف تک یہ خبر جنگل کی آگ بن کر پھیلی۔ عرب سردار قوم قبیلوں کو لے کر مقابلے کے لیے تیار ہوئے۔ اعزا زد آزادی کی خاطر جان کی بازی لگانے راستوں میں رکاوٹ بنے، پہلے ایک یمنی سردار ذو نضر کی کمان میں عرب لشکر نے راہ روکی، پھر نفیل ابن حبیب کی قیادت میں قبیلۂ خثعم مقابلے میں آن ڈٹا، مگر ابرہہ شکست پر شکست دیتا، ہاتھی ریلتا، آبادیوں کو روندتا، قبیلوں کو کچلتا طائف کے قریب پہنچا تو بنی ثقیف نے صلاح مشورہ کر کے اپنا وفد ابرہہ کے پاس بھیجا اور عاجزی کا اظہار کر کے مکّے کی رہنمائی کی۔ ان راستہ بتانے والوں میں ایک شخص ابو رغال آگے آگے تھا۔ ابو رغال راستے ہی میں مر گیا۔ اس کی قبر راستے ہی میں بنی۔ عربوں کو اس سے اتنی نفرت تھی کہ جو ادھر سے گذرتا اس کی قبر پر سنگ باری کرتا۔ مدتوں یہ عمل جاری رہا اور عرب غیرت ابو رغال پر نفرین کرتی رہی۔ یہاں تک کہ قبر کا نشان مٹ گیا۔

ابرہہ کی فوج کشی سے سردار قریش جناب عبدالمطلب باخبر تھے۔ انھوں نے نہ تو ابرھہ سے مقابلہ کے لیے جنگی تیاری کی، نہ اس کے استقبال و امن طلبی کا منصوبہ بنایا۔ ان کے باپ دادا نے مکّہ مکرمہ کی زمین اور اس کے تقدس کی خاطر جنگ جوئی کو ہمیشہ ناپسند کیا۔ جنگ کے مقابلے میں صلح اور اختلاف میں معاہدہ و دوستی پر ان کا یقین تھا۔ ان کے طریق حکمرانی میں کسی پر حملہ کا نشانہ تھا نہ کسی حملہ آور کی خوشامد و بالادستی تسلیم کرنے کا خیال۔ اُنھوں نے اپنی دور اندیشی و بصیرت سے خونخوار قبیلوں اور جنگجو پہلوانوں کو امن عامہ پر آمادہ کر رکھا تھا۔ تاجروں کی حفاظت اور قافلوں کے راستے لوٹ مار سے محفوظ رکھنے کے لیے دستور وضع کئے اور لوگوں سے حلف لیے۔ وہ خود تجارتی قافلے بھیج کر اور آنے والے قافلوں کی نگہداشت کر کے قرب وجوار اور دور دراز کے سوداگروں کو اطمینان دلاتے رہتے تھے۔ ابرہہ کو ہاشم اور عبدالمطلب کی نیک نامی اور صلح جوئی، بلند کرداری اور بلند نگاہی کی خبر تھی۔

ابرھہ طائف سے آگے بڑھا تو راستے میں کسی فوجی دستے کو نہ دیکھ کر حیران ہوا، وہ شہر کے قریب پہنچا تو مکے والوں کے اطمینان کا

مظاہرہ دیکھا کہ سرداروں کے اونٹ میدان میں چر رہے ہیں، کوئی سردار، کوئی وفد، کوئی دستہ نہ لڑنے کے لئے ملاقات کرنے آیا۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اونٹ پکڑ لیں، گلے قبضے میں کرنے کے بعد وہ شہر میں داخل ہوا تو شہر خاموش تھا، عبدالمطلب نے لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ ارد گرد کی پہاڑیوں پر چلے جائیں اور قدرت خدا دیکھیں۔ کچھ لوگ کعبۃ اللہ کے قریب حفاظت کی علامت کے طور پر متعین تھے اور بس۔

قریش کی خاموشی دیکھ کر ابرہہ نے اپنے ایلچی کے ہاتھ خود پیغام بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے ہیں۔ ہمارا مقصد اس گھر کو ڈھانا ہے ـــ ایلچی کو سمجھا دیا تھا کہ اگر لوگ تم سے بات چیت کرنا چاہیں تو اُن کے سردار کو میرے پاس احترام کے ساتھ لے آنا۔ ایلچی شہر میں داخل ہوا، اُسے عبدالمطلب کی شان اور متفق علیہ قیادت کی خبر ملی، وہ اُن سے ملا اور ابرھہ کے پاس چلنے کی درخواست کی، عبدالمطلب پورے وقار کے ساتھ ابرہہ سے ملے۔ ابرہہ ان کی صورت و شخصیت دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ مسند سے اُٹھا، استقبال کر کے مسند تک لایا، اُن کے پہلو میں بیٹھا اور ان کی خواہش دریافت کی۔ عبدالمطلب نے اپنے دوسو اونٹوں کی واپسی کا ذکر کیا۔ ابرہہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ کو دیکھ کر جس قدر متاثر ہوا تھا اُتنا ہی آپ کی بات سن کر حیران ہوں، آپ کو اپنے اونٹوں کی اتنی فکر ہے اور اس گھر کی شمہ بھر فکر نہیں جو آپ کے آباؤ اجداد اور دین و دیانت کا ملجا و ماویٰ، مرکز و اساس ہے ـــ عبدالمطلب نے انتہائی اعتماد کے ساتھ جواب دیا ـــ ابرھہ! میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں انھیں کے بارے میں بات کر سکتا ہوں، خانہ کعبہ کا مالک اللہ ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا، ابرھہ نے غیر متوقع جواب سنا وہ عبدالمطلب کی شخصیت، اُن کی عزیمت، ان کے اعتقاد سے مرعوب ہو چکا تھا، اس نے اُونٹ واپس کر دیئے اور عبدالمطلب وہاں سے اُٹھ کر خانہ کعبہ کے پاس پہنچے اور دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر مناجات شروع کی :-

لاھمّ ان العبد یمنعُ رحلہ فامنع حلالک

یا اللہ، بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے گھر کی حفاظت فرما

لا یغلبنّ صلیبھم ومحالھم عدواً محالک

کل ان کی صلیب اور ان کی تدبیریں تیری تدبیروں پر غالب نہ آئیں

ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدالک

اگر تو ان کو اور ہمارے قبلے (کعبے) کو چھوڑنا چاہتا ہے تو تیری جو مشیت ہو وہ کر (طبری، تاریخ)

یارب لا ارجو لھم سواکا

یارب فامنع عنھم حماکا

انّ عدو البیت من عاداکا

امنعھم ان یخربوا قراکا

پروردگارا! میں ان دشمنوں کے مقابلے میں تیرے سوا کسی کا آسرا نہیں رکھتا، پروردگارا اپنے گھر کو ان کے حملے سے محفوظ رکھ۔ جو شخص تیرے گھر کا دشمن ہے وہ تیرا دشمن ہے۔ ان دشمنوں کو اپنے مہمان خانے کو تباہ کرنے سے باز رکھ۔ ابرھہ ابھی شہر سے دُور ہی تھا کہ

ابابیلوں نے حملہ کر دیا ننھی ننھی چونچوں سے مٹی مٹی کنکریاں برسانا شروع کر دیں۔ ابرہہ مع فوج اور فوج ہاتھیوں سمیت فنا کے گھاٹ اُتر گئی۔ حکومت حبشہ کو یقیناً اس واقعے کے تفاصیل معلوم ہوئے ہوں گے اور حضرت عبدالمطلب کے عقیدے سے، ان کی پالیسی اور اُن کی عظمت کی رپورٹ دی گئی ہوگی۔ تاریخ نے کروٹ لی:

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سال دنیا میں تشریف لائے جس سال ابرھہ نے شکست پائی تھی، کچھ عرصے بعد وہ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام کے اُن علاقوں سے گزرے جہاں راہبوں کی کٹیاں اور پادریوں کے گرجے تھے، ان لوگوں نے قافلے میں نبوت کے چاند اور رسالت کے انوار کو دیکھ کر حضرت ابوطالب کو بتایا کہ آپ کے بھتیجے میں آنے والے رسولؐ کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے بتائے ہوئے صفات ان کے چہرے مُہرے سے عیاں ہیں، پیغمبروں کی سیرت اور انبیا کی صورت کے جو تذکرے مقدس کتابوں میں درج ہیں۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حُلیہ ان سب کا جامع ہے ——— یہ باتیں اگر ابوطالب سے ہوئیں تو خود چرچ کے ذمے داروں کو بھی تو اطلاع تھی۔

عیسائیت کے مبلغوں نے نئے پیغام کو سُنا اس کی تہہ کو پہنچے اور اس کی پیش رفت کے بارے میں مذہبی اور قومی سطح پر سوچا، وہ مطمئن تھے کہ قریش اور مکّے کے بڑے بڑے خاندان اسلام کے خلاف کمربستہ اور نبرد آزما ہیں۔ باہمی جنگ و جدال چھوڑ کر رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل پر متحد و آمادہ ہیں، ان کی تبلیغ پر بند باندھ رکھے ہیں، لوگوں کو آپ کے پاس نہیں جانے دیتے، تقریر نہیں سُنتے، بات نہیں مانتے، عبادت سے روکتے ہیں۔ مسلمانوں کا معاشرتی، اخلاقی، ذہنی اور معاشی بائیکاٹ کر رکھا ہے، ان کو جسمانی و رُوحانی اذیتیں پہنچاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ مارتے، جلاتے، پتھروں سے دباتے، دہکتی ریت پر لٹاتے، بال بچوں سے کو سخت تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ بھرے شہر میں ایک دو دردمند یہ عالم دیکھ کر مٹ جاتے ہیں۔ کوئی جماعت ان کی کمک کو نہیں بڑھتی۔ وہ خاموش تماشائی تھے۔

ادھر کارواں آگے بڑھتا رہا۔ جاں نثار مجاہد ثابت قدمی سے نورِ حق کی مشعل لیے راہوں میں چراغاں کرتے، خون کی سُرخی پھیلاتے جارہے تھے اور ایک سے دوسرا چراغ روشن ہوتا اور دلوں کے ایاغ منور ہوتے جاتے تھے۔ پانچ سال کے اندر اندر مکّے میں براہِ راست اور بیرون مکّہ مسلمانوں کے ذریعے اسلام کا چرچا ہو چکا تھا مسلمانوں کی بڑھنے والی تعداد نے قریش کو قتلِ نبیؐ کے آخری منصوبے بنانے پر آمادہ کر دیا، مگر حضرت ابوطالب آڑے آ گئے۔ اب وہ مکمل اقتصادی بائیکاٹ کرنے ہی والے تھے کہ اللہ کی تدبیر فتح کی نوید لے کر آئی۔

ہجرت، ایک نئی جنگ
ایک نئی سیاسی فتح
ایک نئے برِّ اعظم میں داخلہ
ایک اہم انسان دوستی کا اعلان

نگاہ بصیرتِ نبوت، بالفاظ دیگر مشیّتِ پروردگارِ عالم نے اشارہ کیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حبشہ کی طرف

ہجرت کی اجازت دے کر مسلمانوں کو آگے بڑھایا۔

لوگ کہتے ہیں ــــ " قریش کے ظلم و تعدی کے بادل جب پیہم برس کر نہ کھلے تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جاں نثارانِ اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں "۔ میں سمجھتا ہوں کہ بارشِ ظلم و ستم اور نوبت کفر سے گھبرا کر آنحضرتؐ نے اپنے ساتھیوں کو میدان چھوڑنے کا حکم ہرگز نہیں دیا، مہاجرین کی فہرست بتاتی ہے کہ کمزور، لاوارث افراد یا غلام و بے کس لوگوں کو یہ حکم نہیں تھا بلکہ معززین خاندان اور بڑے بڑے گھرانوں کے افراد کو ترکِ وطن کا مشورہ دے کر آپ نے دو جنگی کارنامے انجام دیئے۔

مکّے والے پہاڑی اور میدانی جنگ کے ماہر تھے وہ ایک ایک کو قتل کر سکتے تھے، تھوڑے سے افراد پر بڑی فوج سے حملہ کر کے سب کو تہ تیغ کر سکتے تھے، اب حضورؐ نے اُن کے سامنے نیا نقشہ پیش کیا۔ مکّے کی بندرگاہ سے حبشہ کی طرف ساتھیوں کو بھیج کر دشمن کو للکارا کہ لو اگر بہادر ہو تو سمندر میں بیڑا اُتارو اور سمندر پار جا کر انھیں مار لو، یہ وہاں اکیلے اور نہتے ہیں تم اسلحہ لے جاؤ اور اُن کے سر اتار لاؤ۔

اہلِ مکّہ نے کلمہ گویوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا، لگاتار اذیت دے رہے تھے۔ حضرتؐ نے ان مجاہدوں کو وطن سے دور بھیج کر دشمنوں کی اذیت سے بچایا، انھیں آزادی اظہارِ ایمان و اظہارِ عمل کا موقع دیا اور ان کے دشمن گھروں میں کرب و بے چینی کی فضا پیدا کر دی، خاندان خالی ہو گئے، گھروں کے چراغ دور چمک رہے تھے اور گھر تاریک تھے۔ جنگ میں دشمنوں کو گھریلو پریشانیوں اور ذہنی خلفشار سے دوچار کرنا اعلیٰ درجے کی تکنیک ہے۔ لوگ پیچ و تاب کھاتے رہیں اور حملہ آور سکون سے بیٹھا ان کی بے بسی پر خوش ہو، اور اپنا مشن پورا کرے۔

آنحضرتؐ نے رجب ۵ بعثت، اپریل ۶۱۵ء پہلے تھوڑے سے آدمی بھیج کر نئے ملک کے طور طریقے اور وہاں کی حکومت و عوام کا مزاج سمجھایا، پھر مکمل دستہ بھیج کر ایک اور سیاسی برتری حاصل کی، دشمن نہ سمندر پار کر سکا، نہ حبشہ جا کر کوئی عیسائی منصوبہ بروئے کار لا سکا۔ ایک دو آدمی گئے بھی تو اپنا نقصان اور مسلمانوں کا فائدہ کر آئے۔

اللہ نے اسلام کو آفاقی مذہب بنایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کالے اور گورے انسانوں کے لیے یکساں رحمت تھے۔ آپ پر فرض تھا کہ دنیا بھر میں اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ اس وقت دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں۔ روم اور ایران، دونوں باہم متصادم تھیں۔ شام و عراق، ترکی اور ایران میں جنگ ہو رہی تھی۔ آپ کا پیغام ایشیا کے کے قلب اور یورپ کی سرحد تک پہنچ چکا تھا۔ عیسائیوں، یہودیوں اور بت پرستوں کی وجہ سے ہند و سندھ، ایران و ترکستان، شام و قسطنطنیہ تک بات پہنچ چکی تھی۔ حضورؐ نے برّاعظم افریقہ پر نگاہِ انتخاب ڈالی اور اسلام عرب سے حبشہ میں پہنچا دیا۔ اسلام کا یہ نئے برّاعظم میں داخلہ تھا جہاں آدم و نوح، ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام میں سے کوئی نہیں گیا تھا، وہاں حضورؐ نے اپنے نامزد نمائندے کے ذریعے اسلام کو بھیجا۔ یہ تبلیغ کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔

حبشہ، افریقہ، کالوں کی دنیا اس قوم سے خطاب جسے رنگ کی بنیاد پر غلام بنایا جاتا رہا، جسے بے وقعت

سمجھا گیا، جسے دوست بنانے کے قابل اور برابر بٹھانے کے لائق نہیں سمجھا گیا۔ آنحضرتؐ نے ان سیاہ فاموں کو خطاب سے نوازا، نگاہِ کرم سے سرفراز کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا میں پہلا اسلام لانے والا سربراہِ ملک ایک سیاہ فام بنا۔ اور اسلام کی سب سے اہم اور بنیادی عبادت کا نقیب ایک افریقی، حبشی سیاہ فام بلالؓ کو مقرر کر کے کالوں کو گوروں کی سرداری بخشی۔

ہجرتِ حبشہ، مشکلات سے فرار یا دشمنوں کے مقابلے سے تھک کر آخری راستہ نہیں تھی بلکہ یہ ہجرت انقلاب کی طرف کامیاب پیش قدمی اور سفر کی دوسری منزل تھی۔ مشرکینِ مکہ کو شکست اور مجاہدینِ اسلام کو فتح دینے، ایک حکومت کو کلمہ پڑھوانے اور رسول اللہ کی تدبیر اور اپنی سیاست کا بلند ترین مظاہرہ کرنے کا ایک معجزہ تھی۔

حبشہ حجاز کے سمندر پار افریقہ کا بّرِاعظم ہے بحرِ احمر کی موجودہ بندرگاہ سے کچھ دُور جنوب میں شُعَیبہ نامی بندرگاہ اس دور میں قافلوں کے اُترنے کا اڈہ تھی۔ اس سے قریب ترین ساحل حبشہ کا تھا۔ مملکت کا دارالخلافہ اکسوم نامی شہر بتایا گیا ہے۔ حبشہ کا حکمران نجاشی کہا جاتا تھا۔ اُن دنوں اَصحمہ نامی نجاشی فرماں روائی کر رہا تھا۔ اصحمہ سلیم الطبع منصف مزاج بادشاہ تھا۔ وہ نہ خود کسی پر ظلم کرتا، نہ کسی کے ظلم پر خاموش رہتا تھا، تاریخ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حبشہ کی زمین پسند تھی اور اصحمہ پر اعتماد۔ آپ نے مسلمانوں سے فرمایا:۔ "تفرقوا فی الارض"۔ آپ لوگ زمین پر پھیل جائیں — لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! کہاں جانا چاہیئے تو آپ نے حبشہ (ا ھھوپیا، ابی سینا) کا اشارہ فرمایا۔

پہلا مہاجر گروہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اشارہ ملتے ہی کم و بیش پندرہ آدمی سفر کو تیار ہوئے جن کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) عثمان بن مظعون (۲) عثمان بن عفّان (۳) اُن کی بیوی رقیّہ (۴) ابوحذیفہ بن عُتبہ بن ربیعہ (۵) اُن کی بیوی سہلہ بنت سہیل بن عمرو (۶) زبیر بن العوام (۷) مصعب بن عمیر (۸) عبدالرحمٰن بن عوف (۹) ابوسلمہ بن عبدالاسد (۱۰) اُن کی بیوی اُمِّ سلمہ ابوجہل کی چچازاد بہن (۱۱) عامر بن ربیعۃ العَنزی (۱۲) اُن کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ (۱۳) ابوسبرہ بن ابی رُھم، سہیل بن بیضاء۔ حاطب بن عمرو بن عبدشمس۔ ابوسبرہ کی بیوی، اُمِّ کلثوم۔ عبداللہ بن مسعود اور اُمِّ ایمن کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔

روانگی

یہ لوگ الگ الگ گروپوں میں شعیبہ پہنچے تو کشتیاں لنگر اُٹھانے کو تھیں، نصف دینار فی کس کرایہ دیا، کشتی میں بیٹھے اور بادبان کھلے سفر شروع ہو گیا۔ دشمنوں کو جو خبر ملی تو دوڑے، بندرگاہ پہنچے تو قافلے جا چکے تھے، پیچ و تاب کھاتے ہوئے پلٹے۔ یا تو یہ سوچ رہے تھے کہ انھیں مکے کی پتھریلی زمین اور اردگرد کی پہاڑیوں میں ختم کر دیں گے، آگے بڑھے تو دہکتی ریت میں بھون ڈالیں گے، حضورِ نبی اعظمؐ کی نئی تدبیر نے اُن کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا۔ وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

مہاجرین کا قافلہ راستے میں کن حالات سے دوچار ہوا؟ کتنے دن میں سفر تمام ہوا؟ جیسے سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں،

لیکن تاریخ نگار محمد بن سعد واقدی، طبقات میں صرف یہ بتاتا ہے کہ مہاجرین نے کہا:

"قدمنا ارض الحبشة فجاوزنا بها خير جار، امنا على دیننا وعبدنا الله، لانؤذى ولا نسمع شيئا نكرهه"

"ہم حبشہ میں اُترے تو اچھے پڑوسیوں کا ساتھ رہا، ہم اپنے دین کے پابند تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، نہ کوئی تکلیف پہنچی نہ کوئی بُری بات سُننے میں آئی۔"

ادھر مکے میں مشرکین نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اکسوم میں وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا، طے ہوا کہ اصحمہ نجاشی سے نمائندے ملاقات کر کے تارکین وطن کی واپسی اور اُن کو قریش کے حوالے کرنے پر بات کریں چنانچہ عمرو عاص ربیعہ کے بیٹے کو ساتھ لے کر حبشہ پہنچے، دونوں نے اپنی سی کوشش کی مگر حکومت نے توجہ نہ کی اور دونوں سیاسی نمائندے ناکام لوٹے۔

قریش نے دوسرا سیاسی ہتھکنڈا استعمال کیا اور حبشہ میں یہ افواہ اُڑا دی کہ قریش مسلمان ہو گئے۔ اس خبر کے اثر سے کم و بیش سب مہاجر مکے واپس آ گئے اور تین مہینے (رجب ۵ بعثت سے شعبان ۵ بعثت تک) وطن سے دُور رہنے کے بعد جو گھروں میں آئے تو قریش کے تیور بدلے دیکھے اس لیے آنے والوں نے اپنے اپنے طاقتور دوستوں کے یہاں پناہ لی:

• عثمان بن عفّان نے ابو اُحیحہ سعید بن العاص سے پناہ لی • ابوحذیفہ بن عتبہ نے اُمیّہ بن خلف سے • زبیر بن العوّام نے زمعہ بن الاسود سے • مصعب بن عمیر نے نضر بن الحارث بن کلدہ یا ابو عزیز بن عمیر سے • عبدالرحمن بن عوف نے اسود بن عبد یغوث سے • عامر بن ربیعہ نے عاص بن وائل سہمی سے • ابوسبرہ بن ابی رہم نے اخنس بن شریق سے • حاطب بن عمرو نے حویطب بن عبدالعزّیٰ سے اور سہیل بن بیضاء نے یا تو کسی عزیز سے پناہ لی یا روپوش رہے اور موقع پا کر حبشہ چلے گئے • عثمان بن مظعون کو ولید بن مغیرہ نے پناہ دی تھی، مگر انھوں نے اعلان کر کے پناہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

۶۱۵ء کے آغاز اور ۶ بعثت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک باقاعدہ قافلہ سالار معین کر کے مہاجرین کو حکم سفر دیا۔ کفار نے رُکاوٹیں ڈالیں مگر قافلہ نہ رُکا اور قریش منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس مرتبہ جانے والوں کی جو فہرست مرتب کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

بنی ہاشم
۱۔ جعفر بن ابی طالب
۲۔ اُن کی زوجہ اسماء بنت عمیس خثعمیہ

بنی اُمیّہ میں
۳۔ عمرو بن سعید بن العاص
۴۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت صفوان (بنی کنانہ)
۵۔ خالد بن سعید بن العاص
۶۔ ان کی اہلیہ اُمینہ بنت خلف (بنو خزاعہ)

بنی اُمیہ کے حلیف ۷۔ عبداللہ بن جحش (بنی غنم بن دودان)

۸ - عبیداللہ بن جحش (یہ شخص عیسائی ہو کر مرا)

۹ - اس کی بیوی اُم حبیبہ بنت ابوسفیان - آنحضرتؐ نے نجاشی سے کہہ کر اُنھیں اپنی زوجیت میں لے لیا، اس طرح ابوسفیان جیسے دشمن پر دوہری ضرب لگی۔

۱۰ - قیس بن عبداللہ (بنی اسد بن خزیمہ)

۱۱ - ان کی بیوی برکہ بنت یسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ کنیز)

۱۲ - مُعَیقیب بن ابی فاطمہ (دوسی)

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے

۱۳ - ابو حذیفہ بن عُتبہ بن ربیعہ۔

خلفاء بنی نوفل بن عبد مناف میں سے

۱۴ - عتبہ بن غزوان (بنی قیس بن عیلان میں)

بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی میں سے

۱۵ - زبیر بن العوام بن خویلد } حضرت اُمّ المومنین خدیجہ کے

۱۶ - اسود بن نوفل بن خویلد } بھتیجے۔

۱۷ - یزید بن زَمعہ بن اسود بن مطّلب

۱۸ - عمرو بن اُمیّہ بن حارث بن اسد

بنی عبد بن قصی میں سے

۱۹ - طلیب بن عمیر بن وہب (حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی اروی بنت عبدالمطلب کے بیٹے۔

عبدالدار بن قصی میں سے

۲۰ - مصعب بن عمیر بن ہاشم

۲۱ - ان کے بھائی ابو الرّوم بن عمیر

۲۲ - سُوَیبط بن سعد

۲۳ - جہم بن قیس

۲۴ - ان کی زوجہ اُمّ حَرملہ بنت عبد الاسود (از بنی خزاعہ)

۲۵ - عمرو بن جہم

۲۶ - خزیمہ بن جہم (گویا جہم کا گھر)

۲۷ - فراس بن نضر بن حارث بن کلدہ

۲۸ - عبدالرحمٰن بن عوف

۲۹ - عامر بن ابی وقاص

۳۰ - مطّلب بن ازہر

۳۱ - ان کی اہلیہ رَملہ بنت ابی عوف (از بنی سہم)

بنی زہرہ کے حلیف

۳۲ - عبداللہ بن مسعود (از ھذیل)

۳۳۔ عُتبہ بن مسعود (بھائی)

۳۴۔ مقداد بن اسود (اسود بن عبد یغوث کے متبنّٰی، ان کے اصل والد کا نام عمرو تھا)

۳۵۔ خالد بن حارث

۳۶۔ ان کی زوجہ رَائطہ بنت الحارث بن جبلہ/ حُبَیلہ (از بنی تمیم)

۳۷۔ عمرو بن عثمان، (طلحہ کے چچا)

بنی مخزوم کے افراد

۳۸۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد (آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد اور دودھ شریک بھائی)

۳۹۔ ان کی اہلیہ امّ سَلَمہ بنتِ ابو اُمیہ (جو بعد میں اُمّ المومنین ہوئیں)

۴۰۔ شمّاس بن عثمان (عتبہ بن ربیعہ کے بھانجے)

۴۱۔ ہبّار بن سفیان

۴۲۔ عبداللہ/ عبیداللہ بن سفیان

۴۳۔ ہشام/ ہاشم بن ابی حذیفہ بن مغیرہ

۴۴۔ سلمہ بن ہشام بن مغیرہ (ابوجہل کے بھائی)

۴۵۔ عیّاش بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے بھائی)

بنی مخزوم کے حلیف

۴۶۔ مُعتّب بن عوف (از بنی خزاعہ)

بنی جمح کے افراد

۴۷۔ عثمان بن مظعون

۴۸۔ ان کے فرزند، سائب بن عثمان

۴۹۔ قُدامہ بن مظعون (عثمان بن مظعون کے بھائی)

۵۰۔ عبداللہ بن مظعون " " " " " "

۵۱۔ حاطب بن حارث

۵۲۔ ان کی بیوی فاطمہ بنت مجلّل عامریہ

۵۳۔ ان کے فرزند محمد بن حاطب

۵۴۔ دوسرے بیٹے حارث بن حاطب

۵۵۔ ان کے بیٹے حطّاب بن حارث

۵۶۔ ان کی اہلیہ فُکَیہہ بنت یسار

۵۷۔ سفیان بن مَعمَر

۵۸۔ ان کے فرزند جابر بن سفیان

۵۹ - دوسرے فرزند جنادہ بن سفیان

۶۰ - دونوں کی والدہ اور سفیان کی بیوی حَسنہ

۶۱ - حسنہ کے دوسرے شوہر سے فرزند شُرحبیل بن حسنہ (از بنی یغوث بن مر)

۶۲ - عثمان بن ربیعہ بن اُھبان

۶۳ - خُنیس بن حُذافہ (حضرت حفصہ کے پہلے شوہر)

۶۴ - قیس بن حُذافہ

۶۵ - عبداللہ بن حارث

۶۶ - ہشام بن عاص بن وائل (عمرو عاص کے بھائی)

۶۷ - ابوقیس بن حارث

۶۸ - عبداللہ بن حذافہ

۶۹ - حارث بن حارث بن قیس

۷۰ - معمر بن حارث بن قیس

۷۱ - بشر بن حارث بن قیس

۷۲ - ان کے مادری بھائی سعید بن عمرو (از بنی تمیم)

۷۳ - سعید بن حارث بن قیس

۷۴ - سائب بن حارث بن قیس

۷۵ - عُمیر بن رِئاب

بنی سہم کے حلیف

۷۶ - مُحمِیّہ بن الجزء (از بنی زبید)

بنی عدی کے افراد

۷۷ - مَعمر بن عبد اللہ بن نَضْلہ

۷۸ - عروہ بن عبد العزّیٰ یا عروہ بن ابی اثاثہ بن عبد العزّیٰ

۷۹ - عدی بن نضلہ

۸۰ - ان کے فرزند نعمان

بنی عدی کے حلیف

۸۱ - عامر بن ربیعہ العنزی (خطاب کے متبنّیٰ)

۸۲ - ان کی بیوی لیلےٰ بنت ابی حثمہ (از بنی عدی)

بنی عامر بن لوی کے افراد

۸۳ - آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی ابو سبرہ بن ابی رُھم (برّہ بنت عبد المُطلب کے بیٹے)

۸۴ - ان کی اہلیہ، ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو
۸۵ - عبداللہ بن مخزمہ
۸۶ - عبداللہ بن سہیل بن عمرو
۸۷ - سلیط بن عمرو
۸۸ - سکران بن عمرو
۸۹ - ان کی بیوی سودہ بنت زمعہ (جو بعد میں اُمّ المومنین ہوئیں)
۹۰ - مالک بن زمعہ (سودہ کے بھائی)
۹۱ - عمرہ یا عمیرہ بنت السّعدی
۹۲ - حاطب یا ابوحاطب بن عمرو
بنی عامر کے حلیف ۹۳ - سعد بن خولہ (یمنی)
بنی الحارث بن فہر سے ۹۴ - ابوعبیدہ بن الجراح
۹۵ - سہیل بن بیضاء
۹۶ - عمرو بن ابی سرح
۹۷ - عیاض بن زہیر یا ربیعہ بن ہلال
۹۸ - عمرو بن الحارث بن زہیر
۹۹ - عثمان بن عبدغنم بن زہیر
۱۰۰ - سعد یا سعید بن عبدقیس
۱۰۱ - حارث بن عبدقیس

بعض روایات کے مطابق عثمان بن عفان اور اُن کی اہلیہ رقیہؓ ملالی جائیں تو ایک سوتین افراد ہوتے ہیں۔ ان میں اکثریت بڑے بڑے قبائل اور ابوجہل، ابوسفیان، عتبہ بن ربیعہ، ہندہ، جگر خوار اور نضر بن حارث جیسے سرداروں کے بھائی، بیٹے بیٹیاں ہوئیں، اور دلوں کے چین تھے۔ عمرو بن عاص کے بھائی کی ہجرت بھی ایک سانحہ تھی۔

جعفر بن ابی طالب کی سربراہی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صورت سے مشابہ صورت رکھنے والے بھائی اور تربیت یافتہ شاگرد، سردار عرب جناب ابوطالب کے فرزند حضرت جعفر رضوان اللہ علیہ کو اس قافلے کا سربراہ اور اپنا خصوصی نمائندہ بنا کر ساتھ کیا تھا۔ یہ لوگ حبشہ پہنچ کر منزل گزیں ہوئے۔ تاریخوں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے یہ معلوم ہو کہ آنحضرتؐ نے انھیں تحفے اور ہدیئے دیئے ہوں، بادشاہ اور اُمراء سے ملنے کا حکم دیا ہو، جائز ناجائز روابط کی اجازت دی ہو۔ سردار اور ساتھی عام حالت میں گئے اور عام حالت میں وہاں رہنے لگے۔

قریش کا وفد کچھ دن بعد قریش نے ابوجہل کے مادری بھائی عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن عاص کو نجاشی کے پاس بھیجا۔ یہ لوگ پادریوں، امیروں اور خود بادشاہ کے لیے قیمتی تحفے اور سوغاتیں لے کر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دشمنی میں پختہ عیاری و چرب زبانی میں ماہر، جوڑ توڑ کے استاد، سمندر سے ساحل پہنچے، کچھ دم لے کر مذہبی و سیاسی رہنماؤں سے ملنے نکلے، ارکانِ سلطنت اور زمام بر آوردہ لوگوں کو تحفے دیتے اور ہموار و ہمنوا کرتے پھرے، جب دل لئے ہموار کرلی تو بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پہلے عرب سرداروں کے تحفے نذر کئے، پھر کہنے لگے:

"ایّها الملک! إنّه قد ضوى الی بلدک منا غلمانٌ سفهاء فارقوا دین قومهم ولم یدخلوا فی دینک، وجاؤا بدین ابتدعوها لا نعرفه نحن ولا أنتَ۔ وقد بعثنا الیک فیهم اشراف قومهم من آبائهم واعمامهم و عشائرهم لتردّهم الیهم فهم اعلی بهم عینا واعلم بما عابوا علیهم وعاتبوهم فیه۔"

"بادشاہ سلامت! آپ کے ملک میں ہمارے یہاں کے چند بے وقوف لڑکے چلے آئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے، پھر آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے، جسے نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ۔ ان کی قوم قبیلے کے معززین نے ہمیں آپ کے حضور میں بھیجا ہے، سرکار ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں، کیونکہ وہی حضرات ان کے نگران ہیں۔ وہی حضرات ان پر عائد شدہ الزامات سے باخبر اور ان پر ناراضگی کے وجوہ سے مطلع ہیں۔"

ان کی تقریر ختم ہوتے ہی ان کی سنگت رکھنے والے سردار و امراء بول اٹھے:

سرکار! یہ دونوں سردار سچ کہہ رہے ہیں، جب ان کی قوم کے سردار ان کے عزیز و اقارب ان سے مطمئن نہیں، ان کے خاندان والے انہیں اچھی طرح جانتے ہیں تو انہیں عمرو بن عاص و ابن ربیعہ کے حوالے کر دیا جائے وہ انہیں پکڑ کر واپس لے جائیں۔

نجاشی نے شاہانہ تحمل و شان سے ان کی عرضداشت سنی اور جواب میں کہا:

لاها الله، إذًا لا أُسْلِمُهُمْ الیهما۔	نہیں، خدا کی قسم! ایں تو ان لوگوں کو تمہارے حوالے
ولا یکاد قوم جاورونی ونزلوا بلادی	نہیں کروں گا۔ جو لوگ میری پناہ میں آئیں،
واختارونی علی من سوای حتی ادعوهم	دوسروں کے مقابلے میں مجھے ترجیح دیں،
فاسئلهم عما یقول هذان فی امرهم۔	اُن لوگوں کے لیے تو یہ نہیں ہوگا ـــ میں
فان کانوا کما یقولان اسلمتهم	انہیں بلاؤں گا۔ جو کچھ ان دونوں نے کہا ہے،
الیهما۔ ورددتهم الی قومهم وان	اس کے بارے میں اُن سے پوچھوں گا۔ اگر بات
کانوا علی غیر ذلک منعتُهم	وہی ہے جو یہ دونوں کہتے ہیں تو ان لوگوں کو ان

منہما واحسنت جوارھم ما جاورونی۔ کے حوالے کر دوں گا، انھیں ان کی قوم قبیلے کے پاس بھیج دوں گا اور اگر ان کے کہنے کے برخلاف بات نکلی تو ان دونوں کے مقابلے میں ان کی حفاظت کروں گا۔ اور وہ لوگ جب تک میرے پاس یہاں رہیں گے میں اچھی طرح امن و پناہ میں رکھوں گا۔"

حبشہ کے بادشاہ نے مختصر لفظوں میں جو کچھ کہا اُسے سیاست و آداب حکومت کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں عمرو عاص اور ابن ربیعہ نے باپ دادا اور قوم قبیلے کی بات ہی نہیں کی تھی اس نے مذہب کے نام پر اشتعال انگیزی کی تھی۔ وہ ان لوگوں کے خلاف مذہبی رہنماؤں کی وساطت سے بادشاہ کو مسلمانوں کے خلاف سخت اقدام پر اُبھارنا چاہتا تھا، لیکن دانشمند حکمران نے منطقی جواب دے کر انصاف کی راہ نکالی۔

جعفر اور اُن کے ساتھی، آنحضرتؐ کی طرف سے نہ تحفے لائے تھے نہ کوئی خط اور درخواست، قریش کے وفد سے بھی نہیں ملے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی وفد یا خط بھیج کر کوئی منبادل قدم نہیں اُٹھایا، گویا حضورؐ کو مہاجرین کے نائد پر بھروسا تھا، اور حضرت جعفر کو اللہ پر یقین و توکل۔ انھیں قرآن مجید کی تعلیم یاد تھی:

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶۔ العنکبوت)	اور اہل کتاب سے بحث و مناظرہ نہ کرو مگر شائستہ و عمدہ انداز سے۔ ان لوگوں کے سوا جنھوں نے ظلم کیا ہو اور اُن سے کہو ہم اس کتاب پر بھی ایمان لائے جو ہم پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو تم پر نازل ہوئی اور ہمارا تمھارا اللہ ایک ہے ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش

مسلمان اطمینان سے بیٹھے تھے کہ دربار سے طلب آئی، وفد کے قائد حضرت جعفر ایک دو افراد کو لے کر دربار میں پہنچے تو عیسائی علما، اپنی کتابوں کے ساتھ، قریش کے دونوں نمائندے، شاہی فوج کے افسر، ارکان سلطنت اور بادشاہ اپنی اپنی مسندوں پر بیٹھے تھے، بادشاہ نے جعفر کی طرف روئے سخن کیا:

——— یہ کیا سننے میں آیا؟ کیا واقعی تم نے اپنے باپ دادا کا دین بھی چھوڑا اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے؟ کیا وہ نیا دین ہمارے مذہب جیسا ہے نہ دوسرے مذاہب کی طرح!

جعفر ابن ابی طالب:

جناب! ہماری قوم جاہلیت میں مبتلا تھی، بتوں کو پوجتی، مُردار کھاتی، بیہودگیوں کا ارتکاب کرتی، پڑوسیوں کا حق چھینتی تھی، طاقت وروں نے کمزوروں کو دبا رکھا تھا ——— ان حالات میں ——— اللہ نے ہماری قوم میں ایک نبی مبعوث فرمایا، اس کے نسب، اس کے کردار، اس کی امانت و صداقت اور پاک دامنی میں کسی کو کبھی کوئی شک نہیں ہوا۔

اسلام کا تعارف اس رسولؐ نے توحید کی تعلیم دی، پتھروں کی پوجا اور باپ دادا کا طریقہ چھوڑنے کو کہا:
(۲) ہمیں سچ بولنے، امانت داری، صلۂ رحم، ہمسایوں سے حُسنِ سلوک، خواتین کی حفاظت اور اپنی ذات کے تحفظ کا حکم دیا۔
(۳) فحش باتوں، جھوٹ، مالِ یتیم کھانے، عورتوں پر اتہام لگانے سے روکا۔
(۴) وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ اللہ کو ماننے اور اس کی اطاعت کا پابند کیا،
(۵) نماز، زکوٰۃ جیسی عبادتیں بجالانے کو کہا۔

ہم نے ان باتوں کو مانا، ایمان لائے، جو حکم اللہ کی طرف سے آتے ہیں ہم اُن کی پیروی کرتے ہیں، اور وحدہ لاشریک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کا کسی کو شریک نہیں مانتے، جو باتیں محمدؐ نے حرام فرمائی ہیں اُنھیں حرام، جو حلال بتائی ہیں اُنھیں حلال جانتے ہیں۔

یہ باتیں ہماری قوم کو گوارا نہیں، وہ ہم پر ستم کرنے لگے، ہمیں تکلیفیں دیں، دین سے برگشتہ کرنا چاہا، اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت چھڑوا کر بتوں کی پوجا کروانا چاہی، بیہودہ باتوں کو حلال منوانے کی کوشش کی۔

"جب انھوں نے ہمارا گھیراؤ کر لیا، ہمیں حد سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، ہمارے دین میں رُکاوٹ ڈالی تو ہم آپ کے ملک میں آگئے، ہم نے آپ کی حکومت کو دوسری حکومتوں پر ترجیح دی، ہم اُمید کرتے ہیں یہاں کوئی زبردستی نہ ہو سکے گی۔"

جعفرؓ کی شخصیت، تقریر کا زور، حقائق کا بیان سُن کر نجاشی اور اہلِ دربار بہت متاثر ہوئے۔ بادشاہ نے ایک اور سوال کیا:

اچھا، خدا کا کوئی پیام یاد ہے؟

جی ہاں!

سناؤ!

جنابِ جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت شروع کی:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کٓھٰیٰعٓصٓ ۝ ذکر رحمۃ ربک عبدہ زکریا.......

........قرآن کی فصاحت و بلاغت، قاری کی رُوحانیت، لہجہ کی تاثیر، انبیاؑ کا تذکرہ، حضرت زکریا، یحییٰ، ابراہیمؑ عیسیٰ اور مریم علیہم السلام کا حال سُنتے سنتے محویت، جذب اور کیف کا سماں بندھ گیا، اسقفوں کا رنگ بدلا، اور آنکھ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، پادریوں کی کھلی کتابوں پر موتی برسے۔ نجاشی نے کہا:

"کتابِ عیسیٰؑ کی قسم! یہ کلام بھی اسی مرکز کا نُور ہے جہاں سے رُوح اللہ کتاب لائے تھے ـــــ جاؤ ـــــ اب تم سے نہ کوئی باز پُرس ہوگی نہ کسی کے سپُرد کیے جاؤ گے۔"

سفرائے قریش کو حکم دیا، آپ تشریف لے جائیں۔
ابن ابی ربیعہ اور ابن عاص منہ لٹکائے، پسینے میں نہائے، غصّے میں بل کھاتے نکلے اور منزل پہنچے حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے:

قال عمرو بن العاص:	عمرو عاص بولا:
واللہ لاتینّہ غدا عنھم بما یستاصل بہ خضراءھم۔	خدا کی قسم، کل میں اُن کے خلاف وہ بات کروں گا کہ ان لوگوں کا سبز باغ جڑ سے اکھڑ جائے گا۔
عبداللہ بن ابی ربیعہ نے کہا:	(ذرا صاحب دل تھا)
لاتفعل فانّ لھم ارحاما وان کانوا خالفونا۔	ہم سے تو یہ نہ ہوگا، آخر ہم ان کے رشتے دار ہیں اگرچہ اُنھوں نے ہماری مخالفت کی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اُنھیں ذلیل یا قتل کروا دیں۔

عمرو عاص: قسم ہے، میں تو ضرور کہوں گا کہ یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بندہ کہتے ہیں۔
دوسرے دن دونوں نمائندے پھر دربار پہنچے، ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بادشاہ سے کہا:

عالی جاہ! یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ و مریمؑ کے بارے میں بڑی سخت بات کہتے ہیں، کسی کو بھیج کر دریافت کیا جائے کہ آخر اس سلسلے میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟

شاہی ہرکارہ بھیجا گیا، جعفر حاضر ہوئے۔ نجاشی نے پوچھا:
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم لوگوں کا کیا عقیدہ ہے؟
جناب جعفر: ہمارے نبیؐ نے وحی کے ذریعے ہمیں جو کچھ بتایا وہی ہمارا عقیدہ ہے۔ ہمارے نبیؐ نے فرمایا:
"وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول، روح الٰہی اور کلمۃ اللہ ہیں جو اللہ نے مریم بتول کو مرحمت کیا۔"
نجاشی نے جھک کر ایک عصا اُٹھا کر کہا:
تمہارے اور ہمارے عقیدے میں اتنا بھی تو فرق نہیں ہے۔
نوجی سرداروں کے بگڑتے تیور دیکھ اصحمہ نے کہا:
مجھے تمہارے تیوروں کی پروا نہیں۔
پھر مسلمانوں کی طرف رُخ کیا:
"آپ لوگ میرے ملک میں اطمینان سے رہ سکتے ہیں جو آپ کو بُرا کہے گا سزا پائے گا، جو بھی ناسزا کہے گا اُسے جرمانہ ہوگا، جو بگاڑ کرے گا مزا بھگتے گا، آپ میں سے کسی آدمی کو دُکھ دینے کے عوض اگر سونے کا پہاڑ بھی ملے تو میں قبول نہ کروں گا۔"

——— ملازمین بارگاہ سے متوجہ ہو کر :

ان کے ہدیے واپس کر دو ، ہیں رشوت لینے کو تیار نہیں ۔

——— دوسرا بیان :

حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضؓ کے علاوہ ، ابن مسعود نے بھی دربار نجاشی کا واقعہ بیان کیا ہے ۔ وُہ موقع کے گواہ تھے اس لیے اُن کی روایت سے کچھ باتیں اور معلوم ہوتی ہیں :

قریش کے دونوں سفیروں نے دربار میں نجاشی کو سجدہ کیا ۔ اس کے بعد دائیں بائیں بیٹھ گئے ۔ معروضات پیش کرتے ہوئے کہنے لگے ۔ ہمارے بنی عم میں سے کچھ لوگ آپ کے ہاں آئے ہیں ۔ یہ لوگ ہم سے اور ہمارے دین سے الگ ہو چکے ہیں ——— نجاشی نے شکایت سُننے کے بعد مہاجرین کو بُلایا ۔ حضرت جعفر نے ترجمانی کی ذمّے داری لی ، یہ لوگ حضورِ شاہ میں پہنچے ، حضرت جعفر نے فقط سلام کیا ، درباریوں نے ٹوکا ——— سجدہ کیوں نہیں کرتے ؟ حضرت جعفر نے کہا ۔ ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا کرتے ۔ اس کے بعد بادشاہ کے سوالوں کے جواب دیئے ، آنحضرتؐ کے بارے میں اپنا عقیدہ بتایا ، احکام اسلام کا تعارف کرایا ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کا تذکرہ کیا ——— نجاشی نے کہا :

> "خدا کی قسم ! حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ ہم کہتے ہیں تم لوگ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے ۔ تم پر اور اُس شخص پر مرحبا جس کے پاس سے تم یہاں آئے ہو ——— میں ان کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہوں ۔ وہی ہیں جن کا تذکرہ انجیل میں موجود ہے جس کی بشارت حضرت عیسیٰ[۱۴] نے دی تھی ۔"

خدا کی قسم ! اگر میں بادشاہی کی ذمہ داریوں میں نہ گھرا ہوتا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ، اُن کی جوتیاں اُٹھاتا ، اُن کو وضو کراتا ۔

خود حضرت جعفر نے اپنے فرزند عبداللہ سے کہا :۔

قریش کے وفد نے جب ہمارے خلاف بیان ختم کیا اور ہم جواب اور اپنے عقائد کی تفصیل ختم کر چکے تو نجاشی نے اُن سے پوچھا :

کیا یہ لوگ تمھارے غلام ہیں ؟

نہیں !

کیا یہ قرض دار ہیں ؟

نہیں !

تو پھر تم لوگ اُن کا تعاقب چھوڑ دو ۔

حضرت جعفر کا بیان ہے کہ عمرو ابن العاص کی گفتگو اور ہماری تقریر کے بعد اصحمہ نے پوچھا :

یہاں کوئی تکلیف تو نہیں دیتا ؟

ہم نے کہا ـــــ ہاں ـــــ بادشاہ نے حکم دیا کہ منادی کر دی جائے کہ جو کوئی ان لوگوں کو ستائے گا اُسے چار درہم جرمانہ کیا جائے گا ـــــ پھر ہم سے پوچھا ـــــ کافی ہے ؟ ـــــ ہم نے کہا نہیں، بادشاہ نے کہا ۔ اچھا اس سے دگنا جرمانہ ہوگا ـــــ (ابن ہشام و مجلسی و مودودی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح پائی، شرک باطل ہوا، توحید کا بول بالا ہوا، قرآن کا کلمہ پڑھا گیا حضرت عیسیٰؑ پر بہتان ختم ہوا۔ دین کے عقائد و اعمال کی تبلیغ ہوئی چھوٹے چھوٹے سرداروں کے عوض اللہ نے ایک باقاعدہ حکومت کو حامی بنا دیا۔ عمرو عاص و ابن ابی ربیعہ ناکام لوٹے ۔

یہ سب ام سلمہؓ کا بیان اور ابن ہشام اور ابن کثیر کی نقل ہے ۔ (السیرۃ ۱/۳۳۶، ابن کثیر، التاریخ ۳/۷۴)

ابن ہشام ہی نے حضرت ابوطالب کا ایک منظوم خط بھی نقل کیا ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب نے سنجاشی کو نجی طور پر اپنے روابط اور جناب جعفر کو وہاں پہنچنے پر توجہ دلائی تھی اور ان کے دشمنوں کے اقدامات و نتائج کے بارے میں خود بادشاہ سے جواب طلب کیا تھا ۔

خط کے بے ترتیب پانچ شعر یہ ہیں :-

الا لیت شعری کیف فی النأی جعفرٌ	وعمرو واعداء العدو الاقارب
وهل نالت افعال النجاشی جعفراً	واصحابه اوعاق ذلک شاغب
تعلّم، ابیت اللعن، انک ماجد	کریم فلا یشقی لدیک المجانب
تعلّم، بان الله زادک بسطة	واسباب خیر کلها بک لازب

وانک فیض ذو سجال غزیرة

ینال الاعادی نفعها والاقارب

کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ اس طولانی سفر دعالم غربت میں جعفر اور سخت ترین دشمن ہم وطن میں کیا کیا مقابلے ہوئے ؟

آیا نجاشی کے کردار و اخلاق سے جعفر اور اُن کے ساتھیوں کو فیض پہنچا یا رکاوٹوں نے اس فیض کو روک دیا ۔

جناب والا، لعنت آپ سے دور، آپ معزز و مکرم ہیں، آپ کی بارگاہ میں آنے والے محروم نہیں رہا کرتے ـــــ

آپ کو خدا نے قوت و قدرت عطا کی ہے ۔ آپ کے پاس ہر اچھائی کے وسائل موجود ہیں ۔

آپ سخاوت کا گہرا اور طوفانی سمندر ہیں جس سے دوست اور دشمن سب فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں (ابن ہشام ۱/۳۵۶)

ابوطالب و امدادِ اسلام

ہجرت حبشہ اور شعب ابوطالب کے واقعے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی بصیرت و کمک نے بھی حدِ کمال ختم کر دی۔ آپ نے اپنے جوان بیٹے کو حبشہ بھیج کر مہاجرین

کاپلہ بھاری کیا۔ خود مکہ میں رہ کر مخالفین کو مرعوب رکھا، نجاشی کو خط لکھے، جس میں ایک خط کے چند اشعار لکھے گئے۔ دوسرا خط تھا ——— شاید باعتبار تاریخ یہ پہلا مکتوب ہو۔

تعلّم ملیک الحبش انّ محمّدًا ——— نبیّ کموسیٰ، والمسیح ابن مریم
اتی بالهدیٰ، مثل الّذی اتیا بہ ——— فکل بامر الله یهدي ویعصم
وانّکم تتلونہ في کتابکم ——— بصدق حدیث لا حدیث المرجّم
فلا تجعلوا الله نداء واسلموا ——— فان طریق الحق لیس بمظلم
وانّکم ما تأتیک منّا عصابة ——— لقصدک الا ارجعوا بالتکرّم

سلطان حبشہ کو معلوم ہوا محمدؐ ویسے ہی نبی ہیں جیسے موسیٰؑ اور مسیحؑ ابن مریم وہ اسی طرح کی ہدایت لے کر آئے جیسے وہ دونوں لائے تھے، ہر نبی اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل کرتا اور حفاظت میں رکھا جاتا ہے۔ آپ لوگوں نے ان کا حال اپنی کتاب میں پڑھا ہے سچی بات ہے، اٹکل کی رائے نہیں ——— اللہ کا کسی کو حریف نہ بناؤ، اسلام قبول کرو، حق کا راستہ تاریک نہیں ہوتا۔ یہ گروہ جو ہمارے یہاں سے آپ کے پاس آیا ہے وہ اس لیے آیا ہے کہ آپ انھیں عزت و احترام سے واپس کریں۔ (ابطالب مومن قریش: عبداللہ خنیزی ص ۱۸۲)

حبشہ کے عیسائیوں کے وفد کی روانگی

رسول اللہ کی تعلیمات وصفات، اسلام کے حقائق وتفاصیل سن کر عیسائی حلقوں میں چرچے ہونے لگے۔ پادریوں نے تحقیق احوال کے لیے ایک وفد تیار کیا اور بیس تیس علماء و زعماء مکے روانہ ہوئے۔ مکے پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشست و برخاست آپ کے عادات و اطوار کا جائزہ لیا، پھر حاضر خدمت ہوئے، سوال و جواب کے بعد آنحضرتؐ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں ان میں ایک آیت تھی:۔

واذ قال الله یٰعیسیٰ بن مریم اذکر نعمتي علیک وعلیٰ والدتک اذ ایدتک بروح القدس تکلم الناس في المهد وکهلاً واذ علمتک الکتٰب والحکمة والتوراة والانجیل واذ تخلق من الطین کهیئة الطیر باذني فتنفخ فیها فتکون طیرا باذني ...... (المائدة آیت ۱۱۰)

(جس دن اللہ رسولوں کو جمع کر کے اُن سے فرمائے گا ....) اور عیسیٰؑ ابن مریم سے خطاب ہوگا۔ تم اس نعمت کو یاد کرو، جو میں نے تمھیں اور تمھاری والدہ کو دی، ہم نے روح القدس سے تمھاری تائید کی، تم جھولے سے لے کر بڑھاپے تک لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔

اور جب ہم نے تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی اور تورات و انجیل، اور جب تم نے میرے حکم سے مٹی سے چڑیا بنائی اور میرے حکم سے اس پر دم کیا وہ میرے حکم سے طائر بنی اور تم میرے حکم سے مادر زاد اندھے کوڑھی کو شفا دیتے تھے اور جب تم میرے حکم سے

مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکال لیتے تھے اور جب تم بنی اسرائیل کے پاس معجزے لے کر آئے اور اس وقت میں نے ان کو تم پر دست درازی کرنے سے روکا تو ان میں سے بعض کفار بولے یہ تو کھلم کھلا جادو ہے۔

وفد کے ممبر آیتیں سن کر شدت اثر سے رونے لگے۔ انھوں نے قرآن کی تصدیق کی اور رسولؐ کو سچا ماننے کا اعلان کیا، یہ لوگ خانہ کعبہ کے پاس سے اٹھ کر آگے بڑھے تو ابوجہل کی پارٹی نے انھیں روک کر بہت برا بھلا کہا، مگر انھوں نے پروا نہ کی، یہ لوگ وطن واپس آگئے تو اور بھی اچھے اثر مرتب ہوئے۔

ایک عجیب واقعہ مہاجرین کے وفد میں عبید اللہ بن جحش نہ معلوم کیونکر داخل ہوگیا۔ اپنے بھائی کی محبت میں یا ام حبیبہ اپنی اہلیہ کے زور دینے سے، چونکہ وہ مخلص نہ تھا اس لیے حبشہ میں عیسائی ہوگیا اس واقعے سے مہاجرین کو سیاسی اور نفسیاتی دھچکا لگنے والا تھا کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دستگیری فرمائی اور نجاشی کو خط لکھ کر ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے عقد کا پیغام بھیج کر مسلمانوں کی عموماً اور حضرت ام حبیبہ کی عزت کو برقرار ہی نہیں رکھا بلکہ کئی گنا بڑھا دیا، ابوسفیان سے یہ رشتہ مزید سیاسی و معاشرتی فوائد کا سبب ہوا۔

خلاصہ و نتیجہ حبشہ کی سیاسی و سماجی تاریخ موجود نہ ہونے کی وجہ سے تفاصیل تو نہیں ملتے مگر نجاشی اصحمہ کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کی روشنی میں وہ ۵ھ بعثت سے ۶ھ ہجری یعنی مکتوب نبویؐ پہنچنے تک اسلام کا حامی رہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا (حیوٰۃ القلوب) اس نے ہدایا بھیجے۔ اس کا فرستادہ شہزادہ بانیبز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں رہا، پھر حضرت علی کی زمین اور ینبع کے چشموں کی نگرانی کرتا رہا۔

(المبرد الکامل ۔ ۳ / ۲۳۸)

ہجرت حبشہ، قریش کے منصوبوں کے لیے ناکامی کا سبب ہوئی، مسلمانوں کو ایک سیاسی طاقت سے یہ کمک ملی کہ یمن کے عیسائی ان کی مخالفت میں وہ نہ کر سکے جو ان سے متوقع تھا، مسلمان دشمنوں کی اذیت رسانی سے بچے، دوسرے برّاعظم میں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ عرب و عجم، سیاہ و سفید کا فرق مٹا اور عوام پر یہ ثابت ہوگیا کہ اسلام تمام انسانوں کی مساوات و آزادی کا حامی ہے۔

آپؐ نے مصائب سے گھبرا کر لوگوں کو ترک وطن کا حکم نہیں دیا بلکہ مصائب سے مقابلہ کرنے کے واسطے، ترک وطن کی مشقت پر آمادہ کیا تاکہ اسلام کا بول بالا ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود بنفس نفیس اس میدان میں کھڑے رہے اور مقابلہ کے سخت ترین امتحانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے۔

آپؐ کی زندگی تضاد کے سانچے سے دور تھی، آپؐ خود پریشانیاں برداشت کرتے رہے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی سعی میں کمی نہ کی، اگر حضورؐ خود حبشہ تشریف لے جاتے تو یقیناً زیادہ عظمت و راحت حاصل کرتے مگر یہ بات حضورؐ کی فطرت بلند کے خلاف تھی۔

ہجرت حبشہ نے نگاہ نبوت کی بلندی، مستقبل پر نظر رکھنے والی بصیرت اور حال سے نپٹنے کی قوت، دشمن کو شکست

دینے کی طاقت، ہر جنگ فتح کرنے کی صلاحیت کا جو ثبوت مہیا فرمایا ہے اس پر مؤرخ و مفکر حیران اور آپ کو نبی آخرالزمان ماننے والے شادماں ہیں۔

مصادر و مراجع

الطبقات الکبریٰ ج ۱	محمد بن سعد الکاتب	بیروت ، لبنان
تاریخ الامم والملوک	محمد بن جریر الطبری	مصر
السیرۃ النبویہ	ابن ہشام	مصر
سیرۃ النبیؐ	شبلی نعمانی	اعظم گڑھ
رسولِ رحمت	غلام رسول مہر و آزاد	لاہور
سیرت سرورِ دو عالم ج ۲	ابوالاعلیٰ مودودی	ادارہ ترجمان القرآن ، لاہور
خطیب قرآن	مرتضیٰ حسین	غلام علی اینڈ سنز، لاہور
حیات القلوب ج ۲	محمد باقر مجلسی	نول کشور پریس ، لکھنؤ ۱۹۱۶ء
منتہی الآمال	شیخ عباس قمی	طہران
حیاۃ محمدؐ	محمد حسین ہیکل ترجمہ امام خان نوشہروی	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۵ء
اسوۃ الرسولؐ ج ۲	اولاد حیدر فوق بلگرامی	کراچی ۱۹۷۷ء

اسلام کا سیاسی و معاشی تصوّر

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

یہ بات بخوبی معلوم و مشہور ہے کہ اسلام محض کوئی مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں ہے بلکہ وُہ زندگی کا ایسا مکمل نظام اور جامع تصوّر ہے، جو ایک منطقی ربط کا حامل ہے۔ ہم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ وُہ ہر بڑے منصوبہ کے بعض اجزا سے اتفاق کرتا ہے اور بعض دیگر حصّوں کو ردّ کر دیتا ہے۔ ہر منصوبہ کا اس طرح مختصر بیان بہ ظاہر کر دے گا کہ کوئی ایسی اہم خرابی یا تو اس کی بنیاد ہی میں موجود ہے یا وہ عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما ہوتے ہیں، اسے فاسد کر رہے ہیں۔

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داروں نے مجرد حریت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تنازع للبقاء میں غیر جانبدار رہ کر اس کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیری اور شخصی حکومتوں کی ظلم و زیادتی سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زر خرید غلامی کی ترویج کی۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق بے سُود ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں سرمایہ دارانہ جماعت نے ان خرابیوں کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی ایسی کوششیں کیں، جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رُونما ہوتی ہیں، وُہ معاشری انتشار و تشتت پیدا کرتی ہیں۔

اسلام حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی ہے اور اس کا فلسفیانہ نقطہ نگاہ خدا پرستانہ ہے زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی اندازے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، ایک روحانی پس منظر، ایک روحانی سطحِ نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصر میکانکی قوتوں کی کار فرمائی نہیں ہے اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تابع ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوشحالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک مہربان، ہمہ داں اور ہمہ تواں ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ قطعاً خیر و خوبی ہے، جس کے طریقہ ہائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان یا دُنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لیے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوشحالی سے قبل اس دنیا کی خوشحالی کے لیے دُعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاقی علت و معلول یہاں اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں، ایسے ہی وُہ اپنے اس عمل کو آخرت میں جاری رکھیں گے۔ اشتمالیت تخلیق کے منجانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے

اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح، تمام مادی مظاہر کی طرح سراسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدایش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح بالکل اس کے برعکس ہے۔ وُہ دعویٰ کے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب ہوتا ہے اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی رُو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اخلاق اور ذہنی نقطۂ نگاہ میں تبدیلی نہیں ہوتی:

ان اللہ لا یغیّر ما بقوم حتّٰی یغیّروا ما بانفسھم۔ (انفال - ۵۳)

خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے نفوس کے انداز بدل نہیں جاتے۔

قرآن مادی طور پر خوشحال قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے، جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہو گئیں۔ قانون اخلاق کے ابدی حقایق پر ایمان نہ لانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انھیں اصلاح کے لیے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں۔ لیکن جب انہوں نے خدا کی نشانیوں کی پروا نہ کی، تو سزا کا دن ان پر آن پہنچا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ "خدا نے خیر و شر کی میزان قایم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔" تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے اور تاریخ کا اشتمالی نظریہ اس کی مادیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر باہم ایسے متخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لیے مارکسی، اشتمالی بننا ناممکن ہے۔

فاشستوں نے محض پیدایش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے مبدل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بجز بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے، جو دورِ وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے اور کچھ نہیں "غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہو میرا وطن ہے"۔ فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے اور بطور فوق الفرد ہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقت ور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے۔ باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے اور طاقت ور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔ لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے پر مشروط ہے:

لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔

اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندہ ملک برسرِ عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔ اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آنحضرتؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے، تو وُہ اپنے انتقام کا حق خود آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ بارہا بلا رو رعایت داد خواہی کے لیے عدالت میں بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے حاضر ہو چکے ہیں۔

اسلام شوریٰ کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز معاملاتِ حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کے اوصافِ حسنہ ہی سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے اور وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے، بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو اُمتِ وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے، جو انتہاؤں میں ہمیشہ خیرالامور اوسطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریہ حیات کے مشابہ ہے۔ جن کا قول تھا کہ زیادتی میں کچھ بھی نہیں، خیرالامور اوسطہا کا اصول ارسطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہے جس نے رینان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے۔ یہ فرشتوں کے لیے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصل فطرت کو مع اس کی تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات زندگی کے لیے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم وضبط میں لانے کے لیے ہیں، فنا کرنے کے لیے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج وافسوس کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

"جب میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارات میری شعوریت میں جاری وساری رہتے ہیں۔ لیکن جب میں آپ سے دُور رہتا ہوں، تو میری اخلاقی سطح یکایک پست ہو جاتی ہے۔ میں اپنی حالت پر کس قدر افسوس کرتا ہوں۔"

اس کو سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہیے۔ تم انسان ہو، فرشتہ نہیں ہو۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے، جو اخلاقی کشمکش سے آزاد ہوں، تو وہ ملائکہ کو یہاں بساتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے۔" یہ سن کر آپ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔

انسانی اصلاح و ترقی کے بعض عظیم پروگراموں کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے۔ ان اصلاحی تجاویز میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں، جو اسلامی غیبیات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان سب میں جزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزاء کے اخفاء کے ساتھ چند اجزاء پر تشددانہ تاکید نے انھیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام و خاسر رکھا ہے۔ حریت پسند عومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو اسلام کی جزو لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے، لیکن نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقاید و اعمال کو اب تک فاسد کر رہے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے، نہ اسلام اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کر سکتا ہے جس میں سُود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے حاشیۂ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی آزادی کے ساتھ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ ضمیر کی تعلیم دی تھی۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کے اساسی اصولوں میں سے ایک ہے۔ مغربی عومیت شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی حکم کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن وہ باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے، جن کا خاص مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی

مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے۔ جس کا معین مقصد بے اعتبار کرنا اور برسرِ اقتدار جماعت کو بالآخر
بے دخل کرنا ہے۔ اشتمالیوں اور فاشستوں دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سرپھٹول کو ترک کر دیا اور صرف ایک کارفرما جماعت قایم کی،
جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہ کیا کرے۔ اسلام کا سارا رجحان ان دونوں متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔
ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی یک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لیے کوئی
آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی
طرح حریت پسند عمومیتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جدوجہد میں صداقت اور عام خوش حالی برطرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی
حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے نمایندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایک آزاد انسان پابند بن جاتا ہے۔ اس طریقہ میں ایک
آزاد خیال انسان اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے، تو نکما سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ سچی اسلامی مجلس
شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے۔ اصحاب فہم و کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دیے یا اکثریت اور اقلیت میں
منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت، مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لیے
طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہیے، جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمائندگی کرے، جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہ
ہوا ہو۔ اس کا انتخاب صرف اس کے علم اور قابلیت کی بناء پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزاء کی، اس کے جملہ تصورات کی تائید کیے بغیر توثیق کرتی ہے۔ فاشسیت
قوم کو ایک عضوی کل میں ڈھالنا چاہتی ہے، جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے، جس سے قومی یگانگت کو
نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آجر و اجیر کے تمام حقوق ملکیت کی پوری نگرانی اور
اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت کچھ ایسی چیزیں ہیں، جو قابلِ تعریف ہیں، لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد ہے
اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوع پرستش بن گئی ہے، جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ
رکھتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعی اور افسانوی وجود کسی قسم کے اخلاقی مقاصد نہیں رکھتا۔ فرد کی اخلاقیت کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا
مقصد طاقت اور عظمت کو برقرار رکھنا اور باشندوں کو بے چون و چرا اور پُراسرار اطاعت کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز
کیا جاتا ہے۔ عالم انسانیت ایک بے حقیقت چیز سمجھی جاتی ہے اور اس کے لیے کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں، فاشسیت
کی رُو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقاء ہوتی ہے جو برتر قوت کے ذریعہ بقاء کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے لیے جنگ
کے لیے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو
جاری کر کے قوم کے اندرونی تصادمات کو رفع کرنے کے بعد یہ مختلف مملکتوں کے درمیان آویزشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسے
یک جماعتی آمریت کی بناء قوت ہے ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی حد بندیوں کو اہم اور
قطعی تسلیم نہیں کرتا اور جملہ بین الاقوامی مساعی امن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات و اصول کی اساس پر جو مختلف مذاہب
یا قومی جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، اُن کے ذریعہ پُرامن تعاون عمل پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں

کی طرف، جو ان میں باہم مشترک ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تعاون عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ فاشسیت نے مجلس اقوام کی اساس کا مضحکہ اڑایا۔ مجلس اقوام اور اس کی جانشین اقوام متحدہ نے نہایت اعلیٰ نصب العین کا اعلان کیا لیکن ان کو روبہ عمل لانے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران تھی اور اس ذہنی ساخت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم اُمید ہو سکتی تھی۔ اوّلاً یہ کہ ان کے لیے انصاف کے ایک کُھلے طریقے پر متفق ہونا ہی دُشوار تھا۔ پھر اگر اتفاق سے وہ راضی بھی ہو جائیں اور انھیں کوئی ایثار و قربانی کرنی پڑے، تو نہ وہ اس کا عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔ مجلس اقوام پر فاشسٹی تصور یہ ہے کہ طاقتور کا یہ حق ہے کہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے، جہاں تک کہ ممکن ہو سکے اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم اور مطیع بنا رہے۔ اگرچہ اندرونِ مملکت آویزشوں کو ختم کر دینے اور قومی یگانگت کو حاصل کرنے کے ناشسٹی طریقوں کی ستائش کی جا سکتی ہے لیکن ایک حقیقی اسلامی مملکت کے لیے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے، جس کا مقصد تمام نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر عالمگیر امن و امان کا قیام ہے۔

قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور موثر انجمن اقوام کی اساس کا اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لیے آپس میں لڑ پڑیں تو غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی کوشش کی جانی چاہیے۔ فیصلہ صادر ہونے پر تمام متخاصم جماعتوں پر اس کی پابندی لازمی ہوگی۔ اگر کوئی جماعت سرتابی کرے اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے، تو تمام جماعتوں کو باہم مل کر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلس اقوام کبھی با اثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکتِ فلاح و خیر جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکت فلاح و خیر کا تصور پیدا کیا ہے مگر ایک تاریخ دان کے لیے اس حقیقت سے انکار دشوار ہوگا کہ مملکت فلاح و خیر کو تشکیل دینے والے اور اسکو روبہ عمل لانے والے پہلے مدبر آنحضرتؐ تھے۔ اس وقت بھی جب کہ انگلستان نے اپنے سیاسی اداروں کو ترقی دی تھی اور پارلیمانی حکومت ایک قابلِ عمل اساس پر استوار کی تھی، تو اس کا زبردست فلسفی ہربرٹ اسپنسر اصول عدم مداخلت کی حامی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا، جو محض ایک پولیس مین کی طرح کارگزار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے تاکہ محصول ادا کنندوں کی طرف سے فوج اور پولیس کو رکھے اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ مملکت کو باشندوں کے قتل، ذاتی نقصان اور چوری و فریب دہی کا بھی انسداد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحت عامہ پر خرچ کر سکتی ہے قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا، جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہیے۔ قانون طلب و رسد بطور خود توازن پیدا کرے گا۔ آدم اسمتھ نے جو معاشیات میں اصول عدم مداخلت کا باوا آدم ہے، حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں پر محدود کیا ہے۔ اس کا قول ہے:

"فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرائض انجام دینے پڑتے ہیں اور یہ ہیں حقیقی اہمیت رکھنے والے تین فرائض جو فہم عامہ کے لیے سادہ اور آسان ہیں:

اوّلاً : معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا ،
ثانیاً : سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و زیادتی سے تا حدِ امکان حفاظت کرنا یعنی صحیح عدل و انصاف قایم کرنا ،
ثالثاً : چند تعمیرات اور چند ادارہ جات قایم کرنا ، جن کا قیام و برقراری کسی فرد یا افراد کی قلیل تعداد کے مفاد کے لیے نہ ہو۔

مملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اٹھانے کی بے روک آزادی عطا کرتے ہیں اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ دیتی ہے۔ مملکت کی طرف سے کوئی علاج تجویز ہونے سے قبل مالداروں اور ناداروں کے درمیان خلیج وسیع ہوجاتی ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال کے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست دان اور انسانیت دوست مفکرین مملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک شروع کرتے ہیں۔ پہلا علاج معاشری عدمِ مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے کے لیے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تھا۔ سرمایہ دار مملکتوں نے اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ رہایش، بیروزگاری کا بیمہ، تندرستی کا بیمہ، وظیفہ پیرانہ سالی اور دیگر متعدد ہمدردانہ تدابیر رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں اور بعض ممالک نے انھیں ایک حد تک اختیار بھی کیا، یہاں تک کہ ہم بیورج کے منصوبہ (BEVERIDGE SCHEME) پر پہنچتے ہیں، جس نے ایک مکمل لائحہ عمل ایک مملکت خیر کے لیے ترتیب دیا ہے۔ یہ رجحانات اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا کس طرح آزمایش و فروگذاشت کے طولانی عمل سے گزر کر درجہ بدرجہ آنحضرتؐ کے تصورِ مملکت کی معقولیت اور صداقت کو دیکھنے کے لیے قریب آرہی ہے۔

سُود کی بابت اسلام کا نقطۂ نگاہ بہت واضح ہے۔ آنحضرتؐ اس پر مُصر تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سُود کا خاتمہ ہوجانا چاہیے۔ اس وقت مغرب کے تمام بڑے معاشیین کسی قدر جھکتے ہُوئے اسی نظریہ کے قریب آرہے ہیں کہ بنک کاری کو قومی بنایا جائے اور سُود پر قابو حاصل کیا جائے۔ کینس نے مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں۔ لیکن اب بھی معاشیین یہ خیال کرتے ہیں کہ سُود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔ اس پر صرف قابو پانا اور پیدایش دولت کے لیے اس کو انتہائی ادنیٰ سطح پر لے آنا چاہیے۔ اسلام سرمایہ کے مالک کو پیدا آور مزدور کے ساتھ حصّہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سرمایہ پیدایش دولت کے ساتھ ناقابلِ شکست طور پر مربوط رہے اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں۔ جب سُود پیدا آوری سے محروم ہوجاتا ہے تو مدیون عام خطرات برداشت کرتا ہے درآنحالیکہ دائن کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ قانوناً اپنی سُودی رقم کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بیکار پڑا ہو زکوٰۃ عاید کی گئی ہے اسلام پیدایش دولت اور تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ہے اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ہے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصّہ حکومت لے لیتی ہے اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ہے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدایش دولت کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رہنا پڑتا ہے کہ دولت ساری ہیئت اجتماعیہ میں سرایت کیے ہُوئے ہے اور کسی حصّہ میں بیجا فراوانی اور دُوسرے

حصہ میں بے انتہا کمی کا باعث نہیں بن رہی ہے۔ قرآن آگاہ کرتا ہے:

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیآء۔ (حشر۔ ۷) خبردار! دولت صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

بے محنت کے کمائی ہوئی دولت زیادہ تر سُود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائداد کی وصیت سے بھی جمع ہوتی ہے۔ حقِ ملکیت اور ذاتی جائداد کے اصول کو عطا کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دُوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تحفظات کر دیے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ہے اور بخیل و بے حس مالداروں کو مطعون کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا، جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی پند و موعظت سُود مند نہ ہو گی، جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ از سر نو ترتیب نہ دیا جائے۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار ناکافی ہے۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وُہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے۔ پھر خیرات کی ارادی اور جبری خیرات میں تقسیم کی گئی ہے۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکوکار اپنی ضرورت سے زاید کوئی چیز نہیں رکھتے، وہ اندوختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زاید دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ زکوٰۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے، ہر قسم کی مصیبتوں میں امداد کے لیے ہے۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تنبیہ سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عبادتیں جو زکوٰۃ یا خیرات نہیں دیتے، خدا کے پاس بے اثر اور ناقابل قبول ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کس مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے اور کس حد تک اس پر محصول عاید کیا جائے۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضاء اور مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی رُو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مضرت کا موجب ہوتی ہے اور غریب، مفلوک الحال، بے بس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے جس سے پورا معاشرتی نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور نیز افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں۔ جو جماعت اس کی پابندی کرتی ہے، وہ پاک ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ اصلی خوشحالی بجز اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کارکردگی اور ترقی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا محور ہے۔ آنحضرتؐ کو تمول اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا، آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اہم مقاصد میں سے بیان فرمایا ہے۔ متعدد دیگر مذاہب نے افلاس کی مدح سرائی کو روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اندازِ فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلط مبحث کا نتیجہ ہے۔ سادہ زندگی کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی اور اس پر عمل کر کے دکھلا دیا۔ لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دُور رکھے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

الفقر سواد الوجه فی الدارین۔ افلاس دونوں جہانوں میں موجبِ رُوسیاہی ہے۔

جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپؐ دولت کی افزونی سے ہراساں تھے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے تمول سے اندیشہ ہے۔"

آپؐ کے بعد جب ایران فتح ہوا اور بیش قیمت مالِ غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے، تو آپؓ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ کسی نے دریافت کیا، اے امیرالمومنین! یہ محل شادمانی اور مسرت کا ہے نہ کہ غم و اندوہ کا۔ اس پر خلیفہ نے ارشاد فرمایا: "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اسلام کے لیے خطرہ نہ ثابت ہو۔" یہ اظہارِ خیال اسلام کے ان مخالف اور جاہل نکتہ چینوں کی آنکھیں کھول دے گا، جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مالِ غنیمت کی محبت سابقین اسلام کی جنگ آزمائیوں کا بھی اصل محرک بنی ہوئی تھی۔

زکوٰۃ کا آئین، جو اسلامی مملکت خیر کا ایک محوری نقطہ ہے۔ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"صرف زکوٰۃ کی ادائی ہی میں تمہارے اسلام کو بناہ مل سکتی ہے۔ اپنے مال و دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ تمھیں پاک و صاف بنائے گی اور تمھیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی، جو تمہارے رشتہ دار ہیں۔ سائل، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے باخبر رہو اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو۔ جو قوم زکوٰۃ کو موقوف کر دیتی ہے، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ بغیر زکوٰۃ کے اللہ کے نزدیک نہ ایمان قبول ہے نہ عبادت۔"

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں۔ اگر وُہ زکوٰۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتتی ہے کیونکہ اسلام کی رُو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں اور اجتماعی فلاح بغیر زکوٰۃ کے ناممکن ہے۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی میں بطور ایک ضروری عنصر کے شامل کیا جائے۔ لیکن یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کرلیں گے اور دُوسرے بے نوائی اور افلاس میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ اس لیے طریقہ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہیے۔ اسلام کی سیاسی کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقہ اثر میں بلا اسلام کی رُوح کو بخوبی سمجھے اور اخذ کیے بسرعت داخل ہونا شروع ہُوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ وُہ ایمان لے آئے ہیں، تو ان سے کہا جائے کہ انھوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا ہے اور ایمان ایک قلبی اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متحیر تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے، جو خود کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں اور نماز ادا کرتے ہوں اور خلیفہ کس طرح اہلِ ایمان کے خلاف برسرِ جنگ ہو سکتا ہے۔ ابتداءً یہ خیال حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی تھا۔ لیکن اس خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ بغیر زکوٰۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نمازیں ادا کرنا لیکن بہبودِ عامہ میں حصہ نہ لینا اور اس کے لیے ایثار و قربانی نہ کرنا فی الواقع ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا: میں ان سے لڑوں گا، جنھوں نے اس محصول کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی اعلیٰ بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی اور واقعۃً ایک خونریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقامِ افسوس ہے کہ ما بعد زمانوں میں یہ لازمی محصول، جو فلاحی مملکت کا سرمایۂ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم مملکت کے ذریعہ ہونی چاہیے تھی، اختیاری بن کر رہ گیا اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا۔ مغرب کی معاشیات عدم مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لیے افراد کی روشن خیال خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا اور اب اس چیز کو دہرایا جاتا ہے کہ ان وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افراتفری برپا کر رکھی ہے۔ خود مطلبی ایسی روشن خیال ثابت نہیں ہو سکتی کہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہو گئیں۔ حکومت کے اختیار و قابو سے نکل کر زکوٰۃ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا اور بہت سے فلاح و بہبود کے منصوبے بھی انفرادی ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیے گئے۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عاید کی تھی۔ اسلامی حکومت کو ہمہ گیری عفریت بنے بغیر اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لیے ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دلپذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت کر دیا۔ زکوٰۃ ایک محصول ہے، جو سرمایہ پر عاید کیا جاتا ہے۔ یہ دولت کو ان حصوں میں گردش کراتا ہے، جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت کی ربط دہی اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتی ہے اور یہ اصول عدم مداخلت کی نقیض ہے۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمانِ دین اخلاقی پاکیزگی اور عام خوشحالی کے لیے زکوٰۃ کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے، جو اسلام کے ایک دلی صفت مفکر تھے۔ فرماتے ہیں: "اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوءِ فہم نہ ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے۔ ایک تادیب نفس اور دوسرے بے نوائی کے خلاف فراہمی اسباب۔ مال و دولت، بخل، خود غرضی، باہمی عناد، نفرت اور اخلاقی تنزل پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ہے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خود غرضی کا علاج ہوتا ہے۔ یہ معاشی رخنوں کو پُر کرتی اور اس کی جگہ جذبۂ رفاقت پیدا کرتی ہے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگِ بنیاد بن جاتی ہے۔ جب یہ نشوونما پاتی ہے، تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اخلاقی برتری کا نمونہ اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اسی کے معنی تادیب نفس کے ذریعہ اصلاح ذات کے ہیں۔"

زکوٰۃ قومی اور معاشری افلاس کے خلاف ایک نہایت موثر تدبیر ہے، کیونکہ ایک شہری بناء اس وقت تک محکم نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر استوار نہ ہو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ہی کے ذریعہ اپنے محتاج اراکین کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کر سکتی ہے۔ وہ گداگروں کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ نادار، معذور، اپاہج، یتیموں اور ایسے ہی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ہے اور انھیں بھیک مانگنے کی ذلت اور بے عزتی سے بچایا جاتا ہے یہ مملکت ہی کا کام ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرورش و پرداخت کا کفیل ہونا چاہیے۔ مگر یہ بوجھل ذمہ داری اسی وقت قابلِ اطمینان طریقہ پر انجام دی جا سکتی ہے جب کہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکوٰۃ کی صورت میں ایک معتدبہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے۔

قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنائے ہیں، جو زکوٰۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں:

انما الصدقات للفقرآء و المساکین والعاملین علیها و المؤلفة قلوبهم و فی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله و ابن السبیل ط فریضة من الله ط و الله علیم حکیم ۝ (التوبہ - ۶۰)

خیرات غربا، ومساکین کے لیے ہے اور ان کے لیے جو اس کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے، جو جدید الایمان ہیں اور ان کے لیے، جو غلامی اور قرض میں ہیں اور بہ راہِ حق میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لیے ہے - یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے -

غریب اور محتاج کے دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی ایک فہرست بنانا ناممکن ہو جائے گا، جن میں انسان ضروریاتِ زندگی کے لیے اعانت کا خواستگار ہوتا ہے۔حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نا اہل لوگوں کو بلکہ بے روزگاروں کو بھی ان میں شامل فرمایا ہے۔یعنی ایسے لوگ جو کام کر سکتے ہیں لیکن جنھیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔آنحضرتؐ انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے سخت آرزو مند تھے کہ غلامی کے رواج کو برخاست کر دیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ قابل قدر عمل ہے۔چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قایم تھا۔ اس لیے بیک جنبشِ قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا۔چند اعمال کے ارتکاب اور ترکِ فعل کے کفارہ میں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا سلوک کرنے کے لیے آقاؤں سے پُرجوش اپیلیں کی گئیں لیکن اس اصول کی رُو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات افراد کو آزادانہ حق قانون سازی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لے، مملکت پر یہ چیز بھی لازم کر دی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہیے، جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بدقسمتی سے اس حالِ زار میں مبتلا ہو گیا ہو غیر مستحق قرضداری سے رہائی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے۔ فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہِ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔

سرورِ کائنات ﷺ کی حکومت

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

مندرجہ عنوانِ بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور صاف کرنے ضروری ہیں :

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت قایم کرنی چاہتے تھے یا اس سے بھی کسی بڑے مطمحِ نظر کے حصول کے لیے حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؛ عام طور پر حکومت کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں ؛ آنحضرت صلعم کا ماحول، جس میں حکومت قایم کی گئی، کیا تھا؛

آنحضرت ﷺ کا ماحول

چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالت کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعًا ایک ہی ملک تھا، جغرافیائی ، لسانی، نسلی یک جہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، جُوا، زنا، شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں (تفصیل صبح الاعشیٰ از قلقشندی وغیرہ میں دیکھیے) خانہ جنگیاں عام تھیں، جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ حکومتوں کی حمائتیں (PROTECTORATES) قایم ہوگئی تھیں[1]۔ ایک حصہ پر رومن اثر تھا، تو دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی[2] اور یہ اجنبی تسلط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیرِ حمایت حکومتوں میں شاہانہ طمطراق اور کرّوفر پیدا ہو گئے تھے مگر گورنر یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد (جو عربوں کی روایات اور قومی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا)[3] یوم ذی قار میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا۔ جس سے عربوں کے ولولوں میں ایک خاموش محرک پیدا ہوگیا تھا اور وُہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ قسمت سے ان استعماری قوتوں (روم و ایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب عرب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے، جہاں قریش اور قریش بھی عبد مناف کا خاندان سب سے با اقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدت لسانی و خیالی میں بہت مددگار رہتے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی۔ دار الندوہ میں وقتِ ضرورت ان کی "پارلیمان" کا اجلاس ہوتا تھا[4]۔ ان کے خطیب، سفیر، حکم یا ثالث خزانہ دار وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے[5]۔ ملک میں چپکے ہی چپکے ذہنیت ترقی کر رہی تھی اور بیرونی ممالک کے سفر وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاشِ حق پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگ شراب چھوڑ چکے تھے۔ متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔ موحدین بھی غیر موجود نہ تھے۔ انسانی قربانی بند ہو چکی تھی اور

(۱) جملہ حوالے نمبروں کی ترتیب سے مضمون کے آخر میں دیے گئے ہیں۔ (م۔ ح۔ ا)

ایسی منت کا معاوضہ سوا اونٹ مقرر ہو چکے تھے۔ انسانیت پروری کا خیال پھیلنے لگا تھا اور متعدد قبائل نے معاہدۂ حلف الفضول کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لیے قایم کی تھی۔ غرض اس قسم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انھیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اوجِ کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے رو بہ انحطاط تھیں۔

ظہورِ قدسی ان حالات میں ۹ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت (۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء) کو مولانا شبلی کے الفاظ میں "شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم"۔

سرورِ کائنات کا مقصدِ رسالت عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کوشش اور جدوجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ "خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو" اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے، جس میں ظلم معدوم ہو، ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو، دنیا سے بدامنی و فساد دور ہو تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپ کے مشن کے خالص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دورِ رسالت میں اہلِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت و حکومت کی چاٹ دی تاکہ آپ نبوت کے دعویٰ سے باز آ جائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لا دیے جائیں، تو میں تبلیغِ حق سے باز نہیں آ سکتا۔ اس واقعہ سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی، اس کے بعد بھی آپ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور بقیہ چند سالہ زندگی گو سیاسی واقعات سے پُر ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ "میں مکارمِ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور بس"۔

حکمرانی کی تربیت پیدائش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانا، بچپن قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا، ایک جنگ (حربِ فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شامل ہونا، دو ایک تجارتی سفرِ شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نیکوکاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا ———— یہی وہ چند باتیں ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلۂ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا، جو قدیم سے ملکِ عرب کا مرکز تھا۔ آپ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے، اس لیے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قایم ہوتی ہیں؟ قیامِ حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک ارتقاء طبعی ہوتی ہے اور بلا مخالفت'

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) کی اطاعت پر جمع کرلینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے اور جدید اضافۂ ملک یا تو ایسے ممالک کا ہوتا ہے، جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں، یا محض خودسر قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

خودسر قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہوسکتا ہے: یا تو بزور شمشیر یا بذریعہ تدبیر۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موروثی طور سے کسی کو تاج شہر یاری حاصل ہوجاتے تو اس کو محفوظ رکھنا اتنا مشکل نہیں، جتنا بزور بازو کوئی مملکت قایم کرنا۔ مملکت قایم کرکے اسے مستحکم اور پائیدار کرنا، حکومت عدل وانصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا۔ بہر حال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں اور مشکل تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقرا، و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی۔ بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمران تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار۔ (ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی ومحافظ قوی استعماری شہنشاہیتوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا) ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی۔ جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے بیش از بیش ہی ہوتے چلے آرہے تھے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والی اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کو غیر ملکی حمایتوں سے آزاد کرا کے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کی جملہ ضروریات قانونی وانتظامی کو بالکل نئے سرے سے مہیا کرنا اور اندرون ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے دوچار ہونا تھا (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آیندہ بھی اشارۃً ذکر ہوگا) اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قایم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قایم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا، اس سلسلے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

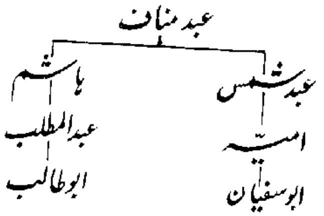
ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج)، ہیں سے ایک بھی آپ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام حکومت کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے۔ آپ کا پہلا اور آخری مقصد بُرے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنا۔ غرض مقصد وحید اصلاح قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، مکر وفریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتھے جمع کیے جا سکتے ہیں اور دولت جمع کی جا سکتی ہے) آپ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کرکے متبعین فراہم کرنے تھے اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداءً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھے، جن سے معمولی امداد تو کیا، خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لیے بے اندازہ اور بلا انتہا مشکلیں پیش آتی تھیں اور آئیں بھی۔ اس پر آپ کس طرح غالب آئے، آیندہ مذکور ہوگا۔

ابتدائے کار چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالا مال ہو کر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (ہونے کا دعویٰ فرماتے ہوئے) آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ عربوں کی سی اجڈ اور پُر نفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا، مکارمِ اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے تبعین کو بھائی بھائی بنا دینا[۱]، یہ آپؐ کا منشا تھا۔ متلاشیانِ حق دوڑ پڑے کہ چشمۂ حیات کا پتا لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے، جو آپؐ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہو گئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آیندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلا اور کچھ اہلِ مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے ان سے عہد لیا کہ "اگر آپؐ کو مدینہ آنا پڑے، تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے۔"[۲]

حریتِ خیال اور آزادیِ تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی، تو اس کی شدت کے باعث آنحضرتؐ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا، یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا، ہر ایسے جبری تارکِ وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ غرض جو بھی ہو، مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا، جہاں سیکڑوں ہی تبعین موجود تھے اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا قریش کی جانب سے عملاً ایک اعلانِ جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انھوں نے اسلام کو تباہ کرنا اپنا قومی مقصد بنا لیا، جیسا کہ بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپؐ کی مخالفت جو اہلِ مکہ کر رہے تھے، اس میں بنو امیہ کا خاندان پیش پیش تھا۔ اور یہ مخالفت پشتینی تھی، کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزند اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے فرزند اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی، لیکن عبد شمس کی اولاد کا دعویٰ باقی رہا اور ہاشم سے ان کا جھگڑا عبد مناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا۔ آخر عبد المطلب اور ابو طالب کی وفات پر بنو امیہ نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لیے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور رہنا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے، اس لیے ان کا مخالفت پر تُلنا گویا پورے اہلِ مکہ کا تُلنا تھا۔



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم چشمک رہا کرتی تھی، خصوصاً اہلِ مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے یہ انتظام فرمایا کہ تمام اہلِ مکہ کا، جو مدینہ منورہ ترکِ وطن کر کے آئے ہوئے تھے، مسلمانانِ مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقدِ مواخات) کرا دیا۔[۳] یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ کارروائی اس جوش و خروش سے قبول کی گئی کہ اہلِ مدینہ نے اہلِ مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا۔ اپنی دولت کا آدھا حصہ انھیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ٹھہرتا۔[۴] اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر و بے بس اہلِ مکہ چین سے بس گئے۔ قبائلی تعصب اور علیحدگیوں کا یک قلم

خاتمہ ہو گیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ و زبان اخوت اور امداد باہمی کی حقیقی رُوح کام کرنے لگی لیکن پھر بھی جو بے اطمینانی اور خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف ہوتے تھے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قائم کر لیا بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کا ضبط (ڈسپلن) اور مل کر کام کرنے اور اُبھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کر دیا۔ عرب یُوں بھی ایک جنگجو قوم تھی، اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یہودی و دیگر عرب قبائل سے) معاہدے کرنے شروع کر دیے[۱]۔ ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کر کے قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:

"۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے قایم چلا آتا ہے، اب بھی قایم رہے گا۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

۴۔ یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

۵۔ کوئی فریق قریش کو امداد نہ دے گا۔ (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے۔)

۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا، تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا، تو دُوسرا بھی شریک صلح ہوگا، لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔"

بنی ضمرہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے،

"یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لیے۔ ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر خداؐ ان کو مدد کے لیے بلائیں گے، تو یہ مدد کو آئیں گے۔"

اسی زمانے میں عید رمضان کے دن فطرہ یعنی غلہ خیرات کرنے کا حکم ہُوا جس پر آیندہ بحث ہوگی۔

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد و فرض یعنی تبلیغ اسلام کا کام بھی برابر جاری رہا اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہلِ مکہ کو کچھ تو اس بات کی جلن تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے صحیح سلامت نکل گئے تھے اور اس سے زیادہ یہ خوف تھا کہ آپ کی روز افزوں طاقت کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لیے سردارانِ قریش مخالفت کا سامان کرنے لگے۔ ادھر سے بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی۔ تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام کیا گیا۔ پتا چلا کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے، جس کے سردار طے کر چکے تھے کہ جملہ منافع "خلاف

مسلمانانِ مہم" کی سربراہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ وجہ کافی تھی۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکّہ اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہو گئی۔ دو ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے[۱۲۵]

آخر جب شام سے قریش کا مذکورہ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا)، تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکّے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ راستہ کترا کر نکل گیا، لیکن اس کی مدد کے لیے جو فوج آئی تھی، اس کی آنحضرتؐ کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ ترحربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاندار فتح ہوئی[۱۲۶]۔ اہلِ مکّہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینہ منورہ چڑھ دوڑے۔ وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی[۱۲۷]، لیکن مکہ والے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کے لیے فتح و شکست برابر رہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابلِ برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی[۱۲۸]، مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دَور شروع ہُوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع ہُوئی۔ اس واقعہ کو جنگِ احزاب یا جنگِ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے[۱۲۹] مگر اب کی بھی برتر فوجی قوت اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا[۱۳۰] اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا[۱۳۱]۔

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پُوری طرح نہ ٹُوٹی تھی اور وہ خیبر کی نوآبادی میں آمادۂ جنگ ہو رہے تھے۔ اس لیے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا[۱۳۲] اور دوسری طرف صلح حدیبیہ میں قریش سے ایک معاہدۂ امن ہو گیا[۱۳۳]۔ لیکن چند روز میں اُدھر سے بدعہدی ہُوئی تو ادھر سے ایک لشکرِ جرّار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔ ظالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے نکلنا اور انتہائی تکالیف و آلام برداشت کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیاً منسیاً کر دیا[۱۳۴]۔ اس کی نظیر سے ہمارے علم میں تاریخ عالم تہی مایہ ہے۔

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً عربوں کو مرکزی حکومت کا فرمانبردار بننا پڑا۔ ہر طرف سے اطاعت کے وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگزاری (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر مقرر کیے جانے لگے[۱۳۵] اور آپؐ کے تدبّر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار جزیرۂ عرب پر پوری طرح قایم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ سے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لیے آپ نے سفارتیں روانہ فرمائیں[۱۲]۔ اور بین الاقوامی (یا صحیح تر اصطلاح بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جنگ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے جس کے ذریعے عرب کی آیندہ سیاست معین ہو گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت اور ایک زبردست مہم کشورکشائی کے لیے فلسطین روانہ ہونے ہی کو تھی[۱۳]۔

حقوق شہریت کا منشور اعظم حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبے دیے، وہ تاریخ تمدن میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تفصیل سیرت شبلی، تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت کے دستور پامال ہیں۔ سب انسان برابر ہیں، عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیزگاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو، غلاموں کو وہی کھلاؤ، جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لغو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمھارا ان (عورتوں) پر اور ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطۂ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہو گے۔ حقوق ترکہ و میراث متعین ہو گئے۔ وارث کے لیے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے، زانی کے لیے پتھر ہیں، جو بچہ اپنے ماں باپ کے سوا غیر اور جو غلام اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعویٰ کرے، اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے "شوہر کے مال" سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے۔ عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہم خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں، اپنے امیر کی اطاعت کرو، چاہے وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو، پانچ وقت نماز پڑھو، مہینا بھر کے روزے رکھو میرے احکام کی اطاعت کرو۔ جنت میں جاؤ گے۔

اسی زمانے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: "آج تمھارا دین مکمل ہو گیا"۔

حکومت کے ارادے حکومت اگر باقی نہ رہ سکے، تو اس کے حصول سے کیا فائدہ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کس طرح اوامرِ الٰہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قایم فرمائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری و پائیداری کے متعلق کیا ارادے قایم کیے گئے۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

استقرار سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم "دنیا و آخرت" دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دیے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے۔ یعنی ہر چیز تو (فقط میری نہیں ہماری ہے لیکن ہم (اور ہیں بھی) خدا کے۔

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے

یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے، تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی چار فرض عین ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں، وُہ علیحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لیے افراد رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے، اس لیے اس اتحاد کی رُوح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی۔ چنانچہ عمومی فرائض سے (سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے) کوئی مستثنیٰ نہیں۔ راعی، بادشاہ اور ادنیٰ مزدور سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو اور ہر سال دُو مرتبہ شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک حربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ اور عسکری تربیت ہے۔ صف بندی قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت، وقت کی پابندی، صفائی و طہارت، صبح تڑکے اُٹھنے کی عادت یہ سب نماز کے جز ہیں۔ ایک حدیث میں (غالباً ابوداؤد میں) ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کو نکلتے تو بلندی پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہتے، نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز کے قیام و قعود اور رکوع و سجود کے اوراد مقرر کیے گئے"۔ نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے، کیوں نہ ہو عماد الدین یعنی دین کا ستون ہے۔

جنگی ضروریات میں سفر کی عادت بہت ضروری ہے۔ حج اسی کا موقع بہم پہنچاتا ہے اس میں ہر سال مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری (یا دُوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی) کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جاتِ مملکت اور اقطاعِ عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موتمر بھی ہے۔ خلیفۂ اسلام کا ایک دربارِ عام بھی ہے، جس میں ہر حصے کی بہترین نمایندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجیے۔ حکومت بغیر مالیے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عشر زراعت حکومتِ اسلامیہ ہی نہیں، ہر حکومت کے لیے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ (Public Property) قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکوٰۃ، عشر، خمس، غنیمت وغیرہ) فقرا و مساکین کی امداد، عہدہ دارانِ متعلقہ کی تنخواہ، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری، رفاہِ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور راہگزاروں کی امداد میں صرف ہوں[29]۔ انفرادیت و اجتماعیت کا بین بین، محنت اور سرمائے اور زمین کی اصلاح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ، ملک سے افلاس کو دُور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے، تو یہی ادارۂ زکوٰۃ و صدقات ہے۔ اور برنارڈشا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں[30]۔

جہاں دنیاوی کاروبار کی تکمیل کے بہت سے ادارے قایم کیے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا، وہیں متعدد احادیث و آیات کے ذریعہ خیرات کی انتہائی تاکید کر کے روحانی و مادی جذبات میں توازن قایم کیا گیا اور "فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة" "دین و دنیا کی بھلائی" عام طور پر ہر فرد کا مطمح نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینا بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں اور یہ سب امور شہریت کی تربیت کے لیے واجب قرار دیے گئے۔

فرائض و مقاصد حکومت کی انجام دہی

جدید اصول قانون میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دیے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظتِ حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں، جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی۔ جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کر دیے جس طرح اب بھی CONSCRIPTION کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے جسے معمول طبیعت میں راسخ کر دینے کے لیے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا، ورنہ جنگی تیاریوں کے لیے قوم کو عام رغبت دلانا کوئی آزاد و مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا۔ اس کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آتے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لیے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں، لیکن حکومت الٰہیہ (سلطنت اسلامیہ) کے قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تاکہ" امن" انتظام اور تمدن کا دَور دورہ ہو اور خوشحالی اور زرفہ کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ" جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قایم کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا، جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضیِ وقت کے روبرو خود بادشاہِ اسلام پر مقدمہ دائر ہو سکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپؐ پر حق ہو، وہ طلب کرے اور جس کسی کو آپؐ سے تکلیف پہنچی ہو، وہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپؐ نے فوری ادائی فرمائی۔ شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دورِ خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا، یہاں ایک تذکرہ بے محل ہو گا، یہاں صرف اسلامی عدلیہ کے خد و خال بیان کرنے ہیں کہ وہ عاملہ یا تنفیذیت سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے سے بادشاہِ اسلام بھی نہیں روک سکتا تا وقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے صریح خلاف نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

" خدا تم کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے"

نیز" اور جب تم لوگوں میں فصل مقدمات کرو، تو عدل سے فیصلہ کرو"

ایسی احادیث بے شمار ہیں، جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور ظلم و ستم پر دھمکی وارد ہے۔ غرض اسلام میں امیر و غریب، آقا و غلام، مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطۂ نظر سے برابر کے حقوق اور وجوہات رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیات خمسؒ (یعنی دین، عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو، تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہ رہتا ہے؛ عدلیہ کے لازمی جزو" شرع اور تشریع" (قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون" شخصی قانون" ہے، یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سالمنڈ" اصول قانون" میں لکھتا ہے کہ:

" مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جا رہا ہے اور شخصی قانون بڑھتا جاتا ہے"

قانون کے استحکام اور تبدل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سائمنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدل پذیر ہونا چاہیے جس سے ذیلی قواعد حسبِ ضرورت بناتے اور بدلے جا سکیں تاکہ قانون ضروریاتِ زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو نہ کہ خارج اسلامی قانون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا قانون مقرر فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر متبدل اصولی احکام ہیں احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے کتاب، وسنت سے مسائل قیاس واجتہاد کی پوری اجازت دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین وضوابط کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی، چنانچہ تعزیرات، ٹارٹ (مرجے اور دیتیں) تحریری صورت پا چکی تھیں۔ انھیں چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطۂ قانون وتشریع کی ابتدا اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وُہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے، تو انہوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو، تو سنتِ نبوی کے موافق اور اس میں بھی پتا نہ چلے تو "اجتہد برائی" یعنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپ کی اُمت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوئے ہیں (ترمذی)۔ ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہوگا اور ایک مسئلے کے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے اور غالباً اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اختلافُ اُمتی رحمۃٌ (یعنی) میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اور الدین یسرٌ۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کارآمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکنے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا، جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا[۱] اور واقعۃً ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گو نظریے کی حد تک اچھا ہو، لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ عملاً قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی بلکہ دنیا اسی کی طرف کھنچی چلی آرہی ہے[۲]، اور مسئلہ توریث، ازدواج وطلاق اور ترک مسکرات میں خاص کر یورپ وامریکہ کا میلان طبع قابلِ ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جواب دہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو سب سے پہلے توریت میں اس کا حکم ہوا[۳]۔ قدیم تر زمانے میں ملزم کے اہلِ خاندان بلکہ اہل قوم بھی جواب دہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریہ قانون میں پیدا کر کے کروڑوں بے گناہوں کو محفوظ کر دیا اور وُہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور حدیث یہی مروی ہوتی ہے کہ:

"انما الاعمال بالنیات"۔ یعنی کام نیت کے مطابق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ متعدد ایسی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور "جایداد" یا "دولت" کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ دولت کی تقسیم میں توازن ہو۔ کے لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم (تاکہ مالداروں



غارِ حرا، جہاں پہلی وحی نازل ہوئی

ہی میں نہ بھرنا رہے) زکوٰۃ، مالگذاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص اجزا ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فصل مقدمات کا نہ صرف مستقل اور باقاعدہ انتظام فرمایا تھا اور نہ صرف قاضیوں کے تقرر اور ان کے لیے شہادت و قضا کے دستور العمل مرتب کیے گئے تھے، بلکہ ساتھ ہی اِفتاء (یعنی پبلک کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانا) اور اصلاح بین الناس (یعنی بیرونِ عدالت جھگڑے رفع کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ۔ شبلی)

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلّاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی دغیر تجارتی ہر قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔ (ایضاً) اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہیے، جو حکومت کے استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دیے۔ حفاظت حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا، اسے جزیہ کہتے تھے۔ مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح و بقا کے لیے یہ تعلیم دی گئی کہ "غیروں پر سخت اور باہم رفیق القلب" نیز "مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت"[۲۸]۔ سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث ضروری ہے۔ اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لیے آیا تھا، اس لیے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے قائل یعنی اہلِ کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاریٰ، مجوس) بُت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہلِ کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض " امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دیے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر اُبھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے[۲۸]، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، جو ارکانِ مذہب ہیں۔ اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے۔ نیز ایک جگہ قرآن میں ہے: "اور نزاع نہ کرو ورنہ فشل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"[۲۹] اس کی فوجی اور ملکی یعنی سول، ضبط یا "ڈسپلن" میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے، ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں مثلاً حلال و حرام غذائیں، درست و غلط معاملات وغیرہ۔ ان کی تفصیل یہاں بے محل ہے، صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹیفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال و حرام، مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے۔ اس لیے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسبِ دلخواہ ہوئی ورنہ امریکہ کا صرف "قانوناً" شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی، اس نظریے سے امریکہ اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کی اصلاحات کا ہے، جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت کے لیے دستور لازمی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک "منتخبہ ذمہ دار ملوکیت" "ELECTED

"RESPONSIBLE MONORCHY" قایم فرمائی، جو ایک بالکل نیا لیکن مسلّمہ طور سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ موروثی کی جگہ منتخبہ ہونے سے
بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکمِ اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جوابدہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں۔
ملوکیت بالاتفاق اس طرزِ حکومت پر بہ لحاظ افادہ مرجح ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو، مگر شرط یہ ہے کہ فردِ مستبد بھی خواہ و بے غرض ہو،
ذمہ دار شاہی جو مشورہ لینے کی پابند ہو، وہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کرتی ہے[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم چونکہ عالمگیر حکومت قایم کرنی چاہتے تھے، اس لیے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو عنتبی حقے میں
ڈال دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قایم کیا، جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی رشتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا
اور بتایا گیا کہ یہی حبل اللہ ہے، اسی کو تھامے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح و بقا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے دشرعی) قانون اور خارجہ سیاست کے، جو مرکزی حکومت سے متعلق تھے اور امور میں
بڑی حد تک صوبہ داری خود مختاری رکھی اور عامل یعنی گورنر کی ذات (جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فرائض کی
کثرت کے باعث عامل، قاضی، تحصیلدار مال تین افراد میں منقسم ہوگئی) صوبے میں بالکل خود مختار تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیابت اور منصرمی کا طریقہ بھی ڈال دیا تھا۔ جب کبھی آپؐ مستقر سے باہر جاتے، کسی کو
اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے تھے[۲] تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قایم
ہوگیا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر تھے[۳] دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسی
سلسلے میں اوپر متعدد صیغوں کا تذکرہ ہوچکا ہے، جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ ان کے
سوا تبلیغ، تعلیم، سِول و ملٹری سروس اور قوانین منضبط متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج، صیغہ خارجہ (دار الانشا وغیرہ) اور صیغہ داخلہ
(مہمانداری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہ مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لیے خاص
ذرائع اختیار فرمائے۔ چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جا بجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا
کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ (تشویق کے سلسلے میں اطلبوا العلم ولو کان بالصین، طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلم
و مسلمۃ، والذین اوتوا العلم درجات، فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں)
غیر مسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قایم فرمائے۔ چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مد اس کے لیے
مختص تھی۔ وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی، اس سے بھی تالیف قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر
کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغِ دین کرے اور
اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں
اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دُور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لیے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔

مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور جزو غیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم،

ائمہ و مؤذنین کے تقرر وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دیے۔

سول سروس ان سب کے ساتھ سول سروس کا ادارہ بھی قائم ہوگیا۔ جہاں گورنروں، قاضیوں، اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا، انھیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دیے جاتے تھے۔ عہدیداران مال کو ہر قسم کے مداخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور پر لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بندوبست و مالگزاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نوآبادی بسانے کے لیے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفادِ عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہو جائیں (شبلی صفحہ ۲)۔ قاضیوں کو خاص کر فوجداری (تعزیری)، اور دیوانی ضابطے مہیا کیے جاتے تھے اور ٹارٹ (ہرجے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے۔ جن امور میں منفرر قصاص معاف کر دے، وہاں منفرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے، معاملات و معاہدات (خرید و فروخت، سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین (قواعد مرتب فرما دیے تھے جن کی ضروری تفصیل و تشریح (ترمیم بھی) وقت بوقت ہوتی گئی۔ ان تمام کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج حکومت کی بقا اور ترقی کے لیے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیاری باش کے زبردست احکام دیے۔ دقت بوقت تیراندازی، گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانب داری، جنگ اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کیا امور ملحوظ رہیں مثلاً آدابِ سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف پلٹنیں، صف آرائی، دشمن کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا، نہ زراعت و عمارات وغیرہ کو تباہ کرنا، تقسیم غنائم، تبادلۂ قیدیاں، قیدیوں سے سلوک، زخمیوں کے لیے دواخانے اور مقتولین سے برتاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دار الانشا یہیں فرامین و توقیعات، معاہدے، مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھائے جاتے تھے اور قرآن مجید مدون کرایا جاتا تھا (قرآن موجودہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پوری طرح مدون ہو چکا تھا۔ "تاریخ القرآن" ۔ پروفیسر مفتی عبد اللطیف جامعہ عثمانیہ)

صیغہ داخلہ مہمانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون و خفیہ پولیس کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔
یہ ہے حکومتِ اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

لہ شبلی۔ سیرۃ النبیؐ جلد اوّل NOLDKE DAS LEBAN MUHAMMAD سدیوکی
دفریخ تاریخ عرب باب ۸،

۲؎ ابن ہشام نیز صبح الاعشیٰ قلقشندی

۳؎ عرب اور ایران کی مشہور جنگ، جو عین زمانۂ ولادت نبوی میں "ذی وقار" نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے۔ دیکھئے سدیو SEDILLOT کی کتاب YLISTORIC GENERALE DES ARABES, LEW EMPIRE, LEW CIVILISATION اور ایام عرب مولفہ شرر وغیرہ

۴؎ شبلی وغیرہ

۵؎ عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تمدن عرب مترجمہ سید علی بلگرامی اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری "تجارت العرب قبل الاسلام"، رسالہ دبدبۂ آصفی بابت رجب و شعبان ۱۳۲۳ھ

۶؎ قرآن مجید: لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا

۷؎ ابن ہشام

۸؎ حدیث: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

۹؎ قرآن مجید: اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

۱۰؎ ابن ہشام

۱۱؎ تفسیر بیان القرآن از محمد علی آیت: والوا الارحام بعضھم اولی ببعض۔

۱۲؎ شبلی صفحہ ا ۲ھ میں یہودیوں اور ۲ھ میں بنی ضمرہ و بنی مدلج وغیرہ سے معاہدے ہوئے۔

۱۳؎ ابن ہشام

۱۴؎ قرآن مجید: اذجاؤکم من فوقکم و من اسفل منکم و اذ زاغت الابصار و بلغت الحناجر و تظنون باللہ الظنونا ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالاً شدیداً۔

۱۵؎ اشارہ ہے بنی تمیم کی مہموں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔ تفصیل ہربرٹ کی کتاب میں ملے گی۔

۱۶؎ فوائد بدریہ از "قاضی الملک بدرالدولہ" شبلی وغیرہ

۱۷؎ قرآن مجید: انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل۔

۱۸؎ مضمون انگلستان کا مذہب آیندہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام۔ لاہور

۱۹؎ سامنڈ کی کتاب "JURISPRUNDENCE" حصہ اول

۲۰؎ قرآن مجید: (ا) ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم

(ب) واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ

(ج) لا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا وغیرہ وغیرہ

حدیث کی کتابوں میں اَن گنت تشویقیں، ثواب، احکام وغیرہ ملتے ہیں۔ صحاح ستہ وغیرہ کا کتاب الجہاد ملاحظہ ہو۔ مثال کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر ممکن ہوتا تو آپؐ اس بات کو پسند کرتے کہ بار بار راہِ خدا میں شہید ہوں۔ آپ نے فرمایا، موت پر ہر شخص کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن شہید کا عمل قیامت تک جاری سمجھا جاتا ہے۔

۲۱ قرآن مجید میں: (ا) ان اللہ یامر بالعدل الآیہ

(ب) واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل الآیہ

۲۲ مسلم الثبوت (اصول فقہ) از محب اللہ بہاری مسئلہ تقریر (سنت نبویؐ)

۲۳ بدایۃ المجتہد از ابن رشد صفحہ ۲ کتاب الدیات

۲۴ ان اللہ عز وجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مأتہ سنۃٍ من یجدد لھما دینھا (حدیث) (ک۔ وق کتب حدیث)

۲۵ امریکہ میں ممانعت شریف برنارڈ کی تصنیف انگلستان کا مذہب آیندہ صدی میں رجحانات سیاسی میں مجلس اقوام کے ذریعے اتحاد و تعاون عالم اور نیز اشتراکیت۔ حج و زکوٰۃ اور اخوت اسلامی کی جانب مائل ہیں۔ روحانیات سے روز افزوں دلچسپی، مغرب کی عیسائیت سے بیزاری، دنیا میں بت پرستی اور شرک سے عام نفرت، ہندی ذات پات اور چھوت چھات سے کراہت، ملوکیت کی جگہ ذمہ دار جمہوریت اور پارلیمانی مشاورت وغیرہ وغیرہ۔

۲۶ باب ہاوز کی کتاب مارٹس ان ایوالیوشن باب قانون اور انصاف۔

۲۷ قرآن مجید: (ا) ھو الذی ارسل رسولہٗ بالھدٰی ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلّہ وکفٰی باللہ شہیدا محمد رسول اللہ والذین معہٗ اشدآءُ علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجّداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذٰلک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل کزرعٍ اخرج شطأہٗ فاٰزرہٗ فاستغلظ فاستوٰی علٰی سوقہٖ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجراً عظیما۔

(ترجمہ) خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے۔ خدا کی گواہی کافی ہے محمد رسول اللہ اور آپ کے ساتھی کفار پر سخت اور باہم نرم، راکع وساجد خدا کے فضل اور رضا مندی کے طلبگار رہیں۔ ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان ہیں۔ توریت وانجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ ایک پودا ہے جس کی شاخ نکلتی ہے جو رفتہ رفتہ مضبوط اور سخت بن کر اپنی ساق پر استوار قایم ہو جاتی ہے اور بونے والے کو باغ باغ کر دیتی ہے، تاکہ کفار کو ان سے جلائے خدا نے ان میں سے مومنوں اور نکوکاروں سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔

(ب) اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین الآیہ

یعنی مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت۔

۲۸؎ قرآن مجید: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول۔ الآیہ

۲۹؎ قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم۔ الآیہ

۳۰؎ حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

۳۱؎

"THE NATION OF LEAVING THE GOVERNMENT OF THE STATE TO DECIDE AND COMPELLING IT ONLY TO CONSULT, SEEMS PREFERABLE....."

GRAMMER OF POLITICS BY H. LASKI P.82 CH. SOVEREIGNTY.

ایچ لاسکی کی کتاب گریمر آف پالیٹکس باب ساورینٹی یعنی اقتدار اعلیٰ:

"یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دے دیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے....."

نبیؐ بحیثیت ایک مدبّر اور ماہرِ سیاست

امین احسن اصلاحی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے لیے جو دین بھیجا، وُہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے، اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وُہ عبادت کے ذریعے بتاتا ہے، اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے، اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے، اتنا ہی اس کا تعلق حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی، اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو جاری و نافذ بھی کر دیا۔ اس وجہ سے حضورؐ کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکّی نفوس اور ایک معلّمِ اخلاق کے ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے، اسی طرح بحیثیت ایک ماہرِ سیاست اور ایک مدبّر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔ میں آج کی صحبت میں حضورؐ کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں۔

اس امر واقعی سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مورّخ علاّمہ ابن خلدون نے ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ اہلِ عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہُوئے بلکہ ہمیشہ ان پر مزاج اور انارکی کا تسلط رہا۔ پُوری قوم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی۔ جس کی ساری قوت وصلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لُوٹ مار میں برباد ہو رہی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعورِ قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں، جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قایم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج، مزاج پسندی کے لیے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو قَوْمًا لُّدًّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے:

لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبہم۔ (انفال ۶۳) اور تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر لیتے، جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدّت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پُوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی۔

یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دُور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی تھی بلکہ اپنے باطنی عقاید و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ،

ہوگئی۔ یہ صرف وہ ہی منظم نہیں ہوگئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم اور اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتر بانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی اور اس نے بلا استثنا دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست و جہانبانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا۔ نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام کیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دیا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دُنیا میں جتنے بھی چھوٹے یا بڑے مدبر اور سیاست دان گزرے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے، تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی۔ لیکن آپ نے صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپؐ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ آپؐ کی کوشش سے ایک بہترین اُمت ظہور میں آئی، جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

کنتم خیر امت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر۔ (تم دنیا کی بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے اٹھائے گئے ہو)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ جن اصولوں کے داعی بن کر اُٹھے، اگرچہ وہ، جیسا کہ میں نے عرض کیا، فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں، نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو آپؐ کے مقابل میں موم پڑ جاتا، لیکن آپؐ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی سمجھوتہ کرنا گوارا نہیں کیا۔ اسی طرح آپؐ کے سامنے پیشکشیں بھی کی گئیں اور آپؐ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سوجھانے کی کوشش کی گئی اور آپؐ کو مختلف قسم کی تدبیریں بھی آپؐ کے کسی موقف سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے، تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہُوئی ہر بات اپنی اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قایم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاستدانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاستدان کا نشان آپ نہیں دے سکتے، جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہوسکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملے میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن حضورؐ نے ایک پُورا نظامِ زندگی کھڑا کر دیا، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضورؐ کو دیوانہ کہتے تھے لیکن حضورؐ نے اس نظامِ زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو

لوگ حضورؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے، وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لیے بھی اپنے اصولوں کی قربانی کبھی نہیں دی۔ اصولوں کے لیے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کیے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کیے گئے، لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے تھی، تو اس کا معاملہ اور تھا۔ وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد ختم ہوگئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپؐ کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت بھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں، شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دے دی جاتی ہیں اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے، تو اگرچہ اس زمانہ میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں اور اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھہراتا ہے اور قانون بھی ان باتوں کو حرام قرار دیتا ہے لیکن کیا ایک سیاستدان اور ایک مدبر یہی سارے کام اپنی سیاسی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لیے کرے تو یہ سارے کام اس کے فضائل اور کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی اور مرنے کے بعد بھی وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لیے یہی صفات اور کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ تھا جو لوگ ان باتوں میں ماہر ہوتے تھے وہی لوگ اُبھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے، بلکہ آپ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلہ میں ایک صاحبِ اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھوٹ کو، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے، کہیں زیادہ سنگین قرار دیا۔ آپؐ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپ کو پیش آئے، جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جاسکتی ہے۔ آپؐ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپؐ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپؐ کو حلیفوں اور حریفوں دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے۔ دشمن سے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں، عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے، آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفت گوئیں کرنی پڑیں اور سیاسی گفتگوؤں کے لیے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے۔ بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپؐ نے انجام دیے لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا۔ کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی

نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہلِ سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں، تو میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی اس دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجئے یا حکمتِ نبوت سے۔

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپؐ نے عرب ایسے ملک کے ایک ایک گوشے میں امن و عدل کی حکومت قائم کی۔ کفار و مشرکین کا زور آپؐ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپؐ نے خاتمہ کر دیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لیے بھی آپؐ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے لیکن پھر بھی انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی یہ شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال و اسباب کی بربادی کا کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا، اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی، جو اس ساری جدوجہد کے دوران میں حضورؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے مارے گئے۔[1]

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام نسل سے بھر دی ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اربابِ سیاست اس صورتِ حالات پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے کسی کے ناموس پر دست درازی کی ہو۔

اہلِ سیاست کے لیے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی اہمیت قائم کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے، تو سیاست کے جو تقاضے ہیں، وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس طرح کے مقاصد کے پیشِ نظر جب وہ نکلتے ہیں، تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں۔ جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں۔ جہاں وہ اترتے ہیں، ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لیے قصر اور دیوان خانے آراستہ کیے جاتے ہیں۔ ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں۔ ان کے لیے بری، بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی خاص سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔

اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحبِ سیاست کا تصور بھی نہ دوسرے لوگ کرتے ہیں اور نہ کوئی صاحبِ سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی وجود تصور کرتا ہے، لیکن ہمارے نبی کریمؐ اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہلِ سیاست سے الگ رہے۔ جب

---

[1] قاضی سلیمان منصورپوری کی تحقیق کے مطابق عہد نبوی کے جمیع شہدا کی تعداد ۲۵۹ اور کفار مقتولین کی تعداد ۷۵۹، بنتی ہے جبکہ دوسری جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق ۲ کروڑ سے بھی متجاوز ہو جاتی ہے۔ (محمد عالم مختار حق)

آپ اپنے صحابہ میں چلتے، تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں۔ مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں۔ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو دو زانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے، اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اُس تصور کی بنا پر، جو حضورؐ کے بارے میں اُس کے ذہن میں رہا ہوگا، سامنے آیا تو حضورؐ کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپؐ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں۔ میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا، اسی طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپؐ کے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر دیوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپؐ جو لباس دن میں پہنتے ، اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور صبح کو وہی لباس پہنے ہوئے ملکی وفود اور سفراء سے مسجد نبویؐ کے فرش پر ملاقاتیں فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اُس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹھ باٹھ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، جس طمطراق اور ٹھاٹھ باٹھ کی اب وہ عادی ہوگئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہل سیاست کی نانا شاہی ہمیشہ سے یہی رہی۔ فرق اگر ہے، تو محض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں دنیوی کرّ و فر کے بجائے خلافتِ الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کی جگہ خدمت اور محبت کا جلال تھا۔ لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم وشام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپؐ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارک ہی میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپؐ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے پُوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حیثیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دُوسرے ممالک میں قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے اس کرۂ ارضی کے تین برّ اعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں۔ لیکن اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لیے موزوں اشخاص کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین برّ اعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل نہیں تھے بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ ، جبّار و قہار حکومتیں بھتیں لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اُٹھ کر اُن کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا، گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی اور ان کے ظلم وجور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں، جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہلِ سیاست کی پُوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجئے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں، جن معنوں میں رسول اللہؐ کے بنائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابہ تھے۔

آخر میں ایک بات بطور تنبیہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپؐ نبی خاتم اور پیغمبر عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبہ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے، جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیلدار کی زندگی کے زاویہ سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سیّد کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے، جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو بخشتا ہے، تو وہ سب کچھ اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضورؐ تو صرف نبیؐ ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاءؐ تھے، صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سیّد المرسل تھے۔ صرف اہل عرب ہی کے لیے نہیں تھے بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپؐ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے نہیں تھی بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضورؐ کسی دینِ رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے بلکہ ایک ایسے دین کے مدعی تھے، جو رُوح اور جسم دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت دونوں کی حسنات کا ضامن تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سرورِ کائناتؐ کا دربار

مُلّا واحدی

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا لمحہ لمحہ لوگوں کو فیض پہنچانے کے واسطے وقف تھا۔ لیکن تمام لوگ ہمہ وقت حاضرِ خدمت نہیں رہ سکتے تھے۔ کبھی ایک جماعت مستفیض ہوتی تھی، کبھی دوسری۔ اس لئے حضورؐ نے مستقل اجلاس کا بھی اعلان کر رکھا تھا کہ جو آنا چاہیں۔ اس وقت آجائیں۔

یہ اجلاس بیشتر مسجدِ نبوی میں منعقد کئے جاتے تھے، اور ان کا وقت عموماً پنج وقتہ نمازوں کے بعد تھا۔ خصوصاً صبح کی نماز کے بعد۔

مٹی کی چھوٹی سی چبوترئی[1] تھی جس پر حضورؐ نشست فرماتے تھے اور چبوتری کے سامنے اور دونوں جانب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بیٹھتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار بیحد سادہ تھا حاضرین میں اگرچہ ایسے بادب حضرات ہوتے تھے کہ بغیر اجازت زبان نہیں کھولتے تھے اور مُطلق جنبش نہیں کرتے تھے۔ ان کی بابت راویوں کے الفاظ یہ ہیں کہ —— سروں پر گویا چڑیاں بیٹھ جاتی تھیں کہ جُنبش کی اور وہ اُڑیں —— کان الطیر فوق رؤسھم مگر گنواروں (بدّوؤں) کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ آتے ہی پوچھتے "محمدؐ کون ہیں"۔ اور جب انھیں بتایا جاتا کہ "وہ گورے رنگ والے جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں"۔ تو کہتے "اے ابن عبدالمطلب! خفا مت ہونا۔ میں سختی سے سوال کروں گا"۔ اور عجیب عجیب سوال کرتے۔ مثلاً۔ "بتایئے میرے باپ کا نام کیا ہے"۔ یا "میرا اونٹ کھو گیا ہے، بتایئے کہاں ہے؟"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ سوالات صرف تزکیۂ نفس کے متعلق کئے جائیں لغو و فضول سوالات کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ مگر لغو و فضول سوالات کو برداشت ضرور کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ نے بگڑ کر اتنا کہا تھا۔ "پوچھے جاؤ جو پوچھنا ہو، میں سب کا جواب دوں گا"۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے محسوس کیا تھا کہ حضورؐ برہم ہیں۔

کوئی آدابِ مجلس سے ناواقف دورانِ تقریر میں یا دوسرے کا جواب دینے میں سوال کرتا تھا تو حضورؐ تقریر جاری رکھتے تھے۔ حضورؐ سے ایک وقت میں ایک ہی شخص گفتگو کر سکتا تھا۔

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم تقریر کر رہے تھے کہ ایک گنوار (بدو) آیا اور آتے ہی بولا۔

"قیامت کب آئے گی"

---

[1] چبوتری اس غرض سے بنادی گئی تھی کہ اجنبی آنے والوں کو حضورؐ کی شناخت میں دشواری پیش نہ آئے ورنہ عموماً حضورؐ سب کے ساتھ مل کے بیٹھتے تھے حضورؐ نے اپنی کوئی اور ممتاز جگہ مقرر نہیں فرمائی تھی۔

حضورؐ تقریر کرتے رہے۔ تقریر سے فارغ ہو کر دریافت فرمایا:

"قیامت کی بابت کس نے سوال کیا تھا"

بدو نے کہا۔

"میں نے"

حضورؐ نے جواب دیا۔

"قیامت جب آئے گی جب لوگ امانت ضائع کرنے لگیں گے"۔

بدو نے پوچھا:

"امانت کیوں کر ضائع ہو گی؟"

فرمایا:

"جب کام نااہلوں کے ہاتھ میں پہنچ جائے گا"۔

یہی بدو حضورؐ کے پاس بیٹھتے بیٹھتے تمیز سیکھ جاتے تھے۔

حضورؐ کے دربار میں نام و نسب یا دولت و ثروت کی وجہ سے کسی کو امتیاز نہیں دیا جاتا تھا۔ کچھ ایسا برتاؤ ہوتا تھا کہ ایک شخص بھی یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ مجھے دوسروں کی نسبت کم عزت دی گئی ہے۔

اوّل، حضورؐ اہلِ حاجت کو اپنی حاجتیں پیش کرنے کا موقع بخشتے تھے۔ جب تک بولنے والا چپ نہ ہو جاتا تھا تو حضورؐ اس کی بات سنتے رہتے تھے بعض اوقات بولنے والا بولے جاتا تو اُسے انگیز کر لیتے تھے۔

قبیلوں کے سردار آجاتے تو حضورؐ ان کی تعظیم و تکریم فرماتے تھے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ اکرموا کریم کل قوم ہر قوم کے معززین کی عزت کرو۔ ویسے ازراہ شفقت بیٹی (حضرت فاطمہ زہراؓ) کے لیے بھی کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اپنی انّا (بی بی حلیمہ) کے لیے بھی اُٹھ کر چادر بچھادی تھی اور حضرت حلیمہ کے فرزند تشریف لائے تو اُن کے لیے بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ مگر اُس قسم کی تعظیم و تکریم جو بادشاہوں اُمرا درؤسا کے ہاں رائج تھی (اور آج تک رائج ہے) اس کی حضورؐ نے شدومد سے مذمت فرمائی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے آنے پر تمام حاضرین کا کھڑا ہو جانا یا ایک شخص بیٹھا ہو اور حاضرین اُس کے سامنے دست بستہ کھڑے رہیں گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام کر رہے ہیں حضورؐ نے اس قسم کی تعظیم و تکریم کو منع فرمایا ہے حضورؐ کا ارشاد ہے "جسے یہ پسند ہو کہ لوگ اُس کے سامنے تعظیماً کھڑے رہیں اُسے اپنی جگہ جہنم میں تلاش کرنی چاہیے"۔ باتیں پوچھنے والے کو حکم تھا کہ بیٹھ کر پوچھو۔ کھڑے ہو کر مت پوچھو۔

حضورؐ حاضرین کے ساتھ بے تکلف اور شگفتہ رہ کر بیٹھتے تھے۔ ہنسی اور ظرافت کی بات اگر ادب و آداب کے خلاف نہ ہوتی تو اُسے بھی جائز رکھتے تھے اور ہنسی و ظرافت میں حصے لیتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ سے کسی شخص نے خواہش کی کہ میں جنت میں کھیتی کروں گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ ادھر بوؤں اُدھر کاٹ لوں۔ چنانچہ دانہ ڈالتے ہی فصل تیار ہو گئی، کوئی بدو صاحب بھی حاضرِ دربار تھے۔ وہ بولے، یہ نعمت فقط مکہ مدینہ والوں کے حصے میں

آئے گی۔ کیونکہ مکّہ اور مدینے والے ہی اہلِ زراعت ہیں۔ ہم تو زراعت نہیں جانتے۔ حضورؐ ہنسنے لگے۔

ایک دفعہ ایک صحابی آئے اور بولے "میں تباہ ہو گیا"۔ حضورؐ نے پوچھا کیوں اور کیسے؟ صحابی نے عرض کیا میں نے رمضان میں بحالت صوم بیوی سے ہمبستری کر لی۔ حضورؐ نے فرمایا ایک غلام آزاد کر دو۔ کفارہ ہو جائے گا۔ صحابی نے کہا میں غریب ہوں۔ غلام کہاں سے لاؤں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا۔ دو مہینے کے روزے رکھ لو۔ صحابی نے کہا یہ بھی ممکن نہیں۔ حضورؐ فرمایا، اچھا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلا دو۔ صحابی نے کہا۔ اس کا بھی مقدور نہیں۔ اتفاق سے اسی وقت کھجوروں کا ڈھیر حضورؐ کی خدمت میں کہیں سے پہنچا۔ حضورؐ نے فرمایا لو یہ ڈھیر مسکینوں میں بانٹ دو۔ صحابی نے کہا، اُس اللہ کی قسم جس نے آپ کو رسولؐ بنایا ہے۔ سارے مدینے میں مجھ سے بڑھ کر مسکین دوسرا نہیں ہے ـــ حضورؐ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تم اپنے ہی لیے لے جاؤ۔

ایک مرتبہ دو شخص حاضر ہوئے ایک کو چھینک آئی، اُس نے الحمد للہ نہیں کہا، حضورؐ نے بھی یرحمک اللہ نہیں فرمایا۔ دوسرے کو چھینک آئی تو اُس نے الحمد للہ کہا اور حضورؐ نے یرحمک اللہ فرمایا۔ الحمد للہ نہ کہنے والا الحمد للہ کہنے والے کی نسبت ذی حیثیت تھا اُسے اپنے لیے یرحمک اللہ نہ فرمانا اور دوسرے کے لیے یرحمک اللہ فرمانا کھٹکا۔ اُس نے حضورؐ سے شکایت کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اس نے اللہ کو یاد رکھا، لہٰذا میں نے اُسے دُعا دی۔ تم اللہ کو بھول گئے میں نے تمھیں بھلا دیا۔

ایک دفعہ حضورؐ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے۔ مجمع زیادہ تھا۔ تین شخص آئے۔ ایک کو درمیان میں ذرا سی جگہ مل گئی، وہ وہاں گھس بیٹھا، دوسرے نے کنارے پر بیٹھ جانا غنیمت سمجھا، وہ کنارے پر بیٹھ گیا۔ تیسرا واپس چل دیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ایک نے اللہ کی پناہ لی۔ دوسرے نے اللہ سے حیا کی۔ اللہ بھی اُس سے شرمایا۔ تیسرے نے اللہ سے منہ پھیر لیا۔ اللہ نے بھی اُس سے منہ پھیر لیا۔

ان جامع میں چونکہ خواتین شریک نہیں ہو سکتی تھیں، خواتین نے درخواست کی کہ ہمارے واسطے الگ دن مقرر کر دیجئے۔ چنانچہ الگ دن مقرر کر دیا گیا۔ خواتین کی مجلس میں عام مسائل شرعیہ پُوچھنے کی اجازت تھی۔ لیکن عورتوں کے مخصوص مسائل پُوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مسائل ازواج مطہرات انھیں بتاتی رہتی تھیں۔ مخصوص مسائل خواہ عورتوں کے متعلق ہوتے خواہ مردوں کے متعلق کوئی سب کے سامنے، برملا دریافت کرنے لگتا تھا تو حضورؐ مکدر ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عاصم انصاری رضی اللہ عنہ نے مجمع عام میں سوال کیا کہ اگر انسان اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ دیکھے۔ تو کیا کرے۔ حضورؐ نے انھیں جھڑک دیا۔ عام سوالات لوگ بے دھڑک کرتے تھے اور جواب باصواب پاتے تھے۔

ایک طریقہ تعلیم کا یہ بھی تھا کہ حضورؐ بطورِ امتحان خود سوال کرتے تھے اور لوگوں سے فرماتے تھے کہ جواب دو۔ اس سے لوگوں کے دماغ پر زور ڈالنے کی عادت پڑتی تھی۔ مثلاً ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے سوال کیا۔ اچھا بتاؤ وہ درخت کون سا ہے۔ جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مُشابہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔ میرا ذہن کھجور کے درخت کی طرف گیا۔ لیکن میں کم سن تھا۔ اظہار کی جرأت نہیں ہوئی۔ دوسرے حضرات اور درختوں کے نام لیتے رہے۔ آخر حضورؐ نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، میں ہمیشہ افسوس کیا کرتا ہوں کہ میں نے اُس وقت کھجور کیوں نہ کہہ دیا۔

ایک دفعہ حضورؐ نے پوچھا۔ تم لوگ جانتے ہو، مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، بے زر کو مفلس کہتے ہیں۔ میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ جملہ قسم کی نیکیاں لے کر تو آئے گا۔ لیکن اُس نے کسی کو گالی بھی دی ہو گی کسی پر تہمت بھی لگائی ہوگی۔ کسی کا مال بھی کھایا ہوگا، کسی کا خون بھی بہایا ہو گا کسی کو مارا بھی ہوگا۔ لہٰذا اس کی نیکیوں میں سے تھوڑا تھوڑا ان کو دے دیا

جائے گا، جس کے ساتھ اُس نے زیادتی کی ہوگی اور پھر اُس کے پاس کوئی نیکی نہیں بچے گی۔ بلکہ اوروں کا کچھ اس کے ذمے رہ جائے گا۔ سو اوروں کی بدیاں اُس کے نام لکھ دی جائیں گی اور وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ایک دفعہ فرمایا کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں اچھا کون ہے اور بُرا کون۔ فرمایا اچھا وہ ہے جس سے لوگ اچھائی کی امید رکھیں بُرائی سے لوگ امن میں ہوں اور بُرا وہ ہے، جس سے اچھائی کی توقع نہ کی جائے اور جس کی برائی سے کوئی مامون نہ ہو۔

دقیق مباحث جو عامۃ الناس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اُن کو حضورؐ نہیں چھیڑنے دیتے تھے ایک دفعہ صحابہ تقدیر پر بحث کر رہے تھے کہ تقدیر کیا شے ہے۔ حضورؐ کے کانوں میں آواز پہنچی تو حضورؐ حجرے سے باہر نکل آئے اور بڑے غصے سے بولے "تمھیں اللہ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ آپس میں قرآن کو ٹکراؤ، پچھلی اُمتیں ایسی ہی باتوں سے برباد ہوتی رہتی تھیں۔"

ایک دوسرے موقع پر حضورؐ نے تقدیر کی گرہ باتوں باتوں میں کھول دی۔

کسی میت کے ساتھ حضورؐ قبرستان تشریف لے گئے تھے۔ وہاں حضورؐ نے فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں ہے، جس کا جنتی یا دوزخی ہونا لکھا نہ جا چکا ہو۔" ایک صاحب نے کہا "تو پھر عمل کس توقع پر کیا جائے؟ ہم تقدیر پر توکل کرکے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں؟"

حضورؐ نے فرمایا "توکل قوتِ عمل کو معطل کر دینے کا نام نہیں ہے۔ اعمال ہی تقدیر ہیں۔ اللہ جسے اعمال کی توفیق بخشتا ہے، وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ جو جنتی ہوگا۔ وہ جنتیوں کے عمل ضرور کرے گا اور جس کی تقدیر میں دوزخ لکھی ہے، وہ دوزخیوں کے عمل کرے گا۔"

دقیق مباحث کے علاوہ عام بحثیں حضورؐ صحابہ کو کرنے دیتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ اس مضمون پر بحث ہو رہی تھی کہ شہرت طلبی اور تفاخر خلوصِ عمل کے منافی ہیں یا نہیں۔ ایک صحابی نے کہا اگر اس نوع کے نعرے جہاد میں کہے جائیں کہ "میں فلاں ہوں اور فلاں قبیلے سے ہوں، ذرا میرا وار روکو تو سہی"۔ تو ثواب نہیں ملے گا۔ دوسرے صحابی نے کہا "میرے نزدیک تو اتنا کہہ دینا جائز ہے"۔ حضورؐ نے سنا تو فرمایا "شہرت اور ثواب میں بیر نہیں ہے۔"

ایک دفعہ حضورؐ مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ بعض صحابی قرآن خوانی اور ذکر و شغل میں مشغول ہیں اور بعض علمی باتیں کر رہے ہیں، حضورؐ نے فرمایا، دونوں جماعتوں کا عمل ٹھیک ہے لیکن مجھے اللہ نے معلّم بنا کر بھیجا ہے، انما بُعِثتُ مُعلّماً اور حضورؐ علمی باتیں کرنے والی جماعت میں بیٹھ گئے۔

حضورؐ کی مجالس کتنی باا ثر ہوتی تھیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو روایتوں سے کیجیے:۔

ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! جب تک ہم حضورؐ کی خدمت میں رہتے ہیں۔ دنیا ہماری نظر میں ہیچ ہو جاتی ہے لیکن بال بچوں میں جا کر حالت پھر بدل جاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے۔"

ایک دفعہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے۔ یا رسول اللہ! میں منافق تو نہیں ہو گیا۔ میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہوں تو جنت اور دوزخ دکھائی دینے لگتی ہے۔ مگر گھر پہنچ کر جنت اور دوزخ کو بھول جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، "اگر ہر وقت وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔"

ایک دفعہ ایک امیر خاتون چوری کے جرم میں پکڑی ہوئی آئیں، بعض صحابہؓ نے ان کی سفارش کی، حضورؐ نے فرمایا "تم سے پہلے کی قومیں

اسی لیے تباہ ہو جایا کرتی تھیں کہ معمولی لوگ قصور کرتے تھے تو انھیں سزا ملتی تھی اور بڑے لوگ قصور کرتے تھے تو ٹال دیتے تھے۔"

ایک دفعہ ایک بدّو آیا۔ اتفاق سے اُسے استنجے کی حاجت ہوئی، وہ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر رفع حاجت کرنے لگا۔ صحابہ مارنے دوڑے۔ حضورؐ نے فرمایا "تم سختی کے لیے نہیں پیدا کئے گئے۔ تمہارا کام نرمی ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے بدّو کو بلا کر سمجھا دیا اور صحابہ کو حکم دیا کہ غلاظت پانی سے بہا دو۔

ایک دفعہ کسی صحابی نے پوچھا، یا رسول اللہ! کوئی اگر یہ کوشش کرے کہ اُس کے کپڑے اچھے اور سلیقے کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے۔ فرمایا نہیں۔ اِنّ اللہ جمیل ویحب الجمال اللہ صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے بندوں کو چاہیے کہ اپنے طور وطریق اور لباس میں سلیقے اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

کبھی کبھی حضورؐ بات کو اہمیت دینے کے لئے اُسے کئی بار دوہراتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ فرمایا: "واللہ وہ صاحب ایمان نہیں، واللہ وہ صاحب ایمان نہیں۔ واللہ وہ صاحب ایمان نہیں۔"

حاضرین نے پوچھا "کون یا رسول اللہ!؟"

فرمایا "جس کے پڑوسی کو اُس کی برائیوں سے امن نہ ملا۔"

ایک دفعہ فرمایا "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دین داری اخلاص کا نام ہے۔"

صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کس کے ساتھ؟"

فرمایا "اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اُس کی کتاب کے ساتھ اُس کے رسولؐ کے ساتھ، مسلمان سربراہوں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ۔"

عہدِ نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

قبل اسلام

جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے۔ اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے تعدادِ ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترکِ وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستے سے ہمیشہ[1] ان کا رخ رہا۔ بعد میں ملاحی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ "تازی" اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ "تاشی"[2] (جس سے عرب مراد لیتے ہیں) اسی لفظ "طی" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

ان تارکانِ وطن کی تعداد ایرانی صوبۂ عراق میں اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ انھوں نے عہد نبویؐ سے صدیوں، قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قایم کر لی تھی اور لخمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انھوں نے خانہ بدوشی تک ترک کردی اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حدِ فاصل اور حاجز مملکت (BUFFER - STATE) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمیں خود یہ لوگ جھیلنے لگے[3] اور ایرانی امن میں ہوگئے، تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزوں آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضاکاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے۔ اس سے عربوں میں جنگجوئی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے۔ ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت

---

[1] اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھیے میرا مقالہ "عربوں کے تعلقات بیزنطینیوں سے"، مجلہ تحقیقات علمیہ جامعہ عثمانیہ سالنامۂ سوم۔ مختصر یہ کہ سینٹ پادل کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو حلب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قایم ہو چکی تھیں۔

[2] بریٹ شنائدر کا انگریزی رسالہ "عربوں کے متعلق چینیوں کی معلومات" (ص۶)

[3] تنبیہ مسعودی ص ۱۸۶

نہیں۔ یہ امر البتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ بیزنطینی قیصروں نے ضجعمیوں اور پھر غسانیوں سے جنگی معاہدہ کر لیا اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایانِ ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا۔ کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسرائے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جونیئر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے، تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں۔ عربی شعراء اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرا نشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے لخمی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفتیں مثلاً بات کا پاس اور آن کے لیے جان تک کی پروانہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضاکاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جونیئر حلیف سہی لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا۔ مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے مٹا دیا تھا[1]۔ اسی لیے انھوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی، کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیاں پر کیا جائے۔ اس کے نتیجہ سے سب واقف ہیں کہ حکمرانِ حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا اور اس وفاشعار نے جانتے بوجھتے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور نشۂ غرور میں چور شہنشاہ نے حاجز خلکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آدھمکے اور گو برائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صُوبہ بنا دیا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہ ہُوا، بلکہ حکمرانِ حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا، تو شہنشاہی احکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دہی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پر ان کی فوج کو جان پر کھیلے ہُوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی اور انھیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدنی دورِ زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافتِ صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ مثنیٰ شیبانی کا ایران پر حملے کے لیے اپنی رضاکارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کُش سیاست کا ردِ عمل تھا۔ اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمنیوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور وہرز کی فوجی گورنری کے بعد لایق باذان وہاں گورنر بنا۔ لیکن پایۂ تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

---

[1] مزدک نے ملکِ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے حمیتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ تھے۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحسا میں بھی (جسے اس زمانہ میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے۔ عمان میں جلندی بن المستکبر کا خاندان کسریٰ ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحبر (مخطوطہ دائرۃ المعارف حیدر آباد میں لکھے ہیں) اور بعد میں اسی جلندی کے بیٹوں جیفر اور عبد سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تخاطب فرمایا تھا۔ عمان وسیع ملک ہے۔ وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوذہ بن علی کو کسریٰ نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اس لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا (دیکھیے استقاق ابن درید ص ۲۰۹، عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۲ ص ۶۷) الحسا میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتا نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا۔ بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے۔

عرب مولفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں، فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسریٰ، قیصر، نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی۔ ابن عبد ربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قائم کیا ہے ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا جس نے وادی وج میں ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ ص ۴۸ - ۴۹) اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ و حنین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آگھیرا تھا اور باوجود منجنیق اور دبابوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نظر نہ آیا اور جناب رسالتمآب صلعم نے مزید جانی نقصان نامناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھا لیا تھا۔

ابتدائے اسلام ایران آتش پرست تھا۔ انتہائی جنسی اباحیت رکھی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے، جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ روم بھی انھی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام (ص ۲۰۸) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت صلعم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی طرف ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیش گوئی بھی فرماتے کہ کسریٰ و قیصر کی دولت تمہارے قدموں پر نچھاور ہو گی۔ جنگ خندق میں سنگ مرمر کی چٹانوں کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑتے پر اسی پیش گوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے[1] کہ ۶ھ کی صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے "فتح مبین" اور "نصر عزیز" کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا شاہکار سمجھا جاتا ہے (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا)، یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے۔ بہر حال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نو پذیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کرنے کے قابل ہو گئے، وہیں انھیں نینوا میں ایرانیوں کی بیزنطینیوں (رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفرین شکست کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ (نینوا کی لڑائی شعبان ۶ھ میں ہوئی، اس کے بعد ہی

---

[1] دیکھیے رسالہ سیاحت حیدر آباد دکن اپریل ۱۹۴۲ء

صلح حدیبیہ ہوئی)

بلاذری (فتوح ص ۹۷) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۵۷) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خط ۶ھ ہی میں روانہ کیا تھا۔ غالباً کسرائے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسریٰ کے پاس مدائن بھیج دے۔

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ سماوہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبوی میں جو اسلامی تعلقات رہے، ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقاء بتایا جائے، ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبوی تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ایک منذرؓ ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں، جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف "الوثائق السیاسیة" دیکھی جاسکتی ہے (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلۂ عبد القیس سے کیا ہوا اور ایک اور معاہدہ کتاب وسیلة المتعبدین میں دستیاب ہوا ہے) یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی۔ جس میں متعدد گتھیاں سلجھانی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں، محدثوں اور دیگر مولفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرائے ایران کے نام بھی تھا، اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ ہے:

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔	۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
۲۔ من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس۔	۲۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسریٰ کے نام۔
۳۔ سلامٌ علیٰ من اتبع الھدیٰ و آمن باللہ و رسولہ۔	۳۔ ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے لیے سلامتی ہو۔
۴۔ وادعوك بدعایة اللہ فانی انا رسول اللہ الی الناس کافة۔	۴۔ میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔
۵۔ لانذر من کان حیًّا و یحق القول علی الکافرین۔	۵۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی بات پوری ہو کر رہے گی۔
۶۔ فاسلم تسلم۔	۶۔ اسلام لا سلامت رہے گا۔
۷۔ فان ابیت فان اثم المجوس علیك۔	۷۔ اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷۱ و ص ۱۵۷۲ (دو روایتیں)، صبح الاعشیٰ قلقشندی جلد ۶ ص ۲۹۶، کتاب الصناعتین لابی

ہلال العسکری، نیز جلد ٦ ص ٣٠٨، اعلام السائلین عن کتب سید المرسلین لابن طولون مکتوب ٣، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ا ص ٢٩١، تاریخ الیعقوبی جلد ٢ ص ٣٠، نصب الرایۃ الاحادیث الہدایۃ للزیلعی مکتوب نمبر ٩، مفید العلوم و مبید الہموم، للقزوینی مکتوب نمبر ٢، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد ٢ ص ١٢٢، المنتقی لابی نعیم ورق ٣٥/ب (مخطوطہ حیدر آباد دکن) لفریدون بک جلد ا ص ٣١، وسیلۃ المتعبدین لعمر الموصلی جلد ٨ ورق ٢٧/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے اور طبقات ابن سعد، اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے۔ اس پر کا تانی نے اپنی اطالوی تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و تعلیمات محمدؐی میں بحث کی ہے۔ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملے گا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اہم تر یہ ہے: بعض روایتوں میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" حذف ہو گیا ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں "کسریٰ ابرویز عظیم فارس" کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام لبعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم۔

ف ٣ میں طبری کی ایک روایت میں واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریك له وان محمدا عبدہٗ ورسولہٗ کے الفاظ زاید ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

ف ٤ میں دعاء اللہ اور دعایۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں۔ رسالات نبویہ مولفہ عبد المنعم خاں ٹونکی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

ف ٥ میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں "لینذر" بھی مروی ہے، جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا۔

ف ٦ میں "فان" کی جگہ "وان" اور اسی طرح "ابیت" کی جگہ "تولیت" نیز "اثم المجوس علیك" کی جگہ "علیك اثم المجوس" وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبد اللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبد اللہ بن حذافہ ہی مدائن گئے تھے یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پایۂ تخت روانہ کیا تھا۔ بہرحال تمام اسلامی مولف بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ (خسرو پرویز) نے طرز تخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی عربی کو برضامندی ورنہ گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔ اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلدی ہی مدائن سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا ہے اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدر کشی کی "تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرت ابن ہشام (ص ٤٦) پر مذکور ہے جو بظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے بلکہ ابن ہشام نے زہری کی

روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے وہاں کسریٰ کے سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے۔ تاریخ طبری (ص ۲، ۱۵۷۱ تا ۱۵۷۴) میں جہاں اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ خدا اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے۔ اور طبری نے شیرویہ کی پدرکُشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بناء پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے، وہیں ایران قدیم کے حالات میں (ص ۱۰۰۹ پر) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:

فاهلك الله كسرىٰ وجاء الخبر الى	چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور اس کی اطلاع
رسول الله (صلى الله عليه وسلم) يوم	جناب رسالت مآبؐ کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے
الحديبية ففرح ومن معه۔	آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آ چکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا، اور پدرکُشی کی اطلاع بطور معجزہ وبنا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں۔ کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلا تنقید متضاد روایات کا آ جانا اور روایات میں بھی احتیاطی قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے، جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔

اسی بنا پر ابو نعیم کی دلائل النبوۃ (جلد ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

"رومیوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی، جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالتمآب صلعم کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورۂ روم کی کئی سال قبل کی پیشگوئی پوری ہو گئی)"۔

نینوہ کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا۔ عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالت مآب صلعم حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے۔ تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عروہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہِ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت صلعم کے ہمعصر زمانہ کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں اور نہ حبشیوں کے ہاں۔ ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ "خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے ۲۷ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے"[1] (جو وسط رمضان ۶ھ کے

---

[1] قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

مطابق ہے) قرآن (شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے۔ شعبان میں نینوہ میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمداً جھوٹ پر آمادہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:

"شیرویہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا جب کہ چھ گھڑی رات گزر چکی تھی۔" (تاریخ طبری ص ۴، ۱۵)

اپنے اندر مقابلۃً کم کشش رکھتا ہے۔

غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

واقعہ	طبری فی روایۃ	ابو نعیم	ابو یوسف	واقدی	ابن کثیر فی روایۃ	ہرقل کا خط یونانی تاریخ میں	عام مورخین
نینوا میں ایرانی شکست	.	.	.	.	یوم الحدیبیہ	.	شعبان سنہ ۶ھ
کسریٰ پرویز کا قتل بیٹے کے ہاتھ	یوم الحدیبیہ	.	.	۱۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ	.	وسط رمضان سنہ ۶ھ	
اس قتل کی اطلاع جناب رسالتمآب کو پہنچنا	.	یوم الحدیبیہ	.	.	.	.	حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ میں
حدیبیہ کے لیے روانگی	.	.	رمضان سنہ ۶ھ	.	.	.	ذی قعدہ سنہ ۶ھ
صلح حدیبیہ	.	.	.	.	شوال سنہ ۶ھ	.	تقریباً اواخر ذی قعدہ یا اوائل ذی حجہ ۶ھ

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے بیان کیا ہے اور کبھی ہجرت کے وقت سے اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی اور سنہ ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل یکم محرم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) سنہ ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا۔ واقدی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اسی لیے من الہجرۃ (ہجرت کے وقت سے) اور للہجرۃ (ہجری سنہ سے) کہنے سے بآسانی خلط ملط ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو اور اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) گیرلانڈ (GERLAND) کی ہے جس کا نام "قیصر ہرقل کی ایرانی مہمیں" (DIE - PERSISCKE FELDZUGE DES KAISERS HERAKLIUS) ہے۔ یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالہ سے نقل ہوا ہے۔

بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ تین ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لیے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ۔

۲۔ جناب رسالت مآب صلعم نے ذی حجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبہ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسیئ زیادۃ فی الکفر الآیۃ) کو دُہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا:

وان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض۔ — زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے، جیسا خلقتِ آسمان و زمین کے وقت تھا۔

(سیرت ابن ہشام ص ۹۶۸، تاریخ طبری ص ۱۷۵۴، وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت سنہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے۔ قمری اور کبیسہ مہینوں کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی فقیم کا سردار (جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا) حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعے سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گمنام اور محترم مہینا ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا۔ (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینا کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر سنہ ۱۰ھ میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

سنہ ۶		سنہ ۷		سنہ ۸		سنہ ۹		سنہ ۱۰	
ہجری مدنی	مکی کبیسہ	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی	ہجری مدنی	کبیسہ مکی
محرم	ربیع ۱	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	صفر	محرم	محرم
صفر	ربیع ۲	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	ربیع ۱	صفر	صفر
ربیع ۱	جمادی ۱	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۲	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	جمادی ۲	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	جمادی ۱	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی ۱	رجب	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۲	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	شعبان	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	رجب	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رمضان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	شعبان	رجب	رجب
شعبان	شوال	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	رمضان	شعبان	شعبان

رمضان	ذی قعدہ	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	شوال	رمضان	رمضان
شوال	ذی حجہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	ذی قعدہ	شوال	شوال
ذی قعدہ		ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی حجہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ	محرم	ذی حجہ		ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ۶ مکی میں جب صلح حدیبیہ ہُوئی، تو رمضان ۶ ہجری چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان رمضان میں نکلے تھے اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ چونکہ اُس وقت تک سال کبیسہ منسوخ نہیں ہُوا تھا اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لیے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا۔ حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینہ چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیسہ سالوں کے ۶ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (مکی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت اکہتر دیں مہینے میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا، اور نہ تو دو کبیسہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا اور سنہ ہجرت کے اکہتر ویں مہینا یعنی ذی قعدہ ۶ مکی کی جگہ جمادی الاولیٰ ۷ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انھیں کس ماخذ سے معلوم ہُوئی۔ اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان ۶ھ م وسط ذی قعدہ ۶ھ مکی) کو ہوا ہوگا اور یہ روایت قطعاً رد کر دینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلعم نے ان سے فرمایا کہ "آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا" اور یہ کہ اس پیش گوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لیے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کے متعلق خود عرب مولف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔

اسی لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بگڑی ہُوئی شکل ہے، جو ابو نعیم نے بیان کی ہے کہ نینوا کی شکست کی خبر[1] حدیبیہ کے دن آئی اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینا بھر پہلے کا واقعہ تھا

[1] گو ابو نعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہُوئی۔

اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں مکہ تک آسکتی تھی۔

مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی واللہ الھادی الی الصواب وھو الموفق والیہ المآب۔

تتمہ جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالت مآب صلعم نے "کسریٰ عظیم الفرس" کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابو ہلال عسکری کی روایت کہ خط میں "کسریٰ ابرویز" لکھا ہوا تھا، ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو، لیکن پرویز کے قتل کے بعد مداین میں جو شاہ گردی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ معلوم نہیں کہ وہ نامۂ مبارک در اصل کس نے وصول کیا بہرحال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالت مآب صلعم نے براہِ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی۔ چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیوں کو اب مداین سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی، جیسا کہ طبری نے (تاریخ ص ۱۹۹۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا جائے، اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مداین سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے اور آنحضرت صلعم کی سیاستِ خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہو رہی تھی کہ ما بقی علاقوں کے لیے مداین کو فکر ہونے لگی۔ چنانچہ چند ہی دنوں بعد جب قسمت نے بوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالتمآبؐ کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۱۶۲۳ میں صراحت ہے اور ترمذی شریف جلد ۲ ص ۲۹۶ باب قبول الھدایا میں بلا صراحتِ نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ نسی کے متعلق عرب مولفوں میں سے البیرونی وغیرہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کبیسہ بنانے کا نام ہے تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینا بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تاکہ اس زمانہ میں لوٹ مار کی جا سکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "نسی" کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پلے ہوئے بعض عرب مولف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کبیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینا لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح ان بدویوں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کیے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے۔ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (MOBERG) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے۔ اسی کا خلاصہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

عہدِ نبوی کے اصولِ سیاسیات

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں ۔ صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپتا ۔ نامانوس اور دشوار گذار راستوں پہ چلتا سینکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو ۔ وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر حکمراں ہو چکا تھا ۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو اس مزاج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر نمونے کے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہوا اور جو ۲۷ ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں سے وقت واحد میں لڑ کر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پہ پھیل جائے ۔

اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمت ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے ۔ بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول و فعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنا اسوۂ حسنہ سمجھتی ہے ۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی ہی پہ مشتمل ہے ۔ لیکن ایک تو یہ "مشارق الارض" سے "مغارب الارض" تک پھیلا ہوا ہے ۔ دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پر سیاستاً نہیں تو سکونتہً قابض ہے ۔ تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پہ مشتمل ہے ۔ چوتھے عظیم الشان اور قابلِ رشک تاریخ رکھتا ہے ۔ جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آئند ارادے اور ولولے پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ پانچویں یک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جز" میثاقی انحطاط" کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناسازگار مقاموں میں زبردست ترین اور منظم حریفوں کو شکست دے رہا ہے ۔ اور ساتویں اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کئے جاتے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

سیاست کاری

عہد نبوی ؐ کی سیاست خارجہ کے اصول دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی وحدت کے ساتھ بدلے ہوئے تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ :

۱ ۔ اپنے ظالم وطن مکّہ ۔

۲ ۔ عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل ۔

۳ ۔ خانہ بدوش عرب قبائل ۔

۴ ۔ عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہر یا شہری مملکتیں (CITY - STATES) مثلاً طائف ۔

۵ ۔ عرب میں بیرونی دخل اندازیعنی ایرانی اور رومی صوبے ، محفوظات ۔ نوآبادیاں وغیرہ ۔

۶ ۔ عرب کے ہمسایہ ممالک وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرتؐ کی "سیاست کاری" خصوصی مسائل سے دوچار ہوا اور ان کو حل کرنے کے لئے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہی ہے ۔ سطور ذیل میں آنحضرتؐ کی صرف مکی سیاست سے بحث کی جائے گی ۔

مکّہ کی اہمیت

شہر مکّہ قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں "ناف ارض" پر پڑا چاہیے اسلام کی عالمگیر توسیع میں کتنا ہی ممد و معاون رہا ہو لیکن یہاں زمانہ ہائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی ۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں جو مصلحتہً مکّہ اور مکّہ والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے اسی طرح ان روحانی عظمتوں یا دیگر لا حاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرۂ ارض کے بننے میں مکّہ کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں ۔

شہر مکّہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اور اس کے علاقے سے گزرنے کے لئے زمانہ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں اس لئے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تجارت کے عرب سے گزرنے کے لئے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آ گیا تھا ۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا ۔ اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مورخ محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے :۔

> " ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومۃ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جایا جاتا تو جب تک قبائل مُضر کے علاقہ سے گزرتا ہو قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ کوئی مضری اور نہ مضریوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا چنانچہ قبائل کلب (بنی الجثم سے حلیفی کے باعث) اور قبائل طے (بنی اسد سے حلیفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے ۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقہ میں تاجر اپنے لئے بنی عمرو بن مرشد کا خفارہ حاصل کرتے تھے ...... بحرین کے صدر مقام المشقّر کو جانے کے لیے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا .... جنوبی عرب میں مہرہ جانے کے لئے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا ..... حضرموت کے سوق رابیہ جانے کے قریشی کاروان بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے ..... جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا .... عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے ، مثلاً قریش ۔ ہوازن ۔ غطفان ۔ عضل ۔ ولیش ۔ جبار ۔ مصطلق ۔ احابیش وغیرہ "

اس کے سوا زمانۂ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکّے کے مضافات میں منا میں جمع ہوتے تھے ۔ ۱۳ھ میں بیعت عقبہ کے سلسلے میں مورخین نے ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ سے ملنے سے پہلے آں حضرتؐ پندرہ قبائل کے پڑاؤوں میں تبلیغ کے لئے گئے تھے ۔

ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومۃ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے۔ مدینے کے غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں "عام الوفود" (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا۔ سیاست نبوی کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے ان ہی کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

تبلیغ رسالت سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپ اٹھے تھے اس کی اشاعت ہو اس غرض کے لئے مالی منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت ؐ نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کر لیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے اس کی مزید مثالیں جمع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اندرونی استحکام کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو اکثر حقیر اور کمزور دشمنوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاریخ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصول مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح روکا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت ؐ ہجرت کر کے مدینے آئے ہیں تو مسلمانان مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بُعاث کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متصادم قوموں کی سرداری کوئی قابل رشک حالت نہیں کہی جا سکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی گتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کر دو تو وہ کہتے ہیں۔ آمنا لیکن آپ گوروں کی لنچنگ پر اتر آتے والی ننگ انسانیت قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجئے اور گورے نو مسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کر لیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں عہد نبوی میں تو حضری آبادی آج سے بھی فوجی مہموں میں بدوی رضا کاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہو گی محتاج بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک مزاج تھا ایک شہری مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں

یہودی رہتے تھے جو زراعت تجارت صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے ان میں بھی آپس میں خون ریزی اور باہمی رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدوؤں کی، ان سب کے ساتھ سینکڑوں مہاجرین تھے جن کے نسبی بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام متصادم اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا یہ ابتداً سیاست خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینے کی حفاظت کے لئے علاوہ اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرتؐ مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں۔ اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلیفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان انکو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرتؐ کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہرحال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش کی جا رہی تھی۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا تھا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آ بسے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لا هجرة بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی) اور بہت کم اس سے استثنا منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دوگونہ تھا مسلمان فوج کے لئے محفوظ رضاکاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نومسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

انسانی خون کی عزت

عہد نبوی میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے۔ انا نبی الرحمۃ انا نبی الملحمۃ (میں رحمت کا پیغمبر ہوں میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبوی کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

فنونِ حرب کی ترقی و استفادہ

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خونریزی کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لئے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنونِ حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لئے ہر اچھی چیز چاہے کسی ملک کی ہو اختیار کی گئی۔

عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی جنگ بدر ہی سے آنحضرتؐ نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا۔ اسے درست کیا جاتا

تھا۔ فتح مکہ کے وقت توصف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہوگئی تھی۔ جو وازع کہلاتا تھا۔ ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ ہوتا تھا۔ اور کم عمر رضا کار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد (مثلاً مشرکین یہودی وغیرہ) واپس کر دیئے جاتے تھے۔ جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ "جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بیکار ضائع نہ کرے۔ بلکہ اوپر آئے تو مارے اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر اسے اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔" وردی کی غیر موجودگی میں اور شبخون کی ضرورتوں کے لئے اسلامی سپاہیوں کے لئے "شعار" (واچ ورڈ) مقرر کئے گئے تھے اور ہر دو بدو کے مقابلہ کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن۔

خندق کے ذریعے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے چنانچہ جنگِ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعہ سے روک کر ناکام واپس کیا گیا۔

خیبر کی لڑائی میں منجنیق سے دشمن کے محصور قلعہ میں پتھر برسائے گئے تھے۔ طائف کے محاصرہ میں مزید برآں دبابے بھی استعمال کئے گئے تھے۔ جو ترقی پاکر زمانہ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پہیئے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر بیل کا یا کوئی اور موٹا چمڑہ منڈھ دیا جاتا تھا کہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جا سکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لئے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجنیق کے علاوہ عرادہ بھی برتا گیا تھا۔ جو منجنیق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں۔ گھوڑوں۔ اونٹوں۔ گدھوں وغیرہ کی دوڑ۔ تیر اندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں۔ نمازوں کے ذریعے صف بندی روزے کے ذریعے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق حج کے ذریعے عرفات وغیرہ کے بے آب وگیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگاہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

خبر رسانی اور ناکہ بندی ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل وحرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لئے مکہ میں بھی آپ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینہ کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرتؐ عرب کے شمال میں دومۃ الجندل کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ کا آدھے راستے سے واپس آجانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتہ کی مہلت پاکر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا۔ خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی تیاری ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ کر بھیجی تو پیام رساں راستے میں پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ناکوں کی بندش (جس

طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکہ کی طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی ۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطہ میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کر کے جبکہ کھا کر منزلِ مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیرِ عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ " صرف تبوک" کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ توریہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا"۔

معاشی دباؤ

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرتؐ اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیا کے ذریعے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لئے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کاروان لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام فلسطین ۔ مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے ۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینبوع کے مابین ہے ۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرتؐ نے مخالفے پیدا کرنے شروع کر دیئے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہو گئی تو قریشی کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحرا میں سے ہو کر عراق جانے لگے ، لیکن جلد ہی آنحضرتؐ کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا ۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا ۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلہ کی برآمد مکہ کو روک دی گئی تھی ۔

متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے مؤثر ہتھیار ثابت ہوا ۔

غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے ۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا ۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے ۔ وہ اصل میں قریش سے حلیفی کرنے آئے تھے ۔ دستورِ مملکت میں مدینے کے یہودیوں کو اسی شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی مدد نہ دیں ۔ نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ دیں ۔ اس دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا ۔

کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں ۔ انھیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں پانی اور دیگر ضروریات کے فروخت سے روزگار نکلتا ہے ، آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز ۔ گھی ۔ بھیڑ ۔ بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں ۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لئے آنحضرتؐ سے مدد طلب کی تھی اور اشجع وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے ۔ (حوالہ ابن سعد)

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے۔ ۶ھ میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینہ کو فوج سے خالی پا کر مکہ والے آ کر نہ لوٹ لیں اور مکہ پر حملہ کریں تو بھی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضہ میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت مؤثر مدد دے سکنے والے صرف خیبری ہی رہ گئے تھے۔ ان کو بچھڑا دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

دشمنوں سے گھیرنا

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم و خزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکہ کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرتؐ کا ابتدا سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری فتوحات کی دھاک معاشی وسائل پر زبردست اقتدار ان تمام امور نے چو طرف کے چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرتؐ کا مطیع کر دیا تھا۔

دِعایہ کاری

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہد نبوی میں برتا گیا تھا جنگ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر دیا گیا تھا۔ کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرتؐ ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا اور بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلہ کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرا دی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکہ میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھا لی گئی اور وہ بہت ممنون ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکہ کے فقرا میں تقسیم کر دے۔

ان کارروائیوں سے مکہ میں بیسیوں بہی خواہ پیدا ہو گئے اور اس طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز

اس مختصر تبصرہ کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام اذا فقھوا (غیر مسلم معزز اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے۔ اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں) یہی وجہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انھیں انعام واکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انھیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد ابن الولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابلِ رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لئے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی۔ بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آ سکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے

رسول اللہؐ کے عہد میں نظامِ عدل

جسٹس ایس اے رحمٰن

قانون کے معنی قانون کا لفظ لغوی اعتبار سے یونانی لفظ "کانون" سے ماخوذ ہے جو سریانی کی وساطت سے عربی زبان میں داخل ہوا۔ اس میں اس کے معنی "سیدھی سلاخ" یا مسطر کے تھے، پھر اس کا اطلاق "قاعدہ" پر ہونے لگا۔ آج کل یہ لفظ یورپی زبانوں میں بمعنی قانونِ کلیسا مستعمل ہے۔ فقہ اسلامی میں "قانون" کے بجائے "شرع" "شریعت" یا "حکم شرعی" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ سلطنتِ عثمانیہ میں لفظ "قانون" کا اطلاق اکثر ان سرکاری احکام پر ہوتا تھا جنھیں حکومت جاری کرتی تھی تاکہ احکام شرع سے ان کی تمیز ہو سکے۔ اسلامی تصورِ حیات کے مطابق "شارعِ حقیقی" صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے جس نے وحی کے ذریعے، دین و دنیا دونوں پر حاوی ہدایت، رسولِ اکرمؐ کی زبانِ حق ترجمان پر نازل کی۔ لہٰذا فقہ اسلامی میں عبادات، معاملات اور عقوبات سب کو علوم دینیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ہم "قانون" سے امور مدنیت سے متعلق وہ جامع اور ضروری قواعد مراد لیں گے جن کی پابندی ایک متمدن معاشرہ میں لابدی ہوتی ہے۔ اور جن کا نفاذ بصورتِ مخاصمہ اولی الامر کی معرفت کرایا جا سکے۔ اس تعریف کی رُو سے وہ دینی یا اخلاقی ضوابط و قواعد، جن کی خلاف ورزی ریاستی سطح پر قابل مواخذہ نہیں، ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔

قرآنی قانون کی خصوصیت اسلامی قانون سازی کا پہلا دَور رسول اکرمؐ کی نبوت یعنی ۶۱۰ء سے لیکر آنحضرتؐ کی وفات یعنی ۶۳۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے اسلامی قانون کا اصلی اور بنیادی سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ جس کی آیات بائیس سال سے کچھ زیادہ عرصے میں وقتاً فوقتاً بذریعہ وحی قلب و زبانِ رسولِ مقبولؐ پر اتاری گئیں۔ اسلام کے سیاسی ثم معاشرتی نظام میں قرآنِ حکیم بمنزلہ دستورِ اساسی کے ہے۔ کوئی اقدام خواہ قانونی ہو یا کسی اور نوعیت کا، قرآنی احکام یا اصولوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا قانون بنایا جائے جو قرآنی نص کا نقیض ہو تو اسلامی ریاست کے نزدیک وہ کالعدم ہوگا۔ عام دساتیرِ اساسی سے قرآنی دستور اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کے متن میں کوئی انسانی ادارہ یا فرد ترمیم و تبدل کا مجاز نہیں۔

اس ابدی اساس کے ہوتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں قانون سازی کی کہاں تک گنجائش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماسوائے چند ایک مخصوص موضوعات کے جن کے متعلق احکامِ قانونی قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہیں، دیگر امور میں اصولی رہنمائی پر اکتفا کیا گیا ہے اور ان امور میں ذیلی یا جزئیاتی قواعد کا تعین حکمتِ شارع نے مکان و زمان کے امکانی تغیرات کے پیش نظر، امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے تاکہ دین میں تنگی کے بجائے آسانی ہو۔ شرط یہ ہے کہ یہ ذیلی یا جزئیاتی قواعد قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اساسی اصولوں یا روحِ دین کے منافی نہ ہوں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضورِ رسالت مآبؐ نے ارشادِ خداوندی :

" یاایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم "

کو مدِنظر رکھتے ہوئے معاملات یا عبادات کے متعلق زیادہ کریدیا سوالات کرنے سے منع فرمایا تاکہ دین متحجر ہوکر نہ رہ جائے۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ اپنے اوپر سخت گیری نہ کرو مبادا اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ پھر یہ بات بھی سزاوارِ اعتنا ہے کہ قرآن مجید کے بعض مسائل کے تصفیہ کو "عرف" یعنی رسوم و عادات کے مروجہ پیمانوں پہ مبنی رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے رسم و رواج اختلاف زمان و مکان کے باعث تغیر پذیر ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ رواجی قاعدے بھی نص یا اصول قرآنی سے متعارض نہ ہونے چاہئیں۔ نصوص یا بنیادی اصولوں کا خاص واقعات پہ اطلاق بھی تعبیر و تفسیر کا تقاضا کرتا ہے۔ قرآنی احکام کی تعبیر و تفسیر کے لئے سنتِ رسولؐ سے بہتر رہنمائی ممکن نہیں۔ ایک بظاہر عام قرآنی حکم کی تخصیص یا ایک بظاہر خاص حکم تعمیم یا ذیلی جزئیات کی تصریح کی متعدد مثالیں ہمیں احادیث میں ملتی ہیں۔ البتہ جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے ایک لیکچر میں اشارہ کیا ہے۔ بعض قانونی نوعیت کی احادیث کے متعلق یہ سوال بھی اٹھ سکتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر منحصر ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اکرمؐ نے علیٰ حالہ قائم رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ کیا ان رسوم و رواج کو جن سے تعرض نہ کیا گیا۔ ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس قوم کی ہدایت کے لئے وہ مامور ہوئے ہیں۔ ان میں اتفاقات کی مروجہ صورتوں کی اصلاح کریں۔ ان کی مالوفات کو یکسر ان سے چھڑا دینے کا ان کو حکم نہیں دیا جاتا الّا یہ کہ بعض خاص صورتوں میں بہ تقاضائے مصلحت ایسا کرنا پڑے۔ تاہم تشریع میں ان علوم و عادات کو ترجیح دی جاتی ہے جو کسی ایک قوم سے مخصوص نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ ان رسم و رواج کے سانچے ابدی نہیں ہوتے۔

نظریہ اجتہاد ان گزارشات سے روشن ہوگا یہ مفروضہ کہ قرآنی نظامِ قانون ایک جامد ضابطہ یا بند محیط ہے۔ جس میں اتنی لچک نہیں کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات و مقتضیات کا ساتھ دے سکے، صحیح نہ ہوگا۔ اجتہاد کا اصول اس نظام کو ایک حرکی اور ترقی پذیر ضابطۂ حیات کی صورت دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شارعِ حقیقی کی حکمتِ بالغہ نے دینِ کامل میں مخصوص حدود کے اندر مستقبل کی ضرورتوں سے ہم آہنگی کی گنجائش رکھی ہے اور غالباً یہ وہی منطقۂ فکر و عمل ہے جو فقہی اصطلاح میں مباح کے زیرِ نگیں ہے۔ ابن قیم، اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ احکام کی تبدیلی اور اختلاف زمان، مکان احوال، نیت اور عادات انسانی کے اختلاف کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ جس نے شریعتِ اسلامی کا دائرہ بالکل محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ وہ نہیں سمجھتے کہ جس شریعت اسلامی میں مصالح انسانی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھا گیا، اس میں ایسے "تنگ نظریوں کی گنجائش نہیں ہے۔

اجتہادی نظریہ کی تصدیق معاذ بن جبل والی حدیث سے ہوتی ہے۔ جسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب آنحضرت نے ان کو یمن روانہ کیا تو دریافت فرمایا کہ "جب کوئی معاملہ تیرے سامنے آئے گا تو تو کس طرح اس میں فیصلہ کرے گا؟ عرض کیا "کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا۔" فرمایا "اگر کتاب اللہ میں اس بات کو نہ پائے؟" عرض کیا "رسول اللہ

کی سنت کے موافق فیصلہ کروں گا۔" فرمایا" اگر سنتِ رسول اللہؐ میں بھی وہ بات نہ ملے؟" عرض کیا "اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔" یہ سُن کر رسول اللہؐ نے ان کے سینہ پہ ہاتھ مارا اور فرمایا" تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے اللہ کے رسول کو اس امر کی توفیق دی کہ راضی ہو اس سے اللہ کا رسولؐ۔" یہ حدیث گویا اجتہاد کا منشور ہے اور ہمارے لئے ہدایت کا ابدی سرچشمہ۔

قانونی نوعیت کی احادیث

اب ہم ان قانونی نوعیت کی احادیث کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں جن سے کسی اصول یا قاعدے پر روشنی پڑتی ہو۔ اس مختصر صحبت میں ساری متعلقہ احادیث کا احاطہ کرنا یا تمام مسائل کو لپیٹ لینا ممکن نہیں۔ اس لئے ہمیں رسالت کے سراج منیر کی چند کرنوں پر ہی اکتفا کرنا ہو گا۔

رسول کریمؐ کی قانونی تصریحات کے پس منظر کے طور پر ایام جاہلیت میں عرب کی حالت کا مختصر ذکر بے جا نہ ہو گا۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی اپنی کتاب فلسفہ التشریع فی الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عرب معاشرہ متفرق قبائل کے مجموعہ سے عبارت تھا۔ جس میں کسی مرکزی حکومت کی شیرازہ بندی نہ تھی۔ ہر ایک فرد اپنے قبیلہ سے وابستہ تھا خواہ قرابت داری کے ذریعے سے ہو یا باہمی عہد و پیمان کے واسطے سے۔ چنانچہ وہ اپنے قبیلہ کی جنبہ داری کرتا تھا اور بیرونی دشمن کے مقابلہ میں قبیلہ کی حمایت میں سینہ سپر رہتا تھا۔ قبائل کے درمیان جنگ و جدل عام تھا اور اس کے ساتھ لوٹ مار، مردوں اور عورتوں کو قید کرنے اور لونڈی غلام بنانے کا عام رواج تھا۔ ان کا اقتصادی نظام سادہ تھا۔ کام کرنے کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ ان کے معاملات کی حیثیت عرفی تھی یعنی قدیم رسوم و عادات پر مبنی عورتوں کا معاشرہ میں درجہ نہایت پست تھا۔ عار یا فقر و فاقہ کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ کثرتِ ازدواج کے باعث بیویوں کی کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ متعہ یا نکاحِ موقت کا بھی عام رواج تھا۔ شوہر بلا کسی پابندی یا شرط کے طلاق دینے کا مجاز تھا۔ اور عورتیں اور بچے حق وراثت سے محروم تھے۔

رسول کریمؐ کی ذات بابرکت کے باعث حکومتی سطح پر شوریٰ کا نفاذ ہوا اور حاکم کے لئے نصوص مقدسہ کی پابندی اور مصلحت عامہ کی رعایت ضروری ٹھہری۔ عدل و احسان، مساوات اور اخوت انسانی کے اصول نافذ ہوئے۔ قبیلہ کی عصبیتی یا جارحانہ لڑائی ممنوع اور دفاعی جنگ مباح قرار پائی۔ امن و امان کی تاکید ہوئی۔ عورت اور معذور لوگوں کی حالت بہتر ہو گئی۔ انفرادی ملکیت کی حرمت قائم ہوئی۔ عہد و پیمان کی پابندی واجب ٹھہری اور دھوکہ بازی یا حیلہ پردازی کی مختلف صورتیں زیرِ امتناع آئیں۔

معاہدوں کی پابندی

قانون کا ایک حصہ بین قومی معاہدوں سے تعلق رکھتا ہے۔ عہد نبوی کے سیاسی آثار میں سے ایک نمایاں واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ نے مدینہ میں ایک وفاقی حکومت کی بنیاد رکھی جس کے صدر اعلیٰ خود حضورؐ تھے۔ اس تحریری معاہدے کا متن جو اس موقع پر تیار ہوا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب "الوثائق السیاسیہ" میں درج کیا ہے۔ فریق معاہدہ ایک طرف رسول اکرمؐ اور مہاجرین و انصار تھے اور دوسری طرف مدینہ کے تمام یہود و نصاریٰ اور دیگر غیر مسلم باشندے۔ تمام فریقوں کو سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت دی گئی۔ مدینہ پر حملہ کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریقوں کی حمایت کی پابند تھی۔ اور دشمن سے صلح کی صورت میں ہر نوع

کی منفعت میں مسلمانوں کی مانند دوسرے شرکا بھی متمتع ہونے کا حق رکھتے تھے۔ ہر فرد کا فرض تھا کہ اپنے ہمسائے کی طرف داری اپنے نفس کی مانند کرے انصاف رسانی پوری جماعت کا فریضہ قرار پائی۔ اس بارے میں کسی رشتہ داری یا قرابت کا پاس ولحاظ ممنوع ہوا۔ ایک شق معاہدہ کی یہ بھی تھی کہ کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہ دے سکے گا۔ فدیہ اور دیت وغیرہ کے اصول حسب سابق رہے۔ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا نظام قائم ہوا۔ باہمی اختلاف یا تنازعہ کا مقدمہ خود رسول اکرمؐ کے فیصلے پر موقوف تھا۔ آنحضرت غیر مسلموں کے مقدمات میں ان کے اپنے شخصی قانون کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ یہ فقید المثال معاہدہ بعد میں قبائل یہود کی مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور ان کی فتنہ پردازیوں کی نذر ہوگیا۔ ہمارے ہاں اقلیتوں کے مسائل کا حل شاید اس تاریخی معاہدہ کی روشنی میں دریافت ہو سکے۔

بین قومی معاہدوں کا جو حشر مہذب متمدن مغربی اقوام کے ہاتھوں ہوتا آیا ہے کسی تاریخ کے طالب علم سے مخفی نہیں۔ رسول اکرمؐ نے جس جماعت یا فرد کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا۔ خود اس کی پابندی کی اور اپنے پیروؤں سے پوری دیانتداری کے ساتھ اس پر عمل کروایا۔ صلح حدیبیہ اس ضمن میں فقید المثال ہے۔ یہ معاہدہ کفار قریش اور آنحضرت کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر ہوا اور اس کے کاتب حضرت علیؓ تھے۔ اس معاہدہ کی رو سے فریقین میں دس سال کے لئے جنگ ممنوع قرار پائی۔ ایک شرط معاہدہ کی یہ تھی کہ اس عرصہ میں اگر مسلمان مکہ میں حج عمرہ یا تجارت کے لئے وارد ہوں تو اہل مکہ پر ان کی جان ومال کی ذمہ داری ہوگی اور اگر قریش تجارت کے لئے مدینہ کی راہ سے مصر یا شام کی طرف عازم ہوں تو مسلمان ان کی جان ومال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ ایک اور شق کے مطابق اگر اہل مکہ میں سے کوئی شخص اپنے خاندانی سربراہ کی اجازت کے بغیر مسلمان ہوکر مدینہ چلا آئے تو اس کا مکہ لوٹا دینا رسول اکرم پر واجب تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ میں سے اسلام ترک کرکے مکہ میں پناہ گزیں ہو تو قریش اس کی واپسی پر مکلف نہ ہوں گے۔ بظاہر اس شق کے تحت فریقین کے حقوق مساوی نہ تھے۔ لیکن جب ابوبصیر جنھیں صاحب عیص بھی کہا جاتا ہے، مکہ سے فرار ہوکر مدینہ پہنچے تو آنحضرت نے اہل مکہ کے دو ایلچیوں کے ہمراہ انھیں واپس جانے کا حکم دیا۔ ابوبصیر نے تعمیل ارشاد کی۔ جب تینوں ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابوبصیر نے حیلہ سے اپنے ایک محافظ کی تلوار پر قبضہ کرکے اسے ختم کر دیا اور پھر بھاگ کر رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا "تم بڑے لڑاکے ہو۔ اگر دوسروں کے ہمراہ بھی تھوڑے آدمی ہوتے تو فریقین میں جنگ چھڑ جانا مشکل نہ تھا۔" قریش کا دوسرا آدمی بھی بدحواسی کے عالم میں رسول اکرمؐ کے پاس شکایت کے لئے پہنچا۔ یہ رنگ دیکھ کر ابوبصیر چپکے سے نکل گئے اور عیص کے مقام پر جا کر مقیم ہوگئے۔ یہ واقعہ ملک میں مشہور ہوگیا تو اہل مکہ میں سے اس زمرہ کے لوگوں نے بھی عیص کا رخ کیا اور اس طرح وہاں گویا مجاہدین کی ایک نو آبادی بن گئی۔ جو قریش کے قافلوں کے لئے خطرہ بن گئی چنانچہ قریش نے خود معاہدہ کی اس شق سے دست برداری دے دی اور عیص والے مدینہ آگئے۔ ابوبصیر اس اثنا میں وفات پا چکے تھے۔

روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ نے جاسوسوں کے قتل کی اجازت دی۔ یہ بات زمانہ حاضر میں بھی سیاست ملکی اور جماعتی سلامتی کے موافق سمجھی جاتی ہے۔ خصوصاً جنگ کے ایام میں قاصدوں کے بارے میں حضورؐ کا فرمان تھا کہ ان کا قتل ممنوع ہے۔ ان کے ارشاد کے مطابق قاصد کا روک لینا اور اس سے کسی قسم کا تعرض بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔ مفتوح جماعتوں یا قوموں پر

مرتبہ بھی عاید کیا جاتا تھا اور ان کے مال و جان کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر قائم ہو جاتی تھی۔ اس قسم کے ذمیوں کو جنگی خدمت سے معاف رکھا جاتا تھا اور کسی قسم کا دیگر بار ان پر نہ ڈالا جاتا تھا۔ پھر ان کے معذور یا نادار لوگوں سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال وہ وثیقہ امان ہے، جو حضورؐ نے تیما کے یہود بنی عادی کے لئے لکھوا دیا تھا۔

ریاست کے معاملات

اب معاملات ریاست پر ایک نظر ڈالئے آیہ شریفہ "ان اللہ یامر بالعدل والاحسان" ہمیشہ حضورؐ کے پیش نظر رہتی تھی۔ چنانچہ جب حضورؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انھیں خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ جب زکوٰۃ وصول کرو تو لوگوں کے نفیس اور منتخب مال کو زکوٰۃ میں لینے کی کوشش نہ کرنا اور مظلوموں کی بددعاؤں سے بچنا اسلئے کہ بددعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ یہ روایت صحیحین میں ہے۔ زکوٰۃ ہی کے سلسلے میں حضورؐ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ کو زکوٰۃ کی وصولی پر مامور فرمایا اور بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس نے زکوٰۃ کے علاوہ تحفہ کے طور پر کچھ چیزیں زکوٰۃ دینے والوں سے لی ہیں تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کے فعل کو زکوٰۃ کے مال میں خیانت سے تعبیر فرمایا۔ گویا حضورؐ نے صراحت فرما دی کہ حرام وسائل بھی حرام میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی شامل ہیں کہ رائش یعنی اس شخص پر بھی لعنت فرمائی جو راشی اور مرتشی کے درمیان واسطہ بنے۔

اجتہاد کی اہمیت

معدلت گستری سے متعلق ہمیں احادیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ جب اسلامی عملداری کا کام مدینہ کی حدود سے بڑھ گیا تو حضورؐ نے چند مفتی یعنی قاضی مدینے میں مقرر فرمائے۔ جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرتؐ کے پاس مرافعہ بھی ہوتا تھا۔ کتانی نے اپنی کتاب التراتیب الادارية میں بحوالہ ابن الجوزی و موطا اس تنظیم کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقدمات کے لئے حضورؐ نے موقتی قاضی بھی تعین فرمائے۔ سرخسی نے مبسوط میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت نے حضرت عمروؓ بن العاص سے فرمایا کہ ان دو آدمیوں کا قضیہ چکاؤ۔ کہا "کیا آپ کی موجودگی میں فیصلہ کروں؟" فرمایا "ہاں!" کہا "کس صورت میں؟" فرمایا "اس طور پر کہ اگر اجتہاد کرو اور صحیح چیز پر پہنچو تو دس نیکیوں کا ثواب ہوگا اور اگر خطا کر جاؤ تو ایک نیکی شمار ہوگی۔" حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جب حاکم غیظ و غضب میں ہو تو دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ ٹھنڈے دل سے معاملہ کے حسن و قبح پر غور نہ کر سکے گا۔ ایک اور حدیث میں اجتہاد کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "جب حاکم حکم لگانے پر آمادہ ہو تو اجتہاد کرے (یعنی معاملہ پر خوب غور و خوض کرے) اگر اس کا فیصلہ حق بجانب ہوگا تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر فیصلہ میں باوجود پوری کوشش کے غلطی رہ جائے تو اُسے ایک اجر ملے گا۔" یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ ساتھ ہی حضورؐ نے قضا کی ذمہ داریوں کا احساس ان معنی خیز الفاظ میں دلایا "جس شخص کو لوگوں کا قاضی بنایا گیا اسے گویا بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔" انصاف رسانی کے سلسلے میں حضورؐ کا فرمان ہے "قاضی کو چاہیئے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنی ذاتی معلومات کو اس میں دخل نہ دے۔"

حاکم کی صفات

آنحضرت طالب عہدہ لوگوں کو کبھی قاضی یا گورنر نہ بناتے تھے۔ لیکن جسے عہدہ کے لئے موزوں خیال فرماتے تھے اس کی جرأت افزائی فرماتے تھے۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے مجھ کو عامل بنا کر یمن بھیجا۔ میں

نے عرض کیا "یا رسول اللہ آپ مجھ کو حاکم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ میں جوان ہوں اور حکومت کرنے کا طریقہ بھی مجھے معلوم نہیں" آپ نے فرمایا "خداوند تعالیٰ تیرے دل کی رہنمائی کرے گا اور تیری زبان کو ثابت رکھے گا"۔ پھر ارشاد ہوا "جب دو شخص کوئی معاملہ لے کر تیرے پاس آئیں تو پہلے شخص یعنی مدعی کے حق میں اس وقت تک فیصلہ نہ کر، جب تک کہ دوسرے کے بیان کو نہ سن لے اس لئے کہ مدعا علیہ کا بیان تجھے حکم دینے میں مدد دے گا۔" ایک اور حدیث کے مطابق حضورؐ نے فرمایا کہ دونوں فریق یعنی مدعا علیہ اور مدعی حاکم کے سامنے بیٹھیں (یعنی ان سے برابری کا سلوک ہو) حضورؐ کا قول ہے کہ اگر محض لوگوں کے دعوے پر ہی ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے لوگ اپنے آدمیوں کے خون اور مال کا دعوےٰ (بغیر مستحکم بنیاد کے) کرنے لگیں گے۔ لہٰذا مدعا علیہ پر قسم بھی ہے۔ یعنی صرف مدعی کا بیان کافی نہیں بلکہ مدعی سے قسم لینا بھی ضروری ہے۔ ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ "ثبوت مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ پر"

حضرت ام سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ حضور نے فرمایا "میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے لے کر میرے پاس آتے ہو۔ ممکن ہے تم میں سے کوئی شخص ایسا ہو جو اپنی دلیل کے ساتھ خوب تقریر کر سکے۔ پھر میں اس کے بیان کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کر دوں تو حقیقت میں اگر اس کا حق نہیں تو وہ اسے نہ لے۔ ایسی صورت میں گویا اس کے لئے دوزخ کی آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کرتا ہوں" یہ محض قانونیت پر انحصار کے خلاف تنبیہ ہے۔ جب حق مدعی کے ساتھ نہ ہو۔ اس بارے میں خود فرد کے ضمیر کو قاضی بنایا گیا ہے اور یہ امر اس پر دال ہے کہ اسلامی نظامِ قانون لادینی نظاموں کے برعکس، محض قانونی موشگافیوں کی بنا پر یا قانونی حیلوں کے ذریعے کسی کو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں کرتا۔ ہر فرد کو روحِ اسلامی کو بھی مدِ نظر رکھنا ہو گا۔

مرافعہ کے علاوہ "استصواب" اور "تصحیح" کی مثالیں بھی عہد نبوی کی تاریخ میں ملتی ہیں جب کبھی حضور کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرزِ عمل کی خبر ملتی تو آپ بصیغہ تصحیح دخل دہی فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ مسندِ احمد بن حنبل میں بھی آنحضرتؐ کے پاس مرافعوں کی نظیریں درج ہیں۔ نیز اس وثیقہ سے جو حضورؐ نے قبیلہ بنو عبد القیس کو تحریر کرا دیا، ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کا امکان بھی تھا۔ اس میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ مفصل مقدمات میں ایسا عدل کریں کہ فریقینِ مقدمہ کو نظرِ ثانی کی ضرورت نہ رہے۔

کتمانِ شہادت

کتمانِ شہادت اور جھوٹی گواہی کے خلاف کئی ایک حدیثوں میں شدید تنبیہ وارد ہے۔ حریم بن فاتک کہتے ہیں کہ آنحضرت نے ایک روز صبح کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر تین مرتبہ فرمایا کہ جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے "قل الحق ولو علیٰ نفسک" (سچ بولو خواہ تمہارے اپنے خلاف ہو) عدلِ رسالت مآب کی اس سلسلے میں ایک مشہور روایت ہے۔ ابولعبہ نے جو انصار میں سے تھا۔ ایک زرہ چرائی اور اسے آٹے کی بوری میں رکھ لیا۔ بوری پھٹی ہوئی تھی اور اس لئے آٹا راستے میں اس کے گھر تک گرتا چلا گیا۔ قرائن سے معلوم ہوا تھا کہ وہی چور ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ زرہ اس نے ایک یہودی کے پاس امانت رکھ دی تھی اور پھر اپنی برادری میں آ کر مشہور کر دیا کہ زرہ یہودی نے چرائی ہے۔ اس انصاری کے برادری کے لوگ حضورؐ سے خواہاں ہوئے کہ آپ انصاری کی عذر خواہی کریں۔ حضورؐ کو اشارۂ غیبی سے حقیقت کا پتہ چل گیا اور آپ نے فیصلہ یہودی کے حق میں فرمایا۔ ابولعبہ اس کے بعد مکہ کی طرف بھاگ کر چلا گیا اور مرتد ہو گیا۔

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے کالعدم تصور ہوگا۔ جب عمرو بن حزم یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آنحضرتؐ نے ایک تحریری ہدایت نامہ عنایت فرمایا تھا۔ اس دستاویز میں منجملہ دیگر ہدایات کے، انہیں ہر معاملہ میں اللہ کے امر کے مطابق صداقت کو مدِنظر رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ تفصیل بھی اس میں درج تھی کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجانہ دلایا جائے گا۔ نیز مختلف اجناس کے لئے بلحاظِ وسائل آبپاشی اور پالتو حیوانات پر زکوٰۃ کے پیمانوں کی صراحت کی گئی تھی۔

سود کی ممانعت سود کا دستور سرمایہ داری نظام کی اساس ہے۔ سود کی ممانعت قرآن مجید میں آئی ہے۔ اس ممانعت کے تحت حضور نے ایک ہی جنس کی کم و بیش مقدار کا تبادلہ ممنوع قرار دیا تاکہ دھوکے، غلطی یا ربا کا امکان نہ رہے۔ صرف دست بدستی برابر برابر مقدار کے جنسی سودے کو جواز بخشا گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ عمدہ قسم کی کھجور حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے لائے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ دو صاع ناقص کھجوریں دے کر ایک صاع عمدہ کھجوریں خریدی گئی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "ایسا نہ کر۔ اگر ضرورت ہو تو پہلے اپنی کھجوریں بیچ ڈال اور ان کی قیمت سے دوسری کھجوریں خرید لے۔" صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے بغیر تلی یا غیر معین کھجوروں کے عوض فروخت سے منع فرمایا۔ اس اصول کے پیش نظر ایک سونے کے ہار کے متعلق ارشاد ہوا کہ اسے فروخت نہ کیا جائے، جب تک سونا اور نگینے علیحدہ علیحدہ نہ کر لئے جائیں۔

ابن ماجہ اور بیہقی کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس کے پاس کوئی ہدیہ یا تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے جانور دے تو وہ نہ تو سواری استعمال کرے اور نہ ہدیہ اور تحفہ قبول کرے مگر اس صورت میں جبکہ قرض دینے سے پہلے بھی اس قسم کا معاملہ جاری ہو۔ صحیحین کی روایت ہے کہ اسی احتیاطی اصول کے پیشِ نظر حضورؐ نے مزابنہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باغ کے تازہ پھلوں کو خشک پھلوں کے بدلے اس طرح فروخت کرے کہ خشک پھل کے پیمانے معین کرے اور تازہ پھلوں کا اندازہ کرے۔ اسی طرح محاقلہ یعنی کھڑی کھیتی کے بدلے معین مقدار غلہ کی فروخت کی ممانعت فرمائی۔ اسی ضمن میں درختوں پر لگے پھلوں کو اس وقت تک بیچنے سے منع فرمایا ہے جب تک ان میں پختگی کے آثار نمایاں نہ ہو جائیں۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا کہ جب تک قبضہ میں نہ لے کر ناپ نہ لیا جائے، اسے فروخت نہ کیا کرو۔ عمومی طور پر حضورؐ نے غیر مقبوضہ اشیاء کی فروخت کے خلاف تنبیہہ فرمائی۔ مگر بیع سلف کی ان شرائط پر اجازت دی کہ ناپ، وزن اور معیار متعین ہوں۔ ملامست اور منابذت کی شکل میں بیع کی حرمت بھی اسی مصلحت کے تحت تھی کیونکہ ان دونوں میں فروخت شدہ کپڑے کو کھول کر نہیں دیکھا جاتا بلکہ پہلی صورت میں بیع محض کپڑے کو چھو لینے سے اور دوسری صورت کپڑے کو ایک دوسرے کی طرف پھینک دینے سے مکمل ہو جاتی ہے۔ پوشیدہ عیب والی شے کی بیع کرنے والے کو حضورؐ نے غضب الٰہی کا مورد قرار دیا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کے لئے دھوکہ دینا جائز نہیں۔"

بیوع کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بائع اور مشتری میں اختلاف واقع ہو اور فروخت شدہ چیز بجنسہ موجود ہو اور فریقین اگر گواہ نہ رکھتے ہوں، تو بائع کا قول معتبر ہوگا، اور فریقین کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا۔ رفع تنازعہ کی خاطر حضورؐ نے یہ

صراحت فرمائی کہ بیع فسخ کرنے کا اختیار تا اختتامِ مجلس رہتا ہے اور بیچنے والے کو مجلس ختم کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں اگر معاہدۂ بیع کی شرط ہو کہ اختیار بعد میں بھی ہو گا تو اور بات ہے۔

احتکار یعنی گرانی کے خیال سے غلہ روک رکھنے والے کو حضورؐ نے ملعون فرمایا۔ یہاں تک تنبیہ کی گئی کہ اگر کسی نے چالیس دن غلہ کو بند رکھنے کے بعد اسے خیرات بھی کر دیا تو اسے ثواب نہ ہو گا۔

قرض کا لین دین

آنحضرتؐ نے قرضہ کی بوجہِ احسن ادائیگی کی بارہا تاکید فرمائی۔ روایت ہے کہ ایک شخص اپنے اثاثہ سے زائد قرضے چھوڑ کر مرا تو حضورؐ نے اس کا جنازہ پڑھنے سے پرہیز کیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے کہ خدا سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے مگر قرض کی معافی نہیں ہوتی۔ اس لئے مفلس قرضدار کا قرضہ معاف کر دینے یا کم از کم اسے مہلت دینے کی ترغیب متعدد احادیث میں وارد ہے۔ ایک شخص کے قرضے اس کے اثاثہ سے متجاوز تھے، حضورؐ نے اثاثہ قرض خواہوں میں بحصہ رسدی تقسیم کر دینے کا حکم فرمایا۔ عصرِ جدید میں قانون دیوالیہ کے تحت بھی یہی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف قرض خواہوں کا تقاضا کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے سختی کے ساتھ قرض کا تقاضا کیا۔ صحابہؓ اس کو دھمکانے یا مارنے کے ارادے سے اُٹھے۔ حضورؐ نے فرمایا "اسے کچھ نہ کہو اس لئے کہ حق دار کو کہنے کا حق حاصل ہے۔" پھر فرمایا "اونٹ خرید کر اسے دے دو۔" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس کے اونٹ سے بہتر اور زیادہ عمر کا ملتا ہے۔ فرمایا۔ "وہی خرید کر دے دو۔ بہتر آدمی وہی ہے جو قرض کو خوبی کے ساتھ ادا کرے۔"

مدنیت کے اصولوں میں ایک اصول ہمیں احادیث میں ملتا ہے کہ جو شخص ایسی بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنائے جو کسی کی ملکیت نہ ہو وہ اسی کی ہے۔ ساتھ ہی کسی کی زمین پر ناحق قبضہ کرنے کے خلاف زبردست تہدید ملتی ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کسی قوم کی زمین بلا اجازت کاشت کرے تو اس کھیتی کی پیداوار کا وہ حقدار نہیں ہے لیکن جو خرچ اس نے کاشت پر کیا ہو۔ اس کے لینے کا مستحق ہے۔

ابو داؤد اور ابنِ ماجہ کی روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تین چیزوں میں سارے مسلمان شریک ہیں۔ پانی، گھاس اور آگ۔ شفع کا حق ہمسایہ اور شریک ملکیت کے لئے احادیث میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ قریب کے رہنے والوں میں مغایرت یا منافرت پیدا نہ ہو۔ یہ بھی صراحت ملتی ہے کہ مشترک ملکیت کی تقسیم کے بعد شریک کا حق قائم نہیں رہتا۔ رفاہِ عام کے لئے وقف کے احکام بھی ہمیں احادیث میں ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے کچھ زمین جس کا نام ثمغ تھا۔ حضرت عمرؓ کو عنایت فرما دی تھی۔ حضرت عمرؓ نے کچھ اور اراضی یہود سے خرید کر اس کے ساتھ شامل کر لی۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "میری جائیداد خوب ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔" حضورؐ نے فرمایا "اسے وقف کر دو اور اس طرح کہ اس کا اصل قائم رہے اور اس کی آمدنی خرچ کی جا سکے۔" حضرت عمرؓ نے اسی پر عمل کیا۔

قرآنی اجمال کی رسالتی سطح پر تفصیل کی مثالیں ہمیں قانون میراث میں ملتی ہے۔ آیۂ میراث کا حکم عام ہے۔ حضورؐ کے ارشادات سے والدین اور اولاد کے مفہوم کی تخصیص ہوئی۔

حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دوسرے سے میراث پانے والے ایک ہی دین پر ہونے چاہئیں۔ آپ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے کہ قاتل مقتول کے مال کا وارث نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں بظاہر وصیت کے متعلق عام حکم ہے۔ حضورؐ نے آیۂ میراث کے پیش نظر صراحت فرمائی ہے کہ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ تمام ورثاءؔ رضامند ہوں۔ لا وصیۃ الوارث۔ پھر آپ نے وصیت کی تحدید ایک تہائی جائیداد تک فرمائی۔ حضرت سعد بن وقاص فتح مکہ کے سال میں بیمار ہوئے اور انہوں نے آنحضرت سے استفسار کیا کہ کتنے مال کی وصیت کر دیں۔ حضورؐ نے ایک تہائی کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا کہ ایک تہائی بھی بہت ہے ارشاد ہوا کہ اگر تو اپنے وارثوں کو مالدار اور خوشحال چھوڑے گا۔ تو یہ اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو مفلس چھوڑے اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وصیت کے احکام کی صورت آیۂ میراث کے نزول کے بعد بدل گئی۔ نیز حضورؐ نے توضیح فرمائی کہ وصیت اور تقسیم میراث پر قرض کی ادائیگی مقدم ہے۔ حالانکہ آیۂ قرآنی کے الفاظ ہیں "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ" بظاہر ان الفاظ سے قیاس ہو سکتا تھا کہ وصیت کا ذکر چونکہ پہلے آیا ہے۔ اس لئے اسے دَین یعنی قرضہ پر بھی فوقیت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کچھ رشتے حرام فرمائے ہیں۔ مثلاً ماں، بیٹی، بہن یا دو بہنوں کا ایک عقد میں جمع کرنا وغیرہ۔ ان کے علاوہ باقی رشتوں کو آیۂ قرآنی میں حلال بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ کا فیصلہ تھا کہ بیک وقت پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی سے بھی نکاح نہ کیا جائے کہ اس طرح خطرہ ہے کہ ان کے درمیان صلہ رحمی اور محبت قائم نہ رہ سکے۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں متعدد احادیث میں تذکرہ ملتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا "بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے اجازت حاصل نہ کرلی جائے اور کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس سے دریافت نہ کر لیا جائے" حضورؐ نے فرمایا کنواری کی خاموشی ہی رضامندی کے مترادف سمجھی جائے۔ گویا قرآن کی شہادت کا جواز اس حکم سے پیدا ہوتا ہے۔ ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ اگر کنواری انکار کرے تو اس پر جبر جائز نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک کنواری لڑکی نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرے باپ نے میری رضامندی کے بغیر میرا نکاح کر دیا ہے۔ آپ نے اس کو چھوڑ دینے کا اختیار دیا۔ حضورؐ نے خلع کا حق ثابت بن قیس کی بیوی کو دلوایا اور فیصلہ محض اس کی ذاتی نفرت کی بنا پر دیا۔ شرط یہ رکھی گئی کہ مہر میں جو باغ اسے شوہر نے دیا تھا۔ وہ شوہر کو واپس کر دے۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے عورت کو معاشرہ میں اس کا جائز مقام دلوایا۔ اسی ضمن میں غالباً شعار کی ممانعت بھی آتی ہے۔ شعار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ بدلے کے طور پر کر دے گا۔ اور دونوں نکاحوں میں مہر کچھ نہ ہوگا۔ اس میں قباحت یہی ہے کہ لڑکیوں کی رضامندی کا حق بالائے طاق رہ جائے گا۔

طلاق کی صورت میں حضانت کا حق حضورؐ نے صغر سن بچوں کی ماں کو دلوایا۔ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت نے ایک لڑکے کو اس امر کا اختیار دیا کہ وہ ماں کے پاس رہے یا باپ کے پاس۔ ان فیصلوں میں بچوں کی صحیح تربیت اور مناسب نشوونما کا نکتہ پوشیدہ ہے۔

عہدِ عتیق میں قانونِ حمورابی کے مطابق کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جاتا تھا اور اصلی قاتل محفوظ رہتا

تھا۔ قانون حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص کا ذکر ہے۔ آنحضرت کے عہد معدلت گستری میں قتلِ عمد، شبہ عمد اور قتلِ خطا میں فرق کیا جانے لگا۔ اس تفریق کا ذکر حضورؐ کے خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی ملتا ہے۔ قتلِ عمد کے لئے قصاص کا حکم ہوا۔ یعنی کہ وارث خون بہا پر راضی ہو جائیں یا معاف کر دیں۔ شبہ عمد کی صورت میں حضورؐ نے دیت مقرر فرمائی۔ ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قاتل کے ہاتھ نے عمداً فعل کیا ہے اور اس کے دل نے خطا۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اگر قاتل کے ہاتھوں بلا ارادہ یا نیت کے قتل ہو جائے تو پھر مارنے والے کا قاتل دوزخ کا مستحق ہوگا۔ آیت ربانی لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْریٰ کے موافق شخصی ذمہ داری کا اصول آنحضرت کے زمانے میں قائم ہوا۔ زمانۂ جاہلیت میں نظیریں ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے دگنا ہوتا۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔ آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد و رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کم تر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا تھا۔ آنحضرت کے حکم سے ایک آزاد آدمی بھی ایک غلام کے قتل کے لئے واجب القتل ٹھہرا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا "سب مسلمان قصاص اور دیت میں برابر ہیں۔" کل مومنٌ اِخوۃٌ کی یہ عملی تشکیل تھی۔ حضورؐ نے فعل کی نوعیت کے لحاظ سے سزا میں بھی تفریق کی ایک شخص کو جس نے مقتول کو پکڑ رکھا تا آنکہ قاتل نے اسے مار ڈالا۔ حضورؐ نے اسے تا عمر قید کی سزا دی اور قاتل کو قتل کرا دیا گیا۔

حضورؐ نے بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی TORT کا اصول قائم فرمایا اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دیا جانے لگا۔ غیر جانبدارانہ قانونی انصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے بھی نظر انداز نہ ہوئے۔ حضورؐ نے ضرب یا جراحت کی دیت کے پیمانے مقرر فرمائے۔ لیکن رحمت للعالمینی کی شان یہ تھی کہ کمزوروں اور ناداروں سے مروت اور فیاضی کا سلوک ہوتا تھا۔ ابن حصین روایت کرتے ہیں کہ ایک نادار و مفلس طبقہ کے لڑکے نے ایک دولت مند خاندان کے لڑکے کا کان کاٹ ڈالا۔ مفلس طبقہ کی جماعت حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا "ہم تو فقیر لوگ ہیں۔ دیت کی استطاعت نہیں رکھتے۔" حضورؐ نے ان کو معاف فرما دیا۔

حالات و واقعات کے لحاظ سے مناسب رعایت روا رکھی جاتی تھی۔ ایک اپاہج اور بیمار شخص جس نے قبیلہ کی ایک لونڈی سے زنا کیا تھا حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضورؐ کے حکم سے اسے کھجور کی ایک ٹہنی سے جس میں چھوٹی چھوٹی سو شاخیں تھیں، ایک ہی ضرب لگائی گئی اور یوں "مأۃ جلدۃ" کا لفظی تقاضا پورا کیا گیا۔ کیونکہ احتمال تھا کہ وہ کوڑوں کی سزا سے مر جائے گا۔ سفر یا جنگ کے حالات میں چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا سے احتراز کیا گیا۔ حضورؐ کا فرمان ہے "لا تقطع الایدی فی السفر" اور ایک روایت میں "سفر" کی بجائے غزو کا لفظ ہے۔ ایک شخص کے غلام نے اس کی بیوی کا آئینہ چرا لیا۔ غلام کو حضورؐ نے سزا دی۔ عباد بن شرجیل کے سرقے کا واقعہ بھی حدیث میں مذکور ہے۔ انہوں نے کسی کے کھیت میں گھس کر وہاں سے کچھ غلہ توڑ کر کھا لیا اور کچھ اپنے کپڑے میں باندھ لیا۔ اتنے میں مالک آن پہنچا۔ اس نے انھیں مارا اور کپڑا بھی چھین لیا اور حضورؐ کے پاس ان کو لے گیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ نادان تھا تو تم نے اسے سمجھایا نہیں اور بھوکا تھا تو کھلایا نہیں۔ یہ سن کر مالک نے

اسے کپڑا بھی واپس کر دیا اور ایک نصف وسق غلہ بھی دے دیا۔

امتحانی آزادی

میری ناچیز رائے میں اس روایت سے پہلے جرم پر محض فہمائش یا امتحانی آزادی PROBATION کے جواز کا قیاس ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کو جس نے کھانے کی چیز کی چوری کی تھی۔ حضورؐ نے سزا نہیں دلوائی درختوں پر لگے ہوئے پھلوں اور سفید کھجوروں کے سرقہ پر بھی حضورؐ نے قطع ید سے منع فرمایا۔ ایک غلام کو جو عادی چور تھا حضورؐ نے چار مرتبہ معاف فرمادیا۔ اور بعد کے جرائم پر سزا دلوائی۔

آنحضرتؐ کی حدیث ہے "لاضرر و لاضرار" یعنی شریعت کا مطمح نظر کسی فریق مقدمہ کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ اسلامی فقہ میں استحسان مصالح مرسلہ کی قسم کے اصولوں کی بنیاد اس قول نبوی سے مناسبت رکھتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کو "تنبیہ" یا تعزیر کے طور پر مارنا ہو تو خطاکار کے منہ پر نہیں مارنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فعل شرف انسانی کے خلاف ہے۔ شرابی کو بعض روایات کے مطابق حضورؐ نے معمولی مار پیٹ کی سزا دی اور بعض حالتوں میں کوڑے بھی لگوائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور خمر حرام ہے۔

اسلام سے پہلے عرب میں کوئی گڑھا یا کوئی جانور اگر کسی آدمی کی مضرت یا ہلاکت کا باعث ہوتا تو سزاوار عقوبت قرار دیا جاتا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک انگلستان میں بھی کسی گاڑی درخت یا دیگر کسی جاندار قاتل کو قانوناً سزائے قتل دی جاتی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بے زبان جانور، کان اور کنوئیں کی ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری پیدا نہیں ہوتی۔

جان و مال کی حفاظت کا حق متعدد احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ ان کا ایک نوکر ایک دوسرے آدمی سے لڑ پڑا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ کاٹ کھایا۔ ان میں سے ایک نے جب اپنا ہاتھ دوسرے کے منہ سے زور سے کھینچ کر نکالا تو اس کے دانت گر پڑے۔ اس نے حضورؐ سے استدعا کی کہ دانتوں کا معاوضہ دلوائیں۔ آپ نے فرمایا۔ کیا وہ اپنے ہاتھ کو تیرے منہ میں چھوڑ دیتا کہ تو اس کو اونٹ کی طرح چباتا رہتا؟" ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت میں لڑتا ہوا مارا جائے تو اسے شہید کا درجہ حاصل ہوگا۔ اور اگر وہ غاصب کو ایسی حفاظتی لڑائی میں مار ڈالے تو اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی راوی نے آنحضرتؐ کا قول روایت کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا اجازت تیرے گھر میں جھانکے اور تو اسے کنکری مارے جس سے اس کی آنکھ پھوٹ جائے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں"۔ یوں ذاتی تخلیہ یا PRIVACY کا حق حضورؐ نے تسلیم فرمایا۔

کوئی امتیاز نہیں

حضورؐ نے واضح فرمادیا کہ حدود کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اس لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تھا۔ تو اسے سزا دیتے تھے۔ قسم ہے خدا کی اگر فاطمہؓ محمدؐ کی بیٹی بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔ اس خطبہ کا ذکر بخاری اور مسلم دونوں نے کیا ہے۔

رسول مقبولؐ کے زیر ہدایت شک کا فائدہ ملزم کو دیا جانے لگا۔ آپؐ کا قول ہے "ادرؤا بالشبہات" یعنی شبہات کی موجودگی

ہیں سزاؤں سے درگزر کرو" اس قول کا حوالہ ابنِ رشد نے ہدایۃ المجتہد میں دیا ہے اور اس کی روایت ترمذی میں بھی موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی سے حضورؐ کا فرمان مروی ہے کہ مسلمان سے جہاں تک ہو حدود کو دور کرو اور اگر ذرا سا موقع بچاؤ کا نکل آئے تو اس کو چھوڑ دو ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا: " فان الامام ان یخطی فی العفو خیرٌ من ان یخطی فی العقوبۃ" یعنی معافی دینے میں خطا کرنا بہتر ہے بہ نسبت سزا دینے میں غلطی کرنے سے۔

حضرت اسامہ بن زید سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کے لوگوں کے مقابلے میں آنحضرتؐ نے ہم کو بھیجا۔ میں ایک شخص کے مقابلہ پر آیا اور اس پر نیزہ سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا۔ میں نے اس کو نیزے سے مار ڈالا اور بارگاہِ نبوتؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا، آپؐ نے فرمایا جب اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تھا تو پھر تو نے اسے کیوں قتل کر دیا ؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اس نے تو اپنے آپ کو بچانے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا، تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا ؟ حضورؐ نے ایک اور مرتبہ فرمایا :۔

" نحن نحکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر" یعنی ہم ظاہر پر فیصلہ کرتے ہیں (جہاں نیت نہ معلوم ہو سکے) اور نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ ظاہر واقعات اور قرائن پر انحصار کا اصول ایک در مخاصمہ سے روشن ہوتا ہے۔ جو حضورؐ نے فیصلہ فرمایا۔ ایک جانور کی ملکیت کے متضاد زبانی دعووں کی صورت میں حضورؐ نے فیصلہ اس شخص کے حق میں کیا۔ جس کے قبضہ میں وہ جانور تھا۔ جدید اصول قانون کا مقولہ بھی یہی ہے کہ قبضہ قانون کا ۱۰/۹ حصہ ہے۔

قتل کے مقدمہ میں عدم شہادت کی صورت میں حضورؐ نے قسامت یعنی جماعتی قسم کا قاعدہ استعمال فرمایا اور جہاں فریقین میں سے کوئی جماعت قسم کھانے کو تیار نہ ہوئی تو حضورؐ نے دیت بیت المال سے دلوا دی۔

بعض نظیروں سے مترشح ہے کہ حضورؐ نے فوجداری نوعیت کے مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لئے حوالات میں محبوس رکھا، اس قسم کی ایک روایت سنن ابو داؤد میں شامل ہے۔ صاحب مبسوط نے اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ بعض اوقات عہد نبوی میں حاضری کا مچلکہ بھی لیا جاتا تھا۔

مغربی قانونی فلسفہ کا ایک اصول یہ ہے کہ صدر ریاست دیوانی عدالتوں میں جواب دہ نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظام میں کسی فرد کو خواہ وہ ریاست کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہیں سمجھا جاتا۔ خود رسول اکرمؐ نے اپنی ذات کے خلاف ضمان یعنی ٹارٹ اور دیوانی، دونوں قسم کے دعوے سن کر مدعیوں کے حق میں فیصلے دیئے۔ اس قسم کے فیصلے قانون کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انہی نظیروں کی وجہ سے عہدِ خلافت راشدہ میں خلیفۂ وقت کو بھی قاضی ایک معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے طلب کر لیتا تھا اور اسے حاضر ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ قضاؔ کی اہمیت حضورؐ کے ایک اور قول سے بھی واضح ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دو فریقوں کے کسی جھگڑے کا عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا، صدقہ ہے۔

شہادت کی پرکھ کی نسبت حضورؐ کا ارشاد ہے کہ خائن مرد اور خائنہ عورت زانی مرد اور زانیہ عورت کی شہادت مقبول نہیں۔ جو شخص کسی کی نسبت دل میں کینہ رکھتا ہے۔ یا کھانے پینے میں کسی کا طفیلی ہے اس کی شہادت بھی اس کے حق میں جس کا وہ

طفیلی ہے۔ قابلِ پذیرائی نہیں۔ حضورؐ کی یہ بھی سنت ہے کہ جب شہادت کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہو تو گواہوں کا تزکیہ کیا جائے۔

مقدمہ بازی کو حضورؐ نے عمومی طور پہ مذموم قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "جھگڑالو اور مقدمہ باز شخص کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ خدائے پاک کے نزدیک سب سے زیادہ مغبوض ہے۔" بعض مقدمات میں حضورؐ نے فقط ایک گواہ کی شہادت پر بھی فیصلہ فرمایا۔ بہ شرطیکہ حلف اس کے ساتھ ہی شامل ہو۔

نفع یا نقصان کے اثبات یا نفی کا پیمانہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق عرفِ عام ہے۔ اس کی مثال براءؓ بن عازب کا مقدمہ ہے۔ اس کی اونٹنی کسی کے باغ میں گھس گئی اور اس کو خراب کر ڈالا۔ باغ کا مالک اور صاحبِ شتر دونوں اپنے آپ کو معذور یا حق بجانب سمجھتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ دن کے وقت کھیت اور باغ کے مالکوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کریں۔ مال مویشی کے مالکوں پر اس کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے رات کے وقت مویشی کے مالکوں کا فرض ہے کہ ان کو سنبھالے رکھیں۔

ایک بنیادی جامع بالغ اصول حضورؐ نے "الخراج بالضمان" کہہ کر قائم فرمایا یعنی کسی چیز کی حاصل یا پیداوار کا مستحق وہی شخص ہوتا ہے جو اس کے وجود اور بقا کا ذمہ دار ہے دوسرے لفظوں میں جو شخص کسی چیز کا تاوان برداشت کرتا ہے اس کو اس سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہے۔

معاہدات کے متعلق حضورؐ نے یہ کلیہ بیان فرمایا کہ مسلمانوں نے آپس میں جن شرطوں کا التزام کیا ہو۔ ان کی پابندی لازم ہے۔ الا یہ کہ انہوں نے کوئی شرط عائد کی ہو جس کی وجہ سے حرام حلال ہو جائے۔ یا حلال کو حرام سمجھنا پڑے۔

بعض خصومات میں تسویے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنے کی مثالیں بھی عہدِ نبویؐ سے ملتی ہیں۔ تعمیرات، غلے یا دیگر زرعی پیداوار کا اندازہ کرنے کے لئے آنحضرت نے ماہر، برسرِ موقع تفتیش کے لئے، مامور فرمائے۔ قیافہ شناس کی شہادت بطورِ قرائن کے مقبول کئے جانے کی نظیریں تاریخ عہدِ نبوی میں مذکور ہے۔

نبی اکرمؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر (۱۰ھ) جبل الرحمۃ کے مشہور خطبے میں جو تصریحات فرمائیں تاریخ میں منشورِ انسانیت کے مترادف ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کے بنیادی حقوق یعنی جان، مال آبرو محفوظ اور قابلِ احترام ہیں۔ امانت کی واپسی اور قرض کی ادائی فرائض میں شامل ہے۔ ربا لینے یا دینے کی قطعی ممانعت کی گئی اور ارشاد ہوا کہ قرض خواہ کو صرف اصل رقم واپس ہوگی۔ قتل عمد کے لئے قصاص اور شبہ عمد کے لئے دیت ہوگی۔ زوجین کے ایک دوسرے پر حقوق کی صراحت کی گئی۔ کسی کا مال غصب کرنے اور کسی مسلمان بھائی سے لڑائی کے خلاف سخت تہدید کی گئی۔ احترامِ فرد کا معیار، نسل و رنگ کی اضافی قدروں کی بجائے اتقا یعنی خوف خدا قرار دیا گیا، وراثت میں قرآنی حصص کی پابندی کی تاکید ہوئی اور وصیت کی تہائی مال تک تحدید کی گئی۔

ہم نے بحرِ سنتِ نبویؐ کی غواصی کر کے چند دُرِ آبدار آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔ حضورؐ کے قول، فعل اور تقریر میں کئی مسائل پر ہمیں رہنمائی مل سکتی ہے لیکن یہ مقالہ ان سب کا متحمل نہیں ہو سکتا ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

بہرصورت جو نظریں میں نے عرض کی ہیں ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اسلامی نظام جس کی داغ بیل حضورؐ رسالت مآب نے ڈالی تھی قانون کا احترام محض جسمانی یا مالی مواخذہ کے خوف سے وابستہ نہیں کرتا بلکہ افراد اور جماعتوں کے اخلاقی شعور کو بیدار کر کے ایک ایسا نصب العین ان کے سامنے رکھتا ہے۔ جس کے زیر اثر قانون کے تقاضوں سے گریز یا فرار کی کم سے کم گنجائش رہے اور افراد اسلامی قانون کی بالادستی بہ طیب خاطر قبول کر لیں۔ یہ گویا ان کا دینی فریضہ ہے کہ قانون کے تقدس کو قائم رکھیں۔ اس طریق کار سے نظام ربوبیت انسانی معاشرہ میں تشکیل پا سکتا ہے تاکہ نیابت الٰہی کے تقاضے پورے ہوں۔ یہ حضورؐ ہی کا فیض ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا نظام شریعت موجود ہے جس کی تحسین اعلام الموقعین میں ابن قیم نے ان الفاظ میں کی ہے

"شریعت کی اساس و بنیاد حکمت پر اور بندوں کے معاشی و معادی مفادات پر قائم ہے۔ شریعت کلیتہً عدل، ہمہ تن رحمت اور سراپا حکمت ہے پس جو مسئلہ بھی عدل سے نکل کر ظلم کی طرف یا رحمت سے عدم رحمت کی طرف یا صلاح سے فساد کی طرف یا حکمت سے نامعقولیت کی طرف جا رہا ہو وہ شریعت ہی نہیں اگرچہ اسے بہ دلائل داخل شریعت کر دیا گیا ہو۔"

اسلام اور مذہبی رواداری

خلیفہ عبد الحکیم

اسلام نے دوسرے مذاہب و ادیان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، اس کے متعلق قرآن میں واضح احکام موجود ہیں۔ جب قرآن نے کہا کہ لا اکراہ فی الدین (مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں)، تو گویا اس نے غیر مبہم الفاظ میں تمام دوسرے ادیان کا پوری آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا بنیادی حق تسلیم کر لیا۔ آیت "لا اکراہ فی الدین" میں لفظ دین اپنے مفہوم کے لحاظ سے مروجہ لفظ "مذہب" سے بہت وسیع معنویت کا حامل ہے۔ قرآن میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ کسی ملک یا ملت کے قوانین،

۲۔ قانون کے مطابق سزا اور جزا،

۳۔ ایک قوت مطاع کی اطاعت،

۴۔ طریقۂ زندگی، جس میں عقاید اور اعمال شامل ہیں۔

ماکان لیاخذ اخاہ فی دین الملک۔ ملکی قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔

"دین الملک" میں دین کا لفظ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا۔ لا اکراہ فی الدین میں دین کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس میں عقاید و اعمال سبھی داخل ہیں۔ ایک فرد یا قوم کا طریقۂ زندگی درحقیقت اس نظریۂ حیات کا عکس ہوتا ہے، جس کو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔

دینی آزادی کا مفہوم

جب مغرب میں انسانی زندگی کو دینیت اور لادینیت، روحانیت اور مادیت، مذہب اور ریاست کی مکمل اور مطلق ثنویت میں تقسیم کیا گیا، تو اس سے پہلے انسان کی تمام تر زندگی کی تشکیل خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا معاشرتی سب مذہبی عقاید پر ہی ہوتی تھی۔ مذہبی اقدار و اصول زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتے تھے۔ عقاید، اخلاق، آداب و قوانین اور رسوم و رواج سب ایک ہی کل کے مربوط اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے جب قرآن نے دین کے معاملے میں مکمل آزادی کا اعلان کیا، تو اس آزادی کا مفہوم مشہور صدر روزولٹ کی اعلان کردہ "چار آزادیوں" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سلطنت میں کوئی قوم یا ملت اپنے شخصی قانون کی پیروی پر مُصر ہو، تو اسے اس کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ اگرچہ دوسرے حقوق کی طرح اس حق کا استعمال بھی چند حدود کے اندر محصور رہو گا۔ اگر یہ بنیادی اخلاقی اقدار کے خلاف ہو یا معاشرے کے امن اور ملک کے دفاع میں خلل انداز ہو، تو اس پر عمل کرنے کی کلی ممانعت ہو گی، خواہ وہ کسی ملت یا قوم کے مذہب کا جزو ہی

کیوں نہ ہو، مثلاً ایک اسلامی مملکت میں کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا پر جلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، خواہ کسی ملت کے نزدیک یہ عمل کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر حالت میں بلا تفریقِ مذہب و ملت ربا، جوا اور زنا مکمل طور پر حرام ہوں گے۔ اس قسم کی حدود اور پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف ملتوں اور قوموں کو اپنے عقاید و اعمال کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی ہوگی اور اس بنیادی اصول کا جواز قرآن حکیم کی اسی آیت "لا اکراہ فی الدین" سے مستنبط ہے۔

صلح پسندی آنحضرتؐ کی دفاعی جنگوں کے متعلق یہ غلط نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ عرب کے بُت پرست قبائل کو تلوار کے زور سے اپنے دین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کافی مدت تک آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ لوگ مسلمانوں کو اپنے عقاید اور نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیں تاکہ وہ اور مسلمان دونوں ایک پُرامن ماحول میں اپنے اپنے طریقوں پر عمل پیرا ہوتے رہیں، لیکن آپؐ کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس ناکامی کے بعد آنحضرت بقول کارلائل ایک انسان اور ایک عرب کی حیثیت سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دین و عقیدے کی آزادی اور بقا کے لیے قوت کا مقابلہ مناسب قوت سے کریں۔ وحشی اور ظالم قبیلوں کے ساتھ پُرامن ترغیب اور رواداری کا برتاؤ ناممکن تھا۔ اگر ان کے خلاف قوت کا استعمال نہ کیا جاتا، تو اسلام اسی وقت ختم ہو جاتا۔ ان کی ذہنیت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی انھوں نے مسلمانوں کی نوخیز مملکت کے مرکز مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر اسلام کی سیاسی طاقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ مسلمانوں کے بلند عزائم اور حوصلے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس جوابی انقلاب کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہے اور یہ رجعت پسند تحریک ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔ آنحضرتؐ کا رویہ ان لوگوں اور قبیلوں کے متعلق نہایت صلح کن اور رواداری کا بہترین مظہر تھا، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غیر جارحانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ جب وہ مکہ واپس آئے، جہاں ان وحشی اور ظالم لوگوں نے مسلمانوں پر ہر قسم کے جور و ستم روا رکھے تھے، تو آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو محض اس لیے فراموش کر کے انھیں معاف کر دیا کہ اب اسلام کو ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

یہود و نصاریٰ سے مراعات جب آنحضرتؐ پہلی دفعہ مدینہ پہنچے، جہاں کے باشندوں کی اکثریت نے انھیں دعوت دی تھی اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا، تو وہاں یہودیوں کی ایک اقلیت بھی تھی، جو دولت اور زمین کی ملکیت کے لحاظ سے خاصی با اثر تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ جس قسم کا معاہدہ کیا، اس سے اسلام کی رُوح کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنے عقاید و اعمال کی پیروی کرنے اور اپنے طریقۂ زندگی کو آزادی سے ادا کرنے کا مکمل حق تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ انھیں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ اگر ان کے مقدمات آپ کے سامنے بھی پیش ہوئے، تو ان کا فیصلہ ان کی اپنی شریعت اور قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کفارِ مکہ سے خفیہ ساز باز شروع کر دی۔ انھوں نے پتھر کی ایک چٹان لڑھکا کر یا زہر دے کر آنحضرتؐ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور ایک یہودی عورت نے تو آپؐ کو زہر کھلا ہی دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا اثر مہلک ثابت نہ ہو سکا۔ آپؐ نے یہود و نصاریٰ کو یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ آپ کا مقصد محض ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے لائے ہوئے ابدی پیغام کی تکمیل ہے۔ ان کی فراخدلی سے تعریف کی۔ ان کی کتابوں کو الہامی اور ان کی تعلیمات کو نورِ ہدایت اور حیات افزا قرار دیا اور خود ان کو خدا کے سچے پیغمبر تسلیم کیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہودی ان سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ اسرائیلی قوانین کی مکمل پیروی کریں اور

عیسائی ان سے تثلیث، ازناری اور کفارے کے عقیدوں کو تسلیم کرنے کی توقع رکھتے تھے، لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنا آنحضرتؐ کی بنیادی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی تحریک کی روح کے منافی تھا۔ اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ یہ دو ملتیں جو توحیدی عقیدے کی حامل تھیں، مسلمانوں کے ساتھ صلح، امن اور آشتی سے رہ سکیں۔ کیونکہ ان تینوں میں کم از کم ایک چیز تو مشترک ہے یعنی عقیدۂ توحید۔

قل یاھل الکتاب تعالوا..... الخ (۳ : ۶۴)

یہ پیشکش اس وقت قابلِ توجہ نہ سمجھی گئی، لیکن اب چودہ صدی کے بعد کم از کم عیسائی دنیا کے بہترین افراد بظاہر اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس پیشکش میں صرف چند باتیں ہیں۔ ایک خدا پر ایمان، جو سب توحیدی مذاہب میں مشترک ہے اور خدا کے سامنے تمام انسانوں کی مساوات یعنی کوئی فرد یا جماعت کسی شخص یا اشخاص کو اپنا خداوند یا الٰہ نہ تسلیم کرے۔ اس وقت بھی جب یہ پیشکش قبول نہ کی گئی تھی مسلمانوں کو یہ ہدایت ملی تھی کہ وہ اہل کتاب سے ہر قسم کے بہترین روابط یا رشتہ مودت والفت قائم کریں، جو مشرک اور کفار کے ساتھ ممکن نہ تھا، چنانچہ مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے تبدیلِ مذہب کا تقاضا کیے بغیر شادی کر سکتے ہیں اور ان کے اکل و شرب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں نیک عیسائیوں کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور ہمدردیوں میں مسلمانوں سے نزدیک ترین ہیں اور خدا کی محبت میں سرشار اور عجز و انکسار کے پُتلے ہیں۔

ایک دُوسری جگہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ایک قوم کے تمام افراد یکساں نہیں اور اس لیے محض کسی ایسی قوم کا فرد ہونا، جس کو تم ناپسند کرتے ہو یا جو تمہاری دشمن ہے، اس کے خراب ہونے کی دلیل نہیں۔ افراد کی اچھائی یا بُرائی کا معیار بھی انفرادی ہونا چاہیے نہ کہ مجموعی۔

عبادت گاہوں کا احترام

انصاف کے معاملے میں دوست، دشمن، مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اخلاقی یا قانونی حدود میں معیار ایک اور یکساں ہونا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی دُوئی قابلِ برداشت نہیں سمجھی گئی۔ ہر قسم کا جارحانہ اقدام ممنوع قرار دیا گیا۔ قرآن میں بے شمار آیات ہیں، جن میں یہ چیز دہرائی گئی ہے کہ خدا حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام کا بنیادی نظریۂ حیات تمام دیگر ادیان کو صرف آزادی دینا ہی نہیں بلکہ سیاسی نظام اور معاشرتی ماحول میں ان کی مکمل حفاظت کا انتظام بھی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت.... (الحج - ۴۰)

یہ چیز قابلِ غور ہے کہ ایسی کتاب، جو اسلام کی داغ بیل رکھ رہی ہے اس میں دوسرے ادیان کے معبدوں کی حفاظت کا ذکر مسجدوں کی حفاظت سے مقدم ہے۔ اپنے معبدوں کی حفاظت ایک فطری بات ہے اور یہ اجتماعی نفسیات کی ایک بنیادی حقیقت ہے۔ ایسے حالات میں جب مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ دوسرے ادیان کے پیروؤں کے معبدوں کی حفاظت کو اپنی مسجدوں سے بھی مقدم سمجھیں، تو انسانیت کی تاریخ میں گویا ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈالنا ہے۔ دُوسرے مذاہب اور ان کی آزادی کو برقرار رکھنے کا یہی شدید جذبہ تھا، جس کے باعث ابتدائی جنگوں میں مسلمانوں نے نہتے شہریوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی ہمیشہ حفاظت کی۔ کسی مذہب کے پجاریوں، پروہتوں اور راہبوں پر تلوار نہ اٹھائی اور نہ کسی عبادت گاہ کو مسمار ہونے دیا۔ ان جنگوں کا مقصد تمام انسانوں کی آزادی کو بحال کرانا تھا، نہ کہ کمزوروں اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں

کا استیصال فلسطین کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ بذاتِ خود وہاں پہنچے، ان کے ساتھ کوئی حفاظتی فوجی دستہ نہ تھا۔ ایک ہی اُونٹ پر وُہ اور ان کا ملازم باری باری سفر کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ عیسائی بشپ کے ساتھ محوِ گفتگو تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور آپ نے بشپ سے باہر جا کر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی لیکن بشپ نے گرجا ہی میں نماز پڑھنے کی پیش کش کی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "ٹھیک ہے ہم خدا کی زمین پر ہر جگہ نماز ادا کر سکتے ہیں، لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے اس عمل سے آیندہ زمانے میں مسلمان اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کا جواز نہ پیدا کر لیں۔"

اس سے اسلام کی صحیح ہیئت سامنے آجاتی ہے کہ اس کا مقصد تمام ادیان و عقاید کی آزادی کو بحال کرنا تھا نہ کہ دُوسروں کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا اور ان پر غاصبانہ حملہ اور قبضہ کرنا۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ایک عیسائی وفد کے اراکین کو اپنی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہماری عبادت میں موسیقی وارغنون وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ آپ کے خیال میں مسجد میں یہ چیز مناسب نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کو اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ کیا کوئی ایسا رواداراور فراخ دل پیغمبر دُوسرے مذاہب و عقاید کے خلاف کسی قسم کی سختی اور تنگ نظری روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آتا ہے کہ اس دنیا کے انسان کبھی ایک عقیدے اور ایک نظریے کے پیرو نہیں ہو سکتے اور اس لیے ان کے شرائع اور رسوم و رواج میں اختلافات یقیناً موجود رہیں گے لیکن ان کے اختلافات کے باوجود ہر ایک کی یہی کوشش ہونی چاہیے اور یہی اصل چیز ہے کہ خیر کے حصول کی انتہائی کوشش کی جائے اور اس میں ایک دُوسرے سے سبقت لے جانے کا عزم کیا جائے۔ لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا ..... فاستبقوا الخيرات۔ (۵ : ۴۸)

آزادی و رواداری

یہی وہ نظریہ تھا جس کے باعث مسلمان ملکوں میں اسلامی سیاسی استیلاء کے باوجود غیر مسلم ملتیں اپنی انفرادی زندگی اور تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکیں۔ عیسائی کلیسا سے ناقوس کی آواز متصلہ مسجد کی اذان کے ساتھ بلند ہوتی تھی۔ ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدی تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ لیکن انہوں نے کبھی دباؤ یا جبر سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی اس حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہُوئی، تو غیر مسلم اکثریت نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور ان کی عطا کردہ ثقافتی اور مذہبی آزادی کا بالکل پاس نہ کیا۔ وُہ تمدن و تہذیب، جو مسلمانوں نے وہاں پیدا کیا اور جس کی ضیا پاشیوں سے تمام یورپ بعد میں منور ہُوا، اس متعصبانہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ ترکوں نے مشرقی یورپ پر چار صدی تک حکومت کی اور مختلف عیسائی فرقوں اور گروہوں کو مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی دیے رکھی۔ ایک عثمانی سلطان نے تمام غیر مسلم رعایا کو جبراً مسلمان کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن علماء نے قرآنی اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے اصول کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے اقلیت میں رہنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ آخر کار اس کے سیاسی نتائج ان کے حق میں اچھے ثابت نہ ہوئے۔

برعظیم پاک و ہند میں یہی صورتِ حال تھی۔ کسی سیاسی یا تبلیغی کوشش کے بغیر ہندو عوام برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم کے شدید عملی مضرات سے تنگ آکر مسلمان ہوتے رہے اور یہ عمل اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا، حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کے تاریک ترین دورِ حکومت میں بھی، جب شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے اصطبل میں تبدیل کی جا چکی تھی، اسلام کی فتوحات بدستور جاری رہیں اسی طرح جس طرح آج افریقہ میں عیسائی مشنری تنظیم اور کثیر دولت کے علی الرغم مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا باعث صرف اسلام کی سادہ تعلیم، غیر عقلی عقاید کا فقدان اور انسانی مساوات کے تصورات ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی اسلام اس وقت پھیلا

جب وہاں ہالینڈ کے عیسائی حکمران اپنے عقاید کی تبلیغ کے لیے سیاسی قوت اور سرمایہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کر رہے تھے۔

یہودی جو قبل مسیح اور بعد میں خود عیسائی سلطنتوں اور علاقوں میں ہمیشہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے رہے، ان کو اسلام کے بعد چین اور آرام کی زندگی میسر آسکی۔ کسی شہر میں یہودی باڑہ نہ تھا۔ مغربی عیسائی سلطنتیں ان پر ظلم کرتیں تو وہ پناہ لینے اسلامی ملکوں میں جا پہنچتے جہاں ان کے لیے دُوسرے باشندوں کی طرح ترقی کے تمام مواقع کھلے تھے۔ کسی اسلامی ملک میں یہودیوں کے خلاف نہ کبھی جذبۂ عناد پیدا ہوا اور نہ ان پر حملے ہُوئے۔ لیکن بدقسمتی سے جدید دور میں ان مراعات اور رواداری کے بدلے میں جو سلوک بین الاقوامی جارحانہ صیہونیت نے کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔

غیر مسلموں سے معاہدے عیسائیوں اور یہودیوں کے متعلق جو رویّہ مسلمانوں کا رہا ہے، اس کے متعلق دو واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینے کے یہود سے جو معاہدہ کیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں،

ان یھود ...... الخ

" بنی عوف کے یہود مسلمانوں کی طرح ایک ملت شمار ہوں گے۔ ہر قسم کے حملے کے خلاف ان کا دفاع مسلمانوں کے ذمے ہوگا۔ ان دونوں کے تعلقات خوش سگالی اور باہمی مشترکہ مفاد پر مبنی ہوں گے۔ یہود کے حلیف مسلمانوں کے حلیف شمار ہوں گے اور ہر مظلوم کی حمایت کی جائے گی، خواہ وہ کسی گروہ سے ہو"

نجران کے عیسائیوں کو جو آزادی کا منشور دیا گیا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

لنجران جوار ..... الخ

" نجران کے عیسائی خدا اور اس کے رسول کی حفاظت میں ہوں گے۔ ان کی جان و مال، عقاید اور علاقوں کی حفاظت کی جائے گی اور یہ حفاظت کی ذمہ داری نہ صرف ان تک محدود ہو گی، جو اس وقت موجود ہیں بلکہ ان پر بھی عائد ہو گی، جو اس وقت موجود نہیں (یعنی آنے والی نسلیں) اور ان پر بھی جو اس قبیلے کی حفاظت میں ہیں (وہ اس قبیلے سے متعلق ہوں یا نہ ہوں)۔"

فلسطین پر قبضہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے جو آزادی کا منشور ایلیا کے باشندوں کو دیا، اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ..... الخ

" یہ امان کا وہ منشور ہے، جو خدا کے بندے عمر امیر المؤمنین نے ایلیا کے باشندوں کو دیا۔ ان کی جان و مال، گرجاؤں اور صلیبوں کی حفاظت کی جائے گی۔ ہر شہری خواہ وہ تندرست ہو یا بیمار، ہماری امان میں ہوگا۔ ان کے گرجا لوگوں کی رہایش گاہوں میں تبدیل نہ ہوں گے اور نہ ان کو گرایا جائے گا۔ ان کی جائدادوں اور صلیبوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا، نہ ان پر کسی قسم کا مذہبی دباؤ ڈالا جائے گا اور نہ کسی کو پریشان کیا جائے گا۔"

آذربائیجان، جرجان اور مدائن کے شہریوں کو جو امان نامے حضرت عمرؓ نے دیے ان کے الفاظ بھی تقریباً ایسے ہی ہیں۔

صرف یہ اضافہ ہے کہ ان کے مذہبی قوانین کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

تبلیغ کے طریقے قرآن کریم میں اسلام کی تبلیغ و توسیع کے لیے قوت یا دباؤ کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وُہ اپنے عملی کردار سے دوسروں کو متاثر کریں اور ان کے سامنے ان ابدی حقایق کو پیش کریں، جن کی اسلام نے تصدیق کی ہے اور ان حقایق کو بھی، جو وسیع تر اور ارتقاء پذیر انسانیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ قرآن کریم نے اس کام کے لیے صرف تین طریقوں کی اجازت دی ہے اور آنحضرتؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششیں صرف ان ذرائع کے استعمال تک محدود رکھیں۔

اُدع الی سبیل ربّك ..... الخ (۱۶ : ۱۲۵)

" اے پیغمبر! لوگوں کو اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت، موعظت اور اچھے دلائل کے ساتھ دعوت دو۔"

مذہبی جھگڑوں میں عام طور پر لوگ مخالفین کے قابلِ حرمت اشخاص اور اشیاء کے متعلق ناواجب اور ناروا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کے غیر مہذب حملوں سے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین کے جھوٹے دیوتاؤں کے متعلق بھی بُرے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی طرف سے خدائے واحد کے خلاف غلط باتیں منسوب کیے جانے کا خطرہ ہے۔

ولا تسبّوا الذین ..... الخ (۶ : ۱۰۸)

قل یٰا یہا الکٰفرون لا اعبد .... الخ (۱۰۹ : ۱-۲)

اس سورت میں آنحضرتؐ کو اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ معبود کے متعلق مخالفین میں کسی قسم کی مصالحت کی گنجائش نہیں۔

اس لیے مختلف عقاید کے پیرؤوں کا فرض ہے کہ وُہ ایک دُوسرے کو مکمل آزادی دیں۔ صداقت اور کذب واضح ہو چکے ہیں، اس لیے اب لوگوں کو سوچنے اور آزادی سے اپنا راستہ اختیار کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

لا اکراہ فی الدّین قد تبیّن الرشد من الغی (۲ : ۲۵۶)

فان اعرضوا فما ارسلنٰك علیھم .... الخ (۴۲ : ۴۸)

اے رسول! اگر وہ صداقت سے اعراض کریں، تو انھیں چھوڑ دو، جب تم نے پیغام پہنچا دیا، تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔

لست علیھم بمصیطر (۸۸ : ۲۲)

قل لست علیکم بوکیل (۶ : ۶۶)

نحن اعلم بما یقولون وما انت علیھم بجبار (۵۰ : ۴۵)

اے رسول! ہم جانتے ہیں، جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ تم انھیں ایمان لانے کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو۔

کچھ یہودی مسلمان ہو چکے تھے، لیکن ان کے بیٹے ابھی اپنے قدیم دین پر تھے۔ ان کے والدین نے ان کو مجبور کرنا چاہا، تو

اس موقع پر یہ آیت اُتری کہ لا اکراہ فی الدین - ایک دُوسری جگہ یہی تنبیہہ دُہرائی گئی :

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین (۱۰ : ۹۹)

کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں ؛

بنیادی تصوّر اسلام نے جو رویّہ دُوسرے ادیان کے متعلق اختیار کیا ہے ، اس کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ صحیح دین ہمیشہ سے توحیدی رہا ہے اور ان تمام توحیدی ادیان کے ہاں بنیادی اخلاقی اقدار مشترک رہے ہیں - تاریخ کے مختلف ادوار میں پیغمبر اور رسول مختلف قوموں کے پاس آتے رہے ہیں ، جو انھیں صحیح تعلیم دیتے رہے - لیکن مرورِ زمانہ سے یہ تعلیم خراب ہوتی رہی - ایک مسلمان کو تمام مذاہب کی اصلی اور بنیادی سچائیوں پر ایمان لانے کا حکم ہے - غیر مسلموں نے عام طور پر آنحضرت پر حملہ کرنا ضروری سمجھا اور مغرب نے جو کتابیں اسلام پر لکھی ہیں ، ان میں اس ترقی پذیر ، لبرل دین کی غلط ترجمانی کے علاوہ آپ کی ذات کے خلاف زہریلے حملے کیے گئے ہیں - لیکن اپنے عقاید کی رُو سے مسلمان ان کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے - اس لیے اسلامی کتب میں کسی دین کے رہنما کے متعلق نار وا حملے نہیں پائے جائیں گے - کوئی مسلمان ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام یا دُوسرے نبیوں کے خلاف کیسے منہ کھول سکتا ہے ؟ قرآن میں مذکور ہے کہ لاتعداد رسولوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے ، اس لیے غالب خیال یہ ہے کہ وہ نیک ہستیاں جن کو ہندو یا چینی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ، وہ بھی حق تعالیٰ کے پیغمبر ہوں گے - وہ قومیں جن کے پاس الہامی کتابیں ہیں ، ان کو اہلِ کتاب کہا جاتا ہے - عرب میں صرف عیسائی اور یہودی ہی ایسی دو قومیں آباد تھیں - اس کے بعد کئی اور قوموں سے بھی نہیں ملنے کا اتفاق ہُوا ، جن کے ہاں قدیم دینی روایات تھیں - اس لیے اہلِ کتاب کی اصطلاح ان سب پر حاوی ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان کے اور اپنے درمیان عقاید کے اشتراک اور اتفاق و ہم آہنگی کی نشان دہی کریں تاکہ باہم میل جول اور خیر سگالی کے تعلقات قایم کرنے میں آسانی ہو - قرآن نے توحیدی عقاید رکھنے والے گروہوں سے جو تعاون کی اپیل ہے ، وہ تمام مہذب انسانیت سے تعاون کی اپیل ہے - لیکن اگر کوئی قوم چھوٹی یا بڑی الحادی مادیت کو مع اس کے تقاضوں کے بطورِ عقیدہ قبول کرتی ہے ، تو اس سے البتہ کسی قسم کا تعاون کرنا بہت مشکل ہے - لیکن پھر بھی قرآن کی دعوت یہی ہے کہ ہر اس شخص اور گروہ سے تعاون کیا جائے ، جو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دیتا اور ان پر عمل کرتا ہے - اگر لادین اشخاص بھی اخلاقی کوشش میں دیانت داری سے تعاون کرتے ہیں ، تو اس حد تک ان سے تعاون کیا جا سکتا ہے ؛

تعاونوا علی البر ..... (۵ : ۲)

تمام توحیدی مذاہب میں نیکی اور تقویٰ کی تعریف تقریباً یکساں طور پر کی گئی ہے - اس لیے تعاون کا دائرہ خاصا وسیع ہے - لیکن جہاں اس کے متضاد نظریات کارفرما ہوں ، وہاں تعاون کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے - دُوسرے توحیدی مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اسلام کا رویّہ محض سلبی اور انفعالی رواداری کا نہیں ، بلکہ ایجابی افہام و تفہیم کا ہے - قرآن میں نجات یافتہ افراد کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وُہ رنج و خوف سے بالا ہیں - قرآن ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا ، جو صداقت یا نجات کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں -

قرآن کریم میں دو جگہ ذکر کیا گیا ہے کہ کائنات کی بنیادی صداقتیں یہ ہیں: خدائے واحد پر ایمان، موت کے بعد انسانی انا کا بقا اور ایک اخلاقی نظام کا وجود، جس کے باعث موت کے بعد انسانوں کو ان کے اعمال کے مطابق سزا اور جزا ملتی ہے۔ جو شخص بھی ان صداقتوں پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، وُہ نجات یافتہ ہے اور اس نے اپنا فرض ادا کیا، خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

ان الذین اٰمنوا ۔۔۔ (۲: ۶۲)

لوگوں میں رسم و رواج اور شرائع کے لحاظ سے اختلاف ہوتا رہے گا اور ایک ہی منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے جاتے رہیں گے۔ لیکن تمام وُہ لوگ، جو ایک روحانی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، سب نجات پائیں گے۔ بعض تنگ نظر مسلمان علما، نجات کے متعلق قرآن کے اس فراخ دلانہ رویّے کو پسند نہیں رکھتے اور اسے اپنی اجارہ داری کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ اس کی تشریح اس کے واضح مفہوم کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیت تقریباً وُہی ہے، جس کا تذکرہ قرآن نے متعصب اور تنگ نظر عیسائی اور یہودی علماء کے متعلق کیا ہے:

قالت الیهود لیست النّصارٰی علٰی ۔۔۔۔ الخ (۲: ۱۱۳)

لارڈ ہیڈلے نے خود مجھ سے بیان کیا کہ جب انہوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کیا، تو ان کا ایک عزیز ترین دوست ایک بشپ ان کے پاس آیا اور کہا: "مجھے افسوس اس بات کا ہے، کہ اس تبدیلیِ مذہب سے جہنم واصل ہو جاؤ گے۔" ہیڈلے نے جواب دیا: "تمہارے مذہب کی یہی تنگ دلی اور تعصب ہے، جس نے مجھے اس کو چھوڑ کر ایک دوسرے زیادہ لبرل مذہب میں داخل ہونے پر مجبور کیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ چونکہ میں نے چند اذعانات پر ایمان لانا ترک کر دیا ہے، اس لیے میں جہنم میں جاؤں گا لیکن اسلام، جس کو میں نے اختیار کیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ چونکہ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، اور بہت اچھے آدمی ہو، اس لیے تم جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اسلام کا خدا ان چھوٹے مسائل کے متعلق متعصب اور تنگ نظر نہیں۔"

عقلیت پسند، انسیت کے علمبردار اور تجربیت پر یقین رکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ مذہب انسانوں میں تفریق اور اختلاف پیدا کرتا ہے۔ لیکن قرآن کا خیال ہے کہ یہ خرابیاں مذہب کے باعث نہیں، بلکہ مذہب کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام انسانیت کی بنیادی وحدت کا قائل ہے، جو ابدی حقایق کے مشترکہ حلقے میں ناگزیر اور شاید پسندیدہ کثرت کو تسلیم کیے بغیر ممکن الحصول نہیں۔ صحیح دین، آپ اسے اسلام کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجیے، زندگی کے متعلق ایسا نظریہ ہے، جس سے غیر عقلی اختلافات کم ہوں اور خیر سگالی، محبت اور تعاون و تفہیم کا دائرہ وسیع ہو جائے۔

دعوتِ نبویؐ کے اصول و مقاصد

معین الدین احمد شاہ

علمائے حدیث اور سیرت نگار حضرات کی دماغی اور علمی کاوشیں ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری انسانی دنیا کے لیے مایۂ صد افتخار ہیں کہ انھوں نے انتہائی سعی و محنت سے کائنات انسانی کے رہنمائے کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی جامعیت اور استیعاب کے ساتھ فراہم کیے اور ترتیب دیے ہیں۔ یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی کوئی بات، آپ کی کوئی جسمانی حرکت و سکون، فرحت و انبساط اور غم و غصہ کی کوئی ادا، بزم و رزم کی کوئی حرکت ایسی نہیں، جو ضبط تحریر میں نہ آچکی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ختمِ رسالت کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، تو صرف یہی ایک دلیل کافی ہے کہ اگر آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت باقی ہوتی تو پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ کے حالاتِ زندگی بھی نسیاً منسیا ہو چکے ہوتے اور اس طرح آپ کی ہر ہر بات اور ہر ہر حرکت ضبطِ تحریر میں نہ آئی ہوتی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ انبیائے سابقین میں سے کسی کے تفصیلی حالاتِ زندگی آج محفوظ شکل میں موجود نہیں، حالانکہ ان میں ایسے بھی ہیں، جن کے ماننے والے آج بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی پر سیکڑوں مستند کتابیں ہر زبان میں موجود ہیں، تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی نبوت و پیشوائی تاقیامت جاری رہنے والی ہے۔ اسی لیے خود قدرت کی طرف سے آپ کے حالاتِ زندگی کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا گیا۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ابن حاتم الرازی کا یہ قول نقل کیا ہے:

لم یکن فی امۃ من الامم منذ خلق اللہ تعالیٰ آدم امۃ یحفظون آثار نبیھم غیر ھذہ الامۃ [1]	جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے امتِ مسلمہ کے سوا کوئی ایسی امت نہیں گزری جس نے اپنے نبی کے آثار کو محفوظ رکھا ہو۔

تاہم بعض دوسری حیثیتوں سے سیرت نگاری کے کام کو علمی حیثیت سے جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً احیاء و اقامتِ دین کی دعوت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر زمانہ کے مخصوص مزاج کے لحاظ سے پیغمبرانہ اصولِ دعوت کی تفسیر کی جائے اور ماحول کی جدید تبدیلیوں پر اس کا انطباق کیا جائے اور جدید مملکتی مسائل کو زمانہ رسالت کی سیاست کاری اور معاشی خاکہ بندی کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے اور عہدِ رسالت کے اصولِ دعوت اور اصولِ عمران و تمدن کی ترتیب و تدوین موجودہ دور کے مخصوص اجتماعی مزاج کی رعایت کے ساتھ کی جائے اور اسلام کے عالمگیر اور ابدی اصول و تصورات کی تعبیر اس ڈھنگ کے ساتھ کی جائے، کہ اس زمانہ کا ذہن و دماغ اس کو آسانی سے قبول کر سکے۔

---

[1] موزج اللبیب للسیوطی، قلمی

دعوتِ نبوی کی اصل عظیم علم و عمل کی ہم آہنگی

پیغمبرانہ دعوت کا مزاج عام سیاسی، معاشی، اصلاحی اور تعلیمی تحریکات سے بالکل مختلف ہے۔ اسی قسم کی تمام تحریکیں محدود اور وقتی مقاصد کے لیے اٹھتی ہیں اور ان کے حصول کے بعد ان کا کام ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں پیغمبرانہ دعوت مستقل اور ابدی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ہوتی ہے اور وقتی مسائل سے وہ صرف ناگزیر حد تک تعرض کرتی ہے اور زندگی کی عالی اور مقصود بالعرض قدروں کو محض وسیلہ و ذریعہ کی حد تک مستحق توجہ سمجھتی ہے اور اپنے عمل اور جدوجہد میں وہ زندگی کی حقیقی اور مقصود بالذات قدروں ہی کو سامنے رکھتی ہے۔ اسی لیے انبیاء و رسل سب سے پہلے لوگوں کو زندگی کے حقیقی مقصد سے روشناس کرتے ہیں اور پھر اسی کے مطابق سیرت سازی کا کام شروع کرتے ہیں اور ذہن و فکر کی تعمیر کا کام اس وقت تک مسلسل جاری رہتا ہے، جب تک کہ مقصدِ حیات کی عقیدت و محبت دلوں کی گہرائیوں میں نہ اُتر جائے۔ اس طریقہ سے تربیت یافتہ اور پختہ کار انسانوں کا ایک گروہ تیار ہو جاتا ہے، جس کا عزم و یقین کفر و باطل کے آہنی قلعوں کو پاش پاش کر دیتا ہے اور جس کی نگاہ بڑے بڑے پُرغرور سروں کو اپنے آگے جھکا دیتی ہے اور جس کی صدائے عشق ملوک و سلاطین کے سربفلک ایوانوں میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ ؎

با سلاطین در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

لیکن اس مقدس گروہ کی منزل مقصود روٹی کے چند ٹکڑے اور منصب و اقتدار کی مسند نہیں، بلکہ اس کی منزل ہر منزل سے آگے اور اس کا مقام ہر مقام سے اونچا ہے۔ اس لیے اس کی سعی و کوشش مسلسل اور غیر منقطع ہوتی ہے۔ اگرچہ جس منزل تک پہنچنے میں دوسرے لوگوں کو کئی کئی صدیاں لگ جاتی ہیں، ان کو اہلِ ایمان کا بے سرو سامان قافلہ چند دنوں میں پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ مگر اس کا جذبۂ عشق اس کو کسی منزل پر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ: ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

حاصل یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تبلیغ، درس و تعلیم اور تربیت تینوں کام ساتھ ساتھ تکمیل پاتے ہیں۔ محض تبلیغ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ایک مشفق اور جفاکش استاذ کی حیثیت سے درس و تعلیم اور تربیت بھی اس کے فرائض میں ہے، اس لیے پیغمبر کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ ان سہ گانہ فرائض نبوت کو ایک ساتھ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے کارِ نبوت کے ان تینوں مراحل کو متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔ وعظ و تبلیغ کا تعلق بالعموم ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے اب تک دعوت قبول نہ کی ہو اور تعلیم و تربیت ان لوگوں کے لیے ہے، جو اپنے سابقہ عقاید کو چھوڑ کر نبی کی جماعت میں شامل ہو گئے ہوں۔ وعظ و تبلیغ کی حسب ذیل آیات ہیں:

يآيها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و الله يعصمك من الناس۔ (مائدہ)

اے رسول! آپ ان اصول و احکام کی تبلیغ کریں جو آپ کے رب کی جانب سے آپ کی طرف اتارے گئے ہیں (اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہے) کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں کی (شرانگیزیوں) سے محفوظ رکھے گا۔

ادع الی سبیل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة و جادلهم بالتی هی احسن۔ (نحل)

آپ دعوت دیں اللہ کے دین کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان کے ساتھ بحث کریں، اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔

فاعرض عنهم وعظهم و قل لهم فی انفسهم قولا بلیغا۔ (النساء-٦٣)

پس اے نبی! آپ ان (کی شرانگیزیوں) سے اعراض کریں اور ان سے ایسی بات کہیں جو دلوں میں اثر جانے والی ہو۔

الذین یبلغون رسلٰت الله و یخشونه ولا یخشون احدا الا الله۔ (احزاب-٥)

وہ جو اللہ تعالیٰ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی دوسرے سے نہیں ڈرتے۔

تزکیہ نفوس اور تعلیم و تربیت پیغمبرانہ دعوت کے اہم عناصر ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم نے ان کا بار بار ذکر کیا ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب و الحکمة۔ (الجمعه)

وہ ذات جس نے عربوں کی اُمّی قوم میں رسول بھیجا، جو انہی میں سے ہے۔ وہ ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے ان کے دلوں کو (عقاید شرک سے) پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں تعلیم کتاب سے نظری تعلیم اور تعلیم حکمت سے عملی تعلیم و تربیت مراد ہے۔ "حکمت" کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی یعنی سنت کے ہیں۔ چنانچہ امام شافعی نے کتاب الرسالۃ میں لکھا ہے:

سمعت من هو ارضی من اهل العلم بالقرآن الحکمة سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

میں نے اس شخص کو جو علوم قرآنی کے ماہرین میں سب سے زیادہ مقبول ہیں، یہ کہتے ہوئے سنا کہ حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ نوع انسانی کے لیے نظام تعلیم و تربیت کا ایک مکمل عملی نمونہ ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ و الیوم الاٰخر و ذکر اللہ کثیرا ۔ (الاحزاب)

بلاشبہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے ۔ یہ اس کے لیے ہے جو اللہ اور یوم آخرت کی آرزو رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔

دراصل درس گاہ نبوت ایک چلتی پھرتی اور متحرک درس گاہ ہے ۔جس کا طرز تعلیم کلاسکی علوم کی طرح محض نظری استدلال پر مبنی نہیں ہے اور نہ مدرسہ و خانقاہ کی حدود کا پابند ہے بلکہ سفر و حضر، خلوت و جلوت، بزم و رزم اور زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبہ میں اس کا کام برابر جاری رہتا ہے ۔شہسواری کی تعلیم گھر کی چار دیواری یا صحن مسجد میں نہیں دی جاتی بلکہ گھوڑے کی پیٹھ پر اس فن کی مشق کرائی جاتی ہے ۔ پیراکی کے اصول خشکی میں نہیں بلکہ طوفانی لہروں کی کشاکش میں ڈال کر سکھائے جاتے ہیں ۔کتاب کے جامد نقوش انسانی قلوب میں وہ برقی رُوح کس طرح پیدا کر سکتے ہیں ، جو مردِ حق آگاہ کی نگاہ انقلاب انگیز سے پیدا ہوتی ہے : ؎

این کارِ حکیمے نیست داماں کلیمے گیر
صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریا مست

اس لیے سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ زندگی کے ہر شعبے میں کرنا چاہیے ۔ آپ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تو اطاعت و عبادت کے فضائل ، امورِ خانہ داری اور عام معاشرتی مسائل کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ، جب مسجد میں تشریف لاتے ، تو مسلمانوں کے اجتماع میں طہارت و عبادت ، حلال و حرام ، حقوق و فرائض ، اخلاق و معاشرت اور سیاست و معیشت کے نکات و معارف بیان فرماتے اور جب مجاہدین کا لشکر جرار جہاد کے لیے کوچ کرتا تو اثنائے سفر اور عین میدانِ جنگ میں بھی خدا پرستی ، اخلاص مقصد، طہارت و پاکیزگی اور احترام آدمیت کا سبق دیتے ۔غرض ہر لمحہ تعلیم و ارشاد کا سلسلہ جاری رہتا۔

غزوۂ احد میں چند لوگوں کی لغزش سے مسلمانوں کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ کفار کی ناگہانی یلغار سے اسلامی جمعیت درہم برہم ہو گئی اور ستر مسلمان شہید ہو گئے ۔ یہ بڑا نازک اور پریشانی کا وقت تھا ۔ ہر طرف سے زخمیوں کی دردناک صدائیں کانوں میں پڑ رہی تھیں ، دشمنوں کا جذبۂ عداوت شہداء کی لاشوں تک سے انتقام لے رہا تھا ، مسلمانوں پر بدحواسی طاری تھی ۔ لیکن ایسے نازک وقت میں بھی خدا کے سچے پیغمبر کے ثبات و استقلال میں فرق نہ آیا اور آپ صرف خدا پرستی ، توحید اور غیرت دینی کا سبق دیتے رہے ۔ چنانچہ مخالف کیمپ سے جب ابوسفیان نے للکار کر کہا : کیا قوم میں محمدؐ موجود نہیں ؟ تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا : جواب نہ دو ۔ ابوسفیان نے دوبارہ آواز دی : کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) ہیں ؟ آپؐ نے پھر فرمایا : ” خاموش رہو “ ۔ تیسری مرتبہ ابوسفیان نے عمرؓ بن الخطاب کا نام لیا ۔ آپؐ نے اس دفعہ بھی فرمایا : ” کوئی جواب نہ دو “ اس خاموشی پر ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا ” یہ لوگ مارے گئے اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے “ جب تک محض غیرتِ نفس کا سوال تھا ، اس وقت تک آپؐ نے جواب دینے سے منع فرمایا ۔ لیکن جب ابوسفیان نے ” اعل ھبل “ ہبل کی جے کا نعرہ بلند کیا تو آپؐ نے فرمایا : ” تم بھی کہو اللہ اعلیٰ و اجل “ اللہ بلند اور برتر ہے اور جب ابوسفیان نے یہ مشرکانہ نعرہ لگایا ” لنا العزّٰی ولا عزّٰی لکم “ اور ہمارے لیے عزّیٰ (بُت کا نام ، ہے اور

تمہارے لیے نہیں ہے۔ تو آپؐ نے پھر صحابہؓ سے فرمایا: تم جواب دو: اللہ مولانا و لا مولا لکم۔[1] اللہ ہمارا مالک ہے اور تمہارا کوئی مالک نہیں ہے۔

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کی جد و جہد انتقامِ ذاتی اور غیرتِ نفس کے جذبہ کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے دین کی عظمت شخصیتوں کی موت و حیات سے وابستہ نہیں ہے۔ خواہ ہم لوگ رہیں یا نہ رہیں، مسلمان کی خواہش یہ ہونی چاہیے کہ اللہ کا دین ہمیشہ غالب و سرفراز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ سفرِ جہاد میں اگر مسلمانوں سے کوئی لغزش ہوتی تو آپ فوراً تنبیہ فرماتے۔ سفر خیبر میں جب اسلامی لشکر خیبر کے قریب پہنچا، تو کچھ لوگوں نے بلند آواز سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ اس پر آپ نے سخت لہجہ میں فرمایا:

اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم و لا غائباً انکم تدعون سمیعاً قریباً و ھو معکم۔ (بخاری)	ضبطِ نفس سے کام لو۔ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم سمیع و قریب کو پکار رہے ہو، جو ہر لحظہ تمہارے ساتھ ہے۔

اثنائے سفر میں بھی تزکیۂ قلوب کا کام برابر جاری رہتا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ خیبر کی راہ میں میں کچھ زیرِ لب پڑھتا جا رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے عرض کی: "لا حول و لا قوۃ الا باللہ"۔ فرمایا: کیا میں تم کو ایک ایسا کلمہ بتا دوں جو جنت کے خزانہ میں سے ایک خزانہ ہے؟ میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہؐ۔ فرمایا: "لا حول و لا قوۃ الا باللہ"۔

غزوۂ بنی المصطلق (جو ابن اسحٰق، ابن جریر اور ابن ہشام کی روایت کے مطابق ۶ھ میں اور موسیٰ بن عقبہ اور حاکم کی روایت کے مطابق ۵ھ میں واقع ہوا) میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ اس پر انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) کا نعرہ لگایا۔ اس کے مقابلہ میں مہاجر نے یا للمہاجرین کا نعرہ بلند کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں جب یہ نامانوس آواز پہنچی، تو آپؐ نے فرمایا:

"یہ جاہلیت کا نعرہ کیسا ہے۔ اس کو چھوڑ دو کہ یہ بہت ناپاک نعرہ ہے"۔

غرض حضر کی طرح سفر میں بھی جس قدر دینی، اجتماعی اور ملی مسائل پیش آتے، تو آپ نورِ نبوت سے ان کو حل فرماتے اور کسی حال میں بھی دعوت و ارشاد کا سلسلہ بند نہ ہوتا بلکہ کتبِ احادیث و سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے قرآنی احکام و فرائض اثنائے سفر ہی میں نازل ہوئے۔

شجاعت و تہور اور سخاوت و فیاضی عربوں کا مایۂ فخر تھی۔ لیکن وہ ان اوصاف کو بلند اخلاقی اصول و مقاصد اور انسانیت کی فلاح و سعادت کے لیے نہیں بلکہ قتل و غارت، انتقام، توہینِ آدمیت اور اس قسم کے دوسرے پست مقاصد کے لیے استعمال

---

[1] بخاری

کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قتل و سفاکی، لوٹ مار، انسانوں کو آگ میں جلانا، عورتوں کی بے آبروئی کرنا، بچّوں اور بڈھوں کو قتل کرنا اور اس قسم کے بہیمانہ افعال ان کے قومی کردار بن گئے تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیشتر غزوات میں اسلامی فوجوں کی خود قیادت فرماتے تھے۔ اس لیے قدم قدم پر اسلامی قوانین صلح و جنگ کی تعلیم دیتے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی غزوہ میں مسلمانوں کو بھوک نے تنگ کیا۔ وہ کہیں سے بکریاں لُوٹ لاتے اور ذبح کر کے ان کا گوشت پکانا شروع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہُوا تو آپؐ نے دیگچیاں اُلٹوادیں اور فرمایا:

ان النھبۃ لیست باحلّ من المیتۃ۔ (اخرجہ ابوداؤد)

لوٹ مار کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے۔

فتح مکہ کے موقعہ پر آپؐ نے فرمایا:

لا یجھزن علیٰ جریح و لا یتبعن مدبر و لا یقتلن اسیر و من اغلق بابہ فھو آمن۔ (فتوح البلدان)

زخمی پر حملہ نہ کیا جاتے۔ بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جاتے، قیدی کو قتل نہ کیا جاتے اور جو دروازہ بند کر دے، اس کو امن دیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی دستور تھا کہ جب آپ کسی جنگ کے لیے مدینہ سے لشکر روانہ کرتے تو رخصت کرتے وقت اہلِ لشکر کو یہ ہدایت فرماتے تھے:

اغزوا باسم اللّٰہ فی سبیل اللّٰہ تقاتلون من کفر باللّٰہ لا تغلوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا ولیدًا و لا امرأۃ۔ (رواہ مالک)

تم اللہ کی راہ میں اللہ کے نام سے جہاد کرو۔ اللہ کا انکار کرنے والوں سے لڑو۔ مالِ غنیمت میں چوری نہ کرو۔ بدعہدی نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو اور بچّے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

پیغمبرانہ دعوت میں تعلیم و تربیت اور علم و عمل کا اتحاد ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کسی واقف کار شخص کو (خواہ وہ مارکسزم پر ایمان رکھتا ہو، یا کسی دوسرے جدید نظریۂ زندگی کا علمبردار ہو) انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں دورِ نبوت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کی جنگی مہموں کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح قدیم وحشیانہ جنگی طریقوں کی اصلاح کی اور جدید قانون صلح و جنگ کو کس طرح عملاً نافذ کیا اور صحابہ کے جوشِ عمل کا یہ حال تھا کہ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی حکم جاری ہوتا اور ادھر اس پر عمل شروع ہو جاتا۔ اس کے مقابلہ میں اس زمانہ کی دُوسری اقوام کی حالت یہ تھی کہ ان کے یہاں کسی شائستہ جنگی قانون کا وجود ہی نہ تھا جس کی وُہ پابندی کرتے۔ اس لیے وُہ ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھیں اور خواہشِ نفس اور لاقانونی ہی ان کا قانون تھا۔

یہ تو انسانوں کے دورِ جہالت کا حال تھا۔ دورِ حاضر کی مہذب اور شائستہ قوموں میں اگرچہ دو تین صدی سے قانون بین الممالک کی ترتیب کا کام ہو رہا ہے اور اس مقصد کے لیے بین المملکتی کانفرنسیں منعقد ہوتی رہی ہیں کہ جنگ کی ہلاکتوں کو ممکن حد تک کم

کیا جا سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جنگ سی سالہ کے اختتام پر ۱۶۴۸ء میں ہالینڈ کے مقنن گروٹیوس کی ان اصلاحی سفارشات کو قبول کیا گیا کہ جنگ میں بچوں، عورتوں، بوڑھوں، مذہبی رہنماؤں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کے بعد دولِ مغرب نے جنیوا کانفرس، بروسلز کانفرنس، ہیگ کانفرنس اور واشنگٹن کانفرنس میں زہریلی گیسوں اور خود بخود پھٹنے والے زہریلے بموں کے استعمال کی ممانعت، تحدیدِ اسلحہ اور بعض دوسری تجویزیں منظور کی گئیں۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود پہلی جنگِ عظیم میں ایک کروڑ جانوں کا نقصان ہوا اور دوسری جنگِ عظیم میں تین چار کروڑ انسان مارے گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ واضعین قانون کی یہ تمام کوششیں محض ریاکاری اور منافقت پر مبنی ہیں، ورنہ ان کے دلوں میں تحفظِ انسانیت کا جذبہ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے اور جب قیامِ امن اور تحفظ انسانیت کی کوشش کرنے والے خود ہی بہیمیت و درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوں تو انسانیت کے مرض کا علاج کیسے ممکن ہے۔ ؎

در دستِ طبیب است علاج ہمہ دردے
دردے کہ طبیب دہد آں را چہ علاجے

ان افسوسناک ناکامیوں کو دیکھ کر بعض مغربی مفکرین اس درجہ مایوس ہوگئے ہیں کہ انھوں نے ان کوششوں کی افادیت ہی کا انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر نپولڈ نے صاف صاف کہہ دیا کہ قانون اور جنگ باہم نقیض ہیں اور میدانِ جنگ میں قانونی پابندیوں کی رعایت کسی صورت سے ممکن نہیں ہے۔

ان حقایق کے پیشِ نظر نسلِ انسانی کو رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مہتم بالشان کارنامہ پر فخر کرنا چاہیے کہ آپ نے صرف آٹھ نو سال کی مدنی زندگی میں عربوں جیسی اجڈ اور وحشی قوم کے وحشیانہ جنگی طریقوں کی اصلاح کرکے ایک جدید بین المملکتی دستور اور احترامِ انسانیت پر مبنی قوانینِ جنگ کو عملاً نافذ کر دیا اور جو لوگ درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے تھے، ان کے دلوں میں ہمہ گیر اخوتِ انسانی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جس کا اعتراف دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔ پروفیسر ورکر لکھتے ہیں:

"یہ عجیب بات ہے کہ جرمنوں اور تاتاریوں ایسی وحشی اقوام کے برعکس، عرب کے بدو جب یہ یک دفعت اپنے صحرائی برِ اعظم سے نکل کر دوسرے ممالک پر حملہ آور ہوئے، تو ان فتوحات کو عام تصور کی وحشیانہ فتوحات میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان لوگوں میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بڑھ کر تہذیب اور پاکیزہ اخلاق نظر آتے تھے۔" [1]

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ سطورِ بالا میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو کم و بیش تاریخ اسلام کا ہر واقف کار جانتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ اس سے بہت

---

[1] دی ہسٹری آف دی لاز آف نیشنس

بلند ہے اور اس کو وہ مرد مومن ہی سمجھ سکتا ہے، جو ذوقِ عشق و مستی سے آشنا ہو۔ وہ کارنامہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیۂ نفوس اور تعلیم و تربیت نے عربوں کو وہ نگاہ حق شناس اور دل خود آگاہ عطا کیا کہ کائنات ہستی کے نقش و نگار اور عالم رنگ و بو کی گوناگوں بوقلمونیوں میں ان کو جلوۂ حق کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور ان کے ذوقِ یقین و ایمان کا یہ عالم تھا کہ ان کی نگاہ ماورائے محسوسات کو پیکرِ مشہود کی صورت میں دیکھتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت حارثؓ سے دریافت کیا: حارثؓ! تمھارا کیا حال ہے؟

عرض کی: یارسول اللہؐ! خدا پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہوں۔

فرمایا: ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

کہا: دنیا سے میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔ رات کو جاگتا اور دن کو بھوکا رہتا ہوں۔ گویا عرشِ الٰہی مجھے سامنے نظر آرہا ہے۔ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم نے ایمان کی حقیقت کو پالیا، اب اس پر قایم رہو۔"[1]

حضرت حنظلہؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم سے جنت و دوزخ کا ذکر فرماتے تو ہماری آنکھوں کے سامنے جنت و دوزخ کا سماں بندھ جاتا تھا۔[2]

نگاہِ نبوت نے ان کے دلوں میں عشق کا ایک ایسا ولولہ پیدا کر دیا تھا کہ وُہ ہر لمحہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے اور ان کی راتیں یادِ الٰہی میں کٹتی تھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں ان کی تعریف کی ہے:

تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً وطمعاً و مما رزقنٰھم ینفقون۔ (السجدہ۔۱۶)	ان کے پہلو بسترِ استراحت سے الگ رہتے ہیں، وُہ خوف و رجاء سے خدا کو پکارتے ہیں اور ہماری دی ہُوئی چیزوں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ دعوت و تبلیغ یہ بھی تھا کہ آپ قرآنی آیات ایسے موثر لہجہ میں تلاوت فرماتے تھے کہ پتھر دل موم ہو جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں آپ کی تلاوت کے اثر سے اسلام اُتر گیا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ارقم بن ابی الارقم، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت ابوعبیدہ بن الحارث اور کئی دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم آپ کی زبان مبارک سے قرآن سُن کر مسلمان ہُوئے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت حضرات صحابہ پر عجیب رقت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ قرآن حکیم نے ان الفاظ میں اس کا نقشہ کھینچا ہے:

---

[1] اسد الغابہ تذکرۂ حارث بن مالک
[2] سنن ترمذی

تقشعر منه جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم و قلوبھم الیٰ ذکر اللہ۔ (زمر۔ ۳)

اللہ کے کلام سے ان لوگوں کے جسم کانپ اٹھتے ہیں، جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے جسم اور دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف پھر جاتے ہیں۔

انسانی شرف و سعادت کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹ جہالت اور قلب و نظر کی تیرگی ہے۔ جہالت کا پردہ اٹھ جانے کے بعد دوسرے تمام پردے آپ ہی سرکنے لگتے ہیں۔ اس لیے پیغمبرانہ دعوت سب سے پہلے قلب و نظر ہی سے تعرض کرتی ہے اور پیغمبرانہ تعلیم و ارشاد کے اثر سے جیسے ہی جہالت کی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے، زندگی کی مستور حقیقتیں اجاگر ہو کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہیں: ؎

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اس لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیثیت محض مبلغ اور واعظ کی نہیں ہے بلکہ ان کو معلم اور مربی بنا کر بھیجا جاتا ہے اور وہ منصبِ رسالت پر فائز ہوتے ہی فکر و ذہن کی تطہیر اور پھر سیرت کی تعمیر کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے"۔

ایک مرتبہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت وہاں دو گروہ الگ الگ بیٹھے تھے۔ ایک گروہ ذکر و عبادت میں مشغول تھا اور دوسرا مذاولت میں مصروف۔ آپ نے فرمایا، اوّل الذکر گروہ بے شک نیک کام کر رہا ہے، ——— وہ خدا سے کچھ مانگ رہا ہے۔ خدا کی مرضی ہے کہ اس کی دعا کو شرف قبول بخشے یا مسترد کر دے لیکن دُوسرا گروہ تعلیم و تعلم کا کام کر رہا ہے (جو آیندہ نسلوں تک اپنا اثر چھوڑنے والا ہے) مجھے بھی چونکہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے میں اسی گروہ میں بیٹھنا پسند کرتا ہوں۔

اسی بنا پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے جہل و تشکک کی تاریکیوں میں گھری ہوئی نسل آدم کو یقین و ایمان کی ضیا باریوں سے منور کیا اور اس کو ضلالت و غوایت کی راہ سے ہٹا کر سعادت ابدی اور شرفِ انسانیت کی شاہراہ پر لگایا۔

دعوت نبوی کا اقتضائے طبعی مصالحت و امن پسندی

پیغمبر کی سیرت عفت و پارسائی، عفو و حلم، صبر و ضبط، مروت و احسان، محبت و ہمدردی اور دوسرے فضائل اخلاق کا ایسا پاکیزہ اور حسین مرقع ہوتی ہے کہ عام انسان تو کیا، بڑے بڑے اہل علم و تقویٰ اور پاکیزہ سیرت لوگ بھی اس کے حسن و زیبایش کی تاب نہیں لا سکتے اور عقل انسانی یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کہ ایک شخص انسان ہوتے ہُوئے بھی اتنے صبر و تحمل، اتنے حوصلہ و ضبط اور اتنی فراخدلی و وسعت قلبی سے متصف ہو سکتا ہے کہ برائی کرنے والوں سے نیک سلوک کرے، راہ میں کانٹے بچھانے والوں کی عیادت کرے، پتھروں سے زخمی کرنے والوں کے حق میں دُعا کرے اور شدید کینہ پرور اور انتقام کیش

دشمنوں پر قابو پانے کے بعد ان کو معاف کر دے۔ وُہ اتنا پاکباز اور عفت مآب ہو کہ اس کی کتابِ زندگی کا کوئی صفحہ خواہشِ نفس کے دھبوں سے داغدار نہ ہو۔ اس کی بے غرضی کا یہ حال ہو کہ سونے چاندی کے ڈھیر اس کے قدموں پر نثار کیے جا رہے ہوں اور وہ نگاہِ غلط انداز سے بھی کبھی ان کی طرف نہ دیکھے۔ اس کو اپنے نصب العین سے اتنی محبت ہو کہ اپنی زندگی کا سارا عیش و آرام اس کے لیے قربان کر دے۔ اس کے دل میں انسانیت کا اتنا درد ہو کہ کسی پر ظلم کرتے ہُوئے دیکھ کر تڑپ اُٹھے اور اپنی ذات کے لیے ایک مرتبہ بھی کسی سے انتقام نہ لیا ہو، بلاشبہ عقل ایسے شخص کے متعلق یہی فیصلہ کرے گی کہ یہ شخص مقامِ انسانیت سے بہت بلند ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان میں خواہشِ انتقام، ہوائے نفس اور دُوسرے لوازمِ بشریت نہ ہوں۔

قرآن حکیم بار بار گزشتہ ایام و وقائع کا ذکر کرتا ہے اور اشرار و مفسدین کی معصیت کوشیوں اور شر انگیزیوں کے مقابلہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ اصلاح و تعمیر کے حالات اور ان کی مقدس سیرتیں ایسے موثر انداز میں بیان کرتا ہے کہ ایک نیک سرشت انسان کے دل میں ان مقدس نفوس کے لیے عقیدت و محبت کے جذبات کا طوفان اُمڈ آتا ہے اور اس کی زبان بے ساختہ ان کی تعریف و توصیف میں زمزمہ سنج ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر اس کی چند مثالیں کافی ہوں گی۔

جب انبیاء علیہم السلام دیکھتے ہیں کہ ان کی دعوت کی مخاطب قومیں کفر و معصیت پر مُصر ہیں اور بار بار سمجھانے کے باوجود ضلالت و گمراہی میں اور زیادہ سخت بلکہ انسانیت کے ان سچے خیر خواہوں کی ایذا رسانی اور قتل تک کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں، تو اس حالت میں بھی ان کے دل جذبۂ انتقام سے بالکل پاک اور قوم کی فلاح و سعادت کے لیے بے چین ہوتے ہیں اور ان کی صلاح و فلاح میں اپنے مساعی کی بے غرضی کا ان الفاظ میں اعلان کرتے ہیں:

لا اسئلکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللّٰہ۔ (ہود - ۳)	میں دعوت و تبلیغ کے عوض تم سے مال و دولت نہیں مانگتا میرا اجر صرف اللہ کے ذمّہ ہے۔
قل ما سألتکم من اجرٍ فھو لکم ان اجری الا علی اللّٰہ۔ (سبا - ۶)	اے نبی! ان سے آپ کہہ دیں کہ میں نے اگر تم سے کوئی اجرت طلب کی ہے تو وہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میرا اجر خدا کے ذمّہ ہے۔

غور کیجئے کہ یہ الفاظ کتنے درد و خلوص میں ڈوبے ہُوئے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سعیِ تبلیغ کے سلسلہ میں قرآن میں جو آیات نازل ہُوئی ہیں، ان سے اس کام کے ساتھ آپ کے شدتِ تعلق اور آپ کے دل میں انسانی فلاح و سعادت کی تڑپ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین۔ (الشعراء - ۱)	شاید آپ اپنے نفس کو اس لیے ہلاک کریں گے کہ وُہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟

حضرات انبیاء علیہم السلام کی پاکیزگی سیرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب حضرت موسیٰؑ کو ایک مدّت کے لیے اجیر مقرر کیا، تو اس وقت انھوں نے جو الفاظ کہے، وُہ انسانیت کی حقیقی خیر خواہی کے

آئینہ دار ہیں :

ما ارید ان اشق علیک ستجدنی ان شآء اللہ من الصالحین ۔ (القصص)	میں یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی سختی کروں ۔ ان شاءاللہ تو مجھے صالحین میں سے پائے گا ۔

ان حقایق سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی سیرت خلوص و دیانت اور انسانی محبت و ہمدردی سے معمور اور ایذا و قتل و سفاکی سے بالکل پاک ہوتی ہے ۔ اس لیے پیغمبروں کی نسبت یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کی دعوت قتل و سفاکی اور خون آشامی کو ضروری قرار دیتی ہے ۔ بلکہ درحقیقت پیغمبرانہ دعوت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ پُرامن طریقہ سے خدا کی زمین کو ظلم و معصیت سے پاک کیا جائے ۔ لیکن جب شر پسند قوتیں مقابلہ پر اتر آتی ہیں ، اس وقت قوت کا استعمال ناگزیر ہوجاتا ہے ۔ کیونکہ : ؎

کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند

پیغمبرانہ دعوت کی ایک اصل یہ ہے کہ مصالحت کے تمام ضروری وسائل و ذرائع استعمال کرنے سے پہلے قوت و طاقت کا ہرگز استعمال نہ کیا جائے اور امکانی حد تک مخالفوں کو حسنِ سلوک اور مروّت و احسان کی قوت سے تسخیر کیا جائے ۔ فریضۂ دعوت کی تکمیل میں جنگ ہرگز شامل نہیں ہے ۔ اس کا حقیقی مقصد انسانیت کی فلاح و نجات ہے ۔ لیکن اگر اس مقصد کی تکمیل میں شرارت پسند مزاحم ہوں اور وہ جنگ سے مجبور کریں ، تو عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی شر انگیزیوں کو قوت کے ذریعہ کچل دیا جائے ۔ مگر اس کی اجازت بہت سے شرائط کے ساتھ ہے :

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر ۔ (الحج)	ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے ، جن سے جنگ کی جاتی ہے یہ اجازت اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے ۔
قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین ۔ (البقرہ ر ۲۴)	تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو ۔ بے شک اللہ تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔

لیکن یہی لوگ اگر جنگ سے دست بردار ہو کر صلح کی پیش کش کریں یا کم از کم ایسا رویّہ اختیار کریں جس سے یہ یقین ہوجائے کہ وہ آئندہ جنگ کی خواہش نہیں رکھتے ، تو اس حالت میں قرآن حکیم کا صریح حکم ہے کہ ان لوگوں کے خلاف ہرگز جنگ نہ کی جائے :

الذین یصلون الیٰ قوم بینکم و بینھم میثاق او جاؤکم حصرت صدورھم ان یقاتلوکم او یقاتلوا قومھم ۔ (نساء)	ان لوگوں سے نہ لڑیں ، جو ایسی قوم سے جا ملیں ، جس سے تمہارا معاہدہ ہے یا وہ اس حال میں تمہارے پاس آئیں کہ تمہارے ساتھ اور تمہاری قوم کے ساتھ جنگ کرنے سے دل برداشتہ ہوں ۔
وان جنحوا للسلم فاجنح لھا ۔ (الانفال)	اگر اہل کفر صلح کے لیے جھکیں ، تو آپ ان سے صلح کر لیں ۔

اس ضمن میں سیرت نبوی کے بہت سے واقعات شہادت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ کو مستقر دین بنایا گیا تو یہاں کے یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس میں یہود کو شہری حقوق عطا کیے گئے تھے لیکن ۲ھ فتح بدر کے بعد یہودیوں نے جب محسوس کیا کہ اسلام ایک ناقابل شکست طاقت بنا جاتا ہے، تو ان کے سینوں میں حسد و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ قبائل یہود میں بنی قینقاع سب سے زیادہ جنگجو اور دلیر تھے۔ اس لیے پہلے انھوں نے معاہدہ کو توڑا اور مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ابن سعد میں ہے:

فلما كانت وقعة بدر اظهروا البغي والحسد ونبذ والعهد۔

غزوۂ بدر کے وقت یہودیوں نے سرکشی و حسد کا اظہار کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

اس موقع پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے، تو ان کا ایک فرد بھی زندہ نہ رہنے پاتا، مگر رحمۃ للعالمین نے عبداللہ بن ابی کی درخواست پر توریت کے حکم کے مطابق ان کو محض جلا وطنی کی سزا دی اور وہ اپنے مال و متاع کو لے کر اذرعات (شام) چلے گئے۔ اس کے بعد ۴ھ میں بنو نضیر نے نقض عہد کیا۔ انھوں نے کئی مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش اور قریش کے بھڑکانے سے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ ایسے لوگوں کی سزا "بین الملکی" قانون کے مطابق قتل سے کم تر کسی صورت میں نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جان و مال سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا اور فقط جلاوطنی کی سزا پر اکتفا کیا۔

عہد رسالت کے واقعات میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں، جن میں غلبہ و اقتدار کے بعد غیر مسلم قبائل سے ان کی جان و مال کے تحفظ کا معاہدہ کیا گیا۔ چنانچہ تبوک کے سفر میں ایلہ، جرباء اور اذرح کے قبائلی سرداروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا۔ دومۃ الجندل کا اکیدر نامی سردار، جو اس سے پہلے قیصر کے زیر اثر تھا مدینہ میں آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پروانۂ امن عطا کیا۔ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے بہت سے وفود آئے۔ ان میں سے بہتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن بعض ایسے بھی تھے، جنھوں نے کہا کہ ہم اسلام تو نہیں قبول کر سکتے، لیکن مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا اقدام بھی نہیں کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی شرط پر ان سے معاہدہ طے کیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے، تو تنہا فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن (قریش) کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فراخدلانہ بلکہ ہمدردانہ سلوک اس حقیقت کبریٰ کی بین دلیل ہے کہ پیغمبرانہ دعوت احترام آدمیت اور ہمہ گیر اصول انسانیت پر مبنی ہے، جس میں انتقام اور جنگ و قتال کی خواہش کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں بعض ارشادات نبوی کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ غزوہ خیبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علیؓ کو علم عطا کیا تو اس موقع پر حضرت علیؓ نے کہا: "میں ان لوگوں سے یہاں تک لڑوں گا کہ وہ ہماری طرح مسلمان ہو جائیں۔" اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں، تم نرمی سے ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان کو ان امور سے آگاہ کرو، جو ان پر واجب ہیں۔ خدا کی قسم اگر ایک آدمی بھی تمہاری کوشش سے راہ راست پر آجائے، تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔"[1]

---

[1] بخاری

جب معرکۂ قتال گرم ہوتا ہے، اس وقت کسے اس کا خیال رہتا ہے کہ دشمن کے چہرہ پر اس لیے ضرب نہ لگائی جائے کہ وہ تمام اعضائے انسانی سے شریف تر عضو اور قدرت کی صنعت کا حسین ترین مظہر ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ہدایت کی ہے:

اذا قاتل احدکم فلیجتنب الوجہ۔ (بخاری ص ۳۴۷)

جب تم سے کوئی دشمن سے لڑ رہا ہو، تو اس کے چہرہ پر وار کرنے سے اجتناب کرے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم کا حق ہے

(الذٰریٰت ۱۹)



فلاحی مُعاشرہ

اور

اقتصادی نظام

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ نظامِ حیات

مولانا محمد ظفیر الدین

آج دنیا ایک ایسے نظامِ حیات کے لیے سرگرداں ہے، جو اسے تمام شعبہ جات زندگی میں طمانیت کی دولتِ وافر عطا کر دے اور جس نظام اجتماع و تمدن میں عدل و مساوات کی حکمرانی ہو، جہاں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن قایم ہو، انسانیت کا احترام و اکرام ہو، دھرم اور مذہب کے نام پر فتنہ و فساد کی گرم بازاری نہ ہو، نظامِ معیشت میں ہمواری ہو اور طبقاتِ انسانی میں کوئی طبقہ افلاس کے قدموں میں کچلتا ہوا نظر نہ آئے، معاشرتی زندگی پاکیزہ اور بدکرداریوں سے پاک ہو اور تمام انسانوں کی عفت و عصمت کا مکمل تحفظ ہو۔

بلاشبہ دنیا میں اس وقت تک ہزاروں مصلح اور پیغمبر تشریف لائے۔ اس میں بڑے بڑے انقلابیوں اور راہ نماؤں نے جنم لیا اور انسانیت کی فلاح و نجاح کے نام پر اصلاح کی سعی کی مگر اس عظیم الشان جماعت میں جو ہمہ گیر نظامِ حیات رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ہم آپ کے سامنے آنحضرتؐ کی زندگی اور آپؐ کے پیغام کا خلاصہ سرسری طور پر پیش کرتے ہیں۔

چالیس سال اپنوں میں

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر اپنے آبائی ماحول میں گزاری، اس عرصہ میں آپ نے تجارت کی، ازدواجی زندگی گزاری، بڑوں اور چھوٹوں میں رہے اور عرب اور شہر مکہ کی ہی تہذیب و تمدن میں پرورش پا کر جوان ہوئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی اس چالیس سالہ زندگی پر کسی کو کوئی جائز اعتراض ہوا؟ کسی نے آپ کے اعمال و اخلاق کا کوئی گلہ اور شکوہ کیا؟ آپ کے رہن سہن اور اپنوں کے ساتھ احترام و اکرام اور محبت و شفقت پر کسی نے کوئی حرف گیری کی؟ انسانی لغزشوں اور کذب و افتراء کی کسی نے ایک مثال پیش کی؟ ظلم و ستم اور جور و تعدی پر کسی کو نالاں پایا؟ مختصر یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے کسی شعبہ پر کسی ایک متنفس کو بھی (بشرطیکہ وہ قابلِ اعتماد اور منصف ہو) شکوہ سنج نہیں پائیں گے بلکہ اس کے برعکس نظر آئے گا تو یہ کہ پورے مکہ والوں کی زبان پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے امین اور صادق کے پاکیزہ لفظ کے علاوہ دوسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔

زندگی کے تیئیس سال مکہ اور مدینہ میں

اب چالیس سال بعد بایں ہمہ اعتماد و اعزاز جب توحید کا لفظ زبانِ وحی ترجمان پر آتا ہے تو مکہ والوں میں ایک عجیب شورش پیدا ہو جاتی ہے اور مکہ کی تیرہ سال کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے غیر ہو گئے، مجلس احباب بزم اعدا میں تبدیل ہو گئی، چچا پیچھے پڑ گئے۔ اہلِ خاندان نے حمایت سے انکار کر دیا، سردارانِ قریش نے دباؤ ڈالنے کی سعی کی، قوم تند مزاجی اور درشت خوئی سے پیش آئی، قریش نے سخت و سست کہا۔ قتلِ نبی کی پے در پے جد و جہد کی گئی۔ صحابہ کرام پر مشقِ ستم جاری رہی، مسلمان خواتین کو زخم لگایا گیا۔ صاحبزادیؓ کو ہجرت حبشہ پر

مجبور رہنا پڑا۔ منافقوں نے مذاق اڑایا۔ شانہ مبارک پر غلاظت ڈالی گئی، گردن مبارک میں پھندا ڈالا گیا، محمدؐ کی جگہ مذمم سے خطاب کیا گیا، شعب ابی طالب میں قید کر کے ترکِ موالات کیا گیا، جسم اطہر لہولہان کیا گیا، معراج کی تکذیب کی گئی، فریب دینے کی کوشش کی گئی، بیہودہ مطالبات کیے گئے اور بالآخر ہجرت پر مجبور کیا گیا، ہجرت کر کے نکلے تو تعاقب کیا گیا، گرفتاری پر انعام و اکرام کا اعلان کیا گیا اور کاشانۂ نبوی پر پہرہ لگایا گیا جو چند گنے چنے مسلمان ہوئے تھے سب نے وطنِ عزیز کو سلام رخصت کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچے۔

مدینہ منورہ پہنچے تو تعمیری کام کی طرف توجہ دی مگر مدینہ کی دس سال کی زندگی میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہود و منافقین اور کفارِ مکہ سے چھوٹی بڑی ۲۸ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ عزیز چچا اور رفیقۂ حیات کی موت کا غم مکہ میں اٹھا چکے تھے۔ یہاں بھی کتنے عزیزوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ پھر صحابہ کرام کی اچانک شہادت کا رنج والم، حضرت حمزہ کی شہادت کا صدمۂ عظیم اور ان کی لاش کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا درد۔ اور دوسری اذیتیں علاوہ ہیں۔

تعلیماتِ نبویؐ ۲۳ سال کی مختصر مدت اور مصائب اور دوسری مصروفیتوں کا یہ ہجوم مگر بتانا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں ہمہ افکار و مصائب دنیا کو کیا تعلیمات دیں۔ ان کی کیسی اصلاح کی۔ ان کے انتشار و تشتت کو کیونکر دُور کر دیا۔ سالہا سال کی جنگ کو صلح اور آشتی سے کیسے بدلا اور کچلی ہوئی انسانیت کو بامِ رفعت تک کس طرح پہنچایا۔

انسانیت کا مقام انسانیت دم توڑ چکی تھی اور آدمیت رسوا ہو رہی تھی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انسانوں کو ہدایت کی مشعل دکھائی اور بتایا کہ ساری کائنات انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ زمین و آسمان، چاند و سورج سب انسان کے اطاعت گزار ہیں۔ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں انسان کے فائدہ کے لیے ہیں۔ انسانیت کا مقام سب سے بلند اور عظیم الشان ہے۔ آپ نے اعلان کیا:

وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ ان فی ذلک لاٰیٰت لقوم یعقلون۔ (نحل ۲)	اور تمہارے کام میں اس نے رات دن، سورج اور چاند کو لگا دیا ہے اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔

انسانوں کو توہم پرستی سے نکالا اور بتایا کہ انسان اپنی خلقت میں سب سے اشرف ہے۔ خوب صورتی اور وضع قطع میں دنیا کی کوئی چیز انسان کے مدِ مقابل نہیں ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے اعلان فرمایا،

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ (والتین) بے شبہ ہم نے آدمی کو بہترین اندازے پر بنایا۔

مرکزیت و اجتماعیت انسان میں خود اعتمادی پیدا کی اور بتایا کہ تم سے اوپر کوئی ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے اور تم اسی کی پرستش کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ وحیِ محمدیؐ نے اعلان کیا:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (ذٰریٰت ۲) اور میں نے آدمی اور جن جو پیدا کیا سو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا۔

اور پھر انسان کا مرکزی نقطہ اسی ایک ذات کو قرار دیا، جس نے کائنات کو وجود بخشا اور اسی مرکز پر لا کر سب میں

یگانگت اور اتحاد پیدا کیا، انتشار و تشتت کو دُور کیا اور سب کے لیے لا الٰہ الا اللہ مُحَمَّد رسول اللہ کی تصدیق و اقرار کو بنیاد قرار دیا، جس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔ (آل عمران ۷)

اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اللہ کے سوا کوئی کسی کو ہم میں رب نہ بنائے۔

کلمۂ توحید میں "محمد رسول اللہ" کا کلمہ شریک کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی بے کسی کا بیسیوں جگہ اعلان کیا اور اپنی عبدیت کو کبھی بھی الوہیت کے درجہ میں لانے کی سعی نہیں فرمائی بلکہ بے شمار موقعوں پر تاکید فرمائی کہ میں اس کا محض ایک بندہ اور رسول ہُوں، اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۔ (کہف-۱۲)

تو کہہ میں بھی تم جیسا ایک آدمی ہُوں۔ میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے۔

یہ بھی پسند نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو۔ کسی نے غیب داں بتایا تو اسے روک دیا کہ اس طرح مت کہو۔ یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی زندگی گزاری۔ پتھر اٹھاتے، خندق کھودی، لکڑی توڑی، رات رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، دوسروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خود ڈرتے رہے۔ الوہیت کا مسئلہ جب اجاگر ہو گیا تو نظام اجتماع کی بنیاد ڈالی اور اپنے ہر عمل سے توحید کا مظاہرہ کیا۔

نظام اجتماع

دن رات میں پانچ وقت کی نماز فرض ہُوئی اور ہر بالغ مرد و عورت پر یہ فریضہ ضروری قرار دیا گیا۔ نماز کے اوقات متعین کیے اور سب کے لیے ایک ہی وقت مقرر کیا۔ فرض نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنوایا گیا۔ پھر جماعت کی نماز جس کو عذر شرعی نہ ہو اس پر ضروری قرار دی۔ اسی کے ساتھ اس میں ایک شخص کو امام اور بقیہ کو مقتدی قرار دیا اور اس طرح یہ نماز روزانہ اجتماعی زندگی کے لیے راہِ عمل قرار پائی۔ اس میں اخوت و مساوات کی پُوری پُوری رعایت ملحوظ رکھی گئی۔ ہر روز ہر محلہ اور گاؤں کی مسجد میں یہ اجتماع ہوتا ہے ہفتہ میں تمام محلوں کو ایک جامع مسجد میں جمع کر دیا۔ سال میں شہر اور دیہات کو عیدگاہ میں لا کر اکٹھا کر دیا اور سال کے اخیر مہینہ میں مسجد حرام کے ذریعہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر دیا گیا۔ ان اجتماعوں میں سے کسی میں بھی امیر و غریب، شاہ و گدا اور شریف و وضیع کا امتیاز باقی نہیں رکھا گیا، بلکہ سب کو ایک صف میں، ایک گھر کے اندر، ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا گیا۔ یہ عملی عبادت آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں قایم ہے۔ اس لیے مزید توضیح اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

دنیاوی زندگی میں ایک امیر کی امارت ضروری ٹھہرائی گئی۔ خلیفۃ المسلمین امام منتخب ہُوا۔ اس کی اطاعت، اگر اکثریت نے اسے منتخب کر لیا ہے ضروری ہے۔ اس سے انحراف جرم اور معصیت ہے۔ خلیفہ خود بھی احکم الحاکمین کے حکم کا تابع ہوگا۔ اسے

کسی الٰہی قانون میں دم مارنے کی گنجایش نہیں۔ نماز کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے:

واركعوا مع الراكعين ۔ (بقرہ ۵) — اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔

مسجد میں ادا کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا:

واقيموا وجوهكم عند كل مسجد وادعوه مخلصين له الدين ۔ (اعراف ۳) — تم سب اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا کرو اور اس کو خالص اسی کا فرمانبردار ہو کر پکارو۔

جامع مسجد کے نظام اور ہفتہ وار اجتماع کے باب میں قرآن نے پکارا:

يآيها الذين اٰمنوا اذا نودى للصلٰوة من يوم الجمعة فاسعوا الىٰ ذكر الله وذروا البيع ۔ (جمعہ ۲) — اے ایمان والو! نماز جمعہ کی جب اذان پکاری جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور بیچنا چھوڑ دو۔

سالانہ اجتماع کے لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

واذن فى الناس بالحج يأتوك رجالاً وعلىٰ كل ضامرٍ ياتين من كل فج عميق ۔ (حج ۳) — اور حج کے واسطے لوگوں کو پکار دو کہ تیری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔ تمام دور راہوں سے آئیں۔

امامت کے لیے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا كانوا ثلٰثة فليؤمهم احدهم و احقهم بالامامة اقرأهم ۔ (مسلم باب احق بالامامۃ) — وہ جب تین شخص ہوں تو ان میں ایک کو ان کی امامت کرنی چاہیے اور ان میں مستحق امامت سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہے۔

امام کی اقتدا اور پیروی کی تاکید فرمائی:

انما جعل الامام ليؤتم به ۔ (بخاری انما جعل الامام ۔۔۔ الخ) — امام تو بس اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

یہ چیزیں اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ غور فرمائیے کہ ان میں کہیں بھی ایسا لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے جس سے نیچ اُونچ کی بُو آتی ہو، شریف اور کمینہ کی بات معلوم ہوتی ہو، شودر اور برہمن کی تفریق ہو اور پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ یہ نظام کیسا تدریجی اور کتنا مرتبط اور ٹھوس ہے۔

خلافت ارضی کے متعلق اعلان ہوا:

ولقد كتبنا فى الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادى الصّالحون ۔ (انبیاء) — اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بالآخر زمین پر میرے نیک بندے مالک ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا :

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض ۔ (نور - ۱۲)

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے کہ البتہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دیں گے ۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی :

اسمعوا و اطیعوا و ان ولی علیکم عبد حبشی ذو زبیبۃ ۔

کہ سنو اور فرمانبرداری کرو ، گو تم پر کسی حبشی بدصورت غلام کو والی بنا دیا جائے ۔

طریق انتخاب کے متعلق ارشاد فرمایا گیا :

امرھم شوریٰ بینھم ۔ (شوریٰ - ۴)

وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں ۔

یہاں بھی بار بار غور کیا جائے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافتِ ارضی کے متعلق جو طریقہ اختیار فرمایا اس میں کہیں ذات پات اور زور زبردستی کی گنجایش ہے ؟ کہیں بھی مساوات کا دامن ہاتھ سے چھوڑا گیا ہے ؟ صرف صلاحیت اور ایمان وجہ استحقاق ہے اور انتخاب کا معاملہ باہمی مشورہ پر ہے ، جو منتخب ہو گیا ، اس کی اطاعت سب پر ضروری قرار دی گئی ۔

نظامِ مساوات

اسلام کا نظام اجتماع دیکھ چکے ، اب دیکھیے آپ نے مساوات کا کیسا نظام قایم فرمایا ۔ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے اسے گہری تنقیدی نگاہ سے ملاحظہ کیجیے ۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا :

انما المومنون اخوۃ ۔ (حجرات - ۱)

سارے مسلمان تو بس بھائی بھائی ہیں ۔

اس کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :

لا فضل العربی علی عجمی ولا عجمی علی عربی ولا لابیض علیٰ اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوٰی ، الناس من آدم و آدم من تراب ۔ (زاد المعاد ، ص ۲۲ ، ج ۴)

نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر ، نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو گورے پر ۔ مگر اصل تقویٰ ہے ۔ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں ۔

علاوہ ازیں خود قرآن پاک کے ذریعہ وضاحت فرمائی :

یٰایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالاً کثیراً ونسآء ۔ (النساء - ۱)

اے لوگو ! تم اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا ۔

شعوب وقبائل کے متعلق جو مسئلہ پیش تھا اس کو بھی کھول کر بیان فرمایا اور بتایا کہ شرافت و رذالت خاندان اور قبیلہ میں نہیں ہے یہ اپنے کردار اور اعمال و اخلاق میں ہے اور عند اللہ شریف وُہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے ۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے

اعلان کیا:

یٰاَیُّھا النّاس اناخلقنٰکم من ذکرٍ و انثٰی و جعلنٰکم شعوبًا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم۔ (الحجرات - ۲)	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتوں اور قبیلوں کو رکھا تاکہ تمہارے آپس کی پہچان ہو اور اللہ کے نزدیک تم میں باعزت وہی ہے، جو بڑا متقی ہے۔

دین کے معاملہ میں نسب و نسل کے بت کو پاش پاش کر ڈالا اور شرافت اور بزرگی، اتقا اور خدا ترسی کو قرار دیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت زیدؓ کی شادی جو نسبًا غلام تھے حضرت زینب بنت جحشؓ سے کی اور اس کا تذکرہ قرآن پاک میں محفوظ کر دیا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اولیائی المتقون حیث کانوا واین کانوا۔ (زاد المعاد)	میرے ہم کنبہ وُہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں، وہ جہاں کہیں بھی ہو۔

اس نظامِ مساوات میں کہیں سے کوئی خامی نظر آتی ہے؟ ایک منصف مزاج کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نظامِ مساوات کلاًّ و جزءً بے داغ ہے۔

نظامِ عدل و انصاف

دنیا میں شور بپا ہے کہ عدل اور انصاف کی روشنی ہر جگہ بکھتی نظر آتی ہے۔ یورپ جو اس وقت دنیا میں سب سے بڑا متمدن خطہ ہے وہ ساری ترقی و تہذیب کے باوجود اب تک گورے اور کالے کی تفریق کرتا ہے اور قانون میں جو رعایت گورے کو اس نے دی ہے، کالے کو اس سے محروم رکھا ہے۔ اپنوں کے لیے جو لطف و کرم ہے، غیروں کے لیے نہیں۔ مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ عدل و انصاف ملاحظہ فرمائیے، کہیں اس میں رو رعایت نظر آتی ہے:

نظامِ مساوات کے ضمن میں آپ نے عدل کی جلوہ گری دیکھ لی۔ اب غور فرمائیے کہ اپنوں سے نہیں غیروں کے ساتھ عدل و انصاف کا کیا برتاؤ روا رکھا گیا ہے۔ بڑے بڑے عادل یہاں پہنچ کر جوشِ عصبیت میں مبہوت نظر آتے ہیں اور قوانین میں ہمواری باقی نہیں رکھتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر اس میں افراط و تفریط نہیں کی اور دوست و دشمن دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا۔ عدل و انصاف کے قوانین کا اعلان فرمایا اور آج نہیں جب کہ اس کا عام شور بپا ہے بلکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جب کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا:

یٰاَیُّھا الذین اٰمنوا کونوا قوّامین للہ شھدآء بالقسط۔ (المائدہ - ۲)	اے ایمان والو! اللہ کے لیے پوری پابندی کرنے والے عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو۔
لا یجرمنکم شناٰن قومٍ علٰی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔ (مائدہ - ۲)	کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑو۔ عدل کرو کہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب یہی بات ہے۔

جور و تعدی پر جب حالات مجبور کر رہے ہوں، انسانی عقل و فہم عدل و انصاف کا ساتھ نہ دے رہی ہو، اس وقت بھی حکم ہے کہ انصاف کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسلام کی محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں۔ کسی موقع پر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی بے قابو فرض کر لیجئے ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ اس کی اس سلسلہ میں ہرگز امداد نہ کی جائے بلکہ اس کے لیے سب مل کر نیکی اور تقویٰ کا اس طرح اظہار کریں کہ تپے جا غیظ و غضب پر شرمندہ ہو کر راہِ راست پر آجائے:

لا یجرمنکم شنآن قومٍ ان صدّوکم عن	اس قوم کی دشمنی جو تم کو حرمت والی مسجد سے روکتی تھی
المسجد الحرام ان تعتدوا و تعاونوا علی	اس کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کرنے لگو۔ آپس میں
البر والتقوٰی و لا تعاونوا علی الاثم والعدوان	نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو۔ گناہ اور ظلم پر مدد
واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ شدید العقاب۔ (مائدہ-۱)	نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بلاشبہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

انصاف کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد کبھی معاملہ سنگین آجاتا ہے۔ احترام و اکرام اور محبت و شفقت ارادوں میں جنبش پیدا کر دیتی ہے۔ اس وقت بھی اجازت نہیں ہے کہ عدل کا دامن تار تار کیا جائے۔ ارشاد رب العزت ہے:

یاَیّھا الذین اٰمنوا کونوا قوّامین بالقسط	اے ایمان والو! انصاف پر قایم رہو۔ اللہ جیسی گواہی
شھدآء للّٰہ و لو علٰی انفسکم او الوالدین	دو گو تمہارا یا تمہارے ماں باپ کا اور یا تمہارے
والاقربین۔ (نساء-۲۰)	قرابت والوں کا نقصان ہو۔

یہ اعلان ہی اعلان نہیں ہے، عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی تاریخ پڑھ جائیے، وہاں عمل ہی عمل ملیں گے۔ آپ پڑھیں گے کہ مسلمان اور یہودی کا مقدمہ پیش ہوا اور فیصلہ یہودی کے حق میں ہوا۔ تفصیل میں چونکہ جانا نہیں ہے، اس لیے واقعات کی تفصیل چھوڑتا ہوں۔

نظامِ جنگ اور انتقام

جنگ اور انتقام کا نام ہی خوفناک ہے۔ یہاں اعتدال کا نام شاید کہیں نظر آجاتے۔ اگر یقین کے ساتھ اعتدال دیکھنا ہو تو اسلام کی تاریخ پڑھیے کہ اسلام نے نظامِ جنگ کتنا پاکیزہ ترتیب دیا اور انتقام کے لیے کتنا جاذبِ نظر اور دلنشین اصول مرتب کیا ہے۔ جزا اور سزا کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے کہ درگزر سے کام لیا جائے اور اگر بدلہ ہی لینا ہو تو برابر اور ویسا ہی ہو:

جزاء سیّئۃٍ سیّئۃٌ مثلھا فمن عفا و	برائی کا بدلہ برائی اسی کے برابر ہے۔ پھر جو معاف
اصلح فاجرہ علی اللّٰہ انہ لا یحب الظالمین۔	کرے اور صلح کرے تو اس کا اللہ کے پاس سے
(شوریٰ-۴)	ثواب ہے۔ بے شک اس کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں۔

دوسری جگہ فرمایا اور کیسے دلنشین انداز میں فرمایا کہ کوئی سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے ساتھ رفق و ملاطفت سے

پیش آنا چاہیے :

لا تستوی الحسنة و لا السیئة ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك و بینه عداوة کانه ولیّ حمیم و ما یلقّٰھا الّا الذین صبروا و ما یلقّٰھا الّا ذو حظ عظیم۔ (حٰم سجدہ۔ ۴)	نیکی اور بدی برابر نہیں۔ بدلہ میں ایسی بات کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر ایسا ہو کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا گہرا دوست قرابت والا ہے اور یہ بات انہی کو ملتی ہے جو تحمل رکھتے ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کی قسمت بڑی ہے۔

عفو اور درگزر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا :

و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا۔ (تغابن ۲)	اگر تم معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو۔
فان ذٰلك من عزم الامور۔ (آل عمران ۔ ۱۹)	بے شک یہ عزیمت کی بات ہے۔

جنگ و قتل کے متعلق فرمایا کہ بچوں ، بوڑھوں ، عورتوں اور جو خدا کی یاد میں گوشہ نشین ہوں ، ان کو نہ چھیڑو :

و قاتلوا فی سبیل اللّٰہ الذین یقاتلونکم و لا تعتدوا ان اللّٰہ لا یحب المعتدین۔ (البقرہ ۔ ۲۳)	اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو ، اللہ تعالیٰ بے شک زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

اسلام نے کہیں بھی زیادتی اور جور و ظلم کو پسند نہیں کیا۔ صلح و سلامتی اسلام کے قوام میں داخل ہے انتقام و مکافات کے سلسلہ میں اس نے بہادری اور احتیاط کی تعلیم دی۔ ارشاد ہوا کہ جو ہتھیار ڈال دیں اور صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں، ان پر زیادتی نہ کرو :

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم و القوا الیکم السلم فما جعل اللّٰہ لکم علیھم سبیلا۔ (النساء)	سو اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں ، پھر تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں ، تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی۔

جہاں جاؤ وہاں خوب غور و فکر کو کام میں لاؤ۔ بغیر سوچے سمجھے کوئی کام عجلت میں نہ کر ڈالو۔ قتل و خونریزی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے اسے خوب اچھی طرح تحقیق کر لو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

یٰٓایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللّٰہ فتبیّنوا۔ (النساء ۔ ۱۳)	اے ایمان والو ! اللہ تعالیٰ کی راہ میں جب سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔

پھر بے رحمی کو بھی راہ نہیں دی ہے۔ اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو اس کے با ایمان ہونے کو بتاتا ہو یا اطاعت کا اعتراف کرلے تو اس کو معاف کر دیا جائے :

و لا تقولوا لمن القٰی الیکم السلام لست مؤمنا۔ (النساء ۔ ۱۳)	اور جو شخص تم سے سلام علیک کرے ، اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

فیصلہ تو ظاہر عمل پر ہے باطن کی ذمہ داری حاکم کے ہاتھ میں نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور فیصلہ جو بھی ہو، انصاف کے ساتھ ہو۔ افراط و تفریط سے پاک اعتدال پر محکم ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ۔ (النساء ۔ ۸) اور تم لوگوں میں جب فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اس حکم سے سرِ مو تجاوز کی اجازت نہیں۔ تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی۔ غزوۂ اُحد میں جس خاتون (ہندہ) نے حضرت حمزہؓ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی، حضرت ابو دجانہؓ نے اس کے سر پر تلوار اس غزوہ میں رکھ کر اٹھائی تھی کہ آنحضرتؐ کی اجازت نہیں ہے کہ عورتوں پر تلوار چلائی جائے[1]۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا جس کا سردار حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ ابھی لشکر روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ وفات فرما گئے۔ چونکہ صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہوتے تو اسے روانگی کا حکم فرمایا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحتیں فرمائیں:

> "دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، مال نہ چھپانا، کسی کے اعضاء کو نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھل والے درختوں کو نہ کاٹنا اور کھانے کی ضرورت کے سوا کسی بکری، گائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا۔ تمہارا گزر ایک قوم پر ہوگا، جو دنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی، تم اس سے تعرض نہ کرنا۔"[2]

پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کے معاملہ میں یہ دستور تھا کہ پہلے مخالفین پر اسلام کی دعوت پیش فرماتے اگر اس پر راضی نہ ہوتے تو جزیہ کا مطالبہ ہوتا، جس کا ماحصل یہ تھا۔ اسلام کی حکومت تسلیم کر لی جائے اور اس کے بعد آخری درجہ میدان کارزار کا ہوتا۔ ذمیوں کی تاریخ پڑھی جائے کہ وہ اسلامی حکومت میں کتنے آرام و عافیت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی عزت و آبرو کتنی محفوظ ہوتی تھی۔

یہ تھا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ جنگ اور اصولِ انتقام۔ آج تو بہت سے لوگ جب اسلام کی رحمتیں عام ہو چکی ہیں یہ کہتے نظر آئیں گے کہ جنگ میں وحشت و بربریت نہیں ہونی چاہیے۔ مگر اس وقت تو کسی کے وہم میں بھی ایسی بات نہیں تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ نظامِ جنگ مرتب فرما کر پیش کر رہے تھے۔

نظامِ معیشت

دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے کہ انسانوں میں ایسا نظامِ عمل ہونا چاہیے کہ سارے انسان پیٹ بھر کر کھائیں، پہننے کے لیے ان کو کپڑا میسر ہو اور رہنے کے لیے گھر ہوں۔ پیٹ کے نام پر بے شمار تحریکیں اُٹھتی رہتی ہیں گو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا، اس میں کوئی

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد اوّل بیان غزوۂ اُحد

[2] تاریخ ملت ص ۵۰ ج ۲

بھی بھوکا، ننگا اور بے گھر نہیں رہ سکتا۔ اس کی عملی مثال خلافتِ راشدہ کا دورِ خلافت موجود ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ارکانِ خمسہ میں ایک زکوٰۃ بھی ہے۔ خدا سے ڈرنے والوں کی صفتوں میں ایمان بالغیب کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا:

ومما رزقنٰھم ینفقون۔ (بقرہ-۱)	اور جو کچھ ہم نے انہیں روزی دیا، اس سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ۔ (بقرہ-۳)	نماز قایم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

قرآن میں بیسیوں جگہ اس کی تکرار ہے اور یہی وہ زکوٰۃ ہے جس کے بند کر دینے پر صدیق اکبرؓ نے تلوار اٹھائی تھی منکرین زکوٰۃ سب کچھ ماننے اور کرنے کو آمادہ تھے مگر صرف یہ کہتے تھے کہ نبی کریمؐ کے بعد زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بہت سے صحابہ کرام اس موقع پر پس و پیش میں تھے کہ وُہ کلمۂ اسلام پڑھتے ہیں پھر صرف زکوٰۃ کے بند کر دینے پر ان کے خلاف تلوار کس طرح اٹھائیں گے مگر صدیق اکبرؓ کی عزیمت اور ان کے بیان سے سبھوں کا سینہ کھلا اور سب نے متفقہ طور پر طے کیا کہ جو زکوٰۃ بند کر دے اس سے لڑنا ضروری ہے اور لڑے۔ صدیق اکبرؓ کی اسی سوجھ پر امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں:

قام ابوبکر یوم الرد مقام الانبیاء (ارتداد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے نبیوں کا سا کام کیا)

بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ جو کہتے ہیں، ان سے قتال کس طرح کیا جائے گا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:

واللہ لاقتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا لقاتلتھم علی منعہ۔ (ریاض الصالحین ص ۵۰۴)	خدا کی قسم میں ان سے ضرور قتال کروں گا جو نماز و زکوٰۃ کی فرضیت میں تفریق کرے گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے بخدا اگر کوئی مجھ کو زکوٰۃ کا ایک عقال (اونٹ باندھنے کی رسّی) بھی نہ دے گا، اس کے روکنے پر بھی ان سے لڑوں گا۔

اس واقعہ سے اہمیت کا اظہار ہے کہ عمل بھی اس پر کس قدر ضروری ہے ورنہ قرآن پاک میں جس قدر تاکید ہے وہی بہت کافی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا۔ (توبہ-۱۳)	ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے کر تو ان کو پاک کرے اور اس کی وجہ سے ان کو بابرکت کرے۔

اور اس زکوٰۃ کا منشا یہ ہے کہ مالداروں سے لے کر حاجت مندوں پر خرچ کی جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم وتردعلیٰ فقرائھم متفق علیہ (ریاض الصالحین باب وجوب الزکوٰۃ)	بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ ان کے مالداروں سے لی جائے اور انکے حاجتمندوں کو دی جائے۔

زکوٰۃ پر چالیس روپے میں ایک روپیہ، غلّہ میں اگر سینچائی نہیں لگی ہے تو دس من میں ایک من یعنی دسواں حصّہ جسے اصطلاح میں عُشر کہتے ہیں اور اگر سینچا پڑا ہے تو اس میں نصف عُشر ہے یعنی بیسواں حصّہ۔ اسی طرح ہر پائدار چیز میں زکوٰۃ ہے جس کی تصریح فقہاء نے بتائی ہے۔ تفصیل فقہ اور حدیث کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

غور فرمائیے صرف زکوٰۃ اور عُشر کی رقم کتنی ہوگی۔ پورے ملک میں جتنا غلّہ پیدا ہوتا ہے اس کا دسواں اور بیسواں حصّہ غریبوں کے نام پر نکل جائے گا اور نقد رقم کا چالیسواں حصّہ محتاجوں کو مل جائے گا۔ علاوہ ازیں قرابت داروں کا حق ہے اور دُوسرے حقوق ہیں، جن کی تاکید حدیث کی کتابوں میں جگہ جگہ ہے۔

پھر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کے خدائی قانون کا اعلان فرمایا۔ سُود کو حرام قرار دیا۔ فریب اور کذب کی کمائی سے منع فرمایا، رشوت کو ناجائز بتایا اور دُوسرے ناجائز شعبوں پر پہرہ بٹھا دیا۔

اسی کے ساتھ اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر تمام ضروری مدّات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی کچھ لوگ بھوک سے مر رہے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ اور رقم ہو تو خلیفۂ وقت مالداروں سے فاضل چیز لے کر مفلسوں اور بھوکے مرنے والوں پر خرچ کرے۔

اس سے بڑھ کر بہتر اور مکمل نظام اور کیا ہو سکتا ہے، کمیونزم میں بھی بالکلیہ مساوات نہیں ہے ورنہ کاشتکاری نہ ہو، کارخانے نہ چلیں، باربرداری کا کام انجام نہ پائے۔ ایک کاشتکاری کرنے والا صدر جمہوریہ جیسا آرام نہیں پا سکے گا اور اس جیسی عزت حاصل نہ کر سکے گا۔ پھر کمیونزم میں قوت کارکردگی مُردہ کر دی جاتی ہے۔ لوگوں میں کمانے اور محنت کا صحیح جذبہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ اسلام کا نظام ان تمام خامیوں سے پاک ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا ہے اس میں کوئی بُھوک سے نہیں مر سکتا۔

نظام عفت و عصمت

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ دنیا نے عفت و عصمت کی مٹی پلید کر ڈالی تھی، عورتوں کی قدر و منزلت ذلت و حقارت میں تبدیل ہوگئی تھی، حسب و نسب کا معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا، عصمت فروشی عام تھی۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی عفت و عصمت کو بیش قیمت قرار دیا۔ اس راستے سے جو فتنہ و فساد اٹھتے رہتے تھے ان کو بند کیا۔ نکاح کا ایک درست طریقہ پیش فرمایا اور اس پر عمل کی تاکید کی۔ زن و شو کے تعلقات کے لیے قوانین ترتیب دیئے۔ اعلان فرمایا؛

وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقرآء	اپنے بے بیاہوں کا اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں جو لائق ہوں ان کا نکاح کر دو۔ اگر وہ مفلس

يغنيهم الله من فضله و الله واسع عليم ۔ (نور۔۴)
ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دیگا اور اللہ کشائش والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔

اس آیت کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ نکاح صلاحیت کے بعد ضرور کرنا چاہیے۔ فقر و فاقہ کا خدشہ جو نفس پیدا کرتا رہتا ہے، اس طرف سے بھی بڑی حد تک تسکین دلائی گئی ہے کہ اگر مشیت ہے تو رب العزت کوئی نہ کوئی جائز شکل پیدا کر دے گا۔

جس میں نکاح کی صلاحیت ہی نہ ہو، نہ بالفعل ہو اور نہ بالقوہ بلکہ وُہ ہر طرح مجبور ہو، اس کو عفت کی زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اشارہ ہے کہ جہاں پھر صلاحیت ہو نکاح کرلے؛

وليستعفف الذين لا يجدون نكاحًا حتّٰى يغنيهم الله من فضله ۔ (نور۔۴)
ایسے لوگ جن کو نکاح کی استعداد نہیں ہے، ضبط کریں تا آنکہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کرے۔

نکاح ایک بڑی نعمت ہے۔ انسان اپنی زندگی میں ماں باپ کے بعد بیوی ہی سے آرام و عافیت اور سکون اور چین حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی عفت اور عورتوں کی عصمت کا پورے طور پر تحفظ کر سکتا ہے۔ رب العالمین فرماتے ہیں؛

ومن اٰياته ان خلق لكم من انفسكم ازواجًا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة ۔ (روم۔۳)
اس کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس چین حاصل کرو اور اس نے تمہارے آپس میں پیار اور مہربانی رکھی۔

شہوت کی جگہ کی حفاظت کا حکم فرمایا اور اس پر عمل کرنے والوں کو سراہا۔ برائی سے روکا اور زیادتی کرنے والوں کی مذمت کی۔ جہاں ایمان والوں کی فلاح کا تذکرہ ہے، ان میں ان کو بھی شمار کیا گیا ہے؛

والذين هُم لفروجهم حافظون الّا علٰى ازواجهم او ما ملكت ايمانهم فانهم غير ملومين ومن ابتغٰى ورآء ذٰلك فاولٰئك هم العادون ۔ (مومنون۔۱)
اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے لُطف اندوز ہوتے ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں ہے اور جو کوئی اس کے سوا کی جستجو کرے وُہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

عفت و عصمت پر غلط تہمت لگانے والوں کے لیے اسّی دُرّے سزا مقرر کی اور اس کی گواہی کو مردود قرار دیا؛

والذين يرمون المحصنٰت ثم لم يأتوا باربعة شهدآء فاجلدوهم ثمانين جلدة ولا تقبلوا لهم شهادةً ابدًا واولٰئك هم الفاسقون ۔ (نور۔۱)
جو پاک دامن عورت کو تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو وہ فاسق لوگ ہیں۔

زنا کار کی سخت سزا مقرر کی۔ اگر غیر شادی شدہ ہے تو سَو دُرّے اور شادی شدہ ہے اور خلوت کر چکا ہے تو اس کے لیے

سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ یعنی قوم کے روبرو اس کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے:

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحدٍ منھما مائۃ جلدۃٍ ولا تاخذکم بھما رافۃٌ فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاٰخر ولیشھد عذابھما طآئفۃ من المؤمنین۔ (نور - ۱)	زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مردان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو تو تم کو ان دونوں پر اللہ کا حکم جاری کرنے میں ترس نہ آئے اور کچھ مسلمان ان کی سزا کو دیکھتے رہیں۔

سنگسار کرنے کے باب میں حدیث میں حضرت ماعزؓ کا واقعہ مذکور ہے اور بھی بہت ساری حدیثیں ہیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے کتنا عظیم الشان نظامِ عفت وعصمت پیش فرمایا۔ اگر اس کے تمام شعبہ جات پر عمل کیا جائے، تو ممکن نہیں، دنیا میں عفت وعصمت کا تحفظ کمزور رہے اور بہت ساری بداخلاقیاں مٹ مٹا نہ جائیں۔

نظامِ امن وامان

امن وامان جو اب ایک جنس نایاب بنتی جا رہی ہے اس کے متعلق بھی رحمتِ عالمؐ نے جو اصول وقوانین پیش فرمائے، وہ ہر طرح مکمل ہیں۔ ان میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ (بنی اسرائیل ۴)	اس جان کو قتل نہ کرو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے لیے۔

قاتل کے لیے قصاص کا حکم نافذ فرمایا یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل بھی قتل کر دیا جائے:

یٰاَیھا الذین اٰمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ الحرّ بالحرّ والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ۔ (البقرہ - ۲۲)	اے ایمان والو! مقتولوں میں تم پر قصاص (برابری کرنا) فرض ہے۔ آزاد کے بدلہ آزاد اور غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلہ عورت۔

اور اس کو عین زندگی بتایا کہ اس کی اہمیت اور فائدوں میں انسان غور وفکر سے کام لے:

ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب۔ (البقرہ - ۲۲)	اور اے عقل والو! قصاص میں بڑی زندگی ہے۔

فسادی اور ڈاکوؤں کے متعلق سخت سے سخت سزا تجویز کی تاکہ امن وامان میں کبھی خلل نہ ہونے پائے جس سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے، پبلک میں خوف وہراس پھیل جاتا ہے، سفر اور کہیں آنا جانا دشوار ہو جاتا ہے اور بہت ساری مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں:

انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من	ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں، یہ ہے کہ وہ قتل کیے جائیں، یا پھانسی دیے جائیں، یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے

الا رض۔ (المائدہ ۵) الگ کر دیئے جائیں۔

چور کی سزا کے متعلق رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چورات کا سکون حرام کر دیتا ہے اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں:

السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ۔ (مائدہ ۔ ۶)

یہ اور اس طرح کے بیسیوں حکم اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے، جن سے امن و امان کا کامل تحفظ ہو جاتا ہے۔ کسی کو گنجائش نہیں مل سکتی کہ وہ فتنہ برپا کرے۔

نظامِ تعلیم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ علم و فضل کی ترغیب دی اور ارتقاء و عروج پر برانگیختہ کیا۔ دورِ اوّل میں مسلمانوں نے حکمت و تہذیب کے جو قابلِ تقلید نمونے پیش کیے، وہ سب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کا ادنیٰ پرتو تھا۔ ارشاد ہُوا:

هل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون۔ (الزمر ۔ ۱) کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں۔

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا اور فرمایا:

وما اُوتیتم من العلم الا قلیلا۔ تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا۔

دعا کے جملہ کے طور پر فرمایا گو خاص واقعہ ہی کے سلسلہ میں فرمایا:

قل رب زدنی علماً۔ (طٰہٰ ۔ ۶) تو کہہ اے رب مجھ کو علم میں زیادہ کر۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم و فنون کے تحصیل کی تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ علم حاصل کرو اگر اس کے لیے چین جانا پڑے۔

علم کی قدر افزائی فرمائی، عالموں کی قدر و منزلت بیان کی، علم کے فضائل پر بحث فرمائی اور مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے دل میں یہ حقیقت راسخ کی کہ علم دنیا کی بڑی نعمت اور بیش قیمت دولت ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

فقیہ واحد افضل عند اللہ من الف عابد۔ ایک فقیہہ اللہ کے نزدیک ہزار عبادت گزاروں سے افضل ہے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے۔ طلبہ کے لیے ساری چیزیں دُعا کرتی ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں سمندر کی تہہ میں ان کے لیے دعاگو ہیں۔ پھر اس کا جو نتیجہ ہُوا وہ تاریخ میں پڑھیے۔ علوم و فنون کا وہ کونسا میدان ہے، جہاں مسلمان نظر نہ آتے ہوں اور سائنس و فلسفہ کا کون سا شعبہ ہے، جو مسلمانوں کا رہینِ منت نہیں۔ پہلے پہل تحقیقات کی تشویق مسلمانوں نے پیدا کی اور کد و کاوش اور جد و جہد کا صور رحمتِ عالمؐ کا پھونکا ہوا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب "کتاب العلم" کے نام سے موجود ہے۔

عقل وفہم سے کام لینے کی ترغیب جتنی رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے شاید کسی نے دی ہو۔ قرآن میں ہر چند سطروں کے بعد افلا یعقلون ، افلا یتدبرون ، لا یشعرون ، لا یفقھون اور فھل من مدکر اور اس طرح کے بیسیوں الفاظ ہیں جو دماغ اور فکر و شعور سے کام لینے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ اس کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔

نظام اخلاق واعمال رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اخلاق و اعمال کی جو بیش بہا تعلیم دی، وہ تو مخصوص آپ ہی کا حصہ ہے۔ فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔	میں تو اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

قرآن پاک نے اعلان کیا:

انك لعلیٰ خلق عظیم۔ (القلم۔ ۱)	اے محمدؐ! بے شک آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر ہیں۔

دوسری جگہ کہا:

لقد جآءکم رسول من انفسکم عزیزٌ علیه ما عنتم حریصٌ علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم۔ (توبہ۔ ۱۶)	تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا ہے۔ تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، وہ اس پر شاق گزرتی ہے۔ تمہاری بھلائی پر حریص ہے۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اپنی امت کو مخاطب کر کے فرمایا:

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ (آل عمران۔ ۱۲)	تم بہترین امت ہو، جن کو عالم میں بھیجا گیا اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔

ہلاک ہونے والی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا:

کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوه لبئس ما کانوا یفعلون۔ (المائدہ۔ ۱۱)	وہ آپس میں بُرے کام سے نہیں روکتے تھے، جیسے وہ کر رہے تھے۔

پھر جزئی مسئلوں میں اخلاق برتنے کی تاکید فرمائی۔ ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم فرمایا۔ ان کے لیے دعائے خیر کرنے کی تاکید کی اور خلافِ ادب بات کہنے سے منع فرمایا۔ والدین کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

لا تقل لھما اُفٍّ ولا تنھرھما وقل لھما قولاً کریما۔ (بنی اسرائیل۔ ۳)	تو ان کو ہوں نہ کہہ اور نہ ان کو جھڑک اور ان سے باادب بات کہو۔

باہمی تعلقات کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تقاطعوا ولا تدابروا لا تباغضوا ولا تحاسدوا وکونوا اعباد اللہ اخوانا و لا یحل للمسلم ان یہجر اخاہ فوق ثلاث۔ (ترمذی ص ۱۲ ، ج ۲)

نہ قطع رحمی کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا کہو، نہ بُغض رکھو اور نہ حسد رکھو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ، مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے۔

ضرر رسانی اور تکلیف دہی سے منع کیا اور مکر و فریب سے سختی کے ساتھ روکا۔ ایک دفعہ فرمایا:

ملعون من ضار مؤمنا او مکربہ۔ (ترمذی ص ۱۶، ج ۲)

اس پر خدا کی لعنت ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے یا فریب دے۔

جھوٹ بولنے والوں کے لیے وعید شدید بیان فرمائی اور سچ بولنے والوں کو سراہا:

علیکم بالصدق فان الصدق یہدی الی البر والبر یہدی الی الجنۃ و ایاکم و الکذب فان الکذب یہدی الی الفجور والفجور یہدی الی النار۔ (ترمذی ص ۱۹، ج ۲)

تم پر سچائی ضروری ہے کیونکہ سچ بولنا نیکو کاری کی راہ دکھاتی ہے اور نیکو کاری جنت کی اور جھوٹ بولنے سے قطعی پرہیز کرو۔ کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری آگ کی طرف۔

حسن خلق کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

خیارکم احسنکم اخلاقاً۔ (ترمذی، ص ۱۹، ج ۲)

تم میں بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے۔

جو کچھ عرض کیا گیا، وہ سمندر میں سے چند قطرے ہیں۔ پھر بھی گزارش ہے کہ ان مسئلوں کو گہری نظر سے مطالعہ کریں اور یہ چیز بھی غور کرنے کے لایق ہے کہ یہ تعلیمات آپ نے دنیا کے سامنے اس وقت پیش کیں، جب وہ فسق و معصیت، ظلم و جبر، عصبیت و جہالت اور شر و فتن میں پھنسی ہوئی تھی، ہدایت اور حقانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور روئے زمین آبِ رحمت کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی تھی۔

سطورِ بالا میں اسلام کے اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی، عمرانی اور ملکی کارناموں کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے۔ اس دور میں بھی اس تابناک روشنی اور عالمتاب آفتابِ ہدایت کی ضرورت آپڑی ہے۔ ان شاء اللہ قوم و ملک دونوں کی گتھی اس میں غور و فکر کرنے سے سلجھ سکتی ہے اور اس پر عمل کرنا حکومت و ملت کی ترقی و عروج کا ذریعہ ثابت ہوگا، وما ارسلناك الا رحمۃ للعلمین۔

صلی اللہ علیہ وسلم

عہدِ جدید کے مسائل اور آنحضرتؐ کا پیغام

شرف الدین اصلاحی

اس میں شک نہیں کہ آج کی دُنیا مسائل کی دُنیا ہے۔ چھوٹے بڑے گوناگوں مسائل، اُلجھے ہوئے، پیچیدہ اور سنگین مسائل؛ سیاسی اور اخلاقی مسائل، معاشی اور معاشرتی مسائل۔ انفرادی اور اجتماعی مسائل، داخلی اور خارجی مسائل، قومی اور بین الاقوامی مسائل، الغرض مسائل ہی مسائل۔ یہ بھی درست ہے کہ پچھلے ادوار کے مقابلے میں اس دَور کے مسائل اور ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں زندگی سادہ اور محدود تھی اس لیے مسائل بھی کم اور سیدھے سادے تھے۔ تہذیب و تمدّن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ زندگی جُوں جُوں پیچیدہ ہوتی گئی مسائل بھی بڑھتے گئے اور ان کی ژولیدگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا، لیکن فی نفسہٖ مسائل کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، مسائل ہمیشہ سے ہیں۔ مسائل اس وقت بھی تھے کہ جب انسان نے تہذیب و تمدن کی بُنیاد رکھ کر اجتماعی زندگی کا آغاز کیا۔ مسائل کل بھی تھے، مسائل آج بھی ہیں، اور مسائل آئندہ بھی رہیں گے۔ مسائل زندگی کے ساتھ ہیں۔ انسان اور مسائل لازم و ملزوم ہیں۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اس دَور کے مسائل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہر وہ شخص بآسانی دے سکتا ہے جو آج کی دُنیا میں رہتا ہے اور حالاتِ حاضرہ کی تھوڑی بہت خبر رکھتا ہے۔ مسائل کا شمار ہمارا مقصود نہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں کہ مسائل ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی نہیں کہ مسائل کیا ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے۔ حل ہے بھی یا نہیں۔ اگر حل ہے تو مسائل حل کیوں نہیں ہوتے۔ گتھیاں سلجھنے کی بجائے اور اُلجھتی کیوں جاتی ہیں۔ مسائل کی تعداد میں کمی کی بجائے روز بروز اضافہ کیوں ہوتا جاتا ہے۔ امن و سکون، سُکھ اور شانتی اس جہانِ گذراں میں انسان کی تمام تر سعی و جستجو کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ سعی و تلاش کی راہ میں اُٹھنے والا ہر قدم اُسے منزل سے دُور لے جا رہا ہے۔

مسائل کی مثال اُن بیماریوں کی سی ہے جو انسانی جسم کو لاحق ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے بیماری کوئی آرزو کرنے کی چیز نہیں۔ بیماری چھوٹی ہو یا بڑی، بیمار امیر ہو یا غریب، بچّہ ہو یا بوڑھا، مرد ہو یا عورت، پہلی فرصت میں فکر یہی ہوتی ہے کہ بیماری کا ازالہ کیا جائے اور انسان اپنا سب کچھ قربان کر کے کھوئی ہوئی صحت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن تمام تر فکر اور کوشش کے باوجود اگر مرض ٹھیک نہ ہو بلکہ اُلٹا بڑھتا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ علاج صحیح نہیں ہو رہا۔ مختلف دواؤں اور مختلف معالجوں کو بدل بدل کر آزمانے اور تجربہ کرنے کے بعد بھی اگر مرض میں افاقہ کی بجائے اضافہ ہوتا جائے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ خود علاج میں کوئی خرابی ہے۔ بیماری کے علاج میں چند باتیں بُنیادی اہمیّت کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسے طبیبِ حاذق کی طرف رجوع کیا جائے جو صحیح طریقِ علاج سے واقف ہو اور اپنے فن کا ماہر ہو۔ طبیب اس نکتے سے واقف ہو کہ مرض کا سبب معلوم

کیے بغیر کوئی علاج کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے مریض کے مزاج اور موسم کی کیفیت کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔ مرض کی صحیح تشخیص اور صحیح دوا کی تجویز پر ہی صحت کی بازیابی کا دارومدار ہے۔ وہ معالج جو اس فطری طریقے کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا، وہ مرض کو اور اُلجھائے گا۔ اپنی بے تدبیروں سے معمولی سی شکایت کو پیچیدہ اور مزمن امراض میں تبدیل کر دے گا۔ اُلٹی سیدھی دوائیں دے کر نئی بیماریاں پیدا کر دے گا۔ ایسے طبیب کے ہاتھوں مریض کی جان خطرے میں پڑ جائے تو بھی جائے تعجب نہیں۔ اس کے برعکس اگر تشخیص و تجویز صحیح ہو تو خطرناک سے خطرناک بیماری بھی بسا اوقات معمولی دواؤں سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اور دوا صحیح ہو تو اس کا اثر فوری ہوتا ہے اور صحت یابی کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہوتی ہے۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر عہد جدید کے مسائل اور ان کی تاریخ کا بے لاگ تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مضمون ہے۔ یہ صورتِ حال اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ مسائل کو حل کرنے کی جتنی بھی کوششیں اب تک کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان میں ضرور کوئی بنیادی خرابی موجود ہے۔

مسائل کے حل میں ساری بات صحیح سمت میں قدم اُٹھانے کی ہے۔ مکّہ کا مسافر اگر ترکستان کی شاہراہ پر چل پڑے، تو منزل کی سچی لگن اور طلبِ صادق کے باوجود وہ ہر گام منزل سے دُور ہوتا جائے گا۔ منزل سے ہمکنار ہونا ایسے مسافر کا مقسوم نہیں ہوتا۔ منزل انھیں ملتی ہے جو ارادے کے بعد منزل کی سمت سفر بھی کرتے ہیں اور راہِ راست ان کے ہم رکاب ہوتی ہے۔ عہد جدید کا انسان اپنے نت نئے مسائل کے حل کا دل سے خواہاں ہے، لیکن اس کے لیے وہ جو تدبیریں کرتا ہے وہ اس لیے اُلٹی ثابت ہوتی ہیں کہ منزل کے تعیّن کے باوجود وہ صحیح راستہ اختیار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مقصد کا اُسے شعور ہے، لیکن ذریعے کی تلاش میں وہ ٹھوکر کھاتا ہے۔ اس لیے اسے ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

فرض کیجیے ہمیں ریشمی دھاگے کا اُلجھا ہوا ایک لچھا سلجھانے کو دیا جائے۔ اگر ہم نے شروع ہی سے اس کا سرا پا لیا تو بڑی سے بڑی گتھّی کے سلجھانے میں بھی چند لمحوں سے زیادہ صَرف نہیں ہو گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم نے سرا ہاتھ میں لیے بغیر ہی اُسے سلجھانے کی کوشش کی تو اس کوشش کا انجام کیا ہو گا۔ یہ ہزار دقّت اگر ہم ایک گرہ کھولنے میں کامیاب ہوں گے تو اس میں سو گرہیں اور پڑ جائیں گی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تھوڑی دیر بعد اس میں گرہیں ہی گرہیں نظر آئیں گی۔ آج انسانیت کو درپیش مسائل اور اُن کے حل کی کوششوں کا یہی حال ہے۔ آج کے انسان کا حال ریشم کے اُس کیڑے کا سا ہے جو ریشم کے تار اپنے گرد لپیٹتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تہ بہ تہ پھندے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور یہ حالت اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس ضمن میں اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر کے صحیح طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا۔ اسے سب سے پہلے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ مسائل کیوں پیدا ہوئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس دریافت میں وہ اپنی ناقص عقل اور خطا کار بصیرت پر اعتماد کرتا ہے اس لیے اصل اسباب کی دریافت سے قاصر رہتا ہے اور رشتہ کا سرا اس کے ہاتھ نہیں آتا۔
اس قسم کی صورتِ حال میں انسانیت کے گُم کردہ راہ قافلے کی رہنمائی کے لیے اس دنیا میں اگر امید کی کوئی کرن ہے تو وہ آنحضور صلعم کا پیغام ہے۔ آنحضرت صلعم کا پیغام نہ صرف یہ کہ مرض کے سبب کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ علاج کے فطری طریقے بھی تجویز

کرتا ہے۔ضرورت اس کے علم اور اس پر عمل کی ہے۔ آنحضرت صلعم نے بتایا کہ ساری خرابی کی جڑ پیغامِ حق سے انسان کی رُوگردانی ہے اور حق کا پیغام ہی دراصل آنحضرت کا پیغام ہے۔ آپؐ نے اپنے پیغام میں سبب کی نشان دہی کے ساتھ فرداً فرداً مسائل کے حل بھی بتا دیئے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اللہ کا فرمان اور آپؐ کی سیرت عمل بالقرآن ہے۔قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لیے جو کچھ فرمایا ہے آنحضورؐ کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے جب آپؐ کی سیرت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن آپؐ کی سیرت قرآن ہے۔قرآن ایک حرف کی کمی بیشی کے بغیر آج کے انسان کے پاس موجود ہے۔آپؐ کی سیرت کو آپؐ کے پاک اصحاب نے جس اہتمام کے ساتھ جمع کر کے محفوظ کر دیا ہے وہ بھی تاریخ انسانی کا ایک فقید المثال واقعہ ہے۔یوں تو آپ کے پیغام کا ایک ایک لفظ اپنی افادیت کے لحاظ سے اہم اور قابلِ توجہ ہے لیکن اس میں تین باتیں خاص اور بنیادی ہیں۔آج کا انسان اگر صحیح معنوں میں ان کو اپنالے تو اس کے جملہ مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے:

۱۔توحید۔ ۲۔رسالت ۳۔آخرت۔

یعنی معبودِ حقیقی اللہ تعالیٰ کو حاکم علی الاطلاق تسلیم کر کے اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔سلسلۂ نبوت کو حیاتِ دنیوی میں واحد ذریعۂ ہدایت مان کر زمامِ کار کلیتہً اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔روزِ جزا کی جوابدہی کا احساس اپنے دل میں ہر لحظہ تازہ رکھا جائے۔انسانی زندگی سے ان باتوں کا اُٹھ جانا ہی عہدِ جدید کے مسائل کا باعث ہے اس لیے یہ مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان باتوں کو ان کے جملہ تقاضوں سمیت اختیار نہیں کر لیا جاتا۔

آنحضرت صلعم کا پیغام اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قانونِ فطرت یعنی حکمِ الٰہی کی پابند ہے، وَكُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے۔یہ قرآن کا فرمان ہی نہیں ہے بلکہ ہمارا آپ کا مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے۔کوئی بڑے سے بڑا کافر، مشرک، ملحد، زندیق، دہریہ اور کمیونسٹ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ قدرت کا کارخانہ کچھ بندھے ٹکے اصُولوں کے مطابق چل رہا ہے اور اسی لیے اس میں کبھی خلل نہیں واقع ہوا۔آفاق و انفس کی بے شمار کھلی ہوئی آیات اس کی روشن دلیلیں ہیں۔انسان اس وسیع و عریض کائنات کا ایک ادنیٰ اور حقیر سا حصّہ ہے۔کیا وجہ ہے کہ مسائل کا بکھیڑا صرف اسی کی جان کے ساتھ ہے۔رخنے صرف اسی کی زندگی میں کیوں ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے مسائل خود پیدا کرتا ہے۔یہ اس کی اپنی کج اندیشیاں اور غلط کاریاں ہیں جو اس کے مسائل کی ذمہ دار رہیں۔اس کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو آزادی و خودمختاری کی نعمت سے بہرہ ور ہے اور یہ آزادی و خودمختاری ہی اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔کائنات کی کوئی شے قدرت کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں سے سرِمُو انحراف نہیں کر سکتی۔مگر انسان کو یہ حق و اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان اصولوں کی پابندی کرے اور چاہے تو خلاف ورزی کرے۔جہاں تک وہ اسلوبِ فطرت کی پابندی کرتا ہے اس کی زندگی ہموار اور استوار رہتی ہے، جہاں وہ انحراف کرتا ہے اس کی زندگی کے نظام میں خلل پیدا ہوتا ہے اور اس خلل سے نت نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔انسان کے لیے پسندیدہ راستہ یہی ہے کہ وہ دوسری مخلوقات کی طرح

اپنے فکر و عمل میں فطرت کے تقاضوں کا پابند رہے لیکن اس کی اُفتادِ طبع ہے دوسرے الفاظ میں بشری کمزوری کہنا چاہیئے اس کو فطرت کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور وہ ان حدود سے تجاوز کر جاتا ہے جن کی پابندی کئے بغیر وہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتا اور نتیجۃً اُلجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے اور طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے، آنحضرت صلعم نے آکر انسان کو فطرت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ اس کو بتایا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ دُنیا میں امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کے لیے اس کو کس طرح رہنا چاہیئے۔

اس ضمن میں ایک بُنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان ہدایتِ آسمانی سے بے نیاز ہو کر اپنے مسائل حل کر سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ مسائل پیدا ہی آسمانی ہدایت سے بے نیازی کے سبب ہوتے ہیں تو آسمانی ہدایت کے بغیر ان کو حل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ مسائل کا حل آسمانی ہدایت کی پیروی ہی میں مضمر ہے اور آسمانی ہدایت کا آخری صحیفہ آنحضرت صلعم کا پیغام قرآن ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ عہدِ جدید کے مسائل صرف قرآن حل کر سکتا ہے۔ انسان کی علمی فتوحات اور عقلی ترقیات کے سامنے مہر و ماہ کی بلندیاں سرنگوں ہیں۔ پھر بھی زندگی کے بُنیادی مسائل کے حل کے لیے وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہدایتِ ربّانی کا محتاج ہے۔ آج کا انسان بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ دُنیا کا خالق وہ ہے۔ جب وہ دُنیا کا خالق نہیں تو اس کے نظام کو چلانے کے لیے قاعدے اور قانون بنانے کا وہ کس طرح اہل ہو سکتا ہے۔ دُنیا کا خالق اللہ تعالےٰ ہے اس لیے اس کی حکمرانی کا حق بھی اُسے پہنچتا ہے۔ لہ الخلق ولہ الامر تخلیق اسی کی ہے اس لیے حکم بھی اسی کا ہوگا۔ انسان خدا کا نائب ہے اور نائب ہی رہے گا۔ نائب کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ اصل مالک کے حکم کو نافذ کرے نہ کہ اپنا حکم چلائے۔ انسان ہوا و ہوس کا بندہ ہے۔ اس سے یہ ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ منصبِ حکمرانی پر فائز ہو کر بے لاگ عدل و انصاف کے ساتھ دُنیا کا کاروبار چلائے گا۔ اسی لیے آنحضرت صلعم نے یہ پیغام دیا کہ تمام بنی نوعِ انسان اس بالاتر ہستی کے مطیع و فرمانبردار ہو جائیں جو ایک ہے، پاک ہے، بے نیاز ہے۔ خالق ہے، مالک ہے، علیم ہے، خبیر ہے، حکیم ہے عادل ہے۔ کہ اس کی اطاعت ہی میں ان کے مسائل کا حل ہے۔

آج کے انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وُہ ایک ایسے دَور میں رہتا ہے جو افکار کے تصادم نظریات کی جنگ کی وجہ سے ابتری اور پراگندگی کا شکار ہے۔ یہ ازم وہ ازم، باطل رنگ بدل بدل کر انسانی فکر و نظر پر یلغار کرتا ہے اور حق اپنے علمبرداروں کی بے حسی کا ماتم کرتا ہے۔ عام انسان ایک افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی اُدھر۔ وہ سرگشتہ و حیران ہے کہ کدھر جائے۔ کبھی اس کو آزماتا ہے کبھی اس کو، کبھی اس کو اپناتا ہے کبھی اس کو۔ ایک ازم کو آزماتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ اس سے مسائل حل نہیں ہوتے تو اس کو چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے ازم کی طرف لپکتا ہے مگر وہاں بھی اس کو مایوسی اور ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ تجربات کے اس چکر سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ وہ ایسے "ازم" کو نہیں اپناتا جو اس کی فطرت کے مطابق ہے اور وہ ازم دینِ فطرت اسلام ہے جو نبی عربی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا۔

عہدِ جدید کے مسائل میں ایک بڑا مسئلہ...... بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ عہدِ جدید کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ خود یہ

سوال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام یعنی دینِ اسلام عہدِ جدید کے مسائل حل کر سکتا ہے یا نہیں۔ اغیار اور دشمنانِ اسلام کا ذکر چھوڑ دیئے خود ہم مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اسلام قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ یہ چودہ سو سال پرانا نظام یا نظریہ نئے دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسلام اس دور کے لیے تھا جب انسانی تمدن ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا۔ عہدِ حاضر کی پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ نئے دور کے نئے مسائل کے لیے نئے نظام کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت وہ عصرِ حاضر کے نت نئے ازموں (ISMS) سے پوری کرنی چاہتے ہیں۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو نہ اللہ کی ہستی پر یقین نہیں رکھتا نہ ہی رسالت کی حقیقت سے واقف ہے اور نہ ہی روزِ جزا کا قائل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان بے دین دہریوں اور ملحدوں کا گروہ ہے جو سرے سے آسمانی ہدایت کی ضرورت ہی پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ لوگ آج کیا چودہ سو سال پہلے بھی اسلام کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہی میں منافقوں کا وہ گروہ بھی شامل ہے جو اوّل الذکر کے سے ہی خیالات رکھتا ہے۔ لیکن معاشی اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے اسلام کا نام لینا بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دینِ اسلام کو عام مذاہب کی طرح ایک مذہب ہی سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا اور دنیا کے امور و مسائل کو مذہب کے دائرے سے خارج تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب چند رسمی عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ جاہلوں کا گروہ ہے جن کی دینی معلومات چند سنی سنائی باتوں تک محدود ہے۔ وہ اسلام کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ انھیں آنحضرت صلعم کی بعثت کی غرض و غایت کی بھی خبر نہیں اس لیے گمراہ کن خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان سب کو ہمارا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ وہ تعصّب و تنگ نظری کو خیرباد کہیں، نیک نیتی کے ساتھ حق کی جستجو کریں اور چاہِ جہالت سے نکل کر علم کی دنیا میں قدم رکھیں۔ پھر دیکھیں کہ اسلام کس طرح آج کے مسائل حل کرتا ہے۔ اسلام کا مقابلہ دنیا کے کسی نظام یا ازم سے کرنا اسلام کی توہین ہے۔ مقابلے اور موازنے کے لیے جو شرائط ہیں وہ یہاں پوری طرح پائی ہی نہیں جاتیں۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظامِ حیات ہے جب کہ دوسرے نظام ہائے زندگی انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ انسانی ذہن جو ہمیشہ افراط و تفریط کا شکار رہتا ہے، خطا اور نسیان جس کی صفت، نقص اور کوتاہی جس کی خاصیت ہے اور ایمان کی بات یہ ہے کہ دوسرے نظام یا ازم جنھیں عہدِ جدید کے مسائل کے حل کا دعوٰی ہے ناقص اور نامکمّل ہیں۔ ان کا دائرۂ عمل زندگی کے کسی ایک شعبے یا چند شعبوں تک محدود ہے۔ اس کے برعکس اسلام مکمل نظامِ زندگی اور جامع دستورِ حیات ہے انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ وہ انسانی زندگی کو ایک اکائی سمجھتا ہے۔ جب کہ دوسرے نظام افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ جب کہ اسلام ہر مسئلے میں اعتدال اور توازن کی راہ پسند کرتا ہے۔ خیر الامور اوسطہا اس کا اصل الاصول ہے۔ وہ اپنے اوامر و نواہی قواعد اور قوانین میں انسانی فطرت کو ملحوظ رکھتا ہے۔ فطرۃ اللہ التی فطر النّاس علیہا۔

رہے دوسرے آسمانی مذاہب سو ان کو مقابلہ پر لانے کا سوال اس لیے نہیں پیدا ہوتا کہ ان کی صحیح اور سچّی باتوں کو اسلام خود تسلیم کرتا ہے اور وہ سب کی سب اسلام میں زیادہ صحت و کمال کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی اصلی تعلیمات اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی تضاد اور اختلاف نہیں۔ اسلام کوئی نیا دین ہونے کا مدعی نہیں وہ ان تمام مذاہبِ آسمانی کا جامع اور ناسخ ہے جن کا سلسلہ

پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے۔ نبی آخر الزماں جو دین لے کر آئے وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل تھا۔ اس لیے نہ اگلے مذاہب کو باقی رکھنے کی ضرورت رہی، نہ ہی یہ ضرورت رہی کہ آئندہ کوئی اور دین آئے۔ آنحضرت صلعم جو پیغام لائے اب وہ رہتی دنیا تک اہل دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے، زندگی کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمانہ اپنے اوپر کتنے ہی رنگ چڑھائے، تہذیب و تمدن کا کارواں کتنی ہی منزلیں آگے بڑھ جائے۔ انسان علم و اکتشاف سائنس اور ٹیکنالوجی کے کتنے ہی معرکے سر کر لے اسلام کی قندیل رحمانی انسانیت کو اس کے سفر ارتقا میں راستہ دکھاتی رہے گی اور اس کی روشنی میں انسان اسی طرح اپنے مسائل حل کرتا رہے گا جس طرح کہ چودہ سو سال پہلے کیا تھا۔ اسلام کسی انسان کا ایجاد کیا ہوا فیشن تو نہیں جو کچھ دنوں بعد پرانا ہو کر بیکار ہو جاتا ہے' وہ ایک حکیم و خبیر خدائے لم یزل و لایزال کا مرتب کردہ آخری جامع اور مکمل دستورِ حیات ہے جس کا مقصد ہی بندوں کی ہدایت و رہنمائی ہے، اگر وہ انسانی مسائل حل نہیں کرے گا تو کیا عہدِ جدید کے وہ ازم حل کریں گے جو چند برخود غلط گم کردہ راہ انسانوں کی خود غرضانہ خواہشات یا ردِ عمل کے منفی رجحانات کا نتیجہ ہیں۔

اب ہمیں مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ عہدِ جدید کے وہ خاص خاص مسائل کیا ہیں جنھیں حل کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اسلام ان مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے اور آج کے نام نہاد "ازم" ان کو کس طرح حل کرنا چاہتے ہیں۔ آج انسانیت کو جن سنگین مسائل کا سامنا ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ خود اس کی بقا اور سلامتی کا ہے۔ اس وقت پوری انسانیت آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ دنیا کا گوشہ گوشہ شر و فساد سے بھر چکا ہے۔ قریب ہے کہ انسان اپنی ہی جلائی ہوئی آگ میں جل کر بھسم ہو جائے۔ ہلاکت اور تباہی کے مہیب تاریک سائے ہر سُو بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ وسائلِ حیات کا بڑا حصہ جو انسان کے لیے بہتر زندگی کا سامان فراہم کرنے کی ضمانت ہوتا وہ آج دنیا کو جہنم میں تبدیل کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ بظاہر امن کی باتیں کرنے والے بباطن جنگ اور کشت و خون کے نقیب ہیں۔ انسان، انسان کا دشمن ہے۔ نفرت، حقارت، تعصب اور تنگ نظری نے انسانیت کی ردا کو تار تار کر دیا ہے۔ دُنیا جسے اخوت، محبت اور بھائی چارے اور باہمی ہمدردی کا چمن زار ہونا چاہیئے تھا وہ آج بغض و عناد، ظلم و ناانصافی، بے رحمی اور برادرکُشی کا گہوارہ بن چکی ہے۔ انسان جسے زندگی سے پیار ہونا چاہیئے تھا وہ زندگی سے بیزار خود زندگی کا گلا گھونٹنے کے درپے ہے۔ یہ صورتِ حال سب کے لیے پریشان کُن ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، چھوٹی ریاستیں ہوں یا بڑے ممالک، اِس برِاعظم کے رہنے والے ہوں یا اُس برِاعظم کے۔ ان کا تعلق ایک بلاک سے ہو یا دوسرے بلاک سے، یہ ایک عالمی اور ہمہ گیر مسئلہ ہے۔ اس وقت پوری انسانیت معرضِ خطر میں ہے۔ انسان نے تہذیب و تمدن اور اسبابِ زیست کی ترقی کے ساتھ خوشگوار زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ اس کی کوشش کے جو ہولناک نتائج سامنے ہیں وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ معلوم نہ تھا کہ اٹوپیا کی جستجو میں وہ جہنم کے دروازے پر پہنچ جائے گا۔ وہ ماحول کی پُرہول تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف آنا چاہتا ہے مگر اس کی کوشش اس لیے کارگر نہیں ہوتی کہ رشتہ کار کا وہ سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ جس کے بغیر تدبیر اُلٹے نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس کی کوشش کی مثال دلدل میں پھنسے ہوئے اُس آدمی کی ہے جو محض اپنی طاقت کے بل پر باہر آنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے آدمی کا انجام ہلاکت ہے۔ اس حالت سے نکلنے کا

صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی ترک کر کے معبودِ حقیقی کی بندگی قبول کرلے کہ یہی سلامتی کا واحد راستہ ہے۔ باقی جتنے راستے ہیں ان میں ہلاکت ہے، خرابی ہے تباہی ہے، بربادی ہے۔ پکارنے والا آج بھی پکار رہا ہے یآ ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ اسلام کا راستہ اطاعت اور اس کی منزل سلامتی ہے۔ عہدِ جدید کے اس بنیادی مسئلے کے حل کے لیے آنحضرت صلعم کا پیغام ہے ادخلوا فی السلم کآفۃ سب کے سب پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اس آواز پر لبیک کہنے کی دیر ہے۔ یہی دُنیا جو آج جہنم کا نمونہ بنتی جارہی ہے، جلد ہی رشکِ ارم بن جائے گی۔

عہدِ جدید کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ نسل، رنگ، زبان اور وطن کے امتیازات کا ہے جن کی بنیاد پر خلقِ خدا اقوام میں بٹ کر باہم برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ اسلام ان امتیازات کو مٹا کر تمام بنی نوعِ انسان کو ایک وحدت کی لڑی میں پروتا ہے اور ان تمام دیواروں کو گرا دینا چاہتا ہے جو انسان اور انسان کے درمیان تفریق و تقسیم کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہیں۔ یہاں نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ گورے کو کالے پر۔ اس کے نزدیک معیارِ فضیلت اگر کوئی چیز ہے تو دین و تقویٰ شرافت اور اخلاق ہے۔ انا خلقنا کم من ذکرٍ و انثیٰ وجعلنا کم شعوبًا وقبآئل لتعارفوا اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اسلام صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ قطع تعلق کی۔ وہ کہتا ہے کہ انسان سب کے سب ایک خدا کی مخلوق اور ایک آدم و حوّا کی اولاد ہیں اس لیے بعض فطری امتیازات کی بنیاد پر تفریق و تقسیم کی مصنوعی حد بندیاں قائم کر کے اپنے گرد گروہی اور جماعتی مفاد پرستی کا حصار کھینچنا فساد فی الارض کے مترادف ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ واللہ لایحب الفساد۔

موجودہ دور میں سیاسی کشمکش کی جتنی صورتیں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب دین سے دُوری کا نتیجہ ہیں۔ اس دور کی سیاسی کش مکش نے انسانی زندگی پر جو بُرے اثرات ڈالے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج ممالک اور اقوام ہی نہیں قبائل اور خاندانوں سے گذر کر گھر گھر اس کے تباہ کن اثرات پھیل چکے ہیں اسلام میں سیاست کا مفہوم کچھ اور ہے اور عہدِ حاضر کے مادہ پرستانہ نظریات کے زیرِ اثر فروغ پانے والے تصوراتِ سیاست کچھ اور ہیں۔ اسلام میں سیاست کی بنیاد خدمتِ خلق، ایثار اور انسانیت کی بھلائی پر ہے جب کہ دوسرے نظام عیاری، مکاری، خود غرضی، مفاد پرستی اور استحصال کو سیاست کا نام دیتے ہیں۔ دنیا میں جب تک اسلامی تصورِ سیاست کی کارفرمائی رہی، دنیا نے عفو و درگذر فلاح و بہبودِ عامہ کے وہ مناظر دیکھے کہ شاید و باید جب سے دنیا میں غیر اسلامی تصورِ سیاست کو فروغ ہوا ہے باہمی منافرت، جوشِ انتقام، لُوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے۔ دین سے جُدا ہو کر سیاست نے چنگیزی کی صورت اختیار کرلی ہے جس کی تباہ کاریاں دیکھ کر دُنیا پناہ مانگتی ہے۔ آنحضور صلعم نے جو دستورِ حیات اور نظامِ زندگی ہمیں دیا ہے اس میں انسانی زندگی کا کوئی جُز اپنے کل سے الگ نہیں رہ سکتا اور اس نظام میں سیاست چونکہ دین کے تابع رہتی ہے اس لیے بے راہروی کا شکار نہیں ہونے پاتی۔ اسلام میں سیاست بھی اسی طرح اصلاح اور اشاعتِ خیر کا ذریعہ ہے جس طرح کہ عبادات و اخلاق۔ آنحضرت صلعم نے جس قسم کی سیاست کو رواج دیا اس کے زیرِ اثر قائم ہونے والی ریاست میں بلا امتیاز و تفریق مسلم اور غیر مسلم سب کے لیے امن اور سلامتی کی ضمانت ہے۔

کردار کی پستی اور اخلاقی گراوٹ بذاتِ خود عہدِ جدید کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے جو دوسرے معاشرتی معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور ان مسائل نے زندگی میں جو الجھنیں پیدا کی ہیں، ان کا ذکر یہاں اس لیے غیر ضروری ہے کہ ان سے ہر کہہ ومہ واقف ہے۔ اخلاق انسانیت کا زیور اور سماج کی زینت ہی نہیں بلکہ اس کی حیثیت جسدِ زندگی میں قلب کی ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور اگر وہ ٹھیک رہے تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا کے دساتیرِ حیات میں اخلاقی تعلیم و تربیت کا کوئی باب نہیں اور اگر اس نام کی کوئی چیز کہیں ہے تو اس کا مسمّیٰ کچھ اور ہے۔ ان کا اخلاق اغراض و مصالح کے تابع ہوتا ہے۔ مجرّد اخلاق کا ان کے ہاں کوئی تصوّر نہیں۔ اخلاق کو ایک مقصود بالذات کی حیثیت سے کسی دنیوی نظام نے اپنے اندر جگہ نہیں دی۔ یہ صرف آسمانی مذہب ہیں جس کی تکمیلی شکل آنحضرت صلعم کا پیغام دینِ اسلام ہے ایک مستقل حیثیت سے موجود ہے۔ قرآنِ مجید کا ایک حصہ اخلاقِ عالیہ کے ذکر و بیان پر مشتمل ہے۔ آنحضرت صلعم نے ایک حدیث میں اخلاقِ عالیہ کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ آپ نے فرمایا بعثت لا تمم مکارم الاخلاق میں اچھے اخلاق انسانی کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اسلام حُسنِ اخلاق اور حُسنِ سیرت کو زندگی کی اساس قرار دیتا ہے۔ جس نظام کی بنیاد ہی اخلاقی قدروں پر ہو اس کے مطابق قائم ہونے والا معاشرہ بنی نوعِ انسان کے لیے رحمت ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرے مسائل کی طرح اس دَور کے معاشی مسائل بھی بے خدا نظریۂ حیات، بے دین تصوّرِ سیاست اور مادہ پرستانہ نظامِ معیشت کے زائیدہ و پروردہ ہیں۔ اس وقت دو معاشی نظام ہیں جنھوں نے پوری دُنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کہنے کو یہ اس دور کے معاشی نظریئے ہیں لیکن حقیقت میں یہ معاشی چکّر ہیں جنھوں نے مل کر خلقِ خدا کو مبتلائے رنج و محن کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے معاشی مسئلے کا حل ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ خود مسئلے ہیں، جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے دوسرے مسائل کی طرح معاش کے مسئلے کا حل بھی اسلام ہی ہے۔ اسلام معاش و معاد کے امتزاج اور دین و دُنیا کی ترکیب سے ایک ایسا متوازن صالح اور پاکیزہ نظامِ معاشرت قائم کرتا ہے جس میں نہ سرمایہ داری فروغ پا سکتی ہے، نہ اشتراکیت پروان چڑھ سکتی ہے۔

اسلام میں سرمایہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام کے اقتصادی اصول سرمایہ داری کو پنپنے نہیں دیتے۔ اسلام سب سے پہلے تو دولت کمانے کے ذرائع پر پابندی عاید کرتا ہے۔ حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی تمیز قائم کر کے آمدنی کے ان تمام طریقوں کو روک دیتا ہے جن کے ذریعے ایک آدمی بلا محنت مشقت کیے بے حساب دولت کما سکتا ہے۔ سُودی کاروبار جو سرمایہ دارانہ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے اپنی جملہ اقسام کے ساتھ اسلام میں حرام ہے، جوئے سٹّے کی ممانعت ہے، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، استحصال اور منافع خوری، ناپ تول میں کمی کرنا، یہ اور اس قسم کی وہ تمام باتیں اسلام میں ناجائز ہیں جن کے باعث عام لوگ معاشی تنگی میں مبتلا ہوں اور ایک مخصوص طبقہ اُن سے فائدہ اُٹھا کر اپنی دولت بڑھائے۔ اس کے بعد اسلام جائز اور حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کے ساتھ بھی ایسی بہت سی قیدیں لگا دیتا ہے کہ معاشی خوشحالی چند آدمیوں کا مقسوم نہ رہے، سوسائٹی کے دوسرے طبقات اور افراد کو بھی اس میں سے باقاعدہ حصّہ ملتا رہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کا پورا نظام اسی مقصد کی تکمیل کے لیے

قائم کیا ہے، جو اغنیا سے وصول کر کے غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس انتظام کے تحت اسلامی معاشرہ میں ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات فراہم کی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ فرض ہے لیکن اس کے علاوہ بھی خیرات، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دے کر اسلام اپنے متبعین کو رضاکارانہ خرچ کرنے اور اپنے بھائیوں کی مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق رکھا گیا ہے۔ وفی اموالھم حق للسائل والمحروم اسلام ارتکاز دولت کے خلاف ہے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دولت چند ہاتھوں میں گردش کرتی رہے اور باقی لوگ اس کے فیض سے محروم رہیں کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء (۵۹:۷)
اسلام میں تقسیم وراثت کے احکام بھی اسی مصلحت کے تابع ہیں۔

اسلام جبر کا قائل نہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختار پیدا کیا ہے اور مختار ہی رہنے دینا چاہتا ہے۔ اسلام جبر کر کے اس کا یہ حق سلب نہیں کرنا چاہتا۔ مذہب تک کے معاملے میں وہ جبر کا روادار نہیں تو کسی کی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو وہ کس طرح جبراً چھین سکتا ہے، لیکن زر اندوزی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ سونا چاندی جمع کرنے والوں کے لیے سخت وعید ہے۔ الذین یکنزون الذھب والفضۃ فبشرھم بعذاب الیم۔ وہ شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جو پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سو رہے۔ غلاموں کو اور دیگر متعلقین کو حسب مقدرت اچھا کھانا کپڑا مہیا کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ حب مال اور بخل کی مذمت کرتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشرہ میں انتہا درجہ کی معاشی ناہمواری راہ نہ پائے اور عام خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو۔ اسلام ان اقتصادی اصولوں کی بنیاد پر ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ یہ تجربہ کامیاب نہ ہو۔

اسلام کے اقتصادی نظام کے نفاذ کے بعد سرمایہ داری خود بخود ختم ہو جائے گی اور سرمایہ داری کا خاتمہ اشتراکیت کی طبعی موت ہوگی۔ اشتراکیت سرمایہ داری کا ردِ عمل ہے۔ سرمایہ داری نہ ہوتی تو آج اشتراکیت کا وجود بھی نہ ہوتا۔ انتہا کا ردِ عمل ہمیشہ انتہا ہوتا ہے۔ ایک انتہا سرمایہ داری ہے تو دوسری انتہا اشتراکیت۔ اشتراکیت انسان کو روٹی کے چند ٹکڑے دے کر اس سے ہر وہ چیز چھین لیتی ہے جو بحیثیت انسان اس کا فطری حق اور مابہ الامتیاز ہے اور سرمایہ داری اسے بے لگام چھوڑ دیتی ہے کہ وہ ابنائے جنس کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔ انسان کے معاشی مسئلے کا حل نہ تو سرمایہ داری کے پاس ہے نہ اشتراکیت کے پاس۔ اشتراکیت کے پاس لے دے کر ایک نعرہ معاشی مساوات کا ہے، لیکن معاشی مساوات کا وہ تصور جو اشتراکیت پیش کرتی ہے ناقابلِ عمل، جبری اور غیر فطری ہے اس لیے معاشرت اور معیشت کے حق میں بحیثیتِ مجموعی اس کے نقصانات زیادہ اور فائدے کم ہیں۔ اشتراکیت جس معاشی مساوات کی تبلیغ کرتی ہے وہ اس عالم کا عنقا ہے۔ خود کمیونسٹ معاشرہ اس کے وجود سے خالی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں معاشی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ مسائل انتہا درجے کی معاشی ناہمواری نے پیدا کیے ہیں۔ لیکن معاشی مسئلے کو آج کل جتنی اہمیت دی جا رہی ہے اُسے دیکھ کر کبھی کبھی یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ انسان انسان نہیں کوئی معاشی حیوان ہے جس کا مقصدِ تخلیق شکم پری کے سوا کچھ نہیں۔ بیشک پیٹ انسان کے ساتھ ہے مگر انسان پیٹ کا نام نہیں۔ اسلام انسان کے معاشی مسئلے کو نظر انداز نہیں کرتا مگر اتنی اہمیت بھی نہیں دیتا کہ دوسرے مسائل جو زیادہ اہم ہیں نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ آنحضرت صلعم کے پیغام کا مابہ الامتیاز یہی ہے کہ آپ نے انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کر کے اس کے مسائل کا حل تجویز کیا ہے۔

اسلام کا بنیادی فلسفہ

شبیر احمد

اسلام کا بنیادی فلسفہ "کائناتی نصب العینیت" ہے۔

اسلام میکانکیت کا قائل نہیں، جس کی رُو سے تمام واقعات وحوادث بشمول انسانی افعال کے ایک لامتناہی سلسلۂ علل ومعلومات کے ناقابلِ شکست جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کائنات کو "نصب العینی" زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے مطابق دنیا کے تمام واقعات انسانی اعمال ہوں یا مظاہر کائنات، کسی نہ کسی مقصد کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس اندازِ فکر کا اساسی تصور "ربوبیت" ہے، جس کا فیصلہ ہے کہ عالم ایک حکیم وعلیم، قادر و قدیر اور رحمٰن و رحیم ہستی کی صنعت گری ہے جس نے کائنات کو کسی بلند تر مقصد کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں غلط نظریوں کی تردید چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق برنبائے باطل نہیں ہوئی:

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلا
ذٰلك ظن الذین کفروا فویل للذین
کفروا من النار۔ (ص - ۲۷)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جوکچھ ان کے درمیان ہے بیکار نہیں بنائے، یہ کافروں کا گمان ہے، تو کافروں کی خرابی ہے آگ سے۔

کائنات کی تخلیق باطل کا ڈھکوسلا ان کجرو دماغوں کا تراشا ہُوا ہے، جو اپنی عیش کوشی کے لیے آخرت کی جوابدہی اس جواب دہی سے ڈرانے والوں اور ان ڈرانے والوں کے بھیجنے والے کو جھٹلاتے ہیں۔ مگر یہ اتنی پائدار حقیقت ہے کہ اس کے جھٹلانے کی سزا جہنم ہے۔ کیونکہ اس ٹھوس اور سنگین حقیقت تک ملکوت ارض وسماوات میں سنجیدہ اور دیانت دارانہ تفکر کے بعد فکر صالح کو جلد یا بدیر پہنچنا ناگزیر ہے۔ قرآن کہتا ہے:

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف
الیل والنهار لاٰیات الاولی الالباب
الذین یذکرون اللّٰه قیامًا وقعودًا وعلٰی
جنوبهم ویتفکرون فی خلق السمٰوٰت و
الارض ربنا ما خلقت هٰذا باطلا سبحٰنك
فقنا عذاب النار۔
(آل عمران ۱۹۰ - ۱۹۱)

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش رات اور دن کی باہم تبدیلیوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے۔ جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پہ لیٹے، اور آسمانوں اور زمین میں غور کرتے ہیں اور (کہتے ہیں) اے رب ہمارے! تُو نے یہ بیکار نہیں بنایا (بلکہ اپنی معرفت کی دلیل بنایا ہے) پاکی ہے تجھے، پس تو ہمیں دوزخ سے بچالے۔

اسی طرح قرآنی تعلیمات کے رُو سے تخلیقِ کائنات عبث و بیکار نہیں ہوئی۔ قرآن کہتا ہے :

افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون ۔ فتعالی اللہ الملک الحق ط لا الٰہ الا ھو رب العرش الکریم۔ (مومنون ۱۱۵ ، ۱۱۶)

توکیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمھیں بیکار بنایا اور تمھیں ہماری طرف پھرنا نہیں، تو بہت بلندی والا ہے اللہ سچا، بادشاہ، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، عزت والے عرش کا مالک ہے۔

اور نہ ہی تخلیق کائنات کے لہو و لعب کا نتیجہ ہے، جیسا کہ مشرک اقوام کا عقیدہ تھا۔ ان کے مذہبی پروہتوں نے حکمران طبقہ کی مطلق العنانی اور فحاشی و عیاشی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دیومالا گھڑی تھی کہ خدا نے اوّلین ایک دیوی کے ساتھ کھیل کھیلا، جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہوئی، اور اس اولاد نے بھی، جنھیں یہ مذہبی پروہت اور قومی بھاٹ فوق الانسانی صفات سے متصف کرتے تھے، اسی طرح کے کھیل کھیلے۔ اس طرح دیوی دیوتاؤں کی ایک فوق الفطری دنیا (PANTHEON) آباد ہوگئی۔ انھیں دیوی دیوتاؤں کی اولاد ہونے کے دعویدار یہ جابرہ روزگار تھے، جو کہتے تھے کہ ان کے تجبر و عظمت کا راز اور ان کے حقِ خداداد سلطنت کی سند ان کے اندر سرولایت کا ظہور ہے اور چونکہ ان کے دیوی دیوتا آباواجداد ہر قسم کی رنگ رلیاں منایا کرتے تھے، لہٰذا انھیں بھی اس عیش کوشی کا حق ہے۔ یونانیوں کی دیومالا اسی خرافات سے بھری ہوئی ہے اور ان کا اسطوری دیولوک اسی قسم کے دیوتاؤں سے آباد ہے، جو شرمناک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ چنانچہ قدیم یونانی فلسفی زنوفینز ہومر (HOMER) اور دُوسرے شاعروں کی اس خرافات کو بے نقاب کرتے ہوئے کہتا ہے :

"لوگ ہومر اور ہزیوڈ کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خدا انھیں کی طرح پیدا ہوئے ہیں اور انھیں کی طرح حس، آواز اور جسم رکھتے ہیں اور خداؤں کو ایسی تمام صفات سے متصف کرتے ہیں، جو خود ان کے لیے باعثِ شرم و ذلت ہیں۔ مثلاً چوری، زنا، جھوٹ وغیرہ۔" (تاریخ فلسفہ۔ ویبر صہ ۱۵)

لیکن اسلام اس اسطوری نظریۂ کائنات پر جو تھیوکریسی، شہنشاہیت و ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام کی اصل ہے، ضرب کاری لگاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :

وما خلقنا السمآء و الارض وما بینھما لٰعبین ، لو اردنا ان نتخذ لھواً لاتخذناہ من لدنا ان کنا فٰعلین ، بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق و لکم

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیل کُود میں نہیں بنائے (بلکہ اس میں ہماری حکمتیں ہیں کہ بندوں کو ہماری معرفت ہو) اگر ہم کوئی بہلاوا ہی اختیار کرنا چاہتے (مثل زن و فرزند کے جیسا کہ مشرکین کہتے تھے) تو اپنے پاس سے اختیار کرتے، اگر ہمیں کرنا ہوتا

الویل ممّا تصفون۔ (انبیا ۱۶-۱۸)

(کیونکہ زن و مرد والے انھیں اپنے پاس رکھتے ہیں، مگر ہم اس سے پاک ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہی نہیں) بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں، تو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے تو جبھی وُہ مٹ کر رہ جاتا ہے اور تمہاری خرابی ہے (اے مشرکو) ان باتوں سے جو تم بناتے ہو اور ہیں رنگ رلیوں اور زن و مرد کے جھمیلے سے متصف کرتے ہو۔

اسلام کا اصولی نظریہ

اس بے مقصدی تخلیق کائنات کے عقیدے کے برعکس اسلام کائناتی نصب العینیت کا علمبردار ہے۔ اس کی تعلیم کی رُو سے کائنات کی تخلیق حق حکمت کے ساتھ ہوئی ہے، قرآن کہتا ہے:

وماخلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما اِلّا بالحق وان الساعة اٰتیة۔ (حجر-۸۵)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عبث نہ بنایا۔ اور بے شک قیامت آنے والی ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ:

خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض بالحق ان فی ذالك لاٰیة للمؤمنین۔ (عنکبوت ۴۴)

اللہ نے آسمان اور زمین حق بنائے۔ بیشک ان میں نشانی ہے (اس کی قدرت وحکمت اور اس کی توحید و یکتائی پر دلالت کرنے والی) اہل ایمان کے لیے۔

لہٰذا اسلامی تعلیم کی رُو سے انسان کو بصیرت مادے کا بے مقصدی مظہر نہیں ہے، بلکہ خلاقِ کائنات نے اُسے ایک بلند مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، جس میں کامیابی و ناکامی کی جواب دہی کے لیے اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون۔

غرض اسلام کے نزدیک یہ کائنات اور انسان کی زندگی بخت و اتفاق (CHANCE) کا نتیجہ نہیں ہے، نہ مادے کے بے مقصدی (FORTUTIOUS) ارتقا کا عارضی مظہر (EPIPHENOMENON) ہیں، جو میکانکی قوتوں کے ایک بے مقصد عمل ویگر سے ختم ہو جائیں، بلکہ ان کی ایک بلند تر غرض و غایت اور ایک پاکیزہ تر نصب العین ہے، جس کے لیے خلاقِ کائنات نے انھیں پیدا کیا ہے۔ اس کی حکمتِ بالغہ نے کائنات کے مختلف حصص و اجزا میں ایک فوق الفکری نظم و ارتباط ودیعت

فرمایا ہے۔ کائنات کے مختلف حصے ایک منظم و مربوط کل کے اجزا ہیں، جو کچھ ظہور میں آتا ہے، ایک مقصد کلی کے تحقق کا جزو ہوتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق انسانی اعمال بھی سعیِ لاحاصل کا مصداق نہیں۔ انسان کی مساعی صرف اس چند روزہ دنیوی زندگی تک محدود نہیں، بلکہ اس کا منشائے تخلیق و وظیفۂ حیات ایک بلند تر مقصد کا حامل ہے، جو عبودیت و عرفانِ الٰہی کا مترادف ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (ذاریات ۵۶)

اس کے ساتھ اگر کائنات میں توافق و ہم آہنگی ہے۔ اگر ہر شے کے نمو اور فروغ کے لیے ایک سلسلہ انتظامات ہے۔ اگر آنکھ کی حفاظت کے لیے اس کی مخصوص ساخت، پپوٹے، پلک اور بھنویں بنائی گئی ہیں تاکہ آنکھ اپنے مخصوص وظیفہ کو باحسن وجوہ انجام دے سکے، تو یہ بھی ہونا یقیناً ضروری ہے کہ انسان جو صنعِ خداوندی کا شاہکار ہے اور جسے بلند تر وظیفہ ادا کرنا ہے، ایسا بلند تر فریضہ جو منشائے تخلیقِ کائنات ہے، تو اس کے لیے بھی اپنے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی مناسب انتظام درکار ہے۔ اس کی ہدایت کے واسطے بھی ایک ربانی ضابطۂ عمل کی ضرورت ہے اور اگر یہ صحیح ہے کہ کائنات کا کوئی جز محض "تجربہ و خطا" (TRIAL AND ERROR) کے اصول کا نتیجہ نہیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کو عمل کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی ہدایت کے لیے بھی ایک ربانی ضابطۂ عمل اور اس کا فوق البشری ابلاغ ضروری ہے۔

پس "کائناتی نصب العینیت" اور عقیدۂ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ پروردگارِ عالم نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے ایک ضابطۂ الٰہی، ایک صراطِ مستقیم، ایک ہدایت نامۂ ربانی بھی نازل کیا ہو، تاکہ اس ضابطہ کے مطابق عمل کر کے اور اس شاہراہِ ہدایت پر چل کر انسان فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔

یہ ہے کائناتی نصب العینیت کا ماحصل، جس کا اسلام سرگرم مبلغ ہے۔ بلکہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اسلام ہی دنیا میں کائناتی نصب العینیت کا واحد بلا شرکتِ غیرے علمبردار ہے۔ نام کے لیے تو بہت سے فکری نظام بالخصوص مذاہب و ادیان نصب العینیت کے مدعی رہے ہیں۔ مگر وہ اس کے مقتضیات کی کماحقہٗ مراعات نہیں کر سکے۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

نصب العینی اندازِ فکر کے بنیادی اجزا

خالق کے افعال ہوں یا مخلوق کے اعمال، انفس و آفاق ہر جگہ نصب العینی اندازِ فکر میں تین اساسی تصورات مضمر رہتے ہیں:

۱۔ ایک فاعل مختار کا تصور، جس نے اس فعل کا ارادہ کیا ہو،

۲۔ اس مقصد و نصب العین کا تصور، جس کے لیے وہ ارادہ کیا گیا ہو۔

۳۔ اس طریقِ کار کا تصور، جس کے ذریعے وہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے کائناتی نصب العینیت کے مقتضیات ثلٰثہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خلاقِ کائنات کا تصور، جس نے کائنات کو بشمول اس کی جملہ تفصیلات کے خلق فرمایا۔
۲۔ اس مقصد کا تصور، جس کے لیے یہ کائنات اور اس کے شاہکار انسان کی تخلیق ظہور میں آئی ہے۔
۳۔ اس طریق کار اور ضابطۂ عمل کا تصور، جس کے مطابق عمل کر کے انسان مقصدِ تخلیق کے تحقق میں فائز المرام ہو سکتا ہے۔

اسلام کی اصطلاح میں:

پہلا اصول "ایمان باللہ" کہلاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے پر ایمان، اس کی وحدانیت پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ وہ تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف اور تمام اقسامِ نقص سے پاک و منزہ ہے۔

دوسرا اصول "ایمان بالآخرۃ" کہلاتا ہے، یعنی اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو عموماً اور انسان کو خصوصاً عبث و باطل پیدا نہیں کیا، بلکہ ایک بلند تر مقصد کے تحقق کی خاطر پیدا کیا ہے اور اس بلند تر مقصدِ تخلیق کے حصول و تحقق میں کامیابی و ناکامی کی جواب دہی کے لیے انسان کو مرے پیچھے جی اُٹھنا اور اپنے رب کے سامنے اپنے اچھے بُرے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اور

تیسرا اصول "ایمان بالرسالۃ" کہلاتا ہے، یعنی اس بات پر ایمان کہ اللہ رب العزت نے محض اپنے لطف و کرم سے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے (جنھیں اسلام کی اصطلاح میں رسول کہتے ہیں) صحیفۂ ہدایت اتارے، تاکہ وُہ اپنی حیاتِ دنیوی اور آنے والی زندگی کو کامیاب بنا سکیں اور یہ کہ ان رسولوں میں آخری رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقائد

پہلا اصول کلمۂ توحید کا، جو اسلام کی بنیادی تعلیم ہے، نصف اول ہے۔ یعنی:

لا الٰہ الا اللہ۔ — اللہ رب العزت کے سوا کوئی معبود نہیں، صرف وہی معبودِ برحق ہے۔

دوسرا اور تیسرا اصول (ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالۃ) اس (کلمۂ توحید) کا نصف آخر ہیں۔ یعنی:

محمد رسول اللہ۔ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ لہٰذا انھوں نے جو کچھ (بالخصوص آخرت کے بارے میں) فرمایا، حق ہے اور جو ہدایت فرمائی، واجب العمل ہے۔

اس طرح اسلام اور کائناتی نصب العینیت عین یک دیگر ہیں۔

نصب العینیت کی غیر اسلامی توجیہات پر ایک نظر

اوپر کہا گیا ہے کہ اسلام ہی دنیا میں کائناتی نصب العینیت کا واحد بلا شرکتِ غیرے علمبردار ہے (اگرچہ نام کے لیے بہت سے فکری نظام اس کے مدعی ہیں، اور کیوں نہ ہوں کہ یہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کا مقتضا اور کائنات کی ناقابلِ انکار حقیقت ہے) مگر وہ اس کے مضمراتِ ثلثہ کے ساتھ خود کو راضی نہ کر سکے، بالخصوص اس کا تیسرا اصول (ایمان

بالآخرۃ) انھیں حریتِ فکر و عمل یا طبیعت کی مطلق العنانی میں سدِّ راہ نظر آیا۔ اس لیے اُنھوں نے اس کا سرے سے ہی انکار کر دیا اور چونکہ فطرت کے یہ تین حقایق آپس میں اس طرح مربوط و منظوم ہیں کہ ایک کا انکار بقیہ دو کے انکار کے بغیر منطقی طور پر ناممکن ہے، اُدھر نفس نصب العینیت سے انکار کی عقلِ سلیم اجازت نہیں دے سکتی۔ اس لیے اس اقرار و انکار میں اُلٹے پُلٹے سمجھوتے کے لیے مختلف ڈھکوسلے تراشے گئے۔ اس کی مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

جہاں تک "ایمان بالغیب" اور محض اقرارِ عبودیت کا تعلق ہے، مسئلہ بالکل صاف ہے اور سوائے ڈھٹائی کے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی فطرت سلیمہ سے پُوچھیے بلا تامل اللہ رب العزت کی معبودیت کا اقرار کرے گی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

ولئن سالتھم من خلق السمٰوٰت والارض	اگر آپ ان سے پُوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے
لیقولن خلقھن العزیز العلیم۔	بنائے، تو ضرور کہیں گے انھیں بنایا اس عزت والے
(زخرف ۹)	علم والے نے۔

اسی طرح "ایمان بالرسالۃ" کا مسئلہ بھی پیچیدہ نہیں ہے۔ معاملہ صرف ایک دستورِ حیات کے نفاذ کا ہے، جو جلد یا بدیر طے ہو سکتا ہے۔ مگر اصل پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی تھی کہ انبیائے کرام فرماتے تھے کہ بندوں کو مرے پیچھے دوبارہ زندہ ہو کر اُٹھنا اور اپنے اچھے بُرے کا بارگاہِ رب العزت میں جواب دینا ہے۔ اس "ایمان بالآخرت" کے عقیدے کے ساتھ دنیا پرست مترفین خود کو راضی نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ محاسبۂ آخرت کا عقیدہ عناں گسیختہ لذت کوشی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا ہے۔ آدمی صرف اسی صورت میں دل کھول کر دادِ عیش دے سکتا ہے کہ اس کے دل میں حشر و نشر اور حساب آخرت کا دغدغہ نہ ہو۔ ع

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسی لیے عرب جاہلیت کی لذت پرستی نے بعث بعد الموت کے تصور کو عسیر الفہم بنا دیا تھا۔ ان کے ایک شاعر کا قول ہے: ؎

حیات ثم موت ثم نشر

حدیث خرافۃ یا ام عمرو

ساسانی عہد کے آخر میں "زروانیت" (دہریت) نے بھی انکارِ آخرت کے لیے "دہر" (یا زروان) کا ڈھکوسلا تراش لیا تھا۔ "اسکندر گمانیک وژار" میں ہے:

"جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نہیں ہے اور اپنے آپ کو دہری (زروانی) کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ دنیا اور وُہ تمام تغیرات جو اس میں رُونما ہوتے ہیں، سب زمانِ نامحدود کے ارتقا کے نتیجے ہیں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ نہ اچھے اعمال کے لیے جزا ہے اور نہ بُرے اعمال کے لیے سزا۔ نہ بہشت ہے نہ دوزخ اور نہ کوئی ایسی چیز، جو انسان کو اچھے یا بُرے کاموں پر مجبور کر سکے۔"

عہدِ حاضر نے جو اس قسم کے تناقضات کی ضخیم سائنٹیفک اور فلسفیانہ اصطلاحوں میں پردہ پوشی کرنے میں کمال رکھتا ہے فطرت کی اس حقیقت ساذجہ (نصب العینیت اور اس کے مضمرات ثلثہ) پر "تشبیہیت" (ANTHROPOMORPHISM) کا الزام لگایا۔ چونکہ معقولیت پسندی "نصب العینیت" کا کھل کر انکار نہیں کر سکتی، اس لیے اس کا ایک نیا تخیل اختراع کیا جس کی رُو سے جرمن فلسفی ونڈل بینڈ (WINDEL BAND) کے الفاظ میں:

"عضوی کل میں اجزاء کی ہیئت کا تعین خود اپنے کل کے ذریعے ہوتا ہے اور کل کے اجزا ہونے کی حیثیت سے اُن کا وجود ممکن ہے۔ غایت جو آغاز سے پیدا ہوتی ہے، خود آغاز کا تعین کرتی ہے۔"[1]

لیکن کائنات کا یہ اعجوبۂ روزگار تصور معقولیت پسند اذہان کے لیے کہاں تک قابلِ فہم ہے، اس پر تبصرہ بھی وِنڈل بینڈ ہی کی زبان سے سُن لیجیے:

"یہ بات نہ صرف ناقابلِ فہم ہی معلوم ہوتی ہے بلکہ ناممکن بھی۔"[2]

قصہ مختصر یہ کہ:

ا۔ بخت و اتفاق (CHANCE) کے عقیدے سے انسانی ذہن اِبا کرتا ہے۔

ب۔ میکانکیت کا اصول اپنی گوناگوں اشکال میں ارتقائے کائنات کی توجیہ سے قاصر ٹھہرا۔

ج۔ نصب العینیت کی نئی اعجوبۂ روزگار توجیہہ، کہ غایت اپنے آغازِ کار کی اور کل اپنے اجزاء کی ہیئت کا تعین کرتے ہیں، خود اپنے علمبردار ونڈل بینڈ کے خیال میں نہ صرف عسیر الفہم بلکہ ناممکن ہے۔

اس کے بعد سوائے منطقی "نصب العینیت" پر جس شکل میں وہ اُوپر اپنے مضمرات ثلثہ کے ساتھ بیان ہوئی، ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں، اور یہی اسلام کا موقف ہے۔

اسلامی فکر کے بنیادی اجزاء

ا۔ اسلامی فکر کا نقطۂ آغاز "ایمان بالغیب" ہے۔ اس کی تمام مساعی علمیہ و عملیہ کی غایت اسی عقیدہ کی تحقیق و توضیح ہے۔ اسلام

---

[1] "IN THE ORGANIC WHOLE, ON THE OTHER HAND, THE PARTS THEMSELVES ARE CONDITIONED BY THE WHOLE AND ARE ONLY POSSIBLE IN IT THERE FORE, THE END, WHICH IS TO COME OUT OF IT, DETERMINES THE BEGINING."
(W. WINDLEBAND, INTRODUCTION TO PHILOSOPHY, P. 144)

[2] "IT SEEMS TO BE NOT MERELY INCOMPREHENSIBLE BUT IMPOSSIBLE."
(IBID., P. 145)

کی نگاہ میں "توجہ الی المعبود" جسے آپ چاہیں تو "جذبۂ مذہبیت" یا "حسِ مذہبی" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ فطرتِ انسانی کا جزو لاینفک ہے جس پر بسا اوقات خارجی حالات کے دباؤ، تعیش کی فراوانی، افلاس کی شدت، ہوا پرستی و نفسانیت اور اسی قسم کے دوسرے عوارض کی بنا پر زنگ لگ جاتا ہے۔ اس لیے دعوتِ اسلامی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس زنگ آلودہ جذبے کو نکھار دے یا جہاں یہ جذبہ بغیر زنگ آلودہ حالت میں ہو، اسے جلا اور صیقل دے کر اس سونے کو کندن بنا دے۔

لہٰذا اسی مشن کے ساتھ انبیاء سابقین کی بعثت ظہور میں آئی۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔ (انبیاء - ۲۵)	اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہ بھیجا مگر یہ کہ ہم اس کی طرف وحی فرماتے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو مجھی کو پوجو۔

ب۔ اسلام کے نزدیک منشائے تخلیق و وظیفۂ حیات ایک بلند تر مقصد ہے، جو عبودیت و عرفانِ الٰہی کا مترادف ہے، قرآن کہتا ہے کہ کائنات و مافیہا کی تخلیق صرف انسان کے واسطے ہوئی ہے:

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا۔	وہی (اللہ) ہے، جس نے تمہارے (دینی و دنیوی نفع کے لیے) بنایا، جو کچھ زمین میں ہے۔

اور انسان کی تخلیق عبودیت و عرفانِ الٰہی کے واسطے ظہور میں آئی ہے:

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (ذاریات - ۵۶)	میں نے جن اور آدمی صرف اس لیے بنائے کہ میری بندگی کریں (اور میری معرفت ہو)

اس توحید عبودیت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسانوں کو ایک الٰہی الاصل ضابطۂ ہدایت کی ضرورت ہے، جو انھیں انبیائے کرام کے ذریعے بھیجا گیا۔ اس ضابطۂ ہدایت پر عمل فرض ہے اور اس لیے انسانوں کو ایک دن اس فریضہ کی بجا آوری یا اس میں غفلت یا اس سے بغاوت کی جوابدہی کے لیے اللہ رب العزت کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔

اسلامی آئیڈیالوجی میں اس آنے والی زندگی پہ ایمان و ایقان اور اچھے بُرے اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ ایمان بالآخرۃ کہلاتا ہے، جو اسلامی فکر کی جان ہے اور جس کے بغیر اسلام جسدِ بے روح ہے۔ قرآن زندگی کے ایسے تصور کو جو عقیدۂ آخرت سے معرا ہو، بشدت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے:

ان الذین لا یرجون لقآءنا و رضوا بالحیٰوۃ الدنیا واطمأنوا بہا والذین ھم عن ایٰتنا غافلون اولٰئك ماواھم النار بما کانوا یکسبون۔ (یونس ۷ - ۸)	بے شک وہ، جو ہمارے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے (روزِ قیامت اور ثواب و عذاب کے قائل نہیں) اور اس پر مطمئن ہو گئے (اور اس فانی کو جاودانی پر ترجیح دی اور عمر اس کی طلب میں گزار دی) اور وہ جو ہماری آیتوں سے غفلت کرتے ہیں (ذاتِ

گرامی سرورِ کائنات اور قرآن کریم سے اعراض کرتے
ہیں) ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ ان کی کمائی کا۔

اسلام کے بنیادی فلسفہ یا اس کے ہمہ گیر نظامِ حیات کا مطالعہ، مطالعہ کہلانے کا مستحق ہی نہیں جب تک اسے بعث بعد الموت اور محاسبۂ آخرت کے عقیدے کی روشنی میں نہ لیا جائے۔

ج۔ اسلام کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے محض اپنے لطف و کرم سے بندوں کی صلاح و فلاح کے واسطے ضابطۂ عمل اپنے پیغمبروں کے ذریعے نازل فرمایا۔ اس الٰہی الاصل ضابطۂ ہدایت کا آخری نزول اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، جس کا نام قرآن ہے۔

کہنے کو بہت سے مفکرین عرفانِ الٰہی اور تکمیلِ نفس کے مدعی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ عقلائے دہر اور سنجیدہ مفکرین کی مساعی فکریہ نہ صرف عرفانِ خداوندی کے باب میں بلکہ نظامِ معاشرت کی تنظیم کے لیے ایک مفید اور دیرپا ضابطہ کی دریافت کے متعلق بھی اپنے عجز و ادراک کا بزبانِ حال اعتراف کر چکی ہیں، کیونکہ ان کا افقِ ذہنی اپنے گرد و پیش ہی تک محدود ہے۔ اپنے ماحول سے بلند ہو کر وہ کسی ایسے نظام کو نہیں سوچ سکتے، جو باوصف اختلافِ اقوام و اوطان اور باوجود تغیرِ ادوار و زمان ہر جگہ اور ہر زمانے میں نافذ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے لیے وہ معذور بھی ہیں۔ ان کی حکیمانہ برتری اور فلسفیانہ عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑے گا کہ وہ آخر تو انسان ہی ہیں۔ ان کا علم کتنا ہی وسیع اور غور و فکر کتنا ہی عمیق کیوں نہ ہو، آخر تو انسان ہی ہیں جس کے ماخذ اور طریق حصول بھی انسانی ہی ہیں۔ لہٰذا وہ صرف وہی سوچ سکتے ہیں اور تجویز کر سکتے ہیں، جو انسانی بساط میں ممکن ہو سکتا ہے اور جس کے لیے ان کا محدود ماحول ان کی مساعدت کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بلند ہو کر سوچنا انسان کے لیے ناممکن ہے اور کسی ایسے معاشرے کا نظامِ حیات مرتّب کرنا، جو اس کے مخصوص گرد و پیش سے وسیع تر ہو اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہو، انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک مافوق البشری طریق کے سوا چارہ نہیں، جسے اسلام کی اصطلاح میں "وحیِ الٰہی" کہتے ہیں۔

لہٰذا اسلام نے انسان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے نیز حیاتِ دنیوی اور آنے والی زندگی کو ہم آہنگ اور متوافق بنانے اور ضمناً خالص انسانی دوستی اور منصفانہ و عادلانہ بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تنظیم استوار کرنے کے لیے انسان کی شاہراہِ عمل کا تعیّن ایک ایسے ہدایت نامہ کی بنا پر کیا، جو منجانب اللہ ہے اور جسے اس کی زبان میں نبوّت و رسالت کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے محض اپنے لطف و کرم سے اپنے بندوں کی نزاعات کے فیصلے کے لیے ایک ضابطۂ حیات اپنے رسول پر نازل فرمایا اور انھیں اس کی بے لاگ مراعاۃ پہ مامور کیا۔ قرآن کہتا ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللہ و لا تکن للخائنین خصیماً۔ (نساء - ۱۰۵)

اے رسول! بے شک ہم نے تمھاری طرف سچی کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں فیصلہ کرو، جس طرح تمھیں اللہ دکھائے اور دغا والوں کی طرف سے نہ جھگڑو۔

اس کے ساتھ بندوں کو مامور فرمایا کہ جو کچھ یہ رسول فرمائیں اسے قبول کرو اور جس سے منع فرمائیں، اس سے باز رہو:

وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ (حشر)

اور جو کچھ تمھیں رسول عطا فرمائیں، وہ لو اور جس سے منع فرمائیں، باز رہو۔

یہ ہے اسلام کا الٰہی الاصل ضابطۂ حیات جس کے ساتھ "کائناتی نصب العینیت" کے مقتضیات ثلٰثہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اسلام اور کائناتی نصب العینیت عین یکدیگر ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس الٰہی الاصل ہدایت نامہ (قرآن) کا تصور ہی اسلامی اور غیر اسلامی نظام ہائے حیات میں فارق ہے۔ اس پر عمل واجب ہے اور انسانیت کی بدنصیبی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے چھوڑ کر ہوا و ہوس کے خود ساختہ ڈھکوسلوں کی طرف نظر اٹھاتے: ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

مپندار سعدی کہ راہِ صفا — تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰؐ

رسولِ اکرمؐ کا معاشی نظام

ملک شیر محمّد خاں اعوان

جن لوگوں نے تاریخِ عالم کے انقلابات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسلام تاریخِ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ انقلاب کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے بعد کی زندگی اس سے پیشتر کی زندگی سے بنیادی طور پر مختلف ہو جائے اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اسلام نے اپنے سے قبل کی زندگی میں واضح تفاوت پیدا کر دیا ہے اسی لیے اہلِ عرب اسلام سے پیشتر کی زندگی کو زمانۂ جاہلیت سے تعبیر کرنے لگے اور پھر یہ انقلاب زندگی کے کسی ایک گوشہ میں نہیں آیا بلکہ اس کی ہمہ گیری نے زندگی کے تمام گوشوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اخلاق و معاشرت، عبادات و معاملات، تہذیب و ثقافت، سیاست و عدالت اور معیشت و معاشرت کے تمام پہلو منقلب کر دیے۔ ان پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں عظیم ترین انقلاب برپا کیا لیکن آج کی دنیا میں معاشی اور اقتصادی مسائل زندگی کے تمام پہلوؤں پر غالب آ گئے ہیں اور مفکرین نے تمام نظامہائے افکار و اخلاق اور تمام مذاہب کو اسی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا ہے کہ علم المعیشت کے متعلق ان کے اصول و قوانین کیا ہیں۔ مغرب میں مذہب کے خلاف جو بغاوت ہوئی اس کا صرف یہی سبب نہ تھا کہ مسیحیت کے تصوراتِ الوہیت لوگوں کو بے بنیاد معلوم ہونے لگے تھے بلکہ ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ اشتراکی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ عیسائیت کا کلیسائی نظام محتاج کو محتاج اور غنی کو غنی رکھنے کا معاون ہے اور وہ ناداروں کو فقط اس موہوم اطمینان کی افیون کھلاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں روٹی کو ترستے رہیں تو کوئی بات نہیں اگلی دنیا کی بادشاہت ان کا مقدر ہے اور دولت مندوں کو جنت کی ہوا تک نہیں لگنے دی جائے گی اور امیروں کا جنت میں داخل ہونا اسی طرح ناممکن ہوگا جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا ناممکن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے یہی دلائل مغرب کے دماغ میں ہلچل پیدا کرنے لگے اور انھوں نے اگر اشتراکیت قبول نہیں کی تو کم از کم مذہب بیزاری ان کا مستقل ذہنی روگ بن کر رہ گئی ہے۔

آج جبکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور محنت و سرمایہ کی آویزش نے دنیا کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے اس وقت دنیا مختلف اور متضاد نظریات و تحریکات کے سیلاب میں بہی جا رہی ہے ہر تحریک اس امر کی مدعی ہے کہ موجودہ دور کی اجتماعی مشکلات کا حل اس کے دامن میں ہے لیکن اس کھلی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج ان نظریات کی افراط میں دنیا امن و سکون سے جس قدر دُور جا پڑی ہے اور اس وقت اضطراب، بے چینی اور بدامنی کے جس قدر ہولناک طوفان اُٹھ رہے ہیں یہ سب دنیا کی تاریخ میں اس سے پیشتر کبھی نظر نہیں آئے۔ یہ سب کچھ کیوں ہے؟ جن لوگوں کی نگاہیں بین الاقوامی مسائل کا جائزہ لیتی رہتی ہیں وہ اس امر پر متفق ہیں کہ دنیا کا موجودہ ہیجان براہِ راست معاشی و اقتصادی عدمِ توازن کا نتیجہ ہے۔

جب کسی ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ چند افراد ملک کی تمام دولت اور وسائل دولت پر قابض ہو کر عیش و مسرت کی زندگی گزار رہے ہوں اور کروڑوں لوگ افلاس و تنگدستی سے دم توڑ رہے ہوں تو عوام میں لازماً ہیجان و اضطراب پیدا ہوگا۔

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم آج کے دور کا سلگتا ہُوا موضوع ہے۔ مختلف معاشی نظریات کتابوں کی زینت بن رہے ہیں مگر عملاً ہر جگہ سرمایہ داری کا دور دورہ ہے کیونکہ جو نظریات پیش کیے جاتے ہیں وہ ناقابلِ عمل ہوتے ہیں۔ آئیے ہم ان لادین نظریات کے پیچھے دوڑنے کے بجائے قابلِ عمل اور تجربہ شدہ اسلامی نظام کو اپنا کر ایک مثالی قوم بن جائیں اور اندھیرے میں بھٹکنے والی انسانیت کے لیے مینارِ نور بن کر اسے صحیح معاشی نظام سے روشناس کرائیں۔ اسلام کے معاشی نظام کے اصول صرف کتابوں میں لکھے رہنے والے ناقابلِ عمل اصول نہیں بلکہ ریگزارِ عرب ان کی تجربہ گاہ رہی ہے اور تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ جب یہ اصول بر سرِ عمل تھے تو غربت و افلاس کا خاتمہ ہو گیا تھا لوگ زکوٰۃ اٹھائے پھرتے تھے مگر لینے والا نہیں ملتا تھا۔ دنیا کا کوئی بے رحم اور متعصب مؤرخ بھی اس حقیقت کا آج تک انکار نہیں کر سکا۔

آج بھی مظلوم انسانیت کو اگر پناہ ملے گی تو اسلام کے دامن میں۔ اگر سیماب وار بے قرار دنیا کو سکون و اطمینان نصیب ہوگا تو اسلام کی چھاؤں میں۔ اگر مجروح و مضطرب سوسائٹی کی مرہم پٹی اور تسکین و تسلی ہوگی تو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارالشفاء میں کیونکہ نسخۂ شفاء ان ہی کے پاس ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (پارہ ۱۵ رکوع ۹)

"اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ

(پارہ ۱۱ رکوع ۱۱)

"اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں کی صحت۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

یہی نسخۂ شفا دل و دماغ اور نفس و روح کی تمام بیماریوں کا مجرب نسخہ ہے اور یہی نسخۂ شفا کیمیا ہے۔ ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشادِ گرامی ہے:

ان اللہ یرفع بھٰذا الکتاب اقواماً ویضع بھا آخرین۔ (صحیح مسلم)

"اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعے اقوام (عالم) کو بامِ عروج پر پہنچائے گا اور اسی قرآن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو (قعرِ مذلت میں) گرا دے گا۔"

انسانیت جب تک غیر مسلم ممالک کی راہ تکتے گی ٹھوکریں کھاتی رہے گی اسے قرار و سکون نصیب ہوگا تو مکّہ اور مدینہ کی گلیوں میں۔ اسے امن و امان ملے گا تو آقا مدنیؐ کے قدموں میں۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جُرمِ خانۂ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

(اقبالؒ)

سرورِ کائنات کے قدموں سے ہٹ کر کائنات کی حیات و ثبات ایک موہوم سی بات ہے ترجمانِ حقیقت فرماتے ہیں: ؎

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بآئینش حیات

میں پوچھتا ہوں آخر وقت کے کون سے مسائل ہیں جن کے بارے میں آج غیر مسلم ممالک کی طرف دیکھا جاتا ہے اور سوسائٹی کی راہ میں کون سی مشکلات ہیں جن کے حل کرنے کے لیے اسلام پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پستی کو بلند کرنے، گرے پڑے کو اٹھانے، مزدور کو روٹی دینے اور عوام کو خوشحال دیکھنے کا حسین تصور تو پہلی بار دنیا کے سامنے پیش ہی اسلام نے کیا ہے اسلام تو خود سب سے بڑا غریب نواز ہے اور سب سے پہلا مزدور پرور ہے۔ اگر مزدور کی حوصلہ افزائی، بھوکے کی شکم پُری اور حاجت مند کی حاجت روائی کا نام کمیونزم ہے تو یہ کمیونزم اسلام کی نقالی ہے۔ اسلام نے یہی اور عین یہی تعلیم کارل مارکس اور اینجلز سے سوا ہزار سال پیشتر نہ صرف پیش کی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اگر تقسیم دولت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی حوصلہ شکنی کا نام کمیونزم ہے تو پھر ہمارے کمیونسٹ دوستوں کو ماسکو کی بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فلسفہ پر اعتماد کرنا چاہیے جنھوں نے سب سے پہلے دنیا کو اس تعلیم سے روشناس فرمایا اور جن کا ایک ممتاز وصفی نام اجیر (مزدور) بھی ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک اقتصادی سوال ہے کہ کمیونزم اسلام کا حریف نہیں اس سلسلہ میں سوویٹ روس صحیح حریف ہے تو سرمایہ دار امریکہ اور امپیریلیسٹ برطانیہ کا۔ کمیونزم دراصل یورپ کے ظالمانہ جفاکارانہ اور امپیریلزم کے سرمایہ دارانہ، خودغرضانہ، تعیشانہ نظام کا جارحانہ ردِ عمل ہے۔ اس لیے ملوکیت اور سرمایہ داری کی مظلوم اور زخم خوردہ بھوکی پیاسی دنیا کمیونزم کے سراب کی طرف لپکے تو تعجب نہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان بھی اشتراکی نظام کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل اسلام کی صحیح رُوح اور سچی شکل و صورت سے ناآشنائی اور صحیح اسلامی نظام و معاشرہ سے عدمِ واقفیت کا افسوسناک نتیجہ ہے ورنہ سوسائٹی کے اونچ نیچ کو جس کامیابی سے اسلام نے ہموار کیا۔ کمیونزم اس کے تصور سے بھی ناآشنا ہے۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام کے اساسی عناصر کیا ہیں اور وُہ کیسا معاشی

نظام ہے جو ہمیشہ کے لیے معاشی عدل کے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حصول معیشت اور اکتساب مال بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ ایک وسیلہ ہے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کا۔ اسلام نے چونکہ انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب قرار دیا ہے اور اس حیثیت میں اس کو یہ منصب تفویض کیا ہے کہ وہ انفرادی طور پر خدا کی ذات و صفات سے قربت و مشابہت حاصل کرے اور اجتماعی حیثیت سے خدا کے قانون کو انسان کے خود ساختہ نظریات و قوانین پر بالاتر کرے اس لیے وہ معاشی اصلاح کو اس نصب العین کے حصول کا ایک ضروری وسیلہ قرار دیتا ہے اور انسان کے معاشی مسئلہ کو اسی حیثیت پر قائم رکھنا چاہتا ہے اس کو نہ کسی خاص طبقہ سے کوئی دشمنی ہے نہ وہ غریبوں کو دولت مند افراد سے رشک و حسد کرنا سکھاتا ہے اور نہ اسے بورژوا یا متوسط طبقہ سے نفرت ہے۔ وُہ معاشی اصلاح کے ذریعے دولت کو محدود ہو جانے سے روکنا ضرور ہے لیکن اس کا مقصد انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا بیدار اور قوی کر دیتا ہے کہ ہر فرد اخوت و ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو جائے اور دوسروں کے مصائب و تکالیف میں ان کی مالی اعانت کرنا اپنا دینی فرض خیال کرے نہ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں دولت سمٹ سمٹا کر ایک محدود طبقہ کے ہاتھوں میں چلی جائے بلکہ وہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد کے درمیان پھیلے اور گردش کرے اس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے :

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ (پارہ ۲۸ رکوع ۴)

"جو غنیمت دلائی اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے وہ اللہ اور رسول کی ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے کہ تمہارے اغنیا کا مال نہ ہو جائے۔"

(ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ)

آیت کے آخری جزو میں اس نے صاف طور پر فرما دیا ہے کہ وہ اجتماعی دولت کو صرف دولت مندوں کا حق نہیں سمجھتا ہے بلکہ اس کی تقسیم میں ہر طبقہ کے افراد کو شریک کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کو مٹانے کی پوری کوشش کی ہے جو دولت کو حاصل کرنے میں بڑی حریص ہے لیکن اس کے صرف کرنے میں بے حد تنگ دل ہے وُہ کہتا ہے کہ تم دولت کما سکتے ہو لیکن یہ حق نہیں رکھتے کہ اس کے انبار لگاتے رہو یا صرف اپنی راحت و آسائش پر اسے صرف کرتے رہو۔ نماز اور زکوٰۃ کے بعد کلام مجید میں شاید ہی کسی اور بات کو اتنی بار دُہرایا گیا ہو جتنا اس بات کو کہ دولت خدا کی راہ میں صرف کرتے رہنا چاہیے یہاں تک کہ ان لوگوں کو سختی سے متنبہ کیا گیا ہے جو دولت جمع کرتے ہیں لیکن خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ارشاد ہوا ہے :

وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ (پارہ ۱۰ رکوع ۱۱)

"اور وہ جو جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی۔" (ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی)

ایک اور جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسان نیکی حاصل نہیں کر سکتا ہے جب تک اپنی دولت کو راہِ خدا میں صرف نہ کرے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (پارہ ۴ رکوع ۱)

"تم ہرگز بھلائی کو نہ پہنچو گے جب تک راہِ خدا میں اپنی پیاری چیز خرچ نہ کرو۔" (ترجمہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی)

دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرنے کی غرض سے اسلام نے خاندانی نظام کو باقی رکھنا ضروری سمجھا کیونکہ خاندان انسانی زندگی اور تمدن کی ایک قدرتی اکائی ہے اور دنیا کے تمام خارجی نظامات میں سب سے زیادہ محکم اور بھروسہ کے قابل ہے۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ سیاسی اور معاشی انقلابات کی آندھیاں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ طبقاتی تقسیم بدلتی رہتی ہے لیکن خاندان اپنی جگہ مضبوطی سے قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اشتراکی اور دُوسرے خیال پرستوں کے باوجود انسانی تمدن پر وہ دور کبھی نہیں آیا ہے اور نہ آسکتا ہے جب انسان خاندانی رشتوں اور بندھنوں سے اپنا پیچھا چھڑا سکے۔ جہاں بھی دس بیس آدمی بسیں گے شادی بیاہ ہوگا۔ شوہر بیوی، ماں باپ، بھائی بہن، داماد اور خسر کے رشتے ہوں گے اور انسان الفتوں اور قرابتوں کے ایک پھیلے ہُوئے سلسلہ میں منسلک رہے گا۔ انسانی زندگی کی اس فطری وحدت کو اسلام اپنے اخلاقی اور معاشی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اس باہمی امداد و معاونت کے جذبہ پر جو فطرتاً خاندان کے افراد میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتا ہے مذہبی فرض و احساس کی مہر لگا دیتا ہے تاکہ انسان نفس پرستی اور خود غرضی کی کیسی ہی شدید حالت سے گزر رہا ہو کم از کم ایک محدود دائرہ میں وُہ دُوسروں کی امداد و پرورش کا ذریعہ بنا رہے۔ اسی غرض سے اسلام نے خاندان کی زندگی کو چھوٹے پیمانہ پر امداد باہمی کا ادارہ بنا دیا ہے اور اہلِ خاندان کے حقوق و فرائض پر مذہبی احکام کا وزن ڈال دیا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ذوی القربیٰ کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور غیر مستطیع اقربا کی امداد کو انسان کی پہلی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ ایک جگہ نہایت بلیغ انداز میں یہ حکم سُنایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ (پارہ ۱۴ رکوع ۱۹)

"بیشک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی اور رشتہ داروں کے دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی اور بری بات اور سرکشی سے۔" (ترجمہ مولانا احمد خان بریلوی)

اپنے قوانین وراثت میں بھی اسلام نے اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ وراثت افراد خاندان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پر تقسیم ہو اس بارے میں اگر اس کا مقابلہ مغربی ممالک کے مماثل قوانین سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں میں دولت اس طرح ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوسکتی جیسے کہ مغرب میں وہ ایک خاص حلقہ میں منجمد رہتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کا سنگِ بنیاد زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ وُہ رقم ہے جو صاحبِ استطاعت افراد سے لے کر غریبوں اور مستطیع افراد میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ اس قسم کی کوئی رقم ہے جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا سے وصول کرتی ہیں کیونکہ اس قسم کے جتنے ٹیکس عوام سے وصول کیے جاتے ہیں وہ ان منافع اور فوائد کے معاوضہ میں لیے جاتے ہیں جو

عوام کو حکومت کی سرپرستی سے حاصل ہوتے ہیں لیکن زکوٰۃ وہ ٹیکس ہے جو محض غیر مستطیع افراد کی مالی اعانت کے لیے وصول کیا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں محصول دہندگان کو کوئی دُوسرا فائدہ کسی اور شکل میں نہیں ہوتا اسی لیے زکوٰۃ کے مصارف معین کر دیے گئے ہیں یعنی زکوٰۃ کی رقم صرف غریبوں کی مالی اعانت میں صرف کی جاسکتی ہے لیکن دوسرے مصرف میں نہیں لگائی جاسکتی ہے۔

اسلام کے معاشی نظام کے متعلق اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام نہ تو خالص اشتراکی ہے اور نہ خالص سرمایہ داری بلکہ ان دُو انتہاؤں کے درمیان وہ ایک اعتدال پیدا کرتا ہے۔ وُہ ذاتی ملکیت کو باقی رکھنا ضروری خیال کرتا ہے لیکن اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کرتا ہے کہ وہ معاشی استحصال کا ذریعہ نہ بننے پائے۔

صحیح اسلامی نظام کے اندر قوم کا کوئی فرد بھُوکا نہیں رہتا اور کمیونزم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب کی دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے شام میں قرآن حکیم کی اس آیت کے مطابق :

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پارہ ۱۰ رکوع ۱۱)

"اور وہ کہ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں خوشخبری سناؤ دردناک عذاب کی" (ترجمہ مولانا احمد رضا خان بریلوی)

یہ فتوٰی دیا کہ دولت جمع کرنا حرام ہے (مسند احمد بن حنبل جلد ۵) تو حضرت ابو ذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا (سیرت النبی جلد پنجم مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی صفحہ ۲۶۱)

اس آواز کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ لوگ آسُودہ حال تھے اول تو کوئی بھُوکا پیاسا نہیں تھا اور جو تھے تو عہدِ عثمانی میں ان کا کھانا بیت المال سے مقرر تھا بلکہ عہد صدیقی میں اسی قسم کا انتظام شروع ہو گیا تھا (طبری صفحہ ۳۰۴ بحوالہ خلفائے راشدین مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی صفحہ ۲۴۴)

اہل حیرہ سے حضرت ابو بکرؓ کا جو معاہدہ ہُوا اس میں یہ شرط تھی کہ کوئی ذمی، بوڑھا (اپاہج) اور مفلس ہو جائے گا تو وہ جزیہ سے بری کر دیا جائے گا نیز بیت المال اس کا کفیل ہو گا۔ (کتاب الخراج صفحہ ۷۲ بحوالہ خلفائے راشدین صفحہ ۷۲)

حقیقت یہ ہے بھُوک کا علاج صرف اسلام کے پاس ہے۔ اسلام نے فقیر کو امیر، نادار کو مالدار بنا دیا اور بھُوکے ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر اور دس ہزار روپے نقد کا مالک بنا دیا۔ (اصابہ بحوالہ مہاجرین حصہ دوم صفحہ ۵۰)

کتان کے رنگے ہُوئے کپڑے سے ناک صاف کر کے کہا واہ ابو ہریرہ آج تم کتان سے ناک صاف کرتے ہو حالانکہ کل منبر نبویؐ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان غش کھا کر گرتے تھے اور گزرنے والے تمھاری گردن پر پیر رکھ کر کہتے تھے کہ ابو ہریرہ کو جنون ہو گیا ہے حالانکہ تمھاری یہ حالت صرف بھُوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔ (بخاری بحوالہ مہاجرین صفحہ ۹۶)

اسی طرح حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا ایک زمانہ وُہ تھا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھُوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھتا تھا اور آج میرا یہ حال ہے کہ چالیس ہزار سالانہ میری زکوٰۃ کی رقم ہوتی ہے (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۱۵۹ بحوالہ خلفائے راشدین صفحہ ۲۳۶)

آج ہر طرف بھُوک ہی بھوک ہے۔ مشینی دور کی برکت سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث ایک جگہ زر و جواہر کے قارُونی انبار ہیں اور ایک جگہ نانِ جویں تک میسّر نہیں۔ سرمایہ کی اس غیر متوازن تقسیم نے مزدور کو سرمایہ دار کا جانی دشمن بنا دیا ہے۔ بھوکا مزدور بھُوکے بال بچوں کو اپنے سامنے دم توڑتا دیکھ کر کمیونزم کا نعرہ بلند کرتا ہے اور دُنیا تنکے کی طرح کمیونزم کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے اے کاش کہ وُہ یہ دیکھتی کہ اس درد کی دوا تو اسلام کے پاس ہے۔ اسلام ہی بے ٹھکانوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی برکت سے کوئی بھوکا رہتا ہے نہ کوئی ننگا۔ بیت المال سے سب کی کفالت ہوتی ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں جتنے اپاہج تھے سب کے نام درجِ رجسٹر تھے ان سب کو وظیفہ ملتا تھا۔ (اصابہ جلد ۵ صفحہ ۸۰)

قرض داروں کے قرض کی ادائیگی کے لیے بھی ایک مد تھی۔ شیر خوار بچّوں کے وظائف مقرر تھے ایک عام لنگر خانہ تھا جس سے فقراء و مساکین کو کھانا ملتا تھا۔ (طبقات ابنِ سعد جلد ۵ صفحہ ۲۸۱ بحوالہ تابعین صفحہ ۲۳۸ و ۲۳۹)

اسی پر بس نہیں بلکہ اسلام نے کسی کو بھُوکا، ننگا اور محتاج و فقیر رہنے ہی نہیں دیا سب کو غنی اور مالدار بنا دیا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے وقت ملک کے طول و عرض میں افلاس کا نشان باقی نہ رہ گیا تھا۔ مہاجر بن زید کا بیان ہے کہ ہم لوگ صدقہ تقسیم کرنے تھے۔ ایک سال کے بعد دُوسرے سال وُہ لوگ جو پہلے صدقہ لیتے تھے خود دُوسروں کو صدقہ دینے لگے تھے۔ (طبقات ابنِ سعد جلد ۵ صفحہ ۲۵۶ بحوالہ تابعین صفحہ ۲۴۲)

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کی صرف اڑھائی سال کی حکومت کی مختصر مدت میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ لوگ ان کے عمال کے پاس فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے صدقہ کا مال لے کر آتے تھے لیکن کوئی صاحبِ حاجت نہ ملتا تھا اور وہ مال واپس لے جانا پڑتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سب کو اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ کوئی شخص حاجت مند باقی نہ رہ گیا تھا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۱۵۴)

متذکرہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں تمام افراد کو زندگی کی اساسی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں اور کوئی فرد کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرع مبیں این است و بس (اقبالؒ)

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم اور ان کی لائی ہوئی روشن کتاب نے حیاتِ انسانی کے ہر تاریک گوشہ اور شعبہ کو منور فرمایا اور بنی نوع انسان کو ایسا جامع ضابطۂ حیات عطا فرمایا جو تا قیامِ قیامت لازوال رہے گا۔ ؎

مُصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
(مولانا احمد رضا خان بریلویؒ)

نقشِ پیمبرؐ ــــ سماجی انصاف

ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی

سماجی انصاف مسلم معاشرے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ تاریخی واقعات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہر زمانے میں اسلام کے فرزندوں نے سماجی انصاف کا بول بالا کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سماجی انصاف اسلام کی بنیادی تعلیم ہے۔ اسلام کے معنی ہیں اللہ پروردگار کے آگے سر جھکا دینا، حق کے آگے چون وچرا نہ کرنا۔ مسلمان وُہ ہے جو اپنے حقوق کو دوسروں کے لیے قربان کر دے۔ جس کی زبان، ہاتھ یا دل سے کسی دُوسرے شخص کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ آج سے تقریباً چودہ سو برس پیشتر پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تاکہ دنیا میں سماجی انصاف قایم ہو، کوئی شخص کسی شخص پر ظلم نہ ڈھائے، زور آور کمزور کو آنکھیں نہ دکھائے، مالدار مفلس کو ذلیل نہ سمجھے طاقت اور مال و دولت کی میزان پر انصاف کو تولا نہیں جاسکتا۔ آج کی طرح اُس دور کی دنیا میں بھی طاقت و دولت کی بنیاد پر طبقات قایم تھے۔ عرب میں علم وتہذیب نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ بدنظمی تھی۔ قبائلی جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے تھے، لوگ طاقت کے مظاہرے سے باز نہ آتے تھے۔ بس چلتا تو اکے دُکے مسافروں کو پکڑ کر دُوسرے قبائل کے ہاتھوں بیچ دیتے تھے۔ لوٹ مار کا خطرہ برابر رہتا تھا۔ یہود و نصارٰی بھی سرزمین عرب میں بستے تھے۔ مگر علم وثقافت کے دعویدار ہونے کے باوجود سماجی خیر وبہبود کے قوانین کا پاس نہ رکھنے کی وجہ سے عربوں کے اخلاق و عادات پر اثر انداز نہ ہوسکے۔ تاریخی شہادتیں بتاتی ہیں کہ مدینہ منورہ، طائف، نجران اور خیبر وغیرہ میں بڑی تعداد میں یہود و نصارٰی بستے تھے۔ علم و دولت کے ذریعہ آس پاس کے عرب قبائل پر حاوی تھے۔ ان سے کام لیتے اور معاوضہ بہت کم دیتے یا بالکل نہ دیتے۔ عرب سرداروں میں بھی یہ بُرائیاں آگئی تھیں۔ سرزمین عرب سے باہر شام ومصر میں بازنطینی نصرانیوں کی حکومت تھی اور مشرق وشمال کی جانب ایرانیوں کی سلطنت تھی، جو آتش پرست تھے۔ عرب کے جنوب میں یمن اور حضر موت کے علاقوں پر اکثر ایرانیوں یا حبشہ کے عیسائی حکمرانوں کا قبضہ رہتا تھا۔ ان کے قلمرو علاقوں میں بھی امن و امان، آزادی وحریّت اور سماجی انصاف و عدل واجبی حد تک ہی نظر آتے تھے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں پیغمبرِ اسلامؐ رحمت بن کر معبوث ہُوئے۔ سیکڑوں بتوں کی عبادت کی جگہ ایک اللہ ربّ العٰلمین کی عبادت کی تلقین کی۔ اللہ تعالٰی کا کلام قرآن پاک پڑھ کر سُنایا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کے طریقے بتائے۔ قریش اور مکّہ کے لوگوں کو اپنی صداقت و امانت کا واسطہ دے کر اپنی رسالت کا یقین دلایا۔ وُہ لوگ جنہیں دولت وثروت اور طاقت کا نشہ تھا، آپؐ سے برگشتہ ہوگئے۔ غریب، مفلوک الحال، غلام اور کمزور آپ کے گرد جمع ہوگئے اور آپ کی تعلیم کے مطابق آپس میں مساوات، اخوت، اخلاص و محبت، عدل وانصاف اور ایثار و قربانی کا عملی مظاہرہ کرنے لگے۔ کچھ مالدار شخصیتیں، جو ایمان کے نور سے چمکیں، انہوں نے بھاری قیمتیں ادا کر کے اپنے غلام مسلمان بھائیوں کو خرید کر آزاد کیا۔ حُسنِ سلوک، محبت وخلوص کا بدلہ اسلام کے فرزندوں کو دشمنی و عداوت سے ملا اور سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قریشیوں نے توحید کے پروانوں کا جینا حرام کر دیا۔ خود پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طرح طرح سے

تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ مجبوراً مسلمانوں کو مکّہ سے ہجرت کرنے کی اجازت دی گئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب کی جانب ہجرت کرنی پڑی اور اس شہر کا نام آپؐ کی تشریف آوری کے بعد مدینۃ الرسول پڑ گیا۔

مدینہ پہنچ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن حکیم کی تعلیمات پر عمل کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی اور امن و امان کے ساتھ مدینہ منورہ کے مختلف قسم کے باشندوں کو جن میں یہود، نصارٰی اور اوس و خزرج کے وُہ سارے افراد بھی تھے، جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے، ان سب کو آپ نے ایک معاہدہ کے ذریعے متحد کر دیا اور یہ لوگ ایک عرصے تک اس معاہدے کی وجہ سے آپس میں ایک دُوسرے کے مدد و معاون بنے رہے اور صلح و آشتی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ البتہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ان کی خوشحالی کو یہود و نصارٰی نہ دیکھ سکے اور وقتاً فوقتاً فرزندانِ اسلام کے خلاف بدعہدی اور بغاوت کا مظاہرہ کرتے رہے اور آخر کار غدر و بے وفائی کے نتیجے میں مدینہ منورہ سے نکالے گئے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد عرب قبائل کے اخلاق و عادات میں نمایاں فرق رونما ہُوا۔ وُہ لوٹ مار، قتل و غارت، فحاشی اور دُوسری برائیوں سے تائب ہو کر باہمی تعاون، حسن سلوک اور اخلاق فاضلہ کے خوگر ہو گئے۔ امانت و دیانت، صلح و آشتی، مودت و اخوت، عدل و انصاف جیسی صفات کے حامل بن گئے۔ مہاجرین و انصار ایک دُوسرے کے بھائی بن چکے تھے اور ایک دوسرے کے حقوق و عزّت کے نگہبان سمجھے جاتے تھے۔

اسلام نے اوّلین بار ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جو صراطِ مستقیم اور راہِ اعتدال پر گامزن رہا۔ اس معاشرے کا ہر فرد نیکی کا گرویدہ اور بدی سے دُور بھاگنے والا تھا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی نیک کام کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے روکنا) کو اپنا فرض منصبی بنا کر اسلامی معاشرہ "امت وسط" کے لقب کا مستحق ہُوا۔ دنیا میں عدل اسی طرح قایم ہو سکتا ہے کہ بُرائی کو روک دیا جائے اور نیکی کو رائج کیا جائے۔ اسی طرح دنیا کے نظم میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں افراط و تفریط سے بچنا یعنی کسی شے کا نہ زیادہ ہونا اور نہ کم ہونا۔ یہ درجہ مقام وسط اور درمیانی ہے۔ دُنیا میں جو بُرائیاں ہیں، غور کیجیے تو وہ افراط و تفریط کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح کسی چیز کو ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اور ہر شے کا اپنی حد سے تجاوز کرنا اسراف ہے اور اس سے بڑھ کر گناہ کی کیا تعریف ہو سکتی ہے کہ وُہ قوتوں اور خواہشوں کے خرچ میں اعتدال سے کام نہ لینے کا نام ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا لفظ "تبذیر" ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس کے مصرف کے علاوہ دُوسری جگہ خرچ کرنا۔ مثلاً دولت فرد کے ضروری آرام و آسایش، عزیز و اقارب کی اعانت، اور اعمال حسنہ میں خرچ کرنے کے لیے ہے۔ اگر اسے محض نمود و نمایش، دنیوی عزّت اور حکام کی نظروں میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے لٹانا شروع کر دیں، تو قرآن پاک اسے "تبذیر" سے تعبیر کرتا ہے اور چونکہ اس کا نقصان اسراف سے زیادہ ہے، اس لیے وعید بھی سخت وارد ہُوئی۔ مسرف کے لیے تو صرف "ان اللہ لایحب المسرفین" (خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا) فرمایا اور تبذیر کے مرتکبین کو "کانوا اخوان الشیاطین" کہہ کر شیطان کے اخوان و اقارب میں شمار کیا گیا۔

دونوں لفظوں کا فرق قرآن پاک کی آیتوں سے واضح ہو جاتا ہے یعنی "کلوا واشربوا ولا تسرفوا ــ ان اللہ لا یحب المسرفین" کھاؤ، پیو، لیکن اسراف نہ کرو ــ اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

بُھوک اور پیاس میں غذا اور پانی کا صرف بالکل صحیح کام ہے اور اشیاء کا بے موقع خرچ کرنا نہیں ہے۔ غذا کھانے ہی کے لیے ہے اور پانی پینے ہی کے لیے ہے۔ لیکن اگر حد خواہش اور ضرورت سے زیادہ کھایا جائے، یا ان کی تیاری اور اکل و شرب پر بے جا روپیہ صرف کیا جائے تو یہ اسراف ہوگا اور اعتدال سے دُور۔ اسی لیے حکم ہُوا کہ اسراف مت کرو۔ ایک دُوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وآت ذاالقربیٰ حقہ والمسکین وابن السبیل و لا تبذر تبذیرا"

اور اقارب کا حق ان کو دو، نیز مسکین اور مسافر کے حقوق ادا کرو اور دولت کو ضائع مت کرو۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ دولت کا صحیح مصرف اعزہ و اقارب کے حقوق ادا کرنا، حاجت مندوں اور مسافروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ پس دُوسرے کاموں میں بے موقع خرچ کرنا سماجی انصاف کے خلاف ہوگا اور فسق و فجور سمجھا جائے گا۔

ایک دفعہ پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے کچھ قرض لیا اور اس کو ایک معین وقت پر ادائیگی کے لیے بلایا۔ اتفاق یہ ہوا کہ میعاد پوری ہونے پر جب وہ اعرابی آپ کے پاس آیا اور اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کیا، تو آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے مزید مہلت چاہی اور فرمایا کہ کچھ دنوں کے بعد آئے۔ اعرابی کو آپ پر طیش آگیا اور بے ادبی کی باتیں کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو پکڑ لیا اور چاہتے تھے کہ اس کو زیادتی کا مزہ چکھائیں، کہ خود پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑھ کر حضرت عمرؓ کو روکا اور کہا کہ میں مقروض ہوں اور اس کا حق مجھ پر ہے اس لیے صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ آخر آپ نے ایک دُوسرے صحابی سے لے کر قرض ادا کیا۔ اعرابی پر آپ کے انصاف اور صبر و تحمل کا بڑا اثر ہُوا اور وُہ ایمان لے آیا۔

غزوۂ خندق میں جب مدینہ کے ایک جانب کھائی کھودنے کا فیصلہ ہُوا تو صحابہ کرام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے اور مٹی ہٹانے میں برابر کے شریک تھے۔ شب و روز سب کے ساتھ اس کام میں مصروف رہے۔ مدینے کے اردگرد قریش کے ناگہانی حملہ کے خوف سے باری باری پہرہ دینے کا کام آپ بھی انجام دیتے تھے۔ ایک شب کو جب کفار کے حملہ کی افواہ گرم ہُوئی تو آپ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دُور دُور تک دشمنوں کے کھوج میں نکل گئے۔ پھر واپس آ کر سب کو تسلی دی، اور اپنے اپنے گھروں میں آرام سے سونے کا حکم دیا۔

لگان و خراج کی رقمیں اور اشیاء لوگوں میں آپ سب سے پہلے تقسیم کر دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اپنے لیے کچھ نہ چھوڑتے چنانچہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات تین تین روز تک گھر میں آگ نہ جلتی اور آلِ نبیؐ ایک یا نصف کھجور کھا کر روزہ افطار کر لیتے۔ غرض اپنے اہل و عیال سے زیادہ اپنی اُمت کی آسائش و سہولت کا آپ کو خیال رہتا تھا۔

فتح مکّہ کے دن قریش کے ظالم سردار آپ کے سامنے سرنگوں کھڑے تھے۔ آپ چاہتے، تو ان کے ظلم کا بدلہ لے سکتے تھے۔ مگر آپ تو سراپا رحمت اور عدل و انصاف تھے۔ آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ آپ کے حسن سلوک سے سب مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ سماجی انصاف اور عدل کا خیال مسلمانوں کو اتنا تھا کہ وُہ کبھی ظلم کا بدلہ بیجا طور پر نہ لیتے اور سزا دینے میں حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھتے۔

اسلام سارے عالم کے اربابِ دانش کو ببانگ دہل دعوت دیتا ہے کہ آؤ سب مل کر اس ایک بات پر اتفاق کر لیں کہ اللہ کے

سوا کسی دوسرے کی پرستش نہ کریں۔ اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ اپنے میں سے کسی کو کسی پر ما سوائے اللہ فوقیت دیں اور نہ اس کے سوا کسی کو آقا اور داتا سمجھیں۔ اگر یہ اہلِ کتاب (اربابِ دانش) اس بات کا عہد نہ کریں، تو کہہ دو کہ تم سب گواہ رہو۔ ہم خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں:

قُل یآ اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآءٍ بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئًا و لا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔

(آل عمران : ۶۴)

اس آیتِ پاک کی واضح تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور اس کے سارے بندے، جس ملک و ملت اور جس دین و عقیدے کے بھی ہوں، اس کے لیے برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ کسی پر اپنی فضیلت جتائے اور نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاجت روا سمجھے۔ یہ بات شرک کے قریب ہے کہ کوئی یہ خیال کرے کہ فلاں بزرگ کی قبر پر حاضری دینے کی وجہ سے میری یہ حاجت یا آرزو پوری ہوئی، حاجت روا اور آرزو پوری کرنے والا اللہ اور صرف اللہ ہے۔ اپنی بداعمالیوں یا ناقص اعمال کی وجہ سے کسی کی دُعا قبول ہوتی دکھائی نہیں دیتی تو وُہ کسی بزرگ کی زیارت کے بعد ان کی سفارش کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔ اسلام نے بُرے اعمال سے بچے رہنے کی تعلیم اسی لیے دی ہے کہ اللہ کے بندے سب آپس میں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں[1] اور نہ کسی کو اپنے سے نیچا سمجھنا چاہیے۔ پس سب کو برابر حقوق حاصل ہیں۔ البتہ ہر ہر فرد اپنے اپنے نیک اعمال کی وساطت سے مختلف مدارج و مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ اس لیے اساسی اصول عدل و انصاف، حقوق و واجبات سارے انسانی افراد کے لیے برابر ہیں۔ ان میں اگر ذرہ برابر بھی کمی یا بیشی کی جائے گی، تو ظلم و عدوان ہوگا۔ رنگ، رُوپ، مذہب اور عقیدے کا فرق نہ کیا جائے گا۔ اسلامی سماج دنیا کی تاریخ میں اوّلین مثال ہے کہ مسلمانوں کی حکومت میں ہر کیش و ملت کے لوگ صلح و آشتی اور امن و امان کے ساتھ بستے تھے اور سب کو مساویانہ شہری حقوق حاصل تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر فرد کے لیے آذوقہ[2] مقرر کیا، تو غیر مسلم فقیر و محتاج کو دستِ سوال بڑھانے کے لیے نہیں چھوڑا۔ ان کے لیے بھی روزینے مقرر کر دیے۔

معاملات اور تجارتی لین دین میں کمی بیشی کرنے سے اسلام نے سختی سے منع کر دیا۔ قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لیے اشیاء کو بازار سے ناپید کر دینا سخت گناہ قرار پایا۔ گرانی بڑھانے کے لیے چیزوں کو خریدنا فساد برپا کرنے کے مترادف بتایا گیا۔ چور بازاری، چوری چھپے اشیاء کی نقل و حرکت کو بھی فساد کہا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قد جآءتکم بینۃ من ربکم، فاوفوا الکیل والمیزان و لا تبخسوا الناس اشیآءھم، و لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین" (الاعراف : ۸۵)

"تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی آچکی ہے، تو تم ناپ اور تول پُوری کیا کرو، اور لوگوں کو

---

[1] مگر تقویٰ کی بنا پر (محبوب احمد)
[2] طعام۔ کھانا (محبوب احمد)

چیزیں کم نہ دیا کرو، اور زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ پیدا کرو۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو، تو سمجھ لو کہ یہ بات تمہارے حق میں بہتر ہے۔

"یا قوم اوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاءھم ولا تعثوا فی الارض مفسدین"۔
(ہود : ۸۵)

اے قوم! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ کیا کرو اور زمین میں خرابی نہ کرتے پھرو۔

زمین میں خرابی کرنا فساد برپا کرنا نہایت عام حکم ہے، اس کا مطلب صرف نقضِ امن نہیں۔ ملکی قوانین، دینی اور اخلاقی نیز معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی سے بھی فساد رُونما ہوتا ہے۔ دُوسروں کے حقوق غصب کرنا، کسی کے ساتھ زبردستی کرنا، کسی کو دھوکا دینا، دنیاوی کاروبار میں تعطل پیدا کرنا، اپنے ذاتی مفاد کے لیے دُوسروں کی سہولتوں کو برباد کرنا، بھلے کاموں میں تعاون نہ کرنا اور بُرے کاموں کے لیے ورغلانا سب خرابی و فساد کے نتائج ہیں۔

اسلام نے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ وُہ اسی سماجی انصاف کے پیشِ نظر مشروع ہے۔ غیر اسلامی ثقافت کے غلبے کے باعث آج کے مہذب سماج میں البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوشش کرنے والوں سے کہا جاتا ہے: "دوسروں کے امور میں مداخلت نہ کرو اور اپنی راہ لو۔" آج سے سالہا سال پہلے کے لوگ جو اسلامی تعلیمات سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، ایسا کہنے والوں کو بُرا سمجھتے تھے، کیونکہ ایسا کہنا اسلامی حکم کے خلاف ہے۔ دو جھگڑنے والے گروہوں میں صُلح کرانا مسلمانوں کی شان ہے اور قرآن کا فرمان۔

سماجی انصاف کے پیشِ نظر اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے اور پیہم کوشش کرنے کی تلقین کی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا فریضہ تھا کہ اپنے ملک، وطن اور ہم قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کوشش میں لگے رہنا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایک طرف سترہ سالہ سپہ سالار محمد بن قاسم سندھ کو فتح کرتا ہے اور مسلمان قیدی عورتوں کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑاتا ہے۔ دُوسری جانب موسیٰ بن نصیر ستر سال کی عمر ہو جانے پر بھی بحرِ اطلانتک کے کنارے پانی میں گھوڑے ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے: اے آسمان اور اے بحرِ بیکراں! اگر اس سے پرے بھی کوئی خطۂ زمین میرے علم میں ہوتا تو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وہاں بھی پہنچنے کی کوشش کرتا اور آگے بڑھنے سے باز نہ آتا۔

غرض اسلام کے نام لیوا اپنے آخری وقت تک کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی جدّوجہد اور عملِ خیر سے دست بردار یا ریٹائرڈ نہیں ہوتے۔

عہدِ نبوت کے عمرانی اور تمدنی مسائل

حکیم حیدر زمان صدیقی

عقل وشعور اور دلِ دردمند رکھنے والے ہر انسان کی نگاہِ تجسس ایک ایسی نئی دنیا کی تعمیر کے لیے وقفِ انتظار رہے، جس کی ہر صبح مسرت بدوش اور حیات آفرین ہو اور ہر شام سکون بخش اور گہوارۂ راحت ہو۔ وہ کون ہوگا جو ایسی انسانی سوسائٹی کی ضرورت محسوس نہ کرتا ہوگا جس کا ہر فرد خداترس، خود آگاہ اور فرض شناس ہو۔ جس کے حدود مملکت میں ہر انسان زندگی کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو۔ جہاں ایک دل بھی بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں سے اندوہ گیں نہ ہو اور نہ کوئی آنکھ زندگی کی محبوب اور حسین تمناؤں کی پامالی سے نمناک ہو۔

بلاشبہ ایک سنجیدہ فکر اور بااحساس انسان کے لیے ازحد مشکل ہے کہ وہ محنت کش اور دکھیا انسانوں کی چیخ پکار، اخلاق وشرافت کی رسوائی، متاعِ انسانیت کی پامالی اور انسانی خون کی ارزانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس پرخون کے آنسو نہ بہائے۔ لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ اس بے نور اور بے ذوق دورِ انسانیت میں درندہ صفت جاہ پرستوں کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے بالغ النظر لوگ بہت کمیاب ہیں، جو زمانہ کی رفتارِ نبض کو پہچان کر بیمار دنیا کے لیے نسخۂ شفا مہیا کر سکیں۔ ورنہ مبداءِ فیض کے دارالشفاء میں ہر درد کا علاج موجود ہے اور سازِ فطرت میں نغمہ ہائے زندگی کی کوئی کمی نہیں: ؎

تو راہ شناس نہٖ واز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمی نیست

دورِ حاضر کا انسانی دماغ جن عملی مسائل سے الجھا ہوا ہے، وہ ہمارے ہی زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ وہ ہمیشہ سے انسانی فکر و توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہر دوسرے دور میں پہلے دور کی نسبت سے ان مسائل کی سطحی نوعیت و وضعیت بدلتی رہی ہو بلکہ کہنا چاہیے کہ بدلتی رہی ہے۔ لیکن زندگی کے واقعی اور حقیقی مطالبات ہر زمانہ میں ایک جیسے رہے ہیں اور اس لیے زندگی سے تعلق رکھنے والے عملی مسائل بھی بنیادی طور پر یکساں ہی رہے ہیں۔ اس بناء پر عقل وبصیرت اور دیانت وانصاف کا اقتضاء یہ ہے کہ مسائلِ حاضرہ کے عملی حل کے لیے انسانی تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ماضی کے کسی دور میں ان مسائل کا موثر عملی حل پیش کیا گیا ہے اور کیا کسی انقلابی تصورِ حیات کے ذریعہ ایسی پاکیزہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے، جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے؟ اگر کسی انسانی دور میں ایسا ہوا ہے تو ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ہم اس مقدس انقلاب کے بانی کی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے کسی ایسے شخص کی رہنمائی قبول کریں، جو راہ و رسمِ منزل سے ناآشنا ہے۔ یقیناً آج انسانی دنیا کی آفاق گیر تباہی و بدامنی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ آج انسانوں کی زمامِ کار ان ائمۂ ضلالت کے ہاتھ میں ہے، جو ان کو خدا اور اس کے پیغمبروں کی راہ سے

پھیر کر فساد و معصیت کی راہ پر چلا رہے ہیں : ؎

لا یفلح الناس فوضی لا سراۃ لھم
ولا سراۃ لمن جہالہم سادوا

یہ مقدس انقلاب جو چھٹی صدی میں ظہور پذیر ہوا ، پوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا انقلاب تھا ، جس کی تہہ میں عالمگیر اور بین الانسانی تصورِ حیات کارفرما تھا اور جس نے انسانوں کا زاویۂ نگاہ ، زندگی کا نقطۂ نظر اور فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی یہاں تک کہ کرۂ ارضی پر بسنے والا کوئی انسان ایسا نہ رہ گیا تھا جو اس حیرت انگیز انقلاب سے متاثر نہ ہوا ہو۔

زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھنا ہے کہ دنیائے انسانیت کے امیرِ اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا ، تو اس وقت آپ کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا اور آپ نے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے کون سا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ وہ مسائل اس زمانہ کے وقتی مسائل تھے یا ان میں اور زمانہ حال کے مسائل میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے ، اگر دوسری صورت ہے یعنی عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل جن کو اربابِ علم و دانش کی پیہم اور لگاتار کاوشیں آج تک حل کرنے سے قاصر رہی ہیں ، بنیادی حیثیت سے متذکرہ بالا دورِ انقلاب کے انسانی مسائل سے مختلف نہیں ہیں ، تو اس صورت میں آج بھی وہی ہمہ گیر تصورِ حیات اور اسی طرز کی عملی جد و جہد انسانی دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کر سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک مقدس اور پاکیزہ انسانی سوسائٹی معرض وجود میں آ سکتی ہے۔

زمانہ قبل نبوت کے اجتماعی مفاسد

جس انسانی دور میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا ، اگر اس کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے ، تو ان میں اس لحاظ سے یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے کہ موجودہ دور علم و تہذیب کے اعتبار سے بہت آگے جا چکا ہے اور انسانی تمدن کی ارتقائی حرکت اور علم سائنس کی حیرت انگیز وسعت و ترقی نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے اور جس تاریخی دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں ، وہ تاریک خیالی ، وہم پرستی ، جہالت اور علمی کم مائگی کا بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے مگر مسائل زندگی کے الجھاؤ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی واضح اور حقیقی فرق نہیں ہے ، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم و ہنر کا فقدان انسانیت کے لیے بلائے بے درماں تھا اور یہاں حکمت و دانش کا غلط استعمال اہلِ دنیا کے لیے وجہ ہلاکت بن گیا ہے : ؎

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

بہرحال سطورِ ذیل میں قبل از نبوت دور کے ان بنیادی مفاسد کا ذکر کیا جاتا ہے ، جو اس وقت انسانی دنیا کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل رہے تھے اور بظاہر ان کی اصلاح کی کوئی امید نہ تھی۔

بے روح اور غلط کارانہ مذہب پرستی

مذہب انسانی اجتماعیت کا قدیم ترین اور موثر ترین عنصر ہے اور اگر وہ الہامی صداقتوں اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت پر مبنی ہو تو اپنے ماننے والوں میں خدا ترسی ، حق پرستی اور ذکر و فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز قدرِ حریت کی نگہداشت اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک سچا مذہب

ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اس کو ماننے والا خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لیے آبادیوں کو پامال کرے اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر اپنا تختِ جبروت بچھائے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر رُوح فرسا اور اندوہناک ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اہلِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی روح کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہو۔ ورنہ آج تک جو کچھ دیکھا اور سُنا گیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیشہ مذہب کے نام سے دنیا کے سٹیج پر ہیبت ناک خونی ڈرامے کھیلے گئے اور مذہب کے پردے میں علمبردارانِ مذاہب جس مکروہ اور بھیانک کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں، اس سے شیطان کی روح بھی لرز جاتی رہی ہوگی۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے، بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور سوائے چند مستثنیات کے مذہب کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے لیکن جس انسانی دور میں دنیا کے آخری ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا، وہ اس حیثیت سے بدترین دورِ انسانیت تھا۔ یعنی اس دور میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ جس طرح مذہب کی توہین و تذلیل کر رہے تھے، اس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت دنیا میں یہودیت، مجوسیت، حنیفیت، ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ مذاہب کو ماننے والے لوگ بکثرت موجود تھے، لیکن بے لوث خدا پرستی اور حقیقت شناسی کسی مذہب میں موجود نہ تھی۔ ہر مذہب چند رسوم وظواہر کا مجموعہ رہ گیا تھا جو مختلف گروہ بندیوں کے لیے محض لیبل کی حیثیت رکھتا تھا اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی گروہ اپنی غلط کارانہ روش کو عین صواب سمجھتا تھا اور دوسروں کی اچھی چیز بھی اس کی نگاہ میں بُری تھی۔ گویا اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو چیز ان کی طرف منسوب تھی، وہ حق، اور جو دوسروں میں پائی جاتی تھی، وہ باطل تھی۔ اس غلط بینی اور اعتقادی گمراہی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف گروہ بندیوں میں کوئی اصولی، اعتقادی اور عملی چیز وجہِ اشتراک نہ رہی تھی بلکہ ہر گروہ دُوسرے گروہ سے بالکلیہ مغایرت رکھتا تھا اور اسی چیز نے ان گروہ بندیوں میں شدید نفرت اور عصبیت پیدا کر دی تھی۔

قالت الیھود لیست النصٰرٰی علٰی شیءٍ وقالت النصٰرٰی لیست الیھود علٰی شیءٍ وھم یتلون الکتٰب۔ (بقرہ)	یہود نے کہا نصرانی کسی مذہب حق پر نہیں ہیں اور نصرانیوں نے کہا یہود حق پر نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں گروہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔

یہ نفرت و عصبیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ سے ناروا سلوک کرنے میں کوئی قباحت تصوّر نہیں کرتے تھے۔ دوسروں پر ظلم و تشدد کرتے، ان سے بددیانتی کرتے بلکہ ان کے مقابلہ میں ہر بداخلاقی کو روا سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہود کے نقطۂ خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لیس علینا فی الامیّٖن سبیل۔ (الآیہ)	اُمیّین (غیر اہل کتاب) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس زمانہ کے اخلاقی تسفل و انحطاط کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو مذہب کی عالمگیر سچائیوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور جن کی نگاہ حقیقت شناس نیکی کو ہر حال میں نیکی اور بُرائی کو ہر حال میں برائی تصور کرتی ہے خواہ نیکی اور برائی کا تعلق اپنوں سے ہو

یا بیگانوں سے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے اہل مذاہب، مذہب کی اس سیدھی سادی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھے۔

دین و مذہب کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وُہ انسانی قلوب، نظر کو ذوقِ تجسس اور امتیازِ حق و باطل کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے اور انسانی قوائے فکر و عمل کو معین حدود و اخلاق کے زیرِ اثر نشوونما دیتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہیں، ان کی دور رس نگاہ کفر و معصیت کے ہر چہار سُو چھائے ہُوئے دُھندلکے میں بھی حق و صداقت کی متلاشی رہتی ہے اور زندگی کی تگ و دَو میں ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی طلب و جستجو اور ذوقِ حق پرستی میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ ان کا جذبۂ شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جس قوم میں خدا پرستی کی حقیقی رُوح فنا ہو جاتی ہے، اس کی آنکھوں سے ایمان و عمل کے حیات آفرین حقایق اوجھل ہو جاتے ہیں اور وُہ اپنے مذہب کی سطحی اور ثانوی درجوں کی باتوں پر ہی قناعت کر لیتی ہے یا دینِ آباء کے اوہامِ باطلہ کو حقیقت تصور کر لیتی ہے:

انہم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللّٰہ و یحسبون انہم مھتدون۔ (الاعراف - ۳)	ان لوگوں نے اللہ کے مقابلہ میں شیطانوں کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر چل رہے ہیں۔

یعنی چند بے ضرر مذہبی مراسم جن پر عمل کرنے سے کچھ دینا اور کھونا نہ پڑتا ہو، ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے، لیکن وہ احکامِ دینی، جن میں قربانیِ جان و مال اور ترکِ عیش و نشاط کا مطالبہ ہو، ان کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے، گویا اب ان احکام کی ضرورت ہی نہیں یا وہ بالکل منسوخ ہو چکے ہیں یا خدائی دین کے مقابلہ میں بالکل ایک نیا دین تراش لیا جاتا ہے اور پھر اسی کو خدائی دین کا نام دے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ اعتقادی و عملی گمراہی ہے، جو ہر زمانہ میں قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی رہی ہے: ؎

مرشدِ رُومی حکیم پاک زاد سرِ مرگِ اُمتاں بر ما کشاد
ہر ہلاکِ اُمتِ پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گماں بُردند عود

دَورِ نبوت کے یہود و نصاریٰ کی بالکل یہی حالت تھی کہ ان کو دین کی زندہ اور متحرک رُوح سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ انھوں نے دین کو خواہشاتِ نفس کا تابع بنا رکھا تھا۔ جہاں مذہب کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتا، وہ کمال دیدہ دلیری سے احکامِ مذہب کی قطع و برید کر کے ان کو خواہش نفس کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ یحرّفون الکلم عن مواضعہٖ ونسوا حظًّا مما ذکروا بہٖ۔ (الآیہ)

ان میں نیک و بد اور صواب و ناصواب کی تمیز ہی باقی نہ رہی تھی۔ علماء و مشایخ ان کو جس راہ پر ڈال دیتے، وہ لوگ اُسی راہ پر چل پڑتے تھے۔

اتخذوا احبارھم و رُھبانھم ارباباً من دون اللّٰہ۔ (الآیہ)	ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشایخ کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔

یہود صرف اس بات کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ اسرائیلی یا یہودی النسل ہیں اور نصرانی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کو مان لینا ہی فلاح و نجات کے لیے کافی ہے، لیکن ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آ سکتا تھا کہ وُہ

فی الواقع کسی پیغمبر کی رہنمائی کو مانتے اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کی اس گمراہی کا بار بار ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ یہودیوں اور مسلمانوں میں بات چل نکلی۔ یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارا مذہب سچا ہے اور نجاتِ اخروی کا استحقاق بغیر ہمارے کسی کو نہیں ہے۔" ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کہا: "ہمارے نبی سب سے آخری نبی ہیں اور ہمارا دین آخری اور مکمل دین ہے۔" لیکن ذیل کی قرآنی آیت میں ان لوگوں سے واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ محض دین و مذہب کی نمایش سے کچھ نہیں بنے گا۔ اصل چیز ایمان و عمل ہے۔ اگر یہ نہیں تو محض کسی مذہب کا کامل و برتر ہونا تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔[1]

لیس باما نیکم و لا امانی اھل الکتاب من	نہ تمہاری آرزوئیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں کام آئینگی
یعمل سوٓءًا یجز بہٖ — — — — — —	(خدا کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ) جو شخص برائی کریگا
— — — — — — — — — —	اس کو اس کی سزا ملے گی اور نہیں پائے گا وہ اللہ کے
— — — — — — — — — —	سوا کوئی دوست اور نہ مددگار۔ اور جو نیک کام کرے گا
— — — — — — — — — —	خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو،
— — — — — — — — — —	وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس پر ذرہ برابر بھی ظلم
و لا یظلمون نقیرًا۔ (النساء)	نہ ہوگا۔

یہود کی عملی حالت کا نقشہ جو قرآن حکیم نے کھینچا ہے، اس سے ان کی اخلاقی پستی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے:

و تریٰ کثیرًا منھم یسارعون فی الاثم	آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ گناہ و سرکشی
و العدوان — — — — — — —	اور حرام خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ بہت ہی
— — — — — — — — — —	بُرے ہیں وُہ اعمال، جو وُہ کرتے ہیں۔ ان کے علماً
— — — — — — — — — —	و مشایخ ان کو گناہ و معصیت کی بات کہنے اور حرام
— — — — — — — — — —	کھانے سے کیوں نہیں روکتے؛ بہت ہی بُرا ہے
لبئس ما کانوا یصنعون۔ (المائدہ)	وہ کام، جو وہ کرتے ہیں۔

اور عام اہلِ کتاب سے قرآن حکیم نے یوں خطاب کیا ہے:

قل یٰاھل الکتٰب لستم علیٰ شیءٍ حتّٰی تقیموا	اے پیغمبر! آپ کہہ دیں اے علمبردارانِ کتاب، تم
التوراۃ و الانجیل و ما انزل الیکم من	کسی صداقت پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ و انجیل
ربکم۔	اور اُن احکام کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر
(مائدہ)	اتارے گئے ہیں، پوری طرح قایم نہ کرو۔

[1] ابن جریر

يَاهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔ (النساء) — اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی ذات پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

مدینہ منورہ اور اس کے ارد گرد یہود کثرت سے آباد تھے۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں مدینہ میں آرہے تھے[1] مدینہ منورہ کے علاوہ یہ لوگ خیبر، فدک، وادی القریٰ میں بھی آباد تھے نیز عرب سے باہر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی کوئی جداگانہ ریاست دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہ تھی۔ عرب میں ان کا ذریعہ معاش تجارت، کھیتی باڑی اور سودی کاروبار تھا۔ یہ لوگ حد درجہ کے لالچی اور سنگدل تھے۔ بڑی بڑی شرحوں پر سُودی رقمیں دیتے تھے اور کفالت کے طور پر لوگوں کے بچے بلکہ مستورات تک اپنے پاس رہن رکھتے تھے۔ ان میں دولت کی کثرت تھی۔ اس وجہ سے ان میں زنا و فحاشی کی کوئی حد نہ تھی اور علماء یہود نے اپنے امراء کی دلجوئی کے لیے زنا کی سزا (جو تورات نے مقرر کی تھی) ہی بدل ڈالی تھی۔

مسیحی مذہب کے پیرو عرب میں بکثرت موجود تھے۔ ابن قُتیبہ کا بیان ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان عیسائی تھے۔ قضاعہ میں بھی عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی کچھ پیروانِ مسیحیت پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل جو ایک خدا شناس عیسائی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے، مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

عیسائیوں میں اگرچہ کچھ بچے کھچے ایسے لوگ بھی تھے جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے تھے اور ٹھیک ٹھیک مسیحی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جن کی قرآن حکیم نے بھی تعریف کی ہے اور ایک مستند حدیث میں "الّا بقایا من اھل الکتاب" کے الفاظ سے ان کو اس وقت کی گمراہ قوموں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی عظیم اکثریت سخت گمراہی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک مسیحی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:

> "عیسائیوں کے عقاید میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔ عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔"[2]

اس زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا تھا، جو حضرت مریمؑ کو بھی شریکِ الوہیت تصوّر کرتا اور اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں مسیحی فرقوں کے دلچسپ مسائل، جن پر وہ پُوری قوت صرف کر رہے تھے، یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ میں صرف خدائی طبیعت پائی جاتی ہے یا خدائی اور انسانی دونوں طبیعتیں ان میں جمع ہیں؟ اگر دونوں ہیں تو ان کا منشا ایک ہے یا الگ الگ؟

نصرانیوں کی اخلاقی حالت یہود سے کچھ کم افسوسناک نہ تھی۔ زمانۂ نبوت سے پہلے یہ لوگ دنیا کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے اور دولت و اقتدار نے ان میں خطرناک حد تک ذمائم اخلاق پیدا کر دیے تھے۔ زنا، مے نوشی، رشوت خوری اور دیگر اخلاقی بیماریاں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھیں۔ حضرت اقبالؒ نے دورِ حاضر کے فرنگیوں کی زہر آلود معاشرت پر بڑی خوبی سے طنز کیا ہے:

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا — نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری

---

[1] طبری [2] معرکۂ مذہب و سائنس ص ۶۲

حلقۂ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے — مے و قمار و ہجوم زنان بازاری (ضرب کلیم)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہدِ رسالت کے ابتدائی دَور میں عیسائیوں کی اخلاقی حالت کسی لحاظ سے انیسویں اور بیسویں صدی کی عیسائیت سے بہتر نہ تھی۔

مجوسیت کا سرچشمہ ایران کی سرزمین تھی، لیکن عرب میں بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کا قبیلۂ تمیم مجوسی تھا اور اس دور کے مجوسیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت ہمعصر اقوام سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ زمانۂ بعثتِ نبوی سے بہت پہلے ایران کے مشہور رہنما مانی نے عیسائیت و مجوسیت کے اجزا سے عجیب وغریب ملغوبہ تیار کیا تھا۔ ایک طرف اس کی جدت نوازی کا یہ حال کہ بیٹی اور بہن کی حرمت اٹھا دی تھی۔ چنانچہ ایران کے ایک حکمران یزدگرد ثانی نے جو اس شریعت کا پیرو تھا، اپنی بیٹی سے نکاح کیا اور کچھ مدت بعد اس کو قتل کر دیا[1]

اس کے بعد ایک اشتراکیت پسند مزدک نامی مصلح پیدا ہوا، جس نے یہ تعلیم دی کہ دولت اور عورت کسی کی ملکیت نہیں۔ اس دین کی اشاعت میں عیاش حکمران و امراء نے سرگرم حصہ لیا کیونکہ یہ نیا دین ان کی تعیش پسندانہ طبائع سے مناسبت رکھتا تھا۔

قریش کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے نگہبان اور ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ یہود و نصاریٰ کے دعووں سے زیادہ بے حقیقت اور بے مغز تھا۔ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ توحید ہے لیکن ان لوگوں کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں بھی توحید کا شائبہ تک موجود نہ تھا بلکہ وہ شدید درجہ کی توہم پرستی اور شرک و بدعت میں مبتلا تھے اور ان کے معبودانِ باطل کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہاں بہت قلیل تعداد میں کچھ ایسے اشخاص بھی ان میں موجود تھے، جن کے ضمیر بالکل مُردہ نہیں ہو چکے تھے اور وہ اپنی خداداد بصیرت سے اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ انسان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے معبودوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرے۔ چنانچہ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بُت کے سالانہ میلے میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمر بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں نے یک لخت ہی محسوس کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ ہم انسان ہو کر پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان لوگوں نے حق و صداقت کی جستجو شروع کر دی۔ ورقہ، عثمان اور عبداللہ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا اور زید نے دینِ حنیفی کی تلاش میں شام کا سفر کیا، کئی پادریوں اور راہبوں سے ملے لیکن جس چیز کی ان کو تلاش تھی، اس کا سراغ نہ ملا اور بالآخر اس اجمالی ایمان کو کافی سمجھا کہ "میں ابراہیمؑ کا دین قبول کرتا ہوں"۔ اسی طرح امیہ بن صلت، جو طائف کے رئیس اور مشہور شاعر تھے، نے بھی بُت پرستی کی مذمت کی تھی۔ غالباً یہ وہی اُمیہ ہیں، جن کی نسبت ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اس کا دل مومن اور دماغ کافر تھا"

دورِ جاہلیت کے کچھ سنجیدہ فکر اور صحیح الخیال اہلِ سخن کا کلام عربی لٹریچر میں ملتا ہے۔ نابغہ اور زہیر ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ نابغہ کے اس شعر سے ان کی توحید پرستی کا اندازہ ہو سکتا ہے: ؎

---

[1] مورخوں کی تاریخ عالم ص ۸۴، بواسطہ سیرت نبویؐ جلد ۴

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً
وَلَيْسَ وَرَاءَ اللّٰهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبٌ[1]

اور زہیر کے اس شعر سے ان کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی کا پتا چلتا ہے : ؎

وَ اِنَّ الْحَقَّ مَقْطَعُهُ ثَلَاثٌ
يَمِيْنٌ اَوْ نِفَارٌ اَوْ جِلَاءٌ

ان کے علاوہ ایک جاہلی شاعر کا یہ مشہور شعر ہماری درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے : ؎

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ
اَدِيْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

غرض سخنِ عشق کی آواز جاہلیت کے بے نور اور گھناؤنے دور میں بھی کہیں کہیں اُٹھ رہی تھی مگر اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے موجودہ مادہ پرستانہ ماحول میں صدائے حق کی ہے اور عربوں کا عام مذاق ذوقِ حق پرستی سے قطعی نا آشنا تھا۔

مدینہ منورہ کے مشرک قبائل اوس و خزرج کی دینی حالت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ صدیوں پہلے جنوبی عرب (یمن) سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سیل العرم کے زمانہ میں جو لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے، اوس و خزرج بھی انھیں میں سے تھے۔ انھوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور یہود سے عہد و پیمان کر لیا تھا۔[2]

بعثتِ نبویؐ کے وقت ہندوستان کے ہندو اپنی تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہو چکے تھے۔ اس دور کو اہلِ تاریخ نے "پُرانک دور" کا نام دیا ہے۔ جس میں ویدا ور گوتم بدھ کی تعلیم کے بجائے پُرانوں کی تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تھا۔ یہ دَور بدھ ازم کے دورِ تنزل سے مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک جاری رہا۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ دَور قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور تھا۔ اس عہد میں بُت پرستی اوجِ کمال کو پہنچ گئی۔ مندر اور عبادت گاہیں زنا و فحش کاری کے اڈے بن گئیں اور مندر کے پجاری ایسے اخلاق سوز اعمال کا ارتکاب کرنے لگے کہ ان کے تصور ہی سے انسانی رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ غرض ہندوستان میں ہندوؤں کی دینی اور اخلاقی حالت بھی اس انتہائی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ اس کی صلاح کی کوئی توقع نہ رہی تھی۔

نظامِ تمدن کی ہیبت ناکیاں انسانی تمدن و اجتماع اگر کسی پاکیزہ اور بلند اخلاقی تصور پر مبنی نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ بیہمانہ طبقاتی نزاع، خود غرضانہ گروہ بندی، ملت کش مفاد پرستی، ظالمانہ سیاست اور معاشی نامساوات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس بات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا پاکیزہ نصب العین دینِ حق کے سوا کسی دُوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتا اور جہاں دین کی رُوح کا فقدان ہو، وہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے مقصد وجود اور حقیقی نصب العین کو جان سکے۔ لیکن سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت

---

[1] اغانی تذکرہ نابغہ جلد ۹ [2] ابن کثیر ص ۲۲۴

دنیا کی تمام قومیں دین کی حقیقی رُوح سے محروم اور لذتِ حق پرستی سے ناآشنا تھیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی سیاست و معیشت اور عمران و تمدن کا پُورا نظام انتشار و فساد کی نظر ہو گیا تھا۔ ظہر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس۔ (الآیہ)
انسانی تاریخ کا یہ دور غیر الٰہی حاکمیت کے جبرِ استبداد، سرمایہ پرستانہ ذہنیت کی سفاکی، ظالمانہ اور فاسقانہ معاشرت اور ہمہ گیر فساد، انسانیت کا ایک ایسا ہیجانی دور تھا، جس کی مثال ماضی کی پوری تاریخ میں بہ مشکل ہی مل سکتی ہے۔ بادشاہوں کی قبا، زریں فاقہ کش اور مفلوک الحال عوام کے خونِ ناحق سے رنگین تھی اور ان کے تختِ زرنگار ہزاروں انسانوں کی لاشوں پر بچھائے گئے تھے۔ امراء و حکام ملک کا خون چوس رہے تھے۔ چاروں طرف ظلم و معصیت کا طوفان بپا تھا۔ قلب و نظر کی صلاحیتیں مٹ گئی تھیں۔ نیکی کو بُرائی اور بُرائی کو نیکی تصور کیا جانے لگا تھا۔ انسانی طبائع شر و فساد سے مانوس ہو گئی تھیں اور اخلاق و شرافت کے لیے دنیا کے کسی گوشہ میں پناہ گاہ نہ رہی تھی اور حد یہ کہ چند گنے چُنے انسانوں کو چھوڑ کر کسی انسانی دل میں حق کی طلب و جستجو کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی، سے

مشرق خراب مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجو

یہ حالات تھے جن میں خالق کائنات نے اپنے آخری نبی احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعہ اس ظلمت کدۂ عالم کو نورِ ہدایت سے روشن کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی اقوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مفاسد کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ بعثت میں اجتماعی اور تمدنی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور آپ کو کن کن عملی مسائل سے سابقہ پڑا؛ اس کے بعد ہم کسی ایک نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ عصرِ حاضر کے انسانی مسائل وہی ہیں، جو اس دور میں تھے یا ان سے متاثر ہیں؟

زہرناک قومی تعصب اور بے قید سیاست بعثت نبویؐ کے وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی قوموں کا اجتماعی کردار پستی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا تھا۔ ان کی سیاست بے اصولے پن، نسل کشی، قومی عصبیت، تخریب پسندی، سفاکانہ حملہ و ہجوم اور بے دردانہ قتل و غارت کے لیے وقف تھی اور ان کے معاشی منصوبوں کا انحصار آوارہ گردی، غارت گری اور لوٹ مار کی متنوع اسکیموں پر تھا اور ان کی معاشرت ظالمانہ اور انسانیت کُش قوانین پر مبنی تھی۔ چنانچہ اس دور کی متمدن قوموں، روم و ایران اور ہند و چین کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ اگر تہذیب و تمدن اسی کا نام ہے تو پھر وحشت و بہیمیت کے لیے کون سا نام تجویز کیا جائے؟

روما کی حکومت اس وقت دو بازوؤں میں تقسیم ہو چکی تھی، "مغربی بازو" اور "مشرقی بازو"۔ مغربی بازو اخلاقی طور پر تسفل و انحطاط کے انتہائی نقطہ پر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مورخ گبن لکھتا ہے:

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی تباہی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و تباہی سے نہیں بچا سکتی تھی۔"

نیز مورخ مذکور لکھتا ہے:

"رومن حکومت مخالفین کی نظر میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالم اور ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کفایت شعاری جتنی ضروری ہوتی جا رہی تھی، اسی قدر اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے، اسی نسبت سے ٹیکسوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔"[1]

اس سیاسی بدنظمی اور اخلاقی پستی کا نتیجہ تھا کہ جرمنی کی وحشی اقوام نے مغربی بازو کو کچل کر رکھ دیا اور گو ان حملہ آور جرمنوں نے عیسائیت قبول کر لی مگر قبولِ مذہب ان کے سفاکانہ اور وحشیانہ مظالم میں کوئی کمی نہ کر سکا۔

سلطنت روما کے مشرقی بازو کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ چونکہ اس کی سرحدیں مملکتِ ایران سے ملتی تھیں، اس لیے یہ ہمیشہ اہلِ ایران سے اُلجھا رہا اور پے بہ پے جنگوں نے اس کو بالکل نچوڑ دیا تھا۔ عہدِ نبویؐ کے آغاز میں ایرانیوں نے اہلِ روم کو عبرتناک شکست دی تھی اور ان کے اہم صوبوں مصر و شام و فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا اور ۶ھ یعنی صلح حدیبیہ کے زمانہ میں رومیوں نے اہلِ ایران کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکے لیکن بیزنطینیوں کے داخلی مفاسد نے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اس فتح عظیم سے فائدہ اٹھاتے۔

رومیوں اور ایرانیوں کی خونریز لڑائیوں میں جو چیز سب سے زیادہ افسوسناک تھی، وہ یہ ہے کہ ان کی قومی عصبیت اور مذہبی جنون اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ انسانیت و شرافت کی کوئی قدر ان کی نظر میں مستحقِ احترام نہ رہی تھی اور مذہب و اخلاق کی پامالی کا خوفناک سے خوفناک منظر بھی ان کے دلوں کو پسیجنے کے لیے کافی نہ تھا۔ چنانچہ خسرو پرویز نے جب فلسطین پر حملہ کیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو نذرِ آتش کر دیا اور بے دردی سے ہزارہا عیسائیوں کو تہ تیغ کیا اور جو بچے کھچے تھے، ان کو گرفتار کر لیا۔ اسی طرح رومی سلطنت کے حکمران ہرقل نے جب شمال کی طرف سے ایران پر حملہ کیا تو اس نے بھی جوابی طور پر مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کیا اور لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔

یہ کوئی اتفاقی واقعات نہ تھے بلکہ یہ وحشت و بہیمیت اس دور کی اقوام کے قومی کردار کا جزو لاینفک بن گئی تھی اور اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے واقعات منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ چنانچہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ایک سو سال پہلے کا ایک واقعہ جس کو اسلامی مورخوں نے قلمبند کیا ہے، یہ ہے کہ یمن کے ذونواس نامی یہودی بادشاہ نے نجران کے عیسائیوں کو جبری حکم دیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ کر یہودی بن جائیں اور اہلِ نجران کے انکار پر اس نے نجرانی عیسائیوں کو دہکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا تھا۔[2] نجران کے کچھ لوگ جو اس آزمائش سے بچ نکلے تھے، حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے اور داستانِ ظلم پوری کی پوری سنائی۔ نیز انجیل کے جلے ہوئے اوراق بھی دکھائے اور نجاشی سے انتقام کی درخواست کی۔ اس پر نجاشی نے قیصر سے مدد طلب کی اور بہت بھاری مسلح فوج لے کر یمن پر حملہ آور ہوا۔ ذونواس کو عبرتناک شکست ہوئی اور اب یمن پر باقاعدہ عیسائی حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن ان عیسائی حکمرانوں میں سے ابرہہ نامی ایک حکمران نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کچھ ہی دن پہلے کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی غرض سے مکہ پر چڑھائی کی تھی جس کا اجمالی ذکر قرآن حکیم میں بھی موجود ہے۔

---

[1] تاریخ زوال و انحطاط روما جلد دوم

[2] طبری ص ۹۲۵

عیسائی حکومتوں میں یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے تھے، ان کے تصور ہی سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ خود پیروانِ مسیح کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر فرقہ اتنا متعصب اور تنگ نظر تھا کہ دُوسرے فرقوں کی جان اور مال اس کے دستِ تعدی سے محفوظ نہ رہتے تھے یہاں تک کہ برسرِ اقتدار طبقہ نے دُوسرے فرقوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ چنانچہ گبن لکھتا ہے، جب حکمران طبقہ سے مسلمانوں کی جنگ شروع ہوئی، تو دُوسرے فرقے کے عیسائیوں نے باہر سے آنے والے اجنبی مسلمانوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور جی کھول کر اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد دی اور مسلمانوں کے ماتحت رہنا ان کو دُوسرے عیسائی فرقوں کے ماتحت رہنے سے اچھا معلوم ہوتا تھا۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت چین اور ہندوستان جو ایشیائی ممالک میں اپنی قدیم تہذیب اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، ایک عبوری دَور سے گزر رہے تھے اور نہایت خطرناک قسم کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ ہند کے برہمنوں اور بدھ ازم کے علمبرداروں میں ایک مدت سے کش مکش چل رہی تھی اور بالآخر برہمنیت کے جبر و تشدد نے بدھ ازم کو ملک بدر کر دیا تھا اور آخر الذکر نے چین میں جا پناہ لی تھی۔ لیکن چین میں پہلے سے فتنوں کی بھرمار تھی اور بڑی مشکل سے اس کو وہاں قدم جمانے کی اجازت ملی۔

یہ تو دُوسری اقوام کے حالات تھے لیکن خود عرب قوم جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اجتماعی اور سیاسی اعتبار سے اس کی حالت بھی کچھ کم تشویشناک نہ تھی۔ یہ ایسی خودسر قوم تھی کہ اس میں قومی مرکزیت کا کبھی احساس ہی نہیں پیدا ہوا تھا اور اس وجہ سے یہاں کوئی متحدہ عرب سٹیٹ قایم نہ ہو سکی تھی۔ اس ملک میں بیسیوں قبائل آباد تھے اور ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا۔ بڑے بڑے شہروں میں اعیانیت کے طرز کی شہری مملکتیں قایم تھیں۔ پڑوس کے حکمرانوں کی للچائی ہوئی نگاہیں گاہے گاہے اس آزاد خطۂ ارضی کی طرف اٹھتی رہیں اور شاہانِ روم و ایران کی طرف سے بارہا کوشش کی گئی کہ اس خودسر قوم کو ہتھیا یا جائے، لیکن وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ عثمان بن الحویرث کو جب قیصر نے مکہ کی بادشاہت کی سند عطا کی اور اس نے واپس آکر مکہ میں اعیانِ قریش کے اجتماع میں قیصر کا پیغام سُنایا تو اس بات کے باوجود کہ اہلِ مکہ کا معاشی مفاد اہلِ روم و شام سے وابستہ تھا، انھوں نے کھلے طور پر انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ اہلِ مکہ ہمیشہ سے آزاد و خود مختار رہے ہیں اور وُہ ہرگز کسی کی آمریت کو پسند نہیں کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ قیصر نے مکہ والوں کو شام کے تجارتی سفر سے روک دیا مگر یہ انتقامی اقدام بھی اہلِ مکہ کو بیرونی طاقت کی غلامی پر مجبور نہ کر سکا۔ غرض عربوں میں ایک طرف اگر یہ خُوبی تھی کہ وُہ حریت نواز اور جمہوریت پسند تھے، تو دوسری طرف مرکزیت کے فقدان نے ان میں انتہائی درجہ کی بہیمیت و خودسری اور قبائلی عصبیت پیدا کر دی تھی اور اس جاہلی عصبیت نے سرزمینِ عرب کو صدیوں تک قتل و غارت اور سفاکی و خون آشامی کی آماجگاہ بنائے رکھا۔ اس ملک میں انسانی جان کی قیمت مکھی اور مچھر کے برابر بھی نہ تھی۔

نیز آزادانہ بدوی زندگی نے عربوں میں کچھ اچھے جوہر بھی پیدا کر دیے تھے۔ مثلاً ہمت و پامردی، شجاعت و بسالت، عزتِ نفس، فیاضی کی قسم کی صفات ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئے تھے۔ لیکن زندگی کا کوئی پاکیزہ تصور نہ ہونے کی وجہ سے ان کی یہ صفات اصلاح و تعمیر کی جگہ تخریبِ انسانیت کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ دُوسرے قبیلہ والوں سے نہایت حقیر اور معمولی بات پر اُلجھ جاتے اور دونوں کی طرف سے سینکڑوں انسانی لاشیں فرشِ خاک پر ڈھیر ہو جاتیں۔ چنانچہ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی جو حرب بسوس کے

---

[1] تاریخ زوال و انحطاط روما

نام سے متعارف ہے، صرف اتنی سی بات پر چھڑ گئی تھی کہ لبوس نامی عورت کی اُونٹنی دُوسرے فریق کی چراگاہ میں داخل ہُوئی اور اس نے پناہ دیے ہُوئے پرندوں کے انڈے توڑ دیے۔ اس پر کلیب وائل نے اُونٹنی کو ہلاک کر دیا اور اس کے نتیجہ میں بکر اور تغلب کی جنگ چھڑ گئی، جو چالیس سال تک جاری رہی۔

قبیلوی عصبیت نے ان کو خیر و شر اور نیک و بد کے احساس و شعور سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ قتل و غارت گری، ظلم و معصیت اور دیگر جرائم ان کی نگاہ میں عیب نہ تھے بلکہ قابلِ فخر کارنامے تصوّر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر اپنی نسبت لکھتا ہے :-

و انی لا ازال اخا حروب

اذا لم اجن کنت مجن جان

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایامِ جوانی میں قریش اور قبیلہ قیس کے درمیان بڑے عرصہ تک جنگ جاری رہی جو حرب فجار کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ نے دونوں طرف سے کئی خاندان برباد کر دیے تھے۔ مدینہ کے قبائل اوس اور خزرج ہمیشہ باہم جنگ آزما رہتے تھے اور زمانۂ بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے بعاث کی لڑائی سے فارغ ہُوئے تھے۔

غرض عرب کی داخلی سیاست کی اصلاح کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہ تھا جو کسی سیاسی رہنما کی ذہنی اُپج سے حل ہو جاتا اور اس پر مستزاد یہ کہ عرب کا محلِ وقوع بھی ایسا تھا کہ وُہ ہر طرف سے اس وقت کی بڑی طاقتوں میں گھرا ہوا تھا اور ان متمدن طاقتوں کے سیاسی اور معاشی دباؤ سے عرب بڑی حد تک متاثر تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے عرب کے تاریخی پس منظر کو سامنے لانا ضروری ہے۔ عرب کسی زمانہ میں ایشیا و یورپ کے ممالک کے لیے تجارتی گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور خود عربوں کی زلیست کا ذریعہ بھی بیرونی تجارت ہی تھی۔ عرب ہمیشہ سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک مصر و شام، مشرقی افریقہ، عراق و فلسطین اور ہند و چین کا سفر کرتے تھے، بلکہ عرب کی قدیم تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ یہ مردم خیز خطۂ ارضی اپنے باشندوں کو آب و دانہ کے لیے ہمیشہ باہر دھکیلتا رہا ہے اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ عرب کی سرزمین کا بڑا حصّہ پیداوار کی کمی کی وجہ سے خود مکتفی نہ تھا اور ان لوگوں کو طوعاً و کرہاً معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اپنی بے آب و گیاہ مرز بوم کو چھوڑ کر سرسبز و شاداب ممالک کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ عرب کی قدیم ترین تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مسیحؑ سے دو تین ہزار سال قبل عرب کی کچھ قومیں صحرائے عرب سے نکل کھڑی ہُوئیں اور انسانی آبادیوں کو پامال کرتی ہوئی آندھی کی طرح آناً فاناً دنیا کے بہت بڑے حصّہ پر چھا گئیں۔ ان قوموں نے بیشتر ممالک مثلاً مصر و شام، مشرقی افریقہ، ایران و عراق، قرطاجنہ، کریٹ اور یونان کو زیرنگیں کیا اور بڑی بڑی مملکتیں قایم کیں۔ چنانچہ ابن خلدون نے لکھا ہے :

وکان لھذہ الامم ملوک و دول فی جزیرۃ العرب وامتد ملکھم فیھا الی شام و مصر فی شعوب منھم۔ (تاریخ ابن خلدون ج ۲)	ان اقوام میں کئی بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جزیرہ عرب میں ان کی بڑی بڑی سلطنتیں قایم تھیں اور ان کے کچھ قبائل کی وسعتِ مملکت مصر و شام تک پہنچ گئی تھی۔

یہ قومیں وہی ہیں، جن کو قرآن حکیم نے عاد اولیٰ کے نام سے موسوم کیا ہے اور قدیم عربی تاریخ میں عرب عاربہ (خالص عرب) اور عرب بائدہ (تباہ ہونے والے عرب) کے ناموں سے متعارف ہیں۔ اور امم سامیہ اُولیٰ میں سے جو لوگ عرب ہی میں رہ گئے تھے، انھوں

نے عرب کے شمال میں عظیم مملکت قایم تھی۔ قرآن حکیم نے ان کو "ثمود" کا نام دیا ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں نے قوموں کو ایک ہی حال میں کب رہنے دیا ہے؛ شاید یہ بات منشاءِ خداوندی کے خلاف ہے کہ ایک ہی قوم ہمیشہ کے لیے انسانی دنیا پر مسلط رہے۔ اس لیے اس قوم کا اقتدار بھی آخر کچھ سامی النسل قوموں کے ہاتھوں ختم ہوا۔

یقال انھم انتقلوا الی جزیرۃ العرب من بابل لما زاحمہم فیہا بنو حام۔ (کتاب العبر جلد ۱)

کہا جاتا ہے کہ وہ بابل سے جزیرۂ عرب کی طرف منتقل ہو گئے جبکہ حامی النسل لوگوں نے ان کو مار بھگایا۔

اسی طرح مصر میں قبطی اقوام نے نئی حکومت قایم کرلی اور دوسرے ممالک میں بھی ان کا شاہانہ اقتدار مٹ گیا۔ ان کے بعد عراق و یمن و شام میں مختلف قومیں برسرِ عروج رہیں۔ یہاں تک کہ روما کی عیسائی سلطنت نے مصر و شام اور فلسطین پر تسلط قایم کر لیا اور عراق و یمن اہلِ فارس کے زیرنگیں آ گئے۔ لیکن چونکہ ایران و روم میں مسلسل آویزش رہتی تھی اور اس کے علاوہ عرب کے خانہ بدوش بدوی قبائل عراق اور شام میں داخل ہو کر لوٹ مار کرتے تھے۔ اس لیے ایرانی حکومت نے مصلحت اندیشی کے طور پر عراق میں عرب اسٹیٹ قایم کردی اور روما نے دمشق میں عربوں کی ایک ریاست قایم کردی۔ یہ ریاستیں جن سیاسی اغراض کے لیے قایم ہوئی تھیں، ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئیں اور نہ صرف یہ کہ ان سرحدی ریاستوں نے حاجزِ مملکت (بفراسٹیٹ) کا کام دیا اور ایرانی و بیزنطینی عرب بدوؤں کے غارت گرانہ حملوں سے محفوظ ہو گئے، بلکہ ایران و روم کی جنگوں میں ان ریاستوں کے لوگ اپنے اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت سردھڑ کی بازی لگا دیتے اور میدانِ جنگ میں پیش پیش رہتے تھے۔ بالآخر بیزنطینیوں کا اثر و نفوذ یہاں تک بڑھا کہ شمالی عرب کے بہت سے قبائل مثلاً دومۃ الجندل، اذرح، جربا وغیرہ نے عیسائیت قبول کرلی اور بیزنطینی حکومت نے یہاں بھی کچھ عرب سرداروں کی ریاستیں قایم کردیں اور اس طرح اس نے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا تھا۔ اسی طرح عراق اور یمن پر ایرانی تسلط بھی دعوتِ نبویؐ کے لیے مستقل خطرہ تھا۔

غرض عرب کی خارجہ سیاست کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ محض سیاسی بصیرت اور عقل و تدبر سے اس کو حل نہ کیا جا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے پیغمبرانہ بصیرت اور الہامی طریق کار کی ضرورت تھی۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ عرب اور بیرونِ عرب کا معاشی مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہ رکھتا تھا اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو ملک سیاسی لحاظ سے شدید انتشار و ابتری کا شکار ہو یا پے بہ پے جنگوں نے اس کے ملکی نظام کو درہم برہم کر دیا ہو، وہاں معاشی حالت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور پھر آمرانہ طرزِ حکومت میں دولت کی نامساویانہ تقسیم ایک ناگزیر اور طبعی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کی قومیں مطلق العنان حکمرانوں یا قبائلی سرداروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں۔

یہ باتیں تو تمام ممالک میں مشترک تھیں لیکن عرب کا معاشی مسئلہ دوسرے ممالک کی نسبت سے بہت زیادہ الجھا ہوا تھا کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ملک کے پیداواری ذرائع کے فقدان نے عربوں کو ہمیشہ پریشان حال رکھا۔ اس ملک کی پیداوار کھجور تھی۔ بعض علاقوں میں غلہ کی کاشت ہوتی تھی لیکن وہ اتنی نہ تھی کہ دوسرے علاقوں کے لیے برآمد کی جا سکے۔ نیز بکریوں اور اونٹنیوں کا دودھ بھی صحرائی لوگوں کی غذا کے کام آتا تھا۔ زیادہ تر یہ لوگ لوٹ مار اور غارت گری کے ذریعہ تنورِ شکم کے لیے ایندھن مہیا کرتے تھے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اگر ان کو چولھے کے لیے پتھر کی ضرورت ہوتی تو کسی مکان کی دیوار توڑ ڈالتے اور اگر لکڑی کی ضرورت پڑتی تو کسی مکان کی چھت اکھاڑ لیتے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری اخلاقی نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی معیوب کیوں نہ ہو لیکن ان کی نظر میں معیوب نہ تھی بلکہ ان کو اپنے اس ظالمانہ کردار پر ناز تھا اور اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا ذریعہ معاش بیرونی ممالک کی تجارت تھی۔

نیز ملک کے طول و عرض میں یہودی سرمایہ دار پھیلے ہوئے تھے۔ تجارت کی اہم منڈیوں پر ان کا قبضہ تھا اور اس کے علاوہ یہ لوگ وسیع پیمانہ پر سودی کاروبار بھی کرتے تھے۔ عرب عوام ان کے قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور یہودی بنیے نہایت گراں شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ ان درندہ صفت انسانوں کی سنگدلی کا یہ حال تھا کہ ضمانت کے طور پر لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو گرد رکھتے تھے۔

اس اجمالی بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے عوام کی معاشی زندگی حد درجہ پست تھی اور قوم کو اس خوفناک افلاک و فاقہ مستی سے نکالنا ملک کا اہم اجتماعی و ملّی سوال تھا۔

عربوں کے معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقی و مجلسی مفاسد اس درجہ گہرے اور خطرناک تھے کہ عام حالات میں ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ بلند و پست، اونچ نیچ اور شریف و وضیع کا امتیاز ان کی قومی روایات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور اخلاقی و مجلسی مفاسد کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ یہ مسئلہ ایک مستقل موضوع بحث ہے اور اس کے تفصیلی گوشوں سے بحث کرنا اس موقع پر مشکل ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

طائف کی سفارت نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف باریابی حاصل کیا تو انھوں نے کہا ہم اس شرط پر اسلام قبول کرتے ہیں کہ ہمارے یہ مطالبات تسلیم کیے جائیں۔ پہلے یہ کہ زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے کیونکہ ہم میں اکثر لوگ مجرد زندگی بسر کرتے ہیں اور زنا کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ دوسرے شراب سے منع نہ کیا جائے کیونکہ یہ ہماری قومی تجارت ہے۔ تیسرے سودی کاروبار کی مخالفت سے ہمیں مستثنیٰ کیا جائے، کیونکہ یہ ہمارا ذریعۂ معاش ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام شرطیں نامنظور کیں۔ لیکن اس واقعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مجلسی زندگی کس قدر بے لگام اور معصیت آلود تھی۔

عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی یہی حال تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لیجیے۔ یہاں ذات پات کی تفریق اور نامنصفانہ مجلسی قوانین نے آبادی کو کئی طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ کسی اونچی ذات کا مرد اگر کسی نیچی ذات کی عورت سے زنا کرتا تو اس کے لیے کوئی سزا نہ تھی۔ لیکن کسی اعلیٰ ذات کو اچھوت نسل کا آدمی چھو لیتا، تو اس کی سزا موت تھی۔ اس ملک کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ عورتیں جوئے میں ہاری جاتی تھیں۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے۔ قومی تہواروں میں شراب کے دور چلتے تھے اور نشہ کی حالت میں ماں، بہن اور بیٹی کی تمیز نہ رہتی تھی اور اس پر طرفہ یہ کہ اس کام کو نیکی کا کام تصور کیا جاتا تھا۔

یہود کے اخلاقی اور مجلسی مفاسد کو قرآن حکیم نے بالوضاحت بیان کیا ہے۔

نتائج بحث و فکر گزشتہ بحث سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت انسانی زندگی کے اجتماعی مفاسد کیا تھے؟ ان مفاسد پر دوبارہ سرسری نگاہ ڈال لیجیے تاکہ آپ کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے کہ عصر حاضر کے

اجتماعی مفاسد کو اس دور کے مفاسد سے کیا نسبت ہے ؛

۱ ——— بے مقصد اور بے روح مذہبیت ! یعنی اس دور کی تمام قومیں اگرچہ کسی نہ کسی مذہب کی پیرو تھیں، لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی دین کی روح سے بالکل تہی مایہ تھی اور یہی وُہ بنیادی فساد تھا جس نے ان لوگوں کی نگاہ سے زندگی کا حقیقی تصور بالکل اوجھل کر دیا تھا اور اگر غور سے دیکھا جائے، تو دیگر تمام مفاسد کا سرچشمہ یہی ہے ۔

۲ ——— شدید نسلی و قومی تعصب ۔ اس دور میں سطح ارضی پر سینکڑوں چھوٹی بڑی قومیں آباد تھیں اور ہر قوم اس زعم میں مبتلا تھی کہ عظمت و شرف اور فضیلت و منقبت کے تمام محاسن و کمالات صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں اور دوسرے لوگ محض اس کی محکومی اور ناز برداری کے لیے پیدا ہوئے ہیں ۔ یعنی ہر قوم یہ عقیدہ رکھتی تھی کہ مخلوقِ خدا پر خدائی کرنے کا حق اسی کو حاصل ہے اور دوسری قوموں کا بس یہی کام ہے کہ اس کی بندگی کریں ۔

۳ ——— بے قید سیاست ۔ یعنی اس دور میں زندگی کا اجتماعی اور سیاسی نظام دین کی پابندی سے بالکل آزاد تھا اور اس ثنویت نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں مہلک جراثیم پیدا کر دیے تھے ۔

۴ ——— دولت کی نامنصفانہ تقسیم

۵ ——— ظالمانہ معاشرتی اور مجلسی رسم و رواج

اس تفصیل سے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور کے عملی مسائل کیا تھے اور اس بات کو سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ دورِ حاضر کے عملی مسائل بنیادی حیثیت سے دورِ رسالت کے مسائل سے مختلف نہیں ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ چودہ سو سال پہلے کے انسانی دور اور موجودہ دور میں کچھ فرق نہیں ہے ۔ یقیناً فرق ہے اور ہونا چاہیے ۔ لیکن سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے ، وہ صرف اتنا ہے کہ انسانیت کے حقیقی اور بنیادی مسائل میں چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں پڑا ۔ یقیناً آج بھی پیروانِ مذاہب مذہب کی حقیقی سپرٹ سے بالکل محروم ہیں اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آ سکتا کہ یہ کسی دین کے پیرو ہیں ۔ اس طرح اقوامِ عالم کا نسلی اور قومی تعصب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ۔ دین و سیاست کی جدائی ایک مستقل عقیدہ بن چکی ہے ۔ معاشی نامساوات اور معاشرتی مفاسد بھی انسانی سوسائٹی میں گہرا اثر پیدا کر چکے ہیں ۔ لہٰذا جب انسانیت کا مرض وہی ہے ، جو چودہ سو سال پہلے تھا ، تو علاج بھی وہی کیوں نہ ہو ، جو پہلے ایک مرتبہ آزمایا جا چکا ہے ۔ یعنی آج اگر ہم دیانت داری سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایک تابناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے ۔

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول نمبر

نقوش

۴

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲ ٹیلی فون نمبر ۵۲۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

نقوش

رسول نمبر

جلد چہارم

شمارہ نمبر ۱۳۰

جنوری ۱۹۸۴ء

مُدیر:

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

قیمت لائبریری ایڈیشن ، ۱۲۵ روپے
بار دوم

ترتیب

طلوع

ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر

(۱) ہمارا پرچم انقلاب لا الٰہ الّا اللہ ۷
(۲) پیغمبرِ انقلابؐ ۱۶
(۳) رحمتِ عالمؐ کا ہمہ گیر انقلاب ۳۳
(۴) انقلابِ محمدیؐ ۴۰
(۵) آنحضرتؐ کا اسلوبِ دعوت و ارشاد ۴۴
(۶) بندگی کا انقلابی تصوّر ۴۸

علوم انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر

(۱) صدرِ اسلام میں دینی علوم کے ارتقا کا اجمالی جائزہ ۵۷
(۲) عرب اور علومِ طبیہ ۸۹
(۳) طبِ نبویؐ ۹۲
(۴) طبِ رسولؐ ۱۰۱
(۵) اسلامی عہد میں تعلیمِ نسواں
(۶) عہدِ نبویؐ میں نظامِ تعلیم
(۷) عہدِ رسولؐ میں نظامِ تعلیم
(۸) عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ کی تعلیمی سرگرمیاں

(۹) عہدِ نبویؐ میں علمی ترقیاں ۱۴۱
(۱۰) جغرافیہ اسلامی عہد میں ۱۴۶
(۱۱) تاجدارِ عالمؐ کی فصاحت و بلاغت ۱۵۱
(۱۲) دورِ نبویؐ میں عرب قوم ۱۵۹

اخلاقی اصلاح

(۱) اوصافِ رسولؐ ۱۶۳
(۲) جوہرِ خلقِ عظیم ۲۲۸
(۳) رسولِ اکرمؐ کی سیرۃ طیبہ دائمی نمونۂ عمل ہے ۲۳۲
(۴) تاجدارِ مدینہ کی گھریلو زندگی ۲۳۷
(۵) نبی کریمؐ بحیثیت معلّمِ اخلاق ۲۴۱
(۶) شمیم الحبیبؐ ۲۴۹
(۷) جنابِ رسالتمآبؐ کی شگفتہ مزاجی ۲۶۹
(۸) معلّمِ انسانیت کی پسندیدہ غذائیں ۲۷۴
(۹) سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ۲۸۱

ہمارے رسولؐ بہ حیثیت سپہ سالار

(۱) الجہاد فی الاسلام ۲۸۷
(۲) جہاد اور اسلام ۲۹۸
(۳) غزواتِ نبویؐ ۳۱۶
(۴) غزواتِ خاتمؐ المرسل ۳۲۳
(۵) مہماتِ رسولؐ ۳۷۲
مہماتِ حضورؐ ۳۷۶
اسلام بزورِ شمشیر کا الزام ۳۷۶
مکّہ میں حضورؐ کی مشکلات ۳۷۷
بعد از ہجرت ۳۷۹
دفاعی تدابیر ۳۸۱

	مہمات کی قسمیں	۳۸۱
۱	سریّہ حمزہؓ بن عبد المطلب	۳۸۲
۲	عبیدہؓ بن حارث کی مہم	۳۸۲
۳	سعدؓ بن ابی وقّاص کی مہم	۳۸۳
۴	غزوۂ ابوا	۳۸۳
۵	غزوۂ بُواط	۳۸۴
۶	غزوۂ تلاشِ کُرز	۳۸۴
۷	غزوۂ ذی العُشیرہ	۳۸۴
۸	عبداللہؓ بن جحش کی مہم	۳۸۵
۹	غزوۂ بدر	۳۸۶
۱۰	غزوۂ بنی قَینُقاع	۳۸۸
۱۱	غزوۂ سَویق	۳۹۱
۱۲	غزوۂ قُرقُرۃُ الکُدر	۳۹۲
۱۳	غزوۂ غَطَفان	۳۹۳
۱۴	غزوۂ بنو سُلیم	۳۹۳
۱۵	زیدؓ بن حارثہ کی مہم	۳۹۳
۱۶	غزوۂ اُحد	۳۹۴
۱۷	مہمِ قَطَن	۳۹۷
۱۸	وادی عُرنہ کی مہم	۳۹۷
۱۹	بئرِ معُونہ کی مہم	۳۹۸
۲۰	رَجیع کی مہم	۳۹۹
۲۱	غزوۂ بنو نضیر	۴۰۰
۲۲	غزوۂ بدر الموعِد	۴۰۰
۲۳	غزوۂ ذات الرِّقاع	۴۰۱
۲۴	غزوۂ دُومۃُ الجندل	۴۰۱
۲۵	غزوۂ مُریسیع	۴۰۱

۲۶	غزوۂ احزاب	۴۰۲
۲۷	غزوۂ بنو قُریظہ	۴۰۴
۲۸	مہم قُرطا	۴۰۴
۲۹	غزوۂ بنو لحیان	۴۰۴
۳۰	غزوۂ غابہ	۴۰۵
۳۱	عُکاشہ کی مہم	۴۰۵
۳۲	مہم ذُوالقصّہ	۴۰۵
۳۳	مہم جموح	۴۰۶
۳۴	مہم عیص	۴۰۶
۳۵	مہم طَرَف	۴۰۶
۳۶	مہم حِسمیٰ	۴۰۶
۳۷	سریۂ دُومۃ الجندل	۴۰۶
۳۸	مہم فدک	۴۰۷
۳۹	مہم ابنِ عتیکؓ	۴۰۷
۴۰	مہم عبداللہؓ بن رواحہ	۴۰۷
۴۱	مہم کرز بن جابر	۴۰۷
۴۲	عمروؓ بن اُمیہ کی مہم	۴۰۸
۴۳	غزوۂ حُدَیبیہ	۴۰۸
۴۴	غزوۂ خیبر	۴۰۹
۴۵	مہم فدک	۴۱۰
۴۶	مہم تُربہ	۴۱۱
۴۷	مہم بنی کلاب	۴۱۱
۴۸	مہم بشیرؓ ابنِ سعد	۴۱۱
۴۹	مہم مَیفعہ	۴۱۱
۵۰	مہم اُلجناب	۴۱۱
۵۱	مہم ابن ابی العوجاؓ	۴۱۲

۵۲	مہمِ کدید	۴۱۲
۵۳	مہمِ بنو مُرّہ	۴۱۲
۵۴	مہمِ رسیّ	۴۱۲
۵۵	مہمِ کعب بن عُمیر	۴۱۳
۵۶	مہمِ مُوتہ	۴۱۳
۵۷	مہمِ ذاتُ السّلاسِل	۴۱۳
۵۸	مہمِ خَبَط	۴۱۴
۵۹	مہمِ خُضَرَہ	۴۱۴
۶۰	فتحِ مکّہ	۴۱۴
۶۱	عُزّیٰ کی تباہی	۴۱۵
۶۲	سُوَاع کی تباہی	۴۱۵
۶۳	مَناۃ کی تباہی	۴۱۵
۶۴	غزوہٴ حُنَین	۴۱۵
۶۵	غزوہٴ طائف	۴۱۶
۶۶	مہمِ بنو تمیم	۴۱۶
۶۷	مہمِ قُطبہ بن عامر	۴۱۷
۶۸	مہمِ بنی کلاب	۴۱۷
۶۹	مہمِ علقمہؓ	۴۱۷
۷۰	مہمِ الفُلس	۴۱۷
۷۱	غزوہٴ تبوک	۴۱۷
۷۲	مہمِ یمَن	۴۱۸
۷۳	آخری حج	۴۱۸
۷۴	مہمِ اُسامہؓ	۴۱۸
۷۵	غیر اہم مہمّات	۴۱۹
	حرفِ آخر	۴۲۰
	ضمیمۂ اوّل ۔ قبائل	۴۲۲

ضمیمہ دوم - مقامات ۴۲۸
ضمیمہ سوم - حضورؐ کے مقرر کردہ عُمّال ۴۲۹
ضمیمہ چہارم - اشاریہ حواشی ۴۳۰
کتابیات ۴۳۲

ہمارے رسولؐ غیر مسلموں کی نظر میں

(۱) ظہورِ قدرت ۴۳۳
(۲) کتبِ سابقہ کی بشارتیں ۴۳۸
(۳) قرآن، اسلام اور رسول اللہؐ غیر مسلموں کی نظر میں ۴۴۷
(۴) سرورِ کائناتؐ (غیر مسلم مفکرین کی نظر میں) ۴۸۰
(۵) دینِ رسولؐ اور دیگر مذاہب ۵۰۱
(۶) شانِ محمدؐ بزبانِ بائیبل ۵۲۶
(۷) آنحضرتؐ کی نسبت بعض عیسائیوں کی رائے ۵۲۹
(۸) سیّدالانبیاؐ ۵۳۹
(۹) محمدؐ اور عیسیٰؑ ۵۴۸
(۱۰) برناڈ شا اور عرب ۵۵۰
(۱۱) ہندوؤں کی کتبِ مقدسہ میں بشاراتِ آنحضرتؐ ۵۵۵

متعلقاتِ سیرت

(۱) سیّدالمرسلینؐ کا بچپن ۵۶۱
(۲) خُلقِ عظیم ۵۷۲
(۳) وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمين ۵۸۰
(۴) اردو میں احادیث کے محاورے ۵۹۰
(۵) دربارِ رسالتؐ کا پیغمبرانہ طمطراق ۶۲۳
(۶) ہجرتِ رسولؐ ۶۲۷
(۷) حیاتِ نبویؐ میں غاروں کی اہمیت ۶۳۴

(۸) پیغمبرؐ پر سحر	۶۴۱
(۹) حیاتِ رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ	۶۴۷
(۱۰) محفلِ میلاد النبیؐ	۶۴۹
(۱۱) مہرِ حجاز	۶۵۱
(۱۲) حضورِ اکرمؐ اور تعددِ ازدواج	۶۵۴
(۱۳) رحمتِ عالمؐ کا لایا ہوا نظامِ حیات	۶۶۸
(۱۴) آدابِ رسولؐ	۶۸۳
(۱۵) ظہورِ قدسی	۷۰۴
(۱۶) نبیؐ اُمّی کا مفہوم	۷۰۸
(۱۷) بارگاہِ نبویؐ میں	۷۱۵
(۱۸) تصویرِ ہجرت	۷۲۴
(۱۹) رسولؐ اللہ کے عہد کا اقتصادی اور معاشی نظام	۷۳۰
(۲۰) گنجِ شائگاں	۷۳۹
(۲۱) انسانیت کا منشورِ آزادی	۷۴۳
(۲۲) حجۃ الوداع	۷۴۷

محمد طفیل پرنٹر، پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

مَیں نے ۱۹۶۴ء میں "آپ بیتی نمبر" چھاپا تھا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اپنی ضخامت کے اعتبار سے، میرا سب سے قیمتی اور ضخیم پرچہ تھا، جو ۱۹۶۴ء کی رعایت سے ۱۹۶۴ صفحات کا تھا۔

اُس نمبر میں دُنیا کی تقریباً تمام بڑی شخصیتوں کی آپ بیتیاں تھیں، جو مجھے اُن موجود شخصیتوں نے خود بھجوائی تھیں یا اُن کے سیکرٹریوں نے، مثلاً امریکہ کے صدر آئزن ہاورنے، ہندوستان کے صدر رادھاکرشنن نے، پاکستان کے صدر جنرل محمد ایوب خان نے۔ ان کے علاوہ آغا خان، ایزرا پاؤنڈ، جواہر لعل نہرو، برٹرینڈ رسل، اہلیا اہرن برگ، طٰہٰ حسین نے ——— اور سرونسٹن چرچل نے، جمال عبدالناصر نے، رضا شاہ پہلوی نے، ملکہ ایلزبتھ نے۔ غرض اس نمبر میں تمام دنیاوی بادشاہوں کے مضامین تھے۔

جب وُہ نمبر شائع ہُوا تو دنیا بھر سے توصیفی خطوط آئے اور مجھے باور کرایا گیا کہ اس سے بہتر پرچہ چھاپنا ناممکن ہے۔ مگر میرے دل میں کوئی اور ہی ارمان تھا، کوئی اور ہی خاکہ تھا۔

آج ۱۹۸۲ء میں، پُورے اٹھارہ برس کے بعد، اپنی محنت کے اعتبار سے، اپنی لگن کے اعتبار سے، وہ حاصلِ زندگی نمبر پیش کر رہا ہُوں کہ جو میرا مُنتہا تھا۔

۱۹۶۴ء میں چھپنے والا نمبر دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں تھا۔ ۱۹۸۲ء میں چھپنے والا یہ نمبر صرف ایک ہستی کے بارے میں ہے جو دنیا کی تمام موجود اور مرحوم شخصیتوں سے اُتم ہے، افضل ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ جس سے دین اور دُنیا کا ٹانکا جُڑا ہوا ہے۔

آج میری وُہ آرزو پُوری ہُوئی، جس کے لیے برسوں بےکل رہا۔ آج میں کہہ سکتا ہُوں کہ حضورؐ سے میری بھی کوئی نسبت ہے۔ اس اعزاز پر خدا کی بارگاہ میں جتنے بھی سجدے کروں، وُہ کم ہوں گے۔

کیونکہ آج میں بھی کسی شمار قطار میں ہُوں!

محمد طفیل

اس شمارے میں

یہ چوتھی جلد ہے۔ تین جلدیں اس سے پہلے پیش کی جاچکی ہیں۔ ایک جلد اور پیش کروں گا، وہ اس لئے کہ جو ضروری عنوانات رہ گئے ہیں یا جو ضروری کام بہ سلسلہ سیرت رہ گیا ہے اُسے پورا کیا جا سکے۔ پانچویں جلد بھی میں اپنے شوق سے پیش کروں گا۔ باقی پانچ جلدیں آپ کے شوق کی پذیرائی میں پیش کروں گا۔ تب میرا منصوبہ مکمل ہو گا۔ مگر ایسا ہونا آپ کی حوصلہ افزائی پر بھی منحصر ہو گا۔ اپنی بساط اسی حد تک تھی۔ وہ بھی اپنے پریس کی ایک مشین بیچ کر! مگر اس پر ملول نہیں، نازاں ہوں!

اس جلد میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت مضامین چھاپے گئے ہیں۔ مثلاً:

۱ —— ایک عظیم انقلاب کا بانی و رہبر
۲ —— علومِ انسانی کے فروغ پر ہمارے رسولؐ کا اثر
۳ —— اخلاقی اصلاح
۴ —— رسولِ اکرمؐ بہ حیثیت سپہ سالار
۵ —— ہمارے نبیؐ غیروں کی نظر میں
۶ —— متعلقاتِ سیرت

چاروں جلدوں میں تین ہزار سے زاید صفحات پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کام کا آغاز ہوا ہے۔ یہ سلسلہ تو اب چلے گا۔ نہ حضورؐ کی صفات گنوائی جا سکیں گی اور نہ نقوش کے صفحات بہ آسانی گنے جا سکیں گے۔

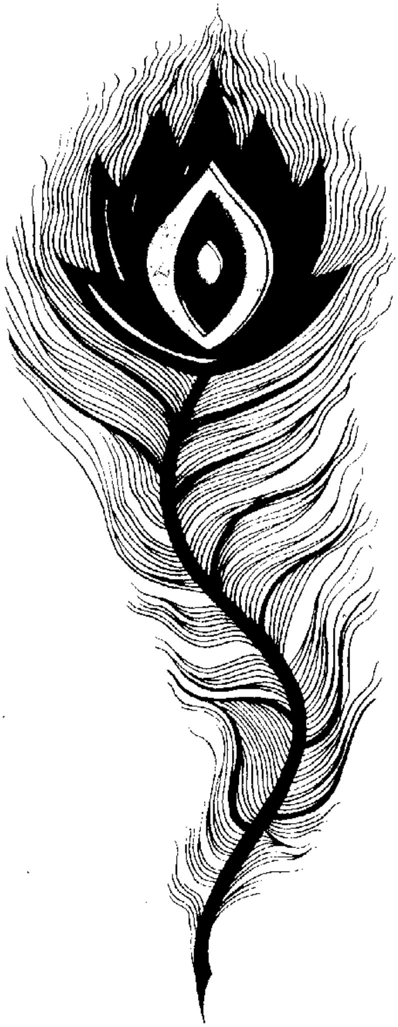
میرا کام تو جب تک سانس ہے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ اگر وقت رسولؐ کے دربار میں گزرے تو میری خوش بختی پر کون رشک نہ کرے گا؟

باقی جو اللہ کو منظور!

محمد طفیل

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

کہ دو کہ حق آ گیا ہے اور باطل چلا گیا ہے، بے شک باطل جانے والا ہی تھا۔
(بنی اسرائیل: ۸۱)



ایک عظیم انقلاب
کا
بانی و رہبر

ہمارا پرچمِ انقلاب — لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

سید قطب شہید

مکّی دور کا بنیادی مسئلہ

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے پورے ۱۳ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدت میں قرآن کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔ قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ نیا اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اسی مسئلہ کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے تمام مسائل میں اولین اہمیت کا حامل ہے عظیم تر مسئلہ تھا، اساسی اور اصولی مسئلہ تھا، عقیدہ کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا، ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان کی عبودیت، اور دوسرے ان کے باہمی تعلق کی نوعیت۔ قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لے کر انسان سے بحیثیت انسان خطاب کرتا رہا کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کو یکساں تعلق ہے وہ چاہے عرب کے رہنے والے انسان ہوں یا غیر عرب۔ نزولِ قرآن کے زمانہ کے لوگ ہوں یا کسی بعد کے زمانہ کے۔ یہ وہ انسانی مسئلہ ہے جس میں کسی ترمیم و تغیر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا مسئلہ ہے۔ انسان کی عاقبت کا مسئلہ ہے۔ اسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہوگا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس کائنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے خالق سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر جزء انسان کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا، اسے کس نے خلعتِ وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟

وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون ہستی ہے

جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے۔ لیکن دیکھ نہیں پاتا؛ اِس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا منتظم و مدبر ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جن کا ہر چشم بینا مشاہدہ کر رہی ہے۔ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے؛ اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنی چاہیے؛ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دار و مدار ہے اور رہتی دنیا تک اسی عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلے کی تحقیق و توضیح میں مکی زندگی کا پورا تیرہ سالہ دَور صرف ہوا۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے، اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن نے مکی دَور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا، اور اس سے صرفِ نظر کر کے نظامِ حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرض نہیں کیا اور اس وقت تک انھیں نہیں چھیڑا جب تک علمِ الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرما دیا کہ اب اِس مسئلہ کی توضیح و تشریح کا حق ادا ہو چکا ہے اور یہ اس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہو چکا ہے، جسے قدرتِ الٰہی اقامتِ دین کا ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جو لوگ دینِ حق کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں اور وہ دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اس دین کی نمائندگی کرے، انھیں اس عظیم حقیقت پر پہروں غور کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے لیے قرآن کریم نے مکی زندگی کے پورے ۱۳ سال صرف کیے اور اس دوران میں کبھی اس سے توجہ ہٹا کر نظامِ زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا، نہ ان قوانین و احکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِ رسالت کا آغاز اسی مسئلہ سے ہوا

یہ عین حکمتِ خداوندی تھی کہ آغازِ رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا محور و مرکز بنایا جائے۔ یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، راہِ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں کہ "لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے"۔ اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں۔ انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں اور انھیں صرف اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بیں نگاہ اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یُوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریقِ دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "الٰہ" اور "لا الٰہ الا اللہ" کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص گرداننے کے صاف معنی یہ ہیں کہ اقتدار پورے کا پورا

کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء و حکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے۔ضمیر و قلب پر، مذہبی شعائر و مناسک پر، معاملاتِ زندگی پر، مال و دولت اور عدل و قضا پر۔ الغرض ارواح و اجسام پر بہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار رہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے، جس نے الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت (حاکمیت) کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ان تمام قوانین اور نظاموں کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے جو اس قبضۂ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں۔ اور ان تمام قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہے جو خانہ ساز شریعتوں کی بدولت دنیا میں کوس لمن الملك بجاتی ہیں۔عرب اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ لا الٰہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی پیشوائی اور قیادت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس دعوت کا' یا بالفاظِ دیگر اس پیامِ انقلاب کا اس تشدد اور غیظ و غضب کے ساتھ استقبال کیا اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمتِ الٰہی نے کس بناء پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قومیت کے نعرے سے کیوں کام کا آغاز نہیں کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دینِ حق کو لے کر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مالدار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیرِ نگیں تھے جن پر عرب حکام رومیوں کے زیرِ سایہ حکومت چلا رہے تھے، جنوب میں یمن کا پورا علاقہ اہلِ فارس کے قبضہ میں تھا، جنھوں نے اپنے ماتحت عرب شیوخ کو فرائضِ حکمرانی سونپ رکھے تھے۔ عربوں کے پاس صرف حجاز اور نجد کے علاقے تھے یا وہ بے آب و گیاہ صحرا تھے جن میں اِکا دُکا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغازِ رسالت سے ۵ اسال قبل اشرافِ قریش حجرِ اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حاکم بنا چکے تھے اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہموطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبہ کو بھڑکاتے۔ اور اس طرح ان قبائلِ عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنہیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت و خون اور انتقام کی چکی میں بری طرح پسے ہوئے تھے۔ حضورؐ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انھیں قومیت کا درس دیتے اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے، عرب قومیت اور عربیت کا پرچم بلند کرتے اور جزیرۂ عرب کے تمام اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست

کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوم پرستی کے نعرہ کو لے کر اُٹھتے تو عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا ہوا لپکتا، اور آپ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپؐ کو ۱۳ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے اور قیادت کا منصب آپؐ کو سونپ دیتے اور اقتدار کی ساری کُنجیاں پُوری طرح آپؐ کے قبضے میں آجاتیں اور رفعت و عظمت کا تاج آپ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپؐ اپنے اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر لے جا کر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے لیکن خدائے علیم و حکیم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس راستہ پر نہیں چلایا، بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور ساتھ ہی متنبہ بھی کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپؐ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

قومی نعرے کو اختیار نہ کرنے کی وجہ

آخر یہ کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں منتخب فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد اور ظلم کا نشانہ بنیں۔ لیکن وُہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوقِ خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پاکر عربی طاغوت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ طاغوت خواہ کوئی ہو وہ طاغوت ہی ہے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس پر صرف اللہ کا ہی اقتدار ہونا چاہیے۔ اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت قایم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف "لا الٰہ الا اللہ" کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیونکر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربی طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔ طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں اور وہ صرف اس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب لا الٰہ الا اللہ کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو، اللہ کے سوا کوئی اور ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے اور اسلام انسانوں کے لیے جس "قومیت" کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر طے ہوتی ہے اور تمام اقوام خواہ کسی رنگ و نسل کی ہوں، عربی یا رومی یا ایرانی، سب کی سب اس عقیدہ کی نگاہ میں پرچم الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی

دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریقِ کار ہے۔

آپؐ نے اقتصادی انقلاب کا طریقِ کار کیوں نہ اختیار کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہوچکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا اور سُودی کاروبار کے ذریعہ اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جارہا تھا۔ اس کے مقابلے میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بُھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزّت و شرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال و دولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزّت و شرافت سے بھی بے بہرہ تھے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم ٹھیرا کر، امراء و شرفا کے خلاف طبقاتی جنگ کیوں نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں بھی ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لے کر اُٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا۔ مگر غالب اکثریت آپؐ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور سرمائے اور جاہ و شرف کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپؐ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال و جاہ سے چمٹی رہتی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ موثر اور کارگر ہوتا۔ اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پُورا معاشرہ لا الٰہ اِلّا اللّٰہ کے اعلان کے خلاف صف آرا ہوجائے، اور صرف چند نادر روزگار ہستیاں ہی دعوتِ حق کے افق تک پہنچ سکیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپ کی تحریک سے وابستہ ہوکر اپنی زمامِ قیادت آپ کے ہاتھ میں دے دیتی اور آپؐ دولت مند اقلیت پر قابو پاکر اس کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکتے تو آپ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور اپنی پُوری قوت و طاقت کو اس عقیدۂ توحید کے منوانے اور اسے قایم و راسخ کرنے میں استعمال کردیتے جس کے لیے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپؐ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انھیں پروردگارِ حق کے آگے جھکا دیتے۔

ایسا طریقِ کار اختیار نہ کرنے کی وجہ

لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپؐ کو اس طریقِ کار پر بھی چلنے کی اجازت نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریقِ کار دعوتِ اسلامی کے لیے موزوں و مناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریہ کے چشمۂ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمام کارکلیتہً اللہ کے ہاتھ میں دیتا ہو۔ اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو

برضا و رغبت قبول کرتا ہو۔ جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہِ الٰہی سے صادر ہو اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کہ وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے اور اس نظام کی اطاعت سے اُسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی یہ کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص و آز کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں اور کچھ دُوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہیں۔ تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہیں۔ انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہیں جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت پر قائم ہیں۔

آپؐ نے اصلاحِ اخلاق کی مہم سے دعوت کا آغاز کیوں نہ کیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔

ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دَور کا نامور شاعر زہیر ابن ابی سلمٰی اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے: سہ

ومن لم یذد عن حوضہ بسلاحہ

یھدم ومن لا یظلم الناس یظلم

جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا تباہ و برباد ہوگا۔ اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔

اسی خرابی کی طرف جاہلی دور کا یہ مشہور و معروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے:

انصُر اخاك ظالما او مظلوما۔

(اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اس پر ظلم ہو رہا ہو)

شراب خوری اور جُوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی دور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔

زناکاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابلِ فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے، خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہدِ حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے

ذریعہ اصلاحِ اخلاق، تزکیۂ نفوس اور تطہیرِ معاشرہ کا کام شروع کر دیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلحِ اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں اسی طرح آپؐ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتیِ فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپؐ کی دعوتِ تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدۂ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گرانبار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتی اور اس حکیمانہ آغاز سے آپؐ کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے پہلے ہی مرحلہ میں "تند و تیز مخالفت" سے دوچار نہ ہوتی۔

اس طریقہ میں کیا کمزوری تھی؟

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزلِ مقصود کو نہیں جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف عقیدہ کی بنیاد پر ہی ہو سکتی ہے، ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیارِ ردّ و قبول فراہم کرے، اور دوسری طرف اس "طاقت" کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں اور انھیں سند کا درجہ حاصل ہو اور اس جزا و سزا کی نشان دہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس طاقت کی طرف سے دی جانے گی۔ دلوں پر اس نوعیت کے عقیدہ کی ترمیم اور بالاتر قوت کے تصور کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیر کا نشانہ بنے رہیں گے۔ اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہو گا وہ ڈانواں ڈول رہے گا۔ اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو گا۔ کوئی نگران اور محتسب طاقت نہ ہو گی، کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیت دلوں میں راسخ ہو گیا اور اس "طاقت" کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشاتِ نفس کی غلامی سے اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہو گئے، اور لا الٰہ الا اللہ کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ اور اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعہ وہ سب کچھ فراہم کر دیا جو وہ تجویز کر سکتے تھے۔ خدا کی زمین رومی اور ایرانی سامراج سے پاک ہو گئی۔ لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو، بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ چنانچہ زمین خدا کے سب باغیوں سے خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی اور عربی، پاک کر دی گئی۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لُوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔ یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدلِ الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ یہاں صرف میزانِ الٰہی میں ہر خوب و زشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا۔ اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی اور اس کا اصطلاحی نام "اسلام" تھا۔ اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کا اضافہ کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی :

"لا الٰہ الا اللہ"

ع سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

نفوس اور اخلاق میں نکھار آ گیا۔ قلوب و ارواح کا تزکیہ ہو گیا۔ اور یہ اصلاح اس انداز سے ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود و تعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالیٰ نے قایم فرمایا تھا۔ اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قایم ہو گئیں۔ اب خدا کی خوشنودی کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف، محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظام، انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی اس بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی اور نہ صدر اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلابِ عظیم کیسے برپا ہُوا ؟

یہ انقلابِ عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اس بنا پر حاصل ہُوا کہ جن لوگوں نے دینِ حق کو ایک ریاست، ایک نظام اور جامع قانون و شریعت کی شکل میں قایم کیا تھا وہ خود پہلے اسے اپنے قلب و ضمیر اور اپنی زندگی میں قایم کر چکے تھے، اسے عقیدہ و فکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے، اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ و پیراستہ کر چکے تھے، اپنی عبادت میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکہ رواں کر چکے تھے۔ اس دین کے قیام پر ان سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وعدہ میں غلبہ و اقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ یہ جُز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین لازماً انہی کے ہاتھوں غالب ہو گا۔ ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انھیں جنّت ملے گی۔ جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا، جو زہرہ گداز آزمائشیں انہوں نے سہیں، جس پامردی اور استقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے اور پھر بالآخر جس طرح اُنھوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اس حقیقت کبریٰ کا ساتھ دیا جو لا الٰہ الا اللہ کے اندر پنہاں ہے اور جو ہر زمان و مکان کے فرماں رواؤں کے لیے ناگوار رہی ہے، ان سب خدمات کے عوض ان سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی فقط وعدۂ فردا !

جب اللہ تعالیٰ نے انھیں آزمایش کی بھٹّی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسیاتی خواہش اور حظ سے دست بردار ہو گئے، اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر اب کسی طور جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہیں، نہ انھیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً انہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے، اور یہ دین انہی کی قربانیوں اور کوششوں سے

بالاتر و برتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آباؤ اجداد کا تفاخر باقی رہا نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن و ملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی بُو باس رہی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ اب " امانتِ عظمیٰ " یعنی خلافتِ ارضی کے بار کو اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے میں کھرے ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہو۔ دل و ضمیر پر، اخلاق و عبادات پر، جان و مال پر اور حالات و ظروف پر صرف اسی کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے جو ان کے ہاتھوں اس غرض کے لیے دیا جائے گا تاکہ شریعتِ الٰہی کو نافذ کریں اور عدلِ الٰہی کو قایم کریں مگر اس اقتدار میں سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کے لیے کوئی حصہ نہ ہو بلکہ وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو، اور اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی خدمت کے لیے ہو۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

نظامِ حق کی کامیابی کا واحد راستہ

اگر دعوتِ اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانہ سفر نہ ہوتا، اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا، اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گزار اور جان گُسل راہ تھی۔ مگر حقیقت میں آسان اور برکت بداماں تھی، تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جُز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا۔ اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بن کر سامنے آتی یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی، یا اصلاحی مہم کا قالب اختیار کرتی یا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شامل کر لیتی تو یہ پاکیزہ و مبارک نظام جو اس دعوت کے نتیجے میں قایم ہوا کبھی خالص ربانی نظام بن کر جلوہ گر نہ ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم کا مکی دور اسی شان و شوکت کا حامل ہے۔ یہ دور قلوب و اذہان پر اللہ کی الوہیت کا نقش ثبت کرتا ہے، انقلاب کے فطری راستے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ اس میں بظاہر کتنی ہی دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا ہو، اور دُوسری پگڈنڈیوں پر جانے سے منع کرتا ہے، خواہ عارضی طور پر انھیں اختیار کرنے کا ارادہ ہو۔ وہ ہر حال میں صرف فطری راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا کوثر نیازی

ساتویں صدی عیسوی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں جو انقلاب برپا کیا تاریخ زمانہ ما بعد میں اس کے اثرات اتنے دوررس تھے کہ اسے بعد کے دور کے تمام انقلابات کی بنیاد و اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی افکار و عادات کے دائرہ میں جو تبدیلی پیدا کی تھی وہ بعد کی صدیوں میں جاری رہی اور اس نے کئی جدید تحریکات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مثلاً جدید سائنسی تحریک جو گلیلیو اور کیپلر سے شروع ہوتی ہے، جمہوریت کی تحریک جس نے انقلاب فرانس کی شکل اختیار کی اور اشتراکی تحریک جس نے جدید روس اور چین کو جنم دیا۔ یہ تمام جدید انقلابات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ افکار کو عملی جامہ پہنانے کی جزوی اور ناقص کوشش ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں پہلے ہمیں لفظ "انقلاب" کی توضیح اور اس کے مضمرات کی تصریح کرنی چاہیے۔ اپنے عام مفہوم میں انقلاب سے مراد یہ ہے کہ نظامِ حکومت میں طاقت کے ذریعہ تبدیلی پیدا کی جائے۔ "انقلاب کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ معیشت، ثقافت، سماجی ڈھانچہ غرضیکہ انسانی مساعی کے کسی شعبہ میں کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں لائی جائے۔"

(انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائینسز۔ جلد ۱۳)

انقلابات عموماً اس وقت برپا ہوتے ہیں جب کوئی قدیم نظام پورے طور سے یا جزوی طور سے شکست و ریخت ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو حکمران طبقہ نااہل ہوتا ہے یا جنگ، معاشی بحران اور اسی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔

انقلابات کی تمام اقسام میں ایک خالص سیاسی انقلاب جس کا مقصد صرف حکومت کے مقتدر اشخاص کی تبدیلی ہو سب سے زیادہ عارضی ہوتا ہے۔ محض حکومت کی تبدیلی سے انسانی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آتا، جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے طرزِ فکر، عادات اور رسوم و رواج میں تبدیلی نہ ہو اور کچھ نئی اخلاقی اقدار کو نہ اپنایا جائے۔ اگر کسی انقلاب کو دیرپا اور مستقل نتائج پیدا کرنا ہوں تو اس کو لوگوں کے سارے طرزِ فکر کو تبدیل کرنا ہوگا۔ نئے قوانین پر عملدرآمد کرنا ہوگا اور ایک نیا نصب العین ساتھ لانا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس انقلاب کے نقیب تھے وہ محض ایک سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ اس نے اساسی اور اخلاقی اقدار بدل ڈالے تھے۔ لوگوں کے طرزِ فکر میں تبدیلی پیدا کی اور سماجی عادات و اطوار کا ایک نیا ڈھانچہ وضع کیا تھا۔ ان تبدیلیوں کی اہمیت سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسلام سے قبل کی دنیا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تاکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عظیم کارنامہ کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکیں جو آپؐ نے ایک بالکل جدید نظامِ زندگی کے قیام اور قدیم دنیا سے کامل انقطاع کی صورت میں انجام دیا۔

روم اور ایران

تیسری صدی کے اختتام پر سلطنت روما کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد (۱۴) کا ایک مضمون نگار رقمطراز ہے:

"اگرچہ سلطنت روما کا کوئی بڑا علاقہ ہاتھ سے نہ نکلا تھا لیکن تیسری صدی کے بحرانی حالات نے سلطنت کی عام حالت پر مہلک اثرات مرتب کیے تھے۔ رومی امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ نہ صرف سرحدی علاقے بلکہ یونان کے وسطی اضلاع، ایشیائے کوچک اور خود اطالیہ کی سرزمین جنگ کی تباہ کاری کا منظر پیش کر رہے تھے اور شہنشاہ آریلین نے روما میں جو قلعہ بندیاں کی تھیں وہ حالات کی تبدیلی کی غماز تھیں۔ جنگ و جدل، طاعون و قحط کے باعث آبادی کم رہ گئی تھی اور صوبوں کے مالی وسائل تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ سرحدوں کی حفاظت کے لیے جتنی رقم درکار ہوتی تھی وہ غریب اور مفلوک الحال رعایا سے زبردستی وصول کی جاتی تھی۔ بحیرہ روم کی صدیوں سے قائم شدہ تہذیب و ثقافت کو تیزی سے گھن لگ رہا تھا اور دربار میں وحشت و بربریت کی علامات کے ساتھ مشرقی عیش و تنعم کی جو کیفیات نمایاں تھیں اور جن سے شہنشاہ آریلین جیسے صالح حکمران بھی مستثنیٰ نہ تھے، عام ابتلاء و خرابی کی غماز تھیں۔"

ڈیاکلیشن کے دورِ حکومت میں رومی سینیٹ بالکل بے اختیار ہو کر رہ گئی تھی۔ جمہوری اداروں کی آخری علامات بھی مٹ گئی تھیں اور حکومت بالکل مطلق العنان شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈیاکلیشن کے زمانہ سے بلدیاتی خود مختاری رفتہ رفتہ محو ہوتی گئی اور سلطنت روما کا نظم و نسق نوکر شاہی کے ہاتھوں میں آگیا جو شہنشاہ کے اشارۂ چشم و ابرو پر کام کرتی تھی۔ ڈیاکلیشن اور قسطنطین نے سلطنت کی حفاظت کی خاطر عوام کے مفادات کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

روما اور ایران دونوں سلطنتوں میں عوام الناس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کی حالتِ زار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"تاریخ شاہد ہے کہ روم اور ایران میں شہنشاہیت ایک مدت تک قایم رہی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے عہد کے عروج میں امراء و رؤسا کے عادات و اطوار کو اپنایا اور حالات کے مطابق تہذیب و تمدن کے لوازم اور اسباب رفاہیت و تعیش میں معتدبہ ترقی کی۔ آخرت کو پسِ پشت ڈال کر دنیاوی زندگی کو عیش و عشرت سے بسر کرنے کو انہوں نے اپنا نصب العین قرار دیا۔ چار دانگ عالم سے موجد اور سائنس دان کھنچ کر ان دو مملکتوں میں جمع ہو گئے اور آسایش حیات کے متعلق انھوں نے کئی ایک نئی چیزیں اور نئے طریقے دریافت کیے۔ تمام علماء اور اہلِ ثروت عیش پرستی میں منہمک تھے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ہر امیر کبیر اور اہل ثروت کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس ایک شاندار محل ہو جس کے صحن میں باغ، حمام وغیرہ اور دیگر لوازم موجود ہوں۔ اس کے دسترخوان پر الوان نعمت چنے جائیں اور اس کی زرق برق پوشاک سب لوگوں کی توجہ کا باعث ہو، نیز اس کے پاس عمدہ نسل کے گھوڑوں اور راحت بخش گاڑیوں کی کمی نہ ہو۔ خدمت کے لیے لونڈیاں اور

کمربستہ غلام حاضر ہوں۔ عصرِ حاضر کے ملوک و سلاطین اور والیانِ ریاست کے ٹھاٹھ باٹھ کو دیکھ کر آپ ان حضرات کی عیش و عشرت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ یہ طریقِ تعیش ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا جس کی وجہ سے عام تمدن اور معاشرت میں ایک لاعلاج روگ پیدا ہو گیا تھا۔ سب لوگ ان کے دیکھا دیکھی عیش و عشرت کی زندگی پر مائل ہو گئے تھے۔ اپنی حیثیت کے مطابق رعیت کے ہر ایک طبقہ میں یہ مرض پھیل گیا تھا، جس نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس سے وہ عاجز آ گئے تھے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر وہ قسم قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی اس کا حاصل ہونا دولت کثیر خرچ کیے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک و سلاطین نے اپنی رعایا و تجار پر اور امراء نے اپنی اپنی آسامیوں پر بھاری ٹیکس لگا دیے۔ اب ان مفلوک الحال عوام کے لیے دو ہی راہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ علمِ بغاوت بلند کریں اور تلوار اپنے ہاتھ میں لیں۔ ایسا کرنا ان بے سرو سامان لوگوں کی قوت سے باہر تھا۔ دُوسرا راستہ ان کے سامنے یہ تھا کہ ان کی اطاعت سے سرتابی نہ کریں اور جیسے بھی ہو زندگی کے دن پورے کریں۔

اس نظامِ تعیش کو قایم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کے پاس اس قسم کے لوگوں کی فوج ظفر موج ہو جو ان کے لیے خوب صورت محل تعمیر کرے، انواع و اقسام کے کھانے تیار کرے اور ان کے لیے مختلف فیشن کے کپڑے اور دیگر سامان زینت و آرائش بنائے۔ چونکہ لوگوں کی کثیر تعداد لایعنی اشغال میں مصروف تھی اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے ایسے ضروری پیشے متروک ہو گئے تھے جن کا وجود اصل تمدن کے لیے ناگزیر تھا مزید برآں جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے جن لوگوں کا تعلق طبقۂ امراء اور اہلِ ثروت سے تھا ان کے دلوں میں بھی یہ شوق موجزن تھا کہ وُہ بھی بڑے پیمانہ پر نہ سہی، کم از کم چھوٹے پیمانہ پر ان سے ملتی جلتی طرزِ معاشرت اختیار کریں۔ بصورتِ دیگر وُہ ان کی نظروں میں ذلیل اور حقیر بن جائیں گے۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر سب کی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح دامنِ حکومت سے وابستہ رہیں اور جس طرح بھی ممکن ہو حکومت کے خزانہ سے کچھ نہ کچھ پا کر اپنی زندگی بسر کریں۔ چنانچہ ان کی ایک کثیر تعداد اس قسم کی تھی جنھوں نے حکومت کی ملازمت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لیا تھا۔ لیکن چونکہ ان کے پیشِ نظر یہ بات نہ تھی کہ حکومت کی مشینری احسن طریقہ پر کام کرے اور نظامِ تمدن کو بہترین صورت پر قایم رکھا جائے بلکہ ان کا مقصد صرف پیسے بٹورنا ہوتا تھا لہٰذا انھوں نے عوام کی کوئی خدمت نہ کی اور یہ بدنظمی بہت بڑی خرابی کا باعث ہُوئی۔

الغرض جب یہ مرض اپنی انتہائی شدّت کو پہنچ گیا اور اس صورت حال میں مزید بگاڑ کی گنجایش باقی نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے اس مرض کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک نبی اُمّی کو مبعوث فرمایا جو اس قسم کے تمدن اور معاشرت سے بالکل نا آشنا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا عجمی نظامِ تعیش کی مذمت فرمائی .... اور اپنی امت کو

ان عادات سے بچنے کا حکم دیا جو اس عجمی زندگی کا جزو لازم اور ان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز تھے۔ آپ نے اپنی امت کو بتایا کہ آپ کی بعثت ان قوموں کے زوال کا باعث ہوگی اور آپ کی نبوت کا مقصد قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو مٹا دینا ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص ۸۴ - ۸۳ ج ا مطبع خیریہ ۱۳۲۲ھ)

اسلام سے پہلے دنیا کی مذہبی حالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے انقلاب کی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے آپ کی بعثت سے پہلے دنیا کی مذہبی حالت کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔

دنیا کے تین بڑے مذاہب عیسائیت، یہودیت اور ہندو مت میں سے پہلا مذہب (یعنی عیسائیت) کلامی بحثوں میں الجھا ہوا تھا۔ مورخ گبن کے الفاظ میں:

"بُت پرستی کے خاتمہ کے بعد عیسائیت کے پیرو امن و امان اور تقویٰ و طہارت کی فضا میں اپنی کامیابی سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ لیکن فتنہ و فساد ان کی طبیعتوں میں رچا ہوا تھا اور انھیں اپنے بانی مذہب کے قوانین اور احکام کی اطاعت کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس بات کی تحقیق کی کہ اس کی فطرت کیا تھی۔" (گبن - تاریخ انحطاط و زوال سلطنت روما، جلد ۴ - ص ۳۲۸)

عیسائی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر فرقہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش و تخلیق کے متعلق مختلف خیالات رکھتا تھا یعنی مسیح کی فطرت الوہی تھی یا انسانی یا الوہیت اور انسانیت دونوں اس کی فطرت میں مدغم تھیں۔ ایبونی فرقہ کا اعتقاد تھا کہ حضرت مسیح عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے:

"یہ لوگ مسیح کے ساتھی تھے اور آپ سے مانوس تھے۔ انھوں نے اپنے ہموطن مذہبی رہنما اور دوست سے دوسرے انسانوں کی طرح گفتگو کی تھی۔ انھیں مسیح اپنی حیوانی اور عقلی زندگی میں بالکل نوع انسانی کا ایک فرد نظر آیا تھا۔" (گبن - حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ ص ۳۲۹ - ۳۳۰)

ڈوکسٹی فرقہ کو اس سے انکار تھا کہ مسیح انسانی فطرت کا حامل تھا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ وہ دریائے اردن کے کنارے ایک کامل مرد کی صورت میں نمودار ہوا، مگر یہ صورت صرف ظاہری تھی نہ کہ حقیقی۔ مسیح ایک نورانی پیکر تھا جس کے جسم سے کوئی چیز گزر نہیں سکتی تھی اور اس کا جسم برائی اور فساد سے پاک تھا۔ ولنیٹن اور بیسلیڈ فرقہ کا اس کے برخلاف یہ اعتقاد تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام ایک بالکل خاکی انسان تھا۔ جب اس کو دریائے اردن میں بپتسمہ دیا گیا تو مسیح ایک فاختہ کی شکل میں اس کے اندر سما گیا اور اس کی بعثت کے دوران اس کے اعمال و افعال میں اس کی ہدایت کرتا رہا۔ اپالینیرس کا اعتقاد یہ تھا کہ الوہیت ایک انسان کے جسم میں مجسم تھی اور کلمہ یا عقل ابدی نے اس کے اندر روح کی جگہ لے لی تھی۔ آریوسی فرقہ کے نزدیک بیٹا دوسری مخلوقات سے کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو لیکن بالآخر وہ بھی مخلوق تھا۔ مسیح کی فطرت کے بارے میں یہ تنازعات قسطنطین اعظم کے لیے پریشانی کا

باعث بن گئے اور اس نے ۳۲۵ء میں بمقام نیقیہ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی جس میں آریوسی فرقہ کے اعتقاد کے برعکس یہ فیصلہ کیا گیا کہ باپ اور بیٹے کا جوہر ایک ہے اور بیٹے کے متعلق یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ وہ مخلوق ہے یا کم از کم باپ سے کم رتبہ ہے۔ مسیح کی فطرت کے بارے میں ان مباحث سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو اخلاق کردار کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ مابعد الطبیعاتی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس طرح اخلاقی مسائل کو کلامی مسائل کے مقابلہ میں نظرانداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ اخلاقی زوال کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ پھر عیسائیت نے رہبانیت اور خانقاہیت کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے نتیجہ میں عیسائیوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے افراد نے تہذیب و تمدن کا کام دوسرے اور تیسرے درجہ کے لوگوں پر چھوڑ دیا اور خود ریگستانوں اور صحراؤں کی راہ اختیار کی تاکہ وہاں دنیا سے الگ تھلگ خدا کی عبادت کر سکیں۔ اس طرح تہذیب و تمدن کی رفتارِ ترقی سست پڑ گئی۔

دوسری طرف یہودی دنیا پرستی میں مبتلا تھے۔ وہ ایک ضدی طبیعت رکھتے تھے اور ہمیشہ اپنے پیغمبروں کی نافرمانی کرتے تھے۔ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کی پیہم تنبیہہ کے باوجود گائے کے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ ان کے مذہبی رہنما اپنی مقدس کتابوں کی غلط سلط تاویلات کرتے تھے تاکہ اس طرح وہ مقبولِ عوام بن جائیں اور سوسائٹی میں ان کا درجہ بلند رہے۔ وہ نسل اور قوم کے پرستار تھے اور اپنے آپ کو تمام قوموں اور نسلوں سے افضل سمجھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں انھیں ایک نجات دہندہ پیغمبر کا انتظار تھا لیکن جب وہ نجات دہندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں نمودار ہُوا تو انھوں نے اس بنا پر اس کو ماننے سے انکار کر دیا کہ وُہ ان کی نسل سے نہ تھا۔ اس طرح نسل پرستی ان کے مذہبی اعتقاد کا جزو لازم تھی۔

ہندومت نے ذات پات کے نظام کو جنم دے کر ایک ایسا معاشرہ پیدا کیا تھا جو مصنوعی عدمِ مساوات سے معمور تھا۔ برہمن سب سے اعلیٰ ذات سمجھی جاتی تھی۔ یہ لوگ مذہب اور علم کے اجارہ دار تھے۔ کھتری دوسرے درجہ کی ذات تھی۔ یہ لوگ سپاہی تھے اور صرف فنونِ جنگ کے ماہر تھے۔ ویش ذات زراعت و کھیتی باڑی کی ذمہ دار تھی۔ سب سے نیچی ذات شودروں کی تھی جن سے روزمرہ کے کاموں میں خدمت لی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ اگر وہ کسی برہمن کو چھُو لیتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی۔ وہ عبادت گاہوں اور مندروں کے قریب نہیں جا سکتے تھے۔ اگر وُہ کسی مقدس کتاب کا کوئی اشلوک سُن لیتے تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ ان کے مکانات، شہروں اور قصبوں سے دُور ہوتے تھے اور وہ اکثر صورتوں میں شہروں یا قصبات میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر انھیں کسی قصبہ یا شہر میں داخل ہونے کی اجازت مل جاتی تو ان کو وہاں ننگے سر اور ننگے پاؤں جانا پڑتا۔ گھڑ سواری کی ان کو قانونی طور پر ممانعت تھی۔ نیز ذات پات کے ان امتیازات کو مذہبی حیثیت حاصل تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے ایک اور مذہبی تحریک نوفلاطونی تحریک تھی۔ جس کے اثر سے انسانی ذہن اپنے حقیقی اور مادی مسائل سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس تحریک کے ماننے والے اس لاحاصل کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مادی تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے وہ خدا کا قرب حاصل کر لیں گے۔ نوفلاطونیوں کے اعتقاد کی رُو سے حقیقی سعادت اسی وقت حاصل ہو سکتی تھی جب انسان اپنے حال سے بے خود ہو کر وجد و سرمستی کی کیفیت سے آشنا ہو جائے، جس میں وُہ اپنے آپ اور خارجی عالم دونوں کو یکسر فراموش کر دے۔ سائنس اور علم کی اتنی ناقدری کبھی نہیں ہُوئی جتنی نوفلاطونیوں کے ہاتھوں ہُوئی۔

مذہبی رواداری کا ارتقاء

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا میں مذہبی تشدد انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ برسرِ اقتدار طبقہ اپنے مخالف فرقوں کو مٹانے کے درپے رہتا تھا۔ عیسائیت کے پیروکاروں نے نسطوری فرقے کے لوگوں کو بازنطینی مملکت سے نکال باہر کیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سلطنت فارس میں جا کر پناہ لی۔ ۴۱۲ء میں اسکندریہ کے بشپ (پادری) سینٹ سائرل نے مخالف فرقوں اور مذاہب پر بڑے مظالم کیے۔ اس نے نولیشی فرقہ (نوویشین) کے گرجاؤں میں لوٹ مار کر کے ان کو بند کرا دیا اور ہزاروں یہودیوں کو شہر بدر کر دیا۔ لیکن اس کا بدترین جرم یہ تھا کہ اس نے زمانہ قدیم کی ایک نہایت فاضل خاتون ہائی پیشیا (HYPATIA) کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گبن رقمطراز ہے:

"ریاضی دان تھیون کی بیٹی ہائی پیشیا نے اپنے باپ کے علوم کی اشاعت و ترویج کا آغاز کیا۔ اس کی فاضلانہ تشریحات نے اپالونیس کی جیومیٹری کی وضاحت کی۔ وہ اسکندریہ اور ایتھنز میں افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کا عام درس دیتی تھی۔ یہ اس کے انتہائی حسن جمال، پختگی اور عقل و دانش کا زمانہ تھا۔ یہ شرمیلی دوشیزہ اپنے مداحوں کو ٹھکرا کر اپنے شاگردوں کی تعلیم و تدریس میں لگی رہی۔ اس دور کے نمایاں اہل علم و فضل حضرات اس فلسفی خاتون سے ملنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ سائرل اس کے مرکزِ علم و فضل میں آنے والوں کے گھوڑوں کی قطاروں اور غلاموں کے ہجوم کو رشک اور حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ عیسائیوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ تھیون کی یہ بیٹی رومن فرمانروا اور آرک بشپ کے درمیان تفاہم و تعاون پیدا کرنے میں واحد رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جلد ہی یہ رکاوٹ دور کر دی گئی اور لینٹ (LENT) کے مقدس موسم میں وہ ہلاکت خیز دن بھی آیا جب ہائی پیشیا کو اس کی راحت بخش گاڑی سے کھینچ کر باہر گرایا گیا اور پیٹر کے وحشی اور بے رحم متعصبوں کے ایک گروہ نے اس کو برہنہ کر کے نہایت غیر انسانی طریقے سے اسے ذبح کر ڈالا۔" (گبن۔ انحطاط و زوال سلطنت روما جلد چہارم ص ۱۴۳)

قبل از اسلام عرب کا ایک اور واقعہ یہودیوں کے مذہبی تعصب پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ یمن کے ایک فرمانروا ذونواس نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ وہ جنوبی عرب میں مسیحیت کو پھیلتا پھولتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ جنوبی عرب میں مسیحیت کا بڑا مرکز نجران تھا۔ اس نے نجران کے باشندوں سے کہا کہ وہ یا تو یہودیت قبول کر لیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھوں نے موت کو ترجیح دی۔ اس نے ان کے لیے خندقیں کھدوائیں، کچھ کو آگ میں جلا دیا، کچھ کو تلوار سے ذبح کر دیا اور کچھ کی شکلیں بگاڑ دیں۔ یہاں تک کہ اس نے ان کے بیس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے۔" (ابن اسحاق۔ سیرت رسول اللہؐ، ص ۱۷)

یہ تھی دنیا کی حالت جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے ان تمام قدیم برائیوں کا خاتمہ کر کے ایک عادلانہ اور منصفانہ معاشرے کی بنیاد رکھی۔ اس معاشرے میں انسان کی آزادیِ ضمیر کا احترام کیا گیا۔ یہ معاشرہ

ذات پات سے پاک تھا۔ یہ معاشرہ علم و معرفت کے حصول پر زور دیتا تھا۔ اس معاشرے میں آدمی کو جانچنے کا پیمانہ اسکی اپنی لیاقت اور قابلیت تھی نہ کہ وہ طبقہ جس سے اس کا تعلق تھا۔

اس بات کی وضاحت کے لیے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں کہ ایک ایسے عظیم انقلابی کا ظہور کیونکر ہُوا۔ لیکن ان میں سے کوئی نظریہ بھی حقائق پر پُورا نہیں اُترتا۔ پہلے نظریہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریۂ توحید عرب کے صحرائی حالات کا نتیجہ تھا۔ جو ایک خدا کے تصور کے لیے بہت زیادہ سازگار تھے۔ لیکن اگر یہی بات ہے تو توحید کا کوئی مذہب ہندوستان کے صحرائے راجپوتانہ یا گوبی کے صحرائے اعظم میں کیوں نہ پیدا ہوگیا؟ دُوسرا نظریہ یہ ہے کہ پورا جزیرۂ عرب ایک تبدیلی کا متقاضی تھا اور لوگ اس انتظار میں تھے کہ انھیں کب ان لامتناہی قبائلی جنگوں سے نجات ملتی ہے۔ آیئے اس ضمن میں سر ولیم میؤر کی رائے معلوم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

> "رسول اللہ صلعم کی بعثت سے قبل جزیرۂ عرب کے امکانی حالات کسی مذہبی اصلاح، سیاسی اتحاد یا قومی نشاۃ ثانیہ کے لیے انتہائی سازگار تھے۔" (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سر ولیم میؤر۔ دیباچہ صفحہ)

یہی مصنف مزید لکھتا ہے :

> "بعض اوقات اسباب و علل ان نتائج کے ساتھ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں جو کسی ایسے شخص نے پیدا کیے ہوں جو بظاہر اس کا اہل نظر نہیں آتا۔ جونہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، سارا عرب ایک نئے روحانی مذہب کے لیے اٹھ کھڑا ہُوا۔ اسی سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جزیرہ عرب ایک تبدیلی کا آرزومند تھا اور اسے قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل کے ساتھ ماضی کا جائزہ لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ قبل از اسلام کی تاریخ اس مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے۔" (لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سر ولیم میؤر۔ حوالہ بالا)

تیسرا نظریہ مارکس کا ہے، جو کہتا ہے کہ ہر انقلابی تبدیلی ایک نئے طبقے کے ظہور کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مارکسسٹوں کی رائے میں جب کوئی نئی پیداواری قوت معاشرے میں ظاہر ہوتی ہے تو معاشرے میں پہلے سے موجود پیداواری حالات سے اس کا تصادم ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک نیا طبقہ ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ نیا طبقہ ایک انقلابی تبدیلی لے آتا ہے۔ لیکن مارکسی حضرات اس کی وضاحت کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرے میں کوئی نئی پیداواری قوت کیوں ظاہر نہ ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے قبل عرب میں نہ تو کوئی نئی پیداواری قوت ظاہر ہوتی نظر آتی ہے اور نہ ہی ان حالات میں کوئی تبدیلی نظر آتی ہے اور نہ ظہور اسلام کے وقت عرب میں کوئی نیا طبقہ اٹھا۔ جن لوگوں نے رسول اللہؐ کا ساتھ دیا ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کسی حد تک دولت مند تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تو خاصے مالدار تھے۔ قیادت کا منصب اسلام سے قبل اور بعد قریش ہی کے ہاتھ میں رہا اور معاشرے کے طبقاتی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہُوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی تعلیمات

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تمام جدید انقلابات کے اصل بانی ہیں۔ لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک کہ ان انقلابات نے انسان کی حالت میں فی الواقع کوئی بہتری پیدا کی۔ جہاں تک ان انقلابات نے صراطِ مستقیم سے منہ موڑا ہے وہاں انھوں نے دراصل تعلیمات نبوی سے انحراف کیا ہے۔ یہ جدید انقلابات کیا ہیں؟ سیاسی میدان میں یہ انقلاب جمہوریت کا انقلاب ہے، جس نے انسانوں میں سیاسی مساوات قایم کی ہے۔ سماجی شعبہ میں یہ عورت کے حقوق اور اس کے صحیح مقام کے بارے میں انقلاب ہے۔ معاشی میدان میں یہ کمیونسٹ انقلاب ہے جس نے معاشی مساوات قائم کر کے بھوک اور افلاس کے شکار عوام کو نجات دلائی ہے۔ علم اور سائنس کے میدان میں یہ سائنسی انقلاب ہے، جس کا آغاز کوپرنیکس، گلیلیو اور کپلر سے ہوا۔ آیندہ سطور میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے ان انقلابات کی بنیاد کیسے رکھی؟

سیاسی تعلیمات

داخلی اور خارجی سیاست کے معاملات میں عوام کے نمائندوں سے مشورہ کرنا جدید جمہوریت کی بنیاد ہے۔ لیکن یہ اصول سب سے پہلے قرآن کریم ہی نے بتایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"وامرھم شوریٰ بینھم" (شوریٰ آیت ۳۸)

ترجمہ: "اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں"

یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ کی کوئی متعین شکل بیان نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوریٰ کی صورتیں زمانہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں۔ جدید نمایندہ جمہوریت بھی شوریٰ کی انہی قسموں میں سے ایک ہے۔

جدید جمہوریت کی ایک دوسری بنیاد قانون کی رُو سے مساوات کا اصول ہے۔ یہ بنیاد بھی سب سے پہلے رسول اللہ صلعم نے واضح طور پر بیان فرمائی۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں:

عن عروۃ عن عائشۃ ان اسامۃ کلم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی امرأۃ فقال انما هلك من كان قبلكم انهم كانوا يقيمون الحد على الوضيع ويتركون على الشريف والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمۃ فعلت ذٰلك لقطعت يدها۔ (بخاری کتاب الحدود)

ترجمہ: "حضرت عائشہؓ عروہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اسامہؓ نامی ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت کے بارے میں کچھ سفارشات پیش کیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے بہت سی قومیں صرف اس لیے تباہ ہوگئیں کہ وہ نچلے طبقے کے لوگوں پر حدود جاری کیا کرتی تھیں۔ اللہ کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہ سے بھی اس قسم کا فعل سرزد ہوتا تو میں اس کے ہاتھ کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔"

دورِ حاضر میں جمہوریت کا دُوسرا اصول مذہبی رواداری اور انسانی ضمیر کی آزادی کا اعتراف ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں اس اصول کو کس طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس دور میں مذہبی اختلافات کو برداشت نہیں کیا جاتا تھا اور مختلف مذہبی گروہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما رہتے تھے۔ مگر ظہورِ اسلام کے بعد قرآن مجید میں مذہبی رواداری کا اصول نہایت تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین" دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ (البقرہ: ۲۵۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے مذہبی رواداری کی عملی طور پر خود ایک عظیم الشان مثال قائم فرمائی۔ ابن قیم نے اس معاہدہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"من محمد النبی الی اسقف ابی الحارث واساقفه نجران وکهنتهم ورهبانهم واهل بیعهم ورقیقهم وملتهم وسواطتهم وعلی کل ما تحت ایدیهم من قلیل وکثیر جوار الله ورسوله لا یغیر اسقف من اسقفته وراهب من رهبانیة ولا کاهن من کهانته ولا یغیر حق من حقوقهم ولا سلطانه ولا مما کان علیه" (زاد المعاد۔ ابن قیم۔ ص ۴۱۔ جلد ۳)

"یہ معاہدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پادری ابی الحارث اور نجران کے دُوسرے پادریوں کے ساتھ ہے۔ نیز ان کے کاہن، راہب، خانقاہ نشین، غلام، اہل قوم اور ان تمام لوگوں کے ساتھ ہے جو ان کے ماتحت ہیں خواہ وہ تعداد میں کم ہوں یا زیادہ۔ ان سب کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے امان ہے۔ کسی پادری کو اس کے عہدے سے نہیں ہٹایا جائے گا نہ کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے منع کیا جائے گا اور نہ کسی کاہن کو اس کی کہانت سے۔ ان کے حقوق، اختیارات اور مراعات جو ان کو پہلے سے حاصل ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔" (ابن قیم۔ زاد المعاد، ج ۳۔ ص ۴۱)

کسی دینی نظام میں اس سے زیادہ فیاضانہ شرائط کا تصور کرنا مشکل ہے جو ایک فاتح نے اپنے مفتوح عوام کے ساتھ روا رکھی ہوں۔

جمہوری مساوات کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے کو ایک عیسائی مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ایک ایسا مکمل جمہوری مساوات کا نظام وجود میں آیا جس سے زیادہ مکمل نظام دنیا میں آج تک کہیں موجود نہ تھا۔" (محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ میریڈتھ ٹاؤنسنڈ)

آزادیٔ نسواں

موجودہ دنیا کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے عورت کو مساوی حقوق دیے اور اسے اس کا صحیح مقام عطا کیا۔ لیکن یہ حقیقت سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ تاریخ کا ایک مسلسل عمل ہے جس کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ہوتی ہے

اسلام سے پہلے تمدنوں میں عورت کو مال وجائیداد میں حقوق حاصل نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے سب سے پہلے اس کو مال وجائیداد میں حقوق دلوائے۔ قرآن مجید نے ذیل کے الفاظ میں عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات کا درس دیا ہے:

"ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف" (البقرہ - ۲۲۸)

"اور عورتوں کا حق مردوں پر ایسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر"

"هن لباس لکم وانتم لباس لهن" (البقرہ - ۱۸۷)

"وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو"

انہی تعلیمات کی گونج حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں سنائی دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اما بعد ایها الناس فان لکم علی نساءکم حقا ولهن علیکم حقا ..... واستوصوا بالنساء خیرا۔ (ابن ہشام۔ سیرت النبی۔ المکتبۃ التجاریہ قاہرہ جلد ۴ ص ۲۷۵ - ۲۷۶)

"اے لوگو! تمہارا عورتوں پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے اور میں تمہیں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں" (سیرۃ ابن ہشام۔ ج ۴۔ ص ۲۷۵ - ۲۷۶)

دورِ حاضر میں عورتوں کو اگر کچھ زیادہ حقوق حاصل ہیں تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ موجودہ طرزِ زندگی نے ان کیلئے ایسے مواقع فراہم کیے ہیں جو ظہورِ اسلام کے وقت عرب معاشرہ میں موجود نہ تھے۔ یہ اسلام کا ہی طفیل ہے کہ آج وہ ان اطواق و سلاسل سے آزاد ہیں جن میں صدیوں سے وہ جکڑی ہوئی تھیں۔

اقتصادی تعلیمات

کمیونزم کو دعویٰ ہے کہ اس نے عوام کی معاشی بحالی و ترقی کے لیے جو کام کیا ہے وہ کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ جزوی طور پر یہ بات صحیح ہو۔ تاہم اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صنعتی انقلاب کے بعد موجودہ دنیا کو جو اقتصادی ذرائع حاصل تھے اور جن کے نتیجہ میں مشینی دور وجود میں آیا، اسلام کو اس سے کہیں کم تر ذرائع حاصل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو انتظامیہ تھی وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی اس لیے آپ کو اپنے زمانہ کے محدود حالات کے تحت کام کرنا پڑا۔ ہمیں آپ کی معاشی اصلاحات کو ان تجدیدی عوامل کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ آپ نے معاشی مساوات میں جو اساسی اصول قایم کیا کمیونزم نے درحقیقت اسی اصول سے تقویت حاصل کی ہے۔

قرآن مجید نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ:

"وہ معاشرہ میں ایسا اقتصادی نظام قائم کرنا نہیں چاہتا جہاں دولت مساوی طور پر افراد کے درمیان گردش نہ کرتی ہو"؛

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القری فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ

والمساکین وابن السبیل کی لا یکون دولة بین الاغنیاء منکم۔ (سورۂ حشر۔ آیت ۷)

"جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے لوگوں سے دلوا دے، وہ اللہ کا حق ہے اور رسول کا۔ اور قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا" تاکہ جو تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔"

قرآن مجید نے ارتکازِ دولت کی مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو عام فلاحی کاموں میں خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

والذین یکنزون الذھب والفضة و لا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔
(سورۃ التوبہ۔ آیت ۳۴)

"جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔"

غریب اور مظلوم لوگوں کے حقوق کا اسلام کس قدر خیال رکھتا ہے، اس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے لگایا جا سکتا ہے:

ارئیت الذی یکذب بالدین فذٰلک الذی یدع الیتیم و لا یحض علیٰ طعام المسکین۔
(الماعون: ۱-۳)

"کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے؛ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔"

ایک دوسرے مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

وما ادرٰلک ما العقبة فک رقبة، او اطعام فی یوم ذی مسغبة، یتیما ذا مقربة اومسکینا ذا متربة۔ (البلد: ۱۲-۱۶)

"اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے؛ کسی کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن کھانا کھلانا یتیم رشتہ دار کو یا مسکین خاکسار کو۔"

معاشی انصاف و مساوات کے جذبہ کی یہی جھلک ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی نظر آتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول یوم القیٰمة یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال یا رب کیف اعودک وانت رب العٰلمین؟ قال اما علمت ان عبدی فلان مرض فلم تعدہ اما علمت انک لو عدتہ لوجدتنی عندہ یا ابن آدم

استطعمتك فلم تطعمنی قال یا رب کیف اطعمك و انت رب العالمین ؟ قال اما علمت انه استطعمك عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت انك لو اطعمته لوجدت ذلك عندی یا ابن آدم استسقیتك فلم تسقنی قال یا رب کیف استقیك وانت رب العالمین ؟ قال استسقاك عبدی فلان فلم تسقه اما علمت انك لو سقیته وجدت ذلك عندی۔

(مشکوٰۃ کتاب الجنائز۔ باب عیادۃ المریض ، ص ۱۳۴)

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا اے آدم کے بیٹے ! میں بیمار تھا تونے میری عیادت نہیں کی۔ وُہ کہے گا اے پروردگار ! میں تیری کیسے عیادت کرتا ، تُو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا ، تونے اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے ! میں نے تجھ سے کھانا مانگا ، تونے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ کہے گا اے پروردگار ! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا ، تُو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا ، اور تونے اس کو کھانا نہیں کھلایا ، کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تُو اس کو کھانا کھلاتا ، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے ! میں نے تجھ سے پانی مانگا ، تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا کہ اے پروردگار ! میں تجھے کیسے پانی پلاتا ، تُو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا تُو نے اس کو پانی نہیں پلایا ، کیا تجھے نہیں معلوم کہ اگر تُو اس کو پانی پلاتا ، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔" (مشکوٰۃ ، کتاب الجنائز ، باب عیادۃ المریض ، ص ۱۳۴)

آج کی مادہ پرست دنیا میں آنحضرت صلعم کی ان تعلیمات پر کیونکر اور کیسے عمل ہورہا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ بیمار کو ہسپتال میں داخل کیا جانا چاہیے ، غیر تعلیم یافتہ افراد کو سکولوں میں تعلیم دلوائی جائے ، بے روزگار کو روزگار مہیا کیا جائے اور ہر ضرورت مند کی جائز ضرورت کو پورا کیا جائے۔ کیا جدید دور کی کوئی فلاحی مملکت یا کوئی کمیونسٹ نظام اس سے بہتر صورت پیدا کرسکتا ہے؟

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سرورِ کائنات صلعم سے روایت کرتے ہیں :

لیس المؤمن الذی یشبع وجاره جائع الی جنبه۔ (مشکوٰۃ ۔ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔ ص ۴۲۴)

ترجمہ : مومن وہ نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھائے مگر اس کا پڑوسی اس کے قرب میں بھوکا رہے۔

(مشکوٰۃ ، باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ، ص ۴۲۴)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور روایت میں ارشاد فرمایا کہ اس قسم کے تمام زوائد ایسے لوگوں کے حوالے کر دیے جائیں جن کے پاس یہ چیزیں نہ ہوں۔ حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے :

عن ابی سعید ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نظر الی رجل یصرف راحلته فی

نواحی القوم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان عندہ فضل عن ظہر فلیعد بہ علی من لا ظہر لہ و من کان لہ فضل من زاد فلیعد بہ علی من لا زاد لہ حتی رأینا ان لا حق لاحد منا فی فضل۔ (مسند احمد بن حنبل۔ جلد ۳ ص ۳۴۷)

ترجمہ، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی سواری کو ایک آبادی کی طرف موڑ رہا تھا تو رسول اللہؐ نے فرمایا جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس زائد سواری کو اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس خوراک کا زائد ذخیرہ ہے وہ ایسے شخص کو دے دے جس کے پاس کھانے کو نہیں۔ حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرنے لگے کہ ہم میں سے کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں ہے۔ (مسند احمد بن حنبل۔ ج ۳، ص ۳۴۷)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جدید فلاحی مملکت حتیٰ کہ کمیونزم بھی اقتصادی انصاف میں ان حدود سے آگے نہیں جا سکتی جو سرورِ کائناتؐ نے متعین فرمائی ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں ان دونوں کا مقصد "ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا" ہے بشرطیکہ "اس کھلانے" کو اس کے لغوی معانی میں نہ لیا جائے۔

علم و مشاہدہ کی ضرورت پر زور

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے ایسے دور میں مبعوث ہوئے جبکہ عیسائیت رہبانیت کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور نوفلاطونیت اپنے پیروکاروں کو اس امر کی تعلیم دے رہی تھی کہ اپنے ذہن اور آنکھیں بند رکھیں اور عیش و تنعم کی تلاش میں مصروف رہیں۔ اگر یہ دونوں رجحانات جاری رہتے تو تمام سائنس اور علم عنقا ہو جاتا۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رجحان کا رُخ پلٹ دیا اور حصولِ علم اور انسانی قوتِ مشاہدہ کو بروئے کار لانے پر زور دیتے ہوئے موجودہ تجرباتی سائنس کی اساس رکھی قرآن مجید اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو مناظرِ فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے اور بیرونی دنیا میں اپنے اللہ کی نشانیاں تلاش کرنا چاہییں۔ ذیل کی آیت میں قرآن مجید مومنوں کو انتباہ کرتا ہے کہ انھیں اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا کہ انہوں نے اپنی دیکھنے، سننے اور سوچنے کی صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کیا ہے:

"ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا"

(سورۃ اسریٰ۔ آیت ۳۶)

ترجمہ: اور اے بندے جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے ضرور باز پرس کی جائے گی۔ (سورۃ اسریٰ: ۳۶)

ذیل کی آیات میں انسان کی توجہ فطرت کے خارجی مظاہر کی طرف دلائی گئی ہے اور اسے ہدایت کی گئی ہے کہ اللہ کی نشانیاں مراقبہ اور استغراق میں تلاش نہ کرے بلکہ فطرت کے ٹھوس حقائق میں ان کی جستجو کرے۔

"افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت و الی الجبال کیف نصبت و الی الارض کیف سطحت۔" (سورہ غاشیۃ آیت ۲۰)

ترجمہ: کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے بنایا گیا ہے، اور آسمان کو کہ کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کہ وہ کیسے نصب کیے گئے اور زمین کو کہ کیسے بچھائی گئی۔ (سورۃ غاشیۃ آیت ۲۰۔ ۱۹۔ ۱۸۔ ۱۷)

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا و بث فیہا من کل دابۃ و تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیٰت لقوم یعقلون۔ (سورہ بقرہ: ۱۶۴)

ترجمہ: "بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لیے رواں ہیں اور مینہ جس کو خدا آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقلمندوں کے لیے خدا کی قدرت کی بہت نشانیاں ہیں۔"

محسن انسانیت صلعم نے درج ذیل حدیث میں سائنس سمیت ہر قسم کے علم کے حصول کی اہمیت پر زور دیا ہے:

"الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بہا۔"

(ترمذی ابواب العلم، جلد ۴، صفحہ ۱۵۵)

ترجمہ: حکمت یعنی علم مومن کی گم شدہ شے ہے، جہاں وہ اسے پالے وہ اس کا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔ (ترمذی ابواب العلم جلد ۴ ص ۱۵۵)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان پر طلب علم فرض قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ۔"

ترجمہ: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا فریضہ ہے۔"

اسی طرح ایک اور قول ہے:

"اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔"

"علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمہیں چین کیوں نہ جانا پڑے۔"

اگرچہ یہ حدیث نہیں ہے لیکن یہ قول مسلمانوں میں اس قدر مقبول ہو چکا ہے کہ بعض اوقات غلطی سے اسے حدیث قرار دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں اس قول کی اس قدر وسیع اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سرورِ کائناتؐ کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

لیکن اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سیکولر علوم کے حصول کے بارے میں مسلمانوں کے ذوق و شوق کی مظہر ہے کیونکہ چین سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہاں سے مسلمانوں کو دینی تعلیم حاصل ہوگی۔

یہ تعلیمات قرونِ وسطیٰ میں علم سائنس کی آفرینش کا باعث ہوئیں اور اگر مسلمانوں کے دورِ عروج کے مسلم سائنسدانوں نے عظیم خدمات انجام نہ دی ہوتیں تو کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن دنیا کو اس قدر متاثر نہ کر سکتے۔ اس لیے بلا جھجک یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ سائنس بڑی حد تک سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی مرہونِ منت ہے۔

اب تک ہم نے صرف ان حقائق پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے جدید انقلابات پر کس طرح گہرے نقوش چھوڑے ہیں، لیکن اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ عصرِ حاضر کے انقلابات کے تمام پہلو اور خوبیاں سرورِ کائنات کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں۔ سرورِ کائنات صلعم نے جو اصول وضع فرمائے ہیں وہ بعض امور میں ان انقلابات سے بھی بہت آگے ہیں اور آپؐ نے جو نصب العین مقرر فرمایا ہے جدید دنیا کو اسے ابھی حاصل کرنا ہے۔ مثلاً جدید دنیا ابھی تک تنگ نظری اور خود غرضی پر مبنی نیشنلزم کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے اور یہ نیشنلزم انسان کی عالمگیر برادری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی طرح جدید دنیا نسلی تعصبات اور امتیازات پر قابو پانے میں بھی ناکام رہی ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ہر قسم کے قومی اور نسلی تعصبات سے منع فرمایا تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"یآ یہا الناس ان ربکم واحد و ان اباکم واحد لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی العربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی"

(نیل الاوطار۔ جلد ۵ طبع مصر ص ۸۸)

ترجمہ: اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر فضیلت ہے۔ نہ سرخ کو سیاہ فام پر اور نہ سیاہ فام کو سرخ پر برتری حاصل ہے۔ یہ اگر ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر ہے۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۵۔ طبع مصر ص ۸۸)

یہ بنی نوعِ انسان کی حتمی وحدت کا واضح اعلان ہے اور قوم پرستی اور نسل پرستی کی نفی ہے۔ مسلمان، ہو سکتا ہے کہ دوسرے امور میں سرورِ کائناتؐ کی تعلیمات کو صحیح معنوں میں عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے ہوں لیکن اس ضمن میں انھوں نے بلاشبہ ایک قابلِ فخر کردار کا مظاہرہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ غیر مسلم مصنفین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ مقابلتاً مسلمان قومی اور نسلی تعصبات سے آزاد ہیں۔ ایک غیر مسلم مصنف کا یہ اعتراف قابلِ توجہ ہے:

"یہاں انسانی اخوت کے بارے میں اسلامی رویہ اور ان لاکھوں انسانوں کے رویہ کا ذکر نہایت ضروری ہے جو دولت اور نسل کے اختلافات کو نہایت معمولی سمجھتے ہیں اور جن کا تصورِ جمہوریت قدیم یونانیوں سے سبقت لے گیا ہے" (اور لنتر۔ ٹرائمفنٹ پلگرمیج)

ایک عیسائی مصنف افریقہ کے سیاہ فاموں سے متعلق مسلمانوں اور عیسائیوں کے رویہ کا موازنہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

"عیسائی سیاح اس شدید خواہش کے باوجود کہ ان کی سوچ مخالفانہ ہے یہ بیان کرتے ہیں کہ ان سیاہ فام لوگوں میں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے فوری طور پر انسانی وقار کا وہ احساس پیدا ہو گیا ہے جو عیسائیت قبول کرنے والے سیاہ فاموں میں بہت کم پیدا ہو سکا ہے۔" (اسلام کی اقدار۔ از ریورنڈ بوسورتھ سمتھ)

فرانسیسی انقلاب اور کمیونسٹ انقلاب دونوں بین الاقوامی نصب العین اور اعلیٰ اقدار کے بلند بانگ دعووں کی بنا پر رونما ہوئے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی نیشنلزم کے تنگ دائرے سے باہر نہیں نکل سکا یورپ میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا زیادہ تر ذمہ دار فرانسیسی انقلاب ہے اور جہاں تک روسی کیمونزم کا تعلق ہے، اس بارے میں انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مصنف کی رائے ملاحظہ فرمائیے:

"دوسری جنگ عظیم کے دوران قومی جذبۂ حب الوطنی کا وہ رجحان جو اس سے قبل بھی دیکھنے میں آتا تھا کمیونسٹ روس میں نہایت شدید ہو گیا۔ سٹالن نے اس ضمن میں خود پہل کی اور ۲۰ جولائی ۱۹۴۲ء کو روسی عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے عظیم اسلاف کے ہمت و حوصلہ سے فیضان حاصل کریں اور اس طرح روس کے جاگیردارانہ ماضی کے فوجی ہیروز کو روس کے کیمونسٹ جوانوں کے لیے مثال اور نمونہ قرار دیا گیا۔"

(جلد ۳ و ۴، صفحہ ۱۰۸)

اسلامی انقلاب دوسرے معاملات میں بھی جمہوری انقلاب اور کمیونسٹ انقلاب سے مختلف ہے۔ جمہوریت کے برعکس، جو غریب اور ضرورت مند افراد کو غاصب سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور انھیں اقتصادی تحفظ دینے کے لیے کچھ نہیں کرتی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجت مندوں کی ضروریات کی کفالت کے لیے لازمی زکوٰۃ کا نظام قایم کیا ہے۔ زکوٰۃ کی تعریف سرورِ کائنات صلعم نے خود ان الفاظ میں کی ہے:

"ان اللہ قد افترض علیہم صدقۃ توخذ من اغنیائھم و ترد فی فقرائھم۔"

(بخاری کتاب الزکوٰۃ۔ ص ۱۸۷۔ جلد ۶)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو تمہارے تونگروں سے لیا جائے گا اور تمہارے محتاجوں کو دے دیا جائے گا۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ۔ ص ۱۸۷، ج ۶)

غریبوں کو دینے کے لیے امیروں سے لینے کے اس اسلامی نظام نے غریب طبقات کو اقتصادی تحفظ کی ضمانت دی اور مسلم معاشرے میں آمدنیوں میں توازن پیدا کیا۔ اسی طرح کیمونزم کے برعکس اسلام نے آزادیِ فکر اور اظہار کو کچلنے کی کوشش نہیں کی۔ کیمونزم میں کوئی دین اور مسلک نہ زندہ رہ سکتا ہے نہ پنپ سکتا ہے، جب کہ سرورِ کائناتؐ کے اسلامی معاشرے میں عیسائی، یہودی اور مشرک مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو پورے ربط و ضبط اور امن و سکون سے بستے تھے۔ مذہب اسلام میں اتنے مکاتب فکر کا وجود بجائے خود اس کے وسیع القلب اور عالمگیر مذہب ہونے کا ثبوت ہے جو سرورِ کائنات کی تعلیمات کی روح ہے۔

کیمونسٹ اور جدید جمہوریت کے داعی اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے

دور میں کسی نمائندہ ادارہ کا کوئی وجود نہ تھا اور اصل طاقت عوام کے پاس نہ تھی۔ یہ اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ نمایندہ اور منتخب اداروں کے قیام کے لیے بعض مادی شرائط مثلاً صنعت کی ترقی، تیز رفتار ذرائع آمد و رفت اور پرنٹنگ پریس کا وجود لازمی ہے۔ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں کوئی منتخب اور نمایندہ ادارہ وجود میں نہیں آسکتا۔ محسن انسانیت صلعم اور ان کے ابتدائی جانشینوں کے دور میں کوئی مطبوعہ لفظ نہ تھا اور کوئی منظم پریس نہ تھا۔ فاصلے اتنے تھے کہ سفر کرنا مشکل تھا۔ مختلف اضلاع اور صوبوں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی رابطہ قایم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اس وقت منتخب نمایندہ ادارے کیسے قایم ہو سکتے تھے؟ اس قسم کے اعتراضات کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جمہوریت کی ایک سے زاید صورتیں ہو سکتی ہیں اور جو بات اسے دوسری طرز کے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے وہ مساوات کی رُوح اور حکومت کے کاموں میں عوام کی شرکت ہے۔

جمہوریت محض سیاسی طریقوں اور اقتصادی اصلاحات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک بنیادی نظریہ ہے اور اقدار جانچنے کا ایک پیمانہ ہے۔ یہ انسان اور اس کے معاشرہ میں صحیح مقام کا ایک واضح تصوّر ہے۔ اگر اسے اس معیار پر جانچا جائے تو سرورِ کائنات صلعم کا انقلاب پُورے طور پر ایک جمہوری انقلاب تھا۔

میں اپنا یہ مقالہ ایک غیر مسلم مورّخ کے اقتباس پر ختم کرتا ہُوں جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی ترقی کے لیے کیا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ سر فلپ گبز "عظمت محمد صلعم" میں لکھتے ہیں:

"اسلام جسے بجا طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین کہا جا سکتا ہے اس نے انسانی تہذیب اور اخلاقیات کی ترقی اور فروغ کے لیے ان تمام مذاہب سے کہیں زیادہ کام کیا ہے جو انسان کی تخلیق سے لے کر اب تک اس کی رُوح کو گرمانے کا باعث ہُوئے ہیں۔" (سر فلپ گبز۔ عظمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

رحمتِ عالمؐ کا ہمہ گیر انقلاب

سیّد ابوبکر غزنوی

وہ انقلاب جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام لائے اس کی ابھری ہوئی خصوصیات کیا ہیں؟ اس رُوئے زمین پر جو انقلاب برپا ہوئے، ان کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بعض انقلاب محض سیاسی تھے بعض اقتصادی تھے بعض ثقافتی تھے۔ مگر وُہ انقلاب جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس روئے زمین پر برپا کیا وہ اخلاقی بھی تھا، روحانی بھی تھا، ثقافتی بھی تھا، سیاسی اور اقتصادی بھی تھا طبیعاتی بھی تھا۔ لینن اور ماؤ کا انقلاب محض اقتصادی اور سیاسی تھا، اخلاقی اور روحانی نہ تھا۔ لینن اور ماؤ جدلیاتی مادیت (DIALECTICAL MATERIALISM) کے قائل ہونے کی وجہ سے مابعد الطبیعات کے سرے سے منکر ہیں۔ پس لینن اور ماؤ کے برپا کیے ہوئے انقلاب بھی ناقص اور ادھورے ہیں۔ مختلف انقلابوں کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات مجھ پر منکشف ہوئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انقلاب سے زیادہ جامع، ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب اس روئے زمین پر آج تک برپا نہیں ہوا۔

محمدی انقلاب ابتدائی مرحلوں میں

یہ کہنا حقائق کی سراسر تکذیب ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جو انقلاب لائے وہ ابتدائی مرحلوں میں صرف اخلاقی اور روحانی انقلاب تھا اور معاشی مسائل پر توجہ بہت بعد میں منعطف کی گئی اگر ابتدائی مکی سورتوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی مرحلے میں جہاں نماز کی تلقین کی گئی، اللہ سے تعلق جوڑنے کی ترغیب دی گئی، معاشی انقلاب کا آغاز بھی اسی مرحلے میں ہو گیا تھا۔

سورہ ہمزہ مکی سورت ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

ہلاکت ہے ہر طعنہ زنی اور عیب چینی کرنے والے کے لیے جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر (تجوریوں میں) رکھا۔ اس کا گمان ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ رہے گا، ہرگز نہیں، ہڈیوں کو چٹخا دینے والی دوزخ میں اسے جھونک دیا جائے گا۔

سورۂ تکاثر دیکھیے:

مال کی بہتات کی ہوس نے تمہیں غافل کر دیا ہے اور یہ ہوس تمہیں مرتے دم تک لگی رہتی ہے۔ ہوش کرو (اس ہوس کا انجام تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا)۔

ابولہب بہت مالدار آدمی تھا۔ انقلاب کے ابتدائی مکی دور میں اس کا نام لے کر اعلان کیا گیا:

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وُہ ہلاک ہوا۔ اس کا مال اور دولت جو اس نے سمیٹی تھی اس کے کام نہ آسکی۔

پھر سورۂ ماعون ملاحظہ فرمائیے:

کیا تونے اس شخص کو دیکھا جو جھٹلاتا ہے ارتکاز دولت کی سزا کو، یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو خود کھانا کھلانا

تو درکنار اس کی ترغیب بھی نہیں دیتا۔

ایک دُوسرے کی ضد ہیں، ایک دُوسرے کے ساتھ حریفانہ کش مکش میں ہم نے حقیقتوں کا چہرہ مسخ کیا، ہم نے اس انقلاب کا حلیہ بگاڑا۔

حضورؐ نے معاشرے کو معاشی اعتبار سے شدت سے جھنجھوڑا اور اس انقلاب کا آغاز اپنی ذات سے کیا ؏

لوح بھی تُو، قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب

آغاز اپنی ذات سے کیا

اسبابِ راحت اور اسبابِ تعیش کا تو وہاں گزر نہ تھا، اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی معاشرے کے حوالہ کریں خود فقر و فاقہ کی سختیاں جھیلتے رہے اور غریبوں، مسکینوں اور بے نواؤں کی چارہ سازی کرتے رہے۔ حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں پر چکی چلانے سے گٹے پڑ گئے تھے۔ خود جھاڑو دیتی تھیں اور گرد اڑ کر ان کے کپڑوں پر پڑتی تھی۔ خود پانی بھرتی تھیں اور مشکیزے کے پٹے کے نشان ان کے کندھوں پر پڑ گئے تھے۔ ایک دن اپنے بابا سے خادم مانگا، تو حضورؐ نے فرمایا:

اے فاطمہ! اللہ سے ڈرتی رہو، اپنے رب کے فرائض ادا کرتی رہو اور اپنے گھر والوں کے کام کاج میں لگی رہو۔ خادم ہونے سے یہ زندگی جو تم بسر کر رہی ہو تمہارے لیے بہتر ہے۔

اس انقلاب کا آغاز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اور گھر سے ہُوا۔ انقلاب مارکس اور لینن کا ہو یا ماؤ کا ہو یا حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہو، یاد رکھیے کہ وہ ہمیشہ انقلابی کی ذات اور گھر سے شروع ہوتا ہے۔ تاریخ عالم اس بات کو جھٹلاتی ہے کہ کبھی ایسا ہُوا ہو کہ انقلابی خود راحت اور تعیش میں ڈوبا ہُوا ہو اور اس نے معاشی انقلاب برپا کیا ہو۔

محنت کش اور مزدور کو عزت بخشی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جھوٹے وقار کے خلاف جہاد کیا۔ وہ گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے صحاح ستہ کی مختلف روایات جو حضرت عائشہؓ، حضرت حسن بصری اور ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہیں، سے پتا چلتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بکری کا دُودھ خود دوہ لیتے تھے، کپڑے کو پیوند خود لگا لیتے تھے، اپنی جوتیاں خود گانٹھ لیتے تھے۔ گھر میں جھاڑو دینے میں بھی عار نہ تھا۔ بازار سے سودا سلف خود اٹھا کر لاتے۔

مسجد قبا کی تعمیر شروع ہُوئی تو صحابہ کرامؓ کے ساتھ آپؐ بھاری پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ صحابہ عرض کرتے:

یا رسول اللہؐ! آپ رہنے دیجیے، ہم جو اٹھا رہے ہیں۔

مگر آپؐ برابر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔ پھر مسجد نبویؐ تعمیر ہُوئی تو آپؐ صحابہ کے ساتھ مل کر کچی اینٹیں بنانے کا کام کرتے رہے اور خود اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور صحابہ کرامؓ یہ شعر پڑھتے تھے: ؎

لئن قعدنا و النبی یعمل

فذاک منا العمل المضلل

(اگر ہم بیٹھ جائیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کام کریں تو ہمارا بیٹھ جانا بہت ہی بُرا عمل ہوگا)

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

کسب معاش کرنے والوں میں سب سے بہتر محنت کش ہے جب وہ اخلاص سے کام کرتا ہے۔

حدیث میں ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں پڑھتے ہیں کان یاکل مع الخادم۔ وہ اپنے خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ یہ اسلامی نظامِ حیات کی ابجد ہے۔ ایک المیہ ہے کہ جو لوگ معاشرے میں اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں وہ عملی طور پر اس کی ابجد ہوز سے بھی محروم ہیں اور وہ نوکر کو اپنے دستر خوان پر بٹھانا توان کے لیے ناقابلِ تصور ہے۔ لاہور میں گزشتہ دنوں ایک ڈنر میں شرکت کا اتفاق ہُوا، جس میں بڑے بڑے حامیانِ دین اور مفتیانِ شرعِ متین شریک تھے میں نے میزبان سے کہا کہ میرے ڈرائیور کو اندر بلا لیجیے، وہ کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔ میرے ڈرائیور کو تو انھوں نے ذرا سی پیش و پس کے بعد بُلا لیا مگر بیسیوں ڈرائیور اور چپڑاسی رات گیارہ بجے تک باہر بھوکے بیٹھے رہے۔ میرے ڈرائیور نے مجھے بعد میں بتایا کہ سب ڈرائیور اور چپڑاسی ان اسلام کے علمبرداروں کو گالیاں دیتے رہے اور ان پر لعنتیں بھیجتے رہے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ہم اسلام کا نام محض SLOGAN کے طور پر بولتے ہیں اور اس ملک میں سوشلزم کا لفظ بھی محض SLOGAN کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ؎

رُخ پر نقاب مصلحتوں کے پڑے ہُوئے
لب پر زمانہ سازی کی مُہریں لگی ہوئیں

جیسے زبان و دل میں کوئی ربط ہی نہیں۔ ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اپنی نظم "سرمایہ محنت" میں کہا: ؎

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

اور اپنی نظم "الارض" میں جاگیرداروں کو شدت سے جھنجھوڑا: ؎

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اپنے ایک مضمون میں یُوں رقمطراز ہیں:

مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔

فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

اس کی نوازش سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔

میرا اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق اور تولید ہو۔ (زمیندار، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

قرآن مجید بار بار دولت مندوں سے کہتا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے یعنی تم ان پر کوئی احسان نہیں کرتے ہو۔

ارض وسما کے مالک ہم ہی ہیں اور نحن نرزقکم و ایاھم اور ہم ہی ہیں کہ تمہیں بھی اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ اسی لیے قرآن و حدیث میں بار بار کہا گیا ہے کہ تمہارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔

ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ اور فرمایا:

یعنی یتیموں اور مسکینوں کا حق انہیں دے دو۔

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

حضورؐ نے بھی لفظ "حق" ہی استعمال فرمایا۔ ساری دقتیں اور دشواریاں دولت کو گردش میں لانے کے سلسلے میں اسی لیے اُبھرتی ہیں کہ ہمیں اس بات کا یقین نہیں آتا کہ ہمارے مال میں غریبوں کا حق ہے۔ حقدار کو حق دلانا ہر حکومت کا فرض ہوتا ہے اور جب بھی کوئی حق غصب کرتا ہے تو حکومت جبراً حقدار کو حق دلاتی ہے۔ اگر ہمیں یہ یقین آجائے کہ غریبوں اور مزدوروں کا ہمارے مال میں حق ہے تو منطقی اعتبار سے ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ اگر غاصبانِ حق برضا و رغبت حقداروں کو ان کا حق دینے پر آمادہ نہ ہوں تو حکومت جیسے دُوسرے حق، حقداروں کو جبراً دلاتی ہے، یہ بھی غریبوں کو جبراً دلائے "تشکیل الٰہیات جدیدہ" میں علامہ اقبالؒ نے امام ابن حزمؒ کا چھ بار ذکر کیا ہے۔ امام ابن حزم بہت بڑے محدث تھے۔ المحلی کی چھٹی جلد میں لکھتے ہیں کہ ایک دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ سے فرمایا کہ:

تم میں سے جس کے پاس فالتو سواری ہو وہ اسے لوٹا دے، جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زاید غذا ہے وہ ان لوگوں کو لوٹا دے جن کے پاس غذا نہیں ہے۔ (ص ۱۵۷)

آپ غور کیجئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں فرمایا کہ عطا کر دیجئے یا بخش دیجئے بلکہ لوٹانے کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس لفظ کے استعمال سے یہ وضاحت فرما دی کہ تم حقداروں کو ان کا حق لوٹا رہے ہو کوئی احسان تو نہیں کر رہے ہو۔ ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک ایک جنس اور مال کی ایک ایک قسم کا جدا جدا ذکر کیا حتیٰ کہ ہمیں یقین آگیا کہ فالتو مال پر ہمارا کوئی حق نہیں رہا۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ نے ایک سال جب غلے کا شدید قحط ہوا، احکام صادر کیے کہ میں نے غلہ سٹاک کرنے کے مختلف مرکز بنا دیئے ہیں اور وہ تمام لوگ جن کے گھروں میں غلہ پڑا ہے ان مرکزوں میں اس غلے کو اکٹھا کر دیں۔ حضرت ابو عبیدہ ہر گھر کے تناسب کے اعتبار سے اس غلّے کو مساوی طور پر تقسیم فرماتے رہے۔

میں پُوچھتا ہوں کہ ابو عبیدہ بن جراح نے ان جاگیرداروں کو اس غلّے کا کون سا معاوضہ دیا تھا۔ بلال بن حارث المزنی کو ایک بہت بڑا رقبہ حضورؐ نے عطا کیا۔ حضرت عمرؓ نے جب زرعی اصلاحات شروع کیں تو زمین کا وہ تمام حصہ جسے وہ کاشت نہ کر سکے ان سے چھین لیا اور مسلمانوں میں اسے بانٹ دیا۔ یہ واقعہ "کتاب الخراج" میں بھی لکھا ہے اور "کنز العمال" میں بھی ہے۔ میں پھر اس بات کی وضاحت کرتا ہوں کہ بلال بن حارثؓ کو حضرت عمرؓ نے اس چھینی ہُوئی زمین کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا۔

بعض دوستوں نے کہا کہ یہ باتیں تو درست ہیں لیکن ان باتوں کو ذاتی انتقام کے لیے استعمال کیا جائے گا، اس لیے ان باتوں کا اظہار نہ کرنا ہی مناسب ہے۔ میں کہتا ہُوں کہ ذاتی انتقام کے لیے تو تمام تعزیرات کو استعمال کیا جا سکتا ہے تو کیا اس خدشے کی بناء پر تمام

تعزیرات میں تحریف اور تاویل کی جائے۔ اگر کوئی احکامِ الٰہی کو ذاتی انتقام کی خاطر استعمال کرتا ہے تو وہ اللہ اور معاشرے کے سامنے جواب دہ ہے اور اللہ کے قانون جزا و سزا سے نہ بچ سکے گا۔

سب کچھ لٹا دیا ام المومنین حضرت خدیجہؓ حجاز کی ممتاز، متمول خاتون تھیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے مال سے تجارت کرتے تھے جب اس ہمہ گیر اور بھرپور انقلاب کو برپا کرنے کا کام آپ نے شروع کیا تو ان کا کاروبار مندا پڑنے لگا۔ جب آپ نے یہ آواز بلند کیا کہ تمام انسان اللہ کی نظر میں برابر ہیں۔ بلال حبشیؓ سرداران قریش سے افضل ہے تو عربوں کی حمیت جاہلیہ کو سخت دھچکا لگا۔ پھر ہمہ تن انقلاب کے کام میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے حضور کو تجارت کا کام بند کر دینا پڑا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے پاس جس قدر اندوختہ تھا اسلام پھیلانے کی خاطر خرچ کر ڈالا۔ تمام اثاثہ اس راہ میں لٹا دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام طائف تشریف لے گئے تو ان کے لیے سواری کے لیے کوئی جانور بھی نہ تھا۔

سرداران قریش نے جب اس تحریک کو شدت سے اُبھرتے ہُوئے اور جھوٹی قدروں کو مسمار ہوتے دیکھا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حجاز کا حکمران بنانے کے لیے تیار ہو گئے اور کہا کہ ہم آپ کو اپنا فرماں روا بنالیں گے، ہم عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دینے کیلئے تیار ہیں۔ ہم دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اسلامی نظریۂ حیات کے پرچار سے باز آجائیں۔ مگر اس انسان نے جو تمام کائنات کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھا تھا اور جو دونوں جہان کی سعادتیں بنی نوع انسان کی جھولی میں ڈالنا چاہتا تھا، ان تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا:

"ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں، تمہاری مجلس میں ہر وقت غریب، مفلس اور نچلے طبقے کے لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹاؤ تو ہم آکر بیٹھیں"۔

مگر وہ انسان جو رنگ، نسل، خون اور خاک کے بتوں کو توڑنے کے لیے آیا تھا، اس نے ان سرداروں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اس تحریک کی اُبھری ہُوئی خصوصیت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے اور اپنے خاندان کے مفاد کو بنی نوع انسان کے مفاد پر ترجیح نہیں دی۔ آپ ہر قسم کی کنبہ پروری اور اقربا نوازی سے برتر رہے۔ اسی بات سے دنیا والوں کو یقین دلایا کہ آپ تمام اقوام کے لیے سراپا رحمت بن کر آئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی آواز پر ہر قسم کے انسانوں نے لبیک کہا۔ اگر آپ اپنے گھرانے کی برتری کے لیے کام کرتے تو غیر ہاشمیوں کو کیا پڑی تھی کہ آپ کا ساتھ دیتے؛ اگر آپ کو یہ فکر لاحق ہوتی کہ قریش کی برتری اور اقتدار کو کسی طرح بچاؤں تو غیر قریشی عربوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ وہ اس کام میں شریک ہوتے۔ اگر آپ عرب کا بول بالا کرنے کے لیے اُٹھتے تو بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کو کیا پڑی تھی کہ آپ کا ساتھ دیتے۔ وُہ بات جس کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان آپ کی طرف کھنچتے چلے آئے۔ وُہ آپ کی بے لوث خدا پرستی تھی اور آپ کا تمام ذاتی، خاندانی اور نسلی مفاد اغراض سے بلند و برتر ہونا تھا۔

جب آپ نے یہ آواز بلند کیا کہ بلال حبشیؓ سرداران عرب سے افضل ہیں اور ہر طرح کی فضیلت اور شرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنا پر ہے اور قریشی اور ہاشمی ہونے کی بنا پر تمہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے تو قریش اور عرب کے سردار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خون کے

پیاسے ہوگئے۔ آپ کے قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مکہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ جب آپ مکہ سے جا رہے تھے تو آپ نے حضرت علیؓ سے کہا:

"علی! تم یہیں رہ جاؤ، یہ لوگ جو میرے قتل کے درپے ہیں، ان کی امانتیں میرے پاس ہیں۔ تم ان میں سے ایک ایک کی امانت لوٹا دینا۔"

حضور علیہ السلام اپنے جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کی امانتیں بھی لوٹا دینے والے اور ہم سیاست کی بنیاد ہی غنڈہ گردی اور شُہدا پن پر قایم کرنے والے۔ ہمیں ان سے کیا نسبت؟

جب مکہ فتح ہُوا تو آپ کی راہ میں کانٹے بچھانے والے، آپ پر اوجھڑیاں پھینکنے والے، آپ کے قتل کی سازشیں کرنے والے سب سر جھکائے ہُوئے کھڑے تھے۔ آپ نے فرمایا:

"جاؤ میں تم سب کو رہا کرتا ہُوں، آج کے دن کے بعد تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، آج بات ختم ہوگئی اور میں نے تم سب کو معاف کیا۔"

بات بات پر اپنے مسلمان بھائیوں سے یہ کہنا کہ "میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا" صد درجہ غیر اسلامی بات ہے۔ یہ فقرہ ابوجہل اور ابولہب کہتے تھے کہ ہم تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ پس ہر وُہ شخص جو بار بار مسلمان بھائیوں سے یہ کہتا ہے کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ ابوجہل اور ابولہب کی رُوح اس کے اندر حلول کر گئی ہے۔

منتشر اجزاء کو مرتّب کیا

محمدی انقلاب کی ایک اُبھری ہُوئی خصوصیت یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاشرے کے منتشر اجزا کو مرتب اور مربوط کیا اور اسے باطل سے ٹکرا دیا۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ جوانوں کو بوڑھوں سے ٹکرا دیا ہو اور (GENERATION GAP) کا سوال پیدا کر دیا ہو۔ انہوں نے یہ نہیں کیا کہ مزدوروں کو صنعت کاروں سے اور کسانوں کو زمینداروں سے ٹکرا دیا ہو اور معاشرے کے مختلف طبقوں کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا ہو، جیسا کہ کارل مارکس اور لینن نے کیا۔ آپ نے جوانوں سے کہا کہ بوڑھوں کے سفید بالوں کا خیال کرو۔ آپ نے بوڑھوں سے کہا کہ بچوں پر شفقت کرو۔ حضورؐ نے اپنا سب کچھ معاشرے کی فلاح و بہبود پر لگا دیا۔ اپنے قائد کے اس ایثار کو دیکھ کر معاشرے کے متمول افراد کے اندر غریب پروری کا جذبہ خود بخود اُبھرنے لگا۔ اور کسی جبر اور تشدد کے بغیر، بلکہ شدید رضا و رغبت کے ساتھ معاشرے کی خوشحالی پر بے دریغ خرچ کرنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے امیروں سے کہا کہ تمہارے پاس جو کچھ مال و منال ہے، سب اللہ کا بخشا ہُوا ہے اور غریبوں کا تمہارے مال میں حق ہے ان کا حق ان کو لوٹا دو۔ اور یُوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معاشرے کے مختلف طبقوں کو باہم متحد اور منظم کیا اور حق کی حمایت میں باطل کے خلاف سب کو صف آراء کر دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"خدا کی قسم دعوتِ اسلام کا جو کام شروع ہُوا ہے پایۂ تکمیل کو پہنچ کر رہے گا، یہاں تک کہ صنعا یمن سے حضر موت تک مسافر چلا جائے گا اور اسے کسی کا کھٹکا نہ ہوگا۔"

عدی بن حاتمؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا؛ "لتفتحن کنوز الکسرٰی"۔ وہ وقت یقینی طور پر آنے والا ہے جب کسریٰ کے خزانے

تمہارے قدموں پر ڈھیر ہوں گے۔ حضورؐ نے جب یہ الفاظ فرمائے، مسلمانوں کی بیچارگی کا یہ حال تھا کہ خود ان کے وطن کے دروازے بھی ان پر بند تھے، قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا نام سُن کر متعجب ہُوئے۔ عدی بن حاتمؓ ضبط نہ کر سکے۔ حیران ہو کر پُوچھا: کون کسریٰ؟ کسریٰ بن ہرمز شہنشاہِ ایران؟" فرمایا: ہاں، وہی اور کون۔ آپ نے فرمایا: عدی!

یعنی عدی تمہیں اس پر تعجب کیوں ہے، اگر تم زندہ رہے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ اسلامی معاشرے کی خوشحالی کا یہ حال ہوگا کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا لے کر صدقہ و خیرات کے لیے نکلے گا مگر کوئی لینے والا نہ ہوگا، سب آسُودہ حال ہوں گے۔ عدیؓ کہتے ہیں کہ میں زندہ رہا اور میں ان لوگوں میں سے ہُوں جنہوں نے فتحِ ایران کے بعد کسریٰ کا خزانہ کھولا اور صحابہؓ نے اسلامی معاشرے کی خوشحالی کا وہ دور دیکھا کہ صدقہ و خیرات لینے والا کوئی شخص نہ ملتا تھا۔

محمدؐی انقلاب امن اور سلامتی، آسُودگی اور خوشحالی کا ضامن ہے۔ ایک لمحے کے لیے غور کیجیے کہ اپنے آقاؐ سے بے وفائی کر کے ہم نے کیا پایا ہے، چوریاں اور ڈکیتیاں جن کے تذکرے سے آدھا اخبار بھرا ہُوا ہوتا ہے۔ افلاس، بھُوک، چیتھڑے اور دھجیاں۔

ساتھیو! وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس ملک میں محمدؐی انقلاب برپا کرنے کے لیے ہم اپنا مال، اپنا وقت، اپنی توانائی، اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو کھپا دیں۔ نتائج تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ تمام عواقب اور نتائج سے بے پروا ہو کر اس عظیم مقصد کے لیے جسم و جاں کی بازی لگا دینا چاہیے۔ اس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے اگر میں اور آپ سب پھانسیوں پر بھی لٹک جائیں تو میں یہ سمجھوں گا کہ ہماری زندگیاں کام آگئی ہیں۔ ؎

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

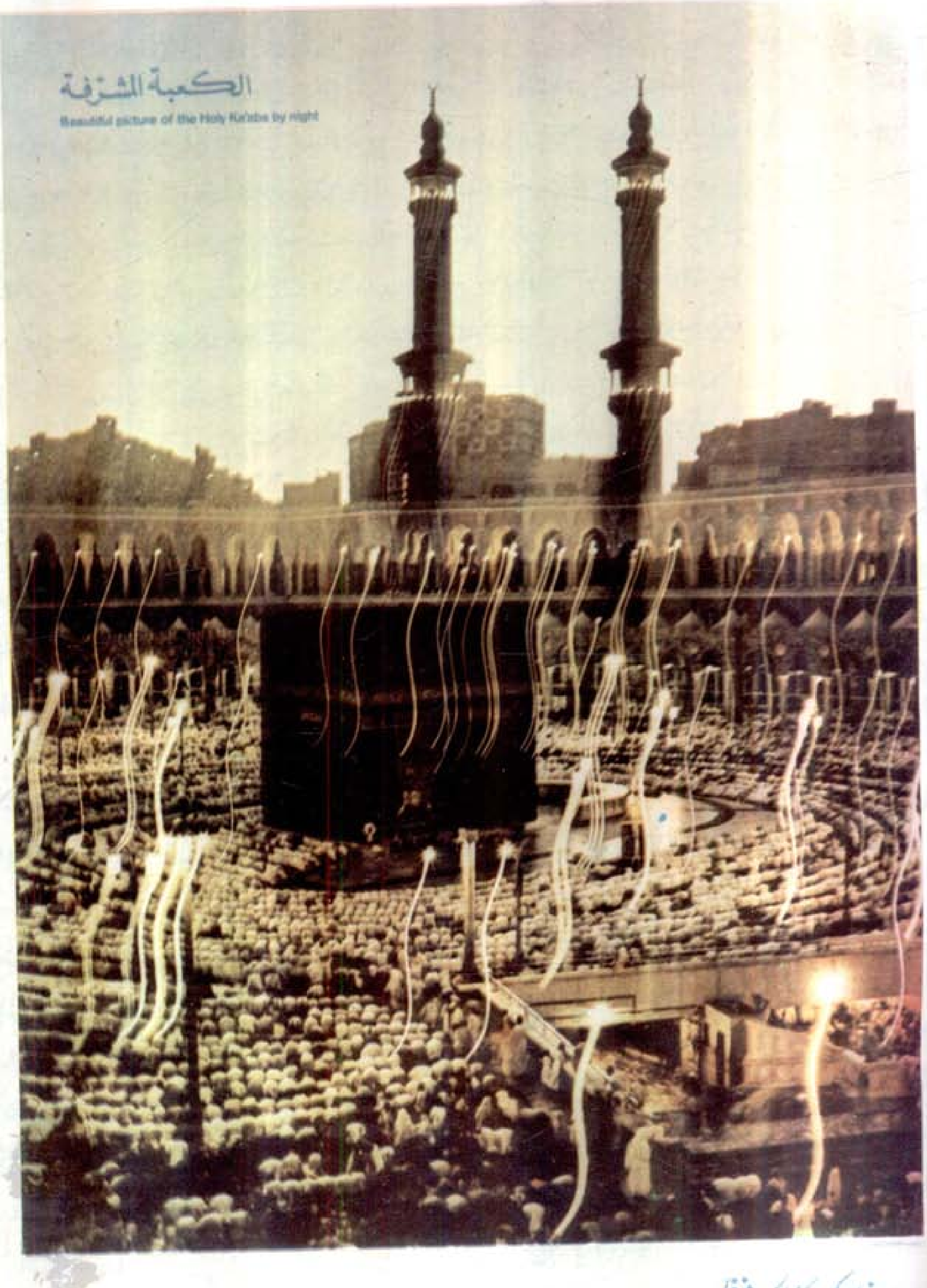
انقلابِ محمدیؐ

عبد الواحد ہالے پوتا

سلسلۂ رسالت اور بعثتِ انبیاء کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انبیاء جو صاحبِ کتاب یا حاملِ صحیفہ ہوئے اور جن کی اپنی قومیں تھیں، جن کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ مبعوث ہوئے۔ ایسے انبیاء کی آمد نے ان اقوام کی کایا پلٹ دی اور ان کی زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب آگیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے کے دور اور آمد کے بعد کے دَور کا اگر تقابلی مطالعہ کریں تو دونوں میں بڑا فرق پائیں گے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد کے دور میں یہودیوں کی زندگی کا ان کی آمد سے پہلے کی زندگی سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان کی قوم کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ ان کے عقائد میں انقلاب آگیا۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں انقلاب پیدا ہوا۔ زندگی کے متعلق ان کے نقطۂ نظر میں انقلاب رُونما ہوا۔ اسی طرح ایک نبی کا دور دوسرے نبی کے دَور سے مختلف معلوم ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ کا دور حضرت موسیٰؑ کے دور سے الگ اور جُداگانہ نظر آئے گا۔ ان کے دور میں بہت سی ایسی اہم خصوصیات نظر آئیں گی جو حضرت موسیٰؑ کے دور میں نہیں تھیں۔

حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کی وجہ سے یہودیوں کی زندگی میں ایک اجتماعی اور قومی نظام مرتب ہو چکا تھا، لیکن ان میں ایک طرف قومی عصبیت پیدا ہو چکی تھی تو دوسری طرف دنیوی اسبابِ عیش اور مادّی فوائد کی جستجو میں انہماک بھی حد سے گزر چکا تھا، روحانی تقاضوں کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کی ضروریات ان کے لیے زیادہ پُرکشش تھیں۔ جس کے باعث ان میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئیں جو مادہ پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم سے ان کی زندگیوں میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ لوگوں کی توجہ دنیوی اور مادی زندگی میں انہماک سے ہٹ کر اُخروی اور رُوحانی زندگی کی طرف ہوگئی۔ آخرت کا تصور ان کی دنیوی زندگی کے رہن سہن پر بھی اثر انداز ہوا۔ رفتہ رفتہ لوگ ترکِ دُنیا کر کے اپنے شب و روز کو آخرت کے لیے وقف کرنے کو اعلیٰ دینی نصب العین سمجھنے لگے۔ رہبانیت کو فروغ ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کی اتباع کرنے والوں میں خانقاہوں کی تعداد بڑھنے لگی جہاں دیندار لوگ دنیا سے منہ موڑ کر اپنی عمریں گذار دیتے تھے۔ اس دور میں خانقاہوں میں بیٹھنا، سادھوؤں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر سادھنا کرنا اور جسم کو فاقہ کشی اور دوسرے طریقوں سے اذیت دینا، یہ اور اس قسم کے دوسرے اعمال بہترین روحانی کام سمجھے جاتے تھے۔ ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی سے تعلق رکھنے والی مختلف اقدار زندگی کی اہم قدریں شمار ہونے لگیں اور ان سے وابستہ لوگ سب سے زیادہ قابلِ عزت اور لائقِ احترام ہستیاں تصوّر کئے جانے لگے۔



خانہ کعبہ کا ایک منظر

اس کے بعد جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ظہور ہوا تو دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ حضورؐ کی بعثت سے ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ سارے جہان میں ایک نئی روشنی لمعہ افگن ہوئی۔ "سراج اور قمر منیر" کی آمد سے ساکنانِ ارض کے شب و روز کی تیرگی کافور ہو گئی۔ کائناتِ ارضی میں اس تاریخ کا عظیم ترین انقلاب رونما ہوا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دینِ اسلام دنیائے موجود کے تمام مذہبی نقطہ ہائے نظر پر حاوی ہو گیا۔ ما قبل اسلام کی ایسی اقدار جو اس بین الاقوامی دستورِ حیات اور عالمِ انسانیت میں وحدت پیدا کرنے والے تاریخی انقلاب سے متصادم تھیں سب کی سب کم عیار ٹھہریں۔ بغرض تاریخِ انسانی کا نیا دور شروع ہوا جسے دورِ مصطفوی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں نورِ مصطفوی کی شعاعیں مشرق سے مغرب تک اور چین سے یورپ تک بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں منعکس ہوئیں جن کے اثرات کے نتیجہ میں نئے علوم و فنون، طبیعیاتی سائنس اور جدید فلسفہ الٰہیات وجود میں آیا جس سے عالمِ بشریت ابھی تک نا آشنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انسان کی اجتماعی زندگی، مادی ترقی اور روحانی ارتقا کی راہیں کھل گئیں جو تہذیب و تمدن کی ہمہ جہتی نشو و نما کے لیے محرک ثابت ہوئیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی منشور قرآن کریم کی تعلیمات سے ہمہ گیر تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ ارشادِ خداوندی "اقرأ" (پڑھ) سے علم و فن کے دروازے کھل گئے تفکر و تدبر کی آیات نے سائنس اور دانائی و حکمت کو فروغ بخشا۔ "فک رقبۃ" نے غلامی کی زنجیریں کاٹ دیں۔ غلاموں کو آزادی ملی اور انسان نے حریت و استقلال کا سبق سیکھا۔ توحید کی تعلیم سے وحدتِ انسانی، اخوت، مساوات، ہمدردی، بھائی چارہ اور بین الاقوامیت کے تصورات وجود میں آئے۔ قیصر و کسریٰ کو بھیجے گئے مکتوبات میں "ھلک کسری فلا کسری بعدہ۔ ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ" کی پیشین گوئی کے بعد استبدادی حکومتوں کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

یہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کا انقلاب آفریں اثر تھا جس کی وجہ سے ہزاروں برس سے قائم استبدادی حکومتوں کا یکلخت خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد اگر کہیں کہیں اِکا دکا اس قسم کی حکومتیں رہ گئیں تو وہ برائے نام تھیں اور ان کی حیاتِ مستعار کے دن تھوڑے تھے۔

قرآن مجید کا ایک کلمہ "قم" (یا ایہا المدثر قم فانذر) سے روحانی دنیا میں ایک انقلاب آگیا جس کے بعد رہبانیت کی زندگی بسر کرنے یا گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سادھنا کرنے کی اہمیت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ایسے کاموں نے لے لی جن میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی موجود ہے۔ کسبِ حلال، خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کام کرنا، لوگوں کو صحیح تعلیم سے آراستہ کرنا، حق کی تائید و حمایت میں جد و جہد کرنا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرنا، لوگوں کو تعلق باللہ اور تقرب الی اللہ کے مفہوم سے آشنا کرنا، عزلت میں بیٹھنے کی بجائے اٹھ کر زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے لیے کوشش کرنا مطلب یہ کہ بیک وقت مادی اور دینی، جسمانی اور روحانی، دنیوی اور اخروی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل کو انسان کا منتہائے مقصود قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وہ پرانی قدریں بدل گئیں جو ہزارہا برس سے سادھوؤں، راہبوں اور جوگیوں کا شعار بنی ہوئی تھیں۔ اس نئے دور میں زندگی کو مذہبی (SACRED) اور لامذہبی (SECULAR) میں تقسیم کرنے

کا تصور بھی بے معنی ٹھہرا۔ اس لیے کہ مصطفوی تعلیم کے نور سے زندگی کا ہر پہلو مکمل طور پر روشن ہوتا ہے۔ اس میں مادی خوشحالی، رُوحانی ترقی سے وابستہ رہتی ہے اور رُوحانی ترقی مادی زندگی کو اُجاگر کرتی ہے۔

نظامِ مصطفٰےؐ میں یہ جامعیت اسی لیے ہے کہ حضورِ اکرمؐ کی شخصیت جامع کمالات ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات جو آپؐ پر نازل ہوئیں وہ انسان کی دنیوی و اخروی، انفرادی و اجتماعی زندگی نیز زمانہ حال و مستقبل سب کے لیے جامع اور مکمل ضابطۂ حیات اور کامل نمونہ ہے۔ جس کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی دوسرا نظام یا نظریۂ حیات نہیں لایا جا سکتا۔ قرآن حکیم کا یہ چیلنج فاتوا بسورۃ من مثلہ چودہ سو سال سے چلا آرہا ہے اور آج تک اس کا جواب نہیں دیا جا سکا۔

بحیثیت خاتم النبیین حضورِ اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر پوری انسانیت کے لیے ایک ایسا دستورِ زندگی اور اجتماعی نظام مرتب کیا جائے جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہو اور جس کے ذریعے فرد، معاشرہ اور اقوام عروج اور ترقی کی منزلیں طے کر سکیں۔ یہ جامع دستور کامل دین اور مکمل نظام جو ہر خطۂ زمین اور ہر زمانہ کے لیے کارآمد اور قابلِ عمل ہے اور جس کو اختیار کیے بغیر انسانیت کی ترقی و خوشحالی ممکن نہیں حضور اکرمؐ کے واسطے سے عطا کیا گیا اور ظاہر ہے کہ ایسا دین کسی ایسے ہی پیغمبر پر اتارا جا سکتا تھا جو جامع، کامل اور مکمل شخصیت کا مالک ہو۔

اس جامع کمالات اور بے مثال شخصیّت کا تعارف کرانے کے لیے شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں :-

حضور اکرمؐ کی شخصیّت اور مقامِ نبوت کا اندازہ لگانے کے لیے مناسب یہ ہوگا کہ آپؐ کی ایک شخصیّت میں چار قسم کی شخصیتوں کا تصور کریں جو تنِ واحد میں جمع کر دی گئی ہیں (۱) ایک شخصیت بادشاہِ عادل کی جو بالطبع شاہ عالم ہو اور جس کے اندر اس قدر جذب کی کیفیت ہو کہ اس کے پرتو سے لوگوں میں اتحاد و اتفاق روز بروز ترقی پذیر ہو اور لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ یگانگت، اُلفت اور موانست پیدا ہو۔ اس وصف کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم اور اس نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔ اگر تم دنیا جہان کی دولت صرف کرتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے (۲) دوسری شخصیّت حکیم، مفکر اور مدبّر کی ہے۔ یہ صفت بھی حضور اکرمؐ کی شخصیّت میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے جس سے حکمت کی تعلیم، علم الاخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاست مدن کے فیوض صادر ہوتے ہیں۔ اس صفت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے۔ یؤتی الحکمۃ من یشآء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اُسے بڑی دولت دی گئی (۳) تیسری شخصیّت عارف کامل کی ہے جو روحانیت اور تزکیہ قلب و تہذیبِ نفس کے طریقوں کو سکھاتا ہے اور جس کی کرامات اور خوارق ثابت ہوتے ہیں اور جس کے رُوحانی ارشادات اور اثرِ صحبت سے گم گشتگانِ راہ ہدایت پاتے ہیں۔ اس صفت کی طرف آیت " ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ " میں اشارہ کیا گیا ہے (۴) چوتھی شخصیت جبرائیلیت کی ہے جس میں تعلق باللہ، روحانی اور الٰہی علوم اخذ کرنے کے لیے واسطہ بننا، ان علوم کو انسانیت کی طرف منتقل کرنا، اور جو علوم ملأ اعلیٰ سے اس کے قلب و دماغ پر القاء ہوں، ان کو بسہولت جذب کرنا

شامل ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات بیک وقت ان چاروں شخصیتوں کی جامع تھی اور یہ آپ کی اس جامعیت کا ہی فیضان تھا کہ آپؐ نے ایک ایسی قوم کو جو آگ کے کنارے کھڑی تھی، نفاق اور ابتری کا شکار تھی، باہمی لڑائی جھگڑوں میں جس کی توانئیں صرف ہو رہی تھیں اور جو خود اپنے محسن کی ایذا رسانی کے درپے تھی، ایسی قوم کو آپؐ کی نگاہِ کیمیا اثر نے ایک متحد و متفق اُمت میں تبدیل کر دیا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، فتوحات حاصل کیں، کفار کو شکست دی، جاہلیت کو مٹایا، کفر و شرک اور ظلم و ستم کا خاتمہ کیا، علم کی روشنی پھیلائی، اخلاقِ مفاسد کا قلع قمع کیا، بغض و عناد، حقد و حسد، عداوت اور کینہ جیسے امراض کا علاج کیا۔ جس کے بعد دینِ حق کے پیرو اس طرح باہم شیر و شکر ہو گئے کہ اس کے آگے خون کے رشتے بھی ہیچ تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو اُمتِ مسلمہ پر اپنا خاص احسان بتایا ہے۔ "واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" اور اس اُمت نے بعد میں بھی یہ مشن جاری رکھا اور ان کی کوششوں سے علوم و فنون، سائنس اور تہذیب و تمدن کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔

تاریخِ انسانی کا یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس کی نظیر نہ ماضی میں تلاش کی جا سکتی ہے اور نہ آئندہ کبھی دنیا پیش کر سکے گی۔ اس لیے کہ دُنیا میں اب کسی ایسی شخصیت کا ظہور نہیں ہوگا جو ان صفات کی حامل ہو، جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دی گئی تھیں، البتہ آپؐ کے اسوہ کی پیروی کر کے آئندہ بھی بقدرِ سعی و کوشش اس قسم کے نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

آنحضرتؐ کا اسلوبِ دعوت و ارشاد

مولانا محمد حنیف ندوی

آنحضرتؐ نے جس طرح کہ قرآن حکیم تدریج نازل ہوتا رہا، اسی طرح تعلیم و ارشاد میں بھی تدریج سے کام لیا اور تئیس برسوں میں برابر لوگوں تک اس کے پیغام کو پہنچاتے رہے۔ یہی نہیں، آپ نے عملاً امت کی باقاعدہ تربیت کی، اُن کے اخلاق کو سنوارا، عبادات و رسوم کی اصلاح کی اور ان تمام باتوں کی تشریح و وضاحت کی جن کا تعلق انسان کی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی و روحانی زندگی سے ہو سکتا ہے۔ آپ اُٹھتے، بیٹھتے، سفر و حضر، صلح و جنگ، ہر حالت میں قرآن حکیم کی عملی تطبیق میں کوشاں رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن حکیم کے ساتھ احادیث و سنن کا ذخیرہ بھی جمع ہوتا رہا اور ترتیب پاتا رہا۔

اوّل اوّل آپ نے دارالارقم کو تعلیم و ارشاد کا مرکز قرار دیا۔ اس کے بعد مسجد کو یہ اہمیت حاصل ہوئی کہ یہاں ہر نوع کے معاملات طے کیے جائیں اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کی مبلغانہ کوششیں صرف مساجد ہی تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ آپ کو جب بھی اور جہاں بھی احکام کی تشریح و توضیح کا موقع میسر آتا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے اور مناسب ہدایات دیتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے:

انما کانوا اذا صلوا الغداۃ قعدوا	صحابہ کی یہ عادت تھی کہ صبح کی نماز کے بعد مختلف حلقوں اور
حلقا حلقا یقرءون القران ویتعلمون	دائروں میں منقسم ہو جاتے اور اپنے اپنے حلقے اور دائرے میں
الفرائض والسنن۔	قرآن پڑھتے، اور آنحضرتؐ سے فرائض و سنن کی تعلیم حاصل کرتے۔

جس کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرتؐ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ایسی علمی مجالس کا اہتمام بھی فرماتے جن سے استفادہ کر کے اس لائق ہو جاتے کہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے عملی سانچوں میں ڈھال سکیں۔ ان علمی مجالس میں عورتوں کو بھی شریک کیا جاتا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے لیے خود ان کی خواہش پر ایک مقام اور وقت کا تعین فرمایا اور کہا کہ تم فلاں گھر پہنچ جاؤ، میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔ چنانچہ آپ وقت مقررہ پر تشریف لائے اور ان کو وعظ و نصیحت سے نوازا۔

آپ کے اندازِ وعظ و نصیحت کی کچھ خصوصیات تھیں۔ مثلاً یہ کہ:

۱۔ آپ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتے کہ صحابہ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مناسب اوقات کا انتظار کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت یہ نصائح کو صدقِ دل سے قبول کر سکتے ہیں۔

ابن مسعود کا کہنا ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخوّلنا بالموعظۃ فی الایام کراھیۃ السّآمۃ علینا۔

یعنی آنحضرت وعظ وارشاد میں تخول سے کام لیتے، تاکہ روزانہ اور ہر وقت کی نصیحت سے طبائع اکتا نہ جائیں۔

تعلیم و تربیت کا یہ ایسا انداز ہے جس کی اہمیت وافادیت کو اس دور کے بہت سے تربیتی اداروں نے اپنا لیا ہے اور اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ تعلیم اسی وقت صحیح نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جب طلبہ کی نفسیات کا خیال رکھا جائے اور دیکھا جائے کہ کب اور کس وقت اُن کا ذہن وقلب حاضر ہے اور اس لائق ہے کہ تعلیم و تربیت کے اصولوں سے صحیح معنوں میں بہرہ مند ہو سکے۔

۲۔ ہر شخص کی ذہنی سطح اور مدارج عقلی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آنحضرتؐ کا قاعدہ تھا کہ وہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ہر شخص کی ذہنی سطح اور اس کے مدارج عقلی کا پورا پورا خیال رکھتے۔ حضری اور شہری لوگوں سے ان کے انداز و معیار کے مطابق گفتگو فرماتے اور بدوی سے اس کی ذہنیت کے مطابق بات کرتے۔ اس کی بہترین مثال ابوہریرہ کی اس روایت سے ملے گی جس میں بنی فزارۃ کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بدوی تھا، اُن کا کہنا ہے کہ یہ شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، جو سیاہ رنگ کا ہے۔ میں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ ہم میاں بیوی میں کوئی بھی سیاہ رنگ کا نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کی سمجھ اور پیشہ کے مطابق جواب مرحمت فرمایا۔ اس سے پوچھا:

هل لك من ابل — کیا تمہارے پاس کچھ اونٹ ہیں؟

اس نے کہا "جی ہاں"۔

آپ نے پھر دریافت فرمایا۔ "وہ کس رنگ کے ہیں؟"

اُس نے کہا "سرخ رنگ کے"۔

آپؐ نے اس پر سوال کیا کہ کیا ان میں کوئی اورق یعنی خاکستری رنگ کا یا کم سیاہ رنگ کا کوئی اونٹ بھی ہے؟"

اس نے کہا "ہاں ہے؟"

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اب تم ہی بتاؤ کہ سُرخ رنگ کے اونٹوں میں یہ سیاہی کیسے آگھسی؟"

اس نے اس کے جواب میں کہا "ممکن ہے اس کے نسب میں کوئی اونٹ خاکستری یا سیاہ رنگ کا ہو۔ اور اس کی جھلک ہو"

جب بات یہاں تک پہنچ چکی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کے شبہے کو دُور کر دیا:

وهذا عسى ان يكون نزعة عرق

کہ یہاں بھی معاملہ ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ نسب کا کرشمہ کارفرما ہو اور اس میں تمہاری بیوی کا کوئی قصور نہ ہو۔

طبرانی کی روایت ہے کہ قریش کا ایک نوجوان جو حیوانیت کے جذبات سے مغلوب تھا۔ آنحضرتؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے زنا کی اجازت مرحمت فرمایئے۔ اس کا کہنا تھا کہ حاضرین اس پر لپکے اور اس گستاخی پہ اس کو خوب ڈانٹا ڈپٹا۔ آپؐ نے یہ دیکھا تو فرمایا۔ اس سے تعرض نہ کرو۔ اس کو اپنے قریب بلا کر پوچھا:

اتحبه لامك —

"کیا تم اسے اپنی ماں کے لئے پسند کرو گے؟"

اُس نے کہا "بخدا، ایسا نہیں ہو سکتا"۔
اس پر آپؐ نے فرمایا "تو کیا تم چاہو گے کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کوئی شخص یہ سلوک روا رکھے"۔
اس نے جواب میں یہی کہا کہ "جی نہیں، میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا"۔
اسی طرح آپؐ نے اس کی دیگر رشتے دار خواتین کا ایک ایک کر کے ذکر کیا اور پوچھا، کہ کیا تم پسند کرو گے کہ ان سے یہ معاملہ روا رکھا جائے۔ اس نے ہر سوال کے جواب میں یہی رویہ اختیار کئے رکھا اور کہا کہ ہرگز نہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے اس کی مغفرت کی دعا فرمائی۔ راوی کا کہنا ہے کہ تفہیم و تعلیم کے اس انداز سے یہ اس درجہ متاثر ہوا کہ اس کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا، اور پھر کبھی اس گناہ کی طرف ملتفت نہ ہوا۔

۳۔ آپؐ کی عادت مبارکہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپؐ جب بھی اپنے صحابہ کو کوئی دینی حکم سمجھانا چاہتے تو اس کو تین تین مرتبہ دہراتے، تاکہ بات نہ صرف دل کی گہرائیوں میں اتر جائے بلکہ لوحِ قلب پر مرتسم بھی ہو جائے۔

انس بن مالک سے روایت ہے:

ان النبی علیه الصلوٰة والسلام كان اذا تكلم كلمة اعادها ثلاثا حتى تفهم منه۔	آنحضرتؐ جب کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تو ہر ایک کلمہ کا تین تین دفعہ اعادہ کرتے تاکہ سننے والا اچھی طرح فہم و ادراک کی گرفت میں لے آئے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ آپؐ کا دائمی معمول تھا۔ آپؐ موقع اور مناسبت کا خیال رکھتے اور اسی انداز میں گفتگو فرماتے، جو مقام و محل کے موافق ہو۔

۴۔ آسانی اور تیسیر بھی ایک اصول تھا، جس کو آنحضرتؐ احکام و عبادات میں خصوصیت سے ملحوظ و مرعی رکھتے اور لوگوں کو اس بات سے باز رکھتے کہ احکام و مسائل میں تضییق یا تنگی سے کام لیں، یا عبادات میں تصنع اور سختی کو اپنائیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

عَلِّمُوا ويسروا ولا تعسروا۔

لوگوں کو تعلیم دو اور آسانی پیدا کرو اور مشکلات سے پرہیز کرو۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے:

خير دينكم اليسر وخير العبادة الفقه۔

تمہارے دین کا وہ حصہ بہتر ہے جو زیادہ آسان اور سہل ہو، اور بہترین عبادت احکام کی سمجھ بوجھ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ اغلوطات سے منع فرمایا کرتے تھے۔ امام اوزاعی کا کہنا ہے کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے مشکل اور پیچیدہ مسائل نہ بیان کئے جائیں، جن سے وہ کچھ بھی اخذ نہ کر سکیں۔ بلکہ صرف وہی باتیں بیان کی جائیں جن کو وہ آسانی سے سمجھ بوجھ سکیں۔

۵- آں حضرتؐ گفتگو میں سامع کے لب و لہجہ کا بھی خیال رکھتے اور یہ بھی دیکھتے کہ اس کا تعلق کس قبیلے سے ہے اور اس قبیلے میں کس نوعیت کی زبان رائج ہے۔

خطیب بغدادی نے عاصم الاشعری سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے اس کو مخاطب فرمایا:

لیس من امبر امصیام فی اسفر اس میں اشعریین کی اس عادت کو ملحوظ رکھا کہ یہ اکثر 'لام' کو 'میم' کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔ اس کو فصیح عربی میں اگر ادا کریں تو یوں کہا جا سکتا ہے:

لیس من امبر الصیام فی السفر کہ سفر کے دوران روزہ رکھنا نیکی نہیں۔

اس طرزِ تخاطب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اگرچہ افصح العرب تھے۔ اور فصیح ترین زبان میں گفتگو فرماتے تھے تاہم تیسیر، آسانی اور تفہیم کو ہر شئی سے مقدم جانتے تھے۔

بندگی کا انقلابی تصوّر

عبد الرحمٰن عزام بک

ہم یہاں پر رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت پر روشنی ڈالیں گے۔ آپؐ کی طبع فیاض میں یہ صفت حد درجہ روشن تھی۔ نماز آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور نفس کی طمانیت تھی، آپ اگر ان عبادت گزاروں میں سے ہوتے جنھوں نے رہبانیت اختیار کر کے دنیا سے قطع تعلق کر لیا یا ان صوفیا میں سے ہوتے جنھوں نے دُنیا کی تمام لذتوں کو خیرباد کہہ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی، تو آپؐ کی عبادت کوئی نئی چیز نہ ہوتی۔ ایک مؤرخ اور ناقد آنحضرتؐ کی زندگی میں خاص طور سے جس چیز پر نگاہ ڈالتا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے اُمور کی انجام دہی اور زندگی کی دیگر ضروریات و علائق سے وابستہ ہو کر دینی فرائض بالخصوص انتہا درجہ کی عبادت کی ادائگی نہایت ہی تعجب خیز اور حیرت انگیز اَمر ہے، کیونکہ دین و دنیا کو ہم آہنگی کے ساتھ گزارنا انتہائی مشکل چیز ہے، ایک طرف آنحضرتؐ اپنے اہل و عیال خاندان اور مسکینوں کی تربیت و سرپرستی کرتے ہیں، تو دوسری جانب اپنی اُمّت کے اہم اُمور میں مشغول نظر آتے ہیں، سیاسی و حکومتی مہمات انجام دیتے ہیں، بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر روانہ کرتے ہیں اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں،

آپ کی خدمت میں وفد آتے ہیں۔ آپ ان کا استقبال کرتے ہیں، فوج تیار کرتے اور بذاتِ خود ان کی قیادت فرماتے ہیں، غیر قوموں اور سلطنتوں سے جنگ کرتے ہیں، فتح و کامرانی کی تدابیر سوچتے اور شکست خوردگی کے اسباب کا انسداد کرتے ہیں، گورنروں کا تقرر کرتے اور بیت المال کی نگرانی کرتے ہیں، اموال خود اپنے ہاتھ سے اپنے روبرو تقسیم فرماتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ اگر میں خود عدل و انصاف نہ کروں، تو دوسرا کون کرے گا؟ دینِ حق کی تبلیغ کرتے، وحی و رسالت کے اسرار و رموز لوگوں کو سمجھاتے ہیں، اخبار و سنن کی تشریح اور اللہ کے احکام کی توضیح فرماتے ہیں۔

الغرض آپ نے اپنے ہر شعبۂ حیات میں اپنا جو مثالی کردار پیش کیا ہے۔ وہ دنیا کے بہادروں کے لیے سبق آموز ہے، ان تمام مصروفیتوں اور مشاغل کے باوجود آنحضرتؐ رات دن عبادت میں محو نظر آتے ہیں، ان عابدوں اور زاہدوں سے بڑھ کر اللہ کی محبت میں سرشار تھے جو پہاڑوں کی چوٹیوں اور جنگلوں کے گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کے دیدار کی طلب کرتے رہتے ہیں۔

بطلِ اعظم کے اس طرح سے دین و دُنیا کو ہم آہنگ کرنے کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے اپنے دن کا ایک حصّہ عبادت کے لیے ایک حصّہ لوگوں کے لیے اور ایک حصّہ اپنے گھر والوں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا، لوگوں کی خدمت گزاری میں اگر زیادہ وقت صرف ہو جاتا، تو اپنے گھر کے مقررہ اَوقات میں کمی واقع ہو جاتی۔ لیکن آپ اوقات عبادت کی ہمیشہ حفاظت و نگہداشت فرماتے، اور اپنی تمام زندگی اسی مداومت اور پابندی میں گزاری، جو آپ کے دوستوں اور دشمنوں سب کے لیے موجبِ حیرت ہے!

آپ توجّہ خالص اور سعی پیہم کا مجسمہ تھے، جب عبادت کی طرف رجوع ہوتے، تو اپنی ساری توجّہ اسی طرف مرتکز کر دیتے اور جب

کسی کام کا ارادہ فرماتے، تو اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر لمحہ بھر چین نہ لیتے۔ مختلف قوموں اور ملتوں کے مؤرخین کا اس پر اجماع ہے، کہ آپ جو کام بھی کرتے اپنا دل و دماغ اسی میں صرف کر دیتے۔ آپ کی یہ بلند و برتر صفت لوگوں سے میل جول رکھنے کے وقت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ جب آپ کسی سے گفتگو فرماتے اپنا سارا دھیان اسی طرف مرکوز کر دیتے۔ جب تک خود مخاطب قطع کلام نہ کر لیتا، آپ اس کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع نہ کرتے۔

یہی جد و جہد نفسِ انسانی کے لیے ضروری ہے، دین و دنیا کے تمام شعبوں میں فلاح و بہبودی کا راز اسی میں مضمر ہے، بطلِ اعظم اپنے ان پیرووں کے لیے اس کا عملی نمونہ تھے، جنھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین اور لائحۂ عمل اسی جد و جہد کو قرار دیا، جس کی بنا پر وہ حکومتوں کے بادشاہ قوموں کے سیاست داں اور زمانے کی سربرآوردہ ہستیاں کہلائے، اُسی کا نتیجہ تھا کہ رسولِ اکرمؐ نے بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والوں، تجارت و زراعت پیشہ لوگوں، دیہاتوں اور تہذیب سے ناآشنا انسانوں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا مالک بنا دیا، یہ اس قابل ہوگئے کہ دُنیا کے حکمرانوں کو عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کا سبق دے سکیں۔

آنحضرتؐ عہدِ طفولیت ہی سے فطری طور پر عبادت کی طرف مائل تھے۔ اسی میں آپ اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کا سکون پاتے تھے، رسالت کے پیشتر مہینہ بھر مکہ کے باہر غارِ حرا میں خلوت گزیں ہو کر اللہ کی عبادت میں سرشار ہو جاتے، ایک شاعر نے کیا ہی بلیغ انداز میں کہا ہے :

"آپ کو بچپن ہی سے عبادت اور گوشہ نشینی سے محبت تھی، اور یہی شریفوں اور نیک طبع لوگوں کی عادت ہے، جب آپ کے دل میں ہدایت کا چشمہ پھوٹ نکلا، تو اسی چشمۂ نور سے آپ کے اعضاء نے سیرابی حاصل کی۔"

فقہاء اور ماہرینِ اصول و شرائع نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ آپ کی عبادت کی صورت نوعیہ کیا تھی اور آپ کس شریعت کے پابند ہو کر عبادت کرتے تھے۔ اس کا طریقہ کیا تھا؟ اس اختلاف کی وجہ سے ان کے تمام اقوال باہم مشتبہ نظر آتے ہیں، لیکن یہ امر تاریخ سے پایۂ ثبوت و تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ آپ کی عبادت اس طرح تھی کہ آپ خالقِ کائنات میں غور و فکر فرمایا کرتے اور موجوداتِ عالم کو دیکھ کر وحدانیت اور خالقیت پر استدلال کیا کرتے تھے، لیکن تاریخ سے کہیں یہ معلوم نہ ہو سکا، کہ آپ اگلی شرائع و ادیان کے طریقہ سے عبادت کرتے تھے۔ آپ نے عہدِ رسالت اور رُشد و ہدایت سے سرفراز ہونے کے پیشتر اس نظریۂ توحید کی تردید کی، جو گذشتہ ادیان و مذاہب میں گھڑ لیا گیا تھا، یہاں تک کہ عربوں کے بعض عبادات مثلاً حج وغیرہ کے رائج شدہ طریقوں کو مذموم ٹھہرایا اور شعائرِ حج کی ادائیگی میں اپنے قبیلہ کے طریقے اختیار نہیں کیے، بلکہ عرفہ میں ٹھہرنے اور واں افاضہ کرنے میں دیگر لوگوں کا اتباع کیا، قریش کی ان اکثر و بیشتر چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ جن کو وہ جاہلیت میں حلال سمجھتے تھے، آپ کی عقلِ سلیم نے جس کو صحیح سمجھا، اسی کی پیروی کی، ہمیشہ طالبِ حق رہے، آپ کی عبادت محض غور و فکر اور ربوبیت میں تدبر پر منحصر تھی، آخر کار آپ کا سینہ ایمان و یقین کی تجلیات سے منور ہو جاتا ہے۔

وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا	اسی طرح بھیجی ہم نے تیری طرف ہمارے امر کی روح تو
ماکنت تدری ما الکتاب ولا الایمان۔	نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔

ووجدك ضالا فھدی اس نے تجھے محبت میں خود رفتہ پایا تو ہدایت کی، جب آپ کو ہدایت کا نور حاصل ہو گیا، تو آپ نے

نماز پڑھنی شروع کر دی، آپ اور حضرت علیؓ مکہ کی گھاٹیوں میں جاتے اور خفیہ طور پر نماز پڑھتے اور شام کے وقت واپس آجاتے،
آنحضرت کا دل نورِ ہدایت سے منور ہوگیا، تو آپؐ نے اللہ سے مسلسل ربط و تعلق پیدا کر لیا۔ اور آپؐ کا نفس خدا کی محبت میں سرشار ہوگیا، ہم بلاخوف تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آپؐ اپنی حرکت و سکون، خواب و بیداری غرض کہ ہر حال میں اللہ ہی سے تعلق رکھتے تھے، ذاتِ خداوندی میں اس درجہ انہماک تھا، کہ اپنے خالق کے رُوبرو اتنی دیر تک کھڑے ہوتے کہ آپؐ کے پاؤں متورم ہو جاتے ۔
مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں آنحضرتؐ جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو آپ کے قدم یا پنڈلیاں سُوج جاتیں، آپؐ سے جب اس کے متعلق پوچھا جاتا، تو فرماتے کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟
ابن مسعود بیان کرتے ہیں، کہ ایک رات میں نے آنحضرت کے ساتھ نماز پڑھی، بڑی دیر تک آپ نے قیام کیا، یہاں تک کہ میں ایک بُرا ارادہ کرنے پر آمادہ ہوگیا، پوچھا گیا، کہ آپ نے کیا ارادہ کیا تھا؟ کہنے لگے کہ میں نے قصد کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑ دوں۔
عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا خدا کو داؤد علیہ السلام کی نماز سب سے زیادہ پیاری تھی اور ان کا روزہ تمام سے زیادہ عزیز، آپ نصف رات سوتے اور باقی تیسرے حصہ میں عبادت کے لیے کھڑے ہوجاتے اور پھر چھٹے حصے میں سوتے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار فرماتے۔
آپ کو اپنی عمر بھر تمام شب اور تہجد گزاری کی عادت رہی جس میں آپ دعائیں مانگتے اور اللہ سے التجائیں کرتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ محبت الٰہی میں کس قدر سرشار اور خشیتِ ایزدی سے کتنے لب ریز تھے۔ آپ اکثر اس وقت یہ دعا فرماتے تھے۔

اللھم لک الحمد انت قیم السموات و الارض ومن فیھن، ولک الحمد انت نور السموات والارض ومن فیھن، ولک الحمد انت ملک السموات والارض ومن فیھن، ولک الحمد انت الحق و وعدک الحق ولقاءک الحق وقولک الحق والجنۃ حق والنار حق، والنبیون حق ومحمدؐ حق، والساعۃ حق، اللھم لک اسلمت وبک آمنت وعلیک توکلت، والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت، فاغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت المقدم وانت المؤخر لا الٰہ الا انت، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

اے اللہ تمام تعریف تیرے لیے ہے، تو ہی آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے، تیرے ہی لیے حمد ہے، تو آسمان و زمین کی تمام چیزوں کا نور ہے، تو ہی تعریف کے سزاوار ہے، تو آسمان و زمین اور ان کی تمام چیزوں کا بادشاہ ہے۔ تو ہی تعریف کا مستحق ہے، تو ہی حق ہے، تیرا وعدہ حق، تجھ سے ملنا حق، تیرا قول حق، جنت و دوزخ حق، انبیاء اور محمدؐ حق ہیں اور قیامت حق ہے، اے اللہ میں تیرے لیے اسلام لایا، تجھ پر ایمان لایا، تجھ ہی پر بھروسا کیا، تیری ہی جانب رجوع کیا تیری خاطر دشمنی کی اور تیری ہی راہ میں فیصلے چکایا، میرے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے، میرے پوشیدہ اور ظاہری گناہ معاف کر دے تو ہی سب سے پہلے تو ہی سب سے آخر ہے تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں، تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ صرف اللہ ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے تہجد کی شان میں اس طرح ارشاد فرماتا ہے۔

یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗ اَوِانْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا اَوْزِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا، اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِیْلًا۔

اے کپڑوں میں لپٹنے والے! رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم کر دو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو، ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں، بے شک رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت اس حکم کی تعمیل پر کمربستہ ہوجاتے ہیں، اسی کو صحابہ کے ایک شاعر ابنِ رواحہ آنحضرتؐ کی شان میں فرماتے ہیں:

"آپ ہم کو ہدایت کرتے اور جب آئندہ کے واقعات وحوادث سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں، تو ہمارے دل اس کا یقین کرتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ یقیناً ہو کر رہے گا، جس وقت مشرکین گہری نیند کے عالم میں مدہوش ہوتے ہیں، تو اس وقت آنحضرتؐ اپنے بستر سے علٰحدہ ہو کر اللہ کی یاد میں مصروف ہوجاتے ہیں۔"

آنحضرتؐ کے قلب و دماغ پر باری تعالیٰ کی ہدایت کا تصور اس طرح چھا گیا تھا کہ ایک لمحہ بھی الٰہی ربط وضبط کا دامن آپ سے نہیں چھوٹتا ـــــــــ آپ کا دل محبتِ الٰہی، خشیتِ ایزدی، یادِ خداوندی اور اطاعت و فرماں برداری کے جذبات سے ہمیشہ لبریز رہتا۔ رات دن کے اکثر و بیشتر حصوں میں خشوع وخضوع کے ساتھ آپ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے حسبِ منشا کوئی کام صادر ہوجاتا، تو آپ فرماتے تھے "الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات سب تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے جس کی نعمت کے طفیل اچھے کام سرانجام پاتے ہیں، آپ کی خلاف مرضی جب کوئی کام پیش ہوتا تو فرماتے: الحمد للہ علیٰ کل حال، ہر حال میں اللہ کا شکر ہے، جب کسی کام کا ارادہ فرماتے تو یہ دعا پڑھتے: "اللّٰھم خِرلی واخترلی" اے اللہ مجھے بھلائی عطا کر اور مجھے پسند کرلے" جب سفر کا قصد فرماتے تو یہ دعا کرتے: "اللّٰھم بک اصول وبک اجول" اے اللہ میں تیری راہ میں جا رہا ہوں اور تیری ہی راہ میں سفر کرتا ہوں، سوتے وقت یہ دعا کرتے "اللّٰھم باسمک وضعت جنبی وباسمک ارفعہ" اے اللہ میں تیرا نام لے کر سویا اور تیرے ہی نام سے اٹھوں گا، بیدار ہوتے وقت فرماتے: الحمد للہ الذی احیانا بعد ان اماتنا والیہ النشور" تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جس نے ہمیں مردہ کرنے کے بعد پھر زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھنا ہے، نئے کپڑے پہنتے وقت فرماتے "الحمد للہ الذی رزقنی ما اتجمل بہ فی حیاتی" شکر وتعریف ہے اس خدائے پاک کے لیے جس نے مجھے ایسی چیز عطا کی جس کے ذریعہ میں اپنی زندگی میں زیب و زینت حاصل کر سکتا ہوں۔

کھانا کھانے کے وقت یہ دعا پڑھتے: الحمد للّٰہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین: سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے، جس نے ہمیں کھلایا، سیراب کیا اور ہم کو مسلمان بنایا۔

یہ دعا پڑھ کر پانی پیتے: الحمد للّٰہ الذی جعل الماء عذباً فراتاً برحمتہ ولم یجعلہ ملحاً اجاجاً بذنوبنا، حمد و شکر ہے، اس خدائے پاک کا، جس نے پانی کو اپنی رحمت سے شیریں بنایا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے اس کو کھارا نمکین نہیں بنا دیا۔ اپنے بستر پر رات کے وقت کروٹ بدلتے تو فرماتے: لا الٰہ الا اللّٰہ الواحد القہار رب السموات والارض وما بینھما العزیز الغفار، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی اکیلا بڑے قہر والا ہے، آسمان، زمین اور ان کے درمیان جتنی چیزیں ہیں ان سب کا پروردگار ہے، غالب ہے اور زیادہ مغفرت کرنے والا ہے۔

رات میں نیند سے جب بیدار ہوتے تو فرماتے: رب اغفر وارحم واھد للسبیل الاقوم: اے پروردگار بخش دے اور رحم فرما اور سیدھے راستہ پر چلنے کی ہدایت دے۔

اللہ سے آنحضرتؐ کا رشتہ توجہ ایک لمحہ کے لیے بھی جدا نہ ہوتا تھا۔ آپ کی طبیعت میں عبادت کا گہرا میلان پایا جاتا تھا، رات اور دن کی اکثر و بیشتر گھڑیوں میں آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے، نماز میں اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور اور روح کی تسکین پاتے، اپنے صحابہؓ کو ان کی برداشت سے بڑھ کر کام کرنے کو منع فرماتے تھے، حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں، کہ آنحضرتؐ کو جب کوئی کام کرنے کی رغبت ہوتی، تو آپ محض اس خوف سے اس کو ملتوی کر دیتے، کہ مبادا لوگ اُسے فرض سمجھ کر کرنے لگ جائیں۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے دو یا تین دن تک مسلسل صوم وصال رکھا۔ اس وقت رمضان کے آخری دن تھے۔ لوگوں نے بھی آپؐ کے اتباع میں صوم وصال رکھا، آپ کو جب اس کی اطلاع ہوئی، تو فرمایا کہ اگر ماہ رمضان کے اور دن باقی رہتے، تو میں دیکھ لیتا کہ کون کون میرا ساتھ دیتے تھے، زیادتی کرنے والے تو باز رہ جاتے، میں تمہاری طرح سے نہیں ہوں۔ مجھے خدا کھلاتا پلاتا ہے۔ یعنی میری مدد کرتا ہے اور مجھے قوت و توانائی عطا کرتا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ نے مسجد میں نماز پڑھی، تو آپ کے پیچھے بہت سے لوگوں نے بھی نماز پڑھی، دوسری شب بھی آپ نماز پڑھ رہے تھے، تو لوگوں کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی، تیسری رات لوگ جمع ہوئے، لیکن آپ تشریف نہیں لائے، جب صبح ہوئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا، میں نے تمہارا عمل مشاہدہ کر لیا، میں اس لیے نہ آسکا، کیونکہ مجھے خوف تھا کہ یہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔

حضرت انس رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں نماز پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے بازو کھڑا ہو گیا۔ ایک اور شخص آیا وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہماری ایک جماعت بن گئی۔ جب آپ کو احساس ہوا کہ ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہیں، تو نماز میں جلدی کرنی شروع کر دی، اس کے بعد آپ گھر تشریف لے گئے اور نماز پڑھی جو پہلی نماز سے زیادہ طویل تھی، میں نے صبح کے وقت پوچھا کہ کیا آپؐ نے ہمیں محسوس کر لیا تھا، آپ نے فرمایا ہاں اسی امر نے تو مجھے اس طرح کرنے پر آمادہ کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں، کہ آنحضرتؐ کے اندر اللہ سے اتصال و تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت و استعداد بہ نسبت دوسروں کے بہت زیادہ تھی، آپ اپنی برداشت اور طاقت سے بڑھ کر کام کرنے کو اپنے لیے بہتر اور محبوب سمجھتے تھے۔ اس چیز کو صرف اپنے لیے مخصوص کر لینے

تھے، جب آپؐ کے صحابہ آپ کی اس بارے میں اتباع کرتے، تو آپ کو ان کی اس مشقت برداری اور غلو پسندی سے خوف دامن گیر ہو جاتا، ایک وہ ہستی جو عبادت کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہو، جہاں تک کوئی شخص رسائی نہیں کر سکتا، اور خدا کا وہ رسول، جس نے ایک ایسا سہل اور آسان دین پیش کیا ہو، جو زندگی کے تمام حقائق کا حامل ہے۔ اگر لوگوں سے صرف اس وجہ سے ناراض ہو جائے کہ وہ دنیا سے قطع تعلق کر لینے اور عبادت گزاری ہی میں منہمک ہو جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ برہمی و برافروختگی اسی کے سزاوار ہے، اسی ہم آہنگی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔

وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک۔

اللہ نے جو کچھ تجھے عطا کیا ہے، اس سے آخرت کے گھر کا سامان تلاش کر اور دنیا کے اپنے حصّہ کو بھی نہ بھول جا، اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے، اسی طرح تو بھی احسان کر۔

ایک مرتبہ کسی سفر میں آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے ایک غار دیکھا، جس کے اطراف سبزہ اُگا ہوا تھا، اس کا دل گوشہ نشینی اور عبادت کرنے کی طرف مائل ہو گیا، آپ برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں یہود و نصاریٰ کا دین لے کر نہیں آیا۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ کا آسان اور سہل دین لایا ہوں۔

بعض صحابہ نے رہبانیت اور دُنیا سے قطع تعلق اختیار کرنے کا ارادہ کیا، آپ سخت غضب ناک ہوئے اور اس سے باز رکھا ایک اور شخص نے ارادہ کیا تھا کہ وہ عبادت کی غرض سے گوشت نہیں کھائے گا۔ آپ نے اس کو منع کر دیا۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرمؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں سے بعض روزہ دار تھے اور بعض افطار کرنے والے سخت گرمی کے دن تھے۔ آپ ایک مقام پر اُترے، ہم میں سے اکثر لوگ چادروں کو سائبان بناتے اور بعض اپنے ہاتھوں سے سُورج کی تیز شعاعوں کو روکتے تھے۔ روزہ دار شدّتِ تمازت کی تاب نہ لا کر گر پڑے، اور افطار کرنے والوں نے اپنے خیمے نصب کیے اور جانوروں کو پانی پلایا، آنحضرتؐ نے فرمایا: "آج افطار کرنے والوں نے ثواب لُوٹ لیا۔"

آنحضورؐ نے ہر چیز میں اعتدال پسندی اور میانہ روی کے جو اوامر و احکام نافذ کیے، وہ تمام صحابہ کے دلوں میں سرایت کر گئے۔ اُنھوں نے اپنے اور استادِ اعظم کے مقصد کو پہچان لیا، اور انہی قوانین و اصول پر کاربند رہے۔ ایک مرتبہ سلمان فارسی رضؓ ابو درداؓ کے گھر آئے، یہ وہ اشخاص تھے۔ جن کے درمیان آنحضرتؐ نے مدینہ میں برادری اور بھائی چارہ پیدا کر دیا تھا۔ سلمان رضؓ نے دیکھا کہ ابو درداءؓ کی بیوی غم زدہ بیٹھی ہوئی ہیں، اُنھوں نے اس کا سبب دریافت کیا، ان کی بیوی نے جواب دیا، آپ کے بھائی ابو درداءؓ کو دُنیا سے کوئی سروکار نہیں رہا ہے، اتنے میں ابو درداءؓ بھی آپہنچے، اُنھوں نے اپنے بھائی کے لیے دسترخوان چنا اور کہنے لگے آپ تناول فرمائیے میں روزہ سے ہوں، سلمانؓ نے کہا میں تمھارے بغیر نہیں کھاؤں گا، چنانچہ یہ سُن کر وہ بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ جب رات ہوئی تو ابو درداءؓ نے جانے کا قصد کیا، تو انہوں نے کہا سو جائیے تو وہ سو گئے، کچھ دیر بعد اُٹھ گئے اور جانے کا ارادہ کیا، پھر انھوں نے کہا سو جائیے۔ جب رات کا آخری حصّہ آپہنچا، تو سلمان نے کہا اب اُٹھیے۔ ان دونوں نے نماز پڑھی، اس وقت سلمان رضؓ نے کہا تم پر اپنے پروردگار کا حق ہے، اپنے نفس کا حق ہے اور اپنے گھر بار والوں کا حق ہے، تم ہر حق دار کا حق ادا کرو۔ اس کے بعد سلمان رضؓ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور یہ ماجرا بیان کیا، آپ نے سُن کر فرمایا سلمان نے سچ کہا ہے؛

انس بن مالک سے روایت ہے کہ تین شخص آنحضرتؐ کے گھر آئے اور آپ کی بی بیوں سے آپ کی عبادت کا حال پوچھا جب انہوں نے اس کی خبر دی، تو انہوں نے آپ کی عبادت کو کم سمجھا اور کہنے لگے کہ ہم کہاں اور حضورؐ کہاں ؟ خدا نے آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ کو معاف کر دیا ہے، ان میں سے ایک نے کہا میں ہمیشہ رات بھر نمازیں پڑھتا رہوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں گا اور افطار نہ کروں گا، تیسرے نے کہا میں عورتوں سے علٰحدہ رہوں گا، اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ آنحضرتؐ تشریف لائے اور آپ کو اس کی خبر ملی، تو فرمایا "کیا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا ہے ؟ سنو! قسم اللہ کی میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں، جو شخص میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میری اُمت سے نہیں" یہی وہ میانہ روی اور اعتدالی روش ہے، جس پر آنحضرتؐ نے سب کو قائم رکھنا چاہا تھا، چنانچہ آپ کو اس مقصد میں حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی۔ آپ کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا رہتا تھا، کہ لوگ کہیں جادۂ اعتدال سے نہ بھٹک جائیں اور اپنے نفسوں کو ناقابل برداشت امور پر آمادہ کرلیں، جس طرح آپ دنیاوی امور انجام دینے اور شجاعت و بہادری کے جوہر دکھلانے میں لاثانی تھے۔ اسی طرح آپ عبادت اور اطاعتِ خداوندی میں بے مثال تھے۔

ہم یہاں پر عبادت کی جس بلند پایہ تصویر کو پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ آپ کی دعا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ دعا بھی عبادت میں داخل ہے۔

"وقال ربکم ادعونی استجب لکم" اور کہا تمہارے پروردگار نے تم مجھے پکارو تو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا؛

مندرجۂ ذیل دعائی انداز پر غور کیجیے کہ اس کے اندر خشوع و خضوع اور تسلیم و رضا کے کتنے بے شمار جلوے نظر آتے ہیں :

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی	میری نماز اور قربانی اور میری موت و حیات جہانوں
للہ رب العلمین لاشریک لہ وبذالک	کے پروردگار ہی کے لیے ہے جس کا کوئی ساجھی نہیں اور
امرت وانا اول المسلمین، اللھم اھدنی	اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب میں پہلا مسلمان
لاحسن الاعمال واحسن الاخلاق، لا	ہوں، اے خدا مجھے بہترین کام اور حسنِ اخلاق کی
یھدی لاحسنھا الا انت وقنی سیٔ الاعمال	توفیق عطا فرما، تو ہی اچھے اور بھلے اعمال کی ہدایت
وسیٔ الاخلاق، لا یقی سیئھا الا انت،	کر سکتا ہے، مجھے بُرے کاموں اور بُرے اخلاق سے
اللھم لک رکعت وبک آمنت ولک	محفوظ رکھ، تو ہی ان سے بچا سکتا ہے۔ اے اللہ میں
اسلمت وعلیک توکلت، انت ربی خشع	تیرے ہی لیے جھکا ہوں تجھی پر ایمان لایا، تیرے ہی لیے
سمعی وبصری ولحمی ودمی وعظمی للہ	اطاعت کی تجھی پر بھروسا کیا، تو ہی میرا پروردگار ہے میرے
رب العلمین، اللھم اغفرلی ما قدمت	کان، میری آنکھیں، میرا گوشت، میرا خون اور میری

وَمَا اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اَعْلَمُ بِہٖ منی انت المقدم وانت المؤخر لا الٰہ الا انت

ہڈیاں جہانوں کے پروردگار کی خشیت سے معمور ہوگئیں، اے اللہ میرے اگلے اور پچھلے، میرے ظاہر و باطن گناہوں کو بخش دے، میری زیادتیوں سے درگزر فرما اور ان خطاؤں کو بھی معاف کردے، جن سے تو واقف ہے، تو ہی سب سے پہلے اور تو ہی سب کے آخر ہے، تیرے سوائے کوئی معبود نہیں۔

الغرض آنحضرتؐ اپنی عبادت میں اخلاص کے اعلیٰ منازل اور اطاعت و محبتِ الٰہی میں محویت کے اُونچے مراتب پر فائز ہوگئے تھے اور بارگاہِ اُلوہیت میں تقرب اور باریابی کا شرف حاصل کر لیا تھا۔ اس کے باوجود دنیوی اُمور کی انجام دہی اور سلطنت کے قیام و استحکام میں بھی گراں قدر حصہ لیا اور سوسائٹی سے فتنہ و فساد اور ہیجان و اضطراب کو دُور کیا، الحاصل آپ کی شخصیت کے اندر زندگی کی تمام حوائج و ضروریات۔ کامل اور اہم مقاصد کی تکمیل کے ذرائع اپنی پُوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھے۔

بطلِ اعظم کی اس جلیل القدر صفت کے سامنے تمام لوگوں کو اپنا سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے، دنیا کے بہادروں اور مشاہیر عالم کی کیا مجال کہ آنحضرتؐ کی جانب آنکھ اُٹھا کر دیکھیں، اگر وہ یہ جراٗت بھی کر بیٹھیں، تو آخر میں حیرانی اور درماندگی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، تاریخِ عالم میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آئے گا، جو اپنے روحانی انہماک اور شب و روز کی عبادت گزاری کے ساتھ ساتھ دنیاوی مہمات کو اور اپنی قوم اور خود اپنے نفس کی خدمت کو بہتر صورت اور خوش اسلُوبی سے انجام دے سکے اور دشمنوں کا مقابلہ اور اُن کی مدافعت کرتے ہُوئے مستحکم و مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالے جیسا کہ آنحضرتؐ نے اپنا یہ فریضہ پورا کرکے دُنیا کے روبرو اپنے آپ کو ایک بے مثال ہستی ثابت کردی۔

خدا جنھیں پسند کرتا ہے

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (بقرہ)		اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ)		عدل و انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ)		تقویٰ والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ)		رجوع الی اللہ کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (آل عمران)		صبر کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ)		پاک صاف رہنے والوں طہارت والوں سے اللہ محبت کرتا ہے۔

خدا جنھیں ناپسند کرتا ہے

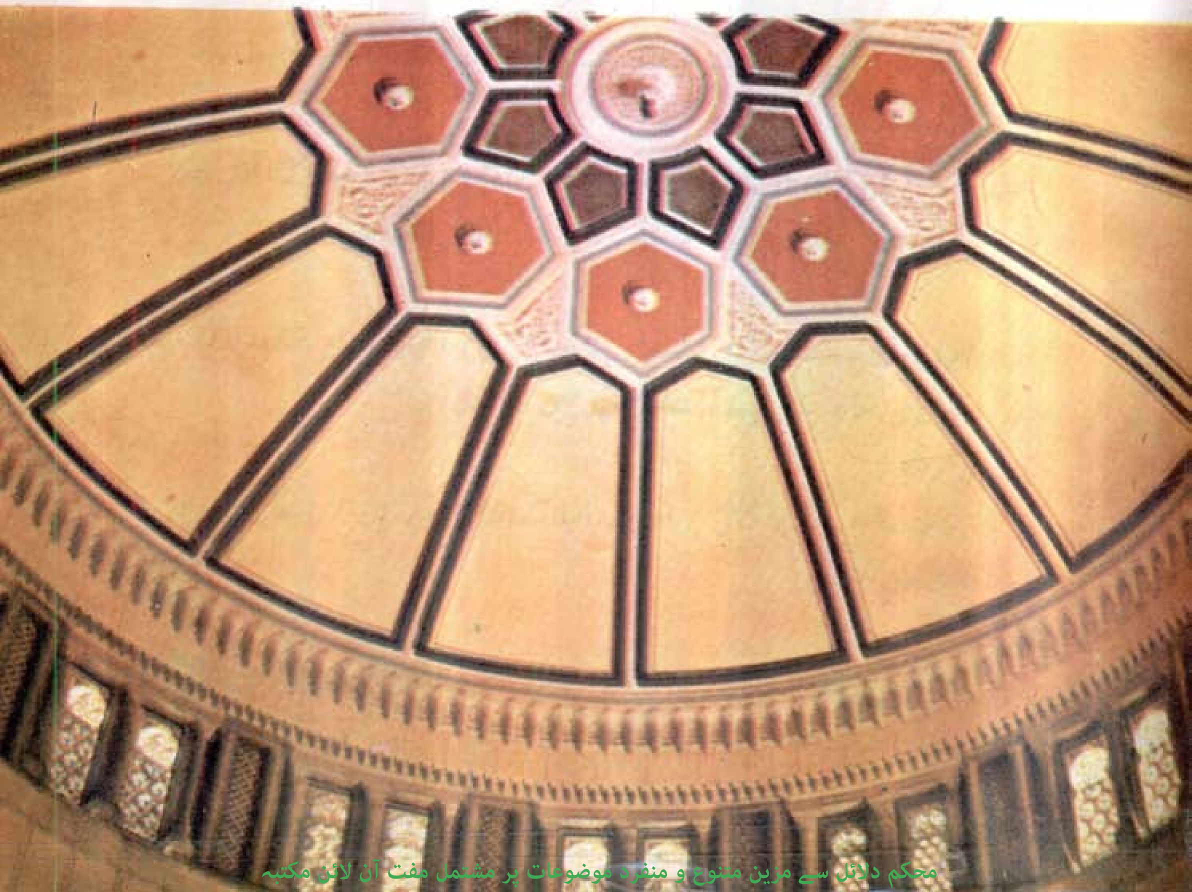
لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ (نساء)	برائی کی اشاعت اللہ کو ناپسند ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ)	حدود الٰہی کو توڑنے والے قانون شرعی کا احترام نہ کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔	اللہ تعالےٰ حیلہ باز، اترانے والے کو ناپسند کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (انفال)	خیانت والوں کو اللہ ناپسند کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (حج)	خیانت کرنے والے احسان کو ملیامیٹ کرنے والے اللہ کو ناپسند ہیں۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

جو ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

(البقرۃ: ۱۲۹)

عُلومِ انسانی کے فروغ پر ہمارے رسُول کا اثر



صدرِ اسلام میں دینی علوم کے ارتقا کا اجمالی جائزہ

مولانا شبیر احمد خاں غوری

علومِ دینیہ کا سرچشمہ قرآن کریم اور وہ ذاتِ مقدس ہے، جس پر قرآن نازل ہُوا۔ اس لیے ان علوم کا آغاز انھی کے ساتھ ہُوا۔

سیرت مقدسہ

ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی (۵۲۹ء) کے چالیس سال بعد فاران کی چوٹیوں سے ہدایت ربّانی کا نور آخری مرتبہ چمکا، جس کے بریق ولمعان نے عالم کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس سال ابرہہ کی فیل سوار فوج "طیراً ابابیل" کی سجیل باری سے "کعصفٍ ماکول" ہوئی تھی، مکہ معظمہ میں اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہُوئی اور اس طرح دعائے خلیل: "ربّنا وابعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتك ویعلمھم الکتاب والحکمة"

"اے رب ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انھی میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور انھیں (تیری) کتاب اور حکمت سکھائے۔"

اور نویدِ مسیحا:

"یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ علیکم مصدقاً لما بین یدی من التوراة ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہٗ احمد۔" (صف-۶)

"اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہُوں۔ اپنے سے پہلی کتاب توریت کی تصدیق کرتا ہُوں اور اس رسول کی بشارت سناتا ہُوں، جو میرے بعد تشریف لائیں گے، اُن کا نام احمدؐ ہے۔"

پوری ہُوئیں۔

اللہ کا یہ آخری رسول عرب کے شریف ترین گھرانے میں پیدا ہُوا۔ بچپن ہی میں والدین کے سایہ سے محروم ہو گیا۔ لہٰذا رسمی تعلیم وتربیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور یہ اس لیے کہ تورات مقدس کی پیش گوئی پوری ہو کہ:

"مردِ اُمّی حکیم ہو گا"

بایں ہمہ اُن اخلاقِ فاضلہ سے متصف تھے جو "مثالی" ہیں اور ابرار واخیار کے اخلاق جن کا پرتو ہیں۔ اس لیے صحیح معنوں میں،

اِنّك لعلیٰ خلقٍ عظیم۔

کے مصداق تھے۔

چالیس سال کی عمر شریف تھی کہ خلعتِ نبوۃ سے مشرف فرمائے گئے۔ اس رسالت کا مقصد بھی توحیدِ ربوبیت تھا، جس کے لیے انبیائے سابقین مبعوث فرمائے گئے تھے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الاّ نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔"

(انبیاء - ۲۵)

جن نفوسِ زکیہ کے نصیب میں سعادتِ دارین مقدر ہو چکی تھی، انھوں نے اس دعوت کو بطیبِ خاطر قبول کیا اور مشرف باسلام ہوگئے۔ مگر اہلِ غرض کا طبقہ جس نے اس حیاتِ عاجلہ ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اور جسے نئے دین کے فروغ اور اشاعت میں اپنی عیش کوشی و عاقبت فراموشی کی موت نظر آ رہی تھی، اسلام اور پیروانِ اسلام کے مٹانے پر کمربستہ ہوگیا۔ دنیا جہان کا کوئی ظلم ایسا نہ رہا، جو ان غرض کے بندوں نے حق پرستوں کے حق میں اٹھا نہ رکھا ہو۔

لہٰذا ۶۲۲ء میں اللہ کے رسولؐ نے اللہ کے حکم سے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت فرمائی۔ اب اپنے دین کی حفاظت کیلیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو جہاد کا حکم دیا۔ ۷ ار رمضان ۲ھ کو غزوۂ بدر میں مسلمانوں نے کفارِ قریش کو شکست دی۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر اس سے انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ۵ھ میں قریش دوسرے دشمنانِ اسلام قبیلوں اور یہود کے ساتھ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ دشمنانِ دین خود محاصرہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان صلح ہوگئی۔ مگر ۸ھ میں قریش نے نقضِ عہد کیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا لیکن کسی لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مکہ فتح ہوگیا۔ آپ نے کعبہ شریف میں پہنچ کر سارے بُت توڑ ڈالے اور اب اللہ کے گھر میں صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت ہونے لگی۔ اکثریت مسلمان ہوگئی اور عرب میں اسلام کی حکومت قایم ہوگئی۔ اب رومیوں اور ایرانیوں نے اس نئی مملکت کے تباہ کرنے کی تیاریاں کیں۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج رومیوں کی تادیب کے لیے تبوک کی طرف روانہ کی۔

۱۰ھ میں آپ نے حج (حجۃ الوداع) فرمایا۔ اس حج میں آپؐ کے ہمراہ ۱۱۴۰۰۰ مسلمان تھے۔ اس موقعہ پر آپ نے جو خطبہ فرمایا، وہ "خطبہ حجۃ الوداع" کہلاتا ہے اور اسلام کی تاریخ میں یادگار رہے۔

اب دین کی تکمیل ہو چکی تھی، لہٰذا آیت کریمہ:

"الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً"

کا نزول ہوا اور کچھ دن بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو آپؐ نے سفرِ آخرت فرمایا۔

اسلام کوئی سیاسی یا مذہبی تحریک نہ تھی بلکہ ایک کامل دین تھا۔ اور اس حیثیت سے اس نے انسان کی شئونِ حیات کے جملہ پہلوؤں کی اصلاح کی۔ اس میں اس کی ثقافتی ترقی بھی شامل ہے، اس لیے اسلام نے علم و حکمت کے حصول پر خاص طور سے زور دیا اور اسے زندگی کی قدرِ اعلیٰ قرار دیا:

"ومن یؤت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیرا۔"

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلبِ علم کو مسلمانوں پر فرض مقرر کیا:

"طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کلّ مسلم و مسلمۃ۔"

دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ جہاں بھی مل سکے، علم کو حاصل کرو:

"اطلبوا العلم ولو کان بالصین"

حصولِ علم میں پہلا مرحلہ نوشت وخواند میں مہارت کا ہے۔ اسلام نے شروع ہی سے نوشت وخواند کی اہمیت پر زور دیا۔ یہاں تک کہ وحیِ الٰہی کا آغاز ہی "اقراء" (پڑھ) کے مبارک ومسعود حکم سے ہُوا:

"اقراء و ربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم" (علق)

بعثتِ اسلام کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت عام ہوگئی اور اسلامی تعلیم کی رُو سے نوشت وخواند معاشرہ کا اہم فریضہ ہوگئے۔ قرآن کہتا ہے:

"یٰآیھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الیٰ اجلٍ مسمی فاکتبوہ ولیکتب بینکم کاتب بالعدل" (بقرہ)

لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشت وخواند کی اشاعت پر خاص توجہ کی۔ چنانچہ بدر کی لڑائی کے قیدیوں میں جو لوگ اپنا زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے، آپ نے ان کا فدیہ یہ ٹھہرایا کہ ہر ایسا شخص مدینہ منورہ کے دس بچّوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

پھر نوشت وخواند کی تقسیم میں اسلام نے شریف ووضیع، آقا وغلام اور مرد وعورت کی کوئی تمیز وتفریق نہیں برتی۔ خواتین میں بھی یہ نعمت عام تھی۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پڑھ سکتی تھیں، لکھتی نہیں تھیں اور ام المومنین حضرت حفصہؓ پڑھ بھی سکتی تھیں اور لکھ بھی سکتی تھیں۔

اسلامی ثقافت کی بنیاد اس کا دین ہے۔ لہٰذا اصولی طور پر اس کی ثقافتی سرگرمیوں کا محور علومِ دینیہ ہی رہے ہیں۔ پھر دینی علوم کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اس لیے عہدِ رسالت ہی سے مسلمانوں نے اس کے ساتھ اعتناء کو سرمایۂ سعادتِ دارین سمجھا۔

قرآن ایک ساتھ نہیں اُترا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہُوا۔ نزولِ وحی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً قلمبند کرا دیتے تھے۔ صحابہ میں سے جن خوش نصیبوں نے اس مقدس خدمت کو انجام دیا، اُن میں خلفائے اربعہ کے علاوہ اُبی بن کعب اور زید بن ثابت الانصاری زیادہ مشہور ہیں۔

اس زمانہ میں کاغذ نایاب تھا۔ لہٰذا قرآن سنگین لوحوں، ہڈیوں، پالان کی لکڑیوں اور درختوں کی چھالوں پر لکھا جاتا تھا۔

اس تحریری قلمبندی کے علاوہ اکثر صحابہؓ نے عہدِ رسالت ہی میں قرآن کو حفظ بھی کر لیا تھا۔ ان حفاظِ قرآن میں سے اُبی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوزید انصاری اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بہت زیادہ مشہور ہیں۔

خلافتِ راشدہ

جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیقؓ آپ کے خلیفہ ہُوئے۔ زمامِ خلافت سنبھالتے ہی صدیق اکبرؓ کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سرحد پر رومیوں کے حملے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق اُن کی تادیب کے لیے اُسامہ بن زید کو روانہ فرمایا اور آخرکار رومیوں کو شکست ہُوئی۔ دُوسری مشکل مانعینِ زکوٰۃ کی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے مطالبہ کو سختی سے دبا دیا۔ یہاں تک کہ انھیں زکوٰۃ دینا پڑی۔ تیسری مشکل

مُرتدینِ عرب کی جانب سے تھی۔ اُدھر مدعیانِ نبوت مدینہ منورہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے، مگر آپ نے ان کا بھی سختی سے مقابلہ کیا اور انجام کار ان کا قلع قمع ہوگیا۔

اسی دوران میں معلوم ہُوا کہ عرب فتنہ پردازوں کو ایرانیوں کی شہ حاصل تھی۔ لہٰذا اس خطرے کے سدِباب کے لیے فارورڈ پالیسی کے اصول کو اپنایا گیا اور مجاہدین کا ایک لشکر ایران کی طرف بھیجا گیا۔ رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی تو ہو ہی چکی تھی مگر اس کی تکمیل کے لیے مزید فوجی مہیں روانہ کی گئیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے ۱۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عمرؓ ان کے جانشین ہُوئے۔ اُن کا عہدِ خلافت اسلامی فتوحات کا عہدِ زریں ہے۔ خالد ابن الولید اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما نے ۱۴ھ (مطابق ۶۳۵ء) میں دمشق فتح کیا۔ اسی سال سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی جنگ میں ایرانی لشکر کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۱۵ھ (مطابق جنوری ۶۳۷ء) میں فلسطین کے اندر یروشلم کے بطریق نے بیت المقدس حضرت عمرؓ کے حوالے کیا۔ ۱۶ھ میں ساسانیوں (شاہانِ ایران) کا پایۂ تخت مدائن فتح ہوگیا ساتھ ہی عراق بھی عربوں کے قبضہ میں آگیا اور حضرت عمرؓ کے حکم کے بموجب بصرہ اور کوفہ میں چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔

۱۹۔۲۰ھ (مطابق ۶۴۰۔۶۴۱ء) میں عمروؓ بن عاص نے مصر کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۲۱ھ (مطابق ۶۴۲ء) میں نہاوند کی فیصلہ کن جنگ ہُوئی۔ جس میں مسلمانوں کی فتح ہُوئی۔ اس طرح ۲۲ھ میں ایران کی فتح مکمل ہوگئی۔

حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی اور حضرت عثمانؓ ذی النورین خلیفہ ہُوئے۔ اُن کے زمانہ میں بھی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر اسلام دشمن طاقتیں اندر ہی اندر خفیہ سازشیں کر رہی تھیں، جو بیک ۳۵ھ میں منظرِ عام پر آگئیں۔ اس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ شہید ہُوئے۔ ان کی جگہ حضرت علیؓ خلیفہ ہُوئے، مگر خانہ جنگیاں بڑھتی ہی گئیں۔ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے پر مُصر تھی۔ حضرت علیؓ بھی چاہتے تھے مگر اُن کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ مزاحمت کر رہا تھا۔ فتنہ بڑھتا گیا۔ پہلے جنگِ جمل ہوئی۔ بعد میں امیر معاویہ نے، جو شام کے والی اور حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار تھے، ان کے خون کا دعویٰ کیا اور فوجیں لے کر آگے بڑھے۔ صفین کے مقام پر لڑائی ہُوئی۔ قریب تھا کہ حضرت علیؓ کی فوج کو فتح ہو کہ امیر معاویہ کی طرف سے تحکیم کا شور ہُوا۔ یعنی یہ مسئلہ دو حکموں (پنچوں) کے سپرد کر دیا جائے۔ حضرت علیؓ اس تجویز کو ماننا نہیں چاہتے تھے۔ مگر فتنہ پردازوں نے جو مشکلات کو کم کرنے کی بجائے بڑھانا ہی چاہتے تھے، انھیں اس تجویز کے ماننے پر مجبور کر دیا اور آپ نے مجبور ہو کر عارضی صلح کر لی۔ کچھ دن بعد فتنہ پردازوں نے کچھ سر پھرے عربوں کو اُکسایا اور اُنھوں نے حضرت علیؓ سے آکر کہا کہ "تحکیم" مان کر ہم سب نے کفر کیا۔ آپ بھی اس کفر کا اقرار کیجیے۔ آپ نے انھیں بہت کچھ سمجھایا، مگر اُن میں سے ایک جماعت اپنی بات پر اڑی رہی اور آخر میں حضرت علیؓ سے علیحدہ ہوگئی۔ یہ لوگ خارجی تھے۔ مجبوراً آپ کو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا پڑی۔ ادھر حکموں نے غلط فیصلہ دیا اور آپ نے پھر شامیوں کے خلاف تیاری شروع کی۔ مگر خارجی اپنی فتنہ پردازیوں سے باز نہ آتے تھے۔ آخر کار ۴۰ھ میں ایک خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے آپ کو شہید کر ڈالا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے سیدنا امام حسنؓ آپ کے جانشین ہُوئے مگر ساتھیوں کی نیت میں فتور دیکھ کر چھ ماہ بعد آپ نے امیر معاویہ سے صلح کر لی اور اُن کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے۔

عہدِ صدیقی میں مسیلمہ کذاب کے مقابلے میں یمامہ کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں بہت زیادہ مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں ایک کثیر تعداد حفاظِ قرآن کی تھی۔ اس سے اندیشہ ہونے لگا کہ اگر حفاظ اسی طرح ختم ہوتے گئے تو قرآن کس طرح باقی رہے گا اس لیے حضرت عمرؓ نے صدیق اکبرؓ سے قرآن کریم کو جمع کرنے کی تجویز کی۔ وہ اس نئے کام کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ مگر آخر حضرت عمرؓ کے پیہم اصرار سے راضی ہو گئے اور یہ اہم کام انہوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا، جو کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے کمال احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ قرآن مجید کو جمع کیا۔ اس سے پہلے عربوں میں کوئی کتاب نہ تھی اور مشیت ایزدی بھی یہی تھی کہ اس قوم میں پہلی کتاب جو مدوّن ہو "اللہ کی کتاب" ہو۔

بعد میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں جب اختلافِ قرأت بڑھا تو آپ نے "مصحفِ صدیقؓ" کی نقلیں کرا کر مختلف اقطارِ ملک میں بھیج دیں۔

بعض صحابہ کرامؓ نے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مجموعے بھی جمع کیے تھے۔ ان میں سے حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت علیؓ کے مجموعے زیادہ مشہور تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بیت المال قایم ہُوا، جس سے علم الحساب کو ترقی ہُوئی۔ آپ نے "علم الفرائض" MUSLIM LAW OF INHERITENCE کی بھی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے:

"اذا لھوتم فالھوا بالرمی واذا تحدثتم فتحدثوا بالفرائض"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابہ کرام غیر جانبدار ہو گئے اور انھوں نے حضرت علیؓ سے بیعت نہیں کی۔ یہ "معتزلہ" کہلائے۔ اور اس طرح اسلامی تاریخ میں معتزلہ کا لفظ پہلی مرتبہ سننے میں آیا۔ اگرچہ بعد کے اصطلاحی معتزلہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں خارجہ فرقہ ظہور میں آیا۔ یہ "تحکیم" کے خلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "لاحکم الا اللہ" (اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "حکم" کا حق حاصل نہیں ہے) یہ لوگ محکمہ یا خارجی کہلاتے ہیں۔ خود یہ لوگ اپنے کو "شراۃ" کہتے ہیں۔ (یعنی انھوں نے اپنی جانیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے عوض میں بیچ دی ہیں) خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا۔ وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتا تھا۔ اجلّ صحابہ کی تکفیر میں بھی اسے باک نہ تھا۔ اس کے علاوہ حکومت کی خرابیوں کی اصلاح بزورِ شمشیر کرنے کا قائل تھا۔ ان کی شورشیں بعد کے خلفاء کے لیے دردِ سر بنی رہیں۔

دین اسلام کا سارا دار و مدار قرآن پر ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے اس کے حفظ و جمع کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح سمجھنے میں بہت زیادہ اہتمام برتا۔ یہ علم "تفسیر" کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فہمِ قرآن کے بارے میں چار شخصوں کی خصوصیت سے سفارش کی تھی یعنی عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب، معاذ بن جبل اور سالم مولیٰ حذیفہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ عہدِ صحابہ کے مفسرین میں خلفائے اربعہ کے علاوہ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، اُبی بن کعب، زید بن ثابت، ابُو موسیٰ الاشعری اور عبداللہ بن زبیر خصوصیت سے مشہور رہیں۔ ان میں حضرت علیؓ "انا مدینۃ العلم وعلی بابھا" کے مصداق تھے۔ دُوسرا درجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا تھا، جو "حبر الامۃ" اور "ترجمان القرآن" کہلاتے ہیں اور تیسرا درجہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ

دُوسرا علم جس کے ساتھ مسلمانوں نے اعتنائے شدید برتا، حدیث تھا۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی و پیشوا کے اقوال و اعمال کی تلاش و تحقیق اور حفظ و تدوین، نیز اس کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر دستورِ حیات مرتب کرنے میں اس درجہ اہتمام نہیں کیا، جس قدر مسلمانوں نے کیا ہے اگرچہ شروع میں اس اندیشے سے کہ کہیں غیر شعوری طور پر قرآن اور حدیث میں التباس نہ ہو جائے، حدیث کی اشاعت پر پابندی لگ گئی تھی، مگر جونہی اس التباس کا اندیشہ ختم ہوا، مسلمانوں نے غیر معمولی شغف کے ساتھ حدیث رسولؐ کے سماع و روایت میں اہتمام کیا۔ عہدِ صحابہ میں یہ علم بہت زیادہ شایع رہا، کیونکہ ہر شخص صحابی تھا، جس نے آنحضرتؐ کو دیکھا تھا یا آپؐ کے ارشاداتِ گرامی سُنے تھے۔ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ صحابہ کرام کی تعداد کا احاطہ متعذر ہے۔ ابو زرعہ سے کسی نے کہا کہ احادیث کی تعداد صرف چار ہزار ہے، تو انھوں نے فرمایا: یہ دشمن اسلام زنادقہ کا قول ہے ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار صحابی تھے۔

محدثین میں شرفِ اولیت عشرہ مبشرہ یعنی خلفائے اربعہ اور طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے۔ لیکن کثرت روایت حدیث کے لیے چار صحابی مشہور ہیں: ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان کے بعد عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ، حضرت عمر فاروق، ام المومنین ام سلمیٰ، ابو موسیٰ الاشعری، براء بن عازب، ابوذر غفاری اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کا درجہ ہے۔

حدیث کے بارے میں صحابہ کا عموماً اپنے حافظہ پر اعتماد تھا، کیونکہ عرب کا حافظہ بے مثل ہوتا تھا، لیکن بعض صحابہ نے اپنی مرویات کو قلمبند بھی کر لیا تھا۔ حدیث کے ان صحائف میں حضرت انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو ہریرہؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے مجموعے مشہور ہیں۔

قرآن و حدیث کے بعد دینی علوم میں فقہ کا درجہ ہے، جو دستورِ حیات کا نام ہے۔ اس لیے علمائے کرام نے اس کے ساتھ بھی غیر معمولی شغف و اہتمام سے کام لیا۔ عہدِ رسالت میں جن حضرات کو فتویٰ دینے کا حق تھا، وہ تین مہاجر اور تین انصار تھے۔ مہاجرین میں حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی اور انصار میں ابی بن کعب، معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ ان کے علاوہ مشاہیر فقہائے صحابہ میں خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق، عبداللہ بن مسعود، ابو موسیٰ الاشعری، عویمر بن مالک، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن عاص اور ام المومنین حضرت عائشہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قابلِ ذکر ہیں۔

لسانی علوم براہِ راست تو دینی علوم کا حصہ نہیں، لیکن چونکہ فہم قرآن و حدیث ان علوم میں تبحر و مہارت پر ہی موقوف ہے، اس لیے انھیں بھی شروع سے دینی علوم اور دینی مدارس کے نصاب میں ایسی ہی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان میں دو علم خاص طور سے اہم ہیں، نحو اور لغت۔

نحو کی ابتدا ابوالاسود دؤلی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زیر ہدایت کی۔ بعد میں ابوالاسود کے شاگردوں نے اس فن کو ان سے سیکھ کر مزید ترقی دی۔

پھر چونکہ قرآن عربوں کی زبان میں نازل ہُوا تھا، اس لیے فہم قرآن کے لیے قدیم عربی زبان کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ چنانچہ عہدِ صحابہ میں شعراء کے کلام سے استشہاد کیا جاتا تھا، اور حضرت عمرؓ نے شعرائے عرب کے کلام کا خصوصیت سے مشورہ دیا۔

امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد کا عہدِ حکومت حضرت علیؓ کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے سیدنا امام حسنؓ خلیفہ ہوئے، مگر ساتھیوں کی بے وفائی سے مجبور ہو کر چھ مہینا بعد امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس طرح "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا زمانہ ختم ہوا اور "ملک عضوض" کا آغاز ہوا۔

نئے خلیفہ کے خاندان میں عرصہ سے وجاہت و ریاست چلی آتی تھی اور حکومتی داؤ پیچ کے بیچ میں ان کی پرورش ہُوئی تھی۔ لہذا سیاسی تدبر کے اندر وہ قیصر و کسریٰ کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے۔ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے مقبری کا قول نقل کیا ہے:

"تم لوگ ہرقل اور کسریٰ کے سیاسی تدبر سے تعجب کرتے ہو اور امیر معاویہؓ کو بھُول جاتے ہو"

عامۂ اہلِ اسلام اس تبدیلیٔ حکومت سے مطمئن نہ تھے۔ سختی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایک جانب حلم و تحمل کو اپنا شعار بنایا (یہاں تک کہ اس باب میں ان کا نام ضرب المثل بن گیا)، اور اپنے مقدور بھر اہلِ بیت نبوت اور ان کے ہوا خواہوں کے تالیفِ قلب کی کوشش کی۔ دُوسری جانب "پھُوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلام کی جمہوری رُوح کے خلاف سب سے پہلے انہوں نے خاندانی حکومت کی بنیاد ڈالی اور اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد مقرر کیا۔

امیر معاویہ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کا بیٹا یزید اُن کا جانشین ہُوا۔ وہ بجا طور پر "عرب کا نیرو" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ" سیدنا امام حسینؓ کی شہادت ہے (۶۱ھ) اگلے سال اس نے اہلِ مدینہ کے خلاف ایک لشکر بھیجا، جس نے دیارِ رسولؐ کی بے حُرمتی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ تیسرے اور آخری سال مکہ معظمہ عبداللہ بن زبیر کے مقابلے میں ایک لشکر بھیجا، جس کی آتش زنی سے غلافِ کعبہ بھی جل گیا۔ آخر حرمین شریفین کی بے حرمتی اور خاندانِ رسالت پر ظلم ڈھانے کے بعد عرب کے اس "نیرو" نے ۶۴ھ میں انتقال کیا۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید تخت نشین ہُوا، مگر باپ کے مظالم سے وہ اس قدر دل برداشتہ تھا کہ چالیس دن بعد ہی انتقال کر گیا۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں مذہبی افتراق شروع ہُوا، جس کی اصل سیاسی تحزب و جماعت بندی تھی۔ ایک جماعت خلافت کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ لوگ آگے چل کر شیعہ (شیعانِ علیؓ) کہلائے۔ دُوسری جماعت شخصی حکومت کی منکر تھی اور امراء و خلفاء کی خلافِ شرع من مانیوں سے بیزار۔ وہ بزورِ شمشیر حکومت میں اصلاح پر مُصر تھی۔ یہ لوگ خارجی تھے، جو امویوں کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے رہے۔ تیسری جماعت عامہ اہلِ اسلام کی تھی جو تفریق و انتشار بین المسلمین کو ناپسند کرتی تھی اور مسلمانوں میں اجتماعِ کلمہ کو بہرحال دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ "اہل السنت و الجماعت" تھے۔

ان میں خارجی فرقہ بڑا آتش مزاج تھا، اس نے اپنے سیاسی معتقدات میں تفریط کے علاوہ جو "فلسفیانہ مذاجیت" کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسلام کے دینی تصور میں بھی افراط سے کام لیا اور گناہِ کبیرہ کو کفر کا مترادف قرار دیا۔ یہ لوگ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو

کافر کہتے تھے۔ اعتدال پسند طبقہ (اہل السنت والجماعت) گناہ کو بُرا سمجھتا تھا اور گنہ گار کو گنہ گار اور فاسق کہتا تھا۔ بایں ہمہ اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیتا تھا۔ لیکن خوارج کے افراط و تشدد کے مقابلے میں ایک تیسرا فرقہ بھی تھا، جس نے خارجیوں کی شدت پسندی کے ردِ عمل کے نتیجے میں جانب تفریط کو اختیار کیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ جس طرح کسی کافر کا نیک عمل اسے فائدہ نہیں پہنچاتا، کسی مسلمان کی بد عملی بھی ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتی، "لا تضر مع الایمان معصیة کما لا ینفع مع الکفر طاعة" ان لوگوں کا مقولہ تھا، یہ لوگ "مرجئہ" کہلاتے تھے۔

اوپر اُن لوگوں کا ذکر آ چکا ہے، جو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر حضرت علیؓ کی بیعت میں شریک نہیں ہُوئے۔ نیز ان لوگوں کا بھی جو متحاربین میں سے کسی کے ساتھ ہو کر نہیں لڑے یہ لوگ "معتزلہ" کہلاتے تھے۔ (تاریخ طبری و تاریخ ابوالفدا) اب نئے "معتزلہ" پیدا ہُوئے۔ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے منصبِ خلافت سے دست بردار ہو جانے کے بعد ان کے معتقدین کے لیے سیاسی سرگرمیوں میں کوئی دل چسپی نہیں رہی اور انھوں نے مساجد کے اندر علم و عبادت کے واسطے گوشہ نشینی اختیار کی۔ اسی گوشہ نشینی و عزلت گزینی (اعتزال) کی وجہ سے وُہ "معتزلہ" کہلائے۔ مگر عہدِ مرتضوی کے معتزلہ اور عہدِ معاویہ کے ان معتزلہ کا بعد کے معتزلی فرقے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملک کے عام سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا اور مختلف علمی تحریکوں کو پیدا کیا۔

امیر معاویہ عرب کے "دہاۃ اربعہ" (چار مدبروں) میں محسوب ہوتے تھے۔ ان کے تدبر اور سیاست کاری کی بدولت مختلف علوم کو ترقی ہُوئی۔

انھوں نے قبائلی عصبیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے طرفدار قبائل کے شعراء کو نوازا۔ اس طرح شعر و شاعری کا مشغلہ جو بعثتِ اسلام کے بعد سے مُردہ ہو گیا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا۔

سیاسی بصیرت کے لیے وہ اپنا بیشتر وقت ملوکِ گزشتہ کی سیرت سے واقفیت بہم پہنچانے میں صرف کرتے تھے اس کے لیے انھوں نے یمن سے عبید بن شریہ کو بلوا کر تاریخ پر کتابیں لکھوائیں۔ اس طرح ان کے زمانہ میں تاریخ کے فن کی بنیاد پڑی۔

امیر معاویہ کا ایک اور کارنامہ "استلحاق" ہے۔ ایک شخص زیاد جو ایک لونڈی سمیہ کے بطن سے تھا مگر امیر معاویہ کے باپ کی ناجائز اولاد سے تھا، اسے حضرت علیؓ سے منحرف کرنے کے لیے اپنا سوتیلا بھائی قرار دے کر اپنے خاندان میں ملا لیا۔ حالانکہ یہ بات شرعاً ناجائز ہے اس سے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگ زیاد کی اس ناجائز پیدایش پر طعن و تشنیع کرتے تھے۔ اس لیے اس نے عربوں کے مختلف خاندانوں کے عیوب اور اخلاقی کمزوریوں پر ایک کتاب بعنوان "مثالب العرب" لکھی، جس سے آگے چل کر شعوبیوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔

یزید خلفائے اسلام میں پہلا شخص ہے، جس نے ملاہی و ملاعب میں انہماک کیا۔ سرجون رومی جو دیوانِ خراج کا افسرِ اعلیٰ اور عیسائی تھا، اس کے ساتھ بادہ گساری میں شریک ہوا کرتا تھا۔

اس عہد میں تفسیر قرآن کے تین اہم مرکز تھے: مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، مدینہ منورہ میں حضرت اُبی بن کعبؓ اور

عراق میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ تفسیر قرآن کا درس دیتے تھے۔ موخر الذکر کے تلامذہ میں سے بعد میں علقمہ بن قیس (المتوفی ۶۱ھ) سروق (المتوفی ۶۲ھ) اور اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ھ) بھی یہی خدمات انجام دے رہے تھے۔

حدیث کے سلسلے میں اپنے ہادی و پیشوا کے ارشاداتِ گرامی اور اندازِ زندگی کے ساتھ مسلمانوں کا شغف و اہتمام اپنی آپ ہی مثال ہے اور اگرچہ وقتاً فوقتاً خود شارع نے اس سلسلے میں کچھ پابندیاں عاید کیں، مگر ان کے شوقِ بے پایاں میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اکثر مشاہیر صحابہ نے اس عہد میں بھی حدیث کی روایت کو جاری رکھا۔ جن میں ام المومنین حضرت عائشہؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ خاص طور پر مشہور ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابوسعید خدری، عقبہ بن عامر، جابرؓ بن عبداللہ، انسؓ بن مالک، علقمہ بن قیسؓ، مسروق بن الاجدعؒ، اسود بن یزیدؒ، جبیرؒ بن نفیر الحضرمی، سوید بن عقلہ، ام الدرداءؓ وغیرہم زیادہ مشہور ہیں۔

فقہ کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس عہد میں صحابہ کرامؓ قلمرو خلافت کے بڑے بڑے شہروں میں پھیل گئے تھے۔ ان کی وجہ سے جگہ جگہ مکاتبِ فقہ قایم ہو گئے۔ مشاہیر فقہاے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن عاص خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ چاروں بزرگ جن میں سے ہر ایک کا نام عبداللہ تھا "العبادلہ الاربعہ" کہلاتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس فقہ کے علاوہ تفسیر میں بھی سر آمد مفسرین روزگار تھے اور عہدِ صحابہ ہی میں "ترجمان القرآن" کہلاتے تھے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دعا دی تھی: اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل۔ عبداللہ بن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے تقریباً ساٹھ سال تک افتا کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ عبداللہ ابن زبیرؓ پہلے مسلمان تھے، جو مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد پیدا ہوئے۔ وہ یزید کے مقابلے میں مکہ معظمہ کے اندر خلیفہ ہو گئے تھے۔ مگر بعد میں جب حجاج نے حملہ کیا، تو اس میں شکست کھائی اور شہید ہوئے۔ وہ مناسکِ حج کے سب سے زیادہ واقف کار تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی فقہا تھے، جیسے ابوسعید الخدری، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ الانصاری، رافع بن خدیج، سیدنا امام حسن، سیدنا امام حسین، زید بن ارقم، نعمان بن بشیر، سمرہ بن جندب الفزاری۔ ان میں سے منصب افتاء عبداللہ بن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابوسعید الخدری، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ انصاری کو حاصل تھا۔

لسانیات کے سلسلہ میں فنِ نحو کو حضرت علیؓ کے ایما سے ابوالاسود الدوئلی نے مدون کرنا شروع کیا تھا مگر اموی عہد میں کچھ ایسے واقعات پیدا ہو گئے کہ اس تدوین کو باقاعدہ طور پر مدون کرنا پڑا۔

زیاد بن ابیہ نے ابوالاسود الدوئلی سے استدعا کی کہ وہ نحو کے فن کو مدون کریں تاکہ لوگوں کو اس کی مدد سے فہمِ قرآن میں سہولت ہو۔ مگر ابوالاسود اس علم کو جسے انہوں نے حضرت علیؓ سے حاصل کیا تھا، عام کرنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے زیاد سے معذرت کر لی۔ اب زیاد نے ایک شخص کو متعین کیا، جس نے قرآن غلط پڑھا۔ اس سے ابوالاسود کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ زیاد کے پاس پہنچے اور کہا، میں نہیں سمجھتا تھا کہ صورتِ حال اس درجہ بگڑ چکی ہے۔ اب زیاد نے قبیلہ بنی عبدالقیس کا ایک آدمی انھیں دیا اور وہ ان کے حسبِ تلفظ قرآن میں اعراب لگاتا جاتا تھا، مگر اس زمانہ میں اعراب کا طریقہ آجکل کے طریقوں سے مختلف تھا۔ اس زمانہ میں فتح کے لیے اُوپر نقطہ لگاتے تھے، کسرہ کے لیے نیچے اور ضمہ کے لیے حرف کے سامنے۔

اس زمانہ میں زندخاں کے کچھ ایرانی بصرہ میں آئے اور قدامہ بن مظعون کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ ان میں ایک سعد نام کا بھی تھا۔ ابوالاسود نے اسے دیکھا کہ گھوڑے کو لیے جا رہا ہے اور پوچھا سوار کیوں نہیں ہوتے؛ سعد نے کہا "ان فرسی ضالعٌ"۔ حاضرین ہنسنے لگے مگر ابوالاسود نے کہا: یہ غیر عرب ہمارے بھائی ہیں۔ رغبتِ اسلام کی غرض سے عربی بولنا چاہتے ہیں مگر صحیح نہیں بول سکتے۔ اس لیے ہمیں ان کی مدد کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد انھوں نے "فاعل ومفعول" کا باب مرتب کیا۔ یہ مبحث ابوالاسود کے شاگرد یحییٰ بن یعمر کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ابن الندیم (المتوفی ۳۸۰ھ) کے زمانہ تک موجود تھا اور اس نے اسے دیکھا۔

ابن الاسود دوئلی کے شاگردوں میں یحییٰ بن یعمر کے علاوہ عنبسہ بن معدان (عنبسۃ الفیل)، میمون بن اقرن اور نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت نصیب ہُوئی۔

مروانیوں کا عروج یزید بن معاویہ کے آخر عہدِ حکومت میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ مکہ معظمہ میں عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ یزید نے ان کے مقابلے میں ایک لشکرِ جرار بھیجا۔ مگر اس کی کامیابی سے پہلے ہی یزید کے دن پورے ہوگئے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید خلیفہ ہوا مگر چالیس دن بعد وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہُوا۔ اب خود لشکرِ یزید کا رجحان اجتماعِ کلمہ ملت کی خاطر عبداللہ بن زبیر کی جانب تھا، مگر مروانیوں نے جو اُمویوں کے چچیرے بھائی ہوتے تھے، اسی خاندان میں خلافت قایم رکھنے کے لیے مروان بن الحکم کو خلیفہ بنا لیا۔ اُدھر سیدنا امام حسینؓ کے انتقام کی آگ عام مسلمانوں کے سینہ میں آتش زن تھی، ان کے اس جذبہ سے فائدہ اٹھا کر ایک شخص مختار ثقفی نے ان کے انتقام کے نام پر اموی حکام کے خلاف خروج کیا اور قاتلینِ حسینؓ کو چُن چُن کر ان کے کیفرِ کردار کو پہنچایا۔ اس کے بعد اس کا تصادم عبداللہ بن زبیر کی افواج سے ہُوا اور اسے شکست ہُوئی۔ اس طرح عبداللہ بن زبیر کی قوت بٹ گئی۔ اتنے میں مروان مرگیا اور اس کا بیٹا عبدالملک اس کا جانشین ہوا۔ اس کے سپہ سالار حجاج نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر انھیں قتل کر ڈالا۔ اس طرح عبدالملک پھر سے پُورے عالمِ اسلامی کا خلیفہ ہوگیا۔ (۷۳ھ)

عبدالملک نے ۸۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ولید خلیفہ ہُوا۔ اس نے بھی حجاج کو عراق کی گورنری پر برقرار رکھا۔ ولید کا زمانہ عظیم الشان فتوحات کے لیے مشہور ہے۔ مغرب میں طارق نے اندلس (اسپین) کو فتح کیا اور مشرق میں محمد بن قاسم نے ۹۳ھ میں سندھ کو اور ۹۵ھ میں ملتان کو فتح کیا اور اس طرح برِّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی حکومت قایم ہُوئی۔

ولید نے ۹۶ھ میں وفات پائی اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہُوا۔ وہ بڑا عادل اور نیک منش خلیفہ تھا۔ اسی نیک نفسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنے بعد اپنے بیٹے کو ولی عہد نہیں بنایا بلکہ اپنے چچا زاد بھائی عمر بن عبدالعزیز کے لیے وصیت کی۔

سلیمان کی وفات ۹۹ھ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہُوئے۔ وُہ حضرت عمر فاروقؓ کے نواسے تھے۔ اس لیے خلیفہ ہو کر انھوں نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح عدل و انصاف کو اپنا شعار بنایا مگر وُہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہے اور ۱۰۱ھ میں وفات پا گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد امویوں کا زوال شروع ہُوا۔ یوں بھی پہلی صدی ختم ہو رہی تھی اور لوگ انقلاب کی توقع کر رہے تھے۔

خارجیوں کی شورشیں اس زمانہ میں بھی جاری رہیں اور ان کے مختلف فرقے ظہور میں آتے رہے۔ ان کے مقابلے میں فرقہ مرجئہ کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ عقیدہ ارجاء کے سب سے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ (جو حضرت علیؓ کے صاحبزادے اور حضرات حسنینؓ کے سوتیلے بھائی تھے) کے صاحبزادے ابو ہاشم تھے۔

عہد صحابہ کے آخر میں عبداللہ بن زبیر یا عبدالملک کے عہدِ خلافت میں "قدریت" اسلامی فکر میں داخل ہوئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بدعت یہود سے آئی۔ بعض کے نزدیک مجوسیوں سے آئی اور ایک قول یہ ہے کہ امویوں کے مظالم کے نتیجہ میں خود مسلمانوں ہی میں پیدا ہوئی۔ بہرحال صحابہ کرام اس بدعت سے بیزار تھے۔ البتہ بعض اکابر تابعین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کا اس جانب رجحان تھا ان میں حضرت حسن بصریؒ کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔

عہدِ ماقبل کی طرح سیاسی حالات نے بھی ثقافتی حالات کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں مختلف علمی تحریکیں ظہور میں آئیں؛

معاویہ بن یزید کے بعد جب امویوں کا اقتدار کمزور پڑنے لگا، تو خاندان والوں نے مروان بن الحکم کو، جو خاندان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھا، اس شرط پر خلیفہ بنایا کہ اس کے بعد پہلے اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ ہوگا اور پھر یزید کا بیٹا خالد۔ مگر عبدالملک نے خلیفہ ہو کر خالد بن یزید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ مجبور ہو کر روپیہ کی ہوس میں خالد بن یزید نے کیمیا اور مہوسی کی طرف توجہ کی اور یونانی و قبطی زبانوں سے کیمیا، نیز طب و نجوم کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا اور اس طرح اس تحریک کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، جو آگے چل کر منصور عباسی اور پھر مامون الرشید کے زمانہ میں اپنے عروج کو پہنچی۔ خالد بن یزید کا مترجم خاص اصطفن تھا۔

سیاسی مفاد کی بدولت امیر معاویہ کے زمانے سے مغربی دیوان خراج پر نصرانی اور مشرقی پر مجوسی چھائے ہوئے تھے۔ یہ لوگ خود کو حکومتی نظام کی رُوحِ رواں سمجھتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عبدالملک نے ان کا زور توڑنے کے لیے دیوانِ خراج کو عربی میں منتقل کرا دیا۔ اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آیندہ کے لیے ترجمہ کے واسطے فضا ہموار ہو گئی۔

عبدالملک کے بیٹے ولید کو تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اکثر عمارات اس کی بنوائی ہوئی ہیں۔ ان میں دمشق کی جامع مسجد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ تعمیرات کے علاوہ اس نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے؛ شفاخانے بنوائے، یتیموں کے لیے مکاتب کھلوائے، نادار، اپاہجوں اور مزمن امراض کے مریضوں کے لیے مکانات بنوائے، علماء و فقہاء کے لیے وظائف مقرر کیے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز عدل و انصاف میں عمر فاروقؓ کے ثانی تھے۔ اگر وُہ کچھ دن اور زندہ رہ جاتے، تو خارجیوں اور قدریوں کی بدعتیں ختم ہو جاتیں، کیونکہ ان دونوں بدعتوں کی اصل وجہ امویوں کا ظلم و ستم تھا۔ اُن سے پہلے بر سرِ منبر حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا جاتا تھا، مگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے موقوف کر کے خطبہ میں "ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائی ذی القربٰی وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون" کا اضافہ کیا۔

جہاں تک علمی سرگرمی کا تعلق ہے، انھوں نے محدثین کو روایتِ حدیث کے لیے ترغیب دی۔ نیز محض نفع رسانی خلق کے لیے اہرن القس کی "طبی کناشں" کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے ہی عہدِ خلافت میں اسکندریہ کا مدرسہ فلسفیہ جو تقریباً ایک ہزار سال سے چلا آ رہا تھا، انطاکیہ میں منتقل ہوا۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تفسیر قرآن کے اہم مرکز تین تھے، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق۔ مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ ان میں سعید بن جبیر (المتوفی ۹۵ھ)، مجاہد بن جبیر (المتوفی ۱۰۴ھ)، عکرمہ (المتوفی ۱۰۴ھ)، عطاء بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ)، طاؤس بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

مدینہ منورہ میں حضرت ابی بن کعب کے تلامذہ تفسیر کا درس دیتے تھے۔ ان میں ابوالعالیہ (المتوفی ۹۰ھ)، محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ)، زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

عراق میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ ان میں اسود بن یزید (المتوفی ۷۴ھ)، مرۃ الھمدانی (المتوفی ۷۶ھ)، عامر بن شرحبیل (المتوفی ۱۰۹ھ) اور الحسن البصری (المتوفی ۱۱۰ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

حدیث کے ساتھ امت مسلمہ کے بے پناہ شغف و اہتمام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، جو آج کے دن تک باقی ہے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ کے والی کو تدوین حدیث کے لیے تاکید کی تھی، اور جیسا کہ امام بخاری نے "صحیح" میں فرمایا ہے، لکھا تھا: "جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تلاش کرو اور انھیں قلمبند کرا لو۔ کیونکہ مجھے علم کی بوسیدگی اور علماء کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قبول کرو۔ علم کی علانیہ اشاعت کرو، تاکہ نہ جاننے والے بھی جان جائیں۔ علم جبھی ضائع ہوتا ہے جب کہ چند مخصوص لوگوں کی ملکیت بن جائے۔" اس ترغیب و تشجیع کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ عہد کے مشاہیر محدثین میں امام زین العابدین، ابراہیم النخعی، سعید بن مسیب، سعید بن الجبیر، حسن البصری، عروہ بن الزبیر، ابو رجاء العطاردی، ابوالعالیہ، جابر بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، شعبی، سالم بن عبداللہ بن عمر، طاؤس بن کیسان، عطاء بن لیسار، سلیمان بن لیسار، مجاہد بن جبیر، عطا بن ابی رباح خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادھر صحابہ کرام نے مختلف شہروں میں جا کر فقہ کے مکاتیب قایم کر دیے تھے۔ چنانچہ اس عہد میں مدینہ منورہ کے اندر جو جو فقہاء ہوئے، ان میں سعید المسیب (المتوفی ۹۴ھ)، عروہ بن الزبیر (المتوفی ۹۷ھ)، محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۷۲ھ) علی بن الحسین زین العابدین (المتوفی ۹۴ھ) حسن بن محمد بن الحنفیہ (المتوفی ۱۰۰ھ) قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق (المتوفی ۱۰۲ھ) ابوبکر بن عبدالرحمٰن (المتوفی ۹۴ھ) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود (المتوفی ۹۹ھ) سالم بن عبداللہ بن عمر (المتوفی ۱۰۶ھ) خارجہ بن زید بن ثابت (المتوفی ۱۰۰ھ) سلیمان بن لیسار (المتوفی ۱۰۷ھ) ابوسلمہ ابن عبدالرحمٰن الزہری (المتوفی ۱۰۴ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں دو فقیہہ ایسے بھی تھے، جو بعد میں منصبِ خلافت پر فائز ہوئے: ایک عبدالملک بن مروان اور دوسرے حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ فقہائے مکہ میں عطاء بن رباح، مجاہد بن جبیر، عبداللہ بن ابی ملیکہ اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس زیادہ مشہور تھے۔ فقہائے بصرہ میں حسن البصری، جابر بن یزید الازدی (المتوفی ۹۳ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ)

ابو العالیہ، مسلم بن یسار، ابو قلابہ (المتوفی ١٠٦ھ) اور فقہائے کوفہ میں ابو مسلم عبیدہ بن عمر السلمانی (المتوفی ٧٢ھ) شریح بن الحارث القاضی (المتوفی ٨٢ھ) الحارث الاعور، عامر بن شراحیل الشعبی، سعید بن جبیر اور ابراہیم بن یزید زیادہ مشہور تھے۔ ان کے علاوہ یمن میں طاؤس بن کیسان، وہب بن منبہ، عطا بن مرھود، شراحیل بن شرحبیل الصنعانی، شام میں ابو ادریس الخولانی، مکحول ابن حوشب الاشعری اور مصر میں ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن عسیلہ الصنابحی، ابو تمیم عبداللہ بن مالک بن الجشانی وغیرہم تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ نحو کی بنیاد حضرت علیؓ کے ایماء سے ابو الاسود الدؤلی نے ڈالی تھی۔ بعد میں انھوں نے زیاد بن ابیہ کے زمانہ میں اسے منظم طور پر مدون کیا۔ اُن کے بعد اُن کے شاگردوں نے اس علم کو ترقی دی۔ ان میں نصر بن عاصم کو خاص طور سے شہرت حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو انھیں نحو کا واضع سمجھتے ہیں۔ نصر بن عاصم کے شاگرد خصوصی ابو عمر بن العلاء تھے۔

نصر بن عاصم نے حجاج بن یوسف کی ولایت عراق کے زمانہ میں حروف متشابہ پر نقطے لگا کر عربی حروف کی کتابت کو مکمل کر دیا۔

مروانیوں کا زوال حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے ساتھ "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کا ادارہ ختم ہوگیا۔ ان کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا۔ (١٠١ھ) وہ چالیس دن تو اپنے پیشرو کے نقش قدم پر چلا مگر پھر مروانی تجبر کی طرف منحرف ہوگیا۔ اس کے زمانہ میں یزید بن المہلب نے خروج کیا۔ خلیفہ نے اس کی تادیب کے لیے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کو بھیجا۔ یزید بن مہلب کو شکست ہوئی اور عقیر کے مقام پر، جو کربلا سے قریب ہے، قتل کیا گیا۔ مورخ کلبی نے اپنے بچپن کی سُنی ہوئی بات نقل کی ہے:

"ضحّی بنو امیۃ یوم کربلاء بالدین ویوم العقیر بالکرم"

"بنو امیہ نے دین اور شرافت دونوں کو ذبح کر دیا، دین کو کربلا میں اور شرافت کو میدانِ عقیر میں۔"

یزید بن عبدالملک نے ١٠٥ھ میں وفات پائی اور اس کا جانشین اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک ہوا، جس نے ١٢٥ھ تک حکومت کی۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ اموی خلفاء میں تین مدبرین گزرے ہیں۔ تیسرا مدبر ہشام تھا۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا ولید بن یزید خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا فاسق و بدکار تھا، جسے توہینِ شریعت میں بھی باک نہ تھا۔ آخر اس کے فسق و فجور سے ناراض ہو کر لوگوں نے بغاوت کی اور سال بعد اُسے محصور کر کے قتل کر ڈالا۔

ولید بن یزید کے بعد اس کا چچا زاد بھائی یزید بن ولید خلیفہ ہوا۔ وہ قدیم بادشاہوں کا نواسہ ہوتا تھا، کیونکہ اس کی ماں ساسانی تاجدار یزدجرد کی پوتی اور اس کی نانی خاقانِ ترکستان اور قیصرِ روم کی اولاد میں سے تھی۔ اسے خود اپنی عالی نسبی پر ناز تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا: ؎

انا ابن کسریٰ وابی مروان
وقیصر جدی وجدی خاقان

(میں کسریٰ کا بیٹا (نواسہ) ہوں اور میرا باپ (دادا) مروان ہے اور قیصر میرا نانا ہے اور دُوسرا نانا خاقان ہے)

چونکہ اس نے خلیفہ ہوکر فوج کی تنخواہ کم کر دی تھی، اس لیے وُہ یزید الناقص کہلاتا تھا ویسے وُہ بڑا دیندار تھا اور معتزلہ کے مسلک کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ اسی لیے خلیفہ ہوکر اس نے غیلان دمشقی کے پیروؤں کو جو فرقہ قدریہ کا سرگروہ تھا، تقرب بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ یزید بن ولید کو حضرت عمر بن عبدالعزیز پر بھی ترجیح دیتے ہیں۔

مگر یزید چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا اور اس کے کچھ دن بعد مروان الحمار خلیفہ ہوا۔ وہ بڑا جفاکش اور محنتی تھا۔ (اسی وجہ سے "حمار" کہلاتا تھا) دوسرا لقب "جعدی" تھا کیونکہ وہ جعد بن درہم کا شاگرد تھا، جو مسلمانوں میں مسلک "تعطیل" کا بانی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اسی "تعطیل" کی نحوست اس کے ساتھ اموی خلافت کو بھی لے ڈوبی۔ اس کا زمانہ شورشوں کے فرو کرنے کی کوشش میں گزرا۔ مگر اب اموی اقتدار کے دن ختم ہو چکے تھے۔ خراسان میں عباسیوں کے طرف داروں نے خروج کیا۔ اُن کی سربراہی ابومسلم خراسانی کر رہا تھا۔ مروان کو شکست پر شکست ہُوئی اور وہ مصر کی طرف بھاگنا چاہتا تھا کہ بوصیر کے مقام پر پکڑا گیا اور قتل ہُوا۔ اس طرح اموی خلافت ختم ہوئی اور عباسی خلافت کا آغاز ہوا۔

ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں سیدنا زید بن علیؒ نے خروج کیا، مگر ناکام ہوکر شہید ہُوئے۔ ان کے پیرو "شیعہ زیدیہ" کہلاتے ہیں۔ وُہ خلافت کا مستحق تو آلِ علیؓ ہی کو سمجھتے ہیں مگر دُوسرے شیعہ فرقوں کی طرح "شیخین" (حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ) کو بُرا نہیں کہتے۔ جن لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، ان میں امام ابوحنیفہ بھی تھے۔ اسی لیے ہشام نے انھیں کوڑوں سے پٹوایا تھا۔

اسی زمانہ میں اکابر تابعین میں سے حسن بصری کا حلقہ بصرہ میں قائم تھا۔ صوفیاء کرام کے سلسلے عموماً انھیں کے واسطے سے حضرت علیؓ تک پہنچتے ہیں۔ ان کے تلامذہ میں دو شخص واصل بن عطا الغزال اور عمرو بن عبید مشہور ہیں۔ اس زمانہ میں "مرتکب کبیرہ" کا مسئلہ بڑے زوروں سے چل رہا تھا۔ خارجی لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر کہتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں فرقہ مرجئہ تھا، جس کے سرگرم علمبردار اس زمانہ میں محمد بن حنفیہ کے صاحبزادے ابوہاشم تھے۔ مرجئہ کا کہنا تھا کہ جس طرح کافر کا نیک عمل اسے فائدہ نہیں پہنچاتا، اسی طرح گناہ ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

کہتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص حسن بصریؒ کے پاس آیا اور "مرتکب کبیرہ" کا حکم دریافت کیا۔ وہ ابھی جواب بھی نہ دینے پائے تھے کہ واصل بول اٹھا کہ وہ نہ کافر ہے، نہ مسلمان، بلکہ دونوں کے "بین بین" ہے۔ اس عقیدہ کو جو "المنزلۃ بین المنزلتین" کہلاتا ہے، احداث کرنے کی بنا پر وہ دونوں حسن بصری کے حلقۂ تلمذ سے نکالے گئے یا کنارہ کش ہوگئے۔ (اعتزالاً) اسی لیے محض مورخین کے قول کی بنا پر وہ اور ان کے متبعین "معتزلہ" کہلاتے ہیں۔ لیکن غالباً معتزلہ کا فرقہ اس سے پہلے سے موجود تھا۔ کیونکہ ابوالفرج اصفہانی نے "الاغانی" میں لکھا ہے کہ بصرہ میں چھ آزاد خیالوں بشار بن برد، صالح بن عبدالقدوس، عبدالکریم بن ابی العوجا، واصل بن عطا، عمرو بن عبید اور ایک ازدی شخص (جس کے مکان پر ان لوگوں کی نشست ہُوا کرتی تھی) کی انجمن تھی۔ آخر میں ازدی نیربان توسمنی (بدھ مذہب کا پیرو) ہوگیا اور باقی لوگوں نے دُوسرے مسالک اختیار کیے۔ ان میں سے واصل بن عطا اور عمرو بن عبید کے متعلق لکھا ہے:

"فصارا الی الاعتزال" (وہ دونوں اعتزال یا معتزلہ کے مذہب کی طرف مائل ہوگئے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اعتزال واصل اور عمرو بن عبید سے کہیں پہلے سے تھا۔

جو کچھ بھی ہو اس زمانہ میں معتزلہ کا بہت زیادہ اثر تھا کیونکہ انھیں معتزلہ کی مدد سے یزید بن ولید اپنے پیشرو ولید بن یزید کو تخت سے اتار کر خود خلیفہ ہُوا تھا۔ بہرحال اصطلاحی "معتزلہ" کا آغاز واصل بن عطا اور عمرو بن عبید نے کیا۔

اس زمانہ میں بھی "قدریت" (انسان کے فاعل مختار ہونے کا عقیدہ) آزاد خیال حلقے میں بہت زیادہ شایع رہا۔ حتی کہ اکا بر تابعین میں سے بعض جلیل القدر تابعی جیسے حسن بصری، مکحول، قتادہ بن دعامہ وغیرہم اس عقیدے کی جانب مائل تھے۔ کھلے ہوئے قدریوں میں غیلان دمشقی، واصل بن عطا، عمرو بن عبید تھے۔ "قدر" کے ردعمل کے طور پر "جبر" کا عقیدہ پیدا ہُوا۔ جس کا بانی جہم بن صفوان تھا۔

دوسری صدی کی ابتدا میں کلامِ باری کا مسئلہ پیدا ہُوا اور اس کے ساتھ "تعطیل" کی بدعت (یعنی اللہ تعالیٰ کسی صفت سے متصف نہیں ہے) اسلامی فکر میں درآئی۔ یہ دراصل یہودیوں کا اندازِ فکر تھا۔ ان میں سے تفلسف زدہ طبقہ توریت کے کلام باری ہونے کا منکر تھا۔ بعثت اسلام کے وقت لبید بن اعصم یہودی، جس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دیا تھا، اس عقیدے کا قائل تھا لبید سے اس کے بھانجے طالوت نے اور طالوت سے بنان بن سمعان نے اس عقیدے کو اخذ کیا۔ بنان بن سمعان سے جعد بن درہم نے یہ عقیدہ لیا۔ اس سے بڑی بے چینی پھیلی اور ہشام نے عراق کے گورنر خالد بن عبداللہ القسری کو جعد بن درہم کے قتل کا حکم دیا۔ خالد نے عید اضحیٰ کے دن خطبہ کے بعد اسے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کیا۔

جعد سے یہ بدعت جہم بن صفوان نے لی (جو عقیدہ "جبر" کا بھی بانی ہے) وہ بھی صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اسی کے نام پر صفات باری کے انکار کا عقیدہ "تجہم" یا "جہمیت" کہلاتا ہے۔ جہم ۱۲۸ھ کی خانہ جنگیوں میں خراسان کے اندر قتل ہوا۔

بہرحال اس صفاتِ باری کے انکار (تعطیل)، بالخصوص قرآن کے مخلوق ہونے کے عقیدہ نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی اور علمائے محدثین نے بڑی سختی سے اس کی مذمت کی۔ پھر بھی یہ ترقی کرتا رہا اور اسی "مسئلہ کلام باری" کی وجہ سے اسلام کو عقلیت کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کا نام "کلام"، اور اس کے علمبرداروں کا نام "متکلمین" قرار پایا۔

اہل السنت والجماعت کے حلقوں میں یہ عہد امام ابوحنیفہ کی تدوینِ فقہ کے لیے مشہور ہے وہ پہلے علم کلام کے عالم متبحر تھے مگر بعد میں فقہ کی طرف متوجہ ہُوئے اور حماد بن ابی سلیمان کی، جو اس زمانہ میں فقہائے کوفہ کے شیخ تھے، شاگردی اختیار کی۔ حماد کی وفات پر امام ابوحنیفہ ہی ان کے جانشین بنے اور اس فقہی نظام کی بنا ڈالی، جو "حنفی فقہ" کہلاتا ہے اور جو اس وقت دنیا کا عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا خصوصاً مذہب ہے۔

دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی تحریک جسے پچھلی صدی میں خالد بن یزید نے جاری کیا تھا، اس صدی میں بھی جاری رہی مگر خالد بن یزید یا حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرح خلفا اور امرا نے ان مترجمین کی سرپرستی نہیں کی۔ اموی خلفاء کے اکثر کاتب (دیوان کتابت یا سکرٹریٹ کے عہدہ دار) محض تفننِ طبع کے طور پر یونانی اور فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ان میں جبلہ بن سالم کا نام خاص طور سے مشہور ہے۔ ۱۱۳ھ میں بعہد ہشام بن عبدالملک ایران کے اندر ساسانیوں کی ایک لائبریری ملی، جس کی

کتابیں بوسیدہ ہو چکی تھیں۔

کہتے ہیں کہ اُمویوں ہی کے عہد میں خراسان کے اندر کاغذ کا کارخانہ قایم ہُوا، ورنہ اس سے پہلے ایران میں کھالوں پر لکھا جاتا تھا۔

امویوں کے عہدِ زوال میں نجوم اور جوتش کو بھی بڑا فروغ ہُوا۔ مگر اس کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لیے ذیل میں صرف دینی علوم کی ترقی کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

سابق عہد کے مفسرین میں سے بعض اربابِ کمال اس عہد تک زندہ رہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کے تلامذہ میں سے عطا بن ابی رباح (المتوفی ۱۱۴ھ)، حضرت ابی بن کعب کے تلامذہ میں سے محمد بن کعب القرظی (المتوفی ۱۱۸ھ) اور زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے تلامذہ میں سے عامر بن شراحیل (المتوفی ۱۰۹ھ) اور سیدنا امام حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ) کی سرگرمیاں اس عہد میں بھی جاری رہیں۔

ان کے علاوہ اس عہد کے مشاہیر مفسرین میں سے عمرو بن دینار، قتادہ بن دعامہ، سیدنا امام محمد بن باقر، ابواسحاق سلیعی، ابوالزناد اور ہشام بن عروہ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سابق عہد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دلچسپی سے حدیث کے ساتھ اعتنا کو خصوصی ترقی حاصل ہُوئی۔ اس عہد میں بھی یہ ترقی جاری رہی۔ چنانچہ اس عہد کے مشاہیر محدثین میں سے ذہبی نے "تذکرۃ الحفاظ" میں امام حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین (المتوفی ۱۱۰ھ) میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) نافع (المتوفی ۱۱۷ھ) وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) مکحول (المتوفی ۱۱۳ھ) زہری (المتوفی ۱۲۴ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) ابوسعید مقبری (المتوفی ۱۲۵ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۸ھ) امام محمد باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) محمد بن المنکدر (المتوفی ۱۳۰ھ) یحییٰ بن ابی کثیر (المتوفی ۱۲۹ھ) ایوب السختانی (المتوفی ۱۳۱ھ) زید بن اسلم (المتوفی ۱۳۶ھ) سلمہ بن دینار (المتوفی ۱۴۰ھ) ابوالزناد (المتوفی ۱۳۱ھ) منصور بن زاذان (المتوفی ۱۳۱ھ) ہشام بن عروہ بن زبیر (المتوفی ۱۴۶ھ) یونس بن عبید (المتوفی ۱۳۹ھ) موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ) خالد الحذاء (المتوفی ۱۴۲ھ) سلیمان التیمی (المتوفی ۱۴۳ھ) حمید الطویل (المتوفی ۱۴۲ھ) ابواسحاق الشیبانی (المتوفی ۱۳۸ھ) الاعمش (المتوفی ۱۴۸ھ) ابومسعود الحریری (المتوفی ۱۴۴ھ) اور ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) کا تذکرہ کیا ہے۔

فقہ کے اندر مختلف شہروں میں فقہائے کرام نے جو مختلف فقہی مکاتب قایم کیے تھے، وہ ان کے تلامذہ کی مساعیٔ جمیلہ سے اس عہد میں بھی ترقی کرتے رہے، جیسے مکہ معظمہ میں عبداللہ بن ابی ملیکہ (المتوفی ۱۱۹ھ) عکرمہ مولی ابن عباس (المتوفی ۱۱۵ھ) عطا ابن ابی رباح (المتوفی ۱۱۵ھ) عمرو بن دینار (المتوفی ۱۲۶ھ) اور عبداللہ بن ابی نجیح (المتوفی ۱۳۲ھ) مدینہ منورہ میں ابن شہاب الزہری (المتوفی ۱۲۴ھ) امام باقر (المتوفی ۱۱۴ھ) عبدالرحمٰن بن القاسم بن محمد بن ابی بکر (المتوفی ۱۲۶ھ) ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۳۶ھ) (جو ربیعۃ الرائے کے نام سے مشہور ہیں) اور ابوالزناد (المتوفی ۱۳۰ھ) یمن میں طاؤس

بن کیسان (المتوفی ۱۰۶ھ) اور وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) شام میں مکحول (المتوفی ۱۱۸ھ) سلیمان بن موسیٰ الاشدق (المتوفی ۱۱۹ھ) یحییٰ بن یحییٰ الغسانی (المتوفی ۱۳۵ھ) اور میمون بن مہران (المتوفی ۱۱۷ھ) کوفہ میں حکم بن عینیہ (المتوفی ۱۱۵ھ) حبیب بن ابی ثابت (المتوفی ۱۱۷ھ) اور حماد بن ابی سلیمان (المتوفی ۱۱۹ھ) اور بصرہ میں حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) محمد بن سیرین المتوفی ۱۱۰ھ) ابوالعالیہ (المتوفی ۱۰۶ھ) قتادہ بن دعامہ (المتوفی ۱۱۷ھ) ایوب السختانی (المتوفی ۱۳۱ھ) یونس بن عبید (المتوفی ۱۳۹ھ)

ان ناموں کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ علماء کرام بیک وقت تفسیر، حدیث اور فقہ میں دستگاہ عالی رکھتے تھے۔

ابھی ائمہ اربعہ کا زمانہ نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ کیونکہ مروجہ مذاہب فقہیہ کے اماموں میں سب سے مقدم امام ابوحنیفہؒ تھے۔ زیرِ نظر عہد کا ثلث آخر ان کے علمی تبحر اور فقہی شہرت کا زمانہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ وقت کے عام دستور کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ اکثر صحابہ کرام کی بھی زیارت کی اور اُن میں سے بعض سے احادیثِ رسولؐ بھی سماع فرمائیں۔ اس لیے وہ تابعین (متاخرین) میں محسوب ہوتے ہیں۔ شروع میں علم کلام کے اندر وہ دست گاہ عالی حاصل کی کہ اس فن میں سرآمد فضلاے روزگار قرار پائے۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا قول ہے:

"الناس عیال علی ابی حنیفہ فی الکلام۔"

لیکن بعد میں فقہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس علم کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ ہُوا یہ کہ کوفہ کی مسجد کے اندر مختلف علماے عالی مرتبت کے حلقے قایم ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک حلقۂ درس امام ابوحنیفہ کا تھا، جس میں بکثرت طالبانِ علم شریک ہوتے تھے۔ ایک دن ایک بدوی عورت کوئی شرعی مسئلہ پُوچھنے آئی۔ امام صاحب کے حلقۂ تلامذہ کی کثرت سے متاثر ہو کر سیدھی امام صاحب کے پاس پہنچی اور جا کر وُہ مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ مگر وہ صاحب (امام حماد بن ابی سلیمان) جو سامنے بیٹھے ہیں، اُن سے پُوچھ لو۔ عورت بدویہ نے بڑی ترش روئی سے کہا: کیسے عالم ہو، اتنی بڑی تعداد شاگردوں کی لیے بیٹھے ہو مگر ایک عورت کو مسئلہ نہیں بتا سکتے۔ بدوی عورت کے اس چبھتے ہُوئے طعنہ نے امام صاحب کی زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ حلقۂ درس کو برخاست کیا اور اٹھ کر امام حماد بن ابی سلیمان کے پاس پہنچے اور ان سے جا کر فقہ پڑھنے کی درخواست کی پہلے تو انھیں یقین نہ آیا مگر جب امام صاحب کو بضد دیکھا تو پھر انھیں اپنا شاگرد کر لیا اور فرمایا: روزانہ صرف پانچ مسئلے حل کیا کرو۔ ظاہر ہے امام صاحب جیسا عبقری روزگار جس کے ذہن میں مدت العمر کے علم کلام کی ممارست نے غیر معمولی حدت اور درّاکی پیدا کر دی تھی، جب ایک دن میں صرف پانچ مسئلے سیکھتا ہوگا، تو ان میں کس درجہ بصیرت و حذاقت بہم پہنچاتا ہوگا۔ اس بصیرت و حذاقت نے ان کے فقہی نظام کو یہ دیرپائی اور قبول عام بخشا کہ آج بھی وہ سوادِ اعظم کا معمول بہ ہے۔

امام صاحب نے بے شمار شیوخ سے علم حاصل کیا اور بے شمار شاگردوں نے ان سے کسبِ فیض کیا، جن میں سے دو بزرگ خصوصیت سے مشہور ہیں، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (جو دونوں "صاحبین" کہلاتے ہیں) مگر ان کی مساعی علمیہ اور اس طرح امام ابوحنیفہؒ کے بعد کی فقہی سرگرمیاں عباسی عہد کے پہلے دور کے تحت میں آتی ہیں، جو ہمارے موضوع سے باہر ہے۔

ادبِ نبویؐ

سیّد شمیم احمد

دوسری اقوام نے اپنے بزرگوں کے ساتھ اپنی محبت میں اتنا غلو دکھایا کہ ان کے بُت تراش کر پوجنے لگے اور انہیں خدا کا شریک بنا ڈالا۔ لیکن اسلام میں بت پرستی تو کجا بُت تراشی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر بنانے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لیے مسلمانوں نے شعر و ادب میں عشقِ رسولؐ کا اظہار کیا مگر اس میں بھی احتیاط کا دامن نہ چھوڑا اور رسولؐ کی مدح بھی اس سے زیادہ نہ کر سکے: ؏

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن رسولؐ کی شان میں کسی قسم کی بے ادبی اور گستاخی کی بھی جرأت نہ ہو سکی اور ہمیشہ یہ شعر سامنے رہا کہ: ؎

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

حضرت نظام الدین اولیاء جیسے بزرگ فرماتے ہیں: ؎

بنہ بہ چندیں ادب طرازی سرِ ارادت بخاکِ آں کو
صلواۃِ وافر بروحِ پاکِ جنابِ خیر الانام برخواں

اسی عشق و ادب کے سبب سلام اور نعت جیسے اصناف ادب میں داخل ہوتے۔ سلام تو خیر دوسرے بزرگوں کی شان میں بھی کہے جاتے ہیں، مگر نعت صرف رسولِ خدا کے لیے مخصوص ہے۔ نعت میں رسول کریمؐ کے ذاتی اوصاف، نسلی برتری، دوسرے پیغمبروں کے مقابلہ میں فضیلت، رسولؐ کے آبا و اجداد اور آل و اصحاب کی مدح کا ذکر ہوتا ہے۔ نیز اپنے گناہوں کا احساس اور اشک ندامت، رسولؐ سے شفاعت طلبی، اپنے غموں کے مداوا کے لیے رسولؐ سے فریاد، مدینہ جا کر رسولؐ کے روضہ پاک کی زیارت کی تمنا، خواب میں دیدار کی آرزو، مدینہ میں دفن ہونے کی خواہش جیسے مضامین بھی نعت کا موضوع ہیں۔ پہلے تو قصے کہانیوں اور دوسرے موضوع کی تصانیف میں عموماً یہ قاعدہ تھا کہ حمد اور نعت ضروری ہوتی تھیں۔ رسولؐ کے ساتھ اظہارِ عشق میں سب سے اچھوتا خیال شاہ علی حبیب نصر پھلواری نے پیش کیا ہے۔ عام طور سے شعراء رسولؐ سے یہی درخواست کرتے رہے ہیں کہ انہیں مدینہ بلا لیا جاتا۔ لیکن حضرت نصرؔ فرماتے ہیں: ؎

صبا بگوشش اگر توانی ز نصرؔ مسکیں بگو پیامے
کہ عمر باشد در انتظارم بیا محمدؐ بیا محمدؐ

ایسی مثالیں دوسروں کے ہاں کم ملتی ہیں۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے رسولؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت کرتے وقت توازن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ سخت احتیاط و توازن کے باوجود ادبِ نبویؐ کا اتنا بڑا ذخیرہ دنیا میں جمع ہو چکا ہے کہ شاید کسی اور

ایسے موضوع پر نہ ہو۔ دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کا ایک بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بھی ملے گا۔

تنوع کے لحاظ سے بھی ادب نبویؐ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ نظم و نثر کے جملہ اصناف میں اس پر قلم اٹھایا گیا ہے اور ہر زبان میں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیزیں ظہور میں آئیں جنھیں عربی ادب کا زریں سرمایہ خیال کیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ادب نبویؐ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق خود رسول اللہؐ سے ہے، جیسے احادیث، مکاتیب اور خطبات وغیرہ۔ دُوسرا وہ جو رسول اللہ کی سیرت، تعلیمات اور کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احکام اور ہدایات کو آپؐ کے دورِ حیات ہی میں صحابہ نے لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ بعض صحابہ کے پاس احادیث کا اچھا خاصہ مجموعہ موجود تھا مگر یہ مجموعے مختصر تھے اور ان میں عموماً وہی حدیثیں تھیں جو انھوں نے خود سُنی تھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، لوگوں میں احادیث جمع کرنے کا شوق بڑھا اور ان کی اشاعت کی ضرورت بھی زیادہ محسوس ہونے لگی۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں لاکھوں حدیثیں جمع ہو گئیں، ان میں بہت سی غلط اور مشتبہ حدیثیں تھیں، جنھیں علماء و محققین نے روایت و درایت کے معیار پر جانچنے کے بعد الگ الگ کیا۔ حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب ہوتے۔ جن میں حضرت امام مالک کی مؤطا، مسند امام احمد بن حنبل، بخاری، مسلم، ابن ماجہ، ابی داؤد، نسائی، ترمذی، مشکوٰۃ اور مشارق الانوار وغیرہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ احادیث عربی ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ یہ طے شدہ ہے کہ عربی ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ خود قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد حدیثوں کا درجہ ہے۔ یہ بھی رسول اللہؐ کا عظیم معجزہ ہے کہ اُمّی ہونے کے باوجود زبان سے ایسے فصیح و بلیغ الفاظ نکالے، بقول سعدیؒ:

> یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
>
> کتب خانۂ چند ملت بشست

مکاتیب بدر اور اُحد کی جنگوں کے بعد ہی اہلِ مکہ کو احساس ہو گیا تھا کہ مسلمان عرب کی بڑی طاقت بن چکے ہیں اور وہ اسلام کے داعی ہیں۔ اس لیے قریش نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا۔ جو تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ ہُوا کہ انھیں قبائلِ عرب میں عام تبلیغ کا موقع مل گیا۔ حضرت سرورِ کائناتؐ نے پڑوسی سلاطین اور عرب سرداروں کے نام مکاتیب بھی بھیجے، خصوصاً کسریٰ ایران، خسرو پرویز، قیصرِ روم، ہرقل اعظم، شاہ مقوقس، مصر اور نجاشی، شاہِ حبش کے نام جو خطوط بھیجے گئے تھے۔ وہ فصاحت و بلاغت کے بے مثال نمونہ ہیں۔

خطبات اللہ نے ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطابت کی جملہ خصوصیات سے نوازا تھا۔ صحابہ کی مجلس ہو یا مخالفین کا مجمع، حج کا اجتماع یا عکاظ کا بازار، آپؐ جہاں بھی بولنے کھڑے ہوتے، لوگ مسحور ہو جاتے۔ اسی وجہ سے ابُوجہل نے آپؐ کو جادوگر مشہور کر رکھا تھا اور وُہ یہی کوشش کرتا کہ آپ کسی کے سامنے تقریر نہ کرنے پائیں۔ بعثت کے بعد جب آپؐ نے قریش کو جمع کر کے پہلی بار اسلام کی دعوت دی اور اس موقع پر جو تقریر فرمائی، تو کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ دریائے حیرت میں چلے گئے۔ اس کے بعد تو آپ کا معمول ہو گیا کہ ہر سال بازارِ عکاظ، میدانِ عرفات اور دُوسرے موقعوں پر لوگوں کو خطاب کرتے۔ ارفع و جامع خطبہ وُہ ہے جو سنہ ۱ھ میں آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ مسلمانوں کے مجمع کے سامنے دیا تھا۔ یہ خطبہ اپنی معنویت و ادب کے اعتبار سے بھی

افصح مانا گیا ہے ۔ فنِ خطابت کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ غرض یہ کہ ان احادیث و مکاتیب اور خطبات کی حیثیت محض دینی نہیں ۔ یہ عربی زبان و ادب کا شاہکار ہیں ۔ بہترین اور معیاری ادب کی کون سی خوبی ہے ، جو کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں ۔

رسولؐ اور عربی ادب رسولؐ کی زندگی، تعلیم ، کارناموں پر ہر دور میں تصنیف کا سلسلہ جاری رہا ۔ عربی ، فارسی ، اردو ، انگریزی ، فرانسیسی ، جرمنی ، روسی ، ہندی ، بنگلہ ، گجراتی اور دوسری زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ۔ آپ کی بعثت عرب میں ہوئی تھی ۔ آپؐ کی زبان عربی تھی ۔ اسی زبان میں آپؐ نے باتیں بھی کیں ، اسی زبان میں قرآن بھی نازل ہوا ۔ اسی زبان میں آپ نے خطبے بھی دیے ۔ سلاطین کو دعوتِ اسلام پیش کی ، لہذا سب سے پہلے عربی ادب متاثر ہوا ۔ عربی میں ادب نبویؐ کا سب سے بڑا ذخیرہ خود احادیث ہی ہیں ۔ اس کے بعد تاریخ و سیر کی کتابوں کا درجہ ہے ۔ طبری ، واقدی ، مسعودی ، بلاذری ، ابن خلکان ، ابن سعد ، ابن کثیر ، ابن اثیر ، ابن خلدون ، علامہ جلال الدین سیوطی اور دوسرے عرب مورخین نے اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں تالیف کیں یہ لوگ عربی زبان و ادب کے ممتاز علماء و مفکر تھے ۔ ان کی تصانیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے بھری پڑی ہیں ۔ دوسری زبانوں میں بھی ان کی تاریخوں کا ترجمہ کیا گیا اور انھیں سامنے رکھ کر نئی کتابیں بھی لکھی گئیں ۔ تاریخ کے علاوہ خاص سیرت پر بھی بہت سی کتابیں الگ لکھی گئیں ۔ ان میں سیرت ابن ہشام کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس کا ترجمہ انگریزی اور اردو میں بھی ہو چکا ہے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے لیے سیرت ابن ہشام ایک نمونہ ثابت ہوئی ۔ اس کے بعد "شمائل ترمذی" کا درجہ آتا ہے ۔ امام ترمذی نے حضورؐ مقبول کے عادات و اطوار ، بول چال ، لباس ، وضع قطع ، رہن سہن غرض کہ جملہ خصوصیات زندگی کو قلمبند کیا اور ہر پہلو پر تفصیل سے روشنی بھی ڈالی ۔

آپ کی زندگی ہی میں حضرت زید بن ثابت نے مدح میں اشعار کہے تھے اور حضرت زید عہدِ نبویؐ کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے تھے خود رسولِ اکرمؐ کو آپ کا کلام پسند تھا ۔ عہدِ صحابہ میں فرزدق عاشقِ رسولؐ مانے گئے ۔ انہوں نے اپنی شاعری کو رسول اور اہلبیت کی مدح کیلئے وقف کر دیا تھا ۔ عباسیوں کے عہد میں متنبی نعت گو شعراء میں سب سے ممتاز تھے ۔

قصیدۂ بردہ عربی کا یہ قصیدہ سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قصیدے کے مصنف امام بوصیری پر فالج کا حملہ ہوا تھا ، اپنے دور کے تمام مشاہیر اطبا سے علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا ۔ زندگی اجیرن بن گئی ۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر بارگاہِ رسالت میں رجوع ہوئے اور یہ قصیدہ کہا ۔ یہ قصیدہ اور دعائیں مقبول ہوئیں اور وہ خود بخود صحت یاب ہونے لگے اور ایسے صحت یاب ہوئے کہ بیماری کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔ اس قصیدہ میں حضورؐ کی مدح اور ان پر درود و سلام کے ساتھ عشق و عقیدت اور ادب و احترام کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے ۔ اپنے مصائب کا ذکر اور صحت یابی کی دعا بہت قرینے سے کی گئی ہے ۔ درد و اثر اور جذبات سے پورا قصیدہ مملو ہے ۔ یہ قصیدہ عربی شاعری کا بھی ایک شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ قصیدہ دس فصلوں میں ہے ، جن کی ترتیب اس طرح کی گئی ہے :

فصل اوّل : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ۔
فصل دوم : اپنے کو خواہشاتِ نفسانی سے باز رکھنے کی آرزو ۔
فصل سوم : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ۔
فصل چہارم : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ۔

فصل پنجم: رسول اللہ کی دعوت۔ فصل ششم: قرآن پاک کا شرف و بزرگی۔
فصل ہفتم: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج۔ فصل ہشتم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد۔
فصل نہم: اللہ تعالیٰ سے بخشش طلبی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی آرزو۔
فصل دہم: مناجات اور عرض مدعا۔

حضرت امام بوصیری کے ساتھ اس قصیدہ کی برکت سے جو معجزہ پیش آیا اس کی وجہ سے یہ قصیدہ بہت مقدس اور متبرک سمجھا گیا۔ اقبال نے بھی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس کا ذکر کیا ہے:

کار ایں بیمار نتواں برد پیش — من چو طفلاں نالم از دارو ئے خویش
تلخی او را فریبم از شکر — خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر
چوں بصیری از تو می خواہم کشود — تا بمن باز آید آں روزے کہ بود
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است
در خطا بخشی چو مہر مادر است

سعدی فارسی شعراء میں خواجہ فرید الدین عطار، حکیم سنائی، شمس تبریزی، حضرت سعدی، مولانا جلال الدین رومی، نظامی گنجوی، فخر الدین عراقی اور حضرت امیر خسرو صوفی منش اور عاشقِ رسولؐ گزرے ہیں۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ نعت، مناجات اور قصائد رسول پر مشتمل ہے۔ حضرت سعدی کی تینوں شہرہ آفاق کتابوں گلستان، بوستان اور کریما میں رسولؐ سے محبت وعقیدت کا والہانہ ذکر ملتا ہے۔ گلستان حضرت سعدی کا نثری مجموعہ ہے۔ اس میں نعت کا حصہ بھی کافی طویل ہے۔ بوستان میں نعتیہ حصہ اور بھی زور دار ہے۔ حضرت سعدی کے نعتیہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں عقیدت کے ساتھ شاعرانہ معیار بھی کافی بلند ہے اور بہت متنوع ہے۔ کریما ایک مختصر تصنیف ہے مگر اس میں بھی نسب کا ذکر بیان ہے۔ لیکن ان کا یہ شعر سب پر فوقیت رکھتا ہے:

بلغ العلیٰ بکمالہٖ — کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ — صلوا علیہ و آلہٖ

نعتیہ کلام میں اس سے بہتر نمونہ کہیں نہیں ملتا۔ حضرت سعدی نے اس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا ہے جو خود وہ اور دوسرے شعراء کافی زور دکھانے کے بعد طویل نظموں میں بھی نہ کہہ سکتے تھے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی صحیح مثال صرف اس شعر پر صادق آتی ہے۔

امیر خسرو کا نعتیہ کلام حضرت امیر خسرو کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت سے بھی کس کو انکار ہو سکتا ہے سلاطین کے دربار میں رہنے کے باوجود وہ صوفی صفت تھے۔ سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کے جاں نثار مرید تھے۔ اوّل تو طبعاً وہ اللہ والے تھے۔ پھر پیر کی نظر کیمیا اثر نے دل میں اور بھی سوز و گداز پیدا کر دیا۔ خسرو کی غزلیں، حمد، نعت اور صوفیانہ کلام سب اسی پر دال ہیں۔ ان میں عجیب کیف اور تاثر ہے۔

نعت قدسی سعدی اور خسرو کے بعد جامی اور قدسی کی نعتیں بے مثال ہیں۔ خاص کر قدسی کی نعت تو ہر عاشقِ رسولؐ کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ میلاد و سیرت کی محفلوں میں عام طور سے پڑھی جاتی ہے:

مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی — دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم — اللہ اللہ! چہ جمالست بدیں بوالعجبی

چشمِ رحمت بکشا سوے من انداز نظر — اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی

نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را — بہتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات — رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم — زاں کہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

عاصیانیم زمانیکہ اعمال مپرس — سوے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

سیّدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوے تو قدسی پئے درماں طلبی

اُردو میں سیرت نگاری اردو ادب میں بھی حضور انورؐ پر کافی سرمایہ موجود ہے۔ نظم و نثر دونوں ہی اس سے مالا مال ہیں۔ تاریخ وسیرت کی کتابوں کے اردو ترجمے بھی بہت ہوئے ہیں اور تصنیف و تالیف و ترجمہ کا یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ ترجمے زیادہ تر عربی اور کچھ فارسی اور انگریزی کتابوں سے کیے گئے۔ تراجم کے علاوہ اردو میں تاریخ و سیرت پہ خود بھی تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ عموماً یہ کتابیں عربی تاریخوں کو سامنے رکھ کر ہی مرتب کی گئی ہیں۔ البتہ آزاد بلگرامی، علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی یا چند دوسرے اہل علم نے خود بھی فکر و تحقیق سے کام لیا ہے۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف میں ادبی شان بھی ہے۔ سیرت کی کتابوں میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی "سیرت النبی"، سید سلیمان ندوی کے "خطبات مدراس"، سرسید احمد خاں کے "خطبات احمدیہ"، مولانا عبدالرؤف داناپوری کی "اصح السیر"، مرزا بشیر الدین محمود کی "سیرت خاتم النبیین"، مولانا محمد علی لاہوری کی "سیرت خیر البشر"، قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" (تین جلدوں میں)، مولوی فضل الدین و آعظ کی سوانح عمری "پیغمبر اعظم"، مرزا حیرت دہلوی کی "سیرت محمدیہ"، مولانا عبدالماجد دریابادی کی "مردوں کی مسیحائی"، خواجہ حسن نظامی کا "میلاد نامہ"، عبدالحلیم شرر کی "خاتم المرسلین"، سیماب اکبر آبادی کی "سیرت النبوی"، نعیم صدیقی کی "محسن انسانیت" وغیرہ سیرت کے موضوع پر مشہور اور قابل ذکر کتابیں ہیں۔ عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی کارکنوں سے مناظرہ بازی کے دور میں غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے بھی سیرت کے موضوع پر لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ ادھر کئی عقیدت مند ہندوؤں نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان تمام تصانیف میں "خطبات احمدیہ"، "اصح السیر"، "سیرت النبی" "خطبات مدراس" اور "محسن انسانیت" اپنی تکنیک اور مقصدیت کے اعتبار سے خاص حیثیت رکھتی ہیں۔

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۰ء میں "خطبات احمدیہ" مکمل کی۔ یہ کتاب سر ولیم میور کی ہفوات کے جواب میں لکھی گئی تھی ـــ

سرسید نے خطبات احمدیہ کے سلسلہ میں اسلام اور عیسائی مذہب کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور کافی تحقیق و کاوش کے بعد اسے مکمل کیا۔ سرسید کا اندازِ بیان صالحانہ اور اسلام اور عیسائیت کو قریب تر لانے والا ہے۔ سیرت کی کتابوں میں علامہ شبلی کی "سیرت النبی" سب سے ضخیم اور جامع ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری جلدیں خود علامہ نے مکمل کیں، باقی چار جلدیں مولانا سید سلیمان ندوی نے مرتب کیں۔ شبلی نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت و تحقیق اور جاں سوزی سے کام لیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی تالیف میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ تھا۔ اس لیے خود کہا بھی: ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

جہاں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات کا تعلق ہے، وہ پہلی اور دوسری جلدوں میں مکمل ہیں۔ باقی چار جلدوں میں سیرتِ رسولؐ کے دیگر پہلوؤں پر فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ سرسید احمد خاں اور شبلی مغربی اہلِ علم حضرات کے متعین کردہ حدود و اخلاق پر رسول اللہؐ کی سیرت کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ یہ طریقہ بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا۔ مولانا عبدالرؤف داناپوری نے اس استدلال کی سختی سے مخالفت کی اور "اصح السیر" لکھی۔ ضخامت کے لحاظ سے یہ شبلی کی "سیرت النبی" کا نصف ہے لیکن خاص سیرت کے موضوع پر اس میں مواد زیادہ ہے۔ اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ تحقیق و کاوش، واقعات کی صحت اور مختلف روایات کی تصدیق یا تردید تحقیقِ حق کی خاطر کی گئی۔ نہ کسی کے اعتراض کا "جواب" دینے یا مغربی علماء و مفکرین کے مقرر کردہ "معیار" پر سیرتِ رسول کو "مطابق" کرنے کی غرض سے، جیسا کہ بعض معترضین کے خیال میں سرسید اور شبلی کا اسلوب تھا۔ "خطباتِ مدراس" سید سلیمان ندوی کے آٹھ لیکچروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے اکتوبر اور نومبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں دیئے تھے۔ اس میں حضورؐ کی زندگی، سیرت اور تعلیم و اخلاق کے جملہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں مولانا ندوی نے اپنی علمی و ادبی صلاحیت اور تاریخی معلومات کا پورا نمونہ پیش کر دیا ہے جو کچھ "سیرت النبیؐ" کی چھ جلدوں میں محیط ہے، اسے ان بارہ لیکچروں میں سمو دیا گیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ THE LIVING PROPHET کے نام سے ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے نیوز ایڈیٹر جناب سعید الحق نے خود مولانا ندوی کی ہدایت اور مشورہ کے مطابق کیا تھا۔ ترجمہ عالمانہ انداز میں ہے۔ ڈھاکہ سے ۱۹۶۰ء میں ترجمہ شایع بھی ہو چکا ہے۔ نعیم صدیقی نے "محسنِ انسانیت" لکھ کر سیرت کے موضوع پر نئے ڈھنگ سے قلم اٹھایا ہے اور انھوں نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ توقع ہے کہ نئی نسل کے سیرت نگاروں کے لیے یہ کتاب نمونہ کا کام دے گی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے "جویائے حق" لکھ کر ناول کے طرز پر سیرت نگاری کا تجربہ کیا، جو پہلا ہونے کے باوجود سب سے کامیاب سمجھا گیا۔ اس میں حضرت سلمان فارسیؓ کی زبانی سارے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس قسم کا دوسرا تجربہ صادق حسین صادق سردھنوی نے "آفتابِ علم" لکھ کر کیا۔ "جویائے حق" اور "آفتابِ علم" میں زبان و بیان اور فنی اعتبار سے وہی فرق ہے، جو شرر اور صادق سردھنوی میں ایک ادیب اور ناول نگار کی حیثیت سے ہے۔ ناول میں سیرت کو موضوع بنانے کا تیسرا تجربہ مولانا ماہر القادری نے "دُرِّ یتیم" لکھ کر پیش کیا۔

کتبِ مولود مسلم معاشرہ میں میلاد کی محفلیں منعقد کرنے کا سلسلہ بھی زمانۂ دراز سے قایم ہے۔ اسلامی تہذیب و

ثقافت کے قدیم مراکز لاہور، ملتان، اجمیر، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، بہار شریف اور جدید صنعتی شہروں بمبئی، کلکتہ اور کان پور وغیرہ میں میلاد کا رواج خوب ہُوا۔ میلاد کے موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ تکنیک کے لحاظ سے میلاد کی کتابیں تاریخ و سیرت کی کتابوں سے بالکل جدا ہوتی ہیں۔ اس میں اصل مقصد تاثر اور دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے میلاد کی کتابوں میں واقعات و روایات کی صحت کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ میلاد نویس کی حیثیت سے غلام امام شہیدؔ نے سب سے زیادہ شہرت پائی۔ وہ لکھنؤ کے ممتاز شعرا میں تھے۔ عشقِ رسولؐ میں سرشار تھے۔ واقعات کے لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بھی صحت کا پُورا خیال نہ کیا ہو مگر فنی اعتبار سے غلام امام شہید کا میلاد سب سے زیادہ معیاری ہے اور علمی حلقوں میں بھی اسے پسند کیا گیا۔ دُوسری معیاری کتب مولود میں "مولود طپش" اور "میلاد اکبر" کا نام بہت مشہور ہے۔

بعض معروف اور ذمہ دار شخصیتوں نے بھی اس طرف قدم اٹھایا، جیسے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے "ذکر النبی" اور علامہ راشد الخیری نے "آمنہ کا لال" لکھی۔ اس کے بعد علامہ شفیق عماد پوری نے "حدیقۂ آخرت" اور "توشۂ رحمت" لکھی، جو علی الترتیب ۱۳۲۸ھ اور ۱۳۵۹ھ میں گیا (بہار) سے شایع ہوئیں۔

عربی میں مولود پر کافی کتابیں لکھی گئیں۔ علامہ جعفر بن حسین برزنجی کی "عقد جوہر فی مولد خیر البشر" کی مکہ اور مدینہ میں بھی بہت شہرت ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۲۷۹ھ میں "مولود برزنجی" کے نام سے مولانا عبدالغنی نے کیا تھا۔ ملک سراج الدین اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور نے شایع کیا۔ ترجمہ میں یہ اہتمام رکھا گیا ہے کہ ہر عربی سطر کے نیچے اردو ترجمہ اور حاشیہ پر اردو میں تشریح ہے۔ اردو میں میلاد کی جو کتابیں ہیں، وہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ عربی اور فارسی میں بھی اس انداز کی تصانیف نہیں ملتیں۔ اس سلسلہ میں اردو کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

اُردو شعرا اور مدحِ رسولؐ

اردو شعراء نے بھی حضرت انورؐ کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں خوب زور دکھایا ہے۔ نعت، قصائد، مناجات، سلام، قطعات اور رُباعیات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوچکا ہے۔ اُردو کی قدیم ترین نعتوں میں شاہ وجہ الحق ابدالی کی نعت بہت موثر اور اس وقت کے لحاظ سے نئے طرز کی ہے۔ شاہ ابدالی پھلواری شریف کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۲۴ھ میں پیدا ہُوئے اور ۱۲۰۰ھ میں وصال فرمایا۔ نعت ملاحظہ ہو:

دو جگ کے سردار محمدؐ　　نبیوں کے سالار محمدؐ
امت کے غمخوار محمدؐ　　سب کے پالنہار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم
میں ہُوں بہت ناچار محمدؐ　　ناؤ پھنسی منجدھار محمدؐ
کوئی نہ کھیونہار محمدؐ　　تم ہی اتارو پار محمدؐ
صلی اللہ علیہ و سلم
تم پہ جان نثار محمدؐ　　عشق تمھارا یار محمدؐ

مشکل ہے یہ کارِ محمدؐ تم ہی نباہنہار محمدؐ
صلی اللہ علیہ وسلم
دلبر د ہم دلدار محمدؐ جی چاہے ہے دیدار محمدؐ
ایک نظر اِک بار محمدؐ ہو جائے سب کار محمدؐ
صلی اللہ علیہ وسلم

اردو شعراء میں غلام امام شہید، شہیدی، نیاز بریلوی، بیدم وارثی، امیر مینائی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، حالی، شفق عماد پوری، مولانا ظفر علی خاں، اقبال، محسن کاکوروی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، امجد حیدر آبادی، بہزاد لکھنوی اور زائر حرم حمید صدیقی کے ہاں اس قسم کی چیزیں بہت بلند پایہ اور ادبی حیثیت سے بھی ارفع نظر آتی ہیں۔

حالی و اقبال

اُردو شعراء میں حالی اور اقبال نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا، وُہ بہت بلند پایہ، پُرتاثیر اور افصح ہے۔ اس میں پہل حالی سے ہُوئی۔ مسدس کا وُہ حصّہ جس میں حضورؐ کا ذکر ہے، سب سے عمدہ ہے اور وہی مسدس کی روح بھی ہے۔ حالی نے مختصر طور سے ولادت، بعثت، تبلیغ و تعلیم اور وفات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ حالی کے کلام میں شعرائے عرب کے کلام کی سی روانی اور زورِ بیان ہے۔ مسدس کے علاوہ حالی کی وُہ نعت بھی جو یُوں شروع ہوتی ہے :

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

بہت مقبول ہُوئی۔ حالی نے قدیم طرز کے نعت و سلام اور قصائد سے ہٹ کر نئے انداز سے رسولؐ کا ذکر کیا۔ اُردو شاعری میں یہ نئی چیز تھی۔

اقبال نے نعتیہ شاعری کو تکنیک کے اعتبار سے بہت وسیع کر دیا۔ اقبال کے ہاں جو تنوّع ہے وہ حالی کے ہاں بھی نہیں۔ اقبال امام بوصیری، سعدی اور حالی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال کو رسولؐ سے عشق تھا۔ وہ رسولؐ کی شان میں ذرا سی شوخی بھی روا رکھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اقبال خدا کے حضور میں تو بہت شوخ ہو گئے "گستاخ" بھی ہو گئے۔ مگر جہاں رسولؐ کا ذکر آتا ہے ادب و احترام سے ذرّہ بھر آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اقبال نے پرانی روش میں "کملی والے" جیسی نعتیں بھی کہیں اور جدید اسلوب میں زورِ بیان دکھایا۔ اس باب میں ان کا مشہور تصور یہ تھا ؎

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بُولہبی ست

لیکن قصیدہ بردہ یا سعدی، خسرو اور قدسی کے کلام کے نمونے اُردو میں کہیں نہیں ملتے۔ اس وقت ابو الاثر حفیظ جالندھری کے سلام کا چرچا ہے۔ سیرت اور میلاد کی محفلوں میں آج کل یہ سلام عام طور سے پڑھا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ولولۂ کیف عشقِ محمدؐ اور سرورِ اظہار کا بڑا ہی دلکش نمونہ ہے :

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر جو سچائی کی خاطر دُکھ اٹھاتا تھا
سلام اس پر جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر جو اُمت کے لیے راتوں کو روتا تھا
سلام اس پر جو فرشِ خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا
سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت اوجِ دارائی

سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالد وحیدر کے افسانے

سلام کے سلسلے میں سب سے زیادہ مقبول بیدل کا سلام ہے، جو" مولود سعدی" میں شامل ہے اور مسدس ہے:

یا نبی سلام علیک — یا حبیب سلام علیک
یا رسول سلام علیک — صلواۃ اللہ علیک

سلام، نعت اور قصائد کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بعض واقعات اور معجزات پر بھی نظمیں اور مثنویاں لکھی گئی ہیں جیسے کہ حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام، قصہ آلِ جابر، واقعہ معراج، بیان نورِ محمدی، وفات نامہ وغیرہ۔ یوں حضرت حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" منظوم سیرتِ رسولؐ ہی ہے اور ایک عظیم کارنامہ جس طرح نثر میں علامہ شبلی کی "سیرت النبی" کا اردو میں جواب نہیں، اسی طرح نظم میں "شاہنامہ اسلام" بھی اپنی مثال آپ ہے۔

بہر حال یہ ایک مختصر جائزہ تھا ادبِ نبویؐ کا، جو یہاں پیش کیا گیا۔ سیرت وحیاتِ نبویؐ پر برابر کام ہو رہا ہے اور اردو بنگلہ میں بالخصوص سیرتِ رسولؐ پر کافی مواد حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ جرائد و رسائل کے رسول نمبروں نے بھی مطالعہ سیرت کو نئے نئے زاویوں سے پیش کیا ہے اور جوں جوں علم وعرفان کی نئی کرنیں پھیلتی جائیں گی حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ جمیل محافلِ عالم میں بڑھتا ہی جائے گا۔ ورفعنا لک ذکرک۔

علومِ عرب

سید محمد عبد الستار گیلانی

ما الفضل إلّا لاھل العلم انھم — علی الھدیٰ لِمَنِ استھدیٰ أدِلّاءُ
وقیمۃ المرء ما قد کان یحسنہٗ — والجاھلون لِاَھْلِ العِلمِ اَعْدَاءُ

یہ امر ساری دنیا پہ اظہر من الشمس و ابین من الامس ہے کہ عرب کی قوم ایک جاہل اور ان پڑھ قوم تھی ، لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ اس کے پاس علم کا کوئی سرچشمہ موجود نہیں تھا بجز علمِ نجوم و علمِ طب کے جن کو اس نے اپنے تجربہ اور استقرا سے حاصل کیا تھا۔

لیکن یہ قوم تیزیٔ طبع ، فصاحت لسانی اور بلند خیالی میں اعلیٰ مرتبہ پہ تھی ۔ انھیں صفات کے باعث فی البدیہہ اشعار کہنا اور بغیر کسی تامل و فکر کے الفاظ کو خلعتِ نظم سے آراستہ و مزین کرنا اس کے نزدیک ایک معمولی سی بات تھی اور بائیں ہاتھ کا کھیل۔ اپنے کلام میں ایسی خوبی ، لطافت ، پاکیزگی اور خوش اسلوبی دکھاتی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد ، کامل فن اور ماہر علم باوجود اپنی انتھک کوششوں ، غایت تامل و تفکر کے اس کے جیسے کلام کا ایک ادنیٰ سا نمونہ پیش کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے اور مجبور و معذور ہو کر اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کرتے کہ :

ما عرفناك حقّ معرفتك ۔

بے شک فی البدیہہ اشعار کہنا ، یہ ایک دشوار امر ہے جس کو وہی شخص خوب سمجھ سکتا ہے جس میں غور و خوض تامل و تردیہ کا اعلیٰ مادہ موجود ہو ۔ وُہ اپنے توسن خیال کو مضمار افکار و میدان اشعار میں جولانی دیتا ہو اور امعانِ نظر و تعمق کے بحرِ عمیق میں برابر غوطہ زن رہتا ہو۔

اہلِ عرب کے مشغلے کی کوئی چیز نہیں تھی ۔ لہٰذا "بیکار مباش کچھ کیا کر" کو مدِ نظر رکھ کر ان لوگوں نے اپنی ہمت والا نہمت کو لغات کے تفنن و تہذیب اور الفاظ کی ترکیب و ترتیب میں مشغول و مصروف رکھا ، حتیٰ کہ ہر ایک شخص نے یہی اپنا طریقۂ عمل بنا لیا اور ہر ایک نے اپنے لیے ایک ایک راہ اختیار کر لی ۔ اس تصرف و مشاغل میں ان کی حذاقت ، جودتِ طبع موافق و مساعد حال ہو کر ان کا ساتھ دیتی اور ان کی فطانت ، زیرکی و ذکاوت ان کی دستگیری و رہنمائی کرتی تھی ۔ بنائے علیہ یہ لوگ ہر ایک حکم کے لیے ایک ایسا قاعدہ کلیہ ، قانون محکم اور ایسی وجہ سدید پیدا کرتے تھے کہ عقل سلیم کو اس کے تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا ۔ یہ باعتبار الفاظ کے منقول اور باعتبار احکام کے معقول ہوا کرتے تھے ۔

ان لوگوں کا ہمیشہ یہی طریقِ عمل اور وتیرہ شغل رہا کیا ۔ یہاں تک کہ جب اسلام کا ظہور ہوا اور اس کی صاف شعاع و

پاکیزہ روشنی سے عرب کے مستفیض و مستنیر ہونے کے علاوہ بہت سے عجم بھی مستفید ہوکر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور عرب و عجم کے باہمی اختلاط و ارتباط اور میل جول کے باعث الفاظ و لغات عربیہ میں فساد کا احتمال ہوا، تو اس کے لیے روابط و ضوابط قوانین و قواعد وغیرہ مرتب کیے گئے تاکہ عربی زبان محفوظ و مصئون رہ سکے۔ چنانچہ مفصلہ ذیل علوم و فنون قایم کیے گئے۔

علمِ متن اللغۃ جس کے ذریعہ اصل وضع کے اعتبار سے الفاظ کی بنا اور اس کی اصلیت معلوم ہوتی ہے۔ اس علم کا واضع شاید احمد یا محمد بن مستنیر ہے جس کا لقب قطرب تھا۔

علم الصرف جس سے حروف کے تغیر و تبدل اور الفاظ متداولہ کے ابنیہ کے ان احکام کی شناخت ہوتی ہے، جن کے باعث مختلف معانی پیدا ہوتے ہیں اس کا واضع غالباً معاذ الہرا ہے۔

علم النحو اس سے اجزائے کلام کی ترکیب، کلمات کے ربط و باہمی تعلق اور الفاظ کی تراکیب معلوم ہوتی ہیں۔ اس امر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ اس علم کا واضع اور جامع کون ہے۔ بعض حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بتاتے ہیں اور بعض ابوالاسود دؤلی کو کسی نے حماد بن سلمہ کی طرف بھی اس کو منسوب کیا ہے۔

مورخین کا اعتماد تو اس پر ہے کہ قواعد نحویہ کا جامع ابوالاسود دؤلی ہے، جس کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پہلی صدی ہجری میں چند قواعد بتا دیے تھے۔ چنانچہ مفردات کی نسبت آپ نے فرمایا:

"الکلام کلہ ثلثٌ۔ اسمٌ وفعلٌ وحرفٌ فالاسم ما انبأ عن المسمی۔ والفعل ما انبأ عن حرکۃ المسمّٰی و الحرفُ ما انبأ عن معنی لیس باسمٍ و لا فعلٍ۔"

پھر مسمی اور اس کی حرکات سے جو کاروبار ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کی شناخت کا یہ طریقہ بتایا:

"کُلُّ فَاعِلٍ مَرْفُوْعٌ وَکُلُّ مَفْعُوْلٍ مَنْصُوْبٌ وَکُلُّ مُضَافٍ اِلَیْہِ مَجْرُوْرٌ۔"

مگر مغنی اللبیب کی شرح الشرح سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد نحویہ کے فراہم کرنے کی بنیاد اور ان کے جمع کرنے کا خیال حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔

اس کی حقیقت یوں منکشف ہوتی ہے کہ ایک شخص آیت "اِنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَ رَسُوْلُہٗ" میں لفظ رسولہٗ کے لام کو کسرہ (زیر) کے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ چونکہ اس طرح پڑھنے سے معنی میں فساد و خرابی ہوتی تھی اس لیے لوگ اس کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لے گئے، جب اس سے وجہ پوچھی گئی، تو اس نے کہا کہ مجھ کو ایک مدنی نے اسی طرح پڑھایا ہے۔ اس پر آپ نے ابوالاسود دؤلی کو بلا کر قواعد نحویہ کے فراہم کرنے و جمع کرنے کا حکم دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہرکیف یہ ایک نہایت کارآمد و مفید علم ہے اور چونکہ یہ علم اعراب و حرکات پر مشتمل ہے، اس لیے یہ ہر وقت دلیل قاری و مصباح ساری ہے۔ اسی پر مبانی و معانی کے اختلافات کا دارو مدار ہے۔ اس وقت ایک چھوٹا سا جملہ یاد آیا جو غالباً ناظرین کرام کی ضیافت طبع و دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہی ہذہ:

"لَا تَاکُلُ السَّمَکَ وَتَشْرَبُ اللَّبَنَ۔"

اس جملہ میں لفظ تشرب کو (مرفوع، منصوب، مجزوم) تین طریقے سے پڑھ سکتے ہیں۔ ہر ایک طریقے سے ایک علٰحدہ معنی و مفہوم پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک سے جدید لذت حاصل ہوتی ہے، بغور ملاحظہ فرمائیں:

اوّل تَشْرَبُ (مرفوع) اس وقت اس کا مرفوع پڑھنا اکل سمك کی نہی اور شرب لبن کی اباحت پر دال ہے یعنی مچھلی نہ کھاؤ اور دودھ پیو۔

دوم تَشْرَبَ (منصوب) اب اس کا نصب (زبر) اکل سمك اور شرب لبن دونوں کی اجتماعی نہی پر دلالت کرتا ہے یعنی مچھلی اور دودھ دونوں کو ملا کر نہ کھاؤ پیو، علٰحدہ علٰحدہ پیو تو مضائقہ نہیں۔

سوم تَشْرَبِ بظاہر "ب" مکسور ہے مگر در اصل یہ جزم و سکون کی حالت میں ہے کیونکہ تشرب کا عطف تاکل پر ہے جو لا کے سبب سے فعل نہی ہے جس کا آخر مجزوم ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا تشرب کے لا کے سبب سے فعل نہی مجزوم ہوگا اور عربی کا یہ قاعدہ ہے کہ ساکن و مجزوم حرف کو کسی دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر پڑھنا ہو تو اس کی کسرہ (زیر) کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ ان الساکن اذا حُرّك حرك بالکسر جب کہ لا تاکل کے لام ساکن کو سَمَكَ کے سین کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی وجہ سے کسرہ (زیر) دیا گیا۔ اس تیسری صورت میں اس کا مجزوم ہونا اکل سمك اور شرب لبن دونوں کی انفرادی نہی کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی نہ تو مچھلی کھاؤ اور نہ دودھ پیو۔ ان دونوں میں سے کسی کی اجازت نہیں۔

واؤ پہلی صورت میں استئناف کے لیے ہوگا، دوسری صورت میں صرف اور تیسری میں عطف کے لیے۔ دیکھیے تبدل اعراب و تغیر حرکات سے معنی و مفہوم میں کس قدر تغیر و فرق ہوگیا۔ اسی طرح ایک اور فقرہ ہے:

"مَا اَحْسَنُ زَیْدٌ۔"

اس فقرہ میں لفظ زیدٌ کو بھی تین طرح (منصوب، مرفوع، مجرور) سے پڑھ سکتے ہیں:

اوّل زیداً (منصوب) اس صورت میں اس کا نصب (زبر) زید کے حُسن کے تعجب کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی کوئی شخص زید کو دیکھ کر تعجب سے کہتا ہے کہ زید کیا ہی اچھا ہے۔ (حُسن سے حُسنِ ظاہری و باطنی دونوں ہو سکتے ہیں)

دوم زیدٌ (مرفوع) اس کا رفع (پیش) اس امر پر دال ہے کہ زید میں مادۂ احسان موجود نہیں۔

سوم زیدٍ (مجرور) اس کا مجرور ہونا زید کے حُسن و خوبی کے استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی سائل کسی سے پوچھتا ہے کہ "مَا اَحْسَنَ فِیْ زَیْدٍ" یعنی زید میں کون سی خوبی اور وصف ہے؟

پہلی صورت میں چونکہ زید کے حُسن پر تعجب ہوتا ہے اس لیے ما تعجبیہ ہوگا اور احسن فعل جامد۔ دوسری صورت سے یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ زید میں مادۂ احسان موجود نہیں۔ اس لیے اس وقت ما نافیہ ہوگا اور احسن فعل متصرف۔ تیسری صورت میں زید کے حسن سے سوال ہوتا ہے اس لیے ما استفہامیہ ہوگا اور احسن اسم تفضیل۔

یہ تو الفاظ کے اعراب و حرکات کے تغیر و تبدل کی حالت اور اس کی خوبی معلوم ہوئی۔ اب ذرا حروف کی طرف آئیے اور دیکھیے کہ ان کی تقدیم و تاخیر اور تقلیب سے کیسے کیسے گل بوٹے نظر آنے اور طبیعت کو کیسے خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لفظ

قلب کو لیجئے۔ اس کے حروف کی تقدیم و تاخیر وغیرہ سے کتنی صورتیں پیدا ہوتی ہیں :

۱ ۔ قلب بمعنی دل
۲ ۔ بلق، کسی چیز کا سیاہ و سفید وغیرہ ہونا
۳ ۔ لقب، وہ نام جو کسی وصف کے سبب سے رکھا گیا ہو۔
۴ ۔ بقل، سبزی و ترکاری
۵ ۔ قبل، پہلے
۶ ۔ لبق، فطانت و زیرکی وغیرہ

اسی طرح :

۱ ۔ لعب بمعنی بازی کھیل
۲ ۔ بعل بمعنی شوہر و زمین بلند
۳ ۔ لبع بمعنی رائیگاں
۴ ۔ عبل بمعنی سینہ وکلائی وغیرہ
۵ ۔ علب بمعنی نشان و جائے درشت
۶ ۔ بلع بمعنی مرد بسیار خوار وغیرہ

ان سب الفاظ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی صورت تبدیل ہوگئی ہے، مگر ان سب کا مادہ اور ان کے حروف ایک ہی ہیں اور سب کے سب بامعنی اور موضوع الفاظ ہیں۔

اگر ان سب امور کو وسعت دی جائے، تو سینکڑوں، ہزاروں مثالیں مختلف صورتوں میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ ہر حرکت کی تبدیلی، ہر اعراب کے تغیر اور ہر حرف کی تقدیم و تاخیر سے علٰحدہ علٰحدہ معانی و مفاہیم پیدا ہوتے ہیں اور ہر ایک سے جدید لذت اور نیا مزہ حاصل ہوتا ہے۔ بنائے علیہ اگر کہا جائے کہ یہ خوبی و خوش اسلوبی، یہ لطافت و پاکیزگی اور جدت طرازی اسی عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہے، کسی غیر زبان میں نہیں، تو شاید بے جا و نادرست نہ ہوگا اور اس وقت دنیا میں جتنی زبانیں ہیں، اگر عربی زبان کا ان سے مقابلہ کیا جائے تو اس کی حقیقت و اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے۔

علم المعانی یعنی وہ علم جس سے ترکیبِ الفاظ میں الفاظ اور مقصود بالذات معنی کی مطابقت معلوم ہوتی ہے۔

علم البیان جس میں ایک معنی کو مختلف طور پر بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ دونوں علموں کا واضع شیخ عبدالقاہر جرجانی ہے۔

علم البدیع اس میں تحسین کلام کے وجوہات سے بحث ہوتی ہے۔ یعنی کلام میں کیوں اور کس وجہ سے خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا واضع عبداللہ بن معتز ہے۔

علم القوافی اس میں اشعار کے قوافی، اوزان و مفاصیل اور اواخر اشعار کے اجزائے ملتزمہ کے احکام وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس کا واضع خلیل بن احمد ہے۔

علم الاشتقاق، علم اصول النحو، علم قرض الشعر، علم انشا نثر، علم الفصاحت و البلاغت، علم المحاضرۃ، علم الخط و مقاطع الحروف وغیرہ بھی انھیں لوگوں کے اختراع و ایجاد کے نتائج ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ لوگ اپنی عربی زبان کو وسعت دیتے اور نئے نئے علوم و فنون ایجاد کرتے چلے گئے۔ چنانچہ اپنی روزمرہ بول چال و گفت گو سے علم المنطق کی بنیاد ڈالی اور سب سے پہلے رئیس حسن بن عبداللہ بن سینا بخاری نے اس کی طرف

سبقت کی۔ یہ وہی شخص ہے جس نے صناعۃ طبیہ کو بدرجۂ کمال پہنچا کر اس کا حق ادا کیا۔ اگرچہ اوّل اوّل شیخ محمد بن زکریا رازی نے اس کی تدوین و تالیف کی بنا قایم کی تھی۔

چونکہ علمِ طب کا تعلق علمِ نجوم، علم طبیعیات اور علمِ موسیقی کے ساتھ تھا، اس لیے محققین حکما اور حاذقین اطبا نے طب کے ساتھ ان علوم ثلثۂ مذکورہ میں سے ہر ایک کو ضروری سمجھ کر علم طبیعیات کو طب کے ساتھ شامل کر لیا، کیونکہ طب و طبیعیات کے مابین احکام مزاجیہ کا علاقہ پایا جاتا ہے۔ علمِ نجوم کو اس لیے تاکہ اجرا علویہ کا اثر ابدان پر ہو سکے۔ علم موسیقی کی اس لیے ضرورت پڑی تاکہ نبض شناسی میں اس سے پوری مدد مل سکے۔ بیطرہ و زردقہ (چوپائے اور پرندوں کا علاج) وغیرہ بھی صناعۃ طبیہ کی شاخیں ہیں۔

علم الفقہ بھی ان کی انتہائے کوشش و غایت جدوجہد کا نتیجہ ہے، جس کے دو حصے قرار دیے گئے ہیں:

۱۔ عبادات: اس میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انسان کے ذمہ خدا کے حقوق کیا کیا ہیں۔

۲۔ معاملات: اس میں اس امر سے بحث ہوتی ہے کہ ایک انسان کے حقوق دوسرے انسان پر کیا کیا ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں:

اوّل یہ کہ زندہ انسان پر زندہ انسان کے کیا کیا حقوق ہیں۔ اس کو اصطلاح میں بیوع کہتے ہیں۔

دوم یہ کہ انسان کے مرنے سے زندوں کے کیا کیا حقوق حاصل ہوتے ہیں، یعنی میت کا جو کچھ مال متروکہ ہے، اس میں سے حقداروں کو کیا کیا حصہ مل سکتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں فرائض کہتے ہیں۔ اس تقسیم کے لحاظ سے علم فقہ کی تین قسمیں ہوئیں:

۱۔ عبادات

۲۔ بیوع

۳۔ فرائض

اب فرائض میں سے ہر ایک شخص کا حصہ معلوم کرنے کے لیے حساب کی اشد ضرورت تھی، جس کا جاننا ہر ایک محقق فقیہ کے لیے ازبس ضروری تھا کیونکہ اسی کے ذریعہ سے وہ نامعلوم حقوق کا استخراج اور معلوم حصوں کی صحیح صحیح تقسیم وغیرہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا **علم الحساب** کی بھی تدوین ہوئی، جس کو ریاضی بھی کہتے ہیں اور علم الهندسہ و علم المساحۃ وغیرہ بھی اس کے فروع سے ہیں۔

علم الالہیات، علم الآداب، علم الانساب، علم التواریخ۔ ان کے علاوہ اور بہتیرے علوم و فنون ہیں۔ مثلاً: کہانت، فراست، ضرب رمل، زجر طائر، قیافہ وغیرہ جن کو انھوں نے بطور لہو و لعب اور ایک مشغلہ کے برابر جاری رکھا۔

ان کی تالیفات و تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کاشتکاری و باغبانی وغیرہ کی طرف بھی تھا۔ چنانچہ فنِ بزدرہ اور فنِ فلاحت کا تذکرہ ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔

ایام قدیمہ کے سلاطین اور ان کے عمائد مقربین یعنی ارکان سلطنت و اعیانِ مملکت وغیرہ علوم و فنون سے کامل واقفیت

اوران پر پوری دستگاہ وقدرت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض بعض مسئلہ میں علما کی اتفاقی غلطیوں سے ان کو متنبہ کیا کرتے تھے۔ اسی سبب سے یہ لوگ علم کی رفعت ومنفعت، علما وفضلا کی شان وشوکت اوران کے حقوق کو کماحقہٗ جانتے اور پہچانتے تھے۔ ہر جگہ حسبِ ضرورت موقع ومحل کے مناسب مختلف علوم وفنون کے مدارس وسکول وغیرہ قایم کرتے تھے۔ اور چونکہ مشایخ علما وطلبہ کو اپنے عطایا سے فیضیاب کرتے تھے، اس لیے لوگ جوق درجوق ان کے یہاں آتے اورحسبِ استعداد و لیاقت جس علم و فن کے تحصیل کی استطاعت رکھتے تھے، اس کے حصول میں ہمیشہ کوشاں رہ کر ان کو حاصل کرتے۔ یہاں تک کہ جب اپنے علم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتے تھے، تو ان کو کسی اعلیٰ منصب وبڑے عہدہ پر مقرر ومعین کر دیا جاتا تھا یا سلاطینِ وقت کے وظائف سے متمتع ہوکر اپنے جمیع امور سے مستغنی اورتمام مشکلات ومہمات سے سبکدوش ہوکر فراغت کے ساتھ توسیع علم وفن، تالیف و تصانیف میں اپنی زندگی کو وقف کر دیتے تھے اور طلبِ علوم وفنون وغیرہ میں اپنی ایک ایسی مثال، ایک ایسا نمونہ پیش کرتے تھے کہ لا عینٌ رات و لا اُذنٌ سمعت ۔ یہ لوگ اپنی حیات کا بیش بہا اور گرانمایہ حصہ اسی مشغلے میں صرف کیا کرتے تھے۔ ایک وُہ زمانہ آیا کہ سلاطینِ وقت کی رغبت اور توجہ علوم وفنون کی طرف سے کم ہوتی گئی۔ اسباب علوم وفنون منقطع ہوتے گئے۔ تحصیل علوم کی کوششیں رائیگاں وضائع ہونے لگیں۔ علما وفضلا کی تصنیفیں تقویم پارینہ سمجھی جانے لگیں۔ انقلابِ زمانہ نے اربابِ علوم واصحابِ فنون کو صفحۂ ہستی پر باقی نہ رکھا۔ یہاں تک کہ علوم وفنون سب ایسے نیست ونابُود ہوگئے کہ وہ علوم تو کجا، ان کے نام ونشان تک ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتے: ؎

سراغ عمر گزشتہ کا ڈھونڈیے گر ذوق

تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

عرب اور علومِ طبیہ

ابو محمد ثاقب کانپوری

عرب اگر ایک طرف اپنی جہالت و بربریت کے لیے مشہور ہے، تو دوسری طرف اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدن میں تمام اقوامِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ بادیہ نشینانِ عرب جنھوں نے خانہ بدوشی کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور کھجور و جَو کھا کھا کر پرورش پائی، دنیا کو علوم و فنون، تہذیب و تمدن کے وہ حیرت انگیز سبق دے گئے جسے زمانہ خواہ وہ ترقی کے کسی مرکز پر پہنچ جائے، کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

تاریخِ عرب کا مطالعہ کرنے والے مورّخ کو سب سے زیادہ جس حیرت کا سامنا ہوتا ہے، وہ عربوں کی ہمہ گیر قابلیت کا نظارہ ہے۔ کبھی وہ عربوں کے علم و ادب اور شعر و شاعری کی سحر طرازیوں سے وجد میں آجاتا ہے۔ کبھی مسائل فلسفہ اسے حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی علوم ریاضیہ اور علم ہیئت کی فضا میں ان کی بلند پروازی اسے دم بخود کر دیتی ہے اور جغرافیائی تحقیقات اور علم طبیعیات کی مُوشگافیوں سے اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

اسی طرح علمِ طب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس بچّے کو یونان کی گود سے لے کر کس محبت و شفقت کے ساتھ پروان چڑھایا۔ اس کے خط و خال کی مشاطہ گری تو انھوں نے کچھ اس انداز سے کی کہ دیکھنے والوں کو یونانی و عربی بچے میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب اگر اس بچے کو اپنی آغوشِ محبت میں نہ لیتے، تو شاید زمانے کو اس کا عالمِ شباب دیکھنا میسر نہ ہوتا اور انگریزی ڈاکٹری خزانہ ان مفید و بیش بہا معلومات سے خالی رہ جاتا، جو اسے آج صرف عربوں کی بدولت حاصل ہے۔

عربوں نے یونانی علوم طبیہ کی تصانیف جس کاہش و محنت کے ساتھ عربی میں منتقل کیں، وہ ان کے ذوق علمی اور متجسسانہ طبیعت پر شاہد ہیں۔ اگرچہ علوم طب میں اضافہ اور یونانی زبان کے تراجم کرنے والے عربوں کی تاریخ میں کثرت ہے۔ تاہم ان سب سے زیادہ مشہور رازی ہے جو ۸۵۰ء عیسوی میں پیدا ہوا اور ۹۳۲ء عیسوی میں دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ اس نے یہی نہیں کہ فنِ طبابت پر مفید کتابیں لکھیں، بلکہ خود پچاس برس تک بغداد میں کامیابی کے ساتھ مطب کرتا رہا۔

رازی کی تصنیفات میں بر الاعظم اور المنصوریہ جو اس نے شہزادہ منصور کے نام پر لکھی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ المنصوریہ کی ترتیب میں اس نے اس سلیقے سے کام لیا ہے، جو آج بھی سبق آموز ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ دس حصوں میں تقسیم کی گئی ہے، پہلا باب تشریح میں ہے، دوسرا امزجہ میں، تیسرا اغذیہ و معالجات میں، چوتھا حفظ صحت میں، پانچواں آرائشات جسمانی میں، چھٹا لوازمۂ سفر میں، ساتواں جراحی میں، آٹھواں سمیات میں، نواں امراض عامہ میں اور دسواں حُمیات کی تشریح میں۔

رازی کی ان کتابوں کی مقبولیت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور متعدد بار طبع ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۵۰۹ء میں وینس میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۵۲۸ء میں پیرس میں چھپی اور سب سے آخر میں اس کی وہ کتاب جو اس نے چیچک کے متعلق لکھی تھی ۱۸۶۶ء میں شایع کی گئی۔ اس کی یہ تصنیفات یہی نہیں کہ ایک عرصے تک یورپ میں شایع ہوتی رہیں بلکہ وہاں کے اکثر طبی مدارس میں نصاب کے طور پر بھی داخل رہیں۔ اس کی ان کتابوں کو معصرین یورپ نے اس قدر پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا کہ اطبائے یونان کی مشہور سے مشہور کتابیں ان کے آگے گرد ہوگئیں۔

مورخین عرب کا بیان ہے کہ رازی اپنے بڑھاپے میں موتیا بند کی وجہ سے اندھا ہوگیا تھا۔ جب لوگوں نے اس سے آنکھیں بنوانے پر اصرار کیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں دنیا کو بہت کچھ دیکھ چکا ہوں اور اب مجھے اس سے اس قدر نفرت ہے کہ میں بغیر کسی افسوس کے اس کے دیکھنے سے دست بردار ہوتا ہوں۔

رازی کے قریب قریب ہمعصر اطبا میں علی عباس کامیاب ترین طبیب تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف ملکی ہے، جس میں اس نے اصولِ طب اور معالجات دونوں کی تشریح کی ہے اور متقدمین اطبا مثلاً جالینوس، ہیپوکرایٹز، اوری باز اور پال ویزین کی بہت سی غلطیاں نکالی ہیں۔ اس کی اس کتاب کا ترجمہ انطاکی نے ۱۱۲۷ء میں کیا اور ۱۵۲۳ء میں بمقام لیون طبع ہوئی۔

طب میں سب سے زیادہ شہرت جس نے حاصل کی اور خواص کی زبان سے گزر کر عوام کی زبانوں پر جس کا نام سب سے زیادہ آیا، وہ بوعلی سینا ہے۔ اسے تمام اطبائے عرب نے اپنا "ملک الاطبا" تسلیم کیا ہے۔ اس کی پیدائش ۹۸۰ء میں ہوئی اور وفات ۱۰۳۷ء میں۔

اگرچہ یہ اپنی عیاشیوں کی زیادتی کی وجہ سے جوان ہی مرگیا، تاہم اس کی تصنیفات کی تعداد اپنے پیشروؤں سے زیادہ ہے۔ اس کی سب سے مشہور وغیر فانی تصنیف "قانون" ہے، جس میں علم ہیئت، علوم حفظ صحت، امراض و معالجات اور خواص الادویہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کتاب میں امراض کا بیان بمقابلہ متقدمین کے بہت کم ہے، لیکن اس میں جن اصول سے بحث کی گئی ہے، وُہ اپنی جگہ غیر فانی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ قریب قریب دُنیا کی ہر زندہ زبان میں اس کی اس کتاب کے تراجم موجود ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی طب کا دار و مدار اسی کی تصانیف پر رہا۔ فرانس و اطالیہ کے طبی دار العلوم تو محض انہی کتابوں کی درس و تدریس تک محدود تھے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک عام طور پر یورپ کے طبی مدارس میں اس کی تصنیفات رائج رہیں۔ فرانس میں اس کتاب کو متروک ہُوئے ساٹھ ستّر برس سے زیادہ نہیں ہُوئے۔

اسی طرح عرب کا سب سے بڑا جرّاح قرطبہ کا البقاسس ہے، جس نے اپنی خداداد ذہانت سے فنِ جراحی میں بہت سے مفید و کارآمد آلات کا اضافہ کیا اور پتھری خارج کرنے کا طریقہ اس نے تمام اطبا سے پہلے دریافت کیا، جو اس زمانے میں بالکل جدید تھا۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ایسی کتاب بھی تصنیف کی جس میں آنکھوں کی جراحی، فتق، بچّے جنانے اور پتھری نکالنے کا مفصل بیان ہے۔

عربوں نے علوم حفظ صحت میں بھی انتہائی ترقی کی تھی، وُہ جانتے تھے کہ ایسے امراض، جو علاج سے رفع نہیں ہو سکتے، ان سے اپنے آپ کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے امراض سے بچنے کے لیے ان کے پاس کوئی مستقل کتاب نہ تھی بلکہ اس کے طریقے زیادہ تر اقوال و ملفوظات کی شکل میں محفوظ تھے۔ چنانچہ ایک طبیب کا قول ہے کہ:

"بڈھوں کے لیے ماہر باورچی اور جوان عورت زہر ہے"

عربوں کے شفاخانے عمدگی کے اعتبار سے اس قدر بہتر ہوتے تھے اور ان میں ہوا اور پانی کا انتظام اتنا اچھا ہوتا تھا کہ موجودہ زمانے کے شفاخانے بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

رازی سے جس وقت شفاخانے کی تعمیر کے لیے کہا گیا کہ وُہ بغداد میں آب و ہوا کے اعتبار سے کسی عمدہ مقام کا انتخاب کرلے، تو اس نے بغداد کے مختلف مقامات کا اس طرح امتحان لیا کہ ہر جگہ تازہ گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لٹکوا دیا۔ جس جگہ کا ٹکڑا دیر میں سڑا، اسی مقام کو منتخب کر لیا۔

آج کل کے انگریزی شفاخانوں کی طرح عربوں کے شفاخانوں میں بھی مریضوں کے لیے بڑے بڑے کمرے اور ہال ہوا کرتے تھے، جس میں طلبا کے لیے دار الاقامتہ بھی ہُوا کرتا تھا، اس لیے کہ انھیں کتابوں کی بہ نسبت عملی تعلیم زیادہ دی جاتی تھی یہ دوا خانے کسی واحد شخصیت کی ملکیت نہ ہوتے تھے بلکہ رفاہِ عام کے لیے اس میں شہر کے تمام معززین شریک ہوتے تھے۔ ان شفاخانوں میں مریض بغیر کسی فیس یا اُجرت کے داخل کیے جاتے تھے اور ان کا علاج مقررہ عرصے تک نہایت مستعدی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان مقامات کا جہاں شفاخانے نہ بن سکتے تھے، اطبا اپنے ساتھ دواؤں کا ایک معقول ذخیرہ لے کر سفر کیا کرتے تھے۔

فنِ جراحی کو عربوں نے جس حد تک ترقی دی، وُہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ یورپ کا موجودہ عملِ جراحی عربوں ہی کی کاوشوں کا ممنون احسان ہے۔ جس وقت انگریزی طب کا وجود بھی نہ تھا، اس وقت گیارھویں صدی عیسوی میں عرب آنکھوں پر عملِ جراحی کرنے کے ماہر تھے۔ کلورا فارم جو بیہوشی کے لیے جدید ترین ایجاد سمجھی جاتی ہے، آٹھ سو برس پہلے عربوں کے نزدیک معمولی چیز تھی۔

02064

طِبِّ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

حکیم سیّد امین الدین

جس طرح کلامِ پاک میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: "وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ" یعنی کوئی رطب و یابس چیز ایسی نہیں ہے جو کتابِ روشن میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح انسانی حیات و ممات کا کوئی گوشہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں احادیثِ پاک میں ہم کو واضح ہدایات نہ ملتی ہوں چونکہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصب رسالت و نبوت تھا۔ آپ اقوام و اُممِ عالم کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ حضور گم کردہ راہ انسانوں کے قلب و نظر کو جلا بخشنے، انھیں اخلاقی اور تمدنی بلندی عطا کرنے، اُن کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی رہنمائی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ آپ جسمانی اور روحانی امراض کے طبیب اور معالج تھے۔ اُمّی لقب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر دنیا جہان کی حکمتیں نثار ہوں آپ ہر روگ اور ہر دُکھ کا درماں بن کر آئے۔ آپ کی کوئی بات حکمت سے خالی نہ تھی اس لیے یہ ناممکن تھا کہ علم الابدان کا باب اس سلسلہ میں تشنہ رہ جاتا۔

طب کا موضوع جیسا کہ آپ جانتے ہیں حفظِ صحتِ حاصلہ اور استردادِ صحتِ زائلہ ہے۔ پہلے حصّہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم حفظانِ صحت کے ان اصولوں کو اپنائیں اور حفظِ ماتقدم کے اُن طریقوں پر عمل کریں جن کے ذریعہ بیماریوں کے حملوں سے محفوظ رہا جا سکے اور دُوسرے حصّہ کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بیماری لاحق ہو جائے تو اس کا علاج کس طرح کیا جائے۔

جہاں تک حفظانِ صحت اور صفائی کے اصولوں کا تعلق ہے تو ہم کو احادیثِ پاک میں بڑا ذخیرہ ملتا ہے بعض چھوٹی سے چھوٹی مگر اہم اور بنیادی باتوں کی جانب آپ نے زیادہ سے زیادہ توجہ فرمائی ہے مثلاً حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ ہفتہ وار ناخن ضرور ترشوائے جائیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تاکید فرمائی ہے کہ ناخن دانتوں سے نہ کاٹے جائیں کیونکہ یہ طریقہ حفظانِ صحت کے اصول کے خلاف ہے۔

حضرت ایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا اور آسمان کی خبریں دریافت کرنے لگا تو اس پر آپ نے فرمایا: تم میں ایک شخص آتا ہے اور آسمان کی خبریں دریافت کرتا ہے مگر اس کو اپنے سامنے کی چیزیں نظر نہیں آتیں یعنی اس کے ناخن پرندوں کے پنجوں کی طرح بڑھے ہوئے ہیں جن میں ہر طرح کا مَیل کچیل بھرا ہوا ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ نے اپنی عبادات اور اُن کے ارکان و شرائط تک میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو بڑی خوبصورتی سے سمو رکھا ہے۔ نماز اور نماز کے لیے غسل و طہارت اور پاکیزگیِ لباس و مکان کا جو نظام اسلام نے قائم کیا ہے اگر اس پر صحیح معنی

میں عمل کیا جائے تو صحت وصفائی اور پاکیزگی کا وہ ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ بڑی حد تک بیماریوں سے نجات پا سکتے ہیں۔

اگر اسلامی طہارت کے طریقوں پر غور کیا جائے تو اس کا معیار سائنس کے طریقوں سے بھی اعلیٰ وارفع نظر آئے گا نماز سے پہلے وضو کا حکم دیا گیا ہے یہ روحانی اور جسمانی دونوں فوائد پر حاوی ہے اسی وجہ سے خود وضو کو روحانی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے ایک موقعہ پر ایک غیر مسلم سائنسدان نے ایک مسلمان کو وضو کرتے دیکھا وہ وضو کی ترتیب کو لغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے ناک میں پانی لینے پر غور کیا۔ اس نے دیکھا کہ کلائی سے کہنی تک کا حصہ دھوتے وقت مستعمل پانی کو دُھلے ہوئے پنجوں کی طرف سے نہیں بلکہ کہنی کی طرف سے بہایا جاتا ہے اس طریقہ سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے سر اور گردن پر مسح کی سائنٹیفک ترکیب کو دیکھا۔ اس نے غور کیا کہ سر اور گردن کو دھویا نہیں جاتا جس سے گرم گرم حالت میں نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے بلکہ صرف ہاتھ پھیرا جاتا ہے جس سے تسکین کے علاوہ اعصاب میں انتعاشی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دھونے سے نہیں ہوسکتی چونکہ پشت اور گردن کا تعلق مبدأ النخاع سے ہے اور دماغی وعصبی اعمال میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طریقہ کو دیکھ کر وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دی اس نے سوچا کہ تیرہ سو برس پہلے جس انسان نے نماز سے پہلے طہارت اور تفریحِ اعضائے بدن کا یہ طریقہ سکھایا ہے وہ نبی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح اسلام میں دانتوں کی صفائی اور خلال کو انتہائی اہمیت دی گئی ہے اور دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مسواک سے بہتر دانتوں کی صفائی کا کوئی اور طریقہ ممکن نہیں یہ طریقہ مضرات سے پاک اور فوائد سے مملو ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسواک انسان کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے اور یہ قول جتنا سائنٹیفک ہے موجودہ طبی سائنس کی روشنی میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے دن میں اکثر کم ازکم پانچ مرتبہ نمازوں سے پہلے وضو کرنا ہوتا ہے اور وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی بھی شدید تاکید کی جاتی ہے۔ ذیل میں اسی قسم کی چند احادیث پاک بیان کی جا رہی ہیں:

۱۔ عَنْ حُذَیْفَةَ رض قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ النَّوْمِ یَشُوْصُ فَاہُ بِالسِّوَاكِ۔ (بخاری ومسلم)

یعنی حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ جب حضور خواب سے بیدار ہوتے تو اپنے دہن مبارک کو مسواک سے صاف کرتے تھے۔

۲۔ عَنْ عَائِشَةَ رض اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اَلسِّوَاكُ مُطَهِّرَةٌ لِّلْفَمِ وَمَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ۔ (نسائی)

یعنی حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: "مسواک منہ کو پاکیزہ کرنے والی اور رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے۔"

۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ اَوْ عَلَی النَّاسِ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلٰوةٍ۔ (بخاری ومسلم)

یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا: "اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میری اُمت مشقت میں پڑجائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے لیے ضرور مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"

۴۔ مُسند احمد میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے پیلے ہو رہے تھے، آپ کی نظر پڑی تو فرمایا: تمہارے دانت پیلے پیلے کیوں نظر آتے ہیں مسواک کیا کرو۔

بہ ظاہر اس عمل کا فائدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ دانت صاف رہیں اور ان کے تعفن سے دُوسری بیماریاں پیدا نہ ہوں چونکہ دانتوں کا ہضمِ غذا سے بڑا تعلق ہے اور غذا اگر اچھی طرح ہضم نہ ہُوئی تو پرورشِ انسانی کرنے والی اخلاط کا توازن بگڑ جائے گا اور ان کے فساد سے صحتِ انسانی پر اثر پڑے گا۔

اسی طرح انسانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے پانی کا استعمال اشد ضروری ہے کیونکہ پانی انہضامِ غذا میں مدد و معاون اور اخلاط کو رقیق کر کے بدن کے ہر عضو میں نفوذ کرانے کا ذریعہ بنتا ہے لیکن پانی پینے کے بھی کچھ آداب ہیں جس کی رہنمائی ہمیں احادیثِ نبویہ سے ملتی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ پانی پیتے وقت تین بار سانس لیا کرو اور سانس برتن کے اندر نہیں بلکہ باہر لیا جائے نیز مشروب میں پھونک مارنے سے بھی منع فرمایا جس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر سے سانس کے ذریعہ سے جو ہوا خارج ہوتی ہے وہ مضرِ صحت ہے لہٰذا زہریلے اور گندے جراثیم سے بچاؤ کے خیال ہی سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ پانی تین سانسوں میں پیا جائے اور تینوں مرتبہ پانی کے برتن کو منہ سے الگ کر کے سانس لیا جائے۔ اس لیے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ گرم کھانے کو مُنہ سے پھونک مار کر ٹھنڈا نہ کیا جائے۔ ارشادِ گرامی ہے:

۱۔ عَنْ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نَہٰی اَنْ یُّتَنَفَّسَ فِی الْاِنَاءِ اَوْ یُنْفَخَ فِیْہِ۔ (ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ)

یعنی حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن کے اندر سانس لینے اور اس میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

۲۔ عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ الرَّسُوْلَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کَانَ یَتَنَفَّسُ فِی الشَّرَابِ ثَلَاثًا خَارِجَ الْاِنَاءِ۔

یعنی حضرت انسؓ سے روایت ہے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مشروب کے پینے کے دوران برتن سے باہر تین بار سانس لیا کرتے تھے۔

جس طرح کلامِ پاک میں وَثِیَابَکَ فَطَہِّرْ وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ کے ذریعہ کپڑوں اور جسم کو پاک صاف رکھنے اور میل کچیل سے صاف سُتھرا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی لباس کو صاف سُتھرا رکھنے اور گندگی سے علیحدہ رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک بار آپ نے کسی شخص کو میلے کپڑے پہنے ہُوئے دیکھا تو فرمایا اس کے پاس اتنا بھی نہیں کہ اپنے کپڑے دھولیتا۔

صفائی سے متعلق بخاری شریف میں روایت ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ ہفتہ میں

ایک دن غسل کیا کرے اور اپنے سر اور بدن کو دھویا کرے۔ آپ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ روزانہ ہر شخص صبح کو اُٹھ کر کسی کھانے پینے کی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ اپنے ہاتھ دھوئے۔ اسی طرح کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید فرمائی چونکہ جب بغیر دُھلے ہُوئے ہاتھ کھانے کے ساتھ مُنھ میں جائیں گے تو مَیل یا جراثیم کے جسم کے اندر جانے کا احتمال رہے گا اور اس میں بھی یہ باریکی رکھی گئی ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو کر کسی کپڑے سے نہ پُونچھے جائیں چونکہ اس طرح اس کپڑے کے جراثیم ہاتھوں میں لگ جائیں گے اور کھانے کے ساتھ مُنہ میں چلے جائیں گے اور اسی مصلحت کی بنا پر آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ دُوسرے کے تولیے میں شرکت نہ کی جائے۔

انسانی صحت کی حفاظت کا حضور پاک علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو اس درجہ خیال تھا کہ آپ نے یہ عام ہدایت فرمائی کہ بیمار آدمی تندرست آدمی کے پاس نہ آئے اور متعدی اور اڑ کر لگنے والی بیماریوں سے بچنے کے لیے تو آپ نے یہاں تک حکم دے دیا کہ جذامی سے ایسا بھاگ جیسے شیر سے بھاگتے ہیں۔ ان تمام ہدایتوں اور احتیاطوں کا مقصد یہی ہے کہ انسانی صحت بیماریوں سے محفوظ رہے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کی یہ حدیث پاک ہے:

فَاِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُوْنِ بِاَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا اِلَیْهِ وَ اِذَا وَقَعَ بِاَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْهَا فِرَارًا مِنْهُ۔

یعنی جب کسی بستی میں تم سُنو کہ وہاں طاعون کی وبا پھُوٹ پڑی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جہاں تم رہتے ہو اگر وہاں پھُوٹ پڑے تو اپنی بستی سے نکل کر نہ بھاگو۔

کس قدر حکیمانہ ارشاد ہے کہ جہاں یہ متعدی وبا پھیلی ہُوئی ہے وہاں خود جا کر اپنے ہاتھوں بیماری کو دعوت نہ دو، اور اگر خود تمہاری بستی اس وبا سے متاثر ہو جائے تو وہاں سے بھاگ کر اس متعدی مرض کو دُوسرے شہر میں نہ لے جاؤ۔

جسمانی صفائی کے بعد غذا کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ غذا کے متعلق بھی اسلام نے تفصیلی ہدایات دی ہیں اور اس ضمن میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فہم و فراست اور عقل و دانش کے قربان جائیے جب احادیث نبویہ کو جدید علم طب کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آپ کا ہر فرمان ٹھوس سائنسی حقیقت پر مبنی ہے اور آپ کی تعلیمات حکیمانہ اور سائنٹیفک ہیں اور سائنس کے اس ارتقائی دور کے علم سے بھی سبقت لے گئی ہیں۔

انسان کی صحیح غذا کیا ہے؟ سبزی یا گوشت؟ یہ مسئلہ مدت سے مابہ النزاع بنا ہوا ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو چودہ سو سال پہلے طے کر دیا ہے۔ گوشت کھانے کو اسلام جائز رکھتا ہے۔ پروٹین غذا کا سب سے اہم جزو ہے۔ اہل سائنس اس بات پر متفق ہیں کہ لحم اور حیوانی غذائیں پروٹین کا بہترین ماخذ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ گوشت سب سالنوں کا سردار ہے۔ گوشت بلغم کی تولید کو کم کرتا اور چہرے کے رنگ کو نکھارتا ہے اور خُون بُہتات کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور پیٹ کو بڑھنے نہیں دیتا یعنی لطیف قسم کی غذا ہے اور اسے کھا کر راحت ہوتی ہے۔ جن جانوروں کا گوشت کھانے کے قابل ہے اور جن کا قابلِ استعمال نہیں ہے اس کی اسلام نے ایسی سائنٹیفک تقسیم کی ہے کہ سائنس سے اس کی حرف بہ حرف

تصدیق ہوتی ہے۔ جن جانوروں کے گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے وہ مضر صحت ہیں اور جن کے نقصانات سے طب جدید خوب واقف ہے۔ خنزیر کا گوشت سراسر مضر صحت اور بیحد مخرب اخلاق ہونے کے علاوہ مولد امراض بھی ہے اور کیا عجب ہے کہ یورپ اور امریکہ میں امراضِ قلب اور ہائی بلڈ پریشر کا مرض زیادہ پائے جانے کی وجہ منجملہ اور اسباب کے سور کا گوشت بھی ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گوشت میں کدو یعنی لوکی ڈال کر استعمال کیا کرو کیونکہ کدو مقوی دماغ ہونے کے علاوہ گوشت کی بھی اصلاح کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سبزی آمیز گوشت بہتر غذا ہے۔ اور حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد سائنس کی تحقیقات کے بالکل مطابق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست اور پشت کا گوشت کھانے کی تلقین فرمائی ہے اور وجہ بھی بتلا دی ہے کہ اس سے کمر اور بازو مضبوط ہوتے ہیں۔ اس قول سے علاج بالاعضاء کے اصول کی تصدیق ہوتی ہے۔

آج اناجوں اور پھلوں کے چھلکوں میں بہترین اور نہایت ضروری اجزاء کی موجودگی کی سائنس تصدیق کرتی ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر چھنے ہوئے آٹے کی روٹی تناول فرمایا کرتے تھے اور زیادہ تر جَو کی روٹی استعمال فرماتے تھے۔ جالینوس کا قول ہے کہ جَو ایسا اناج ہے جو بیماروں اور تندرستوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ آج بھی جَو کو نہایت مفید اور اعلیٰ درجہ کا مقوی و مغذی اناج قرار دیا جاتا ہے اور ہر قسم کی مضرت سے پاک اور لطیف غذا سمجھا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سیال غذاؤں میں سب سے اچھا دودھ ہے۔ دُودھ سے دہی، مسکہ، پنیر، چھاچھ اور بالائی وغیرہ بھی حاصل ہوتی ہے جو اپنی اپنی جگہ غذا بھی ہیں اور دوا بھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی تم کو پینے کے لیے دُودھ پیش کرے تو اس کو رَد مت کرو کیونکہ یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے نیز فرمایا کہ پنیر تنہا مضر ہے اس کو جوز کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ انسانوں کے لیے شہد میں شفا ہے۔ حضور پاک علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو بھی شہد بہت محبوب تھا۔ شیر اور شہد ہزاروں قسم کی بوٹیوں کے مرکب ہوتے ہیں کوئی حکیم ان سے بہتر مرکب دوا اور غذا تیار کرنے پر قادر نہیں ہے۔

رُوح اور جسم کے طبیب اعظم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اشیاء کو بدرقات کے ساتھ استعمال فرماتے تھے چنانچہ دُودھ میں اکثر پانی ملا لیا کرتے تھے اس طرح دُودھ اور زیادہ لطیف اور سریع الاثر ہوجاتا ہے۔ شہد کو پانی میں حل کر کے نوش فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح شہد کی حدّت کم ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی کھجور کو پانی میں ایک رات اور کبھی دو رات تر کر کے اس کا زلال استعمال فرماتے تھے اور کبھی دُودھ میں شہد آمیز کر کے استعمال فرماتے تھے۔

اسی طرح کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بغیر اصلاح کھیرا، ککڑی اور خربوزہ کے ساتھ کھجور ملا کر تناول فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے کہ اس طرح کھانے سے ایک دُوسرے کی حدّت اور برودت کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس فرمان سے دواؤں اور غذاؤں میں حدّت اور برودت کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں زنجبیل یعنی

سونٹھ اور کافور کے مزاج کی تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ جنت کی اغذیہ کا مزاج ادرک اور کافور جیسا ہے۔ یہ دونوں خوشبودار ہیں، ان میں سے ایک بارد اور ایک حار ہے۔ زنجبیل اور کافور کی تاثیر کے لیے خاصہ یا فعل یا اس کے ہم معنیٰ کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ مزاج کہا گیا ہے۔ اس طرح ادویہ و اغذیہ کا مخصوص مزاج بھی قرآن سے ثابت ہوتا ہے جس کا طبِ جدید انکار کرتی ہے۔

حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام مکھن کو کھجور کے ساتھ ملا کر استعمال کرنا بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح کھیرے کو نمک لگا کر بھی استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ کو پھل بہت مرغوب تھے چنانچہ انجیر اور زیت سے بڑی رغبت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ زیت کھایا کرو اور اس کا تیل لگایا کرو بلاشبہ زیتون کا تیل تمام تیلوں سے بہتر ہے۔ پھلوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگور اور انار کی بھی تعریف فرمائی ہے اور انجیر کو بواسیر اور نقرس میں مفید بتلایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ غذائیں

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانوں میں ثرید بہت پسند تھا۔ ثرید شوربے میں روٹی بھگو لینے کو کہتے ہیں اور دودھ میں کھجور کو بھگو کر اس میں تھوڑا سا مکھن کا اضافہ کر لیا جائے تو اس کو بھی ثرید کہا جاتا ہے۔ تلبینہ: بیماری میں جب کوئی شخص کھانا نہیں کھاتا تھا تو آپ اس کو تلبینہ پلانے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تلبینہ دھو ڈالتی ہے شکموں کو جس طرح کوئی دھو ڈالتا ہے اپنے چہرہ کو میل سے۔ تلبینہ کی تیاری کی ترکیب یہ ہے کہ بغیر چھنے ہوئے جَو کے آٹے کو دودھ میں پکایا جائے، اور جب وہ پک جانے کے قریب ہو تو اس میں تھوڑا سا شہد ملا دیا جائے اور پھر اسے ٹھنڈا کر کے پیا جائے، بعض اوقات اس کو ثرید میں ملا کر بھی پیا جاتا تھا۔

حیس بھی حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بہت پسندیدہ غذا تھی۔ یہ بھی تین اجزا سے مرکب ہے یعنی کھجور، مکھن اور دہی سے یہ مقوی غذا ہے اور جسم کو فربہ کرتی ہے۔ اس طرح ہریسہ کو بھی آپ نے مقوی غذا فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سبزی کو دسترخوان پر بہت پسند فرماتے تھے۔ سبز رنگ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت پسند فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جاری پانی اور سبز چیز کو دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے۔ فرمایا: زینت دیا کرو اپنے دسترخوان کو سبز چیزوں سے۔ اس لیے کہ سبز چیز بھگاتی ہے شیطان کو اللہ کے نام سے۔ علماؑ کہتے ہیں کہ سبز چیز سے مراد پودینہ، ہرا دھنیا اور سبز ترکاریاں ہیں، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ سرکہ بہترین سالن ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ خدا نے معدہ سے بڑا کوئی ظرف پیدا نہیں کیا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ اس لیے مناسب ہے کہ معدہ کے تین حصے کیے جائیں، ایک حصہ غذا کے لیے، ایک حصہ پانی کے لیے اور ایک حصہ سانس کی آمد و رفت کے لیے۔ ڈکار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت نفرت تھی۔ ڈکار کی آواز سن کر فرماتے تھے کہ اتنا کیوں کھاتے ہو۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے رات کو فاقہ کرنے سے منع فرمایا ہے چونکہ وہ جلد بڑھاپا لاتا ہے۔ بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے منع فرمایا ہے۔

طب جدید نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ زیادہ کھانا نہ صرف بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے بلکہ یہ عادت قبل از وقت بوڑھا کر دیتی ہے اور زندگی کے بہت سے مصائب مثلاً ذیابیطس، فالج اور مخبوط الحواسی اسی چیز کا نتیجہ ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے متبعین کو یہی تعلیم دی ہے اور زیادہ کھانے کو سختی سے منع فرمایا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث پاک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پینے اور حفظانِ صحت کا ایسا جامع اصول ارشاد فرمایا ہے جس کی مثال کسی طب، کسی سائنس اور کسی ازم میں نہیں ملتی۔ فرمایا، نَحْنُ قَوْمٌ لَا نَأْكُلُ حَتّٰى نَجُوْعَ وَ إِذَا أَكَلْنَا فَلَا نَشْبَعُ۔ یعنی ہم ایسی قوم ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے نہیں کھاتے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔

پرہیز پرہیز بھی دوائی علاج کی طرح سنّت ہے۔ مرض میں غسل یا وضو کی بجائے تیمم کی نہ صرف اجازت بلکہ ہدایت ہے۔ حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آنکھ دُکھنے کی حالت میں حضرت صہیب رومیؓ کو کھجور کھانے سے منع فرمایا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آشوب چشم میں کھجور استعمال کرنے سے باز رکھا۔ اس وقت جَو کے ساتھ چقندر پکا ہُوا موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں سے کھاؤ یہ تمہارے لیے مناسب ہے۔ جس برتن کا پانی دُھوپ سے گرم ہو اس پانی کو استعمال کرنے سے منع فرمایا اور بتلایا کہ ایسے پانی سے برص ہو جایا کرتا ہے۔ نیز گرم مسہلات سے بھی منع فرمایا ہے۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ مٹی کھایا کرتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹی کھانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ مٹی کھانے سے انسان ہمیشہ بیمار رہتا ہے، پیٹ بڑا ہو جاتا ہے اور رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مچھلی کو دُودھ کے ساتھ کھانے یا دُودھ کے ساتھ ترشی کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو گرم غذاؤں، دو سرد غذاؤں، دو قابض غذاؤں یا دو مسہل اشیاء کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اب استردادِ صحتِ زائلہ کی طرف آیئے یعنی اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کے معالجے کے بارے میں بھی ہم کو حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاداتِ عالیہ میں بے شمار ہدایات ملتی ہیں اور صرف علاج معالجہ ہی نہیں بلکہ احادیثِ پاک کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ علمِ طب اور معالجہ میں نہ صرف یہ کہ علمی بصیرت رکھتے تھے بلکہ علمی معلومات اور علم الجراحت سے پوری پوری واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ زاد المعاد کی مندرجہ ذیل احادیث اس بات کی شاہد ہیں:

۱۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ طَبِيْبًا أَنْ يَبُطَّ بَطْنَ رَجُلٍ أَجْوَى الْبَطْنِ فَقِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ هَلْ يَنْفَعُ الطِّبُّ قَالَ الَّذِي أَنْزَلَ الدَّاءَ أَنْزَلَ الشِّفَاءَ فِيْمَا شَاءَ۔

یعنی حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک استسقاء کے مریض کے بارے میں اس کے معالج کو حکم دیا کہ وہ مریض کے پیٹ میں شگاف دے، اس پر حضور سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا طب میں بھی کوئی مفید چیز ہے آپ نے جواب دیا جس ذات نے بیماری اتاری ہے اس نے جس جس چیز میں چاہا شفا بھی رکھی ہے۔

۲۔ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ عَلَى رَجُلٍ يَعُوْدُهُ بِظَهْرِهِ وَرَمٌ

فَقَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! بِهٰذِهٖ مِدَّةٌ فَقَالَ بُطُّوْ عَنْهُ قَالَ عَلِیٌّ فَمَا بَرِحْتُ حَتّٰی بَطَتُّ وَالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ شَاهِدٌ۔

یعنی حضرت علیؓ سے روایت ہے فرمایا : میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ایک بیمار کی عیادت کےلیے گیا اس شخص کی پشت پر کسی جگہ ورم تھا لوگوں نے عرض کیا کہ حضور! ورم میں پیپ پڑ گیا ہے آپ نے فرمایا اسے شگاف دے دو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی وقت آپ کی موجودگی میں اس شخص کے شگاف دے دیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

اسی طرح زخموں کا علاج اور مرہم پٹی کرنا بھی صحابہ کرامؓ اور اہلبیت مطہرین کی سنّت ہے۔ چنانچہ جب اُحد میں حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی اور سامنے کا دانت شہید ہو گیا تو حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں پانی لے کر آئے اور حضرت بی بی فاطمہؓ نے اپنے والد کے زخم دھونے شروع کیے مگر خون نہ تھما تو حضرت فاطمہؓ نے چٹائی کا ٹکڑا جلایا اور اس کی خاکستر زخم پر چھڑک دی تو خون فوراً بند ہو گیا۔

ایک بار جب حضرت سعدؓ بن معاذ کے تیر لگا تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا علاج داغنے سے کیا اور یہ عمل خود اپنے دستِ مبارک سے سرانجام دیا اور جب زخم پر ورم ہو گیا تو دوبارہ پھر داغ دیا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ترمذی شریف میں ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت اسعدؓ بن زُرارہ کو کانٹا لگ جانے پر داغ دیا۔ نیز مشکوٰۃ شریف میں ابن ماجہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے علاج کے لیے سینگھی لگانے والے کو بلایا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ میرے خون میں جوش پیدا ہو رہا ہے اس لیے تم کسی حجام کو بلالاؤ اور دیکھو پچھنا لگانے والا جوان ہو ، نہ ضعیف ہو ، نہ نوعمر۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سُنا ہے کہ نہار مُنہ پچھنا لگوانا زیادہ بہتر ہے اس سے عقل و فہم میں اضافہ ہوتا ہے اور قوتِ حافظہ زیادہ ہوتی ہے۔

اگرچہ دیسی جڑی بُوٹیاں طبِ یونانی کے علاج کی اساس اور بنیاد ہیں اور جڑی بُوٹیوں پر برّصغیر پاک و ہند میں بڑے وسیع تجربات کیے گئے ہیں مگر ابھی حال میں چینی وفود کے تبادلہ سے اہلِ پاکستان میں اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لیے اب ہم آخر میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج اور ان کے خواص کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات گرامی بیان کرتے ہیں۔ چونکہ احادیث پاک کے مطالعہ سے یہ روشن حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جو علوم عطا فرمائے تھے ان میں خواص الاشیاء کا علم بھی شامل تھا اور بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن میں آپ نے متعدد دواؤں کی طبی خاصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ امراض کے لیے ان کا مفید ہونا سمجھایا ، اور ان سے فائدہ اٹھانے کی تلقین فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ کُھمبی کا پانی آنکھوں کے لیے شفابخش ہے۔ چنانچہ ترمذی شریف میں ہے حضرت ابُوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کُھمبیاں لے کر ان کا پانی نچوڑا اور ایک شیشی

میں رکھ لیا۔ میری ایک کنیز کی آنکھیں کمزور اور خراب تھیں میں نے وہ پانی اس کی آنکھوں میں ڈالا اور وہ اچھی ہوگئی۔

سناء کے متعلق ابن ماجہ اور ترمذی میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سناء کے متعلق فرمایا اگر کسی چیز میں موت سے شفا ہو سکتی تو وہ سناء میں ہوتی۔

اسی طرح مہندی کے متعلق ترمذی شریف میں ہے، عَنْ سَلْمٰی خَادِمَۃِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَتْ مَا یَکُوْنُ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَرْحَۃٌ وَلَا نَکْبَۃٌ اِلَّا اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَ عَلَیْھَا الْحِنَاءَ۔

یعنی حضور کی خادمہ حضرت سلمیٰؓ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا جب کبھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زخم، چوٹ یا پھنسی کی تکلیف ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی لگاؤں۔

طبِ رسولؐ

مولوی حکیم محمد عبد الرزاق

"بخاری و مسلم نے بالاتفاق حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"کلونجی میں موت کے سوا ہر مرض کی دوا ہے"۔

کلونجی تیسرے درجہ میں گرم اور دوسرے درجہ میں خشک ہے۔ اس میں ایک قسم کی تیزی اور جلا کی قوت ہے۔ جس کے سبب سے وہ بلغم غلیظ کی غلظت و لزوجت کو قطع کرتی ہے۔ بلغمی مواد کو اور ریاح غلیظہ کو تحلیل کرتی ہے۔ شہد میں ملا کر چاٹنے سے معدہ کا تنقیہ اور ہضم کی تقویت ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں جو ہر مرض کے لیے مفید ہونا وارد ہُوا ہے، اس سے یہ مراد ہے کہ امراض باردہ بلغمیہ میں سے ہر ایک مرض کو نافع ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اہلِ عرب کے اکثر امراض اس زمانہ میں برودت و رطوبت سے ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کی اکثر غذاؤں میں دہی اور سرد و تر ترکاریاں ہوتی تھیں، لہٰذا اگر ٹھیک موقع پر استعمال کی جائے تو تمام امراض باردہ کے لیے بہت مفید ہے۔

۲۔ "مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نوزائیدہ بچوں کو لایا جاتا تو آپ ان کے لیے برکت کی دُعا کرتے اور چھوہارا چبا کر بچے کے تالو میں چپکا دیتے تھے"۔

جب تک بچہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے، اس کی آنتوں میں کسی قدر فضلات براز یہ موجود ہوتے ہیں اور ایک تو ان کی قلت مقدار کے باعث وہ آنتوں میں جمع رہتے ہیں۔ دُوسرے یہ کہ ان کے نکلنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اس لیے بچّہ کو پیدائش کے بعد سب سے پہلے گھُٹی دی جاتی ہے تاکہ اس کی آنتیں فضلۂ مجتمعہ سے پاک ہو جائیں اور چونکہ چھوہارے میں قوتِ جلا موجود ہے، اس لیے بچّے کو چھوہارا دینے سے بھی اس کی آنتوں کے موجودہ فضلات صاف ہونے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ دوسری منفعت یہ بھی ہے کہ اطبّا کے تجارب کثیرہ سے یہ ثابت ہُوا ہے کہ بچّے کو سب سے پہلے جو چیز دی جاتی ہے، اپنی مدت العمر میں کسی موقع پر اس چیز سے اُسے مضرت نہیں ہوتی۔ کیوں کہ بچّے کی طبیعت کو اس چیز کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ مقولہ عام طور پر مشہور ہے کہ فلاں چیز تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ لہٰذا ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک عرب میں چونکہ چھوہارے اکثر کھائے جاتے ہیں، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوزائیدہ بچوں کے تالو پر چھوہارا لگا دیتے تھے، تاکہ اس کا عرق رفتہ رفتہ بچّے کے حلق میں جاتا رہے اور بچّہ بار بار اُسے چُوستا رہے۔ اس عمل سے ایک تو آنتوں کی صفائی مقصود تھی اور دُوسرے یہ بھی نفع منصور تھا کہ چھوہارے سے اس کو مدت العمر میں مضرت نہ پہنچے۔

۳۔ "ترمذی و ابن ماجہ نے عقبہ ابن عامر سے روایت کی۔ فرمایا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیماروں کو کھانے کے لیے مجبور نہ کیا کرو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ ان کو کھلا پلا دیتا ہے"۔

جس مریض کے ہوش و حواس درست ہوں اور وُہ غذا کی ضرورت و منفعت سے کافی واقفیت رکھتا ہو اور اس کے معدے

ہیں بھی کوئی ایسی خرابی موجود نہ ہو، جس کے سبب سے بھوک کا ادراک نہ ہو سکے اور باوجود ان امور کے اس کی طبیعت غذا کی طرف مائل نہ ہوتی ہو تو سمجھ لو کہ اس کے بدن کو غذا کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اسے مرض کی حالت میں غذا کھانے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مریض کی طبیعت ہر وقت دفعِ مرض اور تحلیل و اصلاح مادہ میں مصروف رہتی ہے۔ رطوباتِ بدنیہ میں بعض رطوبات کی اصلاح کر کے انہیں پرورشِ بدن میں صرف کرتی اور غذا کا کام لیتی ہے اور غذا نہ کھلانے کی حالت میں طبیعت ہضمِ غذا اور دفع فضلاتِ غذا وغیرہ امور سے پُورے طور پر سبک دوش رہ کر دفعِ مرض کی طرف متوجہ رہتی ہے اور اگر ایسے موقع پر جبراً غذا کھلائی جائے، تو بہت سی خرابیوں کا اندیشہ رہتا ہے۔

۴۔ "ترمذی نے زید ابن ارقم سے روایت کی ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ ہم کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ذات الجنب میں قسط بحری اور زیت سے علاج کرنے کا حکم دیا۔"

قسط بحری کا مزاج تیسرے درجے میں گرم خشک ہے۔ اس میں ایک قسم کی حدت اور تیزی پائی جاتی ہے جس کے باعث یہ رطوباتِ فضلیہ کو تحلیل اور خشک کرتا ہے۔ اگر اس کا ضماد کیا جاتے، تو مادہ فاسدہ کو عمقِ بدن سے باہر کی طرف جذب کرتا اور ریاح غلیظہ کو تحلیل کرتا ہے۔ درد کو تسکین دینا اور اعصاب کی تقویت اس کا خاص کام ہے۔ اس لیے دردِ سینہ اور پہلو کے لیے مفید اور ذات الجنب بارد کے لیے نافع ہے۔

زیت بھی مقوی اعصاب اور مسکن اوجاع ہے۔ مصفی اخلاط، مفتح سُدد، قاطع عفونت اور مقوی بدن ہے۔ بعض اطبّا نے لکھا ہے کہ زیت کی مالش سے اعصاب کو قوت حاصل ہوتی ہے اور سردی کے تمام نقصانات رفع ہوتے ہیں۔ درد کو بہت جلد رفع کرتا اور مادہ کو تحلیل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اگر قسط کو باریک پیس کر اس میں ملایا جائے اور گرم کر کے ذات الجنب بارد خصوصاً ریحی میں اس کی مالش کی جائے تو بہت نافع ہوگا اور اگر قسط کو اس میں جلا کر صاف کریں اور عام دردوں کے موقع پر اس کی مالش کریں، تو اس سے نفع ہوگا۔

۵۔ "ترمذی و ابن ماجہ نے اسماء بنت عمیس سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر موت کی دوا ہوتی تو سناء ہوتی۔"

سناء کی دوسرے درجہ میں گرم و خشک ہے۔ بلغم، صفراء، سوداء کو براہ اسہال خارج کرتی ہے اور ہر قسم کے اخلاط سوختہ اور خام کو نکالتی ہے، یہ دوا نہ صرف معدے اور آنتوں کا تنقیہ کرتی ہے، بلکہ اس کی قوت اعماق بدن میں نفوذ کر کے اعضائے بعیدہ سے موادِ موذیہ کو کھینچ نکالتی ہے۔ اس لیے عرق النساء، وجع مفاصل، نقرس، دردِ کمر وغیرہ کو جو اخلاط ثلثہ میں سے کسی غلط سے پیدا ہوئے ہوں، نفع کرتی ہے۔ مقوی و منقی دماغ ہے۔ صرع، شقیقہ اور پرانے دردِ سر کو نافع ہے۔ ضیق النفس کے لیے موافق اور جرمِ قلب کی مقوی ہے۔ چونکہ اس سے موادِ خبیثہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے، اس لیے امراض متعلق فسادِ خون کو بھی نفع کرتی ہے۔ خارش خشک و تر اور پھوڑے پھنسیوں اور اکثر قروحِ خبیثہ میں اس کا مسہل بہت فائدہ کرتا ہے۔

غرضکہ جب ہر قسم کے موادِ فاسدہ کو بدن سے نکالنا اور بدن کو اُن سے پُورے طور پر پاک و صاف کرنا اس کا کام ہے، تو

اس کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سوائے موت کے ہر مرض کی بہترین دوا ہے۔

۶۔ "بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابی ہریرہؓ سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معدہ بدن کا حوض ہے۔ سب رگیں اس میں ملتی ہیں۔ اگر معدہ درست ہے تو سب رگیں درست ہیں، معدہ خراب ہے تو کل رگیں خراب۔"

یونانی اطبا، وید اور ڈاکٹر سب کے سب اس بات میں متفق ہیں کہ غذا جب معدے میں پہنچتی ہے، تو اس میں ایک خاص قسم کا تغیر کیمیاوی (ہضم) ہوتا ہے جس کے باعث غذا کا رس (خلاصہ) اس کے فضلی اجزا سے متمیز ہو کر باریک رگوں کے ذریعہ سے جگر وغیرہ کی طرف جاتا ہوا تمام اعضاء میں خاص خاص تغیرات حاصل کر کے پرورشِ بدنی میں صرف ہوتا ہے۔ گویا پرورش بدنی کا مادہ سب سے پہلے معدے میں ہو کر پھر وہاں سے تمام اعضاء میں علیٰ قدرِ مراتب تقسیم ہوتا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ معدہ مثل اس حوض کے ہے، جس میں پہلے پانی جمع ہو کر پھر حوض کے چاروں طرف والے قطعاتِ زمین کو سیراب کرتا ہو۔

وریدیں، شریانیں غذا کے رس کو جذب کرنے والی خاص قسم کی رگیں (بلکہ کسی قدر پٹھے بھی) اس کی ساخت میں سب کے سب مل جل کر منتشر ہو گئے ہیں، تاکہ غذا کے رس کو جذب کرنے والی رگیں اپنا کام بخوبی انجام دے سکیں اور شریانیں معدے کو زندگی کی قوت اور پرورش پانے کی قابلیت بخشیں اور وریدیں اسے اپنی منفعت سے متمتع کریں۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ اگر معدے کا خاص کام (ہضمِ غذا) پورے طور پر درست رہتا ہے، تو سب رگیں ٹھیک اور ان کے تمام افعال درست رہتے ہیں اور اگر کسی سبب سے معدے کا فعل خراب ہو جاتا ہے تو سب رگیں ماؤف اور ان کے افعال خراب ہو جاتے ہیں اور یہ خرابی صرف رگوں تک ہی محدود نہیں رہتی، بلکہ اس خرابی کا اثر تمام اعضاء تک متعدی ہوتا ہے۔ جس سے پرورش بدنی میں قصور اور عام صحت میں اس قدر فتور پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر یہ حالت کچھ دنوں قایم رہے، تو عیش زندگی تلخ ہو جاتا ہے: ؎

مایۂ عیشِ آدمی شکم است

۷۔ "بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علیؓ سے روایت کی، فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ کے نماز پڑھتے میں بچھو نے کاٹ کھایا۔ آپ نے بچھو کو جوتی سے مار ڈالا اور فرمایا: خدا غارت کرے بچھو کو، نبی کے کاٹنے سے بھی باز نہیں آتا۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور نمک کو پانی میں ملا کر بچھو کے کاٹے پر چھیڑکا۔"

نمکِ طعام (کھانے کا نمک) دوسرے درجہ میں گرم و خشک ہے۔ رطوبات متعفنہ کو تحلیل اور خشک کرتا ہے۔ چیپ دار رطوبات کو سطحِ اعضاء سے چھڑاتا اور جس عضو پر اس کا لیپ کیا جائے یا مالش کی جائے، اس عضو کے اجزاء کو سکیڑ کر اس کے مسامات کو وسیع کرتا ہے۔ مسامات کے اندر کی رطوبات کو تحلیل کر کے تفتیح مسامات کرتا ہے۔ اعضاء کی سردی کو دور کرتا اور سرد زہروں کو تحلیل کرتا ہے۔ گرم پانی میں نمک گھول کر بچھو کے کاٹے ہوئے عضو کو اس پانی میں رکھیں، تو اس سے زہر تحلیل ہوتا اور درد فوراً موقوف ہو جاتا ہے۔ نمک و تخم باریک پیس کر بچھو کے کاٹے ہوئے مقام پر لیپ کرنے سے بہت نفع ہوتا ہے۔ نمک باریک پسا ہوا سرکہ میں ملا کر کپڑے کی گدی اس میں تر کریں اور زہر دار جانور کے کاٹے ہوئے مقام پر باندھیں، تو اس سے بہت نفع ہوتا ہے۔ نمک کی پوٹلیوں سے تکمید کرنا تمام دردوں کو مفید ہے، جو اعضاء کی سردی یا ریح سے پیدا ہوئے ہوں۔

۸ ۔" ابو نعیم نے کتاب الطب میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ سب سالنوں کا سردار سالن گوشت ہے۔" اسی کتاب میں حضرت علیؓ کا بیان درج ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: گوشت کھانا اچھا کرتا ہے حلق کو اور صاف کرتا ہے رنگ کو اور چھوٹا کر دیتا ہے پیٹ کو یعنی توند نہیں نکلنے دیتا۔"

گوشت ! اگرچہ ہر حیوان کے گوشت کا مزاج یکساں نہیں ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سے ہر ایک حیوان کے مزاج میں بہ نسبت دوسرے کے تھوڑا یا بہت فرق ہوتا ہے، اسی طرح سے ان کے گوشت کا مزاج بھی ایک دُوسرے سے کسی قدر ضرور مختلف ہوتا ہے، لیکن پھر بھی گوشت کا مزاج عموماً گرم اور تر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ مختلف حیوانات کے گوشت کی باہمی اختلاف مزاجی اس قدر نہیں ہوتی ہے کہ جس کے سبب سے کسی حیوان کے گوشت کو گرم و تر نہ کہا جا سکے۔

جن جن حیوانات کے گوشت کھائے جاتے ہیں، ان میں سب سے بہتر بکری کے یکسالہ بچھڑے کا گوشت ہے۔ اگر نباتاتی غذاؤں کے ساتھ بقدر مناسبت کھایا جائے، تو بآسانی ہضم ہوجاتا اور عمدہ اخلاط پیدا کرتا ہے۔ نباتاتی غذاؤں کی بہ نسبت گوشت میں غذائی اجزاء فضلی اجزأ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ گوشت کھانے سے ریاح اور بلغمی فضلات بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے نباتاتی غذا کھانے والوں کی بہ نسبت گوشت خوروں کا پیٹ چھوٹا ہوتا ہے۔ ان کو نفخ شکم اور کثرتِ ریاح کی شکایت بھی کم ہوتی ہے اور پیٹ بڑھ کر توند نہیں نکلتی ہے۔ اگر کھانے کی مقدار مناسب ہو تو ہضم کی عمدگی اور اخلاطِ بدنیہ کے عمدہ پیدا ہونے سے بدن کی پرورش اچھی طرح سے ہوتی اور رنگ میں رونق و صفائی آتی ہے۔ ان وجوہات سے گوشت کو سب سالنوں کا سردار کہنا بجا ہے۔

ڈاکٹر بھی اس سے متفق ہیں کہ تندرستی کی حالت میں پرورشِ بدنی کے لیے غذا سے جن کیمیاوی اجزا کے حاصل کرنے کی ہمیں ضرورت ہے اور جو نسبت باہمی ان اجزا ئے محصولہ میں ہونی چاہیے، وہ تمام اجزائے مطلوبہ نسبت مقصود کے موافق اسی حالت میں بآسانی اور عمدگی سے حاصل ہو سکتے ہیں، جب کہ ہماری غذا اشیائے نباتاتی اور گوشت سے مرکب ہو۔ کیونکہ صرف نباتاتی غذاؤں میں بعض اجزائے ضروریہ نسبت مطلوبہ سے بہت کم ہوتے ہیں اور اسی کے قریب قریب ان غذاؤں کا حال ہے، جو صرف حیوانی ہوں۔

۹ ۔" ابو نعیم نے انس بن مالک سے روایت کی کہ حضرتؐ نے فرمایا: رات کا کھانا مت چھوڑو، اس سے بڑھاپا جلدی آتا ہے۔"

خالی پیٹ ہونے اور بھوک کی حالت میں بلا کھائے سوئے رہنے سے بدن کی موجودہ رطوبتیں تحلیل ہوتی رہتی ہیں اور بحالتِ صحت جب کہ بدن میں فضلی رطوبات زیادہ نہ ہوں، تو خالی پیٹ سو رہنے سے وُہ غذائی رطوبتیں تحلیل ہونے لگتی ہیں، جن کا ذخیرہ بدن میں ہر وقت بقدر مناسب جمع رہنا حفظِ صحت اور بقائے قوت کے لیے ضروری ہے، اگر کچھ دنوں ایسا کیا جاتے تو رفتہ رفتہ بدن دُبلا، بے رونق اور خشک ہونے لگتا ہے، تمام قوتوں میں ضعف آنے لگتا ہے۔ اس لیے رات کو بے کھائے سو رہنا طبی قواعد کے رُو سے بھی ممنوع ہے۔

۱۰ ۔" جامع کبیر نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا: "کھُمبی آنکھوں کے لیے شفا ہے۔"

کھنبی کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ اُن میں سے اکثر زہریلی ہونے کے باعث استعمال نہیں کی جاتی ہیں۔ لیکن ایک قسم کی کھنبی جو سفید گول چھوٹی ہوتی ہے اور اس میں ایک قسم کی تیز بُو اور چیپ دار رطوبت نہیں ہوتی اور صاف وپاک زمین میں اُگتی ہے، اس میں سمیت نہیں ہوتی اور وُہی استعمال میں آتی ہے۔ اس کا مزاج سرد اور تر تیسرے درجہ میں ہے۔ اس کا تازہ پانی آنکھ میں لگانے سے جرب پلک اور جالا کو نفع ہوتا ہے، بصارت قوی اور تیز ہوتی ہے۔ اگر سُرمہ کو اس کے پانی سے پیسا گیا ہو، تو اس کے لگانے سے نزول الماء کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

۱۱ ۔ "دو اصحابیوں کو، جن کے شدت سے خارش تھی، ریشمی کُرتے پہننے کی نصیحت کی۔"

ریشمی لباس بدن کو فربہ اور باعتدال گرم کرتا ہے۔ گردہ اور پشت کو قوت دیتا ہے، جرب کے لیے مفید ہے۔ بدن اور لباس میں جُوں کی پیدائش کا مانع ہے۔ لیکن اس سے بدن کی جلد رقیق اور نازک ہو جاتی ہے۔ اس کی اصلاح یہ ہے کہ ریشم اور سوت سے ملا کر بُنا ہُوا کپڑا پہنا جائے، تو اس سے یہ مضرت نہ ہو گی۔

یہی وجہ ہے جو شریعتِ اسلام نے مردوں کو ریشم اور سُوت سے بُنے ہُوئے کپڑے پہننے کی اجازت عطا فرمائی ہے۔ فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ۔

اسلامی عہد میں تعلیمِ نسواں

ڈاکٹر احمد شلبی

قرونِ وسطیٰ میں تعلیمِ نسواں سے متعلق جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کو مشرق و مغرب دونوں جگہ مرد کے مقابلے میں تعلیم کے مواقع بہت ہی کم میسّر آئے۔ اسلامی دنیا میں تعلیمِ نسواں پر بحث کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ چند ایسے اقتباسات پیش کریں، جن سے اس عہد کی عیسائی دنیا میں عورت کے ذہنی معیار کا اندازہ ہو جائے۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں عورت کی مطلق کوئی وقعت نہ تھی۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ رومن کیتھولک مذہب عورت کو دوم درجہ کی مخلوق گردانتا تھا جیسا کہ وِتھ نڈسن (WIETH KNUDSEN) لکھتا ہے کہ:

"قرونِ وسطیٰ کے لوگوں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا کہ عورت کو مطلق کوئی اختیار نہیں دیا۔ کسی طاقت ور کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اگر کچھ اختیار تھا تو یہ کہ وُہ گھرداری کے تنگ دائرہ میں پھنسی رہے۔"

اِسی نقطۂ نظر کو انسائیکلوپیڈیا آف ایجوکیشن میں ذرا تفصیل سے یُوں بیان کیا گیا ہے:

"فرانسسکو ڈا باربرینو (FRANCESCO DA BARBERINO) کے نزدیک امیرزادی کو نوشت و خواند سیکھنے کی محض اس وجہ سے اجازت دی گئی تھی کہ وہ بالغ ہو کر اپنی جائداد کی دیکھ بھال کر سکے۔ جہاں تک دیگر معززین، اطباء، ججوں اور دیگر شرفاء کی لڑکیوں کا سوال ہے وہ کافی بحث و مباحثہ کے بعد یہ طے کرتا ہے کہ بہتر ہے، وُہ لکھنا پڑھنا نہ سیکھیں۔ علاوہ بریں تاجروں اور اہلِ حرفہ کی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی قطعی ممانعت تھی۔"[1]

جون لینگڈن ڈیوس (JONN LANG DON DAVIS) بھی اپنی کتاب "مختصر تاریخ خواتین" (SHORT HISTORY OF WOMEN) میں طبقۂ امراء کی خواتین کی کچھ ایسی ہی تصویر کھینچتا ہے۔ پہلے وہ یہ سوال کرتا ہے کہ "عہدِ شجاعت کی خاتون اپنی محل سرا سے میں کس قسم کی زندگی گزارتی تھی؟" پہلی چیز تو یہ ہے کہ تعلیم میں اسے کچھ شُدبُد آ جاتی تھی۔ غالباً بچپن میں اس کا زیادہ وقت کسی اتالیق کے ساتھ یا کسی ادنیٰ قسم کے مدرسہ میں گزرتا تھا، جہاں اسے صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ وہ داستانیں اور عشقیہ افسانے پڑھ سکتی تھی، جو وہ خانہ بدوش میراثیوں سے خرید لیا کرتی تھی۔ اسی واقعہ سے ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادنیٰ طبقہ کی عورت کو ایسی تعلیم بھی میسر نہ تھی۔

انگلستان میں اواخرِ قرونِ وسطیٰ کے متعلق اے ابرام (A.ABRAM) نے یوں لکھا ہے:

"مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعلیم کو کچھ بھی اہمیت حاصل نہ تھی اور معمولی شُدبُد کے علاوہ ان سے کچھ توقع

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ایجوکیشن جلد ۴ ص ۱۶۹۰

بھی نہ کی جاتی تھی۔"

لاٹور لینڈری کا نائٹ (KNIGHT OF LATOUR LANDRY) جو اس مضمون پر مستند استاد مانا جاتا تھا، صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کی لڑکیاں کچھ پڑھنا سیکھ لیں۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو مدرسے میں اس لیے داخل کیا جائے کہ وہاں دین کی اچھی اچھی باتیں سیکھ لیں اور اس طرح اپنے فرائض اچھی طرح جان لیں اور بُری باتوں سے بچی رہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بس اس سے زیادہ وہ اس کی ذہنی تربیت کا خواہشمند نہیں۔ لوگ اپنے وصیت ناموں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ رقم نہیں چھوڑتے تھے بلکہ بجائے اس کے شادی کے اخراجات کے لیے وصیت کیا کرتے تھے۔ غالباً اکثر والدین اس سے مطمئن تھے، کہ ان کی بیٹی تھوڑی سی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے امورِ خانہ داری میں کافی مہارت رکھتی ہو اور اس میں ایک اچھی بیوی بننے کی صلاحیت ہو[1]۔

یہ تھی قرونِ وسطیٰ کی یورپی لڑکی، جس کا خاکہ وہاں کے علماء نے کھینچا ہے۔ اب ہم مسلم خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں ان مصنفین سے اتفاق نہیں ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ تعلیم نسواں بھی عام تھی۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اکثر خواتین نے تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن جہاں تک ہمارا اندازہ ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ خواتین میں تعلیم عام تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں بھی پڑھی لکھی عورتیں ان پڑھ عورتوں سے بہت کم تھیں۔ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس کا کیا سبب تھا جب کہ اسلام کے مذہبی نقطۂ نگاہ سے تحصیلِ علم میں جنس حائل نہ تھی۔ ہمارے خیال میں اس کا سبب وہ مشکلات تھیں، جن سے عموماً طلباء کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ تحصیلِ علم کے لیے سفر قریب قریب لازمی تھا اور اکثر طویل سفر کرنے پڑتے تھے اور طلباء کو مختلف قسم کے مصائب کا سامنا ہوتا تھا۔ عرب خاتون کو ایسی مشکلات سے واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ معاشرہ میں اس کا ایک مقدس مقام تھا۔ ایسا مقام جس کے متعلق ایک عرب شاعر لکھتا ہے:

"یہ فرض تو ہمارا ہے کہ ہم لڑیں اور مرتے دم تک اپنی قوم کی حفاظت کریں اور صنفِ نازک کو یہ حق نہیں کہ ان کے پرے کے پرے شان و شوکت اور تکلف کے ساتھ خراماں خراماں اِدھر اُدھر گشت کرتے پھریں۔"

یہی وجہ تھی کہ مسلمان مردوں کے مقابلہ میں خواتین تعلیم میں پسماندہ تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک کثیر تعداد کو مواقع حاصل ہوئے اور انہوں نے اس عہد کی ثقافت کے ہر شعبہ میں نمایاں حصہ لیا۔

اسلام کے قرونِ اوّل سے شروع کریں، تو ہمیں البلاذری کا یہ بیان ملتا ہے کہ ابتدائی دورِ اسلام میں پانچ عرب خواتین ایسی تھیں، جو لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

حفصہ بنت عمرؓ، ام کلثوم بنت عقبہ، عائشہ بنت سعد، کریمہ بنت مقداد اور سب سے بڑھ کر الشفاء بنت عبداللہ عدویہ جنہوں نے حضرت حفصہؓ کو بھی پڑھایا تھا اور آنحضرت صلعم نے ان سے کہا تھا کہ وہ آنحضرتؐ سے شادی کے بعد بھی حفصہؓ کو پڑھاتی رہیں۔ ازواجِ مطہرات میں سے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمیٰؓ پڑھ سکتی تھیں لیکن انھیں لکھنا نہیں آتا تھا[2]۔

الشفاء کا حضرت حفصہؓ کو پڑھانا لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک مثال قایم ہو گیا۔ ہمیں کوئی مثال ایسی نہیں ملی کہ جس سے یہ ظاہر ہو

---

[1] ENGLISH LIFE AND MANNERS IN THE MIDDLE AGES [2] فتوح البلدان (بلاذری) ص ۴۵۸

کہ لڑکیاں مکاتب میں پڑھتی تھیں یا لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ خواتین کی ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور درخواست کی کہ ہفتہ میں کم سے کم ایک دن آنحضرت صلعم ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی مقرر فرمائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلعم باقاعدہ خواتین کو جمع کرکے ان کو تعلیم دیتے اور پند و نصائح فرمایا کرتے تھے۔ بعض مصنفین نے اس معاملہ میں غلطی کی ہے۔ خلیل طوطح نے اپنی تصنیف "التربیۃ والتعلیم عند العرب" کے صفحہ ۹۹ پر بحوالہ الاغانی تین اقتباسات دیے ہیں، جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ مکتب میں پڑھتی تھیں۔ لیکن یہ اقتباسات اصل ماخذ میں اس طرح نہیں پائے جاتے۔ الاہوانی اس نکتہ پر متضاد بیانات دیتا ہے۔ پہلے تو وہ یہ لکھتا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم مکاتب میں ہوتی تھی[1] اور پھر لکھتا ہے کہ گھر پر تعلیم دینے کا دستور تھا[2]

ہم اس بات پر متفق ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلم لڑکی کو گھر پر ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہی خیال ابن سحنون کی تصنیف آداب المعلمین کے دیباچہ میں ظاہر کیا گیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"اکثر و بیشتر باپ اپنی بیٹی کو پڑھایا کرتا تھا۔ جیسا کہ عیسیٰ بن مسکین (متوفی ۲۰۸ھ) نے کیا، جو ظہر کے وقت تک اپنے شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے اور اس کے بعد اپنی بیٹیوں اور بھتیجیوں اور پوتیوں اور نواسیوں کو قرآن مجید اور دیگر علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے"[3]

شہرۂ آفاق شاعر الاعشا اپنی بیٹی کو پڑھایا کرتا تھا۔ وہ ایسی تربیت یافتہ اور مہذب خاتون ہوئی اور اس نے ایسا ذوقِ سلیم پایا تھا کہ باپ اپنی تازہ نظموں پر اس کی تنقید و تبصرہ پر اعتماد کیا کرتا تھا[4]

بعض حالات میں امرا اور خاندانِ شاہی کی لڑکیوں کے لیے اتالیق مقرر کیے جاتے تھے[5] گھر کی چار دیواری میں تعلیم حاصل کر کے بہت سی عورتوں نے اعلیٰ قابلیت حاصل کی، خصوصاً فلسفہ، تاریخ میں بہت نام پیدا کیا۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ انصار خواتین کی تعریف کیا کرتی تھیں کہ وہ اس مضمون پر عبور حاصل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتیں[6]

مسلم خواتین نے نہ صرف اسلامی علوم حاصل کیے، بلکہ اسلامی کردار اور شرافت میں بھی نام پیدا کیا۔ اس ضمن میں ہم ایک قصہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جس سے ایک مسلم خاتون کا اعلیٰ کردار ظاہر ہوتا ہے۔

۷۳ھ میں الحجاج کی افواج نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو شکست دی اور ان کے اکثر ساتھیوں نے جن میں بہت سے قبائلی سردار تھے، ہتھیار ڈال دیے۔ مایوسی کی حالت میں حضرت عبداللہ بن زبیر اپنی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور اس وقت ان دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ یہ ہے:

ابن زبیر: اماں! میرے ساتھیوں نے میرے ساتھ دغا کی۔ اب صرف چند آدمی میرے ساتھ ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنی امداد سے دست کش ہو جائیں گے۔ اگر میں شکست مان لوں، تو دشمن میری شرائط ماننے کے لیے تیار ہے۔ براہِ کرم مجھے مشورہ دیجیے۔

---

[1] التعلیم عند القابسی ص ۷۰ [2] ایضاً ص ۸۳ [3] ایضاً ص ۱۹۲ [4] الاغانی ص ۲۲ [5] ایضاً ص ۱۰۶ [6] آداب المعلمین ص ۲۳ [7] البخاری ص ۶۴

اسماد : بیٹے ! مجھ سے زیادہ تمھیں اپنے حالات کی خبر ہے۔ اگر تمہیں یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور تم نے بدعت کے خلاف جہاد کیا ہے، تو پھر جب تک جان میں جان ہے، اسے جاری رکھو اور بنی امیہ کی اطاعت قبول نہ کرو۔ اگر تمہیں دنیا کی خواہش ہے، تو پھر تم سے بد تر کوئی غلام نہیں، کہ تم خود کو اور اپنے ساتھیوں کو ایک معمولی چیز کے لیے تباہ کر رہے ہو۔ ساتھیوں کی کمزوری کے باعث ہتھیار نہ ڈالو۔ کیونکہ یہ نیکوں کا شیوہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ جس مقصد کے لیے تمہارے دوستوں نے جان دی ہے، تم اسی مقصد کے لیے جہاد جاری رکھو جب تک کہ فتح یا شہادت نصیب نہ ہو۔

عبداللہ : اماں ! مجھے ڈر ہے کہ شامی مجھے پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ میری لاش گھسیٹیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

اسماد : بیٹے ! بھیڑ جب ذبح ہو جاتی ہے، تو کھال کھینچنے سے نہیں ڈرتی[1]

رفتہ رفتہ جوں جوں تہذیب و ثقافت پھیلتی گئی، مسلم خواتین ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہیں۔ اب ہم ان سطور میں مختصر طور پر یہ دکھائیں گے کہ مختلف خواتین نے مختلف مضامین میں کیسے کیسے کارنامے انجام دیے۔

دینیات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کے دل پسند مضامین حدیث و فقہ تھے۔ ہمیں کثیر تعداد اور مختلف زمانوں میں ایسی خواتین ملتی ہیں، جنھوں نے محدثین اور فقہاء میں ناموری حاصل کی۔

ابن حجر نے اپنی تصنیف "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" میں اسلام کے قرون اولیٰ کی پندرہ سو تینتالیس محدث خواتین کے سوانح حیات جمع کیے ہیں۔ النووی نے اپنی کتاب "تہذیب الاسماء" میں الخطیب البغدادی نے تاریخ بغداد میں اور السخاوی نے الضوء اللامع میں بہت سا حصہ ان خواتین کے حالات کے لیے وقف کیا ہے۔ جنھوں نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔

ہم یہاں صرف چند ایسی خواتین کا حال درج کرتے ہیں جنہوں نے دینیات میں کمال حاصل کیا۔

سب سے زیادہ افضلیت ام المومنین حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ اپنی نصف دینی تعلیم کے لیے انھیں عائشہؓ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ان سے ایک ہزار احادیث مروی ہیں، جن کو انھوں نے براہِ راست آنحضرتؐ سے سنا ہے[2]

حضرت علیؓ کی اولاد میں نفیسہ ایسی مستند محدثہ تھیں کہ فسطاط میں امام شافعی ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتے تھے حالانکہ اس وقت انھیں بھی شہرت اور عروج حاصل تھا[3]

فاطمہ بنت الاقرع ایک مشہور زمانہ عالم و فاضل تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کی خوشنویس۔ انھوں نے کثرت سے قابل اساتذہ کے حلقۂ درس میں شرکت کی تھی اور اپنے بے شمار شاگردوں کے علم سے بھی استفادہ کیا تھا[4]

شیخا شہداء ملقب بہ فخر النساء، جامع مسجد بغداد میں ایک مجمع کے سامنے ادب، خطابت اور شاعری پر لیکچر دیا کرتی تھیں۔

---

[1] تہذیب تاریخ دمشق ص ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ابن کثیر ص ۱۴۷

[2] تہذیب الاسماء ص ۸۴۸

[3] ابن خلکان ص ۲۵۱

[4] الکامل ص ۱۰۸

وقائع اسلام میں ممتاز علماء کے ساتھ اس خاتون کا بھی نام لیا جاتا ہے۔

ایک ممتاز خاتون زینب بنت الشعری نے اپنے زمانے کے نامور علماء دین سے تعلیم حاصل کر کے سندات حاصل کی تھیں۔ ابنِ خلکان کا بیان ہے کہ جب وہ دو سال کا تھا، تو ان خاتون نے اسے بھی ایک سند دی تھی۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ بچوں کی ہمت افزائی اور ان کی سعادت مندی کے لیے اس قسم کی سندیں عطا کی جاتی تھیں، "تاکہ بچہ اپنی ذاتی محنت و قابلیت سے ایسی سندات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

سب سے آخر میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تقریباً پانسو طلبا ابو الخیر الاقطع کی وادی عینده کے حلقۂ درس میں شریک ہُوا کرتے تھے۔[1]

ان عالم و فاضل خواتین کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جن کی تعلیم و تربیت کے ممنونِ احسان بے شمار مرد علماء ہیں۔

مشہورِ زمانہ الخطیب البغدادی کریمہ بنت احمد المروزی کے شاگرد تھے۔ موصوفہ نے انھیں صحیح بخاری کا درس دیا تھا۔[2]

علی بن عساکر کے اساتذہ میں اسّی سے زیادہ خواتین تھیں۔[3]

غرناطہ کے ابوحیان اپنے اساتذہ میں تین خواتین کا نام بھی لیتے ہیں، یعنی مینسہ بنت الملک الکامل، شامیہ بنت الحافظ اور زینب بنت عبداللطیف البغدادی۔[4]

دو ممتاز خواتین عائشہؓ بنت محمد اور زینب بنت کمال الدین نے مشہورِ زمانہ سیاح ابن بطوطہ کو سندات عطا کی تھیں۔

ادب

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اکثر خواتین نے شاعری اور خطابت میں نام پیدا کیا۔ اکثر حالات میں وُہ اپنے ہم عصر مردوں کے برابر اور بعض حالات میں ان سے بڑھ کر ثابت ہُوئیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

النضر ابن الحارث ہجرت سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کیا کرتا تھا اور حضورؐ کو تنگ کیا کرتا تھا۔ جب غزوہ بدر میں وُہ گرفتار ہُوا، تو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی بہن قتیلہ نے ایک درد ناک مرثیہ لکھا، جسے سُن کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مرثیہ ایسا ہے کہ اگر اس کی زندگی میں سُنا جاتا تو ممکن تھا کہ مجرم کی معافی کا باعث ہوتا۔[5]

الفرزدق کی بیوی کو ادب میں اس قدر درک حاصل تھا کہ خود اس کا شوہر اور شاعری میں اس کا حریف جریر دونوں فیصلہ کے لیے اس کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اعلیٰ درجہ کی نظموں میں دونوں کا پلّہ برابر ہے۔ لیکن ادنیٰ درجہ کی نظموں میں جریر کا کلام فرزدق سے بہتر ہے۔[6]

صفیہ جو اشبیلیہ (SEVILLE) کی رہنے والی تھی، خطابت اور شاعری کی صلاحیتوں میں ممتاز تھی، لیکن علاوہ ازیں وُہ خوشنویسی میں سب سے سبقت لے گئی تھی۔ اس کی تحریر کی ہر شخص مدح و ثنا کرتا تھا اور وہ ماہر محررین کے لیے ایک نمونہ تھی۔[7]

---

[1] کتاب الشکوا ص ۵۰ ایشیاٹک ۱۹۳۰ء [2] معجم الادبا ص ۲۴۷ [3] ایضاً ص ۲۴۰ [4] النعیمی ص ۱۰۱

[5] تحفۃ النظار ص ۲۲۲ [6] البیان والتبیین ص ۹۳ [7] A SHORKHIF OF SORACCU P.569

زینب اور حمیدہ بنات زیاد نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعرہ تھیں۔ علم و فن کے ہر شعبہ میں انھیں کمال حاصل تھا اور دونوں حسین و جمیل بھی تھیں، دولت مند تھیں، دلنواز تھیں اور منکسر المزاج۔ علم کی محبت انھیں علماء و فضلاء کی جماعت میں لے آئی تھی، جن سے وُہ نہایت شان و شوکت اور اطمینان سے مساویہ ملتی جلتی تھیں۔ لیکن خواتین کے سے طور طریقوں کا لحاظ رکھتی تھیں [1]

مریم بنت ابی یعقوب انصاری نہایت ممتاز شاعرہ اور ادب کی استاد تھیں۔ ان کا حلقۂ درس عورتوں کے لیے تھا، جو ان کے علم سے استفادہ کرنے آیا کرتی تھیں [2]

ہدانیہ نے اپنے استاد ابو المطرب عبدالمنان سے پڑھا تھا، لیکن وُہ استاد سے بڑھ گئی۔ اس نے المبرد کی تصنیف 'الکامل' پر اور القالی کی 'النوادر' پر عبور حاصل کر لیا تھا اور علم عروض میں مسلّمہ استاد تھی [3]

حفصہ الرکونیہ ساکن غرناطہ اپنی شرافت، اپنے حسن اور دولت و قابلیت کے باعث مشہور رہتی تھی۔ اس کی شاعری میں محبت کے جذبات بھرے ہُوئے تھے، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے، جو یاقوت اور ابن الخطیب نے نقل کیے ہیں۔ وہ خلیفہ کے محل میں خواتین کی استاد و اتالیق تھی [4]

ایک بیش قیمت مخطوطہ موسومہ نزہت الجلساء فی الاخبار النساء مصنفہ السیوطی دمشق کے کتب خانہ الظاہریہ میں ہے۔ اس میں ستائیس خواتین شعراء کے سوانح حیات درج ہیں، جن میں سے ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

تقیہ ام علی بنت ابی الفرج (متوفی ۵۷۷ھ) نہایت قابل خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے صلاح الدین کے بھتیجے تقی الدین عمر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا، جو ساقی نامہ کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس میں شاعرہ نے نہایت خوبی سے ایک محفل مے نوشی کا بے کم و کاست نقشہ کھینچا تھا ساغر و مینا اور دیگر کوائف اس طرح بیان کیے گئے تھے کہ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاعر خود ایک عادی مے خوار ہے۔ قصیدہ پڑھ کر تقی الدین نے بالاعلان کہا کہ شاعر کو ضرور محفل مے نوشی کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس خاتون نے ایک رزمیہ قصیدہ لکھ ڈالا، جس میں اس نے جنگ کی کل جزئیات نہایت تفصیل سے بیان کی تھیں اور میدانِ جنگ و جنگجو بہادروں کا نقشہ کھینچا تھا۔ جب اس نے یہ رزمیہ نظم تقی الدین کو بھیجی، تو ایک خط میں لکھا کہ مجھے جتنا تجربہ بزم کا ہے، اتنا ہی رزم کا ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر تقی الدین نے اس کے اعلیٰ تخیل کا لوہا مان لیا اور اس کی بے حد تعریف کی۔

موسیقی و نغمہ

ایچ۔ جی فارمر کا قول ہے کہ:

"مہد سے لحد تک اور لوری سے لے کر مرثیہ تک عرب اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر لمحہ کے لیے ایک خاص موسیقی ہے۔ خوشی و غم میں، کام کاج میں، کھیل کود میں، میدانِ جنگ اور مراسم مذہبی میں قرونِ وسطیٰ کے ہر عرب گھرانے میں ایک مغنیہ کا ہونا ایسا ہی لازمی تھا، جیسا آج کل ہر گھر میں پیانو۔" [5]

---

[1] نفح الطیب ص ۱۴۴۲ [2] ایضاً ص ۱۱۴۳ [3] ایضاً ص ۱۰۷۸ [4] ارشاد (یاقوت) ص ۱۱۹

[5] LEGACY OF ISLAM (ARNOLD) P. 358.

اس بیان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دور میں اربابِ نشاط کی کتنی تعداد ہوگی ہم قارئین کی توجہ مشہور زمانہ کتاب الاغانی کی طرف مبذول کراتے ہیں جس میں ایسی متعدد لڑکیوں کا حال درج ہے۔ یہاں ہم اس کتاب سے اور نہایت الارب اور نفح الطیب سے صرف چند گانے والی لڑکیوں کے مختصر حالات درج کرتے ہیں۔

مسلمان مغنیوں کے اوّلین دور میں جمیلہ کا نام ملتا ہے۔ اس سے معبد ابن عائشہ، حبابہ، سلامہ، عقیلہ خالدہ اور ربیعہ نے گانا سیکھا۔ نامور مغنی معبد کو اس بات کا اقرار ہے کہ وہ خود اور اس کے ساتھی جمیلہ ہی کے علم و فن کے پھل ہیں اور بغیر اس کی تعلیم کے وہ ہرگز شہرت حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اس دور میں جب ابن سریح، الفرید، معبد اور دیگر موسیقاروں میں مقابلہ ہوتا تو جمیلہ ہی جج مقرر ہوا کرتی تھی[1]

دنانیر جو خاندان برامکہ سے متعلق تھی، نہایت نامور مغنیہ تھی۔ علاوہ اس کے کہ اس نے گانے میں شہرت حاصل کر لی تھی، وُہ اپنے حسن و جمال، بذلہ سنجی اور ادبی وانفیت کے باعث بھی مشہور زمانہ تھی۔ اصفہانی کا بیان ہے کہ اس نے فنِ موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی[2]

خلیفہ مہدی کی بیٹی علیہ ایک مشاق شاعرہ، ایک ممتاز مغنیہ اور ایک نامور موسیقار تھی۔ وہ اور اس کا بھائی ابراہیم دونوں اس فن میں لاثانی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بھائی پر سبقت لے گئی تھی۔ نامور مغنیہ عریب اس دن کو اپنی زندگی کا بہترین دن بتاتی ہے، جس روز اس نے علیہ کا گانا سُنا اور اس کے ساتھ اس کے بھائی نے نوازی کی[3]

منیتم ہاشمیہ، جو اسحاق اور اس کے باپ کی شاگرد تھی، اپنے حُسن و جمال، نغمہ سرائی اور ادبی قابلیت میں مشہور تھی۔ ایک مرتبہ وُہ خلیفہ المعتصم کے سامنے گا رہی تھی اور ابراہیم بن مہدی بھی موجود تھا۔ جب وہ گیت ختم کر چکی تو ابراہیم نے اس کو دوبارہ گانے کی فرمائش کی۔ لیکن اس نے اپنے آقا سے کہا کہ ابراہیم اس طرح سُر سیکھ لے گا۔ اس لیے اس نے اپنے آقا سے اجازت حاصل کی کہ وہ گیت دوبارہ نہ گایا جائے۔ کچھ دن بعد یہ ہُوا کہ ابراہیم اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ منیتم وہی گیت اپنے گھر میں گا رہی تھی۔ ابراہیم چپکے سے وہاں کھڑا ہو گیا اور اس نے تمام کا تمام نغمہ یاد کر لیا۔ بعد ازاں دروازہ پر دستک دی اور اکڑ کر کہا کہ میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے[4]

خدیجہ بنت المامون نہایت اعلیٰ درجہ کی شاعرہ اور مغنیہ تھی، ایک روز بوقتِ شب شاریہ نے نہایت عمدہ گیت خلیفہ المتوکل کے سامنے گایا۔ خلیفہ نہایت خوش ہُوا اور اس نے دریافت کیا کہ یہ پیارا گیت تو نے کہاں سے سیکھا؟ اس نے جواب دیا کہ گیت اور لے دونوں خدیجہ بنت المامون کی تخلیق ہیں[5]

خلیفہ عبدالرحمٰن ثانی کے محل کا ایک حصہ دار المدنیات کہلاتا تھا۔ جہاں مدینہ کے تین گویے قلم، علم اور فضل رہا کرتے تھے۔ ان میں سے فضل اپنے فن میں سب سے ممتاز تھا[6]

عُلیدہ الطنبوریہ کمال حُسنِ صورت و سیرت اور طباعی کی مالک خاتون تھی۔ وُہ نہایت نفاست سے طنبورہ بجایا کرتی تھی اور اسی وجہ سے

---

[1] الاغانی ص ۱۲۴، نہایت الارب، ص ۹۴
[2] الاغانی ص ۳۶
[3] الاغانی ص ۸۳ - ۹۵، نہایت الارب ص ۲۳۱
[4] الاغانی ص ۳۱ - ۳۸
[5] الاغانی ص ۱۱۴
[6] نفح الطیب ص ۸۰ھ (المقری)

بر اس کا لقب پڑ گیا تھا، علاوہ ازیں اس کے گلے میں بڑا لوچ تھا[1]

طب

خدمتِ خلق کے وہ فرائض، جو اس تہذیب یافتہ دور میں صلیبِ احمر کے ادارے سرانجام دیتے ہیں، اکثر اسلامی لڑائیوں میں خواتین اسلام انجام دیا کرتی تھیں۔ جب فتح خیبر کے لیے اسلامی افواج تیاری کر رہی تھیں، اُمیہ بنت قیس الغفاریہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مع ایک جماعتِ خواتین حاضر ہوئیں اور افواج کے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی تاکہ زخمیوں کی مرہم پٹی کریں اور دیگر ممکن خدمات انجام دیں۔ آنحضرتؐ نے اجازت دے دی اور انھوں نے یہ فرائض انجام دیے[2]

الربیع بنت معوذہ کے متعلق روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ اسلامی افواج کے ساتھ خواتین بھی رہا کرتی تھیں، تاکہ زخمیوں کی دیکھ بھال کریں اور پانی پلائیں اور زخمیوں کو واپس مدینہ پہنچائیں[3]

علاوہ ازیں ایسی خواتین کے حالات بھی ملتے ہیں، جنھوں نے علمائے طب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

قبیلہ بنی اَود میں زینب بہت مشہور طبیبہ اور ماہر امراضِ چشم تھی۔

ام الحسن بنت القاضی ابی جعفر الطنجالی مختلف مضامین میں بہت وسیع علم کی مالک تھی، لیکن وہ بحیثیت طبیب بہت مشہور تھی[4]

الحفیظ بن زہر کی بہن اور اس کی بیٹی، جو المنصور بن ابی عامر کے زمانے میں مشہور تھیں۔ بہت اچھی طبیب تھیں اور امراضِ نسوانی میں ماہرِ خصوصی تھیں اور محل شاہی کی خواتین کے علاج معالجہ کے لیے ان ہی کو بلایا جاتا تھا[5]

فوجی خدمت

اسلام نے بہت سی ایسی خواتین پیدا کی ہیں، جنھوں نے عسکریت میں نام پیدا کیا ہے۔ تاریخ میں ہمیں نصیبہ زوجہ زید ابن عاصم کا حال ملتا ہے، جس نے غزوۂ اُحد میں حصہ لیا تھا۔ جب غنیم نے ایک ساتھ ہلّہ بولا، تو اس نے اس حملے کو روکا اور اپنی تلوار سے گیارہ اشخاص کو زخمی کیا[6]

تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلم خواتین نے بیشتر جنگوں میں بھی عملی حصہ لیا تھا۔ چنانچہ جنگ یرموک میں مسلم خواتین بڑی بے جگری سے لڑیں۔ ہند بنت عتبہ بار بار دیگر خواتین کو تلقین کرتی تھی کہ اپنی تلواروں سے مردوں کی مدد کریں[7]

اسی جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑا تو جویریہ بنت ابی سفیان اپنے شوہر کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑتی ہوئی نظر آئی[8]

جنگ صفین میں ایک "سرخ اُونٹ" بہت نمایاں تھا۔ اس پر الزرقاء بنت عدی سوار تھی۔ اس کی مستعدی اور جوشیلی تقریر پروانِ علیؓ کی ہمت افزائی اور جنگ کے نتائج پر بہت اثر انداز ہوئی[9] ایک دوسری خاتون عسکری شاہ بنت الاطرش نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ میدان جنگ میں سامانِ حرب اٹھاتے ہوئے اس کو نہایت جوش و خروش سے جاتے ہوئے دیکھا گیا[10]

---

[1] SHORT HISTORY OF THE SARACENS [2] المراۃ العربیہ (عبداللہ عفیفی) ص ۴۴ [3] الاصابہ (ابن حجر) ص ۵۷۵
[4] ایضاً ص ۷۵ [5] طبقات الاطبا (ابن ابی اصیبعہ) ص ۰۰ [6] THE ARAB WOMAN.
[7] فتوح البلدان (بلاذری) ص ۱۴۱ [8] الطبری ص ۲۱۰۰ - ۲۱۰۱ [9] العقد الفرید (ابن عبدربہ) ص ۲۱۴
[10] العقد الفرید (ابن عبدربہ) ص ۲۱۵

عہدِ منصور میں ہمیں دو شہزادیوں کے حالات ملتے ہیں، جن کے نام اُمّ عیسٰی اور لبّانہ تھے۔ یہ دونوں لباسِ حرب میں ملبوس اسلامی افواج کے ساتھ بازنطینی علاقہ کی طرف مارچ کر رہی تھیں[1]

دیگر سرگرمیاں ملکہ زبیدہ نہایت مہذب اور شائستہ خاتون تھی۔ لیکن یہاں ہم اس کا تذکرہ بطور ایک مصلح معاشرت کریں گے۔ جب اس نے ۱۸۶ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا، تو اسے معلوم ہوا کہ مکہ والوں کو پانی کی قلت کے باعث سخت تکالیف ہیں۔ لہٰذا اس نے اپنے صرفِ خاص سے ایک نہر کھدوائی، جو آج بھی موجود ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ اخراجات کثیر کے باعث خزانچی کو کچھ ہچکچاہٹ ہے تو حکم دیا کہ کام فوراً شروع کر دیا جائے خواہ کدال کی ایک ضرب پر ایک دینار صرف ہو۔ غرض اخراجات ساڑھے دس لاکھ دینار سے زاید ہوئے جو سب کے سب ملکہ نے اپنے صرفِ خاص سے ادا کیے[2]

ایک اور خاتون لبانہ نامی ساکن قرطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ وُہ خلیفہ الحکم کی معتمد ذاتی تھی اور یہ عہدہ اس وقت تک کسی عورت کو نہ ملا تھا[3]

ہم اس مضمون کو ایک مشہور قصہ پر ختم کرتے ہیں کہ:

ایک کنیز ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کی گئی، جس کی قیمت دس ہزار دینار تھی۔ خلیفہ نے شرط منظور کر لی مگر اس شرط پر کہ کنیز کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ نہایت مشہور علمائے دینیات، فقہ، تفسیر، طب، فلکیات، فلسفہ، خطابت اور شطرنج نے یکے بعد دیگرے اس کا امتحان لیا اور ہر مرتبہ اس نے نہ صرف یہ کہ ہر سوال کا جواب اطمینان بخش دیا، بلکہ ان میں سے ہر ایک عالم سے اس نے خود ایک سوال کیا، جس کا وُہ جواب نہ دے سکے۔

---

[1] الکامل (ابن الاثیر) ص ۳۰۲ [2] حضارت الاسلام فی دار السلام (جمیل نخلہ) ص ۹۰

[3] اسلامک سولزیشن (خدا بخش) ص ۲۹۵

عہدِ نبویؐ کا نظامِ تعلیم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عرب اور خاص کر مکہ معظمہ کی معاشرتی حالت کا جو قبل اسلام پائی جاتی تھی، اگر قریب سے مطالعہ کیا جائے، تو ناگزیر اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اس زمانہ کے عربوں میں غیر معمولی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ جب اسلامی تعلیمات نے ان صلاحیتوں کو صیقل کیا، تو عربوں نے اپنی اپج اور کارکردگی کی قابلیت سے دنیا کو حیران کر دیا اور جب "وحدت اور حرکت کے مذہب" یعنی اسلام نے ان کی توانائیوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور ان میں مزید قوت پیدا کر دی تو یہی عرب اس قابل ہو گئے کہ پوری دنیا کو دعوت مبارزت دیں اور وقت واحد میں اس وقت کی دونوں عالمگیر شہنشاہیتوں یعنی ایران اور روم (بیزنطینہ) سے جنگ کریں۔

میں نے اپنے بعض مقالوں میں کسی قدر تفصیل سے بتایا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی عربی خانہ جنگیاں عربوں کے کردار کو بنانے اور ان میں حیرت انگیز قوت برداشت اور دیگر اعلیٰ مہمات پسند قابلیتیں پیدا کرنے میں ممد و معاون رہیں۔ جن پر خود نپولین[1] کو رشک تھا۔ عرب میں معینہ اوقات پر لگنے والے بازاروں اور کاروانوں کی حفاظت کے لیے بدرقوں یا خفاروں کا انتظام کچھ اتنا مکمل اور وسیع ہو گیا تھا کہ اس نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک معاشی "وفاق" قائم کر دیا تھا جس سے عربوں میں وحدت کے خیالات پیدا ہونے لگ گئے تھے اور اسلام کے تحت ان کی "سیاسی وحدت" کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اسی طرح شہری مملکت مکہ کا دستور بھی خاصہ ترقی یافتہ تھا جس سے وہاں کے باشندوں کو اس بات کی تربیت مل چکی تھی کہ ایک عالمگیر شہنشاہیت کے نظم و نسق کو چلا سکیں[2]۔

آج میرے پیش نظر ایک اور مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ زمانہ جاہلیت سے عربوں کی علمی صلاحیتیں بھی اتنی خاصی تھیں کہ ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں عربوں نے علوم و فنون کی حیرت انگیز فصلیں کاٹیں۔ انہی صلاحیتوں کو جاگر کرنا، ان کی خفیہ قابلیتوں کو بیدار کرنا اور ان کو مفید اغراض میں کام میں لانا، یہ البتہ اسلام کا کارنامہ ہے۔

عہدِ نبویؐ کے نظامِ تعلیم کا اس سے بہتر پس منظر کیا ہو گا کہ اسلام سے پہلے عرب میں علمی حالت جیسی کچھ تھی، اس کا خاکہ پیش کیا جائے

عرب میں زمانۂ جاہلیت میں تعلیم

بدقسمتی سے ہمارے پاس زمانۂ جاہلیت کے تعلیمی معاملات کے متعلق بہت کم معلومات محفوظ ہیں۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے کہ اس زمانے میں وہاں لکھنے کا زیادہ رواج نہ تھا اور کچھ یہ کہ لاکھوں کروڑوں کتابیں ہلاکو خان وغیرہ نے بغداد، قرطبہ اور دیگر مقامات پر ایسے زمانے میں تباہ کر دیں، جب کہ ابھی فن طباعت سے کتابیں چھاپنے کا کام نہیں لیا جانے لگا تھا۔ اس دشواری کے باوجود جو کچھ تھوڑا بہت مواد ہم تک پہنچ چکا ہے۔

---

[1] سینٹ ہیلینا کی یادداشتیں (فرانسیسی) جلد ۳ ص ۱۸۳

[2] "شہری مملکت مکہ" جو رسالہ اسلامک کلچر جلد ۱۲ شمارہ ۳ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

اس کی مدد سے زمانہ جاہلیت کی تعلیمی حالت کا پتا چلتا ہے جس سے ہمیں حیرت ہوتی ہے اور اس قوم کے متعلق رشک ہونے لگتا ہے، جو ان پڑھ ہونے پر اتراتی تھی[1]

اولاً ان کی زبان کو لیجئے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی زبان اپنے لغات، محاورات اور ادبی کمالات میں اس زمانے میں ترقی کرتی ہے جب اس کے بولنے والوں کا تمدن عروج پہ ہو اور اس سے پہلے اس زبان کی حالت اتنی پست ہوتی ہے کہ اس کو جانوروں کی آواز سے کچھ ہی بلند قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس زبان میں نہ تو اونچے خیالات ادا کیے جاسکتے ہیں اور نہ معمولی روزمرہ کی ضرورتوں کے سوا اس میں کوئی علوم وفنون ملتے ہیں۔ اگر اس معیار پر اسلام سے عین پہلے کی عربی زبان کو جانچا جائے۔ تو ہم زبان کی نزاکت، لغات کی کثرت، قواعد صرف ونحو کے استحکام اور خاصے بلند معیار کے نظم کے ذخیرہ کے باعث حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مستند عربی زبان زمانۂ جاہلیت کی سمجھی جاتی ہے۔ اسلامی تمدن کے عہد زریں کی زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اگر ہم زمانۂ حال کی کوئی زبان مثلاً جرمن، روسی، فرانسیسی یا انگریزی کو لیں، تو ان کے دو مولف جن میں مثلاً ڈیڑھ ہزار سال کا زمانہ حائل ہو تو ایک ہی زبان کے یہ مولف ایک دوسرے کو بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے برخلاف امراء القیس کی زبان اور قواعد صرف ونحو بالکل وہی ہیں، جو مثلاً زمانہ حال کے مصری شعراء شوقی اور حافظ کے ہیں۔ قرآن اور حدیث اس "جاہلی زبان" میں ہیں جس پر عربی شہنشاہیت کے تمدن نے کوئی اثر قائم کرنے کا موقع نہیں پایا تھا۔ قرآن اور حدیث زمانہ جاہلیت کے بدویوں کو بھی اسی سہولت سے سمجھ میں آتے تھے، جتنا آج کسی جدید عربی کے متعلم کو۔ اس زمانے میں عربی زبان، لغات کی حد تک، اتنی وسیع اور متمول ہوگئی تھی کہ اس کا مقابلہ زمانہ حال کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی زبانوں سے بھی بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں کی مجھے تفصیل بیان کرنی غیر ضروری ہے کیونکہ ہر عربی دان اس سے واقف ہے۔ میرا منشا صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اسلام سے پہلے عربوں کی زبان جس پختگی اور وسعت سے بہرہ ور ہوچکی تھی، وہ یقیناً اس بات کے بغیر ممکن نہیں کہ اس سے پہلے اس زبان کے بولنے والوں میں ادبیات کی بڑی صلاحیتیں اور بڑے چرچے رہے ہوں۔

بے شمار نظمیں زمانہ جاہلیت کی طرف منسوب ہیں۔ خود نثر میں بہت سے خطبوں، تقریروں، ضرب المثلوں، کہانیوں کاہنوں اور حکموں (پنچ) کے فیصلوں وغیرہ کی صورت میں ہم تک ان کی یادگاریں پہنچی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے ہر ناظر یہ اندازہ کرلے گا کہ اس زمانہ کے عربوں میں بلاغت، ظرافت، حسن ذوق اور رقت نظر کا معیار کتنا بلند تھا۔ خود لفظ "عرب" کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنا مطلب اچھے طور سے واضح کرسکتا ہو۔ تمام غیر عرب عجم کہلاتے ہیں، جس کے معنی گونگے کے ہیں۔

یہاں تک تو استنباطات اور قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ خود تاریخی واقعات بھی مفقود نہیں ہیں۔ مدرسوں کے سلسلے میں کسے یقین آئے گا کہ اس زمانے میں وہاں نہ صرف تعلیم گاہیں تھیں بلکہ ایسی تعلیم گاہیں، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پاتی ہوں؟ بہرحال ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (جلد ۴ صفحہ ۱۰۳) میں بیان کیا ہے کہ مکہ کے قریب رہنے والے قبیلہ ہذیل کی ضرب المثل فاحشہ عورت ظلمہ

---

[1] خود ایک حدیث میں ہے "ہم ایک اُمّی قوم ہیں، لکھنا اور حساب کرنا ہمیں نہیں آتا" (مختصر جامع بیان العلم ص ۳۵)۔
معارف: اصل حدیث صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے مگر اس میں فخر کا شائبہ نہیں بلکہ قمری مہینوں کے اختیار کی وجہ بتائی گئی ہے۔

جب بچی تھی، تو ایک مدرسہ جاتی تھی، جہاں اس کا سب سے دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ دواتوں میں قلم ڈال اور نکال کر کھیلا کرے۔ اس دلچسپ واقعہ سے اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قبیلہ قریش کے رشتہ دار قبیلہ ہذیل میں ایسے مدرسے تھے، جو چاہے کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، ان میں لڑکیاں اور لڑکے تعلیم پانے کے لیے جاتے تھے۔

بازار عکاظ میں ہر سال جو ادبی چرچا ہوا کرتا تھا، اس کے باعث اسے ایک "پان عرب لٹریری کانگریس" کہنا بے جا نہ ہوگا۔ عکاظ نے مورخین اور مولفین کو ہمیشہ سے ہی لبھا رکھا ہے۔ حال میں جامعہ مصریہ کے پروفیسر احمد امین نے مجلہ کلیۃ الادب میں اس موضوع پر ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ مجھے یہاں عکاظ کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس قدر کافی ہے کہ اس ادارے کا صرف نام لے لیا جائے، جس نے عربی زبان کو معیاری بنانے کے لیے اتنا نمایاں حصہ لیا ہے۔

غیلان بن سلمہ ثقفی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے[1] کہ وہ ہفتہ میں ایک دن علمی جلسہ منعقد کرتا جس میں نظمیں پڑھی جاتیں اور ان پر تنقید ہوتی۔ ہفتے کے باقی دنوں میں وہ کسی دن عدل گستری کا کام انجام دیتا اور کسی دن دوسرے فرائض میں مشغول ہوتا۔ اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جاہلیت میں طائف والوں کا علمی ذوق بھی کتنا بلند تھا۔

اس زمانے میں مکہ کی علم دوستی اس سے بھی کچھ زیادہ ہی بلند تھی۔ سبع معلقات مکہ ہی کے معبد کعبہ میں لٹکائے جاتے رہے اور اسی اعزاز و امتیاز نے ان سات نظموں کو عربی ادبیات میں ایک لافانی زندگی عطا کر دی ہے۔ ورقہ بن نوفل مکہ کا ایک باشندہ تھا۔ اس نے زمانہ جاہلیت میں توریت اور انجیل کو عربی میں منتقل کیا تھا۔ غالباً یہ مکہ والے ہی تھے جنہوں نے عربی زبان کو سب سے پہلے ایک تحریری زبان کی حیثیت عطا کی تھی[2]۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ یہاں کے اجڈ سپاہی بھی لکھے پڑھے ہوا کرتے تھے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

قصہ نویسی، ناول اور ڈرامہ زمانہ حال میں ادبیات میں بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مکہ والوں کو بھی اس کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ چاندنی راتوں میں خاندانی اجتماع گاہوں پہ یا شہر کے مرکزی دارالندوہ میں یہ لوگ جمع ہوتے اور پیشہ ور قصہ گو وغیرہ وہاں پر جستہ باتیں سنتے ہوئے قصے بیان کر کے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے۔ اس کے کچھ حوالے میرے مضمون "شہری مملکت مکہ" میں ملیں گے۔

ادبی ذوق جاہلیت میں صرف عربوں ہی میں نہ تھا بلکہ عرب میں رہنے والی دوسری قوموں میں بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ یہودی سموأل بن عادیا اور دیگر یہودی اور نصرانی شعراء کے دیوان بھی پائے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ کے یہودیوں نے ایک بیت المدارس قائم کر رکھا تھا، جو نیم عدالتی اور نیم تعلیمی ادارہ ہوا کرتا تھا اور اسلام کے آغاز تک اس کا پتا چلتا ہے۔ (دیکھیے سیرۃ ابن ہشام میں غزوہ بنی قینقاع وغیرہ) زمانہ جاہلیت میں عربی زبان میں لکھنے پڑھنے کی چیزوں کے لیے بڑی کثرت سے الفاظ ملتے ہیں چنانچہ صرف قرآن مجید ہی میں حسب ذیل الفاظ کا ذکر ہے: رق اور قرطاس (کاغذ)، قلم، ن (دوات)، نستنسخ، مرقوم، مسطور، مستطر، مکتوب، تخطہ، تملی، یملل (لکھنے کے معنی میں جو مختلف افعال پائے جاتے ہیں، یہ ان کے صیغے ہیں) کاتب، مداد (سیاہی) اسفار، زبر، کتب، صحف (کتابوں اور تحریری چیزوں کے معنوں میں) وغیرہ

---

[1] ۔ الازمنہ والامکنہ مولفہ مرزوقی جلد ۲ صفحہ ۸۰-۷۹۔ نیز معارف ابن قتیبہ۔

[2] ۔ فہرست ابن ندیم ص ۷۔ نیز کتاب الخراج مولفہ قدامہ بن جعفر کا ٹکڑا جو آکسفورڈ میں ہے (مگر غلطی سے غلاقہ کی طرف منسوب ہے)

غرض ان اور اسی طرح کی مماثل بنیادوں پر علوم و فنون کی وہ بلند عمارتیں بعد میں زمانہ اسلام کے عربوں نے کھڑی کیں، جن پر پورے کرہ ارض کی علمی دنیا فخر کر سکتی ہے۔

قبل ہجرت اسلام یہ چیز عام طور سے معلوم ہے کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں پہلی وحی اتری۔ اس بات کا کوئی پتا نہیں چلتا کہ نو عمری میں آپ نے لکھنے اور پڑھنے کے فن میں حصہ لیا ہو یا آپ عمر بھر اُمی ہی رہے اس کے باوجود یہ کس قدر اثر انگیز واقعہ ہے کہ خدا کے پاس سے آپ کو جو سب سے پہلی وحی آئی، اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو "اقراء" یعنی پڑھنے کا حکم تھا اور قلم کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی تھی کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے۔

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے۔ جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرۂ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ یہ تیرا بزرگ پروردگار ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز بتائی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"

(قرآن مجید سورہ ۹۶۔ آیۃ ۱ تا ۴)

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا۔[1] سہولت کے لیے ہم بھی وہی مشہور تقسیم اختیار کر سکتے ہیں، جو قبل ہجرت و بعد ہجرت کے نام سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق استعمال کی گئی ہے اور اس تقسیم سے وہ زمانے بھی متعین ہو جاتے ہیں، جب آپ کے ہاتھ میں دنیاوی اقتدار تھا یا نہ تھا۔

یہ امر نمایاں کئے جانے کے قابل ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں لکھنے پڑھنے یا علم سیکھنے کا ذکر ہے، وہ مکی آیتیں ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں، اور جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟	(قرآن مجید	۳۹/۹)
۲۔ تم کو علم سے تھوڑی مقدار دی گئی ہے۔	(قرآن مجید	۱۷/۸۵)
۳۔ اللہ سے اس کے بندوں میں صرف عالم ہی ڈرتے ہیں۔	(قرآن مجید	۳۵/۲۸)
۴۔ اور کہہ میرے آقا مجھے علم میں زیادتی عطا کر۔	(قرآن مجید	۲۰/۱۱۴)
۵۔ تمہیں وہ چیز سکھائی گئی جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے آباؤ اجداد	(قرآن مجید	۶/۹۲)
۶۔ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر سات دیگر سمندروں کے ساتھ سیاہی بن جائے تو بھی خدا کے کلمات ختم نہ ہو سکیں۔	(قرآن مجید	۳۱/۲۷)
۷۔ قسم ہے پہاڑ کی اور قسم ہے ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے ایک جھلی پر جو پھیلائی گئی ہے	(قرآن مجید	۵۲/۱ تا ۳)
۸۔ قسم ہے دوات کی اور قلم کی اور اس چیز کی جو تم لکھتے ہو	(قرآن مجید	۶۸/۱)
۹۔ اگر ہم نے تجھ پر ایک واقعی تحریری چیز کاغذ پر لکھی ہوئی بھیجی ہوتی۔	(قرآن مجید	۶/۷)
۱۰۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو یاد رکھنے والوں سے پوچھ لو	(قرآن مجید	۱۶/۴۳)

[1] ترمذی ۴۴/۶۸، ابوداؤد ۳۹/۱۶، ابن حنبل جلد ۵ صہ ۳۱۵، طیالسی صہ ۵۷۷

یہ تمام مکی آیتیں ہیں۔

کسی قوم میں پیغمبر کا مبعوث ہونا تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لیے نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیں حیرت نہ ہو کہ ایک حدیث میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[1] اس کی تائید قرآنی آیتوں سے بھی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا

۱۔ (ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے دعا کی) اے ہمارے آقا ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیتیں سنائے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، تو ہی طاقت ور اور عقل مند ہے۔ (قرآن مجید ۲/۱۲۹)

۲۔ وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں کا ایک رسول بھیجا تاکہ انہیں اس کی آیتیں سنائے ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ اگرچہ اس سے پہلے وہ خاص گمراہی میں مبتلا تھے۔ (ایضاً ۶۲/۲)

۳۔ بے شک خدا نے ایمان والوں پر مہربانی کی جب اس نے ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھیجا، جو انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے فاش گمراہی میں مبتلا تھے۔ ایضاً ۳/۱۶۴

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں۔ خاص کر ایسے شخص کے لیے جو مذہب وسیاست کو بالکل الگ اور ایک دوسرے سے آزاد چیزیں نہ سمجھتا ہو، اور جس کا مطمح نظر یہ ہو کہ:۔

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا" ایضاً ۲/۲۰۱

بیعتِ عقبۂ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانہ میں جو ہجرت سے بھی دو سال پہلے منعقد ہوئی تھی، کوئی ایک درجن مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تھا، تو ان کی خواہش پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ مکہ سے ایک تربیت یافتہ معلم[2] روانہ کر دیا تھا، جو انہیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے اور دینیات اسلام سے واقف کرا سکے۔ بے شبہ اس ابتدائی زمانہ میں تعلیم سے مراد صرف مبادی دین اور عبادت کے طریقوں کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی۔

زمانہ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلے میں بیان کی جا سکتی ہے، یہ بھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبوں کو مقرر کر رکھا تھا، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے وحی نازل ہوتی جائے، اس کو لکھ لیں اور اس کی نقلیں کریں۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لانے لگے تو انہیں قرآن مجید کی چند سورتیں اپنی بہن کے گھر میں لکھی ہوئی ملی تھیں اور بظاہر ان کی بہن بھی پڑھنا جانتی تھی۔

اس سلسلے میں سب سے آخر میں حضرت موسیٰؑ کے قصے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو قرآن شریف کی ایک مکی سورت (کہف) میں مذکور ہے کہ کس طرح وہ طلب علم کے لیے گھر سے نکلے، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور دل دہلانے والے تجربے حاصل کیے اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے، ہر چیز نہیں جان سکتا۔ اور یہ کہ علم میں زیادتی کی خواہش ہو تو بیرونی ممالک کا سفر ناگزیر ہے[3]۔

---

[1] ابن عبدالبر کی مختصر جامع بیان العلم ص۲۵۔ معارف ؛۔ ابنِ ماجہ باب فضل العلماء

[2] سیرت ابن ہشام ص۲۸۹۔ [3] طلب علم کے لیے سفر کے سلسلے میں دیکھئے مقدمہ دارمی ص۴۶

بعد ہجرت

ہمارے پاس بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد ہے، اس کو سنہ وار ترتیب کی جگہ فن وار مرتب کرنا زیادہ سہولت بخش ہو گا، مثلاً مدرسوں کا انتظام، امتحانات، اقامت خانے ابتدائی تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھلانے کا بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، عورتوں کی تعلیم، صوبہ جات میں تعلیمی انتظام، صوبہ جات میں دورہ اور تنقیح کرنے والے افسر وغیرہ۔

ہم ابھی اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلعم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ روانہ کیا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ جب ہجرت کے بعد رسول کریم صلعم خود مدینہ منورہ پہنچے تو بے شمار اور بے حد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آپ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی کو دور کرنے کے کام کی شخصی طور سے نگرانی کر سکیں چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص رض کا تقرر کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں یہ بہت خوش نویس بھی تھے۔[1] رسول کریم صلعم کو ناخواندگی سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہجرت کے ڈیڑھ ہی سال بعد جب ساٹھ ستر مکہ والے جنگ بدر میں گرفتار ہو کر مدینہ لائے گئے تو آپ نے ان لوگوں کا، جو مال دار نہ تھے، ان کی رہائی کے لیے یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں۔[2]

حضرت عبادہ ابن الصامت رض کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے کی اور قرآن مجید کی تعلیم دوں۔[3]

صُفّہ سے مراد مکان کا ملحق حصہ ہوتا ہے۔ یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا، جو اس غرض کے لیے مختص کر دیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے لیے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھرے طالب علموں کے لیے دار الاقامہ کا بھی کام دے اور مدرسہ کا بھی۔ اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں، فن تجوید سکھایا جاتا تھا اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم کا بندوبست تھا جس کی نگرانی خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شخصی طور سے فرمایا کرتے تھے اور وہاں رہنے کی غذا وغیرہ کا بھی بندوبست کیا کرتے تھے۔ یہ طلبہ اپنے فرصت کے گھنٹوں میں طلب روزگار میں بھی مصروف ہوا کرتے تھے۔[4]

درس گاہ صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا بلکہ ایسے بھی بہت سے لوگ آتے تھے، جن کے مدینہ میں گھر تھے اور وہ صرف درس کے لیے وہاں حاضر ہوا کرتے تھے۔ وقتاً فوقتاً عارضی طور سے درس گاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ان کی تعداد ستر بھی تھی۔[5]

---

[1] استیعاب ابن عبدالبر ص ۲۹۳، نیز نظام الحکومت النبویہ مؤلفہ کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد،
[2] ابن سعد ۲/۱ ص ۱۴، سہیلی ۲/۹۲، مسند ابن حنبل ۱/۲۴۷، کتانی کتاب مذکور ۱/۴۸۔
[3] کتانی ۱/۴۸ بحوالہ ابوداؤد وغیرہ (معارف: ابوداؤد کتاب البیوع باب کسب العلم)
[4] بخاری باب سریۃ بیر معونہ،
[5] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷۔



مسجدِ نبوی ﷺ کا ایک منظر

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے قبائل سے بھی طلبہ آتے اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے[1]۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے کسی تربیت یافتہ صحابی کو قبائلی وفود کے ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ کر دیتے تاکہ وہ اس علاقے میں دینیات کی تعلیم کا بندوبست کریں، جس کے بعد وہ مدینہ واپس آجاتے[2]۔

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینہ کے باہر کے لوگ مسلمان ہوتے تو ان کو حکم دیا جاتا تاکہ ترکِ وطن کر کے مرکز اسلام کے قریب آ بسیں[3]۔ جہاں بعض وقت ان کو اپنی آبادی بسانے کے لیے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں[4]۔

ترکِ وطن کے اس حکم میں فوجی، سیاسی اور تمدنی جو اغراض پوشیدہ تھے، وہ ظاہر ہیں۔ ابن سعد[5] نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلے میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا، ایک معلم روانہ کیا۔ معلموں کو ہجرت کے متعلق جو عام ہدائتیں تھیں اس کی انہوں نے لفظی تعمیل کی اور کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے، وہ مسلمان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ قبیلے والے پریشان ہوئے مگر وہ سمجھ دار تھے۔ انھوں نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا تاکہ براہ راست جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معلوم کریں کہ ہجرت کے حکم کا کیا منشا ہے اور یہ عرض کریں کہ انہیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر عظیم معاشی نقصان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مشکلات کو سُن کر انہیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا، جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کرنے والوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔

مدنی زندگی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مستقل سیاست تھی کہ قبائل میں تعلیم و تربیت کے لیے معلم روانہ کریں۔ بیر معونہ کے مشہور واقعہ میں ستر قاریانِ قرآن بھیجے گئے تھے جن کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہیں نجد کے ایک آباد علاقے میں اور کثیر قبائل میں کام کرنا تھا۔

قبائلی نمائندوں کا تعلیم کی غرض سے مدینہ آنا بھی کوئی شاذ و نادر واقعہ نہ تھا[6] اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، ایسے لوگوں کے قیام و طعام اور تعلیم و تربیت کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود شخصی طور سے نگرانی فرماتے تھے اور یہ لوگ عموماً صفہ میں ٹھہرائے جاتے تھے مدینہ منورہ میں صفہ واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم از کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں[7] اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہر مسجد اپنے آس پاس کے محلہ والوں کے لیے درس گاہ کا بھی کام دیتی تھی۔ خاص کر بچے وہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ قبا مدینہ منورہ

---

[1] بخاری باب رحمۃ البہائم نیز تفسیر طبری جلد ۱۱ صفحہ ۵ نیز تفسیر خازن میں سورہ (۹) آیۃ ۱۲۲ کی تفسیر جہاں قرآن مجید میں حکم ہے کہ پوری قوم جہاد پر نہ جائے بلکہ چند لوگ تعلیم حاصل کر کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں نیز ابن عبد البر کی کتاب العلم صفحہ ۲۰ تا ۲۱)

[2] کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ صفحہ ۴۳ و مابعد

[3] دیکھئے مفتاح کنوز السنۃ لفظ ہجرہ

[4] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۲ وغیرہ۔ [5] طبقات ابن سعد باب الوفود

[6] اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے [7] ابوداؤد "کتاب المراسیل" نیز عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۶۸،

کے جنوب میں مسجد نبویؐ سے کوئی دو ڈھائی میل پر واقع ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وقتاً فوقتاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے جاتے اور وہاں کی مسجد کے مدرسے کی شخصی طور سے نگرانی فرماتے[1] بعض احادیث میں رسول کریم صلعم کے عام حکم ان لوگوں کے متعلق محفوظ ہیں جو اپنے محلے کی مسجد کے مدرسے میں تعلیم پاتے تھے[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی احکام صادر کیے تھے کہ لوگ اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کریں[3]

ایک دلچسپ واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے بیان کیا ہے[4] کہ ایک دن جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ لوگ نوافل اور خدا کی عبادت میں مشغول تھے اور کچھ لوگ فقہ کی تعلیم و تعلم میں منہمک۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں ہی لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے۔ جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں، ان کے متعلق خدا کی مرضی ہے کہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔ البتہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں، جو علم حاصل کر رہے ہیں اور جہالت کو دور کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں ——— یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لیے جگہ بنائی جہاں درس ہو رہا تھا۔

یہاں اس مشہور اور اکثر حوالہ دی جانے والی حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے[5]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی شخصی طور سے اعلیٰ تعلیم دیا کرتے تھے حضرت عمرؓ وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے، جہاں قرآن وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کیا کرتے تھے۔ اگر وہاں کوئی بے عنوانی نظر آتی تو فوراً تدارک فرما دیا کرتے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے[6] کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں رسول کریم صلعم نے قضا و قدر کے متعلق کچھ مباحثہ ہوتے سنا آپ اپنے حجرے سے باہر آئے۔ مارے غصے کے آپ کا چہرہ تمتما رہا تھا اور راوی کے الفاظ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انار کا رس آپ کے رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا گیا ہے۔ آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ بہت سی گزشتہ امتیں اسی مسئلہ میں الجھ کر گمراہ ہو گئی تھیں۔

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طے شدہ سیاست تھی کہ صرف وہی لوگ مسجدوں میں امام بنیں جو قرآن مجید اور سنت کے زیادہ سے زیادہ ماہر ہوں (جیسا کہ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔) یہ کوششیں بیکار نہ گئیں۔ اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی

---

1 ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۹۷۔

2 ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۱۴۱

3 کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ جلد ۱ ص۴۱ (معارف صحیح بخاری املاء نبوی بیان حضرت عمرؓ)

4 ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۲۵ نیز دیگر کتب حدیث۔

5 سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "عالم وفقیہ" بحوالہ بخاری و دیلمی، نیز ترمذی باب العلم۔

6 شمائل ترمذی بر موقع۔

ہوئی کہ ہجرت کو چند ہی دن گزرے تھے کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم ادھار ہو، صرف تحریری طور سے انجام پائے اور ایسی دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی لی جایا کرے۔ اس کا منشا قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ اس طرح کی تحریری گواہی "خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور شہادت کے اغراض کے لیے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے۔"[1]

مدینہ میں خواندگی کی کثرت ہو جانے کے باعث اس حکم سے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور ظاہر ہے کہ ملک میں خواندگی کی وسعت کے بغیر ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا تھا۔ گو اس میں شک نہیں کہ پیشہ ور کاتبوں کا بھی اس زمانے میں پتا چلتا ہے[2]۔

ہجرت کے بعد ہی سے سیاسی معاہدات، سرکاری خط و کتابت، ہر فوجی مہم میں جانے والے رضاکاروں کے ناموں کی فہرستیں[3]، مختلف مقامات مثلاً مکہ، نجد، خیبر وغیرہ میں خفیہ نامہ نگار[4] جو عموماً تحریری طور سے آنحضرت صلعم کو اپنے مقام کے حالات سے اطلاع دیا کرتے تھے، نیز مردم شماری[5] اور اس طرح کی بہت سی چیزیں اس بات میں ممد و معاون ہوئیں کہ خواندگی روز بروز بڑھتی ہی جائے۔ تاریخ نے رسول کریم صلعم کے کوئی ڈھائی تین سو خطوط محفوظ رکھے ہیں[6]۔ صحیح تعداد اس سے بہت زیادہ ہونی چاہیے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر چلتی تھی اور دس سال تک حکمرانی کے فرائض آپ کو انجام دینا پڑے تھے۔

عرب میں خطوط پر مہر کرنے کا رواج سب سے پہلے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے شروع ہوا[8]۔ آپ کو خط کی صفائی اور وضاحت کا جس قدر لحاظ رہتا تھا، اس کا اندازہ ان چند احادیث سے ایک حد تک ہو سکتا ہے، جن میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کاغذ کو موڑنے سے پہلے اس کی سیاہی کو ریگ ڈال کر خشک کر لو[8]، یا یہ کہ حرف "س" کے تینوں شوشے برابر دیا کرو اور اس کو بغیر شوشوں کے نہ لکھا کرو[9]۔ غالباً یہ حکم اس لیے تھا کہ شوشے نہ دینا احتیاط پسندی کے فقدان اور سستی پر دلالت کرتا ہے، یا یہ کہ لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے کیونکہ اس سے لکھوانے والے کی زیادہ آسانی سے یاد دہانی ہو جاتی ہے[10]۔

---

[1] قرآن مجید $\frac{2}{282}$، [2] کتانی کی نظام الحکومۃ النبویہ، $\frac{1}{275}$ تا ۷۷،

[3] کتانی کتاب مذکور جلد ا ص ۲۲۱ بحوالہ صحیح مسلم۔

[4] کتانی $\frac{1}{362 \text{ تا } 363}$ (معارف: خفیہ نامہ نگار کی اصطلاح صحیح نہیں ممکن ہے کسی نے اتفاقاً کوئی اطلاع بھیج دی ہو)

[5] صحیح بخاری $\frac{56}{181}$ کتانی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ مسلم شماری کی فہرستوں سے پندرہ سو اندراجات شہر مدینہ میں ہونے معلوم ہوتے تھے، جو ظاہر ہے کہ ابتدائے ہجرت کا زمانہ ہوگا۔ [6] اس پر جدید ترین تالیف الوثائق السیاسیہ کے نام سے میں نے شائع کی ہے۔

[7] کتانی $\frac{1}{177}$ فتوح البلدان مولفہ بلاذری باب الخاتم، [8] کتانی $\frac{1}{129}$

[9] ایضاً $\frac{1}{125}$ وما بعد،

[10] ایضاً $\frac{1}{125}$ وما بعد، (معارف: اوپر کی دونوں باتیں صحیح حدیثوں میں نہیں۔)

عہد نبوی ہی میں یک فنی ذوق یا تخصص ترقی کر گیا تھا اور خود جناب رسالتمآب صلعم اس کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے کہ جس کو قرآن سیکھنا ہو، وہ فلاں صحابی کے پاس جائے، جس کو تجوید یا تقسیم ترکہ کا حساب سیکھنا ہو، وہ فلاں کے پاس جائے وغیرہ[۱]۔

متعدد حدیثوں میں معلموں کو معاوضہ قبول کرنے کی ممانعت کی گئی ہے[۲]۔ عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ وہ درس گاہ صفہ میں قرآن اور فن تحریر کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے انہیں ایک کمان نذر کی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس کے قبول کرنے سے روک دیا[۳]۔

ایک مملکت کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مترجمین کی بھی ضرورت ہوا کرتی تھی، جو غیر زبانیں جانتے ہوں چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ جو دربار رسالت کے میر منشی کہے جا سکتے ہیں، فارسی، حبشی، عبرانی اور رومی (یونانی) جانتے تھے[۴]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبرانی خط لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھ لیں اور چند ہفتوں میں وہ اس میں طاق ہو گئے تھے[۵]۔ چنانچہ یہودیوں کو اگر کوئی خط بھیجا جاتا یا ان کے پاس سے کوئی خط آتا تو حضرت زید بن ثابتؓ اس کو لکھا یا پڑھ دیا کرتے تھے۔

نصاب کا مسئلہ ایسا ہے کہ اس پر پوری صحت کے ساتھ بیان کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ ہمارے پاس جو مختصر و محدود مواد ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر جگہ ایک ہی نصاب جاری نہ تھا معینہ کتب پڑھانے کی بجائے معینہ علم کے پاس لوگ جاتے اور وہ جو پڑھا سکتا، اس سے پڑھتے، بہر حال اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن و سنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ نشانہ بازی[۶]، پیراکی[۷]، تقسیم ترکہ کی ریاضی[۸]، مبادی طب[۹]، علم ہیئت[۱۰]، علم انساب[۱۱] اور علم تجوید قرآن[۱۲] کی تعلیم دی جایا کرے ایک حدیث میں یہ بھی حکم ہے کہ استاد

۱؎ طبقات ابن سعد بر موقع،

۲؎ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "علما" بحوالہ طبرانی نیز بخاری $\frac{۳۷}{۱۶}$ ابو داؤد $\frac{۲۲}{۳۶}$

۳؎ ابو داؤد جلد ۲۔ ص ۱۲۹۔ اس کا ذکر شبلی کی سیرۃ النبی طباعت دوم جلد ۲ ص ۵۰ میں بھی ہے

۴؎ کتانی $\frac{۱}{۲۰۲}$ بحوالہ العقد الفرید مولفہ ابن عبد ربہ وغیرہ

۵؎ ایضاً $\frac{۱}{۲۰۲}$ بحوالہ بخاری وغیرہ

۶؎ جمع الجوامع مؤلفہ سیوطی تحت عنوان "علموا" بحوالہ ابن مندہ، ابو نعیم و دیلمی،

۷؎ ایضاً تحت عنوان" ابو نعیم و ابن مندہ ۔

۸؎ ایضاً تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی و دار قطنی وغیرہ نیز ابن عبد البر کی کتاب العلم ص ۹۰ ، ابو داؤد $\frac{۱۸}{۱}$، ابن ماجہ $\frac{۲۳}{۱}$

۹؎ سیوطی کی جمع الجوامع تحت عنوان "تعلمن" بحوالہ مالک ۔

۱۰؎ ایضاً تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ ابن سنی ۔

۱۱؎ ایضاً تحت عنوان "تعلموا من انسابکم" بحوالہ مالک و ترمذی و بیہقی و طبری ۔

۱۲؎ ایضاً تحت عنوان "تعلموا من امر النجوم" بحوالہ دیلمی،

کی عزت کی جائے[1]

مکہ کے باشندوں کو زبان کی صفائی کا بے حد لحاظ رہتا تھا اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے بچے صحرا کی آزاد زندگی میں پرورش پائیں اور مکہ کی رنگا رنگ کی آبادی میں مل کر متاثر نہ ہوں۔ اسی لیے وہ اپنے نوزائیدہ بچوں کو مختلف قبائل میں بھیج دیتے تھے جہاں وہ کئی سال رہ کر والدین کے پاس واپس آتے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس سے سابقہ رہا تھا اور آئندہ زندگی میں آپ اسے یاد کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ معززین مکہ میں اس کا رواج آج بھی چلا آتا ہے۔

تربیت دلانے کا ایک دوسرا طریقہ مکہ والوں نے یہ اختیار کیا تھا کہ تجارت کے لیے جو کاروان جایا کرتے تھے اس میں کسی معمر کے ساتھ نوعمروں کو بھیج دیا کریں۔ چونکہ مکہ کی معاشی زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک تجارت پر تھا، اس لیے اس طریقے کی اہمیت مکہ والوں کے لیے جیسی کچھ تھی، ظاہر ہے۔ سفر کے تجارب کا فائدہ ما سوا تھا۔

اس زمانے میں نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دینی چاہیے: نشانہ اندازی اور پیراکی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ بھی بچپن ہی سے بچوں کو سکھایا جاتا تھا اور سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو سزا دینے کا حکم تھا[2]۔

عورتوں کے ساتھ علیحدہ سلوک کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہفتے میں ایک دن مقرر کیا تھا جب آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے، ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے[3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے چرخہ کا تناسب سے اچھا مشغلہ قرار دیا تھا[4]۔ ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون سے خواہش کی کہ وہ آپ کی ایک بیوی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں[5]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہ رض کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا[6]۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ آدھا علم عائشہ رض سے حاصل کرو[7]۔ قرآن نے بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا کہ وہ دوسروں کو تعلیم دیا کریں[8]۔

---

[1] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "تعلموا" بحوالہ طبرانی۔

[2] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علموا صبیکم" بحوالہ ابن حنبل و ترمذی و بغوی۔

[3] صحیح بخاری کتاب العلم۔

[4] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان "علموا (نعم لهو المؤمنة فی بیتها الغزل)" بحوالہ ابونعیم و ابن مندہ۔

[5] کتانی $\frac{۱}{۴۹ \text{ تا } ۵۵}$ بحوالہ قاضی عیاض و ابوداؤد۔

[6] سیرۃ النبی مولفہ شبلی طبع دوم $\frac{۲}{۴۳۹}$

[7] احادیث فضل عائشہ کسی کتاب حدیث میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

[8] قرآن مجید $\frac{۳۳}{۳۴}$

ایک حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کے پاس کوئی لونڈی ہو اور وہ اسے تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اور اس کی تربیت کرے اور اچھی تربیت کرے، پھر اس کو آزاد کر کے باضابطہ نکاح کرے، تو اسے دگنا ثواب ملے گا۔[1]

رفتہ رفتہ مملکتِ اسلامیہ جو ابتدائً ایک شہر مدینہ کے کچھ حصہ پر مشتمل تھی پھیلتی گئی اور نہ صرف خانہ بدوش بدوی بلکہ شہروں میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے عربوں نے بھی بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ایک نئے دین کے قبول کرنے کا ناگزیر نتیجہ تھا کہ ایک وسیع تعلیماتی نظام قائم ہو، جو دس لاکھ مربع میل کے رقبے کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ عہد نبوی کے اہتمام پر حکومت اسلامی باوجود اس قدر وسیع رقبے پر مشتمل ہونے کے دینیات کی تعلیم کی ضرورتوں سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونے لگی تھی۔ کچھ تو مرکز مدینہ سے بڑے بڑے مقامات پر تربیت یافتہ معلم بھیج دیئے جاتے تھے اور کچھ صوبہ دار گورنروں کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کر دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ماتحت علاقے کی تعلیمی ضرورتوں کا مناسب انتظام کریں۔[2] یمن کے گورنر عمرو ابن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ یا ہدایت نامہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔[3] اس میں بھی گورنر کو ہدایت ہے کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا بندوبست کریں اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا چاہیئے اور وہ جملہ یہ ہے کہ "لوگوں کو اس بات کی نرمی سے ترغیب[4] دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں" گورنروں کو جس تعلیم کے رائج کرنے کا حکم تھا، اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز باجماعت، روزہ اور حج کعبہ کے احکام شامل تھے۔

صوبہ وار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوبہ یمن میں ایک صدر ناظر تعلیمات مقرر کیا تھا، جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں ہمیشہ دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے۔[5] کوئی تعجب نہیں جو صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کئے گئے ہوں۔

آخر میں تعلیم کی نظری حیثیت کے متعلق قرآن و حدیث کے بعض احکام کی جانب اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ شروع سے آخر تک بار بار اور صاف و صریح الفاظ میں اندھی تقلید کو برا ٹھہرایا گیا ہے[6] اور اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے طور پر غور و فکر کرے اور کسی رسم و رواج کی پیروی محض آبائی و موروثی ہونے کی بنا پر نہ کرے[7]۔ کسی

---

[1] ابن عبدالبر کی کتاب العلم صہ ۲۶۔

[2] کتانی ۱/۴۳ و ما بعد،

[3] سیرت ابن ہشام صہ ۹۶۱ تا صہ ۹۶۲، تاریخ طبری صہ ۱۷۲۷ تا صہ ۱۷۲۹، کتانی ۱/۲۴۸ ۲ تا ۲۴۹ وغیرہ

[4] جمع الجوامع سیوطی تحت عنوان علموا (علموا ولا تعنفوا فان العلم خیر من العنف ۔علموا و یسروا ولا تعسروا) بحوالہ ابن سعد و بیہقی و ابن حنبل۔

[5] تاریخ طبری صہ ۱۸۵۲ و ۱۹۸۳ (احوال ۱۱ھ)

[6] ابن عبدالبر کی کتاب العلم صہ ۱۱۶ باب ذم التقلید بحوالہ آیت "اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ"

[7] طلب علم کی فضیلت کے لیے دیکھو ابوداؤد ۲۴/۱ و ۲، مقدمہ ابن ماجہ صہ ۱۷، مقدمہ دارمی صہ ۲۱ وغیرہ، ترمذی ۳۹/۱ و ۲

اور مذہبی کتاب میں فطرت کے مطالعہ پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہوگا، جتنا قرآن مجید میں۔ ہے کہ سورج، چاند، سمندر کی موجیں، دن اور رات، چمکتے ہوئے ستارے، دلکش فجر، پودے اور حیوانات ——— تمام ہی قوانین فطرت کے تابع بنائے گئے ہیں، جن سے ان کے خالق کی قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق علم لامتناہی ہے[1] اور بڑے سے بڑے عالم کا علم بھی تھوڑا ہی ہوتا ہے، یہ کہ سارا عالم انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور انسان جو زمین میں خدا کا نائب ہے، اپنے برتاؤ اور کردار کے مطابق جانچا جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اس کا بھی بار بار ذکر ہے، کہ حق و صداقت کی پیروی کی جانی چاہیئے اور موروثی عقائد و رواجات سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔

احادیث میں بھی علماء کی بڑی تعریف کی گئی ہے اور ان کو سب سے بہتر انسان قرار دیا گیا ہے[2] حتیٰ کہ ان کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے[3]۔ آخر میں ایک حدیث کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس کا اکثر حوالہ آتا ہے اگرچہ ماہرین اس کو اس کے موجودہ الفاظ میں صحیح حدیث نہیں سمجھتے لیکن اس کا مفہوم قرآن و حدیث کی عام تعلیمی پالیسی سے بالکل متفق ہے۔ یعنی "علم حاصل کرو، اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت کا فریضہ ہے[4]"

ایک حدیث میں یہ دعا ماثور ہے کہ "اے خدا میں تجھ سے علم نافع اور رزق طیب اور عمل مقبول کی استدعا کرتا ہوں[5]" اور اسی پر یہ تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا، آمین!

---

[1] قرآن مجید ۱۷/۸۵ قرآن مجید میں قصہ موسیٰ و خضر کا مقصد بھی طلب علم کی فضیلت اور علم انسانی کی قلت کو نمایاں کرنا ہے

[2] من یرد اللہ بہ خیراً یفقہہ فی الدین (بخاری ۳/۱۴، ۹۶/۱۰، ترمذی ۳۹/۴، مقدمہ ابن ماجہ ص۱۷، مقدمہ دارمی ص۲۳، ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۱۶ تا ص۱۷، حدیث خیر الناس العلماء والمتعلمون (مقدمہ دارمی ص۲۵ و ص۳۱ ابوداؤد ۲۴/۳۱

[3] اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ (بخاری ۳/۱، ترمذی ۳۹/۹ ابن عبدالبر کی کتاب العلم ص۲۱)

[4] اطلبوا العلم ولو بالصین فانّ طلب العلم فریضۃ علیٰ کُلّ مُسلم ومُسلمہ (ابن عبدالبر کی کتاب العلم، بیہقی کی شعب الایمان، ابن عدی کی الکامل اور سیوطی کی جمع الجوامع میں یہ حدیث ہے)

[5] حدیث نبوی بحوالہ کتاب العلم مؤلفہ ابن عبدالبر کی ص۹۴۔

عہدِ رسولؐ میں نظامِ تعلیم

سید رشید احمد ارشد

اسلام کے تعلیمی نظام کی اہمیت کا اندازہ لگانے سے پیشتر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ دورِ جاہلیت میں ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی حالت کیا تھی؟

ظہورِ اسلام سے پہلے عربوں کی تعلیمی زندگی کا سراغ لگانا بے سود ہے کیونکہ اس وقت اہلِ عرب ایک ناخواندہ قوم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اُمّی یعنی ناخواندہ کہلاتے تھے۔ اسلام سے پیشتر چند عربوں نے غیر قوموں کی مدد سے عربی رسم الخط ایجاد کیا تھا ورنہ اس سے پہلے عربی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا۔ یہودی اپنے عبرانی رسم الخط میں خط وکتابت کرتے تھے اور اسی طرح شام وعراق کے اپنے جداگانہ رسم الخط تھے۔ یمنی عربوں کا خط حمیری ان کے تمدن کے ساتھ ہی نیست ونابود ہو چکا تھا۔ اور وہاں کے رہنے والے بھی اس قدیم خط سے ناآشنا ہو گئے تھے۔ اسلام سے پیشتر عربوں کی کوئی مرکزی اور علمی زبان نہیں تھی بلکہ ہر قبیلے کی بولی ایک دوسرے سے مختلف تھی، ان کی بولیوں میں اس قدر اختلاف تھا کہ بعض اوقات ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کی بول چال کی زبان کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بالخصوص یمن اور جنوبی عرب کی زبان، شمالی عرب اور قریش کی زبان سے بہت مختلف تھی۔

یمن کا تمدّن

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے سبا اور حمیری قبائل کے زمانے میں جنوبی عرب کا تمدن عالمِ شباب پر تھا۔ اس وقت یہاں کے بادشاہوں نے خطِ مسند کے نام سے ایک رسم الخط ایجاد کیا تھا جو خطِ حمیری کے نام سے بھی موسوم تھا۔ یہ خط صرف بادشاہوں اور امراء کی یادگاری جنگوں، رسموں اور مخصوص احکام کو کتبوں کی شکل میں لکھنے کے لئے مستعمل رہا۔ عوام میں غالباً اس کا رواج نہیں تھا۔ کیونکہ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے جو کتبات یمن کے کھنڈروں سے برآمد کئے ہیں، انھیں صرف وہاں کے بادشاہوں اور امراء نے اپنے احکام جاری کرنے، یا اپنے جنگی معرکوں کا اعلان کرنے کے لئے خطِ حمیری میں استعمال کیا تھا، عوام کی لکھی ہوئی کوئی تحریر یا کتبہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے اور نہ کوئی ادبی، علمی یا تعلیمی قسم کی تحریر برآمد ہوئی ہے۔ البتہ مستشرقین نے ان کتبات کی مدد سے قدیم حمیری زبان کے حروفِ ابجد اور اس کے الفاظ و قواعد معلوم کر لئے ہیں جو عربی لسانیات میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔

مخصوص رسم الخط

ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ خطِ حمیری کے ذریعے یمن کے عوام کو تعلیم دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ قدیم زمانے میں عوام کو تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ اس زمانے کے تمام مہذب ممالک میں بھی تعلیم محدود ہوا کرتی تھی اور امراء کا ایک مخصوص حلقہ ہی تعلیم یافتہ ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ حمیری رسم الخط نہایت مشکل اور ناقابلِ فہم تھا۔ یہ صرف اینٹوں اور پتھروں میں کھود کر لکھنے کے لئے ہی کارآمد

ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی عربوں کا کوئی تعلیمی نظام نہیں تھا۔

دَورِ جاہلیت بہرحال اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یمن کے قدیمی تہذیب و تمدن کے دور میں عربوں کا کوئی تعلیمی نظام تھا تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب یہ مہذب سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں اور یمن کے باشندے سیلاب آنے کے بعد عرب کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہو گئے تو ان کے تمدن کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی نظام بھی ختم ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ اس کے بعد تمام جزیرۂ عرب میں جہالت و وحشت کا تاریک دَور شروع ہو گیا تھا اور اس سر زمین میں ناخواندگی اور جہالت کا وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا کہ یہ دَور "دَورِ جاہلیت" کہلایا جانے لگا تا آنکہ اسلام نے آ کر ایمان اور علم کی روشنی سے جاہلیت کے اس اندھیرے کو دُور کیا۔

مکہ معظمہ کی مرکزیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تقریباً نصف صدی پیشتر مکہ معظمہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے ایک طرح کی مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ عرب کے تمام قبائل خانہ کعبہ کو مقدس اور متبرک خیال کرتے تھے اور اس تقدس کی وجہ سے اس کے قریب سالانہ میلے اور بازار لگنے شروع ہو گئے تھے۔ اس قسم کے مرکزی اجتماعوں میں مختلف قبائل کے شعرا بھی یہاں آنے لگے اور عکاظ کے مقام پر عرب شعراء کا اجتماع ہونے لگا اور وہ خاص و عام کو اپنے قصائد سنانے لگے۔

دَورِ جاہلیت کے یہ شعراء مقبولیت حاصل کرنے کے لئے ایسی زبان میں اشعار سناتے تھے۔ جسے عرب کے سب لوگ سمجھ سکیں ایسی فصیح اور عام فہم زبان قریش کی زبان تھی کیونکہ قریش کا قبیلہ اپنے مذہبی تقدس کی وجہ سے عرب کے ہر مقام پر تجارت کر سکتا تھا اس طرح انہوں نے عرب قبائل کے تمام عمدہ الفاظ اپنی زبان میں رائج کر لئے تھے۔ یوں ان کی زبان تمام عربوں کی مرکزی زبان بن گئی تھی۔

تعلیم کا سنگِ بنیاد جب خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا کی تو سب سے پہلی وحی اسی مرکزی زبان میں نازل ہوئی۔ سب سے پہلی آیات سورۂ اقراء کی تھیں جن میں نوشت و خواند کی تلقین کی گئی تھی اور قلم کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی فضیلت کا اعتراف کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس پہلی وحی کو اسلامی نظامِ تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

تعلیم و تبلیغ نبوت کے فوراً بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ پیغام خداوندی اپنے رشتہ داروں اور دیگر اہلِ مکہ تک پہنچا دیں اور انھیں قرآن کریم کی آیات و احکام سنائیں۔ چنانچہ آپ حکم الٰہی کی تعمیل میں سخت مخالفتوں کے باوجود مکہ معظمہ میں تبلیغ کرنے لگے۔ یہی تبلیغ، اسلامی تعلیم کا سنگ بنیاد بنی اور آپ کوچہ و بازار میں ہر جگہ تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دینے لگے اور جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے، وہ آپ کی تعلیمات سے زیادہ مستفید ہوئے۔

آپ انھیں نہ صرف اخلاقی اور مذہبی تعلیم دیتے تھے۔ بلکہ ان کی عملی تربیت بھی کرتے تھے اور انھیں علم کی فضیلت سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں علم کی فضیلت کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے — ان

کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم کی فضیلت قرآن کریم میں سورۂ بقرہ میں حضرت آدم کی تخلیق کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں حضرت آدم کو خلافت الٰہی تفویض کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر فرشتوں پر ان کی فضیلت کو محض علم و دانش کی وجہ سے ثابت کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :۔

(ترجمہ) "اور خدا نے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر یہ کہا" اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ" فرشتوں نے عرض کیا" تیری ذات پاک ہے ہم تو اس کے سوا کچھ نہیں جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بلاشبہ تو ہی علم و حکمت والا ہے"

خدا نے آدم سے فرمایا" (اب) تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ" چنانچہ حضرت آدم نے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دیئے تو خدا نے فرشتوں سے کہا" کیا میں نے تم سے یہ کہا نہیں تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور انھیں بھی، جن کو تم پوشیدہ رکھتے ہو"

دوسرے مقامات پر اہل علم کی برتری کو یوں واضح کیا گیا ہے :۔

۱۔ قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون (الزمر۔ ۹)
(اے پیغمبر) کہہ دیجیے کہ کیا اہلِ علم اور جاہل افراد برابر ہو سکتے ہیں۔

۲۔ يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات (مجادلہ۔ ۱۱)
اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے، درجات بلند کرے گا۔

دینی عالموں کی اہمیت اور ضرورت کو ان آیات کریمہ میں واضح کیا گیا ہے :۔

۳۔ فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم اذا رجعوا اليهم لعلهم يحذرون ٥ (توبہ۔ ۱۲۲)
ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے۔ تاکہ وہ دین کی تعلیم حاصل کرتے رہیں اور جب وہ (تعلیم حاصل کر کے) واپس آئیں تو اپنی قوم کو تعلیم دے کر خدا کے عذاب سے ڈرائیں تاکہ وہ (آگاہ ہو جائیں اور بُری باتوں سے) پرہیز کریں۔

۴۔ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (سورۂ نحل۔ ۴۳)
اگر تم کو علم نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھ لیا کرو۔

۵۔ انما يخشى الله من عباده العلمٰؤ (۳۵/۲۸)
بلاشبہ اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے علم کے اضافہ کے لئے اس دعا کی تلقین کی گئی ہے۔

۶۔ وَقُل رَّبِّ زِدنی علماً ○ اور (اے پیغمبر کہہ دیجئے" اے پروردگار! تو میرے علم میں اضافہ کر"۔

احادیثِ نبویؐ مذکورہ بالا چند آیات میں علم اور اہلِ علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان کے علاوہ احادیث نبوی میں بھی علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ جن میں مسلمانوں کو تحصیل علم کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ ہم چند احادیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ ہے (حوالہ) معجم طبرانی کبیر و اوسط و صغیر عن ابی سعید و ابن عباس والحسن بن علیؓ)

۲۔ زمین پر عالم کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستاروں کی ہے جو بحر و بر کی تاریکیوں کو روشن کرتے ہیں۔ اگر ستارے ماند پڑ جائیں تو رہنما بھی بھٹکتے پھریں (مسند احمد)

۳۔ اللہ تعالیٰ جس کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اسے دین کا علم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ (صحیح بخاری مسلم و ترمذی عن ابن عباس و معاویہ)

۴۔ جو شخص صبح سویرے علم حاصل کرنے یا علم کی تعلیم دینے کے لئے گھر سے نکلے تو اسے ایک مکمل حج کا ثواب ملتا ہے (طبرانی کبیر عن ابی امامہ)

۵۔ جو شخص طلب علم کے لئے اپنے گھر سے نکلے تو جب تک وہ واپس نہ آجائے تو اس وقت تک اس کا مرتبہ مجاہد اور نمازی کے برابر ہوتا ہے (ترمذی عن ابن عباس)

۶۔ علم و حکمت مومن کی گم شدہ (دولت) ہے۔ جہاں سے مل جائے اسے حاصل کرنا چاہیے کیونکہ مومن اس کا زیادہ حقدار ہے (ترمذی عن ابی ہریرہ)

۷۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے تم میں سے ایک ادنیٰ مسلمان پر میری فضیلت ہو۔ جو شخص لوگوں کو اچھی تعلیم دیتا ہے اس پر اللہ، اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوق، یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں سمندر میں، دعائے خیر و برکت و رحمت کرتی ہیں۔

۸۔ العلماء ورثة الانبیاء علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں۔

۹۔ تم مہد سے لحد تک علم حاصل کرتے رہو خواہ اس کے لئے چین جانا پڑے۔

معلّمِ مدینہ مکہ معظمہ کی زندگی میں بھی آپ نے تعلیم و تبلیغ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اس سلسلے میں آپ نے گوناگوں تکالیف و مصائب کو بھی برداشت کیا مگر اصل اسلامی نظام تعلیم کا آغاز مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ تاہم ہجرت سے پہلے جب مدینہ منورہ کے چالیس[40] افراد مسلمان ہو گئے تو اہل مدینہ نے درخواست کی کہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لئے کوئی معلم بھیجا جائے۔ لہٰذا آپ نے حضرت مصعب بن عمیر کو مدینہ منورہ بھیجا۔ وہ پہلے مسلمان تھے جو مکہ معظمہ سے باہر ایک اسلامی معلم کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ ان کی تعلیمی مساعی کی بدولت تبلیدا دس

کے سردار حضرت سعد بن معاذ مسلمان ہو گئے اور اسلام مدینہ کے گھر گھر پھیل گیا۔

عام اور لازمی تعلیم

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہاں آکر آپ نے خود مختار اسلامی مملکت قائم کی تو اس کے ساتھ ساتھ آپ نے تعلیم کا اسلامی نظام بھی قائم کیا۔

اس نظام تعلیم میں سب سے مقدم اور اہم قرآن کریم کی تعلیم تھی جو مدینہ کے ہر مرد و زن کے لئے لازمی تعلیم تھی۔ بچے بوڑھے سب قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اس تعلیمی نظام کی نگرانی آپ بذات خود فرماتے تھے اور قرآن کریم کے احکام کی وضاحت کے سلسلے میں جس کسی کو کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ براہ راست آپ کے پاس آکر اپنی مشکلات کو دور کرتا تھا۔

اقامتی جامعہ

آپ نے اس نظام تعلیم کا آغاز اس طرح کیا کہ مسجد نبوی کے ایک حصہ میں سائبان اور چبوترہ (صفہ) بنوایا یہ مسلمانوں کی پہلی اقامتی جامعہ تھی کیونکہ غریب اور لاوارث صحابہ یہاں قیام بھی کرتے تھے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی درس دیتے تھے اور دیگر اساتذہ بھی مقرر کئے گئے تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن سعید بن العاص جو نہایت خوشخط تھے اور زمانہ جاہلیت میں بھی کاتب کی حیثیت سے مشہور تھے، انھیں وہاں لکھنا سکھاتے تھے اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس کام پر مامور کیا کہ وہ اصحاب صفہ کو لکھنا سکھائیں اور قرآن کریم کی تعلیم دیں۔

اصحاب صفہ

اصحاب صفہ میں وہ صحابی شامل تھے جن کا کوئی گھر بار نہیں تھا اور اپنی تنگدستی کی وجہ سے وہ مہاجرین و انصار کی طرح تجارت و زراعت میں مشغول نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا وہ روز و شب اسی سائبان کے نیچے چبوترہ پر اپنی زندگی گذار دیتے تھے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت رہنے کی وجہ سے آپ کی تعلیمات سے زیادہ مستفید ہوئے اور دیگر اساتذہ سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اسی طرح آگے چل کر یہ مسلمانوں کے معلم بنے اور انہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کو تمام دنیا میں پھیلایا۔ انہی میں حضرت ابوہریرہ بھی تھے جو احادیث نبوی کے سب سے بڑے راوی اور عالم بنے اور انہوں نے تنگدستی اور فاقہ کشی کے باوجود سب سے زیادہ احادیث نبوی کا علم حاصل کیا اور آپ کی وفات کے بعد ہزاروں انسانوں کو احادیث نبوی کی تعلیم دی چنانچہ ان کا یہ فیض تاقیامت جاری رہے گا۔

طلبہ کی تعداد

صفہ کی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی کثیر تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض کتب میں اہل صفہ کے طلبہ کی تعداد چار سو بیان کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصحاب صفہ کے علاوہ، جو وہاں مقیم اور شب باش ہوتے تھے۔ ایسے افراد بھی وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ جن کے گھر مدینہ میں تھے یا وہ گرد و نواح میں رہتے تھے۔ اہل مدینہ وہاں صرف درس کے موقع پر شریک ہوتے تھے اور گرد و نواح کے حضرات کی کافی تعداد بھی وقتاً فوقتاً درس میں شریک ہوتی تھی۔

اصحاب صفہ یعنی مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ بعض اوقات مقیم و شب باش طلبہ ستر اسّی تک ہو جاتے تھے۔

نصابِ تعلیم

اس اقامتی درسگاہ میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ اسلامی احکام (فقہ) کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جاتی تھیں فنِ قرأت و تجوید بھی سکھایا جاتا تھا۔ ان کی تعلیمی نگرانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر فرماتے تھے اور یہاں کے مقیم طلبہ کی غذا مہیا کرنے اور قیام کرنے کا بندوبست بھی آپ فرماتے تھے۔

تعلیمِ بالغاں

اصحاب صفہ کے علاوہ کاروباری صحابۂ کرام کی بڑی تعداد بھی فرصت کے اوقات میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ مدینہ کے باشندے مہاجرین و انصار پر مشتمل تھے۔ وہ مسلمان جو مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے اور مہاجرین کہلاتے تھے، اہل مدینہ کے تعاون اور اسلامی اخوت کی بدولت بہت جلد اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو گئے اور چونکہ انھیں مکہ معظمہ میں رہنے کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا تجربہ تھا۔ اس لئے مہاجرین تجارت کرنے لگے۔ تاہم وہ اسلام کے بنیادی مقاصد کو نہیں بھولے بلکہ اپنی فرصت کے اوقات میں مسجد نبوی میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اساتذہ کی تعلیمات سے مستفید ہوتے تھے۔

انصار مدینہ کے قدیمی باشندے تھے اور پہلے سے کاشت کاری کے فرائض انجام دیتے تھے اس لئے وہ زراعت کے کام میں لگے رہے تاہم وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روزانہ حاضر ہوتے تھے اور آپ سے روزمرہ کے اسلامی احکام سیکھتے تھے اور قرآن کریم کی تعلیم، دیگر اکابر صحابہ سے حاصل کرتے تھے۔

چونکہ مہاجرین کی کثیر تعداد مدینہ منورہ میں آ کر آباد ہو گئی تھی اس لئے مدینہ شہر سے باہر مضافات میں مہاجرین و انصار آباد ہونے لگے تھے۔ اس طرح ان کے لئے روزانہ مدینہ منورہ آنا اور مسجد نبوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے مستفید ہونا مشکل تھا۔ اس لئے وہ ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن آتے تھے اور انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ایک ساتھی آتا تھا اور وہ جو تعلیم حاصل کرتا تھا، اس سے اپنے دوسرے ساتھی کو باخبر کر دیتا تھا۔ یوں تعاون سے ہر ایک کو اپنے ساتھی کے ذریعے روزمرہ کی تعلیمات اور اسلامی احکام سے آگاہی حاصل ہو جاتی تھی۔

ایسے صحابہ میں حضرت عمر فاروق بھی تھے وہ بھی شہر سے باہر رہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک انصار پڑوسی سے یہ معاملہ طے کر رکھا تھا کہ ایک دن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرے اور دوسرے دن وہ خود آنحضرت کی خدمت میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جایا کریں گے۔ یوں وہ ایک دوسرے کو روزمرہ کی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہے۔

مدینہ پہنچ کر آپ اکثر اپنے کئی تربیت یافتہ صحابہ کو نومسلم قبائل وفود کے ساتھ روانہ کرتے تھے تاکہ وہ ان کے اپنے علاقوں میں جا کر انھیں اسلامی تعلیم دیں۔ کچھ عرصہ تعلیم دینے کے بعد وہ واپس آ جاتے تھے۔

قرّا کی شہادت

اسی قسم کا ایک المناک واقعہ مدنی دور کے ابتدائی زمانے میں رونما ہوا جبکہ نجد کے بعض قبائل نے درخواست کی کہ انہیں قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لئے عمدہ معلمین کو روانہ کیا جائے۔ لہٰذا آپ نے ان کی درخواست پر ستر قرّاء (قرآنی تعلیم کے معلمین) بھیجے مگر کفار نے بئر معونہ کے قریب انھیں دھوکے سے شہید کر دیا۔ یہ ایک ایسا المناک واقعہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمر بھر اس کا قلق رہا کیونکہ اس قدر لائق اور قابل مسلمان کسی بڑی سے بڑی جنگ میں بھی شہید

نہیں ہوئے ۔ ان کی شہادت اسلام کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ جسے اسلامی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑا۔

جنگی قیدیوں کی تعلیمی خدمت

مدینہ منورہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تبلیغ کی سرگرمیوں میں اضافہ کر دیا تھا تاہم مسلمانوں میں عربی لکھنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس زمانہ میں عربی رسم الخط اپنی ابتدائی حالت میں تھا جس کا سیکھنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے جب جنگ بدر کی فتح کے بعد قریش کے ستر (۷۰) اسیر کردہ افراد گرفتار ہو کر آئے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے چند قیدی ایسے بھی تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے لہٰذا آپ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ان کے لیے یہ شرط مقرر کی کہ اگر ان میں ہر ایک قیدی مدینہ منورہ کے دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے گا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا اور مالی تاوان کے بجائے ان کی یہ تعلیمی خدمت ان کی رہائی کا سبب بن جائے گی۔

چنانچہ حضرت زید بن ثابت بھی ان انصار کے لڑکوں میں شامل تھے۔ جنھوں نے ان قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا اور آگے چل کر یہی حضرت زید بن ثابت آپ کے بہت بڑے کاتب وحی اور جامع قرآن ثابت ہوئے۔

غیر زبانوں کی تعلیم

عہد رسالت میں عام تعلیم قرآن کریم، احادیث نبوی اور نوشت و خواند کی تعلیم تک محدود تھی تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے غیر زبانوں میں بھی خطوط آتے تھے جنھیں غیر مسلموں اور بالخصوص یہودیوں کی مدد سے پڑھوایا جاتا تھا ان خطوط میں بعض معاملات پوشیدہ ہوتے تھے۔ اس لئے آپ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی قابلِ اعتماد صحابی ان غیر زبانوں کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت خود بیان فرماتے ہیں:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میرے پاس مختلف خطوط آتے رہتے ہیں اور میں یہ بات پسند نہیں کرتا ہوں کہ ان خطوط کو ہر کوئی پڑھے ۔ تو کیا تم عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو: یا یوں فرمایا کہ کیا تم سریانی کا لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "ہاں" (سیکھ سکتا ہوں) چنانچہ میں نے سترہ (۱۷) دن میں وہ زبان سیکھ لی۔"

ماہرِ السنہ

مؤرخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے صرف عبرانی اور سریانی زبانیں ہی نہیں سیکھی تھیں بلکہ انھیں غیر زبانوں کو جلد سیکھنے میں بہت بڑا ملکہ حاصل تھا۔ وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانیں بھی جانتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان زبانوں کی ترجمانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ انہوں نے یہ زبانیں ان آزاد کردہ غلاموں سے سیکھی تھیں جو ان قوموں سے متعلق تھے اور مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت مختلف زبانیں جاننے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر زبان کی تمام خط و کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے اور آپ کے کاتب وحی بھی تھے ان یہودیوں سے خط و کتابت بھی وہی کرتے تھے جو مدینہ اور اس کے گردونواح میں آباد تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بھی بہت سی زبانیں جانتے تھے اور اپنے غیر ملکی غلاموں

سے انہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

مخصوص اساتذہ احادیث کی بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تعلیم میں توسیع ہونے کے بعد تعلیم کے کسی خاص شعبہ میں مزید مہارت پیدا کرنے کے لئے مخصوص اساتذہ بھی مقرر کر دیئے گئے تھے۔ چنانچہ فن قرأت میں مہارت کے لئے آپ طلبہ کو حضرت ابی بن کعب کے پاس بھیجا کرتے تھے اور اس میراث کے اسلامی احکام کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے آپ حضرت زید بن ثابت کے ہاں طلبہ بھیجا کرتے تھے۔

فنونِ سپہ گری چونکہ مدینہ منورہ میں اپنے دفاع کے لئے مسلمانوں کو مختلف جنگوں میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے آپ نے تعلیمی نظام میں فنون سپہ گری کو خاص اہمیت دے رکھی تھی آپ نے ہدایت دے رکھی تھی کہ بچوں کو ابتدا ہی سے نشانہ بازی، تیراندازی اور پیراکی کی تعلیم دی جائے۔ بڑوں کے لئے بھی آپ گھڑ دوڑ کے مقابلے کراتے تھے اور جنگی مشقیں بھی کراتے تھے۔

خواتین کی تعلیم قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی میں علم دین کی تعلیم کو خواتین کے لئے بھی اسی قدر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جس قدر وہ مردوں کے لئے ضروری ہے یہاں تک کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں کو تعلیم دینے کی ہدایت بھی فرمائی ہے اور اسے باعث ثواب قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنی لونڈی کو عمدہ تعلیم و تربیت دے کر نکاح کرے گا تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔

چونکہ مسجدِ نبوی مسلمانوں کے لئے سب سے بڑی تعلیمی درسگاہ تھی جہاں آپ صحابہ کرام کو ہر وقت تعلیم دیتے تھے۔ اس لئے ابتداً میں خواتین وہاں نہیں جاتی تھیں اور ان کے مرد بھی انھیں مسجدِ نبوی جانے سے روکتے تھے اس لئے آپ نے انھیں حکم دیا:۔

"تم اللہ کی بندیوں (عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں جانے سے نہ روکو۔"

اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم خواتین بھی کثیر تعداد میں آپ کی مجالس وعظ و تعلیم میں حاضر ہونے لگیں اور آپ کی تعلیمات سے مستفید ہونے لگیں۔ تاہم بعض زنانہ مسائل ایسے تھے جنھیں وہ براہ راست آپ سے نہیں معلوم کر سکتی تھیں۔ اس لئے ان معاملات میں وہ امہات المومنین یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواج مطہرات کے ذریعے مستفید ہوتی تھیں۔ یوں ان ازواجِ مطہرات کے ذریعے وہ خواتین کے مخصوص مذہبی مسائل سے مسلم خواتین آگاہی حاصل کرتی رہیں۔

ان تمام سہولتوں کے باوجود مسلم خواتین نے یہ محسوس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہفتہ میں ایک دن صرف خواتین کے لئے مخصوص کرا لینا چاہیے چنانچہ ان کی درخواست پر آپ نے ہفتہ میں ایک دن صرف خواتین کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا تھا، اس دن آپ ان کے سوالات کے جوابات دیتے اور ملکی حالات کے مطابق انھیں وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ ان اجتماعات سے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے اور جنگی ضروریات کے لئے خواتین نے دل کھول کر مالی امداد کی۔

آپ نے خواتین کو مشغول رکھنے کے لئے مشورہ دیا کہ وہ چرخہ کاتا کریں اور گھریلو صنعتوں میں دلچسپی لیں۔

خواتین کو تعلیم دینے میں آپ کی ازواج مطہرات بھی آپ کی شریک رہیں کیونکہ آپ نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ نہ صرف خود تعلیم حاصل کریں بلکہ دیگر مسلم خواتین کو بھی تعلیم دیں کیونکہ علم چھپانے کو آپ نے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے جرم قرار دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کا آغاز گھر سے کیا تھا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم کی بدولت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حدیث، فقہ، تفسیر اور شعر و ادب میں بہت بڑی عالمہ ہو گئی تھیں اور انہوں نے آپ کی وفات کے بعد بھی اسی تعلیمی فیض کو جاری رکھا یہی حال دیگر ازواج مطہرات کا تھا کہ اگر ازواج مطہرات میں سے کوئی نوشت و خواند سے ناواقف ہوتی تھیں تو آپ دیگر خواتین کو ان کی تعلیم پر مامور کرتے تھے۔ چنانچہ احادیث میں یہ مذکور ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے، جو حضرت عمر فاروق کی صاحبزادی تھیں۔ آپ کے علم و اجازت سے اپنی ایک رشتہ دار خاتون شفا بنت عبداللہ سے جو خوب لکھی پڑھی تھیں، لکھنا سیکھا تھا۔

طریقہ تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دیگر معلمین کا طریقہ تعلیم نفسیاتی نقطہ نگاہ سے نہایت عمدہ اور مؤثر تھا۔ آپ نہایت آسان اور دل نشین انداز میں لوگوں کو تعلیم دیتے تھے۔ جو باتیں ضروری اور اہم ہوتی تھیں انھیں آپ تین دفعہ دہراتے تھے تاکہ ایک کند ذہن انسان بھی انھیں اچھی طرح سمجھ سکے آپ ہر شخص کو اس کی صلاحیت اور عقل و مزاج کے مطابق تعلیم دیتے تھے۔ بلکہ آپ معلموں کو بار بار یہ ہدایت فرماتے تھے۔

"تم لوگوں سے ان کی عقل (ذہنیت) کے مطابق گفتگو کیا کرو۔"

اسی اصول کے مطابق آپ نہایت آسان زبان میں مختصر گفتگو فرماتے تھے اور غیر متعلقہ باتوں کو درمیان میں نہیں لاتے تھے۔ البتہ سمجھانے کے لئے اگر تمثیلات کی ضرورت ہوتی تھی تو ان سے بھی کام لیتے تھے اور جو باتیں اہم اور ضروری ہوتی تھیں ان کو بار بار دہراتے تھے۔

آپ کی محفل میں اکثر جاہل اور عرب بدو آیا کرتے تھے اور وہ اکثر آداب محفل کا لحاظ کئے بغیر ناشائستہ طور پر گفتگو کرتے تھے اور بے ڈھنگے سوالات کرتے تھے۔ مگر آپ ان کے سوالات کو نہایت صبر و تحمل اور ٹھنڈے دل سے سنتے تھے۔ اور ان کے مزاج اور ذہنیت کے مطابق تسلی بخش جواب دیتے تھے جس سے وہ مطمئن ہو جاتے تھے

انقلابی نتائج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظام تعلیم کے انقلابی نتائج آپ کے عہد مبارک ہی میں برآمد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے ذریعے نہ صرف مسلمانوں کی خواندگی کا معیار بڑھا بلکہ انہوں نے تہذیب و مدنیت کے وہ تمام اچھے اصول سیکھے جو بالعموم موجودہ درس گاہوں میں سکھائے جاتے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود ایسے عمدہ نتائج حاصل نہیں ہوتے ہیں۔

مسلمان اس تعلیم کے ذریعے نہ صرف مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے اعلیٰ کردار کے مالک بنے، بلکہ ان کی ادبیت اور قابلیت میں بھی اضافہ ہوا۔

عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ کی تعلیمی سرگرمیاں

مولانا خلیل حامدی

درس گاہ کی تاسیس غزوہ بدر کبریٰ حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن واقعہ ثابت ہوا۔ اس غزوہ میں علمبرداران حق کو اللہ تعالیٰ نے عظیم الشان کامیابی عطا کی۔ لشکر اسلام اور اس کا جلیل القدر قائد صلی اللہ علیہ وسلم بندگان طاغوت اور صنادید قریش پر بہت بڑی نصرت سے سرفراز ہوئے۔ قریش کے کچھ لوگ تو میدان جنگ میں مارے گئے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ گرفتار شدگان میں سے جن کے ورثا ذی حیثیت تھے، وہ ایک معاہدے کے تحت مسلمانوں کو مقررہ مالی فدیہ ادا کرنے کے بعد رہا کروا کر مکہ لے گئے اور جو نادار تھے، وہ مایوس ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے خیالات قائم کرنے لگے۔

ان نازک حالات میں عام مسلمان تو بڑے بڑے مسائل میں اپنی فکری قوتیں صرف کر رہے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جو بلاشبہ مسلمانوں کے تمام اہل معاملات میں پورے انہماک و اعتنا سے کام لیتے تھے، حالات کے تقاضے کے علی الرغم ایک ایسے منصوبے کے بارے میں سوچ بچار کر رہے تھے، جس سے بڑے سے بڑا مفکر بھی اس نوعیت کے حالات میں غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ منصوبہ اہل مدینہ کے بچوں کے بہتر مستقبل کا تھا، جو ابتدائی تعلیم سے یکسر محروم تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک طرف یہ دیکھا کہ اہلِ مدینہ کے بچے گلیوں میں کھیل کود کر اپنا وقت گزار رہے ہیں اور دوسری طرف اسیرانِ بدر آپ کی نگاہ کے سامنے تھے جو تہی دست ہونے کی وجہ سے رہائی کی کوئی سبیل نہ پا رہے تھے۔ چنانچہ آپ نے ہر پڑھے لکھے قیدی پر لازم کر دیا کہ وہ کم از کم انصار کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے اور اگر وہ اپنی مہم میں کامیاب ہو گیا، تو اسے رہائی مل جائے گی۔ آپ کے اس فیصلے نے اسلام کی تاریخ میں نوشت و خواند کی پہلی درسگاہ کی داغ بیل ڈال دی۔

سزا دینے کا نظریہ شاگردوں کی لغزشوں پر یا اسباق سے عدم توجہی پر یا ادائے فرض اور حفظِ آموختہ میں تاخیر و تساہل دکھانے پر اُستاد کا شاگردوں کو زد و کوب کرنا قریب قریب قدیم طریقہ تعلیم میں امر لازم شمار کیا جاتا تھا۔ طلبا کے نظم و نسق کو درست رکھنے کے لیے اس کے بغیر کوئی چارہ نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ اکثر معلمین کے نزدیک تو سزا کا طریقہ اسباق کی تفہیم میں بھی مددگار ہوتا تھا۔ سزا دینے کے نظریہ کے بارے میں آج کل ماہرین تعلیم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اس کے حامی ہیں اور بعض سخت مخالف۔ یہ اختلاف ماضی قریب میں پیدا ہوا ہے اور اس کی بنیاد جدید تجرباتی اصول تعلیم، بچوں کی نفسیات کا مطالعہ اور ان کے طبعی رجحانات کی تحقیق پر قائم ہوئی۔

لیکن پہلی اسلامی درسگاہ کے بارے میں تاریخ کچھ معلومات ہمیں فراہم کرتی ہے۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں بچوں کو زد و کوب کرنے کا طریقہ ناپسندیدگی سے دیکھا گیا ہے اور اس طریقے کے استعمال پر بچوں کے سرپرستوں نے معلمین پر سخت تنقید کی ہے۔ مقریزی کا بیان ہے کہ مذکورہ اسلامی درسگاہ کا ایک کمسن طالب علم جوان قیدیوں کے پاس زیرِ تعلیم تھا، اپنے مدرسہ سے روتا ہوا گھر واپس چلا گیا۔ باپ نے پوچھا "کیوں کیا ہوا؟" لڑکے نے جواب دیا "میرے معلم نے مجھے مارا ہے۔" باپ نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلم (قیدی) نیچے سے بدر کا انتقام لے رہا ہے۔" اس

کے بعد باپ نے بطور احتجاج اپنے بچے کو قیدی معلم کے پاس جانے سے روک دیا۔ یہ اگرچہ نہایت معمولی سا واقعہ ہے، لیکن جو شخص اس کا گہرا مطالعہ کرے گا، اسے معلوم ہو گا کہ جدید طریقہ تعلیم کا یہ اصول کہ تدریس کے لیے ڈنڈے کا استعمال مستحسن نہیں ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں پایا جاتا تھا۔ جدید نظریہ تعلیم اس اصول کو اپنے عہد کے قابل فخر اصولوں میں ایک مضروب طالب علم کے سرپرست نے زد و کوب پر جو احتجاج کیا ہے، وہ اس نظریہ کی قدامت اور اسلامی مزاج سے اس کی ہم آہنگی کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔

درس گاہ کے ایک نامور طالب علم

مقریزی نے اپنی کتاب امتاع الاسماع میں اسیران بدر کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے پاس انصار کے جو بچے پڑھتے تھے، ان میں سے ایک زید بن ثابت بھی تھے، جو کتابت سیکھا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اس قدر خوش خط ہو گئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کاتبان وحی میں شامل کر لیا تھا۔

غیر ملکی زبان کی تعلیم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کے اندر جب علم کے حصول اور کتابت کے فن میں غیر معمولی مہارت و قابلیت کے جوہر دیکھے تو آپ نے ان کو سنہ ۴ھ میں فرمایا "میرے پاس ایسے لوگوں کے خطوط آتے ہیں کہ میں پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا انہیں پڑھے۔" دوسری روایت میں ہے "میں خطوط کے پڑھوانے کے معاملے میں یہودیوں پر اطمینان نہیں رکھتا۔" تیسری روایت میں ہے "میں لوگوں کی طرف مکاتیب بھیجتا ہوں (جن میں معاہدات کے مکاتیب بھی ہوتے ہیں) اور مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ میرے الفاظ میں کمی بیشی نہ کر لیں۔" اس بنا پر آپ نے حضرت زید کو عبرانی زبان یا سریانی زبان پڑھنے کا مشورہ دیا۔ زید نے سر اطاعت جھکا یا۔ سیکھنے کے لیے کمر باندھ لی اور سترہ دن کے اندر حضرت زید نے یہ زبان سیکھ لی (مورخین کے الفاظ میں فتعلمها فی سبعة عشر یوما، ادنوں میں اس زبان کو حاصل کر لیا)

غیر ملکی زبان کی تعلیم کو ہمارے دینی حلقوں میں مستحسن خیال نہیں کیا جاتا اور اسے امکانی حد تک پرہیز کی دعوت دی جاتی ہے مگر مذکورہ بالا واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی زبان کا حصول اس شخص کیلئے مستحسن اقدام ہے، جو دشمنان اسلام کے حملوں سے اسلام کی مدافعت کرنا چاہتا ہو بلکہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ دعوت اسلامی کی اشاعت کی توفیق دے اور وہ ایسے ماحول میں کام کر رہا ہو جس کی زبان سے ناآشنا ہو تو اس کے لیے وہاں کی زبان سیکھنا کار ثواب ہے۔ ایک شخص عالم دین اور قاضی شرع ہو تو بھی اجنبی زبان سیکھ سکتا ہے۔ از روئے شریعت اس میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے عبرانی یا سریانی زبان کی تحصیل کی تھی یہ اعدائے اسلام کی زبان تھی۔ لیکن اس کے باوجود آپ فقہائے صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا۔ افرضکم زید (مسائل وراثت کو سب سے بہتر جاننے والے زید ہیں) حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے عہد میں ان کو جمع قرآن کی مہم پر لگایا تھا ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت زید کو پیادہ پا رخصت کرنے کے لیے نکلے تو حضرت زید نے ان سے کہا۔ اے رسول خدا کے عم زاد! آپ یہ تکلیف نہ فرمائیں۔" حضرت عبداللہ بن عباس نے جواب دیا۔ اہل علم اور اہل شرف کی ایسے ہی عزت کرنے کا حکم ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں زہری سے روایت کی ہے کہ حضرت زید حضرت عمر اور حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں مدینہ میں قضاء، افتاء، قرأت اور فرائض کے مسائل میں معتمد علیہ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے ۴۵ھ میں حضرت زید کی وفات پر فرمایا تھا "علم یوں اٹھتا ہے۔" ابن عمر نے اس موقع پر کہا تھا "خلافت عمر میں یہ ملک بھر میں واحد عالم تھے۔" حضرت حسان نے اپنے مرثیہ میں کہا تھا۔

فمن للقوافی بعد حسان وابنه ؟

ومن للمعانی بعد زید بن ثابت ؟

(حسان اور پسر حسان کے بعد قافیوں کا شہسوار کون ہوگا اور زید بن ثابت کے بعد معانی کا بادشاہ کون ہوگا)۔

مسجد ہی مدرسہ تھی مدینہ منورہ میں مسجد نبوی صرف پنج وقتہ نماز ادا کرنے کے لیے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ کے فرمان سننے کے لیے مسلمانوں کے اجتماع کا مرکز ہی نہیں بلکہ احکام شریعت کی تدریس اور قرآن کی تعلیم کا مدرسہ بھی تھا۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے وہ صحابہؓ تھے جنہوں نے پہلے خود براہ راست شمع نبوت سے اکتساب نور کیا تھا اور مبدء فیاض کے سامنے زانوئے تلمذ طے کئے گیا تھا ادھر آپ کے ارشاد سے دوسرے لوگوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھے۔

حصول تعلیم کی ترغیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت کا عملاً انتظام فرمانے کے بعد مسلمانوں کو بکثرت مواقع پر مختلف طریقوں سے حصول تعلیم کی ترغیب دی۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوالدرداء سے ایک مشہور حدیث مروی ہے۔ آپ نے فرمایا جس کو سننے کے لیے اہل علم طول طویل سفر کر کے حضرت ابوالدرداء کے پاس پہنچا کرتے تھے۔ وہ حدیث یہ کہ۔

"جو شخص علم کی جستجو میں راستہ طے کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ قریب کرتا ہے۔ عالم کے حق میں آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں حتیٰ کہ مچھلیاں پانی کے اندر اللہ سے مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ عالم کو عابد پر وہی درجہ حاصل ہے جو ماہ بدر کو دوسرے تمام ستاروں پر حاصل ہے۔"

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو آگے بڑھ گئے اور ایک واپس چلا گیا۔ ان دونوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ ان میں سے ایک تو حلقہ کے اندر ایک کشادہ جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور دوسرا لوگوں کے پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو سے فارغ ہوئے تو فرمایا، ان تینوں آدمیوں کے متعلق تمہیں خبر دوں؟ ان میں سے ایک نے تو اللہ کے دامن میں پناہ لی اور اللہ نے اسے پناہ دی۔ دوسرا شرم میں رہا اور اللہ نے بھی اس سے شرم کی اور تیسرے نے روگردانی کی اور اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔" عقبہ بن عامر جہنی روایت کرتے ہیں کہ لوگ صفہ میں بیٹھے تھے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور فرمایا تم میں سے کون پسند کرتا ہے کہ وہ بطحان یا عقیق کی وادی میں جائے اور ہر روز دو عمدہ نسل کی کوہان دار اونٹنیاں لائے اور گناہ اور قطع رحمی کے بغیر ان کا مالک ہو جائے؟ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم سب یہ پسند کرتے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "تم میں سے کسی شخص کا مسجد کی طرف جانا اور وہاں کتاب اللہ کی دو آیتیں سیکھ لینا، دو اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین آیتیں سیکھنا تین اونٹنیوں سے بہتر ہے اور چار سیکھنا اونٹوں کے ایک گلہ سے بہتر ہے۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ "جو شخص ہماری اس مسجد میں اس نیت سے داخل ہو کہ وہ علم سیکھے گا یا سکھائے گا، تو وہ بمنزلہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور جو اس مقصد کے بغیر داخل ہوا، وہ اس شخص کی مانند ہے جو ایک چیز پر نگاہ ٹکائے ہوئے ہے لیکن وہ اس کی ملکیت نہیں ہے۔"

الغرض ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا پہلا مدرسہ مسجد ہی میں قائم ہوا تھا۔ جہاں بندگی و عبادت کے ساتھ تعلیم و ارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

معلم کی شخصیت جدید نظریۂ تعلیم اس امر کا داعی ہے کہ معلم کی شخصیت مثالی شخصیت ہونی چاہیئے۔ علم کے لحاظ سے اسے اپنے مضمون میں نہایت وسیع الاطلاع اور حاوی و حاذق ہونا اور اس کے ساتھ اسے معلومات عامہ سے بھی بہت بڑی حد تک بہرہ مند ہونا ضروری ہے اور اپنی

ظاہری شکل و لباس کے لحاظ سے بھی باوقار بن کر رہنا چاہیئے۔ اسے طلباء کے سامنے ایسی ہیئت وحالت میں کبھی نہیں آنا چاہیئے کہ طلبا کو تمسخر و استہزاء کا موقع ملے۔ کیونکہ جب معلم طلبا کا نشانہ تمسخر بن جاتا ہے، تو طلبا اس سے استفادہ تو کیا کریں گے الٹا یہ صورت استاد اور طلباء کے درمیان متعدد الجھنوں اور خرابیوں کو جنم دینے کا موجب ہوگی۔

نبوی نظریہ تعلیم نے بھی اس پہلو کی طرف خاص طور پر دھیان دیا ہے۔ حدیث جبریل میں جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے، معلم کی ظاہری شائستگی اور وقار کی تاکید کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس ایک آدمی آیا، جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے۔ سفر کی کوئی علامت اس پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ ہم میں سے کوئی اسے نہ جانتا تھا۔ وہ آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنے آنحضورؐ کے گھٹنوں سے ملا دیئے اور اپنی ہتھیلیاں آنحضورؐ کی رانوں پر رکھ دیں اور کہنے لگا: "اے محمدؐ! مجھے اسلام کی خبر دو،" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ آپ یہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور رمضان کے روزے رکھیں اور بیت اللہ کا حج کریں اگر استطاعت ہو۔" اس شخص نے کہا: "آپ نے درست کہا،" (اس طرح اس نے اور بھی متعدد سوال کئے اور آپ نے ان کے جوابات دیئے) ہمیں تعجب تھا کہ یہ شخص خود ہی سوال کرتا ہے اور پھر خود ہی آنحضورؐ کی تصدیق کرتا ہے اس کے بعد وہ چلا گیا۔ حضورؐ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر فرمایا: "عمر! جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟" میں نے عرض کیا: "اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" فرمایا: "یہ جبریلؑ تھے تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔"

حضرت جبریل علیہ السلام کا نہایت شائستہ لباس اور سنورے ہوئے بالوں کے ساتھ نمودار ہونا گرد و غبار کے اثرات سے صاف ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مؤدبانہ دوزانو ہو کر بیٹھنا اور پھر آنحضورؐ کا حضرت عمرؓ کو یہ فرمانا کہ یہ تمہارے دین کے معلم بن کر آئے تھے۔ یہ تمام گوشے ایسے ہیں، جس سے ہمیں متعدد امور کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ جس شخص کے کندھوں پر انسانوں کی تعلیم و تربیت بالخصوص نوجوانوں کی تربیت کے فرائض ہوں، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ آداب گفتگو سے واقف ہو، ملکی ماحول اور روایات کے مطابق اپنے لباس کا اہتمام کرتا ہو اور کوئی ایسی نازیبا حرکت نہ کرے، جو اسے شاگردوں کے تمسخر و مزاح کا ہدف بنا دے جس سے وہ غضبناک ہو جائے اور پھر علم و عرفان کا گہوارہ سزا و عقوبت کی کچہری بن جائے۔ کچھ طلبا بطور سزا بنچوں پر کھڑے ہوں اور کچھ کی سرزنش ہو رہی ہو اور کسی کو کلاس بدر ہونے کی سزا مل رہی ہو اور کسی کو صدر مدرسہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے بھیجا جا رہا ہو۔ الغرض معلم کے لیے ہر حیثیت سے باوقار اور پرہیبت رہنا ضروری ہے

مدت تعلیم پہلی اسلامی درسگاہ کے بارے میں جو معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں ان میں سے ایک اس درس گاہ کی مدت تعلیم ہے۔ مسلم نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے حارث کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں حارث بتاتے ہیں کہ میں نے تین سال میں قرآن سیکھا اور دو سال میں وحی۔ یا آپ نے اس کے برعکس فرمایا یعنی دو سال میں قرآن، تین سال میں وحی۔ وحی سے مراد نوشت و خواند ہے۔

طرز تحریر بعض روایات سے اس درس گاہ کے طلباء کی تحریر اور کتابت کے نمونے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد لکھنا سیکھا۔ میرا خط بچھوؤں کی شکل کا ہوتا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ نے ان الفاظ میں اپنے طرز تحریر کی تصویر کھینچی ہے جسے ہم دیکھے بغیر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے اپنے خط کی تمثیل بچھو سے دی ہے۔ بچھو کی شکل جانی پہچانی ہے یعنی ایک دوسرے کو منقطع کرتے ہوئے خطوط اور نصف دائرے۔

عہدِ نبوی میں علمی ترقیاں

محمد حفیظ اللہ پھلواروی

نبی اُمّی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنھوں نے کسی مُعلّم کے سامنے کبھی زانوئے ادب تہہ نہیں کیا تھا اور نہ انھیں کسی عالم کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا طلب علم کو ہر مسلمان کا ایک مقدس فریضہ قرار دیا:

طَلبُ العلم فریضۃٌ علیٰ کُلِّ مُسلم (ابن ماجہ) — علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

مَنْ سلک سبیلا یطلبُ فیہ علماً سَھَّلَ اللہ لَہٗ طریقاً الی الجنۃ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) — جس نے طلب علم کی خاطر کوئی راستہ طے کیا اللہ اس کے لئے جنت کی راہ آسان کرے گا۔

ان الملائکۃ تضع اجنحتھا رضیً لطالب العلم (مشکوٰۃ) — فرشتے علم کے طلب کرنے والوں کے لئے اپنے پَر بچھاتے ہیں تاکہ ان کو راضی رکھا جائے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے قلوب میں علم کی اہمیت جتائی اور صحابہ کرام کو حکم دیا کہ:

ان رجالاً یاتون من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاستوصوا بھم خیراً (مشکوٰۃ) — زمین کے اقطار سے لوگ تمہارے پاس دین سیکھنے کے لئے آئیں گے تو ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیجو۔

مکہ معظمہ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا تبلیغی مرکز "دارارقم" تھا۔ یہ مکان ارقم بن ارقم کا تھا جو کوہ صفا کے دامن میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین سال یعنی سنہ ۶ نبوی کے آخر تک یہاں اشاعت اسلام اور نومسلموں کی تربیت کا کام انجام دیتے رہے۔

"دارارقم" کے قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا مکان جو "داب الحجر" میں واقع تھا، سب سے پہلی تربیت گاہ کہا جاسکتا ہے "دارارقم" کے بعد "شعب ابی طالب" بھی تربیت گاہ کہی جاسکتی ہے۔ جہاں محرم ۷ھ نبوی سے ۱۰ھ نبوی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو محصور رہے۔

یثرب (مدینہ منورہ) کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو تعلیم قرآن کے لئے بھیجا۔ حضرت ابواُمامہ اَسعد بن زُرارہ نے اپنا مکان دیا۔ گویا یثرب میں سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ دس ماہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان پر قیام فرمایا۔ یثرب میں یہ دوسری تربیت گاہ کہی جاسکتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں بے حد اہم جنگی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود اس کے لئے

وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی دُور کرنے کے کام کی ذاتی طور سے نگرانی کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے سعید بن العاص کا تقرر کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ یہ بہت خوش نویس تھے۔ ایک راوی کے الفاظ میں ان کو "معلمِ حکمت" بنایا گیا تھا۔ جس سے لکھنے پڑھنے کی عظیم اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں مسجد کی بنا ڈالی، اور ساتھ ہی اس کے شمالی گوشے میں ایک چبوترہ بنایا۔ جس پر ایک سائبان تھا، یہی "صُفّہ" کہلایا۔ یہاں وہ مہاجرین قیام کرتے جو غیر متاہل اور بے مایہ تھے۔ یہ "اصحابِ صُفّہ" کہلاتے تھے۔ یہ لوگ تعمہ توڑنے نہیں آئے بلکہ دُنیوی علائق سے بے نیاز اور بے تعلق ہو کر تعلیم دین حاصل کرنے میں مصروف رہتے ان لوگوں نے اپنی زندگیاں اسلام سیکھنے کے لیے وقف کر دی تھیں۔

مولانا مناظر حسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ "صُفّہ" اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ باہر سے جو لوگ طلب علم کے لئے آئیں، انھیں اس میں ٹھہرایا جائے اور تعلیم دی جائے اس صُفّہ کے رہنے والوں کی خبر گیری مسلمانوں کے سپرد تھی کم و بیش اسلام کی اس پہلی تعلیم گاہ میں مختلف اوقات کے اندر طلبہ کی تعداد "ستر اسی" تک پہنچ جاتی تھی۔ کچھ تو لکڑیاں جنگل سے لا کر اور ان کو بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ دن کو صُفّہ والے لکڑیاں چُنتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔ لیکن اصحاب ثروت و وسعت کی طرف سے باشارۂ نبوت ان کی امداد بھی ہوتی تھی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ان لوگوں کے کھانے پینے کے مسئلہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ کوئی خراب چیز اگر ان لوگوں کے لیے بھیجتا تو حضورؐ اس پر ناخوشی کا اظہار فرماتے تھے۔[2]

یہاں سے اکتساب علم کرنے والوں کی تعداد مجموعی بقول سیوطی ایک سو ایک بیان کی جاتی ہے۔ "صُفّہ" دن کو مدرسہ کا کام دیتا اور رات کو "دار الاقامہ" کا۔

صرف "صُفّہ" ہی نہیں بلکہ پوری مسجد نبوی تعلیم گاہ تھی، جہاں دینی اور دنیوی تعلیم دی جاتی تھی مسجد نبوی میں "اصحاب صفہ" کی تعلیم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، اُبی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت یہیں درس دیا کرتے تھے۔ اس جامعہ میں اصحابِ ذوق دور دراز ممالک سے اکتساب علم کے لئے آتے تھے۔[3]

مقامی طلبہ کے علاوہ دور دراز کے طلبہ بھی آتے اور اپنا ضروری نصاب تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس جاتے تھے (بخاری)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بنفسِ نفیس تعلیم دیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، وغیرہ بڑے صحابہ ان درسوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ دوسرے صحابہ کرام بھی تعلیم دینے کے لئے مقرر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کے حلقہائے درس کا اکثر معائنہ کرتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ کے لئے یہیں سے لوگ بھیجے جاتے تھے۔

اصحاب صُفّہ کے کھانے پینے کے نگران معاذ بن جبل تھے۔ اہل صُفّہ مزدوری بھی کرتے تھے۔ غرض سب سے پہلی باضابطہ درس گاہ مسجد نبوی تھی اور سب سے پہلا "اقامتی مدرسہ صُفّہ" تھا۔ ایک بار مسجد نبوی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کرام کے دو حلقے ہیں۔ ایک حلقہ میں لوگ تلاوت و دعا میں مشغول ہیں اور دوسرے حلقے میں قرآن پاک

---

[1] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۱۰، ۲۰۹ [2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم جلد اوّل۔ [3] تمدن عرب از محمد جان الحق سلیمانی۔

کا درس ہو رہا ہے۔ آپ یہ فرما کر کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" حلقۂ درس میں بیٹھ گئے۔

مدینہ میں مسجد نبوی واحد درس گاہ نہ تھی بلکہ یہاں کم سے کم نو مسجدیں خود عہد نبوی میں تھیں مقام "الحسا" میں بھی ایک مسجد بنائی گئی تھی جہاں تعلیم کا انتظام تھا۔

مدینہ میں ۲ھ میں ایک اقامتی درس گاہ "دار القراء" کے نام سے قائم ہوئی جس کا ذکر علامہ بلاذری نے کیا ہے۔

۲ھ میں جنگ بدر کے موقع پر بہت سے قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان کی رہائی کی ایک صورت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مقرر کی کہ ہر قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم سے کتنی دلچسپی تھی۔

اسلام کے دائرے میں جو قبائل داخل ہوتے جاتے تھے۔ دربار رسالت سے ان کی تعلیم و تلقین کے لئے ذمہ دار اصحاب کو بھیجا جاتا تھا کہ جو کچھ تم نے ہم سے سیکھا ہے۔ وہ انھیں بھی جا کر سکھاؤ۔[1]

مورخ طبری نے ۱۰ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ کو ناظم تعلیمات بنا کر یمن بھیجا جہاں وہ ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں دورہ کیا کرتے اور مدارس کی نگرانی کرتے (حصہ اول)

معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک یمن میں تعلیم اسلام کے لئے مامور فرمایا تھا۔ ان کی روانگی کے وقت ان سے ارشاد فرمایا کہ :-

"لوگوں کے ساتھ آسانی پسند کرنا انھیں سختی میں نہ ڈالنا۔ خوشخبری اور بشارت انھیں سنانا دین سے نفرت نہ دلانا اور تم آپس میں مل جل کر رہنا (بخاری)

دور دراز اسلامی بستیوں میں تعلیم کے بندوبست کے لئے دورہ کرنے والے مقرر کئے جاتے تھے۔ ان مقامات کے نو عمر اور ذہین لوگوں کو مدینہ بلا کر کچھ عرصہ اسلامی صدر مرکز میں رکھا جاتا اور اسلامی تربیت سے آراستہ کر کے ان کو ملک واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان علاقوں میں مسجدیں بنانے کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ عمان جیسے دور دراز مقامات کے نو مسلموں کے نام آنحضرتؐ کا ایک تہذیبی ہدایت نامہ بخاری وغیرہ نے محفوظ کیا ہے۔ "مسجدیں بناؤ، ورنہ فوج بھیج کر تمھیں سزا دی جائے گی"[2]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو علم کا مرجع آپؐ ہی کی ذات تھی، لیکن آپ کی زندگی ہی میں بلکہ اسلام کے ابتدائی دور میں آپؐ کے فیض یافتہ صحابہ کرام تعلیم کی خدمت انجام دینے لگے تھے۔ چنانچہ ہجرت سے قبل آپؐ نے حضرت مُصعب بن عُمیر کو اہلِ مدینہ کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا اور مدینہ آنے کے بعد تو تعلیم کا پورا انتظام قائم ہو گیا۔

بیرونی اشخاص و قبائل کی درخواست پر ان کی تعلیم کے لئے مدینہ سے معلمین بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک بیرونی وفد کی

---

[1] تدوین حدیث مولانا سید مناظر احسن گیلانی ص۲۳ (۱۹۵۶ء)

[2] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۲۹۳ -

درخواست پر آپ نے ستر قُرّا یعنی معلمین قرآن روانہ فرمائے تھے۔

تعلیم کے ساتھ کتابت وتحریر کو بھی ترقی ہوئی۔ کتابتِ وحی، صلح وجنگ کے معاہدوں دعوتِ اسلام کے خطوط اور دوسرے معاملات واحکام کی کتابت کے لئے تحریر ناگزیر تھی۔ اس لئے آنحضرتؐ نے دینی تعلیم کے ساتھ اسکی جانب بھی توجہ فرمائی۔ یہودیوں سے اکثر معاملات رہتے تھے اس لیے آنحضرتؐ نے ان سے خط وکتابت کے لئے زیدؓ بن ثابت کو عبرانی سیکھنے کا حکم دیا۔

غرض مذہبی و ملکی ضروریات کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اور ذاتی شوق کی وجہ سے صحابہ کرام نے چند دنوں میں معمولی نوشت وخواند کے لئے بقدر ضرورت تعلیم حاصل کرلی۔

عہدِ نبوی میں دوسری طاقتوں سے سیاسی دستاویزوں کا تبادلہ شروع ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت اپنے صحابہ میں سے چند افراد کو ایشیا اور افریقہ کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور ان کی زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد ان کو بحیثیت ترجمان مقرر کیا[1]

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمہات المومنین کی تعلیم کے لئے بھی انتظام فرمایا شفا بنت عبد اللہ عدویہؓ سے آپ نے خاص طور پر اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ وہ انھیں لکھنا پڑھنا سکھا دیں (ملاحظہ ہو نظام الحکومت النبویہ) چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت حفصہ اور حضرت اُم سلمہ علم حدیث میں ید طولیٰ رکھتی تھیں آپ نے انھیں طب کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی (جمع الجوامع السیوطی)

اسلام کے ابتدائی عہد میں خواتین کا سب سے پہلا مرکز حضرت عائشہ کی درس گاہ تھی ہفتہ میں ایک دن حضورؐ خود بھی عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے تھے۔ حج کے ایام میں پہاڑوں کے دامن میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا خیمہ نصب ہوتا اور دور دراز سے آنے والی خواتین ان سے استفادہ کرتیں[2]

آنحضرتؐ نے شفا بنت عبد اللہ سے کہا تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی حفصہ کو پڑھاتی رہیں۔ ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہ اور اُم سلمہ پڑھ سکتی تھیں لیکن انھیں لکھنا نہیں آتا تھا[3]

اُم المومنین حضرت حفصہ سب سے زیادہ پڑھی ہوئی تھیں۔ ان کو شفا نے کتابت کی بھی تعلیم دی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے آپ ہی کے پاس مکمل قرآن پاک کو رکھوایا تھا۔ اس مصحف کا نام "امام" رکھا گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعروں سے بھی رواداری کا سلوک برتا۔ بعض شاعروں کو انعام دیئے اور شاعری کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"بے شک بعض شعروں میں دانش مندی اور حکمت ہوتی ہے۔"

---

[1] اسلام کا نظام حکومت ص ۳۴۶۔

[2] بحوالہ جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ۔

[3] فتوح البلدان

اخلاقی اور حکیمانہ شاعری کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر اُمیّہ بن ابی الصلت کے کلام کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی۔ خود صحابہ میں متعدد بزرگ شاعر تھے اور حضرت حسّان بن ثابت کو دربار نبوی کا شاعر ہونے کا فخر حاصل تھا۔

حسّان بن ثابت (متوفی ۵۴ھ) جب آنحضرتؐ ہجرت کرکے مدینہ پہنچے تو انصار کے دوسرے لوگوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم ان (کفار) کی ہجو کرو اور روح القدس تمہارے ساتھ ہیں"۔ چنانچہ حسّان نے ان کی ہجو کہہ کر انھیں سخت تکلیف پہنچائی اور ان کی زبان کو بند کر دیا۔ کفار کی اس ہجو سے حسّان کو بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی [1]

حسّان بن ثابت اسلام کی تائید میں اور مخالفین کے جواب میں اشعار نظم کرکے لاتے تو ان کے لئے مسجد نبوی میں منبر رکھ دیا جاتا جس پر چڑھ کر وہ اشعار پڑھا کرتے [2]

ایک بار آنحضرتؐ کو ابوبکرؓ نے اس حال میں دیکھا تو آپ نے کہا کہ قرآن کے ہوتے ہوئے شعر و شاعری کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ :-

"قرآن پاک کا اپنا خاص مقام ہے، مگر گاہے گاہے شعر سن لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

کعب بن زہیر کی ہجو گوئی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا خون مباح کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو بیچ میں ڈال کر آپ کے پاس پہنچا اور اسلام لے آیا۔ آنحضرتؐ کی مدح میں اپنا مشہور "لامیہ" قصیدہ کہا جس پر آپ نے اسے معاف فرما دیا، اس کی جان بخش دی اور اپنی چادر مبارک اتار کر اسے دے دی [3]۔

اسلام لانے اور امان پانے کے بعد کعب نے اپنا شہرۂ آفاق قصیدہ پڑھا، اور جب وہ اس شعر پر پہنچے۔

انّ الرسول سَیفٌ یستضاءُ بہ مھنّدٌ من سیوفِ اللّٰہ مسلُولُ۔	بے شک رسول اللہ ایک ایسی تلوار ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے آپ اللہ کی تلواروں میں ایک عمدہ ہندی شمشیر برہنہ ہیں۔

تو آنحضرتؐ نے اپنی وہ چادر جو آپ کے جسد مبارک پر تھی، اتار کر کعب کو عطا فرمائی۔ یہ چادر مبارک استنبول میں سرائے قدیم کے نوادرات میں تبرکات نبوی میں اب بھی شامل ہے [4]۔

نابغہ جعدی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ پڑھا تو آپؐ بہت خوش ہوئے اور دُعا دی کہ اللہ تعالیٰ تیرے منہ کو کبھی نہ توڑے۔ نابغہ نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی لیکن اس کا ایک دانت بھی نہ ٹوٹا۔

خنساء (وفات ۲۴ھ) شعر گوئی میں کمال رکھتی تھی۔ اپنی قوم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی

---

[1] تاریخ ادب عربی۔

[2] رحمۃ للعالمین۔ [3] تاریخ ادب عربی۔ [4] کعب بن زہیر۔ پروفیسر علی محسن صدیقی۔

اور اسلام قبول کر لیا۔ حضور کو اس نے اپنے اشعار سنائے تو آپ جھومنے لگے اور مزید سننے کا شوق یہ کہتے ہوئے ظاہر فرمایا:
—" اور سناؤ اے خنسا !"

بنی تمیم کے وکلا دربار رسالت میں آئے اور اپنے خطیب اور شاعر کو اپنے ساتھ لائے اور آنحضرت کو فخر و مباہات کے مقابلہ کے لئے کہا۔ انھیں اجازت ملی۔ وکلا کے خطیب عطارد نے تقریر کی۔ آنحضرت کے حکم سے ثابت بن قیس نے تقریر کا جواب دیا۔ اس کے بعد وکلا نے اپنے شاعر زبرقان کو کھڑا کیا۔ اس نے آٹھ شعر پڑھے۔ آنحضرت نے حسان بن ثابت کو جواب دینے کے لئے کہا۔ حسان نے فی البدیہہ تیرہ شعر کہے۔ حسان کی نظم سن کر بنی تمیم کے وکلا نے کہا کہ :۔

" یہ شخص (آنحضرت) تو مؤید من اللہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے خطیب اور شاعر ہمارے خطیب اور شاعر سے زیادہ فصیح و بلیغ ہیں "

پھر ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی امی ہونے کا روشن کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی ہی میں علم کا ذوق اس قدر عام فرمایا تھا کہ اونٹوں کے چرواہے میدانوں اور ریگستانوں میں اپنے اونٹ بھی چراتے تھے اور ساتھ ہی دینی علوم کی تحصیل بھی کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ، کا قول ہے :۔

" ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ساری حدیثیں نہیں سُنی ہیں بلکہ ہمارے دوست احباب انھیں ہم سے بیان کرتے تھے اور ہم لوگ اونٹوں کے چرانے میں مشغول رہتے تھے "

گویا مسلمانوں نے علم کی روشنی سے عہد رسالت ہی میں ریگستانوں اور چراگاہوں کو اسلام کی کھلی یونیورسٹی بنا دیا تھا۔ اور چرواہے اس میں تعلیم حاصل کرتے تھے اندازہ کرو کہ مسلمانوں نے علم دین کی کس قدر ضرورت سمجھی تھی اور دین کی بنیادی باتوں کو ہر مسلمان کے دل میں ڈالنے کے لئے کیا کیا جتن کئے تھے اور ان مسلم چرواہوں نے ہی دنیا میں علمی زندگی کا کتنا اونچا معیار قائم کیا تھا[1]

اسلام کا سب سے بڑا مرکز مدینہ منورہ تھا، لیکن نہ تو یہاں اسکول اور کالج کی عالی شان عمارتیں تھیں اور نہ یونیورسٹی، یہاں کا طرز تعلیم یہ تھا کہ :

حضرت جابر بن عبداللہ مسجد نبوی میں درس دے رہے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ اپنی جگہ بیٹھے درس دے رہے ہیں (آپ کے آٹھ سو شاگرد تھے)

حضرت ابوسعید خدری مسند درس بچھائے ہوئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر فاروق درس دینے میں مشغول ہیں۔ حضرت عائشہؓ اپنی جگہ درس دے رہی ہیں۔

---

[1] العلم از المستدرک بحوالہ البلاغ بمبئی۔

علی بن ابی زُرعہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت ایک لاکھ ایسے صحابہ چھوڑے جو عالم ہونے کے ساتھ باقاعدہ حضور کی حدیثیں لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

صدیق اکبر جیسے راست باز انسان فاروق اعظم جیسے صاحب ایمان و اتقاء اور علی جیسے مرد حق شناس درس گاہ نبوت کے فیض یافتہ تھے۔

یہ تھا اس امی کا فیض جس نے کسی معلم کے آگے کبھی زانوئے ادب تہہ نہیں کیا تھا۔ ٹامس کارلائل لکھتا ہے:۔

"ایک بات اس جگہ اور قابل لحاظ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا تھا۔ وہ اُمّی تھے نہ اگلے علوم سیکھے تھے اور نہ پچھلے کیونکہ وہ خود ان تمام چیزوں سے غنی تھے (لیکن) ان کے منہ سے جو کلمہ بھی نکلتا۔ وہ حکمت عملی میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ جہاں بولنے کا موقع نہ ہوتا تو بالکل ساکت رہتے اور جب بولتے تو عقل و اخلاص اور حکمت کے موتی جھڑتے۔"

(لائف آف دی ہولی پروفٹ)

بعض لوگ عربیت کی ناواقفیت اور جہالت کی بنا پر قرآن پڑھ کر ہنستے ہیں۔ اگر وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس فصیح و بلیغ اور دل ہلا دینے والی زبان و عبارت سے لوگوں کو تبلیغ و ہدایت کا درس دیتے ہوئے سنتے تو ان کی طرح یہ بھی سربسجود ہو کر بے اختیار چیخ اٹھتے کہ:۔

"اے پروردگار کے سچے پیغمبر! ہم کو ذلت و ہلاکت کے گڑھے سے نکال کر عزت و نجات کی بلندیوں پر پہنچا دے!" (جان چیک روسو)

(بحوالہ یورپ اور اسلام)

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ (پیرس) اپنے ایک مضمون "قرآن مجید کے ترجمے" میں تحریر فرماتے ہیں:

"شمس الائمہ سرخسی (وفت ۴۸۳ھ) نے اپنی تالیف "المبسوط" میں لکھا ہے:۔"مروی ہے کہ (چند نو مسلم) ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے درخواست کی کہ ان کے لئے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کریں اور آپ نے سورہ فاتحہ کا فارسی میں ترجمہ کر کے انھیں بھیجا۔"

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور بڑے فقیہ امام تاج الشریعہ نے اپنی کتاب "النهاية حاشية الهداية" میں مزید تفصیل یہ دی ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جزء بھی نقل کیا ہے "بنام خداوند بخشا ئندہ مہربان"

(جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ ہے)

جغرافیہ اسلامی عہد میں

دنیا مسلمانوں کا وطن اکبر ہے۔ مسلمان اس دنیا کے باشندے ہیں اور اس کی ہر اقلیم، ہر ملک اور ہر براعظم کو اپنی جیب سمجھتے ہیں۔ اللہ کی زمین اور اللہ کے بندے، خدا کی مخلوق اور ساری خدائی۔

"ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" — "ہر ملک ہمارا ملک ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ہر ملک ہمارے ہی خدا کا تو ملک ہے"۔ جس قوم کے بچے یہ خیال لے کر پیدا ہوں اور جس قوم کے جوان اجنبی ملکوں کے ساحلوں پر کھڑے ہو کر اس قسم کے عقیدہ کا اظہار کریں، وہ پہاڑی سرحدوں میں قلعہ بند ہو کر نہیں رہ سکتے۔

حضرت عیسیٰؑ کے میلاد پر چھ سو سال گزر چکے تھے کہ مسلمان چشمے کی طرح ابھرے، آبشار کی طرح زمین پر نازل ہوئے اور بہتے ہوئے دریاؤں اور نہروں کی طرح چاروں طرف بڑھتے چلے گئے۔ عرب سے چلے، فرانس کے پہاڑوں تک پہنچے، سائبیریا کے جنگلوں میں بسے، بحر شمالی کے قریبی شہروں پر سایہ فگن ہوئے، چین میں آباد ہوئے، مصر، شام، عراق، فارس، اٹلی، سسلی، اسپین، افغانستان، ہندوستان، بحر روم، بحر الکاہل، بحر عرب، بحر ہند کے حکمران بنے۔ انہوں نے بحر روم کو فتح کیا، ہوا کا رخ بدلا، چاند سورج پر علم و تحقیق کی کمند ڈالی اور ستاروں کو اپنی رفتار کے ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ انہوں نے عرب کے نخلستانوں میں قوت حاصل کی، شام کے سنگتروں کا رس پیا، ایران کے محلات میں گرد جھاڑی، آریانا (افغانستان) پہنچ کر پھل کھائے، ہندوستان آ کر پھول سونگھے، اسپین میں داخل ہو کر یونیورسٹیاں بنائیں، سمرقند میں رصدگاہیں قائم کیں، ملکوں کے راستے ناپے، اقلیموں کے حالات پر دسترس حاصل کی، براعظموں کے نقشے بنائے، زمینوں کا بندوبست کیا اور پیداواروں کی تنظیم کی۔

وہ شش جہات عالم میں آزاد بن کر گھومے، مگر خدا کے ہو کر رہے۔ وہ جہاں گئے، خدا کے نام کے ساتھ، خدا کے گھر (بیت اللہ) کا نام بھی ساتھ لے گئے۔ ساری دنیا ان کا گھر تھی، مگر ان کا دل؟ بیت اللہ کی محبت کا گھر تھا۔

بیت اللہ کا عشق، حج کی محبت، فتح کا شوق، علم کا ذوق، یہ چار چیزیں تھیں جنھوں نے فاتح مسلمانوں کو سیر و سیاحت پر آمادہ کیا اور یہ سیر و سیاحت کی قدر و قیمت تھی کہ مسلمانوں کے علمی دماغ اور تعلیمی مزاج جغرافیہ کی ایجاد و تجدید کی طرف متوجہ ہوئے۔

۱۹۶ء میں ارتستین پہلا یونانی عالم تھا جس نے فینیقی سوداگروں اور سکندر کے سپاہیوں سے دنیا کے ملکوں کے حالات سنے اور ان کو قلم بند کیا۔ یہ تھی جغرافیہ کی ابتداء۔ اس کے بعد اسٹرابون سیاح اور بلینوس اور بطلیموس نے کتابیں لکھیں، جن میں جغرافیہ بطلیموس کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ بطلیموس نے چار سو پہاڑوں، بہت سے شہروں اور پہاڑی پیداواروں کا ذکر کیا۔ اس

حد پر جغرافیہ ختم ہو گیا۔ پانچ سو برس بعد مسلمان علوم و فنون کا تاج سر پر رکھ کر نمودار ہوئے اور انھوں نے حقیقی معنوں میں علم جغرافیہ کو ایک مستقل علم کی حیثیت سے ایجاد کیا۔ اصمعی، ہمدانی، ابوالاشعث نے کتابیں تحریر کیں۔ جغرافیہ کی تخلیق کے لیے سیاحت بڑی ضروری چیز تھی، مسلمان اس کام میں نمبر اول نکلے۔ انہوں نے دنیا کو اپنے قدموں سے روند ڈالا، ہر طرف گئے، ہر سمت میں بڑھے، ہر ملک میں پہنچے اور سمندروں، دریاؤں، نہروں، ساحلوں، شہروں، جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، وادیوں، انسانوں اور حیوانوں سے ان کا نام پوچھ کر چھوڑا۔ انہوں نے خود زحمت اٹھائی، معلومات جمع کیں اور ان کو ہمارے سامنے بطور ارمغان پیش کر دیا۔

شیخ ابوزید بلخی، جغرافیہ کا پہلا مسلمان موجد تھا جس نے "صور الاقالیم" لکھ کر اس فن کا بنا بیج بویا۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں فنی ضرورت کے مطابق سمندروں، دریاؤں، ساحلوں، پہاڑوں، شہروں، شہری باشندوں اور ان کے تمام طبعی حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابو اسحٰق الاصطخری دوسرا جغرافیہ دان تھا جس نے بلخی کا زمانہ پایا اور اپنی یادگار زمانہ کتاب "مسالک الممالک" لکھ کر ساری دنیا پر احسان کیا۔ اصطخری نے دنیائے معلومہ کا دورہ کیا۔ اس کی مہم تیسری صدی ہجری کے بعد پوری ہوئی اور اس سے زبردست نتائج برآمد ہوئے۔

عصر حاضر کے سیاح بلخی اور اصطخری ہی کے نقشِ قدم پر قدمِ ہمت اٹھا کر چلتے ہیں اور دنیا کی سیاحت کرتے ہیں۔ ابن حوقل نے ۳۳۱ھ میں سیاحت کی اور "مسالک والممالک" کے نام سے اپنا جغرافیہ لکھا۔ اس نے ایک اور بات ایجاد کی اور وہ یہ کہ مختلف اقالیم کے نقشے بھی درج کیے جو بڑے رنگین اور مزین تھے۔ یورپ نے ابن حوقل کی اس اٹلس سے بہت فائدہ حاصل کیا اور اس تصنیف کو زبردست اہمیت دی۔ اس کے بعد ہمدانی، مسعودی اور مقدسی نے سیاحت کی اور فنِ جغرافیہ کو توسیع و ترقی دی۔

ابوعبداللہ محمد بن ادریس الاندلسی جغرافی نے سیاحت کے علم کو "مہم" بنا دیا۔ اس کی مہم نے افریقہ کے برِاعظم کو بھی نہ چھوڑا "نزہۃ المشتاق" ادریسی ہی کا معرکۃ الآرا جغرافیہ ہے۔ ادریسی نے صحرائے افریقہ کے متعلق نادر و نایاب معلومات قلمبند کیں جن کو آج تک یورپ کے جانباز سیاح بھی دریافت نہیں کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ براعظم یورپ میں ابن ادریس کی "نزہۃ المشتاق" کا فنی درجہ بہت بلند ہے، ۱۸۳۶ھ میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہو کر علمائے یورپ کے سامنے آ چکا ہے۔

مسلمان علمائے پانچویں چھٹی صدی ہجری میں فنِ جغرافیہ کے بارے میں تازہ اصول ایجاد کیا۔ انھوں نے جغرافیہ کو قاموس دائرۃ انسائیکلو پیڈیا کے طرز پر ترتیب دینا شروع کیا۔

ابوعبداللہ شہاب الدین رومی یاقوت الحموی نے اس ایجاد کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کی۔ یاقوت نے قاموسی اصول پر حروف ہجا کے اعتبار سے شہروں کا جغرافیہ لکھا اور اس کا نام "معجم البلدان" تجویز کیا۔ اگرچہ مصنف ۶۲۸ھ میں وفات پا گیا، مگر اس کا کارنامہ کارناموں کی دنیا میں آج بھی زندہ ہے۔

تیسرا فن جو فنِ جغرافیہ کے لیے دوسرے درجہ پر لازمی ہے، سیاحت ہے۔ مسلمانوں نے سیاحت کو بھی ایک فن بنا کر اس سے خوب خوب کام لیا۔ ابن فضلان چلپی، ابن بطوطہ نے سفرنامے لکھے جن میں جغرافی معلومات کے صدہا سربمہر ذخیرے ملتے ہیں۔

ایک عیسائی پادری نے کسی جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں میں جغرافیہ کی توسیع و ترقی حج کی برکت تھی۔ دنیا کے مسلمان حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے اور صدہا وہاں سے دنیا کی پیمائش کرنے کے لیے نکلتے تھے۔ سیر و سیاحت کا داعیہ یہاں سے پیدا ہوا۔ اس شوق کو خدا نے پیدا کیا اور خدا کے گھر نے ابھارا۔ اب وُہ نہ شوق تھا، نہ ذوق بلکہ ایک فن تھا جس سے فاتح مسلمانوں نے ہر فتح کے محاذ پر کامیابی حاصل کی۔

کیا زمانہ تھا، کیسے لوگ تھے، کیا علم تھا، کیا فن تھا۔ مٹی پر ہاتھ ڈالتے تھے تو خدا کے حکم سے سونا ہوجاتا تھا۔ دراصل ان کا اعتقاد سچّا تھا، قبلہ صحیح تھا، زبان پکی تھی، علم حق تھا، وُہ موحد تھے، ہم کاریگر بھی نہیں رہے۔ یا وُہ زمانہ تھا، یا یہ دَور ہے۔ جھوٹے دل سے خدا کو اب بھی یاد کر لیتے ہیں مگر خدا کا گھر اب دل سے دُور اور دماغ سے اوجھل ہے۔

تاجدارِ دو عالمؐ کی فصاحت و بلاغت

عبدالرحمٰن عزام

بطلِ اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے۔ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی۔ جو کچھ آپؐ کو بطور الہام عطا کیا گیا، اس کی تفصیل کتاب اللہ میں ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے جو اقوال و آثار ہیں، وہ آپ کی عقلِ سلیم اور پاکیزہ زبان کے نتائج و ثمرات ہیں۔ آپؐ کے کردار و گفتار کی حقیقی تصویر تا ابد جھلکتی رہے گی اور آپ لوگوں کے پیشوا اور فصاحت و بلاغت کے امام تسلیم کیے جائیں گے۔ جس شخص میں یہ تین امور انجام دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، وہ تاریخ عالم کی بے مثال ہستی تصور کیا جائے گا:

۱۔ مختلف قبائل اور متضاد خاندانوں کو متحد و منظم کر کے ایک جماعت بنا دینا،

۲۔ ایک ایسی سلطنت کی بنیاد قائم کرنا، جو چار دانگ عالم میں تمام حکومتوں اور سلطنتوں کا مرکز بن جائے اور صدیوں تک برقرار رہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب میں جہاں بھی آلِ ہاشم نے سلطنت قائم کی، اس کے اثرات کم از کم ہر سال سے بھی زیادہ مدت تک برقرار رہے،

۳۔ دنیا کے سامنے ایک ایسا دین پیش کرنا، جس کو عرب و عجم، سیاہ و سپید، غرضیکہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ماننے والے موجود ہوں۔

چنانچہ یہ تین عظیم الشان مقاصد آپؐ میں جلوہ گر تھے، جن کی تکمیل وحی کے بعد آپ کی شستہ و شیریں زبان، فصیح و بلیغ انداز، عقل، فہم اور طبعِ سلیم کے ذریعے ہوئی۔

تمام اکابر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا آسان اسلوب تفہیم اور معجز طرزِ بیان عطا کیا گیا تھا جو کسی معلم و مصلح کو نصیب نہ ہوا۔

آپؐ عربی زبان کے مالک تھے۔ آپؐ کا ہر لفظ معنی کا مخزن، ہر کلمہ حقائق سے لبریز، ہر قول حکمتوں کا سرچشمہ اور جملہ فصاحت و لطافت کا مظہر تھا، جو تصنع اور خود ساختگی کے شائبہ سے پاک تھا۔

ایک دن آپؐ کے صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ سے زیادہ فصیح و بلیغ کسی کو نہیں دیکھا۔

آپؐ نے فرمایا: اس میں کیا شک ہے، قرآن تو میری اپنی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔

آنحضرتؐ نے اپنی فصاحت کی خود اس طرح تعبیر پیش کی کہ آپؐ قریش میں پیدا ہوئے اور بنو سعد میں پرورش پائی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ آپؐ کے اندر دیہات کے جرأت آمیز انداز اور شہر کے لطافت بخش آثار موجود تھے۔ آپؐ کا قریش میں پیدا ہونا اور بنو سعد میں نشوونما پانا اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہے کہ آپؐ میں عرب کے ہر قبیلہ و گروہ کو اپنے لہجہ سے مخاطب کرنے کی قدرت پائی جاتی ہے۔ آپؐ

ایسے دلکش انداز، بلیغ اسلوب اور شستہ زبان میں کلام فرماتے کہ سننے والا خواہ قحطان یا عدنان کا ہو یا جنوبی جزیرہ کا، خواہ شمالی حجاز کا ہو یا تہامہ و نجد کا باشندہ ہو، خود بخود آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اسے اعتراف کرنا پڑتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فصاحت و بلاغت کے امام ہیں۔

آپؐ کی گفتگو بہت روشن، صاف اور واضح ہوتی۔ اس میں ابہام اور اشتباہ کو دخل نہ ہوتا۔ آپؐ کی مجلس میں سے ہر شخص اس کو یاد کر سکتا تھا۔ حضرت عایشہؓ فرماتی ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری طرح تیز گفتگو نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ رُک رُک کر صاف اور واضح کلام فرماتے تھے۔ آپؐ کے قریب بیٹھا ہوا ہر شخص اس کو محفوظ کر لیتا۔

حضرت عایشہؓ سے ایک اور روایت ہے کہ:

آپؐ اس طرح گفتگو فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص اس کو شمار کرنا چاہے، تو شمار کر سکتا تھا۔

عرب قوموں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر بہت ناز تھا۔ اس غرض کے لیے ان کے بڑے بڑے میلے ہوا کرتے تھے جہاں وہ باہم اپنے ادبی مظاہرے کیا کرتے تھے، جس کے اشعار لاجواب ہوتے، ان کو جلی حروف میں لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگوں کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور فصاحت و بلاغت کے ایسے جوہر دکھائے جن کی آب و تاب سے عرب کے فصاحت کے دعویداروں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ انھی عربوں میں خواہ وہ جاہلیت کے ہوں یا اسلامی دور کے ابوبکرؓ قریش میں باعتبارِ حسب و نسب بہت ممتاز تھے۔ یہ بھی آنحضرتؐ کی فصاحت و بلاغت پر حیرت کرتے تھے۔ ایک دن ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں عرب کے گلی کوچے اور یہاں کے بازار گھوم چکا ہوں، فصحا کے بلیغ سے بلیغ کلام بھی سُن چکا ہوں، لیکن آپؐ کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں سب کو ہیچ پایا۔ یہ ادبی شان آپؐ میں کس نے پیدا کی، کس نے آپؐ کو یہ معجز بیانی سکھائی ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور اعجاز بیان سے آراستہ و پیراستہ کیا۔

آپ کی فصاحت کی یہی سچی تصویر ہے کیونکہ آنحضرتؐ فطری طور پر فہیم و ذکی تھی۔ آپؐ کو منجانب اللہ غیر معمولی فہم و بصیرت، عقلِ سلیم اور طبعِ مستقیم عطا ہوئی تھی، جو آپؐ کے ہر قول و فعل میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔

جاحظ، جو عربی ادب میں بہت بلند درجہ رکھتا ہے، آنحضرتؐ کے فصیح و بلیغ کلام کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:

"خدا نے آپؐ کے کلام میں لطافت و محبت کی چاشنی پیدا کی تھی اور اس کو مقبولیت کا شرف عطا کیا تھا۔ اس میں شیرینی، دل آویزی اور شستگی بھی رہتی تھی۔ باوجود کلام کی تکرار اور سننے والے کو اعادہ کی عدم حاجت کے نہ آپؐ کے کلام کا وقار اور توازن گھٹتا نہ کسی کلمہ میں لغزش ہوتی، آپ کی فصاحت کا نہ کوئی دشمن مقابلہ کر سکا اور نہ کسی خطیب کو آپ کی فصاحت کی ہمسری کی ہمت ہوئی۔ آپؐ طول طویل خطبوں کو موزوں و مجمل کلام میں بیان فرما دیتے۔ آپ نے صداقت و واقعیت کو کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آنحضرتؐ کے کلام میں جس قدر

راست بازی، انصاف پسندی، نفع رسانی اور وزن و وقار کا پہلو غالب تھا، اتنا کسی اور کے کلام میں ناپید تھا۔"

اب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و کلمات سے، جو مختلف مواقع پر استعمال کیے گئے، جن میں بے شمار معانی وحقایق پوشیدہ ہیں "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کی فصاحت و بلاغت کا سمندر کس قدر لامحدود اور ذخار تھا۔ صدیاں گزرنے پر بھی اس قسم کی جودت طبع، طلاقت لسانی اور معجز بیانی کا ثبوت کوئی شخص پیش نہیں کر سکا۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ میرے پروردگار نے مجھے نو (۹) چیزوں کا حکم دیا ہے:

۱۔ خفیہ و علانیہ حالت میں اور خلوت و جلوت میں خدائے تعالیٰ سے ڈرنا،

۲۔ غصہ اور خوشی کے وقت عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا،

۳۔ فقر و غنا میں میانہ روی اختیار کرنا،

۴۔ جو مجھ سے قطع تعلق کرے، میں اس سے صلہ رحمی کروں،

۵۔ جو مجھے محروم رکھے، میں اس پر بخشش و احسان کروں،

۶۔ جو مجھ پر ظلم و ستم ڈھائے، میں اس سے درگزر کروں،

۷۔ میرے ارادہ میں غور و فکر ہو،

۸۔ میری زبان پر ذکرِ خدا ہو،

۹۔ میری نظر سراپا عبرت ہو،

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار پر یہ کلمات لکھے ہوئے پائے:

"جو تجھ پر ظلم کرے تو اس کو معاف کر دے، جو تجھ سے رشتہ توڑے، تو اس کو جوڑ دے، جو تجھ سے بدی کرے، تو اس پر اچھائی کا سلوک کر۔ ہمیشہ حق بات کہہ، خواہ اپنی ذات پر ہو۔"

ابن عباسؓ فرماتے ہیں، میں آنحضرتؐ کا ردیف تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"اے لڑکے! اللہ کی حفاظت کر، خدا تیری حفاظت کرے گا۔ حق کی حفاظت کر، خدا کو تو اپنے قریب پائے گا۔ خوشحالی میں اللہ کی حمد و ثنا کر، تنگ دستی اور مصیبت کے وقت وہ تیری تعریف کرے گا۔ اگر تجھے کسی چیز کی حاجت ہے، تو تو اللہ ہی سے مانگ۔ اگر تجھے امداد و اعانت درکار ہے، تو خدا ہی سے طلب کر۔ خدا نے جو چیز تیرے مقدر میں نہیں لکھی، اگر تمام لوگ بھی مل کر تجھے کچھ فائدہ پہنچانا چاہیں، تو ان سے نہ ہو سکے گا۔ قلم خشک ہو گئے اور دفتر تہہ کر دیئے گئے۔ اگر تیرے اندر تسلیم و رضا کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے کی قوت موجود ہے تو اسے کر گزر۔ اگر تجھ میں اتنی طاقت نہیں، تو مصیبت پر صبر کرنے میں بہت بہتری ہے۔ کامرانی و فتح صبر و عزیمت سے اور راحت و آسائش مصیبت و تکلیف کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ہر تنگی کے بعد کشادگی اور ہر مشکل

کے بعد آسانی ہے اور تنگ دستی و مشکل ہرگز خوشحالی پر غالب نہیں آسکتی۔"

ابوذرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تو جہاں کہیں ہو، خدا تعالیٰ سے خوف کر۔ بدی میں نیکی اور احسان کر، کیونکہ بھلائی برائی کو مٹا دیتی ہے۔ لوگوں سے حُسنِ خلق اور نیک سلوک سے پیش آ۔"

ابن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یہ دو خصلتیں جس شخص میں پائی جائیں گی، اللہ تعالیٰ اُس کے نام کے ساتھ صابر و شاکر لکھے گا۔ جس میں یہ صفات نہ پائی جائیں، وہ نہ شاکر کہلائے گا اور نہ صابر:

۱۔ جس شخص نے اپنے دین میں بڑے آدمی کو دیکھا اور اُس کی اقتدا کی،

۲۔ جس نے اپنی دنیا میں اپنے سے کم مرتبہ شخص کو دیکھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی حمد و تعریف کی۔"

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص خود کو ڈانواں ڈول ثابت نہ کرے (یعنی وہ شخص جو اپنی کمزوری کی وجہ سے نہ دوسروں کی رائے پر چلتا ہے اور نہ اپنی رائے پر ثابت قدم رہتا ہے) جو یہ کہتا ہے میں لوگوں کے ساتھ ہوں۔ اگر کوئی بھلائی کرے تو میں بھی احسان کروں گا۔ اگر وہ بُرائی کریں، تو میں بھی بدی کروں گا۔ لیکن تم اپنی رائے میں مستقل رہو۔ اگر لوگ بھلائی کریں، تو تم بھی ان کا اتباع کرو۔ اگر وہ بُرائی کریں، تو تم ان کی بدی سے احتراز کرو۔"

حضرت معاویہؓ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو ایک خط میں لکھا کہ تم مجھے ایک جامع اور مختصر خط لکھو، جس میں میرے لیے کچھ وصیت ہو۔ چنانچہ انھوں نے ان کو لکھا:

"تم پر سلام ہو۔ بعد حمدِ خدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص لوگوں کو ناخوش رکھ کر خدا تعالیٰ کو رضامند رکھے گا، خدا تعالیٰ اس کو لوگوں سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لے گا اور اگر اللہ تعالیٰ کو ناخوش رکھ کر لوگوں کی خوشنودی تلاش کرے گا، تو خدا تعالیٰ اپنا ذمہ اس سے اٹھا لے گا اور لوگوں کے رحم و کرم پر اسے چھوڑ دے گا۔ والسلام علیک۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"انسان کے اندر یہ چیزیں نہایت بُری ہیں: بخیلی جو ہلاک کر دے اور وہ بزدلی جو مصیبت میں ڈالے۔ تم ظلم کرنے سے بچتے رہو کیونکہ ظلم قیامت کے دن کی ظلمتوں میں سے ہے۔ بخل سے بھی پرہیز کرو کیونکہ بخیلی نے تمہاری گزشتہ قوموں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کی خونریزی اور ہتک حرمت پر آمادہ کر دیا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"خدا تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزیں مذموم قرار دی ہیں، "قیل و قال"، "اضاعت مال" اور "کثرت سوال"۔

نیز آپ نے فرمایا:
"تم اپنے کسی بھائی کو گالیاں نہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ اس کو معاف کر دے اور تم کو مصیبت میں مبتلا کر دے۔"
نیز آپ نے ارشاد فرمایا:
"کیا میں تمہیں بتاؤں، تم میں سے بُرا شخص وُہ ہے، جو تنہا کھاتے، اپنے غلام پر تازیانے لگائے اور اس پر رحم نہ کرے۔"
ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:
"عنقریب وُہ دَور آئے گا، جب تو ایسی قوم کو دیکھے گا کہ ان کے ہاتھوں میں گائے کی دُم ہوگی اور وہ خدا کے غضب میں صبح و شام کریں گے۔"
نیز آپ نے فرمایا کہ دو قسم کے لوگ جہنمی ہیں:
"ایک وہ، جن کے پاس گائے کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے، جن سے وہ لوگوں کو مارتے رہیں گے۔
دوسرا گروہ ان عورتوں کا ہوگا، جو اوڑھی ہوئی ہیں، مگر ننگی ہیں۔ لوگوں کے دلوں کو مائل کرنے والی اور خود ان کی طرف مائل ہونے والی ہیں۔ ان کے سر اونٹ کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ وہ جنت میں داخل ہوں گی نہ اس کی بُو ہی سونگھ سکیں گی۔"
نیز آپ نے ارشاد فرمایا:
"دُو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگوں کو نقصان پیش ہوتا ہے، ایک تندرستی، دوسری فارغ البالی۔"
اس معنی خیز اور حقیقت پرور کلمات میں غور کیجئے اور دیکھیے کہ ان کے اندر کتنی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس شخص کی صحبت میں کوئی بھلائی نہیں، جو تمہیں ویسا نہ چاہے جیسا کہ تم اس کو چاہتے ہو۔ لوگ اپنے زمانے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میری امت جب تک امانت کو غنیمت اور صدقہ کو فرض سمجھے، بھلائی میں رہے گی۔ بخل کی اطاعت کیشی نفسانی خواہشوں کی پیروی اور خود پسندی سے بچتے رہو۔ کیونکہ یہ چیزیں ہلاکت میں ڈالنے والی ہیں۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک منصف مزاج اور حقیقت پسند خطیب تھے۔ اپنی بصیرت افروز حقیقتوں کو لوگوں کے دلوں میں اور کانوں تک اس انداز میں پہنچاتے کہ وہ ان میں سرایت کر جاتیں۔ آپ رنگین کلامی، فضول باتوں اور لفاظی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کا کبھی قصد نہ فرماتے تھے۔ آپ خواہ مخواہ کی فصاحت چھانٹنے اور منہ بنا بنا کر گفتگو کرنے کو نہایت ناپسند جانتے تھے۔ آپ کی گفتگو حد درجہ واضح اور ظاہر ہوتی، جو دل و دماغ میں فوراً اثر انداز ہو جاتی۔ آپ طول طویل خطبے، ایجاز و اختصار کے ساتھ دیا کرتے تھے، جو حشو و زواید سے خالی ہوتے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ آپ کے کلام میں ایجاز کامل کے ساتھ اعجاز اکمل بھی پایا جاتا تھا۔
ابُو سعیدؓ خدری فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ہمیں عید کی نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا۔ قیام قیامت کے متعلق جس قدر

شواہد و آثار تھے، وہ تمام ہمارے روبرو پیش کیے۔ بعضوں نے اس کو یاد کر لیا اور بعض کو بھول گئے۔ آپؐ نے اپنے خطبہ میں فرمایا:

"دنیا ایک دلکش سبز باغ ہے۔ خدا تعالیٰ نے تمھیں دنیا کا خلیفہ اور اپنا نائب بنایا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ سُنو! دنیا سے بچتے رہو۔ عورتوں کے معاملہ میں احتیاط برتو۔ جب کسی شخص کو حق بات کا علم ہو جائے، تو اس کو بلا خوف و خطر کہہ دے۔ اور لوگوں کے خوف کا اندیشہ نہ کرے۔ آگاہ ہو جاؤ، ہر فریبی اور غدار کے لیے قیامت کے دن اس کے دھوکے اور فریب و غدر کے مطابق ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ نافرمان امام کے دھوکے سے بڑھ کر اور کوئی غدّار نہیں ہے۔ غصہ انسان کے دل میں گویا ایک چنگاری ہے جس سے اس کی دونوں آنکھیں سُرخ انگارہ ہو جاتی ہیں اور رگیں پھول جاتی ہیں۔ اگر اس کا احساس ہونے لگے، تو اپنے مقام سے اُٹھ جانا چاہیے۔"

پھر ذرا اس خطبہ کو بھی ملاحظہ کیجئے، جس کو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ آدمیوں کے سامنے ارشاد فرمایا۔ جو زندگی کے اکثر و بیشتر بنیادی امور اور شریعت کے ٹھوس اصول پر حاوی و محیط ہے۔ اس کے اندر آپ نے جاہلیت کے رسم و رواج کو مٹا دیا۔ باہم مساوات کو قایم کیا۔ انتقام کے پست ترین جذبات کو فنا کر دیا اور عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو، جو عربوں میں آناً فاناً صرف ایک جھونکے سے بھڑک جایا کرتی تھیں، ایک دم بجھا دیا۔ اسی طرح سُود کو بھی حرام کر دیا۔ عورت کی شانِ منزلت بڑھائی۔ فتنہ و فساد، لوٹ مار اور آپس کے جنگ و جدل کو جو عربوں کے عزّت و وقار کا سرمایہ تصور کیا جاتا تھا، مطلقاً حرام قرار دیا۔ حرمت والے کو حلال قرار دیا اور حرام و حلال اوقات کو بیان فرمایا کیونکہ اہلِ روم خاص مہینوں میں عربوں سے جنگ کرنے کو حرام قرار دینے میں انتہائی غلو برتتے تھے اور ان کے حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔ الغرض آپ نے لوگوں کو مختلف احکام و اوامر کی نصیحت فرمائی اور جن گناہوں کو حقیر اور اعمال کو کمتر جانتے تھے، ان سے خوف دلایا۔

آپؐ نے خطبہ کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! تم اچھی طرح کان دھر کر سُنو! کیونکہ نہیں معلوم میں اس سال کے بعد پھر اس جگہ تم سے خطاب کر سکوں۔

لوگو! زمانہ اس وقت سے اب تک اپنی گردش میں مصروف ہے، جب سے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ بارہ مہینوں کا ایک سال ہے۔ ان میں سے چار مہینے حرمت و تعظیم والے ہیں۔ یہ تین تو مسلسل ہیں: ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور چوتھا رجب، جو شعبان اور جمادی کے مابین ہے۔ یہ مہینا کون سا ہے؟ کیا ذی الحجہ نہیں ہے؟

لوگوں نے عرض کیا: بے شک وہی ہے۔

آپؐ نے فرمایا: یہ شہر کون سا ہے؟ کیا یہ وہی شہر نہیں ہے؟

لوگوں نے کہا: بے شک۔
آپ نے فرمایا: یہ دن کون سا ہے؟ کیا قربانی کا دن نہیں ہے؟
لوگوں نے جواب دیا: بے شک۔
پھر فرمایا: تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں تم پر حرام ہیں۔ جیسا کہ یہ دن، یہ مہینا اور یہ مقدس شہر حرمت والے ہیں، تم عنقریب اپنے پروردگار سے جا ملو گے اور اپنے اپنے اعمال کے متعلق پُوچھے جاؤ گے۔

سُنو! میرے بعد کہیں تم گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دُوسرے کی گردنیں مارتے پھرو۔ تم میں سے جو شخص یہاں حاضر ہے، اپنے دُوسرے غیر حاضر شخص کو میرا پیغام پہنچا دے۔ شاید وہ لوگ، جن کو یہ پیغام پہنچا ہے، بمقابلہ سننے والوں کے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں۔ کیا میں نے اپنا پیام پہنچا دیا۔ کیا میں نے اپنی تبلیغ کا فرض انجام دے دیا؟ جس شخص کے پاس کوئی امانت ہو، اس کو اس کے حقدار تک پہنچا دے۔ ہر سُود ساقط کر دیا جاتا ہے۔ ہاں تمھارا راس المال تم رکھ سکتے ہو، تاکہ کسی پر ظلم نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ راس المال سُود نہیں ہے۔ عباس بن عبدالمطلب کا جتنا سُود ہے، وہ سب ساقط کر دیا جاتا ہے۔ جاہلیت کی جس قدر خونریزی اور دیت تھی، وہ تمام معدوم کر دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے میں عبدالمطلب کے بیٹے حارث بن ربیعہ کی خونریزی کو معاف کرتا ہُوں۔

لوگو! اب شیطان جزیرۂ عرب میں بتوں کی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ مگر اس کے علاوہ دیگر چیزوں میں اس کو اپنی اطاعت کی توقع ہے۔ تم اپنے جن اعمال کو حقیر سمجھتے ہو، وہ ان سے خوش ہو گیا ہے۔ تم اپنے دین میں شیطان سے ڈرتے رہو۔

لوگو! بے شک نسئی کفر میں زیادتی کا موجب ہے۔ کافر لوگ اس سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایک سال تو اس کو حلال کر دیتے ہیں اور دوسرے سال اس کو حرام، تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو تعداد حرمت کی مقرر کی ہے، اس کی موافقت ہو جائے۔ اس لیے وُہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر دیتے ہیں۔

لوگو! تم پر تمھاری عورتوں کا حق ہے اور ان پر بھی تمھارا حق ہے۔ تم پر ان کا یہ حق ہے کہ وہ تمھارے سوائے کسی ایسے شخص سے ربط و ضبط نہ رکھیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو اور کوئی فاش غلطی نہ کر بیٹھیں۔ اگر وہ اس طرح کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے کہ تم ان کو اپنے بستروں سے الگ کر دو اور ان کو پہلے تو ہلکی سی سزا دو، اگر وہ اس سے باز رہ جائیں، تو ان کے لیے ان کا کھانا اور کپڑا ہے۔

اے لوگو! تم عورتوں کو بھلائی کا حکم دو (یعنی مرتے وقت مال اور ورثہ کی وصیت کرو) کیونکہ وہ تمھارے پاس قیدیوں کے مانند ہیں، ان کو اپنے آپ کسی چیز پر قابو نہیں ہے۔

اے لوگو! تم میری باتوں کو سمجھ لو۔ میں نے اپنی تبلیغ کا فرض ادا کر دیا۔ میں نے تم میں دو چیزیں یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ چھوڑی ہیں۔ جب تک ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

اے لوگو! میری باتیں سنو اور سمجھو اور جان رکھو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے ایک بھائی کا مال دوسرے پر حرام ہے۔ لیکن ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے دے دے، تو جائز ہے تاکہ تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کر بیٹھو۔ اے خدا! کیا میں نے اپنا تبلیغی فرض پورا کر دیا ہے؛

لوگوں نے بیک آواز جواب دیا: بے شک۔

آپؐ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ ہے۔ پھر آپؐ اپنی اونٹنی پر سے اُتر گئے۔

اس خطبہ میں زندگی کے اہم اصولوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس خطبہ کے وقت عرب کی اجتماعی حالت بلکہ تمام انسانی سوسائٹی کی کیفیت کا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خطبہ آنحضرتؐ کے ظہور قدسی کے بعد ایک اہم اجتماعی انقلاب کا پیش خیمہ اور زبردست اصلاحی نظام کے لیے سنگِ بنیاد تھا۔ اس کے اندر تمام امراض و علل کی تشخیص اور ان کا علاج، تہذیب و عمران کے وہ زرّیں اصول اور ارتقاء کے وہ اسرار و رموز پوشیدہ ہیں، جنھوں نے عرب کے جاہلوں اور گمراہوں کے اندر وہ عظیم الشان روح پھونکی اور ایک ایسی قوم بنا دیا، جو مشرق و مغرب میں صدیوں تک حکمرانی کرتی رہی۔

زمانہ خواہ کتنا ہی پلٹا کھائے اور گزشتہ یادگاروں کو مٹانے کی کوشش کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ اپنی لطافت خیز رفتار اور ترنّم ریز آواز کے ساتھ جاری رہے گا اور علم و ادب کے شیدائیوں اور دلدادگان کو ایسا سرور و کیف بخشے گا، جس میں ہر ادیب اپنے دل میں وجدانی کیفیت اور روح میں تسکین محسوس کرے گا۔

دورِ نبوی میں عرب قوم

گلزار حسین

چھٹی صدی عیسوی میں دنیائے تہذیب و تمدن اور جہانِ عمرانیت و معاشرت مکمل طور پر مسخ ہو چکا تھا۔ کفر، الحاد، شرک، ظلم و استبداد اور بے حیائی کی تاریکی نے ہر طرف سے انسانیت کو گھیر رکھا تھا۔ عرب کی حالت بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہاں بھی اصنام شکن حضرت ابراہیمؑ کی اولاد نے پھر سے شیوۂ آذری اختیار کر رکھا تھا۔ ستاروں کی پرستش اور بتوں کی پوجا مکمل طور پر حاوی تھی۔ ارواحِ خبیثہ اور بھوت پریت پر بھی ان کا اعتقاد تھا، جنھیں یہ خدا کا مقرب سمجھ کر پوجتے تھے۔

جاہلیت کی بنا پر ان کی اخلاقی حالت بھی نہایت پست تھی اور روزمرہ کی زندگی میں وحشت و بربریت عیاں تھی۔ مثلاً کھانے پکانے میں حرام و حلال تو ایک طرف، نفیس و خبیث کی بھی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض ان کی عام غذا تھی۔ چھپکلیوں کو کھا جاتے تھے۔ مردہ جانوروں اور چمڑے تک کو بھون کر کھا لیتے تھے۔ درندگی کا یہ عالم کہ زندہ اونٹ کی کوہان اور دُنبہ کی دُم کی چکی کاٹ کر کھا لیتے۔

عائلی زندگی میں باپ کے مرنے کے بعد اس کی تمام بیویاں، سوائے حقیقی ماں کے بیٹے کی وراثت میں آجاتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔ بیویوں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی۔ عارضی نکاح کا رواج تھا اور بدکاری عام اور مختلف شکلوں میں تھی۔ شجاعت اور بہادری میں کسی کی شہرت سنتے تو اپنی بیوی اس کے پاس بھیج دیتے تاکہ بہادر اولاد پیدا ہو۔

بے شرمی کی یہ کیفیت کہ حج میں ہزاروں لوگ جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا سب عورتیں مرد برہنہ ہو کر طوافِ کعبہ کرتے۔ شراب پانی کی طرح پیتے۔ حد یہ کہ عورتیں اور بچے ساقی گری کرتے۔ اسی شراب کے عشق کی وجہ سے ان کی زبان میں اس کے تقریباً ۲۵۰ نام ہیں۔ شراب کے ساتھ قمار بازی لازمی ہوتی تھی اور اس کا شمار ان کے ہاں قومی مفاخر میں تھا۔

معاشی زندگی میں سُود خواری کا نظام رائج تھا۔ عورتوں اور بچوں تک کو گروی رکھوا لیا جاتا تھا۔ سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کی وجہ سے لُوٹ مار عام تھی اور بعض قبائل کا ذریعہ معاش ہی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی تھا کہ عورتوں اور بچوں کو لوٹ کر دُوسری جگہ فروخت کر دیتے۔ شرفا لڑکیوں کو موجبِ شرم و عار سمجھتے تھے اور اس سے بچنے کے لیے زندہ دفن کر دیتے تھے۔

ان سب سے بڑھی ہُوئی خرابی ان کے ہاں خانہ جنگی کی تھی۔ ایک قبیلہ دُوسرے قبیلے کے خُون کا پیاسا رہتا تھا اور انتقام نسلاً بعد نسلٍ وراثتاً چلتا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر خُون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔ قانون اور مرکزیت نہ ہونے کی وجہ سے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ان تمام نقائص و عیوب کے باوجود ان میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں جو صرف انہی میں تھیں اور آج بھی ہمیں تہذیب و تمدن کی ترقی یافتہ دنیا میں کہیں نظر نہیں آتیں۔

حجاز کا عرب نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی ہوسِ ملک گیری اس میں تھی۔ یہ خصوصیت ساری دنیا میں اس سرزمین کو حاصل تھی کہ

زندگی کی نمو دست سے کہ اُس وقت تک کسی غیر نے ان پر حکومت نہیں کی تھی۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی بھی کوئی منظم حکومت قایم نہیں تھی۔

یہ کیفیت ان کی مذہبی دنیا میں بھی تھی یعنی کسی خاص مذہب کا کوئی اثر نہ تھا۔ محض اپنی ذوق بندگی کے لیے کچھ معبود وضع کر رکھے تھے جس طرح جی میں آتا، ان کی پرستش کر لیتے۔ لیکن اس پرستش میں بھی وہ لوگ اپنے معبودوں کے تابع نہیں تھے۔ امراء القیس کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے گھر سے نکلا تو پہلے اپنے بُت کے مندر میں گیا تاکہ اپنے معبود سے اس باب میں استفسار کرے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ تیر پھینک کر فال لیتے تھے۔ چنانچہ پہلا تیر پھینکا تو جواب نفی میں ملا۔ دوسرا پھینکا تو بھی نفی اور تیسرا پھینکا تو بھی نفی ہی میں نکلا۔ اس نے ترکش اٹھا کر بُت کے مُنہ پہ مارا اور کہا: ملعون! تیرا باپ قتل کر دیا جاتا تو میں دیکھتا کہ تُو کس طرح کہتا ہے کہ انتقام نہیں لینا چاہیے۔

سادہ زندگی اور سیدھے سادے ماحول کے ساتھ ساتھ صحرا کی وسعت نے ان کی نگاہوں میں سیر چشمی، ارادوں میں بلندی، عزم میں پختگی اور خیالوں میں فرخندگی پیدا کر دی تھی۔ ان کی مہمان نوازی آج بھی ضرب المثل کے طور پر بیان کی جاتی ہے۔

ایفائے عہد کی یہ حالت کہ جان پر بن جائے، گھر تباہ ہو جائے، دنیا بھر سے لڑائی مول لینی پڑے مگر کیا مجال کہ ایک دفعہ عہد دینے کے بعد پھر جائے۔ ایک دفعہ امراء القیس نے اپنی تلواریں اور زرہیں سموال کے پاس بطور امانت رکھیں۔ حارث غسانی نے انھیں سموال سے طلب کیا تو اس نے امانت داری کے خلاف سمجھ کر دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حارث نے ایک جرار لشکر لے کر چڑھائی کر دی، سموال میں تاب مقابلہ نہ تھی، اس لیے اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اتفاقاً سموال کا بیٹا قلعہ سے باہر رہ گیا تھا جو پکڑا گیا۔ حارث نے سموال کو پکارا۔ وُہ قلعہ کے بُرج پر آیا تو حارث نے کہا کہ امراء القیس کی زرہیں وغیرہ اب بھی میرے حوالے کر دو، ورنہ تمھارے بیٹے کو ابھی قتل کر دوں گا۔ اس نے اس پر بھی دینے سے صاف انکار کر دیا اور آنکھوں کے سامنے بیٹے کو ذبح ہوتے دیکھنا گوارا کر لیا۔

اسی طرح رفاقت میں بھی کبھی جان کی پروا نہیں کرتے تھے اور احسان کا اس قدر پاس کہ بدلہ ادا کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ شجاعت کا یہ عالم کہ میدانِ جنگ ان کے لیے کھیل کا میدان بن چکا تھا۔ بستر پر مرنا ان کے لیے بڑی ذلت کی موت تصور کی جاتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ موت ان کے نزدیک ایک کھیل تھا۔ مرد تو مرد، عورتوں کی بھی یہی کیفیت تھی کہ موت سے انھیں کسی قسم کا خوف ہی محسوس نہیں ہوتا تھا۔

لیکن ان تمام چیزوں سے بڑھ کر احساسِ برتری کا جذبہ ان کی پُوری زندگی پر چھایا ہُوا تھا۔ کوئی گوارا نہیں کرتا تھا کہ دوسرا اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے۔ ایک فرد کی دُوسرے فرد سے آگے بڑھنے کی تمنا، ایک قبیلے کی دُوسرے قبیلے پر مسابقت کی آرزو انھیں سب کچھ بھلا دیتی۔ بنو اُمیہ اور بنو ہاشم ایک ہی لڑی کی دو شاخیں تھیں مگر باہمی رقابت انتہا کو پہنچی ہُوئی تھی۔ ابوجہل سے جب ایک شخص نے پُوچھا کہ محمدؐ کی دعوتِ اسلام کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمدؐ کے خاندان نے عزت و شرف میں دعویٰ برتری کیا او ثبوت میں دعوتیں کھلائیں۔ اس کے جواب میں اسی شان کے ساتھ ہم نے بھی دعوتیں دیں۔ انھوں نے خون بہا دیے، ہم نے بھی دیے۔ انھوں نے بڑی بڑی فیاضیاں کیں، ہم نے بھی کیں۔ ہم دونوں خاندان ہم پلّہ ہو چکے تھے کہ دفعتاً ان کی طرف سے یہ دعویٰ ہُوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی آگئی ہے، اب ہم کہاں تک برداشت کریں۔

نسلی تفاخر انتہائی شدت سے کار فرما تھا۔ وہ ہر غیر عرب کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

سچائی کا یہ عالم کہ جب ابوسفیان ہرقل کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف رومیوں سے مدد مانگنے کو گیا تو ہرقل نے نبی اکرم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس سیرت کے مالک ہیں۔ اس وقت بھی ابوسفیان اس ذات اقدس و اعظم کے بارے میں جس کو وہ لوگ اپنا سخت دشمن سمجھتے تھے، سچائی سے روگردانی نہ کر سکا اور کہا کہ اس کی ساری زندگی میں ہم کسی بات پر انگلی نہیں رکھ سکتے سوائے اس کے کہ وہ ہمارے خداؤں کے خلاف ہے۔

برادران! یہ تھی وہ قوم جس نے رشد و ہدایت کے اس بارِ عظیم کو اٹھانا تھا، جو انسانیت کو اس کی منزل و منتہا پر رہتی دنیا تک لے جانے والا تھا۔

جبّار و قہّار

خدا جبّار ہے، اسمائے حسنٰی میں جبّار کے معنی وہ نہیں جو عوام نے سمجھے اور جبر کو ظلم و ستم کا مترادف خیال کیا بلکہ جبّار کے معنی ہیں "شکستہ دلوں کی شکستگی کو دُور کرنے والا۔ دکھیاؤں کے درد دُکھ کو توڑ دینے والا۔"

خدا قہّار ہے یہاں بھی قہر بمعنی غیظ و غضب نہیں، بلکہ قہر کے معنی حکومت ہیں۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ وہ اپنے بندوں پر حکمران ہے۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

بے شک آپ بہترین اخلاق پر ہیں

(القلم: ۴)



اَخلاقی اِصلاح

اوصافِ رسولؐ

حافظ مفتی محمد انوار الحق

سادہ زندگی

جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی زندگی بھی دنیوی اعتبار سے اوّل سے آخر تک نشیب و فراز کا ایک عجیب مرقع ہے آپ ولادت سے پہلے تو یتیم ہو گئے۔ ہوش سنبھالنے نہ پائے تھے کہ موت نے ماں کی آغوشِ محبت سے جُدا کر دیا اس کے چند ہی دن بعد دادا کا سایۂ شفقت بھی سر سے اُٹھ گیا۔ غرض بچپن یوں یتیمی اور بیکسی میں گزرا۔ جوان ہوئے تب بھی ایک مدت عُسرت و ناداری رفیق رہی۔ پھر یکایک قدرت نے دولتِ ظاہری کو بھی قدموں پر ڈال دیا اور آخر چالیس برس کے سن میں خالقِ کون و مکاں اور صانعِ زمین و آسماں کی طرف سے آپ کو وہ خلعتِ نبوت عطا ہوا جس کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی نعمت بھی کچھ وقعت نہیں رکھتی لیکن اس کے ساتھ ہی ہر چہار طرف سے دشمنیوں اور پریشانیوں کا بھی سامنا ہوا یہاں تک کہ آخر دس برس کی بے شمار تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد عزیزوں کی مخالفت نے وطن کی مفارقت پر مجبور کیا۔ اب پھر آہستہ آہستہ زمانے نے رنگ بدلا اور ایک عمر ناکامی کے بعد خدا نے اس منشاءِ عالیہ کی تکمیل کا سامان مہیا کیا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے یہاں تک کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صداؤں نے حدودِ عرب سے نکل کر قیصر اور کسریٰ کے ایوانوں میں غلغلہ ڈال دیا۔ مگر ان سارے تغیرات اور انقلابات میں ایک بات جو سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ آنجناب نے ہمیشہ ایک ہی طور پر زندگی بسر فرمائی، جب کچھ نہیں تھا تب بھی دل غنی تھا، جب خدا کی عنایت سے سب کچھ ہو گیا تب بھی غرور یا نخوت یا تصنّع یا نمائش مطلق چھو نہیں گئی اور ایسا ہو بھی کیونکر سکتا تھا اس شہنشاہِ ہر دوسرا کی نظروں میں ان حطامِ دنیوی کی وقعت ہی کیا تھی کہ اس سے طبیعت پر کچھ اثر پڑتا۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (کہف، ع ۹)	مال اور اولاد حیاتِ دنیا کی زینت ہیں اور باقی رہنے والے نیک کام تیرے رب کے نزدیک بہ لحاظ ثواب بھی بہتر ہیں اور بہ لحاظ امید بھی۔

آپ جس طرح بچپن میں بکریاں چرایا کرتے تھے ایسے ہی نبوت اور سلطنت مل جانے کے بعد بھی بکریوں کا دودھ دوہا کرتے تھے۔ اور دودھ دوہنے پر ہی کیا موقوف ہے آپ نے کبھی اپنے ذاتی کاموں کے لیے اپنے خدّام تک کو تکلیف نہیں دی اور ہمیشہ اپنا سب کام آپ اپنے ہاتھوں سے کیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے آپ کو دنیوی کام کاج میں اوروں سے ممتاز نہیں کیا بلکہ جیسے تم سب لوگ اپنے گھروں میں اپنا کام کرتے ہو،

ایسے ہی آپ بھی کیا کرتے تھے ۔ آپ خود ہی اپنی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے ، خود ہی اپنے کپڑے سیتے تھے ، خود ہی جوتیاں گانٹھ لیتے تھے ۔ غرض اپنے سب کام خود کر لیتے تھے ۔" (بخاری و ترمذی)

کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ کسی نے بے احتیاطی اور لاپروائی سے مسجد میں تھوک دیا یا ناک صاف کی تو گو آپ کو یہ بات بہت ناگوار گزری مگر آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے خود صاف کر دیا اور فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کو کھڑا ہوتا ہے تو وہ گویا اپنے معبود سے سرگوشی کرتا ہے اور اس کا پروردگار اس کے اور قبلے کے بیچ میں ہوتا ہے' اس لیے تم کو کبھی مسجد میں اپنے سامنے نہ تھوکنا چاہیے ۔" (بخاری ص ۵۸)

مدینہ منورہ میں جب مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی تو آپ بنفس نفیس سب کاموں میں شریک تھے یہاں تک کہ معمولی مزدور کی طرح آپ بھی اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے تھے ۔ (بخاری ص ۵۵۵)

اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر آپ نے بھی کھائی کھودنے میں سب لوگوں کا ساتھ دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے مٹّی اٹھانے اور پتھر توڑنے میں تامل نہیں فرمایا یہاں تک کہ صدر مبارک گرد آلود ہو گیا ۔ (بخاری ص ۲۱۸)

غرض آپ کو کسی کام کے کرنے میں بھی عار نہیں ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ صرف اپنا ہی کام نہیں بلکہ اوروں کا کام بھی خود کر دیا کرتے تھے اور اس میں آپ اور آپ کے ادنیٰ ترین خادم میں کچھ فرق نہ ہوتا تھا ۔

کھانے میں آنجنابؐ کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کی غذا عموماً جَو کی روٹی ہوتی تھی ۔ (بخاری و ترمذی ص ۵)

اور چونکہ اس سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے یہاں چھلنی نہیں تھی اس لیے اس کی بھوسی پھونک مار کر ہٹا دی جاتی تھی ۔ اس سے زیادہ نازک مزاجی اور ذائقہ طلبی کی اس مطبخ میں اجازت نہ تھی ۔ (ترمذی ص ۵۷۷)

مگر طرہ یہ ہے کہ بسا اوقات یہ بھی نہیں ہوتی تھی ۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں کبھی آپ کو اور آپ کے اہل و عیال کو پیٹ بھر کر جَو کی روٹی بھی متواتر دو دن تک نہیں ملی ۔ (ترمذی ص ۵۷۷)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ "ہم اہلبیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بعض دفعہ ایک ایک مہینہ تک آگ نہیں جلی اور ہم صرف کھجوروں اور پانی پر گزارا کرتے رہے ۔" (شفا ص ۶۳)

ابو طلحہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر بھوک کی شکایت کی اور دامن اٹھا کر دکھایا کہ پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے ۔ جناب رسالتمآبؐ نے ہماری تسکین کے لیے اپنا دامن اٹھایا تو ہم نے دیکھا کہ شکم مبارک سے دو پتھر بندھے ہوئے تھے ۔ (مشکوٰۃ ص ۳۸۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دودھ شریک بھائی مسروق اُن کے پاس آئے حضرت عائشہؓ نے کھانا منگوایا اور فرمانے لگیں کہ "جب میں سیر ہو کر کھانا کھاتی ہوں تو مجھے رونا آتا ہے ۔" انھوں نے پوچھا کہ کیوں ؟ آپ نے جواب دیا کہ "مجھے آپؐ کا زمانہ یاد آجاتا ہے کہ جب تک آپ بحیات رہے خدا گواہ ہے کہ کبھی ایک دن میں دو بار سیر

ہو کر روٹی نہیں کھائی۔" (ترمذی ص ۵۷۸)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "جناب رسالت مآبؐ نے عمر بھر خوان پر کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی چھنے ہوئے باریک آٹے کی روٹی تناول فرمائی۔" (ترمذی ص ۵۷۸)

ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی کھانے کو بُرا نہیں کہا۔ جو کچھ موجود ہوتا تھا وہی تناول فرما لیتے۔ اور بھوک نہیں ہوتی تھی تو چھوڑ دیتے تھے۔" (بخاری ص ۸۱۴)

ملبوسات کو دیکھیے کہ آنجنابؐ کا لباس قمیص، چادر، تہبند یا ازار اور عمامہ تھا۔ یہ سب چیزیں بالعموم سُوتی اور معمولی قسم کے کپڑے کی ہوتی تھیں۔ ریشم کا استعمال تو آپ نے اپنی اُمت میں مردوں کے لیے ناجائز فرما دیا تھا اور خود آپ کے لباس میں تو قطعاً کسی قسم کی بھڑک اور نمایش ہوتی ہی نہ تھی۔ موزے آپ کو ایک مرتبہ نجاشی (شاہِ حبش) نے اور ایک بار ایک شخص وحیہ نے تحفۃً بھیجے تھے۔ پاپوش مبارک چمڑے کی تھیں جن میں دو تسمے کے بند لگے ہوئے تھے ان سے وہ انگلیوں میں باندھ لی جاتی تھیں۔

آپ کے آرام فرمانے کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پُوچھا گیا کہ "آنجناب کا بستر آپ کے گھر میں کس چیز کا تھا؟" اُنھوں نے فرمایا کہ "ادھوڑی کا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔" (بخاری و ترمذی ص ۵۹۴)

یہی سوال حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ "ایک ٹاٹ کا ٹکڑا تھا جسے ہم دُہرا کر دیا کرتے تھے۔ آنجنابؐ اسی پر استراحت فرماتے تھے۔ ایک رات میں نے خیال کیا کہ اگر اس کی چار تہیں کر دیں تو غالباً آپ کو زیادہ آرام ملے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، جب صبح ہُوئی تو آنجنابؐ نے پُوچھا کہ "رات تم نے میرے لیے کیا بچھایا تھا؟" میں نے کہا "وہی آپ کا ٹاٹ تھا، مگر ہاں ہم نے اُس کی چار تہیں کر دی تھیں تاکہ آپ کو زیادہ آرام ملے۔" آپ نے فرمایا کہ نہیں اسے تو جیسا پہلے تھا ویسا ہی کر دو۔ اس نے مجھے رات ہی کو نمازِ شب سے باز رکھا۔ (ترمذی ص ۵۹۴)

سواریوں میں آنجناب کو گدھے پر سوار ہونے سے عار نہ تھا۔ چنانچہ آپ فتح خیبر کے دن گدھے پر سوار تھے جس کی لگام کھجور کی چھال کی تھی۔ انسؓ سے روایت ہے کہ "آپ حج کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کے اونٹ کا پالان پُرانا تھا جس کی قیمت ہمارے خیال میں چار درہم (ایک روپے) سے زیادہ نہ ہوگی۔" (شفا ص ۵۸)

یہ تو آپ کی طرزِ زندگی کا مختصر سا خاکہ تھا۔ یہ بھی دیکھ لیجیے کہ آپ اپنے عزیزوں کو کس طرح رہنے کا ارشاد فرماتے تھے، حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ایک بار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سُنا کہ آنجنابؐ کے پاس کوئی غلام ہے، تو چونکہ حضرت فاطمہؓ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے اور ان میں تکلیف تھی اس لیے وہ آنجنابؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ اس غلام کو اپنے لیے مانگ لیں۔ اتفاق سے آپ تشریف نہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ذکر کیا اور خود واپس آ گئیں۔ جب آنجناب تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے کہا۔ آپؐ اسی وقت حضرت فاطمہؓ کے ہاں آئے اور اپنے پاس اُن کو اور حضرت علیؓ کو بٹھا کر فرمایا کہ "میں تم کو ایک ایسی بات نہ بتاؤں جو اس چیز سے (یعنی خادم سے) بہتر ہو جو تم مجھ سے مانگتی ہو۔ سُنو، تم سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمدللہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہا کرو، یہ تمھارے لیے

خادم سے بہتر ہے۔" (بخاری ص ۵۲۵ د) سے

یُوں کی ہے اہلبیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دخترِ خیر الانامؐ ہے

غرض آنجناب نے زندگی تو اس طرح بسر کی اور وفات سے پہلے فرمایا کہ "میرے ورثاء کو میرے ترکے میں روپیہ پیسہ کچھ نہ ملے گا۔" (ترمذی)

حقیقت میں آپؐ کے پاس ان مزخرفات دنیوی میں سے کچھ تھا ہی نہیں جو کسی کو دیا جاتا۔ حالت تو یہ تھی کہ آپؐ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تیس درہم کے عوض گرو رکھی ہوئی تھی اور آں جنابؐ کے پاس اتنا زر نقد نہ تھا کہ اُسے چھڑا لیتے۔" (بخاری ص ۱۴۱۶)

آپؐ نے ترکہ میں صرف اپنے ہتھیار، ایک خچر اور تھوڑی سی مملوکہ زمین کے سوا اور کوئی چیز نہیں چھوڑی اور ان اشیأ کی بابت بھی ارشاد فرمایا کہ یہ خیرات کر دی جائیں۔ (بخاری ص ۱۴۱۵)

سُبحان اللہ! کیسی پاکیزہ زندگی تھی کہ اس پر لاکھوں جانیں قربان کی جاسکتی ہیں۔

وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ط — اور سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن مرا اور جس دن کہ وہ پھر زندہ کیے جائیں گے۔

یہ تھی طرزِ معاشرت اُس شخص کی جس کی نسبت نعوذ باللہ من ذالک مخالفین یہ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے ذاتی مقاصد اور نفسانی اغراض کے حصول کے لیے اور ملک گیری اور جاہ طلبی کی ہوس میں اپنی قوم پر تلوار اٹھائی اور مذہب کی آڑ میں کُشت و خون کی اجازت دی۔ خدا کی پناہ کس قدر کور باطنی اور دریدہ دہنی سے اس بہترین خلائق صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اتہام لگایا جاتا ہے۔ کیا ایسی ہی سادہ پُر محن اور جفاکشی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آپ نے یہ تمام کوششیں کی تھیں جن کی انتہائی کامیابی سے بھی آپ کے طرزِ بُود و باش میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا۔ کیا دنیا کی گزشتہ اور موجودہ قوموں کی تاریخیں کسی ایک فرد کو بھی مثالاً پیش کر سکتی ہیں جس نے دنیوی اغراض سے خروج کر کے اپنے لیے ایک مستقل سلطنت قائم کر لی ہو۔ اور اس کے بعد اس کی وضع زندگی میں اس کے عشرِ عشیر بھی سادگی اور جفاکشی باقی رہی ہو۔ قطعاً و یقیناً اس کی کوئی نظیر صفحۂ عالم پر نہیں ہے۔ بیشک لوگوں نے بہت سادہ اور پُر مشقت زندگیاں بسر کی ہیں۔ مگر ان کے ہاتھ سلطنتیں نہیں لگیں۔ بلاشبہ آدمیوں نے سلطنتیں حاصل کر لی ہیں مگر ان میں یہ زہد و اتقا نہیں رہا۔ شاید کوئی شخص یہاں بدھ کی مثال پیش کرے کہ گو اس نے ایسا نہیں کیا مگر کم سے کم اپنی سلطنت سے تو دست بردار ہو ہی گیا تو میں کہوں گا کہ ایسی مثالیں تو بارگاہِ نبوت کے غلاموں میں بھی بہ کثرت مل سکتی ہیں۔ حضرت ابراہیم ادھم، شاہِ بلخ اور شاہ شجاع والیِ کرمان وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اسی آستانے کے گداؤں کی خاکِ پا ہیں اور خدا جانے ان جیسے اور کتنے خدا کے بندے اس اُمتِ مرحومہ میں گزر چکے ہوں گے۔ حقیقت میں یہ خصوصیت تھی جو فیاضِ ازل نے اپنے رسول برحق جناب سرور کائنات علیہ الصلٰوۃ والتحیات کی ذات بابرکات کے لیے

مخصوص اور منتخب فرمائی تھی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ؕ

حُسنِ معاشرت اور خوش خُلقی

جناب سرورِ کائنات علیہ الصّلوٰۃ والتحیات کی سادہ اور بے تکلف زندگی کے حالات تو آپ نے سُن لیے مگر یہیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپ کی یہ فقیرانہ طرز بود و باش نہ تو بے نوائی اور تنگدستی کی وجہ سے تھی کیونکہ رقوم خُمس کے علاوہ باغِ فدک اور خیبر وغیرہ کی آمدنی بھی آپ کے تمام مصارف کے لیے اچھی طرح کافی ہو سکتی تھی۔ اور نہ رہبانیت گوشہ نشینی اور دنیا سے بے تعلقی کے باعث سے تھی۔ کیونکہ آنجنابؐ نے ایسے ترکِ دُنیا کو جائز ہی نہیں رکھا تھا جس کے سبب سے آدمی اپنے فرائض کو بجا لانے سے معذور ہو جائے اور اپنے کرنے کے کام دُوسروں کے سر ڈالے۔ اور اس بارہ میں خود آنجنابؐ کا طرزِ عمل نہایت کامل دنیاداروں کا سا تھا، نہیں، بلکہ اس کی اصلی وجہ حطام دنیوی کی بے وقعتی، راحتِ جسمانی سے بے نیازی، بے انتہا مروت اور ایثار و ہمدردی تھی۔ لیکن ان کے واقعات ہم آئندہ بیان کریں گے، سرِ دست یہ دیکھنا چاہیے کہ اس قدر زُہد اور بے نفسی کے باوجود بھی آپ کے تعلقات اپنے متعلقین کے ساتھ کس قسم کے تھے۔

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ کوئی شخص اپنے خدمت گار کی نظروں میں ہیرو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بیرونی دنیا میں غیروں کے روبرو خواہ کوئی شخص اپنے آپ کو کتنا ہی کیوں نہ لیے دیئے رہے تاہم گھر کی خلوت اور تنہائی میں یہ وضع قایم رکھنا نہایت مشکل ہوتا ہے اور نوکروں اور گھر والوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی باتوں میں آدمی کی بدمزاجی، درشت خوئی، زود رنجی اور اس قسم کے بیسیوں عیب کُھل جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بالکل درست ہے مگر ہم اسی معیار کو پیشِ نظر رکھ کر جناب رسالتمآبؐ کی طرزِ معاشرت کو لیتے ہیں۔

خادمِ بارگاہِ نبوی انس رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ "میں آٹھ برس کا تھا جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، اور برابر دس برس تک شرف یابِ ملازمت رہا مگر اس تمام مدت میں حضورؐ نے کبھی اُف تک نہ کہا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تُو نے یہ کام کیوں کیا' یا وہ کام کیوں نہیں کیا۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۱)

آں جناب بے انتہا خوش خلق تھے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ آپ نے مجھے کہیں جانے کا حکم دیا مگر میں نے جانے سے انکار کیا گو میرے دل میں بھی تھا کہ چونکہ حضور سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا ہے اس لیے جاؤں گا، پھر میں نکلا یہاں تک کہ میرا گزر چند بچوں پر ہُوا جو بازار میں کھیل رہے تھے وہاں آپ نے پیچھے سے آن کر میری گردن پکڑلی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو آپ مسکرا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ "کیوں انس! جہاں میں نے تم کو بھیجا تھا گیا تم وہاں گئے تھے۔" میں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! میں جا رہا ہوں۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۱)

آپ کے اخلاق کی یہ کیفیت تھی کہ مدینہ میں لوگ اکثر صبح ہی پانی لے کر آپ کی خدمت میں آتے تاکہ آپ نمازِ صبح سے فارغ ہو کر اس میں برکت کے لیے ہاتھ ڈال دیں، تو خواہ کیسی ہی سردی کیوں نہ ہوتی مگر آپ ہرگز ان برتنوں میں ہاتھ

ڈالنے سے دریغ نہ فرماتے تھے۔ اگر کسی لونڈی کو بھی کچھ ضرورت ہوتی تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی لے جاتی اور آپ کبھی جانے میں تامل نہ فرماتے۔ (مشکوٰۃ ص ۲۴۲)

انسؓ ہی کا بیان ہے کہ حضور سرورِ کائنات کی زبانِ مبارک سے نہ کبھی کوئی فحش اور بیہودہ کلمہ نکلتا تھا۔ نہ آپ کسی پر لعنت کرتے تھے۔ نہ کسی کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ اگر کسی پر بہت ہی خفا ہوتے تو فقط اتنا فرماتے: "مالہٗ ترِب جبینہٗ" اسے کیا ہوگیا اس کی پیشانی خاک آلودہ ہو۔ (بخاری ص ۸۹۲)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے آپ سے کہا بھی کہ مشرکین کے لیے دعائے بد کیجئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں لعنت کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اللہ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

آنجنابؐ نے خانگی تعلقات کو آدمی کی نیکی اور خوش خوئی کا معیار قرار دیا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ:

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ۔ — تم میں سے اچھے وہی ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے ہیں۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۰)

اور آنحضورؐ طبعاً اور فطرۃً اس اصول کی بہترین مثال تھے۔ آپؐ اپنے اہلبیت پر نہایت مہربان اور بے انتہا شفیق تھے۔ عین عنفوان شباب میں آپؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہوئی اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سنِ کہولت کو پہنچ چکی تھیں اور عمر میں آنجنابؐ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود بھی آپ کا پچیس برس کا ساتھ حسنِ معاشرت کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔ اس تمام مدت میں کوئی خفیف سے خفیف بات بھی ایسی پیش نہیں آئی جو ذرا دیر کے لیے بھی کسی قسم کی شکر رنجی کا باعث ہوتی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جب جناب رسالتمآبؐ نے مختلف ضرورتوں اور مصلحتوں سے متعدد شادیاں کیں تب بھی یہ حال تھا کہ جب کبھی آپ کے ہاں قربانی کی جاتی تو آپ سب سے پہلے خصوصیت کے ساتھ حضرت خدیجہ مرحومہ کی ملنے جلنے والی عورتوں کے ہاں حصّہ بھجواتے اور آنجنابؐ ان کا ذکر ایسی دلی محبت سے فرماتے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کو رشک ہوتا۔ حالانکہ وہ ازواجِ مطہرات میں سب سے زیادہ محبوب اور منظورِ نظر تھیں۔ لیکن آنجناب کی یہ محبت و شفقت کچھ حضرت خدیجہؓ ہی کے لیے مخصوص نہ تھی وہ طبیعت ہی ایسی تھی کہ اس میں ہر قسم کی خوبیاں فطرۃً علیٰ وجہ کمال موجود تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد جب ازواجِ مطہرات کی تعداد نو تک پہنچ گئی تب بھی حضور کا طرزِ عمل ایسا منصفانہ اور مشفقانہ رہا کہ کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی حالانکہ دنیوی عیش و آرام کی جو کچھ کیفیت تھی وہ تو ہم اُوپر دیکھ ہی چکے اور ایسی تنگ دستی کی حالت میں باہمی رقابت کی وجہ سے ذرا ذرا سی بات پر روز لڑائی جھگڑے ہونے چاہئیں تھے، مگر وہاں تو اللہ کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا تھا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا

اے نبی! تُو اپنی بیبیوں سے کہہ دے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو مالِ دنیا دے دوں اور تم کو خوبی کے

وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ؕ (احزاب ع ۴)

ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو ترجیح دیتی ہو تو بیشک اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے اجرِ عظیم مہیا کیا ہے۔

بھلا پھر کس کو یہ گوارا ہو سکتا تھا کہ دنیوی مال کے لالچ سے آنجناب کی صحبت روح پرور کو چھوڑنے کا خیال بھی کرتی۔ اس کے علاوہ یوں بھی آپ کے فیضِ صحبت نے ان کی طبیعتوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ اگر باہمی رقابت تھی بھی تو آنجنابؐ کی راحت رسانی اور رضا جوئی کے لیے ورنہ اور کسی قسم کے دنیوی آرام و آسائش کا تو خیال تک بھی نہیں گزرتا تھا مگر آنجنابؐ بھی ان کا پاس خاطر اس قدر رکھتے تھے کہ ہرگز کسی بات میں ان میں سے کسی کی حق تلفی یا کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہونے دیتے تھے اور ہمیشہ ان کے ساتھ نہایت عمدہ اور بہتر سے بہتر سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ "جناب رسالتمآبؐ کی طبیعت میں کسی قسم کی بیہودگی اور لغویت نہیں تھی نہ آپ کبھی چلّاتے تھے نہ کبھی بدی کے عوض بدی کرتے تھے بلکہ ہمیشہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے"۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ "آپ نہایت فراخ حوصلہ، نہایت صادق البیان، نہایت نرم مزاج اور نہایت خوش خلق تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ جب آپ کے گھر والوں یا اصحاب و احباب میں سے کوئی آپ کو پکارتا تھا تو آپ ہمیشہ بلالحاظ خردی و بزرگی جواب میں کہا کرتے تھے لبّیک۔ یعنی حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔

آپؐ کو بچوں سے بھی بڑی محبت تھی۔ چنانچہ بسا اوقات آپ اپنی نواسی امامہ بنت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گود میں لے کر یا کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھتے تھے۔ جب رکوع میں جاتے تو ایک طرف بٹھا دیتے اور جب قیام فرماتے تو پھر اسے اٹھا لیتے۔" (بخاری ص ۷۰۸)

نماز میں اتنی محبت کا اظہار آپؐ کی طبیعت کی بے انتہا شفقت اور رفاقت کی دلیل ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس بچی کے رونے اور مچلنے کے خیال سے نماز تک میں اس کا بہلانا جائز رکھتے تھے۔ شاید اس میں یہ مصلحت مدنظر ہو کہ اُس زمانہ میں چونکہ لڑکیاں بڑی حقارت اور ذلّت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں اور شرفائے عرب ان کو باعثِ عار سمجھتے تھے، تو آنجنابؐ کی اس الفت و شفقت کو دیکھ کر وہ باطل خیال مٹ جائے اور بلاوجہ لڑکیوں کی حق تلفی نہ ہو۔ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما سے بھی آپ کو بیحد محبت تھی۔ اور ان پر ہی کیا موقوف ہے آپ سب ہی بچوں پر شفیق اور مہربان تھے۔ چنانچہ بچّے آپ کے پاس آتے تو آپ اپنی گود میں بٹھاتے تھے۔ وہ آپ کے کپڑوں پر پیشاب بھی کر دیتے تھے مگر آپ کچھ خیال نہیں کرتے تھے۔ آپ چھوہارے چبا چبا کر ان کو کھلایا کرتے تھے اور اُن کو بہلایا کرتے تھے اور اُن کے لیے دعائے خیر و برکت کیا کرتے تھے۔ (بخاری ص ۸۸۰، ۹۴۰، ۹۴۴ وغیرہ)

انسؓ کا بیان ہے کہ آپ ان کے چھوٹے بھائی ابوعمیر کے ساتھ اکثر کھیلا کرتے تھے۔ ابوعمیر نے ایک بلبل

پال رکھی تھی اور اس سے اسے بہت محبت تھی۔ چنانچہ آپؐ اس سے فرمایا کرتے تھے: یَا عُمَیرُ مَا فَعَلَ النُّغَیرُ۔ اے عُمیر! نغیر کیسی ہے؟ یا اس کا کیا حال ہے؟ (بخاری ص ۹۰۵)

ام خالد بنت خالد کہتی ہیں کہ" میں ایک دن اپنے والد کے ساتھ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی میں اس وقت ایک زرد قمیص پہنے ہوئے تھی۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا کہ" یہ بہت اچھی ہے، بہت اچھی ہے۔" پھر میں آپ کی پشت پر جا کر مہرِ نبوت سے (جو دونوں شانہائے مبارک کے بیچ میں ایک مضغہ گوشت کی طرح تھی) کھیلنے لگی۔ اس پر میرے والد نے مجھے گھُرکا۔ مگر آپ نے اُن کو منع کر دیا اور فرمایا کہ رہنے دو اسے کھیلنے دو۔" (بخاری ص ۸۰۶)

اسی بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ" جب آنجناب مکہ معظمہ تشریف لائے تو عبدالمطلب کے بچے آپ کے استقبال کے لیے بھاگے ہوئے آئے آپ نے نہایت شفقت سے اُن میں سے ایک کو اپنے آگے اور ایک کو اپنے پیچھے سوار کر لیا۔" (ص ۲۴۲)

آپ کے بچوں پر مہربان اور شفیق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا خیال ہوتا ہے کہ لمبی نماز پڑھوں مگر اثنائے نماز میں کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں نماز کو چھوٹا کر دیتا ہوں کیونکہ مجھے یہ بات ناگوار معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ماں پر سختی کی جائے۔" (بخاری ص ۹۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک بچوں کی پرورش، ان کی خدمت اور ان پر شفقت خدا کی عبادت کی زیادتی سے بھی زیادہ ضروری اور قابلِ توجہ کام ہے۔

جریر ابن عبداللہ کا بیان ہے کہ" میں جب سے مسلمان ہوا آنجناب نے کبھی مجھے گھر میں آنے سے منع نہیں فرمایا۔ اور جب آپ مجھے دیکھتے تھے مسکرانے لگتے تھے۔ آپ اپنے اصحاب سے مزاح بھی فرماتے تھے اور ان کی سب باتوں میں شریک ہوتے اور ان سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ آپ بچوں سے کھیلا کرتے اور ان کو اپنی گود میں بٹھایا کرتے تھے۔ آپ آزاد اور غلام اور لونڈی اور فقیر سب کی دعوت کو یکساں طیب خاطر سے قبول فرما لیتے تھے اور شہر کے دور دراز حصوں میں بھی مریضوں کی عیادت اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ اور جب کوئی شخص کوئی عذر پیش کرتا تو قبول فرما لیتے اور اسے معذور سمجھتے تھے۔" (شفا، ص ۵۳ و ۵۴)

آپ کے یہ الطاف کچھ مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں تھے بلکہ آپ سب ہی پر شفیق تھے۔ چنانچہ انسؓ کہتے ہیں کہ" ایک یہودی لڑکا آپ کی خدمت گزاری کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ پھر آپ نے اس سے اسلام قبول کرنے کے لیے فرمایا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو وہیں اس کے پاس تھا۔ اس نے کہا کہ" تو ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا مان لے۔" پس وہ مسلمان ہو گیا۔ اس سے آپ بہت خوش ہوئے۔ اور وہاں سے نکلے تو فرمانے لگے کہ" خدا کا شکر ہے کہ وہ آگ سے بچ گیا۔" (بخاری ص ۱۸۱)

ظاہر ہے کہ اس لڑکے کے حالتِ نزاع میں اسلام لانے سے آپ کا کسی قسم کا ذاتی اور ظاہری فائدہ نہ تھا اور آپ کی

یہ تمام کوشش اور پھر اس پر مسرت محض آپ کی شفقت اور دلسوزی کی وجہ سے تھی۔

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کسی شخص نے کوئی بات چپکے سے کہنے کے لیے اپنا منہ گوش مبارک سے لگایا ہو اور آپ نے اس آدمی کے سر اٹھانے سے پہلے اپنا سرِ اقدس ہٹا لیا ہو۔ اور نہ کبھی ایسا ہوا کہ کسی نے آپ سے مصافحہ کیا ہو، اور آپ نے اس کے ہاتھ کھینچنے سے پہلے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ آپ کبھی اور آدمیوں کے سامنے پاؤں نہیں پھیلاتے تھے۔ جس کسی سے ملتے تھے پہلے خود سلام کرتے تھے اور خود مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے تھے۔ جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تھا تو آپ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اکثر اس کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے تھے اور اُسے اپنے گدے پر بٹھا لیتے تھے۔ اور اگر وہ اس پر بیٹھنے سے انکار کرتا تو آپ اصرار فرماتے اور اُسے اسی پر بیٹھنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ آپ تعظیماً و احتراماً اپنے اصحاب کا نام نہ لیتے تھے۔ بلکہ ان کو کسی کنیت سے خطاب فرماتے اور اُن کو نہایت محبت آمیز اور پسندیدہ ناموں سے یاد کرتے تھے۔ آپ کبھی کسی کا قطع کلام نہیں کرتے تھے۔ البتہ اگر کوئی شخص نازیبا بات کہتا تو آپ یا تو اُسے منع فرماتے یا اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تاکہ وہ خود ہی رک جائے۔" (شفا، ص ۵۴)

آپ کی انتہائے خوش خلقی اور کمال ادب کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جب آپ نماز پڑھتے ہوتے تھے اور کوئی شخص ملنے کے لیے آتا تھا تو آپ نماز کو مختصر کر دیتے تھے اور سلام پھیر کر اس کی حاجت روائی فرماتے تھے اور جب وہ چلا جاتا تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے۔ (شفا، ص ۵۴)

یہ صورت نوافل میں ہوتی تھی کیونکہ فرض نماز تو مسجد میں ادا کی جاتی تھی اور اس میں کسی قسم کی تخفیف اور اختصار جائز اور اختیاری نہیں ہے۔

عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "میں نے کسی شخص کو جناب رسالتمآبؐ سے زیادہ خوش خلق اور خوش مزاج نہیں دیکھا۔" (شفا، ص ۵۴)

غرض آپ کی ہر ایک بات ہر ایک کام اور ہر ایک تعلق اس وعدہ صادقہ کی مجسم تصدیق اور ثبوت تھا کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ اور ہم نے تجھے تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اور اس میں اعدا و مخالفین تک بھی مستثنیٰ نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ آپ کے لطف و مراعات کا تذکرہ آپ کے حلم، عفو اور شجاعت وغیرہ کے ضمن میں آئے گا۔

شجاعت

جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ذاتِ بابرکات میں تمام صفات ظاہری و باطنی اور کمالات صوری و معنوی ایسے تناسب اور موزونیت کے ساتھ جمع تھے کہ حقیقت میں یہ بہت ہی مشکل ہے کہ کسی ایک صفت کو اوروں پر مقدم

رکھا جائے۔ لیکن بہر حال چونکہ سب کا ذکر یکبارگی نہیں ہو سکتا اس لیے ہم ایک خارجی وجہ سے شجاعت کو پہلے لیتے ہیں۔ وہ وجہ یہ ہے کہ بالعموم اور مذہبوں نے اپنے مقتداؤں کے لیے شجاعت کا دعویٰ نہیں کیا اور پھر اسی نقص کی وجہ سے اس صفت کو مصلحانِ قوم اور ہادیانِ ملت کے لیے غیر ضروری سمجھنے لگے۔ لیکن یہ خیال خود ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عرفِ عام میں شجاعت صرف تہوّر اور بیباکی کا نام ہے اور اس کی نمایش فقط میدانِ جنگ میں ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت میں سچی شجاعت وہ ہے جو مجاہدۂ نفس اور مجادلاً ہوا و ہوس میں ظاہر کی جائے، جو عفو اور حلم کی شان میں نمایاں ہو، جو ثبات و استقلال کی صورت میں آشکار ہو۔ چنانچہ جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے:

لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ مَنْ یَّمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ۔

(صحیحین از مشکوٰۃ ص ۴۶۹)

وہ پہلوان نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ اصل پہلوان وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے نفس کا مالک ہو۔

اس لحاظ سے یقیناً شجاعت کو تمام دیگر صفاتِ حسنہ پر فضیلت حاصل ہے لیکن اگر اس وسعتِ نظر سے کام نہ لیا جائے اور شجاعت کو اس کے عرفی معنوں ہی میں لیں تب بھی بلاشبہ وہ اتنی پاکیزہ اور پسندیدہ خوبی ہے کہ جو طبیعت اس صنت سے متصف نہ ہو وہ کسی طرح اخلاق انسانی کا بہترین اور کامل ترین نمونہ ہونے کے قابل نہیں کہی جا سکتی۔ اب اس مختصر سی تمہید کے بعد دیکھیے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں صفت شجاعت کتنی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ انسؓ کا بیان ہے کہ "آپ اشجع الناس یعنی انتہا درجے کے بہادر اور شجاع تھے۔ چنانچہ ایک رات کا ذکر ہے کہ اہلِ مدینہ یکایک گھبرا اُٹھے (جیسے کوئی دشمن چڑھ آئے یا ڈاکہ پڑے) تو لوگ اس آواز کی جانب چلے مگر اُدھر سے اُن کو آپ واپس آتے ہوئے ملے۔ کیونکہ آپ سب آدمیوں سے پہلے تنہا اُدھر تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے تسلّی کے طور پر فرمایا کہ "ڈرو مت، گھبراؤ مت" اور آپ اُس وقت ابو طلحہ کے برہنہ پشت گھوڑے پر سوار تھے اور گردن مبارک میں تلوار لٹکی ہوئی تھی۔" (بخاری ص ۴۲۶)

براء ابن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے مجھ سے پُوچھا کہ "کیا تم سب جنگِ حنین میں حضرت رسول اللہ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہُوئے تھے؟" میں نے کہا کہ "ہاں۔ لیکن آنجناب اپنی جگہ پر قایم رہے اور بیشک میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ ایک سفید خچر پر سوار تھے اور ابُوسفیان بن حارث آپ کے چچا زاد بھائی آپ کی رکاب تھامے ہوئے تھے اور حضرت عباسؓ آپ کی لگام پکڑے ہوئے اور آنجناب یہ شعر رجزیہ پڑھ رہے تھے:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ، اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ۔

میں سچا پیغمبر ہوں، میں ابنِ عبد المطلب ہوں۔

اور اس دن آپ سے زیادہ بہادر اور شجاع کوئی شخص نظر نہیں آیا اور خدا کی قسم جب لڑائی بہت تند اور تیز ہوتی تھی تو ہم آپ ہی کی پناہ ڈھونڈا کرتے تھے اور ہم میں سب سے زیادہ دلیر اور بہادر اور شجاع وہی شخص ہوتا تھا جو آپ کے ساتھ کھڑا رہ سکتا تھا۔ (بخاری ص ۶۱۷)

اسی واقعہ کی بابت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ "میں اس دن آپ کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ جب مسلمان

بھاگ کھڑے ہوئے تو آپ نے اپنے خچر کو دشمنوں کی طرف بڑھانے کے لیے ایڑ دی اور میں اسے تیز چلنے سے روکنا چاہتا تھا، یہاں تک کہ آخر میں نے ارشاد عالی کے مطابق اصحابِ سمرہ کو آواز دی اور وہ میری آواز سنتے ہی پلٹے اور ذرا دیر میں لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔" (شفا، ص ۵۰ و ۵۱)

اُبی بن خلف کا واقعہ ہے کہ جنگِ بدر میں جب وہ فدیہ دے کر رہا ہوا تو اس نے آپ سے کہا کہ "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جسے میں ہر روز ایک پیمانہ (فرق) جوار کھلاتا ہوں میں اس پر بیٹھ کر تجھے قتل کروں گا۔" آپ نے جواب دیا کہ "نہیں، بلکہ انشاءاللہ تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔" اس کے بعد جنگِ اُحد میں اُس نے آنجناب کو دیکھا تو گھوڑا بڑھاتا ہوا آپ پر حملہ کرنے کے لیے آیا۔ مگر چند مسلمان اس کے راستہ میں حائل ہو گئے۔ اس پر آپ نے اُن کو حکم دیا کہ "ہٹ جاؤ اور اسے آنے دو۔" اور آپ نے حارث بن الصمہ کے ہاتھ میں سے نیزہ لے لیا اور آگے بڑھ کر اُسے ہوا میں جنبش دے کر اُبی کے مارا اور وہ اپنے گھوڑے پر ڈگمگا گیا اور اس کی پسلی ٹوٹ گئی اور وہ چیختا چلاتا قریش کی طرف بھاگا۔ لوگوں نے اس سے کہا بھی کہ زخم کچھ زیادہ خوفناک نہیں ہے۔ مگر وہ یہی کہتا رہا "جو تکلیف مجھے ہے وہ اگر سب لوگوں کو بانٹ دی جائے تو وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے ہی کہا تھا کہ تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ واللہ اگر وہ مجھ پر تھوک دیتے تب بھی میں نہ بچتا۔" آخر وہ لوٹتے ہوئے مکہ سے چھ میل اُدھر مقام سرف پر مر گیا۔" (شفا، ص ۵۱ و ۵۲)

عمران بن حصین کہتے ہیں کہ ہمیشہ غنیم پر حملہ کرتے وقت آپ سب سے آگے ہوتے تھے۔ (شفا، ص ۵۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا بیان ہے کہ "جب لڑائی شدت کی ہوتی تھی اور جوش و محنت سے آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں تو ہم آنحضرتؐ کی آڑ لیتے تھے اور ہم میں سے کوئی آدمی دشمن سے آپؐ سے زیادہ قریب نہ ہوتا تھا۔ اور میں نے جنگِ بدر میں اپنے آپ کو دیکھا کہ ہم آپؐ ہی کی پناہ ڈھونڈتے تھے۔ اور آپؐ اس دن سب سے زیادہ مستقل مزاج اور قوی القلب تھے۔" (شفا، ص ۵۱)

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع اقدس میں جس طرح جبن و بزدلی کا مطلق نشان نہ تھا ویسے ہی قساوت اور جنگ جوئی کا بھی قطعاً وجود نہ تھا اور آپ کی شجاعت دیگر خصائل حسنہ کی طرح افراط و تفریط سے بالکل پاک اور نہایت ہی معقول اور صحیح قسم کی تھی۔ بلاشبہ آپ کو بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مگر وہ سب کی سب صرف محافظت اور مدافعت کے لیے تھیں۔ اور آپ نے خود کبھی پیش قدمی نہیں کی۔ ہاں جب کوئی موقع آ پڑا اور مقابلہ پڑ گیا تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ چنانچہ بدر میں آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں سے ایک ہزار شجاعانِ مکہ کا مقابلہ کیا اور خدا نے آپ کو مظفر و منصور کیا۔ ایک اور روایت ہے کہ ایک روز آپ دشمن کے انتظار میں ایک جگہ پڑے رہے، یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ پھر آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ "اے لوگو! دشمن سے ملنے کی تمنا مت کرو اور اللہ سے امن و عافیت چاہو۔ مگر جب مقابلہ ہو جائے تو صبر کرو اور یقین جانو کہ جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔" (بخاری ص ۳۱۶) یعنی حمایتِ حق سے بڑھ کر اور کوئی خدمت جنت کا مستحق نہیں کرتی۔

آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدانِ جنگ میں سالارِ لشکر کی حیثیت سے قلب میں ہوتے تھے۔ اور اگرچہ آپ کی ہی شجاعت و ہمت تمام فوج کی پشت و پناہ ہوتی تھی۔ تاہم خود آپ کے ہاتھ بہت کم خون آلود ہوتے تھے۔ چنانچہ باوجودیکہ آپ پندرہ سولہ غزوات میں بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ لیکن اُبَیُ ابن خلف کے سوا صرف ایک اور آدمی آپ کے ہاتھ سے مارا گیا، اس زمانہ میں جبکہ جنرل صرف اپنی طاقت اور جلاوت کی وجہ سے منتخب اور ممتاز ہوتا تھا اور اس کا سب سے زیادہ دشمنوں کو قتل کرنا ہی اس کے لیے باعثِ اعزاز ہوتا تھا۔ یہ خموش شجاعت لوگوں کو بہت ہی عجیب معلوم ہوتی ہوگی مگر کیا یہ سچی شجاعت کی بہترین مثال نہیں ہے۔

ثبات و استقلال

ثبات اور شجاعت حقیقت میں ایک ہی صفت کی دو کسی قدر مختلف صورتیں ہیں اور دونوں میں فرق فقط یہ ہے کہ شجاعت میں قوتِ مدافعت کا پہلو زیادہ نکلتا ہے اور ثبات میں طاقتِ برداشت کا۔ ایک میں کیفیت فاعلی غالب ہے دوسری میں کیفیت انفعالی۔ لیکن بہرحال وہی شخص شجاع اور ثابت قدم ہو سکتا ہے جو مصائب و آلام میں پریشان نہ ہو۔ جو تکلیفوں اور سختیوں سے نہ گھبرائے، جو حادثوں کو سکون اور سکوت سے سہے اور جو شدتِ خوف و خطر میں بھی مطمئن اور مستقل رہے۔ اور جب تک کسی میں یہ باتیں نہ ہوں تب تک اس میں نہ شجاعت ہو سکتی ہے نہ ثبات۔ اس لیے دراصل یہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ جو موقع اور ضرورت کے مطابق کبھی ایک صورت سے نمایاں ہوتی ہے کبھی دوسری حیثیت سے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شجاعت کی ایک دو مثالیں آپ نے دیکھ لیں۔ اب آپؐ کے ثبات و استقلال کے چند واقعات سن لیجئے۔ اس کی سب سے بڑی اور نمایاں مثال تو آپ کی تبلیغ مذہب اور تعلیم اسلام ہی ہے۔ اور اگر ہجرت کے بعد کے زمانے کو چھوڑ بھی دیں (اگرچہ وہ بھی کچھ کم مشکل اور محنت طلب نہ تھا) تب بھی وہ گیارہ سال جو آنجناب نے آغازِ رسالت سے ہجرت تک مکہ معظمہ میں بسر کیے اور جو دل شکن مخالفتیں اور جانکاہ مصیبتیں دعوتِ حق میں وہاں آپ کو پیش آئیں وہ ثبات و استقلال کی ایسی مثالیں ہیں جن کی نظیر دنیا کی تاریخ نہیں دکھا سکتی۔ اور اگر غور کریں تو وہی آپ کی صداقت کی سب سے بڑی تصدیق ہیں کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جھوٹ اتنا پائدار ہو۔ کوئی بڑی سے بڑی دنیوی غرض اور سخت سے سخت قوتِ ارادی بھی اتنی مسلسل ناکامیوں اور متواتر مایوسیوں کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتی جب تک کہ تائیدِ غیبی اور امدادِ ربانی اس کے ساتھ نہ ہو۔

جب آپؐ نے توحید و تنزیہہ باری تعالیٰ کی تبلیغ اور بت پرستی کی مذمت شروع کی تو اہلِ قریش نے آپ کے چچا ابو طالب سے شکایت کی اور چاہا کہ وہ آپ کو کہہ سُن کر اس سے روک دیں۔ ایک دو بار تو ابو طالب نے ان لوگوں کو سمجھا بجھا کر ٹال دیا۔ مگر جب آپ کے وعظ کا سلسلہ برابر جاری رہا تو ایک دن ان کے بڑے بڑے لوگ سب اکٹھے ہو کر پھر ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ "ابو طالب! تم ہم میں بڑے بوڑھے ہو اس لیے ہم نے کہا تھا کہ تم اپنے بھتیجے کو منع کر دو مگر تم نے کچھ نہیں کیا اب ہم اس کی باتیں نہیں سُنی جاتیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو بُرا کہے اور ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو کم سمجھ اور نادان بتائے۔ اب بھی یا تو تم اسے ان حرکتوں سے روک لو ورنہ پھر ہماری تمہاری لڑائی

ہوجائے گی۔ اور اُس وقت تک صلح نہ ہوگی جب تک ایک فریق نہ مارا جائے۔" وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر ابُو طالب کو بڑی فکر ہوئی۔ نہ تو وہ اپنی قوم سے خواہ مخواہ کی لڑائی مول لینا چاہتے تھے نہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑنے کو ان کا جی چاہتا تھا۔ آخر اُنھوں نے آپ کو بلایا اور آپ سے یہ سارا جھگڑا کہا۔ اور کہا کہ "یا ابن اخی! ان لوگوں نے مجھ سے یہ کہا، اب تم خود اپنے اور میرے حال پر رحم کرو، اور مجھے ایسی بات پر مجبور مت کرو جو مجھ سے نہ ہو سکے۔" یہ آپ کے لیے نہایت ہی نازک اور آزمائش کا وقت تھا کیونکہ ابوطالب کی یہ بات سُن کر آنجناب سمجھے کہ اب شاید انھوں نے بھی میرا ساتھ چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے اور یہ بھی میری مدد سے دستبردار ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے نہایت استقلال سے جواب دیا کہ "یا عم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لاکر رکھ دیں کہ میں اس بات کو چھوڑ دوں تب بھی خدا گواہ ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک کہ اللہ اسے پُورا نہ کر دے یا میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔" یہ کہہ کر آپ آبدیدہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے جانے لگے۔ مگر آپ کو جاتے ہوئے دیکھ کر ابُوطالب نے آپ کو پھر بلایا اور کہا: "یا ابن اخی! جاؤ اور جو تمھارا جی چاہے کہو، کیونکہ خدا کی قسم میں کبھی بھی تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔" (سیرت ابن ہشام ص ۱۴۰)

جب اہلِ مکہ ابوطالب کی طرف سے ناامید ہو گئے تو اُنھوں نے براہِ راست آپ کو ملانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک روز بعد مغرب اُنھوں نے ایک جلسہ کیا اور اس میں آپ کو بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو اُنھوں نے پہلے تو آپ سے بہت کچھ شکایت کی اور پھر یہ کہا کہ "اگر تُو نے یہ نئی نئی باتیں اس لیے پھیلانا شروع کی ہیں کہ تو دولتمند ہو جائے تو ہم نے آپس میں تیرے لیے اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ تو ہم سب سے زیادہ مالدار ہو جائے۔ اگر تُو ہم میں بزرگی چاہتا ہے تو ہم تجھے اپنا سردار بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تو ملک اور سلطنت کا خواہاں ہے تو ہم کو تجھے اپنا بادشاہ بنا لینے میں بھی تامل نہیں ہے، اور اگر تجھے آسیب ہو گیا ہے تو ہم اپنے خرچ سے تیرا علاج کرنے پر بھی آمادہ ہیں اور اگر تُو پھر بھی اچھا نہ ہُوا تو خیر ہم تجھے دیوانہ سمجھ کر معذور کہیں گے مگر یہ تو نہیں دیکھا جاتا کہ تُو ہمارے بُتوں کو بُرا کہے، اور ہم میں آپس میں تفرقہ ڈالدے اور ایک دُوسرے کو جُدا کر دے۔ اس سے تجھ کو باز آنا چاہیے۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھ میں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، نہ میں مال چاہتا ہوں نہ بزرگی نہ بادشاہت۔ نہ میں دیوانہ ہوں۔ لیکن اللہ نے مجھے تمھاری ہدایت کے لیے مامور کیا ہے، اور میں اللہ کا پیام تم تک پہنچاتا ہوں اور تم کو سمجھاتا ہوں، اگر تم مانو تو تمھارے لیے دین دنیا کی بہتری ہے، اور اگر نہ مانو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ مجھ میں اور تم میں فیصلہ کر دے جو اس کو منظور ہو۔"

اس پر ان لوگوں نے کہا کہ "اچھا تُو خدا کا رسول ہے تو ہمارے ملک میں سے پہاڑوں کو ہٹا دے، اور عراق و عجم کی نہریں بہا دے، اور ہمارے بزرگوں کو زندہ کر دے۔"

آپؐ نے فرمایا: "مجھے اللہ نے ان باتوں کے لیے نہیں بھیجا ہے، مجھے جو حکم دیا گیا ہے وہی کرتا ہوں اور جو پیام مجھے پہنچا ہے اسے تم تک پہنچاتا ہُوں، اس کا ماننا یا نہ ماننا تمھارا کام ہے۔"

انھوں نے کہا" اچھا تو ہمارے لیے کچھ نہیں کرتا تو خود اپنے ہی واسطے باغ اور محل اور سونے چاندی کے خزانے مانگ لے جس سے تیری ناداری اور تنگ دستی دُور ہو جائے اور ہم پر تیری فضیلت اور رسالت ثابت ہو جائے کیونکہ تُو بھی گلی کوچوں میں ایسے ہی پھرتا ہے جیسے ہم پھرتے ہیں۔ اور تُو بھی تلاشِ معاش کا ایسا ہی محتاج ہے جیسے کہ ہم۔ تو پھر ہم میں اور تجھ میں فرق کیا ہے۔ یا اگر یہ بھی نہیں تو یہی کر کہ آسمان کو توڑ کر ہم پر لا گرا۔"

آپؐ نے اس کا پھر بھی وہی جواب دیا کہ" مجھے خدا نے اس لیے نہیں بھیجا ہے۔ مجھے تو اس نے فقط بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔"

اُنھوں نے کہا:" یُوں تو ہم نہیں مانیں گے۔ اور واللہ کہ ہم تجھے نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ تجھے ہم قتل نہ کر ڈالیں یا تُو ہم کو نہ مار ڈالے۔"

اس پر آنجنابؐ اُٹھ کھڑے ہُوئے اور وہاں سے حزین و غمگین واپس تشریف لے آئے۔ مگر اس ناکامی سے آپ کے استقلال میں ذرا بھی تزلزل نہیں ہوا۔ آپ کے واپس آجانے کے بعد اس مجلس میں ان سب لوگوں نے آپ کے قتل کا مشورہ کیا اور ابوجہل نے عہد کیا کہ" خواہ کچھ بھی ہو کل جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی نماز میں سربسجود ہوں گے تو میں ایک بھاری پتھر اُن کے سر پر پٹک دُوں گا۔ پھر تم کو اختیار ہے چاہو میری مدد کر دیا مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اور قصاص میں بنی عبدمناف کا جو جی چاہے کرے۔"

اُن سب نے قسمیں کھائیں کہ" ہم ہرگز تیرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔"

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے دن حسبِ معمول کعبے میں نماز کے لیے تشریف لائے اور نہایت اطمینان اور استقلال سے نماز میں مشغول ہو گئے۔ ابوجہل اپنی قرارداد کے مطابق ایک بڑا بھاری پتھر لیے بیٹھا تھا اور اہلِ قریش بڑے شوق سے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب آپ سجدے میں گئے تو ابُوجہل پتھر لے کر جھپٹا، مگر جب آپ کے پاس گیا تو یکایک مرعوب اور خوفزدہ ہو کر اُلٹا پھرا اور پتھر اس کے ہاتھ سے چھُٹ گیا۔ اور یُوں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنی قدرتِ کاملہ سے بچالیا۔ (سیرت ابن ہشام ص ۱۵۱)

لیکن اس واقعہ کی کیا خصوصیت ہے۔ ایسے ایسے حملے بارہ برس تک برابر روز ہی ہوتے رہے اور خدا یُوں ہی آپ کو بچاتا رہا۔ مگر آپ جس دھن میں تھے اس میں ان خطروں اور مخالفتوں سے نہ کچھ کمی ہوتی تھی نہ زیادتی۔ اور ہو بھی کیونکر سکتی تھی آپ کو اللہ نے جس کام کے لیے بھیجا تھا آپ کو اس کی تعمیل کے سوا اور کسی بات سے کچھ سروکار بھی نہ تھا۔ کیونکہ آپ کو یہ حکم مل چکا تھا کہ:

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔

اور جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں ان میں سے بعض خواہ تم کو دکھا دیں یا تم کو وفات دیں (تم کو اس سے کچھ تعلق نہیں) بیشک تمھارا کام تو صرف ان کا پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔

اور آپ کی زندگی کا ہر ایک واقعہ اس کا ثبوت ہے کہ آپ نے کیسی کامل اطاعت اور احتیاط سے اس ارشاد کی تعمیل کی۔

آخر جب اس طویل مدت کے پیہم امتحانِ صبر و ثبات کے بعد وہ وقت آگیا کہ آپ مکہ سے ہجرت فرمائیں۔ تو یہ واقعہ آپ کے استقلال کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ اہلِ مکہ نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور جس کام میں ابو جہل مرعوب ہو کر ناکام رہ گیا تھا اس کی تکمیل کے لیے تمام قبائل کا ایک ایک منتخب جوان مقرر ہوا تا کہ یوں آپ کے قتل کا الزام تمام قبیلوں میں بٹ جائے اور بنی ہاشم کو آپ کا قصاص لینے کی جرأت نہ ہو۔ بلاشبہ یہ رائے نہایت ہوشیاری اور دُور اندیشی پر مبنی تھی اور بظاہر عرب میں کوئی طاقت اس متفقہ کوشش کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مہلکے سے بچ جانا جس طرح تائیدِ غیبی اور امدادِ ربانی کا نہایت نمایاں ثبوت ہے ویسے ہی آپ کے ثبات و استقامت کا بھی نہایت واضح واقعہ ہے۔ جب ان لوگوں نے رات کو آپ کا مکان چاروں طرف سے گھیر لیا تو آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنی جگہ سُلا دیا اور اپنی چادر اُڑھا دی اور خود بکمال تنہا بالکل اطمینان اور استقلال سے ان کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ خدا نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیے کہ کسی نے آپ کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا اور یُوں ان کی ساری کوشش رائگاں گئی۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۶۵)

پھر جب آپ اور حضرت ابوبکرؓ نے مکے سے نکل کر تین شبانہ روز تک غارِ ثور میں قیام فرمایا تو ایک دن حضرت ابوبکرؓ نے وہیں سے قریش کو ادھر آتے ہوئے دیکھا، اس سے وہ بہت پریشان ہوئے اور اُنھوں نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اگر ان میں سے کسی نے نیچے نظر کی تو وہ ہم کو دیکھ لے گا۔" آپ نے جواب دیا: "اے ابوبکر! تم ان دو شخصوں کی بابت کیا خیال کرتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔" یعنی جب اللہ ساتھ ہے تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ غار کے پاس سے لوٹ گئے اور آپ ان کے شر سے محفوظ رہے۔ (بخاری ص ۵۱۶)

اس کے بعد جب آپ وہاں سے تشریف لا رہے تھے اور اہلِ مکہ آپ کی تلاش میں چاروں طرف سرگرداں تھے تو اتفاق سے ان میں سے ایک شخص سُراقہ ابن مالک نے آپ کو پا لیا۔ حضرت ابوبکر نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گئے اور انھوں نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! انھوں نے ہم کو آ لیا۔" آپ نے پھر بھی نہایت اطمینان سے فرمایا کہ: "اے ابوبکر! کچھ فکر مت کرو بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" (بخاری ص ۵۱۱)

چنانچہ خدا کی قدرت سے وہی سُراقہ جو آپ کے پکڑنے کے لیے آیا تھا آپ کی حفاظت کا ذریعہ بن گیا۔ یعنی وہ آپ سے صلح کر کے واپس چلا گیا اور جو اہلِ مکہ اس کو آپ کے تعاقب میں آتے ہوئے ملے ان کو بھی الٹا پھیر لے گیا۔ سچ ہے: ؏

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

مگر یقیناً اس تمام سفر میں خدا کے حکم سے آپ کا استقلال و استقامت ہی آپ کے محفوظ و مصئون رہنے کا ظاہری سبب بن گیا۔

ہجرت کے بعد مظالم قریش کے کم ہو جانے اور حالات کے بدل جانے سے آپ کی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی میں کچھ فرق

نہیں ہوا اور بار ہا اس کی آزمائش ہوئی۔ جنگِ اُحد کے موقع پر آپ نے لڑائی کا ارادہ کرنے سے پہلے اصحاب کرام سے اس بارے میں مشورہ کیا تو یہ بات قرار پائی کہ میدان میں نکل کر لڑنا چاہیے۔ اس پر آپؐ نے خود زیب سر فرما لیا اور روانگی کا ارادہ کر لیا۔ اُس وقت پھر بعض لوگوں کی رائے بدلی اور اُنھوں نے آپؐ کو ٹھہرنے کی رائے دی۔ مگر آپؐ نے ان کی طرف کچھ التفات نہ فرمائی اور کہا کہ یہ بات نبی کی شان کے شایاں نہیں ہے کہ وہ خود پہن کر اُسے اتار دے تاوقتیکہ اللہ اسے حکم نہ دے"۔ (سیرت ابن ہشام ص ۴۴۸)

جنگِ حنین میں مسلمان پسپا ہو ہی چکے تھے۔ مگر محض آپ کے استقلال و استقامت نے میدان جیت لیا۔ اس وقت اگر آپ کے قدم ذرا بھی ڈگمگا جاتے، اگر آپؐ کی تیوری پر ذرا بھی بل پڑ جاتا تو مسلمانوں کو ایسی شکست ہوتی کہ شاید دنیا کی تاریخ بدل جاتی۔ لیکن جہاں نفسانیت کا گزر ہی نہ ہو اور جس کا ہر ایک کام خالصۃً لوجہ اللہ ہو اس کے پائے ثبات میں ناکامی سے کیا لغزش ہوسکتی ہے اس کے لیے شکست و فتح دونوں یکساں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن کے نرغے اور مسلمانوں کی گریز پائی سے آپ کا قدم پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھا۔ البتہ خدا نے ان مسلمانوں کو جو فتح مکہ کی وجہ سے اپنی شجاعت اور کامیابی پر مغرور ہو گئے تھے یہ سبق دے دیا کہ غرور ہمیشہ ذلت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور خدا کی مدد کسی قوم یا کسی نام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ نکوکاری کا صلہ اور حُسنِ اعمال کا انعام ہے۔

چنانچہ اسی کی بابت کلامِ پاک میں یہ ارشاد ہوا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ط ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ط وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

بے شک اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی اور خاص کر حنین کے دن جب کہ تمھاری کثرت نے تم کو مغرور کر دیا تھا پھر وہ کثرتِ تعداد تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود اپنی وسعت تم پر تنگ ہونے لگی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر اور مسلمانوں پر اطمینان اور سکون نازل فرمایا اور ایسی فوجوں کو بھیجا جن کو تم نہیں دیکھتے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اُن کو سزا دی اور بیشک کفر کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔

حلم اور تحمل

گزشتہ باب میں ہم نے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے وہی چند واقعات بیان کیے ہیں جو عرف فی شجاعت اور ظاہری بہادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن آپ کی طبیعت کا اصلی میلان اور آپ کے خلق کریم کا صحیح نمونہ شجاعت کے دوسرے مفہوم یعنی ضبطِ نفس، بردباری اور حلم کے موقعوں پر نظر آتا ہے۔

جنگِ اُحد میں جب جناب رسالت مآب روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دانت مبارک عتبہ بن ابی وقاص کے پتھر کے

صدمے سے شہید ہو گیا اور چہرہ اقدس عبداللہ ابن شہاب الزہری کے حملہ سے مجروح اور خون آلود ہو گیا، تو آپ کے اصحاب کرام آنجناب کی اس تکلیف سے نہایت ملول اور رنجیدہ ہوئے اور ان پر یہ حادثہ بہت ہی شاق گزرا اور انھوں نے آپ سے عرض کیا کہ "کاش آپؐ ان لوگوں کے حق میں دعائے بد فرماتے تاکہ یہ اپنے کیفر کردار کو پہنچتے۔" آنجنابؐ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "میں لعنت اور بد دعا کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ راہِ راست کی طرف بلانے کو آیا ہوں، اور خدا نے مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" اور پھر آپؐ نے اللہ سے دعا کی کہ "بارِ الٰہا! میری قوم کو بخش دے، اور ان کو راہِ راست کی ہدایت کر، کیونکہ وہ جانتے نہیں۔" (شفا، ص ۷۴)

سُبحان اللہ! غور کرنے کی بات ہے کہ یہ خیر طلبی، یہ عذر خواہی کس حال میں کن لوگوں کی طرف سے کی گئی تھی، اس وقت کہ جب دہانِ اقدس سے خون جاری تھا خود کے دو حلقے رخسارۂ گلگوں میں ایسے گھرے اُتر گئے تھے کہ ابو عبیدہ ابن الجراح نے دانتوں سے پکڑ کر بمشکل ان کو نکالا تو اس سے ان کا دانت گر گیا۔ اور ان لوگوں کے لیے جو شروع سے آپ کے درپئے آزار رہتے تھے جن کے مظالم گوناگوں نے آپ کو ترکِ وطن اور مفارقتِ احباب پر مجبور کیا، جن کے تشدد و تعذیب سے آپ کے بیسیوں رفیق اور دوست تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہو گئے اور جن کی روز افزوں زیادتیوں سے آخر آپؐ کو آپ کی طبعی مروّت اور رحم دلی کے برخلاف تلوار اٹھانی پڑی اور جس کا خونریز اور جانکاہ صدمہ اُسی وقت دوسروں پر نہیں پڑا بلکہ خود آپ کی ذات بابرکات پر اتنی شدت سے پہنچا تھا۔ ایسی حالت میں ایسے لوگوں کے لیے ایسی دعا اس سے بڑھ کر بُردباری، تحمل اور حلم کی کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ "طفیل بن عمرو نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! قبیلہ دوس نافرمانی اور سرکشی کرتا ہے اور اسلام لانے سے انکار کرتا ہے، آپ ان کے لیے بد دعا کیجئے۔" آپ نے ہاتھ اٹھائے لوگ سمجھے کہ آپ ان کے لیے بد دعا کرتے ہیں مگر آپ نے کہا تو یہ کہا کہ "بارِ الٰہا! دوس کو ہدایت کر اور راہِ راست دکھلا، اور ان کو دائرہ اسلام میں لے آ۔"

غزوہ ذات الرقاع ۵ھ کا واقعہ ہے کہ آنجناب اتفاق سے احباب و اصحاب سے جُدا ہو کر ایک درخت کے نیچے دوپہر کے وقت آرام فرما رہے تھے کہ دشمنوں میں سے ایک شخص غورث بن حارث وہاں پہنچا اور اس نے آپ کو تنہا سوتا ہوا پا کر آپ کے قتل کے ارادہ سے تلوار کھینچی کہ اتنے میں آپ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دشمن ننگی تلوار لیے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے آپ کو بیدار دیکھ کر کہا کہ "اب بتا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "اللہ۔" اب اسے خدا کی قدرت کہیے یا رعبِ نبوت سمجھئے بہرحال خواہ وجہ کچھ ہی ہو واقعہ یہ ہے کہ ہیبت سے اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر آپؐ کے قدموں پر گر پڑی، آپؐ نے وہی تلوار اٹھا کر فرمایا کہ "اب تُو بتا کہ تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟" اس نے کہا "کوئی نہیں، مگر ہاں تو ہی عمدہ بدلہ دینے والا ہو، اور حلم و عفو سے کام لے۔" آپؐ نے اسے معاف کر دیا اور چھوڑ دیا۔ (بخاری) بعض راویوں کا بیان ہے کہ جب وہ اپنے لوگوں میں آیا تو اس نے اُن سے کہا کہ "میں بہترین خلق کے پاس سے آیا ہوں۔" اور یہ قصہ کہا، اور یہی وجہ اس کے اسلام لانے کی ہوئی۔ (شفا، ص ۷۴)

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں جناب رسالت مآبؐ کے ہم رکاب تھا۔ آپؐ اس وقت چادر اوڑھے

ہوئے تھے جس کی کور بہت موٹی تھی۔ ایک بدوی نے چادر کا کنارہ پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی موٹی کور کی رگڑ سے آپ کے شانے اور گردن پر نشان پڑ گیا (بخاری) آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے اس مال میں سے جو تیرے پاس ہے میرے دونوں اونٹوں پر بھی کچھ لاد دے۔ کیونکہ اس میں سے جو کچھ تو مجھے دے گا وہ کچھ تیرا یا تیرے باپ کا مال نہیں ہے۔" یہ تلخ اور درشت بات سُن کر پہلے تو آنجناب فرطِ حلم و کرم سے خاموش رہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ "بے شک مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا بندہ ہُوں، مگر اے اعرابی! یہ تو کہہ کہ اب تیرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو تُو نے میرے ساتھ کیا ہے؟" اس نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے پُوچھا "کیوں نہیں؟" اس نے کہا "کیونکہ تُو برائی کے عوض میں بُرائی نہیں کرتا۔" یہ سُن کر آنجناب ہنسنے لگے۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ "اس کے ایک اُونٹ پر جَو اور ایک پر کھجوریں بار کر کے اسے دے دیں۔" (شفا، ص ۴۸)

ایک مرتبہ یہودی زید بن سعنہ اسلام لانے سے پہلے آپ کے پاس اپنے کچھ قرض کا تقاضا کرنے آیا اور شانۂ مبارک سے چادر کھینچ لی اور بہت کچھ بک جھک کر کہنے لگا کہ "تم بنی عبد المطلب بڑے ہی نادہند اور وعدہ خلاف ہو۔" اس کی بدزبانی پر بھی جناب رسالت مآبؐ برابر مسکراتے رہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے جھڑک کر ایسی بیہودہ گوئی سے روکنا چاہا تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "اے عُمر! تم نے ہم دونوں سے وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو ہونا چاہیے تھا اور جس کی ہم کو ضرورت تھی۔ یعنی مناسب یہ تھا کہ تم اسے جھڑکنے کی بجائے مجھ سے ایفائے وعدہ اور ادائے قرض کے لیے کہتے اور اس کو حسنِ طلب اور نرمی تقاضا کی ہدایت کرتے۔" یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ "اس کا قرض ادا کریں اور اس کو جھڑکنے کے معاوضہ میں لسے بیس صاع (تقریباً ڈیڑھ من) جَو اور دے دیں۔" حالانکہ اُس وقت میعادِ قرض میں بھی تین دن باقی تھے۔ اس حلم، نیک طینتی اور خوش خوئی نے اس شخص کے دل پر اتنا اثر کیا کہ وہ مُسلمان ہو گیا۔ اس کا بیان ہے کہ "مجھے آپ میں نبوت کی تمام نشانیاں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر صرف دُو باتیں میں نے نہیں آزمائی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا حلم ان کے غصہ سے زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ ان پر جتنی سختی کی جائے اُسی قدر اُن کی نرمی اور مہربانی بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے ان دونوں صفتوں کو آپ میں برای العین دیکھ لیا اور مجھے آپؐ کی رسالت میں کچھ شبہ نہیں رہا۔" (شفا، ص ۴۸)

حقیقت میں ضبطِ نفس اور حُسنِ اخلاق سے بڑھ کر انسان میں اور کیا خُوبی ہو سکتی ہے اور اس خوبی کے کمال کا مذکورہ بالا واقعہ سے بڑھ کر اور کیا معجزہ ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب سرورِ کائنات نے حمایت حق میں محارم الٰہی کی حفاظت کی نیت کے سوا اپنے اوپر کسی قسم کی ظلم و زیادتی سے کبھی داد خواہی نہیں کی اور کسی ذاتی حق تلفی اور ستم رسیدگی کا ہرگز انتقام نہیں چاہا۔ نہ آپ نے حالتِ جہاد کے سوا کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا نہ تنبیہ کے لیے نہ سزا کے طور پر۔ (بخاری از مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

سب جانتے ہیں کہ آپ مسجد سے زیادہ کسی مقام کی عزت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر اس میں کوئی ذرا سی ناپاک اور غلیظ چیز بھی پڑی ہوتی تھی تو آپؐ کو بہت ملال ہوتا تھا۔ مگر ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ کوئی بدو وہاں آیا۔ ان وحشی صحرائیوں

کو اتنی تمیز کہاں ۔اس نے وہیں مسجد میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔اس کی یہ بد تہذیبی اور بے ادبی سب کو شاق گزری اور لوگ اسے مارنے اُٹھے۔مگر جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نے ان کو روک لیا اور فرمایا کہ" اسے جانے دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دو، کیونکہ بیشک تم آسانی اور نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو اور تشدد کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے ہو"۔ (بخاری ص ۸۹ و ۹۰۵)

آپ نے ایک موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تھا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ ۔ اللہ کل کاموں میں نرمی اور رفق کو پسند کرتا ہے۔

اور بلاشبہ آپ کا طرزِ عمل ہمیشہ ہر حال میں اس قول کے مطابق رہا۔

عفو و رحم

غور سے دیکھا جائے تو حلم اور عفو ایک دُوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔وہی شخص دُوسروں کی لغزشوں اور غلطیوں سے چشم پوشی کر سکتا ہے جسے اپنے نفس پر اختیار اور اپنی طبیعت پر اقتدار ہو ورنہ جس میں حلم نہیں ہے اس میں رحم ممکن نہیں ہے مغلوب الغیظ آدمی کو تو اوروں سے درگزر کرنے کی جگہ اکثر خود اپنی تیز مزاجی اور زود رنجی پر ان سے معافی مانگنے اور معذرت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے حقیقت میں جس طرح حلم شجاعت کے ایک خاص اور زیادہ اعلیٰ درجہ کا نام ہے ویسے ہی رحم حلم کی ایک مخصوص اور زیادہ پاکیزہ صورت سمجھنی چاہیے کیونکہ حلم تو یہ ہے کہ آدمی ناپسندیدہ حالات اور خلافِ طبیعت واقعات کو سنجیدگی اور متانت سے برداشت کرے اور ان کے ناگوار ہونے کی وجہ سے از خود رفتہ نہ ہو جائے۔اور رحم یہ ہے کہ وہ ان حالات کے باعث اور ان واقعات کے موجب شخص پر دسترس رکھنے کے باوجود بھی اسے معاف کر دے اور اس کی قابلِ سرزنش حرکتوں پر اُسے کچھ نہ کہے۔اس لیے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (آل عمران ع ۱۴)

اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے، اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اور اسی تعلق کی بنا پر سچی شجاعت کے لیے حلم اور رحم جزوِ لازم سمجھے گئے ہیں اور اس وجہ سے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جس طبیعت میں اتنا اعلیٰ درجے کا حلم موجود ہو جیسا کہ گزشتہ باب میں چند روایتوں سے معلوم ہوتا ہے اس میں عفو اور رحم کی صفات حسنہ علیٰ وجہ کمال نہ پائی جائیں۔چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات نہایت ہی رحیم المزاج واقع ہوئے تھے اور حتی المقدور اپنے بڑے سے بڑے دشمنوں کو بھی معاف فرما دیتے تھے۔قریشِ مکہ سے زیادہ سخت دشمن آپ کے اور کون تھے اور ان سے زیادہ کس کے ہاتھوں آپ کو تکلیفیں پہنچی تھیں۔اس لیے فتح مکہ کے وقت ان سب کو یقین تھا کہ ان کی ایک ایک بات کا ان سے بدلہ لیا جائے گا اور ان کی سابقہ جفائیں ہی ان کی تباہی اور بربادی کا

سبب بن جائیں گی۔ لیکن جب آپؐ تشریف لائے تو آپ نے کسی کو بھی کچھ نہیں کہا اور سب کو معاف کر دیا۔ پھر آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیا کہتے تھے کہ میں تم سے کیا برتاؤ کروں گا؟" اُنھوں نے کہا کہ "اچھا، کیونکہ آپ مہربان بھائی اور مہربان بھائی کے بیٹے ہیں!" آپ نے فرمایا کہ "آج میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔" (شفا، ص ۴۸)

لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ — آج تم پر کچھ الزام نہیں ہے اللہ تم کو معاف کرے

وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ط (۱۲: ۹۲) — اور بے شک وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

خیبر کی ایک یہودی عورت زینب بنت حارث نے آپ کی خدمت میں ایک بھنی ہوئی بکری پیش کی جس میں اس نے زہر ملا دیا تھا اور آپ اور اصحاب کرام اس میں سے کھانے لگے کہ اتنے میں آپ نے سب کو ہاتھ روکنے کے لیے ارشاد فرمایا اور کہا کہ یہ گوشت مسموم ہے۔ پھر آپ نے اس عورت کو بلا کر اس سے پوچھا تو اُس نے یہ عذر کیا کہ میں آپ کے دعویٰ نبوت کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کیونکہ پیغمبر کو زہر سے کچھ نقصان نہیں ہو سکتا۔ آپؐ نے اس عورت کو معاف کر دیا حالانکہ آپؐ کے بعض اصحاب زہر کے اثر سے انتقال کر گئے اور خود آنجناب کا مزاج مقدس بھی ناساز رہا۔ لیکن اس کے انتقام میں آپؐ نے اس عورت سے بازپرس نہیں فرمائی۔ (بخاری ص ۴۴۹)

رحم کی ترغیب و تحریص کے لیے آنجنابؐ نے ارشاد فرمایا:

اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ — رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے تم زمین والوں

فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ۔ (ابوداؤد) — پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اور اس میں قطعاً شائبہ شبہ تک نہیں ہو سکتا کہ آپ خود اس قول کے سب سے اعلیٰ اور اکمل نمونہ تھے۔

سلمہؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں مدینہ سے نکلا اور غابہ کی طرف چلا۔ جب میں جنگل کے پاس پہنچا تو مجھے عبدالرحمن بن عوف کا غلام آتا ہوا ملا اور اس نے مجھ سے کہا کہ "آنجناب کی اونٹنیاں چور لے گئے۔" میں نے پوچھا کہ "وہ کون لوگ تھے؟" اس نے کہا کہ "غطفان اور فزارہ۔" میں نے وہیں تین نعرے لگائے: "یا صباحاہ یا صباحاہ۔" ایسے کہ جنگل گونج اٹھا پھر میں ان کے تعاقب میں بھاگا تو میں تھوڑی دور پر اُن کو جا لیا۔ وہ پانی پینے کو ٹھہرے تھے میں نے ان پر تیر برسانے شروع کیے اور رجز یہ شعر پڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ اونٹنیاں چھوڑ کر بھاگ گئے اور میں اُن کو گھیر لایا۔ راستے میں مجھے آپ آتے ہوئے ملے۔ میں نے آپ سے قصہ کہا اور یہ بھی عرض کیا کہ "وہ لوگ ابھی پیاسے ہیں اگر ان کے پیچھے کچھ آدمی بھیج دیے جائیں تو غالباً وہ گرفتار ہو سکتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "اے ابن الاکوع! اب تم نے اپنا مال پا لیا اب ان کو جانے دو، وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے ہوں گے۔" (بخاری ص ۴۲۷) یہ درگزر محض آپؐ کے رحم کی وجہ سے تھی ورنہ چوروں کا پکڑا جانا کیا مشکل تھا۔

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کی طرف کچھ سوار بھیجے۔ وہ قبیلہ

بنی حنیفہ کے ایک شخص ثمامہ بن اثال کو پکڑ لائے اور اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ جب آپ وہاں تشریف لائے تو آپ نے اس سے کہا: "اے ثمامہ! اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے جواب دیا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرا ارادہ بھلائی کا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کر دے گا تو مجھ پر بہت سے خون ہیں (یعنی میرا قتل حق بجانب ہوگا) اور اگر تو احسان کرے گا تو وہ ایسے شخص کے ساتھ ہوگا جو شکر گزار رہے گا۔ اور اگر تو مجھ سے کچھ مال وصول کرنا چاہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے مانگ لے (یعنی میں دولت مند آدمی ہوں رقم فدیہ ادا کر سکتا ہوں)۔ آپ نے ایک دو دن کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ رہا ہو کر وہ مسجد کے باہر چلا گیا، وہاں سے ذرا دیر میں نہا دھو کر پھر آیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اور کہنے لگا: "یا رسولؐ اللہ! دنیا میں مجھے آپؐ سے زیادہ عداوت اور آپ کے مذہب سے زیادہ نفرت کسی چیز سے نہ تھی۔ مگر اب مجھے آپؐ سب سے زیادہ محبوب اور آپ کا مذہب سب سے زیادہ مرغوب ہے۔" (بخاری ص ۶۲۷)

اس سے بھی زیادہ رحم و عفو کا واقعہ حاطب ابن ابی بلتعہ کا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ "جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اور زبیر اور مقداد کو روضہ خاج کی طرف روانہ کیا اور فرمایا کہ "وہاں ایک شتر سوار عورت ہے؛ اور اس کے پاس ایک خط ہے وہ لے آؤ۔" ہم چلے، جب ہم اس باغ میں پہنچے تو وہاں وہی عورت ملی۔ ہم نے اس سے خط مانگا تو اس نے انکار کیا۔ مگر ہمیں یقین تھا کہ آنجناب کا فرمانا غلط نہیں ہو سکتا اس لیے ہم نے اس سے کہا کہ "یا تو تُو خود وہ خط دے دے ورنہ ہم تیری تلاشی لیں گے۔" ہمارا یہ اصرار اور یقین دیکھ کر اس نے اپنے جوڑے میں سے خط نکالا۔ ہم وہ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھا تو وہ خط حاطب ابن ابی بلتعہ نے بعض مشرکین مکہ کو لکھا تھا اور اُس میں، اُن کو آنجناب کے ارادوں اور تجویزوں وغیرہ کی اطلاع دی تھی۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا: "اے حاطب! یہ کیا؟" اُس نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! ذرا ٹھہریے میں اہلِ قریش میں سے تو ہوں نہیں کہ اُن کو میری قرابت کا پاس ہو، اور مہاجرین کے تو ان سے رشتہ داری کے تعلقات ہیں اور ان کے اعزّہ مکّے میں ہیں جو ان کے اہل و عیال اور ان کے مال و منال کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر میرا کوئی بھی نہیں ہے اس لیے میں نے یہ جاسوسی اور خبر رسانی اس خیال سے کی تاکہ میرا بھی قریش پر کوئی احسان ہو جائے اور وہ میرے اہل و عیال کو کچھ نہ کہیں، ورنہ میں نے یہ فعل کفر و ارتداد کی وجہ سے نہیں کیا۔" آپ نے یہ سن کر اصحاب سے فرمایا کہ اس نے سچ سچ کہہ دیا۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "یا رسولؐ اللہ! اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔" مگر آپؐ نے فرمایا: "یہ شخص جنگِ بدر میں شریک تھا۔" (گویا اس لیے قابلِ معافی ہے)۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُنھوں نے کہا: "اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔" (بخاری، ص ۵۶۷)

اللہ اللہ کس قدر رحم و حلم ہے کہ ایک شخص آپ کا رفیق اور دوست بن کر آپ کے ساتھ رہتا ہے اور پھر آپ کی تمام تجاویز سے دشمن کو اطلاع دیتا ہے آپ اسے پکڑ لیتے ہیں اور اس کا جُرم اتنا یقینی ہے کہ وہ خود انکار کی گنجائش نہیں پاتا اور اس کا عذر بدتر از گناہ معلوم ہوتا ہے مگر آپؐ کا رحم خود اس کا عذر خواہ بن کر اس کی جان بخشی کرا دیتا ہے، حالانکہ

آج کل کی بڑی سے بڑی مدعی تہذیب سلطنت میں اس جُرم کا شُبہ بھی سزائے قتل کے لیے کافی ہے اور اس میں کسی قسم کی بھی رعایت کا امکان نہیں۔

ذاتی تعلق کے لحاظ سے آپ کے رحم و عفو کی ایک مثال اس سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ جنگِ بدر میں ایک شخص طعیمہ بن عدی جناب سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عرب جاہلیت میں تو ایسے واقعات کا رونا برسوں بلکہ پشتوں تک رہتا تھا۔ چنانچہ اس کے بھتیجے جبیرہ بن مطعم نے اپنے غلام وحشی سے یہ وعدہ کیا کہ "اگر وہ حضرت حمزہ کو مار ڈالے تو آزاد ہو جائے۔" وحشی آپ کی تاک میں رہا، جنگِ اُحد میں جب وہ ایک شخص سباع سے مصروفِ جنگ تھے تو وحشی نے موقع پا کر پیچھے سے آپؓ کو نیزہ مارا جس سے آپ شہید ہو گئے۔ اس کے بعد وحشی حسبِ قرارداد آزاد ہو کر مکے میں رہنے لگا۔ اور جب مکہ فتح ہو گیا تو وہاں سے بھاگ کر طائف پہنچا۔ اتفاق سے اسے معلوم ہُوا کہ اہلِ طائف کے قاصد جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہے ہیں تو وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ آپ قاصد کو کچھ نہیں کہتے۔ چنانچہ جب آپ کی نظر اس پر پڑی تو آپ نے پوچھا کہ "کیا تُو وحشی ہے؟" اس نے کہا "ہاں۔" آپ نے پوچھا کہ "کیا تُو نے ہی حمزہ کو قتل کیا تھا؟" اُس نے کہا "آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے۔" آپ نے فرمایا "کیا تو یہ کر سکتا ہے کہ میرے پاس سے چلا جائے اور مجھے اپنی صورت نہ دکھائے۔" چنانچہ وہ وفات حسرت آیات تک سامنے نہیں آیا اور آخر مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اس نے قتلِ حمزہؓ کی تلافی کی۔ یہ قصہ خود وحشی نے جعفر بن عمرو ضمیری اور عبداللہ بن عدی سے بیان کیا تھا۔ (بخاری ص ۵۸۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ "میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر میں شبِ قدر کو پا جاؤں تو کیا دُعا مانگوں؟" آپ نے فرمایا: یہ:

اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي۔ (مشکوٰۃ ص ۱۸۲)

اے اللہ! تو بڑا درگزر کرنے والا ہے اور تو درگزر کرنے کو پسند کرتا ہے تو مجھ سے بھی درگزر کر۔

اس ایک بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک عفو کس قدر پسندیدہ صفت ہے۔ اور مذکورہ بالا واقعات سے ظاہر ہے کہ آپ اس صفت کے کیسے کامل اور جامع نمونہ تھے۔

صبر و شکر

صبر دنیا میں انسان کے لیے نہایت ہی ضروری اور مفید صفت ہے۔ اس کا تعلق ایک طرف تو حلم سے ہے اور دوسری طرف تسلیم و رضا سے، حلم اس حال میں ممدوح ہے جبکہ آدمی قدرت ہوتے ہوئے بھی بجا غصے کو دبا لے۔ لیکن صبر کے قابلِ تعریف ہونے میں قدرت اور استطاعت کی شرط نہیں ہے۔ بلکہ جب کبھی آدمی انسانی یا آسمانی خلافِ طبع بات کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتا ہے اور اس پر جزع فزع اور داد فریاد کرنے سے باز رہتا ہے تو وہی صبر ہے۔ اور یقیناً مستحسن، اسی طرح جیسے حلم کا ظاہری نتیجہ عفو ہے ویسے ہی صبر کا عملی نتیجہ شکر ہے۔ مگر نہیں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام

نے ایسے صبر کی ہرگز تعلیم نہیں دی جو کسی طرح بھی ہماری حالت کی اصلاح میں مانع ہو یا جسے ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کا حیلہ بنا سکیں۔ اسلام نے تو اصول ہی یہ ٹھہرایا ہے کہ:

اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی۔ (النجم ع ۳)

بے شک انسان کے لیے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اس کی کوشش ضرور ملحوظ رکھی جائے گی۔

کوشش نہ کرنا صبر ہے ہی نہیں، بلکہ یہ تو پرلے درجہ کی کاہلی، بزدلی اور پست ہمتی ہے اور اس کا نتیجہ شکر کی بجائے انتہا کی ناشکری ہے۔ کیونکہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں سے کام نہ لینے اور ان کو رائیگاں چھوڑ دینے سے بڑھ کر اس کی نعمتوں کی اور کیا ناقدردانی اور ناشکرگزاری ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں تو جا بجا اس کو کفر کہا گیا ہے۔ اور حقیقت میں ناشکری ہی کفر ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق صبر محمود وہی ہے کہ آدمی ناگزیر واقعات پر بیقراری اور ناشکیبائی کا اظہار نہ کرے جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں۔ لیکن جن باتوں پر اس کی دسترس ہے ان میں حتی المقدور پوری کوشش نہ کرنا صرف صبر کا غلط استعمال ہی نہیں بلکہ سخت گناہ اور بڑا کفران ہے۔ اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام واقعاتِ زندگی اس سچی تعلیم کی عملی مثال ہیں۔ آپ شدائد پر صبر کرتے تھے۔ مگر آپ کی تسلیم و رضا ناخوش آیند باتوں کی امکانی مدافعت میں مانع نہ تھی۔ آپ کو اللہ پر کامل توقع تھا۔ لیکن یہ توکل آپ کی سعی و کوشش میں مخل نہ تھا۔

گفت پیغمبر بہ آوازِ بلند
بر توکل زانوے اُشتر بہ بند

آپ بے انتہا صابر تھے۔ کفارِ مکہ کے ہاتھ سے آپ کو جو ایذائیں پہنچیں اُن کا برداشت کرنا آسان کام نہ تھا۔ آپ ہی کا جگر تھا کہ آپ نے اُن پر صبر کیا اور کبھی اپنے فرض کے بجا لانے میں اضطرار اور اضطراب کو دخل نہ دیا۔ حالانکہ حالت یہ تھی کہ آپ کے وعظ و نصیحت پر تمسخر اور استہزا تو شروع ہی سے کیا جاتا تھا۔ پھر نوبت سبّ و شتم تک پہنچی۔ وہ لوگ کبھی آپ کو دیوانہ اور مجنون کہتے تھے کبھی ساحر اور عیّار قرار دیتے تھے، کبھی آپ کی ناداری اور بے کسی پر آوازے کستے تھے۔ جب ان باتوں سے کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے آپ کے ساتھ اور زیادہ گستاخی اور بے حرمتی کا برتاؤ کیا۔ آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے اور چونکہ غالباً آپ اس زمانہ میں برہنہ پا پھرتے ہوں گے اس لیے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کو کیسی تکلیف ہوتی ہو گی جب آپ کعبے میں نماز ادا فرماتے تھے تو کفار آپ کو ہر طرح چھیڑتے اور پریشان کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ پر خاک ڈال دی اور آپ اسی حال میں گھر تشریف لائے تو آپ کی ایک صاحبزادی نے مٹی جھاڑ دی اور سر دُھلایا اور وہ روتی جاتی تھیں آپ نے فرمایا: "بیٹی رومت، بے شک اللہ تیرے باپ کا محافظ ہے۔ (سیرت ابن ہشام ص ۳۲۷)

ایک روز اور ایسا ہی ہوا کہ آپ سایۂ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اس دن کعبے میں اونٹ ذبح کیے ہوئے تھے۔ ابوجہل وغیرہ نے ان کی آلائش آپ کے اوپر ڈال دی اس وقت اتفاق سے حضرت فاطمہؓ پہنچ گئیں اور انھوں نے اسے

آپ پر سے ہٹایا ۔" (بخاری ص ۴۷)

روایت ہے کہ ایک بار عروہ بن زبیر نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ " یہ تو بتاؤ کہ مشرکوں نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ سخت بدسلوکی کیا کی تھی ؟" اُنھوں نے جواب دیا کہ " ایک روز آپ کعبے میں نماز ادا فرماتے تھے کہ اتنے میں وہاں عقبہ ابن ابی مُعیط آگیا اُس نے گردن مبارک میں ایک کپڑا لپیٹ کر بڑی سختی سے آپ کا گلا گھونٹنا شروع کیا ، حُسنِ اتفاق کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپہنچے اور آپ نے عقبہ کے کندھے پکڑ کر اُسے پیچھے ہٹایا اور کہا " کیا تم لوگ اس شخص کو مارے ڈالتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے ۔" (بخاری ص ۵۹۵)

لیکن غالباً آنجناب کو ان تمام ذاتی تکلیفوں سے زیادہ تکلیف اپنے اصحاب و رفقا کی تکلیف اور پریشانی سے ہوتی ہو گی معلوم ہوتا ہے کہ یہی وجہ تھی کہ اہلِ مکہ بیکس و مسکین مسلمانوں کو اتنی سخت اذیتیں پہنچاتے تھے جسے سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ ورنہ ان بیچاروں نے ان کا کیا بگاڑا تھا ۔ وہ تو ان کے بتوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے فقط اتنا البتہ تھا کہ خود ان کے دل میں نورِ ایمان گھر کر گیا تھا اور اس سعادتِ عظمیٰ اور نعمتِ کبریٰ کے مقابلہ میں کوئی تکلیف اور کوئی مصیبت ان کی حقیقت شناس نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتی تھی مگر بات یہی تھی کہ چونکہ آنجنابؐ پر دست درازی کی جرأت وہ تو کر نہیں سکتے تھے اس لیے اور ہر طرح سے ایذا رسانی کی کوشش کرتے تھے اور چونکہ آپ کی رحیم المزاجی اور رقیق القلبی کو بھی جانتے تھے ۔ اس لیے آپ کے ضعیف اور کمزور پیرؤوں کو تکلیف دے کر آپ کو تکلیف پہنچانا چاہتے تھے یہاں تک کہ ان میں سے متعدد آدمی تو ان کے ظلم و تشدد ہی سے جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ جناب رسالت مآبؐ ان سب جسمانی اور روحانی سختیوں کو اٹھاتے تھے مگر رشتۂ صبر ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا اور ادائے فرض سے منہ نہ موڑتے تھے ۔

یہ تو اپنے ابنائے قوم کی ایذا رسانیوں پر صبر کی مثالیں تھیں اور حقیقت میں انہی کا برداشت کرنا طبیعت پر زیادہ گراں بھی ہوتا ہے مگر ان کے علاوہ اور ناخوشگوار واقعات سے بھی آپؐ کی زندگی خالی نہ تھی ۔ اور آپ رسولِ خدا ہونے کی وجہ سے ان حادثات سے مصئون نہ تھے جو عام طور پر انسان کو وقتاً فوقتاً پیش آتے ہیں اگرچہ ہم کو ان میں سے اکثر حالات تو معلوم ہی نہیں ۔ کیونکہ آپ کا تسلیم و توکل خود آپ کو ہی کسی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا تو اوروں کو ان کا علم کیونکر ہو سکتا تھا ۔ تاہم آپ کی اولاد امجاد کے انتقال کا حال تو تاریخی واقعہ ہے ۔ آپؐ کے چار صاحبزادے قاسم ، طاہر ، طیب (از حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) اور ابراہیم (از ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا) پیدا ہوئے ۔ مگر چاروں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا ۔ ظاہر ہے کہ اولاد کی موت سے زیادہ آدمی پر اور کیا صدمہ ہو سکتا ہے ۔ یُوں تو ہر جگہ ہی مگر خاص کر عرب میں تو اولاد ذکور کی بڑی قدر تھی ۔ کیونکہ انہی پر قبیلوں کی طاقت کا مدار تھا ۔ اور انہی سے آیندہ نسل چلتی تھی ۔ وہاں جس قدر لڑکیوں سے نفرت کی جاتی تھی اسی قدر لڑکوں سے محبت کی جاتی تھی چنانچہ سنگدل اہلِ مکہ آنجنابؐ کے ان حوادث پر بھی آپؐ سے استہزا کرتے تھے اور آپؐ کو ابتر (مقطوع النسل) ہونے کا طعنہ دیتے تھے ۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپؐ کی تسکین کے لیے فرمایا :

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۔ بیشک تیرا دشمن ہی مقطوع النسل اور بے نام و نشان ہے ۔

چنانچہ دیکھیے کہ یہ وعدہ صادقہ کتنی عمدگی سے پُورا ہوا کہ اسی زمانہ میں اُن لوگوں کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ اور ایک ہی پشت کے بعد خود ان کی اولاد دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر ان پر لعنت کرنے لگی۔ لیکن بہر حال ان سب باتوں سے بھی آپ کے پائے صبر و ثبات میں لغزش نہیں ہوتی تھی۔

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "ہم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو سیف لوہار کے یہاں گئے جس کی بیوی آپ کے صاحبزادے ابراہیم کو دُودھ پلاتی تھیں۔ اس وقت ابراہیم بالکل جاں بلب تھے ان کی حالت دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے (ذرا ان لوگوں کی سخت دلی کو دیکھیے) کہ اس حالت میں آپ کو آبدیدہ دیکھ کر عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا" یا رسول اللہ آپ بھی!" (یعنی آپ بھی بے صبری کا اظہار فرماتے ہیں) آپؐ نے فرمایا: اے ابنِ عوف! یہ آنسو رحم اور شفقت کی وجہ سے ہیں۔ (یعنی بے صبری اور ناشکری کی وجہ سے نہیں ہیں) اور بے شک آنکھ سے آنسو بہتے ہیں اور دل رنج کرتا ہے۔ مگر ہم کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔" (بخاری ص ۱۷۴)

اسی طرح اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ" آپ کی ایک صاحبزادی کے لڑکے کا انتقال ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے آپ کو بلایا۔ آپ نے ان کو سلام کہلا بھیجا، اور یہ کہا کہ" بے شک جو اللہ نے لے لیا ہے وہ اس کا تھا اور جو کچھ اس نے دیا ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ اور اس کے نزدیک سب کا ایک وقت مقرر ہے، اس لیے تم کو صبر اور شکر سے کام لینا چاہیے"۔ انھوں نے پھر آپ کو قسم دلا کر بہ تاکید بلوایا، تو آپؐ اصحاب سمیت تشریف لے گئے۔ آپ نے بچّے کو اٹھایا تو اس کی سانس اُکھڑ چکی تھی۔ آپؐ کے آنسو بھر آئے۔ یہ دیکھ کر سعد نے آپؐ کو ٹوکا اور کہا" یا رسولؐ اللہ! یہ کیا ہے؟" آپؐ نے فرمایا" یہ رحمت اور رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالی ہے۔ اور بے شک اللہ اپنے رحیم المزاج بندوں پر رحم کرتا ہے"۔ یعنی اشک باری کو اضطراب پر محمول نہ کرنا چاہیے بلکہ یہ تو عین صبر ہے۔ البتہ کسی عزیز کی مفارقت کو محسوس نہ کرنا قساوت اور سخت دلی کی دلیل ہے۔" (بخاری ص ۱۷۱)

سبحان اللہ! خدا نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا نیک اور پاک دل عطا فرمایا تھا، اور آپ کو ہر ایک بات میں افراط و تفریط سے کس خوب صورتی سے بچایا تھا۔ یہی صبر اگر بڑھ جائے کہ آدمی کو اپنے عزیزوں سے ہمدردی نہ رہی اور اس کا دل ان کے صدموں کو محسوس نہ کرے تو یہ قساوت بن جائے۔ اور قطعاً قابلِ تعریف نہ ہو۔ اس کے برخلاف اگر وہی آنسو جو ایک شیر خوار بچّے کی جاں کنی یا ایک ضعیف بیوہ کی بیکسی پر ٹپکتے ہیں خود اپنی جسمانی تکلیف یا اپنے ادائے فرض کی دقتوں پر نکلیں تو وہ جبن ہو جائے اور یقیناً مستحقِ ملامت ٹھہرے۔ یہ اعتدالِ مزاج اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت بیش بہا عطیہ ہے جس کو وہ چاہے عطا کر دے۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ط

ان دونوں صورتوں کے سوا صبر کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے لیے کسی قسم کی آسائش کے اسباب مہیا کرنا آدمی کے اختیار میں ہو۔ مگر وہ (سستی یا پست ہمتی یا بے سروسامانی کے سبب سے نہیں بلکہ) اپنی فیاضی یا رحمدلی یا ہمدردی کی وجہ سے صبر کرتا ہے اور وہ اسباب دُوسروں کو دیتا ہے۔ یہ صبر سب سے زیادہ مشکل، اور سب سے زیادہ محمود ہے

کیونکہ پہلی دونوں صورتوں میں تو چار و ناچار صبر کرنا ہی پڑتا ہے اور تھوڑا بہت رو دھو کر سب ہی صبر کر لیتے ہیں۔ مگر یہ آخر الذکر صورت خود اختیاری ہے اور اس کے لیے بڑے ضبطِ نفس کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ ظاہر بیں اشخاص کے لیے یہ نہایت ہی عجیب ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صفاتِ حسنہ میں تغیر حالات نے ذرا بھی فرق پیدا نہیں کیا۔ مکہ معظمہ میں آپؐ جس طرح کفار کی ایذا پر صابر و شاکر رہے۔ مدینہ منورہ میں ویسے ہی آپ خود اپنے نفس پر ضابط اور قادر رہے صرف صبر کی نوعیت کسی قدر بدل گئی۔ یہاں باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح کامیاب اور متقدر بنا دیا۔ مگر پھر بھی آپ کی جو طرزِ معاشرت تھی وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور اس سے آپ کے صبر اور ضبط کا اندازہ ہو سکتا ہے، کتنی بڑی بات ہے کہ ایک با اختیار نبی اور ایک ہر دلعزیز رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے جاں نثار اتباع اور سر فروش اصحاب میں کچھ تی لوگ بھی شامل ہوں جو اس کے اشارۂ ابرو پر اپنی دولت، اپنا گھر بار اور اپنی جان تک قربان کرنے کو سعادتِ دارین جانتے ہوں۔ اس پر دو دو دن کے فاقے گزریں محض اس وجہ سے کہ اس نے جو کچھ آیا محض مسکینوں کی دستگیری اور محتاجوں کی کار برآری میں صرف کر دیا۔ کیا یہ صبرِ محمود کی بہترین مثال نہیں ہے، اور کیا آپ کی زندگی ایسی مثالوں کا ایک مسلسل تذکرہ نہیں ہے؟ یقیناً اس سے متعصب سے متعصب شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

سوید بن نعمان کہتے ہیں کہ "میں جنگِ خیبر میں آپ کے ہم رکاب تھا جب آپ خیبر کے قریب مقام صہبا میں پہنچے تو آپ نے عصر کی نماز پڑھ کر کھانا مانگا وہاں ستّو کے سوا اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ وہی لایا گیا۔ ہم سب نے اسی کو گوندھ گاندھ کر کھا لیا اور اس کا پانی پی لیا۔ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات اُٹھ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے کُلّی کی۔ پھر ہم نے نماز پڑھی۔" (بخاری ص ۸۱۲)

جابرؓ کہتے ہیں کہ غزوۂ خندق کے موقع پر ہم لوگ کھائی کھود رہے تھے۔ کھودتے کھودتے ایک بڑا پتھر آ گیا۔ سب آپ کی خدمت میں آئے اور حال عرض کیا۔ آپؐ خود اس میں اترنے کے لیے تیار ہو گئے حالانکہ اس وقت شدّتِ گرسنگی سے شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا کیونکہ وہاں ہم کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے کُدال لے کر اس پتھر کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔ پھر میں اجازت لے کر گھر آیا اور میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ حالت دیکھی ہے کہ صبر کی تاب نہیں ہے۔ کیا تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟" اس نے کہا "ہمارے یہاں کچھ جَو اور ایک بکری کا بچّہ ہے۔" میں نے اسے ذبح کر کے پکانے کے لیے دیگچی میں رکھا۔ اُس نے جَو پیسے اور آٹا گوندھ کر روٹی پکانے لگی۔ پھر میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یارسول اللہؐ! میرے پاس کچھ تھوڑا سا کھانا ہے قدم رنجہ فرمائیے، اور ایک دو آدمیوں کو اور لیے چلیے۔" آپ نے پُوچھا کہ "کتنا کھانا ہے؟" میں نے کیفیت عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "بہت ہے اور بہت اچھا ہے، تم اپنی بیوی سے کہہ دو کہ جب تک میں نہ آؤں تب تک دیگچی چُولھے پر سے اور روٹی کو تنور میں سے نہ نکالے۔" پھر آپ سب مہاجرین کو لے کر چلے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت فکر ہوئی اور میں نے اپنی بیوی سے آ کر کہا: "اری کمبخت! جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب مہاجرین و انصار کو لے کر آ گئے۔" اس نے کہا کہ "کیا آپؐ نے تم سے

حال پوچھ لیا تھا؟" میں نے کہا "ہاں"۔ اتنے میں آپ بھی تشریف لے آئے اور آپ نے لوگوں سے کہا کہ "آؤ۔ مگر ہجوم مت کرو۔" پھر آپؐ نے روٹیاں نکال کر اس پر گوشت رکھا اور اصحاب میں تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ سب سیر ہوگئے اور پھر بھی کھانا باقی رہ گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "کھاؤ اور لوگوں کو دو، کیونکہ وہ بھوکے ہیں۔" (بخاری ص ۵۸۸)

اس ایک واقعہ سے آپ کے کتنے خصائل حمیدہ پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ کی سادگی اور بے تکلفی آپ کی محنت اور جفاکشی اور صبر و ثبات، آپ کا استقلال و استقامت، آپ کا انصاف اور مساوات، یہ ایک واقعہ آپ کی اِن صفاتِ حسنہ کا آئینہ ہے۔ اور وہ اپنی نوعیت میں کچھ انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ایسے موقعے اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ چنانچہ انسؓ بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن ابوطلحہ نے اُم سلیم سے کہا کہ "جناب رسولؐ اللہ کی آواز سے ضعف پایا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے کچھ کھایا نہیں۔ کیا تمھارے پاس کچھ ہے۔" اُنھوں نے جَو کی کچھ ٹکیاں نکالیں اور ان کو اپنی اوڑھنی میں لپیٹ کر مجھے دیں، اور مجھے خدمتِ اقدس میں روانہ کیا۔ میں پہنچا تو آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اور بہت سے آدمی حاضر تھے۔ میں چُپ چاپ کھڑا رہا آپؐ نے مجھے کھڑا دیکھ کر پُوچھا کہ "کیا تم کو ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟"

میں: "جی ہاں۔"

آپ: "کھانے کے لیے۔"

میں: "جی ہاں"۔

یہ سن کر آپ نے سب لوگوں کو ساتھ لیا اور چلے۔ میں آگے آگے بھاگتا ہوا گھر آیا اور حال کہا۔ ابوطلحہ اور ام سلیم کو اس سے تردد ہوا۔ کیونکہ کھانا زیادہ نہ تھا۔ مگر اُن کو آپ کی ہر بات پر پُورا اعتبار تھا۔ ابوطلحہ نے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ آپ اندر تشریف لائے اور ام سلیم سے کہا "یا ام سلیم! تمھارے پاس کیا ہے، لاؤ"۔ وہ وہی روٹیاں لے آئیں۔ اور ایک کُپّا تھا، اس میں سے کچھ نچوڑا۔ آپ نے اس سے روٹی لگائی اور دس دس آدمیوں کو بلا کر کھانا کھلا دیا۔ یہاں تک کہ سب کا پیٹ بھر گیا۔" (بخاری ص ۵۱۹)

یہ واقعات اُس زمانے کے ہیں جب کہ خدا نے اپنی قدرت اور مہربانی سے دولتِ دنیا کو آپ کے قدموں پر ڈال دیا تھا، مگر اس سے آپ کی طبیعت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ آپ جیسے مصائبِ آسمانی پر صابر تھے ویسے ہی کفارِ قریش کی جور و جفا پر بھی صابر شاکر رہے اور ویسے ہی مدینہ میں رئیسِ قوم ہونے کے بعد بھی صابر و ضابط رہے۔ یُوں تو کوئی وقت، کوئی لمحہ، کوئی ثانیہ ایسا گزرتا ہی نہ تھا جب آپ کا دل یادِ الٰہی سے غافل ہوتا ہو، لیکن آپ اپنے اس تقرب و معرفت کے باوجود بھی محض ذکرِ قلبی پر قانع نہ تھے اور ان شدائد ظاہری پر بھی آپ کی عبادت گزاری کا یہ عالم تھا کہ کثرتِ قیام و شب بیداری سے آپ کے پاؤں ورم کر آتے تھے۔ مگر جب آپ سے کہا گیا کہ "آپ تو محبوبِ خدا اور رسول اللہ ہیں۔ آپ کو اس قدر عبادت کی کیا ضرورت ہے؟" تو آپ نے فرمایا کہ "تو کیا میں بندۂ شکر گزار نہ ہوں۔" (بخاری ص ۱۵۲) یعنی یہ درست ہے کہ مجھ پر منعمِ حقیقی کے بے شمار احسان و انعام ہیں لیکن یہ خود ہی اس بات کے مستلزم ہیں کہ اس کا اور زیادہ شکر ادا کیا جائے۔

نہ یہ کہ اس کے لطف و کرم کے بھروسا پر اسے بھلا دیں اور اس سے غافل ہو جائیں ۔سُبحان اللہ! کتنا معقول اور پاکیزہ جواب ہے ۔ اور اگر خدا ہدایت دے تو آنجناب کی یہ ایک بات ہی ساری دنیا کی اصلاح کرنے کے لیے کافی ہے ۔مگر وائے برحالِ ما کہ آپ کو اپنا ہادی اور مقتدا جانتے ہیں ۔مگر جو حالت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ۔

سخاوت

فضائلِ انسانی میں دُوسروں کی نفع رسانی کے لحاظ سے سخاوت کا درجہ سب سے مقدم ہے ۔کیونکہ علی العموم عوام کو جتنا عملی فائدہ بظاہر اس سے پہنچتا ہے ۔ اتنا اور کسی سے نہیں پہنچتا۔ سخاوت کے لیے یہ ضرور نہیں ہے کہ آدمی دولت مند ہی ہو۔ اور ہزاروں لاکھوں روپیہ خیرات کر سکے ۔ نہیں ، بلکہ سچّی سخاوت اور فیاضی یہ ہے کہ آدمی مقدور بھر دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں دریغ نہ کرے ۔ اور خدا نے اپنے فضل و کرم سے جو نعمتیں اس کو عطا فرمائی ہیں۔ اُن میں مستحقین کو شریک کرنے میں بخل اور خست سے کام نہ لے اس کے لیے دولت کی اتنی ضرورت نہیں جس قدر نیک دلی کی حاجت ہے ۔کیونکہ یقیناً وہ غریب آدمی جو اپنا پیٹ کاٹ کر کسی بھوکے کو اپنی رُوکھی سُوکھی روٹی میں سے ایک ٹکڑا دے دیتا ہے اس کروڑپتی سے بدرجہا زیادہ قابلِ ستائش اور مستحقِ آفریں ہے جو اپنے بیحد حساب دولت میں سے چند لاکھ روپیہ خیراتی کاموں یا قومی چندوں میں خرچ کر دیتا ہے ۔ نہیں اگر یہ شخص اپنی ساری کی ساری دولت بھی خیرات کر دے پھر بھی بمشکل اس غریب کے برابر ہو سکتا ہے ۔کیونکہ اگر اس کی یہ سخاوت نمود و نمائش کے شائبہ سے پاک ہو، تب بھی دُنیا میں اس کی اس فیّاضی اور فراخ حوصلگی کا غلغلہ اور اس کے ابنائے قوم کا اس کی داد و دہش پر تشکر و امتنان ہی اس کی جود و عطا کا کافی معاوضہ ہو سکتا ہے ۔لیکن اس کے مقابلہ میں وہ غریب آدمی غالباً خود بھی اپنی فیاضی کو بھول جاتا ہے اور اس بھوکے کو بھی اس کا احسان یاد نہیں رہتا اور دنیا کو تو اس عالی ہمتی اور فراغ حوصلگی کی خبر تک بھی نہیں ہوتی ۔

دولتِ دنیا کے لحاظ سے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کا مقابلہ امریکہ اور یورپ کے قارون شوکت فیّاضوں اور شدادِ حشمت مخیّروں سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جس حقیقی جُود و سخا کے واقعات آپ کی روزمرہ زندگی میں ایسی کثرت سے پیش آتے تھے کہ کسی کو ان کا خیال تک نہ رہتا تھا اس کی مثال ملنا آسان نہیں ہے ۔ آپ کی طبیعت کی فیاضی کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بروایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کبھی زبانِ فیض ترجمان سے کسی سائل کے لیے بھی " نہیں" نہیں نکلا ۔ (صحیحین از مشکوٰۃ ص ۴۴۲) اور بقول انسؓ آپ نے کبھی کسی چیز کو آئندہ کے لیے نہیں رکھا ۔ (مشکوٰۃ ص ۴۴۳) یہی وجہ ہے کہ جب ایک شخص نے آپ سے بکریاں مانگیں اور وہ اتنی تھیں کہ دو پہاڑیوں کا درمیانی میدان ان سے بھرا ہُوا تھا، تو آپ نے وہ سب اسے دے دیں ۔ یہ شخص اپنی قوم میں جا کر کہنے لگا کہ " اے قوم! اسلام لے آؤ۔ کیونکہ خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قدر دیتا ہے کہ فقر کا خوف نہیں رہتا۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۳)

جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ جب ہم جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب جنگِ حنین سے واپس آ رہے تھے

تو ایک جگہ چند بدوی آپؐ سے مانگتے مانگتے لپٹ پڑے، یہاں تک کہ آپ کو ایک ببول کے درخت تک دھکیلتے ہوئے لے گئے۔ اور اس کش مکش میں آپ کی چادر اُس کے کانٹوں میں اُلجھ گئی۔ آپ نے وہاں رُک کر ان سے فرمایا کہ میری چادر تو مجھے دے دو۔ اگر میرے پاس جنگل کے ان درختوں کے برابر بھی اُونٹ ہوتے تو میں سب تم میں بانٹ دیتا۔ اور تم مجھے نہ تو بخیل پاتے اور نہ جھوٹا اور نہ ڈرپوک (کہ خواہ نخواہ کسی چیز کے دینے میں دریغ کروں یا ایفائے وعدہ نہ کروں یا فقر و فاقہ سے ڈر کر کچھ اپنے لیے بچا رکھوں)

(بخاری ص ۳۹۶)

ابو سعید الخدریؓ کہتے ہیں کہ" ایک دفعہ انصار میں کچھ لوگوں نے آپ سے کچھ مانگا۔ آپ نے اُن کو دے دیا۔ اُنھوں نے اور مانگا، آپ نے اُن کو اور دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ تھا سب دے ڈالا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ" میرے پاس جو کچھ مال آتا ہے میں اُسے تم لوگوں سے بچا کر جمع نہیں کر رکھتا اور بلا شبہ جو شخص اللہ سے یہ مانگتا ہے کہ وہ اسے سوال کی ذلت سے بچائے۔ اللہ اسے اس سے بچا لیتا ہے۔ اور جو استغنا چاہتا ہے، اللہ اسے غنی کر دیتا ہے۔ اور جو شخص صبر اختیار کرتا ہے اللہ اسے صابر بنا دیتا ہے۔ اور کسی شخص کو عطایائے الٰہی میں سے کوئی عطیہ صبر سے زیادہ اچھا نہیں دیا گیا۔ (بخاری ص ۱۹۸) یعنی صبر خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

ایسے ہی حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ" میں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کیا۔ آپ نے مجھے دیا۔ پھر میں نے اور مانگا، آپ نے اور دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: "یا حکیم! بے شک یہ مال پاکیزہ اور پسندیدہ ہے۔ جو کوئی اسے بلا حرص ضرورت کے لیے لیتا ہے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور جو کوئی اسے لالچ سے لیتا ہے۔ تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ اور بے شک دست بلند (دینے والا) دست پست (لینے والے) سے بہتر ہے۔" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! بخدا میں آپ کے سوا مرتے دم تک کسی سے کچھ نہ مانگوں گا۔" چنانچہ روایت ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے عہدِ خلافت میں حکیم کو کچھ دینا چاہا۔ مگر اُنھوں نے قبول نہ کیا اور برابر اپنے قول پر ثابت قدم رہے۔ (بخاری ص ۳۸۴)

آپ کے جُود و عطا کے ایسے واقعات جتنے چاہیں جمع کیے جا سکتے ہیں کیونکہ آپ کے ابرِ کرم کی گہر باری کسی موسم اور موقع کی منتظر نہیں رہتی تھی بلکہ وہ فیاضِ ازل کی بخشش کی ایک مثال تھی کہ ہمیشہ ہر حال میں جاری رہتی تھی۔ چنانچہ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمایا کہ" اگر میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا ہو تب بھی مجھے خوشی اسی وقت ہو کہ میں تین دن گزرنے سے پہلے ہی وہ سب بانٹ دُوں اور میرے پاس سوائے اس کے جو میں ادائے قرض کے لیے اٹھا رکھوں اور کچھ باقی نہ رہے۔" (بخاری ص ۳۲۱)

یہ محض آپ کی تمنا ہی نہ تھی بلکہ خدا نے اسے کئی بار کر دکھایا اور جو کچھ آپ کی زبانِ صدق بیان سے نکلا تھا وہ بارہا عملاً پُورا ہو گیا۔ آپ کے پاس بڑی بڑی رقمیں آئیں مگر جب آپ وہاں سے اُٹھے تو خالی ہاتھ اُٹھے۔ چنانچہ عامل بحرین نے

آپ کی خدمت میں ایک لاکھ دس ہزار درہم بھیجے۔ آپ نے شام ہوتے ہوتے وہ سب دے دیے۔ ایک مرتبہ آپ کے پاس نوّے ہزار درہم آئے، آپ نے ان کو چٹائی پر رکھ دیا اور جو سائل آیا اسے دیتے گئے یہاں تک کہ وہ سب تقسیم ہو گئے۔ (شفا، ص ۵۰)

آپ کی بے انتہا سیرچشمی اور فیاضی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بعض وقت جب آپ کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا اور کوئی حاجت مند آجاتا تھا تو آپ قرض تک لے کر اس کی حاجت روائی میں تامل نہ ہوتا تھا اور بالعموم آپ پر اسی قسم کے قرض تھے ورنہ آپ اپنی ذاتی ضرورتوں کو قرض لے کر پورا کرنے سے بالکل بے نیاز تھے۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا، اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر جاؤ تم میری ذمہ داری پر چیزیں خرید و۔ جب ہمارے پاس کچھ آئے گا تو ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ "یا رسولؐ اللہ! اللہ نے آپ کو ان باتوں کی تکلیف نہیں دی جو آپ کی استطاعت سے باہر ہیں۔" آپ کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح دوسروں کے لیے خود قرض کا بار اٹھانا اور پھر قرض خواہوں کی باتیں سننا کیا ضرور ہے۔ جو کچھ آپ کے پاس ہوتا ہے وہ تو آپ دے ہی دیتے ہیں پھر ایسا کیوں کیا جائے۔ آپ کو اُن کی یہ بات کچھ ناپسند ہوئی۔ کیونکہ آپ کی بندہ نوازی کسی کی دل شکنی کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ مگر آپ ساکت رہے کہ وہیں سے انصار میں سے کسی نے کہا "یا رسولؐ اللہ! آپ تو دیجئے اور اللہ سے افلاس کا خوف نہ کیجئے۔" آپ یہ توکل اور کشادہ دلی کی بات سن کر مسکرانے لگے اور آپ کی بشاشت بشرے سے ظاہر ہو گئی۔ (شفا، ص ۵۰)

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیے کہ آپؐ کا یہ جود بیجا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اوّل تو علی العموم تمام مسلمان تھے ہی غریب اور نادار کیونکہ مہاجرین کا تو تمام سامانِ معیشت مکہ ہی میں رہ گیا تھا اور وہ بمشکل جان بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔ رہے انصار، تو وہ بھی کچھ زیادہ متمول نہ تھے، کیونکہ جہاں یہودیوں کی سی سود خوار تجارت پیشہ قوم ہو گی وہاں کوئی اور قوم کیا دولت مند ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا اول تو عرب کی حمیت اور شرافت۔ اُس پر آپ کی صحبت روح پرور کی برکت اور سعادت وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا جو بلا وجہ اور بے ضرورت زمرۂ سائلین میں شامل ہونے کا عار گوارا کرتا۔ یہ بھی تھا کہ وہاں آپس میں ایک دوسرے کی حالت تو مخفی تھی ہی نہیں اس لیے آپ کے پاس ضرورت مند ہی آتے تھے اور آپ ان کی بے دریغ اعانت و دستگیری فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ،

اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّخَازِنٌ وَّ اللّٰہُ یُعْطِی۔ — بیشک میں تو خزانچی اور بانٹنے والا ہوں اور اللہ ہی دیتا ہے۔ (بخاری)

آپ تو کبھی اپنے جود و عطا پر تشکر و امتنان کے متوقع ہوتے ہی نہ تھے۔ لیکن چونکہ بہر حال سوال تو مکروہ ہے ہی، اور سائل کو خواہ نخواہ گردن جھکانی ہی پڑتی ہے اور بالخصوص غیور شخص کو تو اس سے بہت ہی شرم آتی ہے۔ اس لیے بسا اوقات آپ کی طبع کریم اپنے جود کی کوئی ایسی صورت نکال لیتی تھی جس میں احسان کا بار بظاہر کچھ ہلکا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ اکثر ایسا کیا کرتے تھے کہ کسی سے کوئی چیز خرید فرما لی اور پھر وہی چیز اسے ہدیۃً دے دی۔ یہ محض آپ کا حسنِ عطا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس سے فی الواقع احسان میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔

جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ "میں ایک غزوے میں آپ کے ساتھ تھا میرا اونٹ تھک کر پیچھے رہ گیا، اتنے میں آپ آ گئے۔ آپ نے پُوچھا کہ "کیوں جابر! کیا حال ہے؟" میں نے عرض کیا کہ "میرا اونٹ تھک گیا ہے۔" آپؐ نے میرے اونٹ کے ایک تسمہ مارا تو وہ خوب تیز چلنے لگا۔ پھر ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے۔ پھر آپ نے مجھ سے پُوچھا کہ "کیا تم یہ اونٹ بیچتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں"۔ آپ نے مجھ سے وہ خرید لیا۔ پھر آپ آگے تشریف لے آئے اور میں ذرا دن چڑھے پہنچا۔ میں نے اُونٹ مسجد کے دروازہ پر باندھ دیا۔ آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ "تم اب آئے ہو۔" میں نے عرض کیا کہ "ہاں یا رسول اللہ!" آپ نے فرمایا کہ "اُونٹ کو چھوڑ دو اور مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھو۔" جب میں نماز سے فارغ ہوا تو آپ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ "اونٹ کی قیمت ادا کر دیں۔" میں قیمت لے کر چلا تو آپ نے مجھے پھر بلایا، میں ڈرا کہ میرا اونٹ واپس کر دیا جائے گا۔ اور وہ مجھے نہایت ناپسند تھا۔ مگر میں آیا تو آپ نے فرمایا کہ اونٹ بھی لے جاؤ اور اس کی قیمت تمھاری ہو چکی اسے بھی رہنے دو۔" (بخاری ص ۲۸۳)

ایسا ہی واقعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے ساتھ پیش آیا۔ ابنِ عمرؓ کہتے ہیں کہ "ہم ایک سفر میں ہمرکاب تھے اور میں حضرت عمرؓ کے ایک نوجوان اونٹ پر سوار تھا۔ وہ مجھ سے رُکتا نہیں تھا۔ اور سب کے آگے ہو ہو جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ مجھے ڈانٹتے تھے اور بار بار پیچھے ہٹا دیتے تھے مگر اُونٹ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آپ نے دیکھا تو حضرت عمرؓ سے فرمایا: "یا عمر! تم اسے بیچتے ہو؟" اُنھوں نے کہا: "یا رسول اللہ! یہ آپ ہی کا ہے۔" آپ نے فرمایا: "نہیں تم میرے ہاتھ بیچ دو۔" حضرت عمر نے اسے بیچ دیا۔ آپ نے وہ وہیں مجھے دے دیا اور فرمایا کہ "یا عبداللہ! یہ اونٹ تمھارا ہے۔ اب جو تمھارا جی چاہے کرو۔" (بخاری)

سبحان اللہ! بخشش کا کتنا پاکیزہ اسلوب ہے۔ اس حسن عطا سے عطیہ کی قیمت کم ہونے کے بجائے صدچند بڑھ جاتی ہے۔ یہ ہے سچی سخاوت، ورنہ ع

در تلاشِ نام سیم و زر فشاندن جود نیست

آپ کی انتہائے سخاوت کی مثال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ "جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم مرض موت میں مبتلا تھے تو آپ کے پاس کچھ دینار آئے، آپ نے سب اسی وقت تقسیم فرما دیے صرف چھ باقی رہ گئے آپ نے بعض امہات المومنین کو دے دیے۔ مگر آپ کو نیند نہ آئی۔ یہاں تک کہ آپ نے پُوچھا کہ میں نے وہ چھ دینار کیا کیے۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ نے فلاں فلاں ازواج مطہرات کو دے دیے۔ آپ نے فوراً وہ دینار ان کے پاس سے منگوا کر تقسیم کر دیے۔ اس کے بعد آپؐ نے بہ اطمینان استراحت فرمائی۔ (طبقات ابنِ سعد جزء ثانی قسم ثانی)

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ عام مسلمانوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ عام طور پر کوئی شخص ایسے توکل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کی خصوصیت تھی اسی لیے کلام پاک میں صریح طور پر یہ حکم فرما دیا گیا ہے کہ:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ — نہ اپنے ہاتھ کو بالکل اپنی گردن سے باندھ لے

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ؕ (بنی اسرائیل ع ۲) نہ بالکل پھیلا دے کہ پھر حسرت زدہ ہو کر بیٹھے اور لوگ تجھے بُرا کہیں اور ملامت کریں۔

ایثار اور حُسنِ سلوک

ایثار بھی سخاوت کی ایک صورت ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سخاوت کے مفہوم میں عموماً کسی کو کچھ دینا پایا جاتا ہے، اور ایثار کے لیے اس کی ضرورت نہیں بلکہ جہاں کہیں آدمی کسی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دے اور اس کے حق کو اپنے نفس پر مقدم سمجھے، وہیں ایثار ہوگا۔ اگرچہ عملاً اس نے کسی کو کچھ بھی نہ دیا ہو۔ مثلاً ایک خواستگار ملازمت یہ دیکھ کر اپنی درخواست واپس لے لیتا ہے کہ ایک اور امیدوار اس سے زیادہ اس خدمت کا اہل اور حاجت مند ہے تو بلا شبہ یہ اس کا ایثار ہوگا۔ گو یہ فعل سخاوت کی ضمن میں نہیں آتا۔ ایثار کو سخاوت پر اس وجہ سے ایک گونہ فضیلت حاصل ہے کہ سخاوت میں اس بات کا امکان ہے کہ معطی کی ذات پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے لیکن ایثار تب ہی ہو سکتا ہے، جبکہ اپنے جائز حقوق اور بجا خواہشات کو دبا کر ان سے غیروں کو مستفید کیا جائے۔

جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی زندگی کا اصل اصول ہی ایثار تھا۔ کیونکہ آپ کا سب سے بڑا کام یعنی دعوئ نبوت تھا ہی اس بات کا متلزم کہ آپ اپنے تمام اسبابِ آسائش اور سامانِ راحت سے دست بردار ہو کر ہر قسم کی دنیوی مصلحتوں اور ظاہری منفعتوں کو اپنی قوم اور ملک اور نوع کی دائمی اصلاح اور ابدی بہبودی پر نثار کر دیں یہاں تک کہ جب آپ کو وعظ و نصیحت سے باز رکھنے کے لیے اہلِ قریش نے دولت و حشمت کی لالچ دینی چاہی تو آپ نے اس سے قطعاً انکار کر دیا اور اپنی نوع کی بہتری کے لیے اپنی ذات پر دُنیا بھر کی تکلیفیں گوارا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ایثار ہو سکتا ہے!

لیکن اس ایک عام مثال کے علاوہ بھی آپؐ کے ایثار کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ چنانچہ سہیل سے روایت ہے کہ ایک عورت جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے پاس ایک بُنی ہوئی چادر لائی۔ جس کی خوب صورت کو رتھی۔ اس نے کہا کہ "میں نے اسے اپنے ہاتھ سے بُنا ہے، اور میں اسے خود لے کر آئی ہُوں تا کہ آپؐ کو پہناؤں" آپ کو اس وقت چادر کی ضرورت بھی تھی اور یُوں بھی آپ کبھی حقیر سے حقیر ہدیہ بھی رد نہ کرتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے وہ چادر لے لی اور آپ اسی کو تہبند کے طور پر باندھ کر باہر تشریف لائے۔ ایک شخص نے اس کی بہت تعریف کی اور آپ سے وہ چادر مانگی۔ آپ نے فوراً اُس کے حوالے کر دی۔ اور لوگوں نے اس پر اسے بہت طعن کیا اور کہا کہ "تُو نے بہت بُرا کیا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے آپ نے اسے زیبِ تن فرمایا تھا تُو نے اسے مانگ لیا حالانکہ تُو جانتا تھا کہ آپ کبھی انکار نہیں فرماتے۔" اس نے کہا کہ "خدا گواہ ہے کہ میں نے پہننے کے لیے نہیں مانگی بلکہ اس لیے لی ہے کہ یہ میرا کفن ہو۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (بخاری ص ۱۷۰)

ابُو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں بُھوکا ہوں" آپ نے اپنے اہلبیت کے ہاں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ کسی کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر آپ نے کہا کہ "کیا کوئی ہے جو اس شخص کو آج کی رات مہمان رکھے اور اللہ کی رحمت کا مستحق ہو۔" یہ سُن کر انصار میں سے ایک شخص اٹھا اور اُس نے کہا "یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں" چنانچہ وہ اُس کو ساتھ لے کر اپنے گھر گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہمان بھیجا ہے تو تُو کچھ اٹھا نہ رکھ اور جو کچھ ہو اس کے لیے لے آ۔" اس نے کہا "خدا جانتا ہے کہ میرے پاس تو بچّوں کے شام کے کھانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے کہا "کچھ مضائقہ نہیں، بچّے کھانا مانگیں تو انھیں تھپک تھپک کر سُلا دینا۔ آ چل چراغ گُل کر دیں اور آج رات خالی پیٹ ہی سو رہیں۔" چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن جب وہ شخص خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے خوشنودیِ خداوندی کی خوش خبری سنائی اور اس پر آیت شریف نازل ہوئی: (بخاری ص ۲۵۷)

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ	اور وہ لوگ مہاجرین کو اپنے نفس سے مقدم رکھتے ہیں
خَصَاصَةٌ (حشر، ع ۱)	خواہ خود ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ اکبر! تعجب ہوتا ہے کہ چند روزہ صحبت بابرکت نبوی نے بادیہ نشینانِ عرب کی طبائع کو کس قدر ایثار و احسان کا ذوق شناس بنا دیا تھا کہ ان کو اپنا اور اپنے لختِ جگر نورِ نظر بچّوں کا بُھوکا رکھنا ایک مہمان کی خاطر شکنی سے بہت زیادہ خوش گوار تھا کیا دنیا کی تاریخ اس کی کوئی نظیر دکھا سکتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے بچپن میں سرفلپ سڈنی کا قصہ پڑھا تھا جس میں بڑی شدومد سے اس کی اس مروّت اور انسانیت کی تعریف کی گئی ہے کہ اس نے زٹفن کے میدان میں زخمی ہو کر پانی مانگا جب پانی آیا تو اُسی وقت ایک تشنہ لب سپاہی نے پانی دیکھ کر اُس کی آرزو کی، سرفلپ سڈنی نے خود پانی نہیں پیا اور وہ پیالہ اس زخمی کو دے دیا۔ کچھ شک نہیں کہ یہ ایثار نہایت قابلِ تعریف اور مستحقِ ستائش ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں جنگِ یرموک کا یہ واقعہ بھی دادطلب ہے۔

حذیفہ کہتے ہیں کہ جنگِ یرموک میں میرے چچازاد بھائی زخمی ہو کر گرے تو تھوڑا سا پانی لے کر ان کو تلاش کرنے چلا تاکہ ان کو پلا دُوں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کو پایا اُن کی آخری حالت دیکھی، میں نے اشارے سے دریافت کیا کہ "پانی پلاؤں؟" انھوں نے کہا "ہاں"۔ میں پلانے ہی کو تھا کہ قریب سے آہ کی آواز آئی۔ میرے بھائی نے اشارہ سے کہا کہ "پہلے انھیں پلاؤ"۔ میں ادھر گیا تو دیکھا کہ ہشام بن العاص مجروح پڑے ہیں۔ میں نے چاہا کہ ان کو پانی پلاؤں۔ اتنے میں ایک اور طرف سے آہ کی آواز آئی۔ ہشام نے اشارے سے کہا کہ "پہلے انھیں پلاؤ"۔ میں وہاں گیا تو وہ اب تک جاں بحق ہو چکے تھے۔ لوٹ کر ہشام کے پاس آیا تو وہ بھی انتقال فرما چکے تھے۔ پھر اپنے بھائی کے پاس آیا تو ان کی رُوح بھی پرواز کر چکی تھی۔ (منقول از کلید القرآن ص ۶۴ ماخذ حمایت الاسلام)

دونوں واقعے بالکل ایک ہی قسم کے ایثار کی مثال ہیں۔ مگر ان میں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ ایک واقعہ ایک قوم کے

ایک بہترین فرد کا واقعہ ہے جس پر اس کی قوم کو آج تک ناز اور بجا ناز ہے۔ دوسرا واقعہ ایک ہی وقت میں ایک مختصر سی جماعت کے تین شخصوں میں اسی قسم کے کامل ایثار کا ثبوت دیتا ہے۔ اور پھر بھی وہ واقعہ کچھ غیر معمولی طور پر مشہور اور زبان زد نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت میں ایسے واقعات نادر الوقوع اور شاذ نہ تھے بلکہ یہ خصائل اس پوری قوم میں نسبتاً عام تھے۔ ورنہ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس موقع پر صرف وہی لوگ تشنہ کام ہو کر پانی کے لیے کراہتے جن میں اتنا اعلیٰ درجے کا ایثار موجود تھا، نہیں، حقیقت میں بات یہ تھی کہ اس وقت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن مثال نے تمام اہلِ اسلام کے دلوں میں وہ صفاتِ حمیدہ پیدا کر دی تھیں کہ ایثار اُن کا شعار بن گیا تھا اور اُن میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر سر فلپ سڈنی سے کم نہ تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ اس وقت ان کے ایسے کارنامے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر نہیں سمجھے جاتے تھے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحابی کے پاس کہیں سے بُھنی ہوئی سِری آئی۔ اُنھوں نے کہا کہ فلاں دوست بہت محتاج ہے اور وہی اس کا زیادہ مستحق ہے۔ چنانچہ وہ سری اس کے پاس بھیج دی۔ انھوں نے بھی یہی خیال کیا کہ فلاں دوست زیادہ محتاج ہے اور سری ان کے پاس بھیج دی۔ تیسرے شخص نے بھی یہی خیال کیا۔ غرض یہ سری کئی جگہ پھر پھرا کر پھر اسی پہلے شخص کے پاس آ گئی۔ (الحقوق والفرائض)

یہ حالات سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ مگر جب ہم اس عملی تعلیم کو دیکھیں جس پر یہ مبنی تھے، تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔ اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اُسوۂ حسنۂ نبویؐ کے اتباع کا نتیجہ ہونا ہی یہی چاہیے تھا۔ اور جہاں کہیں یہ نتیجہ پیدا نہ ہو وہاں یقین کر لینا چاہیے کہ اتباعِ سنّت کا فقط نام ہی نام ہے ورنہ فی الواقع جناب رسالتمآب صلّی اللہ علیہ وسلم کی تقلید نہیں کی جاتی۔ آپ کے تو ایثار و احسان کی یہ حالت تھی کہ نہایت ہی خفیف اور جزئی باتوں میں بھی اس کا خیال رکھتے تھے اور اوروں کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید فرماتے تھے۔

اس حسن مراعات کو ملاحظہ فرمایئے کہ ایک بار آپ کہیں جنگل میں تشریف لیے جاتے تھے ایک صاحب اور بھی آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ایک جگہ کھود کر دو مسواکیں نکالیں، ایک سیدھی تھی اور ایک ٹیڑھی۔ آپؐ نے ٹیڑھی خود لی اور سیدھی اس شخص کو دے دی۔ اس نے عرض بھی کیا کہ سیدھی آپ رہنے دیں۔ مگر آپ نے نہیں لی اور فرمایا کہ "جو شخص کسی کی صحبت میں رہتا ہے، تو خواہ گھڑی بھر ہی کیوں نہ ہو، قیامت کے دن اس سے پُوچھا جائے گا کہ حقِ صحبت بجا لایا یا نہیں۔" (الحقوق والفرائض)

ظاہر ہے کہ جہاں اتنی اتنی باتوں کا لحاظ رکھا جائے وہاں جتنا اعلیٰ درجہ کا ایثار پایا جائے کم ہے۔ لیکن قابلِ دید یہ بات ہے کہ اس لحاظ سے ان لوگوں کی کیا حالت ہے جو اتباعِ سنّت کے دعویدار ہیں۔

محبت و شفقت

دنیا میں حُسنِ معاشرت کے قیام اور نظامِ تمدّن کی بقا کا مدار سب سے زیادہ محبت پر ہے، بعینہٖ جس طرح تمام اجرام آسمانی کششِ ثقل کے پھندے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ویسے ہی افراد انسانی بھی محبت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور خواہ

مسئلہ ارتقاء ان کو معرکۂ ہستی میں باہم کتنا ہی مخالف اور بر سرِ پیکار کیوں نہ بنائے۔ اور اصولِ افادہ ان کو آپس کے تعلقات میں کیسا ہی خود غرض اور نفس پرست کیوں نہ بتائے۔ اس سے کوئی تنگ خیال سے تنگ خیال فلسفی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کا لطف اور زندگی کا مزہ محبت ہی سے ہے۔ اور یہ محبت بھی خواہ خود غرضی ہی کی ایک خوشنما صورت کیوں نہ ہو تاہم یہ نہ ہو تو جینا وبال ہو جائے اور اس عالمِ رنج ومحن میں حیاتِ مستعار کے چند دن کاٹنے بھی دُوبھر ہو جائیں کیونکہ محبت ہی کی چاشنی ہے جو یہاں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی تلخی کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ اور اس پر مزہ یہ ہے کہ اصول افادہ خواہ کچھ بھی کہے۔ لیکن یہ بہر حال مسلم ہے کہ محبت جس قدر شائبہ غرض سے پاک ہو اتنی ہی زیادہ قابلِ تعریف ہے کیونکہ وہ جتنی بے غرضانہ ہو گی اُسی قدر اُس کا دائرہ اثر بھی زیادہ وسیع ہو گا اور اُسی قدر اس کے احباب واصحاب بھی کثیر التعداد ہوں گے۔ مگر یہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کچھ آسان نہیں ہے۔ انسان فی الواقع اپنے ذاتی فائدوں اور نفسانی خواہشوں کے جال میں ایسا پابند ہوتا ہے کہ اس کی محبت کو خود غرضی پر محمول کرنا کچھ بیجا اور خلافِ قیاس نہیں ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ اول تو اہل وعیال ہی کی محبت جو بالکل فطری اور طبعی سمجھی جاتی ہے وہ بھی غرضوں سے ملوّث ہوتی ہے اور گھر کی چار دیواری سے نکل کر تو دنیا میں بہت ہی کم ایسے تعلقات پائے جاتے ہیں جو محبت کے پاک نام کے مستحق ہوں اور ان سے بھی زیادہ کمیاب وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر ان تعلقات کا اثر ہو۔ یُوں کہنے کو اپنی قوم کے دوست اور اپنے ملک کے بہی خواہ اور اپنی نوع کے ہمدرد بہت سے ہوں گے مگر ان کے ان مخلصانہ دعووں کی بقا جب ہی تک ہے جب تک ان کی محبوب قوم اور ان کا پیارا وطن ان عاشقانِ معشوق خو کی ناز برداری کیے جاتا ہے۔ لیکن اگر کہیں اتفاق سے اُن کے اعزاز واحترام میں کچھ فرق آئے یا کوئی بات ان کے خلافِ مزاج ہو تو پھر ان کے تمام قومی ایثار ومحبت کے جذبات ہوا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اس بے غرضانہ محبت پاشی کے لیے کوئی اور تشنہ لب ڈھونڈھ لیتے ہیں۔

بہر کیف ہم کو کسی سے کیا سروکار، ہم کو تو صرف یہ دکھانا تھا کہ محبت جس قدر زیادہ عام اور بے غرضانہ ہو، اتنی ہی زیادہ محمود۔ لیکن ساتھ ہی اسی قدر زیادہ مشکل اور نادر الوجود بھی ہوتی ہے اور ایسی محبت صرف ان ہی نفوسِ زکیہ میں پائی جاتی ہے جن کو محبوبِ حقیقی نے اصلاح وارشادِ خلق کے لیے مامور فرمایا ہے اور ان میں بھی اس کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلٰوۃ والتحیات رحمۃ للعالمین ہیں۔ یعنی آپ کی سچی محبت اور خالص شفقت کا دائرہ قبیلے اور شہر اور قوم اور ملک ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ تمام دُنیا پر حاوی اور محیط ہو گیا۔ لیکن یہ محض عقیدہ ہی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی حیاتِ بابرکات کا ہر ایک واقعہ اس کا شاہد ہے۔ جو تکلیفیں آپ کو ابنائے وطن کے ہاتھوں پہنچیں، ان کے چند مختصر واقعات ہم آپ کے صبر وثبات کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں اور یہاں اُن کو دُہرانے کی حاجت نہیں۔ البتہ یہاں ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہم یہ پُوچھتے ہیں (اور مخاطب وہ لوگ ہیں جو ہمارے ہم عقیدہ نہیں) کہ آخر آپ کو اس قدر حوصلہ فرسا قوتِ برداشت کے اظہار کی ضرورت ہی کیا تھی! اہلِ مکہ آپ سے چاہتے ہی کیا تھے، یہی نا کہ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور شرک وبُت پرستی سے نہ روکیں۔ تو پھر آپ نے ایسا ہی کیوں نہ کیا! مانا کہ آپ جو کچھ فرماتے تھے سچ فرماتے تھے اور انھیں کے فائدے کے لیے فرماتے تھے۔ لیکن جب وہ لوگ خود ہی اُسے سننا نہ چاہتے تھے تو آپ کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ ان کے لیے اپنے آپ کو اس

بلا میں ڈالتے اور پریشان ہوتے۔ مخالف کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تمام جد و جُہد صرف دولت و ثروت اور شوکت و حکومت حاصل کرنے کے لیے تھی۔ مگر یہ ان کی نادانی یا کور باطنی ہے۔ یہ سب چیزیں تو شیوخِ مکّہ خود ہی آپ کی خدمت میں پیش کرتے تھے، اور عالم بیکسی میں آپ کو یہ کیونکر یقین ہو سکتا تھا کہ خدا آپ کو بعد میں اس سے زیادہ دولت و حکومت عطا کرے گا۔ اگر ان کی تمام تگ و دو کی غایت و غرض یہی ہوتی تو اس وقت کی تنگ دستی و ناداری میں تو اہلِ مکّہ کی پیش کردہ دولت و حکومت ہی آپ کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی اور آپ کو وہی غنیمت سمجھنی چاہیے تھی اس سے قطع نظر کیجئے اور یہ دیکھیے کہ آپ نے ان باتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان سے ذاتی کیا فائدہ اٹھایا۔ آپ کی سادہ زندگی کے واقعات ہم سن ہی چکے۔ آپ کے ایثار اور سخاوت کے حالات ہم نے دیکھ ہی لیے تو کیا آپ کو دولتِ دنیا کی ہوس اس لیے تھی کہ آپ بے چھنے جَو کی روٹی کھائیں۔ اپنی جُوتیاں اپنے ہاتھوں سے سیئیں۔ آپ کے اہل بیت نے خود چکّیاں پیسیں۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ آپ نے ہمیشہ کے لیے اپنی اولاد پر زکوٰۃ اور صدقات کو بھی حرام فرما دیا حالانکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ جس دولت کے حاصل کرنے میں آپ نے اتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں اوّل تو خود ہی اس سے فائدہ اٹھاتے اور خیر اگر خود کسی وجہ سے اسے استعمال نہ کیا تھا تو کم از کم اپنی اولاد کو تو اس سے مستفید ہونے دیتے۔ مگر صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور ہم جس پہلو سے چاہیں غور کریں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام افعال آلائش، ریا اور آمیزشِ غرض سے بالکل پاک اور مبرا ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ حقیقت میں جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے نسبت ایسی بدگمانی ہی غلط اور مہمل ہے کیونکہ آپ کی سعی و کوشش کی وجہ ہی تھی تعظیم لامر اللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ یہ آپ کی بالکل سچی اور بے غرضانہ محبت ہی تھی جو آپ کو اتنی مخالفتوں اور ایسی مصیبتوں کے باوجود بھی اصلاح بین الناس سے دست کش نہیں ہونے دیتی تھی اور آپ ان لوگوں کی اس قدر ایذا اور آزار رسانی پر بھی ان کو صداقت کی طرف بلانے اور حقیقت کا رستہ دکھانے سے باز نہیں رہ سکتے تھے بعینہٖ جس طرح ماں باپ اپنے بچّوں کی نافرمان برداری اور رنج دہی پر صبر کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کی بھلائی اور بہتری میں کوشاں رہتے ہیں لیکن ماں باپ کی محبت کی ایک انتہا ہوتی ہے اور جب عقوق حدِ برداشت سے گزر جاتا ہے تو وہ بھی اس سے کنارہ کر جاتے ہیں۔ مگر آپ کی محبت و شفقت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ لوگ جس قدر آپ سے سرکشی کرتے تھے آپ اتنی ہی ان کے ساتھ اور رعایت فرماتے تھے۔ وہ جس قدر آپ کو تکلیف دیتے تھے آپ اتنی ہی ان سے اور مہربانی کرتے تھے۔ غرض جس طرح ان کی عداوت اور دشمنی بے پایاں تھی ویسے ہی آپ کی شفقت اور محبت غیر محدود تھی۔ اور بلاشبہ آپ اس وعدۂ صادق کی مجسم تصدیق تھے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ط   اور ہم نے تجھے تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

لیکن اس کے لیے سید طاہر اور طیب دل کی ضرورت ہے اس کا کچھ اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس نے خود کبھی اپنی محبت کو بے غرض اور مخلص بنانے کی کوشش کی ہے ورنہ عام طور پر انسانی طبیعت اس کی مشکلات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔

ظاہر ہے کہ جو شخص دشمنوں تک کا دوست ہوگا وہ دوستوں سے کیسی کچھ محبت نہ کرتا ہوگا۔ آپ بھی اپنے اصحاب و

احباب پر بے انتہا شفیق اور مہربان تھے۔ چنانچہ اس کی مثالیں ہم آپ کے حُسنِ سلوک، ایثار، رحم، صبر وغیرہ مختلف اخلاقِ حسنہ کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں۔ اور آئندہ اور ابواب میں بھی دیکھیں گے۔ بات یہ ہے کہ محبت کا اثر کسی خاص فعل میں محدود نہیں ہوتا بلکہ جہاں محبت ہو وہاں اس کا رنگ ہر ایک بات میں نمایاں ہوتا ہے کیونکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تعلقاتِ انسانی میں تمام صفاتِ حسنہ محبت ہی کی پیدا کردہ ہیں البتہ یہ ضروری بات ہے کہ ہر ایک کی محبت کے اظہار کی جداگانہ صورت ہوتی ہے۔ مثلاً دولت مند کی محبت سخاوت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم کی محبت انصاف اور حلم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ طبیب اپنے محبوب مریض کو مفید سے مفید اور خوش ذائقہ سے خوش ذائقہ دوا پلاتا ہے۔ پیر اپنے پیارے مرید کو سب سے جلدی منازلِ سلوک طے کرانا چاہتا ہے۔ غرض ہر ایک کا الگ الگ رنگ ہوتا ہے۔ لیکن کامل ترین محبت وہی ہے جو ہر تعلق میں ہویدا اور ہر شان میں نمایاں ہو۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا شفقت اور غیر محدود محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنی اُمتِ مرحومہ پر عبادات کا بار بھی حتی الامکان بہت ہی کم ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپؐ خود اسی خیال سے نوافل پر مداومت نہیں فرماتے تھے کہ کہیں لوگ ان عبادتوں کو اپنے اوپر لازم نہ کرلیں۔ اور یُوں تکلیف مالا یطاق میں نہ پڑ جائیں۔

عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "ایک روز آپ میرے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ" میں نے سُنا ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو اور دن کو روزہ رکھتے ہو۔" میں نے کہا "جی ہاں"۔ آپ نے فرمایا" جاگو بھی اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور ناغہ بھی کرو۔ کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، اور تمہاری آنکھوں کا بھی، تمہارے دوستوں اور بھائیوں کا بھی حق ہے اور گھر والوں کا بھی۔" (بخاری ص ۱۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ایک روز میرے پاس بنی اسد کی ایک عورت بیٹھی تھی کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ نے پُوچھا کہ "یہ کون ہے؟" میں نے کہا کہ" فلاں ہے، اور یہ رات بھر نماز پڑھتی ہے، سوتی نہیں۔" آپ نے فرمایا: "یہ چھوڑ دو تم کو وہی کام کرنے چاہئیں جن کی تم طاقت رکھتی ہو۔ کیونکہ بیشک اللہ نہیں تھکتا جب تک تم نہ ملول ہو جاؤ۔" (بخاری ص ۱۵۴)

ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ "ایک شخص خدمت بابرکت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ" میں صبح کی نماز باجماعت فلاں شخص کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا کیونکہ وہ بڑی لمبی نماز پڑھتا ہے۔" یہ سُن کر آپ اتنے ناراض ہوئے کہ میں نے کبھی آپ کو اتنا خفا نہیں دیکھا اور آپ نے نصیحتاً کہا کہ اے لوگو! تم لوگوں کو دین سے نفرت دلاتے ہو۔ جب تم نماز پڑھاؤ تو اُسے مختصر کرو۔ کیونکہ ان میں بیمار اور بُوڑھے اور حاجتمند بھی ہوتے ہیں۔" (بخاری ص ۹۰۲) یعنی ان کو تمہاری لمبی نماز سے تکلیف ہوگی اور یُوں وہ عبادت سے ملول ہو جائیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نیکی برباد، گناہ لازم۔

سعد ابن وقاصؓ کہتے ہیں کہ "میں مکہ میں بیمار ہو گیا اور میری حالت نازک ہو گئی مگر میرا اس شہر میں مرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جہاں سے میں ہجرت کر چکا تھا۔ آپ میری عیادت کے لیے تشریف لائے، تو میں نے کہا "یا رسول اللہ! میں اپنا تمام مال خیرات کرنا چاہتا ہُوں۔" آپ نے فرمایا: "نہیں"۔ میں نے کہا" اچھا آدھا۔" آپ نے فرمایا" نہیں"۔ میں نے کہا" اچھا تہائی۔"

آپؐ نے فرمایا: "تہائی بھی بہت ہے۔ مگر خیر۔ بیشک یہ بہتر ہے کہ تم اپنے وارثوں کو دولت مند چھوڑو بہ نسبت اس کے کہ تم اُن کو نادار چھوڑو۔" (بخاری ص ۳۸۳)

لیکن آپ کی شفقت مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ اُس سے آپ کے منکر بھی مستفید ہوتے تھے۔ روایت ہے کہ قبیلہ اراش کے ایک شخص نے ابوجہل کے ہاتھ ایک اُونٹ بیچا۔ وہ اُس کی قیمت دینے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ وہ بیچارہ پریشان ہو کر قریش کی مجلس میں آیا اور پکار پکار کر کہنے لگا: "یا معشرِ قریش! میں ایک اجنبی مسافر ہوں اور ابوالحکم ابن ہشام (ابوجہل) نے میرا حق مار لیا ہے، کیا تم میں سے کوئی ایسا انصاف والا ہے کہ میری دادرسی کرے اور اُس سے میرا حق دلائے۔" جنابِ رسالت مآبؐ بھی وہیں ایک طرف تشریف فرما تھے۔ اِن بے دردوں نے اس بیچارے کی فریاد کا تو کچھ خیال نہ کیا۔ البتہ آپ کو چھیڑنے اور آپ سے استہزا کرنے کے لیے اُس سے کہہ دیا کہ "جاؤ اس شخص کے پاس جا کر اس سے کہو وہ تمھارا حق دلا دے گا۔" اس غریب کو آپؐ کی اور ابوجہل کی باہمی مخالفت کا کچھ حال معلوم نہ تھا اُس نے ان کے کہنے کے مطابق آپ سے آکر کہا۔ اس کی غربت اور بیکسی پر آپ کا بحرِ شفقت موجزن ہوا۔ آپ نے اپنے ضعف اور ابوجہل کی جہالت اور عداوت کا کچھ بھی خیال نہ کیا اور فوراً اس کے ساتھ چلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، وہ لوگ تو یہی تماشہ دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک آدمی کو آپ کے پیچھے روانہ کیا کہ وہ سب ماجرا ان سے آکر کہے۔ خیر، آپ نے جا کر ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس نے پوچھا "کون؟" آپؐ نے جواب دیا: "محمد" (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم)۔ وہ نکلا اور آپ کو دیکھ کر اس کا رنگ اُڑ گیا۔ آپؐ نے اس سے کہا "اس آدمی کا حق ادا کرو۔" اس نے کہا "اچھا جو کچھ اس کا آتا ہے وہ میں ادا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اندر جا کر چپ چاپ اُس کا روپیہ لا دیا۔ اور وہ شخص خوش خوش آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوا اور آپ کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ جب اور لوگوں نے یہ واقعہ سُنا تو ان کو اس خلافِ امید کارروائی پر بہت تعجب ہوا۔ مگر ابوجہل اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ اُس سے اور کچھ بن ہی نہ پڑا۔ (سیرت ابنِ ہشام ص ۲۱۱)

مسلم اور غیر مسلم پر ہی کیا منحصر ہے۔ آپ کی شفقت تو جانوروں تک کو حاوی تھی۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص جنگل میں چلا جا رہا تھا، اسے بجد پیاس لگی۔ اتفاق سے اُسے ایک کُنواں ملا تو اس نے اس میں اُتر کر پانی پیا، باہر آیا تو وہیں ایک کُتا بھی پیاسا ہانپتا کانپتا آگیا تھا اور شدتِ تشنگی سے کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس آدمی کے دل میں خیال آیا کہ جیسی تکلیف پیاس سے مجھے تھی ویسی ہی اِسے بھی ہوگی۔ یہ خیال کر کے وُہ پھر اُترا اور اُس نے اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھرا اور اسے دانتوں سے پکڑ کر اُوپر لایا، اور کُتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کی رحم دلی اور ہمدردی کے انعام میں اسے بخش دیا۔" آپؐ کی زبان سے یہ قصہ سُن کر لوگوں نے پُوچھا: "یا رسول اللہ! کیا ہم کو جانوروں پر رحم کرنے کا بھی اجر ملتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "ہاں"۔ (بخاری ص ۸۸۸) ہر ایک ذی حیات پر شفقت و رحم کا صلہ ہے۔

یہ حالت تھی آپؐ کی شفقتِ خلق اللہ کی، حالانکہ جس قوم اور ملک میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ وہ لوگ ایسے سخت دل تھے کہ وہ اپنی اولاد کو جیتے جی زمین میں گاڑ دیتے تھے اور اُن کو ذرا بھی رحم نہیں آتا تھا۔ ع

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

عدل و انصاف

اگر ذرا غور و تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انصاف سچی محبت کی عمومیت اور اعراض نفسانی سے بریت کا نام ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس معاملہ میں قاضی کی کوئی ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہے۔ اور اس کو فریقین سے یکساں تعلق اور یکساں محبت ہے تو اس میں اسے کسی طرح کی زیادتی یا بے انصافی کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اور جب کوئی شخص اپنے سب ابنائے نوع پر یکساں مہربان ہو گا اور اس میں کسی قسم کی نفسانیت اور خودغرضی نہ ہو گی تو اس کے پورے طور پر عادل اور منصف نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلا شبہ ظلم صرف اس حالت میں کیا جا سکتا ہے جبکہ اس سے یا تو ہمارا کوئی ذاتی فائدہ ہو یا جب ہمارا دو آدمیوں میں سے ایک کی طرف زیادہ میلان ہو۔ اور ہم دوسرے کے مقابلہ میں اسے فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں۔ مگر جس طبیعت میں یہ باتیں نہیں اُس میں بے انصافی کا خیال تک آنا محال ہے۔

ہم جناب سرور کائنات رہبر مخلوقات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی بے غرضانہ محبت اور مخلصانہ شفقت کا حال دیکھ چکے۔ اگر وہ واقعات سچے ہیں اور ہمارا استدلال درست ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ آپ نہایت اعلیٰ درجہ کے منصف مزاج اور عدل پرور ہوں۔ اور کبھی کسی پر آپ کے ہاتھ سے کوئی زیادتی نہ ہوئی ہو۔ اگر واقعات سے اس بات کی تصدیق ہو جائے تو اول اس سے ہمارے مذکورہ بالا استدلال کی صحت پائی جائے گی اور دُوسرے آپ کی یہ انصاف پسندی آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی نہایت قوی اور معقول دلیل بن جائے گی۔ آیئے دیکھیں کہ آپ کے حالات حیات اس بارہ میں کیا کہتے ہیں۔

اگرچہ ہم کو آپ کے قبل بعثت کے حالات اس تفصیل و تشریح سے نہیں معلوم جیسا کہ ہمارا جاننے کو جی چاہتا ہے تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ شروع ہی سے آپ کو اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے امتیاز خاص حاصل تھا، یہاں تک کہ آپ ظاہری دولت و ثروت نہ ہونے کے باوجود بھی اکثر اختلافاتِ قریش میں حکم بنائے جاتے تھے۔ اور اسی لیے آپ کا لقب "امین" ہو گیا تھا۔

بعثت کے بعد آپ کی صفاتِ حمیدہ کے اظہار کے مواقع صد چند ہو گئے۔ اور آپ کی منصف مزاجی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہود مدینہ بھی اپنی ذاتی خصومتوں میں آپ ہی سے تصفیہ چاہتے تھے حالانکہ اُن کو آپ کی نبوت سے انکار تھا تب بھی بالاتفاق آپ ہی کا فیصلہ چاہا جاتا تھا اور کبھی کسی کو آپؐ کے انصاف پر شائبہ شبہ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ بھی نہ تھا کہ فقط غیروں ہی میں آپ کا انصاف مسلّم ہو، نہیں آپ کا انصاف اتنا یقینی تھا کہ اگر کبھی مسلمان اور غیر مسلم کا باہم جھگڑا ہو جاتا تھا تب بھی موافق اور مخالف سب ہی آپ کے پاس آتے تھے۔ چنانچہ ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی اور ایک نام کے مسلمان بشر میں جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا "چلو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلیں۔" بشر نے کہا "نہیں، کعب بن الاشرف سردار یہود کے پاس چلیں۔" کیونکہ وہ لوگ رشوت وغیرہ لیتے تھے۔ مگر اس سے یہودی نے انکار کیا اور آخر دونوں آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہودی حق بجانب تھا۔ آپؐ نے اُسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ جب دونوں باہر نکلے تو بشر نے کہا "یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہوا، چلو (حضرت عمرؓ کے پاس چلیں۔" اسے یہ خیال تھا کہ شاید ان کا تعصب مذہبی انصاف پر غالب آ جائے۔ یہودی آپؐ کے

فیصلہ سے قوی دل ہوگیا تھا اس نے مان لیا اور دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ مگر یہودی نے آتے ہی ان کو یہ سُنا دیا کہ معاملہ حضور سرورِ کائناتؐ کے سامنے پیش ہو چکا ہے اور آپؐ نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔ مگر یہ شخص اس پر راضی نہیں ہوا اور اب یہاں آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بشر سے اس کی تصدیق کی۔ اس نے بھی کہا کہ ہاں صورتِ واقعہ یہی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا "تم دونوں ذرا ٹھہرو میں ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور تلوار لا کر منافق بشر کی گردن اُڑا دی اور کہا کہ "جو شخص (مسلمان ہو کر) اللہ اور اُس کے رسول کے فیصلہ کو نہیں مانتا میں اس کا فیصلہ یُوں کرتا ہوں"۔ اس پر اس کے ساتھ کے اور منافقوں نے بہت غل مچایا۔ مگر اللہ نے وحی سے حضرت عمرؓ کے فعل کی تائید فرمائی اور اُسی دن سے اُن کا لقب فاروق ہوگیا۔ (تفسیر خازن۔ النساء، ع ۹)

فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت فاطمہ بنت الاسود چوری کے جُرم میں پکڑی گئی۔ ثبوتِ جُرم کے بعد آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ شرفائے قریش کو یہ عار ناگوار گزرا اور انھوں نے چاہا کہ آپؐ سے سفارش کرا کے اس عورت کو اس سزا سے بچالیں۔ مگر بارگاہِ رسالت میں عرض کرنے کی جرأت کسے تھی۔ آخر اسامہ بن زید کو کہہ سُن کر اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ سے اس کے لیے سفارش کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "یا اسامہ! تم اللہ کی مقرر کردہ سزا میں سفارش کو دخل دیتے ہو"۔ پھر آپ اُٹھے اور آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ "اے لوگو! تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوگئیں کہ جب ان میں کوئی بڑا خاندانی شخص چوری کرتا تھا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے تھے۔ اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے۔ (یعنی ایسی ناانصافیاں ہی اُن کی بربادی کا سبب ہوئیں) خدا گواہ ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چوری کی ہوتی تو یقیناً میں اُس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا"۔ (بخاری ص ۶۱۶)

انصاف کی انتہا تو یہ ہے کہ لوگ ذرا ذراسی بات میں خود آپ پر تشدد اور تقاضا کرتے تھے۔ مگر آپ اپنے حلم اور انصاف کی وجہ سے ہمیشہ ان کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ "جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کا ایک اونٹ قرض تھا ایک دن وہ تقاضا کرتا ہوا آیا اور سخت سست کہنے لگا۔ اس کی ہرزہ گوئی اصحابِ کرام کو بہت ناگوار ہوئی اور انھوں نے اسے روکنا چاہا مگر آپ نے فرمایا کہ "اسے کچھ مت کہو کیونکہ قرض خواہ کو تقاضا کرنے کا حق ہے"۔ پھر آپؐ نے حکم دیا کہ ایک اسی کا سا اونٹ لا کر اُسے دے دیں اتفاق سے ویسا اونٹ موجود نہ تھا، لوگوں نے آکر عرض کیا کہ اس سے بہتر اونٹ موجود ہیں مگر ویسا اونٹ موجود نہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ اس کے اونٹ سے بہتر اونٹ دے دیا جائے۔ اور آپ نے فرمایا کہ "تم میں سے بہتر وہی ہے جو بہتر ادائیگی کرے"۔ (بخاری ص ۳۰۹)

ایسے واقعات بارہا پیش آئے۔ اور گو آپ نے اس کی بابت کوئی حکم صادر نہیں فرمایا تاہم خود آپ کا دستور العمل ہمیشہ یہی رہا کہ جس کسی سے کچھ قرض لیتے تھے اس کو عموماً میعادِ مقررہ سے پہلے ادا کر دیتے تھے اور اس کی واجب الادا جنس سے کچھ زیادہ عطا فرماتے تھے۔ یہ آپ کا احسان ہوتا تھا کیونکہ قرض خواہ کو اس بیشی کے مانگنے کا کچھ حق نہیں ہوتا تھا (ورنہ وہ تو سُود ہو جاتا) لیکن آپ اسی کو اس لحاظ سے انصاف سمجھتے تھے کہ قرض خواہ کو اپنی چیز کے فائدے سے اتنے دن تک محروم رہنے کی تلافی ہو جائے۔ مسلمان جو اس وقت بدقسمتی سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ نادہند اور بدمعاملہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگر آپ کی صرف اسی ایک سنت کی پیروی کریں تو ان کے مباحثِ قومی میں سے مسئلہ سود از خود غائب ہو جائے اور وہ یقیناً ناداری اور حاجت مندی کے قعرِ ذلت سے نکل کر دولت و حشمت کے اوجِ عزت پر پہنچ جائیں کیونکہ دولت کی کنجی تجارت ہے اور تجارت کا مدار ساکھ اور اعتبار پر ہے جو ہم

میں نہیں ہے اور اس کا فقدان نتیجہ ہے اسی سنتِ نبوی کے ترک کا۔ اگر ہم صرف ایک اس سنت پر چلتے ہوتے تو یقیناً ہم دولت اور تجارت کے مالک ہوتے اور غالباً ہم کو آج اپنی ان مٹی ہوئی سلطنتوں کا ماتم بھی نہ کرنا پڑتا، جن کو گردشِ فلک اور انقلابِ لیل و نہار نے نہیں بلکہ خود ہماری بداطواریوں اور بداعمالیوں نے ہمارے دستِ مرتعش سے لے کر اُن ہاتھوں میں دے دیا جن میں ہمارے ہادی صادق اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے تتبع نے عنانِ حکومت کے تھامنے کی طاقت پیدا کر دی ہے افسوس کہ ہم کو کیا تعلیم دی گئی اور ہم نے اس پر کیا عمل کیا۔ افسوس کہ ہم کو کیا ہونا چاہیے تھا اور ہم کیا ہو گئے ؎

کبھی خاقان تھے کبھی قیصر و کسریٰ ہم تھے

اب تو کچھ یاد نہیں یہ بھی کہ کیا کیا تم تھے

یہاں ایک اور حدیث بھی قابلِ ذکر ہے۔ اور اگرچہ اس کو بظاہر اس باب سے کچھ تعلق نہیں ہے مگر اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے ہماری اس موجودہ حالت کا اب سے تیرہ سو برس پہلے کتنا صحیح اندازہ فرمایا تھا اور اُسی وقت ہم کو اس راستے کے خطرات سے کتنی اچھی طرح متنبہ اور آگاہ کر دیا تھا جس کو ہم نے اُن کی ہدایت کے باوجود بھی اپنے عقوق و عصیان کی وجہ سے نہ چھوڑا۔ اور آخر اس حالِ زار کو پہنچے۔

روایت ہے کہ جب ابو عبیدۃ بن الجراح بحرین سے جزیہ وصول کر کے لائے تو ان کے واپس آنے کی خبر سارے شہر میں مشہور ہوگئی۔ تمام انصار صبح کی نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوئے۔ آپ نماز کے بعد واپس چلے تو وہ پھر راستے میں آپ کے سامنے آئے آپ ان کو دیکھ کر مسکرانے لگے اور آپ نے فرمایا "شاید تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ کچھ لے کر آئے ہیں"۔ اُنھوں نے کہا "یارسول اللہ! ہاں"۔ آپ نے فرمایا "خوش ہو جاؤ اور اُس چیز کی امید رکھو جو تم کو مسرور کرے گی۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے تمھاری تہی دستی اور عسرت سے کچھ اندیشہ نہیں ہے لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ تمھارے سامنے بھی دنیا پیش کی جائے، جیسے کہ تم سے پہلوں کے سامنے کی گئی تھی۔ پھر وہ اس میں محو و منہمک ہو گئے جیسا کہ معروف ہے۔ اور پھر یہ حرص و ہوس اور عیش و عشرت تم کو بھی ہلاک کر دے۔ جیسے کہ اس نے اُن کو برباد کر دیا"۔ (بخاری ص ۴۴۷)

مسلمانوں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے کہ اُس کا ایک ایک ورق آپ کے اس ارشاد کی کیسی تصدیق کرتا ہے، جس کا آپ کو احتمال تھا وہی ہوا اور بحالات موجودہ وہی ہونا چاہیے تھا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی منصف مزاجی کے ضمن میں صلح حدیبیہ کے بعض واقعات بھی قابلِ ذکر ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے آپ ۶ھ میں حج کے مقصد سے مکہ کی جانب نہضت فرما ہوئے۔ اہلِ مکہ کو یہ خوف ہوا کہ مبادا ایسے میں آپ کی تشریف آوری سے مسلمانوں کی جماعت اور طاقت اور زیادہ بڑھ جائے اور خود مکہ کے بہت سے آدمی اسلام قبول کر لیں۔ اس لیے عمائد قریش نے آپ کو راستے ہی میں روکنے کی تیاری کی۔ حدیبیہ پر دونوں فریقوں کا مقابلہ ہوا۔ چونکہ آپ کا قصد لڑائی کا بالکل نہ تھا، نہ آپ اس ارادے سے نکلے تھے، اس لیے اگرچہ آپ کے ہمرکاب ایک ہزار مسلمان تھے مگر آپ نے جنگ پر پیش قدمی نہیں کی اور اہلِ مکہ کو یہی پیام کہلا بھیجا، اگرچہ ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ "اگر تم نے بہ صلح و آشتی نہ مانا تو پھر مجبوراً ہم بزورِ شمشیر مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ جو ارادہ

ہم کر کے نکلے ہیں وہ فسخ نہیں ہو سکتا۔" اس پر قریش نے سہیل بن عمرو کو معاہدہ کرنے کے لیے بھیجا آپ نے قریش کی تمام شرائط کو منظور فرما لیا اور عہد نامہ لکھنے کے لیے کاتب کو بلایا اور حکم دیا کہ لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔ سہیل نے کہا " رحمان کو تو ہم جانتے ہی نہیں کہ کیا ہے، تم تو جیسے پہلے سے لکھا کرتے تھے ویسے ہی لکھو باسمک اللّٰھم"۔ اس پر مسلمانوں نے بگڑ کر کہا" واللہ ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے سوا اور کچھ ہرگز نہیں لکھیں گے"۔ مگر آپ نے فرمایا کہ" خیر باسمک اللّٰھم لکھ دو"۔ پھر فرمایا " آگے لکھو، یہ ہے جو طے ہوا۔ محمد رسول اللہ ہیں اور"۔ سہیل نے پھر ٹوکا اور کہا" واللہ اگر ہم آپ کو رسول اللہ ہی مانتے تو حج کعبہ سے روکتے ہی کیوں، اور لڑائی ہی کیوں ہوتی اس لیے محمد رسول اللہ کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھو"۔ آپ نے فرمایا " خدا گواہ ہے کہ میں بلاشبہ اللہ کا رسول ہوں۔ لیکن خیر، اگر تم مجھے جھٹلاتے ہو تو محمد بن عبداللہ ہی لکھ دو"۔ (بخاری ص ۲۰۹)

غرض یوں وہ معاہدہ لکھا گیا اس کا باقی حصہ میں کسی دوسرے مقام پر عرض کروں گا یہاں مجھے صرف اتنا ہی دکھانا ملحوظ تھا میں نے اس واقعے کو انصاف کے باب میں لیا ہے۔ گو بظاہر اس میں عدل کی نسبت رفق کا پہلو زیادہ نکلتا ہے۔ میرے خیال میں یہ واقعہ آپ کی منصف مزاجی کا نہایت ہی نمایاں ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ مشکل بات یہ ہی ہے کہ آدمی اپنے مخالف کے نقطۂ خیال کو قبول کرلے اور وہ بھی بالخصوص مذہبی معاملات میں، اگر آپ کے دل میں ذرا بھی چور ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ آپ اپنے صحابہ اور متبعین کے سامنے اپنے لقب رسول اللہ کو حذف کرنے کی اجازت دیتے۔ کیونکہ اسی پر تو سارا دارومدار تھا۔ لیکن آپ کو اس کا اشتباہ بھی نہیں ہوا اور آپ کی طبعی انصاف پسندی اور معدلت گستری نے سہیل کے اعتراض کی معقولیت کو قبول کر لیا اور معقول بات کو تسلیم کر لینے میں کبھی آپ کو کچھ تامل ہوا ہی نہیں۔ یہ ہے سچی تعمیل اس ارشادِ الٰہی کی:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ؕ (مائدہ ع ۶)	اور اگر تو ان غیر مسلم لوگوں میں فیصلہ کرے تو انصاف سے فیصلہ کر۔ بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تواضع اور انکسار

سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ قول نہایت ہی سچا ہے: ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوے اوست

تواضع عالی مرتبہ اور بلند پایہ شخص کے لیے اتنی ہی مشکل ہے جس قدر ادنیٰ مرتبے اور پست حالت کے آدمی کے واسطے خودداری اور پابندیٔ وضع۔ لیکن جس شخص کے دل میں اپنے ابنائے نوع کی محبت ہو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس میں تواضع اور انکسار نہ ہو کیونکہ محبت مساوات کی مستلزم ہے۔ اور مساوات میں کبر و نخوت کی گنجائش نہیں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی اور سب لوگوں سے محبت بھی کرے۔ ان پر شفیق بھی ہو ان کا ہمدرد بھی رہے اور پھر اپنے آپ کو اُن سے افضل بھی سمجھے اور ان سے غرور بھی کرے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کو کسی پر فضیلت ہے ہی نہیں۔ اصول فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ تو یقیناً بالکل درست ہے مگر کسی کا افضل ہونا اور بات ہے اور اس کا اپنے آپ کو افضل سمجھنا دوسری بات ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ فی الواقع جو لوگ اوروں سے بہتر ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اور جو اپنے آپ کو اوروں سے بہتر سمجھتے ہیں وہ اصل میں ایسے ہوتے نہیں۔ اس سے یہ بھی نہ خیال ہونا چاہیے کہ چونکہ سب برابر ہیں اس لیے حفظ مراتب کی ضرورت نہیں۔ نہیں، بڑے خواہ کیسے ہی متواضع اور منکسر المزاج کیوں نہ ہوں چھوٹوں کو کبھی اپنی حد سے گزرنا اور سر رشتہ ادب کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔ حقیقت میں تعلقات کی خوبی یہی ہے کہ ایک طرف سے محبت و شفقت ہو اور دوسری طرف سے عقیدت و اطاعت، ایک طرف سے تواضع و انکسار ہو اور دوسری طرف سے ادب اور عزت۔ اسی حسن مراعات کا بہترین مرقع ہم کو جناب خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے احباب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے باہمی تعلقات میں نظر آتا ہے۔

یہ تو ہم گزشتہ بابوں میں دیکھ ہی چکے ہیں کہ آپ کیونکر ہر ایک کام میں اپنے صحابہ کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور کسی طرح اپنے آپ کو اُن میں ممتاز نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ یوں بھی آپ بے انتہا متواضع اور منکسر المزاج تھے یہاں تک کہ آپ اپنے متبعین کو اس بات کی بھی اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ آپ کو کسی گزشتہ پیغمبر سے افضل سمجھیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "کسی کو یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ میں یونسؑ بن متی سے بہتر ہوں اور جس کسی نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں، اس نے غلط کہا (بخاری ص ۰۹)" حالانکہ یونس بن متی اولوالعزم اور صاحب کتاب پیغمبروں میں سے نہیں تھے۔ اور آپ خاتم النبیین تھے مگر پھر بھی آپ کا انکسار ایسا مقابلہ جائز نہ رکھتا تھا۔

ابو سعید الخدری بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ اتنے میں ایک یہودی آیا اور اس نے کہا کہ "ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم)! تیرے رفیقوں میں سے ایک نے میرے منہ پر طمانچہ مارا۔" آپ نے پوچھا "کس نے؟" اس نے کہا "انصار میں سے ایک نے۔" اور کچھ پتہ بتایا۔ آپ نے اُسے بلایا اور اُس سے پوچھا "کیا تُو نے اسے مارا ہے؟" اس نے کہا "ہاں، میں نے اسے بازار میں یہ قسم کھاتے سُنا: "قسم اس ذات کی جس نے موسیٰ کو تمام نوع بشر میں سب پر فضیلت دی۔" اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے کہا: "اے ناپاک! کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟" اور میں نے اس کے ایک طمانچہ مارا۔" آپ نے فرمایا: "تم لوگ مجھے پیغمبروں پر برتری مت دو۔" (بخاری ص ۳۲۵)

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "تم میری تعریف میں زیادہ مبالغہ مت کرو۔ جیسے مسیحیوں نے عیسیٰ ابن مریم کو حد سے زیادہ بڑھایا! میں تو اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، اس لیے مجھے عبداللہ و رسولہ کہا کرو۔" (شفا، ص ۵۸)

ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو "یاخیر البریہ" (یعنی اے بہترین خلائق) کہہ کر خطاب کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ "یہ لقب ابراہیمؑ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔" (شفا، ص ۵۸)

اگر انسانی طبیعت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علی العموم خواہ کوئی شخص کتنا ہی متواضع اور منکسر المزاج کیوں نہ ہو۔ پھر بھی کم سے کم وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اس کی عزت اور اُس کی صفاتِ حسنہ کی تعریف کریں اور خاص کر جس بات میں وہ اوروں سے خاص طور پر ممتاز ہے، اُس میں اُس کی فضیلت مسلّم رہے۔ مگر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ آپ کی

وجہ امتیاز نبوت ہی تھی۔ اور یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ اور انبیا کو آپ پر فضیلت دینے سے آپ کے متبعین کی نظروں میں شاید آپ کی وقعت کچھ کم ہو جائے۔ لیکن آپ کی حقیقی عظمت اور فضیلت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ آپ کو اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اور آپ نے اپنے آپ کو نبوت میں بھی اوروں پر مرجح اور افضل نہیں رکھا یہاں تک کہ آپ کو خود اپنے صحابہ کا اقتدا کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ غزوہ تبوک کے سفر کا واقعہ ہے کہ آپ صبح اُٹھ کر کہیں باہر تشریف لے گئے اور دیر ہو گئی۔ جب آپ واپس آئے تو جماعت کھڑی ہو گئی تھی اور عبدالرحمٰن بن عوف پہلی رکعت پڑھا چکے تھے۔ آپ کے ساتھ اس واقعہ کے راوی مغیرہ بن شعبہ تھے۔ اُنھوں نے ان کو اطلاع دینی چاہی تو آپ نے منع فرما دیا، اور انہی کے پیچھے نماز میں شریک ہو گئے۔ (خصائص کبریٰ للسیوطی ص ۲۰۶) اور یوں تو جا بجا کلام مجید ہی میں ارشاد ہے کہ:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (کہف ع ۱۲)

اے پیغمبر! تو کہہ دے کہ بیشک میں تمھاری طرح کا آدمی ہوں مگر مجھ پر وحی کی گئی ہے کہ بیشک تمھارا پروردگار خدائے واحد ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۚ (بنی اسرائیل ع ۱۰)

اے پیغمبر! تو کہہ دے کہ سبحان اللہ میں تو ایک انسان پیامبر کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

حالی مرحوم نے ارشادِ نبوی کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے: ؎

نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم — بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "کسی شخص کو اس کے اعمال جنت میں داخل نہیں کر سکتے" یعنی آدمی سے کچھ نہ کچھ گناہ ہو ہی جاتے ہیں محض اپنے حسنِ عمل پر کسی کو نازاں نہ ہونا چاہیے بلکہ اللہ کے عفو و کرم پر بھروسا رکھنا چاہیے۔ لوگوں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! کیا آپ بھی؟" آپ نے فرمایا: "ہاں میں بھی جب تک اللہ کی رحمت و مغفرت مجھے ڈھانپ نہ لے۔" (بخاری ص ۹۵۰)

لیکن آپ کی تواضع فقط اسی پر موقوف نہ تھی بلکہ آپ کا ہر ایک فعل آپ کے انکسار کا عملی ثبوت ہے آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ آپ کے صحابہ آپ کی تعظیم کے لیے قیام بھی کریں۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک روز آپ باہر تشریف لائے اور آپ اس وقت ایک عصا پر سہارا کیے ہوئے تھے تو سب صحابہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اس پر آپ نے فرمایا: جیسے عجمی آپس میں ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم کو کھڑا نہ ہونا چاہیے۔" (شفا، ص ۸۰)

آپ نے فرمایا "بے شک میں بھی ایک بندہ ہوں جیسے اور لوگ کھاتے ہیں ویسے ہی میں بھی کھاتا ہوں، جیسے اور لوگ بیٹھتے ہیں ویسے ہی میں بھی بیٹھتا ہوں۔" (شفا، ص ۸۰)

جب مکّہ سے ہجرت فرماکر آپ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے ابو ایوبؓ کے گھر میں قیام فرمایا۔ ابو ایوبؓ کہتے ہیں کہ "ہم کو یہ بات بہت شاق گزرتی تھی کہ آپ تو نیچے رہیں اور ہم اوپر۔ چنانچہ میں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ اوپر قیام فرمائیں اور ہم نیچے رہیں گے۔ کیونکہ یہ ہم کو بڑی بے ادبی معلوم ہوتی ہے۔" مگر آپؐ نے اسے قبول نہ کیا اور فرمایا کہ "مجھے اور میرے پاس آنے والوں کو نیچے ہی رہنے میں زیادہ آرام ہے۔" چنانچہ آپ وہیں رہے۔ ایک دن اتفاق سے ہماری پانی کی ٹھلیا ٹوٹ گئی تو میں اور ام ایوب دونوں اپنی چادر سے اس پانی کو پونچھتے رہے۔ اگرچہ ہمارے پاس اس کے سوا اوڑھنے کے لیے اور کچھ نہ تھا کیونکہ ہم کو یہ ڈر تھا کہ مبادا پانی آپ پر ٹپکے اور آپ کو تکلیف ہو۔" یہ مثال ہے ایک طرف سے شفقت و انکسار کی اور دوسری طرف سے محبت و احترام کی۔" (سیرت ابن ہشام ص ۲۷۶)

"آپ فرطِ انکسار سے گدھے پر بھی سوار ہو جاتے تھے اور اونٹ وغیرہ پر اپنے پیچھے اور لوگوں کو بھی بٹھا لیتے تھے۔ مسکینوں اور بیکسوں کی عیادت کو تشریف لے جاتے تھے۔ فقیروں اور غریبوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اپنے اصحاب میں بالکل ملے جلے رہتے تھے، اور مجلس میں جہاں جگہ مل جاتی تھی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ آپ نوکروں کے کام میں شریک ہو جاتے تھے اور ان کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے تھے۔"

(شفا، ص ۸ د)

عمرو بن سائب سے مروی ہے کہ "ایک دن آپ تشریف فرما تھے کہ آپ کی دایہ حلیمہ کا شوہر حارث بن عبد العزیٰ آیا۔ آپ نے اس کے لیے چادر کا ایک کونہ پھیلا دیا۔ ذرا دیر میں حلیمہ آئی تو آپ نے دوسرا کونہ پھیلا دیا۔ پھر آپ کا دودھ شریک بھائی عبد اللہ بن حارث آیا تو آپ کھڑے ہو گئے اور اسے اپنے سامنے بٹھایا۔" (شفا، ص ، د)

انسؓ کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک دیوانی سی عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا کہ مجھے تجھ سے کچھ کام ہے۔ آپ نے فرمایا: "اے امِ فلاں! تیرا مدینے کی گلیوں میں جہاں جی چاہے بیٹھ جا، میں بھی تیرے ساتھ بیٹھا رہوں گا یہاں تک کہ تیرا کام پورا ہو جائے۔" چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ بیٹھے رہے حتّٰی کہ اس کا جو کچھ کام تھا وہ پورا ہو گیا۔" (مشکوٰۃ ص ۴۴۲)

ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ "ایک دن میں بہت بھوکا تھا اور میں نے شدتِ گرسنگی سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے اور میں راستے پر بیٹھا تھا جدھر سے لوگ آتے جاتے تھے اتنے میں ابو بکرؓ وہاں سے گزرے میں نے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی، اور میرا مطلب یہ تھا کہ شاید وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔ مگر وہ چلے گئے۔ پھر عمرؓ گزرے ان سے بھی میں نے ایک آیت اسی نیت سے پوچھی مگر وہ بھی چلے گئے۔ پھر ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے اور آپ نے میرے بشرے سے میری حالت سمجھ لی اور کہا: "ابو ہریرہ!" میں نے کہا "لبیک یا رسول اللہ۔" آپ نے فرمایا "چلو۔" میں بھی آپ کے ہمراہ چلا۔ پھر جب آپ مکان پر پہنچے تو آپ نے میرے لیے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ اجازت لے کر میں بھی اندر گیا وہاں ایک برتن میں دودھ رکھا تھا آپ نے پوچھا کہ "دودھ کیسا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟" معلوم ہوا کہ فلاں شخص نے آپؐ کے لیے بھیجا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا "ابو ہریرہؓ! اہلِ صفّہ کو بلا لاؤ۔" اور اہلِ صفّہ وہ لوگ تھے جن کا گھر بار نہ تھا۔ جب کوئی چیز خیرات یا صدقہ کے طور پر آپ کے پاس آتی تھی تو آپ وہ سب کی سب انہی لوگوں کو بھیج دیتے تھے۔ اور اگر تحفتہً

آتی تھی تو آپ ان لوگوں کو بلا کر اس کو ان میں بانٹ دیتے تھے اور خود بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ مگر اس وقت مجھے ان لوگوں کا بلانا ناگوار گزرا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کا اہلِ صفہ کی نسبت تو میں زیادہ مستحق ہوں کہ اگر اس میں سے تھوڑا سا پی لوں تو ذرا جان میں جان آجائے مگر خیر "قہرِ درویش بر جانِ درویش"، میں ان کو بلا لایا، جب وہ آگئے تو آپ نے مجھے اُن کو دودھ پلانے کا حکم دیا، مجھے اُمید نہ رہی کہ اس میں سے مجھے بھی کچھ ملے گا۔ مگر فرماں برداری اور اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پس میں نے پیالہ لے کر ان میں سے ایک ایک کو دُودھ پلانا شروع کیا۔ جب ایک آدمی سیر ہو کر پی لیتا تھا تو وہ پیالہ مجھے واپس کر دیتا تھا، میں دوسرے کو دے دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی طرح میں نے سب کو دُودھ پلایا اور میں آپ تک پہنچ گیا۔ آپؐ نے پیالہ مجھ سے لے کر اسے اپنے ہاتھ پر رکھ لیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا: "ابوہریرہؓ! اب میں اور تم باقی رہ گئے۔" میں نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہؐ"۔ آپ نے فرمایا: "بیٹھ جاؤ اور پیو۔" میں بیٹھ گیا اور پیالہ لے کر دودھ پینا شروع کیا۔ پی چکا تو آپؐ نے پھر فرمایا "اور پیو۔" میں نے اور پیا۔ آپؐ نے پھر فرمایا "اور پیو۔" یہاں تک کہ میں نے عرض کیا "بخدائے لایزال اب تو بالکل گنجائش نہیں رہی۔" آپؐ نے کہا "اچھا اب مجھے دو۔" میں نے پیالہ پیش کیا آپؐ نے اسے لے کر بسم اللہ کی اور خدا کا شکر ادا کیا اور پھر سب کا پس ماندہ دودھ نوش فرمایا۔" (بخاری ص ۹۵۶)

سبحان اللہ! کس قدر محبت وایثار، تواضع اور انکسار کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے اور حالت یہ تھی کہ ایسے واقعات ہر روز ہی پیش آتے رہتے تھے۔ یہ ہجرت کے بعد کا ذکر ہے۔ یعنی اس زمانہ کا جب بخیال دشمناں آپ کی دنیوی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور اگرچہ آپ ظاہری حیثیت سے بھی بادشاہ ہو گئے تھے لیکن آپ کے حُسنِ ادب کا یہ حال تھا کہ آپ کبھی تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ (بخاری ص ۸۱۲)

آپ کو لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اپنے منکرین ومخالفین تک کے پاس جا کر ان کی سفارش کرنے میں عار نہ ہوتا تھا بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ کسی پہ کچھ قرض ہوا اور یہودی قرض خواہ نے (کیونکہ لین دین کا کام یہودی ہی کرتے تھے) تنگ طلبی کی۔ اور وہ شخص آپ کے پاس آیا، اگر آپ کے پاس کچھ ہوا تو خود ادا کر دیا، ورنہ اس یہودی کے پاس خود تشریف لے گئے اور اس سے کچھ اور مہلت دینے کے لیے کہا، مگر وہ لوگ عموماً اس کا بھی کچھ خیال نہ کرتے تھے تو آپ اِدھر اُدھر سے کوشش کر کے جس طرح ممکن ہوتا تھا ادائے قرض کا بندوبست کر دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "بھوکوں اور مسکینوں کے لیے کوشش کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ اور قائم اللیل اور صائم النہار کے برابر درجہ رکھتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۳۵۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کے کچھ دینار آپ پر قرض تھے وہ تقاضا کرنے آیا۔ آپ نے فرمایا: "اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے کہ میں تجھے دُوں۔" یہودی نے کہا "یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! جب تک تُو مجھے دے گا نہیں، میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔" آپ نے فرمایا: "اچھا تو میں تیرے پاس بیٹھا رہوں گا۔" چنانچہ آپؐ اس کے پاس بیٹھ گئے اور وہیں ظہر، مغرب، عشا کی نماز ادا فرمائی، یہاں تک کہ دوسری صبح ہوگئی۔ آپؐ کے اصحاب کرام کبھی اس یہودی کو دھمکاتے تھے کبھی اس سے وعدہ کرتے تھے کبھی آپ سے عرض کرتے تھے کہ "یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے

قید کر رکھا ہے۔" آپؐ نے فرمایا" میرے پروردگار نے مجھے اس بات سے منع کیا ہے کہ میں کسی معاہد یا غیر معاہد پر زیادتی کر دوں"۔ جب اور دیر ہوئی اور زیادہ دن چڑھا تو وہ یہودی مسلمان ہوگیا اور اس نے کہا کہ "میں تو آپ کے حلم، انصاف اور تواضع وغیرہ صفاتِ حسنہ کا امتحان کرنا چاہتا تھا"۔ (خصائص کبریٰ للسیوطی و مشکوٰۃ ص ۴۴۳)

انتہائے عروج میں آپ کی تواضع اور فروتنی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے وقت آپ مظفر و منصور اس شہر میں داخل ہوئے، جس نے شروع سے آپ کو تکلیف دینے اور آپ کی مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ تو فرطِ انکسار سے آپ کا سرِ مبارک اتنا جھکا ہوا تھا کہ کاٹھی کے سامنے کے حصہ سے لگا جاتا تھا۔ آپؐ اس وقت اونٹ پر سوار تھے اور تنہا نہ تھے بلکہ اسامہؓ آپ کے ردیف تھے (نسیم الریاض شرح شفا و سیرت ابن ہشام ص ۳۲۶) حالانکہ اس وقت فاتحانہ شان اس بات کی مقتضی تھی کہ آپ گھوڑے پر اپنے صحابہ کے جھرمٹ میں کالبدر فی النجوم شاہانہ تزک و احتشام سے تشریف لاتے۔ مگر یہ شان ہی اور ہے جو شہنشاہوں کو کہاں نصیب!

صدق

اگر میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھتا ہوتا تو آپ کے صدق پر قطعاً استشہاد نہ کرتا، کیونکہ یہ تو آپ کی وہ صفت ہے جس میں آپ کو بعثت سے برسوں پہلے ہی سے شہرت عام حاصل ہو چکی تھی اور جس سے آپ کے اسی زمانہ کے شدید ترین اعدا نے بھی انکار نہیں کیا اس کے سوا یوں بھی صدق باقی تمام محاسنِ اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے اور جب تک کسی طبیعت میں پوری سچائی نہ ہو تب تک اس میں کوئی اور اعلیٰ خوبی ہونی ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس جامع صفات حسنہ روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق پر واقعات سے استدلال کرنا، سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اور یہ آنجناب کی شان میں گستاخی ہی نہیں بلکہ خود اپنی جہالت اور نادانی کا بھی اظہار ہے لیکن میں تو چونکہ اپنے ابنائے وطن کی تقلید اور اتباع کے لیے آپ کے اسوۂ حسنہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں اس لیے میرے لیے آپ کے صدق کا بیان بھی ضروری ہے۔

ہم میں سچائی کی اس قدر کمی ہے کہ اگر ترتیبِ ابواب میں اپنی ضرورت کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو یقیناً اس باب کو فاتحۃ الکتاب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن خیر چونکہ ہم لوگ عموماً ایسے مضامین کی کتابوں کو ختم کرنے سے پہلے ان کے ابتدائی حصہ کو بھول جاتے ہیں اس لیے شاید اس کا آخر میں ہونا بھی کچھ زیادہ ناموزوں نہ ہو۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد کتاب کے جلد ختم ہو جانے کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ حافظے کے کسی کونے میں باقی رہ جائے۔

سچائی کے متعلق جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی تعلیم کا اندازہ اس ایک حدیث سے ہوسکتا ہے۔ اور اگر گوش شنوا ہو تو یہی ایک نصیحت عمر بھر کی اصلاح کے لیے کفایت کرتی ہے۔ عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ "ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا کہ" یا رسول اللہ! جنت پانے کا عمل کیا ہے؟" آپ نے فرمایا: "صدق۔ کیونکہ جب آدمی سچا ہوتا ہے تو نیکی کرتا ہے۔ اور جب نیکی کرتا ہے تو نورِ ایمانی پیدا ہوتا ہے۔ اور جب ایماندار ہوتا ہے تو جنت میں داخل

ہوتا ہے۔" (ترغیب وترہیب ص ۵۰۱)

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خبردار ہمیشہ سچے رہو، خواہ تم کو سچائی میں ہلاکت ہی کیوں نظر نہ آئے۔ کیونکہ بلاشبہ نجات اسی میں ہے۔" (ترغیب وترہیب ص ۵۰۱)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "دیکھو ہمیشہ صدق پر جمے رہو، کیونکہ صدق نکوکاری کی طرف لے جاتا ہے اور نکوکاری جنت کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اور جو شخص ہمیشہ سچ پر قایم رہتا ہے وہ بارگاہِ الٰہی میں صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور خبردار، جھوٹ سے بچو کیوں کہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتا ہے اور بدکاری آگ کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اور جو شخص جھوٹا ہوتا ہے وہ بارگاہِ کبریائی میں کذاب لکھا جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم، ابو داؤد و ترمذی از ترغیب و ترہیب ص ۵۰۱)

آپ کی سچائی اور راست بازی اتنی اعلیٰ درجہ کی تھی کہ زبان صدق بیان پر تو کیا کبھی آپؐ کے خیال میں بھی کوئی غلط بات نہیں گزرتی تھی اور گزشتہ کے متعلق آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ تو درست ہوتا ہی تھا لیکن خیالات کی راست بازی کا اتنا اثر تھا کہ آیندہ کی بابت بھی جو بات آپ کی زبانِ مبارک سے نکلتی تھی خدا اس کو سچ کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس کے بیسیوں مستند واقعات ہیں کہ آپ نے کسی شخص یا کسی واقعہ کی بابت کچھ فرمایا اور بعد میں بعینہٖ وہی ہوگیا۔ لیکن اس پر آپؐ نے کبھی پیش گوئی یا غیب دانی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اس سے قطعی انکار فرمایا۔ آپ کی یہ صفت اتنی مشہور و معروف تھی کہ آپؐ کے اعدا و مخالفین تک کو اس سے انکار نہ تھا۔

چنانچہ روایت ہے کہ جنگِ بدر میں اخنس ابن شریق ابوجہل سے ملا تو اس نے اس سے کہا "اے ابوالحکم! میں تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں یہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تو ہماری بات سننے والا نہیں ہے۔ تو مجھے سچ سچ بتا دے کہ آیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے یا جھوٹا۔" ابوجہل نے جواب دیا کہ "واللہ! بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچ بولتا ہے اور اس نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔" (شفا، ص ۵۹)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم کو تیری راست گفتاری اور صادق البیانی پر تو شبہ نہیں ہے اور ہم تجھے تو نہیں جھٹلاتے۔ البتہ جو کچھ تو لایا ہے اور جو کچھ تو کہتا ہے اس کو ہم جھٹلاتے ہیں اور اسے ہم نہیں مانتے۔ چنانچہ اسی پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: (شفا، ص ۵۹)

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ	بے شک ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو باتیں کہتے ہیں
فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ	تجھ کو رنجیدہ کریں گی۔ لیکن یہ ظالم تجھ کو نہیں جھٹلاتے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ط (انعام ع ۴)	بلکہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ط	اور تو اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرا۔

تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھے اور آپؐ نے سب قبائل قریش کو پکارا۔ آپ کی آواز سن کر سب اہلِ قریش جمع ہوگئے یہاں تک کہ جو شخص خود نہیں آسکتا تھا اس نے اپنا آدمی خبر لینے کو بھیجا۔ انھوں نے آپ سے پوچھا کہ "کیا

ہوا؟" آپ نے فرمایا: "یہ بتاؤ کہ اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے پیچھے اس وادی میں ایک لشکر پڑا ہوا ہے اور صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے تو تم میرے کہنے کو سچ سمجھو گے یا نہیں؟" سب نے کہا: "ہاں۔ بے شک کیونکہ ہم نے کبھی تجھے جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا۔" آپ نے فرمایا: "تو میں تم کو عنقریب آنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں۔" یہ سن کر ابولہب نے کہا "تجھ پر ہلاکت ہو کیا تُو نے ہم کو اس واسطے بلایا تھا؟" اس پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔ (بخاری ص ۷۰۲)

حالی مرحوم نے اس واقعہ کو اپنے مسدس میں نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے: ؎

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر — تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور — سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ "اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجکو صادق کہ کاذب؟"

کہا سب نے "قول آج تک کوئی تیرا — کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا"
کہا "گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا — تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا؟
کہ فوج گراں پشت کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمہیں گھات پاکر"

کہا "تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے — کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے"
کہا "گر مری بات یہ دل نشیں ہے — تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا"

بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ "نضیر بن حارث ایک دن آپ کے متعلق اکابرِ قریش سے کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تم میں نوعمر لڑکا تھا تب وہ تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ کردار، راست گفتار اور امانت دار سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب اس کی داڑھی کے بال سپید ہو گئے اور اس نے تم سے وہ باتیں کہنی شروع کیں جو وہ کہتا ہے تو اب تم کہتے ہو کہ وہ جادوگر ہے۔ نہیں، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہے، ہم نے جادوگروں کے شعبدے دیکھے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، تو واللہ وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کہانت کے تماشے بھی دیکھے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے، تو واللہ وہ دیوانہ بھی نہیں ہے، ہم دیوانوں کی دیوانگی اور خبط کو بھی جانتے ہیں۔ اور تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے، واللہ وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ ہم شعر کے تمام اصناف سے بھی واقف ہیں۔ پس اے معشرِ قریش! تم اس معاملے پر غور کرو، واللہ تم پر یہ ایک امرِ عظیم واقع ہوا ہے۔" (سیرت ابن ہشام ص ۱۵۹)

یہ شخص نضیر بن حارث آپ کا نہایت دشمن تھا اور ہمیشہ آپ کے درپے آزار رہتا تھا۔ چنانچہ اس کو شیطان

قریش کہتے ہیں۔ یہ جنگِ بدر میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔" (سیرت ابن ہشام، ص ۲۱۴)

اِن واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ کفارِ قریش زیادہ تر اپنی ضد اور اپنے غرور و نخوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتے تھے، اور باوجودیکہ وہ آپ کو صادق القول جانتے تھے پھر بھی آپ کو جھٹلاتے تھے اور آپ سے لڑتے تھے۔ بہر حال اس سے ہم کو بحث نہیں۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ آپ کی کامل راستبازی پر آپ کے سخت سے سخت دشمن کو بھی کبھی حرف گیری کا موقع نہیں ملا۔

صدق ہی کا ایک شعبہ ایفائے وعدہ بھی ہے۔ اگرچہ یہ معمولی سچائی سے کسی قدر زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ ایفائے وعدہ میں بعض وقت مشکلات کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ لیکن انھیں مشکلات کے سبب سے یہ قابلِ تعریف بھی زیادہ ہے۔ اس لیے احادیث نبوی میں اس کی تاکید بھی زیادہ کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ" منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو:

اوّل بات کرے تو جھوٹ بولے۔

دوسرے جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے۔

تیسرے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" (صحیحین از مشکوٰۃ ص ۸)

ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ تینوں باتیں جھوٹ ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ سچا آدمی نہ جھوٹ بولتا ہے نہ وعدہ خلافی کرتا ہے نہ امانت میں خیانت کرتا ہے۔

آپ کے مبعوث ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی لحاؓ نے آپ سے کچھ چیز لی۔ مگر قیمت میں کچھ کمی رہ گئی۔ اس نے آپ سے کہا کہ" تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" اس کے بعد وہ بھول گیا۔ تین دن بعد اسے یاد آیا آن کر دیکھا تو آپ وہیں تھے۔ آپؐ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ" تم نے مجھے بہت سخت تکلیف دی۔ میں تین دن سے یہیں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔" (شفا، ص ۵۶)

صُلح حدیبیہ کا کچھ قصہ انصاف کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس صلح کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر اہلِ مکہ میں سے کوئی شخص آپ کے پاس آجائے تو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو پھر بھی آپ اسے واپس کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط مسلمانوں کے لیے بڑی سخت تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے کہا کہ" سبحان اللہ! یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جو شخص مسلمان ہو کر ہمارے پاس آئے ہم اسے مشرکوں کو دے دیں"۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی اور یہ شرط عہد نامہ میں لکھی بھی نہیں گئی تھی کہ ابو جندل بن سہیل زنجیریں کھڑکھڑاتا ہوا آیا۔ وہ مکے کے زیریں حصہ سے نکل بھاگا تھا اور مسلمانوں کے لشکر تک پہنچ گیا تھا۔ سہیل نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر کہا" یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پہلا شخص ہے جسے میں چاہتا ہوں کہ تم واپس کر دو۔" آپؐ نے فرمایا: ابھی تو معاہدہ لکھا بھی نہیں گیا۔" مگر سہیل نے کہا" واللہ! اگر تم نے یہ نہ کیا تو پھر میں ہرگز تم سے کسی شرط پر بھی صلح نہ کروں گا۔" آپؐ نے ہر چند اسے نرم کرنا اور سمجھانا چاہا مگر اس نے مانا ہی نہیں۔ اس پر ابو جندل نے کہا" یا معشر المسلمین! میں مسلمان ہوں اور اب مشرکوں کے حوالے کیا جاتا ہوں۔ کیا تم میرا حال نہیں دیکھتے کہ میں کس بلا میں مبتلا ہوں۔" اور یہ ظاہر تھا کہ

اسے محض اللہ کے ماننے کے سبب سے بہت سخت سخت تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ اس پر بقول ابن اسحاق آپ نے فرمایا "اے ابوجندل! صبر کرو، گھبراؤ مت۔ پس بیشک ہم غدر اور عہد شکنی نہیں کرتے۔ اور بلاشبہ اللہ تمھارے لیے کشایش اور راستہ پیدا کر دے گا" اور یہ کہہ کر اسے سہیل کے حوالے کر دیا۔ حالانکہ یہ بات تمام مسلمانوں پر بے انتہا گراں گزری اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بڑے شد و مد سے اس سے اختلاف کیا مگر آپ نے ایفائے عہد میں شائبہ شبہ تک کو گوارا نہ فرمایا اور کسی کے اختلاف کی مطلق پروا نہ کی۔" (بخاری ص ۳۷۹)

اس کے بعد جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو قریش میں سے ایک شخص ابوبصیر جو اسلام لاچکا تھا مکے سے بھاگ کر وہاں آگیا۔ قریش نے حسبِ وعدہ اسے لینے کے لیے آدمی بھیجے۔ آپ نے بے تامل ابوبصیر کو اُن کے حوالے کر دیا۔ مگر جب وہ ذوالحلیفہ پہنچے تو وہاں ٹھہر کر انھوں نے کچھ کھانے پینے کا ارادہ کیا۔ ابوبصیر نے ان میں سے ایک کی تلوار کی تعریف کی اور دیکھنے کے لیے مانگی۔ اس نے خوشامد میں آکر تلوار دے دی۔ ابوبصیر نے تلوار لے کر پہلا وار اُسی پر کیا، وہ تو وہیں ٹھنڈا ہوگیا، دُوسرا آدمی بھاگا اور گرتا پڑتا سیدھا مسجد نبوی میں آیا۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچا تو اُس نے کہا "واللہ میرا رفیق مارا گیا اور میں بھی اتفاقیہ ہی بچا ہُوں"۔ اتنے میں ابوبصیر بھی آگیا اور اس نے آتے ہی کہا: "یا نبی اللہ! واللہ خدا نے آپ کو اپنے عہد سے سبکدوش کر دیا کیونکہ آپ تو مجھے ان کے حوالے کر چکے تھے۔ پھر اللہ نے مجھے ان سے نجات دی"۔ آپ نے فرمایا: "یہ شخص آتش جنگ کا بھڑکانے والا ہے"۔ آپ کے لہجے سے سب کو یقین ہوگیا کہ آپ ابوبصیر کو ضرور واپس کر دیں گے۔ اس ڈر سے ابوبصیر وہاں سے فوراً چل دیا اور سمندر کے کنارے پر جا کر پناہ گزیں ہُوا۔ اس کے بعد قریش میں سے جو شخص مسلمان ہو کر مکے سے نکل بھاگتا تھا وہ سیدھا وہیں جاتا تھا، یہاں تک کہ ابوبصیر کے ساتھ ایک جماعت ہوگئی اُنھوں نے اپنی شکم پُری کے لیے یہ وتیرہ اختیار کر لیا کہ قریش کا جو قافلہ شام کی طرف جاتا تھا اسی کو لُوٹ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش نے تنگ آکر آپ کی خدمت میں بڑے عجز و الحاح سے کہلا بھیجا کہ آپ ان لوگوں کو اپنے ہاں بُلا لیں اور آئندہ بھی جو شخص مسلمان ہو کر مکے سے چلا جائے اُسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں تب آپ نے ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہاں آنے کی اجازت دی۔ اور یُوں وہ شرط ٹوٹی جو شروع میں مسلمانوں کو اتنی ناگوار گزری تھی لیکن آخر میں خود اہلِ مکہ کے لیے ایسی وبالِ جان ہوگئی کہ اُنھوں نے خود منتیں کر کے اس سے اپنی جان چھڑائی۔" (بخاری ص ۳۸۰)

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز صداقت و امانت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہجرت سے پہلے باوجودیکہ اہل مکہ آپ کے جانی دشمن اور آپ کے قتل کے درپے تھے پھر بھی آپ کی صداقت و امانت پر ان کو اتنا کلی اعتبار تھا کہ جس کسی کے پاس کچھ بھی ایسا سامان ہوتا تھا جس کے ضائع ہو جانے کا ڈر رہتا تھا تو وہ اسے آپؐ کے پاس امانت رکھ جاتا تھا۔ چنانچہ ہجرت کے وقت آپ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو اپنے بستر پر اور اپنے پیچھے چھوڑ جانے کا اصلی سبب ہی یہ تھا کہ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد وہ تمام ودیعتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیں (سیرت ابن ہشام ص ۲۷۳) ورنہ ایسے وقت میں حضرت علیؓ کو اس بھڑوں کے چھتے میں تنہا چھوڑ جانا کچھ کم خطرناک نہ تھا، کیونکہ ابوطالب کا تو انتقال ہی ہو چکا تھا۔ اور یہ امر قرینِ قیاس تھا کہ قریش آپ کو نہ پاکر اپنی ساری ناکامی کا بدلہ حضرت علیؓ ہی سے لیں۔ مگر آپ نے حضرت علیؓ کو اطمینان دلا دیا تھا کہ ان کو کچھ خوف نہ کرنا چاہیے اور بہرحال چونکہ امانتوں کی واپسی لازمی تھی اس لیے حضرت علیؓ وہیں رہے۔ یہاں تک کہ وہ کل اشیا اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دی گئیں۔

سبحان اللہ! کتنی عمدہ تعمیل ہے اس ارشادِ الٰہی کی کہ :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ط (نساء ۔ ع ۵)

بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیا کرو اور جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

حیا

قدرت نے انسان کے جذبات حیوانی کی لگام اور اس کے قوائے شہوانی کا انتظام حیا کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اور فقط یہی نہیں بلکہ اسی کے ذریعہ سے اور بہت سی برائیوں کی بھی روک تھام کی ہے۔ آجکل کی تہذیب میں حیا کی کچھ زیادہ تاکید نہیں کی جاتی بلکہ اسے ایک صفت صرف صنفِ ضعیف کے لیے مخصوص اور فرقۂ اناث کے واسطے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس تہذیب کی غلطی ہے اور اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ کے اصول کی صحت میں کچھ تغیّر نہیں ہوا۔ چونکہ غالباً ناظرین خود اپنے ذاتی تجربے سے اس کی تصدیق کر سکیں گے اس لیے مجھے اس بحث کی مزید تصریح غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال خصائل انسانی میں سے حیا کو نکال لیجئے اور دیکھیے کہ انسانیت کا کتنا بڑا جزء غائب ہو جاتا ہے اور کتے اور آدمی میں کتنا فرق رہ جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ درست ہے کہ اور مکارمِ اخلاق کی طرح حیا کا بھی غلط استعمال ہو سکتا ہے اور اس میں بھی افراط و تفریط ممکن ہے۔ لیکن اس سے اس صفت کی پاکیزگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اتنی عمدہ خصلت ہے کہ اگر کسی شخص میں حیا کے سوا اور کوئی خُوبی نہ ہو تب بھی وہ صرف اسی کی وجہ سے ہر قسم کی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بے حیائی کو ارتکابِ فواحش کا دروازہ سمجھنا چاہیے۔ جب تک یہ دروازہ نہیں کُھلتا، اور آنکھوں میں شرم اور دل میں غیرت باقی رہتی ہے۔ تب تک ناکردنی حرکات کی طرف قدم ہی نہیں بڑھتا اور یُوں اگر آدمی نیکی نہ بھی کرے تب بھی بدی سے محفوظ رہتا ہے۔

حیا کے کئی درجے ہیں، سب سے پہلا درجہ تو یہ ہے کہ آدمی کو غیروں کے سامنے کوئی ناشائستہ بات کرتے ہوئے شرم آئے۔ اور اگرچہ یہ درجہ بہت ابتدائی اور معمولی ہے مگر پھر بھی بہت سی ظاہری بُرائیاں اس سے چُھوٹ جاتی ہیں اس سے ترقی ہوتی ہے تو آدمی اپنے عزیزوں اور گھر والوں سے بھی شرم کرنے لگتا ہے اور اس سے بہت سی ایسی قباحتیں دور ہو جاتی ہیں جو بیرونی دنیا کی نظروں سے چھپ کر گھر کی چہار دیواری کے پردے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے آپ سے بھی شرم آنے لگے یا بہ الفاظِ دیگر وہ خدا سے شرم کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بدکرداریوں سے ہی نہیں بلکہ بدگمانیوں سے بچائے گا اور حتی المقدور اپنے دل میں کسی قسم کا ناپاک اور شرمناک خیال تک نہ گزرنے دے گا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو کسی خلوت کدے میں بھی تنہا نہ پائے گا اور اسے دل کے مخفی پردوں اور دماغ کے تاریک گوشوں میں بھی گناہ کی تصویر کو پناہ دینے کی جسارت نہ ہو گی اسی لیے ارشادِ نبوی ہے کہ : (مشکوٰۃ ص ۳۶۸)

خُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔ — اسلام کی خاص خصلت حیا ہے۔

جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ذات بابرکات یوں تو تمام صفاتِ جمیلہ کی بہترین مثال ہے۔ اس لیے آپ میں حیا کا بھی علیٰ وجہ الکمال پایا جانا کچھ عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن تعجب تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ آپ نے کس زمانے میں کس قسم کے لوگوں کے سامنے حیا اور غیرت کا کیسا اعلیٰ درجے کا نمونہ پیش کیا۔ کہنے کو تو عرب اپنے آپ کو بڑا ناک والا کہتے تھے مگر حالت یہ تھی کہ برہنگی ان کے لیے کچھ باعثِ شرم نہ تھی بلکہ حج میں تو ننگے ہی ہو کر طواف کرتے تھے۔ پھر بھلا جہاں سترِ غلیظ تک چھپانے کی پروا نہ ہو وہاں شرم و غیرت کیا ہوگی! خدا کی شان ہے کہ انہی لوگوں میں آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور آپ کی حیا کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اُنھوں نے بھی آپ کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا۔ (شمائل ترمذی ص ۲۸)

ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ "آنجناب شریف پردہ نشیں کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ اور جب کوئی بات آپ کو ناپسند ہوتی تھی تو ہم لوگ فوراً آپ کے چہرے سے سمجھ جاتے تھے۔ اگر آپ کو کسی کی بات اچھی نہ معلوم ہوتی تو اُسے اشارے کنائے سے آگاہ فرما دیتے تھے تاکہ وہ خفیف نہ ہو۔" (بخاری ص ۹۰۱ و شفاؑ ص ۵۲)

لیکن یہ رعایت فقط انہی باتوں میں تھی جو آپ کو ذاتی طور پر ناپسند ہوتی تھیں ورنہ احکامِ الٰہی میں پہلوتہی کرنے والے کو آپ کبھی یُوں طرح نہیں دیتے تھے اور اعلائے کلمۃ الحق میں آپ کی آواز کسی وجہ سے پست نہیں ہوتی تھی۔ اور حقیقت میں اگر ایسا ہوتا تو وہ حیا کا غلط استعمال ہوتا۔ مگر اس عینِ صداقت اور محض خیر صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی بات میں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز کیونکر ہو سکتا تھا وہاں تو غلطی کا امکان ہی نہ تھا۔

چنانچہ ایک دن کا واقعہ ہے کہ ایک شخص خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا جس پر زعفران یا کسی ایسی ہی چیز کی زردی کا نشان تھا۔ اگرچہ آپ اپنی امت میں اس قسم کے زنانہ پن کے بناؤ سنگار پسند نہ فرماتے تھے۔ لیکن آپ نے اس شخص سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ جب وہ چلا گیا تو اور حاضرینِ مجلس سے فرمایا کہ "اگر تم اس سے اس کے دھو ڈالنے کے لیے کہتے تو اچھا ہوتا۔" (ابو داؤد ص ۵۰۶ و شمائل ترمذی ص ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی حیا اتنی اعلیٰ درجے کی تھی کہ آپ کسی کو نادم و شرمسار ہوتے ہوئے دیکھنے سے بھی شرم کرتے تھے۔
حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ "جب آپ کو کسی کی کوئی ناپسندیدہ بات معلوم ہوتی تو آپ اس کا نام لے کر بالتخصیص کچھ نہیں فرماتے تھے بلکہ یُوں کہہ دیتے تھے کہ 'وہ کیسے آدمی ہیں جو ایسی باتیں کرتے ہیں'!" (شفاؑ ص ۵۲) یوں اس کو اشارۃً تنبیہ بھی ہو جاتی تھی اور وہ اور لوگوں کے سامنے خجل اور خفیف بھی نہیں ہوتا تھا اور بہت سے آدمیوں کو اس حرکت کی قباحت بھی معلوم ہو جاتی تھی۔

یہ آپ کی شدّتِ غیرت اور فرطِ حیا ہی کی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو کلامِ مجید میں آپ کی طرف سے لوگوں کو یہ آدابِ ملاقات سکھانے کی ضرورت پڑی کہ جب کوئی کسی کے ہاں ملنے جائے تو یہ جائز نہیں کہ وہاں بیٹھ کر اور لوگوں سے اِدھر اُدھر کی غپ لگانے لگے۔ اور یوں صاحبِ خانہ کی تکلیف اور کوفت کا باعث ہو۔ آپ کے اصحاب حاضرِ خدمت ہوتے تو وہاں آپس میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اور جنابِ رسالت مآب اپنی تکلیف کو ان کی دل شکنی پر ترجیح دیتے مگر ان سے کچھ نہ فرماتے تھے۔ اس پر ارشادِ باری ہوا کہ:

إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ ط (احزاب - ع ٧)

بیشک تمھاری اس بات سے پیغمبر کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ تم سے شرم کرتے ہیں۔ اور اللہ کو سچ بات کہنے میں کسی کا کچھ لحاظ نہیں ہے۔

مگر یہ امر یہاں بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آپ صرف اپنی ذاتی تکالیف و مکروہات کو ہی اس خموشی سے گوارا فرما لیتے تھے اور اس کے اظہار میں شرم کرتے تھے۔ لیکن کسی صداقت مذہبی کے اعلان اور فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں ہرگز ذاتیات آپ کے لیے مانع نہیں ہوتی تھیں۔ اور یہی حیا کا سچا اور صحیح استعمال ہے۔ اللہ سب کو اس کی توفیق دے۔

وقار و متانت

مقتضائے قیاس یہ ہے کہ جو شخص اس قدر حلیم اور شفیق، اتنا رقیق القلب اور منکسر المزاج لوگوں کے دلوں سے اس کا عظمت و وقار کم ہو جائے اور اس کا رعب و داب قایم نہ رہے۔ مگر خدا نے اپنی قدرت سے جناب سرور کائنات علیہ الصّلوٰۃ والتحیات کو کچھ ایسا مزاج عطا فرمایا تھا کہ ان تمام باتوں کے باوجود بھی جو رُعب کا اثر ان پر تھا وہ شاہان عالی وقار کو بھی نصیب نہ ہوگا حالانکہ آپ کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ ہر ایک سے بے انتہا نرمی اور محبت سے پیش آتے تھے اور آپ کے صحابہ بھی آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ مگر خدا نے آپ کی سادہ اور بے تصنع وضع کو اپنے جمال و جلال کا مظہر بنایا تھا۔

خارجہ بن زید انصاری کہتے ہیں کہ جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم نہایت ہی باوقار تھے اور مجلس میں کبھی آپ سے کوئی بیجا حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔ (شفا ص ٦١)

آپ بیشتر اوقات خاموش رہتے تھے، بلا ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کوئی نازیبا بات کرتا تھا تو اس سے اعراض فرماتے تھے۔ آپ کا کلام صاف اور واضح ہوتا تھا، نہ اتنا طویل کہ اس میں کوئی بات فضول اور زاید از ضرورت ہو نہ اتنا مختصر کہ کوئی کام کی بات رہ جائے یا سمجھ میں نہ آئے۔ آپ قہقہہ مار کر اس طرح نہیں ہنستے تھے کہ دندان مبارک کھل جائیں۔ بلکہ تبسم فرماتے تھے اور آپ کے اصحاب بھی آپ کی توقیر و تعظیم اور صفاتِ نبویہ کی تتبع کی وجہ سے زور سے نہیں ہنستے تھے۔ آپ کی مجلس میں حلم اور امانت اور حیا اور نیکی کی گفتگو ہوتی تھی۔ لوگ آپ کے سامنے بلند آواز سے باتیں نہیں کرتے تھے۔ اور وہاں کسی قسم کی نازیبا اور ناپسندیدہ گفتگو نہیں کی جاتی تھی۔ جب آپ کلام فرماتے تھے تو سب اہلِ مجلس ادب سے سر جھکا لیتے تھے اور بالکل سکوت ہو جاتا تھا۔ آپ نہایت صحت اور وضاحت سے گفتگو کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آپ اس قدر صاف تکلم فرماتے تھے کہ اگر کوئی گننے والا گننا چاہتا تو ایک ایک حرف الگ الگ گن لیتا۔" (مشکوٰۃ ص ٤٤٢)

اسی طرح آپ کی چال نہایت معتدل اور متوسط قسم کی تھی۔ نہ تو آپ بہت تیز چلتے تھے کہ ساتھ والوں پر گراں ہو نہ اس قدر آہستہ چلتے تھے کہ اس سے تکان اور سُستی مترشح ہو۔ غرض اعتدال اور میانہ روی آپ کی ہر ایک بات سے ہویدا تھی۔ ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک شخص نے حاضرِ خدمت ہو کر کچھ عرض کرنا چاہا مگر رعب نبوی سے اس کے بدن میں لرزہ پڑ گیا۔

آپ نے فرمایا "گھبراؤ مت، اطمینان سے بات کہو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، بلکہ میں بھی قریش کی ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔" (شفا، ص ۵۹)

صلح حدیبیہ کی شرائط کے طے ہونے سے پہلے قریش کا ایک سردار عروہ ابن مسعود اہلِ مکّہ کا سفیر بن کر جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں اس نے آپ کی ریش مبارک کو ہاتھ لگانا چاہا (جیسے کہ بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے)۔ مغیرہ ابن شعبہؓ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ تو جب عروہ کا ہاتھ ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا وہ تلوار کی کوتھی سے اسے ہٹا دیتے تھے۔ اور کہتے تھے "جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ریش مبارک سے اپنا ہاتھ ہٹالے۔" بہرحال جب وہ وہاں سے اپنے لشکر میں واپس گیا تو اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا "اے قوم! واللہ میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں اور میں قیصر اور کسریٰ اور نجاشی کے پاس سفیر بن کر گیا ہوں۔ مگر خدا جانتا ہے کہ میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جیسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب ان کی عزّت اور ادب کرتے ہیں۔ واللہ اگر وہ تھوکتے بھی ہیں تو زمین پر گرنے نہیں پاتا۔ اور لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر منہ اور جسم پر مل لیتے ہیں۔ اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے وضو کے گرے ہوئے پانی کے لیے جان دیتے ہیں۔ اور جب وہ کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ تعمیلِ ارشاد کے لیے دوڑتے ہیں۔ اور جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کے سب پاس بیٹھنے والوں کی آوازیں دھیمی ہو جاتی ہیں اور فرطِ تعظیم و تکریم سے ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور کبھی ان سے آنکھ نہیں ملاتے۔ انھوں نے تم کو امن کا پیام بھیجا ہے تو تم کو چاہیے کہ اسے قبول کر لو۔" (بخاری ص ۳۷۸ و ۳۷۹)

سُبحان اللہ! یہ شانِ نبوت تھی شانِ حکومت نہ تھی۔ یہ بات کسی کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اپنے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرزِ عمل کی تقلید میں وہ طریقہ اختیار کریں جس سے ہمارے ملنے جلنے والوں میں ہماری عزّت اور لحاظ باقی رہے کیونکہ اس سے بھی آدمی اکثر برائیوں سے بچ جاتا ہے۔

زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی

انسانی طبیعت میں طیبت و ظرافت کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ اس کی بھی بڑی خوبی یہی ہے کہ انداز سے ہو ورنہ اگر نمک کی طرح زیادہ ہو گئی تو متانت، سنجیدگی اور بہت سی اخلاقی خوبیوں کو مٹا کر آدمی کو نکمّا اور بیکار کر دے گی۔ اور اگر کم ہوئی تو زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی نہ ہو گی۔ اور زندگی بالکل پھیکی اور بے لطف رہے گی۔ دُنیا میں ظریفوں کی تو کمی نہیں ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ متانت اور سنجیدگی بھی ہو اور شگفتہ مزاجی بھی ہو۔ اور بالخصوص بزرگانِ ملّت و مقتدیانِ مذہب تو اپنی شان کو خوش طبعی اور مذاق سے بہت ارفع سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک ان کا ایسا سمجھنا بجا بھی ہے۔ کیونکہ جو دل و دماغ موت و زیست کے مسائل اور دنیاوی و عقبیٰ کے مباحث پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں ان کو ہنسی دل لگی کا بہت کم موقع ملتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی طبیعت خود ہی ان باتوں سے اُچاٹ ہو جاتی ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

خبر ز زندہ دلی نیست اہلِ مدرسہ را
کہ دل بسانِ مگس در کتاب می میرد

پس اگر مزاج میں کامل اعتدال ہو تو البتہ یہ ممکن ہے کہ طبیعت میں تفکر و تدبر بھی ہو اور شگفتگی بھی باقی رہے۔ لیکن ایسے مزاج النادر کالمعدوم ہیں۔

جناب سرورِ کائنات علیہ الصّلوٰۃ والتحیات کو اللہ نے ایسا ہی مزاج عطا فرمایا تھا۔ آپؐ میں اس قدر متانت اور سنجیدگی اور بزرگی کے ساتھ زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی بھی اعلیٰ درجہ کی تھی اور باوجودیکہ آپؐ کا عرفانِ الٰہی میں ڈوبا ہوا قلبِ مطہر کسی وقت دم بھر کے لیے بھی صناعِ ازل کے آثارِ قدرت پر غور و خوض سے غافل نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی آپ محض زاہدِ خشک ہرگز نہ تھے۔ چہرہ مبارک ہر وقت بشاش رہتا تھا اور آپ ہر شخص سے نہایت خندہ روئی سے ملتے تھے۔ چنانچہ جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ "میں جب سے اسلام لایا آپ نے مجھے اپنے ہاں آنے سے منع نہیں فرمایا۔ اور آپ جب مجھے دیکھتے تھے مسکرانے لگتے تھے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۷)

بسا اوقات چھوٹے چھوٹے بچے آپ کے پاس آجاتے تھے اور آپ ان سے کھیلا کرتے تھے اور ان کو کھلایا کرتے تھے، کبھی آپ ان سے خوش طبعی کی باتیں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ بعض مرتبہ آپ محبت اور مزاح سے انسؓ کو " ذو الاُذنین " (دو کانوں والا) کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں کسی بات پر کچھ شکر رنجی ہو گئی، حضرت علیؓ مسجد میں جا کر سو رہے۔ اتفاق سے آپؐ ان کے ہاں تشریف لائے اور یہ قصہ سن کر مسجد میں گئے اور وہاں آپؐ نے حضرت علیؓ کو اٹھایا چونکہ وہ اس وقت فرشِ زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور کچھ مٹی بھی جسم سے لگ گئی تھی اس لیے آپؐ نے ان کو "ابو تراب" کا نام دے دیا۔ اس دن سے یہ کنیت ایسی مقبول ہوئی کہ گویا اس کے سوا حضرت علیؓ کی اور کوئی کنیت ہی نہیں رہی۔ (بخاری ص ۹۲۹)

ایک مرتبہ آپؐ نے کسی کو ایک اونٹ دینے کا وعدہ کیا، جب وہ آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "میں تجھے اونٹنی کا بچہ دیتا ہوں" اس پر وہ بگڑا اور اس نے کہا "میں اونٹنی کا بچہ کیا کروں گا!" آپؐ نے فرمایا "اونٹ اونٹنی کے بچے نہیں ہوتے تو کیا ہوتے ہیں!" وہ شخص آپؐ کا مطلب غلط سمجھا تھا آپؐ نے یونہی ہنسی سے اونٹ کہنے کے بجائے اونٹنی کا بچہ کہہ دیا تھا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ شاید آپؐ نے چھوٹے کم عمر بچے کے لیے حکم دیا ہے۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

اسی طرح ایک دفعہ ایک بوڑھی عورت اُمِّ زبیر خدمتِ بابرکت میں آئیں اور آپ سے کہا کہ "یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کیجیے کہ اللہ مجھے جنت میں جگہ دے۔" آپؐ نے فرمایا "اے اُمِّ زبیر! بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔" یہ دل شکن جواب سن کر وہ بے چاری بہت مایوس ہوئیں اور انھوں نے پوچھا کہ "کیوں بوڑھی عورتوں نے کیا کیا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گی؟" آپؐ نے فرمایا "تم نے قرآن میں پڑھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت والیوں کو نوجوان اور دوشیزہ پیدا کرے گا تو پھر بوڑھیاں وہاں کیسے جا سکتی ہیں۔" آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ ان کا بڑھاپا باقی نہ رہے گا، اس لیے ان کو اس حالت کے لحاظ سے بوڑھی کہنا درست نہیں ہے۔ آپؐ نے بطور خوش طبعی اُمِّ زبیر سے اس طرح فرمایا کہ ان کو آپؐ کا مطلب سمجھنے میں مغالطہ ہوا حالانکہ آپ نے

جو کچھ فرمایا تھا وہ بالکل درست تھا۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸)

مگر ان واقعات سے آپ کی شگفتہ مزاجی کے علاوہ آپ کی راست گفتاری کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ ہنسی سے بھی غلط بیانی نہیں فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آپؐ سے کہا "یا رسولؐ اللہ! آپ ہم سے مزاح فرماتے ہیں۔" یہ بات ان لوگوں کو آپؐ سے عجیب معلوم ہوتی تھی۔ آپؐ نے اس کے جواب میں فرمایا "ہاں مگر میں کبھی حق اور صدق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔ (شمائل ترمذی ص ۱۸) آپؐ نے متبعین کو سچ کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ مزاح میں بھی جھوٹ بولنے کو منع کیا۔

آپؐ لوگوں کو کھیلنے کودنے اور خوشی منانے سے بھی منع نہیں فرماتے تھے کیونکہ آپ کو اللہ نے بالکل ٹھیک طور پر بتا دیا تھا کہ فی الحقیقت انسان کے لیے کون سی بات مضر ہے اور کون سی نہیں۔ اور آپ کو معلوم تھا کہ نیکی اور پارسائی، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کے بھی منافی نہیں ہے۔ اور انبساطِ روح کے لیے کسی قدر تفریح بھی ضروری ہے۔ بلکہ اسی وجہ سے کبھی کبھی آپ خود بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں حضرت ابوبکرؓ آ گئے۔ وہ عید کا دن تھا اور دو لڑکیاں وہی گیت گا رہی تھیں جو انصار نے جنگِ بعاث کے دن جوڑا تھا (یہ لڑائی ہجرت سے تین سال قبل اوس اور خزرج میں ہوئی تھی) ابوبکرؓ نے ان کو دیکھ کر کہا کہ "یہ شیطان کے باجے ہیں۔" مگر آپؐ نے کچھ خیال نہ فرمایا، تو انھوں نے دوبارہ یہی کہا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا "اے ابوبکر! ان کو گانے دو، کچھ مت کہو، ہر قوم کا کوئی خوشی کا دن ہوتا ہے، اور آج کا دن ہمارے لیے عید ہے۔" (بخاری ص ۵۵۹)

ایسے ہی بریدہ سے روایت ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کسی لڑائی پر تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ واپس آ گئے تو ایک حبشی لونڈی آئی، اس نے کہا "یا رسولؐ اللہ! میں نے نذر مانی تھی کہ جب آپ بخیریت واپس آئیں گے تو میں آپ کے سامنے گاؤں گی اور دف (ڈھول) بجاؤں گی۔" آپؐ نے فرمایا: "اگر تو نے یہ نذر مانی تھی تو اچھا گا اور بجا ورنہ نہیں۔" اس نے گانا بجانا شروع کیا۔ اس اثنا میں حضرت ابوبکر، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئے، مگر وہ گاتی بجاتی رہی۔ مگر جب حضرت عمرؓ آئے تو وہ ڈر کے مارے جھٹ چپ ہو گئی اور دف پر بیٹھ گئی۔ (مشکوٰۃ ص ۵۷۶)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ "ایک دن جناب رسالت مآبؐ تشریف فرما تھے کہ ہم نے باہر سے بچوں کی آواز سنی، آپؐ نے اٹھ کر دیکھا کہ ایک حبشن ناچ گا رہی تھی اور بچے آس پاس کھڑے تھے۔ آپؐ نے مجھ سے بھی کہا "عائشہ! آ تماشہ دیکھ۔" چنانچہ میں آئی اور آپؐ کے دوش مبارک پر ٹھڈی رکھ کر کھڑی ہو گئی اور آپؐ کی آڑ میں سے دیکھتی رہی، آپؐ نے مجھ سے کئی بار پوچھا کہ "اچھی طرح دل بھر کر دیکھ لیا یا نہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔ بات یہ تھی کہ میں تماشے سے زیادہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آپؐ کے دل میں میرا خیال اور محبت کس قدر ہے۔" اتنے میں حضرت عمرؓ آ گئے تو سب لوگ منتشر ہو گئے۔ (ترمذی ص ۵۲۹)

آپ اعدا کی آزار رسانی اور تکلیف دہی کو بھی اسی شگفتہ مزاجی سے برداشت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ "دیکھو اللہ نے مجھے قریش کی گالیوں اور کوسنے سے کیسا بچایا ہے، وہ لوگ مجھے مُذَمَّم (یعنی بُرا، قابلِ مذمت) کہہ کر بد دعائیں دیتے ہیں، حالانکہ میں مُحَمَّد (اچھا اور قابلِ تعریف) ہوں۔" (مشکوٰۃ) یعنی جب وہ مذمم کو کوستے ہیں

تو جو مذمم ہوگا اسی کو وہ کوسنا لگتا ہوگا اور وہی اُن کی گالیوں کا بُرا مانتا ہوگا۔ ہم مذمم ہیں ہی نہیں ہم تو محمد ہیں۔ یوں اللہ ہم کو ان کی بد زبانیوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اگر وہ ہم کو محمدؐ سمجھ لیں تو پھر بُرا ہی کیوں کہیں۔

ان مثالوں سے جہاں آپؐ کی شگفتہ مزاجی معلوم ہوتی ہے وہیں اس میں آپ کے اعتدال اور میانہ روی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ہم کو یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہم کو آپس میں کیسے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ اور اگر ایک دوسرے سے مذاق کریں تو کس حد تک۔ اگر ہر وقت مُنہ پھُلائے رکھنا اچھا نہیں تو یقیناً ہر وقت کی دل لگی بھی مناسب نہیں۔ آدمی کو نہ ایسا ہونا چاہیے کہ "افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را" کا مصداق ہو اور نہ ایسا کہ لوگ اس کی ہر وقت کی چھیڑ خانی اور ہنسی مذاق سے تنگ آجائیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ خبردار! بہت ہنسنے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس سے دل مرجاتا ہے اور چہرے کا نور جاتا رہتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۴۵۳)

ایک اور حدیث ہے کہ "افسوس اس شخص پر جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹی باتیں بناتا ہے۔" (مشکوٰۃ ص ۴۵۲)

اتباعِ سنّت اور ہم

مسلمانوں کو شروع سے اس بات پر ناز رہا ہے کہ جس سچی محبت اور دلی عقیدت سے انھوں نے اپنے مخبر صادق جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے حالات و روایات کو محفوظ رکھا ہے اور جس احتیاط و التزام سے وہ آپؐ کی احادیث و سُنن پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی نظیر دُنیا کی کسی قوم اور کسی مذہب میں نہیں مل سکتی۔ بلاشبہ ان کا یہ ناز بجا اور یہ فخر زیبا ہے۔ اب اس گئے گزرے زمانے میں بھی باوجودیکہ الحاد و ارتداد کا اس قدر زور ہے تاہم غالباً دنیا کے پردے پر کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کے دل و دماغ کے کسی نہ کسی کونے میں آں جنابؐ کی محبت اور عظمت کا کچھ مٹا مٹایا نشان باقی نہ رہا ہو اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا شخص ہو تو اس کے تمام ادعائے اسلام کے باوجود بھی اسے قطعاً مسلمان نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عقیدۂ توحید کے بعد حق فی الجملہ اور اقوامِ عالم میں بھی کسی نہ کسی صورت میں پایا ہی جاتا ہے۔ مسلمانوں کا مایۂ ناز و نشانِ امتیاز صرف محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو یقیناً کچھ بھی نہیں۔ اور اس کے سامنے مذہب کا نام لینا ہی فضول ہے۔ بہرکیف یہی محبت اتباعِ سنّت کی سب سے بڑی محرک ہے، اور اتباعِ سنّت ہی اس محبت کی سب سے بہتر علامت ہے کیونکہ اگر محبوب کی ہر ایک ادا محبوب نہیں ہے تو محبت کا دعویٰ جھوٹا اور غلط ہے۔ مجنوں اپنی لیلیٰ کی مشابہت کی وجہ سے آہوان صحرا پر قربان ہوتا ہے اور اُس کی ادنیٰ ملابست کے سبب سے سگِ لیلیٰ کو چومتا ہے، اور یہی اُس کے مجنونِ محبت اور مفتونِ الفت ہونے کا ثبوت ہے۔ اس لیے اگر اتباعِ سنّت کی غایت و غرض صرف اثباتِ محبت ہی ہو تب بھی حضور سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی ہر ایک بات واجبِ تقلید ہے۔ لیکن ہم کو تو اس کی بدولت اس سے بھی زیادہ حوصلہ افزا امیدیں ہیں ہم کو تو یقین واثق ہے کہ اگر ہم کو اللہ اس کی توفیق دے تو ہم محبِ رسول ہو کر محبوبِ خدا بن جائیں، کیونکہ وعدۂ صادقہ ہے کہ:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔

اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہیے کہ اتباعِ سنّت کے کیا معنیٰ ہیں۔ مگر معاف کیجئے قطع کلام ہوتا ہے مجھے یہیں یہ جملہ معترضہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ میرا روئے سخن صرف انہی اصحاب کی طرف ہے جن کے دل میں کچھ مذہبی حمیت اور اسلام کی محبت باقی ہے۔ اور یہاں میرا خطاب ان لوگوں سے نہیں ہے جو سرے سے مذہب کو ضعیف الاعتقادی اور وہم پرستی کا مرادف اور اخلاق اور نیکی کو حفظ نفس اور نفع ذات کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جہاں فرائض کی فرضیت سے ہی انکار ہو وہاں اتباعِ سنن کب مستحب ہو سکتا ہے، اس لیے میں ان سے قطع نظر کرتا ہوں۔

ہاں تو اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اتباعِ سنّت کے کیا معنی ہیں، میرے خیال میں اس کے معنی تو صاف ہیں اور ان کے سمجھنے میں تو کچھ دقت نہیں ہوئی۔ البتہ چونکہ اس پر عمل کرنا ذرا آسان نہ تھا۔ اس لیے اس میں تساہل و تغافل سے کام لیا گیا۔ بلاشبہ بالعموم مسلمان بہت سی باتوں میں سنّتِ نبوی پر چلتے ہیں یا کم سے کم چلتے تھے، جب تک کہ انھوں نے ایمان کو نفاق کے عوض اور اخلاص کو ریا کے بدلے نہیں دیا تھا لیکن کیا سنّت نبوی کی پیروی فقط یہی ہے کہ تحیۃ نماز کے ساتھ دو چار رکعتیں اور پڑھ لی جائیں۔ کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول رہا ہے یا یہ کہ لبیں ترشوا لی جائیں یا پائنچوں کو ٹخنوں سے اونچا رکھا جائے یا دوپہر کو قیلولہ کیا جائے، کیونکہ یہ حضور سرورِ کائناتؐ علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی وضع تھی بلاشبہ یہ باتیں بھی اچھی ہیں کیونکہ آنجناب کی تقلید جس قدر چھوٹی سے چھوٹی اور جزوی سے جزوی بات میں بھی، ہو سکے عین سعادت ہے۔ مگر دنیا میں ہمیشہ پھول پتوں سے پہلے جڑ اور تنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور عمارت سے پہلے اس کے نقش و نگار کا وجود ممکن نہیں ہوتا۔ فرع اور اصل کا جو تعلق ان باتوں میں ہے وہی مذہب میں بھی ہے۔ اور اتباعِ سنن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ محض ظاہری وضع و صورت میں آنجنابؐ کی تقلید کرنا اور اخلاقِ حسنہ اور خصائلِ جمیلہ میں آپ کا اتباع نہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے جڑ کے بغیر پھول یا مکان کے بغیر نقش و نگار کا خیال کیا جائے۔

انسان کے نقطۂ خیال سے اشیائے عالم کے مفید ہونے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ اشیاء خود ہی مقصود بالذات ہوں، جیسے غلہ کہ آدمی کو ہر حال میں اس کی ضرورت رہتی ہے۔ یا یہ کہ وہ اگرچہ بذاتِ خود تو کچھ مفید اور کارآمد نہ ہوں۔ لیکن اشیاءِ مرغوبہ کے حصول کا واسطہ اور ذریعہ بن سکتی ہوں، جیسے روپیہ کو وہ بذاتِ خود محض بیکار چیز ہے۔ مگر چونکہ اس سے ضروری چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں اس لیے وہ بھی ضروری سمجھا جانے لگا۔ انسان کی ساری کوششیں بہرحال انھیں دونوں قسموں کے حصول پر مصروف رہتی ہیں۔ اور اس کی تمام تگ و دو انہی کے دائرے میں محدود ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال نیکی کا بھی ہے۔ بعض نیکیاں تو مقصود بالذات ہیں جیسے سچائی، انصاف، شفقت، اطاعت وغیرہ اور بعض ان کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ جیسے قیام و قعود یا روزہ میں ترکِ آب و دانہ وغیرہ غرض ہم تعمیم کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقی خوبیاں مقصود بالذات ہیں اور مذہبی عبادتیں ان کے حاصل کرنے کا طریقہ اور واسطہ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان عبادات ظاہری کی ضرورت اور فرضیت میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ غالباً اس سے کسی کو انکار نہ ہو کہ فی نفسہٖ روپیہ بالکل نکمی چیز ہے کیونکہ آدمی خود اسے نہ کھا سکتا ہے نہ پہن سکتا ہے نہ وہ کسی درد کی دوا ہے نہ کسی مرض کا علاج۔ لیکن کیا اس سے اس کی قیمت یا حاجت کچھ کم بھی ہو جاتی ہے۔ حقیقت میں عبادتوں کی معقولیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کوئی نمایاں اور عملی فائدہ ہو۔ اور خواہ اور مذاہب نے ان کی اس حقیقت کو سمجھا ہو یا نہیں۔ اسلام نے تو بالکل صاف طور پر اس کا اعلان

کر دیا ہے۔ چنانچہ نماز کا جہاں حکم دیا ہے وہیں اس کی غایت اور غرض بھی بتا دی ہے کہ:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ وَ لَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ ط (عنکبوت ع ۵)

بے شک نماز ناپسندیدہ اور مکروہ باتوں سے روکتی ہے اور البتہ اللہ کا یاد کرنا زیادہ بڑی بات ہے۔

احادیثِ نبوی سے اس فرمان کی اور بھی زیادہ وضاحت اور صراحت ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہ ارشاد خاص طور پر قابلِ غور ہیں:

مَنْ لَّمْ تَنْتَہِہٖ صَلٰوتُہٗ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ لَمْ یَزْدَدْ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا بُعْدًا۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳ جزو اول)

جس شخص کو اس کی نماز نے ناپسندیدہ اور مکروہ باتوں سے نہ روکا اس نے اُسے اللہ سے اور بھی زیادہ دُور کر دیا۔

کَمْ مِّنْ قَآئِمٍ حَظُّہٗ مِنْ صَلٰوتِہِ التَّعَبُ وَ النَّصَبُ۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳، جزو اول)

بہت سے ایسے قیام کرنے والے ہیں کہ ان کی نماز سے ان کو بجز کوفت اور تکلیف کے اور کچھ حاصل نہیں۔

لَیْسَ لِلْعَبْدِ مِنْ صَلٰوتِہٖ اِلَّا مَا عَقَلَ مِنْھَا۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳ جزو اوّل)

بندے کے لیے اس کی نماز میں سے وہی ہے جو اس نے سمجھ کر کیا (یعنی اگر بے سوچے سمجھے ادا کی تو اس سے کچھ نتیجہ نہیں)

اِنَّمَا الصَّلٰوۃُ تَمَسْکُنٌ وَ تَوَاضُعٌ وَ تَضَرُّعٌ وَ تَاَوُّہٌ وَّ تَنَادُمٌ۔ (احیاء العلوم ص ۱۴۳ جزو اول)

بے شک نماز خاکساری اور تواضع اور گریہ وزاری اور شرمساری ہے۔

اسی طرح جہاں روزہ کی فرضیت کا ارشاد ہوا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ:

وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (البقرہ ع ۲۳)

تاکہ تم گنتی کو پورا کرو اور اللہ نے جو سیدھا راستہ تم کو دکھایا ہے اس پر اس کی بزرگی بیان کرو اور شاید کہ تم اُس کے احسان پر شکر ادا کرو۔

اور جناب رسالتمآبؐ نے یہ فرما کر اُس حکم کو اور زیادہ صاف کر دیا ہے کہ:

مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَ الْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَہٗ وَ شَرَابَہٗ۔ (بخاری ص ۱۵۵)

جو شخص قولاً و فعلاً جھوٹ نہیں چھوڑتا اللہ کو اُس کے کھانا پینا چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو نماز، روزہ مقصود بالذات ہیں وہ محض ارکانِ ظاہری میں محدود ہی نہیں بلکہ وہ ان تمام محاسنِ باطنی پر بھی حاوی ہیں جن پر تمام صفاتِ حمیدہ و اخلاقِ پسندیدہ کا انحصار ہے۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان چیزوں کے مقصود بالذات ہونے کی نسبت ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ نسبتی ہے۔ یعنی گو غلہ اگرچہ روپیہ کے مقابلہ میں مقصود بالذات ہے مگر حقیقت میں وہ بھی صرف غلہ ہونے کی وجہ سے مطلوب نہیں۔ بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ مدارِ صحت ہے اور صحت بنائے حیات ہے۔ اور قیامِ حیات ہماری ساری جسمانی اور مادی کوشش اور کشمکش کا غایت الامال ہے۔ اس طرح اگرچہ اعمال و عبادات ظاہری کے مقابلہ میں اخلاقی نیکیاں مقصود بالذات ہیں۔ مگر خود ان کی ضرورت تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کے لیے ہے، اور دل کی پاکیزگی اور نفس کی صفائی معرفتِ الٰہی اور تقربِ ربانی کی طرف رہبر ہے اور یہی ہماری تمام روحانی ترقی اور باطنی اصلاح کا معراجِ کمال ہے اور یہی وہ بے بہا انعام ہے جس کا اتباعِ سنّت کے صلہ میں ہم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ؕ (کہف ع ۱۲)

پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا آرزومند ہے اُسے چاہیے کہ وہ نیک کام کرے اور اپنے اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

مگر غور کیجئے کہ کیا یہ انعام ہم کو کسی رسمی عبادت سے مل سکتا ہے، کیا اس سے کہ ہم کسی جسمانی ریاضت کے مستحق ہو سکتے ہیں، کیا اس اعلیٰ علیین تک ہم محض ظاہری اتباعِ سنّت سے پہنچ سکتے ہیں۔ کیا یہ روحانی کمال سرسری نمائش اعمال کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ حاشا و کلا یہ کسی طرح ممکن نہیں، اس کے لیے اطمینانِ قلب کی ضرورت ہے۔ جو کامل اخلاقی اعتدال کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور کامل اعتدال کی بہترین مثال وہ ہے جس کا کچھ سرسری سا خاکہ ہم نے گزشتہ اوراق میں پیش کیا ہے۔ پس ہمارا نصب العین یہی ہے۔ اگر ہم سچے دل سے مذہب کو مانتے ہیں، اگر ہم خلوصِ نیت سے سنّتِ نبویؐ پر چلنا چاہتے ہیں، یعنی بہ الفاظِ دیگر اگر ہم سچ مچ اپنے خدا سے ملنے کے آرزومند ہیں تو ہم کو اپنے آپ میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں جو آپ کی ہر ایک بات میں مضمر تھیں اور جنھوں نے آپ کو بہترین مخلوقات بنا دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ہم اس درجے تک کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں ہم مانتے ہیں کہ ذرہ آفتاب نہیں بن سکتا۔ پھر بھی جو ذرہ آفتاب کی ضو میں آتا ہے وہ آفتاب نہیں تو تارے کی طرح چمکنے ہی لگتا ہے۔ لیکن جو ذرہ آفتاب کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا اس کو ازلی سیاہ روئی اور دائمی تیرہ بختی کے سوا اور کیا نصیب ہو سکتا ہے۔ غالب مرحوم نے خوب کہا ہے: ؎

گفتمش ذرّہ بہ خورشید رسد، گفت محال

گفتمش کوشش من در طلبش، گفت رواست

بہرحال اس ظلمت پسند ذرّے کی سیاہ روئی تو اسی کے افعال کا نتیجہ ہے۔ مگر ظلم تو یہ ہے کہ وہ اپنی تیرہ بختی سے نورِ آفتابِ عالمتاب کو بدنام کرتا ہے۔ جس کا اس کو کچھ حق نہیں کیونکہ وہ خود اس سے روگرداں ہے۔ خیال کیجئے کہ کیا ہم جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اس سے بڑا کوئی الزام لگا سکتے ہیں کہ ہم چند آسان اور سرسری سی باتیں لے کر تمام سنّتِ نبوی کو انہی میں محدود سمجھیں اور صرف انہی کے اتباع کا التزام کر کے عملاً دنیا کو یہ دکھائیں کہ گویا جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری خوبیوں کا خلاصہ یہی ہیں۔

میرے خیال میں آپ کی شان میں اس سے بڑھ کر کوئی گستاخی اور بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے اعمال ظاہری کا استخفاف مدّنظر نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی یہ تو بدیہی بات ہے کہ مذہبی حیثیت سے یہ اعمال جسمانی اور افعال ظاہری مقصود بالذات نہیں ہیں اور اگر ان کی اصلی غایت وغرض سے قطع نظر کر لی جائے تو یقیناً وہ بے معنی اور مہمل ہو جاتے ہیں۔ سچ ہے: ؎

دلِ آگاہ می باید وگرنہ

گدا یک لحظہ بے نامِ خدا نیست

مولوی معنوی علیہ الرحمۃ نے اسی اصول کو اس پُر زور پیرایہ میں بیان کیا ہے: ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است　　از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

کعبہ بنگاہِ خلیل آزر است　　دل گزرگاہِ جلیل اکبر است

کعبۂ کوراں ز آب و گل بود　　کعبۂ روشن ضمیراں دل بود

انصاف شرط ہے۔ کیا اتباعِ سنّت یہی ہے کہ ہم خوان پر کھانا کھانے سے تو پرہیز کریں، کیونکہ آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ لیکن اس بات کا کبھی بھولے سے بھی خیال نہ کریں کہ آپ کی غذا بالعموم کیا تھی، اور جو کچھ تھی وہ کس وجہ سے تھی چمچے کے استعمال سے تو اتنا احتراز مگر کھانا لذیذ سے لذیذ اور پُر تکلف سے پُر تکلف حلق تک ٹھونس لینا اور اپنے غریب بھائیوں اور فاقہ زدہ ہمسایوں سے ایسی لاپروائی اور بے اعتنائی برتنا، گویا وہ آدمی ہی نہیں ہیں۔ کیا یہ سنّتِ نبوی کا منہ چڑانا نہیں ہے؟ اسی طرح اگر پائنچے ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائیں تو ان پر اتنا اعتراض ہو لیکن اس کے سوا اگر لباس کبر و نخوت کا سبب یا ریا و نمائش کا ذریعہ بن جائے تو کچھ نہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح طور پر سنّت کی پیروی نہیں ہے۔ بلا شبہ آپ کا طرزِ عمل یہی تھا۔ لیکن یقیناً یہ باتیں مقصود بالذات نہیں تھیں اس لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ آپ ایسا کرتے کیوں تھے۔ اگر آپ اب تک نہیں سمجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے محاسنِ اخلاق کا علم نہیں ہے۔ اور آپ نے اس کتاب کے گزشتہ باب نہیں پڑھے ہیں۔ اس لیے پھر ورق گردانی کیجئے اور دیکھیے کہ ان باتوں سے آپ کا مدعا کیا تھا، یہ کہ آپ کی طرح آپ کے متبعین میں بھی صبر و شکر، سخاوت و مروّت، ایثار و ہمدردی، جفاکشی و وفا شعاری کی صفات محمود پیدا ہو جائیں اور غرور و تکبر، حسد و ہوس، خود نمائی اور خود پسندی، شکم پروری اور تن آسانی وغیرہ خصائل مذمومہ کا انسداد ہو سکے۔ اب اگر ہم میں وُہ باتیں ہیں اور یہ نہیں ہیں تو ہمارا جس طرح جی چاہے کھانا کھائیں اور کپڑا پہنیں۔ اصلی مقصود حاصل ہو گیا۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو خوان اور چمچے کے ساتھ اگر ہاتھوں کا استعمال بھی ترک کر دیں یا پائنچوں کو ٹخنوں سے کیا گھٹنوں سے بھی اوپر چڑھا لیں تب بھی نتیجہ ہیچ۔ اور اتباعِ سنّت معلوم ہاں البتہ اگر یہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرنے کے بعد پھر بہ مزید ادب و احتیاط و بہ فرطِ محبت و عقیدت آپ کی اس وضع ظاہری کی بھی تقلید کی جائے، تو کیا کہنا، نورٌ علیٰ نور۔ تب یہ سچ مچ کا اتباع سنت ہو۔ خدا اس کی توفیق سب کو دے۔

یہی کیفیت نماز روزے کی بھی ہے۔ شاید مجھے یہ نہ کہنا چاہیے کہ نماز روزہ باوجود ایں شدّت تاکید مقصود بالذات نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارا رسمی روزہ نماز اصل میں روزہ نماز ہے ہی نہیں۔ صوم و صلوٰۃ کی جو تعریف خدا اور رسولؐ نے فرمائی ہے

وہ اس پر منطبق ہی نہیں ہوتی۔ وہ تزکیۂ نفس و تصفیۂ باطن کا بہترین راستہ ہیں۔ اور اس میں قیام و قعود اور ترک آب و نان کے سوا اور کچھ بھی خوبی نہیں اس لیے وہ بلاشبہ مقصود بالذات ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف ان کی یہ حالت ہے کہ بقول غالب مرحوم: ؎

تن پروری خلق فزوں شد زریاضت
جز گرمیِ افطار نہ دارد رمضاں ہیچ

کیا یہ مناسب ہے کہ ہم نماز پڑھیں مگر برائیوں سے باز نہ آئیں۔ روزے رکھیں مگر اس سے صبر و حلم کے بجائے حرص و ہوس اور غصہ اور بدمزاجی پیدا ہو جائے حالانکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہم کو یہ بتاتی ہے کہ ایک غیبت سے روزہ اور نماز اور وضو سب کچھ فاسد ہو جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اسلام کی مقرر کردہ عبادتیں انسان کو اس کے مقصدِ حیات تک پہنچانے کے لیے بہترین اور قریب ترین راستہ بتاتی ہیں۔ اس لیے ان سے اعراض کرنا نہایت ہی سخت غلطی اور بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ لیکن بظاہر اس صراطِ مستقیم پر چلنا، مگر فی الواقع بدمستوں کی طرح وہیں پاؤں پٹک پٹک کر رہ جانا اور اپنے مقصودِ اصلی کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھانا اس سے بھی بڑا قصور اور اس سے بھی بدتر جرم ہے۔ لسان العصر اکبر نے خوب کہا ہے: ؎

وہ بھی گمراہ ہے جو خضر کا طالب نہ ہوا
وہ بھی نادان ہے جو خضر کو منزل سمجھا

ہمارے ہاں خدا کے فضل سے ایسے بزرگ تو اب بھی بہت مل جائیں گے جو ہمیشہ روزے رکھتے ہیں اور جن کی نماز کبھی قضا نہیں ہوتی اور جو اور طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے اصحاب بہت کم ہوں گے جن کو اپنے گھر میں کوئی خلافِ طبع واقعہ پیش آ جانے پر غصہ نہ آتا ہو، جو اپنے خادم پر خفا نہ ہوتے ہوں، جو کسی محبوب امر میں اپنے بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوں۔ اور جو اپنی نکوکاری پر مغرور ہو کر کسی دوسرے کو حقیر نہ سمجھتے ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے لوگ ہیں ہی نہیں۔ خدا کے بندے ایک سے ایک بہتر و برتر ہیں۔ مگر ہاں ان کی کمی بہت ہے۔ اور چونکہ ہم خود ایسے نہیں ہیں اس لیے غالباً ہم کو وہ کہیں نظر بھی نہیں آتے۔ لیکن اتباعِ سنت یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک ایسا اور اس سے بھی اچھا ہو جائے۔

مگر زیادہ قابلِ افسوس حالت تو طبقہ جدید کی ہے۔ مصلحانِ قوم نے محاسنِ باطنی پیدا کرنے کے لیے رسمی عبادتوں اور ظاہری قیدوں کی اہمیت کو گھٹایا تھا۔ ہماری بدقسمتی سے یہ تو مٹ گئیں مگر وہ پیدا نہ ہوئیں۔ ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ۔ ان بزرگوں پر تو یہ اعتراض ہے کہ ان میں ظاہرداری زیادہ اور حقیقی نیکیاں کم تھیں مگر اب ہم سے تو وہ حقیقی نیکیاں بھی کوسوں دور ہیں اور اسلام کی ظاہری شان کا بھی پتا نہیں۔ آج کل تو حالت یہ ہے کہ: ؎

وضع میں طرز میں اخلاق میں سیرت میں کہیں
نظر آتے نہیں کچھ حرمتِ دیں کے آثار

البتہ اس سارے غل شور کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانانِ وطن نے مذہب کو کھو کر قوم اور ملک کا نام سیکھا ہے۔ مگر وہ اتنا نہیں سوچتے کہ قوم کا تو وجود ہی مذہب سے ہوا ہے اور ملک مسلمانوں کا اب کوئی باقی نہیں رہا۔ جن خوش نصیبوں کو خدا نے یہ بے بہا

نعمتیں دی ہیں وہ چاہیں تو اپنے مذہب کو ان پر قربان کردیں یا اپنی حسنِ تدبیر سے اسے بھی سنبھال لیں اور ان کو بھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس تو لے دے کر اسلام کا نام ہی رہ گیا ہے۔ اور اگر یہ بھی گیا تو پھر ایسے سیلِ حوادث میں کاروانِ رفتہ کے اس مٹے مٹائے نقشِ قدم کا باقی رہنا معلوم۔

اے نفس! خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔ نشۂ نخوت سے ہوش میں آ۔ آخر یہ بےخودی کب تک۔ یہ حق ناشناسی تا کے۔ وہ وقت بہت قریب ہے جب تجھے بارگاہِ احکم الحاکمین میں حاضر ہونا ہوگا، جہاں اپنی زندگی بھر کے ایک ایک کام، ایک ایک خیال، ایک ایک نیت کا ذرا ذرا حساب دینا پڑے گا، جہاں تیرے اعضاء و جوارح تیرے خلاف شہادت دیں گے۔ جہاں تیرے مخفی ارادے اور پوشیدہ مدعا ظاہر ہو جائیں گے۔ اور ریا اور تصنع کا پردہ اُٹھ جائے گا۔ جہاں اعمال و افعال اپنی اصلی حالت میں نظر آئیں گے اور اُن کی ٹھیک قیمت لگائی جائے گی۔

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ (انبیاء ع ۴) — اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم نہایت عمدہ حساب کرنے والے ہیں۔

تو خود ہی سچے دل سے انصاف کر اور دیکھ۔ کیا تو اس دن کی جواب دہی کے لیے تیار ہے؟ کیا تو اس عدالت کی باز پرس سے بےخوف ہے؟ تو اس کا جواب آج یہیں دے۔ کیونکہ وہاں بھی تیرا نامۂ اعمال تیرے ہاتھ میں ہی دیا جائے گا اور تجھ سے ہی انصاف چاہا جائے گا۔

اِقْرَأْ كِتَابَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ط (بنی اسرائیل ع ۲) — تو اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے۔ آج تو ہی خود اپنے لیے اچھا حساب کرنے والا ہے۔

تو اپنے مال و جمال پر مغرور ہے۔ اپنی دولت و ثروت پر فریفتہ ہے۔ اپنی طاقت اور حکومت پر دلدادہ ہے۔ اپنے علم و عمل پر نازاں ہے۔ یہ سب حیاتِ دُنیوی کی دل آویزیاں اور نظر فریبیاں ہیں۔ تجھے اپنے تقویٰ اور پارسائی پر غرہ ہے اپنی نکوکاری اور پرہیزگاری کا گھمنڈ ہے اپنے حسنِ اعمال اور کثرتِ عبادت پر بھروسا ہے اپنی شب بیداری اور اطاعت گزاری پر اعتماد ہے۔ یہ اچھے کام ہیں خدا قبول کرے۔ مگر کیا تجھ کو یقین ہے کہ یہ سب عمل اغراضِ نفسانی کی آمیزش سے پاک اور نمود و نمائش کی آلائش سے مبرّا ہیں اور ان میں شہرت طلبی اور جاہ پرستی کا مطلق شائبہ نہیں ہے۔ کیا تجھ کو اطمینان ہے کہ پابندی صوم و صلوٰۃ نے تجھ میں خود پسندی اور خود ستائی پیدا نہیں کی۔ اور تُو نے اپنے زُہد و اطاعت کے زعم میں کسی دُوسرے کو حقیر نہیں سمجھا اپنے آپ کو اچھی طرح دیکھ اور یقین کر لے کہ اگر ان میں سے کوئی برائی بھی تجھ میں موجود ہے تو تیرے عمل ناقص اور تیری عبادتیں ناقابلِ قبول ہیں۔ بارگاہِ رب العزت میں ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں وہاں فقط ایک بات دیکھی جاتی ہے اور وہ خلوص ہے اگر تُو نے جو کچھ کیا ہے خلوص اور نیک نیتی سے کیا ہے تو تیرا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، سونا، جاگنا غرض ہر ایک کام عبادت میں داخل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ تجھ میں خلوص نہیں ہے تو تیرے تمام اعمال بیکار ہیں نہ تُو نے کوئی فرض ادا کیا نہ کسی سنّت کی پیروی کی۔ اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اسی لیے تو ارشاد ہوا ہے کہ:

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ — اور بیشک تیرا پروردگار اپنے بندوں کی زیادتیوں کے باوجود بھی ان کو بہت بخشنے والا ہے اور بیشک

الْعِقَابِ ط (رعد ع ۲) تیرے پروردگار کا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔

وہاں غلطیوں پر پکڑ نہیں ہوگی۔ آدمیوں سے غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں وہاں لغزشوں پر گرفت نہ کی جائے گی۔ لغزش سے تو انسان کا خمیر ہی ہوا ہے اگر ان پر سزا دی گئی تو کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ مگر وہ بڑا غفور الرحیم ہے، ہاں اس کی سند نہیں کہ جان بوجھ کر پھسلیں اور سنبھلنے کی کوشش نہ کریں دیدہ و دانستہ غلطیاں کریں اور ان سے باز نہ آئیں۔ اتباعِ سنّت کے دعوے تو بڑے لمبے چوڑے ہوں۔ مگر اخلاقِ نبوی کے اختیار کرنے کا کبھی ارادہ تک نہ کیا جائے ارکان مذہبی کی ظاہری پابندی تو بڑے شدومد سے کی جائے لیکن دل میں صداقت اور خلوص کا نشان تک نہ ہو۔ لیکن معاف کیجئے میں کیا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں مجھے شرم آنی چاہیے کہ میں صداقت اور خلوص کا نام لیتا ہوں جب کہ خود مجھ میں ان کا نام ونشان بھی نہیں۔ جو نگاہ میں نے دوسروں کی نکتہ چینی کے لیے اٹھائی تھی اتفاق سے وہ خود میرے ہی افعال پر جا پڑی اور میں نے حسرت و افسوس سے دیکھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور جو کچھ لکھ رہا ہوں اگرچہ وہ صداقت اور خلوص پر مبنی ہے۔ لیکن حیف کہ صداقت اور خلوص سے معرا ہے۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس میں بھی میری کیا کیا ذاتی غرضیں کون کون سی نفسانی خواہشیں مضمر اور مستتر ہیں۔ سچ یہ ہے کہ کہنا بہت آسان ہے مگر کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر اس سے زیادہ دو روئی کو میری طبیعت بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس لیے اس دُعا پر ختم کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ اللہ آپ کو اپنے فضل وکرم سے جناب سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سچی سنّت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور مجھے بھی اس کی برکت سے محروم نہ رکھے۔ آمین

رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ط رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ o رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ط اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ o

(آل عمران ع ۲۰)

اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک منادی کرنے والے کو سُنا کہ وہ ایمان کی منادی کر رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے ہیں۔ پس اے پروردگار! ہمارے قصور معاف فرما اور ہم سے ہمارے گناہ دُور کر اور نیک بندوں کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ بخیر کیجیو۔ اور اے پروردگار! جو کچھ تُو نے اپنے پیغمبروں سے وعدے کیے ہیں ہم کو نصیب کر اور قیامت کے دن ہم کو ذلیل اور رسوا نہ کیجیو۔ بے شک تُو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

جوہرِ خُلقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

شیخ الازہر عبدالحلیم محمود

ترجمہ : ڈاکٹر سید مطلوب حسین

اس مقالہ کو پیش کرنے کا اصل مقصد پیغمبر علیہ السلام کے محاسنِ اخلاق کا بیان یا اظہار ہے جن سے آپ کو مزین کیا گیا تھا اور جو تمام اخلاقِ حسنہ اور اعلیٰ کردار کی بنیاد اور ذریعہ ہیں ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ کے اخلاق کے بارے میں استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ اُمّ المؤمنین کی اس تعریف سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہتا ۔

باوجود اس بات کے کہ جو وصف اُمّ المؤمنین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے ہم اسے جامع اور مانع طریقے سے بیان کریں گے جو حتمی ہوگی اور شک و شُبہ سے بالا ہوگی ۔

قرآن کریم نے اخلاق کی کم سے کم حدود متعین کی ہیں لیکن فضیلت کی زیادہ سے زیادہ تصویر کشی کی ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مکارمِ اخلاق کی بلند ترین چوٹی کی نشاندہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم مقربین الٰہی کے درجات کے منابع نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ میانہ روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سابقین بالخیرات کی بات بھی کرتا ہے۔ وہ اصحاب الیمین کے بارے میں بھی بتاتا ہے اور مقربین کے بارے میں بھی گفت گو کرتا ہے۔ اور اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ مقربین کی تعداد اصحاب الیمین کی نسبت بہت کم ہے چنانچہ مقربین کی تعداد اوّلین میں زیادہ ہے اور آخرین میں کم۔ اصحاب الیمین اوّلین اور متاخرین دونوں میں بہت سے ہیں۔ اصحاب الیمین اور مقربین کے بارے میں سورہ واقعہ کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے ۔

ہم ایک مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت کریں گے۔ برائی کا بدلہ برائی سے دینا عدل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وجزآؤُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلھا (۴۲ : ۴۰)" لیکن قرآن کریم اس کو عدل کہنے کے باوجود اخلاقِ کریمانہ کا ایک اور درجہ بیان کرتا ہے اور وہ درجہ "کظم الغیظ" ہے۔ اور وہ شخص جو بُرائی کا بدلہ برائی سے دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود غصہ کو پی جاتا ہے وہ اخلاقِ کریمانہ کی میزان میں اُس شخص سے بلند درجہ کا حامل ہے جو برائی کا بدلہ بُرائی سے دیتا ہے ۔

قرآن کریم اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اخلاقِ عالیہ کا تیسرا درجہ بھی بیان کرتا ہے۔ اور یہ درجہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے اور غصہ کو پی جانے سے تجاوز کرکے عفو تک پہنچ جاتا ہے اور عفو کی قدرت رکھنے کی وجہ سے برائی کا بدلہ برائی سے دینے اور غصہ کو پی جانے سے کہیں بلند ہے۔ قرآن کریم اس سے آگے بلند ترین درجہ کا ذکر کرتا ہے۔ جو احسان کا درجہ ہے جس کے حامل مقربین الٰہی ہیں ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" (۳ : ۱۳۴)

"جو لوگ غصہ کو پی جانے والے ہیں۔ اور لوگوں پر احسان کرنے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ محسنین سے پیار کرتا ہے۔"

یہ سب اخلاقِ کریمانہ کے درجات ہیں اور یہ سبھی کریم ہیں البتہ ان کے درمیان تفاوت ہے جیسا کہ کریم اور اکرم کا تفاوت ہے اور شریف اور اشرف کے مابین فرق ہے۔ اس کے بعد ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم سوال کریں۔

جب حضرت عائشہ صدیقہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف یوں فرماتی ہیں کہ آپ کا اخلاق قرآن ہے تو کیا اُن کی مراد قرآن کے بیان کردہ اخلاق کے ادنیٰ درجہ سے تھی یا اُن کی مراد اخلاقِ قرآنی کے اوسط درجہ سے تھی یا اخلاقِ قرآنی کے بلند ترین درجہ کو بیان کرنے سے تھی۔ اس مسئلہ کو بھی قرآنِ کریم نے خود ہی حل کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہمارے سامنے خلقِ قرآنی کے اس درجہ کو ایک عام اور مجمل صورت میں بیان کرتا ہے جس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جا پہنچے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں بیان فرماتا ہے "وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم" "بے شک آپ خلقِ عظیم کے درجہ پر فائز ہیں۔

قاضی عیاض صاحب الشفاء لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کی تعریف اُن عطیات کی وجہ سے کی ہے جو خود اُن کو عطا کئے تھے اور جن کی طرف آپ کی ہدایت فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے مجد و شرف کے بیان کے لئے تاکید کے دو حروف (انّ۔ لَ) بیان کئے۔ کہا گیا ہے کہ خلقِ عظیم سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد آپ کی طبع کریم ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی استطاعت تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

علامہ واحدی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کی صفت بیان کی اور آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو قبولیت کی سند عطا فرمائی۔ اور آپ کے خلق کو آپ کے ماسوا پر فضیلت دی کیونکہ یہ اخلاقِ کریم آپ کو جبلی طور پر عطا ہوئے تھے۔ صحابہ کرام اور تابعین سے بھی اس آیتِ کریمہ کے بارے میں گفتگو کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام سے بڑھ کر کوئی دین محبوب نہیں اور اسلام سے بڑھ کر وہ کسی دین سے راضی نہیں ہے۔

حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احکام کا امتثال امر فرماتے تھے اور جس سے اللہ تعالیٰ آپ کو روکتا تھا ترک جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ یا رسول اللہ آپ اس خلقِ عظیم پر پورے اترتے ہیں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کریم میں دیا ہے۔ ان سب کے ساتھ اس آیتِ کریمہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس سے آپ کی تمجید و ثنا کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور ہمارے اس ایمان کے باوجود کہ یہ آیتِ کریمہ ان تمام عظمتوں پر مشتمل ہے جو اب تک بیان کئے جاتے رہے ہیں۔ اور وہ تمام مطالب شریفہ جو بیان کئے جاتے رہے ہیں اور بیان کئے جاتے رہیں گے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر و تشریح بیان کے آخری درجہ کی محتاج رہے گی۔

اس خلقِ عظیم کے بارے میں کچھ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ اس میں کوئی اور مکرّم و محترم نبی یا کوئی برگزیدہ رسول یا کوئی

نہایت مقرب فرشتہ حضور علیہ السلام کے ساتھ شریک ہے؟

کیا سیدنا ابراہیم علیہ السلام خلق عظیم کے اس بلند مرتبہ پر فائز نہیں تھے جبکہ وہ حلیم اور سلیم الطبع تھے؟

کیا سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام اِس خلقِ عظیم کے حامل نہیں تھے جبکہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی تھے؟

کیا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اِس خلقِ عظیم پر فائز نہیں تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کی تمام برکتیں اُن پہ تھیں جہاں کہیں وہ گئے؟

اور ملائکہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی عدم تعمیل نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس پر کہ انہیں مامور کیا گیا ہے۔ حالانکہ اُن کے درمیان حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہم السلام اور حاملین عرش شامل ہیں کیا وہ بھی خلقِ عظیم کے حامل نہیں ہیں؟

کیا اُن میں سے کوئی مکارم اخلاق کے اس بلند درجہ پر پہنچا جن پہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز تھے؟

وہ کونسا مقام تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بلند ترین اخلاق کے ساتھ استادہ تھے؟

اس سوال کو قرآن شریف اس درجہ تک حل کر دیتا ہے کہ شرح صدر اور صاف دلی کے ساتھ ہم رسول اللہ کی جذباتی محبت کے متحمل ہوتے ہیں۔ بے شک قرآن حکیم اِس مسئلہ کو اس صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ کوئی چیز پردۂ راز میں نہیں رہتی اور وہ آیات جن میں آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے اِس ضمن میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (۶ - ۱۶۲ : ۱۶۳)

"کہہ دے کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میری حیات و موت رب العلمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کے لئے مجھے مامور کیا گیا ہے اور میں اوّل المسلمین ہوں۔"

قرآنِ کریم کی یہ آیت حضور علیہ السلام کے اعلیٰ ترین درجۂ اخلاق کے بارے میں بیان کرتی ہے بے شک یہ علوِ اخلاق کا بلند ترین مقام ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لازوال کوششوں، اپنی روزمرہ زندگی، اپنے افعال اور اپنے پیغمبرانہ اعجاز سے اخلاقِ عالیہ کی تکمیل کے لئے مامور کیا گیا تھا۔ آپ کو اخلاقِ مروجہ کی تشہیر کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا۔ بلکہ آپ کو اُن اخلاقِ عالیہ اور اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کیلیے فائز کیا گیا تھا جو آپ کی بعثت سے قبل مفقود تھے۔

مختصر یہ کہ آپ اوّل المسلمین تھے اور آپ کی مثل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ یہ مکارم اخلاق اسی طرح ناقص رہتے اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ آپ انھیں مکمل نہ کرتے۔

کائنات میں کسی پیغمبر، کسی نبی، کسی برگزیدہ رسول اور نہ ہی کسی مقرب فرشتے نے اللہ تعالیٰ کی مکمل رضا کی بلند ترین چوٹی اور مکارم اخلاق کے بلند ترین مقام تک رسائی حاصل کی۔ اور اوّل المسلمین ہونا ہی اللہ تعالیٰ کی مکمل رضا ہے۔

یقیناً تمام کائنات۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات خواہ اُن کا تعلق اوّل المسلمین سے ہو۔ خواہ اُن کی نسبت ملائکہ سے ہو خواہ بنی نوع انسان سے، خواہ یہ اوّلیت قدیم ہو یا جدید، خواہ اس اوّلیت کی نسبت ابدیت تک کی جائے، بلاشک و شبہ اوّل المسلمین کا ظہور، وجودِ کائنات میں ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کائنات ابھی تک نامکمل تھی۔ ناقص تھی۔

کائنات مادی اور معنوی ہر لحاظ سے ناقص تھی۔ وہ اس لئے ناقص تھی کہ ابھی سرزمین کو اس ہستی کی وجہ سے معطر ہونا تھا جو اجساد میں سب سے زیادہ پاکیزہ ہے اور اس کی فضاؤں کو اُسے منزہ کرنا تھا جو ارواح میں سب سے زیادہ نفیس اور پاکیزہ ہے چنانچہ لازم تھا کہ ایک ایسا وجود کائنات میں آئے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو مکمل کرے اور وہ (اللہ تعالیٰ) اپنی نعمتوں کا اس کے ذریعے اتمام کرے اور اس کی رسالت اور پیغام سے اللہ تعالیٰ اس طرح راضی ہو کہ اس کو ساری انسانیت کے لئے ابدی دین بنادے اور یہی وہ وجہ ہے جسے ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے سے مراد لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بایں طور نازل کیا کہ اسلام وجہہ للہ کا مقصد پورا ہو۔ اسلام وجہہ للہ کے مقاصد کی تحدید کی۔ اسلام وجہہ للہ کے طریقوں اور اسالیب کی تحدید کی اور اسلام وجہہ للہ کے اغراض و مقاصد کی تحدید کی۔ بایں سبب اسلام ہی وجہہ للہ ہے۔ وہ تسلیم ہے اور وہی استسلام جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھتا ہے اور اس سے راضی ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی رغبت رکھے گا مقبول نہیں ہوگا۔ اور یہ قابلِ قبول ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ کہ وہ اسلام وجہہ للہ کے منافی ہے یقیناً اسلام وجہہ للہ ہی جوہر دین ہے۔ یہی دینِ قیم ہے اور یہی دینِ وحید ہے۔

اور یہی نقشِ وحید ہے — الٰہی نص جو ساری کائنات میں منفرد ہے جو اسلام وجہہ للہ کی کیفیت کو واضح کرتی ہے۔ وہ قرآن حکیم ہے۔ اور جب انسان اسلام وجہہ للہ کے مقام تک جا پہنچتا ہے تو گویا معراج انسانیت تک جا پہنچتا ہے۔ اور مکارم اخلاق کی چوٹی تک جا پہنچتا ہے

لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے وجہہ للہ کی صفت میں امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ ایک لابدی امر ہے کہ اُن میں سے ایک انسان اول حیثیت کا حامل ہو۔ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کے مطابق رسول اللہ بالاطلاق اول ہیں۔

قرآن کریم نے اوّل المسلمین کی صفت سے حضور علیہ السلام کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا۔ اگر ایسا اوّل المسلمین مکارم اخلاق کو حدِ اتمام تک پہنچانے والا۔ وہ جس کی صلوٰۃ اور نسک اور جس کی زندگی اور موت اللہ رب العالمین کے لئے ہوتی ہے وجود میں نہ آتا تو یہ کائنات تا ابد اس کی منتظر رہتی تاکہ وہ اس کے وجود سے کمال حاصل کرسکے اور کائنات مادی اور روحانی اغنیاء سے ناقص نہ رہ جاتی۔

جب نبی علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تو اللہ کی حکمت آپ کے وجود اور آپ کی رسالت سے انتہا تک جا پہنچی اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں بیان فرمایا ہے۔

" الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا "

" آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تمہارے لیے اتمامِ نعمت کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا "

صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیک یا سیدی یارسول اللہ۔

رسولِ اکرم ﷺ کی سیرۃِ طیبہ دائمی نمونۂ عمل ہے

اعجاز الحق قدوسی

ربیع الاول کا مہینہ رحمتوں اور سعادتوں کا مہینہ ہے۔ اسی مہینے میں خدا کی سب سے بڑی رحمت کا ظہور ہوا۔ اسی مہینے میں نسلِ انسانی کو نعمتِ غیر مترقبہ سے سرفراز فرمایا گیا۔ اسی مہینے میں ضلالت اور گمراہی کی تاریکیاں حق کے نور سے جگمگا اٹھیں۔ اسی مہینے میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی جس کی ہدایت کی روشنی تمام عالموں کو منور کرنے والی تھی۔ اسی مہینے میں خدا کے اس برگزیدہ رسول کی پیدائش ہوئی جو سارے انبیاء علیہم السلام کے سرتاج ہیں۔

میں اس مختصر سے مضمون میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کی ایک خصوصیت آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ تمام عالم کے لیے قیامت تک رسول ہیں۔

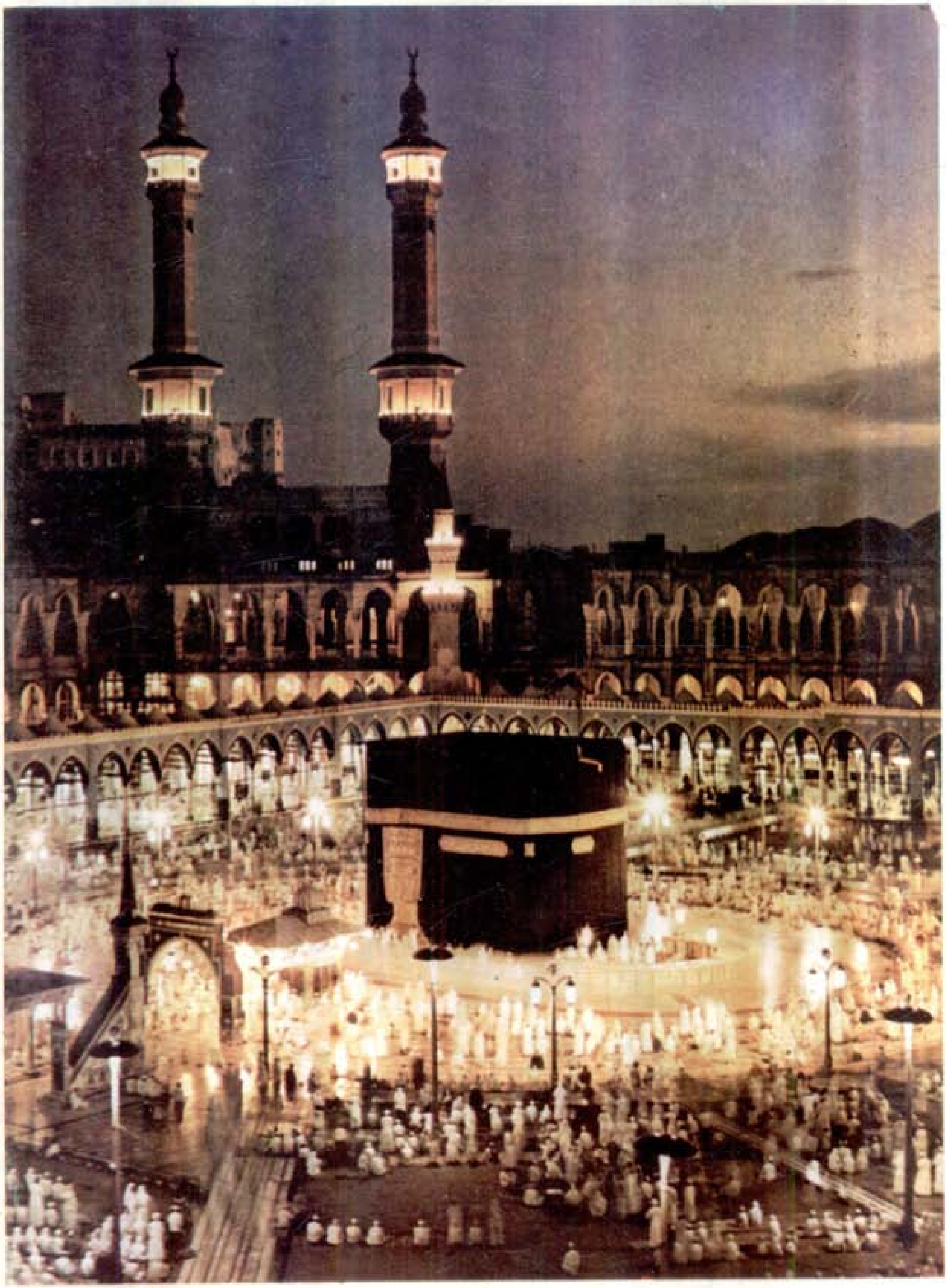
دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر حضرت محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ جس کی حیاتِ طیبہ تمام انسانوں کی رہبری کرے وہی سارے عالم کے لیے رسول ہے۔ ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے عالم کے لیے رحمت بن کر آئے اور تمام عالموں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ ساری کائنات کے لیے رؤف و رحیم ٹھہرائے گئے۔ آپ کا طرۂ امتیاز خُلقِ عظیم ہے۔ چونکہ آپ سارے عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے اس لیے آپ کی حیاتِ طیبہ کسی خاص جماعت، کسی خاص قوم، کسی خاص ملک، کسی خاص زمانے کے لیے خاص نہ تھی بلکہ آپ سارے عالموں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ کی زندگی کو بھی تمام عالم کے لیے اُسوۂ حسنہ ٹھہرایا گیا۔

انسان جب کسی شعبۂ حیات میں قدم رکھتا ہے تو اس کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس نے زندگی کے جس شعبے کو اختیار کیا ہے، اس کے سامنے اس میں کوئی اچھا نمونہ ہو تاکہ وہ اسے دیکھ کر اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کا کمال یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد اپنی حیثیت کے مطابق آپ کی زندگی کی روشنی میں اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے، اس لیے کہ ادب و اخلاق کا کوئی سبق ایسا نہیں جو ہمیں آپ کی حیات طیبہ میں نہ ملتا ہو۔

اب میں آپ کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک کے بے شمار پہلوؤں میں سے چند پہلو اجمالی طور پر پیش کرتا ہوں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں جامعیت اور عمل کے جو درس ہم کو ملتے ہیں دنیا کی تاریخ ان کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مثلاً تجارت ہی کو لیجیے ایک تاجر اور کاروباری انسان کی زندگی کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ حُسنِ معاملہ کا خوگر اور ایفائے عہد کا پابند ہو۔ اگر کسی تاجر کی زندگی میں یہ دو وصف مفقود ہوں تو وہ کبھی اچھا تاجر نہیں بن سکتا۔



خانہ کعبہ کا ایک منظر

مرحلہ ہے جہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے انصاف کے اس نازک ترین مرحلے سے گزر کر بھی تمام دنیا کے حاکموں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ چھوڑا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم ایک مرتبہ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کی بہت بھیڑ تھی ایک آدمی آکر منہ کے بل آپ پر لد گیا، آپ کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی، آپؐ نے اس سے اسے ٹھوکا دیا، جس کی وجہ سے اتفاقاً اس کے خراش آگئی، آپؐ نے اس سے فرمایا کہ میاں! تم مجھ سے بدلہ لے لو۔ اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔

دوستی و تعلقات کی دنیا پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دوستی اور محبت کی بنیادیں خلوص، باہمی ارتباط اور ایک دوسرے کی ہمدردی سے مستحکم ہوتی ہیں۔ دیکھیے کہ آپ بحیثیت ایک دوست اور ساتھی ہونے کے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔

ایک سفر میں صحابۂ کرامؓ نے کھانا پکانے کا انتظام کیا اور ہر ایک نے ایک ایک کام اپنے ذمے لے لیا، حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے کہا کہ ہمارے ماں باپ قربان آپ کو زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ ہم سب کام خود انجام دے لیں گے۔ ارشاد فرمایا: یہ صحیح ہے، لیکن خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو دُوسروں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہو۔

دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ نے اخلاق و کردار کا وُہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ اگر آج بھی اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو آپ کا بڑے سے بڑا دشمن دوست ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا ضمیر بالکل تاریک نہ ہو گیا ہو۔

آپؐ نے مکے کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جنھوں نے آپ کو سخت سے سخت تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ آپ نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کر دیا، آپ نے ہندہ کو معاف کر دیا جس نے آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، آپؐ نے عُمیر بن وہب کو معاف کر دیا جو اپنی تلوار زہر میں بجھا کر آپؐ کے قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ آپؐ نے اس یہودیہ کو معاف کر دیا جس نے خیبر میں آپؐ کو زہر دیا تھا۔

مالدار ہونے کی حیثیت سے اگر دنیا کسی صالح نظام تمدن کو برسرِ عمل لانا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کو اپنے لیے نمونہ بنائے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی، تمام عمر آپؐ نے کسی کا سوال رد نہیں کیا۔

ایک روز حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا ابوذرؓ! اگر یہ اُحد کا پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی اس کو گوارا نہیں کروں گا کہ تین روز گزر جائیں اور ایک دینار بھی میرے پاس رکھا رہ جائے۔ مگر وُہ کہ جس کو میں قرض کی ادائی کے لیے رکھ چھوڑوں۔

آج دنیا کے ہر حصے میں مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ جاری ہے۔ یہ عالمگیر جنگ صرف اس لیے برپا ہے کہ سرمایہ داروں نے دنیا کے معاشی وسائل پر اس طرح قبضہ کر رکھا ہے کہ ساری انسانیت اُن کے مقابلے میں مجبور و لاچار ہو کر رہ گئی ہے، لیکن

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس سلسلے میں جو جو اصول پیش کیے ہیں اگر اُن پر عمل کیا جاتا تو دُنیا آج جس محرومی و بدنصیبی سے دوچار ہے، آپ دنیا کے ہر فرد کو اپنی حیثیت کے مطابق خوش حال و خوش نصیب پاتے۔

سرمایہ داری کی بنیاد روپے کے جمع کرنے اور اس نظریے پر قایم ہے کہ انسان وسائل ثروت پر جب کبھی قبضہ پائے تو وہ ان کو روکے رکھے، یہاں تک کہ اُن سے اپنی ذات کے لیے فائدہ نہ اٹھائے۔ اس خودغرضانہ نظریے نے نظامِ معیشت کو اس طرح تباہ کیا کہ ہر ملک میں دولت صرف چند سرمایہ داروں کے قبضے میں جمع ہو کر رہ گئی۔ اس غیر منصفانہ نظامِ معیشت نے تباہی مچا کر رکھ دی، اسی نظامِ معیشت کی کوکھ سے ہزاروں فاقہ کش، مزدور، قرضدار پیدا ہُوئے جو ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سب سے پہلے انسانی ضمیر پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ دولت جمع کرنے سے نہیں بلکہ اچھے کاموں میں خرچ کرنے سے بڑھتی ہے۔ آپؐ ہی نے دنیا کو یہ بتایا کہ جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں وہ اُن کے لیے جائز نہیں ہوسکتی جب تک وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کریں۔ آپؐ نے سُود کو حرام قرار دیا اور سُود کے روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ آپ ہی نے حصولِ معیشت کے ذرائع میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز قرار دیا۔ آپؐ ہی نے مزدوروں کی مشکلات حل کرتے ہُوئے فرمایا کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کی جائے۔ آپؐ ہی نے سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ اخلاق اور سرمایہ دارانہ نظام کا قلع قمع کرکے دنیا پر خوش حالی، امن اور بلند اخلاق کے دروازے وا کیے۔

خودغرض اور نفس پرست سرمایہ داروں نے جن مصیبتوں کو انسانوں پر مسلط کیا ہے وہ بلیک مارکٹنگ اور چوربازاری ہے، جو غریبوں کے لیے عذابِ الیم سے کم نہیں۔

آپؐ نے ان لوگوں پر جو غذائی اجناس اور دُوسری اشیاء کو محض نفع اندوزی کی خاطر روک کر رکھتے ہیں، بہت بڑی ذمہ داری عائد کی ہے۔ آپ نے فرمایا: جو لوگ غذائی اجناس اور دوسری اشیاء کو ذخیرہ کر لیتے ہیں تاکہ بازار میں مصنوعی طور پر ان کی مقدار گھٹ جائے اور قیمت بڑھ جائے، تو وہ بڑے گنہگار ہیں۔ آپؐ نے تجارت میں بھی خوش اخلاقی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اللہ اس آدمی پر رحم کرتا ہے جو خریدنے، بیچنے اور تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔

خرید و فروخت کے آداب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ خرید و فروخت کرتے وقت جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ۔ اپنے مال کا عیب اور خُوبی دونوں باتیں خریدار کے سامنے بیان کرو، اور مال بیچنے کے لیے چکنی چُپڑی، پھُسلا دینے والی باتیں نہ کرو، مال کو تخمینے سے نہیں بلکہ پوری طرح ناپ تول کر بیچو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو اپنے مال کے عیب کو چھپاتا ہے اور خریدار پر ظاہر نہیں کرتا وُہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں رہتا ہے۔

تفوق و برتری کا وُہ خیال جو ہزار ہا سال سے انسان کی فطرت میں جاگزیں تھا، آپؐ نے اس کو مٹا کر دنیا کو احترام انسانیت کے درس اور مساوات کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ آپ ہی نے دنیا پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ غلام و آقا، شاہ و گدا، شودر و برہمن خدا کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اسلام میں معیارِ شرافت تو تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے۔

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میرے شمار میں نہیں آسکتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے منبر پر سے کئی مرتبہ یہ الفاظ فرمائے تھے کہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں بنی نوع انسان کو مساوات کا پیغام دیتے ہُوئے فرمایا کہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

انسان کی سب سے بڑی خوبی کو واضح کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین آدمی وُہ ہے، جس سے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچے۔

رحمۃ للعالمینؐ کی شانِ رحمت کی عمومیت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ آپؐ نے فرمایا: تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

اس مختصر سی تحریر میں آپ کی سیرت طیبہ کے یہ چند پہلو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تمام عمر لکھنے والے لکھتے رہیں اور بیان کرنے والے بیان کرتے رہیں تب بھی حضورؐ کا اول وصف بیان نہیں ہو سکتا۔ ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم

تاجدارِ مدینہ کی گھریلو زندگی

ڈاکٹر حافظ محمد سالم توحیدی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہے، آپ ساری دنیا والوں کے لیے مشعل ہدایت اور خضر راہ بن کر تشریف لائے تھے۔ دینی و دنیوی نقطۂ نگاہ سے حضورؐ کے تمام پہلو مکمل تھے۔ آپؐ نہ صرف پیغمبر تھے کہ صرف تبلیغ پر اکتفا کرتے، نہ صرف عابد شب زندہ دار تھے کہ جنگل یا پہاڑ کے کسی کھوہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہتے، نہ دنیادار تھے کہ زندگی کے طمطراق اور جاہ و جلال کا مظاہرہ فرماتے۔ آپ کو ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں کو علمی تعلیم دینا تھی تاکہ شاہ و گدا، امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ ہر حیثیت کے لوگ آپ سے فیض اندوز ہوسکیں۔

انسان کی زندگی اپنے گھر ہی کی چاردیواری کے اندر اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ کوئی خواہ کتنا ہی عظیم المرتبت انسان کیوں نہ ہو، اپنے گھر کے اندر قدم رکھتا، تو پھر وہ بے تکلف ہوجاتا ہے اور عام و خاص کا فرق جاتا رہتا ہے۔ تصنع کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ آیئے، دنیا کے سب سے بڑے بلند مرتبہ انسان کی خانگی زندگی کیا تھی اور گھریلو زندگی کا عنوان کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی روشنی میں تلاش کریں۔

حضورؐ کے کاشانۂ اقدس میں بیک وقت مختلف المزاج، حیثیت اور عمر کی چند بیویاں تھیں۔ ان میں رؤسائے عرب کی چشم و چراغ بھی تھیں، غریب و نادار لڑکیاں بھی، صاحبِ جمال بھی تھیں اور صاحبِ کمال بھی۔ سن رسیدہ بھی تھیں اور چودہ پندرہ برس کی عمر والی بھی، تیز مزاج بھی تھیں اور حلم و صبر والی بھی۔ گویا کاشانۂ نبوت میں مختلف الخیال عناصر کا اجتماع تھا۔

پہلی بیوی حضرت خدیجہؓ تھیں۔ جب ان کی عمر چالیس سال اور حضورؐ کی عمر شریف ۲۵ برس کی تھی، تو شادی ہوئی۔ نہایت شریف النفس، صاحبِ جمال اور مالدار بیوی تھیں۔ حضورؐ کے سرد و گرم زمانہ میں جان و مال سے ساتھ رہیں۔ ہر طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ دونوں میں انتہائی محبت تھی۔ غارِ حرا میں حضورؐ کو آپ ہی کھانا پہنچاتی تھیں۔ حلم و صبر کا پیکر تھیں۔ عورتوں میں سب سے پہلے آپ ہی نے اسلام قبول کیا ان کے رہتے ہوئے حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ کل اولاد آپ ہی کے بطن سے ہوئی۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ، زینبؓ، رقیہؓ اور اُمّ کلثومؓ جوان ہوکر بیاہی گئیں۔ حضورؐ کے وصال کے وقت صرف حضرت فاطمہؓ حیات تھیں، چھ مہینے کے بعد وہ بھی اپنے باپ سے جا ملیں۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضرت سودہؓ سے شادی کی، جن کی عمر تقریباً ۵۰ برس تھی۔ بہت فیّاض و غیور خاتون تھیں۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان ہوئیں اور عہد فاروقی میں وصال ہوا۔

تیسری حضرت عائشہؓ حضرت صدیق اکبرؓ کی صاحبزادی نو سال کی عمر میں بیاہی گئیں، علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھیں۔ حدیث و فقہ، شعر و شاعری میں ثانی نہ رکھتی تھیں۔ ۱۹ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔ ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں (مسند ابن حنبل) ترمذی شریف

ہیں ہے کہ پیچیدہ مسائل صحابہ کرامؓ آپ ہی سے حل کراتے تھے۔ ۶۶ سال کی عمر میں وصال ہوا۔

چوتھی بیوی حضرت عمر فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ تھیں۔ بڑی طمطراق کی خاتون تھیں۔ عہد امیر معاویہ میں وصال ہوا۔

پانچویں بیوی حضرت ام سلمہؓ بہت غیور سیر چشم تھیں۔ غرباء پروری ان کا خاص شیوہ تھا۔ اس لیے ام المساکین سے پکاری جاتی تھیں۔ بہت اطاعت گزار خاتون تھیں۔ ازواج مطہرات میں سب کے پیچھے ۶۱ھ میں بعمر ۸۴ سال انتقال ہوا۔

چھٹی بیوی حضرت جویریہؓ اپنے قبیلہ کے سردار کی چشم و چراغ تھیں۔ حسین و خوبصورت خاتون تھیں۔ بہترین کھانا پکاتی تھیں۔ ۶۵ سال کی عمر میں وصال ہوا۔

ساتویں بیوی حضرت ام حبیبہؓ حضرت ابوسفیان رئیس اعظم قریش کی لختِ جگر تھیں، ان کا نکاح حبشہ کے شاہ نے پڑھایا تھا اور حق مہر بھی انہوں نے ہی ادا کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے باپ ابوسفیان، جو ہنوز مسلمان نہیں ہوئے تھے، بیٹی سے ملنے آئے اور رسول اللہؐ کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے حضورؐ کے بستر کو الٹ دیا اور کہا کہ آپ میں کفر کی ناپاکی ہے تو ان کے باپ ناراض ہو کر چلے گئے۔ ۴۴ھ میں انتقال ہوا۔

آٹھویں بیوی حضرت صفیہؓ قبیلہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی تھیں، جنگِ خیبر میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ حسن میں، تدبیر میں بہت ممتاز تھیں۔

نویں بیوی حضرت میمونہؓ تھیں۔ مقام سرف میں شادی ہوئی۔ نیک شعار کریم النفس خاتون تھیں۔

دسویں بیوی حضرت زینبؓ تھیں۔ جود و سخا، حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھیں۔ اپنے دست و بازو سے کماتی تھیں اور فقراء و مساکین میں تقسیم کرتی تھیں۔ نہایت سیر چشم خاتون تھیں۔ ۳۵ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ ۵۳ برس کی عمر میں وفات پائی۔

گیارھویں بیوی حضرت ماریہ قبطیہؓ تھیں، جو حسن و جمال میں بے نظیر تھیں۔

یہ بیویاں مختلف المزاج کی ضرور تھیں، مگر کل پاک سیرت شریف النفس تھیں۔ دیکھو کاشانہ نبوت میں فکر و فاقہ کا دور دورہ تھا دو دو ماہ چولھے نہیں سلگتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ نیک بیویاں صبر و تحمل سے کام لیتی تھیں۔ لب شکایت کبھی نہ کھولتی تھیں۔ اور محبت میں سر مو فرق نہیں آتا تھا۔

یکساں سلوک

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام بیویوں کے ساتھ یکساں سلوک اور برتاؤ کرتے تھے۔ مگر میلانِ طبع حضرت عائشہؓ کی طرف زیادہ تھا۔ کیونکہ وہ بہت بڑی صاحبِ فضل و کمال خاتون تھیں۔ حدیث و فقہ میں آپ کو وہ یدِ طولیٰ حاصل تھا کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان سے فتویٰ پوچھتے تھے اور مسائل کی پیچیدگیاں ان کی خدمت میں جا کر سلجھاتے تھے اور یہ اس لیے نہیں تھا کہ آپ بہت کم عمر تھیں یا خوب صورت تھیں بلکہ حسن و جمال میں حضرت صفیہؓ، حضرت زینبؓ آپ اپنی مثال تھیں، صرف علم و فضل کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کی طرف میلانِ خاطر کچھ زیادہ تھا۔ بتقاضائے بشریت بعض بیویوں کو اس خصوصیت پر رشک آیا اور حضورؐ کی خدمت میں تمام بیویوں کی طرف سے حضرت زینبؓ نمایندہ بن کر گئیں اور کہا کہ جو مرتبہ عائشہؓ کو عطا کیا گیا ہے، وہ اس کی مستحق نہیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ چپ بیٹھی سنتی رہیں اور وہ اشارہ پا کر جواب دینے کو کھڑی ہوئیں تو وہ مدلل تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو گئیں۔

اور حضورؐ نے فرمایا کہ کیوں نہ ہو عائشہؓ حضرت ابوبکرؓ کی تو بیٹی ہیں۔

ایک بار اتفاق سے حضرت عائشہؓ کسی بات پر حضورؐ کے سامنے تُرش رُو ہو کر کچھ زور سے بول رہی تھیں کہ ان کے ابّا جان حضرت ابوبکرؓ تشریف لے آئے اور غصہ میں آ کر حضرت عائشہؓ پر ہاتھ اُٹھایا۔ وُہ جھٹ حضورؐ کی آڑ میں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ کہنے لگے: اری بیوقوف! رسول اللہؐ کا ادب نہیں کرتی۔ اور باہر چلے گئے۔ حضورؐ نے مسکراتے ہُوئے فرمایا: "عائشہؓ! میں نے تم کو بچا لیا" حضرت عائشہؓ نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔

حضورؐ روزانہ تھوڑی دیر کے لیے تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جاتے اور کچھ دیر بیٹھ کر چلے آتے اور جن کے ہاں شب باش ہونے کی باری ہوتی، وہیں ٹھہر جاتے۔ عصر کی نماز پڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کے حجرے سے شروع کرتے، جس کے ہاں حضورؐ شب باش ہونے کے لیے ٹھہرتے، کل بیویاں وہیں جمع ہو جاتیں۔ سب ہنستی بولتی باتیں کرتیں اور بڑی پُر تکلف صحبت ہوتی۔ اور پھر اس کے بعد سونے کے وقت واپس چلی آتیں۔

حضرت صفیہؓ بہت اچھا کھانا پکانا جانتی تھیں۔ ایک روز انھوں نے کوئی اچھی چیز پکائی اور حضورؐ کے لیے بھیج دی۔ آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے یہاں تھے۔ حضرت عائشہؓ کو ناگوار معلوم ہوا اور پیالہ زمین پر پٹک ڈالا۔ حضورؐ خود دستِ مبارک سے پیالہ کے ٹکڑوں کو چنتے تھے اور مسکراتے ہُوئے فرماتے تھے: "عائشہؓ! تاوان دینا ہوگا"

اس طرح کے واقعات اکثر ہوتے رہتے تھے مگر آپ اپنے خلقِ عظیم کے باعث ہنس کر ٹال دیتے۔ آپؐ کو ازواجِ مطہرات سے خاص محبت تھی۔ تعلقات بھی نہایت خوشگوار تھے۔ لیکن دنیوی طریق پر آپ نے کبھی بھی اس کا اظہار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کتنی محبوب بیوی تھیں۔ لیکن حضورؐ کے رہتے ہُوئے آپؐ کو نہ اچھا کپڑا نصیب ہُوا، نہ اچھی غذا، بلکہ زیور بھی نصیب نہ ہُوا۔ عائشہؓ کو ایک مرتبہ طلائی کنگن حضورؐ نے پہنے ہُوئے دیکھا، تو فرمایا، اگر تمہیں جنت کی آرزو ہے، تو پُر تکلف لباس اور زیورات سے پرہیز کرو۔ مگر مہندی لگانے کی تاکید فرماتے تھے۔ چوڑیوں کے بارے میں فرماتے کہ اس کی آواز سے گھر میں برکت ہوتی ہے اور عورتوں کا سہاگ ہے۔

ابتداء میں جو کچھ مل جاتا، ازواجِ مطہرات کھا پکا لیتی تھیں مگر فتح خیبر کے بعد ہر بیوی کے لیے اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جَو کا سالانہ انتظام تھا جو حضورؐ کے کثرت اشتغال کے باعث حضرت بلالؓ کے ذمہ اس کا انتظام تھا۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹا موٹا جو کچھ مل جاتا، خدا کا شکر بجا لیتے اور کھا لیتے۔ جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ روٹی کا آٹا چھانا نہیں جاتا۔ کُرتہ میں گردن کے پاس کا بٹن کُھلا رہتا۔ بستر کبھی کمبل کا ہوتا، کبھی چمڑے کا، جس میں کھجور کی چھالیں بھری رہتیں۔

کاشانۂ اقدس ۹ھ میں جب کہ ارض عرب سے یمن تک تمام ملک زیر نگین اسلام تھا اور حضورؐ اس کے واحد فرمانروا تھے، اس وقت بھی کاشانۂ اقدس میں صرف ایک چارپائی اور پانی کے لیے ایک سوکھا مشکیزہ تھا۔ یہ تھا شہنشاہ دوجہاںؐ کے کاشانہ عالیہ کا نقشہ، جس کو زمین و آسمان پر تصرّف حاصل تھا۔ مسجد نبویؐ کے متصل ازواج مطہرات کے خام حجرے تھے جو طول میں دس ہاتھ اور عرض میں چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھے۔ پردہ کے خیال سے دروازہ میں کمبل لٹکے ہوئے تھے۔

ایک بار (بزمانۂ ایلاء) حضرت عمرؓ حضورؐ سے ملنے گئے، تو دیکھا کہ سردارِ دوجہاںؐ نے ایک تہبند باندھا ہُوا ہے، ایک،

کھردری چٹائی ہے، جس پر لیٹنے سے جسم مبارک پر اسی کے نشانات پڑے ہیں۔ ایک طرف گوشہ میں محض تھوڑا سا جَو رکھا ہوا ہے۔ مشکیزہ کی کھالیں کھونٹی میں لٹک رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عمرؓ بے اختیار رو پڑے۔ آپ نے فرمایا : گھبراؤ نہیں میرے لیے عقبیٰ ہے۔

مگر یاد رکھیے کہ یہ رہبانیت نہیں تھی، فقر پسندی کا جوش تھا۔ رہبانیت ہوتی تو معاملاتِ دنیا سے حضورؐ کنارہ کش ہوتے مگر آپ کے گھر میں ایک نہیں تو نو بیویاں تھیں، اولادیں تھیں، خویش و اقارب تھے، ملنے جلنے والے تھے۔ صاف بات یہ تھی کہ حضورؐ تصنع کو بالکل پسند نہ فرماتے تھے۔ حضورؐ کی توجہ قوم کی اصلاح و ترقی کی طرف تھی۔

صاف شفاف کپڑے پہنتے تھے اور اپنے جان نثاروں کو بھی اس کی تاکید فرماتے۔ ہدایت تھی کہ کپڑوں میں بہتر پیوند کیوں نہ ہوں مگر صاف ستھرے ہوں۔ خوشبو کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ ویسے آپ نے قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی استعمال کیا ہے اور اچھے سے اچھے کھانے بھی تناول فرمائے ہیں۔ مگر اس طرح کی عادت شریف نہ تھی۔

عظمت و محنت سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ بے تکلف معمولی سے معمولی کام کر لیا کرتے تھے۔ بازار سے سودا سلف خود لے آتے، کپڑوں میں پیوند خود لگا لیتے، پھٹے جوتے گانٹھ لیتے، گھروں میں جھاڑو دے لیتے، غلاموں مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر بلا تکلف کھانا کھا لیتے اور حد تو یہ ہے کہ دُوسروں کا بھی معمولی کام کر دینے میں کچھ تامل نہیں کرتے تھے۔

بعض صحابہ کرامؓ جو گھر پر نہ ہوتے، تو ان کی بکریاں گھر جا کر دوہ دیا کرتے۔ مسجد قبا، مسجد نبویؐ اور غزوۂ خندق میں حضورؐ نے مزدور کی حیثیت سے کام کیے ہیں۔ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ سب سے حضورؐ خندہ پیشانی سے بات کرتے۔ ضعیف و کمزور کو حقیر نہ جانتے تھے اور یہ سب کچھ تعلیماً تھا کہ کوئی کسی کو پیشہ یا کام کی وجہ سے ذلیل نہ سمجھے اور جائز طور پر جو بھی پیشہ اختیار کیا جائے، وہ اچھا ہے کیونکہ پہلے بھی اور آج کے دور میں بھی بعض معمولی پیشہ کے باعث اس کے کرنے والوں کو نیچی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے حضورؐ نے کر کے دکھا دیا کہ کوئی پیشہ ہو، اگر جائز ہے تو وہ ذلیل نہیں۔

نبیِ کریمؐ بحیثیت معلّمِ اخلاق

پیر محمد کرم شاہ

یہ جہانِ رنگ و بو جلوہ گاہِ حیات ہے۔ زندگی کی بوقلموں رنگینیوں کے باعث یہ جہاں آباد ہے۔ گو نباتاتی اور حیوانی زندگی میں بھی رنگینیوں کے بڑے دلکش اور دلربا مینا بازار سجے ہوئے ہیں لیکن انسانی زندگی میں جو رعنائیاں اور ندرت آفرینیاں ہیں، یہاں تخلیقی قوتوں کے جو سمندر موجزن ہیں وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ یہ انسان ہی ہے جس کو خلعتِ وجود بخشنے کے بعد اس کے خالق نے فرمایا! لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ اس قدرت و طاقت والے نے عرش و فرش، کائنات کی لامتناہی پہنائیوں کو لفظ کُن سے پیدا کیا لیکن آدم خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا خلقته بیدی۔ میں نے اسے اپنی قدرت کے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ علم اور عمل، فکر اور تخلیق، تدبیر اور تعمیر کی جو بے پناہ صلاحیتیں اس پیکرِ خاکی میں ودیعت فرمائیں۔ ان کا تذکرہ " نفخت فیه من روحی " کے معنی خیز الفاظ سے کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت، علم اور قدرت کا یہ شاہکار سب سے الگ تھلگ انفرادی زندگی بسر کرے، خلاقِ عالم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اگر وہ عزلت اختیار کرتا تو وہ بے پایاں صلاحیتیں بے مصرف ہو جاتیں۔ اس چشمہ حیواں سے کوئی تشنہ لب اگر سیراب نہ ہوتا تو اس کی حیات بخش تاثیر کا کسے علم ہوتا، ان صفات کے ودیعت فرمانے والے کے حضور فرطِ عقیدت سے جبین نیاز کون جھکاتا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان، اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرے، اپنے بنی نوعِ انسان سے استفادہ بھی کرے اور انہیں فائدہ بھی پہنچائے۔ دوسروں کے علوم و فنون سے رہنمائی بھی حاصل کرے اور اپنے فکر و نظر کے چراغ روشن کر کے شبستانِ وجود کو منور بھی کرے۔ وہ ماں باپ کا بیٹا بھی ہو اور اپنے بیٹے بیٹیوں کا باپ بھی۔ اس کے خاندان کے افراد اس کے لئے تقویت کا باعث ہوں ضرورت کے وقت وہ ان کا سہارا بنے حتیٰ کہ اس کے تعلقات کا حلقہ سارے ملک اور ساری قوم کو اپنے احاطہ میں لے لے۔

ان معاشرتی تعلقات کے باعث حقوق و فرائض کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ معاشرے کا ہر فرد جب تک اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا نہیں کرے گا نیز جب تک اسے اپنے حقوق کی بازیابی کا یقین نہ ہو گا اس وقت تک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس لیے حقوق و فرائض میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قانون کی طاقت سے اس توازن کو برقرار رکھا جائے اور جو شخص بھی اس توازن کو بگاڑنے کا مرتکب ہو اس کی سرکوبی کر دی جائے اور یا اس کی اخلاقی قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ایسے خطوط پر ان کی نشو و نما کر دی جائے کہ پھر ہر قسم کے حالات میں وہ راہِ اعتدال پر ثابت قدمی سے چلتا رہے۔ قانون کی عمل داری انسانی زندگی کے صرف چند گوشوں تک ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ نیز ہر کام اگر قانون کے زور سے کرایا جائے تو خلوص و ایثار اور محبت و پیار کے غنچے کھل کر پھول نہیں بن سکیں گے۔ اسلام نے حقوق و فرائض میں توازن پیدا کرنے، پھر اسے برقرار رکھنے کے لئے اور معاشرہ کو ہر قسم کی بے راہروی سے بچانے کے لئے اخلاقی تربیت پر اسی لئے بہت

زیادہ توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کہ میں "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم" کے عنوان پر اظہار خیال کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ خلق کی تشریح کر دوں تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔

علامہ ابن منظور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں لکھتے ہیں:

الخُلُقُ والخُلْقُ: السجيّته وهو الدين والطبع والسجيّته وحقيقته انه لصورة الانسان الباطنة وهى نفسه واوصافها ومعانيها المختصّة بمنزلة الخَلق لصورته الظاهرة واوصافها ومعانيها۔

خُلق اور خُلُق کا معنی فطرت اور طبیعت ہے۔ انسان کی باطنی صورت کو مع اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کے خُلق کہتے ہیں۔ جس طرح اس کی ظاہری شکل و صورت کو خلق کہا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو دانش ایمانی اور دانش برہانی دونوں سے مالا مال ہیں، جو حکمت و فلسفہ کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے بھی ماہر ہیں خلق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالخلق عبارة عن هيئة فى النفس راسخة عنها تصدر الافعال بسهولة و يسر من غير حاجة الى فكر و روية (احیاء العلوم)

ترجمہ: یعنی خلق، نفس کی اسی راسخ کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں ان کے کرنے کے لئے سوچ بچار کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جو کسی سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبا درعارضی جوش سے ان کا ظہور ہوتا ہے وہ خواہ کتنے اعلیٰ اور عمدہ ہوں انھیں خلق نہیں کہا جائے گا۔

خلق کا اطلاق انہی خصائل و عادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی جڑیں قلب و روح میں بہت گہری ہوں۔ انہی غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے انہی پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کسی ترنگ میں آکر اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لئے اپنے خزانوں کے منہ کھول دے تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے۔ جو شخص کسی وقتی جوش کے ماتحت اپنے دشمن پر حملہ کر کے اسے مار گرائے اسے ہم شجاع نہیں کہیں گے۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ جب بھی اسے میدانِ جہاد میں سر کف آنے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کرے گا۔

اس لئے نیک اور عمدہ خصائل کو پیدا کرنا پھر ان کو اس طرح پختہ اور استوار کرنا کہ وہ ان سے مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو جس طرح چشمہ سے پانی ابلتا ہے، یا آنکھ اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے، یا کان آواز سنتے ہیں۔ یہ کیفیت افراد و اقوام کی صحت مند ترقی کے لئے جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اسی کٹھن اور خطرناک مہم کو سر کرنے کے لئے حکماء و فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں لیکن ان کے باہمی اختلافات اور ان کی نظریاتی کشمکش نے ان کی محنت کو بے ثمر کر دیا۔ وہ یہ طے

نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ایپی قورا اور اس کے ساتھی لذت و الم کو خیر و شر کا معیار ثابت کرنے میں اپنی ذہنی قابلیتیں کھپاتے رہے۔ ان کے معتقدات کے معبد میں مدتوں لذت کے صنم کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ زینو جو ایک مستقل مکتبہ فکر (مدرسہ رواقیہ) کا مؤسس تھا۔ اس نے اس کے برعکس نفس کشی اور لذات سے کلی اجتناب کو خیر کا سرچشمہ قرار دیا۔ افلاطون استاد ہے اور ارسطو شاگرد، اقلیم دانش و حکمت کے دونوں تاجور ہیں، دونوں کی عبقریت شک و شبہ سے بالاتر ہے، دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے لیکن یہ دو بھی متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ استاد مثل علیا اور غیر محسوس جہان کے طواف میں سرگرداں ہے اور اس کا شاگرد ارسطو، عالم محسوسات سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہ ذہنی خلفشار صرف اسی زمانہ کی خصوصیت نہیں جبکہ حکمت و فلسفہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھے بلکہ آج بھی جبکہ فکر انسانی کی یلغار سے خلائیں کہرام بپا ہے بے یقینی کی وہی کیفیت ہے۔ ہربرٹ سپنسر، جان لوک اور ہیگل وغیرہ جن فلسفیوں نے علم اخلاق کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی ثقیل تحریریں پڑھ کر آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ انہوں نے روحوں کو 'اضطراب' دلوں کو بے چینی اور عقلوں کو بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انہوں نے کسی ایسی راہ کی نشاندہی نہیں کی جو مسافر کو منزل تک پہنچا دے۔ البتہ انہوں نے آبلہ پا راہرؤں کے راستہ میں تشکیک کے کانٹے بڑی کثرت سے بکھیرے ہیں۔ یقین کی ٹمٹماتی ہوئی شمع جس کی مدھم لو میں افتاں و خیزاں وہ سوئے منزل رواں تھے وہ بھی بجھ گئی۔ ترجمانِ حقیقت حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

ان کو اپنا راہبر بنانے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے صحیح روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ فضائل، وہ خصال حمیدہ، وہ اخلاق عالیہ، جن کی تعریف میں اس نے صدہا ورق سیاہ کئے تھے اس کی عملی زندگی میں تو ان کا نام و نشان تک نہیں، بلکہ وہ تو رذائل کی دلدل میں کمر تک دھنسا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اپنی قوم کے اخلاق کو درست کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں وہ انبیاء کرام کا گروہ تھا۔ ان کی باتیں سادہ اور واضح تھیں۔ ان کی تعلیمات میں الجھاؤ اور التباس نہیں تھا۔ ان کے ہاں پیچیدہ علمی اصطلاحات کی بھرمار نہیں تھی۔ بلکہ ان کے ارشادات عام فہم اور دلوں میں گھر کر جانے والے تھے۔ انہوں نے خیر و شر کا معیار لذت و الم، نفس پرستی یا نفس کشی کو قرار نہیں دیا۔ انہوں نے اخلاق حسنہ کی غرض و غایت بیان کرنے کے لیے سعادت، مسرت، قوت، غلبہ کے مبہم الفاظ استعمال نہیں کئے تاکہ ان کا شارح حسبِ منشاء ان کو معانی کا لباس پہناتا رہے بلکہ اس کد و کاوش اور جد و جہد کی غرض و غایت رضائے الٰہی کو قرار دے کر ان تمام فکری الجھنوں کو ختم کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ جس چیز نے گروہ انبیاء کی تعلیمات کو قبولِ عام بخشا اور ان کے لیے دلوں کے دریچے کھول دیئے، وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قول و عمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ وہ دوسروں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتے پہلے خود اس پر کاربند ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کے یہ

اعمال کسی ذاتی غرض اور منفعت سے وابستہ نہ تھے۔ ان کے اقوال کی دل نشینی، ان کے اعمال کا بانکپن اور ان کے خلوص کی مہک نے ان لوگوں کی کایا پلٹ دی جن کو ان کی صحبت کا فیضان نصیب ہوا۔

لیکن انبیاء سابقین کا دائرہ کار محدود تھا۔ ان کی نصیحت کا مقصد کسی ایک قوم کی یا کسی ایک ملک کے باشندوں کی اصلاح تھا اور وہ بھی محدود وقت تک کے لئے۔ بارگاہ الٰہی سے یہ شرف اور یہ اعزاز فقط عبد مکرم، رسول معظم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ارزانی ہوا کہ آپؐ کی رسالت ہر اسود و احمر، عربی و عجمی، شرقی و غربی کے لیے تھی۔ ارشاد الٰہی ہے وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔ ہم نے آپ کو تمام اولادِ آدم کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں آپ کا آفتابِ نبوت تا قیامت نور افشانی کے لئے طلوع ہوا ہے۔

اصلاحِ اخلاق کا فریضہ جو ہر نبی نے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق انجام دیا اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو وقف فرمایا۔ ارشاد ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں مکارمِ اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔ تکمیلِ اخلاق کا یہ فریضہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا اس کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ اخلاقی تعلیم کی جامعیت

۲۔ اندازِ تعلیم

۳۔ معلّم کی شخصیت

سابق انبیاء کرام کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے صرف زندگی کے چند گوشوں میں راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ایوبؑ ہمیں مصائب و امراض میں صبر و استقامت کی ایک چٹان نظر آتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کی لڑیاں پروتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں شدت اور سختی کا عنصر غالب ہے اور حضرت عیسیٰؑ کوہِ زیتون پر کھڑے اپنے سامعین کو عفو و درگزر، رحمت و شفقت کی تلقین کرتے سنائی دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہیں جہاں ان نفوسِ قدسیہ نے قدم نہیں رکھا اور ایسے نقوش نہیں چھوڑے جن سے آنے والی نسلیں اپنی منزل کا سراغ لگا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مہجور و متروک گوشوں کو نورِ ہدایت سے منور کرنے کے لئے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کی خلعتِ زیبا عطا فرما کر اپنی مخلوق کی چارہ گری کے لیے مبعوث فرمایا۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے، ہمیں وہاں زندگی کی بوقلمونیوں کا ایک حسین و جمیل مرقع نظر آتا ہے۔ وہاں جنگ کی شعلہ سامانیاں بھی ہیں اور صلح کی رافت و رحمت بھی، دشمنی و نفرت کے انگارے بھی برستے ہیں اور عقیدت مندانہ محبت و مودت کے رنگین پھول بھی بکھار کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے محبوبِ خدا کو حلقۂ یاراں میں بھی دیکھا ہے اور حملہ آوروں کے نرغے میں بھی۔ ہم نے ان کی کاروباری مصروفیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور غارِ حرا کی خلوتوں میں ان کے سوز و گداز کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ہم نے انھیں اپنے وطن سے بظاہر انتہائی بے بسی اور بے کسی میں ہجرت کرتے بھی دیکھا ہے اور پھر چند سال بعد اسی شہر میں فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا منظر بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے برتاؤ

کا ریکارڈ بھی ہمارے سامنے ہے اور اپنے جاں نثار اور وفا شعار ساتھیوں سے حسنِ سلوک کی تفصیلات بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ الغرض زندگی کے وسیع و عریض میدان کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں حبیب کبریاؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ کے حسین و جمیل نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری اسوۂ محمدیؐ کے علاوہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی اسی آبِ زلال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس دارشفا میں انسانیت کے ظاہری و باطنی، سیاسی و معاشی، سماجی اور اخلاقی ہر قسم کے ناقابلِ علاج روگوں کے لیے اکسیر موجود ہے۔ خاتم الانبیاؐ کو بارگاہِ الٰہی سے جو کتاب منیر مرحمت ہوئی اس کے مندرجہ ذیل مقامات کا ہی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو حضورؐ کا لایا ہوا نظامِ اخلاق اپنی تمامتر رعنائیوں اور جملہ زیبائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ملے گا۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۷۶ اور ۱۷۷، سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات، سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴۔

اندازِ تعلیم

مذکورہ بالا آیات میں اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اور افادیت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے کوئی سلیم الطبع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن میں اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ بھی بڑے دلنشین اور روح پرور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔ سرورِ کائنات علیہ التحیات والتسلیمات نماز میں اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اللھم اھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عن سیئاتھا لا یصرف عنی سیئاتھا الا انت (مسلم شریف)

ترجمہ: اے اللہ بہترین اخلاق کی طرف میری راہنمائی فرما تیرے سوا بہترین اخلاق کی طرف کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے دُور کر دے کیوں کہ تو ہی بُرے اخلاق کو مجھ سے دُور کر سکتا ہے۔

یہ اس پاک ہستی کی دُعا ہے جس کے اخلاقِ حسنہ کی گواہی عالم الغیب والشہادہ نے یوں دی ہے۔ وانک لعلی خلق عظیم۔ یہ اس پیکرِ خصائلِ حمیدہ کی دعا ہے جس کا دامن ہر قسم کی نازیبا حرکات کے داغ سے پاک ہے۔ ایسی ہستی جب عجز و نیاز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کرتی ہوگی تو خود سوچیئے صحابہ کرامؓ کے دلوں پر اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کے نقوش کس طرح ثبت ہوتے ہوں گے۔ اہلِ ایمان کے نزدیک ایمان سے بڑھ کر کوئی قیمتی دولت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو جب یہ ارشاد فرمایا ہوگا تو اخلاقِ کریمہ کی اہمیت ان کی نگاہوں میں کتنی بڑھ گئی ہوگی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقاً

ترجمہ: جس شخص کا خلق بہترین ہوگا تمام مومنین میں سے اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل ہوگا۔

ہر نیک دل انسان عبادتِ الٰہی میں لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ یادِ الٰہی کی شمع فروزاں رہے اور وہ بصد جان اس پر قربان ہوتا رہے۔ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص کثرت عبادت پر ناز کرنے لگے اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کم ہو جائے۔ اس اندیشے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے محبوب نے تنبیہہ فرما دی:

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل وصائم النہار (ابوداؤد)

انسان اپنے اخلاق کے باعث اس درجہ پر فائز ہو جاتا ہے جو رات بھر ذکرِ الٰہی میں کھڑے رہنے والے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ کون بندہ ہے جس کے دل میں اپنے پروردگار کی رضا اور محبت کی تمنا چٹکیاں نہ لے رہی ہو۔ اس کا طریقہ بتا دیا۔ احب عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً (طبرانی)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ وہ محبوب ہوتا ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں۔ اس طرح ہر مومن کی یہ خواہش ہوگی کہ اس کے ہادی و مرشد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر نگاہِ لطف و کرم ہو اور قیامت کے روز اسے اپنے آقا کے قرب میں جگہ ملے چنانچہ اپنے مشتاقانِ جمال کو یہ فرما کر بشارت دی۔ ان احبکم الیّ واقربکم منی فی الآخرۃ محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الی وابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقاً۔

ترجمہ: تم میں سے مجھے سب سے پیارا اور آخرت میں سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور روزِ قیامت مجھ سے دُور وہ شخص ہوگا جو بدخلق ہے۔

بے شمار ارشاداتِ نبویؐ میں سے یہ چند اقوال پیشِ خدمت ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اور دلنشین اسلوب کوئی کہاں سے لائے گا۔

جن چیزوں کو اخلاقِ حسنہ کہا گیا ہے وہ کیا ہیں

انسانی معاشرہ کا فرد ہوتے ہوئے معاشرہ کے دوسرے افراد کے جو حقوق انسان پر واجب ہیں ان کو حسن و خوبی سے انجام دینا ہی حسنِ خلق کہلاتا ہے۔ ماں باپ، بیوی، بچے، پڑوسی، یتیم، بیوہ، سائل، بیمار، مسافر، مجاہد، سب کے ساتھ مروت و احسان کرنے کی تاکید ارشاداتِ نبوت میں موجود ہے۔ یہ تعلیم اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ انسان تو انسان حیوانات و نباتات بھی اس میں داخل ہیں۔ شیر دار جانوروں کو تلف کرنے، پھل دار درختوں کو کاٹنے، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو ویران کرنے، بستے ہوئے گھروں کو اجاڑنے، ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسلوب تخاطب اتنا شیریں ہے کہ اس کی مٹھاس اور عذوبت روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ایک فاحشہ عورت کا تذکرہ ہے۔ جس کے عمر بھر گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے معاف فرمایا کہ اس نے پیاس سے تڑپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا۔ بیوہ عورتوں، مسکین لوگوں کی خدمت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

الساعی علی الارملۃ والمساکین کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النہار ویقوم اللیل

ترجمہ: بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور اس عابد کی مانند ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

یتیم کی حفاظت اور کفالت کے شوق کو یوں مہمیز لگائی ہے:

"انا وکافل الیتیم فی الجنة ھکذا"

"کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ساتھ ہوں گے جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں"۔

بے شک معلم اخلاق کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں اور اس کا اسلوب بیان بھی دلنشین اور لذیذ ہے ۔ لیکن معلم کریم کی شخصیت میں جو دلربائیاں اور رعنائیاں ہیں وہ قلب ونظر کو مسحور کر رہی ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر دل دیوانہ اور روح سرشار ہو جاتی ہے۔ ان کی ذات والاصفات میں جو بانکپن اور نکھار ہے اس نے ان کی دعوت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تو خود راست گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی تو خود ایسے ایسیریوں کا ربند ہوئے کہ دشمن بھی عش عش کر اٹھے۔ آپ کو معلوم ہے جب قیصر روم نے ابوسفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ حضورؐ کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے، ابوسفیان اس وقت اسلام اور رسول اسلام کا بدترین دشمن تھا، لیکن اس کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ آپؐ کے اخلاق بڑے بلند ہیں، وہ قول کے پکے اور بات کے سچے ہیں۔ عرب کے بدو اور اجڈ لوگ حضورؐ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر حضورؐ کے گرویدہ ہوئے تھے۔ مسجد نبوی کی تعمیر کا وقت آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس کی بنیادیں کھود رہے ہیں۔ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حبیب بھی ان کے ساتھ کام میں برابر کا شریک ہے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر جب عرب کے سارے مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا، اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لئے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا، صحابہ کرامؓ کی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھ میں کدال لئے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ گیسوئے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے، روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے، اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدین اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجھاد ما بقینا ابدا

ترجمہ: ہم وہ جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفٰےؐ کے دست مبارک پر تادم واپسیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

سرور عالم ہادی برحقؐ ان کے جوش ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

اللھم لا عیش الا عیش الآخرہ　　فاغفر الانصار والمھاجرہ

اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الٰہی میرے انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

لشکر اسلام میدان بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ تین تین سپاہیوں کے لیے ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اپنی سواری میں سیدنا علیؓ اور مرثدؓ بن ابی مرثد کو شریک کر لیا ہے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدسیوں کا یہ لشکر نکلتا ہے تو حضورؐ اونٹنی پر سوار ہیں، مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضورؐ اتر جاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری میں بھی حضورؐ ہی سوار رہیں اس سے انھیں روحانی مسرت ہوگی۔ حضورؐ جانتے ہیں کہ یہ پیش کش صدق دل سے کی جا رہی ہے لیکن حضورؐ کو اچھی طرح علم ہے کہ حضورؐ کا مقام اقدار عالیہ کے معلم اور استاد کا ہے، حضورؐ ان کی

اس مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انہیں یوں جواب دیتے ہیں ۔

ما انتما با قوی منی ولا انا اغنیٰ عنکما من الاجر ۔

کہ نہ تم مجھ سے طاقتور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ تمھیں مجھ سے زیادہ اجر و ثواب کی ضرورت ہے ۔ چرخ پیر نے بھی یہ منظر کا ہے کو دیکھا ہو گا کہ لشکر کا سپہ سالار، اُمت کا سردار اور مجاہدین کا محبوب قائد ناقہ کی نکیل ہاتھ میں لئے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔

یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا، یہی وہ اخلاق کریمانہ تھے جنہوں نے سب کو حضورؐ کی محبت کا اسیر بنا لیا ۔ یہی وہ سیرت کا بلند معیار تھا جس نے عرب جیسی وحشی درندہ صفت اور درشت قوم کو کاروانِ انسانیت کا امام بنا دیا۔ اس معلم اخلاق کی تربیت سے وہ اُمت تیار ہوئی جس کے بارے میں خالقِ دو جہاں نے فرمایا :

کنتم خیر امة اخرجت للناس

شیم الحبیب

مصنف : مفتی الٰہی بخش کاندھلوی
مترجم : مولانا اشرف علی تھانوی

میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں جس نے ہماری طرف ایک رسول کو بھیجا جو عربی، ہاشمی، مکی مدنی سردار، امین، سچی خبریں دینے والے سچی خبریں دیے گئے قریشی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کی آل واصحاب پر جو کہ آپ کے محب خاص اور راز دار با اختصاص تھے۔ رحمت نازل فرمادے اور بعد حمد وصلوٰۃ کے مدعا یہ ہے کہ علماء (ہمیشہ سے) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل کو جمع کرتے رہے۔

اور اس باب میں نوبنو مسلک اور اعتدال طریق پر چلتے رہے۔ لیکن بعض نے اس قدر تطویل کی جس سے دل اُکتا جاوے اور بعض نے اس قدر اختصار کیا کہ فہم مطلب ہی میں خلل پڑجاوے اور لوگ مختلف ہوتے ہیں بعضے (تطویل یا ایجاز سے) بھاگتے ہیں اور بعضے اس کے شائق اور طالب ہوتے ہیں۔ (سو تطویل واختصار سے نفع عام نہیں ہوتا بخلاف مقدار اوسط مناسب کے کہ وہ ہر شخص کے مذاق کے موافق ہوتا ہے) اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ آپ کے محاسن اوصاف ومکارم اخلاق اور شمائل اور خصائل میں سے ایک مختصر حصہ مگر کافی شافی قلمبند کردں کیونکہ عاشق سرگشتہ ومہجور جب محرومِ وصال ہوتا ہے تو منزل محبوب یا خط وخال ہی کو یاد کر کے اپنے دل کو سمجھاتا ہے اور محبوب کے جمال اور اوصاف کا بیان وتذکرہ کر کے اپنا جی بہلاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس میں حصولِ ثواب اور نجات من العذاب اور شفاعت محبوب رب الارباب اور دعائے طالبین واحباب کی بھی امید رکھتا ہوں اور یہ امید کیسے نہ رکھوں جبکہ حسنِ عمل کا کوئی وسیلہ میرے پاس نہیں اور عمر تمام معاصی اور لغزشوں میں صرف ہوئی اس لیے میں نے آپ کے شمائل ومدائح وفضائل کے تذکرہ کا دامن پکڑا۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے اور سب مسلمانوں سے اس کو قبول فرمائے اور مستحق جمیع محامد کا وہی رب العالمین ہے اور چونکہ کتاب الشمائل امام ترمذی رحمۃ اللہ کی اور کتاب الشفاء قاضی عیاض رحمۃ اللہ کی اس باب میں جامع تر اور ضابطہ ترتھیں اس لیے میں نے انہی دو کتابوں سے ایسے مضامین منتخب کیے جو طالب راغب کو (دوسری کتابوں سے) بے نیاز کردیں اور جن سے مہجور مشتاق دل کو تسلی ہوسکے۔ سو ہم امام حسنؓ بن علی کی روایت سے جو کہ ہندؓ سے مروی ہے شروع کرتے ہیں کیونکہ وُہ فصاحت و بلاغت کے منتہی پیمانہ پر ہے اور معدن نبوتِ ورسالت یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلاماً تا بین کاملین کے بیان خصوصیات کے اعلیٰ درجہ میں ہے۔ پس میں کہتا ہوں (وصل اوّل آپ کے حلیہ شریف میں) قاضی ممدوح نے اپنے اسناد معنعن سے جو کہ امام زین العابدینؒ تک پہنچتی ہے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ حضرت حسنؓ بن علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ دریافت کیا اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت ذکر اوصاف کیا کرتے تھے اور میں امیدوار رہا کہ ان اوصاف میں سے کچھ میرے سامنے بھی بیان کریں جس کو میں اپنے ذہن میں جماؤں۔ پس اُنھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی ذات میں) عظیم تھے (نظروں میں) معظم تھے آپ کا چہرۂ مبارک ماہِ بدر کی طرح چمکتا تھا بالکل میانہ قد آدمی سے تو

قامت میں قدرے نکلے ہُوئے تھے اور دراز قد سے قامت میں کم تھے۔ سر مبارک (اعتدال کے ساتھ) کلاں تھا۔ مُوئے سر سیدھے قدرے بل دار تھے۔ اگر سر کے بالوں کو جمع کرتے وقت اُن میں (اتفاقاً از خود) مانگ نکل آتی تو مانگ نکلی رہنے دیتے تھے ورنہ نہیں (یعنی ابتدائِ اسلام میں ایسا معمول تھا اور بعد میں تو قصداً مانگ نکالتے تھے) آپ کے موئے سر نرمۂ گوش سے تجاوز کر جاتے تھے جبکہ آپ بالوں کو بڑھائے ہوئے تھے آپ کا رنگ مبارک چمکدار تھا، پیشانی فراخ تھی، ابرو خمدار بالوں سے پُر تھی اور باہم پیوستہ نہ تھیں اُن دونوں کے درمیان میں ایک رگ تھی کہ وُہ غصہ میں اُبھر جاتی تھی۔ بلند بینی تھے بینی مبارک پر ایک نور نمایاں تھا کہ جو شخص تامل نہ کرے آپ کو دراز بینی سمجھے۔ ریش مبارک بھری ہوئی تھی پتلی خُوب سیاہ تھی رُخسار مبارک سُبک تھے۔ دہن مبارک (اعتدال کے ساتھ) فراخ تھا (یعنی تنگ نہ تھا نہ یہ کہ زیادہ فراخ تھا) دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں (ذرا ذرا) ریخیں تھیں۔ سینہ سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط تھا۔ گردن مبارک ایسی (خوبصورت) تھی جیسی تصویر کی گردن (خوب صورت تراشی جاتی ہے) صفائی میں چاندی جیسی تھی۔ بدن جسامت میں معتدل اور پُر گوشت اور کسا ہوا تھا۔ شکم اور سینہ مبارک ہموار تھا اور سینہ قدرے اُبھرا ہوا تھا آپ کے شانوں کے درمیان قدرے (اوروں سے زائد) فاصلہ تھا جوڑ پر کی ہڈیاں کلاں تھیں۔ کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن روشن تھا۔ سینہ اور ناف کے درمیان لکیر کی طرح بالوں کی ایک متصل دھاری چلی آتی تھی اور ان بالوں کے سوا ثدیین (وغیرہ) پر بال نہ تھے (البتہ) دونوں بازو اور شانوں سینہ کے بالائی حصہ پر (مناسب مقدار سے) بال تھے۔ کلائیاں دراز تھیں ہتھیلی فراخ تھی۔ کفین اور قدمین پُر گوشت تھے۔ (یا تھ پاؤں کی انگلیاں لمبی تھیں یا راوی نے بلند کہا ہے (کہ اس کا بھی وہی حاصل ہے)

اعصاب آپ کے برابر تھے۔ آپ کے تلوے (قدرے) گہرے تھے (کہ چلنے میں زمین کو نہ لگتے) قدم مبارک ہموار اور ایسے صاف تھے کہ پانی اُن پر سے (بالکل ڈھل جاتا یعنی میل کچیل خشونت وغیرہ سے پاک تھے چکنے ہونے سے پانی ان کو ذرا نہ لگا رہتا)۔ جب چلنے کے لیے پاؤں اُٹھاتے تو قوت سے پاؤں اکھڑتا تھا اور قدم اس طرح رکھتے کہ آگے کو جھک پڑتا تھا اور تواضع کے ساتھ قدم بڑھا کر چلتے۔ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا گویا (کسی بلندی سے) پستی میں اُتر رہے ہیں جب کسی (کروٹ) کی طرف (کی چیز) کو دیکھنا چاہتے تو پورے پھر کر دیکھتے (یعنی کن انکھیوں سے دیکھنے کی عادت نہ تھی) نگاہ نیچی رکھتے آسمان کی طرف نگاہ کرنے کی نسبت زمین کی طرف آپ کی نگاہ زیادہ رہتی۔ عموماً عادت آپ کی گوشۂ چشم سے دیکھنے کی تھی (مطلب یہ کہ غایت حیا سے پورا سر اٹھا کر نگاہ بھر کر نہ دیکھتے) اپنے اصحاب کو چلنے میں آگے کر دیتے۔ جس سے ملتے خود ابتدا السلام فرماتے۔ پھر میں نے (یعنی امام حسنؓ نے ہند بن ابی ہالہ سے) کہا آپ کی گفت گو کے متعلق مجھ سے بیان کیجیے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت (آخرت کے) غم میں اور ہمیشہ (امورِ آخرت کی) سوچ میں رہتے کسی وقت آپ کو چین نہیں ہوتا تھا اور بلا ضرورت کلام نہ فرماتے تھے۔ آپ کا سکوت طویل ہوتا تھا کلام کو شروع اور ختم مُنہ بھر کر فرماتے (یعنی گفتگو اوّل سے آخر تک نہایت صاف ہوتی) کلام جامع فرماتے (جس کے الفاظ مختصر ہوں مگر پُر مغز ہوں) آپ کا کلام (حق و باطل میں) فیصلہ کن ہوتا جو حشو و زوائد ہوتا اور نہ تنگ ہوتا۔ آپ نرم مزاج تھے نہ مزاج میں سختی تھی اور نہ مخاطب کی اہانت فرماتے نعمت اگر قلیل بھی ہوتی تب بھی اس کی تعظیم فرماتے اور کسی نعمت کی مذمت نہ فرماتے مگر کھانے کی چیز کی مذمت اور مدح دونوں نہ فرماتے (مذمت تو اس لیے نہ فرماتے کہ وہ نعمت تھی اور مدح زیادہ اس لیے نہ فرماتے کہ اکثر اس کا سبب

حرص اور طلب لذت ہوتی ہے) جب امر حق کی کوئی شخص ذرا مخالفت کرتا تو اس وقت آپ کے غصہ کی کوئی تاب نہ لا سکتا تھا جب تک کہ اس حق کو غالب کر لیتے اور اپنے نفس کے لیے غضبناک نہ ہوتے تھے اور نہ نفس کے لیے انتقام لیتے اور (گفتگو کے وقت) جب آپ اشارہ کرتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ کرتے اور جب کسی امر پر تعجب فرماتے تو ہاتھ کو لوٹتے، جب آپ بات کرتے تو اس کو یعنی داہنے انگوٹھے کو بائیں ہتھیلی سے متصل کرتے یعنی اس پر مارتے اور جب آپ کو غصہ آتا تو آپ اُدھر سے مُنہ پھیر لیتے اور کروٹ بدل لیتے اور جب خوش ہوتے تو نظر نیچی کر لیتے (یہ دونوں امر ناشی حیا سے ہیں) اکثر ہنسنا آپ کا تبسم ہوتا اور اس میں دندان مبارک جو ظاہر ہوتے تو ایسے معلوم ہوتے جیسے بارش کے اولے۔

وصل دوم آپ کے تقسیم اوقات و طرزِ معاشرت میں:

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک زمانہ تک حسینؓ بن علیؓ سے اس کو چھپائے رکھا پھر جو میں نے اُن سے بیان کیا تو معلوم ہُوا کہ وُہ مجھ سے پہلے اپنے والد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں جانا باہر آنا نشست و برخاست طرز طریق سب پوچھ چکے ہیں اور کوئی بات بھی (بے تحقیق کیے ہُوئے) نہیں چھوڑی غرض امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تشریف رکھنے کے متعلق پُوچھا انہوں نے فرمایا کہ آپ کا گھر میں اپنے ذاتی حوائج (طعام و منام وغیرہ) کے لیے تشریف لے جانا آپ اس اس باب میں (منجانب اللہ) ماذون تھے سو آپ اپنے گھر میں تشریف لاتے تو آپ اپنے اندر رہنے کے وقت کو تین حصوں پر تقسیم فرماتے ایک حصہ اللہ تعالیٰ (کی عبادت) کے لیے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں (کے حقوق ادا کرنے) کے لیے (جیسے اُن سے ہنسنا بولنا) اور ایک حصہ اپنے نفس (کی راحت) کے لیے پھر اپنے حصّہ کو اپنے اور لوگوں کے درمیان تقسیم فرما دیتے (یعنی اُس میں سے بھی بہت سا وقت اُمت کے کام میں صرف فرماتے) اور اُس حصۂ وقت کو خاص اصحاب کے واسطے سے عام لوگوں کے کام لگا دیتے (یعنی اس حصہ میں عام لوگ تو نہیں آ سکتے تھے مگر خواص حاضر ہوتے اور دین کی باتیں سن کر عوام کو پہنچاتے اس طرح سے لوگ بھی ان منافع میں شریک ہو جاتے) اور لوگوں سے کسی چیز کا اخفاء نہ فرماتے (یعنی احکام دینیہ کا اور نہ متاع دنیوی کا بلکہ ہر طرح کا نفع بلا دریغ پہنچاتے) اور اس حصہ امت میں آپ کا طرز یہ تھا کہ اہلِ فضل (یعنی اہلِ علم و عمل) کو آپ اس امر میں اوروں پر ترجیح دیتے کہ ان کو حاضر ہونے کی اجازت دیتے اور اُس وقت کو ان لوگوں پر بقدر ان کے فضیلتِ دینیہ کے تقسیم فرماتے سو ان میں سے کسی ایک کو ایک ضرورت ہوتی کسی کو دو ضرورتیں کسی کو زیادہ ضرورتیں ہوتیں سو ان کی حاجت میں مشغول ہوتے اور ان کو ایسے شغل میں لگاتے جس میں ان کی اور بقیہ امت کی اصلاح ہو وہ شغل یہ کہ وہ لوگ آپ سے پُوچھتے اور ان کے مناسب حال امور کی اُن کو اطلاع دیتے اور آپ یہ فرمایا کرتے کہ جو تم میں حاضر ہے وہ غیر حاضر کو خبر کر دیا کرے اور (یہ بھی فرماتے کہ) جو شخص اپنی حاجت مجھ تک (کسی وجہ سے مثلاً پردہ یا ضعف یا بعد وغیرہ ذلک) نہ پہنچا سکے تو تم لوگ اُس کی حاجت مجھ تک پہنچا دیا کرو کیونکہ جو شخص ایسے شخص کی حاجت کسی ذی اختیار تک پہنچا دے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُس کو پُلصراط پر ثابت قدم رکھے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انہی باتوں کا تذکرہ ہوتا تھا اور اس کے خلاف دوسری بات قبول نہ فرماتے (مطلب یہ کہ لوگوں کے حوائج و منافع کے سوا دوسری لایعنی یا مضر باتوں کی سماعت بھی نہ فرماتے) اور سفیان بن وکیع کی حدیث میں حضرت علیؓ کا یہ قول بھی ہے کہ لوگ آپ کے پاس طالب ہو کر آتے اور کچھ نہ کچھ کھا کر واپس ہوتے (یعنی آپ علاوہ

نفعِ علمی کے کچھ نہ کچھ کھلاتے بھی تھے) اور ہادی یعنی فقیہہ ہو کر آپ کے پاس سے باہر نکلتے۔ امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ میں نے (اپنے والد سے عرض کیا کہ آپ کے باہر تشریف رکھنے کے حالات بھی مجھ سے بیان کیجیے کہ اُس وقت میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ اپنی زبان کو لایعنی باتوں سے محفوظ رکھتے تھے اور لوگوں کی تالیفِ قلب فرماتے تھے اور اُن میں تفریق نہ ہونے دیتے تھے اور ہر قوم کے آبرو دار آدمی کی آبرو کرتے تھے اور ایسے آدمی کو اُس قوم پر سردار مقرر فرما دیتے تھے اور لوگوں کو (امورِ مضرّہ سے) حذر رکھنے کی تاکید فرماتے تھے اور ان (کے شرر) سے اپنا بھی بچاؤ رکھتے تھے مگر کسی شخص سے کشادہ روئی اور خوش خوئی میں کمی نہ کرتے تھے اپنے ملنے والوں کی حالت کا استفسار رکھتے تھے اور لوگوں میں جو واقعات ہوتے تھے آپ ان کو پُوچھتے رہتے تاکہ مظلوم کی نصرت اور مفسدوں کا انسداد ہو سکے اور اچھی بات کی تحسین اور تصویب اور بُری بات کی تقبیح اور تحقیر فرماتے۔ آپ کا ہر معمول نہایت اعتدال کے ساتھ ہوتا تھا اس میں بے انتظامی نہیں ہوتی تھی (کہ کبھی کسی طرح کر لیا کبھی کسی طرح کر لیا۔ لوگوں کی تعلیم مصلحت سے) غفلت نہ فرماتے بوجہ اس احتمال کے کہ اگر اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بعضے خود دین سے غافل ہو جاویں گے یا (بعضے امورِ دین میں اعتدال سے زیادہ مشغول ہو کر دین سے) اُکتا جاویں گے ہر حالت کا آپ کے یہاں ایک خاص انتظام تھا۔ حق سے کبھی کوتاہی نہ کرتے اور ناحق کی طرف کبھی تجاوز کر کے نہ جاتے لوگوں میں سے آپ کے مقرب بہترین لوگ ہوتے سب میں افضل آپ کے نزدیک وہ شخص ہوتا جو عام طور سے سب کا خیر خواہ ہوتا اور سب سے بڑا رتبہ اُس شخص کا ہوتا جو لوگوں کی غم خواری و اعانت بخوبی کرتا۔ پھر میں نے اُن سے آپ کی مجلس کے بارہ میں پوچھا کہ اس میں آپ کا کیا معمول تھا انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھنا اور اٹھنا سب ذکر اللہ کے ساتھ ہوتا اور اپنے لیے کوئی جگہ بیٹھنے کی (ایسی) معین نہ فرماتے (کہ خواہ مخواہ اسی جگہ بیٹھیں اور اگر کوئی بیٹھ جاوے تو اس کو اُٹھا دیں) اور دوسروں کو بھی (اس طرح) جگہ معین کرنے سے منع فرماتے اور جب کسی مجمع میں تشریف لے جاتے اور جس جگہ مجلس ختم ہوتی وہاں ہی بیٹھ جاتے اور دوسروں کو بھی یہی حکم فرماتے اور اپنے جلیسوں میں سے ہر شخص کو اس کا حصہ (اپنے خطاب و توجہ سے) دیتے (یعنی سب پر جدا جدا متوجہ ہو کر خطاب فرماتے) یہاں تک کہ آپ کا ہر جلیس یُوں سمجھتا کہ مجھ سے زیادہ آپ کو کسی کی خاطر عزیز نہیں، جو شخص کسی ضرورت کے لیے آپ کو لے کر بیٹھ جاتا یا کھڑا رکھتا تو جب تک وہی شخص نہ ہٹ جاتا آپ اس کے ساتھ مقید رہتے۔ جو شخص آپ سے کچھ حاجت چاہتا تو بدون اس کے کہ اُس کی حاجت پُوری فرماتے یا نرمی سے جواب دیتے اس کو واپس نہ کرتے آپ کی کشادہ روئی اور خوشخوئی تمام لوگوں کے لیے عام تھی گویا بجائے اُن کے باپ کے ہو گئے تھے اور تمام لوگ آپ کے نزدیک حق میں (فی نفسہٖ) مساوی تھے (البتہ) تقویٰ کی وجہ سے متفاوت تھے (یعنی تقویٰ کی زیادتی سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے تھے اور امور میں سب باہم متساوی تھے) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ حق میں سب آپ کے نزدیک برابر تھے آپ کی مجلس حلم اور علم و حیا اور صبر و امانت کی مجلس ہوتی تھی اس میں آوازیں بلند نہ کی جاتی تھیں اور کسی کی حرمت پر کوئی داغ نہ لگایا جاتا اور کسی کی غلطیوں کی اشاعت نہ کی جاتی تھی۔ آپ کے اہلِ مجلس ایک دُوسرے کی طرف تقویٰ کے سبب متواضع مائل ہوتے تھے اس میں بڑوں کی توقیر کرتے تھے اور چھوٹوں پر مہربانی کرتے تھے اور صاحب حاجت کی اعانت کرتے تھے اور بے وطن پر رحم کرتے تھے۔ پھر میں نے ان سے آپ کی سیرت اپنے اہلِ مجلس کے ساتھ دریافت کی انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت کشادہ رُو رہتے نرم اخلاق تھے آسانی سے موافق ہو جاتے تھے نہ سخت خُو تھے نہ درشت گو تھے نہ چلا کر

بولتے اور نہ نامناسب بات فرماتے تھے نہ کسی کا عیب بیان کرتے اور نہ (مبالغہ کے ساتھ) کسی کی مدح فرماتے جو بات (یعنی خواہش کسی کی) آپ کی طبیعت کے خلاف ہوتی اُس سے تغافل فرما جاتے (یعنی اس پر گرفت نہ فرماتے) اور (تصریحاً) اُسے مایوس (بھی) نہ فرماتے (بلکہ خاموش ہو جاتے) آپ نے تین چیزوں سے تو اپنے کو بچا رکھا تھا، ریاء سے اور کثرتِ کلام سے اور بے سُود بات سے، اور تین چیزوں سے دوسرے آدمیوں کو بچا رکھا تھا کسی کی مذمت نہ فرماتے کسی کو عار نہ دلاتے اور نہ کسی کا عیب تلاش کرتے اور وہی کلام فرماتے جس میں اُمید ثواب کی ہوتی اور جب آپ کلام فرماتے تھے آپ کے تمام جلیس اسی طرح سر جُھکا کر بیٹھ جاتے جیسے ان کے سروں پر پرندے آکر بیٹھ گئے ہوں، اور جب آپ ساکت ہوتے تب وہ لوگ بولتے۔ آپ کے سامنے کسی بات میں نزاع نہ کرتے۔ آپ کے پاس جو شخص بولتا اُس سے فارغ ہونے تک سب خاموش رہتے (یعنی بات کے بیچ میں کوئی نہ بولتا) اہل مجلس (میں سے ہر شخص) کی بات (رغبت کے ساتھ سُنے جانے میں) ایسی ہی ہوتی جیسے سب میں پہلے شخص کی بات تھی (یعنی کسی کے کلام کی بے قدری نہ کی جاتی) جس بات سے سب ہنستے آپ بھی ہنستے جس سے سب تعجب کرتے آپ بھی تعجب فرماتے اور پردیسی آدمی کی بے تمیزی کی گفتگو پر تحمل فرماتے اور فرمایا کرتے کہ جب کسی صاحبِ حاجت کو طلبِ حاجت میں دیکھو تو اس کی اعانت کرو، اور کوئی آپ کی ثناء کرتا تو آپ اس کو جائز نہ رکھتے البتہ اگر کوئی (احسان کی) مکافات کے طور پر کرتا تو خیر (بوجہ مشروع ہونے اس ثناء کے بشرط عدم تجاوز حد کے اس کو گوارا فرما لیتے) اور کسی بات کو نہ کاٹتے، یہاں تک کہ وُہ حد سے بڑھنے لگتا اُس وقت اُس کو ختم کرا دینے سے یا اُٹھ کر کھڑے ہو جانے سے قطع فرما دیتے اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے کہا آپ کا سکوت کس کیفیت کا تھا انہوں نے کہا کہ آپ کا سکوت چار امر پر مشتمل ہوتا تھا حلم اور بیدار مغزی اور اندازکی رعایت اور فکر (آگے ہر ایک کا بیان ہے) سو اندازکی رعایت تو یہ کہ حاضرین کی طرف نظر کرنے میں اور اُن کی عرض معروض سُننے میں برابری فرماتے تھے اور فکر باقی اور خالی میں فرماتے تھے (یعنی دنیا کے فنا اور عُقبیٰ کی بقاء کو سوچا کرتے) اور حلم آپ کا صبر یعنی ضبط کے ساتھ جمع کر دیا گیا تھا (آگے اس ضبط کا بیان ہے)

سو آپ کو کوئی چیز ایسا غضبناک نہ کرتی تھی کہ آپ کو از جا رفتہ کر دے اور بیدار مغزی آپ کی چار امر کی جامع ہوتی تھی ایک نیک بات کو اختیار کرنا تاکہ اور لوگ آپ کا اقتداء کریں۔ دُوسرے بُری بات کو ترک کرنا تاکہ اور لوگ بھی باز رہیں تیسرے رائے کو اُن امور میں صرف کرنا جو آپ کی اُمت کے لیے مصلحت ہو چوتھے اُمت کے لیے اُن امور کا اہتمام کرنا جن میں اُن کی دنیا اور آخرت دونوں کے کاموں کی درستی ہو۔

وصل سوم تتمہ وصل اوّل میں :

جاننا چاہیے کہ اسی طرح کے شمائل متفرق حدیثوں میں ان حضرات سے وارد ہُوئے ہیں حضرت انسؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت براء بن عازبؓ حضرت عائشہؓ حضرت ابو جحیفہؓ حضرت جابر بن سمرہؓ حضرت امّ معبدؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت معرض بن معیقیبؓ حضرت ابو الطفیلؓ حضرت عداء بن خالدؓ حضرت خریم بن فاتکؓ حضرت حکیم بن حزامؓ ہم بھی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے

مختصر سا اس میں سے ذکر کرتے ہیں پس ان سب حضرات نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ مبارک چمکتا ہوا تھا آپ کی پتلی نہایت سیاہ تھی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ مژگانیں آپ کی دراز تھیں۔ دونوں ابروؤں کے درمیان قدرے کشادگی تھی ابرو خمدار تھی بینی مبارک بلند تھی ودندان مبارک میں کچھ ریخیں تھیں (یعنی بالکل اوپر تلے چڑھے ہوئے نہ تھے) چہرہ مبارک گول تھا جیسا چاند کا ٹکڑا۔ ریش مبارک گنجان تھی کہ سینہ مبارک بھر دیتی تھی شکم اور سینہ ہموار تھا سینہ چوڑا تھا۔ دونوں شانیں کلاں تھے استخواں بھاری تھیں دونوں کلائیاں اور بازو اور اسفل بدن (ساق وغیرہ) بھرے ہوئے تھے دونوں کف دست اور قدم کشادہ تھے سینہ سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط تھا قد مبارک میانہ تھا نہ تو بہت زیادہ دراز نہ بہت کوتاہ کہ اعضاء ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے ہوں اور رفتار میں کوئی آپ کے ساتھ نہ رہ سکتا تھا (یعنی رفتار میں ایک گونہ سرعت تھی مگر بے تکلف) آپ کا قامت قدرے درازی کی طرف نسبت کیا جاتا تھا (یعنی طویل تو نہ تھا مگر دیکھنے میں قد اونچا معلوم ہوتا تھا) بال قدرے بل دار تھے جب ہنسنے میں دندان مبارک ظاہر ہوتے تو جیسے برق کی روشنی نمودار ہوتی ہے جیسے اولے بارش کے ہوتے ہیں جب آپ کلام فرماتے تو سامنے کے دانتوں کے بیچ میں سے ایک نور سا نکلتا معلوم ہوتا تھا گردن نہایت خوب صورت تھی چہرہ مبارک پھولا ہوا نہ تھا اور نہ بالکل گول تھا (بلکہ مائل بتدویر تھا) بدن گٹھا ہوا تھا گوشت ہلکا تھا اور دوسری روایتوں میں ہے کہ آنکھوں میں سفیدی کے ساتھ سرخی تھی جوڑ بند کلاں تھے۔ جب زمین پر پاؤں رکھتے تو پورا پاؤں رکھتے تھے تلوے میں زیادہ گڑھا نہ تھا یہ تمام کتاب شفا کے مضمون کا خلاصہ ہے اور ترمذی نے اپنے شمائل میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ہمارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں کف دست اور دونوں قدم پُر گوشت تھے سر مبارک کلاں تھا۔ جوڑ کی ہڈیاں بڑی تھیں۔ نہ بہت طویل القامت تھے اور نہ کوتاہ قامت تھے کہ بدن کا گوشت ایک دوسرے میں دھنسا ہوا ہو آپ کے چہرہ مبارک میں ایک گونہ گولائی تھی۔ رنگ گورا تھا اس میں سرخی دمکتی تھی۔ سیاہ آنکھیں تھیں۔ مژگانیں دراز تھیں۔ شانے کی ہڈیاں اور شانے بڑے بڑے تھے۔ بدن مبارک بے مُو تھا (یعنی بدن پر بال نہ تھے البتہ سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک دھاری تھی جب کسی (کروٹ) کی طرف (کی چیز) کو دیکھنا چاہتے تو پُورے پھر کر دیکھتے۔ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مُہرِ نبوت تھی اور آپ خاتم النبیین تھے۔ اور حضرت جابرؓ بن سمرہ کی روایت میں ہے کہ آپ کا دہن مبارک (اعتدال کے ساتھ) فراخ تھا۔ ایڑیوں کا گوشت ہلکا تھا۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔ جب آپ کی طرف نظر کرو تو یوں سمجھو کہ آپ کی آنکھوں میں سُرمہ پڑا ہے حالانکہ سُرمہ پڑا نہ ہوتا تھا اور حضرت ابوالطفیل لیثی نے کہا ہے کہ آپ گورے ملیح میانہ قد تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ میانہ قامت خوش اندام گندمی رنگ تھے۔ موئے سر دراز تھے بن گوش تک۔ آپ پر ایک سُرخ (دھاری دار) جوڑا تھا۔ اور شمائل ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ بہت دراز تھے اور نہ کوتاہ قامت تھے اور نہ بالکل گورے بھبوکا تھے اور نہ سانولے تھے اور مُوئے مبارک آپ کے نہ بالکل خمدار تھے اور نہ بالکل سیدھے (بلکہ کچھ بل دار تھے)۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو چالیس برس کے ختم پر نبی بنایا پھر مکہ میں دس برس مقیم رہے اور حضرت ابن عباسؓ کے قول پر تیرہ برس رہے کہ آپ پر وحی ہوتی تھی (دس برس کی روایت میں کسر کو حساب میں نہیں لیا پس دونوں روایتیں متطابق ہیں)

اور مدینہ میں دس سال رہے پھر ساٹھ سال کی عمر میں اور ابن عباسؓ کے قول پر ترسیٹھ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی اور امام بخاریؒ نے فرمایا کہ ترسیٹھ سال کی روایتیں زیادہ ہیں اور (باوجود اتنی عمر کے) آپ کے سر اور ریش مبارک میں سفید بال بیس بھی نہ تھے اور محققین نے کہا ہے کہ آپ کے سر اور داڑھی میں سفید بال کل سترہ تھے۔ اور حضرت جابر بن سمرہؓ نے فرمایا کہ میں نے مہرِ نبوت کو آپ کے دونوں شانوں کے درمیان میں ایک سُرخ اور اُبھرا ہوا گوشت مثل بیضۂ کبوتر کے دیکھا۔ حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ وہ مثل چھپر کھٹ (مسہری) کی گھنڈی کے تھی اور عمرو بن اخطب انصاری سے روایت ہے کہ کچھ بال جمع تھے اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ کی کمر پر ایک اُبھرا ہوا گوشت کا ٹکڑا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مثل مٹھی کے تھی اُس کے گرداگرد تل تھے جیسے مسّے ہوتے ہیں (اور ان روایات میں کچھ منافی نہیں سب اوصاف کا جمع ہونا ممکن ہے) حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے کوئی بالوں والا سُرخ جوڑا (یعنی مخطط لنگی چادر) پہنے ہُوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا اور حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں نے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین نہیں دیکھا گویا آپ کے چہرہ میں آفتاب چل رہا ہے اور جب آپ ہنستے تھے تو دیواروں پر چمک پڑتی تھی۔ اور حضرت جابرؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مثل تلوار کے (شفاف) تھا انہوں نے کہا کہ نہیں بلکہ مثل آفتاب اور ماہتاب کے مدور تھا (تلوار کی تشبیہ میں یہ کمی تھی کہ وہ مدور نہیں ہوتی) اور حضرت امِ معبدؓ نے کہا آپ دور سے سب سے زیادہ جمیل اور نزدیک سے سب سے زیادہ شیریں اور حسین معلوم ہوتے تھے اور حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ جو شخص آپ کو اوّل وہلہ میں دیکھتا تھا مرعوب ہو جاتا تھا اور جو شخص شناسائی کے ساتھ ملتا جلتا آپ سے محبت کرتا تھا۔ میں نے آپ جیسا (صاحبِ جمال و صاحبِ کمال) نہ آپ سے پہلے کسی کو دیکھا اور نہ آپ کے بعد کسی کو دیکھا۔

وصل چہارم آپ کے طیب و مطیب ہونے میں:

اور حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نے کوئی عنبر اور مشک اور کوئی (خوشبودار) چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہک سے زیادہ خوشبودار چیز نہیں دیکھی اور آپ کسی سے مصافحہ فرماتے تو تمام تمام دن اُس شخص کو مصافحہ کی خوشبو آتی رہتی اور کبھی کسی بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو وُہ خوشبو کے سبب دُوسرے لڑکوں میں پہچانا جاتا اور آپ ایک بار حضرت انسؓ کے گھر سوئے ہوئے تھے اور آپ کو پسینہ آیا تھا تو حضرت انسؓ کی والدہ ایک شیشی لا کر آپ کے پسینہ کو جمع کرنے لگیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے اس بارہ میں پُوچھا انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس کو اپنی خوشبو میں ملا دیں گے اور یہ پسینہ اعلیٰ درجہ کی خوشبو ہے۔ اور امام بخاری نے تاریخ کبیر میں حضرت جابرؓ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس رستہ سے گزرتے اور کوئی شخص آپ کی تلاش میں جاتا تو وہ خوشبو سے پہچان لیتا کہ اس رستہ سے تشریف لے گئے ہیں۔ اسحٰق بن راہویہ نے کہا ہے کہ یہ خوشبو بدون خوشبو لگائے ہُوئے (خود آپ کے بدن مبارک میں) تھی اور ابراہیم بن اسمٰعیل مُزنی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ مجکو (ایک بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سواری پر بٹھلا لیا۔ میں نے مہرِ نبوت کو اپنے منہ میں لے لیا سو اس میں سے مُشک کی لپٹ آ رہی تھی۔ اور مروی ہے کہ جب آپ بیت الخلاء میں جاتے تھے تو زمین پھٹ جاتی تھی اور آپ کے بول و براز کو نگل جاتی اور اس جگہ

نہایت پاکیزہ خوشبو آتی۔ حضرت عائشہؓ نے اسی طرح روایت کیا ہے اور اسی لیے علماء آپ کے بول و براز کے طاہر ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔

ابو بکر بن سابق مالکی اور ابو نصر نے اس کو نقل کیا ہے اور مالک بن سنان یوم احد میں آپ کا خون (زخم کا) چوس کر پی گئے۔ آپ نے فرمایا اس کو کبھی دوزخ کی آگ نہ لگے گی اور عبد اللہ بن زبیر نے آپ کا خون جو پچھنے لگانے سے نکلا تھا، پی لیا تھا اور برکتؓ اور آپ کی خادمہ اُمِ ایمنؓ نے آپ کا بول پی لیا تھا سو اُن کو ایسا معلوم ہُوا جیسا شیریں نفیس پانی ہوتا ہے اور آپ (قدرتی) مختون آور نال کٹے ہُوئے سُرمہ لگے ہُوئے پیدا ہُوئے تھے حضرت آمنہؓ آپ کی والدہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کو پاک صاف جنا، کوئی آلودگی آپ کو لگی ہُوئی نہ تھی اور آپ باوجودیکہ ایسا سوتے تھے کہ خراٹے بھی لینے لگتے تھے (یعنی سونے سے آپ کا وضو نہیں ٹوٹتا تھا) روایت کیا اس کو عکرمہ نے اور وجہ (اُس کی یہ تھی کہ) آپ سونے میں حدث سے محفوظ تھے۔

وصلِ پنجم آپ کی قوتِ بصیرت میں:

وہب بن مُنَبِّہ کہتے ہیں کہ میں نے اکثر کتابوں میں پڑھا ہے اور سب میں یہ مضمون پایا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم عقل میں سب پر ترجیح رکھتے تھے رائے میں سب سے افضل تھے۔ اور آپ ظلمت میں بھی اس طرح دیکھتے تھے جس طرح روشنی میں دیکھتے تھے جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے اور آپ دور سے ایسا ہی دیکھتے تھے جیسا نزدیک سے۔ اور پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے اور آپ نے نجاشی کا جنازہ (حبشہ میں) دیکھ لیا تھا اور اس پر نماز پڑھی اور آپ نے بیت المقدس کو مکہ معظمہ سے دیکھ لیا تھا جبکہ قریش کے سامنے اُس کا نقشہ بیان فرمایا (یہ سب معراج کی صبح کو قصہ ہوا تھا) اور جب آپ نے مدینہ منورہ میں اپنی مسجد کی تعمیر شروع کی اُس وقت خانہ کعبہ کو دیکھ لیا تھا اور آپ کو ثریا میں گیارہ ستارے نظر آیا کرتے تھے۔

وصلِ ششم آپ کی قوتِ بدنیہ وغیرہ میں:

اور آپ (کی قوت کی یہ کیفیت تھی کہ آپ نے ابو رکانہ کو جو اپنے اہل زمانہ میں بہت قوی (مشہور) تھے کُشتی میں گرا دیا جبکہ اُن کو اسلام کی دعوت دی (اور اُنھوں نے) اپنے اسلام کو اس پر معلق کیا کہ مجکو کشتی میں گرا دیجیے) اور قبل زمانہ اسلام کے آپ نے ابو رکانہ کو کشتی میں گرا دیا تھا۔ وہ دوسری تیسری بار پھر آپ سے مقابل ہوا۔ آپ ہر بار میں اس کو پچھاڑ دیتے تھے اور آپ تیز چلتے تھے کہ جیسے زمین لپٹی چلی آرہی ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم بڑی کوشش کرتے تھے (کہ آپ کے ساتھ چل سکیں) اور آپ کچھ اہتمام بھی نہ فرماتے تھے (پھر بھی ہم تھک جاتے تھے) اور آپ کا ہنسنا تبسم ہوتا تھا اور جب (گوشہ کی) کسی چیز کو دیکھتے تھے تو پُورے اُس طرف مُڑ کر دیکھتے (یعنی دُزدیدہ نظر سے نہ دیکھتے)۔

وصلِ ہفتم آپ کے بعض خصائص میں:

اور آپ کو کلمات جامعہ عطا کیے گئے اور تمام زمین آپ کے لیے مسجد اور آلۂ طہارت بنائی گئی (یعنی یہ نہیں کہ خاص

مسجد ہی میں نماز درست اور جگہ نماز درست نہ ہو اور اسی طرح ہر جگہ کی مٹی سے بشرط پاک ہونے کے تیمم درست ہے) اور آپ کے لیے غنیمت کو حلال کیا گیا (اور پہلی شریعتوں میں مال غنیمت) کا کھانا حلال نہ تھا اور آپ کے لیے شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود مخصوص کیا گیا اور آپ جن وانس اور تمام خلائق کی طرف مبعوث ہُوئے۔

وصل ہشتم آپ کے کلام وطعام ومنام وقعود وقیام میں :

اور عرب کی سب زبانیں جانتے تھے میں کہتا ہوں کہ بلکہ تمام زبانیں (یہ بعض کا قول ہے۔ ام معبدؓ کہتی ہیں کہ آپ شیریں کلام اور واضح بیان تھے نہ بہت کم گو تھے (کہ ضروری بات میں بھی سکوت فرما دیں اور نہ زیادہ گو تھے (کہ غیر ضروری اُمور میں مشغول ہوں) آپ کی گفتگو ایسی تھی جیسے موتی کے دانے پرو دیے گئے ہوں اور آپ کھانے اور سونے بہت کم تھے کھانے ہوئے سہارا لگا کر نہیں بیٹھتے تھے معنی اس کے اہل تحقیق کے نزدیک یہ ہیں کہ نہ ایسی چیز کا سہارا لیتے جو آپ کے نیچے ہوتی (جیسے گدا وغیرہ) اور نہ کسی کروٹ پر (ہاتھ یا تکیہ کے سہارے) بوجہ دے کر بیٹھتے آپ کی نشست کھانے کے لیے ایسی ہوتی جیسے کھڑے ہونے کے لیے کوئی تیار ہو کر بیٹھتا ہے یعنی اکڑو بیٹھتے تھے اور آپ فرمایا کرتے کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں اور غلام کی طرح بیٹھتا ہوں اور آپ کا سونا داہنی کروٹ پر ہوتا تھا کہ قلت منام میں معین ہو۔

وصل نہم آپ کی بعض صفات ومکارم اخلاق شجاعت وسخاوت ہیبت وجاہ وبے نفسی وایثار وغیرہ میں :

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی تھی۔ روایت کیا اسکو نسائی نے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کو ہمبستری میں چالیس مردوں کی قوت دی گئی تھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مجھکو اور لوگوں پر چار چیزوں میں فضیلت دی گئی، سخاوت اور شجاعت اور قوت مردمی اور مقابل پر غلبہ اور آپ نبوت کے قبل بھی اور بعد میں بھی صاحبِ وجاہت تھے حضرت قیلہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جب آپ کو دیکھا تو ہیبت کے مارے کانپنے لگیں۔ آپ نے فرمایا اے غریب دل کو تھام رکھ (یعنی ڈرمت) اور حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے کہ آپ کے روبرو عقبہ بن عمرو کھڑے ہوئے خوف سے کانپنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ طبیعت پر آسانی کرو کوئی جابر بادشاہ نہیں ہوں اور آپ کو تمام خزائن رُوئے زمین کے اور تمام شہروں کی کُنجیاں (عالم کشف میں) عطا کی گئی تھیں اور آپ کی حیات میں بلاد حجاز او ریمن اور تمام جزیرۂ عرب اور نواحِ شام وعراق فتح ہوگئے تھے۔ اور آپ کے حضور میں خمس اور صدقات اور عُشر حاضر کیے جاتے تھے اور سلاطین کی طرف سے ہدایا بھی پیش ہوتے تھے۔ ان سب کو آپ نے لوجہ اللہ صرف فرمایا اور مسلمانوں کو غنی کر دیا اور فرمایا کہ مجھکو یہ بات خوش نہیں آتی کہ میرے لیے کوہِ اُحد سونا بن جاوے اور پھر رات کو اُس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہے بجز ایسے دینار کے جس کو کسی واجب مطالبہ کے لیے تھام لوں اور یہ آپ کی کمال سخاوت وجُود وعطا ہے۔ چنانچہ (اسی کمال سخاوت کے سبب آپ مقروض رہتے تھے حتیٰ کہ) آپ نے جس وقت وفات فرمائی ہے تو آپ کی زرہ اہل وعیال کے اخراجات میں رہن رکھی ہوئی تھی اور آپ اپنے ذاتی خرچ اور پوشاک

اور مسکن میں صرف قدرِ ضرورت پر اکتفا فرماتے تھے اور غالب اوقات آپ کمبل اور موٹا کھیس اور گاڑھی چادر پہنتے تھے اور (بعض اوقات) اپنے اصحاب کو دیبا کی قبائیں جس میں سونے کے تار بنے ہُوئے تھے تقسیم فرماتے تھے اور جو ان میں موجود نہ ہوتے اُن کے لیے اُٹھا کر رکھتے اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ آپ کا خلق قرآن تھا۔ اس کی خوشی کی بات سے آپ خوش ہوتے تھے اور اس کی ناخوشی کی بات سے آپ ناخوش ہوتے تھے (یعنی قرآن سے جو بات حق تعالیٰ کے خوش یا ناخوش ہونے کی ثابت ہوتی آپ کی خوشی و ناخوشی اسی کے تابع تھی) حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ آپ خلق عظیم پر قایم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اصل فطرت میں مکارم اخلاق متانت طبع اور اعتدال مزاج پر پیدا کیا تھا۔

اور حضرت آمنہ بنت وہب کہتی ہیں کہ آپ جس وقت پیدا ہُوئے تو آپ کے دونوں ہاتھ زمین کی طرف کھلے ہُوئے تھے اور سر آسمان کی طرف اٹھائے ہُوئے تھے۔

وصل دہم آپ کی عصمت میں :

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھکو ہوش آیا بتوں سے اور شعر گوئی سے مجھکو نفرت تھی۔ اور کبھی کسی امر جاہلیت (یعنی امر غیر مشروع) کا مجھکو خیال تک بھی نہیں آیا بجز دو بار کے اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ نے مجھکو محفوظ رکھا پھر اس (خیال کی بھی نوبت نہیں آئی)۔

وصل یازدہم تتمہ وصل نہم میں :

اور آپ لوگوں کے ایذا دینے پر سب سے زیادہ صابر تھے اور سب سے بڑھ کر حلیم تھے، بُرائی کرنے والے سے درگزر فرماتے اور جو شخص آپ سے بدسلوکی کرتا تھا آپ اس سے سلوک کرتے تھے اور جو شخص آپ کو نہ دیتا آپ اسی کو دیتے اور جو شخص آپ پر ظلم کرتا آپ اس سے درگزر فرماتے اور کسی کام کے دو پہلوؤں میں جو آسان ہوتا اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہوتا (اس میں اپنے متبعین کے لیے آسانی کی رعایت فرمائی، نیز تجربہ ہے کہ آسانی پسند طبیعت دوسروں کے لیے بھی آسانی تجویز کرتی ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ حتیٰ کہ سیرت ابن ہشام میں مروی ہے کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے اُحد کے روز آپ پر پتھر چلایا اس سے آپ کا دندانِ رباعیہ زیریں جانب راست کا شکستہ ہو گیا (یعنی جھڑ گیا اور رباعیہ کہتے ہیں سامنے کے چار دانتوں کے دونوں کروٹوں کی طرف کے چار دانتوں کو دو اوپر اور دو نیچے) اور آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا لوگوں نے عرض کیا کہ آپ اُن پر بددعا کیجیے۔ آپ نے فرمایا: اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت کیجیے کیونکہ اُن کو خبر نہیں اور آپ نے کسی چیز کو (یعنی آدمی یا جانور کو) اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، البتہ اللہ کی راہ میں جو جہاد کیا وُہ اور بات ہے اور نہ کسی عورت کو مارا نہ کسی خادم کو مارا۔ اور حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی گئی جس پر آپ نے انکار فرما دیا ہو۔ کسی نے خوب کہا ہے (یہ فرزدق کا عربی شعر تھا جس کا ترجمہ فارسی میں یہ ہے): ؎

نرفت لا بزبانِ مبارکش هرگز
مگر در اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

اور آپ درماندوں کا بار اٹھا لیتے تھے اور نادار آدمی کو مال دے دیتے یا دلوا دیتے اور مہمان کی مہمانی کرتے اور حق معاملات میں آپ اعانت فرماتے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ اور امام ترمذی نے روایت کیا کہ آپ کے پاس ایک بار نوّے ہزار درہم آئے (تقریباً پچیس ہزار روپیہ ہوتا ہے) اور ایک بوریے پر رکھے گئے۔ سو آپ نے کسی سائل سے عذر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سب ختم کر کے فارغ ہو گئے۔ پھر آپ کے پاس ایک شخص آیا اور کچھ مانگا۔ آپ نے فرمایا میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا (جو تجھ کو دے سکوں) لیکن تو میرے نام سے (ضرورت کی چیز) خرید لے جب ہمارے پاس کچھ آوے گا ہم ادا کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ جو چیز آپ کی قدرت میں نہ ہو حق تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں فرمایا (پھر آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں)۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات خوش نہیں معلوم ہوئی پھر انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خوب خرچ کیجئے اور مالک عرش (یعنی حق سبحانہٗ وتعالیٰ) سے کمی کا اندیشہ نہ کیجئے آپ نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرۂ مبارک پر بشاشت نمایاں ہوئی اور اگلے دن کے لیے کوئی چیز اٹھا کر نہ رکھتے تھے جیسا کہ حضرت انسؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر میں ہوائے بارش خیر سے بھی زیادہ فیاض تھے۔

وصل دوازدہم دوسرے بعض اخلاق جمیلہ و طرزِ معاشرت میں :

حضرت ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نہ کوئی شجاع دیکھا اور نہ مضبوط دیکھا اور نہ فیاض دیکھا اور نہ (دوسرے اخلاق کے اعتبار سے) پسندیدہ دیکھا اور ہم جنگِ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آڑ میں پناہ لیتے تھے اور بڑا شجاع وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو (میدانِ جنگ میں) آپ سے نزدیک رہتا جب آپ غنیم کے قریب ہوتے تھے کیونکہ اس شخص کو بھی (اس صورت میں) غنیم کے قریب رہنا پڑتا تھا۔ اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ شرم و حیا میں اس سے بڑھ کر تھے، جیسے کنواری لڑکی پردہ میں ہوتی ہے۔ اور آپ نہایت لطیف الجلد نرم اندام تھے اور کسی شخص کو برُو ناگوار بات نہ فرماتے اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نہ آپ بروئے عادت سخت گو تھے اور نہ بتکلف سخت گو بنتے تھے۔ اور نہ بازاروں میں خلاف وقار باتیں کرنے والے تھے اور بُرائی کا عوض برائی سے نہ دیتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ غایتِ حیا سے آپ کی نگاہ کسی شخص کے چہرہ پر نہیں ٹھہرتی تھی (یعنی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالتے تھے) اور کسی نامناسب چیز کا اگر کسی ضرورت سے ذکر کرنا ہی پڑتا تو کنایہ فرماتے۔ اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ سب سے بڑھ کر دل کے کشادہ تھے، بات کے سچے تھے، طبیعت کے نرم تھے، معاشرت میں نہایت کریم تھے اور جو شخص آپ کی دعوت کرتا اُس کی دعوت منظور فرماتے اور ہدیہ قبول فرماتے اگرچہ وہ (ہدیہ یا طعام دعوت) گائے یا بکری کا پایہ ہی ہوتا اور ہدیہ کا بدل بھی دیتے تھے اور دعوت غلام کی اور آزاد کی اور لونڈی کی اور غریب کی سب کی قبول فرما لیتے اور مدینہ کی انتہا آبادی پر بھی (اگر مریض) ہوتا اُس کی) عیادت فرماتے اور معذرت کرنیوالا کا عذر قبول فرماتے اور اپنے اصحاب سے ابتداءً مصافحہ کیا کرتے اور کبھی اپنے اصحابؓ میں پاؤں پھیلائے ہوئے نہیں دیکھے گئے جس سے اوروں پر

جگہ تنگ ہو جاوے اور جو آپ کے پاس آتا اس کی خاطر کرتے اور بعض اوقات اپنا کپڑا (اس کے بیٹھنے کے لیے) بچھا دیتے اور گدہ تکیہ خود چھوڑ کر اس کو دے دیتے اور کسی شخص کی بات بیچ میں نہ کاٹتے اور تبسم فرماتے اور خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے بجز حالت نزول وحی یا وعظ یا خطبہ کی نہ ہوتی (کیونکہ ان حالتوں میں آپ کو جوش ہوتا تھا جس میں تبسم و خوش مزاجی ظاہر نہ ہوتی تھی) اور بعض اوقات فرستادوں کی خود خدمت فرماتے جیسے نجاشی بادشاہ کے فرستادے آئے تھے اور آپ قیامت میں تمام اولادِ آدم کے سردار ہوں گے اور سب سے اوّل آپ ہی کی قبر شریف کی زمین شق ہوگی (اور آپ باہر تشریف لاویں گے) اور سب سے اوّل ہی شفاعت کریں گے اور سب سے اوّل آپ کی شفاعت قبول ہوگی اور آپ (غایت تواضع) سے دراز گوش پر بھی سوار ہوتے تھے اور (کبھی) اپنے پیچھے بھی کسی کو بٹھلا لیتے اور غریبوں کی عیادت فرماتے تھے اور محتاجوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے اور اپنے کپڑے میں (خود) جُوں دیکھ لیتے (کسی خادم پر موقوف نہ رکھتے اور یہ دیکھنا اس خیال سے تھا کہ کسی اور کی نہ چڑھ گئی ہو) اور اپنی بکری کا دودھ نکال لیتے اور اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگا لیتے اور اپنی پاپوش کو خود (وقت حاجت کے) سی لیا کرتے اور اپنا گھر کا کام اور گھر والوں کا کام کر لیا کرتے (اور گھر میں جھاڑو دے لیا کرتے) اور خدمت گار کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتے اور اس کے ساتھ آٹا گوندھوا لیتے اپنا سودا بازار سے خود لے آتے اور سب سے بڑھ کر احسان کرنے والے اور عدل کرنے والے اور عفیف اور سچ بولنے والے تھے حتیٰ کہ ابوجہل بن ہشام باوجود اس کے کہ آپ کا کامل دشمن تھا اخنس بن شریق نے بدر کے روز جب اس سے پوچھا کہ اے ابوالحکم! یہاں تو میرے اور تیرے سوا اور کوئی موجود نہیں جو ہماری بات کو سُن لے گا تو مجھ کو یہ بتلا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا جھوٹے ہیں؟ ابوجہل نے کہا: واللہ محمد سچے ہیں اور محمد نے کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں۔

وصل سیزدہم تتمہ وصل ہشتم میں:

حضرت خارجہ بن زید سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں سب سے زیادہ باوقار ہوتے۔ اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ جب مجلس میں بیٹھتے تو دونوں پاؤں کھڑے کر کے ملا کر ان کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا کر بیٹھتے اور ویسے بھی اکثر نشست آپ کی اسی ہیئت سے ہوتی (اس کو احتباء کہتے ہیں اور یہ تواضع اور سادگی کی وضع ہے) حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ آپ چار زانو بھی بیٹھتے تھے اور بعض اوقات اکڑوں (بغل میں ہاتھ دے کر) بیٹھ جاتے اور جب آپ چلتے تو جمعیت خاطر (یعنی طمانیت) کے ساتھ چلتے آپ کی چال سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ نہ آپ کے دل میں تنگی ہے (کہ گھبرائے ہوئے چلیں) اور نہ طبیعت میں سُستی ہے (کہ پاؤں نہ اٹھتا ہو غرض نہ بہت تیز چلتے تھے نہ سُست رفتار تھے) حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ آپ کے کلمات میں نہایت وضاحت ہوتی تھی اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اس طرح کلام فرماتے کہ اگر کوئی شمار کرنے والا (الفاظ کو) شمار کرنا چاہتا تو شمار کر سکتا تھا۔ اور آپ خوشبو کی چیز اور خوشبو کو بہت پسند فرماتے اور کثرت سے اس کا استعمال فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے اور کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک نہیں مارتے تھے اور انگلیوں اور ہڈیوں اور جوڑوں کے صاف رکھنے کو پسند فرماتے (کیونکہ یہ مواقع میل جمع ہونے کے ہیں) اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متواتر

تین روز بھی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا۔ یہاں تک کہ آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اور حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ آپ کا بستر ایک ٹاٹ تھا اور کبھی آپ چارپائی پر آرام فرماتے جو کھجوروں کے بان سے بُنی ہوتی حتی کہ آپ کے پہلو مبارک میں اس کا نشان پڑ جاتا۔

وصل چہار دہم آپ کے تنگی معیشت کو اختیار کرنے میں :

اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شکم کبھی پیٹ بھرائی سے پُر نہیں ہُوا اور کسی سے شکوہ کا اظہار نہیں کیا اور فاقہ آپ کو بہ نسبت تونگری کے زیادہ محبوب تھا اور دن دن بھر بھُوکے گزار دیتے اور رات رات بھر بھوک سے کروٹیں بدلتے رہتے اور اگر آپ چاہتے تو اپنے رب سے تمام روئے زمین کے خزائن اور اس کی پیداوار اور اس کی فراخ عیشی کا سامان مانگ لیتے لیکن آپ یہی فرمایا کرتے تھے کہ مجھکو دنیا سے کیا علاقہ میرے اولوالعزم بھائیوں نے اِس سے زیادہ سخت حالت پر صبر کیا اور اپنی اسی حالت میں گزر گئے۔

وصل پانزدہم آپ کی خشیت مجاہدہ میں :

اور آپ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ کاش میں ایک درخت ہو جاتا جو کاٹ دیا جاتا اور آپ اس قدر (نفل) نماز پڑھتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر جاتے۔ اس پر حق تعالیٰ و تقدس نے براہِ ترحم فرمایا طٰہٰ الخ یعنی ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لیے نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑیں اور آپ نماز پڑھتے اور آپ کے سینہ میں ہنڈیا کا سا جوش (مسموع) ہوتا تھا اسی طرح عبداللہ بن شخیر نے روایت کیا ہے اور آپ برابر مغموم رہتے تھے کسی وقت آپ کو چین نہ تھا۔ یہ کیفیت فکر (آخرت سے) اور دن بھر میں ستر بار یا سو بار استغفار فرماتے تھے۔ میں کہتا ہُوں کہ یہ تو تعلیم امت کے لیے تھا یا خود اُمت کے لیے مغفرت طلب کرنا مقصود تھا یا یہ وجہ تھی کہ آپ دریائے قرب و عرفان میں مستغرق تھے اور آناً فاناً ترقی فرماتے رہتے تھے، کیونکہ تجلیات متجدد ہوتی رہتی ہیں۔ اور تجلی حسب استعداد محل تجلی کے ہوتی ہے اور آپ کی استعداد برابر متزائد ہوتی جاتی تھی (اس لیے تجلیات بھی لاتقف عند حد فائض ہوتی تھیں، پس جب مرتبہ مابعد کو عالی دیکھتے تھے تو اپنے کو مرتبۂ ماقبل کے اعتبار سے تقصیر کی طرف منسوب فرماتے تھے کیا تم نے سنا نہیں کہ نیکوں کے حسنات مقربین کی سیئات ہوتی ہیں۔

وصل شانزدہم آپ کے حسن و جمال میں :

اور ترمذیؒ نے قتادہ سے انہوں نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا جو خوش آواز اور خوش رُو نہ ہو اور تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم صورت شکل میں بھی اور آواز میں ان سب سے احسن تھے۔ میں کہتا ہُوں کہ (باوجود ایسے حسن و جمال) عام لوگوں کا آپ پر اس طور عاشق نہ ہونا جیسا حضرت یوسف علیہ السلام پر عاشق ہوا کرتے تھے۔ بسبب غیرت الٰہی کے ہے کہ آپ کا جمال جیسا تھا غیروں پر ظاہر نہیں کیا جیسا کہ خود حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال بھی

جس درجہ کا تھا وُہ بجز حضرت یعقوب علیہ السلام یا زلیخا کے اوروں پر ظاہر نہیں کیا۔

وصل ہفدہم آپ کے رفق و تواضع و پاکیزگی طبیعت میں :

اور آپ نہایت حلیم تھے نہ کسی کو دشنام دیتے تھے نہ سخت بات فرماتے نہ لعنت کی بد دُعا دیتے تھے اور نزدیک جگہ جانے میں دراز گوش پر سوار ہوتے تھے اور دُور جانے میں ناقہ پر اور معرکہ حرب میں خچر اور کسی مدد چاہنے والے کی پکار پر گھوڑے پر سوار ہوتے (تاکہ جلدی پہنچ جاویں اور معرکہ میں کمال ہے ثابت قدم رہنا اس لیے گھوڑے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ ایسا جانور اختیار کیا کہ وُہ بھاگنے میں کم ہو یعنی خچر اور باقی معمولی حالات میں تواضع کی صورت اختیار فرمائی یعنی دراز گوش کی سواری اور سفر دراز میں جفاکش جانور کی ضرورت تھی اور وہ شتر ہے) اور آپ کافر اور دشمن سے بھی اس کی تالیف قلب کی توقع پر کشادہ رُوئی کے ساتھ پیش آتے تھے اور جاہل (کی بے تمیزی کی بات) پر صبر فرماتے اور اپنے گھر میں آکر گھر والوں کے کاموں کا انتظام فرماتے اور چادر اوڑھنے میں بہت اہتمام فرماتے کہ اس میں سے ہاتھ پاؤں کچھ ظاہر نہ ہو (غالباً بیٹھنے کی حالت میں ایسا ہوتا ہوگا) اور آپ کی کشادہ روئی اور انصاف سب کے لیے عام تھا اور غصہ آپ کو بے تاب نہیں کرتا تھا اور اپنے جلیسوں سے کوئی بات (خلاف ظاہر) دل میں نہ رکھتے تھے اور آنکھوں کی خیانت (دزدیدہ نظر) آپ میں نہ تھی تو قلب کی خیانت کا تو کیا احتمال ہے اور آپ تمام احوال و اقوال اور افعال میں کبائر سے اور محققین کے نزدیک صغائر سے بھی معصوم تھے اور آپ سے کسی قسم کی وعدہ خلافی یا حق سے جنبش کا صدور ممکن ہی نہ تھا نہ قصداً نہ سہواً نہ صحت میں نہ مرض میں نہ واقعی مراد لینے میں نہ خوش طبعی میں نہ خوشی میں نہ غضب میں۔

وصل ہشدہم آپ کے اعتدال تزئین میں :

اور آپ جس روز مکہ معظمہ میں تشریف لائے ہیں (یعنی یوم فتح مکہ میں) اس روز آپ کے سر کے بال چار حصے ہو رہے تھے۔ روایت کیا اس کو ام ہانی نے، اور آپ شروع میں اپنے بالوں کو بے مانگ نکالے جمع کر لیا کرتے تھے پھر آپ مانگ نکالنے لگے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ایک روز ناغہ کر کے کنگھا کیا کرتے تھے۔ اور حضرت انسؓ سے آپ کے خضاب کے متعلق پوچھا گیا انھوں نے کہا آپ حد خضاب تک ہی نہ پہنچے تھے (یعنی آپ کے اتنے بال سفید ہی نہ ہوئے تھے) بس تھوڑی سی سفیدی دونوں کنپٹیوں میں ہوئی تھی۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے مہندی اور تیل کا خضاب کیا ہے (یعنی ایسی ترکیب سے کہ بال سیاہ نہ ہوں) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ کے بالوں کا پکنا سرخ رنگ کا تھا (یعنی سیاہ سے سرخ ہو گئے تھے سفید نہ ہوئے تھے) اور عبداللہ بن عقیل کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک حضرت انسؓ کے پاس خضاب کیا ہوا دیکھا (محققین کے نزدیک ان روایات میں تطبیق یہ ہے کہ آپ کے بال پکنے تو لگے تھے مگر بہت کم پکے تھے سو بعضے سرخ ہوں گے اور بعضے سفید لیکن آپ نے قصداً ان کو خضاب نہیں لگایا لیکن آپ کی عادت اکثر اوجاع وغیرہ میں مہندی رکھ دینے

کی تھی ایسا اتفاق ہوا ہوگا اس سے وہ سفید بال رنگین ہوگئے اب سب روایات جمع ہوگئیں واللہ اعلم)۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ سونے کے قبل ہر آنکھ میں تین تین سلائی سرمہ کی ڈالتے تھے۔ اور آپ سفید کپڑے کو اور کرتہ کو پسند کرتے تھے۔ اور آپ کی آستین گٹے تک ہوتی تھی اور چادر یمانی کو پسند فرماتے اور (کبھی) بالوں کی سیاہ چادر (بھی) پہنتے تھے اور (ایک بار) رومی جبہ تنگ آستین کا (بھی) پہنا ہے (اس سے تشبہ ممنوع لازم نہیں آتا کیونکہ یہ ثابت نہیں کہ وہ لباس اہلِ روم کا خاص تھا۔ رومی ہونا باعتبار ساخت کے ہے۔ اور آپ نے سیاہ سادہ چرمی موزے (بھی) پہنے ہیں اور اُن پر (وضو میں) مسح فرمایا ہے، اور آپ کے نعلین شریف میں انگلیوں میں پہننے کے دو دو تسمے تھے (ایک انگوٹھے اور سبابہ کے درمیان ایک وسطی اور اس کے پاس والی کے درمیان میں)، اور پشت پر کا تسمہ بھی دوہرا تھا اور آپ بالوں سے صاف کیے ہوئے چمڑے کے نعلین پہنتے تھے اور وضو کر کے ان میں پاؤں بھی رکھ لیتے، روایت کیا ہے اس کو حضرت ابن عمرؓ نے اور آپ (گاہ گاہ) گتھے ہوئے نعلین میں نماز (بھی) پڑھ لیتے (کیونکہ وہ پاک ہوتے تھے اور اس وقت عرف میں یہ خلاف ادب نہ ہوگا) اور آپ نے چاندی کی انگشتری بنوائی تھی اور اُس سے مُہر لگاتے تھے اور (التزام اور دوام کے ساتھ) پہنتے نہ تھے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے روایت کیا ہے اور حضرت انسؓ نے کہا ہے کہ اُس کا نگین حبشہ کا تھا۔ شروح بخاری میں مذکور ہے کہ ملک حبشہ کا ایک پتھر تھا یا اس کا رنگ حبشیوں کا سا (یعنی سیاہ) تھا اور وہ مہرہ یمانی یا عقیق تھا اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ کی انگشتری چاندی کی تھی اور اُس کا نگین اُسی کا تھا (میرے نزدیک نگین سے مراد خانہ نگین ہے یعنی نگین رکھنے کا حلقہ اور کسی چیز سونے وغیرہ کا نہ تھا جیسا بعضے بنوا لیتے ہیں) اور اُن ہی سے ایک روایت میں ہے گویا اس کی سفیدی (اور چمک) آپ کے ہاتھ میں اس وقت میری نظر میں ہے میں کہتا ہوں کہ ان روایات کا اختلاف باعتبار اختلاف حالات کے ہے خوب بصیرت حاصل کر لو اور خلاف کو چھوڑ دو اور اس انگشتری پر یہ منقوش تھا" محمد رسول اللہ " اس طرح سے کہ محمد ایک سطر اور رسول ایک سطر اور اللہ ایک سطر، روایت کیا اس کو حضرت انسؓ نے اور جب آپ بیت الخلاء میں جاتے تو انگشتری نکال دیتے اور اس کو (جب پہنتے تو) داہنے ہاتھ میں پہنتے، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اس کو حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے نقل کیا ہے اور حضرت انسؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آپ داہنے ہاتھ میں انگشتری پہنتے اور آپ کی تلوار قبیلہ بنی حنیفہ کی ساخت کی تھی اور اس کی مُوٹھ کی گھنڈی (یعنی تلوار پکڑنے میں جس جگہ پر ہاتھ ہوتا ہے اس کے سرے پر جو روک ہوتی ہے وہ) چاندی کی تھی (چونکہ وہ ہاتھ سے جدا رہتی ہے اس لیے چاندی کی درست ہے) اور جنگِ اُحد میں آپ دو زرہیں اور فتح مکہ کے روز آپ خود (یعنی آہنی کلاہ) پہنے ہوئے تھے اور آپ جب عمامہ باندھتے تھے تو اُس کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑ لیتے تھے اور کتبِ سِیَر میں بروایت صحیحہ ثابت ہے کہ آپ کبھی دونوں شانوں کے درمیان چھوڑتے تھے اور کبھی بے شملہ عمامہ باندھتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کبھی کلاہ بدون عمامہ کے اور کبھی عمامہ بدون کلاہ کے پہن لیتے اور آپ کے پاس ایک سیاہ عمامہ تھا اور آپ نصف ساق تک لنگی باندھتے تھے اور اجازت اس سے نیچے بھی دی ہے مگر یہ فرما دیا ہے کہ ازار کا ٹخنوں میں کچھ حق نہیں (یعنی ٹخنے سے نہ لٹکنا چاہیے)، اور آپ جب بیٹھتے تھے تو زانوں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا لیتے اور آپ مسجد میں ایک پاؤں دوسرے،

پانوں پر رکھ کر چت لیٹتے تھے حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آپ کو بائیں کروٹ پر ایک تکیہ کا سہارا لگائے ہوئے بیٹھے دیکھا ہے اور حضرت انسؓ نے آپ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپؐ ایک کپڑا قطری تھا کہ اس کو بغل کے نیچے سے نکال کر کندھے پہ ڈال رکھا تھا اور لوگوں کو (اسی طرح) نماز پڑھائی (قطر ایک قریہ ہے بحرین کے علاقہ میں، وہاں سے چادریں آتی ہیں کپڑا ان کا موٹا ہوتا ہے)

وصل نوزدہم تتمہ وصل ہشتم و سیزدہم میں:

اور انہیں سے روایت ہے کہ جب آپ کھانا کھا نے تھے تو اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے۔ ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں تو تکیہ لگا کر نہیں کھاتا اور آپ تین انگلیوں سے کھاتے تھے اور ان کو (کھانے کے بعد) چاٹ لیتے تھے اور اکثر آپ کی غذا جو کی روٹی ہوتی تھی اور آپ نے چوکی (میز) پر کبھی کھانا نہیں کھایا اور نہ کبھی تشتری میں کھایا بلکہ دسترخوان پر کھاتے تھے اور کبھی آپ کے لیے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ سرکہ کو اور روغن زیتون کو اور شیریں چیز کو اور شہد کو اور کدو کو پسند کرتے تھے اور آپ نے مرغ کا اور سرخاب کا اور بکری کا اور اونٹ کا اور گائے کا گوشت کھایا ہے اور ثرید کو (یعنی شوربے میں توڑی ہوئی روٹی کو) پسند کرتے تھے اور آپ فلفل اور مصالح بھی کھاتے تھے اور آپ نے خرمائے نیم پختہ تازہ اور خرمائے خشک اور چقندر اور خبیص (یعنی کھجور اور گھی اور پنیر کا مالیدہ) بھی کھایا ہے اور آپ کو کھرچن خوش معلوم ہوتی تھی اور آپ نے فرمایا ہے کہ برکت طعام کی اس میں ہے کہ کھانے سے پہلے بھی ہاتھ دھوئے اور کھانے کے بعد (بھی) دھوئے اور آپ ککڑی خرما کے ساتھ کھاتے تھے جیسا کہ عبداللہ بن جعفر نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عائشہؓ نے روایت کیا کہ آپ تربوز خرما کے ساتھ کھاتے اور فرماتے کہ اس کی گرمی کا اس کی سردی سے تدارک ہوجاتا ہے اور پانی آپ کو وہ پسند تھا جو شیریں ہو سرد ہو اور آپ خرما تر کر کے اس کا زلال اور دودھ اور پانی سب ایک ہی پیالہ میں پیا کرتے تھے جو لکڑی کا موٹا سا بنا ہوا تھا اور اس میں لوہے کے پترے لگے ہوئے تھے۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دے سکے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آپ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر نوش فرمایا اور عمرو بن شعیبؓ نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے جد سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا ہے اور جب آپ پانی پیتے تھے تو درمیان میں دو بار سانس لیتے تھے اور امام بخاریؒ نے اسی روایت میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ تین بار سانس لیتے تھے اور آپ جب اپنی خواب گاہ پر جاتے اپنا داہنا ہاتھ اپنے رخسارہ کے نیچے رکھتے روایت کیا ہے اس کو براء بن عازب نے اور جب سوتے تو آواز سے سوتے روایت کیا ابن عباسؓ نے، اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر جس پر آپ سوتے تھے چمڑے کا تھا اس کے اندر پوست خرما بھرا ہوا تھا اور حضرت حفصہؓ نے کہا ہے کہ آپ کا بستر ایک کمبل تھا ہم اس کو دوہرا کر دیا کرتے اور آپ اس پر سویا کرتے اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ مریضوں کی عیادت فرماتے تھے اور جنازہ میں

شریک ہوتے تھے اور دراز گوش پر سوار ہوتے تھے اور غلام تک کی دعوت قبول کر لیتے تھے اور غزوہ بنی قریظہ میں آپ ایک دراز گوش پر سوار تھے جس کا لگام پوست خرما کی رسّی کا تھا اور پوست خرما کا ہی بنا ہوا اُس کا پالان تھا اور اُن سے ایک روایت ہے کہ آپ زمین پر بیٹھ جایا کرتے تھے اور اپنی بکری کا دودھ نکال لیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر بکری کا دست کھلانے کے لیے میری دعوت کی جاوے تو منظور کر لوں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پُرانے پالان پر حج کیا ہے اور اس پالان پر ایک کملی تھی جو چار درم (ایک روپیہ) کی بھی نہ تھی۔ اس پر یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ اس کو ایسا حج (مبرور) بنائے جس میں نمایش اور قصد شہرت نہ ہو اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر عوض بھی دیتے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھ پر (ایک بار) تیس رات دن اس حالت میں گزرے ہیں کہ میرے پاس کوئی کھانے کی چیز نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے بجز اتنی مقدار قلیل کے جو بلال کی بغل میں آجاتا تھا روایت کیا اس کو حضرت انسؓ اور حضرت انسؓ نے یہ بھی کہا کہ آپ کے پاس کبھی گوشت روٹی کی قسم سے صبح کا یا شام کا کھانا جمع نہیں ہوا بجز اس کے کہ کھانے سے کمانے والے ہی زیادہ ہوئے۔

وصل بستم آپ کی وفات شریف میں:

اور حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ آخری زیارت جو مجکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوئی وہ اس طرح کہ آپ نے (مرض وفات میں) دوشنبہ کے دن پردہ اٹھا کر دیکھا اُس وقت مَیں نے آپ کا چہرہ مبارک دیکھا جیسے قرآن مجید کا ورق (پاک صاف) ہوتا ہے اور حضرت ابوبکرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا بوسہ لیا اپنا مُنھ تو آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان رکھا اور ہاتھوں کو آپ کی کلائیوں پر رکھا اور یہ الفاظ کہے ہائے نبی ہائے صفی ہائے خلیل اور سفیان بن عیینہ جعفر بن محمد سے اور وُہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوشنبہ کے روز وفات پائی۔ سو اُس دن اور سہ شنبہ کی شب اور سہ شنبہ کے دن آپ کے دفن میں (بوجہ غلبہ غم وحیرت اور بعضے امور وانتظام اجتماع مسلمین) توقف ہوا اور پھر شب کو آپ دفن کیے گئے کہ آخر شب میں پھاوڑوں کی آواز زمین کھودنے کی حالت میں سُنی جاتی تھی اور عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ دوشنبہ کو وفات ہوئی اور شب سہ شنبہ میں دفن کیے گئے۔ ابوعیسٰی ترمذی اس روایت کو غریب (یعنی منفرد) کہتا ہے میں کہتا ہوں کہ صحیح یہی ہے کہ آپ شبِ چہار شنبہ میں دفن ہوئے۔

وصل بست ویکم تتمہ وصل ہفتم میں:

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا اور یہ بھی فرمایا ہے کہ میں شب اس حالت میں بسر کرتا ہوں کہ میرا رب مجکو کھلا پلا دیتا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ مجھ کو نسیان نہیں ہوتا لیکن نسیان کرا دیا جاتا ہے (تاکہ اس کے متعلق احکام سنت قرار پا دیں) اور (یہ بھی فرمایا ہے کہ) میں اپنے پیچھے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا اپنے آگے سے دیکھتا ہوں اور آپ ہمیشہ دل سے بیدار رہتے تھے اور (باوجود اس بیداردلی کے) آپ کی نماز فجر کا قضا ہو جانا

ایک حکمتِ الٰہی کے سبب سے تھا جو اس امر کو مقتضی ہوئی کہ قضا کا حکم امت پر ظاہر ہو جاوے۔

وصل بست و دوم آپ کے مزاح میں :

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں خوش طبعی تو کرتا ہوں مگر (اس میں بھی) بات سچ ہی کہتا ہوں۔ سو آپ مومنین سے اُن کا دل خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے جیسے آپ نے ایک اعرابی سے (جس نے سواری کے لیے جانور مانگا تھا) فرمایا کہ میں تجھ کو اُونٹنی کے بچہ پر سوار کروں گا (وہ یہ سمجھا کہ تکلم کے وقت جو بچہ ہے اس پر سوار کرنا مراد ہے اس لیے کہا میں بچہ کو کیا کروں گا۔ آپ کے جواب سے معلوم ہو گیا کہ باعتبار ماضی کے جو تھا وہ مراد ہے) اور جیسے آپ نے ایک (بڑھیا) عورت سے فرمایا تھا کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہ جائے گی۔ اور وہ جب گھبرائی تب آپ کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ مطلب یہ ہے کہ جانے کے وقت کوئی بڑھیا نہ رہے گی سب جوان ہوں گی۔

وصل بست و سوم تتمہ وصل ہفتم و بست و دوم میں :

اور آپ افضل الانبیاء خاتم المرسلین اور منتہی النبیین تھے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام احکامِ شرعیہ میں آپ کا اقتداء کریں گے۔

وصل بست و چہارم آپ کے بعض عوارض بشریت کے ظہور اور اس کی حکمت میں :

اور آپ کو بھی مثل دُوسرے انسانوں کے شدائد جھیلنے کا اتفاق ہُوا تا کہ آپ کا ثواب مضاعف ہو اور درجات بلند ہوں پس آپ کو مرض بھی ہوا اور درد وغیرہ کی شکایت بھی ہُوئی۔ اور آپ کو گرمی اور سردی کا اثر بھی ہُوا اور بھُوک پیاس بھی لگی اور آپ کو (موقع پر) غصہ اور انقباض بھی ہوا اور آپ کو ماندگی اور خستگی بھی ہوتی تھی اور کمزوری اور پیری بھی ہُوئی اور سواری پر سے گِر کر آپ کے خراش بھی ہو گیا اور جنگِ اُحد کے دن کفار کے ہاتھ سے آپ کے چہرہ اور سر میں زخم بھی ہُوا اور کفار طائف نے آپ کے قدم مبارک کو خُون آلُود بھی کیا اور آپ کو زہر بھی کھلایا گیا اور آپ پر جادو بھی کیا گیا اور آپ نے دوا بھی کی اور پچھنے بھی لگوائے۔ جھاڑ پھونک کا بھی استعمال کیا اور اپنا وقت پورا کر کے عالَمِ بالا میں ملحق ہو گئے اور اس دارالامتحان والبلاء سے آزاد ہو گئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے مواقع میں دُشمنوں (کے قتل و ہلاک کی تدبیر کرنے) سے محفوظ رکھا حتیٰ کہ یومِ اُحد میں جب بدر بن قمہ نے آپ پر پتھر چلایا اور اُس سے آپ کا رخسارہ مبارک زخمی ہو گیا اور خود آہنی کے دو حلقے رُخسارہ میں گھُس گئے اُس وقت اللہ تعالیٰ نے بچایا اور جب آپ جبل ثور کی طرف (پوشیدہ) تشریف لے گئے اس وقت قریش کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور غورث (بن حارث) کی تلوار کو اور ابو جہل کے پتھر کو اور سُراقہ بن مالک کے گھوڑے کو لبید بن اعصم کے سحر (کے اثر مقصود) کو اور (اسی طرح) یہودی عورت کے زہر کے (اثر مقصود) کو آپ سے دُور رکھا اور (ہلاکت سے) آپ کے محفوظ رہنے میں اور (معمولی) تکلیف ہو جانے میں آپ کے شرف کا اظہار ہے (یہ حکمت تو محفوظ رہنے کی ہے)

اور آپ کو ثواب دینا ہے (یہ حکمت تکلیف ہونے میں ہے) اور نیز اس لیے بھی تکلیف ہوئی تاکہ آپ کے بارہ میں معجزات و عجائب کے ظاہر فرمانے کے سبب لوگ ضلالت میں نہ پڑ جاویں (یعنی اگر جسمانی تکلیف نہ ہوتی تو شاید کسی کو آپ پر الوہیت کا شبہ ہو جاتا) جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام کے بارہ میں (خاص عجائب کے سبب) ضلالت میں پڑ گئے اور تاکہ مصائب میں آپ کی اُمت کے لیے تسلی کا سبب ہو (کہ جب سیدالانبیا کو بھی تکالیف پہنچی ہیں تو ہم کیا چیز ہیں)۔

وصل بست و پنجم آپ کی روح پر اُن عوارض کے اثر نہ ہونے میں:

اور یہ عوارض مذکورہ صرف آپ کے عنصری جسد شریف پر بوجہ مشارکت نوعی کے طاری ہوتے تھے رہا آپ کا قلب مبارک سو وہ تعلق با خلق سے منزّہ مقدس اور مشاہدۂ حق میں مشغول تھا کیونکہ ہر آن ہر لحظہ اللہ ہی کے ساتھ اللہ ہی کے واسطے اللہ ہی میں مستغرق اور اللہ ہی کی معیت میں تھے حتیٰ کہ آپ کا کھانا پینا پہننا حرکت و سکون بولنا خاموش رہنا سب، اللہ ہی کے واسطے اور اللہ ہی کے حکم سے تھا۔ (چنانچہ ارشاد خداوندی ہے) "اور آپ نفسانی خواہش سے کچھ نہیں بولتے یہ سب وحی ہی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے" اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کی آل و اصحاب پر قیامت تک رحمتِ کاملہ نازل فرماتا رہے، یہ (جو کچھ لکھا گیا) مطولات کا اجمالی مضمون ہے اس کو یاد رکھو کیونکہ اس پر بجز علماء محققین کے اور وہ بھی کتب اور دفاتر کثیرہ کے تتبع کے بعد ہر شخص مطلع نہیں ہو سکتا اور ہم نے ایسا نافع خوری اور دلپسند سیری بخش مجموعہ تم کو دے دیا جس کو بہت، قلیل مدت میں ضبط کر سکتے ہو اے اللہ اس کے پڑھنے والے کو اور لکھنے والے کو اور سننے والے کو اور یاد کرنے والے کو اور کسی کے سامنے نقل کرنے والے کو اور تالیف کرنے والے کو (اور ترجمہ کرنے والے کو) بخش دیجیے۔ آمین

اور ہم چند ابیات پر اس کو ختم کرتے ہیں جو آپ کے دربار شریف میں بطور تحفہ کے (مبلغین صلوٰۃ و سلام کے واسطے سے) بھیجے جاتے ہیں۔ یہ اشعار مولف کے ہیں: ؎

دستگیری کیجیے میرے نبی — کشمکش میں تم ہی ہو میرے ولی
جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ — فوج کلفت مجھ پر آ غالب ہوئی
ابن عبداللہ زمانہ ہے خلاف — اے میرے مولا خبر لیجے مری
کچھ عمل ہے اور نہ طاعت میرے پاس — ہے مگر دل میں محبت آپ کی
میں ہوں بس اور آپ کا دربا رسول — ابرِ غم گھیرے نہ پھر مجکو کبھی
خواب میں چہرہ دکھا دیجیے مجھے — اور مرے عیبوں کو کر دیجیے خفی
درگزر کرنا خطا و عیب سے — سب سے بڑھ کر ہے یہ خصلت آپ کی
سب خلائق کے لیے رحمت ہیں آپ — خاص کر جو ہیں گنہ گار و غوی

کاش ہو جاتا مدینہ کی میں خاک لعل بوسی ہوتی کافی آپ کی
آپ پر ہوں رحمتیں بے انتہا حضرت حق کی طرف سے دائمی
جس قدر دنیا میں ہیں ریت اور سانس اور بھی ہے جس قدر روئیدگی
اور تمھاری آل پر اصحاب پر
تا بقائے عمر دارا خسروی

جنابِ رسالتمآبؐ کی شگفتہ مزاجی

ارشد میر ایڈووکیٹ

عربی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے "مزاح المومنین عبادۃ" یعنی ایمان کی حدود کے اندر مومنین کا باہمی مزاح بھی عبادت ہے اسی طرح یہ بھی معروف قول ہے "الملح فی الکلام کالملح فی الطعام" جس کا مطلب ہے کہ کلام میں مزاح کو وہی مقام حاصل ہے جو طعام میں نمک کو ہے۔

انسانی فطرت حزن و مسرت سے مرکب ہے اور متانت کے ساتھ مسکراہٹ سے ہی حیاتِ انسانی کا قافلہ رواں دواں ہے۔ سرورِ کائناتؐ، فخرِ موجوداتؐ کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے کہ حضورؐ نے کس طرح ربانی مقصدِ جلیلہ کی تکمیل کے لیے اپنی حیاتِ گرامی کا ایک ایک لمحہ وقف کر رکھا تھا اور انتہائی دلسوزی، درد مندی اور سنجیدگی سے فلاحِ انسانی کے لیے کوشاں رہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضورؐ نے کسی مرحلہ پر بھی ترش روئی یا عبوست کو پسند نہیں فرمایا۔

حضورؐ اقدس کی ذاتِ گرامی فطری تقاضوں کو اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ رکھنے کے لیے وقف رہتی تھی۔ آپؐ نے مزاح میں بھی متانت کا پہلو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور کبھی کھلکھلا کر یا قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے بلکہ آپؐ کی ہنسی ہمیشہ تبسم تک محدود رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آیا رسولِ اکرمؐ کبھی مزاح بھی فرماتے تھے تو آپ نے فرمایا۔ ہاں! لیکن ہر کہہ و مہ کے ساتھ نہیں بلکہ مخاطب کے محل و مقام اور استعداد کے مطابق ایسا فرماتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ ایک روز کوئی ضعیفہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا یا رسولؐ اللہ! دعا کیجیے میں جنت میں جاؤں، جس پر آنحضورؐ نے فرمایا۔ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ بڑی پریشان ہوئی اور رونے لگی جس پر آپؐ نے فرمایا کہ جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جوان کر کے داخل کریں گے۔ اس پر وہ بڑھیا خوش ہو گئی۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ اکرمؐ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ اسے کوئی سواری کا جانور عطا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ہم تجھے اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس نے کہا یا رسول اللہ میں اونٹنی کے بچہ کو کیا کروں گا؟ (کیونکہ سواری کے لیے بچہ تو کام نہیں دے سکتا) آپؐ نے فرمایا۔ اونٹ کو ناقہ یعنی اونٹنی ہی تو جنتی ہے۔ مزاح کا یہ لطیف پیرایہ نہ صرف زیرِ لب تبسم کا عکاس ہے بلکہ اس میں صداقت کا پہلو بھی پوری آب و تاب سے نمایاں ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ مزاح فرماتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "یقیناً" مگر اس میں صرف سچی بات کہتا ہوں: لطیف ترین اور صداقت پر مبنی مزاح کی ایک اور درخشاں مثال یوں ہے کہ ایک عورت حضورؐ کی خدمت میں پہنچی۔ آپ نے اس کے شوہر کی بابت پوچھا تو اس نے نام بتایا۔ جس پر آپؐ نے فرمایا: وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ جونہی وہ

عورت گھر پہنچی، اپنے شوہر کی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے خاوند نے کہا۔ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ عورت نے جواب دیا۔ رسول اکرم نے مجھے آپ کے بارے میں پوچھا، میں نے بتایا تو فرمایا وہی جس کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ کیا میری آنکھوں میں سفیدی سیاہی سے زیادہ نہیں ہے؟ حضور اکرم کی شگفتہ مزاجی کی ایک اور مثال حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی اکثر آپؐ کے لیے گاؤں کی چیزیں تحفے کے طور پر لایا کرتا تھا۔ آپ کو بھی اس سے بے حد انس تھا اور آپؐ بھی اُسے شہر کی کوئی نہ کوئی سوغات ضرور عنایت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں۔" زاہر کی شکل و صورت بھی اچھی نہ تھی۔ ایک دن وہ اپنا سودا بیچ رہا تھا کہ حضورؐ پیچھے سے آئے اور بے خبری سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے کہا کون ہے مجھے چھوڑ دے مگر جب مڑ کر دیکھا تو رسولؐ خدا تھے جس پر وہ اپنی کمر حضورؐ کے سینہ مبارک سے ملنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا۔ یہ غلام کون خریدتا ہے؟ زاہر کہنے لگا۔ یا رسولؐ اللہ! آپ مجھے کھوٹا سکہ پائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا مگر اللہ کے نزدیک تو تو بہت قیمتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ السلام کے لیے شائستہ مزاح پیدا کرنا تبلیغی اور دینی ضرورت بھی تھی کہ حضورؐ کی ذات اگر ایسا نہ کرتی تو ان کے قدرتی رعب و جلال کی بنا پر حاضرین کا ان کے قرب میں رہنا بھی مشکل ہو جاتا۔ مزید برآں سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے آنے والے اکابر عمداً مزاح سے اجتناب کرتے۔ یہی سبب ہے کہ حضورؐ بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو مزاحاً ان کے حسب حال القابات سے بھی نوازتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ایک روز تفنن کے طور پر فرمایا۔ "یا ذالاذنین" یعنی اے دو کانوں والے۔ بادی النظر میں کان تو ہر شخص کے دو ہی ہوتے ہیں۔ انھیں جو خصوصیت سے یہ لقب عطا کیا تو ان کے کان بڑے ہوں گے۔ بصورت دیگر ان کی قوت سامع کافی تیز ہوگی۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کو یہ لقب (یعنی بلی کا باپ) اس لیے دیا کہ عربی میں ہریرہ بلی کو کہتے ہیں اور آپؓ نے ایک بلی پالی ہوئی تھی۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو ابوتراب (مٹی کا باپ) کا لقب اس بنا پر مرحمت ہوا کہ ایک دن خاک پر سوتے میں ان کے رخساروں پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ نیز انھوں نے حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کی کنیت بھی رکھی اور اُسے ابوعمیر کہہ کر پکارا۔ ابوعمیر کے پاس نغیر نامی پرندہ تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ پرندہ مر گیا جس سے بچہ بہت رنجیدہ تھا۔ چنانچہ یہ دیکھتے ہوئے آپؐ نے اسے مزاحاً کہا: اے عمیر نغیر کو کیا ہوا؟

سرورِ کائنات جہاں خود شستہ مذاق کرتے تھے وہاں اگر صحابہ کرامؓ بھی اس نوع کا مذاق کرتے تو اس سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ غزوۂ تبوک کے دوران ایک بالکل چھوٹے سے خیمہ میں بیٹھے تھے کہ میں نے باہر سے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اندر آ جاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کیا پورا آ جاؤں۔ فرمایا ہاں پورے آ جاؤ۔

اسی طرح حضرت ام سلمیٰؓ راوی ہیں کہ نبی کریمؐ کی وفات سے تقریباً ایک سال قبل حضرت ابوبکرؓ تجارت کے لیے بصرہ گئے۔ ان کے ہمراہ حضرت نعمانؓ اور حضرت سویبطؓ بھی تھے۔ ان میں سے حضرت سویبطؓ ظریف الطبع تھے۔ دورانِ سفر ایک روز حضرت سویبطؓ نے حضرت نعمانؓ سے کھانا مانگا۔ حضرت ابوبکرؓ وہاں موجود نہ تھے۔ نعمانؓ نے کہا۔ حضرت ابوبکرؓ کے آنے پر دوں گا۔ حضرت

سویبطؓ نے کہا کہ اچھا میں تم سے دیکھ لوں گا۔ کچھ دیر چلتے رہنے کے بعد ایک قبیلہ کے پاس سے گزرے تو سویبطؓ نے وہاں کچھ لوگوں سے کہا کہ میرے پاس ایک غلام ہے اگر تم خریدنا چاہو تو لے لو مگر اس میں ایک بات ہے کہ وہ خود کو آزاد کہتا رہے گا لیکن تم اسے چھوڑنا نہیں چنانچہ دس اونٹوں پر معاملہ طے ہو گیا اور ان لوگوں نے نعمانؓ کے گلے میں چادر ڈال لی یہ بیچارے چیختے ہی رہے کہ میں آزاد ہوں مگر انھوں نے کہا کہ ہمیں تمہاری اس بات کا علم ہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابو بکرؓ آگئے تو انھوں نے ان کی جان چھڑائی اور مال واپس کر دیا۔ جب یہ حضرات مدینہ منورہ آئے تو یہ قصّہ حضورؐ کو سنایا۔ آپؐ سن کر خوب مسکرائے گویا خود بھی شگفتہ مزاج تھے اور شگفتگی کلام کو پسند بھی فرماتے تھے۔

ایک دن ایک شخص سے آپؐ نے دریافت فرمایا کہ بتاؤ تمہارے ماموں کی بہن تمہاری کیا لگی۔ اس سادہ دل نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا۔ آپؐ مسکرا دیئے اور فرمایا کہ ہوش کر، تجھے تیری ماں یاد نہیں رہی۔

رسول مقبولؐ ایک روز صحابہ کرامؓ کے جلو میں کھجوریں کھا رہے تھے۔ شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرتؐ اور دیگر حاضرین کھجوریں کھا کھا کر گٹھلیوں کو حضرت علیؓ کے آگے رکھتے جا رہے تھے۔ حضورؐ نے مزاحاً فرمایا۔ کہ گٹھلیاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ کھجوریں حضرت علیؓ نے کھائی ہیں۔ حضرت علیؓ بھی رسول اکرمؐ ہی کی آغوش تربیت کے پروردہ تھے۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ دیکھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں نے گٹھلیاں چھوڑ دی ہیں۔ جن کے سامنے گٹھلیاں نہیں ہیں وہ شاید مع گٹھلیوں کے کھا گئے ہیں۔

آپؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ اس حاضر جوابی سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ اسی طرح حضرت صہیبؓ کہ مشہور صحابی رسول تھے۔ نبی اکرمؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپؐ اس وقت کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی کھجوریں کھانے لگے تو آپؐ نے فرمایا کہ "آنکھ آئی ہوئی ہے اور کھجوریں کھا رہے ہو"۔ جس پر حضرت صہیبؓ نے کہا "یا رسولؐ اللہ! میں اچھی آنکھ سے کھا رہا ہوں۔ ایک آنکھ تو درست ہے۔" اس بدیہہ گوئی پر آپؐ مسکرا دیئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی مدینہ منورہ میں آیا۔ اونٹنی کا زانو باندھا اور مسجد نبویؐ میں جا کر سرکار دو عالمؐ کے پیچھے نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر باہر آیا اور اونٹنی پر سوار ہو کر بلند آواز سے کہا۔

"اے ربِ ذوالجلال! مجھ پر رحم فرما اور سرورِ کائنات پر اور ہم دو کے سوا اور کسی کو اس میں شریک نہ کرنا۔"

یہ کلمات سن کر آنحضورؐ نے مسکراتے ہوئے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "تم اس (دہقانی) اور اونٹ میں سے کسے زیادہ ناسمجھ کہو گے۔ تم نے سنا اس نے کیا کہا ہے؟"

صحابہ کرامؓ بھی مسکرائے اور عرض کیا "جی ہاں سنا۔"

ایک دفعہ بارگاہِ رسالت میں ایک صحابی نے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ! مجھے میرے بت نے بہت نفع دیا۔"

صحابہ کرامؓ نے حیرانی کے عالم میں صحابی کے منہ کی جانب دیکھا کہ بت بھلا کیسے کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے۔ یہ صورت حال بھانپتے ہوئے صحابی نے کہا "یا حبیبِ کبریا! میں سفر پر روانہ ہوا۔ دورانِ سفر میں نے ستوؤں کا بت بنایا۔ دورانِ سفر کھانا

ختم ہوا تو میں نے بُت کو توڑ کر کھا لیا۔ مجھے تو بُت نے بے حد نفع دیا۔" یہ جملہ سُن کر جملہ صحابہ کرامؓ ہنسنے لگے اور آنحضورؐ بھی مسکرا دیئے۔

امام عالی مقام حضرت امام حسینؓ نے سواریِ شُتر کی خواہش کی تو حضورؐ نے فرمایا۔ میں ہی تمہارا اُونٹ بننے کو تیار ہوں جس پر حضورِ اکرمؐ نے انھیں کاندھوں پر اُٹھا لیا اور حجرے کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک لے گئے۔ اسی دوران امام عالی مقامؓ نے فرمایا کہ اُونٹ کی تو مہار ہوتی ہے۔ جب کہ میرے اونٹ کی مہار کوئی نہیں۔ اس پر حضورؐ نے اپنے گیسو ان کے ہاتھ میں دے دیئے کہ یہ مہار ہے۔ اس حالت میں حضرت عمرؓ تشریف لے آئے اور حضرت امام حسینؓ سے کہا کہ بھئی تمہیں سواری خُوب ملی ہے۔ حضورؐ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ سوار بھی تو خُوب ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، سُنا ہے کہ جب دجال ظاہر ہو گا تو دُنیا قحط کا شکار ہو گی۔ اس عام قحط میں دجال لوگوں کی ضیافت کرے گا جس میں انواع و اقسام کے کھانے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اس دور میں ہُوا تو پہلے اس کے کھانوں سے خوب پیٹ بھروں گا اور پھر اس سے منحرف ہو جاؤں گا۔ یہ سُن کر حضورؐ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس دور میں ہوئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی نعمتوں سے بے نیاز کر دے گا۔

بطورِ نمونہ مشتے از خروارے یہ چند مثالیں محض اس لیے درج کی گئی ہیں تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ نبی علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے لطیف اور پاکیزہ مذاق سے کس قدر محظوظ ہوتے تھے۔ شگفتگی، برجستگی اور متانت کا ایک حسین امتزاج ہوتی تھی آپؐ خوش ہوتے تو زیرِ لب تبسم فرماتے۔ قہقہہ لگانا نبوت کی سنجیدگی کے خلاف تھا۔ قہقہہ تو وہ لوگ لگائیں جو بے فکر ہوں۔ آپؐ اپنے بارے میں فرماتے تھے کہ میں کیونکر بے فکر ہوں۔ جب کہ صاحبِ صور تیار کھڑا ہے اور قرآن پاک کی بعض سُورتوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ انہوں نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ گویا آپؐ کی حالت یُوں تھی ؎

مرا در منزلِ جاناں چہ امن و عیش چُوں ہر دم
جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

آپؐ کا تبسم بھی اس لیے تھا کہ آپؐ کے ساتھ مصالحِ خلق وابستہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی بوقتِ تبسم آپؐ کے دندان مبارک نظر آ جاتے تھے۔ اس وقت دندانِ مبارک یُوں چمکتے تھے جیسے بادلوں کی اوٹ میں سے بجلی چمکی ہو۔ اس سلسلہ میں عامر بن سعد بن ابی وقاص راوی ہیں کہ انھوں نے دیکھا کہ آپؐ نے غزوہ خندق کے موقع پر تبسم فرمایا اور آپؐ کے دندانِ مبارک نظر آنے لگے۔ عامر نے اپنے والد صاحب سے پُوچھا کہ حضورؐ کا تبسم کس نوع کا تھا۔ اس پر سعد کہنے لگے کہ غزوہ خندق میں ایک آدمی نے تیروں سے بچنے کیلئے لوہے کی ڈھال کا سہارا لیا ہُوا تھا۔ میں تیر پھینکتا جا رہا تھا اور وہ شخص اپنا چہرہ ڈھال سے بچا رہا تھا۔ اسی دوران میں نے ایک تیر چلانے کے لیے نکالا۔ اس نے اچانک سر اُونچا کیا، میں نے فوراً تیر چلا دیا جو اس کی پیشانی میں دھنس گیا اور وہ بل کھا کر گر پڑا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر رسُولِ خدا بے ساختہ مسکرا پڑے۔ اس وقت ہم نے آپؐ کے دندانِ مُبارک دیکھے۔

تاریخ نے حضورؐ کی دلآویز حسِ مزاح کا ایک اور واقعہ محفوظ رکھا ہے۔ غزوہ بنی مصطلق میں مشہور منافق عبداللہ بن ابی نے حضورؐ

کے خلاف سازش کی اور ایک مجلس میں کہا کہ مدینہ جا کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ اس مجلس میں حضرت زیدؓ بن ارقم موجود تھے۔ وہ اس وقت بالکل بچے تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ حضورؐ تک پہنچا دیا۔ جب عبداللہ بن ابی سے دریافت کیا گیا تو اس نے انکار کیا۔ زیدؓ پر لوگوں نے شک کیا کہ انہوں نے غلط اطلاع پہنچائی ہے مگر سورۃ منافقون کی آیت نمبر ۸ میں اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمائی تو حضورؐ نے زیدؓ بن ارقم کو بلایا اور مسکرا کر ان کا کان پکڑا اور فرمایا "لڑکے کا کان سچا تھا"۔ حضورؐ کا یہ فرمان اپنے اندر جہاں شگفتگی اور واقعیت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے وہاں علم بیان کی بلاغتوں کو بھی سمیٹے ہوئے ہے مجاز مرسل میں بعض اوقات آلہ کہہ کر وہ چیزیں مراد لے لی جاتی ہیں جن کے لیے وہ آلہ مخصوص ہو۔ اس فرمان میں "کان" سے سنی ہوئی بات مراد ہے۔

حضورؐ چونکہ "افصح العرب" تھے۔ اس لیے آپؐ کا ہر ارشاد فصاحت و بلاغت کی بے پایاں کیفیتوں کا امین ہوتا تھا۔ آپؐ کا مزاح شگفتگی، شائستگی اور پاکیزگی کا حامل تھا۔ یہ دلوں میں گدگدی پیدا کر کے بے پایاں طمانیت عطا کرتا تھا۔ مزاح کا یہی وہ نادر مثالی اور انمول نمونہ ہے کہ جس سے کسی کی دلآزاری نہیں ہوتی۔ حضورؐ کا فرمان ہے: "اپنے بھائی کے ساتھ خصومت نہ کرو اور ایسا مذاق نہ کرو جس سے اسے ایذا پہنچے اور ایسا وعدہ نہ کرو جو وفا نہ کر سکو"۔ ایک اور مقام پر حضورؐ نے فرمایا: خالص ایمان تک آدمی نہیں پہنچا جب تک مزاح اور جھوٹ کو نہ چھوڑ دے"۔ ظاہر ہے کہ جب مزاح کے ساتھ جھوٹ کی آمیزش ہو جائے گی تو ایک طرف مزاح لطیف نہیں رہے گا بلکہ پھکڑپن میں بدل جائے گا اور دوسری طرف اس مزاح کا نشانہ بننے والا بات کی کسک دل میں محسوس کرے گا اور یوں دل پر ایسے زخم لگ جائیں گے جو کبھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔ مزاح کے اپنے حدود ہیں جب مزاح ان سے گزر جائے تو وہ پھکڑپن بن جاتا ہے۔ ایک ادیب کے الفاظ میں "ادب کے جس نقطۂ عروج پر بیان کی خوبیاں، ذہن کے تنقیدی زاویے اور قلم کی تعمیری شوخیاں پختہ تر ہو کر ایک معیاری لطافت بن جاتی ہیں، مزاح کہلاتا ہے"۔ گویا مزاح کا مقصد تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ طمانیت ہے دل آزاری نہیں۔ تبسم ہے قہقہہ نہیں۔ حضورؐ کی شگفتہ طبعی کے جو پاکیزہ نمونے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لبوں سے زیادہ دل مسکراتا ہے۔ قرآن حکیم میں واضح حکم ہے:۔

"اپنے مومن بھائی کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو" (الحجرات ۱۱) اسی فرمانِ اقدس سے اس پھبتی، طنز اور تضحیک کی نفی ہو جاتی ہے جس سے دلآزاری کا پہلو نکلتا ہو۔ حضورؐ کے مزاح میں شگفتگی بدرجۂ اتم موجود تھی مگر دلآزاری کا شائبہ بھی نہیں تھا اور اسی انداز کی تقلید ہم سب پر لازم ہے کہ یہی طریقہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے۔

معلمِ انسانیت کی پسندیدہ غذائیں

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے ذریعہ عظمت و نجات ہے آپ کی تعلیم اس قدر کامل و مکمل ہے کہ اس سے صحت مند اور لذیذ غذاؤں تک کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور ان کو استعمال کر کے ظاہری و مادی فائدے کے علاوہ سنتِ رسول کی ادائیگی کا ثواب بھی نصیب ہو سکتا ہے۔ وہ مسلمان بڑا ہی خوش نصیب ہے جو کسی چیز کو اس لئے پسند کرے کہ وہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھی اس طرح اس چیز کا استعمال عبادت اور ذریعہ ثواب بن جاتا ہے

شہد

عربی میں شہد کی مکھی کو نحل کہتے ہیں قرآن کریم کی ایک سورۃ کا نام نحل ہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہوئے شہد کی مکھی اور شہد کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

"اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں اور چھتوں میں، پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھا اور اپنے رب کی راہیں چل جو تیرے لئے نرم اور آسان ہیں اس کے پیٹ سے ایک چیز پینے کی رنگ برنگ نکلتی ہے جس میں لوگوں کے لئے تندرستی ہے بے شک اس میں نشانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو غور کریں۔" (آیت نمبر ۶۸ - ۶۹)

قابلِ غور ہے یہ آیت کہ کس طرح ایک مکھی پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور جب وہ اس کے پیٹ میں رہ کر باہر آتا ہے تو میٹھا لذیذ بھی ہوتا ہے اور صحت بخش بھی۔ خدا کی پیدا کردہ اس لذیذ و مفید نعمت کی اہمیت، افادیت اور لذت کا اندازہ نبی کریم کے ارشادات سے مزید کیا جا سکتا ہے۔

علیکم بالشفائین العسل والقرآن (دو چیزوں سے صحت حاصل کرو شہد اور قرآن کریم سے)

اس حدیث میں شہد کو صحت بخش ہونے کے ساتھ قرآن کریم کو بھی ذریعہ صحت فرمایا گیا کیوں کہ شہد تو جسمانی امراض کو ختم کرنے اور جسم کو صحت یاب کرنے والی ایک غذا ہے اور قرآن کریم روحانی امراض کو ختم کرنے اور روح کو جلا بخشنے والی کتاب ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ (ہم اتارتے ہیں قرآن میں وہ چیز جو ایمان والوں کے

ورحمۃٌ للمؤمنین ۵ ۸۲:۱۷ لیے شفا اور صحت و رحمۃ المؤمنین ہے۔

۲۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے بیان کیا کہ ایک شخص نے نبی کریمؐ سے عرض کیا کہ میرے بھائی کے پیٹ میں درد ہے یا اس نے کہا کہ میرے بھائی کو اسہال (دستوں) کی شکایت ہے تو حضورؐ نے فرمایا:

اسقہ عسلا۔ اسے شہد پلا دو۔

وہ شخص چلا گیا اور پھر واپس آ کر عرض کرنے لگا کہ میں نے شہد پلایا لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ نبی کریمؐ نے پھر شہد ہی پلانے کا حکم دیا۔ دو تین بار ایسا ہی ہوا۔ جب وہ چوتھی مرتبہ خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:۔

صدق اللہ وکذب بطن اخیک — اللہ نے سچ فرمایا اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔

اس ارشاد کو سنکر وہ شخص گیا اور پھر شہد پلایا اور وہ صحت یاب ہو گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریمؐ کو ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق شہد کی افادیت پر کس قدر یقین تھا مریض گھبرا یا مگر آپ شہد ہی پلوانے رہے اور آخر کار اللہ کا ارشاد سچ ہوا اور مرض ختم ہو گیا۔

شہد کی یہ تاثیر آج بھی باقی ہے شرط یہ ہے کہ شہد بھی اصلی ہو اور مسلمان بھی اصلی۔

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:۔

من یلعق العسل ثلث عدداتٍ فی کل شھر لم یصبہ عظیم من البلاء — (جو شخص ہر مہینے تین دن شہد چاٹ لے تو اسے کوئی بڑی تکلیف نہیں ہو گی۔

یعنی شہد کا استعمال صحت کا ایک مستقل ذریعہ ہے اس حقیقت کو طبی تحقیق نے بھی ثابت کیا اور اطباء نے تسلیم کیا کہ شہد بہت سی بیماریوں کی دوا ہے مثلاً جسم اور خاص طور پر پھیپھڑوں کے لئے قوت بخش ہے۔ قلب کے لیے فرحت بخش ہے کھانسی دمہ اور ٹھنڈ سے ہونے والی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔ لقوہ اور فالج کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ خون کو صاف کرتا ہے اگر سرمہ کی طرح آنکھوں میں لگایا جائے تو آنکھوں کو بیماری سے بچاتا اور نظر کی حفاظت کرتا۔ غرض کہ بے شمار امراض کا علاج ہے۔

کھجور

کھجور ایک بہترین میوہ بھی ہے اور غذا بھی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر موجود ہے۔ سورہ رحمٰن کی دسویں آیت میں اس طرح ذکر فرمایا گیا۔

فیھا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام — اس میں میوے ہیں اور غلاف والی کھجوریں۔

میوؤں کے تذکرے کے بعد خاص طور پر نخل (کھجور) کا ذکر اس کی افادیت (اہمیت) کو ظاہر کرتا ہے جس کی وضاحت نبی کریمؐ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے۔

۱۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:۔

من تصبح کل یوم سبع تمرات عجوۃٍ لم یضرہٗ فی ذالک الیوم سم ولا سحر
جو شخص روزانہ صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالیا کرے اُسے اس دن زہر اور جادو سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

کھجور کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک قسم عجوہ ہے جو درمیانہ سائز کی ہوتی ہے اور اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے یوں تو نبی کریمؐ نے ہر کھجور کو پسند فرمایا ہے لیکن عجوہ کی خاص طور پر احادیث بیان فرمائی اور اس کو بہت سے امراض کا علاج بتایا جیسا کہ اسی حدیث میں فرمایا گیا کہ جو روزانہ صبح سات عجوہ استعمال کرے وہ دن بھر زہر اور جادو کے اثر سے بچا رہے گا۔ غور فرمایئے زہر اور جادو کس قدر تکلیف دہ چیزیں ہیں اور اس کا علاج کتنا معمولی سا ہے۔ اس عجوہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا۔

۲۔ والعجوۃ من الجنۃ وھی شفاءٌ من السم
اور عجوہ جنت کا پھل ہے اس میں زہر سے شفا دینے کی تاثیر ہے۔

۳۔ حضرت سعدؓ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا تو نبی کریمؐ میری عیادت کو تشریف لائے۔ آپؐ نے میرے سینے پر اپنا نورانی ہاتھ رکھا، مجھے اس کی ٹھنڈک دل تک محسوس ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا۔

"تمہیں دل کی تکلیف ہے، تم حارث بن کلدہ ثقفی کے پاس جاؤ کیونکہ وہ طبیب ہے"۔

فلیأخذ سبع تمراتٍ من عجوۃ المدینۃ فلیجأھن بنواتھن ثم لیلدک
اسے چاہیے کہ مدینہ کی عجوہ کھجور کے سات دانے کر انہیں گٹھلیوں سمیت کوٹ لے اور تمہارے منہ میں ڈال دے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو دیکھا کہ آپؐ یاکل الرطب بالقثاء "تازہ کھجوریں اور ککڑی ایک ساتھ تناول فرماتے تھے"۔ کھجور اور ککڑی کا استعمال صرف ایک اتفاق نہ تھا بلکہ نبی کریمؐ نے اپنے اس عمل سے کھجور کی گرم تاثیر اور ککڑی کی سرد تاثیر کو ختم کرنے کا طریقہ سکھایا۔ یا اس مقصد کے لئے آپ کا ایک دوسرا عمل یہ تھا کہ

کان یاکل البطیخ با لرطب یقول
آپ تربوز تازہ کھجور کے ساتھ کھاتے تھے اور فرماتے:

یدفع حرا ھذا برد ھذا
یہ تربوز گرمی کو ختم کرتا ہے اور کھجور سردی کو دور کرتی ہے۔

نبی کریمؐ کا یہ عمل اسی بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ آپؐ صحت کا کس قدر خیال فرماتے تھے، اور مفید غذاؤں کے استعمال کا کس طرح طریقہ تعلیم فرماتے تھے۔

۵۔ بسر سلمی کی بیٹی عطیہ اور بیٹے عبداللہ نے بیان کیا کہ ہم نے نبی کریمؐ کی خدمت میں مکھن اور تازہ کھجوریں پیش کیں اور آپ مکھن و کھجور کو پسند فرماتے تھے۔

تمر خشک کھجور کو کہا جاتا ہے۔ جو مکھن کے ساتھ واقعی بہت لذیذ بھی ہو جاتی ہے اور مکھن اس کی گرم و خشک تاثیر کو ختم کر دیتا ہے غرض کہ کھجور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذا تھی۔ اب امت کے لئے اس کا استعمال فائدے کے علاوہ ذریعۂ ثواب بھی ہے۔

گوشت

گوشت صحت و قوت کے لئے ایک نہایت ہی مفید غذا ہے مسلمانوں کے لئے جن جانوروں کا گوشت حلال کیا گیا وہ اس کو نہ صرف بطور غذا استعمال کرتے ہیں بلکہ بڑے شوق اور میلانِ طبع سے استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ بھی خیال کر لیا جائے کہ اس مرغوب غذا کے متعلق نبی کریمؐ کا ارشاد اور عمل کیا ہے۔ تو پھر اس کا استعمال سنتِ نبوی پر عمل بھی ہو گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں حضورؐ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ حضرت ابو درداءؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا :۔

سید طعام اھل الدنیا و اھل الجنۃ۔ — دنیا والوں اور جنت والوں دونوں کے کھانوں کا سردار گوشت ہے۔

۲۔ حضرت بریدہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے فرمایا :۔

خیر الادام فی الدنیا والآخرۃ اللحم — دنیا اور آخرت میں بہترین سالن گوشت ہے

سب حصوں کا گوشت مزے میں برابر نہیں ہوتا بلکہ سر، پائے، سینہ، ران، وغیرہ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ مزا ہوتا ہے۔ جو جس کو پسند ہوتا ہے۔ وہ اسی حصہ کو استعمال کرتا ہے۔ نبی کریمؐ کو بھی بعض حصوں کا گوشت خاص طور پر پسند تھا جو ان چند احادیث سے ظاہر ہے

۱۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ حضورؐ کی خدمت میں گوشت لایا گیا اس میں سے دست آپ کو دیا گیا کیونکہ آپ دست کو پسند فرماتے تھے۔ لہٰذا آپ نے اُسے دانتوں سے کاٹ کر تناول فرمایا۔

۲۔ حضرت ضباعہ بنت زبیرؓ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ ہم نے اپنے گھر میں بکری ذبح کی تو حضورؐ نے پیغام بھیجا کہ اس میں سے ہمارا حصہ بھیج دیں۔ میں نے عرض کیا صرف گردن کا گوشت بچا ہے جو آپ کے لیے بھیجتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ حضورؐ نے کہلا بھیجا۔ یہی بھیج دو کیوں کہ گردن کا گوشت بکری کا عمدہ حصہ ہے۔ گردن کا گوشت خیر سے قریب تر اور نقصان سے بعید تر ہے

۳۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیان کیا :

کانت الذراع احب اللحم الی رسول اللہ — کاندھے کا گوشت حضورؐ کو سب سے زیادہ پسند تھا۔

۴۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بیان کیا :

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحبہ الذراع — حضورؐ کاندھے کا گوشت پسند فرماتے تھے۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔

ان اطیب اللحم لحم الظھر۔ پاکیزہ ترین گوشت پیٹھ کا ہے۔

۶۔ حضرت ام سلمہؓ نے بیان کیا کہ وہ حضورؐ کے پاس بھنی ہوئی ران لے گئیں آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔

۷۔ حضرت عبداللہ ابن حارثؓ نے بیان کیا کہ ہم نے حضور کے ساتھ بھنا ہوا گوشت کھایا۔

۸۔ حضرت مغیرہ بن شیبہؓ نے بیان کیا کہ ایک رات نبی کریمؐ کے ساتھ ایک شخص کے یہاں مہمان ہوا۔ گھر والے نے بکری ذبح کی۔ نام بجنب نشوی ثم اخذ الشفرۃ فجعلہ یحرب بھامنہ۔ تو آپ نے، دست بھوننے کی فرمائش کی جو آپ کے سامنے لایا گیا پھر آپ نے چھری لی اور اس سے میرے لئے دست میں سے کاٹنے لگے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ نبی کریمؐ کو گوشت بہت پسند تھا اور خاص طور سے ران، دست، گردن، پیٹھ، کاندھے کا گوشت وہ بھی بھنا ہوا پسندیدہ تھا۔

نبی کریمؐ کے اس بہترین شوق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اگر اللہ وسعت عطا فرمائے تو بہترین غذا اور لذیذ کھانے بھی کھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن لذیذ کھانوں کے حاصل کرنے کے لئے حرام و ناجائز طریقے اختیار کرنے کی ہرگز اجازت نہیں یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ اس کو اگر روکھی سوکھی روٹی ملے تو بھی خدا کا شکر ادا کرکے کھائے اور خوش رہے اور اگر بہترین غذائیں میسر ہوں تو ان کو بھی استعمال کرکے خدا کا شکر ادا کرے جیسا کہ نبی کریمؐ کا عمل تھا کہ آپ کئی کئی دن بھوکے رہتے تھے معمولی کھانا ملتا تو بھی خوش ہو کر کھا لیتے اور جب عمدہ کھانے میسر ہوتے تو ان کو بھی خوش ہو کر استعمال کرتے۔

آپؐ سے پرندوں کا گوشت استعمال کرنا بھی ثابت ہے۔

۱۔ حضرت زید الجرمیؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا۔

رایت رسول اللہ یا کل لحم دجاج میں نے اللہ کے رسولؐ کو مرغ کا گوشت کھاتے دیکھا۔)

۲۔ حضرت ابراہیم ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ ان کے دادا حضرت سفینہؓ نے فرمایا۔

اکلت مع رسول اللہ لحم حباری ۵ میں نے نبی کریمؐ کے ساتھ سرخاب کا گوشت کھایا۔

۳۔ حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ ہم نے بمقام مرالظہران ایک خرگوش کو اس کے بل سے نکالا۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک گئے مگر میں نے اسے پکڑ لیا اور اسے ابوطلحہؓ کے پاس لائے۔ انہوں نے اسے ذبح کرکے اس کے دست نبی کریمؐ کے پاس بھیج دیئے آپ نے اُسے قبول کر لیا اور بھنوانے کے بعد اس میں سے کچھ تناول بھی فرمایا۔

کدّو

نبی کریمؐ کو سبزیوں میں سب سے زیادہ کدّو (لوکی) پسند تھا۔ حضرت انسؓ نے بیان فرمایا کہ ایک درزی نے حضورؐ کی دعوت

کی۔ کھانے میں جَو کی روٹی اور شوربہ پیش کیا۔ شوربہ میں کدو اور گوشت تھا۔ میں نے دیکھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیالے کے کناروں سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے نکال لیتے اور تناول فرماتے تھے۔ اس دن سے ہی میں کدو کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔

ثرید و حلوہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثرید و حلوہ بھی پسند تھا۔ ثرید ایک تو اس کھانے کو کہا جاتا ہے جو شوربے یا تلی دال میں روٹی بھگو کر تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک نرم جلد ہضم ہونے والا کھانا ہے۔ اس کو اللہ کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پسند فرماتے تھے۔ ثرید کی ایک دوسری قسم بھی ہے۔ جو میٹھی ہوتی ہے اس کو حلوہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ستو میں کھجور خشک، دودھ اور گھی ملا کر ملیدے کی طرح بنایا جاتا ہے۔

حضورؐ کو دونوں ہی قسم کا ثرید پسند تھا جیسا کہ ابن عباسؓ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا۔

کان احب الطعام الی رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم الثرید من الخبز والثرید من
الحیس

روٹی سے تیار کیا ہوا اور ستو سے تیار کیا ہوا۔ خاص طور پر حلوہ کی پسندیدگی کا ذکر بھی موجود ہے۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا۔

کان رسول اللہ یحب الحلواء والعسل   حضور علیہ السلام حلوے اور شہد کو پسند فرماتے تھے

سالن روٹی

حضرت جابرؓ نے بیان کیا کہ نبی کریمؐ نے ایک مرتبہ اپنے اہل خاندان سے دریافت فرمایا کہ کوئی سالن ہے تو عرض کیا گیا گھر میں سرکہ کے سوا کچھ نہیں تو آپؐ نے وہی منگایا اور اسی سے کھانا تناول فرمانا شروع کر دیا۔ آپ کھاتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:

نعم الادم الخل نعم الادم الخل   سرکہ کتنا اچھا سالن ہے، سرکہ کتنا اچھا سالن ہے۔

حضرت یوسف ابن عبد اللہؓ نے فرمایا میں نے نبی کریمؐ کو دیکھا کہ اخذ کسرۃ من الشعیر فوضع علیھا تمرۃ فقال ھٰذہٖ ادام ھٰذہٖ۔ آپ نے جَو کی روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر کھجور رکھ کر فرمایا۔ یہ ہے سالن یہ ہے سالن۔

حضرت انسؓ نے بیان فرمایا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعجبہ الثفل   حضورؐ ہانڈی کی کھرچن کو پسند فرماتے تھے۔

ان احادیث سے واضح ہے کہ جس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھنے ہوئے گوشت، دکی، شہد اور حلوہ جیسی نفیس غذائیں پسند فرمائیں اس کی شان یہ بھی تھی کہ سب انفس سالن کی جگہ سرکہ، حلوے کی جگہ کھجور اور جَو کی روٹی کا ٹکڑا اور ہانڈی کی کھرچن میسر ہوتی تو وہ اس کو بھی پسند

فرماکر رازقِ حقیقی کا شکر ادا کرتے اور اس پر بھی خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے درحقیقت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح انسانیت کے دونوں طبقوں، دولتمندوں اور غریبوں کو سہارا عطا فرمایا کہ اگر گوشت والے سنّتِ رسولؐ ادا کرنے کا ثواب پائیں تو سرکہ چٹنی اور روٹی پر زندگی بسر کرتے والے بھی یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیں کہ یہ معمولی کھانے صرف انھیں کی تقدیر میں نہیں بلکہ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پسند فرمائے اور خوش ہو کر استعمال فرمائے۔ بلکہ ان کا تو اگر مزید حال معلوم کرنا ہے تو حضرت مالک بن دینارؒ کے اس بیان سے اندازہ کیجیے۔

ما شبع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خبز ولا لحم الا علی ضفف

نبی کریمؐ نے سوائے اجتماع کے کبھی نہ روٹی سیر ہو کر کھائی اور نہ کبھی گوشت پیٹ بھر کر کھایا۔

یعنی جب کوئی اجتماع ہوتا دعوت وغیرہ ہوتی تب تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو کر کھانا تناول فرما لیا کرتے تھے۔ ورنہ حال یہ تھا کہ حضرت مسروقؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ایک مرتبہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میرے لئے کھانا منگوایا اور کہنے لگیں میں جب کبھی کھانا سیر ہو کر کھاتی ہوں تو مجھے رونا آجاتا ہے۔ حضرت مسروقؓ نے عرض کیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے تو فرمایا مجھے وہ زمانہ یاد آجاتا ہے جب خدا کی قسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دن دو مرتبہ روٹی اور گوشت پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

دودھ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ بھی بہت پسند تھا آپؐ نے اکثر بکری کا دودھ استعمال کیا اور گائے کا بھی استعمال کیا۔ گائے کے دودھ کے متعلق آپؐ کا ایک ارشاد بھی موجود ہے۔ جس کو حضرت صہیبؓ نے بیان فرمایا۔ آپؐ فرماتے ہیں:

علیکم اللبن البقر فیہا شفاء وسمنہا دواءٌ ولحمہا داءٌ

تم گائے کا دودھ استعمال کرو کیونکہ اس میں شفا ہے اور اس کے گھی میں دوا کی تاثیر ہے اور اس کے گوشت میں بیماری ہے۔

یعنی گائے کا دودھ اور مکھن نہایت ہی مفید اور مقوی ہیں لیکن حضور علیہ السلام نے اس کا گوشت پسند نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اس میں بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح بکری کا گوشت کھانا سنت ہے اسی طرح گائے کے گوشت سے بچنے کی کوشش کرنا بھی جائز ہے۔ بہر حال حدیث میں گائے کے گوشت کی حرمت نہیں بلکہ ناپسندیدگی کا اظہار ہے، ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آپؐ نے صحابہ کرام کے لئے گائے ذبح فرمائی اور دوسری حدیث میں ہے کہ ازواج مطہرات کی طرف سے حج میں گائے ذبح فرمائی۔

مذکورہ احادیث سے جہاں نبی کریم رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ غذاؤں کا پتہ چلا وہاں کھانے

کے سلسلے میں آپؐ کی تعلیمات کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ہر قسم کی حلال طیب غذاؤں کے استعمال کی اجازت دیتا ہے چاہے وہ بکری اور مرغی کا گوشت جیسی اعلیٰ اور گرانقدر غذا ہو یا کھجور اور جَو کی روٹی جیسی معمولی غذا ہو لیکن یہ خیال ضرور کرنا چاہیے کہ عمدہ کھانے ملنے پر غرور و تکبر نہ کیا جائے بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور معمولی کھانا نصیب ہونے پر ناشکری نہ کی جائے بلکہ اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ اعلیٰ نعمتوں پر شکر ادا کرنے سے وہ نعمتیں جاری رہتی ہیں اور معمولی نعمتوں پر شکر ادا کرنا ان نعمتوں کے اعلیٰ ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ

عبد القدوس ہاشمی

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپ کے احوال زندگی کا بار بار اور غور و فکر کے ساتھ عمیق طالعہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے نہایت ضروری ہے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ مطالعہ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہمیں خالق کائنات خدائے بزرگ و برتر نے اپنی کتاب قرآن مجید میں یہی حکم دیا ہے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں، ان کی اتباع کریں اور ان کے اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کے لیے نمونہ عمل قرار دے کر اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگنے کی سعی کریں اور اس میں ساری زندگی بسر کر دیں۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ہم اسی صورت میں کر سکتے ہیں، جب کہ ہم آپ کی سیرت طیبہ سے واقفیت حاصل کریں، بار بار پڑھیں، سُنیں، دوسروں کو سنائیں، خود یاد رکھیں اور دوسروں کو یاد دلاتے رہیں۔ ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ ہم پر غفلت طاری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اللہ سے محبت ہے اور رسول اللہ سے غفلت، اللہ سے غفلت ہے اور جو اللہ کی یاد سے غافل ہوگیا، اسے نہ یہاں چین اور نہ وہاں چین۔

اور ایک غیر مسلم کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ اس لیے ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے کہ نوع انسانی میں سے مردِ کامل کا صرف یہی ایک نمونہ ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اتباع کرے یا انکار، لیکن یہ جان لینا تو ہر آدمی پر فرض ہے کہ ہر پہلو سے کامیاب و کامران اور ہر اعتبار سے مکمل انسان کیسا ہوتا ہے؟ کون بدنصیب ہوگا، جو یہ نہ چاہے کہ اسے ایک بامقصد اور کامیاب زندگی میسر ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کامیاب زندگی کیسی ہوتی ہے اور کیا اس کا کوئی مکمل نمونہ ہمیں نظر آتا ہے کہ ہم اس سے کچھ سیکھیں اور کچھ حاصل کریں۔

زمین پر زمانہ نا یاد گار سے نوع انسانی آباد ہے اور آج بھی لاکھوں اور کروڑوں نہیں بلکہ اربوں آدمی اس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، سب کا قصہ ایک ہی سا قصہ ہے کہ پیدا ہوا، بڑوں نے دیکھ بھال کی، پرورش و پرداخت ہوئی، ایک محدود مدت تک زمین پر زندہ رہا اور بالآخر مر کر پیوند زمین ہو گیا۔ نہ پیدا ہوتے میں اختیار و ارادہ کو دخل تھا اور نہ موت میں۔

حیاتِ جاوداں میری نہ مرگ ناگہاں میری

سب کہاں؟ جن چند لوگوں کا حال آپ کو معلوم ہے، ان ہی کی زندگیوں پر غور کیجیے۔ پیدائش اور موت پر تو یقیناً کسی کو بھی اختیار حاصل نہ تھا۔ لیکن سن بلوغ سے موت تک جو کچھ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتے رہے، ان اعمال و افکار میں انہوں نے اپنے ارادہ و اختیار کو کس کس طرح استعمال کیا اور وہ اپنے مقاصد زندگی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہاں! اور یہ بھی دیکھیے کہ انہوں نے اپنے ایک رخ کی تکمیل کے لیے زندگی کے دوسرے رخوں کو نظر انداز تو نہیں کر دیا۔ مثلاً

ایک شخص روحانی سکون حاصل کرنے کے لیے بیوی بچوں کو چھوڑ کر پہاڑ پر جا بیٹھا، تو اس کی زندگی اور پہاڑ کی چٹان میں کیا فرق باقی رہا۔ وہ نہ ہوا، پہاڑ کی ایک چٹان ہوئی۔ دوسرا بیوی بچوں اور عیش و عشرت دنیا میں اس طرح الجھا کہ ساری کائنات سے غافل ہو گیا، تو اس کی زندگی اور کتے بلیوں کی زندگی کے مابین امتیاز کیا رہا۔ وہ نہ رہا کتے رہے بلیاں رہیں۔ آدمی کاہے کو ہوا محض ایک جانور ہو کے رہ گیا۔

انسانی زندگی تو مختلف اور متنوع فرائض و واجبات کا مجموعہ ہے اور ان ہی کی اچھی طرح تکمیل سے زندگی کا کمال وابستہ ہے۔ ایک آدمی پر کچھ فرائض اپنی ذات کی طرف سے عاید ہوتے ہیں کچھ کنبے اور گھرانے کی طرف سے کچھ ہمسایوں اور اہل وطن کی طرف سے، کچھ قوم و ملت کی طرف سے اور کچھ بنی نوع انسان کی طرف سے۔ ان ہی متنوع فرائض و واجبات کی اس طرح متناسب و متوازن ادائیگی کہ ایک کی وجہ سے دوسرا رخ متاثر نہ ہو اور ایک میں انہماک سے دوسرے کی طرف سے تغافل نہ پیدا ہو جائے، کامیاب و کامران زندگی کہلاتی ہے۔ اپنی ذات سے وابستگی اور اپنی راحت و عافیت کا اہتمام یقیناً ہر انسان کی اولین تمنا ہے۔ اس حد تک کہ پہاڑوں میں تارک الدنیا کی زندگی بسر کرنے والے سادھو بھی بھوک پیاس کے لیے کچھ نہ کچھ جتن کیا ہی کرتے ہیں اور گرمی سردی سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی غار تلاش کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی ہی ذات کو مقصود و معبود بنا لے اور زندگی کے دوسرے واجبات سے غافل ہو جائے تو اس کی زندگی کو نمونہ کی کامیاب زندگی نہیں کہا جا سکتا اور نہ ایسی کسی زندگی سے ہمارے لیے کوئی ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ۔

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اب اس تصویر کا دوسرا رخ لیجیے۔ ایک شخص وطن دوستی بلکہ ناپاک وطن پرستی کے نشہ میں سرشار ہو کر اپنے اوپر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر لیتا ہے، نہ اپنی ذات کی فکر کرتا ہے، نہ پلٹ کر بیوی بچوں کی طرف دیکھتا ہے حتیٰ کہ ان عمومی فرائض و واجبات کی طرف سے بھی غافل ہو جاتا ہے، جو محض ایک انسان ہونے کی وجہ سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایسے شخص کو کوئی ذی ہوش آدمی کامیاب و کامران بھلا آدمی نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی تنگ نظر وطنی حکومت کا اسے سربراہ بنا دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شہر کے باغ عام میں آنے والی نسلوں کے دماغوں کو زہرناک بنانے کے لیے اس کا مجسمہ نصب کر دیا جائے۔ مگر ایک بلند نظر آدمی اسے اچھا نمونہ نہیں قرار دے سکتا۔

پھر یہ بھی دیکھیے، ایک آدمی کو اپنی اس مختصر سی زندگی میں کیسے کیسے متنوع حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی دولت کی فراوانی، کبھی غربت کی پریشانی کہیں دوست سے واسطہ پڑتا ہے، کہیں دشمن سے مقابلہ۔ کبھی صحت و قوت کبھی بیماری و ناتوانی۔ آدمی کو کیا کیا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کبھی قوم کا سردار کبھی سردار کا فرماں بردار۔ کہیں حکومت و جماعت کا منتظم کہیں نادانوں کا معلم۔ یہ انسان ہی تو ہے، جو کبھی فوج کا کمانڈر اور کبھی جج بن کر داد عدل گستری دیتا ہوا نظر آتا ہے۔

کیا یہ حقیقت و واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنے بڑوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہمارے سامنے ایک ایسا کامل نمونہ ہو، جس کی سیرت میں انسانی زندگی کے ان متنوع و مختلف حالات کا کامیاب نمونہ ہمیں مل جائے تلاش

یہ تجھنے دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا دکھائی دیتا ہے، جو ہمارے لیے ان تمام حالات میں نمونہ کا کام دے سکے۔ بہت سے فاتحین اور کشور کشاؤں کا حال ملتا ہے۔ بہت سے فلسفیوں کے افکار ملتے ہیں۔ بہت سے تارک الدنیا لوگوں کے تذکرے ہم سنتے ہیں۔ بہت سے بادشاہوں، وزیروں اور عالموں فاضلوں کے قصے موجود ہیں۔ ان کی بڑائی تسلیم، ان کی سربلندیاں سر آنکھوں پر۔ مگر غور سے دیکھئے تو یہ سب کچھ سیرت انسانی کے کسی ایک رُخ کی کہانی سے زیادہ کچھ ہے؟ اس سے انکار نہیں اور ہمارا تو ایمان ہے کہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خالق نے ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں عملی زندگی کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے کے لیے سچے اور بہترین رہنما بھیجے تھے۔ لیکن ان کے حالات ہم تک کہاں اور کتنے پہنچ سکے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان میں اکثر کی تاریخی شخصیت بھی قابل اعتماد تاریخوں سے ثابت نہیں ہوتی۔ اور جو کچھ مستند یا غیر مستند حالات ہمیں ملتے ہیں، وہ محض چیدہ چیدہ واقعات ہیں، جن سے ان بزرگوں کی سیرت و کردار کا مکمل تو کیا کوئی نامکمل خاکہ بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ ہزاروں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور محض سوالات ہی رہ جاتے ہیں۔ ان کے حل کرنے کے لیے ہمیں ان قصہ کہانیوں میں کوئی کرن نہیں دکھائی دیتی۔

اس کے برخلاف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا کسی جگہ تاریکی کا نشان نہیں پاتا۔ ہر چیز واضح اور چمکتے ہوئے آفتاب کی طرح واضح ہے۔ آپ کا شخصی کردار، رحمت، رأفت، شفقت، خشیت، عبادت، شجاعت، عدالت، صداقت، سخاوت، فراست، متانت، ایثار، احساس ذمہ داری، عاجزی اور تواضع، صبر، توکل، ثبات، دانش مندی وغیرہ وغیرہ سب کی کیفیت اور ان کے عملی نمونے مل جاتے ہیں اور بہت سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی گھریلو زندگی میں اچھے شوہر، اچھے باپ اور اچھے نانا دادا وغیرہ کے بہترین نمونے ہمیں ملتے ہیں، جماعتی زندگی میں اچھے دوست، اچھے ساتھی، شفیق سردار اور مساکین کے سرپرست و مددگار کا بہترین نمونہ ہمیں آپ کی ذات میں ملتا ہے۔ اسی طرح ملی و قومی زندگی میں عدل، انصاف، فوجوں کی کمانداری، انتظامات حکومت، رعایا پروری، سیاسی سمجھ بوجھ، دوستوں کی دلداری، دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک وغیرہ ایسا مکمل اور اتنا بہترین نقشہ ہمیں سیرت طیبہ میں دکھائی دیتا ہے کہ ویسا اور کہیں نہیں دکھائی دیتا اور کمال یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے یہ سارے نمونے صرف ایک ہی مقدس و مکمل انسان میں مل جاتے ہیں اور مطالعہ کرنے والا بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ:

کاسۂ غیر کو، اور منہ سے لگاؤں، توبہ
شان پہچانتا ہوں یار کے پیمانے کی

اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ زندگی کے کسی مرحلہ پر اور کسی حالت میں کہیں اور سے کوئی سبق حاصل کیا جائے خوشی، غم، تونگری، افلاس، سرداری، حکومت، اقتدار، ناتوانائی، صلح، جنگ، امن، بدامنی، اخلاص، دشمنی وغیرہ آخر آپ کو اپنی زندگی میں ان ہی باتوں سے تو واسطہ پڑے گا۔ آپ کو ان حالتوں میں کیا یقین رکھنا چاہیئے اور کیا عمل کرنا چاہیئے کہ آپ کامیاب رہیں اور آپ کا خالق بھی آپ سے خوش رہے۔ اس کا جواب آپ کو صرف سیرت طیبہ ہی میں مل سکتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین اسلام ہی کی تکمیل نہیں فرمائی بلکہ نبوت اور رہنمائی کے سلسلہ کو

آپ پر ختم کر کے سیرت انسانی کی بھی تکمیل فرمادی، اور اس طرح تکمیل فرمادی کہ اس سے زیادہ مکمل اور اتنے اچھے نمونہ کردار کا تصور بھی ممکن نہیں۔

مسلمانوں کے لیے تو اس بات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں اس لیے کہ یہ ان کا ایمان ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ خالق کائنات کی رضامندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخلصانہ اتباع کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔ اور بغیر حصول رضائے الٰہی نہ دنیا بھلی اور نہ آخرت۔ البتہ ایک غیر مسلم کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ اس لیے کہ اس میں ایمان و یقین کا فقدان ہے۔ لیکن سیرت طیبہ کا عمیق مطالعہ اس کے لیے بھی ایک فریضہ انسانی کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر اس نے سیرت طیبہ کا مطالعہ نہیں کیا تو اسے کہیں دنیا میں ایسا مکمل، واضح اور تفصیلی نمونہ، کامیاب انفرادی، اجتماعی اور قومی زندگی کا نہیں مل سکتا۔ وہ اپنی زندگی کے بہت سے مرحلوں میں یا تو کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو جائے گا یا بری طرح ٹھوکریں کھائے گا۔ زندگی بہرحال زندگی ہے چاہے مسلمان کی زندگی ہو یا غیر مسلم کی۔ یہ وقت سب پر آتا ہے۔ جب ایک آدمی کا دماغ یہ سوال کرتا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور ہمارے عمل کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ لازم ہے کہ آدمی کے سامنے اس سوال کے وقت کوئی نمونہ عمل موجود ہے۔ ایک نبی اور ایک فلسفی کے مابین یہ واضح فرق ہر جگہ نمایاں ہے کہ نبی جو کچھ کہتا ہے، اس کے مطابق عمل کر کے دکھاتا ہے اور فلسفی جو کچھ سوچتا ہے، وہ کہتا ہے نہ خود اس کے مطابق عمل کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے عمل کرنے والے کو نتائج عمل کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ دنیا کلجگ نہیں کرجگ ہے اور

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

حقوق

عورتوں کے حقوق

اسلام ہی عورتوں کو تمدن میں برابر کی جگہ دیتا ہے اور اُن کے مساویانہ حقوق کو بحال کرتا ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ ۔ عورتوں کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ۔

بچّوں کے حقوق

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۔ تنگدستی کے ڈر سے تم اپنی اولاد کو نہ مارا کرو

والدین کے حقوق

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ ماں باپ کے ساتھ عمدہ ترین برتاؤ کرو

الدفاع فی الاسلام

ابو سلمان شاہجہانپوری

اسلام کے شرعی واجبات وفرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان وکفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض جہاد ہے لیکن جہاد کی حقیقت کی نسبت سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں مخالفین اسلام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دینا ہے۔

"جہاد" کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ سعی کو جو ذاتی اغراض کی جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے، جہاد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، انفاق وقت وعمر سے بھی ہے، محنت وتکالیف برداشت کرنے سے بھی اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے جس سعی کی ضرورت ہو اور جو سعی جس کے امکان میں ہو، اس پر فرض ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغت وشرع دونوں اعتبار سے داخل۔ یہ بات نہیں ہے کہ جہاد سے مقصد مجرد لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی ولسانی پر نہ ہوتا حالانکہ کتاب وسنت ایسے اطلاقات سے لبریز ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحب اقناع نے نقل کیا ہے، جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل وجامع ہے۔

الامر بالجهاد منه مايكون بالقلب كالعزم عليه او منه ما يكون باللسان كالدعوة الى الاسلام والحجة والبيان والرائى والتدبير فى ما فيه نفع المسلمين و بالبدن اى القتال بنفسه فيجب الجهاد بغاية ما يمكنه من هذه الامور (جلد ۱-۶۵۳)

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ہر رات دن تمام جہاد حق میں بسر کر سکتا ہے۔

مشہور حدیث ہے:۔ المجاهد من جاهد نفسه فى ذات الله والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه۔

سورہ الفرقان میں ہے کفار کے مقابلہ میں لڑنے سے بڑا جہاد کرو۔

فلا تطع الكافرين وجاهدهم به جهاداً كبيراً۔ پس کافروں کی اطاعت نہ کرو اور ان سے بڑے سے بڑا جہاد کرو۔

سورۃ الفرقان بالاتفاق مکی ہے اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ اس کی زندگی میں کون سا جہاد تھا۔ جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً

وہ حق کی استقامت اور اس کی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا سب کو معلوم ہے۔ حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی جیسی اللہ کے رسولؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے مکی زندگی میں برداشت کیں۔ اس پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔

جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم (۹ : ۶۶)

حالانکہ منافق تو خود اسلام کے تحت مقہورانہ و نکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے جنگ و قتال کی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ان سے کبھی جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت و مقاومت فساد کا جہاد تھا، جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

بخاری و ابن ماجہ میں ہے حضرت عائشہؓ نے پوچھا۔ ھل علی النساء جھاد؟ کیا عورتوں کے لیے بھی جہاد ہے؟ فرمایا "نعم جھاد، لاقتال فیہ الحج والعمرۃ" ہاں! جہاد ہے۔ مگر اس میں لڑنا نہیں ہے۔ حج اور عمرہ۔ اس حدیث میں اس سعی اور ترک وطن کی محنت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے، عورتوں کے لیے جہاد فرمایا اور کہا ایسا جہاد جس میں لڑائی نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت "جہاد" باقی رہتی ہے۔

اگر امت کے لیے دفاع و جنگ کا وقت آگیا، یا کسی جماعت مفسدین پر امام نے حملہ کیا، تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں جس کی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے جس نے زبان سے دعوت و تبلیغ کی، وہ بھی مجاہد ہے۔ جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی محنت و تکلیف اٹھائی، وہ بھی مجاہد ہے۔ البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلوتہی کرلے، تو اس کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا اس کا شمار مومنوں کے بجائے منافقوں میں ہوگا۔ جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا، وہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا۔ زمین پر گو مسلمان کہلائے، پر اللہ کے حضور منافق کہلائے گا۔ جس شخص کی زبان اعلان حق اور دعوت الی الجہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی اس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کرلی۔ گو شیطان حیل اور نفس خادع اس کو ہزاروں فریب دیتا رہے۔ ترمذی اور ابو داؤد میں ہے

"افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر"

سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمہ حق ہے، جو شاہان جور و ظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے۔

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ ان مجاہدین کاملین اور اصحاب عزیمت کا ہے، جن کی زندگی سرتاسر جہاد فی سبیل اللہ اور جن کا وجود یکسر خدمت حق و شیفتگی صدق و عشق دعوت ہے، جو اس عمل مقدس کے لیے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے، بلکہ ہر صبح جو ان پہ آتی ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے اور شام کی تاریکی جو ان پر پھیلتی ہے، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے۔ اس کی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا، جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلت عظمی کے اجر و ثواب سے خالی ہو۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے۔ دل، زبان، اعضا و جوارح۔ سو ان کا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے۔ ان کی زبان ہمیشہ یہ اعلان حق و دعوت الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے

ان کے ہاتھ اور ان کے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے۔ اس کے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا، جو انہوں نے نہیں کیا؟ اور اس راہ کا کون سا مرتبہ رہ گیا، جو انہوں نے نہیں پایا؟

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر۔

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو۔ انسانی اعمال کی کون سی بڑائی اور عظمت ہے۔ جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی؟ اور نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کا کون سا عمل حق ہے، جو اس کے بغیر انجام پا سکتا ہے؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کی اہمیت و فضیلت پر اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں، ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا، یہ جڑ یہی عمل قرار پایا اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لوددت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم احیا ثم اقتل (رواہ البخاری)

خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا، تو میں چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ ہوں، پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اس کی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے۔

جہاد کی قسمیں

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد صرف جنگ و قتال کا نام نہیں بلکہ جہاد کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم "قتال" ہے اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں (۱) "ہجوم" اور "دفاع" یعنی (offensine اور Defensine)

دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے۔ یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے۔ ضروری ہوا کہ حریف اور مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہوں گے۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے۔ بحکم وما کان المومنون لینفروا کافۃ "ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیئے، جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی ہے، تو کافی ہے۔ جو مسلمان شریک ہوگا، اس کے لیے بڑا اجر ہے۔ جو شریک نہ ہوگا، اس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔

حقیقت حکم دفاع

یہ صورت تو اس قتال کی ہوئی، جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہوگی۔ دوسری قسم "دفاع" ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے، تو کیے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (ڈیفنس) کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر بچائیں۔ اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے، تو اس سے نجات دلائیں اور اس کام کے لیے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں اور اسلامی فرائض میں یہ فرض اس درجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے ناواقف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاوری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے

شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے، بلکہ بالاتفاق مثال نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔

ہدایہ میں ہے۔

الا ان یکون النفیر عاماً فحینئذ یصیر من فروض الاعیان

"نفیر" نفر سے ہے۔ نفر کے معنی ہیں، تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے بلاوے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو "نفیر" کا اطلاق ہوا قرآن میں ہے "انفروا خفافا وثقالا" اور "الا تنفروا" مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

هذا اذا لم یکن النفیر عاماً فاذا کان النفیر عاماً بأن هجم العدو علی بلدة من بلاد المسلمین، فیصیر من فروض الاعیان سواء کان المستنفر عادلاً او فاسقاً (فتح القدیر ۴: ۲۸۲)

فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو۔ لیکن اگر مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا، تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جائے گا خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق اور عنایہ میں ہے۔

ثم الجهاد یصیر فرض عین عند النفیر العام علی من یقرب من العدو وهو یقدر علیه (مجموعہ فتح القدیر ۴: ۲۸۱)

اور اگر نفیر عام کی حالت ہو، تو جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض عین ہو جائے گا، جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قابو رکھتے ہوں۔ اسی طرح سراجیہ، ردالمحتار، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے۔

"اذا جاء النفیر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو"

اور "الجهاد فرض کفایة اذا لم یکن النفیر عاماً، فاذا قام به البعض، یسقط عن الباقین۔ فاذا صار النفیر عاماً، فحینئذ یصیر من فروض الاعیان" الخ۔

حملہ و ہجوم کے دائمی جہاد میں جب قتال فرض کفایہ ہوتا ہے، بعض جماعتیں مستثنیٰ ہوتی ہیں، مثلاً عورتیں اور لڑکے، عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کے لیے آقا کی خدمت مقدم ہے۔ لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آ گئی ہو، تو اس کی فرضیت ایسی ہمہ گیر اور بالاتر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ، کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو، غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول جہاد ہو جائے۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے "وجوب النفیر" یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آ جائے، تو قتال کے لیے سب

کا اٹھ کھڑا ہونا واجب ہے۔ پھر آیہ "انفروا خفافاً وثقالاً" اور "ما لکم اذا قیل لکم انفروا" الخ
سے وجوب پر استدلال کیا ہے۔

اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ کی روایت درج ہے۔

"لا ھجرۃ بعد الفتح ولکن جہاد ونیۃ واذا استنفرتم فانفروا"

یعنی وہ جو اوائل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی تو فتح مکہ کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے۔ تو جب جمع ہونے کے لیے پکارے جاؤ، جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے۔

الآن تدعو الحاجۃ الیہ أن کان یدھم العدو ویتعین علی من عینہ الامام۔ (جلد ۶ :- ۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے۔

اذا کان الکفار مستقرین بلادھم فالجہاد فرض کفایۃ، ان اقام بہ بعضھم سقط الحرج علی الباقین واذا قصدوا بلادنا واستنفر امام المسلمین، وجب علی الاعیان"

یعنی اگر کفار اپنے ملک میں ہیں، مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں، تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے، تو پھر فرض عین ہو جائے گا۔

چونکہ جابجا نفیر کا لفظ آیا ہے، اس سے یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے کیا مراد ہے؟ مقصود

نفیر کا مطلب

یہ ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا، نفیر عام کی حالت نہ پیدا ہوگی؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دے دیا ہے۔

"نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود۔ استنفار را چوں منقح کنیم حاصل شود حالتے کہ مقتضائے استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا، و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین، و کافرین، و عدم کفایہ از ان مسلماناں، وانچہ بداں ماند" (مسوّی جلد ۲ - ۱۲۹)

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضروری نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے، جو مقتضائے نفیر ہے۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہو گئی، تو جہاد فرض ہو گیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور ان کی شکست کا خوف ہوا، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانانِ عالم پر فرض ہو گیا، خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و بدحالی ہے۔ ان کا فرض ہو گا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا

جب وقت آجائے، تو خواہ موذن کی صدائے "حی علی الصلوٰۃ" سنائی دے یا نہ دے، وقت کا آجانا وجوب کے لیے کافی ہوتا ہے۔

احکام قطعیہ دفاع غرض کہ "دفاع" اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے، جن کو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے، تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سنے اور از سرتا پا کانپ نہ اٹھے۔

یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ط ارضیتم بالحیوۃ الدنیا من الآخرۃ فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل (۹-۳۸)

مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو، تو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت کر لی؟ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو جس زندگی پر ریجھے بیٹھے ہو، وہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شیئا واللہ علی کل شئ قدیر۔ (۹-۳۹)

یاد رکھو! اگر تم نے حکم الٰہی سے سرتابی کی اور وقت کے آنے پر بھی راہ حق میں کمربستہ نہ ہوئے تو اللہ نہایت ہی سخت عذاب میں ڈال کر اس کی سزا دے گا اور تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کے لیے کھڑا کر دے گا، تم چھانٹ دیئے جاؤ گے، کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں ہے۔ تم ہی اپنی زندگی و نجات کے لیے اس کے محتاج ہو۔

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت، ان کی حکومتوں کے مٹانے اور ان کی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کے لیے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں۔

والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں، مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر ڈالتے ہیں۔

والذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ۔

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ۔

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض (۹: ۷۲)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم ایک دوسرے کی رفیق و مددگار ہیں۔

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض ٹھہرا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان ان کے مقابلہ

کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کی یاوری و اعانت کے لیے اس طرح اٹھ کھڑے ہوں، جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کے لیے اٹھتے اور اپنی جان و مال سے اسی طرح مدد دیں، جس طرح خود اپنے گھر بار کی حفاظت کے لیے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں اور جن پر عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے، ان سب میں یہ احکام موجود ہیں اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملے گا جو ان حکموں سے بے خبر ہو اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے، جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکی ہیں اور یہ احکام اپنی یکساں غیر مبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

ترتیب وجوب دفاع

(ترتیب وجوب دفاع کے متعلق اشارہ کیا جا چکا ہے لیکن ضروری ہے کہ مسئلہ کے اس پہلو کی مزید تشریح کر دی جائے)

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہو گیا، تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے جو عقل و حکمت کی بنا پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہو سکتی تھی۔ صورت اس کی یہ ہے کہ جب غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا، تو اس ملک کے تمام مسلمانوں پر بہ مجبور و قصد اعداء دفاع فرض عین ہو گیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلے کے لیے کافی قوت نہیں رکھتے، دشمن بہت زیادہ قوی ہے یا رکھتے ہیں اور غفلت و تساہل کرنے لگتے ہیں، تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائیگا بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ مگر صورت اس کی یوں ہوں گی کہ پہلے ان مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر واجب ہو گا۔ پھر ان سے قریب پر، پھر ان سے قریب تر پر۔ حتیٰ کہ مشرق و مغرب جنوب و شمال تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہو جائے گی۔

اس وقت سارے فرائض، سارے وظائف، سارے کام ملتوی کر دینے چاہئیں۔ بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت جہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے اور قیام دفاع کے لیے شرعاً جن جن وسائل و انتظامات کی ضرورت ہے، سب کو مل جل کر ان کا انصرام کرنا چاہیے اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام و پیشوا نہیں ہے، جو نظم و قیام اپنے ہاتھ میں لے، تو سب کا فرض ہو گا کہ پہلے امام و امیر کا انتظام کریں۔ پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو، ان کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر و سعی کام میں لائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے، سب مبتلائے معصیت و فسق ہوں گے۔ ایسی معصیت ایسا فسق، ایسا عدوان ایسا نفاق جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے۔

فتح القدیر میں ہے۔

فيجب على جميع اهل تلك البلدة النفر وكذا من يقرب منهم ان لم يكن

باهلها كفاية، وكذا من يقترب ممن يقترب ان لم يكن بمن يقترب كفاية، او تكاسلوا او عصوا، وهكذا الى ان يجب على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً (جلد ۲ ص ۲۳۸)

اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا، تو پھر اس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض عین ہو جائے گا اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کے لیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں، تو جو مسلمان ان سے قریب ہوں گے، ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا اور اگر وہ بھی کافی نہیں، یا انہوں نے سستی کی، یا دانستہ انکار کیا تو پھر ان تمام لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں، یہ فرض عائد ہوگا، اسی طرح یکے بعد دیگرے اس کا وجوب منتقل ہوتا جائے گا حتیٰ کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب میں دفاع کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فرض ہو جائے گا۔

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ وحدیث میں ہے۔ عبارتوں کے نقل وترجمہ میں طول ہوگا، ردالمحتار وغیرہ شروح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے۔

"فاما من وراءهم ببعد من العدو فهو فرض كفاية عليهم حتى يسعهم تركه اذا لم يحتج اليهم بان عجز من كان يقترب من العدو عن المقاومة، او لم يعجزوا عنها لكنهم تكاسلوا، فانه يفترض على من يليه فرض كالصلوة والصوم لا يسعهم تركه، وثم الى ان يفترض على جميع اهل الاسلام شرقاً وغرباً"

جو لوگ عقبی علاقوں میں دشمنوں سے دور ہوں ان پر (قتال) فرض کفایہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کے ترک پر مواخذہ نہ ہوگا جب کہ اس کی ضرورت نہ پڑی لیکن جو دشمن سے قریب ہوں، وہ مقابلہ واستقامت کی طاقت رکھتے ہوئے سستی کریں یا طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ضرورت پیش آنے پر ان پر بہر حال یہ نماز، روزے کی طرح فرض ہوگا اور اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس طرح مشرق ومغرب کے تمام اہل اسلام پر یہ فرض ہو جاتا ہے اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے۔

"ثم الجهاد يصير فرض عين عند النفير العام على من يقترب من العدو وهو يقدر عليه واما الا اذا احتيج اليهم اما بعجز المقترب، واما للتكاسل فحينئذ يفرض على من يليهم" الخ ،

چنانچہ عام اعلان کے بعد دشمن کے قریب تر علاقوں والے صاحب قدرت لوگوں پر جہاد (قتال) فرض عین ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ ان کے عقب میں ہیں، ان پر فرض نہیں ہوتا، جب تک کہ ضرورت پیش نہ آئے، خواہ قریب کے لوگ قتال سے عاجز ہوں یا سستی کریں۔ اس وقت یہ ان سب پر فرض ہو جاتا ہے۔

اور شرح موطا میں ہے۔

"فان لم تمتنع الكفاية بمن نزل بهم، يجب على من بعد منهم من المسلمين عونهم"

اگر وہ لوگ جن پر حملہ ہوا، دشمن کے مقابلے میں کافی نہ ہوں، تو ان کے عقبی علاقوں کے مسلمانوں پر ان کی مدد واجب ہوگی۔

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں، جن میں وجوب دفاع کے لیے یکے بعد دیگرے اس ترتیب اور الاقرب فالاقرب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانانِ عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت تمام مسلمانانِ عالم سے طالب اعانت ہو، یا اس کی بےبسی اور بے چارگی کی حالت ایسی ہو جائے کہ بلا تمام مسلمانانِ عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی اور فتح ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام یعنی جزیرہ عرب پر غیر مسلم حملہ آور ہوں، جن کو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو۔

فضائل دفاع

اسلامی احکام میں بحکم "دفاع" جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات بتائی گئی ہے کہ قومی زندگی اس عمل کے بقا پر موقوف ہے، جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی جان اور اپنا مال قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم ان پر غالب نہ آسکے گی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا۔ اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے جب تک یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت و عزت انہی کے لیے تھی جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے۔

ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباءُو بغضب من اللہ !

سنن ابو داؤد میں ہے۔

اذا ضن الناس بالدینار والدرھم وتبایعوا بالعین واتبعوا اذناب البقر وترکوا الجہاد فی سبیل اللہ انزل اللہ بھم بلاءً فلم یرفعہ حتی یرجعوا۔

یعنی جب کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دیتی ہے، تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دور نہیں ہو سکیں الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصل بنیاد یہی تھی، اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے، جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے، اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی، اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا "ای العمل افضل"؟ کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے؟ فرمایا "ایمان باللہ ورسولہ" اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا "ماذا ثم" اس کے بعد؟ فرمایا۔ الجہاد فی سبیل اللہ" اللہ کی راہ میں جہاد!

بخاری میں ابو سعید خدری سے مروی ہے۔

قیل ای الناس افضل فقال مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ و مالہ۔

آپ سے پوچھا گیا سب سے زیادہ افضل آدمی کون ہے؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کرتا ہے اور فرمایا جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے، جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے۔

بخاری میں دو حدیثیں ہیں۔

"ماکان عبد یموت لہ عند اللہ خیر یسوہ ان یرجع الی الدنیا وان لہ الدنیا وما فیھا الا الشھید لما یری من فضل الشھادۃ فانہ یسرہ ان یرجع الی الدنیا فیقتل مرۃ اخری اور روایت انس ما احد یدخل الجنۃ یحب ان یرجع الی الدنیا ولہ ما علی الارض من شیئ الا الشھید یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقتل عشر مرات لما یری من الکرامۃ"

حاصل دونوں کا یہ ہے کہ دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی مگر اس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا۔ جب وہ شہادت کا اجر و ثواب دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے، کاش پھر دنیا میں جا سکوں اور دس مرتبہ اس طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں اور دس مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل کروں۔

جن لوگوں نے جنگ بدر میں جان نثاریاں کی تھیں، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے، تو آپ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا۔

"لعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ماشئتم"

یہ وہ جاں نثار حق ہیں، جنھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی تھی عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کہہ دیا ہو کہ جو جی میں آئے کرو۔

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی تیاری کی خبر پہنچی، تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی۔ کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے لیے تیار رہا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے۔ اور دو سو اوقیہ سونا تھا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

"لایضر عثمان ما عمل بعدھا"

اخرجہ الترمذی والحاکم ایضاً من حدیث عبد الرحمن بن حباب نحوہ۔

آج کے دن کے بعد سے عثمانؓ خواہ کچھ ہی کرے، لیکن کوئی عمل اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل دفاع کے لیے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسولؐ کی نظروں میں ایسا محبوب

محترم کام ہے جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کسی عمل کی طاقت کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نصیب نہ ہوئی۔
قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے۔

الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ واولئک ھم الفائزون۔ یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنات لھم فیھا نعیم مقیم۔ خالدین فیھا ابدا ان اللہ عندہ اجر عظیم

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے جہاد کیا، سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اور اونچا درجہ انہی کا ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے۔ اللہ کی طرف سے ان کے لیے بشارت ہے، اس کی رحمت، اس کی محبت، بہشتی زندگی کی نعمتیں اور ان کی دائمی اور ہمیشگی، سب کچھ انہی کے لیے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و دفاع میں حصہ نہ لے سکیں، مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں یا اور کسی قسم کی خدمت انجام دیں، تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے۔ لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں اور طاعتوں سے بڑھ کر اجر ہے
ابن ماجہ میں ہے۔

من ارسل بنفقۃ فی سبیل اللہ واقام فی بیتہ فلہ بکل درھم سبع مائۃ درھم ومن غزا بنفسہ فی سبیل اللہ وانفق فی وجھہ ذلک فلہ بکل درھم سبع مائۃ الف درھم، ثم تلا ھذہ الآیۃ، واللہ یضاعف لمن یشاء

یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے مال سے جہاد میں مدد دی تو اس کو ہر ایک درہم کے بدلے سات سو درہم کا اجر ملے گا۔ یعنی اس انفاق میں سات سو درہم زیادہ اجر ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی "اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے، دوگنا کر دیتا ہے"

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تکمیل اس وقت لازم و ملزوم ہو جاتی ہے، جب حملۂ اعدا کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آجائے۔ لیکن عزم و استقلال کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کے لیے تیار رہیں اور تیاری کرتے رہیں۔ جو دل اس عزم و طلب سے خالی ہوا، اس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا۔

اسلام اور جہاد

محمد جعفر شاہ پھلواروی

بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو وضع تو ہوئے تھے کسی وسیع مفہوم کو ادا کرنے کے لیے، لیکن رفتہ رفتہ ان کی وسعت میں تنگی پیدا ہوتے ہوتے بہت ہی محدود قسم کا مفہوم باقی رہ گیا۔ ان ہی میں لفظ جہاد بھی شامل ہے۔ اس کے اصل لغوی معنی ہیں، پوری طاقت سے کوشش کرنا۔ قرآنی اصطلاح میں اسلامی نصب العین کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ عربی زبان میں اور خود ہماری زبان میں بھی جد و جہد (یا جد و جُہد) کوشش بلیغ ہی کو کہتے ہیں۔ اور لفظ جہاد میں زیادۃ حرف کی وجہ سے معنی اور زیادہ مبالغہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھیے کسی بلند مقصد کا حصول آسانی سے نہیں ہوتا۔ جتنا بلند مقصد ہوگا۔ اتنا ہی اس کا حصول بھی دشوار ہوگا اور جس قدر حصول دشوار ہوگا۔ اتنی ہی سعی بلیغ اور ویسی ہی سر توڑ کوشش بھی درکار ہوگی۔ پھر اس کوشش میں جو چیز رکاوٹ ڈالے گی، اسے قربان بھی کرنا پڑے گا۔ اسی کوشش و قربانی کا نام ہے جہاد۔ انسان کے پاس جتنی عزیز و محبوب متاع ہے، وہ ایک ایک کر کے اس کوشش کی راہ میں آڑے آئے گی۔ کبھی وقت اور اس کی مصروفیتیں رکاوٹ ڈالیں گی۔ کبھی مالی نقصان کا خیال روک بنے گا، کبھی بال بچوں کی صحبت آڑے آئے گی۔ کبھی اپنے تن بدن کی ناتوانیاں اور اپنی جان کا خوف دیوار بن کر حائل ہوگا۔ غرض ہزار جھگڑے بیچ میں سد سکندری بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ ان سب کو عبور کرنا یا ان سب کو درمیان سے ہٹا دینا گوہر مقصود کے حصول کا تقاضا ہوگا۔ یہی جہاد ہے۔ ایک آیت میں ان تمام چیزوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ ان كان اٰباؤكم وابناؤكم واخوانكم وازواجكم وعشيرتكم واموال ن اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومسٰكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله وجهاد فى سبيله فتربصوا حتّٰى يأتى الله بامره ط والله لا يهدى القوم الفٰسقين ۝ (۹ : ۲۴)

کہہ دو کہ اگر تمہارے آباؤ اجداد اور تمہارے فرزند اور تمہارے بھائی اور تمہاری ازواج اور تمہارے افراد خاندان اور تمہارے وہ مال جو تم نے جمع کر رکھے ہیں اور وہ تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تمہیں خطرہ لگا رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں پسند ہیں (اگر یہ سب چیزیں یا کوئی ایک چیز) تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہے، تو انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا فیصلہ کن حکم لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کو دیکھیے اس سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مقصد کی محبت: پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ یا اس کی رضا ایک مسلمان کا اصلی مقصد ہے۔ رسول اس کا واسطہ ہے اور جہاد و کوشش حصول مقصد کا طریقہ ہے۔ اگر مقصد سے محبت ہے، تو اس کی رہبری کرنے والا بھی ضرور محبوب ہوگا نیز اس راہ میں ہر ممکن کوشش بھی محبوب ہوگی۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی مقصد تو مطلوب ہو اور اس کے حصول کے لیے سعی محبوب نہ ہو یا جو اس کی راہبری کرے، اس سے محبت نہ ہو۔ گویا جہاد فی سبیل اللہ ویسا ہی محبوب ہونا چاہیے جیسا خود اللہ اور اس کا رسول محبوب ہے۔ اگر جہاد محبوب نہیں

تو اللہ کی محبت ایسی ہی ہوگی جیسے اللہ سے تو محبت کا دعوےٰ ہو اور اس کے رسولؐ سے کوئی محبت نہ ہو۔ پس جس چیز کے لیے سعی و کوشش یعنی جہاد نہ ہو، اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اس مقصود کی محض خواہش ہے۔ کوئی محبت یا طلب یا تڑپ نہیں۔

دوسری چیز اس آیت سے یہ واضح ہوتی ہے کہ اللہ، رسول یا جہاد کے راستے میں رک

سب سے زیادہ محبوب مقصد: بن کر کھڑی ہو جانے والی چیزیں یہی ہیں، جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ باپ دادا، آل اولاد، بھائی بند، بیوی یا شوہر، کُنبے کے افراد، جمع کردہ مال و اسباب، تجارت کی گرم بازاری اور گھر بار یا وطن۔ ان تمام چیزوں سے زیادہ خود نفس جہاد مرغوب و محبوب ہونا چاہیئے۔ اگر اللہ یا اس کا پیغامبر محبوب ہے۔

تیسری حقیقت، جو اس آیت سے واضح ہوتی ہے، جہاد کا مطلب ہے، یعنی ان میں سے کوئی شے یا ان کے علاوہ کوئی

قربانی: چیز بیچ میں حائل ہو جائے، تو محبت جہاد کا تقاضا یہ ہے کہ اسے عبور کر لیا جائے یا یوں کہیے کہ اسے قربان کر دیا جائے۔

اب یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ جہاد و کوشش کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جس چیز کو بھی اس کوشش میں لگایا جائے گا،

اقسامِ جہاد: اسی چیز کا جہاد ہو گا۔ اگر صرف قلب و دماغ کا موقع ہے اور قلب و دماغ کو اس کوشش میں لگایا جائے تو یہ جہاد بالقلب ہو گا۔ اگر قلم یا علم کو لگائے، تو جہاد بالقلم اور جہاد بالعلم ہو گا۔ اگر جسم کو لگائے تو جہاد بالجسم ہو گا۔ اگر مال کو لگائے، تو جہاد بالمال ہو گا اور اگر جان کی بازی لگا دی، تو جہاد بالنفس ہو گا۔ ان تمام چیزوں کو دو ہی بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تجارت، مساکن، وطن، مال، اسباب وغیرہ کا جہاد اور باپ دادا، آل اولاد، بھائی بند، ازواج اور افراد کنبہ وغیرہ کا اور اپنی ذات کا جہاد۔ ان دو میں اول کو مختصراً جہاد بالمال اور دوسرے کو بالاختصار جہاد بالنفس کہتے ہیں۔ قرآن پاک جہاد کے ساتھ قریباً ہر جگہ ان ہی دو چیزوں کو بیان کرتا ہے۔

مثلاً: وَتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم۔

غرض انسان کے مطلوبات و مرغوبات قدرۃً دو ہی قسموں کے ہیں مال اور جان (خواہ اپنی جان ہو، یا اپنے کسی محبوب کی)، ان دو کے ذکر میں تمام قسم کے جہاد خود بخود سمٹ کر آ جاتے ہیں اور الگ الگ ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسلئے قرآن مجید بار بار جاھدوا فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم کہتا ہے۔ قرآن پاک میں ہر جگہ جہاد کے ذکر میں اموال کو انفس کے ذکر پر مقدم کیا گیا ہے۔ یہ تقدم اس لئے نہیں کہ جہاد بالمال جہاد بالنفس سے زیادہ مشکل ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد کا آغاز جہاد بالمال ہی سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو مال نہ دے سکے، وہ جان کیا دے گا؟ جان بہر حال مال سے زیادہ قیمت رکھتی ہے اور جہاد کی آخری منزل ہے اور زبانی، قلبی، دماغی، وقتی، جسمانی اور مالی تمام جہادوں سے زیادہ مشکل جانی ہی جہاد ہے۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جہاد کی بہت سی شاخیں ہیں اور ان میں سب سے اعلیٰ و ارفع جان کا جہاد ہے

جہاد بالنفس کا مطلب: یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جہادِ جانی کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ جہاد جانی کے معنی فقط جان دے دینا نہیں بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ "اسلامی کاز" (cause) کے لیے ہمیشہ سر بکف رہنا، سر توڑ کوشش کرتے رہنا۔ جان کو جوکھوں میں ڈالے رہنا اور زندگی سے بے پروا ہو کر اس راہ پر لگے رہنا۔ ایک آیت میں اس جہاد کی کئی قسمیں ایک جگہ اس طرح جمع کر دی گئی ہیں:

ذٰلک بانھم لا یصیبھم ظمأ ولا نصب ولا یہ اس لیے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جو پیاس، تھکن اور بھوک کی

مخمصة فی سبیل اللہ ولا یطئون موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الّا کتب لھم بہ عمل صالح ط ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ہ ولا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ ولا یقطعون وادیا الّا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون ہ (۹ : ۱۲۰، ۱۲۱)

مصیبت جھیلیں اور جس مقام کو روند کر اہلِ کفر کو غصّے میں ڈال دیں اور دشمن سے جو مقصد حاصل کر لیں، تو ان میں سے ہر ایک چیز کے بدلے ان کے لیے عمل صالح لکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ یقیناً محسنین کے اجر کو ضائع نہیں فرماتا اور وُہ جو چھوٹا بڑا انفاق کریں اور جو میدان قطع کریں، اس کے عوض بھی عمل صالح لکھا جائے گا۔ تاکہ اللہ ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے۔

دیکھیے یہ جانی جہاد کی مختلف صورتیں ہیں۔ اللہ کی راہ میں بُھوکا پیاسا مرنا، تھکن برداشت کرنا، کسی سرزمین کو روندنا، دشمن سے مقصود (فتح یا صُلح وغیرہ) حاصل کرنا، کسی میدان کی مسافت کو قطع کرنا وغیرہ سب کچھ جانی جہاد میں داخل ہے۔ اسی بیان کے دوران میں مالی جہاد کا بھی ذکر آیا ہے کہ بڑا انفاق اور چھوٹا خرچ سب مالی جہاد میں داخل ہے۔

جانی جہاد: یہ تمام صورتیں جہاد جانی کی ہیں، لیکن یہ وہ صورتیں ہیں، جن کو زندہ ہی ادا کر سکتا ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اس راہ میں مجاہد کی جان چھن جائے اور (عام اصطلاح میں) وُہ رتبۂ شہادت حاصل کر لے لیکن جہاد کا مقصد جان دے دینا نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ ہے، خواہ دشمن کی جان لے کر ہو یا اپنی جان دے کر ہو یا دونوں کو باقی رکھ کر ہو، یا دونوں کو ختم کر کے ہو۔ یہ ساری شکلیں جانی جہاد ہی کی ہیں کیونکہ یہ سب سر توڑ کوششیں ہیں اور جہاد کے معنی ہی ہیں سر توڑ کوشش، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔

جانی قربانی: ان ہی کوششوں میں ایک بڑی کوشش قتال و جنگ بھی ہے اور اسی کے وہ تمام اجزا ہیں جو اوپر کی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔ گویا قتال و جنگ جہاد ہی کا ایک اہم پہلو ہے، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ جہاد کا فردِ اکمل ہے اب یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہو گی کہ لفظ جہاد خاص طور پر جنگ و قتال کے معنی میں کیوں بولا جانے لگا۔

یہ تمہید ہمیں اس لیے کرنی پڑی کہ آئندہ مضامین میں یہ لفظ بار بار اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جہاد صرف لڑائی ہی کو کہتے ہیں۔ بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جس طرح شہید کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں اسلیے بولتے ہیں کہ فی سبیل اللہ قتل ہونا سب سے بڑی شہادت یعنی عملی گواہی ہے۔ اسی طرح جہاد کو بمعنی جنگ و قتال اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ جد و جہد اور سعی و کوشش کا سب سے بڑا ثبوت جنگ و قتال ہی ہے۔ اگر اسی کی ضرورت ہو اور اس کے بغیر کام نہ چلتا ہو۔

دفاعی جنگ: اسلام کا یہ مُوقف نہیں کہ جو شخص اسلام قبول کرے، وہ بس کسی نہ کسی کافر سے لڑائی شروع کر دے، بلکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ انسانیت کے سب سے اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے جہاں اور بہت سی کوششیں کرنی پڑتی ہیں، وہاں کبھی اس کوشش کی بھی نوبت آ ہی جاتی ہے۔ اگر دنیا صرف باتوں ہی سے معقولیت کی زندگی اختیار کرے، تو جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لیکن انسان میں دو قسم کی فطرتیں ودیعت کی گئی ہیں:

ایک فطرتِ سلیمہ اور دوسری فطرتِ سقیمہ۔ فطرتِ سلیمہ رکھنے والے جب معقولیت کی راہ اختیار کرتے ہیں تو فطرتِ سقیمہ رکھنے والوں کی روش پر فطرۃً زد آتی ہے۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہی وُہ خود ہی معقولیت پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ معقولیت پسند یہ نامعقول

حرکت نہیں کرتا کہ باتوں سے پہلے لاتوں پر اُتر آئے۔ اس کا کام جب تک معقول باتوں سے چلتا ہے، وہ اسی کو اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔ وُہ نامعقول حملوں کا جواب بھی معقول باتوں ہی سے دے گا۔ اِدھر اس کی نامعقولیت بڑھتی جائے گی اور ادھر معقولیت۔ یہاں تک کہ بات کے بعد لات کا مقام آجائے۔ معقولیت جتنی زیادہ موتی جائے گی، نامعقولیت پر چوٹ اتنی ہی زیادہ گہری ہوتی جائے گی اور اس شکست کو محسوس کرنے کے بعد نامعقول خود باتوں کو چھوڑ کر لاتوں پر اتر آتا ہے۔ اس وقت بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ لاتوں کا جواب لاتوں سے دیا جائے۔ اس مقابلے میں معقولیت اور نامعقولیت کا وہی تناسب باقی رہتا ہے۔ جو باتوں کے مقابلے میں تھا۔ یہاں قدم قدم پر وہی معقولیت وہی اخلاقی قدروں کی نگہداشت اور وہی انسانیت ہوتی ہے اور ادھر وہی نامعقولیت ہوتی ہے، جس کا ابتدائی قدم "معقول باتوں میں ظاہر ہو رہا تھا۔

جھوٹے پروپیگنڈے:

گویا جہاد (بمعنی قتال) کا پہلا قدم ہے حملہ آور کے حملوں کا معقولیت سے جواب دینا اور یہ ایک ایسا حق ہے، جس کی معقولیت سے صرف وہی انکار کر سکتا ہے۔ جو معقولیت کو خیرباد کہنے کا اعلان کر چکا ہو۔ تاہم بعض معقول حق کو نامعقول ثابت کرنے کی کوشش کرنے والوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ مسلمانوں کے عالمگیر زوال کے بعد جب یورپ نے سر اُٹھایا، اور یہ تمدنی روشنی اس کے اندر اسلام ہی کے صدقے میں آئی تھی، تو اس نے پہلا "جہاد"، یہی کیا کہ جہادِ اسلامی کو نامعقول ثابت کرنے کی کوشش فرمائی۔ سیرت کی کتابیں لکھیں، تاریخیں شائع کیں۔ مقالات سپردِ قلم کیے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، یہ ثابت کرنے میں کہ جہاد وحشت ہے، بربریت ہے، خلافِ امن حرکت ہے، انسانیت کے خلاف ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی جہاد زبردستی مسلمان بنانے کے لیے ہوتا ہے۔ ان پروپیگنڈوں سے پڑھا لکھا مگر احساس کمتری رکھنے والا اور مرعوبیت کا مارا طبقہ متاثر ہوا مگر ایک ناقابل قطع شہ رگ مذہب کی باقی تھی۔ قرآنی تعلیمات جہاد کو وُہ کہاں لے جاتے اور مذہب کا مقابلہ محض استدلال عقلی سے کس طرح کرتے؟ اس کے لیے انہوں نے مذہبی رنگ میں بعض مجددین بھی پیدا فرمائے، جنہوں نے جہاد کے خلاف الماریوں کی الماریاں لکھ ڈالیں اور اپنی جدید شریعت میں اسے "حرام" قرار دے دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یورپ فی الواقع جہاد کو خلافِ انسانیت و تمدن سمجھتا تھا؟ کیا وُہ فی الحقیقت یہ یقین رکھتا تھا کہ اسلام نے جبراً مسلمان بنانے کے لیے تلوار اٹھائی تھی؟ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ یہ قومیں حقیقت کو سمجھنے میں آپ سے بہت آگے ہیں۔ بڑی ذی عقل و ذی فہم ہیں، نہایت نکتہ رس اور حقیقت شناس ہیں۔ یہ اصلیت کو خوب سمجھتی ہیں۔ ان کی فکر ان کا ادراک بہت بلند ہے۔ پھر سوچیے انہوں نے اسلامی جہاد کو ایک بھیانک شکل کیوں دی اور اسے جبراً مسلمان بنانے کا ذریعہ کیوں فرض کیا؟ اس کے کچھ خاص وجوہ ہیں۔

پروپیگنڈے کی غرض:

ان کا مقصد صرف مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سرد کرنا تھا۔ اگر فی الواقع جہاد بُری چیز ہوتا تو سب سے پہلے یہ خود قتال کو ترک کرتے، لیکن یہ تو مقصد ہی نہیں تھا۔ مقصد تو فقط اتنا تھا کہ مسلمان جہاد کا خیال ترک کر دیں اور یہ اطمینان سے ان پر حکمرانی کرتے رہیں۔ ان کو دنیا کی کسی قوم سے خاص خطرہ نہ تھا۔ رہ رہ کر ان کی نیند کو خراب کرنے والا صرف یہ خیال تھا کہ اگر کہیں یہ قوم بیدار ہو گئی اور وہی سابق جذبہ جہاد عود کر آیا، تو یہ پھر کہیں کے نہ رہیں گے۔ لہٰذا خیریت

صرف اسی میں ہے کہ عقلی راہ سے، مذہبی راہ سے، تعلیمی راہ سے، غرض ہر طرح مسلمان کے دل سے اس کا خیال ہی نکال دیا جائے۔ ان کے سر پر خطرۂ جہاد کا ہوا ہر وقت سوار تھا۔ اسی خطرے کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ہے:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے میں نے یہ قدسیوں سے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

احساس کہتری نے یہاں تک شکست خوردگی قبول کر لی کہ بہت سے مسلمان بھی یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ اسلام جہاد کو سب سے بڑی عبادت قرار دیتا ہے، شرم وندامت محسوس کرنے لگے۔ اگر کہیں دبی زبان سے اقرار بھی کیا، تو صرف اس حد تک کہ "ہاں مدافعانہ جنگ تو اسلام میں جائز ہے"، یعنی ضروری ہونے پر بھی شبہ ہے۔

مدافعانہ اور جارحانہ: اسلام میں "مدافعانہ" اور "جارحانہ" نام کے دو جہاد نہیں۔ یہاں صرف ایک مثبت چیز ہے، جسے "جہاد" کہتے ہیں۔ مدافعت اگر کوئی چیز ہے، تو وہ شروع سے آخر تک مدافعت ہے اور جارحانہ اقدام ہے، تو وہ از اوّل تا آخر جارحانہ اقدام ہے۔ جہاد ایک ضروری اور ناگزیر عمل ہے، جو مومن کو بہر حال کرنا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے، جس کے لیے وُہ وجود میں آیا ہے، اگر آپ نظر غور و فکر سے کام لیں، تو مدافعانہ جنگ کی کوئی صحیح تعریف نہیں مل سکے گی۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے، کہ جب دشمن تمہارے گھروں میں گھس کر تم پر تلوار اُٹھائے اور اس کی دھار تمہاری گردن سے چوتھائی انچ کے فاصلے پر پہنچ جائے، تب تم سمجھو کہ دشمن نے واقعی جارحانہ حملہ کر دیا ہے اور اب مدافعت کا وقت آگیا ہے۔ یہ تصور تو کسی پرستار اہنسا کا بھی نہیں ہو سکتا۔ برخلاف اس کے اگر صرف یہ خطرہ ہو کہ دشمن حملہ کرنے والا ہے، ذرا سی غفلت میں ہمارا صفایا ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی اس کا زور توڑ دیا جائے۔ جب ہی ہم اس کی غارت گری سے محفوظ رہ سکتے ہیں، تو اس صورت میں آگے بڑھ کر حملہ کر دینا ہی عین مدافعت ہے اور تحفظ قوم کا عین فطری تقاضا ہے۔ اس کی صورت خواہ کیسی ہی جارحانہ نظر آئے، لیکن دراصل یہ بھی مدافعت ہی کی ایک ضروری شکل ہے۔ اس انتظار میں رہنا کہ جب دشمن ہماری سرحدوں میں گھس کر قتل و غارت شروع کر دے گا تب ہم پر مدافعت ضروری ہوگی ایک شاعر کے لیے تو صحیح ہو سکتا ہے، جس کی دنیا صرف خیالی ہوتی ہے، لیکن ایک بیدار، زندہ اور مقدام قوم کے فرد کے لیے یہ شاعری کوئی وقعت نہیں رکھتی بلکہ ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھیے تو جس طرح جارحانہ اقدام مدافعت ہی کی ایک دوسری شکل ہے، اسی طرح مدافعت اس اقدام کا پہلا زینہ ہے، جو آپ اپنی حفاظت و مدافعت نہ کر سکے، وہ آگے کیا بڑھ سکے گا۔ بحیثیت ایک مسلمان امت کے اگر ہم فقط اپنے بچاؤ پر قانع ہو جائیں، تو اس امت کے وجود میں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اس لیے دراصل اسلامی نقطہ نظر سے مدافعت اور جارحانہ اقدام میں کوئی فرق نہیں۔ جہاد صرف ایک ہی مثبت حقیقت ہے اور یہ دونوں اس کی ایسی دو صورتیں ہیں، جو باہم پیوستہ ہیں اور ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتیں۔

اجزائے جہاد: احادیث اور فقہ کو الگ کر کے بھی دیکھیے، تو قریباً سو آیات صرف جہاد سے متعلق ہیں، جن کے مضامین مختصراً یہ ہیں:

جہاد کی فرضیت : جہاد کن سے کیا جائے؟ ان کا کیا جُرم ہے؟ جہاد کی غرض و غایت کیا ہے؟ کس زمان و مکاں میں اس سے باز رہنا چاہیئے؟ اپنا بچاؤ کیوں ضروری ہے؟ ثابت قدمی کیوں لازمی ہے؟ ثابت قدموں پر کیا انعام اور بھاگنے والوں پر کیا عذاب ہوتا ہے؟ جہاد کن کن چیزوں سے ہوتا ہے؟ سامانِ جہاد کی فراہمی کیوں فرض ہے؟ مجاہدین کا کیا درجہ ہے؟ جہاد کن معذوروں پر فرض نہیں؟ یہ فرض کفایہ اور فرض عین کب ہوتا ہے؟ جنگ کے بعد صلح کن بنیادوں پر اور کیوں ہونا چاہیئے؟ اسیرانِ جنگ کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے؟ مالِ غنیمت و فے کا کیا مصرف ہے؟ جہاد کے بغیر کیوں قوم زندہ نہیں رہ سکتی؟ ۔ غرض اس قسم کے بے شمار مضامین ہیں، جو صرف قرآن پاک میں ذکر ہوئے ہیں۔ ان سب کو نقل کرنے اور ان کی تشریح کرنے کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ یہاں اس وقت ایک مختصر مقالہ لکھنا ہے۔ البتہ ان مضامین کے بعض گوشے ایسے ہیں، جن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کے بغیر مقصدِ مقالہ سامنے نہ آسکے گا۔

اُمتِ مسلمہ کا وجود کیوں عمل میں آیا : اس سوال کا جواب قرآن پاک میں یوں ہے :

كُنتم خيرامة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تومنون بالله (۳ : ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو، جو کبھی برپا کی گئی ہے۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد صرف عقل اور مشورہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں مراد وہ نہیں بلکہ وہ امر و نہی مقصود ہے، جس کی بنیاد ایمان باللہ پر ہے اور وحیِ خداوندی ہی کے محک پر معروف و منکر کو پرکھا جائے۔ اس وقت یہ بحث کرنا مقصود نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ بہرحال ہے ایسا ہی اور یہ مقصد اتنا عظیم الشان، جہانی اور عالمگیر ہے کہ کسی محدود حلقے میں سمٹ کر رہنا اس کے فطری مزاج کے منافی ہے جس طرح پانی کی فطرت ہے نشیب کی طرف جانا اور جس طرح گرمی سے ہوا کا پھیلنا ہوا کا مزاج فطری ہے، اسی طرح امر بالمعروف نہی عن المنکر کی فطرت میں پھیلاؤ ہے۔ یعنی اگر اس کے پھیلاؤ کو روک دیا جائے تو اس کا کسی محدود حلقے میں سمٹ کر باقی رہنا بھی ناممکن ہے۔ اگر پوری بستی میں وبا پھیلی ہوئی ہو یا پھیلنے کا خطرہ ہو، تو صرف ایک گھر کے اندر کچھ صفائی کر لینا، اس گھر کو بیرونی مسموم فضا کے اثر سے بچا سکتی ہے، نہ بستی کے دوسرے گھرانوں کو۔ لامحالہ یہ کرنا پڑے گا کہ اپنے گھر کے باہر کی فضا بھی قابو حاصل کیا جائے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ پوری انسانی سوسائٹی بد "مُنکر" سے مسموم ہو اور ایک مختصر محدود حلقہ اپنی بعض اصلاح کر کے یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم محفوظ ہو گئے۔ اور فرض کیجیے کہ اگر ایسا ممکن بھی ہو تو یہ کس انسانیت کا تقاضا ہے کہ خود تو وبا سے بچ رہو، مگر دوسروں کو وبا کا شکار بننے دو؟

آگے چلنے سے پہلے یہاں دو ایک ضروری باتیں ذہن نشین کر لینا چاہیئے :

اولاً یہ کہ یہاں **تامرون** کہا گیا ہے۔ **تعظون** نہیں فرمایا گیا ہے۔ امر کے معنی ہیں آرڈر کرنا۔ یہ اسلامی سوسائٹی

وعظ اور امر : کا دوسرا اسٹیج ہے۔ پہلا زینہ ہے، دعوت، جیسا کہ اس آیت میں ذرا پہلے کہا گیا ہے کہ :

و لتكن منكم امة يدعون الى الخير و يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر (۳ : ۱۰۴)

یعنی تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے، جو خیر کی دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ صرف دعوت و وعظ ہی میں ساری عمر نہیں ختم کر دینا ہے بلکہ رفتہ رفتہ ایسا مقام بھی حاصل کرنا ہے کہ جن لوگوں پر وعظ و دعوت اثر نہ کر سکے، ان پر امر و نہی (ORDER) نافذ کیا جا سکے۔

جہاد کا مطلب: ثانیاً یہ کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لیے جس قسم کی بھی جد و جہد، سعی بلیغ اور سر توڑ کوشش کی جائے گی، وہی جہاد ہے۔

معروف اور اسلام: ثالثاً اسلام سراسر خیر و معروف ہے اور اس کے مقابلے میں کفر یکسر شر و منکر ہے۔ لیکن آیت میں امر بالاسلام اور نہی عن الکفر نہیں کہا گیا ہے بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب یا دین کو الگ رکھ کر بھی اگر دیکھا جائے تو معروف منکر مثبت اور مستقل چیز ہے۔ معروف ہر وہ اچھائی ہے، جس کو فطرت سلیمہ اچھائی مانتی ہے، اور منکر ہر وہ بُرائی ہے جس کا فطرت سلیمہ انکار کرے گویا معروف (جسکا مادہ عرف ہے) جانی پہچانی چیز ہے اور منکر (جسکا مصدر انکار ہے) اسی کی ضد ہے۔

امر و نہی کے لیے طاقت: رابعاً اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی صرف دعوت تو دی جائے گی لیکن امر، آرڈر یا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔ بخلاف اس کے معروف اختیار کرنے اور منکر کو ترک کرنے پر امر بھی کیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام لانے پر ہرگز مجبور نہیں کیا جائے گا لیکن اگر وہ امن و انتظام میں خلل ڈالے، تو امر کی قوت کو ضرور حرکت میں لایا جائے گا۔ اسلام تو سودا ہی ہے خوشی کا۔ اس کے معنی ہی میں رضا کارانہ خوشدلی کے ساتھ نظام زندگی کو قبول کر لینا، دباؤ سے، جو اسلام ہو، وہ تو اسلام ہی نہیں رہتا۔ لیکن فتنہ و فساد ایک ایسی چیز ہے کہ خواہ وہ خوشدلی سے ہو یا کسی کے دباؤ سے نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اسے روکنے کے لیے اگر دعوت و وعظ ناکافی ہو تو طاقت کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے، جیسا زندگی کی بقا کیلئے آب و ہوا کا وجود۔ پوری انسانیت جس وقت معقولیت کی سطح پر پہنچ جائے گی، اس وقت طاقت کے استعمال کی واقعی ضرورت نہ رہے گی لیکن ابھی وہ منزل دُور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ سے آج تک کوئی زمان و مکان خالی نہیں رہ سکا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا خلاصہ: غرض انسانی زندگی میں بعض گوشے ایسے موجود ہیں، جہاں طاقت ہی کام آسکتی ہے اس استعمال طاقت سے مقصود صرف یہ ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد دُور ہو۔

قرآن پاک نے اسی مقصد کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ:

اِلا تفعلوہ تکن فتنة فی الارض و فساد کبیر (۸: ۷۳)	یعنی اگر تم نے یہ نہ کیا، زمین میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا۔

اس کے دائرے کا پھیلاؤ اس طرح ہوگا کہ:

واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة (۸: ۲۵)	اس فتنے سے بچو، جس کا اثر صرف ظالموں ہی تک محدود نہیں رہے گا۔

دوسرے لفظوں میں اگر فتنہ و فساد کا ابتدا ہی میں سدباب نہ کیا گیا، تو یہ پھیل کر نیک و بد سب کو تباہ و برباد کر دے گا، جب سیلاب اُٹھتا ہے، تو اچھے بُرے سب کو لے ڈوبتا ہے۔

فتنہ و فساد کا مطلب: قرآن پاک کے تفحص و تدبر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے جان، مال، آبرو، ایمان، کردار وغیرہ کو جو چیز

بھی آزمائش اور خطرے میں ڈالے، وُہ فتنہ ہے اور زندگی میں جو شے ناہمواری پیدا کرے، وہ فساد ہے۔ ان دونوں چیزوں کا سدِباب، ایک ایسا انسانی فریضہ ہے، جس کے ضروری ہونے سے کوئی دہریہ و لامذہب بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی حاصل ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اور اس کے لیے طاقت کا استعمال عین تقاضائے عقل ہے۔

لگے ہاتھوں یہاں یہ بھی سُن لیجیے کہ جنگ اور طاقت کا استعمال ایک ایسی فطرت ہے، جو حاصل زندگی ہے۔

جنگ اور فطرت: انسان بیمار پڑتا ہے اور دوا استعمال کرتا ہے۔ اس استعمال دوا کی کیا اصلیت وحقیقت ہے؟ یہ صرف ایک جنگ ہے۔ مرض کے خلاف۔ تعلیم وتربیت کیا ہے؟ جہالت وناشائستگی کے خلاف جنگ ہے۔ لباس، خوراک، مکان اور دوسری آسائشیں کیا ہیں؟ فقط ایک جنگ ہے ان خطرات کے خلاف، جو ان چیزوں کے نہ ہونے سے پیش آ سکتے ہیں۔ غرض پوری زندگی کے تمام مثبت کام اس کے منفی پہلوؤں کے خلاف جنگ ہیں۔ اس سے اور آگے بڑھیے، تو یہ پوری کائنات نفی واثبات اور ایجاب و سلب کی جنگ ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں بچاؤ، تحفظ (Protection) ہر مرحلے پر ایک فطری حق ہے اور اسی کا دوسرا نام ہے جنگ اور کسی مقصد کو مدارِ زندگی قرار دینے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے، اس سے تحفظ اور ضروری ہے اور یہی ضرورتِ تحفظ کبھی خاموش جنگ ہوتی ہے اور کبھی سرِ میدان۔ جنگ اگر فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے، تو بہرحال ایک فطری چیز ہے اور اگر اس کے خلاف ہے، تو جنگ سے بچنا بھی ایک جنگ ہے، فطرتِ سقیمہ کے خلاف۔

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر چیز اپنے مقصد اور نتیجے کے لحاظ

جنگ کے دو رُخ اور جہاد فی سبیل اللہ: ہی سے اپنی قدریں بناتی ہے۔ یہی جنگ اگر محض قوم، ملک، نسل کے ترفع وتعلی کے لیے ہے اور اس کا مقصد محض ملک گیر یا جذبۂ انتقام کی تسکین یا ہوس زر و زن کی تکمیل وغیرہ ہے تو یقیناً اس سے زیادہ بدتر کوئی چیز نہیں۔ لیکن اگر اس کا مقصد صرف انسانیت کی سربلندی، آدمیت کا قیام، اخلاقی قدروں کی حمایت ہو، تو اس سے بڑھ کر کوئی خیر اور کوئی نیکی نہیں ہو سکتی۔ ہمیں بتانا صرف یہی ہے کہ اسلام نے نری جنگ کی حمایت نہیں کی ہے، جس کا کوئی بلند مقصد ونتیجہ نہ ہو اس کے پیش نظر جو مقصد تھا اور اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوا (جس کا کچھ تفصیلی ذکر آگے آئے گا) اسے دیکھتے ہوئے اسے محض جنگ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہی ہے وہ شے جسے جہاد فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد وہی ہے، جس کا خلاصہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا یوں کہیے کہ فتنہ وفساد کا سدِباب۔

اتنے بڑے، بلند اور عالمگیر مقصد کا حصول یوں ہی بیٹھے بیٹھے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے وُہ سر توڑ کوشش

حصولِ مقصد کی تیاری: ضروری ہوتی ہے، جس کے لیے شرعی اصطلاح ہے جہاد۔ اس کے لیے ہزاروں قسم کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ ایمان، علم، اخلاق، عمل صالح، ذہنی ارتقاء، بیدار مغزی، تزکیۂ نفس وغیرہ وغیرہ۔ انہی تیاری کے اجزاء میں ایک ضروری جزو ہے اعدادِ قوۃ یعنی مادی طاقت، فوجی تربیت، سامانِ حرب وغیرہ۔ قرآن کریم نے اس تیاری کی طرف اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ۔ اپنے امکان بھر قوت اور پلے ہوئے گھوڑے مہیا کرو، جس

ترهبون به عدو الله وعدوكم ۔ کہ اس کے ذریعے اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

یہاں آیت میں جس قوت کو جمع رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں تمام طرح کی فوجی قوتیں شامل ہیں۔ ملٹری ٹریننگ، سیاسیات جنگ کا فہم، موقع شناسی، حوصلوں کو بلند رکھنے کے طریقے، فوجی تنظیم، دائم آمادگی اور ان کے علاوہ تمام سامانِ حرب بندوق سے لے کر ایٹم بم تک اور طیارے سے لے کر ٹینک اور آبدوز کشتی تک اور راشن کے تمام سامان وغیرہ، جتنی چیزیں ہیں، سب اس میں داخل ہیں۔ اس طرح پلے ہوئے گھوڑوں میں حمل ونقل (ٹرانسپورٹ) کے وہ تمام ذرائع داخل ہیں، جو فوج کو یا اس کے سامان کو جلد سے جلد منزلِ مقصود پر پہنچا سکیں۔ اور پھر دیکھیے کہ تمام چیزوں کا تعلق ... یہ نہیں کہ دنیا میں جو بھی غیر مسلم ہے، اسے فنا کر دو، مار لوٹ مار شروع کر دو۔ قرآن ایسے پست مقاصد کی کیوں کر حمایت کر سکتا ہے؟ اس نے اس تیاری کا ایک ہی مقصد بتایا ہے: ترهبون به عدو الله وعدوكم اللہ کے اور اپنے دشمن کو مرعوب رکھنا۔

دو طرح کے دشمن: یہاں دو دشمنوں کا ذکر ہے: عدو اللہ اور عدوکم۔ اللہ کا دشمن اور تمہارا دشمن اس سے مراد ہے، دینی دشمن اور قومی دشمن۔ یعنی بعض دشمن ایسے ہوتے ہیں، جن کی عداوت بربنائے دین ہوتی ہے اور وہ محض اس لیے مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں کہ اسلام کو مٹا دیں۔ یہ ہیں دینی دشمن یعنی عدو اللہ۔ اور بعض دشمن ایسے ہوتے ہیں، جو مسلمانوں سے صرف ایک قوم کی حیثیت سے جنگ کرتے ہیں۔ اور اس قوم کو مٹانا چاہتے ہیں، ان کی ہوسِ ملک گیری اور شوقِ سیادت واقتدار مجبور کرتا ہے کہ اپنی قوم کا حاکمانہ اقتدار دوسری قوم پر قائم کریں، خواہ وہ ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہیں قومی دشمن، جن کو عدوکم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

آج ان دونوں قسم کی مثال میں ہم انگریز اور ہندو کو پیش کر سکتے ہیں (متحدہ ہندوستان میں) اور ہندو ہم وطن اور ہم نسل بھی تھے اور اس کے پیش نظر وہ متحدہ قومیت کا پرچار بھی کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان کو ایک اقلیت قرار دینا اور اس پر اپنا حاکمانہ اقتدار کرنے کے جذبے کو فروغ دینا صرف اس لیے تھا کہ انہیں اپنا مذہب ویسا ہی عزیز تھا۔ جیسا کسی اور کو یا مسلمان کو عزیز تھا۔ یہ ساری عداوتیں قومی سے زیادہ دینی ومذہبی بنیاد پر تھیں۔ اگر سارے مسلمانانِ ہند، ہندو دھرم قبول کر لیتے اور انہیں یقین آجاتا کہ یہ تبدیلی مذہب فی الواقع سچی ہے، تو ان کو مسلمانوں سے عداوت رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ تمام شواہد اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہیں کہ ان کی دشمنی خالص مذہبی ہے۔

اب دوسری طرف انگریز کو دیکھیے۔ مسلمان کا دشمن وہ بھی ہے، لیکن اس کی دشمنی مذہبی سے زیادہ قومی ہے۔ وہ جس طرح یہاں کے اور باہر کے مسلمانوں پر اپنا اقتدار قائم ودائم رکھنے کا متمنی ہے۔ اسی طرح اپنے ہم مذہب فرانس اور جرمنی پر بھی اپنا تسلط جمائے رکھنے کا خواہش مند رہا ہے۔ اور ان سے جو جنگیں بھی ہوئی ہیں، وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ قومیت کی بنا پر ہوئی ہیں۔

قرآن مجید ان دونوں قسم کے، مذہبی اور قومی، دشمنوں کو مرعوب رکھنے کے لیے قوت وسامان کی تیاری کو فرض قرار دیتا ہے۔

آزادی کی قدر وقیمت: مرعوب رکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو تم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قومی ومذہبی دونوں حیثیتوں سے اپنے تحفظ کو قرآن ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ تحفظ صرف اس لیے ہے کہ مسلمان پر کسی دوسری قوم کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اقتدار بھی نہ قائم رہے اور یہ بالکل آزاد ہو۔ دشمن خواہ مذہبی نقطۂ نگاہ رکھتا ہو یا قومی، دونوں یکساں مصیبت ہیں اور ان کے اقتدار کے بعد وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا، جس کے لیے امتِ مسلمہ وجود

میں آئی ہے۔ محکومیت خواہ کیسی ہی خوشگوار، کتنی ہی آسائش بخش اور عدل گستر فضا میں ہو، لیکن ہے وہ ایسی لعنت جس کے آنے کے بعد محکوم قوم میں نہ ایمان وضمیر باقی رہ سکتا ہے نہ کردار۔ غلط نہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے کہ غلامی اور ایمان وکردار میں کچھ ایسا تباین وتناقض ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ غلامی، فطرت اور کردار کو مسخ کر دیتی اور آزادی اقوام وافراد میں بلند کرداری پیدا کرتی ہے۔ آزاد قوموں کا ہی کردار ان کے ایمان کی پختگی اور ضمیر کی بیداری کا ضامن ہوتا ہے۔

اعدادِ قوت کی غرض: غرض مسلمان اگر بدقسمتی سے کہیں محکوم ہے، تو ہر عبادت اور ہر نیکی سے مقدم یہ فرض ہے کہ وُہ آزاد ہونے کی جدوجہد، سر توڑ کوشش یعنی جہاد، مسلسل کرتا رہے۔ اگر ایک منٹ کے لیے اس غلامی پر رضامندی کا جذبہ پیدا ہو، تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان کے رخصت ہونے کے لیے دریچہ کھل گیا اور اگر مسلمان آزاد ہے، خواہ وُہ ہجرت کر کے بنی اسرائیل کی طرح آزاد ہوا ہو، یا الگ اپنی حکومت بنائی ہو۔ تو ہر فرض سے زیادہ مقدم فرض یہ ہے کہ اس پر کوئی دوسرا تسلط ہونے کا تصور بھی نہ پیدا ہونے دے۔ یہی ہے، تحفظِ خود اختیاری اور اسی مقصد کے لیے ہے اعدادِ قوت، تا آنکہ دشمن خواہ دینی ہو، یا قومی، آنکھ اُٹھا کر بھی اس طرف نہ دیکھ سکے۔

بقائے وجود مقدم ہے: دین، اسلام، تبلیغ اور چنان وچنیں تمام باتیں اس پر موقوف ہیں کہ ہمارا وجود باقی رہے۔ اگر وجود ہی باقی نہ رہے، تو یہ تبلیغی اسکیمیں اور یہ اسلام اور خدا ورسول کی باتیں کہاں ہوں گی اور کون کرے گا؟ وجود و بقا اتنی ہی ضروری چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی خاطر ابدی حرام بھی عارضی طور پر حلال ہو جاتے ہیں۔ خنزیر ایک ابدی حرام شے ہے اور یہ ایک مستقل قانون ہے لیکن حالتِ اضطرار میں یہ بھی حلال ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اگر دین پر اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کرے تو دین اس کی جان بچانے کے لیے اپنے ابدی قانون کی ابدیت کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی خاص وجہ ہے یعنی دین کا پورا نظام ہی انسانی زندگی کی بقا اور خوشگواری کے لیے، نہ کہ اسے فنا کرنے کے لیے جہاد کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ کہ کچھ عارضی قربانیاں دے کر مستقل بقاء وخوشگواری پیدا کی جائے۔ اگر کوئی انسان زندگی بچا کر دین کی سو خدمتیں کرنے کا یقین رکھتا ہے اور اس کی جان خنزیر ہی کھا کر بچ سکتی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ خنزیر نہ کھا کر ایک تقوے کا ثبوت دے اور سو تقوے سے محروم رہ جائے۔ اسی طرح یہ سمجھنا چاہیئے کہ دین کی ساری خدمتیں اس پر موقوف ہیں کہ ہمارا وجود باقی رہے اور اس پر کسی غیر کا تسلط نہ قائم ہو۔ اس بقاء کے لیے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے اور اسی مقصد کے لیے اعدادِ قوۃ کا حکم ہے۔ یہ خود اتنی بڑی عبادت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا درجہ واشگاف لفظوں میں یوں بیان فرما دیا ہے کہ:

عینان لا تمسهما النار عین بکت من خشیته الله وعین باتت تحرس فی سبیل الله۔ (ترمذی)	دو آنکھیں ہیں، جن کو آگ نہیں چھوئے گی: ایک وُہ آنکھ جو خوفِ خدا سے روئے اور دوسری وُہ جو راہِ خدا میں پہرہ دے۔

ذرا غور کیجیے، سرحدوں پر شب کو دشمن کی نقل وحرکت کی نگرانی کرنے والا اور تہجد میں گریہ وزاری کرنے والا دونوں کا درجہ ایک ہی ہے۔ بلکہ دشمن کے نرغے مسلسل ہوں، تو تہجد ہی نہیں فرض نمازوں کی موجودہ شکل بھی معاف ہو جاتی ہے: فرجالاً او رکبانا

پیدل ہو یا سواری پر جس حال میں ہو، اسی طرح نماز ادا کرلو۔ بلکہ اس سے بھی آگے چلیے ۔ یہ بھی اس وقت معاف ہو جاتے گی ۔ غزوۂ خندق میں چار نمازیں مسلسل قضا ہو گئیں، جن کو بعد میں ایک اذان اور چار اقامتوں سے اکٹھا ہی ادا کیا گیا ۔ اس جوازِ قضا کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے، یعنی دشمن کے غلبے کا خطرہ ۔ اگر آزاد وجود باقی رہ گیا تو نمازیں ہزاروں ادا ہو جائیں گی ۔ لیکن اگر دشمن کا تسلط ہو گیا، تو ایک نماز بھی نہ ہو سکے گی ۔ جو قتل کیا جائے گا ۔ اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں ۔ جو زندہ رہے گا، اس کی نماز بھی بے جان، بے وزن اور بے اثر رسم ہو کر رہ جائے گی اور آخر کار بقول اقبال :

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اس وقت دین اور عبادت کا تصور ہی بدل جائے گا اور اس کے بعد یہ نوبت آئے گی کہ نہ فقط یہ کہ جذبۂ جہاد ختم ہو غلامی کو گہوارۂ راحت سمجھ لیا جائے گا بلکہ وہ مجددین و مفتین بھی پیدا ہو جائیں گے ۔ جو حکومت کافرہ کی اطاعت کو عین عبادت اور جہاد کو قطعاً حرام بتانے لگیں گے اور امتِ مسلمہ کے وجود میں آنے کا مقصد یکسر فوت ہو جائے گا ۔

اعدادِ قوت کا مقصد : یہی وجہ ہے اعدادِ قوت کا حکم دینے کی، جس کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ تمہارا دینی و قومی دشمن تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرآت نہ کر سکے ۔ غلام قوم کا کوئی ضمیر اور کوئی کردار نہیں ہوتا، اس لیے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر چیز کی بازی لگا دینا فرض ہے ۔ جو قوم خود اپنی حریت کو قائم نہ رکھ سکے، وہ دوسری مظلوم و غلام قوموں کو ظالموں کی غلامی سے باہر لانے کا فرض کیا انجام دے سکتی ہے ؟ امتِ مسلمہ کا تو وجود ہی اس مقصد کے لیے ہوا ہے کہ تمام انسانوں کو باہمی غلامی سے نکال کر ایک ملک کی غلامی میں لے آئے پس گروہ خود ہی اپنے آپ کو دوسروں کی غلامی سے محفوظ نہ رکھ سکے تو وہ دوسرے غلام انسانوں کو قیدِ غلامی سے کیا باہر لا سکے گی ۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اعدادِ قوت غلط استعمال کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ پہلے تو اپنی حفاظت کی جا سکے کیوں کہ اس کے بغیر کوئی قوم بھی آزاد ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ پھر اپنے مقاصد میں نمو اور توسیع پیدا کر سکے ۔ یہ کوئی انسانیت نہیں کہ ایک قوم خود تو آزاد ہو اور دوسری قوموں کو غلامی میں دیکھتی رہے ۔ اس مقصدِ عظیم کے لیے اپنے اندر حفاظتِ خود اختیاری کی قوت سے کہیں زیادہ مزید قوت پیدا کرنی پڑے گی اور اعدادِ قوت کا بڑا مقصد اسی طرح پورا ہو سکے گا ۔

دنیا میں ہمیشہ یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ معقولیت کو صرف معقولیت کی وجہ سے تسلیم کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ بات، بہتر سے بہتر انسان کہے، اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی جاتی ۔ لیکن اگر وہی شخص کوئی اقتدار یا قوت حاصل کرے، تو اس کی بات توجہ سے سنی جاتی ہے اس نقطۂ نظر سے بھی اعدادِ قوت ایک ضروری فریضہ ہے ۔

اعدادِ قوت کے شعبے : اوپر یہ لکھا جا چکا ہے کہ اعدادِ قوت میں بہت سی چیزیں داخل ہیں ۔ ہم چند ایک کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اپنے تحفظ کے لیے ایک حکومت کو آج کے دور میں کیا کیا کرنا پڑتا ہے :

۱۔ پروپیگنڈا اس میں اخبار، رسالے، خفیہ مراسلات، ریڈیو، تار برقی، ڈاک وغیرہ سب داخل ہیں اور وہ لوگ بھی جو مختلف طریقوں سے یہ فرض انجام دیتے ہیں ۔

۲۔ جاسوسی اس میں وہ لوگ داخل ہیں، جو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں وہاں کی خبریں اپنے ملک میں پہنچاتے ہیں اور موقع موقع سے وہاں اپنا پروپیگنڈا بھی کرتے ہیں اور تالیف قلوب کے لیے رقمیں بھی صرف کرتے ہیں۔ اسی زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو اپنے ملک میں باغیوں اور دوسرے ممالک کے جاسوس کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ ذرائع حمل ونقل اس میں ہوائی، بحری اور بری تمام قسم کے جاندار اور مشینی سواریاں داخل ہیں جو عین وقت پر ہر وہ سامان پہنچا سکیں جس کی ضرورت پیش آئے۔

۴۔ آلات حرب و ضرب اس میں وہ تمام کارخانے داخل ہیں، جن میں بندوق، توپ، ٹینک، آبدوز کشتی، بحری تباہ کن جہاز، بارودی سرنگیں، بمبار طیارے اور بم کی تمام اقسام اور ان کے اجزا تیار ہوں۔

۵۔ طبی امداد اس میں دواؤں اور مرہم پٹی کے تمام سامان داخل ہیں۔

۶۔ سامان خورد و نوش اس میں امن و جنگ کے مختلف دور کے سامان داخل ہیں۔ مثلاً عام غذائیں اور حالات جنگ کے مطابق غذائیں اور آب رسانی کا سامان۔

۷۔ لباس اس میں فوجی لباس کے علاوہ وہ زرہیں اور دیگر لباس وغیرہ بھی داخل ہیں، جن کے ذریعے گولیوں اور گیسوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

۸۔ حوصلے (Morale) حوصلے کو بلند رکھنے اور غیرت کو ٹھیس لگانے کے ذرائع مثلاً خطباء، شعراء، اعلان انعامات، اہل و عیال کی میدان جنگ میں موجودگی وغیرہ۔ ان میں دو چیزیں اور بھی ملا لیجیے :

اوّل وہ انسان، جو یہ کام کریں گے اور وہ مقام جہاں انہیں ان کاموں کی تربیت دی جائے گی۔ یوں سمجھیے کہ: پروپیگنڈے کے لیے اخبار اور رسالے کی ضرورت ہے، تو یہ خود بخود نہیں شائع ہوں گے بلکہ ان کے لیے خاص ڈھب کے آدمی (ایڈیٹرز) تیار کرنے ہوں گے، جو اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کو قلم کی نوک پر لائیں۔ اس کے لیے انہیں خاص مدارس میں تعلیم حاصل کرنی ہوگی۔ لہذا ایسی تعلیم گاہیں بھی اسی اعداد قوت کے زمرے میں شامل ہوں گی۔ پھر اس کی طباعت و اشاعت کے لیے کاغذ اور پریس وغیرہ لازمی ہیں۔ پس کاغذ کے کارخانے اور پریس کے پرزے اور نیز ان کو برتنے والے اور اس کی تعلیم دینے والے آدمی بھی اعداد قوت میں شامل ہوں گے۔ اسی طرح خفیہ مراسلات، ریڈیو، تار برقی، ڈاک وغیرہ کو بھی سمجھیے۔ ان سب کے لیے آدمی درکار ہیں۔ جو اپنی اپنی فنی تعلیم حاصل کر کے یہ خدمت انجام دے سکیں۔

یوں ہی باقی چیزوں کو بھی سمجھنا چاہیے۔ جاسوسی کرنے والے بھی آدمی ہی ہوں گے، جن کو اس فن کی پختہ تعلیم دینی ہوگی۔ ذرائع حمل و نقل کو استعمال کرنے والے بھی انسان ہی ہوں گے۔ جو بغیر فنی تربیت کے صحیح کام ہی نہیں کر سکتے۔ آلات حرب و ضرب میں نہ فقط ان کے تیار کرنے والے بلکہ ان کو استعمال کرنے والے انسانوں کی ضرورت ہوگی، ورنہ اگر ہتھیار کو چلانے والے ہی موجود نہ ہوں تو سارے ہتھیار بیکار رہیں گے، اسی طرح طبی امداد، سامان خوراک و پوشاک وغیرہ مہیا کرنے والوں کو بھی سمجھ لیجیے۔ ان سب کے

لیے مناسب انسانوں کی ضرورت ہو گی اور پھر ایسے معلموں اور تعلیم گاہوں کی بھی، جو مناسب انسان پیدا کریں اور ان سب سے بڑھ کر وہ مجاہدین (ملٹری مین) اور ان کی ٹریننگ جن کے ایک ایک قدم پر فتح و شکست کا دار و مدار ہے۔

اخذِ حذر: دوسری چیز یہ ہے کہ دشمن کے پاس بھی یہی تمام چیزیں ہوں گی اور وہ ان سب سے حملہ کرے گا۔ اس کے بچاؤ کے لیے بھی ہمیں اندرونِ ملک بہت کچھ سامان کرنا پڑے گا، مثلاً زمین دوز قلعے، مقناطیسی غبارے، آگ بجھانے کے سامان، ہراس کو دور کرنے کے مختلف ذرائع، حوصلوں کو بلند رکھنے کے طریقے، ضروریاتِ زندگی کی تباہی کے بعد فی الفور ان کا انتظام، فرسٹ ایڈ وغیرہ۔ غرض بیسیوں چیزیں ہیں، جن کا مقصد ارھاب عدو (دشمن کو مرعوب رکھنا) نہیں بلکہ خود اپنا بچاؤ ہے۔ جسے قرآنی اصطلاح میں "اخذِ حذر" کہتے ہیں۔

ہم نے اعداد قوت کے تمام جزئیات کا احاطہ بالکل نہیں کیا ہے۔ چند چیزیں وضاحت کے لیے پیش کی ہیں، ورنہ فروع در فروع اتنی جزئیات ہیں، جن کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

مالی جہاد: اب سوچیے کیا یہ تمام کام جو اخذِ حذر اور اعدادِ قوۃ سے تعلق رکھتے ہیں، یوں ہی مفت میں ہو جائیں گے۔ کیا ان کیلئے لا انتہا مال کی ضرورت نہ ہو گی؟ یقیناً ہو گی اور ہمارے اندازوں سے بھی زیادہ ہو گی۔ آپ اس کا کچھ اندازہ اس سے کر سکتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۴ء کی جنگِ عظیم میں ساڑھے انیس کروڑ روپے صرف ہوتے رہے ہے۔ سالانہ؟ نہیں۔ ماہانہ؟ جی نہیں۔ ہفتہ وار؟ اجی نہیں۔ پھر؟ روزانہ۔ کیا یہ ساری محارب حکومتوں کا مجموعی خرچ ہے؟ توبہ کیجیے۔ تو کیا صرف اتحادیوں کا؟ نہیں حضرت پھر؟ صرف برطانیہ کا۔ آپ نے غور فرمایا، ہر روز ساڑھے انیس کروڑ روپے جنگِ عالمگیر میں صرف کرتا رہا۔ اس سے اندازہ فرما لیجیے کہ موجودہ دور میں جنگی اخراجات کیا ہوا کرتے ہیں۔ اور اعدادِ قوۃ اور اخذِ حذر کے لیے روپے کی کتنی شدید ضرورت ہے بس یہی ہے **جہاد بالمال** اور انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑا اہم شعبہ۔

جانی جہاد کا مطلب: بلکہ اعدادِ قوۃ اور اخذِ حذر کے جتنے شعبے مختصراً اوپر بیان ہوئے ہیں، یہ فقط جہاد بالمال ہی میں داخل نہیں جہاد بالنفس میں بھی ان کا شمار ہے۔ کیوں کہ جہاد بالنفس کے معنی صرف جان دے دینا قطعاً نہیں جان دے دینا تو ایک آخری مرحلہ ہے۔ اس سے پہلے کا مرحلہ ہے:

"جان کو جوکھوں میں ڈالنا"، اوپر کی بیان کردہ تمام تصریحات، جن کا تعلق اعدادِ قوۃ اور اخذِ حذر سے ہے، جہاد بالنفس ہی ہیں۔ آلاتِ حرب بنانے اور ایجاد کرنے کے لیے سائنٹسٹ کا مغز کھپانا، اسے تیار کرنے کے لیے مزدوروں کا مشقت برداشت کرنا۔ پروپیگنڈے کے لیے مصنف کا دماغ ریزی کرنا، رات بھر پہرہ دینا، حتیٰ کہ فوجیوں کے لیے کھانا کپڑا تیار کرنا اور پہنچانا وغیرہ، یہ ساری خدمتیں جان کو جوکھوں میں ڈالنا ہے۔ یہ جان دینا تو نہیں مگر اس سے پہلے کا مرحلہ ہے اور یہ بھی عین جہاد بالنفس ہے۔

بہر حال یہ جان جوکھوں میں ڈالنے والے تمام مراحل بھی ایسے ہیں، جو انفاق مال کے بغیر طے نہیں کیے جا سکتے اور اس کے بغیر جہاد بالنفس کی ابتدائی اور آخری منزلوں کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ جہاد بالمال کو جہاد بالنفس پر مقدم رکھا گیا ہے۔ ترتیب ایثار بھی اسی کی متقاضی ہے۔

جہاد سے پہلوتہی : اگر جہاد بالمال اور جہاد بالنفس سے ذرا بھی پہلوتہی کی جائے۔ کوئی روحانی ریاضت اس خلا کو پر نہ کر سکے گی۔ بلکہ تاریخ اسلام یہ بتاتی ہے کہ روحانی قوت بھی مادی قوت کی کمی سے کم ہو جاتی ہے۔ بغیر قوت کے سارا دین صرف یاتریوں اور سادھوؤں کا ایک بے جان دھرم رہ جاتا ہے۔ خوب کہا ہے علامہ اقبال نے ؎

در کمر تیغ دو رُو قرآں بہ دست   تن بدن، ہوش و حواس اللہ مست

این دو قوت حافظ یک دیگر اند   کائناتِ زندگی را محور اند

بولنے کو جس کا جی چاہے بولے، کسی کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ لیکن جہاد میں کوتاہی محض اس لیے کہ کچھ لوگ (مثلاً: یورپین مصنفین) اسلام کو بربریت قرار دیں گے۔ اتنی بڑی غفلت ہوگی جس سے بڑی اور کوئی غفلت نہیں ہو سکتی۔ پوری انسانی تاریخ میں اب تک کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے، جہاں کوئی نظام، قوت کے بغیر قائم رہ سکا ہو۔ ابھی تک انسان اس بلند مقام پر نہیں پہنچا ہے، جہاں اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے قبل اعداد قوت ایسی ہی ضروری ہے، جیسا بچے کی ابتدائی زندگی میں دودھ۔ یقیناً انسان ساری عمر دودھ نہیں پیتا۔ اس کی زندگی عام غذاؤں کے سہارے چلتی ہے۔ لیکن تاآنکہ اس کا معدہ ثقیل غذائیں ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کرے۔ اس کی بقا کے لیے دودھ ضروری ہے۔ اسی طرح انسانیت کی اونچی منزل، جہاں ہر معقول بات رضاکارانہ خوشدلی سے ہو، تک پہنچنے سے پہلے معقولیت کو قائم رکھنے کے لیے اعدادِ قوت سے مفر نہیں۔

اگلوں کے نمونے : آپ پچھلی تاریخ انسانیت پر نظر ڈالیے۔ کیا کوئی دور ایسا رہا ہے، جب جہاد کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو؟ صرف محسوس ہی نہیں کی گئی بلکہ اس میں حصہ لینا پڑا ہے۔ انبیاء اور صالحین نے بھی اس میں حصہ لیا اور جو کسی دین پر یقین نہیں رکھتے، ان کو بھی اس کے سوا چارہ نہ رہا۔ آئیے چند نمونے اس کے دیکھ لیجیے :

بائیبل : سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ :

جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے، تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا• اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک اپنے لیے کھول دے، تو وہاں کے سب باشندے تیرے باجگذار بن کر تیری خدمت کریں• اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو اس کا محاصرہ کرنا• اور جب خداوند تیرا خدا اُسے تیرے قبضے میں کر دے، تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا• لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی، کھانا• ان سب شہروں کا یہی حال کرنا، جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں• پر ان قوموں کے شہروں میں، جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے، کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا بلکہ تو ان کو یعنی حتی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی قوموں کو جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے، بالکل نیست کر دینا[1]

[1] استثنا ۲۰ : ۱۰ تا ۱۷

کچھ اور بھی ملاحظہ ہو:

• اور جیسا کہ خداوند نے موسےٰ کو حکم دیا تھا، اس کے مطابق انہوں نے مدیانیوں سے جنگ کی اور سب مردوں کو قتل کیا • اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا اور ان کے چوپائے اور بھیڑ بکریاں اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا • اور ان کی سکونت گاہوں کے سب شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان سب چھاؤنیوں کو آگ سے پھونک دیا • اور انہوں نے سارا مالِ غنیمت اور سب اسیر کیا انسان اور کیا حیوان ساتھ لیے • (موسےٰ سرداروں پر جھلا کر) ان سے کہنے لگا۔ کیا تم نے سب عورتیں جیتی بچا رکھی ہیں؟ • اس لیے ان بچوں میں جتنے لڑکے ہیں، سب کو مار ڈالو اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں، ان کو قتل کر ڈالو • لیکن ان لڑکیوں کو، جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں، اپنے لیے زندہ رکھو • اور جو کچھ مالِ غنیمت جنگی مردوں کے ہاتھ آیا ہے، اسے چھوڑ کر لوٹ کے مال میں چھ لاکھ پچھتر ہزار بھیڑ بکریاں تھیں • اور بہتر ہزار گائے بیل • اور اکسٹھ ہزار گدھے • اور نفوسِ انسانی میں سے بتیس ہزار ایسی عورتیں جو مرد سے ناواقف اور اچھوتی تھیں۔

(گنتی ۳۱/۳۵، تا ملتقطاً)

وید: اب ذرا ویدوں کو بھی دیکھیے:

وہ اندرا جس... نے ورترا کو قتل کیا اور جس نے قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دیئے، وہ جو کالے داسوں (غلاموں) کی فوجوں کو قتل کرتا ہو۔ ("قدیم ہندوستان کی تہذیب" مصنفہ مسٹر آر سی دت۔ ترجمہ اردو ص ۲۷ بحوالہ رگ وید، منڈل۔ امنتر ۱۹، رچا ۷)

اور ملاحظہ ہو:

ہم نے داسوں کو دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قضا و قدر نے ان کو اسی واسطے پیدا کیا تھا۔

(ایضاً ص ۳۸، ۲، منتر ۲۰، رچا ۶، ۷)

تخمینہ بھی ملاحظہ ہو:

اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں تباہ و غارت کیا۔

(ایضاً ص ۴۴ بحوالہ ایضاً ۴، منتر ۱۶، رچا ۱۰)

ہم نے صرف نظیر و مثال کے طور پر یہ مختصر حوالے دیئے ہیں۔ ورنہ بائیبل میں اور ویدوں میں جتنے حوالے ہیں، ان کو نقل کرنے کیلئے ایک الگ تصنیف کی ضرورت ہے۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ کسی مذہب کو ماننے والوں کے لیے اسلام کے متعلق یہ کہنے کا موقع ہے کہ:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لامذہبوں کے اعداد و شمار: ایک نظیر ان کی بھی سن لیجیے، جو مذہب وغیرہ کے قائل نہیں، یا برائے نام قائل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو گذشتہ دونوں جنگوں میں باہم جنگ کر کے انسانی خون بہاتے رہے۔ پہلی

جنگ عظیم کے مقتولین کے اعداد و شمار ملاحظہ فرمائیے یہ جنگ چار سال جاری رہی اور نتیجے میں یہ اعداد و شمار مقتولین کے شائع ہوئے:

روس	۱۷ لاکھ	ٹرکی	۲ لاکھ پچاس ہزار
جرمنی	۱۶ لاکھ	بلجیم	۱ لاکھ دو ہزار
فرانس	۱۳ لاکھ ستر ہزار	بلغاریہ	۱ لاکھ
اٹلی	۴ لاکھ ساٹھ ہزار	رومانیہ	۱ لاکھ
آسٹریا	۸ لاکھ	سرویا و مانٹینگرو	۱ لاکھ
برطانیہ	۷ لاکھ	امریکہ	پچاس ہزار

میزان : ۷۳ لاکھ ۳۸ ہزار

دوسری جنگ عظیم کے مقتولین کے اعداد و شمار بھی ملاحظہ ہوں:

روس	دو کروڑ دس لاکھ	امریکہ	دس لاکھ ستّر ہزار
جرمنی	ساٹھ لاکھ سے سوا کروڑ تک	برٹش امپائر	چودہ لاکھ تیس ہزار
پولینڈ	نو لاکھ	فرانس	دس لاکھ
چین	تیس لاکھ	اٹلی	گیارہ لاکھ
جاپان	ستائیس لاکھ سے پچاس لاکھ تک	یوگوسلاویہ	سولہ لاکھ پچاسی ہزار
آسٹریا	سات لاکھ	ہنگری	چھ لاکھ
رومانیہ	سات لاکھ	ہالینڈ	دو لاکھ چھتّر ہزار
فن لینڈ	ایک لاکھ نواسی ہزار ایکسو چھیاسٹھ	بلجیم	ساٹھ ہزار
چیکوسلاویکیہ	ساٹھ ہزار	فلپائن	تیس ہزار
سلاویکیہ	تیس لاکھ پچاس ہزار		

نوٹ :- ان اعداد و شمار میں قیدی و زخمی سپاہیوں کا شمار داخل نہیں۔ کل تعداد قریباً چار کروڑ ہوتی ہے اور ان اعداد و شمار کی اشاعت کے بعد بھی بعض جگہ جنگ جاری تھی (کوثر ۵ ہم ۹)

غور طلب بات صرف یہ ہے کہ خود سب کچھ کرتے ہوئے اسلامی جہاد کو نہایت بھیانک اور غلط شکل دے کر پیش کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم اگر یہی کام کریں، تو عین تہذیب ہے اور تم کرو تو بربریت ہے؟

اسلامی و غیر اسلامی جنگوں کا فرق :

دونوں میں فرق کیا ہے، جو اسلامی جہاد کو بربریت اور معترضین کی ہنر آزمائیوں کو تہذیب قرار دیا جائے؟ ہاں فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ کچھ تفصیلات اس کی بھی سن لیجیے:

۱۔ جہاد اسلامی ایک بلند ترین نصب العین کے لیے ہے اور دوسری جنگوں کا کوئی بلند مقصد نہیں صرف ملک گیری ہے۔ اپنی قومی برتری کا قیام ہے اور مفتوحہ علاقوں کو اپنا غلام بنانا ہے۔

۲۔ اسلامی جہاد کا نتیجہ عدل و انصاف، فراخ دلی و رواداری، متوازن تہذیب و تمدن کی شکل میں ظاہر ہوا ہے اور غیر اسلامی جنگوں کا کوئی خوشگوار نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے نہیں ظاہر ہو سکا۔

۳۔ اسلامی جہاد کے تمام قوانین احترام آدمیت، استیصال شر و فساد، ترکِ تعدی و انتقام اور احتیاط تقویٰ پر مبنی ہیں اور دوسری جنگوں میں بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار، گوشہ گیر وغیرہ کسی کا لحاظ [illegible] اور غلبہ و استیلا کے بعد انتقام کی آگ اور مشتعل ہو جاتی ہے۔

اسلامی آدابِ جنگ:

یہ آخری شق ایسی، کہ تفصیل پیش کیے بغیر اس کا یقین مشکل ہے۔ اسلامی قوانینِ جہاد کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به۔ — تم دشمنوں کے ساتھ اتنا ہی کر سکتے ہو، جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔

۲۔ ولئن صبرتم لهو خير للصابرين۔ — اور اگر صبر و درگزر سے کام لو اور تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے۔

۳۔ لا يجرمنكم شنان قوم على الا تعدلوا۔ اعدلوا۔ هو اقرب للتقوى۔ — کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل سے باہر نہ لے جائے۔ عدل کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہی تقوے سے قریب تر ہے۔

۴۔ ان الله لا يحب المعتدين — حد سے متجاوز ہونے والوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔

کچھ فرامینِ نبویؐ بھی سن لیجیے:

۵۔ اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کی راہ میں اللہ کے نافرمانوں سے جہاد کرو

۶۔ بدعہدی اور خیانت نہ کرو۔

۷۔ لاشوں کو مثلہ نہ کرو۔

۸۔ راہبوں اور گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو۔

۹۔ کھجوریا اور کوئی پھلدار درخت نہ کاٹو۔

۱۰۔ عمارت کو نہ گراؤ۔

۱۱۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مریضوں اور غیر محارب آدمیوں کو نہ چھیڑا جائے۔

فتح مکہ کے وقت کی ہدایات بھی سن لیجیے:

۱۔ حرم میں خونریزی نہ ہو،

۲۔ صرف اسی کا مقابلہ کیا جائے، جو سامنے آکر مقابلہ کرے،

۳۔ جو شخص کعبہ میں داخل ہوا سے پناہ۔

۴۔ جو شخص ابو سفیان کے گھر داخل ہو، اسے پناہ،
۵۔ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرے، اسے پناہ،
۶۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔
۷۔ ہتھیار پھینک دینے والے کا تعاقب نہ ہو،
۸۔ زخمی اور اسیر نہ قتل کیے جائیں۔

یہ ہیں مختصر نمونے ان قوانین کے، جن کا ہر مجاہد کو جہاد کے موقع پر پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اور عالمگیر جنگوں میں جتنا بھی ان باتوں کا لحاظ و خیال رکھا گیا ہے، وہ آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

دونوں کا فرق: نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ اسلامی جہاد تو انسانیت کے لیے رحمت ہے اور بربریت و درندگی دراصل اُن کی جنگیں ہیں۔ جو اسلامی جہاد کو بربریت قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہمارے معترضین بے خبر نہیں لیکن ان کی بربریت چھُپ ہی سکتی ہے۔ اس صورت میں کہ وہ اسلامی جہاد کو بربریت و وحشت ثابت کرنے کی کوشش اور پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ غرض ان تمام پروپیگنڈوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اولاً تو مسلمان اس اہم فریضہ زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں اور ثانیاً خود معترضین کی جنگی درندگیوں پر پردہ پڑا رہے۔

لیکن کیا اب پاکستان بننے کے بعد اور آزادی کی نعمت حاصل ہونے کے بعد بھی ہمیں اسی غلط فہمی اور فریب فرنگ میں مبتلا رہنا چاہیے؟

وہ فریب خوردہ شاہیں، جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہ بازی

غزواتِ نبویؐ

محمّد طاہر فاروقی

عہدِ رسالت میں جو لڑائیاں پیش آئیں ان کے بیان میں ہمارے مورخین نے بڑی بے احتیاطی کی ہے، جس کی وجہ سے مخالفوں کو بات کا بتنگڑ بنانے کا موقع مل جاتا ہے اور ناواقف لوگ ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جتنے معرکے پیش آئے وہ دو قسم کے ہیں۔ جس معرکے میں آپؐ نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی وہ غزوہ ہے، اور جس میں آپؐ خود شریک نہ تھے وہ سریہ کہلاتا ہے۔ مگر ان الفاظ کے استعمال میں بھی ہمارے قدما نے احتیاط نہیں کی۔ اکثر جماعتیں جو لڑنے کے علاوہ کسی دوسرے کام کے لیے بھیجی گئیں، ان کو بھی مورخین نے سریات کے ذیل میں شمار کر لیا۔ جس سے اس عہدِ مبارک کی لڑائیوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی حالانکہ دراصل لڑائیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

سریہ میں ایسی جماعتیں بھی شامل کر لی گئیں جو صرف دو تین افراد پر مشتمل تھیں۔ یا ان کے بھیجنے کے مقاصد ہی کچھ اور تھے۔ مثلاً:

۱۔ دشمن کے ارادوں کا حال معلوم کرنا اور جاسوسی کرنا۔

۲۔ صلح کرنے اور امن قایم کرنے کے لیے جانا۔

۳۔ تبلیغ اسلام کے واسطے جانا

۴۔ حملہ آوروں سے مدینہ منورہ کو بچانے کی غرض سے آگے بڑھ جانا۔ ان میں سے اکثر سریے بغیر چھیڑ چھاڑ اور چپقلش کے واپس آ گئے۔

۵۔ سفارت لے کر دوسرے قبائل کی طرف جانا۔

۶۔ قریش کے قافلوں کی شام کی آمد و رفت میں روک ٹوک کرنا۔

اسلام کو آئے چودہ سال سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مکہ میں مسلمانوں پر جو غیر انسانی اور ہیبت ناک مظالم کیے گئے، اور خود آنحضرت صلعم کے ساتھ جیسی گستاخیاں روا رکھی گئیں، ان کا حال سب کو معلوم ہے۔ اسی لیے اول ملک حبش کو اور پھر مدینہ کو ہجرت کی اجازت دی گئی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اب تک مسلمانوں کو لڑنے کی اجازت نہ تھی۔ جب قریش نے مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور برسرِ فساد اور آمادۂ جنگ ہوئے تو جہاد کی اجازت ملی۔ اس اجازت کی مصلحت خود خدا نے بتا دی تھی۔

جہاد کے لیے جو حکم سب سے پہلے نازل ہوا، وہ سورۂ حج میں موجود ہے، اس میں بہ صراحت فرما دیا گیا ہے کہ مسلمان لڑائی کے لیے تیار ہوئے تو وہ لڑائی جارحانہ نہ تھی بلکہ مدافعانہ اور حفاظت خود اختیاری کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: "تم کو لڑائی کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اور تم کو صرف خدا کی پرستش کے جرم میں وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اگر ایسا

ہوتا (یعنی جہاد کی اجازت نہ دی جاتی) تو یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔"

یہ آخری بات صاف بتاتی ہے کہ جہاد کے حکم میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور دیگر اقوام سے جو معاہدے مذہبی آزادی اور امن عام کے لیے کیے تھے، اور قریش جن کو پامال کرنے کے درپے تھے، ان کی حفاظت کی جائے۔ اس لیے کہ اگر کوئی قوم معاہدہ کا پاس اور لحاظ کرنے والی نہ رہے گی تو مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کون کرے گا؟ اسی لیے جہاد کی دوسری آیت میں بھی خدا نے یہی حکم دیا کہ "صرف ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑنے کے لیے آئیں۔" اس مختصر بیان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان جنگجو نہ تھے بلکہ ان کو لڑنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

ہجرت کر کے مدینہ آجانے کے بعد آنحضرت صلعم تو امن پھیلانے اور صلح فرمانے میں مصروف تھے، اور قریش اپنا جال پھیلا رہے تھے۔ مدینہ میں ایک جماعت تھی جس کو خود قرآن حکیم نے منافقین کا لقب دیا ہے۔ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان بنتے رہتے مگر درپردہ درپے آزار رہتے۔ ان کا سردار عبداللہ ابن اُبی ابن سلول تھا۔ اس کا مدینہ میں بہت اثر تھا۔ قریش نے اسے لکھا کہ "تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو اور انھیں مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ کر کے تمھیں نیست و نابود کر دیں گے۔" اس نے اپنی جماعت کے لوگوں کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ لیکن آنحضرت صلعم کو پہلے سے خبر ہو گئی۔ آپ خود تشریف لائے اور ان منافقوں کو سمجھایا کہ "قریش نے تم کو دھوکا دیا ہے۔ اگر تم ان کے فریب میں آگئے تو یاد رکھو کہ جن سے تم لڑو گے اور جنھیں تم نقصان پہنچاؤ گے وہ سب تمہارے عزیز و اقارب ہیں۔ قریش تو پھر بھی غیر ہیں۔" عبداللہ ابن اُبی کے ساتھی اس بات کو سمجھ گئے اور یہ فتنہ دب گیا۔

قریش نے اسی طرح یہود کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا۔ یہود خود بھی مسلمانوں سے خفا تھے۔ ایک تو اس لیے کہ اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سچا نبی مانتا تھا اور ان کی نبوت پر ایمان لانا اسلام کا جزو تھا۔ نیز یہ کہ اسلام کی رُو سے یہودی حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کرنے میں غلطی پر تھے۔ دُوسرے یہ کہ مسلمانوں نے اپنا قبلہ بدل دیا تھا یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا تھا۔ تیسرے یہ کہ یہودیوں کو خطرہ تھا کہ مسلمان قوت پکڑتے جاتے ہیں تو اس سے ان کے اثر اور عظمت میں خلل آتا ہے۔ اب یہود نے دیکھا کہ سارے مکہ کی طاقت ہمارے ساتھ ہوئی جاتی ہے۔ تو انھوں نے قریش سے اسلام کی مخالفت میں تعاون کرنا قرین مصلحت سمجھا۔

قریش کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو انھوں نے مسلمانوں کو دھمکی دی کہ: "تم یہ نہ سمجھنا کہ مکہ سے چلے آئے تو آرام سے بیٹھ رہو گے۔ ہم وہیں آکر تمھارا قلع قمع کر ڈالیں گے۔" دھمکی سے تجاوز کر کے انھوں نے چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دی۔ ربیع الاول ۲ھ میں کرز ابن جابر آیا اور مدینہ کے باہر جو مویشی چر رہے تھے انھیں لوٹ کر لے گیا۔

اسی طرح قریش نے ان قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان آباد تھے۔ چنانچہ ان قبائل نے بھی مدینہ آنے جانے والوں پر سختیاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں اہل مدینہ کو ہر وقت مشرکین مکہ کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہؓ سب کے سب اپنے ہتھیار ساتھ لے کر سوتے تھے۔

آخر رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ قریش کی

نقل وحرکت اور ان کے ارادوں کا پتا لگائیں۔ وہ ٹوہ لینے مکّہ کے قریب تک جا پہنچے تھے کہ قریش کا ایک قافلہ نظر آیا جو شام سے واپس آرہا تھا۔ حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کیا۔ لڑائی میں عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو کافر قید ہوئے اور مال غنیمت ہاتھ آیا۔ واپس آکر حضرت عبداللہؓ نے مالِ غنیمت پیش کیا اور سارا قصہ سنایا۔ آنحضرت صلعم نے جنگ کی اجازت نہیں دی تھی، اس لئے آپ کو حضرت عبداللہؓ کا یہ فعل ناگوار ہوا اور آپؐ نے مالِ غنیمت بھی قبول نہیں فرمایا۔ عمرو بن الحضرمی معززین قریش میں سے تھا۔ اور دو کافر جو قید ہوئے وہ مغیرہ رئیس قریش کے بیٹے تھے۔ اس لیے اس واقعہ نے قریش کے جوشِ انتقام کو بھڑکا دیا اور نتیجہ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔

غزوۂ بدر میں قریشِ مکہ پورے ساز و سامانِ حرب سے اچھی طرح لیس تھے اور مسلمان ان کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بے حد کمزور تھے۔ مگر حق و باطل کے اس معرکہ کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ جاء الحق و زھق الباطل کا پہلا روشن نشان دنیا کو نظر آیا اور مسلمانوں کو بے مثال فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح اسلام کی آیندہ ترقیوں کا پیش خیمہ تھی۔ قریش کے گیارہ بڑے بڑے سردار مارے گئے اور قریش کا اصل زور ٹوٹ گیا مگر ان کے دل جوشِ انتقام سے بھر گئے۔ جس کا نتیجہ جلد ہی ظاہر ہوا۔ قبائل عرب پر بھی مسلمانوں کی اس فتح کا بہت اچھا اثر پڑا کہ وہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب ہو گئے۔ مگر یہود کی آتشِ حسد اور زیادہ بھڑک اُٹھی اور وہ مسلمانوں کے پہلے سے بھی زیادہ سخت جانی دشمن بن گئے۔

فتح بدر سے یہودیوں کے دلوں میں حسد کی جو آگ بھڑکی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہر وقت مسلمانوں کے آزار کے در پے رہنے لگے۔ مشرکین مکہ نے ان کو پہلے ہی اچھی طرح سے بھڑکا رکھا تھا۔ منافقینِ مدینہ نے اور روغن تازہ ملا۔ حالانکہ مسلمانوں اور یہودیوں میں باہم صلح و آشتی کے معاہدے ہو چکے تھے۔ مگر انھوں نے ان کا بھی احترام نہ کیا۔ سب سے پہلے بنو قینقاع نے اس معاہدے کو توڑا اور شوال کے مہینہ میں جنگ کا اعلان کر دیا۔ اتمامِ حجت کے طور پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو سمجھایا۔ مگر انھوں نے کہا "قریش تو فنونِ جنگ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تم سے ہار گئے۔ ہم تم کو بتا دیں گے کہ لڑائی کیا ہوتی ہے۔" مجبوراً مسلمانوں کو لڑائی پر تیار ہونا پڑا۔ یہود قلعہ بند ہو کر لڑے۔ پندرہ دن محاصرہ رہا۔ تنگ آگئے تو انھوں نے صلح کی درخواست کی اور کہا کہ "آنحضرت صلعم جو بھی فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔" عبداللہ ابن ابی منافقینِ مدینہ کا سردار اور بنو قینقاع کا حلیف تھا۔ اس نے سفارش کی کہ ان کو صرف جلاوطن کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ شام کو جلاوطن کر دیے گئے۔ ان کی تعداد سات سو تھی۔

یہاں تمام غزوات کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔ یہ بتانا مطلوب تھا کہ مسلمانوں سے قریش اور یہود کی لڑائیاں کس طرح شروع ہوئیں اور ان جنگوں میں مسلمانوں کا رویّہ کیا تھا۔

غزوۂ اُحد غزوۂ بدر کے جوشِ انتقام میں پیش آیا۔ دوسری طرف یہود کے دوسرے قبائل برابر مخالفت اور دشمنی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ بنو نضیر کی چھیڑ چھاڑ جب حد سے بڑھ گئی تو آنحضرت صلعم نے معاہدہ کی تجدید چاہی۔ بنو قریظہ نے تو معاہدے کی تجدید کر دی۔ لیکن بنو نضیر برسرِ مخالفت رہے۔ آخر پریشان ہو کر صلح پر آمادہ ہوئے اور بخوشی و رغبت انھوں نے جلاوطنی پسند کی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلمانوں نے ان کے مال اسباب سے مطلق تعرض نہیں کیا اور وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ تمام مال و متاع اور ساز و سامان کے ساتھ شام اور خیبر کو کوچ کر گئے۔

اس کے بعد بڑی لڑائی غزوۂ خندق ہے۔ چونکہ اس جنگ میں مکہ کے قریش اور یہود اور دُوسرے قبائل نے بڑے پیمانے اور بڑی تیاریوں کے ساتھ شرکت کی تھی، اس لیے اس کو غزوۂ احزاب بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت بنو قریظہ (یہود) نے کھُلم کھلا معاہدے کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اس لیے جنگِ خندق کی فتح کے بعد ان کو سبق سکھانا لازم تھا، اور خود یہود نے شہادت دی تھی کہ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم کی حیثیت سے جو فیصلہ فرمایا تھا وہ تورات کے احکام کے عین مطابق تھا۔

مختصر یہ کہ قریش اور یہود اور منافقین تین بڑے دشمن اور مفسد گروہ تھے جو در پردہ اور علی الاعلان اسلام کی ہر طرح کی مخالفت اور مخاصمت پر کمربستہ رہتے تھے اور مجبور ہو کر مسلمانوں کو ان سے جنگ (جہاد) کی اجازت دی گئی تھی۔ پھر بھی جو جنگیں پیش آئیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ قریش کے حملوں کے نتیجہ میں جو لڑائیاں ہُوئیں وہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب اور غزوۂ حنین میں محدود ہیں۔ یہود کی لڑائیاں غزوۂ بنو قینقاع، غزوۂ بنو نضیر، غزوۂ بنو قریظہ اور غزوۂ خیبر ہیں۔ ان میں سے پہلی دو میں مطلق خونریزی نہیں ہُوئی اور مفتوحین نے بخوشی و رغبت جلاوطنی کی سزا منظور کی۔ رومیوں سے سریّہ موتہ (جس میں آں حضرت صلعم شریک نہ تھے) اور غزوۂ تبوک صرف دو معرکے ہُوئے۔

اب ان اسلامی نبوی جنگوں کا ایک اور زاویۂ نظر سے مطالعہ کیجئے تو حیرت ناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ جو اسلامی دستے دُوسرے مقاصد سے بھیجے گئے تھے، جن میں لڑائی بھڑائی کا نام و نشان بھی نہیں ملتا، ان کو بھی مورخین نے غزوات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ جس سے غزوات کی تعداد بے سبب زیادہ نظر آنے لگی ہے ورنہ حقیقت میں لڑائیاں صرف اتنی ہیں جن کا اوپر ذکر ہُوا۔ یا پھر فتح مکہ ہے۔ واضح ہو کہ غزوۂ تبوک میں بھی کوئی لڑائی نہیں پیش آئی تھی۔ ایسے ہی بعض اور غزوات ہیں جن میں آنحضرت صلعم نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ مگر بغیر کسی لڑائی کے واپس تشریف لائے۔ جیسے غزوات سویق، حمراء الاسد، انمار، بدر دوم، دومۃ الجندل، بنو لحیان، غابہ اور ذات الرقاع۔ سریّات میں بھی چند کے علاوہ جو لڑائی ہی کے لیے بھیجے گئے تھے باقی موقعوں پر کوئی جنگ نہیں ہُوئی۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو لڑائیوں میں شامل کیا جائے۔ جو شخص بھی دیانت داری سے تاریخ کا مطالعہ کرے گا، وہ اس بات کو دل سے قبول کرے گا کہ جو دستے تبلیغ اسلام، تکمیل صلح، بت شکنی، رہزنوں کے تعاقب، جاسوسی، مخبری یا اس طرح کے دوسرے مقاصد کے لیے بھیجے گئے، ان کا شمار جنگوں میں کرنا سخت ناانصافی ہے اور فتح مکہ جیسی اہم جنگ جس طرح اختتام کو پہنچی اور یہاں جیسی رحم دلی، فراخ حوصلگی، عام معافی، رواداری اور سیر چشمی کا مظاہرہ فرمایا گیا، اس پر ہزاروں امن، صلح، آشتی اور خوش اخلاقی کی مثالیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ درحقیقت خلق عظیم کا یہ وُہ اسوۂ حسنہ تھا جس کی مثال رہتی دنیا تک نہیں مل سکتی۔ اور اس کا کوئی پرتو اگر نظر آ سکتا ہے تو صرف مسلمان سلاطین کی فتوحات میں۔ جیسے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی فتح بیت المقدس۔

دشمنانِ اسلام کہتے چلے آئے ہیں کہ "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا" اور ان کو اعتماد ہے اپنے زبردست پروپاگنڈے

اور تحریری قوت پر۔ جانتے ہیں کہ جھوٹ بات بھی بار بار دُہرائی جائے، اور مسلسل کہی جاتی رہے، تو سننے والوں کے دل میں شک تو پیدا کر ہی دیتی ہے۔ اسی لیے کتنے مسلمان نوجوان ہیں جو تفصیلات سے بے خبر اور ناواقف ہونے کے باعث ان کے پروپاگنڈے سے کم و بیش متاثر ہو جاتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ دشمنوں میں سے کوئی بھی آج تک اس دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ غزوات نبوی سے اس پر دلیل لانے کی حقیقت مذکورہ بالا تحریر سے روشن ہو گئی۔

اتمامِ حجت کے لیے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان لڑائیوں میں مقتولین اور قیدیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر کم نظر آتی ہے۔ اگر جبر و تشدد کے لیے لڑائیاں ہوتیں تو قیدی اور مقتول اس سے بہت زیادہ ہوتے۔ ان تمام غزوات میں مخالفین کے کل قیدی ۶۵۶۴ اور کل مقتول ۷۵۹، تھے۔ اور مسلمانوں میں سے کل ۲۵۹ شہید اور صرف ایک بزرگ قید ہوئے۔ یقینی طور پر تحقیق ہے کہ دشمنوں کے ان قیدیوں میں سے ۶۳۴۸ قیدیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر کسی شرط کے (غزوہ حنین کے بعد) آزاد فرما دیا تھا۔ صرف ایک شخص کو قصاص میں قتل کیا گیا تھا۔ باقی ۲۱۵ قیدیوں کے متعلق بات رہ جاتی ہے۔ ان میں سے ستر قیدی غزوۂ بدر کے تھے، جن کو فدیہ ادا کرنے پر رہا کر دیا گیا تھا۔ اب بچے ۱۴۵ قیدی۔ تو یہ بھی بات ہے کہ جس سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین ؐ نے صرف ایک غزوۂ حنین کے چھ ہزار سے زیادہ قیدیوں کو آنِ واحد میں آزادی بخش دی تھی، اس ذات مقدس نے ان تھوڑے سے افراد کو بھی اپنی رحمت و عفو سے محروم نہ رکھا ہوگا۔

اب ان اعداد کے مقابلے میں دنیا کی دوسری مذہبی و سیاسی لڑائیوں کے قیدیوں اور مقتولوں کی تعداد دیکھی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمانوں نے صرف مدافعت کے لیے مجبور ہو کر تلوار ہاتھ میں لی تھی یا کسی اور مقصد سے لڑے تھے۔ جان پورٹ کی روایت کے مطابق ڈیڑھ کروڑ کے قریب عیسائی مذہب کی بھینٹ چڑھائے گئے تھے۔ مہابھارت کے مقتولین کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ فرانس، امریکہ اور روس نے جمہوری سلطنتیں قائم کرنے میں لاکھوں سے زیادہ تہ تیغ کر دیے۔ پہلی جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد بہتر لاکھ ہے۔ اور دُوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں کئی کروڑ آدمی ہلاک بتائے گئے ہیں۔ چین کی جنگِ آزادی نے کیا بھینٹ لی تھی، ان مقتولین کی تعداد کا شاید کبھی بھی تخمینہ نہ لگایا جا سکے گا۔ غرض اس مختصر تشریح سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام کے پھیلنے کا سبب اس کی صداقت و حقانیت تھی یا تلوار کا زور۔"

اب ذرا نتائجِ جنگ پر ایک اور طرح نظر ڈالیے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب ہی میں نہیں، دنیا بھر میں لڑائیوں میں عجیب عجیب ظلم و ستم روا رکھے جاتے تھے۔ اسلام نے ان سب کی اصلاح کی۔ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کے قتل سے بتاکید منع کیا۔ ایفائے عہد کی تعلیم کی۔ صلح حدیبیہ میں اس کی ایسی عجیب مثال موجود ہے جس کی نظیر تلاش کرنی بے سُود ہے۔ قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا۔ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے بدر اور حنین کے قیدیوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ فوجیں کوچ کرتی ہیں تو عام طور پر راستے کی بستیوں کو سخت مصائب اور تکالیف سے سابقہ ہوتا ہے۔ اہل فوج ان سے رسد وغیرہ کا ٹیکس وصول کرتے ہیں، اور فوجوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے آمد و رفت کی راہ قطعاً مسدود ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتاکید ان سب باتوں سے منع فرمایا۔ سب

سے بڑی اصلاح یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی محبت دلوں سے نکال دی۔ ورنہ اسلام سے قبل صرف لُوٹ مار کے لیے لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ جس کی چند مثالیں اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی ملتی ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ یہ شغف جاتا رہا۔ مالِ غنیمت کی محبت دل سے بالکل نکل گئی۔ اسی طرح انتقام اور دیت کے جو غلط اور وحشیانہ طریقے رائج تھے، آنحضرت صلعم نے ان کو بھی دُور کر دیا۔ مساوات کا قانون قایم کرنا اور اسے نافذ و جاری کر کے دکھانا، اسلام کا سیاسی دنیا پر سب سے بڑا احسان ہے۔ چنانچہ غزواتِ نبوی میں اس کی روشن و تابناک مثالیں نظر آتی ہیں۔

غزواتِ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم

بریگیڈیر گلزار احمد

غزواتِ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ اور ان سے متعلق امور اور معاملات کی تحقیق کئی پہلوؤں سے ضروری ہے۔ اولاً غزواتِ نبوی ہی سیرت پاکؐ کی اولیں کتابوں کا باعث بنے۔ اس کے علاوہ مدنی دور کے اولیں سالوں میں دشمن کی جانب سے حملوں کا خدشہ اس قدر زیادہ رہتا تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات آرام کی ضرورت یا خواہش محسوس ہوئی تو صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ کوئی قابل آدمی آپؐ کی جگہ پہرہ دے تاکہ آپؐ آرام فرما سکیں۔ سعدؓ بن وقاص نے زرہ پہنی اور آپؐ نے اس رات آرام فرمایا۔ تاریخ ان ایام کے متعلق یہ بھی بتاتی ہے کہ صحابہؓ سورج نکلنے پر جب کھیتوں کو جاتے تھے تو اپنے ہتھیار ساتھ لے کر جاتے تھے۔

جب حالات یہ تھے کہ شب و روز دشمن کی جانب سے حملہ کا خدشہ موجود رہتا تھا اور مدنی دور کے اولیں نو سالوں میں ۲۹ بار شاہِ مدینہؐ کو بہ نفسِ نفیس بیرونِ مدینہ سفر کرنا پڑا۔ ان سفروں کو غزوات کا نام دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان کے دوران لڑائی واقع ہوئی ہو۔ ان غزوات کے علاوہ بھی حضور اقدسؐ اپنے جلیل القدر صحابہؓ کی زیر قیادت چھوٹے بڑے لشکر روانہ فرماتے رہتے تھے تاکہ ملک کے اندر امن و امان قایم رہے اور امت کے اندر زیادہ سے زیادہ لشکر سالار اور کماندار تربیت حاصل کر سکیں اور یوں ملت کی آیندہ ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ ان لشکروں کو "سرایا" کا نام دیا گیا ہے اور ان کی تعداد پچاس سے زاید ہے۔ جس شہر سے ۹ سال کے عرصہ میں اسّی سے زاید مہمیں اندرون حدودِ ریاست یا بیرونِ حدودِ مملکت روانہ کی گئی ہوں اس کی زندگی پر اس طویل جنگ کا ضرور اثر پڑا ہوگا۔ اس لیے اس دور کی تاریخ اور سیرتِ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ کے وقت یہ امر مسلسل ذہن کے سامنے رکھنا چاہیے کہ اس تمام عرصہ میں مدینہ کی فضا پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے اس عرصہ کے امور مملکت یعنی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بین الملکی سیاسیات سے متعلق امور کے فیصلوں کے وقت عسکری ضروریات بھی پیشِ نظر رہی ہوں گی۔

غزواتِ خاتم الرسلؐ پر تحقیق کی ان دو وجوہ کے علاوہ ایک اور پہلو بھی ہے جسے ملّتِ اسلامیہ کو آزاد زندگی کے دوران ہمہ وقت پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہ پہلو فلسفۂ جنگ سے متعلق ہے۔ یعنی وہ کون سے مواقع ہیں جب ملّتِ اسلامیہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اور اس کے مطابق جہاد بالسیف کی طرف رجوع کرے اور جب جنگ بپا ہو جائے تو اسلامی لشکر دل کا طرزِ عمل کس طرح کا ہو۔

ملتِ اسلامیہ کی یہ پہلی جنگ تھی اور اس جنگ کو جو بات دوسری اسلامی جنگوں سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی

قیادت، سپہ گری، اس کی تیاری، اس کے دوران کی تزویرات (STRATEGY) اور اس کی لڑائیوں کے دوران کی تدبیرات (TACTICS) یہاں تک کہ اس کے لیے وسائل کی فراہمی کے علاوہ اس کے بین الاقوامی پہلو یعنی اس کے دوران امور خارجہ پر فیصلے غرضیکہ اس کا ہر پہلو سرورِ کون و مکان شہنشاہِ دوجہان سربراہِ مملکت مدینہؐ کے اپنے ہاتھوں انجام پذیر ہوا۔

جنگ ہی کے ذریعہ ملت اور اس کے مفاد کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اہم تر زندگی کا کون سا پہلو ہو سکتا ہے۔ اس لئے سنتِ ختم المرسلینؐ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہی ملت اپنی نگہبانی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ دورِ خیر البشرؐ ایسا دور ہے جس میں ملت کے مادی وسائل نہایت محدود تھے اور افرادی طاقت ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی بایں ہمہ جب اس دور کے جزیرۃ العرب کی طاقتور ترین مملکت نے جنگ کا اعلان کیا تو اسے قبول کر لیا گیا اور مدینہ کی نوزائیدہ مملکت نے دفاع کی تیاریاں شروع کر دیں اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ تیاریاں ہر پہلو مکمل تھیں۔ آج چودہ سو سال بعد ملتِ اسلامیہ نہایت ہی تاریک دور سے گزر کر کچھ اس طرح عالم انسانی پر ابھری ہے جیسے کوئی نوزائیدہ مملکت وجود میں آئی ہو۔ اگر حقیقت کو نگاہ میں رکھا جائے تو عالم اسلام کا بیشتر حصہ نوزائیدہ مملکتوں پر مشتمل ہے اور دورِ اوّل کی طرح وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ ہر چہار سو سے اس کا دشمنوں کے درمیان گھر جانا بھی مسلّم ہے۔ ان حالات میں آج ملتِ اسلامیہ کے لیے سنتِ خاتم الرسلؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح طور پر سمجھنا اور ان ہی خطوط پر دفاع کے لیے تیار ہونا ازحد ضروری ہے۔

جنگ ایک معاشرتی حقیقت ہے اور اس کے دوران خون کا بہنا اور تباہی و بربادی کے واقعات کا رونما ہونا فطرت جنگ کا خاصہ ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود یہ تاریخی امر ہے کہ جہاں کہیں ملتِ اسلامیہ کے افراد کو جنگ میں شرکت کرنی پڑی انھوں نے جنگ کی تمام فطری تباہیوں کے باوصف ظلم، تشدد اور بے جا خون آشامی سے احتراز برتا۔ جب دورِ فاروقِ اعظمؓ میں بیت المقدس مسلمانوں نے فتح کیا تو ایک شہری کا بال بیکا نہ ہوا اور نہ ہی کسی کے مال یا عزت کو آنچ آئی۔ وہی بیت المقدس جب چار سو ساٹھ سال بعد یورپ کے متمدن صلیبی شہزادوں نے فتح کیا تو ان کے اپنے بیانات کے مطابق شہر کی گلیوں میں مسلمانوں کے خون سے گھٹنوں تک دلدل بن چکی تھی اور وہ فاتحانہ انداز میں "خون کے ان دریاؤں کو عبور کر کے خدا کے حضور دو زانو ہوئے جس نے انھیں فتح عطا کی تھی۔ چھیانوے سال بعد وہی بیت المقدس ایک بار پھر مسلمانوں نے فتح کیا۔ غازی صلاح الدین کی فوج چونکہ مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لیے اس بار بھی کسی شہری کا بال بیکا نہ ہوا۔ مگر جب وہی شہر بیسویں صدی کے یورپ کی مہذب اور متمدن صیہونی قوم نے فتح کیا تو مسلمانوں کے قبلۂ اول کو بھی عمداً نذرِ آتش کر دیا۔ مقامِ فکر ہے کہ کیوں ایسے ہوتا ہے۔ کیا ان اور ان جیسے سیکڑوں دوسرے واقعات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مسلمان جب میدانِ جنگ کا رُخ کیا کرتا تھا تو اس کے سامنے شہنشاہِ مدینہؐ کا عملی نمونہ موجود رہا کرتا تھا۔ جب دوسرے ادیان کی افواج فتح سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کے سامنے ان کے دین کے بانیوں کی کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہوتی جو ان کے عمل، ان کے کردار اور ان کے جذبات کی حدود کو متعین کر سکے۔ یہ فخر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ہی حاصل ہے کہ انھوں نے حضور اقدس سے سبق حاصل کر کے اپنے صدیوں کے دشمنوں کے ساتھ بارہا عطا و بخشش کا سلوک کیا۔ آج اُمتِ فخرِ رسلؐ ایک بار پھر جادہ پیما ہونے کو ہے۔ لازم ہے کہ جنگ

لڑنے کے وہ طور طریقے جو سرورِ جہاںؐ نے استعمال کیے ان کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیا جائے تاکہ میدانِ جنگ کو رُخ کرنے کے دوران سنّت کے مطابق عمل ممکن ہو۔

قریشِ مکہ نے انتہائی کوشش کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ یا کسی دوسرے مقام کو ہجرت نہ فرما سکیں۔ مگر جب ان کی کوششوں کے باوجود آپؐ مدینہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو اہلِ مکہ نے ایک خط عبد اللہ بن اُبی کو لکھا کہ اگر اہلِ مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو قتل نہ کیا یا مدینہ سے نکال نہ دیا تو وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں گے۔ عبد اللہ بن ابی ان دنوں مدینہ کے دونوں بڑے قبیلوں اوس اور خزرج میں ہر دلعزیز تھا اور حضورؐ کی ہجرت سے قبل اس کی تاج پوشی کی رسم کی تیاریاں شروع تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے پر اس کو بادشاہ مقرر کرنے کا خیال ترک کر دیا گیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی رنج تھا۔ اس نے اہلِ مکہ کا یہ خط ملنے پر مسلمانوں کے خلاف لڑائی پر غور کرنا شروع کر دیا۔ حضورِ اقدسؐ کو جب اس بات کا علم ہوا تو آپؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس اقدام کے نتائج سے اسے آگاہ کیا۔ آپؐ نے اسے یاد دلایا کہ اس کے اپنے قبیلہ کے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی صف میں کھڑا ہونا تھا اور آپؐ نے فرمایا:

"مجھے یقین ہے کہ تم اپنے قبیلہ کے افراد کے مابین جنگ ہرگز پسند نہ کرو گے۔"

عبد اللہ بن ابی کو شاید اب تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ اسلام کے دائرہ میں انسان مکمل طور پر داخل ہوتا ہے۔ اس قدر واضح نظریۂ حیات کو قبول کر لینے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اگر زندہ رہے تو اسی مکمل ضابطۂ حیات پر قایم رہ کر زندہ رہیں گے ورنہ الٰہ العالمین اور اس کے آخری پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہُوئے اس جہان سے رخصت ہوں گے۔ اس نظریہ پر میدانِ جنگ میں عمل ابھی شروع نہیں ہُوا تھا۔ البتہ حضورؐ نے اسے ضرور سمجھا دیا ہو گا اسی وجہ سے عبد اللہ بن ابی نے باولِ ناخواستہ مسلمانوں کو مدینہ سے بجبر نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ تاریخ اس بات پر خاموش ہے مگر بعد کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ کے حملہ کے پیشِ نظر مدینہ کا دفاع کرنے کا فیصلہ اسی محفل میں یا اس کے جلد بعد کر لیا گیا اور دفاعی امور کے علاوہ مدینہ کی سیاسی زندگی کی قیادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دی گئی۔ حضورؐ نے مدینہ کے دفاع کے لیے جو اقدامات ہاتھ میں لیے ان میں سے تین پہلو نمایاں ہیں:

اولاً مدینہ کو تحریری آئین عطا کیا۔ اس آئین کی رُو سے اختلافی مسائل کا فیصلہ آپؐ کے ہاتھ میں دیا گیا۔ جنگ سے متعلق مختلف قبائل کی ذمہ داریاں اور ان کی حدود کا واضح تعین کیا گیا۔

دوم امورِ خارجہ بھی آپؐ ہی کے دستِ مبارک میں دیے گئے اور آپؐ نے سفارتی سفر کے ذریعہ تزویراتی اہمیت کے علاقوں میں مدینہ کا اثر و رسوخ قایم کرنا شروع کر دیا۔

تیسرا پہلو سپاہ کی عسکری تربیت اور مختلف عہدوں کے لیے افسروں کو تیار کرنا تھا۔ اس پہلو کو بھی حضور اقدسؐ نے اپنے دستِ مبارک میں لیا۔ سپاہ کی عسکری تربیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ مہاجر صحابۂ کرامؓ کے لیے مدینہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اور اس علاقہ کے رہنے والے قبائل، وہاں کا جغرافیہ اور وہاں کی آب و ہوا، یہ سب باتیں نئی تھیں۔ ان کے لیے ان باتوں سے واقفیت اور ان باتوں کا عادی ہونا اور بدلے ہوئے حالات میں جنگی ماحول کی صعوبتوں کے لیے تیار رہنا بھی ضروری تھا۔

حضور سرور دو عالمؐ نے جو آئین مملکتِ مدینہ کے لیے منظور فرمایا اور جس پر تمام قبائل نے اتفاق کیا اسے "میثاق مدینہ" کا نام دیا گیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ عہد نامہ عالم انسانی کا پہلا تحریری آئین ہے۔ اس میں اجتماعی زندگی کے وہ تمام پہلو موجود ہیں جو مملکت کو بطریق احسن چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ غزواتِ ختم الرسلؐ کے مطالعہ کے لیے البتہ صرف ان اشقاق کا ذکر ضروری ہوگا جو دفاعِ مدینہ سے متعلق ہیں:

ا۔ وہ یہودی جو مسلمانوں کی پیروی کریں گے ان کی مدد کی جائے گی اور ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے گا۔

ب۔ جب مسلمان اللہ کی راہ میں جنگ کر رہے ہوں گے تو (کسی فریق کی طرف سے) علیحدہ صلح نہیں کی جائے گی۔

ج۔ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

د۔ جب یہودی مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے ہوں گے تو وہ اپنے اخراجات خود برداشت کریں گے۔

ھ۔ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر کوئی (فریق) بھی جنگ کا اعلان نہیں کرے گا۔

و۔ اس دستاویز میں شامل فریق ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

ز۔ جب تک جنگ جاری رہے گی یہودی مسلمانوں کو جنگ کے اخراجات کا حصہ ادا کریں گے۔ (یعنی جب جنگ میں شریک نہیں ہوں گے تو بھی جنگ کے اخراجات کا حصہ ادا کریں گے)

ح۔ یثرب کو اس دستاویز میں شریک فریقوں کے لیے حرم (امان گاہ) کا مقام حاصل ہوگا۔

ط۔ قریش اور ان کے حلیفوں کی مدد نہیں کی جائے گی۔

ی۔ دستاویز میں شامل فریق یثرب پر حملہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کو آئیں گے۔

"میثاق مدینہ" کی ان اشقاق سے چند باتیں ذہن کے سامنے آتی ہیں:

۱۔ مدینہ کو باقاعدہ آزاد مملکت کا مقام دیا جا چکا تھا۔ اس دستاویز کے ذریعہ بیرونی دنیا کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ مدینہ اب چند غیر منظم اور غیر متمدن قبائل کی بستی نہیں بلکہ ایک باقاعدہ ریاست ہے جس کا اپنا آئین، اپنا قانون، اپنی تنظیم ہے اور اپنی بین الاقوامی حیثیت ہے۔ اکثر مورخین بعد کے واقعات پر رائے زنی کرتے ہوئے اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

۲۔ قریشِ مکہ کو مدد نہ دینے کا بالاتفاق رائے فیصلہ، مدینہ پر حملہ ہونے کے احتمال کا اندیشہ اہل قریش کے حلیفوں کا ذکر۔ یہ سب ایسی حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے جن کو ہر وقت نگاہ کے سامنے رکھنا پڑے گا۔ قریش مکہ کی جانب سے حملہ کرنے کے فیصلہ کی خبر کی توثیق کے علاوہ یہ امر بھی اہل مدینہ کے علم میں تھا کہ اہلِ مکہ جب مدینہ پر حملہ آور ہوں گے تو ان کے حلیف قبیلے ساتھ ہوں گے۔ بعد کی مہموں سے اس تشویش کی صداقت کا ثبوت ملتا ہے۔

۳۔ یہودیوں کے قبائل اور دوسرے قبائل جو مدینہ میں آباد تھے ان سب کو اس بات کا احساس تھا کہ متحدہ دفاع کے بغیر ریاست مدینہ کی بقا ناممکن ہے۔ یہی وجہ تھی ورنہ آج تک اہل مدینہ کو متحدہ دفاع کا خیال تک پیدا نہیں ہوا تھا۔

۴۔ شق "الف" سے ثابت ہوتا ہے کہ تعداد کی کمی کے باوجود مسلمانوں کا وقار نہایت بلند تھا۔

۵۔ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے پیش ہونے کے یہ معنے تھے کہ فیصلہ قرآن کی رُو سے ہوگا اور حضور اقدسؐ اس فیصلہ کو سنائیں گے۔

۶۔ جنگ کے اعلان کی حضورؐ کے علاوہ کسی اور کو اجازت نہ ہونے کے یہ معنے ہیں کہ حضور اقدسؐ کو سربراہِ مملکت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔

۷۔ شق "ب" سے یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے علاوہ مسلمانوں کا کسی جنگ میں شامل ہونے کا امکان نہ تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران کسی فریق کو علیحدہ صلح کی اجازت نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ کوئی فریق اگر خفیہ طور پر دشمن کے ساتھ مل گیا ہو اور مسلمانوں سے پوشیدہ دشمن کے ساتھ صلح کرے اور پھر اس معاہدہ کو سامنے رکھ کر یہ کہے کہ مسلمان ہمارے حلیف ہوتے ہُوئے ہمارے دوست کے ساتھ کیوں لڑتے ہیں۔ ایسے موقع کی پیش بینی کے طور پر یہ شق داخل کی گئی تھی۔ بعد کے واقعات نے اس شک کو درست ثابت کر دیا۔

۸۔ شق "ز" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "یہودی" اگر جنگ میں شامل نہ بھی ہوں تو جب تک جنگ جاری رہے گی انھیں جنگ کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرنا ہوگا۔

غزواتِ ختم الرسلؐ کے دوران کے اکثر واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ "میثاقِ مدینہ" کی طرف وقتاً فوقتاً رجوع کیا جائے ورنہ غلط رائے قایم ہو جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ غزواتِ نبویؐ کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں ایک مستقل اور مربوط جنگ کا مقام دیا جائے اور ہر مہم کو علیحدہ وحدت یا اکائی سمجھ کر اسے جنگ کا نام نہ دیا جائے۔ حضور اقدسؐ کی اس جنگ کا آغاز اہلِ مکہ کے اُس خطے سے ہوتا ہے جس کا ذکر آ چکا ہے اور جسے اعلانِ جنگ کا مقام حاصل ہے۔ اس جنگ کا اختتام آج تک نہیں ہوا۔ البتہ غزواتِ نبویؐ تبوک کے غزوہ پر ختم ہو گئے تھے اور اس کے بعد نئے دور میں اسلام اور اسلام کے زیرِ نگیں سرزمین کا دفاع کرنے کے لیے حضور اقدس کے جانشینوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کیں۔ بیعت عقبہ ثانی کا واقعہ ہے کہ عباس بن عبادہ نے کہا:

> "اے اہلِ خزرج! تمھیں کچھ احساس ہے کہ تم کس بات کا وعدہ کر رہے ہو۔ تم ہر ایک سے جنگ کرنے کا وعدہ کر رہے ہو ...."

اور جب کبھی کسی نظامِ حیات کو "اللہ کے بندوں" کی جانب سے یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا عطا کردہ نظام نافذ کریں گے تو انھیں اپنے آپ کو اور اپنے عقاید کو بچانے کے لیے تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک اللہ کا نام لینے والوں کا وجود قایم رہے گا اور اس فلسفہ حیات کے منکر بھی موجود ہوں گے۔

بیعت عقبہ ثانی کے واقعہ کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ سعد بن ضرارہ کے الفاظ تھے،

> "تم جانتے ہو کہ کس بات کا وعدہ کر رہے ہو۔ یہ عرب و عجم کے ساتھ جنگ کا وعدہ ہے۔ یہ پورے عالم انسانی کے ساتھ جنگ کرنے کا وعدہ ہے۔"

عجیب اتفاق ہے کہ یہ وعدہ شعوری اور غیر شعوری طور پر آج چودہ صدیوں کے بعد بھی پُورا کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر جب عباس بن عبادہ نے فوراً غیر مسلموں پر ٹوٹ پڑنے کا خیال ظاہر کیا تو حضورؐ نے فرمایا:

"ابھی اللہ کی جانب سے لڑائی کی اجازت نہیں ملی"

بجا ارشاد تھا۔ اللہ کی راہ میں اللہ کے احکام کے مطابق ہی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ ہماری رائے میں کسی مکتب خیال یا دین و مذہب کے نزدیک لڑائی کے دوران اپنے قوانین، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنے عقاید کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا جتنا کہ غزوات نبیؐ کے دوران رکھا گیا۔ مین لڑائی کے دوران اگر کوئی فرار ہوتے ہوئے بھی کلمہ طیبہ پڑھ لیتا تھا تو حکم تھا کہ اٹھا ہوا تلوار گیر ہاتھ رک جانا چاہیے۔ جب دشمن شکست تسلیم کر لیتا تھا تو اسے فوراً معاف کر دیا جاتا تھا اور اس کی املاک پر اسے قابض رہنے دیا جاتا تھا۔ خصوصیت صرف غزوات نبوی میں پائی جاتی ہے کہ یہ جنگ امن و امان قایم کرنے کے لیے لڑی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے ادوار میں مسلمان سپاہ کا برتاؤ مفتوح آبادیوں کے ساتھ مشفقانہ اور مربیانہ رہا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو جس نظام حیات پر قایم رہنے کا مسلمان امت دعویٰ کرتی رہتی ہے اس نظام حیات کے قوانین کی خلاف ورزی ہوتی۔

اور یہی وہ نظام حیات ہے جس کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے قریشِ مکہ نے اس جنگ کا آغاز کیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قریش مکہ اس قدر تنگ نظر تھے کہ اپنے درمیان کسی دوسرے دین و مذہب کے وجود کو قبول نہیں کرتے تھے یا اس دین کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں کہ وہ اس کے قیام سے خائف تھے کہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا یا ان کا دین ختم ہو جائے گا۔ اس سوال کا جواب اس لیے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اکثر و بیشتر جب کوئی نیا مکتب خیال وجود میں آتا ہے اور پرانے مکتب خیال کے سربراہ اور وہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے، تو اس نئے مکتب خیال پر عقیدہ رکھنے والے افراد کے ملک بدر ہونے کے بعد یہ مخاصمت از خود ختم ہو جاتی ہے قریش مکہ کی یہ مخالفت و مخاصمت مسلمانوں کے ملک چھوڑنے پر اور بھڑک اٹھی۔ اس لیے دیکھنا پڑے گا کہ اس بڑھتی ہوئی مخالفت کی کیا وجہ تھی۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ بعثتِ نبویؐ کے وقت مکہ میں یہودی، عیسائی، صابی اور مختلف عقاید کے رکھنے والے قریش بستے تھے۔ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بُت تھے۔ کعبہ کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بت یا تصویر کا وجود بھی بتایا جاتا ہے۔ کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا طریق عبادت کیا ہے۔ ان حقایق کی روشنی میں کوئی نہایت ہی خطرناک انجام اہل مکہ کے پیش نظر ہو گا کہ انھوں نے حبشہ ہجرت کرنے والوں کو واپس لانے کی کوشش اور تحائف اور انعام و اکرام تک کے لالچ دے کر ان مہاجروں کو واپس لانا چاہا اور جب مدینہ کی ہجرت شروع ہوئی تو پوری کوشش کی کہ حضور اقدسؐ مدینہ نہ پہنچ سکیں۔ ندوہ کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ جو کوئی حضورؐ کو زندہ یا قتل کر کے واپس لائے گا تو سو اونٹوں کے انعام سے نوازا جائے گا۔ غصہ کی یہ شدت اور دشمنی کی یہ حد ہمیں اس دور کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اہل عرب ایک خاص نظام زندگی کے مطابق اپنے امور طے کیا کرتے تھے۔ اس نظام زندگی میں فرد کو مکمل مذہبی آزادی تھی۔ یعنی عہد حاضر کے نظریات کے مطابق مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ تھا۔ اسلام اس آزادہ روی کو ایک خاص نظم اور ضبط کے تحت لا رہا تھا اور فرد اور معاشرہ دونوں کو ایک واضح اور غیر مبہم نظامِ زندگی عطا کر رہا تھا۔ اہلِ قریش کے ایک موقع پر الفاظ تھے:

"اس نے ہمارے نظامِ زندگی کو جاہلانہ کہا ہے۔"

اور اس نظامِ زندگی کے خطوط اس قدر واضح تھے کہ جو اس کو قبول کرتا تھا وہ ایک نئی ملت کا فرد بن جاتا تھا۔ انھیں یہ بھی شکایت تھی کہ :

"ان کے درمیان تفریق پیدا ہوگئی ہے۔"

اور یہ نیا نظامِ زندگی لانے والا وہی قریشی تھا جسے اس کی بے داغ اور باضابطہ جوانی پر وہ برسوں سے "امین" کا لقب دے چکے تھے اور انھیں خدشہ تھا کہ اگر اس نظامِ زندگی کی تفاصیل اہلِ عرب کے سوادِ اعظم تک پہنچ گئیں تو "امینِ مکہؐ" اور اس کے اصحابؓ طاقت حاصل کرلیں گے اور پھر ہم پر غالب آجائیں گے۔"

مکی دور میں ایسے واقعات بھی گزر چکے تھے جب دوسرے قبائل کے افراد نے حضورؐ کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر ان کی شرائط آپؐ کو منظور نہ تھیں۔ بحیرہ بن فراس جو قبیلہ بنو عامر کا فرد تھا اس نے کہا تھا :

"اگر قریش کے اس آدمی کو میں اپنے ساتھ لے جاسکوں تو میں اس کی مدد سے پُورے عرب کو زیر کرلوں۔"

اور پھر حضورؐ کو مخاطب کر کے کہا :

"اگر ہم لوگ آپؐ کے تابع ہوجائیں اور خدا آپؐ کو اپنے دشمنوں کے خلاف فتح دے دے تو پھر کیا آپؐ کے بعد ہم ملوکیت حاصل کرسکیں گے ؟"

آپؐ نے فرمایا تھا :

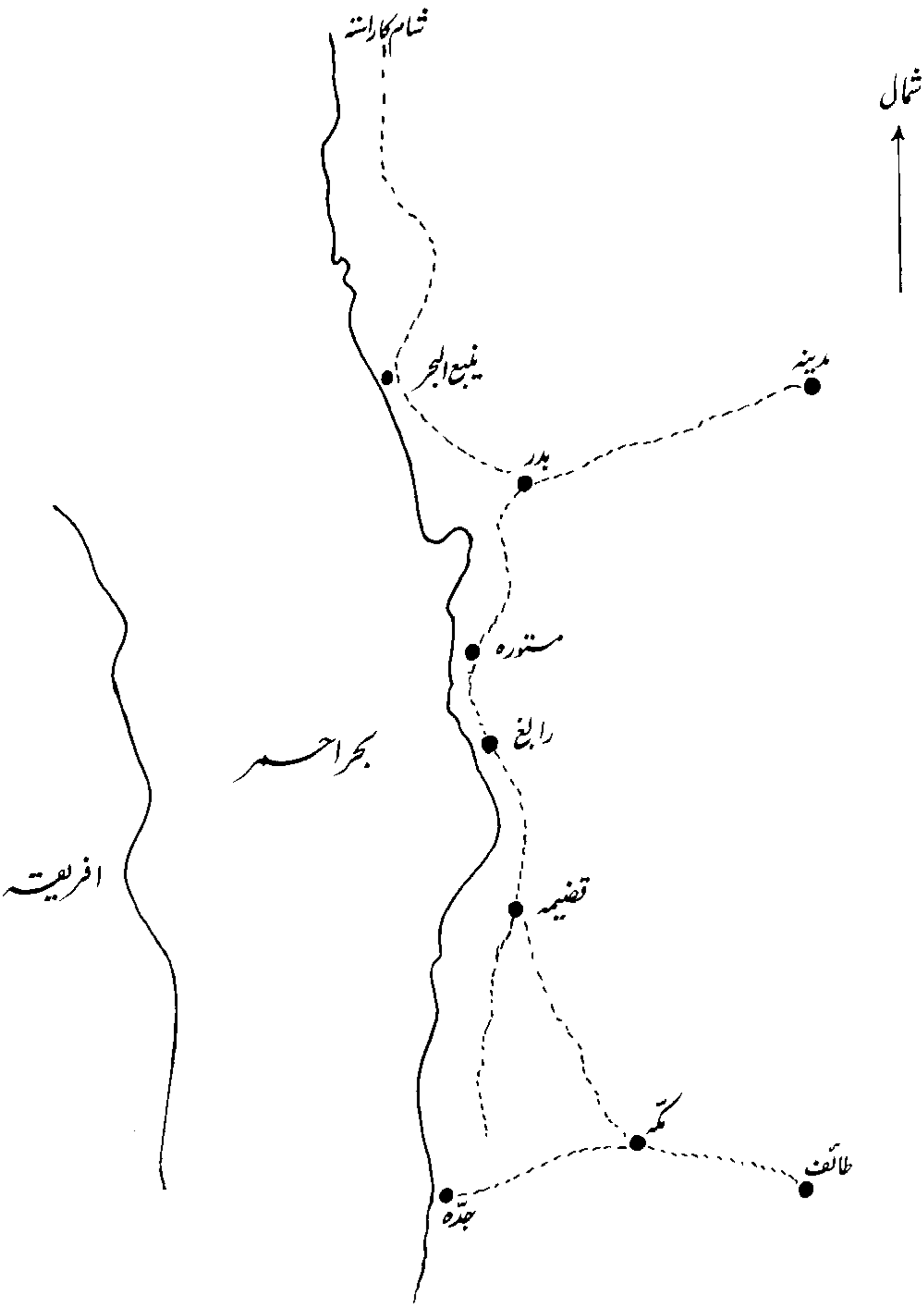
"ملوکیت ایسی چیز ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے۔"

تو وہ شخص کہنے لگا :

"تو پھر آپؐ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپؐ کو عربوں کے خلاف اپنے سینوں کے زور سے حفاظت دیں اور پھر خدا آپؐ کو فتح دے تو اس کا پھل کوئی اور کھائے۔ شکریہ، ہمیں یہ قبول نہیں۔"

یہ تھا وہ پس منظر جس نے قریشِ مکہ کو دشمنی کی انتہا تک پہنچا کر ان سے مدینہ کے خلاف اعلانِ جنگ کا مراسلہ بھجوایا۔ ظاہر ہے کہ دفاعِ مدینہ کے لیے ہر ممکن اقدام ضروری ہوگیا تھا۔ حضورِ اقدسؐ نے مدینہ کے مختلف قبائل کو ایک ہی وحدت میں منسلک کرنے کے بعد مدینہ سے مغرب کی جانب بحرالاحمر کے ساحل کے قرب وجوار میں رہنے والے قبائل کے ساتھ دوستانہ اور حلیفانہ مراسم قائم کرنے کے لیے سفارتی سفر اختیار کیا۔ اس سفر میں آپ ودآن کے مقام تک تشریف لے گئے۔ چونکہ اس سفر میں ابواء کے مقام پر بھی قیام کیا گیا اس لیے اس سفر کو غزوۂ ودان اور غزوۂ ابواء کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ غزوہ ہر اس سفر کو کہا گیا ہے جو سرورِ کونینؐ نے مدینہ سے باہر اختیار کیا۔ ضروری نہیں کہ یہ سفر جنگی مقاصد کے لیے کیا گیا ہو یا اس کے دوران کوئی جنگی کارروائی عمل میں لائی گئی ہو۔ ودآن اور ابواء کے مقامات مکہ سے مدینہ آنے والے راستہ کے قریب واقع ہونے کے علاوہ اس تجارتی شاہراہ پر واقع ہیں جو مکہ سے شام جاتی ہے اور جسے اہلِ مکہ اپنے قافلوں کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے

نقشہ "الف"



شمال
شام کاراستہ
ینبع البحر
مدینہ
بدر
مستورہ
رابغ
بحر احمر
افریقہ
قضیمہ
مکہ
طائف
جدّہ

اس سفر کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ تربیتی اور سفارتی مقاصد کی تکمیل کے علاوہ یہ سفر تزویراتی (Strategic) مقصد بھی حاصل کر رہا تھا۔
(ملاحظہ ہو نقشہ "الف")

اس سفر کے دوران حضور اکرمؐ صرف مہاجر اصحابؓ کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ ان کی تعداد ساٹھ کے قریب تھی۔ علمبردار حمزہ بن عبدالمطلب تھے۔ شاید اس لیے کہ مہاجر اصحاب اس علاقہ اور وہاں کے جغرافیہ سے ناواقف تھے اور ان کی تربیت مقصود تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ ابھی انصار صحابہ پر بوجھ ڈالنا چاہتے ہوں۔ اس سفر کے تمام مقاصد حاصل ہو گئے۔ ابو ضمرہ جو اس علاقے کا بارسوخ قبیلہ تھا اس کے سردار مخشی بن عمرو الضمری کے ذریعہ سمجھوتہ ہوا جس کی رُو سے ضمرہ قبیلہ اور مدینہ کے درمیان ان ہی شرائط پر معاہدہ ہوا جو میثاق مدینہ کے مطابق دوسرے قبائل کے ساتھ طے پائی تھیں۔ اس کے علاوہ جہینہ قبیلہ کے ساتھ معاہدہ طے پایا کہ اگر مکہ اور مدینہ کے درمیان لڑائی ہوئی تو یہ قبیلہ غیر جانب دار رہے گا۔ یہ سفر (غزوہ) صفر ۲ ہجری میں اختیار کیا گیا اور اس میں حضورؐ اور آپؐ کے ساتھی تقریباً پندرہ بیس دن مدینہ سے غیر حاضر رہے۔ اس کے دوران کسی طرح کا کوئی مقابلہ پیش نہیں آیا جو ذرائع اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ غزوہ بنو ضمرہ کے خلاف حملہ کرنے کے لیے یا قریش مکہ کے کسی قافلہ کا راستہ روکنے یا لوٹنے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا وہ غلطی پر ہیں۔ ابھی قریش کا کوئی قافلہ شام نہیں گیا تھا اور بنو ضمرہ کی جانب سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی کہ ان پر حملہ کیا جاتا اور حضور اقدسؐ کے سامنے لڑائی کی جو اجازت تھی (۲۲ : ۲۹) اور جنگ کرنے کا جو حکم تھا (۲ : ۲۱۶ اور ۹ : ۳۶) ان کے الفاظ سے واضح ہے کہ جنگ انہی کے ساتھ کی جا سکتی تھی جو پہل کرنے کے مجرم تھے اور "ولا تعتدوا" کہہ کر پہل اور زیادتی کرنے سے روک دیا گیا۔ سراپا "خلق قرآن" سے کون توقع کر سکتا ہے کہ خالق العالمین کے حکم کے خلاف کوئی اقدام عمل میں آتا۔

اس سفر کی خبر جب مکہ پہنچی تو انھیں اپنی تجارتی شاہراہ کے مسدود ہونے کا خدشہ پیدا ہوا۔ انھوں نے عکرمہ بن ابی جہل کی کمان میں تین سو کا لشکر روانہ کیا تاکہ ساحلی علاقہ کے قبائل پر مکہ کا رعب قائم رہے اور وہ تجارت کا راستہ نہ روکیں۔ اغلباً اس لشکر کے بھیجنے کا یہ مقصد بھی تھا کہ مدینہ پر بھی حملہ کیا جائے۔ مورخین اس موقع پر بھی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ انہوں نے قریش کے اس تین سو کے لشکر کو تجارتی قافلہ قرار دیا ہے حالانکہ کسی تجارتی قافلہ کے ساتھ تین سو محافظ نہیں ہو سکتے۔ محافظوں کی اتنی تعداد اگر ضرورت ہو تو تجارت غیر نفع بخش بن جاتی ہے۔

حضور اقدسؐ کی عسکری استخبارات کا محکمہ اس قدر مکمل تھا کہ مکہ کی ہر حرکت کی اطلاع آپ کو بروقت مدینہ پہنچ جاتی تھی۔ خیال ہے کہ اس مرتبہ بھی مکی لشکر کی روانگی کی اطلاع بروقت آپؐ کو مل گئی اس لیے کہ حضورؐ نے عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب کو ساٹھ مہاجروں کی کمان سونپ کر اس مکی لشکر کے مقابلہ کے لیے روانہ فرمایا۔ دونوں لشکر ثنیۃ المرع کے قریب آمنے سامنے ہوئے۔ مکی لشکر سے دو بارسوخ آدمی بھاگ کر مدنی لشکر میں شامل ہو گئے۔ ان کے نام المقداد بن عمرو البحرانی جو بنو زہرہ قبیلہ کا حلیف تھا اور عتبہ بن غزوان بن جابر المزینی جو بنو نوفل کا حلیف تھا، بتائے گئے ہیں۔ دو ایسے افراد کا لشکر سے دوڑ کر دشمن کی صفوں میں شامل ہو جانا جو بارسوخ تھے اور طاقتور قبائل کے حلیف تھے اور ساتھ ہی مدنی لشکر سے تیراندازی کا شروع ہو جانا، ان دونوں باتوں

نے مکی کمانڈار کو خوفزدہ کر دیا۔ تیر اندازی میں پہل سعد وقاص کی جانب سے بتائی جاتی ہے۔ ممکن ہے اور مجاہدوں نے بھی تیر پھینکے ہوں۔
مکی کمانڈار نوعمر اور ناتجربہ کار تھا۔ وہ اس بدلتی ہوئی حالت کا مقابلہ نہ کرسکا اور کمبلٹ گیا۔ مدنی لشکر نے بھی مزید مزاحمت مناسب
نہ سمجھی اور عسکری ترتیب کو قایم رکھتے ہوئے مدینہ کا رُخ کیا۔ اگر مکی لشکر نہ ہوتا اور مکی تجارتی قافلہ ہوتا اور اس کے محافظ یوں بھاگ کھڑے
ہوتے تو مدنی لشکر ضرور اس قافلہ کو لوٹ لیتا۔ مگر چونکہ وہاں کسی قافلہ کا وجود نہ تھا اس لیے مدنی لشکر نے اپنے سے پانچ گنا بڑے لشکر کو
عقب نشینی کرنے دی۔ یہ سریہ صفر ۲ ہجری کے آخری ایام میں واقع ہوا۔

اس ناکامی پر قریشِ مکہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ابوجہل قریش کا سرکردہ رہنما تھا۔ اس کے لڑکے کو میدانِ جنگ میں ناکامی
ہوئی تھی۔ اس لیے ایک اور مہم تیار کی گئی۔ اس بار ابوجہل تین سو کا لشکر لے کر خود روانہ ہوا۔ اس بار مدینہ سے حضور اقدسؐ نے حضرت حمزہ
بن عبدالمطلب کو تیس مہاجر دے کر روانہ کیا تاکہ مکی لشکر مدینہ کے قریب نہ آسکے۔ دونوں لشکر ساحلی علاقے میں آمنے سامنے ہوئے
مگر قبیلہ مجدی بن عمرو الجہنی نے دونوں لشکروں کو لڑنے سے باز رکھا۔ حضور اکرمؐ کے پہلے سفر غزوہ ودان کے دوران اس قبیلہ کے
ساتھ غیر جانبداری کا معاہدہ ہوا تھا اور اسی بناء پر اس قبیلہ کے سردار نے لڑائی نہ ہونے دی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس بار بھی مورخ
اس سریہ کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قریشِ مکہ کا ایک قافلہ شام سے آرہا تھا اور حضورؐ نے اس کو لوٹنے کے لیے یہ سریہ روانہ فرمایا تھا۔ اہلِ مکہ
کے پاس اتنے محافظ ہرگز نہ تھے کہ وُہ ہر ماہ تین سو محافظوں کو قافلوں کی حفاظت کے لیے روانہ کرسکتے اور نہ ہی ان کی جانب سے ہر ماہ
ایک قافلہ روانہ ہوسکتا تھا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم انتہائی خلوص اور
محنت سے مرتب کی ہوئی کتب تواریخ سے اختلاف کریں۔ البتہ عسکری پہلوؤں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہم ان مورخوں کی آراء سے
اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ غزوات اور سرایا عمل میں آئے۔ یہ رائے ہے کہ ان کی تہہ میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ
علیہ وسلم کا مقصد کون سا تھا۔ ایک نوزائیدہ مملکت دو ماہ میں تین بار قافلوں کو لوٹنے کے ناکام سفر اختیار نہیں کرسکتی۔ ایک نئے
نظامِ حیات کے گنتی کے چند داعی جو اپنی حفاظت اور پناہ کے لیے اہلِ مدینہ کا سہارا ڈھونڈنے پر مجبور ہوئے تھے وہ نئی مملکت کو
وجود میں لانے کے چند ماہ بعد اپنے میزبانوں سے مشورہ کیے بغیر اپنے دشمنوں کے خلاف پہل نہیں کرسکتے۔ خصوصاً جب پہل کرنا
خود ان کے عقیدہ، طبیعت اور احکامِ الٰہی سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس سریہ کو سریۂ سیف البحر کا نام دیا گیا ہے اور یہ
ربیع الاول ۲ ہجری میں واقع ہوا۔

غزوہ ودان کے بعد مکہ کی جانب سے دو بار پہل ہوچکی تھی۔ ضروری محسوس ہو رہا تھا کہ مملکتِ مدینہ کے سربراہ اور
کمانڈر اعظمؐ بنفسِ نفیس اس تزویراتی علاقہ کا دورہ کرتے، وہاں کے قبائل سے راہ و رسم بڑھاتے، دوستوں کو تسلی دیتے،
کمزور قبائل کی ہمت بڑھاتے تاکہ مملکتِ مکہ کے طاقتور اور بارسوخ قبیلۂ قریش کو نامناسب اہمیت نہ مل سکے۔ یوں بھی
ہر مملکت اپنے اثر و رسوخ کے علاقہ میں اور خاص طور پر اپنی مملکت کے سرحدی علاقوں میں علمبردار گشت (FLAG MARCH) کے
ذریعہ اپنا وقار قایم رکھا کرتی تھی۔ مملکتِ مدینہ کو تو ابھی اپنی سپاہ کی تربیت کو بھی مکمل کرنا تھا۔ سریۂ سیف البحر کی واپسی کے بعد
حضور اقدسؐ ساٹھ کے قریب مہاجر اصحاب کو ہمرکاب لے کر ایک اور سفر پر روانہ ہوئے۔ یہ سفر بھی ربیع الاول ۲ ہجری میں کیا گیا ہے

اور اس کو غزوۂ بواط کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سفر کے دوران بواط کے مقام تک گشت کی گئی۔ اس غزوہ کے دوران بھی کسی دشمن سے آمنا سامنا نہیں ہوا۔ مورخوں نے اس غزوہ کو بھی اہل قریش کے قافلہ کے خلاف کارروائی بتایا ہے۔ اور اس بار پھر غلطی کی ہے۔

جمادی الاولیٰ ۲ ہجری کے دوران حضورؐ پھر بیرونِ مدینہ تشریف لے گئے۔ اس بار پھر ساحلی علاقہ تک اپنے سفر کو محدود رکھا اور بنو مدلج کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا۔ یہ قبیلہ بنو ضمرہ کا حلیف تھا جن کے ساتھ غزوۂ ودان کے دوران معاہدہ طے پا چکا تھا اس سفارتی اور تربیتی غزوہ کو بھی مورخوں نے قریش کے تجارتی قافلہ کے خلاف کارروائی بتایا ہے حالانکہ ان ایام میں اس علاقہ میں کسی تجارتی قافلہ کا وجود نہ تھا۔ اس سفر کو غزوہ ذوالعشیرہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے دوران حمزہؓ بن عبدالمطلب علمبردار تھے اور تقریباً ساٹھ ستر مہاجر صحابہ ہمرکاب تھے۔

جنگی کارروائیوں کا آغاز کیے مکہ کو کافی عرصہ گزر چکا تھا اور ابھی تک تیر نشانہ پر نہ بیٹھا تھا۔ بین القبائلی حالات مکہ کے مخالف جا رہے تھے۔ بین الاقوامی سطح پر رائے عامہ بڑا دخل رکھتی ہے۔ جب کسی مملکت کے دوستوں اور حلیفوں میں کمی واقع ہونا شروع ہو جائے تو اسے کوئی غیر معمولی قدم اٹھانا پڑتا ہے ورنہ بین الملکی سطح پر اس کا وقار گرنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس خیال سے مکہ کی جانب سے کرز بن جابر الفہری کی کمان میں ایک تیز رفتار گشت روانہ کی گئی جس نے رات کی تاریکی میں مدینہ کے باہر کھیتوں اور باغوں کو نقصان پہنچایا اور کچھ جانور ہانک کر لے گئی۔ دوسری صبح اطلاع ملنے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساٹھ مہاجر اصحاب کا لشکر مرتب کیا اور کرز بن جابر کا تعاقب کیا۔ مکی گشت غیر معروف راستوں سے ہوتی ہوئی نکل گئی اس لیے آپؐ بدر کے مقام سے واپس مدینہ چلے گئے۔ اس مہم کو غزوہ صفوان اور غزوۂ بدرالاولیٰ کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ جمادی الآخر ۲ھ ہجری کا واقعہ ہے۔ اس غزوہ کے دوران علیؓ بن ابی طالب علمبردار تھے اور زیدؓ بن الحارثہ کو مدینہ میں نیابت عطا کی گئی تھی۔

کرز بن جابر کے چھاپہ کے جلد بعد اطلاع ملی کہ ایک اور مکی گشت مدینہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ حضورؐ نے سعدؓ ابن ابی وقاص کو آٹھ مہاجر اصحاب کی نظارتی گشت پر روانہ فرمایا۔ وہ خرار اور جحفہ کے مقامات تک گئے مگر دشمن لوٹ گیا تھا۔ یہ سریہ رجب ۲ھ میں واقع ہوا اور اس کے دوران میں مقداد بن عمرو علمبردار مقرر کیے گئے تھے۔

اسی ماہ حضور اقدسؐ نے ایک اور نظارتی گشت روانہ کی تاکہ مکہ کے جنوب کے علاقہ میں مکی نقل و حرکت کی اطلاع لے آئے۔ اس گشت کے کماندار عبداللہ بن جحش مقرر ہوئے۔ انھیں ملفوف احکامات دیے گئے اور حکم دیا گیا کہ ملفوف احکامات تین دن کی مسافت کے بعد کھولے جائیں۔ انھوں نے تحریری احکام کے مطابق کوچ جاری رکھا اور مکہ کے جنوب میں نخلہ کے مقام پر جا کر رکے تاکہ مکی نقل و حرکت معلوم ہو سکے۔ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ کسی قسم کی لڑائی یا چھاپہ وغیرہ کی کوشش نہ کریں۔ نخلہ کے مقام پر ایک مکی قافلہ بھی آ کر رکا۔ عبداللہ بن جحش نے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قافلہ لوٹ لیا اور اس کے دو محافظ قید کر لیے گئے۔ حملے کے دوران ایک محافظ عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ مدینہ پہنچنے پر انھیں سرزنش ہوئی اور قافلہ کا سامان لوٹا دینے کے علاوہ مقتول کا خون بہا ادا کیا گیا۔

جنگ کے اس پہلے دور کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ عرصہ بیشتر ایک دوسرے کی طاقت معلوم کرنے، سفارتی تعلقات بڑھانے اور چھوٹی مہموں کی ترسیل میں گزارا گیا۔ قریش مکہ نے چار بار کوشش کی کہ مدنی مفادات کو نقصان پہنچائیں۔ مگر وہ صرف ایک بار کامیابی سے حملہ آور ہو سکے تھے۔ دُوسری طرف مدینہ نے بھی سریہ نخلہ کے دوران مکہ کو نقصان پہنچایا تھا گو اس نقصان کی تلافی کر دی گئی تھی۔ اس کے برعکس مدینہ کو سفارتی کوششوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ اس کی تین مہمیں مدافعانہ تھیں اور ایک مہم اس لیے نکالی گئی تھی کہ کی چھاپہ مار گشت کا تعاقب کیا جائے۔ قریش مکہ بہر نوع طاقتور فریق تھے۔ ان کے تعلقات جزیرۃ العرب کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے حلیفوں کی تعداد ان گنت تھی اور یہ حلیف یمن سے لے کر شام کی سرحدوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ قریش مکہ جنگ کے ان اوّلیں ایام کے نتیجہ سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس دور کے غیر جانبدار مبصر ضرور محسوس کر سکے ہوں گے کہ اب مکہ کی جانب سے کوئی اہم قدم اٹھایا جائے گا۔ یہ ممکن اقدام کس صورت میں رونما ہو گا۔ اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا تھا کہ مکہ اب براہِ راست مدینہ پر حملہ آور ہو گا۔ مگر رائے عامہ کو استوار کرنے کے لیے وُہ کیا کرے گا اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

مکی مدنی جنگ شروع کرنے والوں کو یہ احساس نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داخلی اور خارجی سطح پر خاطر خواہ انتظام کر سکیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے اب تک جو مہمیں روانہ کی تھیں ان میں قریش مکہ نے اپنی پوری طاقت استعمال نہیں کی تھی۔ اب انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی اس غلط معاملہ فہمی کی وجہ سے مدینہ دن بدن طاقت پکڑتا جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتے تھے کہ اگر مدینہ کے استحکام اور بین القبائلی سطح پر تعلقات بڑھانے کی یہ رفتار جاری رہی تو عرب کا اچھا خاصا حصہ مدینہ کا حلیف بن جائے گا اور پھر نیا نظامِ زندگی قبول کر لیا جائے گا۔ اس نظامِ زندگی کو اسی وجہ سے وُہ کہیں باہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ اس کا حبشہ میں جڑیں پکڑ لینا بھی انھیں منظور نہ تھا۔ اب وُہ مدینہ میں قائم ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی ریاست تھی جس میں اس نظامِ زندگی کا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس دین کے لانے والے کی حیثیت اب سربراہِ مملکت کی تھی اور یہ سربراہِ مملکت وہی تھا جسے وہ "امین" کا لقب دے چکے تھے اور جزیرۃ العرب اسؐ کی نیک نامی، بلند اخلاق اور صداقت و سخاوت کو تسلیم کرتا تھا۔ ان کے لیے ایک ہی راستہ کھلا تھا اور وُہ یہ کہ اپنی پوری طاقت کو مجتمع کر کے مدینہ پر حملہ کریں اور اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ انہوں نے ایک بار حضورؐ کے چچا حضرت ابو طالب سے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہا تھا:

"اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس نے تمہارے دین کی مخالفت کی ہے اور تمہارے آبا و اجداد کے دین کی مخالفت کی ہے۔ اس نے تمہاری قوم میں افتراق پیدا کیا ہے اور ہمارے نظامِ زندگی کا مضحکہ اڑایا ہے۔ (ہمیں دے دو) تاکہ ہم اس کا خاتمہ کر دیں۔"

حضور کا خاتمہ کرنے کی کوشش ہجرت کی شب تک جاری رہی تھی۔ ان کی اس ناکامی نے انھیں جنگ شروع کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

"آج دنیا کتنی مختلف ہوتی اگر قریش کے سربراہ منتخب افراد کے ذریعہ قتل کروانے کی بجائے کسی دلیر آدمی کو کرایہ پر لے لیتے اور وہ خنجر ہاتھ میں لے کر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گھر چلا جاتا۔"

درست دنیا مختلف ضرور ہوتی مگر اس میں نہ علم ہوتا، نہ فن، نہ سائنس، نہ فلسفہ۔ اور اگر "طلب العلم" کا حکم آپؐ کی جانب سے انسانیت کو نہ ملا ہوتا تو آج انسان نہ چاند کے راز ہائے سربستہ پر عبور حاصل کرتا اور نہ ہی رحم و کرم اور امن و صلح کی زندگی کا خواہاں ہوتا۔ قریشِ مکہ بھی شاید دنیا کو اس کے پرانے رنگ پر قایم رکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے حضور اقدسؐ کے وجود کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

اب جنگ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ انھیں اپنی پوری طاقت کو بہم کر کے مدینہ پر حملہ آور ہونا تھا مگر اس میں چند قباحتیں بھی تھیں۔ مکہ کے قریب بنو بکر کا قبیلہ تھا جس کے ساتھ مکہ کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اگر قریش اپنی پوری طاقت لے کر مکہ سے باہر چلے جاتے تو خطرہ تھا کہ بنو بکر مکہ پر حملہ آور ہو کر مکہ کو نقصان پہنچائیں گے۔ علاوہ ازیں مکہ سے مدینہ جانے کے لیے مکی لشکر کو بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے علاقوں سے ہو کر جانا پڑتا تھا اور یہ دونوں قبیلے مدینہ کے حلیف بن چکے تھے۔ ان کو مدینہ کی مدد کرنے سے روکنے کے لیے کوئی چال چلنی پڑتی تھی۔ بنو بکر، بنو ضمرہ اور بنو مدلج کو خاموش رکھنے کا ایک ہی طریقہ قریش مکہ کی سمجھ میں آیا۔ اہلِ عرب کے ہاں تجارتی قافلوں اور تجارتی شاہراہوں کو آزادی دی گئی تھی۔ اس لیے اگر قریشِ مکہ یہ ثابت کر سکتے کہ مدینہ ان کے قافلہ پر حملہ آور ہو رہا ہے تو بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے دو قبیلے مکی لشکر کے راستہ میں حائل ہونے سے احتراز برتیں گے اور بنو بکر مکہ پر حملہ آور نہ ہوں گے اس فیصلہ کو انتہائی صیغۂ راز میں رکھا گیا اور نہایت چالاکی سے ڈراما کھیلا گیا۔

ایک بہت بڑا قافلہ شام روانہ کیا گیا جس میں کوشش کی گئی کہ مکہ کے زیادہ سے زیادہ گھروں کا مال تجارت شامل ہو۔ کہا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی گھر یا خاندان ہو جس نے اس قافلہ کے ذریعہ شام سے سامان نہ منگوایا ہو۔ اس کے علاوہ سامانِ حرب بھی کافی مقدار میں منگوایا گیا تاکہ مدینہ کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ جب یہ قافلہ دمشق سے روانہ ہوا تو زرقہ کے مقام سے ضمضم نامی قاصد کو روانہ کیا گیا۔ اس نے مکہ پہنچ کر اونٹ کا پالان الٹا کیا اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ جہاں سے گزرتا چیخ چیخ کر پکارتا کہ "محمدؐ اور اس کے ساتھی قافلہ لوٹنے کے لیے گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں، پہنچو اور اپنے قافلہ کو بچاؤ۔۔۔"

شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہر ایک نے اس قافلہ کے ذریعے سامان منگوایا تھا اور اب اس کے لٹ جانے کا خطرہ تھا پہلا قدم درست پڑا تھا۔ اہلِ مکہ کی ہمدردی حاصل ہو چکی تھی۔ دوسرا مرحلہ بنو بکر کو خاموش کرنا تھا۔ اس پر چار دن صرف ہوئے۔ انہوں نے مدد کے طور پر اپنے آدمی تو نہ بھیجے البتہ اقرار کیا کہ مکی فوج کی غیر حاضری میں مکہ پر حملہ آور نہ ہوں گے۔

ضمضم کے مکہ پہنچنے کے پانچ چھ روز بعد مکی لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ اغلباً اس دوران شام کی شاہراہ پر رہنے والے قبائل جو مدینہ کے حلیف تھے انھیں بھی مطلع کر دیا گیا ہو گا کہ مکی لشکر کی نقل و حرکت محض اپنے قافلہ کو بچانے کی غرض سے کی جا رہی تھی۔ مکی لشکر کو بدر پہنچنے میں دس دن صرف ہوئے۔ نجد کے رہنے والے دو قبیلے بنو غطفان اور بنو سُلیم بھی مکی لشکر کے ہمراہ بدر پہنچے۔

اُدھر مدینہ میں مکی لشکر کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیے آپؐ نے دو آدمیوں کو اس غرض سے روانہ کیا کہ مکی لشکر کی آمد وغیرہ کی نقل و حرکت کی خبر رکھیں۔ حضور اقدسؐ نے اس مرتبہ تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے پورے حالات بیان فرمانے کے بعد ان کی آراء دریافت کیں۔ مہاجر اصحاب میں سے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عمرؓ اٹھے اور انھوں نے

مکمل وفاداری کا یقین دلایا۔ پھر مقدادؓ اٹھے اور انھوں نے بھی مکمل وفاداری کا اعلان کیا۔ اب حضورؐ نے نگاہ انصار اصحاب کی جانب کی۔ انصار اصحاب کی طرف سے حضرت سعدؓ بن معاذ اُٹھے اور انھوں نے بھی مکمل فرمانبرداری کا یقین دلایا۔ اب آپؐ نے فرمایا:

"..... مجھ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ دونوں میں سے ایک ہمارے ہاتھ آئے گا۔"

یعنی حضورؐ کو علم تھا کہ مکی لشکر روانہ ہو چکا ہے اور مکی تجارتی قافلہ اپنے واپسی سفر پر شام سے روانہ ہو چکا ہے۔ مدنی لشکر تین دن میں بدر پہنچا تو مکی لشکر بدر کی وادی کے جنوبی کونے پر پہنچ چکا تھا اور قرآن مجید کے مطابق مکی قافلہ پاس ہی نیچے ساحل کے قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا:

اذ انتم با لعدوۃ الدنیا وھم با لعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم۔	جس وقت تم (درے کے) قریب والے کونے پر تھے اور وہ دُور والے کونے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے (کی طرف) تھا۔

چونکہ تینوں مشیتِ ایزدی سے ایک ہی وقت پر ایک ہی جگہ اکٹھے ہو گئے تھے اللہ العالمین اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے:

ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد۔ (الانفال ۸:۴۲)	اور اگر تم (لوگ آپس میں) وعدہ کرتے تو وعدہ ہرگز ایفا نہ کر سکتے" (اکٹھے اس مقام پر نہ پہنچ سکتے تھے)

کوئی تاریخ کی کتاب اور کوئی روایت کتنی ہی مستند کیوں نہ ہو قرآن کے مقابلہ میں اس کا صحیح ہونا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکی اور مدنی لشکر اور مکی قافلہ بدر کے مقام پر ایک ہی وقت میں موجود تھے اور قافلہ مدنی لشکر کی موجودگی سے آگاہ ہو کر اور راستہ بدل کر مکہ کی جانب بڑھ نہیں گیا تھا۔

جو روایات مختلف کتبِ تواریخ میں دی گئی ہیں اور اس واقعہ کے متعلق جو تفاصیل بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابن اسحاق جملہ سیرت نگاروں میں اولیت کا مقام رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ ابوسفیان بن حرب شام سے ایک بہت بڑے قافلہ کے ساتھ آرہا تھا..... اس کے محافظ صرف تیس یا چالیس آدمی تھے ......"

اس کے بعد لکھتا ہے:

"محمد بن مسلم اور عاصم بن عمر بن قتادہ اور .... اور .... نے مجھے واقعہ کا کچھ حصہ سنایا اور ان سب کے بیان سے میں نے بدر کے واقعہ کا بیان مرتب کیا ہے۔"

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا کہ ابوسفیان شام سے واپس آرہا تھا تو آپؐ نے مسلمانوں کو بلایا اور کہا:

"یہ قریش کا قافلہ ہے جس میں ان کا سامان ہے۔ جاؤ اور اس پر حملہ کرو شاید اللہ اس کو تمہارے ہاتھ میں

دے دے۔"

لوگوں نے آپؐ کی اس دعوت کو قبول کیا۔ کسی نے شوق سے اور بعض نے بے دلی سے۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں حضورؐ لڑائی نہیں کریں گے۔

اس سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ بے دلی سے شامل ہوئے تھے یا جو لوگ حضورؐ کے اس سفر میں ہمرکاب نہیں ہوئے وہ قافلہ لوٹنا پسند نہیں کرتے تھے اور چونکہ لڑائی کا امکان نہ تھا اس لیے وہ بے دلی سے شامل ہوئے تھے اور بعض اسی وجہ سے شامل ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس کے برعکس ان اوائل ایام کے دوران میں بعض افراد کے رویہ پر قرآن حکیم فرماتا ہے:

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم۔ تم پر جنگ کو فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناپسند ہے۔

(البقرہ ۲ : ۲۱۶)

یہی نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ جنگ سے جی چرانے لگے اور حضور اقدسؐ کو یہ امر ناگوار گزرا تو اللہ العالمین نے آپؐ کے فرض کو واضح طور پر بیان فرما دیا:

فقاتل فی سبیل اللہ لا تکلف الا نفسک وحرض المؤمنین۔ پس تو لڑ اللہ کی راہ میں تو صرف اپنے لیے ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دے (فی سبیل اللہ جنگ کی)

(النساء ۴ : ۸۴)

یعنی حضورؐ کے ذمہ جہاد کی ترغیب دینا تھا۔ اگر لوگ اس فریضہ کو شوق سے پورا نہ کرتے تو ان کی ذمہ داری آپؐ پر نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اصحاب رسول اللہ حضورؐ کے ہمرکاب بدر گئے وہ انتہائی دلیری اور جرأت و شجاعت سے لڑے۔ تین سو تیرہ[۳۱۳] کے لشکر کے مقابلہ میں ایک ہزار[۱۰۰۰] کی جمعیت تھی۔ مکی لشکر کو تعداد کے علاوہ ہتھیاروں میں بھی برتری حاصل تھی۔ اگر لوگ بے دلی سے بدر کو روانہ ہوئے ہوتے تو لڑائی کا نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ جب حضور اقدسؐ بدر پہنچے تو مکی لشکر وادی کے دوسرے کنارہ پر پہلے سے پہنچ چکا تھا۔ جو روایتیں یہ بتاتی ہیں کہ حضور اقدسؐ کی قافلہ کے بدر پہنچنے سے قبل ہی بدر پہنچ کر اس کا راستہ روکے ہوئے تھے وہ حقیقت سے بہت دور ہیں ضمضم اگر بدر سے روانہ کیا گیا ہوتا تو اسے بدر سے مکہ تک کے دو سو[۲۰۰] میل کے فاصلہ کو طے کرنے کے لیے کم از کم چار دن درکار تھے۔ چار دن اہل مکہ کو بنو بکر کے ساتھ مذاکرات میں صرف کرنے پڑے۔ انھوں نے کم از کم دو دن تیاریوں میں صرف کیے ہوں گے۔ تمام روایات متفق ہیں کہ مکی لشکر کو مکہ سے بدر تک دس[۱۰] دن لگے تھے۔ ان تمام کا حاصل بیس[۲۰] دن ہے۔ اگر مدنی لشکر ضمضم کی روانگی سے قبل ہی بدر میں موجود تھا تو پھر اس کے وہاں پر بیس[۲۰] دن رکے رہنے کا کیا سبب تھا۔

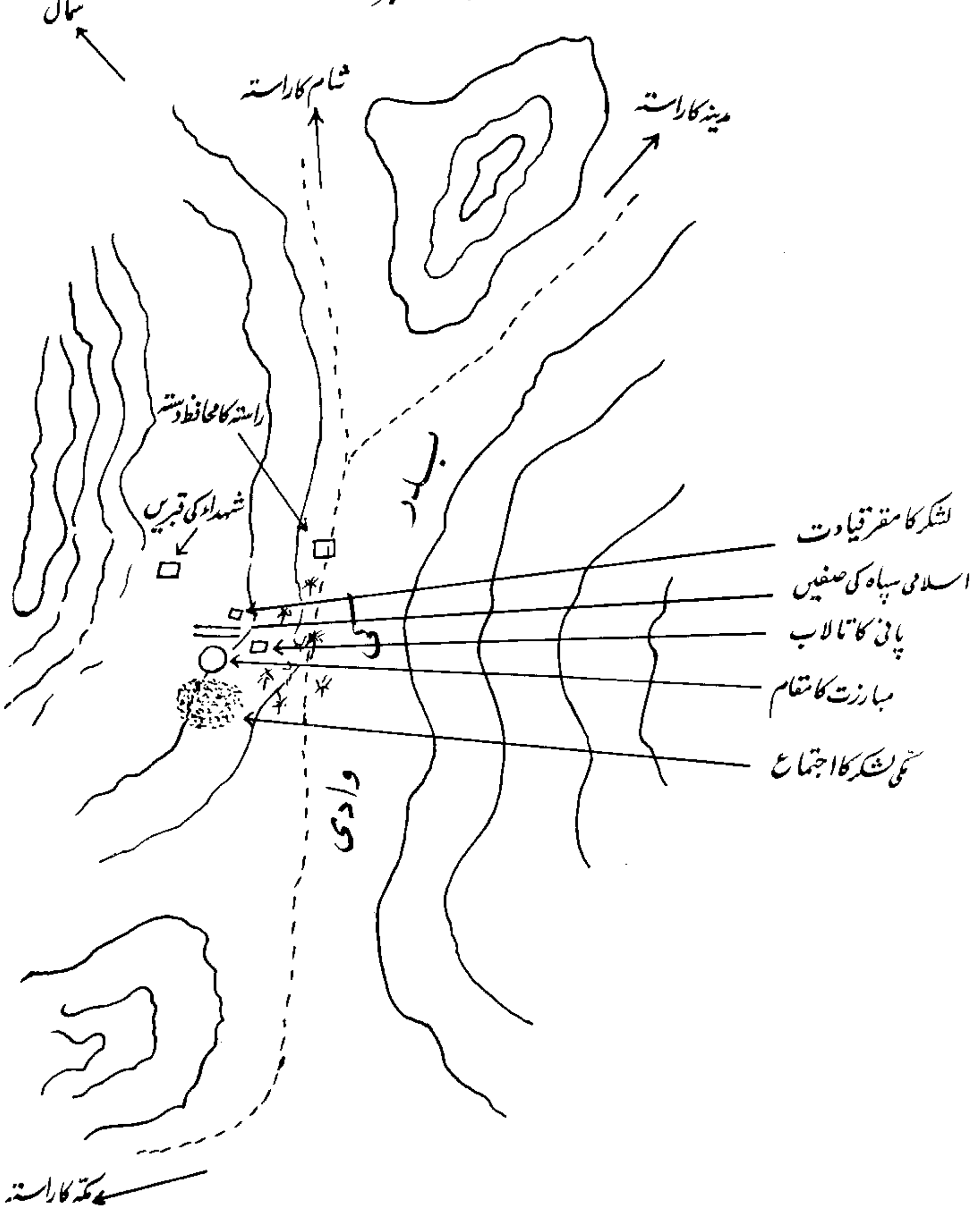
کہا گیا ہے کہ مکی قافلہ راستہ بدل کر اور سمندر کے قریب سے ہو کر مکہ کی طرف بڑھ گیا تھا اور پھر آگے جا کر مکی لشکر کو اطلاع دی تھی کہ ان کے بدر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کے مطابق "قافلہ وہیں نیچے قریب ہی موجود تھا"۔ بدر سے ساحل سمندر بمشکل پندرہ میل ہے۔ ساحل کے ساتھ کے دو تین میل اونٹوں کے گزرنے کے لیے موزوں نہیں۔ اگر قافلہ راستہ بدل بھی لیتا تو اصل راستہ سے بارہ[۱۲] میل سے زیادہ دور نہ جا سکتا تھا۔ قافلوں کی رفتار سست ہوتی ہے۔ بارہ[۱۲] میل کا فاصلہ

نقشہ "ب"

بدر کی لڑائی کا میدان

(بے پیمانہ)

۱۷، رمضان ۲ہجری



زیادہ نہ تھا۔ مدنی لشکر اس پر آسانی سے حملہ آور ہو سکتا تھا اس لیے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جب مکی قافلہ بدر کے قریب سے گزرا تو اس وقت تک مدنی لشکر وہاں نہیں پہنچا تھا۔ ابوسفیان نے جو اُونٹ کی لید اور اس میں مدینہ کا چارہ دیکھا تھا وُہ لید اس گشت کے اونٹوں کی ہوگی جو حضورؐ نے اطلاع حاصل کرنے کے لیے چند روز پیشتر روانہ کی تھی۔ ابوسفیان نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہاں پر لشکر کے ستر اسّی اُونٹوں کا کوئی ثبوت نہ تھا اور یہ کہ وہاں پر ایک دو اونٹ ہی آئے تھے اس لیے وہ قریب ہی پڑاؤ ڈال کر رُک گیا تاکہ مکی لشکر کے آنے پر اس میں شامل ہو جائے۔ ایک روایت کے مطابق وہ لڑائی میں شامل تھا اور زخمی بھی ہوا تھا۔ بدر پہنچ کر حضورؐ نے اچھا سا مقام چنا۔ اپنے اونٹ اس سے کچھ فاصلہ پیچھے ایک نشیب میں بٹھائے اور رات دعا و عبادت میں گزاری۔ دُوسری صبح ۱۷ رمضان ۲ھ ہجری کو نماز سے فارغ ہو کر اپنے اس چھوٹے سے تاریخی لشکر کی صف بندی کی اور اپنے صدر مقام میں دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ مگر دل کو اپنے پروردگار کی یاد سے ایک لمحہ بھی غافل نہ ہونے دیا۔ بدر کی وادی دو اُونچے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ وادی کے وسط میں پانی کا چشمہ ہے جس کے قریب سے شام اور مدینہ کی شاہراہ گزرتی ہے۔ وادی کے شمالی حصہ میں پہنچ کر شام اور مدینہ کے راستے جدا سمتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ شام کا راستہ شمال کا رُخ قائم رکھتا ہے اور مدینہ کا راستہ مشرقی رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ راستہ کے مغرب کی جانب اونچی زمین ہے۔ حضورؐ نے اسے ہی میدانِ جنگ کے لیے چنا تھا۔ (دیکھیں نقشہ "ب")

دُوسری صبح مکی فوج باجے گاجے کے ساتھ اپنے عسکر سے آگے بڑھی اور مدنی لشکر گاہ کا رُخ کیا۔ جب حضورؐ نے انہیں آتے دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دستِ دعا بلند کر کے کہا:

"اے اللہ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج ختم ہو جاتی ہے تو پھر قیامت تک تیرے احکام ماننے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

اس ایک جملہ میں بہت سے نکات مضمر ہیں:

اوّلاً تو یہ کہ عبادت کے معنے حکم ماننے کے ہیں۔ حکم کا ذکر جب بارگاہِ رب السموٰات سے متعلق ہوتا ہے تو حکم ماننے کے معنے ہوتے ہیں کہ اس کے عطا کردہ قوانین کے مطابق زندگی گزاری جائے۔

دوسرا نکتہ یہ تھا کہ جب مسلمان میدانِ جنگ کا رُخ کرتا ہے تو اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں غالب آنے کے یا پھر شہید ہو جانے کے۔ "یغلبون او یقتل" کا یہی مفہوم ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اللہ کا آخری پیغام اور قانون آچکا ہے۔ اللہ کے آخری نبیؐ نے یہ قانون انسانیت تک پہنچایا ہے۔ اب اگر یہ چھوٹی سی جماعت جو اس قانون پر زندگی گزار رہی ہے وہی اس لڑائی میں ختم ہو جاتی تو ختم رسالت کے اصول کے مطابق پھر نہ کوئی پیغام بھیجا جاتا تھا اور نہ پیغامبر کا وجود ہونا تھا۔ ایسے میں اللہ کے قانون پر کون عمل کرتا اور کون ہوتا جو اس کے احکام کے مطابق اس کے عطا کردہ نظامِ زندگی کو فروغ دے کر خالص اسلامی معاشرہ وجود میں لاتا۔ یعنی قیامت تک پھر اللہ کا قانون رائج نہ ہو سکتا۔

حضور اکرمؐ نے اپنے لشکر کو دفاعی لڑائی کے مطابق ترتیب دیا تھا مگر ساتھ ہی خیال بھی رکھا گیا تھا کہ جوابی حملہ کی جونہی ضرورت محسوس ہو اسی وقت پورا لشکر حملہ کر سکے اور کسی طرح سے دیر یا الجھن پیدا نہ ہو۔ آپ نے لشکر کی دو صفیں بنائیں اور ہاتھ میں تیر لے کر صف سیدھی کی۔ عرب میں اب تک لڑائی کے دوران صف بندی کا دستور نہ تھا۔ وہ ہجوم کی شکل میں حملہ آور ہوا کرتے تھے آپؐ نے اپنی اُمت کی جماعتی زندگی کی تربیت نماز اور لڑائی دونوں مقامات پر صف بندی کے ذریعہ شروع کی۔ نماز میں جس طرح امام کے احکام کے بغیر کوئی حرکت نہیں کی جا سکتی اسی طرح لڑائی میں کماندار کے حکم کے بغیر کوئی حرکت نہیں ہو سکتی۔ جس طرح نماز میں سلام پھیرنے سے قبل اگر کوئی اپنی نماز ختم کر دے تو اس کی نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح لڑائی میں سپاہی کماندار کے حکم کے بغیر صف سے نکل نہیں سکتا۔ اسلامی لشکر نماز کے دوران انضباط قایم رکھنے کے سبق سیکھ چکا تھا۔ آج نماز عشق کا عملی سبق درپیش تھا۔ آج حکم ملا کہ جب تک حضورؐ حکم نہ دیں اس وقت تک کسی ہتھیار سے دشمن پر وار نہیں کیا جائے گا تاکہ کوئی تیر، کوئی بھالہ اور کوئی پتھر ضایع نہ جائے۔ جب تیر کمان سے نکلے تو وہ دشمن کے سینہ میں پیوست ہو ورنہ مدنی ریاست کے مادی ذرائع اجازت نہ دیتے تھے کہ یونہی تیر پھینکے جائیں اور وہ سینۂ زمین میں پیوست ہوتے رہیں۔

حضور سرورِ دو عالمؐ نے اگلی صف میں شمشیر زن اور نیزہ باز افراد کو رکھا۔ تیر انداز پچھلی صف میں تھے۔ دونوں پہلوؤں کو ترچھی ترتیب دی گئی تھی تاکہ دشمن اپنے رسالہ اور برتر عددی قوت سے فائدہ اٹھا کر اسلامی لشکر کو لپیٹ میں نہ لے سکے۔ ایک راستہ اسلامی لشکر کے عقب میں جاتا تھا۔ اس راستہ سے فوج کے اونٹوں پر حملہ ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے ایک ٹولی (سیکشن) کو اس راستہ کی حفاظت پر متعین کر رکھا تھا۔ پینے کے پانی کی کمی نہ تھی۔ رات بارش ہو گئی تھی اور صفوں کے قریب ہی تالاب بنا لیا گیا تھا۔ دشمن کے افراد کو اجازت تھی کہ لڑائی شروع ہونے تک پانی پیتے رہیں۔ لڑائی شروع ہونے کے بعد اس تالاب سے پانی پینے کی اجازت نہ تھی۔

قریش جب اسلامی صفوں سے تقریباً تین سو گز پر پہنچے تو رُک گئے۔ زمین ڈھلوان ہونے کی وجہ سے وہ نچلی سطح پر تھے اور رات جو بارش ہوئی تھی اس کی وجہ سے کیچڑ سا ہو گیا تھا اور انھیں اوپر آنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج بھی اُن کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا۔ حضورؐ نے جو مقام چنا تھا وہاں سے سورج اسلامی لشکر کے عقب میں تھا۔ صفیں درست کرنے، تفصیلی احکامات صادر کرنے اور ادنیٰ کماندار (JUNIOR COMMANDER) مقرر کرنے کے بعد حضورؐ اپنے مقرِ قیادت یعنی فوج کے صدر مقام (FORCE HEAD QUARTER) میں آ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کھجور کی ٹہنیوں اور پتوں کا جھونپڑا تھا جو صفوں کے درمیان میں پیچھے کی طرف قدرے اونچی زمین پر بنایا گیا تھا تاکہ آپ سائے میں لڑائی کے میدان کو ہر لمحہ دیکھ سکیں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق احکامات دیتے رہیں۔

قریب آ کر مکی فوج کے علمبردار عتبہ بن ربیعہ نے مدنی فوج کو مبارزت کے لیے للکارا۔ مدنی فوج سے تین انصار جوان آگے بڑھے۔ مکی علمبردار نے انصار کے ساتھ مبارزت کرنے سے انکار کر دیا۔ نیا نظامِ زندگی مہاجر اصحاب نے پہلے پہل اپنایا تھا اور حسب و نسب کے لحاظ سے بھی قریشِ مکہ چاہتے تھے کہ اپنے ہم پلہ جوانوں سے مقابلہ کریں۔ حضورِ اقدسؐ نے

انصار نوجوانوں کو واپس بلایا اور اپنے ہی خاندان کے تین اولوالعزم افراد کو آگے بڑھنے کے لیے حکم دیا۔ یہ حمزہؓ بن المطلب، علیؓ بن ابی طالب ابن عبدالمطلب اور عبیدہؓ بن الحارث بن المطلب تھے۔ جب یہ تینوں آگے بڑھے تو مکی علمبردار نے ان کی نامزدگی قبول کی۔ حمزہؓ شیبہ بن ربیعہ کے مقابل ہوئے، علیؓ ولید بن عتبہ کے بالمقابل آئے اور عبیدہؓ بن الحارث عتبہ بن ربیعہ کے سامنے کھڑے ہوئے۔ مبارزت غیر معمولی طور پر جلد ختم ہوئی۔ حمزہؓ اور علیؓ نے فوراً اپنے حریفوں کو ختم کر دیا۔ ادھر عبیدہؓ بن الحارث اور عتبہ بن ربیعہ نے ایک دوسرے کو زخمی کر دیا۔ مبارزت کی ایک شرط ہوا کرتی تھی کہ جونہی خون بہہ نکلے تو مبارزت میں حصہ لینے والے ایک دوسرے کی مدد کو آ سکتے تھے۔ چونکہ حمزہؓ اور علیؓ اپنے اپنے حریفوں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ وہ عبیدہؓ بن الحارث کی مدد کو پہنچ سکتے تھے۔ دونوں عقابوں کی طرح جھپٹے اور دوسرے ہی لمحہ عتبہ بن ربیعہ کا لاشہ ریت میں تڑپ رہا تھا اور مکی علم زمین بوس ہو چکا تھا۔ تینوں بار اسلامی لشکر سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ مکی کماندار اب اپنی فوج کے حوصلوں کو مزید پست نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عام حملہ کا حکم دے دیا۔

مکی کماندار اعلیٰ کی یہ سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کی فوج اپنی آنکھوں سے تین سورماؤں کے سر خاک میں تڑپتے دیکھ چکی تھی۔ انھیں حملہ کرنے کے لیے بلندی کی طرف آگے بڑھنا تھا۔ رات کی بارش پاؤں کو جمنے نہ دے رہی تھی اور سامنے سے سورج کی شعاعیں آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ اس پہ مزید حیرانی اور تعجب کی یہ بات کہ اسلامی سپاہ خاموش اور ساکت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے وہ میدانِ جنگ پر نہیں بلکہ مسجد نبویؐ کے کچے فرش پر اپنے خالق و مالک کے حضور صف بستہ ہیں اور جان کا ہدیہ پیش کرنے کی سعادت کے منتظر ہیں۔ وہ اور آگے بڑھے کہ نہ معلوم اسلامی سپاہ کس خیال سے خاموش کھڑی ہو۔ ان کے ذہنوں پہ مبارزت کے نقشے ثبت ہو چکے تھے وہ ضرور قلب کی حرکت کو تیز کر رہے ہوں گے کہ نہ معلوم اور کتنوں کا یہی حشر ہو۔ اور پھر معاً تیروں کی بوچھاڑ پڑی اور اس ہجوم کے بڑھنے کی رفتار ضرور کم ہوئی ہو گی۔ کچھ لاشے ریت پر تڑپے ہوں گے۔ کچھ معمولی زخموں کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ آئے ہوں گے۔

اور پھر ان کی ٹکر اُس سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے ہوئی جو ان کی منتظر تھی اور جسے وہ نہ معلوم کتنی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ٹیلے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہ معلوم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اتنی بڑی جمعیت کہاں سے لے آئے تھے۔ دُور سے تو یہ کم نظر آتے تھے اور اب دائیں سے بائیں تک۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمان ہی مسلمان صف بستہ نہیں دیوار بنے کھڑے تھے۔ ان سے کون ٹکر لے۔ اور مکی سپاہ نے دوسری ٹکر اس دیوار سے لی اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ بائیں جانب سے مکی رسالہ بڑھ آنا چاہیے تھا۔ مگر یہ کیا ہوا۔ وہ تو بہت پیچھے رُک گیا۔ نہ معلوم رسالہ کیوں رُک گیا۔ کیا مسلمان اتنے زیادہ ہیں؟ وہ تو چند نفوس تھے۔ اور پھر مکی سپاہ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ان کے کمانداروں کی آواز بلند ہوئی ہو گی مگر یہ آواز آج اپنی گرج کھو چکی تھی۔ بہادرانِ مکہ کے حملوں کے ریلے بڑی دیر تک اس انسانی جسموں کی دیوار سے ٹکراتے رہے۔ جونہی اس دیوار کا ایک فرد لپک کر شہادتِ عظمیٰ حاصل کرتا اور صف میں جگہ خالی ہوتی تو پچھلی صف سے ایک اور فرد خاموشی سے آگے بڑھتا اور اس خلا کو پُر کر لیتا۔ دائیں بائیں والوں کی یہ فکر نہ تھی کہ ان کا پہلو خالی ہو جائے گا اور دشمن کو اندر داخل ہونے کی جگہ مل جائے گی۔ مسجد نبویؐ

یں صف کے خلاپُر کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ اور پھر یہ بھی تو نماز تھی بلکہ حقیقی نماز جس کے لیے سالہا سال سے مشق ہوتی رہی تھی۔ مدتوں سے ان کی آرزو تھی کہ اللہ کرے کوئی یہ نہ کہہ دے، ع

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

معاً ایسا محسوس ہوا کہ ان ریلوں کی شدت اور رفتار میں کمی ہو رہی ہے۔ سپہ سالار مدینہؐ لمحہ لمحہ کی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپ جھکے، مٹھی بھر کنکر اٹھائے اور دشمن کی طرف پھینکتے ہُوئے فرمایا:

"اب حملہ کرو۔ ان کو شکست ہوگی"

اور یہ آواز شرق و غرب کی پہاڑیوں سے ٹکرا کر کچھ اس طرح گونجی کہ لڑائی کے میدان اور بدر کی پُوری وادی پر پھیل گئی۔ مکی فوج اپنا تمام زور ختم کر چکی تھی۔ مدنی فوج کے حملہ کی تاب نہ لا سکی۔ وُہ دیوار جو ان کی بار بار کوششوں سے حرکت میں نہ آئی تھی اب آگے کو بڑھ رہی تھی اور یہ بڑھتا ہوا انسانی سیلاب مکی سپاہ کو نہایت مہیب نظر آیا ہوگا۔ وُہ رُکے، رُک کر پلٹے اور پھر بھاگ کھڑے ہُوئے۔

بدر کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ اپنے اور پرائے مقتول دفن کیے جا رہے تھے۔ شہداء کو وردی کے کفن میں دفنایا گیا۔ خونِ شہید سے پاک کوئی پانی نہیں ہو سکتا۔ وہ غسل اور کفن سے بہت بلند و بالا ہوتا ہے۔ دشمن کے اکثر آدمی کھیت رہے اور اتنے ہی قید کر لیے گئے باقی ماندہ نے تیز سواریوں پر مکہ کا رُخ اختیار کیا اور تجارتی قافلہ سے بہت پہلے وہاں پہنچ گئے اور اپنی ناکامی کی داستان سنائی جس کو لوگوں نے باور کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر جب شکست کی تصدیق ہوگئی تو پورے شہر میں کہرام مچ گیا۔

مسلمانوں کے شہداء کی تعداد چودہ تھی۔ چھ مہاجر اصحابؓ اور آٹھ انصارؓ۔ اس فتح کا اثر انتہائی دور رس ہونا تھا۔ جزیرۃ العرب کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مکہ کو شکست ہوئی تھی۔ قریشِ مکہ کا مدینہ کی نوزائیدہ مملکت سے شکست کھا جانا معمولی بات نہ تھی۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا کہ عرب کی سرزمین پر ایک نیا سورج چمکنے والا ہے اور اس سورج کی روشنی ہر کس و ناکس کے لیے یکساں طور پہ فیض پہنچائے گی۔ یُوں بھی یثرب اب مدینۃ النبیؐ بن چکا تھا اور عرب قبائل کا رُخ مکہ کے علاوہ اس جانب بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ فتحِ بدر نے مدینۃ النبیؐ کی حیثیت ہی بدل دی تھی۔ اب یہ ایک فاتح کا صدر مقام تھا۔ وہ فاتحؐ جو اللہ کی جانب سے ایک نیا قانون اور نیا نظامِ زندگی لے کر آیا تھا اور یہ جنگ جس کی پہلی لڑائی کا فیصلہ ربّ العزت نے اس کے حق میں کیا تھا یہ اسی نظامِ زندگی کے تحفظ و بقا کے لیے لڑی جا رہی تھی۔

اور وہ فرسودہ نظامِ زندگی جو بیت اللہ کے قرب سے مستفیض نہ ہو سکا اور جس کے نام لیواؤں نے خالق کائنات کے سوا دنیا کی ہر شئی کو سجدہ کیا اس کا دیا اب ٹمٹما رہا تھا۔ اس کے بتوں کے پجاریوں نے اس شکست کو دل پر نقش کر لیا اور فیصلہ کیا کہ جب تک اس رسوائی کا بدلہ نہ لیں گے امن و چین سے نہ سوئیں گے۔ شہر میں منادی کر دی گئی کہ کوئی اپنے مقتولوں پر نوحہ نہ کرے۔ وہ غم کو پالنا چاہتے تھے کہ جس قدر اسے دم پخت کیا گیا اسی قدر جوابی کارروائی کے وقت ان کے جوانوں میں غم و غصہ شدید ہوگا۔ ابو سفیان نے قسم کھائی کہ جب تک دوبارہ خون نہ بہے گا وہ اس وقت تک بیوی کی خوابگاہ کا رُخ نہ کرے گا۔ اس کی بیوی نے بھی سوگند اٹھائی کہ جب تک اس کا خاوند دشمن پر حملہ آور نہ ہوگا وہ سُرمہ، تیل اور مستی کو اپنے اُوپر حرام کرے گی۔ اہلِ مکہ جوانمردی میں معروف تھے۔

ان کا غم سمجھ میں آسکتا تھا۔ ان کی عزت کی رکھوالی عورتوں نے بھی اس شکست کو صبر سے قبول کیا اور پورا ایک مہینہ آہ و بکا اور نوحہ سے احتراز برتا اور پھر جب انھوں نے اپنے غم کو الفاظ کا جامہ پہنایا تو سننے والوں کے دل دہل گئے۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے قبل ابو سفیان مدینہ پر ناکام حملہ کر چکا تھا۔

مدینہ کی یہودی آبادی پر اس فتح کا اثر اس قدر ہوا کہ انھوں نے اس کے بعد کھلم کھلا حضورؐ کی مخالفت شروع کر دی۔ وُہ میثاقِ مدینہ کی دستاویز کے دستخط کنندہ تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے بدر کی لڑائی میں نہ شرکت کی تھی اور نہ اخراجات میں حصہ دار بنے تھے۔ دراصل وُہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ ہی انھیں مساواتِ انسانی اور دولت کی تقسیم کے اصول زکوٰۃ، صدقات اور خیرات کی شکل میں پسند تھے۔ خیال ہے کہ بدر سے قبل ہی انھوں نے مدینہ سے باہر رہنے والے یہودیوں کے توسط سے قریشِ مکہ کے ساتھ رابطہ قایم کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ بدر کے چند ہی روز بعد یہودی قبیلہ بنو قینقاع نے بغاوت کر دی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اہلِ مکہ اور بنو سُلیم سے ساز باز کر رکھی تھی کہ تینوں متحد ہو کر ایک بار پھر مدینہ پر حملہ کریں۔ یہ وہی بنو سُلیم قبیلہ ہے جو بدر کی لڑائی میں نجد سے آکر قریشِ مکہ کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔ اگر قافلہ کا راستہ روکنا یا سرِ نخلہ بدر کا باعث ہوتا اور مکی فوج اور مدنی لشکر اتفاقاً بدر کے مقام پر آمنے سامنے ہو گئے ہوتے تو ممکن تھا مگر نجد کے دو قبیلے بنو سلیم اور بنو غطفان اسی صورت اس جنگ میں شامل ہو سکتے تھے کہ قریشِ مکہ نے انہیں ماقبل سے دعوت دی ہوتی، وقت اور مقام معین کیا ہوتا اور انھوں نے اس دعوت کو پہلے سے قبول کر لیا ہوتا ورنہ نجد کے رہنے والے قبیلے اتفاقاً وہاں نہیں موجود ہو سکتے تھے۔

جب بنو قینقاع سے کہا گیا کہ مدینہ کا امن وامان ضروری تھا اور جنگ سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا تو انھوں نے جواب دیا:

> "ہمیں قریش کی طرح مت سمجھو۔ تم لوگوں نے ایک ایسی قوم کے ساتھ مقابلہ کیا تھا جنھیں معلوم نہیں کہ جنگ کیسے کرتے ہیں اور تم نے انھیں شکست دے دی۔ اللہ کی قسم اگر ہم تمہارے ساتھ لڑے تو تم صحیح مردوں سے مقابلہ کرو گے۔ ہم جانتے ہیں کہ لڑائی کس طرح کی جاتی ہے۔"

اس پر حضورؐ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے واپس چلے آئے۔ اب ایک ایسا واقعہ ہُوا جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے فوراً کارروائی عمل میں لانا پڑی۔ ایک مسلمان لڑکی ایک یہودی سنار سے کچھ خریدنے آئی۔ ساتھ کی دُکان والے یہودی نے اس کا پیراہن اونچا کر دیا۔ اس نے دُہائی دی کہ:

> "کیا مدینۃ النبیؐ میں عورتوں کی عزت اسی طرح ہوا کرتی ہے۔"

پاس سے ایک مسلمان نوجوان گزر رہا تھا اس نے تلوار کھینچ کر بدکردار یہودی کا سر قلم کر دیا۔ پاس کے یہودیوں نے یہ دیکھا تو انھوں نے اکٹھے ہو کر اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضور اقدسؐ نے فوراً لشکر تیار کیا اور بنو قینقاع کے قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ ممکن ہے کہ بنو قینقاع کو امید ہو کہ باہر کی بستیوں کے یہودی ان کی مدد کو آئیں گے۔ مگر انھوں نے بیرونی کمک کا انتظار تک نہ کیا اور پندرہ دن کے بعد اس شرط پر دروازے کھول دیے کہ انھیں اپنا سامان لے جانے کی اجازت دی جائے اور وہ مدینہ سے چلے جائیں۔ ان کی یہ شرط قبول کر لی گئی اور انھوں نے اپنی خود پسند صلح کے مطابق اپنا قلعہ خالی کر دیا۔ مگر مکانوں کے دروازے تک اکھاڑ کر

لے گئے۔ تاریخ اس بات پر خاموش ہے بلکہ اس دور کے واقعات کے تقدم و تاخر میں بھی کہیں کہیں غلطی نظر آتی ہے۔ خیال ہے کہ یہودیوں نے ماقبل کے سمجھوتے کے مطابق قریشِ مکہ کو اطلاع دی کہ وُہ مسلمانوں کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں اور اب اپنے قلعہ میں محصور ہیں۔ مکہ سے ابوسفیان آیا مگر اس وقت تک بنو قینقاع شہر بدر ہو چکے تھے۔ اس نے شہر کے باہر ایک یہودی سردار سلام بن مشکم سے حالات دریافت کیے۔ بنو قینقاع جنھوں نے بغاوت کی تھی وہ جا چکے تھے۔ اس لیے اس نے شہر کے مضافات میں چند درخت کاٹے اور دو آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد رات کی تاریکی میں فرار اختیار کیا۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ مکہ میں ایک ماہ تک سوگ رہا اور پھر بدر کے مقتولوں کی یاد میں ہر طرح کا نوحہ اور آہ و بکا سننے میں آیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان نے جو چھاپہ مدینہ کے مضافات میں مارا تھا اس سے اس کی واپسی ایک ماہ کے اندر ہو چکی تھی۔ اگر اس وقت تک بنو قینقاع کا محاصرہ ختم نہ ہوا ہوتا تو وہ ضرور اس یہودی قبیلہ کو مدد دیتا۔ اس لیے ہم اس میں حق بجانب ہیں اگر یہ کہیں کہ بدر سے واپسی کے جلد بعد بنو قینقاع کی بغاوت اور انخلاء اور ان کے جانے کے بعد ابوسفیان کا آنا اور رات ہی میں اپنی قسم پوری کر کے لوٹ جانا واقع ہوا۔ دُوسری صبح حضورؐ نے جلدی سے لشکر تیار کیا اور ابوسفیان کا تعاقب کیا۔ اس تعاقب کی وجہ سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے ستوؤں کے تھیلے پھینک دیے تاکہ اونٹ زیادہ تیزی سے دوڑ سکیں اور تعاقب ناکام رہے۔ اس وافر مقدار میں ستُو لانے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابوسفیان یہودیوں کی مدد کو آیا تھا ورنہ اگر صرف چھاپہ مارنا مقصود ہوتا تو زادِ راہ سے زائد ستُو لانے کی ضرورت نہ تھی۔ ستُو پھینکے جانے کی وجہ سے اس مہم کو غزوۂ سویق کا نام دیا گیا ہے اور ہماری رائے میں یہ شوال ۲ھ ہجری کے پہلے نصف کا واقعہ ہے۔ بنو قینقاع کا غزوہ آخر رمضان ۲ھ ہجری سے شروع ہو کر شوال کے پہلے ہفتہ میں ختم ہو گیا ہو گا۔

ابوسفیان کے لوٹ جانے کے جلد بعد اطلاع ملی کہ بنو سُلیم جنھوں نے بدر میں لشکر بھیج کر مکہ کی مدد کی تھی۔ وہ مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ممکن ہے جب ابوسفیان مکہ سے اس لیے روانہ ہوا تھا کہ بنو قینقاع کی مدد کو پہنچے تو بنو سُلیم کو بھی اطلاع دے دی ہو گی کہ وُہ بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور اس طرح بنو قینقاع کو گھیرے سے نجات دلائیں۔ ابوسفیان چونکہ محض ایک چھاپہ مار کر لوٹ گیا تھا اس لیے بنو سُلیم اپنی تیاریوں میں مصروف رہے۔ حضورِ اقدسؐ نے پچاس مہاجر اور انصار اصحابؓ پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بنو سُلیم کو ان کے اپنے علاقہ میں ہی سزا دینے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ آپؐ چار ہی دن میں بنو سُلیم کے علاقے میں پہنچ گئے مگر آپؐ کی آمد کی خبر پا کر بنو سُلیم نے ایک دن قبل پہاڑوں کا رُخ کیا اور اپنی خیمہ گاہوں کو خالی کر گئے۔ یہ واقعہ شوال ۲ھ کے اواخر کا ہے۔ یوں غزوۂ بدر کے تقریبًا ایک ماہ کے اندر ہی مدینہ کے خلاف اس اہم اور طاقتور جوڑ کا قلع قمع کر دیا گیا۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ فتح بدر کے ایک ماہ کے اندر مجاہدوں کی تعداد تین سو تیرہ ۳۱۳ سے بڑھ کر چار سو پچاس تک پہنچ چکی تھی۔ اس مہم کو غزوۂ بنو سُلیم اور غزوہ الکدر کے نام دیے گئے ہیں۔

اس قبیلہ نے جلد بعد دوبارہ حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس لیے انھیں سزا دینے کے لیے ایک اور مہم نکالی گئی۔ اس بار بھی قیادت حضورؐ نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ مگر بنو سُلیم نے اس مرتبہ بھی اپنی خیمہ گاہوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ اس

مہم کو غزوۂ بنو سُلیم ثانی کہا گیا ہے اور یہ ذوالقعدہ ۲ھ میں واقعہ ہُوا۔

بنو غطفان جو نجد کے رہنے والے تھے انہوں نے بھی بدر کے مقام پر قریش مکّہ کی مدد کی تھی۔ یہ نہایت ہی طاقتور قبیلہ تھا اور پانچ ہزار (۵۰۰۰) ہتھیار بند میدان جنگ میں مہیا کر سکتا تھا۔ اطلاع ملی کہ بنو غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے فوراً لشکر تیار کیا اور پیشتر اس کے کہ وُہ پوری تیاری کرکے مدینہ پر حملہ آور ہوتے۔ آپ نے ان کی خیمہ گاہوں کا رُخ کیا۔ اس مرتبہ بھی آپؐ کے ہمرکاب چارسو پچاس (۴۵۰) کے قریب مہاجر اور انصار اصحابؓ تھے۔ بنو غطفان چونکہ ابھی تیار نہ تھے اس لیے مدینہ کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔

بدر کے بعد سے شام کا ساحلی تجارتی راستہ مکمل طور پر مدینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ امکان تھا کہ قریش آیندہ اپنی تجارت جاری رکھنے کے لیے نجد کے راستہ عراق سے تجارتی روابط قایم کریں۔ اس لیے ضروری تھا کہ قریش کے حلیفوں کے علاقہ میں چند روز قیام کیا جائے اور سفارتی تعلقات بڑھا کر مکّہ کے لیے اس شاہراہ کو بھی مشکل بنا دیا جائے۔ بعض مفکروں نے مورخوں کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ حضورِ اقدسؐ بدر سے قبل بھی اہل مکّہ کے قافلوں کی تلاش میں لشکر روانہ کیا کرتے تھے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان چونکہ جنگ شروع ہو چکی تھی اس لیے مدینہ حق بجانب تھا اگر اقتصادی ہتھیار کے استعمال کے طور پر مکّہ کی اس تجارتی شاہراہ کو مسدود کرنے کی کوششیں جاری رکھتا۔ البتہ ہمیں اس رائے سے اس لیے اختلاف ہے کہ ابھی مدینہ اتنا طاقتور نہیں ہُوا تھا کہ وہ حملہ میں پہل کرتا اور نہ ہی نظریاتی طور پر مسلمان حملے میں پہل کر سکتے تھے۔ یہ وُہ دور ہے کہ جس کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "تم ڈر رہے تھے کہ لوگ تمھیں اُچک نہ لیں"۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضورِ اقدسؐ کبھی کوئی کام سوچے بغیر ہاتھ میں نہیں لیتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضورؐ تین بار خود تشریف لے جائیں اور تین بار کبار صحابہؓ کو روانہ فرمائیں اور ہر بار قافلہ ہاتھ سے نکل جائے۔ بعد کے غزوات اور سرایا کے نتائج سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ آپ کا ہر اقدام سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عمل میں آتا تھا حتیٰ کہ لشکروں کی تعداد، کمانڈر کی شخصیت اور علمبردار کی قابلیت۔ یہ تمام باتیں انتہائی غور و فکر کے بعد فیصلہ کی جاتی تھیں۔ آپؐ کے خلاف پورا جزیرۃ العرب مکّہ کا حلیف بن چکا تھا۔ آپؐ نے مدینہ اور اس کی حدود کی حفاظت کرنا تھی اور مدینہ کی بقاء کے ساتھ ساتھ اور مدینہ کے مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اسلام کا مستقبل وابستہ تھا۔ لشکر کے افراد کے حوصلہ کا خیال، رائے عامہ کی جانب نظر، دشمن کے ارادوں کے قوی ہونے کا خطرہ، ان تمام باتوں کے پیشِ نظر حضورؐ کا کوئی سریہ، کوئی غزوہ ناکامی سے دوچار نہیں ہو سکتا تھا جن غزوات اور سرایا میں دشمن قبائل بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو جاتے تھے وہ بھی کامیاب مہمیں تھیں۔ اس لیے کہ مقصد یہ نہ تھا کہ دشمنوں کو تباہ کیا جائے یا ان کے افراد کو ختم کیا جائے۔ حضورؐ کے پیشِ نظر جو مقصد تھا وہ اعلائے کلمۃ الحق تھا۔ آپ اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچانے کے لیے مبعوث ہُوئے تھے۔ اس لیے انسانیت کا زندہ رہنا ضروری تھا تاکہ اس تک حضورؐ اپنا پیغام پہنچا سکیں۔ یہ تو عصرِ حاضر کی جنگوں کا خاصہ ہے کہ کروڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ان سے زاید جنگ کے نتیجہ میں جو بیماریاں پھیلتی ہیں ان کا شکار ہوتے ہیں اور پھر بھی جنگی مقاصد کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔

غزوۂ بنوغطفان کے بعد حضورؐ چند ہفتے نجد میں ٹھہرے رہے مگر یہ قبائل جو ہزاروں کی تعداد میں ہتھیار بند مہیا کر سکتے تھے ؛ ہیبتِ سپاہِ شاہِ مدینہ سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ اپنے علاقہ میں ہی مدنی لشکر پر حملہ کرنے کی جرأت کر سکتے ۔ مدینہ پر حملہ کی تیاریوں کی وجہ یہ تھی کہ قریش مکہ کا ساتھ اور مدینہ کے اندر رہنے والے یہودیوں کی خفیہ مدد کی امید ہوا کرتی تھی ۔ غزوۂ غطفان ربیع الاوّل ۳ھ میں واقع ہوا ۔ اس کے جلد بعد ربیع الآخر ۳ھ میں غزوۃ الفردہ پر آپ تشریف لے گئے ۔ یہ غزوہ خالصتاً سفارتی تعلقات بڑھانے کی غرض سے عمل میں لایا گیا تھا ۔ اس کے دوران شام کی تجارتی سرحد پر مزید غور و فکر ہوا تاکہ اسے قریشِ مکہ استعمال نہ کر سکیں ۔ اس سفر کی وجہ سے اہلِ مکہ یہ سمجھے کہ آپؐ نجد کی طرف سے غافل ہیں ۔ اس لیے انہوں نے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا اور اسے نجد کے راستہ عراق عرب روانہ کیا ۔ نجد کے قبائل کی اکثریت مکہ کے حلیفوں پر مشتمل تھی مگر اس کے باوجود وہ اس تجارتی راستہ کو استعمال نہ کر سکے ۔ حضورؐ کو معلوم ہو گیا تھا کہ مکی قافلہ کب مکہ سے روانہ ہوا ہے ۔ آپؐ قافلوں کی رفتار کا تجربہ رکھتے تھے ۔ آپؐ نے زید بن حارث کو چھوٹی سی جماعت دے کر روانہ فرمایا ۔ انہوں نے آپ کی ہدایات کے مطابق القردہ کے مقام پر مکی قافلہ کو جا لیا اور ان کا تمام سامان اور باربرداری کے جانور پکڑ لیے ۔ ابوسفیان بن حرب جان بچانے میں کامیاب ہو گیا ۔

بدر سے اب تک کے دَور کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دَور بھی خاصا اہم اور شہنشاہِ مدینہ کے لیے مصروف رہا ہے ۔ اس دور میں آٹھ مہمیں مدینہ سے باہر گئیں ۔ ان میں سے سات کی قیادت حضور انورؐ نے بہ نفسِ نفیس فرمائی ۔ صرف ایک سریہ صحابی کی قیادت میں روانہ کیا گیا ۔ یہ صحابی حضورؐ کا آزاد کردہ غلام تھا مگر حضورؐ انہیں کسی اہم خدمت کے لیے تیار کر رہے تھے ۔ سپہ سالاروں کی تربیت کی جانب جس قدر توجہ آپؐ نے فرمائی اتنی توجہ صدیوں کی تاریخِ جنگ میں کسی سپہ سالارِ اعظم نے نہیں دی ۔ حضورؐ جانتے تھے کہ اس نئے نظامِ حیات کے خلاف دنیا کی تمام طاقتیں صف آرا ہوں گی اور اس نظامِ حیات کے دفاع کے لیے مدتوں تک ملت کو قربانیاں پیش کرتے رہنا پڑے گا اور شہادت کے طلبگاروں کی قیادت کیلئے سپہ سالاروں کی تربیت از بسکہ ضروری تھی ۔ اس دور کی آخری مہم یہ سریہ تھا جس کے نتیجہ میں اہلِ مکہ نے دیکھا کہ ان کی تجارت کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں ۔ اب اگر انھیں زندہ رہنا تھا تو مدینہ کو شکست دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کا وجود ختم کرنا ضروری تھا ورنہ ان کے خیال میں وُہ خود آزاد اور باوقار زندگی نہ گزار سکتے تھے ۔ اس دور کا اختتام غزوۂ اُحد پر ہوتا ہے اور اس کا مقصد بھی بدر کی طرح اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنا تھا ۔ اُحد کی لڑائی شوال ۳ھ میں ہوئی ۔

حضور انورؐ مسجد قبا میں تشریف فرما تھے کہ مکہ سے خط کے ذریعہ اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں ۔ یہ اطلاع آپؐ نے اپنے تک رکھی تاکہ شہر میں خوف و ہراس نہ پھیل جائے ۔ اور جو لوگ خفیہ طور پر مکہ کے ہم خیال تھے وُہ مکی لشکر کی مدد کی تیاریاں نہ شروع کر دیں ۔ خط اُبیؓ بن کعب نے پڑھا تھا اور اُسے آپؐ نے منع فرما دیا کہ کسی سے خط کے مضمون کا ذکر نہ کرے ۔ جب آپؐ کے خیال میں مکی لشکر مدینہ کے قریب پہنچنے والا تھا تو آپؐ نے حضرت خبابؓ کو روانہ فرمایا کہ مکی لشکر کی نقل و حرکت کو نگاہ میں رکھے ۔ مکی لشکر مدینہ کے قریب پہنچ کر مدینہ کے شمال میں کوہِ اُحد سے مغرب کی جانب خیمہ زن ہو گیا ۔

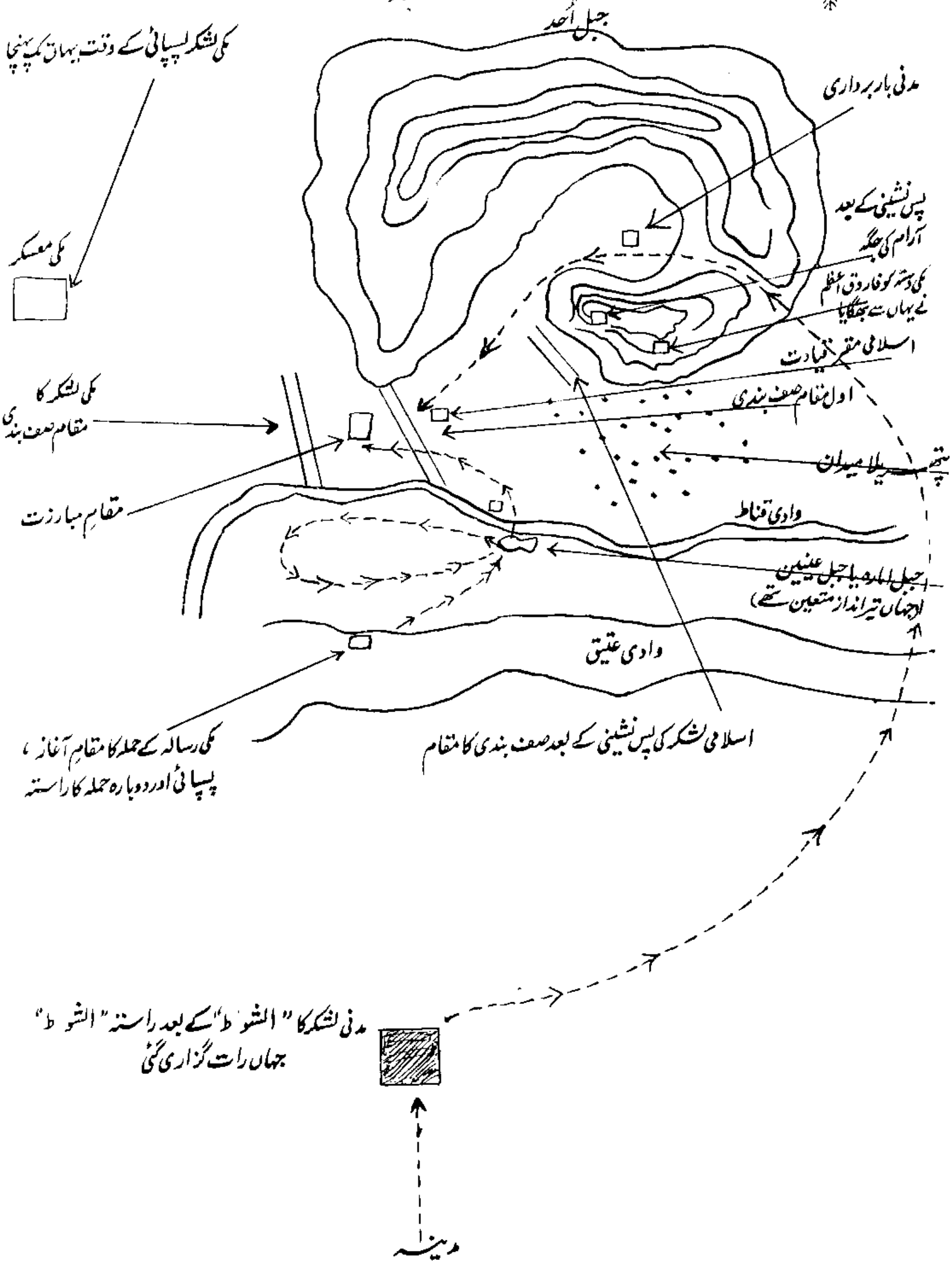
حضورؐ نے دوسرے دن مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور مشورہ طلب فرمایا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے ۔ حضورؐ خود شہر کے اندر

(نقشہ "ج")

اُحد کی لڑائی کا میدان (بے پیمانہ)

(۶ شوال ۳ھ ہجری)

شمال



رہ کر مقابلہ کرنے کے حق میں تھے مگر بہت سے ایسے نوجوان موجود تھے جو معرکۂ بدر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے اصرار پر مجمع کی اکثریت کا رجحان شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے حق میں نظر آیا۔ البتہ عبداللہ بن اُبی جو منافقین کا رہنما تھا حضورؐ کے ساتھ متفق تھا۔ سرور دو عالمؐ اُٹھے اور مکان کے اندر جا کر زرہ و خود پہن کر مجمع میں تشریف لائے۔ اب لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید آپؐ ان کے اصرار کو بُرا مان گئے ہیں اور کہنے لگے کہ جس طرح آپؐ کی مرضی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"پیغمبرِ خدا کے لیے مناسب نہیں کہ جب وہ ایک بار زرہ پہن لے تو اسے اس سے قبل اتار دے کہ اللہ اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ فرما دے۔"

اب آپؐ نے تین نیزے منگائے۔ ایک پر مہاجر سپاہ کا علم باندھا اور وہ حضرت مسعدؓ کو عطا فرمایا اور دوسرے دو انصار سپاہ کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو عطا فرمائے اور پھر گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے روانگی کا اشارہ فرمایا۔ آج مدینہ کی فوج کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ وہ مسافر جو دو سال قبل اپنے صادق ترین صحابیؓ سفر و حضر کے ساتھی صدیق اکبرؓ کے ساتھ یثرب پناہ لینے کے لیے پہنچے تھے آج مملکتِ مدینہ کے صدر مقام مدینۃ النبی سے ایک ہزار کے لشکر کے ساتھ اس مملکت اور اس کے رہنے والوں کے دفاع کے لیے علم لہراتے ہوئے میدانِ جنگ کو تشریف لے جا رہے تھے مگر ابھی "عشق کے امتحان" اور بھی باقی تھے رات "الشوط" کے مقام پر گزارنے کے بعد عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو منافق ساتھیوں کو لے کر یہ کہتے ہوئے واپس مدینہ چلا گیا کہ شہر کے اندر سے دفاع کرنے کا اس کا مشورہ چونکہ قبول نہیں کیا گیا تھا اس لیے وہ اپنے آدمی بے فائدہ مروانا نہیں چاہتا تھا۔ حضورِ اقدسؐ کے پاس اب صرف سات سو (۷۰۰) کی جمعیت رہ گئی تھی۔

حضورِ اکرمؐ نے اس لشکر کے ساتھ پہلے سیدھے مشرق کا رُخ اختیار کیا۔ پھر معمولی بائیں کو مڑ کر کوہِ اُحد کے جنوب مشرقی کونے میں جو چھوٹی سی گھاٹی ہے اس سے داخل ہو کر اُحد کے درمیان کُھلے میدان میں باربرداری کے اونٹ چھوڑے اور پھر اُحد کے جنوب میں جو گھاٹی ہے اُس سے نکل کر اُحد کے جنوب مغربی کونے پر صف آرا ہو گئے۔ یہاں سے مکی معسکر نظر آ رہا تھا۔ آپؐ نے صبح کی نماز اسی مقام پر ادا کی اور پھر دشمن کا انتظار فرمانے لگے۔ اب آپؐ کی صفوں کا داہنا کنارا اُحد کے ساتھ ملحق تھا اور بایاں کنارہ وادیٔ قناۃ کے کنارے تک پہنچا ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ "ج")

اس طرح صف آرائی میں آپؐ کی صفوں کا رُخ تقریباً مغرب، جنوب مغرب کی جانب تھا اور مدینہ قدرے بائیں، مگر سامنے تھا۔ اُحد آپؐ کے داہنے تھا اور پتھریلا میدان جس میں آج کل عمارتیں بن چکی ہیں، عقب میں تھا۔ بائیں اور پیچھے جبل العینین تھا جسے اب جبل رماۃ کہا جاتا ہے۔ اس دو گنبدی پہاڑی پر آپؐ نے پچاس (۵۰) تیر انداز متعین فرمائے تاکہ اگر وادیٔ قناۃ کے راستہ سے ہوتا ہوا دشمن کا رسالہ عقب سے حملہ آور ہونا چاہے تو اسے تیروں کی بوچھاڑ سے روک لیا جائے۔ آپؐ نے اپنے دونوں پہلوؤں کو اس خوبی سے تدبیراتی (TACTICAL) طور پر محفوظ کر لیا تھا کہ دشمن کا مضبوط اور طاقتور رسالہ بیکار ہو گیا تھا۔

مکی لشکر مدنی لشکر کو صف آراستہ دیکھ کر باجے گاجے اور دف کی جھنکار کے شور میں آگے بڑھا اور قریب آ کر رُک گیا۔ اس مرتبہ مکی لشکر نے بھی صفیں آراستہ کیں اور حسبِ معمول مبارزت کے لیے مدنی لشکر کو للکارا۔ طلحہ مکی فوج کا علمبردار تھا۔ پہلے وہ

آگے بڑھا۔ حضورؐ نے زبیرؓ کو اس کے مقابلہ کے لیے منتخب فرمایا۔ زبیرؓ نے پہلے ہی وار میں طلحہ کا سر قلم کر دیا۔ طلحہ کے بعد طلحہ بن ابو طلحہ نے مکی علم سنبھالا اور وہ مبارزت کے لیے آگے بڑھا اور پلک جھپکنے میں ختم کر دیا گیا۔ اب مکی علم کے گرد مبارزت کے ایسے جوہر اور ہمت و استقلال کے نمونے دیکھنے میں آئے جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ طلحہ بن ابو طلحہ کے بعد اس کے بھائی شیبہ نے علم سنبھالا۔ اُسے حمزہؓ نے قتل کیا۔ اب ابو سعید بن ابو طلحہ نے علم ہاتھ میں لیا۔ اسے سعد وقاصؓ نے نیزہ کے وار سے ختم کیا۔ غرضیکہ مکی علم آٹھ ہاتھوں نے سنبھالا اور سبھی کا خاتمہ آناً فاناً ہوتا گیا۔ ہر بار کوہِ اُحد اللہ اکبر کی صدا سے گونج اُٹھتا۔ مکی کماندار ابوسفیان اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور عام حملہ کا حکم دے دیا۔

یہ حملہ بدر کے معرکہ کی طرح پھر اسی ناقابلِ تسخیر چٹان سے ٹکرایا اور مکی فوج اس طرح بکھر گئی جس طرح سمندر کی بے تاب مگر مجبور لہریں ساحلِ سمندر کی چٹانوں سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ مکی کماندار نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ اس کی فوج نے بار بار بڑھنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکامی ہوئی اور پھر معاً مکی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ مدنی فوج نے اس کا تعاقب کیا۔ اُدھر بائیں جانب مکی رسالہ بھی روک لیا گیا تھا۔ اس کے کماندار خالد کے جوہر ابھی نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ جونہی مکی فوج میں بھگدڑ مچی مکی رسالہ بھی پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ مدنی فوج بڑھ کر مکی معسکر تک جا پہنچی۔ جونہی جبل رماۃ پر متعین تیراندازوں نے دیکھا کہ مکی فوج بھاگ کھڑی ہوئی ہے اور اس کے رسالہ کا حملہ بھی انہوں نے پسپا کر دیا ہے وہ بھی مالِ غنیمت جمع کرنے کے خیال سے اپنے مقام سے ہٹ گئے۔ صرف کماندار اور نو یا دس افراد اپنے مقام پر قایم رہے۔ حضور اقدسؐ نے ان پچاس افراد کو اس پہاڑی پر متعین کرتے وقت فرمایا تھا کہ "چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو انہوں نے وہاں پر قایم رہنا ہے اور" اگر دیکھو کہ ہمارا گوشت گدھ نوچ رہے ہیں تو بھی تم اس مقام سے نہ ہلنا۔" حکم عدولی کی سزا سخت ہوتی ہے۔ فوجی انضباط حکم عدولی کو قبول نہیں کرتا۔ جنگ میں متعین مقام کو چھوڑنے کی سزا موت ہے اور بجا طور پر یہ سزا مقرر کی گئی ہے۔ غیر انضباطی اور حکم عدولی میدانِ جنگ میں شکست کا باعث بنا کرتی ہیں۔ رسول اللہؐ کے حکم کی خلاف ورزی اور لشکرِ خیر البشر ختم الرسلؐ جس کی فوج نے آدابِ رزم و بزم سکھانے تھے اس میں غیر انضباطی اور حکم عدولی کا واقعہ سرزد ہو جائے۔ اس کی سزا اللہ العلمین کی جانب سے ہونی تھی۔ وہی ہوا۔

جب مکی رسالہ بھاگا جا رہا تھا تو خالد بن ولید کے قریب کے ایک شخص نے مڑ کر دیکھا اور جبل رماۃ کو خالی پایا۔ اس نے خالد سے پکار کر اس امر کی نشان دہی کی۔ خالد نے بھی بھاگتے ہوئے مڑ کر دیکھا اور وہ پہاڑی جس نے اس کے حملہ کو دیر تک روکے رکھا تھا اسے خالی پایا۔ راوی کہتا ہے: "خالد نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی اور ہم نے بھی اس کے ساتھ اپنے گھوڑوں کی باگ موڑی اور جبل رماۃ پر جو لوگ رہ گئے تھے ان کو سُموں تلے کچلتے ہوئے مدنی فوج پر عقب سے حملہ کر دیا۔"

مکی فوج جو بے حواس ہو کر بھاگ رہی تھی اور جس کے خیموں تک مدنی مجاہد پہنچ چکے تھے اسے جب معلوم ہوا کہ فاتح فوج بکھری ہوئی حالت میں مکی سوارہ (CAVALRY) کے گھیرے میں آ گئی ہے اس نے فرار ختم کیا اور دوبارہ مدنی فوج پر پلٹ پڑی۔ آناً فاناً نقشہ بدل گیا۔ جب کوئی فوج فرار اختیار کرتی ہے تو فاتح فوج کی ترتیب بھی قایم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے کہ اس نے قیدی پکڑنے ہوتے ہیں، اسلحہ اکٹھا کرنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مفتوح مکمل طور پر میدانِ جنگ چھوڑ جائے۔ مدنی

فوج بھی قیدی پکڑنے اور اسلحہ اکٹھا کرنے میں مصروف تھی۔ ظاہر ہے کہ قیدی پکڑنے کے لیے فرداً فرداً انھیں ان کا پیچھا کرکے پکڑنا پڑا ہوگا۔ اس لیے وہ ایک ایک اور دو دو ہوگئے ہوں گے۔ بعض مؤرخوں کا اس بات پر زور دینا کہ مکی سوارہ (CAVALRY) کے عقبی حملہ کی وجہ سے وُہ ایک ایک اور دو دو ہو گئے تھے درست معلوم نہیں ہوتا۔ وہ مکی سوارہ پہنچنے سے قبل ہی ترتیب کھو بیٹھے تھے مدنی فوج کی اتلاف (CASUALTIES) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انصار صحابہؓ جن کی تربیت اس قدر پختہ نہ تھی جتنی کہ مہاجر اصحابؓ کی تھی ان کے شہداء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ لڑائی ختم ہونے تک ستّر انصار اور چار مہاجر اصحاب شہادت کا مقام حاصل کر چکے تھے۔ دونوں کی کل تعداد کو نظر میں رکھا جائے تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ انصار اصحابؓ کی تربیت ابھی بہتر ہو سکتی تھی۔ بعد کے غزوات نے ثابت کر دکھایا کہ بہت جلد یہ کمی پُوری کر لی گئی۔

جب حضورِ اقدسؐ نے دیکھا کہ فوج پر دو طرفہ حملہ ہو گیا ہے تو آپ نے اپنی سپاہ کی دوبارہ تنظیم شروع کر دی۔ عین لڑائی کے میدان میں جب گھسان کی دست بدست لڑائی ہو رہی ہو اس وقت گھری ہُوئی فوج کو دوبارہ منظم کرکے نرغے سے نکالنا معمولی کام نہیں۔ چونکہ دشمن کا تعاقب کرتے ہُوئے بعض افراد بہت آگے نکل گئے تھے اور انھیں شاید یہ احساس بھی نہ تھا کہ حضورؐ نے فوج کو دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے آپؐ نے بلند آواز سے پکار کر فوج کو اپنے گرد جمع ہونے کا حکم دیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا :

"یہاں ہُوں میں اللہ کا رسولؐ ، یہاں آؤ، میرے پاس لوٹ آؤ، اور میری طرف آؤ، فلاں اور فلاں اور فلاں میری طرف اور فلاں یہاں، ہوں میں اللہ کا رسولؐ۔"

حضور اقدسؐ کے ساتھ حضورؐ کا محافظ دستہ ہمہ وقت موجود رہا تھا۔ یہ چودہ اصحاب تھے، سات مہاجر اور سات انصار۔ انہوں نے سوارہ کا حملہ نہایت دلیری سے روکا۔ آپؐ کی آواز سُن کر سپاہ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئی اور آپؐ ان کو منظم کرتے ہُوئے آہستہ آہستہ پس نشینی بھی کرتے جاتے تھے اور دشمن کے پے بہ پے حملوں کو روکتے جاتے تھے۔ آپؐ زخمی بھی ہو چکے تھے، دو دندان مبارک شہید ہو چکے تھے۔ خود کی کڑیاں چہرے کے گوشت میں پیوست ہو چکی تھیں۔ دشمن کا زور بھی آپؐ ہی کے گرد تھا تاکہ حلقہ توڑ کر آپؐ تک پہنچا جائے۔ مگر شمعِ نبوّت کے پروانے یہ کب ہونے دیتے تھے۔ بالآخر آپؐ نے بقیہ اصحابؓ کے ساتھ اُحد کے جنوبی حصّہ کی بلندی حاصل کر ہی لی۔ اب دشمن کو ناکام لوٹنا پڑا۔ بائیں جانب سے مکّی سوارہ نے بھی برابر کی بلندی سے حملہ کرنے کی کوشش کی مگر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو چند مہاجر صحابہ دے کر دشمن کو بھگا دیا۔ یہاں پر حضورؐ کے زخم دھوئے گئے۔ اس پس نشینی میں وقت صرف ہُوا ہو گا اس لیے کہ مدینہ خبر چلی گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ وہاں سے اور لوگوں کے علاوہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ تشریف لے آئیں۔ حضرت فاطمہؓ نے ہی حضورؐ کے زخم دھوئے اور حضرت عائشہؓ نے زخمیوں کو پانی پلایا۔ مکّی فوج کا سپہ سالار قریب آیا اور آکر کہا کہ بدر کا بدلہ اُتر گیا ہے اور پھر اگلے سال انہی دنوں میں بدر کے مقام پر فیصلہ کن لڑائی لڑنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ جب سرکارِ دو عالمؐ نے مکی فوج کو واپس جاتے دیکھا، تو آپؐ نے بھی فوج کو مدینہ واپسی کا حکم دے دیا۔

بعض مؤرخوں نے اُحد کو اسلامی فوج کی شکست بتایا ہے۔ ہمیں اس رائے سے اختلاف ہے۔ فتح و شکست کے ساتھ کچھ عوامل وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ حملہ آور فوج کا مقصد۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو اسے فاتح نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ لڑائی کے بعد لڑائی کے میدان سے ایک فریق کا نکل جانا۔ اس موقع پر حالانکہ مدنی فوج کو پسپائی کرنی پڑی تھی مگر وہ لڑائی کے میدان میں آخر تک مجبور رہی تھی۔

۳۔ فتح کا ثبوت، مالِ غنیمت اور جنگی اسیر ہوا کرتا ہے۔ مکی فوج نہ تو مالِ غنیمت حاصل کر سکی تھی اور نہ ہی مدنی فوج کا ایک فرد بھی اسیر کیا جا سکا تھا۔

۴۔ حملہ آور جس مملکت پر حملہ کر رہا ہے اس کی سرزمین کا کچھ حصہ اپنے زیرِ نگیں کرے۔ اس پہلو سے بھی مکی حملہ آور کسی طرح کی کامیابی حاصل نہ کر سکے تھے۔

۵۔ بین الاقوامی سطح پر حملہ آور کو کوئی خاص فائدہ حاصل ہو۔ اُحد کے موقعہ پر حملہ کرنے سے قبل مکی قافلوں کے لیے دونوں راستے بند تھے۔ اس لڑائی کے بعد یہ دونوں راستے مثل سابق مسدود رہے۔ یعنی جن علاقوں پر مدینہ بدر کے بعد سے اثر حاصل کر سکا تھا وہ اثر اُحد کی وجہ سے ضایع نہیں ہوا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ قبل دوپہر جو کامیابی اور فتح مدنی فوج کو حاصل ہوئی تھی وہ کھو دی گئی۔ اور یہ لڑائی ہار جیت کے بغیر ختم ہوئی۔

دُوسری صبح حضورِ انورؐ نے اُحد میں شریک مجاہدوں کو حاضری کے لیے بلایا اور مکی فوج کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ بہت سے مسلمان شامل ہونا چاہتے تھے جو کسی وجہ سے اُحد میں شریک نہیں ہو سکے تھے آپؐ نے انہیں اس لشکر میں شامل ہونے کی اجازت نہ دی۔ یہ غزوۂ اُحد کی لڑائی کا حصہ تھا اس لیے اس میں وہی مجاہد شرکت کا حق رکھتے تھے جو اُحد میں شامل تھے۔ آج اسلامی سپاہ کی تعداد گھٹ کر پانچسو چالیس (۵۴۰) رہ گئی تھی۔ صرف حضرت جابر بن عبداللہؓ واحد خوش قسمت شخص تھے جنہیں اُحد میں شریک نہ ہونے کے باوجود ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُحد کے روز حضرت جابرؓ کے والد حضرت عبداللہؓ چاہتے تھے کہ خود تشریف لے جائیں اور حضرت جابرؓ کو بہنوں کی حفاظت کے لیے مدینہ چھوڑ گئے تھے۔ حضرت عبداللہؓ اُحد میں شہید ہو گئے تھے اس لیے حضرت جابرؓ کا شرکت پر اصرار حق بجانب تھا اور رحمۃ للعالمینؐ نے انہیں اس غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی۔ آپؐ اس غزوہ میں حمراء الاسد تک تشریف لے گئے۔ جب ابوسفیان جس کا معسکر چند میل آگے تھا اس نے سُنا کہ آپؐ اس کے تعاقب میں نکل پڑے ہیں تو وہ تیزی سے مکہ روانہ ہو گیا۔ چونکہ غزوۂ حمراء الاسد غزوۂ اُحد کا شاخسانہ تھا اور مکی سپاہ اس تعاقب کی وجہ سے میدان چھوڑ گئی تھی اس لیے اگر کسی فریق کو ناکام کہا جا سکتا ہے تو وہ قریشِ مکہ تھے نہ کہ مملکتِ مدینہ۔ بہرکیف مکہ کا پلڑا بھاری کہہ سکتے ہیں۔ مدینہ جیتی ہوئی بازی سے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا اور ابھی دشمن میں اتنی سکت تھی کہ وہ اس جنگ کو اور طول دے سکتا تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اس نے اس جنگ کو خاصا طول دیا۔

غزوۂ اُحد کے جلد بعد بنو عدل اور بنو قرع کے نمائندے مدینہ آئے اور اسلام لانے کی غرض سے کچھ اساتذہ کے لیے

درخواست کی۔ آپؐ نے سات آدمی ساتھ کیے۔ راستہ میں ان کے ساتھ دھوکا ہُوا اور ان میں سے پانچ کو شہید کر دیا گیا اور باقی دُو کو اہل مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا جنھوں نے ان کو ازحد اذیتیں دے کر شہید کیا۔ یہ واقعہ الرجیع کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ دنوں کے بعد عامر بن طفیل بنو عامر کا سردار اور ابو براء جو بنو سلیم سے متعلق تھے وُہ مدینہ آئے اور انہوں نے بھی اساتذہ کے لیے درخواست کی۔ چونکہ ایک بار دھوکا ہو چکا تھا اس لیے آپؐ اساتذہ بھیجنے کے حق میں نہ تھے مگر ابو براء نے اپنی ذمہ داری پر انہیں لے جانے کا وعدہ کیا۔ اس جماعت کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا اور صرف دُو اصحاب بچ کر واپس آئے۔ یہ واقعہ بئر معونہ کے نام سے معروف ہے۔ بنو عامر نے اس دوران میں دو آدمی مدینہ روانہ کیے کہ اس معاملہ میں وُہ بے قصور تھے۔ یہ دونوں واپس جا رہے تھے کہ اتفاق سے ان کی مڈبھیڑ ان دُو اصحاب سے ہوگئی جو بچ کر واپس آئے تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ حضورؐ ان دو آدمیوں کو معافی دے چکے ہیں۔ ان دونوں اصحاب نے بنو عامر کے ان دونوں آدمیوں کو قتل کر دیا حالانکہ یہ قتل غلطی سے ہُوا تھا آپؐ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کر دیا۔

انہی دنوں ایک سریہ بھی روانہ کرنا پڑا۔ کچھ آدمیوں نے مدینہ کے اونٹ چرا لیے تھے ان کے تعاقب میں ایک سریہ روانہ کیا گیا جو اونٹوں کا کچھ حصہ ان ڈاکوؤں سے چھین کر واپس لے آئے۔ اسے سریہ قصمہ کا نام دیا گیا ہے اور یہ محرم ۴ھ کا واقعہ ہے۔

اُحد کی جیتی ہُوئی بازی کا ہاتھ سے جانا، ڈاکوؤں کا مدینہ کی چراگاہ سے اُونٹ ہانک کر لے جانا اور اساتذہ کی دو جماعتوں پر کامیاب حملے۔ ان تمام غیر مربوط باتوں میں ربط پیدا کرنے والے فتنہ انگیز افراد تو ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہودی قبیلہ بنو نضیر کو شہ دی اور ممکن ہے کہ اس میں مکہ کا ہاتھ بھی شامل ہو۔ البتہ مدینہ کے منافقین کا ہاتھ ضرور تھا۔ انہوں نے بنو نضیر کو یقین دلایا تھا کہ :

"اگر تم پر حملہ ہوا تو ہم تمہاری مدد کو ضرور آئیں گے۔"

انہوں نے اور باتوں کے علاوہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ آپؐ نے لام بندی کا حکم دیا اور فوراً ان کے قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ بنو نضیر نے تین ہفتوں تک انتظار کیا مگر نہ تو قریشِ مکہ ان کی مدد کو پہنچے اور نہ ہی عبد اللہ بن اُبی نے ان کو کسی طرح کی مدد دی۔ بالآخر انہوں نے غیر مشروط طور پر شکست تسلیم کر لی۔ اس کے بعد عبد اللہ بن اُبی نے ان کی سفارش کی اور حضورؐ نے اس کی منافقت کا علم رکھتے ہُوئے بنو نضیر کو بخش دیا اور انہیں ہتھیاروں کے علاوہ اپنا تمام اثاثہ مدینہ سے لے جانے کی اجازت دے دی وہ جا کر شام اور خیبر میں آباد ہوگئے اور وہاں بھی مدینہ کے خلاف شرارت کرنے سے باز نہ آئے۔ اس غزوہ کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔ یہ ربیع الاوّل ۴ھ کا واقعہ ہے۔

بنو غطفان جو بدر میں قریش کا ساتھ دے چکے تھے اور اس کے بعد بھی انہوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاری کی تھی وہ خیبر کے یہودیوں کے بھی حلیف تھے۔ ممکن ہے بنو نضیر نے خیبر پہنچ کر انہیں اکسایا ہو۔ جمادی الاول ۴ھ میں اطلاع ملی کہ وہ پھر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپؐ نے جلدی سے چار سو مہاجر اور انصار اصحابؓ کا لشکر تیار کیا اور ان کی خیمہ گاہوں کا رُخ کیا۔ اس مرتبہ پھر بنو غطفان کو حضورؐ کی آمد کا علم ہوگیا اور وُہ پہاڑوں میں رُوپوش ہوگئے۔ اس سفر کا نام غزوہ ذات الرقاع ہے۔

اب ابو سفیان نے پیغام روانہ کیا کہ گزشتہ سال والا بدر کے مقام پر طاقت کی آزمائش کا اقرار بدستور قائم ہے۔ ساتھ ہی حملہ کی

تیاریاں بھی شروع کر دیں اور ان تیاریوں کا چرچا عام ہونے لگا۔

حضور اقدسؐ شعبان ۴ھ (مارچ ۶۲۵ء ب م) مدینہ سے ایک ہزار پانچسو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ فوج کے علاوہ آپؐ اپنے ساتھ بہت سے مدینہ کے تاجر بھی لیتے گئے تاکہ وہاں پر میلے کے دوران وہ تجارت کے ذریعہ نفع کمالیں۔ مدینہ کی فوج اور تاجر ایک ہفتہ بدر کے مقام پر ٹھہرے مگر ابوسفیان نہ آیا۔ وُہ مکہ سے تو روانہ ہُوا تھا مگر ایک ہی منزل چل کر لوٹ گیا اور کہا کہ اس سال اونٹوں کے لیے چارہ کی قلت ہے اس لیے لڑائی پر روانگی موزوں نہ ہو گی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے بنو نضیر کے کچھ یہودی شام کی سرحد پر چلے گئے تھے۔ خیال ہے کہ انہوں نے وہاں کے عیسائی قبائل کو مدینہ کے خلاف بھڑکایا۔ انہوں نے مدینہ کے تجارتی کاروانوں پر حملے شروع کر دیے۔ یہ بھی اطلاع ملی کہ یہ قبائل مدینہ پر حملہ کی تیاریاں بھی کر رہے ہیں۔ آپؐ ایک ہزار (۱۰۰۰) کا لشکر لے کر شمالی علاقوں میں گئے اور وہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر آپؐ نے تجارتی راستوں کی حفاظت کے انتظامات کیے۔ کسی قبیلہ کو حملہ کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لیے آپؐ شمالی علاقہ میں امن و امان قائم کرنے کے بعد مدینہ لوٹ آئے۔ یہ سفر غزوۂ دومۃ الجندل کہلاتا ہے۔

اس دور کا اگر جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دَور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اُحد کے واقعہ کی وجہ سے انضباط اور ثابت قدمی کی جانب پہلے سے زیادہ توجہ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو گی۔ اس دور کی سات مہموں میں سے چھ کی کمان سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس دور میں مدینہ سے غیر حاضری بھی زیادہ عرصہ کے لیے رہی مگر دشمنوں کو ہمت نہ پڑی کہ حضورؐ کی غیر حاضری میں مدینہ پر حملہ آور ہوں۔ حضورؐ اس سرعت سے سفر کرتے تھے اور اس درجہ راز داری رکھی جاتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ آپؐ کب کس مقام پر ہوں گے۔ اس لیے دشمن حضورؐ کی غیر حاضری میں بھی مدینہ پر حملہ کرنے سے قبل انتہائی غور و فکر کرتے ہوں گے۔ طویل عرصہ کی غیر حاضری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنی غیر حاضری میں نیابت کے جو انتظامات فرماجاتے تھے ان پر حضورؐ کو مکمل اعتماد تھا۔ ان نیابتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ چاہتے تھے کہ اُمت میں زیادہ سے زیادہ امورِ مملکت سنبھالنے والے افراد تربیت پا لیں تاکہ حضورؐ کے بعد ریاست و مملکت کو خلا محسوس نہ ہو۔

ان دور دراز کے سفروں سے آپؐ کی فوج کی جسمانی اور ذہنی توانائی کا پتا بھی ملتا ہے۔ درست کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی مگر حضورؐ جیسی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کہاں کسی میں ہو سکتی تھیں۔ البتہ آپؐ فوج کے باقی افراد کو بھی توانائی کی بہترین حالت میں رکھنا چاہتے تھے۔ ان مہموں کے ذریعہ مملکتِ مدینہ کی سرحدوں کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح بتدریج ہر سال مدینہ کی حدود ہر چہار سُو بڑھتی رہیں۔

اس دور میں بھی مکہ کے تجارتی کاروان مکہ سے شمال اور مشرق کی جانب سفر نہ کر سکے اور ان کا تجارتی سامان ضایع ہوتا رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ اپنا پُرانا مقام تقریباً کھو چکا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قریشِ مکہ کو اپنی ضایع ہوتی ہُوئی عزت اور ماسبق کے وقار کے کم ہونے کا علم نہ ہُوا ہو۔ وہ روزِ اوّل سے اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ اب یکایک وُہ کس طرح مدینہ کی بالادستی کو قبول کر لیتے۔ اب انہیں بنو نضیر کی وجہ سے خیبر کے یہودیوں کی جانب سے پہلے سے زیادہ کمک کا اقرار ہوا۔

انہوں نے اپنے پرانے حلیفوں سے بھی راہ و رسم پیدا کیا اور اسلام کو کلیتاً ختم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ یہ کوشش غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق پر منتج ہوئی۔ بدر اور اُحد کی لڑائیوں کی شدت کے باوجود خطرہ اور ابتلاء کا موقعہ اس سے قبل شاید ہی ہوا ہو۔ یہی وُہ معرکہ ہے جس کے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے۔ (احزاب ۳۳ : ۱۱)

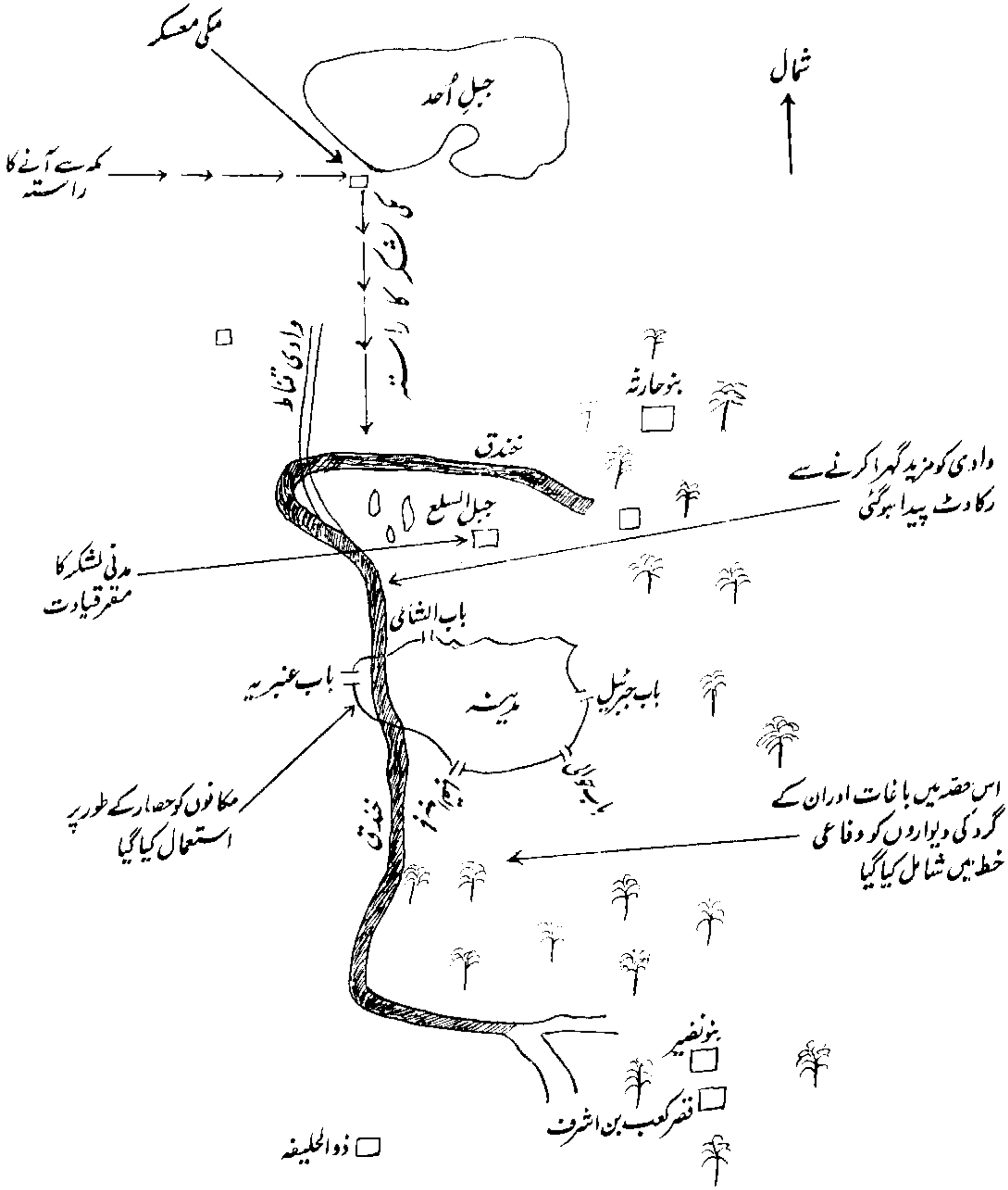
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خفیہ پیغام کے ذریعہ ذوالقعدہ ۵ھ میں اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ بہت بڑی جمعیت لے کر مدینہ پر حملہ کے لیے چل پڑے ہیں۔ آپؐ لشکروں کی رفتار سے واقف تھے۔ اُحد کے وقت بھی آپؐ کو مکی فوج کی روانگی کی جب اطلاع ملی تھی تو آپؐ نے ان کے پہنچنے کا وقت درست متعین کر لیا تھا۔ اس مرتبہ آپؐ کا پختہ ارادہ تھا کہ مدینہ کا دفاع مدینہ کے اندر رہ کر کیا جائے اور دشمن کی زاید طاقت کو استعمال ہی نہ ہونے دیا جائے۔ آپؐ کو صرف چھ دنوں کی مہلت ملی تھی۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت سلمان فارسی کے مشورہ سے خندق کھودنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہمیں یہ بات قابلِ توجہ نظر نہیں آتی۔ خندقی لڑائی بجائے خود ایک فن ہے۔ جنھوں نے پہلی عالمی جنگ کی خندقی جنگ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں محض خندق کھودنا ہی مقصود نہیں ہوتا، خندق کے ایک ایک قدم کو اگر دفاعی افواج کے کارگروار سے نیچے نہ رکھا جائے تو حملہ آور فوج چند شہتیر یا چند درختوں کے تنے رکھ کر خندق کے اُوپر سے گزر سکتی ہے۔ اگر یہ بھی میسر نہ ہوں تو خندق کو پتھروں اور مٹی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کماندار اعلیٰ کے لیے ذاتی طور پہ خندقی جنگ کے تمام پہلوؤں سے پوری واقفیت ضروری ہے ورنہ خندق نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ خندق کی لمبائی، چوڑائی، اس کو کھودنے پر کتنے آدمیوں کے کتنے دن صرف ہوں گے اور انہیں ہر روز کتنے گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ اس کی سمت، اس کے ہر موڑ کا دوسرے موڑ کے ساتھ رابطہ، پلٹن، کمپنی، پلاٹون اور سیکشن میں خندق کے مختلف حصوں کو بانٹنا اور کمانداروں کے مقامات کا تعین کرنا۔ یہ تمام ایسے امور ہیں جو اگر درست حل نہ کیے گئے ہوں تو خندق دردِ سر بن کر شکست کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ہم اس لیے اس امر کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ رسول اللہؐ چونکہ اُحد کے موقعہ پر بھی شہر کے اندر رہ کر دفاع کرنا چاہتے تھے اس لیے آپؐ کے ذہن میں شہر کا اس طرح کا دفاع پہلے سے موجود تھا۔ آپؐ چونکہ دفاعی امور کو ہمیشہ صیغۂ راز میں رکھتے تھے اس لیے آپؐ نے کسی سے ذکر نہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے بھی کہیں خندق کا لفظ استعمال کر لیا ہو۔ البتہ تاریخی طور پر یہ درست نہیں کہ دفاعی منصوبوں میں ایران کے اندر خندق کا عمل دخل رہا تھا۔ قلعوں کے گرد خندق دہلی سے لے کر ہسپانیہ تک پائی جاتی تھی۔ البتہ پُورے شہر کا دفاع خندق، مکانات اور باغات کو باہم منسلک کر کے اگر تاریخِ جنگ میں پہلی بار منظرِ عام پہ آیا ہے تو وُہ مدینہ کے دفاع کے لیے غزوۂ احزاب میں آیا ہے۔ اس سے قبل یہ طریقِ دفاع راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ "د")

آپؐ نے نو ہزار گز کی لانبی خندق جو کم از کم بارہ فٹ گہری اور پندرہ فٹ چوڑی تھی، اسے چھ دن میں مکمل کیا۔ اس قدر کھدائی اتنے کم عرصہ میں اس وقت تک شاید ہی کسی مقام پر کی گئی ہو۔ اب مدینہ حملہ روکنے کے لیے تیار تھا۔ مکی فوج پہلے کی طرح سیدھی اُحد کے دامن میں گئی اور وہاں تین دن تک پڑاؤ ڈالے رکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ اس بار کھلے میدان میں ان کی اعدادی برتری کو اور ان کے مضبوط رسالہ کو استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا تو انہوں نے مدینہ کا رُخ کیا۔ جُونہی خندق کے سامنے پہنچے تو خندق کے اُس پار سے ان پہ پتھروں کی بوچھاڑ پڑی۔ وُہ اب سمجھے کہ یہ مٹی کی دیوار سی جو سامنے کھڑی ہے یہ دمدمہ ہے جو حال ہی میں

(نقشہ "د")

خندق کی لڑائی کا میدان

(شوال تا ذیقعدہ ۵ھ)



ان کی پذیرائی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ سامنے والے رُکے تو پیچھے والوں کو معلوم نہ تھا کہ آگے کیا ہو رہا ہے۔ ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا جس کو رفع کرنے میں خاصی دیر اور وقت ہُوئی۔ اس کے بعد سے مکی سپاہ خندق کے قریب سوچ سمجھ کر اور عسکری تیاری کے بعد ہی آیا کرتی۔

غزوۂ احزاب، یعنی جب قومیں اور قبیلے مسلمانوں پر اجتماع کی صورت میں حملہ آور ہوئے تھے۔ واقعتاً جزیرۃ العرب میں مکہ کے پھیلے ہُوئے حلیفوں کا اجتماع تھا۔ اس کی تعداد بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) سے چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) تک بتائی گئی ہے۔ چند قبائل کی تعداد کی تفصیل بتائی گئی ہے، وُہ یہ ہیں:

نام قبیلہ	پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور	کماندار
۱۔ قریش مکہ	۴۰۰۰	۳۰۰	۱۵۰۰	ابُو سفیان
۲۔ بنو ادجہ	۴۰۰	نا معلوم	نا معلوم	مِسار ابن رُخیلہ
۳۔ بنو مُرّہ	۴۰۰	"	"	الحارث بن عوف
۴۔ بنو فزارہ	۱۰۰۰	"	۱۰۰۰	عُیینہ بن حصن
۵۔ بنو سُلیم	۷۰۰	"	"	حضیفہ
	۶۵۰۰	۳۰۰	۲۵۰۰	

۶۔ بنو فزارہ اور بنو سُلیم کے پاس سوارہ موجود تھا۔ اس لیے اگر ان دونوں قبائل کا سوارہ ۳۰۰ تصور کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور
	۳۰۰	

۷۔ بنو غطفان کے پاس غزوۂ خیبر میں ۵۰۰۰ پیادہ فوج کی موجودگی ثابت ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس موقع پر وُہ اپنی پوری پیادہ سپاہ اور پورا سوارہ ساتھ نہ لائے ہوں۔ اس لیے ان کے اعداد کا بھی شمار ہونا ضروری ہے۔

پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور
۵۰۰۰	۳۰۰	۱۵۰۰

۸۔ خیبر کے یہودی قبائل کے پاس ۱۰۰۰۰ ہتھیار بند ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان کا ہاتھ اس مہم میں ثابت ہے۔ ان کے سردار نے مدینہ کے یہودیوں کو شامل کرنے کا اعتراف کیا تھا کہ وہی تمام عرب قبائل کو لے کر مدینہ آیا ہے۔ اس لیے ان کے لشکر کی تعداد کم از کم ۵۰۰۰ پیادہ اور ۲۰۰ سوار شمار کر لی جائے۔

پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور
۵۰۰۰	۲۰۰	۵۰۰

۹۔ بنو سعد، بنو کنانہ اور بنو تہامہ کی موجودگی مسلّم ہے۔ تعداد نہیں دی گئی۔ ان تینوں کے ایک ہزار پیادہ اور دو سو سوارہ شامل کر لیا جائے تو مناسب ہوگا۔

	پیادہ	سوار	بار برداری کے جانور
	۱۰۰۰	۲۰۰	۲۰۰
میزان	۱۷۵۰۰	۱۳۰۰	۴۷۰۰

یعنی	۱۸۵۰۰	ہتھیار بند
اور	۲۰۰۰	کے قریب ساربان موجود ہوں گے۔
اس نفری کے لیے	۱۰۰۰	کے قریب ملازم پیشہ قسم کے لوگوں کا ہونا بدیہی ہے۔
یعنی	۲۱۵۰۰	سے کم تعداد کا یہ اجتماع نہ ہوگا۔

جن تاریخ دانوں نے "احزاب" کی تعداد چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) بتائی ہے وہ چنداں غلط معلوم نہیں ہوتی ۔ اس کے مقابلہ میں دفاعی قواء کی کل تعداد تین ہزار (۳۰۰۰) تھی، ان میں وہ منافق بھی شامل تھے جن کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ بہانے بنا کر اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ (احزاب ۳۳: ۱۳)

اس عظیم اجتماع کا علمبردار عثمان بن طلحہ تھا جو اُس خاندان کا فرد تھا جنہوں نے اپنے نظامِ حیات کی بقاء کے لیے بدر اور اُحد میں اپنے جگر گوشوں کی بڑی تعداد لاتؔ اور مناتؔ کی بھینٹ چڑھائی تھی۔ مگر جو لوگ ان کے مقابلہ میں اپنے نظامِ حیات کا دفاع کر رہے تھے ان کا جذبۂ ایمان ان سے بھی بلند تھا اور اس بات کی تصدیق جزیرۃ العرب کے بکھرے ہُوئے میدانوں میں کئی بار ہو چکی تھی۔

سپاہِ جزیرۃ العرب نے دفاعی افواج کے پہلے حملے کے بعد خندق سے دُور اپنا معسکر قایم کیا۔ کئی روز تک کوششیں جاری رہیں کہ کسی مقام سے خندق کو عبور کیا جائے مگر دفاعی افواج ہر مقام پر ان کو روکنے میں کامیاب رہیں۔ ایک روز عکرمہؔ بن ابی جہل اور اس کے چند ساتھیوں نے خندق کا ایک ایسا مقام ڈھونڈ لیا جہاں سے ان کے گھوڑے کُود کر پار ہو گئے۔ انہوں نے سیدھا مدینہ کے مقرِ قیادت (COMMAND H.Q) کا رُخ کیا۔ حضور اقدسؐ اپنے مقرِ قیادت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو چند آدمی دے کر ان کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ دونوں دستوں کا آمنا سامنا ہونے پر عکرمہؔ کے دستہ کے ایک مشہور دلیر عمروؔ نے حضرت علیؓ کو مبارزت کے لیے للکارا۔ آپ پیادہ تھے مگر آپ آگے بڑھ آئے۔ وہ دونوں لشکروں کی نگاہوں کے سامنے سوار ہو کر پیادہ سے لڑنا نہ چاہتا تھا، گھوڑے سے اُتر آیا اور گھوڑے کی کونچیاں کاٹ ڈالیں۔ اس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اب میں فاتح بن کر ہی اپنے معسکر کو لوٹوں گا۔ دیر تک تلوار سے لڑائی ہوتی رہی حتیٰ کہ گرد کی وجہ سے دونوں دیکھنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ معاً گرد کے غبار کے اندر سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہُوئی۔ اس پر قریب کی اسلامی افواج نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ یہ دیکھ کر عکرمہؔ اور اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہُوئے اور گھوڑوں کو دوڑاتے ہُوئے خندق کے پار ہو گئے۔ البتہ ان کا ایک ساتھی نوفل خندق میں گر گیا۔ عمروؔ کی لاش کے لیے کی سپہ سالار نے دس ہزار درہم پیش کیے مگر حضور پُرنور نے لاش بغیر معاوضہ کے لے جانے کی اجازت دے دی۔

یہ ناکامی جزیرۃ العرب کی متحدہ کمان کے لیے باعثِ ننگ تھی۔ دُوسری صبح پوری جمعیت خندق کے باہر صف آرا تھی۔ ابوسفیان نے پُورے محاذ پر حملے کا حکم دے دیا۔ یہ حملہ اپنی شدت کے باوجود ناکام رہا۔ مدینہ کی دفاعی افواج چاک و چوبند محاذ کے اپنے اپنے خطہ کو پوری مستعدی سے سنبھالے ہُوئے تھیں۔ مدنی سپاہ اب ہر طرح سے تجربہ کار کہلا سکتی تھی۔ دفاعی خط بھی اس خوبی سے تجویز کیا گیا تھا کہ خندق اور اس کے اندرونی جانب خندق سے کھُدے ہُوئے ملبہ کا دمدمہ دفاعی افواج کو ایک طرح سے

آڑ کا کام بھی دے رہے تھے۔ حملہ آور فوج کی تعداد سات آٹھ گنا زیادہ ہونے کے باوجود بے دست و پاسی ہو رہی تھی۔ دشمن کے سپہ سالار نے بالآخر اس مقام پر انتہائی شدت سے حملہ کیا جو اسلامی مفر قیادت کے بالکل سامنے تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل، خالد بن ولید اور دوسرے دلیر نوجوان سبھی اس حملہ میں شامل تھے۔ اُس روز شام تک دشمن کی یہ کوششیں جاری رہیں مگر اس مقام پر متعین اسلامی فوج ان کی ہر کوشش ناکام بناتی رہی۔ اس کے باوجود اس روز اسلامی فوج کے صرف پانچ افراد شہادت کا رتبہ حاصل کر سکے۔ اس روز ظہر کی نماز بھی ادا نہ کی جا سکی جسے بعد میں باجماعت قضا کر کے پڑھا گیا۔

اگر کوئی دقت ہو رہی تھی تو منافقین کی جانب سے جو رازداری کے لیے ضرر رساں ہونے کے علاوہ اپنی پوری کوششیں بروئے کار لا رہے تھے اور جہاں تک یہودی قبیلہ بنو قریظہ کا تعلق ہے وُہ کسی وقت بھی خطرہ کا باعث بن سکتے تھے اور اندرونِ شہر سے حملہ کر کے پُورے دفاعی منصوبہ کو بیکار بنا سکتے تھے۔ جس روز پورے محاذ پر دشمن نے حملہ کیا تھا اس روز بھی "مجتمع احزاب" (COALITION ARMIES) کے سپہ سالاروں کی خواہش تھی کہ بنو قریظہ ان کے حملہ کے ساتھ ساتھ اپنے قلعہ کی جانب سے حملہ آور ہوں مگر آخری وقت ان کی ہمت ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔ ایک روز اس مکان کے قریب جہاں مسلمان عورتوں اور بچوں کو جمع کیا گیا تھا وہاں پر ایک یہودی مخدوش حالت میں دیکھا گیا۔ کوئی مرد موجود نہ تھا۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اکیلے ہی اس کا کام تمام کر دیا۔ ممکن ہے اس واقعہ کی وجہ سے وُہ یہ سمجھتے ہوں کہ اس جانب بھی دفاعی انتظام مکمل تھے اور اس لیے عام حملہ میں شامل نہ ہوئے ہوں۔ اب ایک اور کوشش کی گئی، جب "مجتمع احزاب" مدینہ پہنچی تھیں تو یہودی سردار کعب بنو قریظہ کے سردار حُیَیّ بن اخطب کے پاس گیا تھا اور اسے انتہائی فخر سے بتایا تھا کہ وُہ پُورے عرب کو مجتمع کر کے اسلام کے خلاف لے آیا ہے۔ اور اسے بھی شامل ہونے کے لیے کہا۔ حیی بن اخطب نے پہلے تو کہا کہ اس کا رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدہ ہے مگر وہ بالآخر کعب کے کہنے میں آ گیا۔ جب اس سے کسی نے حضورؐ کے ساتھ معاہدہ کا ذکر کیا تو کہنے لگا:

"کون ہیں رسول اللہؐ۔ ہمارا محمدؐ کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں"

اب ابوسفیان نے کوشش کی کہ ایک اور حملہ ہو، اور اس کے ساتھ ہی بنو قریظہ بھی حملہ آور ہوں۔ بنو قریظہ نے شرط رکھی کہ ہمارے سپاہی لڑائی میں تجربہ نہیں رکھتے اس لیے قریش اپنے ستر (۷۰) بلند خاندانوں کے جوان رہنمائی کے لیے ان کے پاس روانہ کریں تاکہ وہ خاطر خواہ طور پر حملہ میں شامل ہو سکیں۔ ابوسفیان اس بات پر راضی ہو گیا۔ اس منصوبہ کی اطلاع حضورؐ تک بھی پہنچ گئی۔ یہ انتہائی خطرناک منصوبہ تھا۔ افرادی قوت اس بات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی کہ خندق پر بھی ہمہ وقتی پہرہ موجود ہو اور باغات کی جانب اور بنو قریظہ کے قلعہ کی جانب بھی پہرہ مکمل رہے۔ حضورؐ کو معلوم تھا کہ اسلامی فوج میں جو منافقین شامل تھے ان میں نعیم نامی سپاہی دشمن کے لیے جاسوسی کر رہا تھا۔ اس طرح انتظام کیا گیا کہ نعیم کے سامنے کسی نے یونہی ذکر کر دیا کہ یہودی قبیلہ بنو قریظہ اس لیے قریش سے ستر سپاہی مانگ رہا ہے کہ انہیں یرغمال بنا لے۔ اس شام نعیم کو موقع دے دیا گیا کہ وُہ خندق آسانی سے پار کر لے جیسا کہ اُمید تھی وہ چپکے سے دشمن کے معسکر میں چلا گیا اور وہاں یہ قصہ ابوسفیان کے سامنے بیان کر دیا۔ ابوسفیان پہلے ہی یہودیوں کے تذبذب اور نیم دلی سے تنگ آ چکا تھا۔ اب اسے مکمل شک پیدا ہو گیا کہ یہودی انھیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس نے یہودیوں کو

کہلا بھیجا کہ ہم ستر چیدہ اور اعلیٰ خاندان جری قریش تو شہر کے اندر داخل نہیں کر سکتے۔ البتہ تم لوگ آج بہرصورت عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دو۔ بنو قریظہ یوں بھی متحدہ محاذ سے نا امید ہو چلے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ ابوسفیان اپنے جوان اس لیے مہیا نہیں کر رہا کہ وہ انہیں مروانا چاہتا ہے۔ انہوں نے "یوم سبت" کا بہانہ کیا اور حملہ سے انکار کر دیا۔ ابوسفیان کو اب یقین ہو گیا کہ یہودی اپنی فطرت سے مجبور اسے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

مدینہ کا محاصرہ جاری رہا۔ اب "متحدہ محاذ" کی جانب سے کوئی خاص حملہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس مدینہ نے لڑاکا کشتیاں خندق پار بھیج کر حملہ آوروں پر وار کرنے سے گریز نہ کیا اور ان کے بیس اونٹوں کی باربرداری بھی ایک موقعہ پر اپنے قابو میں لے لی۔ اب دشمنوں کی صفوں میں بے دلی اور نا امیدی پھیل رہی تھی۔ بیس یا بائیس[۲۲] ہزار سے زاید جمعیت کا ایک ہی مقام پر ہونا، مختلف قبائل کی سپاہ کا صبح و شام ایک دوسرے کے ساتھ الجھنا اور موسم کی نامساعدت۔ یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ منضبط افواج کو بھی نا امید کر دیتیں جزیرۃ العرب کی متحدہ افواج نے تو ابھی انضباط کے مبادیات پر بھی عبور حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے نظامِ حیات کے دفاع کے علاوہ جرأت و دلیری کے مظاہر اور نمونے پیش کرنے اور دیکھنے کے لیے بھی تو آئے تھے اور اس "خندق" نے ان کو لہو گرم کرنے کے مواقع تک سے محروم کر دیا تھا۔ نا امیدی کے ایّام پر مزید ایک رات باد و باراں کا یہ عالم کہ خیمے تک اُکھڑ گئے اور جانوروں نے اپنی رسیاں تڑوا کر چاروں طرف تباہی مچا دی۔ اب حالات برداشت سے باہر تھے۔ ابوسفیان جس نے مسلمانوں کو مکمل طور پہ تباہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اٹھا اور کہا:

"اے قریش! ہم مستقل معسکر میں نہیں ہیں۔ گھوڑے اور اُونٹ مر رہے ہیں۔ بنو قریظہ نے بدعہدی کی ہے اور ان کے متعلق مخدوش خبریں آ رہی ہیں۔ طوفان کی شدت کو بھی تم لوگ دیکھ رہے ہو جو نہ کھانا پکانے دیتی ہے اور برتنوں، آگ اور خیموں کو ختم کر رہی ہے۔ چلو یہاں سے، میں بھی جا رہا ہوں۔"

اور ہر ایک نے اپنی راہ لی۔ حضورؐ نے دوسری صبح فرمایا:

"اب قریش تم پہ حملہ آور نہ ہوں گے، اب تم ان پہ حملہ کرو گے۔"

غزوہ احزاب قریشِ مکّہ کی کوششوں کی انتہا تھی۔ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے ان کے درمیان منافقین کی موجودگی اور یہودی قبائل کی فتنہ انگیزی کے باوجود یہ مشکل دور بھی ختم ہو گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر سا جائزہ لے لیا جائے۔ اس سے مکّہ اور مدینہ کی لڑائی کے آیندہ کے واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مملکتِ مدینہ کا دفاع بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کے دوران کے واقعات کے تواتر اور باہمی ربط سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غیر مرئی طاقت ان واقعات کو ظہور میں لا رہی ہے۔ درست کہ انسان اس جنگ، اور اس جنگ سے متعلق ہر واقعہ کو دلائل اور براہین سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی استعداد کے مطابق منطقی استدلال کے ذریعہ ان واقعات کی عالمِ انسانی کے بہت سے دوسرے واقعات کے ساتھ مطابقت ثابت کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتا ہے، مگر اس پوری جنگ کا کامیابی کے ساتھ موجودہ مرحلہ تک پہنچنا دو باتوں پہ منحصر تھا: اوّل لاذاتِ خیرالبشر سید الرسل محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی اور دوم اس نظریۂ حیات اور اس پر مبنی نظامِ زندگی پر جو اللہ العالمین نے آپؐ کے ذریعہ عالمِ انسانی کی جانب بھیجا تھا ۔ اس نظامِ زندگی اور اسے بحسن وخوبی جاری کرنے کا نتیجہ تھا کہ ایک چھوٹی سی غیر معروف سی بستی نے پورے جزیرۃ العرب کا مقابلہ کیا ۔ اس مقابلہ کے دوران اخلاق اور آدمیت کے تمام اصول پیشِ نظر رکھے اور باوجود وسائل کی کمی کے کسی گوشے ، کسی انسانی گروہ اور کسی مادی طاقت کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا اور اس پوری کشمکش کو اپنے افراد اور ان کے وسائل کے ذریعہ جاری رکھا ۔ شاید یہ بھی آئندہ نسلوں کے لیے ایک اہم سبق تھا کہ جب باطل کے ساتھ رزم آراء ہونا پڑے تو جو وسائل استعمال کیے جائیں وہ تمام تر صداقت پرستوں سے حاصل کیے جائیں ورنہ باطل کی شمولیت سے صداقت داغدار ہو کر کمزور ہو جائے گی۔
اس نظامِ زندگی کا ایک خاص پہلو جو اس جنگ کو اب تک کامیاب طور پر جاری رکھنے کا باعث بنتا رہا تھا وُہ اس کا زندگی کو ایک مکمل اکائی ، ایک وحدت اور ایک مربوط سلسلہ تصوّر کرنے کا پہلو تھا ۔ اس کے نتیجہ میں فرد اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ایک ہی فلسفہ کا تابع پاکر اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا تھا۔

غزوۂ ودّان سے شروع ہو کر غزوۂ خندق تک اسلام ایک مسلسل آزمایش میں رہا تھا ۔ یہ بات ہر فرد کو معلوم تھی ۔ اس کے باوجود جس کسی نے اس نظامِ حیات کو ایک بار قبول کر لیا تھا اس نے پھر اس سے مُنہ نہیں موڑا تھا اور اس نظامِ حیات کی صداقت پر جان دے کر شہادت دینا اپنا بلند ترین مقصدِ حیات تصور کیا تھا ۔ غزوۂ بدر کے موقع پر دشمن کو خیال تھا کہ ایک بھرپور وار سے اس نئی مملکت اور اس کے فلسفۂ زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود کر دے گا ۔ انھیں اس میں ناکامی رہی ۔ وُہ دوبارہ آئے اور پہلے سے زیادہ مادی وسائل ساتھ لائے ۔ مگر اس بار بھی وُہ اپنے مقصد میں ناکام رہے ۔ جزیرۃ العرب کے قبائل اور دُور ونزدیک کی بستیاں دیکھ رہی تھیں کہ مکّہ کے سیاسی ، معاشرتی اور معاشی مقام کا حریف پیدا ہو چکا ہے مگر چونکہ اس حریف کے پیشِ نظر ان کے موجودہ نظامِ زندگی کو بدلنا تھا اسی طرح قریشِ مکّہ کی تیسری بڑی کوشش میں تقریباً جزیرۃ العرب کا وُہ حصّہ شامل تھا جو سیاسی اور معاشرتی شعور رکھتا تھا ۔ درست کہ یہ پچیس (۲۵) دن مسلمانوں کے لیے آزمایش کے دن تھے مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ متحدہ عرب کی یہ کوشش بھی بارآور نہ ہوسکی ۔ اب تک مدینہ دفاعی جنگیں لڑتا رہا تھا گو اس کے دوران مہاجماتی عمل (Offensive Action) کی طرف بھی رجوع کیا گیا اور عسکری اصطلاحات کے مطابق مدینہ اب تک مہاجماتی دفاع (Offensive Defence) کے نظریہ کا پیرو رہا تھا ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک عظیم تزویرات (GRAND STRATEGY) کا تعلق ہے حضور اقدسؐ مہاجماتی تزویرات (OFFENSIVE STRATEGY) پر عمل کرتے رہے تھے ۔ البتہ تدبیراتی (TACTICAL) سطح پر آپؐ نے سوائے غزوۂ مصطلق کے آپ نے ہر لڑائی میں دفاعی تدبیرات سے آگاہ کیا اور جب دیکھا کہ دشمن کے حملہ کا زور کم پڑ گیا ہے تو آپؐ نے مہاجماتی تدبیرات اختیار کر کے جوابی حملہ سے دشمن کو شکست دی ۔ غزوۂ احزاب میں دشمن کا محاصرہ اس قدر وسیع پیمانہ پر تھا اور اس میں اتنے مختلف مقامات سے قبائل آکر شامل ہُوئے تھے کہ جوابی حملہ یا ان کے تعاقب کا موقع نہ تھا ۔ تعاقب صرف ایک یا دو قبائل کا ممکن تھا اور اگر یہ کوشش کی جاتی تو مدینہ سے لشکرِ اسلام کی غیر حاضری میں دوسرے قبائل کا پلٹ کر مقر قیادت پر حملہ آور ہونے کا امکان تھا ۔ اس لیے

حضور اقدسؐ نے حملہ آوروں کا تعاقب نہ کیا۔ البتہ جو دشمن گھر کے اندر موجود تھا اس سے نپٹنے کا فیصلہ کیا۔ خندق کے مورچوں سے واپس آتے ہوئے حضورؐ نے دوبارہ لام بندی کا حکم دیا اور بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔

بنو قریظہ معاہدہ توڑ چکے تھے اور ایسے موقع پر بغاوت کی تھی جب مملکتِ مدینہ کے صدر مقام کا دشمن محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ وہ عملی طور پر باہر صرف اس لیے نہیں نکلے تھے کہ وہ سپاہِ مدینہ کی عسکری قابلیت سے واقف تھے اور انہیں متحدہ محاذ کی کامیابی کا یقین نہ تھا۔ ایسے مارِ آستین کا ختم کرنا ہی قرینِ مصلحت تھا۔ بنو قریظہ کا محاصرہ پچیس دن رہا۔ وہ اس سے زیادہ کی تاب نہ لا سکے اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ ان کے متعلق فیصلہ کے لیے انہی سے دریافت کیا گیا کہ وہ کسے منصف بنانا چاہتے ہیں؟ انہوں نے حضرت سعدؓ بن معاذ کا نام تجویز کیا۔ حضرت سعدؓ خندق کی لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے اور اب مسجد نبوی میں ان کے علاج کے لیے خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ صحابیہ حضرت رفیدہؓ نرسنگ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ان کے لیے سواری روانہ کی گئی کہ آکر بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ دیں۔

حضرت سعدؓ جب آئے تو ان کے قبیلہ نے ان کے سامنے بنو قریظہ کی سفارش کی کہ ان پر سختی نہ کی جائے۔ حضرت سعدؓ نے کہا:

"وقت آگیا ہے کہ سعد اللہ کی راہ میں کسی شخص کی ناراضگی کی پروا نہ کرے۔"

پھر انہوں نے مجمع کی طرف نگاہ کرتے ہوئے پوچھا:

"کیا آپ لوگ اللہ کے سامنے اقرار کرتے ہیں کہ میرا فیصلہ قبول کریں گے؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا:

"ہاں۔"

پھر انہوں نے حضورؐ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"اور کیا یہ (میرا فیصلہ) وہ بھی قبول کریں گے جو یہاں موجود ہیں؟"

حضور اقدسؐ نے اثبات میں جواب دیا۔

حضرت سعدؓ نے اپنا فیصلہ سنایا:

"تو پھر میں فیصلہ کرتا ہوں کہ جنگ کے قابل افراد قتل کیے جائیں، اُن کی جائداد بانٹ دی جائے اور ان کی عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں۔"

اس فیصلہ پر عمل کیا گیا۔ یہ واقعہ ذوالحج ۵ھ کا ہے۔

عُیَینہ بن حصن جس نے بنو غطفان کے منصوبہ دستہ کی غزوۂ خندق میں قیادت کی تھی وہ اپنی برتری دکھانے کے لیے مدینہ کی چراگاہوں پر چھاپہ مار کر مدینہ کے کچھ اونٹ ہانک کر لے گئے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب قبائل پے بہ پے ناکامیوں کے باوجود مدینہ کی برتری ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ جونہی مقر قیادت میں اس حملہ کی اطلاع ملی ایک تیز رفتار دستہ ان کے تعاقب میں روانہ کیا گیا اور چھاپہ ماروں سے بیشتر اونٹ چھین لیے گئے۔

اہلِ خیبر مختلف طریقوں سے دوسرے قبائل کو مدینہ کے خلاف بھڑکانے کے علاوہ غزوۂ خندق میں اہم کردار ادا کر چکے تھے۔ ان کے علاقہ سے فوج اور تمام ادنیٰ درجہ کے کمانداروں کی واقفیت اور وہاں کے جغرافیائی حالات سے شناسائی ضروری تھی۔ حضور اقدسؐ نے ربیع الآخر ۶ھ ہجری میں ایک مہم کی قیادت فرمائی اور خیبر کے اردگرد کے علاقہ کی دیکھ بھال کے بعد بغیر کسی معرکہ کے مدینہ لوٹ آئے۔

اسی مہینہ بنو اسد کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف حضرت عکاشہؓ بن الاسدی کو چالیس مجاہدوں کا دستہ دے کر روانہ کیا گیا۔ بنو اسد اس سریہ کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو چکے تھے۔

اسی مہینہ ایک اور سریہ بنو ثعلبہ کے علاقہ میں بھیجا گیا انہوں نے اپنے علاقہ میں بدامنی پھیلانی شروع کر دی تھی۔ یہ سریہ ناکام رہا۔ اس لیے کہ بنو ثعلبہ نے ان کے لیے چھاپہ ڈال رکھا تھا اور دستہ کے شرکاء دس مجاہدوں کو شہید کر دیا۔

جونہی اس سانحہ کی اطلاع ملی حضورؐ نے دوسرے ہی دن حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو چالیس مجاہدوں کی کمان دے کر روانہ فرمایا کہ بنو ثعلبہ کو مناسب سزا دیں۔ سریہ کے قریب پہنچنے پر بنو ثعلبہ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس لیے کوئی معرکہ نہ ہُوا۔

اسی مہینہ یعنی ربیع الآخر ۶ھ ہجری میں بنو سُلیم کے خلاف حضرت زیدؓ بن الحارث کو روانہ کیا گیا۔ اطلاع ملی تھی کہ وہ ایک بار پھر مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بنو سُلیم بدر اور احزاب میں مدینہ کے خلاف صف آراء ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب حضرت زیدؓ ان کے چند قیدی پکڑ کر لے آئے اور انہوں نے حضورِ اقدس کو یقین دلایا کہ وہ حملہ کی تیاریاں نہیں کر رہے تھے تو انہیں بخش دیا گیا اور ان کے تمام قیدی رہا کر دیے گئے۔

جمادی الآخر میں ہی حضرت زیدؓ کو بنو ثعلبہ کے خلاف بھی روانہ کیا گیا۔ انہوں نے مدینہ کی گشت کو چھاپہ ڈال کر شہید کر دیا تھا مگر اس مرتبہ بھی بنو ثعلبہ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس مہم سے واپس آتے ہی حضرت زیدؓ کو وادی القراء روانہ کیا گیا۔ وہاں پر اس سے قبل حضرت زیدؓ کی زیر کمان ایک گشت پر وہاں کے قبائل نے حملہ کر کے انہیں نقصان پہنچایا تھا۔

رجب کے مہینہ میں ہی اطلاع ملی کہ قریشِ مکہ ایک بار پھر قسمت آزمائی کر کے ایک تجارتی قافلہ شام روانہ کر رہے ہیں۔ وہ ساحلی علاقہ یعنی مدینہ کے علاقہ سے گزر رہے تھے اس لیے اس قافلہ کو اِلیس کے مقام پر روک لیا گیا اور اس کا تمام سامان بحق سرکارِ مدینہ ضبط کر لیا گیا۔

شعبان ۶ھ میں ساحلِ سمندر پر اور مکہ کی سرحدوں کے قریب بنو مصطلق کے خلاف ایک مہم عمل میں لائی گئی۔ حضورؐ نے کمان اپنے ہاتھ میں رکھی تھی اور علمبردار حضرت ابوبکرؓ اور حضرت سعدؓ بن عبیدہ تھے۔ بنو مصطلق کے علاقہ میں پہنچ کر انہیں گھیرے میں لے لیا گیا اور ان کے بہت سے قیدی لے لیے گئے مگر بعد میں پُورے قبیلہ کو معافی دے دی گئی اور ان کے اسیر رہا کر دیے گئے۔

۶ھ کے باقی ماندہ ایام میں پانچ مزید سرایا روانہ کیے گئے۔ ان کا مقصد دور دراز علاقوں میں امن و امان قائم رکھنا تھا تاکہ ملک کی تجارت کو فروغ ہو اور لوگ اپنے کاروبار میں کسی خوف و خطر کے بغیر مصروفِ عمل رہیں۔

۶ھ کے آخری ایام میں آپؐ نے ایک بار پھر صلح کی طرف رجوع کیا کہ شاید اہلِ مکہ اپنی ناکامیوں کا احساس کرتے ہُوئے

جنگ کے راستہ کو ترک کرنے پر تیار ہو جائیں۔ یہ بات ہمہ وقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ حضور رحمۃ للعالمین کا مقصد حکومت قایم کرنا مملکت کو وسعت دینا یا دشمنوں کی افواج کو شکست دینا نہیں تھا۔ حضورؐ کا مقصدِ حیات تبلیغ اسلام یعنی اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچانا تھا۔ اور چونکہ یہ اللہ کا آخری پیغام تھا اس لیے مشیت ایزدی کے مطابق اسلام یعنی نئے نظامِ حیات کو عملی طور پر انسانی معاشرے میں قایم کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل یُوں ہو سکتی تھی کہ ایک بار ایک مثالی معاشرہ قایم ہو جائے۔ اس معاشرہ کی اپنی مملکت، حکومت ہو، اس کی اپنی فوج ہو، اس کا ایک معاشی نظام ہو اور اس پر بھی ابتلاء و مصیبت کے ایام آئیں تاکہ قیامت تک کی ہزاروں لاکھوں صدیوں میں جب بھی کوئی انسانی گروہ مختلف سمتوں سے مخالفت کے باوجود اسی طرح کا معاشرہ قایم کر کے اس نظامِ حیات کو ایک بار پھر عملی طور پر نافذ کرنا چاہے تو اس کے سامنے ایسی ازلی و ابدی مثال موجود ہو جو ہر حال، ہر موقعہ، ہر دور اور ہر جگہ پر قابلِ عمل ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دین کو ختم کرنے کی انتہائی کوششیں بے سُود ثابت ہو چکی تھیں۔ آپؐ اس پس منظر میں اور طاقت ہوتے ہوئے بے اسلحہ و بے ہتھیار اور بغیر بہت بڑی جمعیت کے صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے۔ تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جہاں فاتح نہتے ہو کر اپنے دشمنوں کے گھر اس لیے گیا ہو کہ آیندہ صلح اور امن کے ماحول میں زندگی گزاری جائے۔

آپؐ نے فیصلہ کیا کہ آپؐ عمرہ کے لیے مکہ تشریف لے جائیں گے اور آپؐ کے ہم رکاب جو لوگ ہوں گے ان کے پاس عرب کے دستور کے مطابق سوائے تلوار کے اور کوئی اسلحہ یا جنگی سامان نہ ہوگا۔ آپؐ نے اس ارادہ کو اردگرد کے قبائل تک پہنچایا تاکہ مختلف مقامات کے لوگ شامل ہو جائیں اور مکہ کو بھی یقین آجائے کہ یہ سفر خالصتاً دوستانہ اور صلح کن اغراض کے پیشِ نظر شروع کیا گیا ہے۔ آپؐ کی ان دوستانہ خواہشات کی اطلاع تو مکہ والوں تک پہنچ گئی مگر اہلِ مکہ اس طرح آپؐ کے ساتھ صلح کر کے اپنے ہاتھوں اپنے نظامِ حیات اور اس کے اندر اپنے بلند و با اقتدار مقام کو ختم نہ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جونہی سُنا کہ حضور اقدسؐ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ آنے کے لیے روانہ ہو گئے ہیں انہوں نے قرب و جوار کے حلیف قبائل کو پیغام بھیج کر مدافعت کے لیے بلایا۔ اس اجتماع کو قبائلِ عرب کا دوسرا بڑا اجتماع کہا جا سکتا ہے۔ مکہ کے شمال میں مدینہ کے راستہ پر ذوالتواء کا مقام ہے۔ یہ متحدہ سپاہ اس مقام پر حضورؐ کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اپنا عزم دکھانے کے لیے انہوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی تھیں۔

جب آپؐ نے یہ سُنا تو آپؐ راستہ چھوڑ کر مکہ کے مشرق سے ہوتے ہُوئے جدہ سے آنے والے مکہ کے راستے پر حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہو گئے۔ آپؐ نے اس طرح ان کو مجبور کیا کہ اگر وُہ لڑائی کرنا چاہیں تو حضورؐ کے چنے ہُوئے مقام پر لڑنے پر مجبور ہوں گے مکہ کی دہلیز پر اس طرح حضورؐ کا پہنچ جانا قریشِ مکہ کے لیے ازحد خطرناک تھا۔ یہاں پہنچ کر بھی آپ نے صلح مندانہ طور پر عمرہ ادا کرنے کے ارادہ کا برملا اظہار کیا۔ اہلِ مکہ رسماً کسی کو عمرہ ادا کرنے سے منع بھی نہ کر سکتے تھے اور آپؐ کی موجودگی مکہ کے گردو نواح میں انھیں پسند بھی نہ تھی۔ اب آپؐ کی جانب انہوں نے پیغامات بھیجنا شروع کیے کہ آپؐ واپس چلے جائیں۔

سفارتیں روانہ ہونا شروع ہُوئیں۔ حضرت عثمانؓ کی معسکر میں بھیجے گئے مگر ان کی واپسی میں دیر ہونے لگی۔ بلکہ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آپؐ نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور نہتے ہونے کے باوجود اپنا ارادہ ظاہر فرمایا کہ چونکہ آپؐ کے سفیر کو واپس آنے نہیں دیا گیا یا شاید قتل کر دیا گیا ہے اس لیے آپؐ نے مکہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آزاد اور خود مختار

مملکتِ مدینہ کے سربراہؐ سے یہی توقع ہوسکتی تھی کہ اُس کے سفیر کے قتل کے یہ معنے تھے کہ اُس کی مملکت اور ملوکیت (SOVEREIGNTY) پر براہِ راست حملہ کر دیا گیا ہے۔ آپؐ نے دعوت دی کہ جو رضا کارانہ طور پر فی سبیل اللہ جہاد کے لیے بے ہتھیار و اسلحہ لڑائی میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں وُہ حضورؐ کے ہاتھ میں تا شہادت لڑنے کی بیعت کریں۔ عرب کی آزاد سرزمین میں آزاد قبائل کے نہ معلوم کتنے افراد اس منظر کو دیکھ رہے ہوں گے کہ ببول کے درخت کے نیچے معسکر کے ہر فرد نے اپنے رہنما، اپنے رسول، اپنے سپہ سالار، شہنشاہِ مدینہؐ کے ہاتھ پر صدقِ دل سے بیعت کی کہ وہ بے اسلحہ و بے ہتھیار، بے خود و بے زرہ مکہ اور ان کی لاتعداد جمعیت کے ساتھ لڑائی میں شرکت کرے گا۔ وہ کونسی آنکھ ہوگی جو اس منظر کا نقشہ بھلا سکی ہوگی اور وہ کون سا انسان ہوگا کہ جس کا دل ان جوانمردوں کی مردانگی کو دیکھ کر دہل نہ گیا ہوگا۔ یہ خبر آناً فاناً مکی معسکر میں پہنچا دی گئی ہوگی۔ حضرت عثمانؓ لوٹ آئے اور ساتھ ہی مکہ کی جانب سے نئی سفارت بھی آگئی جس کا سردار سہیل تھا۔ وہی سہیل جو بدر کے مقام پر اسیر بنا کر مدینہ لے جایا گیا تھا اور وہاں سے فدیہ ادا کرنے پر رہا ہُوا تھا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد شرائط طے پائیں کہ اس سال رسول اللہؐ واپس چلے جائیں اور آیندہ سال انہی دنوں عمرہ کے لیے تشریف لائیں۔ مسلمانوں کی موجودگی میں اہلِ مکہ تین دن کے لیے مکہ خالی کر جائیں گے۔ مسلمان نہتے آئیں گے یعنی ہر فرد کے پاس صرف ایک تلوار ہو گی جو نیام میں ہو گی۔ یہ صلح دس سال تک کے عرصہ کے لیے عمل میں آئے گی۔ جو قبائل رسول اللہؐ یا اہلِ مکہ کا ساتھ دینا چاہیں وُہ دے سکیں گے اور ان کے فرائض و حقوق بھی وہی ہوں گے جو ان دو فریقوں کے ہوں گے۔ اس معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی ایسا فرد جو خود کفیل نہ ہو وُہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے گا۔ البتہ کوئی مسلمان مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا آئے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ حضورؐ چونکہ صلح چاہتے تھے آپؐ نے ان شرائط کو قبول کر لیا۔ عہد نامہ تحریر ہونے کے دوران کے واقعات بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپؐ صلح کے خواہشمند تھے اور جنگ جاری رکھنا آپؐ کے مقصد کے خلاف تھا۔ مخالفت و مخاصمت اور جنگ و جدال کا ماحول تبلیغ دین کے لیے موزوں نہیں ہُوا کرتا۔ آپؐ سے یہ بنیادی اصول مخفی نہ تھا۔ اسی لیے آپؐ نے ہر موقع پر امن و سلامتی، بخشش و عطا اور رحمت و محبت سے کام لیا۔ مورخ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ گو یہ شرائط بادی النظر میں مدینہ کی فاتح مملکت کے مفاد کے خلاف نظر آتی تھیں اس کے باوجود صلح کے دو سالوں کے درمیان اتنے لوگوں نے اسلام قبول کیا جتنے ماقبل کے سالوں میں دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہُوئے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدسؐ نے تو اس صلح کو اس لیے قبول کیا کہ یہ اقدام عین آپؐ کے مقصد اور آپؐ کے لائے ہُوئے پیغام کے مطابق تھا۔ مکہ نے صلح کیوں قبول کی، اس کی بھی وجوہات تھیں:

اوّلاً: مدینہ نے ان کی تمام تجارتی راہیں بند کر رکھی تھیں اور ان کا تجارتی مال ان کے گوداموں میں گل سڑ رہا تھا۔ تجارتی مال کی تباہی کے علاوہ ان کی آمدنی بند ہوچکی تھی۔ تجارت شروع ہونے سے وہ از سرِ نو طاقت پکڑ سکتے تھے۔

ثانیاً: جنگ کی وجہ سے زائرین کی تعداد میں کمی بھی ان کے لیے اقتصادی طور پر خسارے کا باعث بنی ہوئی تھی۔

ثالثاً: جو قبائل اس مرتبہ ان کے ساتھ تھے انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اور حسنِ اخلاق دیکھا تو انہوں نے مکی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ دینے کے خیالات کا اظہار کیا۔

رابعاً: سرکارِ مدینہؐ اور ان کے اصحابؓ مکہ کی دہلیز تک آچکے تھے۔ اس سال ان کے لوٹ جانے سے مکہ کا بھرم رہ جاتا تھا۔ اگر

وُہ نہ لوٹتے اور مکہ کے حلیف ان کے ساتھ لڑنے پر رضامند نہ ہوتے تو انہیں خطرہ تھا کہ حضورؐ مکہ پر کہیں قبضہ نہ کر لیں۔

اس صلح کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فتح سے منسوب کیا ہے۔ حدیبیہ سے لوٹتے ہُوئے اس کے شرکاء کو آیندہ فتح کی نوید دی گئی اس لیے حضور اقدسؐ نے مدینہ پہنچ کر چند روز توقف فرمایا اور جب دیکھا کہ خیبر کے یہودیوں نے اس صلح نامہ کے مطابق اپنے پرانے حلیف یعنی مکہ کا ساتھ دینے کا اعلان نہیں کیا اور نہ ہی علیحدہ صلح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے تو آپؐ نے بشارت ربانی کے مطابق ان اصحاب کو مہم پر ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا جنھوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان میں حصہ لیا تھا۔ تاریخ ان اصحاب کے مقام کو بہت بلند سمجھتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان اصحاب کے فیصلہ نے ان کی عقیدت، ان کی ذات بابرکات کا احترام اور ان کا اللہ پر ایمان کا پورا پورا ثبوت پیش کیا۔ ایک دو یا گنتی کے آدمیوں کا اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت کے ساتھ نہتے لڑ جانا ممکن ہے۔ پُوری فوج کا ایسے حالات میں شہادت پر بیعت کرنا اور بات ہے۔ "تاریخ عالم کہیں ایسا واقعہ پیش نہیں کرتی۔ چونکہ ان ہی لوگوں کے لیے اللہ نے فتح کا وعدہ فرمایا تھا اس لیے حضورؐ نے ان اصحابِ بیعتِ رضوان کے علاوہ کسی اور مسلمان کو ساتھ نہ لیا اور اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ گو روانگی کے وقت آپؐ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ مہم کس کے خلاف ہے۔ البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ خیبر کے خلاف ہے۔ اس وقت خیبر کے متعدد قلعوں میں دس ہزار ہتھیار بند موجود تھے۔ ان کے علاوہ ان کے حلیف قبیلہ بنو غطفان نے بھی ایک ہزار ہتھیار بند ان کی مدد کے لیے روانہ کر دیے تھے۔ بنو غطفان کے پاس ابھی چار ہزار ہتھیار بند افراد مزید موجود تھے اور خیبر اور بنو غطفان میں طے پا چکا تھا کہ جونہی اسلامی لشکر خیبر کے قریب پہنچے تو بنو غطفان اس پر عقب سے حملہ کر دیں۔ قیاس ہے کہ خیبر نے ان یہودی قبائل کے ذریعہ رومی گورنرِ شام سے بھی مدد طلب کی ہوئی تھی جو قبائل مدینہ سے نکل کر شام کی سرحد پر آباد ہُوئے تھے۔ عراق کے ایرانی گورنر کے ساتھ بھی خیبر کے تعلقات موجود تھے اور ممکن ہے کہ انہیں ان اطراف سے کمک کا بھی یقین ہو۔ اتنی بڑی جمعیت کے خلاف حضور اقدسؐ نے وہی چودہ ہزار مجاہد اپنے ساتھ لیے جنہیں بیعتِ رضوان میں شرکت کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ زخمیوں کی تیمارداری کے لیے بیس صحابیات کو بھی خصوصی اجازت دی گئی کہ وہ بھی لشکر کے ہمراہ جہاد میں شمولیت کریں۔ پوری ملت کی ملی جنگ اور کلی جنگ کی مثال پیش کی جا رہی تھی کہ بعد کے ادوار میں ملت حسب ضرورت اپنے معاملات کو مناسب شکل دیتی رہے۔

مدینہ سے چند منزل جانے کے بعد آپؐ نے ایسے دوراہے پر قیام فرمایا جہاں سے بنو غطفان اور خیبر پر یکساں طور پر حملہ ہو سکتا تھا۔ اس قیام کی اطلاع جب بنو غطفان کو پہنچی تو وہ یہ سمجھے کہ ان کی خیمہ گاہوں پر آپؐ حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس خوف سے وُہ واپس اپنے قبائلی علاقہ میں چلے گئے اور دوبارہ خیبر کا رُخ نہ کیا۔

جہاں تک اہلِ خیبر کا تعلق ہے ان کی وادی کی دونوں جانب مضبوط قلعے تھے۔ یہ تعداد میں بارہ تھے اور ان کے محلِ وقوع اس خیال سے چنے گئے تھے کہ تزویراتی (STRATEGIC) اور تدبیراتی (TACTICAL) لحاظ سے پوری وادی کا دفاع ہو سکے اور قلعے ایک دوسرے کو مدد دے سکیں۔ چونکہ مدینہ خیبر سے جنوب کی طرف ہے اس لیے اہلِ خیبر نے وادی کے جنوبی کنارے والے قلعوں کو زیادہ مضبوط کر رکھا تھا اور اپنے بہترین سپاہی اور سردار اسی جانب متعین کیے تھے۔

خیبر والوں کو اس وقت آپؐ کی موجودگی کا علم ہوا جب آپ ایک صبح طلوعِ آفتاب کے وقت شمالی قلعوں کے باہر نظر آئے

اس ناگہانی حملہ (SURPRISE ATTACK) کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ہی دن تین قلعے ہتھیار رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ خیبر کی مہم دو ماہ تک جاری رہی۔ بعض قلعوں نے کافی سخت مقابلہ کیا مگر بالآخر تمام کے تمام قلعے سر ہو گئے۔ یہودیوں کی گزارش پر آپؐ نے انہیں اپنی زمینوں پر آدھی پیداوار کی بٹائی کے اقرار پر قابض رہنے دیا۔ البتہ یہ شرط تھی کہ جب بھی حکومتِ مدینہ ان کے اخراج کا فیصلہ کرے انہیں خیبر خالی کرنا پڑیگا۔ خیبر کی مہم حضور اقدسؐ کی سپہ سالارانہ صلاحیتوں اور عسکری معاملات میں آپؐ کی تزویراتی و تدبیراتی سمجھ بوجھ کا پتا دیتی ہے۔ رسولِ اُمّی جو اپنا نام تک نہ لکھ جانتے تھے اور نہ پڑھ جانتے تھے، جنہوں نے کسی فوج میں کارگزاری کے ذریعہ لشکر سالاری کا تجربہ حاصل نہ کیا تھا اپنے لشکر سے گیارہ گُنا زیادہ فوجی طاقت کے خلاف لشکر کشی کرتے وقت صرف وہی اشخاص ہمرکاب رکھتے ہیں جنہوں نے بیعتِ رضوان میں حصہ لے کر اللہ کی جانب سے فتح کی خوشخبری حاصل کی تھی۔ دُوسرے آدمی موجود ہیں، وہ ہمسفر ہونے کے تمنائی بھی ہیں۔ مگر اللہ کا آخری پیغام رسانؐ اللہ کے وعدہ پر بھروسہ کرتے ہُوئے ان ہی خوش بختوں کو ساتھ رکھتا ہے جنہوں نے ایسے نازک موقعہ پر جان کی بازی لگا دی تھی۔ خیبر کی مہم محرم ۷ھ میں شروع ہوکر ربیع الاوّل کے شروع میں ختم ہُوئی۔

خیبر کے بعد وادی القریٰ، تیمہ اور فدک کے یہودیوں نے بھی اُن ہی شرائط پر اطاعت قبول کر لی جو شرائط اہلِ خیبر کو عطا کی گئی تھیں۔ اسی طرح خیبر سے واپسی کے دوران ذات الرقاع کے مقام پر دشمن کے اجتماع کی خبر ملی۔ جب آپؐ ان کی طرف متوجہ ہُوئے تو وہ پہاڑوں میں چھُپ گئے۔

۷ھ ہجری کے دوران جمادی الآخر اور رمضان کے مہینوں کے درمیان پانچ سرایا بیرونِ مدینہ روانہ کیے گئے۔ یہ تمام سرایا کامیاب رہے۔ اکثر میں اسیر مدینہ لائے گئے۔ معافی مانگنے پر سب رہا کر دیے گئے۔ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مہموں کی کمان کے بجائے تبلیغ اور انتظامی امور کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ دے سکتے تھے۔ دشمن کا زور ختم ہو چکا تھا۔ بعض کوتاہ اندیش قبائل حکومت کی طاقت سے بے خبر بغاوت اور لوٹ مار کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ ان کے خلاف اصحابؓ کی کمان میں چھوٹے چھوٹے دستے مقصد پُورا کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ان پانچ سرایا میں تیس سے زائد کی گشت کسی میں بھی نہ بھیجی گئی۔ ربیع الاول ۸ھ ہجری میں ذات العرق میں قبیلہ ہوازن نے مدینہ کے خلاف جمع ہونا شروع کیا مگر جونہی شجاع بن الاسدی کی زیر کمان پچیس مجاہدوں کی گشت کا سنا تو وہ منتشر ہو گئے۔

مدینہ اور خیبر سے گئے ہُوئے یہودیوں کی سازشوں کا نتیجہ ہُوا کہ شام اور جزیرۃ العرب کی سرحدوں پر جو عیسائی قبائل آباد تھے انہوں نے ہرقل روم کو آمادہ کر لیا کہ مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ آج تک جزیرۃ العرب کبھی متحد نہیں ہُوا تھا اس لیے عراق، شام اور مصر پر قابض بادشاہوں کو اس طرف کبھی کسی خطرہ کا احتمال نہیں ہُوا تھا۔ اب عرب مدینہ کی قیادت میں متحد ہو رہے تھے۔ عربوں کی عسکری روایات سے دنیا واقف تھی۔ اب تک ان کی یہ صلاحیتیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتی رہی تھیں۔ ان کے متحد ہونے کے بعد عربوں کا ناقابلِ تسخیر قوت بننے کا خطرہ تھا۔ اسلام نے انہیں جو جذبہ دیا تھا اس سے بھی ہرقل اور اس کے مشیر ناواقف نہ ہوں گے۔ اسلام قبول کرنے کی دعوت بھی دربارِ ہرقل میں پہنچ چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ ہرقل مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورِ اقدسؐ کو بہت ممکن ہے کہ صحیح تعداد کا علم ہو۔ مگر یہ راز کسی پر افشا نہ کیا گیا۔ تین ہزار کا جری لشکر تیار کیا گیا اور اس کا کماندار اعلیٰ زید بن

حارث کو مقرر کیا گیا۔ گزشتہ بارہ مہینوں میں زیدؓ کو کئی مہموں پر روانہ کیا گیا تھا۔ کون جان سکتا ہے کہ یہ آزمائش و امتحان کے سرایا تھے یا کسی بہت بڑے معرکہ کے پیشِ نظر تربیت و تیاری تھی۔ آج تک اتنا بڑا لشکر مدینہ نے صدر مقام سے باہر روانہ نہیں کیا تھا۔ بعض مورخ رومی فوج کی دو لاکھ کی تعداد اور ان کے مددگار عیسائی قبائل کی پچاس ہزار تعداد کو اس لیے قبول نہیں کرنا چاہتے کہ اسلامی فوج کی اتلاف صرف دو سو پچاس تھیں۔ یہ استدلال درست نہیں۔ طرفین کی اتلاف فریق مخالف کی تعداد پر منحصر نہیں ہُوا کرتیں۔ ان کا انحصار ہتھیاروں، اسلحہ، طرزِ جنگ اور دل گردہ پر ہوا کرتا ہے۔ حضورؐ واحد سپہ سالار ہیں جو ہمیشہ کم سے کم تعداد کے لشکر روانہ فرمایا کرتے تھے۔ کم سے کم طاقت (ECONOMY OF FORCE) کے اصول کا استعمال آپؐ سے بہتر کوئی سپہ سالار نہیں کر سکا۔ آپؐ بنو غطفان کے پانچ ہزار ہتھیار بندوں کے خلاف ساٹھ سے زاید کا لشکر روانہ نہیں فرماتے تھے اور وُہ جو پانچ ہزار کا لشکر تیار کر سکتے تھے ہمیشہ ناگہانیت (SURPRISE) کا شکار ہو جانے کی وجہ سے پہاڑوں میں روپوش ہونے پر مجبور ہوا کرتے تھے۔ آپؐ خیبر کے موقعہ پر سولہ ہزار کے خلاف صرف چودہ سو کے لشکر کو لے کر روانہ ہُوئے تھے۔ اس لیے سرورِ کونینؐ اگر تین ہزار کا لشکر شمالی علاقوں میں روانہ فرماتے ہیں اور مغربی مورخوں کی تحقیق کے مطابق یونانی ماخذ بھی ہرقل کے بھائی کے زیرِ کمان دو لاکھ کا لشکر بتاتے ہیں تو پھر اتلاف کی کمی کی دیگر وجوہات ڈھونڈنی پڑیں گی اور بہت ممکن ہے کہ ان وجوہات کی روشنی میں موتہ کی لڑائی کا نقشہ بہتر سمجھا جا سکے۔

حضور اقدسؐ کی دُور رس نگاہ کا ثبوت اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ مملکتِ مدینہ کا سب سے بڑا لشکر اُس دَور کی فاتح طاقت کے خلاف روانہ فرماتے وقت لشکر کی کمان کے مستقبل پر مکمل احکامات نافذ فرمائے۔ زیدؓ کماندار تھے مگر زیدؓ کی شہادت پر کمان کے لیے جعفرؓ بن ابی طالب کو نامزد کیا۔ اور فرمایا کہ جب جعفرؓ بھی رتبۂ شہادت حاصل کر لے تو عبداللہؓ بن رواحہ اسلامی لشکروں کی کمان سنبھالے۔ اور چونکہ روانگی کے وقت عبداللہ بن رواحہ کو خیر و برکت عطا فرما چکے تھے اس لیے حکم ہُوا کہ جب عبداللہؓ بھی شہید ہو جائے تو لشکر اپنا کماندار خود عین میدانِ جنگ میں منتخب کرے۔ خیر و برکت کے الفاظ کے متعلق یہ رائے ہے کہ شہادت کے طلبگار لڑائی شروع ہونے سے قبل دعائے خیر و برکت کی گزارش کرتے تھے۔ جن کے حق میں دُعا کے الفاظ لب مبارک سے ادا ہو جاتے تھے وہ جانتا تھا کہ اسے اس لڑائی میں شہادت نصیب ہو جائے گی۔ جن کے سوال پر آپؐ خاموش رہتے وُہ سمجھ جاتے تھے کہ ابھی قسمت نے یاوری نہیں کی۔ اس روز لشکر کی مدینہ سے روانگی سے قبل نمازِ جمعہ کے بعد حضرت عبداللہؓ نے دعائے برکت کی درخواست کی تھی اور آپؐ نے دعا فرمائی۔ جب کمان کی مزید تفاصیل بیان فرمائیں تو حضرت عبداللہؓ کو تیسرا کماندار نامزد فرمایا۔ آج تک کسی مہم میں آپؐ نے کمان کے متعلق یہ نہیں فرمایا تھا کہ فلاں کے بعد فلاں کماندار ہوگا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس طرح کے احکام جاری فرمائے۔ یہ تمام باتیں بے وجہ نہیں ہو سکتیں۔

جب اسلامی لشکر شام کی سرحد کے قریب پہنچا تو اطلاع ملی کہ ہرقل شہنشاہِ مملکت بازنطین (دراصل کماندار اس کا بھائی تھا) دو لاکھ کی جمعیت کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ اتنے بڑے رومی لشکر کی جنوبی شام میں موجودگی کی صرف ایک وجہ ہو سکتی تھی اور وہ مملکتِ مدینہ پر فوج کشی تھی۔ حضورؐ کی عسکری استخبارات کی بروقت کارکردگی داد طلب ہے۔ دشمن کی تعداد کی اطلاع، ان کے ارادوں کا ذکر اور ان کی روانگی کی تاریخوں کا تعین۔ یہ سب باتیں اگر کاملاً درست نہ ہوتیں تو زیدؓ کا لشکر شام کی سرحد پر بروقت نہ پہنچ سکتا۔ لشکر نے

معمولی بحث کے بعد فیصلہ کیا دشمن کی تعداد بے معنی ہے۔ انہیں فرض کی ادائیگی سے غرض ہے۔

دونوں لشکر بحیرۂ مُردار کے ساحل پر مشارف گاؤں کے مقام پر ایک دُوسرے کے بالمقابل ہُوئے۔ جیسا کہ معمول ہے دونوں نے اپنے اپنے رسالوں کو دشمن کے بازؤوں کے صحیح مقامات کے تعین کے لیے استعمال کیا۔ واقعات سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ زیدؓ نے اپنے رسالے کے استعمال میں دشمن کو اپنی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہونے دیا۔ ناظر اور لڑاکا گشتوں (RECCE AND FIGHTING PATROLS) کا استعمال چھ روز تک رہا۔ ساتویں دن زیدؓ نے رابطہ (CONTACT) توڑ کر کچھ اس انداز میں پس نشینی کی کہ رومی یہ سمجھے کہ اسلامی لشکر بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ رومی لشکر فیلانکس (PHALLANX) کی ترتیب میں صف آراء تھا۔ فیلانکس تیز رفتاری تو کجا چند قدموں سے زیادہ کی حرکت کی اجازت نہیں دیتا۔ زیدؓ نے تیزی سے پس نشینی کی اور چند میل عقب میں موتہ کے مقام پر اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دی کہ رومی لشکر جونہی سامنے آئے اس کے غیر مرتب فیلانکس کے بکھرے ہُوئے سپاہیوں پر ہلّہ بول دیا جائے۔ فیلانکس یوں بھی اس قدر گنجان ہوتا ہے کہ اس کے اکثر افراد کو بازو اٹھانے کے لیے جگہ نہیں ہوتی اور وہ اپنے ہتھیاروں کا استعمال اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ رومی لشکر پر جونہی یہ ناگہانی حملہ ہوا اس کی اگلی مگر بے ترتیب صفیں پیچھے کو بھاگ گئیں حالانکہ حملہ محاذ کے صرف ایک حصّہ پہ ہُوا تھا مگر لڑائی میں فوج کی بھگدڑ چھُوت کی بیماری کی مانند ہُوا کرتی ہے۔ ہر طرف شور و غل اور عقب کو بھاگنے کی کوشش۔ فیلانکس کی گہرائی اس کی چوڑائی کے برابر ہوتی ہے بھاگ کر کہاں جاتے۔ اب پیچھے سے اسلامی سپاہ کی شمشیریں چمکنا شروع ہُوئیں۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ مسلمان سپاہی ایک ایک اور دو دو ہو گئے تھے۔ مورخوں نے وہی اُحد والی غلطی کی ہے۔ جب دشمن بھاگ کھڑا ہو تو دو سے زاید آدمی کس طرح اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ دشمن کا تعاقب کرنے والی فوج خود بکھر جاتی ہے۔

زیدؓ بالآخر شہید ہُوئے۔ جعفرؓ ابن ابی طالب نے بڑھ کر کمان سنبھال لی۔ جعفرؓ نے پیدل لڑنا پسند کیا اور آپ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے گھوڑے کی کونچیاں کاٹ ڈالیں۔ جعفرؓ دلیر، شجاع، نڈر اور طالبِ شہادت، علیؓ ابن ابی طالب کے چھوٹے بھائی۔ ایسے جوانمرد کے سامنے کون ٹھہر سکتا تھا۔ آپ رومی صفوں کو چیر کر بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ بہتر زخموں نے بدن کا خون نچوڑ دیا۔ جب وہ گرے تو عبداللہؓ قریب ہی تھے۔ علمِ نبویؐ انہوں نے سنبھالا اور اشعار پڑھتے ہُوئے رومی صفوں کو چیرنے کا عمل جاری رکھا بالآخر انہوں نے بھی درِ جنت پہ دستک دی۔ درِ بہشت بریں وا ہُوا اور اسلامی لشکر کا تیسرا کماندار بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوا۔

حکمِ رسالت تھا کہ تیسرے کماندار کے شہید ہونے پر لشکر دشمن کی تلواروں کے سائے میں اپنا چوتھا کماندار منتخب کرے گا۔ یہی ہوا۔ خالدؓ بن ولید کو چوتھا کماندار چُنا گیا۔ جو مورخ یہ کہتے ہیں کہ موتہ کے مقام پر اسلامی لشکر کو شکست ہُوئی تھی۔ وہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ شکست خوردہ لشکر میدانِ جنگ میں اپنا کماندار چننے کے قابل نہیں ہُوا کرتا۔ فاتح دشمن ایسی تقاریب کی اجازت نہیں دیا کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن موتہ کے مقام سے بھاگنے میں مصروف تھا۔ اگر جعفرؓ کے زخم اس کی فوج گن سکتی ہے اور نیا کماندار چن کر اس کے احکام کے مطابق واپسی کے دوران مالک بن زفیلہ عیسائی سردار جو دشمن کے بائیں بازو کی حفاظت پہ مامور تھا اسے قتل کر سکتی ہے تو ایسی فوج شکست خوردہ نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُحد کی طرح یہ مقابلہ بھی فتح و شکست کے بغیر انجام پذیر ہُوا۔ چونکہ وہ رومی مملکت کو ختم کیے بغیر لوٹے تھے اس لیے چند لوگوں نے ان پہ کنکر پھینکے اور کہا کہ یہ دشمن کو پیٹھ دکھا کر

آ سکے ہیں ۔ ابھی تو تفاصیل سے مدینہ کے لوگ مکمل لاعلم تھے ۔ کیسے معلوم ہُوا کہ یہ بھاگ آئے ہیں ۔ یہ فقرہ یونہی کسی نے کہہ دیا ہوگا ۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا تھا :

"یہ بھاگے ہوئے نہیں ہیں ۔ اگر اللہ کو منظور رہا تو یہ پھر لڑیں گے ۔"

تاریخ شاہد ہے کہ ایسے ہی ہوا ۔

اُس دَور کی دنیا کی سب سے بڑی طاقت نے موتہ کے مقام پر جو زخم کھائے وہ مغربی دنیا کے دلوں پر ابھی ہرے ہیں اور شاید قیامت تک مندمل نہ ہوں ۔ گو روم کا تنزل اس معرکہ کے نتیجہ میں شروع ہو چکا تھا مگر جن شمالی قبائل نے اس غیر ملکی طاقت کو مدد دی تھی ان کا معاملہ ابھی باقی تھا ۔ غزوۂ موتہ جمادی الاُولیٰ ۸ھ ہجری میں ہُوا ۔ دوسرے ہی مہینہ حضورؐ نے عمرو بن العاص کو تین سو کا لشکر دے کر شمالی علاقہ میں روانہ فرمایا کہ وہاں کے قبائل نے جو لاتا نونیت کے واقعات شروع کر دیے تھے وُہ ختم ہوں ، عمروؓ ابن العاص نے اس علاقہ میں پہنچ کر مدینہ اطلاع دی کہ قبائل کے اجتماع کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کی طرف کمک روانہ کی جائے ۔ حضورؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو دو سو مجاہد دے کر کمک کے طور پر روانہ فرمایا ۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ صف کے سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے ۔ وہاں پر کمان کا سوال پیدا ہُوا ۔ حضرت ابو عبیدہؓ پرانے کماندار تھے مگر عمروؓ ابن العاص نے کہا کہ مہم کے کماندار وُہ ہیں اس لیے نماز کی امامت اور افواج کی امامت یعنی کمان کرنے کے وہی حقدار ہیں ۔ کمک کا کماندار اسی صورت ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ کمان (HIGH COMMAND) نے اس طرح کے واضح احکام صادر کیے ہوں ۔ ان کا موقف مان لیا گیا ۔ قبائل کے اجتماع کو شکست ہُوئی اور شمالی علاقوں میں امن و امان قایم کر دیا گیا ۔ اس مہم کا نام سریۂ ذات السلاسل ہے ۔

رجب ۸ھ ہجری میں حضرت ابو عبیدہ کو بھی کمان کا موقعہ مل گیا ۔ انہیں تین سو کا لشکر دے کر سیف البحر روانہ کیا گیا ۔ باغی قبیلہ لشکر کی آمد سُن کر پہاڑوں کی جانب نکل گیا ۔ اسی طرح شعبان ۸ھ ہجری میں سریۂ محارب میں بھی ہُوا ، کوئی لڑائی نہیں ہُوئی ۔

اس دور کا جائزہ اگر لیا جائے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ پورے جزیرۃ العرب پر چھا گیا ہے اور مکہ پس منظر میں چلا گیا ہے ۔ شمالی علاقہ جو کبھی کسی بھی مملکت کے تابع مکمل طور پر نہ رہا تھا وہ بھی مطیع ہو کر امن و امان قایم رکھ رہا تھا ۔ گو اہلِ مکہ کی تجارت پرانے پیمانہ پر از سرِ نو جاری ہو گئی تھی مگر سیاسی طور پر مکہ اپنا مقام کھو بیٹھا تھا ۔ مکہ کے حلیف ختم ہو چکے تھے ۔ بنو فزارہ کا سردار اعُیَینہ بن حصن جس نے بارہا مکہ کی مدد کی تھی وُہ مدینہ آیا اور اپنے تمام کارناموں کی معافی مانگی ۔ وہ جس نے چالیس دینی مدرسوں کو قتل کروایا تھا اسے مدینہ کے دربار میں رحمۃ للعٰلمینؐ نے بخش دیا ۔ اُس دور کے مبصروں کو محسوس ہوتا ہوگا کہ جزیرۃ العرب اب وہ پُرانا عرب نہیں رہا ۔ اب اس میں نئی روح کارفرما ہو چکی ہے ۔ اس احساس کے نمایاں ہوتے ہی قریش مکہ کو ایک بار پھر اپنے جاتے ہوئے اقتدار کی فکر دامنگیر ہُوئی ۔

اہلِ مکہ نے صلح حدیبیہ اس لیے قبول کی تھی کہ وُہ اپنی تجارت کو بحال کرنا چاہتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ تجارت کے بحال ہونے سے ، وُہ اپنا سیاسی اور معاشرتی مقام قایم رکھ سکیں گے مگر حالات نے تمام پرانے نظام کو بدل ڈالا تھا ۔ مدینہ اب رومی سلطنت کے ساتھ مبارزت میں بلند مقام حاصل کر چکا تھا ۔ نجد پُوری طرح مدینہ کے زیرِ نگیں تھا ۔ شمالی علاقے مدینہ کی اطاعت قبول کر چکے تھے ساحلی علاقہ پورے کا پورا مدینہ کے زیرِ تصرف تھا ۔ مکہ اگر تجارت کر رہا تھا تو وہ مدینہ کے رحم و کرم پر ۔ اگر حالات کو اسی طرح رہنے دیا گیا

تو پھر مکہ بھی مدینہ کی سیادت وقیادت کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیگا اور پھر ان کی دینی و سیاسی رہبری افسانہ بن کے رہ جائے گی۔ مکی نوجوانوں نے زور دیا کہ صلح حدیبیہ کو توڑ دیا جائے ——— اب ایک واقعہ ہُوا جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اہل مکہ کے نوجوانوں کی تجویز تھی یا وہ جوش میں آکر اور صلح حدیبیہ کو توڑنے کی غرض سے شامل ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر بنو خزاعہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی مدینہ کے حلیف ہیں۔ اس وقت بنو بکر نے اعلان کیا تھا کہ وہ قریشِ مکہ کے حلیف ہیں۔ بنو بکر کو آخری مرتبہ بنو خزاعہ کی جانب سے نقصان پہنچا تھا۔ صلح حدیبیہ کے مطابق یہ بدلہ نہ لے سکے تھے۔ مگر قریش مکہ کے کچھ جوانوں کے ساتھ مل کر بنو بکر نے اچانک بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا اور یہاں تک کہ انہیں حرم میں بھی تعاقب کر کے مارا۔ بنو خزاعہ حضورؐ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہُوئے۔ آپؐ نے انھیں یقین دلایا کہ کچھ کیا جائے گا اور وہ لوٹ آئے۔ آپؐ نے قریش کو لکھا کہ وہ مقتولوں کا خون بہا ادا کریں۔ قریشِ مکہ نے انکار کیا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ پھر صلح حدیبیہ ختم کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ جہاں تک ان کا تعلق ہے صلح حدیبیہ ختم ہو چکی ہے - یہ حقیقتاً اعلانِ جنگ تھا۔

دوبارہ سوچنے پر قریش مکہ نے چاہا کہ صلح حدیبیہ قایم رہے مگر خوں بہا کا ذکر پھر بھی نہ کیا۔ ابوسفیان مدینہ آیا مگر دربارِ رسالتؐ میں باریابی کی اجازت نہ ملی اور ناکام واپس چلا گیا۔

حضورؐ جب تیاری مکمل کر چکے تو دس ہزار کا لشکر لے کر مکہ کے خلاف روانہ ہو گئے۔ منزل آخر تک صیغۂ راز میں رہی۔ ساتویں دن مرالظہران کے مقام پر معسکر لگایا اور حکم دیا کہ ٹولی ٹولی یعنی دس آدمیوں کے لنگر کی آگ کی بجائے ہر شخص اپنا الاؤ جلائے۔ دیکھنے والوں کو معلوم ہُوا کہ دس ہزار نہیں بلکہ ایک لاکھ کا لشکر ہے۔ ابوسفیان خدمت میں حاضر ہُوا مکہ کی جانب سے معذرت خواہی کی اور مسلمان ہُوا۔ مگر آپؐ نے صرف یہ کہا، جاؤ اور جا کر اعلان کر دو کہ:

"جو حرم میں پناہ لے گا یا جو ابُوسفیان کے گھر پناہ لے گا اور جو اپنے دروازے بند کر دے گا اسے امان ملے گی۔"

دُوسری صبح لشکر چار بریگیڈوں میں تقسیم ہوا اور چاروں جانب سے حضورؐ اس مکہ میں داخل ہُوئے جہاں سے جاتے وقت آپؐ کو پکڑنے کے لیے سَو اونٹوں کے انعام کا اقرار ہُوا تھا۔ ایک محلہ نے مدافعت کی ورنہ کوئی لڑائی نہیں ہُوئی۔ کچھ دیر آرام فرمانے کے بعد حضورؐ حرم کعبہ تشریف لے گئے۔ آپؐ حرم کعبہ کے دروازہ پر کھڑے تھے اور سردارانِ قریش سر جھکائے سامنے بیٹھے تھے خالق العلمین کی تعریف و توصیف کے بعد حضورؐ نے پُوچھا:

"اے قریش! مجھ سے کس طرح کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

جواب ملا:

"باعزت باپ کے باعزت بیٹے سے اچھے سلوک کی توقع ہے۔"

ارشادِ رحمتِ عالمؐ ہُوا:

"آج تمہیں کوئی پرسش نہیں، جاؤ تمہاری گردنیں آزاد ہیں۔"

عمر بھر کے دشمن آزاد ہو کر دوست بن چکے تھے۔

مکہ کے جنوب میں بنو ہوازن کا علاقہ تھا۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا جس کی شاخیں صحرا اور پہاڑوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور صحرائی لڑائی اور پہاڑی لڑائی سے یکساں طور پر واقف تھے۔ طائف ان کا مرکزی مقام تھا۔ مکہ اور مدینہ کی جنگ میں اب تک انہوں نے حصہ نہیں لیا تھا۔ اس لئے بھی ان کی تمام طاقت محفوظ تھی۔ انھیں کعبہ کے بتوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ناگوار گزرا۔ ان کا سردار مالک ابھی نوجوان اور خود سر تھا۔ قریش مکہ کی شکست نے شاید اسے یہ خیال بھی دے دیا تھا کہ مدینہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ قریش اس سے شکست کھا گئے ہیں۔ مگر میں بہت بڑے قبیلے کا سردار ہوں۔ اگر میں فاتح عربؐ کو شکست دے دوں تو میں پورے عرب کا بادشاہ بن سکتا ہوں۔ اس خیال نے اسے پورے قبیلے کی طاقت کو یکجا کرنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس نے قبیلہ کی تمام شاخوں کو بلوا بھیجا اور حکم دیا کہ ریوڑ، عورتیں اور بچے سبھی ساتھ لے آؤ۔ اسے ایک بزرگ نے مشورہ بھی دیا کہ یہ کیا کر رہے ہو، کہنے لگا: "بیوی بچوں کی حفاظت کے خیال سے یہ بے جگری سے لڑیں گے"

حضور اقدس کو جب اطلاع ملی تو آپؐ نے فوراً ہوازن کی پہاڑیوں کا رُخ کیا۔ دس ہزار کا لشکر آپؐ مدینہ سے ساتھ لائے تھے قریش مکہ نے دو ہزار کا دستہ مہیا کیا۔ روانگی سے تیسرے دن ایک وادی سے گزر رہے تھے کہ اچانک دونوں طرف کے ناموں سے حملہ ہوا خالد بن ولید طلایہ کی کمان کر رہے تھے مگر طلایہ میں بنو سُلیم کے نوجوان تھے جن کی تربیت ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ جلد ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ تنگ وادی میں جب طلایہ بھاگ کھڑا ہوا تو پوری فوج کے قدم اُکھڑ گئے۔ آپؐ قریب ہی تھے۔ آپؐ وادی کے ایک اونچے حصہ پر کھڑے ہو گئے اور پکار کر فرمایا:

"کہاں جا رہے ہو، ادھر میرے پاس آؤ، یہاں ہوں میں اللہ کا رسول، محمد! عبد اللہ کا بیٹا!"

حلقۂ اصحابؓ میں "ابریشم کی طرح نرم" آواز میں بولنے والے آخری نبیؐ کی آواز دونوں طرف کے پہاڑوں کے ساتھ ٹکرائی اور دوست دشمن کو معلوم ہوا کہ کس طرح جب خون کے دریا بہہ رہے ہوں تو کمان دار ٹھنڈے دل سے اپنی کمان قایم رکھتا ہے اور افواج کو درست طریقہ پر سرگرم عمل ہونے کی ہدایات دیتا ہے۔ جب آپؐ نے فرمایا:

"اے انصار!

اے ببول کے درخت کے ساتھیو!

میرے پاس آؤ۔

اے انصار!

اے خزرج!"

صحابۂ کرامؓ "لبیک لبیک" کہتے ہوئے اور اپنی زرہیں پھینکتے ہوئے اونٹوں سے کود دے۔ آج مدینہ کے غازی زرہ کے بغیر لڑنے میں آسانی اور خوشی محسوس کر رہے تھے۔ معاً لڑائی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ بنو ہوازن جب بنو سُلیم کا تعاقب کرتے ہوئے مدنی لشکر کے مقر قیادت تک پہنچے تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے ٹکرا کر رک گئے۔ حضورؐ یہ نقشہ ملاحظہ فرما رہے تھے۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو فرمایا:

"اب تنور گرم ہوا ہے۔"

ایک دلیر خاتون اپنی سواری بڑھاتی ہوئی حضورِ اقدسؐ کے قریب پہنچ گئی اور کہا:

"حضورؐ جو بھاگنے والے ہیں انھیں بھی دشمنوں کی طرح قتل کرنا چاہیے۔"

اس روز تو بھاگنے والے قتل نہ کیے گئے مگر عہدِ حاضر کی افواج کی قیادت نے میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کی سزا موت تجویز کی ہے۔ ہوازن کو غزوۂ حنین میں شوال ۸ھ میں شکست فاش ہوئی۔ وہ مختلف سمتوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ زیادہ تر نے طائف جا کر پناہ لی۔ ان کے معسکر سے چوبیس ہزار اونٹ اور چالیس ہزار بھیڑ بکریاں ہاتھ آئیں۔ ان کے بیوی بچوں کو البتہ آزاد کر دیا گیا۔ قریش کے جن سرداروں نے ہجرت کے دوسرے دن ندوہ میں بیٹھ کر آپؐ کو پکڑ کر لانے والے کو سو اونٹ انعام دینے کا اعلان کیا تھا انھیں نام بنام بلایا گیا اور حنین میں حاصل شدہ اونٹوں میں سے انہیں ایک ایک سو اونٹ انعام دیے گئے۔ یہ تھا رحمتِ عالمؐ کا بدلہ۔

حنین کی فتح کے بعد کچھ روز تک طائف کا محاصرہ کیا گیا مگر بے جا خون خرابہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ آپؐ نے محاصرہ اٹھا لیا اور فرمایا کہ اہلِ طائف خود مدینہ حاضر ہوں گے۔ ایسے ہی ہوا۔ اہلِ طائف کے سرداروں نے مدینہ حاضر ہو کر گزشتہ کی معافی مانگی۔ انعام و اکرام اور خلعت و سفر خرچ سے نوازے گئے اور ان کے تمام قصور بخش دیے گئے۔ یہ دریا دلی، یہ بخشش، یہ جود و سخا اور یہ انعام و کرام۔ مگر جب سپہ سالارِ مدینہؐ، شاہِ زمان، فاتحِ خیبر و حنین ان سفارتوں پر دولت کی بارش کر کے مسجدِ نبویؐ سے اُٹھتے اور اپنے چند ہاتھ کے طول و عرض کے حجرہ میں داخل ہوتے اور پُوچھتے کہ اس روز گھر میں کیا پکا ہے؟ تو اکثر جواب ملتا:

"گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ چُولھا گرم ہوتا۔"

اور شہنشاہِ دو عالم، سربراہِ مملکتِ عرب و عجمؐ، فاتحِ ہر میدان خالی پیٹ سو رہتے۔ یہ تھے محمدؐ، اللہ کے رسولؐ، آخری نبیؐ، عالم بشریت کے لیے زمان و مکاں سے بلند تر نظامِ زندگی لانے والے اُمی پیغامبرؐ، اور اس پر مکمل طور پر نمونہ قایم کرنے والے جنھوں نے عسرت و نصرت، بزم و رزم، ناداری و شہنشاہی کی زندگی غرضیکہ ہر انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طور طریقے مثال کے طور پر قایم کیے۔ اللہ اور اللہ کے فرشتے کیوں نہ ایسے سرورِ دو جہاںؐ پر درود پڑھیں۔ آپ بھی پڑھیے،

اللھم صل علیٰ محمدٍ و علیٰ آلِ و اصحاب محمد و بارك وسلم وصل علیه۔

یوں تو فتح مکہ اور حنین و طائف کے غزوات پر غزواتِ نبویؐ کا ذکر ختم ہو جانا تھا مگر شمال سے اطلاع آئی کہ رومی شہنشاہ ایک بار پھر زور آزمائی کے لیے بڑھ رہا ہے۔ اس بار آپؐ نے لام بندی پورے اعلان کے بعد کی اور بتا دیا کہ کہاں کا قصد ہے۔ تیس ہزار کا لشکر تیار ہوا، ایک تہائی سوارہ پر مشتمل تھا۔ امت نے دل کھول کر بیت المال کی مدد کی۔ حضرت عمرؓ آدھا اثاثہ اٹھا لائے، حضرت ابوبکرؓ نے اپنی پوری پُونجی پیش کر دی۔ دس ہزار سپاہ کا اسلحہ وغیرہ حضرت عثمانؓ نے فراہم کیا۔ اس کے باوجود بہت سے تھے جو اس لیے نہ جا سکے کہ سواری مہیا نہ ہو سکی۔ مدینہ میں تنہا ساتھی کے ساتھ شامل ہونے والا اللہ کا اُمی رسولؐ آج تیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ مملکتِ مدینہ جو پورے جزیرۃ العرب پر مشتمل تھی اس کے تحفظ اور دفاع کے لیے اس دور کی فاتح مملکت کے خلاف لشکر کشی کر رہا تھا۔ جنھوں نے تین ہزار سے کاری زخم کھائے تھے وہ تیس ہزار کے مقابلہ میں کس طرح آتے۔ لڑائی نہیں ہُوئی البتہ چھوٹی چھوٹی

جھڑپوں کے ذریعہ شمالی علاقہ کے قبائل کو امن اور سکون سے رہنے کی تلقین کے بعد حضور اقدسؐ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ اور صحابہؓ کو مملکت کے نظم ونسق اور انتظام وانصرام کے سبق سکھانے میں مصروف ہو گئے۔ اب کوئی غزوہ عمل میں نہیں آیا۔ غزوات کی مہم میں جو مقصد تھا وہ دوست و دشمن کو امن عطا کرنا تھا وہ حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے اب صرف " الیوم اکملت " کے اشارہ کا انتظار تھا۔

مہمّاتِ رسولؐ

غلام جیلانی برق
ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی

الفہرس

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	مہماتِ حضورؐ	۳۷۶
	اسلام بزورِ شمشیر کا الزام	۳۷۶
	مکہ میں حضورؐ کی مشکلات	۳۷۷
	بعد از ہجرت	۳۷۹
	دفاعی تدابیر	۳۸۱
	مہمات کی قسمیں	۳۸۱
۱	سریّہ حمزہؓ بن عبدالمطلب	۳۸۲
۲	عُبیدہؓ بن حارث کی مہم	۳۸۲
۳	سعدؓ بن ابی وقاص کی مہم	۳۸۳
۴	غزوۂ اَبواء	۳۸۳
۵	غزوۂ بُواط	۳۸۴
۶	غزوۂ تلاشِ کرز	۳۸۴
۷	غزوۂ ذی العُشَیرہ	۳۸۴
۸	عبداللہؓ بن جحش کی مہم	۳۸۵
۹	غزوۂ بدر	۳۸۶
۱۰	غزوۂ بنی قینُقاع	۳۸۸
۱۱	غزوۂ سَویق	۳۹۱
۱۲	غزوۂ قرقرۃ الکُدر	۳۹۲
۱۳	غزوۂ غطفان	۳۹۳
۱۴	غزوۂ بنو سُلیم	۳۹۳
۱۵	زیدؓ بن حارثہ کی مہم	۳۹۳
۱۶	غزوۂ اُحد	۳۹۴
۱۷	مہمِ قَطَن	۳۹۷
۱۸	وادیٔ عُرَنہ کی مہم	۳۹۷
۱۹	بئرِ معونہ کی مہم	۳۹۸
۲۰	رَجیع کی مہم	۳۹۹
۲۱	غزوۂ بنو نضیر	۴۰۰
۲۲	غزوۂ بدر الموعد	۴۰۰
۲۳	غزوۂ ذات الرِّقاع	۴۰۱
۲۴	غزوۂ دُومۃ الجندل	۴۰۱
۲۵	غزوۂ مُریسیع	۴۰۲
۲۶	غزوۂ اَحزاب	۴۰۲
۲۷	غزوۂ بنو قُریظہ	۴۰۴
۲۸	مہم قُرطاء	۴۰۴
۲۹	غزوۂ بنو لحیان	۴۰۴
۳۰	غزوۂ غابہ	۴۰۵
۳۱	عُکاشہ کی مہم	۴۰۵
۳۲	مہمِ ذُو القصّہ	۴۰۵
۳۳	مہمِ جموح	۴۰۶
۳۴	مہمِ عیص	۴۰۶
۳۵	مہمِ طرف	۴۰۶
۳۶	مہمِ حِسمٰی	۴۰۶
۳۷	سریّہ دُومۃ الجندل	۴۰۶
۳۸	مہمِ فدک	۴۰۷

۳۹	مہم ابن عتیک رضؓ	۴۰۷
۴۰	مہم عبداللہؓ بن رواحہ	۴۰۷
۴۱	مہم کرز بن جابر	۴۰۷
۴۲	عمروؓ بن اُمیّہ کی مہم	۴۰۸
۴۳	غزوہ حُدیبیّہ	۴۰۸
۴۴	غزوہ خیبر	۴۰۹
۴۵	مہم فدک	۴۱۰
۴۶	مہم تُربہ	۴۱۱
۴۷	مہم بنی کلاب	۴۱۱
۴۸	مہم بشیرؓ ابن سعد	۴۱۱
۴۹	مہم مَیفعہ	۴۱۱
۵۰	مہم اَلجناب	۴۱۱
۵۱	مہم ابنؓ اَبی العَوجاء	۴۱۲
۵۲	مہم کدید	۴۱۲
۵۳	مہم بنو مُرّہ	۴۱۲
۵۴	مہم سِی	۴۱۲
۵۵	مہم کعب بن عُمیر	۴۱۳
۵۶	مہم مُوتہ	۴۱۳
۵۷	مہم ذاتُ السّلاسِل	۴۱۳
۵۸	مہم خبطؔ	۴۱۴
۵۹	مہم خُضرہ	۴۱۴
۶۰	فتحِ مکّہ	۱۱۴
۶۱	عُزّیٰ کی تباہی	۴۱۵
۶۲	سُواع کی تباہی	۴۱۵
۶۳	مَناۃ کی تباہی	۴۱۵
۶۴	غزوہ حُنین	۴۱۵
۶۵	غزوہ طائف	۴۱۶
۶۶	مہم بنو تمیم	۴۱۶
۶۷	مہم قُطبہ بن عامر	۴۱۷
۶۸	مہم بنی کلاب	۴۱۷
۶۹	مہم علقمہؓ	۴۱۷
۷۰	مہم اَلفُلس	۴۱۷
۷۱	غزوہ تبوک	۴۱۷
۷۲	مہم یمن	۴۱۸
۷۳	آخری حج	۴۱۸
۷۴	مہم اُسامہؓ	۴۱۸
۷۵	غیر اہم مہمات	۴۱۹
	حرفِ آخر	۴۲۰
	ضمیمہ اوّل ۔ قبائل	۴۲۲
	ضمیمہ دوم ۔ مقامات	۴۲۸
	ضمیمہ سوم ۔ حضورؐ کے مقرر کردہ عُمّال	۴۲۹
	ضمیمہ چہارم ۔ اشاریہ حواشی	۴۳۰
	کتابیات	۴۳۲

مہماتِ رسولؐ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی کے دس برس میں اٹھاسی (۸۸) مہمات ترتیب دی تھیں۔ ان میں سے کچھ تبلیغی تھیں۔ جیسے بئرِ معونہ (عنوان نمبر۱۹) رجیع (۲۰) اور رلین (۲۷)، کی مہمات۔ کچھ خالص دفاعی تھیں جیسے بدر، اُحد اور اَحزاب۔ کہ دشمن مدینے پر چڑھ آیا تھا اور حضورؐ کو تلوار اٹھانا پڑی تھی۔ کچھ اقتصادی تھیں جن کا مقصد قریشِ مکہ کو اقتصادی طور پر کمزور کرنا تھا اور اس کی واحد صورت یہ تھی کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو جو شام تک جاتے تھے نواحِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں حضورؐ نے کئی مہمات بھیجی تھیں۔ دیکھیے عنوان ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۷، ۸ وغیرہ اور کچھ انسدادی تھیں۔ حضورؐ کا نظامِ اخبار و اطلاعات اس قدر محکم و مکمل تھا کہ جہاں بھی کوئی سازش ہوتی مدینہ پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنتا یا قبائل آمادۂ پیکار ہوتے تو حضورؐ کو اطلاع مل جاتی اور آپؐ فوراً کوئی مہم اس طرف بھیج دیتے۔ اس نوع کی مہمات چالیس سے کم نہ تھیں۔ دیکھیے عنوان ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۰ وغیرہ۔

اسلام بزورِ شمشیر کا الزام

غیر مسلم تاریخ نگار عموماً یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔ یہ الزام بوجوہ بے بنیاد ہے۔ اول اس لیے کہ اللہ نے دین میں جبر سے روک دیا تھا لا اکراہ فی الدین (دین میں جبر نہیں ہے) حضورؐ کی اٹھاسی مہمات کی تفصیل آپ کے سامنے ہے ان میں ایک بھی ایسی مہم نہیں جو کسی قوم یا قبیلے کا دین بدلنے کے لیے بھیجی گئی ہو۔ دوم، مذہب ایک شدید ترین تعصب کا نام ہے جس کی جڑیں رُوح کی گہرائیوں میں ہوتی ہیں۔ رُوح کا نکلنا تو آسان ہے لیکن مذہب کا چھٹنا مشکل۔ اگر مذہب تلوار سے بدل سکتا ہے تو پھر آیئے تلوار میں دیتا ہوں ذرا پشاور سے آگے کوہستانی قبائل میں جائیے اور ان کا مذہب بدل کر دکھایئے۔ اگر ہم لحہ بھر کے لیے اس الزام کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو سوال یہ ہے کہ انڈونیشیا میں گیارہ کروڑ، ملایا میں ایک کروڑ، جزائر بحرالکاہل میں اسی لاکھ، چین میں آٹھ کروڑ اور سیاہ افریقہ میں بائیس کروڑ مسلمان کہاں سے آ گئے ہیں۔ ان ممالک میں تو ہماری تلوار کبھی نہیں گئی تھی۔ ہاں ہمارے روشن جبیں علماء و صوفیاء، دیانت دار تاجر اور راست باز مسافر ضرور گئے تھے۔ یہ انہی لوگوں کا حُسنِ کردار تھا، جس سے کروڑوں انسان متاثر ہوئے اور وہ خدائے قدوس کے سامنے جھک گئے۔

حضورؐ اور پیروانِ حضورؐ نے بارہا میدانِ جنگ میں اسلام پیش کیا تھا لیکن صرف اُن لوگوں کے سامنے جنھوں نے حملے میں پہل کی تھی اور پھر شکست کھائی تھی۔ انھیں دو میں سے ایک کا اختیار دیا گیا تھا، اسلام یا جزیہ۔ جزیہ ایک ہلکا سا ٹیکس ہے جو زکوٰۃ، صدقہ اور عُشر سے بہت کم تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں جزیہ کی شرح یہ تھی:

د۔ سرمایہ دار: چار درہم ماہوار۔ ایک درہم ہماری چونی کے برابر ہوتا ہے۔

ب۔ اوسط الحال: دو درہم ماہانہ

ج۔ ذرا کمتر: ایک درہم ماہانہ

تمام نادار، بے کار اور معذور اس سے مستثنیٰ تھے۔

مکہ میں حضورؐ کی مشکلات مکہ میں حضورؐ کو جہاد کی اجازت نہیں تھی اس لیے آپؐ اور آپؐ کے جاں نثار چپ چاپ قریش کے مظالم سہتے رہے اور جواباً کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ ابوجہل[1] (۲ھ) نے آپؐ کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ کون سا ایذا تھا جو ابولہب[2] اور اس کی بیوی نے نہیں دیا۔ ایک دن جب حضورؐ سجدے میں گئے تو عقبہ[3] نے اونٹ کی اوجھ آپؐ پر پھینک دی۔ اسی عقبہ نے ایک دن آپؐ کی گردن میں چادر ڈال کر اسے مروڑنا شروع کیا۔ اوپر سے حضرت ابوبکرؓ آگئے اور انھوں نے عقبہ کو دھکیل کر آپؐ کی گردن کو آزاد کرایا۔ جب آپؐ طائف[4] میں تبلیغ کے لیے گئے تو وہاں کے لوگوں نے آپؐ کو اتنے پتھر مارے کہ آپؐ کے جوتے لہو سے بھر گئے۔ ہجرت سے پانچ برس پہلے قریش نے ابوطالب کے گھرانے کو اس حد تک زچ کیا کہ یہ لوگ شعب ابی طالب میں منتقل ہو گئے اور وہاں تین برس تک ناداری و عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ حضرت بلال[5]ؓ، امیہ[6] بن خلف کے غلام تھے۔ جب یہ ایمان لائے تو امیہ نے دوپہر کے وقت انھیں گرم ریت پر لٹا کر ان کی چھاتی پر ایک

---

[1] ابوجہل کا پورا نام ابوالحکم عمرو بن ہشام بن مغیرہ مخزومی تھا۔ مخزوم قریش ہی کا ایک قبیلہ تھا۔ یہ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ ۵۷۰ء میں پیدا ہوا اور میدانِ بدر میں دو بھائیوں معاذ بن عفراء اور معوذ بن عفراء کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ۔ پنجاب ج ۱ "ابوجہل")

[2] ابولہب کا اصلی نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ یہ حضورؐ کا حقیقی چچا تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ مل کر حضورؐ کی راہوں میں کانٹے بچھایا کرتا تھا۔ اعدائے اسلام میں یہ واحد آدمی ہے جس کے متعلق ایک سورہ نازل ہوا تھا تبت یدا ابی لہب... جب بدر میں قریش کو شکست ہوئی تو دفورِ غیظ و غضب سے اسے پہلے بخار ہوا پھر چیچک نے حملہ کر دیا۔ جب یہ ہلاک ہوا تو دو تین دن پڑا رہا اور پھر کرایہ کے حبشیوں نے اسے دفن کیا۔ (ڈکشنری آف اسلام "ابولہب")

[3] عقبہ بن ابی معیط اموی حضورؐ کے بدترین اعداء میں سے تھا۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا ص ۱۰۸)

[4] طائف مکہ سے کوئی دس میل جنوب میں ایک سرسبز مقام ہے۔

[5] بلالؓ بن رباح حبشی، اسلام کے ایک دشمن امیہ بن خلف کا غلام تھا۔ یہ آپ کو بے اندازہ اذیتیں دیتا تھا۔ بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ یہ امیہ غزوۂ بدر میں بلالؓ ہی کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا۔ حیاتِ رسولؐ میں آپ مؤذن رہے اور تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ پھر شام کی طرف چلے گئے ۶۳ برس کی عمر پائی ۲۰ھ میں فوت ہوئے اور دمشق میں دفن ہوئے۔ (اکمال۔ ص ۱۱۱۴)

[6] امیہ بن خلف بدر میں حضرت بلالؓ کی ضرب سے ہلاک ہوا تھا اور اس کا بھائی ابی بن خلف میدانِ احد میں حضورؐ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا۔ ص ۶۷)

بھاری سِل رکھ دی۔ عمارؓ[۸] یمنی، صُہیبؓ[۹] رومی اور دیگر متعدد نومسلموں سے بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اُن کا یہ سلوک صرف غریبوں سے نہ تھا بلکہ حضرت عثمانؓ[۱۰] جیسے صاحبِ جاہ و دولت، حضرت ابوذرؓ[۱۱]، حضرت زبیرؓ[۱۲] بن عوام اور حضرت سعیدؓ[۱۳] بن زید جیسے معزز لوگ بھی ان کے مظالم کا شکار رہے۔ آخر تنگ آ کر حضورؐ نے صحابہ کو ہدایت کی کہ وہ حبشہ چلے جائیں چنانچہ صحابہؓ کے دو قافلے روانہ ہوئے۔ پہلے میں گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت عبدالرحمانؓ[۱۴] بن عوف بھی شامل تھے۔ دوسرے قافلے میں ۸۰ صحابہ تھے اور یہ ہجرت ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

قریش نے عمروؓ[۱۵] بن عاص (بعد میں فاتح مصر) کی قیادت میں ایک سفارت حبشہ میں بھیجی۔ اس نے پہلے وہاں کے اسقفِ اعظم کو

---

[۸] عمارؓ کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا سُمیّہ تھا۔ یہ پہلے حُذیفہ بن مُغیرہ قرشی کے غلام تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہیں بے اندازہ اذیتیں دی گئیں لیکن ثابت قدم رہے۔ یہ تمام غزوات میں شامل ہوئے اور جنگِ صفّین (۳۷ھ) میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ (اکمال ص ۱۱۶۱)

[۹] صُہیبؓ کا والد سنان بن خالد (مالک) بن عبد عمرو بن طفیل موصل میں کسریٰ کا عامل تھا۔ رُومیوں کے ایک حملے میں صہیبؓ اسیر ہو گیا اور رُوم میں پلتا رہا۔ اتفاقاً وہاں مکّہ کا ایک تاجر کلب جا پہنچا اور صہیب کو خرید لایا۔ اس سے عبداللہ بن جدعان التیمی نے خرید کر اسے آزاد کر دیا لیکن یہ عبداللہ کے پاس ہی قیام پذیر رہا۔ یہ اور عمار ایک ہی دن اسلام لائے تھے۔ وفات ۳۸ھ میں۔ (استیعاب ج ۱ ص ۳۱۴ و اکمال ص ۱۱۴۵)

[۱۰] عثمانؓ بن عفان بن ابی العاص بن اُمیّہ بن عبدشمس القرشی الاموی حضورؐ کے بعد تیسرے خلیفہ تھے جو ۲۴ھ سے ۳۵ھ تک برسرِ اقتدار رہے۔ آپ کے گھر میں آگے پیچھے حضورؐ کی دو بیٹیاں تھیں۔ پہلے رُقیّہ اور پھر اُمِ کلثوم۔ آپ نے دو دفعہ ہجرت کی۔ پہلے حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف (استیعاب ج ۲ ص ۴۶۷)

[۱۱] ابُوذرؓ غفاری کا پورا نام جندب بن جنادہ بن سفیان بن عبید بن غفار تھا۔ والدہ رملہ بنت ربیعہ تھی۔ کہتے ہیں کہ ابوذر اسلام لانے والوں میں چوتھے تھے۔ بدر، اُحد اور خندق میں شامل ہوئے۔ عہدِ ابوبکرؓ میں شام کی طرف چلے گئے اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ربذہ (مدینہ سے چار منزل شمال مشرق کی طرف) کو مسکن بنا لیا اور ۳۲ھ میں وہیں وفات پائی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۸۲)

[۱۲] زُبیرؓ بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعُزّیٰ بن قُصَیّ القرشی الاسدی ابوعبداللہ (۳۶ھ) کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب حضورؐ کی پھوپھی تھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ اللہ کی راہوں میں سب سے پہلے تلوار کا استعمال آپ ہی نے کیا تھا۔ آپ عشرۂ مبشرہ میں شامل تھے۔ جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کی طرف سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۰۱)

[۱۳] سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل القرشی العدوی (۵۰ھ) بدر کے سوا تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور عمرؓ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ آپ حضرت عمرؓ کے بہنوئی تھے۔ بیوی کا نام فاطمہ۔ انہی کو سزا دینے گئے تھے کہ عمرؓ خود مسلمان ہو گئے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۳۸)

[۱۴] عبدالرحمانؓ بن عوف بن عبد عوف بن عبد بن حارث بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ بن کعب قرشی۔ زہری حضورؐ سے دس سال چھوٹے تھے۔ یہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور فقیہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ وفات ۳۲ھ میں ہوئی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۳۹۰ اور اکمال ۱۱۰۱)

[۱۵] عمروؓ بن عاص بن وائل بن ہاشم بن سعید بن سہم قرشی۔ سہمی سالِ فتح (مکہ) سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضورؐ نے آپ کو عُمان کا حاکم مقرر کیا تھا۔ عہدِ عمرؓ میں مصر کو فتح کیا اور ۴۳ھ میں وفات پائی۔

(استیعاب ج ۲ ص ۴۳۴ و اکمال ص ۱۱۶۲)

تحائف دے کر قابو کیا اور پھر کچھ تحائف نجاشی کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد استدعا کی کہ یہ مہاجر مسلمان اُن کے حوالے کیے جائیں لیکن نجاشی نے اُن کی بات نہ سُنی۔

جو لوگ حضورؐ کو ایذا دینے کے لیے ہر روز نئے طریقے سوچتے تھے۔ ان میں ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور اسود بن عبد یغوث سرِ فہرست تھے۔ (سیرت النبیؐ ج ۱، ص ۲۵۶)

عربوں کی شجاعت، جاں بازی اور اپنے وقار کی حفاظت کے لیے سرفروشی کی بے شمار داستانیں تاریخ عرب اور دواوینِ عرب میں محفوظ ہیں۔ اگر حضورؐ مظالمِ قریش کا انتقام لینے پر تُل جاتے تو بنو ہاشم، بنو تیم، بنو زُہرہ، بنو عدی اور دیگر قبائل کے سینکڑوں سرفروش آپؐ کا اشارہ پاتے ہی جان پر کھیل جاتے لیکن انتقام لینے کی اجازت نہ تھی اس لیے حضورؐ اور آپؐ کے جاں نثار چُپ چاپ ظلم سہتے رہے۔ اور جب یہ مظالم اُن کی قوتِ برداشت سے باہر ہوگئے تو مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ آپؐ (بموجب سیرت النبیؐ ج ۱ صفحہ ۲۷۰) ۸۔ ربیع الاول ۱۳ نبوی / ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ کی بیرونی بستی قُبا میں داخل ہوئے تھے۔ واٹ (ص ۱۶) کی تحقیق یہ ہے کہ آپؐ ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء مطابق ۱۲۔ ربیع الاول ۱ھ کو قبا میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ ابن خلدون (ج ۱ ص ۹۶) کی رائے بھی یہی ہے لیکن وُہ ساتھ ہی لکھتے ہیں کہ حضورؐ سوموار کو قبا میں پہنچے تھے۔ ریاضی کے ایک فارمولے کے مطابق سوموار ۸۔ ربیع الاول ۱ھ کو تھا۔ اور اُس روز ستمبر کی ۲۰ تاریخ تھی کہ ۲۴۔ چار روز بعد مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اور اس روز سے آپؐ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

بعد از ہجرت

ہجرت کے بعد بھی قریش فتنہ سامانیوں سے باز نہ آئے چنانچہ انھوں نے مدینہ کے ایک رئیس عبداللہ بن اُبَی[۱۱] کو لکھا:

"تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم قسم کھا کر اعلان کرتے ہیں کہ اگر تم نے اُن سب کو مار نہ ڈالا یا نکال نہ دیا تو ہم تم پر حملہ کر کے تمھیں تباہ کر دیں گے اور تمھاری مستورات کو اسیر بنا لیں گے۔"

انہی دنوں قبیلۂ اوس کا ایک سردار سعد[۱۲] بن معاذ عمرہ کے لیے مکہ میں گیا تو کعبہ میں ابوجہل سے ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگا کہ تم نے ایک "مرتد" (خاکم بدہن) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر تم اُمیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو واپس نہ جاتے۔ سعد نے جواباً کہا کہ ابوجہل! شرارتوں سے باز آ جاؤ ورنہ ہم تمھارے تجارتی قافلوں کو حدودِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

مدینہ میں متواتر یہ خبریں آ رہی تھیں کہ قریش مدینہ پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ مدّت تک یہ حال رہا کہ حضورؐ رات کو جاگتے رہتے

---

[۱۱] عبداللہ بن اُبَی مدینے کا رئیس المنافقین، جو اسلام کے خلاف تادمِ آخریں سازشوں میں مصروف رہا۔ اس کی وفات غزوۂ تبوک (۹ھ) سے چند ہفتے بعد ہوئی تھی۔ حضورؐ نے اس کا جنازہ پڑھایا لیکن معاً تنبیہ نازل ہوئی کہ آیندہ اس کی قبر پر نہ جانا۔

[۱۲] ابو عمروؓ سعد بن معاذ بن نعمان بن امراء القیس بن زید الاشہلی الانصاری ہجرت سے کچھ پہلے اسلام لا چکا تھا۔ بدر و اُحد میں شامل ہوا۔ خندق میں تیر سے زخمی ہوا اور ایک ماہ بیمار رہ کر فوت ہوگیا۔ (۵ھ)

(استیعاب ج ۲، ص ۵۴۵)

اور بروایت بخاری[۱۸]:

کانوا لا یبیتون الا بالسلاح۔

(کہ صحابہ رات بھر مسلح رہتے)

ربیع الاوّل ۲ھ میں مکہ کا ایک قریشی سردار کرز[۱۹] بن جابر الفہری مدینہ میں آیا۔ اور گرد جس قدر مویشی چر رہے تھے سب کو ہانک کر لے گیا۔ حضورؐ چند صحابہ کو لے کر اس کی تلاش میں میدانِ بدر تک گئے لیکن وُہ نکل گیا تھا۔

تو یہ تھے وہ حالات جن سے حضورؐ گزر رہے تھے۔ آپ کی یہ دلی آرزو تھی کہ اللہ انہیں جہاد کی اجازت عطا فرمائے

اِذنِ جہاد چنانچہ ہجرت[۲۰] سے ایک سال بعد ۱۲ صفر ۲ھ کو یہ آیت نازل ہُوئی:

اُذِنَ لِلّذِیْن یقاتلون بانّھم ظلموا و انّ اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ الّذین اُخرِجوا من دیارھم بغیر حقٍ اِلّا ان یقولوا ربّنا اللہ ولو لا دفع اللہ النّاس بعضھم ببعض لھدّمت صوامع و بِیَعٌ وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیراً ولینصرنّ اللہ من ینصرہ انّ اللہ لقویٌّ عزیز۔ (الحج: ۳۹-۴۰)

جن لوگوں پر جنگ ٹھونسی جا رہی ہے ہم اُن مظلوموں کو لڑنے کی اجازت دیتے ہیں اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جنہیں اُن کے گھروں سے اس بنا پر نکال دیا گیا ہے کہ یہ اللہ کو اپنا رب کہتے تھے۔ اگر اللہ ایک گروہ کے حملوں کو دوسرے گروہ سے نہ روکتا تو راہبوں کے مسکن، گرجے، یہود کی عبادت گاہیں اور مساجد، جن میں اللہ کو بہت یاد کیا جاتا ہے سب گر جاتیں۔ جو شخص اللہ کی مدد کرے گا اللہ اس کی امداد سے کبھی غافل نہیں ہوتا کیونکہ اللہ بہت طاقت ور اور غالب ہے۔

آیۂ بالا سے واضح ہے کہ جہاد کا مقصد مظلوموں کا دفاع اور عبادت گاہوں کی حفاظت ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے لڑو لیکن کسی صورت میں زیادتی نہ کرو۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا انّ اللہ لا یحبّ المعتدین۔ (بقرہ: ۱۹۰)

(اللہ کی راہ میں تم صرف اُن لوگوں سے لڑو جو تم پر حملہ کریں۔ اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فمنِ اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثلِ ما اعتدیٰ علیکم واتّقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتّقین۔ (بقرہ: ۱۹۴)

---

[۱۸] بخاری: باب الجہاد

[۱۹] کرز بن جابر بن حسیل بن لاحب بن حبیب القرشی الفہری اس واقعہ کے بعد جلد مسلمان ہو گیا۔ اور حضورؐ نے اسے شوال ۶ھ میں بنو عرینہ کے چند ڈاکوؤں کے تعاقب میں بھیجا جو حضورؐ کی اُونٹنیاں ہانک لے گئے تھے۔ فتح مکہ کے دن یہ راستے سے بھٹک گئے اور کسی کافر نے انہیں مار ڈالا۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳)

[۲۰] نسائی بحوالہ سیرت النبی ج ۱۔ ص ۳۰۹

(پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جواباً تم اس سے اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم سے کی - اللہ سے ڈرو اور سمجھ لو کہ اللہ اہلِ تقویٰ کے ساتھ ہے)

اگر کسی وقت کوئی قوم اپنی بے بس رعایا کو نسل و مذہب کی بنا، پر قتل کرنے لگے جیسا کہ بھارت، اسرائیل، جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں عموماً ہوتا رہتا ہے تو مسلمانوں پر ایسے لوگوں کی مدد فرض ہو جاتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۔ (النساء - ۷۵)

(تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر کیوں نہیں لڑتے جو ہر وقت دُعا مانگتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں اس بستی سے نجات دلا جس کے باشندے ظالم ہیں)

لیکن مسلمان اس فرض کو اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب اُس کی برّی، بحری اور فضائی قوت سے ساری کائنات لرزہ براندام ہو۔ ایک ایسا وقت تھا جب ہم دنیا میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ ہماری افواج جس طرف کا رُخ کرتی تھیں کامیابیاں ان کے قدم چُومتی تھیں۔ یہ وُہ وقت تھا جب ہم پوری طرح مسلمان تھے۔ اسلام کو چھوڑنے کے بعد آج ہماری پچاس ریاستوں کی حالت یہ ہے کہ یورپ کی کسی قوم سے ایک دن کے لیے بھی نہیں لڑ سکتیں۔ جو قوم ذخائرِ کائنات سے فائدہ نہیں اُٹھاتی اور اخلاقی اقدار کا سفینہ سیلِ شراب میں بہا دیتی ہے اُس کا یہی حال ہوتا ہے ؎

عصا نہ ہو، تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (اقبالؒ)

دفاعی تدابیر حضورؐ نے قریش کے حملوں سے بچنے اور انہیں کمزور کرنے کے لیے دو قدم اٹھائے۔ اوّل ان کے تجارتی قافلوں کو جو نواحِ مدینہ سے گزر کر شام کی طرف جاتے اور آتے تھے، روکنے کے لیے مہمات بھیجنے کا انتظام کیا تاکہ وُہ لوگ اقتصادی بدحالی کا شکار ہو کر شرارتیں ترک کر دیں۔ دوم، مسلمانوں میں اس حد تک جذبۂ جہاد پیدا کر دیا کہ یہ لوگ شہادت کو سب سے بڑا اعزاز سمجھنے لگے۔

مہمات کی قسمیں

حضورؐ نے مدینہ کی دہ سالہ زندگی میں کم و بیش اٹھاسی (۸۸) مہمات بھیجی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی تھیں جن کی قیادت کسی صحابی کے سپرد تھی۔ یہ سرایا[1] کہلاتی ہیں اور بعض کی قیادت خود سرورِ دو عالمؐ نے کی تھی اور یہ غزوات (جنگیں) کے نام سے مشہور ہیں۔

---

[1] اس وقت ایران، روم اور مصر پر حریص، عیاش اور شکم پرست بادشاہوں کی حکومت تھی جو جونکوں کی طرح غریب رعایا کا خون چوس رہے تھے اور انہیں افلاس و جہالت کے جہنم میں دھکیل رکھا تھا۔ عربوں نے روم و ایران پر دو مقاصد کے لیے چڑھائی کی تھی اوّل مظلوم انسانیت کو بادشاہوں کے ظلم سے چھڑانے کے لیے۔ دوم بار بار کی سرحدی جھڑپوں اور سازشوں کو ختم کرنے کے لیے۔

[2] سریۃ جیش (یعنی لشکر) کو کہتے ہیں خواہ یہ دس افراد پر مشتمل ہو یا زیادہ پر۔ بعض مہمات پر صرف ایک آدمی بھیجا گیا تھا اور اسے بھی سریۃ کا نام دیا گیا تھا۔ اس کی جمع ہے سرایا۔

ان کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان[۲۳] میں سے نو غزوات ایسے ہیں جن میں حضورؐ نے دشمنوں سے جنگ کی تھی۔ یعنی بدر، اُحد، مریسیع، خندق، قریظہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف۔ اور باقی اٹھارہ میں شمشیر کا استعمال نہیں ہُوا تھا۔ سرایا کی تعداد ساٹھ سے کچھ اُوپر تھی۔ ان تمام کی تفصیل اور تاریخی ترتیب یہ ہے:

۱۔ سریۂ حمزہ بن عبد المطّلب حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آ رہا ہے۔ چونکہ آپؐ یہ طے کر چکے تھے کہ قریش کی اقتصادی قوت کو توڑنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے اس لیے آپؐ نے اپنے عم محترم حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب (۲ھ) کو تیس مہاجرین کا ایک دستہ دے کر ساحل کی طرف بھیجا۔ اس مہم کا علم سفید تھا جو حضرت حمزہؓ کے ایک حلیف ابو مرثدؓ کنّازؓ[۲۴] بن الحصین الغنوی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں پہنچے تو ایک آدھ دن کے بعد قافلہ بھی آ گیا۔ ابو جہل اور تین سو دیگر نوجوان اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ جنگ کے لیے صفیں آراستہ ہو گئیں۔ لیکن فریقین کے ایک حلیف مجدیؓ[۲۵] بن عمرو کی کوششوں سے یہ تصادم ٹل گیا اور حضرت حمزہؓ واپس آ گئے۔ یہ واقعہ ہجرت سے سات ماہ بعد کا ہے۔

(ابن الجوزی: تلقیح صفحہ ۲۲)

۲۔ عبیدہؓ[۲۶] بن حارث کی مہم اس مہم کا مقصد بھی قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا تھا۔ یہ ہجرت سے آٹھ ماہ بعد شوال میں بھیجی گئی تھی۔ اس میں ساٹھ مہاجر صحابہ شامل تھے اور اس کی سیادت حضرت ابو الحارث عبیدہؓ بن حارث بن المطلب کے سپرد تھی۔ جب یہ لوگ اَحیا[۲۷] پر پہنچے تو سامنے سے کارواں نمودار ہُوا جس کا قائد ابو سفیانؓ[۲۸] بن حرب تھا

---

[۲۳] طبقات ابن سعد۔ اردو ترجمہ از مولانا عمادی ص ۲۴۳ طبع کراچی ۱۹۷۰ء

[۲۴] پُورا نام کنّازؓ بن حصین بن یربوع بن عمرو الغنوی (۱۲ھ) ایک محترم صحابی۔ آپ کے فرزند مرثد بھی صحابی تھے۔ کنّاز غزوۂ بدر میں شامل تھے۔ ۶۶ سال۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ ابن البر۔ القرطبی۔ طبع ثانی حیدر آباد ص ۲۲۹ - ۱۳۳۶ھ)

[۲۵] مجدی بن عمرو بنو جُہینہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ مدینہ کے شمال میں خیبر کے قریب آباد تھا اور اس کے تعلقات اہل مکہ و اہل مدینہ سے اچھے تھے۔

(واٹ: محمدؐ ایٹ مدینہ۔ ص ۲)

[۲۶] عبیدہ بن حارث بن المطلب بن عبد مناف بن قصی القرشی حضورؐ سے دس سال بڑے تھے اور آغاز بعثت ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ آپ بدر میں شامل ہُوئے تھے اور اسی میں شہادت پائی تھی۔ (استیعاب ج ۲، ص ۴۰۹)

[۲۷] مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی پچاس میل دور جُحفہ کا مشہور مقام ہے جو اہل شام و مصر کی میقات بھی ہے۔ اس سے دس میل کے فاصلے پر ایک وادی بطن رابغ کے نام سے مشہور ہے جس کے ایک چشمے (یا کنوئیں یا جھیل) کا نام اَحیاء تھا۔

(یاقوت۔ معجم البلدان۔ ج ۱۔ ص ۱۴۵)

[۲۸] ابو سفیانؓ صخر بن حرب بن اُمیّہ بن عبد شمس الاموی القرشی، امیر معاویہ کا والد، حضورؐ سے دس سال بڑا، فتح مکہ کے روز اسلام لایا۔ حنین و طائف کے غزوات میں شامل ہُوا۔ حضورؐ نے اسے حنین کی غنیمت سے سو اُونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی دی تھی۔ طائف میں اس کی ایک آنکھ چلی گئی تھی اور جنگ یرموک میں دُوسری۔ اس کی وفات ۳۳ھ یا ۳۶ھ میں ہوئی تھی۔ (استیعاب ص ۶۸۹)

اور اس کے ہمراہ دو سو محافظ بھی تھے۔ طرفین نے ایک دوسرے پر تیر تو چلائے لیکن تلوار کا استعمال نہ کیا۔ اس مہم کا علم حضرت مسطح[۲۹] بن اُثاثہ بن المطلب بن عبدِ مناف کے پاس تھا۔ (تلقیح۔ ص ۲۲)

۳۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی مہم یہ مہم ہجرت سے نو ماہ بعد ذی القعدہ میں بھیجی گئی تھی۔ اس میں صرف بیس مہاجر صحابہ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (بعد میں فاتح ایران)، اس کے قائد تھے۔ علم حضرت مقدادؓ[۳۰] بن عمرو البہرانی کے پاس تھا۔ یہ لوگ حجاز کی ایک وادی خرار[۳۱] تک گئے لیکن کاروان نکل چکا تھا اور واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۴۔ غزوۂ اَبواء صفر ۲ھ میں حضورؐ صلعم، ساٹھ[۳۳] مہاجرین کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ مقصد قریش کی شامی تجارت کو بند کرنا تھا۔ آپ مدینے سے نکل کر کوئی اسّی میل جنوب مغرب میں ابواء تک گئے۔ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو جُحفہ سے ۲۳ میل دُور تھا۔ یہیں حضورؐ کی والدہ حضرت آمنہؓ[۳۴] مدفون ہیں۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ کے والد حضرت عبداللہ[۳۵] ایک تجارتی سفر میں فوت ہوئے تھے اور مدینہ میں دفن تھے۔ حضرت آمنہؓ ہر سال اُن کی قبر پہ جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک ایسے ہی سفر سے واپس آ رہی تھیں کہ وفات پا گئیں اور ابواء میں دفن ہوئیں۔

اس مہم میں حضورؐ کی نیابت (مدینہ میں)، کے فرائض حضرت سعدؓ بن عبادہ نے سرانجام دیئے تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے پاس تھا

۲۹؎ پورا نام مسطحؓ بن اُثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب بن عبدِ مناف قرشی تھا۔ یہ کئی غزوات میں شامل ہوئے۔ ۵۶ برس کی عمر پائی اور ۳۴ھ میں انتقال ہوا۔ (الکمال فی اسماء الرجال ص ۱۱۸۰، طبع لاہور ۱۹۶۳ء)

۳۰؎ پورا نام سعدؓ بن ابی وقاص۔ مالکؓ بن وُہَیب بن عبدِ مناف۔ والدہ کا نام حَمنہ بنت سُفیان تھا۔ آپ اسلام قبول کرنے والوں میں تیسرے تھے اور غزوات میں پہلا تیر انھوں نے ہی چلایا تھا۔ حضورؐ نے میدانِ اُحد میں آپ سے فرمایا تھا ارم سعد فداك ابی و اُمّی (سعد، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، تیر چلاؤ) آپ نے عہدِ فاروقؓ میں بے شمار فتوحات حاصل کیں۔ ایران کے فاتح بھی آپ ہی تھے (الکمال ص ۱۱۲۵)

۳۱؎ مقدادؓ بن عمرو بن ثعلبہ بن مالک بن ربیعہ بن ثُمامہ غزوۂ بدر میں شامل ہوئے تھے۔ ستر برس کی عمر تھی کہ ۳۳ھ میں وفات پا گئے اور بقیع میں دفن ہوئے۔ (تلقیح ص ۶۰)

۳۲؎ خرّار۔ یہ وادی مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مغرب میں جُحفہ کے قریب تھی۔ (تلقیح ص ۲۲)

۳۳؎ یہ تعداد شبلی (سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۳۱۱) نے بتائی ہے۔ ابن خلدون (ج ۱، ص ۷۵) کے ہاں یہ تعداد ۲۰۰ تھی۔

۳۴؎ آمنہؓ بنت وہب بن عبدِ مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ قرشیہ۔ شادی کے وقت حضرت عبداللہ کی عمر پچیس سال اور بروائتے تیس تھی۔ جب حضورؐ کی عمر آٹھ برس ہوئی تو آپؐ کی وفات ہوگئی۔ (استیعاب، ج ۱، ص ۱۵)

۳۵؎ عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدِ مناف بن قُصَی بن کلاب بن مُرّہ کی وفات حضورؐ کی ولادت سے پہلے ہوئی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس وقت حضورؐ کی عمر دو ماہ اور ایک اور روایت کے مطابق اٹھارہ ماہ تھی۔ (ایضاً ص ۱۵)

(باقی برصفحہ آئندہ)

آپ کارواں کو نہ پاسکے اور پندرہ دن کے بعد لوٹ آئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۵۔ غزوۂ بُواط بُواط مدینہ سے کوئی پچاس میل دُور مغرب کی طرف پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ینبع سے ایک منزل مشرق میں یہ کبھی جہینہؓ (قبیلہ) کی ملکیت تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک کارواں جس میں اڑھائی ہزار اونٹ ہیں، اور جس کی حفاظت اُمیہ بن خلف اور سو دیگر آدمی کر رہے ہیں، شام سے آرہا ہے۔ چنانچہ آپ دو سو صحابہ کو لے کر نکل پڑے۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کو نائب مقرر کیا اور علم حضرت سعد بن ابی وقاص کے ہاتھ میں دیا۔ آپ بواط تک گئے لیکن کارواں کو نہ پا سکے اور واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۲)

۶۔ غزوۂ تلاشِ کُرز صفحاتِ گزشتہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ کا ایک مہم جُو کُرزؓ بن جابر مدینہ کی چراگاہوں سے بہت سے مویشی ہانک کر بھاگ گیا تھا۔ حضورؐ اس کی تلاش میں سواد بدر کی ایک وادی سُفوان تک گئے تھے لیکن اُسے نہ پا سکے۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۲ھ میں پیش آیا تھا۔ حضورؐ نے زیدؓ بن حارثہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور علم حضرت علیؓ کے سپرد تھا یہ غزوۂ بدر اُولیٰ کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد کُرز اسلام لے آیا۔ فتح مکہ کے دن بھٹک کر غلط راستے پر نکل گیا اور ایک مُشرک نے اُسے مار ڈالا۔

(استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۲۳)

۷۔ غزوۂ ذی العُشَیرہ ذوالعُشیرہ مدینہ کے مغرب میں ساحل کی طرف ینبعؓ کے قریب ایک موضع جہاں حضورؐ جمادی الآخرہ ۲ھ میں ایک تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے گئے تھے۔ آپ کے ہمراہ ڈیڑھ سو اور بروایتے دو سو مہاجر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۳۶؎ ابو ثابت سعدؓ بن عبادہ بن دلیم بن حارثہ خزرج کا سردار تھا اور فتح مکہ کے دن علم بردار۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا چنانچہ یہ مدینہ کو چھوڑ کر خوران (شام) چلے گئے اور وہیں ۱۱ھ یا ۱۵ھ میں وفات پائی۔ (الاکمال ص ۱۱۳۵ واستیعاب ج ۲ ص ۵۴۹)

۳۷؎ یہ قبیلہ مدینہ سے کوئی ڈیڑھ سو میل شمال مغرب میں آباد تھا۔

۳۸؎ کرز۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۹

۳۹؎ ابو اُسامہ زیدؓ بن حارثہ بن شراحیل الکلبی کو بنو قین نے حملہ کر کے بچپن ہی میں غلام بنا لیا تھا۔ جاہلیت میں نواحِ مکہ کی ایک منڈی حُباشہ میں فروخت ہُوا۔ اور حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے حکیمؓ بن حزام بن خویلد القرشی الاسدی (م ۵۴ھ) نے اسے خرید کر حضرت خدیجہؓ کے حوالے کر دیا اور بعد میں موصوفہ نے حضورؐ کو دے دیا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۱۸۵)

۴۰؎ علیؓ بن ابی طالب بن عبدالمطلب لڑکوں میں پہلے مسلمان تھے۔ خواتین میں پہلی مسلمہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ مردوں میں سب سے پہلے مسلم ابوبکرؓ اور غلاموں میں زیدبن حارثہ۔ جب حضرت علیؓ اسلام لائے تو اس وقت آپ کی عمر کوئی راوی ۸ سال، کوئی ۱۲، کوئی ۱۴، کوئی ۱۵ اور کوئی ۱۶ بتاتا ہے۔ آپ تمام غزوات میں شامل ہُوئے۔ ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک خلیفہ رہے۔ ۴۰ھ میں شہادت پائی۔ اس وقت آپ کی عمر تریسٹھ برس تھی۔

(استیعاب، ج ۲ ص ۴۶۲)

۴۱؎ ینبوع مدینہ سے اندازاً ایک سو بیس میل مغرب کی طرف ساحل پر ایک مقام، جو آج بھی موجود ہے۔

صحابہ تھے۔ فرائض نیابت حضرت ابو سلمہؓ[۴۲] بن عبدالاسد المخزومی کے سپرد تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے حوالے تھا۔ سواری اور باربرداری کیلئے تیس اونٹ بھی تھے۔ آپ قافلے کو نہ پاسکے اور واپس آگئے۔ (تلقیح ص ۳۴)

۸۔ **عبداللہ بن جحشؓ کی مہم** رجب ۲ھ میں حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[۴۳] بن جحش کو آٹھ مہاجر صحابہ کے ہمراہ نخلہ[۴۴] کی طرف بھیجا۔ ساتھ ہی ایک خط لکھ کر دیا اور ہدایت فرمائی کہ اس خط کو دو دن کے بعد کھولنا اور کسی ہمراہی کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کرنا۔ جب دو دن کے بعد حضرت عبداللہؓ نے وہ خط کھولا تو اس میں تحریر تھا:

"تم برابر چلتے جاؤ اور مکہ و طائف کے مابین نخلہ میں جاکر قیام کرو۔ وہاں قافلے کا انتظار کرو اور حالات سے ہمیں اطلاع دیتے رہو۔"

خط پڑھ کر حضرت عبداللہؓ نے ساتھیوں کو کہا کہ تم میں سے جو چاہے واپس چلا جائے۔ سب نے آگے جانے پر اصرار کیا۔ جب وہاں پہنچ کر مقیم ہو گئے تو انھیں قریش کا ایک چھوٹا سا کارواں نظر آیا۔ چونکہ رجب میں جنگ ممنوع تھی۔ اس لیے سب سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ بالآخر انھوں نے حملے کا فیصلہ کیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ چنانچہ واقدؓ[۴۵] بن عبداللہ کے تیر سے قافلے کا ایک اہم رکن عمروؓ[۴۶] بن الحضرمی مارا گیا دو دیگر ارکان یعنی عثمان بن عبداللہ بن المغیرہ اور حکمؓ[۴۷] بن کیسان کو گرفتار کر لیا اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ مہم مدینہ میں

---

[۴۲] ابو سلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی حبشہ کی ہجرت میں شامل ہوئے تھے۔ بدر میں بھی حصہ لیا تھا۔ پھر اُحد میں شامل ہوئے۔ دشمن کے ایک تیر سے زخمی ہو گئے۔ زخم مندمل ہونے کے بعد دوبارہ ہرا ہو گیا اور اسی سے ۴ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ اس کی وفات کے بعد حضورؐ نے اس کی زوجہ اُمّ سلمہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۸۵)

[۴۳] عبداللہؓ بن جحش بن رئاب بن یعمر بن صبرہ بن مرۃ الاسدی اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں شامل ہوئے۔ ان کی بہن زینب بنت جحش حضورؐ کے نکاح میں تھی۔ بدر میں حصہ لیا اور اُحد میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱، ص ۳۴۱)

[۴۴] نخلہ، مکہ و طائف کے درمیان ایک چراگاہ، جو بُستانِ ابنِ عامر کے نام سے مشہور تھی۔ (یاقوت۔ معجم۔ ج ۸)

[۴۵] واقدؓ بن عبداللہ بن عبد مناف بن عرین بن یربوع التمیمی ابتدائی مسلمانوں میں سے تھا۔ حضورؐ کے ہمراہ تمام غزوات میں شامل ہوا۔ اور حضرت عمرؓ کی خلافت (۱۳ھ - ۲۳ھ) میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۰۶)

[۴۶] عمرو بن عبداللہ بن عمار بن اکبر بن ربیعہ بن مالک الحضرمی اصلاً حضرموت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا والد امیر معاویہ کے دادا حرب کا حلیف تھا اور بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا بھائی العلاء اسلام لے آیا تھا اور حضورؐ نے اسے بحرین کا گورنر لگا دیا تھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۰۵)

[۴۷] حکم بن کیسان، حضرت خالد بن ولید کے بھائی ہشام بن ولید بن مغیرہ کا مولیٰ (حلیف، آزاد کردہ غلام، پناہ میں لیا ہوا) تھا۔ جب حضورؐ نے اسے آزاد کر دیا تو یہ اسلام لے آیا اور مدینہ ہی میں رہ گیا۔ اس کی شہادت بئر معونہ کے واقعہ (۴ھ) میں ہوئی تھی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۱۷)

واپس آئی اور حضورؐ کو معلوم ہُوا کہ ان لوگوں نے شہرِ حرام میں جنگ کی ہے تو آزردہ خاطر ہو گئے اور وحی کے آنے تک مالِ غنیمت کی تقسیم روک دی۔ بالآخر یہ آیت نازل ہُوئی:

یسئلونك عن الشھر الحرام قتالٍ فیه۔ قل قتالٌ فیه کبیرٌ و صدٌّ عن سبیل الله و کفرٌ به والمسجد الحرام و اخراج اھله منه اکبرُ عند الله والفتنة اکبرُ من القتل۔ (بقرہ: ۲۱۷)

(اے رسول! یہ لوگ آپ سے شہرِ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہئے کہ اس میں لڑنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہوں سے روکنا، اس کا انکار کرنا، مسجدِ حرام میں داخل ہونے سے روکنا اور اس سے وہاں کے رہنے والوں کو نکال دینا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یاد رکھیے کہ فتنہ (شرارت، ایذا، سازش) قتل سے بھی بدتر جُرم ہے)

چند روز بعد اہلِ مکہ نے عثمان و حکم کا فدیہ بھیجا لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ مہم کے دو آدمی یعنی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہؓ[۱۸] بن غزوان ابھی تک واپس نہیں آئے۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ کہیں تمہارے ہاتھ نہ لگ گئے ہوں۔ میں اُن کے آنے پر قیدیوں کا فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ ایک آدھ دن کے بعد یہ دونوں پہنچ گئے تو حضورؐ نے قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

جو قتل و گرفتار ہُوئے وُہ بڑے خاندانوں کے لوگ تھے۔ مقتول عمرو عبداللہ الحضرمی کا بیٹا تھا۔ جو امیر معاویہ کے دادا حرب بن اُمیہ کا حلیف تھا۔ (اصابہ: ترجمہ علاء الحضرمی) عثمان بن مغیرہ (حضرت خالد کا دادا اور ولید کا والد) کا پوتا تھا جو حرب بن امیہ کے بعد دوسرے درجے کا رئیس شمار ہوتا تھا۔ حکم بن کیسان، خالد بن ولید کے بھائی ہشام بن ولید بن مُغیرہ کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام یا پناہ جُو) تھا۔ (استیعاب ص ۱۱۷)

اس واقعہ نے قریش کو سخت مشتعل کر دیا اور وُہ انتقام لینے پر تُل گئے۔ بدر، اُحد اور احزاب کے حملے اسی واقعہ کا نتیجہ تھے۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن الحضرمی پہلا مقتول ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور یہ پہلا مالِ غنیمت تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ (ابن خلدون، ج ۱، ص ۷۸۔ سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۳۱۲)

۹۔ غزوہ بدر

بدر دراصل ایک کنویں کا نام تھا جو اس نواح کے ایک سردار بدر بن حارث یا بدر بن کلدہ نے کھدوایا تھا۔ لیکن بعد میں یہ ساری وادی بدر کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ وادی مدینہ سے کوئی اسّی میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ آجکل وہاں ایک اچھا خاصہ گاؤں آباد ہے جس میں کئی سو مکان اور دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک جامع کہلاتی ہے اور عین اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضورؐ کے لیے ایک جھونپڑی بنائی گئی تھی اور گرد دُور تک نخلستان ہیں۔ یہ وادی بیضوی شکل کی ہے، اندازاً پانچ میل لمبی اور چار میل چوڑی۔ اس کے اردگرد کئی پہاڑیاں ہیں۔ ان میں سے ایک کا موجودہ نام العدوۃ الدنیا

---

[۱۸] عتبہؓ بن غزوان بن حارث بن جابر بن وہب المازنی اسلام لانے والوں میں سے ساتویں تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں شامل ہُوئے۔ بعد ازاں ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے اور تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ ۱۷ھ میں سفرِ حج سے واپس بصرہ جا رہے تھے کہ ایک مقام معدن سلیم میں سواری سے گر کر فوت ہو گئے۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۴۹۲)

[illegible]

حضورؐ ۲۲/۲۳ رمضان کو مدینہ واپس آئے تھے۔ (تنقیح ص ۲۳، میدان جنگ ص ۲۶-۴۵، ابنِ خلدون ج ۱، ص ۸۲-۸۸)

۱۰۔ غزوہ بنی قینقاع مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، یہ سب کے سب مدینہ کے حوالی میں رہتے تھے اور ان کا گزارہ تجارت، صناعی (زرگری و آہنگری) اور زراعت پر تھا۔ قینقاع زرگری کا کام کرتے تھے (اور اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ کے ذخائر بھی پاس رکھتے تھے) گو حضورؐ نے مدینہ آتے ہی اوس، خزرج اور یہود سے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس کی رُو سے انہیں یہ ضمانت دی گئی تھی کہ:

"جو یہود مسلمانوں سے تعاون کریں گے اُن کی مدد کی جائے گی۔ اگر وُہ ظلم کریں گے تو انہیں تنبیہ کی جائے گی۔ اور ہم اُن کے خلاف کسی اور کی مدد نہیں کریں گے ..... جنگ کی صورت میں یہود مسلمانوں کو مالی مدد دیں گے ..... اور یہود کو پُوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی ...." (ابن خلدون، ج ۱، ص ۶۷-۷۰)

لیکن یہود نے جلد ہی اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کر دی اور اس سلسلے میں کئی ناگوار قدم اٹھائے مثلاً:

ا۔ حضورؐ کی آمد سے پہلے یہود سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمان طاقت ور ہو رہے ہیں تو پراپیگنڈہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بُرا بھلا کہنے لگے۔

ب۔ یہ لوگ جب حضورؐ کی مجلس میں جاتے تو السّلامُ علیکم کی بجائے "السّامُ علیکم" (تم پر موت) کہتے۔ (یہ واقعہ صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں منقول ہے)

ج۔ مسلمانوں میں مایوسی و بددلی پھیلانے کے لیے صبح کو ایمان لاتے اور شام کو لوٹ جاتے۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (عمران: ۸۰)

(اہل کتاب (مراد یہود) کا ایک طبقہ کہے گا کہ قرآن پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو پھر جاؤ تاکہ مسلمان (بددل ہو کر) بھی اسلام سے بھاگ جائیں)

د۔ انہوں نے مسلمانوں کی طاقت توڑنے کے لیے اَوس و خزرج کو باہم لڑانا چاہا۔ (سیرت النبیؐ شبلی - ج ۱- ص ۴۰۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

عباس فتح خیبر سے پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن قوم کے ڈر سے چھپائے پھرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن اعلان کر دیا۔ حنین، طائف اور تبوک میں شامل ہُوئے۔ حضورؐ آپ کی بہت عزت کرتے تھے اور صحابہؓ آپ سے بڑے بڑے امور میں مشورہ لیتے تھے۔ آپ کی وفات جمعہ کے دن رمضان ۳۲ھ میں ہُوئی۔ (استیعاب - ج ۲- ص ۴۸۵)

۵۵ ولیدؓ بن ولید بن مغیرہ القرشی، خالدؓ بن ولید کے بھائی تھے۔ بدر میں حضورؐ کے خلاف لڑے، قید ہو گئے۔ لیکن جُونہی اس کے بھائیوں نے انہیں فدیہ دے کر رہا کرایا، یہ مسلمان ہو گئے۔ حضرت خالدؓ انہی کی ترغیب سے مسلمان ہُوئے تھے۔ ان کی وفات فتح مکہ کے بعد ہوئی تھی۔ (ایضاً ص ۶۰۲)

ہ - یہ قریشِ مکہ سے مل کر سازشیں کرنے لگے اور ان کی شرارتوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ حضورؐ کو اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا۔ (ایضاً ص ۴۰۳)

و - یہود کے اشتعال کا باعث اوّلاً غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی معجزانہ فتح تھی۔ اس سے قریش کا زور ٹوٹ گیا تھا اور مسلمانوں کی قوت بڑھ گئی تھی۔ ثانیاً وحیِ الٰہی یہود کی اخلاقی کمزوریوں کو کھول کھول کر بیان کر رہی تھی کہ یہ جھوٹ بولتے، حرام کھاتے۔ اپنی الہامی کتابوں کو بگاڑتے۔ خیانت سے کام لیتے۔ انبیاء کو قتل کرتے اور حضرت مریمؑ پر افترا باندھتے ہیں۔

وقس علیٰ ھذا۔ ابنِ سعد نے طبقات میں غزوۂ بنی قینقاع کے ذیل میں لکھا ہے:

"واقعۂ بدر کے بعد یہود کے بغض و حسد میں اضافہ ہو گیا اور ان لوگوں نے عہد کو توڑ ڈالا۔"

(بحوالہ سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۴۰۴)

ز - کعب[۵۵] بن اشرف مدینہ کا مشہور شاعر تھا۔ اصلاً یہ قبیلۂ طے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا باپ مدینہ میں آکر بنو نضیر کا حلیف بن گیا تھا۔ اس نے ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور کعب اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسے اسلام سے اس حد تک عداوت تھی کہ جب بدر میں بڑے بڑے سردارانِ قریش ہلاک ہو گئے تو یہ تعزیت کے لیے مکہ میں گیا اور مقتولِ کشتگانِ بدر کے مرثیے لکھ کر قریش کو انتقام کے لیے اکساتا رہا۔ اُس نے خود بھی حضورؐ کو ہلاک کرنے کی سازش کی تھی۔ اُس کے اشعار نے بنو قینقاع کے دلوں میں مزید نفرت بھر دی اور وہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے شب و روز سازشیں کرنے لگے۔

ح - اُن کے اقتصادی مظالم حد سے بڑھ چکے تھے۔ یہ بھاری شرحِ سود پر قرض دے کر سب کچھ لوٹ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں اور عورتوں تک کو رہن رکھ لیتے تھے۔ (سیرت ص ۳۹۶)

ط - یہ آگ دہک ہی رہی تھی کہ ایک واقعہ نے اسے بھڑکا کر شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ ہوا یوں کہ ایک مسلم خاتون ایک یہودی کی دکان پر سودا لینے گئیں۔ چند نوجوان یہودیوں نے مل کر اس کی بے حرمتی کی۔ اس پر ایک مسلمان نے اُس دکان دار پہ حملہ کر کے اسے مار ڈالا اور یہودیوں نے اُس مسلمان کو قتل کر دیا۔ حضورؐ اس پر بھی مشتعل نہ ہوئے بلکہ خود چل کر یہودیوں کے ہاں گئے اور انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے جواباً حضورؐ کی توہین کی اور بد زبانی سے کام لیا۔

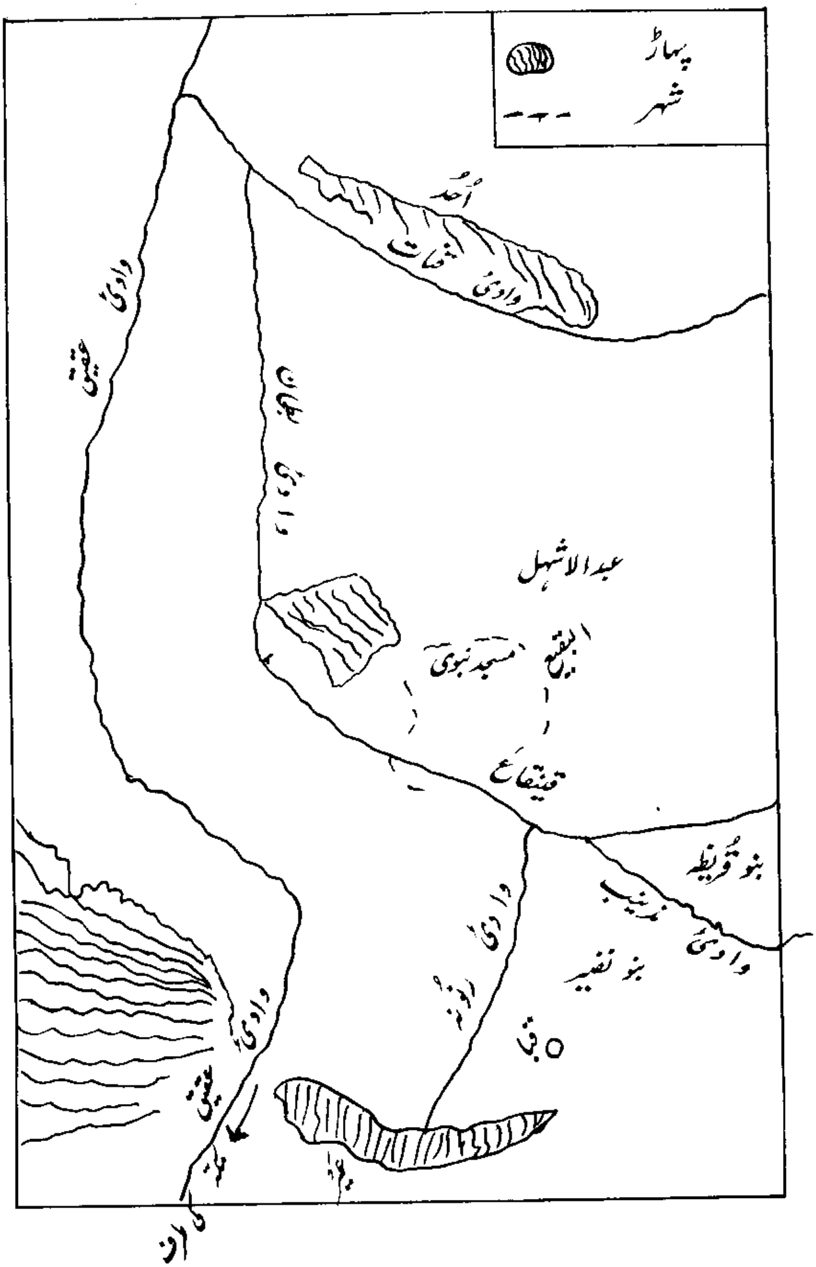
جنگ اب حضورؐ کے پاس جنگ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ آپ سنیچر کے دن نصف شوال ۲ھ کو صحابہ کا ایک دستہ لے کر محلۂ قینقاع کی طرف بڑھے۔ حضرت ابو لبابہ[۵۶]ؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ علم حضرت حمزہؓ کے ہاتھ

---

[۵۵] کعب بن اشرف اتنا دولت مند تھا کہ اس نے یہودی علماء کی تنخواہیں باندھ رکھی تھیں۔ جب اس کی دل آزاریاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک صحابی محمد بن مسلمہ انصاری (۴۳ھ) نے اسے شوال ۳ھ میں قتل کر دیا۔ (سیرت النبیؐ - ج ۱۔ ص ۴۰۷)

[۵۶] ابو لبابہؓ نام کے تین صحابی تھے۔ اوّل حضورؐ کا ایک مولیٰ۔ دوم ابو لبابۃ الاسلمی۔ سوم ابو لبابہ بن عبد المنذر الانصاری۔ اور یہاں آخر الذکر مراد ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

شہر مدینہ اور حوالی



میں دبا اور ان کا محاصرہ کرلیا۔ پندرہ روز کے بعد یہود نے پیش کش کی کہ مسلمان اُن کے مال میں سے جو چاہیں لے لیں۔ لیکن انہیں بال بچوں سمیت مدینہ سے جانے کی اجازت دے دیں۔ حضورؐ نے یہ پیش کش منظور فرمالی اور ان کے مال و متاع سے اشیائے ذیل لے لیں:

۱۔ تین کمانیں یعنی کتوم۔ رَوحا اور بیضاء

۲۔ دو زرہیں، صُغدیہ اور فِضّہ

۳۔ تین تلواریں: قَلعی، بتّار۔ اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔

۴۔ تین نیزے

اس کے بعد وہ لوگ مدینہ کو چھوڑ کر خیبر[۵۷]، فدک[۵۸] اور تیماء[۵۹] وغیرہ کی طرف نکل گئے۔ (تلقیح ص ۴۲، سیرت النبیؐ ج ۱ ۔ ص ۳۹۵-۴۰۸)

۱۱۔ غزوۂ سَوِیق سَوِیق کے معنی ہیں ستّو۔ بات یوں ہوئی کہ شکستِ بدر کے بعد ابُوسفیان نے قسم کھالی تھی کہ وہ اس شکست کا انتقام لینے سے پہلے نہ تو بیوی کے قریب جائے گا، نہ بالوں کو تیل لگائے گا۔ چنانچہ وہ دوسو شُتر سواروں کے ساتھ مدینے پر بڑھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہود اس کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ چنانچہ وہ پہلے حُیَیّ[۶۰] بن اخطب کے ہاں گیا۔ لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ پھر بنونَضِیر کے سردار سلام بن مِشکَم کے پاس آیا۔ اُس نے پُرجوش استقبال کیا۔ شراب پلائی، پُرتکلّف ضیافت کی، اور مسلمانوں کے متعلق ہر بات بتائی۔ چنانچہ اسے مسلمانوں کو للکارنے کی جُرأت نہ پڑی اور واپسی کا ارادہ کرلیا۔ مدینہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ان کے نام کے متعلق اختلاف ہے۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) کے ہاں ان کا نام رفاعہ تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ بن بشیر بتاتے ہیں کہ ان کا نسب نامہ یہ ہے: رفاعہ بن منذر بن زُبَیر بن زید بن اُمیّہ الاوسی الانصاری ہجرتِ حضورؐ سے کچھ پہلے اسلام لائے تھے۔ تقریباً تمام غزوات میں شامل رہے۔ حضورؐ نے غزوۂ سُویق میں بھی آپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ آپ غزوۂ تبوک میں عمداً شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس پر بعد میں اتنے پچھتائے کہ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اور اعلان کیا کہ جب تک اللہ میری توبہ منظور نہیں کرے گا میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ جب یہ خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپ ان کے ہاں گئے اور قبولِ توبہ کی اطلاع دی۔ وفات ۳۵۔۴۰ھ کے درمیان ہوئی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۵۶)

[۵۷] مدینہ سے اندازاً سو میل شمال میں یہود کا ایک شہر۔

[۵۸] خیبر سے کوئی ۲۰ میل شمال کی طرف ایک بستی۔

[۵۹] مدینہ سے دوسو میل شمال میں خیبر اور فدک سے آگے ایک گاؤں۔

[۶۰] حُیَیّ بن اخطب بنونضیر کا ایک سردار، جو ۴ھ میں خیبر میں جا آباد ہوا تھا۔ اس نے حضورؐ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ حضورؐ کے خلاف کسی حملہ آور کی مدد نہیں کرے گا۔ بایں ہمہ وہ احزاب میں شامل ہو کر ۵ھ میں مدینہ پر حملہ آور ہُوا۔ اور جب احزاب ناکام ہو کر واپس چلے گئے تو یہ بنوقریظہ (مدینہ) کے ہاں رہنے لگا۔ چونکہ بنوقُرَیظہ بھی معاہدہ توڑ کر احزاب میں شامل ہُوئے تھے اس لیے حضورؐ نے احزاب کے واپس جانے کے بعد بنوقریظہ کا محاصرہ کر لیا۔ حُیَیّ گرفتار ہوا اور حضورؐ نے اس کی موت کا حکم دے دیا۔ (البلاذری: فتوح البلدان انگریزی۔ ص ۴۱)

تین میل کے فاصلے پر ایک مقام عُرَیض کہلاتا تھا وہاں ایک نخلستان میں دو آدمی مصروفِ کار تھے۔ ان میں سے ایک کا نام شبلی (سیرت، ج ۱، ص ۳۰۵) نے سعد بن عمرو لکھا ہے اور دُوسرے کے متعلق ابن خلدون کے حاشیہ نگار حکیم احمد حسین الہ آبادی نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ سعید بن عمرو کا ایک حلیف تھا (ج ۱، ص ۹۲) یہ سعد کون تھا؟ اس کا ذکر حافظ ابن عبد البر قرطبی[۶۲] (۴۶۳ھ) نے الاستیعاب میں نہیں کیا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ شاید صحابی نہ تھے۔ ابوسفیان نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور پھر ڈر سے بھاگ نکلا۔ اور اونٹوں کو سُبک سیر بنانے کے لیے ستو کے تھیلے راہ میں پھینکتا گیا۔ اسی مناسبت سے یہ مہم غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہو گئی۔

جب حضورؐ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ ۵۔ ذی الحجہ ۲ھ کو اسّی صحابہ کے ہمراہ ابوسفیان کی تلاش میں نکلے۔ دُور تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ نہ ملا اور آپ پانچ دن کے بعد واپس آ گئے۔ آپ کی غیر حاضری میں نیابت کے فرائض حضرت ابولبابہؓ[۶۲] بن عبد المنذر نے سرانجام دیئے تھے۔ (تلقیح ص ۲۴، ابن خلدون، ج ۱، ص ۹۲ اور سیرت النبیؐ شبلی ج ۱۔ ص ۳۶۵)

۱۲۔ غزوۂ قَرقَرَۃُ الکُدر

حضورؐ کو اطلاع ملی کہ عرب کے دو اہم قبیلے سُلَیم[۶۳] اور غطفان[۶۴] اَرحَضِیَہ[۶۵] کے قریب ایک موضع قرقرۃ الکدر میں، جو مدینہ سے کوئی اسّی میل دُور تھا، جمع ہو رہے ہیں۔ آپ نے ان کو سزا دینے کا فیصلہ فرمایا اور دو سو صحابہ کے ہمراہ ۱۴/۱۵ المحرم ۳ھ کو مدینے سے روانہ ہوئے۔ علم حضرت علیؓ کے پاس تھا۔ حضرت عبد اللہؓ[۶۶] بن اُمّ مکتوم کو بطور نائب پیچھے چھوڑا۔ آپ تین چار روز کے بعد منزل پر جا پہنچے۔ لیکن وہاں دشمن کا نشان تک نہ تھا۔ وہاں صرف اُن کے اُونٹ تھے جو صحرا میں چر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی اُونٹ اُن کی سواریاں ہیں جن پر چڑھ کر وہ مدینے پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہانک کر لے چلو۔ چنانچہ وہ انہیں ہانک لائے اور حضورؐ نے بیت المال کے لیے ایک سو اُونٹ رکھ کر باقی چار سو ہمراہیوں میں بانٹ دیئے اور ہر ایک کو دو دو اونٹ مل گئے۔ (تلقیح ص ۲۴)

---

[۶۲] حافظ ابوعمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی النمری (۳۶۸ - ۴۶۳ھ) بہت بڑے مورخ، محدث اور عالم انساب تھے۔ ان کا تعلق نمرہ قبیلے سے تھا۔ الاستیعاب کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں: (۱) کتاب الانتہاء (فقہاء پر)۔ (۲) کتاب الدرر فی اختصار المغازی والسیر (۳)، کتاب فی قبائل العرب وانسابہم (۴)، بہجۃ المجالس۔ (فرید وجدی: دائرۃ المعارف ج ۱۰، ص ۱۰۲۴)

[۶۲] دیکھئے حاشیہ شمار نمبر ۵۶

[۶۳] بنو سُلَیم مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مشرق کی طرف آباد تھے۔

[۶۴] غطفان مدینہ کے جنوب اور قدرے مشرق میں ۶۰/۷۰ میل دُور رہتے تھے۔

[۶۵] مدینہ کے جنوب مشرق میں بئر معونہ کے قریب ایک مقام (یاقوت۔ معجم۔ ج ۱۔ ص ۱۸۲)

[۶۶] اکثر اصحاب رجال کا خیال ہے کہ عبد اللہؓ بن اُمّ مکتوم اور عمرو بن امّ مکتوم جس کا ذکر حاشیہ شمار نمبر ۴۹ میں ہو چکا ہے ایک ہی شخصیت تھے دونوں کا نسب نامہ ایک ہے۔ بعض رجال نگاروں نے عبد اللہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ (استیعاب ج ۱، ص ۳۷۹)

۱۳۔ غزوہ غطفان غزوۂ کُدُر (۱۴/۱۵ محرم ۳ھ) سے کوئی دو ماہ بعد حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد کے دو قبیلے ثعلبہ اور محارب، جو غطفان کی شاخیں تھیں، ذو امر[۶۷] میں جمع ہو رہی ہیں بنو محارب کے رئیس دُعثور بن حارث اس اجتماع کے قائد و محرک ہیں چنانچہ آپ ۱۲ ربیع الاول ۳ھ کو ۴۵۰ صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے اور حضرت عثمانؓ بن عفان کو بطور نائب پیچھے چھوڑ گئے۔ جب ان قبائل کو آپ کی آمد کا علم ہُوا تو پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ آپؐ وہاں دن کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ دبے پاؤں دُعثور وہاں جا پہنچا، تلوار سونت کر حضورؐ کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے کہنے لگا، بتا اے محمد! تجھے اب مجھ سے کون بچائے گا؟ حضورؐ نے بے ساختہ جواب دیا: اللہ۔ معاً جبریلؑ نے دُعثور کے سینے میں اس زور سے دو ہتڑ رسید کیا کہ اس کی تلوار گر گئی جسے حضورؐ نے فوراً تھام کر پُوچھا: بتا اب تجھے کون بچائے گا؟ کہنے لگا: کوئی نہیں اور ساتھ ہی کلمہ پڑھ کر اسلام لے آیا۔ حضورؐ وہاں کچھ دیر ٹھہرے اور پھر کسی تصادم کے بغیر واپس چلے گئے۔ (تلقیح ص ۲۵)

۱۴۔ غزوۂ بنو سُلیم مدینہ سے کوئی ۵۰/۶۰ میل جنوب مشرق میں ایک مقام فُرع کہلاتا تھا اور اس کے قریب ہی ایک اور موضع بُحران کے نام سے مشہور تھا، حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو سُلیم بُحران میں جمع ہو رہے ہیں آپ ابن اُم مکتومؓ[۶۸] کو نائب بنا کر ۶ جمادی الاولیٰ ۳ھ کو تین سو صحابہ کے ہمراہ روانہ ہُوئے۔ منزل پر پہنچے تو وہاں کسی لشکر کا نشان تک نہ تھا۔

۱۵۔ حضرت زیدؓ[۶۹] بن حارثہ کی مہم جب قریش کی قدیم تجارتی شاہراہ، جو ساحلِ قلزم کے ساتھ ساتھ شام تک جاتی تھی مسلمانوں کے پیہم حملوں سے غیر محفوظ ہو گئی تو قریش کی اکثریت نے اس کا استعمال ترک کر دیا۔ البتہ ایک گروہ، جس کا سردار صفوانؓ[۷۰] بن اُمیہ تھا (یہ اپنے آپ کو ابوسفیان کا رقیب سمجھتا تھا) شام سے تجارت کرنے پر مُصِر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک قافلہ بایں ہدایت شام کو بھیجا کہ وہ آتے جاتے مدینہ کے مشرق سے گزرے اور رہبری کے لیے بنو عجل کے ایک آدمی فراتؓ[۷۱] بن حیان کو اُجرت پر ساتھ بھیج دیا۔ قافلے کی سیادت صفوان بن اُمیہ کے سپرد تھی۔ جب یہ قافلہ مالِ تجارت لے کر لوٹا تو حضورؐ کو

---

۶۷ ذو امر نجد میں بنو غطفان کا ایک موضع۔ (یاقوت: معجم۔ ج ۱۔ ص ۲۲۴)

۶۸ عمروؓ بن اُم مکتوم۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۴۹۔

۶۹ زیدؓ بن حارثہ۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۹۔

۷۰ صفوان بن اُمیہ بن خلف بن وہب بن حذافہ بن جُمح القرشی الجُمحی کا والد اُمیہ بن خلف بدر میں اپنے سابق غلام حضرت بلالؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا صفوان فتح مکہ کے بعد اسلام لایا تھا۔ بات یُوں ہُوئی کہ جب حضورؐ مکہ سے لوٹے تو یہ بھی ساتھ شامل ہو گیا اور حنین و طائف میں حضورؐ کی طرف سے لڑا، حالاں کہ اس وقت تک یہ کافر ہی تھا۔ آپؐ نے اسے حنین کی غنیمت سے کافی حصہ دیا۔ یہ فتح مکہ سے ایک ماہ بعد اسلام لے آیا اور مدینہ میں آ گیا۔ لیکن حضورؐ نے اُسے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ افصح القریش تھا۔ اس کی وفات ۴۲ھ کو مکہ میں ہُوئی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۱۸)

۷۱ فرات بن حیان بن ثعلبۃ العجلی یمامہ کے ایک قبیلے بنو عجل سے تعلق رکھتے تھے۔ زیدؓ بن حارثہ کی مہم کے بعد جلد مسلمان ہو گئے اور جب مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا تو حضورؐ نے انہیں مسیلمہ سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۲۰)

اطلاع مل گئی۔ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو سو سواروں کے ساتھ جمادی الآخرہ ۳ھ میں اس قافلے سے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ جونہی یہ لوگ قافلے کے قریب پہنچے تو تمام محافظ قافلے کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور حضرت زیدؓ سارے قافلے کو مدینے میں ہانک لائے۔ اس تمام مال و متاع کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔ (تلقیح ص ۲۵، ابن خلدون ج ۱ ص ۹، واٹ ص ۲۰)

۱۶۔ غزوۂ اُحد بدر کے ستر مقتولوں کا انتقام لینے کے لیے قریش سخت بے تاب تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انہوں نے اڑھائی لاکھ درہم جمع کیے۔ نواحی قبائل میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے شعراء بھیجے اور اس طرح تین ہزار جانبازوں کا ایک لشکر تیار کیا جس میں سات سو زرہ پوش تھے اور جن کے پاس دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ یہ لشکر بُدھ کے دن (۵ شوال ۳ھ) اُحد کے قریب فروکش ہوا۔ حضورؐ کو لمحہ لمحہ کی خبر مل رہی تھی۔ آپؐ دو دن بعد نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر ایک ہزار افراد کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ جب شہر کے باہر پہنچے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ بایں ہمہ حضورؐ کے عزم میں فرق نہ آیا۔ آپؐ نے میدانِ اُحد میں پہنچ کر صف آرائی کی حضرت زبیرؓ[۲۶] بن عوام کو رسالے کا افسر مقرر کیا۔ پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہؓ بن[۲۷] جبیر کی قیادت میں اُس چوٹی پر متعین فرمایا جو مسلمانوں کے پیچھے تھے۔ ۔ آغازِ قتال کو سب سے پہلے خواتین قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں جن میں کُشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام کے رجز تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند سب سے آگے تھی پیچھے چودہ دیگر عورتیں تھیں، جن میں اُمِّ حکیم (ابوجہل کے فرزند عکرمہ کی بیوی)، فاطمہ (خالد بن ولید کی ہمشیر)، بَرزَہ (طائف کے رئیس مسعود ثقفی کی بیٹی) اور رَیطہ (عَمرو بن عاص کی زوجہ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رجزیہ اشعار میں سے دو یہ ہیں ؎

نَحْنُ بناتُ طارِق   نمشی علی النّمارِق

(ہم مسافرانِ شہر یعنی تاروں کی بیٹیاں ہیں جو قالینوں پر چلنے کی عادی ہیں)

اِن تَقبِلوا نُعانِق   او تدبروا نفارِق

(اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔ پیچھے ہٹو گے تو ہم تمہیں چھوڑ جائیں گی)

جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو حضورؐ نے مہاجرین کا علَم حضرت علیؓ کو۔ اَوس کا حضرت اُسیدؓ[۲۸] بن حُضَیر کو اور خزرج کا حبابؓ[۲۹] بن مُنذِر کو

---

۲۶ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۱

۲۷ عبداللہ بن جُبیر بن نُعمان بن اُمیّہ بن امرأ القَیس انصاری ہجرتِ رسولؐ سے ذرا پہلے اسلام لائے تھے۔ بدر میں حصہ لیا اور اُحد میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۳۴۲)

۲۸ اُسیدؓ بن حُضَیر بن سماک بن عَتیک بن رافع بن اِمرأ القَیس بن زید بن عبد الاشہل بن حارث بن خزرج بن عمر بن مالک بن اَوس انصاری اشہلی عقبہ ثانیہ سے بھی ذرا پہلے ایمان لائے تھے (عقبۂ اولیٰ و ثانیہ میں ایک سال کا زمانہ حائل تھا) بدر میں شاید شامل نہیں ہوئے لیکن اُحد میں بڑی پامردی سے لڑے۔ جب دیگر صحابہ حضورؐ کو تنہا چھوڑ گئے تھے تو یہ حضورؐ کے پاس ہی ڈٹے رہے۔ علم و حُسنِ تلاوت میں مشہور تھے۔ شعبان ۲۰ھ میں وفات پائی اور فاروقِ اعظمؓ نے انہیں بقیع میں دفن کیا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۸)

۲۹ حُبابؓ بن مُنذِر کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۵۱۔

عطا کیا۔ جب جنگ شروع ہوگئی تو مسلمانوں کے تُند و تیز حملوں سے قریش کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ رجز خواں عورتیں پیچھے کو بھاگیں اور مسلمانوں نے قریش کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ یہ صورت دیکھ کر قُلّہ کوہ کے تیرانداز بھی نیچے کو بھاگے۔ عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا۔ لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ اس پر خالدؓ[56] بن ولید نے پیچھے سے حملہ کیا۔ حملہ اتنا تیز تھا کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک خاصی تعداد شہید ہو گئے۔ حضورؐ کے چہرے پر چوٹ آئی۔ دائیں طرف کا ایک نچلا دانت ٹوٹ گیا اور آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے ہیں۔ اس عام بد حواسی چھا گئی اور حضرت عمرؓ نے تلوار پھینک دی۔ پاس ہی حضرت انسؓ[57] بن مالک کے چچا حضرت ابن نضرؓ[58] کھڑے تھے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ یہ کیا؟ کہا: حضورؐ کے بعد لڑ کر کیا کریں گے۔ ابن نضرؓ نے کہا کہ اُن کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ یہ کہہ کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہادت پائی۔

حضورؐ کو سب سے پہلے حضرت کعبؓ[59] بن مالک نے دیکھا اور بلند آواز سے کہا "مسلمانو! رسول اللہؐ صلعم یہ ہیں۔" یہ سن کر جاں نثار ٹوٹ پڑے اور کفار نے ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت ابو دجانہؓ[60] اور حضرت طلحہؓ حضورؐ کے لیے سپر بن گئے اور تمام وار اپنے جسموں پر سہنے لگے تاہم تلوار کا ایک وار حضورؐ کے خود پر پڑ گیا اور اس کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں۔ اس حالت میں بھی آپؐ کی زبان پر یہ الفاظ تھے

---

۵۶ خالدؓ بن ولید بن مُغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی کی والدہ لبابۃ الصُّغریٰ اُم المومنین میمونہ کی بہن تھی۔ جاہلیت میں خالد اشرافِ قریش میں شمار ہوتے تھے۔ یہ کب مسلمان ہوئے؟ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ کوئی حدیبیہ و خیبر کے درمیان بتاتا ہے کوئی اسے سالِ خندق (۵ھ) کا واقعہ قرار دیتا ہے اور کوئی ۸ھ کا۔ بہر حال یہ غزوۂ مکہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ پھر حنین میں بھی شامل ہُوئے۔ ۹ھ میں حضورؐ نے انہیں دُومۃ الجندل کی طرف بھیجا اور یہ وہاں کے فرمانروا اکیدر بن عبدالملک کو گرفتار کر لائے۔ ایک سال بعد یہ والیٔ نجران (بلحارث بن کعب) کو پکڑ لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے انہیں منکرینِ زکوٰۃ اور جھوٹے نبیوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجا۔ مُسیلمہ کو آپ ہی نے قتل کیا تھا۔ آپ کو حضورؐ نے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ وفات کے وقت آپ کے جسم پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس پر تلوار، تیر یا نیزے کا زخم نہ ہو۔ آپ کی وفات ۲۱/۲۲ھ کو حمص اور بروایتے مدینہ میں ہُوئی تھی۔ آپ تاریخِ اسلام کے سب سے بڑے فاتح تھے۔ (استیعاب ج ا ص ۱۵۳)

۵۷ انسؓ بن مالک خزرجی انصاری حضورؐ کے خادم تھے۔ جب یہ حضورؐ کی خدمت میں آئے تو آٹھ دس سال کے تھے۔ ۹۱ھ میں بصرہ کے قریب وفات پائی اور وہیں دفن ہُوئے۔ (ایضاً ص ۳۵)

۵۸ شبلی (سیرت ج ا، ص ۳۰۸) نے ابن نضر لکھا ہے اور ابن خلدون (ج ا ص ۱۰۲) نے نضر بن انس۔ صحیح اَنس بن نَضر ہے۔ یہ اُحد میں شہید ہُوئے تھے۔ (استیعاب ج ا۔ ص ۴۴)

۵۹ کعبؓ بن مالک بن ابی کعب عَمرو بن القَین بن کعب الانصاری عقبۂ ثانیہ میں اسلام لائے تھے۔ بدر و تبوک کے سوا باقی تمام غزوات میں شامل ہُوئے۔ یہ شاعر بھی تھے۔ یہ غزوۂ تبوک میں عمداً شامل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سخت نادم و تائب ہُوئے تو یہ آیت نازل ہُوئی:

وعلی الثلٰثۃ الذین خُلِّفُوا۔۔۔۔۔۔ اس کی وفات ۵۰ - ۵۳ھ میں ہُوئی۔ (استیعاب ج ا ص ۲۱۶)

۶۰ ابُو دجانہ۔ سماک بن اوس بن خرشہ انصاری۔ ۱۱ھ میں مُسیلمہ کے خلاف لڑتے ہُوئے شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۶۴۴)

(باقی بر صفحہ آیندہ)

ربّ اغفر لقومی فانّهم لا یعلمون ۔ (بخاری ۔غزوۂ احد)

(اے رب ! میری قوم کو معاف کر دے کہ وہ لاعلم ہے)

ابوسفیان کی بیوی ہند جس کے والد عتبہ کو حضرت حمزہ نے بدر میں قتل کیا تھا ، کو حضرت حمزہؓ کی لاش نظر آگئی ۔ اس نے آپ کے کان اور ناک کاٹ کر اُن کا ہار بنا لیا اور کلیجہ نکال کر چبا گئی ۔

جب دونوں فوجیں میدان سے الگ ہوئیں تو حضورؐ نے ایک دستہ تعاقب میں بایں غرض بھیجا کہ کہیں ابوسفیان مدینے پر حملہ نہ کر دے اور دوسرے دن زخمی ہونے کے باوجود آپؐ خود بھی مدینہ کے جنوب میں آٹھ میل تک گئے لیکن قریش جا چکے تھے اس لیے واپس تشریف لے آئے ۔

اس جنگ میں شہداء و مقتولین کی تعداد یہ تھی :

۱ ۔ شہداء ۷۰ ۔ ان میں حضرت حمزہؓ ، حضرت عبداللہؓ بن جحش ، حضرت مصعبؓ بن عمیر و دیگر مہاجر صحابہ اور ۶۵ انصار شامل تھے ۔

۲ ۔ مقتولینِ قریش کی تعداد بقولِ ابن خلدون (ج ۱ ۔ ص ۱۰۴) بائیس تھی اور بقول ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۵) تیئس ۔ ان میں قابلِ ذکر یہ تھے :

ولید بن عاص بن ہشام ۔ ابو اُمیہ بن ابی حذیفہ بن مُغیرہ اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ ۔

اس جنگ کے بعد مدینہ ماتم کدہ بن گیا ۔ حضورؐ جس طرف سے گزرتے عورتیں کسی نہ کسی کو رو رہی ہوتیں لیکن حضرت حمزہؓ کا نوحہ خواں کوئی نہیں تھا اس پر حضورؐ کو دکھ سا ہوا اور فرمایا :

اما حمزۃُ فلا بواکی لہٗ ۔ (افسوس کہ حمزہ پہ رونے والا کوئی نہیں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

؎ طلحہؓ بن عبیداللہ بن عثمان بن عمرو بن سعد القرشی التیمی جب ہجرت کر کے مدینے میں پہنچے تو حضورؐ نے انہیں کعبؓ بن مالک بن ابو کعب کا بھائی بنا دیا ۔ غزوۂ بدر کے وقت طلحہ شام میں تھے ۔ اُحد میں آپ نے کعب بن مالک کے ہمراہ حضورؐ کو بچانے کے لیے تیر و تیغ کے کئی زخم کھائے تھے ۔ جب حضورؐ زخمی ہو کر گرے تو یہ آپؐ کو پیٹھ پر اُٹھا کر بلندی پر ایک غار میں لے گئے ۔ بدر کے بعد حضرت طلحہ تمام غزوات میں شامل ہوئے ۔ آپ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے ۔ جنگِ جمل (۳۶ ھ) میں مروان بن الحکم کے تیر سے شہادت پائی ۔ آپ حضرت علیؓ کی طرف سے لڑ رہے تھے کہ جنگ کو چھوڑ کر الگ ہو گئے ۔ (استیعاب ج ۱ ۔ ص ۲۰۶)

؎ حضورؐ حمراء الاسد (موضع) تک گئے اور یہ تعاقب غزوہ اُحد کے سلسلے میں تھا ۔ بعض تاریخ نگاروں نے اسے ایک الگ غزوہ قرار دیا ہے ۔

؎ عبداللہؓ بن جحش کے لیے دیکھئے حاشیہ نمبر ۴۳

؎ مصعبؓ بن عُمیر کے لیے دیکھئے حاشیہ نمبر ۵۰

انصار کو اس ارشاد کا علم ہوا تو اپنی خواتین کو حضورؐ کے گھر ماتم حمزہؓ کے لیے بھیج دیا۔ جب یہ عورتیں حضورؐ کے در پر جمع ہوئیں تو آپؐ گھر سے باہر آئے۔ ان سب کے لیے دعا فرمائی، شکریہ ادا کیا اور یہ کہہ کر انہیں واپس بھیج دیا کہ آج سے مُردوں پر نوحہ کی رسم بند کی جاتی ہے۔ (تلقیح ص ۲۵، واٹ ص ۲۱۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۰۰۔۱۰۵۔ سیرت النبی ج ۱ ص ۳۶۹ ۔ ۳۸۸)

۱۷۔ مہمِ قطن کُرفہ و مکہ کی راہ پر دونوں کے وسط میں ایک قصبہ فَیدْ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے قریب ایک پہاڑ قطن کہلاتا تھا۔ حضورؐ کے زمانے میں وہاں بنو خزیمہ کی ایک شاخ اسد بھی آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلۂ اسد کے ایک سردار خویلد کے دو بیٹے سلمہ و طلیحہ[۵۵] مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر ترتیب دے رہے ہیں۔ حضورؐ نے حضرت ابو سلمہ[۵۶] کو ۱۵۰ صحابہ کے ہمراہ اس طرف بھیجا۔ یہ جیش یکم محرم ۴ھ کو روانہ ہوا اور وہ لوگ ان کی روانگی کی خبر سن کر منتشر ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۶۔ شبلی سیرت ص ۳۸۹)

۱۸۔ وادیٔ عُرَنہ کی مہم وادیٔ عُرَنہ مکہ کے مشرق میں عرفات کے قریب واقع تھی۔ یہ بنو لحیان کی ملکیت تھی۔ اس قبیلے کے سردار کا نام سفیان بن خالد الہذلی تھا۔ حضورؐ کو خبر ملی کہ سفیان مدینے پر حملہ کرنے کے لیے ایک جیش ترتیب دے رہا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبد اللہ بن اُنَیس[۵۷] کو اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ یہ ۵۔ محرم ۴ھ کو تنہا چل پڑے وہاں پہنچ کر اُسے تلاش کیا۔ موقعہ پا کر مار ڈالا اور سر کاٹ کر ساتھ لے گئے۔ جب حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ بتایا تو حضورؐ نے خوش ہو کر اپنا عصا عطا کیا اور فرمایا:

تخصر بهذه فی الجنة۔ (کہ جنت میں اس کے سہارے سے چلنا)

جب یہ فوت ہوئے تو عصا اُن کے کفن میں رکھ دیا گیا۔ (تلقیح ص ۲۶۔ سیرت النبیؐ ج ۱ ص ۳۸۹)

---

۵۵ طُلَیحہؓ و سلمہ دونوں بھائی تھے۔ سلمہ کے مشرف بہ اسلام ہونے کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ البتہ طلیحہ اسلام لے آئے تھے لیکن حضورؐ کی رحلت کے بعد یہ بھی سیلابِ ارتداد میں بہہ گئے اور اپنے سارے قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف منظم کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی گوشمالی کے لیے حضرت خالدؓ بن ولید کو بھیجا لیکن یہ شام کی طرف بھاگ گئے اور عہدِ عمرؓ میں تائب ہو کر مدینہ میں آئے اور پھر کئی جنگوں میں شامل ہوئے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۱۱)

۵۶ ابو سلمہ: تذکروں میں اس کنیت کے دو ہی صحابی ملتے ہیں۔ اوّل ابو سلمہ جس کا نام کہیں مذکور نہیں۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ حضورؐ کی صحبت میں رہے تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۶۸۶) دوم۔ ابو سلمہ: عبد اللہ بن عبد الاسد بن ہلال بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم القرشی المخزومی اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرتِ حبشہ میں بھی حصہ لیا تھا۔ یہ اُحد میں زخمی ہوئے۔ زخم اچھا ہونے کے بعد پھر ہرا ہو گیا اور آپ ۳۔ جمادی الآخرہ ۴ھ (استیعاب میں ۳ھ درج ہے جو صریحاً غلط ہے کیونکہ اُحد کا واقعہ جمادی الآخرہ ۳ھ سے چار ماہ بعد پیش آیا تھا) کو وفات پا گئے۔ مہم قطن کی سیادت انہی کے سپرد ہوئی تھی۔ (استیعاب ج ۲۔ ص ۶۸۵)

۵۷ عبد اللہ بن اُنَیس بن اسعد بن حرام بن حبیب بن مالک جُہَنی ہجرتِ رسولؐ سے کچھ عرصہ پہلے اسلام لائے تھے۔ اُحد اور بعد کے غزوات میں حصہ لیا اور ۵۴ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۳۴۶)

۱۹۔ بئرِ معونہ کی مہم

صفر ۴ھ میں حضورؐ نے نجد کے ایک قبیلے عامرؓ[88] بن صعصعہ کے ایک رئیس ابو البراء عامر بن مالک کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ قبیلے کی حمایت حاصل کرنے نیز اُسے اسلام سے متعارف کرانے کے لیے چند صحابہ میرے ساتھ بھیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اہل نجد پر اعتبار نہیں۔ کہنے لگا کہ میں ضامن ہُوں۔ چنانچہ آپ نے چند صحابہ اس کے ساتھ کر دیئے۔ ان کی تعداد بعض روایات کے مطابق ستر اور بعض دیگر کے مطابق چالیس تھی۔ جب یہ لوگ ارضِ بنو سُلیمؓ[89] کے ایک کنوئیں بئرِ معونہ پر پہنچے تو وہاں سے اپنی جماعت کے ایک ہی آدمی حرامؓ[90] بن ملحان کو حضورؐ کا خط دے کر قبیلے کے سردار عامر بن طفیل کی طرف بھیجا۔ اس نے قاصد کو قتل کر دیا اور بنو سلیم کے چند آدمیوں کے ہمراہ بئرِ معونہ کی طرف چل پڑا۔ راہ میں سامنے سے صحابہ آ گئے جو قاصد کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ عامر نے ان کو گھیر کر قتل کر دیا اور عمروؓ[91] بن اُمیّہ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام کو آزاد کرنے کی منت مانی تھی اس لیے تو آزاد ہے اور ساتھ ہی اس کی چوٹی کاٹ لی۔ اس جماعت کا سردار حضرت مُنذِرؓ[92] تھا اور اس میں حضرت عامرؓ[93] بن فہیرہ اور حضرت نافعؓ[94] بن بُدیل جیسے مقدّس لوگ شامل تھے۔ (تلقیح ص ۲۶۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۵۔ واٹ ط ۳۲۔ شبلی ص ۳۸۹)

۸۸؎ عامر بن صعصعہ کا قبیلہ ہوازن کا ایک حصّہ تھا۔ مدت تک اس کی سیادت ابو البراء عامر بن مالک کے پاس رہی۔ بعد میں دو نوجوان سردار، عامر بن طفیل اور علقمہ بن عُلاثہ خود سر ہو کر اپنی مرضی کرنے لگے۔ اس کی شہادت حرام بن ملحان کے قتل سے ملتی ہے کہ ابو البراء نے اُسے اور اس کی جماعت کو پناہ دی لیکن عامر بن طفیل نے اسے قتل کر دیا۔ (واٹ ص ۹۰)

۸۹؎ سُلیم کے قبیلے نے اسلام کے خلاف کوئی خاص حصّہ نہیں لیا۔ اوائل ہجرت میں ایک دو مرتبہ انھوں نے شرارت کا ارادہ کیا تھا لیکن اسلامی جیش کے آنے پر منتشر ہو گئے البتہ بئرِ معونہ کے البتہ کے ذمّہ دار یہی لوگ تھے۔ انھوں نے عامر بن طفیل کے ساتھ مل کر تمام صحابہ کو مار ڈالا۔ بعد میں ان کا رویّہ ٹھیک ہو گیا۔ فتحِ مکّہ اور حنین کی مہم میں سُلیم کے ایک ہزار جوان شامل تھے حنین میں حضورؐ نے تین عَلم تین سُلیمیوں کو دیئے تھے۔ یعنی عباس بن مرداس، خُفاف بن ندبہ اور حُجاج بن علاط۔ یہ قبیلہ حضورؐ کی زندگی میں ہی مسلمان ہو گیا تھا۔ (واٹ ص ۹۵)

۹۰؎ حرامؓ بن ملحان۔ مالک بن خالد بن زید بن حرام الانصاری نے بدر و اُحد میں حصّہ لیا۔ آپ حضرت انس بن مالک کے ماموں تھے۔ جب عامر بن طفیل نے آپ کے سر میں نیزہ مارا اور آپ کے ہاتھوں پر خون گرنے لگا تو فرمایا فُزْتُ وَ رَبِّ الْکَعْبَۃ (رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا) شہادت ۴ھ میں پائی۔ (استیعاب ج ۱، ص ۱۳۲)

۹۱؎ عمروؓ بن اُمیّہ بن خویلد بن عبد اللہ بن ایاس بن عبید الضمری۔ بدر اور احد میں قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے لیکن اُحد کے بعد فوراً اسلام لے آئے اور ۶ھ میں حضورؐ نے انہیں ایک تبلیغی خط دے کر نجاشی کی طرف بھیجا تھا۔ عہدِ معاویہ میں مدینہ میں وفات پائی۔

(استیعاب ج ۲ ص ۴۲۰)

۹۲؎ مُنذِر بن عَمرو بن خُنیس بن حارثہ بن لَوذان الانصاری الساعدی ہجرتِ رسولؐ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ بدر و اُحد میں حصّہ لیا اور بئرِ معونہ کے المیہ میں شہید ہو گئے۔ (۴ھ) (استیعاب۔ ج ۱ ص ۲۷۵)

۹۳؎ عامرؓ بن فُہیرہ حضرت ابو بکرؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ جبلِ ثور میں مویشی چرایا کرتے تھے۔ جب حضورؐ ابو بکر صدیق رضؓ کے ہمراہ غارِ ثور میں پناہ گزیں ہُوئے تو یہ ہر شام وہاں کھانا وغیرہ لاتے تھے اور سفرِ ہجرت میں ان دونوں کے ساتھ تھے۔ بدر و اُحد میں حصّہ لیا اور بئرِ معونہ کے حادثے میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲۔ ص ۲۴۹)

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۲۰ - رَجیع[95] کی مہم صفر ۴ھ میں قبائل عَضَل[96] و قارہ کے چند آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہماری قوم اسلام لا چکی ہے لیکن احکامِ شرعیہ سے نا آشنا ہے۔ اس لیے ہمارے ساتھ چند عالم و مبلّغ بھیجئے۔ حضورؐ نے سات صحابہ کا انتخاب فرمایا اور حضرت مرثد[97]ؓ بن ابی مرثد کو ان کا امیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ جب یہ لوگ مقامِ رَجیع پر پہنچے تو انہوں نے غدّاری کی اور بنو لحیان[98] کے چند آدمیوں کو بُلا کر پانچ کو تو مروا ڈالا اور باقی دُو یعنی حضرت خبیبؓ[99] بن عدی اور حضرت زیدؓ[100] بن دَثِنَہ کو مکہ میں قریش کے ہاں فروخت کر دیا اور قریش نے انہیں شہید کر ڈالا۔ خُبَیبؓ کو ابو سَرْوَعَہ[101] نے، جس کے والد حارث بن عامر کو خُبَیبؓ نے اُحُد میں قتل کیا تھا اور زید کو صفوان[102] بن اُمیّہ بن خلف نے کیونکہ اس کا باپ امیہ بن خلف بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوا تھا۔ اور صفوان کے بدلے میں کسی مسلمان کا سر لینا چاہتا تھا۔ (تلقیح ص ۲۶ - ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۰ - شبلی ج ۱ ص ۳۹۱)

---

[94] نافعؓ بن بُدَیل بن ورقاء الخزاعی ایک صاحبِ علم صحابی تھے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۹۴)

[95] مدینہ و مکہ کے وسط میں ایک مقام عُسفان کہلاتا تھا۔ رجیع مکہ و عُسفان کے درمیان واقع تھا۔ (شبلی ج ۱ - ص ۳۹۱)

[96] عَضَل اور قارہ، قبیلۂ اسد بن خُزَیمہ کی شاخیں تھیں اور یہ مکہ و مدینہ کے مشرق میں رہتی تھیں۔ (واٹ - ص ۸۱)

[97] حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد الغنوی بدر و اُحد میں شامل ہُوئے تھے اور حادثۂ رجیع میں شہید ہوئے۔ (۴ھ) آپ نے حضورؐ سے کئی احادیث روایت کی ہیں۔ آپ کو حضورؐ نے مہم رجیع کا امیر مقرر کیا تھا لیکن ایک اور روایت کے مطابق اس مہم کا امیر عاصمؓ بن ثابت بن ابی الاقلح انصاری تھا یہ بھی ان سات صحابہ میں شامل تھا جنھیں حضورؐ نے اس مہم پر بھیجا تھا۔ جب بنو لحیان نے صحابہ کو قتل کر دیا تو انہوں نے عاصم کا سر کاٹ کر سلافہ بنت سعد بن شہید کے پاس فروخت کرنا چاہا لیکن شہد کی مکھیوں کے اچانک حملے سے ایسا نہ کر سکے۔ سلافہ کے دو بیٹوں کو اُحد میں عاصم نے ہلاک کیا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ عاصم کے کاسۂ سر میں شراب پیئے گی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۶۵ و ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۵)

[98] بنو لحیان۔ قبیلۂ ہُذَیل کی ایک شاخ تھی جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھی۔ اس کے ایک سردار سُفیان بن خالد بن نُبَیحہ الہُذَلی کو عبداللہؓ بن اُنَیس نے قتل کر دیا تھا (دیکھیے عنوان نمبر ۱۷)۔ اسی قتل کا انتقام لینے کے لیے بنو لحیان نے ان صحابہ کو قتل کیا۔ (واٹ - صفحہ ۹۰)

[99] خُبَیب بن عَدِی بن عوف بن کُلفَہ انصاری بدر میں موجود تھے۔ انہیں ابُو سَرْوَعَہ (ح - ۱۰۱) نے شہید کیا تھا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۱۶۲)

[100] زیدؓ بن دَثِنہ بن معاویہ بن عُبَید بن عامر بن بیاضۃ الانصاری نے بدر و اُحد میں حصہ لیا تھا۔ مہم رجیع میں پہلے قید ہُوئے اور بعد ازاں صفوان بن اُمیّہ کے ہاتھوں شہید۔ (ایضاً ص ۱۸۹)

[101] ابُو سَرْوَعَہؓ عُقبہ بن حارث بن عامر بن نوفل بن عبدِ مناف القرشی النوفلی الحجازی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔ (استیعاب - ج ۲ - ص ۶۹۳)

[102] صفوان بن اُمیّہ کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۷۰۔

۲۱۔ غزوۂ بنو نضیر بنو نضیر یہود مدینہ کا ایک قبیلہ تھا جو مسجد نبوی سے جنوب مشرق کی طرف شہر سے باہر آباد تھا۔ یہ ہر وقت اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے حضورؐ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے تین علماء سے اسلام پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائیں اور ساتھ تین صحابی بھی لے آئیں۔ حضورؐ نے یہ دعوت منظور فرمالی اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر اُن کے ہاں چلے گئے۔ یہود نے آپ کے آنے سے پہلے چھت پر ایک یہودی کو چڑھا دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ جب مسلمان باتوں میں لگ جائیں تو وُہ رسول (صلعم) پر ایک وزنی سِل گرا دے۔ جب حضورؐ وہاں پہنچے تو انہیں اُسی دیوار کے سائے میں بٹھایا گیا لیکن وحی نے آپؐ کو سازش کی اطلاع دے دی چنانچہ آپ اُٹھ کر واپس چلے گئے اور بنو نضیر کو سزا دینے کی سکیم بنانے لگے۔ آپ ربیع الاول ۴ھ میں صحابہ کا ایک جیش لے کر بنو نضیر کے محلے میں گئے۔ ان کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ دن کے بعد اس شرط پر صلح ہُوئی کہ یہود ہتھیار چھوڑ جائیں اور جتنا سامان اٹھا سکتے ہیں لے کر مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ خیبر وغیرہ کی طرف چلے گئے اور مدینہ سے بایں شان روانہ ہُوئے کہ عورتیں دَف بجا بجا کر گا اور ناچ رہی تھیں۔ (تلقیح ص ۲۶۔ شبلی ج ۱ ص ۴۰۸۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ ص ۹۷، ابن خلدون ج ۱ ص ۱۱۷)

۲۲۔ غزوۂ بدر الموعد[۳۴] جنگِ اُحد کے خاتمے پر ابُو سفیان نے بلند آواز سے کہا تھا کہ اگلے سال ہمارا تمہارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا۔ چونکہ حضورؐ نے اس چیلنج کو منظور کر لیا تھا اس لیے آپ یکم ذی القعدہ[۳۵] ۴ھ کو (حضرت عبداللہ[۳۶] بن رواحہ کو بطور نائب[۳۷] چھوڑ کر) پندرہ سو صحابہ اور دس گھوڑوں کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابو سفیان بھی دو ہزار ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا لیکن اُسے حملے کی ہمت نہ پڑی اور واپس چلا گیا (تلقیح ص ۲۷) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جُوں جُوں دن گزر رہے تھے حضورؐ کی فوجی طاقت بڑھ رہی تھی۔ بدر میں آپ کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ لیکن بعد کی جنگوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جدول یہ ہے:

---

[۳۴] موعد کے معنی ہیں: وعدہ۔ جائے وعدہ اور زمانِ وعدہ۔ چونکہ اُحد میں ابو سفیان نے اگلے سال بدر میں لڑنے کا چیلنج دیا جسے حضورؐ نے منظور فرما لیا تھا۔ اس لیے بدر کے ساتھ الموعد (وعدہ۔ جائے وعدہ۔ زمانِ وعدہ) کا لفظ بڑھا دیا گیا ہے یعنی وُہ بدر جہاں مقابلے کا فیصلہ (وعدہ) ہوا تھا۔ (مُنجد " وعدٌ ")

[۳۵] ابن خلدون (ج ۱ ص ۱۱۸) کے ہاں یہ سفر شعبان میں ہُوا تھا اور ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۷) کے ہاں یکم ذی قعدہ ۴ھ کو۔

[۳۶] عبداللہؓ بن رواحہ بن ثعلبہ بن امراءُ القیس الانصاری ہجرتِ رسُول سے پہلے اسلام لائے اور فتح مکہ کے بعد دیگر تمام مہمات میں شامل ہُوئے۔ غزوۂ موتہ (۸ھ) میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۱ ص ۳۴۸)

[۳۷] ابن خلدون (ج ۱ ص ۱۱۸) لکھتا ہے کہ:

نائب کا نام عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول تھا لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ عبداللہ رئیس المنافقین تھا اور حضورؐ اسے اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

سال	غزوہ	گھوڑوں کی تعداد	بندوں کی تعداد	سال	غزوہ	گھوڑوں کی تعداد	بندوں کی تعداد
۲ھ	بدر	۲	۳۱۳	۸ھ	حنین	۸۰۰	۱۲,۰۰۰
۴ھ	بدر الموعد	۱۰	۱۵۰۰	۹ھ	تبوک	۱۰,۰۰۰	۳۰,۰۰۰
۷ھ	خیبر	۲۰۰	ایضاً	۰	۰	۰	(واٹ ص ۲۵۰)

۲۳۔ غزوۂ ذات الرّقاع[۱۰۷] حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد میں غطفان کے دو قبیلے ثعلبہ اور انمار مدینے پر حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں آپؐ نے حضرت عثمان بن عفان کو اپنا نائب مقرر کر کے چار سو (یا سات سو) صحابہ کے ساتھ محرم ۵ھ میں کوچ کیا اور ایک ایسے میدان میں ڈیرے ڈالے جس کے چاروں طرف سرخ، سفید اور سیاہ رنگ کی پہاڑیاں تھیں اور یوں نظر آتا تھا گویا رنگ برنگ کپڑے دھوپ میں لٹکے ہوئے ہیں۔ قبائل منتشر ہو گئے اور حضورؐ لڑے بغیر واپس آ گئے۔

(تلقیح ص ۲۷)

۲۴۔ غزوۂ دُومۃُ الجَندل دُومۃ الجندل کا قصبہ مدینہ سے پانچ سو میل شمال میں اس تجارتی شاہراہ کے قریب واقع تھا جو یمن سے شام تک جاتی تھی۔ چونکہ وہاں کے قبائل مدینہ کے تجارتی قافلوں کے لیے خطرہ بن گئے تھے، اس لیے حضورؐ ان کی گوشمالی کے لیے ۲۲/۲۴ ربیع الاول ۵ھ کو ایک ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ حضرت سباع[۱۰۸] بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور پندرہ دن کے بعد دُومہ میں پہنچے۔ لیکن قبائل منتشر ہو چکے تھے اس لیے واپس آ گئے۔

(تلقیح، ص ۲۷)

۲۵۔ غزوۂ مُریسیع (یا بنی مُصطَلِق) مُریسیع ایک چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے اندازاً سو میل جنوب مغرب میں ساحل کی طرف واقع تھا اس کے نواح میں بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو مصطلق آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ مدینہ پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپؐ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دے دیا اور حضرت زید[۱۰۹] بن حارثہ کو نائب مقرر کرنے کے بعد ۲۔ شعبان ۵ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو وہ لوگ جنگ کے لیے تیار تھے ان میں سے

---

[۱۰۷] ذات الرقاع کے لفظی معنی ہیں : دھجیوں اور ٹکڑوں والی۔ اس سے مراد غطفان کا وہ میدان ہے جس کے گرد رنگ برنگ پہاڑیاں تھیں۔ اور جن کی وجہ سے یہ مہم "ذاتُ الرّقاع" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

[۱۰۸] حضرت سباع بن عرفطہ کے متعلق حافظ ابن عبدالبر نے صرف اتنا کہا ہے کہ حضورؐ نے دُومۃ الجندل اور خیبر کے سفر کے دوران انہیں مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور یہ بڑے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۰۴)

[۱۰۹] زید بن حارثہ کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۹۔

دس مارے گئے۔ چھ سو اسیر ہُوئے۔ اور غنیمت میں دو ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔ اسیروں میں رئیسِ قبیلہ حارث (حرث) بن ابی ضرار کی بیٹی جُویریہؓ بھی تھی۔ یہ تقسیم کے وقت حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصّے میں آئی۔ جب حضورؐ کو معلوم ہُوا کہ یہ سردارِ قبیلہ کی بیٹی ہے تو آپؐ نے حضرت ثابتؓ کو کچھ رقم دے کر اُسے آزاد کرا لیا اور اسے اپنی زوجیت میں لے لیا۔

اس تصادم میں صرف ایک صحابی شہید ہوا تھا۔ (شبلی، ج ا، ص ۴۱۲ - ۴۱۳۔ تلقیح، ص ۲۷۔ ابنِ خلدون، ج ا، ص ۱۲۸۔ واٹ، ص ۱۳۵)

واقعۂ اِفک یہ واقعہ اسی غزوہ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ بات یوں ہُوئی کہ واپسی پر حضورؐ نے رات کو ایک جگہ قیام فرمایا۔ آدھی رات کے وقت حضرت عائشہؓ رفعِ حاجت کے لیے لشکر گاہ سے باہر گئیں، واپسی پر انہیں محسوس ہوا کہ اُن کا ہار، جو وہ اپنی بہن سے عاریتًہ لائی تھیں کہیں گر گیا ہے۔ وہ دوبارہ واپس گئیں تو قافلہ چل دیا اور آپ رہ گئیں۔ آپ لشکر گاہ میں بیٹھ کر انتظار کر رہی تھیں کہ صفوانؓ بن معطل، جس کا کام قافلہ کی گری پڑی اشیا کو سنبھالنا تھا، آ گیا۔ حضرت عائشہؓ کو تنہا دیکھ کر پہلے بلند آواز سے "انا للّٰہ وانّا الیہ راجعون" کہا۔ پھر اونٹ کو بٹھایا، حضرت عائشہؓ کو سوار کیا اور مہار پکڑ کر چل دیا۔ جب یہ اپنے قافلے میں پہنچے تو منافقِ اعظم عبداللہ بن اُبیّ نے حضرت عائشہؓ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ جب داستانِ افترا سارے مدینے میں پھیل گئی تو حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کنارہ کر لیا۔ اس پر وہ سخت بے چین بلکہ بیمار رہنے لگیں۔ اور اندازاً ایک ماہ کے بعد وحی نے آپ کی براءت کا اعلان کیا۔ "اِفک" کے معنی ہیں جُھوٹ بولنا اور الزام تراشنا۔ (ابنِ خلدون ج ا۔ ص ۱۳۰)

۲۶۔ غزوۂ اَحزاب (یا خندق) بنو نضیر مدینہ سے نکل کر خیبر میں پہنچے تو انہوں نے انتقام کی ٹھان لی۔ ان کے رؤسا میں سے حُیَیّ بن اَخطب اور کنانہ بن ربیع قریش کو ساتھ ملانے کے لیے

۱۱ۃ جُویریہؓ بنت حارث بن ابی ضرار غزوۂ مریسیع میں اسیر ہونے سے پہلے مسافع بن صفوان (بروایتے: صفوان بن ملک) کی زوجہ تھیں اور آپ کا نام بَرّہ تھا۔ حضورؐ نے انہیں زوجیت میں لینے کے بعد ان کا نام جویریہ رکھ دیا۔ ۶۵ سال کی عمر میں ۵۶ھ میں وفات پائی۔ (تلقیح۔ ص ۱۱)

۱۱۱ۃ حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس بن ظہیر انصاری پہلے انصار کے خطیب تھے۔ اسلام لانے کے بعد خطیبِ رسولؐ بن گئے۔ اُحُد اور بعد کے غزوات میں شامل ہُوئے اور حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت (۱۱ - ۱۳ھ) میں مسیلمہ کے خلاف لڑتے ہوئے یمامہ میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ا۔ ص ۹۴)

۱۱۲ۃ حضرت عائشہؓ بنت ابی بکرؓ الصدیق حضورؐ کے نکاح میں ہجرت سے دو برس (اور بروایتے: تین برس) پہلے آئیں۔ اس وقت آپ کی عمر چھ سال تھی نو برس کی عمر میں رخصتی ہُوئی۔ حضورؐ کے ساتھ نو سال گزارے۔ ۶۶ سال کی عمر پائی۔ ۱۷ رمضان ۵۷ھ یا ۵۸ھ میں وفات پائی۔ اور جنت البقیع میں مدفون ہُوئیں۔

۱۱۳ۃ صفوانؓ بن معطل بن ربیعہ بن خزاعی السُّلمی الذکوانی غزوۂ مریسیع سے ذرا پہلے اسلام لائے تھے اور بعد ازاں یہ ہر غزوہ میں شامل ہُوئے۔ آپ کی وفات میں اختلاف ہے۔ کوئی ۱۹ھ بتاتا ہے، کوئی ۵۸ھ یا ۶۰ھ۔ (استیعاب ج ا ص ۲۱۸)

مکہ میں گئے۔ وُہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے اس لیے جھٹ مان گئے۔ پھر غطفان، بنو اسد[۱۵۱۱]، بنو سُلیم، بنو سعد اور چند دیگر قبائل کو ساتھ ملایا۔ اور اس طرح دس ہزار کا لشکر لے کر مدینے کی طرف بڑھے۔

حضورؐ تک یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمانؓ[۱۵۱۲] فارسی نے رائے دی کہ فوج کے لیے ایک موزوں جگہ تجویز کر کے اس کے سامنے خندق کھود دی جائے۔ حضورؐ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ چند صحابہ کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ مختلف مقامات کا معائنہ فرمانے کے بعد فوج کے لیے ایک موزوں جگہ پسند کی نیز طے ہوا کہ بچوں اور عورتوں کو قلعہ نما مکانات (آطام، آجام) میں منتقل کر دیا جائے۔

شہر کے جنوب مشرق اور مغرب میں پہاڑیاں بھی تھیں اور گھنے باغات بھی۔ ان سے گزرنا مشکل تھا۔ صرف شمال کا رُخ ایسا تھا جہاں سے دشمن بآسانی مدینے پر حملہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی پیمائش کی گئی اور بیس بیس گز کے ٹکڑے دس دس آدمیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ خود حضورؐ بھی کھدائی کیا کرتے تھے۔ تیار ہونے کے بعد یہ خندق ساڑھے تین میل لمبی، کافی چوڑی اور اتنی گہری تھی کہ ایک دفعہ ایک حملہ آور نے کودنے کی کوشش کی تو گر کر مر گیا (طبری ص ۱۴۷۶۔ بحوالہ محمد حمید اللہ ص ۹۶)۔ یہ کھدائی تین ہفتے جاری رہی حضورؐ اُن دنوں اپنا گھر چھوڑ کر خندق کے پاس ایک ٹیلے پر خیمہ لگا کر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ شہر کے باقی لوگ از خود اپنے اپنے محلوں کے سامنے خندقیں کھودنے لگے اور اس طرح سارا شہر ایک قلعہ بن گیا۔ جب یہ خندق مکمل ہو گئی تو دشمن بھی آن پہنچا اور اس نے محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے شدت پکڑی تو مدینہ کے بنو قریظہ بھی دشمن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ قریش نے ہر چند زور مارا کہ وہ خندق کو عبور کر کے آگے نکلیں لیکن تیراندازوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ البتہ ایک تنگ جگہ سے ایک دفعہ چار قریش سردار پار کُود گئے لیکن جھٹ مارے گئے۔ جب محاصرہ طول پکڑ گیا اور قریش کے ذخائر رسد ختم ہونے لگے، ساتھ ہی ایک ایسی آندھی چل پڑی جس سے درخت اُکھڑ گئے اور قریش کا مال و اسباب اُڑ گیا تو وہ گھبرا گئے اور اکیس دن کے بعد واپس چلے گئے۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ کا ذکر یُوں کیا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا۔ (احزاب: ۹)

[۱۵۱۱] اسد، خزیمہ سے تعلق رکھتا تھا، سُلیم، غطفان سے اور سعد، عامر بن صعصعہ سے۔ (واٹ۔ ص ۸۱)

[۱۵۱۲] سلمانؓ۔ ابو عبداللہ۔ فارسی۔ اصلاً خوزستان کے ایک شہر رامہُرمز کے رہنے والے تھے۔ ان کا والد زرتشتی تھا۔ لیکن سلمان عیسائی ہو گئے۔ جب تبدیلِ مذہب کے بعد بھی وہ غیر مطمئن رہے تو صداقت کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ ایک دن بردہ فروشوں نے انہیں پکڑ کر مدینہ کی منڈی میں بیچ ڈالا۔ بعد میں انہیں حضورؐ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ حضورؐ ان سے بہت خوش تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدائن کے گورنر تھے انہیں پانچ ہزار درہم تنخواہ ملتی تھی۔ یہ ساری تنخواہ صدقہ کر دیتے تھے اور اپنی روزی مزدوری سے کماتے تھے۔ (استیعاب ص ۵۵۶۔ کنسائز انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ص ۳۶۲)

(اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب تم پر حملہ آور چڑھ آئے تھے اور ہم نے آندھی اور خفیہ لشکر بھیج کر انہیں بھگا دیا تھا۔ بے شک اللہ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے)

ابن الجوزی (تلقیح ص ۲۰) لکھتے ہیں کہ خندق کا واقعہ ذی قعدہ ۵ھ میں پیش آیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[۱۱۶] بن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔ مہاجرین کا علم بردار حضرت زیدؓ[۱۱۷] بن حارثہ تھے اور انصار کا حضرت سعدؓ[۱۱۸] بن عُبادہ۔ آپؐ خندق میں پندرہ یوم رہے آپؐ کے ساتھ تین ہزار صحابہ تھے اور حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار تھی۔ (شبلی ج ۱ ص ۴۱۹۔ ابن خلدون ج ۱ ص ۱۲۰۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ ص ۶۰)

۲۷۔ غزوۂ بنو قُریظہ بنو قریظہ یہود کا ایک قبیلہ تھا جو مدینہ میں مسجد نبویؐ سے جنوب مشرق کی طرف آباد تھا۔ جنگِ احزاب میں یہ لوگ معاہدے کو توڑ کر قریشِ مکہ کے ساتھ مل گئے تھے اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آئے تھے۔ جب احزاب واپس چلے گئے تو حضورؐ نے صحابہ سے کہا کہ وہ ہتھیار نہ کھولیں اور سب سے پہلے بنو قریظہ کے فتنے کو ختم کریں۔ چنانچہ ۲۲۔ ذیقعدہ ۵ھ کو آپؐ تین ہزار صحابہ اور ۳۶ گھوڑوں کے ساتھ اُن کے محلے میں گئے اور اُن کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن کے بعد وہ تنگ آ گئے اور حضرت سعدؓ[۱۱۹] بن معاذ کی ثالثی پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت سعد قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اوس بن قریظہ کے حلیف تھے۔ آپؐ نے یہود کی مقدس کتاب تورات ہی کے مطابق فیصلہ کیا۔ تورات میں درج ذیل ہے:

"...... تُو اُن کا محاصرہ کر۔ اور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو مردوں کو قتل کرا دے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لے۔"

سعد نے اُن کے تمام لڑنے والے مردوں کو قتل اور اطفال و خواتین کو قیدی بنانے کا حکم دے دیا۔ یہ تھی اُن کی غداری۔ عہد شکنی اور تخریب کاری کی سزا۔ (تلقیح ص ۲۸۔ شبلی ۴۲۳)

۲۸۔ مہم قرطاء قُرطاء، نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کی ایک شاخ تھی جو حرمین کے مشرق میں آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو آپؐ نے محرم ۶ھ میں حضرت محمدؓ[۱۲۰] بن مَسلمہ کو تیس صحابہ کے ہمراہ ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ وہ لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور صحابہ کچھ مالِ غنیمت لے کر واپس آ گئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۲۹۔ غزوۂ بنو لحیان ہم کہہ چکے ہیں کہ بنو لحیان قبیلہ ہُذیل کی ایک شاخ تھی، جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھی۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو لحیان کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آپ حضرت عبداللہؓ

---

۱۱۶ دیکھیے حاشیہ نمبر ۶۶ — ۱۱۸ دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۹

۱۱۷ دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۶ — ۱۱۹ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۷

۱۲۰ ابو عبدالرحمان محمدؓ بن مَسلمہ بن سلمہ بن خالد بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ بن حارث الانصاری تمام غزوات میں شامل ہوئے۔ آپ فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ حضورؐ نے کئی بار آپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا۔ جب مسلمان آپس میں لڑنے لگے تو آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ آپ کی وفات ۴۳ھ یا ۴۶ھ یا ۴۷ھ) میں ہوئی تھی۔ مروان بن حکم نے جو اس وقت امیر مدینہ تھے، جنازہ پڑھایا تھا اور آپ مدینہ میں دفن ہوئے تھے۔ (استیعاب ج ۱ ص ۲۳۱)

بن امّ مکتوم کو اپنا نائب مقرر کر کے دو سو صحابہ اور بیس گھوڑوں کے ساتھ ربیع الاول ۶ھ کو مدینہ سے نکلے۔ وہاں پہنچے تو وُہ سب پہاڑوں کی طرف بھاگ چکے تھے۔ اس لیے آپ ۱۴ دن کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۳۰۔ غزوۂ غابہ غابہ ایک چراگاہ کا نام ہے جو مدینہ سے اندازاً بارہ میل کے فاصلے پر واقع تھی اور جس میں حضورؐ کی اُونٹنیاں چرتی تھیں ایک رات بنو غطفان کی ایک شاخ فزارہ کے سردار عُیینہ[۱۲۱] بن حصن نے چالیس سواروں کے ساتھ غابہ پر حملہ کیا اور بیس اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔ ساتھ ہی حضرت ابوذر[۱۲۲] غفاری کے فرزند کو، جو اسی چراگاہ میں رہتا تھا قتل کر ڈالا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو پانچ سو (یا سات سو) کی جمعیت لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ آپ کے ساتھ آٹھ گھڑ سوار بھی تھے۔ انہوں نے چوروں کو جا لیا۔ لڑائی ہوئی۔ چار چور مارے گئے اور مسلمانوں میں سے صرف ایک شہید ہُوا۔ انہوں نے دس اونٹنیاں تو پکڑ لیں لیکن باقی دس کو وُہ بھگا لے گئے۔ (واقدی ص ۲۴ - تلقیح ص ۲۸)

۳۱۔ عکّاشہ رضؓ کی مہم حضورؐ کو اطلاع ملی کہ نجد کا ایک قبیلۂ اسد، شرارت پر آمادہ ہے۔ آپ نے حضرت عکّاشہ[۱۲۳] بن محصن الاسدی کو ربیع الاول ۶ھ میں چالیس صحابہ کا ایک دستہ دے کر اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ جب یہ دستہ ارضِ اسد کے ایک چشمے غمر پر پہنچا تو وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۳۲۔ مہم ذو القصّہ مدینہ سے چوبیس میل دور نجد میں بنو ثعلبہ کا ایک موضع ذو القصّہ کہلاتا تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ وہاں ثعلبہ کے آدمی حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں چنانچہ آپ نے ربیع الاول ۶ھ میں محمدؓ[۱۲۴] بن مسلمہ کو صرف دس صحابہ کے ہمراہ مقابلے کے لیے بھیجا وہاں ایک سو آدمی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے سب کو مار ڈالا۔ صرف محمدؓ بن مسلمہ بچ کر نکل سکے۔ حضورؐ نے فوراً چالیس صحابہ کا ایک اور دستہ حضرت ابو عبیدہؓ[۱۲۵] بن جراح کی قیادت میں روانہ کیا لیکن وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

---

[۱۲۱] ابو مالک عُیینہؓ بن حصن بن حُذیفہ بن بدر الفزاری فتح مکہ سے ذرا پہلے اسلام لائے اور غزوۂ مکہ میں شامل ہُوئے۔ اسلام لانے سے پہلے لاف زن، ڈانگ مار اور اکھڑ سمجھے جاتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی حد تک اکھڑ رہے۔ ایک مرتبہ اجازت لیے بغیر حضورؐ کے گھر میں داخل ہو گئے اور حضرت عائشہؓ کے متعلق پُوچھنے لگے کہ یہ کون ہے؟ فرمایا: یہ میری زوجہ عائشہ ہے۔ کہنے لگے: کیا آپ کو اس سے حسین تر بیوی نہیں مل سکتی تھی؟ حضرت عائشہؓ سخت ناراض ہُوئیں اور پُوچھا یہ کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: احمق مطاعٌ۔ یہ ایک احمق ہے۔ جو اپنی قوم کا لیڈر ہے۔ آپ نے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی ایک ایک دفعہ گستاخانہ گفتگو کی تھی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۱۳)

[۱۲۲] ابو ذرؓ جُندب بن جنادہ بن قیس بن عمرو غفاری اسلام لانے والوں میں چوتھے تھے۔ باقی تفاصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۰۔

[۱۲۳] عکّاشہؓ بن محصن بن حرثان بن قیس الاسدی فضلائے صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں شامل ہُوئے اور حضورؐ سے ایک سال بعد ۱۲ھ میں مُرتدین کے خلاف لڑتے ہُوئے شہید ہو گئے۔ (استیعاب - ج ۲ - ص ۲۰۸)

[۱۲۴] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲

[۱۲۵] ابو عبیدہؓ عامر بن عبداللہ بن جراح بن ہلال بن اہیب بن ضبہ بن حارث بن فہر القرشی الفہری تمام غزوات میں شامل تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی۔ اُحد میں جب ایک کافر عبداللہ بن قمیئہ کی ضربِ شمشیر سے خود کی دو کڑیاں حضورؐ کے چہرۂ مبارک میں چُبھ گئیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

دو تین ہفتے بعد ثعلبہ کے چند آدمی اپنے اونٹوں کو چرانے کے لیے مدینہ کے قریب ایک چراگاہ میں آ گئے۔ حضورؐ نے حضرت ابو عبیدہ رضؓ کو دوبارہ چالیس صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ وہ خود تو بھاگ گئے لیکن ان کے بیشتر مویشی پیچھے رہ گئے جنہیں یہ ہانک لائے۔ (تلقیح ص ۲۸)

۳۳ - مہم جموح (یا جموم) حضورؐ کو اطلاع ملی کہ بنو سُلیم کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے ربیع الآخر ۶ھ میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو اُن کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ ارضِ بنو سُلیم کے ایک چشمے جموح (یا جموم) پر پہنچے تو وہاں ایک عورت نے بنو سلیم کے محلے تک اُن کی رہ نمائی کی۔ چنانچہ یہ کچھ قیدی اور مالِ غنیمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (تلقیح ص ۲۹)

۳۴ - مہم عیص مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ سے کوئی پچاس میل مشرق میں ارضِ بنو سُلیم سے گزرنے والا ہے۔ آپ نے جمادی الاولیٰ ۶ھ میں زیدؓ بن حارثہ کو ۱۰۰ سواروں کے ہمراہ اُس کی طرف بھیجا۔ ارضِ سُلیم کے ایک مقام عیص پر قافلہ والوں سے مقابلہ ہُوا اور حضرت زیدؓ کامیاب ہُوئے۔ مالِ تجارت میں چاندی کی بہی خاصی مقدار تھی جو بیت المال میں داخل کر دی گئی۔ (تلقیح ص ۲۹)

۳۵ - مہم طَرَف طَرَف ایک چشمہ ہے۔ مدینہ سے ۳۶ میل بصرہ (مشرق) کی طرف۔ خبر ملی کہ اس مقام پر کچھ اعراب (دیہاتی جنگلی) حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ۱۵ اصحابہ کے ساتھ بھیجا۔ یہ طَرَف تک گئے۔ لیکن مقابلے میں کوئی نہ آیا۔ (تلقیح ص ۲۹)

۳۶ - مہم حِسمیٰ مدینہ میں خبر آئی کہ بنو جُزام، جو مدینہ سے کوئی تین سو میل شمال میں تیماد کے قریب آباد تھے۔ مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو لُوٹ لیتے ہیں۔ حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۶ھ میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو پانچ سو کا ایک لشکر دے کر اُس طرف بھیجا۔ وادی القُریٰ[۱۲۶] سے ذرا شمال میں بمقام حِسمیٰ جُزامیوں سے مقابلہ ہُوا۔ انہیں سخت شکست ہُوئی۔ زید کو غنیمت میں ایک سو اسیر، ایک ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ملیں۔ (ایضاً ص ۲۹)

۳۷ - سَرِیّہ دُومۃ الجندل دُومۃ الجندل شمالی عرب کا ایک سرحدی شہر ہے جس میں بنو کلب آباد تھے۔ جب انہوں نے مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو تنگ کرنا شروع کیا تو حضورؐ نے حضرت عبدالرحمانؓ[۱۲۷] بن عوف کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تو حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں دانتوں سے کھینچ کر نکالا اور اس کوشش میں آپ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ حضورؐ نے آپ کو اُمین الملّت کا خطاب دیا تھا۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد جب انصار نے اپنا الگ خلیفہ چُن لیا تو صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ نے حضرت کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کی تھی۔ آپ شام کے فاتح تھے۔ آپ کی وفات اُردن کے ایک شہر عمواس میں (۱۸ھ) میں ہوئی تھی۔

(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۶۷۰)

[۱۲۶] وادی القریٰ: مدینہ سے ۱۲۵ میل شمال میں فدک اور تیماد کے درمیان ایک آباد وادی۔ (معجم البلدان۔ ج ۸۔ "واد")

[۱۲۷] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۳۔

شعبان ۶ھ میں سات سو صحابہ کے ہمراہ اُن کی طرف بھیجا۔ وہاں پہنچے تو اُن کا امیر اَصبَغ بن عَمرو الکلبی بہت سے دیگر آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہوگیا اور اپنی بیٹی حضرت عبدالرحمٰنؓ کے نکاح میں دے دی۔ (ایضاً ص ۲۹)

۳۸۔ مُہم فَدک مدینہ سے اندازاً ایک سو بیس میل شمال میں خیبر اور وادی القُریٰ کے درمیان یہود کی ایک بستی فَدک کہلاتی تھی۔ اس میں بنُو سعد بن بکر کا قبیلہ بھی آباد تھا۔ اطلاع ملی کہ اِس قبیلہ کے لوگ یہودیانِ خیبر کی امداد کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپؐ نے شعبان ۶ھ میں حضرت علیؓ کو ایک سو صحابہ کے ہمراہ اُس طرف بھیجا۔ یہ لوگ خیبر و فدک کے درمیان ہَمَج نامی ایک چشمے پر جا رُکے۔ وہاں اُس قبیلے سے جنگ ہُوئی۔ وہ خود تو فوراً بھاگ گئے لیکن اُن کے مویشی پیچھے رہ گئے جن میں سے حضرت علیؓ پانچ سو اُونٹ اور دُو ہزار بکریاں ہانک لائے۔ (تلقیح ص ۲۹)

۳۹۔ مُہم ابنِ عَتیک حضورؐ کو اطلاع ملی کہ خیبر میں یہود کا ایک سردار ابُو رافع سَلاّم بن اَبی الحُقَیق النَضری مدینہ پر حملے کے ارادے سے ایک لشکر جمع کر رہا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عبداللہؓ[۱۲۸] بن عتیک کو چار دیگر صحابہ کے ہمراہ اُس کی طرف بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ابُو رافع کو اُس کے گھر میں داخل ہو کر قتل کر دیا۔ اور بخیریت لوٹ آئے۔ یہ مہم رمضان ۶ھ میں بھیجی گئی تھی۔ (تلقیح ص ۳۰)

۴۰۔ مہم عبداللہؓ بن رواحہ جیسا کہ ہم عنوان ۳۸ کے تحت بتا چکے ہیں۔ جب ابو رافع قتل ہوگیا تو یہودِ خیبر نے اُسَیر بن زارِم کو اپنا امیر بنا لیا۔ یہ قبائل غَطفان کے ہاں امداد کے لیے گیا۔ جب حضورؐ کو یہ اطلاع ملی تو آپؐ نے شوّال ۶ھ میں حضرت عبداللہؓ[۱۲۹] بن رواحہ کو ۳۰ صحابہ کے ساتھ اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے وہاں پہنچ کر اُسَیر اور اس کے تیس آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ (ایضاً ص ۳۰)

۴۱۔ مہم کُرز بن جابر شوّال ۶ھ میں قبیلۂ عُرَینَہ[۱۳۰] کے آٹھ آدمی حضورؐ کے پاس مدینہ میں آئے اور اسلام لانے کے بعد مدینہ ہی میں رہنے لگے۔ انہیں مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو حضورؐ نے انہیں مدینہ سے چھ میل دُور قُبا کی جانب ذُوالجَدر نامی ایک چراگاہ میں بھیج دیا جہاں حضورؐ کی اُونٹنیاں بھی چرتی تھیں۔ چرواہے کا نام یسار تھا۔ یہ حضورؐ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ جب وُہ لوگ تندرست ہو گئے تو یسار کی آنکھیں پھوڑنے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اُسے قتل کر دیا اور پندرہ اونٹنیاں ہانک کر لے گئے۔ حضورؐ تک یہ المناک اطلاع پہنچی تو آپؐ نے حضرت کُرزؓ[۱۳۱] بن جابر الفہری کو ۲۰ صحابہ کے ہمراہ

---

[۱۲۸] عبداللہؓ بن عتیک بن قیس بن اسُود (خزرجی) بدر اور بعض دیگر غزوات میں شامل ہُوئے۔ جنگِ جمل (۳۶ھ) میں حضرت علیؓ کی طرف سے لڑتے ہُوئے شہادت حاصل کی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۳۷۷)

[۱۲۹] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۰۵

[۱۳۰] عُرَینَہ نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کی ایک شاخ تھی۔

[۱۳۱] یہ وہی کُرز ہیں جو اسلام لانے سے پہلے ایک دفعہ اہل مدینہ کے اونٹ لے گئے تھے۔ دیکھیے عنوان ۶ اور حاشیہ ۱۹۔

اُن کے تعاقب میں بھیجا۔ انہوں نے چوروں کو جا لیا اور حضورؐ نے ان کو سخت سزا دی۔ (طبقات ابن سعد۔ ج ۱۔ ص ۴۳۶۔ تلقیح۔ ص ۳۰)

۴۲۔ عمروؓ بن اُمیّہ کی مہم مکہ میں حضورؐ اور اسلام کا بڑا دشمن ابوسفیان تھا۔ یہ مسلمانوں کی تخریب و تباہی کے لیے مسلسل سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ تنگ آکر حضورؐ نے حضرت عمروؓ[۱۳۱] بن اُمیّہ اور سلمہؓ[۱۳۲] بن اسلم کو حکم دیا کہ وُہ ابوسفیان کو ختم کرائیں۔ یہ دونوں مکہ میں پہنچے۔ عمرو کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوسفیان نے انہیں دیکھ لیا اور قریش کو خبر کر دی۔ قریش انہیں پکڑنے کے لیے جمع ہُوئے تو یہ دونوں بھاگ نکلے اور نواحِ مکہ میں قریش کے تین آدمیوں کو قتل اور ایک کو گرفتار کرنے کے بعد واپس آ گئے۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۳۷ اور تلقیح ص ۳۰)

۴۳۔ غزوہ حُدَیبیہ حُدَیبیہ ایک کنویں کا نام ہے جو مکہ سے بارہ میل شمال میں واقع تھا۔ جب حضورؐ ذی قعدہ سنہ ۶ھ میں تقریباً پندرہ سو صحابہ کے ہمراہ عُمرہ کے لیے روانہ ہُوئے اور قریش تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے خالدؓ[۱۳۳] بن ولید کو دو سو سوار دے کر آگے بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو روکے۔ بلدح[۱۳۴] میں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ لیکن حضورؐ کترا کر حدیبیہ کی طرف نکل گئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ وہاں سے آپؐ نے حضرت خراشؓ[۱۳۵] بن امیہ کو قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف عُمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش نے انہیں گرفتار کر لیا۔ پھر آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ وہ بھی دیر تک نہ لَوٹے تو آپؐ نے تمام صحابہ سے ایک ببول کے درخت کے نیچے سرفروشی کی بیعت لی۔ یہ خبر قریش تک پہنچی تو انہوں نے سہیلؓ[۱۳۶] بن عمرو کو بات چیت کے لیے بھیجا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

---

۱۳۱ دیکھئے حاشیہ نمبر ۹۱

۱۳۲ سلمہؓ بن اسلم بن حریش بن عدی بن مجدعہ بن حارثہ انصاری تمام غزوات میں شامل ہُوئے اور ۱۴ھ میں شہادت پائی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۶۰)

۱۳۳ دیکھیے حاشیہ نمبر ۶،

۱۳۴ بلدح: مکہ کے مغرب میں ایک وادی۔ (معجم۔ ج ۲۔ ص ۲۶۴)

۱۳۵ خراشؓ بن اُمیّہ بن الفضل الکعبی الخزاعی حضورؐ کے ہمراہ حدیبیہ اور بعد کے غزوات میں شامل ہُوئے اور خلافت معاویہ (۴۰۔۶۰ھ) کے دوران وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۶۲)

۱۳۶ سُہیلؓ بن عمرو بن عبد شمس بن عبد ود بن نصر بن مالک القرشی العامری قریش کے ایک معزز سردار تھے نیز فصیح البیان خطیب بھی۔ جب بدر میں اسیر ہُوئے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ اُس کے سامنے کے دو دانت نکال دیئے جائیں تاکہ اس کی فصاحت ختم ہو جائے۔ حضورؐ نے فرمایا: جانے دو، شاید اس کی فصاحت سے کبھی ہم بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ فتنۂ ارتداد میں آپ نے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے فصیح و بلیغ خطبے دیئے اور جنگِ یرموک (۱۵ھ) میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۷۶)

۲ ۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کریں ۔
۳ ۔ صرف تلواریں لانے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی نیام میں ہوں گی ۔
۴ ۔ جو مسلمان مکہ میں مقیم ہیں ان میں سے کسی کو ساتھ نہ لے جائیں اور اگر حضورؐ کا کوئی ساتھی مکہ میں رہنا چاہے تو اُسے نہ روکیں ۔
۵ ۔ اگر اہل مکہ میں سے کوئی مدینے چلا جائے تو اُسے واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو اُسے واپسی کی اجازت نہیں ہوگی ۔
۶ ۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کریں فریقین اس کا احترام کریں گے ۔

تو یہ تھا معاہدۂ حُدیبیہ ۔ جب یہ لکھا جا رہا تھا تو قریش کے نمایندے سُہیل کے فرزند ، حضرت ابو جندلؓ [۱۳۸] جو اسلام لا چکے تھے اور قریش کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر رہے تھے ، کسی طرح رسیوں اور بیڑیوں سمیت بھاگ کر حضورؐ کی خدمت میں جا پہنچے لیکن آپؐ نے انہیں شرائطِ معاہدے کے مطابق لوٹا دیا ۔

اس معاہدہ کے بعد مکہ مدینہ کے لوگ آپس میں آزادانہ ملنے لگے اور اہلِ مکہ اہلِ مدینہ کے حُسنِ کردار ، حُسنِ معاملہ اور حسنِ صحبت سے متاثر ہونے لگے ۔ اس سے اسلام کے خلاف نہ صرف عناد کم ہوگیا بلکہ بے شمار دلوں میں اس سیدھے سادے دین کے لیے محبت بھی پیدا ہوگئی ۔ یہ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ جب دو سال بعد حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے تو چند گھنٹوں کے اندر اندر سارا مکہ مسلمان ہوگیا اور غالباً انہی نتائج کی بنا پر اللہ نے اس معاہدے کو فتحِ مبین کہا تھا ۔ (طبقات ۔ ج ۱ ۔ ص ۴۳۵ ۔ تلقیح ص ۳۰ ۔ شبلی ج ۱ ۔ ص ۴۴۷)

۴۴ ۔ **غزوۂ خیبر** خیبر یہود کا ایک قلعہ بند شہر تھا مدینہ سے اندازاً سو میل شمال میں ۔ بنو نضیر ، قُریظہ اور قینقاع کے بیشتر جلاوطن یہود وہیں جا ٹھہرے تھے اور ارد گرد کے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے رہتے تھے ۔ جب ان کی شرارتیں ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو حضورؐ جمادی الاولیٰ ۷ھ [۱۳۹] میں سولہ سو صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے ۔ ان میں دو سو سوار بھی تھے ۔ حضرت سباعؓ [۱۴۰] بن عُرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور تین عَلم تیار کرائے ۔ علَم خاص حضرت علیؓ کو دیا ۔ دُوسرا حضرت حبابؓ [۱۴۱]

---

۱۳۸ ابو جندلؓ کا نام تھا عبداللہ بن سہیل بن عمرو ۔ جسے اسلام لانے کے بعد باپ نے زنجیروں میں باندھ دیا تھا ۔ یہ کسی طرح زنجیریں نکال کر ساحلِ بحر پر چلے گئے اور چند دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل کر قریش کے تجارتی قافلوں کو لُوٹنے لگے ۔ فتح مکہ کے بعد یہ کام چھوڑ دیا ۔ ان کی وفات خلافتِ عمرؓ کے دوران (۱۳ ۔ ۲۳ھ) ہوئی تھی ۔ (استیعاب ۔ ج ۲ ۔ ص ۶۳۲)

۱۳۹ شبلی کہتے ہیں کہ حضورؐ محرم ۷ھ میں روانہ ہوئے تھے ۔ (سیرت ۔ ج ۱ ۔ ص ۴۸۱) ۔ ابن خلدون (ج ۲ ۔ ص ۱۴۹) نے بھی یہی لکھا ہے لیکن قدیم ترین ماخذ طبقات ابن سعد (ج ۱ ۔ ص ۴۴۹) نیز ابن الجوزی (تلقیح ۔ ص ۳۱) نے جمادی الاُولیٰ کو ترجیح دی ہے ۔

۱۴۰ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۰۸

۱۴۱ " " " ۵۱

بن منذر کو اور تیسرا سعدؓ[۱۴۱] بن عبادہ کو۔

زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے، تیر اٹھانے اور دیگر چھوٹے بڑے کاموں کے لیے کچھ مستورات بھی ساتھ ہو لیں۔

خیبر میں کئی قلعے تھے۔ مثلاً سلالم، قموص، ناعم، نطاۃ، زُبیر، قُصارہ، الوطیح، شق اور مَربطہ۔ جن کی حفاظت پر بیس ہزار سپاہی متعین تھے۔ ان میں قموص مضبوط ترین تھا۔ اس کا رئیس مَرحَب بن عنترؔ تھا۔ سب سے پہلے ناعم فتح ہوا۔ پھر کئی دیگر قلعے۔ لیکن قموص فتح نہ ہو سکا۔ حضورؐ نے یکے بعد دیگرے کئی صحابہ کو اس مہم پر بھیجا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: میں کل ایک ایسے شخص کو علَم دوں گا جو ناکام نہیں آئے گا۔ دُوسرے روز حضورؐ نے حضرت علیؓ کو علَم عطا کیا۔ جب حضرت علیؓ قلعہ کے سامنے پہنچے تو مرحب اینٹھتا اور جھُومتا ہُوا سامنے سے نمودار ہُوا اور حضرت علیؓ کی طرف نہایت حقارت سے دیکھ کر کہنے لگا۔ کیا عربوں کی فوج میں تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں تھا؟ حضرت علیؓ نے کہا: ذرا سامنے تو آؤ۔ مرحب نے آگے بڑھ کر تلوار کا وار کیا لیکن حضرت علیؓ اُچھل کر ایک طرف کو ہو گئے اور معاً مرحب کے سر پر وُہ ضرب رسید کی کہ تلوار اس کے خود اور کھوپڑی کو کاٹ کر نچلے جبڑے تک اُتر آئی۔ مرحب گر گیا۔ اس کی فوج بھاگ نکلی اور پُورے بیس دن کے بعد قموص فتح ہو گیا۔ ساتھ ہی اہل خیبر نے ہتھیار پھینک دیئے حضورؐ نے سالانہ نصف زرعی پیداوار کا لگان عائد کر کے انہیں کامل امن و اماں دے دیا۔

خاتمۂ جنگ کے بعد ایک جلاوطن مدینی یہودی سلّام بن مشکم کی بیوی زینب نے آپؐ کو ایک زہر آلود بریاں بکری بھیجی۔ آپؐ نے ذرا سا لقمہ چکھ کر اسے ترک کر دیا، لیکن حضرت بشرؓ[۱۴۲] بن براء چند لقمے کھا گئے اور ہلاک ہو گئے۔ حضورؐ نے جرمِ قتل میں زینب کو قتل کر دیا۔

اس جنگ میں شہداء و مقتولین کی تعداد یہ تھی:

شہداء: ۱۷ مقتولین (یہود): ۹۳

فتح مکمل ہو چکی تو مہاجرینِ حبشہ میں سے بعض حبشہ سے واپس آ گئے اور حضورؐ سے ملنے کے لیے خیبر جا نکلے۔ ان میں حضرت جعفرؓ[۱۴۳] بن ابی طالب بھی شامل تھے۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہُوئے اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ خوشی ہُوئی ہے فتح خیبر سے یا جعفر کے آنے سے۔ (تلقیح ص ۳۱، ابن خلدون ج ۱۔ ص ۱۴۹۔ طبقات ج ۱ ص ۴۴۴۔ شبلی ج ۱ ص ۴۷۵)

۴۱۔ مہمِ فدک فدک وادی القرٰی کی ایک بستی تھی۔ یہ وادی خیبر اور تیماء کے درمیان واقع تھی اور بہت سرسبز و شاداب تھی اس بستی میں یہود آباد تھے۔ جب حضورؐ فتح خیبر کے معاً بعد فدک کی طرف بڑھے تو اُن لوگوں نے لڑے بغیر نصف زرعی پیداوار سالانہ پر صلح کر لی۔ (شبلی ج ۱۔ ص ۵۰۲)

---

[۱۴۱] دیکھیے حاشیہ نمبر ۳۶

[۱۴۲] بشرؓ بن براء بن معرور انصاری، خزرجی قبیلہ بنوسلمہ کے سردار تھے۔ آپؓ نے بدر، اُحد، خندق اور خیبر میں حصہ لیا تھا۔ (استیعاب ج ۱ ص ۶۱)

[۱۴۳] ابوعبداللہ جعفرؓ بن ابی طالب (عبد مناف) بن عبدالمطلب حضرت علی اور عقیل بھائی تھے، حضرت علی سے دس سال بڑے۔ جعفر سے بڑے عقیل تھے اور عقیل سے بڑے طالب۔ سب کی اعمار میں دس دس سال کا فرق تھا۔ آپ کی شہادت مُوتہ کی جنگ (۸ھ) میں ہوئی تھی۔ (ایضاً ص ۸۱)

۴۶۔ مہم تُربہ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ مکہ سے چار رات کے فاصلے پر نجران کی طرف ایک مقام تُربہ میں ہوازن (قبیلہ) کے کچھ شوریدہ سر آمادۂ شر ہیں۔ آپؐ نے شعبان ۷ھ میں حضرت عمرؓ کو تیس صحابہ کے ہمراہ اس سمت بھیجا لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔ (طبقات ج ۱ ص ۴۵۸)

۴۷۔ مہم بنی کلاب شعبان ۷ھ میں حضرت ابوبکرؓ کو نجد کے ایک قبیلے بنو کلاب کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ آپ نے ان کے شریروں کو سزا دی اور چند قیدی پکڑ لائے۔ (تلقیح ص ۳۱)

۴۸۔ مہم بشیرؓ بن سعد شعبان ۷ھ میں حضورؐ نے حضرت بشیرؓ[۱۴۵] بن سعد کو تیس صحابہ کے ہمراہ فدک کے ایک قبیلہ بنو مُرّہ کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ چونکہ وُہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے انہوں نے اس دستے کو بہت نقصان پہنچایا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد کو سخت زخمی کر دیا اور انہیں ان کے ساتھی اٹھا کر واپس لائے۔

(طبقات۔ ج ۱ ۔ ص ۴۶۰)

۴۹۔ مہم مَیْفعہ مَیْفَعَہ مدینے سے ۹۶ میل دُور نجد میں ایک مقام تھا جہاں رمضان ۷ھ میں دو قبائل ، بنو عُوال اور بنو عبد بن ثعلبہ کے چند شوریدہ سر شرارت کے لیے جمع ہو گئے۔ حضورؐ نے حضرت غالبؓ[۱۴۶] بن عبداللہ کو ایک سو تیس آدمی دے کر اُس طرف بھیجا۔ وہاں جنگ ہُوئی اور قبائل کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے دوران جب حضرت اُسامہؓ[۱۴۷] بن زید ایک کافر اُسامہ بن نہیک بن مرداس کی طرف تلوار لے کر بڑھے تو اس نے بلند آواز سے کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ۔ لیکن حضرت اُسامہؓ نے اُسے مار ڈالا۔ جب یہ خبر حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ ناراض ہُوئے اور فرمایا:

هَلْ شَقَقْتَ قَلْبَهٗ ۔ (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟)

اس پر اسامہؓ نے توبہ کی اور آیندہ محتاط رہنے کا عہد کیا۔ (تلقیح ص ۳۱ ۔ طبقات ج ۱ ص ۴۶۰)

۵۰۔ مہم الجناب الجناب ایک مقام ہے خیبر و وادی القُریٰ کے درمیان (معجم ۔ ج ۳ ۔ ص ۱۴۱)۔ شوال ۷ھ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ عُیَیْنہؓ[۱۴۸] بن حصن، قبیلۂ غطفان کی ایک جمعیت کے ساتھ الجناب میں مقیم ہے۔

---

۱۴۵ بشیرؓ بن سعد بن ثعلبہ بن خلاص بن زید الانصاری ہجرت سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ بدر، اُحد اور بعد کے غزوات میں شامل ہُوئے۔ آپ کی وفات خلافتِ ابوبکرؓ کے عہد (۱۱۔ ۱۳ھ) میں ہُوئی تھی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۶۲)

۱۴۶ غالبؓ بن عبداللہ بن مسعر اللیثی حضورؐ کے قابلِ اعتماد صحابی تھے۔ انہیں حضورؐ نے کئی مہمات کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۱۶)

۱۴۷ اُسامہ بن زید بن حارثہ بن شراحیل بن کعب الکلبی حضورؐ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کے بیٹے تھے حضورؐ کی وفات کے وقت یہ تقریباً بیس سال کے تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد وادی القُریٰ میں رہنے لگے۔ کافی عرصے کے بعد مدینے میں آئے اور ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۹)

۱۴۸ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲۱۔ یہ وُہی عُیَیْنہ ہے جو ایک مرتبہ حضورؐ کی اُونٹنیاں چرا کر لے گیا تھا۔

اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپؐ نے حضرت بشیرؓ[۱۴۹] بن سعد انصاری کو تین سو آدمی دے کر اُس طرف بھیجا۔ وہ لوگ انہیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ انہیں صرف دو آدمی اور چند اونٹ ملے جنہیں یہ پکڑ لائے۔ (طبقات، ج ۱، ص ۴۶۱)

۵۱۔ مہم ابن ابی العوجاء ذوالحجہ ۷ھ میں بنو سُلیم کی ایک جمعیت کو منتشر کرنے کے لیے حضورؐ نے حضرت ابن ابی العوجاءؓ[۱۵۰] کو پچاس آدمیوں کے ہمراہ بھیجا۔ وہاں پہنچے تو قبائلیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان میں سے اکثر قتل ہو گئے اور ابن ابی العوجاء سخت زخمی ہُوئے (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۶۵)

۵۲۔ مہم کدید کدید[۱۵۱] حجاز میں ایک مقام ہے جہاں صفر ۸ھ میں بنو ملوّح کے چند آدمی برائے شرارت جمع ہوگئے تھے حضورؐ نے حضرت غالبؓ[۱۵۲] بن عبداللہ لیثی کو دس صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ان پر حملہ کیا اور اُن کے مویشی ہانک لائے۔ (طبقات ج ۱ ص ۴۶۷)

۵۳۔ مہم بنو مرّہ ہم عنوان نمبر ۴۴ میں بیان کر چکے ہیں کہ شعبان ۷ھ میں فدک کے بنو مرّہ نے حضرت بشیرؓ[۱۵۳] بن سعد انصاری اور اُن کے ساتھیوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا انہیں سزا دینے کے لیے حضورؐ نے صفر ۸ھ میں حضرت غالبؓ بن عبداللہ لیثی کو دو سو صحابہ کے ہمراہ اُس طرف بھیجا۔ تصادم میں اُن کے چند آدمی مارے گئے اور یہ کچھ مال غنیمت لے کر واپس آ گئے۔ (ایضاً۔ ص ۴۶۸)

۵۴۔ مہم سیّ سیّ[۱۵۴] ایک کنویں یا چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے پانچ منزل دور۔ مکہ و بصرہ کی راہ پر نجد میں واقع تھا۔ وہاں قبیلۂ ہوازن کے چند آدمی فتنہ کاری کے لیے جمع ہو گئے۔ حضورؐ نے حضرت شجاعؓ[۱۵۵] بن ابی وہب الاسدی کو چوبیس آدمی دے کر بھیجا۔ وہ لوگ مقابلے میں نہ آئے اور یہ غنیمت لے کر لوٹ آئے۔ (ایضاً ص ۴۶۸)

۱۴۹؎ دیکھئے حاشیہ نمبر ۱۴۵

۱۵۰؎ ابن ابی العوجاءؓ کا ذکر صاحبِ استیعاب نے نہیں کیا۔ ابن الجوزی نے صرف اتنا کیا ہے (تلقیح، ص ۲۲) اسمہٗ اخرم کہ اُن کا نام اخرم تھا اور اخرم کے متعلق استیعاب (ج ۱، ص ۴۸) نے اتنا ہی لکھا ہے کہ یہ حضورؐ کا شاہ سوار تھا۔

۱۵۱؎ یاقوت، معجم البلدان۔ ج ۷۔ ص ۲۲۴

۱۵۲؎ دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۴۶

۱۵۳؎ 〃 〃 〃 ۱۴۵

۱۵۴؎ یاقوت، معجم البلدان۔ ج ۵۔ ص ۲۰۲

۱۵۵؎ شجاعؓ بن ابی وہب بن ربیعہ بن اسد بن صہیب الاسدی ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے۔ تمام غزوات میں شامل ہوئے حبشہ کی طرف بھی ہجرت کی تھی۔ جنگِ یمامہ میں شہادت پائی۔

(استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۹۳)

۵۵۔ مہم کعبؓ بن عُمیر حضورؐ نے ربیع الاول ۸ھ میں حضرت کعبؓ[156] بن عُمیر غفاری کو پندرہ صحابہ کے ہمراہ ذات اطلاح[157] میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ اُن لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا اور سب کو مار ڈالا۔ صرف ایک زخمی کسی طرح مدینے میں واپس پہنچا۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۶۹)

۵۶۔ مہم مُوتہ مُوتہ جنوبی اردن کا ایک سرحدی شہر ہے۔ بات یوں ہوئی کہ حضورؐ نے جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حضرت حارثؓ[158] بن عُمیر ازدی کو ایک تبلیغی خط دے کر بُصریٰ (شام) کے والی کی طرف بھیجا۔ جب قاصد موتہ میں پہنچا تو اسے قبیلۂ غسان کے سردار شُرحبیل بن عمرو الغسانی نے قتل کر دیا۔ اِس پر حضورؐ نے ایک مہم ترتیب دی۔ جو تین ہزار غازیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت زیدؓ[159] بن حارثہ کو امیر مقرر کیا اور ہدایت فرمائی کہ اگر زید شہید ہو جائے تو حضرت جعفرؓ[160] بن ابی طالب اور اُن کے بعد حضرت عبد اللہؓ[161] بن رواحہ امیر ہوں۔ اگر یہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان خود ہی اپنا امیر منتخب کریں۔ جب یہ مہم وہاں پہنچی تو بہت سے صحابہ اور تینوں امیر شہید ہو گئے اور جب باقیماندہ لوگ مدینہ میں واپس آئے تو لوگوں نے اُن پر مٹی اچھالی۔ (تلقیح۔ ص ۳۲)

۵۷۔ مہم ذات السلاسل مدینہ میں یہ خبر آئی کہ وادی القریٰ میں، جو مدینہ سے دس یوم کی مسافت پر واقع تھی۔ بنو قضاعہ کے کچھ لوگ فتنہ پردازی کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ حضورؐ نے جمادی الآخرہ ۸ھ میں حضرت عمروؓ[162] بن عاص کو تین سو صحابہ کے ہمراہ اس سمت بھیجا وہاں پہنچ کر انہوں نے اطلاع دی کہ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کمک بھیجی جائے۔ آنحضرتؐ نے حضرت ابو عبیدہؓ[163] بن جراح کو دو سو آدمی دے کر ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ لیا تھا تاکہ جم کر لڑ سکیں اور بھاگنے کی راہیں بند ہو جائیں۔ اسی بنا پر اس مہم کو ذات السلاسل (زنجیروں والی) کہتے ہیں۔ ان تمام انتظامات کے باوجود قبائل کو شکست ہوئی۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۴۷۲۔ تلقیح۔ ص ۳۲)

---

۱۵۶ کعبؓ بن عُمیر غفاری اعاظم صحابہ میں سے تھے آپ کو حضورؐ نے کئی مہمات پر بھیجا تھا۔ آپ ذات اطلاح کی مہم (۸ھ) میں شہید ہو گئے تھے۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۲۱۷)

۱۵۷ ذات اطلاح ایک موضع کا نام ہے وادی القریٰ کے قریب۔ (یاقوت۔ معجم ج ۱۔ ص ۲۸۷)

۱۵۸ حضرت حارثؓ بن عُمیر ازدی کو حضورؐ نے اپنا قاصد بنا کر والیٔ بُصریٰ کی طرف بھیجا تھا۔ جب یہ موتہ میں پہنچے تو قبیلۂ غسان کے سردار شُرحبیل نے انہیں ایک سرائے میں ٹھہرایا اور بعد ازاں انہیں قتل کر دیا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۱۱۴)

۱۵۹ دیکھیے حاشیہ نمبر ۴۹

۱۶۰ 〃 〃 〃 ۱۴۴

۱۶۱ 〃 〃 〃 ۱۰۵

۱۶۲ 〃 〃 〃 ۱۴

۱۶۳ 〃 〃 〃 ۱۲۵

۵۸ - مہم خَبَط خَبَط کے دو مفہوم ہیں ۔ اوّل : درختوں کے سُوکھے پتّے ۔ دوم : مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر شمال مغرب کی طرف ساحل کے قریب قبیلۂ جُہَینَہ کا ایک موضع ۔

رجب ۸ھ میں حضورؐ نے حضرت عبیدہؓ بن جرّاح کو مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ساحل کی طرف بھیجا ۔ جہاں سے جُہَینَہ کی شرارتوں کی اطلاعات آرہی تھیں ۔ اتفاقاً سفر میں ان کا راشن ختم ہو گیا اور انہیں سُوکھے پتوں پر گزارہ کرنا پڑا ۔ جب یہ ساحل پر پہنچے تو سمندر کی لہر میں لپٹی ہُوئی ایک بڑی مچھلی خشکی پر رہ گئی اور انہوں نے اسے گھیر کو پکڑ لیا ۔ پھر جہینہ کا رُخ کیا ۔ وہ لوگ بھاگ گئے اور صحابہ واپس آ گئے ۔ (طبقات ج ۱ ۔ ص ۲۷۳)

۵۹ - مہم خُضُرہ نجد میں قبیلۂ بنُو محارب کے ایک موضع کا نام خُضرہ ہے ۔ شعبان ۸ھ میں حضورؐ نے بنُو محارب کی گوشمالی کے لیے حضرت ابوقتادہؓ[۴۳] بن ربعی انصاری کو خُضرہ کی طرف بھیجا ۔ انہوں نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی ۔ صحابہ اتنا مالِ غنیمت ساتھ لائے کہ خُمس نکالنے کے بعد بھی ہر ایک کو بارہ بارہ اُونٹ ملے ۔ (ایضاً ص ۲۷۴)

۶۰ - فتح مکہ بنوخزاعہ مکہ و مدینہ کے درمیان بدر کے قریب آباد تھے اور مسلمانوں کے حلیف تھے ۔ معاہدہ حدیبیہ کے مطابق قبائل عرب کو پوری پوری آزادی تھی کہ جس کے ساتھ چاہیں ، معاہدہ کریں ۔ فریقین اس کا احترام کریں گے ۔ لیکن قریش نے اس شرط کو توڑ دیا اور نجد کے ایک قبیلے بنوبکر کے ساتھ مل کر حضورؐ کے حلیف بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا ۔ ان لوگوں نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی ۔ لیکن حملہ آوروں نے انہیں وہاں بھی معاف نہ کیا ۔ اس پر خزاعہ کے چند آدمی حضورؐ کے ہاں مدینہ میں گئے ۔ حضورؐ نے بات سُن کر قریش کو پیغام بھیجا کہ مقتولوں کا خون بہا ادا کرو لیکن قریش نے انکار کر دیا ۔ اس پر حضورؐ ۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے ۔ جب مکہ کے قریب مرّ الظہران میں پڑاؤ ڈالا تو ابوسفیان رات کے وقت چند دیگر آدمیوں کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے مرّ الظہران میں گیا ۔ کسی فوجی نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر حضورؐ کے ہاں لے گیا ۔ وہاں پہنچ کر ابُوسفیان فوراً اسلام لے آیا ۔ ۲۰ رمضان کو صبح کے وقت لشکرِ اسلام مکہ کی طرف روانہ ہوا ۔ ہر قبیلے کا علم جدا تھا ۔ علمِ نبویؐ حضرت زُبیرؓ بن عوّام کے پاس تھا ۔ حسب الحکم مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہُوئے ۔ آں حضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا یا ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا تاہم خالد بن ولید ایک دستہ لے کر مقابلے میں آ گیا ۔ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر جلد بھاگ نکلا ۔ صحابہ میں سے تین شہید ہوئے تھوڑی دیر میں سارے شہر نے اطاعت قبول کر لی ۔ حضورؐ نے عام معافی کا اعلان کر دیا ۔ پھر اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا ۔ اُس وقت حرم میں ۳۶۰ بُت رکھے ہُوئے تھے ۔ آپؐ جب کسی بُت کے پاس سے گزرتے تو عصا سے اُسے ٹھوکا دے کر پڑھتے : قُل جاء الحق وزھق الباطل ۔ ساتھ ہی ایک غیبی ہاتھ کی ضرب سے وہ اُوندھا پڑ جاتا ۔ جب ظُہر کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دی ۔ بقول ابنِ سعد (ج ۱ ۔ ص ۲۷۸) یہ کعبہ میں پہلی اذان تھی ۔ پھر شہر میں منادی کرائی کہ ہر شخص اپنے گھر کے بتوں کو توڑ ڈالے ۔ ساتھ ہی گرد و نواح کے اصنام مثلاً عزّیٰ ، مناۃ ، لات ، سواع وغیرہ کو توڑنے کے لیے مہمات بھیجیں ۔

---

[۴۳] ابوقتادہؓ بن ربعی بن بلدمہ انصاری تمام غزوات میں موجود تھے ۔ ۵۴ھ میں وفات پائی ۔ (استیعاب ۔ ج ۲ ۔ ص ۶۸۴)

مکہ ۲۰ رمضان ۸ھ کو فتح ہوا تھا۔ بعد از فتح حضورؐ پندرہ دن اور وہاں رہے۔ پھر حضرت عتابؓ[۱۶۵] بن اُسید کو عامل مکہ بنا کر واپس تشریف لے گئے۔ (طبقات ج ۱۔ ص ۴۴۴۔ تلقیح ص ۲۳۔ شبلی ج ۱۔ ص ۵۰۹)

۶۱۔ عُزّیٰ کی تباہی عزّیٰ دراصل نخلہ[۱۶۶] میں ایک درخت کا نام تھا جس کے نیچے ایک بُت رکھا ہُوا تھا جو لات و منات کے بعد تراشا گیا تھا۔ اس درخت کی مناسبت سے یہ بھی عُزّیٰ کہلانے لگا تھا۔ فتح مکہ سے پانچ دن بعد حضورؐ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو تیس سوار دے کر ہدایت فرمائی کہ وہ اس بُت کو توڑ آئے اور آپ نے تعمیل کی۔ (تلقیح۔ ص ۲۴، طبقات ص ۴۴۸، اصفہانی: کتاب الاغانی ج ۲ ص ۱۲)

۶۲۔ سُواع کی تباہی سُواع۔ قبیلہ ہُذیل کا بُت تھا جو مکہ سے تین میل دور ایک مقام رُہاط میں نصب تھا۔ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد حضرت عمروؓ بن عاص کو حکم دیا کہ وہ اس بُت کو گرا دیں اور انہوں نے تعمیل کی۔ (تلقیح۔ ص ۲۴)

۶۳۔ مناۃ کی تباہی مناۃ۔ اوس، خزرج اور غسان کا صنم تھا جو مکہ کے شمال میں ایک مقام مُشلّل میں نصب تھا۔ حضورؐ نے فتح مکہ کے بعد حضرت سعدؓ[۱۶۷] بن زید اشہلی کو حکم دیا کہ وہ اُسے جا کر توڑ آئے۔ سعد نے تعمیل کی۔ سعدؓ کے ہمراہ بیس سوار تھے۔ (تلقیح ص ۲۴)

۶۴۔ غزوۂ حُنین حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے تین دن کی مسافت پر شمال میں واقع ہے۔ اس کے نواح میں ثقیف و ہوازن آباد تھے۔ جب حضورؐ ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار مجاہدین (ان میں دس ہزار اہلِ مدینہ تھے اور دو ہزار اہلِ مکہ) کے ہمراہ مکہ سے روانہ ہوئے تو ۱۰ شوال کو وادیٔ حنین میں پہنچے وہاں ثقیف و ہوازن ہزاروں کی تعداد[۱۶۸] میں پہلے ہی سے مقیم تھے۔ اُن کی قیادت مالکؓ[۱۶۹] بن عوف کے ہاتھ میں تھی۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر تمام موزوں مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے گھاٹیوں میں جا بجا جما دیئے تھے۔ جب ۱۱ شوال کی صبح طلوع ہوئی اور صحابہ کی صفیں دشمن کی طرف بڑھیں تو سامنے سے ہزاروں جوان ٹوٹ پڑے۔ تیروں کا مینہ برسنے لگا اور یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ صحابہ اِدھر اُدھر

---

[۱۶۵] عتابؓ بن اُسید بن ابی العیص بن اُمیہ بن عبد شمس القرشی فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے۔ آپ کو حضورؐ نے مکہ سے جاتے وقت عاملِ مکہ بنا دیا تھا۔ عتابؓ اس منصب پر حضورؐ کی رحلت تک فائز رہے اور ۱۳ھ میں وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۰۸)

[۱۶۶] مکہ سے دس میل کے فاصلے پر ایک باغ جو بُستانِ عامر کے نام سے مشہور تھا۔ (معجم۔ ج ۸۔ "نخلہ")

[۱۶۷] سعدؓ بن زید بن مالک بن عبید بن کعب بن عبدالاشہل انصاری اشہلی بدر اور بعد کے غزوات میں شامل تھے۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۰۳)

[۱۶۸] واٹ (ص ۷۰) لکھتا ہے کہ قبائلیوں کی تعداد بیس ہزار تھی۔

[۱۶۹] مالکؓ بن عوف بن سعد بن ربیعہ بن یربوع النصری حنین کی جنگ کے فوراً بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضورؐ نے انہیں بھی مالِ غنیمت سے ایک سو اُونٹ دیئے تھے۔ یہ شاعر بھی تھے اور حضورؐ نے انہیں اپنی قوم کا سردار بنا دیا تھا۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۲۴۷)

بھاگ نکلے اور حضورؐ کے پاس صرف سات صحابہ رہ گئے یعنی حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضلؓ[171] بن عباس، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت اُسامہؓ[172] بن زید اور حضرت ربیعہؓ[173] بن حارث بن عبد المطلب۔ حضورؐ نے دائیں اور بائیں طرف دیکھ کر زور سے آواز دی یامعشر الانصار انا ابنُ عبد المُطّلب۔ انا النبی لاکذب۔ (اے انصار میں عبد المطلب کا فرزند اور بلاریب نبی ہُوں)، حضرت عباسؓ نے بھی لوگوں کو آواز دی۔ چنانچہ وہ سب لوٹ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس شجاعت و بے جگری سے لڑے کہ دشمن گھبرا کر بھاگ نکلا اور ستر لاشیں میدان میں چھوڑ گیا۔ صحابہ میں سے صرف چار نے شہادت پائی۔ اسیروں کی تعداد ۶ ہزار تک جا پہنچی۔ مالِ غنیمت میں ۲۴ ہزار اُونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی آئی۔ حضورؐ نے تالیفِ قلوب کے لیے سردارانِ قریش پر خاص نوازش کی۔ اُبوسفیان کو ۳۰۰، حکیم بن حزام کو ۲۰۰، صفوان بن اُمیہ اور چند دیگر کو ایک ایک سو اُونٹ دیئے۔ دوسری طرف انصار میں سے ہر ایک کو چار چار اونٹ ملے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا۔ جب یہ اطلاع حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ نے سب انصار کو طلب فرمایا۔ ایک نہایت موثر اور دل ہلا دینے والا خطبہ دینے کے بعد پُوچھا:

"اے انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اُونٹ اور بکریاں لے کر گھر جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر واپس پہنچو۔"

انصار بے اختیار بول اُٹھے کہ ہم اس تقسیم پر بہت خوش ہیں اور اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے اُن کی ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔

اس کے بعد قبائل کا ایک وفد قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا اور رحمۃٌ للعالمینؐ نے سب کو چھوڑ دیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(تلقیح۔ ص ، ۔ طبقات ج ۱۔ ص ۴۸۸۔ شبلی۔ ج ۱۔ ص ۵۳۰۔ واٹ ص ۷۰)

۶۵۔ غزوۂ طائف طائف۔ مکّہ کے مشرق میں چالیس میل دُور ایک سبز و شاداب مقام ہے جہاں وادیٔ حنین کے جھگڑے جمع ہو گئے تھے۔ حضورؐ نے حُنین سے فارغ ہو کر شوّال ہی میں طائف کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ قلعہ بند ہو کر چھتوں پر سے تیر برسانے لگے۔ جن سے بارہ صحابہ شہید ہو گئے۔ محاصرہ اٹھارہ دن جاری رہا چونکہ طویل سفر اور ذومہمات (کعبہ و حنین) کی وجہ سے صحابہ اُکتا گئے تھے۔ اس لیے حضورؐ نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چل دیئے۔ دو ماہ اور سولہ دن کے بعد آں حضرتؐ مدینہ میں تشریف لائے۔ (تلقیح ص ۳۵)

۶۶۔ مُہم بنو تمیم تمیم عرب کا ایک اہم قبیلہ تھا جو خلیج ایران کے مغربی ساحل پر کُوَیت کے قریب آباد تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ آپؐ نے حضرت عُیینہؓ[174] بن حصن الفزاری کو پچاس سواروں کے ہمراہ

---

[170] دیکھیے حاشیہ نمبر ۵۳

[171] فضلؓ بن عباس بن عبد المطلب حنین اور آخری حج میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ وفات ۱۳ھ یا ۱۸ھ میں ہوئی۔ (استیعاب ج ۲ ص ۵۲۱)

[172] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۴۷

[173] ربیعہؓ بن حارث بن عبد المطلب، حضرت عباسؓ کے بھتیجے تھے۔ فاروقِ اعظمؓ کی خلافت کے آخری سال یعنی ۲۳ھ میں وفات پائی۔ فتح مکّہ کے دن جب حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے خُون آج سے معاف ہیں تو آپؐ نے ربیعہ بن حارث کی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ ربیعہؓ کے بیٹے تمام (یا ایاس) کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ (استیعاب۔ ج ۱۔ ص ۱۸۰)۔ [174] دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۲۱۔

جو خالص اعراب تھے اور اُن میں کوئی مہاجر یا انصاری شامل نہ تھا اس سمت روانہ کیا۔ وہاں سے یہ گیارہ مرد، گیارہ عورتیں اور تیس بچے گرفتار کر لائے۔ پیچھے پیچھے رؤسائے تمیم کا ایک وفد بھی آن پہنچا۔ حضورؐ نے اُن کی درخواست منظور فرما کر تمام قیدی چھوڑ دیئے۔ یہ واقعہ محرم ۹ھ میں پیش آیا تھا۔ (طبقات۔ ج ۱ ص ۴۹۹)

۶۷۔ **مہم قُطبہ بن عامر** مدینہ میں اطلاع آئی کہ بنو خثعم جو مکہ کے شمال میں دو یوم کی مسافت پر وادی بیشہ کے قریب رہتے تھے آمادۂ فساد ہیں۔ حضورؐ نے صفر ۹ھ میں حضرت قُطبہؓ[۱۷۵] بن عامر کو بیس آدمی دے کر اس طرف روانہ کیا۔ وہاں شدید مقابلہ ہُوا اور حضرت قُطبہؓ کافی مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔ (تلقیح ص ۳۵)

۶۸۔ **مہم بنی کلاب** بنو کلاب نجد میں رہتے تھے۔ ان کے متعلق خبر ملی کہ یہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے ربیع الاوّل ۹ھ میں حضرت ضحاکؓ[۱۷۶] بن سفیان کو اُن کی طرف بھیجا اور انہیں سخت شکست ہُوئی۔ (طبقات ج ۱ ص ۵۰۰)

۶۹۔ **مہم علقمہ** ربیع الآخر ۹ھ میں حبشہ کے کچھ آدمی جدہ میں آکر قانون شکنی کرنے لگے۔ حضورؐ نے علقمہؓ بن مُجزّز المُدلجی کو تین سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر اس سمت بھیجا لیکن وہ لوگ انہیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ (طبقات۔ ج ۱۔ ص ۵۰۱)

۷۰۔ **مہم الفُلس** الفُلس قبیلہ طے کا بُت تھا اور یہ قبیلہ مدینہ سے اندازاً سو میل شمال مشرق میں آباد تھا۔ حضورؐ نے ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؓ کو ڈیڑھ سو سواروں کے ہمراہ اس طرف بھیجا۔ یہ بُت مشہور حاتم (کریم و فیّاض) کے محلے میں نصب تھا۔ ان لوگوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ غنیمت میں کچھ مویشی اور قیدی آئے۔ ان میں حاتم کی بیٹی بھی شامل تھی۔ روایات میں ہے کہ جب حاتم کی بیٹی حضورؐ کے سامنے لائی گئی تو آپؐ نے اس کی طرف اپنی ردا پھینکی تاکہ وہ معزز خواتین کی طرح سارے جسم کو ڈھانپ سکے۔ غنیمت میں تین تلواریں بھی تھیں جو حضورؐ نے لے لیں۔ یعنی رُسُوب، مِخذَم اور یمانی۔ اور آلِ حاتم کو رہا کر دیا۔ (تلقیح۔ ص ۳۵، طبقات۔ ج ۱۔ ص ۵۰۲)

۷۱۔ **غزوۂ تبوک** تبوک۔ شمالی عرب کا ایک شہر ہے۔ مدینہ سے ساڑھے تین سو میل دُور اور خلیج عقبہ سے ایک سو میل مشرق میں۔ جب شامی تاجروں نے مدینے میں آکر یہ بتایا کہ رُومی فوجیں عرب کی شمالی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں تو حضورؐ نے جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا۔ چونکہ سفر بہت طویل اور موسم گرم تھا اس لیے آپؐ نے ہر شخص سے کہا کہ وہ سواری کا انتظام کرے۔ ابن خلدون (ج ۱۔ ص ۱۷۷) لکھتا ہے کہ اس غزوہ میں حضرت عثمانؓ نے سب سے زیادہ مال واسباب دیا تھا۔

---

۱۷۵ قُطبہؓ بن عامر بن حدیدۃ بن عمرو بن سواد انصاری عقبۂ اُولیٰ و ثانیہ نیز تمام غزوات میں شامل ہُوئے۔ اُحد میں نو زخم کھائے تھے۔ ۲۳ھ اور ۳۵ھ کے درمیان وفات پائی۔ (استیعاب۔ ج ۲۔ ص ۵۳۲)

۱۷۶ ضحاکؓ بن سُفیان بن عوف بن کعب بن ابی بکر بن کلاب الکلبی شجاعانِ عرب میں شمار ہوتے تھے اور محفل میں حضورؐ کے سر پر تلوار سونت کر کھڑے ہوتے تھے۔ (استیعاب ج ۱۔ ص ۳۲۳)

آپ نے ایک ہزار دینار، ایک سو گھوڑے اور نو سو اونٹ پیش کیے تھے۔ حضورؐ ماہ رجب ۹ھ میں تیس ہزار مجاہدین اور دس ہزار گھوڑوں کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ تیرہ چودہ دن کے بعد تبوک میں پہنچے وہاں بیس دن رہے لیکن رومی فوج سامنے نہ آئی اس لیے آپ واپس چل پڑے اور دو ماہ کے بعد رمضان ۹ھ میں مدینے پہنچ گئے۔ (تلقیح ص ۳۶ - ابن سعد ج ا۔ ص ۵۰۲)

۷۲۔ مہم یمن حضورؐ نے حضرت علیؓ کو تین سو سواروں کے ہمراہ یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا اور ہدایت کی کہ جب تک وہ لوگ تم پر حملہ آور نہ ہوں تم اُن سے جنگ نہ کرو۔ وہاں پہنچ کر جب حضرت علیؓ نے اسلام پیش کیا تو انہوں نے تیر اور پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ اس پر جنگ چھڑ گئی اور بیس یمنی ہلاک ہو گئے لیکن اس واقعہ کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

(ابن سعد، ج ا، ص ۵۰۰)

۷۳۔ آخری حج حضورؐ ذی قعدہ ۱۰ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ہمراہ تمام ازواج مطہرات اور دیگر لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ کہتے ہیں کہ اس حج میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی شامل ہوئے تھے۔

"پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ صیہون کے پہاڑ پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار شخص ہیں۔" (مکاشفہ یوحنا۔ $\frac{14}{1-5}$)

آپ نے عرفات میں وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ فرمایا:

"اے لوگو سُنو! شاید میں اس سال کے بعد اس مقام پر آپ سے پھر نہ مل سکوں۔ جس طرح آج کا دن، یہ شہر اور یہ مہینہ مقدس ہے اسی طرح تمہارے لیے ایک دُوسرے کی جان و مال مقدس ہے۔ تم میں سے جس کے پاس امانت ہے اسے ادا کرے۔ قرضوں پر سُود نہ لو۔ عہد جاہلیت کے مقتولوں کا سلسلۂ انتقام آج سے ختم کیا جاتا ہے۔ اے لوگو! سرزمین عرب میں شیطان اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ تم پر تمہاری بیویوں کے اور بیویوں پر کچھ تمہارے حقوق ہیں جنہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ یاد رکھو کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اللہ کے ہاں بزرگ تر وُہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اے لوگو! کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا، آواز آئی کہ ہاں۔ فرمایا کہ اس پیغام کو حاضر غائب تک پہنچا دے۔" (خلاصہ ابن خلدون ج ا ص ۲۰۱)

حضورؐ ۱۰ ذی الحجہ کو مکہ سے واپس چلے اور دس بارہ یوم کے بعد مدینہ میں تشریف لے آئے۔ (تلقیح۔ ص ۳۶ - ابن سعد ج ا، ص ۵۰۹)

۷۴۔ مہم اُسامہؓ حضورؐ کو اطلاع ملی کہ شمالی سرحد پر رومی مصروف شرارت ہیں۔ آپ نے حضرت اُسامہؓ بن زید کو بلایا اور تین ہزار مجاہدین کے ہمراہ ۱۰ ربیع الاوّل ۱۱ھ کو روم کی طرف روانہ کیا۔ آپ مدینہ کے باہر جُرف میں آخری جائزے کے لیے ٹھہرے۔ ۱۲ ربیع الاوّل کو آگے بڑھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضورؐ کی وفات کی خبر ملی۔ لشکر واپس آ گیا۔ لیکن جونہی حضرت ابوبکرؓ بیعت وغیرہ سے فارغ ہو چکے تو آپؓ نے اُسامہؓ کو اپنی مہم پر دوبارہ جانے کا حکم دے دیا۔ آپ یکم ربیع الآخر کو

روانہ ہوئے۔ بیس دن کے بعد منزل (موتہ) پر پہنچے۔ خبر یوں کی گوشمالی کی۔ پھر واپس چل پڑے اور پندرہ دن کے بعد مدینے پہنچ گئے۔
(ابن سعد ج ۱، ص ۵۲۴، تلقیح ص ۳۷)

غیر اہم مہمات

حضورؐ کی تمام مہمات کی تعداد کیا تھی؟ اس میں سیرت نگاروں کا اختلاف ہے مثلاً:

و ۔ البلاذری (فتوح البلدان) ۱۶ بتاتا ہے۔
ب ۔ قاضی سلیمان منصورپوری (رحمۃ للعالمینؐ) کے ہاں یہ تعداد ۲۰ ہے۔
ج ۔ شبلی (سیرت النبیؐ) 〃 〃 〃 〃 ۳۵ 〃 ۔
د ۔ ابن خلدون (تاریخ) 〃 〃 〃 〃 ۳۶ 〃 ۔
ہ ۔ طبری (〃) 〃 〃 〃 〃 ۳۹ 〃 ۔
و ۔ ابن سعد (طبقات) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔
ز ۔ ابن الجوزی (تلقیح) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔
ح ۔ واٹ (محمد ایٹ مدینہ) 〃 〃 〃 〃 ۴۸ 〃 ۔

میں نے اس مقالے میں صرف ۳۴، کا ذکر کیا ہے اور ۱۴ اس بنا پر چھوڑ دی ہیں کہ بعض تشنۂ تفصیل تھیں اور بعض کے راوی ضعیف تھے۔

ان کا جدول یہ ہے:

شمار	سال	ماہ	منزل	امیر مہم	مجاہدین کی تعداد	کس کے خلاف
۱	۲ ھ	رمضان	•	عُمیرؓ	۱	عصماء ۔ دشمنِ رسولؐ پر حملہ
۲	〃	شوال	•	سالمؓ	۱	ابوعفک ۔ 〃 〃 〃 〃
۳	۳ ھ	ربیع الاوّل	•	محمدؓ بن مسلمہ	۵	کعب بن اشرف ۔ دشمنِ رسولؐ پر حملہ
۴	〃	شوال	حمراء الاسد	حضورؐ	۷۰۰	قریش
۵	۴ ھ	ذی الحجہ	•	عبداللہؓ بن اُنیس	۵	ابو رافع ۔ دشمنِ اسلام پر حملہ
۶	۶ ھ	ربیع الآخر	ذوالقصہ (نجد)	ابوعبیدہؓ بن جراح	۴۰	بنو ثعلبہ
۷	〃	رجب	وادی القُریٰ	زیدؓ بن حارثہ	•	بنو فزارہ
	〃	رمضان	•	〃	•	اُمِّ قرفہ
۹	۷ ھ	محرم	نجد	ابانؓ بن سعید	•	•
۱۰	۷ ھ	شعبان	فدک	غالبؓ بن عبداللہ	۲۰۰	بنو مُرّہ
۱۱	۸ ھ	ربیع الاوّل	ذات اطلاح (شام)	کعبؓ غفاری	۱۵	قضاعہ

۱۲	۸ ھ	رمضان	بطن اِضم (مکہ و یمامہ کے درمیان ایک مقام)	ابو قتادہؓ الربعی	۸	۰
۱۳	″	″	یلملم (مکہ کے قریب)	ہشامؓ بن عاص	۲۰۰	۰
۱۴	۹ ھ	شوال	دُومہ	خالدؓ بن ولید	۴۲۰	رکندہ
						میزان اعظم : ۸۸

حرفِ آخر

عرب کے تین طرف (مشرق، مغرب اور جنوب) سمندر تھا اور شمال میں خشکی۔ حضورؐ کی تمام تر توجہ شمالی علاقوں کی طرف تھی۔ کیونکہ :

ا۔ مدینہ کی تجارت شام سے ہوتی تھی اور اس کے تجارتی قافلے شمالی قبائل کے مساکن سے گزر کر آگے جاتے تھے۔ اس لیے ان قبائل کی تسخیر کے لیے حضورؐ نے بار بار شمال کی طرف مہمات بھیجیں۔ موتہ، تبوک، دومۃ الجندل، خیبر اور فدک کی مہمات کا ذکر ہو چکا ہے آپؐ نے شمالی قبائل کی طرف قاصد بھی بھیجے تھے۔ دِحیہ بن خلیفہ کلبی والیٔ بُصریٰ کی طرف گیا تھا۔ شُجاع بن وَہب اَسدی، غسان کے ایک سردار مُنذر بن حارث کی طرف اور ایک دیگر صحابی حضورؐ کا خط لے کر غسان کے والی جَبلہ بن اَیہم کے ہاں گئے تھے۔ آپ نے بعض شمالی قبائل سے مُعاہدے بھی کیے تھے۔ مثلاً جُہینہ، فزارہ، اَیلہ اور عُذرہ وغیرہ۔

حضورؐ کی اسی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ فتح مکہ کی مہم میں سُلیم، غفار، مُزَینہ، جُہینہ، ضمرہ، لَیث، سعد بن بکر اور اَشجع جیسے اہم اور معزز قبائل کے دستے بھی شامل ہُوئے تھے۔

حضورؐ کو علم تھا کہ کون سا قبیلہ کس کا دشمن ہے۔ اس زمانے میں سُلیم کی مُرّہ سے، فزارہ کی عامر سے، عبس کی ذُبیان سے، عامر بن صعصعہ کی تیم سے، مراد کی ہمدان سے اور ہوازن کی غطفان سے عداوت تھی۔

آپ اس کش مکش کو دُور کر کے دونوں کو ساتھ ملا لیتے اور اگر صلح نہ ہو سکتی تو کسی ایک کے حلیف بن جاتے۔

ب۔ حضورؐ اس حقیقت سے پُوری طرح آشنا تھے کہ کوئی انقلاب تمکن فی الارض یعنی سیاسی قوت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک غلام قوم جو دُوسروں کی سلاسل میں جکڑی ہوئی ہو۔ فکر و عمل میں کوئی حرکت پیدا نہیں کر سکتی۔ آپ کے سامنے اصلاحِ انسانیت، فروغ امن اور استیصالِ ظلم و استحصال جیسے بلند مقاصد تھے۔ ان کے حصُول کے لیے آپ جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر ساری دنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دینا چاہتے تھے اور اس کی بہترین صورت یہی تھی کہ شمالی سرحدات محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ رحلت سے ڈیڑھ سال پہلے حضورؐ تیس ہزار مجاہدین کو لے کر شمال کے ایک سرحدی شہر تبوک تک گئے۔ جاسوس بھیج کر رُومی فوج کو تلاش کیا۔ لیکن وُہ سامنے نہ آئی اور حضورؐ لوٹ آئے۔ اسی طرح کی ایک مہم حضورؐ نے ہجرت کے آٹھویں سال موتہ کی طرف بھیجی تھی اور دو سال پہلے (سنہ ۶ھ) دُومۃ الجندل کی طرف۔ آخری علالت میں بھی آپ کو شمالی سرحدات کا خیال رہا۔ چنانچہ رحلت سے دُو دن پہلے حضرت اُسامہؓ کو تین ہزار کی جمعیت دے کر شام کی طرف جانے کا حکم دیا۔ ابھی حضرت اُسامہؓ تیاری ہو رہے تھے کہ حضورؐ انتقال فرما گئے اور یہ مہم رُک گئی لیکن جونہی خلیفۂ اوّل

بیعت وغیرہ سے فارغ ہوئے تو حضرت اسامہؓ کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔

حضورؐ کے بعد بھی اسی پلان پر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ اسی برس کی قلیل مدت میں سندھ کے صحراؤں سے ہسپانیہ کی شاداب وادیوں تک اللہ کا پیغام پھیل گیا اور دشت و دمن صدائے تکبیر سے گونج اُٹھے:

صلی اللہ علیہ وسلم

جلوہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارہ سینائے او
رونق از ما محفلِ ایّام را
اُو رُسُل را ختم و ما اقوام را (اقبالؒ)

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

ضمیمۂ اوّل

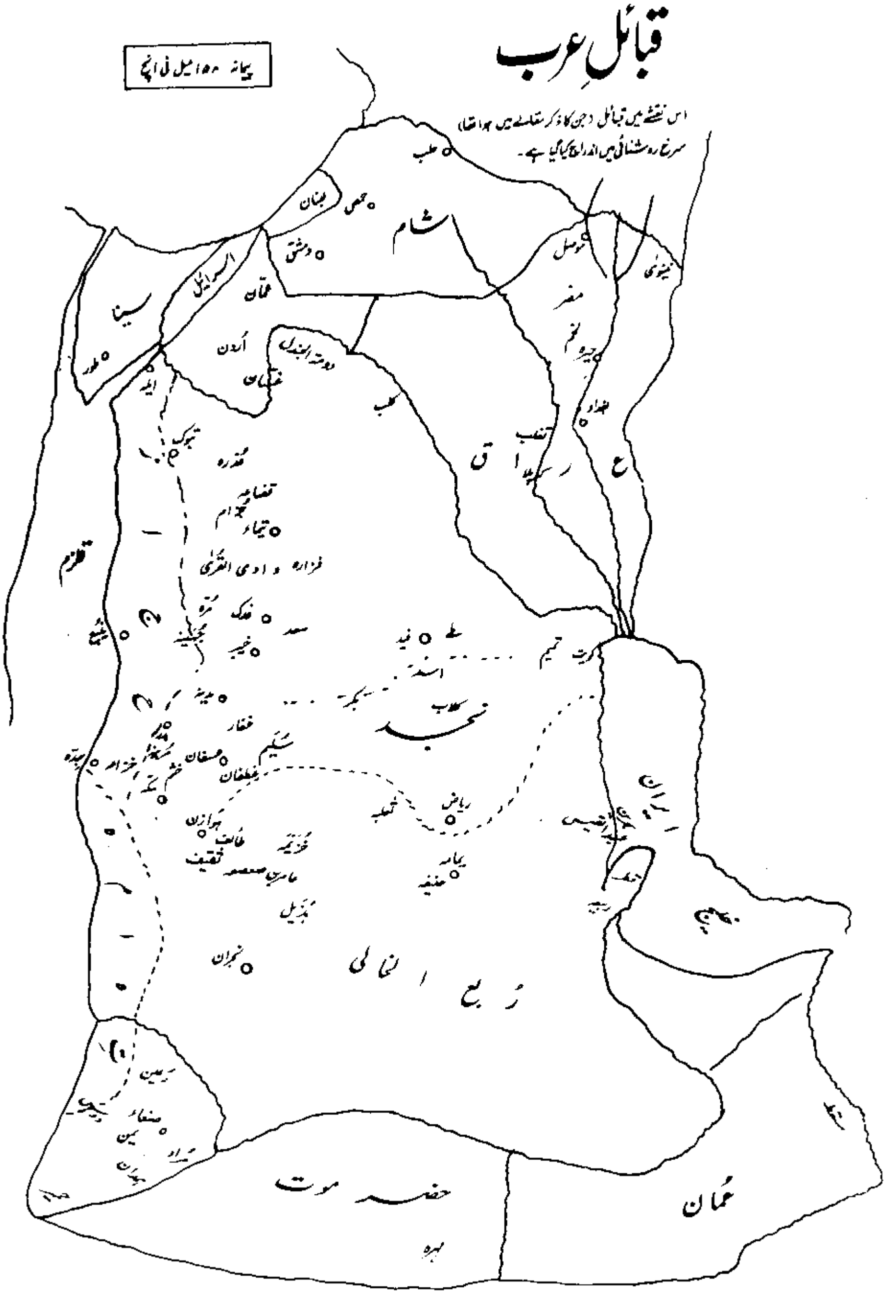
قبائل

عرب میں سینکڑوں قبائل تھے جو جنوبی اُردن سے بحیرۂ عرب کے ساحل تک تقریباً گیارہ لاکھ مربع میل زمین میں آباد تھے۔ ان میں کئی ہمنام تھے۔ مثلاً خزاعہ، ہوازن اور قریش کی ایک ایک شاخ کا نام بنو کعب تھا اور کتنے ہی قبائل عوف، مالک اور ازد کہلاتے تھے۔

قبائل کے بڑے بڑے گروہ دو تھے۔ بنو عدنان اور بنو قحطان۔ عدنان حضورؐ کے اکیسویں جد تھے اور قحطان عدنان کا نانا تھا۔ جنوبی عرب یعنی یمن وغیرہ میں قحطان کی اولاد آباد تھی اور شمال میں عدنان کی۔ غطفان، خزاعہ، مزینہ، ہذیل، کنانہ، تمیم، دارم، مُرّہ، کلاب، ہوازن، سُلیم، مازن اور جُشم عدنانی تھے اور سبا، حمیر، کہلان، اوس، خزرج، کندہ، ہمدان، مراد، مہرہ وغیرہ قحطانی۔ ان دونوں گروہوں میں کچھ نام مشترک تھے۔ مثلاً ثعلبہ، جُشم، حارث، حرب، ربیعہ، مُرّہ، مُزینہ، مازن اور غنم وغیرہ۔ عربستان کا جغرافیہ لکھنے والوں نے عرب کی بستیوں، وادیوں اور پہاڑوں کے نام توگن ڈالے ہیں لیکن ان کا مقام متعین نہیں کیا۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں یہ تو بار بار لکھا ہے کہ فلاں موضع نجد یا حجاز میں فلاں قبیلے کی ملکیت تھا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ ریاض یا فید یا مدینہ سے کس سمت میں کتنی دُور واقع تھا۔ حجاز کا رقبہ پچاس ہزار اور نجد کا سوا لاکھ مربع میل ہے۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ فلاں مقام نجد میں تھا، بات نہیں بنتی۔ مقام کا تعین نہ یاقوت کے ہاں ملتا ہے نہ کتاب فی جزیرۃ العرب کے مصنف ابوسعید السیرافی کے ہاں اور نہ معجم البقاع کے مصنف ابوعبید البکری الاندلسی کے ہاں۔

ایک اور مشکل اِن قبائل کے انساب کے متعلق ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ کون کس کی شاخ اور کس کا جد تھا، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہُذیل کنانہ کی شاخ بھی تھی اور خزاعہ کی بھی۔ غفار ضمرہ کی شاخ تھی، ضمرہ اور لیث، بکر بن عبد مناۃ کی شاخیں تھیں۔ پھر بکر بن عبد مناۃ اور حارث بن عبد مناۃ، کنانہ کی شاخیں تھیں۔ یہ شاخ در شاخ کا سلسلہ بڑا ہی اُلجھا ہُوا ہے اسے سلجھا کر مختلف شاخوں کے اوطان تلاش کرنا کارے دارد۔

ایک اور دقت یہ کہ جغرافیہ نگاروں کے ہاں اوطانِ قبائل کے متعلق کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یاقوت بار بار ہُذیل کو تہامہ کا ایک قبیلہ بتاتا ہے لیکن واٹ منٹگمری (ص ۸) لکھتا ہے کہ یہ مکّہ کے مشرق میں تھا۔ یاقوت کے ہاں بنو مُرّہ کا وطن یمامہ تھا۔ اور واٹ کے ہاں فدک۔ ان دونوں میں ۵۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ ان کتابوں میں اس قسم کے درجنوں تضادات ملتے ہیں۔ ان حالات میں اوطانِ قبائل کا صحیح نقشہ تیار کرنا مشکل ہے۔ ساتھ والے نقشے کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ غالباً یہ صحیح ہے۔ منٹگمری واٹ نے بڑی محنت سے اوطانِ قبائل کی ایک فہرست تیار کی تھی جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکے گا کہ کوئی قبیلہ حرمین سے کس سمت میں آباد تھا۔ وہ حرمین سے کتنا دُور تھا؟ یہ سوال مدت سے منتظرِ جواب ہے۔


قبائل عرب
اس نقشے میں قبائل (جن کا ذکر مقالے میں ہوا تھا)
سرخ روشنائی میں اندراج کیا گیا ہے۔
حلب
شام
حمص
لبنان
دمشق
عمان
اسرائیل
سینا
طور
اردن
غسان
دومۃ الجندل
کلب
موصل
نینویٰ
مضر
تغلب
عراق
ایلہ
تبوک
عذرہ
قضاعہ
جذام
تیماء
فزارہ
وادی القریٰ
قلزم
فدک
سعد
خیبر
جہینہ
ینبع
طے
تمیم
اسد
بکر
نجد
مدینہ
غفار
سلیم
عسفان
غطفان
مکہ
جدہ
خزاعہ
ریاض
ہوازن
طائف
ثقیف
خزیمہ
عامر بن صعصعہ
یمامہ
حنیفہ
ہذیل
نجران
ربع الخالی
صنعاء
یمن
حضرموت
عمان
مہرہ

اور رہے گا۔

۱۔ قبائلِ حرمین کے مغرب میں :

۱۔ خزاعہ ؛ (اسلم ۔ کعب بن عمرو ۔ المصطلق)[۱]

۲۔ کنانہ ؛ (بکر بن عبدِ مناۃ (ضمرہ وغفار) ۔ لیث ۔ دُئِل ۔ مُدلج ۔ الحارث بن عبد مناۃ)

۳۔ مُزَینہ

۴۔ جُہَینہ

۵۔ اَزد شَنوءہ

۲۔ قبائلِ حرمین کے مشرق میں :

۱۔ خُزَیمہ (مُدرکہ ۔ کنانہ)

۲۔ اَسد بن خُزَیمہ (عَضَل اور قارہ)

۳۔ طے (نبہان)

۴۔ ہُذَیل (لحیان)

۵۔ مُحارِب (بنو خَصافہ)

۶۔ غَطَفان (اَشجع، فزارہ، مُرہ، ثعلبہ ۔ (انمار ۔ عُوال))

۷۔ سُلَیم ؛ (رِعل ۔ شیبان)

۸۔ ہوازن ؛ (عامر بن صعصعہ (البکاء ۔ ہلال ۔ کلاب ۔ (قُرطاء ۔ عُرَینہ) ربیعہ ۔ جُشَم ۔ نصر ۔ سَعد بن بکر ۔ ثمالہ ثقیف (بنو مالک ۔ اَحلاف (باہلہ))

۳۔ شمالی قبائل :

۱۔ سَعد بن ہُذَیم

۲۔ عُذرہ

۳۔ جُذام

۴۔ قضاعہ (جَرم ۔ القین اور سلامان)

۵۔ بالی

۶۔ بَہراء

۷۔ لخم

۸۔ غسّان

۹۔ کلب

۴۔ جنوبی قبائل :

۱۔ خثعم

۲۔ مَذحج (عَنس ۔ جُعفی ۔ خَولان ۔ النخع ۔ رُہاء ۔ سَعد العشیرہ (زُبید) ۔ صُداء)

---

[۱] بریکٹ سے مراد شاخ اور شاخ در شاخ ہے۔

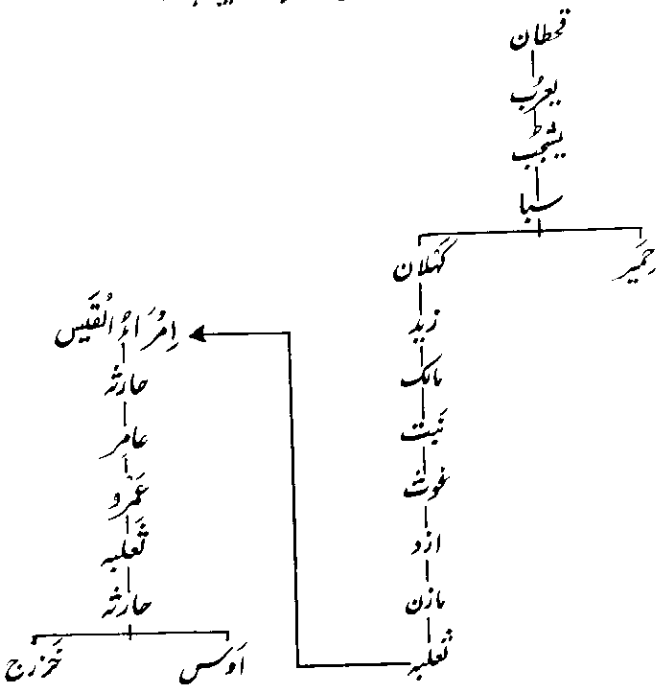
۳۔ بجیلہ
۴۔ ہمدان
۵۔ حارث بن کعب
۶۔ مراد
۷۔ کندہ (تجیب)
۸۔ حمیر
۹۔ عک اور اشعر

۵۔ عرب کے باقیماندہ قبائل:

۱۔ مہرہ
۲۔ ازد عمان
۳۔ عبدالقیس
۴۔ حنیفہ
۵۔ تمیم
۶۔ وائل
۷۔ بکر
۸۔ تغلب

یہ قبائل کی پوری فہرست نہیں ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

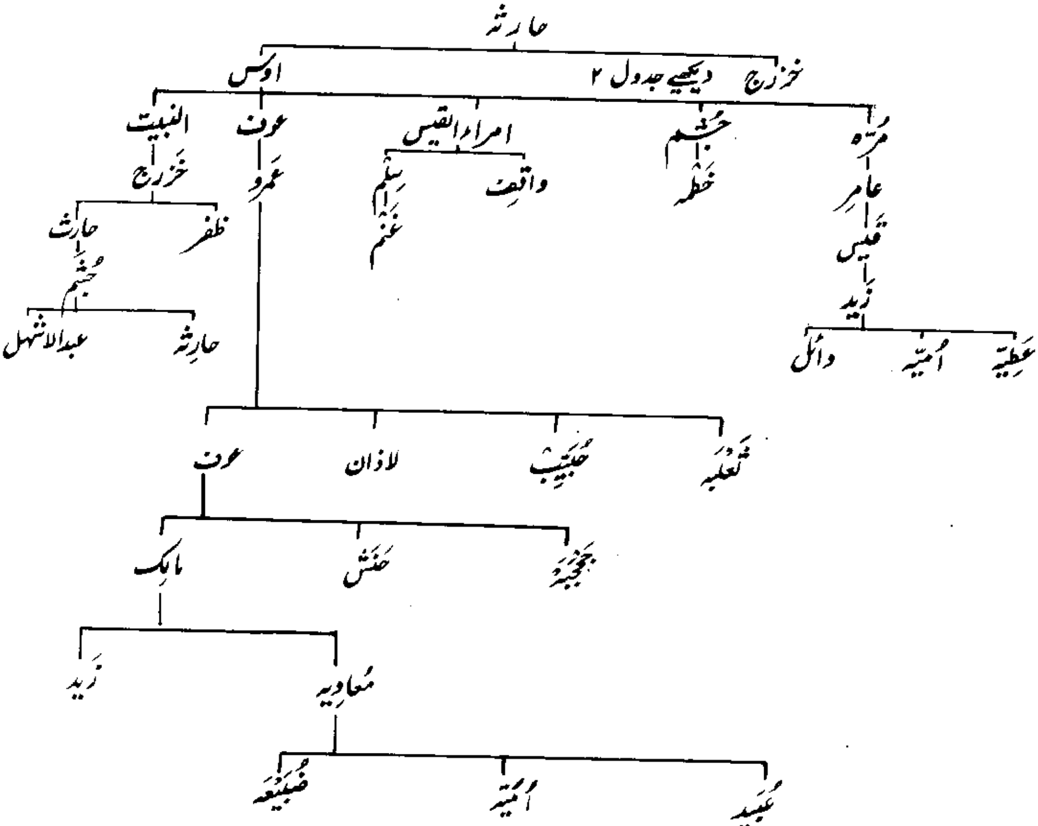
قبائلِ مدینہ مدینہ میں کچھ تو یہود آباد تھے جو کسی حملے کی وجہ سے فلسطین کو چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے اور یا اوس و خزرج۔ ان کا جدِّ اعلیٰ یمن سے آیا تھا۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے:



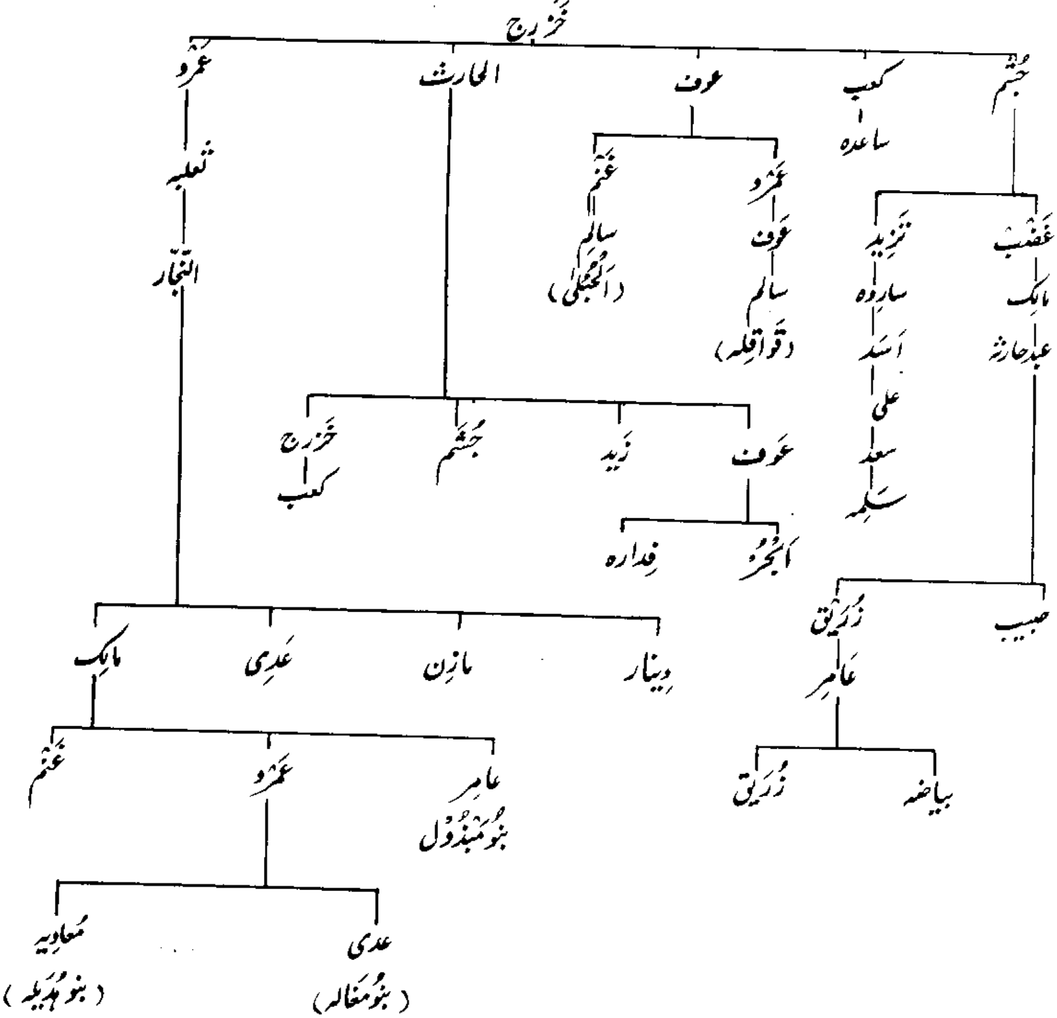
(دائرۂ معارفِ اسلامیہ ج ۳ "اوس")

ہوا یوں کہ کہلان کے دارالحکومت مآرب کے قریب وادیٔ عرم کا بند بوسیدہ، موش خوردہ ہوگیا۔ جب سبا کے رئیس عمرو بن عامر کو یقین ہوگیا کہ بند ٹوٹنے والا ہے۔ تو وہ اپنی ساری جائداد اپنے برادر زادوں بنو حمیر (جو بند کے بوسیدہ پن سے بے خبر تھے) کے پاس بیچ کر خود اقارب سمیت یمن سے نکل گیا۔ ثعلبہ بن عمرو حجاز میں مقیم ہوگیا اور حارثہ بن ثعلبہ مدینے چلا گیا۔ اوس و خزرج اسی کی اولاد ہیں اُن کے بعض افراد شمال کی طرف نکل گئے تھے۔ طے، لخم، غسان اور کلب انہی کی اولاد ہیں۔ کنسائیز انسائیکلو پیڈیا آف عرب سویلزیشن (ص ۲۹۲) میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت چوتھی صدی عیسوی میں ہوئی تھی۔ تین سو برس کے بعد جب حضورؐ مدینہ میں وارد ہوئے تو اوس و خزرج پچھتر سے زاید قبائل میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جداول یہ ہیں:

(۱)



(۲)

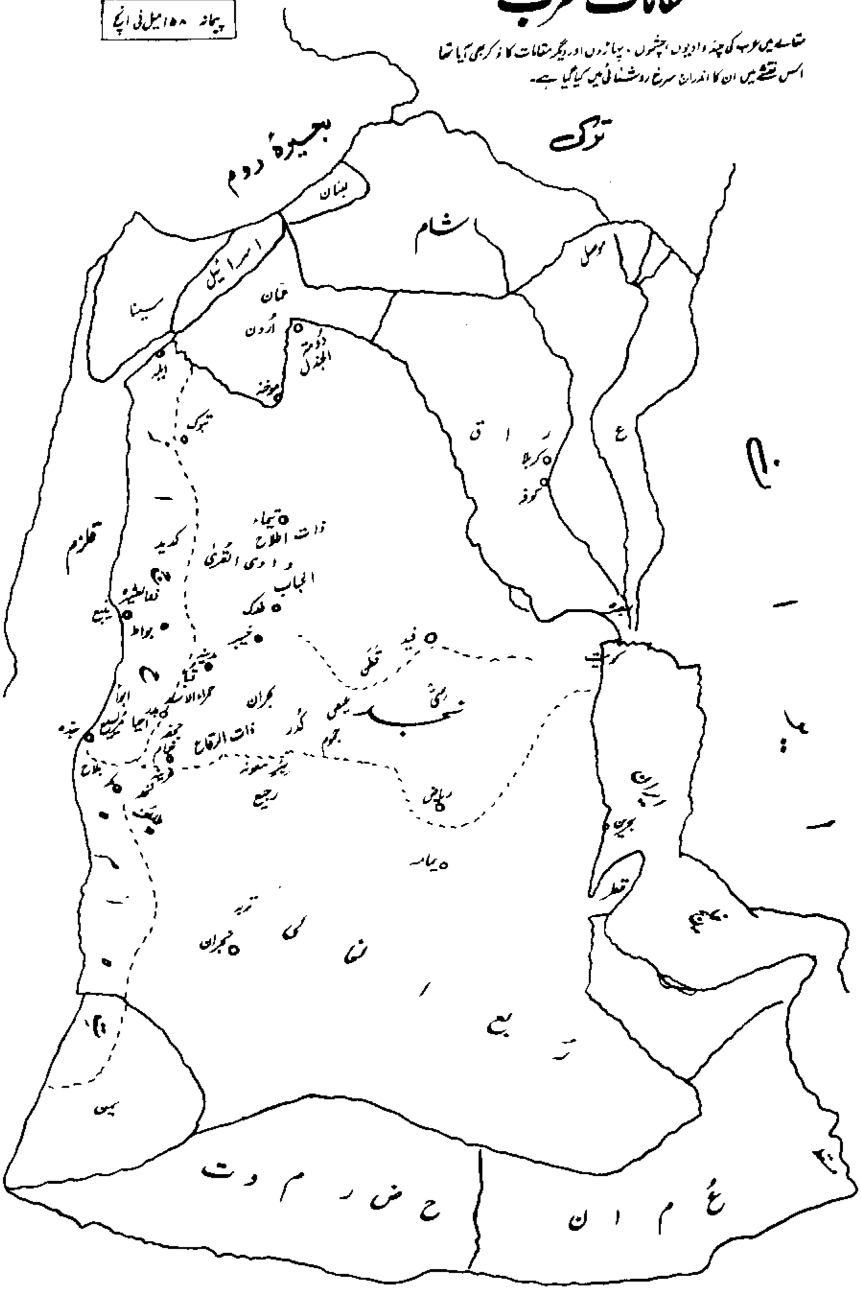

خزرج
جُشم
کعب
عوف
الحارث
عَمْرو
غَضْب
تزید
ساعدہ
عَمْرو
غَنْم
مالک
ساردہ
عوف
سالم
عبد حارثہ
اَسَد
سالم
(الحُبلی)
(قواقلہ)
علی
سعد
سلمہ
ثعلبہ
النجّار
خزرج
کعب
جُشَم
زید
عوف
اَبُجر
فدارہ
حبیب
زُرَیق
عامر
بیاضہ
زُرَیق
دینار
مازن
عَدی
مالک
عامر
بنو مُبذول
عَمْرو
غَنْم
عدی
(بنو مغالہ)
معاویہ
(بنو ہُدیلہ)

(واٹ ص ۱۵۴)

ضمیمۂ دوم

مقامات عرب

مقالے میں عرب کی چند وادیوں، چشموں، پہاڑوں اور دیگر مقامات کا ذکر بھی آیا تھا
اس نقشے میں ان کا اندراج سرخ روشنائی میں کیا گیا ہے۔



ضمیمۂ سوم

اُن عُمّال کی فہرست جو حضورؐ نے مقرر فرمائے تھے۔

شمار	نام	کہاں بھیجا	شمار	نام	کہاں بھیجا
۱	حضرت اَلمُہاجرؓ بن اَبی اُمیہ مخزومی	صنعاء	۱۸	حضرت الاَقرعؓ بن حابس تمیمی	بحرین
۲	″ زیادؓ بن لبید انصاری	حضرموت	۱۹	″ ولیدؓ بن عقبیٰ بن ابی مُعَیط قرشی	اَلمُصطَلِق
۳	″ علیؓ بن ابی طالب	نجران	۲۰	″ عدیؓ بن حاتم طائی	قبائل سطے و اَسَد
۴	″ مُعاذؓ بن جبل انصاری	ایضاً	۲۱	″ مالکؓ بن نُویرہ تمیمی	تمیم
۵	″ عبداللہؓ بن زید انصاری	حِمیر	۲۲	″ زبرقانؓ بن بدر تمیمی	بنو حنظلہ (تمیم)
۶	″ مالکؓ بن عُبادہ ہمدانی	″	۲۳	″ قَیسؓ بن عاصم تمیمی	بنو سعد (تمیم)
۷	″ عُقبہؓ بن نمر ہمدانی	″	۲۴	″ بُریدہؓ بن اَلحُصَیب اَسلمی	اسلم و غِفار
۸	″ مالکؓ بن مُرّہ (مُرارہ) رُہاوی	″	۲۵	″ کعبؓ بن مالک انصاری	″ ″
۹	″ عامرؓ بن شہر ہمدانی	ہمدان (یمن)	۲۶	″ عبادؓ بن بِشر انصاری	سُلَیم و مُزَینہ
۱۰	″ ابو موسیٰؓ اشعری	مآرب (یمن)	۲۷	″ رافعؓ بن مکیث جہنی	جُہَینہ
۱۱	″ خالدؓ بن سعید بن عاص قرشی	نجران و زبید کے درمیانی علاقے میں	۲۸	″ عمروؓ بن عاص قرشی	فزارہ
			۲۹	″ ضحاکؓ بن سُفیان کلابی	بنو کلاب
۱۲	″ طاہرؓ بن ابی ہالہ تمیمی	عک اور اَشعر	۳۰	″ بُسرؓ بن سفیان کعبی	کعب
۱۳	″ یَعلیٰؓ بن اُمیہ تمیمی	جَنَد (یمن)	۳۱	″ نُعَیمؓ بن عبداللہ النحام قرشی	کعب
۱۴	″ عمروؓ بن حزم انصاری	نجران	۳۲	″ ابن لُتبیہؓ ازدی	ذُبیان
۱۵	″ عُکاشہؓ بن ثور غوثی	سکاسِک (؟)	۳۳	″ عُیَینہ بن حِصن فزاری	تمیم
۱۶	″ ابو سفیانؓ بن حرب قرشی	نجران	۳۴	″ قضاعیؓ بن عمرو عُذری	اَسَد
۱۷	″ اَلاَعلیٰؓ بن حضرمی	بحرین		٭	٭

نوٹ: ان عمال کا کام زیادہ تر صدقات و زکوٰۃ جمع کرنا تھا۔

ضمیمہ چہارم
اشاریہ حواشی

اس مقالے کے حواشی میں ۴۹ رجال (صحابہ اور دیگر) کا تعارف کرایا گیا ہے، ان کی فہرست یہ ہے:

شمار حاشیہ	نام	شمار حاشیہ	نام	شمار حاشیہ	نام
	الف	۶	اُمیّہ بن خلف		**خ**
۴۴	آمنہؓ (اُمِّ رسولؐ)	۷۷	انسؓ بن مالک	۷۶	خالدؓ بن ولید
۶۱	ابن عبدالبر	۷۸	انس بن نضر	۹۹	خُبیبؓ بن عدی انصاری
۱	ابوجہل		**ب**	۱۳۶	خراشؓ بن اُمیّہ خزاعی
۱۳۸	ابوجندلؓ بن سُہیل	۱۴۳	بشرؓ بن براء انصاری		**ر**
۸۰	ابودجانہؓ انصاری	۱۴۵	بشیرؓ بن سعد انصاری	۱۷۲	ربیعہؓ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی
۱۰	ابوذرؓ غفاری		**ث**		**ز**
۱۰۱	ابوسروعہؓ عقبہؓ بن حارث	۱۱۱	ثابتؓ بن قیس بن شماس	۱۱	زُبیرؓ بن عوام قرشی
۲۸	ابوسفیانؓ بن حرب		**ج**	۳۹	زیدؓ بن حارثہ کلبی
۴۲	ابوسلمہؓ عبداللہ بن عبدالاسد	۱۴۴	جعفرؓ بن ابی طالب	۱۰۰	زیدؓ بن دَثِنہ انصاری
۱۲۵	ابوعبیدہؓ بن جراح	۱۱۰	جُویریہؓ (اُمّ المومنین)		**س**
۱۶۴	ابوقتادہؓ انصاری		**ح**	۱۰۸	سباعؓ بن عُرفطہ انصاری
۵۶	ابولبابہؓ بن عبدالمنذر	۱۵۸	حارثؓ بن عُمیر ازدی	۳۰	سعدؓ بن ابی وقاص
۲	ابولہب	۵۱	حُبابؓ بن منذر انصاری	۱۶۷	سعدؓ بن زید اشہلی
۱۵۰	اَخرمؓ (ابن ابی العوجاء)	۹۰	حرامؓ بن مِلحان انصاری	۳۶	سعدؓ بن عبادہ انصاری
۱۴۷	اُسامہؓ بن زید	۴۷	حکمؓ بن کیسان مخزومی	۱۷	سعدؓ بن معاذ انصاری
۷۴	اُسیدؓ بن حُضیر			۱۲	سعیدؓ بن زید قرشی

۱۱۵ سلمانؓ فارسی
۱۳۳ سلمہؓ بن اسلم انصاری
۱۳۷ سُہیل بن عمرو قرشی

ش

۱۵۵ شجاعؓ بن ابی وہب اسدی

ص

۷۰ صفوانؓ بن اُمیہ بن خلف قرشی
۱۱۳ صفوانؓ بن معطل السلمی
۸ صُہیبؓ بن سنان رُومی

ض

۱۷۶ ضحاکؓ بن سفیان بن عوف کلبی

ط

۸۱ طلحہؓ بن عبیداللہ قرشی
۸۵ طُلیحہؓ بن خویلد الاسدی

ع

۹۳ عامر بن فُہیرہ
۱۱۲ عائشہؓ (اُم المومنین)
۵۳ عباسؓ بن عبدالمطلب
۱۳ عبدالرحمانؓ بن عوف القرشی
۱۶ عبداللہؓ بن اُبی - منافق
۶۶ عبداللہؓ بن اُم مکتوم
۸۷ عبداللہؓ بن اُنیس انصاری
۷۳ عبداللہؓ بن جُبیر انصاری
۴۳ عبداللہؓ بن جحش اسدی
۱۰۵ عبداللہؓ بن رواحہ انصاری
۳۵ عبداللہؓ بن عبدالمطلب (پدرِ رسولؐ)
۱۲۸ عبداللہؓ بن عتیک انصاری
۲۶ عُبیدہ بن حارث قرشی
۱۶۵ عتّاب بن اُسید قرشی
۴۸ عُتبہؓ بن غزوان مازنی
۹ عثمان بن عفان
۳ عُقبہ بن ابی مُعیط اُموی
۱۲۳ عکاشہؓ بن محصن الاسدی
۴۰ علیؓ بن ابی طالب
۷ عمارؓ بن یاسر مذحجی
۴۹ عمروؓ بن اُم مکتوم
۹۱ عمروؓ بن اُمیہ الضمری
۱۴ عمروؓ بن عاص (فاتحِ مصر)
۴۶ عمرو بن عبداللہ بن عمار حضرمی
۱۲۱ عُیینہؓ بن حصن الفزاری

غ

۱۴۶ غالبؓ بن عبداللہ اللیثی

ف

۷۱ فراتؓ بن حیان العجلی
۱۷۱ فضلؓ بن عباس بن عبدالمطلب ہاشمی

ق

۱۷۵ قُطبہؓ بن عامر انصاری

ک

۱۹ کُرزؓ بن جابر الفہری
۵۵ کعبؓ بن اشرف مدینی (شاعر)
۱۵۴ کعبؓ بن عُمیر غفاری
۲۴ کنازؓ بن حصن ابو مرثد الغنوی

م

۱۷۷ مالکؓ بن عوف نصری
۲۵ مجدیؓ بن عمرو
۱۲۰ محمدؓ بن مسلمہ انصاری
۹۷ مرثدؓ بن ابی مرثد الغنوی
۲۹ مِسطحؓ بن اثاثہ القرشی
۵۰ مصعبؓ بن عُمیر القرشی
۹۲ منذر بن عمرو الساعدی
۵۲ مہجعؓ بن صالح (خادمِ عمرؓ بن خطاب)

ن

۹۴ نافعؓ بن بدیل الخزاعی

و

۹۵ واقدؓ بن عبداللہ تمیمی

کتابیات

۱۔ طبقات — ابو عبداللہ محمد بن سعد بصری۔ اُردو ترجمہ از مو' عبداللہ العمادی۔ دوسرا ایڈیشن، نفیس اکاڈمی کراچی

۲۔ تاریخ — ابنِ خلدون۔ اُردو ترجمہ از حکیم احمد حسین عثمانی۔ کراچی ۱۹۶۶ء

۳۔ تلقیح — ابن الجوزی۔ دہلی ۱۲۸۶ھ

۴۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ حافظ ابن عبدالبرؒ۔ قرطبی۔ حیدر آباد۔ دکن

۵۔ تجرید البخاری میں "راویانِ حدیث" — طابع دین محمد۔ لاہور

۶۔ عہد نبویؐ کے میدان جنگ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ لاہور ۱۹۳۹ء

۷۔ اکمال فی اسماء الرجال۔ محمد بن عبداللہ خطیب۔ اردو ترجمہ سید ثابت حسین امروہی۔ لاہور ۱۹۶۳ء

۸۔ سیرت النبیؐ۔ مولانا شبلی۔ طبع پنجم۔ لاہور

۹۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔ فرید بن مصطفیٰ وجدی۔ مصر ۱۹۲۳ء

۱۰۔ معجم البلدان۔ یاقوت حموی۔ مصر ۱۳۲۳ھ

۱۱۔ تاریخ۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری۔ اردو ترجمہ از محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ کراچی ۱۹۷۰ء

۱۲۔ فتوح البلدان۔ البلاذری۔ انگریزی ترجمہ از فلپ ہٹی۔ بیروت ۱۹۶۶ء

۱۳۔ کنسائیز انسائیکلوپیڈیا آف سوبک سویلیزیشن۔ ہالینڈ ۱۹۵۹ء

۱۴۔ دائرۂ معارفِ اسلامیہ۔ اردو۔ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور ۱۹۶۶ء

۱۵۔ رحمۃ للعلمین۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری۔ لاہور ۱۹۴۹ء

۱۶۔ محمدؐ ایٹ مدینہ۔ منٹگمری واٹ۔ آکسفورڈ ۱۹۵۶ء

ظہورِ قدرت

منشی رگھوناتھ راؤ درد

(۱)

ڈراؤنی اور خوفناک راتوں میں وحشی درندوں کی دل ہلانے والی آوازیں سُن کر کلیجہ کانپ جاتا تھا۔ آندھی اور اس کے ساتھ طوفان نوخیز قدرتی طور پر آتے جاتے تھے، اس پر کبھی کبھی خونخوار جنگ یا چھوٹی سی خونخوار جھڑپ دیکھنے سے آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔ عورت، اس کا دل ہے کتنا لیکن اپنی جان پر کھیلنے والی ہستی کے لیے اس سے بھی زیادہ خوفناک اسباب پیدا ہو جائیں، تب بھی اس کو کچھ پروا نہیں ہوتی۔ مگر اس عورت کے پاس ایک امانت تھی، جس کے لیے اس نے جنگل کی خاک چھاننے پھرنے کا عہد کیا تھا کیونکہ اس امانت کے لیے چاروں طرف چور، اُچکّے، ڈاکو، اٹھائیگیرے داؤ پیچ لڑا رہے تھے۔ چاہتے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح مظلوم عورت کا لال پاش پاش کر دیں تاکہ اس کی ہستی دنیا والوں کے لیے خواب ہو جائے۔

ایسے خطرناک دشمنوں میں گھر کر بھی دُکھیا ماں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کس ناز سے پالا پوسا تھا، بتلانے کی ضرورت نہیں۔ چٹیل میدان، ہمدم نہ ساتھی، صرف ماں اور بچّہ۔

قربان جائیے اس قدرت کے، ایک آسمانی طاقت شاملِ حال تھی، جو دوپہر کی چمکنے والی دھوپ میں، سورج کی شکل میں، چاندنی راتوں میں بدر بن کر اور اندھیری سنسان راتوں میں جھلملانے والے ستاروں میں نظر آتی تھی۔

بچّہ بے فکر، رنج و غم سے آزاد، آنے والی بلاؤں سے بے خبر، ماں کی گود میں بیٹھا ہُوا انگوٹھا چُوستا تھا۔ اس کو جھُولنے کے لیے گہوارہ نہیں تھا۔ اوڑھنے کے لیے نرم اور گرم کپڑے نہیں تھے۔ اس کے رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں تھا۔ لیکن اس کو ماں کی گود میں سب کچھ مل جاتا تھا۔ آغوشِ مادر سے بڑھ کر کوئی چیز اس کو عزیز نہیں تھی۔

ناشاد ماں جانتی، اچھی طرح جانتی تھی کہ ہم دونوں کی زندگی خطرے میں ہے۔ دُنیا میں میرے چاہنے والے بہت ہیں، مگر اس نورِ نظر کا کوئی روادار نہیں۔ عزیز، اقارب، خویش، یگانے، بیگانے سب خون کے پیاسے ہیں۔ اس کو اپنے مرنے کا غم نہیں تھا، صرف بچّہ کی سلامتی چاہتی تھی۔

دن، دھوپ چھاؤں بن کر غائب ہوتا تھا۔ رات تارے گننے میں ختم ہوتی تھی۔ ماں یاس و حسرت، رنج و غم کے ساتھ بچّہ کو کلیجہ سے بھینچ بھینچ کر اشکِ حسرت بہاتی تھی۔ امید صرف امید پر زندگی کے دن پورے کر رہی تھی۔

(۲)

جب یہ ہستی دنیا میں آئی تھی، اس کے ساتھ ایک صدائے غیب بھی۔ یہ وہ آواز تھی، جس کے لیے بزدل عورت جنگل کی

شیرنی بن کر لق ودق بیابان میں رہنے بسنے لگی تھی۔ صدائے غیب کیا تھی، وہ ایک معمہ تھا جس کا مطلب "ظہورِ قدرت"۔

ماسا کی ماری کبھی ڈراؤنے خواب دیکھ کر کانپ جاتی تھی، کبھی چپکے چپکے رو دیتی تھی۔ اس کی اس حرکت کو پرند و چرند، کیڑے مکوڑے غور سے دیکھتے تھے۔

صبح کے وقت پرند اپنی خوشنما آواز سے، خوب صورت پروں کو پھیلا کر نغمہ سنجی کرتے تھے۔ ظہورِ قدرت کے گیت جوشِ مستی میں گاتے تھے۔ میٹھے سروں سے بچے کو لوری دیتے تھے۔

دوپہر میں چرند اپنے بچوں کے ساتھ خوش فعلیاں کرکے ان دونوں کا دل بہلاتے تھے۔ راتوں کو کیڑے مکوڑے اپنی رسیلی، بند نہ ہونے والی آواز جنگل میں لبا دیتے تھے۔ یہ تھے تمام قدرت کے کھیل۔ ناشاد ماں ان قدرتی دوستوں کی طرف دھیان نہیں دیتی تھی۔ صرف اس کو اپنے بچے کی دُھن تھی۔

آہ! بوڑھی ماں نے دیکھا کہ اس کا ہونہار بچہ دم توڑ رہا ہے۔ اس نظارے نے اس غریب دکھیا کا دل اور بھی توڑ دیا۔ مرنے والے کی بے لبسی اور بیکسی سے ضعیفہ دیوانی ہو گئی۔ اس نے کس آفت سے مقابلہ کرکے اس جگر کے ٹکڑے کو پالا تھا۔ کیا اسی دن کے لیے! اس کی آنکھیں مرنے والے کی صورت کو تک رہی تھیں۔ پُرحسرت آنکھیں جو کوئی دم میں بند ہونے والی تھیں، سفید ہونٹ، جن کی سُرخی معدوم ہو چکی تھی، زبانِ حال سے الوداع کہہ رہے تھے۔ مرنے والا بے ہوش، بے خبر تھا۔ ماں کی بے قراری اور اضطرابی سے اس کو کچھ واسطہ نہیں تھا۔ خواب مرگ کا اثر اس پر اچھی طرح ہو چکا تھا۔

شدتِ غم سے کپکپاتی آواز میں ضعیفہ چلا اُٹھی کہ "ہائے غضب" چھاتی دھڑا دھڑ پیٹ رہی تھی۔ منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ پھر کہنے لگی، اے میرے کلیجے کی ٹھنڈک! آنکھوں کے نور! تُو آج مجھے کس کے سہارے چھوڑ چلا۔ یا اللہ! مجھ دکھیاری پر رحم کر۔ میری ہری بھری کوکھ جلا کر مجھے تاراج نہ کر۔ بچا۔ او میرے خدا! میرے اس نونہال کو بچا۔ تیری خدائی کے صدقے، اگر تو چاہتا ہے، تو مجھے اٹھا لے، لیکن میرا لال مجھے بخش دے۔ اتنا کہا اور وہ بے بس ہو گئی۔

یہ وہ دردناک آواز تھی، جو سچے دل سے نکل کر آسمان تک جا پہنچی۔ ہوائیں گونجنے لگی۔ درخت خاموش ہو گئے، آفتاب ڈر کر بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ آندھی اور طوفان سرگوشیاں کرنے لگے۔ آسمان پر خوفناک شور ہُوا۔ بجلی چمکنے لگی، بادل گرجنے لگے۔ یکایک زمین تھرانے لگی۔

(۳)

مرنے والا مریض کسی قدر چونکا۔ بیہوش ماں کو پکارا اور مایوسی سے آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ بوڑھی ماں بیہوش تھی مگر اس کو محسوس ہونے لگا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ مریض پر بھی غنودگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ دنیا میں سیاہی پھیل گئی۔ ضعیفہ نے دیکھا، اچانک مریض کے اطراف ایک روشنی نمودار ہو گئی۔ یہ کیا ہے! اس کا دھڑکنے والا دل اندر سے کہنے لگا " ظہورِ قدرت" کی علامت۔

روشنی بتدریج بڑھتی گئی۔ ایک حلقہ مریض کے اطراف ہو گیا۔ ضعیفہ کی دُھندلی آنکھیں اُس چمکنے والے نور کی تاب نہ لا کر بند ہونے لگیں۔ تاہم وُہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب مریض بھلا چنگا تھا۔ اس کا وہی مردانہ حسن تھا۔ چہرے پر شباب کی تازگی اور سرخی تھی۔ سفید ہونٹوں میں سرخی آگئی تھی۔ الوداع کہنے والی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ صحت اور اس کے ساتھ طاقت، جسم میں خون کی گردش نے ثابت کر دکھایا کہ نقاہت اور کمزوری کافور ہوگئی۔

نوجوان مریض نے اس نور کو دیکھا اور اپنی حالت کو اچھی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس کو یقین ہوگیا کہ اب وہ موت کے پنجے سے آزاد ہے۔ جاں بخش نور پر نگاہ دوڑا کر کہا کہ "ماں، ماں یہ خواب تو نہیں ہے"

ضعیفہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی: "نہیں، یہ خواب نہیں "ظہورِ قدرت" ہے۔"

مریض: یہ کیا اس صدائے غیب کی تعبیر ہے، جو میرے دنیا میں آنے کے چند روز بعد تمھیں سنائی دی تھی۔

ضعیفہ: ہاں! ہاں!!

اٹھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی اور کہا: یارب! تُو نے میری سُن لی اور میرا چاند جی اُٹھا۔ اس مرنے والے کو زندگی بخشنے والے داتا! تیری کریمی پر میں واری۔"

کسی قدر روشنی مدھم ہونے لگی۔ ضعیفہ ڈر گئی کہ پھر کہیں اس کا بچہ مرض میں مبتلا نہ ہو جائے۔ یہاں تک کہ وہ تمام روشنی معدوم ہوگئی۔ پھر وہی تاریکی اور وہی سنسان رات۔ مگر مریض اب مریض نہیں تھا، صحت یاب نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں، بازو مضبوط تھے۔ موت پر اس کو اچھی طرح فتح حاصل ہوگئی تھی۔

(۴)

نوجوان کو بسترِ مرگ کے واقعات یاد تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی دنیا میں "ظہورِ قدرت" کا اعلان کر دے۔ لیکن بوڑھی ماں منع کرتی تھی۔

ماں بیٹے کے ساتھ تشکر کے لیے سجدے میں گر گئی۔ حضورِ قلب سے تشکر کے الفاظ کہہ چکنے کے بعد پھر اس نے کہا: "مرنے والے کو جلانے والے! میں چاہتی ہوں کہ تو میرے اس بچے کو لافانی زندگی عطا کر اور ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ میری دعا صرف یہی ہے۔"

سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا، ایک عجیب و غریب مخلوق سامنے کھڑی ہے۔ نوجوان بے اختیار چلایا، آہا! فرشتہ۔ فرشتے کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے بڑھیا اور نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا کہ "سنو! میں خدا تعالیٰ کے پاس سے اس لیے آیا ہوں کہ "ظہورِ قدرت" کے متعلق تم کو خوشخبری سناؤں کہ وقت بالکل قریب آرہا ہے۔ ضعیفہ نے مسرت سے پوچھا: اس کے سوا کچھ اور بھی کہو گے؟

فرشتہ: ہاں ضرور۔ تجھے اور تیرے نورِ نظر کو لافانی زندگی عطا کی گئی ہے۔

ضعیفہ نے فرشتے کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ "کیا میرے بچے کے ساتھ مجھے بھی لافانی زندگی عطا کی گئی ہے۔

فرشتہ: بیشک! لیکن اس لافانی زندگی کے لیے بیحد قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تُو نہیں جانتی کہ دنیا میں آجکل فریب و

دغا کا بازار گرم ہے۔ بدی کی طرف لوگ رجوع ہو رہے ہیں۔ شرک اور کفر کو اپنے گھروں میں پال رہے ہیں۔ ایسی صورت میں تم دونوں لافانی زندگی کے مالک ہو جاؤ۔ بے کھٹکے نیکی کی تلقین کرو۔ لوگوں کو سچائی کے دسترخوان پر جمع ہونے کی دعوت دو۔ لوگ تمھاری کوششوں سے برہم ہو جائیں گے۔ تم کو مارنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑیں گے۔ تم ہر حالت میں محفوظ رہو گے۔ لیکن خون میں لت پت ہو جاؤ گے۔ قریب میں ایک اور مقدس وجود سے دنیا کی تاریکی دُور ہو گی۔ آخر کار سچائی کی فتح ہو گی۔ جھوٹ اور مکر کا بازار سرد پڑ جائے گا۔ لوگ اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع ہو جائیں گے۔ جو لوگ سچائی اور حق کے لیے جان دیں گے، اُن کو شہادت کا درجہ مل جائے گا۔

یہ تقریر سُن کر پھر ایک بار دونوں نے فرشتے کے ہاتھ چُومے۔ بعد ازاں فرشتے نے نہایت تعظیم کے ساتھ کہا کہ وہ وقت دُور نہیں "ظہورِ قدرت" کا تماشا دیکھو گے۔ یہ کہہ کر وہ آسمانی مخلوق اپنے پروں کو جنبش دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہاں کچھ نہ تھا۔ وہی جنگل، وہی وحشت۔ لیکن ماں بیٹے دونوں وفورِ مسرت سے جُھوم رہے تھے۔

(۵)

۲۹ اگست ۵۷۰ء م ۱۲ ربیع الاوّل کو مکہ شریف میں ایک ہلچل مچی ہُوئی تھی۔ مکہ معظمہ میں ایک نئی مسرت نمایاں ہو رہی تھی اس روز قبیلہ قریش میں ایک "دُرِ یتیم" کا ظہور ہُوا تھا۔ فرشتے آسمان سے وحدانیت کے نغمے گاتے ہُوئے زمین پر اُتر رہے تھے۔ ہر ایک دل میں مسرت کا دریا لہریں لے رہا تھا۔ مجرموں کا دل دھڑک رہا تھا۔ خاندان قریش کا "دُرِ یتیم" ہر آنے جانے والے کو نظرِ غور سے دیکھ رہا تھا۔

فرشتے وہاں موجود تھے، لیکن لوگوں کی نظروں سے پنہاں۔ بار بار اس کی نگاہیں دروازے تک جا کر واپس آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

ماں اپنے مرحوم شوہر کی یاد سے مغموم تھی لیکن اس موہنی مورت کو دیکھتے ہی اس کے دل کی کلی شگفتہ ہو جاتی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا، سب لوگ سو گئے تھے، صرف فرشتے اس "دُرِ یتیم" کے محافظ تھے۔ ضعیفہ اور اس کے ساتھ ایک نوجوان، دونوں نے آ کر فرشتوں سے کہا کہ ہم اس مقدس ہستی کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔

فرشتوں نے ضعیفہ اور اس کے نوجوان بیٹے کو "دُرِ یتیم" کے سامنے لا کر حاضر کر دیا۔ ضعیفہ نے جونہی اس مقدس ہستی کو دیکھا، ادب سے سر جھکا کر اس بچّے کے قدم چُومے اور ننھے ننھے ہاتھوں کو بار بار چُومنے لگی۔ نوجوان اس قابلِ عظمت صورت کو دیکھ کر کسی قدر مخوف ہونے لگا۔

ایک فرشتے نے اس کے کان میں کہا کہ "تو کیوں ڈرتا ہے۔ جا اور اس ظہورِ قدرت سے اپنی لافانی زندگی کو نثار کر"۔ وہ نوجوان گیا۔ اس دُرِ یتیم کے قدم چُومنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن بچّہ مچل کر ہنس دیا۔ جلدی سے اس نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ضعیفہ کی طرف دیکھنے لگا۔

ضعیفہ نوجوان بن گئی اور وہ نوجوان بھی ایک خوب صورت بچّہ بن کر دُرِ یتیم کے قدموں تلے بیٹھ گیا۔ فرشتے حیران تھے۔

ایک دُوسرے کے مُنہ کو تک رہے تھے۔

ہاتفِ غیبی نے صدا دی: اے فرشتو! یہ عورت سرزمینِ عرب ہے اور یہ اس کا ہونہار بچہ اسلام ہے۔

اچانک ایک روشنی نمودار ہوئی۔ اس کے بعد اور ایک فرشتہ دکھائی دیا اور پھر ان دونوں کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا،

"ظہورِ قدرت" جس کے تم متمنی تھے، تمھاری قسمت کا فیصلہ جس کے ہاتھ میں دیا گیا ہے، وہ **محمدؐ** یہی ہیں۔

یہ مبارک الفاظ ختم ہوتے ہی فرشتے وحدانیت کے نغمے سنانے لگے۔ زمین پر آسمان سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اس وقت عرب اور اسلام **محمدؐ** کے ہاتھوں کو چوم رہے تھے۔

کُتبِ سابقہ کی بشارتیں

مولانا حسن میاں پھلواروی

قرآن مجید میں ارشاد ہوا : وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَاٰیَۃ ۔ (سورہ آل عمران پ ۴) اس آیت میں اس عہد و بثاق کا ذکر ہے، جو روز ازل میں تمام نبیوں سے حضرت سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین پر ایمان لانے، ان کی تصدیق اور مدد و نصرت کرنے پر لیا گیا تھا۔ حضرت مولائے کائنات امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :

"آدمؑ سے لے کر مسیحؑ تک جتنے پیغمبر گزرے، خدا نے ہر ایک سے سید عالم رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی تصدیق اور تائید کا پختہ قول و قرار لیا۔" (تفسیر امام طبری وغیرہ)

اسی لیے سب پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیش گوئیاں فرمائیں اور اپنی اُمتوں کو حضور پُر نور کی اِس عالم میں تشریف آوری کی بشارتیں دیں۔ اگلی سب آسمانی کتابوں میں خصوصاً توریت و انجیل میں ہمارے آقائے نامدار سرور و سردار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی اوصاف گرامی سب کچھ مذکور تھا۔ پڑھو :

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا	وہ رسول نبی اُمی جس کو اہل کتاب توریت و انجیل میں
عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ۔	لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اب تک موجودہ توریت و اناجیل میں بھی باوجود اس قدر تغیر و تبدل، ترمیم و تحریف کے بہتیری بشارتیں صاف صاف موجود ہیں، جن میں سے بعض کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :

۱۔ خداوند نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا :

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وُہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سُنے گا، تو میں اُس کا حساب اُس سے لُوں گا۔ لیکن وُہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات کہے میرے نام سے، جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے، تو وہ نبی قتل کیا جائے۔"

(توریت مطبوعہ مرزا پور ۱۸۷۰ء، باب ۱۸ ۔ آیت ۱۸ تا ۲۰)

سبحان اللہ کیسی واضح بشارت ہے۔ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ نبی بنی اسمٰعیل میں ہوگا اور "تجھ سا ایک نبی" سوائے پیغمبر عربیؐ اور کسی پر صادق ہی نہیں آسکتا۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی مُوسیٰ کے

مانند ہوا ہی نہیں۔ جیسا کہ خود تورات کا بیان ہے کہ:
"پھر قایم نہ ہوا کوئی نبی بنی اسرائیل میں موسیٰؑ کے مانند، جس نے پہچانو ہو اللہ کو دو بدو۔"
(تورات کتاب استثنا ۲ باب ۳۴۔ درس ۱۰)

لیکن حضور نبی امیؐ جناب کلیم اللہؑ کے بالکل "مثل" تھے اور اکثر امور میں ایک کی دوسرے سے مشابہت ثابت ہے۔ مثلاً:

۱۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ مستقل صاحب شریعت تھے، ہمارے حضورؐ بھی مستقل صاحب شرع تھے۔ لیکن بنی اسرائیل میں کوئی نبی حضرت موسیٰؑ کے بعد حتیٰ کہ سیدنا مسیحؑ بھی مستقل صاحب الشرع نہ تھے۔ (دیکھو انجیل متی باب ۵)

۲۔ موسیٰ علیہ السلام حکومت و فرمانروائی کی شان بھی رکھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تاجداروں کے تاجدار تھے۔

۳۔ جہاد کا حکم موسیٰ علیہ السلام کو بھی ہوا اور ہمارے حضورؐ کو بھی مخالفین کے حملوں کا جواب دینے اور سرکشوں کی سرکوبی کا حکم دیا گیا۔

۴۔ سیدنا موسیٰؑ کو کوہ طور پر معراج ہوئی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اتم و اکمل درجہ کی معراج ہوئی، وغیرہ وغیرہ (لیکن سیدنا مسیحؑ جن کو عیسائی اس بشارت کا مصداق ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان وجوہ مماثلت سے بالکل خالی ہیں)

غرض آنحضرت سیدنا موسیٰؑ کے مانند بے شک ہیں، قرآن میں بھی حضورؐ کو "مثل موسیٰ" فرمایا گیا۔ پڑھو: إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ نیز آیہ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِۦ میں بعض مفسروں نے شاهد سے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مثله سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا۔

اس بشارت کی یہ آیت کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" قرآن پاک کی طرف اشارہ ہے۔ جو خدا کا کلام ہے اور حرف حرف آنحضرتؐ پر نازل ہوا: ؎

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نہ گفت ست کافر است

بشارت کا آخری حصہ یہ ہے کہ "جھوٹا نبی قتل کیا جائے" یہ حضور پُر نور کی نبوت کی صداقت کا قطعی فیصلہ ہے۔ کیونکہ اگر معاذ اللہ آپ وہ نبی مبشر و موعود نہ ہوتے تو ضرور اس آخری آیت کے مصداق ثابت ہوتے۔ مگر یہاں تو خدائی وعدۂ حفاظت شامل حال تھا کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ مخالفین نے قتل و اہلاک کی کیا کچھ انتہائی تدبیریں نہ کیں، مگر ایک بھی پیش رفت نہ ہو سکی۔ مخالفین ہی ہلاک و برباد ہوئے اور خدا نے اپنے سچے رسولؐ کی ہر طرح مدد و حفاظت کی۔ پڑھو: وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ ٱللَّهُ ۖ وَٱللَّهُ خَيْرُ ٱلْمَٰكِرِينَ۔

ہاں یہ بشارت نبی اُمی کی نسبت اس طرح بھی صادق ہوئی کہ حضورؐ کے آخر زمانہ میں مُسیلمہ کذاب نے جھوٹا دعوائے نبوت کیا اور وہ خبیث حضرت خلیفۂ اول صدیق اکبرؓ کے ابتدائے زمانہ خلافت میں قتل کیا گیا۔

۲ - حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام ایک آنے والے نبی کا مشتاقانہ ذکر اور اس کی ثنا و توصیف فرماتے ہیں:

"(۲) تو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے۔ تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے اسی لیے خدا نے تجھے ابد تک مبارک کیا۔"

(۳) "اے پہلوان اپنی تلوار کو، جو تیری حشمت اور بزرگاری ہے، حمائل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔"

(۴) اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبال مندی سے آگے بڑھ۔ تیرا دہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلا دے گا۔"

(۵) "تیرے تیر تیز ہیں۔ لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ وے بادشاہ کے دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔"

(۶) "تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔"

(۷) "تیرے سارے لباس سے مُر اور عود کی خوشبو آتی ہے۔"

(۸) "بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزّت والیوں میں ہیں۔"

(۱۶) "تیرے بیٹے تیرے باپ دادوں کے قائم مقام ہوں گے تو انھیں تمام زمین کے سردار مقرر کرے گا۔"

(۱۷) "میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ پس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے۔"

(زبور شریف باب ۴۵ ملتقطاً)

یہ بشارت کس قدر صاف اور حرفاً حرفاً سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق ہے۔ حضرت داؤد کے[1] بعد ایسا کون نبی دنیا میں آیا جو باطنی فضل و کمال کے ساتھ ظاہری حسن و جمال میں بھی یکتائے زمانہ و یگانۂ عالم ہو اور حشمت و شوکت، حکومت و سلطنت اور تیر و تلوار کا بھی مالک ہُوا ہو۔ بجز محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نہیں۔

سبحان اللہ کس خلوص اور جوشِ محبت کے ساتھ حضرت داؤدؑ نے حضورِ انورؐ کے حسن و جمال، جاہ و جلال، غزوات و فتوحات اور عظمت و جلالت وغیرہ کو بیان فرمایا ہے۔ جس مُنہ سے حضرت داؤدؑ نے اُس محبوب کی یہ تعریف کی، اس مُنہ کے قربان اور جس مبارک لب و دہن سے یہ مدح و ثنا فرمائی اُس لب و دہن کے صدقے۔ آہ: ؎

نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

اے حضرت داؤد! خدائے ذوالجلال والاکرام کی طرف سے آپ پر ہزاروں صلوٰۃ وسلام۔ آپ نے ہمارے آقا و مولیٰ، منظرِ حسنِ ازلی، پرتوِ جمالِ لم یزلی، نبی اُمّی، رسول عربی (صلوات اللہ وسلامہ علیہ وآلہٖ) کے حسن و جمال کی کیسی سچی تعریف فرمائی کہ "تُو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے۔" ؎

---

[1] حضرت یوسف علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے بہت پہلے گزرے ہیں۔ ۱۲

شخصیتوں کا اختلاط

مندرجہ بالا سرسری جائزہ کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ تو ایسے مسلمان ہیں، جو اپنے شعائر و رسوم کے اعتبار سے غیر مسلم ہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کی شخصیت دراصل دو شخصیتوں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو دینداری کا عادی تھا۔ لہٰذا وہ شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں لیکن ساتھ ہی انہوں نے ایک ایسے معاشرہ میں بھی نشو و نما پائی ہے، جن کی فکری سطح اسلامی نظریات سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ لہٰذا جب وہ زندگی کے کوائف و ظروف پر غور کرتے ہیں، چاہے وہ عام فکری حیات سے تعلق رکھتے ہوں یا اجتماعی، اخلاقی، سیاسی یا دوسرے شعبوں سے، تو وہ ان پر اسلامی فکر کے مطابق غور و فکر نہیں کرتے۔ البتہ اپنی مخصوص زندگی میں وہ مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ فکری یا نفسیاتی اعتبار سے یہ بالکل ہی ایک نئی مخلوق ہے۔ عالمِ انسانی میں دو قسم کے مخلوط نظامِ تعلیم رائج رہے ہیں۔ ایک تو اسلامی تعلیم کا۔ لیکن یہ نظامِ تعلیم اپنے طریقے، وسائل اور سطح کے اعتبار سے قدیم ہے، جس کا سراغ ہمیں ان صدیوں میں ملتا ہے، جو عباسی عہدِ حکومت کے بعد گزر چکی ہیں۔ دوسرا نظامِ تعلیم وُہ ہے، جس کا سرچشمہ مغرب، مغربی افکار اور مغرب کی جدید تہذیب ہے اور ان نفسیاتی اور فکری اثرات نے جو بعض لوگوں میں شدت سے ظہور پذیر ہو چکے ہیں، بعض عجیب و غریب اور مخصوص نوعیت کے مظاہر پیدا کر دیئے ہیں۔ مثلاً اس نوع کا ایک مظاہرہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلامی احکام میں اس انداز کی تاویلیں کی جانے لگی ہیں، جو زیادہ تر تکلف و تعسف سے خالی نہیں ہوتیں۔ ان تاویلات کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں تطبیق کی کوئی صورت نکالی جائے۔ لیکن یہ سب کچھ اسلام کی قربانی دے کر کیا جاتا ہے۔ گویا وہ چاہتے یہ ہیں کہ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر اور اس کی قطع و برید کر کے اسے ایک ایسی بوتل میں بند کیا جا سکے۔ جس کا دہانہ تنگ ہو۔ چاہے ایسا کرنے کے لیے انھیں اس کے ہاتھ پاؤں یا اس کے جسم کے کسی بنیادی عضو ہی کو کاٹنا چھانٹنا کیوں نہ پڑ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس سلسلہ میں میں کچھ مثالیں پیش کروں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہ مثالیں میری ذاتی رائے پر مبنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دوسری مثالیں اس مقام پر زیادہ بہتر ہو سکتی ہوں اور ان سے بہتر طور پر استشہاد کرنا ممکن ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال نامور شخصیتوں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کے مجسموں کا قایم کرنا ہے۔ بعض مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں کا خیال ہے کہ اسلام میں مجسمہ سازی چند وجوہ سے حرام کی گئی تھی، جو اب باقی نہیں رہیں۔ لہٰذا اگر آج ہم اپنے سربرآوردہ لوگوں کے مجسمے نصب کرنے لگیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں مجسمہ سازی اور ان کی تنصیب کی حرمت کی وجہ صرف بت پرستی کے رجحان کو روکنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے کہیں گہری ہے۔ نامور شخصیتوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اسلام نے اس انداز کو کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس نے معنوی اور ذہنی تقدیس و عظمت اور احترام پر زور دیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذہنی تقدیس اور حرمت و عظمت کے اثرات مجسموں کی تنصیب سے کہیں زیادہ دیرپا اور گہرا اثر چھوڑ جانے والے ثابت ہُوئے ہیں۔ آج تقریباً چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور دیگر ائمہ اور بزرگوں کی یاد مسلمانوں کے دلوں میں اس سے کہیں زیادہ تازہ ہے، جو یورپ کے لوگوں کے دلوں میں ان کے جگہ جگہ اپنی نامور شخصیتوں کے مجسمے نصب کر دینے سے ہو سکتی ہے۔ میں نے پیرس، لندن، ماسکو وغیرہ

یں خود اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ نامور شخصیتوں کے مجسموں کے سامنے وہاں کے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ باشندوں پر بھی وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے، جو کسی جاہل سے جاہل مسلمان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین اور دیگر بزرگانِ دین کا محض نام لے دینے سے مرتب ہو جاتے ہیں حالانکہ ان تمام حضرات کے مجسمے کبھی بھی نصب نہیں کیے گئے۔

مجھے عرض کرنے دیجیے کہ مجسمے وہی قومیں نصب کرتی ہیں جو قدیم الایام سے بُت پرستی کرتی رہی ہیں اور جن کے ہاں ہمیشہ سے یہ ذہنیت کارفرما رہی ہے کہ جب کوئی ہیرو ان کی قوم میں پیدا ہُوا تو انھوں نے ہمیشہ اسے انسانوں کی صف سے الگ کر کے دیوتاؤں کی صف میں شامل کر دیا۔ کیونکہ ان کی عقل میں کبھی یہ بات آ ہی نہیں سکتی، کہ ہیرو بھی انسان ہو سکتا ہے۔ اسی ذہنیت کے ماتحت انہوں نے اپنے ہیروؤں کو دیوتا بنا کر ان کے مجسمے نصب کیے۔ آج بھی وہی ذہنیت ایک دوسرے رُوپ میں اپنی نمایندگی کر رہی ہے ظاہر ہے کہ اسلام اس نقطۂ نظر کا حامی نہیں ہے۔

لاٹری اور سٹہ بازی بھی اس کی ایک مثال ہے۔ جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کا بظاہر گہرا ما حصل یہی ہے کہ اخلاق کے سرچشمے، جو ایمان کی گہرائیوں سے پھُوٹتے ہیں، ان کے سوتے دلوں میں خشک ہو گئے ہیں اور لوگ اس قدر مادہ پرست بن چکے ہیں کہ وہ مادی منفعت اور منفعت اندوزی کے علاوہ کسی چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ جب تک اشیاے صرف کی قیمتیں نہ بڑھ جائیں، کسی نیک کام کے لیے ان سے ایک پیسہ وصول نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا سٹہ اور لاٹری کا اوارہ دلوں کے اخلاقی چشموں کے خشک ہو جانے پر مبنی ہے۔ دلی جذبات اور نفس کی گہرائیوں سے جب اخلاق کے سوتے پھُوٹتے ہیں، تو ان کا مظاہرہ ہمیشہ قربانی اور ایثار کی شکل میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو اس کا ظہور قیمتیں بڑھانے کے خسیس اور ناجائز کسب کی صورت ہی میں ہو رہا ہے۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس نوع کی خرافات یا اس قسم کے رجحانات کے درمیان جن کا نام میں "تکلف و تاویل" رکھتا ہوں اور نئے حوادث اور نئے واقعات کی کیفیات کا اندازہ لگانے کے درمیان، جن کے لیے واقعی شریعت اسلامیہ سے احکام مستنبط کرنے کی ضرورت ہے فرق کرنے کا قائل ہُوں۔ اس قسم کے مسائل کو میں آیندہ بیان کروں گا۔

اسلامی مفہومات میں رنگ آمیزی اسلامی تصورات میں رنگ آمیزی کا رجحان جو آج دوسری تہذیبوں سے ملاپ کی بنا پر پیدا ہو رہا ہے، ہماری تاریخ میں کوئی انوکھا رجحان نہیں ہے ہماری پرانی تاریخ بھی اس قسم کے رجحانات سے بھرپور ہے۔ اس سے پہلے ہمارا ٹکراؤ اور تصادم یونانی فکر کے ساتھ ہو چکا ہے اور اس تصادم سے بے شمار نئے رجحانات پیدا ہُوئے تھے۔ مثلاً علم کلام کے مسائل۔ کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اسلامی عقیدہ نے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہہ لیجیے کہ اسلامی ایمان نے، کیونکہ عقیدہ کا لفظ بھی خود بعد کی پیداوار ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد میں یہ فلسفیانہ جدلی صورت اختیار نہیں کی تھی جو عہد عباسی میں اسے حاصل ہوئی۔

اس سے پہلے ایمان کا لفظ ——— ایمان قرآنی لفظ ہے ——— عقلی اور نفسیاتی دونوں معنوں پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں رجحانات، یعنی عقلی اور نفسیاتی، ظہورِ اسلام کے وقت ابتدائی عہد میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جُلے اور

پوری طرح ایک دوسرے میں گتھے ہوئے تھے۔ پھر ہم یکایک دیکھتے ہیں کہ اسلام کی تین الگ الگ شاخیں ہوگئیں۔ ایک شاخ تو فقہ کی تھی، جس کا کام عبادات و معاملات کے سلسلہ میں ظاہری احکام و شعائر سے بحث کرنا تھا۔ دُوسری شاخ وُہ تھی، جو اسلام کے اعتقادی عقلی کے گوشوں سے بحث کرتی تھی۔ اس کو "علم کلام"، "عقیدہ" یا "علم توحید" کا نام دیا گیا۔ اسلام کی تیسری شاخ قلبی اور اخلاقی گوشوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے اخلاق یا زہد کہہ لیجئے۔ یہ وہی شاخ ہے، جو صدر اوّل کے بعد تصوف کے نام سے پکاری گئی۔ لہٰذا اس کا ماحصل یہ نکلا کہ اسلام تین شعبوں سے مرکب مانا گیا، جن میں سے ہر ایک شعبہ ایک دوسرے سے الگ تھا۔ فقہ، کلام اور اخلاق۔

اس گزارش سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ فقہاء اسلام کو علم کلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا یا متکلمین، سب کے سب فقہ سے بالکل بے بہرہ ہوا کرتے تھے یا زہاد اور واعظ حضرات کو فقہ اور عقاید سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر کسی ایک شعبہ کا غلبہ ہُوا کرتا تھا۔ چنانچہ کچھ لوگ متکلم کہلاتے تھے، کچھ فقیہہ کہلاتے تھے اور کچھ زاہد اور صوفی کہلاتے تھے۔ اگرچہ بعض شخصیتیں ایسی بھی گزری ہیں، جو ان تینوں شعبوں کی جامع تھیں۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اسلام جو کبھی ایک جامع وحدت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد ان مختلف پہلوؤں میں بٹ گیا، جو ایک دُوسرے سے الگ الگ تھے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود اسلام کی اپنی صورت ہی چند گوشوں میں بٹ گئی۔ ایک اسلام تو علم کلام کا ہو گیا، دوسرا اسلام اخلاق کا قرار پا گیا اور تیسرا اسلام فقہ کا سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ اسلام تو اسلام ہی ہے۔ وہ نہ کلام کا اسلام ہے، نہ فقہ کا اسلام ہے اور نہ تصوف کا اسلام ہے۔ میرے نزدیک مختلف پہلوؤں والے اسلام کو ممکن ہی نہیں کہ اسلام کی مکمل اور کامل صورت سمجھا سکے۔ اسلام کے ان مختلف پہلوؤں میں بٹ جانے سے ہوسکتا ہے کہ علمی اور تدریسی اعتبار سے کچھ افراد کے لیے کسی قدر سہولت و کفایت ہوگئی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اجزا اُسے وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی، جو مرکب صورت میں ایک مجموعہ کے اندر ہوسکتی ہے۔ پہلی قسم کا اسلام صدر اوّل یعنی صحابہ کرام کا اسلام تھا، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع رہتے تھے۔ یہ اسلام ان تینوں اجزا کو مرتب، متوازن اور زندگی بخش انداز میں جمع کیے ہُوئے تھا۔ لہٰذا یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ ہم اسلام کو (فی ذاتہ) ان تصورات سے الگ کر کے دیکھیں، جو مختلف ادوار میں اسلام کو سمجھنے کے سلسلہ میں مسلمانوں نے قایم کیے تھے۔ ایک تو وہ اسلام ہے جو اپنی اصل اور سرچشمہ کے ذریعہ سے یعنی کتاب و سنت کے ذریعہ، جو اس کے اصلی مصادر ہیں، سمجھا جا سکتا ہے اور دوسرے ہر عہد کے مسلمانوں کی اپنی اپنی فہم ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں بعض مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے میں غلطیاں بھی کی ہیں، لیکن ان غلطیوں سے اسلام کی ذات پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ہی اسلام کے اصل مصدر اور اس کی حقیقی صورت پر خوردہ گیری کی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس فہم کو ہم اسلام کی حقیقی تصویر سے قریب تر سمجھ سکتے ہیں اور جس سے ہم اسلام کو سمجھنے میں مانوس ہوسکتے ہیں، وہ درحقیقت صدر اوّل یعنی عہد صحابہ و تابعین ہی کی فہم ہو سکتی ہے۔ میرا مقصد اس بیان سے یہ نہیں ہے کہ بعد کے تمام زمانوں میں مسلمانوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ سمجھنے کی کوششیں فرمائیں، میں خدانخواستہ ان کی تنقیص کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں بڑے بڑے علماء، محققین اور ایسے ایسے حقایق کا ادراک کرنے والے پیدا ہوتے ہیں، جن کے حلقے اور سلسلے آج

تک جا رہی ہیں اور ختم نہیں ہوتے۔ بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب تک ہم اسلام کے رُخِ تاباں سے ان حجابات و نقابات کو نہ اٹھائیں خواہ وہ ہمارے زمانہ کے ہوں یا پچھلے زمانوں کے، اسلام کی ذاتی اور حقیقی صورت ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ اسلام درحقیقت ایک نظامِ کامل ہے۔ وُہ اپنے طور پر خود زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا تصور ہے، جو خود وجود پر بھی حاوی ہے۔ اس کا تعلق صرف سمجھ لینے ہی سے نہیں بلکہ سمجھ کر اس پر یقین کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی نظام بھی ہے جس کے سوتے خود اس تصور اور ایمان ہی کے سرچشموں سے پھُوٹتے ہیں۔

اسلامی تصور یا اسلامی مفہوم کا ایک عام خلاصہ یہ ہوگا کہ یہ عالم طبعی جو انسان کو احاطہ کیے ہُوئے ہے اور یہ ساری کائنات جس میں انسان زندگی گزارتا ہے، اس کا اُفق اور اس کی مسافتیں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو جائیں، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مخلوق ہے جس کے اُوپر ایک قوت خالقہ اور ایک حیات مدرکہ موجود ہے۔ یہ خالق کی قوت ہے۔ اس کائنات اور اس سرزمین میں انسان بذاتہٖ اسی خدائے خالق کا خلیفہ ہے تاکہ وہ اس میں زندگی بسر کرے اور اس میں جو نعمتیں طبعیات اور ارزاق بلکہ حلال اور مشروع لذات کی پائی جاتی ہیں، ان سے استفادہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ اسے اپنی خلافت، استفادہ اور سعی و عمل کا حساب بھی دینا ہے اور اس قوت خالقہ، مدرکہ اور محاسبہ کے سامنے ہر بات کی جواب دہی بھی کرنا ہے۔ اس فہم اور ایمان سے عمل اور عبادت کے دو ہموار پہلو اور سوتے پھُوٹتے ہیں، جن میں شدید اتصال پایا جاتا ہے۔ یعنی مثلاً زمین میں کھیتی کرنا اور ساتھ ہی اس قوت خالقہ کی صنعت و کاریگری پر غور و فکر کرنا، جس نے زمین کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے لیے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں۔ یہ عمل اور عبادت دراصل ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں چنانچہ وہ جب زمین میں ہل چلاتا ہے یا اپنے ہاتھ سے ہل کو حرکت دیتا ہے، تو وہ خدا ہی کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اس طرح جہاں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے وہیں اس کا عبادت گزار بھی ہے۔ اسی طرح جب وہ دن کی چند ساعتوں میں تنہائی میں اپنے خالق کا تصور کرتا ہے اور غور کرتا ہے کہ اس موجودہ زندگی کے بعد جواب دہی اور حساب کا مرحلہ بھی پیش آنا ہے، تو وہ اس وقت بھی خدا کا مطیع ہوتا ہے۔ اس فکر یا اس عقیدہ یا اس ایمان کے ماتحت صحیح طور پر کچھ اخلاقی تعلیمات جنم لیتی ہیں۔ یہ تعلیمات ایک طرف تو زندگی کے کچھ واقعی مسائل کو حل کرتی ہیں اور دوسری طرف وہ روحانی ترقی کے لیے بھی کام کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اذہان کے لیے ایک وسیع میدان مہیا کر دیتی ہیں۔ انھیں متعین حدود میں کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ اور اس انداز سے کام کرتی ہیں کہ اس کے تمام اعمال اخلاقی اور روحانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں اس موقعہ پر اسلام کے اخلاقی نظام کی تلخیص اس سے زیادہ الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ پھر وہ انسان جو اس طرح کا ایمان رکھتا ہو اور زندگی میں اس انداز پر عمل کرتا ہو، وہ تنہا ایک فرد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے، جو ایک اجتماعی ہیئت کا حصہ ہوتا ہے اور اسی اجتماع میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسلام ہی اس کے رجحانات، صفات اور افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعلقات کی حد بندی کرتا ہے۔ اسلام اس فرد کی تکمیل کا سامان اس حیثیت سے کرتا ہے کہ وُہ ایک معاشرہ یا ہیئت اجتماعیہ کا جزو ہے۔ اس کے لیے ایسے قوانین اور ہدایات صادر کرتا ہے، جس میں فرد کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت پورے

اعتدال و توازن کے ساتھ جمع ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے لیے ایک نظام اجتماعی قایم کرتا ہے، جو اس کی انسانی یعنی مادی اور روحانی ترقیات کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ نظام اجتماعی نظامِ حکومت پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد و اساس شوریٰ، مساوات، عدالت اور جواب دہی کے تصور پر قایم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظام اجتماعی ایک اقتصادی نظام بھی پیش کرتا ہے، جو ایک طرف عدالت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری طرف باہمی اجتماعی کفالت پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ وہ نظام اجتماعی ایک ایسے عائلی نظام پر بھی مشتمل ہوتا ہے، جس میں ایک طرف ابتدائی دور کے آزاد فطری رجحانات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ساتھ ہی ایک تربیت یافتہ سلیم الطبع ہیئت اجتماعیہ کا رنگ بھی منعکس ہوتا ہے۔

یہ ہیئت اجتماعیہ جس کے سیاسی، اقتصادی اور عائلی پہلوؤں کی اسلام تنظیم کرتا ہے، تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے سعادت و ارتقاء کی منزلیں طے کر سکے، دراصل چند اخلاقی اور اعتقادی بنیادوں پر ہی قایم ہے۔ جو اس کے نظام کے تنوں اور اس کی عمارت کی بنیادوں کا کام دیتی ہیں۔ چنانچہ اسلامی تشریع، جو اپنے موضوع اور تنظیم کے اعتبار سے چند ظاہری بنیادوں اور موضوعی ضوابط پر مبنی نظر آتی ہے، دراصل خود انسانی نفس میں اس کے اخلاقی بیج اور اعتقادی اصول جاگزیں ہوتے ہیں۔ وہی اسے غذا دیتے، اسے نشوونما دیتے اور استحکام بخشتے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی تشریع جس کا تعلق اخلاق سے منقطع نہ ہو، خواہ ان دونوں کی الگ الگ بنیادیں بھی کیوں نہ ہوں، کسی دوسرے انداز تشریع کے ساتھ ملتبس نہیں ہو سکتی۔ یہ اخلاق، خود بالذات یا عام فلسفہ یا کامل اعتقاد پر منحصر ہوتے ہیں۔

اس طرح اسلامی نظام میں اس کا عقیدہ یا فلسفہ اور اخلاق اور اجتماعی تشریع سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل وحدت کی تشکیل کر لیتے ہیں۔ جو زندگی کی وحدت کا سامنا کرتی ہے۔ اسلامی نظام کی یہی سب سے بڑی فضیلت ہے، جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ تمام دوسرے نظام زندگی کے پہلوؤں میں سے محض کسی ایک پہلو ہی کی رعایت کرتے ہیں، اور یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کی طرف اس حیثیت سے غور ہی نہیں کرتے کہ وُہ ایک مکمل وحدت ہے۔ وحدت، توازن، ترتیب و عمومیت ہی وہ خصائص کبریٰ ہیں، جو اسلامی نظام کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتے ہیں، خواہ وُہ نظام مادی ہوں یا روحانی ہوں یا دینی ہوں۔

اسلامی نظام میں نسبتوں کی تعیین

اسلامی نظام میں وحدت کی خصوصیت کے علاوہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دُوسری خصوصیت بھی ہے، جو اپنی اہمیت میں کسی طرح بھی وحدت کی خصوصیت سے کم نہیں ہے۔ اور یہ خصوصیت زندگی کے پہلوؤں اور اس کی اقدار کے درمیان نسبتوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مال، لذت، عمل، عقل، معرفت، قوت، عبادت، قرابت، قومیت اور انسانیت وغیر زندگی کی اقدار میں سے چند قیمتی اقدار ہیں۔ اسلام نے اپنے نظامِ حیات میں ان سب کا مرتبہ اور مقام متعین کر کے ایک نسبت مقرر کر دی ہے کہ وہ اس سے آگے نہ بڑھنے پائے تاکہ کوئی قدر کسی دوسری قدر پر زیادتی نہ کر سکے۔ چنانچہ ان اقدار کی نسبتوں میں کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانا کہ کوئی قدر اپنی حد سے بڑھ جائے اور کوئی قدر دوسری اقدار کی نسبت سے گھٹ جائے۔ اسلام کے لیے خالص ملمع کاری اور فریب ہے۔ جیسا کہ عملاً

ہمارے آخری ادوار میں ہو رہا ہے۔ زندگی کے نظام میں نسبتوں کے درمیان کوئی تبدیلی عمل میں لانا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی مصور کارٹون بناتے ہوئے جسمانی نسبتوں میں تغیر و تبدل کر دے۔ جس میں انسان کے اہم اعضاء اور اجزا، تو سب کے سب موجود ہوں لیکن وہ اس انداز سے ہوں کہ اس سے مسخرا پن اور استہزا ٹپکتا ہو، یا جیسے کسی مرکب دوا کے اجزاء میں نسبتوں اور اوزان میں تبدیلی کر دی جائے، جس سے دوا کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور اس کی ساری صفات اور خصوصیات بدل جائیں بلکہ بسا اوقات وہ بجائے فائدہ رساں ہونے کے ضرر رساں بلکہ مہلک بن جائے۔ لہٰذا اگر ہم زندگی کے مثلاً سو جزو فرض کر لیں، تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ان میں سے عبادت کے لیے چند اجزا مخصوص کر دیے ہیں، انفاق، کسب، جہاد، مشروع لذتوں سے استفادہ وغیرہ۔ ہر بات کے محدود حصے مقرر ہیں۔ اگر ہم ان نسبتوں کو بدل دیں اور مثلاً جہاد کی قیمت گھٹا کر عبادت کی قیمت میں اضافہ کر دیں اور مثلاً مال کا حق کسب و انفاق پر دو اعتبار سے گھٹا دیں اور لذتوں کو گراں کر دیں یا انھیں لغو قرار دے دیں، تو اس طرح ہم اسلام کے نظام سے نکل کر کسی اور نظام میں داخل ہو جائیں گے، جو اپنی حقیقت اور رُوح کے اعتبار سے اسلامی نظام کے خلاف ہوگا۔ اس طرح ہم اس توازن کو برباد کر دیں گے، جو اسلام نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں قایم کیا ہے۔ چنانچہ آخری ادوار میں کامل مسلمان اسے سمجھا جاتا تھا، جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہے، یہاں تک کہ کسی اور مشغلہ سے اسے سروکار ہی نہ ہو۔ محراب مسجد میں ہر وقت معتکف رہے اور اس سے کبھی جدا ہی نہ ہو۔ اپنے اذکار و اوراد میں چوبیس گھنٹے مصروف رہے۔ یہ صورت حال یقیناً اس صورت سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے، جو آپ کے بہترین پیروکار تھے، اپنی زندگی گزاری تھی۔ اگر عبادت ہی ان کی زندگی کا بنیادی جزو ہوتا، تو وہ جہاد کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہو سکتے۔ معاشرہ کو فاسد عقاید سے آزاد کرنے کی راہ میں جہاد، صحیح عقاید کو لوگوں کے دلوں میں راسخ کرنے کے لیے جہاد، ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لیے، کمزوروں کی حمایت کے لیے، لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کے لیے، جہاد کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ رہتا۔ بالکل اسی طرح ایسے مسلمانوں کی زندگی بھی، جو ہر وقت جہاد اور اصلاح معاشرہ ہی میں مصروف رہیں، اسلام کی مکمل تصویر کے مقابلہ میں ناقص ہی کہلائے گی۔ جب کہ اس کی زندگی عبادت کے عنصر سے بالکل ہی خالی ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہو۔

ہمارے فقہائے متقدمین کو اس تصور یعنی باہمی نسبتوں کے تصور کا پورا پورا احساس تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان فرائض وغیرہ کو، جن کا ایک مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے، قوت کے اعتبار سے متفاوت درجات میں تقسیم کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ انھوں نے ممنوعات اور محرمات کے الگ الگ درجے قرار دیے ہیں۔ چنانچہ گناہ کے اعتبار سے وہ مجاہد اور سرحد کا محافظ جو جہاد کی صف میں اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور وہاں دشمن کو گھس جانے کا موقع دے دے، اس شخص کے برابر نہیں ہوتا، جو شراب پی لیتا ہے یا سور کا گوشت کھا لیتا ہے۔ حالانکہ دونوں باتیں از روے شریعت حرام ہیں۔ قرآن کریم کی آیات اور بے شمار احادیث بھی اس تصور یعنی تعیین مراتب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

أجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام كمن آمن بالله واليوم الآخر وجاهد في سبيل الله لا يستوون عند الله۔ (سورۃ توبہ، آیت ۱۹)

دکیا تم نے حاجیوں کو پانی پلا دینے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو ان لوگوں کے اعمال کے برابر سمجھ لیا ہے، جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں؛ ہرگز نہیں۔ یہ سب اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہوسکتے)

اگر ہم اس نوعیت کی احادیث جمع کرنا شروع کردیں، جو بعض اعمال کی قدر و قیمت کچھ دُوسرے اعمال کے مقابلہ میں متعین کردیتی ہیں، تو ہم زندگی کی اقدار کی ریاضی کی کسور کے ساتھ نسبتیں مقرر کرسکتے ہیں۔ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امام عادل کا ایک دن کا عمل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہوتا ہے[۱]۔ نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ ایک عالم کی فضیلت ایک عبادت گزار آدمی پر ایسی ہی ہے، جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر[۲]۔ نیز آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ایک فقیہہ شیطان پر بہ نسبت ہزار عابدوں کے زیادہ گراں ہوتا ہے[۳]۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوسکتی ہے، جو اپنی تمام تر توجہات کا رُخ کسی ایک امر کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ جو اسلام میں فی ذاتہ مطلوب یا ممنوع ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے امور بھی ہوسکتے ہیں، جو اہمیت میں اس سے بڑھے ہوئے ہوں۔ مثلاً آج کل اسلامی ممالک دو بڑے خطرات سے دوچار ہیں۔ ان میں سے ایک استعمار ہے اور دوسرا الحاد۔ جن میں سے ایک زمین پر استیلاء اور غلبہ ہے اور دوسرا عقیدہ پر استیلاء اور غلبہ۔ یعنی اسلامی ممالک کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی ثروتوں کا سلب و نہب۔ چنانچہ اگر کسی ملک پر مکمل استیلاء حاصل ہوجائے اور وہاں کے باشندوں کے عقاید کو ختم کردیا جائے اور یہ صورتِ حال کچھ عرصہ تک قایم رہ جائے، تو دینی شعائر کو قایم کرنے، اسلامی اوامر کی تعمیل کرنے، اس کے احکام کے اپنے حالات سے تطبیق دینے کے مواقع ہی کہاں باقی رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کے اذہان کو دُوسرے معاملات کی طرف موڑنا اور انھیں اسلامی تنازعات کا محور بنا لینا درحقیقت بنیادی معاملات سے انھیں غافل کردینا ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اسلامی ممالک پر براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مغربی تسلّط و استیلاء ہے۔ اور ان مغربیوں کا مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے اسلامی عقاید کی بیخ کنی کرنا اور ملحدانہ افکار و مذاہب کی اشاعت ہے، جس کی صورتیں ہر جگہ مختلف ہیں، تو کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ مسلمانوں کو گروہوں میں تقسیم کردیا جائے، جن میں سے کچھ تو یہ کہہ رہے ہوں کہ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں اور کچھ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ نہیں، یہ بیس ہیں۔ کچھ کا یہ نظریہ ہو کہ ایک مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے اور کچھ ان کے برخلاف اسے ناجائز سمجھتے ہوں۔ یا سنّت اور بدعت کے معرکے ایسے معاملات میں برپا کرنا، جن کا عقاید سے کوئی تعلق نہیں۔ مدعا یہ نہیں ہے کہ ان موضوعات پر علمی انداز سے بھی بحث نہ کی جائے، بلکہ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کی تنبیہات اس وقت ضروری ہوسکتی ہیں، جب کہ عقاید و عبادت تک کوئی بات پہنچ جائے،

---

[۱] ایک روایت میں ہے، کہ ایک گھنٹے کا عدل و انصاف ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ یعنی تمام رات کے قیام اور دن بھر کے روزہ سے افضل ہے اور ایک گھنٹہ کا ظلم ساٹھ سال کے گناہوں سے زیادہ سخت ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے۔

[۲] اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ صرف ولید بن مسلم اس کا راوی ہے۔ [۳] اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔

تو ایسی صورت میں عبادت وغیرہ کے متعلق صحیح طریقہ کی طرف متنبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ عبادت کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سب کی سب توقیفی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حکم دے دیا ہے یا کر کے دکھا دیا ہے، اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے، نہ زیادتی۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس سے بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو یا مسلمانوں کی دو جماعتوں میں خصومت یا عداوت کی آگ بھڑکتی ہو تو میرے خیال میں اسے بھی چھوڑ دینا واجب ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی ناگوار صورت حال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، جو اس اصل منکر (ناپسندیدہ عمل) سے بھی زیادہ منکر ہے۔ موجودہ احوال وظروف میں مسلمانوں کی قوت کو پراگندہ کر دینا اور عظیم بنیادی مقاصد کو چھوڑ کر فروعی باتوں کی طرف متوجہ ہونا کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ تو مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دینا ہے، جو ان حالات میں خطرناک ترین جرم ہے۔

اسلام اور جدید مشکلات کا مقابلہ

نصوص کو سمجھنے میں تکلیف

مسلمانوں کو جب اس زمانہ میں مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو مسلمانوں نے مختلف موقف اختیار کیے۔ کیونکہ انھیں متنوع حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بعض اوقات مسلمانوں نے اسلام کی پیمائش دوسرے پیمانوں سے اور اس کے مسائل کا اندازہ ان اقدار سے کرنا شروع کر دیا، جو مسلمانوں کے اپنے نہیں تھے بلکہ دوسرے غیر مسلم نظاموں سے مانگے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آتے، جو اسلامی نصوص کو سمجھنے میں تکلف برتتے اور الفاظ کے مدلولات کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھانے لگے۔ اس کی مثال میں وہ لوگ پیش کیے جا سکتے ہیں، جو مالی ٹیکسوں کے شعبہ کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں مالی ٹیکسوں کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اسلام میں صرف زکوٰۃ ہے اور اس کے سوا کوئی ٹیکس نہیں۔ اگر یہ انکار کرنے والے دقیقہ رس ہوتے اور انھیں ذرا بھی واقفیت ہوتی، تو ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ ٹیکس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مال کی ایک مقررہ مقدار ہوتی ہے، جسے حکومت لوگوں سے جبراً وصول کرتی ہے۔ اس کا ایک متعین طریقہ ہوتا ہے، جو مال کی مجموعی مقدار پر ایک محدود نسبت سے عاید کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ٹیکسوں کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کا مطالعہ کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اسلام بعض ٹیکسوں کو برقرار رکھتا ہے اور بعض ٹیکسوں کا انکار کرتا ہے۔ خود زکوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ وہ بھی ایک مالی ٹیکس ہے۔ یہی حال مثلاً خراج اور جزیہ کا ہے۔ اگر ہم یہ سوال پیش کریں کہ کیا حکومت کا لوگوں پر ایسے ٹیکس لگانا جائز ہے، جن کے متعلق کوئی شرعی نص وارد نہ ہوئی ہو، تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ اسلام نے ایک قانون بنا دیا ہے، جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے، جو صحیح ترمذی میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فی المال حق سوی الزکوٰۃ"

(مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے)

اس حدیث نے حق کی کوئی تحدید نہیں فرمائی۔ اگر ہیئت اجتماعیہ کی مصلحت مال خرچ کرنے کی مقتضی ہو اور بیت المال میں اتنا مال موجود نہ ہو، جو کفایت کر سکے اور یہ مصلحت بھی ضروری ہو۔ مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع یا فقرا یا مساکین کی ضروریات کو پورا کرنے

کے لیے اگر اموال زکوٰۃ کافی نہ ہو سکتے ہوں اور مزید اموال کی ضرورت ہو تو حکومت اور مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحبِ مقدرت لوگوں کے اموال میں سے اتنا مال لے لے جو اس ضروری احتیاج کے لیے کافی ہو سکے۔ اس بنا پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیکس لگانا فی نفسہ کوئی معیوب بات ہے۔ البتہ اگر حاکم کوئی ایسا مالی ٹیکس لگا دے، جس کا کوئی واقعی جواز موجود نہ ہو یا اس سے لوگوں کی ایک بڑی جماعت پر ظلم و ستم ہوتا ہو، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکم نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے، جسے اسلام قبول نہیں کرتا۔ اس بات کی قطعی کوئی اہمیت نہیں کہ ٹیکس ("ضریبہ") کا لفظ یا اصطلاح جدید زمانے کی پیداوار ہے۔ یہ لفظ یا اصطلاح قدیم زمانے میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لفظ یا اصطلاح کے نئے ہونے سے یہ استدلال تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مدلول اور اس کے معنی بھی قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ بلکہ حقیقت حال تو اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ اس کا مدلول (یعنی رعیت کے مال میں حکومت کی طرف سے اپنے لیے کچھ کم حصہ مقرر کر دینا) قدیم زمانہ میں بھی معروف تھا۔ حتیٰ کہ دراصل زکوٰۃ بھی خود اس وسیع مفہوم کے تحت آتی ہے۔ البتہ زکوٰۃ ٹیکس کی کم سے کم مقدار ہے، جو لامحالہ ضروری ہے اور جب ہم اس حدیث پر غور کریں جو یہ بتا رہی ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی دوسرے حقوق ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس دوسری حدیث پر بھی غور کریں، جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ "ہم ایک مرتبہ حضورؐ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یکایک ایک آدمی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور دائیں بائیں نظریں گھمانے لگا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو تو وہ اسے دے دے، جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ زادِ راہ ہو، تو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں ہے، اور اس کے بعد مال و دولت کی بہت سی اقسام بیان فرمائیں، حتیٰ کہ ہمیں نظر آنے لگا کہ ضرورت سے زیادہ کسی چیز میں بھی ہمارا اپنا کوئی حق نہیں ہے۔" مجھے عرض کرنے دیجیے کہ جب ہم ان دونوں حدیثوں پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے (جیسا کہ ہمارے فقہائے کرام نے بھی بیان فرمایا ہے) کہ جب ضرورت مقتضی ہو اور مصلحت عامہ کا مطالبہ ہو، تو وہ لوگوں کے ایسے اموال سے، جو ان کی اصل اور بنیادی ضرورت سے زیادہ ہو، اتنا کچھ لے سکتی ہے، جس سے وہ ضرورت اور مصلحتِ عامہ پوری ہو سکے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اموال کی ملکیت کے معنی اسلامی مفہوم میں یہی ہیں کہ وہ اس نوع کی ملکیت ہے، جسے حکومتِ وقت ضرورت اور مصلحت عامہ کے ساتھ محدود کر سکتی ہے۔ البتہ ضرورت اور مصلحت کا اندازہ کرنا حاکم کی خواہشات کے تابع نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے ان مقاصد کی روشنی میں، جو شرعی نصوص سے مستنبط ہوں، ان کا اندازہ لگایا جائے اور صرف ضرورت ہی کی حد تک رہا جائے، اس سے تجاوز نہ کیا جائے۔ ہمارے فقہائے کرام نے بھی ان حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جن میں حکومت کو مالداروں کے اموال یا لوگوں سے زائد از ضرورت اموال لے لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ ضروری احتیاج کو رفع کیا جا سکے۔

جدید حالات پر شریعت کے قوانین کی تطبیق

زمانے کی رفتار بڑی تیز ہے۔ آئے دن ایسے نئے حالات و واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کا تقاضا ایسے نئے فیصلے کرنے کا ہوتا ہے جو شریعت کے مبادی پر مبنی اور اس کے نصوص اصول عامہ اور مقاصد سے مستنبط ہوں۔ اس کی مثال ہمارے اس دور میں محنت کشوں کے مسائل ہیں۔ بعض لوگ کہنے لگے ہیں کہ مزدور یا کاریگر سرمایہ دار کا ایک اجیر (اُجرت پر کام کرنے والا) ہوتا ہے۔ اس لیے

اس پر اجارہ کے وہی احکام منطبق ہونے چاہئیں جو کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ جو معاہدہ مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان طے پا چکا ہے، جب تک اس میں شرائطِ اجارہ پوری طرح موجود ہوں، تو ان ہی کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ کارخانہ دار پر یا مزدور پر کوئی دوسری شرط اپنی طرف سے عاید کر سکے۔ مثلاً اجرتوں پر نظرثانی یا اوقاتِ کار کی کوئی نئی پابندی ممکن نہیں۔

اگر ہم اس مسئلہ پر شریعت کی روح کو سامنے رکھ کر غور کریں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ خیال بالکل ہی سطحی بلکہ ناقابلِ قبول ہے اور آجکل کے پیچیدہ حالات سے ناواقفیت اور شریعت کی رُوح سے جہالت پر مبنی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مزدور اکثر اپنی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس اجرت کو قبول کرلے، جو اسے پیش کی جارہی ہے حالانکہ یہ اجرت اکثر و بیشتر اس اجرت سے کم ہوتی ہے جس کا وہ واقعی طور پر مستحق ہے۔ یہ پیچیدگی اس وقت اور بھی شدّت اختیار کر جاتی ہے جب کارخانہ دار کوئی فردِ واحد ہو یا مشترکہ سرمایہ کی کمپنی، یا چند کمپنیوں کا کارٹل، جنھوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے یہ طے کر لیا ہو کہ وُہ مزدوروں کو معمولی اور ناقابلِ ذکر اجرت سے زیادہ نہیں دیں گے۔ کیونکہ انھیں تو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی حرص ہوتی ہے اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں کاریگروں کی شدید احتیاج سے وہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اکثر کارخانہ دار اپنے کاریگروں سے لمبے لمبے گھنٹوں تک پُرمشقت کام لیتے ہیں، جیسا کہ یورپ میں مشینی صنعت کے ابتدائی دور میں ہوتا رہا ہے۔ ان جیسے حالات میں تھوڑے سے مالدار اور با رسوخ لوگ ہزاروں کاریگروں سے جو غریب، حاجت مند اور بے رسوخ ہوتے ہیں، اپنے فیصلوں کو منوانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

تو کیا ہم ان مزدوروں کو ان کے فقر اور بدحالی میں چھوڑ دیں؟ اسلام اس مشکل کا یہ علاج کر سکتا ہے کہ وہ غریب کاریگروں کو بیت المال سے مالی امداد دے جب کہ ان کا فقر و فاقہ کارخانہ داروں کے ظلم و ستم کا نتیجہ نہ ہو اور اگر بیت المال میں زکوٰۃ کی مد میں اتنا مال و دولت نہ ہو، جو اس ضرورت کو پورا کر سکے، تو حکومت مالداروں پر مزید ٹیکس لگا سکتی ہے تاکہ اس سے ان فقراء کی ضروریات پوری کی جا سکیں، لیکن جب یہ فقر و فاقہ ان کارخانہ داروں کے ظلم و ستم کا نتیجہ ہو، وہ انہیں کے استحقاق سے بہت ہی کم اجرت دیتے ہوں، یا منافع کی تقسیم میں عدالت اور انصاف کا جو تقاضا ہونا چاہیے کارخانہ دار اس کا لحاظ نہ رکھتے ہوں، مزدوروں کو بہت کم اجرت دے کر خود بے اندازہ منافع لے اڑتے ہوں، تو ان صورتوں میں حکومت کا یہ منصب ہے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کرے اور انصاف و عدالت کے مطابق اجرت کا تعین کر دے۔ فقہی طور پر یہ مسئلہ "باب التسعیر" (نرخ بندی) میں داخل ہے۔ جس طرح سامانِ تجارت اور اشیائے صرف کی قیمتیں مقرر کی جاتی ہیں، اسی طرح محنت کی اجرت اور قیمت مقرر کی جا سکتی ہے۔ اگر اشیائے خوردنی کی ذخیرہ اندوزی کی جارہی ہو اور اس کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزیں ظالمانہ نرخوں پر فروخت کی جارہی ہوں، تو اکثر فقہا نے صراحۃً حکومت کی طرف سے نرخ مقرر کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ اس فیصلے کو سامنے رکھتے ہُوئے یہ کہنا غلط نہیں کہ محنت بھی دیگر اشیائے صرف ہی کی طرح ہے اور اس کی بھی شرح منضبط ہونی چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

اُعطوا الاجیر اجرہٗ قبل ان یجف عرقہٗ۔

(مزدور کو اس کی مزدوری اس سے پہلے دے دو کہ اس کا پسینہ خشک ہو جائے)

ایک اور حدیث میں جو صحیح بخاری میں ہے، یہ مضمون آیا ہے:

ثلثة انا خصمهم یوم القیامة رجل اعطی بی ثم غدر ورجل باع حُرًّا فاکل ثمنه ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منه و لم یعطه اجره۔

(تین آدمی ہیں جن سے میں خود قیامت کے دن جھگڑوں گا اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب میں جھگڑا کروں گا تو میں غالب بھی آجاؤں گا۔ ایک تو وہ شخص ہے جسے میرا واسطہ دیا گیا اور پھر بھی اس نے عہد شکنی کی ہو۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس نے کسی آزاد آدمی کو غلام بنا کر فروخت کر دیا ہو اور اس کی قیمت کھا گیا ہو۔ تیسرا آدمی وہ ہے جس نے اجرت پر کسی مزدور کو رکھا ہو اور اس سے کام تو پورا لے لیا ہو مگر اس کی اجرت پوری پوری ادا نہ کی ہو)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں حدیثوں میں اجرت سے مقصود عدل و انصاف پر مبنی اجرت ہے، جس کا مزدور مستحق ہوتا ہے۔ وہ ظالمانہ اجرت نہیں، جسے وُہ شدت ضرورت کے تحت بظاہر رضامندی مگر درحقیقت سخت بددلی سے لیتا ہے۔ دوسری احادیث میں اس کی بھی ممانعت آئی ہے کہ بچوں اور باندیوں کو محنت و مزدوری کرنے پر مجبور کیا جائے، کیونکہ وُہ اس طرح چوری کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں:

عن عثمانؓ: قال لا تکلفوا الصبیان الکسب فانکم متی کلفتموهم سرقوا الا الحدیث۔

اخرجه المالک فی المؤطا۔

جیسا کہ دوسری احادیث میں خدام سے اتنا کام لینے کی ممانعت فرمائی گئی ہے، جو ان کی بساط سے زیادہ ہو:

ولا تکلفوهم من العمل ما یغلبهم ۔(الحدیث۔ اخرجه الخمسة الا النسائی۔)

یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ حکومت کو مباحات میں پابندیاں لگانے یا ان پابندیوں کو نافذ کر دینے کا حق ہے، جب کہ اس میں مصلحت عامہ مضمر ہو۔ ان تمام ہدایات میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ انھیں محنت کے نظام کی بنیاد بنایا جا سکے، جس سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ خواہ وہ کاریگر ہوں، یا کارخانہ دار، یا سرمایہ دار کیونکہ جس طرح یہ ممکن ہے کہ سرمایہ دار، مزدور اور کاریگروں پر ظلم کرنے لگیں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ واقعات اس کے برعکس پیش آنے لگیں۔ یعنی کاریگر اپنی کثرت تعداد، شور و شغب کی شدت اور بعض اوقات حکام پر غلبہ و تسلط پا جانے کی وجہ سے ناحق کے مطالبات پیش کرنے لگیں۔ اگرچہ زیادہ تر حالات میں پہلی ہی صورت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا شریعتِ اسلامیہ میں حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ عدل کو قایم کرے اور ہر شخص کو اپنی حدود میں رکھے اور قوانین شریعت کے مطابق ہر شخص کو وہ کچھ دے، جس کا وہ مستحق ہے۔ قوانینِ شریعت میں تین باتیں خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھی گئی ہیں:

۱۔ مصالح عامہ،

۲۔ لوگوں کے حقوق اور

۳۔ لوگوں کا آپس میں ایک دُوسرے کے ساتھ عدل و انصاف۔

یہاں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ امور مندرجہ بالا کا تعلق تو تشریع سے ہے اور حکومت کو تشریع کا حق نہیں۔ کیونکہ اسلامی نظام میں تشریع کا حق صرف خدا ہی کی ذات کو حاصل ہے۔ اس قسم کے دعاوی ایک شدید مغالطہ پر مبنی ہیں۔ آجکل تشریع کا لفظ بھی بالکل ہی نئی اصطلاح میں استعمال ہونے لگا ہے۔ وہ حالات جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ مثلاً اجرتوں کی تجدید۔ اوقات کار کی تحدید، اور دوسری پابندیاں، یہ درحقیقت تشریع نہیں بلکہ حالات کو قوانینِ شریعت سے تطبیق دے کر خود شریعت ہی کے احکام کو نافذ کرنا ہے۔ یہ مسائل سیاست شریعت کے باب سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شارع نے حکومتِ وقت کو اجازت دی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قایم رکھا جا سکے۔ اگر آج کچھ لوگ اس کا نام تشریع رکھ لیتے ہیں، تو اس سے یہ چیز ممنوع نہیں ہو جاتے گی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان لوگوں کا یہ نام رکھنا درست ہے یا غلط۔ معتبر وہ مفہوم ہے جس پر کوئی لفظ دلالت کرتا ہے اور وُہ فیصلہ، جو اسلام اس کے بارے میں کرتا ہے، ناموں کا اعتبار نہیں۔

اصطلاحات اور جدید تصنیفات

جن حالات میں اکثر التباس اور غلطی واقع ہو جاتی ہے، جدید اصطلاحی الفاظ کا استعمال بھی ہے۔ نیز اصطلاحات کی جدید تصنیف بھی ہے۔

نئے الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال بڑے خطرناک نتائج پر منتج ہوتا ہے اور بسا اوقات انحراف یا نامانوس مفہومات کو داخل کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بعض اوقات تو محض اصطلاح مقرر کرنے کی بات ہوتی ہے، جس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً اگر ہم نکاح و طلاق، نفقہ و وصیت اور میراث کے احکام کو کسی ایک باب میں جمع کر دیں اور اس باب کا نام "احوال شخصیہ" یا "عائلی احکام" رکھ دیں یا ہم ان احکام کو جن کا تعلق دوسری حکومتوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے تعلقات سے ہے "علاقات خارجیہ" یا "بین الاقوامی قانون" کے عنوان کے تحت ایک جگہ جمع کر دیں اور اصل احکام میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کریں، تو اس طرح ہم اسلام کے احکام اور ان کے مفہومات میں کسی خلل اندازی یا کسی رنگ آمیزی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ خود فقہاء کی مقرر کردہ بہت سی اصطلاحات بھی آغازِ اسلام کے بعد کے عہد کی پیداوار ہیں۔ مگر ان باتوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ایسا کرنا بعض اوقات عیوب و آفات سے خالی نہیں ہوتا، کیونکہ بعض مسائل کو دوسرے مسائل سے جُدا کر کے ایک خاص عنوان کے تحت جمع کر دینے سے اکثر ان مسائل کا تعلق دوسرے مسائل سے منقطع ہو جاتا ہے یا کم از کم وہ تعلق مخفی ہو جاتا ہے جو فی نفسہ بعض حالات میں مقصود ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک مثال "عقیدہ" کا لفظ ہے۔ میں نے یہ لفظ کتاب اور سنّت کی نصوص میں کہیں نہیں پایا اور میرا خیال ہے کہ یہ لفظ عباسی عہد میں اس معنی کے لیے گھڑا گیا ہے، جس میں آجکل وُہ استعمال ہو رہا ہے۔ جو لفظ قرآن و حدیث میں مستعمل ہے، وہ "ایمان" کا لفظ ہے۔ "عقیدہ" کا لفظ ائمہ اور علماے اسلام میں سے بے شمار لوگوں نے ان بنیادی افکار کے معنی میں استعمال کیا ہے، جن کی تصدیق کرنا، جنھیں قبول کرنا اور جن کا اعتقاد رکھنا دین پر ایمان لانے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ سلف میں سے ہمارے ائمہ اور علماء نے اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال کیا ہے، اس لیے اس بات کی دلیل بھی ہے کہ یہ جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ ایسا کرنے سے ہمارے

یہاں عقلی عنصر جو عقیدہ کا مفہوم ہے، نفسیاتی عنصر سے بالکل الگ ہو گیا ہے حالانکہ "ایمان" کا مفہوم جو قرآن و حدیث میں مستعمل ہے، ان دونوں کا مجموعہ تھا۔ اس طرح عقیدہ کی بحثوں کو ایک خاص علم یعنی علم کلام میں جمع کر دینے سے عقیدہ کا لفظ محض عقلی بحثوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا قلبی اور نفسیاتی پہلو کے مباحث سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا قلبی اور نفسیاتی مباحث کے لیے ایک الگ علم مخصوص ہو گیا ہے۔ اصول ایمان اور مسائل اعتقاد کو ایک باب میں "عقیدہ" کے عنوان کے تحت جمع کر دینا بلاشبہ ایک صحیح کام ہے، جس میں کوئی برائی نہیں، عقیدہ کا ایک نیا لفظ گھڑ لینے سے بھی یہ بات نہیں ہوئی کہ اس کا کوئی نیا مفہوم پیدا کر لیا گیا ہو یا اس کے مشمولات میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر لیا گیا ہو۔ بلکہ اس سے یہ فائدہ بھی پہنچا کہ اعتقادیات کے مسائل ایک مقام میں مجتمع ہو کر دوسرے مسائل سے ممتاز ہو گئے، جس سے ان کی وضاحت میں کافی اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نقصان بھی پہنچا، کہ زندگی کی وہ وحدت جس پر "ایمان" کا ایک لفظ دلالت کرتا تھا، دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ "ایمان" کا لفظ عقل اور جذبات، یا عقل اور قلب دونوں عناصر کو شامل تھا مگر اس تقسیم کے بعد عقلی پہلو نفسیاتی اور قلبی پہلو سے قطعاً الگ ہو کر رہ گیا۔

ایک دوسری صورت بھی ہے، جس میں کسی لفظ کی کسی خاص تعبیر یا کسی خاص لفظ کے استعمال سے بڑا خطرہ اور گہرا اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ اس سے اصل مفہوم ہی بدل جاتا ہے اور بعض مرتبہ ایسے نئے نئے مفہوم اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں، جو اسلام کے لیے نامانوس ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک عقیدہ سے کسی دوسرے عقیدہ کی طرف یا ایک مذہب و نظام سے کسی دوسرے مذہب یا نظام کی طرف جب الفاظ کو منتقل کیا جاتا ہے، تو وہ اپنے ساتھ اپنے ان تمام ظاہری رسوم اور باطنی مفہومات کو بھی کھینچ لاتے ہیں، جو اس معاشرہ سے تعلق رکھتے تھے، جس میں وہ اب تک استعمال ہوتے رہے تھے۔ مثلاً جمہوریت، اشتراکیت، حریت و آزادی کے الفاظ خاص فضاؤں اور متعین معاشروں میں پروان چڑھے اور ان میں خاص مفہوم اور خاص نظریات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد جب ہم اسلام کے نظام اور اس کے مفہومات کی تعبیر کرتے ہوئے ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، تو اگر ہم باریک بینی اور اسلامی احتیاط سے متصف نہ ہوں، تو ہم اسلام کے اندر نامانوس مفہومات کو داخل کرنے یا اسلامی نقطۂ نظر میں انحراف پیدا کرنے کا خطرہ قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم آگے چل کر ذرا تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

ان تعبیرات (EXPRESSIONS) کی مثالیں بہت ہیں۔ جنہیں ہم نے دوسری زبانوں سے اپنے ہاں منتقل کیا ہے اور اس ضمن میں ہم نے ان نقطہ ہائے نظر کو بھی منتقل کر لیا ہے، جن کی یہ تعبیرات حامل تھیں۔ ہمارے بزرگ ان تعبیرات کو اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور ہمارے بچے ابتدائے عمر سے انھیں سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ہم بے تکان بولتے ہیں: "فطرت نے ملک شام کو بڑی زرخیز وادی عطا کی ہے۔ اس کے ساحلی مقامات کو فطرت نے موسلا دھار بارشوں سے شاداب کر دیا ہے۔" یا "فطرت ناراض ہو گئی۔ بارشوں کے سلسلے میں اس نے بخل برتا اور سمندر کی موجوں کو اس نے بے قابو کر دیا۔" یہ اور اسی قسم کی دوسری تعبیرات دراصل یورپ کی اٹھارویں صدی کے نقطۂ نظر کی پیداوار ہیں، جس کے سبب انہوں نے خدا کی جگہ فطرت کو براجمان کر کے اسے خدا بنا لیا تھا اور خدا کے وجود سے انکار کر بیٹھے تھے۔ یہ کھلی ہوئی ملحدانہ فکر ہے۔

مبتدیوں کے کانوں میں ان تعبیرات کو بار بار ڈالتے رہنا بالواسطہ طور پر الحاد کے نظریہ کی تلقین کرنا ہے۔ بلکہ لاشعوری طور پر لوگوں میں اس کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ اسی ضمن میں انبیاء کرام کے لیے "عظیم شخصیت" (HERO) "نابغہ" اور "عبقریت" (GENIUS) وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی آجاتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ میں انبیاء کرام سے ان صفات کی نفی کا قائل ہوں، لیکن میری رائے یہ ضرور ہے کہ ان الفاظ کو بکثرت دہراتے رہنے اور ان الفاظ پر اکتفا کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ "عظمت شخصیت" (HEROISM) نابغگی اور عبقریت کا مفہوم وحی اور نبوت کے مفہوم کی جگہ لیتا جا رہا ہے۔ حالانکہ نبوت اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے ان اوصاف سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ یہ صفات اگرچہ نبوت کے منافی نہیں . . . . بلکہ اکثر یہ تمام صفات نبوت کے تحت ہی آجاتی ہیں کیونکہ یہ تو معمولی صفات ہیں، جن کے ساتھ موصوف ہو کر انسانوں کے بعض عام افراد بھی اپنے اردگرد کے لوگوں سے متمیز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً شدت ذکاوت وغیرہ۔ کیونکہ بہر حال یہ سب کی سب وہ بشری صفات ہیں، جو عادۃً انسانوں کو حاصل ہوا ہی کرتی ہیں۔ لیکن نبوت کا مفہوم خدا کے ساتھ انسان کے ایک خاص تعلق پر مبنی ہوتا ہے کہ خدا کسی خاص بشر ہی کو اس تعلق کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ یہ تعلق اور اتصال کیسا ہوتا ہے؛ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے؛ اور قدرت الٰہیہ کے ساتھ اس کی حقیقت اور کنہ کیا ہوتی ہے؛ یہ سب باتیں ہم نہیں جان سکتے۔

نئی قسمیں اسی زمرہ میں ان تعبیرات کا استعمال بھی آجاتا ہے، جن سے آج عرب ممالک کے اجتماعات کی ابتدا ہوتی ہے۔ مثلاً بسم اللہ والوطن (خدا اور وطن کے نام سے) یا بسم اللہ والشعب (خدا اور قوم کے نام سے) یا بسم اللہ والعروبۃ (خدا اور عربیت کے نام سے) یا کسی کہنے والے کا یوں کہنا "میں خدا اور وطن کی قسم کھاتا ہوں" یا "میں اللہ اور قومی شرف و عظمت کی یا قومیت کی قسم کھاتا ہوں"۔ یہ تمام تعبیرات دراصل یورپ کے معاشرہ میں پیدا ہوئیں اور وہیں سے ہمارے ہاں آئی ہیں۔ کیوں کہ انہیں نے ان اقدار کو خدا بنا رکھا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ ان اقدار کی اس قدر تعظیم کرنے لگے ہیں کہ وہ تعظیم تقدس کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے ان اقدار کو خدا کے ساتھ ایک ہی درجہ پر رکھ چھوڑا ہے۔ جب کہ اسلام ان تمام صورتوں میں ایک قسم کا بت پرستانہ رجحان سمجھتا ہے۔ کیونکہ خدا ہی وہ واحد بلند اور مطلق قدر ہے، جس کا مقابلہ کوئی قدر نہیں کر سکتی۔ خدا کے سوا جتنی بھی قدریں ہیں، خواہ وہ کتنی ہی محبوب، معظم اور عزیز کیوں نہ ہوں، وہ خدا کے مقابلہ میں سب کی سب فرعی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے مگر خدا کے ساتھ ان کو ملانا جائز نہیں۔ اسی کی ایک مثال "ایمان" کے لفظ کو جگہ بے جگہ استعمال کر لینا بھی ہے مثلاً لوگ کہہ دیا کرتے ہیں "میں تو وحدت یا قومیت یا قبیلہ اور خاندان پر ایمان رکھتا ہوں"۔ ایمان کے لغوی معنی عام طور پر تصدیق کرنے کے ہوتے ہیں اور شریعت میں اس لفظ کو دین کے بنیادی عقاید کی تصدیق کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ "میں خدا پر، یوم آخر پر اور نبیوں پر ایمان لاتا ہوں"۔ لہٰذا دوسرے مقام پر اس لفظ کو استعمال کرنا اسی نقطۂ نظر سے پیدا ہوا ہے، جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ وہ ان اقدار کو خدا بنا لینے پر مبنی ہے۔ ایسا کرنا دراصل اس عہد میں پرانے بتوں کی جگہ نئے اصنام کو قایم کرنے کے مترادف ہے۔ سلامت روی کی جو تعبیر اسلامی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے وہ یہی ہو سکتی ہے کہ "میں خدا پر ایمان لاتا ہوں اور اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور قوم پر اعتماد کرتا ہوں اور وحدت و اتفاق سے تمسک کرتا ہوں۔ خدا ہی کی طرف جھکتا ہوں اور اسی کے لیے کوشش

کرتا ہوں "

یہ دو صورتیں ہیں، جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ کچھ الفاظ بطور جدید اصطلاح کے استعمال کیے جائیں اور بس۔ یہ کسی جدید تصور پر مشتمل نہیں ہوتے۔ ان کا استعمال جائز ہے۔ اس کی مثال ہم نے شخصی حالات سے دی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم نے قابلِ غور باتیں بھی بیان کر دی تھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ اور تعبیرات جدیدہ یا منقولہ کو استعمال کر کے ہم اپنے ہاں جدید مفہوموں کو داخل کر لیں اور اجنبی اور مخالف نقطہ ہائے نظر کی طرف جھک پڑیں۔ جو بعض اوقات اصل اور صحیح رجحان سے بنیادی انحراف تک پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک تیسری صورت بھی ہے، جو ان صورتوں سے زیادہ نازک اور زیادہ خطرناک ہے۔ یہ صورت کسی مذہب یا نظام کے مفاہیم و افکار کو دوسرے مذہب یا نظام میں منتقل کرتے ہُوئے پیش آتی ہے۔ کیونکہ ہر دینی یا اجتماعی مذہب، مثلاً اسلام، مسیحیت، اشتراکیت، جمہوریت وغیرہ کے اپنے اپنے مفہوم ہوتے ہیں اور اپنی اپنی قدریں ہوتی ہیں اور ہر مفہوم اور ہر قدر کے لیے ایک خاص تعبیر ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح ہر زبان کی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں، جو کسی مفہوم اور قدر کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلامی مفہومات اور احکام کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے جن کی زندگیاں اپنے مخصوص نظاموں اور مذہبوں سے متعلق معاشروں میں ہی گزری ہیں منتقل کرنے لگتے ہیں، تو چونکہ وہ اپنے مفہوموں اور اپنی وضع کردہ اصطلاحوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتے، اس لیے آپ مجبور ہو جاتے ہیں کہ آپ انہی کے الفاظ اور انہی کی اصطلاحات کو استعمال کریں، تاکہ آپ اسلام کے مفہومات اور اسلام کے نظام کو ان تک پہنچا سکیں اور وہ ان کا تصور کر سکیں۔

بلاشبہ اس کارگزاری میں بڑا ہی خطرہ ہے۔ خاص کر اس وقت جب کہ یہ کام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ جائے، جن میں نہ کافی حزم و احتیاط ہو نہ دونوں مذہبوں کو سمجھنے اور دونوں رجحاناتِ فکر کا تصور کرنے اور دونوں موقعوں تک پہنچنے کی پوری پوری صلاحیت ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ہم روسی اشتراکیت کے معاشرہ میں یا امریکی جمہوریت کے معاشرہ میں اسلام کے مفہوموں اور زندگی کے متعلق اسلام کے نقطہ ہائے نظر کو اس انداز سے منتقل کرنا چاہیں کہ وہ اسلام کے نظام، اس کے احکام اور اس کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، تو نرا سہ بات ہے کہ ہم اپنی فقہی اصطلاحات کو جو اسلامی احکام کے لیے مشہور ہیں، استعمال نہیں کر سکتے کہ فلاں چیزیں عبادات میں شامل ہیں اور فلاں چیزیں معاملات میں اور پھر معاملات کو ان کے معروف ابواب میں تقسیم کر کے بتانا۔ اسی طرح علمائے کلام عقیدہ کی اصطلات کو بھی استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان اصطلاحات کے ساتھ ایسے لوگوں کو مخاطب بنائیں، جن کے ہاں دوسری اصطلاحات مروج ہیں اور وجود، اقدار، اعمال بشری اور نظام ہائے اجتماعی کے لیے ان کی اپنی اپنی تعبیرات ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیں چاہیے کہ ہم پہلے ان کی تعبیرات، ان کی تقسیمات، ان کے مقولات اور مفہومات کو خود اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس کے بعد ہم ان کے طریقہ اور اسلوب کو سمجھ کر اسلامی نظام کے مفہومات کو ان کی طرف منتقل کریں۔ اس کے لیے ہمیں کبھی ایک مفہوم کا تجزیہ کر کے دو مفہوم بنانے ہوں گے۔ کبھی دو مفہوموں کو ایک ہی مفہوم میں ادا کرنا ہوگا۔ گویا اس طرح ہمیں اسلام کو ان نئے قالبوں میں اس طرح ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اصل مواد میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہونے پائے۔

جمہوریت اور اشتراکیت اسلام کے مفہومات اور نظریات کو دوسرے مذاہب کے لوگوں تک ان کے اپنے نقطہ ہائے نظر کے مطابق منتقل کرنے میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ اندیشہ تو اس میں ہے کہ ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی اور مذہب فکر مثلاً اشتراکیت کی طرف چل پڑیں (خواہ وہ اشتراکیت بزعم پیروان مارکس سائنٹیفک سوشلزم ہو، خواہ اشتراکی کہلانے والے مذاہب فکر میں کا کوئی اور مسلک) یا جمہوریت کی طرف رُخ کریں۔ یعنی انھیں ایک مذہب سمجھ لیں اور ان کا فلسفہ اپنا لیں اور کہنے لگیں کہ یہ اشتراکیت یا یہ جمہوریت خود اسلام کا ہی ایک ہی حصہ ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ طرزِ فکر یقیناً ایک فریب اور ملمع کاری ہے۔ جس سے اسلام کے اپنے مفاہیم مجروح ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اشتراکیت اور جمہوریت کے ساتھ اسلام کا کوئی نقطۂ اتصال اور کوئی وجہ اشتراک نہیں۔

جمہوریت جمہوریت پسندوں کا خاص رجحان دراصل انفرادی استبداد اور کسی مخصوص طبقہ یا خاندان کی حکومت وسیادت کا مقابلہ ہے۔ یورپ کی تاریخ میں یہ رجحان مطلق العنان بادشاہوں، بالادست با اختیار طبقوں اور با اقتدار علمائے دین کے استبداد کے خلاف ردِ عمل کی شکل میں نمودار ہُوا۔ لہٰذا جمہوریت پوری قوم یا قوم کی اکثریت کو حکومت میں شریک کرنے کی جدوجہد کرتی رہی اور جمہوریت کو عملاً نافذ کرنے کے لیے مختلف قوموں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد کیا ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہوگا کہ اسلام جمہوریت کے منافی ہے؟ کیا ایسا کہنا اسلام کی صورت کو مسخ کر دینا نہیں ہے؟ جن لوگوں کے پیشِ نظر حکومت کے صرف دو نظام ہیں، یعنی استبدادیت یا جمہوریت، کیا ان سے یہ کہنا کہ اسلام جمہوریت کے مخالف ہے۔ اسلام کو بدترین صورت میں پیش کرنا نہیں ہوگا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ استبداد کے مقابلے میں اسلام جمہور کا ساتھ نہیں دے گا؟ کیا اسلام کا موقف قطعاً یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس محاذ میں شامل ہوجائے، جو انفرادی استبداد اور ترجیحی سلوک کا مقابلہ کر رہا ہو؟

لیکن ہمیں یہ کہنے کا بھی حق نہیں کہ اسلام بغیر کسی شرط کے مطلقاً جمہوری ہے۔ کیونکہ ایک سیاسی نظام کی حیثیت سے جمہوریت افراد اور جماعتوں سے متعلق کچھ ایسے افکار و مفاہیم سے نسبت حاصل کر چکی ہے، جنھیں اسلام تمام تر قبول نہیں کرتا، بلکہ ان سے اکثر مقامات پر متعارض ہوتا ہے۔ چنانچہ جمہوریت کا ایک بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ریاست میں اصل اہمیت فرد کی ہے اور دراصل فرد ہی کی مصلحت کے لیے ریاست وجود میں آتی ہے۔ فرد اپنے اعمال میں مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اقتصادی یا نظریاتی امور سے ہو۔ حکومت کا سب سے اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد کی آزادی میں توازن برقرار رکھے۔ جمہوریت کا یہ فلسفہ اسلام کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ عقاید میں الحاد اور ایمان کے درمیان تفریق کو قائم نہیں رکھتا اور اجتماعی مصلحت کے لیے ایک طرف بے قید سرمایہ داری کو تسلیم کرتا ہے، دوسری طرف سرمایہ داری پر پابندی عاید کرنے کا بھی قائل ہے۔ اسلام ان تمام رجحانات میں مساوات کا قائل نہیں۔ وہ فرد کو ایسی مطلق آزادی نہیں دیتا، جس سے الحاد، بداخلاقی اور سماجی ظلم و ستم کو تقویت ملے۔ اس کے علاوہ اسلام کا جمہوریت سے ایک اور بنیادی اختلاف بھی ہے۔ اگرچہ اسلام میں قوم کی مصلحت قانون سازی کا مرکزی نقطہ ہے اور حکومت کی بنیاد باہمی مشورے اور حاکم کے جواب دہ ہونے کے اصولوں پر ہے۔ لیکن حاکمیت کا آخری مرجع ذاتِ الٰہی ہے۔ وہی

درحقیقت ریاست کا سرچشمہ ہے۔ اسی کا ارادہ (جس کا مظہر قرآن کریم ہے) حقیقی قوت حاکمہ ہے۔ اس کے برخلاف جمہوریت میں قوم حکومت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ قوم کا ارادہ اور منشا قطعاً آزادانہ ہوتا ہے اور اسی کا فیصلہ آخری ہوتا ہے۔

اگر قوم کو حکومت کا سرچشمہ قرار دینے سے یہ مراد لی جاتی کہ حکومت قوم کی تفویض کردہ ہے اور حاکم قوم کا نمایندہ ہو کر حکومت حاصل کرتا ہے۔ وہ خود اپنی ذات سے، یا وراثتہً یا براہِ راست خدا کی طرف سے اقتدار حاصل نہیں کرتا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں، اسلام اس سے اتفاق کرے گا۔

(۱) لیکن قوم کے افراد میں (خواہ وہ حاکم ہوں یا محکوم) جب کوئی اختلاف پیدا ہو جائے، تو آخری فیصلہ صرف کتاب اللہ کا ہوگا، جس نے ایک راستہ مقرر کر دیا ہے اور نشانات سے اس کی حد بندی فرما دی ہے۔ قوم غلطی بھی کر سکتی ہے اور صحیح فیصلہ بھی کر سکتی ہے چنانچہ افراد قوم، حاکم پر نگران ہوتے ہیں۔ وہ حق کا مطالبہ اور زیادتی کے خلاف احتجاج کر سکتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی نصوص کی تعبیر اور اس کے مفہومات کے تعین میں حاکم کی بجائے علمائے کرام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی قید نہیں کہ وہ علما حکومت کے محکموں میں تعینات ہوں یا محض رسمی علماء ہوں۔ جب خوارج نے لاحکم الا للہ اور لا حکم الا للقرآن کا نعرہ لگایا تھا، تو حضرت علیؓ نے ان کی تردید میں یہی فرمایا تھا کہ قرآن کے لیے ترجمان کی ضرورت ہے۔ قرآن کا فیصلہ بہر حال کچھ لوگ بتائیں گے، خود قرآن بتانے کے لیے نہیں آئے گا۔

(۲) یعنی کوئی ایسا آدمی ضروری ہے، جو فیصلہ کرنے کا اہل ہو۔ لہٰذا انسان کا فیصلہ ناگزیر ہے۔ لیکن اس فیصلہ کرنے والے پر لوگوں کی نگرانی ضروری ہے اور ایسے لوگوں کا وجود لابدی ہے جو قرآن کریم اور اس کے مقاصد کی سمجھ رکھتے ہوں اور اس کے احکام کی تطبیق کی اہلیت رکھتے ہوں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اگر ہم جمہوریت کو ایک اجتماعی مذہب کی حیثیت سے لیں اور اس کے جداگانہ وجود کو تسلیم کریں، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عین اسلام ہے یا اسلام اس سے کوئی مماثلت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مذاہب اپنی اساسیات، اپنے فلسفہ اور نتائج تطبیق کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ جب ہم جمہوریت کا ایک ایسے رجحان کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، جو انفرادیت، استبداد اور تفریق و امتیاز کے خلاف جنگ کرتا ہے اور جمہور کی بہبود کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ انھیں حکومت میں شریک کرتا اور محاسبہ کا حق دیتا ہے، تو بلاشبہ ان معنوں میں اسلام بھی جمہوری انداز نظر رکھتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اسلام کی اپنی ایک جمہوریت ہے، جو اسی کے نظام کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ جمہوریت حکام کے استبداد کی روک تھام کرتی اور قوم کو ان کی نگرانی اور محاسبہ کا حق دیتی ہے۔

اشتراکیت

دوسری مثال اشتراکیت کی ہے۔ بے شمار محققین نے اس لفظ کو اسلام کے اس تصورِ عدل کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے، جو معاشرہ کے تمام افراد کو مساوی حیثیت دیتا ہے۔ اشتراکیت کے ضمن میں ہمارے مؤقف کی وضاحت جمہوریت کے ذیل میں تفصیلی بحث سے ہو چکی ہے۔ اشتراکیت کو جب ایک ایسے مذہب فکر کی حیثیت سے لیا جائے کہ اس کا فلسفہ، اس کے مفہومات، اس کا اقتصادی نظام (جس کی ایک واضح شکل قومی ملکیت ہے)، سب ہی کچھ شامل کیا جائے،

تو اسلام اس سے قطعی جداگانہ چیز ہے۔ دونوں مذاہب کی مبادیات اور اساسیات مختلف ہیں۔

اشتراکیت ہمارے ہاں ایک اور مفہوم میں بھی رائج ہے کہ قوم کے تمام افراد کو منافع اور مصالح میں یکساں شریک کیا جائے۔ منافع کی تقسیم اور منفعت کے امکانات میں مساوات پیدا کی جائے اور اس مقصد کے لیے حکومت کو اقتصادی کارگزاریوں میں مداخلت کا حق دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ مفہوم ہر قسم کی اشتراکیت پر منطبق ہوتا ہے۔ اگرچہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف ملکوں میں طریقِ کار مختلف ہیں۔

اس مفہوم کے اعتبار سے اشتراکیت کوئی مذہب نہیں بلکہ محض ایک رجحان کا نام ہے۔ جو یورپ میں سرمایہ داروں کے استبداد کے ردّعمل میں پیدا ہُوا۔ کیونکہ وہاں سرمایہ دار طبقہ ترجیحی حقوق کا مالک بن بیٹھا۔ یہ دراصل اس آزادروی کا نتیجہ تھا، جو بے قید معیشت کی قائل تھی اور حکومت کی مداخلت کے سراسر خلاف تھی۔ ظاہر ہے اسلام اشتراکیت کے اس رجحان کا مخالف نہیں ہے اسلام کا مقتضا بھی پایانِ کار منافع کی عام تقسیم اور معاشرتی عدل و انصاف کا قیام ہے بلکہ جب مصلحت کا اقتضا ہو تو اسلام حکومت کو اقتصادی بلکہ غیر اقتصادی امور میں بھی مداخلت کا حق دیتا ہے۔ یہ کہنا کہ اسلام اشتراکیت کے اس مفہوم کا سرے سے مخالف ہے۔ سادہ الفاظ میں یُوں کہنا ہوگا کہ اسلام سرمایہ دارانہ ظلم، سرمایہ داروں کے ترجیحی حقوق اور تجاوز کی تائید کرتا ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد افراد کی اقتصادی کارگزاریوں کی تحدید، حکومت کی مداخلت اور معاشرہ کی مصلحت کے تحفظ پر ہے۔ اسلام بھی حکومت کی مداخلت کا قائل ہے۔ چنانچہ ذخیرہ اندوزی کا انسداد، قحط کے زمانے میں غذائی سامان کے تاجروں کو عادلانہ نرخ پر فروخت کرنے پر مجبور کرنا اور زمانہ جنگ میں مالداروں پر زکوٰۃ کے علاوہ بار ڈالنا اور اگر معاشرہ میں ایسے نادار موجود ہوں کہ زکوٰۃ سے ان کی کفالت نہ ہو سکے، تو مالداروں سے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال لینا، ایسی مشہور مثالیں ہیں، جن کا تذکرہ فقہاء کی کتابوں میں بالصراحت موجود ہے۔ یہ مثالیں اسی رجحان کی ترجمان ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام حکومت کی مداخلت کا قائل ہے تاکہ معاشرتی عدل قایم ہو سکے۔ لہٰذا یہ بات کہنا کہ اسلام اشتراکیت سے مماثلت نہیں رکھتا، نہ صرف اشتراکیت کی حقیقت سے ناآشنائی ہوگی بلکہ اسلامی تعلیمات و احکام سے بھی جہالت ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مثل المومنین مثل الجسد اذا اشتکی منه عضوٌ، تداعی له سائر الجسد بالسھر والحمی۔	تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب ان میں سے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے، تو رات کو جاگنے اور حرارت کی وجہ سے سارا بدن اس کی اذیت محسوس کرتا ہے[۱]

آپ ہی کا ارشادِ گرامی ہے:

قوم استھموا علیٰ سفینة فی البحر	کچھ لوگ سمندر میں ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے

---

[۱] صحیح مسلم، جلد چہارم ص ۲۰۰۰، باب ۵۴ ۔ قاہرہ ۔ ۱۹۵۵ء

فاصاب بعضهم اعلاها واصاب بعضهم اسفلها فكان الذين فی اسفلها يصعدون لنسيتقون الماء فيصبون على الذين فی اعلاها فقال الذين فی اعلاها لا ندعكم تصعدون فتؤذونا فقال الذين فی اسفلها فانا ننقبها فی اسفلها، فنستقی فان اخذوا على ايديهم فمنعوا هم نجوا جميعا وان تركوهم غرقوا جميعا۔	کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نیچے کے حصے میں۔ جو نچلے حصے میں تھے، وہ پانی لینے کے لیے اوپر گئے۔ اوپر والوں نے روکا کہ اس سے ہمیں دقت ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ ہم نیچے ہی سوراخ کر لیتے ہیں اور پانی حاصل کر لیں گے۔ اب اگر انھیں روکا نہ جاتے تو سب غرق ہو نگے اگر روک دیا تو سب بچ جائیں گے[1]

یہ مسلمہ امر ہے کہ اسلام اس بات کو ہرگز قبول نہیں کرتا کہ رعایا کا کوئی فرد بھوکوں مرے۔ خواہ اس کا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایک آدمی اسلامی حکومت کا وفادار شہری ہے، تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات کی کفالت بھی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفاے راشدین کے عہد میں غیر مسلم اور اہل کتاب نادار لوگوں کے لیے ایک مخصوص شعبہ قایم تھا۔

یہ رجحان کوئی سرسری بات نہیں تھی نہ اخلاقی مواعظ و نصائح تک محدود تھی۔ بلکہ فقہا نے تفصیل کے ساتھ اس کے احکام مرتب کر دیے تھے جو عملاً نافذ ہوئے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ قواعد عامہ میں بھی ان کی بنیادیں ملتی ہیں۔ ہمارے اس موضوع سے متعلق اس قسم کے قواعد عامہ تقریباً ہر جگہ مل سکتے ہیں۔ مثلاً:

الضرر يزال۔	ضرر کو بہرحال دور کیا جائے گا۔
لا ضرر ولا ضرار۔	نہ ضرر برداشت کیا جا سکتا ہے، نہ پہنچایا جا سکتا ہے۔
يتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام۔	ضرر عامہ کو دور کرنے کے لیے خاص ضرر کو برداشت کیا جائے گا۔

ان قواعد کی تشریح میں فقہائے مختلف مثالیں دی ہیں۔ مثلاً ایسی ملکیت دیوار جو عام راستے کی طرف جھک رہی ہو، گرا دینا واجب ہو گا۔ صاحبین کے نزدیک ایک بیوقوف (سفیہ) آدمی کے تصرفات پر مطلقاً پابندی لگائی جا سکتی ہے تاکہ ضرر عام کی روک تھام ہو سکے[2] امام ابن تیمیہ تو اس فیصلے میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے نزدیک ماہر فن اشخاص کو مفاد عامہ کے پیش نظر کام کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ ہم نے اب تک کہا ہے، اس پر اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت سے ہمیشہ روس ہی کا منافی اسلام مذہب،

---

[1] ترمذی، جلد دوم، ابواب فتن، ص ۳۴، کانپور، ۱۳۴۳ھ

[2] ابن نجیم کی کتاب "الاشباہ والنظائر" میں ان قواعد عامہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مراد نہیں ہُوا کرتا۔ بلکہ یہ ایک عام رجحان کے طور پر بھی مستعمل ہے۔ جس میں مختلف مذاہب فکر موجود ہیں۔ چنانچہ خود یورپ میں مسیحی اشتراکی (CHRISTIAN SOCIALISTS) کے نام سے کچھ جماعتیں اُبھر رہی ہیں۔ حالانکہ اگر اشتراکیت کو محض قایم بالذات مذہب تسلیم کیا جائے تو مسیحیت کا اشتراکیت کے ساتھ صفت کے طور پر استعمال ناممکن ہوگا۔

اسلام میں ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں، جو جمہوریت اور اشتراکیت سے مطابقت رکھتے ہیں، تاہم ان رجحانات کو مسلمانوں کی زندگی میں شعار عام کا درجہ حاصل نہیں۔ نہ یہ ہماری ہیئت اجتماعیہ کا عنوان بن سکتے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب کی بعض صفات کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں، لیکن دوسری بہت سی صفات اور بنیادی تصورات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جو ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔

تمام سیاسی اور اقتصادی نظامات کی کچھ نہ کچھ اعتقادی بنیادیں ہُوا کرتی ہیں اور یہ نظامات دراصل اسی عقیدہ یا فلسفہ کے خارجی مظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اشتراکیت سے وابستگی دراصل اس عقیدہ سے وابستگی ہوگی کہ پیداوار زندگی کا محور ہے اور وجود کی اصل مادہ (MATTER) ہے۔ اس تصور میں علم اور عقل دونوں محض پیداوار (PRODUCTION) اور مادی زندگی کے خدمت گزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں فرد انسانی اس بڑی مشین کا ایک حصہ ہوتا ہے جسے ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ اور جو حکومت کی صورت میں متشکل ہے۔ اگر ہم ان شعاروں کو اپنی نشاۃ ثانیہ کا واحد عنوان قرار دیں، تو ضمناً ہم اس بات کو تسلیم کر لیں گے کہ ہم ان اعتقادات پر ایمان رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ہمارے نزدیک اپنے افکار کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔

اسلام کی اشتراکیت معاشرتی عدل اور تقسیم دولت کے لیے قانون بنانے اور اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے اشتراکیت کو عنوان اولیں قرار دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی اجتماعی تحریک ایمان باللہ کے عقیدے اور افراد کی مساوات سے شروع ہوتی ہے، جس کی غایت معاشرتی عدل کا قیام ہے۔ یہ ہے اسلام کی اپنی اشتراکیت، جس کی غایت محض مال اور اس کی تقسیم نہیں بلکہ یہ دراصل اس روحانی تحریک کی ایک شاخ ہے، جس کا مقصد ایک خاص نظام کے اندر خدا کے بندوں کے مابین عدل و انصاف کا قیام اور حسنِ سلوک کے ذریعہ رضاءِ الٰہی کی تحصیل ہے۔ غور فرمایئے اسلامی نظام کی تعبیر کے لیے اشتراکیت کے لفظ میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ وہ اس نظام کا صحیح عنوان بن سکے۔ اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اسلام کے امتیازات کی اس طرح حفاظت کرنا چاہیئے کہ یہ دُوسرے مذاہب فکر کے مفہومات سے مشتبہ نہ ہونے پائیں۔

مفہومات کی تشریح مشتبہ مفہومات کی تصحیح کا کام اسلام کے ہر دور میں برابر ہوتا رہا ہے۔ اسلامی عقیدہ کے محافظ علماً ہر دور میں محدثاتِ امور، عقاید میں درپردہ اضافوں اور جدید انحرافات کی تردید کرتے رہے ہیں۔ بدعات کو علماء نے مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ جو بدعات عادات سے متعلق ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس وغیرہ کے اسلوب تو یہ چیزیں ناپسندیدہ بدعات میں شمار نہیں ہوتیں بشرطیکہ کوئی چیز براہِ راست نصوص سے متصادم نہ ہو۔ نو ایجاد آلات، وسائل نقل و حمل وغیرہ کے بارے میں بدعت کا لفظ مذموم معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس اسے خدا کی نعمت شمار کیا گیا ہے کیونکہ ان میں بنی نوع انسان کی بہبود مضمر ہے۔ سب سے زیادہ خطرناک بدعات عقاید سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہماری

رائے میں یہ بدعات عقیدہ کے محدود مفہوم تک ہی منحصر نہیں بلکہ یہ تمام بنیادی افکار و رجحانات کو شامل ہیں۔ تیسری قسم کی بدعات وُہ ہیں۔ جو عبادات سے متعلق ہیں۔ ان کے سلسلے میں اصول یہ ہے کہ عبادات سب توفیقی ہیں۔ ان میں کمی یا بیشی نہیں کی جا سکتی۔

یہ تصحیح ہر زمانے میں علماء اور ائمہ اسلام کے ہاتھوں ہوتی رہی ہے۔ وہ اس قسم کے انحرافات سے باخبر رہتے تھے اور نئی داخل شدہ بدعات کی تردید کر کے افکار کی تصحیح کرتے رہتے تھے۔ ان کی ایک واضح مثال دمشق کے فرزند جلیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ تھے۔ ان کا بہترین کارنامہ اس رجحان کی تخلیق ہے کہ یونانی عقلیت اور باطنی رجحانات کے مقابلے میں اسلامی افکار کو رواج دیا جائے۔

آج ہمیں اس تصحیح کی زیادہ ضرورت ہے۔ خواہ یہ مفہومات مغربی افکار کے زیر اثر رواج پائے ہوں یا مشرقی عقلیت سے اثر پذیر ہوئے ہوں۔ خصوصاً ان افکار کی تصحیح نہایت ضروری ہے جو اسلامی عقلیت، یونانی عقلیت اور ایرانی اور ہندی عقلیت کا معجون مرکب ہیں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی فکر کی از سرِ نو تعمیر کریں اور اپنے ذہنوں کو ان افکار سے صاف کریں، جنھیں ہم آج تک بدیہیات سمجھتے آئے ہیں۔ یہ افکار ہمارے فکری، سیاسی اور اقتصادی ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ہماری ترقی اسی پر موقوف ہے۔

آجکل انسانیت کا سامنا مذاہب سے ہے۔ ہر مذہب میں اگر ایک پہلو حق کا ہے، تو دُوسرا پہلو باطل کا بھی موجود ہے۔ ان میں سے کوئی مذہب بھی انسانی مشکلات کو بنیادی طور پر توازن کے ساتھ حل کرنے کی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اسلام ہی ایک مذہب ہے جو بیک وقت مادی ترقی اور اخلاقی و روحانی ارتقاء کا ایک توازن کے ساتھ ضامن ہو سکتا ہے۔ نظاماتِ اجتماعی کے لیے اسلام خود انسان کے ضمیر میں اپنی بنیادیں تعمیر کرتا ہے۔ وہ فرد کے لیے ایسا وسیع میدان مہیا کرتا ہے، جس میں وہ استبدادی انداز سے محفوظ ہو کر مادی اور روحانی ترقی کر سکے۔ اسلام زندگی کو ایک وحدت کے اعتبار سے لیتا ہے۔ اس کے تمام پہلو، سیاست، معیشت، اخلاق، عبادت، عقیدہ اور قانون سازی، حیاتی وحدت کے ساتھ ایک نظم میں پیوستہ ہیں۔

مختلف مذاہب کا مطمحِ نظر، خواہ وہ دینی ہوں یا اجتماعی، زندگی کا کوئی ایک اہم مقصد ہوا کرتا ہے۔ مثلاً عدالتِ اجتماعی، حیات روحانی یا فردِ انسانی کی حرّیت لیکن اسلام نے ان تمام مقاصد میں ترتیب قایم کر کے ان کو اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ یہ تمام مقاصد ایک قوت سے وابستہ ہیں جو خدائے برتر کی ذات ہے۔

شانِ محمدؐ بزبانِ بائیبل

عبد الرحیم منہاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد!

مستقبل کے واقعات کی صحیح پیش گوئی خدا کے کلام کی اصلیت اور خدا کی موجودگی کی سب سے بڑی شہادتوں میں سے ایک ہے۔ صدیوں پہلے ایک واقعہ کی پیشگوئی کرنا اور بعدہٗ اس کی صحیح تصویر دیکھنا، الٰہی طاقت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ جس کی تردید ناممکن ہے۔

اگرچہ کتاب مقدس بائیبل ہر سال تغیر و تبدل کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے، تاہم بائیبل میں ایسے مقامات بھی پائے جاتے ہیں، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود انسان کو اپنی طاقت دکھانے کے لیے اس شہادت کا اظہار کرتا ہے۔

یسعیاہ ۴۱ : ۲۲ سے ۲۹ آیت میں خداوند تعالیٰ خود اپنے نبی کی معرفت اپنی عظمت اور برتری کے ثبوت میں آئندہ واقعات کے متعلق پیش گوئی بیان کرتا ہے اور غیر اقوام کے دیوتاؤں کو چیلنج کرتا ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعہ اپنی طاقت کا اظہار کریں، جیسا کہ قرآن کریم نے عیسائیوں کو چیلنج کیا کہ تم اپنے تین خداؤں کے ذریعے اپنی طاقت کا اظہار کرو۔

سیّدنا حضور مسیح علیہ السلام نے بھی اپنے پیرؤوں کے ایمان کو مضبوط کرنے کے لیے مستقبل کے متعلق پیشگوئیاں کیں۔ جس رات حضرت مسیحؑ دنیا والوں سے جُدا ہونے کو تھے، آپؑ نے اپنے شاگردوں سے کہا :

”اور اب میں نے یہ سب باتیں پوری ہونے سے پہلے ہی تمھیں بتا دیں، تاکہ جب پوری ہوں تم یقین کرو۔“

چنانچہ ایک موقع پر آپؑ نے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے ہوئے سیدنا حضور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشارت اس طرح دی :

”مجھے تم سے اور بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ لیکن ابھی تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ (محمدؐ) یعنی رُوحِ حق (سچائی کا روح) آئے گا تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اور تمھیں آئندہ کی خبر دے گا وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔“

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیّدنا حضور مسیحؑ کے یہ مبارک الفاظ آپ کے ٹھیک چھ سو سال بعد عالمِ وجود میں آئے۔ یعنی کہ ریگستانِ عرب پر پرچمِ محمدؐ لہرایا اور صدق و کذب میں تصادم ہوا۔ آخر فتح نے سچائی کے قدم چُومے اور رُوحِ حق کی فوج نے باطل کے تمام قلعے مسمار کر دیے۔ ایک جگہ درج ہے کہ :

”یعنی جو لوگ اندھیرے میں بیٹھے تھے، انھوں نے بڑی روشنی دیکھی اور جو موت کے ملک اور سایہ میں

بیٹھے تھے، ان پر روشنی چمکی۔" (متی ۴: ۱۶؛ ایسعیاہ ۴۲: ۷)
یہی وجہ ہے کہ آج سیرتِ سرورِ کائنات جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نوعِ انسان کے لیے مشعلِ راہ سے بھی بڑھ کر ہے ——— لیکن دنیا کے علماء ہٹ دھرمی اور تعصب کے رتھ پر بھاگے جا رہے ہیں اور سیدنا حضور مسیحؑ کے اس ارشاد کی بے بنیاد تاویل کرتے ہیں۔ پادری صاحبان کہتے ہیں کہ روحِ حق (سچائی کا روح) سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ اس سے مراد وہ رُوح القدس ہے، جو کہ سیدنا مسیحؑ کے بعد ان کے شاگردوں پر نازل ہوتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ سیدنا حضور مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں رُوحِ حق کی شناخت یہ ہے:

"روحِ حق سچائی کا رُوح تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔"

اب آپ کے کہنے کے مطابق جو روح القدس مسیحؑ کے شاگردوں پر نازل ہوا، اس نے شاگردوں یا دیگر عیسائیوں کو کونسی سچائی کی راہ دکھائی بلکہ اعمال ۲۱، ۱ تا ۲۵ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب روح القدس مسیحؑ کے شاگردوں پر نازل ہوا، تو ان سب نے جھوٹ بولنا اور فریب دینا شروع کر دیا۔ جھوٹ بولنے کا دوسرا نام سچائی ہے۔ شاگردوں پر روح القدس نازل ہُوا تو کچھ عرصہ بعد پولوس بھی ان میں آ شامل ہُوا اور سب کا استاد بن گیا۔ پولوس کے نزدیک جھُوٹ بولنا ثوابِ عظیم ہے (رومیوں ۳: ۵) بلکہ پولوس خود بھی بڑے فخر کے ساتھ جھُوٹ بولا کرتا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو کتاب مقدس بائیبل سے دریافت کریں۔ ایک مقام پر پولوس کہتا ہے کہ میں پیدائشی یہودی ہُوں (اعمال ۲۲: ۲۲) دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ میں پیدائشی رُومی (بُت پرست) ہوں۔ (اعمال ۲۲: ۲۵ تا ۲۸)

تیسرے مقام پر پولوس کہتا ہے کہ" میں پیدائشی فریسی ہُوں" (اعمال ۲۳: ۶، ۷، ۸)۔

ہم کس طرح یقین کریں کہ ایک آدمی تین متضاد جگہ یا مذاہب میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ پولوس پیدائشی رومی (بت پرست) بھی ہے اور پیدائشی یہودی (توحید پرست) بھی ہے اور پیدائشی فریسی (یہودیوں کا ایک فرقہ) بھی ہے۔ یہ کون ہے ——— جو اپنی پیدائش تین مختلف جگہ بتلا رہا ہے۔ یہ عیسائیوں کا سب سے بڑا رسول، جس پر روح القدس نازل ہوا تھا۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ پولوس جھوٹ بولا کرتا تھا جیسا کہ ہم نے ثابت کیا اور جھُوٹا آدمی رُوحِ حق ہو نہیں سکتا۔
اور سُنیے کہ اس جھوٹ بولنے والے رُوحِ حق کی تعلیم کیا ہی انوکھی ہے جس پر عمل کرنے سے شیطان بھی شرما جاتا ہے۔

ہم کیوں نہ برائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو۔ (رومیوں ۳: ۸)

یہی وُہ پولوس ہے (جس پر بقول ان کے روح القدس نازل ہوا تھا) جو خدا تعالیٰ کی پاک شریعت کو لعنت اور شریعت پر عمل کرنے والوں کو لعنتی کہتا ہے۔ (گلیتوں ۳: ۱۱)

خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"کیونکہ یہ باغی لوگ اور جھُوٹے فرزند ہیں اور خداوند کی شریعت سے انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو کہتے ہیں کہ ہم پر سچی نبوت نہ کرو۔ ہم سے خوشگوار باتیں کرو اور ہم سے جھُوٹی نبوت کرو۔" (یسعیاہ ۳۰: ۸)

ان تمام حوالوں کے ہوتے ہوئے حضرت پولوس اور اس کے ساتھی رُوحِ حق کے زمرے میں نہیں آتے۔ اس لیے کہ سب کے سب دغاباز اور جھوٹے اور برائی کی تعلیم دینے والے تھے جیسا کہ ہم نے کتاب مقدس سے ثابت کیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رُوحِ حق حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے:

"جھُوٹ بولنے والوں پر اللہ کی لعنت ہو" (القرآن)

"رُوحِ حق آئے گا۔ وُہ میرا جلال ظاہر کرے گا" (بائیبل)

اہل یہود کے سب سے بڑے معلم سردار کہن کیفا نے مجرم قرار دے کر کہا، یہ مشرک ہے۔ پولوس نے اس کی تصدیق کی کہ "واقعی مسیح لعنتی ہے" (گلیتوں ۳ : ۱۳)

روحِ حق سیدنا حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا:

"یہ دونوں جھُوٹے اور دروغگو ہیں۔ مسیحؑ نہ لعنتی ہے نہ مشرک ہے بلکہ وہ خدا تعالیٰ کا رسُول اور کلمۃ اللہ ہے"

سردار کہن کیفا نے کہا:

"مسیح مشرک ہے"

پولوس نے کہا:

"مسیح لعنتی ہے"

اور روحِ حق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسیحؑ پاک، معصوم اور کلمۃ اللہ ہے"

ناظرینِ اللہ کے لیے انصاف کریں کہ سیدنا حضور مسیحؑ کا جلال کس نے ظاہر کیا، پولوس نے یا حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے! پولوس کو رُوحِ حق تسلیم کرنا کلامِ الٰہی کا جنازہ اٹھانا ہے۔

حضرت یوحنا (یحییٰؑ) نے یردن پار بیتِ عبناہ میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہُوئے فرمایا:

"تمھارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے، جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد آنے والا۔ میں جس کی جُوتیوں کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں" (یوحنا ۱ : ۲۷)

آنحضرتؐ کی نسبت بعض عیسائیوں کی رائے

مولوی علی شبیر

معجزاتِ نبویؐ رہ نوردانِ بادیہ ضلالت کے لیے تاحشر خضرِ طریقت ثابت ہوتے رہیں گے اور کمالاتِ احمدیؐ گم گشتگانِ وادیٔ ظلمت کے واسطے مشعلِ ہدایت کا کام دیتے رہیں گے۔ تشنہ کامانِ حقیقت کو وُہ چشمۂ رحمت تاقیامت سیراب کرتا رہے گا اور غواصانِ بحرِ تحقیق اس دریائے معرفت سے ابدالآباد تک گوہرِ مقصود حاصل کرتے رہیں گے۔ حضور سرورِ کائناتؐ کے خصائلِ حمیدہ مخالفین سے اپنی اکملیت ہمیشہ ہمیش تسلیم کراتے رہیں گے اور جنابِ اکمل الموجوداتؐ کے فضائلِ برگزیدہ رہتی دُنیا تک منکرین سے اپنی اولیت وافضلیت منواتے رہیں گے۔ وہ وقت آپہنچا ہے کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی عینک چڑھی ہوئی تھی، وہ اب اسے اتار کر جیبوں میں رکھتے جا رہے ہیں اور جن کی گھٹی میں تنفر شریک تھا، ان کے مزاج کا تنقیہ ہو چلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعجاز کسی خاص مکان و زمان تک محدود نہیں ہے بلکہ تاقیامت یُوں ہی یہ دولت تقسیم ہوتی رہے گی۔

کرۂ ارض کے وُہ حصے، جہاں جہالت کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں اور دنیا کے وُہ ممالک جہاں ابرِ ضلالت سطحِ افلاک کو گھیرے ہُوئے ہے، وہاں بھی اب ہلالِ گنبدِ خضرا کی چاندنی چھٹکے گی اور وہاں کے زمین و آسمان بھی انوارِ ماہتابِ رسالت سے بقعۂ نور بنیں گے۔

اب وہ زمانہ آرہا ہے کہ وُہ شمع جس کا اجالا چالیس برس تک کوہستانِ بطحیٰ کے غاروں میں رہا تھا، اس کی روشنی سے بادشاہانِ روئے زمین کے دربار جگمگا اٹھیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ ہمارے خداوند کی ذات ملکی الصفات فنا ہونے والے انسان کی توصیفات وتعریفات سے مستغنی ہے۔ 'آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'۔ یہ بے بضاعت کیا لکھے: ؎

کہ خاصاں دریں رہ فرس راندہ اند
بلاحصی از تگ فرو ماندہ اند

اور بالفرض کچھ لکھے بھی، تو اس کی سند نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ درویش آخر اسی سرورِ کونینؐ کا ایک بے وفا غلام اور اسی کی خیر الامم کا ایک نالائق فرد ہے۔ البتہ تعریف وہ ہے، جو دشمن کے منہ سے نکلے الفضل ما شهدت به الاعداء۔ اس لیے بعض غیر متعصب عیسائی مورخوں کے وہ خیالات یہاں درج کیے جاتے ہیں، جنھوں نے ہمارے مولا اور ہمارے آقا کی نسبت ظاہر کیے ہیں۔ اگرچہ یہ مضمون بھی بہت ہی وسیع اور یہ موضوع نہایت وقیع ہے: ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

مگر اس درویش کی علالت اور بعض وجوہ طوالت کی اجازت نہیں دیتے : ع

اگر در خانہ کس است یک حرف بس است

آنحضرتؐ کی شکل و شمائل جان ڈیون پورٹ صاحب آں حضرتؐ کے حلیہ مبارک کی نسبت اپنی کتاب " ایا لوجی فار محمدؐ اینڈ دی قرآن" میں لکھتے ہیں :

" آپؐ کی شکل شاہانہ تھی، خط و خال باقاعدہ اور دل پسند تھے۔ آنکھیں سیاہ اور منور تھیں۔ بینی ذرا اٹھی ہوئی، دہن خوب صورت تھا۔ دانت موتی کی طرح چمکتے تھے، رخسار سرخ تھے۔ آپ کی صحت نہایت اچھی تھی۔ آپ کا تبسم دلآویز اور آواز شیریں و دلکش تھی۔"

ایڈورڈ گبن صاحب اپنی کتاب "تاریخ روم" میں لکھتے ہیں :

" آں حضرتؐ حسن میں شہرۂ آفاق تھے اور یہ نعمت صرف انہی کو بری معلوم ہوتی ہے، جن کو اللہ کی طرف سے عطا نہیں ہوئی۔ پیشتر اس کے کہ آپؐ کوئی بات فرمائیں، آپ کسی خاص آدمی یا گروہ کو متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ لوگ آنحضرتؐ کی شاہانہ شکل، نورانی آنکھیں، خوشنما تبسم، بکھری ہوئی داڑھی اور ایسا چہرہ جو دل کے ہر ایک جذبہ کی تصویر کھینچ دے اور ایسے حرکات و سکنات، جو زبان کا کام دیں، دیکھ دیکھ کر تعریف کیا کرتے تھے۔"

جب یورپین عیسائی مورخ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کے متعلق اتنا کچھ لکھیں، تو کسی مسلمان شاعر کی زبان سے یہ شعر نکل جانا زمین و آسمان کے قلابے ملانا نہیں ہے : ؎

تو بدیں جمال و خوبی سرِ طور گر خرامی
ارنی بگوید آنکس کہ بگفت لن ترانی

آنحضرتؐ کا اعزاز خاندان ڈاکٹر ویٹ صاحب لکھتے ہیں :

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب کے نہایت عمدہ خاندان اور معزز قوم سے تھے۔ آپؐ نہایت شکیل و جمیل اور عادات میں خلیق و بے تکلف تھے۔"

آنحضرتؐ کی فصاحت سر ولیم میور صاحب باوجودیکہ نہایت متعصب عیسائی ہیں، لکھتے ہیں :

" آں حضرتؐ کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کا خالص ترین نمونہ تھی۔"

آں حضرتؐ کی معرفتِ الٰہی و دیگر خصائل ڈاکٹر اے اسپرنگر صاحب اپنی کتاب سیرتِ محمدیؐ میں لکھتے ہیں :

" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیز فہم، نہایت اعلیٰ درجہ کے عالی نظر، صائب الرائے اور بلند خیال تھے۔ گو وہ شاعر کے نام کو پسند نہیں کرتے تھے مگر شاعری کی قابلیت

ان میں بدرجۂ غایت تھی۔ قرآن کی فصیح و بلیغ عبارت اور بلند پایہ مضامین ان کے عمدہ فضائل کے شاہد ہیں۔ اُن کے خیال میں ہمیشہ خدا کا تصور رہتا تھا۔ ان کو نکلتے ہُوئے آفتاب، برستے ہوئے پانی اور لہلہاتے ہُوئے سبزے میں خدا ہی کا یدِ قدرت نظر آتا تھا۔ ان کو بجلی کی کڑک، ندی کے شور اور پرندوں کے نغموں میں خدا ہی کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ ان کو سنسان جنگلوں اور پرانے شہروں کے کھنڈروں میں خدا ہی کے قہر کے آثار دکھائی دیتے تھے۔"

واشنگٹن اِرونگ صاحب اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں:

آنحضرتؐ کا نبی برحق ہونا "آنحضرتؐ کے اوائل زمانہ سے وسط حیات تک کے حالات سے ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس عجیب و غریب فریب سے جس کا الزام آپ پر (عیسائیوں نے) لگایا ہے، آپ کی کیا غرض تھی؟ اور ایسا پاکھنڈ پھیلانے سے آپ کا کیا مدعا تھا؟ کیا حصولِ مال مقصود تھا؟ نہیں! کیونکہ حضرت خدیجہؓ کے نکاح سے آپ فی الجملہ دولت مند ہو چکے تھے اور دعوائے نبوت سے سالہا سال پیشتر آپ نے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے مال میں اضافہ کرنے کی خواہش نہیں ہے۔

تو کیا حصولِ جاہ مراد تھی؟ یہ بھی بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے اپنے وطن میں عقل و امانت میں رفیع المرتبہ تھے اور قریش کے بزرگ قبیلے اور اس کے معزز و ممتاز طبقہ میں سے تھے۔

تو کیا حصولِ منصب مقصود تھا؟ مگر یہ بھی آپؐ کا خیال نہ تھا، کیونکہ کئی پشتوں سے تولیت کعبہ اور امارت حرم خاص آپؐ ہی کے قبیلے میں تھی اور آپ کو اپنی وقعت و حالات سے اور بھی عالی مرتبہ بننے کا یقین تھا۔ جس دین میں آپ نے نشوونما پائی تھی، اسی پر قایم رہنے سے آپ کے قبیلہ کی جاہ و عزّت کا سب دارو مدار تھا۔ مگر آپ نے اسی کی بیخ کنی کر کے اپنے تمام فائدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس مذہب کی جڑ کاٹ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے عزیز و اقربا، سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ آپ پر اہلِ شہر کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا۔ تمام اہلِ عرب اور جو لوگ کعبہ میں ملکوں ملکوں سے بتوں کی پرستش کے لیے آیا کرتے تھے، سب کو آپ سے عداوت و عناد ہو گیا۔ اشاعتِ دین کے وقت آپ کے سامنے کوئی بھی ایسا کھلم کھلا نفع نہ تھا، جو آپ کی ان تمام مصیبتوں کا کافی معاوضہ ہو سکتا، جو آپ کو خدماتِ نبوت بجالانے میں پیش آئیں بلکہ برخلاف اس کے ابتدائے رسالت میں تو آپ کو طرح طرح کے خوف و خطر ہی سامنے تھے۔ برسوں تک تو اس میں آپ کو کامیابی ہی نہ ہُوئی۔ جیسے جیسے آپ نے اپنی تعلیم کا اظہار کیا اور وحی کو آشکارا کیا، ویسے ہی ویسے لوگوں نے آپؐ کی ہنسی اڑائی اور بُرا کہنا شروع کیا۔ آخر بڑی بڑی ایذائیں دیں، جس سے آپؐ کی اور آپؐ کے اصحاب کی املاک و جائدادیں برباد ہو گئیں اور آپ کے بعض اقربا و اصحاب غیر ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور خود آنحضرتؐ کو بھی اپنے شہر میں چھپ کر رہنا پڑا اور بالآخر ہجرت کرنا پڑی۔ پس آپؐ کو

ایسی کیا غرض تھی کہ آپ اس فریب کو برسوں تک نباہتے جس کے باعث آپ کی تمام دنیوی دولتیں خاک میں مل گئیں۔"

اسی بارہ میں جان ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں :

"کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے اس حقیر و ذلیل بت پرستی کے بدلے، جس میں اس کے ہم وطن یعنی اہلِ عرب مبتلا تھے، خدائے برحق کی پرستش قایم کرکے بڑی بڑی ہمیشہ رہنے والی اصلاحیں کیں۔ وہ جھوٹا نبی تھا؛ کیا ہم اس سرگرم اور پُرجوش مصلح کو فریبی ٹھہرا سکتے ہیں؟ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائیاں مکر پر مبنی تھیں؟ نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بے شک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بجز دلی نیک نیتی و ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ ابتدائے نزولِ وحی سے اخیر دم تک مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور جو ان سے بہت کچھ ربط ضبط رکھتے تھے، ان کو بھی کبھی آپؐ کی ریاکاری کا شبہ نہیں ہوا۔"

ٹامس کارلائل صاحب اپنی کتاب "لکچرز آن ہیروز" میں لکھتے ہیں :

"ہم لوگوں یعنی عیسائیوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک پُرفن اور فطرتی شخص اور جھوٹے دعویدار نبوت تھے اور اُن کا مذہب دیوانگی و خام خیالی کا ایک تودہ ہے، اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں۔ جو جھوٹ باتیں متعصب عیسائیوں نے اس انسان (یعنی آنحضرتؐ) کی نسبت بنائی تھیں، اب وُہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کا باعث ہیں اور جو باتیں اس انسان (یعنی آنحضرتؐ) نے اپنی زبان سے نکالی تھیں، بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قایم ہیں۔ اس وقت جتنے آدمی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے۔ میرے نزدیک اس خیال سے بدتر اور ناخدا پرستی کا کوئی دوسرا خیال نہیں ہے کہ ایک جھوٹے آدمی نے یہ مذہب پھیلایا۔"

گاڈفری ہگنز اپنی کتاب اپالوجی میں عیسائیوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ جانچتے وقت تم کہتے ہو کہ وہ شریر و مکار تھے۔ ہم کہتے ہیں کہ وُہ اپنے زمانے کے سقراط تھے۔ جب ہم ان کو برائیوں سے متصف سنتے ہیں، تو ہم ان کے عادات و خصائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو فریقین (یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں) کے قول کے مطابق ابتدائے عمر و ایام شباب میں رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں اس عجیب طرزِ عمل سے آپ کا کیا مقصد تھا۔ تم اس کا یہ جواب دیتے ہو کہ ان کے دو مقصد تھے : ایک تو متعدد عورتوں سے نکاح اور دُوسرے حصولِ جاہ۔ جس سے یہ غرض تھی کہ ایک شہر کے تاجر بن کر اپنے آپ کو بادشاہ بنادیں۔ اس کے واسطے وہ چودہ برس تک خلق سے کنارہ کشی کرکے گوشہ نشینی کی زندگی

بسر کرتے رہے اور اپنے عادات و اطوار بے عیب رکھتے ہم (یعنی گاڈفری ہیگنز صاحب) دریافت کرتے ہیں کہ دنیا کی کسی تاریخ میں ایسی کوئی اور نظیر بھی پائی جاتی ہے۔ اگر عورتوں سے عشرت مقصود تھی، تو یہ عجیب معاملہ ہے کہ آپ نے پچیس سال کی عمر میں، جو وقت کہ خاص جوشِ جوانی کا خیال کیا جاتا ہے، صرف حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو اپنے ملک کے رواج کے مطابق بہت سے نکاح کر سکتے تھے۔ مگر آپ اس قاعدے سے مستفید نہ ہوتے اور اس بیوی کے تاحینِ حیات اسی کے ساتھ ستائیس برس تک نباہ کیا۔

اب رہی دوسری بات یعنی حصولِ مرتبہ، تو اس کا یہ جواب ہے کہ آپ نے کوشش و سازش کر کے اپنے کو محافظِ کعبہ کیوں بنا لیا۔ اس عہدے پر آپ کے آباء و اجداد بھی مامور تھے اور جس شخص کے نام یہ عہدہ ہوتا تھا، وہ تمام ملک عرب میں اوّل درجہ کا رئیس شمار ہوتا تھا۔ اگر صرف بلند حوصلگی مقصود تھی، تو بجائے اس کے کہ آپ نے اپنے کو مسیح کا پیرو ظاہر کیا، اگر وہ یہودیوں کا مسیح ظاہر کرتے اور بیت المقدس کو اپنا مسکن قرار دیتے، تو بلاشبہ تمام یہودی ان کے زمرے میں داخل ہو جاتے اور عیسائی بھی کم از کم اتنے تو ضرور آملتے جتنے کہ بحالتِ موجودہ شامل ہو گئے ہیں۔"

تعلیمِ محمدیؐ و اصلاحات

ایڈورڈ گبن صاحب کہتے ہیں:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب شکوک و شبہات سے پاک و صاف ہے۔ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔ مکے کے پیغمبر نے بتوں کی، انسانوں کی اور ستاروں کی پرستش کو معقول دلائل سے رد کر دیا۔ وہ اصول اوّل یعنی ذات باری تعالیٰ جس کی بناء عقل و وحی پر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔ چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔"

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب سیرت محمدیؐ میں لکھتے ہیں:

"ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو، جن کی تاریکی مدتوں سے جزیرہ نمائے عرب پر چھا رہی تھی، کالعدم کر دیا۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں۔ مذہبِ اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو اور کسی مذہب میں نہیں۔"

گاڈفری ہیگنز صاحب کہتے ہیں:

"انجیل کی طرح قرآن شریف بھی غریب آدمی کا دوست و غم خوار ہے۔ وہ آدمیوں کی مدارج کے اعتبار سے توقیر نہیں کرتا۔ یہ امر اس کے مصنف کی لازوال نیک نامی کا باعث ہے۔"[1]

---

[1] رسول کریمؐ اس کے مصنف نہیں بلکہ قرآن مجید ان پر نازل ہوا۔ عیسائی دانستہ ایسا لکھتے ہیں۔ (ادارہ)

اذان کی نسبت ایک عیسائی مصنف لکھتا ہے کہ:

آنحضرتؐ کی مقرر کردہ اذان "مختلف اوقات کی نماز کی اطلاع موذن مسجد کے میناروں پر کھڑے ہوکر اذان دے کر کرتے ہیں۔ ان کی آواز جو ایک بہت سادہ مگر سنجیدہ لہجے میں بلند ہوتی ہے، شہروں کے غل غپاڑے میں مسجد کی بلندی سے دلکش و دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سنسان رات میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اکثر فرنگیوں کی زبان سے پیغمبر صاحب کی تعریف نکل گئی ہے کہ انھوں نے یہودیوں کے معبد کی قرنا اور کلیسا ئے نصاریٰ کے گھنٹوں کی آواز کے مقابلہ میں انسانی آواز کو پسند کیا۔"

ایڈورڈ گبن صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

تعلیمِ محمدیؐ کی برکتیں "حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت میں سب سے آخر بات جو غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی رسالت لوگوں کے حق میں مفید ہوئی یا مضر؟ جو لوگ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سخت دشمن ہیں، وہ بھی اور عیسائی و یہودی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باوجود پیغمبر برحق نہ ماننے کے اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرتؐ نے دعویٰ نبوت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لیے کیا تھا، گو وہ یہ کہیں کہ صرف ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اس سے اچھا ہے۔ گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذاہب سے مذہب اسلام اچھا ہے۔ آنحضرتؐ نے انسان کے خون کے کفارے کو نماز و روزہ و خیرات سے بدل دیا، جو ایک پسندیدہ اور سیدھی سادی عبادت ہے یعنی جو انسان کی قربانی بتوں پر ہوتی تھی، اس کو معدوم کر دیا۔ آنحضرتؐ نے مسلمانوں میں نیکی و محبت کی ایک روح پھونک دی۔ آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں پر اور یتیموں پر ظلم و ستم کو روک دیا۔ قومیں جو ایک دوسرے کی جانی دشمن تھیں، وہ اعتقاد و فرمانبرداری میں متفق ہوگئیں اور خانگی جھگڑوں میں جو بہادری بیہودہ طور سے صرف ہوتی تھی، وہ نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے مقابلے پر مائل ہوگئی۔"

ٹامس کارلائل صاحب کہتے ہیں:

"اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہلِ عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی ہے، عرب کے چٹیل بیدانوں میں بسر کرتی تھی اور کسی شخص کو اس کا کچھ خیال ہی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ بھیجا گیا، جس پر وہ یقین کرتے تھے۔ اب دیکھو، کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا، وہ تمام دنیا میں مشہور ہوگئی اور چھوٹی چیز بھی بڑی بن گئی۔ اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی ہوگئی۔"

اسلام بزورِ شمشیر نہیں پھیلا اگرچہ اس مضمون پر ایک مستقل کتاب ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب پروفیسر مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی موجود ہے، جس کا اُردو ترجمہ بھی "دعوتِ اسلام" کے نام سے ہو چکا ہے اور اس مسئلہ پر زیادہ کہنے سننے کی اب ضرورت نہیں رہی ہے، تاہم ایک اور مورخ یعنی جان ڈیون پورٹ صاحب کا خیال بھی درج کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس بات کا خیال کرنا بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدے کی تلقین کی گئی ہے، اس کی اشاعت بزورِ شمشیر ہوئی کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں، وہ بلا تامل اس بات کو تسلیم کریں گے کہ آنحضرت کا دین جس کے ذریعہ سے انسانوں کی قربانی کے بدلے نماز اور خیرات جاری ہوئی اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی وحسنِ معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی، وہ مشرقی دنیا کے لیے ایک حقیقی برکت تھا اور اسی وجہ سے خاص کر آنحضرتؐ کو ان خونریز تدبیروں کی ضرورت نہ ہوئی، جن کا استعمال بلا استثناء اور بلا امتیاز حضرت موسیٰؑ نے بُت پرستی کے نیست و نابود کرنے کے لیے کیا تھا۔ پس ایسے اعلیٰ وسیلہ کی نسبت جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات و مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کے لیے پیدا کیا ہے، گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغویات ہے۔"

آنحضرتؐ کا سلوک غیر مذاہب کے ساتھ ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ:

"مسلمانوں کی لڑائیوں کو ان کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آنحضرتؐ نے اپنی حیات میں جو مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قایم کیں، ان سے خلفا نے دوسرے مذاہب کو آزادی دینے کا سبق حاصل کیا۔ ملک عرب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کی عبادت گاہ اور ان کا مفتوحہ ملک تھا۔ اگر وہ چاہتے، تو وہاں کے بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والوں اور بت پرستوں کو شرعاً نیست و نابود کر سکتے تھے۔ مگر آنحضرتؐ نے انصاف کو کام فرما کر نہایت عاقلانہ تدبیریں اختیار کیں۔"

آنحضرتؐ کی نسبت اتہام مرض صرع اکثر عیسائی مورخوں نے آنحضرتؐ کی سوانحعمری لکھتے وقت اس امر کو بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے کہ آپ عارضۂ صرع یعنی مرگی میں مبتلا تھے اور نزولِ وحی کے وقت اضطرار وغشی لاحق ہونے کے متعلق جو روایتیں مشہور ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ معتبر ہیں یا غیر معتبر، اُن سے عیسائیوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ آنحضرتؐ کو صرع کے دورے ہوتے تھے اور اس وجدانی حالت و کیفیت کو صرع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس اتہام کی تردید اولاً عیسائی مورخوں کی زبان سے بیان کی جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ درویش بھی اس مسئلے پر کچھ روشنی ڈالے گا۔

نہایت مشہور و لایق مورخ گبن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرعی دوروں کی تکذیب ان الفاظ میں کرتا ہے:

"یہ یونانیوں کا ایک بیہودہ اتہام ہے۔"

اور ایک مقام پر بھی یہی مورخ کہتا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عارضہ صرع، بیہوش کر دینے والی بیماری کو تھیوفینز، رومارس اور بعض دوسرے یونانی مورخوں نے بیان کیا ہے اور بالنجر و پریڈ و مارکشی نے اپنے سخت تعصب سے اس کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر نگل لیا ہے۔"

گاڈفری ہیگنز کہتا ہے:

"یہ متواتر بیان کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عارضہ صرع لاحق تھا، یونانیوں کا ایک ذلیل اختراع ہے جنھوں نے اس عارضہ کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس لیے منسوب کر دیا ہے کہ اس کے اخلاق پر ایک دھبا ہو جائے اور عیسائیوں کو طعنہ زنی و تنفر کا موقع ملے۔"

اگرچہ یورپین مورخوں کی شہادت مذکورہ نفس الزام کی تردید کے لیے کافی ہے مگر اس تصویر کا دُوسرا رُخ بھی دکھایا جاتا ہے۔ غور طلب یہ امر ہے کہ مرگی کا بیمار رسالت جیسے اہم ترین کام کو انجام بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟

از روئے تحقیقات طب صرع کا مریض اکثر دیوانہ ہوتا ہے بلکہ دماغ میں کوئی خلقی نقص ہونے کی وجہ ہی سے عموماً یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ مرگی کے بیمار کا حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اس میں تیزی، چستی و چالاکی نام کو نہیں رہتی۔ سُستی و کاہلی اسے باقاعدہ کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ اس کے تمام قوائے جسمانی و دماغی و ذہنی تقریباً معطل ہو جاتے ہیں۔ اس کی صورت سے دائمی ضعف و نقاہت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کمزوری و معمولی اس کو محنت و مشقت پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔ جفاکشی و صبر و استقلال اس کے پاس سے رفوچکر ہو جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آثار متذکرہ میں سے آیا کوئی اثر آنحضرتؐ میں پایا جاتا تھا یا نہیں؟ کوئی مورخ خواہ عیسائی ہو یا مسلمان یہ بیان نہیں کرتا کہ ان آثار میں سے ایک بھی اثر آنحضرتؐ میں پایا جاتا تھا بلکہ سب اس پر متفق ہیں کہ آپ نہایت قوی، تندرست و مضبوط تھے۔ تمام عمر آپ کو بڑے بڑے خطرے پیش آئے اور بڑی بڑی تکلیفیں اور صدمے آپ پر گزرے مگر آپ ہمیشہ ثابت قدم رہے اور آپ کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ یہاں تک کہ جس کام کے واسطے آپ مبعوث ہوئے تھے، اس کو پورا کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ وہ کام محض مسیحائی اور کوئی ایسا معمولی کام نہ تھا۔ جس کے انجام دینے کے لیے اوروں کی بھی ہمت پڑتی ہو۔ جیسا کہ خواجہ حافظؒ فرماتے ہیں: ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا مے کرد

بلکہ وہ کام تمام انبیائے سابقین کے مذاہب کی تجدید و تکمیل تھی۔ اللہ اکبر! روحی فداک یا رسول اللہ۔ ؎

بہت سے کام چھوڑے تھے ادھورے اگلے نبیوں نے
دقیقہ تم نے کچھ رکھا نہ ختم المرسلینؐ باقی
(شبیر)

بیانِ مذکورہ بالا سے یہ تو بخوبی ثابت ہوگیا کہ آنحضرتؐ میں مرض صرع کی کوئی علامت نہ تھی۔ اب ہم آنحضرتؐ کے کارنامے کو پیشِ نظر رکھ کر چند تنقیحات قایم کرتے ہیں تاکہ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جو کام آنحضرتؐ نے کیے، ان کی انجام دہی مرگی کے بیمار سے ممکن ہی نہیں۔

کیا یہ قرینِ قیاس ہے کہ ایک مرگی زدہ آدمی جس کو ہر شخص جانتا ہو کہ یہ اس عارضہ میں مبتلا ہے، اپنی بیماری کے دوران کو آثارِ نزولِ وحی قرار دے کر بطورِ ثبوتِ نبوت پیش کرے اور سب اُس کو تسلیم کر لیں۔ وہ اپنے ملک و قوم کے مروجہ دین کے خلاف ایک نئے مذہب کا رستہ دکھائے اور وہ قوم اس کو مان لے۔ وہ بت پرستوں کے سامنے استیصالِ بت پرستی کا وعظ بیان کرے اور بت پرست اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اس کی آواز پر آمنّا و صدقنا کہہ اُٹھیں اور اپنے معبودوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیں۔ وہ پیغمبری کا دعویٰ کرے اور اُس کے عزیز و اقارب و اکابرِ قوم سب اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر کے اس کا کلمہ پڑھنے لگیں، اس کے حکم پر جلاوطنی اختیار کر لیں، گھر بار، روپیہ پیسہ، زراعت و تجارت چھوڑ دیں۔ اس کے اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جائیں اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو قتل کرنے سے بھی نہ چُوکیں؟

کیا کوئی مرگی زدہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی تجدید اس طور سے کر سکتا ہے جیسے کہ آنحضرتؐ نے کی اور جس کی کوئی نظیر آنحضرتؐ سے قبل دنیا میں نہیں پائی جاتی؟

کیا کوئی صرع کا بیمار علم الٰہیات کو ایسے مستحکم و معقول اصول پر قایم کر سکتا ہے جیسے کہ آنحضرتؐ نے قایم کیا اور جس کی مثال دنیا میں معدوم ہے؟

کیا کوئی ضعیف الدماغ یا ناقص الدماغ شخص قوانینِ تمدّن و معاشرت و اخلاق کو اس درجہ کمال پر پہنچا سکتا ہے، جہاں آنحضرتؐ نے پہنچا دیا؟

کیا کسی مصروع نے اپنے بنی نوع کی فلاح و بہبود کے واسطے ملکی و مالی و دینی و دنیوی قوانین کا ایسا مجموعہ مرتب کیا ہے جیسا کہ آنحضرتؐ نے مرتب کیا؟ جو اپنی طرز میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ کیا کسی مصروع نے اپنی کوششوں سے قلیل مدت میں ایک زبردست جزیرہ نما کو جس کی وسعت تقریباً ہندوستان کے مساوی ہے، فتح و مسخر کیا ہے؟ کیا کسی صرع کے بیمار نے مختلف قبائل کو اخوت کی حبل المتین سے کس کر ایک مضبوط و عظیم الشان قوم بنا دیا ہے؟

کیا کسی مصروع نے دنیا کے علماء و فضلاء و شعراء کے سامنے بطور دلیلِ نبوت ایسی کتاب پیش کی ہے، جو بلحاظ فصاحت و بلاغت و خوبیٔ مضامین بے مثل ہو اور جس کے مانند آج تک کوئی تصنیف نہ کر سکا ہو۔ حالانکہ وہ کتاب تیرہ سو برس سے چلا چلا کر تمام دنیا کو اشتہار دے رہی ہے کہ اس کتاب کے مثل تم ایک سورۃ ہی بنا لاؤ اور اگر تنہا نہیں بنا سکتے، تو اپنے حمایتیوں کو بلا لو۔ سب مل کے بناؤ۔ کیا یہ سب کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے، ایک ناتواں، لاچار، معذور، ضعیف القویٰ، کمزور دماغ والے شخص سے ظہور میں آنے ممکن ہیں؟

مصروع کو بیمار کو جانے دو۔ کیا دنیا کے کسی صحیح المزاج، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ و طاقتور آدمی نے بھی اپنی مدت العمر

یں وہ تمام مہمات سر کی ہیں، جو آنحضرتؐ نے کیں؟

معمولی انسان کو بھی چھوڑ دو۔ کیا دوسرے اولوالعزم نبیوں سے بھی یہ سب کچھ ظہور میں آیا تھا؛ مخالفین کے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں ہے، جس سے ہمارے سوالات کا جواب اثبات میں مل سکے۔ اور اس لیے قطعی طور پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ کارہائے نمایاں جو بنی اسرائیل کے سب سے بڑے مقنن[1] حضرت موسیٰؑ سے، دنیا کے سب سے بڑے عقلمند حضرت سلیمانؑ سے اور خدا کے اکلوتے فرزند حضرت عیسیٰؑ سے وجود میں نہ آئے ہوں۔ ان کی تکمیل ریگستانِ حجاز میں پرورش پایا ہوا ایک بے پڑھا عرب فرمادے، تو کیوں اس کے افعال و اقوال کو ہم منجانب اللہ نہ سمجھیں اور کیوں اس اُمّی کو ہم سید المرسلین وخاتم النبیین نہ کہیں!

اللّٰھم صلّ علیٰ محمّد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلّم۔

---

[1] عیسائی حضرت موسیٰؑ کو سب سے بڑا مقنن، حضرت سلیمانؑ کو دنیا میں سب سے زیادہ عقلمند اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا کہتے ہیں۔ اس فقرے میں یہ تینوں صفات انھیں کی زبان سے بیان کر دی گئی ہیں۔ ۱۲ شبیر

سید الانبیاءؐ

ٹامس کارلائل

ٹامس کارلائل انیسویں صدی کا ایک نامور انگریز مصنف، مورخ اور مفکر تھا۔ اس کے لکچروں کا مجموعہ "ہیروانیڈ ہیرو ورشپ" بہت مشہور ہے۔ جس میں ایک لکچر حضور رسالتمآبؐ کے متعلق بھی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ عیسائی اہلِ قلم اور اہلِ کلیسا اسلام اور بانیِ اسلام پر طرح طرح کے الزامات عائد کرکے اپنے مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کارلائل نے پیغمبرِ اسلامؐ کی عظمت کا اعتراف جس خلوص و دیانت کے ساتھ کیا ہے، وہ خود اس کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی دلیل ہے۔ پیشِ نظر مضمون کارلائل کے اسی لکچر سے ماخوذ ہے۔

ہمارے پیشِ نظر ہیرو (محمدؐ) کو اپنے ابنائے جنس میں خدا نہیں مانا گیا بلکہ ایسا انسان سمجھا گیا ہے، جسے خدا کی طرف سے دی ہوئی یعنی پیغمبر ——— کسی بڑے انسان کو خدا سمجھ لینا لوگوں کی نہایت فاش اور ابلہانہ غلطی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیشہ یہ مشکل سوال پیش رہا ہے کہ دراصل اسے کیا سمجھنا چاہیے اور کس طرح اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ کسی عہد کی تاریخ میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے کسی جلیل القدر انسان کا استقبال کس طرح کیا۔ لوگوں کو ہمیشہ ایسے انسان میں صفاتِ ایزدی کا کچھ نہ کچھ پرتو نظر آیا ہے اور یہ نہایت اہم سوال رہا ہے کہ لوگ ایسے شخص کو خدا سمجھیں یا پیغمبر یا کچھ اور ——— حضرت محمدؐ میرے خیال میں یقیناً پیغمبرِ صادق ہیں اور میں آپؐ کے وہ اوصاف بیان کر دینا چاہتا ہوں، جو انصاف کے ساتھ بیان کر دینا ضروری ہیں۔ حضرت محمدؐ کے متعلق ہم عیسائیوں کا یہ قیاس بالکل بے بنیاد ہے کہ "آپ دغاباز اور کذبِ مجسم تھے اور آپ کا مذہب محض فریب و نادانی کا ایک مجموعہ ہے۔" کذب و افترا کا وہ انبارِ عظیم جو ہم نے اپنے مذہب کی حمایت میں اس ہستی کے خلاف کھڑا کیا ہے، خود ہمارے لیے شرمناک ہے۔ اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آج بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ انسانوں کے حق میں شمعِ ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔ یہ اٹھارہ کروڑ انسان بھی ہماری طرح خدائے تعالیٰ کے دستِ قدرت کا نمونہ ہیں۔ بندگانِ خدا کی بیشتر تعداد آج بھی کسی اور شخص کی بہ نسبت محمدؐ کے اقوال پر ایمان رکھتی ہے۔ کیا ہم کسی طرح اسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ سب روحانی بازی گری کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ جس پر اتنے بندگانِ خدا ایمان لائے؟ کیا ایک جھوٹا آدمی کسی مذہب کا بانی ہو سکتا ہے؟ جھوٹا آدمی تو اینٹ اور چونے کا ایک مکان تک نہیں بنا سکتا۔ اگر کسی شخص کو مٹی، چونے اور ان اشیاء کے خواص کا صحیح علم نہ ہو اور وہ ان کا پورا لحاظ نہ رکھے، جو مکان کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں، تو اس کا بنایا ہوا مکان مکان نہ کہلا سکے گا، بلکہ مٹی کا ایک ڈھیر ہوگا۔ ایسا مکان بارہ صدی تک نہیں قائم رہ سکتا اور نہ اس میں اٹھارہ کروڑ انسان سما سکتے ہیں۔

61

میرا خیال ہے کہ خلوص بڑا گہرا خلوص اور سچا خلوص ہر بڑے انسان کی پہلی خصوصیت ہے اور ایسے شخص کو ہم "اوریجنل انسان" کہتے ہیں۔ اس کی فطرت کسی پہلے مرقع کی نقل نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا قاصد ہے، جو پردۂ غیب سے پیغام دے کر ہمارے پاس بھیجا گیا۔ خواہ ہم اسے شاعر کہیں یا پیغمبر یا دیوتا۔ بہرصورت ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ساری نوعِ انسان کے الفاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ حقیقتِ اشیاء کی روحِ رواں سے نکلتا ہے اور رات دن اسی میں بسر کرتا ہے۔ اوہام اس سے اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے۔ وہ اندھا ہو، بے خانماں ہو، مصیبت زدہ ہو، روزمرہ کی گفتگو میں منہمک ہو۔ لیکن یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ کیا اس کے الفاظ فی الحقیقت ایک طرح کی وحی نہیں ہیں؟ جب اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی اور لفظ ہی نہ ہو، تو پھر ہم وحی کے سوا اسے کس نام سے تعبیر کریں؟ ایسے انسان کی ہستی قلبِ کائنات سے ابھرتی ہے اور وہ اشیاء کی بنیادی حقیقت کا ایک جزو ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس دنیا میں بہت سے الہام بھیجے ہیں۔ لیکن کیا یہ شخص اس کا آخری اور تازہ ترین مظہر نہیں ہے۔" اس کی عقل وحی کی پروردہ ہوتی ہے۔" ہم کسی طرح ~~حضرت محمدؐ کو حریص و منصوبہ~~ باز اور ان کی تعلیمات کو جہل و نادانی نہیں سمجھ سکتے۔ وہ پیغام جو آپ لے کر آئے تھے، بالکل سچا تھا۔ وہ ایک آواز تھی، جو پردۂ غیب سے بلند ہوئی۔ اس شخص کے نہ اقوال جھوٹے تھے نہ افعال۔ اس میں تنگ ظرفی اور نمائش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ زندگی کا ایک جادۂ تاباں تھا، جو خاص سینۂ فطرت سے ہویدا ہوا، اور جسے خالقِ عالم نے کائنات کو منور کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

آں حضرتؐ نے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد اپنے چچا کے ساتھ تجارت اور دوسرے اغراض کے لیے مختلف سفر کیے۔ لیکن آپ کا اہم ترین سفر وہ ہے، جو سنِ شعور سے چند سال قبل شام کے میلوں میں شرکت کی غرض سے آپ نے اختیار کیا تھا۔ کیونکہ اس موقع پر پہلی دفعہ آپ کو بیرونی دنیا کے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اس عنصرِ جدید (یعنی مذہب عیسوی) سے واقف ہوئے، جو آپ کے لیے بے انتہا اہم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سفر کے اثناء میں حضرت ابوطالب اور آپؐ سرجیس نام ایک نسطوری راہب کے ہاں ٹھہرے تھے، جس نے آپ کو مذہب عیسوی کی تعلیم دی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم عمر بچہ کو کوئی راہب کیا تعلیم دے سکتا ہے۔ غالباً نسطوری راہب کے اس واقعہ میں بہت مبالغہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی عمر اس وقت چودہ سال کی تھی، اور آپ عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے تھے۔

یہ امر کہ آپ نے جوشِ شباب کے ختم ہونے تک بالکل معمولی طریقہ پر اور نہایت سادگی و خاموشی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزارے، بجائے خود اس خیال کی تکذیب کرتا ہے کہ آپ کی نیت میں کس طرح کا مکر و فریب تھا۔ چالیس سال کی عمر میں آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس وقت تک بھی آپ کی ساری کوشش پاک زندگی بسر کرنے کے لیے تھی اور آپ کی شہرت بہت اچھی تھی اور ہمسائے آپ کے متعلق بہت نیک خیالات رکھتے تھے۔ مخالفوں کا یہ کہنا کہ جب بڑھاپا آ پہنچا، ساری گرمیٔ شباب ختم ہو گئی اور آپ کے لیے اس دنیا میں صرف اطمینان و عافیت ہی ایک چیز باقی رہی تو اس وقت آپ کو ہوس پرستی کی سوجھی اور اپنے سارے گزشتہ خصائل و فضائل پر پانی پھیر کر ایک ایسی شے کے لیے مکر و فریب اختیار کیا، جس سے آپ کسی طرح متمتع نہ ہو سکتے تھے ایک ایسی بات ہے، جس کو میں کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس سیر چشم، پاک طینت اور صاف باطن انسان میں، جسے مادرِ صحرا نے اپنے

آغوشِ شفقت میں پالا تھا، جذبۂ ہوس پرستی اور شہرت طلبی نہ تھی، بلکہ کچھ اور ہی خیالات موجزن تھے۔ یہ اس قسم کی بزرگ و برتر جان پاک تھی، جسے خلوص و صداقت کے بغیر گزر ہی نہیں۔ جس کے خمیر میں خود فطرت اخلاص کو جگہ دیتی ہے۔ جس وقت اور لوگ اوہام میں مبتلا تھے اور اسی پر اڑنے رہنے کے لیے جنگ و جدل کر رہے تھے، اس شخص کی عقل پر وہم و گمان کا پردہ نہ پڑ سکا۔ وہ اپنی روح اور حقایق اشیاء کے ساتھ سب سے الگ تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رازِ ہستی ایک بیم و رجا کے ساتھ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ جس کے وجود کو کسی طرح کا وہم و گمان پوشیدہ نہ کر سکا۔ یہ صفت جسے ہم نے "خلوص" کے لفظ سے تعبیر کیا، درحقیقت صفاتِ ایزدی کا ایک پرتو ہے اور ایسے انسان کی آواز دراصل ہاتفِ غیب کی آواز ہے۔ جسے لوگ انتہائی توجہ سے سنتے ہیں اور انہیں سننا چاہیے، کیونکہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ہیچ ہے۔

آنحضرت کی عمر کا چالیسواں سال تھا۔ آپ ماہِ رمضان میں تسبیح و تحلیل اور ان مسائل پر غور و فکر میں بسر کرنے کی غرض سے مکہ کے قریب کوہ حرا کے ایک غار میں تشریف لے گئے تھے کہ ایک دن آپؐ نے اپنی بیوی خدیجہؓ سے فرمایا کہ فضلِ باری تعالیٰ سے تمام عقدے حل ہو گئے۔ میرے سارے شکوک و شبہات رفع ہو گئے اور میں حقایق و معارف کو بے نقاب دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمام اصنام و عقاید مہمل ہیں۔ مٹی کے کھلونے ہیں۔ سارے عالم کا مالک خدائے واحد ہے۔ ہمیں ان تمام بتوں سے منہ موڑ کر اسی ذاتِ واحد کے آگے سر جھکانا چاہیے۔ صرف وہی ایک ذاتِ بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوا عظمت و رفعت کا کوئی نشایاں نہیں۔ وہ حقیقت ہے۔ یہ بت مجاز۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا۔ وہی ہمیں پال رہا ہے اور ہم سب اسی کا پرتو ہیں۔ اسی حسنِ ازل کی ایک عارضی نقاب ہیں۔ "اللہ اکبر" یعنی خدا ہی بزرگ و برتر ہے اور "اسلام"، کا مطلب ہے راضی برضائے الٰہی رہنا۔ یہ سمجھنا کہ ہماری قوت اسی کی کامل اطاعت میں مضمر ہے، وہ ہماری دنیا اور آخرت کے لیے جو چاہے کرے۔ جو کچھ ہمارے لیے بھیجے، خواہ وہ موت ہو یا موت سے بدتر کوئی چیز، وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ ہم اپنے کو اسی کے حوالے کرتے ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ "اگر اس کا نام اسلام ہے، تو کیا ہم سب مسلمان نہیں ہیں" اسلام عبارت ہے ایثارِ نفس اور نفس کشی سے۔ یہ عقل کا وہ نقطۂ کمال ہے، جو قدرت اس دنیا پر اب تک منکشف کر سکی۔ اور یہی وہ نور ہے، جو اس اُمّی سیدِ عربی کی روح کو منور کرنے کے لیے ظاہر ہوا تھا۔ حیاتِ سرمدی کے اس مہر منور کو جو ظلمت کدۂ موت میں طلوع ہوا تھا۔ آنحضرتؐ نے "وحی" اور "فرشتہ جبرئیل" کے نام سے موسوم کیا۔ کیا آج بھی کوئی بتا سکتا ہے کہ اسے اور کس لفظ سے تعبیر کرنا چاہیے؟ .... آنحضرتؐ کی تبلیغ قدرتاً قریش کو ناگوار گزری، جو کعبہ کے پاسبان اور بتوں کے متولی تھے۔ دو ایک ذی اثر آدمی اسلام لے آئے تھے۔ اسلام گو آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، لیکن اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ جس سے ہر شخص ناراض ہو رہا تھا اور کہتا تھا کہ "یہ کون ہیں، جو اپنے کو ہم سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں احمق اور ہمارے بتوں کو لکڑی کے کھلونے ٹھیراتے ہیں۔" آخر آپ کے خوش صفات چچا ابو طالب نے آپ سے کہا: جانِ عم! کیا تم اس تبلیغ سے باز نہیں آسکتے؟ اپنی حد تک اس عقیدہ کے پابند رہو۔ لیکن اس کا چرچا کر کے دوسروں کو پریشان کرنے، سردارانِ قبائل کو ناراض کرنے اور ہمیں خود اپنے کو خطرہ میں ڈالنے سے کیا حاصل؟" آنحضرتؐ نے یہ سن کر جواب دیا کہ "اگر میرے داہنے ہاتھ میں، سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر بھی رکھ دیں اور اس تبلیغ سے باز رہنے کی خواہش کریں تو بھی میں اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔" اس پیغامِ صداقت میں، جو آپ

لے کر آئے تھے، ایک ایسا فطری عنصر شامل تھا، جو آفتاب و ماہتاب غرض فطرت کی کسی صنعت سے کم نہ تھا۔ یہ عنصر مہ و خورشید اور تمام انسانوں اور اشیاء کی مخالفت کے باوجود اس وقت تک اپنا اظہار کرتا رہے گا، جب تک اسے خدائے تعالیٰ کا حکم ہوگا۔

ہجری ۱ھ، عیسوی ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔ اس وقت آنحضرتؐ کی عمر ترپن سال کی تھی۔ آپ بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کے احباب ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے۔ آپ کا راستہ سنسان اور پُرخطر تھا اور بجز اس کے کہ خود آپ کا دل نورِ امید سے روشن تھا، ظاہری صورتِ حال نہایت تاریک تھی۔ ایسی صورتوں میں سب آدمیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ اب تک آنحضرتؐ نے صرف ترغیب و تلقین کے ذریعہ اپنے مذہب کی اشاعت فرمائی تھی۔ لیکن جب ستم شعار اعداء نے آپؐ کو بے رحمی کے ساتھ وطن سے نکال دیا اور نہ صرف اس پیغام ایزدی کی طرف سے بے اعتنائی کی، بلکہ آپ کی جان کے بھی درپے ہوئے تو مادرِ صحرا کے اس پُرجوش فرزند نے اس طرح اپنی مدافعت کا تہیہ کیا، جو ایک انسان اور ایک عرب کے شایاں تھا۔ اس نے کہا "اگر قریش اسی پر تلے ہوئے ہیں، تو یہی سہی۔ یہ لوگ اس پیغام کو نہیں سنتے، جو ان کے اور تمام نوعِ انسان کے لیے بے انتہا اہم ہے اور چاہتے ہیں کہ اسے جبر و تشدد اور قتل و غارت کے ذریعہ دبا دیں۔ اچھا! تو انھیں شمشیر آزمائی بھی کر لینے دو۔"

اس کے بعد آنحضرتؐ کو دس سال اور ملے، جو سخت جنگ و جدل اور جد و جہد میں صرف ہوئے۔ اس شدید کش مکش کا جو نتیجہ نکلا، وہ آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت کا معیار اسی کو قرار دے لیں، تو یہ ایک بنیادی غلطی ہوگی۔ تلوار استعمال بے شک ہوئی، مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے؟ ہر نیا خیال ابتداءً ایک ہی شخص کے دماغ میں پیدا ہوتا اور اسی میں جاگزیں رہتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک انسان اپنے تمام ابنائے جنس کے خلاف اس کا پابند ہوتا ہے۔ اگر وہ اکیلا تلوار لے کر اس خیال کی اشاعت کرنا چاہے، تو شاید ہی کچھ حاصل ہو۔ اس لیے پہلے تو اسے تلواریں بہم پہنچانی پڑیں گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر خیال خود بخود وسعت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مذہب عیسوی کا دامن بھی ہمیں انسانی خون کے دھبوں سے پاک نہیں نظر آتا۔ جب اس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو اس نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔ کیا شارلیمین کے عہد میں سکسنیوں کا تبدیل مذہب تبلیغ کا نتیجہ تھا؟ اس لیے زورِ شمشیر کا اعتراض میرے خیال میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک اس دنیا میں ہر شے کو جد و جہد کا حق حاصل ہے، خواہ وہ زبان سے ہو یا تلوار سے یا کسی اور ذریعے سے، جو اسے میسر آ جائے۔ وہ ہر چند تبلیغ و تلقین کرے۔ لڑے جھگڑے اور ایڑی چوٹی کا زور لگائے لیکن انجام کار یہ جد و جہد کسی ایسی چیز پر غالب نہ آ سکے گی، جو مغلوب ہونے کی مستحق نہ ہو۔ جو چیز اس سے بہتر ہے، وہ اس کو ہرگز زیر نہیں کر سکتی۔ البتہ جو چیز اس سے بدتر ہے، اس پر وہ ضرور قابو پا لے گی۔ اس مبارزتِ عظمیٰ میں خود قدرت ثالث ہے، جو کبھی غلطی نہیں کر سکتی اور آخر کار وہی شے فروغ پائے گی، جو سب سے زیادہ مطابق فطرت ہے اور جسے ہم عام طور پر "صادق ترین" کہتے ہیں۔

مادرِ صحرا کے اُس اُمّی فرزند (آنحضرتؐ) نے اپنے پُرخلوص اور روشن ضمیر کے ذریعہ سے جو موت و حیات کی طرح صداقت سے معمور تھا، اور اپنی نگاہ حقیقت آشنا کی بدولت جو بالکل خداداد تھی، عربوں کی لایعنی بت پرستی، یونانیوں اور یہودیوں کے مذہبی مناظرات، قدیم روایات، رسم و رواج اور فضول کج بحثیوں میں اصل حقیقت کو پا لیا اور فرمایا کہ "بت پرستی فعل عبث ہے"، ان

لکڑی کے بُتوں کو تم لوگ تیل اور موم لگاتے ہو اور انھیں مکھیاں چمٹتی ہیں۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہیں، جو تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ پوچ اور مہمل کفر و شرک ہے۔ اگر تم ان کی حقیقت سمجھو، تو اُن کا وجود دہشت خیز اور نفرت انگیز ہو جائے۔ بقا صرف خدا کی ذات کو ہے۔ قوت و اقتدار اسی کو حاصل ہے۔ اسی نے ہم کو پیدا کیا۔ وہی ہم کو مار اور جلا سکتا ہے۔ "اللہ اکبر"۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تمہارے حق میں وہی بہتر ہے، جو وُہ چاہے۔ خواہ وہ تمہارے نفس کو کتنا ہی گراں گزرے، لیکن تم اسی کو بہترین پاؤ گے۔ تم اس کے اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ دنیا اور عقبیٰ میں تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" اگر وحشی بُت پرستوں نے آپ کے اس پیغام کو قبول کر لیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے اسے اپنے حرارت بھرے سینوں میں جگہ دی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میرے نزدیک وہ اسی طرح قبول کیے جانے کے قابل تھا۔ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی یہی ایک ایسا پیغام ہے، جسے ہر شخص کو قبول کرنا چاہیے۔ اس سے انسان اس معبدِ عالم کا سر نشین بن جاتا ہے۔ خالقِ جہاں کے احکام کا ہم صفیر ہو جاتا ہے اور ان احکام کی احمقانہ مخالفت کے بجائے اُن کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے لگتا ہے۔ آج تک مجھے فرض شناسی کی اس سے بہتر تعریف نہ معلوم ہو سکی۔ مقصدِ کائنات کا ساتھ دینے میں تمام محاسن شامل ہیں۔ اس سے انسان کو نیکی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ مقصدِ کائنات کا کامیاب ہونا ضروری ہے اور وہ صراطِ مستقیم پر رہتا ہے۔

آنحضرتؐ سے معجزات ظہور میں نہیں آئے اور آپؐ نے اکثر بلا تامل کہہ دیا "میں معجزے نہیں کر سکتا۔ میں ہادیِ خلق ہوں اور میرا کام ان عقاید کو تمام مخلوق تک پہنچانا ہے۔" اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آپ کے نزدیک یہ کائنات ایک معجزۂ عظیم رہی۔ چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں کہ "اس دنیا کو دیکھو! کیا وُہ دستِ قدرت کی عجیب و غریب صنعت نہیں ہے؟ یہ ایک نشانی ہے، تمہارے لیے اگر تم دیدۂ بینا رکھتے ہو، یہ زمین خدا نے تمہارے لیے پیدا کی اور اس پر راستے بنا دیے۔ تم اس پر رہ سکتے ہو اور چل پھر سکتے ہو۔" عرب جیسے گرم و خشک ملک میں بادلوں کا وجود آنحضرتؐ کے لیے حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "بادلوں کے یہ پرے، جو سینۂ فلک کی گہرائی سے نکلتے ہیں! آخر کہاں سے آتے ہیں؟ سیاہ ابر کے یہ دَل کے دَل آسمان پر جمع ہوتے اور برستے ہیں، جن سے مُردہ زمین جی اُٹھتی ہے، سبزہ لہلہانے لگتا ہے اور کھجوروں سے لدے ہوئے بلند سایہ دار درخت پیدا ہوتے ہیں۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں ہے؟ تمہارے مویشی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے، جو تمہاری خدمت کرتے اور تمہارے لیے غذا اور لباس بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ شام کے وقت قطار در قطار گھروں کی طرف لوٹتے ہیں اور تمہارے لیے ایک نعمت ہیں۔" آپ نے اکثر جہازوں کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا ہے۔ "وہ بڑے متحرک پہاڑ اپنے کپڑوں کے پر پھیلا کر سُرعت کے ساتھ پانی پر چلتے ہیں۔ آسمانی ہوائیں انھیں چلاتی ہیں اور جب کبھی خدائے تعالیٰ ہوا بند کر دیتا ہے، وہ رُک جاتے ہیں اور حرکت نہیں کر سکتے۔" معجزات! آپ فرماتے ہیں کہ تم لوگ کیا معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تمہارا وجود خود ایک معجزہ نہیں ہے؟ خدا نے تمھیں تھوڑی سی مٹی سے پیدا کیا۔ اس سے پہلے تمہارا وجود بھی نہ تھا۔ پھر جب تم پیدا ہوئے، تو بہت چھوٹے سے تھے۔ اس کے بعد تم میں حسن آیا، طاقت آئی اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ مگر پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو۔ تمہارے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ تمہاری طاقت جواب دینے لگتی ہے اور آخر کار تم فنا ہو جاتے ہو۔

آپ کا یہ جملہ خصوصاً مجھے بہت پسند ہے کہ "خدا نے تعالیٰ نے تم میں ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اگر یہ نہ پیدا کرتا تو تم لوگوں کا کیا حال ہوتا" یہ ایک نہایت اعلیٰ اور اچھوتا خیال ہے۔ حقیقت اشیاء کی ایک نادر جھلک ہے۔

آپ کی طبیعت میں شاعرانہ کمال اور بہترین و صادق ترین خیالات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ ایسی اعلیٰ ذہانت، بصیرت اور دل و دماغ کے مالک تھے کہ شاعر، بادشاہ، مذہبی پیشوا غرض جس قسم کے مشہور انسان بننا چاہتے بن سکتے تھے۔ آپ پر ہمیشہ یہ بات عیاں رہی کہ یہ کائنات سراپا ایک معجزہ ہے۔ جیسے اس سے قبل بیان ہو چکا ہے۔ اسکینڈی نیویا کے باشندوں اور دوسرے مفکرین کی طرح آپ کی بھی یہ رائے ہے کہ یہ عالم جو بظاہر بالکل حقیقی اور مادی دکھائی دیتا ہے، دراصل ذاتِ باری تعالیٰ کے وجود اور قدرت کا صرف ایک مرئی اور محسوس مظہر ہے۔ فضا کے سینۂ عریاں پر ذاتِ الٰہی کا ایک پرتو ہے اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "یہ بڑے بڑے پہاڑ ایک دن بادلوں کی طرح پھٹ کر آسمان میں غائب ہو جائیں گے۔" سیل لکھتا ہے کہ عربوں کے عقیدہ کے مطابق آپ نے زمین کو چوڑی چکل ظاہر کیا، جس کو مستحکم کرنے کے لیے پہاڑ قائم ہیں۔ قیامت کے دن یہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ جائیں گے اور زمین اس قدر گھومے گی کہ تباہ ہو کر گرد و غبار کی طرح خلا میں غائب ہو جائے گی۔ خدا تعالیٰ اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لے گا اور وہ فنا ہو جائے گی۔

آنحضرتؐ پر اللہ تعالیٰ کا عالمگیر اقتدار ہر وقت عیاں تھا۔ یعنی آپ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام اشیاء کی اصلی طاقت، رُوح اور حقیقت کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ایسی ناقابلِ بیان قوت، عظمت اور جبروت موجود ہے، جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی چیز عہدِ حاضر میں قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اور کوئی آسمانی شے نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ سرے سے ایک شے ہی نہیں سمجھی جاتی بلکہ وہ اشیاء کا ایسا مجموعہ تصور کی جاتی ہے، جو صفاتِ ایزدی سے معرا اور ہیچ کارہ ہو۔ موجودہ علوم و فنون کے انہماک میں اس کا احتمال ہے کہ ہم خدا کو بھلا بیٹھیں، حالانکہ اس کو بھولنا نہ چاہیے۔ کیونکہ اگر وہی بھلا دیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھر کون سی چیز یاد رکھنے کے قابل رہے گی۔ اس صورت میں تمام علوم بالکل مہمل، مُردہ اور بے کار ہو جائیں گے۔ اعتقادِ باری تعالیٰ کے بغیر بہترین علوم بھی چوب خشک ہوں گے نہ کہ درخت سبز، جس سے ہر دم نئی لکڑی حاصل ہو سکے۔ انسان کسی نہ کسی طریقہ پر خدا کی پرستش کیے بغیر کچھ نہیں جان سکتا۔ اگر یہ نہ ہو، تو اس کا سارا علم و فضل ہیچ ہے۔

اسلام کوئی آسان مذہب نہیں۔ اس میں روزہ داری، طہارت، سخت اور پیچیدہ مسائل، دن میں پانچ دفعہ نماز، شراب سے اجتناب، غرض ایسے احکام ہیں، جن پر نظر کرتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آسان ہونے کی وجہ سے مقبول ہوا اور ایک اسلام پر کیا منحصر، دنیا میں کوئی مذہب یا مذہبی عقیدہ محض سہل ہونے کی وجہ سے نہیں رائج ہو سکتا۔ یہ کہنا کہ انسان تن آسانی، عیش پرستی، صلہ کی امید یا مٹے و انگبیں کی لالچ سے، خواہ وہ اس عالم میں ہو یا دوسرے عالم میں، اعمالِ نیک کی طرف مائل ہوتے ہیں، دراصل نسلِ آدم پر بہتان لگانا ہے۔ ذلیل ترین انسان میں بھی شرافت کا کچھ نہ کچھ جوہر موجود ہوتا ہے۔ ایک غریب سپاہی بھی جو صرف اپنی جان قربان کرنے کے لیے ملازم رکھا جاتا ہے ایک خاص عزت رکھتا ہے، جو اُس کی حقیر تنخواہ اور فوجی قواعد و ضوابط سے مختلف ہوتی ہے۔ نسل آدم کا ادنیٰ ترین فرد بھی اپنے دل میں جس چیز کی موہوم سی تمنا

رکھتا ہے، وہ مئے و انگبیں کی لذت نہیں بلکہ اعمالِ صالح کا شوق اور خدا کے ایک نیک بندہ کی حیثیت سے جنت میں داخل ہونے کی آرزو ہے۔ آپ اسے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیجیے۔ پھر دیکھیے کہ ایک سست ترین مزدور بھی آسمانِ شہرت پر چمک جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو تن آسانی کے ذریعہ نیک کاموں کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے، وہ بنی نوع انسان پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ مصیبت، ایثار، شہادت اور موت ہی وہ موجباتِ ترغیب ہیں، جن سے قلبِ انسانی متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ اندرونی شمعِ حیات روشن کر دی جائے، تو اس سے ایسا شعلہ پیدا ہوگا، جو تمام آلائشوں کو جلا دے گا۔ ادنیٰ طبقہ میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ مسرت و شادمانی ہی کارہائے نمایاں کی ترغیب دلانے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس سے اعلیٰ تر ذرائع کی ضرورت ہے۔ کسی مذہب کے پیرؤوں کی تعداد میں اضافہ انسانوں کی شکم پروری سے نہیں ہوتا بلکہ ان اعلیٰ جذبات کے اُکسانے سے جو ہرِ قلبِ انسانی میں خوابیدہ ہیں۔

کہنے کو خواہ کچھ ہی کہا جاتے لیکن محمدؐ کے دامن پر کبھی ہوس پرستی کا دھبّا نہیں لگ سکتا۔ یہ انتہائی غلطی ہوگی اگر ہم آپ کو نفس پرست سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ آپ کسی طرح کے عیش و عشرت کے عادی تھے۔ آپ کا اثاث البیت بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ آپ کی معمولی غذا جَو کی روٹی اور پانی تھی۔ بعض دفعہ مہینوں آپ کے گھر میں چولہا تک نہ سلگتا۔ عرب مورخین بجا فخر کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "آپ اپنی نعلین خود درست کرتے اور اپنی عبا پر خود پیوند لگاتے۔" آپ ایک غریب، جفاکش اور تنگدست انسان تھے جنھیں کسی طرح کی محنت و مشقت سے عار نہ تھا۔ غرض آپ میں کسی حیثیت سے کوئی کمی نہ تھی ——— آپ میں تمام خواہشاتِ جسمانی سے اعلیٰ تر ایک جذبہ کارفرما تھا، ورنہ وہ تند خو عرب، جو تیئیس سال آپ کے زیرِ علم لڑتے رہے اور جنھیں ہر وقت آپ کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا، آپ کی اس قدر تعظیم نہ کرتے۔ وہ آتش مزاج لوگ تھے، جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے اور ہر طرح کا فتنہ و فساد برپا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ ان پر سچّی قابلیت اور جرأت کے بغیر کوئی شخص حکمرانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لوگ آپ کو پیغمبر کہتے تھے حالانکہ آپ ان کے رو برو بالکل صاف و سادہ حالت میں بغیر کسی نقاب و حجاب کے کھڑے تھے۔ انھوں نے آپ کو عبا سیتے، نعلین درست کرتے، لڑتے، مشورہ کرتے، حکم دیتے، غرض ہر حالت میں دیکھا تھا۔ انھیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ آپؐ کس قسم کے آدمی تھے۔ اس وقت ہم آپ کو جو چاہیں کہہ لیں، لیکن آج تک کسی شہنشاہ نے تاجِ مرصّع پہن کر اس طرح حکومت نہ کی ہوگی، جس طرح اس خرقہ پوش انسان نے کی ہے۔ میرے نزدیک اس کی ذات میں اصلی ہیرو کے وہ تمام صفات موجود تھے، جو اسے تیئیس سال کی سخت اور حقیقی آزمائش میں کامیاب کرانے کے لیے ضروری ہیں۔ آخری الفاظ، جو آنحضرتؐ کی زبان سے نکلے، ایک دُعا ہے، ایک قلبِ مضطر کے اپنے خالق کی بارگاہ میں چند ٹوٹے پھوٹے جملے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہب اسلام کی اشاعت نے آپ کی طبیعت میں کوئی خرابی پیدا کر دی بلکہ اور اچھا اثر کیا۔ آپ کے حالات میں بہت سی عمدہ باتیں لکھی ہیں مثلاً جب آپؐ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا، تو آپؐ نے اپنے طرز میں جو کچھ فرمایا، وہ صداقت سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ عیسوی عقائد سے ملتا جلتا ہے یعنی انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ یہی آپؐ نے اس وقت بھی فرمایا، جب

آپؐ نے آزاد کردہ غلام زیدؓ کی وفات کی خبر سُنی۔ زیدؓ دوسرے مسلمان تھے۔ یہ غزوہ تبوک میں شہید ہوئے، جو یونانیوں سے آنحضرتؐ کی پہلی جنگ تھی۔ ان کی شہادت کا حال سُن کر آپؐ نے فرمایا: "اچھا ہوا کہ زیدؓ راہِ خدا میں کام آئے۔ وُہ اب اپنے مالک سے جا ملے اور ان کا انجام بخیر ہوا"۔ لیکن اس کے باوجود حضرت زیدؓ کی صاحبزادی نے آپؐ کو ان کی نعش پر روتے دیکھا اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟"

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "ایک انسان کو اپنے دوست کی جدائی پر روتا دیکھ رہی ہو"۔

مجھے محمدؐ کا تصنع اور ظاہرداری سے کوسوں دُور رہنا بہت پسند ہے۔ مادرِ صحرا کا یہ سادگی پسند فرزند اپنے بل بوتے پر کام کرتا ہے اور اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط ادعا نہیں کرتا۔ اس میں نہ تو غرور و خود نمائی ہے، نہ خوشامد و عاجزی۔ وہ اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنی عبا پر خود پیوند لگاتا اور اپنی نعلین کی خود مرمت کرتا ہے، دوسری طرف نہایت بے تکلفی سے ایران کے بادشاہوں اور یونان کے شہنشاہوں کو ان کے فرائض پر توجہ دلاتا ہے۔ غرض وُہ اپنے درجہ اور عزت کا پوری طرح علم رکھتا ہے بدوؤں کے ساتھ خونریز معرکہ آرائیوں میں ظلم و ستم کے بغیر گریز نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں رحم و کرم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ آنحضرتؐ نہ تشدد پر اعتذار کرتے ہیں اور نہ رحم و کرم پر افتخار۔ وُہ دونوں آپؐ کے دل کی اصلی صدائیں تھیں جو ارتجالاً بلند ہوگئیں۔ آپؐ نے ہمیشہ شیریں زبانی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ وقتِ ضرورت زور اور سختی بھی کی ہے۔ آپؐ میں لگی لپٹی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ غزوۂ تبوک کا آپؐ بار بار ذکر کرتے تھے۔ اس موقعہ پر آپؐ کے ساتھیوں میں سے بعض نے گرمی کی شدت اور فصل کے خراب ہو جانے کا عذر کیا تھا۔ آپؐ اس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "تمہاری کھیتیاں کتنے دن کام آئیں گی؟ ابد تک ان کا کیا حشر ہوگا؟"

محمدؐ کے اخلاقی اصول کا میلان ہمیشہ خیر کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے قلب کے سچے احساسات ہیں، جس کا مطمحِ نظر صداقت و معدلت رہتا ہے۔ گو اسلام میں مسیحیت کا یہ اصول عفو نہیں پایا جاتا کہ اگر کوئی شخص ایک طمانچہ مارے تو دُوسرا گال بھی اس کے آگے کر دیا جائے بلکہ اسلام میں بدلہ لینے کا حکم ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط ہے کہ حدِ انصاف سے نہ بڑھنا چاہیے۔ اسی طرح اسلام کامل مساوات کا علمبردار ہے۔ جیسا کہ ایک اعلیٰ مذہب اور نباضِ فطرتِ انسانی کو ہونا چاہیے۔ اس میں ایک مسلمان کی جان دنیا کے تمام تاج و تخت پر بھاری ہے۔ نیز اس کی رُو سے سب بنی آدم یکساں ہیں۔ خیرات دینا اسلام میں صرف جائز ہی نہیں بلکہ لازم ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا نصاب بھی مقرر کر دیا گیا ہے اور اگر کوئی شخص نہ ادا کرے، تو وہ اس کا جواب دہ ہوگا۔ ہر شخص کی سالانہ آمدنی کا دسواں حصہ (خواہ وہ کتنا ہی ہو) غریبوں، معذوروں اور محتاجوں کا حق ہے۔ یہ تمام اصول نہایت عمدہ ہیں۔ یہ رحم و انصاف اور محبت و انسانیت کے وُہ مطالبات ہیں، جن کی صدائے بازگشت مادرِ فطرت کے اُس اُمی فرزند سے بلند ہوئی۔

عربوں کے حق میں اسلام گویا ظلمت میں نور کا ظہور تھا، جس کے اثر سے ملکِ عرب پہلے پہل بیدار ہُوا۔ ایک غریب گلہ بان قوم، جو ابتدائے آفرینش سے ریگ زاروں میں گمنام پڑی پھر رہی تھی، اس کی ہدایت کے لیے ایک ہیرو پیغمبر کے لباس میں ایسا پیام دے کر بھیجا گیا، جس پر وہ ایمان لا سکی۔

دیکھو! اب وہ گمنام چرواہے دنیا میں مشہور ہوجاتے ہیں اور وہ حقیر شتربان سارے عالم پر چھا جاتے ہیں۔ ایک صدی کے اندر عرب کا سکہ دہلی سے غرناطہ تک جاری ہوگیا اور اس کی شجاعت و ذہانت کا آفتاب مدت تک ایک عالم پر ضوفشانی کرتا رہا۔

ایمان ایک بڑی اور جاں بخش نعمت ہے۔ جہاں کوئی قوم ایمان لائی، تاریخ اس کی عظمت و رفعت کی داستانوں سے معمور ہوئی۔ عربوں کی قوم آنحضرت کی ذات اور ایک صدی کی مدت۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے، گویا ایک چھوٹی سی چنگاری ایسے تودۂ عظیم پر گری، جو بظاہر محض انبار خاکستر تھا۔ مگر وہ انبار آتش گیر مادہ ثابت ہوا، جس کے شعلے دہلی سے غرناطہ تک بلند ہوئے اور آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ بڑا انسان ایک برقِ آسمانی ہوتا ہے اور باقی سب لوگ تودۂ ہیزم کی طرح اس کے منتظر رہتے ہیں، جنھیں وہ آنِ واحد میں شعلۂ روشن بنا دیتا ہے۔

محمدؐ اور عیسیٰؑ

اے۔جی۔بٹمی

پروفیسر اے۔جی ٹمی نے نیشن اینڈ اینتھیم مورخہ ۲۳ نومبر میں ایک مضمون لکھ کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت عیسیٰؑ کی کامیابی وشہادت اور ان کی اقوام کی اپنے مذہب سے دوری صرف حالات اور وقت کی بات تھی اور اگر حضرت عیسیٰؑ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جگہ ہوتے یا آنحضرتؐ ان کی جگہ ہوتے تو حضرت عیسیٰ یقیناً کامیاب اور آنحضرتؐ بلاشبہ مصلوب ہوتے۔ چنانچہ مسٹر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عیسیٰؑ اور رسولؐ اسلام نے ایک ہی طرح اپنے کام شروع کیے۔ دونوں نے ایک "آسمانی حکومت" کی تبلیغ کرکے، جو اس عہد کے عقاید اور سیاسی مفاد کے خلاف تھا کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کو اس کے لازمی نتیجہ سے دوچار ہونا پڑا۔ چند ہی سالوں کے بعد وہ گرفتار ہوئے، مجرم بنے اور شہید کر دیے گئے۔ محمدؐ نے عظمت حاصل کی۔ ایک حکومت کی بنا ڈالی، جس نے مشرقی سلاطین کی عظمت کو قایم کرکے ان کو حکومت روم کا شریک و معاصر بنا دیا۔ ظاہراً ہم کو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی عجیب نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت آنحضرتؐ کی زندگی حیرت انگیز ہے"

"دونوں پیغمبر رومن حکومت میں پیدا ہوئے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ اندرونی صوبہ میں تھے اور آنحضرتؐ سرحد صوبہ میں۔ برٹش سلطنت سے اگر تمثیل دوں، تو کہہ سکتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ کی شال بنگال کے ایک باغی کی تھی اور حضرت محمدؐ کی قندھار کے ایک حملہ آور کی۔ اس لیے اول الذکر رومی والی ٹائبیریس کے قبضہ میں تھے اور موخرالذکر ہرقل کے مضبوط ہاتھوں سے دور۔ آنحضرتؐ نے جب ہرقل کو خط لکھا تو اس نے نرم ومصلحت آمیز جواب دیا لیکن دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ تھے جو ہمیشہ حکومت کی اطاعت کرتے رہے، سخت ترین سزا کے مستحق سمجھے گئے حضرت عیسیٰؑ اگرچہ آنحضرتؐ سے کم نقصان دہ تھے، لیکن چونکہ ان کو آسانی سے پالیا گیا، اس لیے وہ مظالم کے شکار ہوئے انھوں نے قیصر کے سامنے وہی چیز پیش کی، جو اس میں تھی اور مصلوب ہوئے۔ لیکن آنحضرتؐ کے جانشینوں نے قیصر کے صوبے لے لیے۔ پس یہ اختلاف ان کی ذاتوں سے وابستہ نہ تھا، بلکہ حکومت سے مختلف تعلقات پر منحصر تھا"

"کوئی شخص بھی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت عیسیٰؑ کی جگہ ہوتے، تو یقیناً وہ بھی مصلوب ہوتے۔ کیونکہ جب انھوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا تو اپنی جان ہتھیلی پر لیے تھے اور آپؐ کو حضرت عیسیٰؑ سے کہیں زیادہ خطرات کا سامنا تھا کیونکہ آپ نے اپنا فرض ان وحشی قبائل میں

شروع کیا، جو حکومت روم کے متمدن لوگوں سے زیادہ خوفناک، انتقام پسند اور بدخو تھے۔ آپ نے ابتداء میں بہت کم کامیابی بھی حاصل کی۔ چنانچہ ابتدائی تین سالوں کا نتیجہ صرف تیس اشخاص تک محدود تھا (اور یہ حضرت عیسیٰؑ کی تمام مدت تبلیغ ہے) ساتویں سال حالت نازک ہو گئی۔ مکہ والوں نے اس جماعت سے اپنے تمام تعلقات منقطع کر لیے، اور اگر وہاں کے حالات بھی فلسطین جیسے ہوتے، تو آپؐ کا خاتمہ زیادہ حسرتناک ہوتا۔

جس چیز نے اسلام اور اس کے بانی کو بچا لیا، وُہ عرب کے قبائل کی سیاسی خانہ جنگیاں اور حکومت روم سے دوری تھی اور انھی چیزوں نے اہلِ یثرب کو اس بات پر تیار کر دیا کہ جس شخص کو اہل مکہ نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوں اور جس کے خون کے پیاسے ہوں، اس کو عزت سے لاکر اپنی تمام دولت، محبت اس پہ نثار کر دیں محمدؐ نے دنیاوی کامیابی بھی حاصل کی، لیکن یہ صرف واقعات وحالات کی بنا پر تھا۔ ورنہ اگر وہ ایسے واقعات وحالات میں نہ ہوتے، تو دنیا کا کوئی گوشہ بھی ان کے لیے مامن نہ ثابت ہوتا۔ پھر کیا اگر حضرت مسیحؑ ایسے حالات میں ہوتے، تو وہ ایک "حکومت ارضی" کے قیام میں کامیاب نہ ہوتے؟ ہوتے اور یقیناً ہوتے، اور اگر رومی حکومت پیلاطس کی تیغ براں کو نہ روکتی تو آج حواریین تخت حکومت پر جلوہ افروز نظر آتے۔"

"پس ہم دیکھ چکے کہ دونوں کا طریق عام یکساں تھا اور یہ عام عیسائی اعتراض کا ایک اٹل جواب ہے کہ محمدؐ روحانیت سے زیادہ مادیت کے متلاشی تھے اور عیسائیت صرف اپنی خوبیوں کی بناء پر پھیلی اور اسلام بزورِ شمشیر عام ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت اس کے بالکل متضاد تھی۔ اسلام کہتا ہے "اسلام یا جزیہ" لیکن دوسری طرف مسیحیت کا اعلان ہے "مسیحیت یا موت"۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی فاتحین اور مشرقِ وسطیٰ کی تبدیلی مذہب کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ چنانچہ صدیوں تک اگرچہ اسلامی فتوحات کا سیلاب بڑھتا رہا لیکن تبدیلی مذہب کا کوئی سوال سامنے نہ آیا۔ لیکن بعد میں اسلام نے بھی وہی صورت اختیار کر لی، جو اس سے سات سو سال قبل مسیحیت حکومت روم کے مغربی صوبوں میں کر چکی تھی۔ تاہم یہ بات قائم رہ گئی کہ اگرچہ دونوں ایک ہی حالات میں بڑھے لیکن مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔"

"کیا دونوں بانیانِ مذاہب کی تعلیمات اور ان کی حیات ہم کو یہی بتاتی ہیں، یا یہ دونوں جماعتوں کے لوگوں کے اضافے تھے؛ دونوں گروہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ مخالف جماعت کے بدترین کارناموں کو ایک طرف اور اپنی بہترین تعلیمات کو دوسری طرف رکھ کر مخالف کی صف پر حملہ کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی کاٹ کا کوئی جواب نہیں۔"

"لیکن کیا اس سوال کا جواب بھی یہی نہیں ہے کہ حالات وواقعات نے ان سے یہ سب کچھ کرا یا، مثلاً اگر دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے بہترین حالات کے بعد ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء کے بدتر حالات یا ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء کے بدترین حالات رونما ہوئے اور انھوں نے مسیحیت کو مغرب کی مادی ترقی کا سیاہ داغ لگا دیا۔ تو یہ سب کچھ حالات وواقعات پر منحصر تھا۔ اسی طرح اسلام کے زوال کے اسباب بھی پیش کیے جا سکتے ہیں۔" ہ

برناڈشا اور عرب

خالد کمال مبارک پوری

برناڈشا عصر حاضر کے عالمگیر شہرت یافتہ ائمہ مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کی تصنیفات دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور دنیا کی بہت سی زندہ زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کے افکار و آراء ہر مذہب اور ملت کے اہل علم طبقہ میں مشہور و معروف ہیں۔ اس کے افکار و آراء کی مقبولیت اس کی فلسفیانہ رنگینی، لطیف نکات، عبارت کی عمدگی اور طرز تحریر کا اچھوتا پن ہے۔ اگر وہ اپنی تحریر میں عام طرز تحریر کا رنگ اختیار کرتا اور اپنے زمانہ کے رائج طریقہ کو اپناتا تو ہرگز اسے یہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی اور وہ صرف اہل علم کے مخصوص طبقہ میں ہی منحصر ہو جاتا۔

جب آپ اس کے ڈرامے پڑھتے، تو ان پر جاسوسیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں، تو مصنف کے مقاصد کو بالکل واضح پائیں گے اور آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس معلم و مصلح کا مقصد ان ڈراموں سے بلندیٔ اخلاق کا یا قلعہ تعمیر کرنا ہے، جو فلسفۂ اخلاق کی بنیاد پر قایم ہو۔

برناڈشا نے اپنے ڈراموں میں صرف ہنسی مذاق اور تفریحی عبارتیں ہی نہیں پیش کی ہیں، بلکہ ہر ڈرامہ کا ایک طویل مقدمہ بھی بالتفصیل بیان کیا ہے، جو اس کے نظریات و افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور ہر صاحبِ فہم و فراست کے ذہن پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقدمات کبھی کبھی ڈرامہ سے بھی بڑے ہو جاتے ہیں۔

اس مقالہ کا مقصد برناڈشا کے دینی، سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ نظریات و افکار کا تجزیہ و تشریح نہیں ہے، بلکہ آج ناظرین کرام کے سامنے اس کی تصنیفات سے عرب، بلادِ عرب اور اسلام و مسلمین سے متعلق باتیں پیش کی جائیں گی، جن سے برناڈشا کی علومِ شرقیہ سے دلچسپی اور فنونِ شرق سے متعلق معلومات کا پتا چلتا ہے۔

برناڈشا اور الف لیلیٰ

دنیائے عرب میں برناڈشا نے سب سے پہلے جس چیز کو پہچانا، وہ داستان الف لیلہ کے لیے رلیف گیا۔ وہاں اسے الف لیلہ کا ترجمہ مل گیا۔ پھر کیا تھا، دل و جان سے اس کے مطالعہ میں لگ گیا۔ جب اس کی پھوپھی نے دیکھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے مطالعہ میں غرق ہے تو کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی اور اسے اپنے کپڑوں کے بکس میں بند کر کے رکھ دیا۔ جب برناڈشا نے ضد کی تو کہا کہ اس کے پڑھنے سے ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن برناڈشا نے عہد کر لیا کہ بغیر اس کو اچھی طرح دیکھے ہوئے چین سے نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ اپنی پھوپھی کو غافل کر کے اس کی تلاش جاری کر دی۔ جو یندہ یابندہ کے مطابق اسے کتاب مل گئی۔ پھر اس کے مطالعہ میں غرق ہو گیا اور اس کے تمام قصّے پڑھ ڈالے جن کا اثر اس کے ذہن و دماغ پر چھا گیا۔ اس کا مظاہرہ یوں ہوا کہ ایک مرتبہ جبکہ وہ تورات اور اس کے

اخلاقیات پر مطالعہ کر رہا تھا، نہایت جرأت مندانہ لہجہ میں مسیحیوں کو خطاب کر کے کہا کہ مسیحی حضرات صرف تورات کو مقدس سمجھنے سے باز آجائیں اور تورات کو اپنے کتب خانوں میں الف لیلہ کے پہلو میں رکھا کریں۔

نیز یورتان جو اپنے دین کے معاملہ میں بڑے متشدد قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے تین ڈراموں کے مقدمہ میں برناڈ شا نے انگریزی اور عربی ادب میں محبت کے قضایا کے سلسلہ میں دونوں کو ملا کر دوش بدوش چلنے اور قضایا کا حل دریافت کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

"الف لیلہ ایسے قصوں کے مجموعہ پر مشتمل ہے، جو اپنی افادیت اور عمدگی کے لحاظ سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ہمارے افسانوں اور قصوں میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کیونکہ عربی ادب میں محبت کا علاج صورت طبیعہ مثلاً احساسات وغیرہ سے کیا گیا ہے۔ لہذا اس کے اندر نہ تو مبادی مقررہ کا وجود ہے نہ سراب نما شخصیت کا فقدان اور نہ ہی اس بات کا مظہر ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا شجاعت، محبت، دوستی کی صفت میں متصف ہونا ناممکن ہے۔ ہاں البتہ جب دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کی صفت سے دل چسپی لیتا ہے، تو یہ اور بات ہوتی ہے۔ عربی قصہ نویس، جن کی تقلید میں انگریزی افسانے لکھے جاتے ہیں، یکے بعد دیگر شخصیات کو اجاگر کرتے رہتے ہیں اور ایک سے ایک نئی ایجاد پیش کرتے رہتے ہیں اور انگریزی افسانہ نویس صرف جنسی معاملات ہی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جنسی گوشے اس قدر قوی ہو گئے کہ ناشرین و محررین اور پروڈیوسر حضرات اس وقت تک کتاب یا ڈرامے شایع کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، جب تک کہ ان کے اندر محبت اور جنسی ادب کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔"

برناڈ شا اور محمدؐ برناڈ شا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور اسلامی تعلیمات کا بڑا شیدا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بعض تصانیف میں لکھا ہے کہ:

"میری بڑی تمنا ہے اور میں اسے واجب سمجھتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھوں اور میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت کو اگر آج کے عالم جدید کی عنانِ حکومت دے دی جائے، تو دنیا اپنی مشکلات کے حل تلاش کرنے میں کامیاب و بامراد ہو جائے گی اور اس کے اندر امن و سلامتی کی لہر دوڑ جائے گی۔ کاش! دنیا اس جیسے مصلح کی ضرورت کو محسوس کرتی۔"

برناڈ شا اپنے ڈرامے میں اولیاء و انبیاءؑ کے متعلق بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا، اس نے حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح لکھنے کی نیت کی تھی، لیکن اس خوف سے کہ حضرت مسیحؑ سے متعلق ڈرامہ عالم مسیحیت میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ڈرامہ عالمِ اسلام میں مقبول نہ ہو گا۔ اس نے کھل کر دونوں شخصیتوں کا ڈرامہ نہیں لکھا، بلکہ اپنی فکر کو بدل کر ان دونوں شخصیتوں کی زندگی پر اپنے مختلف ڈراموں میں روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے تین مشہور ڈراموں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح اپنے ڈاکٹر سے متعلق ایک ڈرامہ

کے مقدمہ میں برنارڈ شا نے پاکیزگی، صفائی اور نظافت کے سلسلہ میں اسلام کو سراہا ہے، چنانچہ مسیحیوں کے انقلاب کی جانب اشارہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

"یہ کہنا بہت آسان اور ممکن ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ بڑی دور رس اور وسیع تھی، جس کا ثبوت اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے نظافت (وضو) کو ارکان اسلام میں داخل فرمایا۔"

اسی طرح اپنے ایک اور ڈرامہ "انڈروکلس اور سیر" میں لکھا ہے کہ:

"مسیحیوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی تہذیب یورپ کی تہذیب سے کئی گنا زیادہ ترقی پر ہے، تو ان وہشت آمیز تعجب کا اندازہ کرنا مشکل ہو گیا۔"

پارلیمنٹ کے ممبروں کے سامنے جو مطبوعات کی رقابت پر بحث کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے، برنارڈ شا نے جو بیان دیا، اُس میں دین اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"ثقافت عامہ کو اپنانے کے سلسلے میں رقابت نے جو گل کھلائے، اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبتیں بھی ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں، اس کی مثال یوں لیجئے کہ جب فلسفہ کے ارتقائی دور میں ہمارے اور فلسفہ کے درمیان رقابت پیدا ہوئی اور ڈارون، ہکسلی، ٹنڈال، سنبسر، کارلائل سے لے کر رسکن اور تبلز تک یہ کشمکش جاری رہی، تو اس وقت عام مفہوم اور عوام کی اصطلاح میں ان کی کتابوں کو فسق و فجور اور دہریت کی حامل بتلایا جاتا تھا، ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ کاتھولیکی اور ارتھوڈکسی فرقے ان کی تصنیفات پڑھنے سے شدت کے ساتھ روک رہے ہیں۔ جب ان سے وجہ پوچھی جاتی ہے، تو یہی کہتے ہیں کہ یہ کتابیں دہریت اور فسق و فجور کی حامل ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اگر لوتھر کے راہبہ سے شادی کرنے اور غالیلیو کی دہریت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادتِ اصنام کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے اور وحدانیت باری کے لیے کوشش کرنے کے خلاف اگر مسیحیت اور اس کے اخلاق غالب آجاتے ، تو آج دنیا کا کیا نقشہ ہوتا،

اسلام اور مسیحیت اپنی وسعت کے باوجود عوام کی نظر میں اپنے ماضی کو زیادہ مضبوط اور مستقل نہ بنا سکے۔ آج انگریز اس لیے مسیحی ہے کہ وہ انگلینڈ میں پیدا ہوا ہے۔ اگر وہی استنبول میں پیدا ہوتا، تو اس کا مسلمان ہونا ضروری ہوتا۔ لوگ آج اسلام اور مسیحیت کے ان جہادوں سے واقف نہیں ہیں، جو ان دونوں نے بلندیٔ اخلاق کے لیے کیے ہیں۔ اسی طرح اسلام اور مسیحیت کے وجود کو قرون ماضی کے اخلاق کے سر پر خطرہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو رہے ہیں۔"

برنارڈ شا اور تعدد ازواج

اپنے مشہور ڈرامہ "شادی کی تیاری" کے ایک طویل مقدمہ میں برنارڈ شا نے شادی پر سماجی، اقتصادی، سیاسی، دینی اور جنسی حیثیت سے سیر حاصل بحث کی ہے اور اس میں مختلف نظریات کو ذکر کرنے کے بعد اپنے نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

"اگر مان لیا جائے کہ جنگ ہمارے تین چوتھائی مردوں کو فنا کے گھاٹ اتار دے، تو اس صورت میں ہمارے لیے لازم ہوگا کہ اسلامی طریقہ کو اپنایا جائے، جو بیک وقت چار شادی تک کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اپنی قوم کو کسی بھی صورت سے خطرہ سے باہر نہیں لا سکتے اور اگر اتفاق سے جنگ کبھی اس کے برعکس تین چوتھائی عورتوں کو ختم کر دے، تو اس صورت میں ہمیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا اور ہمارا وجود تنگی میں پڑ جائے گا۔ یہیں سے یہ بنیادی نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں عورتوں کو قتل نہ کیا جائے" تاکہ نسلِ انسانی باقی رہے، صرف شرافت و بہادری کا بقا مقصود نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے۔"

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بُت پرستی

اسی ڈرامہ میں آپ کو یہ عبارت بھی ملے گی:

"ہوچکس نے سومرس راہب کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا، میں اپنے ارادے، اپنے تجبّر اور اپنی شرافت کے علاوہ کسی بھی دُوسری چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ تمہاری دینی تعلیم تمہاری پوری پوری موافقت کرتی ہے۔ لیکن وُہ میرے قابل نہیں ہے۔ میں تو نابلیوں کی طرح اسلام کو دُوسرے ادیان کے مقابلہ میں فضیلت دیتا ہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ برطانوی شہنشاہیت اس صدی کے آخر میں حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گی۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوں اور مجھے ان کی رائے سے ایک حد تک اتفاق ہے۔ میری بات اے سومرس تمہیں زبین پر ڈال سکتی ہے تمہیں معلوم نہیں کہ دین میں ایک عظیم قوت ہوتی ہے۔ یہ قوت دافعہ حقیقت اور وحدانیت کا بہترین مظاہرہ ہوتی ہے۔ لیکن تم اور تمہارے جوڑی دار اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ نہیں سمجھ سکتے کہ تالیف انسانیت کی آسان اور بہتر ترکیب کیا ہے؟ دین و دانش اور ایمان و عقیدت کی چمک دمک لے کر انسان کی طرف بڑھنا یہی اس کے قریب کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس حقیقت کو چھوڑ کر تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری دیانت داری پر ایمان لائیں؟ اور اس نشہ میں چُور ہو کر تم یہاں تک حماقت کر بیٹھے ہو کہ اپنے علاوہ دوسرے سے علم حاصل کرنے سے بہتر یہ بتلاتے ہو کہ بچہ موت کے ظالم ہاتھوں میں پڑ کر دم توڑ دے۔"

زنجبیہ کی ذات باری سے متعلق بحث والے ڈرامہ میں بعض تقلیدی عادتوں اور ان رسم ورواج پر تنقید کی ہے، جو احکام رسل اور تعلیماتِ انبیاء سے بے تعلق ہیں۔ چنانچہ اسی میں آگے چل کر لکھا ہے کہ:

"نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بڑے عظیم اور جرأت مندانہ اقدام کیے جب توحید بت پرستی کے مقابلہ میں آگئی اور آپ نے دنیا کو ادیان سابقہ کی جانب پلٹ کر غور و فکر کرنے کی دعوت دی اور ایک ذات وحدۃ الوجود کو پہچاننے پر زور دیا۔"

اس کے بعد لکھتا ہے کہ :

"تورات میں مذکور دوسری وصیت، جس میں فرمایا گیا ہے کہ آپ اپنے لیے نہ کوئی تمثال بنائیں، نہ کوئی صورت اور نہ اس کو سجدہ کریں، نہ اس کی عبادت کریں مسلمانوں کے نزدیک زیادہ محترم اور قابلِ عمل ہے۔ اگر مسیحیوں سے اس معاملہ میں موازنہ کیا جائے، تو مسلمان بہت آگے نظر آئیں گے۔"

ہندوؤں کی کتب مقدسہ میں بشارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

الحاج بشیر الدین پنڈت صاحب

وید ۱۱۳۱ ہیں (مہابھاشیہ پاتنجلی) - ان میں سے کل دس گیارہ دستیاب ہیں، رگوید، یجروید، سام وید - یہ تین قدیم ترین ہیں۔ (منوجی) اتھروید آخری وید ہے۔ ان کا زمانہ تالیف بقول سوامی دیانندجی ایک ارب ۲۱ کروڑ برس ہے۔ لیکن عصر حاضر کے محققین انھیں چار ہزار سال پرانا بتاتے ہیں۔ یہی زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔

اُپ نِشَد ۱۲ قدیم ہیں اور آج ان کی تعداد ۲۰۰ سے اُوپر ہے۔ ان میں سے ایک اللہ اُپ نِشَد بھی ہے، جس کو اکبر کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے۔ اُپ نشدوں کو ویدوں پر فضیلت کا دعویٰ ہے۔

(راجہ رام موہن رائے کے لکچر ملاحظہ ہوں نیز منڈک اُپ نشد کھنڈا منتر ۴تا۶ چھاندوگیہ اُپ نشد پر پھاٹک ۷، کھنڈا-۲، شپتھ برہمن کانڈ ۱۰ ادھیائے ۳ وغیرہ)

پران مہرشی ویاس جی نے انھیں ۱۸ جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔ وید ان کے مصداق ہیں (ملاحظہ ہو اتھروید کانڈ ۱۱ سوکت، منتر ۲۴) رگوید میں بھی یگیہ میں پڑھے جانے والے پران کا ذکر ہے (ملاحظہ ہو رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۲۰ منتر ۶) اس کے علاوہ چھاندوگیہ اپ نشد پر پھاٹک ۷، کھنڈا-۲ میں بھی پرانوں کا ذکر موجود ہے۔ اس طرح پران بھی ویدوں کے ہمعصر ہیں، جن پرانوں کے وید مصدق ہیں چونکہ انھیں میں حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق بشارتیں ہیں، اس لیے لعض لوگ یہ عذر پیش کر دیتے ہیں، کہ یہ نقلی ہیں، اصلی غائب ہوگئے۔ یہ عذر غلط ہے۔ اس لیے کہ پران اہل ہند میں ویدوں کے مقابلہ میں زیادہ کثیر الاستعمال ہیں۔ تعجب ہے کہ پران جو شروع زمانہ سے آج تک بکثرت پڑھے جاتے ہیں، وہ تو گم ہوگئے مگر وید، جن کو بہت کم لوگ پڑھتے اور جانتے ہیں، وہ باقی رہ گئے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ پرانوں میں پیش گوئیاں بعد میں شامل کی گئیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ہندوستان کے کسی گوشہ میں کوئی نہ کوئی پران تو کسی برہمن کے گھر سے ایسا دیکھنے کو ملتا، جو پیش گوئی سے خالی ہوتا۔

۱- سام وید میں آنحضرت صلعم کا ذکر ملاحظہ ہو سام وید پر پھاٹک ۲ رشتی ۶ منتر ۸:

ترجمہ: "احمد نے اپنے رب سے پرحکمت شریعت کو حاصل کیا۔ میں سورج کی طرح روشن ہو رہا ہوں۔ یعنی میں (رشی وتسہ کنو) اس بشارت کو دیکھتے وقت آفتاب رسالت کے نور سے منور ہو رہا ہوں۔"

قرآن شریف اس منتر کے راز کو اس طرح کھولتا ہے،

یاایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً ومبشراً ونذیراً — اے نبی! ہم نے تجھے شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے

وداعیًا الی اللہ باذنہٖ و سراجاً منیرا۔ اور نو اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والا
(۳۳: ۴۵-۴۶) اور روشن کرنے والا سورج ہے۔

تشریح روشنی دو طرح کی ہوتی ہے، اجرامِ فلکی کی۔ ایک وہ اجرام جو بذاتِ خود روشن ہیں جیسے سورج۔ دوسرے وہ اجرام، جو اس سے روشن ہوتے ہیں، جیسے رات کے وقت چاند، ستارے سورج کی روشنی کی گواہی دیتے ہیں۔ اس لیے رشی وتسہ کا یہ کہنا کہ میں سورج کی مانند روشن ہوں، درحقیقت سراجًا منیرا کے لیے ایک گواہی ہے اور وہ سراجًا منیرا احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۲۔ اتھروید کے کنتاپ سوکت میں بشارات اتھروید تینوں ویدوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں رگوید کی رچائیں (محامد) سام وید کے گانے اور یجروید کی عبادات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ وہ مہلک امراض سے شفا، جنگ میں فتح ونصرت کے نسخے اور بہشت و دوزخ کے تفصیلی بیانات بھی ہیں۔ اس لیے اس وید کو برہم وید (علم الٰہی) کہا جاتا ہے جس طرح بائبل کا ماخذ الواح بابل ہیں، اسی طرح ویدوں کی اندرونی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ اتھروید صحیفہ ابراہیمؑ کی بڑی حد تک نقل ہے۔ رگوید کا ۱/۲ حصہ بائبل کی طرح بابل کے صحائف سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بابل اور مصر کے بادشاہوں کی جنگوں کا حال بھی ہے۔ (تفصیل کے لیے ڈاکٹر پران ناتھ پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کا مضمون دیکھیے، جو ٹائمز آف انڈیا کے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے)

اتھروید کے بیسویں باب کے کچھ سوکت کنتاپ سوکت کہلاتے ہیں۔ ان کو طویل یگیوں اور قربانیوں میں ۱۷ پجاری بڑے اہتمام سے پڑھا کرتے تھے اور یہ ہر سال ہوا کرتا تھا، گویا ایک طرح سے انھیں یاد رکھنے کے لیے ہندو قوم کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ کنتاپ کے معنی ہیں پیٹ کی پوشیدہ گلٹیاں۔ یہ نام ان منتروں کا غالبًا اس لیے رکھا گیا کہ ان کا راز آیندہ زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ یہ راز نافِ زمین (مکہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ مکہ کی زمین کو ام القریٰ (نافِ زمین) الہامی کتب میں بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہیں سب سے پہلے پہلا خدا کا گھر بنا اور نسل انسانی کو یہیں سے روحانی غذا ملنا شروع ہوئی۔ ان اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعٰلمین (۳: ۹۶) قرآن شریف میں مکہ کے دو نام ہیں، ایک بکہ، دوسرا مکہ۔ بکہ کے معنی ہیں بطن (پیٹ زیرِ ناف) اور مکہ کے معنی ہیں پستان۔ انسان کو اپنی ماں سے غذا دو جگہ سے ملتی ہے: یعنی پیٹ سے (رحمِ مادر سے) اور چھاتیوں سے۔ اسی طرح نسلِ انسانی کی ابتدائی پرورش کنتاپ (پوشیدہ گلٹیاں۔ رحمِ مادر) یعنی بطن مکہ سے شروع ہوئی۔ مگر جب بچہ رحمِ مادر سے مکمل ہو کر باہر آ گیا، یعنی وسیع دنیا میں قدم رکھا، تو یہی گلٹیاں چھاتی میں دودھ بن گئیں۔ اس طرح انسان کی پرورش کا سامان اب مکہ میں یا ماں کی چھاتیوں میں ہے۔ کنتاپ سوکتوں کو لوگ اب تک معمّہ یا پہیلیاں سمجھتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر پنڈت راجہ رام پروفیسر میکولر، بلوم فیلڈ وغیرہ نے ایسا ہی سمجھا، لیکن یہ گلٹیاں اب واضح ہو چکی ہیں۔

۳۔ کنتاپ سوکت کا پہلا منتر ——— اسم مبارک آنحضرت صلعم ترجمہ: "اے لوگو! یہ (بشارت) احترام سے سنو۔ محمدؐ تعریف

کیا جائے گا۔ ساٹھ ہزار اور نوّے دشمنوں میں اس ہجرت کرنے والے (امن پھیلانے والے کو) ہم (حفاظت میں) لیتے ہیں۔"

تشریح زراشنسہ یعنی لوگوں میں تعریف کیا گیا۔ کورم یعنی امن پھیلانے والا یا مہاجر شلیسٹی سہسر مکہ کی آبادی اس وقت ساٹھ ستر ہزار تھی، جیسا کہ ابن اثیر کامل وغیرہ نے لکھا ہے۔

ترجمہ: "اس نے مامح رشی کو سو دینار، دس تسبیحیں، تین سو گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں۔"

واضح اسم گرامی (مترجمہ پنڈت کھیکرن و پروفیسر راجہ رام)

تشریح ما یعنی مہا بمعنی بہت زیادہ۔ مح یعنی تعریف کیا گیا۔ عرونام یعنی عربی گھوڑے۔

مطلب پیش گوئیاں بالعموم استعارات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس منتر میں سو طلائی دینار وہ صحابہ کرامؓ ہیں، جنھوں نے مکہ کے پُرفتن دور میں مکہ سے حبش کو ہجرت کی۔ سرجہ یعنی گلدستہ تسبیح، سردار (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۴۸ منتر ۱) میں سرجہ بمعنی سہرا) عشرہ مبشرہ مراد ہیں۔ عروہ بمعنی تیز رو یا عربی گھوڑے۔ ان سے مراد اصحاب بدر ہیں، جو تین سو تیرہ تھے۔ گو کا مادہ گم یعنی جنگ کے لیے نکلنا (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۴۳ منتر ۶) گائے کو رعب و جلال اور ہلاکت کا مظہر قرار دیا گیا ہے (رگوید منڈل ۵ سوکت ۷۵ منتر ۲) گائے صلح و اتفاق و اتحاد کی علامت بھی ہے (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۱۲ منتر ۳) ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ محمدؐ کے ساتھی گائے کی طرح مقدس اور رحم و محبت کے مجسمہ ہیں اور اندر دیوتا کی طرح بارعب اور خوفناک بھی ہیں۔ اس تضاد کی پہیلی کو قرآن شریف نے اس طرح حل فرمایا:

محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ اشدآء علی الکفار رحماء بینھم ..... الخ (۴۸ : ۲۹)

مکہ کی فتح کے وقت ٹھیک دس ہزار کی قدسی جماعت آپ کے ساتھ تھی۔

مذکورہ بالا منتر میں حسب ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ اس منتر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام جو ذاتی نام سے بھی کسی قدر مشابہ ہے، موجود ہے۔

۲۔ آپؐ کو رشی یا پیغمبر بتایا گیا ہے۔

۳۔ آپؐ کو سو خالص سونے کے طلائی دینار، یعنی سابقون الاولون صحابہؓ کرام کے دیئے جانے کا ذکر ہے۔

۴۔ عشرۂ مبشرہ یعنی با اقبال جنت کے دس گلدستوں کا عطیہ۔

۵۔ عابد زاہد عالم جنگجو ۳۱۳ تاریخی اصحاب بدر کا ذکر۔

۶۔ فتح مکہ کے وقت دس ہزار قدسیوں کی جماعت کا ذکر۔

دنیا کی تاریخی روشنی میں یہ ساری خوبیاں اور نشانات صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات میں ملتی ہیں اور یہ نشانیاں ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ ہیں، جیسی کہ بعد کو تاریخی وجود میں آئیں۔ دنیا کے کسی رشی یا پیغمبر کے ساتھ بجز آنحضرتؐ کے ان کی تطبیق نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ جنگِ احزاب کا مفصل ذکر

اتھرو وید کانڈ ۲۰ سوکت ۲۱ منتر ۹ حسب ذیل ہے:

ترجمہ: "اے صادقوں کے رب! تجھے ان سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور مستانہ ترانوں سے دشمن کی جنگ میں مسرور کیا، کہ جب حمد کرنے والے نیز عبادت کرنے والے کیلئے تُو نے دس ہزار دشمنوں کو بغیر مقابلہ شکست خوردہ کر دیا۔

معنی برترینتے شو، پتے بمعنی صادقوں کے رب۔ اَمَدَنْ بمعنی مسرور کیا۔ ورسنسٹریانے ان بہادرانہ کاموں سے۔ سُوماسہ یعنی مستانہ ترانوں نے۔ ورِتر بمعنی دشمن۔ کارُوے بمعنی حمد کرنے والے کے لیے۔ وَرہشتے بمعنی عبادت کرنے والے کے لیے۔ اَپرتی بمعنی بغیر مڈ بھیڑ۔ نی وَرہتیہ یعنی تُو نے شکست خوردہ کر دیا۔ ہیتشو یعنی جنگ میں۔

تشریح وید منتر میں اللہ تعالیٰ کو ست پتی یعنی صادقین کی تربیت کرنے والا بتایا ہے۔ صادقین صحابہ کرام کی صفت ہے: من المومنین رجالٌ صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ کونوا مع الصادقین۔

وید منتر میں دُوسری نشانی یہ ہے کہ سرور دینے والوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں اور ترانوں سے اللہ کو راضی کر دیا۔ اس کا نقشہ قرآن پاک میں یُوں کھینچا گیا:

لما را المؤمنون الاحزاب قالوا ھذا ما	جب مومنوں نے دشمن کے لشکر کو دیکھا۔ انہوں نے
وعدنا اللہ ورسولہ وصدق اللہ و رسولہ	کہا یہ وُہ ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسول نے
وما زادھم الا ایمانا و تسلیماً۔	کیا تھا (اس نظارہ نے) ان کے ایمان نیز تسلیم و
(۳۳ : ۲۲)	رضا کی ایمانی قوت کو المضاعف کر دیا۔

تیسری نشانی دس ہزار کے لشکر عظیم کو، جو تین ہزار کے مقابل تھا اور ہر طرح سے بڑھ چڑھ کر تھا، شکست خوردہ بتایا۔ قرآن شریف میں یہ آیت جنگ احزاب وقوع پذیر ہونے سے پہلے نازل ہو چکی تھی:

جند ما ھنالك مهزوم من الاحزاب۔ (۳۸ : ۱۱)

چوتھی نشانی اسم احمدؐ کا ذکر۔ کاروے یعنی حمد کرنے والے کے لیے یعنی احمد۔ پروفیسر گرفتھ نے اس کا ترجمہ CIBGFR اور پروفیسر پنڈت راجارام نے ستوتا یعنی حمد کرنے والا کیا ہے۔ یہ صفاتی نام ہے، جو اس جنگ کا ہیرو ہے، وہ حمد کرنے والا بھی ہے اور سپہ سالار بھی۔

حمد کرنے والے کی دُوسری صفت لفظ برہشتے ہے، جس کے معنی ہیں مقدس گھاس، جو ویدی (آتشکدہ) کے کناروں پر بچھائی جاتی ہے۔ استعارۃً مقدس گھاس والا سے مراد عبادت گزار ہوتی ہے۔ دُوسرے معنی اس کے روشن اور نورانی شخص کے بھی ہیں۔ یعنی احمد نہ صرف خدا کی حمد کرنے والے ہیں بلکہ عین میدانِ جنگ میں خدا کی عبادت کرنے والے بھی ہیں۔ یہ وید منتر کی پانچویں نشانی ہے۔ آخری نشانی ہے دشمن کا بغیر مقابلہ کیے فرار ہو جانا۔ اس کی وجہ اسی سوکت کے منتر ۱تا ۸ نیز ۱، اور ۸ میں بیان کی ہے۔ ان منتروں میں خطاب ہے اندر دیوتا سے، جو تند و تیز ہوا کا رفیق اور رعد و کڑک کا دیوتا ہے۔ اس جنگ میں دشمن تند ہوا اور کڑک سے

ڈر کر یا اندر دیوتا سے خوف کھا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وید کے اپنے الفاظ ہیں:

"تونے اے اندر! دس ہزار دشمنوں کو بغیر مڈھ بھیڑ کے شکست خوردہ کر دیا۔"

دشمن کی ہزیمت واقعی ایک حیرت انگیز امر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقابلہ در اصل مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اسی خالقِ فطرت کے ساتھ تھا، جس کے ایک ادنیٰ غلام تند ہوا، جھکڑ اور رعد و کڑک سے دشمن خوف زدہ ہو کر فرار ہو گیا۔ قرآن کریم نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

یا یھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمة اللہ علیکم اذ جاءتکم جنود فارسلنا علیھم ریحًا وجنوداً لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیرا۔ (۳۳:۹)

اے لوگو! جو ایمان لاتے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو، جب تم پر لشکر آ پہنچے، سو ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیجا، جنھیں تم نہیں دیکھتے تھے اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔

جنگِ احزاب صداقتِ اسلام کا کھلا معجزہ ہے۔

مسجدِ نبویؐ

محقق ملی حافظ کی تحقیق کے مطابق مسجد شریف کا عہد وار رقبہ مندرجہ ذیل ہے :

۱ - بناءِ ثانی عہد مبارک حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سنہ ۷ھ	۲۴۷۵	مربع میٹر
۲ - اضافہ حضرت عمر الفاروقؓ سنہ ۱۷ھ	۱۱۰۰	〃
۳ - اضافہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ سنہ ۲۹-۳۰ھ	۴۹۶	〃
۴ - اضافہ بعہد ولید بن عبدالمالک الاموی سنہ ۸۸-۹۱ھ	۲۳۶۹	〃
۵ - اضافہ بعہد مہدی بن منصور العباسی سنہ ۱۶۱-۱۶۵ھ	۲۴۵۰	〃
۶ - اضافہ سلطان الاشرف قائتبائی سنہ ۸۸۷ تا سنہ ۸۹۲ھ	۱۲۰	〃
۷ - اضافہ سلطان عبدالمجید خان عثمانی سنہ ۱۲۶۵ تا سنہ ۱۲۷۷ھ	۱۲۹۳	〃
۸ - اضافہ ملک عبدالعزیز آلِ سعود سنہ ۱۳۷۰ تا سنہ ۱۳۷۵ھ	۶۰۲۴	〃
کل رقبہ	۱۶۳۲۷	مربع میٹر

جناب مظہر علی خان لکھنوی (مکتبہ عین القضاۃ مدینہ منورہ) نے مسجد نبویؐ کا خریطہ شائع کیا ہے۔ جس میں شمالاً جنوباً طول ۱۸۰ میٹر اور شرقاً غرباً عرض ۹۶ میٹر دکھایا گیا ہے۔ اس حساب سے کل رقبہ ۱۷،۲۸۰ مربع میٹر ہو جاتا ہے لیکن روضہ مبارک کے مشرقی جانب دیوار مطلوبہ عمودی خط سے ذرا اندر کی طرف کم دکھائی دیتی ہے۔ ممکن ہے یہ ۹۵۳ میٹر کا فرق وہ ہو۔

مَالِي وَلِلدُّنْيَا وَمَا أَنَا وَالدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ
اِسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا

میرا اور دُنیا کا کیا جوڑ اور تعلق ، میری اور دُنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسافر تھوڑی دیر درخت کے سایے تلے ٹھیر جاتا ہے پھر اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔

(مشکوٰۃ: کتاب الرقاق)

مُتعلّقاتِ سیرت



خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن

بریگیڈ مبیئر گلزار احمد

فخرِ انسانیتؐ کی ولادت باسعادت ۹ ربیع الاوّل بمطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے بعد ہوئی۔ مولود صبح وطلوعِ آفتاب سے کچھ قبل آفتابِ دوجہاں اس جہاں میں تشریف فرما ہوئے۔ یہ دوشنبہ کا دن تھا۔ تاریخ کے عجائبات کے راز کون جان سکتا ہے۔ آپؐ کی ولادت، نبوّت، ہجرت اور وفات سبھی اہم واقعات دوشنبہ کے دن واقع ہوئے۔

آپؐ کی زندگی کا ہر واقعہ یوں تو معجزہ نظر آتا ہے اور پوری زندگی ایک دلکش معجزہ ہے۔ البتہ طالب علم کے ذہن میں یہ جستجو پیدا ہونا فطری سا امر ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ آپؐ کا بچپن کس طرح گذرا۔ وہ کون سے واقعات وحادثات تھے، جنھوں نے آپؐ کی زندگی کے خطوط اور سمت متعین کی اور وہ کون کون لوگ تھے جنھوں نے تربیت کے ذریعہ آپؐ کے اخلاق وکردار کو متاثر کیا۔

جس انسان نے اپنی جان کے دشمنوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا جس نے دشمن فوج کے کمانڈر اعلیٰ ابوسفیان کو والیٔ نجران کے فرائض انجام دینے کے قابل بنا دیا، جس نے احد کے میدان میں اسلامی فوج کو فتح سے محروم کر دیا تھا اُسے سیف اللہ کے لقب کے شایانِ شان بنایا، جس نے سیّد الشہدا حضرت حمزہ ابن عبد المطلب جیسے جلیل القدر مجاہد کے قاتل کو ایمان کے قابل بنایا۔ اور پھر اُسے مسیلمہ کذاب کے قتل کے ذریعے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقع عطا کیا جس نے مساواتِ انسانی کا وہ سبق دیا کہ آزاد کردہ حبشی غلام کو خلیفۂ وقت کی جانب سے سیّدنا کا خطاب دلوایا اور جس نے لاکھوں انسانوں کے قلب وذہن میں عجوبۂ روزگار تبدیلیاں لائیں۔ اس "امی" ہادیؐ کے بچپن اور اس کی تربیت کے مدارج سے آشنا ہونے کی خواہش ہر دل میں پیدا ہوتی ہوگی۔ اسباب علل اور علت ومعلول کا عادی انسان جب صحرا کی بدویانہ زندگی میں بچپن گذارنے والے "امی امین" کے حسنِ معاملہ اور عہد وپیمان کی پاسداری اور ایفاءِ وفا کے ایمان افروز واقعات پر نظر ڈالتا ہے یا پھر دوسری طرف بدر و اُحد کے دوران قیادت وسیادت کی بلندیوں کی جانب نگاہ اُٹھاتا ہے یا جیران کے میدان میں اپنے قتل کے خواہشمند مکہ کے قریش سرداروں کو ایک ایک سو اونٹ کا تحفہ دے کر اُن کے سرِ نیاز کو اس یاد سے جھکا دیتا ہے جب انھوں نے ندوہ میں بیٹھ کر اعلان کیا تھا کہ جو اُسے زندہ یا مردہ لے آئے گا اُس کو ایک سو اونٹ انعام کے طور پر پیش کیے جائیں گے تو گنہگار انسان معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آیا یہ سب کچھ ایک انسان کے قلب وذہن کی واردات کا نتیجہ ہے۔ اگر اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے والا اور اس پر مکمل ایمان لانے والا[1]۔ اور اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ[2] کہنے والا نورِ مجسّم حدودِ بشریت کے اندر رہ کر یہ سب کچھ اور

---

[1] فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ۔ (الاعراف ۷: ۱۵۸) [2] فصلت ۴۱: ۶

اس سے بھی زیادہ کارنامہ اور فرائض ان حدود کے اندر رہ کر انجام دے سکا تھا تو عقل و دانش پر بھروسا رکھنے والا انسان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ کون سا ماحول تھا جس نے اس فوق الانسانیت انسان کے ذہن و بدن کی نشو و نما میں حصّہ لینے کی سعادت حاصل کی تھی۔

آپؐ کا خاندان بنو ہاشم مکّہ کے سب سے بااثر قبیلہ قریش کا حصّہ تھا۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب قریش مکّہ میں اثر و رسوخ رکھتے تھے مگر یہ اثر ان کے بعد نہ رہ سکا۔ شاید اس لیے کہ قبائلی زندگی میں فرد کی عقل و فراست اور تدبّر و تفکّر ہی انسان کو اعلیٰ مقام دیا کرتا ہے۔ اگر آپؐ کے والد حضرت عبداللہ زندہ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ وہ حضرت عبدالمطلب کا مقام حاصل کر لیتے مگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند ماہ قبل مدینہ کے سفر کے دوران مدینہ میں وفات پا گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپؐ کے والد بزرگوار کی وفات ان واقعات کی پہلی کڑی تھی جن سے شاید قدرت کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ سیّد البشرؐ کسی بشر رشد و ہدایت یا رہنمائی اور مثال کے حاجت مند نہ تھے۔

ہر بچّہ اپنے والد کو انسانیت کا بہترین مظہر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے والد کی ہر عادت، ہر طریقِ کار، اس کی طرزِ گفتگو اور اس کے اخلاق و کردار کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ربّ العلمین نے جس ہستی کو قیامت تک کے لیے مثال بنانا تھا اس کے سامنے وہ کوئی مثال نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ضروری تھا کہ ہادیٔ برحق والا کی جانب سے ہدایت حاصل کرنے سے محروم رہتے۔

اللہ کی عطا کردہ امانت[1] جو آمنہ کو عطا ہوئی تھی۔ اس کے مستقبل کی فکر آمنہ سے بہتر کسے ہو سکتی تھی۔ ماں اپنے لختِ جگر کو تعریف کے قابل دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے نومولودؐ کا نام احمدؐ رکھا۔ دادا کو بھی اپنے منظورِ نظر بیٹے کی اولاد سے پیار فطری بات تھی۔ وہ خود بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ گردوپیش میں احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے محمدؐ نام رکھا۔ دونوں کو شاید یہ معلوم تھا کہ یہ دونوں نام ماقبل کے صحیفوں میں آچکے ہیں۔ توریت نے اللہ کے آخری پیغام رساں کو محمدؐ اور انجیل نے احمدؐ کے نام سے یاد کیا ہے۔

چند روز چچا ابولہب کی کنیز ثویبہ نے دودھ پلایا۔ اور پھر آٹھ دن کے نومولودؐ نے حلیمہ سعدیہ کی گود میں ایک لاغر سی اونٹنی کی پیٹھ پر صحرا کا رُخ کیا۔ اماں حلیمہ سعدیہ کا کہنا تھا کہ اس روز اس کمزور ترین اونٹنی کی رفتار کا ساتھ باقی قافلہ نہ دے سکا تھا۔ حلیمہ سعدیہ خود بھی چنداں خوشحال نہ تھیں، مگر آج ان کے قلب و ذہن کو کسی نامعلوم وجہ سے سکون و اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ بی بی آمنہ جیسی جلیل القدر ماں کا لختِ جگرؐ اماں حلیمہ کی گود میں تھا۔ طمانیت قلب کیوں نصیب نہ ہوتی۔

صحرائی وسعتوں میں ایک سحر، ایک کشش، ایک مقناطیسی قوت اور ایک جلال ہوتا ہے۔ چشمِ بینا کا صحرا میں وا ہونا اُسے فطرت کے اس قدر قریب لے آتا ہے کہ پھر کسی رہنما، کسی ہادی اور کسی اُستاد کی ضرورت نہیں رہتی اور بنو سعد کے

---

[1] "امین بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی۔" ابوالاثر حفیظ جالندھری۔

چھوٹے سے قبیلے میں تھا بھی کون جو اس نومولود کو کچھ سکھاتا یا فطرت کے رازہائے سربستہ اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا۔ اس کے سامنے تو صرف صحرا کی وسعتیں تھیں اور آسمان کی بلندیاں۔ نہ حدِ ادھر نہ حد اُدھر۔ ذہن رسا کے سامنے فطرت بے نقاب تھی جو قدم قدم پر اور ہر ہر لحظہ نئے خیال کا موجب بن رہی تھی۔

" ذرا نم ہو تو بہت زرخیز" ہوتا ہے صحرا کا یہ ماحول۔ اون کے خیموں میں رہنے والے مطمئن اور صبر و شکر کے عادی صحرائی باشندے اپنے اونٹوں، بکریوں اور بھیڑوں کی محدود دولت کو قیصر و کسریٰ کے خزانوں سے عظیم تر سمجھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ریت کے نرم و گداز ٹیلوں پر لیٹ کر غروبِ آفتاب سے سحر انگیز منظر کو دیکھتے رہنا اور پھر اوّل شب کی خاموشی میں تاروں کی چمک ذہن انسانی کو خالق و مخلوق کے تعلقات کے سبھی گوشوں سے شناسا کر سکتی ہے مگر اس کے لیے تجربہ و مشاہدہ بھی ضروری ہے۔ یہ نومولود اپنے سے بڑوں کو دن کے وقت گلہ بانی میں مصروف دیکھتا ہوگا اور رات کو الاؤ کے گرد بنو سعد کے فصیح و بلیغ[1] مردانِ آزاد کا کاروبارِ زندگی پر تبصرہ کرنا بھی سُنتا ہوگا۔ مگر ابھی آپؐ کے لیے اس میں کسی طرح کی رہنمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ ماحول البتہ آپؐ کو کسی اُستاد، کسی ہادی اور کسی مُرشد کی غیر موجودگی میں ایامِ طفلگی سے ہی اپنے آپ پر بھروسا کرنے کا خوگر بن گیا ہوگا۔ اس خداداد ماحول نے ضرور فراخیٔ قلب اور فکر و خیال کی بلندیوں کی بنیاد بھی غیر محسوس طور پر رکھی ہوگی۔ خالقِ ارض و سما نے ہر قدم پر اپنے اس شاہکار کے اندر کردار و اخلاق کے کمال کے سامان خود ہی پیدا کرنے تھے۔ اس لیے کہ اسی ذاتِ بابرکات کے متعلق اُسے ایک دن یہ حکم دینا تھا کہ اس کے ہر قول اور ہر فعل میں تمہارے لیے رہنمائی حاصل کرنے کی نعمت موجود ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳ : ۲۱)

ممکن ہے کہ عمرانیات کے ماہر اماں حلیمہ سعدیہ کے قلب و ذہن کی صلاحیتوں کو ایک شہنشاہِ بے مثل اور رہنمائے نسلِ انسانی کی پرورش کے قابل قرار نہ دیں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسی ماں کا دودھ پی کر افضل البشرؐ نے جسمانی نشو و نما پائی۔ تاریخ اس کی خدمت اولادِ آدمؑ کو کتنا ہی کیوں نہ گوشۂ تاریکی میں رکھے مگر مؤرخ اقرار کرتا ہے کہ جب فاتح بدر و حنین کے سامنے حلیمہ سعدیہ آئیں تو اس لاثانی سپہ سالارؐ نے لپک کر اور "میری ماں، میری ماں" کہتے ہوئے اُس کا استقبال کیا۔

حلیمہ سعدیہ دستور کے مطابق ہر چھ ماہ کے بعد اس عظیم امانتؐ کو اپنی والدہ کی ملاقات کے لیے مکہ لے جاتی تھیں۔ یوں تو دستور تھا کہ اس طرح صحرا کی کھلی فضا کی زندگی کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی تھی مگر بی بی آمنہ نے فیصلہ کیا کہ آپؐ کے لیے اس مدت کو ایک سال کے لیے مزید بڑھا دیا جاتے۔ اب آپؐ کو اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے ساتھ ایک سال اور رہنے کا موقع مل گیا اور یوں بھیڑ بکریوں کی گلہ بانی میں عملی طور پر حصہ لینے کے مواقع ملتے رہے۔ یہ رضاعی رشتہ حنین کی لڑائی کے قیدیوں کے حق میں رحمۃ للعلمینؐ کے ہاتھوں باعثِ رحمت و آزادی ثابت ہوا۔ جب قبیلہ اپنی آزادی حاصل کر کے اور رضاعی بہن شیما خوش و خرم

لہ حضورِ اقدسؐ فرمایا کرتے تھے کہ آپؐ کی عربی باقی لوگوں سے فصاحت و بلاغت میں بہتر ہے۔ اس لیے آپؐ کا بچپن بنو سعد کے درمیان گذرا ہے۔

تحائف لے کر قبیلہ کے ساتھ اسی صحرا کو لوٹی جہاں ریت کے ٹیلوں پر وہ اس چاند کو لیے پھرا کرتی تھی جس کے استقبال کے موقع پر یثرب کی لڑکیوں کے لیے "طلع البدر" کا گیت مقدر ہو چکا تھا۔

چھ سال کے بعد شرق و غرب کے لامتناہی تصوّر کو خیرباد کہہ کے یہ امانتؐ بیت اللہ کے سائے سے متعارف ہونے کے لیے والدہ محترمہ تک پہنچا دی گئی اور اماں حلیمہ سعدیہ انعام و اکرام اور بوجھل سا دل لے کر واپس بنو سعد کے ٹیلوں کو لوٹیں۔

اب تھوڑے سے عرصہ کے لیے آپؐ کو مکّہ کی شہری زندگی کی گہما گہمی دیکھنے کا موقع ملا ہو گا۔ آپؐ کا مولود بازار کے بالکل قریب ہے۔ بیت اللہ بھی دُور نہیں۔ صحرا کی خاموشیوں کی عادی طبیعت پر شہر کے شور و غل کا کیا اثر پڑا ہو گا۔ یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جنھیں عرصہ تک کوہ و صحرا کی زندگی گذارنے کے بعد کسی شہر کے مرکز میں زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑے۔ اس وقت مکّہ جزیرۃ العرب کا معاشرتی، تمدنی، دینی اور تجارتی مرکز تھا۔ اس وجہ سے قریش مکّہ آسودہ حال بھی تھے اور قبائل میں محترم بھی۔ اعیانِ قریش نے مکّہ کو باقاعدہ تنظیم کے ذریعہ منضبط کر رکھا تھا۔ زندگی کے شعبے متعین تھے ان شعبوں کے سربراہ مقرر تھے۔ افرادِ قبیلہ کو آزادی رائے اور اس کے بےباکانہ اظہار کے مواقع میسّر تھے مگر انضباط کی حدود کے اندر رہنا ضروری ہوتا تھا۔ شوریٰ کے اجلاس کے لیے دارالندوہ موجود تھا۔ البتہ چند سالوں کے بعد "حلف الفضول" کے وجود میں آنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شوریٰ کے فیصلوں میں بھی طاقت ور اور کمزور کا عنصر داخل ہو چکا تھا۔ ان باتوں سے طفل شش سالہ کو کوئی سروکار نہ تھا مگر آپؐ کا بالآخر "حلف الفضول" میں شامل ہونا دورِ رسالت میں اس کی یاد مسرت سے کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس دور کا عرب عدل و انصاف کی پرانی روایات سے ہٹ چکا تھا ورنہ غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے "حلف الفضول" کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مکّہ کی زندگی کو طفلؐ نووارد نے کچھ اس طرح دیکھا ہو گا جیسے دُھند کے غبار کے اس پار کچھ حرکت ہو رہی ہو اور دیکھنے والا محض چند خاکے دیکھنے اور چند آوازیں سننے کے ماسوا کسی طرح کا معلوماتی استفادہ نہ کر سکا ہو اور پھر جلد ہی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کر لی ہو۔

ماں بیٹے کی مُلاقات کے بعد ماں کو خیال ہُوا ہو گا کہ بیٹے نے والد کو تو نہیں دیکھا، والد کے مدفن کو ہی دیکھ لے، اس لیے بی بی آمنہ نے یثرب کا سفر اختیار کیا۔ یثرب کے مسافر کی عمر اب چھ سال ہو چکی تھی۔ اب مشاہدے میں آنے والے مقامات اور واقعات کے خطوط حافظے پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے۔ ننھے محمدؐ اور احمدؐ کو والدہ کا یثرب لے جانا ہمیشہ یاد رہا۔ یہ بھی یاد رہا کہ والدہ نے اس جوانِ رعنا کا ذکر بھی کیا تھا جو یثرب کے سفر سے مکّہ کو لوٹا تھا۔ یہ بات بخشگی سے واضح ہوتی ہے کہ خالقِ ارض و سما کا فیصلہ تھا کہ اس کے آخری پیغام کا اوّلین مخاطبؐ اور نسلِ انسانی کا آخری رہبر و ہادیؐ "امّی" رہے تاکہ وہ دنیوی اثرات سے محفوظ رہ کر خالصتاً اللہ کا پیغام انسانیت تک پہنچائے۔ اس پیغام نے قیامت تک انسانیت کا ساتھ دینا تھا۔ اسے صدیوں تک بدلتے ہوئے زمانوں اور بدلتے ہوئے مقامات کی بدلتی ہوئی ضروریات کے باوجود غیر متبدل رہنا تھا۔ اس لیے اس پیغام کو کاملاً اللہ کا بھیجا ہُوا پیغام ہونا تھا۔ اگر والد یا کسی اور بزرگ کی نصیحتیں ارشاداتِ عالیہ یا علم و حِکم کے خزینے رسولِ آخر الزمان صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذہن پر نقش ہو جاتے تو اللہ کے پیغام کے

متاثر ہونے کے امکانات و خدشات تھے۔ اور رسولؐ پیغام ربانی کے لیے ان خدشات سے بچنے کا واحد ذریعہ یہ تھا کہ وہ یتیم[1] بھی ہو اور "امی" بھی ہو۔ والد کا سایہ تو ربِ کعبہ نے اٹھا لیا تھا مگر ان کا مدفن وہ مقام قرار پایا جہاں خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے آخری دس سال گذار کر خود بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رونق افروز رہنا تھا۔

یثرب کے سفر اور قیام کے دوران کے واقعات میں آپؐ کو تیرنا سیکھنا اور یثرب کے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنا آخر عمر تک یاد رہا۔ واپسی کا سفر یتیمی کو مکمل کرنے والا سفر تھا۔ ابوا کے مقام پر والدہ محترمہ بی بی آمنہ نے انتقال کیا۔ کون جانتا تھا کہ مشیتِ ایزدی اس کم سن کو کس طرح کی زندگی سے دوچار کرنا چاہتی ہے۔ آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ قدرت نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں کسی ایسے قلبی و ذہنی عنصر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ جسے ورثہ میں ملی ہوئی تربیت اور تعلیم پر محمول کیا جا سکے۔ والد کے سائے کے اُٹھ جانے سے اس کمسنؐ کے لیے ایسی کوئی ہستی نہ رہی تھی جسے وہ فطری طور پر تقلید کے قابل قرار دیتا۔ ماں کی ممتا پیار و محبت، رحم و کرم، لطف و احسان اور بخشش و عطا کی جانب رہبری کرتی ہے۔ ابوا کے پڑاؤ پر وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ دوسروں پر لطف و کرم کے اسباب سیکھنا تو کجا، جب اللہ کا یہ شاہکار فہم و ادراک کی دہلیز تک پہنچا تو خود اسؐ کے لیے مہر و محبت کا سرچشمہ موجود نہ رہا۔ شاید اس سے یہ مقصود تھا کہ خود اسؐ کے اپنے ذہن پر کسی بشر کی کرم فرمائیوں کے نقش نہ اُبھر سکیں۔ اور اسؐ کے تمام فضل و کرم، اسؐ کی جود و سخا اور بخشش و عطا اللہ کی دین ہو۔ جب نصف صدی اور تین سال بعد حرم کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے سردارانِ قریش اور اہالیانِ مکہ کو مخاطب کر کے آپؐ نے فرمایا تھا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اور اپنے آپ اور اپنے ساتھیوں پر کیے گئے تمام مظالم اور ان کی یاد کو ذہن کی سطح سے محو کر دیا تھا تو وہ اللہ کی عطا کردہ "رحمت عالمی" کی صفت کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی بزرگ کی صحبت میں حاصل کردہ خصوصیت کا پرتو۔ یہ اس خُلق عظیم کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا جو خیر البشرؐ کو وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۴:۶۸) کہہ کے خالق کائنات نے یہ اشارہ کیا کہ اس بلند مرتبہ پر قائم کرنے والا وہ خود ہے۔ یہ وہ مقامِ عزت و احترام ہے جہاں ربّ العزت کے بغیر کوئی ہستی نہیں پہنچا سکتی اور نہ کوئی اس کی جانب رہنمائی کر سکتا ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے رہنماؤں کے وعظ و نصیحت یا رشد و ہدایت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو ان گزشتہ چودہ صدیوں میں مثال موجود ہونے کی بناء پر اور اس سے ہدایت حاصل کر کے کوئی ایک انسان تو اس مقام کے قریب پہنچ سکتا۔ "امی" پیغمبرؐ کا یہ خُلق عظیم آپؐ کا رحمتِ عالم ہونا، آپؐ کا ہر عمل شفقت و محبّت سے لبریز ہونا اُس رحمان و رحیم کا انعام تھا جس نے قیامت تک آنے والی نسلوں کے ہر فرد کے لیے ایک مثال قائم کرنا تھی، اور پھر اس کا مثیل وجود میں نہیں لانا تھا۔ اس لیے کہ اپؐ فنِ انسانی سنِ بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور آئندہ صرف اور صرف اسیؐ مثال کی روشنی میں انسانی زندگی کو مرتب کیا جانا تھا۔

پڑاؤ کی مسافرانہ زندگی، قافلہ اور قافلہ والوں کی بے ترتیب اور پُرہیجان زندگی، ہر چہار سو ریت کے ٹیلے اور دُور نیلگوں بے آب و گیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ اور عین غربت میں دنیا کے واحد موجود سہارے کا اُٹھ جانا۔ چھ سال کے کمسن محمدؐ و احمدؐ کے دل کی کیفیت تصور سے بالاتر ہے۔ وہ بچہ جو والد کی شفقت سے روزِ اوّل سے محروم رہا تھا جس نے بادیہ نشینوں

[1] الم یجدک یتیما (۹۳:۶)

کے خیموں کے سوا کوئی دوسرا مسکن زیادہ عرصہ کے لیے نہیں دیکھا تھا، اور پھر اس ماحول سے بھی علٰحدگی ہو گئی تھی۔ اسؐ نے ایک پڑاؤ کی بستی میں واحد سہارے سے جدا ہو کر اپنی والدہ کی کنیز سے کیا کیا سوال کیے یا نہ کیے ہوں گے۔ امّاں جان کو کیا ہوا ہے؟ کل تو بول رہی تھیں۔ آج کیوں بات نہیں کرتیں؟ لوگ انھیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ وہ کب واپس آئیں گی۔ ہم مکہ کب جائیں گے؟ اور پھر خیمے میں صرف ام ایمن برکہ حبشہ تھی اور چھ سال کا دُرِ یتیمؐ۔ اس یتیمؐ نے ابوا کے مقام کو مدنی زندگی کے دور میں دیکھنا تھا مگر اس وقت اس کا کسے خیال ہو سکتا تھا۔ وہ سفر تو سپہ سالارِ افواج مدینۃ النبیؐ کے لیے مقدر ہو چکا تھا ہاں۔ مگر یہ سب حادثات و واقعات ان سفروں کی تیاری کی بنیاد تھے جو فخرِ انسانیتؐ کو پیش آنے تھے۔ بلکہ اس ویرانے کے متعلق بھی کہا جا سکتا تھا کہ "بسودائے تو تنگ است ہنوز" کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس فرض شناس کنیز کو طفل تسلیاں دینے کی ضرورت پیش آئی یا عین محفل میں بھی تنہائی کے عادی بچےؐ نے غم کے اس کوہِ گراں کو بھی معمول کے مطابق حادثہ سمجھ کر کچھ پوچھنے یا سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

مکہ مکرمہ پہنچ کر اُمّ ایمن نے کن الفاظ میں حضرت آمنہ کے آخری الفاظ حضرت عبدالمطلب تک پہنچائے اور بی بی آمنہ کی یہ عظیم امانتؐ کس طرح ان کے سپرد کی ہو گی۔ یہ تخیل اور تصوّر کا حصّہ ہیں۔ انھیں الفاظ کا جامہ پہنا کر قلم کا درِ ثنا نہیں بنایا جا سکتا۔ اب آپؐ کی کفالت معمر دادا عبدالمطلب کے حصّہ میں آئی۔ یہ وہی عبدالمطلب ہیں جن کو چاہِ زمزم کو معلوم کرنے اور دوبارہ کھُدوانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کے ذمہ حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات بھی تھیں۔ دادا نے ننھے یتیم پوتے کے ساتھ جی بھر کر پیار کیا ہو گا۔ کعبہ کے سائے میں گلیم عبدالمطلب پر بیٹھنے کی ہمّت اُن کے بیٹے نہ کر سکتے تھے۔ مگر محمدؐ احمدؐ نام پانے والا یتیم پوتا جب بھی بیت اللہ جاتا دادا کی گلیم پر ہی متمکّن ہوتا اور دادا جب آتے تو اُسے پیار سے گود میں بٹھا لیتے۔

اللہ نے اپنے آخری نبیؐ کے لیے جو تربیت مقرر کر رکھی تھی، اس میں کسی بزرگ کی بزرگی، اُس کا عام لوگوں سے ملنا جُلنا، اس کا کاروبارِ روزمرّہ میں رُعب و دبدبہ اور اس کے اصول زندگی کا دخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مبادا کہیں اس بزرگ کی صفات کی جھلک یا اس کا رنگ اس اللہ کے فرستادہ ہادیٔ نسل انسانی کی طبیعت میں گھر نہ کر جائے تاکہ اس کا خلقِ عظیم، اس کا جلال و جبروت، اس کی سپہ سالاری، اس کا عدل و انصاف اور اس کا مملکت، ریاست اور حکومت کے معاملات کو حل کرنا، مکمل طور پر وحی کی عطا کردہ بصیرت پر منحصر ہو۔ یہی وجہ نظر آتی ہے کہ مدینہ سے لوٹ کر آنے کے جلد بعد جب حضورِ اقدس کا سن بمشکل آٹھ سال کا ہُوا تھا تو دادا نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔

دادا نے بستر مرگ پر فیصلہ فرمایا تھا کہ آپؐ کی نگہداشت آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب کریں گے۔ ابوطالب کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی مگر انھوں نے آپؐ کو انتہائی پیار اور شفقت سے رکھا۔ یہ وہ دَور ہے جب آپؐ نے گلہ بانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان بھیڑ بکریوں میں دوسروں کے جانور بھی شامل ہوتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ امانت کی نگہداشت کا آغاز کمسنی میں ہی ہو گیا تھا۔ امانت و دیانت کا یہ معیار بعد ازاں تجارت میں بھی جاری رہا حتیٰ کہ "امّی یتیم" کو "امین" کا لقب

اس معاشرے نے دیا جس میں صاف گوئی، آزادیٔ رائے اور بے خوف تنقید کو معمول سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح آپؐ کے اُجرت پر بھیڑ بکریاں چرانے سے حضرت ابوطالب کو ضروریاتِ روزمرہ اور گھر کے اخراجات کے سلسلہ میں دشواریوں سے کسی حد تک نجات حاصل ہوگئی ہوگی۔

اڑھائی تین سال بعد جب آپؐ کی عمر بارہ سال کی تھی تو آپؐ نے حضرت ابوطالب کے ہمراہ تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ قریشِ مکہ جاڑوں میں جنوب کی جانب اور گرمیوں میں شمال کی جانب تجارتی قافلے روانہ کیا کرتے تھے۔ جو لوگ خود نہیں جا سکتے تھے وہ دوسروں کو اپنا مال دے کر روانہ کرتے اور متفقہ فیصلہ کے مطابق منافع میں شراکت یا اُجرت کے اصول پر کام کیا جاتا۔ شام اس وقت بازنطینی حکومت کے تسلط میں تھا۔ بازنطینی حکومت اس وقت ایشیا اور افریقہ کی سب سے بڑی طاقت و حکومت سمجھی جاتی تھی۔ شام کے سفر میں عام معلومات میں اضافہ ضرور ہوا ہوگا مگر بازنطینی مقبوضات کی اخلاقی اور دینی سطح اس قدر گر چکی تھی کہ اس سفر کے دوران بارہ سال کا نوجوان معاشرتی و معاشی امور، کسی مکتبِ فکر، فلسفہ یا دین کے پیچیدہ مسائل کسی فیلسوف یا راہب سے نہیں سیکھ سکتا تھا۔ بحیرہ راہب کا قصہ یوں بھی قابلِ توجہ نہیں، البتہ اس سے مستشرقین نے جو دور از کار نتائج نکال کر اسلام کی تعلیمات کو ایک راہب کی سرسری ملاقات پر مبذول کیا ہے۔ اہلِ مغرب کی فطرت کو ظاہر کرنے کے علاوہ اس کا کوئی مقام نہیں۔

سنِ بلوغت کے بعد آپؐ نے ضرور ایسے سفر اختیار کیے ہوں گے۔ اور لامحالہ تجارت میں حصہ لیا ہوگا۔ اس لیے کہ "امین" کا لقب معاملات کی حسن کارکردگی پر ہی مبنی ہوگا۔ اسی طرح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا آپؐ کو مختارِ کُل کے طور پر اپنے سامانِ تجارت کے ساتھ روانہ کرنا ماقبل کے تجربہ اور امانت و دیانت میں معروف ہونے کی بنا پر کیا گیا ہوگا۔ یہ کہنا کہ یہ سفر یا گھر کے اخراجات کے لیے اجرت پر بکریاں چرانے کا تجربہ مابعد کی نبوت کا باعث بنا۔ اس قدر غیر منطقی استدلال ہے کہ اس پر غور کرنا ہی تضیع اوقات ہے۔ ایسے تجربے جہانگیری و جہانبانی کی بنیاد قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ نبوت و رسالت تو خالصتاً اللہ کی دین ہے۔ اکمل و کامل دین جس نے قیامت تک کے لیے درست نظامِ حیات کا مقام قائم رکھنا ہے وہ بکریاں چرانے اور چند تجارتی سفر اختیار کرنے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یہ فرائض اور ان کی کما حقہٗ انجام دہی صبر و استقلال اور تدبر و تفکر کی عادت کے موجب بن سکتے ہیں مگر ایک مکمل دین کے جزئیات کا حل اور ایک اُمت کی زندگی کی ہر شعبہ میں ہدایت و دستگیری کرنے کی صلاحیتیں بکریاں چرانے کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ باپ، ماں اور دادا کی رہبری سے محروم رکھا جانے والا کمسن بچہ جب شہری زندگی کی کفالت کے ذرائع پیدا نہ کر سکا تو بکریاں چرانے کی وجہ سے اس کے "امی" رہنے کی مدت اور کیفیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

یہ انسان اور اس کے گرد کی کائنات علیم و خبیر اور سُننے، دیکھنے اور جاننے والے اللہ العالمین کی تخلیق ہے۔ یہ نہ از خود وجود میں آئی ہے اور نہ ہی اُسے کھیل تماشے کی غرض یا غلط مقصد کے لیے وجود میں لایا گیا ہے[1]۔ اور نہ ہی اس کائنات

[1] وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۲۱ : ۱۶ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ ۴۴ : ۳۹ ۔

کو کسی غلط مقصد یا محض بے کاری شے بنایا ہے[1] اس کائنات کی تخلیق کا بہت بڑا مقصد تھا۔ اس کے اندر الٰہ العلمین نے بے انداز قوتیں داخل کی تھیں اور پھر ان قوتوں کے عمل اور ردِ عمل کے نتیجہ میں اس کائنات کے ذرہ برابر کرہ ارضی پر پانی کو وجود میں لایا اور پانی کو بلند مقام دیا گیا جو کسی اور شے کو نہیں بخشا گیا تھا۔ خالق العلمین نے اپنا عرش اس پر قائم کیا[2] پانی کو ایک اور اہم خاصیت بخشی۔ اس کے ذریعہ ہر زندہ شے کو پیدا کیا[3]

اور پھر جب اس کرۂ ارضی پر ہر شے کا وجود آ گیا جو خالق العلمین کے شاہکار کے رشتۂ جسم و جان کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھی تو پھر اپنی اس متوازن تزین (التین ۹۵ : ۵) کو اپنا نائب بنا کر اس کرۂ ارض پر اُتارا (البقرہ ۲ : ۳۰) گو اسے مٹی سے بنایا گیا تھا مگر اس کے بننے سنورنے میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی تھی۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں اسے درست کر لوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا[4]

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بشرِ خاکی کے اندر اپنی رُوح کا پھونکنا عین درست تھا۔ اس لیے کہ اسے اپنا نائب بنا کر اس کرۂ ارض پر بھیجا جا رہا تھا۔ اور یہ رُوح امرِ ربی کا نتیجہ ہے[5] اس کو سمجھنا اور اس کی انتہائی قوت کا پتا لگانا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق الٰہ العالمین سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قوتوں یعنی اس کی صفات کا اندازہ لگانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے اور جس طرح ان تمام سیاروں، ستاروں، تمام برقی اور مافوق البرقی رووں کا عمل اور ردِ عمل ہوتا ہے اس پر عبور پا لینے سے خالقِ کائنات کی قدرت، قوت اور اس کی صفات کا علم وسیع تر ہے۔ اگر اس کرہ ارض کے تمام سمندروں کا پانی روشنائی بنا لیا جائے اور اس کے تمام درختوں سے قلم تراش لیے جائیں تب بھی اس کی قدرت کے اوصاف گِنائے نہیں جا سکتے[6]

اس مٹی سے بنے ہوئے انسان کو باقی مخلوق پر ایک فوقیت بھی بخشی۔ اسے روزِ اوّل سے علم الاشیا عطا فرمایا[7] یہ علم دے کر اسے اس کرۂ ارض پر بطور خلیفہ متمکن کیا[8] اور پھر اسے اس بات سے بھی آگاہ کیا گیا کہ تمہاری خلافت کرۂ ارض کے

ؔ۱ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص ۳۸ - ۲۷)

ؔ۲ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ ..... (ھود ۷ : ۱۱)

ؔ۳ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط : (الانبیاء ۲۱ : ۳۰)

ؔ۴ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (ص : ۳۸ : ۷۲)

ؔ۵ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ۔ (الاسراء ۱۷ : ۸۵)

ؔ۶ قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي ۔ (مریم ۱۸ : ۱۰۹)

ؔ۷ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ۔ (البقرہ ۲ : ۳۱)

ؔ۸ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ ۲ : ۳۰)

لیے ہے مگر اس کے باوجود میں نے ارض و سما کی ہر شے تمھارے لیے مسخر کی ہے۔[1] اب انھیں استعمال کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے تمھیں ان کی خاصیتیں معلوم کرکے انھیں اپنے قبضے میں لانا ہوگا۔

اس کرۂ ارضی پر انسان کی زندگی لاتعداد مدوجزر سے گذری ہے۔ شروع کے ایام میں ایک ہی ملت بن کر زندگی گزارتا رہا۔[2] مگر جوں جوں انسانوں کے علم میں ترقی ہوتی رہی تو بعض انسان علم کی موجودگی کے باوجود گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے اور آپس کے اختلافات کی خلیج وسیع کرتے رہے۔ یوں کہیے کہ جب اللہ کی جانب سے علم حاصل ہو جاتا ہے تو پھر علم کے اس عزور کی وجہ سے عجیب و غریب تاویلات کے ذریعہ آپس میں اختلافات شروع کر دیتے۔ اہل کتاب علمانے بھی اسی طرح کیا۔[3] اور یوں انسانیت گروہوں، فرقوں اور حلقوں میں بٹتی گئی۔ درست کہ اگر اللہ چاہتا تو انسان ایک ہی اُمت بنے رہتے[4] مگر مشیت ایزدی کو انسان کی بھلائی میں اس کی اپنی کوشش اور اپنا اختیار استعمال کرنا مقصود تھا۔ اس لیے کہ انسان کو جب روزِ اول علم الاشیا بخشا گیا تھا اور کائنات کی جملہ اشیا اس کے لیے مسخر کی گئی تھیں تو مقصود یہ تھا کہ یہ خاک کا پتلا جہاں کہیں بھی ہو اپنے خداداد علم کے ذریعہ خود تسخیر کائنات پر قدرت حاصل کرکے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام کی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر نباہ سکے۔ اس کے علم میں اضافہ اور اس کے علم حاصل کرنے کی صلاحیت میں ہر دور میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جوں جوں انسانی ذہن ترقی کرتا رہا اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فرستادہ پیغامبروں کے ذریعہ اس کے علم میں اضافہ کرتا رہا ہے۔ کبھی قبائلی سطح پر، کبھی جغرافیائی حدود کے اندر اور کبھی قبلیہ و جغرافیہ دونوں پر مشتمل انسانی گروہوں تک ہدایت بھیجی جاتی رہی۔ انسانوں کا مختلف ادیان میں بٹ جانا اس وجہ سے بھی تھا۔ مگر بالآخر انسانیت کو ایک ہی دین پر قائم ہو کر تسخیر کائنات کے ازل مقرر شدہ منتہیٰ مقصود کی جانب سفر اختیار کرنا تھا۔ انسانی سفر کی یہ آخری کڑی ہونی تھی اور اس آخری مدت سفر کے لیے آخری پیغام اور آخری ہدایت کا آنا ضروری تھا۔ اس آخری پیغام کو عالم انسانی کا مشترکہ دین ہونا تھا۔ یعنی اس کا ہر دور میں ہر مقام کے لیے موزوں ہونا ضروری تھا۔ اس طرح کا زمان و مکان سے بلند تر نظام حیات صرف خالق کائنات ہی مرتب کرکے انسانوں تک پہنچا سکتا تھا۔ جس پیغام نے قیامت تک کے لیے ہر دور میں اور ہر مقام پر قابل عمل ہونا تھا اس میں اصول بھی ضروری تھے اور جزئیات کا ہونا بھی لازمی تھا۔ اس میں اشارات و کنایات، تشبیہ و تمثیل بھی ہونا تھی اور اس میں بعض پہلوؤں پر باریکیوں اور تفاصیل کا ہونا بھی ضروری تھا۔ اس قدر تنوع، اس قدر ٹھہراؤ، اس ضرورت کے لیے استدلال اور براہین، اس قدر وسیع میدان اور اتنی طویل مدت کے بدلتے ہوئے حالات کی ضروریات کو ایک ہی کتاب میں

---

۱ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ؕ (الجاثیہ ۴۵ : ۱۳)

۲ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (یونس ۱۰ : ۱۹)

۳ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۔ (آل عمران ۳ : ۱۹)

۴ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (الشوریٰ ۸ : ۴۲ ۔ المائدہ ۵ : ۴۸ ، ھود ۱۱ : ۱۱۸)

سمو دینا صرف اور صرف خالق انسان ہی کر سکتا تھا اور جب اس کی نظر میں انسانی ذہن اتنے گہرے اور دقیق پیغام کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تو پھر اس نے اس پیغام کو اس انسان صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانیت پوری انسانیت قیامت تک پیدا ہونے والی انسانیت کی جانب روانہ کیا اور واضح الفاظ میں اس سید البشرؐ کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ اور (اے محمدؐ) ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سُنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (سبا: ۳۴: ۲۸)

اِس پیغام نے گو قیامت تک کے لیے قائم اور قابلِ عمل رہنا تھا۔ مگر اس پر مکمل طور پر عمل کر کے مثال پیش کرنے کی ذمہ داری صرف ایک انسانؐ کو دی گئی۔ اس ایک انسانؐ نے عام شہری، تاجر، آجر، پڑوسی، معاشرے کا باعزت انسانؐ امانتوں کا بار اُٹھانے والا مصلح، ہدایت دینے والا خطیب، سپاہی، سپہ سالار اور حکمران بن کر عملاً مثال قائم کرنا تھی، کہ زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف مقامات پر زندگی کو کس طرح گذارنا ہے۔ قرآن خالقِ کائنات کا کلام ہے مگر اس پر عمل انسانوں نے مختلف ادوار میں مختلف جغرافیائی پابندیوں کے تحت کرنا ہے۔ دائمی پیغام کو حدودِ بشریت کے اندر رہ کر زندگی کی ایک ہی مدت میں اس مکمل[1] طور پر پیغام پر عمل کرنا تھا کیونکہ اِس عمل کے مطابق رہتی دنیا تک پوری انسانیت نے عمل پیرا ہونا تھا۔[2] اِس لیے اگر عالمِ انسانی میں کوئی معجزہ رُونما ہوا ہے تو وہ یہ مکمل زندگی ہے جس نے اللہ کے عطا کردہ مکمل پیغام کے مطابق عمل کیا ہے۔ اور اس واحد انسان کی اس واحد زندگی نے نمونہ بن کر انسانیت کو تسخیرِ کائنات کی منزل تک لے جانا ہے۔ یُوں محسوس ہوتا کہ کُن کے لمحہ جب کائنات وجود میں آئی، اور اس کائنات کے مختلف حصّوں کے عمل، اور ردِّ عمل کے نتیجے میں اس کُرۂ ارضی کو حیاتِ انسانی کے قابل بنایا، تو خالقِ کائنات کی نگاہوں میں پورا خاکہ موجود تھا اس حیات کو لاتعداد رہنماؤں کے ذریعہ اِس مقام تک لایا گیا جہاں وہ لافانی نظامِ حیات کے مطابق زندگی گذار کر اِس کائنات کو مسخر کرنے کی مہم پر چل کھڑا ہو۔ مگر اس لافانی نظامِ حیات کے لیے ایک ہی مثال پیش کی۔ اِس لیے کہ اس مثال کو تیار کرنے میں صدہا صدیاں گزارنی تھیں اور اُسے بچپن سے بعثت تک بیرونی اثرات سے محفوظ رکھ کر صرف اپنے لافانی پیغام پر عمل کرنے کے قابل بنانا تھا۔ اگر اس لافانی انسانؐ نے کسی اُستاد، کسی رہبر یا کسی ہادی سے سبق حاصل کیے ہوتے تو پھر وہ اللہ کے نازل کردہ پیغام کے مطابق بے آمیزش زندگی نہ گذار سکتا۔ اور اس کا ہر قول، ہر فعل اور ہر ردِّ عمل اللہ کی جانب سے قابلِ اِطاعت نہ ہوتا۔ قیامت تک کے لیے رہنے والے احکام کے دوران اطیعوا الرّسول کا بار بار اِعادہ اِس بات کو پختہ کرتا ہے کہ اللہ کے آخری رسُولؐ کا رسالت کے سلسلہ کو ختم کرنے کے لیے یہی معنے ہیں کہ اب انسانیت ایک ہی نظام پر عمل کرتی ہے اور آئندہ ادیان میں بٹنا بند ہو جائے ورنہ علّمَ آدمَ الاَسمآءَ سے لے کر

---

[1] اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (المائدہ ۵: ۳)

[2] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳: ۴)

ارتقا تک جو ترقی ذہن انسانی نے کی تھی۔ وہ رائیگاں جاتی ۔ ختم رسالت کا اصول انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک ہونے کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ سیرت کا ایک ہونا بالآخر انسانیت کا ایک ہی پیغام پر عمل پیرا ہونا یقینی بناتا ہے۔

جب تک عالم انسانی کی انتہائی اور آخری منزل یعنی تسخیر کائنات پر نگاہ نہ رکھی جائے اور اللہ کے آخری پیغام کی اس منزل کی جانب رہبری کو نہ دیکھا جائے اُس وقت تک یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور سرورِ کونین خاتم الرسل، سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اپنے بچپن کے دوران والد، والدہ، دادا، اور کسی اُستاد و رہبر یا ہادی و مُرشد سے استفادہ کرنے سے خود اللہ کی جانب سے دُور رکھے گئے اور ان معنوں میں "امی" رکھے گئے کہ خود خالق کائنات آپؐ کو "امی" کہہ کے پکارنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ یعنے اس ہستی کو "امی" رکھا جس کو وجود میں لانے کے لیے اور جسے قیامت تک کے لیے مثال بنانے کے لیے صدہا صدیوں پر حاوی ایک آفاقی نظام قائم کیا، اور پھر خود ہی فرمایا :-

لولاک لما خلقت الافلاک ؛

خلقِ عظیم

محمد صلاح الدین

انسان اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا شاہکار ہے، اسے احسن تقویم پر پیدا کیا گیا، اس کے جسدِ خاکی میں اس کے خالق نے خود اپنی رُوح پھونکی، اس کے وجود پر اپنی لامحدود صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ڈالا اور اسے مظہرِ صفاتِ الٰہی بنایا۔ اسے وُہ علم عطا کیا جو فرشتوں کو بھی حاصل نہ تھا، اسے اشرف المخلوقات قرار دے کر فرشتوں سے سجدہ کرایا اور ان سے عظمتِ آدم تسلیم کرائی گئی اسے جنت کی ناقابلِ تصور راحتوں اور نعمتوں سے نوازا گیا اور پھر زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی وسیع بزمِ کائنات سجا کر اور زمین کو کبھی نہ ختم ہونے والے سامانِ زیست کے خزانوں سے بھر کر اسے خلیفۃ اللہ کے عظیم منصب پر فائز کر کے یہاں بھیجا گیا۔ یہ عظمت و رفعت بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہے۔

اس گروہِ انسانی میں بعض نفوسِ قدسیہ کو خلافت کے علاوہ ایک اضافی اور خصوصی منصب نبوت کا عطا ہوا جس نے انھیں دوسرے لوگوں کی نسبت بلند تر درجے پر فائز کر دیا۔ اس خصوصی گروہِ انبیاءؑ میں اللہ تعالیٰ نے صرف ایک ہستی کو منتخب کر کے اسے خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین قرار دے کر اور وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم کی سند جاری کر کے ازل سے ابد تک آنے والے پُورے عالمِ انسانیت میں بلند ترین مقام پر فائز کر دیا، اس پر خود درود بھیجا، فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ اس عظیم ہستی پر مسلسل درود بھیجتے رہو، اور مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے بغیر تمھاری نماز مکمل ہوگی نہ قابلِ قبول، اور قیامت تک کے لیے اعلان کر دیا گیا کہ اب نسلِ انسانی میں سے جس کسی کو ہدایت و رہنمائی حاصل کرنی ہے وہ محمدؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرے اور ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف اسی نمونۂ کامل کی طرف دیکھے۔

حضورِ اکرمؐ کو یہ مقام و مرتبہ کیوں عطا ہوا؟ اس سوال پر غور کیا جائے اور قرآنِ کریم میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ حضورؐ نے کارِ نبوت کی تکمیل فرمائی ہے اور یہ کارِ نبوت تھا تکمیلِ اخلاق۔

انسان اپنے طبعی وجود میں دوسری ذی حیات مخلوق سے مختلف نہیں۔ اس کا جبلّی کردار حیوانات کے جبلّی کردار کی طرح خود کار اور احتیاجات، جذبات و عواطف اور احساسات و میلانات کے لحاظ سے یکساں ہے، اسے جو چیز حیوانات کی سطح سے اُوپر اٹھاتی اور اشرف المخلوقات کی بلندی تک پہنچاتی ہے وہ اس کا اخلاقی کردار ہے۔ انبیاءِ کرام اسی اخلاقی کردار کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھیجے گئے، کتابیں اسی مقصد کے لیے اتاری گئیں، حکمت اور میزان (شعورِ خیر و شر) کا نزول اسی غرض سے ہوا، انسان نے اخلاق کا پہلا درس خود اپنے خالق و مالک سے حاصل کیا۔ تخلیقِ آدم کے بعد تعلیمِ آدم کا ذکر کرتے ہوئے

فرمایا گیا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (بقرہ : ۳۱)

اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔

یہاں نام سکھانے کے مفہوم میں اشیائ کے خواص، نافع و مضر پہلو، استعمال کے طریقے اور ان کے ساتھ انسان کے تعلق و رویہ کی نوعیت سب شامل ہیں اور لفظ كُلَّهَا سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ علم کامل تھا، ادھورا نہیں۔ انسان کو اس دنیا میں زندگی کے آغاز کے لیے اور بحیثیت خلیفہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے جتنے علم کی ضرورت تھی وہ العلیم نے اپنے لامحدود علم سے بقدرِ ضرورت اسے مہیا کر دیا۔ گویا جو انسان کا خالق ہے، وہی اس کا معلّم اوّل بھی ہے اور پھر اس کی بارگاہ سے علم و اخلاق کا خزانہ لے کر اس دنیا میں جو پہلا انسان بھیجا گیا وہ یہاں اپنی اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت پر مامور کر کے انسانیت کا معلم اوّل بنایا گیا۔ اس کے بعد جتنے انبیاء انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے وہ درحقیقت سب کے سب معلمِ اخلاق ہی تھے۔ حضورِ اکرمؐ نے اپنے مشن کی وضاحت خود ان الفاظ میں بیان فرمائی:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا۔

مجھے معلّم بنا کر بھیجا گیا۔

اور پھر اس معلمِ انسانیت نے اپنی تعلیم کا اصل مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔

میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

ان دونوں احادیث کو باہم مربوط کر کے دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ علم کا اصل مقصود اخلاق ہے۔ اخلاق مطلوب ہے اور علم اس کا ذریعہ۔ معلّم کا کام محض انتقالِ علم نہیں، تشکیلِ اخلاق ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ کسی بھی کام کی تکمیل کے لیے خود اس میں کامل ہونا ایک لازمی شرط ہے۔ کمال کے بغیر تکمیل کا تصور محال ہے۔ حضورِ اکرمؐ کو یہ کمال کس درجہ میں حاصل تھا اس کا اندازہ خالقِ کمال کی جاری کردہ اس سند سے ہو جاتا ہے کہ:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (القلم : ۴)

اور بے شک اے محمدؐ! تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو۔

یہ اخلاق، جس کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہونے کی سند جاری کی جا رہی ہے، ہے کیا شَے؟ علم و عمل کی مکمل یکجائی اور قول و فعل کی ایسی کامل ہم آہنگی جس میں علم کا عمل سے اور قول کا فعل سے کوئی فاصلہ نہ ہو۔ خارجی اعمال کا قلب و ضمیر کی داخلی زندگی سے کہیں ٹکراؤ نہ ہو۔ شخصیت مربوط و منظم ہو، منتشر اور منقسم نہ ہو۔

اس نوعیت کی اخلاقی زندگی کے لیے علم کا درست ہونا ضروری ہے۔ اگر علم کی بجائے کوئی شخصیت محض ظن و گمان پر مبنی جہل کو اپنے اعمال کی بنیاد بنا بیٹھے اور اس کے اندر قول و فعل کی یکجائی بھی موجود ہو تو ہم اس کے کردار کو اخلاقی کردار قرار

نہیں دے سکتے کیونکہ قول بجائے خود ناقص اور جہل پر مبنی ہے، اس سے مربوط و منسلک اعمال اخلاق کا مظہر نہیں ہو سکتے اور نہ معیارِ اخلاق بن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جو اخلاقی کردار مطلوب ہے وہ اسی علم پر مبنی ہونا چاہیے جو خود اس کا عطا کردہ ہے، جسے وہ علم قرار دے وہی علم ہے اور جسے وہ جہل قرار دے وہ سراسر جہل ہے۔

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ تکمیلِ اخلاق سے کیا مراد ہے؟ کیا سابق انبیاؑ تعمیرِ اخلاق کے مشن میں ناکام رہے تھے؟ کیا ان کا اپنا اخلاقی کردار کاملیت کے درجے پر پورا نہیں اترتا تھا؟ معاذ اللہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ قرآن تو تمام انبیاؑ کو نہ صرف کامیاب قرار دیتا ہے بلکہ ان کے درمیان فرق قایم کرنے کی ممانعت کرتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ (بقرہ : ۲۸۵)

ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔

جب انبیاؑ کے درمیان کوئی فرق نہیں تو پھر خلقِ عظیم کی سند جاری کر کے یہ فرق کیوں قایم کیا گیا ہے؟ کیا نعوذ باللہ پچھلے انبیاؑ اخلاق کے معاملہ میں کسی بھی درجے میں کمزور تھے؟ قرآن تو انھیں اپنے دور کا بہترین انسان قرار دیتا ہے، پھر اس فرق کی اصل حقیقت کیا ہے؟

اس فرق کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ہمارا مروجہ نظامِ تعلیم پرائمری کی ابتدائی جماعتوں سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ سطح تک مختلف درجات میں عموداً پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مختلف درجات میں تعلیم دینے والے معلّمین اپنی اپنی جگہ علم اور اخلاق کے لحاظ سے بہترین کردار کے مالک ہیں۔ ان سب کی تعلیم اور طریقۂ کار بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ جو حقائق ابتدائی جماعتوں میں بچوں کے فہم و شعور کی سطح کے مطابق ذہن نشین کرائے جاتے ہیں وہی اگلی جماعتوں میں علم کی وسعت اور شعور کی بلوغت کے لحاظ سے بتدریج پھیلتے اور واضح ہوتے جاتے ہیں۔ نظامِ اخلاق جن اقدار و عقاید پر مشتمل ہے وہی آخری درجات تک سیرت و کردار کی تشکیل کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ تعلیم کے کسی بھی مرحلے پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ معلّم نے کسی بھی درجے میں ضروری علم پہنچانے اور اخلاقی تربیت دینے میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ ہم کسی بھی درجے کے معلّم کو کمتر قرار نہیں دے سکتے کیونکہ وہ سب تعلیم و تربیت ہی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ لیکن ہم یونیورسٹی کی سطح پر تحقیق و تکمیل کے اس مرحلے سے قبل کسی بھی درجے کی تعلیم کو مکمل نہیں کہہ سکتے جو متعلم کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ اب وہ رسمی تعلیم کے تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر خود اپنی صلاحیت اور مطالعہ و تحقیق کے بل پر سلسلۂ تعلیم تاحیات جاری رکھ سکے۔

یہی صورت اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ تعلیم و تربیت میں نظر آتی ہے جو انسان کو ایک اخلاقی وجود بنانے کے لیے مرتب کیا گیا۔ حضرت آدمؑ کو انسانیت کے عہدِ شیر خوارگی میں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے جس مقدار علم کی ضرورت تھی وہ انھیں ان کے رب نے مہیا کر دی۔ انھیں زندگی کے بنیادی حقائق، اس کے مقصد اور معروف و منکر کی صورت میں اخلاقی اقدار سے آگاہ کر دیا گیا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انسانیت کو اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع دنیا کو اسی عہدِ شیر خوارگی تک محدود نہیں رہنا تھا۔ نمو اور ارتقا کا سلسلہ جاری رہا۔ انسانیت اپنے عہدِ طفولیت اور بلوغت کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ علم و شعور کی بڑھتی ہوئی روشنی اور خدا کی بخشی ہوئی مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کے ذریعہ وہ اپنی دنیا کی تعمیرِ نو

کرتی گئی۔ ارتقا کے مختلف درجات میں اسے نت نئے اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ان مختلف درجات میں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے اضافی علم کے ساتھ انبیأ مبعوث کیے جاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی ضرورت کے مطابق اسے علم و رہنمائی فراہم کرتا رہا۔ یُوں انسانیت اپنی تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی تکمیلِ تعلیم اور پختگیِ شعور کی اس سطح تک پہنچی جہاں آکر اعلان کر دیا گیا کہ :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ : ۳)

آج ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

گویا ایک طرف آخری معلّم کو خلقِ عظیم کی سند جاری کر کے اس کے مشن کی تکمیل پر اظہارِ اطمینان کیا گیا اور دوسری طرف متعلم یعنی انسان کو اس تعلیم کی تکمیل پر سندِ فراغت جاری کر دی گئی جس کا آغاز حضرت آدمؑ کے ابتدائی مدرسۂ تعلیم سے ہوا تھا۔ دین کی یہ نعمت جزواً جزواً مختلف انبیأ کے ذریعہ اتاری گئی اور نبی آخرالزماں پر اس کو مکمل کر دیا گیا۔ اسلام کا جو کامل و اکمل نقشۂ حیات حضورؐ کے دور میں جلوہ گر ہوا اسے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے سندِ قبولیت عطا کر دی گئی۔ اس تکمیلِ دین کا اصل مقصود چونکہ تکمیلِ اخلاق تھا اور حضورِ اکرمؐ کو اسی کی خاطر مبعوث کیا گیا تھا اس لیے اپنی ذات میں اور اپنے زیرِ تعلیم انسانی گروہ میں اسے درجۂ کمال تک پہنچانے کی بنا پر آپ کو یہ سندِ فضیلت بھی جاری کر دی گئی کہ :

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم : ۴)

اور بے شک اے محمدؐ ! آپ اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔

اور پھر آپ کو رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین قرار دے کر قیامت تک آنے والے ہر زمانے کے لیے ہادی و رہنما بنا کر سلسلۂ وحی منقطع اور مدرسۂ نبوت بند کر دیا گیا اور ہمیشہ کے لیے طے کر دیا گیا کہ اب جس کسی کو اخلاق کے بلند مرتبے پر فائز ہونا ہے وہ اسی نمونہ کامل کا اتباع کرے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ (احزاب : ۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین نمونہ ہے۔

وہ علم و اخلاق جو حضرت آدمؑ کے کنبے سے شروع ہوا تھا، ان کی نسل کو ایک مخصوص زمانے، ایک مخصوص علاقے اور ایک مخصوص قوم کے محدود دائروں میں منتقل ہوتا اور پھیلتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور حضرت محمدؐ کے عہدِ مسعود میں پُوری انسانیت، پُورے کرۂ ارض اور آنے والے ہر زمانے پر محیط ہو گیا۔

اب ایک اور پہلو پر غور فرمائیے۔ علم کا مقصود تھا اخلاق، لیکن اخلاق کیا بجائے خود مقصود تھا؟ اس کی غایت اولیٰ ہے؛ انسان کو اخلاق کی ضرورت کیوں ہے؟ کیا اس کے بغیر وُہ اپنی جبلّی قوتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا؟

اس کا جواب بھی خالقِ کائنات سے سُن لیجئے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

(الحدید : ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسانی معاشرہ عدل پر قائم ہو جائے۔

گویا رسولوں، کتابوں اور معیارِ خیر و شر کی میزان شعور، ان سب کے نزول کا واحد مقصد انسانی معاشرہ کو عدل پر قائم کر دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کا نظام عدل پر استوار کیا ہوا ہے۔ وہ انسان کی اپنی دنیا کو بھی اسی عدل پر استوار دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کی تنظیم و تشکیل کا کام اس نے اپنے خلیفہ ہی کے ذمّہ رکھا ہے۔ البتہ اس ذمہ داری کی تکمیل کے لیے اس نے انسان کی تعلیم و تربیت کا پورا اہتمام کیا۔ نبی بھیجے، ان پر کتابیں اتاریں، انھیں حکمت اور میزان کی دولت سے نوازا گیا اور معلّم بنا کر انسانیت کی اخلاقی تربیت پر مامور کیا گیا۔ یہ سارا اہتمام کس لیے ہے؟ انسانی معاشرے کو عدل پر قائم کرنے کے لیے۔ اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے تو صورت یہ بنتی ہے کہ علم ذریعہ ہے تشکیلِ اخلاق کا۔ اور اخلاق ذریعہ ہے قیامِ عدل کا، عدل کا وجود اخلاق کے بغیر اور اخلاق کا وجود علم کے بغیر محال ہے اور اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں علم ہوگا وہاں اخلاق ہوگا۔ جہاں اخلاق ہوگا وہاں لازماً عدل کی حکمرانی ہوگی۔ عدل سے عاری معاشرہ اخلاق کے وجود سے خالی ہے اور اخلاق سے تہی دامن معاشرہ علم سے بے بہرہ ہے۔ زندگی کی مادی آسائشیں مہیا کرنے والا علم بھی بلاشبہ علم ہے لیکن اسلام حقیقی علم صرف اسی کو تسلیم کرتا ہے جو وسائلِ حیات کو عدل کے تقاضوں کے مطابق تمام انسانوں کے لیے باعثِ راحت و آسائش بنا سکے۔ یہ علم موجود نہیں تو ایک کا عیش لاکھوں کے لیے جہنم کی بھٹی دہکا دینے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ علم جو لیقوم الناس بالقسط کی شرط پوری نہ کرتا ہو جہل ہے، عذاب ہے، شیطنت ہے، آتشِ نمرود ہے، دولتِ قارون ہے، فراستِ ہامان ہے، رعونتِ فرعون ہے، اور انسانیت کے لیے زہر ہے۔ علم کا اخلاق سے اور اخلاق کا عدل سے جو رشتہ ہے اسے سمجھ لینے کے بعد یہ حقیقت از خود واضح ہو جاتی ہے حضورِ اکرمؐ کو خلقِ عظیم کی سند جاری کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ نے مقصودِ اخلاق پا لیا یعنی انسانی معاشرہ کو عدل پر قائم کر دیا۔ آپؐ نے اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو کر عدل کو اس کے معیارِ مطلوب پر پہنچا دیا۔ اخلاق اور عدل بلندی کی جانب متوازی اور منفصل خطوط کی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ انسان اخلاقی لحاظ سے جتنا بلند ہوگا عین اسی نسبت سے عادل و منصف بھی ہوگا۔ بے اخلاق عادل نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ اخلاق کے جس بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں اسی مرتبے پر وہ بحیثیت عادل بھی فائز ہیں۔

خلقِ عظیم کی سند کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے جس سورت میں یہ سند جاری کی ہے اس کا عنوان ہے "القلم"۔ اس کی ابتدائی آیات ملاحظہ ہوں :

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا

غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝

ن ۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں (قرآن) تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں اور بے شک تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو۔

غور فرمایئے، اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہونے کی سند جاری کرنے سے قبل قسم کس چیز کی کھائی جا رہی ہے؟ قلم کی' اور اس سے تحریر ہونے والے حروف و الفاظ کی یعنی ذرائع علم کی۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی جانب کہ قلم اور کتاب کا اخلاق سے کیا تعلق ہے قلم و کتاب کے تقدس اور اخلاق سے ان کے تعلق کی وضاحت کے لیے اس سے حسین پیرایۂ اظہار دنیا کے لٹریچر میں ملنا محال ہے۔ قلم اور کتاب کی قسم کھا کر اخلاق کی سند جاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ جس علم کے حوالے سے اپنی دعوت پیش کر رہے ہیں وہ کفار و مشرکین کے بہتان کے مطابق کوئی مجذوب کی بڑ یا مجذوب کی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ قلم و کتاب سے تعلق رکھنے والا علم ہے۔ یہ وہی علم ہے جو پہلے نبی اُمّی حضرت آدمؑ کو عطا کیا گیا تھا اور اب آخری نبی اُمّی حضرت محمدؐ کو بخشا گیا ہے۔ یہ ظن و گمان پر مبنی نہیں، لوحِ محفوظ سے منتقل کیا جانے والا علم ہے۔ کفار و مشرکین علم کا جو تصوّر اپنے ذہن میں بٹھائے ہوئے تھے اس میں چونکہ قلم اور کتاب کے رسمی ذرائع کو بڑی اہمیت حاصل تھی اس لیے ان دونوں چیزوں کی قسم کھا کر ان کے اس الزام کی پُر زور تردید کی جا رہی ہے کہ محمدؐ نے کبھی قلم ہاتھ میں پکڑا نہ کسی سے کتاب پڑھا سیکھا اس لیے وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ ان کے دماغ کی اختراع ہے، کاتبینِ وحی کے ہاتھوں اس علم کا قلم سے تحریر ہونا اس الزام کی تردید کے لیے چونکہ سب سے بڑا ثبوت تھا اس لیے اللہ نے انہی دو چیزوں کی قسم کھا کر کفّار کا منہ بند کیا اور اپنے نبی کو اطمینان دلایا کہ تم ان کی الزام تراشیوں سے دل شکستہ نہ ہو، تمہارے صاحبِ علم ہونے کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ تم اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہو۔ یہ مرتبہ علم کے بغیر نہیں مل سکتا۔ کفّار و مشرکین کی بدگوئی، ایذا رسانی اور طعنہ زنی کے مقابلے میں تم جس صبر و تحمل اور استقامت کے ساتھ اپنی دعوت کا کام انجام دے رہے ہو وہ تمہارے اخلاق کی بلندی کی واضح علامت ہے۔

حضورِ اکرمؐ کو واقعات کے جس تناظر میں خُلقِ عظیم کی یہ سند جاری کی جا رہی ہے اس سے اسلام کا وہ تصوّرِ اخلاق بھی واضح ہو جاتا ہے جو بدقسمتی سے بعد میں اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ ہمارے سامنے نہ رہ سکا اور اس کی جگہ ایک ایسا تصوّرِ اخلاق رواج پا گیا جس کی سب سے بڑی خصوصیت منافقت ہے۔ داخلی شخصیت سے جُدا ایک ملمع کی طرح چڑھا ہوا مزاظاہر دار بیگ والا خارجی کردار اخلاق کی علامت بن گیا۔ یہ معرکہ حق و باطل میں انبیاءِ کرام اور ان کے سچے پیروکاروں کا جوہرِ کردار اور قوتِ کردار تھا، ان کے اندر جرأت و بیباکی، عزیمت و استقامت اور اپنے دَور کی بڑی سے بڑی جابر و قاہر قوت کو پرِکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ دینے کے عزم و حوصلہ کی صفات اسی اخلاق کی بنیاد پر استوار تھیں لیکن اب ایسے لوگوں کو "صاحبِ اخلاق" سمجھا جانے لگا جو نہایت دبو، مریل، مرنجان مرنج، حق و باطل کی ہر کش مکش سے گریزاں، عافیت پسند، مصلحت اور مصالحت کے اصول پر کاربند، ہر طاقتور کے سامنے سربسجود، ہر زور آور کے سامنے دست بستہ اور

ہر قوت کے سامنے سپر انداز ہوں، جو کڑھتے ہوئے دل کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ کے پھول سجا لینے کا فن جانتے ہوں۔ جن کا دل لعنت بھیجے اور زبان قصیدہ پڑھنے میں بیک وقت مصروف رہ سکیں، جو اندیشۂ سُود و زیاں میں ہر وقت لرزتے کانپتے اور ہر لمحہ موجود سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے زندگی کے دن کاٹ رہے ہوں۔ ان کی عاجزی اور انکساری جو درحقیقت ان کی بُزدلی اور پست ہمتی کی علامت ہوتی ہے، علامت اخلاق بن جاتی ہے۔

اسلام اس "اخلاق" کے لیے منافقت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اخلاق اس صفت کا نام ہے جہاں زبان دل کی رفیق ہو، اسی لیے کلمۂ طیبہ کو محض زبان سے ادا کر لینے پر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ قبولِ اسلام کے لیے تصدیق بالقلب ایک لازمی شرط ہے۔ حضور اکرمؐ کے زمانہ میں عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں کا پورا گروہ اسی بنا پر منافق قرار پایا تھا کہ وہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتا تھا اور تمام ظاہری اعمال کی بجا آوری میں بھی بڑا مستعد تھا۔ لیکن اس کا دل ایمان سے خالی تھا۔ اس کا کردار وحدتِ فکر و عمل کی بجائے عقاید و اعمال کی ثنویت پر مبنی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فکر و عمل کی کامل وحدت رکھنے والے کردار کو "خلقِ عظیم" قرار دیا اور عبداللہ بن ابی کے گروہ کو اس کے داخلی اور خارجی کردار کے تضاد کی بنا پر "منافق" ٹھہرایا۔ دنیا میں کون ہے جو صداقت، دیانت، امانت، عدل، احسان، رحم دلی، ایثار، عفو و درگزر، حلم، بُردباری، تواضع، استغنا، اعتدال، استقامت، شجاعت، شرم و حیا اور پابندیِ عہد وغیرہ کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کا قدردان و علمبردار نہ ہو یا کم از کم ان خوبیوں کے معروف ہونے کا معترف نہ ہو اور جھوٹ، خیانت، ناانصافی، ظلم، غیبت، بدگوئی، فریب دہی، عہد شکنی، مفاد پرستی، حرص و طمع، فحاشی و بدکاری، ریاکاری، بزدلی، بخل اور دوسری برائیوں کو منکر و مذموم نہ سمجھتا ہو لیکن اصل مسئلہ معروف کو جزوِ زندگی بنانے اور منکر سے نجات پانے کی عملی آزمائش کا ہے۔ دُنیا میں اس کا کوئی جامع اور کامل نمونہ موجود ہے تو صرف ایک ہی ہے —— محمدؐ کا اسوۂ حسنہ، اور اس اسوۂ حسنہ کے خلقِ عظیم ہونے کا مطلب ہے معروف میں کامل اور منکر سے یکسر پاک شخصیت۔ معروف کو پھیلانے، نافذ کرنے اور منکر کو مٹانے والا ایسا کردار جس کے اندر تضادات کی کسی ادنیٰ سی علامت کا وجود ناممکن بلکہ اس کا تصور تک محال ہے۔ اس نے مساوات کا درس دیا تو غلام آقا بن گئے اور آقا ان کے خادم، اس نے اخوت کا پیغام دیا تو مدینہ میں اجنبی سگے بھائیوں سے بڑھ گئے، ان کی خاطر بیویوں کو طلاق دے کر ان کے گھر بسائے گئے۔ گھر کے برتن، کپڑے، مویشی، کھیت اور کھیتوں کی فصلیں سب تقسیم ہو گئے۔ جس نے یہ تعلیم دی تھی اس نے اپنا کوئی گھر نہ بسایا، خدا کے گھر مسجد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس کے پاس کبھی دو وقت کی خوراک جمع نہ ہونے پائی۔ اس نے دنیا کے خزانے لٹائے مگر دنیا کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے گھر میں دو مٹھی جَو موجود نہ تھے۔ ہے دنیا میں اس کا کوئی مثل؟ اخوت اور مساوات کے نعرے دُوسروں نے بھی لگائے اور بڑے زور شور سے لگائے، مگر اقتدار کی باگیں ان کے ہاتھ میں آئیں تو ان کے اسبابِ عیش سے آراستہ بلند و بالا محلات زار کے محل پر بازی لے گئے۔ ان کی قبروں تک کے لیے ایسی وسیع اور عظیم الشّان عمارتیں تیار کی گئیں جن کا تصور بادشاہوں کے ہاں ناپید تھا۔ ان کے ٹھاٹ باٹ نے افسانوی شہزادوں اور شہنشاہوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ محمدؐ نے اپنے ہمعصر شاہانِ روم و ایران اور مصر و شام کے مقابلے میں جیسی سادہ زندگی بسر کی اس کا موازنہ آج کے نام نہاد عوامی رہنماؤں، مساوات کے علمبردار اشتراکی آمروں اور ان کے ہمعصر بادشاہوں سے کیجئے۔ "اخلاق" کے معنی آپ پر

خود بخود واضح ہو جائیں گے اور یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ از آدم تا ایں دم پُوری نسلِ انسانی میں "خلقِ عظیم" کی سند صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیوں جاری کی گئی ہے اور کوئی دُوسرا کیوں اس اعزاز کا سزاوار نہ بن سکا۔

اور اب آخری بات ——— خلقِ عظیم ہونے کا بالکل فطری اور منطقی مفہوم یہ ہے کہ انسانیت کو اس کا خالق جس درجہ کمال پر پہنچانا چاہتا تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جلوہ گر ہو گیا، اب قیامت تک نہ کوئی اس درجہ کمال کو پہنچے گا، نہ لائق اتباع ٹھہرے گا۔ ہر آنے والے کو، خواہ وہ مہدی ہو یا مسیح موعود، محمدؐ کی اتباع کرنی ہو گی، اب نہ کسی کی شریعت چلے گی، نہ کوئی غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری کا مرکز بنے گا، نہ کسی پر وحی نازل ہو گی، نہ کتاب، حکمت اور میزان اُترے گی کیونکہ ان سب کے نزول کا مقصد اسوہ حسنہ اور خلقِ عظیم کی صورت میں پُورا ہو گیا۔ اب کوئی نیا نبی آکر کیا کرے گا، کیا وہ انسان کے اخلاق کو اس حد سے آگے لے جا سکے گا جہاں محمدؐ اسے چھوڑ گئے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر نئے نبی کی ضرورت کیا ہے؟ محمدؐ کے بعد نبوت کا ہر دعویدار جھوٹا، مکّار اور فریبی ہے ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین

(۲۱ : ۱۰۷)

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

اس آیت مبارکہ کو زیبِ عنوان کرتے ہی مجھے خیال آیا قرآن مجید دیکھنا چاہیے کہ للعالمین[1] کا لفظ کن کن اشیاء یا اشخاص کے متعلق آیا ہے۔ مجھے مندرجہ ذیل آیات میں یہ لفظ ملا:

۱۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ۔ (۶ : ۹۰)

۲۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۱۲ : ۱۰۴) (۳۸ : ۸۷) (۶۸ : ۲۷)

۳۔ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۶۸ : ۵۲)

۴۔ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱ : ۷۱)

۵۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ
مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۳ : ۹۶)

۶۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَ
جَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۹ : ۱۵)

۷۔ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱ : ۹۱)

۸۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۔

آیاتِ بالا پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آیت نمبر ۱، ۲، ۳ میں قرآن مجید کو ذکرٌ للعالمین فرمایا گیا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے جو جملہ عالمین کے لیے "ذکر" ہے۔

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسم مبارک تو اس مصدر کے ساتھ مذکر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ۔ (۸۸ : ۲۱)

آیت نمبر ۴ و ۵ میں اللہ تعالیٰ نے لفظ برکت کا استعمال کیا ہے۔ آیت نمبر ۴ بیت المقدس کے لیے ہے اور آیت نمبر ۵ بیت الحرام کے لیے۔ مسلمان ان دونوں مسجدوں کو اسی ادب و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں جو کلامِ الٰہی میں ان کے لیے ظاہر فرمائے گئے ہیں اور چونکہ لفظ برکت ہر دو کے لیے مشترک ہے اور لفظ ھُدًی بیت الحرام کے لیے خاص اور زائد ہے، اس لیے بیت الحرام کا درجہ بھی بیت المقدس سے زیادہ تسلیم شدہ ہے۔

آیات نمبر ۶، ۷، ۸ میں لفظ آیت کا استعمال ہوا ہے اور اس کا مصداق ان مختلف آیات میں مقصود ہے۔

---

[1] للعٰلمین بعض اور آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (ادارہ)

آیت نمبر ۶ میں حضرت نوحؑ کی کشتی کو یا اہل کشتی کو آیت فرمایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۷ میں حضرت مریم اور ان کے فرزند کو آیت بتایا گیا ہے۔

آیت نمبر ۸ میں نوعِ انسانی کی مختلف زبانوں اور متلون رنگتوں کے اختلاف کو آیت بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ صرف قرآن مجید ہے۔

مُبَارَكٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ بیت المقدس و بیت الحرام ہیں۔

اٰیٰتٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ اصحابِ نوح اور کشتیِ نوح اور حضرت مریم و حضرت ابن مریم اور اقوام عالم کا اختلاف الوان اور تباین السنہ ہیں۔

اور لفظ رحمت ایسا لفظ ہے جس کا استعمال نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہی کے لیے ہوا۔ حضور کے سوا کسی دوسرے کے لیے نہیں ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ۔ (اعراف) میری رحمت ہر ایک سے زیادہ وسیع ہے۔

پس جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ عالمین کے لیے رحمت بنایا گیا ہے تو ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت بھی جملہ عالمین کے لیے ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رحمۃ للعالمین وہی وجود متبرک ٹھہرے گا۔

جس کے اہلِ عالم بلکہ عالم در عالم کی بہبود و سود، رفاہ و فلاح، خیر و صلاح، عروج و ارتقا، صفا و بہا کے لیے بلا شائبہ غرض اور بلا آمیزشِ طمع اپنی مقدس زندگی کو صرف کیا ہو۔

جس نے بندوں کو خدا سے ملایا ہو۔

جس نے الٰہی جلوہ انسانوں کو دکھایا ہو۔

جس نے دل کو پاک، رُوح کو روشن، دماغ کو درست، طبع کو ہموار بنایا ہو۔

جس کی تعلیم نے امنِ عامہ کو مستحکم اور مصلحتِ عامہ کو استوار کیا ہو۔

جو غریبی و امیری، جوانی و پیری، امن اور جنگ، امید اور ترنگ، گدائی و پادشاہی، مستی و پارسائی، رنج و راحت، حزن و مسرت کے ہر درجہ، ہر پایہ اور ہر مقام پر انسان کی رہبری کرتا ہو۔

جس نے فلک کی بلندی، زمین کی پستی، رات کی تاریکی، دن کی روشنی، سورج کی چمک، جگنو کی دمک، ذرہ کی پرواز، قطرہ کی طراوت میں عرفانِ ربانی کی سیر کرائی ہو۔

جس کی تعلیم نے درندوں کو چوپانی، بھیڑیوں کو گلہ بانی، رہزنوں کو جہاں بانی، غلاموں کو سلطانی، شاہوں کو اخوانی سکھائی ہو۔

جس نے خشک میدانوں میں علم و معرفت کے دریا بہائے ہوں۔

جس نے سنگلاخ زمینوں سے کتاب و حکمت کے چشمے چلائے ہوں۔

جس نے خود غرضوں کو محبت قومی کا دردمند بنایا ہو۔
جس نے دشمنوں کو اپنا جگر بند ٹھہرایا ہو۔

وہؐ ——— غریب کا محب	مسکین کا ساتھی
شاہوں کا تاج	آقاؤں کا آقا
غلاموں کا محسن	یتیموں کا سہارا
بے آسروں کا آسرا	بے خانمانوں کا ماوٰی
دردمندوں کی دوا	چارہ گروں کا دردمند
مساوات کا حامی	اخوت کا بانی
محبت کا جوہری	اخلاص مشتری
صدق کا منبع	صبر کا معدن
خاکساری کا نمونہ	رحمتِ ربانی کا پتلا
اوّلین انسان	آخرین رسولؐ

اگر رحمۃ للعلمین کے لقب سے ملقب نہ ہوگا تو پھر ان جملہ صفات کے جامع کا اور کیا نام ہوگا؟

ہاں رحمۃ للعلمین وہی ہے جس نے ملکوں کی دُوری، اقوام کی بیگانگی، رنگتوں کا اختلاف، زبانوں کا تباین دُور کر کے سب کے دلوں میں ایک ہی ولولہ، سب کے دماغوں میں ایک ہی تصوّر، سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری کر دیا ہو۔

ہاں رحمۃ للعلمین وہی ہے جو یہودیوں کی طرح نذر و منت کی قبولیت کے واسطے نبی لاوی کا واسطہ ضروری نہیں ٹھہراتا۔

جو کاتھلوں کی طرح آسمان کی کنجیاں شخصِ واحد کے ہاتھ میں سپرد نہیں کر دیتا۔

جو، روح کو سرگ یا نرگ میں دھکیل دینے کی طاقت صرف برہمنوں ہی کو عطا نہیں کرتا۔

جو، خاص رقبہ کے باشندوں کو آسمانی یا دشاہت کے فرزند نہیں ٹھہراتا۔

جو، نسلِ واحد کے افراد ہی کو خدا کی برگزیدہ قوم نہیں قرار دیتا۔

جو، یہودیوں، عیسائیوں، زردشتیوں، برہمنوں، جینیوں اور لاماؤں کی طرح اپنے سوا باقی سب پر رحمت و افضال کے بھرپور خزانے بند نہیں کرتا۔

ہاں رحمۃ للعلمین وہی ہے جو بندہ کو خدا کی حضوری تک لے جاتا اور اسے ادعونی استجب لکم کی قدسی آواز سے آشنا بناتا ہے اور خدا و بندہ کے درمیان کسی تیسرے کے لیے کوئی رخنہ باقی نہیں چھوڑتا۔

ہاں رحمۃ للعلمین وہی ہے جس کے دربار میں:

عداسں نینوائی، بلال حبشی، سلمان فارسی، صہیب رومی، ضماد ازدی، طفیل دوسی، ذوالکلاع حمیری، عدی طائی،

اثامہ نجدی، ابوسفیان اُموی، ابوذر غفاری، ابوعامر اشعری، کرز فہری، ابوحارث مصطلقی، سُراقہ مُدلجی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے ہیں اتنی قوموں اور اتنے مختلف الدعاوی سرداروں کا مجمع کسی اور جگہ بھی نظر آتا ہے!

یہاں ہر شخص اپنے اپنے ملک اور اپنی قوم کا حق وکالت ادا کر رہا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے دامانِ دل کی وسعت کے موافق پھولوں سے جھولیاں بھر رہا ہے اور اپنے اپنے ملک کے مشامِ جان کو ان سے معطر کر رہا ہے۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے، جس کے دربار میں عثمان طلحہ بھی موجود ہے جو کعبہ کا کلید بردار ہونے سے حجازی قوموں میں اسی اعزاز کا مالک سمجھا جاتا تھا جو عزت کلیسائے روما کے مسند نشین کو آسمان کے کلید بردار ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔

اُس کے دربار میں عبد اللہ بن سلام بھی موجود ہے۔ نسب عالی کے سلسلہ کو دیکھو تو یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تک منتہی ہوتا ہے۔ قومی وجاہت پر نظر کرو تو یہودان بنو قریظہ و بنو قینقاع و بنو نضیر و خیبر و فدک کا بچہ بچہ انھیں خیرنا و ابن خیرنا کہہ کر یاد کرتا ہے۔

فضیلتِ علمی اور امامت قوم کی بزرگی کا اندازہ کرنا ہو تو سُن لو کہ ربیون اور احبار تک سیدنا و ابن سیدنا کہہ کر ان کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہی بزرگوار دربارِ محمدی کے صفِ نعال میں جاگزین ہے اور دل ہی دل میں یہ کہہ کر خوش ہو رہا ہے: ؏

تیری مجلس میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

اسی دربار میں صرمہ ابن انس بھی حاضر ہے۔ صُحفِ انبیا کا عالم ہے۔ سوریا اور یروشلم کے متواتر سفر کر چکا ہے۔ توراۃ و انجیل کو قدیم زبانوں میں پڑھا ہے۔ دربار ہرقل میں اس کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے اور دربار حبش میں اس کی کرامتوں کا خوب چرچا ہے عیسائیانِ حجاز کا گویا سب سے بڑا بشپ یہی ہے اب وہی مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ کو بار بار پڑھ رہا ہے اور توحیدِ خالص کی لذت میں مستغرق ہے۔

اسی دربار میں سلمان بھی موجود ہے۔ فارس کے بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا ہے جو زرتشتی مذہب چھوڑ کر کاتھولکی عیسائی بنا، پھر اطمینانِ قلب نہ پا کر دینِ حقہ کی طلب میں ایران سے شام، شام سے عراق، عراق سے حجاز پہنچا تھا۔ اب تو دل و جان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کا فرش بنا چکا ہے۔ کوئی شخص اگر ان سے باپ دادا کا نام پوچھتا ہے تو فرما دیتے ہیں سلمان بن اسلام بن اسلام بن اسلام سبعین مرۃ اسی طرح ستر بار کہتے چلے جاؤ۔

اسی دربار میں خالد بن ولید بھی حاضر ہے۔ بُت پرستی کی تائید اور بُتوں کی حمایت میں شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھا چکا ہے اُحد میں اسلامی لشکر کو فاش شکست دے چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ فتح کا غرور اور غلبہ کا سرور اس کے ازدیادِ غفلت اور ترقی رعونت کا سبب بن جائے۔ لیکن رحمتِ عالم کی خاکساری نے اس فاتح کے دل کو بھی فتح کر لیا ہے، وہ خود ہی کھچا کھچا آتا ہے اور لات و عزیٰ کے توڑنے کی خدمت حاصل کرنے کی التجا کر رہا ہے۔

اسی دربار میں شاہِ حبش کا عریضہ پیش ہو رہا ہے، جو سلطنت چھوڑنے اور حاضر خدمت ہو جانے کی اجازت کا خواست گار ہے۔

اسی دربار میں ذوالبجادین موجود ہے جو گھر بار اہل و عیال چھوڑ کر آیا ہے۔ کمبل کا تہہ بند، کمل کرتہ، جس پر ببول کے کانٹوں سے

بخیہ گری کی ہے، زیبِ تن ہے۔ فرطِ شوق اور جوشِ انبساط سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ آج شاہ کج کلاہ سے اپنے آپ کو برتر سمجھ رہا ہے۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے جو یہودیوں جیسی مخذول و مقہور قوم کے ساتھ ان الفاظ میں معاہدہ کرتا ہے:

و - ان یہود بنی عوف امۃ مع المؤمنین۔	یہود بھی مسلمانوں کی طرح ایک قوم سمجھی جائے گی۔
ب - وان بینھم النصر علیٰ من حارب۔	جو کوئی ان سے لڑے مسلمان ان کو مدد دیں گے۔
ج - ان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم۔	مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات خیر اندیشی نفع رسانی نیکی کے ہوں گے۔
د - وان بطانۃ یہود کانفسھم۔	یہودیوں کے حلیف بھی اس معاہدہ میں اس کے ساتھ شامل ہیں
ہ - وانّ النصر للمظلوم[1]	مظلوم کی ہمیشہ مدد کی جائے گی۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو خراج گزار اور مفتوح عیسائیوں کے ساتھ ان الفاظ میں معاہدہ کرتا ہے:

۱ - لنجران جوار اللہ و ذمۃ محمد النبی علیٰ انفسھم وملّتھم وارضھم واموالھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم وتبعھم۔	اہلِ نجران کو خدا کی حفاظت اور محمد رسول اللہ کی ذمہ داری حاصل ہوگی۔ ان کی جان اور مذہب اور ملک اور اموال کے متعلق تمام موجودہ اشخاص اور غیر موجودہ اور ان کی قوم اور اُن کے پیرو اسی ذمہ داری میں شامل ہوں گے۔
۲ - وان لا یغیّروا لما کانوا علیہ۔	ان کی موجودہ حالت تبدیل نہیں کی جائے گی۔
۳ - ولا یغیر حق من حقوقھم۔	اُن کے حقوق میں سے کوئی حق بدلا نہ جائے گا۔
۴ - ولا یغیر کلما تحت ایدیھم من قلیل او کثیر[2]	اور جو کچھ تھوڑا بہت ان کے قبضہ میں ہے اس میں کوئی تغیّر نہ کیا جائے گا۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو کافروں کو بھی بآوازِ بلند سناتا ہے:

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ۔	تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو دین اور مذہب کے متعلق کل دُنیا کو یہ اصول سکھاتا ہے:

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔	دین کے معاملہ میں کسی پر بوجھ نہیں ہے۔ تحقیق ہدایت اور گمراہی میں ظاہر و باہر امتیاز ہوگیا ہے۔

پھر اسی سلسلہ میں اپنی حیثیت کو کُھلے لفظوں میں ظاہر کرتا ہے:

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ۔	رسول کا کام لوگوں کو احکامِ الٰہی کا سنا دینا ہے اور بس۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو تمام عالم سے نیکی اور عمدہ سلوک کی تعلیم اس طرح پر دیتا ہے:

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ	خدا تم کو لوگوں کے ساتھ نیکی اور اچھا سلوک کرنے سے

---

[1] سیرت ابنِ ہشام ج ۱ ص ۱۰۸ [2] فتوح البلدان بلاذری

فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ (۶۰ : ۸)

نہیں روکتا بلکہ خدا تو ایسے کام کرنے والوں سے محبت کرتا ہے لیکن یہ لوگ ایسے ہوں کہ انھوں نے دین کے لیے تم سے جنگ نہ کی ہو اور دین کے لیے تم کو وطن سے نہ نکالا ہو۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو دشمنوں کے ساتھ برتاؤ کے طریق کی اس طرح تعلیم دیتا ہے :

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۔ (فصلت ع ۵)

بدی کا بدلہ نیکی سے دو۔ پھر جس شخص کے ساتھ تمھاری عداوت ہے وُہ تمھارا اگرم جوش حامی بن جانے گا۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو معاملاتِ انصاف میں عداوت و نفرت کے تاثرات سے ہم کو علٰحدہ رہنے کا حکم دیتا ہے اور خالص انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے :

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔

(۵ : ۸)

کسی قوم سے مخالفت کا ہونا تمھیں انصاف کرنے کی طرف کھینچ نہ لے جائے، انصاف ہی کرو۔ یہی خدا شناسی سے قریب تر ہے اور تقوٰی اختیار کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

فرمایا :

وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔

(۵ : ۱۲)

قوم کی یہ مخالفت کہ انھوں نے تم کو مسجد الحرام سے روک دیا تھا۔ تم کو ادھر نہ لے جائے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو تم تو نیکی اور تقوٰی کے کاموں میں اُن کی مدد کرو اور گناہ و سرکشی کے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو۔ خدا سے ڈرتے رہو۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے جو شہادت واقعہ کے لیے لوگوں کو اس طرح تیار کرتا ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۔ (۵ : ۸)

اے ایمان والو! اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور انصاف کے ساتھ شہادت دیا کرو۔

انصاف کا وجود شہادت ہی پر قایم ہے، اس لیے شہادت کی بابت پھر ان الفاظ میں تعلیم دی گئی :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ قیام کرنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری گواہی خود تمھارے والدین کے خلاف یا اقرباء کے خلاف ہو امیر ہو یا غریب کہ روابیت یا رحم کے خیالات تمھیں آتے ہوں مگر یاد رکھو کہ خدا ان دونوں سے

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔

(۴ : ۱۲۵)

بڑھ کر ہے دیکھو ایسا نہ کرنا کہ سچی شہادت سے عدولی کردیا دبی زبان سے کوئی بات کہو گواہی سے ٹل ہی جاؤ یہ باتیں تو خواہش نفس پر چلنے کی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

ہاں رحمۃ للعٰلمین وہی ہے، جو ہر انسان کو اس کی بیوی کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(۳۰ : ۲۱)

خدا کے نشانوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمھاری بیویوں کو تمھاری جنس کا بنا دیا تاکہ تم اُن سے تسلّی پاؤ پھر تمھارے درمیان محبت اور پیار قایم کر دیا۔ سوچنے والوں کے لیے اس کے اندر بہت سے نشان ہیں۔

رحمۃ للعالمین وہی ہے، جس نے شوہر بیوی کے رشتہ کو اتنا پاک ٹھہرایا کہ بہشت میں جاتے وقت بھی اُس جوڑے کو ایک دُوسرے سے الگ نہ کیا بلکہ یُوں خبر دی :

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ۔

(۴۳ : ۷۰)

تم اور تمھاری بیویاں شادی و نشاط اور نعمت و شادمانی کے ساتھ جنّت میں چلے جاؤ۔

رحمۃ للعالمین وُہی ہے جو شوہر اور بیوی کے حقوق کی بابت یہ فیصلہ سناتا ہے :

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ۔

(۲ : ۲۲۸)

عورتوں کے حق شوہروں پر ویسے ہی ہیں جیسے شوہروں کے حق عورتوں پر۔

پھر سینارٹی کے متعلق یہ تعلیم فرماتا ہے :

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (۴ : ۳۴)

مرد غالب ہیں عورتوں پر بہ وجہ اس فضیلت کے جو خدا نے (پیدایش سے) ایک کو دوسرے پر دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر صرف کرتے ہیں۔

ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے جو ایک انسان کی جان کی قدر و قیمت ان الفاظ میں ظاہر فرماتا ہے :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔

(۵ : ۳۲)

اگر کسی شخص نے ایک انسان کو بھی قتل کر دیا (واجب القصاص اور مجرم اس سے الگ ہیں) گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی۔

رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو خونخوار لڑائیوں کو بند کرتا، حکمرانی کی آرزو یا توسیعِ ملک کی تمنّا یا غلبہ قوت کے اظہار یا جوشِ انتقام کے وفور کے

اصول پر لڑائی کرنے کو قطعاً ممنوع ٹھہراتا ہے۔ وُہ جنگ کو صرف مظلوم کی امداد کا آخری ذریعہ، عاجزوں، درماندوں، عورتوں، بچّوں کو ظالموں کے ہاتھ سے چھڑانے کا وسیلہ مذاہب مختلفہ اور ادیان متعددہ میں عدل و توازن قایم کرنے کا آخری حیلہ بتاتا ہے۔ دنیا کا رحم دل سے رحم دل شخص بھی اِن اصولوں کے لیے لڑائی کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا اور معمولی سمجھ کا انسان بھی ایسی لڑائی کو سراپا رحمت کہنے میں ذرا تامل نہیں کرسکتا۔ اب اصولِ بالا پر رحمۃ للعالمین کے بتائے ہوئے احکام کو سنو:

۱- اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (۲۲ : ۳۹-۴۰)

جن مسلمانوں سے قتال ہُوا، ان کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے کیونکہ وہ مظلوم تھے اور خدا ان کی نصرت پر قدرت رکھتا ہے یہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا کسی وجہ کے نکالے گئے ہیں صرف اس لیے کہ انھوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان لیا اگر (یہ اجازت دے کر) بعض لوگوں دشمنوں کو بعض لوگوں (مسلمانوں) کے ذریعہ سے روک نہ دیتا تب عیسائیوں کے گرجے یہودیوں کے معابد پارسیوں کے مندر مسلمانوں کی مسجدیں (جن میں خدا کا بہت نام لیا جاتا ہے) ضرور گرائی جاتیں۔

۲- وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (۴ : ۷۵)

تم خدا کی راہ میں اور ضعیف مردوں اور عورتوں اور بچّوں کے بچاؤ کے لیے کیوں جنگ نہیں کرتے، حالانکہ وُہ دُعائیں کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے باشندے بڑے ظالم ہیں۔

ان احکام سے واضح ہے کہ اسلام میں جنگ کو اختیار کیا گیا ہے تو نہ ملک گیری کے لیے، نہ ہوسِ حکمرانی کے لیے بلکہ ضعیفوں، عورتوں، بچّوں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دینے کے لیے جنگ کو اختیار کیا گیا تھا، نہ تلوار کا خوف دلا کر کلمۂ اسلام پڑھوانے کے لیے، بلکہ یہودیوں، عیسائیوں، ترساؤں کے معابد کو حفاظت و حمایت میں مثل مساجد لے کر ان سب کو انہدام سے بچانے کے لیے۔

کیا کسی اور مذہب کی پاک ترین کتاب سے بھی یہ بیان مل سکتا ہے کہ ادیان مختلفہ کے بچاؤ اور ان کی عبادت گاہوں کے قیام کے واسطے کسی قوم نے جنگ کی ہو، اگر نہیں اور ہم کو وثوق کے ساتھ یقین ہے کہ ہرگز نہیں۔ تو سب کو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ رحمۃ للعالمین ہی کی رحمتِ قلبی کا نتیجہ ہے کہ جنگ کا مقصد ایسا مقدس بنایا، جس سے آج دنیا کا کوئی مذہب انکار نہیں کرسکتا۔

ایسی ضروری جنگ کے لیے رحمۃ للعالمین یہ بھی ضروری ٹھہراتے ہیں کہ الٹی میٹم ایک لمبے وقت کا دیا جائے تاکہ اس عرصہ میں باہمی سمجھوتے کی ایسی صورتیں نکل آئیں جس سے جنگ ٹل بھی جائے۔

قرآن مجید میں ہے: فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ۔ (۹ : ۲) یعنی تم کو چار ماہ کی مہلت ہے۔

جنگ کے لیے اتنی مہلت کا دیا جانا ہی رحمت ہے، لیکن جنگ شروع ہو جانے کے بعد مستثنیات کا خاص طور پر ذکر ہے:

ا- اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ جو لوگ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، جن سے تمہارا عہد ہے۔

ب ۔ اَوْجَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْيُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۔

یا وُہ جو حاضر ہو کر ظاہر کر دیں کہ وہ تم سے یا اپنی قوم سے جنگ کرنے میں رُک گئے ۔

تو وہ جنگ سے مستثنیٰ ہوں گے ۔ چنانچہ صاف لفظوں میں فرمایا :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۔ (۴ : ۹۰)

پھر اگر یہ لوگ علٰحدہ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی درخواست کریں ۔ تب خدا نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی ۔

خیال کرو کہ یہ احکام کس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ اس جنگ کا مقصد دین کو بجبر قبلوانے کا ہرگز نہیں ۔

غور کرو کہ ایک معاہد قوم کا وجود بھی تم کو نظر آئے گا جو مسلمان نہیں، اگر مسلمان ہوتے تو اُن سے مسلمانوں کا تعلق (بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ) ہی کا نہ ہوتا، بلکہ وُہ تو (فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ) کے درجے ہوتے ۔

پھر اس معاہد قوم کی بھی اتنی عزت ہے کہ اگر فریقِ جنگ میں سے کوئی شخص اس کے پاس چلا جائے تو وُہ بھی فریقِ جنگ کے حکم سے نکل جائے گا۔

پھر وہ شخص بھی جنگ سے مستثنیٰ ہو جائے گا، جو مسلمانوں سے یہ عہد کر لے کہ وہ نیوٹرل (غیر جانبدار) رہے گا، نہ مسلمانوں کا طرفدار ہوگا نہ اُن کے مخالفین کا۔ دیکھو اگر جنگ کی بنیاد مذہب کا بجبر قبلوانا ہوتا تو ان غیر مذاہب والوں کے لیے یہ ضوابط کبھی نہ ہوتے ۔

ہاں ! رحمۃ للعالمین وُہ ہے جو انسانوں کو اخلاقِ فاضلہ اور فضائلِ محمودہ اور محاسنِ جمیلہ اور صفاتِ کاملہ کی تعلیم دیتا ہے ۔

ماں باپ کی بابت سکھایا :

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ (۱۷ : ۲۴)

اُن کے لیے ذلّت کے بازوؤں کو زمین پر بچھا دے اور دعا بھی کیا کر کہ اے خدا ! ان پر رحم کر جیسا کہ انھوں نے مجھے چھٹپنے سے پالا ہے ۔

اس حکم میں فرمانبرداری اطاعت و خدمت گزاری کا بھی حکم دیا اور یہ بھی بتایا کہ ماں باپ کے لیے دعا کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ جس طرح بچہ ماں باپ کی تربیت کا محتاج ہے اسی طرح ہر انسان خدا کے رحم کا محتاج ہے ۔

قصور والوں کی معافی کے متعلق فرمایا گیا ہے :

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ط (۲۴ : ۲۲)

چاہیے تم معافی دیا کرو اور درگزر کیا کرو، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے ہو کہ خدا تم کو معاف کر دے ۔

معافی دینا انسان کو ذرا مشکل اور شاق گزرتا ہے، اس لیے اسے سمجھایا گیا ہے کہ جب انسان معافی کا خدا سے خواستگار رہے تو کیا وجہ ہے کہ وُہ خود معافی دینے کو پسند نہیں کرتا، گویا یہ اصول بتایا، معاف کرو تم کو بھی معاف کیا جائے گا۔

زنا کی برائی کے متعلق بھی استدلال کا ایسا ہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے :

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ سَآءَ سَبِيْلًا۔ (۱۷: ۳۲)

زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ تو بے حیائی ہے اور بُرا راستہ ہے۔

بُرے راستہ کے لفظ پر غور کرنا چاہیے۔

ایک عیاش مزاج شاید اپنی شوریدگی طبع کی حالت میں زنا کو کچھ معیوب نہ سمجھتا ہو، مگر اسے غور کرنا چاہیے کہ کسی کی بہو بیٹی کو اپنے بستر پر بلانا تو اسے ناگوار نہیں گو زنا، لیکن کیا اُسے یہ بھی ناگوار نہیں ہے کہ اس کی بہو بیٹی غیر کے بستر پر جائے، اس کی غیرت اسے پسند نہیں کرتی تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شخص خود اپنے طرزِ عمل سے ایسی ہی بُرائیوں کا رستہ بنا رہا ہے۔ یہ رستہ سب سے پہلے اُس کے گھر تک سیدھی سڑک بن جائے گا۔

رحمۃ للعالمین وہ ہے، جس نے شراب اور جُوئے کی حرمت کا حکم تمام عالم کو سنایا، شراب کو رجس اور عملِ شیطان اور بنائے عداوت سببِ بُغض و سرمایہ غفلت اور ذریعۂ دُوری از خدا بتایا۔ یہ فیصلہ اس زمانہ کا ہے جب تمام دنیا شراب پر لٹو تھی جب بزرگوار پولوس کی ہدایت کے پابند سادہ پانی پینے کو معیوب سمجھتے تھے۔ جب ایران شراب کے پیالہ کو جامِ جم سمجھتا تھا۔ جب ہندوستان دیوتاؤں اور ٹھاکروں کے تقرب کے لیے اُس کا استعمال ضروری سمجھتا تھا، جب بہت سے مراسم دینی و دنیوی کی تکمیل شراب کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔ جب عرب کے کسی شاعر و زبان آور کا کلام اُس کی توصیف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اسلام کے اس حکم کا تیرہ سو برس تک دُنیا نے مقابلہ جاری رکھا، لیکن یورپ کی جنگِ عظیم (از ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) نے اس حکم کی اصلیت کو منکشف کر دیا۔

شاہِ برطانیہ جارج پنجم نے ترکِ مے نوشی میں اوّل قوم کو خود نمونہ بن کر دکھایا۔ پھر روس و انگلستان و فرانس میں ایک حد تک اس پر عمل کیا گیا۔ امریکہ نے شراب تیار نہ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ فی الواقع ترکِ شراب ایک رحمت ہے۔

اور جس وجودِ پاک نے سب سے پہلے دنیا کو اس مسئلہ کی ہدایت کی وہ رحمۃ للعالمین ہے۔ ایسے احکام قرآن مجید اور حدیث پاک سے سیکڑوں کی تعداد میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

ناظرین غور سے معلوم کریں گے کہ ہم نے اس مضمون میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے، یہ خالص ایسے مسائل ہیں کہ مسلم و غیر مسلم ہر دو مساوی طور پر اُن سے مستفید ہو سکتے ہیں، چنانچہ مستفید ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کے ترک کر دینے کے بعد تمدن کے قیام اور شائستگی کے وجود کی بقا ہی نہیں رہ سکتی اس لیے دنیا کو ماننا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم فی الواقع رحمۃ للعالمین تھے۔

البتہ اہلِ اسلام کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو التفاتِ خاص ہے اور یہ لوگ اس آفتابِ حقیقت سے زیادہ تر منوّر ہونے کی سعی کیا کرتے ہیں۔ اس لیے رب العالمین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں فرمایا ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ دیکھو رحمت کے ساتھ یہاں رافت کا اضافہ ہو گیا ہے۔

مبارک ہیں وہ لوگ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی رحمت و رافت سے استفاضہ کرتے ہیں۔

اُردُو احادیث کے محاورے

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

اللہ پاک کا بے حد شکر و احسان ہے کہ اُس نے انسان کو قوتِ گویائی عطا فرمائی اور اپنے کلام، نیز اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ذریعے اُسے بات کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ یعنی قرآن وحدیث کے بے شمار الفاظ اور محاورات نے عرب اور غیر عرب ملکوں میں فصاحت اور بلاغت کو چار چاند لگائے اور وہاں کے ادب کو صحیح معنی میں "ادب" بنایا۔

برصغیر پاک وہند میں چوں کہ فارسی بولنے والوں میں ہماری اردو زیادہ رواج پذیر رہی ہے اس لیے اس زبان میں وہ عربی الفاظ و محاورات بھی داخل ہوئے جو فارسی میں رائج ہو چکے تھے اور وہ بھی شامل ہوئے جو عربی کے علما اور فضلا نے براہ راست اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے عام کیے۔ چنانچہ انھی بزرگوں کے قلم سے اردو میں ایسی کتابیں ہزاروں کی تعداد میں نکلی ہیں جن کا تعلق گو کہ دین سے نہیں ہے لیکن وہ دین سے بے تعلق بھی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں میں عربی کے بکثرت اقوال، محاورات اور ضرب الامثال کی شکل میں درج ہیں چند مثالوں سے ان کی وضاحت ہو سکے گی۔

عربی کے بعض اقوال اور ضرب الامثال یہ ہیں جو فارسی میں بھی مستعمل ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اَلْعِیَانُ لَا تَحْتَاجُ اِلَی الْبَیَانِ	عیان راچہ بیان
۲۔ اَلدَّارُ ثُمَّ الْجَارُ	اوّل خویش بعدہٗ درویش
۳۔ اَلْبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتْ طَابَتْ	مرگِ انبوہ جشنے دارد
۴۔ اِذَا حَضَرَ الْمَآءُ بَطَلَ التَّیَمُّمُ	آب آمد تیمم برخاست۔
۵۔ اِنَّ اللَّبِیْبَ مِنَ الْاِشَارَۃِ یَفْهَمُ	عاقل را اشارہ کافی ست
۶۔ اَلْعَبْدُ یُدَبِّرُ وَ اللّٰہُ یُقَدِّرُ	ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال
۷۔ اَلْقَلِیْلُ یَدُلُّ عَلَی الْکَثِیْرِ	مشتے نمونہ از خروارے
۸۔ اَلدَّرَاهِمُ بِالدَّرَاهِمِ تُکْتَسَبُ	کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج
۹۔ اَلْقُلُوْبُ تُشَاهِدُ	دل را بدل رہیست

لہ قریب تین سال ہوئے اس موضوع پر مضمون لکھا تھا۔ ایک صاحب مجھ سے لے گئے اور ابھی بتایا کہ وُہ ضائع ہوگیا۔ چنانچہ دوبارہ لکھا جا رہا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک مضمون "اردو میں قرآنی محاورات" لکھا تھا جو پہلے نیا دور (کراچی ۶۲ ۱۹ء) میں شائع ہوا تھا۔ پھر بینات (کراچی۔ مارچ اپریل ۱۹۶۴ء) میں نقل ہوا۔

۱۰۔ اَلْمَرْءُ مَخْفِیٌّ تَحْتَ لِسَانِہٖ — تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

لیکن عربی کے بہت سے اقوال ایسے بھی ہیں جو اُردو میں زیادہ رائج ہیں۔ مثلاً :

۱۔ اَلْمَاضِیْ لَا یُذْکَرُ — گزشتہ را صلوات

۲۔ تَسْمَعُ بِالْمُعَیْدِیِّ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاہُ — دُور کے ڈھول سہانے

۳۔ رُبَّ صَلِفٍ تَحْتَ الرَّاعِدَۃِ — جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں

۴۔ سَاَلْتُہٗ عَنْ اَبِیْہِ فَقَالَ خَالِیْ شُعَیْبٌ — زمین کی سُننا ، آسمان کی کہنا

۵۔ صَفْصَفَۃٌ بِنَقْدٍ خَیْرٌ مِّنْ بَدْرَۃٍ بِوَعْدٍ — نو نقد ، نہ تیرہ اُدھار

۶۔ عُوْدٌ یُعَلِّمُ الْفَتْحَ — مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے

۷۔ فِی الْمَھْدِ یَنْطِقُ عَنْ نَّجَابَۃِ جَدِّہٖ — ہونہار برواکے چکنے چکنے پات

۸۔ کُلُّ کَلْبٍ بِبَابِہٖ نَبَّاحٌ — کُتا اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے

۹۔ لَا تُضِیْعُوا الْحِکْمَۃَ عِنْدَ غَیْرِ اَھْلِھَا — اندھے کے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے

۱۰۔ ھٰذَا کَالنَّقْشِ الْحَجَرِ — یہ بات پتھر کی لکیر ہے

یہ ہیں عام عربی اقوال جو اردو میں بھی کسی نہ کسی شکل میں رائج ہیں۔ اب ہم حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وُہ احادیث نقل کرتے ہیں جو اُردو میں محاورات یا ضرب الامثال کی طرح بولی جاتی ہیں،

۱۔ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَءْ بِاسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ الْاَبْتَرُ ——— جو بھی اہم کام اللہ پاک کے نام سے شروع نہ کیا جائے وُہ برکت سے محروم ہوتا ہے۔

اس نام پاک کو اسی لیے ہر کام کی ابتدا میں ادا کیا جاتا ہے۔

محسن کاکوروی کہتے ہیں :

کہیں جبریل اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ
سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

داغ کا مشہور شعر ہے :

جب کہا میں نے کہ لو مرتا ہوں میں
بولے بسم اللہ ، اچھی بات ہے

سالک کہتے ہیں :

جو قصے کا ترے انجام ہے قیس
وُہ بسم اللہ ہے یاں داستاں کی

بسم اللہ سے دوسرے محاورات بھی بنائے گئے ہیں۔

۲۔ اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰہَ عَبْدٌ لَّا یَحْمَدُہٗ ——— حمد کرنا، شکر کی چوٹی ہے۔ اللہ کا شکر اُس بندے نے نہیں کیا جس نے اُس کی تعریف نہیں کی۔

الحمدللہ کہنے کی دوسری احادیث میں بھی ترغیب آئی ہے، اردو میں بہت مستعمل ہے۔

میر کا شعر ہے:

اب حال اپنا اُس کے ہے دل خواہ
کیا پُوچھتے ہو، الحمدُ للہ

وزیر لکھنوی کہتے ہیں:

ہُوا شاہِ دواوین نام بسم اللہ سے دیواں کا
سرِ دیوان پہ ہے الحمدللہ تاج قرآں کا

ذوق کا شعر ہے:

ہوا حمدِ خدا میں دِل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

۳۔ حُبُّكَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ ——— کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔

غالب نے اپنے انداز میں کہا ہے:

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حالی نے ایک موقع پر مسدس میں اس طرح کہا ہے:

نہیں حق سے کچھ اس محبت کو بہرہ
کہ جو تم کو اندھا کرے اور بہرا

(ڈپٹی نذیر احمد نے بھی توبۃ النصوح کے پہلے باب میں یہ حدیث لکھی ہے)

حالی نے (قوم کی پاسداری) اسی طرح پھر کہا ہے:

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کی
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبعِ بشر

۴۔ جُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ ——— میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

قرۃ العین بہت عزیز چیز کو کہا جانے لگا (اولاد کو بھی)۔

مسرور کا شعر ہے :

آنکھیں جلتی ہیں تپ فرقت سے
آ مری آنکھ کی ٹھنڈک آ جا

اقبال بھی کہتے ہیں :

وہ صاحب تحفۃ العراقین
ارباب نظر کا قرۃ العین (ضرب کلیم)

۵ - اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ (دعام الدین) ——— نماز ، دین کا ستون ہے ۔

ستون کا استعارہ اردو میں بھی آتا ہے ۔ منیر شکوہ آبادی کا شعر ہے :

سر پہ اٹھا لیا فلک بے ثبات کو
قد بشر ستون ہے قصر حیات کا

حالی نے مسدس میں کہا ہے :

ستوں ، چشم بد دور ، ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسولؐ امیں کے

۶ - اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ——— نماز ، مومنوں کی معراج ہے ۔

اردو میں معراج ، انتہائی ترقی کے لیے مستعمل ہے ۔ منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :

اے منجم ہے وہی شرم و حیا کی معراج
جس فلک پر ہے ہلال خم گردن ان کا

اکبر الٰہ آبادی بھی کہتے ہیں :

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لیے معراج ہے

۷ - لَا تَجْزُوْ صَلٰوۃٌ لَا یَقْرَاءُ فِیْهَا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ ——— جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ چل نہیں سکتی ۔

چلنا (درست ہونا) اردو میں بھی ہے ۔ اکبر الٰہ آبادی کا شعر ہے :

امید حور ہیں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر
خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ ہتھکنڈا نہ چلے

۸ - اُقْتُلُوا الْاَسْوَدَیْنِ فِی الصَّلٰوۃِ الْحَیَّۃَ وَالْعَقْرَبَ ——— مارو دو کالوں کو نماز میں ۔ وہ سانپ اور بچھو ہیں ۔

صرف کالا بھی اردو میں سانپ کے لیے مستعمل ہے۔ ذوق کہتے ہیں:

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا، نہ مُنہ سے بولے، نہ سر سے کھیلے

آتش کہتے ہیں:

تریاق کا ہے جو ہر اس جسمِ سخت جاں میں
کالا بھی کاٹتا تو مجھ کو اثر نہ ہوتا

داغ کا شعر ہے:

گیسوؤں پر ہاتھ رکھ کر ناز سے کہتے ہیں وہ
سامری کو بھی تو ڈس جائیں یہ دو کالے مرے

۹۔ اذان دینے کے لیے دونوں ہاتھ کانوں تک لے جاتے ہیں، کانوں پر ہاتھ رکھنا (پناہ مانگنا) محاورہ یہیں سے بنا ہوگا۔ ذوق کہتے ہیں:

الٰہی کان ہیں کیا اس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لیے

داغ بھی کہتے ہیں:

وہ عرضِ وصل سے رکھتے ہیں ہاتھ کانوں پر
اثر یہ خوب تری طرزِ گفتگو نے کیا

یہ قرآنی محاورہ (یجعلون اصابعہم فی اٰذانہم) سے قریب ہے۔

۱۰۔ رفع یدین (جس میں ائمہ کا اختلاف ہے)، اردو میں کسی چیز سے ہاتھ اٹھا لینا" (ترک کر دینا) کا ماخذ ہے۔ ظفر نے کئی جگہ استعمال کیا ہے:

۱۔ ہاتھ اٹھایا سینہ کاوی سے نہ میں نے عشق میں
اے جنوں جب تک نہ میرا ٹوٹ ہر ناخن گیا

۲۔ اٹھاؤ ہاتھ بس اب شیوۂ جفا سے ڈرو
کہ ظلم خوب نہیں اے بُتو خدا سے ڈرو

شبلی کہتے ہیں:

تقلیدِ کہن سے ہاتھ اُٹھائیں
تہذیب کے دائرے میں آئیں

۱۱۔ سبابہ۔ سب بمعنی گالی۔ اسلام سے پہلے عرب لوگ گالی دیتے وقت اُنگلی اُٹھاتے تھے (اسلام میں اشارۂ توحید کیلئے سبابہ کو سباحہ کہا گیا)۔
اسی سے انگلی اٹھانا، مطلق اشارہ کرنے کے لیے بھی مستعمل ہے۔
داغ کہتے ہیں:

باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وُہ آتے ہیں
اُنگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

وزیر کا شعر ہے:

مشورت کچھ قاتلوں میں ہے ہمارے قتل کی
بے طرح اُٹھنے لگی ہیں جانبِ سر اُنگلیاں

اور رُسوائی کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:
"ابن الوقت گھر لوٹ کر آیا تو ہر طرف سے انگلیاں اُٹھتی تھیں"۔ (ابن الوقت صفحہ ۹۵)

۱۲۔ نماز ختم کرنے کے لیے سلام پھیرتے ہیں۔
تعلق ختم کرنے کے لیے بھی اُردو میں یہ محاورہ آتا ہے۔ داغ کا شعر ہے:

اے عشق رخصت اے ہوس و آرزو سلام
اپنا مقام آج سے دارِ بقا ہُوا

نذیر احمد لکھتے ہیں:
"سلام ہے ایسے دین کو کہ انسان اپنے آپ سے باہر ہو جائے اور دُنیا کے نیک و بد پر کچھ نظر نہ کرے"۔
(توبۃ النصوح ص ۱۱۹)

لفظ سلام سے اُردو میں اور محاورے بھی بنتے ہیں۔

۱۳۔ اَلدُّعَاءُ یَرُدُّ الْبَلَاءَ ——— دعا، بلا کو ٹالتی ہے۔
مولانا اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:
"دُعا، نازل شدہ بلا کو بھی نافع ہے اور اُس بلا کو بھی جو ابھی نازل نہیں ہُوئی......" (دیباچہ مناجاتِ مقبول)
"دُعا، ردِّ بلا" اردو میں عام طور پر بولا جاتا ہے۔ اِسی مضمون کو مومن نے اس طرح استعمال کیا ہے:

ایک دشمن کہ چرخ ہے، نہ رہے
تجھ سے یہ اے دعا، نہیں ہوتا

۱۴۔ قُلِ الْحَقَّ وَاِنْ کَانَ مُرًّا ——— سچ کہو اگرچہ وُہ تلخ ہو۔

اَلْحَقُّ مُرٌّ" بھی آتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی :

اِلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَ اَلْکِذْبُ یُھْلِكُ ـــــــ سچ نجات دلاتا ہے اور جھوٹ تباہ کرتا ہے۔

مولانا حالی نے کلمہ الحق نظم لکھی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں :

سُنے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی
حنظل میں ایسی تلخی نہ ہو گی
ہے ناگواری پہچان تیری
اَلْحَقُّ مُرٌّ ہے شان تیری
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پروان کرتی ہے لعنت

اسمٰعیل میرٹھی کہتے ہیں :

(سچ اور جھوٹ)

سچ کہو گے تو دل رہے گا صاف
سچ سے ہو جائیں گے قصور معاف
ہے بُرا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا مُنہ کالا

۱۵۔ مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ ـــــــ میرے اصحاب کی مثال میری اُمت میں ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک۔ (بغیر نمک کے کھانے میں لذت نہیں ہوتی)

سالک کا شعر ہے :

ہزار حصہ بڑھی لذتِ ستم اُن کی
رہا گلہ بھی تو کالملح فی الطعام رہا

۱۶۔ لَمْ یُحْرَمْ مَنْ فُصِدَ لَهٗ ـــــــ جس کا کچھ تھوڑا سا بھی مطلب پُورا ہوگیا تو وہ محروم نہیں۔

اسی طرح کی ایک اور حدیث ہے :

اَلْمَاشُ خَیْرٌ مِّنْ لَا شَیْءٍ ـــــــ گھر کا کچھ بھی سامان ہو ، گو کم قیمت سہی ، کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔

اردو میں کئی طرح سے بولتے ہیں۔ مثلاً :

ہونا ، نہ ہونے سے بہتر ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا سہی۔ کچھ نہیں تو اتنا ہی سہی۔

جیسے غالب کا شعر ہے : قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

فارسی میں کہتے ہیں :

از خرس موئے بس است

انگریزی میں بھی بولتے ہیں :

"Some thing is better than nothing."

"بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی" ایک اردو کہاوت بھی ہے۔

۱۷۔ لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ ——— تونگری ، مال کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ تونگری دل کی تونگری ہے۔

حضرت سعدیؒ کا مشہور مقولہ ہے :

"تونگری بہ دل است نہ بہ مال و بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال"

۱۸۔ ایک اور حدیث ہے :

خَیْرُ الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ ——— بہترین غنیٰ نفس کا غنیٰ ہے۔

درد کہتے ہیں :

ہمت رفیق ہووے تو فقیر سلطنت ہے
آتا ہے ہاتھ یعنی یاں تخت دل کے ہاتھوں

رشک کا شعر ہے :

لازم یہ ہے سوال کو سمجھو سوالِ قبر
ساماں میں فقیر رہو ، دل غنی رہے

یوں بھی ایک حدیث آتی ہے :

۱۹۔ اٰفَۃُ الدِّیْنِ الْھَوٰی ——— دین کی آفت ہوا وہوس ہے۔

حضرت سعدیؒ کہتے ہیں :

ع آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند

ذوق کا شعر ہے :

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

۲۰۔ اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِنْفَاذَ قَضَآئِہٖ وَقَدَرِہٖ سَلَبَ ذَوِی الْعُقُوْلِ عُقُوْلَھُمْ حَتّٰی یَنْفُذَ فِیْھِمْ قَضَآءُہٗ وَقَدَرُہٗ ——— جب اللہ تعالیٰ اپنی قضا و قدر کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو عقلمندوں کی عقل کو سلب کر لیتا ہے حتیٰ کہ

ان میں اُس کی قضا و قدر نفوذ کر جاتی ہے۔
حضرت سعدیؒ کہتے ہیں : ع

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

امیر خسروؒ کا شعر ہے :

از سرِ بالینِ من برخیز اے نادان طبیب
دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست

میر نے اس شعر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :

بس طبیب اُٹھ جا میری بالیں سے ، مت دے دردِ سر
کام یاں آخر ہُوا ، اب فائدہ تدبیر کا

۲۱۔ مَنْ اَبْطَأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ ——— جس کا عمل کسی کو پیچھے رکھے تو اُس کا نسب آگے نہیں بڑھائے گا۔
اقبال کہتے ہیں :

عمل سے زندگی بنتی ہے ، جنّت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۲۲۔ مِلَاكُ الْعَمَلِ خَوَاتِمُهٗ ——— عمل کا حساب اس کے نتائج پر ہے۔
۲۳۔ اس طرح بھی ہے :
اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ ——— وہی عمل معتبر ہے جس کا خاتمہ بخیر ہو۔
جیسی کرنی ویسی بھرنی ، کیے کا پھل پانا وغیرہ محاورات ہیں۔
نوح ناروی کہتے ہیں :

خرّمی مفقود ، عشرت گُم ، مسرت دُور ہے
جیسی کرنی ویسی بھرنی ، یہ مثل مشہور ہے

۲۴۔ ایک اور حدیث ہے :
يُبْعَثُ عَلٰى نِيَّاتِهِمْ ——— ہر شخص کا حشر اپنی نیّت کے مطابق ہوگا۔
یہ حدیث بھی مذکورہ بالا احادیث سے مطابقت رکھتی ہے۔
۲۵۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ——— جیسی نیّت ہو گی ویسا عمل ہوگا۔
بیان میرٹھی کا شعر ہے :

تھی نزاعِ مصلحت آمیز پر رنجش فضول
انما الاعمال بالنیات ہے قولِ رسولؐ

۲۶ - اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ——— جب تجھے حیا نہیں آتی تو جو تیرے جی میں آئے کر۔

اردو میں بولتے ہیں کہ "اُتر گئی لوئی پھر کیا کرے گا کوئی"
یُوں بھی بولتے ہیں کہ "مُنہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی"
میرؔ کا شعر ہے:

آتی ہے شمع شب کو آگے ترے یہ کہہ کر
مُنہ کی گئی جو لوئی تو کیا کرے گا کوئی

۲۷ - اِنَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِكِتَابِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ ——— بے شک دین، نصیحت ہے اللہ کے لیے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور اس کی کتاب کے لیے اور مسلمانوں کے حاکموں کیلئے (جب تک وہ شریعت پر چلتے ہوں) اور عام مسلمانوں کے لیے (اُن کے دین اور دنیا کی اصلاح کی فکر کرنا)۔

حالیؔ نے اپنی نظم "فلسفۂ ترقی" میں کہا ہے:

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسولؐ انس و جاں

۲۸ - اَلشَّبَابُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ ——— جوانی، جنون کا ایک شعبہ ہے۔

جوانی دیوانی مشہور ہے۔ حضرت سعدیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ:
"در ایامِ جوانی چنانکہ افتدوانی"
قدرؔ کا شعر ہے:

سچ یہ کہتے ہیں کہ دیوانی جوانی ہوتی ہے
آپ نے دل لے کے مجھ سے جانِ من کیا کر دیا

ریاضؔ خیر آبادیؒ کہتے ہیں:

ایسی دیوانی جوانی کہ یہ کہنی آئی
لے مبارک ہو تجھے چاک گریباں ہونا

۲۹ - اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِّنَ الْعَذَابِ ——— سفر سقر ہے۔

فسانۂ عجائب میں ہے کہ "سفر اور سقر کی صورت ایک ہے اس سے بچنا نیک ہے ....." (طوطے کا بیان)

۳۰ - كُلُّ وَدُوْدٍ اِذَا غَضِبْتَ اَوْ اُوْسِيَ اِلَيْهَا قَالَتْ هٰذِهٖ يَدِيْ فِيْ يَدِكَ لَا اَكْتَحِلُ بِغُمْضٍ حَتّٰى

ترضیٰ ——— (جنتی عورتوں کے متعلق فرمایا کہ) ہر ایسی محبّت کرنے والی بیوی جب تمہیں غصہ آئے یا اُسے رنج پہنچایا جائے تو وُہ کہہ دے کہ یہ میرا ہاتھ تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں اس وقت تک نہیں سوؤں گی جب تک آپ راضی نہ ہوں۔

ہاتھ میں ہاتھ دینا' محاورہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں کہ "بے جانے بُوجھے ، زندگی بھر کے لیے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تو اندھیرے کا نشانہ ہے (ایامیٰ)۔

شوق کا شعر ہے:

میں کہاں ہُوں جو ساتھ دوں تیرا
ہاتھ میں اپنے ہاتھ دُوں تیرا

۳۱۔ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنِ النَّائِمِ وَالصَّبِیِّ وَالْمَعْتُوْہِ ——— سونے والے اور بچّے اور مجنوں سے قلم اُٹھا لیا گیا (یعنی وُہ مکلّف نہیں ہیں)۔

درد کہتے ہیں:

مشابہ کوئی ان آنکھوں سے کم ہے
یہ نرگس ہے سو مرفوع القلم ہے

رشک کا شعر ہے:

ہوں وہ سودائی کہ لکھواؤں گا جس سے خطِ شوق
منتشر کیسا کہ مرفوع القلم ہو جائے گا

۳۲۔ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ کَائِنٌ ——— قلم خشک ہو چکا ہے اُس کے متعلق جو ہونے والا ہے۔

مومن کا شعر ہے:

غلط کہ صانع کو ہو گوارا خراشِ انگشتہائے نازک
جوابِ خط کی اُمید رکھتے جو قولِ جفّ القلم نہ ہوتا

۳۳۔ اَهْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ ——— اہلِ جنّت بھولے ہوتے ہیں۔
(بھولے لوگ جنّتی کہلائے جاتے ہیں)

رومیؒ کہتے ہیں:

اکثر اہل الجنۃ البلہ اے پسر
بہرِ ایں گفتہ ست سلطان البشرؐ

ذوق کا شعر ہے:

آخر دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
عاقبت پایا تو ہاں بلہ کو اہلِ جنت

۳۴ - تَجِدُوْنَ شَرَّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ذَا الْوَجْهَيْنِ الَّذِي يَأْتِي هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَ هٰؤُلَاءِ بِوَجْهٍ۔
تم قیامت کے دن بدترین آدمی دو رُخے کو پاؤ گے جو اُن کے پاس ایک مُنہ سے آتا ہے اور دُوسرے کے پاس دُوسرے مُنہ سے ۔

اُردو میں بھی دو رُو ، دو رُخا وغیرہ محاورے آتے ہیں ۔

شعور کا شعر ہے :

ظُلمتِ کفر ہو زائل شرفِ ایماں سے
نورِ وحدت سے دو رُو جامۂ یک رو ہو جائے

۳۵ - مَنْ طَلَبَ الدُّنْيَا حلالاً استعفافاً عن المسئلةِ وسعياً على اهلهِ وتعطفاً على جارهِ لقى الله تعالىٰ يوم القيامة و وجهه مثل القمر ليلة البدر ——— جو شخص جائز ذریعے سے دنیا اس لیے کمائے کہ بھیک مانگنے سے بچے اور بال بچوں کے لیے کوشش کرے اور اپنے ہمسایوں پر مہربانی کرے ، ایسا شخص قیامت کے دن خدا سے ملے گا اور اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہو گا ۔

حالی نے اس حدیث کو اس طرح پیش کیا ہے :

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی — کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تاکہ اس سے ہو اپنی پرائی — نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی

طلب سے ہے دنیا کی گر یاں یہ نیت
تو چمکو گے واں ماہِ کامل کی صورت

۳۶ - اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ - شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ - صِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ - وَغِنَاءَكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَ فَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ ——— پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت جان ، تیرے بڑھاپے سے پہلے جوانی ، بیماری سے پہلے صحت ، محتاجی سے پہلے مال داری ، مشاغل سے پہلے فراغت اور موت سے پہلے زندگی ۔

حالی نے مسدس میں لکھا ہے :

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے — فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی ، بڑھاپے کی زحمت سے پہلے — اقامت ، مسافر کی رحلت سے پہلے

فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کر لو کہ تھوڑی ہے مہلت

۲۷۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْفَعُ شَیْئًا مِّنَ الدُّنْیَا اِلَّا وَضَعَہٗ ——— بے شک اللہ پاک اِس دنیا کی کسی چیز کو بلند نہیں کرتا مگر اُس کو پست کر دیتا ہے۔

ہر کمالے را زوالے۔

ظفرؔ کہتے ہیں:

ہوتا ہے چودھویں کو ہمیشہ خسوفِ ماہ
جو دن کمال کا ہے وہی ہے زوال کا

دُوسرے شعرأ نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ ناسخؔ کہتے ہیں:

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وُہ کونسا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

شاہ نصیرؔ کا شعر ہے:

نصیرؔ یادِ جوانی عبث ہے پیری میں
کہ ایک رنگ پہ رہتا نہیں جہاں کا رنگ

۲۸۔ کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ ——— دنیا میں ایسا رہ جیسے تو ایک مسافر ہے یا راستہ گزرنے والا۔

انشاؔ کا مشہور شعر ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

اسی مضمون کو رندؔ نے یوں پیش کیا ہے:

ہمراہی کمر باندھ کے راہی ہوئے یاں سے
آگاہ کرو جلد مرے ہمسفروں کو

ایک اور حدیث ہے:

۲۹۔ کُوْنُوْا فِی الدُّنْیَا اَضْیَافًا ——— دنیا میں مہمان کی طرح رہو۔

اسیرؔ لکھنوی کا شعر ہے:

ہوں رہروِ عدم مجھے دنیا سے کام کیا
دو روز دیکھنے کو یہ میلا، ٹھہر گیا

حالیؔ کہتے ہیں:

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی　　ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وُہ بڑھاپا دیکھا　　جو جا کے نہ آئے وُہ جوانی دیکھی

خلیل لکھنوی کا شعر ہے :

مسافر رہِ نا آشنائے منزل ہیں
مثالِ ریگِ رواں جائیں گے کہاں ، دیکھیں

فغاں کہتے ہیں :

مہمان جہاں تھے ایک شب کے
شام آئے تھے اور سحر گئے ہم

امیر مینائی بھی کہتے ہیں :

کوئی آتا ہے عدم سے تو کوئی جاتا ہے
سخت دونوں میں خدا جانے سفر کس کا ہے

۴۰ ۔ مَنِ انْقَطَعَ اِلَى الدُّنْيَا وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَيْهَا ——— جو شخص دُنیا کی طرف ہمہ تن مائل ہوگا اللہ پاک اُس کو اُسی کا کردے گا ۔

ولی کہتے ہیں :

نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش
قُفل ہے لذتِ دنیا، حقیقت کے خزانے کا

ذوق کا شعر ہے :

مُنہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا

ایک حدیث یہ بھی ہے :

۴۱ ۔ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ ——— دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی چوٹی ہے ۔

ذوق کہتے ہیں :

سب کو دُنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے

ایک اور حدیث ہے :

۴۲ - اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّ طَالِبُھَا کِلَابٌ ——— دُنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتا ہے۔

رند کہتے ہیں:

غدار ہے سگِ دُنیا کی جیفۂ دُنیا
مجھے تو تیسرے فاقے بھی یہ حلال نہیں

۴۳ - اَلدُّنْیَا مَزْرَعُ الْاٰخِرَۃِ ——— دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں کہا ہے:

یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت
فقیری میں ضائع کرو اس کو مت

۴۴ - مَصِیْرُکُمْ اِلٰی اَرْبَعَۃِ اَذْرُعٍ ——— تم کو آخر کار چار ہاتھ بھر جگہ (قبر) میں جانا ضرور ہے۔

شعور کہتے ہیں:

ہو نہ محتاجِ کفن مقدور یاں اتنا تو ہو
لیجیے دو گز زمین اے آسماں اتنا تو ہو

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

کتنا ہے بد نصیب ظفر، دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوے یار میں

ناسخ بھی کہتے ہیں:

کل ہی اک دو گز زمیں رہنے کو بعد از قبضِ روح
آج گو قبضے میں سارا ربعِ مسکوں ہو گیا

۴۵ - اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ ——— آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے۔

یعنی:-

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر، باز با باز

رشک کا شعر ہے:

باغِ سخنوری میں ہوں وہ مُرغِ خوش بیاں
عنقا ہوئی ہے جنس مرے ہم صفیر کی

ایک دوہا مشہور ہے:

اُتم سے اُتم ملے اور ملے نیچ سے نیچ
پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ

شبلی نے قریش کے ایک واقعے کو اس طرح نظم کیا ہے :

جنگِ ناجنس سے معذور رہیں ہم آلِ قریش
بھیج اُن کو جو ہیں رُتبے میں ہمارے ہم سر

۴۶ - لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ ——— کجاوے نہ باندھے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں کی طرف (برائے تقرب و ثواب) ۔

انیس کہتے ہیں :

ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبر دار

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے :

جتنی ہوتی ہے طویل العمر ہوتی ہے قوی
ہے عروجِ ارتقا اس کے لیے شدِّ رحال (مادرِگیتی)

۴۷ - خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا ——— بہتر کام وہ ہیں جو متوسط ہوں (نہ ان میں افراط ہو نہ تفریط) ۔

سحر لکھنوی کا شعر ہے :

خیرالامور اوسطھا پر عمل کیا
رکھا قدم جو راہِ توسط کے درمیاں

منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں :

شاگردِ حضرتِ علی اوسط ہو اے منیر
خیرالامور اوسطھا پر نظر رہے

۴۸ - لَیْسَ الْخَبَرُ کَالْمُعَایَنَةِ ——— سُنی ہوئی بات آنکھوں دیکھی جیسی نہیں ہوتی ۔

میر تقی میر کہتے ہیں :

تجھ سے یوسف کو کیوں کر دیں نسبت
کب شنیدہ ہو دیدہ کی مانند
ع شنیدہ کے بُوَد مانندِ دیدہ

رند بھی کہتے ہیں :

ستم کرتا ہے چرخِ سفلہ پرور ، اہلِ غیرت پر
جو کانوں سے نہ سُنتے تھے وہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

۴۹۔ اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی ——— اُوپر کا ہاتھ (دینے والا) نیچے کے ہاتھ (لینے والے) سے بہتر ہے۔

ہاتھ اونچا ہونا، ہاتھ اُونچا کرنا، سخاوت کے لیے مستعمل ہے۔

منیر کا شعر ہے:

عیدِ اضحٰی مرے نوّاب کی سرکار میں ہے
دستِ زربخش اُٹھا ہے گہر افشانی کو

ایک اور حدیث ہے:

۵۰۔ اَسْرَعُکُنَّ لَحَاقًا بِیْ اَطْوَلُکُنَّ یَدًا ——— (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج سے فرمایا کہ تم میں سے میرے ساتھ جلد تر ملنے والی وہ بی بی ہے جس کا ہاتھ زیادہ لمبا (سخی) ہے۔ حضرت زینبؓ بنت جحش کا ہاتھ سخاوت میں سب سے بڑھا ہُوا تھا، اس لیے وُہ سب سے پہلے فوت ہُوئیں حالانکہ ہاتھ کی لمبائی حضرت سودہؓ کی سب سے زیادہ تھی) ہاتھ کھُلا ہونا بھی محاورہ ہے۔

یدِطولیٰ ہونا یعنی کمال اور مہارت حاصل ہونا کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ سخاوت کے معنی میں ہندی میں بھی آتا ہے:

تُلسی داس غریب کی کوئی نہ پُوچھے بات
مایہ کو مایہ ملے لمبے کر کر ہات

۵۱۔ اَلْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ——— اذان دینے والے لمبے ہوں گے لوگوں سے گردن میں، قیامت کے دن۔

اونچی گردن، بلندگردن (ممتاز اور معزز) ہونا اردو میں بھی مستعمل ہے اور فارسی میں بھی۔ جیسے حضرت سعدیؒ کہتے ہیں: ع

گردنِ بے طمع بلند شود

علامہ اقبالؒ نے ساقی نامہ (بالِ جبریل) میں کہا ہے:

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

۵۲۔ اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ ——— جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

دبیر کا مشہور مصرع ہے:

زیرِ قدم والدہ، فردوسِ بریں ہے

اور یہ مصرع انیس سے منسوب ہے :

ع کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے

مولانا احسن مارہروی کا شعر ہے :

سچ ہے یہ ارشاد ، زیرِ پائے مادر ہے بہشت
منحرف جو ماں سے ہو اچھی نہیں اُس کی سرشت (مادرِ گیتی)

۵۳ ۔ مَنْ اَصَابَ مَالاً مِّنْ نَهَاوِشٍ اَذْهَبَهُ اللّٰهُ فِيْ نَهَابِرٍ ——— جس نے ظلم کا مال پایا تو اللہ پاک اس کو بربادیوں میں تلف کر دے گا۔

مالِ حرام بود بجای حرام رفت

آتش کہتے ہیں :

مضموں کا چور ہوتا ہے رُسوا جہان میں
چکھی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

۵۴ ۔ مَالاَ عَيْنٌ رَاَتْ وَلاَ اُذُنٌ سَمِعَتْ ——— کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سُنا۔

محسن کاکوروی کہتے ہیں :

آنکھوں سے لکھوں صفت وُہ آنکھیں
ما لا عَيْنٌ رَاَتْ وہ آنکھیں

دوسرے شعرأ نے بھی محبوب کے "سراپا" کے لیے یہ مضمون لیا ہے ۔

محسن کاکوروی کا ایک اور شعر نعت میں اس طرح ہے :

صفحۂ خدِ مبارک پہ الف بینی ہے
دیکھنا عارضِ انور کا خدا بینی ہے

اس شعر کا مضمون اس حدیث سے ماخوذ ہے :

مَنْ رَاٰنِيْ فَقَدْ رَاَى الْحَقَّ ——— جس نے مجھے دیکھا البتہ اس نے حق کو دیکھا ۔

سودا کا شعر ہے :

حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اُس کو اُس نے دیکھی شکلِ یزدانی

مولانا احمد رضا خاں کہتے ہیں :

کھُلے کیا رازِ محبوب و محب، مستانِ غفلت پر شرابِ قد رای الحق زیبِ جامِ من رآنی ہے

۵۵ - مَنْ كَفَّ لِسَانَهُ عَنْ اَعْرَاضِ النَّاسِ اَقَالَ اللّٰهُ عَثْرَتَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ——— جو شخص اپنی زبان کو لوگوں کی آبروریزی سے روکے گا تو خدا بھی قیامت کے دن اس کی لغزشوں کو معاف کر دے گا۔

ایک اور حدیث ہے:

۵۶ - اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ ——— مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

ایک حدیث یہ بھی ہے:

۵۷ - لَا تَخْرِقَنَّ عَلٰى اَحَدٍ سِتْرًا ——— تم کسی کی پردہ دری نہ کرو۔

پردہ دری اور پردہ داری کے بہت سے محاورات استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً:

مومن کا شعر ہے:

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

درد کہتے ہیں:

دل تنگ ہے یہ غنچۂ دل، مُنہ نہ کھلانا
جوں نکہتِ گل اس میں تری پردہ دری ہے

غالب کہتے ہیں:

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

۵۸ - اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ ——— عقلمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع بنایا۔

ع ہوا جب نفس تابع، مطلب دل ہو گیا حاصل (امیر)

ایک اور حدیث ہے:

۵۹ - اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِیْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ ——— بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

ذوق کہتے ہیں:

جو مارے نفس کو اور کرلے اپنے غصّے کو زیر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ذوقؔ کا ایک اور شعر (نفسِ امّارہ کے متعلق) ہے :

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

تسلیمؔ بھی کہتے ہیں :

مار ڈالا ہم کو اس کم بخت نے
نفسِ امّارہ مگر مرتا نہیں

نفس کو مارنا اور غصّہ پی جانا اردو میں عام ہے۔ داغؔ کہتے ہیں :

اُس نے غیروں کو پلائی بزم میں
رشک سے ہم غصّہ پی کر رہ گئے

۶۰۔ يَعْرِفُ الْفَضْلَ لِاَهْلِ الْفَضْلِ ذُو الْفَضْلِ ——— اہلِ فضل کے درجے کو اہلِ فضل ہی جانتے ہیں۔

ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

ذوقؔ کا شعر ہے :

گہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

۶۱۔ مَنْ كَثُرَ كَلَامُهٗ كَثُرَ سَقَطُهٗ ——— جس کی باتیں زیادہ ہوں گی اس کی غلطیاں زیادہ ہوں گی۔

ایک اور حدیث ہے :

مَنْ صَمَتَ نَجَا ——— جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔

ولیؔ کہتے ہیں :

ہمیشہ لشکرِ آفات سوں رہے محفوظ
نصیب جس کو ہوا ہے حصارِ خاموشی

مقولہ ہے کہ ایک چپ لاکھ بلا کو ٹالتی ہے۔ (مولانا حالیؔ کی ایک نظم "چپ کی داد" عورتوں کی بے زبانی کے سلسلے میں ہے)

عربی کا ایک قول یہ بھی ہے :

اَلْمَرْءُ مَخْفِيٌّ تَحْتَ لِسَانِهٖ۔

اور حضرت سعدیؒ کا مشہور شعر ہے:

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

۶۲ - مَنْ يَّدُمْ قَرْعَ الْبَابِ يُوْشَكُ اَنْ يُّفْتَحَ لَهٗ ——— جو دروازہ کھٹکھٹاتا رہے گا ضرور اس کے لیے دروازہ کھولا جائے گا۔

مسدس حالی میں ہے:

وُہ بھولے ہُوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

اقبال کا فلسفۂ "عشق" بھی یہی ہے۔ ایک ہی شعر ملاحظہ ہو:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود (ساقی نامہ)

اصغر گونڈوی اپنے انداز میں کہتے ہیں:

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

شیفتہ بھی کہتے ہیں:

جو جان کھوکے پائیں وہ فوزِ عظیم ہے
وہ چیز ڈھونڈتے ہیں تن آسانیوں میں ہم

۶۳ - كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا ——— بہت ممکن ہے کہ محتاجی کفر ہو جائے۔

ولی کہتے ہیں:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

سرسید نے ایک جگہ لوگوں کا حال اس طرح لکھا ہے کہ "پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جاوے، خدا ملے یا نہ ملے اس کو بھرنا چاہیے۔" (تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۵۲۔ لاہور ۱۳۱۲ھ)

نظیر اکبر آبادی کی نظم "مفلسی" کے ایک بند کا شعر ہے:

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں

ایک اور حدیث ہے:

اَلْبَطَالَۃُ تُقْسِی الْقَلْبَ ——— بے کاری، دل کو سخت بنا دیتی ہے یعنی بے حس اور مُردہ۔

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل

۶۴۔ اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ اَیَّامِ دَھْرِکُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَھَا ——— بے شک تمھارے زمانے کے ایام میں تمھارے رب کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی ہیں، سو اُن کو لیتے رہو۔

حالی نے اسی حدیث سے حمد کی ایک غزل میں یہ شعر تیار کیا ہے:

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

۶۵۔ مَا امْتَلَأَتْ دَارٌ حَبْرَۃً اِلَّا امْتَلَأَتْ عَبْرَۃً ——— کوئی گھر خوشی سے نہیں بھرتا لیکن بالآخر وہ آنسوؤں سے بھرے گا (خوشی کے بعد غم)۔

درد کہتے ہیں:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

جعفر علی حسرت کہتے ہیں:

اپنے لب تو وا نہ کر اے خندۂ زخمِ جگر
چرخ دے گا لاکھ غم اس شادمانی کے سبب

حالی کہتے ہیں:

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بُکا ہوتا ہے

ظفر کا شعر ہے:

ہے صرصرِ حوادثِ دوراں کا غم بھی ساتھ
کیونکر ہنسے کہیں دل مسرور کا چراغ

شادی اور غمی کے ساتھ شادی مرگ بھی محاورہ آتا ہے۔ مثلاً:

امیر مینائی کا شعر ہے:

میرے مرتے ہی زمانہ درہم و برہم ہوا
ہر خوشی پھیلی کہ شادی مرگ اک عالم ہوا

ایک اور حدیث ہے:

كَثْرَةُ الضَّحَكِ تُمِيْتُ الْقَلْبَ ——— زیادہ ہنسی مُردہ دل بناتی ہے۔

لیکن زندہ دلی، پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ناسخ نے کہا ہے:

زندگی ، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

۶۶۔ هَاجِرُوْا تُوْرِثُوْا اَبْنَاءَكُمْ مَجْدًا ——— تم ہجرت کرو، اپنے بچوں کو ورثے میں بزرگی دو گے۔

اس حدیث سے شعراء نے مضامین تلاش کیے ہیں۔ ذوق کا شعر ہے:

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

ناسخ کہتے ہیں:

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

غالباً شہیدی کا شعر ہے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

امیر مینائی نے اس کے برعکس لکھا ہے:

پُوچھا نہ جائے گا جو چمن سے نکل گیا
بے کار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

۶۷۔ اَلْقَرِيْبُ مَنْ تَقَرَّبَ لَا مَنْ تَنَسَّبَ ——— تیرا قریبؔ (رشتہ دار) وُہ ہے جو تیرا قُرب چاہتا ہو (تیرا خیر خواہ ہو) نہ کہ وُہ جو خاندانی رشتہ رکھتا ہو (اور دل میں دشمن ہو)۔

حالی کہتے ہیں:

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

۶۸۔ اِبْدَاْ بِمَنْ تَعُوْلُ وَلَا تُلَامُ عَلٰى كَفَافٍ ——— پہلے ان عزیزوں کی خبرگیری کر جن کی پرورش تجھ سے متعلق ہے اور اگر تیرے پاس تیری احتیاج سے زائد نہ ہو (اور تو دوسرے عزیزوں کی خبرگیری نہ کرے) تو تجھ پر ملامت نہیں۔

مثل مشہور ہے : اوّل خویش بعدہٗ درویش ۔
انگریزی میں بھی ہے کہ : CHARITY BEGINS AT HOME.

۶۹ ۔ ایک اور حدیث ہے :

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ ——— تم میں وُہ بہتر ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو ۔ (محبت اور خبرگیری میں)
اور یُوں بھی مروی ہے جیسا کہ نظم طبا طبائی کا شعر ہے :

لَا يُلَامُ الْمَرْءُ فِیْ حُبِّ الْعَشِيْرَةِ یاد رکھ
پھر ملامت بھی کرے کوئی تو کچھ پروا نہ کر ("پند سُود مند")

۷۰ ۔ خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ ——— آدمیوں میں بہتر وُہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے ۔

ایک اور حدیث ہے :

خَيْرُ النَّاسِ خَيْرُهُمْ لِنَفْسِهٖ ——— لوگوں میں جو بہتر ہے (لوگوں سے بھلائی کرتا ہے) وُہ اپنے ساتھ بھلائی کرتا ہے (کیونکہ جب لوگوں سے بھلائی کرے گا تو لوگ بھی اس کے ساتھ بھلائی کریں گے) ۔

ناسخ کا شعر ہے :

رات دن غافل بدوں سے بھی کیا کر نیکیاں
کیا بُرا ہے اس میں کیا تیرا بھلا ہو جائے گا

داغ کہتے ہیں :

یہ کام نہیں آساں ، انسان کو مشکل ہے
دنیا میں بھلا ہونا ، دنیا کا بھلا کرنا

۷۱ ۔ اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَآءِ ——— رحم کرنے والوں پر رحمٰن بھی رحم کرتا ہے ، تم زمین والوں پر رحم کرو تو تم پر آسمان والا بھی رحم کرے گا ۔

حالی کہتے ہیں :

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

۷۲ ۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ رَفَعَهُ اللّٰهُ ——— جو شخص خدا کے لیے انکساری کرے گا خدا اس کا درجہ بلند کرے گا ۔

ایک اور حدیث ہے :

طُوْبٰى لِمَنْ ذَلَّتْ نَفْسُهٗ وَحَسُنَتْ خَلِيْقَتُهٗ ——— تحسین ہے اُس کے لیے جس نے اپنے نفس کو

جھکایا اور جس کے اخلاق اچھے ہوئے۔
ولی کی ایک غزل کے دو شعر ہیں:

نفسِ سرکش پر جو کوئی پایا ہے یاں فتح و ظفر
دارِ عقبیٰ کے بھتر الحق کہ وہ منصور ہے
خاکساری جس کو سلطانی ہے اِس عالم میں
کاسۂ خاکی اُسے جیوں چینیِ فغفور ہے

آتش کا شعر ہے:

غبارِ راہ ہو کر چشمِ مردم میں محل پایا
نہالِ خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

صبا لکھنوی کہتے ہیں:

میری فروتنی مجھے معراج ہو گئی
حاصل ہوا زوال میں رتبہ کمال کا

امیر مینائی کا شعر ہے:

مرتبہ پیشِ خدا ہوتا ہے اتنا ہی بلند
جس قدر ملتا ہے انسان سے انساں جھک کر

۷۳۔ مَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللّٰهُ ——— جس نے تکبّر کیا اُسے اللہ نے گرا دیا۔
ولی کا شعر ہے:

عجب کچھ بوجھ رکھتے ہیں سر آمد بزمِ معنی کے
تواضع نئیں ہے جس میں اس کوں انساں کر نہیں گنتے

اسی غزل کا مطلع ہے:

بزرگاں کَن جو کوئی اپنے کوں ناداں کر نہیں گنتے
سخن کے آشنا اُن کوں سخنداں کر نہیں گنتے

غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مشہور قول ہے۔

۷۴۔ يُبْصِرُ اَحَدُكُمُ الْقَذٰى فِىْ عَيْنِ اَخِيْهِ وَيَدَعُ الْجِذْعَ فِىْ عَيْنِهٖ ——— تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی آنکھ کا تنکا دیکھ لیتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر کو چھوڑ دیتا ہے۔
سرسید لکھتے ہیں: "تو اُس ذرّہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے، دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اُس کو

نہیں دیکھتا ......" (خطباتِ احمدیہ ۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی ۔ امرت سر صفحہ ۶۷۲)

سرسید یوں بھی لکھتے ہیں :

" اگر ہم کسی دُوسرے کی آنکھ کی پُھلی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چُھپتا ۔" (تہذیب الاخلاق ۔ لاہور ۱۳۱۲ ھ ص ۱۵۵)

سودا نے اپنے طور پر یہ مضمون پیش کیا ہے :

محق اپنے سے اوروں کے ہُنر کو جو کہے عیب
کیونکر نہ خطا بینوں کا ہو وے ہدفِ تیر

اسی طرح ناسخ نے بھی :

آپ اپنے عیب سے واقف نہیں ہوتا کوئی
جیسے بو اپنے دہن کی آتی ہے کم ناک میں

کسی جدید شاعر کا شعر ہے :

خود اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر رکھیں
ہماری آنکھ کے تنکے نکالنے والے

۷۵ ۔ اَلْحَرْبُ خُدْعَۃٌ" ——— جنگ ایک حیلہ سازی ہے ۔

ذوق کا شعر ہے :

سچ ہے الحرب خدعۃ" اے ذوق[1]
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

۷۶ ۔ لَا تُغْمِدُو السُّیُوْفَ عَنْ اَعْدَآئِکُمْ فَتُوْتِرُوْا ثَارَکُمْ ——— اپنی تلواروں کو نیام میں مت ڈالو ورنہ تم اپنے دل کے جوش کو اور اپنے حق کو تباہ کر دو گے ۔

ناسخ کہتے ہیں :

مر رہا ہوں آپ، تم بدنام ہونے ہو عبث
غصہ جانے دو، کرو تلوار اپنی میان میں

شعور کا شعر ہے :

نہ کر نیام میں تیغِ قضا کو تو اے تُرک   یہی اشارۂ چشمِ رکاب رہتا ہے

---

[1] ذوق کے لامیہ قصیدے میں بھی " اللہ جمیل و یحب الجمال" اور " الجنس یمیل" الی الجنس" جیسے اقوال نظم کیے گئے ہیں ۔

۷۷ ۔ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ وَاسْتَذَلَّ الْإِمَارَةَ لَقِيَ اللّٰهَ وَلَا وَجْهَ لَهٗ عِنْدَهٗ ——— جس نے جماعت چھوڑ دی اور امیر کی ذلّت کی تو اللہ پاک کی ملاقات کے وقت اس کی کوئی عزّت نہ ہوگی۔

ایک اور حدیث ہے:

یَدُ اللّٰهِ عَلَی الْجَمَاعَةِ ——— اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔

حالی نے اسی حدیث سے یہ مضمون لیا ہے:

جماعت کی عزّت میں ہے سب کی عزّت
جماعت کی ذلّت میں ہے سب کی ذلّت

۷۸ ۔ اَلْفُرْقَةُ عَذَابٌ ——— تفرقہ عذاب ہے۔

ذوق کہتے ہیں:

پڑے تفرقے یہ جُدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں، دل کہیں، جاں کہیں ہے

۷۹ ۔ اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ ——— بڑی جماعت کی پیروی کرو۔ پس جو علیحدہ ہوگا وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

سوادِ اعظم، بڑی تعداد اور بڑی جماعت کے لیے اردو میں بھی بولا جاتا ہے جو حق پر ہو۔

امجد حیدر آبادی کہتے ہیں:

پیروی سے جو سوادِ اعظم کی بہکا وُہ کبھی
راہ پائے گا نہیں، یُوں ہی بھٹکتا جائے گا

۸۰ ۔ كَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا ——— موت ایک واعظ کے طور پر کافی ہے۔

اسی مضمون کو ذوق نے اس طرح پیش کیا ہے:

موت نے کر دیا ناچار، وگرنہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

حالی کے یہ دو شعر اسی مضمون سے قریب ہیں:

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمھارا
کر دیا چُپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

اکبر نے اسی سے ملتا جلتا مضمون لیا ہے؛

ان مصائب سے کام لے اکبر
غم بڑا مُدرکِ حقائق ہے

۸۱۔ اَلْعَیْنُ حَقٌّ ——— نظر کا لگ جانا برحق ہے۔

نظر لگنا اُردو میں مستعمل ہے۔ غالب کہتے ہیں؛

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

داغ کا شعر ہے؛

کچھ روتے ہیں، کچھ مرتے ہیں، کچھ لوٹ رہے ہیں
کس کی نظرِ بد تری محفل کو لگی ہے

نظر لگنا اور نظر کا کھا جانا بھی مستعمل ہے۔ انیس کہتے ہیں:

اٹھارھواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

۸۲۔ اَلْمُؤْمِنُ مِرْآۃُ الْمُؤْمِنِ[1] ——— مومن دوسرے مومن کا آئینہ ہے۔

آئینہ، حقیقت حال ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

آتش کا شعر ہے:

قرار اس کو نہیں آتا ہماری بے قراری سے
زمانہ آئینہ ہے اپنے احوالِ دِگرگوں کا

محسن کاکوروی کہتے ہیں:

فرحت سے ہُوا یہ قلب بے تاب
آئینہ دکھا رہا تھا سیماب

۸۳۔ اَلْھَمُّ نِصْفُ الْھَرَمِ ——— فکر آدھا بڑھاپا ہے۔

ھَم دراصل اس فکر کو کہتے ہیں جو مصیبت آنے سے پہلے ہو اور اس سے نیند اُچاٹ ہو جائے۔

اس حدیث سے منیر شکوہ آبادی نے ایک اچھا مضمون پیش کیا ہے:۔

---

[1] جناب زکریا مائل نے اس حدیث اور بعض دُوسری حدیثوں کا منظوم ترجمہ، اخبار انجام (کراچی۔ ۱۹۶۴ء) میں حکمت کے موتی کے نام سے شائع کیا تھا۔

خوفِ خدا سے رہتی ہے نم ، چشم پاک ہیں
اطفالِ اشک کیوں نہ ہوں پیرانِ پارسا

۸۴۔ تَفَرَّغُوْا مِنْ هُمُوْمِ الدُّنْيَا مَا اسْتَطَعْتُمْ ——— دنیا کے رنج و غم سے جس قدر ممکن ہو فارغ رہو۔
شاعروں نے اس فراغت سے نئے نئے مضامین بنائے ہیں :
انیس کا شعر ہے :

سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہے

جلیل کہتے ہیں :

دِل مٹ گیا بلا سے ، فراغت تو ہو گئی
اس بے کسی میں چھوٹ گئے بے لبسی سے ہم

فارسی میں بھی کہا گیا ہے کہ : ع

فارغ از فکر و غم و وسواس باش

۸۵۔ اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ ——— (خواہ مخواہ کی) احتیاط ، بدگمانی ہے۔
ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں : " احتیاط بھی اسی کی مقتضی ہے۔ الحزم سوٗالظن " (ابن الوقت ۔ فصل ۲۸)

۸۶۔ اَلرَّفِيْقُ قَبْلَ الطَّرِيْقِ ——— سفر سے پہلے رفیقِ سفر ڈھونڈھ لو۔
امیر مینائی کہتے ہیں :

ہر کس کی راہ میں کھوئے گئے کہ ہم سے خضر
طریق پُوچھتے ہیں آ کے رھنمائی کا

۸۷۔ كَرَمُ الْكِتَابِ خَتْمُهٗ ——— خط کی عزت اُس کی مُہر ہے۔
ولی کہتے ہیں :

اشکِ خون آلُود ہے سامانِ طغرائے نیاز
مُہرِ فرمانِ وفاداری ہے داغِ عاشقی

ذوق کہتے ہیں : ع

مُہر وُہ کرتا ہے نامے پر مجھے آئے ہے رَشک

۸۸۔ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ لَتَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ ——— بے شک دل بھی زنگ آلُود

ہوتے ہیں جیسے لوہا زنگ آلود ہوتا ہے ۔
اسی مضمون کو سودا نے اس طرح لیا ہے :

غش بہم پہنچا نہ محرومِ تجلی ، دل کو رکھ
صیقل اس آئینے کی گردِ شکستِ زنگ ہے

ذوق بھی کہتے ہیں :

صفائے دل کی یہی ہے صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائے گی بالضرورت اس آئینے میں یہ زنگ ہو کر

۸۹ ۔ اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضِبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاهْتَزَّلَهُ الْعَرْشُ ——— جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ پاک غضب ناک ہو جاتا ہے اور عرش بھی اُس کے غضب سے لرز اُٹھتا ہے ۔
حالی نے یہیں سے مضمون لے کر مسدس میں کہا ہے :

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علمِ دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہفت نظر علمِ انشا ہمارا

ظفر اپنے انداز میں کہتے ہیں :

کہتے ہیں آپ کو وہ ہُنروَر زمانے میں
جن پر کبھی پڑا بھی نہیں ہے ہنر کا عکس

۹۰ ۔ اُحْثُوا فِیْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِیْنَ التُّرَابَ ——— مدّاحوں (خوشامدیوں) کے مُنہ میں خاک ڈالو ۔
اُردو میں بھی مُنہ میں خاک ڈالنا محاورہ ہے ۔ ذوق کہتے ہیں :

زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بدشعاری ہے
کہ میں نے خاک بھر دی اُن کے مُنہ میں خاکساری ہے

سید احمد دہلوی لکھتے ہیں : " تمہارے مُنہ میں خاک ، تم ایسی فال تو نکالو ۔" (ہادی النساء صفحہ ۱۲۲ ۔ لاہور ۱۹۳۰ء)

۹۱ ۔ ایک حدیث اس طرح بھی آتی ہے :

... رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ .... (مظاہر حق ۔ ۱/۳۰۲ طبع لکھنؤ ۱۳۱۶ ھ)
خاک آلودہ ہو ناک اس شخص کی (جس نے درود نہ بھیجا) ۔
خاک آلود ہو ، خاک پڑے وغیرہ محاورے اُردو میں ہیں ۔

رندؔ کہتے ہیں :

ایسے جینے پہ رندؔ خاک پڑے
موت اس زندگی پہ ہنستی ہے

۹۲ - فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ اِلیٰ رُکْبَتَیْہِ وَ وَضَعَ کَفَّیْہِ عَلیٰ فَخِذَیْہِ ...... (مظاہر حق - جلد اول - ص ۲۴) [1]
(جبریل علیہ السلام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے) اور لگا دیے اپنے دونوں زانو ، حضورؐ کے دونوں زانوؤں کی طرف اور رکھے اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں زانوؤں پر ۔

زانو تہ کرنا ، زانوے ادب تہ کرنا ، دوزانو (ادباً) بیٹھنا وغیرہ محاورات یہیں سے بنے ہیں ۔ محسن کاکوروی نے سراپا میں لکھا ہے :

سر بزانوے ادب آ کے سخنگو بیٹھیں
فکرِ عالی کے فرشتے بھی دو زانو بیٹھیں

جوشش ملسیانی لکھتے ہیں کہ " اُن کے شاگرد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھیں ایسے بلند پایہ اور گراں مایہ استاد کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل ہوا " (دیباچہ احسن الکلام)

۹۳ - خَصْلَتَانِ مُعَلَّقَتَانِ فِیْ اَعْنَاقِ الْمُؤَذِّنِیْنَ لِلْمُسْلِمِیْنَ صِیَامُھُمْ وَصَلٰوتُھُمْ (م - ح - ۱/۲۳۴)
دو چیزیں لٹکی ہوئی ہیں بیچ گردنوں مؤذنوں کے مسلمانوں کے لیے ، اُن کے روزے اور اُن کی نمازیں ۔ (یعنی مؤذنوں کے ذمے ہیں مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تاکہ صحیح وقت پر ادا کر سکیں) ۔

گلے بندھنا اور گلے پڑنا ، ذمے ہونا کے معنی میں ہے ۔

شاہ نصیر کا شعر ہے :

زلفِ خوباں کیوں گلے پڑتی ہے تو
کوئی تیرے دام میں آتے ہیں ہم

بحر کہتے ہیں :

کچھ ایسی گلے پڑ گئی ابرو کی محبت
تلوار کا ڈورا رگِ گردن نظر آیا

۹۴ - اَبْغَضُ الْبِلَادِ اِلَی اللہِ اَسْوَاقُھَا (م - ح - ۱/۲۴۰) ——— اللہ کے نزدیک ، شہروں کے بہت مبغوض مکان اُن کے بازار ہیں ۔

---

[1] یہاں سے مظاہرِ حق (تفسیر مشکوٰۃ - طبع لکھنؤ ۱۳۱۶ھ) کے حوالے آئیں گے ۔

اسی حدیث سے اردو میں سوقیانہ ، سوقیانہ پن ، بازاری ، بازاری پن وغیرہ محاورے بن گئے۔
مولانا شبلی لکھتے ہیں: " ابتذال کا معیار ، مذاقِ صحیح کے سوا اور کوئی چیز نہیں ۔ مذاقِ صحیح خود بتا دیتا ہے کہ یہ لفظ مبتذل ، پست اور سوقیانہ ہے " (موازنہ انیس و دبیر)
مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں: " شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی ہے جس نے حدِ اعتدال سے بڑھ کر بازاری روش اختیار کر لی ہے " (شعر الہند ۔ جلد اوّل ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول)
قائم چاند پوری کا شعر ہے:

حُسن کو تیرے میں یوسف سے مقابل کرتا
کون روکش ہو پہ ہر سوقی و بازاری سے

۹۵۔ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ (م ۔ ح ۔ ۱/۲۴۴) ——— سایہ میں رکھے گا ان کو اللہ بیچ سایہ اپنے کے۔
منیر شکوہ آبادی کہتے ہیں:

شفاعت اُمتِ عاصی کی جب فرمائیں گے حضرتؐ
کرے گا سایہ ہم سب پر ہمارے فضلِ ربانی

شبلی نے اپنے انداز میں کہا ہے:

ہیئت میں بلند پایہ اُس کا
تھا فلسفہ زیرِ سایہ اُس کا

۹۶۔ فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ (م ۔ ح ۔ ۱/۲۴۴) ——— اللہ کے سایے میں وہ بھی ہوگا جو اُس کو تنہائی میں یاد کرتا ہے اور بہتی ہیں اُس کی آنکھیں۔
سودا کا شعر ہے:

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا

میر کہتے ہیں:

وہ دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبہ

شبلی نے یوں کہا ہے:

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ خفقان سے جگر شق ہے

۹۷ - رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَاَخْفَاهَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهٗ (م - ح ۱/۲۳۸) ——— (اللہ کے سایہ میں وُہ شخص بھی ہوگا کہ) جس نے اللہ واسطے کچھ دیا پس چھپایا اُس کو یہاں تک کہ نہ جانا اُس کے بائیں ہاتھ نے کہ اُس کے داہنے ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

اُردو میں بولتے ہیں کہ داہنے ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں کو خبر نہ ہو۔ کسی کا مصرع ہے : ع

دائیں سے دو کہ بائیں کو مطلق خبر نہ ہو

عزیز جے پوری نے اس حدیث کو اس طرح نظم کیا ہے :

ہے یہ ارشادِ سرورِ بطحا
اپنی اُمّت کے اہلِ ثروت کو
دو اگر ایک ہاتھ سے خیرات
دُوسرے ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو

۹۸ - فَوَضَعَ کَفَّهٗ بَیْنَ کَتِفَیَّ (م - ح ۱/۲۴۴) ——— پس رکھا اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھوں کے درمیان۔

پیٹھ پر ہاتھ رکھنا ، پیٹھ تھپکنا وغیرہ محاورے ہیں۔ پیٹھ ٹھونکنا بھی آتا ہے۔ گلزارِ نسیم کا شعر ہے :

لے لے کے بلائیں کاکلوں کی
پیشانی چُومی پیٹھ ٹھونکی

۹۹ - فَاَمِیْتُوْهُمَا طَبْخًا (م - ح ۱/۲۴۴) ——— پس مارو اُن کو پکا کر (یعنی پیاز اور لہسن کی بُو)۔

آتش کا شعر ہے :

بیتاب دِل کو تسکین ہوتی ہے دیدِ خط سے
وُہ بُوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

ناسخ بھی کہتے ہیں :

تیرے آگے نہ چلے جانِ سیہ مار کے پیچ
زلفِ پیچاں نے اسے مار رکھا مار کے پیچ

ایسی بکثرت احادیث اُردو نثر اور اُردو شعر میں مستعمل ہیں اور یہ ننانوے احادیث اُردو میں بالخصوص رائج ہیں۔

کاش ان کا ابلاغ اِس عاجز کے لیے ذریعۂ مغفرت بن جائے !

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں "اَلطَّالِحُ لِیْ" ہم نے سُنا ہے (حالی)

دربارِ رسالتؐ کا پیغمبرانہ طمطراق

مولانا محمد زاھد

- بڑے دربار دیکھے اور شہنشاہِ زمیں دیکھے
محمدؐ کی کچہری کے مگر جلوے نہیں دیکھے

دنیا میں بہت سے دربار قایم ہوئے۔ ہر ملک اور قوم کے جلیل القدر فرمانرواؤں اور طنطنہ وجلال کے تاجداروں نے پوری صولت و سطوت دکھائی۔ شاہی مجالس وآئین کے احتشام وعظمت کا تصور کس دماغ میں نہیں۔ درباروں میں جمہور پر رعب واثر ڈالنے اور اپنے جلال و عظمت کی نمایش کرنے کے لیے کیا کیا اہتمام نہیں کیے جاتے۔ خیل وحشم، نقیب وچاوش، دربان وسپاہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔ سرو سامان کی فراوانی اور دولت وامارت کی درخشانی سے نگران نگاہیں اونچی نہیں ہوسکتیں، لیکن شہنشاہِ کونینؐ کا ایک دربار ہی اس کرۂ ارض پر قایم ہوا، جس پر بخت نصر، ٹیٹس، خسرو، اسکندر، مامون، منصور، سلیمان اور شاہجہان کے دربار سجائے گئے تھے مگر یہاں نہ وہ طمطراق تھا، نہ طنطنہ اور نہ وہ شان وشکوہ تھا اور نہ وہ سطوت خیزیاں۔ انتہا یہ ہے کہ کوئی دربان بھی دروازہ پر نہ ہوتا تھا تاہم جلالِ نبوت سے ہر ذی روح ایک پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ کوئی شخص ذرا جنبش بھی نہ کرتا تھا۔ مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ گفتگو کی اجازت میں بھی خاص ترتیب ملحوظ رہتی تھی۔ لیکن نسب ونام اور مال ومنال کو اس امتیاز مراتب سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر اجازت دی جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جن کی طرف اس روز سے پہلے کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ اس کی معروضات سنتے اور حاجت براری کرتے۔ جملہ حاضرین کے سر ادب سے جھکے رہتے تھے۔ آپؐ خود بھی مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے کہ فخر وامتیاز کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے۔ آپؐ جب کچھ بولتے اور فرماتے تو پوری مجلس پر ایک سناٹا چھا جاتا۔ جب تک کوئی چپ نہ ہو جاتا، دوسرے شخص کی مجال نہ ہوتی تھی کہ زبان کھول سکے۔ دربار نبوت میں ہر قسم کی بحث وتذکار ہوتے اور آپؐ بھی ان میں حصہ لیتے۔ مہذب ظرافت اور ہنسی میں بھی آپؐ حصہ لیتے تھے۔ جس رتبہ کا آدمی ہوتا، اس سے اسی طرح گفتگو کرتے۔

تعیین اوقات تعلیم وارشاد کے لیے آپؐ نے خاص اوقات کا تعین کر دیا تھا۔ یہ صحبتیں بالعموم مسجد نبویؐ میں منعقد ہوتی تھیں۔ آپؐ کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی۔ اسی لیے باہر سے جو لوگ آتے انہیں آپؐ کے پہچاننے میں دقت ہوتی تھی۔ صحابہؓ نے آپؐ کے لیے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا تھا، اسی پر بیٹھ جاتے۔ پھر آپؐ کے اردگرد صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے۔

دربارِ نبوت میں ہر شخص آسکتا تھا کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بعض وحشی بدو وحشیانہ طریق پر بھی گفتگو کرتے تھے مگر آپؐ، تحمل سے کام لیتے تھے۔ ایک شخص آتا ہے، پوچھتا ہے محمدؐ کون ہے؟ صحابہ بتاتے ہیں کہ یہ گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

وُہ کہتا ہے:

"اے ابن عبد المطلبؓ! میں تم سے نہایت سختی کے ساتھ گفتگو کروں، خفا نہ ہونا"

آپؐ اسے اجازت دے دیتے ہیں۔ اخلاق، مذہب اور تزکیۂ نفس پر گفتگو بحث و تذکار کا مرکزی نقطہ ہوتا تھا۔ بعض لوگ مبتذل اور معمولی باتیں بھی پُوچھتے تھے۔ مگر آپؐ ایسے سوالات ناپسند کرتے تھے۔ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تھا، تو دُوسرے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی تھی۔

بحث و گفتگو کے مسائل و موضوعات فیوض روحانی کا یہ سرچشمہ عموماً صبح کے وقت جاری ہوتا تھا۔ آپؐ نمازِ فجر سے فراغت پاتے ہی بیٹھ جاتے تھے۔ ویسے ہر نماز کے بعد کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے تھے۔ آپؐ ان مجالس میں بڑی بڑی پُرزور تقریریں بھی کرتے تھے اور بصیرت افروز وعظ بھی فرماتے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دن صبح کے وقت آپؐ نے نماز پڑھ کر جو تقریر کی، تو سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آپ وعظ و نصائح کے جلسے درمیان میں ناغہ دے کر منعقد فرماتے اور کبھی اخلاقیات پر گفتگو کرتے، کبھی روحانیت پر بولتے اور کبھی دنیوی مسائل پر ارشاد فرماتے۔ زراعت، باغبانی تجارت، گھوڑ دوڑ، سیاسیات، صنعیات اور عسکریات پر بھی بحث و تقریر فرمایا کرتے تھے۔

عملیات کی پایہ شناسی ایک روز آپؐ مسجد میں جو تشریف لائے تو صحابہ کے دو حلقے قائم تھے، ایک حلقہ قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دُوسرے میں علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا: دونوں عمل خیر میں مصروف ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف معلّم بنا کر بھیجا ہے۔ یہ کہہ کر آپؐ علمی حلقہ میں بیٹھ گئے۔

اس سے آپؐ کی بلندی مرتبت اور علم دوستی پر کیسی تیز روشنی پڑتی ہے۔ جن دقیق مسائل کی تہہ تک جمہور عوام کے دماغ کی رسائی نہ ہو سکتی تھی، ان پر بحث و گفتگو کو آپؐ ناپسند فرماتے تھے۔ لوگ شہرت طلبی کو خلوص عمل کے منافی سمجھتے تھے۔ آپؐ نے یہ بتا دیا کہ ثواب کا کام کیا جائے گا، تو لازمی شہرت ہو گی۔ البتہ صرف شہرت ہی مقصود نہ ہونی چاہیے۔ لوگوں کا خیال تقدیر کے متعلق یہ تھا کہ یہ نام ہے قوائے عملیہ کے تعطل کا، جو قسمت میں مرقوم ہو چکا، اسے کوئی عمل اور طاقت نہیں مٹا سکتی۔ آپؐ نے ایک صحبت میں یہ فرما کر اس خیال کی تردید کر دی کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں۔ خدائے قدوس انسان کو جن اعمال کی توفیق دیتا ہے، وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں۔ اس لیے قوتِ عمل کے بے کار کر دینے کا نام توکّل نہیں۔ چنانچہ ایک روز صحابہ کرام ایک جنازہ کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو تشریف لاتے، تو سب آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپؐ نے اس سے زمین کو کریدا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کی جنت یا دوزخ پہلے سے لکھی نہ جا چکی ہو۔ یہ سن کر ایک صحابی کہنے لگے "یا رسول اللہؐ! پھر عمل کی کیا ضرورت ہے اور کیوں نہ ہم اپنی تقدیر ہی پر عمل کر کے عمل کو ترک کر دیں، جس شخص کی قسمت میں سعادت ہو گی، وہ خود بخود اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق سعادت مندوں میں داخل ہو جائے گا اور جو بدبخت ہو گا، وُہ بدبختوں ہی میں شامل کر لیا جائے گا۔"

آپؐ نے یہ سُن کر جواب دیا کہ سعادت مند وہ لوگ ہیں، جنھیں سعادت مندانہ عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بدبخت وُہ ہیں، جن کے لیے کارہائے شقاوت کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔ (بخاری، ج ۳)

شگفتہ مزاجی باوجود اس کے کہ صحابہ دربارِ نبوت میں کان الطیور فوق رؤسھم بیٹھے رہتے تھے، ادب و احترام ہر شخص کو

ملحوظِ خاطر رہتا تھا اور اکثر ہدایت و ارشاد، اخلاق و مذہب، تصفیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کی گفتگوئیں ہوتی رہتی تھیں تاہم یہ نہ تھا کہ آپؐ کی مجلس تعیش و خشونت کا ایک زندہ مرقع ہو اور ہمیشہ ہر وقت خشک مسائل پر خشک ہی گفتگو ہوتی رہتی ہو۔ شگفتہ مزاجی اور ظرافت کا رنگ بھی مباحث و کلام میں شامل ہوتا تھا۔ خندہ روئی کے ساتھ گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ ایک شخص نے خدا سے جنت میں کھیتی کرنے کی آرزو کا اظہار کیا۔ پُوچھا گیا کہ کیا یہ تیری آرزو پُوری نہیں ہُوئی ہے۔ بولا ہاں مگر چاہتا ہُوں کہ میری کھیتی بوتے ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اجازت ربانی حاصل کر کے بیج ڈالا۔ فوراً اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہو گیا۔ کہیں ایک بدّو بیٹھا ہوا اس ظرافت آمیز حقائق بیانی کو سُن رہا تھا۔ سُنتے ہی بولا: یا رسول اللہ! یہ سعادت غالباً صرف انصاریوں یا قریش ہی کو حاصل ہو گی کہ یہی لوگ زراعت پیشہ ہیں، ہم لوگ تو نہ کاشتکار ہیں اور نہ اس سے کوئی لگاؤ رکھتے ہیں۔ آپؐ یہ سُنتے ہی ہنس پڑے۔ (بخاری)

دربارِ نبویؐ میں ایک صاحب حاضر ہوتے ہیں، عرض کرتے ہیں: حضورؐ! میں تو تباہ ہو گیا۔ پوچھا: کیا ہُوا، کیوں تباہ ہو گیا؟ بولا: رمضان میں اپنی بیوی سے مقاربت کر لی۔ ارشاد ہُوا: تو کیا ہے، جاؤ ایک غلام آزاد کر دو۔ بولا: غریب ہُوں، غلام کہاں سے خریدوں۔ فرمایا: اچھا دو مہینے تک مسلسل روزے رکھو۔ عرض کی: مجھ میں یہ طاقت بھی نہیں۔ فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ بولا کہ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں ہے۔ اسی اثناء میں کہیں سے کھجوروں کی بھری ہُوئی زنبیل آ گئی، آپؐ نے یہ اسے دے کر کہا کہ اسے لے جاؤ اور غرباء میں تقسیم کر دو۔ بولا: قسم ہے اس خدائے پاک کی جس نے آپؐ کو پیغمبر بنا کر ہماری ہدایت کے لیے مبعوث کیا ہے، میں تو اتنا غریب ہُوں کہ مدینہ بھر میں مجھ سا کوئی ایک بھی نہ ہو گا۔ اس پر آپ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور فرمایا کہ اچھا تو تم انھیں خود ہی کھا لو۔ (بخاری ص ۸۰۸)

ایک اندھا دربارِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور پُوچھتا ہے کہ حضورؐ! کیا میری بخشش ہو جائے گی؟ آپؐ جواب دیتے ہیں کہ بھائی اندھا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔ وُہ یہ سُن کر رونے لگتا ہے۔ اس پر آپؐ کو اور تمام حاضرین کو ہنسی آ جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بیوقوف روتا کیوں ہے، حضورؐ نے صحیح تو فرمایا: کوئی اندھا اندھے کی حیثیت سے جنت میں نہ جائے گا، اس روز سب کی آنکھیں روشن ہوں گی۔ اسی طرح ایک بُڑھیا آ کر سوال کرتی ہے اور آپؐ ویسا ہی جواب دیتے ہیں۔ وہ بھی بیقرار ہو جاتی ہے۔ اس پر سب کو ہنسی آ جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں سچ ہے کوئی عورت بوڑھے ہونے کی صورت میں جنت میں نہ جائے گی، سب عورتیں اس وقت جوان ہوں گی، وہ بھی ہنسنے لگتی ہے، اور پھر سب کو ہنسی آ جاتی ہے۔ اس قسم کی صدہا ظرافت آمیز باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ان مجلسوں میں بالعموم مرد ہی شریک ہوتے تھے، لیکن عورتیں بھی آتی تھیں مگر بہت کم۔ انھیں آپؐ کے

عورتوں کے لیے انتظام فیض تلقین سے استفاضہ کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ عورتیں اب وُہ عورتیں تو رہی ہی نہ تھیں، جو جاہلیت کے زمانہ میں تھیں، ان کا رتبہ بھی بلند ہو چکا تھا۔ ان کے دل میں بھی اُمنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لیے ایک خاص دن کے مقرر کیے جانے کی استدعا کی، جو منظور ہو گئی اور ان کے لیے وعظ و ارشاد کا ایک خاص دن مقرر کر دیا گیا۔ مقررہ دن عورتیں جمع ہو جاتیں۔ آپؐ انھیں فیضیاب ہدایت کرتے۔ انھیں مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کرنے کی اجازت تھی اور یہ خاتونانِ حرم برابر وُہ مسائل دریافت کرتی رہتی تھیں، جو عورتوں ہی کی ذات سے متعلق ہوتے تھے۔

صحبت نبویؐ کے فیوض صحبت اور پھر ایسے گرامی قدر پیغمبر جلیل کی صحبت۔ ظاہر ہے کہ اثر سے خالی نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑے بڑے شقی ازلی چند روز کی صحبت ہی میں سرآمد روزگار بن گئے عرب میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ خدا کے بھولنے والے خدا کے پاکباز بندے بن گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے بزرگ تو دنیا اور علائق دنیا ہی سے بیزار ہو گئے اور خدا پرستی ہی میں لطف و سکون پانے لگے۔ اگر آپ رہبانیت و ترک علائق کو مذموم نہ بتاتے، تو ہزارہا انسان خانقاہوں میں ترک تعلق کر کے بیٹھ جاتے۔

لوگ برابر مراحل سعادت اور منازل عرفان طے کرتے چلے جاتے تھے۔ حضرت حنظلہؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں تو منافق ہو گیا ہوں کہ جب تک خدمت میں رہتا ہوں، تو حشر و نشر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ بال بچوں میں گیا اور سب کچھ بھول گیا۔ فرمایا بالکل باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو ملائکہ سے مصافحہ کرتے۔ (ترمذی)

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ آپؐ کے سامنے رہتا ہوں، تو نگاہوں میں دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہم بال بچوں میں جاتے ہیں، تو حالت ہی بدل جاتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ یکساں حال رہتا، تو تمہاری زیارت کو فرشتے آیا کرتے۔ (ترمذی)

انگلستان کے شہرۂ آفاق مورخ نے اسی بناء پر تو لکھا کہ "محمدؐ کی صحبت و عظمت نے انسانوں کو فلاح و بہبود کا معدن بنا دیا، جو عبادت مقرر کی نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ عرب کے بت تختِ خداوندی کے آگے ٹوٹ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے۔ انسانوں کے قتل و غارت کو آپ نے خیرات و نماز کی صورت میں بدل دیا اور ان میں نیکی کی ایک زبردست روح پیدا کر دی۔ بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے پند و نصائح سے انتقام کی خواہش، بیواؤں پر ظلم اور یتامیٰ کی حق تلفی کو آپؐ نے سختی کے ساتھ روکا۔ بلاشبہ آپؐ کا مذہب شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔"

فرزندانِ توحید خدا کے لیے سنبھلو اور سیرت نبویؐ سے وہی سبق حاصل کرو، جو عرب نے حاصل کر کے جنت الفردوس کو خرید لیا۔

ہجرتِ رسولؐ

مقبول احمد نظامی سیوہاروی

ہجرت کے معنی دُور ہونے کے ہیں اور اگر حقیقتاً خیال کیا جائے تو سب سے زیادہ تکلیف دہ ہجرت اپنے وطن سے علیحدہ ہونا ہے۔ علیحدگی بھی وُہ، جو مجبوری سے ہو۔ دوست، احباب، عزیز قریب اور سب سے زیادہ اپنا گھر، محلہ کی وُہ گلیاں، جن میں پل پھر کر نشوونما پائی۔ جب عالم خیال میں ان سے جُدا ہونا تکلیف دینا ہے، تو کیوں آپؐ کو تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ مانا! رسول اکرمؐ تعلقاتِ دنیوی سے پاک تھے۔ تاہم فطرت اور اس کے لوازمات سے آپؐ خالی نہ تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مکہ سے جدا ہوتے وقت آپؐ نے ارشاد فرمایا!

"واللہ! تو خدائے تعالیٰ کی ساری زمین میں مجھے محبوب ہے۔ اگر تیرے لوگ مجھے باہر نہ نکالتے، تو میں ہرگز باہر نہ جاتا"

حقیقت میں یہ آپؐ ہی کا دل گردہ تھا، آپؐ ہی کا استقلال تھا، جس کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ یہ ملکوتی قوت، اور لازمۂ رسالت کا باعث تھا، جو ایسے موقعوں پر بھی آپؐ امرِ حق سے روگرداں نہ ہوتے تھے۔

سر ولیم میور جنھوں نے بہت زیادہ اپنی تحریرات میں تعصب سے کام لیا ہے، اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں جہاں ابوطالب کی نصیحت اور اپنی مجبوری کو کفار قریش کے مقابلہ میں ظاہر فرما کر سرور کائناتؐ سے اعلانِ حق سے باز رہنے پر اصرار کرتے ہیں اور سرور کائناتؐ جواب دیتے ہیں، تو ان عظمت سے لبریز الفاظ میں فوٹو کھینچتے ہیں؛

"اگر منکرین میرے داہنے ہاتھ پر کرۂ آفتاب اور بائیں پر کرۂ
ماہتاب رکھ کر مجھے امرِ حق کے اعلان سے روکنا چاہیں گے، تو
میں (واللہ) باز نہ آؤں گا، تاوقتیکہ مجھے کامیابی نہ ہو یا اس
کوشش میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔"

آخر یہ الفاظ کس طاقت نے آپ سے کہلائے اور یہ استقلال اور اولوالعزمی کہاں سے پیدا ہوئی؟ وہی قوتِ رسالت تھی، جو آپؐ کو اس قدر اولوالعزم بنائے ہوئے تھی اور یہی فرضِ رسالت اور احکامِ خدا کی پابندی تھی کہ تمام تکالیف اور صعوبتیں جنابؐ نے برداشت کیں اور امرِ حق کو نہ چھوڑا۔

جو لوگ ان تکالیف کو کسی دنیاوی نفع پر محمول کریں، ان سے زیادہ کوئی نادان اور کور چشم نہیں۔ وُہ ذاتِ اقدس صفات جس کے اشارۂ ابرو پر لاکھوں فدائی کٹ مرنے کے لئے تیار ہوں، جس کی باج گزاری کو شاہانِ عالم فخر سمجھتے ہیں، وُہ ہو اور ایک بوریا ہو، فاقہ سے ہو، پتھر پیٹ پر بندھے ہوئے ہوں:

رہبر موسیٰ، ہادیِ عیسیٰ، تارکِ دُنیا، مالکِ عقبیٰ
ہاتھ کا تکیہ، خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم

جو سامان تعیش میں ایک جزو بھی نہ رکھتا ہو، کیا اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ تبلیغ ہدایت سے اس کی اور کوئی غرض تھی؟

انسان بتدریج ترقی کرتا ہے۔ ابتداً اگر وہ اسباب پیش آمدہ سے مجبور رہتا ہے، تو اپنی آئندہ زندگی میں ان راحتوں کے تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے، جو زمانہ مجبوری میں اسے حاصل نہ تھیں۔ لیکن آپ کو تعجب ہو گا کہ ابتداً جب کہ جناب پر احکامات الٰہی نازل نہ ہوئے تھے اور آپ کا کوئی ساتھی نہ تھا، ضروریاتِ زندگی سے فارغ البال تھے۔ بخلاف اس حکومت کے زمانہ کے جب کہ دنیا بھر کے اسبابِ تنعم آپ کے ادنیٰ اشارے سے حاصل ہو سکتے تھے۔

کیا اس جیسے آزاد، خود مختار زمانے اور ایسی حکومت حاصل شدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی کوئی مثال دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ چونکہ یہ بحث طویل ہے، اس لئے فی الحال اس کو چھوڑ کر ہم اپنے اصل مضمونِ ہجرت پر متوجہ ہوتے ہیں۔

ہجرت کا باعث

مخالفت کی ابتداء تو اسی زمانہ سے ہوئی تھی، جب کہ لوگ اسلام قبول کرنے لگے تھے اور اُن کے معبودوں کی تذلیل شروع ہو گئی تھی۔ ہم اس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تین چار سال گذر چکے تھے۔ اگرچہ ابھی تک علانیہ تلقین اسلام نہ کی گئی تھی، خفیہ طور سے لوگ مسلمان ہو رہے تھے اور تمام امور خفیہ ہی رکھے گئے تھے۔ مگر اب وہ وقت نہ رہا تھا اور زمانہ آ گیا تھا کہ (روحی فداہ) حضورؐ انور علانیہ تبلیغ اسلام کریں۔ آسمانی ندا آ چکی تھی۔

"مشرکوں سے بچو اور علانیہ طور سے اُن امور کی ہدایت کرو، جن کا تم کو حکم دیا گیا ہے۔"

اس کے بعد دوسرا حکم: وانذر عشیرتک الاقربین واخفض جناحک لمن اتبعک من المؤمنین نازل ہوا اور جنابؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر منادی کی،

کہ یہ قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

قال فاعلموا ان اللہ بعثنی الیکم رسولا۔ وقراء یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ○

یہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمین جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن، سب کے دل میں لگادی — اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

اہل عرب کے دلوں میں آپؐ کی مخالفت کی آگ موجزن ہو گئی اور وہ ہر طرح آپؐ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہو گئے انہوں نے سوچ لیا کہ اس تھوڑی سی جماعت کو اپنی طاقت کی افزونی سے کچل ڈالا جائے اور ان پر اس قدر سختیاں توڑی جائیں، کہ دوسروں کو مسلمان بننے کی ہمت نہ پڑے۔

طارق بن عبداللہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بازار ذی المجاز میں دیکھا کہ آپؐ منادی فرماتے ہیں، لوگو! کہو لا الٰہ الا اللہ تاکہ تمہاری فلاح ہو۔ یہ سُن کے ایک شخص نے پیچھے سے پتھر مارا، اور کہا (معاذ اللہ) اس کذاب کی باتوں کو نہ سننا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے، جو لوگوں کو توحید کا سبق دے رہا ہے؟ اور یہ کون ہے، جو اس کی ایذا کا درپے ہے۔ جواب ملا، ہادی محمدؐ بن عبداللہ ہیں اور ایذا دہندہ اُن کا چچا عبدالعزیٰ (ابو لہب) ہے۔ سچ ہے؛

اقارب کالعقارب فی الایذاء ✱ فلا تفرح بعم او بخال

فکم عم یکون الغم منہ ✱ وکم خال عن الاحسان خال

عزیز مثل بچھوؤں کے ایذا دینے والے ہیں۔ پس کسی چچا ماموں پر ناز نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کتنے ہی چچا باعث غم ہوتے ہیں اور کتنے ہی ماموں احسان سے خالی ہوتے ہیں۔

آخر نوبت بانیجا رسید کہ حضورؐ انور نے بعض اصحاب کو حبش کی جانب ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ ہجرت حضورؐ کی نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب میں ہوئی۔ اس پر بھی کفار قریش نہ مانے اور نومسلموں کے ستانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حتیٰ کہ مہاجرین حبش کے تعاقب میں پہنچے۔ اگرچہ انہیں ناکام آنا پڑا، لیکن تعاقب کرنے میں کسر نہ رکھی۔

معاہدہ قریش کو دیمک چاٹنے کے بعد رجب کا ذکر بالتفصیل کاتب الواقدی۔ طبری وغیرہ نے کیا ہے، کچھ دنوں کے لئے آنحضرتؐ کو جزئی اطمینان ہو گیا تھا۔ لیکن بی بی خدیجہؓ کی وفات اور آپؐ کے چچا ابوطالب کے انتقال نے وہ اطمینان مبدّل بہ اضطراب کر دیا۔ کاتب الواقدی لکھتے ہیں کہ جس وقت ابوطالب کی وفات ہونے لگی، حضورؐ انور نے پاس تشریف لے جا کر فرمایا: چچا جان! اب آپ کا آخر وقت ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھ لیجئے تاکہ مجھے شفاعت کا استحقاق حاصل ہو جائے۔ جواب دیا کہ میں تو کبھی کا مسلمان ہو گیا ہوتا لیکن اپنے خاندان اور آبائی مذہب کا خیال ہے۔

اس استقلال اور فرض منصب کو دیکھیئے۔ وہ چچا جس نے تمام عمر آپؐ کی حفاظت کی دم توڑ رہا ہے اور آپؐ، گھبراہٹ جزع فزع کے بدلے میں اپنے منصب کو ادا کر رہے ہیں۔

ابھی نبوت کو دسواں ہی سال تھا کہ ان دو اہم دلخراش واقعات نے پیش آ کر آپؐ کو بے چین کر دیا اگرچہ ابوطالب کی وفات کے بعد آپؐ کے چچا ابو لہب نے حمایت کا وعدہ کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے وعدے پر قائم نہ رہا۔ یہ زمانہ حضورؐ انور کے لئے بڑا نازک تھا اور یہ کیفیت تھی جو مجبور کر رہی تھی کہ یا تو جنابؐ اپنے دعویٰ نبوت سے دستبردار ہو جائیں، یا قریش سے دست بدست جنگ پر آمادہ ہوں۔ مانا صحابہؓ کرام آپؐ پر جان نثار کرتے تھے۔ لیکن اس ٹڈی دل جماعت،

کے مقابلہ پر یہ مٹھی بھر آدمی کیا کر سکتے تھے۔ مزید برآں بیعت عقبۂ ثانیہ کا گھاؤ مشرکین کو لگا، جس سے وُہ اور بھی درہم برہم ہو گئے۔ حتیٰ کہ سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کو جو نومسلموں کے تعلیمی سردار مقرر کئے گئے تھے اور اپنی جماعت سے پیچھے رہ گئے تھے، پکڑ لائے۔ سعد بن عبادہ کو تو اچھی طرح ایذا دی۔ منذر بن عمرو پنجہ سے چھُوٹ گئے۔

جماعت انصار کے جانے کے بعد آنحضرت ؐ کے لئے بھی ہجرت کا ارشاد باری تعالیٰ کی جانب سے ہُوا، اور خفیہ طور سے اصحاب رسول ؐ مدینہ جانے لگے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب کے بعد (جو کہ بڑی دھوم دھام اور اعلان کے ساتھ مدینہ ہجرت کر گئے تھے) سوائے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور صدیق اکبرؓ کے اکابر صحابہ میں سے کوئی نہ رہا تھا۔

حضرت عمرؓ کے جانے کے بعد ایک جلسہ مشرکین قریش کا ہُوا جس میں آنحضرت ؐ کے متعلق ہر شخص نے اپنی تجویز پیش کی۔ بعض کی رائے تھی کہ آنحضرت ؐ کو ایک مکان میں قید کر کے دانے پانی سے ترسایا جائے اور یہاں تک مدت قید کو طول دیا جائے کہ آپ ؐ ہلاک ہو جائیں۔ لیکن شیطان لعین، جو شیخ نجدی کے بہروپ میں صدر جلسہ تھے، بولے کہ یہ ترکیب ٹھیک نہیں۔ آپ ؐ کے فدائیوں کو معلوم ہو گا، تو وُہ آپ ؐ کو نکال لے جائیں گے۔

دوسرے نے تجویز پیش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں سے نکال دو۔ جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے۔ شیخ نجدی بولا: یہ تدبیر درست نہیں۔ محمدؐ کی چرب زبانی اور شیریں زبانی اس غضب کا جادو (معجزہ) ہے جس سے ہر جگہ اس کے فدائی پیدا ہو جائیں گے اور پھر وہی خطرہ بدستور قائم ہو جائے گا، جو پیش نظر ہے۔

جب سب اپنی اپنی کہہ چکے، تو ابو جہل بولا: سنو بھائیو! میرا خیال یہ ہے کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک جوان منتخب ہو کر محمدؐ سے لڑے اور تاوقتیکہ اس کو قتل نہ کر لیں، پیچھا نہ چھوڑیں۔ اگر ایسا ہو گا تو خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا۔ اور بنی عبد مناف کو تمام قبائل سے لڑنا دشوار ہو جائے گا۔ یہ تجویز باتفاق صدر جلسہ پاس ہو گئی اور سب اپنی اپنی جگہ تکمیل کی فکر میں مشغول ہو گئے۔

اِدھر تو یہ تجویزیں ہو رہی تھیں، اُدھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام حال آئینہ ہو رہا تھا۔ رتی رتی کی خبریں روح القدس کے ذریعہ سے پہنچ رہی تھیں۔ اُسی وقت ارشاد باری ہُوا، کہ آج آپ بستر استراحت پر، جو روزانہ کی آپ ؐ کی آرام گاہ ہے، آرام نہ فرمائیں اور کسی اپنے فدائی کو اپنی جگہ پر متعین فرما کر جانب یثرب کوچ فرمائیں۔

جب رات ہو گئی، تو باہمی قرارداد کے مطابق مشرکین نے دولت سرائے نبوی ؐ کا احاطہ کر لیا اور مستعد ہو گئے کہ جب آپ آرام فرمائیں، تو آپ ؐ کو شہید کر دیا جائے۔

رسول کریم ؐ نے علیؓ ابن ابی طالب سے فرمایا: علی! مشرکین میرے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ کوئی جان نثار میری جگہ لیٹ جائے۔ تم میرے بستر پر آرام کرو، اور یقین رکھو کہ کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ وقت سخت آزمائش کا تھا اور حضرت مولا علیؓ کا ہی دل گردہ تھا کہ اِس پُرخطر مقام میں سینہ سپر ہو گئے۔

جان دینے کا جو وعدہ تھا تو حاضر ہے یہ سر ۔۔۔ لیجئے آپ کا قرضہ ہے ادا کرتے ہیں

حضرت علیؓ کو بستر پر لٹا کر حضورؐ انور دروازہ سے مشرکین کے قریب میں ہوتے ہوئے گزرے، لیکن کسی نے آپؐ کو نہ دیکھا۔ احادیث میں وارد ہے کہ جاتے وقت سرورِ کائناتؐ نے مشتِ خاک سورہ یٰسین شریف کی نو آیتیں پہلی پڑھ کر کفار پر ڈال دی تھی۔ جس کے اثر سے وُہ آپؐ کو نہ دیکھ سکے: وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینٰھم فھم لا یبصرون ٥ بعض نے سورہ بنی اسرائیل کی پینتالیسویں آیت کو بھی یٰسین کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے واذا قرأت القرآن جعلنا بینک وبین الذین لا یؤمنون بالاخرۃ حجابا مستورا ٥ بہرحال آپؐ بچ کر نکل گئے۔ کچھ دُور تشریف لے جانے کے بعد آپؐ کو ایک کافر ملا۔ لیکن وُہ اپنے کو تنہا سمجھ کر آپؐ کا مقابل نہ ہُوا اور دوڑا ہُوا اس جماعت کے پاس پہنچ کر بولا۔ تم یہاں کس لئے کھڑے ہو۔ تمہارا شکار تو یہاں سے چل دیا۔ یہ سنتے ہی اوّل تو وُہ لوگ سٹ پٹائے، لیکن روزنِ مکان سے دیکھا تو بستر پر کسی کو سوتے ہوئے پایا۔ نہایت خوش ہوئے اور دراتہ اندر گھس گئے۔ جب حضرت علیؓ کو کفار نے شور و شغب سے جاگ اٹھتے پر دیکھا، تو یہ لوگ سخت متعجب ہوئے اور سختی کے ساتھ حضرت مولاؓ سے رسول انورؐ کی بابت دریافت کرنے لگے، تو آپ نے فرمایا: واللہ اعلم برسولہ کیا تم مجھے نگہبانی پر بٹھا گئے تھے، جو مجھ سے پوچھتے ہو۔ یہ سُن کر وہ تمام لوگ کھسیانے ہو گئے اور حضرت مولاؓ کو قید کر لیا۔ اس پر ابولہب نے کہا: دیوانو! جاہلو!! بھلا علیؓ کے قید کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟ یہ تو خود تمہاری نگاہوں کا قصور ہے

حضورِ انورؐ یہاں سے صدیق اکبرؓ کے مکان پر پہنچے۔ ایسے وقت تشریف آوری سے صدیق اکبرؓ نے گھبرا کر دریافت کیا۔ روحی فداہ خیر تو ہے۔ آپؐ نے ساری کیفیت سنا کر ارشادِ باری سنایا کہ ہجرت کا حکم ہے۔ جھٹ پٹ سامانِ سفر درست کر دیا گیا اور آپؐ صدیق اکبرؓ کی ہمراہی میں غارِ ثور پر تشریف لے گئے۔

یہ راستہ حضورِ انورؐ نے نہایت سختی کے ساتھ کاٹا۔ اس خیال سے کہ کہیں مشرکین عرب پتا نہ لگا لیں۔ حضورِ انورؐ نے جُوتے اتار ڈالے تھے، جس سے حضورؐ کے پائے مبارک میں آبلے پڑ گئے اور خون بہنے لگا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب حضورؐ کی یہ حالت دیکھی، تو آپ سے نہ رہا گیا اور اپنے کندھوں پر جنابؐ کو بٹھا کر غارِ ثور پہنچایا۔ غارِ ثور مکہ سے دکھن کی سمت ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس تھوڑے سے سفر میں چھالے اور زخموں تک کیوں نوبت پہنچا دی۔ لیکن نہیں، جو شخص ایسی اندیشناک حالت میں رات کے وقت جنگل کا اور جنگل بھی خار آلود، کا سفر کرے اور جس کو اپنی عمر کے حصہ میں کبھی ایسی حالت نہ پیش آئی ہو، اگر اس سے زیادہ اسے تکلیف پہنچی، تو تعجب نہیں۔

درِ غار پر حضورِ انورؐ کو کھڑا کر کے صدیق اکبرؓ خود اندر گئے اور اس تاریک گڑھے کو ہاتھوں سے صاف کیا تمام سوراخوں کو اپنی قیمتی چادر پھاڑ پھاڑ کر بند کر دیا۔ ایک سوراخ جو رہ گیا تھا، اس کو پیر کے انگوٹھے سے بند کر کے حضورِ انورؐ کو آواز دی کہ اب جنابؐ تشریف لے آئیں۔ اس سوراخ میں سے کئی زہریلے جانوروں نے آپ کو کاٹا، جن کے اثر سے آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ جب حضورِ انورؐ نے صدیق اکبرؓ کی یہ حالت دیکھی تو دعا فرمائی اور آبِ دہن اس مقام پر لگا دیا، جس سے زہر کا اثر اور تکلیف جاتی رہی۔ غار میں مشرکین کے خیالات اور ارادے عبداللہ بن ابوبکر کی معرفت آپؐ کو معلوم ہوتے تھے اور خورد و نوش کا انتظام عامر بن فہیرہ کے متعلق تھا جو رات کو بکریوں کا دودھ پہنچایا کرتے تھے۔

تین دن کے قیام کے بعد حسبِ قرار داد عامر ابن ہیرہ اور عبداللہ ابن اریقط اونٹ ورغار پر لے آئے۔ ایک اونٹ پر صدیق اکبرؓ اور رسول کریمؐ اور دوسرے پر عامر و عبداللہ سوار ہو کر ساحل کے راستہ سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ ایک دن ایک رات کہیں قیام نہ کیا۔ دوسرے دن دھوپ کی تیزی اور ریگستانی میدان کی تپش سے مجبور ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدیق اکبرؓ نے ایک پتھر کی آڑ میں زمین صاف کر کے اپنا پوستین بچھا کر آرام کے لئے عرض کیا۔ تھوڑی دیر آرام فرما کر حضورؐ اور پھر وہاں سے عازم سفر ہوئے۔

اس دردانگیز سفر میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ سراقہ ابن مالک جو مشرکین کا اعلان حضورؐ کی گرفتاری اور انعام کو سن چکا تھا اور جس کو ایک مسافر کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ فلاں راستہ سے تین مسافر جا رہے ہیں اور جس نے قیاساً سمجھ لیا تھا کہ درحقیقت یہ مختصر قافلہ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کا ہے۔ جنابؐ کے تعاقب میں چلا۔ اس کا بیان ہے کہ جب میں اس مختصر قافلہ کے قریب پہنچا، میرے گھوڑے نے چراغ پا ہو کر مجھے پٹک دیا۔ چونکہ مجھے چوٹ نہیں آئی تھی، اُٹھ کر پھر سوار ہو گیا حتیٰ کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا اور آپؐ کی گفتگو کو جو آپؐ صدیق اکبرؓ سے فرما رہے تھے، میں سننے لگا۔ میں نے تیر مارنے کا ارادہ کیا لیکن ساتھ ہی میرے گھوڑے کے اگلے پیر زمین میں دھنس گئے اور میں گر پڑا چونکہ چوٹ اب کی مرتبہ بھی نہیں آئی تھی، گھوڑے پر سوار ہو کر چاہا کہ اس کو آگے چلاؤں، ممکن نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر میں نے کہا کہ یا محمدؐ آپ پر حملہ کرنے کی وجہ سے مجھ پر یہ مصیبت پڑی ہے۔ دعا کیجئے کہ میں اس سے نجات پاؤں۔ جنابؐ نے کچھ التفات نہ کیا۔ جب میں نے قسم کھائی کہ میں آپؐ کے ساتھ دغا نہ کروں گا اور اپنے بے زبان گھوڑے کی ہلاکت کا عذر کیا تو آپؐ نے فرمایا؛ اللھم ان کان صادقا فاطلق فرسہ فوراً میرے گھوڑے کے پیر زمین سے نکل آئے۔ میں نے اپنے موجودہ مال و متاع کو پیش کیا، کہ آپؐ اس کو قبول فرمالیں۔ لیکن آپؐ نے اس کو محض بے ضرورت بتایا اور میری التماس پر ایک امان نامہ مجھے لکھ کر دے دیا۔ امان نامہ لے کر میں واپس ہوا اور جو شخص مجھے ملا، اس سے کہہ دیا کہ میں دُور دُور تلاش کر آیا، کہیں پتا نہیں اور یہ تمام تلاش کرنے والوں کو واپس کر دیا۔

امام بخاری اس روایت کو لکھ کر کہتے ہیں کہ سراقہ نے اس امان نامہ سے جنگِ حنین میں فائدہ اٹھایا تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔

دوسرا واقعہ ام معبد بنت خالد خزاعی کا ہے، جو مسافروں کی خاطر داری کیا کرتی تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے، تو قحط کا زمانہ تھا اور اس کی بکریاں کچھ مر چکی تھیں اور جو ایک آدھ تھی، وہ مرنے کے قریب تھی۔ دودھ دینا تو کجا۔ آپؐ نے اس بکری سے جو کسی صورت سے دودھ دینے کے قابل نہ تھی، دودھ دوہا اور اپنے اصحاب کو پلا کر خود پیا اور ام معبد کے برتنوں کو بھی دودھ سے بھر دیا۔

تیسرا واقعہ بریدۃ بن الخصیب الاسلمی کا ہے، جو حضور انورؐ کی تلاش میں نکلے تھے اور قریب پہنچنے پر آپؐ کی معجز بیانی کے اثر سے بجائے حملہ کرنے کے مسلمان ہو گئے تھے اور مدینہ تک علم برداری کی خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔

اس سے آگے صدیق اکبر کے عزیز طلحہ یا باختلاف روایات زبیر ابن عوام کا قافلہ ملا، جو آپؐ کے ساتھ مدینہ جانا چاہتا

تھا۔ مگر آپؐ نے یہ کہہ کر کہ تم مکہ ہو کر مدینے آؤ تاکہ مہاجرین کی صف میں شامل ہو جاؤ، ان کو واپس کر دیا۔ راستہ میں حضورؐ انور نے بادِ صرصر کے گرم جھونکوں اور ریگستانی زمین کی تپش سے بہت تکلیف پائی۔ جب سواد مدینہ نظر آنے لگا اور وہاں کے باغات عمارتیں، چھوٹے چھوٹے مکانوں کا سلسلہ پیش نظر ہوا تو آپؐ بہت خوش ہوئے۔

کاتب الواقدی لکھتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس راستہ سے سفر نہیں کیا تھا، نہ آپؐ کو زیادہ تر لوگ پہچانتے تھے، اس لئے بھی جیسا چاہیئے تھا آپؐ کا سراغ نہ مل سکا۔

اہل مدینہ کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا اور وہ لوگ روزانہ شہر سے باہر آ کر ان توحید کی منادی کرنے والے مسافروں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ جس دن حضورؐ مدینہ میں داخل ہوئے ۱ھ ۸ ربیع الاول ۶۲۲ء تھی۔

اہل مدینہ نے آپؐ کی تشریف آوری پر بے انتہا شادمانی کا اظہار کیا اور ہر طرح جان و مال سے ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے لوگ ناواقف تھے، اس لئے بعض کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے جس طرف سورج کی شعاعیں پہنچ رہی تھیں، آپؐ کو کھڑا کر دیا۔ چونکہ ذات اقدس واطہر کا سایہ نہ تھا، عام لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ آپؐ رسول خدا ہیں۔

آپؐ کا اصل قیام تو کلثوم ابن الہدمی کے مکان پر تھا لیکن عام نشست کے لئے ابو سعد بن خیثم کا مکان بوجہ اس کے مکان مردانہ ہونے کے تجویز کیا گیا تھا۔ یہ مکان محلہ قبا میں تھا۔ جس میں سب سے پہلے حضورؐ نے مسجد کی بنا ڈالی۔ اس مسجد کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (توبہ ۱۰۸)۔ اور یہیں حضرت مولاؓ مکہ سے چھپ چھپا کر پیادہ پائی کی تکلیفیں اٹھاتے ہوئے پہنچے تھے۔

(اختلافِ روایات کو پیش نظر رکھ کر) دس روز یا آٹھ روز یا بیس روز کے بعد جنابؐ نے (شہر خاص) مدینہ کی جانب چلنے کی تیاری کی۔ اور مدینہ پہنچ کر ابو ایوب انصاری کے مکان پر قیام فرمایا۔ جس روز حضورؐ مدینہ پہنچے، جمعہ کا دن تھا اور یہی پہلا جمعہ تھا، جو آپؐ نے خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ ادا کی۔

قیام کی بابت ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہ شرف بخشیں۔ لیکن آپؐ نے فرما دیا تھا کہ میرا ناقہ مامور ہے، جہاں یہ قیام کرے گا، وہیں میرا قیام ہے۔ چنانچہ ناقہ کا پہلا قیام اس مقام پر ہوا، جہاں مسجد نبویؐ ہے اور دوسری مرتبہ وہاں جا کر بیٹھا، جہاں منبر شریف ہے۔ سب سے زیادہ قریب اس مقام سے ابو ایوب انصاری کا مکان تھا۔ جہاں آپؐ نے قیام فرمایا۔

اسی مقام پر عبداللہ ابن سلام جو مشاہیر علمائے یہود اور اولاد حضرت یوسفؑ سے تھے آ کر مشرف باسلام ہوئے۔ ہجرت کے پہلے ہی سال مسجد نبویؐ کی بنیاد پڑی۔ اسی سال اذان کا حکم ہوا۔ اسی سال بیت المقدس سے کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

مسجد نبویؐ کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحابؓ نے اینٹیں اور گارا ڈھو کر بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ مسجد تمام مساجد عالم سے زیادہ بزرگ اور قابل تعظیم مانی جاتی ہے۔

حیاتِ نبویؐ میں غاروں کی اہمیت

سید جلال حامدی

ابتدائے آفرینش سے آج تک انسان کی طبیعت یہ چاہتی رہی ہے کہ اس کو راحت وسکون میسر آئے۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اکثر انبیاء و رسل نے تلاش سکون اور یکسوئی قلب کے لیے پہاڑوں یا کوہستانی غاروں میں پناہ لی۔ انسان نے سب سے پہلے غاروں ہی کو اپنا پہلا مسکن بنایا تھا اور ان سے انسان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔

پہاڑوں کو تراش کر اپنے معبد اور رہائش گاہیں بنانے میں فراعنہ مصر کو بہت شہرت ہوئی اور آج بھی ان کی عظیم یادگاریں موجود ہیں، جو عجائبات میں شمار ہوتی ہیں۔ قرآنِ پاک نے بھی فرمایا ہے کہ "وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر رہتے تھے"۔ اس طرح ہندوستان اور چین کے رشی منی، اوتار بھی پہاڑوں میں گوپھائیں بنا بنا کر رہتے اور گیان دھیان میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت آدمؑ کی جب توبہ قبول ہوئی تو "جبل رحمت" پر ہی حضرت حوا سے ان کی ملاقات ہوئی اور اسی کی یادگار وہ جگہ ہے جس کا نام "عرفہ" یا "معرفت" یعنی پہچان کی جگہ ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی "ارارط" پہاڑ پر جا کر رکی تھی۔ سیدنا موسیٰؑ کو کوہ طور پر ہی تجلی و کلام کا شرف عطا ہوا تھا۔ غرض پہاڑوں کا انسان کی روحانی عظمت و رفعت کی داستان سے بھی گہرا تعلق ہے۔ قرآن پاک میں یارانِ غار (اصحاب کہف) کا تذکرہ دیکھیے۔ سورہ کہف (یعنی غار والی سورۃ) میں فرمایا گیا ہے کہ اصحاب کہف چند صالح اور نیک مرد تھے۔ ان کے زمانہ میں دقیانوس نامی کوئی بادشاہ تھا۔ یہ بڑا ظالم بھی تھا اور شرک کا بھی مرتکب تھا۔ لوگوں سے جبراً بتوں کی پوجا کراتا اور جو نہ مانتا، اسے سنگسار کرا دیتا تھا۔ مگر یہ لوگ شرک و بت پرستی سے بیزار ہو چکے تھے اور بادشاہ کے خوف سے ایک غار میں پناہ کے لیے چلے گئے تھے۔

خدا تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی اور ان کے لیے غار میں مکمل حفاظت کا انتظام کیا۔ اس غار میں نہ کوئی اندر جا سکتا اور نہ بارش یا دھوپ ان کو پریشان کر سکتی۔ یہ لوگ قیامت تک اسی غار میں سوتے رہیں گے۔ خدا کے عظیم پیغمبر سیدنا عیسیٰؑ نے بھی بیت المقدس میں کوہ زیتون کی ایک کھوہ میں قیام فرمایا اور وہیں تبلیغ فرماتے تھے یہاں سے ہی آپ کو یہودیوں نے سولی پر چڑھانے کے لیے گرفتار بھی کیا تھا۔ مگر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک ایسے ہادی کی ضرورت تھی جو تمام کائنات کے لیے آخری پیغمبر ہو۔ چونکہ ابھی تک اللہ کے پیغمبر اپنی اپنی آبادیوں میں جماعتوں گروہوں اور برادریوں کی ہدایت کے لیے آتے رہتے تھے، لیکن دنیا کو اب ایسے ہادی کی ضرورت ہو چکی تھی، جو ان تمام ہدایتوں کا جامع ہو۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف جہالت، گمراہی نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا، حالانکہ اس وقت کی دنیاوی ترقی کے لحاظ سے لوگ بہت آگے تھے مگر پھر بھی وہ روحانی ترقی کے معاملہ میں پیاسے تھے یا بھٹکتے ہوئے۔ خود عرب میں معاشرہ کی حالت یہ تھی کہ بت پرستی عام تھی اور وہی ہر برائی کی جڑ تھی۔ عرب کے باشندوں پر ان کی اپنی خود مختاری نے بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس خود مختاری سے خود سری اور سرکشی پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنی شجاعت اور جرأت کا نشانہ خود اپنے ہی بھائیوں کو بنا رکھا تھا۔ بیکاری، کاہلی، جوا، شراب عام تھی۔ غیر ممالک سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے ان کی زبان بے شک بڑی فصیح تھی مگر اس فصاحت کا استعمال زیادہ تر خود ستائی اور اپنے فحش کارناموں کے اظہار کے لیے وقف تھا۔ الگ رہنے کی وجہ

سے معاہرت (سسرالی رشتے) کی برائیاں غلط طور پر ان کے ذہنوں پر مسلط ہو چکی تھیں۔ مدعیان شرافت بڑی دیدہ دلیری اور فخر سے اپنی بیٹیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ جہالت نے بت پرستی کو پیدا کیا اور اس نے وساوس و توہم کو۔ دنیا اس گمراہی اور تاریکی میں گھری ہوئی تھی۔ کہ آفتاب ہدایت طلوع ہوا۔

ربیع الاول کے مہینے میں دوشنبہ کے مبارک دن یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ابتدائی عمر حضرت حلیمہؓ سعدیہ کے ہاں صحرا نشینی، گلہ بانی میں گزری تاکہ قوت عظمت اور جہاں بانی کی صلاحیتیں پیدا ہوں۔ چار سال کے بعد واپسی ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں حضرت آمنہؓ جیسی عظیم ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر دنیا میں آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا سایۂ عاطفت موجود تھا۔ ماں کے دو سال بعد مقدس بزرگ دادا نے بھی رفاقت دنیا چھوڑ دی تو حضرت ابوطالب نے اس عظیم الشان امانت کو سنبھالا اور جواں مرگ بھائی کی موت کا صدمہ اس نورانی بھتیجے کو دیکھ کر دور ہوتا چلا گیا۔ آپؐ کی عمر بارہ سال کی تھی کہ چچا کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام بھی تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آپ نے بصرہ و یمن کے بھی متعدد سفر فرمائے۔

کون ایسا باکمال مصور ہوگا، جو اپنے موئے قلم سے اس پاکباز، پارسا، باحیا، خوش شکل نوجوان کے کردار کی عظمت، حشمت، امانت، وجاہت، جلالت کی صحیح تصویر کھینچ سکے۔ آپؐ کے حسنِ معاملہ اور مستعدی کو دیکھ کر حضرت خدیجہؓ نے شریکِ زندگی بننے کا اظہار فرمایا۔ خدا پر ایمان اس عظیم الشان رسُول کی جان تھی۔ کفر و شرک کی رسموں سے پرہیز ان کی سرشت میں تھا۔ حضورؐ کے سامنے ایک عظیم الشان انقلاب لانے کا کام تھا اور حضورؐ برابر اس مقدس مشن کے لیے کام کر رہے تھے اور دنیا میں ایک نئے معاشرہ کو جنم دے رہے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت سے سات برس پہلے ایک روشنی اور چمک سی نظر آنے لگی تھی اور آنحضرتؐ اس روشنی کے معلوم ہونے سے خوش ہوا کرتے تھے۔ اس چمک میں کوئی آواز یا صورت نہ بھی نہ ہوتی تھی۔ بعثت کا زمانہ جس قدر قریب ہوتا گیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مزاج میں خلوت گزینی کی کشش بڑھتی گئی۔ آپ راتوں کو ایک غار میں چلے جاتے۔ یہ غار مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے اور جبل نور کی بلندی سے ذرا نیچے اتریں تو کعبہ شریف کی جانب ایک غار ہے۔ اس غار کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز کے قریب ہے۔ غار کے قبلہ کی سمت ایک لمبا سا شگاف بھی ہے، جس میں سے کعبہ صاف نظر آتا تھا۔ حضورؐ اس غار میں اکثر زمزم اور ستو وغیرہ لے کر تشریف لے جاتے اور عبادت میں وقت گزارتے۔ اس عبادت میں تحمید و تقدیس الٰہی کا ذکر شامل ہوتا۔ اور قدرت الٰہیہ پر تدبر و تفکر بھی۔ جب تک پانی اور ستو ختم نہیں ہوتے، شہر میں تشریف نہ لاتے۔ غار حرا کی ان سکوت زا تنہائیوں کی کیفیتوں کا صحیح علم تو نبی ہی کو ہو سکتا ہے۔ مگر آج بھی ہم جیسے گناہ گار اور ناچیز اُمتیوں کو اس غار میں ایک عجیب شان اور عجیب سکون اور رحمت کا احساس حاصل ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس غار کو حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے نسبت رہی ہے۔

غار حرا میں پہلی وحی

عرب کا روشن ضمیر آقا، غار حرا کی تاریکیوں میں نور کی جھلک دیکھنے لگا۔ اس کے خواب سچے اور الہام صحیح ثابت ہونے لگے پانچ برس تک یہی کیفیت رہی، مگر آپ کی روح اس سے زیادہ بلندی و رفعت کی طلب گار تھی اور وہ جوہر قابل براہ راست، اکتساب علم کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔ اس لیے عمر کے اکتالیسویں سال ۱۲ ر فروری ۶۱۰ء کو اسے وہ منصب جلیل عطا ہوا جس کا اہل اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لیلۃ القدر کی اس سعید ساعت کو خدا کا پیامی جبرائیلؑ دنیا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غار حرا میں اللہ کا پہلا پیغام لے کر آیا اور آتے ہی کہا۔

اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق ○ اقرا وربك الاكرم الذی

علم بالقلم ۝ علم الانسان مالم یعلم ۝

(پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ پڑھ تیرا خدا کریم ہے، وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہیں تھیں)

روایت ہے کہ جب جبرئیلؑ غار حرا میں ظاہر ہوئے تو کہا "پڑھ"۔ آپؐ نے فرمایا "میں تو پڑھنا نہیں جانتا"۔ تب حضرت جبریلؑ نے آپ کو سینے سے لگا کر خوب زور سے دبایا اور پھر وہی الفاظ دہرائے۔ مگر پھر وہی جواب پایا۔ پھر اسی طرح دبایا۔ غرض تیسری مرتبہ جواب سننے کے بعد حضرت جبریل نے پانچ آیتیں پڑھیں۔ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے اور لیٹ گئے۔ حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو۔ چنانچہ کمبل اڑھا دیا گیا۔ جب کچھ دیر بعد ذرا سکون خاطر ہوا، تو آپ نے خدیجۃ الکبریٰؓ کو غار حرا کی سرگزشت من وعن کہہ سنائی اور کہا مجھے جان کا خوف ہے۔ بیوی جس کی نظر خاوند کے بلند اخلاق پر تھی، پکار اٹھیں کہ یہ واقعہ آپ کو مبارک ہو۔ خدا ہرگز آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ قرابت داروں سے حسن سلوک کرتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ فقیروں مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، مسافروں کی مہمانی فرماتے ہیں۔ اچھے کام کرنے والوں کے مددگار ہیں، خدا آپ کو کبھی اندوہگیں نہ کرے گا۔ اب خدیجۃ الکبریٰؓ کو خود بھی اطمینان قلب کی ضرورت ہوئی۔ اس لیے وہ نبیؐ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں، جو بڑھاپے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اور کہا۔

"اے بھائی! اپنے بھتیجے کا ماجرا سُن"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا کا واقعہ سنایا تو ورقہ بن نوفل نے کہا، یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا۔ اے کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں، جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دے گی اور کہا۔ ہاں جس کو لے کر تم آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو۔ اگر اس زمانہ تک زندہ رہا، تو تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔ افسوس یہ روشن قلب بزرگ جلد ہی فوت ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوف کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ ان معاملات کی ابتدا، اور بشریت کے تقاضے کے باعث تھا، کون نہیں جانتا کہ ایک نامعلوم وادی میں پہلا قدم کس قدر جھجک پیدا کرتا ہے۔ پھر غار کی تاریکی میں فرشتے کا زور زور سے بھینچنا سوائے خوف کے اور کیا کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ یہ واقعہ بھی آنحضرتؐ کی سچائی کی دلیل ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر فرشتہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، جنہوں نے ابھی تک پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ خدا کا وہ پاک نام اور کلام پڑھایا، جو سارے علموں کی کنجی اور ساری حقیقتوں کا خزانہ ہے۔

اس کے بعد روح الامین کوہ میں آئے اور نبیؐ کے سامنے خود وضو کیا اور حضورؐ نے بھی وضو کیا۔ دونوں نے مل کر نماز پڑھی اور روح الامین نے نماز پڑھائی۔ حضرت جبریلؑ کے ظہور اول کے بعد چھ ماہ تک کوئی آیت نہیں اتری۔ وحی کے التوا کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ رہا۔ اس کو زمانہ "فترت" کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی حضرتؐ برابر غار حرا میں جاتے رہے اور شبستان دل کو نور حق سے منور کرتے رہے۔ طالب صادق کے امتحان کی یہ اول منزل ختم ہو گئی۔ تو ایک دن پھر جب کہ حضورؐ غار حرا سے نکل کر گھر آ رہے تھے، اس فرشتے کا ظہور ہوا۔ آپ پر وہی کیفیت پھر طاری ہوئی مگر تھوڑی دیر میں مکان پر پہنچ کر کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اتنے میں کان میں یہ پر جلال آواز آئی۔

یاایہا المدثر ۝ قم فانذر ۝ وربک فکبر ۝ وثیابک فطہر ۝ والرجز فاہجر ۝

(اے چادر اوڑھنے والے! اٹھ اور ان لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا اور اپنے رب کی بڑائی اور کبریائی بیان کر۔ اپنے کپڑوں کو پاک کر، نجاست یعنی شرک و بدی سے جدائی اختیار کر)

غور فرمائیے پہلی وحی میں عطائے علم کی بشارت تھی، اس وحی میں اشاعتِ دین کا حکم ہوا۔ یہ دینی وحی تھا۔

جب تبلیغ دین کا حکم پایا، تو سب سے پہلے گھر سے ہی اس کارِ خیر کو شروع کیا۔ سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰؓ نے دعوت اسلام قبول فرمائی، پھر حضرت علیؓ اور حضورؐ کے غلام حضرت زیدؓ نے دین کی دولت پائی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو یہ عزت نصیب ہوئی جو حضورؐ کے نور سے پہلے ہی مستنیر تھے، وہی پہلے آپ کی صداقت کے قائل ہوئے پھر رفتہ رفتہ حضرت ابوبکرؓ کی سعی و کوشش سے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ فاتح ایران اور حضرت طلحہؓ ایمان لائے۔ ان کے علاوہ حضرت عمارؓ، خباب بن الارتؓ، ارقمؓ، سعد بن زیدؓ، عثمان ابن مظعونؓ، عبیدہ ابن جراحؓ، صہیب رومیؓ السابقون الاولون میں سے ہیں۔

اسلام چونکہ امن و سلامتی کا مذہب ہے، اس لیے شر و فساد کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس احتمالِ شر کے پیشِ نظر، توحید و رسالت کی تبلیغ کو ابتدا میں عام نہ کیا۔ اس خاموش تبلیغ سے جو تین برس سے ہو رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ میں مومنین اور مخلصین کی تعداد (مستورات سمیت) کل چالیس جانوں سے زیادہ نہ تھی۔

اب چوتھے سال یہ حکم آیا۔

"فاصدع بما تومر"

(اور جو کچھ تجھ کو حکم دیا گیا ہے، وانشگاف کہہ دے)

جونہی یہ حکم آیا، آپ نے کوہِ صفا کی چوٹی پر چڑھ کر پکارا "اے اہلِ قریش دوڑو۔" لوگ حسبِ دستور اس کو یقینی خطرہ کا نشان سمجھ کر دوڑ پڑے جب سب جمع ہو گئے، تو آپ نے دنیا و آخرت کا حقیقی خطرہ بطورِ استعارہ یوں بیان فرمایا کہ میں اگر تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب میں، ایک لشکرِ جرار تمہاری گھات میں ہے، تو کیا تم میری بات کا یقین کر لو گے۔ سب نے کہا۔ ہاں کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپ کو سچ بولتے سنا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو سخت عذاب نازل ہو گا۔

لوگ اسے بے حقیقت بات سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے اور گالیاں دیتے رہے اب دشواریوں کے سخت مقابلہ کا وقت آ گیا۔ حضورؐ پر اور حضورؐ کے عشاق پر طرح طرح کے ظلم و ستم ہونے شروع ہوئے جس کے بیان کرنے کا یارا نہیں۔ آپ کا دشمن اول ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط اور اس کے ساتھی تھے، جب مشرکوں اور کافروں کے جبر و تشدد کو مسلمانوں پر سہتے ہوئے پورے پانچ برس ہو گئے، تو آنحضرتؐ نے مومنین کی اس جماعت کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور مہاجرین کی یہ پاک جماعت مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی۔

تکالیف و مصائب کا لامتناہی سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا کہ نبوت کے دس سال پورے ہوئے۔ حضورؐ کے عظیم تدبر کے شاہسوار، محسن عاشق، چچا سید ابوطالب بھی سفرِ دنیا طے کر گئے۔ حضورؐ پر اس صدمہ جانکاہ کا حال بیان سے باہر ہے۔ ابھی حضرت ابوطالب کا کفن میلا بھی نہ ہوا تھا کہ حضورؐ کی پرستار، حضورؐ پر سب کچھ قربان کر دینے والی، شریکِ حیات سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ بھی اس دنیا سے سدھار گئیں۔

اب قیاس کیجئے ان دو صدموں سے حضورؐ کے لیے دنیا کیسی اندھیر ہو گئی ہو گی۔ چنانچہ اس وجہ سے تاریخ اسلام میں اس سال کو عام

حزن یا سال غم کہتے ہیں۔ انہی گھنگھور مایوسیوں میں امید کی پہلی کرن پھوٹی کہ آنحضرتؐ ایامِ حج میں تبلیغ دین فرماتے لوگوں کے درمیان میں سے گزر رہے تھے کہ چند سعید و منور روحیں حضورؐ کو نظر آئیں۔ آپ نے ان کا حسب و نسب پوچھا، معلوم ہوا کہ مدینہ (پاک) کے رہنے والے، بنی خزرج (قبیلہ) کے لوگ ہیں۔ حضورؐ نے ان کو دعوت دی، کلامِ پاک سنایا۔ یہ لوگ تہی دست آئے تھے، اب دامنوں کو دولتِ ایمان سے بھر کر واپس ہوئے ادھر کفارِ اسلام کے قلوب تبلیغ دین کی اس کامیابی سے مارے غصّے کے پھنک رہے تھے۔ وہ سخت پیچ و تاب میں رہتے تھے اور اس طرح تقریباً ایک سال بیت گیا۔ پھر دوسرا حج آ گیا، پھر اہلِ مدینہ سے چند بزرگ پرنور ہستیاں آئیں۔ نور سے منوّر ہو کر واپس مدینہ گئیں اور حضورؐ نے ان کو تبلیغ کا حکم دے دیا کہ وہ بھی باقاعدہ تبلیغ کریں۔ حضورؐ نے اہلِ مکہ کی ایذا رسانی کے پیشِ نظر نقل مکانی کا عمومی حکم دے دیا۔ مدینہ کے مسلمان ہر چند کہ تنگ دست تھے مگر انہوں نے مظلوموں اور مہاجرین کی دل کھول کر امداد کی جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ لوگ آہستہ آہستہ سب خطروں سے نکل کر دارالامان مدینہ پہنچ گئے لیکن سالارِ قافلہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ آخر ان بڑی بڑی آزمائشوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا خاص انعام جو کسی دوسرے رسول و نبی کو نہیں ملا۔ وہ واقعہ معراج پیش آیا اور رب احکم الحاکمین کے حکم کا انتظار تھا۔ قریش بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ مسلمانوں کو ہجرت نہ کرنے دیں۔

اب آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ تھے۔ کفار نے اپنی ایک فیصلہ کن مجلسِ مشاورت طلب کی۔ اس جلسہ کا سرغنہ ابوجہل تھا۔ مقصود یہ تھا کہ ہر قبیلے سے ایک شخص لیا جائے اور سب یکبار سرکارِ دو عالم رحمۃ للعالمینؐ پر ٹوٹ پڑیں اور اس شمع کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیں۔ اس وجہ سے سرِ شام ہی تمام گھات میں کھڑے ہو گئے کہ جونہی صبح حضورؐ گھر سے نکلیں، سب تلواریں سونت کر ٹوٹ پڑیں۔ مگر اعداد کے اس منصوبے سے قبل ہی پروردگارِ عالم نے اپنے محبوبؐ کو ہجرت کا حکم عنایت فرما دیا تھا۔ ہجرت سے دو روز پہلے یہ حکم پا کر سردار الانبیاؐ لوگوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے دوپہر کے موزوں وقت صدیق اکبرؓ کے گھر پر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پیشوائی فرمائی۔ آنحضرتؐ نے تخلیہ میں ابوبکرؓ کو نوید ہجرت سنائی۔ نہ معلوم کب سے حضرت ابوبکرؓ ہمرہی کے شرف کے لیے بارگاہ ایزدی میں دعائیں فرما رہے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت انہی کے لیے وقف فرمائی۔ آپؓ نے فرمایا کہ میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، کیا شرف ہمرہی مجھ کو عطا کیا جائے گا؟ حضورؐ نے فرمایا "ہاں" اس شرفِ عظیم پر صدیق اکبرؓ فرطِ انبساط سے رو پڑے

حضرت ابوبکرؓ نے نہایت عجز سے عرض کیا، کہ اس مبارک دن کے لیے میں نے ببول کی پتیاں کھلا کر دو اونٹنیاں پال رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک حضورؐ پسند فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں۔ حضورؐ نے ایک کی قیمت ان کو عطا فرما دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے پاسِ ادب سے قیمت قبول کر لی۔

ہر چند کہ ظالم کفار نے اپنی اس سازش کو بہت زیادہ راز میں رکھا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ پر سب کچھ منکشف فرما دیا تھا۔ آنحضرتؐ کو اُس رات مکہ سے نکل جانے کا حکم مل چکا تھا۔ اس لیے حضرت علیؓ کو طلب فرمایا اور کہا "علیؓ ہمیں ہجرت کا حکم آ گیا ہے۔ تم میرے بستر پر میری چادر اوڑھ کر سو جانا اور صبح کو سب کی امانتیں دے کر تم بھی چلے آنا۔"

سیّد لولاک اس وقت بھی امانت کی حفاظت کے لیے بے چین تھے۔ اس لیے تمام امانتیں حضرت علیؓ کو سپرد کر دیں۔ آج کی رات آنحضرتؐ کے بستر پر سونا موت کے منہ میں جانا تھا، مگر جناب علیؓ اسد اللہ تھے اور جرأت و رجالت کے پیکرِ عظیم اس خطرہ کے باوجود جناب امیرؓ حضورؐ کے بستر پر سو گئے۔ ادھر جھٹ پٹے سے ہی دشمن گھات میں آ بیٹھے تھے۔ آنحضرتؐ آدھی رات کو اللہ کا نام لے کر باہر نکلے۔ حضورؐ کی موت کے خواہاں خود موت کی چھوٹی بہن نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ آنحضرتؐ سورۂ یٰسین تلاوت فرماتے ہوئے بغیر کسی مزاحمت کے صاف نکل گئے، کسی نے بھی

علیہ السلام کو جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ واقعہ ۲۷ صفر روز پنج شنبہ کا ہے یعنی ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء۔

خدا کے برگزیدہ نبیؐ اپنے پیارے دوست ابوبکرؓ کے گھر پہنچے۔ انہوں نے جلد جلد سفر کا سامان تیار کیا۔ شب کی تاریکی میں دونوں بزرگ چل پڑے۔ مکے سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر کوہ ثور ہے۔ اس کی بلندی بہت زیادہ ہے اور راستہ بہت سنگلاخ۔

نکیلے پتھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کو زخمی کر رہے تھے اور ٹھوکر لگنے سے تکلیف بھی ہوئی تھی۔ ابوبکرؓ نے حضرتؐ کو اپنے کندھے پر اٹھایا اور آخر ایک غار تک پہنچے۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کو باہر ٹھہرایا اور خود اندر جا کر غار کو صاف کیا۔ اپنے تن کے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر غارِ ثور کے تمام سوراخ بند کر دیئے۔ ایک سوراخ باقی رہا تھا۔ اس میں اپنا انگوٹھا پھنسا دیا اور حضور انور علیہ السلام سے عرض کیا کہ یا نبیؐ تشریف لے آئیں۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے زانو پر سر اقدس رکھ کر آرام فرمایا۔ اس غار میں ایک سانپ زیارت اقدس کا مشتاق تھا۔ اپنا سر صدیق اکبرؓ کے پاؤں پر ملا۔ انہوں نے اس خیال سے کہ جان جائے مگر اپنے محبوب رسولؐ کی نیند میں خلل نہ آنے پائے۔ اپنا پاؤں وہاں سے نہیں ہٹایا۔ آخر اس نے پاؤں میں کاٹ لیا۔ ہر سال وہ زہر عود کر آتا۔ آخر اس سے ہی آپ نے شہادت پائی۔

صبح ہوئی حضرت علیؓ حسبِ معمول خواب سے بیدار ہوئے۔ قریش نے قریب جا کر پہچانا۔ پوچھا محمدؐ کہاں ہیں؟ علیؓ نے جواب دیا مجھے کیا خبر؟ کیا میرا پہرا تھا؟ قریش نے غصّہ میں حضرت علیؓ کو مارا اور گھسیٹ کر خانہ کعبہ تک پکڑ لائے۔ پھر تھوڑی دیر ایک جگہ بند رکھا اور پھر چھوڑ دیا اب وہ ابوبکرؓ کے گھر آئے۔ دروازہ دھڑ دھڑایا۔ اسماءؓ نکلیں۔ ابوجہل نے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ بخدا مجھے نہیں معلوم کہاں ہیں۔ ابوجہل نے اسماءؓ کے منہ پر زور سے تھپّڑ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔ یہاں سے سراغ لگاتے لگاتے وہ لوگ غار ثور کے منہ پر پہنچ گئے۔ ان کے پاؤں کی آہٹ پا کر یارِ غار کو تشویش لاحق ہوئی۔ جو تقاضائے بشریت تھا۔ کہا حضورؐ دشمن سر پر آپہنچا ہے۔ صدیق اکبرؓ سرتاپا اضطراب تھے مگر سرکارِ دو عالمؐ ہمہ تن اطمینان۔ جب حضرت ابوبکرؓ کا اضطراب زیادہ بڑھتا ہوا پایا، تو حضورؐ نے فرمایا۔ صدیق غم نہ کرو۔ ہمارے ساتھ ہمارا اللہ ہے۔ جس کو قرآن شریف میں یوں فرمایا ہے۔

الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا ط

(کہ ہمنتو) اگر تم (اللہ کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد نہ کرو گے تو اپنا ہی کچھ کھوؤ گے۔ ان کی مدد کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے اور یہ موقع تو اس کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہے (اس) نے تو ان کی اس وقت مدد کی (تھی) جب کافروں نے انہیں (ان کے وطن مکہ سے اس طرح) نکلنے پر مجبور کیا (کہ نکلتے وقت کل دو آدمی تھے اور) دو میں سے دوسرے رسولؐ تھے۔ اس وقت یہ دونوں (ایک) غار میں (جا کر چھپ رہے) تھے (اور کافر انہیں تلاش کرتے کرتے جب عین اسی غار کے منہ پر پہنچے تو) اس وقت (گھبرا رہے تھے اور) وہ (یعنی رسول) اپنے کو تسلی دے رہے اور ان سے کہہ رہے تھے کہ (صدیقؓ) غم نہ کر (یہ کافر ہمیں کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے) بلاشبہ ہمارے ساتھ (ہمارا) اللہ ہے۔

ایسے خوف کے وقت یہ اطمینان صرف نبیوں ہی کا شیوہ ہے۔ بہادری دوسری چیز ہے۔ خطرے میں اطمینان قلب کسی اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ رسولِ خدا اور صدیق اکبرؓ کو اللہ پر بھروسا تھا دونوں اس بھروسا کے سہارے خاموش بیٹھے رہے۔ مگر بچانے والے

کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ دشمن ادھر ادھر دیکھ بھال کر چلے گئے۔ غار کی تنگی و تاریکی کی وجہ سے ان پناہ گزینوں کا کسی کو گمان تک نہ گزرا۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں تین روز تک اسی غار میں رہیں۔ رات کی تاریکی میں اسماءؓ بنت ابوبکرؓ گھر سے روٹی دے جاتیں عبداللہؓ ابن ابوبکرؓ اہل مکہ کی باتیں سُنا جاتے۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکرؓ کے غلام تھے جن کے پاس حضرت ابوبکرؓ کا ریوڑ تھا۔ وہ بکریاں بھی وہاں لے آتے۔ نبی علیہ السلام بقدر ضرورت دودھ لے لیتے اور وہ پھر ریوڑ کے نشان قدم سے آنے والوں کے نشانات قدم نامعلوم بنا دیتے تھے۔ چوتھے روز نورِ وحدانیت سے جھلملانے والے ستارے غار کی تاریکیوں سے نکلے۔ حضرت اسماءؓ کھانا لے کر پہنچ گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام بھی اونٹنیاں لے کر حاضر ہو گئے۔ دونوں مُبارک سوار سُبک رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو گئے۔ مگر بی بی اسماءؓ کو اچانک خیال آیا کہ توشہ دان کا مُنہ باندھنے کا تسمہ تو گھر ہی بھُول آئی ہوں۔ جھٹ کمربند کو پھاڑ کر توشہ دان اس سے باندھا۔ آنحضرتؐ بی بی اسماءؓ کی اس فہم سے بہت خوش ہوئے اور انہیں "ذات النطاقین" (دو کمر بند والی) کا لقب دیا۔ یہ عظیم الشان خطاب سرکار دو جہاںؐ کا دیا ہوا شرف ہے۔ پھر شمس و قمر پر مشتمل یہ قافلہ مدینہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

جب کفار کو آنحضرتؐ کی تلاش میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے ذاتِ گرامی کی گرفتاری کے لیے ایک سو اونٹوں کا انعام رکھا۔ بہت سے بیکار قسمت آزمائی کے لیے نکل پڑے۔ ان میں سراقہ بن جعشم بھی تھا۔ عین جس وقت حضورؐ روانہ ہونے والے تھے، سراقہ آ پہنچا۔ خدا کی قدرت سے اس کے گھوڑے نے سکندری کھائی اور سوار خود فرشِ راہ ہو گیا۔ تاہم سنبھلا اور ترکش سے فال کے تیر نکالے۔ لیکن قسمت نے جواب نفی میں دیا۔ امید پر تقدیر سے لڑ جانے والا عرب مایوس نہیں ہوا اور پھر باگیں اٹھائیں۔ اب گھوڑا دلدل میں پھنس گیا مگر دل میں ڈرا کہ خدا کی قید میں پھنس گیا ہوں۔ اس لیے نہایت عاجزی سے سرکار دو عالمؐ کو آواز دی اور امان کی تحریر مانگی۔ رحمۃ للعالمینؐ۔ صاحب عفو و درگزر تھے۔ چمڑے کے ٹکڑے پر عامر بن فہیرہ سے فرمان امن لکھوا کر دے دیا اور فرمایا "تیرے ہاتھ میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں"۔ اس وقت سراقہ نے شاید اس بات کو صرف حوصلہ افزائی سمجھا ہو، مگر حضورؐ کے منہ سے نکلا ہوا فرمان تھا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جب ایران فتح ہوا، تو غنیمت میں سونے کے دو کنگن بھی آئے۔ پیش گوئی کے مطابق حضرت عمرؓ نے سراقہ کو جو مسلمان ہو چکے تھے، بلا کر ہاتھوں میں پہنا دیئے۔ نبی برحق کی پیش گوئی اس طرح آخر پوری ہوئی۔ واقعہ ہے کہ سراقہ یہ تحریر امن لے کر واپس ہوا، تو راستے میں جو کوئی بھی ملتا، اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیتا کہ اس راستہ پر حضورؐ نہیں ہیں۔ چنانچہ مدینہ کے یہ مقدس مسافر قدرے اطمینان سے منزل کی طرف بڑھتے رہے۔

پیغمبر پر سحر

نواب اعظم یار جنگ مولوی محمد چراغ علی خاں

"وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلاً مسحوراً" (فرقان)

۱ـــــ کسی سچے مسلمان کا تو یہ کام نہیں کہ جناب پیغمبر کی نسبت ایسا کہے کہ ان پر کبھی ایک منٹ کے لیے بھی جادو کا اثر ہوا۔ یہ بات تو کافروں ہی کو زیبا تھی اور انھوں نے ہی کہی تھی کہ یہ نبی تو جادو کا مارا ہُوا ہے۔ اور اس تہمت نالائق کو خدا نے بھی جھٹلایا۔ چنانچہ سورہ فرقان اور اسریٰ کی آیت کو ہم نے اس بیان کے عنوان میں لکھ دیا ہے۔ مگر ایک عرصہ سے مسلمانوں میں سے ایسی حمیت جاتی رہی وہ اس کی تو کچھ پروا نہیں کرتے بلکہ ایسے مضمون کی حمایت کرتے ہیں۔

۲ـــــ مسلمان محدثوں نے اس مضمون کی ایک عجیب وغریب روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے جناب پیغمبر پر جادو کر دیا تھا اور وہ چالیس دن تک یا چھ مہینے یا برس دن تک اس میں مبتلا رہے۔ ابی حمزہ کی روایت میں تو چالیس دن ہیں اور وہب کی روایت میں چھ مہینے۔ مگر زہری کی روایت میں برس دن ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسی کو معتمد قرار دیا ہے[1] سبحانک ھذا بہتان عظیم۔

۳ـــــ اس سحر کا اثر (دروغ برگردنِ راوی) یہاں تک ہو گیا تھا کہ معاذ اللہ جناب پیغمبر کے دماغ میں خلل آ گیا تھا۔ چوں مادہ سحر بسرِ مبارک رسیدہ بود چناں تخیل مے کرد کہ چیزے کہ نکردہ است کردہ می شود و ایں تصرف است از ساحر در طبیعت و مادہ دموی تا آں مادہ بر بطن مقدم دماغ غلبہ کرد و مزاج آں از طبیعت اصلی برگشت (سفر السعادۃ علامہ مجد الدین فیروز آبادی) ص ۱۶۹۔ یہی مضمون ابن القیم نے بھی لکھا ہے۔

۴ـــــ ایسے لغو اور واہی خیالوں کو تو قرآن مجید جھٹلا چکا پس جو روایتیں بھی اس مضمون کی ہوں گی وہ کب لائق التفات ہوں گی وہ راوی بھی انھیں کافروں کی کہی ہوئی کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام علامہ امین الدین طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں (ذیل ہاروت وماروت) لکھا ہے:

"ماروی من الاخبار ان النبی سحر فکان یریٰ انہ فعل مالم یفعلہ او انہ لم یفعل ما فعلہ فاختار

---

[1] وفی روایۃ ابی حمزہ عند الاسماعیلی انہ صلی اللہ علیہ وسلم اقام اربعین وفی روایۃ وھب عن ھشام عند احمد ستۃ اشھر وجمع بان ستۃ اشھر من ابتداء تغیر مزاجہ والاربعین یوما من استحکامہ لکن فی جامع معمر عن الزھری انہ لبث سنۃ واسنادہ صحیح۔ قال ابن حجر فھو المعتمد۔ ارشاد الساری شرح صحیح بخاری۔ ج ۸ ص ۳۲۴۔

مدت بقائے ایں عارضہ بقولے چہل روز و در روایتے شش ماہ و در روایتے یک سال بود۔ شرح سفر السعادت۔ عبد الحق دہلوی

مفتعله - لا یلتفت الیہا۔[1]

۵ ——— اگرچہ جھوٹی روایتیں سچی ہوں تو پھر نبی کی بات پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ بہت سی وحی کی باتیں بھی صرف ان کے تغیر دماغ کی وجہ سے خیال میں آ گئی ہوں گی۔ حدیث کی شرح کرنے والے ایک عجیب مخمصہ میں گرفتار ہیں نہ تو ان سے اس روایت باطلہ کی تکذیب کرتے بنتا ہے اور نہ منکروں کو جواب دیتے بنتا ہے۔ قاضی عیاض الغرناطی نے (سنہ ۴۷۶ - ۵۴۴ ہجری) کتاب شفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ میں (ص ۲۹۹ و ۳۰۰) اس اعتراض کے اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جادو کا اثر جناب پیغمبر کے دل اور اعتقاد اور عقل پر نہ تھا صرف ظاہر میں ہاتھ پیر پر ہوا تھا مگر بخاری و مسلم کی روایتوں کے مقابلہ میں وہ تاویلیں پیش نہیں جاتیں اور معہذا اصل سحر کے مان لینے سے کچھ مفر نہیں ملتا۔ اور مسحور وہی ہے جس کی عقل میں خلل آ گیا ہو۔[1]

۶ ——— ہم نے مناسب جانا کہ اس بحث میں اصل روایتوں پر نظر کی جاوے اور دیکھیں کہ وہ کچھ معتبر ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ بخاری نے روایت کی ہے:

حدثنا ابراهیم بن موسیٰ اخبرنا عیسیٰ بن یونس عن هشام عن ابیه عن عائشة رضی الله عنها قالت سحر رسول الله صلی الله علیه وسلم رجل من بنی زریق یقال له لبید بن الاعصم حتی کان رسول الله یخیل الیه انه کان یفعل الشئ وما فعله الخ۔

حدثنی عبد الله بن محمد قال سمعت ابن عیینه یقول اول من حدثنا به ابن جریج یقول حدثنی ال عروه عن عروه فسالت هشاما عنه فحدثنا عن ابیه عن عایشة رضی الله عنها قالت کان رسول الله صلی الله علیه وسلم سحر حتی کان یری انه یاتی النساء ولا یاتیهن الخ۔

حدثنا عبید بن اسماعیل حدثنا ابو اسامه عن هشام عن ابیه عن عایشة قالت سحر رسول الله صلی الله علیه وسلم حتی یخیل الیه انه یفعل الشئ وما فعله الخ۔

مسلم نے روایت کی ہے:

حدثنا ابوکریب قال حدثنا ابن نمیر عن هشام عن ابیه عن عایشة رضی الله عنها قالت سحر رسول الله صلعم یهودی من یهود بنی زریق یقال له لبید بن الاعصم قالت حتی کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یخیل الیه یفعل الشئ وما یفعله الخ۔

ان روایتوں میں یہ قول تو حضرت عائشہ کی طرف منسوب ہے کہ جناب پیغمبر پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا اور اس قول کے

---

[1] والمسحور الذی قد سحر فاختلط علیه عقله وزال عن حد الاستواء هذا هو القول الصحیح تفسیر کبیر فخر رازی - (اسری)

بعد ایک قصہ ہے کہ جس میں اختلاف الفاظ اور کسی قدر اختلاف مضمون بھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب پیغمبر نے فرمایا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، اور ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ اس شخص کا (یعنی پیغمبر صلعم کا) کیا حال ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ یہ شخص مطبوب ہے اس کا ترجمہ حدیث کی شرح کرنے والوں نے مسحور کیا ہے یعنی جادو کا مارا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا ؟ تب اس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کاہے سے جادو کیا ہے ؟ اس نے کہا کہ کنگھی اور سر کے ٹوٹے ہوئے بال اور کھجور کے درخت کا گابہ۔ پھر اس نے پوچھا وہ کہاں ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ ذروان کے کنوئیں میں۔ تب جناب پیغمبر اور اصحاب وہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے آکر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اس کنوئیں کا پانی سرخ سا تھا اور درخت وہاں کے ایسے تھے جیسے سانپ کی سر یا بدصورت الخ۔

۷ ——— یہ ایسی روایت ہے کہ جس کو اگر صحیح وقطعی تسلیم بھی کر لیا جاوے تو بھی کسی ذی عقل اور صاف طبیعت آدمی کی نظر میں اس میں کچھ خلافِ حقیقت نہیں ہے مگر جو لوگ جاہلی طبیعت کے ہیں اور دیو، بھوت اور جادو کو مانتے ہیں وہ اس روایت کے مضمون کو اپنے ڈھنگ پر لے جاتے ہیں اور کچھ تحریف اور تاویل کر کے نبی کو جادو کا مارا ہوا بنا لیتے ہیں۔ ذالك ظن الذين كفروا۔

۸ ——— اس روایت کی تفسیر ہمارے مذاق پر تو یہ ہے کہ ہم کو اس امر سے تو انکار نہیں ہے کہ کوئی شخص جادو نہیں کرتا یا کوئی شخص کسی کو جادو کا مارا ہوا نہیں سمجھتا بلکہ ہمارا قول صرف یہی ہے کہ ہم کو جادو کے تحقق سے انکار ہے یعنی جادو کبھی چلتا نہیں اس کا اثر کسی پر ہوتا نہیں۔ " لا يفلح الساحر حيث اتى"۔ گو وہ لاکھ پڑا کہا کرے کہ میں نے اس شخص پر جادو کر دیا ہے اور جس شخص کی نسبت جادو کرنے والا یا جادو کرنے کا دعویٰ کرنے والا یہ کہے کہ میں نے اس پر جادو کر دیا ہے تو عرف میں اس کو مسحور یا جادو کا مارا ہوا بھی کہیں گے تو حقیقت میں اس مسحور پر کچھ جادو کا اثر نہوا ہو جیسے عموماً کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کا معشوق ہے حالانکہ شخص عاشق کے عشق کا اس پر درحقیقت کچھ بھی اثر نہیں ہوا کرتا۔

عرب میں اور یہودیوں میں سحر اور ساحری کا بڑا چرچا تھا ایسا ہوا ہوگا کہ لبید بن اعصم یہودی نے اسی خیال باطل یعنی جادو کے کارگر ہونے کی بنا پر جناب پیغمبر کی نسبت جادو کا عمل کیا ہو اور کنگھی اور سر کے بال کسی درخت کی چھال میں لپیٹ کر ذروان کے کنوئیں میں داب دیے ہوں گے۔ اس معاملہ کا چرچا لوگوں میں ہوتا ہوگا۔ ان میں سے دو آدمی جنھوں نے یہ بات سنی ہوگی جناب پیغمبرؐ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوں گے کہ لبید نے اُن پر (اپنے زعم میں) فلانے کنوئیں میں جادو کیا۔ اس بات کو سن کر جناب پیغمبرؐ اس کنوئیں پر خود گئے یا کسی کو بھیجا ہو۔ کیونکہ اور روایتوں میں ہے (عند ابن سعد من حديث ابن عباس فبعث الى على وعمار فامرهما ان ياتيا البير) کہ اپنے اصحاب کو بھیجا تھا اور یا یہ ہوا ہو کہ اصحاب میں سے کوئی خود ہی چلے گئے ہوں۔

۹ ——— پس اس روایت میں کوئی بات جادو کے تحقق کی نہیں نکلتی۔ سب سے زیادہ مشکل اور باطل قول یہ ہے کہ سحر رسول الله الخ یہ اگر ان معنوں میں لیا جاوے کہ لبید نے پیغمبرؐ کی نسبت جادو کا عمل کیا تو کچھ بھی دقت نہیں ہاں اگر یہ مراد ہو کہ درحقیقت پیغمبر پر کسی کے جادو کا عمل چل گیا اور جادو اُن میں موثر ہو گیا اور اُن کے دماغ میں خلل آگیا اور عقل میں فتور پڑ گیا تو یہ بالکل جھوٹ اور باطل ہے۔ یقیناً راویوں کے دماغ میں فتور آ گیا ہوگا یا محدثوں کی عقل میں خلل آ گیا ہوگا۔ کیونکہ کسی شخص کے جادو کے

مارے ہوئے ہونے پر گواہی دینا ایک ایسے امر پر شہادت دینا ہے جو قابل حس نہیں ہے۔ کسی کو مسحور سمجھنا امر حسی نہیں ہے پس اس پر کوئی گواہی نہیں ہوسکتی۔

۱۰ ——— عوام نے اس روایت کے مضمون سمجھنے میں چند غلطیاں کی ہیں:

اول تو یہ کہ سحر رسول اللہ الخ کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ایسے ہی ثابت ہے کہ کوئی کہے کہ زید پر گولی چلی۔ گو زید اس گولی کے اثر سے بالکل محفوظ ہو۔ یا کوئی کہے کہ ہندہ تو خالد کی معشوق ہے۔ گو ہندہ کو خالد سے کچھ بھی واقفیت نہ ہو یا اس کے عشق کا اثر ذرا بھی اس میں نہ ہوا ہو۔

دوم یہ کہ وہ جو دو شخص پیغمبر کے پاس آ کے بیٹھے تھے اُن میں سے اُن لوگوں نے ایک کو تو جبریل بنالیا اور ایک کو میکائیل۔ حالانکہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں "رجلان" کا لفظ صاف موجود ہے (یعنی دو آدمی) جو روایتیں ان صحیحین کے درجہ سے گھٹی ہوئی ہیں اُن کے راویوں نے اپنے دل سے "رجلان" کی جگہ "ملکان یعنی دو فرشتے" کر دیا۔ جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے اور جن راویوں نے اور بھی زیادہ آزادی برتی اور روایت بالمعنی پر کفایت نہ کی وہ اس سے بھی بڑھ گئے اور صاف صاف "جبرائیل و میکائیل" ہی کہہ دیا جیسا کہ ابن سعد کی ایک منقطع روایت میں ہے۔

سوم یہ کہ ان دونوں آدمیوں نے جو یقیناً لبید کے ہمراز تھے جناب پیغمبرؐ کو مطبوب بتلایا۔ اس لفظ کو شارحین نے مسحور کے معنی میں قرار دیا ہے حالانکہ یہ بھی ایک زبردستی سی ہے۔ قسطلانی شارح بخاری نے اس کنایہ کو صرف تفاول کے طریق پر قرار دیا ہے اور قرطبی نے کچھ اور ہی لکھا۔ انما قیل للسحر الطب لان اصل الطب الحذق والتفطن له فلما کان کل من علاج المرض والسحر انما یاتی عن فتنة وحذق اطلق علی کل منهما هذا الاسم۔ جب طب کا لفظ ایسا عام ہے تو اس سے خاص سحر سمجھنا خلل دماغ سے خالی نہیں اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ امر تسلیم کر لیا ہے کہ جادو کا اثر ضرور متحقق ہوتا ہے پس اب جو کوئی خبر جادو کی روایت میں آوے گی وہ ضرور تسلیم کی جاوے گی حالانکہ اس کا تحقق محض ایک وہم اور خیال ہے اور معتزلہ کو جو مسلمانوں میں ایک حکیمانہ خیال کا فرقہ ہے جادو کے تحقق سے انکار ہے۔

۱۱ ——— اگر ضابطہ فن درایت کی رُو سے اس روایت پر نظر کی جاوے تو یہ کسی طرح صحیح و ثابت و یقینی و قطعی نہیں ٹھہر سکتی۔

اوّل تو یہ ایک خبر واحد ہے اور اخبار احاد سے کسی امر کی نسبت جس کی وُہ خبر دیتے ہیں یقین نہیں حاصل ہوتا۔ پس یہ خبر بھی سچی اور یقینی نہیں ہوسکتی۔

دوم یہ کہ اس روایت میں عنعنہ ہے یعنی عیسٰی بن یونس اور ابن نمیر اور ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر نے حدثنا یا اخبرنا کہہ کر روایت نہیں کی جس سے اتصال پایا جاتا بلکہ عن عن کہہ کر روایت کی ہے جس میں احتمال ہے کہ ایک نے دوسرے سے بگوش خود سُنا ہو یا اوروں سے سُنا ہو جن کا نام ظاہر نہیں کیا اور ایسی روایت جس کا کوئی راوی بھی مجہول یعنی نامعلوم رہ جاوے صحیح اور سندی نہیں ہوسکتی۔

اس باب میں جو کچھ بحثیں اور تقریریں ہیں وہ ہم کو معلوم ہیں۔ علی ابن المدینی (اُستاد بخاری) اور بخاری اور ابوبکر صیرفی اور شافعی کا یہ مذہب ہے کہ روایت معنعن کو متصل سمجھا جاوے گا جبکہ دونوں راوی ایک ہی زمانہ میں ہوں اور اُن میں باہم ملاقات ہونا بھی ثابت ہو اور وُہ لوگ مدلس بھی نہوں اور مسلم وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ دونوں راویوں کا صرف ایک زمانہ میں ہونا چاہیئے ناکہ ملاقات ممکن ہو اور ملاقات کا ثابت ہونا شرط نہیں ہے۔ مسلم نے مقدمہ صحیح میں اپنے مخالف کی بڑی فضیحت کی ہے اور ایک طولانی تقریر کی ہے مگر محی الدین نووی نے منہاج شرح صحیح مسلم بن حجاج میں (باب ماتصح بہ روایۃ الرواۃ بعضہم عن بعض) لکھا ہے کہ جس باب کی طرف مسلم گیا ہے محققوں نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کو ضعیف بتلایا ہے اور جس بات کو مسلم نے رد کیا ہے اُسی کو صحیح قرار دیا ہے[1] مگر ہماری رائے میں تو ان دونوں مذہبوں میں ایک گونہ سہل انگاری اور مسامحت ہے کیونکہ ان میں سے جس نے زیادہ تشدد کیا ہے وہ صرف یہی کہتا ہے کہ صرف ان دونوں راویوں کا جو عنعنہ کرتے ہیں باہم ملاقات کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک مرتبہ[2] شاید تمام عمر میں ملاقات کا ہوجانا بھی ثابت ہونا چاہیے۔ اور یہ اصول پھر بھی ناقص ہے کیونکہ جب تک ہر ہر خبر میں بالمشافہ سنی ہونے کی تصریح نہ ہوگی ہمیشہ وہی احتمال ارسال قایم رہے گا۔ ہم روز کے تجربہ سے یہ بات ثابت پاتے ہیں کہ گو زید و خالد دونوں راوی ایک ہی شہر میں رہتے ہوں اور ملاقات بھی ہوا کرتی ہو تاہم زید کا ہر عنعنہ خالد سے بلاواسطہ اور بالمشافہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ کتب احادیث کے راوی جن میں سے ایک تو خراسانی ہے اور ایک بصری اور ایک کوفی ہے تو ایک مصری اور پھر ان کی معنعن روایتیں اتصال پر حمل کی جاتی ہیں یہ عجب قاعدہ ہے۔

مسلم نے اپنے قول کی تائید میں انھیں راویوں کا حوالہ دیا ہے جن پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عایشۃ۔ چنانچہ لکھا ہے بیقین تعلم ان ھشاما قد سمع من ابیہ وان اباہ قد سمع من عایشۃ رضی اللہ عنہا الخ مگر جب تک ایک خاص خبر میں بالمشافہ سُننا ثابت نہو تب تک عام طور کا سماع کچھ مفید نہوگا۔

غرض کہ اس میں نہایت شبہ ہے کہ عیسٰی بن یونس اور ابن نمیر نے ہشام سے یہ روایت بلاواسطہ سنی یا بواسطہ اور ایسے ہی ہشام نے عروہ سے بالمشافہ سُنی یا کسی اور واسطے سے اور ایسے ہی عروہ نے اُمّ المومنین عایشہؓ کے رُوبرو یہ روایت سُنی یا اَور کے ذریعہ سے۔ پس اس وجہ سے یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔

سوم یہ کہ اس روایت کا ایک راوی ہشام بن عروہ ہر چند کہ عموماً ممدوح اور ثقہ اور معتبر ہے مگر امام مالک نے اُس کو جھوٹا یعنی کذاب کہا ہے پس یہ راوی مقدوح ٹھہرا اور روایت کم سے کم ضعیف ٹھہرے گی اسماء رجال کی کتاب تہذیب الکمال

---

[1] وھذا الذی صار علیہ مسلم قد انکرہ المحققون وقالوا ھذا الذی صار الیہ مسلم ضعیف والذی ردہ ھو المختار الصحیح الذی علیہ ائمۃ ھذا الفن مثل علی ابن المدینی والبخاری وغیرھما۔ شرح صحیح مسلم للنووی۔

[2] والمعنعن الذی قیل فیہ فلان عن فلان من غیر لفظ صریح بالسماع او التحدیث او الاخبار اتی عن رواۃ سمین معروفین موصول عند الجمہور بشرط ثبوت لقاء المعنعنین بعضہم ولو مرۃ الخ۔ ارشاد الساری شرح بخاری للقسطلانی ج ۱ ص ۹۔

میں لکھا ہے:

قال للحافظ ابوبکر الخطیب - اخبرنی الرمانی قال حدثنی محمد بن احمد بن عبد الملك الادونی قال حدثنا محمد بن علی الایادی قال حدثنا زکریا بن یحییٰ الساجی قال حدثنا احمد بن محمد البغدادی قال حدثنا ابراهیم بن المنذر قال حدثنا محمد بن فلیح قال قال لی مالك بن انس هشام بن عروه کذاب الخ

اگر ہمارے جواب میں یہ کہا جاوے کہ یہ روایت ایک خبر واحد ہے اس پر یقین نہیں ہوتا تو ہم کہیں گے کہ پیغمبر صلعم پر جادو ہوجانے کی روایت بھی تو خبر واحد ہے اس پر بھی یقین نہ کیجیے۔

چہارم یہ کہ حضرت ام المومنین عائشہ رضؓ کا یہ فرمانا کہ سحر النبی الخ ضابطہ فن درایت کے موافق تو قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس میں کسی امر حسی کی خبر نہیں ہے پس جیسا کہ راوی کا ثقہ اور عادل ہونا ضرور ہے۔ ویسا ہی یہ بھی ضرور ہے کہ اس نے امر حسی یا واقعہ چشم دید کی خبر دی ہو نہ کہ امر عقلی یا خیالی یا وہمی اور اعتقادی کی۔ ہم ان راویوں کے مشاہدات پر اعتبار کرتے ہیں نہ ان کی رائے اور خیالات کو نہیں مانتے۔ رائے تو صرف شخص معصوم صاحب الوحی کی مانی جاتی ہے۔

پس ان وجوہ سے یہ خبر قابلِ قبول اور لائق اعتبار نہیں ہے۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ادبی تبصرہ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمہ اللہ

حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لیے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آجکل انھیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیے اور کیسی نہ ہونی چاہیے یہ وہ عقدہ ہے جسے جناب رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کر لیا ہے امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی "اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنھوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دور عشق وحسن کی ہوشربا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنون لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھاوے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پر حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے وہ فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیالے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا گیا: ؎

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ

حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں، تاکہ اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اسی کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سُن کر بے انتہا محظوظ ہُوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا۔ لیکن میں سچ کہتا ہُوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزند اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لیے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دوگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بُت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دوجہان صلعم (بابی انت و امی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت کے ایک دُوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیاض نے فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وُہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لیے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اس غایت آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انھیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو "چنیا بیگم" کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیے۔ مصوّرِ فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے افیون کی چٹکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے۔ انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ جملہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکہ دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا اس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقاء کیا ہونی چاہیے۔

محفلِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع، ان کے افکار اور ان کے نقطہ ہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تیوہاروں کے منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنے مقدس دنوں کے مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں ان کو مدِ نظر رکھیں۔

منجملہ ان مقدس ایام کے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں، ایک میلاد النبیؐ کا دن بھی ہے۔ میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رُو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وُہ اسوۂ رسولؐ کو مدِ نظر رکھیں تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قایم رہے۔ ان جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں؛ پہلا طریق تو درود و صلوٰۃ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقعے نکالتے ہیں، عرب کے متعلق میں نے سُنا کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں، اور تیسرا بہ آوازِ بلند اللّٰھم صلّ علیٰ سیّدنا محمد وبارك وسلّم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رُک جاتی ہے اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں یہ درود کا اثر ہے۔ اور لازم ہے کہ جس پر درود پڑھا جائے اس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق انفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو آپ کے سوانح زندگی بیان کرے تاکہ ان کی تقلید کا ذوق شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔

تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے لیکن بہرحال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے وُہ طریقہ ہے کہ یادِ رسول اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے کی جو کیفیت حضور سرورِ عالم کے وجودِ مقدس سے ہویدا تھی وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا رومؒ فرماتے ہیں،

آدمی دید ست باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

یہ جوہرِ انسانی کا انتہائی کمال ہے کہ اسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابوں کو پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لیے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسّر نہ ہو تو پھر ہمارے لیے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر ہم آج عمل پیرا ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طریق پر عمل کرنے کے لیے کیا کیا جائے ؟ پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملّی اعتبار سے یہ تربیت علما کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے، یونیورسٹیاں نہ تھیں، لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید، حج، وعظ غرض تعلیم و تربیت عوام کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قایم نہ رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی رُوح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علماء کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں۔ لیکن وہاں علما، ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیار اعلیٰ کو پا لیا ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہُوئے تھے۔ اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دُور ہیں۔

دنیا میں نبوّت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا: بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ۔ یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ اس لیے علماء کا فرض ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں تاکہ ہماری زندگی حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے اور اتباع سنّت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسول اللہ نے اس کو کس طرح کھایا ہے مبادا میں ترکِ سنّت کا مرتکب ہو جاؤں۔ ؎

کامل بسطام در تقلیدِ فرد

اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود نہیں ہیں جن سے ہماری زندگی خوش گوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دُوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباع سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویّہ اس چیز کے متعلق کیا ہو گا۔

حضرت مولانا رومؒ بازار میں جا رہے تھے۔ آپ کو بچّوں سے بہت محبت تھی، کچھ بچّے کھیل رہے تھے، ان سب نے مولاناؒ کو سلام کیا، اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لیے دیر تک کھڑے رہے، ایک بچّہ کہیں دُور کھیل رہا تھا، اس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت ! ابھی جائیے گا نہیں، میرا سلام لیتے جائیے۔ تو مولانا نے بچّہ کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لے کر گئے۔ کسی نے پُوچھا: حضرت ! آپ نے بچّہ کے لیے اس قدر توقف کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یُونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسول اور اتباع سنّت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ علماء کو چاہیے کہ ان کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہے لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انھیں فی الحال صرف اخلاقِ نبویؐ کی تعلیم دینی چاہیے۔

میرِ حجاز ﷺ

مولانا ظفر علی خاں

واعظ سخن ز سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کایں جا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است

جس طرح شبِ تاریک کی ظلمت مہرِ عالم افروز کی آمد کا مژدہ اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے اسی طرح طغیان و عصیان کی فراوانی اور فواحش و معاصی کی کثرت دریائے رحمتِ الٰہی کے جوش میں آنے اور کسی ایسے نفسِ قدسی کے دنیا میں جلوہ گر ہونے کی بشارت دیتی ہے جو ایک اشارۂ چشم و ابرو سے عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیتا ہے۔ جس کی زبانِ حقیقت ترجمان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ کفر و طاغوت کی رگِ گردن کے لیے تیر و نشتر کا حکم رکھتا ہے اور جو چشم زدن میں کارگاہِ حیات کا نقشہ بدل دیتا ہے۔

رحمتِ خداوندی کا ظہور

ان ہادیانِ سرمنزلِ معرفت کی بعثت کا سلسلہ ابتدائے آفرینش کے ساتھ جاری ہوا۔ خاکدانِ گیتی کا ہر گوشہ اور ہر چپہ ان شموسِ ہدایت کے نور سے مستنیر ہوا تا آنکہ ۵۷۱ء میں جب ابنائے آدمؑ تذلل و تسفل کی انتہائی گہرائیوں میں گر چکے تھے، جب خدا کے بندوں کی گردنیں اصنام و اوثان کے سامنے سجدہ ریزی کرنے کے لیے وقف ہو گئی تھیں، جب حریتِ نفس اور آزادیٔ ضمیر کا خاتمہ ہو چکا تھا، جب خدا کے بندے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر خدا کے احکام سے غافل ہو گئے تھے، جب انسانیت کبریٰ پر بہیمیت و نفسانیت پورے طور پر غالب آگئی تھی اور جب اس خطۂ غبرا پر جہالت و ضلالت کی تاریکی پورے طور سے مسلط ہو چکی تھی، دنیا کا وہ سب سے بڑا ہادی اور خدا کا وہ سب سے برگزیدہ انسان مبعوث ہوا جس کی جبینِ تابناک سے نورِ حقیقت کی شعاعیں نکل رہی تھیں، جس کے جاہ و جلال کو دیکھ کر قیصر و کسریٰ کے تخت لرز گئے، جس کے فیضان کی اشعۂ لامعہ نے ظلمت آبادِ ارضی کو بقعۂ نور بنا دیا۔ جس کے سرمنزلِ شہود پر قدم رکھتے ہی استعباد و استعمار کی زنجیریں کٹ گئیں۔ تمیزِ رنگ و نسل مٹ گئی۔ انسانیت کا کھویا ہوا وقار قائم ہوا۔ مخلوق خداوندوں کی خداوندی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جس نے چار سوئے گیتی میں یہ اعلان کر دیا کہ شاہی و خسروی وجہِ افتخار و امتیاز نہیں، بلکہ خدا کے نزدیک اسی کا رتبہ سب سے بلند ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ عام اس سے کہ وہ افریقہ کے کسی تپتے ہوئے صحرا کا حبشی ہو، یا یورپ کے کسی برفانی خطہ کا سفید فام انسان، یہود اسے دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی دعائیں ممثل ہو کر اس کی شکل میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔ نصاریٰ نے کہا

کہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت مجسم ہو کر سالکان مسالک شرک و ضلالت کو سر منزل ہدایت و سعادت کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے جلوہ گر ہو گئی ہے۔ اہلِ دنیا جو صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دوڑے۔ بندوں کو وہ عہد یاد آ گیا جو انھوں نے معبود حقیقی سے باندھا تھا اور دنیا کے در و بام اس نورِ مثل کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔

حُریت اور آزادی کا دور

آج کا دن اسی فضل مجسم کے دنیا میں آنے کا دن ہے، جس کی شانِ رحمۃٌ للعالمینی نے سپید و سیاہ اور اصفر و احمر کو اپنی آغوش میں پناہ دی۔ جس کی رافت و عطوفت کا ابر گھر بار تمام دنیا پر برسا اور جس کے نورِ ہدایت سے دنیا کا ہر چھوٹا اور بڑا رہتی دنیا تک فیضیاب ہوتا رہے گا۔ ؎

الذی ردت الیہ الشمس و انشق القمر
کان امیا و لکن عندہٗ ام الکتاب
والذی فی کفہ الکفار لما ابصروا
کلم الحصباءُ قالوا انہا شیٔا عجاب

حضورؐ نے فاران کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ایک پیغام دیا، جن روحوں نے اس پیغام پر لبیک کہا انھیں خلافت الٰہیہ عطا ہوئی۔ قیاصرہ و اکاسرہ کے تاج ان کے قدموں پر نثار ہوتے۔ اور جب تک آفتاب عالمتاب مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوتا رہے گا، دنیا اس یتیم مکہ کے اس اعجاز کو نہ بھولے گی کہ اس نے شتربانوں کو جہانبانی کے گر سکھائے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے رُبع مسکون پر چھا گئے اور مشرق و مغرب میں ان کے جھنڈے لہرانے لگے۔ خود اُمّی ہونے کے باوجود اپنے متبعین کو علم و معرفت کے وہ رموز بتائے کہ وہ محفلِ علوم کے صدر کہلائے اور تمام دنیا نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تمیزِ آقا و بندہ اس طرح مٹائی اور مساوات کا ایسا بلند معیار قائم کیا جس کا مافوق متصور ہی نہیں، غلامی کی جڑیں اس طرح کاٹیں کہ جب تک حضورؐ کے حلقہ بگوش حضورؐ کی تعلیم پر عمل پیرا رہے، شجرِ غلامی دنیا میں سرسبز نہ ہو سکا۔

عیدِ میلاد النبیؐ

آج طول و عرض گیتی میں حضور رحمۃٌ للعالمینؐ کے میلاد کی مجالس قائم ہوں گی۔ حضورؐ کے حلقہ بگوش جو دنیا کو غلامی سے نجات دلانے کے ضامن و کفیل تھے اور جو آج خود نا آشنائے آزادی ہیں اور جن کے دلوں پر آج خوف غیر اللہ مسلط ہے۔ جا بجا جمع ہو کر مجالس میلاد منعقد کریں گے۔ لیکن انھیں سوچنا چاہیے کہ جب تک وہ حضورؐ کی تعلیم پر عمل پیرا نہیں ہوتے، جب تک وہ حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنا شعار نہیں بناتے، جب تک وہ اپنے دلوں کو طاغوتی طاقتوں کی گرفت سے نہیں چھڑاتے، اور جب تک وہ ان مفاسد کے استیصال کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نہیں اُٹھ کھڑے ہوتے، جنھوں نے خدا کی سرزمین کو جہنم زار بنا دیا ہے،

جب تک وہ شعائرِ دین کے احترام کو اپنا شعار نہیں بناتے، جب تک وہ اعتصام بحبل اللہ کا بھولا ہوا سبق دوبارہ ازبر نہیں کرتے، اور جب تک وہ اپنے آپ کو حضور رحمۃٌ للعالمین کے سچے حلقہ بگوش اور جان نثار غلام ثابت نہیں کرتے، اُس وقت تک عید میلاد پر اُن کا خوشیاں منانا یا جھوم جھوم کر مجالس و محافل میں نعتیہ اشعار گانا بے معنی ہے۔ اگر ان کے دل میں اپنے آقا و مولا کا حقیقی احترام ہے، اگر انھیں اپنے ہادیِ برحق سے تعلق قلبی ہے، اور اگر انھیں ان ذمہ داریوں کا احساس ہے جو خدائے واحد کے پرستار اور اسلام کے علمبردار ہونے کی حیثیت میں ربِ کعبہ کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں تو انھیں عہد کر لینا چاہیے کہ وہ خدا و رسولؐ کی رضا جوئی پر کسی انسان کی رضا جوئی کو ترجیح نہ دیں گے۔ ان کا جو قدم اُٹھے گا خدمتِ اسلام کے لیے اٹھے گا اور جس طرح ان کے آقا و مولا نے خالق کا پیغام مخلوق تک پہنچانے میں شدائد و مصائب سے مُنہ نہ موڑا۔ اسی طرح وہ بھی اسلام کو سربلند کرنے، تعلیماتِ اسلامی کو جہل آبادِ ارضی میں پھیلانے، خدا کے بندوں کی گردنیں فراعنۂ عصر کے آستانوں سے ہٹا کر معبودِ حقیقی کے سامنے جھکانے اور انسان کو اس کے فطری اور پیدائشی حقوق کے دلانے میں وہ مخاطر و مہالک کو ہرگز خاطر میں نہ لائیں گے اور اپنے ضمیر کی آزادی کو کسی قیمت پر نہ بیچیں گے۔

عید میلاد کی خوشیاں اُن سعید رُوحوں کے لیے ہیں جو یہ عہد ربِ کعبہ کے ساتھ باندھیں اور اپنے حقیقت ناشناس بھائیوں سے اسی قسم کا عہد لیں ورنہ یُوں تو عید میلاد وُہ لوگ بھی منائیں گے جو اپنے دنیوی آقاؤں کی خوشنودی اور رضا جوئی پر شعائر اللہ کی حرمت تک کو قربان کر دینے میں مضائقہ نہیں سمجھتے اور جن کے نزدیک مسلمان کی تعریف یہی ہے کہ وُہ ہر قسم کی ترقی کا سنگِ راہ بنا ہے وطنیت کے احساس سے اس کا دل خالی ہو اور اسباب تعبد کو تقویت پہنچانا اس کا مقصدِ حیات ہو۔

حضور اکرمؐ اور تعدد ازواج

محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ مقالہ لکھنے کا سبب اس وقت یہ مقالہ سپردِ قلم کرنے کی ایک خاص وجہ ہے۔ ایک طرف عموماً مسیحی اور دُوسرے غیر مسلم اور ان کے ہمنوا آزاد خیال حضرات کی نظروں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیک وقت نو بیویاں رکھنا بہت کھٹکتا ہے اور دُوسری طرف خود مسلمان حضورؐ کی صحیح پوزیشن کو نہ سمجھنے کے باعث ہر حال میں تعدد ازواج کو ایک "سنّت" قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ اس لیے ہم ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے۔

متعدد شکوک تعدد ازواج پر ایک شُبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سوکن لانا ایک بے رحمی کا پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ عورت اسے کبھی ٹھنڈے دلوں گوارا نہیں کرتی۔ ہم یہاں پہلے ایک عقلی سوال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص سے، جس کی بیوی موجود ہے اور اسے کوئی دوسری عورت بُری طرح دل دے بیٹھتی ہے۔ اب دیکھیے اگر وہ اسے حبالۂ عقد میں لے آتا ہے، تو بیوی کی دل شکنی ہوتی ہے اور اگر ایسا نہیں کرتا، تو دوسری عورت کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ایک خرابی لازم ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو اھون البلیتین (LESSER EVIL) کے طور پر اختیار کرنا پڑے گا اور ایسے مواقع پر صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ بیوی کا حق چونکہ مقدم ہے، اس لیے دوسری عورت کی دل شکنی یا اس کی زندگی کی خرابی کو برداشت کرنا پڑے گا۔

اگر خود مرد کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے اسی طرح کا قلبی تعلق پیدا ہو جائے، تو اس صورت میں بھی اسے اپنی بیوی کی خاطر اپنے تمام جذبات کو دبانا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح مذکورہ صورت میں بیوی کے مقابلے میں اپنی یا دوسری عورت کی رعایت نہ کرنا اھون البلیتین ہے۔ اسی طرح کسی موقع پر خود بیوی کی رعایت نہ کرنا اھون البلیتین ہو سکتا ہے یا نہیں؛ ہماری عقل کہتی ہے کہ ہو سکتا ہے (یہ ضرورتیں کیا ہو سکتی ہیں ان کا ذکر آگے آئے گا)

دُوسرا شُبہ حضورؐ کے تعدد ازواج پر غیر مسلموں کا ایک ناگفتہ بہ الزام یہ بھی ہے کہ خاکم بدہن اس کا سبب ہوائے نفسانی کا غلبہ تھا۔ ذرا سوچیے:

ا۔ کیا اس انسان کے متعلق ہوائے نفسانی سے مغلوب ہونے کا وہم بھی ہو سکتا ہے، جس نے پچیس سال کا زمانہ تجرد کمال عفت و پاکبازی سے گزارا ہو، اور اس پچیس سال کی عمر میں نکاح بھی کیا ہو، تو ایک ایسی عورت سے، جو اس سے پندرہ سال بڑی یعنی چالیس سال کی ہے، جو پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہے اور صاحبِ اولاد بھی ہے اور جو خود پیغامِ نکاح دیتی ہے؟

ب۔ اسے ایک دوشیزہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ وہ خود تندرستی و جمال میں یگانۂ روزگار ہے، ساری قوم کا

محبوب ہے۔ خاندانی وقار کا مالک ہے۔ عرب میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کا جی چاہے، دس دس عورتیں رکھ لیتا ہے۔

ج۔ پچاس سال کی عمر تک یعنی پورے پچیس سال اسی ایک بوڑھی صاحب اولاد اور گزشتہ دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کی رفاقت پر قانع رہتا ہے اور اشارۃً بھی کسی دوسری رفیقۂ حیات کی خواہش نہیں کرتا۔

د۔ اس رفیقہ (حضرت خدیجہؓ) کی وفات کے بعد اپنی عمر کے پچاسویں سال بالکل اپنی ہم سن پچاس سال کی بڑھیا (سودہؓ) سے نکاح کرتا ہے اور اپنی عمر کے پچپن سال تک اسی ایک بوڑھی عورت کا رفیق بنا رہتا ہے اور کسی دوسری کی طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔

ہ۔ اس کے بعد پچپن سال کی عمر سے انسٹھ سال کے درمیان میں جو نو عورتیں حبالہ عقد میں آتی ہیں، ان میں ساری عورتیں ایسی ہیں جو ایک، دو اور تین تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی ہیں۔

کیا ان تمام حقایق پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس انسان میں غلبۂ نفسانی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود تھا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ۵۵ سال کی عمر سے پہلے تک اور پھر ۵۹ سال کی عمر کے بعد (۶۳ سال کی عمر تک) تو ہوائے نفسانی کا شائبہ بھی موجود نہ ہو اور صرف ۵۵ سے ۵۹ سال تک کے درمیان فقط پانچ سال کے لیے ساری ہوسناکیاں دفعتہً پیدا ہو گئیں؟ کیا نفسانی ہیجان صرف ۵۵ سال سے ۵۹ سال کی عمر تک ہوا کرتا ہے؟ نہ پہلے نہ بعد میں؟

و۔ پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہوائے نفسانی کی تکمیل کا تو بہترین موقع اسی وقت تھا جب (۵ھ یا ۶ھ نبوی میں) تبلیغ دین روک دینے کے عوض میں ساری قوم دولت، سیادت اور حسین ترین عورتیں پیش کر رہی تھی۔ اس سے بہتر موقع ہوسناکیوں کی تکمیل کا اور کیا ہو سکتا تھا؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حرم سرائے نبوت میں ایک ساٹھ سال کی صاحب اولاد بڑھیا (خدیجہؓ) کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں۔

ز۔ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ سارے عرب پر اقتدار و فرمانروائی قایم ہو چکنے کے بعد نو بیویوں پر مزید اضافے سے کیا چیز روک سکتی تھی؟

ح۔ ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ جن لوگوں کو حضورؐ سے واسطہ تھا، ان میں عربی و عجمی، دوست و دشمن، جاہل و متمدن سب ہی قسم کے لوگ تھے۔ حضورؐ میں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ ہوسناکی کا ہوتا، تو دشمن کو اس سے بہتر پروپیگنڈے کا اور کیا حربہ ہاتھ آ سکتا تھا؟ انھوں نے شاعر کہا، مجنون کہا، خواہشمند اقتدار ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ سارے الزام لگائے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی سخت سے سخت دشمن بھی نفسانی ہوسناکیوں کا الزام نہیں لگاتا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضورؐ نے تعدد ازدواج فرمایا تھا، وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ اُونچا انسان مغلوب النفس نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی مصلحتیں وہی ہو سکتی ہیں، جو اس کی ساری زندگی کے حرکت و سکون میں جھانکتی ہیں۔

تیسرا شُبہ ایک شُبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اُمت کے لیے تو مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع کے نزول کے بعد چار تک کی تحدید کر دی گئی اور جن اُمتیوں کے پاس چار سے زاید بیویاں تھیں، ان سے چار کے علاوہ کو جدا کرا دیا گیا۔ لیکن خود حضورؐ نے اس پر

عمل نہیں فرمایا بلکہ جو نو بیویاں نزولِ آیت کے وقت تھیں، وہ بدستور رہیں۔ اپنے لیے یہ رعایت اور اُمت کو اس رعایت سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے لیے یہ رعایت ہے اور اُمت اس رعایت سے محروم ہے۔ لیکن دراصل معاملہ برعکس ہے۔ مندرجہ ذیل حقایق پر غور فرمائیے:

ا۔ ہر مسلمان کے لیے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے۔ لیکن حضورؐ کے لیے ان سے اسی صورت میں نکاح جائز ہے، جب کہ ان عورتوں نے ہجرت کی ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے:

و بنٰت عمک و بنٰت عمٰتک و بنٰت خالک و بنٰت خٰلٰتک التی ھاجرن معک۔

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے سگے اور مہربان چچا ابوطالب کی بیٹی ام ہانی حضورؐ کے لیے حلال نہ تھیں، کیونکہ وہ ایمان ہی فتحِ مکہ کے بعد لائی تھیں، جب کہ ہجرت ختم ہو چکی تھی۔

ب۔ ہر امتی بشرطِ عدل و ضرورت چار بیویاں رکھ سکتا تھا۔ لیکن قانوناً وہ ان سب کو یا بعض کو الگ کر کے دوسری عورتوں کو حبالۂ عقد میں لا سکتا تھا، وہ اس طرح قانون سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سیکڑوں نکاح کر سکتا تھا۔ لیکن رسولؐ کے لیے ان نو عورتوں کے بعد ہمیشہ کے لیے نکاح کا دروازہ بند ہے۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ:

لا یحل لک النسآء من بعد و لا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن۔

(اے رسولؐ! اب ان موجودہ نو ازواج کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ ان کو الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے۔ اگرچہ ان دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو)

ان آیات سے جو واضح نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔ اُمت کا کوئی فرد ایک بیوی کی وفات کے بعد یا ضرورت ہو تو زندگی میں دوسری، اور یوں ہی تیسری، چوتھی، جتنی بھی چاہے، بیویاں کر سکتا ہے لیکن رسولؐ کے لیے ام المومنین میمونہؓ کے بعد یہ دروازہ بند ہے۔

۲۔ اُمت کے لیے بیویوں کو طلاق دے کر اس کی بجائے دوسری بیویاں کرنے کا امکان موجود ہے، لیکن رسولؐ کو اس کی بھی اجازت نہیں۔

۳۔ اُمت کے لیے ناموافقت مزاج یا کسی دوسری عورت کی کششِ حسن تبدیلِ زوج کا بہانہ بن سکتی ہے۔ لیکن رسولؐ کے لیے یہ راہ بھی مسدود ہے۔

ذرا انصاف سے دیکھیے، رعایتیں اُمت کے لیے ہیں یا رسول کے لیے؟ یہاں زیادہ سے زیادہ چار کی تحدید ہے۔ لیکن موتِ زوجہ، ناموافقت مزاج اور کسی کی کششِ حسن تبدیل و تجدیدِ ازواج کے بہانے بن جاتے ہیں۔ لیکن وہاں ایک کے سوا ساری عورتیں سن رسیدہ و بیوہ ہونے کے باوجود نہ تحدید بعد الموت کی اجازت ہے نہ تبدیل بعد الطلاق کی اور نہ نو پر کسی اضافے کی۔ غور سے دیکھیے رعایت اُمت کے لیے زیادہ ہے یا خود رسولؐ کے لیے؟

یہ بتانے کے بعد کہ حضورؐ کے تعدد ازدواج میں ہوائے نفسانی کے غلبے کا کوئی شائبہ تک نہ تھا ، اب ہم ان مصالح کا ذکر کرینگے جن کی وجہ سے حضورؐ کو متعدد نکاح کرنے پڑے ۔ یہ مصالح ذاتی نہ تھے ، سراسر قومی و دینی تھے ۔ ان کا افادی پہلو صرف اس قدر نہ تھا کہ کرنے میں ملی فائدے تھے بلکہ اس کا دُوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نہ کرنے میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی تھیں ۔ ہم بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ کسی اہم واقع پر غور کرتے وقت اپنا ماحول پیش نظر رکھتے ہیں حالانکہ ہر واقعے کو اس کے اپنے زمان و مکان اور اپنے احوال و ظروف کی میں رکھ کر دیکھنا چاہیے ۔ اب امہات المومنین کے مصالح عقد پر غور کیجیے :

۱۔ حضرت سودہؓ : ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو بن عبد ود سے ہُوا تھا ۔ یہ اپنے شوہر سے پہلے ایمان لے آئی تھیں اور ان ہی کی ترغیب سے ان کے شوہر بھی اسلام لے آئے ۔ حضرت سودہؓ نے اپنے خاوند اور والدہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی ۔ ادھر سکران کا حبش میں اور ادھر حضرت خدیجہؓ کا مکے میں انتقال ہوا ۔ اس وقت ان کی عمر بھی پچاس سال کی تھی اور حضورؐ کی عمر بھی اتنی ہی تھی ۔ حضورؐ نے ان کی قربانیوں کا لحاظ کرتے ہُوئے ان کے مصائب کو ختم کرنے کے لیے اپنے نکاح میں لے لیا ۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس سال کی ہم عمر اور بیوہ عورت سے یہ نکاح صرف سودہؓ اور ان کے خاندان کی قربانیوں ، سبقت الی الاسلام اور ہجرت حبشہ وغیرہ ہی سے تعلق رکھتا تھا ۔ نفسانیت کا تو اس میں شائبہ بھی نہیں ہو سکتا ۔ خود حضرت سودہؓ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ مجھے حضورؐ کی کنیزی کا شرف بہت کافی ہے ۔ اس لیے میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہُوں ۔

۲۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ : حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد باوجود اس کے کہ پچاس سال کی بوڑھی حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا تھا ۔ لیکن حضرت خدیجہؓ کی جدائی سے حضور اکرمؐ مغموم سے رہتے ۔ کیونکہ یہ سن میں حضورؐ سے پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود اوّل مومنہ تھیں ۔ زندگی بھر مالی ایثار کرتی رہیں اور ہر سرد و گرم کو جھیلتی رہیں ۔ ایسی رفیقۂ حیات کی جدائی سے حضورؐ کا ملول ہونا قدرتی بات تھی ۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اس کو بھانپ لیا اور اپنی لختِ جگر کو حضورؐ کی کنیزی میں دینے کی درخواست کی ۔ کیا حضورؐ اس صدیق کی درخواست کو رد فرما سکتے تھے ، جس نے اسلام لانے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا ۔ متعدد سعید روحوں کو اسلام کی رغبت دلائی اور ہر ہر قدم پر ایثار میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا اور رفاقت میں "ثانی اسلام و غار و بدر و قبر" ثابت ہُوا ۔

۳۔ حفصہ بنتِ عمر بن الخطاب : پہلا نکاح خُنیس ابن حذافہ سلمی سے ہُوا تھا ۔ شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو فطرتاً ان کے عقد ثانی کا خیال ہُوا ۔ پہلے آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے نکاح کر لینے کو کہا ، مگر آپ خاموش رہے ۔ پھر حضرت عثمانؓ سے ذکر کیا ۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی پہلی بیوی رقیہؓ بنت رسول اللہؐ قضا کر چکی تھیں ۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ شاید یہ ضرور حفصہؓ سے رشتہ کر لیں گے ۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا ۔ اس سے حضرت عمرؓ کو کچھ ملال ہُوا اور حضورؐ سے اس ملال کا ذکر کیا ۔ حضورؐ نے ایک عجیب بلیغ جملہ فرمایا کہ : یتزوج عثمان من ھو خیر من حفصۃ و یتزوج حفصۃ من ھو خیر من عثمان ۔ یعنی حضرت عثمانؓ کو حفصہؓ سے بہتر بیوی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر ملے گا ۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کا حضورؐ نے اپنی دوسری دختر حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کر دیا اور حضرت حفصہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا ۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر فرمایا ، تو میں خاموش رہا تھا ، جس سے شاید تمہیں کچھ خیال پیدا ہُوا ہو ۔ لیکن بات یہ تھی کہ مجھے پہلے ہی حضورؐ کے عندیے کا پتا چل چکا تھا ۔ اس لیے میں خاموش رہا کہ جب تک حضورؐ

صاف لفظوں میں انکار یا اقرار نہ فرمالیں، میں بھی انکار یا اقرار نہ کروں۔ حضرت حفصہؓ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح کچھ تیز مزاج سی تھیں اور حضرت عثمانؓ نے غالباً اسی وجہ سے ان سے نکاح کرنا پسند نہ کیا ہوگا۔ بہرکیف حالات یہ تھے کہ حضرت حفصہ کو کوئی معقول رشتہ نہ ملتا تھا اور باپ کو فطرۃً اس کی فکر تھی۔ باپ بھی ایسا، جو زندگی بھر اسلام کی راہ میں سراپا ایثار کے لیے وقف رہا۔ اس کی دلداری کا اس سے بہتر اور کیا سامان ہو سکتا تھا جو حضورؐ نے کر دیا؛

۴۔ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ: ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث بن عبدالمطلب سے، دوسرا عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب سے اور تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ یہ عبداللہ بن جحش ام المومنین زینب بنتِ جحش (جن کا ذکر آگے آئے گا) کے بھائی اور حضورؐ کے پھوپھی زاد برادر ہیں۔ یہ غزوۂ اُحد میں شہید ہُوئے، تو حضورؐ نے نہ فقط قرابت کا لحاظ فرمایا بلکہ شہادت احد سے پیدا ہونے والی ملّی پیچیدگی کو دُور فرمانے کے لیے ان سے نکاح فرما لیا۔ یہ دراصل قدردانی (APPRECIATION) تھی ان جاں نثاروں کی قربانیوں کی تاکہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کے اہل وعیال بے سہارا نہ رہیں اور دوسروں کو بھی اس نوع کی قدردانی کی ترغیب ہو۔

۵۔ حضرت ام سلمیٰؓ: ان کا پہلا نکاح ابوسلمہ سے ہوا تھا۔ یہ حضورؐ کے رضاعی بھائی ہیں اور گیارھویں مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہجرتِ حبشہ بھی کی تھی اور پھر مکّے واپس آکر ہجرت مدینہ سے بھی سرفراز ہُوئے۔ جب یہ ہجرت مدینہ کے لیے روانہ ہُوئے تو ان کے بچّے سلمہ کو ان کے خاندان والوں نے اور ان کی بیوی ام سلمہ کو ام سلمہ کے خاندان والوں نے یہ کہہ کر چھین لیا کہ تم جہاں چاہو، جاؤ مگر ہم اپنے خاندان کے کسی فرد کو تمھارے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ ابوسلمہ نے اس کے باوجود عزم ہجرت کو پُورا کیا۔ ام سلمہ ہر روز شام کو اس مقام پر آکر رویا کرتی تھیں، جہاں ان کے شوہر سے ان کو چھینا گیا تھا۔ ایک سال تک وہ اسی طرح رویا کیں مگر ترکِ اسلام کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ آخر سنگدلوں کے دل بھی پسیج گئے اور وُہ بھی مدینے پہنچ گئیں۔ ان کے شوہر ابوسلمہؓ بدری ہیں اور غزوۂ احد میں بھی شریک ہُوئے، جہاں زخمی ہُوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ وفات کے وقت انہوں نے دعا کی کہ اللّٰھم اخلفنی فی اھلی بخیر (خداوندا میرے کنبے کی اچھی طرح نگہداشت فرما) دو خورد سال لڑکے عمر اور سلمہ چھوڑے اور دو لڑکیاں زینب اور درہ۔ غور کیجئے، رضاعی بھائی ہے، جس نے سبقت الی الاسلام بھی کی اور حبشہ و مدینہ دونوں کی ہجرتوں سے بھی سرفراز ہُوا۔ ہجرتِ مدینہ کے وقت کڑی آزمائشوں میں پڑا اور کھرا اترا۔ وہ چار بچے چھوڑ کر مرتا ہے اور بیوی ام سلمہ کی قربانیاں بھی کم نہیں۔ ابوسلمہ اور ام سلمہ کی ان قربانیوں کا کیا صلہ ہونا چاہیے تھا اور معصوم بچوں کی کفالت کی کیا شکل پیدا کرنی چاہیے تھی۔ جس کے لیے ابوسلمہ نے مرتے وقت دعا بھی کی تھی؛ انہی اہم سوالوں کا جواب تھا ام سلمہ کا ام المومنین بن جانا۔

۶۔ حضرت زینب بنت جحش: یہ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کا پہلا نکاح زید بن حارثہ کے ساتھ حضورؐ نے خود کر دیا تھا تاکہ زید کے ساتھ مصنوعی غلامی کی جو حقارت بلاوجہ وابستہ ہے، وہ ختم ہو جائے اور ساتھ ہی خاندانی تفاخر کا بھی خاتمہ ہو جاتے۔ زید کا پہلا نکاح ایک حبشی الاصل خاتون حضرت ام ایمن سے ہُوا تھا جو زید سے دو چند بڑی تھیں۔ ان دونوں کی زندگی خوشگواری کے ساتھ گزری۔ لیکن زینب بنت جحش زید کے ساتھ نہ نباہ سکیں۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حضورؐ اگر زینب سے خود نکاح فرمانا چاہتے تو ہزاروں جان سے زینب اسے منظور فرما لیتیں اور حضور کنوارپنے ہی میں ان سے نکاح فرما لیتے۔ لیکن حضورؐ تو

صرف غلام و آزاد کی اُونچ نیچ کے فرق کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس لیے زید سے زینب کو بیاہ دیا لیکن طلاق کی نوبت آنے کے بعد زینب کے ٹوٹے ہُوئے دل کو کس طرح جوڑا جا سکتا تھا؛ اور اس سے زیادہ اہم ایک اور چیز بھی سامنے آگئی۔ عرب کے دستور کے مطابق منہ بولا بیٹا حقیقی فرزند کی طرح حقوق رکھتا تھا۔ وہ وارث بھی ہوتا تھا اور اس کی بیوی حقیقی بہو کی طرح باپ پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ حضورؐ کو جہاں زینب کی طلاق کی تحقیر کو عزت سے بدل کر اشک شوئی کرنا تھی وہاں ہمیشہ کے لیے ایک قانون بھی دینا تھا کہ منہ بولے فرزند کا رشتہ حقیقی فرزند جیسا نہیں ہوتا، جو اس کی بیوی منہ بولے باپ پر حرام ہو جائے۔ یہ معاملہ اتنا اہم تھا کہ ازواج مطہرات میں صرف زینب ہی ایسی عورت ہیں جن کے لیے قرآن میں زوجنکھا (ہم نے ان کو تم سے بیاہا ہے) کا لفظ آیا ہے اور تنہا زیدؓ ہی ایک ایسے صحابی ہیں، جن کا نام بھی قرآن میں آیا ہے۔ اس بے معنی رسم تبنیت اور اس پر مصنوعی تعمیر قرابت و وراثت وغیرہ کو توڑنے کے لیے ایک زبردست عملی نمونے کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت نکاحِ زینب کا باعث ہُوئی۔ ورنہ اگر صرف زینب کی چاہت ہوتی تو نکاح زید سے پہلے ہی اس سے کونسی چیز روک سکتی تھی؛

۷۔ حضرت جویریہؓ بنت الحارث: یہ بنو خزیمہ یعنی بنو مصطلق کے خاندان سے تھیں۔ یہ غزوہ مریسیع یعنی غزوۂ مصطلق میں اسیر ہو کر آئی تھیں اور ثابت بن قیس بن شماس کے حصے میں آئیں۔ ان کا پہلا نکاح ایک مصطلقی فرد مسافع بن صفوان سے ہُوا تھا۔ ثابت سے انہوں نے رہا کر دینے کی درخواست کی مگر انہوں نے زرِ فدیہ طلب کیا۔ یہ حضورؐ کے پاس آئیں اور مدارج النبوۃ کی روایت کے مطابق اسلام بھی لے آئیں اور حضورؐ سے عرض کیا کہ میں سردار قوم حارث بن ابی کی بیٹی ہُوں۔ لہٰذا مجھ سے بہتر سلوک کیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر سلوک نہ ہوگا کہ میں تمہاری طرف سے زرِ فدیہ دے کر آزاد بھی کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لُوں؛ حضرت جویریہؓ نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ یہ بھنک پہنچتے ہی تمام لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر جویریہؓ کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہُوا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصہار (سسرالی رشتہ داروں) کو بطور اسیر نہیں رکھیں گے۔ بنو مصطلق کے قیدی چھ سو کی تعداد میں تھے، جن میں سینکڑوں جویریہؓ کے رشتہ دار تھے یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ اگر حضورؐ ان سے نکاح کے خواہشمند ہوتے، تو ثابت بن قیس کے حصے میں ان کو دینے کے بجائے خود ہی اپنے حصے میں لے سکتے تھے۔ لیکن اب معاملے میں پیچیدگی یُوں پیدا ہو گئی کہ اگر ان کو زرِ فدیہ دے کر آزاد کر دیا جاتا ہے، تو یہ تنہا آزاد ہو کر گھر چلی جاتی ہیں۔ لیکن اگر حضورؐ سے نکاح ہو جاتا ہے تو از خود ان کے سینکڑوں رشتے دار اور ساتھ ہی دوسرے قیدی (جن کو ملا کر چھ سو قیدیوں کی تعداد ہوتی ہے) ایک لحظے میں آزادی کی سانس لیتے ہُوئے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ خود سوچیے کہ انسانیت اور اس کی اقدار کی محافظت کا ایسے موقع پر کیا تقاضا ہونا چاہیے تھا؛ یہ نکاح انسانیت کے لیے اتنا بابرکت تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

ما رأینا امرأۃ کانت اعظم برکتہ علیٰ قومھا منھا۔ (رواہ ابو داؤد)

(اپنی قوم کے لیے جویریہؓ جیسی بابرکت عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی)

۸۔ ام حبیبہؓ: یہ ابوسفیان بن حرب کی صاحبزادی ہیں۔ باپ آخری وقت تک حضورؐ کی دشمنی کرتا رہا، مگر یہ مومنہ تھیں اور اپنے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئیں۔ عبید اللہ دائم الخمر تھا اور عیسائیوں کی صحبت میں عیسائی ہو گیا۔

ایک عورت جو محض اسلام کی خاطر خویش واقارب اور وطن کو چھوڑ کر حبشہ آئی تھی، ارتداد شوہر کی وجہ سے بے سہارا ہوگئی مگر ترکِ اسلام کا خیال ایک لحظے کے لیے بھی اس کے دل میں نہیں آیا۔ اس غریب الدیار کی ان قربانیوں اور استقامت علی الدین کا اسے کیا صلہ ملنا چاہیے تھا؟ حضورؐ نے اسی خیال سے عمرو بن امیہ فہری کو بھیجا اور شاہِ حبشہ نے ایک باندی کو بھیج کر حضورؐ کا پیغام دیا۔ ام حبیبہ نے مارے خوشی کے اپنے سارے زیور جو اس وقت زیب تن تھے، اتار کر اس باندی کو انعام میں دے دیے۔ اب اس سے اس مسرت کا اندازہ کرنا دشوار نہیں، جو انہیں ارتداد شوہر کے صدمے کے بعد بطور تلافی حاصل ہوئی ہوگی۔

ان کے ایمان اور ادب رسولؐ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کا باپ ابوسفیان تجدید معاہدہ حدیبیہ کے لیے مدینہ آیا، تو اسے آتا دیکھ کر ام حبیبہؓ نے رسول اللہؐ کا بستر لپیٹ کر الگ رکھ دیا تھا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ تو مجھ کو بستر سے دور رکھنا چاہتی ہے یا مجھ سے بستر کو، ام حبیبہؓ نے جواب دیا کہ تو ابھی مشرک ہے اور تو اس قابل نہیں کہ رسول اللہؐ کے بستر پر بیٹھ سکے۔

۹۔ حضرت صفیہؓ: ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا تھا۔ کنانہ غزوۂ خیبر میں مارا گیا تھا اور صفیہ بطور اسیر آئی تھیں اور دحیہ کلبی کی درخواست پر ان کو دینے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں کہ یہ ایک بڑے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی ہیں، جو بنو قریظہ اور بنو نضیر دونوں کا سردار تھا۔ لہٰذا اسے کسی بڑے سردار ہی کے پاس جانا چاہیے اور حضورؐ سے بڑا سردار کون ہو سکتا تھا۔ اس پر حضورؐ نے صفیہ کو پہلے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ام المومنین ہونے کا شرف بخشا۔

اس دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کو اگر حضورؐ پہلے ہی لینا چاہتے، تو دحیہ کلبی کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہ فرماتے لیکن بات یہ تھی، ایک اسیرہ جو ایک سردار کی بیٹی بھی ہے اور اس کا شوہر ابھی جنگ میں مارا بھی گیا ہے، کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا اور کوئی سہارا اس کے سوا نہ تھا، کہ وہ ام المومنین بننے کا ابدی شرف حاصل کریں۔ پھر دیکھیے حضورؐ نے انہیں پہلے آزاد فرما دیا۔ جس کے بعد وہ مختار تھیں کہ خواہ حضورؐ کے پیامِ نکاح کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اس کے بعد ان کا پیغامِ نکاح کو بخوشی قبول کر لینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضورؐ سے بہتر اور کوئی پناہ گاہ ان کی نظروں میں نہ تھی۔

۱۰۔ حضرت میمونہؓ: یہ عبداللہ بن عباس اور خالد بن ولید کی خالہ ہیں۔ اسماء بنت عمیس (جو یکے بعد دیگرے جعفر طیار، ابوبکر صدیق اور علی مرتضیٰ کی بیوی بنیں) ان کی اخیافی بہن ہیں نیز حضرت حمزہ کی بیوی سلمیٰ بنت عمیس اور ام المومنین زینب بنت خزیمہ کی بھی اخیافی بہن ہیں۔ میمونہ کا پہلا نکاح حویطب بن عبدالعزیٰ سے اور دوسرا ابورہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا۔ یہ دوسرے نکاح کے بعد جب بیوہ ہوگئیں، تو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے ان کی بے کسی کا ذکر فرمایا اور حضورؐ نے ان سے نکاح فرما لیا۔

نتیجہ

ان تمام نکاحوں پر ایک غائر نظر ڈالیے، تو بات صاف ہو جائے گی کہ:

۱۔ ان میں سے ایک کے سوا ساری عورتیں وہ ہیں، جس کا ایک یا دو یا تین نکاح پہلے ہو چکے ہیں۔

۲۔ یہ نکاح اس لیے کئے گئے کہ ان عورتوں یا ان کے رشتہ داروں کی قربانیاں فراموش نہیں کی جا سکتی تھیں۔

۳۔ یا اس لیے کہ ان کا روحانی سہارا حضورؐ سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

۴۔ یا اس لیے کہ ان کی اور ان کی اولاد کی معاشی کفالت کا سامان کرنا تھا۔

د۔ یا اس لیے کہ ان کا خاندانی احترام باقی رکھنا مقصود تھا۔

دیگر مصالح لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ مصالح اور بھی ہیں، جن میں ایک حصہ متاہل لوگوں کے لیے درس معاشرت کا ہے اور دوسرا حصہ قیمتی نتائج کا حامل ہے۔ پہلے ان شاندار نتائج کو دیکھیے، جو ان نکاحوں کے بعد ظاہر ہُوئے۔ ان میں چند خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ توسیعِ دین ازدواج کے بعد اصہار یعنی سسرالی رشتے داروں سے حسنِ تعلقات و ہمدردی کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے اور اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ حضورؐ کے ان نکاحوں سے یہ فائدہ حاصل ہُوا کہ مختلف قبائل سے راہ و رسم پیدا ہو گئی اور ان کے قریب ہو جانے سے وہ تمام غلط فہمیاں دُور ہو گئیں، جو دشمنوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے یا کھنچے کھنچے رہنے سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس طرح نظامِ حق کی اشاعت و توسیع کے لیے مختصر مدت میں زمین ہموار ہو گئی۔ حضورؐ کی کوئی دُو زوجہ بھی ایک خاندان کی نہ تھیں۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابو سفیان بنو امیہ سے ہیں اور نسباً سب سے قریب۔ حضرت میمونہؓ بنت حارث بنو عیلان سے ہیں اور نسب میں سب سے زیادہ دُور۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بنی عزّی سے ہیں، حضرت سودہؓ بنت زمعہ بنی عامر سے ہیں۔ حضرت عائشہؓ بنت ابی بکر بنی تمیم سے ہیں، حضرت حفصہؓ بنت عمر بنی عدی سے ہیں، حضرت زینبؓ بنت جحش بنی اسد سے ہیں، حضرت ام سلمہؓ بنت ابی اُمیہ بنی مخزوم سے ہیں، حضرت جویریہؓ بنت حارث بنی مصطلق سے ہیں، حضرت صفیہؓ بنت حیی خاندان سیدنا ہارون سے ہیں اور حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بنی ہلال سے ہیں۔ عرب کی قبائلیت اور اس کے موثرات سے جو لوگ واقف ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ عرب کے اتنے مختلف قبائل اور ان کی شاخوں سے خوشگوار صہری تعلقات قائم ہونے کے بعد ملنے جلنے کے کس قدر مواقع پیدا ہُوئے ہوں گے اور ان صہری تعلقات کی وجہ سے کم سے کم مدت میں نظامِ حق کی توسیع میں کتنی مدد ملی ہو گی۔

۲۔ اصلاح و قیامِ امن اسی کا نتیجہ تھا کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے ازدواج ۶ھ کے بعد ابو سفیان کی مخالفت ڈھیلی پڑ گئی اور کچھ دنوں کے بعد یہ اور ان کے دونوں فرزند معاویہ و یزید ایمان لے آئے۔ ام المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث کے نکاح ۵ھ کے بعد حارث اور ان کا سارا خاندانِ مصطلق پیشہ رہزنی سے تائب ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی ہارونیہ کے ازدواج ۷ھ کے بعد یہود نے پھر کسی سازش میں حصہ نہ لیا۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے نکاح ۷ھ کے بعد نجد کے سارے فتنے ختم ہو گئے۔ غرض جس قبیلے یا ملک کی عورت آئی، وہاں کے فتنے سلامتی سے، وہاں کا افتراق اتحاد و اتفاق سے اور وہاں کی بدامنیاں امن سے بدل گئیں۔ کون ہے جو ان خوشگوار نتائجِ امن و اصلاح کو دیکھتے ہُوئے ان نکاحوں کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے؟

۳۔ آدھی دنیا کی تعلیم ان ازواجِ مطہرات کے ذریعے جس کے سبب بڑے مقصد کی تکمیل ہُوئی، وہ نصف انسانی دنیا کی تعلیم ہے قرآن نے اصولی طور پر عورتوں کے ضروری مسائل بتا دیے ہیں، لیکن بے شمار جزئیات ایسے ہیں، جن کی تشریح حضورؐ کو فرمانا پڑی۔ تعلیمِ نساء کا یہی انداز بہتر ہو سکتا تھا اور رہُوا کہ امہات مومنین نے حضورؐ سے وہ مسائل معلوم کیے اور ان سے دوسری عورتوں نے حاصل کیے۔ نسائی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی دخل ہے اور ان ہی سے ایسے

بہتیرے مسائل مروی ہیں۔

نصف دین کی تکمیل

اب ایک دشواری پر بھی نظر ڈالیے۔ ایک طرف حضورؐ کی حیا کا یہ عالم ہے کہ روایتوں میں ہے کہ حضورؐ کنواری پردہ نشین سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ نیز حضورؐ کا ارشاد ہے کہ :

الحیاء شعبة من الایمان ۔

(شرم و حیا ایمان کا ایک حصہ ہے)

روایتوں میں ہے کہ نبوت سے بہت پہلے حضورؐ ایک بار محض بے ستری کے خوف سے بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حیاسے نبویؐ حرم سرا کے اندر بھی کبھی بے نقاب نہ ہُوئی۔ کیا اس قدر غیر معمولی حیا کے ہوتے ہوئے حضورؐ سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ برسرِ منبر حضورؐ ان مسائل کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہوں گے کہ جن کو پڑھاتے ہُوئے آج بھی طلبہ و مدرسین آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں؟ یہ طہارت و نجاست کے مسائل ہیں، حیض و نفاس کے دقایق ہیں، آداب و مواصلت کی پابندیاں ہیں، شکست صوم و صلوٰۃ کی نزاکتیں ہیں جن کا جاننا زن و مرد کے لیے ضروری ہے۔ ایک طرف ان مسائل کا علم ضروری اور دُوسری طرف ان کے اظہار سے حیا مانع۔ اس پیچیدگی کا حل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ ازواج مطہرات کے ذریعے عورتوں کو اور ان عورتوں کے وسیلے سے مردوں کو مسائل ضروریہ کی تعلیم حاصل ہو۔ بلاشبہ حرم سرائے نبوت کے اندر بھی حضورؐ کی حیا، اسی طرح پردۂ حجاب میں رہتی تھی۔ لیکن بہرحال اپنی بیویوں سے حیا وارانہ مسائل کا اظہار مشکل نہ تھا۔ آدھے معمورہ عالم اور نصف دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کی اس سے بہتر کیا شکل ہو سکتی تھی؟ واقعات شاہد ہیں کہ عبداللہؓ بن عباس کی فقاہت، علی مرتضیٰؓ کی دقیقہ رسی، صدیقؓ و فاروقؓ کی عقدہ کشائی جن مسائل میں آکر اٹک جاتی تھی، وہاں ان کی گرہ کشائی کے لیے بعض ازواج النبیؐ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ خلوت گاہ نبوت کا رازدار امہات مومنین کے سوا کوئی دُوسرا نہ تھا۔ شمع نبوت کے پروانے جلوت کی زندگی سے واقف نہ تھے اور امہات مومنین حقایق خلوت کی بھی رازدار تھیں۔ ہم تو یہاں تک دیکھتے ہیں کہ بعض امہات تفسیر و فقہ کے حقایق و دقایق بھی ان واقف کاران جلوت کو بتاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصف دین کی تکمیل اور دنیا کی آدھی آبادی کی تعلیم کا یہ عظیم الشان کام ایک دو عورتوں سے نہیں چل سکتا تھا۔

صرف نو کی تعداد کو دیکھ کر جس کا جی چاہے شبہات پیدا کرلے۔ لیکن اس کا یہ روشن و عیاں پہلو ایسا ہے، جس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مصلح بھی گزرا ہے، جس نے اپنی بیوی کو مصلحاتِ امت، مبلغاتِ دین، معلماتِ مسائل اور مدرساتِ فقہ بنا کر پیش کیا ہو اور نصف دین کی تکمیل ان ہی کے ذریعہ کرائی ہو؟

ذرا ان روایات کے اعداد و شمار کو دیکھیے، جو ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) روایات مروی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اٹھتر (۳۷۸)، حضرت میمونہؓ سے چھہتر (۷۶)، حضرت ام حبیبہؓ سے پینسٹھ (۶۵)، حضرت حفصہؓ سے ساٹھ (۶۰)، حضرت صفیہؓ سے دس (۱۰) اور حضرت سودہؓ سے پانچ (۵) روایتیں مروی ہیں۔ یہ صرف وہ روایات ہیں، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ نہ پہنچ سکنے والی روایات کے شمار کا اللہ کو علم ہے۔ پھر زینب بنت جحش کی مرویات اس فہرست میں موجود نہیں ہیں، حالانکہ ۵ھ میں ان کو شرفِ زوجیت حاصل ہوا اور ۲۰ھ تک زندہ رہیں۔ ابطال تبنیت سے متعلق جتنے مسائل ہیں، جو بسلسلۂ واقعۂ زید بن حارثہؓ ظہور میں آئے، ان سب کا تعلق

ان ہی زینب بنت جحش سے ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کا صراحۃً ذکر ہے۔ پھر ان سے کسی روایت کا نہ ہونا مشکل سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یقیناً دیگر امہات مومنین کی طرح ان سے بھی صحابہ و صحابیات نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ بہرحال یہ فہرست صرف ان ہی روایات کی ہے، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور معلوم نہیں کتنی روایتیں ہوں گی جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ ام المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ تو صرف تین ماہ زندہ رہیں اور حضرت خدیجہؓ روایات کے دور سے پہلے ہی رحلت فرما چکی تھیں۔ اس لیے ان دونوں سے روایات کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن زینب بنت جحش سے کسی روایت کا نہ ہونا قابل غور ہے۔

بہرکیف کہنا یہ ہے کہ ان روایات میں بے شمار نسائی مسائل بھی ہیں اور بلا شبہ شطر دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کا بوجھ ان ہی امہات مومنین کی گردن پر تھا، جس کا اٹھانا ایک دو کے بس کی بات نہ تھی۔ اب دوسری نوع کے مصالح پر غور کیجئے۔

حُسنِ معاشرت کا درس

حضورؐ کی سیرت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی زندگی سراپا عمل ہے۔ محض وعظ و نصائح نہیں۔ حضورؐ کی زندگی سے ہر کہ و مہ، ہر شاہ و گدا، ہر اسود و احمر، ہر عربی و عجمی اور ہر جماعت و فرد یکساں طور پر اپنی زندگی کے لیے نمونۂ عمل حاصل کر سکتا ہے۔ معاشرے کے لیے سب سے پہلا سنگِ بنیاد ازدواجی زندگی ہے، جس مصلح میں تاہل اور ازدواجی زندگی کا نمونہ نہ ہو، وہ کامل لیڈر نہیں بن سکتا۔ عیسائی اپنی کمزوری کو محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی میں ایک متاہل کے لیے کوئی عملی نمونہ موجود نہیں۔ نہ انہوں نے شادی بیاہ کیا، نہ اپنا کوئی گھر بنایا۔ عیسائیوں کو اس خلا کو پُر کرنے اور اسی کمزوری کو چھپانے کی سرف یہی تدبیر نظر آئی کہ حضورؐ کے تعدد نکاح پر تمام مصالح کی طرف سے آنکھیں بند کر کے سرف تعدد پر اعتراضات اور حملے کیے جائیں۔ ان سے پوچھیے کہ اگر نسل انسانی کا خاتمہ مقصود نہ ہو، تو نمونہ کس کی زندگی ہے؛ بے زوج انسان کی یا متعدد ازواج رکھنے والے کی؟ پھر ان سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ تم ان انبیا کے متعلق کیا کہتے ہو، جنھوں نے ایک سے زیادہ نکاح کیے؟ ذرا ملاحظہ ہو:

سیّدنا ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں: ہاجرہ، سارہ اور قتورہ (پیدائش ۱۶: ۲۴، ۱۸: ۱۵، ۲۵: ۱۰۱)

سیّدنا یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، زاخل اور بلہاہ (پیدائش ۲۹: ۲۳، ۲۴، ۲۸، ۲۹)

سیّدنا موسیٰؑ کی بھی چار بیویاں تھیں، صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب (خروج ۲: ۲۱، قاضیوں ۱: ۱۶، ۴: ۱۶)

ان چار کے علاوہ بھی حضرت موسیٰؑ کے متعلق "خداوند ان کے خدا" کا فرمان سُنیے:

حب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خدا ان کو تیرے ہاتھ میں کر دے اور تو ان کو اسیر کر لائے ۵ اور اسیروں میں کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اس کو بیاہ لینا چاہے ۵ تو تو اسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈائے اور اپنے ناخن ترشوائے ۵ اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینے تک اپنے ماں باپ کے لیے ماتم کرے۔ اس کے بعد تو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے ۵ (استثنا ۲۱: ۱۰ تا ۱۳)

سیدنا داؤدؑ کی نو بیویوں کے نام تو سیموئیل[۱] ۱۸ : ۲۷ اور سیموئیل ۳ : ۲ تا ۵ اور ۱۱ : ۲۶ وغیرہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ دس اور حرموں اور جوروؤں کا ذکر سیموئیل[۲] ۵ : ۱۳ میں ہے۔

سیدنا سلیمانؑ کے متعلق بھی کچھ سن لیجیے :

اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔ (سلاطین[۱] ۱۱ : ۳)

دوسرے غیر مسلم اسی طرح بدھسٹوں سے دریافت کیجیے کہ ایک متاہل اور صاحب اہل وعیال انسان کے لیے مہاتما بدھ کی زندگی اُسوہ و نمونہ بن سکتی ہے۔ جن کو بال بچوں میں رہ کر تلاشِ حقیقت ناممکن نظر آئی اور جنھوں نے آخرکار اپنی بیوی اور بچے پر ایک آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر جنگل کی راہ لی۔

یونہی ہنود سے سوال کیجئے کہ کیا بال بچوں والے انسان کے لیے رام چندر جی مہاراج کی زندگی نمونہ بن سکتی ہے، جنھوں نے چودہ سال بن میں ساتھ دینے والی وفادار بیوی کو جدا کردیا۔ اُن سے یہ بھی پوچھیے کہ وہ راجہ دسرتھ کے متعلق کیا کہتے ہیں، جن کی تین بیویاں تھیں؛ پٹ رانی کوشیلا، رانی ست مہری اور رانی کیکئی۔ اور ان کا کیا خیال ہے سری کرشن جی کی بابت جن کی گوپیوں کی تعداد وہم و خیال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے؟

ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی یا ہنود اگر انھیں اپنے بزرگوں کی تعدادِ ازواج پر کوئی اعتراض نہیں تو ایک ایسے پیغمبر کے احترام کو بھی قائم رکھیں گے، جس کے ساتھ نکاحوں کے بے شمار انسانی مصالح وابستہ ہیں اور جس کے خوشگوار نتائج سے کوئی انصاف پسند آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔ ان کی تشریح کچھ اُوپر گزر چکی ہے اور باقی کا ذکر آگے آتا ہے۔

حسنِ معاشرت کا سبق اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضورؐ کی زندگی جہاں ہر شعبۂ حیات کے لیے زندہ نمونہ ہے، وہاں ازدواجی زندگی رکھنے والوں کے لیے بھی حُسنِ معاشرت کا اعلیٰ اُسوہ ہے اور چونکہ تاہل کی زندگی ہی معاشرے کا پہلا سنگِ بنیاد ہے، اس لیے کوئی ایسا شخص دنیا کا کامل لیڈر نہیں ہوسکتا، جس کی زندگی اس خاص شعبۂ حیات میں بھی اعلیٰ نمونہ نہ رکھتی ہو۔ حضورؐ کا اسی سلسلے میں ایک دُوسرا کمال دیکھیے کہ کن کن جہتوں سے حضورؐ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے واحد نمونہ ہے۔ ایک عفاف پسند مجرد انسان کے لیے حضورؐ کی زندگی نمونہ ہے کہ عرب جیسے بے لگام ملک میں پچیس سال تک کمال عفت و عصمت کی زندگی گزارتے ہیں پھر اپنی اصلی ازدواجی زندگی ایک بیوہ صاحبِ اولاد اور اپنے سے پندرہ سال بڑی عورت (خدیجہؓ) کے ساتھ پچاس سال کی عمر تک گزارتے ہیں اور اس دوران میں اعلیٰ سے اعلیٰ پیشکش کے باوجود کسی دُوسری عورت کی طرف رُخ بھی نہیں فرماتے۔ اس ایک رفیقۂ زندگی کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ساری عمر میں کبھی کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ بیوی نہ فقط قربان ہوتی رہی بلکہ حیرت یہ ہے کہ اس فلک نیلگوں کی چھت کے نیچے اور اس زمین کی پشت پر سب سے پہلے جو ہستی حضورؐ کی نبوت پر ایمان لاتی ہے، وہ بھی خدیجہؓ ہے۔ بیوی اپنے شوہر کے تمام رازہائے درون پردہ سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے شوہر کا کوئی عیب و ہنر پوشیدہ نہیں ہوتا۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، وہ تو معمولی ولایت کی بھی کبھی قائل نہیں ہوتی۔ کردار یا معاشرت کی معمولی کمزوری بھی ہو، تو کسی دعوے کے جواب میں عورت دھجیاں بکھیر کر رکھ دے، لیکن ذرا نگاہِ غور سے دیکھیے خدیجہؓ دو شوہروں کو پہلے

بھی دیکھ چکی ہیں اور اب پندرہ سال مسلسل حضورؐ کی ایک ایک ادا کا تجربہ کر چکی ہیں، زندگی کے ایک ایک گوشے میں حضورؐ کو پرکھ چکی ہیں۔ کتنا بلند کردار رکھنے والا اور کیسے عدیم النظیر حسنِ معاشرت کا مالک ہوگا۔ وہ انسان جس کے متعلق خدیجہؓ صرف انسانیت کی قائل نہیں ہوتی بلکہ نبوت پر ایمان لے آتی ہے اور اپنی عمر کے بقیہ دس سال اس طرح ساتھ دیتی ہے کہ جان و مال سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ ہر امتحان میں کھری اترتی ہے، ہر خطرے کا مقابلہ کرتی ہے اور ایمان میں ایک لحظے کے لیے بھی کبھی تزلزل نہیں آیا۔ کیا یہ حسنِ معاشرت انسان کا آخری کمال نہیں؟ اور کیا ازدواجی زندگی کے لیے یہ سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں؟

پھر اس کے بعد دُوسرا نمونہ یہ ہے کہ پیغمبر اس اصلی رفیقۂ زندگی کی رحلت کے بعد نکاح کرتا ہے تو بالکل اپنی ہم عمر پچاس سال کی سودہؓ سے۔ کیا یہ بجائے خود عفاف کا اعلیٰ نمونہ نہیں۔ اس رفیقۂ زندگی کو اپنے شوہر پہ کتنا زبردست اعتماد تھا کہ اس نے اپنے دل سے سوت پن کی تمام آلائشوں کو باہر نکال کر اپنی باری ایک دُوسری بیوی کو بخش دی۔ کیا یہ اعتماد حسنِ معاشرت کے بغیر ہی حاصل ہو گیا۔

آگے چلنے سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ اپنی پسند سے ایک بیوی لانے والوں کا بھی یہ حال ہے کہ عمر میں کوئی ہفتہ باہمی نوک جھونک سے خالی نہیں جاتا اور اگر خدانخواستہ ایک سے زیادہ رفیقۂ زندگی ہو، تو ایک کے ہاتھ میں سر کے بال اور دوسری کے ہاتھ میں ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں۔ لیکن اس انسان کی عظمت محبوبیت، کردار بلند اور حسنِ معاشرت کا اندازہ کیجیے، جس کے پاس پچپن سال کی عمر کے بعد نو ایسی بیویاں یکجا ہو جاتی ہیں، جو مختلف عمر کی ہیں، مختلف قبائل کی ہیں، مختلف تمدن کی ہیں، مختلف مزاج کی ہیں اور گھروں میں فقر و فاقہ ایک مسلسل مشغلہ ہے لیکن ساری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صرف ایک ہی لطیف سی جھلک نظر آتی ہے، جس کے بعد ایلا[1] کا مسئلہ رحمتِ الٰہی بن کر نازل ہوا، ورنہ اس سے پہلے ایلا اور طلاق ایک ہی چیز متصور ہوتی تھی۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان ازواج مطہرات میں کس کس نوع کی بیویاں ہیں۔ ان میں عائشہؓ جیسی کنواری بھی ہے۔ ان میں سودہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ اور ام حبیبہؓ جیسی ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان میں خدیجہؓ، صفیہؓ، میمونہؓ جیسی دُو دُو شوہروں کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان ہی میں زینبؓ بنت خزیمہ جیسی تین تین شوہروں کی بیوہ بھی ہیں اور ان ہی میں زینبؓ بنت جحش جیسی مطلقہ بھی ہے پھر ان کے قبائل، ان کے تمدن، ان کے مزاج اور ان کی عمریں متفاوت اور مختلف ہیں۔ کسی کو شاہانہ اخراجات نہیں ملتے، بلکہ بعض اوقات کئی کئی مہینے کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حُسنِ معاشرت نے یکساں زبردست اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ جب کثرتِ غنائم کو دیکھ کر امہاتِ مومنین نے مزید گزارے کا مطالبہ کیا، تو ایک ہی مسئلہ تخییر[2] نازل ہونے کے بعد سب نے اپنے مطالبے

---

[1] اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائے، تو اسے "ایلا" کہتے ہیں۔ عرب میں یہ طلاق تصور کی جاتی تھی۔ حضورؐ سے ازواج مطہرات نے ایک بار اضافۂ اخراجات کا مطالبہ کیا، تو حضورؐ کو ناگوار گزرا اور ایک ماہ تک کسی کے پاس نہ گئے۔ ایک ماہ کے بعد حکم نازل ہوا کہ ایلا کرنے والے اگر چار ماہ گزارنے سے پہلے اپنی قسم توڑ کر کفارۂ قسم ادا کر دیں، تو طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اسی طرح چار ماہ گزر جائیں تو طلاق بائن ہو کر زوجین میں تفریق ہو جائے گی۔

[2] جب ازواج مطہرات نے اضافۂ اخراجات کا مطالبہ کیا تو کچھ دنوں کے بعد آیات تخییر نازل ہوئیں جس کی غرض یہ تھی کہ اگر تم دنیا چاہتی ہو، تو تمہیں بہت کچھ دے کر الگ کر دیا جائے اور اگر رضائے الٰہی چاہتی ہو تو نبوی زندگی پر قناعت کرو۔ اس پر سب نے دنیا کے مطالبات سے دستبرداری دے کر اللہ، رسول اور آخرت کو پسند کیا۔

واپس لے لیے۔ کیا یہ انسانیت کا معمولی کمال ہے ؟ اور کیا کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں حُسنِ معاشرت کے ایسے نمونے مل سکتے ہیں کہ ہر نوع کی عورت ایک ساتھ ہونے کے باوجود اس کا حسنِ معاشرت سارے عالم کے لیے نمونہ بن سکے ؟ یہ حقیقت آخر کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا صرف یہی انسان کامل ہے، جو یہ اعلان کر سکے کہ خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی (یعنی تم میں بہترین انسان وُہ ہے، جو اپنے اہل و عیال کے لیے سب سے بہتر ہو اور میں اس لحاظ سے تم سب میں بہتر ہوں) ہم نے بڑے بڑے مصلحین کو دیکھا، جو ایک رفیقۂ زندگی سے بھی نہ نباہ سکے، اسے اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔ بعض تو ساری عمر بیوی سے مقدمہ بازی کرتے رہے۔ پس کیا نو مختلف ازواج سے ایسا غیر معمولی نباہ اس انسان کا آخری کمال نہیں اور کیا کسی ایک نوع کی رفیقۂ زندگی رکھنے والے کے لیے حضورؐ کی زندگی ایک بہترین نمونہ نہیں ؟ پھر وہ بھی ایسی حالت میں کہ حضورؐ کو تنہا یہی ایک کام نہیں کرنا تھا بلکہ ایک طرف ساری اُمت کی اصلاح کا کمر کو توڑنے والا بوجھ بھی ہے اور ساری ساری رات خدا کی بندگی کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔

خانگی زندگی کی سچّی شہادت

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ حقیقی مصلح وہی ہے، جس کے ظاہری اور باطنی دونوں کردار آئینے کی طرح عیاں ہوں۔ ہمارے موجودہ دورِ قیادت میں پبلک لائف اور پرائیویٹ لائف کے دو حصوں میں زندگی کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پبلک سطح پر اپنی زندگی کا کوئی خوشگوار پہلو پیش کر دینا مصلح کے لیے مشکل نہیں۔ مکمل قیادت کا صحیح پتا اس وقت چلتا ہے، جب اس کی اندرونی زندگی بھی آئینے کی طرح سامنے آ جائے۔ یُوں تو حضورؐ کی خانگی زندگی کی شہادت کے لیے تنہا خدیجہؓ ہی کافی ہو سکتی تھیں، لیکن اس تنہا شہادت پر بیسیوں شُبہے وارد ہو سکتے تھے مگر ان نو مشاہدات عادلات میں سے کس کس کی گواہی پر شُبہے کیے جا سکتے ہیں ؟

اسلام نے کسی بات کے ثبوت کے لیے گواہوں کی جو بڑی سے بڑی تعداد رکھی ہے وہ چار مردوں، دُوسرے لفظوں میں آٹھ عورتوں کی گواہی ہے۔ لیکن جن امورِ شنیعہ کے ثبوت کے لیے گواہوں کی یہ تعداد مقرر کی گئی، ان سے حضورؐ کی پاک ترین اخلاقی زندگی اس درجے بعید ہے کہ تعداد کی برابری بھی سوءِ ادب ہے۔ اس لیے آٹھ عورتوں کی بجائے نو عورتوں کی شہادت تاریخ کے سامنے ہے۔ تاریخ ان نو مشاہدات عادلات سے دریافت کرے کہ حضورؐ کی پرائیویٹ اور خلوتی زندگی کیا تھی۔ خلوتی زندگی کا پتا نہ بیٹی دے سکتی ہے، نہ فرزند، نہ خادم و خادمہ، نہ دوست، نہ دشمن، نہ داماد، نہ بہو، نہ معتقد، نہ شاگرد۔ یہاں سچّی اور کھری گواہی بیوی ہی دے سکتی ہے۔ کیونکہ خلوت کی زندگی کی صحیح رازدار یہی ہوتی ہے۔ یہ بتا سکتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کیریکٹر رکھتا ہے ؟ اہل و عیال سے اس کا سلوک کیسا ہے ؟ اس کی راتیں کس طرح گزرتی ہیں ؟ اسے اپنے مقصد کے ساتھ کتنی لگن ہے ؟ اس کی زندگی کا کیا نقشا ہے ؟ اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ اس کے انسانی تعلقات کیسے ہیں ؟ اور خود خدا کے ساتھ اسے کیا وابستگی ہے ؟ ان تمام سوالات کا جواب اگر نو شاہدات عادلات یک زبان ہو کر دیں اور وُہ بھی وُہ، جن سے اندرونی زندگی کا کوئی راز چھپا ہُوا نہ ہو، تو دنیا کی کون سی عدالت اسے ردّ کر سکتی ہے ؟ کثیر الازواج مصلحین تو دنیا میں اور بھی بہت سے گزرے ہیں، لیکن کسی ایسے مصلح کا نام لیجئے، جس کی اتنی بیویاں اس کے پرائیویٹ کیریکٹر کی ایسی ہی گواہ ہوں، جن کے نکاح سے ہزار انسانی

مصالح وابستہ ہوں اور جو مصلحاتِ اُمت بنا کر پیش کی گئی ہوں۔

ان تمام تصریحات مذکورہ بالا کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کے تعددِ ازواج کا مقصد کچھ قربانیوں کی قدر دانی وحوصلہ افزائی تھی، یا بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری یا خاندانی احترام کی بقا اور اس کے ساتھ ہی حُسنِ معاشرت کا عملی درس دینا۔ صنفِ ضعیف کے درجے کو بلند کرنا، انھیں معلمات امت بنانا، معاشرے کی اصلاح کرنا، صہری تعلقات کے ذریعے دین کی توسیع کرنا اور امن و امان قایم کرنا وغیرہ۔ ان انسانی مصالح کے بغیر ہی مطلق تعددِ ازواج کو سنت قرار دینا درست نہیں۔ سنّت صرف تعددِ ازداج ہی نہیں حضورؐ کی پُوری زندگی ہے۔ حضورؐ کی دُوسری "کڑوی" سنتوں سے اعراض برت کر صرف "میٹھی" سنتوں کو اختیار کرنا معاشرے کو جتنا فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس سے زیادہ مفاسد پیدا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی اصل اور آئیڈیل ازدواجی زندگی وہی ہے، جو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ بسر ہُوئی ہے۔ اس کے علاوہ ساری مناکحتیں ایک ہنگامی اور ناگزیر قومی و ملّی مصالح کے تحت ہُوئی تھیں اور ایسے وقت میں ہُوئی تھیں، جب کہ حضورؐ اس کی بشری ضرورت نہ رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجۃ الکبریٰؓ کے اور کسی ام المومنین سے حضورؐ کی کوئی اولاد نہ ہُوئی۔ ہمیں بعض لوگوں کا یہ انداز دیکھ کر تعجب ہُوا کہ وہ تعددِ ازواج النبیؐ کی تاریخی حقیقت کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن چونکہ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا اور حضورؐ قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے تھے، اس لیے یہ قصہ ہی غلط ہے کہ حضورؐ کی نو بیویاں تھیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تاریخی حقایق کو اس طرح جھٹلانے سے قرآن کی کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ قرآن کا رجحان توحدِ زوج ہی کی طرف ہے، کیونکہ وُہ عدل بین النسا کو ضروری قرار دینے کے ساتھ اس عدل کو انسانی طاقت سے باہر بھی بتاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی لچک بھی رکھی ہے کہ ملت کی ہنگامی ضرورتوں کے وقت تعددِ ازواج مستحب بلکہ ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ ان ہی ضرورتوں کے تحت حضورؐ نے نو ازواج ایک ساتھ رکھیں اور چونکہ قرآن نے ان کو الگ کرنے کی صریح ممانعت کر دی تھی، اس لیے حضورؐ کا ان سب کو زوجیت میں باقی رکھنا بھی ناگزیر تھا۔ ان مادرانِ امت کو فرزندانِ اُمت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظامِ حیات

محمد ظفیر الدین مفتاحی

موجودہ دنیا جس برق رفتاری سے آگے جا رہی ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں جا کر دم لے گی، مگر سارے جدید انکشافات اور تمام تر تمدنی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں اطمینان و سکون اور امن و سلامتی عوامی خواہش کے مطابق موجود نہیں ہے، گو مختلف ممالک میں مختلف طرزِ حکمرانی کارفرما ہے۔

آج انسان اس تغیر پذیر دنیا میں ایک ایسے نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کے لئے سرگرداں ہے جو اس کو تمام شعبہ جات زندگی میں سکون و اطمینان اور خوشحالی و فارغ البالی کی دولت سے نواز دے، جس نظام میں عدل و مساوات، اخوت و محبت اور ہمدردی و رواداری کی فراوانی، معیشت و معاشرت میں ہمواری و توازن اور عفت و عصمت اور جان و مال کا مکمل تحفظ ہو، اسی کے ساتھ اونچ نیچ کی تفریق، رنگ و نسل کا امتیاز اور دھرم و مذہب کے نام پر فتنہ کی گرم بازاری قطعاً نہ ہو۔

ریاست میں حکمرانی کے قوانین و اصول ایسے جاری ہوں، جن میں بدلتے ہوئے سماج اور ان کے سیاسی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت ہو، اندرونِ ملک امن و سکون ہو اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات خوشگوار ہوں اور قانون کی نظر میں امیر و غریب اور شاہ و گدا کی کوئی تمیز نہ ہو، معذور و مجبور افراد کے لئے حکومت کی طرف سے قیام و طعام اور ضروریات زندگی کا انتظام ہو، تعلیم و ترقی اور اظہار رائے کی ہر فرد کو پوری آزادی حاصل ہو، ملک کا مالیاتی نظام اور اس کی فوجی طاقت قابلِ اعتماد ہو۔

اسلامی آئینِ حکومت

انسان اگر تعصب و تنگ نظری سے الگ ہو کر غور و فکر کرے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ دنیا کے موجودہ نظاموں میں بہتر اور موجودہ پریشانیوں کا مداوا صرف رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام حیات ہے، جو رب العالمین کا عطا کردہ ہے کیونکہ یہ افراط و تفریط اور نقص و غلو ہر ایک انسانی عیب سے پاک ہے اور کائنات انسانی کے لیے باعث راحت و سکون ہے اور اس کے ظاہر و باطن کی پاکیزگی کا ضامن ہے۔

یہ دستورِ زندگی انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے بلکہ رب الناس کا بخشا ہوا ہے، اس میں ہر ایک طبقہ اور ہر ایک خطہ کے باشندوں کا یکساں لحاظ و پاس ہے، اس دستور کا نزول اس وقت ہوا جب انسانیت دم توڑ چکی تھی، کائنات انسانی جور و تعدی سے کراہ رہی تھی، عوام و خواص ایک یا چند خاندانوں کے غلام بننے پر مجبور تھے، کمزور و ناتواں پس رہے تھے اور دولت مند و طاقتور دادِ عیش دے رہے تھے، اس وقت جس قدر بھی قوانین سلطنت دنیا میں رائج تھے وہ افراط و تفریط کے شکار تھے، خواہ وہ لائیکرگس کا قانونِ حکومت رہا ہو، یا قدیم مصر کا نظامِ سلطنت، منو مہاراج کا بنایا ہوا قانونِ زندگی ہو، یا زمانۂ جاہلیت کا اصولِ حکمرانی، روم و ایران کا آئین ملکی ہو یا کسی اور ملک و نسل کا دستورِ حیات۔

انسانی عظمت کا اعلان

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے جنھوں نے مشعل ہدایت دکھائی اور

پروردگارِ عالم کی طرف سے اعلان فرمایا کہ یہ ساری کائنات انسانوں کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ زمین و آسمان، چاند و سورج، حیوانات و جمادات سب کے سب انسانوں کی راحت رسانی میں مشغول ہیں، اور ان سب کی تخلیق اسی لئے عمل میں آئی ہے، ارشادِ ربانی ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (النحل - ۲)

رات و دن، سورج و چاند کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام پر لگا دیا ہے اور ستارے اسکے حکم سے تمہارے کام میں لگے ہوئے ہیں، بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں

اسلام نے انسانوں کو اس قدیم توہم پرستی سے نکالا جو دیمک کی طرح انھیں چاٹ رہے تھے، اور یقین دلایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اپنی خلقت میں متناسب الاعضاء

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ (التین)

بے شبہ ہم نے آدمیوں کو بہترین انداز سے بنایا ہے۔

یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرف بخشا ہے اس میں اس کا کوئی مدِ مقابل نہیں ہے۔

لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (بنی اسرائیل)

بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت و شرف بخش رکھا ہے۔

انسانوں کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے انھیں مسجودِ ملائک بنایا اور اس کے منکر کو راندۂ درگاہ قرار دیا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ (البقرہ)

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، پس فرشتوں نے سجدہ کیا ابلیس نے البتہ سرتابی بھی کی اور کبر ظاہر کیا۔

پھر انسانوں میں خود اعتمادی پیدا کی اور ان کو بتایا کہ تم سے اوپر صرف خدا کی ذات ہے، کوئی دوسرا نہیں اور تم دراصل اسی ذات کی پرستش کے لئے پیدا ہوئے ہو۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ (ذاریات - ۲)

میں نے جن و انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دعوتِ توحید

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ذہن نشین کیا کہ انسانوں کا ملجا و ماویٰ ربِ کائنات ہے اور ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔

اس مرکزِ توحید پر لاکر کائناتِ انسانی میں اتحاد و یگانگت پیدا کی، اور ان کے باہمی انتشار و تشتت کو ختم کرنے کی سعی فرمائی، ساتھ ہی دعوت دی کہ آؤ ہم سب مل کر ایک ذات کی عبادت کریں، اہلِ کتاب کو خطاب کرکے اعلان کیا گیا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۝ (آل عمران - ۷)

اے اہلِ کتاب ایک بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے اور وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور نہ اس کا کسی کو شریک ٹھہرائیں اور یہ کہ ہم میں کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا رب نہ بنائے۔

رسالت پر بھی یقین کرنے اور ایمان لانے کی دعوت دی، مگر اس کی وضاحت کر دی کہ رسول اللہ خدا اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتا ہے جو خدا کے احکام و پیامات بندوں تک پہونچاتا ہے، رسول بشر ہوتا ہے، خدا نہیں ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ بھی خدا کے برگزیدہ نبی ہیں اور ساتھ ہی خاتم النبیین،

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (الکہف)

آپ کہہ دیں میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں میری طرف وحی الٰہی آتی ہے کہ بلاشبہ تمہارا معبود بس ایک ہے۔

مساوات اور اخوتِ انسانی

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی باہمی تفریق اور باہمی جنگ و جدال پر یہ اعلان فرما کر خطِ نسخ کھینچ دیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ (النساء — ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیل پڑیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم صلہ رحمی کی درخواست کرتے ہو، بیشک اللہ تم سب کا نگراں ہے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشادِ خداوندی کی مزید تشریح فرمائی اور کھل کر اعلان فرمایا۔

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض إلا بالتقوی، الناس من آدم وآدم من تراب (زاد المعاد صفحہ ۲۲ جلد ۲)

نہ کسی عربی النسل کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر، ہاں فضیلت خدا ترسی سے ہوتی ہے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں۔ اور آدم مٹی سے تیار ہوئے۔

شرافت کا معیار

خاندان و قبیلہ دنیا میں تعارف کا ذریعہ ہے، شرافت و رذالت اس میں محصور نہیں، اسلام میں شرافت و بڑائی کا معیار عقاید کی مضبوطی، اخلاق و اعمال کی پاکیزگی اور خدا ترسی ہے، رنگ و روپ اور جغرافیائی تقسیم میں کچھ رکھا ہوا نہیں ہے، قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ اعلان ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات — ۲)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو خاندان و قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم میں جان پہچان رہے، کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کی شادی جو نسباً غلام تھے حضرت زینبؓ بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کی، جو آزاد اور خاندان قریش سے تھیں، حضرت بلالؓ غلام تھے لیکن بڑے بڑے خاندانی محترم افراد ان کا نام بڑے ادب و احترام سے لیتے تھے اور ان کی بزرگی پر رشک

کیا کرتے تھے ۔

اسلامی عبادت میں مساوات کا مظاہرہ مسجد خانہ خدا ہے دن رات کے پانچ وقتوں میں یہاں باجماعت نماز ادا ہوتی ہے، اس کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں اور نہ کوئی تفریق و تمیز، یہاں ایک ہی صف میں سب کے سب کھڑے ہوتے ہیں، صدر جمہوریہ بھی اور ایک معمولی چپراسی بھی۔ اقبال مرحوم کی زبان میں :

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلان ہے

ان اولیائی المتقون حیث کانوا واین کانوا — میرے ہم کنبہ وہ ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں وہ جہاں کہیں بھی ہوں ۔ (زاد المعاد)

نیکو کار کا درجہ خلافت ارضی کے سلسلہ میں بھی فوقیت اور برتری نیکو کار کو دی گئی ہے ارشاد خداوندی ہے :

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (انبیاء - ۷) — ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کی وراثت کے حقدار میرے نیکو کار بندے ہیں ۔

یہاں صرف ایمان وایقان اور عمل صالح معیار قرار پایا اور واقعہ بھی ہے کہ جو ان جوہروں سے خالی ہوگا، وہ سب کچھ ہوگا منصف نہیں ہو سکتا، اور خدا کے عام بندوں سے اُسے محبت جیسی چاہئے نہیں ہو سکتی، اس لئے خلافت ارضی میں ان کو ہی ترجیح دی جانی چاہئے تھی اور ان کو ہی دی گئی ۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (النور - ۱۲) — اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان نیکو کار سے وعدہ کیا ہے کہ وہ زمین ان کو خلافت سے نوازیں گے ۔

انصاف اور عدل اسلام میں عدل و انصاف کی بڑی تاکید ہے تعصب و تنگ نظری کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، دوست و دشمن کی تمیز نہیں، اپنے پرائے میں امتیاز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ - ۲) — اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے انصاف کی ۔

بسا اوقات عداوت منصف کے قدم میں جنبش پیدا کر ڈالتی ہے، اور وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی پر مجبور رہا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن مقدس میں خصوصی طور پر تاکید کی گئی ۔

لا يجرمنكم شنآن قوم على الا تعدلوا - اعدلوا هو اقرب للتقوىٰ (المائدہ - ۲) — کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے ہرگز انصاف کا دامن نہ چھوٹنا انصاف کرنا کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے ۔

انصاف میں کوئی جذبہ حائل نہ ہونے پائے حالات سے مجبور ہو کر عقل و فہم جب عدل و انصاف سے روگردانی پر مجبور کرے اُس وقت،

بھی منصف کو حکم ہے کہ انصاف کا سر رشتہ اسکے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، کیونکہ اسلام میں محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں کسی سخت سے سخت موقع پر بھی بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے، اسلام میں محبت و عداوت کی جگہیں متعین ہیں اور اسی طرح غیض و غضب کے مقامات بھی مذہب اور دین کے نام پر بھی اس قانون میں انصاف سے سر مو ہٹنے کی اجازت نہیں ہے ارشاد ربانی ہے۔

لا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن	اس قوم کی دشمنی جس نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا
المسجد الحرام ان تعتدوا (المائدہ)	تھا اس کا باعث نہ بننے پائے کہ تم زیادتی پر اتر آؤ

باہمی مدد اور تعاون کا حکم ہے مگر نیک کاموں میں بُرے میں نہیں، جائز میں نا جائز میں نہیں، حلال میں حرام میں نہیں۔

وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم	تم نیک کام اور پرہیزگاری پہ مدد کرو، گناہ اور ظلم کے
والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب	کام پہ مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بلاشبہ اللہ کا عذاب
(المائدہ)	سخت ہے۔

انصاف کے تخت پر بیٹھنے کے بعد کبھی معاملہ بڑا سنگین سامنے آتا ہے اور احترام و اکرام، محبت و شفقت اور خونی رشتہ ارادوں میں کمزوری پیدا کر دیتا ہے اور منصف کا قلم فرد انصاف مرتب کرنے میں کپکپانے لگتا ہے، ایسے وقت کے لئے خصوصی تاکید فرمائی گئی ہے۔

یآیھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط	اے مومنو! اللہ کے واسطے انصاف کیا کرو اور اس پہ
شھدآء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین	قائم رہو گو تمہارا یا تمہارے والدین کا یا تمہارے رشتہ داروں
والاقربین (النساء ـ ۲)	کا نقصان ہو۔

یہ تاریخی حقائق ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے ایسے نازک مواقع پر بھی قانون خداوندی پر ہی عمل کیا، خود ہمارے ہندوستان کی تاریخ میں بھی اس طرح کے واقعات کی کمی نہیں۔

مشورہ کی اہمیت

اسلام میں معاملات ان لوگوں کے مشورے سے طے ہوتے ہیں جو ذی رائے معتمد اور نیک و صالح ہوتے ہیں، انتخاب امیر کا طریقہ بھی یہی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وامرھم شوری بینھم (شوریٰ ـ ۴)	وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں۔

ایک جگہ اس کا حکم بھی دیا گیا ہے:

وشاورھم فی الامر (آل عمران ـ ۱۷)	معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے جس میں شریعت کی کوئی اجازت یا ممانعت وارد نہ ہو تو اس وقت کے لئے آپ کا کیا ارشاد ہے، آپ نے فرمایا:

تشاوروا العلماء والعابدین (طبرانی)	اہل علم اور عبادت گذاروں سے مشورہ کر لیا کرو

ساتھ ہی یہ بھی فرمایا

ولا تمضوا رای خاصۃ (طبرانی)	کسی خاص آدمی کی رائے نافذ نہ کرو۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا تھا اس پر یہ بھی فرمایا تھا:

"اے گروہ انصار۔ ہم مہاجرین امیر ہیں اور آپ ہمارے وزیر ہیں، آپ کے مشورے کے بغیر امور طے نہیں کئے جائیں گے۔"

صحابہ کرامؓ کا عمل

چنانچہ خلفائے راشدین کا اسی پر عمل تھا، دارمی میں ہے:

"اگر صدیق اکبرؓ کو کوئی مشکل مسئلہ پیش آجاتا اور کتاب و سنت میں اس کا حکم نہ ملتا تو آپ مسلمانوں کے سرداروں اور علماء کو بلا کر مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو اس کے موافق فیصلہ فرماتے، حضرت عمرؓ کا بھی اسی پر عمل تھا، کوئی دشوار مسئلہ سامنے آتا اور کتاب و سنت میں حکم نہیں ملتا تو صدیق اکبرؓ کے فیصلوں میں تلاش کرتے اگر آپ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے، ورنہ مسلمانوں کے سربرآوردہ لوگوں اور علمائے کرامؓ کو مشورہ کے لیے طلب کرتے اور ان سے مشورہ کرتے اور جب کسی رائے پر متفق ہو جاتے تو فیصلہ فرماتے۔"

امیر جماعت کی اطاعت

جب مشورہ سے کوئی شخص خلیفہ منتخب ہو جائے تو حکم ہے کہ اس کی باتوں پر عمل کرو۔

اسمعوا واطیعوا وان ولی علیکم عبد حبشی (جمع الفوائد)

سنو اور اطاعت کرو گو تم پر کسی حبشی غلام کو والی مقرر کر دیا گیا ہو۔

رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ذمہ داری کا عہدہ اس شخص کے سپرد نہیں فرماتے جو اس کا طلبگار ہوتا، ایک دفعہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ مجھے والی بنا دیا جائے یہ سن کر آپ نے فرمایا:

انا واللہ لا نولی ھذا العمل احدا سالہ او احدا حرص علیہ (جمع الفوائد ص ۳۱۷ ج ۱)

بخدا میں اس شخص کو اس کام کا ذمہ دار نہیں بنا سکتا جو اس کے لئے درخواست کرے یا اس عہدہ کا وہ حریص ہو۔

حکمران کے فرائض

حکمران طبقہ کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے فرائض میں خیانت کرے گا اس پر جنت کی بو بھی حرام ہو گی اور وہ رب العزت کے یہاں ملعون قرار پائے گا۔ (جمع الفوائد صفحہ ۳۱۶ جلد ۱)

اسی وجہ سے حکم ہے کہ ذمہ داری کا عہدہ بہترین افراد کے سپرد کیا جائے، جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا کان امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا واذا کانت امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلاءکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا (جمع الفوائد)

جب تمہارے امراء تمہارے بہترین افراد ہوں اور تمہارے باثروت لوگ سخی اور تمہارا باہمی معاملہ مشورہ سے طے ہو تو اس وقت زمین کی پیٹھ تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے، اور جب تمہارے ذمہ دار لوگ تم میں سے بدترین ہو جائیں اور تمہارے مالدار افراد تم میں بخیل شمار کئے جائیں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں آجائیں تو پھر تمہارے لیے زمین کا اندرونی حصہ اس کے ظاہری حصہ سے بہتر ہو گا۔

ایک صحابی کی تقریر | معاذؓ بن جبل رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں یہ ایک مرتبہ بحیثیت سفیر قیصر روم کے دربار میں تشریف لے گئے وہاں ایک موقع پر فرمایا:

" ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے، اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے اور اگر وہ ان کے سوا کسی اور چیز پر عمل کرے، تو ہم اسے معزول کر دیں گے اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں، اگر زنا کرے تو سنگسار کریں اور اگر وہ کسی کو برا بھلا کہے تو اس کو بھی اسی کا حق ہوگا، اور اگر کسی کو زخمی کرے تو اسے اس کا بدلہ دینا پڑے، وہ ہم سے چھپ کر پردے میں نہیں بیٹھتا، وہ ہم سے غرور کے ساتھ پیش نہیں آتا، مال غنیمت میں اپنے آپ کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا، وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"

(جمع الفوائد)

خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دے، پبلک کے ساتھ نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔

" اے اللہ! جو ذمہ دار حکومت پبلک اور رعایا پر سختی کرے تو بھی اس کے ساتھ سختی سے پیش آ اور جو نرمی کا معاملہ کرے تو بھی اس پر نرمی فرما۔"

خلیفہ راشد فاروق اعظمؓ کا یہ واقعہ ہر خاص و عام جانتا ہے کہ جب قحط پڑا تو آپ نے قسم کھالی تھی کہ جب تک قحط دور نہ ہوگا دسترخوان خلافت پر گھی اور شہد کا استعمال بند رہے گا، اور جب مدینہ منورہ سے بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے تو اونٹ ایک ہی تھا۔ باری باری آپ اور آپ کا غلام دونوں اس پر سوار ہوتے تھے، چنانچہ شہر میں داخلہ کے وقت غلام کی باری آگئی مگر اس کے عرض کرنے کے باوجود آپ نے اونٹ پر اسی کو بٹھایا اور خود نکیل پکڑ کر پیدل چل رہے تھے۔

جنگ و انتقام | جنگ اور انتقام کا نام کس قدر خوفناک ہے، یہاں اعتدال کو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، مگر اسلامی قانون میں یہاں بھی انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا ہے قتال کا حکم ہے مگر ان لوگوں سے جو ان سے لڑنے کا عزم رکھتے ہوں، ہر کسی سے نہیں اور اس صورت میں بھی ظلم و جور سے منع کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین (بقرہ - ۲۳)

اللہ کے راستے میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں اور تعدی نہ کرو بلا شبہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

اسلام میں جنگ پر صلح کو ترجیح دی گئی ہے کہ اسلام نام ہی امن و سلامتی کا ہے ارشاد الٰہی ہے۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ (انفال - ۸)

اگر وہ لوگ صلح کے لئے مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا کرو۔

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم

اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں۔

فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا (النساءٔ) — تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی ہے

حکم ہے کہ جہاں جاؤ سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد جاؤ۔ اقدام میں عجلت نہ کرو، قتل و خونریزی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا اذا ضربتم فی سبیل اللہ فتبینوا (النساء - ۱۳) — اے ایمان والو! جب تم جہاد کے لیے نکلو تو تحقیق کر لیا کرو۔

جذبہ صلح و آشتی

اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو امن و سلامتی کرتا ہو اور ایمان کی نشاندہی کرتا ہو تو حکم ہے کہ اسے تسلیم کرو بحث نہ کرو۔

ولا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا (النساء) — جو تم سے سلام علیک کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں۔

قانون اسلام میں برائی کا بدلہ برابر کی برائی سے دیا جا سکتا ہے مگر افضل یہ ہے کہ درگذر سے کام لیا جائے۔

جزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظٰلمین ۝ (شوریٰ - ۴) — برائی کا بدلہ اس کے برابر برائی ہے پس جو شخص معاف کر دے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

درگذر کا درجہ

قرآن مقدس میں درگذر کی تعریف بھی کی گئی ہے اور اس کا فائدہ بھی بتایا گیا ہے ارشاد ہے:-

لا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم وما یلقٰھا الا الذین صبروا وما یلقٰھا الا ذو حظ عظیم (حم السجدہ - ۴) — نیکی اور بدی برابر نہیں، نیک برتاؤ سے بدی کو دفع کریں پھر آپ میں اور جس میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا دلی دوست ہوتا ہے، یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں اور بڑے صاحبِ نصیب ہیں۔

انسانیت کا لحاظ

کمزوروں، نہتوں، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا ہے، غزوہ احد میں جس خاتون نے حضرت حمزہ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی جب حضرت ابودجانہؓ کی تلوار ان پر پڑی تو عورت ذات دیکھ کر فوراً روک دی اور فرمایا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورتوں پر تلوار نہ چلائی جائے۔

یہی چیز تھی کہ جہاد پر ایک لشکر کو روانہ کرتے ہوئے صدیق اکبرؓ نے تاکید فرمائی تھی۔

"دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا۔ مال نہ چھپانا، کسی کے اعضاء نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھلدار درختوں کو نہ کاٹنا، کھانے کے سوا کسی بکری گائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا، تمہارا گذر ایک قوم پر ہوگا جو دنیا چھوڑ کر خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی تم ان کو نہ چھیڑنا۔"

دین کے سلسلہ میں زبردستی نہیں

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ پہلے اپنے مخالفین پر دولتِ اسلام پیش فرماتے اور اگر اس پر راضی نہ ہوتے تو جزیہ کا مطالبہ کرتے کہ حکومت کے وفادار بن جاؤ اور غداری نہ کرو۔ اس کو

بھی کوئی نہیں مانتا تو آخری مرحلہ میں جنگ کی بات کرتے، اسلام کا حکم ہے۔

لا اکراہ فی الدین — دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں ہے

اقتدار تسلیم کر لینے کے بعد غیر مسلموں کو اسلامی حکومت میں وہی حقوق حاصل ہوتے جو مسلمانوں کے لیے ہیں اس کی تفصیل کے لئے خاکسار کی کتاب "اسلام کا نظام امن" مطالعہ کیا جائے۔

آنحضرتؐ کا عمل | کون ایسی اذیت ہے جو صنادید قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہونچائی اور قتل کی کونسی سازش ہے جس میں وہ شریک نہیں رہے، مگر جب ۸ھ میں آپ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو کس شان سے آپ نے فرمایا:

من دخل دار ابی سفیان فھو امن ومن اغلق بابہ فھو امن ومن دخل المسجد فھو امن (جمع الفوائد صفحہ ۶۲ جلد ۲) — جو ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اس کو امن ہے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے امن ہے جو خانہ خدا میں داخل ہو جائے اسے امن ہے

ومن القی السلاح فھو امن (ایضاً) — اور جو ہتھیار ڈال دے اسے امن ہے۔

چنانچہ اس پر پورا پورا عمل ہوا۔ فتح مکہ کے بعد تمام صنادید مکہ کعبہ میں جمع کئے گئے وہ آج اس یقین کے ساتھ آئے تھے کہ اسلام کی تلوار انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گی، مگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جب یہ کلمات انہوں نے اپنے کانوں سے سُنے۔

لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین — آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تمھیں معاف کریں وہ ارحم الراحمین ہیں۔

کانما نشروا من القبور (شرح معانی الآثار ص ۱۹۲ ج ۲) — گویا وہ قبروں سے زندہ ہو کر نکل رہے ہیں۔

فتنہ ختم ہونے کے بعد امن | اسلام کا قانون ہے کہ جب فتنہ دب جائے تو پھر قتال بند کر دیا جائے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ (بقرہ - ۲۴) — ان سے اس وقت تک قتال کرو تا آنکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو۔

جہاد کی اجازت کب ہے | جہاں جہاد کی اجازت دی گئی ہے وہاں صراحت موجود ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اُخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ (الحج - ۶) — جن لوگوں سے ناحق جنگ کی جاتی ہے ان کو اس بنا پر جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ ان کے غالب کر دینے پر قادر ہے جو بے وجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

جب کسی پر بے جا ظلم و تعدی ہو، اور بے وجہ اپنے گھر سے بے گھر کیا جائے تو وہ اپنی مدافعت اور جور و تعدی کو ختم کرنے کے لئے کیسے ہاتھ پیر مارنے کی سعی نہیں کرے گا جبکہ اسلام نے بتایا ہے کہ جو اپنی جان، اپنی عزت و آبرو یا اپنے مال کی حفاظت کے سلسلہ میں قتل کیا جائے شہید ہے۔

جہاد کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں رکاوٹ بننے والوں کو دفع کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف و نھوا عن المنکر (الحج - ۶)

یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان لوگوں کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز پڑھیں۔ زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کو کہیں اور برُے کاموں سے منع کریں۔

اسی طرح دنیا سے جنگ وجدال کا خاتمہ، انسانیت کا تحفظ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی ہے جن کا رب العالمین سے صحیح تعلق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا (الحج - ۶)

اگر ایک کی دوسرے سے مدافعت نہ کرتا تو راہبوں کے خلوت خانے اور یہود ونصاریٰ کے معابد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے سب ڈھا دیئے جاتے۔

دوسری حکومتوں سے تعلقات

اسلام میں خواہ مخواہ لڑنے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت مقصد کے تحت ہے چنانچہ جو لوگ فتنہ و فساد کرنے نہیں دیتے، مظالم نہیں ڈھاتے، ان سے اور ایسی غیر مسلم حکومتوں سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہیں۔ ذیل کی آیت میں اس کی صراحت موجود ہے ارشاد ربانی ہے۔

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبرّوھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ (الممتحنہ - ۲)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان وانصاف سے نہیں روکتا جو دین کے معاملہ میں تم سے نہیں لڑتے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظٰلمون (الممتحنہ - ۲)

صرف ان لوگوں سے تم کو دوستی سے روکتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور نکالنے والوں کی مدد کریں جو ایسوں سے دوستی کرے گا وہ گنہ گار ہوگا۔

معلوم ہوا کہ غیر مسلم ممالک میں سے جو ممالک محارب و مخالف کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ ان سے تعلقات خوشگوار رکھے جائیں گے

رواداری

اسلام چاہتا ہے دنیا سے ظلم و ستم ختم ہو اور عدل و مساوات کی حکومت قائم ہو، اسلام میں جیسی رواداری ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم، والمحصنٰت من المومنات والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب

آج تمہارے لئے حلال چیزیں حلال رکھی گئی ہیں اور جن کو کتاب دی گئی ہے ان کا ذبیحہ تمکو حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے اور مسلمان پارسا عورتیں اور اہلِ کتاب پارسا عورتیں جب تم ان کو

من قبلکم اذا اٰتیتموھن اجورھن محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین (المائدہ۔ ۱)

ان کا معاوضہ دیدو اس طرح سے کہ تم ان کو بیوی بناؤ۔ ان سے نہ اعلانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ طور پر یار اور جو شخص ایمان کے ساتھ کفر کرے گا تو اس کا عمل غارت ہو جائے گا اور وہ آخرت میں بالکل خسارہ میں رہے گا۔

اسلام میں چھوت چھات کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی کی اجازت غیر قوموں سے تعلقات کی استواری کی دلیل ہے۔

رستم کے پوچھنے پر صحابی رسول زہرہؓ نے کہا تھا کہ ہمارا مقصد خدا کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا پرستی پر لگانا ہے اس لئے کہ سارے انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں اور ایک ماں باپ سے ہونے کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں۔

اسلامی ریاست میں اس کا پورا لحاظ و پاس ہے کہ سارے انسانوں کو پیٹ بھر کھانا، ستر پوشی اور پوشاک کے لیے کپڑے اور رہنے بسنے اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے گھر میسر ہو، ملک میں کوئی بھوکا، ننگا اور بے گھر نہ ہو، سبھوں کے لیے اس قدر انتظام اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔

محتاجوں اور معذوروں کے لئے انتظام

اسلام میں غریبوں اور محتاجوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقات کی مد قائم کی گئی ہے اور اس کی ادائیگی ہر صاحبِ نصاب پر ضروری قرار دی گئی ہے، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب بعض قبائل نے زکوٰۃ بند کرنے کا ارادہ کیا اور خلیفہ رسول صدیق اکبرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اعلان فرمایا کہ ایسے لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانا فرض ہے، فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ جو کلمۂ اسلام کا اقرار کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا اور صرف زکوٰۃ روکتا ہے، اس کے خلاف تلوار کیسے اٹھانا درست ہوگا، صدیق اکبرؓ نے جواب میں فرمایا:

واللہ لاقاتلن عن فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فان الزکوٰۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا لقاتلتھم علی منعہ (ریاض الصالحین ص۴۸۵)

خدا کی قسم میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا زکوٰۃ حق مال ہے، اگر کوئی ایک معمولی سی بھی رسی روکے گا تو بخدا اس روکنے پر اس سے جنگ کروں گا۔

اسلام اسے برداشت نہیں کرتا ہے کہ کوئی خزانے رکھے اور کوئی ایڑی رگڑ رگڑ کر جان دے، اس کا حکم ہے:

خُذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا (توبہ۔ ۱۳)

تم انکے مال سے صدقہ وصول کر کے انھیں پاک کر دو اور اس کے ذریعہ سے بابرکت بناؤ۔

مال والوں سے ایک مخصوص رقم لی جائے گی اور حاجت مندوں پر جو مستحق قرار پائیں گے تقسیم کی جائے گی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم۔ (ریاض الصالحین)

اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض قرار دی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو دی جائے گی۔

نقدی پر چالیسواں حصہ فقرا و مساکین کا ہے، مال تجارت کی قیمت لگائی جائے گی اور سال پورا ہونے کے بعد ڈھائی فی صدی غربا کے لئے نکالا جائے گا۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں دسواں اور بیسواں حصہ مساکین کے لئے مخصوص ہے سونا چاندی کے زیورات میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔

اس کے ساتھ اسلام کا یہ قانون بھی ہے کہ اگر ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی خدانخواستہ کچھ لوگ فاقہ سے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ غلہ یا نقد رقم ہو تو خلیفہ وقت مالداروں سے فاضل رقم لے کر مفلسوں اور بھوکے مرنے والوں پر خرچ کرے گا۔ پھر اُن تمام صورتوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے جن سے غریبوں کا خون چوسا جا سکتا ہے جیسے سود، رشوت، احتکار، اسراف، بخل وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کا معاشی نظام اشتراکی نظام سے بہت بہتر ہے اور مفید تر بھی ساتھ ہی مضبوط بھی، زکوٰۃ و عشر اور صدقات نافلہ کے علاوہ بھی بہت سارے حقوق ایک کے دوسرے پر رکھے گئے ہیں شخصی ملکیت کو جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ توانائی میں فرق نہ آنے پائے اور انسان انسان باقی رہے جانور بن کی صف میں لاکر کھڑا نہ کیا جائے، مرنے کے بعد میراث کا قانون ہے کہ مرنے والے کی دولت اور جائداد ورثہ پر تقسیم ہوگی۔

اسلام نے خود رُو پودوں، چشموں، دریاؤں، سمندر کی مچھلیوں اور پرندوں پر کوئی پابندی عاید نہیں کی ہے اس طرح کی چیزوں پر ٹیکس، محصول اور ٹھیکہ جائز نہیں ہے،

قانون امن وسلامتی

اسلام میں امن وامان اور سکون وسلامتی کے لئے جو قوانین ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان کے اجراء کے بعد بدامنی، قتل وخون ریزی، اور چوری ڈکیتی کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا ہے، پہلے اسلام انسان کے دلوں پر مذہب کی راہ سے حکومت قائم کرتا ہے۔ عالمگیر اخوت ومحبت کا درس دیتا ہے، حقوق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی اہمیت دلوں میں جاگزین کرنے کی سعی کرتا ہے بغض و حسد اور بدظنی کی مذمت کرتا ہے۔ لوٹ مار، غارت گری اور چوری ڈکیتی کے نتائج وعواقب پر روشنی ڈالتا ہے، فتنہ وفساد اور مردم آزاری کے نقصانات بتاتا ہے، اور مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کے بعد جان کی قدر وقیمت اور اس کی حفاظت، قتل وخونریزی کا وبال اور اس کی سزا، حدود وقصاص کے مسائل واحکام سب کی تفصیل بیان کرتا ہے، باطن وظاہر دونوں راستوں سے انسانوں کی انسانیت کو آواز دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق (بنی اسرائیل - ۳)	جن جانوں کو اللہ نے محترم بنایا ہے ان کو حق کے سوا کسی اور طرح قتل نہ کرو۔

قاتل کے لئے قصاص کا حکم دیا گیا، ارشاد ہے

کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ (البقرہ - ۲۲)	تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کیا گیا، آزاد آزاد کے بدلے اور غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے۔

قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا اور قرآن نے بتایا۔

ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الالباب (البقرہ - ۲۲)	اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے لے عقل مندو

ورثاء مقتولین قاعدہ کے مطابق قصاص میں قاتل کے قتل ہو جانے کے بعد ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں لیکن اگر کوئی وارث مقتول اس کو بنیاد بنا کر پوری فضا خراب کرنے کی سعی کرنا چاہے تو اس کو اختیار نہیں دیا جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم (البقرہ) — پھر جو اس فیصلہ کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

قتل کی اہمیت جتائی گئی اور اس کے نقصانات کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا گیا

ومن اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرآئیل انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا (المائدہ - ۵) — اور اسی سبب سے ہم نے بنی پر لکھ دیا کہ جو کوئی کسی ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر ملک میں فساد کے قتل کرے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر دیا اور جس نے اس ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔

فساد اور ڈاکہ زنی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کو پھانسی دی جائے یا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ ڈالے جائیں۔

انما جزآؤ الذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض (ایضاً) — ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا پھانسی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں۔ یا شہر بدر کر دیئے جائیں۔

چور کی سزا یہ تجویز کی ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ گٹوں سے کاٹ ڈالے جائیں۔

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزآءً بما کسبا نکالاً من اللہ (المائدہ - ۶) — اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ان کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالو، ان کے کرتوت کی سزا میں تنبیہہ ہے اللہ کی طرف سے،

حدود و قصاص میں قطعاً کسی کی رعایت درست نہیں ہے، جو بھی جرم کا مرتکب ہوگا اس پر مقرر کردہ سزا مرتب ہو کر رہے گی، ایک مخزومیہ خاتون کی سفارش پر نبی کریمؐ نے برافروختہ ہو کر فرمایا تھا کہ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی لاڈلی فاطمہ بھی چوری کرے گی تو اس کا ہاتھ بھی شریعت کے مطابق کاٹا جائے گا۔

عفت و عصمت کا پاس

جان کے برابر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ قیمت عفت و عصمت اور پاک دامنی کی ہے۔ اسلام میں اس کی حفاظت کا بھی پورا سامان فراہم کیا گیا اور خلاف ورزی پر سخت سزا تجویز کی گئی ہے، اسلام نے حکم دیا۔

وانکحوا الایامٰی منکم والصالحین من عبادکم وامآئکم ان یکونوا فقرآء یغنھم اللہ من فضلہ (النور - ۴) — تم اپنے بے بیاہوں اور غلاموں اور لونڈیوں کا جو نکاح کے لائق ہوں نکاح کر دو اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مالدار بنا دے گا۔

نکاح ایک عبادت ہے اور زن و شو کی زندگی محبت و پیار کی زندگی ہے۔

ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ (روم - ۳) — اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس چین کرو اور اس نے تم دونوں کے درمیان اس میں پیار اور مہربانی رکھ دی ہے

پاک دامنی کو جو بھی غلط طور پر داغدار کرنے کی سعی کرے گا اسلام میں اس کے لئے سخت سزا ہے۔ چار عینی گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں اسی درّے لگائے جائیں گے۔

والذین یرمون المحصنٰت ثم لم یاتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا، (نور-۱)

جو لوگ پاک دامن والی عورت کو تہمت لگائیں پھر نہ لائیں چار مرد گواہ تو ان کو اسی درّے لگاؤ، اور کبھی ان کی کوئی گواہی قبول نہ کرو۔

زنا سے بچنے کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں اگر کوئی اس کے باوجود زنا کا مرتکب ہوگا، تو غیر شادی شدہ کو سو دُرّے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے گا،

الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذکم بهما رأفة فی دین الله ان کنتم تومنون بالله والیوم الآخر ولیشهد عذابهما طائفة من المومنین (نور-۱)

زنا کرنے والی عورت اور مرد ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو درّے مارو اور تم کو ان پر اللہ کا حکم چلانے میں ترس نہ آنے پائے، اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی سزا مسلمانوں کی ایک جماعت دیکھے۔

تعلیم و تربیت

اس نظام میں تعلیم و تربیت پر بھی کافی زور دیا گیا ہے، حدیث میں جگہ جگہ علم کی فضیلت اور ترغیب ہے قرآن پاک کی اولین آیات جو نازل ہوئیں ان کا تعلق جبری تعلیم سے ہے، خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی پہلی آمد پر آپ کو پڑھنا سکھایا، اور جب تک آپ نے قرآنی آیات کی تلاوت نہیں کی وہ بار بار تلاوت کے لیے فرماتے رہے؛

اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق (العلق)

اپنے رب کے نام سے پڑھ جو سب کا پیدا کرنے والا ہے، انسان کو جمے ہوئے لہو سے بنایا۔

قرآن پاک میں علم کی فضیلت کے سلسلہ میں ارشاد ہے:-

هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر-۱)

کیا سمجھ والے (اہلِ علم) اور بے سمجھ برابر ہوتے ہیں

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا گیا اور فرمایا گیا۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا

تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے

زیادتی علم کے لیے دعا کا حکم دیا گیا ارشاد ہوا۔

قل رب زدنی علما (طہ-۶)

آپ کہیں اے رب مرے علم میں زیادتی عطا فرمادے

علم کی قدر و قیمت، علم والوں کی منزلت کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فقیه واحد افضل عند الله من الف عابد (مشکوٰة)

ایک فقیہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہزار عابد سے افضل ہے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ طلبہ کی روشنائی شہدا کے خون سے زیادہ قیمتی ہے کبھی فرمایا کہ طلبہ کے لیے روئے زمین کی ساری چیزیں دعا کرتی ہیں حتی کہ مچھلیاں پانی کے اندر ان کے لیے دعا کرتی ہیں، یہ بھی ارشاد فرمایا علم کا حاصل کرنا ہر مرد و عورت کے لیے فرض ہے اور جہاں سے اور جیسے ممکن ہو علم طلب کرو۔

دنیا میں علم کا ذوق سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب کا نتیجہ ہے ابتدا میں مسلمانوں ہی سے علوم و فنون کا چرچا پھیلا اور دنیا کی دوسری قوموں میں علم و فن کا شوق پیدا ہوا، سائنس و فلسفہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو مسلمانوں کا رہین منت نہ ہو۔

اخلاق و اعمال کی پاکیزگی

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبہ جات کو سنوارا، وہیں آپ نے اخلاق و اعمال کی بلندی و پاکیزگی پر بھی کافی توجہ دی اور یہ واقعہ ہے کہ اعمال و اخلاق پر جو توجہ اسلام نے دی ہے، کہیں وہ موجود نہیں، غیر مہذب قومیں ان تعلیمات کی بدولت مہذب بن گئیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم نے اعلان کیا۔

انک لعلی خلق عظیم (القلم - ۱)   بیشک آپ بڑے خلق پر پیدا ہوئے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اخلاق و صداقت کا نمونہ تھی، اور اسلام کی اشاعت میں آپ کی صداقت اور آپ کے اخلاق و اعمال کو بڑا دخل ہے آپ کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم (توبہ - ۱۶)

تم میں سے تمہارے پاس ایک رسول آیا، جس سے تم کو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس پر بھاری ہے اور تمہاری بھلائی بہت چاہنے والا ہے اور ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے

اس امت کو اس کا خصوصی شرف حاصل ہے کہ وہ مبلغ بنا کر بھیجی گئی ہے، اس امت کے سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران - ۱۲)

جو امتیں عالم میں بھیجی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو،

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق صراحت فرمائی ہے۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مشکوٰۃ)   میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کو مکمل کروں۔

زندگی کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، اسلام نے ہر مرحلہ میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، حسن ادب پر زور دیا ہے اور احترام و اکرام کی تاکید کی ہے۔

آدابِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام

مولوی محمد صالح

اللہ تعالیٰ کلام مجید میں متعدد مقامات پر ارشاد فرماتا ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں کلامِ الٰہی کو برحق مانتے ہیں اور خدائے تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کرتے ہیں وہ جنت کے مستحق ہوں گے جہاں ہر قسم کے عیش وعشرت کے سامان مہیا ہیں اور جو لوگ دنیا کے عیش وعشرت میں مشغول ہوکر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے جہاں طرح طرح کے عذاب ہیں۔ چونکہ صحابہ کو خدا اور رسول کے ارشاد پر یقین واثق اور عشق کامل تھا اس لیے وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ ایسے کام کریں جس کے باعث دوزخ سے محفوظ رہ کر جنت کے مستحق ہوجائیں جہاں اس محبوب حقیقی کے جمال لایزال کے مشاہدہ سے بہرہ ور ہوں گے۔ یوں تو ہر مسلمان کا دعویٰ ہے کہ میں جو کام کرتا ہوں اچھا ہے اور اپنے آپ کو اچھا ظاہر کرتا ہے حتیٰ کہ ایک بدکردار بھی اپنے آپ کو نیکوکار سمجھتا ہے۔ ؎

ہر کسے خود را نماید بایزید

نیک چوں بینی بماند بایزید

مگر اصحاب کرام کے حالات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے اعمال و افعال میں کیا نسبت ہے اور اُن کو خدا و رسول کے ساتھ کس درجہ کا عشق تھا اور ہم کو کتنا!

مسلمانو! صحابہ کرام وہ لوگ تھے جن کی افضلیت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گواہی دی ہے۔ چنانچہ دیلمی نے مسندِ فردوس میں ذکر کیا ہے:

عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ نَظَرَ فِیْ قُلُوْبِ الْعِبَادِ فَلَمْ یَجِدْ قَلْبًا اَتْقٰی مِنْ قُلُوْبِ اَصْحَابِیْ وَلِذَالِکَ اخْتَارَھُمْ فَجَعَلَھُمْ صِحَابًا فَمَا اسْتَحْسَنُوْا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ وَّمَا اسْتَقْبَحُوْا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ قَبِیْحٌ۔

یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی قلب میرے صحابہ کے قلوب سے زیادہ پاکیزہ نہیں دیکھا۔ اس لیے ان کو میری صحابیت کے لیے پسند فرمایا جو کچھ وہ اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا ہے اور جو بُرا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بُرا ہے۔

غرض صحابہ کرام کے دلوں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بڑی عظمت تھی اور وہ آپ کے آداب کی رعایت رکھتے تھے باوجود اس کے اگر کسی سے بمقتضائے بشریت یا سادگی سے کوئی ایسی حرکت ہوجاتی جس میں بے ادبی کا شائبہ ہوتا تو ساتھ ہی کلامِ الٰہی میں تنبیہ اور زجر و توبیخ نازل ہوتی جس سے سب متنبہ اور ہوشیار ہوجاتے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اصحاب کرام

قلوب میں آپ کی تعظیم و تکریم اس قدر جاگزیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُوبرو بات نہ کر سکتے تھے اور اگر ان کو کچھ دریافت کرنا ہوتا تو کئی دنوں تک خاموش رہتے اور موقع کے منتظر رہتے۔ یا کسی بدوی کی فکر میں رہتے کہ وہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پُوچھے اور ہم استفادہ کریں کیونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعظیم و اجلال کے باعث خود دریافت نہ کر سکتے تھے اور مجلس شریف میں آکر بیٹھتے تو بالکل بے حس و حرکت سر نیچے کیے بیٹھے رہتے۔ کبھی نگاہ اٹھا کر بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف نہ دیکھتے۔

صحابہ کرام کے آداب کما ینبغی تحریر میں نہیں آسکتے کیونکہ ادب ایک کیفیتِ قلبی کا نام ہے جس سے مختلف اقسام کے آثار و افعال ظہور میں آتے ہیں۔ اس کو بیان کرنا امکان سے خارج ہے۔ مگر چند آثار ارقام کیے جاتے ہیں۔ جن کی غرض یہ ہے کہ مسلمان ان حضرات کی کیفیتِ قلبی کو پیشِ نظر رکھ کر اس قسم کی کیفیتِ قلبی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

صدیق اکبرؓ کا طریق ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صحیح بخاری میں سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں صُلح کرانے کے واسطے تشریف لے گئے۔ جب نماز کا وقت ہُوا تو موذن نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھ کر اقامت کہی۔ اور انھوں نے امامت کی۔ اس عرصہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی تشریف فرما ہو گئے اور صف میں قیام فرمایا۔ جب نمازیوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا تو دستک دینے لگے، اس غرض سے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خبردار ہو جائیں کیونکہ ان کی عادت تھی کہ نماز میں کسی طرف نہ دیکھتے تھے۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دستک کی آواز سنی تو گوشۂ چشم سے دیکھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف فرما ہیں لہٰذا پیچھے ہٹنے کا قصد کیا۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ فرمایا کہ اپنی ہی جگہ پر قائم رہو۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ اور اس نوازش پر کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے امامت کا حکم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا اور پیچھے ہٹ کر صف میں کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے۔ جب نماز سے فارغ ہُوئے تو فرمایا کہ اے ابوبکر! جب میں خود تمھیں حکم کر چکا تھا تو تم کو اپنی جگہ پر کھڑے رہنے سے کون چیز مانع ہُوئی تھی۔ عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ابی قحافہ کا بیٹا اس لائق نہیں کہ "اَنْ یُّصَلِّیَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بڑھ کر نماز پڑھائے۔

اب یہاں گہری نظر کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پیچھے ہٹنے سے منع فرمایا مگر اُن سے امتثال نہ ہو سکا حالانکہ اللہ تعالیٰ سورۂ حشر رکوع ۱ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ یعنی "اور جو حکم دیں تم کو رسول تو اس کو قبول کرو۔ اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔ اس انکار کی حکمت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حال میں بالتفصیل لکھی گئی ہے۔

کنز العمال میں مروی ہے: قَالَ ابْنُ الْاَعْرَابِیِّ رُوِیَ اَنَّ اَعْرَابِیًّا جَاءَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فَقَالَ اَنْتَ خَلِیْفَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا قَالَ فَمَا اَنْتَ قَالَ الْخَالِفَةُ بَعْدَهٗ۔ یعنی ایک اعرابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔

اُس نے کہا پھر کیا ہو ؟ آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خالفہ ہوں۔
جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ خالفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی گھر کے سب لوگوں میں ایسا ہو جس میں کچھ خیر نہ ہو۔ چونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ادب نے اجازت نہ دی کہ اپنے آپ کو اس لفظ کا مصداق سمجھیں۔ اس لیے اُس کو ایسے طور سے بدلا جس میں مادہ خلافت باقی رہے اور ادب بھی ہاتھ سے نہ جائے حالانکہ آپ کی خلافت احادیث صحیحہ سے صراحتاً ثابت ہے۔
جائے غور ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفہ کہنے میں تامل کرتے ہیں تو اب ان لوگوں کو کیا کہیں جو کمال فخر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برابری اور بھائی چُپنے کی نسبت لگاتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس برابری سے اُن کا مقصود کیا ہے۔ اگر اُن کو اپنی فضیلت ظاہر کرنا منظور ہے تو وہ خصوصیات حضور کہاں ہیں۔ جو نہ کسی نبیِ مرسل کو نصیب ہوئیں اور نہ کسی فرشتۂ مقرب کو ملیں۔

کافراں دیدند احمد را بشر
ایں نمے دانند کہ آں شق القمر
گر بصورت آدمی انساں بُدے
احمد و بوجہل خود یکساں بُدے

افسوس ان لوگوں کو اتنی سمجھ نہیں کہ ؎

در محفلے کہ خورشید اندر شمارِ ذرہ ہست
خود را بزرگ دیدن شرطِ ادب نباشد

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اپنے باپ کو آنحضرتؐ کی گستاخی کرنے کے سبب طمانچہ مارنا

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ نے کفر کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی ناشائستہ کلمہ منہ سے نکالا۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً ان کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو عرض کیا : یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت میرے پاس تلوار نہ تھی ورنہ ایسی گستاخی پر اس کی گردن اڑا دیتا۔ اُسی وقت آپ کی شان میں یہ آیت نازل ہوئی :

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورہ مجادلہ)

تو نہ پائے گا ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور روزِ آخرت پر کہ وُہ ایسوں سے دوستی کریں جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے گو وُہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے

کنبے کے ہی ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے اور اُن کی تائید کی اپنے فیضانِ غیبی سے اور ان کو داخل فرمائے گا ایسے باغوں میں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی۔ یہ خدائی لشکر ہے خبردار ہو جاؤ اللہ کا لشکر وہی فلاح پانے والے ہیں۔

دیکھیے اس آیت مبارک سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی کیسی شان پائی جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر بیٹھنا خلافِ ادب سمجھا

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آغازِ خلافت میں منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینے لگے تو منبر کے جس درجے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ القا فرمایا کرتے تھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس سے نیچے کے درجے پر بیٹھے کہ ؏

بجاے بزرگاں نشستن خطا است

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایامِ خلافت میں اسی منبر پر بیٹھ کر خطبہ دینا چاہا تو اس درجہ سے بھی نیچے کے درجے پر بیٹھے کیونکہ ان کے نزدیک مقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے ساتھ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کا ادب بھی واجب تھا۔

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان کی چھت پر ایک پرنالہ تھا ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نئے کپڑے پہنے ہوئے مسجد کو جا رہے تھے جب اس پرنالے کے قریب پہنچے اتفاق سے اس دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے گھر دو مرغ ذبح کیے جا رہے تھے یکایک ان کا خون اس پرنالے سے ٹپکا اور اس کے چند قطرے عمر خطاب رضی اللہ عنہ کے کپڑوں پر پڑ گئے آپ نے اس پرنالے کے اکھاڑ ڈالنے کا حکم صادر فرمایا لوگوں نے فوراً اس پرنالے کو اکھاڑ دیا اور آپ گھر واپس آ کر دوسرے کپڑے پہن کر مسجد میں تشریف لائے اداۓ نماز کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آ کر کہنے لگے یا امیر المومنین! خدا کی قسم اس پرنالے کو جسے آپ نے اکھاڑ ڈالا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس جگہ لگایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر نہایت مضطرب اور پریشان ہوئے تھوڑی دیر کے بعد آپ نے عباس رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اے عباس! میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ اپنے پیر میرے کندھے پر رکھ کر اس پرنالے کو جیسا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لگایا تھا اسی جگہ پر لگا دو۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی درخواست پر اس کو پہلی جگہ پر لگا دیا۔

دیکھیے حضرت عمر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے دل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کس قدر عظمت اور عزت تھی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طریق ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش کی طرف جنگ حدیبیہ میں صلح کے واسطے بھیجا تو قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طواف کرنے کی اجازت دی۔ لیکن آپ نے طواف کرنے سے انکار کیا اور اپنے پروردگار کے حکم یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ اپنے آقائے نامدار کا ادب تعظیم مدِ نظر رکھ کر فرمایا مَا کُنْتُ لَا فْعَلَ حَتّٰی یَطُوْفَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یعنی میں طواف نہ کروں گا جب تک میرے مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں گے۔

دیکھیے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت اللہ شریف کے طواف کرنے کے مقابلے میں جو عبادت میں داخل ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رعایت ادب کو افضل جانا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدارج النبوت میں لکھتے ہیں کہ کوئی عبادت حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی رعایت ادب کے برابر نہیں ہے۔

اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد صحابہ کرام اور تابعین عظام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث اور کلام کے ذکر کے وقت آپ کی تعظیم و توقیر فرماتے اور آپ کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ کنزالعمال میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا میں اسلام میں چوتھا شخص ہوں اور میرے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے دی ہیں اور میں نے جب سے اپنا داہنا ہاتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دستِ مبارک سے ملایا ہے اُس دن سے میں نے اپنی شرمگاہ کو کبھی نہیں چھوا۔ (کیمیائے سعادت)

ادب کا یہ وہ مرتبہ عظمیٰ ہے جس پر ہر شخص مکلف نہیں بلکہ یہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہی حصّہ تھا اس کی حقیقت یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے:

وَاِذَا اَتَی الْخَلَاءَ فَلَا یَمَسَّ ذَکَرَہٗ بِیَمِیْنِہٖ وَلَا یَتَمَسَّحْ بِیَمِیْنِہٖ۔

یعنی جب کوئی پاخانے جائے تو دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو نہ چھوئے نہ اس سے نجاست پونچھے۔

دوسری حدیث میں ہے:

کَانَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْیُمْنٰی لِطُھُوْرِہٖ وَطَعَامِہٖ وَکَانَتْ یَدَہُ الْیُسْرٰی بِخَلَاءِہٖ وَمَا کَانَ مِنْ اَذًی۔

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دایاں ہاتھ وضو کرنے اور کھانے کے لیے تھا۔ اور آپ کا بایاں ہاتھ پاخانہ میں ڈھیلا استعمال کرنے اور ہر مکروہ چیز کے لیے تھا۔

ان حدیثوں سے ثابت ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر اس قدر برتری ہے کہ پاخانہ وغیرہ کی حالت میں اسے مکروہ و نجس اشیاء کو چھونے سے بچایا جائے۔ اور اس خدمت کے لیے صرف بائیں ہاتھ کو مخصوص کر لیا جائے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

نے اس فضیلت کی بنا پر کہ ان کا ہاتھ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھ سے چھو چکا ہے۔ اُس کے شرف کو اس قدر وسیع اور عام کر لیا کہ خلا وغیرہ کی حالت میں بھی مدت العمر اس سے مس ذکر نہ کیا۔ یعنی دائیں ہاتھ کی جو فضیلت حالتِ خلا میں مسّ ذکر سے مانع تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے چھونے کے باعث اس قدر وسیع کر لی کہ غیر خلاء کی حالت میں بھی اس سے مسّ ذکر گوارا نہ کیا۔ یا یُوں سمجھو کہ اگر شرع نے دائیں ہاتھ سے مسّ ذکر کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ وہ بائیں سے اشرف ہے۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے عدم مسّ ذکر کی علت بجائے اس کے دایاں ہونے کے اس امر کو قرار دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کے ساتھ چھُو چکا ہے۔ فافہم۔

اب ایک اور پہلو پر نظر کرنی چاہیے۔ یعنی اگر اس ہاتھ میں کسی قسم کی برکت پیدا ہو گئی تھی تو شرمگاہ میں کون سی برائی رکھی تھی، جس کو وہ متبرک ہاتھ لگانا مذموم سمجھا گیا۔ حالانکہ احادیث و آثار سے مصرّح ہے کہ وہ بھی ایک عضو ہے مثل اور اعضاء کے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

۱۔ عَنْ قَيْسِ بْنِ طَلْقٍ اَنَّ اَبَاهُ حَدَّثَهُ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ مَسَّ ذَكَرَهُ اَيَتَوَضَّوءُ قَالَ هَلْ هُوَ اِلَّا بِضْعَةٌ مِنْ جَسَدِكَ۔

یعنی موطا امام محمد میں قیس بن طلق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا آلۂ تناسل کے چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ فرمایا وہ تو ایک ٹکڑا ہے تیرے جسم کا۔

۲۔ عَنْ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ قَالَ مَا اُبَالِيْ اِيَّاهُ اَمَسُّ اَوْ اَنْفِيْ اَوْ اُذُنِيْ۔

یعنی موطا امام محمد میں مروی ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے کچھ پروا نہیں کہ ذکر کو مس کروں یا ناک کو یا کان کو۔ یعنی ان تمام اعضاء کے چھُونے کا ایک ہی حکم ہے۔

۳۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ سُئِلَ عَنِ الْوُضُوْءِ مِنْ مَسِّ الذَّكَرِ فَقَالَ اِنْ كَانَ نَجِسًا فَاقْطَعْهُ۔

یعنی موطا امام محمد میں ابراہیم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پُوچھا کہ مس ذکر سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ کہا اگر وہ نجس ہے تو اس کو کاٹ ڈال۔

الحاصل شرعاً بول و براز کی حالت کے سوا دیگر حالت میں مسِ ذکر میں کوئی کراہت نہیں۔ البتہ اگر کراہت ہے تو طبعی ہے۔ پھر اس کراہت طبعی کو ادب نے وہاں اس درجہ بڑھایا کہ مشابہ بلکہ زیادہ کراہت شرعی سے کر دیا جس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عمر بھر اس فعل سے بچتے رہے۔

اِس سے معلوم ہُوا کہ ادب ایک ایسی چیز ہے کہ اپنا پورا اثر کرنے میں نہ منتظرِ امر ہے نہ محتاجِ نظیر۔ بلکہ اہلِ ایمان میں وُہ ایک قوتِ راسخہ ہے جس کو خاص ایمان کے ساتھ تعلق ہے اور اس کا منشا عظمت و قوت اُس شخص یا اُس چیز کی ہے جس کے آگے ادب کرنے والا اپنے کو کم درجہ اور ذلیل سمجھتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صحیح مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جب وہ صلح نامہ لکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کفار کے درمیان حدیبیہ کے دن ٹھہرا تھا۔ جس میں یہ عبارت تھی:

هٰذَا مَا كَاتَبَ عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

تو مشرکوں نے کہا کہ لفظ رسُول اللہ نہ لکھو کیونکہ اگر رسالت مسلّم ہوتی تو پھر لڑائی کیا تھی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اس لفظ کو مٹا دو۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں وہ شخص نہیں ہوں جو اس لفظ کو مٹا سکوں۔ لہذا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے خود اُس کو اپنے ہاتھ سے مٹایا۔

اب یہاں تعمق نظر کی ضرورت ہے کہ باوجودیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لفظ رسول اللہ مٹانے کا امر فرمایا تھا مگر ان سے امتثال نہ ہو سکا حالانکہ اللہ تعالیٰ سورہ حشر رکوع ۱ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

یعنی اور جو حکم دیں تم کو رسول، تو اُس کو قبول کرو اور جس چیز سے منع کریں اُس سے باز رہو۔

سورۂ احزاب رکوع ۵ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝

یعنی اور یہ حق نہیں کسی ایماندار مرد کا نہ عورت کا۔ جب یہ فیصلہ کر دے اللہ اور اس کا رسُول کسی امر کا کہ اُن کو رہے اختیار اپنے معاملہ کا۔ اور جس نے نافرمانی کی اللہ اور اس کے رسول کی۔ سو راہ بھولا صریح چُوک کر۔

امتثالِ امر نہ ہونے کی وجہ: یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جس کے دفعیہ کے لیے تعمق نظر درکار ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات سے عدول حکمی عمل میں آئے۔ وہ بھی کس موقع میں جبکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس رُوبرو حکم فرما رہے ہیں اور اس کا بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن حضرات میں گویا سرتابی کا مادہ ہی نہ تھا۔ اِس سے بڑھ کر انقیاد کیا ہو کہ ایک اشارہ پر جان دینا اُن کے سامنے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ عدولِ حکمی خلافِ مرضی خدا اور رسول تھی۔ کیونکہ اگر یہ بات ہوتی تو خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کو زجر و توبیخ فرما دیتے بلکہ کوئی آیت نازل ہو جاتی، اس لیے کہ اُن حضرات کی تادیب کا لحاظ بیش از بیش مرعی تھا اس وجہ سے کہ وہ حضرات ایک عالم کے مقتداء ہونے اور دنیا کے لیے نمونہ بننے والے تھے بغرض ان تمام امور پر نظر ڈالنے سے پریشانی ہوتی ہے۔ مگر یہ خلجان اس طرح سے دفع ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کا پاسِ ادب جو سچے دل سے تھا۔ وُہ کچھ ایسا با فروغ تھا کہ اس کے مقابلہ میں وہ عدول حکمی قابلِ التفات نہ ہُوئی۔ اگر اس حالت کو خیال کیجیے بشرطیکہ دل میں وقعت وعظمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل طور پر ہو۔ تو معلوم ہو گا کہ ان حضرات کے دلوں کا اُس وقت کیا حال ہو گا۔ اُدھر خود بنفسِ نفیس سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بالمواجہ حکم فرما رہے ہیں۔ اور ایک طرف سے

آیات واحادیث بآوازِ بلند کہہ رہی ہیں کہ خبردار امر واجب الانقیاد سے سرِ مو انحراف نہ ہونے پائے۔ اور ادھر ادب کا دل پہ اس قدر تسلط ہے کہ امتثال کے لیے نہ ہاتھ یاری دیتے ہیں نہ پاؤں۔ آخر ان بزرگوں کو ادب نے اس قدر مجبور کیا کہ امتثالِ امر ہو ہی نہ سکا۔ اور انہوں نے وہی کیا جو مقتضائے ادب تھا۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب نصِ قطعی کے مقابلہ میں آخر ادب ہی کی ترجیح ہوئی تو دین میں اُس کو کس قدر باوقعت اور ضروری چیز سمجھنا چاہیے۔ ؎

شد ادب جملہ طاعتِ محمود
طاعتِ بے ادب ندارد سُود

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نمازِ عصر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے باعث قضا کرنا

شفا قاضی عیاض میں مروی ہے کہ جنگ خیبر کی واپسی میں منزل صہبا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عصر ادا فرمائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جماعت میں شامل نہ ہو سکے تو آپ نے اسی وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زانوئے مبارک پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نمازِ عصر نہیں پڑھی تھی اس لیے اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے کہ نمازِ عصر کا وقت گزر رہا ہے جو سب نمازوں سے افضل ہے اور جس کی تاکید قرآن مجید میں بتکرارِ عطف فرمائی ؛

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ (سورہ بقرہ رکوع ۳۱)

یعنی حفاظت کرو اور نگاہ رکھو تم نمازوں کو۔ اور نمازِ وسطیٰ یعنی نمازِ عصر کو۔

خندق کے دن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عصر کے فوت ہو جانے پر کفار کے واسطے یہ بددعا فرمائی ؛

حَبَسُوْنَا عَنْ صَلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللہُ بُیُوْتَھُمْ وَقُبُوْرَھُمْ نَارًا۔

یعنی اُن کفار نے ہم کو نمازِ وسطیٰ سے یعنی نمازِ عصر سے روکا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے۔

باوجود اتنی تاکید کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عمداً نمازِ عصر کو ترک کیا، محض اس خیال سے کہ اگر میں اپنا زانو ہلاؤں گا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیدار ہو جائیں گے اور آپ کے خواب میں خلل آجائے گا۔ لہٰذا آپ نے محض حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے باعث زانو کو نہ ہلایا۔ حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو گیا اور نمازِ عصر کا وقت جاتا رہا۔ مگر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بیدار ہوئے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نماز کے فوت ہو جانے کا حال عرض کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ "یا الٰہ العالمین! اگر علی تیری اطاعت میں تھا تو پھر آفتاب کو طلوع کر دے"۔ پس اُسی وقت ڈوبا ہوا آفتاب پلٹ آیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہایت تسکین کے ساتھ نمازِ عصر ادا کی۔ پھر آفتاب حسبِ معمول غروب ہو گیا۔ ؎

ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں
اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

الغرض اطاعت و فرمانبرداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر امر میں واجب و لازم ہے۔ جس نے تصدیق رسالت کی، مگر

اتباع و اطاعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ کی وہ گمراہ ہے۔ اس حدیث کو روایت کیا طحاوی نے مشکل الآثار میں دو طریق سے۔ ایک روایت اسماء بنت عُمَیس سے، دُوسری فاطمہ بنت حسین سے۔ قاضی عیاض نے شفا میں۔ سیوطی نے الدرالمنتثرہ فی الاحادیث المشتہرہ میں۔ اور حافظ ابن سید الناس نے بشری اللبیب میں۔ اور اس حدیث کے دونوں طرق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ۱۱۴۴ھ ہجری میں مدینہ منورہ میں اپنے استاد شیخ ابوطاہر سے مسلسل فاطمہ بنت حسین تک اور اسماء بنت عُمَیس تک ازالۃ الخفاء میں نقل کیے ہیں۔

ازالۃ الخفاء میں ہے کہ ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔ لیکن اس کے جواب میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوت میں لکھا ہے کہ ابن جوزی حدیثوں کے موضوع کہنے میں بہت جلدی کرنے والے ہیں۔ بہرکیف یہ حدیث صحیح ہے۔

صواعق میں ہے کہ عراق کی ایک جماعت مشایخ ابوالمنصور مظفر بن اُردشیر قبادی رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں حاضر تھی جبکہ وہ نمازِ عصر کے بعد وعظ فرما رہے تھے۔ اور یہی حدیث اور اہلِ بیت کے فضائل بیان کر رہے تھے کہ یکایک ابر آیا اور آفتاب چُھپ گیا۔ لوگوں نے گمان کیا کہ آفتاب غروب ہوگیا۔ پس آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر آفتاب کو اشارہ کیا اور تین اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ ہے: ؎

کر رہا ہوں میں بتوفیقِ خدا — نعت و مدحِ مصطفیٰ و مرتضیٰ
تُو نہ ڈوب اے شمسِ تاباں پُرضیا — سُن لے تُو بھی وصفِ آلِ مصطفیٰ

وہ جماعتِ حاضرین کہتی ہے کہ اُسی وقت ڈوبا ہوا آفتاب پھر نکل آیا۔ ؎

اولیاء را ہست قدرت از اللہ
تیرِ جستہ باز گردانند ز راہ

حضرات قباث عثمان و عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بیہقی نے دلائل النبوت میں ابی الحویرث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ عبدالملک بن مروان نے قباث بن اشیم رضی اللہ عنہ سے پُوچھا کہ تم اکبر ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکبر تھے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْبَرُ مِنِّیْ وَاَنَا اَسَنُّ مِنْہُ۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بڑے تھے اور میں عمر میں اُن سے زیادہ ہُوں ——— اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریف عام فیل میں ہے اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میری والدہ صاحبہ اُسی ہاتھی کی لید کے پاس مجھے لے کر کھڑی تھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی انہی قباث رضی اللہ عنہ سے اِسی قسم کا سوال کیا تھا۔ اور انہوں نے اُن کو بھی

یہی جواب دیا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اکبر تھے اور میری ولادت پیشتر ہے۔ (بیہقی)

عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اِسی قسم کا سوال ہوا تھا۔ آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اکبر تھے اور میری ولادت پیشتر ہے۔ (کنز العمال)

کنز العمال میں یزید بن الاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے استفسار فرمایا کہ میں بڑا ہوں یا تُم؟ عرض کیا کہ آپ اکبر ہیں اور اکرم ہیں، میری عمر زیادہ ہے۔

اِس ادب کو دیکھیے کہ باوجودیکہ اس موقع میں لفظ اکبر اور اسنّ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں مگر اس لحاظ سے کہ لفظ اکبر مطلق بزرگی کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ صراحتہً اُس کی نفی کر دی اور مجبوراً لفظ اسنّ کو ذکر کیا۔ کیونکہ صراحتہً مقصود پر دلالت کرنے والا سوائے اِس کے کوئی لفظ نہ تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ جنکی تعظیم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کیا کرتے تھے اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا ادب میں یہ حال ہو تو پھر ہم کو کس قدر ادب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مگر افسوس ہے آجکل کے بعض بے ادب اور گستاخ فرقوں پر جو شب و روز آیات و احادیث سے کرید کرید کر من گھڑت معانی بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیصِ شان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان بے ادبوں کو رشد و ہدایت بخشے تاکہ وہ بے ادبی اور گستاخی کے باعث دوزخ کا ایندھن بننے سے محفوظ رہیں۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم

ابو داؤد میں عبد بن فیروز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مَیں نے پُوچھا کہ کن جانوروں کی قربانی درست نہیں۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں میں کھڑے ہُوئے اور فرمایا کہ چار قسم کے جانور ہیں جن کی قربانی درست نہیں۔ ایک وہ جس کی آنکھ پُھوٹی ہو۔ دوسرا وہ جو سخت بیمار ہو۔ تیسرا وُہ جس کا لنگ ظاہر ہو۔ چوتھا وہ جو نہایت دُبلا ہو۔ اُس کو آپ نے اپنی انگلیوں کے اشارے سے تشریح فرمائی۔ لیکن میری انگلیاں حضرت کی انگلیوں سے چھوٹی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں پہلے دستِ مبارک کے اشارہ سے تعیین فرمادیا کہ چار جانور ہیں جن کی قربانی درست نہیں۔ پھر اُن کی تفصیل۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے جب اِس واقعہ کو بیان کیا تو ادب نے اجازت نہ دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی حکایت اپنے ہاتھ سے کی جائے۔ لہٰذا عذر ظاہر کیا کہ میری انگلیاں چھوٹی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ چار کا اشارہ ہاتھ سے کرنے میں مقصود صرف تعیینِ عدد ہے۔ ظاہراً نہ اس میں کوئی مساوات کا شائبہ ہے نہ سوءِ ادب کا۔ باوجود اس کے ادب صحابیؓ نے دستِ مبارک کی حکایت کو بھی گوارا نہ کیا جس سے تشبیہ لازم آجاتی تھی۔ اب دوسرے آداب کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔

افسوس ان لوگوں کے حال پر جو باوجود مدعیِ علم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کے کلمات کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں فہم سلیم عطا فرمائے تاکہ وہ عذابِ اُخروی سے بچ جائیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

صحیح بخاری میں ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ کے کسی راستہ میں دیکھا۔ چونکہ میں جُنبی تھا اس لیے میں چھُپ گیا۔ پھر غسل کر کے حاضرِ خدمتِ اقدس ہوگیا۔ آپ نے فرمایا: اے ابوہریرہ! تم کہاں تھے؟ عرض کیا کہ مجھے نہانے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے آپ کے ساتھ بغیر طہارت کے بیٹھنے کو مکروہ سمجھا۔ فرمایا:

سُبْحَانَ اللهِ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا یَنْجَسُ۔

یعنی پاک ہے اللہ تعالیٰ۔ مومن نجس نہیں ہوتا۔

دیکھیے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حالت میں جو الگ ہوگئے، تو اس سے ظاہر ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کمال درجہ کی عظمت اُن کے دل میں موجود تھی۔ جس نے ان کی عقل کو مقہور کر کے اُن کے دِل کو اس ادب پر مجبور کر دیا تھا ورنہ وہ جانتے تھے کہ جنابت کا جسم میں سرایت کرنا ایک امر حکمی ہے حسی نہیں، جس سے دوسرے کو کراہت ہو۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کا اثر دُوسرے تک متعدی نہیں ہوسکتا۔

ہرچند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ شرعیہ بیان فرما دیا کہ مسلمان نجس نہیں ہوتا۔ مگر کلام اس میں ہے کہ اس حالت میں حاضر ہونے کو انہیں کون سی چیز مانع تھی۔ اگر نعوذ باللہ طبیعت میں بے باکی ہوتی تو خیال کر لیتے کہ اس حالت میں مجالست سے کوئی ممانعت نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی خیال آسکتا تھا کہ چل کر تو دیکھیے کہ حضور منع فرمائیں گے تو ایک مسئلہ معلوم ہوجائے گا، خصوصاً اُس زمانہ میں کہ ہر روز نئے نئے مسائل معلوم ہونے کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ ادب نے اُن کو جرأت کرنے نہ دی۔

پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو مسئلہ بیان فرمایا اُس سے یہی مقصود معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ شرعیہ معلوم ہوجائے۔ علاوہ اس کے اگر ان کی یہ حرکت ناگوارِ طبع مبارک ہوتی تو صاف زجر فرما دیتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکے۔

حضرت اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

زرقانی نے شرح مواہب اللدنیہ میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ اسلع بن شریک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُونٹنی پر میں کجاوہ باندھا کرتا تھا۔ ایک رات مجھے نہانے کی حاجت ہوئی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوچ کا ارادہ فرمایا۔ اُس وقت مجھے نہایت تردّد ہوا کہ اگر ٹھنڈے پانی سے نہاؤں تو مارے سردی کے مرجانے یا بیمار ہوجانے کا خوف ہے۔ اور یہ بھی گوارا نہیں کہ ایسی حالت میں خاص سواری مبارک کا کجاوہ اُونٹنی

پر باندھوں۔ مجبوراً کسی شخص انصاری سے کہہ دیا کہ کجاوہ باندھے۔ پھر میں نے چند پتھر رکھ کے پانی گرم کیا اور نہا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے جا ملا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اے اسلع! کیا سبب ہے کہ تمہارے کجاوہ کو میں متغیر پاتا ہوں۔ عرض کیا، یارسول اللہ میں نے نہیں باندھا تھا۔ فرمایا: کیوں؟ عرض کیا: اُس وقت مجھے نہانے کی حاجت تھی اور ٹھنڈے پانی سے نہانے میں جان کا خوف تھا۔ اس لیے کسی اور کو باندھنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اسلع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: یایہا الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلوٰۃ۔ (سورۂ مائدہ رکوع ۲)

جس سے سفر میں تیمم کرنے کی اجازت ملی۔ (درمنثور و طبرانی وغیرہ)

سبحان اللہ کیا ادب تھا کہ جس کجاوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے اس کی لکڑیوں کو حالتِ جنابت میں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ تھا۔ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو اس کا منشا محض ایمان دکھلائی دے گا۔ جس نے ایسے پاکیزہ خیالات ان حضرات کے دلوں میں پیدا کر دیے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ نہ عموماً اس قسم کے امور کی تعلیم تھی نہ صراحتہً ترغیب و تحریص۔ الحاصل جب ان لکڑیوں کا اس قدر ادب کیا گیا تو معلوم ہُوا کہ انبیاء و اولیاء کا جس قدر بھی ادب کیا جائے تو محمود ہے۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مصعب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نہایت ہی ہنس مکھ تھے مگر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کے رُوبرو کیا جاتا تو ان کا رنگ متغیر ہو جاتا اور میں نے انھیں کبھی بلا وضو حدیث بیان کرتے نہیں دیکھا۔

امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مصعب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے یا اُن کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کیا جاتا تو اُن کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے باعث جُھک جاتے یہاں تک کہ اُن کے ہم نشینوں پر گراں گزرتا۔ پس آپ سے ایک دن اس کا باعث دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

لو رأیتم ما رأیت لما انکرتم علیٰ ما ترون۔

یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفعت شان اور عظمت مکان جو میں جانتا ہُوں اگر تم اسے جانتے تو ہرگز تم اپنے دیکھے ہُوئے پر انکار نہ کرتے۔ ؎

نمیدانم کہ امین نو بہار جلوہ می آید
کہ در پرواز آمد رنگِ روگلہائے بستانرا

مصعب بن عبداللہ سے مروی ہے کہ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی حدیث بیان کرتے تو پہلے وضو کرتے پھر کپڑے وغیرہ پہن کر آراستہ ہوتے پھر حدیث شریف بیان کرتے۔ اور جب کوئی شخص دروازے پر آتا تو لونڈی بھیج کر دریافت فرماتے کہ تم کیوں آئے ہو؟ کوئی حدیث پوچھنے آئے ہو یا مسائل فقہ۔ اگر وہ کہتا مسائل فقہ پوچھنے آیا ہوں

تو آپ اُسی حالت میں باہر آکر اُسے مسئلہ بتلا دیتے۔ اگر وہ کہتا حدیث پُوچھنے آیا ہُوں تو آپ غسل خانے میں جاکر غسل فرماتے اور نئے کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، عمامہ باندھتے، سبز چادر اوڑھتے اور ان کے واسطے خاص اس وقت کے لیے ایک کُرسی بچھائی جاتی۔ پس آپ آکر اس پر بیٹھتے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ حدیث بیان فرماتے، اور جب تک حدیث بیان کرتے رہتے خوشبو سلگتی رہتی۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھا اور آپ حدیث شریف بیان فرما رہے تھے کہ آپ کو بچھّو نے سولہ بار کاٹا اور آپ کے چہرہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ مگر آپ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حدیث کا بیان کرنا نہ چھوڑا۔ جب آپ حدیث بیان کرنا ختم کر چکے اور لوگ چلے گئے تو میں نے دریافت کیا۔ فرمایا کہ آج میرے حدیث بیان کرنے میں بچھّو نے سولہ بار کاٹا۔ اور میں نے حدیث کی عظمت و اجلال کے باعث صبر کیا۔ سبحان اللہ ان حضرات کے دلوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا احترام جاگزیں تھا کہ سولہ بار بچھّو کاٹے اور اُف نہ کریں۔ جان جائے مگر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توقیر میں خلل نہ آئے بخلاف آج کل کے بعض مدعیانِ علم کے کہ وہ عمداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیصِ شان کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت بخشے۔

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادب رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث صحیح میں مروی ہے کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی پیشانی میں بال اس قدر دراز تھے کہ جب وہ بیٹھتے اور اُن بالوں کو چھوڑ دیتے تو زمین پر پہنچتے۔ لوگوں نے اُن سے پُوچھا کہ تم نے ان بالوں کو اتنا کیوں بڑھایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اس وجہ سے ان کو نہیں کٹواتا کہ ایک وقت ان پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دستِ مبارک لگا تھا اس لیے میں نے تبرکاً ان بالوں کو رکھا ہُوا ہے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا طریقِ ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چند موئے مبارک تبرکاً تھے۔ ایک جنگ میں آپ کی وُہ ٹوپی گر پڑی آپ نے اس کے حصول کے واسطے سخت جنگ کی۔ حتیٰ کہ چند مسلمان بھی اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ صحابہ کرام نے ان کو الزام دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے یہ فعل ٹوپی کے واسطے نہیں کیا بلکہ اُن مُوئے مبارک کے واسطے کیا جو اس میں ہیں تاکہ وہ ضائع نہ ہوں اور کفار کے ہاتھ میں نہ جانے پائیں اور مجھ سے اس کی برکت جاتی نہ رہے۔

امیر معاویہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ الخلفاء میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حال میں لکھا ہے؛

وکان عندہ شئ من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقلامۃ الاظفار فاوصی ان تجعل فیہ وعینیہ وقال افعلوا ذٰلك وخلوا بینی وبین ارحم الرّاحمین۔

یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ موئے مبارک اور تراشۂ ناخن محفوظ تھے جب وُہ مرنے لگے تو وصیت کی کہ یہ چیزیں میرے منہ اور آنکھوں میں رکھ دینا اور پھر میرا معاملہ ارحم الراحمین کے سپرد کر دینا۔

اس سے ظاہر ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان متبرک چیزوں کو خدائے تعالیٰ کے حضور میں جاتے وقت اپنی تقصیروں کی معافی کا ذریعہ قرار دیا اور امید کامل باندھ لی کہ ان کی بدولت میری مغفرت ہو جائے گی۔ سبحان اللہ یہ تھا ادب رسول اور کمال عقیدہ سچے مسلمانوں کا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کی جگہ پر رکھا پھر اس کو اپنے منہ پر ملا۔

مستدرک حاکم میں عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عظمت کے لحاظ سے کوئی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سر نہ اٹھاتا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رُوبرو تو اس قسم کا ادب ہوتا ہی تھا۔ لیکن وُہ حضرات جب حدیث شریف کے حلقوں میں بیٹھتے تھے تو اس خشوع و خضوع کے ساتھ سر جھکائے بیٹھتے تھے گویا گردنوں پر سر ہی نہیں۔ چنانچہ مستدرک میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن قرط رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں مسجد میں گیا، دیکھا کہ ایک حلقہ میں لوگ ایسے سر جھکائے بیٹھے ہیں کہ گویا ان کی گردنوں پر سر ہی نہیں۔ یعنی سب لوگ حدیث شریف سُننے والے کچھ ایسے مودبانہ سر جھکائے بیٹھے تھے کہ گردنوں پر سر نہیں دکھائی دیتے تھے اور ایک صاحب حدیث شریف بیان کر رہے تھے۔ جب غور سے ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

اب ذرا زمانہ کے انقلاب اور طبیعتوں کی رفتار کو دیکھیے کہ بعد خیر القرون نے لوگوں کو ان حضرات کے مسلک سے کس قدر دُور کر دیا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ معاملہ بالکل بالعکس ہو گیا ہے اُس زمانہ میں حالانکہ ان امور کی تعلیم عموماً نہ تھی مگر دل ہی کچھ ایسے مہذب اور مؤدب تھے کہ قسم قسم کے آداب اور طرح طرح کے حسنِ عقیدت پر دلالت کرنے والے افعال خود بخود ان سے ظہور پاتے تھے اور وہ ان کو اصولِ شرعیہ پر منطبق کر دیتے تھے۔ جس کا سمجھنا بھی شاید اس زمانہ میں بآسانی نہ ہو سکے۔ کیوں نہ ہو، ان حضرات کے دل وہ تھے جن کو تمام بندوں کے دلوں پر فضیلت ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صحابیت کے واسطے منتخب فرمایا تھا۔ چنانچہ دیلمی نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں کے دلوں کو دیکھا تو میرے اصحاب کے دلوں سے پاکیزہ تر کوئی دل نہ پایا۔ اسی واسطے ان کو میرے اصحاب ہونے کے لیے پسند فرمایا۔ جو کام وہ اچھا سمجھتے ہیں اللہ کے نزدیک بھی وُہ اچھا ہے اور جس کو وُہ بُرا جانتے ہیں اللہ کے نزدیک بھی وُہ بُرا ہے۔

غرض وہ ہر قسم کے آداب کے سب سے اعلیٰ مظہر تھے اور اُن پر کوئی اعتراض بھی نہ کرتا تھا، اس لیے کہ اُس وقت

تک بے ادبی کی بنیاد نہ پڑی تھی۔ اور اگر چند خود سروں نے بنیاد ڈالی بھی تھی تو اس وجہ سے کہ اُن کی بداعتقادیوں نے ان کو دائرۂ اتباع سے خارج اور دُوسرے نام کے ساتھ مشتہر کر دیا تھا۔ اُن کی باتیں کسی کی سمعِ قبول تک پہنچی ہی نہ تھیں۔

الحاصل خیر القرون کا یہ حال تھا کہ ہر قسم کے آداب کی بنیاد رکھی جاتی تھی اور اِس آخری زمانہ کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ اُن حضرات نے جن کا اتباع بحسبِ ارشادِ شارع علیہ السلام ضروری ہے طرح طرح کے آداب تعلیم کر گئے۔ اگر کسی سے اِس قسم کے افعال صادر ہو جائیں تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ اور صرف اعتراض ہی نہیں بلکہ شرک کے الزام تک نوبت پہنچا دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ادب نصیب کرے۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کا زندگی میں اور بعد وصال یکساں واجب ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کرنی جیسی آپ کی زندگی میں واجب و لازم ہے۔ ویسے ہی آپ کے وصال کے بعد بھی واجب و لازم ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے :

عن ابی بکر الصدیق قال لاینبغی رفع الصوت علی نبی حیا ولا میتا۔

یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آواز کو بلند کرنا نہیں چاہیے، نہ زندگی میں اور نہ ہی وصال کے بعد۔

روضۂ مبارک کے قریب میخ گاڑنے پر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تہدیدی حکم

روی عن عایشۃ انہا کانت تسمع صوت وتد یوتد والمسمار یضرب فی بعض الدور المنصلۃ بمسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فترسل الیھم لا توذو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یعنی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ اس کھونٹی کی آواز جو مسجد نبوی کے ارد گرد گھروں میں گاڑی جاتی تھی اور اس میخ کی آواز جو ٹھونکی جاتی تھی سُنتی تھیں۔ انھوں نے ان گھر والوں کے پاس کہلا بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ دو۔

روی وما عمل علی مصراعی بابہ بالمناصع الا توقیا لذلک وتادبا معہ۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دروازے کے کواڑ اس وجہ سے بچنے کے لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ادب کی خاطر کپڑے کے بنائے ہُوئے تھے۔

مسجد نبوی میں چلا کر بولنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تعزیری حکم مسجد نبوی میں اونچی بولنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں بلند آواز کرنے والوں کو تنبیہ کی اور ڈانٹا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

عن السائب بن یزید قال کنت قائما فی المسجد فحصبنی رجل فنظرت فاذا عمر بن الخطاب فقال اذهب فأتنی بهٰذین فجئت بهما قال من انتما او من این انتما قال من اهل الطائف قال لو کنتما من اهل البلد لاوجعتکما ترفعان اصواتکما فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔ (رواہ البخاری)

یعنی صحیح بخاری میں سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں ایک بار مسجد نبوی میں کھڑا تھا کہ کسی نے مجھے کنکری ماری۔ دیکھا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ کہا جاؤ اور ان دو شخصوں کو لے آؤ۔ جب ان دونوں کو میں ان کے پاس لے گیا تو پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے ہو؟ انہوں نے کہا ہم طائف کے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس شہر سے ہوتے تو میں تم کو ضرور اذیت پہنچاتا اور مارتا، اس واسطے کہ تم مسجد نبوی میں بلند آواز کرتے ہو۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ مسجد نبوی میں کوئی شخص آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر کوئی کرتا بھی تو مستحق تعزیر سمجھا جاتا تھا۔ باوجودیکہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ چنداں دُور نہ تھے۔ مگر اسی ادب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو پکارا نہیں بلکہ کنکری پھینک کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ تمام ادب اس وجہ سے تھے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں بحیات ابدی تشریف رکھتے ہیں کیونکہ اگر لحاظ صرف مسجد ہونے کا ہوتا تو فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

دُوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس تعزیر کو اہلِ شہر کے لیے خاص فرمایا جن کو مسجد شریف کے آداب خوب معلوم تھے۔ اگر صرف مسجد ہی کا لحاظ ہوتا تو اہلِ طائف بھی معذور نہ رکھے جاتے۔ کیونکہ آخر وہاں بھی مسجدیں تھیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ ابو جعفر کو مسجدِ نبوی میں چلا کر بولنے پر ڈانٹنا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خلیفۂ وقت ابو جعفر کو مسجد نبوی میں ان کے باآواز بلند بولنے پر ڈانٹا۔ چنانچہ درمنظم میں ابن حجر ہیثمی اور شفا میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہما نے بسندِ متصل روایت کی ہے:

عن ابن حمید قال ناظر ابوجعفر امیر المؤمنین مالکا فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقال له یا امیر المؤمنین لا ترفع صوتك فی هذا المسجد فان اللہ تعالیٰ ادب قوما فقال لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ومدح قوما فقال ان الذین یغضون اصواتهم عند رسول اللہ الاٰیة وذم قوما

فقال ان الذین ینادونک من وراء الحجرات الایۃ وان حرمتہ میتا کحرمتہ حیا فاستکان لہا ابوجعفر وقال یا ابا عبد اللہ استقبل القبلۃ وادعوام استقبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لم تصرف وجھک عنہ وھو وسیلتک ووسیلۃ ابیک آدم علیہ السلام الی اللہ یوم القیٰمۃ بل استقبلہ واستشفع بہ فیشفعک اللہ وقال اللہ تعالیٰ ولو انہم اذ ظلموا انفسہم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔

یعنی امیر المؤمنین ابوجعفر منصور نے جو خلفائے عباسیہ سے دوسرے خلیفہ ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسجد نبوی میں کسی مسئلہ میں مباحثہ کیا جس میں ان کی آواز کچھ بلند ہوگئی۔ اس پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اے امیر المومنین! اس مسجد میں آواز بلند نہ کیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تادیب کی ایک قوم کی اس آیت شریف میں یا ایہا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی یعنی اے مسلمانو! اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔ یعنی میرے حبیب کے دربار میں اپنی آواز بلند نہ کرو۔ اور مدح کی ان لوگوں کی جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آواز پست کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا سورہ حجرات رکوع ۱ میں ان الذین یغضون اصواتہم عند رسول اللہ اولٰئک الذین امتحن اللہ قلوبہم للتقویٰ لہم مغفرۃ واجر عظیم یعنی جو لوگ دبی آواز سے بولا کرتے ہیں رسول اللہ [illegible] یہ وسلم کے پاس وہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جانچ لیا ہے ان کے دلوں کو پرہیزگاری کے لیے، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ اور مذمت کی اس قوم کی جو حجرہ کے باہر سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پکارتے تھے چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد فرمایا ان الذین ینادونک من وراء الحجرات اکثرھم لا یعقلون ولو انہم صبروا حتی تخرج الیہم لکان خیرا لہم یعنی اور جو لوگ کہ تجھ کو حجروں کے باہر پکارتے ہیں وہ اکثر بیوقوف ہیں اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تو ان کی طرف از خود نکلتا تو اُن کے حق میں بہتر تھا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حرمت وصال کے بعد بھی وہی ہے جو قبل وصال کے تھی امیر المومنین یہ سنتے ہی متادب اور متذلل ہوگئے۔ پھر پوچھا اے عبداللہ! قبلہ کی طرف متوجہ ہوکر دعا کروں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے کیوں منہ پھیرتے ہو وہ تو وسیلہ ہیں آپ کے اور آپ کے باپ آدم علیہ السلام کے قیامت کے روز۔ تو حضرت کی طرف متوجہ ہوکر شفاعت اور سفارش طلب کیجیے کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت قبول کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولو انہم اذ ظلموا انفسہم جاؤک فاستغفروا اللہ واستغفر لہم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ یعنی اور اگر یہ لوگ جب انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔ تیرے پاس آجاتے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول اُن کے واسطے معافی چاہتا تو ضرور پاتے اللہ کو توبہ قبول

کرنے والا مہربان۔

یہاں سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ مراتب تعظیم اور آداب رسالت کا لحاظ رکھیں گے وہی اس وعدے میں داخل ہیں، برخلاف ان کے جو بے ادبی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بولتے ہیں کہ ان کے نیک عمل بھی ضایع ہو جاتے ہیں۔

مسلمانو! ان بزرگوں کے اعتقادوں کو دیکھیے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے آواز بلند کرنے کے باب میں ان آیات پر استدلال کیا: یاایھا الذین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی اور ان الذین ینادونک من وراء الحجرات۔ اور خلیفہ وقت نے پوچھا تک نہیں کہ فوق صوت النبی اور ینادونک کے معنی یہاں کیونکر صادق آتے ہیں اور اگر اجتہاد کیا گیا تو اس کا طریقہ کیا ہے پھر یہ بھی نہ تھا کہ خلیفہ موصوف کچھ جاہل تھا بلکہ وہ نہایت کامل العقل عالم جید اور ادیب اور متدین تھا مگر معلوم نہیں۔ اس استدلال میں کس درجہ کی قوت تھی جس نے خلیفۂ وقت کو عین مباحثہ میں ساکت کر دیا۔ اگر اس زمانہ میں کوئی شخص اس قسم کا استدلال کرے تو اس پر سیکڑوں اعتراض کیے جائیں گے۔ علیٰ ہذا اگر کوئی شخص اس استدلال کی نزاکت کو نہ سمجھ کر اس میں کچھ کلام کرے تو وہ کون سا مسلمان ہوگا جو معترض کی رائے کو امام مالک کی رائے پر ترجیح دے گا کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وہ شخص ہیں کہ جن کے شاگردوں کے شاگرد ہونے پر امام بخاری اور مسلم وغیرہ محدثین کو فخر ہے غرض اس استدلال پر حجت کرنے والا جاہل مطلق اور علم سے بے بہرہ ہے۔

مسلمانو! امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات سے وہ ادب استنباط کیا کہ اس کی بدولت قیامت میں اہل ایمان بہرہ اندوز اور متمتع رہیں گے۔ (جزاہ اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء)

صحابہ کرام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام مبارک کے ساتھ بابی کہتے

بخاری شریف میں ام المومنین حفصہؓ سے مروی ہے کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کرتیں تو بِابی کہتیں۔ چنانچہ ام المومنین فرماتی ہیں: وقلما ذکرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا قالت بِابی۔ معنی اس کے یہ ہیں کہ میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے فدا ہوں۔

صحابہ کرام اکثر بِابی انت وامی یا رسول اللہ کہا کرتے تھے۔ چنانچہ کتب احادیث میں موجود ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ کے اشفاق و مراحم کے روبرو مہرمادری اور شفقتِ پدری کی کچھ حقیقت نہیں۔ ان دونوں کو آپ پر سے فدا کرنا چاہیے۔

سبحان اللہ! کیا ادب تھا کہ روبرو تو روبرو غائبانہ وصال شریف کے بعد بھی وہ ادب مرعی تھا کہ جب تک ماں باپ کو فدا نہیں کرتے نام مبارک کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

آپ کے نام مبارک کا ادب کافر بھی کرتے تھے

کیوں نہ ہو یہ نام مبارک وہ تھا کہ ذکر میں کفار بھی بسا اوقات متادب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مواہب اللدنیہ میں۔ اور زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مواہب اللدنیہ میں لکھا ہے کہ ایک جماعت قبیلہ کندہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ الفاظ تحیت کے ادا کیے جو اس زمانہ میں سلاطین کے حضور میں کہے جاتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ محمد بن عبداللہ ہوں انھوں نے کہا ہم آپ کا نام لے کر نہیں پکاریں گے۔ آپ نے

فرمایا کہ میں ابوالقاسم ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا اے ابوالقاسم! فرمائیے کہ ہم نے اپنے دل میں کیا چھپایا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا یہ تو کاہنوں کا کام ہے اور کاہن اور اُن کا پیشہ دوزخی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پھر کیونکر معلوم ہو کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تب آپ نے ایک مٹھی کنکریاں اٹھائیں اور فرمایا کہ دیکھو یہ گواہی دیتی ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں چنانچہ اسی وقت کنکریاں دستِ مبارک میں تسبیح کرنے لگیں۔ یہ سُن کر حاضرین نے صدقِ دل سے کلمۂ شہادت پڑھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور وہ سب لوگ مشرف باسلام ہوئے۔

ظاہر ہے کہ یہ لوگ قبل امتحان مشرف باسلام نہیں تھے باوجود اس کے نام مبارک لینے میں ترکِ ادب سمجھا۔ کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی ادب پسند آ گیا ہو اس سے ان کو ابدالآباد کے لیے عزت و شرافت حاصل ہو گئی کہ مسلمان ہو کر جنت الفردوس میں داخل ہوئے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جذب القلوب میں ارقام فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ میں اپنے گھوڑے پر سوار نہ ہوتے تھے کیونکہ وہ فرماتے تھے کہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ میں اُس زمین کو گھوڑے کے سُم سے روندوں۔ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لگے ہوئے ہیں۔ فی الحقیقت وہ زمینِ پاک نہایت واجب التعظیم ہے۔ بقول حافظ رحمۃ اللہ علیہ ؎

بمقامیکہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدہ گہ صاحب نظراں خواہد بود

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں مرقوم ہے کہ آپ صحیح بخاری کے جمع کرنے کے وقت ہر حدیث لکھنے کے واسطے تازہ غسل کیا کرتے اور دوگانہ نماز پڑھتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آبِ زمزم سے غسل کرتے اور مقامِ ابراہیم پہ دوگانہ پڑھتے تھے۔ چونکہ اس طرح انہوں نے حدیثِ نبوی کی تعظیم اور توقیر کی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا فضلِ عظیم دیا ہے کہ تمام مسلمان ان کو اپنا امام جانتے ہیں اور انکی تعظیم اور انکی کتاب کی وہ قدر ہوئی کہ دنیا میں سوائے قرآن مجید کے کسی اور کتاب کی ایسی قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ یہ مقبولیت محض ادبِ حدیث کا سبب تھا ورنہ احادیثِ صحیحہ کی اور بھی بے شمار کتابیں تھیں۔

جمہور علمائے اہل السنۃ والجماعۃ کا اس پر اتفاق ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ کتاب البخاری، یعنی تمام کتابوں سے زیادہ صحیح کتاب کتاب اللہ کے بعد بخاری کی کتاب ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا طریق ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امام سیوطیؒ نے تنزیہ الانبیاء عن تشبیہ الاغبیاء میں امام سُبکی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ترشیح سے نقل کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض تصانیف میں وہ قصہ نقل کیا جو کسی عورت نے کھال چُرایا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام نے اُس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا اور کسی نے سفارش کی۔ پھر وہ حدیث نقل کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس وقت فرمایا کہ اگر فلاں عورت بھی (جو ایک شریفہ تھیں) چُرا تیں تو اُن کا ہاتھ بھی قطع کیا جاتا۔

امام سُبکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ادب دیکھو کہ حدیث شریف میں فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نام مصرح ہے۔ اگر بعینہٖ حدیث نقل کر دیتے تو کوئی بیجا اور بے موقع بات نہ تھی لیکن آپ نے ازراہِ کمال ادب صراحۃً نام مبارک کو ذکر نہ کیا۔

سبحان اللہ! کیا ادب تھا حالانکہ الفاظ حدیث کو بعینہٖ نقل کرنا ضروری ہے اور وُہ نام مبارک جو حدیث شریف میں وارد ہے لفظ لَو کے تحت ہیں ہے جو علیٰ سبیل فرض محال آتا ہے مگر با ایں ہمہ چونکہ حدیث شریف میں یہ نام مبارک مقام توہین میں وارد تھا اس لیے ادب نے اجازت نہ دی کہ اُس نام مبارک کو صراحۃً ذکر کریں۔ گو حدیث شریف میں وارد ہے۔ سچ ہے جو مقربین بارگاہ ہوتے ہیں انہی کو ادب نصیب ہوتا ہے۔ ہر کس و ناکس میں وہ صلاحیت کہاں۔ ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب

بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

سلطان محمود غزنوی کا طریقِ ادبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کہتے ہیں کہ غازی سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے غلام ایاز کا ایک بیٹا تھا جو بادشاہ کا ملازم تھا اور اس کا نام محمد تھا۔ ایک دن بادشاہ سلامت نے ایاز کی موجودگی میں اُس سے یُوں خطاب کیا کہ اے ایاز کے بیٹے! وضو کا پانی لاؤ۔ ایاز نے ان الفاظ کو سُن کر دل ہی دل میں خیال کیا کہ نہ معلوم میرے بیٹے نے کیا خطا کی جس کے باعث بادشاہ سلامت نے اس کو نام سے نہیں بُلایا۔ پس جب سلطان محمود وضو سے فارغ ہُوئے تو ایاز کی طرف دیکھا کہ وہ مغموم و ملول ہے اس سے غم و رنج کا سبب پُوچھا اس نے دست بستہ کھڑے ہو کر عرض کی کہ عالیجاہا! میرے مغموم ہونے کا باعث یہ ہے چونکہ حضور نے میرے لختِ جگر کو نام لے کر نہیں بلایا۔ اس لیے معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اس سے کوئی بے ادبی اور گستاخی سرزد ہوئی ہے کہ جس کے باعث آپ اس سے خفا اور ناراض ہیں۔ بادشاہ سلامت نے مسکرا کر کہا اے ایاز! خاطر جمع رکھ، تمہارے صاحبزادے سے کوئی بات میری طبع کے خلاف سرزد نہیں ہوئی اور نہ ہی میں اس سے کسی طرح ناراض یا خفا ہوں۔ اس وقت نام نہ لینے میں یہ حکمت تھی کہ میں اس وقت بے وضو تھا چونکہ یہ آقائے نامدار سرورِ کونین رحمۃ للعالمین کا ہمنام تھا اس لیے مجھے شرم آئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام مبارک ایسی حالت میں میری زبان سے گزرے جبکہ میں بے وضو یا بے طہارت ہوں۔ ولنعم ما قیل۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب

ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی است

مسلمانو! تم کو بھی لازم ہے کہ تم بھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعظیم و توقیر کرو جس طرح بزرگانِ دین کیا کرتے تھے

اور ہر بات میں آپ کا ادب ملحوظ رکھو جس وقت آپ کا ذکر ہو یا آپ کا نام مبارک لیا جائے یا آپ کا کلام پڑھا جائے یا آپ کے فضائل و محامد بیان کیے جائیں تو نہایت متوجہ ہو کر حضورِ قلب کے ساتھ سُنا کرو اور جب تک ایسے مقام میں رہو درود شریف کی کثرت کیا کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے بلکہ حقیقت میں تمہارا اپنا ہی نفع اور بہبودی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے دلوں میں حبیبِ خدا اشرف انبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی عظمت و محبت ڈالے حضور کا سچا تابعدار اور فرمانبردار بنائے اور قیامت میں حضور کی معیت سے شاد کام فرمائے۔ آمین ثم آمین ۔ ٥

دیدہ باشی تشنہ مستعجل بر آب
جاں بجاناں ہمچناں مستعجل است

ظہورِ قدسی

چودھری افضل حق

وجدان نے چودہ سو سال کی اُلٹی زقند لگا کر پہلے زمانہ کے واقعات کو تخیل کی نظر سے دیکھا۔ دنیا بداعمالیوں سے ظلمت کدہ بنی ہُوئی تھی۔ کفر کی کالی گھٹائیں ہر طرف تلی کھڑی تھیں۔ عصیاں کی بجلیاں آسمان پر کوند رہی تھیں۔ نیکی نفس کی طغیانیوں میں گھِری ہُوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ راہ سے بھٹکی ہُوئی نیکی آس و یاس کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی تاکہ کہیں روشنی کی کرن پھُوٹے اور اسے سلامتی کی راہ مل جاوے۔ وہ کفر کے اندھیرے میں ڈرتے ڈرتے قدم اٹھا رہی تھی۔ دیکھو وُہ چند قدم پر رُک گئی۔ سرِ راہ دو زانو ہو کر عالمِ یاس میں سینہ پر ہاتھ باندھے گردن جھکا کر مصروفِ دعا ہو گئی اور نہایت عجز و الحاح سے بولی: اے نور و ظلمت کے پرور دگار! میں غریب اس پُر ہول اندھیرے میں کب تک بھٹکتی پھروں۔ اے آقا! اپنے کرم سے اس نور کا ظہور کر جو ظلمت کدۂ دہر کو منور کر دے، وُہ نور پیدا کر جو بے بصر کو طاقتِ دیدار بخشے۔ اس نے آمین، آمین کہہ کر سر جھکایا۔

یک بیک اس کے دل میں خوشی کی لہر اُٹھی اور وُہ شگفتہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح شاداب ہونے لگی کیونکہ اسے قبولیت دعا کا القاء ہو رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ستاروں سے زیادہ روشن آنکھیں اٹھائیں۔ کفر کی گھٹائیں چھٹ رہی تھیں۔ افق مشرق پر محبت کی کہانی سے زیادہ دلکش پَو پھُوٹ رہی تھی۔

دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا

آفتاب ہدایت کے طلوع کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء مطابق ۹ ربیع الاوّل دو شنبہ کی مبارک صبح قدوسی آسمان پر جگہ بجگہ سرگوشیوں میں مصروف تھے کہ آج دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا مجسم بن کر دنیا میں ظاہر ہو گی حوریں جنت میں تزئینِ حسن کیے بیٹھی تھیں کہ آج صبح کائنات کا غازہ نمودار ہو گا جس کے عالمِ وجود میں آتے ہی شرک اور ظلمت کی آفت کافور ہو جائے گی، لوگ اپنے پروردگار کو پہچاننے لگیں گے۔ نسل و خون کے امتیاز کی لعنت مٹ جائے گی۔ غلام اور آقا ایک ہو جاویں گے۔ شبنم نے عالمِ ملکوت کی ان باتوں کو سُنا اور یہ پیغامِ مسرت کرۂ ارض کے غنچوں تک پہنچایا۔ وُہ خوشی سے کھل گئے۔ کلیاں مسکرانے لگیں۔ دن کے دس بجے بی بی آمنہؓ کے بطن سے وُہ لعل جہانتاب پیدا ہُوا جس کے لیے قعرِ ذلت میں گری ہُوئی مخلوق کو اٹھانا، غریب اور غلام کو بڑھانا، عورت کو مرد کے برابر کر دکھانا ازل سے مقدر ہو چکا تھا۔ وہ نومولود، زچہ خانہ میں مسکرایا، اس کائنات ارضی کا ذکر کیا ہے فضائے ملکوت میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی کیونکہ دنیا کو سچی خوشی کا سبق اس سے ملنے والا تھا۔ کفر سجدہ میں گر گیا۔ ادیانِ باطلہ کی نبض چھُوٹ گئی۔ عبداللہ کا بیٹا، آمنہؓ کا جایا دنیا میں کیا آیا دین و دنیا پر مستقل ترقی کے دروازے کُھل گئے۔ کائنات کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو کر

مصروفِ عمل ہوگئیں۔ انسانیت کی تعمیر اخوت و مساوات کی بنیادوں پر شروع ہوئی۔ متلاشیانِ حق کو ایسا عرفانِ الٰہی نصیب ہوا کہ ماسوا اللہ کا خوف خود بخود دل سے جاتا رہا۔ عبدالمطلب کو جب معلوم ہوا کہ علم و اخلاق کی حد کمال نے انسانی پیکر اختیار کر لیا تو دل ہی دعاؤں نے آنکھ کھولی۔ اس خیال سے کہ یہ مولود انسانوں کا ممدوح ہے اس کا نام محمدؐ رکھا۔ انسانیت کے اسی کمال کا عالمِ وجود میں آنا انسانوں کے لیے کس قدر باعثِ برکت ہوا۔ اس کا حال دنیا میں پھیلی ہوئی روشنی اور تہذیب سے پوچھو۔

میلاد النبیؐ

مسلمان اس دن کو یاد کرکے جتنا مسرور ہو کم ہے۔ کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو مسرتوں سے بھر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اس خوشگوار یاد کو تازہ رکھنے کے لیے کیا کیا؟ مولود پڑھا، نعتیں سن کر رات آنکھوں میں کاٹی۔ جب عین نماز فجر کا وقت ہوا تو سو گئے۔ ہندوستان میں میلاد کی محفلوں پر روپے صرف ہوئے مگر مسلمانوں کے پاس اپنی اور انسانیت کی تعمیر کے لیے پائی تک نہیں۔ کاش! مسلمان اس دن اپنے چندوں سے مرکز قایم کرتے تاکہ اولوالعزم بچے پیدا کرکے تعلیم کو عام کرتے اور دنیا سے اپنا لوہا منواتے۔ دنیا کے سب سے بڑے خادم کی یاد تعمیری کام سے منائی جاتی ہے، صرف نعتیں پڑھ دینے سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو ترقی نہیں پہنچ سکتی۔ باتوں سے نہیں عمل سے اسلام کا بول بالا کرو، مخلوق کی خدمت کے مواقع تلاش کرو۔ بچے کی صحت کی حفاظت ماں باپ کا مقدس فرض ہے۔ توانا جسم، تندرست رُوح کا مسکن ہے۔ جب جسم توانا اور رُوح تندرست ہو تو ارادہ دنیا کو مسخر کرنے نکلتا ہے ورنہ عزم چند قدم نکل کر مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ جاتا ہے اور تیز رو مسافروں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

صحرائی تربیت

عرب کی قوت کا انحصار تربیتِ اطفال پر تھا۔ ملک کا دستور تھا کہ قصبات کی بیبیاں بچہ پیدا ہوتے ہی دیہات میں اس کی تربیت کا انتظام کرتی تھیں تاکہ کھلی ہوا اور آزاد فضا میں جسم کی مناسب نشوونما ہو سکے اور ان میں مردانگی کے جوہر پیدا ہوں۔ آپؐ کی والدہ آمنہؓ نے پیدائش کے دو تین روز بعد دودھ پلانے کے لیے آپؐ کو ابولہب کی لونڈی ثوبیہ کے سپرد کر دیا کہ حسب دستور قبیلہ ہوازن کی عورتیں شہر میں آئیں تاکہ کوئی بچہ دودھ پلانے کے لیے اجرت پر مل جائے۔ عورتوں میں سے مائی حلیمہ بی بی آمنہؓ کے گھر آئی۔ یتیم جان کر سوچ میں پڑ گئی۔ تقدیر نے کہا: حلیمہ! گدڑی کو نہ دیکھ، اصل کو دیکھ، دین و دنیا کی دولت کو چھوڑ کر خالی ہاتھ نہ جانا۔ اس کے نام سے تیرا نام رہے گا۔ اس کی دایہ بن اور دنیا میں عزت حاصل کر۔ بی بی آمنہؓ نے جگر کے ٹکڑے کو جب مائی حلیمہ کے سپرد کیا ہوگا بیٹے کی جدائی کے تصور نے قلب میں قلق کے کتنے طوفان اٹھائے ہوں گے۔ بی بی آمنہؓ نے نورِ نظر کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ خدا کی برکتیں قریش کے گھر سے نکل کر ہوازن کے قبیلہ میں داخل ہوگئیں، جو موتی ریت کی تہہ میں پائے جاتے ہیں وہ دُرِ شاہوار بنتے ہیں۔ مٹی اور پتھروں میں دبے ہوئے ہیرے کوہِ نور کہلاتے ہیں۔

آمنہؓ کا لالؐ

دیکھو سعید الفطرت بچہ قدرت کے مکتب میں تعلیم پا رہا ہے۔ اب پانچ برس کی عمر ہے رضاعی بہن شیما کے ساتھ بھولی بھٹکی بھیڑ بکریوں کے ساتھ پھرتا ہے اور انھیں گلہ میں واپس لانے میں مدد دیتا ہے۔ جب ایک بھیڑ بکری کو گھیر کر واپس لاتا ہے تو اسے دنیا مسرت سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

کھلی ہوا اور بکریوں کے پیچھے دوڑ دھوپ نے بچے کے ہاتھ پاؤں مضبوط کر دیے۔ جب چھ برس کے بعد بچہ گھر لوٹا تو ماں نازک پودے کو مضبوط پا کر باغ باغ ہو گئی۔ کیونکہ مضبوط بازو ہی تو بچے کی آئندہ کامرانیوں کا عنوان ہے۔ شوہر کی موت کے بعد بیوہ کے لیے دنیا میں اس سے زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات کیا ہے کہ وہ اس کی چھوڑی ہوئی نشانی کو ساتھ لے کر خاوند کی قبر کے سرہانے کھڑی ہو اور آنسوؤں کے موتی نذر کر دے۔

یتیمِ مکہ

آمنہؓ چھ برس کے یتیم بچے کو ہمراہ لے کر خاوند کی قبر کی زیارت کو گئیں۔ مہینہ سے زاید مدینہ میں ننھیال رہیں۔ کسی سیرت نگار نے ذکر نہیں کیا کہ کتنی دفعہ اپنے جگر گوشہ کو ساتھ لے کر آنسوؤں کا انمول تحفہ چڑھانے مرقد پر حاضر ہوئیں۔ ہاں صرف اتنا بتایا جاتا ہے کہ عمر میں جوان غم میں بوڑھی بیوہ واپسی پر بمقامِ ابوا میں انتقال کر گئیں۔ آمنہؓ کی لونڈی امّ ایمن اپنے یتیم آقا اور دو جہان کے سردار کو لے کر مکہ پہنچی اور آنحضرتؐ دادا کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔ دو سال کے بعد آپؐ کے دادا عبدالمطلب ۸۲ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ آنحضرتؐ فرطِ محبت سے غم کے آنسو روئے، باپ کے بعد ماں، ماں کے بعد دادا بھی وہاں جا رہے جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ ان چھوڑ کر جانے والوں کے لیے آنسو بہانے کے سوا انسان کے بس میں اور کیا ہے، اس جہان سے جانے والو! تمھارے لیے رونا بھی فضول اور خاموش رہنا بھی ناممکن۔ عبدالمطلب نے مرتے وقت اس گنج گراں بہا کو اپنے بیٹے ابو طالب کے سپرد کر دیا۔ ابو طالب جناب عبداللہ کے ماں جائے بھائی تھے، جواں مرگ بھائی کی موت کا صدمہ بھتیجے کو دیکھ کر دور ہو جاتا تھا۔ ابو طالب کثیرالاولاد اور قلیل المال تھے، اس لیے آپؐ کو بکریاں چرانے پر لگایا گیا۔ یہ پیشہ اکثر نیک لوگوں کے لیے بابرکت ثابت ہوا ہے، یہ دین و دنیا کی فتح مندیوں کی تمہید ہے، نبوت کا حقدار اور نیکی کا حامل وہی ہے، جو مخلوق کی محبت میں سرشار ہو کر عناصر کو فنا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو اس کی ترقی اور خوشی میں حائل ہوں اس کے جسم اور روح کی بالیدگی قوموں کی رہنمائی کی ذمہ داری اٹھا سکے، جسم اور روح کی ترقیوں کی حدِ کمال کا نام ہی پیغمبری ہے۔

دینِ حنیف کا آخری معمارؐ

آپؐ کی عمر بارہ برس کی تھی کہ ابو طالب تجارت کی غرض سے شام کے سفر کو چلے آپؐ چچا سے لپٹ گئے ابو طالب کو آپؐ سے

خاص انس تھا۔ چنانچہ ابوطالب نے اس خیال سے کہ بچّہ کا دل نہ ٹوٹے، آپؐ کو ساتھ لے لیا، آپؐ نے اس کے بعد شام، بصرہ، یمن کے متعدد سفر کیے۔ جب آپؐ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش اور قیس کے قبیلوں کی مشہور لڑائی میں آپؐ نے شرکت کی لیکن آپؐ نے کسی پر ہتھیار نہیں اٹھایا۔ سیرت کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ بعض لوگوں کو کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کا خیال ہوا۔ قبائل نے تعمیر کے باہم حصے تقسیم کر لیے۔ حجرِ اسود کا موقع آیا تو اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے تلواریں کھنچ گئیں۔ بالآخر دعویداروں نے خون کے بھرے ہوئے پیالوں میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر جان لڑا دینے کی قسمیں کھائیں۔ ایک بزرگ نے تجویز کی کہ جو سب سے پہلے حرم میں کل صبح آئے اس کی تجویز مان لی جائے سب سے پہلے حرم پاک میں آپؐ ہی تشریف لائے، آپؐ نے چادر بچھا کر قبیلہ کے ہر سردار کو حجرِ اسود کو اٹھا کر مقررہ جگہ پر رکھنے کے لیے کہا۔ خدا کے گھر کا یہ آخری معمار دینِ حنیف کی عمارت کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا ثابت ہُوا۔ دین کی عمارت اس کے ہاتھوں ایسی مکمل ہُوئی کہ دوبارہ نقش و نگار کی ضرورت نہ رہی۔

قدوسیّت کا شاہکار

کون ایسا باکمال مصوّر ہے جو اپنے قلم کی جنبشوں سے عرب کے ایک پاکباز انسانؐ کی تصویر کھینچے، جس سے دنیا پارسائی کا سبق لے۔ جس کے لب قہقہہ سے ناآشنا ہوں، جس کا ہلکا تبسّم اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ ہاں مصوّر رنگوں کی آمیزش میں اعتدال پیدا کرنا کہ پاک صورت میں نیک سیرت اس طرح جھلکتی نظر آئے کہ تصویر نور کی تنویر دکھائی دے۔

کون ایسی تصویر بنائے جو مادیت کی آلودگیوں سے پاک ہو اور اس پہ وجدانی کیفیت اور روحانی سکوت طاری ہو، وہ سادہ لباس میں ہو مگر آنکھوں میں قناعت کی کائنات بھری ہو، اس کی بھرپُور جوانی اور مناسب اعضا، اور محتاط عادات محفوظ زندگی کی شہادت دیتے ہوں، قد درمیانہ ہو تاکہ نہ وہ کسی کو کمتر سمجھے اور نہ کوئی اسے حقارت کی نظر سے دیکھے، جس کے رنگ میں اعتدال ہو تاکہ افریقہ کے کالے اور یورپ کے گورے کے لیے اس میں محبوبیت ہو، اور دنیا کا نقشہ پاؤں تلے اس طرح بچھا رکھا ہو کہ رحمت کی ہواؤں سے اس کا دامنِ کرم اڑتا اڑتا تمام عرب و عجم کو اپنے سایہ میں لے لے، جوانی زندگی کی شگفتہ بہار ہے۔ نقرئی چاندنی کی سرمستی و سرشاری میں حسن دعوتِ لطف اندوزی دیتا ہے، اس زہد شکن موسم میں توبہ بھی پیغمبری ہے، یہ صرف ان انسانوں کا کام ہے جن کی شان ادراک کی سرحد سے پار ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسی فطرت سعید کے مالک تھے کہ کبھی جذبات بے قابو نہ ہُوئے دوست ان کے کیرکٹر کی عظمت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، دشمن ان کی پاکبازی کے معترف ہو گئے۔ جس ملک میں حُسن بے نقاب کو کھلے بندوں متاعِ ایمان پہ ڈاکہ ڈالنے کی اجازت ہو، عشق کی کشاکش سے بچ نکلنا خاص سعادت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی شبنمِ صبح کی طرح تمام آلودگیوں سے پاک تھی، اس پاکباز پہ بڑھاپے میں الزام تراشنا مخالفوں کی ذہنی دشمنی ہے۔

اُمّی نبیؐ کا مفہوم

پروفیسر عبد القیوم

قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بکثرت ذکر آتا ہے کہیں تو آپؐ کے منصب کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ کہیں آپؐ کے اخلاق حسنہ اور خصائل حمیدہ کا ذکر فرمایا، کہیں آپؐ کی عبادات کا تذکرہ کیا، کہیں آپؐ کو رحمت عالم قرار دیا، کہیں گھریلو معاملات کی طرف اشارات کئے، کہیں آپؐ کے جنگی معرکوں کی تفصیلات بیان فرمائیں، کہیں آپ کے القاب کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح چند ایک مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمّی لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ - الاٰية (سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷)

یعنی وہ لوگ جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اُمّی نبی ہیں پیروی کرتے ہیں، جن کے اوصاف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

پھر اسی سورت کی اگلی آیت (۱۵۸) میں فرمایا:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

یعنی اے لوگو! خدا پر اور اس کے رسول اُمّی نبی پر جو خدا پر اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں، ایمان لاؤ اور ان کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

سورۃ الجمعۃ میں فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آیت نمبر ۲)

یعنی وہی ذات تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں، انہی میں سے حضرت محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور انھیں قرآن و سنت کی تعلیم دیتے ہیں اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید نے اُمّی کا لفظ سورۂ بقرہ میں آیت نمبر ۷۸ میں ذکر کیا۔ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۲۰ اور آیت نمبر ۷۵ میں بھی ذکر فرمایا ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (بقرہ ۷۸)

یعنی بعض اُن میں اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالاتِ باطل کے سوا خدا کی کتاب سے واقف ہی نہیں اور وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں

سورۂ آل عمران کے مقامات بھی ملاحظہ ہوں، آیت نمبر ۲۰ میں فرمایا:

وَقُلْ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ — یعنی اہل کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے کہو کہ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟

پھر آیت نمبر ۷۵ میں فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ — یعنی اہل کتاب امانت میں خیانت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اُمّی لوگوں کے بارے میں ہم سے مؤاخذہ اور باز پرس نہیں ہوگی

ان مقامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لفظ اُمّی کی تشریح و توضیح کے لئے کتب لغت، تفسیر، حدیث اور تاریخ و سیرت کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔ عربی زبان کی سب سے مستند اور ضخیم لغت ابن منظور افریقی کی "لسان العرب" ہے۔ یہ لغت اتنی بڑی ہے کہ شاید ہی کسی اور زبان کی لغت اس کی وسعت اور پھیلاؤ کا مقابلہ کر سکے۔ لسان العرب (جلد ۱۲، صفحہ ۳۴) میں اَلْاُمِّیّ کی تشریح کرتے ہوئے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفاد درج ذیل ہے:

اَلْاُمِّيُّ اَلَّذِيْ لَا يَكْتُبُ — یعنی اُمّی وہ ہے جو لکھنا نہ جانے۔

پھر اور وضاحت کی کہ یہ لکھنا اکتسابی ہے۔ بعد ازاں حدیث سے سند پیش کرتے ہوئے عبارت نقل کرتے ہیں:

(۱) اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ — یعنی ہم اَن پڑھ لوگ ہیں، نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب۔

(۲) بُعِثْتُ اِلٰى اُمَّةٍ اُمِّيَّةٍ — یعنی میں ایک اَن پڑھ قوم میں مبعوث ہُوا ہوں۔

پھر لسان العرب کے مصنف لکھتے ہیں کہ عربوں کو اس لئے اُمّی کہتے تھے کہ ان میں لکھنے کا رواج بڑا نادر تھا۔

بعد ازاں اپنی تائید میں بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ والی قرآنی آیت پیش کرتے ہیں اور اس کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُمّی لقب سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ عرب قوم لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی اور اللہ تعالےٰ نے آنحضرتؐ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپؐ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ وَبَعَثَهُ اللّٰهُ رَسُوْلًا وَ هُوَ لَا يَكْتُبُ وَلَا يَقْرَأُ مِنْ كِتَابٍ۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ابن منظور لکھتے ہیں کہ اللہ تلاوتِ قرآن آپؐ کا ایک معجزہ تھا۔ جب بھی آپؐ تلاوت فرماتے، نہ تو کبھی الفاظ کا ردّ و بدل ہوتا اور نہ زیر زبر میں فرق آتا۔

صاحبِ لسان العرب کی اس وضاحت کے بعد آیئے قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے مفسروں سے پوچھیں کہ ان کے ذہن میں اُمّی کا کیا مفہوم ہے؟

ہمارے قدیم ترین مفسروں میں علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ ان کی تفسیر "جامع البیان فی تفسیر القرآن" تفسیر علوم کا خزانہ ہے۔ امام ابن جریر طبری اُمِّيُّوْن (جمع اُمّی) کا مفہوم یوں قلمبند کرتے ہیں: اَلَّذِيْنَ لَا يَكْتُبُوْنَ وَلَا يَقْرَءُوْنَ (جلد ۱، صفحہ ۲۵۷) یعنی وہ لوگ جو نہ لکھ سکیں نہ پڑھ سکیں۔ اسی جلد کے صفحہ ۲۵۹ پر لکھتے ہیں اَلْاُمِّيُّ عِنْدَ الْعَرَبِ هُوَ الَّذِيْ لَا يَكْتُبُ یعنی عربوں کے نزدیک اُمّی وہ شخص ہے جو لکھنا نہ جانتا ہو۔

مصر جدید کے دو جید عالم محمود محمد شاکر اور احمد محمد شاکر اتنے فضیلت مآب اور وسیع النظر بزرگ ہیں کہ اس دور میں ان کی نظیر عالم اسلامی

میں قطعی محال ہے یہ عقابی نگاہ رکھنے والے عالمانِ دین تفسیر طبری (طبع جدید) کے حاشیہ میں اس امر کی تحقیقی وضاحت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا قطعاً نہ جانتے تھے (ملاحظہ ہو جلد ۱، صفحہ ۲۵۸)

ابن جریر طبری کے بعد علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) بڑا جید عالم اور عالی مرتبہ مفسر گزرا ہے۔ زمخشری اپنے زمانے میں تفسیر لغت، ادب اور نحو کا امام تھا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر الکشاف میں لفظ اُمّی کی تفسیر یوں کی ہے۔

اَلْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْعَرَبِ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا لَا یَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُوْنَ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ

(تفسیر کشاف جلد ۴، صفحہ ۹ طبع مصر ۱۳۵۴ھ)

یعنی امّی کی نسبت عربوں کی طرف ہے کیونکہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

سورۃ الجمعہ کی اسی آیت کے سلسلے میں (یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِہٖ) رقمطراز ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باقی عربوں کی طرح امی ہونے کے باوجود ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ حالانکہ عربوں کو معلوم تھا کہ آپ پڑھ نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی استاد سے پڑھنا سیکھا تھا اور امّی آدمی کا پڑھنا سیکھے بغیر تلاوت کرلینا ایک معجزہ ہے (حوالہ مذکور)

اندلس کا شہرۂ آفاق مفسر قرآن امام ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی (متوفی ۶۷۱ھ) اپنی ضخیم تفسیر "جامع الاحکام القرآن" میں وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ (سورہ بقرہ: ۷۸) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَیْ مَنْ لَا یَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ واحدھم اُمِّیٌّ، مَنْسُوْبٌ الی الْاُمَّۃِ الْاُمِّیَّۃِ ھِیَ عَلٰی اَصْلِ وِلَادَۃِ اُمَّھَاتِھَا، لَمْ تَتَعَلَّمِ الْکِتَابَۃَ وَلَا قِرَاءَتَھَا (تفسیر قرطبی، جلد ۲، صفحہ ۵)

یعنی امّی وہ جو نہ پڑھ سکے، نہ لکھ سکے۔ اُمّی کا لفظ ان پڑھ لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ اُمّی وہ لوگ ہیں جو اسی حالت پر ہوں جس حالت میں ماؤں نے انھیں جنم دیا۔ انھوں نے نہ لکھنا سیکھا نہ پڑھنا۔

امام قرطبی سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ کی تفسیر کرتے ہوئے امّی کی یہی تشریح لکھ کر فرماتے ہیں:

وقال ابن عباس رضی اللہ عنہ: کَانَ نَبِیُّکُمْ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّیًّا لَا یَکْتُبُ وَلَا یَقْرَأُ وَلَا یَحْسُبُ، قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۲۹۸)

یعنی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمہارے پیغمبر اُمّی تھے آپ لکھنے پڑھنے اور حساب سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اے پیغمبر! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ لکھنا جانتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل جو آپ کو جھٹلاتے ہیں ضرور شک کرنے لگتے۔ (سورۃ العنکبوت آیت ۴۸)

امام بیضاوی (قاضی عبداللہ بن عمر) (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں سورۃ الجمعہ والی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فِی الْاُمِّیِّیْنَ کی توضیح یوں کرتے ہیں: اَیْ فِی الْعَرَبِ لِاَنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُوْنَ یعنی اللہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں میں، مبعوث فرمایا کیوں کہ ان کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھی۔ پھر رَسُوْلًا مِّنْھُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مِنْ جُمْلَتِھِمْ اُمِّیًّا مِثْلَھُمْ یعنی انہی عربوں میں سے انہی جیسا امّی (تفاسیر اربع ج ۶، صفحہ ۲۵۷، طبع مصر ۱۳۲۰ھ)

تفسیر خازن میں اسی آیت کے ضمن میں فاضل مفسر یوں رقم طراز ہے:

اَلْاُمِّيُّ هُوَ الَّذِیْ عَلٰى مَا خُلِقَ عَلَيْهِ، ..... لَا تَكْتُبُ وَلَا تَقْرَاُ، وَكَانَتِ الْعَرَبُ اُمَّةً اُمِّيَّةً، العرب،

كَاَنَّهٗ مَنْسُوْبٌ اِلٰى اُمِّهٖ

یعنی اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عربوں میں مبعوث فرمایا، عرب ان پڑھ قوم تھی، نہ لکھنا جانتے نہ پڑھنا۔ امی ماں کی طرف منسوب ہے

امی وہ ہے جو پیدائشی صلاحیتوں اور خصلتوں پر قائم رہے۔ پھر رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کی تفسیر بیان کرتے ہیں: یعنی محمداً صلی اللہ علیہ وسلم یَعْلَمُوْنَ

نَسَبَهٗ، وَهُوَ مِنْهُمْ۔ وَقِيْلَ اُمِّيًّا مِثْلَهُمْ۔ وَاِنَّمَا كَانَ اُمِّيًّا لِاَنَّ نَعْتَهٗ فِیْ كُتُبِ الْاَنْبِيَاءِ: اَلنَّبِيُّ الْاُمِّيُّ۔ وَكَوْنُهٗ بِهٰذِهٖ

الصِّفَةِ اَبْعَدُ مِنْ تَوَهُّمِ الْاِسْتِعَانَةِ بِالْكِتَابَةِ عَلٰى مَا اَتٰى بِهٖ مِنَ الْوَحْیِ وَالْحِكْمَةِ (تفاسیر اربع ج ۴ صفحہ ۲۵، مصری)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی عربوں میں سے رسولؐ بنا کر بھیجا۔ وہ آپؐ کے حسب نسب سے خوب واقف ہیں۔

نیز انہی جیسا اُمی، آپؐ امی اس لیے تھے کہ گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں آپ کی ایک صفت "امی نبی" بھی درج تھی۔ اور آپؐ کا اُمی ہونا اس بات کی قطعی

شہادت تھی کہ قرآن و سنت وحی الٰہی ہے، آپؐ نے خود نہیں لکھا۔ آپؐ کے امی ہونے کی وجہ سے خود لکھ لینے کے وہم کا ازالہ ہو گیا۔

تفسیر مدارک میں بھی اسی آیت کے ضمن میں فاضل مصنف نے یوں تحریر کیا ہے:

اَیْ بَعَثَ رَجُلًا اُمِّيًّا فِیْ اُمِّيِّيْنَ ..... وَالْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلٰى اُمَّةِ الْعَرَبِ لِاَنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَكْتُبُوْنَ

وَلَا يَقْرَءُوْنَ مِنْ بَيْنِ الْاُمَمِ۔ (تفاسیر اربع ج ۴ صفحہ ۲۵۷) یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک امی آدمی کو ان پڑھ لوگوں میں نبی بنایا۔ اور امی

کی نسبت عرب قوم کی طرف ہے کیونکہ وہ باقی قوموں کی نسبت لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے۔

امام شوکانیؒ نے اپنی قابل قدر تفسیر "فتح القدیر" میں لفظ امی کی تشریح بھی اسی طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اُمی کا لفظ "اُمَّتِ

اُمِّيَّة" کی طرف منسوب ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایسے ہی رہیں جیسے ان کی ماؤں نے انھیں جنم دیا ہو۔ وہ نہ تو لکھنا سیکھیں اور نہ لکھا ہوا

پڑھ سکیں۔ آں حضرتؐ کی حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ (جلد اول، صفحہ ۸۷)

پھر سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۲۰ کی تفسیر کے سلسلے میں لفظ اُمِّيِّيْنَ کا مفہوم لکھتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَكْتُبُوْنَ (جلد اول صفحہ ۲۹۷) یعنی امی وہ لوگ ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔

اسی طرح شیخ علی المہائمی اپنی نادر تفسیر تبصیر الرحمٰن میں رقمطراز ہیں کہ امی لوگوں کو رسولؐ کی زیادہ ضرورت تھی اور امی نبی سے بلند مرتبہ علوم

کا اظہار بطور معجزہ تھا تاکہ لوگ یقین کر لیں کہ یہ تعلیم الٰہی ہے، انسان کو اس میں کوئی دخل نہیں (جلد دوم صفحہ ۱۴۳ طبع مصر ۱۲۹۵ھ)

اب تک تو گفتگو نامور متقدمین اور متاخرین مفسروں کے گرد گھومتی رہی اور ان سب کا ایک مرکزی نقطے پر اتفاق ہے۔ آئیے اب

ذرا دور حاضر کے جانے پہچانے مفسروں سے بھی استصواب رائے کر لیں۔ بیسویں صدی کی مشہور عربی تفسیروں میں "تفسیر المنار" سرفہرست ہے

یہ تفسیر درحقیقت مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر ہے جسے ان کے شاگرد رشید سید رشید رضا نے مرتب کیا ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے کہ النبی الْاُمِّيُّ

نِسْبَةٌ اِلَى الْاُمِّ وَالْمُرَادُ الَّذِیْ لَا يَقْرَاُ وَلَا يَكْتُبُ (تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۲۲۴) یعنی امی کی نسبت اُم (ماں) کی طرف ہے۔

مراد ہے وہ شخص جو لکھ پڑھ نہ سکے۔ پھر صفحہ ۲۲۵ پر فرماتے ہیں:

اَلْاُمِّيَّةُ آيَةٌ مِنْ اَكْبَرِ آيَاتِ نبوتہ — یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کی نبوت کا بہت بڑا معجزہ ہے۔

دورِ حاضر کی دوسری مشہور اور ہردلعزیز تفسیر "المراغی" کی ہے۔ علامہ مراغی مرحوم جامع ازہر کے شیخ الشیوخ اور ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

(۱) اُمِّيٌّ وَهُوَ مَنْ لَا يَقْرَأُ وَلَا يَكْتُبُ۔ — یعنی امی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

(تفسیر المراغی جلد ۱ صفحہ ۱۴۴)

(۲) فَاِنَّ رَجُلًا اُمِّيًّا لَا يَقْرَأُ وَلَا يَكْتُبُ وَلَمْ يَتَعَلَّمِ الْعِلْمَ وَلَمْ يُدَارِسْ اِنْسَانًا مَدٰى حَيَاتِهٖ يَاْتِيْ بِهٰذِهِ الْحِكَمِ وَالْاَحْكَامِ۔ (جلد ۲۱ صفحہ ۴) — یعنی ایک اُمّی آدمی جو نہ لکھ سکے نہ پڑھ سکے اور کوئی علم بھی حاصل نہ کیا ہو اور عمر بھر کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ نہ کیا ہو، ایسا امی ایسے حکم احکام لائے تو اس کی نبوت میں کون اور کیوں کر شک کر سکتا ہے۔

جلد ۹ صفحہ ۱۰۸ پر اُمّیت کو نبوت کا معجزہ قرار دیا ہے۔

عصرِ حاضر کی ایک مختصر مگر بڑی مقبول تفسیر مصر کے تین علماء محمود حمزہ، حسن علوان اور احمد برانق نے "تفسیر القرآن الکریم" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے:

اَلْاُمِّيُّ الَّذِيْ لَا يَقْرَأُ وَلَا يَكْتُبُ — امی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

(جلد ۹ صفحہ ۵۸/۲۴)

عصرِ حاضر کا ایک اور نامور مصری عالم اور شہرہ آفاق مصنف استاد ابوزہرہ ہے جو بہت سی کتابوں کا مصنف ہے اور جس کی کئی ضخیم کتابوں کے اُردو تراجم لاہور سے شائع ہو چکے ہیں، مصر کے کلیۃ الحقوق (لا کالج) میں اسلامی فقہ کا مشہور استاد ہے یہ مصری عالم اپنی ایک گرانقدر تصنیف میں ضمناً امی کے معانی پر بھی روشنی ڈالتا ہے:۔

(۱) فَاَسَاسُهَا اَنَّ الْقُرْآنَ الْكَرِيْمَ تَقُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اُمِّيِّيْنَ لَا يَقْرَءُوْنَ وَلَا يَكْتُبُوْنَ۔

(مصادر الفقہ الاسلامی صفحہ ۱۳)

اس عبارت میں بھی امی کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

(۲) وَكُلُّ هٰذَا جَاءَ عَلٰى لِسَانِ اُمِّيٍّ لَا يَقْرَأُ وَلَا يَكْتُبُ، لَمْ يَجْلِسْ اِلٰى مُعَلِّمٍ (حوالہ مذکور صفحہ ۲۱، ۲۳) یعنی یہ سب کچھ اس امی کی زبان سے نکلا جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا اور نہ کسی استاد کے پاس بیٹھا تھا۔)

(۳) وَهٰذَا كُلُّهٗ جَاءَ عَلٰى يَدِ اُمِّيٍّ لَمْ يَقْرَأْ وَلَمْ يَكْتُبْ (صفحہ ۲۵) یہ سب کارنامہ اس امی کا ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کتب احادیث میں بھی اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوپر ایک دو احادیث کا ذکر آ چکا ہے۔

اب ذرا سیرت کی کتابوں کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ سیرت النبیؐ پر لکھنے والے مؤرخ کس چیز کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

ابن حزم اندلسی (۳۸۴ - ۴۵۶ھ) مشہور سیرت نگار، حدیث دان اور فقیہ ہے۔ وہ اپنی سیرت میں یوں رقمطراز ہے :-

وھو صلی اللہ علیہ وسلم اُمّیٌّ لا یَقْرَاُ وَلَا یَکْتُبُ ونَشَأَ فِی بِلَادِ الْجَھْلِ وَالصَّحَارِیْ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، آپ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، آپ نے جاہل ملک اور صحراؤں میں نشوونما پائی۔

(جوامع السیرۃ طبع مصر صفحہ ۴۳)

علامہ سہیلی (متوفی ۵۸۱ھ) مشہور امام، محدث، اور فقیہ ہیں۔ اپنی مشہور و معروف کتاب "الروض الانف" میں صلح حدیبیہ (۶ھ) کے ذکر میں آں حضرت صلعم کے امی ہونے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔

(جلد دوم صفحہ ۲۳۰ - طبع مصر ۱۹۱۴ء)

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حدیث اور تاریخ کی بعض کتابوں جن میں بخاری اور ابن خلدون بھی شامل ہیں کَتَبَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ امام سہیلی نے صاف لکھ دیا ہے کہ کَتَبَ کا مفہوم ہے اَمَرَ اَنْ یُّکْتَبَ یعنی جہاں کہیں "لکھا" مرقوم ہے اس سے مراد محض یہ ہے کہ حکم دیا کہ لکھا جائے۔ اس کی تائید امام قرطبی نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا جانے لگا تو قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو نے "محمد رسول اللہ" کے جملے پر اعتراض کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا۔

(تفسیر قرطبی جلد ۱۳ صفحات ۳۵۱-۳۵۲)

امام ابن حزم نے بھی یہی لکھا ہے کہ آپ نے "محمد رسول اللہ" اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور کاتب کو حکم دیا کہ وہ محمد بن عبداللہ لکھے۔

(جوامع السیرۃ صفحہ ۲۰۹)

تمام مورخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

علامہ زرقانی کے شرح مواھب اللدنیہ میں اس موضوع پر بڑی طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔ اس دلچسپ اور محققانہ بحث کا مفاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے صلح حدیبیہ کے موقعے پر حضرت علی رض کے بتانے پر آپ نے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت علی رض نے عبارت یوں بنا دی۔ محمد بن عبداللہ۔

پھر وہ ایک دلچسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی ایک روایت کے ظاہر الفاظ کی بنا پر اندلس کے ایک عالم ابو الولید باجی (۴۰۳ھ — ۴۷۴ھ) نے اس بات کا اظہار کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ابن عبداللہ تحریر فرمایا تھا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ اندلس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور علمائے اندلس نے اس پر زندیق کا فتویٰ لگاتے ہوئے اس کے اس عقیدے کو قرآن مجید کے صریح خلاف قرار دیا۔ چنانچہ ابو الولید باجی نے اس موضوع پر ایک خط کے ذریعے مصر، شام اور عراق کے علماء سے فتویٰ پوچھا۔ اس کے جواب میں جمہور علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے قطعاً نہیں لکھا تھا بلکہ بخاری کے الفاظ بطریق مجاز ہیں یعنی لکھنے کا حکم دیا تھا۔

نویں صدی ہجری میں مصر کے مشہور مورخ و سیرت نگار اور محدث و فقیہ علامہ سخاوی بھی اپنی نادر کتاب الاعلام (صفحہ ۱۶) میں امام ابو اسحاق احمد بن محمد الثعالبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے۔ آپ نے کسی مؤدب اور معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ مکہ مکرمہ سے باہر بھی کسی شخص سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے گزشتہ انبیاء اور امم سابقہ کے احوال قرآن مجید میں ذکر کیے تو عرب کے عقلمند

لوگوں نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی و الہام آپؐ پر نازل ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ آپؐ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کرنے لگے اور یہ بھی معجزات نبوت میں سے ہے۔

ان ساری معروضات کا خلاصہ یہ ہے :۔

۱۔ امّی کا مفہوم ہے، ایسا شخص جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔

۲۔ عرب قوم کی بھاری اکثریت لکھنے پڑھنے سے عاری تھی۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

۴۔ تمام مفسروں، مؤرخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر یہ بات کتنی قابلِ اعتنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی اَن پڑھ قوم کو کتنے علوم کا حامل بنا دیا۔ علم کا شوق دلایا۔ لکھنے پڑھنے کو رواج دیا۔ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھ کر بام عروج تک پہنچایا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ علم و فن کا وہ کون سا گوشہ ہے جس میں امّی نبی کی امت نے گہرے نقوش مرتسم نہیں کیے۔

بارگاہِ نبویؐ میں

سیّد ابوالحسن علی ندوی

مورخین اور مصنفین کو خدا معاف کرے، مقدس سے مقدس مقامات اور افضل سے افضل اوقات میں بھی یہ تاریخی ذوق اور طرزِ فکر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور وہ چند لمحات کے لئے بھی اس سے آزاد نہیں ہو پاتے، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اپنے علم و مطالعہ کی فضا میں سانس لیتے ہیں اور حال کا رشتہ ہمیشہ ماضی سے جوڑنا چاہتے ہیں، مناظر کو دیکھ کر ان کا ذہن بہت جلد اس تاریخی منظر کی تلاش میں نکل جاتا ہے جن کے نتیجہ میں ان مناظر کا وجود اور نمود ہے۔

مجھے کل روضۂ نبویؐ کی زیارت نصیب ہوئی۔ میرے چاروں طرف نمازیوں اور عبادت گزاروں کا زبردست مجمع تھا ان میں کچھ لوگ سجدے میں تھے اور کچھ رکوع میں تلاوتِ قرآن کی آوازیں فضا میں اس طرح گونج رہی تھیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ میں بھنبھنا رہی ہوں، اس وقت کا سماں کچھ ایسا تھا کہ مجھے تاریخ اور تاریخی شخصیات کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر دینا چاہئے تھا، لیکن تاریخ کی قدیم یادیں بادلوں کی طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئیں اور میرا ان پر کوئی زور نہ چل سکا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس امت کی نامور شخصیتوں اور رہنماؤں کو ایک نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔ اور وہ وفود کی شکل میں یکے بعد دیگرے بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہو رہے ہیں اور اسی عظیم مسجد میں فریضۂ نماز ادا کرنے کے بعد اسی عظیم نبیؐ کو ہدیۂ سلام اور خراجِ عقیدت و محبت پیش کر رہے ہیں اور اس کے احسان کا اعتراف کر رہے ہیں اور (طبقاتی اختلاف کے باوجود) اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یہی وہ نبیؐ ہیں جنھوں نے اللہ کے حکم سے ان کو ظلمت سے روشنی کی طرف، تیرہ بختی سے خوش بختی کی طرف، مخلوق کی عبادت سے خدائے واحد کی عبادت کی طرف اور مذاہب کے ظلم و استبداد سے اسلام کے عدل و انصاف کی طرف اور دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف نکالا، وہ اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ اسلام ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا سارا وجود اور زندگی نبوت کی مرہونِ منت ہے، اگر خدانخواستہ ان سے وہ سب واپس لے لیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نبیؐ کے ذریعہ عطا کیا تھا اور نبوت کے وہ عطیے ان سے چھین لئے جائیں جنھوں نے دنیا میں ان کو عزت و سرفرازی بخشی تھی تو ان کی حیثیت ایک بے روح اور بے جان ڈھانچے اور چند مبہم اور بے مقصد خطوط و اشکال سے زیادہ نہ رہ جائے گی اور وہ تاریخ کے تاریک ترین عہد جنگلیوں کے قانون اور رہزنوں اور لٹیروں کی حکومت کی طرف واپس چلے جائیں گے اور موجودہ تہذیب و تمدن کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔

اچانک میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ بابِ جبریل سے (جو مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھا) ایک جماعت داخل ہو رہی ہے، سکون و وقار میں ڈوبے ہوئے ان کی پیشانی سے علم کا نور اور ذہانت کی روشنی

صاف عیاں تھی، وہ باب الرحمۃ اور باب جبریل کے درمیانی حصے میں پھیل گئے، وہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کے شمار کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں نے دربان سے پوچھا کہ :۔ یہ لوگ کون ہیں ؟ اُس نے کہا کہ :۔ اس اُمت کے امام اور رہنما انسانیت کے محسن اور نوعِ انسانی کے ممتاز اور قابلِ فخر نمونے ہیں، ان میں سے ہر ایک پوری پوری قوم کا امام، پورے پورے کتب خانہ اور مکتبِ فکر کا بانی اور موسس پوری نسل کا مربی اور ہر علم و فن کا موجد ہے ان کے لازوال آثار اور لافانی شاہکار اور نمونے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں، ان کے علم و اجتہاد اور تحقیق کی روشنی میں کئی کئی نسلوں نے سفرِ زندگی طے کیا ہے، اُس نے عجلت کے ساتھ چند ہستیوں کے نام بھی مجھے بتا دیئے :۔ حضرت مالک بن انسؓ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ، لیث بن سعد مصری، امام اوزاعی، امام بخاری، امام مسلم، تقی الدین بن تیمیہ، ابن قدامہ، ابو اسحاق الشاطبی کمال ابن الہمام، شاہ ولی اللہ دہلوی، یہ لوگ تھے جنہوں نے زمان و مکان کے تفاوت اور فرقِ مراتب اور اختلافِ درجات کے ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں خراجِ عقیدت پیش کیا اور اشکِ ندامت نذر کئے۔

میں نے دیکھا کہ سب سے پہلے انہوں نے تحیۃ المسجد کی دوگانہ بہت خشوع و خضوع اور حضوریِ قلب کے ساتھ ادا کی، پھر بہت ادب اور تواضع کے ساتھ قبر مبارک کی طرف بڑھے، اور بہت جچے تلے مختصر، معانی سے لبریز، گہرے اور پُرمغز کلمات کے ساتھ سلام پیش کیا، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز میں رقت، وہ کہہ رہے تھے :۔

"یا رسول اللہؐ ! اگر آپ کی لازوال، وسیع اور جامع، عادلانہ اور کشادہ شریعت نہ ہوتی اور اس کے وہ اصول نہ ہوتے جن سے انسانی ذہن اور انسانی صلاحیت نے نئے نئے گل بوٹے پیدا کئے اور زمین کا دامن بیش قیمت اور عطر بیز پھولوں سے بھر دیا اور اس کا وہ حکیمانہ اور معجزانہ نظام نہ ہوتا جس نے انسانی فکر و تدبر اور اخذ و استنباط کی صلاحیت کو بیدار کر دیا، اور اگر انسانیت کو اس کی احتیاج نہ ہوتی تو نہ اس عظیم فقہ کا کوئی وجود ہوتا نہ اس عظیم اسلامی قانون سے کوئی واقف ہوتا جس سے اس وقت ہر قوم کا دامن خالی تھا، نہ اتنا بڑا اسلامی کتب خانہ وجود میں آتا جس کے سامنے دنیا کا سارا مذہبی لٹریچر ہیچ ہے ——
اگر علم کی اشاعت اور خدا کی نشانیوں اور اس کی قدرتِ کاملہ میں غور و فکر اور استعمالِ عقل کے لئے آپ جدوجہد نہ فرماتے تو یہ شجرِ علم زیادہ دنوں تک برگ و بار نہ لا سکتا، اور نہ اس کی وہ اشاعت ہوتی جو آج نظر آ رہی ہے، عقلِ انسانی پہلے کی طرح پا بہ زنجیر ہوتی اور دنیا استفادہ سے محروم۔"

میں اس جماعت کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ میری نظر ایک دوسرے گروہ پر پڑی جو باب الرحمۃ سے ہو کر اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کے آثار ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھے مجھے بتایا گیا کہ اس

جماعت میں حسن بصری، عمر بن عبدالعزیزؒ، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، داؤد الطائی ابن السماک، شیخ عبدالقادر جیلانی، نظام الدین اولیاؒ اور عبدالوہاب المتقی جیسے حضرات بھی رونق بخش ہیں۔ جنھوں نے اپنے قابلِ رشک پیشرووں کی یاد تازہ کردی۔ نماز کے بعد یہ لوگ بھی قبرِ مبارک کے سامنے کھڑے ہوئے اور اپنے نبی و پیشوا اور سب سے بڑے معلّم اور رہنما کو درود و سلام کا تحفہ پیش کرنے لگے، وہ کہہ رہے تھے:۔

"یارسول اللہؐ! اگر ہمارے سامنے وہ عملی مثال نہ ہوتی جو آپ نے پیش فرمائی تھی اور وہ مینارۂ نور نہ ہوتا جس کو آپ نے بعد کے آنے والوں کے لئے قائم فرمایا تھا، اگر آپ کا یہ قول نہ ہوتا کہ:" اے اللہ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے"۔ اگر آپ کی یہ وصیت نہ ہوتی کہ:" دنیا میں اس طرح زندگی گذارو جس طرح کوئی مسافر یا راہی زندگی گذارتا ہے"۔ اگر زندگی کا وہ طرز نہ ہوتا جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے اس طرح کیا ہے کہ:" ایک چاند کے بعد دوسرا چاند اور دوسرے کے بعد تیسرا چاند نکل آتا تھا اور آپ کے گھر میں نہ آگ جلتی تھی نہ چولھے پر دیگچی چڑھانے کی نوبت آتی تھی"۔ تو ہم دنیا پر اس طرح آخرت کو ترجیح نہ دے سکتے، اور نہ ان ضروریاتِ زندگی پر قناعت کرتے جو زندگی و صحت کی بقا کے لئے ناگزیر ہیں، نہ ہم نفس کی ترغیبات پر قابو پا سکتے، اور نہ دنیا کے حسن و جمال اس کی رعنائی و زیبائی اور عہدہ و منصب کی طاقت اور کشش کا اس طرح مقابلہ کر سکتے"۔

ان کے حکیمانہ الفاظ ابھی پوری طرح میرے دل و دماغ میں پیوست بھی نہ ہوئے تھے کہ میری نظر ایک اور گروہ پر پڑی، جو "باب النساء" سے بہت حجاب اور ادب کے ساتھ گذر رہا تھا ظاہری آرائش اور آزادروی کے ان مناظر سے جو اسلامی اصول و آداب کے منافی ہیں یہ گروہ بالکل محفوظ اور خالی تھا، یہ مختلف قوموں اور دور دراز ملکوں کی صالح عبادت گذار، عفیف خواتین تھیں جو عرب و عجم اور مشرق و مغرب کے مختلف خطوں سے تعلق رکھتی تھیں، بہت دبی زبان میں اور پورا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنے جذباتِ تشکر و عقیدت کا اظہار اس طرح کر رہی تھیں:۔

"ہم آپ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اے رسول اللہؐ! ایسے طبقے کا درود و سلام جس پر آپ کا سب سے بڑا احسان ہے، آپ نے ہم کو خدا کی مدد سے جاہلیت کی بیڑیوں اور بندشوں، جاہلی عادات و روایات، سوسائٹی کے ظلم اور مردوں کی زور دستی اور زیادتی سے نجات بخشی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے رواج کو ختم کیا، ماؤں کی نافرمانی پر وعید سنائی، آپ نے فرمایا کہ جنّت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ آپ نے وراثت میں ہم کو شریک کیا اور اس میں ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی حیثیت سے ہم کو حصّہ دلایا، یوم عرفہ کے مشہور تاریخی خطبہ میں بھی آپ نے ہمیں فراموش نہیں کیا اور کہا کہ:" عورتوں کے

بارے میں خدا سے ڈرو اس لئے کہ تم نے ان کو اللہ کے نام کے واسطہ سے حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر آپ نے مردوں کو عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک، ادائے حقوق اور بہتر معاشرت کی ترغیب دی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے طبقہ کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزا دے جو انبیاءؑ و مرسلین اور اللہ کے نیک اور صالح بندوں کو دی جاسکتی ہے۔"

یہ نرم آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں کہ ایک اور جماعت نظر آئی جو "باب السلام" کی طرف سے آ رہی تھی، میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کہ وہ علوم و فنون کے موجد اور مرتب اور ائمہ نحو و لغت و بلاغت کی جماعت تھی، ان میں ابوالاسود الدولی، خلیل بن احمد، سیبویہ، کسائی، ابوعلی الفارسی، عبدالقاہر الجرجانی، السکاکی، مجدالدین فیروزآبادی سید مرتضیٰ الزبیدی بھی تھے۔ جو اپنے علوم کا سلام پیش کر رہے تھے، اور اپنی شہرت اور مرتبۂ علمی کا خراج ادا کرنے آئے تھے۔ میں نے دیکھا وہ بہت بلیغ اور ادبی الفاظ میں اس طرح گویا ہیں:-

"یا رسول اللہ! اگر آپ نہ ہوتے اور یہ مقدس کتاب نہ ہوتی جو آپ پر نازل ہوئی اگر آپ کی احادیث نہ ہوتیں اور یہ شریعت نہ ہوتی جس کے سامنے ساری دنیا نے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، اور وہ اس کی وجہ سے عربی زبان سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے پر مجبور تھی، تو پھر یہ علوم بھی نہ ہوتے جن میں آج ہم کو رہنمائی اور برتری کا شرف حاصل ہے، نحو، بیان اور بلاغت ان میں سے کسی چیز کا بھی وجود نہ ہوتا، نہ یہ بڑی بڑی معاجم اور لغات نظر آتیں، نہ عربی زبان کے مفردات میں یہ نکتہ آفرینیاں اور دقیقہ سنجیاں ہوتیں، نہ ہم اس راستہ میں اتنی زبردست اور طویل جدوجہد کے لئے تیار ہوتے۔ عجم کو (جس کے ہاں زبانوں اور لہجوں کی کوئی کمی نہ تھی) عربی سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہ ہوتی اور نہ ان میں وہ مصنفین اور اہلِ قلم پیدا ہوتے جن کے ادبی مرتبہ اور مہارتِ فن کے اعتراف پر ادبائے عرب بھی مجبور ہیں۔ اے رسول اللہ! آپ ہی ہمارے درمیان اور اسلام میں پیدا ہونے والے ان علوم کے درمیان رابطہ اور واسطہ تھے جو آپ کے عہدِ رسالت اور عہدِ امامت میں پیدا ہوئے۔ درحقیقت صرف آپ ہی عرب و عجم میں رابطہ کا ذریعہ ہیں۔ آپ ہی کی ذات ہے جس نے اس درمیانی خلا کو پُر کیا ہے اور عرب و عجم قریب و بعید کو گلے ملا دیا ہے۔ آپ کا کتنا احسان ہے ہماری اس ذہانت، طباعی اور تبحر علمی پر، اور آپ کا کتنا کرم ہے علم کی اس ثروت پر، انسانی عقل کی زرخیزی پر اور قلم کی گلکاری پر۔ اے رسول اللہ! اگر آپ نہ ہوتے تو یہ زبان بھی بہت سی

اور زبانوں کی طرح صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جاتی - اگر قرآن مجید کا معجزہ نہ ہوتا تو اس پر تحریف کا ایسا عمل جراحی ہوتا کہ اس کی صورت ہی مسخ ہو جاتی، جیسا بکثرت دوسری زبانوں کے ساتھ ہوا ہے - عجمی لہجے اور مقامی زبانیں اس کو جذب کر لیتیں یا نگل لیتیں اور اس کی فصاحت یکسر ختم ہو جاتی، یہ آپ کے وجودِ مبارک، شریعتِ اسلامی اور اس کتاب مقدس کا فیض ہے جس نے اس زبان کو فنا کے دست برد سے محفوظ رکھا ہے اور عالم اسلام کے لئے اس کی عزت و محبت واجب کر دی ہے، اور ہر مسلمان کے دل کو اس کی محبت و عقیدت سے لبریز کر دیا ہے - آپ ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس زبان کو دوام بخشا اور اس کی بقا و ترقی کی ضمانت کی، اس لئے ہر اس شخص پر جو اس زبان میں بات کرتا ہے یا لکھتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی بلند مرتبہ حاصل کرتا ہے یا اس کی دعوت دیتا ہے آپ کا احسان ہے اور وہ اس احسان کو ماننے پر مجبور رہے "

میں ان کے اس اعتراف اور اظہارِ حقیقت کو غور سے سن رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ "باب عبدالعزیز" پر جا کر ٹھہر گئی، اس دروازے سے ایک ایسا گروہ داخل ہو رہا تھا جس پر مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے رنگ نمایاں تھے اس میں دنیا کے بڑے بڑے سلاطین اور تاریخ کے ممتاز ترین بادشاہ اور فرمانروا شامل تھے - ہارون رشید، ولید بن عبدالملک ملک شاہ سلجوقی، صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، ظاہر بیبرس، سلیمان القانونی، اورنگ زیب عالمگیر بھی اس گروہ میں شامل تھے - انہوں نے اپنے خادموں اور سپاہیوں کو دروازے کے باہر ہی چھوڑ دیا تھا اور نظریں جھکائے، تواضع و انکساری کا مجسمہ بنے ہوئے بہت آہستہ آہستہ گفتگو کرتے ہوئے چل رہے تھے - میری نظر کے سامنے ان سب کی شخصیتیں اور کارنامے ابھرنے لگے - میری آنکھوں میں اس طویل و عریض دنیا کا نقشہ پھر گیا جس پر ان کا سکہ چلتا تھا، اس غلبہ و اقتدار کی تصویر یکایک میرے سامنے آ گئی جو ان کو دنیا کی بڑی بڑی قوموں، طاقت ور سلطنتوں اور جابر بادشاہوں پر حاصل تھا - ان میں وہ شخص[1] بھی تھا جس نے بادل کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ کہا تھا :- " تو جہاں چاہے جا کے برس تیرا خراج آخر کار میرے ہی خزانہ میں آئے گا " وہ شخص[2] بھی تھا جس کی سلطنت کی وسعت کا عالم یہ تھا کہ اگر سب سے تیز رفتار اونٹ، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا چاہتا تو یہ ۱۵ ماہ سے کم میں ناممکن تھا - ان میں وہ فرمانروا بھی تھے جو نصف کرۂ ارضی پر حکومت کرتے تھے اور بڑے بڑے بادشاہ ان کو خراج پیش کرنے پر مجبور تھے[3] ایسے

---

[1] ہارون رشید کی طرف اشارہ ہے -

[2] ولید بن عبدالملک مراد ہے -

[3] سلیمان قانونی کی طرف اشارہ ہے -

فرمانروا بھی تھے جن کی ہیبت سے سارا یورپ لرزہ براندام تھا، اور جن کے زمانے میں مسلمانوں کو عزت کا یہ مقام حاصل تھا کہ جب وہ یورپ کے ملکوں میں جاتے تھے تو ان کے دین کے احترام اور ان کے غلبہ و سطوت کے اثر سے گرجوں کے گھنٹے بجنا بند ہو جاتے تھے[1] غرض اسی طرح کے نہ جانے کتنے بادشاہ اور فرماں روا اس مجمع میں موجود تھے، وہ مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنے کے لئے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور حضور کو درود وسلام کا ہدیہ پیش کرنا چاہتے تھے، اور اُس کو اپنے لئے سب سے بڑا شرف و اعزاز اور سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش اُن کی یہ نماز اور یہ درود و سلام قبول ہو۔ میں نے دیکھا کہ وہ لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں، اُن کے دلوں پر ہیبت طاری تھی۔ یہاں تک کہ وہ "صفہ" کے نزدیک پہنچ گئے جو فقرا صحابہ کا مسکن اور جائے قیام تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وہاں رُک گئے اور عزت و احترام اور شرم و حیا کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اس کو دیکھنے لگے۔ اُس کے قریب ہی انہوں نے تحیۃ المسجد کے طور پر دو رکعتیں پڑھیں اور قبرِ مبارک کی طرف بڑھے اور پھر اُن کی محبت و عقیدت، جذبات و احساسات اور علم و ایمان کی زبان نے جو کچھ کہلوایا وہ انہوں نے اس بارگاہِ نبوی میں عرض کیا لیکن شریعت کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے اور توحیدِ خالص کو پیشِ نظر رکھ کر، میں نے سُنا وہ کہہ رہے تھے:

"اے رسول اللہ اگر آپ نہ ہوتے اور آپ کا یہ جہاد اور یہ دعوت نہ ہوتی جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور جس نے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کر لیا اور اگر آپ کا یہ دین نہ ہوتا جس پر ایمان لانے کے بعد ہمارے آباؤ اجداد گوشۂ عزلت اور قعرِ ذلت سے نکل کر عزت و سربلندی، حوصلہ مندی اور بلند ہمتی کی وسیع زندگی میں داخل ہوئے پھر اس کے نتیجہ میں انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں، دُور دراز ملکوں کو فتح کیا اور اُن قوموں سے خراج وصول کیا جو کسی زمانہ میں اُن کو اپنی لاٹھی سے ہانکتی تھیں اور بھیڑ بکری کے گلّہ کی طرح اُن کی پاسبانی اور حفاظت کرتی تھیں۔ اگر جاہلیت سے اسلام کی طرف اور گوشۂ گمنامی اور تنگ و محدود قبائلی زندگی سے تسخیرِ عالم کی طرف یہ مبارک سفر نہ ہوتا جو آپ کی برکت سے انجام پذیر ہوا تو دنیا میں کسی جگہ بھی ہمارا جھنڈا سربلند نہ ہوتا اور نہ ہماری کہانی کسی جگہ سُنائی جاتی۔ ہم اسی طرح بے آب و گیاہ خشک و ویران صحراؤں اور حقیر وادیوں میں باہم دست و گریبان رہتے۔ جو طاقتور ہوتا وہ کمزور پر ظلم کرتا، بڑا چھوٹے پر زیادتی کرتا۔ ہماری غذا بہت ہی حقیر اور معیار اتنا پست تھا کہ اس سے زیادہ پست کا تصور مشکل ہے، ہم اس گاؤں یا اپنے محدود قبیلہ سے

---

[1] سلیمان بن سلیم العثمانی کی طرف اشارہ ہے۔

آگے بڑھ کر کچھ سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے جس میں ہماری ساری زندگی اور ساری جدوجہد محصور تھی۔ ہماری مثال تالاب کی مچھلیوں اور کنوئیں کے مینڈکوں کی سی تھی۔ ہم اپنے محدود تجربوں کے جال میں گرفتار تھے اور اپنے جاہل اور بے عقل آباؤ اجداد کے گن گاتے تھے۔

آپ نے اسے رسول اللہؐ ہم کو اپنے دین کی ایسی روشنی عطا کی کہ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ خیال میں وسعت پیدا ہوئی، نظر کو جلا ہوئی۔ اس کے بعد ہم اس وسیع اور جامع دین اور اس روحانی رشتہ اور رابطہ کو لے کر خدا کی وسیع اور کشادہ زمین میں پھیل گئے۔ ہم نے اپنی تمام خوابیدہ اور جامد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے شرک و بت پرستی اور ظلم و جہالت کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور ایسی عظیم الشان حکومتیں قائم کیں جن کے سایہ میں ہم اور ہماری اولاد اور ہمارے بھائی صدیوں تک آرام اور فائدہ اٹھاتے رہے۔

آج ہم آپ کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرنے آئے ہیں اور اپنے جذبۂ محبت اور عزت و احترام کا خراج یا ٹیکس اپنی خوشی و مرضی سے ادا کر رہے ہیں اور اس کو اپنے لیے باعثِ فخر اور وسیلۂ شرف سمجھتے ہیں۔

ہمیں پورا اعتراف ہے کہ اس دین کے احکام و قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں (جس سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو سرفراز کیا تھا) ہم سے یقیناً بڑی کوتاہی ہوئی۔ ہم اللہ سے استغفار کرتے ہیں بے شک وہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

میں ان بادشاہوں کی طرف متوجہ تھا۔ میری نظریں اُن کے خاموش اور باادب چہروں پر مرکوز تھیں۔ میرے کان اُن کے ان پُرخلوص، نیازمندانہ الفاظ پر لگے ہوئے تھے جو اس سے قبل میں نے اُن سے کسی موقع پر نہیں سُنے تھے کہ ایک اور جماعت داخل ہوئی اور ان بادشاہوں اور فرماں رواؤں کی پروا کئے بغیر اُن کی صفوں سے ہوتی ہوئی سامنے آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان بادشاہوں کے رعب و دبدبہ اور قوت و اقتدار کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یا تو یہ شاعر ہیں یا انقلابی، یہ اندازہ غلط نہ تھا اس لئے کہ یہ جماعت ان دونوں گروہوں پر مشتمل تھی۔ اس میں سید جمال الدین افغانی امیر سعید حلیم، مولانا محمد علی، امام حسن البنا کے پہلو بہ پہلو ترکی کے مشہور شاعر محمد عاکف اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی موجود تھے۔ ترجمانی کے لئے ان لوگوں نے آخر الذکر کا انتخاب کیا اور لائق ترجمان نے ان الفاظ میں اپنے جذباتِ عقیدت کا اظہار کیا:-

"یا رسول اللہؐ میں آپ سے اُس قوم کی شکایت کرنے آیا ہوں جو آج بھی آپ کے خوانِ نعمت سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور آپ کے سایۂ رحمت میں زندگی گزار رہی ہے، اور آپ ہی کے لگائے ہوئے باغ کے پھل کھا رہی ہے، وہ اُن ملکوں میں جن کو آپ نے

قفس استبداد سے آزاد کرایا تھا اور سورج کی روشنی اور کھلی ہوا عطا کی تھی وہ آج آزادی کے ساتھ اور اپنی مرضی کے مطابق حکومت کر رہی ہے۔ لیکن یہی قوم اسے رسول اللہ آج اسی بنیاد کو اکھاڑ رہی ہے جس پر اس عظیم اُمت کے وجود کا دارومدار ہے۔ اس کے رہنما اور لیڈر آج یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس اُمتِ واحدہ کو کثیر التعداد قومیتوں میں تقسیم کر دیں، وہ اُسی چیز کو زندہ کرنا چاہتے ہیں جس کو آپ نے ختم کیا تھا، اُسی چیز کو بگاڑ رہے ہیں جس کو آپ نے بنایا تھا۔ وہ اس اُمت کو عہدِ جاہلیت کی طرف دوبارہ واپس لے جانا چاہتے ہیں جس سے آپ نے اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکالا تھا اور اس معاملہ میں یورپ کی تقلید کر رہے ہیں جو خود زبردست ذہنی افلاس اور انتشار و بے یقینی کا شکار ہے، وہ اللہ کی نعمت کو ناشکری سے تبدیل کر کے اپنی قوم کو تباہی کے گھر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ "چراغِ مصطفوی" اور "شرارِ بولہبی" کی معرکہ آرائی آج پھر قائم ہے۔ بدقسمتی سے ابولہب کے کیمپ کی طرف وہ لوگ نظر آ رہے ہیں جو اسلام کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں اور عربی زبان بولتے ہیں۔ وہ آج اپنے جاہلی کارناموں اور اصنام پر فخر کرنے لگے ہیں جن کو آپ نے پاش پاش کر دیا تھا۔ یہ لوگ اُن تاجروں میں ہیں جو سودا خریدتے وقت تو زیادہ لینا چاہتے ہیں اور بیچتے وقت کم دیتے ہیں۔ آپ سے انہوں نے ہر چیز حاصل کی اور ہر طرح کی قوت و عزت سے بہرہ مند ہوئے۔ اب وہ اُن قوموں کے ساتھ جن کے وہ حاکم اور نگراں ہیں یہ سلوک کر رہے ہیں کہ اُن کو بالجبر یورپ کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور اُس کو جاہلی فلسفوں، نیشنلزم، سوشلزم، کمیونزم کے حوالہ کر رہے ہیں۔

آپ نے جن بتوں سے کعبہ کو پاک کیا تھا وہ آج مسلمان قوموں کے سروں پر نئے نئے ناموں اور نئے نئے لباسوں میں پھر مسلط کئے جا رہے ہیں۔ مجھے عالمِ عربی کے بعض حصوں میں جن کو آپ کا مرکز اور قلعہ ہونا چاہیئے تھا، ایک عام بغاوت نظر آ رہی ہے لیکن کوئی فاروق (رضی اللہ عنہ) نہیں۔ فکری و ذہنی ارتداد کی آگ تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے اور کوئی ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نہیں جو اس کے لئے مردانہ وار میدان میں آئے اور اس آگ کو بجھائے۔

میری طرف سے اور میرے تمام ساتھیوں کی طرف سے جن کی نمائندگی اور ترجمانی کا فخر مجھے حاصل ہوا ہے آپ کو دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے اور عقیدت و احترام کے

جذبات میں ڈوبے ہوئے سلام کا تحفہ قبول ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ہم ان تمام لیڈروں اور رہنماؤں سے بری اور بیزار ہیں جنھوں نے اپنا رُخ اسلام کے قبلہ کی طرف سے پھیر کر مغرب کی طرف کر لیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں آپ سے اور آپ کے دین سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہم آپ کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا پھر اعلان کرتے ہیں اور جب تک زندگی ہے اسلام کی اس رسی کو ان شاء اللہ مضبوطی سے پکڑے رہیں گے۔"

یہ بلیغ اور ایمان و یقین سے لبریز الفاظ ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ مسجد نبوی کے میناروں سے اذان کی دلنواز صدا بلند ہوئی اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر میں یکبارگی ہشیار ہو گیا اور تخیلات کا یہ حسین سلسلہ جو تاریخ کے سہارے قائم ہوا تھا ٹوٹ گیا۔ میں اب پھر اسی دنیا میں واپس آ گیا تھا جہاں سے چلا تھا۔ کچھ لوگ نماز میں مشغول تھے اور کچھ تلاوت کر رہے تھے۔ عالم اسلام کے مختلف وفود اور جماعتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہدیۂ سلام پیش کر رہی تھیں۔ زبانوں اور لہجوں کے اختلافات کے ساتھ جذبات و تاثرات کے اتحاد نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔

مترجم: مولوی سید محمد الحسنی

تصویرِ ہجرت

ناصر نذیر فراق

بہت آنکھیں ہیں فرشِ راہ چلنا دیکھ کر جاناں
کفِ نازک میں کانٹا چبھ نہ جائے کوئی مژگاں کا

پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو تیرہواں سال ہے قوم کے سمجھانے میں آپ نے کوئی جتن نہیں چھوڑا مگر ڈھاک کے تین پات قریش نے جس طرح نبوت کے دعوے کے پہلے دن آپ کو جھوٹا کہا تھا آج بھی اسی طرح منہ بھر کے آپ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں مکہ میں سب سے بڑا جھٹلانے والا گروہ آپ کا کنبہ اور آپ کا خاندان ہے جس کا نام قریش یا بنی ہاشم ہے آپ کو پتھر مارنے والے قریش ہیں آپ کے راستہ میں کندگی اور کانٹے بچھانے والے قریش ہیں مگر اس سال ۶۲۲ء میں قریش کا کینہ حضور صلوٰۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑھ گیا ہے کیونکہ آپ کی نگہبانی کرنے والے چچا جناب مستطاب سلطان الملکہ حضرت ابوطالب اس دنیا سے دار العاقبۃ کی طرف تشریف لے گئے اور ملکہ جہان و جہانیان حضرت خدیجۃ الکبریٰ جو آپ کی مونس و غمگسار تھیں وہ بھی جنت کو سدھار چکی ہیں گھر میں آتے ہیں تو بے ماں کی بچی فاطمہ رضی کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں باہر جاتے ہیں تو قریش پتھر برساتے ہیں اور "لست مرسلا لست مرسلا" کی صدائیں لگاتے ہیں جو دل کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ ایک بدمعاش پکار کر کہتا ہے یا محمد میں نے تمہاری ہلاکت کے لیے ایک صبا رفتار گھوڑا خریدا ہے اس پر سوار ہو کر تمہیں ماروں گا دوسرا بکا۔ الحساب اے احمد میں نے تمہارا سر اتارنے کے لیے ایک تیغ دودم لی ہے بالفعل کفار کا اس مستعدی سے حضور کے قتل پر آمادہ ہو جانے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انہوں نے تاڑ لیا تھا کہ گو اسلام کا پودا محمد کے خاطر خواہ پھولا پھلا نہیں ہے مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات محمد کے ساتھی سب کے سب جاں نثار ہیں علی بن ابی طالب اٹھارہ برس کا نوجوان بہادر ذوالفقار لئے ہر دم اس کا پہرہ دیتا ہے۔ ابوبکر بن ابی قحافہ جیسا مالدار بر تجربہ کار خرچ کے وقت اس کے لیے سونے چاندی کا مینہ برسا دیتا ہے۔ عمر بن الخطاب جیسا جیوٹ جی دار ہر آن اس کے لیے سینہ سپر رہتا ہے حمزہ بن عبدالمطلب اس کے پلہ پہ ہے جو شیر کا کلہ چیر ڈالتا ہے ان کے علاوہ جعفر بن ابی طالب اور عثمان بن عفان اور چار سو نوجوان شہر مکہ کے رہنے والے نامی نامدار اور قریب ایک ہزار کے طائف اور نواح طائف کے ساکن اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اس کا کلمہ پڑھتے ہیں یثرب یعنی مدینہ کے خاص عام اس کے غلام ہو چکے ہیں اگر اس شخص کی پوری روک تھام نہ ہوئی تو یہ بازی لے جائے گا اور ہمیں تہتر کے بیجوں میں پہنچا دے گا اگر اسے مکہ سے باہر جانے کی سوجھی تو غضب ہی ہو جائے گا اور سونے کی چڑیا ہمارے ہاتھوں سے اڑ جائے گی یہ شخص اپنی جادو بیانی اور شیریں زبانی سے مکہ سے نکل کر ایک عالم کو پرچا لے گا اور اپنے دام میں پھنسا لے گا یہ ٹڈی دل فوجیں لے کر مکہ پر چڑھائی کرے گا اور ہم سب کو پیس کر دھر دے گا اس لیے اب دیر کرنے کا موقع نہیں ہے گھڑی کی چوتھائی میں اس کا کام تمام کر دو مار پیچھے بایاں بچا ہی کرتا ہے بنی ہاشم اس کے قتل پر کھو رو لائیں گے مگر ہم سب سے کیا دبے ہوں گے ادھر تو قریش اور مکہ کے سارے قبیلے یہ چرغم چرغم کر ہی رہے تھے ادھر حضور نے بھی ان کی سن گن پالی تھی آپ نے اپنے صحابہ کو جتا دیا تھا اور ان میں سے ایک ادھ اپنے روزانہ مکہ سے ہجرت کر جاتے تھے بعض صحابہ نے حضور کے

مُنہ پر کہہ بھی دیا تھا کہ حضورؐ ہمیں جو ہجرت کے لئے آمادہ کرتے ہیں تو کیا خود بدولت بھی ہجرت فرمائیں گے۔

حضورؐ۔ بے شک میرا ارادہ بھی ہجرت کا ہے کیونکہ خدا کی مرضی ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔

صحابہؓ۔ حضور اقدسؐ اس ہجرت سے تو جہاد اچھا ہے ہمیں حکم دیجئے تاکہ ان دشمنوں کی دم بھر میں منڈیا مروڑ کر رکھ دیں۔

حضورؐ۔ بے شک تم سب صاحب مارنے مرنے والے ہو مگر خدا نے مجھے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنے شہر کے باشندوں کو تہ تیغ کروں میں قوم کے برباد کرنے سے یہ بہتر جانتا ہوں کہ میں قوم میں سے نکل جاؤں۔

صحابہؓ۔ جو مرضی مبارک مگر ہمارا جی نہیں پسند کرتا کہ ہم آپ کو کفار کے نرغہ میں چھوڑ کر چلے جائیں ایک دن ایک وقت میں ہم سب مسلمان اپنے بال بچوں کو اور حضورؐ والا کو اور حضورؐ کی اہلبیت کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل جائیں اور مکہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں۔

حضورؐ۔ تمہارے ساتھ میرا اس طرح جانا بڑی جوکھوں رکھتا ہے کفار جب ہمیں تمھیں کھلے بندوں جاتا دیکھیں گے تو چڑھ جائیں گے اور ہم تم پر پل پڑیں گے حرم پاک کی حدود میں خونریزی ہوگی اور میں یہ بے ادبی کرنی نہیں چاہتا میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں اپنی قوم کا اپنے ہاتھوں سے ستیاناس کروں اگر قوم کا بدنام کرنا مجھے مدِنظر ہو تو میرا صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا کافی ہے "انک لعلیٰ خلق عظیم" میری نشانی ہے وہ جتنا چاہیں مجھے ستائیں مگر میں ان کا بُرا نہ چاہونگا آپ لوگ خدا و رسول کے کاموں میں جرح و قدح نہ کریں اور جس طرح آپ کو حکم ہو ٹھنڈے دل سے مکّہ سے نکل جائیں۔

ویسے تو کفار ہمیشہ حضور پُر نورؐ کی ذاتِ پاک کے ستانے کے لیے مشورہ کیا کرتے تھے مگر اگست ۶۲۲ء میں سارے شہر کے دارالندوہ کے اندر حضورؐ کے قتل کے لیے برابر مجلسیں گرم ہوتی رہیں اور سب سے اخیر انجمن ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو ہوئی جس میں ابلیس لعین بھی شیخ نجدی بن کر شریک تھا اس پنچایت میں یہ بات طے پاگئی کہ آج رات کو جب محمدؐ اپنے بچھونے پر خواب استراحت میں ہوں تو تلواروں سے ان کا کام تمام کردیا جائے

پے مشورت مجلس آراستند

نشستند و گفتند و برخاستند

ہر قبیلہ کے سورما اور بیر اپنے اپنے ہتھیاروں کو مانجھ کر برق دم بنا رہے تھے اور جبرئیلؑ امین یہ آیہ کریمہ حضور والا کے گوش گذار فرما رہے تھے۔ واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک اویقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین یعنی کافروں نے ٹھان لی ہے کہ اے محمدؐ آپ کو بندی خانہ میں رکھیں یا آپ کو مار ڈالیں یا آپ کو دیس سے نکالا دیں وہ اپنی گھات میں لگ رہے ہیں اور اللہ اپنی گھات میں ہے اور اللہ اچھے گھات کرنے والوں میں سے ہے۔

اور جبرئیل علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ یا رسول اللہ پہلے جو آپ کی ہجرت کا ارادہ بلاد بحرین اور قنسرون کی طرف تھا وہ اب نہیں ہے۔ رب العزت نے ارشاد کیا ہے کہ آپ سیدھے مدینہ طیبہ کو تشریف لے جائیں اور کچھ خاص خاص ہدایتیں بھی کیں آپ اس وحی کو معلوم کر کے دولت خانہ پر تشریف لئے جاتے تھے اور حضرت علی بھی آپ کے ہمراہ تھے جو آپ نے دیکھا قریش اور ابوجہل ہتھیار لئے گلی کے موڑ پر کھڑے ہیں۔

ابوجہل (اپنے دوستوں سے) یہی تو میاں محمد ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر تم میرے کہنے پر چلوگے اور مسلمان ہو جاؤگے تو عرب اور عجم تمہاری ملکیت ہوں گے اور اگر اس کے خلاف کروگے تو نیچا دیکھوگے میرے ہاتھ سے مارے جاؤگے اور جہنم میں ٹھکانا ملے گا۔

حضور والاؐ۔ بے شک میں یہی کہتا ہوں اور جو کہتا ہوں وہ ہو کر رہے گا اور تو جہنم کے اندر پڑا سڑے گا یہ فرما کر آپ اپنے دولتخانہ میں چلے گئے اور حضرت علیؓ کو ہجرت کا مفصل حکم ارشاد فرمایا کہ برادر حکم الٰہی یہی ہے کہ آج رات کو تم میرے بچھونے پر سو رہو اور میں ابوبکر کو ساتھ لے کر مکہ سے نکل جاؤں۔ ڈرنا نہیں کفار تمہارا بال بیکا نہ کر سکیں گے۔

حضرت علیؓ۔ زہے نصیب میرے کہ میں حضورؐ کے بچھونے پر سونے کی سعادت حاصل کروں اور حضورؐ کو روشن ہے کہ مجھے کسی موقع پر خوف و ہراس نہیں ہوتا۔

حضور والاؐ۔ جیتے رہو خوش رہو۔

ان باتوں کو بی بی فاطمہ علیہا السلام نے بھی سنا اور آپ کا ننھا سا کلیجہ دھڑکنے لگا آپ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے اور آپ نے کھسیانی آواز میں کہا کہ باوا جان آپ مجھ بے ماں کی بچی کو کس پر چھوڑتے ہیں۔

حضورؐ۔ خدا پر گھبرانا نہیں تمہاری بڑی باجی اور تمہاری سوتیلی ماں سودہؓ تمہارے پاس رہیں گی اور تمہارا دل بہلائیں گی

فاطمہؓ۔ باوا جان بغیر آپؐ کے میرا دل کیونکر بہلے گا۔

حضورؐ۔ میری جان جامع المتفرقین ہمیں تمہیں جلد ملائے گا۔ پیغمبر زادی ہو جفا اور کفا کو سہنا اور اف نہ کرنا۔

دوسری تصویر

کیا ڈھونڈے دشت گم شدگی میں تجھے کہ ہے
عنقا ترے سراغ سے دُور اور شکستہ پر

صفر کی ستائیسویں اور ستمبر کی بارھویں تاریخ ہے رات کا وقت ہے چاند کا کہیں پتہ نہیں ہے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ستاروں نے ادب سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور تاریکی ایسی چھا گئی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ہے آدھی رات کے قریب حضورؐ نے اٹھ کر وضو کیا اور حضرت علیؓ سے فرمایا برادر ہوشیار رہو جاؤ وقت آ گیا ہے اب تم اُٹھ کر دروازہ بند کر لو اور میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔

حضرت علیؓ۔ کیا حضورؐ تشریف لئے جاتے ہیں۔

حضورؐ۔ ہاں سے
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

حضرت علیؓ سے
بہ سفر رفتنت مبارک باد
بہ سلامت روی و باز آئی

حضورؐ دروازہ کھول کر باہر آئے اور آپؐ نے دیکھا کفار دو رویہ گلی میں کھڑے ہیں ہتھیار ہاتھوں میں ہیں مگر خدا نے اُن پر نیند کو مسلط کر دیا ہے خراٹے لے رہے ہیں حضورؐ نے کھڑے ہو کر سورہ یٰسین شریف کی آیتیں " فھم لا یبصرون " تک پڑھیں اور گلی میں سے خاک اُٹھا کر ان کی طرف پھینکی اور غیب سے آواز آئی وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی اور وہ خاک بحکم الٰہی کفار کی آنکھوں اور چندیا پہ جا کر پڑی اور آپ بہت اطمینان کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکان کی طرف چل دیے راستہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی آپ کو مل گئے اور اپنے گھر آپ

کو رے گئے وہاں پہنچ کر آپ نے دم لیا اور سارا حال کہا حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کی وہ کھڑکی کھول دی جو جنگل کی طرف لگی ہوئی تھی اور حضورؐ اپنے پیچھے دوست ابوبکرؓ کے ساتھ غار ثور کی جانب چل دیئے حضرت ابوبکرؓ کی بیوی بچے حاضر تھے اور دست بستہ کھڑے تھے جب حضورؐ کھڑکی سے نکل گئے تو سب نے کہا کہ اللہ بیلی اللہ نگہبان اور کھڑکی بند کر لی اس رات کی اندھیری ساون کی اندھیری کو مات کرتی تھی غار ثور کا حضرت ابوبکرؓ کے مکان سے ڈھائی کوس کا فاصلہ تھا گھپ اندھیرے میں چلنا دشوار تھا قدم قدم پر دونوں صاحب ٹھوکریں کھاتے تھے آخر کار پتھروں اور کانٹوں نے حضور والا کے پائے مبارک کو گھائل کر دیا اور حضورؐ مجبور ہو کر زمین پر بیٹھ گئے اس وقت ابوبکرؓ نے اپنی صدق وصفا کا جوہر دکھایا اور نبی آخر الزماں کو اپنی پیٹھ پر چڑھایا اور انگوٹھوں کے بل چل کر خدا کے محبوب کو غار کے دہانہ تک پہنچایا ابوبکرؓ کے کپڑے دھجیاں ہو گئے تھے پاؤں تلوؤں سے لے کر پنڈلیوں تک زخمی ہو گئے تھے خون بہ رہا تھا اس وقت اس ہولناک مقام پر سوائے اندھیرے اور ہوا کے سناٹے کے کون تھا۔ اندھیرے نے کہا ابوبکرؓ آفرین صد آفرین سچ مچ تُو رفیق طریق ہے تو صدیق ہے ہوا بولی بیشک تُو یار غار ہے تو دوست غمگسار ہے اور محب وفادار ہے ابوبکرؓ اپنی جان پر کھیل اس غار میں گھسے اور حتی الوسع اسے اندر سے جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور حضور والا کو اس کے اندر بٹھا دیا یہ ۱۲ ستمبر کی رات تھی اس مہینہ میں کوٹھری کیا کمرہ میں مارے گھمس کے بیٹھنا دشوار ہوتا ہے رات بھر برقی پنکھے چلائے جاتے ہیں اور گرمی تابڑ توڑ پڑتی ہے مگر معاذ اللہ گرم پہاڑ کی کھو میں بیٹھنا لکھا ہے یہ انہیں حضرات کا کام تھا حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں لکھتے ہیں کہ جب فقیر غار ثور کے دیکھنے کے لیے غار میں اترا تو خوف سے بولانے لگا اور میں نے کہا کہ اے باری تعالیٰ محمدؐ کو معراج میں بلا کر قاب قوسین کا رتبہ عطا فرمایا اور پھر اس محبوب کو تو نے اس غار میں جو گیدڑ اور بھیڑیوں کا مسکن ہے داخل فرمایا ہاتف غیبی نے ندا دی کہ ”اے عبدالحق تو کیا جان سکتا ہے اس لئے محمد کو جو قاب قوسین او ادنیٰ میں حاصل تھا وہی تند ہمارے ساتھ اس بھٹ میں حاصل تھی“۔

حضورؐ کو دولت خانہ سے نکلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی جو شیطان لعین نے آ کر کفار کو چونکایا کہ تم بازی ہار گئے محمد صاف نکل گیا اور تمہارے سروں پر دھول ڈال گیا کفار نے شیطان سے کہا نہ ہم سوئے نہ ہمارے سروں پر محمدؐ دھول ڈال گئے مگر سروں پر ہاتھ پھیرا تو شیطان کا کہنا سچ معلوم ہوا اور جھلا کر دولت خانہ کی دیوار پھاند کر اندر پہنچے اور حضرت علیؓ کو اندر بچھونے پر سوتا دیکھ کر کہا کون سوتا ہے۔

حضرت علیؓ ۔ علی بن ابی طالب۔

کفار ۔ محمدؐ کہاں ہیں۔

حضرت علیؓ ۔ مجھے خبر نہیں۔ کفار نے حضرت علیؓ کے فرمانے کا یقین نہ کیا اور گھر کا کونہ کونہ ڈھونڈ ڈالا مگر جس لعل شب چراغ کو ڈھونڈتے تھے اُسے نہ پایا اور بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر آئے اور چلا کر کہنے لگے محمدؐ چل دیے انہیں ڈھونڈو اس صدا نے سارے شہر میں ہلچل ڈال دی رات بھر حضرت کو تلاش کرتے رہے اور اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارتے پھرے یہاں تک کہ اس فخر الانبیاءؐ کی جدائی میں فجر اپنا گریبان پھاڑ کر مشرق سے نمودار ہوئی اور شفق رنگین آنسوؤں سے اپنا مکھڑا دھونے لگی مکہ اداس تھا خاک اڑ رہی تھی کفار اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو کھوج نکالنے والوں اور سراغ رساں لوگوں کو بلایا حضورؐ کو اور ابوبکرؓ کو زندہ پکڑ کر لانے والوں کو یا سر کاٹ کر لانے والوں کے لیے سو سو اونٹ انعام ٹھیرایا کھوجیا بلا کا پر بین تھا وہ کفار کو غار ثور کے دہانہ پر لے پہنچا اور اس نے کہا کھوج آگے نہیں جاتا سو بس وہ محمدؐ اور ابوبکرؓ اس غار کے اندر ہیں اندر اترو اور دونوں کو باندھ

لو کفار غار کے دہانہ پر ہکا بکا کھڑے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا پاگل ہوا ہے غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے غار کے منہ پر کبوتر کا گھونسلا ہے گھونسلے میں کبوتری بیٹھی انڈے سے رہی ہے اگر غار میں کوئی جاتا تو نہ جالا سلامت رہتا نہ گھونسلا دوسرے نے کہا میں اس جالا کو محمد کی پیدائش سے پہلے اس دہانہ میں پاتا ہوں محمد یہاں نہیں ہیں آگے چلو اور انھیں چاروں طرف ڈھونڈو دیر کر نی کس نے بتائی ہے خدا نے غار پہ سے کفار کو ٹالا اور سب کے سب ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے ۔

تیسری تصویر

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
طپش شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

حضور پر نورؐ بارھویں ستمبر سے سولھویں ستمبر تک غار میں رہے رات کے وقت موقع دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے دونوں صاحب باہر آتے تھے عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آزاد غلام جو بکریاں چرانے کے بہانے سے غار کے آس پاس رہتے تھے آپؐ کو بکریوں کا دودھ پلاتے تھے اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ جو بظاہر کفار کے حرگہ میں شامل تھے رات کو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور کفار کے مشوروں سے آپ کو خبردار کرتے تھے آج ربیع الاول کی پہلی تاریخ سولھویں ستمبر سے مطابق ہے دوشنبہ کی آدھی رات ہے چاند کسی عاشق بیمار کے زار نزار بدن کی طرح اپنا زرد چہرہ دکھا کر غروب ہوگیا اندھیرا چھایا ہوا ہے پہاڑ کے دامن میں سناٹا ہے آسمان پر تارے آنکھیں کھولے اس مرقع کو گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں ناظرین چشم بصیرت سے دیکھیں گے کہ غار کے دہانہ پر چار اونٹ کجاووں سے آراستہ بیٹھے جگالی کر رہے ہیں ان میں سے اگلا اونٹ عامر بن فہیرہ کا ہے جو ہمرکاب رہیں گے دوسرا اونٹ عبداللہ بن اریقط دیلمی کا ہے جو اگوا بن کر چلے گا اور رہبری کرے گا تیسرا اونٹ حضرت ابوبکرؓ کی سواری کا ہے چوتھی اونٹنی حضور پر نورؐ کی ہے جس کا نام قصویٰ ہے جو چار سو درہم کے بدلے حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے مول لی ہے اس موقع سے چار قدم کے فاصلہ پر ایک عورت سیاہ پوش ہاتھ میں ایک گٹھری لیے کھڑی ہے ۔

ابوبکر صدیقؓ ۔ اسماءؓ لاؤ کھانا مجھے دو تاکہ شکار بند میں باندھ لوں اس سیاہ پوش عورت نے دسترخوان اپنے والد ماجد کے حوالے کیا ۔

ابوبکرؓ واہ بیٹی توشہ تو لائیں مگر توشہ باندھنے کے لئے کوئی رسی نہ لائیں ۔

اسماءؓ اس بات کو سن کر ایک چٹان کی آڑ میں چلی گئیں اور اپنے ازار بند کو دہرا دھر کھڑا چیر کرے آئیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے کھانا باندھ کر لٹکا دیا اور حضرت نے فرمایا اے آل ابی بکرؓ تم نے اپنے نبیؐ کی بڑی خدمت کی ہے اللہ تمھیں اس کی جزائے خیر دے ۔

اسماء بنت ابی بکرؓ ۔ یا رسول اللہ فداک ابی و امی آپ کی جدائی شاق ہے یہ کہہ کر چپکے چپکے سسکیاں لینے لگیں ۔

حضور والا ۔ نہیں بوا اتم اپنا جی بھاری نہ کرو خدا نے چاہا تو ہم تم سب سے جلد ملیں گے یہ کہہ کر حضورؐ نے دعا پڑھی اور قصویٰ ناقہ پر سوار ہوگئے اور عبداللہ بن اریقط دیلمی نے رہبری کے لیے اپنا اونٹ آگے بڑھایا اور یہ قافلہ چند ہی قدم چلا تھا جو رات کی تاریکی نے ہماری نظروں سے غائب کر دیا ۔

چوتھی تصویر

کس کا سراغ جلوہ حیرت ہے اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

دشمنوں کے لحاظ سے آپ کا اگوا مدینہ کی طرف آپ کو معمولی اور مشہور راستہ سے نہیں لے گیا بلکہ سواحل کی غیر معمولی راہ سے اس نے سفر کروایا۔ وہ اپنے اونٹ کو خراماں خراماں لئے جاتا تھا اس نے اونٹ کی مہار چھوڑ دی تھی ایک ہاتھ اس کا تلوار کے قبضہ پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کا علم کو سنبھال رہا تھا۔ اس کے پیچھے حضور کا ناقہ تھا جو مورنی کی طرح نازو انداز سے ریگزار پر قدم رکھتا چلا جاتا تھا ناقہ کے پیچھے حضرت ابوبکرؓ کا اونٹ اور اس کے پیچھے عامر بن فہیرہ شیردل کا اونٹ تھا یہ حضرات یلغار کرتے چلے جاتے اگر راہ کے مصائب اور معجزات کو حوالہ قلم کیا جائے تو لکھنے کے لئے دفتر درکار ہوں مختصر یہ ہے کہ حضورؐ نے چودہ دن میں اس سفر کو طے کیا ستمبر کی ۲۰ تاریخ اور صبح کا سہانا وقت تھا کہ سامنے شہر مدینہ کی فصیل اور اس کے ادھر ادھر کھجوروں کے سرسبز باغ نظر آئے اہل مدینہ کو بھی یہ خبر مل گئی تھی کہ سردار انبیا مکہ سے چل دیئے ہیں اور ہمارے شہر کو آ رہے ہیں اس لیے وہ خوشیاں منا رہے تھے اور روز مدینہ سے نکل کر پیشوائی کے لئے دو چار میل آتے تھے اور حضورؐ کو نہ پاکر مایوس چلے جاتے تھے۔ ۲۰ ستمبر کو بھی ناکام پلٹ رہے تھے جو ایک یہودی نے ٹیلہ پر سے حضورؐ کے قافلہ کو دیکھ کر کہا یا معاشر العرب ھذا جدکم اس مژدہ کو سنتے ہی انصار پلٹے اور حضورؐ کے ناقہ کے چاروں طرف پروانہ وار گرے کچھ لوگ خوشی کے نعرہ لگاتے ہوئے مدینہ کی طرف بھاگے تاکہ آپ کی تشریف آوری کی خبر سب کو پہنچا دیں پھر کیا تھا چند ہی منٹ میں سارا مدینہ امنڈ پڑا پیر و جوان اور عورتیں اور لڑکے اور لڑکیاں ننھے بچیاں۔ لونڈیاں غلام دوڑے چلے آئے۔

ایک کہتا تھا جاء رسول اللہ دوسرا کہتا تھا جاء نبی اللہ یہاں تک کہ انصار اپنی آنکھیں بچھاتے آپ کو محلہ قبا میں لے پہنچے اور حضورؐ بنی عمرو بن عوف کے ہاں مہمان ہوئے خوشی کے جوش میں نوجوانوں نے نیزہ بازی اور پڑے کے کرتب شروع کر دیے بنی نجار کی لڑکیاں ہاتھوں میں دف لے کر آئیں اور یہ شعر گاتے لگیں ؎

نحن جوار من بنی النجار

یا حبذا محمد من جار

شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرحت و شادمانی کی امنگ میں انصار کی پردہ نشین بیویاں بھی اپنے محل اور حویلیاں چھوڑ کر حضورؐ کے دیدار کو چلی آئیں اور یہ شعر گانے لگیں ؎

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

معتقدین نے جھٹ پٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہلا دھلا کر سفید لباس پہنائے حضورؐ گردن جھکائے مراقبہ میں تھے اور حضرت ابوبکرؓ آپ کے پہلو میں تھے عقیدت مندوں اور آرزومندوں کا ہجوم دم بدم بڑھتا جاتا تھا دونوں صاحبوں کی صورت ایک سی لباس ایک سا آنے والے یہ نہ سمجھتے تھے کہ پیر کون سے ہیں اور مرید کون سے حضرت ابوبکرؓ نے بات کو بھانپ لیا اور اس لئے آپ نے ایک چادر لے کر دو کونے اپنے ہاتھ میں اور دو کونے کسی دوسرے آدمی کو دیے اور حضورؐ کے سر اقدس پر شامیانہ سا بنا کر کھڑے ہو گئے اب حاضرین اچھی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے مشرف ہونے لگے ؎

خوشا وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

رسول اللہؐ کے عہد کا اقتصادی اور معاشی نظام

مولانا محمد اشرف خاں

دینِ توحید

ہمارے آقا سید الانبیأ حبیبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری رسول اور نبوت کا معراجِ تام ہیں۔ آپ کی بعثت کا دائرہ ہر زمان ومکان کو اپنے دائرۂ عمل وحیطۂ اختیار ونفوذ میں لئے ہوئے ہے۔ آپ جملہ انبیاء (علیہم السلام) کے سردار، اپنی تکمیل وجامعیت میں ممتاز، گلشن نبوت کے گل سرسبد اور باعث آفرینش وحاصلِ کائنات ہیں۔

آپ کا دین توحیدِ الٰہی کے ساتھ "وحدت انسانیت" دین ودنیا کی یکجائی، معاش ومعاد کے ارتباط اور دنیا وآخرت کے باہمی ربط وتسلسل کا علمبردار ہے۔ آپ کا دین مسجد وبازار، عبادت ومعاملات خدا پرستی اور دنیا داری کی دوئی کا قائل نہیں بلکہ آپ کے دین وحدت نے انسانی زندگی کو ایک "کل" کی صورت میں پیش کیا۔ جس میں انسان کے جملہ انفرادی واجتماعی دینی ودنیاوی، قومی وطبقاتی، نجی وعائلی، تجارتی وزراعتی، صنعتی ومعاشی، اقتصادی سیاسی ومعاشرتی وعمرانی احوال ومعاملات کا انتہائی منصفانہ قابلِ عمل حل پیش کر دیا گیا جس میں جملہ طبقات انسانی کے مفادات وضروریات کی رعایت کی گئی ہے۔

رسول کا پیغام اس کا ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے سن کر کہتا اور اللہ تعالیٰ سے دیکھ کر سناتا ہے۔ اس لئے ہر نبی کے قول وفعل پر الٰہی علم کی مہر لگی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے قول وفعل میں علوم ومرضیات الٰہیہ کا پیام رساں اور نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا مخلوق سے تعلق اپنی انسانی نسبت سے کم اور اپنی نبوی اور الٰہی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

(ترجمہ) "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پیامبر اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔"

اس آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اے انسانو! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارا نسبی تعلق نہیں۔ اس لئے ان کے کلام وپیام کو ان کی بشری حیثیت سے نہ پرکھو۔ بلکہ ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ان کے ہر پیام وکلام اور ان کے عطا کردہ ہر نظام کو مانو خواہ وہ عبادات سے متعلق ہو۔ یا معاملات سے، معاشرت سے متعلق ہو یا معاشیات سے، اقتصاد سے متعلق ہو یا سیاسیات سے، تدبیر مدن کے متعلق ہو یا عائلی قوانین سے زندگی کے جس طبقے یا جس مسئلے کے متعلق انہوں نے جو حل اور طریقہ بتا دیا۔ ان کا ذاتی تجویز کردہ نہیں۔ بلکہ رسول اللہؐ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علم وپیام، حکم ومنشا کو آپ تک پہنچایا ہے۔ اس لئے ان کی بات گویا اللہ تعالیٰ کی بات اور ان کی اطاعت گویا اللہ تعالیٰ

کی اطاعت ہے۔ قرآنِ کریم ہمارے اس دعوے کی تصدیق ان آیات پاک سے کرتا ہے :

(ترجمہ) "آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ آپ کی ہر بات اللہ تعالیٰ کی وحی ہے"۔

"جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔

مذکورہ آیت سے دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رتبی اور زمانی اور مکانی لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ ہیں۔

نظامِ حیات

آپ پر نبوت اور رسالت کے ہر جزو و کل کو ختم کر دیا گیا۔ اس لئے اب آپ کا پیغام اور لایا ہوا نظام زندگی اور حیات انسانی کے متعلق بتائے ہوئے جملہ طریقے پوری انسانیت کے لئے قیامت تک اللہ تعالیٰ کا آخری پیام اور انسانی فوز و فلاح، کامیابی اور نجات کا آخری نظام ہے جس میں کسی تبدیلی و تغیر کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس پیغام و نظام حیات کی بھیجنے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو "کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْماً" کی مصداق ہے۔ یعنی ازل میں ابد تک کے احوال و کوائف کی جاننے والی جملہ طبقات انسانیہ کے مفادات کی نگہبان و نگران اور ہر زمانے میں پیش آنے والے انسانی مسائل سے واقف ہے۔ پس جو نظامِ حیات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ وہ جملہ انسانوں اور ہر طبقہ کے مفادات و ضروریات کا کفیل اور بہترین حل ہے۔ کہ اس کا اصل موجد اور شارع یعنی پیش کرنے والا اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ اس لئے یہی نظام منصفانہ اور عادلانہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسا نظام حیات نہیں دے سکتی۔ خواہ معاشی و اقتصادی ہو۔ یا خواہ سیاسی و قانونی، جس میں ہر طبقہ اور ہر گروہ کے حقوق کی برابر منصفانہ نگہداشت اور رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے غیر اللہ کے کسی طبقہ یا گروہ یا فرد کا مجوزہ نظام یا اس کا کوئی حصہ اسلامی نظام کی نہ جگہ لے سکتا ہے۔ نہ اس کا پیوند اسلام میں لگایا جا سکتا ہے۔ انسانوں کا جو طبقہ یا گروہ یا فرد قانون بنائے گا۔ اس میں انسانی بشری میلانات و تقاضوں کی بنا پر طبقاتی، نسلی و وطنی و قومی و ملکی مفادات خاصہ (VESTED INTERESTS) کی کچھ نہ کچھ رعایت ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہے جس کے لئے پوری مخلوق بدرجۂ عیال کے ہے، حدیث پاک میں آتا ہے "الناس عیال اللّٰہ" (بیہقی فی شعب الایمان) اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو قانون بھیجا ہے اور جو نظامِ عدل، نظام اقتصاد و معاشیات دیا ہے۔ وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے تمام احوال و وقائع کو جان کر دیا ہے۔ جس میں کسی طبقہ کی رعایت نہیں۔ نہ کسی کا خوف، عدل میں مانع آیا ہے۔ اس لئے وہ نظام ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی داد رسی کے لئے دیا ہے بقول رومی ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم!

اس میں کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ نہ ظلم کی کسی کو اجازت دی جائے گی۔ حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نقل فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے۔ تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ (صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ)

غرض قانونِ الٰہی میں کسی خاص طبقہ گروہ، جماعت یا فرد کے لئے کسی ظالمانہ مراعات و تحفظات کا کوئی چور دروازہ کھلا نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ہر طبقہ انسانی کی فلاح و بہبود کے پیش نظر ایسا عادلانہ و منصفانہ نظامِ اقتصاد و معاشیات پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ہر طبقہ انسانی کے حقوق کی حفاظت اور اس کی دارین کی ترقی کا انتظام ہے اور مختلف طبقات انسانیہ میں الفت و یگانگت و اخوت کا پورا پاس رکھا گیا ہے۔

بنیادی حقوق

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام اقتصاد پیش کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اور جیسے ہر نظام کا مابعد الطبیعاتی یا فکری پس منظر ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد پہ اس نظام کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نظامِ اقتصاد و معاش کی چند مابعد الطبیعاتی اور فکری بنیادیں ہیں۔

پہلی بنیاد اللہ تبارک و تعالیٰ کی ربوبیت کبریٰ اور رزاقیت مطلقہ کا تصور ہے کہ اصلاً پوری انسانیت کی پرورش اور ضروریات کی کفالت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات اور احادیث مبارکہ کا ذخیرہ اس حقیقت پر گواہ ہے ربوبیت الٰہیہ کا یہ نظام گو کائنات کے ذرہ ذرہ میں جاری و ساری و طاری ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق چونکہ انسان نرا حیوان یا بڑھیا حیوان نہیں۔ بلکہ خلیفہ الٰہی اور انسانی شرف و فضیلت کا حامل ہے۔ اور اس کی زندگی اور ضروریات صرف اس عالم میں ختم نہیں ہو جاتیں گی۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے نظام کی بنیاد انسان کے بارے میں چند موٹی موٹی صداقتوں پر رکھی۔

۱۔ اس کی دنیاوی اور معاشی بنیادی ضرورتیں کسی صورت میں نظرانداز نہ کی جائیں اور اس میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ہی ان ضرورتوں کی کم از کم تحدید فرما کر اعلان فرمایا تھا۔

(ترجمہ) بلاشبہ تمہارا یہ حق ہے کہ تم یہاں نہ بھوکے رہو اور نہ ننگے رہو اور یہ کہ تم نہ پیاسے رہو اور نہ دھوپ کی تپش اٹھاؤ۔

یعنی انسان کے کم از کم بنیادی حقوق چار ہیں۔ روٹی۔ کپڑا۔ پانی۔ مکان۔

۲۔ چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء علیہم السلام کے نزدیک انسان کی ضروریات صرف اس عالم ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ عالم ایک رہگزر ہے جہاں سے چل کر انسان نے اپنے اصلی ٹھکانے پہنچنا ہے۔ جہاں اس کا ہمیشہ ہمیشہ کا قیام ہوگا، اس لئے اس کی پرورش کا نظام اور اس کی دنیاوی جملہ حاجتوں کی کفالت کا حکیمانہ طریقہ وہ مقرر کیا گیا کہ یہاں کی ضروریات بھی بطرز احسن پوری ہوں اور آخرت کی زندگی بھی اس کے ساتھ ساتھ بنتی چلی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

(ترجمہ) اور نہیں کوئی چلنے والا زمین پر مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ اس کا رزق ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تھوڑے رہنے کی جگہ اور زیادہ رہنے کی جگہ بھی جانتا ہے۔ (ھود - ۱)

چنانچہ حدیث پاک میں دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا کہ انسان کے ہر عمل کا پھل اسے آخرت میں ملے گا۔ اس لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ حیات دیا۔ وہ بیک وقت دین و دنیا دونوں کی بھلائی اور کفالت کا ضامن ہے۔

عادلانہ نظام

انسان چونکہ خلیفۂ الٰہی ہے۔ اس لئے اس کے خلافت کے جواہر و خصائص اور کمالات کی بقا کو اس نظامِ معاش و اقتصاد میں اس کے حیوانی تقاضوں سے بڑھ کر اہمیت دی گئی ہے۔ خلافت کے جواہر سے ہماری مراد انسان کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں۔ جو اخلاقِ فاضلہ، رحم و کرم۔ جود و سخا۔ صبر و شکر۔ قربانی و ایثار۔ اخلاص و بے نفسی، غمگساری و چارہ سازی محبت و الفت وغیرہ وغیرہ اوصافِ حمیدہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے انسان اور حیوان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے ان جواہر کی بقا اور آخرت کی زندگی کے بناؤ کے لئے مختلف و متفاوت صلاحیتوں کے انسانوں کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا منصفانہ اور عادلانہ نظامِ معیشت و اقتصاد پیش کیا۔ جس میں ہر فرد و طبقہ اپنی جملہ صلاحیتوں کو بطریقِ احسن بروئے کار لا سکے۔ اس کی دنیاوی اور معاشی حاجتیں بھی کماحقہٗ پوری ہو جائیں۔ اور اس کے اخلاقِ فاضلہ کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے۔ بلکہ ہر طبقہ اور ہر گروہ کا انسان اس نظامِ معاش و اقتصاد میں محبت و چین، سکون و اطمینان اور بھائی چارے کی زندگی گزار سکے۔ جس میں طبقاتی کشمکش، گروہی کشاکش اور باہمی جنگ و جدل، رقابت و منافست کے جذبات کارفرما نہ ہوں، بلکہ ہر طبقہ انسانی دوسرے طبقہ کا ہمدرد و غمگسار، معاون و مددگار، خیر خواہ و خدمت گار بن کر زندگی گزارنے کو اپنی نجات و کامیابی کا ذریعہ سمجھے حضرت رسول انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا (بخاری) اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کر زندگی گزارو کہ تمہارے ایمان کا نشان یہ بھی ہے کہ جو بھلائی اپنے لئے چاہتے ہو۔ دوسرے انسانوں کے لئے چاہو۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ (مسند احمد) تم میں سے اس وقت تک کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک لوگوں کے لئے بھی اس چیز کو نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے (مسند احمد ص۲۷۲)

اس لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظامِ معاش و اقتصاد دیا۔ اس میں مزدور کے مفادات کی نگہداشت کو سرمایہ دار کا دین بنا دیا گیا۔ کاشتکار کے حقوق کی ادائیگی زمیندار کا مذہب قرار دیا گیا۔ مالدار کی جائز حاجتوں کو پورا کرنا مزدور کے لئے عبادت ٹھہری اور زمیندار کے حقوق کی ادائیگی کاشتکار کے لئے نیکی بنا دی گئی۔ حاکم و محکوم، کاشتکار و زمیندار، مزدور و مالدار ہر طبقہ و ہر گروہ کے مفادات کو آپس میں ٹکرایا نہیں۔ بلکہ انسانیت کی بنیاد پر جملہ طبقات کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے انہیں آپس میں ایک جسد واحد کی طرح جوڑ دیا گیا کہ رب العالمین کے فرستادہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں منافرت و حقارت جنگ و جدل کے جذبات کو سازشوں یا انقلابی دعوتوں کے ذریعے بھڑکانے نہیں آئے تھے۔ بلکہ آپ کا پیام باہمی الفت و محبت بھائی چارہ اور یگانگت انسانی، ہمدردی و غمگساری کا تھا۔ بقول عارف رومی انبیاء علیہم السلام توڑتے نہیں آتے جوڑنے آتے ہیں۔ وہ مختلف طبقات کو آپس میں لڑاتے نہیں، جوڑتے ہیں ؎

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اخوت انسانیہ کے انعام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ط

سرمایہ دارانہ نظام

۱۔ دنیا میں عموماً معاشی بحران اور اقتصادی فساد جن وجوہ سے پھیلتا ہے ۔ اُن میں سے پہلی وجہ سرمایہ داری کا وہ ظالمانہ و بہیمانہ نظام ہے۔ جسے قرآن نے قارونیت و اکتنازیت (اکتناز دولت) کے نام سے یاد کیا ہے ۔ اس کی بنیاد شخصی یا طبقاتی فوائد (VESTED INTEREST) خود غرضی اور ذاتی منافع پر ہے ، سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار دولت و زمین کو اپنی پیدا کردہ ذاتی ملکیت سمجھتا ہے ۔ اور اس کے تصرف و نمو کا اپنے کو مختار مطلق گردانتا ہے ۔ جس میں وہ کسی خدائی ضابطہ یا حقیقی اخلاقی اقدار کا پابند نہیں ہوتا اور نہ ہی ملت و انسانیت اور دیگر طبقات انسانی کے مفادات کو اپنا ذاتی مفاد اور ان کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھتا ہے ۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کے اس ذہن کا اشارہ قارون اور قوم شعیب کے الفاظ میں بالترتیب اس طرح فرمایا ہے ، قارون کہتا ہے :۔

(ترجمہ) "قارون نے کہا یہ سب مال و دولت مجھے اپنی ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے ۔ (اس لئے میں اس کا مالک حقیقی ہوں اور اس لئے مجھے اس پر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے) قوم شعیب نے کہا :۔

ترجمہ :۔ کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔ یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں (۱۱ - ۸۶)

گویا سرمایہ دار مال و دولت کو صرف اپنی ملک سمجھتا ہے اور اس میں ہر جائز و ناجائز تصرف کو اپنے ذاتی مصالح و مفادات کے ماتحت جائز سمجھتا ہے ۔ خواہ اس کے اس عمل سے دوسرے طبقات کے حقوق کلیتہً یا جزواً سلب ہو جاتے ہوں ۔ قرآن کریم نے سرمایہ دار کی اس ذہنیت کا تذکرہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک پیش شدہ مقدمہ کے تذکرہ میں تمثیل کے طور پر کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا ۔ اس میں دو فریق تھے ۔ ایک کے پاس (۹۹) ننانوے دنبیاں تھیں دوسرے کے پاس ایک ۔ ایک دنبی والے نے مرافعہ کیا کہ ۹۹ دنبی والا کہتا ہے کہ یہ ایک دنبی بھی مجھے دے دے کہ میری سو پوری ہو جائیں ۔ ہمارے نزدیک سرمایہ دار کی حرص و آز کا یہی عالم ہے ۔ وہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے دولت کے جملہ منابع اور ذرائع پر قبضہ کر لیتا ہے اور چند دن میں دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے ۔

سرمایہ داری کی بنیاد جن بڑے بڑے ستونوں پر ہے ۔ وہ بے لگام آزاد و باطل نجی ملکیت کے علاوہ سود ، قمار (سٹہ وغیرہ) احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی ، رشوت اور دیگر ناجائز آمدنیاں وغیرہ ہیں ۔ اس نظام پر تفصیلی نقد و تبصرہ کی یہاں گنجائش نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ یہ ظالمانہ نظام کس طرح انسانیت کے جملہ اخلاقی و عادلانہ تقاضوں کو ختم کر دیتا ہے ۔ اس کے ضمن میں زمینداری کا وہ غیر اسلامی (FEUDAL SYSTEM) بھی ہے ۔ جو کسی خدائی ضابطہ اور حدود و قیود کا پابند نہیں ۔

اشتراکی نظام

سرمایہ دارانہ نظام میں "دولت" کی ناجائز و غلط لوٹ کھسوٹ کے ردِعمل میں وہ منفی نظام جسے اشتراکیت و اشتمالیت انقلابی سوشلزم وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر اس دور میں وجود میں آتا رہا۔ جب بھی سرمایہ کی بدعملی نے نادار طبقات کی زندگی اجیرن کر دی۔ چنانچہ مصر قدیم میں فراعنہ کے عہد میں اس کے نقوش ملتے ہیں۔ افلاطون نے نظریاتی طور پر اسے کسی حد تک پیش کیا۔ مشہور یونانی مقنن سولن کے عہد میں سپارٹا میں لیکاوگا نے اصولِ اشتراکیت کے مطابق دولت کو مساوی تقسیم کر دیا۔ ایران قدیم میں مزدک نے زن، زر، زمین کے عام ہونے کا نعرہ لگایا۔ اٹھارویں و انیسویں صدی کے یورپ کے حالات نے اس ذہن کو جلا بخشی۔ جس کا سب سے بڑا نمائندہ کارل مارکس ہے۔ جس نے انجلز کے ساتھ مل کر اشتمالیت و اشتراکیت کو ایک مستقل مذہب بنا دیا اور بیسویں صدی میں لینن نے اسے عملی صورت بخشی اور اب روس و مشرقی یورپ کے علاوہ چین میں ماؤزے تنگ کی سرکردگی میں وہ ایک مستقل نظامِ حیات کی صورت میں رائج ہے اور دیگر ممالک میں پر و بال نکالنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اشتراکیت غلط سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کا مزاج ہر اس بات کا انکار کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ نظامِ معاش میں ساری و طاری ہے "ردِعمل" کے غیظ و غضب میں وہ سرمایہ دارانہ نظام کے غلط مالی خاکوں کو ہی نہ صرف مٹاتا ہے بلکہ جو چیز وہاں رائج تھی۔ اس کا قلع قمع بھی کر دیتا ہے۔ یورپ کے زمانہ وسطیٰ کے حالات جن کے ردِعمل نے مارکسزم کو جنم دیا۔ اس نظام پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ اس نے نہ صرف اقتصادی نظام کی نفی کی بلکہ بقول اقبال کے:

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ

لاکلیسا لاسلاطین لا الٰہ

کا وہ منفی نعرہ بلند کر دیا۔ جو اشتراکی نظام کی رگ و پے میں سرایت کر گیا اور اشتراکیت کی بنیاد میں انکار خدا، انکار آخرت اور انکارِ اقدارِ روحانیہ اور اثبات پیٹ و مادیت سمو گئی۔

دین آں پیغمبرے ناحق شناس

بر مساوات شکم دارد اساس

گویا اب اشتراکیت ایک ایسا ملحدانہ نظام زندگی قرار پایا۔ جس میں خدا کی جگہ کارل مارکس نے، صحیفہ آسمانی کی جگہ کیپٹل نے اور پیغمبر کی جگہ لینن و ماؤزے تنگ نے لے لی۔ اس کے اقتصادی نظام کی بنیاد ہیگل کے جدلیاتی نظریہ۔ ڈارون کے ارتقائی نظریہ کی بنیادوں پر استوار ہونے کے بعد طبقاتی باہمی کشاکش اور مزدور و کسان اور سرمایہ دار و زمیندار کی باہمی آویزش قرار پائی۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں اصل مسئلہ پیٹ اور صرف پیٹ کا ہے، اس بڑھیا حیوان کی حیوانی زندگی کی ضروریات کے جو مصادر و منابع تھے۔ باہمی کشمکش میں سرمایہ داروں نے قوت و حیلوں سے ان پر قبضہ کر کے ایک بڑے طبقہ کو آسائش زندگی سے محروم کر دیا۔ اور سرمایہ دار کے دھوکے اور دجل نے غریب و مزدور کو فریب دینے کے لئے مذہب کا افیون ایجاد کیا اور خدا، پیغمبر اور آخرت وغیرہ کے نظریات اور دین کی حدود و قیود میں اسے الجھا کر پیٹ کے اصل مسئلہ سے بیگانہ کر دیا۔ اس لئے اشتراکی نظریہ میں جیسے سرمایہ دار کا وجود گالی ہے۔ اسی طرح نظریاتی اور عملی طور پر اشتراکی سوسائٹی میں خدا، پیغمبر اور دین کا وجود بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا وہاں ایک ہی

نظریہ جاری ہوگا اور ایک ہی کی بات چلے گی۔ وہ مارکسی لینزم کی بات ہو۔ یا چیئرمین ماؤزے تنگ کی۔ جیسے ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے اشتراکی مملکت میں " اشتراکی مذہب" کے سوا دوسرا دین عملاً نہیں سما سکتا۔ جو اس کا انکار کرتا ہے۔ وہ حقائق کو جھٹلاتا ہے۔ خصوصاً اسلام جیسا مذہب جو زندگی کے جزو وکُل پر حاوی ہے اشتراکی نظریات کی بقا کے ساتھ اس کا وجود قطعاً باقی نہیں رہ سکتا۔

طبقاتی کشاکش

اشتراکیت چونکہ مالدار (HAVES) اور نادار (HAVENOTS) کی آویزش کی نقیب ہے۔ اس لئے انسانی آبادی کا وہ کثیر حصہ جسے سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام نے قلاش بنا دیا ہے۔ یعنی مزدور، کسان، اس کے مسائل کے حل کرنے کی دعوت کو لے کر وہ آگے بڑھتی ہے۔ گویا وہ ایک " طبقہ" کے مسائل کے حل کی داعی ہے اور پوری انسانیت کے حل کا وہ خود بھی دعویٰ نہیں کرتی۔ اشتراکیت ذرائع آمدن اور مصادر و منابع پیداوار کی عام ملکیت کی قائل ہے۔ اس لئے "نجی ملکیت" کا وہ قطعاً انکار کرتی ہے۔ لیکن عملاً اشتراکی ممالک میں " مصادر و منابع پیداوار" مملکت کی ملکیت قرار پاتے ہیں اور مملکت کی باگ ڈور چونکہ "کمیونسٹ پارٹی" کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جو کہ ایک " محز وطی پارٹی" ہوتی ہے۔ جس پر صرف چند چوٹی کے لیڈروں کا عملاً اختیار ہوتا ہے۔ اس لئے سب دولت و سرمایہ کے سپید و سیاہ کے مالک و حاکم اور مختار کل "کمیونسٹ پارٹی" بالفاظ دیگر اس کے چند سرکردہ لیڈر قرار پاتے ہیں۔ جن کے خلاف کسی آواز کا اٹھانا بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح اشتراکی ممالک میں دولت و زمین غریب، مزدور و کسان کو نہیں ملتی۔ بلکہ سرکاری ملکیت بن کر کمیونسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ اور اس کے منافع بھی برابر تقسیم نہیں ہوتے۔ بلکہ جیسا کہ روس و دیگر ممالک کی تنخواہوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تنخواہ ۸۰ روبل یعنی ۵۰ روپے سے تیس ہزار روبل یعنی چھ ہزار روپے تک چلی گئی ہے (COMRAD YRON) بحوالہ اکنامکس آف اسلام صفحہ ۹۔

بہر حال اشتراکی تحریک مزدور و کسان اور نوجوان طالب علم کو سبز باغ دکھا کر ایسے نظام میں قید کر دیتی ہے جس سے بدتر آمرانہ نظام تاریخ میں نہیں دیکھا گیا۔ جہاں انسانی بنیادی آزادیوں کا حال یہ ہوتا ہے:

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

اقبالؒ نے سچ کہا ہے:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اسلام نے ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے رد عمل، غیر فطری و باطل اشتراکی نظام کے مقابلہ میں جو نظام اقتصاد و معاشیات دیا۔ وہ انسانی فطرت کے عین تقاضوں کے مطابق ہے اور جملہ طبقات انسانی کی ضرورتوں کا کفیل اور انسانی مادی ضرورتوں اور دنیاوی حاجات کی کار برآری کے ساتھ اس کی روحانیت و آخرت کی کامیابی کا بھی کفیل ہے۔ معاشیات میں سب سے اہم مسئلہ ملکیت " زمین و مال" کا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بے لگام آزاد نجی ملکیت کا قائل ہے۔ اشتراکیت قطعاً "نجی ملکیت" کی منکر ہے۔

حدودِ الٰہی

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نظام اقتصاد و معیشت کی بنیاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے تصورِ ربوبیت، مالکیت و حاکمیت وغیرہ پر ہے۔ اس لئے اسلام میں اصلاً کوئی انسان کسی چیز کا حقیقی مالک اور متصرف نہیں ہو سکتا۔ کائنات اور اس کی جملہ اشیاء زمین اور اس کی جملہ چیزوں کا مالک و متصرف و مختارِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی بیشتر آیات کا منشا ہے۔ الارض للہ۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ لَهٗ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کو اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر مجازی طور پر اپنے احکام اور نازل کردہ حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ مختلف طبقات انسانیہ کو اُن کے مفادات کی رعایت کرتے ہوئے اور اُن کی صلاحیتوں کو روبکار لانے کے لئے جتنا مناسب سمجھے، زمین و دولت کا نجی مالک بنا دے۔ یہ نجی ملکیت آزاد اور انسانی چاہتوں کی پابند نہیں ہوگی۔ بلکہ الٰہی نجی ملکیت کا نظام آمدن و صرف ہر حیثیت سے احکام الٰہی کا پابند اور حدود الٰہیہ سے مقید ہوگا اور اس نجی ملکیت و دولت کا حصول و استعمال ایک امین کی حیثیت سے انسان کرے گا۔ گویا "اسلام" مقید و پابند حدودِ الٰہی نجی ملکیت (DIVINE CONTROLLED PRIVATE PROPERTY) کی اجازت دیتا ہے۔ جس کی ایک ایک پائی کی آمدن و صرف کا حساب اس نے اللہ تعالیٰ کو دینا ہوگا اور اگر وہ اللہ کے احکام کے مطابق آمد و خرچ نہیں کرے گا۔ تو وہ ایسا مجرم ہوگا۔ جس کی عبادات تک بعض اوقات مقبول نہیں ہوں گی کہ حرام کمائی والے کی نماز و حج و زکوٰۃ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق مقبول نہیں ہیں۔ غرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نظریۂ ملکیت کے بارے میں یہ ہے ؎

در حقیقت مالک ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزد ما است

یہ مال و دولت و نجی ملکیت اصلاً فضیلت و شرف کا سبب نہیں۔ بلکہ حکمتِ الٰہیہ نے اسے دے کر انسان کے اخلاقی جواہر و کمالات کو پرکھنا چاہا ہے کہ کیا انسان خلیفۂ الٰہی اور "انسان" کی حیثیت سے اس کا استعمال کرتا ہے۔ یا حیوانوں اور درندوں کی طرح اخلاق کے تقاضوں کو ملیامیٹ کر دیتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اصل کمال انسان کا مال و دولت نہیں بلکہ اس کا ایمان و عمل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقید و پابندِ حدودِ الٰہی نجی ملکیت کو اس طرح "قائم" فرمایا کہ اسلامی نجی ملکیت کی اجازت، ظالمانہ قارونی سرمایہ دارانہ نظام کو جنم نہ دے دے بلکہ دولت کی ایسی عادلانہ تقسیم ہو کہ ایک ہموار معاشی زندگی وجود میں آ سکے جس میں ہر طبقۂ انسانی کا ہر فرد راحت و چین کی زندگی گزار سکے اور نہ صرف اس کی حاجات ضروریہ ہی پوری ہوں بلکہ وہ معاشرہ میں باوقار اور خود کفیل اور فارغ البال انسان پرور خدا پرست شخص کی زندگی گذار سکے۔

"مقید اسلامی نجی ملکیت" کو ارتکاز دولت کا سبب بننے سے روک کر اسلامی معاشیات کی بنیاد قرار دیا گیا۔ قرآن کریم نے ایک مقام پر فرمایا۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (الحشر-۱) — تاکہ دولت تمہارے تونگروں میں سمٹ کر ہی نہ آ جائے۔

لیکن اسلام جہاں ارتکاز دولت کو روکتا ہے۔ وہاں انسان کے اخلاق و روحانیت خلاقتی کمالات کی بقا کیلئے مساویانہ تقسیم دولت کا قائل نہیں، کہ اگر دولت سب میں برابر تقسیم ہو جائے تو جود و سخا، صبر و شکر، ایثار و قربانی، بھائی چارہ و غمگساری وغیرہ کی انسانی صفات بھی ختم ہو جاتی ہیں اور انسان صرف ایک حیوان یا ایک خود کار مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی قویٰ و صلاحیتوں کے تفاوت کی بنا پر بھی یہ مساوات عادلانہ نہیں۔ کیا آپ کی عقل تسلیم یہ گوارا کرتی ہے۔ کہ ایک مجھ جیسا جاہل گنوار اور ایک یونیورسٹی کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہر و حاذق استاد مالی اجرت کے لحاظ سے ایک ہی سطح پہ لا کر کھڑے کر دیئے جائیں۔ اس لئے اسلامی مساوات کا نعرہ غلط ہے۔ اسلام کے نظام معاشیات میں مساوات نہیں مواسات یعنی ہمدردی و غمگساری ہے کہ ہر انسان کے درد کو اپنا سمجھو اور اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھ کر پورا کر دو۔ قرآن کریم نے اس عدم مساوات کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الاعراف)

ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کی روزی کو تقسیم کر رکھا ہے۔ اور ہم نے ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ
(النحل)

اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پہ رزق میں فضیلت دی ہے۔

اسی طرح اسلامی نجی ملکیت کا انکار قرآن کریم کی تقریباً ایک چوتھائی احکام کا ابطال اور اسلام کے پورے نظام معاش کا انکار ہے۔ یہ بات بھی قطعاً غلط اور اسلام کے اصولِ اقتصاد اور انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی سے اس کی ساری نجی ملکیت کو طلب یا جبراً سلب کر لیا جائے۔ قرآن کریم اپنے حکیمانہ انداز میں فرماتا ہے:

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ
وَلَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝ اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا
فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝
(محمد - ۳۷)

اور اگر تم ایمان و تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اجر عطا کرے گا اور تم سے تمہارا سارا مال طلب نہیں کرے گا اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے۔ پھر انتہا درجہ تک طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ (اس طرح تمہارے مال صرف کرنے کی فطری ناگواری) کو ظاہر کر دے۔

(دیکھو روح المعانی و تفسیر کبیر زیر آیت مذکورہ)

غرض اسلام نے نہ تو نجی ملکیت کو قطعاً ختم کیا نہ اسے بالکل آزاد و بے لگام چھوڑا بلکہ عادلانہ قوانین کے اجرائے سے اسے ایسا مقید و پابند کر دیا کہ دولت کی ناہموار تقسیم ختم ہو گئی۔

گنج شائگاں

مولانا ظفر علی خاں

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس احادیث جمع کرنا باعثِ فوزِ عظیم ہے۔ مولانا جامیؒ نے اسی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر چالیس احادیث کا منظوم ترجمہ اربعین جامیؒ کے نام سے فارسی میں کیا تھا، مولانا ظفر علی خاںؒ نے انہی احادیث کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔ وہ ۱۰ ستمبر ۱۹۲۷ء کے "زمیندار" میں شائع ہوا، وہ گنج شائگاں تبرکاً تیمناً ہدیۂ قارئین ہے:

۱۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ

مسلمانو! اسی صورت میں تم ہو اہلِ ایماں سے — کہ جو الفت ہے اپنے نفس سے ہو اپنے اخواں سے

۲۔ مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ

عطا و منع و حُب و کیں میں جو اللہ والے ہیں — وہی ایماں میں کامل اور سیدھی راہ والے ہیں

۳۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ

نہ قول اور فعل ایذا نہ دیتا ہو جو مسلم کو — تو اے مسلم! پہنچ جاتا ہے تو اسلام کی لم کو

۴۔ خَصْلَتَانِ لَا یَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ اَلْبُخْلُ وَسُوْءُ الْخُلُقِ

سرشتِ اسلام کی ہے مانعِ بخل و بد اخلاقی — نواقص میں ہمیشہ سے چلی آتی ہے ناچاقی

۵۔ یَشِیْبُ ابْنُ اٰدَمَ وَتَشِبُّ فِیْہِ خَصْلَتَانِ اَلْحِرْصُ وَطُوْلُ الْاَمَلِ

ہوا و حرص ہے دشمن تمہاری زندگانی کا — بڑھاپے پر اسی سے رنگ چڑھتا ہے جوانی کا

۶۔ مَنْ لَّمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ

وہ انساں جو نہیں منت پذیرِ انساں کے احساں کا — ادا حق اس سے ہو سکتا نہیں ہے شکرِ یزداں کا

۷۔ مَنْ لَّا یَرْحَمُ النَّاسَ لَا یَرْحَمُہُ اللّٰہُ

نہ آیا رحم جس کو بے کسوں اور ناتوانوں پر — لگائی مہر اس نے حق کی رحمت کے خزانوں پر

۸۔ اَلدُّنْیَا مَلْعُوْنَۃٌ وَّمَلْعُوْنٌ مَا فِیْہَا اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی

یہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے لعنت کے قابل ہے — مگر جس کو خدا یاد آئے وہ رحمت کے قابل ہے

۹۔ دُمْ عَلَی الطَّہَارَۃِ یُوَسَّعْ عَلَیْکَ الرِّزْقُ

اگر آلودہ داماں کو طہارت سے گرائش ہو — تو دن تنگی کے سب کٹ جائیں روزی میں کشائش ہو

۱۰ ——— لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ حُجْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَیْنِ

کرزیشِ عقرب کا مزہ عاقل نہیں چکھتا ۔۔۔ اُسی سوراخ پر اُنگلی مسلماں پھر نہیں رکھتا

۱۱ ——— اَلْوَعْدَۃُ دَیْنٌ

کسی سے وعدہ کرتے ہو تو لازم ہے وفا کرنا ۔۔۔ کہ یہ اک قرض ہے اور فرض ہے اس کا ادا کرنا

۱۲ ——— اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ

کسی محفل میں شامل ہو تو اس نکتہ پہ عامل ہو ۔۔۔ کہ راز اس کی امانت ہے بنے تم جس کے حامل ہو

۱۳ ——— اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ

کسی کو مشورہ دے کر وہی کچھ راز دیں سمجھے ۔۔۔ جو اپنے آپ کو اس کے مصالح کا امیں سمجھے

۱۴ ——— اَلسَّمَاحُ رِبَاحٌ

یقینی نفع ہے جس میں سخاوت وہ تجارت ہے ۔۔۔ خدا کی راہ میں دینا نہیں جانا اکارت ہے

۱۵ ——— اَلدَّیْنُ شَیْنُ الدِّیْنِ

نہ ڈالو اے مسلمانو! گلے میں قرض کا پھندا ۔۔۔ مہاجن کی کرے کیوں بندگی اللہ کا بندہ

۱۶ ——— اَلْقَنَاعَۃُ مَالٌ لَّا یَنْفَدُ

گھٹانے سے نہیں گھٹتا قناعت مال ہے ایسا ۔۔۔ ہے رونق اس سے گودڑ کی چھپا یہ لال ہے ایسا

۱۷ ——— نَوْمُ الصُّبْحَۃِ تَمْنَعُ الرِّزْقَ

چڑھے دن تک پڑے لیتے ہیں خراٹے جو بستر پر ۔۔۔ نہیں رہتا کوئی حق ان کی روزی کا مقدر پر

۱۸ ——— اٰفَۃُ السَّمَاحِ الْمَنُّ

کسی پر گر کرو احساں تو بھولے سے نام اُس کا ۔۔۔ سخاوت کا یہ ہے سودا اور لینا ہے حرام اس کا

۱۹ ——— اَلسَّعِیْدُ مَنْ وُّعِظَ بِغَیْرِہٖ

سعادت اس نے کی ہے اپنے دِمتعال سے حاصل ۔۔۔ ہوئی ہے جس کو عبرت دوسروں کے حال سے حاصل

۲۰ ——— کَفٰی بِالْمَرْءِ اِثْمًا اَنْ یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ

زباں سے کان کی گر پردہ داری ہو نہیں سکتی ۔۔۔ بڑی اس سے کوئی لغزش تمہاری ہو نہیں سکتی

۲۱ ——— کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا

اجل سے بڑھ کر واعظ کیا کریں گے نکتہ آموزی ۔۔۔ جو کرنی ہے تو کر لو موت ہی سے عبرت اندوزی

۲۲ ——— خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ

کوئی انساں اُس انساں کے درجہ کو نہیں پہنچا ۔۔۔ کہ اس کی ذات سے لوگوں کو نفعِ بہتریں پہنچا

۲۳ ——— اِنَّ اللہَ یُحِبُّ السَّھْلَ الطَّلْقَ

خدا رکھتا ہے اُس کو دوست جو ہنس مکھ ہو خوشخو ہو — شگفتہ جس کی فطرت ہو کشادہ جس کا ابرو ہو

۲۴ ——— تَھَادُوْا تَحَابُّوْا

محبت ہدیہ و سوغات دے کر بڑھ ہی جاتی ہے — جو سیلاب آئے ندی میں تو آخر چڑھ ہی جاتی ہے

۲۵ ——— اُطْلُبُوا الْخَیْرَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْہِ

ہے جس کی صورت اچھی اُس سے کرنا ہے سوال اچھا — کہ حال اچھا ہے جس کا غالباً اس کا ہے فال اچھا

۲۶ ——— زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا

ملاقاتوں میں لُطف آتا ہے کچھ مدت کی دوری سے — گھٹا نہ کیوں ہوا اس کو رات اور دن کی حضوری سے

۲۷ ——— طُوْبٰی لِمَنْ شَغَلَہٗ عَیْبُہٗ عَنْ عُیُوْبِ النَّاسِ

مبارک وُہ ہیں جو عیب اپنے رکھتے ہیں نگاہوں میں — نظر جن کی نہیں اُلجھی ہے غیروں کے گناہوں میں

۲۸ ——— اَلْغِنٰی اَلْیَاسُ مِمَّا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ

اگر کرنا ہے نکتہ بے نیازی کا تجھے از بر — تو جو کچھ دوسروں کا ہے نہ رکھ ہرگز نظر اُس پر

۲۹ ——— مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ

عیاں ہو جائے گا اسلام کی خوبی کا راز اس سے — کہ جو کچھ بے ضرورت ہو بجا ہے احتراز اُس سے

۳۰ ——— لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَ الْغَضَبِ

صفوں کو تم نے اُلٹا، پہلوانوں کو پچھاڑا بھی — مگر غصہ میں دیو نفس کا لشکر اکھاڑا بھی ؟

۳۱ ——— لَیْسَ الْغِنٰی عَنْ کَثْرَۃِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ

غنی اس کو نہ سمجھو جس کے گھر میں نقرہ و زر ہو — غنی اس شخص کو کہتے ہیں جو دل کا تونگر ہو

۳۲ ——— اَلْحَزْمُ سُوْءُ الظَّنِّ

اگر ہو تو یہی محتاط ہونے کی نشانی ہو — کہ اپنے اوپر انساں کو ہمیشہ بدگمانی ہو

۳۳ ——— اَلْعِلْمُ لَا یُحِدُّ عَنْہُ صَدٌّ

ہر اک انساں کو حق ہے علم کی دولت سے ہو فائز — کسی کو روکنا اس سے نہیں اسلام میں جائز

۳۴ ——— اَلْکَلِمَۃُ الطَّیِّبَۃُ لِلسَّائِلِ صَدَقَۃٌ

اگر خالی ہو جیب اور مرتبہ سائل کا پہچانو — تو میٹھی بات کو خیرات کا نعم البدل جانو

۳۵ ——— کَثْرَۃُ الضِّحْکِ تُمِیْتُ الْقَلْبَ

ہنسو لیکن نہ اتنا جس سے دل پژمردہ ہو جائے — طبیعت ہو منغّض اور مذاق افسردہ ہو جائے

۳۶ ——— اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ

زمیں پھیلی ہوئی ہے جس طرح افلاک کے نیچے ۔۔۔ یُونہی جنت بھی ہے ماں کے قدم کی خاک کے نیچے

۳۷ ——— اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْمَنْطِقِ

زباں اس کو نہ سمجھو ہے یہ اک آفت کا پر کالا ۔۔۔ نہ رکھو گے جو قابو میں تو کر دے گی تہ و بالا

۳۸ ——— اَلنَّظَرَةُ سَهْمٌ مَّسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ

نظر کا تیر نامحرم پہ جب تم نے چلایا ہے ۔۔۔ اُسے ابلیس نے زہرِ ہلاہل میں بجھایا ہے

۳۹ ——— لَا يَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ دُوْنَ جَارِهٖ

نہیں ہے شائبہ تک اس میں لے مسلم تری خُو کا ۔۔۔ کہ خود تو پیٹ بھر کر کھائیں ہمسایہ رہے بھُوکا

۴۰ ——— لُعِنَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَلُعِنَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ

جہاں میں جس قدر ہیں درہم و دینار کے بندے ۔۔۔ ہیں ان کے واسطے پھیلے ہوئے پھٹکار کے پھندے

انسانیت کا منشورِ آزادی

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ہجرت نبوی کا دسواں سال تھا۔ عیسوی ۶۳۲ء فروری کا مہینہ آیا تو سرور کائنات مفخرِ موجودات رسول اکرم ابی و امی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بار حج بیت اللہ کا ارادہ فرمایا اور اپنے صحابہ کو بھی تیاری کا حکم دیا۔ کیونکہ حج ۹ھ میں فرض ہوا تھا اور عام روایت یہی ہے کہ حضور اکرم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ سفر حج کی تیاری کا اعلان ہوتے ہی لوگوں کے انبوہ مدینہ میں جمع ہونے لگے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ ۲۴ ذی قعدہ یعنی ۲۲ فروری ۶۳۲ء جمعرات کو مدینہ سے باہر نکلے اور ذوالحلیفہ میں تشریف لائے۔ وہاں غسل کر کے خطمی اور بالچھڑ (سنبل الطیب) سے سر دھویا، مشک کی خوشبو بالوں میں لگائی۔ حتیٰ کہ سر کے بالوں میں اور ریش مبارک میں سفیدی نظر آنے لگی۔ پھر مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی، ایک تہبند اور ایک چادر کا احرام باندھا۔ پھر بلند آواز سے تلبیہ پڑھا۔ لبیك اللهم لبيك لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك لبيك۔ قافلہ روانہ ہوا تو راستہ میں بھی لوگ اس میں شریک ہوتے گئے۔ مکہ کے قریب پہونچ کر آپ نے ذی طوی میں قیام فرمایا اور صبح کو بالائی حصہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ شریف میں تشریف لائے۔ رکن یمانی کو بوسہ دیا۔ پھر سات بار طواف کیا۔ اس طرح کہ تین بار طواف میں سینہ تان کر چلے اور چار بار معمولی انداز سے۔ دونوں رکن ہائے یمانی کے درمیان پہنچ کر آپ یہ دعا پڑھتے تھے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدنیا حسنةً وفی الاخرۃ حَسَنَةً وقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ پھر مقام ابراہیم کی طرف تشریف لائے اور یہ آیت بآواز بلند تلاوت کی۔ وَاتَّخِذُوا من مقام اِبراھم مُصَلّی۔ یہاں دو رکعت نماز پڑھی۔ پہلی رکعت میں قل ھو اللہ احد اور دوسری رکعت میں قل یاایھا الکٰفرون کی تلاوت فرمائی۔ پھر رکن یمانی کی طرف آکر اُسے بوسہ دیا۔ اب آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے۔ وہاں یہ آیت پڑھی۔ ان الصفا والمروۃ من شعآئر اللہ۔ پہلے آپ کوہ صفا پر اتنی بلندی پر چڑھے کہ بیت اللہ وہاں سے نظر آ رہا تھا۔ اس وقت آپ نے بآواز بلند پڑھا۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ لہ الملك ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر۔ لا الہ الا اللہ وحدہ أنجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الأحزاب وحدہ۔ پھر صفا سے اتر کر مروہ کی طرف جاتے ہوئے بطن وادی میں اترے تو تیزی سے چلے اور مروہ کی بلندی پر قدم مبارک آہستہ ہو گئے۔ جو تکبیر صفا پر پڑھی تھی وہی یہاں بھی پڑھی۔

۸ ذی الحجہ کو ترویہ کا دن آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے منیٰ میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر پانچ نمازیں پڑھیں اور اتنی دیر قیام فرمایا کہ آفتاب قدرے بلند ہو گیا ۹ ذی الحجہ کو وہاں سے کوچ کیا، اور مقام نمرہ میں نزول فرمایا۔ جب نمرہ میں خوب دھوپ پھیل گئی تو آپ نے اپنی اونٹنی طلب فرمائی۔ جس کا نام قصواء تھا۔ اس پہ کجاوہ کسا گیا۔ آپ سوار ہو کر بطن وادی یعنی میدانِ عرفات میں تشریف لائے۔ یہاں حدِ نظر تک انسانوں کا ہجوم تھا۔ سارا میدان کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تمام اصحاب رسولؐ بآواز بلند تکبیر و تہلیل و تسبیح و تقدیس میں مصروف تھے۔

مورخین نے اس مجمع کا اندازہ ایک لاکھ ۴۰ ہزار بتایا ہے بعض نے ایک لاکھ ۲۴ ہزار لکھا ہے ۔ یہاں آپ نے وہ عظیم الشان تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جسے بجا طور پر انسانیت کا منشور آزادی CHARTER OF HUMAN FREEDOM کہا جا سکتا ہے ۔

ایک لاکھ سے زائد انسانوں کا مجمع تھا، جن کی خوش نصیب آنکھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روئے مبارک پر جمی ہوئی تھیں ۔ آپ اپنی اونٹنی قصواء پر بیٹھے تقریر فرما رہے تھے ۔ سارے میدان عرفات میں ایسا ادب آمیز سکوت تھا کہ ہر شخص کے کانوں تک سرور کائنات کی مبارک شیریں، دلنواز اور سراپا اعجاز آواز پہنچ رہی تھی ۔ یوں تو حضور کا ہر فعل اور ہر قول "حدیث" ہے اور اس میں زندگی اور معاشرت کے ہزاروں لاکھوں مسائل اور معاملات کے بارے میں احکام موجود ہیں، لیکن آج ایک ایسا اجتماع تھا جو نہ پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھا تھا، نہ یہ دنیا ان قدسی صفات انسانوں کے درمیان ایک شہنشاہ دو عالم، رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے پھر کبھی سن سکے گی ۔

آج آپ نے ان احکام کی طرف واضح اشارے کیے جن کا تعلق سارے عالم انسانیت سے تھا ۔ خواہ گورے ہوں یا کالے امیر ہوں یا غریب، شریف ہوں یا رذیل، پڑھے لکھے ہوں یا جاہل، غلام اور باندیاں ہوں یا آزاد، آپ نے اس آخری پیغام میں واضح کر دیا کہ انسانوں کی معاشرت کے عائد کئے ہوئے وہ سارے مصنوعی بندھن جو دوسرے انسانوں کے استحصال کے لئے ہیں، توڑے جاتے ہیں ۔ انسان کی فطرت اور بنیادی آزادی کو بحال کیا جاتا ہے ۔ انسانوں کے وہ حقوق جن پر غاصبوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور اللہ کے بندوں کو جو فطرت کی طرف سے مساوی صلاحیتیں اور مساوی انعامات لے کر پیدا ہوئے تھے، کہیں غلام بنا لیا ہے، کہیں ان کا استحصال ہو رہا ہے ۔ کہیں انھیں سماج کی طبقہ بندی میں نچلی سطح پر پھینک دیا گیا ہے کہیں وہ پیٹ بھر کھانے سے محروم ہیں کہیں ان کے جسم پر پورا لباس بھی نہیں ہے، کہیں عورتوں کو مردوں سے کمتر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا ہے، کہیں حاکموں کو یہ غرّہ ہو گیا ہے کہ ان کے محکوم بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جا سکتے ہیں اور متاع بازار کی طرح آنکے جا سکتے ہیں کسی کو اپنے نسب اور حسب پر گھمنڈ ہے، کسی کو رنگ و نسل کا غرور ہے، کوئی اپنے تئیں خدا کی برگزیدہ مخلوق سمجھ بیٹھا ہے ۔ یہ سب وہ طریقے اور مظاہرے ہیں، جن میں ایک انسان دوسرے کا استحصال کرتا ہے اس کے حقوق کو پامال کرتا ہے، اور دنیا میں اللہ نے جن نعمتوں کو سب کے لیے عام کر دیا ہے، ان سے ایک کمزور طبقے کو محروم رکھ کر انھیں غریب، پسماندہ اور مفلوک الحال بنا دیتا ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ رہتی دنیا تک کے لیے عظمت انسانیت کا اعلان کرتا ہے ۔ یہ بتاتا ہے کہ تمام نوع بشر کے حقوق برابر ہیں اور کسی کو کمزور طبقے پیدا کرنے، پھر ان کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔ آج اقوام متحدہ کی فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اقوام عالم کے سینکڑوں نمائندے CHARTER OF HUMAN RIGHTS بناتے ہیں ۔ اس پر لمبے چوڑے مباحثے اور سیمینار کرتے ہیں ۔ مگر اس کا نفاذ نہیں کر پاتے ۔ صحرائے حجاز میں ایک نبی امی نے میدانِ عرفات میں اونٹنی کی پیٹھ پر بیٹھ کر جو آواز بلند کی تھی وہ چودہ سو برس سے اقصائے عالم میں گونج رہی ہے ۔ ذرا غور کیجئے اس میں کونسا پہلو ایسا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے حقوق کا اور انسانیت کی عظمت و شرف کا اعتراف نہیں کرتا؟ اس سے زیادہ واضح، پرسوز اور اثر انگیز آواز میں کیا آج تک دنیا کے کسی مصلح کسی ریفارمر، کسی لیڈر، کسی رہنما کی آواز انسانیت کے کانوں نے سنی ہے؟ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا:

"لوگو! مجھے امید نہیں ہے کہ ہم تم پھر کبھی اس جلسہ میں اکٹھے ہو سکیں گے ۔ دیکھو تمہارا خون تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر ایسے ہی حرام ہیں جیسے وہ آج کے دن اس شہر میں اور اس مہینہ میں حرام ہیں ۔

— دیکھو تم اپنے رب سے ملو گے تو وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں باز پرس کرے گا خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا۔ کبھی آپس میں ایک دوسرے کی گردن کاٹنے لگو۔

دیکھو جاہلیت کی ہر بری رسم کو میں اپنے پیروں تلے روندتا ہوں۔ دور جاہلی کے تمام خون کا بدلہ اپنے پیروں تلے رکھتا ہوں۔ اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا قصاص چھوڑتا ہوں جس نے بنی سعد کا دودھ پیا تھا اور جسے بنو ہذیل نے قتل کیا تھا۔

جاہلی کے دور کے سارے سود بھی ختم اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان سے عباس بن عبدالمطلب کا سُود چھوڑتا ہوں۔

لوگو! اپنی بیویوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تم نے اللہ کی ذمہ داری پہ انھیں اپنا بنایا ہے۔ اور اللہ کے کلام سے ان کے جسم کو اپنے لئے حلال کیا ہے۔ عورتوں پہ تمھارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پہ کسی غیر کو نہ آنے دیں اور ان کا حق تم پہ یہ ہے کہ انھیں اچھی طرح کھلاؤ اور پہناؤ۔

دیکھو! میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اسے مضبوط پکڑ لو گے تو تم گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے۔

لوگو! یقیناً نہ میرے بعد کوئی نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی امت آنے والی ہے۔ دیکھو اپنے رب کی عبادت کرتے رہنا۔ پانچوں وقت نماز پڑھنا۔ ایک مہینہ روزے رکھنا۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ ادا کرتے رہنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ اپنے حاکموں کی اطاعت کرنا تاکہ تم اپنے ربّ کی جنت میں داخل ہو سکو۔

اور دیکھو! کل قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

سب نے کہا! ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کے احکام پہونچا دیئے اور حق رسالت ادا کیا۔ اور ہماری خیر خواہی کی باتیں ہمیں بتا دیں اس پہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کی پھر تین بار فرمایا "اے اللہ گواہ رہیو۔ اے اللہ گواہ رہیو۔ اے اللہ گواہ رہیو"

دیکھو! جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان لوگوں تک پہونچا دیں جو اس وقت حاضر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ان سننے والوں سے زیادہ سمجھ دار ہوں —"

یہ تھا وہ انسانیت کا منشورِ آزادی اس میں جو اصول آ گئے ہیں اب ان پہ غور کر لیجئے۔

پہلا اصول: PEACEFUL CO-EXISTENCE کا ہے۔ جیو اور جینے دو۔ اور یہی وہ بنیادی حق ہے جس کے لیے آج تیسری دنیا جدوجہد کر رہی ہے اور عالمی طاقتیں اسے یہ حق دینے پہ تیار نہیں ہیں۔

دوسرا اصول: آپ نے انتقام کے چکّر کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ جو افراد اور قوموں کی زندگی میں سب سے بڑی فساد کی جڑ ہے۔ آج کی اصطلاح میں یہ جذبۂ انتقام، توازنِ طاقت BALANCE OF POWER کے خوبصورت نام کی آڑ میں پرورش پاتا ہے۔ اور اسے "نزع سلاح" یعنی DISARMAMENT کی تحریک سے دبانے کی ساری کوششیں ناکام ہو رہی ہیں۔

تیسرا اصول: آپ نے عورتوں کے حقوق کی تاکید فرمائی۔ آج کی دنیا میں WOMENS LIBERTY کی تحریک کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ مگر اس نے عورتوں کے فرائض پہ دھیان نہیں دیا۔ اسی لئے مغرب کی میکانکی زندگی میں ازدواجی رشتے اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ آپ نے مرد

اور عورت دونوں کے حقوق کی وضاحت کر دی ہے اور بتا دیا ہے کہ عورت سے عفت وعصمت اور وفاداری کا مطالبہ کرنا مرد کا حق ہے۔

چوتھا اصول: اس خطبہ میں تصورِ آخرت کو یاد دلایا، جو اسلامی عقیدہ کی اساس ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ خود کو ACCOUNT ABILITY سے آزاد سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس سے ظلم و شر کے سوا کچھ سرزد نہیں ہوگا اور اسے کسی چیز کی دہائی نہیں دی جاسکتی۔ آج کی اصطلاح میں اسی کو AUTHORITARIANISM اور CHAUVINISM کہا جاتا ہے۔ ایک خدا ترس سوسائٹی میں ظلم و جبر و پنپنے کے لیے مشکل ہی سے سازگار ماحول مل سکتا ہے۔

پانچواں اصول: آپ نے اتفاق و اتحاد کی تلقین فرمائی کہ تم آپس میں ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔

چھٹا اصول: اس میں فرسودہ روایات کی بیخ کنی کر کے ایک صحت مند سماجی انقلاب کی دعوت دی گئی ہے اور صاف اعلان فرمایا کہ جاہلی رسمیں، سند نہ سمجھی جائیں یہ RADICALISM کی بنیاد ہے۔

ساتواں اصول: سود کی مخالفت کر کے آپ نے اقتصادی زندگی سے استحصال کا خاتمہ کر دیا۔

آٹھواں اصول: تمام مسلمانوں کو کتاب اللہ کی طرف بلایا۔ جو اسلامی معاشرہ کا بنیادی دستور ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ بھی واضح کر دیا۔ گویا اس دستور میں ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔

نواں اصول - ارکانِ اسلام ادا کرنے کی تاکید فرما دی۔

دسواں اصول - حاکمانِ وقت کی اطاعت کی تلقین سے یہ مراد ہے کہ لا اینڈ آرڈر کے مسائل اور سیاسی خلفشار پیدا نہ ہو۔ اولوالامر کا انتخاب چونکہ جمہوری طریقہ پر ہوتا تھا، اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کی حکومت کو بدنظمی اور انتشار کا شکار نہ بنایا جائے۔

آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ اس CHARTER OF HUMAN RIGHTS کو دنیا کے کونے کونے میں عام اور شائع کر دیا جائے تاکہ ساری انسانیت اپنے حقوق پہچان لے اور ان کے حصول کی جدوجہد اور حصول کے بعد حفاظت کرے۔ اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیت نازل ہوئی۔ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔ آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تمہارے لیے تمام کر دیا۔

حجۃ الوداع

مولانا غلام رسول مہر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری بڑا واقعہ حجۃ الوداع ہے۔ حج فرض ہونے کے بعد یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج تھا۔ اسی موقع پر دین قیم کی تکمیل ہوئی۔ حضور صلعم نے منیٰ اور عرفات میں جو خطبات ارشاد فرمائے۔ ان میں اسلامی تعلیمات کے متعلق بعض نہایت اہم بنیادی امور کا ذکر تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ حضور صلعم جس فرض نبوت کی بجا آوری کے لیے مبعوث ہوئے تھے، وہ ہر لحاظ سے پایۂ تکمیل پر پہنچ چکا تھا۔ رسالت کا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلعم نے حجۃ الوداع کے خطبات میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اس نے طبعاً وصایا کی حیثیت اختیار کر لی تھی یہی وجہ ہے کہ حجۃ الوداع کو سیرت طیبہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

حج ہجرت کے نویں سال فرض ہوا تھا۔ اسی سال حضور صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج بنا کر مکہ معظمہ بھیج دیا پھر سورۂ برأت کی چالیس آئتیں نازل ہوئیں تو حضرت علیؓ کو یہ آئتیں دے کر مکہ معظمہ کی طرف روانہ فرمایا تاکہ حج کے موقع پر یہ سب کو سنا دی جائیں۔

حضور صلعم کا عزم حج

ہجرت کے دسویں سال ذی قعدہ کے مہینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حج کا ارادہ فرمایا۔ یہ خبر مشہور ہوئی تو ہزاروں مسلمان بے تابانہ شرف معیت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضور صلعم ۲۶ ذی قعدہ سنہ ۱۰ھ (۲۳ اپریل ۶۳۲ء) کو ہفتے کے روز مدینہ منورہ سے چلے اور ذوالحلیفہ میں مقام کیا، جو اہل مدینہ کے لیے میقات ہے اور تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ آج کل اس مقام کو "آبار علی" کہتے ہیں۔

۲۷ ذی قعدہ کو قافلہ نبوی ذوالحلیفہ سے چلا اور ان الفاظ میں تلبیہ شروع ہوا۔

لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک لا شریک لک۔

ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں، اے خدا تیرے سامنے حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہم حاضر ہیں۔ ہر ستائش صرف تیرے لیے ہے اور ہر نعمت تیری ہے سلطنت بھی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

موقع کا راوی بتاتا ہے کہ میں نے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا، جہاں تک بصارت مساعدت کرتی تھی، آدمیوں ہی کا جنگل نظر آتا تھا۔ حضور صلعم کی زبان مبارک سے لبیک کی صدا بلند ہوتی تو ہر طرف سے اس کی آواز بازگشت آتی اور گرد کے میدان اور پہاڑ گونج اٹھتے۔

اس واقعہ پر چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہمارے تمام دینی اعمال کی حیثیت اب بڑی حد تک رسمی سی رہ گئی ہے۔ مگر آج

بھی موسم حج میں مکہ معظمہ کی مقدس فضا کے اندر اور اس متبرک مقام کے تمام راستوں پر عازمین حج کا تلبیہ سن کر ہر انسان خدا پرستی کا ایک نادیدہ پیکر بن جاتا ہے۔ جن خوش نصیبوں نے ۲۷ ذی قعدہ ۱۰ھ کو خود حضور صلعم کے زیر قیادت کم و بیش ایک لاکھ اہل حق کے تلبیہ کا منظر دیکھا ہوگا، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دلوں اور روحوں کا نقشہ کیا ہوگا۔

تلبیہ کی معنوی حیثیت

پھر تلبیہ کی معنوی حیثیت پر غور فرمائیے۔ اس کی مرکزی روح توحید ہے، جو دین حق کی روح حیات ہے اس کے حرف بہ حرف میں عبودیت و بندگی، عجز و نیاز، بارگاہ باری تعالیٰ میں حاضری کے ذوق و شوق و شیفتگی کے ایمان پرور محسوسات بے تاب و مضطرب نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی موقع اور محل کا تصوّر فرمائیے۔ کائنات انسانیت کا مقدس ترین وجود تیئس سال میں فرض نبوت کو بوجہ احسن تکمیل پر پہنچا چکا تھا۔ اس کی تعلیمات حقہ کے ثمرات حسنہ ہر طرف نگاہوں کو روشنی اور قلوب کو ایمان کی دولت سے مالا مال کر رہے تھے اور خدائے واحد کے روبرو سرافگندگی و حوالگی کا عشق اس درجہ کمال پر پہنچا ہوا تھا کہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ایک فرد کے بدن کا رُواں رُواں شکر و سپاس میں سراپا حمد و ستائش بنا ہُوا، اسی کے آگے سجدہ ریزی کی بیتابیوں کا مرجع و محور ہے۔ یہی اسوہ حسنہ تھا، جس کی پیروی عالم انسانیت کے لیے اس زندگی اور آئندہ زندگی میں واحد فوز و فلاح ہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، جو اس پیروی سے سعادت اندوز نہ ہوں گے، ان کے لیے دونوں جہانوں میں امن و سلام کی امید خیال خام ہوگی۔

مکہ مکرمہ میں داخلہ

۲۷ ذی قعدہ ۱۰ھ کو ذوالحلیفہ سے روانہ ہو کر حضور صلعم منزل بہ منزل ۳ ذی حجہ ۱۰ھ (یکم مارچ ۶۳۲ء) کو سرف پہنچے۔ جہاں سے مکہ معظمہ صرف چھ سات میل ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں ام المومنین حضرت میمونہؓ کا مکان تھا اور وہیں ان کا مزار بنا۔ ۴ ذی حجہ (۲ مارچ ۶۳۲ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت حضور صلعم مکہ مکرمہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ خانہ کعبہ کے طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا۔ پھر سعی کے لیے کوہ صفا پر پہنچے، وہاں سے کعبہ نظر آیا تو فرمایا۔

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہ الملک ولہ الحمد یحیی ویمیت وھو علی کل شیءٍ قدیر۔ لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ انجز وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ

اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ سلطنت اس کی ہے اور ستائش بھی اسی کے لیے زیبا ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے اور سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ ایک ہے اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس نے اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور اکیلے تمام گروہوں کو شکست دے دی۔

ایک ارشاد کی توضیح

وعدے کی ایفاء، اپنے بندے کی امداد اور اکیلے تمام گروہوں کی شکست پر عرب کے زمین و آسمان زبان سے شہادت دے رہے تھے۔ تیئس سال پیشتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تنہا تھے۔ پھر آپ کی دعوت پر ایک ایک دو دو آدمی ساتھ ملتے گئے۔ اس مقدس گروہ نے تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں ایسی خوفناک اذیتیں برداشت کیں جن کا تصور بھی جسموں پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ پھر سب کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اس کے باوجود مخالفوں نے انہیں دکھ دینے اور تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رزم و پیکار کی ہر قوت اس مقدس ترین وجود اور اس کے جان نثار ساتھیوں کے خلاف بے دریغ

استعمال کی گئی۔ آخر ہر قوت ناکام و نامراد ہو کر اسی راستے پر گامزن ہو گئی، جو حضور صلعم نے آغاز نبوت میں پیش کیا تھا گیا یہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت نہ تھا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے مقدس ترین بندے کی امداد فرمائی اور تنہا تمام گروہوں کو شکست دے دی۔

کیفیت حج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کی آٹھویں تاریخ (۶ ر مارچ ۶۳۲ء) کو جمعرات کے دن تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔ نویں تاریخ (۷ ر مارچ) کو جمعہ کے دن صبح کی نماز ادا کر کے عرفات کی طرف روانہ ہوئے عرفات کے کنارے پر ایک مقام نمرہ ہے، جہاں کمل کے خیمے میں آپ نے قیام فرمایا۔ دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ قصواء پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لائے اور سواری ہی کی حالت میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ ظہر و عصر کی نماز ادا کر کے پھر میدان میں دیر تک قبلہ رو ہو کر مصروفِ دعا رہے۔ سورج ڈوبنے لگا، تو عرفات سے چلے۔ رات مزدلفہ (مشعر الحرام) میں گزاری اور دسویں ذی الحجہ (۸ ر مارچ) کو منیٰ میں پہنچ گئے۔ ایام تشریق منیٰ میں گزارے۔ البتہ دسویں تاریخ کو قربانی کے بعد مکہ معظمہ جا کر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ ۱۳ ر ذی الحجہ کو بعد زوال منیٰ سے اٹھے اور حنیف بن کنانہ میں مقام کیا۔ رات کے پچھلے پہر خانہ کعبہ کا طواف کیا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

حضور صلعم کے خطبات

یہ حجۃ الوداع کا سرسری خاکہ ہے، جس میں تفصیلات نہیں دی گئیں۔ میرا اصل مقصود یہ ہے کہ خطبات شریفہ میں سے بعض ضروری چیزیں یہاں پیش کروں، جنہیں میرے نزدیک امت کے لیے وصایا کی حیثیت حاصل ہے۔

خطبوں کے متعلق تمام روایات کو یکجا کر کے اہلِ علم و تحقیق اس نتیجے پر پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں تین خطبے ارشاد فرمائے۔ پہلا ۹ ر ذی الحجہ کو عرفات کے میدان میں، دوسرا ۱۰ ر ذی الحجہ کو منیٰ میں اور تیسرا ۱۱ ر یا ۱۲ ر ذی الحجہ کو منیٰ میں۔ ان میں بعض مطالب کو اپنی اہمیت کے پیش نظر دہرایا گیا۔ انداز مختلف تھا۔ میں انہیں بلحاظ ترتیب یہاں پیش کروں گا۔ مناسب یہی معلوم ہوا کہ عربی عبارتیں نہ لکھوں اور مطالب اردو میں بیان کر دوں۔

عالمگیر مساوات

عرفات کے خطبے میں حضور صلعم نے سب سے پہلے جاہلیت کی تمام بیہودہ رسموں اور تمام نازیبا دستوروں کے خاتمے کا اعلان کیا۔ پھر فرمایا:

"لوگو! سن لو کہ تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے (یعنی آدم ؑ)۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت و برتری نہیں، مگر صرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بناء پر۔"

یہ اس حقیقت کا اعلان تھا کہ انسان کی فضیلت نہ خاندان پر موقوف ہے اور نہ نسل، خون یا رنگ پر، نہ کسی خاص ملک یا قوم کا باشندہ ہونا اس بارے میں معیار بن سکتا ہے، نہ اچھا لباس، عالیشان مکان یا دولت و ثروت کے انبار کسی کو بڑا بنا سکتے ہیں۔ محض علم یا عہدہ و منصب بھی بڑائی کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔ املاک کی فراوانی بھی اس باب میں قطعاً سودمند نہیں ہو سکتی۔ بڑائی اور بزرگی صرف تقویٰ، پرہیزگاری، حسن عمل، اور فضیلت اخلاق پر منحصر ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس مختصر سے ارشاد نے عالم انسانیت کے نقطۂ نگاہ میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، جس کی کوئی مثال اس سے پیشتر نہیں ملتی؟ پہلے انسانوں کا مطمح نظر کیا تھا؟ کسی خاص نسل یا رنگ یا خون سے وابستگی، دولت جمع کرنے کا جنون

عالی شان مکان بنانے کا اضطراب، بڑے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو، ملک فتح کر لینے کا زور ان تمام چیزوں کے لیے کش مکش کے ہنگاموں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ انسانوں میں تفرقہ، بغض، عداوت اور نفرت پیدا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے رہیں۔ اونچے مناصب پر پہنچ جائیں تو اختیار و اقتدار سے فائدہ اٹھا کر دولت سمیٹیں، رشوتیں لیں۔ لاکھوں بے وسیلہ مساکین کچلے جائیں اور دنیا میں امن مفقود رہے۔ قومیں قوموں سے اور ملک ملکوں سے لڑتے رہیں اور کسی کے لیے اطمینان سے سانس لینے کا موقع پیدا ہی نہ ہو۔ لیکن نکوکاری اور پرہیز گاری کو عالم انسانیت کا نصب العین بنا دینے کے بعد سب کی کوشش یہ ہو گی کہ نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھیں، خدمت خلق میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ خدا کے بندوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پیار کریں۔ ان کے امن و راحت کا خیال رکھیں۔ حق و انصاف کی پاسداری ہوتی رہے۔ اور دنیا امن سے بھر جائے کتنے رنج و قلق کا مقام ہے کہ جو قوم اپنے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام حق کی داعی اور مبلغ بنائی گئی، وہ بھی آج عملاً اس کی پابندی سے منزلوں دور ہے۔

اسلامی اخوت

پھر فرمایا۔

دیکھو، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

نیز فرمایا۔

ہاں، میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ تمہیں جلد خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔

دیکھیے، مسلمان نوکر ہوں یا آقا، غریب ہوں یا امیر، مفلس ہوں یا دولت مند، معمولی حیثیت رکھتے ہوں یا اونچے درجے پر فائز ہوں ان میں کوئی امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔ وہ سب ایک سطح پر ہیں ان سب کے دل میں ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی بھائیوں کی سی محبت ہونی چاہیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ مظلوم ہو یا ظالم۔ عرض کیا گیا۔ حضور! مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آگئی۔ مگر ظالم کی مدد کیوں کر ہو؟ فرمایا، جو بھائی ظلم کرے، اسے ظلم سے باز رکھو۔ یہ ظالم بھائی کی امداد ہے۔

مسلمان اس آئینے کو سامنے رکھ کر اپنے اعمال کا محاسبہ کریں، تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہو گا کہ شرم و ندامت کے مارے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برادرانہ محبت و الفت کے لیے ایک کسوٹی بھی تجویز فرما دی یعنی اپنے بھائی کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرو، جس کی توقع تم اس سے رکھتے ہو۔

باقی رہا گمراہ ہو کر ایک دوسرے کی گردن مارنے کا معاملہ، تو میں سمجھتا ہوں کہ تاریخ اسلام میں اس کی اتنی شہادتیں موجود ہیں کہ میرے لیے کچھ عرض کرنا قطعاً غیر ضروری ہے اور بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اسی گمراہی کے باعث عزم و شرف کے بلند مقام سے محروم ہوئے جس پر وہ اسلام کی بدولت پہنچے تھے۔

اجتماعی زندگی کی بنیادیں

اجتماعی زندگی کی بنیادیں تین ہیں۔ جان کا پاس، مال کی حفاظت اور آبرو کا احترام انسانوں کے درمیان کشمکشوں اور جھگڑوں، رنجشوں اور مخالفتوں کے جتنے بھی واقعات آپ کے سامنے

آئیں، ان کا تجزیہ کیا جائے، تو وہ ہیں جان، مال اور آبرو کے بارے میں کم یا زیادہ بے احتیاطی کے سوا اور کوئی چیز نہ نکلے گی۔ آج دنیا ان تین بنیادوں پر قائم رہنے کا پختہ عہد کرلے، تو سارے جھگڑے مٹ سکتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین بنیادی چیزوں کی حفاظت کا معاملہ بھی آخری حد پر پہنچا دیا۔ فرمایا۔

لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں قیامت تک کے لیے اسی عزت و حرمت کی مستحق ہیں، جس طرح تم آج کے دن (یوم حج) اس مہینے (ذی الحجہ) اور اس شہر (مکہ مکرمہ) کی حرمت کرتے ہو۔

امن وسلامتی کی راہ

عربوں میں بدلے کا دستور عام تھا۔ ایک خون ہو جاتا، تو انتقام کا لامتناہی سلسلہ چھڑ جاتا صرف عرب ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں خادموں اور غلاموں کے ساتھ حد درجہ برا سلوک کیا جاتا۔ عورتوں کے جائز حقوق کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا۔ سود در سود نے ضرورت مندوں کے لیے زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ انہیں وجوہ سے امن وسلامتی کی راہ ظلم و جبر کے اندھیرے میں گم ہو گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

۱۔ میں زمانہ جاہلیت کے تمام خون (خون کے بدلے) آج مٹا رہا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان میں سے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں،

۲۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ۔ جو خود پہنو، وہی انہیں پہناؤ۔

۳۔ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ جس طرح تمہارے حق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے حق تم پر ہیں

۴۔ میں جاہلیت کے تمام سود باطل قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے خاندان میں سے عباس بن عبدالمطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔

گمراہی سے بچنے کا طریقہ

پھر فرمایا۔

میں تم میں وہ چیز چھوڑے جاتا ہوں۔ جسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے، تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یہ اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔

دیکھیے یہی کتاب مسلمانوں کی ہدایت و سعادت کا سرچشمہ تھی۔ اس کے مطابق عمل نے ملت اسلامیہ کو عالم انسانیت کی امامت کے درجہ عالیہ پر پہنچایا۔ آج اسی کو مسلمانوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ وہ مختلف سہارے ڈھونڈتے ہیں جدھر سے کوئی اچھی صدا اٹھتی ہے یا بطور خود سمجھ لیتے ہیں کہ صدا اچھی ہے، ادھر ہی بیتابانہ دوڑتے ہیں۔ لیکن اس پاک کتاب کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، جو انہیں گمراہی سے محفوظ رکھنے کا واحد اور بہترین ذریعہ ہے۔

آخر میں فرمایا۔

لوگو! نہ میرے بعد کوئی اور پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت وجود میں آنے والی ہے خوب سن لو اپنے پروردگار کی عبادت کرو، پنجگانہ نماز کے پابند رہو، ماہ رمضان کے روزے رکھو، مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجا لاؤ۔ اپنے اولیائے امور کی اطاعت کرو۔ ان اعمال کی جزا یہ ہے کہ اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

تکمیلِ دین خطبہ شریف کے اختتام پر فرمایا تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا، بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟ عرض کیا گیا ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔ آپؐ نے انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا۔ اے خدا تو گواہ رہنا پھر لوگوں سے کہا کہ جو اس وقت موجود ہیں، وہ انہیں سنا دیں، جو اس وقت موجود نہیں گویا ہر مسلمان کو دائمی حق دار بنا دیا تعلیم اس موقع پر وہ آیت نازل ہوئی جس میں تکمیل دین اور اتمام نعمت کی بشارت دی گئی تھی
اب میں منیٰ کے خطبے یا خطبوں میں سے ایک دو اقتباسات پیش کروں گا۔

دین کامل ہو چکا تھا، نعمت منزلِ اتمام پر پہنچ چکی تھی، وہ امت وجود میں آ چکی تھی جو روئے زمین پر خلافت الٰہیہ کا نادر نمونہ پیش کرنے والی تھی اور جس نے تھوڑی ہی مدت میں زندگی کے ہر دائرے اندر عظیم الشان خدمات کے ایسے انبار لگا دیئے، جن کی کوئی مثال نہ پہلے موجود تھی اور نہ بعد میں سامنے آ سکی۔ عالم انسانیت میں پیشتر بھی بار ہا انقلاب آ چکے تھے، مگر ساتویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے سے جس انقلاب کی ابتدا ہوئی تھی، اور حجۃ الوداع پر اس کی تکمیل ہوئی وہ ہر نقطۂ نگاہ سے یگانہ و نادیدہ تھا۔ سید سلیمان مرحوم کے قول کے مطابق ایک نئے نظام، نئی شریعت اور نئے عالم کا آغاز ہو رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطے پر آ گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے تھے۔

غور کیجئے کہ تاریخ عالم میں جو نیا دور شروع ہو رہا تھا، اس کی تعبیر کے لیے اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی تھی کہ زمانہ پھر اس جگہ آ گیا جب اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی تھی۔

پھر جان، مال اور آبرو کا موضوع ذہن مبارک میں آ گیا اور اہمیت کے اعتبار سے اسے دہرانا مناسب سمجھا، لیکن اسلوب بالکل نیا اختیار کیا۔ فرمایا۔

"کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے عرض کی "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" آپ کچھ دیر خاموش رہے اور لوگوں نے سمجھا شاید آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھ دیں گے۔ سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟" لوگوں نے کہا۔ "بے شک" پھر ارشاد ہوا۔ "یہ کون سا مہینہ ہے؟" لوگوں نے پھر کہا "خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔" آپؐ نے پہلے کی طرح سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں؟" لوگوں نے کہا "بے شک" پھر پوچھا "یہ کون سا شہر ہے؟" لوگوں نے پھر کہا "خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔" اس مرتبہ بھی سکوت کے بعد فرمایا "کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں؟" لوگوں نے کہا "بے شک"۔

اس اسلوب خطاب سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں کے دل میں قربانی کے دن، حج کے مہینے اور مکہ مکرمہ کی حرمت پیوست ہو جائے۔ یہ ہو چکا، تو فرمایا۔

تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں اس طرح قیامت تک احترام کی مستحق ہیں، جس طرح تمہارے لیے آج کا دن (قربانی کا دن) یہ مہینہ (حج کا مہینہ) اور یہ شہر (مکہ مکرمہ) احترام کے مستحق ہیں

حجۃ الوداع کے بعد حضور صلعم نے بہت کم مدت اس دنیا میں گزاری [illegible] روایات
۹ ذی حج) سے صرف اکیاسی روز بعد وفات پائی۔ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم